

شوکت صدیقی

جائنگلوس



۱۳۵۶

یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ جاگیروں اور
نجی جائیدادوں کے موجودہ حقوق کس بنیاد پر جائز
ہیں۔ سب سے پہلی دستاویز تو تلوار کی نوک سے
تحریر کی گئی جسے جرنیلوں اور سپاہیوں نے اپنے ہاتھ
سے لکھا اور قیمت کے عوض تلوار، خنجر اور نیزے
کی ضربیں لگا کے انسانی خون کی مہریں ثبت کی
گئیں۔ وہ حضرات جو یہ فرماتے ہیں کہ وقت ہی
ناجائز کو جائز بنا دیتا ہے ازراہ کرم اس سوال کا تسلی
بخش جواب دیں کہ کسی گناہ کو نیکی بننے کے لئے
کتنا وقت درکار ہوتا ہے اور کس سالانہ شرح سے
ایک غیر قانونی اور ناجائز سودا قانونی اور جائز بن
جاتا ہے؟

کارل مارکس

ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ خزاں رسیدہ پتے درختوں سے ٹوٹ کر گرے اور دور دور تک بکھر گئے۔ یہ ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں کی ایک ویران رات تھی۔ لاری اسٹینڈ سنسان تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دونوں اندھیرے میں دم بخود کھڑے تھے۔ ڈرائیور ہوٹل کے سامنے لکڑی کی بیچ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ قریب ہی ایک آوارہ کتا ہڈی چبا رہا تھا۔ ہڈی اس کے دانتوں تلے رک رک کر ایک ہی انداز سے بجتی اور اس کی آواز سناتے میں تحلیل ہو جاتی۔

دونوں سایوں کی مانند تاریکی میں دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ ایک کا قد کسی قدر نکلتا ہوا تھا۔ چھریا بدن تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دبی ہوئی تھیں۔ رنگ گندی تھا۔ یہ رحیم داد تھا۔ دوسرا لال دین تھا۔ مگر سب اسے لالی کہتے تھے۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط جوان تھا۔ دونوں کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سروں کے بال خشک اور بے ترتیب تھے۔ لالی بیچ پر لیٹے ہوئے آدمی کی چادر اتار لینا چاہتا تھا۔ اس نے چادر کا کونا پکڑ کر آہستہ سے کھینچا۔ وہ چونک پڑا۔ کروٹ بدلی اور نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں بڑبڑایا۔

”اوئے تنگ نہ کر۔“

اب وہ خاموش لیٹا تھا۔ رحیم داد اور لالی کو مطلق اندازہ نہ تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ دونوں سراپیسگی کے عالم میں کچھ دیر دم سادھے کھڑے رہے۔ جب نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ آواز تو وہ بے دے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

رحیم داد نے چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ ”رات کتنی رہتی ہے؟“ اس کے لہجے سے تھکن اور بے

زاری جھلک رہی تھی۔

”ابھی بہت رہتی ہے۔“ لالی نے گردن اٹھا کر آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھا۔ چند لمبے خاموش رہا، پھر قدموں کی رفتار تیز کرتے ہوئے اس نے رحیم داد کی جانب تکیسی نظروں سے دیکھا۔ ”اڑل کھوتی نہ بن۔ مرداں والی چال چل۔“

”تو نے فیہ تھانیداری شروع کر دی۔“ رحیم داد نے احتجاج کیا۔

”ایسا کریس لیٹ جا۔“ لالی نے ایک بار پھر مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ ”میں بیٹھ کر تیرے پاؤں

دبا تا ہوں۔ یہی چاہتا ہے نا۔“

رحیم داد بے زبان سے ایک لفظ نکالے بغیر جھنجھلا کر لالی کو دیکھا اور چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

آدھی رات تک دونوں منگمری جیل میں قیدی تھے۔ رحیم داد کو بلوے اور اقدام قتل کے جرم میں تین سال قید با مشقت ہوئی تھی۔ جیل ہی میں اس کی ملاقات لالی سے ہوئی۔ وہ پہلے سے وہاں موجود تھا اور ڈیڑھ سال کی سزا بھگت رہا تھا۔ ایک روز لالی نے رحیم داد کو اعتماد میں لیا اور جیل سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ رحیم داد کچا تھا۔ پہلے ذرا جھجکا اور انکار میں گردن ہلانے لگا۔ مگر جب لالی نے حوصلہ بڑھایا اور قید کی تھکن سے نکل کر آزاد فضا میں سانس لینے کی تمنا خوف و ہراس پر غالب آگئی تو وہ لالی کے ساتھ فرار ہونے پر آمادہ ہو گیا۔ جیل کے گھڑیاں نے رات کے بارہ بجائے۔ پہرہ بدلا۔ نئے پہرے دار بیروں اور چکیوں کے تالے بجا، بجا کر ”کائٹا“ تالا سب ٹھیک ہے۔“ کی صدا میں بلند کر چکے تو لالی نے اپنا کام دکھایا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ نہایت صفائی سے جیل کی اونچی اونچی فصیلوں سے باہر نکلا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔

جیل سے بھاگے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ صبح گنتی ہونے سے پہلے کسی کو ان کے فرار کی خبر نہ ہوگی۔ ان کے پاس چند گھنٹے اور تھے۔ اس عرصے میں وہ جلد سے جلد بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ کچھ دیر ایک دیرانے میں بھٹکتے رہے، پھر عارف والا روڈ پر آگئے اور چلتے چلتے لاری اسٹینڈ پر پہنچ گئے۔

لاری اسٹینڈ اب بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ جیل اس سے بھی پیچھے تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ستارے ابلے ابلے کول بن گئے تھے۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں جانب درخت تھے۔ پت جھڑ کے دن تھے۔ ہوا میں تیزی کے ساتھ ہلکی ہلکی خنکی بھی تھی۔ سڑک پر بکھرے ہوئے خشک پتے تیز جھونکوں سے خاموشی میں کھڑکھڑا رہے تھے۔

لالی اور رحیم داد بچے پیر تھے۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے مسلسل چل رہے تھے اور تھکن کے باوجود تیز تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھیں اس علاقے کے بارے میں کوئی اندازہ نہ تھا۔ نہ راستوں کا پتہ تھا اور نہ کوئی ایسا ٹھکانا جانتے تھے جہاں وہ روپوش ہو سکتے۔ وہ منزل سے بے خبر آگے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رحیم داد کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔

”لالی! یہ تو بتا ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”یہ تو مجھے بھی پتہ نہیں۔“ لالی نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”خول نہ کر۔ ٹھیک، ٹھیک گل کر۔ اس طرح ہم نے کب تک چلتے رہتا ہے۔“

لالی نے رحیم داد کا بازو تھام کر اٹھکیوں سے گوشت ٹٹولا۔ ”دیکھنے میں تو ٹکڑا لگتا ہے، پر باتیں زنانوں کی سی کرتا ہے۔ رجے! حوصلے سے کام لے۔ ایسے تو اپنے ساتھ مجھے بھی مروا دے گا۔“

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ عقب سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ سڑک کے موڑ سے روشنی ابھری اور خزاں رسیدہ درختوں کی برہنہ شاخوں سے جھن جھن کر ہر طرف بکھرنے لگی۔ وہ جھٹ سڑک سے نیچے اترے اور ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں دبک کر بیٹھ گئے۔ رحیم داد زیادہ سہا ہوا تھا۔ وہ گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ لالی بھی خوف زدہ تھا۔ مگر جو کس نظر آتا تھا۔ روشنی قریب آتی گئی۔ سڑک پر پیسوں کے تیزی سے دوڑنے کی آواز بڑھتی گئی۔

ذرا دیر بعد ایک جیپ عین ان کے سامنے آکر ٹھہر گئی۔ جیپ میں چار مسلح رنجرز سوار تھے۔ ایک ڈرائیور کے برابر بیٹھا تھا۔ تین پچھلی نشست پر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں دبی تھیں۔ جیپ کے رکتے ہی اگلی نشست سے ایک شخص نیچے اتر ا۔ وضع قطع سے ڈرائیور معلوم ہوتا تھا۔ اس کے باہر آتے ہی ایک رنجر بھی جیپ سے اتر کر سڑک پر آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا انڈیش میں اتر ا۔ جھاڑی کے قریب پہنچا اور اطمینان سے پیشاب کرنے لگا۔

رحیم داد اور لالی سانس روکے بیٹھے رہے۔ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے رہے۔ ہوا کے تھپیڑوں سے چھینے، اڑاڑ کر ان کے چروں پر گرتے رہے۔ مگر ڈر کے مارے انھوں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔

سڑک پر ڈرائیور جھک جھک کر جیپ کے پیچھے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کو کھانسی کا ٹھک محسوس ہوا۔ اس کے حلق کے اندر خرخر ہونے لگی۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ دبوچ لیا۔ اسی اثناء میں ڈرائیور کی آواز ابھری۔

”پچھو تو نہیں لگتا جی، پر ایک پیسے میں ہوا ضرور کم ہے۔“

جھاڑی کے قریب کھڑے ہوئے ریختر نے گردن موڑ کر اونچی آواز سے کہا۔ ”نیش تک تو پہنچ ہی جائے گی۔ وہیں پیٹرول پمپ سے پینے میں ہوا بھر دیا لیتا۔“ وہ چٹلون کے مٹن لگاتا ہوا مڑا اور جیب کی جانب بڑھنے لگا۔

لالی اور رحیم داد جھاڑی کی اوٹ سے اسے دیکھتے رہے۔ ذرا نیور اور ریختر جیب میں داخل ہوئے اور اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ رات کے سنائے میں جیب کا انجن زور زور سے گھڑ گھڑایا۔ جیب آگے بڑھی اور تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ ذرا دیر بعد نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ لالی گردن اٹھائے اسے دور تک دیکھتا رہا۔ پھر رحیم داد کی پیٹھ پر زور سے دھپ مار کر بے تکلفی سے بولا۔

”تو نے تو مرواہی دیا تھا رنجہ۔“

”سور دا پتیا لکل منہ پر کھڑا موت رہا تھا۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری سے کہا۔

”پرتیری کھانی سے تو بیڑا ہی گرک ہو جاتا۔ وہ تو میں نے جھٹ تیرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ورنہ دونوں فیر جیل کی ہوا کھاتے۔“ لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”اب یہیں بیٹھا رہے گا؟ جیتتی کر۔ ابھی تو بہت چلنا ہے۔“

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ لیکن خاموش رہا۔ لالی نے دریافت کیا۔ ”کس سوچ میں پڑ گیا رنجہ۔“

”سوچ رہا ہوں۔ یہ پو لے ادر کیسے آگئے۔ کہیں انھیں ہمارے جیل سے فرار ہونے کا تو پتہ نہیں چل گیا؟“

”پو لے تو نہیں تھے۔ وردی سے تو ریختر لگتے تھے۔ پر ہمیں یہاں سے جلد ہی دور نکل جانا چاہئے۔“

”ہم نے جانا کہاں ہے؟“ رحیم داد نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ”پروا نہ کر۔ بس ذرا کدم بڑھا کے چل۔“

دونوں جھاڑی سے نکل کر سڑک پر آگئے اور خشک پتوں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ انھوں نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا ہو گا کہ بنجر اور اجاڑ علاقہ ختم ہو گیا۔ اب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سڑک پر چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں سڑک سے اتر کر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے کچے راستے پر چلنے لگے۔ یہ پیسا تھا۔ یہ اتنا کشادہ کپا راستہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔

ہی ہے کے دونوں طرف گندم اور جو کی فصلیں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی

چلتی۔ گندم اور جو کی بالیاں جھوننے لگتیں۔ کھیتوں میں دور تک لہریں ابھرتی اور ڈوبتی نظر آتیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ لالی اور رحیم داد ہر آواز پر چونک پڑتے۔ ان کے قدم ڈمگنا جاتے۔

ایک ایک ان آوازوں میں ایک نئی آواز ابھری۔ یہ گیدڑوں کا بے ہنگم شور تھا۔ وہ زور زور سے چیخ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد گیدڑوں کا ایک غول کھیتوں سے نکل کر ان کے قریب سے گزرا۔ رحیم داد اور لالی جھجک کر کھڑے ہو گئے۔

دونوں کچھ دیر بعد آگے بڑھے۔ یہاں زیادہ طویل نہ تھا۔ مشکل سے دو ڈھائی فرلانگ کا راستہ تھا۔ دونوں بہت چونکا تھے اور کسی انجانے خوف سے سسے ہوئے تھے۔ یہاں ختم ہو گیا۔ وہ کھیتوں سے نکل کر باہر آگئے۔ سامنے رڑ تھا۔ اس کھلے میدان کے اس پار درختوں کا جھنڈ تھا۔ جھنڈ کے پیچھے مٹی کے بنے ہوئے کچے مکانات تھے۔ مکانوں کے بیچ سے گلی گزرتی تھی۔ گلی کے کنارے دو منزلہ پختہ ماڑی تھی۔ اس کے پہلو میں پھوس کی چھت کا لمبا ڈھارا تھا۔ ڈھارے میں موٹی تھے، جن کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھینٹاں رک رک کر سنائے میں بج رہی تھیں۔

وہ آگے بڑھے۔ رڑ عبور کیا اور درختوں کے نیچے پہنچ کر اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔ ماڑی کی ایک کھڑکی سے روشنی ابھر کر اندھیرے میں بکھر رہی تھی۔ وہ دھندلی روشنی میں گرد و پیش کا جائزہ لینے لگے۔ دفعتاً ”قدموں کی آہٹ ابھری۔ ایک شخص نہایت مشتبہ حالت میں ان کے سامنے سے گزرا۔ اس کے چہرے پر ڈھانا بندھا تھا۔ صرف آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ چونکنا نظروں سے ادر ادر دیکھتا ہوا ڈھارے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ لالی اور رحیم داد آنکھیں پھاڑے اسے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ آگے بڑھا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد کچھ دیر تو حیرت سے گم صم رہا، پھر اس نے لالی کے کان کے قریب منہ لے جا کر دھیرے سے پوچھا۔

”لالی! یہ یہ چکر کیا ہے؟“

”موٹی چور جان پڑتا ہے۔“

لال کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد وہ شخص موٹیوں کے ڈھارے سے باہر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رسی دبی تھی۔ وہ آگے آیا تو پیچھے سے ایک ہمیش بھی نمودار ہوئی۔ وہ کسی اور سمت جانے کے بجائے سیدھا درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر لالی ایک درخت کے تنے کی آڑ میں دبک گیا اور ہاتھ پکڑ کر رحیم داد کو اپنی پشت پر کر لیا۔ وہ شخص آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آتا گیا۔ قریب اور قریب۔ جب وہ بالکل ان کے نزدیک پہنچ گیا تو لالی نے

جھٹ کر بائیں ہاتھ سے اس کا منہ دبوچ لیا۔ اس شخص نے نہایت بھرتی سے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ لیکن لالی نے چاقو کھولنے کی مہلت نہ دی۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر مروڑ دیا۔ چاقو زمین پر گر پڑا۔

رحیم داد حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ لالی نے چاقو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر رحیم داد سے کہا۔ ”کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھا اور کھول لے اسے۔“

رحیم داد نے فوراً اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ جھک کر چاقو اٹھایا۔ اسے کھولا اور اس شخص کے قریب پہنچ گیا۔ اب رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے چاقو کی نوک اس کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ لالی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔

وہ سرا سید ہو کر دونوں کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ دونوں جیل کے قیدیوں کی وردی میں اس کے سامنے اس طرح کھڑے تھے کہ اندھیرے میں بھوتوں کی مانند ڈراؤنے نظر آتے تھے۔ وہ چند لمبے ہکا بکا رہنے کے بعد اٹکتے ہوئے بولا۔ ”تیس ہو کون؟“ لالی نے تزاقت سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا۔

”سیدھی طرح گل کر۔ تیرا نام کیا ہے؟“

”جہا۔“ اس نے آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

لالی نے قریب کھڑی بھینس کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یہ بچہ اٹھا کر لایا ہے نا؟ جی بچہ بتا۔“

”ہاں جی۔“ اس نے دھیرے دھیرے اپنی گردن ہلائی۔

”یار بچے! تو اونچا کار گیر لگتا ہے۔“ لالی نے بے تکلفی سے کہا۔ ”صاف اڑا لایا ج۔ ذرا بھی کھٹکانہ ہوا۔“

”بس جی اوپر والے کی مہربانی ہے۔“ وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر فخریہ لہجے میں بولا۔ ”جس ڈنگر پر ہاتھ پھیر دیا، سمجھ لے اپنا ہو گیا۔“ وہ بھینس کی گردن اور پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

لالی نے رحیم داد کے ہاتھ سے چاقو لے کر اپنے قبضے میں کیا۔ جچے سے پوچھا۔ ”تیس نوں اب کتھے جاتا ہے؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا لالی سے سوال کیا۔ ”تیس یہ کیوں جانا چاہتا ہو؟“

لالی جل کر بولا۔ ”تھانے میں تیرے خلاف پرچہ چاک کرانا ہے نا۔“

مجھے نے دونوں کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ شلو کے جیسے آدمی آستینوں کے کرتے اور گھٹنوں تک اونچے اونچے جاگیا نما پا جاے پنے ہوئے تھے۔ کرتوں پر جیل کے نمبر نظر آرہے تھے۔

”تیس تھانے کیسے جاسکتے ہو؟“ جہا انھیں مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

”توں نے فیر ٹیڑھی گل بات کی۔“ لالی نے کھلا چاقو اس کے سامنے کر دیا۔

جہا ڈر گیا۔ عاجزی سے بولا۔ ”مجھے اب جانے دے۔ جاگ ہو گئی تو سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”غلطی شٹی ہو گئی تو معاف کر دے۔ میں نوں ابھی بہت دور جاتا ہے۔“

”یہی تو پوچھ رہا ہوں تیس نوں کتھے جاتا ہے؟“ اس دفعہ لالی کا لہجہ نرم تھا۔

”میں نے جی پہلے اہر جانا ہے۔“ مجھے نے شمال کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ ”اہر ۵ میل ادھر جھنگر میں ہے۔ تیس نوں تو پتہ ہی ہو گا، چوری کے ڈنگر اٹھانے کے بعد اہر ہی میں چھپا کے رکھے جاتے ہیں۔ اگے میں نوں بھی ایسا ہی کرنا ہے۔ اُہر میں لے جا کر رکھوں گا۔“

”ایسہ گل اے تو فیر ہاتھ ملا۔“ لالی نے چمک کر کہا اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”جا، ایک اُہر اور اڑا لا۔“

جہا انکار میں گردن ہلانے لگا۔ ”ناجی نا، ایک ہی بہت ہے۔ میں دو مجیں اکیلے لے کر جا بھی تو نہیں سکتا۔ لمار ستہ ہے۔ اگے نہر ہے۔“

”پروانہ کر۔ ہم دونوں جو تیری مدد کو موجود ہیں۔ اہر تک تیرے ساتھ ہی چلیں گے۔“ لالی نے اسے ہولے سے ٹھوکا دیا۔ ”قنافت جا، دیری نہ کر۔“

”جی نہیں چھوڑ دوں؟“

”چھوڑ دے، چھوڑ دے، کہیں نہیں جائے گی۔“ لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”ہم نے رسا گیری یا مویشی چوری نہیں کرنی۔ ہم ایسا گھٹیا دھندا نہیں کرتے۔ فکر نہ کر۔ واپسی پر جی بچے ہمیں ملے گی۔“

جہا کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے ڈھارے کی سمت بڑھا اور ایک بار پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد اب تک خاموش کھڑا تھا۔ دل ہی دل میں لالی کی حرکتوں پر کڑھ رہا تھا۔ جب ضبط نہ ہو سکا تو جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”یار لالی، تو نے یہ کیا چکر چلایا ہے۔ خاما خانا دکھت خراب کیا۔ اب تک تو ہم بہت دور نکل

جاتے۔

”کہاں نکل جاتے؟ نہ رستہ معلوم نہ جگہ کا کوئی آتا پتہ۔“ لالی نے رحیم داد کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”رہتے تو بیکار میں اپنا مگر خراب نہ کر۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ تیں نوں پتہ نہیں بجھا اپنے بہت کام آئے گا۔“

”کیا کام آئے گا؟“ رحیم داد کے لمبے میں ابھی تک جھنجھلاہٹ تھی۔

”اہر میں بجھا جہاں موٹی چھپاتا ہے وہیں ہم بھی چھپ سکتے ہیں۔ پہلے کہیں چھپنے کا ٹھکانا ملنا چاہئے۔ اس کا بندوبست بجھا کر دے گا۔ آگے بھی وہ کام آئے گا۔ وہ بھی مجرم ہم بھی مجرم۔ اور مجرم کی مدد مجرم ہی کر سکتا ہے۔ کیا سمجھا؟“

رحیم داد کی سمجھ میں لالی کی بات آگئی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ بھینس ان سے چند قدم کے فاصلے پر چپ چاپ کھڑی جگالی کر رہی تھی۔ دم ہلا کر چمچھاڑا رہی تھی۔ رحیم داد اور لالی اس سمت گردن اٹھائے دیکھ رہے تھے جدھر بجھا گیا تھا۔

لیکن اس بار بتجما جلدی نہ لوٹا۔ اسے دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ اس نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”بتجما ابھی تک نہیں آیا۔ ایسا نہ ہو کوئی گڑبہ ہو جائے۔“

”حوصلے سے کام لے، حوصلے سے۔“ لالی نے رحیم داد کو تسلی دی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ دونوں بچے کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرتے رہے۔ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے درختوں کے خشک پتے کھڑکھڑاہٹ پیدا کر رہے تھے۔ اب لالی بھی پریشان ہو گیا تھا۔ اچانک ڈھارے کی طرف کوئی زور سے کھنکارا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

”اوئے، کون ہے؟“

لالی اور رحیم داد نے گھبرا کر دیکھا۔ بتجما ڈھارے کے چھپرے باہر نکلا۔ اندھیرے میں اس کی سفید دھرتی اور قیص دور سے نظر آرہی تھی۔ اس کے پیچھے، پیچھے مویشیوں کا رکھوالا بھی ڈھارے سے نکلا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ وہ ڈانگ سنبھالے بتجما کے تعاقب میں دوڑا اور اونچی آواز سے ”چور، چور“ کی صدا بھی بلند کرتا رہا۔

لالی اور رحیم داد اس سے زیادہ کچھ نہ دیکھ سکے۔ وہ سرا سید ہو کر جدھر منہ اٹھا، سر پٹ بھاگے۔ نہ انھوں نے قریب کھڑی ہوئی چوری کی بھینس پر توجہ دی اور نہ بتجما کی طرف کوئی دھیان دیا۔ وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتے تھے۔



شرقی افق پر ہلکا ہلکا دودھیا اجالا پھیل رہا تھا۔ رات رخصت ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لیکن صبح کی آمد کے ساتھ لالی اور رحیم داد کے لیے خطرہ بھی قریب آتا جا رہا تھا۔ دن کی روشنی میں وہ گھوم پھرنہ سکتے تھے۔ ان کے جسموں پر جیل کی مخصوص وردی تھی جو دور سے چٹلی کھاتی تھی کہ وہ مفروضہ قیدی ہیں۔

وقت کم تھا اور انھیں جلد سے جلد چھپنے کے لیے کسی ٹھکانے کی تلاش تھی۔ لالی نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اسے نشیب میں کچھ فاصلے پر سکنا نظر آیا۔ یہ برساتی تالا اب خشک اور اجاڑ تھا۔ اس کے ایک کنارے پر فراش اور سرس کے ٹکڑے درخت تھے جو بلندی پر دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ لالی درختوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ اسے یہ جگہ چھپنے کے لیے مناسب معلوم ہوئی۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ زمین پر بے سدھ پڑا تھا اور گرمی گرمی سانسیں بھر رہا تھا۔ لالی نے جھک کر اسے جھنجھوڑا۔

”بہت آرام کر چکا۔ اب اٹھ کے بیٹھ۔“

رحیم داد نے کروٹ بدلی اور تھکے ہوئے لمبے میں بولا۔ ”مجھے تو ادھ لگ رہی ہے۔“

لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ”نہیں اٹھا تو میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا۔“

رحیم داد جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آنکھیں ملنے ہوئے بولا۔ ”یہ تو بتا، جانا کدھر ہے؟ سویرا ہو رہا ہے۔ اجالا پھیلتا جا رہا ہے۔“

لالی نے نشیب میں اترتے ہوئے کہا۔ ”میرے پچھے، پچھے چلا آ۔ سکنا لے کے اس پار جو جھل ہے، دن وہیں گزائیں گے۔“ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر درختوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے کی باناب اشارہ کیا۔ یہ گھنا جھگ تھا اور قریب بھی تھا۔

رحیم داد چپ چاپ لالی کے ہم راہ نشیب میں اترنے لگا۔ دونوں آگے بڑھے۔ سکنا لے پر پہنچے۔ کچھ دور جانے کے بعد ٹوبلا۔ اس میں ابھی تک پھیلی برسات کا پانی موجود تھا مگر زیادہ گدلا نہ بنا۔ دونوں ٹوبے کے کنارے بیٹھ گئے۔ چلو بھر بھر کپانی پیا۔ منہ دھویا، ہاتھ دھوئے اور ترو تازہ ہو کر درختوں کی جانب بڑھے۔

اب مشرق میں روشنی کا سرخ لاؤ دیکھنے لگا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مگر جھل کے درختوں کے نیچے ابھی تک اندھرا تھا۔ وہ آگے آگے بڑھتے گئے۔ اجالا پھیلتا گیا۔ انھیں ایک پرانا رخت نظر آیا۔ اس کا تنا خوب چوڑا تھا اور اندر سے کھوکھلا بھی تھا۔ لیکن اس میں صرف ایک

آدی کے چھپنے کی گنجائش تھی۔

دونوں دیر تک ادھر ادھر گھومتے رہے۔ اب درختوں کے پتوں سے دھوپ چھن چھن کر نیچے بکھرنے لگی تھی۔ ہر طرف پرندے بچھا رہے تھے۔ تھکنے سے دونوں کا برا حال تھا۔ انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ نیند غالب تھی اور بھوک بھی ستا رہی تھی۔ انھیں ایک پگڈنڈی نظر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ پگڈنڈی پر چلے گئے۔

کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ ان کی نظر لکڑی کے تختوں کی بنی ہوئی بوسیدہ جھوپڑی پر پڑی۔ پہلے تو وہ قریب جاتے ہوئے ڈرے۔ مگر لالی نے اس دفعہ بھی ہمت سے کام لیا۔ اس نے جھوپڑی کے نزدیک پہنچ کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔

دروازہ چرچاتا ہوا کھل گیا۔ دونوں نے اندر جھانکا۔ جھوپڑی بالکل خالی تھی۔ فرش پر خشک گھاس بچھی تھی۔ جگہ جگہ گھوڑے کی لید بکھری ہوئی تھی۔ وہ اندر داخل ہوئے اور بڑھال ہو کر فرش پر گر پڑے۔

لالی کچھ دیر خاموش لیٹا رہا، پھر اٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد آنکھیں بند کئے خاموش پڑا تھا۔ لالی نے دروازہ کھلا رکھا اور چونکا نظروں سے باہر دیکھتا رہا۔ ہر طرف گمراہ سناٹا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر جاگتا رہا۔ پھر نیند نے شب خون مارا۔ وہ جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔

دروازہ کھلا تھا۔ لالی اور رحیم داد بے خبر سو رہے تھے۔

دوپہر ہوئی، سہ پہر ہوئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ یکایک سانے میں پگڈنڈی پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ خطرے کا احساس خوف بن کر اس کے چہرے پر منڈلانے لگا۔ اس نے آہستہ سے رحیم داد کو جھنجھوڑا۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آہٹ اس نے بھی سن لی تھی۔

دونوں بالکل خاموش تھے۔ انجانے خوف سے سسے ہوئے تھے۔ لالی کے پاس بیٹھے کا چاقو موجود تھا۔ اس نے چاقو کھولا اور دروازے کی اوٹ میں چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے ہی کھڑا تھا۔

آہٹ قریب ہوتی گئی۔ اتنی قریب کہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا کہ آنے والا تھا ہے اور بھاری بھاری بوٹ پسے ہوئے ہے۔ مگر وہ ان کی طرف نہ آیا۔ آگے نکل گیا۔ اس کی چاپ خشک پتوں پر دیر تک ابھرتی رہی، اور جب سانے میں ڈوب کر ختم ہو گئی تو دونوں کے چہروں پر چھایا ہوا خوف

مٹ گیا۔ وہ جھکے ہوئے سے فرش پر بیٹھ گئے۔ ذرا سکون نصیب ہوا تو بھوک نے پریشان کیا۔ گھاس پر ادھر ادھر پھرنے کے دانے بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو چن چن کر کھانے لگا۔ لالی بھی کھانے لگا۔ انھوں نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایک ایک دانہ کھالیا۔ پنے خشک اور کیلے تھے۔ مٹی بھر بھی نہ تھے۔ بھوک تو کیا مٹی البتہ پیاس شدت سے بڑھی۔ مگر وہ دروازے سے باہر نہ نکل سکتے تھے۔ دن کی روشنی ابھی تک پھیلی تھی۔ اور روشنی میں ٹکنا خطرے کو دعوت دیتا تھا۔

سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیل گیا۔ پیاس سے لالی اور رحیم داد کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ جب اندھیرا کسی قدر گہرا ہو گیا تو دونوں جھوپڑی سے باہر آئے۔ ہوا تیز تھی اور درختوں میں سنسناتی ہوئی گزر رہی تھی۔ خشک پتے اڑاڑ کر شور مچا رہے تھے۔ دونوں خاموشی سے پگڈنڈی پر چلتے رہے۔ وہ ٹوبے کی جانب جا رہے تھے۔ لیکن لالی نے اس دفعہ نشیب میں پہنچنے کے لیے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

میل، سو میل فاصلہ طے کر کے دونوں ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔ ٹوبا زیادہ دور نہ تھا۔ مگر راستہ خراب تھا۔ نشیب میں اترتے ہوئے رحیم داد کا پیر پھسلا۔ وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ لیکن وہ لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ ٹوبے پر پہنچ کر انھوں نے اس بے قراری سے پانی پیا کہ ان کے پیٹ پھول گئے۔ دونوں ٹوبے کے کنارے ہی لیٹ گئے اور دیر تک بے سدھ پڑے رہے۔

اس دفعہ ٹوبے کا پانی پی کر لالی کا جی متلانے لگا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا، اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جاسکے۔ لالی کی لمبیت پھر بگڑی۔ وہ ابکیاں لینے لگا اور ایک جھاڑی کے قریب بڑھال ہو کر گر پڑا۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری تھی۔

ذرا دیر وہ زمین پر لیٹا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ اس نے پھر آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ لالی کا سر دبانے لگا۔

کچھ ہی وقت گزرا تھا کہ اجالا پھیلنے لگا۔ چاند درختوں کے عقب سے دھیرے دھیرے طلوع ہو رہا تھا۔ دیکھتے، دیکھتے چاندنی ہر طرف پھیل گئی۔ ٹوبے کا پانی بھلوانے لگا۔ لیکن چاندنی جس قدر ٹھہرتی جا رہی تھی رحیم داد اسی قدر خوف زدہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا فوراً اندازہ ہو گیا کہ وہ قطعی غیر محفوظ جگہ بیٹھا ہے۔ ہر طرف کھلا ریتلا میدان تھا۔

جھاڑی بھی زیادہ گھنی نہ تھی۔ اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر لالی ہر خطرے اور ہر خدشے سے بے نیاز نگری نیند سو رہا تھا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ چاند چڑھ کر درختوں کے اوپر اٹھ گیا۔ ریت کے ذرے جھلکانے لگے۔ سائے سمٹ گئے۔ سنا بہت گہرا تھا۔ ناگاہ رات کے گہرے سناٹے میں کوئی زور سے کھٹکارا۔ ساتھ ہی خشک پتوں پر آہٹ ہوئی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ کوئی ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ مگر وہ ایک نہیں دو تھے۔

رحیم داد نے انھیں دور ہی سے دیکھ لیا تھا۔ جب وہ اسی سمت آنے لگے تو رحیم داد سخت گھبرایا۔ اس نے لالی کو آنے والے خطرے سے خبردار کرنے کی غرض سے زور زور سے جھنجھوڑا۔ مگر لالی بیدار نہ ہوا۔ کڑوٹ بدل کر بے خبر سو رہا۔

آنے والے نزدیک آتے گئے۔ وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ رحیم داد اور زیادہ بدحواس ہو گیا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا، جب اس نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ اپنی جگہ دم بخود بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا، ان میں ایک مرد بے اور دوسری عورت۔ مرد آگے، آگے چل رہا تھا۔ اس کے سر پر بڑی سی گھڑی تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ دونوں نے رحیم داد کو دیکھ لیا تھا۔ مگر وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ جب وہ بالکل نزدیک پہنچ گئے تو عورت لمحے بھر کو ہٹ گئی۔ اس نے گردن موڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کے قریب پڑے ہوئے لالی کو بھی دیکھا۔ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

”کوئی بندہ جان پڑتا ہے۔“

”ہو گا کوئی۔ سدھی، سدھی چل۔“ مرد نے اسے ڈانٹا۔

دونوں نے مزید بات چیت نہ کی۔ چپ چاپ رحیم داد اور لالی کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے۔ البتہ عورت مڑ مڑ کر دیکھتی رہی۔ دونوں دور ہوتے ہوتے اندھیرے میں گم ہو گئے۔ ان کی چاپ دیر تک خشک پتوں پر ابھرتی رہی۔ ان کے جانے کے بعد بھی رحیم داد کا خوف رفع نہ ہوا۔ وہ چونکنا نظروں سے بار بار اس سمت دیکھتا رہا جدھر وہ گئے تھے۔ ہر آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔

بہت دیر ہو گئی۔ کوئی نہ آیا۔ چاند چڑھتے چڑھتے آسمان کے پتوں پہنچ گیا۔ رات پوری طرح جاگ رہی تھی اور لالی سو رہا تھا۔ وہ آدمی رات کے بعد جاگا۔ اٹھ کر بیٹھا تو رحیم داد نے پوچھا۔

”اب تیرا جی کیسا ہے؟“

لالی نے انگڑالی لے کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہی ہے۔“ اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاند کو دیکھا۔

”بہت رات ہو گئی۔ مجھے بگایا بھی نہیں۔“

”بہت بگایا، تجھے اپنا ہوش ہی کب تھا۔“

”طبیعت بہت گڑبڑ ہو گئی تھی۔“ لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”رہے، کھڑا ہو جا۔ اپنے پاس تو چلنے کے لیے رات ہی ہے۔ دن میں کہیں چھپ کر آرام کریں گے۔“

رحیم داد چپ چاپ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے، اور کہیں ٹھہرے بغیر مسلسل چلتے رہے۔ چاند ڈوب گیا۔ اندھیرا چھا گیا۔ راستہ دشوار ہو گیا۔ وہ سکنالے کی گزرگاہ پر چل رہے تھے۔ زمین ریتی اور ناہموار تھی۔ دونوں طرف اونچے نیچے اور ٹپے تھے۔ کہیں کہیں ببول اور بیری کے درخت تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔

انھوں نے سستانے کی مطلق کوشش نہ کی۔ آگے، اور آگے بڑھتے گئے۔ جب صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلا اور اندھیر چھٹا تو وہ ایسی جگہ پہنچ چکے تھے جہاں گھاس اور سرکنڈوں کے اونچے اونچے پودے تھے۔ زمین دلدلی تھی، اس قدر نرم اور پولی کہ پیر اندر دھنستے تھے۔ ان میں دلدل عبور کرنے کی ہمت نہ تھی۔ دونوں تھکنے سے نڈھال ہو رہے تھے۔ سورج بھی طلوع ہونے والا تھا۔ انھوں نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ایک اونچے ٹیلے پر چڑھ گئے۔ ہر طرف دیرانی چھائی تھی۔

دونوں نے بلندی سے دیکھا کہ دلدل کے اس پار بہت بڑا ٹوبا ہے، جو صبح کی روشنی میں شفاف جھیل کی طرح جھلکاتا دور تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ کچھ دور آگے سکنالے پر پل تھا جس پر سڑک گزرتی تھی۔ یہ پاک پتھر روڈ تھی۔

لالی کچھ دیر رحیم داد کے ساتھ ٹیلے پر خاموش کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی جھلک رہا تھا۔ اسے کسی ایسے ہی مقام کی تلاش تھی جو سڑک سے نزدیک ہو اور محفوظ بھی۔ یہ ایسا ہی محفوظ علاقہ تھا۔ دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ نہ کوئی پگڈنڈی تھی نہ راستہ تھا۔ ہر طرف ٹیلے اور ٹپے تھے۔ جنگلی پودوں کی جھاڑیاں تھیں۔ کہیں کہیں فراش کے اکا دکا درخت بھی تھے۔

دونوں نے ادھر ادھر گھوم پھر کر نیلیوں کے درمیان چھپنے کا ٹھکانا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ جلد ہی انھیں ایک ٹھکانا مل گیا۔ یہ کشادہ اور قد آدم گہرا غار تھا۔ انھوں نے باہر سے غار کا جائزہ لیا۔ اندر داخل ہوئے اور چھیل زمین پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے۔

وہ دن بھر گری نیند سوتے رہے۔ آنکھ کھلی تو شام آہستہ آہستہ نیلیوں اور نیوں پر اتر رہی تھی۔ دلدل پر اگی ہوئی اونچی اونچی گھاس اور سرکنڈوں کے پودے دھند میں لپٹے ہوئے تھے۔ غار سے نکل کر دونوں باہر آئے۔

سورج نیلیوں کے دور تک پھیلے ہوئے ناہموار سلسلے کے پیچھے ڈوب چکا تھا۔ مغرب میں گہری سرخ روشنی پھیلی تھی۔ اس روشنی میں رحیم داد بچو کی مانند ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر نمایاں ہو گئی تھیں۔ بھوک کے مارے اس کا برا حال تھا۔

لالی بھی بھوک سے بے ہوش تھا۔ مگر اس ویرانے میں کھانے کے لیے کیا ملتا۔ اس وقت انھیں پیٹ کی آگ سرد کرنے کی فکر دامن گیر تھی۔ دلدل عبور کرنا خطرناک تھا اور نیلیوں کے درمیان راستہ بنانا بھی آسان نہ تھا۔ مگر اندھیرا بڑھنے سے پہلے وہ آگے نکل جانا چاہتے تھے۔ جھٹ پٹے میں چلنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ انھیں نیلیوں کی بلندی پر دور ہی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ سڑک پر گزرنے والی گاڑیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھیں۔ آخر بہت سوچ بچار کے بعد انھوں نے کہیں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور غار کے دہانے پر بیٹھ کر چاند کے طلوع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

رات کا ایک پہر گزرا۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں غار سے باہر نکلے اور چھٹکی ہوئی چاندنی میں نیلیوں اور نیوں کے درمیان چلنے لگے۔ وہ رفتہ رفتہ سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مگر راستہ اس قدر پیچیدہ اور دشوار تھا کہ انھیں سنبھل سنبھل کر، ٹھہر ٹھہر کر چلنا پڑتا۔ آخر وہ اونچے اونچے ٹیلے عبور کرنے کے بعد نشیب میں اترے۔

سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا ٹوبا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر اونچی اونچی گھاس تھی۔ عقب میں دلدل تھی۔ ٹوبے سے کوئی فرلانگ بھر کے فاصلے پر پل تھا۔ سڑک پر آمد و رفت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

دونوں پل کی جانب بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم آگے گئے تھے کہ سناٹے میں دور سے بارن کی آواز ابھری۔ وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ سڑک کے موڑ پر تیز روشنی جھلملائی۔ ذرا دیر بعد کار کی دونوں بتیاں نظر آنے لگیں۔ کار بہت تیز رفتار سے سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ پلک جھپکتے ہی پل پر پہنچ گئی۔ پھر زوردار دھماکہ ہوا۔

لالی اور رحیم داؤنے خوف اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ کار بے قابو ہوئی۔ پل کے جنگلے سے ٹکرائی۔ اچھلی اور ڈھلان پر تیزی سے لڑھکتی ہوئی نیچے آنے لگی۔ ساتھ ہی انسانی جینیں

بھی ابھریں۔

ایک اور دھماکہ ہوا۔ یہ پہلے دھماکے سے زیادہ بڑا اور ہولناک تھا۔ لڑھکتی ہوئی کار سے اونچے اونچے شعلے بلند ہوئے۔ کار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گئی۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ لالی اور رحیم داد بت بنے کھڑے رہے۔

سڑک بالکل سناں تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اچھلی چاندنی میں جلی ہوئی کار کا ڈھانچہ سیاہ دھبے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ یکایک خاموشی میں رک رک کر ایسی آواز ابھری جیسے کوئی شدید درد سے کراہ رہا ہو۔

لالی خاموشی سے کراہ سنتا رہا۔ مگر زیادہ دیر اسے سن نہ سکا۔ وہ آواز کی سمت بڑھا۔ رحیم داد بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ بہت سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دونوں کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ کراہ بند ہو گئی۔ مگر وہ رکے نہیں۔ آگے ہی بڑھتے گئے۔

قریب جا کر انھوں نے دیکھا، کار کے جھلے ہوئے ڈھانچے کے نیچے ایک لاش دبی ہے۔ آدھا دھڑا لٹی ہوئی کار کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ہے۔ چہرہ اور ہاتھ جل کر سیاہ پڑ گئے ہیں۔ ہر طرف جلے ہوئے گوشت کی تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔ ڈھانچے کے آس پاس کار کے ٹوٹے ہوئے دروازے، دو پینے اور دوسرے حصے ادھر ادھر بکھرے تھے۔ چاندنی میں رحیم داد نے کوئی چیز دیکھی اور اس پر پل کی طرح تیزی سے جھپٹا۔ یہ ایک مڑی مڑی روٹی تھی۔ رحیم داد نے اسے جھٹ اٹھایا۔ اس میں لگی ہوئی ریت اور مٹی صاف کئے بغیر بے صبری سے ہبڑ ہبڑ کھانے لگا۔ ریت کے ذرے اس کے دانتوں تلے کر کر اٹھ پیدا کر رہے تھے۔ مگر وہ جلدی جلدی ایک کے بعد دو سرا لقمہ نگٹا چلا گیا۔ لالی بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد نے روٹی کا ٹکڑا اسے بھی دیا۔ روٹی باسی اور ٹھنڈی تھی۔ لیکن وہ اسے مزے سے کھاتے رہے۔

روٹی کھانے کے بعد انھوں نے ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ اب ان کے جسموں میں توانائی اور چستی آگئی تھی۔ انھوں نے کار کے ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے کے آس پاس کھانے کی اشیاء تلاش کرنا شروع کر دیں۔ جلد ہی انھیں بید کی الٹی ہوئی نوکری میں کھلا ہوا ناشتا دان مل گیا۔ اس میں بھنا گوشت تھا۔ ابلے ہوئے انڈے تھے۔ تین موٹے موٹے پرائٹھے تھے۔ نوکری میں ایک ڈبل روٹی تھی اور بسکٹوں کے دو بیٹک بھی تھے۔

کھانے کی اشیاء دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ دونوں نوکری کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک پرائٹھا اٹھایا۔ لالی نے فوراً اسے ٹوکا۔

”سب نہ کھا جانا کئی روز کا راشن ہے یہ۔“

رحیم داد نے مسکرا کر آدھا پر اٹھا لالی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آگے کی فکر ضرور کرنی چاہئے۔“

دونوں نے پر انھوں کے آدھے آدھے ٹکڑوں پر تھوڑا سا بھنا ہوا گوشت رکھا اور اطمینان سے کھانے لگے۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے ناشتا دان بند کیا جو ایک طرف سے ٹیڑھا پڑ گیا تھا۔ بڑی مشکل سے بند ہوا۔ رحیم داد نے اسے نوکری میں ڈالا۔ ڈبل روٹی اور بسکٹوں کے پیکٹ بھی رکھے۔

دونوں نے ایک بار پھر ٹوبے پر جا کر پانی پیا۔ پانی پی کر لالی زور زور سے ڈکاریں لینے لگا۔ رحیم داد کو خطرے کے احساس نے خوف زدہ کیا۔

”یار، روٹی تو کھالی اب چلنا چاہئے۔“

”کہاں چلیں؟“ لالی نے پوچھا۔

”آگے چلتے ہیں سڑک کا رستہ ٹھیک رہے گا۔“

لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”سڑک کا رستہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ آگے خطرہ ہے۔ یہ ٹھکانا ابھی چھوڑنا ٹھیک نہیں۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”یار روٹی کا تو بندوبست ہو گیا۔ پانی کا بھی راشن رکھنا ہو گا۔“

لالی کار کے ڈھانچے کی جانب چل دیا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ ڈھانچے کے قریب ابھی تک جلے ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ یہ بو اس قدر تیز اور ہولناک تھی کہ رحیم داد دور ہی ٹھہر گیا۔ لالی چند قدم آگے بڑھا پھر وہ بھی ٹھہر گیا۔ ڈھانچے میں اسے اپنے کام کی کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اس نے ڈھانچے کے ادھر ادھر جھک کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر اسے ایک چمکتا ہوا ڈبا نظر آیا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ یہ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے کا ڈبا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈبا اٹھا لیا اور رحیم داد کو دے کر بولا۔

”لے یار! اپنا کام تو بن گیا۔ اس میں پانی بھر لے۔ کئی دن چلے گا۔“

رحیم داد نے ڈبا سنبھالا اور ٹوبے پر چلا گیا۔ اس نے ڈبا اندر اور باہر سے کئی بار دھویا اور پانی بھر کر اوپر سے دھکتا بند کر دیا۔ پانی سے بھرا ہوا مین کا ڈبا خاصا وزن تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں نوکری تھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے پاس پہنچا۔ وہ ڈھانچے سے ہٹ کر کوئی بیس قدم دور ایک تودے

کے قریب کھڑا تھا۔ اس کے سامنے زمین پر ایک آدمی پڑا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ دی کا چہرہ اور بال خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ داہنا ہاتھ کہنی کے پاس سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ وہ سفید بٹن شرت اور گہری نیلی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں سیاہ جوتے تھے۔ اجلی چاندنی اس کے ایک ایک چیز صاف نظر آرہی تھی۔ وضع قطع سے وہ سرکاری افسر لگتا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

”مر گیا؟“

لالی نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا اور کچھ کلمے بغیر جھک کر زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے لٹری اتاری اور اپنی کلائی پر باندھ لی۔ پھر اس کے پیروں سے جلدی جلدی جوتے اتارنے لگا۔ اس کے بعد اس نے پتلون کے بٹن کھولے اور دونوں پانچے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ پتلون اتر کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ لالی نے فوراً پتلون کی جیبیں ٹٹولیں۔ پچھلی جیب سے چمڑے کا بٹہ نکالا۔ لالی نے بٹہ کھول کر اندر نظر ڈالی۔ بٹے میں نوٹ تھے۔ اس نے بٹہ ٹوبے کی جانب اچھال دیا اور اس جیب میں رکھ لیا۔ جب وہ بٹن شرت اتارنے لگا تو لاش میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ ساتھ ہی لٹری ہوئی سانس لینے کی آواز ابھری۔ رحیم داد چیخا۔

”ابھی زندہ ہے۔“

لالی نے گھوم کر اس کی جانب تہ آلود نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”چپ کر کے کھڑا رہ۔“ اس نے بٹن شرت اس طرح اتاری جیسے قصائی بکرے کی کھال اتارتا ہے۔ پھر بنیان اور اندر دیر مارے۔ بنیان اور اندر دیر خون میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بٹن شرت پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر یادہ بڑے نہیں تھے۔

زخمی آدمی کے جسم میں دوبارہ حرکت نہیں ہوئی۔ اس کے کٹے ہوئے ہاتھ سے خون بننے کے عٹ ریت پر بڑا سا سیاہ دھبہ بن گیا تھا۔

لالی نے سارے کپڑے لپیٹے اور ٹوبے کی جانب چل دیا۔ اس نے سب سے پہلے بٹن شرت پانی میں ڈال کر دھوئی، بنیان اور اندر دیر ایک طرف پھینک دیئے۔ لالی نے پتلون الٹ پلٹ کر دیکھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔

وہ پتلون دھونے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ اوپر سڑک پر آہٹ سنائی دی۔ لالی اور رحیم داد نے تنک کر اس طرف دیکھا۔ یہ سڑک پر کسی گاڑی کے دوڑنے کی آواز تھی۔ دونوں کو خطرے کا احساس ہوا۔

لالی اور رحیم داد بلندی سے انھیں پوری طرح دیکھ رہے تھے۔ اب وہ اس جگہ ٹھہرنے کے بجائے جلد سے جلد غار میں پہنچنا چاہتے تھے۔ لیکن جھاڑی سے نکل کر آگے جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔

وہ خاموش بیٹھے دونوں کو دیکھتے رہے۔ خاصی دیر ہو گئی۔ چاند آہستہ آہستہ مغرب میں اترتا جا رہا تھا۔ سائے طویل ہو گئے تھے۔ چاند غروب ہو جانے کے بعد اندھیرے میں چلنا اور غار تک پہنچنا بہت دشوار ہوتا۔ ان کی بے چینی لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ادھر وہ دونوں کھسنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

چاند جب مغرب افق کے قریب پہنچ گیا اور بڑوں کے نشیب میں اندھیرا پھیلنے لگا تو لالی اور بے چین ہو گیا۔ اس نے بڑا سا پتھر اٹھایا اور پوری قوت کے ساتھ ڈھانچے کی جانب پھینکا۔ پتھر کار کے آہنی ڈھانچے سے ٹکرایا۔ سنائے میں ٹن سے آواز ہوئی۔ ڈھانچے پر جھکے ہوئے دونوں آدمی فوراً سیدھے ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے گہرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ ان میں سے ایک پل کی جانب سر ہٹ بھاگا۔ دوسرا بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ دونوں تیزی سے چڑھائی عبور کر کے پل پر پہنچے اور ٹرک پر سوار ہو گئے۔ فوراً ہی انجن کا شور خاموشی میں ابھرا۔ ٹرک اشارت ہوا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔

ٹرک کے جانے کے بعد لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ لالی نے اس کی پیٹھ پر بے تکلفی سے دھپ مارا۔ ”کو استاد! کیسی رہی ترکیب نمبر ۱۳؟“ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ اس نے چاقو بند کیا۔ ٹوکری اٹھائی اور کپڑے بغل میں دبالیے۔ دونوں سنبھل سنبھل کر ٹیلوں پر چڑھنے لگے۔ رحیم داد ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا ٹین کا ڈبا اٹھائے لالی کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ دونوں غار کے قریب پہنچے تو اندھیرا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ پانی کا ڈبا کونے میں رکھ کر لیٹ گیا۔

لیکن لالی ٹوکری اور بغل میں دبے ہوئے کپڑے رکھنے کے بعد بھی نہیں لیٹا۔ اس نے گیلی بش شرٹ اٹھائی۔ جھٹکا دے کر پانی جھاڑا۔ غار کے دہانے پر پہنچا۔ بش شرٹ ایک تودے پر پھیلا دی اور اس کے کناروں پر بھاری بھاری پتھر رکھ دیئے تاکہ تیز ہوا سے اڑ نہ جائے۔

ہوا سینیاں بجاتی ٹیلوں اور بڑوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ چاند بہت دور ایک اونچے ٹپے کے پیچھے آہستہ آہستہ اتر رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ دکھتا ہوا الاؤ رہ گیا۔ بڑا دل آویز منظر تھا۔ لالی کھوئی کھوئی نظروں سے چاند کی الوداعی روشنی دیکھتا رہا۔ چاند ڈوب گیا۔ ٹیلے اور ٹپے تاریکی میں

لالی نے کپڑے سمیٹ کر بغل میں دبالیے اور رحیم داد کے ہاتھ سے ٹوکری لے لی۔ دونوں آگے پیچھے تیزی سے ٹیلوں کی جانب دوڑے۔ لیکن وہ ٹیلوں پر چڑھنے بھی نہ پائے تھے کہ بریک لگنے کی تیز آواز ابھری۔

یہ ٹرک تھا اور پل پر ٹھہر گیا تھا۔ دونوں نے سسہی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ ٹرک ڈرائیور دروازہ کھول کر نیچے اترتا۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی ٹرک سے باہر آیا۔ دونوں پل کے قریب کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے لگے۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں آگے پیچھے ڈھلان سے نیچے اترنے لگے۔

رحیم داد اور لالی نے انھیں نشیب میں اترتے دیکھا تو ایک ابھرے ہوئے اونچے تودے کی آڑ میں دبک گئے۔ مگر یہ جگہ قطعی غیر محفوظ تھی۔ چاند پوری تابانی سے ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ اجلی چاندنی میں ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ ان سے قریب تر گھنی جھاڑی بھی خاصی دور اور بلندی پر تھی۔ جھاڑی تک پہنچنے کی کوشش کرتے تو دونوں دور سے صاف نظر آجاتے۔

آنے والے رفتہ رفتہ قریب آرہے تھے۔ وہ نیچے پہنچ کر پہلے ٹوٹی پھوٹی کار کے جھلے ہوئے ڈھانچے کے پاس گئے۔ لیکن انھوں نے ڈھانچے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ادھر ادھر جھک جھک کر دیکھتے رہے۔ انھوں نے ڈھانچے کے نیچے دبلی ہوئی لاش بھی دیکھی۔ چند منٹ تک وہ ڈھانچے کے آس پاس منزل لاتے رہے۔ ایک بار وہ اس تودے کے بہت قریب پہنچ گئے جس کے عقب میں رحیم داد اور لالی دبکے بیٹھے تھے۔

دونوں ان کی چاپ صاف سن رہے تھے۔ لالی نے چاقو کھول لیا تھا اور آنے والے خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکس تھا۔ رحیم داد نے بھی ایک پتھر ہاتھ میں اٹھالیا تھا۔

لیکن آنے والے زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ انھوں نے جلی ہوئی کار سے ٹوٹ کر علیحدہ ہو جانے والے دونوں پتے اٹھائے اور آہستہ آہستہ چڑھائی پر چڑھنے لگے۔ لالی اور رحیم داد نے دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔

وہ بھی آہستہ آہستہ کھسکتے ہوئے بلندی کی جانب بڑھنے لگے۔ جب گھنی جھاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تو انھوں نے پل کی جانب دیکھا۔ ٹرک ابھی تک کھڑا تھا۔ وہ ٹرک کے اشارت ہونے اور آگے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ مگر ٹرک اشارت نہیں ہوا۔ ذرا ہی دیر بعد دونوں پھر نشیب میں اترتے نظر آئے۔ وہ سیدھے ڈھانچے کے پاس گئے اور اس میں جڑے ہوئے پتے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔

ڈوب گئے۔ لالی مڑا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا غار کے اندر چلا گیا۔



لالی اور رحیم داد کے پاس اب صرف بسکٹوں کا ایک پیکٹ رہ گیا تھا۔ اس میں سے بھی وہ چار بسکٹ شام کو کھا چکے تھے۔ ڈبا بھی پانی سے قریب قریب خالی ہو چکا تھا۔ وہ ڈبے سے منہ لگا کر گھونٹ، گھونٹ پانی پیتے۔ اگر کوئی زیادہ پانی پینے کی کوشش کرتا تو دوسرا جھٹ ڈبا اس کے ہاتھ سے چھین لیتا۔ دوسرے کو دھوپ تیز ہو جاتی۔ بھر اور پتھر لے نیلے گرمی سے دکنے لگتے۔ دونوں کو بار بار پیاس لگتی۔

شروع میں تو وہ اطمینان سے پانی پیتے رہے۔ مگر جب ڈبے میں پانی چوتھائی سے بھی کم رہ گیا تو دونوں کی خود غرضی بیدار ہوئی۔ وہ پانی پیتے وقت ایک دوسرے کو ٹوکتے غصے سے گھورتے۔ زیادہ جھنجھلاتے تو چھینا جھینی سے بھی دریغ نہ کرتے۔ لالی ہریار زیادتی کرتا۔ رحیم داد ٹوکتا اور غصے سے بڑا داتا تو وہ بے غیرتی سے دانت نکال کر کھسیانی ہنسی ہنستا۔

اس شام انھوں نے دو دو بسکٹ کھائے اور ایک ایک گھونٹ پانی پیا۔ آپس میں یہ سمجھوتا ہوا کہ صبح تک نہ کوئی بسکٹ کھائے گا نہ پانی پئے گا۔ اس سمجھوتے پر سختی سے عمل کرنے کا عہد کر کے دونوں پڑ کر سو گئے۔

رات گئے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ جب قرار نہ آیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لالی گہری نیند سو رہا تھا۔ باہر اجلی چاندنی چھٹکی تھی۔

رحیم داد آہستہ سے غار کے باہر نکلا اور اس کے دہانے پر کھڑا چاندنی میں ڈوبے ہوئے ٹیلوں اور ٹیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ کئی منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ اس عرصے میں لالی نے نہ کروٹ بدلی نہ ہی جسم کو حرکت دی، بے خبر سوتا رہا۔

رحیم داد گردن موڑے اسے ایک تک دیکھتا رہا۔ پھر ہولے ہولے چلتا ہوا غار کے اندر گیا۔ ٹنول کر بسکٹ کا پیکٹ اٹھایا اور آہستہ آہستہ بسکٹ کھانے لگا۔ اس نے ایک بسکٹ ختم کیا، ٹین کا ڈبا اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا اور جیسے ہی گردن اونچی کی۔ ڈبا منہ سے لگایا۔ اچانک کسی نے اس کی گردن دبوچ لی۔

یہ لالی تھا اور اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ لمحے بھر خاموش رہ کر وہ غصے سے دھاڑا۔

”اوئے کج بخر یہ چار سو مہیسی۔“ رحیم داد کھسیانا ہو کر بولا۔

”یار میری گردن تو چھوڑ۔“

لالی نے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا سر غار کی پتھر کی دیوار کے ساتھ کھٹاک سے ٹکرایا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ چند لمحے خاموش پڑا رہا۔ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پانی کا ڈبا اٹھایا اور غار کے باہر پھینک دیا۔ بسکٹوں کا پیکٹ بھی اٹھا کے غصے سے پھینک دیا۔ اور غضب ناک ہو کر بولا۔

”لے جا، سب کچھ لے جا۔ میں نوں کچھ نہیں لینا۔“

لالی اس حرکت پر اور جھنجھلیا۔ دانت پیس کر رحیم داد پر جھپٹا اور گھونٹوں اور لاتوں سے اس کی مرمت کرنے لگا۔ رحیم داد کچھ دیر تو خاموشی سے پٹا رہا، پھر بھپاک سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن جھکا کر اس نے لالی کے منہ پر زور سے ٹکرماری۔ چوٹ کراری آئی۔ لالی کا جڑا ہل گیا۔ وہ تکلیف سے بلبل کر رحیم داد کو مارنے کے لیے پل پڑا۔ رحیم داد بھی پسپا نہ ہوا۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لالی کو جلدی ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ رحیم داد کو جس قدر کمزور اور بودا سمجھتا تھا ہرگز ایسا نہ تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں خاصا کس بل تھا۔ ایک بار اس نے زور لگا کر لالی کو گرا دیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ لالی بے بس ہو گیا۔

وہ ذرا دیر تک زمین پر پڑا بے بسی سے ادھر، ادھر گردن ہلاتا رہا اور رحیم داد تباہ توڑ کے لگتا رہا۔ آخر لالی نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا منہ دبوچ لیا اور دانت بھینچ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ رحیم داد کا سر زور سے پتھر کی دیوار سے ٹکرایا۔ وہ کراہتا ہوا دیں ڈھے گیا۔

لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد دیوار کے پاس بے سدھ پڑا تھا۔ لالی خاموش بیٹھا اسے گھورتا رہا، اور ہونٹوں سے رستا ہوا خون ہاتھ سے بار بار پونچھتا رہا۔ وہ کھٹکتا ہوا رحیم داد کے پاس گیا۔

رحیم داد آنکھیں بند کئے چپت لیٹا تھا اور رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ لالی نے آہستہ سے جھنجھوڑا، مگر وہ بے سدھ پڑا رہا۔ لالی نے کئی بار جھنجھوڑا، لیکن رحیم داد نے آنکھ نہ کھولی۔ لالی کا سارا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور رحیم داد کی پیشانی اور کپٹنیوں کو ہولے ہولے سسلانے لگا۔

بست دیر بعد رحیم داد نے آنکھ کھولی۔ اس کے سر میں ابھی تک درد تھا۔ اس نے دیکھا، لالی اس کے سرہانے بیٹھا ہے۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور اٹھنے کی کوشش کی۔ لالی نے پیار سے ڈانٹا۔

”لیٹا رہ۔ طبیعت کیسی ہے؟“

”مگر اب تو دگنی کاٹنی پڑے گی۔ شکت بھی زیادہ کرنی پڑے گی۔ کید تنائی بھی ہوگی۔ جیل سے بھاگنا محول نہیں ہے۔ کیا سمجھا؟“

”سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر اب میں یہاں رہوں گا نہیں۔“

لالی نے ہلکا سا قفسہ بلند کیا۔ ”میرے ساتھ بھی نہیں رہے گا؟ جان من! یہ بے وفائی؟“ وہ لمبے بھر رک کر بولا۔ ”مگر میں تجھے اکیلا نہیں جانے دوں گا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔ لے اب تو مان جا۔“

لالی نے رحیم داد کا بازو پکڑا اور کھینچ کر اندر لے آیا۔ رحیم داد خاموشی سے زمین پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا دیوار سے نیک لگا کر بولا۔ ”اب آرام ٹال گل بات ہوگی۔ بول کیا کہتا ہے؟“

”گل ایسہ ہے لالی! مجھے یہ زندگی بالکل پسند نہیں۔“

”تو کیا مجھے چنگی لگتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے۔ پر اب میں کچھ کر بھی تو نہیں سکتا۔“

”یہ تو سوچ، اس طرح کب تک کام چلے گا؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے، کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا اور یقینی کرنا پڑے گا۔“ لالی ذرا دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تیار ہو جا! ابھی تو رات رہتی ہے۔ چاندنی بھی ہے۔“ وہ لمبے بھر کے لیے رکا۔ ”بسکٹ کھا کر پانی پی لے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔“

رحیم داد نے کچھ کسے بغیر بیکٹ سے بسکٹ نکال کر کھانا شروع کر دیے۔ وہ بسکٹ کھاتا رہا اور لالی اپنی جیل کی وردی اتارنے لگا۔ وردی اتار کر اس نے پتلون پہنی۔ پتلون ذرا تنگ تھی، البتہ بش شرٹ اس کے جسم پر ٹھیک رہی۔ لیکن جوتے ڈھیلے تھے۔ لالی نے جیل کا کرتا پھاڑا اور اس کی دھجیاں بھر کر جوتے پن لیے۔ جب وہ کپڑے بدل چکا تو ہنس کر بولا۔

”کیسا لگ رہا ہوں؟“

”بالکل صاحب بہادر لگ رہا ہے۔“

”پروانہ کر، تجھے بھی صاحب بہادر بنا دوں گا۔“ لالی نے جیب سے نوٹ نکالے۔ انھیں فضا میں لہرایا۔ ”ایک سو چالی سے اوپر ہیں۔“ وہ اپنی بات کتے کتے افسردہ ہو گیا۔ ”پتہ نہیں مرنے والا کون تھا۔ چنگا ہی بندہ تھا۔ اپنے لیے تو پتلون کی جیب میں یہ روپے چھوڑ گیا۔ کام بن گیا۔“

”اوپر سے راشن پانی کا بندوبست بھی ہو گیا۔ یا را! میں کہتا ہوں، اس روز روٹی ٹکرنے ملتا تو کیا ہوتا۔ ذرا سوچ، کیا ہوتا؟ چلا تک تو جا نہیں رہا تھا۔“ رحیم داد نے بسکٹ کا پیکٹ لالی کی طرف

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی نے پوچھا۔ ”بول، بولتا کیوں نہیں؟ طبیعت تو اب ٹھیک ہے نا؟“

اس دفعہ بھی رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یا را! زیادتی ہو گئی۔ معاف کر دے۔ یہ غصہ بہت حرام کا ختم ہوتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ ”لے، اب تو اٹھ جا پیارے!“ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لالی چپ چاپ اٹھا اور غار سے باہر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا۔ اس نے بسکٹ کا پیکٹ اور پانی کا ڈبا رحیم داد کے سامنے رکھ دیا، چکار کر گویا ہو گا۔

”سارے بسکٹ کھا لے۔ پانی بھی سارا پی لے۔ میری پروا نہ کر۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔“ اس نے ایک بسکٹ اٹھایا اور رحیم داد کے ہونٹوں سے لگا کر بولا۔ ”لے اب تو کھا لے۔ زیادہ کھرا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

رحیم داد نے اس کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ ”میں نے کچھ نہیں کھانا۔“ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگا۔ لالی نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ”تو تو زنانیوں کی طرح ٹوے بہانے لگا۔ یا را! اس میں رونے کی کون سی گل ہے۔“ رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا خاموش بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا۔ لالی نے پانی کا ڈبا اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کر دیا۔

”لے، گھونٹ بھر پانی پی لے۔“

”لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ جی بھر کے رو لینے دے۔“

”مگر توں رو کیوں رہا ہے؟“

رحیم داد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اٹھا اور غار سے باہر جانے لگا۔

لالی اسے باہر جاتے دیکھ کر بولا۔ ”کہاں جا رہا ہے؟“

”جیل!“ رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

لالی اس کی جانب لپکا اور ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”تیرا مگر چل گیا ہے؟“

رحیم داد نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے جانے دے۔ لالی! میں اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسی زندگی سے تو جیل بھلی۔“ لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”اتنی جلدی گھبرا گیا۔ یا را! چند روز کی بات ہے۔ فیروز کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ رحیم داد بے زاری سے بولا۔ ”مجھے نہ روک۔ میں تیرے رستے پر نہیں چل سکتا۔ میرے نصیب میں جتنے دن کی جیل لکھی ہے، کاٹ لوں گا۔“

بڑھا دیا اور بار بار انکار کے باوجود اصرار کر کے بیچے ہوئے بسکٹ اسے کھلا دیئے۔

مگر جب لالی نے پانی پینے کے لیے ڈبا اٹھا کر منہ سے لگایا تو مشکل سے چند قطرے نکلے۔ سخت کوفت ہوئی۔

بسکٹ کھانے سے گلا خشک پڑ گیا تھا۔ پیاس اچانک بڑھ گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی جیل کی وردی بھاری پتھر کے نیچے چھپائی۔ نین کا ڈبا اٹھا کر دور پھینکا اور رحیم داد کے ہم راہ عمارے نکل کر ناہموار نیلوں پر چلنے لگا۔

دونوں ایک بار پھر نشیب میں اتر رہے تھے۔ سامنے چاندنی میں جھلکتا ہوا نوبا تھا۔ آگے چل تھا اور سڑک دیران تھی۔ ٹوبے کے پاس پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ حادثے میں ہلاک ہونے والوں کی لاشیں اٹھائی جا چکی ہیں۔ البتہ کار کا جلا ہوا ڈھانچہ بدستور اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ اجلی چاندنی میں سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اور رحیم داد نے جھک کر ٹوبے سے پانی پیا، منہ ہاتھ دھوئے اور تروتازہ ہو کر آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے ہوئے پل پر پہنچ گئے۔ دونوں کچھ دیر پل پر خاموش کھڑے رہے اور سوچتے رہے کہ انھیں کس سمت جانا چاہئے۔ مگر یہ فیصلہ لالی ہی کر سکتا تھا۔ رحیم داد ایسے موقعوں پر خاموش رہتا تھا۔ جدھر لالی چلتا، بغیر حیل و حجت اس کے پیچھے پیچھے چل دیتا۔ لیکن لالی بھی اس وقت تذبذب میں مبتلا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کہاں ہے؟ نہ یہ اندازہ تھا کہ کون سا راستہ دونوں کے لیے محفوظ رہے گا؟ رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ چاند کی رنگت میں زردی آگئی تھی۔ پاک پتھر روڈ بالکل سنسان تھی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا۔ اس نے رحیم داد سے مشورہ کیا۔

”رحیم! اپنا تو مگر کام نہیں کر رہا، تو بتا کہ ہر چلیں؟“

”میں نے کیا بتانا۔ جدھر کہے گا، تیرے سنگ چل دوں گا۔“

”پر تمیں نوں کہیں تو جانا ہی ہوگا۔ تیرا تو گھریا رہی ہے۔“

”ہے تو، تجھے بتا بھی چکا ہوں۔ گھروالی ہے۔ ایک چھوہری ہے۔ دوپٹ ہیں۔ چھوہری مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ یاد بھی بہت آتی ہے۔“ رحیم داد اپنی بات کہتے کہتے غم زدہ ہو گیا۔ ”مگر میں اس کے پاس کیسے جاسکتا ہوں۔ گھر جانے کے سارے رستے تو میں نے خود ہی بند کر دیئے۔“

”یار تیرا تو پورا ٹبر ہے۔ میں نے یہ جھنجھٹ ہی نہیں پالا۔ تیری طرح کچھ یار دوست ہیں، انھی کے ساتھ گزرتی رہی۔“

یار دوستوں کے ذکر پر لالی کو شادو یاد آگیا۔ اس کا بہت اچھا دوست تھا۔ عرصہ ہوا، وہ بھی اس کی

طرح جرائم پیشہ تھا۔ چوری اور زہنی کرتا۔ کبھی اکیلے، کبھی لالی یا دوسروں کے ساتھ مل کر۔ ان کا باقاعدہ گروہ بن گیا۔ لالی بھی شادو کے ساتھ گروہ میں شامل تھا۔ انھوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔ بے جگری سے ڈاکے ڈالے۔ خوب گل چھرے اڑائے۔ مگر ایک تانگے والے کی مخبری پر پکڑے گئے۔ مقدمہ چلا۔ سزائیں ہوئیں۔ جیل سے نکلے تو گروہ تترہتر ہو چکا تھا۔ شادو نے جیل کانٹے کے بعد ایسی توبہ کی کہ پھر ادھر کا رخ نہ کیا۔ لیکن پولیس اسے برابر پریشان کرتی رہی۔ علاقے میں چوری، ڈاکہ زنی کی کوئی واردات ہوتی اسے ضرور تھانے میں بلایا جاتا۔ پوچھ گچھ ہوتی۔ ڈرایا، دھمکایا جاتا۔

اب شادو لائل پور میں رہتا تھا اور سانیکلوں کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ اس نے شادی کر لی تھی۔ دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ لالی اس سے برسوں نہ ملتا۔ مگر جب بھی ملتا، وہ ہمیشہ لالی کے ساتھ محبت سے پیش آتا۔ ایک بار لالی ڈاکے کی ایک واردات کے بعد دو ہفتے شادو کے گھر میں روپوش رہا۔ حالانکہ اس کی بیوی گھر میں لالی کے رہنے پر خوش نہیں تھی۔ ہر وقت کڑکڑ کرتی رہتی۔ شادو کبھی اسے پیار سے سمجھاتا، کبھی ناراض ہوتا۔ آئے دن جھگڑا رہتا۔ لیکن شادو کی آنکھوں میں کبھی میل نہ آیا۔ وہ لالی کا ہر طرح سے خیال رکھتا۔

لالی پل پر کھڑا شادو کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کسی نہ کسی طرح شادو کے پاس لائل پور پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لائل پور جانے کے لیے لاری کے اڈے یا ریلوے اسٹیشن تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیل سے فرار ہوئے اتنے دن ضرور ہو چکے ہیں کہ پولیس نے راستوں کی ناکہ بندی اور اسٹیشنوں کی نگرانی ختم کر دی ہوگی۔ لیکن سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ لباس تبدیل کرنے کے بعد لالی تو ہر جگہ پہنچ سکتا تھا مگر رحیم داد کی جیل کی وردی مسلسل خطرہ تھی۔ لالی کہیں جانے سے پہلے رحیم داد کو اس خطرناک وردی سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ صرف اسی صورت میں دونوں سفر کرنے کے قابل ہو سکتے تھے۔ لالی کو یہ کام جلد سے جلد کرنا تھا۔

رحیم داد بھی کچھ دیر بھولی بھری یادوں میں کھویا رہا۔ مگر جب لالی گم صم کھڑا رہا اور آگے نہ بڑھا تو رحیم داد نے ٹوکا۔ ”تو کس سوچ میں پڑ گیا؟ رات کم رہ گئی ہے۔“

لالی اس کی بات سن کر چونک پڑا۔ ”نھیک کہہ رہا ہے۔“

”پر توں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟“ رحیم داد نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

”کہیں تو چلنا ہی ہوگا۔ یہاں اس طرح کھڑا رہنا بھی خطرناک ہے۔“

لالی آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔ دونوں پاک پتھر روڈ پر کچھ دور تک چلتے رہے، پھر

نشیب میں اتر گئے اور جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ایک گینڈی پر چلے گئے۔ علاقہ
نجر اور ویران تھا۔ جگہ، جگہ پھوگ اور لانا کے پودوں کے جھنڈ تھے۔ دونوں مغرب کی سمت بڑھ
رہے تھے۔ اب وہ پاک تین روڈ سے بہت دور جا چکے تھے۔



درختوں کے پیچھے کہیں کہیں روشنی جھللا رہی تھی۔ کوئی بہتی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔
لالی اور رحیم داد آگے بڑھے۔ اب بہتی کے نشان واضح ہوتے جا رہے تھے۔ چراغوں کی ٹمٹماہٹ
بڑھ گئی تھی۔ اکا دکا مکان صاف دکھائی دے رہے تھے۔

دونوں نے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے رڑ عبور کیا اور گاؤں میں داخل ہو گئے۔ گاؤں خاصا
بڑا تھا۔ دور تک مکانوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ بیشتر مکانات مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا پختہ اور نیم
پختہ تھے۔ مگر وہ مکانوں کے قریب نہ گئے۔

رحیم داد خوف سے سہما ہوا تھا۔ لیکن لالی جاق چوبند نظر آ رہا تھا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر گرد
و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک گھنے درخت
کے نیچے پہنچ کر رک گیا۔ سامنے کچا مکان تھا جو گاؤں کے نکل پر تھا، اور دوسرے مکانوں سے الگ
تھلگ بھی تھا۔

لالی چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں اس مکان کے نزدیک
پہنچے اور دیوار سے لگ کر اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے ہو گئے۔ لالی نے جھک کر اپنے جوتے
اتارے اور رحیم داد کے حوالے کر دیئے۔ اس نے گردن اٹھا کر دیوار کی بلندی کا اندازہ لگایا۔
دیوار زیادہ اونچی نہ تھی۔ لالی نے دونوں ہاتھ بلند کئے۔ اچھلا اور ہاتھوں سے دیوار کا بالائی حصہ تھام
لیا۔ وہ پیروں سے سہارا لیتا ہوا، دھیرے دھیرے اوپر پہنچ گیا۔ دیوار پر پہنچ کر اس نے اندر کا جائزہ
لے لیا۔ دیوار سے چمٹا ہوا جھانکتا رہا، پھر خاموشی سے صحن میں اتر گیا اور دیوار کے ساتھ دھک

کر بیٹھ گیا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دیر تک جب کوئی کھٹکانہ ہوا تو لالی اٹھا اور اس دروازے کی جانب بڑھا جو باہر لگی میں کھلتا تھا۔

لالی نے دروازہ کھولا۔ گردن باہر نکالی۔ آہستہ سے سیٹی بجائی اور ہاتھ کے اشارے سے رحیم داد کو اپنے قریب بلایا۔ رحیم داد اس کے پاس گیا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر دیا، مگر کندی نہیں لگائی۔ دروازے کے سامنے صحن تھا۔ ایک طرف شیشم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے پتل تھا جس میں ایک بھینس بندھی تھی۔ صحن سے ملا ہوا دالان تھا۔ اس پر پھوس کی ٹھیدہ چھت تھی۔ دالان کے عقب میں دروازہ تھا۔ اس کا ایک پت ذرا سا کھلا تھا۔ روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔

لالی نے رحیم داد کو بیرونی دروازے پر ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ خود ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا اور دروازے سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ کچھ دیر وہ خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

چھت سے لالین لٹک رہی تھی۔ مگر اس کی روشنی دھیمی تھی۔ لالی نے ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ دیوار کے پاس چارپائی تھی۔ اس پر بستر بچھا تھا۔ مگر بستر خالی تھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا۔ ایک اور دروازہ بھی تھا۔ یہ ملحقہ کوٹھری میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کا ایک پت کھلا تھا۔ اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی۔

کمرے میں عجب نامانوس سی بو پھیلی تھی۔ ایسی بو جو اس سے پہلے لالی نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اس پر اسرار بو نے کمرے کا ماحول آسیب زدہ بنا دیا تھا۔ کسی ان جانے خوف سے لالی کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ واپس چلا جائے۔ عین اسی وقت کوٹھری کے اندر گرمی گرمی سانسیں بھرنے کی سرسراہٹ ابھری۔ لالی نے آہستہ سے چاقو نکال کر کھولا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب چوکننا نظروں سے دیکھنے لگا۔ ایک منٹ گزرا، دو سرا گزرا۔ کوئی نہیں آیا۔ گرمی گرمی سانسیں کی سرسراہٹ بھی بند ہو گئی۔ لالی کی نگاہ لکڑی کے اس صندوق پر پڑی جو چارپائی سے ذرا ہٹ کر رکھا تھا۔

لالی نے صندوق دیکھتے ہی واپس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے ہاتھ اونچا کیا۔ لالین کی لو اور دھیمی کر دی۔ آگے بڑھا اور صندوق کے قریب جا کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ صندوق کے کٹدے میں تالا پڑا تھا، مگر تالا کھلا تھا۔ اس میں کنجی بھی لگی ہوئی تھی۔ لالی کو کسی قدر حیرت بھی ہوئی۔ لیکن اس پر توجہ صرف کرنے کے بجائے اس نے آہستہ سے ایک ہاتھ سے ڈھلکا اٹھایا اور دوسرا ہاتھ

اندر ڈال کر کپڑے تلاش کرنے لگا۔ کپڑے نیچے تھے۔ اوپر ایک موٹی کھیس تہہ کر کے رکھی گئی تھی۔

لالی نے ایک کپڑا نیچے سے نکالنے کی کوشش کی، اچانک اسے اپنی پشت پر آہٹ سنائی دی۔ ساتھ ہی آواز آئی۔
”وے کون ہے؟“

لالی نے پلٹ کر دیکھا، کوٹھری کے دروازے کے پچوں بیچ ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ آنکھیں جنگلی کبوتر کی مانند گرمی سرخ تھیں۔ اس کے داہنے ہاتھ میں چھری تھی اور خون میں تھڑی ہوئی تھی۔ دھندلی روشنی میں عورت خوار اور ڈراؤنی نظر آرہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ لالی کی جانب بڑھی۔ لالی اسے دیکھ کر سخت حواس باختہ ہو گیا۔ صندوق کے اندر پڑا ہوا ہاتھ بھی باہر نہ نکال سکا۔ جس حالت میں تھا، اسی حالت میں دم بخود بیٹھا رہا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر عورت گرجی۔

”سور دے پتر، چوری کرنے آیا تھا؟“

لالی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ اس نے گردن جھکالی اور خاموشی سے فرش تکتے لگا۔ عورت اس کے سر پر آکر کھڑی ہو گئی اور اسی درشت لمبے میں بولی۔ ”تیرے بھی ٹوٹے کر کے اسی کے برابر لٹا دوں گی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر کوٹھری کی جانب اشارہ کیا۔
”دیکھو گا؟ چل دیکھ لے، کھڑا ہو۔“

لالی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ عورت نے خونخوار نظروں سے اسے دیکھا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب انگلی اٹھا کر بولی۔ ”اتھ چل۔“ لالی اس کی ہدایت پر سرکس کے سدھے ہوئے جانور کی طرح لڑکھڑاتے قدموں دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازے کے قریب پہنچا تو عورت نے ڈپٹ کر کہا۔

”اندر ٹر جا۔“

لالی خاموشی سے اندر چلا گیا۔ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے اندر آگئی۔ کوٹھری صاف ستھری تھی۔ طاق میں چراغ بھی جل رہا تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی میں سامنے چٹائی پر کوئی لیٹا تھا۔ اس کا پورا جسم چادر سے ڈھکا تھا۔ عورت نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ لالی نے دہشت زدہ ہو کر دیکھا، اس کی گردن کٹی ہوئی ہے۔ ہلکی ہلکی نامانوس بو اچانک تیز ہو گئی۔ مقتول کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور اس قدر ڈراؤنی تھیں کہ لالی نظر بھر کر نہ دیکھ سکا۔ عورت، لاش کے

سہانے بیٹھ گئی۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی سہا ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔
”اسے کس نے کتل کر دیا؟“

”کون کرے گا اسے کتل؟“ عورت نے لالی کو سرخ سرخ آنکھوں سے گھورا اور پاگلوں کی طرح سینے پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”اسے میں نے کتل کیا ہے، ہاں میں نے کیا ہے۔“ اس نے خون سے آلودہ چھری لالی کے سامنے کر دی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”یہ بھی پیچھے۔ یہ کون ہے؟“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”یہ میرا یار ہے۔“

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ عورت نے بھی کوئی بات نہیں کی۔ وہ ابھی تک گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔ وہ اپنی عمر کی اس سرحد پر تھی جب جوانی کی دوپہر کا سورج ڈھلنے لگتا ہے۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھردرے تھے۔ جسم کسا ہوا اور مضبوط تھا۔ چہرہ کڑی محنت اور تیز دھوپ سے سنولا کر صندلیں ہو گیا تھا۔ بڑی بڑی آنکھیں بچھ کر دھندلا گئی تھیں۔ چراغ کی دھندلی دھندلی روشنی میں لالی کو اب وہ ندھال اور تھکی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کوٹھری کے ایک کونے میں مٹکا رکھا تھا اور اس پر المونیم کا گلاس بھی تھا۔ لالی نے رمان سے کہا۔
”پانی پی لے۔“

”پلا دے۔“ عورت نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ اس دفعہ اس کے لہجے میں پہلے جیسی درشتی نہیں تھی۔

لالی نے مٹکے کا ڈھکنا اٹھا کر گلاس اندر ڈالا اور پانی سے بھرا ہوا گلاس بڑھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ پورا گلاس اس طرح غٹا غٹ پل گئی گویا بہت دیر سے پیاسی ہو۔ پانی پینے کے بعد اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم پڑ گئی۔ اس نے دیوار سے بیٹھ نکالی اور چند لمحوں تک آنکھیں بند کئے بیٹھ رہی۔ مگر جلد ہی اس نے آنکھیں کھول دیں اور کھوئی کھوئی نظروں سے لاش کو دیکھنے لگی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”دیکھ تو کیسا گھرو ہے۔“

لالی نے لاش کے چہرے کی جانب ایک بار پھر دیکھا۔ گھونگر والے لمبے لمبے بال، کھلتی ہوئی رنگت، تیکھے نقش و نگار اور مڑی ہوئی طرح دار مونچھیں۔ واقعی وہ بڑا وجیہ اور بانکا جوان تھا۔ عورت رک رک کر کہتی رہی۔ ”اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ پہلے اتنا سوہنا تھا۔ ایسا رنگ روپ تھا، ہاتھ لگاؤ تو میلا پڑ جائے۔ کوئی دیکھے تو دیکھتا رہ جائے۔“ عورت اس کے ذکر میں لذت محسوس کر

رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی رفتہ رفتہ ہلکی پڑتی جا رہی تھی۔ ”اس کی میری یاری آشنائی ہو گئی۔ جانے کیسے ہو گئی۔ بس ہو گئی، فیر سب ہی کچھ ہوا، وی جو ہوتا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جب بہت بدنامی ہوئی تب میں ایک رات اس کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔ ہائے کیسی کالی رات تھی۔ اسی رات میں جہانگیرہ آگئی۔ اس پنڈ کا نام جہانگیرہ ہے۔“ وہ لاش کو دیکھتی رہی اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر آہستہ آہستہ بولتی رہی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز اور وہیما لہجہ محسوس کیا۔ ”تو نے اس کا خون کیوں کر دیا؟“

عورت نے چونک کر اس طرح حیرت سے لالی کو دیکھا جیسے اسے یکسر فراموش کر چکی ہو۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے لالی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر لالی نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ عورت سب کچھ کہہ ڈالے۔ وہ ساری باتیں کہہ دیتی تو ٹھنڈی پڑ جاتی۔ نہ اس کی آنکھیں خون خوار رہتیں نہ چہرہ ویران نظر آتا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بار حالات میں اس کے ساتھ ایک قاتل بھی بند تھا۔ وہ ساری رات جاگتا تھا۔ کھا جانے والی نظروں سے گھورتا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتا تھا۔ دوسرے ملزموں کا گلا گھونٹنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ مگر جب اس نے پولیس کے سامنے سب کچھ اگل دیا تو واپسی پر حالات میں آکر دھڑام سے فرش پر گر گیا۔ مردے کی طرح ٹھنڈا پڑا رہا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ دوسرے روز، زور زور سے جھنجھوٹنے پر جاگا۔

لالی نے اصرار کر کے عورت سے پوچھا۔ ”بولتی کیوں نہیں؟ تو نے اس کا خون کیوں کر دیا؟“

”یہ نہ پیچھے۔“ عورت کی آنکھوں میں ایک بار پھر شعلے بھڑکنے لگے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ ”اس نے میری طرف سے آنکھیں بند کر لیں، مجھے دھوکا دیا۔“ وہ گلہ کرنے کے انداز میں کہنے لگی۔ ”میں نے اس کے کارن گھریا پھوڑا۔ اپنے دونوں نکلے چھوڑے۔ گھر والے کو چھوڑا۔ وہ برا بندہ نہیں تھا۔ جان چھڑکتا تھا مجھ پر۔ جو کہتی کرتا تھا۔ بس ذرا...“ اس نے نہایت بے باکی سے گالی دی اور سامنے پڑی ہوئی لاش کی جانب اشارہ کر کے نفرت اور غصے سے منہ بگاڑا۔ ”یہ دھوکے باز نکلا۔ ایک دم ہڈ حرام نہ کام کا نہ کاج کا۔ ہر دھوکہ مانگ کا ڈھتا، مونچھیں مروڑتا، آڑا ترچھا ہو کر آئینہ دیکھتا۔ گلیوں میں اینڈا بھرتا۔ شہر جا کر روز سنیا دیکھتا۔ میں نے اس سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اپنے زیور اور کپڑے لے بیچ کر ایک ن خرید لی۔ دن رات محنت کرتی۔ لمبردار کی حویلی میں کام کاج کرتی۔ اپنا پیٹ پالتی اور اس کے نکھرے بھی پورے کرتی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اس کے لیے میں نے کیا نہیں کیا۔ اپنی ذرا بھی پروا نہ کی۔ میں ایسی نہ تھی۔ میرا ایسا روپ رنگ

نہ تھا۔ سب کچھ جل کر کوئلہ ہو گیا اور اس نے مجھے کیا دیا؟ میرا خانہ خراب کر کے کہیں اور آگھ لڑائی۔“

عورت بات کرتے کرتے رک گئی۔ لاش کو گھورنے لگی۔ اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ”کہتا تھا شاداں! تیرے بنا زندہ نہیں رہ سکتا۔ ریل کے نیچے لیٹ جاؤں گا۔ گلے میں پھندا ڈال کر مر جاؤں گا۔“ عورت کے لہجے میں تنہی بڑھتی گئی۔ اس کا چہرہ وحشت ناک ہو گیا۔ ”جھوٹا، مکار۔ مجھے چھوڑ کے اس کجری کے ساتھ چپکے سے نکاح کر لیا۔ ہفتوں نہ آتا۔ جب آتا، ہتھ پھیلائے ہوئے۔ کچھ لیے بنا نہ ملتا۔ میں جان بوجھ کر دھوکا کھاتی رہی۔“

وہ خاموش ہو کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے ہاتھ میں خون آلود چھری ابھی تک دبئی ہوئی تھی۔ مگر لالی کو اب اس سے ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ عورت اپنا خول توڑ کر آہستہ آہستہ باہر آ رہی تھی۔

لالی چاہتا تھا کہ وہ کچھ بھی اپنے دل میں نہ رکھے۔ ہر بات کہہ ڈالے۔ کھرے سکے کی طرح ٹن ٹن بولنے لگے۔ لالی نے اسے کرید۔

”یہ تو بتا، آج کیا ہوا؟“

وہ کھوئی کھوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی، پھر دھیرے دھیرے کہنے لگی۔ ”آج شام، پورے تین مہینے بعد آیا تھا۔ پہلے تو ڈھیر سارا پیار جتایا۔ وہی ایکٹروں والی فلمی باتیں۔ روز روز سنیما جو دیکھتا تھا۔ کہنے لگا، اپنی نچ دے۔ اے ادھار چکانا تھا۔ میں نے بار بار انکار کیا۔ وہ نہ مانا۔ اپنی ہی کہتا رہا۔ مجھے ایک دم گم آگیا۔ انھی اور جھلیانی سے چھری نکال لائی۔ چھری اس کے سامنے ڈال کر بولی۔ توں نے میرا خانہ خراب ہی کرنا ہے تو یہ چھری لے اور میرے گلے پر چلا دے۔ میں جیتے جی تو اپنی نچتوں کی نہیں۔“ وہ لمحے بھر رک کر بولی۔ ”ایمان نال بتا، اپنی نچ دوں گی تو میرا کیا بنے گا۔“

بات ادھوری ہی چھوڑ کے وہ پھر خاموش ہو گئی۔

لالی نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔ ”شاداں! تیرا نام شاداں ہی ہے نا؟ تو چاچا چہا کیوں بات کرتی ہے۔ یہ بتا، اس کا خون کیوں کر دیا؟“ وہ رفتہ رفتہ بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔

”اس نے ایک ایسی بات کہی، میں گسے سے پاگل ہو گئی۔“ شاداں اپنی بات کتے کتے ایک بار پھر

بکی۔

”میں نے تجھے اس کا نام تو بتایا ہی نہیں۔“

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”ہو گا کوئی نام۔“

”بالا۔“ اس نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ پڑا ہے بالا۔ اب تو بس نام ہی رہ گیا ہے۔“

لالی بیزار سے بولا۔ ”اس کا منہ ڈھک دے۔ آگے بتا۔“

شاداں نے جھک کر بالائی لاش کا چہرہ چادر سے ڈھک دیا۔ ”ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ چھری دیکھ کر وہ ٹھنھا مار کر ہنسا۔ جب ہنس چکا تو منہ ٹیڑھا کر کے بولا۔ بوڑھی ڈھکی کے گلے پر تو کسائی چھری چلاتا ہے۔ میں ایسا کام نہیں کرتا۔ کسائی کے پاس چلی جا۔ مجھے حوالے کر دے۔ سنا توں نے؟“ اس نے کیا کہا؟“ وہ لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”اس نے مجھے بوڑھی ڈھکی کہا۔ کیا میں بوڑھی ڈھکی لگتی ہوں؟“ اس کا چہرہ بچھ کر دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے گہری سانس بھری اور تڑپ کر بولی۔

”ہاں میں بوڑھی ڈھکی ہی لگتی ہوں۔ پر بوڑھی ڈھکی بھی تو میں اسی کے ہاتھوں بنی۔ اس نے میرا سب کچھ چھین لیا اور آنکھیں بھی پھیر لیں۔ ایک نمبر کجتر نکلا۔“

شاداں کی آنکھیں پھر خوں خوار ہو گئیں۔ اس نے چھری مضبوطی سے پکڑ لی۔ ”میں کچھ نہ بولی۔ چھری اٹھائی اور روتی ہوئی باہر چلی گئی۔ اس نے مجھے روکا بھی نہیں۔ آئینہ اٹھا کر اپنا حسن دیکھنے لگا، مونچھیں مروڑنے لگا۔ میں دیر تک اندھیرے میں بیٹھی روتی رہی۔ نہ وہ باہر آیا نہ میرے آنسو پونچھے۔ واپس آئی تو بستر خالی تھا۔ کوٹھری میں جا کر دیکھا تو آرام سے سو رہا تھا۔ وہ میرے ساتھ سوتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ بوڑھی ڈھکی کے ساتھ کیوں سوتا؟“

”فیر کیا ہوا؟“ لالی نے بے قراری سے پوچھا۔

”ہوتا کیا تھا۔ میں کھڑی اسے گھورتی رہی۔ فیر دھیرے دھیرے اس کے پاس گئی اور سرہانے بیٹھ گئی۔ وہ اسی طرح آرام نال سوتا رہا۔ میں نے جل کر چاہا اس کے منہ پر تھوک دوں، پر میں نے تھوکا نہیں۔ چھری ہاتھ میں دبئی تھی۔ اس کی گردن پر پھیر دی۔ پورا گلا کاٹ دیا۔“ یہ کہہ کر جیسے اس پر غشی طاری ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے سردیوار سے نکال لیا۔ وہ بے سدھ پڑی ہو لے ہو لے سانس لے رہی تھی۔

کوٹھری میں گہری خاموشی چھا گئی۔ فضا میں خون کی بو بسی ہوئی تھی۔

لالی جلد ہی اس خاموشی سے اکتا گیا۔ ”اب تیں نوں کیہ کرنا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔“ شاداں آنکھیں کھول کر رمان سے بولی۔ اس کی آواز اس قدر مبہم تھی،

جیسے گھڑے کی اندر منہ ڈال کر بول رہی ہو۔

”کچھ نہ کچھ تو کرتا ہی پڑے گا۔“

”بتا، کیا کروں؟“

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ شاداں کی بڑی بڑی آنکھوں پر لمبی لمبی پلکوں کے سائے چھائے ہوئے تھے۔ چہرہ کچھلی رات کا چاند بن گیا تھا۔ اس وقت وہ اس شاداں سے قطعی مختلف تھی، جو کچھ دیر پہلے لالی کے سر پر خون سے لتھڑی ہوئی چھری تانے کھڑی تھی۔ جس کی آنکھوں میں شعلے دیکتے تھے، چہرے پر دشت برستی تھی۔ لالی کو اب وہ ایسی عورت نظر آئی جو جوان تھی، سرکش تھی اور اپنی سفاکی کے باوجود قابلِ رحم بھی تھی۔ اسے شاداں سے لگاوت کی حد تک ہمدردی پیدا ہو گئی۔

”ایک بات کہوں، مان لے گی؟“

”بول۔“ شاداں نے آہستہ سے کہا۔

”میرے ساتھ بھاگ چل۔“

”تیرے ساتھ بھاگ چلوں؟“ شاداں نے غصے سے اسے گھورا۔ ”صورت دیکھی ہے اپنی۔ آخ تھو۔“ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کھینا نہ ہو کر بولا۔ ”آتا برا کیوں مانتی ہے؟ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا تھا۔“

وہ اسے قہر آلود نظروں سے گھورتی رہی، پھر تیوری پر بل ڈال کر بولی ”وے دلتے، توں نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ میں کوئی کنجری ہوں؟“ اس نے چھری لالی کے سامنے کر دی۔ ”یہ چھری دیکھی ہے؟“

مگر لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوا۔ ”زیادہ اکڑ نہ دکھا۔ یوں بیٹھی رہے گی تو سدھی جیل جائے گی۔“

وہ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولی۔ ”جیل چلی جاؤں گی پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“

”نہ جا، ہرگز نہ جا۔ بھول جا یہ بات۔ اپنے یا ربالے کو بھی بھول جا۔ آگے کی سوچ۔“

”مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ توں جا یہاں سے۔“

لالی ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں تو نہیں جاؤں گا۔“

”نہیں جائے گا؟“ وہ چھری تان کر غصے سے لالی پر جھپٹی۔ ”آنکھیں نکال لوں گی تیری۔“ لالی

نے جھٹ اس کی کلائی زور سے دبوچ لی۔ وہ ہلبلا کر بولی۔ ”کنجرا میرا ہتھ چھوڑ۔“

لالی نے چھری چھین لی، اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ”بول اب کیا کہتی ہے؟“ شاداں نے کوئی جواب

میں دیا۔ وہ اپنی ہزیمت پر غصے سے ہانپنے لگی۔

”دل سے میل نکال دے۔ میں اتنا برا بندہ نہیں ہوں جتنا تو سمجھ رہی ہے۔“ لالی نے توقف

کیا۔ ”جو ہوتا تھا، ہو گیا، آگے کی سوچ، آگے کی۔“

”میں نے ٹھیک نہیں کیا۔“ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”نچ دیتی تو کیا ہل جاتا؟“

”تو خود کو بھی نچ دیتی، تب بھی وہ تیرا نہ بنتا۔“

”سچ کہہ رہا ہے۔ پر میں اب کیا کروں۔ مجھے اب کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ سب کچھ مک گیا۔

مارا کھیل ختم ہو گیا۔“

لالی نے اس کی دکھتی رگ چھیڑی۔ ”تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟“

”آتے ہیں، بہت یاد آتے ہیں۔“ مامتا کا جذبہ جاگ اٹھا۔ وہ بچے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اب تو

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئے۔ جو نصیب میں لکھا ہے، پورا ہو گا۔“

”نصیب کو چھوڑ۔ ہوش سے کام لے۔“

وہ بے بسی سے بولی۔ ”کچھ سمجھ نہیں آتی، کیا کروں؟“

”میرا کہا مان۔“ لالی نے بالے کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زمین کھود کر اسے

میں دبا دے۔“ لالی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی گھبرا کر بڑبڑایا۔

”صبح ہو گئی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاداں نے ٹوکا۔ ”کہاں جائے گا؟ ہمیں ٹھیر جا۔ میں اکیلے زمین کیسے کھودوں گی۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا،

برہ دوروازے کی جانب لپکا۔ شاداں نے پوچھا۔ ”نہیں رکے گا؟ اب تو اجالا ہو گیا۔“ اس نے

وغری کے روشن دان سے پھونتی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی کی طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”رات کو

مدھرے میں چلا جانا۔“ اس کے انداز میں دلی عاجزی تھی۔

”تو کہتی ہے تو نہیں جاؤں گا۔ باہر میرا سا تھی بیٹھا ہے۔ اسے لے کر آتا ہوں۔“

لالی باہر چلا گیا۔ کمرے سے گزر کر آنگن میں پہنچا۔ اس نے دیکھا، رحیم داد دروازے کے برابر

دار سے پیٹھ ٹکائے گہری نیند سو رہا ہے۔ لالی نے قریب پہنچ کر اسے جھنجھڑا۔ رحیم داد نے ہڑبڑا کر

نکھیں کھول دیں۔ کھینا نہ ہو کر بولا۔ ”یار! اوگھ آگئی تھی۔ توں نے دیر بھی تو کتنی لگا دی۔“ اس

نے صبح کی ہلکی ہلکی روشنی دیکھی تو ایک دم گھبرا گیا۔

”صبح ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟“

”ٹھیک ہی ہو گا۔ ہم نے اب کیس نہیں جانا۔ میں ٹھہریں گے۔“
رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
لالی نے ہاتھ پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ ”میرے ساتھ آ۔“

دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچے۔ شاداں ابھی تک اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ لاش کے چہرے سے اس نے چادر اٹھا دی تھی اور کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رحیم داد نے لاش دیکھی اور اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھیں تو سرا سید ہو کر دروازے پر ٹھہر گیا۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ ”یار! یہ کیا چکر ہے؟“

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑھ کر چادر اور سر کا دی۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں لاش کا کٹا ہوا گلا دیکھا تو خوف سے آنکھیں اور پھٹ گئیں۔ لالی نے لاش کا چہرہ چادر سے ڈھکتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”دیکھ لیا تو نے؟ یہ چکر ہے۔“ رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ دم بخود کھڑا رہا۔ لالی نے شاداں کی طرف نظریں اٹھائیں۔

”کھڑی ہو۔ بہت ہو چکا سیایا۔“

مگر شاداں وہیں بیٹھی رہی۔ ”مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔ توں باہر جا۔“ اس نے لاش کے چہرے سے پھر چادر ہٹا دی۔ رحیم داد اس کی ڈراؤنی آنکھیں نہ دیکھ سکا۔ پریشان ہو کر کوٹھری سے باہر چلا گیا۔

لیکن لالی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ شاداں بڑبڑانے لگی۔ ”وہی آنکھیں، وہی چمکتا تھا، وہی چھلے دار بال۔“ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھا کرنے لگی اور لالی کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ ”لگتا ہے ابھی ابھی سویا ہے۔“ وہ جھکی ہوئی اس کا چہرہ ہنسی رہی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور بالے کے بے جان چہرے پر بکھرنے لگے۔ وہ بے قرار ہو کر اس کا ماتھا اس کے ہونٹ چومنے لگی۔ اس نے سینے پر دو ہتھ مارا اور دل دوز آہ بھر کر زور سے چیخی۔ ”ہائے ربا، میں مر گئی۔“ وہ لاش کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کوٹھری کی دھندلی روشنی میں گھٹی گھٹی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

ایک چراغ زور سے بھڑکا۔ کوٹھری کی دیواروں پر پرجھائیاں لہرائیں اور چراغ بجھ گیا۔ اندھیرا ہوتے ہی لالی اس طرح چونکا گویا سوتے سوتے آنکھ کھل گئی ہو۔ اس نے بوجھل آواز سے شاداں کو مخاطب کیا۔ ”شاداں! اب اٹھ جا۔ بہت کر چکی چٹی۔ دکھت کم ہے، ابھی بہت کام کرنا ہے۔“

شاداں پھر بھی نہ اٹھی۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ ”اٹھتی ہے کہ نہیں۔“ شاداں چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے جھک کر بالے کے مردہ چہرے پر چادر ڈال دی۔ دونوں کوٹھری سے باہر آ گئے۔

رحیم داد کمرے میں گم صم کھڑا تھا۔ اس نے دونوں کو دیکھا مگر کوئی بات نہیں کی۔ لالی نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا، کنڈی لگائی۔ شاداں کمرے کے ایک گوشے میں دیوار سے پیٹھ ٹکا کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ راکھ بن گیا تھا۔ آنکھیں دیران تھیں اور ابھی تک سرخ تھیں۔ لالی نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ کمرے سے نکل کر باہر آگن میں گیا اور بیرونی دروازے کی کنڈی چنھا دی۔ اب ہر سو صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ گھروں سے ملی جلی آوازوں کا شور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ رات بھر کا سویا ہوا گاؤں بیدار ہو رہا تھا۔

لالی کمرے میں واپس آیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا تھا اور شاداں اسی طرح کھوئی کھوئی بیٹھی تھی۔ اس نے لالی کی جانب نظر نہ اٹھائی۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے شاداں کو مخاطب کیا۔

”یہ کپڑے تو بدل۔ جا قافٹ نہالے۔“

لیکن شاداں اٹھنے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ بیزاری سے بولی۔ ”میں نوں کہیں نہیں جانا۔ یہیں بیٹھا رہنے دے۔ بہت تھک گئی ہوں۔“

”کیا چاہتی ہے؟ اگر تجھے جیل ہی جانا ہے تو مجھے کیوں روکا؟“ شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ ”بولتی کیوں نہیں؟“

شاداں نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ ”کیا بولوں؟“

”جو کہہ رہا ہوں، وہ کر۔ کپڑے بدل لے۔“ کوٹھڑا دھکا دے۔ ہمیں بھی روٹی کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔ پہلے پانی پلا۔“

شاداں نے اس کی ساری باتیں خاموشی سے سنیں۔ اٹھی، باہر گئی اور کٹورے میں پانی بھر کر لائی۔ لالی نے کٹورا لیا اور غٹ پانی پینے لگا۔ شاداں نے صندوق سے کپڑے نکالے اور بغل میں دبا کر کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھسک کر لالی کے قریب پہنچا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”یار! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“ وہ سخت پریشان تھا۔

”وہی جو دیکھ رہا ہے۔“

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ ”مخول نہ کر۔ صاف صاف بتا، معاملہ کیا ہے؟ کچھ سمجھ نہیں

آتی۔“ وہ اپنی بات کتے کتے لمحے بھر کور کا اور کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولا۔

”اسے تو نے کتل کیا ہے؟“

”گھاس تو نہیں کھا گیا؟ میں کیوں کتل کرنے لگا۔ خون کس کے ہاتھ اور کپڑوں پر لگا ہے؟ تجھے اتنا بھی دکھائی نہیں دیتا؟“

”تیرا مطلب ہے، اس زنانی نے کیا ہے؟“ اس نے گردن موڑ کر باہر آنگن کی جانب دیکھا۔ شاداں وہاں نہیں تھی۔ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔

”یہ تو بہت ظالم ہے۔“

”وہ اس سے بھی زیادہ ظالم تھا۔“

”ہوگا مجھے تو یہ بہت خطرناک لگتی ہے۔ آنکھیں دیکھیں ہیں، کیسی لال لال انگرا ہیں۔“

”ذرا مت۔ ابھی اس کے سر پر خون سوار ہے۔ نہالے گی تو اتر جائے گا۔“

”گھروالا تھا اس کا؟“

”نہیں اس کا یا تھا۔“ لالی نے تفصیل سے ایک ایک بات رحیم داد کو بتا دی۔

وہ سب کچھ سن چکا تو پریشان ہو کر گویا ہوا۔ ”یہ بتا، اب کرنا کیا ہے؟“

”زمین کھود کر لاش وہابی ہے۔“

رحیم داد سہما ہوا تھا۔ ”یار! کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ شاداں مجھے ٹھیک نہیں لگتی۔“

”تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسی ویسی زنانی نہیں ہے اور اگر بری ہے بھی تو اپنا کیا لے گی۔ اب تو اس کی ٹانگ بھی ہمارے ہی ساتھ بندھی ہے۔ چند روز یہاں چھپے رہیں گے۔ فیر آگے جانے کا پروگرام بنائیں گے۔ اس غار سے تو جنگی ہی جگہ ہے۔ روٹی بھی کھانے کو مل جائے گی اور کپڑے لے بھی آرام سے مل جائیں گے۔“

دونوں چارپائی پر بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کرنے لگے۔

شاداں کمرے میں واپس آگئی۔ وہ ابھی ابھی نما کر آئی تھی۔ اس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر تازگی تھی۔ اچلے لباس میں وہ رات والی شاداں سے مختلف لگ رہی تھی۔ آنکھوں میں خون خوار چمک تھی نہ چہرے پر وحشت۔ اس کے ایک ہاتھ میں خون آلود کپڑے دبے تھے۔ لالی نے کپڑے اس سے لیے اور کوٹھری کی کنڈی کھول کر سارے کپڑے اندر ڈال دیے۔ جب وہ کوٹھری کا دروازہ بند کر کے دوبارہ کنڈی لگا رہا تھا تو شاداں نے پوچھا۔

”میرے کپڑے لے لے وہاں کیوں ڈال دیے؟“

”لاش کے ساتھ ہی انھیں بھی دبا دوں گا۔ چھری بھی رکھ دوں گا۔“

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“ پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”چھری تو دے دے۔ مجھے اس ضرورت ہوگی۔“

لالی بے پروائی سے بولا۔ ”دوسری لے آتا۔ میں جو کچھ کر رہا ہوں، کرنے دے۔ بیچ میں اپنی لہ نہ اڑا۔“

شاداں نے خاموشی سے اس کی بات مان لی۔ ”جیسی تیری مرضی“ وہ دروازے کی جانب مڑی۔

میں تم دونوں کے لیے روٹی نکر لے آؤں۔“

لالی نے پوچھا۔ ”تیں نوں کہیں دودھ تو نہیں پینا؟“

”دودھی کو پینا تو ہے۔ بعد میں پینا دوں گی۔ فکر نہ کر۔“

”نہیں، پہلے دودھ پینا دے۔ ہر کام دیے ہی کر جیسے روز کرتی ہے۔ ہماری پروا نہ کر۔ ہم بعد

میں بھی روٹی کھا لیں گے۔“ وہ اپنی بات کتے کتے لمحے بھر کے لیے رکا۔ ”گھر میں کوئی کدال

گی؟“

”کدال تو ہے۔“

”پہلے بھی ہوگا؟“

”نہیں، پہلے نہیں ہے۔ پڑوس سے لے آؤں گی۔ ابھی لائی۔“ شاداں دروازے کی جانب

جی۔

لالی نے فوراً ٹوکا۔ ”ٹھہر جا شاداں! رہنے دے، پہلے کے بغیر ہی کام چل جائے گا۔“

”پر اس میں ہرج کیا ہے!“

”بہت ہرج ہے۔ تو یہ باتیں نہیں سمجھتی۔ جیسا کہتا ہوں، ویسا کر۔ میرا کام مجھ پر چھوڑ دے۔

میں اپنا کام کر۔ منہ کیا تک رہی ہے میرا؟ جاکدال اور ایک ٹوکری لے آ۔“

شاداں باہر چلی گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد کدال اور ٹوکری لے کر واپس آگئی۔ لالی نے کدال اور ٹوکری سنجال کر رحیم داد سے کہا۔ ”تیار! تھوڑی سی کھائی کر لیں۔ فیر اطمینان سے روٹی کھائیں گے۔“

”پہلے کچھ کھائی تو لے۔“ شاداں نے اصرار کیا۔

”کھا لیں گے، تو پہلے اپنا روز کا کام نمٹا لے۔ اور ہاں باہر جانا تو دروازے میں تالا ضرور ڈال

دینا۔ ”لالی نے چھت سے لٹکی ہوئی لائین اتاری، جو ابھی تک روشن تھی۔ اس نے لائین ہاتھ میں سنبھالی اور رحیم داد کے ہم راہ کو ٹھری میں چلا گیا۔

اس نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لائین کی بتی اونچی کر دی۔ روشنی بڑھی اور پھیلی تو فرش پر چادر سے ڈھکی ہوئی لاش نظر آئی۔ رحیم داد خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ مگر لالی نے لاش کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ اطمینان سے کدال اٹھا کر آہستہ آہستہ زمین کھودنے لگا۔ رحیم داد ٹوکری میں مٹی بھر کر ایک طرف ڈالنے لگا۔

زمین توقع کے خلاف اندر سے سخت ٹکلی۔ ایک بار لالی نے کدال چلائی تو زور سے ٹن کی آواز آئی۔ لالی نے ہاتھ روک لیا۔ جھک کر دیکھا تو ایک بھاری پتھر اڑا تھا۔ اسے نکالنے میں لالی اور رحیم داد پسینے پسینے ہو گئے۔ ذرا دم لینے کو رکے تھے کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی شاداں کی آواز ابھری۔

”دروازہ کھول۔ میں ہوں شاداں۔“

لالی نے دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد کے ہم راہ باہر آ گیا۔ دونوں بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔ ”ہو گیا کام؟“

لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ ”آتی جلدی کیسے ہو جائے گا کام۔ کیا تو نے ہمیں گور کن سمجھ رکھا ہے؟“

”منہ ہاتھ دھولو۔ میں ابھی تمہارے لیے روٹی لاتی ہوں۔“

دونوں باہر آگن میں گئے اور کنوئیں سے پانی نکال کر منہ ہاتھ دھونے لگے۔ اب ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ گلی میں بچے شور مچا رہے تھے۔ کبیر قریب دو عورتیں چیخ چیخ کر لڑ رہی تھیں۔

رحیم داد نے یہ آوازیں سن کر بیرونی دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور زنجیر چڑھی ہوئی تھی۔ دونوں آگن میں زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ کمرے کے اندر آ کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔

انھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاداں ناشتہ لے کر آگئی۔ ناشتے میں روٹی تھی، ساگ تھا۔ مٹی کی ٹھوٹھی میں تازہ تازہ مکھن تھا اور دو گلاسوں میں لی تھی۔ دونوں کو سخت بھوک لگی تھی۔ وہ کھانے پر پل پڑے۔ شاداں ان کے قریب ہی بیٹھ گئی اور اصرار کر کے کھانا کھلانے لگی۔ بار بار مکھن نکال کر روٹی پر ڈال دیتی۔ اپنی بھینس کی اور اس کے دودھ کی تعریف کرتی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سنوار لیے تھے۔ اس کے چہرے پر ہلکا ہلکا دکھ کا سایہ تھا۔ آنکھوں میں جلتے بجتے

اغ روشن تھے۔ اس کے جسم سے پسینے کی ہلکی ہلکی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہ لالی کے بالکل قریب ہی تھی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے جسم کی مہک محسوس کر سکتا تھا۔ لالی کو اس کا اس طرح سے بیٹھ کر چاؤ سے کھانا کھانا بہت اچھا لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا۔

اس نے لسی کا پورا گلاس چڑھایا اور زور سے ڈکاری۔ ”مزہ آ گیا۔“ اس نے مڑ کر شاداں کو بلھا۔ وہ بڑی طرح دار عورت تھی۔ اس کے چہرے پر ڈھلتی دھوپ کی جگمگاہٹ تھی۔ شاداں نے ردن کو خم دے کر دروازے کی جانب دیکھا۔ لالی کو شاداں کا یہ انداز بھا گیا۔ مسکرا کر اس سے طب ہوا۔ ”شاداں! تو بہت زور آور ہے۔ سوہنی بھی ہے۔ کیا بات ہے تیری۔“ وہ اپنی بات کتے ہتے رکا۔ ”سچ جان۔ بالاجتھے پہچان نہیں سکا۔ بیچ اور گھٹیا تھا۔“

شاداں نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ایسی بات مت کر۔“ اس کا ہاتھ کھردرا اور ت تھا، لہجہ بھی کھردرا تھا۔

”تو میرے سامنے ایسی گل نہیں کہہ سکتا۔“

”وہ تجھے بھی بچ سمجھتا تھا۔ دودھ دینے والی بچہ بوڑھی ہو جائے تو کسائی کے کھونٹے سے باندھ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

شاداں کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ تمللا کر چیخی۔ ”یہ میرا اور اس کا معاملہ ہے۔ توں کون تا ہے بولنے والا؟ تھانے دار ہے؟“

لالی کھسپانا ہو کر رہ گیا۔ انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نرمی سے گویا ہوا۔ ”یہ بتا۔۔۔۔۔“

شاداں بات کاٹ کر بے زاری سے بولی۔ ”مجھ سے کچھ نہ پوچھ۔“ وہ ابھی تک ناراض تھی۔ لانے کوئی بات نہیں کی۔ چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔

رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ ”مجھے تو ادھنگ آ رہی ہے۔ لالی! تیرا کیا ارادہ ہے؟“

لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شاداں بول پڑی۔ ”سو جاؤ کچھ دیر۔ رات بھر کے جاگے ہوئے۔“

شاداں کے لہجے میں پہلے جیسی تلخی نہیں تھی۔ لالی نے اس کا بدلا ہوا انداز دیکھا تو اسے مخاطب با۔ ”تجھے بھی تو نیند آ رہی ہوگی۔ تو سوئی کب۔“

”میری فکر نہ کر۔ میری آنکھوں میں بالکل نیند نہیں۔ دودھی کو دودھ پہنچانا ہے۔ ملک کی حویلی کام کرنے جانا ہے۔ اور بھی بہت کام دھندا کرنا ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”دروازہ اندر سے بند کر۔“ لے لے جب میں باہر جاؤں گی تو تالا ڈال جاؤں گی۔“ شاداں کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے اٹھ کر دروازہ بند کیا۔ دونوں وہیں چٹائی پر ٹانگیں پیار کے لیٹ گئے۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ لالی لیٹتے ہی سو گیا۔ کچھ دیر بعد رحیم داد کو بھی نیند آگئی۔

دونوں تھکے ہوئے اور رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ بے خبر ہو کر سو گئے۔ انھیں کچھ بھی خبر نہ ہوئی کہ شاداں کب گھر سے باہر گئی۔



کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا چھایا تھا۔ باہر آنگن میں گرمی خاموشی تھی۔ شاداں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ دونوں اٹھ کر کوٹھری میں چلے گئے۔ دن کی دھندلی دھندلی روشنی میں کھدائی کرتے رہے۔ جب اندھیرا بدھ گیا تو لالی نے لائٹیں روشن کر لی۔ کھدائی مشکل تھی۔ بار بار کدال پتھروں سے ٹکرا کر پلٹ جاتی۔ مگر انھوں نے ہاتھ نہیں روکا۔ لالی تھک جاتا تو رحیم داد کدال سنبھال لیتا۔ دونوں باری باری ڈیوٹی بدلتے رہے۔

بست دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ سامنے شاداں کھڑی تھی۔ لالی اور رحیم داد کوٹھری سے نکل کر کمرے میں آگئے۔ انھوں نے دیکھا، باہر آنگن میں اندھیرا پھیلا ہے۔ پھر رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر بھی سناٹا چھا گیا تھا۔ شاداں نے آہستہ سے پوچھا۔

”کتنا کام رہ گیا ہے؟“

”ابھی بہت کام ہے۔ میں زمین زیادہ گرمی کھودنا چاہتا ہوں۔“

”روٹی کھالے۔“

لالی آمادہ نہ ہوا۔ ”ابھی نہیں“ کام ختم کرنے کے بعد۔ ”رحیم داد نے بھی لالی سے اتفاق کیا۔ دونوں جلد سے جلد کام نمٹا دینا چاہتے تھے۔

شاداں نے جھک کر سرگوشی کی۔ ”کدال آہستہ چلا۔ آواز سنائی پڑتی ہے۔“

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”ڈھول بجانا شروع کر دے۔“

”مسکری نہ کر۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

”تجھے ڈر بھی لگتا ہے؟“

شاداں جھینپ کر رہ گئی۔ لالی نے مزید کوئی بات نہیں کی۔ وہ رحیم داد کے ہم راہ کوٹھری میں چلا گیا۔ کھدائی شروع ہو گئی۔ اس دفعہ دونوں سنبھال سنبھال کر کدال چلا رہے تھے تاکہ آواز پیدا نہ ہو۔ مگر اس طرح کھدائی کی رفتار سست پڑ گئی۔ آدھی رات سے کچھ پہلے انھوں نے خوب گرمی قبر

مردی۔ دونوں نے لاش اٹھائی اور نیچے اتارنے لگے۔

اسی وقت شاداں دروازہ کھول کر اندر آگئی۔ اس نے آتے ہی لاش کے چہرے سے چادر اٹھا لی اور گرمی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ بالے کا بے جان چہرہ میٹا لا پڑ چکا تھا۔ آنکھیں کھلی ہوئی میں اور پہلے سے زیادہ ہی بے نور ہو گئی تھیں۔ لاش سے ہلکی ہلکی بدبو اٹھ رہی تھی۔ لالی نے اداں کو زیادہ دیر وہاں ٹھہرنے نہیں دیا۔ اس بار شاداں نے اپنے سینے پر نہ دوہتر مارا، نہ چیخی، نہ دئی چپ چاپ باہر چلی گئی۔

لالی اور رحیم داد نے اس کے جاتے ہی لاش بستر میں پیٹ کر نیچے لڑھکا دی۔ شاداں کے خون لود کپڑے اور چھری بھی ڈال دی اور جلدی جلدی پتھر اور مٹی ڈال کر گڑھا بھرنے لگے۔ گڑھا رنے کے بعد جو مٹی بچ گئی، وہ انھوں نے کوٹھری میں پھیلا کر برابر کر دی۔ رحیم داد بالٹی میں پانی لے آیا۔

لالی نے کوٹھری کے فرش پر پانی چھڑک دیا۔ جب ہر کام لالی کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ دھڑکی کا دروازہ بند کر کے رحیم داد کی ساتھ باہر آگیا۔

شاداں دالان میں چپ بیٹھی تھی۔ لالی نے آتے ہی کہا۔ ”فٹ روٹی لا۔ بہت بھوک لگی ہے۔“

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ جب وہ جانے لگی تو لالی نے ٹوکا۔ ”کل کوٹھری میں ٹریاں یا بھوسا بھر دینا اور اس میں تالا لگا دینا۔ تجھ سے یہ کام نہ ہو تو ہم دونوں کر دیں گے۔ فکر نہ کر۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔“

شاداں کھوٹی کھوٹی کھڑی رہی پھر خاموشی سے چلی گئی۔



موسم اچانک بدل گیا۔ رات کسی قدر گرم تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ فضا غبار آلود تھی۔ شاداں نے اصرار بھی کیا مگر رحیم داد اور لالی چارپائی پر نہ لیٹے۔ چارپائی دالان میں پڑی تھی۔ شاداں نے لا ڈال دی تھی۔

دونوں اس پر نہ لیٹے تو شاداں خود لیٹ گئی۔ لالی اور رحیم داد جلدی سو گئے۔ صبح بہت تڑکے اداں نے دونوں کو بیدار کیا۔ مگر دونوں پر نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دالان سے اٹھ کر کمرے میں جا کر سوتے اور دیر تک بے خبر سوتے رہے۔

..... شاداں نے آکر پھر انھیں جگایا۔ لالی کو اشارے سے دالان میں بلایا۔ وہ گھبرائی ہوئی

نظر آ رہی تھی۔ ”یہ جو تیرا ساتھی رہے ہے، جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟“
لالی انکار نہ کر سکا۔ ”ہے تو۔ تو نے اس کی جیل کی وردی نہیں دیکھی؟“

”اور تو بھی جیل سے بھاگا ہے؟“

لالی کو تشویش ہوئی۔ ”تجھے کیسے پتہ چلا؟“

”میں ملک کی حویلی میں گئی تھی۔“

لالی نے اسے اپنی بات مکمل نہ کرنے دی۔ بیچ میں بول پڑا۔ ”یہ ملک کون ہے؟“

”پنڈ کا لبردار ہے۔ اس کا نام ملک اللہ نواز ہے۔ ملک کی حویلی میں تھانیدار بیٹھا تھا۔“

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”تھانیدار اس کی حویلی میں کس لیے آیا تھا؟“

”جب سے ادھر تھانیدار لگا ہے، روز ہی ملک کے پاس آتا ہے۔ وہ ملک کا بھائی جو ہے۔“

شاداں نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ ”تھانیدار کہتا تھا۔ دو کیدی جیل سے بھاگ گئے۔ ابھی تک پکڑے نہیں گئے۔ پولیس ان کی کھوج میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔“ شاداں نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر پریشانی چھا رہی تھی۔ ”اس کی گلاں سن کر میرا ہاتھ ٹھٹکا۔ مجھے جھٹ تم دونوں کی یاد آئی۔“

”تجھ سے تو تھانیدار نے کچھ نہیں پوچھا۔“

”مجھ سے کیوں پوچھتا؟ پر یہ ضرور کہتا تھا، ہر تھانے میں تم دونوں کی تصویریں لگا دی گئی ہیں۔“

پورے دو ہزار پکڑوانے والے کو انعام ملے گا۔“

”پہلے روٹی نکر دے، فیر گل بات ہوگی۔“

لالی کمرے میں آگیا۔ اس نے رحیم داد کو ہر بات بتادی۔ تھوڑی دیر بعد شاداں لسی لے آئی۔ لسی کے ساتھ رات کی باسی روٹی بھی تھی۔ شاداں اس وقت بھی ان کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ لالی نے لسی پیتے پیتے پوچھا۔

”بالے کے کپڑے لے تو تیرے پاس ہوں گے؟“

”ایک ایک لے گیا تھا۔ وہ اپنی ہر چیز لے گیا۔ اس کجری کے لیے میرے راکھواں کپڑے لے کر چالے گیا۔ جادو کر دیا تھا اس پر۔“

”اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ بات کرتے کرتے یادوں کے سارے بہت دور چلی گئی۔“

ہوگا۔ جو تا تو مجھے بھی چاہئے۔ یہ سب کچھ آج ہی کرنا ہوگا۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا بالے کے لیے چاہئے ہے۔“

لالی نے اپنی ڈاڑھی کے بڑھے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”اس پنڈ میں ڈاڑھی مونڈنے کے لیے بلیڈ ٹنڈ بھی مل جائے گا؟ یہ تو بہت وڈا پنڈ ہے۔ موضع لگتا ہے۔ یہاں تو سب کچھ ملتا ہوگا۔“

”پنڈ میں ٹائی بھی ہے۔ اسے بلا لاؤں؟“ شاداں نے نہایت سادگی سے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر

بولی۔ ”نہیں، ٹائی کا میاں آنا ٹھیک نہیں۔ میں نے تمہارے بارے میں کسی کو بتایا بھی نہیں۔“

رحیم داد نے تاکید کی۔ ”بتانا بھی نہیں۔ کوئی پوچھے تب بھی نہ بتانا۔“

شاداں ہاتھ ملا کر بولی۔ ”فکر نہ کر، کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

لالی نے اسے ٹوکا۔ ”جو کام میں نے بتایا ہے، فنانٹ کرنا ہے۔ اب تو جا۔“

اس کے جانے کے بعد دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے، آخر کمرے کا دروازہ بند کر کے فرش پر لیٹے اور سو گئے۔ دن ڈھلے شاداں واپس آئی۔ اس نے آتے ہی لالی اور رحیم داد کو اپنی کار گزاری سنائی۔ قیص کا کپڑا خرید کر اس نے گاؤں کے درزی کو سلنے کے لیے دے دیا تھا اور اس سے دوسرے روز سہ پہر تک قیص تیار لینے کا وعدہ بھی لے لیا۔ جوتوں کے بارے میں اس نے بتایا کہ بدھ کو بازار میں ملیں گے۔ بازار لگنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ دھوتی کے بارے میں اس نے بتایا کہ اسے بھی بازار سے خرید لے گی۔ البتہ وہ گاؤں کی دکان سے ایک عدد بلیڈ خرید لائی تھی۔ لالی اس کی کارگزاری سن کر بہت خوش ہوا۔ جیب سے نوٹ نکال کر بولا۔ ”میں نے پیسے تو تجھے دیئے ہی نہیں تھے۔ بھول گیا تھا۔ بول کتنے دے دوں؟“

وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ ”رہنے دے اپنے روپے۔ رکھ لے، آگے کام آئیں گے۔ میں ملک کی گھر والی سے کچھ روپے لے آئی تھی۔ کام چل جائے گا، فکر نہ کر۔“

شاداں زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہری۔

ابھی اسے گھر کا بہت کام کاج کرنا تھا۔ وہ بڑی جفاکش اور مخنتی عورت تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی۔ کہیں ٹک کر نہ بیٹھتی۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں، کبھی ادھر، کبھی ادھر، کسی لمحے قرار نہ تھا۔ جاتے ہی وہ بھینس کے لیے چارہ کاٹنے بیٹھ گئی۔

بلیڈ ہاتھ آیا تو لالی کو ڈاڑھی کے بال صاف کرنے کی سوجھی۔ رحیم داد کو ایسا شوق نہیں چڑایا۔ ویسے اس کی ڈاڑھی کے بال اتنے بڑھ گئے تھے کہ بلیڈ سے مونڈنا آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے کپڑے دھونے کا صابن اور پانی ملا کر لالی کی ڈاڑھی کے بال کسی نہ کسی طور صاف کر دیئے۔

ڈاڑھی ٹھیک سے نہیں منڈی تھی۔ چہرے پر کئی جگہ بلیڈ کے چرے کے بھی لگ گئے تھے، مگر لالی خوش تھا۔ آئینہ ہاتھ میں لے کر بار بار اپنی صورت دیکھتا تھا۔

شام ہوتے ہی دونوں لالین لے کر کوٹھری میں گھس گئے۔ مٹی خشک ہو کر جم گئی تھی۔ انھوں نے معائنہ کرنے کے بعد لکڑیاں اور دوسرا کاٹھ کباڑ کوٹھری میں بھر دیا۔ دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ شاداں کوٹھری خالی رکھنا چاہتی تھی۔ مگر لالی نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ جو مرضی میں آیا وہی کیا۔

رات کو کھانا کھاتے ہوئے لالی نے شاداں کے سامنے بالے کا پھر ذکر چھیڑ دیا۔ اس مرتبہ بھی اس نے بالے کو اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا۔ شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔

”توں چاہتا کیا ہے؟“

لالی نے اپنے صفاچٹ رخساروں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں توں اسے بھول جا۔ اس سے نفرت کرنے لگے۔“

شاداں جل کر بولی۔ ”اور تیرے ساتھ بھاگ جاؤں؟“ اس نے حقارت سے اپنا منہ بگاڑا۔

”توں سمجھتا کیا ہے ڈاڑھی منڈوا کر تو گھرو بن گیا۔ جا، باہر چاندنی میں پیشاپ کر کے اپنی شکل دیکھ لے۔“

وہ اس کی بات کی تلخی نظر انداز کر گیا۔ ”میرا کہاں، اپنے بال بچوں کے پاس چلی جا۔ بہت یاری آشنائی کر لی۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کیس نہیں جاؤں گی۔“ وہ بیزار سی بولی۔

لالی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گویا ہوا۔ ”تو کیسی ماں ہے، ایک میری ماں تھی۔ میرے بیوے نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔ مجھ سے ملنے راتوں کو چھپ چھپ کر آتی تھی۔ گھر کے راستوں پر دن دن بھر میرا انتظار کرتی تھی۔ کئی بار میرے بیوے نے اسے بالوں سے پکڑ کر مارا پر وہ باز نہ آئی۔ ایک بار اس کے سر پر ایسا گھما کر سوتا مارا، وہیں ڈھیر ہو گئی۔ سانس بھی نہ لی۔ بیوے کو لمبی جیل ہوئی۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔“ لالی آہستہ آہستہ یادوں کے چراغ جلاتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھر کر کہا۔

”مگر وہ ماں تھی۔“

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ تینوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ آنگن میں چاندنی اتر آئی تھی۔ اس کی رنگت کفن کی طرح سفید تھی۔ رات

بڑھال کھڑی تھی۔

تینوں اپنے اپنے دکنوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹک رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شاداں اٹھی اور خاموشی سے بستر پر جا کر سو گئی۔

لالی اور رحیم داد بھی اپنی اپنی جگہ سو گئے۔

نہ جانے رات کتنی گزر چکی تھی۔ اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا، شاداں اس کے سرہانے بیٹھی ہے۔

لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور آنگن کے آخری سرے پر لے گئی۔ اجلی چاندی میں اس کا چہرہ نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں ستارے بھللا رہے تھے۔ وہ گردن کو خم دے کر ایسے زاویے سے کھڑی تھی کہ بھرپور عورت نظر آرہی تھی۔ لالی چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ آہستہ سے بولی۔

”میری ایک گل مان لے گا؟“

”بول کیا کہتی ہے؟“

شاداں نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ شاداں کا ہاتھ گرم بھی تھا اور گداز بھی۔ لالی کو اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

شاداں کھسک کر لالی کے قریب آگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ بے ساختہ لالی سے چٹ جائے گی۔ مگر شاداں نے ایسا نہیں کیا۔ جھکی اور جھک کر پیر سے جوتی نکالی۔ جوتی لالی کے ہاتھ میں دی اور تیکھے لمبے میں گویا ہوئی۔

”مجھے اس سے مار۔“

لالی گھبرا گیا۔ ”کیوں؟“

”پہلے مجھے مار، فیر بتاؤں گی۔“

لالی خفا ہو کر بولا۔ ”صاف صاف بتا۔“

”دھیرے بول۔“

لالی نے آہستہ سے استفسار کیا۔ ”تو چاہتی کیا ہے؟“

وہ تڑپ کر بولی۔ ”ہائے میں مر گئی۔ میں نے ملک سے صاف صاف بتا دیا، تم دونوں میرے گھر میں چھپے ہو۔“ اس نے نظریں جھکا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”دو ہزار کے لالچ نے مجھے اندھا کر دیا۔“

سوچا ایک اور خرید لوں گی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔“ یہ کہتے کہتے وہ بے قرار ہو گئی۔ ”لالی مجھے مار۔ مارتا کیوں نہیں؟ میں تیرے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر وہ اس سے صرف اتنا کہہ سکا۔

”توں نے جو کرنا تھا کر چکی۔ اب مجھے بتا کیوں رہی ہے؟“ اس نے شاداں کو ٹیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”توں نے یہ نہیں سوچا، مجھے اور رجنے کو پکڑا کر تو بھی تو پھنس جائے گی۔ توں نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بھول گئی؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اب آگے کی سوچ۔ ملک اپنی گھوڑی پر تھانے گیا ہے۔“ شاداں نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا اور سسے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”پولیس آتے ہی ہوں گے۔ تم دونوں یہاں سے چلے جاؤ۔ جاتکیرہ سے دور نکل جاؤ۔“

لالی نے خطرہ سر پر منڈلاتا محسوس کیا۔ وہ سخت پریشان ہو گیا۔ لپک کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اسے جھنجھوڑ کر گہری نیند سے بیدار کیا۔ صورت حال سے آگاہ کیا۔

رحیم داد بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں فوراً چلنے پر کمر بستہ ہو گئے۔ شاداں بھی ان کے ساتھ ساتھ چلی۔ لالی کے منع کرنے کے باوجود چلی۔ تینوں گھر سے باہر نکلے۔ شاداں آگے، آگے چل رہی تھی۔ لالی چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جا رہا تھا۔

گاؤں سنسان تھا۔ انھوں نے مشکل سے دو فرلانگ فاصلہ طے کیا ہو گا کہ رات سنائے میں بھاری، بھاری بوٹوں کی آواز ابھری۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ یہ پولیس والوں کے قدموں کی آہٹ ہے۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ تیزی سے آگے بڑھا اور جھپاک سے قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

لالی اور رحیم داد اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتے، پودوں سے الجھتے، گندم اور جو کی فصلوں کے درمیان راستہ بناتے۔ آگے اور آگے بڑھتے گئے۔



دور سے ریل کے انجن کی چنگھاڑ سنائے میں ابھری۔ ساتھ ہی لوہے کی پڑیاں کھٹ کھٹ بجنے لگیں۔ رحیم داد اور لالی سراسیمہ ہو کر ٹھہر گئے۔ پلٹ کر ادھر دیکھنے لگے جدھر سے ریل گاڑی آ رہی تھی۔ اب ریل کی پڑی پر کھڑے رہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ دونوں نشیب میں اترے اور ایک رخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے۔ پڑیوں پر ریل گاڑی دوڑنے کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

ذرا ہی دیر بعد سرمئی دھندلے میں انجن کی تیز روشنی ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ریل گاڑی ان کے سامنے آگئی۔ دونوں چپ چاپ کھڑے اسے گزرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ پہلے انجن دھاڑتا ہوا گزرا، پھر ایک ڈبا، دوسرا ڈبا، تیسرا ڈبا گزرا۔ پھر فرسٹ کلاس کا ڈبا سامنے آیا۔ ایک کھڑکی کھلی۔ دو اتھ ایک سوٹ کیس اٹھائے باہر نکلے۔

سوٹ کیس کھڑکی سے نیچے گرا اور پڑی کے نشیب میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی تیزی سے آگے نکل گئی۔

سب کچھ آنا، فنا ہوا۔ دونوں حیران و پریشان جہاں تھے وہیں کھڑے رہے۔ سوٹ کیس چند گز کے فاصلے پر ان کے سامنے پڑا تھا۔ وہ چند لمحے تک اسے حیرت سے تکتے رہے، پھر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔ یہ سیاہ چمڑے کا سوٹ کیس تھا۔ رحیم داد نے بے صبری سے ٹھک کر اسے اٹھانا چاہا۔

لالی نے روک دیا۔ ”ٹھہر جا رجنے!“

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

لالی نے مثبتہ نظروں سے سوٹ کیس دیکھا۔ ”مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد انچکپاتے ہوئے بولا۔ ”یار! اس کے اندر کیس کئی پھٹی لاش نہ رکھی ہو۔“ رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر لالی کو دیکھا اور سسے ہوئے لمبے میں گویا ہوا۔ ”دیکھنے میں بھی بھاری بھاری لگتا ہے۔“

لالی مخمضے میں پڑ گیا۔ خاموش کھڑا سوٹ کیس کو تکتا رہا۔ چند لمحے دونوں گوگو کے عالم میں کھڑے رہے۔ آخر لالی نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا۔ سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑا، اسے اٹھایا اور آہستہ آہستہ اونچا نیچا کر کے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اندر کیا ہے۔ سوٹ کیس زیادہ بھاری نہیں تھا۔ اس کے وزن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اندر کپڑے اور دو سراسفری سامان بھرا ہے۔ لالی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ”لے یار! بن گیا کام۔“

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

”یہ تو کھولنے ہی پر پتہ چلے گا۔ مجھے تو کپڑے لے لئے معلوم ہوتے ہیں اور بھی کام کی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ فٹ کلاس کے ڈبے سے گرا ہے۔ سامان بھی اس میں فٹ کلاس ہی ہو گا۔ یار! کیسا کٹاک سے آکر گرا جیسے اپنے ہی لیے پھینکا گیا ہو۔“

”یار! اسے کھول کر تو دیکھ“ رحیم داد اپنی بے قراری پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔

”یہاں نہیں آگے چل کے۔ اب یہاں زیادہ دیر ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔“

وہ سوٹ کیس ایک ہاتھ میں لٹکا کر چلنے لگا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ دونوں نشیب سے نکل کر اوپر آگئے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ ریل گاڑی کی پڑی دھند میں لمبی سنسان پڑی تھی۔

دونوں آہستہ آہستہ پڑی کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ مگر وہ ادھر نہیں گئے، جدھر ریل گاڑی گئی تھی بلکہ اس طرف بڑھنے لگے جدھر سے آئی تھی۔ مشکل سے وہ پچاس ساٹھ قدم آگے گئے ہوں گے، ناگاہ درختوں تلے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ انھوں نے گھبرا کر اس طرف دیکھا، ایک شخص اندھیرے سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں دونوں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ اس نے دور سے لاکارا۔

”اوئے چھبڑ! سوٹ کیس رکھ دے۔“

لالی جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ لیکن اس نے سوٹ کیس نہیں چھوڑا۔ اجنبی اور قریب آگیا۔ اس دفعہ وہ زیادہ گرج دار آواز سے بولا۔ ”دیکھتا کیا ہے؟ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔“ وہ جھپٹنے کے انداز میں

تیزی سے لپکا۔ لیکن آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹھک کے حیرت سے چیخا۔

”اوئے لالی! کتے حرام دے۔“

لالی نے فوراً اسے پہچان لیا۔ وہ اشرف تھا۔ کئی سال پہلے وہ اسی کے گروہ میں شامل تھا۔ جیل میں بھی ساتھ رہ چکا تھا۔ اشرف پیار سے گالیاں دیتا ہوا قریب آیا اور لالی کے گلے سے لپٹ گیا۔ نہایت گرجوشی سے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچنے لگا۔ اس نے علیحدہ ہو کر لالی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔

اس کی ملگجی بش شرٹ اور پتلون دیکھی، بڑھی ہوئی حجامت اور گردے اٹے ہوئے بال دیکھے۔ کبیدہ خاطر ہو کر بولا۔

”یار! تو نے یہ اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟“

لالی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”تجھے نہیں معلوم؟“

”مجھے پتہ ہے تو منگمری جیل سے بھاگا ہوا ہے۔ نصیرا تو تیرے ساتھ ہی جیل میں تھا۔ پرسوں چھوٹ کے آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ لالی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اشرف نے اس کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ تیرے ساتھ کا دوسرا مفرور کیدی ہے نا؟ اس کی جیل کی وردی تو بدلوا دی ہوئی۔ یہ صاف تجھے پکڑا دے گا۔“

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”یہ بتا، اتنے سویرے سویرے یہاں کیسے آچکا۔“

”ذیوٹی پر تھا۔“ اشرف نے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسی کے انتظار میں تھا۔“

”کچھ اونچا چکر لگتا ہے۔“ لالی نے آنکھ مار کر پوچھا۔ ”معاملہ کیا ہے؟“

”بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے یہ بتا، تیرا پروگرام کیا ہے؟“

”میرا کیا پروگرام ہے۔“ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”چھپتا لگتا پھرتا ہوں۔ نہ رہنے کا ٹھکانا ہے نہ روٹی نکر کا۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔“

”ایسا کر میرے ساتھ چل۔“ اس نے لالی کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ ”راتے کی پروا نہ کر۔ کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ ادھر اپنی ہی عمل داری ہے۔ لور تک کی میں گارنٹی لیتا ہوں۔“

”ایسا کر۔ سوٹ کیس کھول۔ اپنے مطلب کے کپڑے نکل آئے تو بن گیا کام۔“

اشرف سوٹ کیس کھولنے پر آمادہ نہ ہوا۔ ”یہ سنڈکیٹ کا مال ہے۔ اسے صرف باس کھول سکتا

ہے۔

”باس؟“ لالی نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ باس کیا چیز ہے؟“

”بہت اونچی چیز ہے۔ فٹ کلاس سے نیچے نہیں چلتا۔ کراچی گیا ہے۔“

”سوٹ کیس اسی نے پھینکا تھا؟“

”ہاں۔“ اشرف نے جواب دیا۔ ”میں بھی اسی ٹرین میں تھا۔ فٹ کلاس کے ساتھ والے انٹر کے ڈبے میں تھا۔ پیچھے کا در آباد سٹیشن ہے۔ وہیں اتر گیا تھا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ رہا سامنے آؤٹر گنل۔“

لالی نے سوٹ کیس اس کے حوالے کر دیا۔ ”لے، سنبھال اپنی امانت۔“ اس نے مسکرا کر پوچھا ”کتنا مال پانی ہو گا اس کے اندر؟“

”مخبر نے تو لاکھ روپے سے اوپر کی اطلاع دی تھی۔ مال زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیش کے علاوہ جزاؤں زورات جارہے تھے اس میں۔“ اس نے سوٹ کیس کا ہینڈل پکڑ کر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”اپنا سنڈکیٹ چھوٹا شکار نہیں مارتا۔“

لالی مرعوب ہو کر بولا۔ ”یار! یہ تو بہت اونچا چکر جان پڑتا ہے، پر خطرناک بھی اتنا ہی ہے۔“

”کوئی خطرناک شرتناک نہیں۔“ اشرف نے ہنس کر بتایا۔ ”میں نے سوامینے میں صرف ایک بار نکلے ہیں اور سٹکرا شکار مارتے ہیں۔ اکیلے نہیں کھاتے، مل بانٹ کے کھاتے ہیں۔ اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ بندھا ہے۔ اپنے پر کوئی آسانی سے ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔“ اس نے ایک آنکھ دبا لی۔ ”جی چاہے تو لگ جالین میں۔ بول کیا کہتا ہے۔ چلتا ہے میرے ساتھ؟“

لالی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چلیں گے تو ہم دونوں ہی چلیں گے۔ تو سوٹ کیس کھولنے کو تیار نہیں۔ فیرا پنا ریحے کیسے چلے گا۔“

”اپنی بات کر۔“ اشرف نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”یار! برا نہ مان۔ یہ تو دیکھنے ہی میں یتیم مسکین لگتا ہے۔ اسے خاما خا نکال لایا۔ ایک بار پوری سزا کاٹ لینے دے، فیرفروٹ ہو کر نکلے گا۔ ابھی تو بہت کچا ہے۔“

”شرنے! بہت اونچا نہ اڑ۔ مارا جائے گا۔ یہ تیری جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا کرتا؟“

اشرف نے گردن اونچی کی۔ ”پورا راشن لے کر چلتا ہوں۔“ اس نے پتلون کی جیب سے پستول نکالا اور لالی کے سامنے گھما پھرا کر بولا۔ ”پورا لوڈ ہے۔ کیا سمجھا؟“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”بختی فیصلہ کر، بول کیا کہتا ہے؟ میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔“ اس نے مڑ کر

پیچھے دیکھا۔ ”یوسف والا سٹیشن سے ٹرین آنے ہی والی ہے۔ مجھے اسی سے واپس لوور جانا ہے۔“

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ ”چلا جالالی! میری پروا نہ کر۔“ اس کا لہجہ بجا بجا تھا۔ ”جو نصیب میں لکھا ہے، ہو کے رہے گا۔“

لالی نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ ”چپ کر رہے! کو اس نہ کر۔ یہ میرا اور شرنے کا معاملہ ہے۔ خاما خا اپنی ٹانگ بیچ میں نہ اڑا۔“ اس نے رحیم داد کا بازو پکڑا۔ اسے اپنی طرف کھینچا اور کمر میں ہاتھ ڈال کر بے تکلفی سے بولا۔ ”شرنے! یہ اپنا جگر ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ تو جا، میرا تیرا رستہ الگ ہے۔“

”جیسی تیری مرضی۔ جی تو چاہتا تھا تو ساتھ چلتا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے بٹا نکال کر کچھ نوٹ نکالے اور لالی کی طرف بڑھا کر مخاطب ہوا۔ ”یہ رکھ لے، کام آئیں گے۔ پیارے! ہم تو یاروں کے یار ہیں۔“

لالی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ ”انھیں اپنے ہی پاس رکھ۔ یاری دوستی کی بات کرتا ہے تو اتار دے کمیٹس، پتلون۔ تجھ سے زیادہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔“ اشرف سٹپٹا کر خاموش کھڑا رہا۔ لالی منہ بگاڑ کر بولا۔ ”جاد کچھ لیا تجھے بھی۔ خالی پیلی بوکھیں مارنا جانتا ہے۔ اونہہ!“ اس نے جھنجھلا کر زمین پر تھوک دیا۔

اشرف بھڑک اٹھا۔ ”گالی نہ دے لالی!“ وہ جلدی جلدی اپنی قمیص اتارنے لگا۔ ”تو بھی اتار اپنے کپڑے، بختی نال۔ ٹائم بہت کم ہے۔“

دونوں نے جھٹ پٹ کپڑے اتارے اور ایک دوسرے سے بدل لیے۔ لالی نے اشرف کا جوتا بھی ہتھیا لیا۔ وہ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔ کپڑے البتہ ذرا ڈھیلے تھے۔ مگر لالی کے جسم پر بدنما نہیں لگتے تھے۔

اشرف نے ضد کر کے لالی کی جیب میں پچاس روپے بھی ڈال دیے۔ لالی نے کہا۔ ”یار! ذرا ٹھیر۔ ادھر کا کچھ اٹا پاتا تو بتا۔ اپنے کو تو کچھ نہیں ملوم۔ چاہتا ہوں جلد سے جلد اس ضلع سے باہر نکل جاؤں۔ تو بتا، کیا کروں؟“

”ایسا کر ریلوے لائن کے اس پار نکل جا۔ آگے ملتان روڈ ہے۔ اس سے کچھ ہی دور آگے نہر لوہاری دو آب ہے۔ اسے پار کر لے تو جھل اور بٹے ہیں۔ تیرے لیے بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ دن بھر وہاں رہ۔ رات کو چک ۷۶ کی طرف نکل جا۔ کبھے تھہ کو ہے۔ ادھر سے سدھی سڑک نور شاہ جاتی ہے۔ نور شاہ نہ جانا۔ نور شاہ سے پہلے فیرفروٹ آئے گی۔ اس کے کنارے کنارے چلتا ہوا عالم

شاہ پہنچ جا۔ راوی نزدیک ہی ہے۔ کسی چن پر پہنچ کر بیڑی میں بیٹھ کر دریا کے دوسری طرف پہنچ جا۔ وہاں سے ضلع لائل پور شروع ہو جائے گا۔ میں اس رستے سے دوبار لائل پور جا چکا ہوں۔ لائل پور پہنچ کر جی چاہے تو میرے پاس لہور آ جانا۔ دیکھ ضرور آنا۔“

لالی نے اشرف کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور پیشانی چوم کر محبت سے رخصت کیا۔

اشرف سوٹ کیس اٹھا کے آگے بڑھ گیا۔ وہ لالی کی میلی کپیلی بش شرٹ، تنگ اور اننگی پتلون اور بڑے بڑے جوتوں میں بھدا اور بے ڈول لگدبا تھا۔ لالی اسے جاتے ہوئے دور تک دیکھتا رہا۔ مگر اشرف نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا قادر آباد اسٹیشن کی جانب بڑھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دونوں بیڑی عبور کر کے اس پار چلے گئے۔ کچھ ہی دور گئے تھے کہ سڑک آگئی۔ یہ ملتان روڈ تھی اور اس وقت بالکل ویران تھی۔ وہ سڑک کے دوسری جانب چلے گئے۔ نہر بھی زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔

دونوں نہر پر پہنچے۔ کچھ دور اس کے کنارے کنارے چلے۔ پل آگیا۔ پل سے گزر کر وہ نہر کے اس پار پہنچ گئے۔

اشرف نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہر کے کنارے کھجور کے چند درخت تھے۔ ان کے عقب میں جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا جھنگر تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ جھنگر ختم ہوا تو اونچے نیچے نیلوں اور ٹپوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ ایک ٹیلے پر چڑھنے لگے۔ اوپر پہنچے تو فراش کے اونچے اونچے درخت دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دوسرے جنگلی درخت تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ ٹیلے کی بلندی سے انھوں نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی۔ صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں جھنگر کے اس پار نہر لوہڑ باری دو آب چاندی کے تار کی طرح جھللا رہی تھی۔

وہ ڈھلانوں سے اترتے، چڑھائیوں پر چڑھتے اور آگے چلے گئے۔ اب وہ بہت تھک چکے تھے۔ انھیں کسی محفوظ ٹھکانے کی تلاش تھی۔ دونوں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر انھیں جھاڑیوں کا جھنڈ نظر آیا۔ قریب ہی کھڑوں کی مانند جھگے ہوئے دو پتھریلے ٹیلوں کے درمیان ایسا خلا تھا جس کے اوپر نیلوں کی چوئیاں ملنے سے محراب بن گئی تھی۔ یہاں وہ روپوش ہو سکتے تھے۔ دھوپ سے بچ کر دن میں سو بھی سکتے تھے۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی تھی اور انھیں اس وقت ویرانی ہی کی ضرورت تھی۔

دونوں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے ڈھلان سے نیچے اترے اور محراب کے سامنے جا کر

نہر گئے۔ محراب ان کے قد سے اونچی تھی۔ اندر کی زمین خاصی ہموار تھی۔ اس میں سخت مٹی کی تہہ اور پتھر تھے۔ مگر صاف ستھری تھی۔

محراب سے ذرا ہٹ کر فراش کا ایک درخت سراٹھائے کھڑا تھا۔ محراب کے دوسری طرف کا حصہ بھی تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ اس کے عین نیچے گہرا کھڈ تھا۔ کھڈ میں ریتی مٹی کے اونچے اونچے تودے تھے۔

رحیم داد زیادہ کھڑا نہ رہ سکا۔ محراب کے نیچے چلا گیا اور نڈھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ لالی بھی اس کے برابر لیٹ گیا۔ دونوں دیر تک خاموش پڑے رہے۔ باہر درختوں اور نیلوں پر زرد زرد دھوپ پھیلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد زمین پر چٹ لیٹا تھا۔ اس نے کوٹ بدلی۔ لمحے بھر لالی کے چہرے کو تکتا رہا، پھر گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ شاداں خطرناک زنانی ہے۔“

”ہے تو۔“ لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”پر اس میں ایک بات ہے جو ہر زنانی میں نہیں ہوتی۔“

رحیم داد حیرت سے بولا۔ ”وہ کیا؟“

”شاداں کھرا روپیہ ہے، بجائے تو ٹن سے بولے۔“

رحیم داد نے احتجاج کیا۔ ”کیا بات کر رہا ہے لالی؟ بال بال بچ گئے۔ ورنہ اس نے تو مروا دیا تھا دونوں کو۔“

”دو ہزار بہت بھاری رقم ہوتی ہے رحیم!“ وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کورکا۔ ”میری تو سگی موسیٰ نے صرف دو سو روپے کے لیے مجھے آگ میں جھونک دیا تھا۔“

”چوری کی ہوگی۔“

”نہیں۔“ لالی اسی طرح چٹ لیٹا اوپر دیکھتا رہا اور آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”میں نے اس کے دو سو کے نوٹ دیوے سے جلا کر روشنی کی تھی۔ ان دنوں میں بہت چھوٹا ہوتا تھا۔ شبرات پر ماں کے ساتھ موسیٰ کے گھر گیا تھا۔“

رحیم داد نے دیکھے لمحے میں کہا۔ ”بہت ظالم تھی۔“

”یہ بات بھی نہیں۔“ لالی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھ کر ہولے ہولے ہلانے لگا۔ ”میرا موسا درزی تھا۔ سلائی کی مشین بیچ کر اپنی بیٹی کے دیہ کے لیے دو سو روپے لایا تھا۔ موسیٰ اس کی

دوسری گھروالی تھی۔ پہلی مرگئی تھی اور اسی کی بیٹی کا ویاہ تھا۔ میں نے موسا کے دو سو روپے جلا ڈالے تو وہ گسے سے پاگل ہو گیا۔ جتنا دیا اٹھا کر موسی کے منہ پر مارا۔ اس کی ایک آنکھ جل گئی۔ اس نے اپنا منہ مجھ پر اتارا۔ مجھے دھکا دے کر جلتے لالاؤ میں پھینک دیا۔ ماں نہ ہوتی تو جل کر مر جاتا۔ ٹھیک ہی ہوتا۔ لالی کی آوازیں درد کی چیخیں تھیں۔

رحیم داد خاموش رہا۔ لالی بھی نہ بولا۔

دونوں یادوں کی دھوپ چھاؤں میں ڈولتے رہے۔ آخر ان کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گری نیند سو گئے۔ دھوپ ٹیلوں کی بلندی سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیری گھائیاں روشن ہو گئی تھیں۔ دن کا ایک پیر گزر گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج کا لالاؤ سرد پڑ گیا۔ دونوں بے خبر سوتے رہے۔



ہلکا ہلکا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد ابھی تک بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے اسے بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ سخت بھوک لگی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو سوتا چھوڑ کر باہر نکلا اور کچھ دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ پھر ایک طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کے وہ آہستہ آہستہ نشیب میں اترنے لگا۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلما رہی تھیں۔ نیچے گھاٹی میں نیل گوں دھند لکا پھیل رہا تھا۔ لالی آگے بڑھا تو سرس کے درختوں کا جھنڈ نظر آیا۔ ان میں پیلے پیلے پھولوں کے گچھے جھول رہے تھے۔ ان کی مکھ ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ فضا میں پہلی رات کی دھن کی سی چھب تھی اور لالی کو شدید بھوک لگی تھی۔

وہ ٹیلوں اور بوں کے دامن میں اونچے اونچے ناہموار راستوں پر چلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ یکایک تیزو کا بھکا آیا۔ لالی ٹھہر گیا۔ اس نے ایک نیلے کی بلندی سے دیکھا کہ کچھ فاصلے پر ایک مردار خچر پڑا ہے۔ دو گدھ اس کا گوشت نوج نوج کر کھا رہے ہیں۔ اوپر نیلے پر پانچ جیسے گدھ قطار میں بیٹھے تھے اور اڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

مردہ خچر کے جسم سے اٹھتی ہوئی تیزو کے باوجود لالی وہیں کھڑا رہا اور گردن اونچی کر کے متحس نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

دور فراش کے درختوں کے پیچھے سے دھواں اٹھ رہا تھا جو شام کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ قریب ہی کوئی آبادی ہے۔ وہ اسی طرف چل دیا۔ نزدیک جا کر دیکھا، ٹیلوں کے دامن میں بے بسی کی طرح کا اونچا اور ابھرا ہوا میدان ہے۔

میدان میں جگہ جگہ اونٹ کے سیاہ بالوں کے بنے ہوئے مندے کے خیمے لگے ہیں۔ ان خیموں کو خانہ بدوش پاندے گھرے کہتے ہیں۔ خیمے پھٹے پرانے تھے اور بے ترتیبی سے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔

خیموں کے آس پاس اونٹ اور خچر بندھے تھے، بھینٹوں کے ریوڑ بھی تھے۔ خیموں کے باہر آگ روشن تھی۔ لالی نے دور ہی سے بھانپ لیا کہ وہاں پاندوں نے پڑاؤ ڈالا ہے۔

وہ میدان میں پہنچنے کے لیے مڑا۔ جھٹ پٹے میں اس نے دیکھا، دو خانہ بدوش لڑکیاں آپس میں کھٹکھٹ گھسیٹ رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے بال نوج رہی ہیں۔ زور زور سے چیخ رہی ہیں۔ ان کے قریب ہی زمین پر سوکھی شاخوں کے گٹھے رکھے تھے۔ سامنے مٹی کے تودے پر ایک نوجوان پاندہ بیٹھا نہایت سکون سے لڑکیوں کو ایک دوسرے کے جھونٹے کھسوتے دیکھ رہا تھا۔ لالی کی چاپ بن کر نوجوان نے پلٹ کر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ذرا دیر ہکا بکا بیٹھا رہا۔ پھر ایک دم اٹھ کر خیموں کی سمت بھاگا۔

لڑکیاں بھی دھیمکا مشتی چھوڑ کر لالی کو حیرت سے تکتے لگیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور گندے تھے۔ بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں تھیں جو جھونٹے کھسوتے سے بکھر کر منہ پر آگئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ رخسار تازہ سیب کی طرح گلابی تھے۔ وہ خچریلوں پر اگنے والے جنگلی پھولوں کی مانند تھیں جن میں رنگ ہی رنگ ہوتا ہے، خوشبو اور مکھ نہیں ہوتی۔ توڑو تو ہاتھ میں کانٹے چھب جائیں۔

ایک خانہ بدوش لڑکی بڑھ کر لالی کی قریب آئی۔ اس کے پہلو سے لگ کے اس طرح کھڑی ہو گئی کہ اس کے بدن کی تیز بو لالی کی سانس میں گھل مل گئی۔ لڑکی نے سر جھکا کر اپنے بکھرے ہوئے بال دکھائے اور دوسری لڑکی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”اس نے مجھے مارا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سٹ کر لالی کے اس قدر قریب آگئی کہ اس کی بھری بھری چھاتیاں لالی کے بازو میں پیوست ہو گئیں۔ لالی نے جھرجھری لی اور بے رخی سے اسے زور سے دھکا دیا۔ ”پرے ہٹ کر بات کر۔“ لڑکی کے بھورے بھورے بال اور بکھر گئے۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچی۔ اس نے لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔

دوسری نے زور کا تقہ لگایا اور لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”ڈیرے جانا ہے؟“

”ہاں جی۔“ لالی نے مختصر جواب دیا۔

مزد کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ خانہ بدوش لڑکیوں نے قریب پڑے ہوئے لکڑیوں کے گٹھے اٹھا کر

سے آکر اکٹھا ہوتے ہیں۔ یہ ان کا آخری پڑاؤ ہوتا ہے۔ گرمی بڑھنے سے پہلے پہلے وہ درہ گول کے راستے جہاں سے آتے ہیں وہیں لوٹ جاتے ہیں۔

پاوندوں میں جرائم پیشہ بھی ہوتے ہیں جو ڈاکہ زنی اور مویشیوں کی چوری کرتے ہیں یا چرس اور افیون کا ناجائز دھندا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پولیس ان کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کرتی ہے۔ وہ جہاں بچتے ہیں، وہاں کے تھانے میں اپنی آمد کی باقاعدہ اطلاع دیتے ہیں۔

بوڑھے کی جانب سے خواہ مخواہ صفائی پیش کرنے پر لالی نے جلد ہی بھانپ لیا کہ پاوندے اس کی پتلون اور اجلی قمیص سے سخت مرعوب ہو گئے ہیں۔ اسے پولیس یا سی آئی ڈی کا افسر سمجھ رہے ہیں۔

لالی ان کی غلط فہمی سے فائدہ اٹھا کر ہراساں کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس ویرانے میں اپنی آمد کا بھی اسے کوئی نہ کوئی عذر پیش کرنا تھا۔ لہذا اس نے یہ ظاہر کیا کہ محکمہ جنگلات کے سرکاری کام کے سلسلے میں ادھر آیا ہے۔ لیکن اس کے عملے کے دوسرے لوگ ابھی پہنچ نہیں سکے۔ اس کے بعد اس نے سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ انھیں بتایا کہ وہ سخت بھوکا ہے اور بھوک ہی سے بے قرار ہو کر اس طرف آیا ہے۔

وہ ان کے ہم راہ ایک خیمے کے اندر گیا، ان کا مہمان بنا۔ کنورا بھر بھیڑ کا دودھ پیا۔ شد اور پیر کھایا۔ قوے کا گرم گرم پیالہ پیا۔ مکئی کی ڈھیری روٹیاں لیں۔ شد اور پیر لیا۔ مشکیزے میں پانی لیا۔ ہاتھ کا بنا ہوا کبل اور ایک نمدا لیا۔ بھیڑ کی چربی سے جلنے والا چراغ لیا اور ایک تیز دھار چھری بھی لی۔

تیس روپے میں یہ سودا کسی طور برانہ تھا۔ پاوندوں نے اسے چرس بھری سگریٹ بھی پلائی۔ چرس پر دم لگا کے لالی کے جسم میں سرخوشی اور جولانی آگئی۔ خانہ بدوش اس کے ہاتھ چرس بھی فروخت کرنا چاہتے تھے مگر لالی اس چکر میں نہیں پڑا۔ وہ زیادہ دیر وہاں ٹھہرا بھی نہیں۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ راستہ نامہوار اور پیچیدہ تھا اور چڑھائی بھی چڑھنا تھی۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ رحیم داد اس کی اچانک غیر حاضری سے سخت پریشان ہوگا۔

دوپاوندے دور تک اس کے ہم راہ آئے۔ وہ اور بھی آگے تک اس کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے مگر لالی نے ایک موڑ پر انھیں رخصت کر دیا۔ وہ انھیں نہ تو اپنا ٹھکانہ دکھانا چاہتا تھا نہ اپنے بارے میں کسی قسم کی اطلاع بہم پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے کہ پولیس والے برابر ان سے پوچھ گچھ

سروں پر رکھے اور ہرنیوں کی طرح چوڑیاں بھرتی آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔ لالی آہستہ آہستہ ڈیرے کے جانب چلا۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک بوڑھا پاوندہ، دو جوانوں کے ہم راہ خیموں کے پیچھے سے نکلا اور لالی کی طرف بڑھنے لگا۔ قریب آکر تینوں پاوندوں نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔

بوڑھا پاوندہ اکھروں سے لہجے میں بتانے لگا کہ پڑاؤ رات ہی کو ختم ہو جائے گا اور صبح تڑکے قافلہ کوچ کرے گا۔ وہ مظفر گڑھ کے راستے ڈیرہ غازی خان جارہے ہیں۔ بوڑھا پوچھے بغیر لالی کے سامنے صفائی پیش کر رہا تھا۔ اسے یقین دلایا تھا کہ قافلے کا تعلق کسی جرائم پیشہ گروہ سے نہیں ہے۔



لالی کئی برس پہلے چند روز کے لیے پاوندوں کے ڈیرے میں قیام کر چکا تھا۔ چنانچہ عادات و اطوار اور ان کے طرز زندگی سے کسی حد تک واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ پاوندے ان خانہ بدوش قبائل میں سے ہیں جو موسم سرما شروع ہوتے ہی افغانستان کے کوہستانی دروں سے نکل کر پنجاب اور سندھ کے میدانی علاقوں میں پھیل جاتے ہیں۔ اینٹوں کے بھٹوں پر تعمیرات کا کام کرتے ہیں۔ دیہات کے کچے مکانات کے لیے، مٹی کی دیواریں کھڑی کرتے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ کبل اور مندے، بھیڑ اور لومڑی کی کھالیں، قراقلی ٹوپیاں، جڑی بوٹیاں، خشک میوے، پینگ اور مشک، گھوڑے، ایرانی بلیاں اور گرے ہاؤنڈ شکاری کتے فروخت کرتے ہیں۔ ان کی عورتیں سخت جفاکش، سختی اور منہ زور ہوتی ہیں۔ اس قدر آزاد اور بے باک ہوتی ہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بھی ذرا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔ پاوندے عورتوں اور بچوں کے ساتھ اونٹنوں اور خچروں پر سوار ہو کر، خیمے اور سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔

سفر کے دوران مرد اور عورتیں مل کر کوہستانی نغے لایے ہیں۔ نعموں کے ساتھ ساتھ اونٹنوں کے گلے میں بندھی ہوئی پیتل کی گھینٹیاں بجاتی ہیں جو نغمے کی لے کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ساز کا کام دیتی ہیں۔ قافلے کی حفاظت کے لیے پاوندے اپنے ہم راہ روسی نسل کے کتے رکھتے ہیں۔ یہ کتے برف کی طرح سفید اور کو تاہ قامت ہوتے ہیں۔

درختوں میں بت بھر گلتے ہی پاوندوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ وہ دریائے سندھ عبور کر کے پہلے ڈیرہ اسماعیل خان پہنچتے ہیں جہاں دور دراز کے علاقوں میں بکھرے ہوئے قافلے مختلف ستوں

کرتے رہتے ہیں۔

لالی ایک ٹیلے کی آڑ میں کھڑا انھیں دور تک واپس جاتے دیکھتا رہا۔ دونوں نظروں سے ادجھل ہو گئے تو وہ آگے بڑھا۔ اس نے ناہموار چڑھائی عبور کی اور سامان سے لدا پھندا محراب کے قریب پہنچ گیا۔



رحیم داد آہٹ سن کر گھبرا ہوا یا ہر آیا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ دیوار سے نیک لگا کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ رحیم داد اندھیرے میں ایک ایک چیز ٹٹول کر دیکھنے لگا۔ جب اس نے کمبل کی تہہ کھولی اور اندر سے تازہ تازہ روٹیوں کی سوندھی سوندھی مکھن نکلی تو وہ بچوں کی طرح چپک کر بولا۔

”اوہو، ہو یا راکمال کر دیا۔ روٹیوں کا تہا تو بالکل گرم گرم ہے۔“

”شمد اور پیر بھی ہے۔“ لالی نے اسے مطلع کیا۔ جیب سے ماچس نکالی، جھک کر چراغ اٹھایا اور اسے روشن کر دیا۔ ہوا تیز تھی، چراغ کی لو بار بار بھڑکتی۔ لالی نے ادھر ادھر سے پتھر اکٹھا کر کے چراغ ان کی اوٹ میں رکھ دیا۔ اس طرح وہ ہوا سے محفوظ ہو گیا۔ روشنی بھی باہر جانے کے بجائے محدود ہو کر رہ گئی۔

رحیم داد نے زمین پر نمدا بچھا دیا۔ دونوں اس پر بیٹھ گئے۔ لالی پادندوں کے ڈیرے کا حال بتانے لگا۔ رحیم داد نے روٹیاں نکال کر باہر رکھیں۔ آٹھ روٹیاں تھیں۔ موٹی موٹی اور خوب بڑی بڑی۔

”یہ ۸ دن کا راشن ہے۔“ لالی نے پادندوں سے خریدی ہوئی چھری نکالی اور ہر روٹی کے چار چار ٹکڑے کر دیئے۔

”روٹیاں تو چل جائیں گی۔ پر پانی کم ہے۔“

”ہو کی تو اپنے پاس ہے اور نہر بھی زیادہ دور نہیں۔ پانی نہر سے آجائے گا۔“ لالی نے مسکرا کر منگیزے کی جانب اشارہ کیا۔ ”پر ۸ دن تک یہاں کون پڑا رہے گا؟ تب تک ہم بہت آگے نکل جائیں گے۔“

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”برا بمانا۔ تیرا معاملہ تو ایک دم فسط کلاس بن گیا۔“ اس نے اپنا میلا پچھلا لباس دیکھا۔ ”یہ جیل کی وردی نہ جانے اپنے بدن سے کب اترے گی اور جب تک یہ نہیں اترے گی، میرے لیے تو خطرہ ہی خطرہ ہے۔“

”پردانہ کر۔ جلد ہی تیرے لیے بھی کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ مجھے ہر دم اسی کی فکر رہتی ہے۔“

خطرہ صرف تیرے لیے نہیں، میرے لیے بھی تو ہے۔ یہ تو سوچ تو اور میں کیا الگ الگ ہیں۔؟“ اس نے رحیم داد کو ٹھوکا دیا۔

”دیکھ کیا رہا ہے؟ شروع ہو جا۔“

رحیم داد فوراً شروع ہو گیا۔ اس نے روٹی کا ایک ٹکڑا اٹھایا۔ اس پر تھوڑا سا شمد ڈالا، پیر کا ٹکڑا رکھا۔ پھر روٹی گول گول لپیٹ کر دانتوں سے چباتے ہوئے بولا۔

”تو نہیں کھائے گا؟“

”نہیں۔“ لالی نے انکار کر دیا۔ ”مجھے دو گھونٹ پانی پلا دے۔ میں نوں جانا ہے۔“ وہ لمبے بھر کو رکا۔ ”چرس پر دم لگا کر بھڑکی لگ جاتی ہے۔“

رحیم داد نے منگیزہ لالی کی طرف بڑھا دیا۔ ”یار! تو نے تو پادندوں کے ڈیرے پر زبردست عیش کئے۔“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منگیزہ منہ سے لگا کر پانی کے کئی گھونٹ پئے۔ منگیزہ ایک طرف رکھا، ہاتھ سے منہ پونچھا اور کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے جلدی سے پوچھا۔ ”اکیلایا جائے گا؟“

لالی نے رمان سے کہا۔ ”ہاں۔“

”شاداں کے پاس تو نہیں جا رہا؟“

”جاتا تو ہیں رہا ہوں۔“ لالی نے اقرار کیا۔

رحیم داد آنکھ مار کر بولا۔ ”ایسا جان پڑتا ہے، شاداں پر تیرا دل آگیا۔“

”چھوٹا یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”اپنے پاس دل ہے کہاں؟ دل تو دل والوں کے پاس ہوتا ہے۔“

”تو چاہے کچھ کہے۔ تیری ایل دیکھ کر تو مجھے ایسا ہی لگتا ہے، تو....“

لالی اس کی بات کاٹ کر بیڑاری سے بولا۔ ”نھرک بازی چھوڑ۔ کام کی بات سن۔“ اس نے چھری پتلون میں اڑس لی اور اپنا چاقو نکال کر رحیم داد کو دیا۔ ”اسے رکھ لے۔ میں کل رات کو لوٹوں گا۔ واپسی پر دیر ہو جائے تو فکر نہ کرنا۔“

”ابھی اندھیرا ہے۔ چاند نکل آئے تب جانا۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھا اور قریب کے ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ بلندی پر جا کر اس نے دیکھا، ہر طرف ہولناک تاریکی چھائی ہے۔ دور دور تک کچھ نظر نہیں آتا۔ اس نے جھک کر محراب کے نیچے نظر ڈالی۔

رہا۔ ”گل اسد ہے رتھے! میں نے خود ہی شاداں کے پنڈ جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”کیوں؟“

”میں نے چلتے چلتے سوچا، وہاں تو ابھی پولیس لگی ہوگی۔ تفتیش کرتی ہوگی۔“

”یہ تو تمہیں نوں پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا۔ میں تو کتنا ہوں شاداں نے ہمارے بارے میں پولیس کو سب کچھ بتا دیا ہوگا۔“

”بتانا تو نہیں چاہئے۔ اس نے بالے کا خون جو کیا ہے۔ یہ بت ہم دونوں جانتے ہیں۔ دیے ہمارے بارے میں وہ اتنا ہی جانتی ہے جتنا پولیس کو پتہ ہے۔“

”ایسا ہے تو اس نے ملک کو کیوں ہمارے بارے میں بتایا؟“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”بتا اس نے ایسا کیوں کیا؟“

”وہ تو اس نے دو ہزار انعام کے لالچ میں کیا۔ پر اسے جلد ہی اپنی غلطی کا پتہ چل گیا تھا۔ یا راہو اتنی بری نہیں جتنی تو سمجھتا ہے۔“

”سوچ لے۔ دیے میں تو یہی کہوں گا، تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔“

”میں تو تیرے لیے کپڑے لینے اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“ لالی اسے سمجھانے لگا۔ ”یہ تو تمہیں نوں بھی پتہ ہے جب تک تیرے بدن پر جیل کی وردی ہے، ہم کہیں جا بھی تو نہیں سکتے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ہم دونوں فٹ میاں سے لاکل پور کی طرف نکل جائیں۔“

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔

باہر چاندنی چمٹکی تھی۔ رات کھرتی جا رہی تھی۔ خنکی بھی بڑھ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد رحیم داد جمایاں لیتا ہوا بولا۔

”مجھے تو جھوک آرہی ہے۔ میں تو اب سوتا ہوں۔“

یہ کہتا ہوا وہ منہ پر لیٹ گیا۔ مگر لالی نہ لیٹا۔ اس نے پھونک مار کر چراغ بجھایا۔ باہر نکل کر کچھ دیر چاندنی میں ادھر ادھر ٹھکتا رہا۔ واپس آکر وہ بھی لیٹ گیا۔ رحیم داد پہلے ہی سوچکا تھا۔ لالی ذرا دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی بھی آنکھ لگ گئی۔

صبح اٹھ کر دونوں نے شد کے ساتھ روٹی کا ایک ایک کٹوا کھایا، پانی پیا۔ محراب کے نیچے بیٹھے رہے یا اس کے قریب ہی منزلتے رہے۔ مگر دور نہیں گئے۔ شام کو انھوں نے پھر روٹی کا ایک ایک کٹوا کھایا۔ تھوڑا تھوڑا پیڑ بھی کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر انھوں نے فوراً چراغ بجھا دیا۔ اندر سے میں بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چاند طلوع ہوا تو دونوں باہر نکلے اور کچھ دور جا

رحیم داد چراغ کی دھندلی روشنی میں بیٹھا روٹیوں کے ٹکڑے گن رہا تھا۔ لالی زیادہ دیر ٹیلے پر نہ ٹھہرا۔ آہستہ آہستہ دوسری طرف اتر گیا۔ وہ چڑھائیوں پر چڑھتا، ڈھلانوں سے اترتا، تاہوار راستوں سے گزرتا ہوا نیلیوں کے نیچے گھٹے جھنگر میں پہنچ گیا۔ جھنگر غبور کر کے وہ نہر کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ شاداں کے پاس جانا چاہتا تھا اور اس سے رحیم داد کے لیے کپڑے لانا چاہتا تھا۔ کپڑے مل جاتے تو وہ رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا سکتا تھا اور اس کے ہم راہ شرفے کے بتائے ہوئے راستے سے لاکل پور کی طرف نکل جاتا۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ چلتے چلتے اچانک اسے خیال آیا کہ آج شاداں کے گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں۔ کل ہی رات پولیس سے اس کی مذہبڑ ہوئی ہے۔ اب پولیس نہ صرف شاداں سے پوچھ گچھ کرتی ہوگی بلکہ اس کے گھر کی گرائی بھی کرتی ہوگی۔ گاؤں کے اندر اور باہر جگہ جگہ ناکوں پر پولیس تعینات ہوگی۔

یہ سوچتے سوچتے اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ نہر اب زیادہ دور نہ تھی۔ مگر لالی نے آگے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ واپس مڑا اور اپنے ٹھکانے کی جانب روانہ ہوا۔ جب وہ جھنگر سے گزر کر نیلیوں پر چڑھ رہا تھا تو رات خاصی گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہری ویرانی چھائی تھی۔

وہ کچھ ہی دور چلا تھا کہ روشنی پھیلنے لگی۔ دور فراش کے اونچے اونچے درختوں کے پیچھے سے چاند ابھر رہا تھا۔ گول گول سونے کے بڑے سے تھال کی طرح چمکتا دکھتا چاند ویرانے میں اس قدر خوبصورت نظر آ رہا تھا کہ لالی ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ چاند ابھر کر اوپر آیا تو اندھیرے راستے روشن ہو گئے۔

اجلی اجلی چاندنی میں چلتا ہوا لالی کچھ ہی دیر بعد محراب کے قریب پہنچ گیا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا۔ پتھر لے راستوں پر آہٹ سن کر وہ گھبرایا ہوا جھٹ نکل کر باہر آگیا۔ لالی کو اس نے کھڑی کھڑی چاندنی میں دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”یار، تو واپس کیوں آگیا؟“

”اندر چل کر آرام سے گل بات کریں گے۔“

دونوں محراب کے نیچے پہنچ گئے۔ لالی دور سے چل کر آیا تھا۔ منہ پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ مگر رحیم داد سخت بے چین تھا۔ خاموش نہ رہ سکا۔ ”یہ تو بتا دے، رستے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی۔“

”ذرا دم لے، سب کچھ بتا دوں گا۔ ویسے پریشانی کی کوئی گل نہیں۔“ لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا

کر ایک ٹیلے پر چڑھ گئے۔ بلندی سے انھوں نے گھوم پھر کر ہر طرف نظر دوڑائی۔ اجلی اجلی چاندنی ہر طرف چھٹکی ہوئی تھی۔ مگر سنا بہت گہرا تھا۔ وہ بہت دیر بعد واپس آئے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔

دوسرا دن بھی اسی طرح گزرا۔ تیسرا دن بھی گزر گیا۔ مگر جوتھے روز پانی ختم ہو گیا۔ البتہ روٹیاں ابھی موجود تھیں۔ شمد اور پنیر بھی تھا۔ دن بھر وہ پیاسے رہے۔ شام ہوئی اور اندھیرا پھیلنا تو لالی نے مشکیرہ اٹھایا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ لیا۔

دونوں ٹیلوں سے اتر کر جھنگر میں پہنچے۔ اسے عبور کیا اور نہر پر پہنچ گئے۔ اب رات کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ لالی نے نہر سے مشکیرہ میں پانی بھرا اور مشکیرہ رحیم داد کے حوالے کر کے بولا۔

”میں اب شاداں کے پنڈو جمائے جاؤں گا۔ کوشش کروں گا سورج نکلنے سے پہلے واپس آجاؤں۔ آج نہ آسکا تو کل آجاؤں گا۔ مان لے، مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔ میں آؤں گا ضرور۔ میرا انتظار کرنا۔ تیرے پاس ابھی چار روٹیاں رہتی ہیں۔ شمد اور پنیر بھی ہے۔ یہ کئی دن کا راشن ہے۔ روٹیاں سوکھ جائیں تو پانی میں بھگو کر کھا لیتا۔ صبح شام روٹیوں کا ایک ایک چپا کھاتا۔ پانی مک جائے تو رات کے اندھیرے میں نہر سے لے آتا۔ پردن میں ہرگز اپنے ٹھکانے سے باہر نہ نکلتا۔“

رحیم داد اس کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر کہا۔ ”یار! جھیتی ٹال آجانا اور میرے لیے کپڑے ضرور لانا۔ دیے مجھے ساتھ لے چلتا تو ٹھیک رہتا۔ مجھے ادھر کے رستوں کا کچھ تو آتا ہوتا ہے۔ میں نوں تو کچھ بھی پتہ نہیں، توں تو بچپن سے لہور میں رہا۔“

”پردانہ کر۔ مجھے رستے کا سب پتہ ہے۔ میں جھیتی آؤں گا اور تیرے لیے کپڑے ضرور لاؤں گا۔“ لالی محبت سے اس کی پیٹھ تھپک کر بولا۔ ”اب تو ٹر جا۔“

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا مشکیرہ لٹکائے جھنگر کی طرف چل دیا۔

لالی خاموش کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا پل پر پہنچا۔ اسے عبور کیا اور نہر کی دوسری جانب چلا گیا۔ وہ آگے بڑھا تو سڑک آگئی اس نے دور ہی سے دیکھا، ایک لاری تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اس کے جانے کے بعد گہرا سناٹا چھا گیا۔

لالی سڑک سے گزر کر ریل کی پٹری کی جانب بڑھا۔ ریل کی پٹری کے آس پاس سناٹا اور زیادہ گہرا

قا۔ ہر طرف دیرانی تھی۔

وہ ریل کی پٹری کے کنارے کنارے کچھ دور تک چلتا رہا، پھر نشیب میں اتر کر جنگلی جھاڑیوں کے درمیان راستہ بناتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔



رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ لالی سنان راستوں سے گزرتا، ہر آہٹ پر چونکتا، ایک ر پھر شاداں کے گھر کی دیوار کے نیچے کھڑا تھا۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر دیوار پر چڑھا اور آہستہ سے آنگن میں اتر گیا۔ اس نے چونکنا نظروں سے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور والان کی جانب بے دے قدموں بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ شاداں والان کے ایک کونے میں فرش پر لیٹی ہے۔ وہ باگ رہی تھی۔ اس نے اجلی چاندنی میں لالی کا سایہ دیکھا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ لالی اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔

شاداں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ لالی نے کچھ کہنا چاہا تو شاداں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا اور لالی کا ہاتھ پکڑ کر آنگن میں آگئی۔

وہ اسے پوچھتی میں لے گئی۔ آہستہ سے پوچھا۔ ”توں آیا کیسے؟“

”دیوار بھانڈ کر۔“ لالی بے نیازی سے بولا۔

”مسکری نہ کر۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔“

”پہلے یہ بتا، کمرے میں کون ہے؟“

”ہے کوئی، کیا کرے گا جان کر۔“ شاداں نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے آنکھ مار کر بے تکلفی سے کہا۔ ”کوئی نیا یا ر پھانس لیا؟“

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میں کوئی ہمال ہوں؟ مجھے سمجھتا کیا ہے کبوتر۔“ یہ کہہ کر اس نے غصے سے زمین پر ٹھوک دیا۔

لالی نے اس کی برہمی پر ذرا بھی برا نہ مانا۔ ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ ”ایسا نہیں ہے تو فیرو چپا کیوں رہی ہے؟ صاف صاف بتا کمرے میں کون ہے؟“ اس نے لمحے بھر رک کر پوچھا۔

”تیرا قصہ تو نہیں آگیا؟“

”نہیں۔“ شاداں کے لمحے میں ٹھہراؤ آگیا تھا۔ ”وہ یہاں کیسے آسکتا ہے۔“

”کیوں نہیں آسکتا؟ تو اس کی گھروالی جو ہے۔ چھوٹ تو نہیں گئی۔ اس نے تجھے طلاق تو نہیں

دی۔

”دے بھی نہیں سکتا۔“ شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”جب بالے کے ساتھ میرے جانے کا اسے پتہ چلا تو اس نے نہ پرچہ چاک کرایا نہ تھانے گیا۔ سب نے بہت کہا تب بھی نہ گیا۔ وہ اور ہی طرح کا بندہ ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ ذرا سا شرابی اور ڈوپٹے کا پلو سر پر ڈال لیا۔ ”اب بھی جان دیتا ہے مجھ پر۔“

لالی نے نظر بھر کر شاداں کو دیکھا۔ وہ پڑھتی کے کنارے پر اس طرح کھڑی تھی کہ ہلکی ہلکی چاندنی کی پھوار میں اس کا چہرہ اچلے پھیلنے کی طرح دمک رہا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔

لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”تجھ پر جان دینے والے اور تیرے لیے ترپنے والے تو اور بھی بہت ہیں۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔“ اس نے شاداں کی دیکتی ہوئی پیشانی اور آنکھیں بھرپور نظروں سے دیکھیں۔

”تو تو ابھی تک متسلی مٹا رہی تھی۔“

”دے مخول نہ کر۔“ وہ شرما گئی۔ پھر تجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اب کیا رہ گیا مجھ میں، جل کر راکھ ہو گئی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”بالے مجھے برباد کر گیا۔“

”اس کی گل چھوڑ۔ ٹھیک ٹھیک بتا، کمرے میں کون ہے؟“

”نراض تو نہیں ہو گا؟“ شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میرے سر پر ہتھ رکھ کر بتا۔“

”نہیں۔“ لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھے بغیر کہا۔ ”نہیں مٹاؤں گا۔ بالکل نہیں مٹاؤں گا۔“

”ایسے نہیں۔“ شاداں نے اصرار کیا۔ ”سر پر ہاتھ رکھ کر بتا۔ برا تو نہیں منائے گا؟“

لالی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”لے اب بتا۔“

شاداں نے ذرا سا آگے جھک کر سرگوشی کی۔ ”تاجی ہے، اندر منجی پر سو رہی ہے۔“

”کون تاجی؟“ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ ہونق کی طرح شاداں کا چہرہ دیکھنے لگا۔

شاداں ٹاک سیکڑ کر حیکھے لہجے میں بولی۔ ”وہی کنجری، جس نے بالے کو مجھ سے چھین لیا تھا۔“

لالی نے خطرے کے احساس سے خوف زدہ ہو کر کہا۔ ”وہ یہاں کیسے آئی؟“

”آئی نہیں۔ میں خود جا کر لائی ہوں۔“ شاداں مطلق خوف زدہ نہیں تھی۔

لالی اس کی بات سن کر سخت پریشان ہوا۔ جھنجھلا کر بولا۔ ”تیرا گڑ تو نہیں چل گیا؟ یہ تجھے سوچھی کیا؟“

”نراض نہ ہو۔ تو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا ہے۔“ وہ صفائی پیش کرنے لگی۔ ”نپ چڑھی تھی اسے۔ کوئی دوا دارو بھی نہیں۔ میں شام کو اس کے لیے دوائی لائی ہوں۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”ترب کر بولی۔“

”ہائے سرسوں کے پھول کی طرح پیلی پڑ گئی ہے۔“

لالی اس کی باتوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے بولا۔ ”تجھے کس نے کہا تھا اسے اپنے گھر میں لا، اس کا علاج کرا۔ اور کوئی نہیں اس کا؟ کوئی تو ہو گا؟“

”ہے تو۔“ شاداں نے جواب دیا۔ ”ویر ہے، پر وہ کراچی میں ہوتا ہے۔ بھر جائی تھی، وہ بھی پچھلے دنوں اس کے پاس چلی گئی۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”ٹھیک ہی ہوا۔ ایسی چندال تھی۔ ہائے، کیا بتاؤں، روز تاجی کا ہاتھ پکڑ کر نکالتی تھی۔ مارتی تھی، جھونٹے کھسوتی تھی۔ تبھی تو بالے کے گلے پڑ گئی۔“

لالی اس کی باتوں سے اکتا گیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ ”خاما خا کی کڑکڑ بند کر۔ یہ بتا وہ بالے کو تو نہیں پوچھتی تھی؟“

”کیوں نہیں پوچھتی تھی۔ میں اس کے پاس گئی تو اس نے پہلی بات یہی پوچھی۔ میں نے بھٹ کہا۔ بالے تو میرے پاس تین مہینے سے نہیں آیا۔ لور گیا ہو گا، ایکٹر بنے۔ وہ تو اپنے کو سوہنا مندا سمجھتا ہے۔“ شاداں نے غور سے لالی کا چہرہ دیکھا۔

”غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟“

”بات تو ٹھیک ہی کہی، پر اسے یہاں لے کیوں آئی؟“

”نہ لاتی تو کیا کرتی۔ بیمار ہے۔ کھانے پینے کو بھی گھر میں کچھ نہیں۔ پیسہ کوڑی بھی اس کے پاس نہیں۔“ شاداں نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

”تو چاہتا ہے مرجانے دیتی اسے؟“

وہ لالی سے اور قریب ہو گئی۔ اتنے قریب کہ لالی اس کے پتھر کے مانند سخت جسم کی چھین محسوس کر سکتا تھا۔ شاداں رمان سے بولی۔ ”تاجی کے پیٹ میں بچہ ہے۔ بالے ہی کا ہے۔ سچ جان اسی کا ہے۔“ شاداں نے یہ بات ایسی لذت سے کہی کہ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔

لالی گم صم کھڑا رہا۔ اسے شاداں پر غصہ بھی آ رہا تھا اور اس سے ہمدردی بھی تھی۔ شاداں اس کی الجھن سے بے نیاز کستی رہی۔ ”جینا نہیں ہو گا۔ بچے کو خود بالوں گی۔ اپنے ہی پاس رکھوں گی۔“

تاجی بھی نہیں رہے گی۔ میرا کیا لے گی، اپنے نصیب کا کھائے گی۔“

”تو سفنا تو نہیں دیکھ رہی؟“ لالی نے مسکرا کر ٹوکا۔ ”اب تو جاگ جا۔“

شاداں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ یہ سب کرے گی کیسے؟“

شاداں نے شیشم کے پیڑ کے قریب پڑے ہوئے چھپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ پتل دیکھ رہا ہے؟ ادھر آ۔“ وہ لالی کا ہاتھ پکڑ کر چھپر کے پاس لے گئی اور اس کے نیچے بیٹھی ہوئی بھینس کی تھو تھنی محبت سے سلواتے ہوئے بولی۔

”میری بوری دھری ہے۔ نیلی بار کی ہے۔ بھاڑ ہے۔ کٹے کے بنا صرف چارے پر صبح شام پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔“

”پر تیرا اس سے کیا بنتا ہوگا؟“

”لے یہ کم ہے۔“ شاداں نے چمک کر کہا۔ ”ملک کی حویلی پر دودھی آتا ہے۔ روز کے روز دام چکا کر دودھ لے جاتا ہے۔ شام کو چالی میں دودھ بلو کر مکھن نکال لیتی ہوں۔ وہ بھی بک جاتا ہے۔“ شاداں نے قدرے تامل کیا۔ ”اور سن، ساڑی کی فصل پر بھٹی کی چٹائی بھی کرتی ہوں۔ خاصی چوگی مل جاتی ہے۔ ملک کی حویلی میں بھی کام کاج کرتی ہوں۔ محنت کرنے کے معاملے میں زبردست ابھری ہوں۔ پرواہ نہ کر لالی۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔“

”جب اتنے بہت سے کام کر لیتی ہے تو ایک کام اور کر۔“ لالی مسکراتے لگا۔ ”مجھے پکڑا دے۔ ایک اور رُج آجائے گی۔“

”گالان نہ نکال۔“ وہ بگڑ کر بولی۔ ”میں نے جتنی تیرے ہاتھ میں دے دی تھی۔ جتنی سے مار لے، پر ایسی گل بات نہ کہہ۔“

”مجھے پکڑا دے گی تو تجھ سے کوئی گلہ نہ ہوگا۔ سچ کہہ رہا ہوں تجھے انعام ملے گا تو مجھے خوشی ہوگی۔“ لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ ”شاداں! توں بہت زوروں کی مٹیا رہے۔ مٹی جائے چند بن کر مسکتی جائے۔ بالے تجھے پہچان ہی نہ سکا۔ وہ تو ایک نمبر.....“

شاداں نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی، جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی نے ہاتھ بدھا کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ مگر وہ چونک پڑا۔ شاداں کا ہاتھ بالکل خالی تھا۔ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”شاداں! تیرے ہاتھ کی چوڑیاں کہاں گئیں؟“

”توڑا لیں۔ بالے جو مر گیا۔“

”تجھ پر ابھی تک اس کی محبت کا بھوت سوار ہے۔“ لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”اس طرح اس ایسا پا کرے گی تو ضرور جیل جائے گی۔“

”زراض کیوں ہوتا ہے۔ تو چاہتا ہے، میں خوشی مناؤں، سلاری باندھوں، دانتوں پر دندا سلطوں، نکھوں میں کاجل ڈالوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بتاتا ہوں، ابھی بتاتا ہوں۔“ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”ایسا کر بھانسی کے پھندے پر جا رنک جا۔“ شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ ”بیچھے سے کام لے بیچھے سے۔ تیری تو مت ماری گئی ہے۔ آج نہیں تو کل چرچا ہوگا۔ بالے کہاں گیا؟ ایسی گل بات زیادہ دل چھپی نہیں رہتی۔ خون سر پر چڑھ کر بولتا ہے۔ توں صاف پکڑی جائے گی۔ کچھ تو سوچ۔ سب بٹے کیا کیس گئے۔ مرنا ہی ہے تو ذلیل اور بدنام ہو کر کیوں مرنا چاہتی ہے؟“ شاداں گم صم کھڑی اس باتیں سنتی رہی۔

لالی نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا، شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”لے، کل جا کر ٹیاں پن لینا۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔“ لالی نے نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر ہاتھ بند کر دیا۔ سمجھ گئی تا میری بات کا مطلب؟“

”سمجھ گئی۔“ شاداں نے سر ہلایا اور نوٹ ملگجے لاپے کے ڈب میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بتا ج آیا کیسے؟“ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ”کپڑوں کے لیے آیا ہوگا، ہائے میں تو بھول ہی گئی۔ جس رات یا ہے، اس کے بعد تو دو روز تک تھانے دار نے پچھ پچھ کر میرا گھر خراب کر دیا۔“

”کیا بتایا توں نے؟“

”میں نے کہہ دیا، دونوں بالے سے ملنے آئے تھے۔ اس کا دوست بتاتے تھے۔ میں نے خوب بے بہائے۔ روروں کر کہا، وہ مجھے چھری دکھا کر ڈراتے تھے۔ بار دینے کو کہتے تھے۔“

”توں تو ایک دم فروٹ نکل۔ دیکھنے میں ایسی نہیں لگتی۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”بالے کے سے میں بھی پوچھتے تھے؟“

”پوچھتے تھے۔“ شاداں نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”میں نے وہی بات کہی جو تاجی سے تھی۔ کوئی غلط بات تو نہیں کہی میں نے؟“

”ابھی تک تو ٹھیک ہی جا رہی ہے۔“

”تجھ۔“ زنگلتا ہے تیرا کیا بھروسا۔ چور اچکا جو ٹھیرا۔“

لالی اس کی چوٹ اس طرح سے گیا جیسے گونگا چپ چاپ کڑوی دوا نگل جاتا ہے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”آزمائے۔ لے چل ملک کے پاس پکڑو دے مجھے بھاگوں گا نہیں۔ بھاگ جاؤں تو پیشاپ سے منہ دے دینا۔“ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

”ایک رات تیرے پنڈ آؤں گا اور تجھے صاف اڑا لے جاؤں گا۔“

شاداں ایک دم پھر گئی۔ ”تو اپنے کنجھن سے باز نہیں آئے گا۔“ وہ غصے سے لالی کو گھورنے لگی۔ ”مر جاؤں گی۔ پر تیرے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔“

لالی ڈھنٹائی سے مسکراتا رہا۔ ”تو ضرور چلے گی۔ میرے سوا تجھے کوئی بھگا کر نہیں لے جاسکتا۔ شرط بدلے مجھے سے۔“ اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ”آہا تھ مار۔“

شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ کہنا چاہا۔ عین اس وقت کمرے کے اندر آہستہ آہستہ کھانے کی آواز ابھری۔ شاداں نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا۔ گردن جھکا کر سرگوشی کی۔

”لگتا ہے، تاجی جاگ گئی۔ تو اب رُجا۔“

لالی نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بجنے والے تھے۔ چائے ڈوب گیا تھا۔ اندھیرے میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا ابھر رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر کہا۔ ”ہاں اب مجھے چلنا چاہئے۔ صبح ہونے والی ہے۔ توں کیس اور دھوتی ضرور لے آنا۔ میں بعد میں آؤں گا۔“ وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا۔

”ٹھیر میں بھی تیرے سنگ چلوں گی۔“

لالی آنکھ مار کر بولا۔ ”رہنے دے، ابھی وہ رات نہیں آئی۔“

”بکواس نہ کر۔“ شاداں نے اسے ڈانٹا۔ ”تیرا ایسے جانا ٹھیک نہیں۔ چل میں تجھے رُکے نکل تک چھوڑ آؤں۔ بوری کو بھی ساتھ لے چلوں گی۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گی۔ بیمار ہے، اسے موک لگ گیا ہے۔ سلوتری کو دکھانے ساتھ والے چک لے جا رہی ہوں۔“

لالی جاتے جاتے رک گیا اور چونکا نظروں سے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ مگر کھانسی اب بند ہو چکی تھی۔ شاداں نے بھینس کھولی۔ اس کی گردن میں موٹی رسی کا ڈابا ڈالا اور اسے ہنکاتی ہوئی لالی کے پاس پہنچی۔ دونوں گھر سے نکل کر گلی میں آگئے۔ شاداں نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ ہر طرف دودھیا دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ گھروں سے رک

موشیوں کی اڑاٹ، بوڑھوں کی کھانسی اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

شاداں نے ان آوازوں سے پریشان ہو کر کہا۔ ”جیتتی کر بول برالا شروع ہو گیا۔“

لالی نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ تیز قدم اٹھا کر چلنے لگا۔ دونوں ویران راستوں سے گزرتے، درختوں کی آڑ لیتے آگے بڑھنے لگے۔ بھینس ان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ شاداں کبھی اس کی گردن پر ہاتھ پھیرتی کبھی لاڈ سے تھوحتھی سلاتی اور اسے ہنکانے کے لیے رک رک کر منہ سے ”تت تت“ کی آواز نکالتی۔

لالی صبح کا پھیلتا ہوا اجالا دیکھ کر اور زیادہ تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے جوتوں کی تیز رگڑ سے خاموشی میں آہٹ ابھر رہی تھی۔

شاداں نے اسے ٹوکا۔ ”وے لالی! دھیرے چل۔ دگر دگر نہ کر۔“

لالی نے پلٹ کر شاداں کو دیکھا، اپنی رفتار ست کر دی اور خاموشی سے شاداں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا۔ دونوں گاؤں سے نکل کر باہر آگئے۔ اب رُ شروع ہو گیا تھا۔ رُ کے ایک طرف رنج کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ صبح کی نرم نرم ہوا کے جھونکوں سے گندم کی بالیاں جھومتیں اور خشک پتوں سے سرسراہٹیں ابھرتیں۔ رُ اس وقت سنان تھا۔ اس کی زمین سخت اور ہموار تھی۔ کیس کیس بارش سے زمین میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ گاؤں کے سامنے کا یہ میدان کھیل کوو کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مگر صبح کے نالے میں چٹیل نظر آتا تھا۔

دونوں کھیتوں کے ساتھ ساتھ رُ سے گزرتے رہے۔ شاداں کے بال پھری ہوا کے جھونکوں سے اڑاڑ کر اس کے صندوق چرے پر بکھر جاتے۔ وہ ہر بار انھیں سمیٹ کر پیچھے کرتی۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ وہ گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ لالی چپ چاپ اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے جسم کے دائرے اور پیچ و خم دیکھتا رہا۔ اب نہ وہ خوف زدہ تھا نہ بے چین۔ شاداں کی پناہ میں وہ خود کو محفوظ سمجھ رہا تھا اور شاداں ملگجے لاپے میں اپنے بھاری کولھے گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہلاتی آگے آگے چل رہی تھی۔ وہ اپنی اوپر اٹھی ہوئی گردن کو ہلکا سا خم دے کر ادھر ادھر دیکھتی جاتی۔ ایسے جیسے کتیا اپنے پلے کی رکھوالی کرتے وقت چوکس نظر آتی ہے۔ سویرا بلند یوں سے نیچے اتر رہا تھا۔

ہر چیز خواب کے مانند دھندلی اور خاموش نظر آ رہی تھی۔ یکایک اس خاموشی میں دور سے گھوڑے کے دوڑنے کی آواز ابھری۔

نے ہنسا کر دونوں ٹانگیں اوپر اٹھادیں۔ ملک بے قابو ہو گیا۔ اس نے گھبراہٹ میں ٹریگر دبا دیا۔ گولی چلی اور چیختی ہوئی بھینس کے پیٹ میں اتر گئی۔ سب کچھ پلک جھپکتے ہوا۔ ملک کی گھوڑی ہنساتی ہوئی سرپٹ بھاگی۔

ملک اللہ نواز پیٹ پر بیٹھا اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر گھوڑی رکنا تھی نہ رکی۔ دوڑتی ہوئی دور نکل گئی۔ بندوق بھی ملک کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

لالی نے تیزی سے دوڑ کر بندوق اٹھائی۔ اس میں ابھی تک کارتوس موجود تھا۔ وہ بندوق اٹھا کر پلٹا۔

شاداں کی بھینس زور زور سے ڈکرائی۔ چند قدم بھاگی پھر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس کے پیٹ سے خون نکل کر دور تک زمین پر پھیل گیا۔ بھینس بے بسی سے گردن ہلا کر زمین پر منہ رگڑنے لگی۔ شاداں دوڑ کر زخمی بھینس سے دیوانوں کی طرح پلٹ گئی۔ اس کے کپڑے خون سے لت پت ہو گئے۔ دونوں آنکھیں اشکوں سے آبشار بن گئیں۔ لالی بھی آہستہ آہستہ چلتا ہوا بھینس کے قریب پہنچ گیا۔

شاداں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اور سسے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”توں گیا نہیں؟“
لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا بھینس کو ترپتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”شاداں! تیری بوری مر رہی ہے۔“
”دیکھ رہی ہوں، پر توں یہاں سے ٹر جا۔“

لالی چپ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں بھینس کے پیٹ سے اٹھتے ہوئے لال لال خون پر جمی تھیں۔ یکایک شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے بولی۔ ”کھڑا کیوں ہے؟ جا یہاں سے۔ ملک اپنے کړندوں کو لے کر آتا ہی ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ لالی پر جھپٹی اور اسے زور سے دھکا دیا۔
”جا، جیتھیتی نال ٹر جا۔“

لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھا اور مزمر کر شاداں کو اور اس کی تڑپتی ہوئی بھینس کو دیکھتا رہا۔ مگر جب اس راستے کی جانب بڑھا جلدھر سے گاؤں میں داخل ہوا تھا تو اس نے دیکھا، کئی ہالی، مل پتھالی لیے سانسے کھڑے ہیں اور اسی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ لالی کی ان پر نظر پڑی تو وہ ہنکا۔ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی بندوق اٹھائی اور اس کی نال ان کی طرف کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹے اور مل پتھالی چھوڑ چھاڑ بگ مٹ بھاگے۔

لالی نے ان کی سراپیمگی سے فائدہ اٹھایا اور جھٹ کھیتوں میں داخل ہو کر ایک پگڈنڈی پر تیزی

شاداں گھبرا کر بولی۔ ”ہائے میں مر گئی۔ یہ تو ملک جان پڑتا ہے۔“

لالی بھی پریشان ہو گیا۔ دونوں رک گئے۔ دیکھتے دیکھتے کھڑی فصلوں کی آڑ سے نمبردار ملک اللہ نواز خان نکلا اور عین ان کے سامنے آگیا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر مرغ کی طرح اکڑا بیٹھا تھا۔ آگے بندوق رکھی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی اس نے گھوڑی کی راس زور سے کھینچی اور شاداں سے مخاطب ہوا۔ ”اتنے سویرے کہاں چلی؟“ اس نے شاداں کے پیچھے کھڑے ہوئے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“ شاداں نے کچھ کہنا چاہا مگر ملک پہلے ہی بول پڑا۔ ”یہ وہی جیل سے بھاگا ہوا کیدی تو نہیں ہے؟ وہی جان پڑتا ہے۔“ ملک نے غصے سے ڈپٹ کر دریافت کیا۔

”ٹھیک ٹھیک بتا، کون ہے یہ؟“

شاداں کچھ نہ بتا سکی۔ اس کی آنکھیں خوف اور گھبراہٹ سے پھٹی ہوئی تھیں، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ بالکل ہونق نظر آ رہی تھی۔ شاداں کو خاموش پا کر ملک زور سے چیخا۔ ”آج یہ نکل کر نہیں جائے گا۔“ اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی بندوق اٹھائی اور لالی کو لٹکرا۔

”آگے بڑھا تو گولی سے اڑا دوں گا۔“

”ملک جی!“ شاداں اور کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ لیکن ملک اس کی التجا سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ فلمی ولن کی طرح زور سے دباڑا۔

”ہٹ جا میرے سامنے سے۔“

لالی خاموش کھڑا تھا۔ ملک بندوق تانے اسے خون خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کی گھنی مونچھیں غصے سے ابابیل کے پروں کی مانند پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی کلف وارپک کا اونچا طرہ ہوا سے لہرا رہا تھا۔

شاداں ابھی تک لالی اور ملک کے درمیان دیوار بنی کھڑی تھی۔ اچانک لالی نے پیچھے سے شاداں کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ منہ کے بل زمین پر گری۔ ملک کی نظریں بھٹک گئیں۔ لالی جھٹ قریب کھڑی ہوئی بھینس کے اوٹ میں جھک کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ملک نشانہ باندھتے ہوئے چلایا۔

”باہر نکل، نہیں تو میں فائر کھول دوں گا۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جھپاک سے چھری نکالی اور بھینس کی ٹانگوں کے بیچ سے ملک کی جانب تیزی سے پھینکی۔ چھری گھوڑی کی ایک ٹانگ چیرتی ہوئی گوشت میں پوسٹ ہو گئی۔ گھوڑی

سے دوڑنے لگا۔ اب اسے دور سے ملی جلی انسانی آوازوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ آوازیں اسی سمت سے آرہی تھیں جہاں شاداں کی زخمی بھینس دم توڑ رہی تھی۔



پڑیلی میں دور دور تک جنگلی جھاڑیاں اور اونچی اونچی گھاس تھی۔ زمین خشک اور ریتیلی تھی۔ صبح کا اجالا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ چڑیوں کے غول بھراتا مار کر جھاڑیوں سے نکلنے اور چھماتے ہوئے فضا میں بکھر جاتے۔ لالی نے بندوق گھنی جھاڑیوں کے نیچے ایک گڑھے میں ڈال دی۔ اسے خشک پتوں اور پتھروں سے چھپا دیا۔ اب لالی کو اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود روپو دے رو دتا، جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کے درمیان سے راستہ بناتا، جدھر منہ اٹھا، اسی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس سے بھری ہوئی پڑیلی ختم ہوئی تو اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ سامنے سڑک ہے۔ سڑک صبح کے اجالے میں سانپ کی طرح بل کھاتی دور تک چلی گئی تھی۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے کنارے چلتے لگا۔ سڑک کے دونوں جانب بنجر اور غیر مزدور علاقہ تھا۔ کہیں کہیں مٹی اور ریت کے تودے سر اٹھائے کھڑے تھے۔

اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تو دور سے ہریالی نظر آئی۔ آگے بڑھا تو کھیتوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی نہر ملی۔ سورج نکل آیا تھا۔ نہر کا پانی لمبی لمبی دھوپ میں بھللا رہا تھا۔ سڑک نہر کے اوپر سے گزرتی تھی۔

لالی نے نہر دیکھی تو بے قرار ہو کر نیچے اترا۔ نہر کے قریب گیا۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا اور نہر کے کنارے لیٹ گیا۔ نرم اور لیٹ کر بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ٹھنڈے جھونکے آئے تو

نہیں سے آنکھیں بند ہونے لگیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ ذرا دیر سستا کر اٹھ کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر سڑک پر آگیا۔ اس نے پل عبور کیا اور آگے بڑھنے لگا۔

اب دن نکل آیا تھا۔ اسے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جہاں روپوش ہو کر دن گزارا جاسکے۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ان کے پیچھے گاؤں کے مکانات نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دور آگے بڑھا تھا کہ ایک لاری شور مچاتی، دھول اڑاتی سامنے سے آتی نظر آئی۔ وہ سڑک سے اتر کر نیشب میں آگیا۔ لاری تیزی سے دوڑتی ہوئی گزر گئی۔ لالی پھر سڑک پر آگیا۔

فرلانگ سوا فرلانگ فاصلہ طے کیا تو اسے سڑک سے ایک کپار است گاؤں کی طرف جاتا نظر آیا۔ یہی کپار است سڑک کے دوسری طرف بھی جاتا تھا۔ مگر اس طرف لاگھا تھا۔ جگہ جگہ ریت نے نیلے تھے اور ان کے درمیان گندم اور جو کے پودے لہلہا رہے تھے۔ پننے اور سروس کے کھیت بھی تھے۔ ہوا زور سے چلتی تو سروس کے پیلے پیلے پھول کسی المیزار کے بنستی انچل کی طرح لہراتے۔ ایک ساندنی سوار نیلوں اور کھیتوں کے درمیان کچے راستے پر گرد کے گبولے اڑاتا دور جاتا نظر آ رہا تھا۔

لالی مخمضے میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کدھر جائے اور کون سا راستہ اختیار کرے؟ وہ خاموش کھڑا ساندنی سوار کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں اسے اپنی پشت پر چاب ستانی دی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ایک شخص آہستہ آہستہ اسی کی جانب بڑھ رہا ہے۔ وہ ادھیڑ آدمی تھا۔ اس کا لباس اجلا تھا۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ سر پر سفید گجڑی تھی۔ ڈاڑھی کے بال کچھڑی تھے۔ قریب آکر اس نے لالی سے پوچھا۔ ”کیا تم لاری سے اترے ہو؟“ لالی بات کا جواب فوراً نہ دے سکا۔

اسے خاموش پا کر وہ شخص مسکرایا۔ ”مجھے بھی اسی لاری سے جانا تھا۔ پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ لاری نکل گئی۔“

”ابھی ابھی گئی ہے جی۔“

”یہ لاری تو کوٹ ننگر سے آ رہی تھی۔ تم بھی وہیں سے آ رہے ہو؟“ لالی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خود ہی بولا۔ ”گلتا ہے‘ تم غلط جگہ آ گئے۔“

لالی اس کی بات کا جواب نہیں دے سکا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ نہ اسے آگے کا پتہ تھا نہ پیچھے کا۔ وہ پہلے کبھی اس طرف آیا ہی نہ تھا۔

وہ شخص بولا۔ ”تم آگے چلے آئے، تمہیں پیچھے اترنا تھا۔ سفر میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ اسی لاری سے میں پہلی پہاڑ جا رہا تھا۔ صبح کا وقت تھا۔ جھوک آگئی۔ آنکھ کھلی تو دہپال پور میں تھا۔ پہلی پہاڑ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کو رکا۔ ”مگر واپسی کے لیے تمہیں شام سے پہلے کوئی لاری نہیں ملے گی۔ اس سڑک پر پچھلی بارشوں کے بعد بہت کم لاریاں چلتی ہیں۔ سڑک ٹوٹ پھوٹ کر بہت خراب ہو گئی ہے۔ پہلی لاری صبح نکل جاتی ہے۔“ لالی کو وہ بھلا آدمی لگا۔ اس کے لہجے میں نرمی اور شفقت تھی۔ مگر لالی خاموش رہا۔ وہ ابھی تک بھونچکا تھا اور خود کو ذہنی طور پر آمادہ نہیں کر سکا تھا کہ اس شخص کے ساتھ کس طرح کا رویہ اختیار کرے۔ بیکسر نظر انداز کر دے یا اس کے جذبہ ہمدردی سے فائدہ اٹھا کر راستہ دریافت کرنے کی کوشش کرے۔ جب لالی نے اس کی باتوں کے جواب میں کچھ نہ کہا اور گم صم کھڑا ہوا تو وہ شخص بولا۔

”تم کس سوچ میں پڑ گئے؟“

آخر لالی کو بولنا پڑا۔ اس نے بات بتائی۔ ”بات یہ ہے جی! میں یہاں دوسری بار آیا ہوں۔ کئی سال پہلے آیا تھا۔ رات کا دکھ تھا۔ یاد پڑتا ہے اسی جگہ اترنا تھا۔“

”لاری سے آئے تھے یا تانگے سے؟“

”آیا تو لاری ہی سے تھا۔“ لالی نے گاؤں کی طرف نظر ڈالی جس کے مکانات درختوں کے پیچھے سے نظر آرہے تھے۔ اس نے پلٹ کر سڑک کے اس پار لاگھے کی جانب دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”سمجھ نہیں آتی، یہی جگہ تھی یا کوئی اور۔“

”کوئی بات نہیں۔“ اس شخص نے درختوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ رہا اپنا چک۔ تم چاہو تو شام تک میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہو۔ یہاں دھوپ میں کھڑے کھڑے پریشان ہو گے۔ آؤ میرے ساتھ۔ جہاں تمہیں جانا ہے پہنچا دوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

لالی انکار نہیں کر سکا۔ چپ چاپ اس کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں کچھ دور کچے راستے پر چلتے رہے۔ وہ شخص ایک پی ہے کی جانب مڑ گیا۔ لالی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے رہے اور جب بیہاٹے کر کے باہر آئے تو گاؤں شروع ہو چکا تھا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئے۔ ایک دو منزلہ پختہ مکان کے سامنے ٹھہر کر اس شخص نے کہا۔

”لوئی! یہ رہی اپنی ماڑی۔ یہ گھر کا آگواڑہ ہے۔ ساتھ ہی ذرا ہے۔ بیٹھک بھی اسی طرف ہے۔ ادھر، چلتے ہیں۔ وہیں بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔“

وہ مکان کے ساتھ ساتھ چلا اور سیدھے ہاتھ کو مڑ گیا۔ مکان کے آگے آم اور نیم کے بیڑ تھے۔ ان کے نیچے چارپائی بچھی تھی۔ اس شخص نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم یہاں بیٹھو۔ میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔“ وہ جس طرف سے آیا تھا اسی طرف واپس چلا گیا۔

لالی چارپائی پر خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے سامنے مکان کا جو حصہ تھا اس کے آگے کھلا ہوا نیچی چھت کا برآمدہ تھا۔ برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھڑکی بھی تھی۔ برآمدہ اس وقت خالی تھا۔

مکان آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ اس کے گرد نواح میں صرف چند کچے مکانات تھے۔ لالی نے گاؤں صرف ایک نظر دیکھا۔ اس میں کئی اور بھی دو منزلہ مکانات تھے۔ گاؤں اپنی آبادی اور رونق کے اعتبار سے جہانگیر سے بھی بڑا تھا۔ مکان دیکھ کر لالی کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا میزبان گاؤں کا کھانا پیتا آدمی ہے۔ مگر وہ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

درختوں کے نیچے ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اسے سکون ملا۔ اس نے دل میں کہا کہ دن گزارنے کے لیے اچھا ٹھکانا مل گیا۔ شام کو چلا جاؤں گا۔ موقع ملا تو شاداں سے مل لوں گا۔ پچھلی رات کے بارے میں معلوم کروں گا کہ بعد میں اس پر کیا ہوتی؟ اگر وہ کپڑے لے آئی تو آج ہی رات رحیم داد کو جیل کی وردی سے چھٹکارا دلا دوں گا۔ پھر آگے جانے کا پروگرام بنے گا۔ مگر شاداں کے گھر جاتے ہوئے اسے خطرے کا بھی احساس ہوا۔ اتنے سنگین واقعے کے بعد گاؤں بھر میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ ملک اللہ نواز بہت غصے میں ہوگا۔ ہو سکتا ہے اس نے پولیس کو بھی بلایا ہو۔ تھانیدار اس کا بھائی ہے۔

لیکن شاداں کے گاؤں کی طرف جانا اس کے لیے ضروری تھا۔ رحیم داد کے پاس پہنچنے کا راستہ اسی طرف سے جاتا تھا۔ کوئی اور راستہ لالی جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔

اس نے نظریں اٹھائیں تو دو کانٹیل سامنے سے آتے نظر آئے۔ لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے سرا سید ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور بھاگ کر کسی گلی میں گھس جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت برآمدے کی طرف سے آواز آئی۔

”ادھر بیٹھک میں آجاؤ۔ کچھ کھاپی لو۔ تم نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔“

لالی نے دیکھا، برآمدے میں اس کا میزبان دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ لالی تو اس وقت چاہتا بھی یہی تھا۔ فوراً اٹھا، برآمدے میں پہنچا اور بیٹھک کے اندر چلا گیا۔ بیٹھک صاف ستھری تھی۔ ابک

طرف اونچے پایوں کا بیٹھک تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ موٹڑھے تھے۔ دو تین کرسیاں تھیں اور ایک میز بھی تھی۔ میز پر لمپ رکھا تھا۔ اس کے قریب ہی چند پرانے اخبار پڑے تھے۔ دیواروں پر رنگین طغریں لگے تھے۔ ایک آئینہ بھی میز کے پاس ہی دیوار پر آویزاں تھا۔ اس شخص نے لالی کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ایک موٹڑھا کھینچ کر بولا۔

”میں تو جی اس پر بیٹھوں گا۔ مجھے تو اسی پر بیٹھنے میں آرام ملتا ہے۔“

لالی کرسی پر بیٹھتے ہوئے جھجکا۔ میزبان نے اصرار کر کے اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ ذرا دیر بعد ایک عورت دوپٹے کے انچل سے سر ڈھانکتی ہوئی اس دروازے سے کمرے میں داخل ہوئی جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں حقہ تھا۔ اس نے حقہ موٹڑھے کے سامنے لا کر رکھ دیا۔ اس شخص نے حقے کی نینھالتے ہوئے عورت سے کہا۔

”بھاگ بھری! کھانے کو کچھ روٹی شوٹی لا۔ جلدی کر۔“

”ابھی لائی جی۔“ یہ کہتی ہوئی وہ اندر چلی گئی۔

وہ شخص چپ بیٹھا حقہ گزرتا رہا۔ ذرا دیر بعد بھاگ بھری لوٹے میں بانی لائی۔ لالی نے باہر جا کر منہ دھویا، پھر اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ وہ شخص لالی سے مخاطب ہوا۔ ”برخوردار! تم سوچتے ہو گے۔ میں کون ہوں؟“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”میں مشرقی پنجاب کا مہاجر ہوں۔ میرا نام فیض محمد ہے۔ مگر لوگ مجھے ماسٹر جی کے نام سے جانتے ہیں۔ بات یہ ہے برخوردار کہ میں پہلے سکول ماسٹر تھا۔ جب پاکستان بنا تو میں بھوانی کے پرائمری سکول میں پڑھاتا تھا۔ ویسے میں رہنے والا سونی پت کا ہوں۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو لٹ پٹ کر پاکستان آگیا۔ کچھ دن ٹھوکر س کھاتا رہا، پھر پاک بجن میں سکول ماسٹر لگ گیا۔ سونی پت میں اپنی کچھ زرعی اراضی تھی۔ اس کا کلیم داخل کیا۔ بھاگ دوڑ کی تو کلیم منظور ہو گیا اور اس چک میں الاٹمنٹ بھی مل گیا۔ میں سکول ماسٹری چھوڑ چھاڑیماں آگیا۔ اب غلہ منڈی میں آڑ مت کا کاروبار بھی کرتا ہوں۔ چار مرنے کے لگ بھگ زمین ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ عزت کے ساتھ گزر رہی ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”برخوردار! تم نے اپنے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟“

لالی صاف جھوٹ بول گیا۔ ”سرفراز۔ جی میرا نام محمد سرفراز ہے۔“

”اچھا، اچھا۔“ وہ مسکرایا۔ ”ادھر کیسے آنا ہوا؟“

”ایک دوست کے پاس آیا تھا۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“

”جی وہ۔“ لالی ذرا سا الجھا۔ ”اس کا نام رحمت ہے۔“

”وہی تو نہیں، جو محمد حنیف پنواری کا پتر ہے؟“

”مجھے اس کے پیر کا نام تو ملوم نہیں جی۔“

”اگر یہ وہی رحمت ہے تو وہ اب اس چمک میں نہیں رہتا۔“ فیض محمد نے حقے کا کش لگا کر کہا۔

”اس نے ریلوے میں نوکری کر لی ہے۔ کبھی کبھار یہاں آتا ہے۔“

وہ کچھ اور کہتا چاہتا تھا، اسی اثناء میں بھاگ بھری ناشتا لے کر آگئی۔ اس نے درمی پر دسترخوان بچھایا اور ناشتے کا سامان اس پر رکھ دیا۔ ناشتے میں پرائیڈ تھے، تلے ہوئے انڈے تھے، مکھن تھا اور چائے بھی تھی۔ ماسٹر جی نے لالی کو مخاطب کیا۔ ”لو بر خوردار! ناشتا کرلو۔“ وہ اٹھا اور دسترخوان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ لالی بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”میں نے تو صبح ہی ناشتا کر لیا تھا۔ تمہارا ساتھ دینے کے لیے صرف ایک پیالی چائے پیوں گا۔ تم میرا خیال نہ کرنا۔ اطمینان سے کھاؤ۔ کسی تکلف و کلف کی مطلق ضرورت نہیں۔“

لالی خاموشی سے بیٹھا ناشتا کرتا رہا اور فیض محمد اسے اپنے کاروبار اور زمیں داری کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں سناتا رہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر لالی پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فیض محمد نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔ بھاگ بھری دسترخوان اور برتن اٹھا کر لے گئی۔ فیض محمد نے اخبار پڑھتے پڑھتے سر اٹھایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

”لو جی! یہ تو اپنے ہی ضلع کی خبر ہے۔ دو قیدی منگمری جیل سے نکل بھاگے۔ ہفتے بھر سے اوپر ہو گیا۔ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں لگے۔ دو ہزار کا انعام بھی مقرر ہوا۔ تب بھی نہ پکڑے گئے۔“ وہ مسکرایا۔ ”پکڑے بھی کیسے جائیں۔ سب ملی بھگت ہے۔“

لالی نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ فیض محمد نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔ ”سرفراز! تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ سو جاؤ۔“ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے لالی کو سونے سے منع کر دیا۔ ”بھئی! پہلے حجامت بنالو۔ بہت بڑھ گئی ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نائی کو بھیجتا ہوں۔ تم حجامت بنالو۔ بچھوڑے مویشیوں کا کڑا ہے۔ وہاں کنواں بھی ہے۔ جی چاہے تو نمالو۔ پھر اطمینان سے سو جانا۔“

فیض محمد کے اٹھتے ہی لالی بھی احترا م کھڑا ہو گیا۔ فیض محمد گھر کے اندر جانے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جاتے جاتے ٹھنک کر گویا ہوا۔

”میں گھوڑی پر بیٹھ کر منڈی چلا جاؤں گا۔ ویسے سائیکل بھی ہے۔ مگر مجھے گھوڑی کی سواری پسند

ہے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے واپس آ جاؤں گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو کندی کھٹکھٹا کر بھاگ بھری کو بلا لیتا۔ ادھر ڈیرے پر بھی کئی کی اور نوکر چاکر موجود ہیں۔“

وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ لالی اس کے جانے کے بعد بھی خوف زدہ رہا۔ طرح طرح کے اندیشے پریشان کرنے لگے۔ باہر جانا خطرناک تھا اور کمرے میں بیٹھا رہتا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ وہ خاموش بیٹھا آنے والے خطرے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر خطرہ نہیں آیا۔ نائی آگیا۔ اس نے لالی کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی صاف کی۔ مونچھیں کاٹ چھانٹ کر درست کیں اور سر کے بال بھی تراش دیے۔ اس نے حجامت بناتے ہوئے لالی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ نائی پھر بھی خاموش نہ رہا۔ گاؤں کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں بتاتا رہا۔

حجامت بنانے کے بعد نائی چلا گیا۔ لیکن لالی سو نہ سکا۔ وہ نہانے کے لیے کونئیں پر بھی نہیں گیا۔ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر بستر پر لیٹے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ بھاگ بھری کھانا لے کر آگئی۔ کھانا کسی قدر پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ لالی نے بھوک نہ ہونے کے باوجود کھانا کھایا۔ اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور تھکا ہوا بھی تھا۔ لیٹتے ہی ایسی گہری نیند سویا کہ چراغ جلے آنکھ کھلی۔

اس نے دیکھا، لمپ روشن ہے۔ فیض محمد عرف ماسٹر جی سامنے موڑھے پر بیٹھا ہے۔ اسے بیدار دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ ”بر خوردار! تمہاری لاری تو نکل گئی۔ میں دن ڈھلے ہی واپس آگیا تھا۔ لیکن تم اس قدر گہری نیند سو رہے تھے کہ جگانے کو جی نہ چاہا۔“ اس نے تامل کیا۔ ”کوئی ضروری کام تو نہیں تھا؟“

”نہیں۔“ لالی نے بہت مختصر جواب دیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”تب تو ٹھیک ہے۔ ویسے میں نے معلوم کیا تھا۔ رحمت تین روز بعد آ رہا ہے، کیوں نہ اس کا انتظار کر لو؟“

لالی پریشان ہو گیا۔ وہ فوراً کوئی جواب نہ دے سکا۔ بات یہ تھی کہ وہ سرے سے کسی رحمت کو جانتا ہی نہ تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت اس کی زبان پر یہی نام آیا، ورنہ وہ کوئی دوسرا نام بتا دیتا۔ مگر اب رحمت اس کے لیے زحمت بن گیا تھا۔ اس مسئلے کا واحد حل اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ رحمت کے پہنچنے سے پہلے ہی گاؤں سے نکل جائے۔ ساتھ ہی اسے رحیم داد کا بھی رہ رہ کر خیال آ رہا تھا۔ رحیم داد اکیلا تھا اور لالی نے رات تک اس کے پاس پہنچنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ لالی کو

خاموش پا کر ماسٹر جی نے کہا۔

”برخوردار! تم کس سوچ میں پڑ گئے؟ اب آئے ہو تو رحمت سے مل کر ہی جانا۔ تین ہی دن کی تو بات ہے۔ تکلف چھوڑو۔ تمہارا اپنا گھر ہے۔ جب تک چاہو، ٹھہرو۔“

”صبح نہیں تو کل شام ضرور چلا جاؤں گا۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا جی!“

”جیسی تمہاری مرضی۔ دیے میں تو یہی کہوں گا، تمہیں رحمت سے مل کر جانا چاہئے۔“ فیض محمد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”بھئی برا نہ ماننا۔ سنا ہے، رحمت کا چال چلن کچھ ٹھیک نہیں۔ بازاری عورتوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تو جی اسے بہت دنوں سے نہیں ملا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔ وہ پہلے ایسا نہیں تھا۔ نوکری کے بعد اس نے پر پرزے نکال دیے۔ برخوردار! بچ پوچھو تو لڑکے کو جو ان ہوتے ہی شادی کی زنجیر میں باندھ دیتا چاہئے۔ زمانہ بہت برا ہے۔ محمد حنیف نے یہی غلطی کی۔ میں نے سمجھایا بھی مگر میری بات سن کر ٹال گیا۔ کہنے لگا، لڑکے کی مرضی نہیں ہے۔ لے بھی اب دیکھ لڑکے کی مرضی۔“ فیض محمد کھل کر مسکرایا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔

”تم نے تو اپنا گھر بسالیا ہو گا؟“

”نہیں۔“ لالی معصوم صورت بنا کر بولا۔ ”بات یہ ہے جی! ماں اور پو تو اپنے ہیں نہیں۔ بھائی بھین بھی نہیں۔ بالکل اکیلا ہوں۔ نوکری چاکری بھی نہیں۔ رحمت کے پاس اسی لیے آیا تھا۔“

لالی کی بات سن کر فیض محمد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا۔ لالی نے اس کا یہ رویہ دیکھا تو دل ہی دل میں پچھتا یا کہ اس نے ماسٹر جی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ناحق ایسی بات کہی۔ ایسا محسوس ہوا کہ اس نے اپنی پریشاں حالی بتا کر خود کو ماسٹر جی کی نظروں میں گرالیا۔ ذرا دیر بعد فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کھانا آجائے گا۔ تم اکیلے ہی کھا لیتا۔ میں رات کا کھانا نہیں کھاتا، عشاء کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتا ہوں۔ یہ میرا روز مرہ کا معمول ہے۔ اب تم سے صبح ملاقات ہوگی۔ فجر کی اذان سے پہلے میرے لیے حجرے سے باہر نکلنے کا حکم نہیں۔“ فیض محمد دروازے کی جانب بڑھا۔

”کھڑکی کھول دیتا۔ بہت اچھی ہوا آتی ہے۔ کمرے میں گرمی ہو تو باہر چارپائی پڑی ہے۔ ڈیرے سے رحمان کو بلا لیتا۔ بستر لگا دے گا۔“

”نہیں جی! یہیں ٹھیک ہے۔ میں کھڑکی کھول لوں گا۔ فکر نہ کریں۔“

”تم دن بھر سوتے رہے ہو۔ نیند جلدی نہیں آئے گی۔ کرسی نکال کر باہر آمدے میں بیٹھ جاؤ۔ ذرا دل بہل جائے گا۔“ فیض محمد نے شفقت کا اظہار کیا۔ ”روٹی کھا کر سو جانا۔ ابھی تو سمجھو، رات شروع ہوئی ہے۔“

وہ چلا گیا۔ لالی چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ زیادہ دیر اس کے پاس نہ ٹھہرے۔ وہ بیٹھا رہتا تو باتیں بھی کرنا پڑتیں۔ نت نیا جھوٹ بولنا پڑتا۔ لالی اس سے بات کرتے ہوئے کتراتا تھا۔ کم سے کم بولتا اور بت سنبھل سنبھل کر بولتا۔ اسے ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا کہ اس کا عامیانہ لب و لہجہ کہیں سارا بھرم نہ کھول دے۔

فیض محمد کے جانے کے بعد لالی کمرے سے باہر آ گیا۔ کچھ دیر خاموش کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا درختوں کے نیچے جا کر ٹھلنے لگا۔ گاؤں کی گھما گھما اب اجڑنے لگی تھی۔ سناٹا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی دور نہیں گیا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں ٹھٹھا رہا۔ رات دھیرے دھیرے تاریک ہوتی گئی۔ اسی اثناء میں برآمدے کی کھڑکی سے منہ نکال کر کسی عورت نے اسے مخاطب کیا۔ ”روٹی کھا لو باؤ جی!“

لالی خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ مگر وہاں بھاگ بھری نہیں، کوئی دوسری عورت کھڑی تھی۔ عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر سخت محنت اور خوراک کی کمی نے اس کی جوانی کا چراغ وقت سے پہلے ہی مدھم کر دیا تھا۔ لالی دسترخوان کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ عورت دروازے کے قریب کھڑی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مڑ کر اسے دیکھا۔

”کیا نام ہے تیرا؟“

”ریا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں جی رحمان کی گھر والی ہوں۔“

”ذرا پانی تو پلا۔“

ریا نے گلاس میں پانی بھر کر دیا۔ لالی نے پانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ریا نے برتن سمیٹے، دسترخوان اٹھایا اور چلتے چلتے لالی سے پوچھا۔ ”کوئی اور کام ہو تو جی بتا دیں۔ مجھے گھر جا کر ابھی اور کام کاج کرنا ہوگا۔“

”نہیں، اب تو جا۔“

ریا خاموشی سے گھر کے اندر چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ لالی ذرا دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر برآمدے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا اور کھڑکی کھول دی۔ پھونک مار کر لیٹ بچھا یا اور بستر پر دراز ہو گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ پٹنگ سے نیچے اتر ا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

پھر رات گزر چکی تھی۔ رات کے اندھیرے میں سنان گاؤں اوجھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ کھڑکی کے قریب کھڑے کھڑے اس نے سوچا کہ اب یہاں سے چلا جانا چاہئے۔ رحیم داد اس کا انتظار کر رہا ہو گا۔ مگر خالی ہاتھ رحیم داد کے پاس جا کر وہ کیا کرتا۔ جب تک رحیم داد کے جسم پر چیل کے قیدیوں کی وردی تھی اس وقت تک لالی کا ہر مقصد ا دھورا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے پر پہنچا، جو گھر کے اندر کھلتا تھا۔ اس نے دروازہ ہولے ہولے ہلایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ لالی کو سخت کوفت ہوئی۔ وہ خاموشی سے بستر پر جا کر لیٹ گیا اور کروٹیں بدلتے بدلتے سو گیا۔

سویرے بہت تر کے فیض محمد نے اسے بیدار کیا۔ اصرار کر کے باہر لے گیا۔ برآمدے سے نکل کر وہ لالی کے ہم راہ گھر کے پچھواڑے گیا، جہاں باڑے میں اس کے موٹی اور چوکھڑے۔ وہ ایک بھینس کے پاس گیا، جو کھوری میں منہ ڈالے سانی کھا رہی تھی۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ماتھے اور کھروں پر سفید نشان تھے۔ فیض محمد نے بھینس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر بڑے فخر سے بتایا۔ ”برخوردار! یہ بلحا ہے۔ اس کے کھروں اور متھے پر سفید سفید پھلیاں دیکھ رہے ہو۔ ایسی بچ کو بچ کلیان بھی کہتے ہیں۔ یہ دھری ہے۔ پکا بیس سیر دودھ دیتی ہے۔“

لالی خاموش رہا۔ فیض محمد آگے بڑھا اور ایک بھوری بھینس کی گردن جھک کر آہستہ آہستہ سہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بھی دھری ہے۔ اس کا کٹنا پچھلے دنوں مر گیا۔ صرف چارے پر دودھ دیتی ہے۔ یہ بھی اعلیٰ نسل کی بچ ہے۔“ اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ ”یہ نیلی باری مشہور ہے۔ بچ کلیان کے ساتھ میں اسے بھی میلے سے خرید کر لایا تھا۔ منہ مانگی قیمت دی تھی۔“

لالی نے بھوری بھینس کو غور سے دیکھا اور اس کی چکنی چکنی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”ماسٹری، یہ نیلی باری کی بچ ہے نا؟ یہ نیلی باری کیا ہوا جی؟“

”برخوردار، پہلے یہ سمجھ لو کہ بار کسے کہتے ہیں۔“ فیض محمد، آڑھتی سے فوراً اسکول ماسٹر بن گیا۔ ”بار، ایسے غیر مزروعہ اور بنجر علاقے کو کہتے ہیں، جس پر کھیتی باڑی نہ ہوتی ہو۔ مٹھری کسی زمانے میں ایسا ہی علاقہ تھا۔ اسے باری دو آب کہا جاتا ہے۔ یعنی راوی اور ستلج کے درمیان کا علاقہ۔ دراصل یہ بیٹھو ہے جس کا ایک ڈھلان راوی کی جانب ہے اور دوسرا ستلج کی جانب۔ پرانے زمانے کے جاٹوں نے باری دو آب کو چار باروں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ ہیں راوی باری، گنجی باری، ماس

بار اور نیلی بار۔“

”پر یہ نیلی بار کونسا ہوا ماسٹری؟“

”برخوردار! یہ تو تمہاری سمجھ میں آ گیا کہ بار کسے کہتے ہیں۔ اب آگے کی سنو۔ نہریں نکلنے سے پہلے، خاص طور پر نہر لونری باری دو آب سے قبل، باری دو آب کا علاقہ اس قدر زرخیز اور سرسبز و شاداب نہ تھا جیسا آج ہے۔“ ماسٹری فیض محمد نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ ”نیلی، دراصل دریائے ستلج ہی کا نام ہے۔ اس کا پرانا نام گھارا ہے۔ مگر اسے اب ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ تحصیل دیپال پور میں بھی ستلج ہی کہا جاتا ہے۔ لیکن ساتھ کی تحصیل پاک پتن میں اسے نیلی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ستلج کا پانی گرا نیلا ہے۔ اسی لیے اسے نیلی کہتے ہیں۔ نیلی بار بھی اسی نیلی سے پڑا۔“ اس نے ہلکا مقدمہ لگایا۔

”اب تو تمہاری سمجھ میں نیلی بار کا مطلب آ گیا۔“

لالی نے مسکرا کر مستعدی سے جواب دیا۔ ”بالکل آ گیا جی۔“ وہ ایک بار پھر بھوری بھینس کی پیٹھ سہلانے لگا۔

لالی کی یہ شیفتگی اور پیار دیکھ کر فیض محمد خوش ہوا۔ کہنے لگا۔ ”ابھی یہ کھا گاؤ تو نہیں ہوئی، پھر بھی اس کا دودھ گاڑھا ہوتا ہے۔ اس سے عجب طرح کی مٹک آتی ہے۔ ایسی سوندھی، سوندھی خوشبو کہ دودھ کا گلاس منہ سے لگاؤ تو تھانے کو جی نہ چاہے۔“

فیض محمد اپنی دوسری بھینسوں کے بارے میں دیر تک خوش ہو ہو کرتا رہا۔ آخر میں وہ گھوڑی کے پاس گیا اور اس کی خوبیاں گنانے لگا۔ دھوپ درختوں سے نیچے اترنے لگی تو وہ باڑے سے لالی کے ہم راہ واپس کمرے میں آیا۔ ناشتا تیار تھا۔ ذرا ہی دیر میں لگا دیا گیا۔ دونوں نے بیٹھ کر ناشتا لیا۔

ناشتے پر بھی فیض محمد اپنی بھینسوں اور دوسرے مویشیوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ لالی نے ان کی گفتگو میں دلچسپی کا اظہار کیا اور جان بوجھ کر ناشتا دیر تک کرتا رہا۔ وہ صبح کی لاری سے سفر رنات نہ چاہتا تھا۔ فیض محمد نے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی، بلکہ بار بار یہی اصرار کرتا رہا کہ سے رحمت سے مل کر ہی جانا چاہئے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر وہ زیادہ دیر لالی کے پاس نہ ٹھہرا۔ ہوا یہ کہ اس کے کچھ ملنے والے آگئے۔ سامنے انھیں کمرے کے اندر نہیں بلایا۔ دروازہ کھول کر برآمدے میں گیا اور ان کے ساتھ نقول کے۔ نجم پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ دیر تک آہستہ آہستہ باتیں کرتا رہا اور ان کے ساتھ

چار دیواری تھی۔ اس کا پھانک بند تھا اور پھانک کے عین سامنے مویشیوں کا رکھوالا چارپائی ڈالے سو رہا تھا۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لالی ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات سناٹا تھی۔ لالی گوگمو کے عالم میں تھا۔ یکایک عقب میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو ہوش اڑ گئے۔ فیض محمد آہستہ آہستہ اسی طرف آ رہا تھا۔ لالی جہاں تھا وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ وہ قریب آکر ٹھہر گیا۔ مگر نہ اس نے کسی شک کا اظہار کیا نہ حیرت کا۔ حسب معمول نرم لمبے میں بولا۔

”برخوردار! تم یہاں ہو۔ بیٹھک میں تمہیں نہ پایا تو طبیعت پریشان ہوئی۔ خیریت تو ہے۔ تم اتنی رات گئے ادھر کیسے آ گئے؟“ وہ دم بھر کے لیے رکا اور جلد ہی بے تکلفی سے مسکراتے لگا۔ ”مجھ گیا۔ سگریٹ کی طلب نے ستایا ہو گا۔ ماچس نہیں ہو گی۔ دنیو کے پاس ماچس لینے آئے ہو گے۔ یہی بات ہے نا؟“

لالی کو اس کی نیک نفسی اور سادہ دلی پر پیار آ گیا۔ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا۔ ”بات تو جی، کچھ ایسی ہی تھی۔“

”میرا اندازہ غلط نہیں ہوتا۔“ وہ بدستور مسکراتا رہا۔ ”مجھے اس وقت یہاں دیکھ کر تمہیں بھی سخت حیرت ہو گی۔ مجھے تو اس وقت حجرے کے اندر وظیفہ پڑھنے میں مشغول ہونا چاہئے تھا۔ باہر کیسے آ گیا؟ یہی بتانے تمہارے پاس آیا تھا۔“

مویشیوں کا رکھوالا دونوں کی باتیں سن کر بیدار ہو گیا تھا اور حیران و پریشان آنکھیں پھاڑے انھیں دیکھ رہا تھا۔ مگر فیض محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ لالی کو مخاطب کیا۔ ”آؤ، بیٹھک میں اطمینان سے باتیں ہوں گی۔“ وہ مڑا اور لالی کے ہم راہ چپ چاپ چلتا ہوا بیٹھک میں پہنچ گیا۔ لالی کو کمرے میں چھوڑ کر وہ گھر کے اندر گیا اور ماچس ہاتھ میں لیے واپس آ گیا۔ اس نے لیپ روشن کیا اور میز کے قریب کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ لالی بستر پر لیٹا لگا بیٹھا تھا۔ ذرا دیر توقف کرنے کے بعد فیض محمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

”برخوردار! آج عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں وظیفہ کا ورد کر رہا تھا۔ خلاف معمول نیند کا ایسا زبردست جھوٹا آیا کہ آنکھ لگ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں، ایک بزرگ سامنے کھڑے ہیں۔ سفید براق لباس، چہرے کے گرد نور کا ہالہ، آنکھوں میں ایسا جلال کہ نظریں خود بخود جھک گئیں۔ کیا بتاؤں، کیا ثناء، تم، ان کی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”چند لمبے وہ خاموش کھڑے میری جانب دیکھتے

ہی اٹھ کر کہیں چلا گیا۔

دوپہر کو وہ لالی کے پاس آیا اور اس کے لیے سگریٹ کے پیکٹ اور ایک کنگھا بھی لایا۔ دونوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھایا۔ مگر خلاف معمول وہ چپ چاپ تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ اس نے کھانا بھی رغبت سے نہیں کھایا۔ چند لمبے کھا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اس نے خود ہی اپنی پریشانی کا سبب بتایا۔ ”میرے فشی کا آج صبح انتقال ہو گیا۔ کل شام تک بالکل بھلا چنگ تھا۔ رات کو ٹھیک ٹھاک سویا۔ فجر کے وقت سینے میں ایسا شدید درد اٹھا کہ چٹ پٹ ختم ہو گیا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ ”اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا نیک اور مخفی بندہ تھا۔ عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ یہی کوئی چالیس سال کا ہو گا۔ چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ وہ چند لمبے خاموش رہا۔

”انھیں بیس اپنے پاس لے آؤں گا۔ مگر ان پر قیمتی کا جو داغ لگ چکا ہے، اسے کون مٹا سکتا ہے۔“

لالی چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ فیض محمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”قریب ہی کے پنڈ میں رہتا تھا۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔ شاید شام تک واپس نہ آسکوں۔ دیر ہو جائے تو میرا انتظار نہ کرنا۔ شام کو جانا تو رحمان یا کسی نوکر کو بتا دینا۔ ویسے میں چاہتا ہوں، تم آج کی بجائے کل صبح کی لاری سے جاؤ۔ بولو، کیا ارادہ ہے؟“

”آپ کہتے ہیں جی تو میں کل صبح ہی چلا جاؤں گا۔“

فیض محمد نے اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں کی۔ چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی دیر تک خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا اور شام تک سو رہا۔

عشاء کی نماز سے کچھ پہلے فیض محمد تھکا ہارا واپس آیا۔ لالی سے اس کی زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ چند منٹ ٹھہر کر وہ وظیفہ پڑھنے اپنے حجرے میں چلا گیا۔

رات کا کھانا کھا کر لالی کمرے سے باہر نہیں گیا۔ اس نے لیپ چھوٹک مار کر بچھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

☆

بیٹھک کا دروازہ کھول کر لالی خاموشی سے باہر نکلا اور دبے قدموں چلتا ہوا گھر کے پچھواڑے گیا۔ مویشیوں کے باڑے پر پہنچا۔ باڑا مویشیوں کے عام ڈھارے کی طرح کانہ تھا جس پر بارش اور سردی سے بچاؤ کے لیے چھپر ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ باڑا احاطے کی مانند تھا جس کے گوشہ آدم

رہے۔ پھر حکم دیا، فیض محمد! اپنی بیٹی طاہرہ کو اس نوجوان کے حوالہ عقد میں دے دے جو دو روز سے تیرا سمان ہے۔ نافرمانی کرے گا تو رائدہ درگاہ ہوگا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اب تک وہ آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔“

لالی بھونچکا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ ماسٹر فیض محمد نے اسے خاموش پایا تو نہایت شفقت سے کہا۔ ”بھئی! اس میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ضرور ہے۔ میں نے بہت غور کیا تو یہ نکتہ ہاتھ آیا۔ تمہارے سر پر کسی کا سایہ نہیں۔ پریشان حال بھی ہو مگر نیک اور سعادت مند ہو۔ میرا معاملہ یہ ہے کہ مجھے بھی بیٹی کی فرض سے بسدوش ہونا ہے۔ کسی نہ کسی کے ساتھ تو اس کا پلو باندھنا ہی ہوگا۔ ویسے خاندان میں کئی لڑکے ہیں۔ پڑھے لکھے اور برسر روزگار بھی ہیں۔ لیکن مجھے تو تمہارے لیے حکم ملا ہے۔ تمہیں اپنی فرزندگی میں لینے پر مجھے خوشی ہوگی۔ تم میرے پاس رہو گے، کاروبار میں ہاتھ بٹاؤ گے، میرا سہارا بنو گے۔ میرے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“

اس نے ایک بار پھر کھٹک کر گلا صاف کیا۔ ”عزیزم! میری طرف سے تو ہاں ہے۔ رہ گئی تمہاری مرضی، تو جو چاہو، اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ ہم دونوں ہی کے لیے تائید نہیں ہے۔“ لالی پھر بھی کوئی جواب نہ دے سکا۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر گہری خاموشی چھائی رہی۔ آخر فیض محمد کی آواز ابھری۔

”برخوردار! کیا اس خاموشی کو میں تمہاری مرضی سمجھوں؟“

اب لالی کے لیے خاموش رہنا ممکن نہ رہا وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں کیا بتاؤں جی! میں تو کچھ بھی نہیں سوچ سکا۔“

”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔“ فیض محمد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”سوچ لو۔ اچھی طرح سوچ لو۔ تمہیں حق حاصل ہے، جو چاہو اور جیسا چاہو، اپنے بارے میں فیصلہ کرو۔“ اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے لالی سے پوچھا۔ ”تمہاری گھڑی میں کیا بج رہا ہے؟“

لالی نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر بتایا۔ ”ساڑھے چار۔“

فیض محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب تم سو جاؤ۔ میں تو اب سو نہ سکوں گا۔ کچھ ہی دیر میں صبح ہو جائے گی۔ مسجد میں فجر کی نماز ادا کروں گا اور صبح کی بس سے منڈی چلا جاؤں گا۔ تم سے شام کو واپسی پر ملاقات ہوگی۔ تمہارے پاس خاصا وقت ہے۔ اچھی طرح غور کرو۔ جو بھی فیصلہ کرو، مجھے بے جھجک بتا دنا۔“

اس نے لالی کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ گھر کے اندر جانے کے بجائے بیٹھک کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ لالی نے سوچا تھا کہ اس کے جانے کے بعد چپکے سے نکل جائے گا۔ مگر اب اس کی گنجائش نہ تھی۔

صبح ہونے والی تھی اور فیض محمد ابھی باہر ہی تھا۔ اس نے سونے کی کوشش کی مگر بے چین رہا۔ ٹھیک سے نیند نہیں آئی۔ دن میں بھی وہ بے چین رہا۔

شام کو فیض محمد کی واپسی ہوئی۔ وہ روز کی طرح مسکراتا ہوا لالی کے پاس آیا اور نہایت شفقت سے مخاطب ہوا۔ ”کچھ تھکے تھکے نظر آرہے ہو۔“ اس نے توقف کیا اور لالی کے جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی وضاحت کی۔ ”بات یہ ہے کہ تم کہیں آتے جاتے بھی تو نہیں، تمام وقت تو کمرے میں رہتے ہو۔ ذرا باہر نکلا کرو۔ مگر سوال یہ ہے کہ کس کے پاس جاؤ، کہاں جاؤ؟ تمہارا کوئی ملنے جلنے والا بھی یہاں نہیں ہے۔ یہاں رہو گے تو سبھی سے میل ملاپ پیدا ہو جائے گا۔“

لالی چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

فیض محمد کچھ دیر خاموش رہا پھر یوں گویا ہوا۔ ”برخوردار! تم بہت کم گو ہو۔ مجھے تمہاری یہ ادا پسند بھی ہے۔ مگر نوجوانوں کو اتنا خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ ہنس بولا کرو۔ کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ رہو گے تو بولنے کی بھی عادت پڑ جائے گی۔ بھئی! میں زیادہ دیر خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ سخت الجھن ہوتی ہے۔ اور تم سے باتیں کر کے تو دل بہت خوش ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، تین روز نہیں، تمہارے ساتھ تین برس بیت گئے۔“

وہ بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ مگر فیض محمد سے زیادہ دیر خاموش نہ رہا گیا۔ وہ حرف مطلب پر آگیا۔ ”برخوردار! کیا فیصلہ کیا تم نے؟“ پھر خود ہی بولا۔ ”فیصلہ کیا کرنا ہے۔ بھئی میں نے تو یہ سمجھ لیا ہے کہ میرا کوئی بیٹا نہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہارے روپ میں مجھے بیٹا دے دیا۔ میری دو بیٹیاں ہیں۔ بڑی تو بیابہ کرپشاور چلی گئی۔ سال دو سال میں آتی ہے۔ سمجھو وہ تو غیر ہو گئی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔

”ہاں تو برخوردار! تم نے کیا سوچا؟“

لالی سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ پچھلی رات سے جس سوال نے اسے الجھن میں ڈال رکھا تھا وہ ہنوز جواب کا محتاج تھا۔ لالی میں نہ صاف انکار کرنے کی جرات تھی نہ وہ اپنے بارے میں اصل حقیقت سے آگاہ کر سکتا تھا۔ دونوں ہی صورتوں میں اس کے دل کو زبردست نہیں لگتی۔ لالی اسے کسی طور دکھ پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے اپنے جرائم پیشہ ہونے کا کبھی اتنی شدت سے احساس نہیں

ہوا تھا۔ وہ دلدل میں گر گیا تھا۔ اس دلدل سے نکلنے اور صاف ستھری زندگی بسر کرنے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ مگر وہ اس دلدل میں اتنا دھنس چکا تھا، اس قدر لت پت ہو گیا تھا کہ اس موقع سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اسے سب سے بڑا دکھ اس بات کا تھا کہ جس زندگی کے اس نے کبھی سنا خواب دیکھے تھے، وہ خود چل کر اس کے گھر آئی تھی۔ مگر وہ دروازے کے پت کھول کر اس کا خیر مقدم نہیں کر سکتا تھا۔

لالی کو خاموش اور گم دیکھ کر فیض محمد نے کہا۔ ”برخوردار! جو کہتا ہے صاف صاف کہہ دو۔ تم انکار کر دو گے تو میں یہی سمجھوں گا کہ مجھی میں کوئی خامی ہوگی۔ تمہیں میں اچھا سمجھتا ہوں، ہمیشہ سمجھتا رہوں گا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”مجھے جو حکم ملا، اس کی تعمیل میں سر جھکا دیا۔ اپنی پگڑی تمہارے سامنے ڈال دی۔ بیٹی باپ کی عزت ہی ہوتی ہے۔“ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں کے پیانے جھلک اٹھیں گے۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ جھک کر اس کے پیر پکڑ لے اور اسے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے۔ وہ بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ فیض محمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔

”معلوم ہوتا ہے میری باتیں تمہیں ناگوار گزریں؟“

لالی کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ ”ہرگز نہیں۔ جو آپ کا فیصلہ، وہی میرا فیصلہ ہے جی۔“ وہ تڑپ کر اٹھا اور لالی کو گلے سے لگایا۔ چند لمحوں تک وہ لالی کو گلے سے لگائے خاموش کھڑا رہا۔ لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ رو رہا ہے۔ اس کے جسم کی حرارت میں باپ کے پیار کا لاڈ تھا۔ اس نے شفقت سے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کی پیشانی چومی۔ ”تم نے میری لاج رکھی۔ مجھے حکم عدولی کے عذاب سے بچا لیا۔“ لالی سر جھکائے نہایت سعادت مندی سے کھڑا رہا۔

فیض محمد نے لمحہ بھر خاموش رہ کر کہا۔ ”نیک کام میں تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ کسی دھوم دھام کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ وظیفے سے فارغ ہوتے ہی مسجد کے ملاجی کے پاس جاؤں گا۔ نمازیوں میں گواہ اور وکیل بھی مل جائیں گے۔ فجر کی نماز کے بعد نکاح ہو جائے گا۔ مجھے یہی بشارت ہوئی تھی۔“

وہ لالی کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وظیفہ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ گھر کے اندر چلا گیا۔

لالی بے چینی سے کمرے میں ٹپٹپٹ لگا۔ اس نے فیض محمد کا دل رکھنے کے لیے ہامی تو بھری تھی مگر اسے نباہ نہیں سکتا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد اس گھر سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔

رات کو لالی سے کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ دو چار لقموں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ پٹنگ پر خاموش بیٹھا

رہا اور بار بار گھڑی دیکھتا رہا۔ اسے رات تاریک اور گلی کو بچے سنانا ہو جانے کا انتظار تھا۔ کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ لالی نے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ عین اس وقت گھر کے اندر جانے والے دروازے کا ایک پت آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ کوئی دروازے کی اوٹ میں دبکا کھڑا تھا۔

لالی حیران و پریشان بیٹھا اس جانب دیکھتا رہا۔ ذرا دیر بعد ایک نوجوان لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور سر جھکا کر لالی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنا بدن سفید چادر سے چھپائے ہوئے تھی، صرف چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کھلتا ہوا پیچی رنگ، سبک نقش و نگار، ابھری ہوئی سیاہ آنکھیں۔ وہ اچھی خوش شکل لڑکی تھی۔

لالی نے انکل سے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ ”تم طاہرہ تو نہیں ہو؟“

”ہاں میں طاہرہ ہوں، ماسٹری کی بیٹی۔“

”تم اتنی رات گئے یہاں کس لیے آئی ہو؟“

اس دفعہ طاہرہ نے گردن اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ تیوری پر پل ڈالا اور ایک دم پھٹ پڑی۔ ”یہ کہنے آئی ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔“

لالی سٹپٹا کر رہ گیا۔ حیران ہو کر بولا۔ ”کیوں؟“

”اس لیے کہ میں تمہارے ساتھ شادی وادی کا ڈھونگ رچانا نہیں چاہتی“ وہ ویسے ہی تکیے لہجے میں بولی۔ ”تم مجھے بالکل پسند نہیں۔ تم صورت سے اجڑا اور لوفر لگتے ہو۔“ اس نے غصے سے لالی کو گھورا۔

”جاؤ یہاں سے نکل جاؤ۔“

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”دھیرے بولو۔ ماسٹری آجائیں گے۔“

”آجائے دو۔ مجھے کسی کی پروا نہیں ہے، نہ تمہاری، نہ ابا جی کی۔ میں کسی سے ڈرتی نہیں۔ سنا نہ۔“

لالی جل کر بولا۔ ”مجھے سنانے کیوں آئی ہو، جاؤ، جا کر اپنے ابا جی کو سناؤ۔“

”میں ان کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ طاہرہ نے تکیے نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میں تم سے تکررے آئی ہوں۔ یہ بتانے آئی ہوں کہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی، نہیں چاہتی۔“

”نہ کرو۔ میں نے تمہارے آگے ہاتھ نہیں جوڑے، پیروں پر پگڑی نہیں ڈالی۔ نہ کبھی تمہیں اسے میں چھیڑا، نہ آنکھ ماری، نہ سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، اوئے سو بنیو! ہم تو کتل ہو گئے۔ میں نے

تو....

”ارے ارے۔“ طاہرہ اس کی بات کاٹ کر حیرت سے بولی۔ ”تم تو بالکل لفٹکے ہو۔“ وہ ایک بار بھر دھاڑنے لگی۔ ”تم یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے؟ جاؤ ابھی چلے جاؤ۔“ پہلی نظر میں وہ طاہرہ کو بھولی بھالی شرمیلی دوشیزہ سمجھا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اس قدر تیز اور طرار ہوگی۔ مگر جب وہ اپنی تمام تیزی اور طراری کے ساتھ کھل کر سامنے آگئی تو لالی نے دل ہی دل میں کہا۔ چھوہری تو زوردار ہے۔ اب اسے طاہرہ کو چھیننے میں مزا آنے لگا۔ ”میں تو نہیں جاؤں گا۔ بیس رہوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ ٹانگیں پیار کر بستر پر لیٹ گیا۔ طاہرہ کو مخاطب کر کے بولا۔

”کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔ آرام سے گل بات کرو۔“

وہ اسی طرح خفگی سے بولی۔ ”میں یہاں بیٹھے نہیں آئی ہوں۔ تم سے صاف صاف یہ کہنے آئی ہوں کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔“ چند لمحوں کے بعد رک کر اس نے کہا۔ ”ذرا اپنی شکل تو دیکھو۔ کسی خطرناک غنڈوں کی سی مونچیں ہیں۔ اونہہ!“ طاہرہ نے تحارت سے منہ بگاڑا۔

گمر لالی بالکل ناراض نہ ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ کل صبح منڈوا دوں گا۔ تم چاہو تو استرا لا کر ابھی مونڈ دو۔ لے آؤ اسی بات پر استرا!“

طاہرہ نے غصے سے گردن ہلائی۔ ”گویا مونچیں منڈوا کر تم گل فام بن جاؤ گے اور میں تمہیں اپنا سرتاج بنا لوں گی۔ چغدا! احمق کیس کا۔“

”نکالو، نکالو جتنی چاہے گالاں نکالو۔ کل صبح کے بعد تم سے پوچھوں گا۔“

”کیا کرو گے تم؟“

لالی اٹھ کر پٹنگ پر بیٹھ گیا۔ گردن ذرا اسی اکڑا کر نخوت سے بولا۔ ”کل صبح میں تمہارا کسم بن جاؤں گا۔“

”ختم!“ وہ تمللا کے بولی۔ ”تم غنڈے ہو۔ بالکل تھرڈ کلاس غنڈے۔“

لالی نے مطلق ناگواری ظاہر نہیں کی۔ قمیص کی آستین چڑھائی اور طاہرہ کو اپنے بازو کی مچھلیاں دکھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ دیکھ رہی ہو؟ نزدیک آ جاؤ۔ چھو کر دیکھو۔“

”دیکھ رہی ہوں، دیکھ رہی ہوں۔ تم دور رہی سے اچھے خاصے مسئلے نظر آتے ہو۔“

”میں تمہیں اپنے بازو اس لیے دکھا رہا ہوں۔“ لالی نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ ”کل صبح کے بعد تم

نے کڑکڑکی تو سمجھ لینا۔ ایک چپہرہ ادھر سے لگاؤں گا دوسری ادھر سے۔“ لالی نے ہاتھ گھما گھما کر خبردار کیا۔

”اوپر سے ایک ٹھڈا بھی لگاؤں گا۔ وہ جاؤگی دور تک گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی۔ ساری کڑکڑ نکل جائے گی۔“

”کیا کہا؟ تم مجھے مارو گے؟“ اس نے تہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”وحشی، درندے! بے غیرت! تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی؟ تم تو بالکل جنگلی ہو۔“

لالی نے مصالحت کرنے کے انداز میں کہا۔ ”چلو، نہیں ماروں گا۔ اب تو غصہ تھوک دو۔ جو تم کوگی، وہ کروں گا۔ مونچیں بھی منڈوا دوں گا۔ ایک دم صفا چٹ۔ بال بھی نئے اسٹائل کے بتاؤں گا۔ کیفٹ اور پتلون تو پہلے ہی پہنے بیٹھا ہوں۔ بولو اب تو میری گھروالی بننا منظور کر لو گی؟“

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تھکی ہوئی سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دفعہ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔ ”کیا واقعی تم سمجھتے ہو کہ تمہارے ساتھ میری شادی ہو جائے گی؟“

”سمجھنا کیا، سولہ آنے کی گل ہے۔“

طاہرہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ پھر دفعتاً ”اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔“ اچھا تو پھر یہ بھی سن لو بلکہ اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لو۔“ اس نے اپنے بدن سے چادر اتار کر میز پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا پھولا ہوا پیٹ دکھا کر بولی۔ ”یہ کسی کی امانت ہے اور جس کی یہ امانت ہے میں اسی کی امانت ہوں۔“

لالی بھونچکا رہ گیا۔ چند لمحوں خاموش رہا۔ پھر اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ ”کس کا ہے؟“

”کسی کا بھی ہے۔ تمہارا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

”کیوں نہیں ہے، بالکل ہے۔“ لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”زیادہ کڑکڑ نہ کرو۔ صاف صاف بتاؤ۔“

”چلو، یہ بھی سن لو۔“ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ ”میں لمبو میں اپنی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ وہاں کالج میں پڑھتی تھی۔ کالج کے ایک پروفیسر مجھے گھر پر بھی پڑھاتے تھے۔ مجھے ان سے محبت ہو گئی۔ وہ بھی مجھ سے دیوانوں کی طرح محبت کرنے لگے۔“ یہ کہتے کہتے وہ یادوں کے سہارے بہت دور نکل گئی۔ ”ایک لمحے کی جدائی بھی برداشت نہ ہوتی۔ گھر اور کالج کے باہر بھی ہم چھپ چھپ کر ملتے۔ کبھی....“

لالی بات کاٹ کر بولا۔ ”شالیمار باغ اور لارنس گارڈن میں اس کے ساتھ ٹھک ٹھک کر گانے بھی گاتی ہوگی؟“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا۔ ”یہ تو فلمی باتیں ہوئیں۔ آگے بتاؤ؟“

”آگے جو کچھ ہوا، وہ تمہارے سامنے ہے۔“

”اسے بھی دیکھ لیا۔ اور آگے بتاؤ۔“

”پروفیسر کی ایک بیوی پہلے سے موجود ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ مگر مجھے اس کی دوسری بیوی بننا منظور ہے۔ میں اس کی محبت میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں، لیکن اباجی تیار نہیں ہیں۔ وہ میری تعلیم ادھوری چھڑا کر مجھے گھر لے آئے۔ اب تمہارے سر منڈھنا چاہتے ہیں مجھے، تاکہ ان کی بدنامی نہ ہو۔“

لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”میں تو جی تم سے یہی کہوں گا، تمہیں بھی چاہئے کہ ماسٹر کی بدنامی نہ ہو۔ وہ بہت چنگے بندے ہیں۔ فرشتے، ہیں فرشتے، اتنے نیک اور بھلے مانس کہ جی چاہتا ہے ان کے پیر دھو کر پیوں۔“ لالی نے دل کی بات صاف صاف کہہ دی۔

طاہرہ کے چہرے پر چند لمحوں کے لیے غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس میں حیا بھی تھی اور دبا دبا کرب بھی تھا۔ وہ ذرا دیر تک اسی عالم میں بیٹھی رہی، مگر جلد ہی غم کا سایہ آہستہ آہستہ اس کے چہرے سے ہٹ گیا۔ غصے اور نفرت کی کڑی دھوپ چھا گئی۔ ”تم نے زے چغہ ہو۔ تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ میں اباجی کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ نہ وہ فرشتے ہیں نہ اتنے بھلے مانس جتنا تم انھیں سمجھ رہے ہو۔“ طاہرہ نے قدرے تامل کیا۔

”وہ ایک نمبر فراڈ ہیں۔ پہلے تو انھوں نے چار سو بیسی کر کے بوگس کلیم منظور کرایا، پرائمری اسکول کے معمولی ماسٹر سے بڑے زمین دار بن گئے۔ پھر غلے کی آڑ میں کاروبار شروع کر دیا۔“ اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”سن رہے ہو؟“

”ہاں جی، بالکل سن رہا ہوں۔ کہتی جاؤ۔“

”اچھا تو اب یہ بھی سن لو۔ آڑ میں کا تو صرف ہمانہ ہے۔ وہ سٹنگ کرتے ہیں۔ ادھر سے کنگ اور چینی سرحد پار بھیجتے ہیں ادھر سے ہندوؤں کی بیمار اور بوڑھی گائیں بھیجیں لاتے ہیں۔ قصائیوں کے ہاتھ بیچ کر ان کا سٹرل گوشت لوگوں کو کھلاتے ہیں۔ دن بھر سٹنگ کا دھندا کرتے ہیں۔ رات کو وظیفے پڑھ پڑھ کر اپنے گناہ بخشواتے ہیں۔“ طاہرہ کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ ”سن لیا تم نے وہ کتنے نیک اور فرشتہ ہیں؟“

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے قلابازی کھا گیا ہو۔ اسے دکھ بھی ہوا، حیرت بھی ہوئی۔ مگر تا

کے ذہنی خلفشار سے بے نیاز بولتی رہی۔ ”اب تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ وہ تمہیں اپنے سٹنگ کے دھندے میں ایجنٹ کے طور پر استعمال کریں گے تاکہ سنجے زور بارڈر پولیس کے ساتھ گولی چلے تو تمہی مارے جاؤ، تمہی جیل جاؤ۔ مگر یہ سلسلہ بھی چند ہی مہینے چلے گا۔ میرے بچے کی پیدائش کے بعد وہ کسی مقدمے میں پھنسا کر تم سے فارغ خطی لکھوا لیں گے اور میرا بیاہ اپنے بھتیجے سے کر دیں گے۔ وہ بد صورت ہے اور ایک ٹانگ سے لنگڑا بھی۔ مگر بہت بڑی زمین داری اور جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ اپنی یہ سکیم وہ آج ہی شام ماں جی کو بتا چکے ہیں۔“ اس نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

”تم نے سب کچھ سن لیا۔ اب بتاؤ، کیا تم ایسی لڑکی سے شادی کر لو گے جس کے پیٹ میں کسی اور کا بچہ ہے؟“

”کتنے دن کا ہے؟“ لالی نے اس کے پھولے ہوئے پیٹ کی جانب دیکھ کر کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“

”چھ سات مہینے سے تو کم کا نہیں لگتا۔“

”شاید!“ طاہرہ نے مختصر جواب دیا۔

لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ ”صرف تین مہینے کی تو بات ہے۔ فیروز سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“

طاہرہ نے لالی کو خوں خوار نظروں سے دیکھا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ ”تم عجیب بے غیرت انسان ہو۔ تم ایسا بچہ قبول کر لو گے؟“

”کر لوں گا، ضرور کر لوں گا۔ حرج ہی کیا ہے جی!“ وہ نہایت ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔ ”ویسے سچ پوچھو تو یہ میرا معاملہ ہے بھی نہیں۔ اولاد کے بارے میں صرف ماں بتا سکتی ہے کہ اس کا بیٹا کون ہے۔ میں کس کا پتر ہوں، یہ بات میری ماں بتا سکتی تھی۔ تم کس کی دھی ہو، یہ بات بھی ماسٹر جی نہیں، تمہاری ماں بتا سکتی ہے۔ غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں میں؟“

طاہرہ نے زچ ہو کر کہا۔ ”جو کچھ تم کہہ رہے ہو، ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے۔“ وہ مذہال ہو کر پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

لالی بھی خاموش رہا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اب لالی کو وہاں سے چلا جانا چاہئے تھا۔ اس نے طاہرہ کو پھر چھیڑا۔

”تم یہاں کیوں بیٹھی ہو؟ اندر جاؤ۔ وٹاٹلو، خوشبو لگاؤ، ریشمی پٹاگل پہنو، سرخ، تمہی اوڑھو،

سنگھار کرو۔ سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آتا۔ وہی بن کے آتا۔ میں تمہارا گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔ گھنڈ چکانی دوں گا۔

طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔ پھر اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ اس نے لالی کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”کو تو تمہارے پیروں پر سر رکھ دوں۔ خدا کے لیے میرے ساتھ شادی کا خیال دل سے نکال دو۔“

”اپنے ابا جی سے کیوں نہیں کہتیں؟ ویاہ تو انھوں نے ہی طے کیا ہے۔“

”کہہ چکی ہوں“ ان سے بار بار کہہ چکی ہوں۔ ان کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔ ماں جی کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ جب سے سنا ہے بے چاری بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ”طاہرہ زری سے بولتے بولتے اچانک دھیمی پڑ گئی۔ اس نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا اور غم زدہ ہو کر بولی۔ ”تم اتنے سنگدل کیوں ہو؟ تم مجھ سے شادی کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ تمہیں مجھ سے محبت بھی نہیں ہے۔“

”ہرگز نہیں۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلادی۔ ”سیدھی سیدھی معاملے کی بات یہ ہے کہ اب تو میں ماسٹر جی سے اپنا ٹیکس وصول کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے مجھ سے چار سو بیسی جو کی ہے۔“

طاہرہ چونک پڑی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی۔ جھٹ اپنے کانوں سے سونے کے جھمکے اتارے، ہاتھوں کے کنگن اتارے اور انھیں لالی کی طرف بڑھا کر بولی۔ ”لو یہ لے لو۔ یہ تمہارا ٹیکس ہے۔ اب یہاں سے چلے جاؤ۔“ لالی نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ طاہرہ تھملا کر بولی۔ ”قسم کھا کر کہتی ہوں، زہر کھالوں گی، خودکشی کروں گی مگر تمہارے ساتھ شادی نہیں کروں گی، نہیں کروں گی۔“

”زیور پہن لو۔ زہر کھانے اور خودکشی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ لالی نے اس دفعہ نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”میں یہاں سے ابھی چلا جاؤں گا، پر ایک شرط پر۔“

”کیا شرط ہے تمہاری؟“ طاہرہ کے چہرے پر خوشی سے پھول کھل اٹھے۔

”مجھے تمہاری نہیں، تمہاری بوری کی ضرورت ہے۔ وہ پکا اٹھارہ سیر دودھ دیتی ہے اور تمہارے پیٹ میں....“

طاہرہ بات کاٹ کر بولی۔ ”ایک نہیں تم دو لے جاؤ۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جاؤ، جا کر نکال لاؤ دونوں کو اور یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں صرف بوری کی لالوں گا۔ مگر اسے لینے میں نہیں جاؤں گا۔ وہاں راکھا موجود ہے۔ تم خود

جاؤ اور مجھے لے کر آ جاؤ۔“

”مگر وہ مجھے بھی نہیں لے جانے دے گا۔ میں اس سے کہوں گی کیا؟“

لالی اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ”یہ میں نہیں جانتا۔ مجھے نکال کر تم ہی لاؤ گی اور میرے ساتھ ساتھ پنڈ کے آخری سرے تک جاؤ گی۔ بولو کیا کہتی ہو؟ اگر یہ کام کر سکتی ہو تو جلدی کرو۔ نہیں تو اندر جاؤ، مجھے سونے دو۔ صبح نکاح کے بعد تم سے ملوں گا۔“

طاہرہ کا دلکتا ہوا چہرہ ایک بار پھر سونا پڑ گیا۔ ”تم یہ تو سوچو۔ میں اسے کیسے نکال کر لا سکتی ہوں۔“ وہ گڑگڑانے لگی۔ ”خدا کے لیے مجھے بتاؤ، میں کیا کروں؟“

لالی نے اس کا پریشان چہرہ دیکھا اور کھل کر مسکرایا۔ ”تم مجھے بے وکوف، پند، اٹک، جنگلی اور نہ جانے کیا کیا کہہ چکی ہو۔ پر تم نے یہ بھی سوچا، خود تمہارے پاس کتنی سمجھ ہے۔ اگر تمہارے پاس سمجھ بوجھ ہوتی تو یوں کہیں کی طرح پیٹ پھلائے نہ بیٹھی ہوتیں۔“ اس نے کچھ تامل کیا۔ حقارت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”ماسٹر جی دھنیے پڑھتے ہیں، بیٹی شٹک لڑاتی ہے اور میں بے وکوف ہوں۔ اٹک اور جنگلی ہوں۔“

طاہرہ خاموش بیٹھی اس کی جلی کٹی سنتی رہی۔ لالی اسے مخاطب کر کے بولا۔ ”اس طرح یہاں بیٹھے رہنے سے کام نہیں چلے گا۔ یہ بتاؤ آس پاس کے کسی پنڈ میں تمہارا کوئی شریک، کوئی رشتہ دار ہے۔ ماں، چاچا، ماما، کوئی نہ کوئی تو ہو گا؟“

طاہرہ نے جھٹ جواب دیا۔ ”ماموں ہیں۔ چھ میل ادھر ایک چک میں رہتے ہیں۔ مگر وہ ہمارے گھر کم آتے ہیں۔ سگے ماموں نہیں ہیں۔“

”سگے، سوتیلے کی چھوڑو۔ بیچھے سے کام لو بیچھے سے۔ ماں جی تو تمہاری ہی طرف دار ہیں نا؟“

”بالکل ہیں۔ انھوں نے ہی تو مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔“

”تو بس تم سیدھی ان کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو کہ وہ راکھے کو ماماں کو بلانے بھیج دیں۔ وہ ادھر جائے اور ادھر تم بوری کی نکال کر لاؤ۔ بن گیا دونوں کا کام۔“

طاہرہ نے خوش ہو کر گردن ہلائی۔ ”یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔“ اس نے موج میں آ کر چٹکی بجائی۔ ”بالکل ٹھیک ہے۔“

”خانی پیلی ٹھیک کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جاؤ اور بوری کی لے کر فافٹ آ جاؤ۔“

طاہرہ جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ ”اور دیکھو

”وہ کس لیے؟“

”جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔ سچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ اے ایسے ہی نہیں لے جاؤں گا۔ اس کے ساتھ چاک یا گوجر بن کر جاؤں گا۔ آیا بھیجے میں؟ اور ہاں دیکھو۔ جاتے ہی ماسٹر جی کے حجرے کی زنجیر یا ہر سے چڑھا کر اس میں چپکے سے تالا ڈال دیتا۔ ہر کام چوکس ہونا چاہئے۔“

طاہرہ چلی گئی۔ لالی بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پندرہ منٹ بعد طاہرہ واپس آئی، مسکراتے ہوئے بولی۔ ”رکھو اچلا گیا۔ کم بخت بڑی مشکل سے گیا۔ جب میں نے اور ماں جی نے نوکری سے نکال دینے کی دھمکی دی تب گیا۔“ اس نے بغل میں دبے ہوئے کپڑے لالی کو دے دیے۔ ایک لٹا بھی لائی تھی، وہ بھی دے دی۔

لالی نے ساری چیزیں لے کر کہا۔ ”اب اندر جا کر تھوڑی دیر انتظار کرلو۔ اتنی دیر میں راکھا پنڈ سے دور چلا جائے گا۔ جلدی نہ کرنا، ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔ سمجھ گئیں؟ اب تم جاؤ۔“

طاہرہ کے جاتے ہی لالی نے جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کئے۔ اپنی پتلون اور قمیص تہہ کر کے بغل میں دبائی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے وہ جوتی بھی کپڑوں کے اندر رکھ لی جو ماسٹر جی نے عام استعمال کے لیے دی تھی۔ لالی نے گھڑی دیکھی، ساڑھے دس بج رہے تھے۔

طاہرہ دوبارہ کمرے میں آئی۔ اس نے لالی کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔ ”ارے! تم تو بالکل پینڈو لگ رہے ہو۔“ اس نے لالی کو دو سو روپے کے نوٹ دیئے۔ ”لو، یہ رکھ لو۔ تمہیں ضرورت پڑے گی۔“

لالی نے روپے لے کر دھوئی کے ڈب میں رکھ لیے۔ طاہرہ نے ذرا دیر خاموش رہ کر چادر کے اندر سے چڑے کی چار گول گول تھیلیاں نکال کر لالی کو دیں۔ ”یہ کھسے ہیں۔ ماں جی نے کہا ہے انھیں اُٹھانے کے چاروں کھروں میں پھنسا دینا تاکہ کھوئی اُٹھ کر سراغ لگانے نکلیں تو کھروں کے نشان پہچان نہ سکیں۔ سمجھ گئے؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ لالی نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ ”اپنے ماسٹر جی رسا گیری کا دھندا بھی کرتے ہیں؟“

طاہرہ نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تم جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ بوری سامنے درختوں کے نیچے کھڑی ہے اسے لے جاؤ۔“

لالی اڑ گیا۔ ”نہیں، تمہیں بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔“ وہ آگے بڑھا۔ اس نے برآمدے میں کھلنے والا دروازہ کھولا اور طاہرہ کو مخاطب کیا۔ ”چلو آگے بڑھو۔ جو طے ہوا ہے وہی ہوگا۔“ اس کا

لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”تمہیں بھگا کر نہیں لے جاؤں گا۔ ایسا ارادہ ہوتا تو یہاں سے جاتا ہی کیوں۔“ طاہرہ نے گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازے کی اوٹ میں اس کی ماں کھڑی تھی۔ لالی نے طاہرہ کو خاموش پا کر کہا۔

”خانا خا کا نکھرنا نہ کرو۔ آگے بڑھو۔ میرا منہ کیا تک رہی ہو۔“

طاہرہ ہچکچتی ہوئی آگے بڑھی اور لالی کے ساتھ بیٹھک سے باہر نکلی۔ بھینس درختوں کے نیچے کھڑی تھی۔ لالی نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ وہ بھوری بھینس تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ بھینس کے چاروں کھروں میں چڑے کے کھسے چڑھا دیئے۔ رسی کھولی اور بھینس کو آگے بڑھانے کے لیے دھیرے دھیرے تات تات کی آواز نکالی۔

بھینس آگے بڑھی۔ لالی اس کی رسی پکڑ کر چلنے لگا۔ طاہرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنا بدن چادر سے چھپا رکھا تھا۔

آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ چاندنی دھندلی اور میلی میلی تھی۔ طاہرہ بہت خوف زدہ معلوم ہو رہی تھی۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر آہٹ پر کانپ اٹھتی۔ کسی قریب کی گلی میں کتا زور زور سے بھونکنے لگا۔ اس کی آواز سن کر طاہرہ ایسی بدحواس ہوئی کہ گرتے گرتے بچی۔

لالی نے جھٹ بازو پکڑ کر اسے سنبھال لیا اور جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دونوں گھر سے لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر تھے اور ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے تھے۔ طاہرہ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ لالی کو اس پر ترس آ گیا۔

”تم واپس چلی جاؤ۔ زبان کی تم جتنی فروٹ ہوا اتنی ہی بزدل اور ڈرپوک ہو، بالکل چھچھوند رکی طرح۔ آہٹ ہوئی اور چرچر کرتی بھاگی۔“ طاہرہ نے اس کی باتوں کا بالکل برا نہ مانا۔ مسکرا کر بولی۔ ”تمہارا بہت بہت شکریہ! تم بہت نیک بندے ہو۔“

لالی نے اس کی جانب ذرا جھک کر دھیرے سے سرگوشی کی۔ ”میں بالکل نیک بندہ نہیں ہوں۔ ہاں تم بہت نیک اور جنگلی ہو۔ نہ شادی ہوئی نہ ویاہ اور دھنچ میں میرے لیے یہ اُٹے آئیں اور دو سو روپے بھی۔“ طاہرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ وہ واپس جانے کے لیے مڑی تو لالی نے اسے ٹوکا اور اس کے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”اپنے بچے کا نام لالی رکھنا۔“

”اے اے اے“ وہ حیرت سے بولی۔ ”یہ کیا نام ہوا؟“

”میرا نام بھی لالی ہے۔ میں بھی اپنی ماں کے پیٹ میں بالکل اسی طرح آیا تھا۔ طوم نہیں، میرا بیو کون ہے؟ میری ماں کے ویاہ کے بعد جو میرا پیو بنا، وہ مجھے بیشہ حرام داکہتا۔ ماں کو گلاں نکالتا، اور گھر سے مار کر باہر کر دیتا۔ مجھے اس سے ملنے نہ دیتا۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”میرے ساتھ تمہارا ویاہ ہو جاتا تو میں تمہارے بچے کو کبھی حرام دانہ کہتا۔ تمہیں مار کر کبھی گھر سے نہ نکالتا۔ پر میرے ہاتھ میں تو ویاہ کی لکیری نہیں ہے۔“

طاہرہ نے نظر بھر کو لالی کو دیکھا اور واپس جانے کا ارادہ بدل دیا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ تمہیں گھاؤں کے ٹکڑے پر جا کر رخصت کروں گی۔“

لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”اتنی جلدی جلدی فیصلے نہ بدلا کرو۔ ایک گڑھے سے نکلو گی تو دوسرے میں گر جاؤ گی۔“ معا رات کے سنائے میں آہٹ ابھری۔ لالی نے ہولے سے طاہرہ کو دھکا دیا۔ ”جاؤ، کوئی آ رہا ہے۔“

طاہرہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے گھر کی جانب چلی گئی۔ لالی آگے بڑھ گیا۔



لالی جانتی تھی کہ داخل ہو کر شاداں کے گھر پر پہنچا تو رات ڈھل رہی تھی۔ اس نے بھینس گھر کے دروازے کے نزدیک ایک درخت سے باندھی اور دیوار پھاند کر آگن میں آہستہ سے اتر گیا۔ شاداں آگن میں سو رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ لالی نے قریب جا کر دھیرے سے شاداں کا کندھا جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”وے لالی توں، تو بالکل جٹ لگ رہا ہے۔ میں تو ڈر گئی تھی، کون آگیا؟“

”ڈرمت، میں تجھے اغوا کرنے نہیں آیا۔ یہ بتا تیری بوری کا کیا بنا؟“

”مرگئی، ملک نے اسے مار ڈالا۔“ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ذرا دیر خاموش رہی۔ پھر شعلے کی طرح

بھڑک اٹھی۔ ”میں ملک کا خون پی لوں گی۔ اس کی بوئیاں چھاؤں گی۔“

”بوری کو ملک نے نہیں، میں نے مارا۔ لے میری بوئیاں نوچ کر چبا۔“

”لالی! تو یہاں سے چلا جا۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگتا۔“ شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تیں

نوں پتہ ہے، میں نے بوری کے کارن بالے کا گلا کاٹ ڈالا۔“

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تاجی تو کمرے میں نہیں ہے؟“

”نہیں وہ آج سویرے مجھ سے لڑ جھگڑا اپنے گھر چلی گئی۔“

لالی نے شاداں کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا۔ ”میرے ساتھ آ۔“

شاداں ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ ”لالی! مجھے تنگ نہ کر۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔

میراجی کرتا ہے، اپنا گوشت نوچ ڈالوں۔“

انکار کے باوجود لالی اسے کھینچتا ہوا آنگن کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ مگر جب وہ دروازے کی جانب بڑھا تو شاداں نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ آنکھیں نکال کر بولی۔ ”کیا چاہتا ہے؟ میں تیرے سنگ نہیں جاؤں گی۔“

”پاگل نہ بن، تیری مرضی کے بنا تجھے کوئی اپنے سنگ نہیں لے جاسکتا۔ یہ بات تو بھی جانتی ہے۔ فیر کیوں ڈرتی ہے۔“ لالی نے آگے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ ”دروازے تک تو آجا۔ یہ تو تیرے ہی گھر کی دلچ ہے۔“

شاداں آہستہ آہستہ دروازے تک چلی گئی۔ لالی نے دروازہ کھولا۔ باہر گیا اور بھینس کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ شاداں حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔

”ہائے! یہ تو کہاں سے لے آیا؟“

لالی نے دروازہ بند کیا۔ ”ٹھیک طرح دیکھ لے۔ بوری ہے اور دھری بھی ہے۔ پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے۔ نیلی باری کی کھولی ہے۔ اب تو ہنس دے۔ تیری بوری واپس آگئی۔“

شاداں نے بھینس کی گردن اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ ”لگتی تو ویسی ہی ہے۔“ پھر اس کی تھو تھنی سلاتے ہوئے بولی۔ ”اٹھاراں ہی سیر دودھ دیتی ہے نا؟“

”بیٹھ جا، تھنوں کے نیچے۔ دودھ کر دیکھ لے۔“

”اس وکھت؟ تیرا مگر تو نہیں چل گیا۔ یہ بتا کہاں سے لایا؟“ اس کی نظر بھینس کے کھروں پر پڑی۔ ”چوری کر کے تو نہیں لایا؟ اس کے کھرے میں کھسے کیوں پڑے ہیں؟“

”اس لیے کہ کھوئی اس کا کھرانہ نکال سکیں۔“ وہ نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ ”ویسے یہ مجھے دلچ میں ملی ہے۔ گھروالی تو نہیں ملی۔ اس کی مجھے ضرورت بھی نہیں تھی۔“

”ٹھیک ٹھیک بتا؟“

”میں نے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے۔“ لالی نے مسکرا کر بتایا۔ ”اسے نہ لاتا تو گھروالی گلے پڑ جاتی۔ تھی تو ایسی سوہنی، تجھے کیا بتاؤں۔ لور کے کالج میں پڑھتی ہے، پر وہ گھبنے ہے۔ اس کے بیٹ میں بچہ ہے۔“

”تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”صاف صاف بات کر۔“

”آرام سے بیٹھ کر تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ پہلے یہ بتا، اس روز میرے جانے کے بعد کیا ہوا؟“

”تیرے جاتے ہی ملک اپنے اپنے کمرندوں کو لے کر آگیا۔ مجھے زبردستی پکڑ کر اپنی حویلی میں لے گیا۔

بہت لال پیلا ہوا۔ بہت نراض ہوا۔ مارنے کو بار بار اٹھا۔ مجھے دھکی دی کہ کسی سے نہ کہوں کہ

بوری اس کی گولی لگنے سے مر گئی۔ پر پنڈ میں یہ بات سب کو ملوم ہے۔“ وہ اپنی بات کتے کتے دم بھر کوری۔ ”بوری کو اس کے کئی اور کمرندے اسی وکھت ریزھے میں ڈال کر لے گئے۔ کھائی کو دے دیا ہو گا۔ دور کسی گڑھے شھرے میں ڈال دیا ہو گا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ملک سو روپے دیتا تھا۔ میں نے نہیں لیے۔ خالی ہاتھ چلی آئی۔“

”ٹھیک ہی کیا۔ اس نے پولیس تو نہیں بلائی؟“

”نہیں! بوری کے مرنے کے بعد ڈر گیا۔ پر اپنی بندوک کے بارے میں بار بار پوچھتا تھا۔ توں نے اس کا کیا کیا؟“

”ادھر پڑیلی کی ایک جھاڑی میں پھینک دی۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب تو یہ سوچ۔

کل سب پوچھیں گے، یہ کہاں سے آئی، تو کیا کئے گی؟“

”ہائے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ بتا کیا کہوں؟“

”تیرا کھسم کہہ دے گا، یہ تو اس نے تجھے دی ہے؟“

”کہہ دے گا۔ ضرور کہہ دے گا۔ جو کہوں گی، وہی کہہ دے گا۔“

”وہ تجھے اتنا پیار کرتا ہے تب بھی اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس سے اتنا خاریوں کھاتی ہے؟“

”تمیں نوں پتہ نہیں، مجھے وہ کبھی پسند نہیں آیا۔“ وہ خیالوں میں کھو گئی۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولی۔ ”میری ماں مر گئی تھی۔ سوتیلی ماں تھی۔ وہ مجھے بہت تنگ کرتی تھی۔ مارتی تھی۔ کھانے کو

نہیں دیتی تھی۔ ننگی ننگی گالاں نکالتی تھی۔ میں چھوٹی سی تھی تو اس نے کھیر دین سے میرا دیاہ کر دیا۔ میرے گھروالے کا نام کھیر دین ہے۔ توں نے اسے نہیں دیکھا۔ بالکل ادھکڑ ہے۔ آدھے سے زیادہ

تو اس کی داڑھی اور سر کے بال چٹے ہیں۔ ہائے، ایسی بری شکل ہے اس کی، تجھے کیا بتاؤں۔ یہ لاما منہ اور باہر نکلے ہوئے یہ لے لے دانت۔ بالکل دندلو ہے۔ گھمے تو اسے آتا ہی نہیں۔ کبھی لڑائی

جھگڑا نہیں کرتا۔ کوئی آنکھ دکھائے تو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں۔ ہائے، کھیر دین کتنا نیک بندہ ہے، کتنا بھلا ہے۔ فرشتہ ہے فرشتہ۔ شاداں ہی بری ہے۔“ وہ غصے سے ایک دم پھر گئی۔

”ایسا ہی بھلا ہے تو اس فرشتے سے اپنی دھی، اپنی بھین کیوں نہیں دیاہ دی؟ شاداں کیوں اس کے گلے میں ڈھول بنا کر ڈال دی؟ ماں نے چپکے سے تین سو روپے جو لیے تھے۔ ہائے کتے ستے داموں

بچ دیا مجھے۔“

وہ نہ جانے اور کیا کیا کہتی مگر لالی نے اسے روک دیا۔ ”اپنی ہی کہے جائے گی یا دوسرے کی بھی

”کہہ کیا کہتا ہے؟“

”میرا کہاں۔ کل سویرے ہی سویرے اپنے کھنڈے کے پاس چلی جا۔ ہو سکے تو اسے اور بچوں کو چند روز کے لیے یہاں لے آ۔“

”میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ شاداں نے صاف انکار کر دیا۔ ”ایک بار اس کے گھر سے چلی آئی، اب اس کی دلچ پر قدم نہیں رکھوں گی۔ اس نے پہلے بھی بہت فتنیں کیں پر میں نہیں گئی۔ اب کیسے جاسکتی ہوں؟“

”نہ جا۔“ لالی جل کر بولا۔ ”پکڑی جائے گی۔“

”تو کیا چمچ، نچوری کی ہے؟“

”میں کی طرف سے چوری کی ہے، ماں اور دھمی کی طرف سے دیچ میں ملی ہے۔ یہ دو سو روپے بھی ملے ہیں۔“ لالی نے دھوتی کے ڈب سے روپے نکالے اور شاداں کو دے کر بولا۔ ”لے یہ رکھ لے۔ ماں لے، پولیس کوئی چکر شکر چلائے تو کچھ دے دلا کر معاملہ دبا دینا اور دیکھ، کل ضرور کھیر دین کے پاس جانا۔ دندلو تجھے اپنے لے لے وانتوں سے کاٹ تو نہیں کھائے گا۔ ویسے بھی تجھے برسوں کا نثار رہا ہے۔ چند روز اور کاٹ لے گا تو تیرا کیا بگڑ جائے گا۔“ لالی نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا۔ ”ضد نہ کر، میرا کہاں۔ ورنہ گھر آئی، نچ بھی ہاتھ سے جائے گی اور خود بھی کسی چکر میں پڑ جائے گی۔ بول، کیا کہتی ہے؟“

”توں کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔“ شاداں صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے رضامند ہو گئی۔ ”سویرے ہی سویرے چلی جاؤں گی۔“

”یہ بتا کڑے لے آئی؟“

”نہیں، درزی پنڈ چھوڑ کر شہر چلا گیا۔ برانہ ماں۔ کل شام تک ٹھہر جا۔ میں ضرور تیرے لیے کیس سلوا کر لے آؤں گی۔ دھوتی کا کیا ہے وہ میری لے لے۔ ویسے پدر سے بھی کام چل جائے گا۔“

”اب ضرورت بھی نہیں، مجھے اب جانا ہے۔ ابھی رات رہتی ہے۔ اندھیرے میں نکل جاؤں گا۔ دیکھ، سویرے اپنے کھنڈے کے پاس چلی جانا۔“

”تجھے کہہ تو دیا، چلی جاؤں گی، ضرور چلی جاؤں گی۔“ شاداں نے بھینس کی رسی پکڑی اور لالی کو روک کر بولی۔ ”بوروی کو باندھ لوں۔ توں اکیلا نہیں جائے گا۔ میں بھی ساتھ چلوں گی۔“

”آج نہیں۔ اب تو میرے ساتھ اس روز چلے گی جس روز میں تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔ تار

رہتا۔“

”بکواس نہ کر۔“ شاداں منہ بگاڑ کر بولی۔ ”توں تو اڑیل ٹو ہے۔“

لالی کھل کر مسکرایا۔ ”دیکھ اتنا تو ہوا۔ کبھر سے مجھے اڑیل ٹو بنا دیا۔ میڑھی میڑھی نیچے اتر رہی ہے۔“ وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

☆

لالی اس راستے کی جانب بڑھا جو ریل کی پٹری کی طرف جاتا تھا۔ اسی راستے سے وہ پہلے بھی جمائگیرہ آچکا تھا اور اب اس سے بخوبی واقف ہو چکا تھا۔ وہ جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔ ابھی اسے خاصا لمبا فاصلہ طے کرنا تھا۔ رات ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے تھے۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ مگر وہ دو ڈھائی میل آگے گیا تھا کہ ایک موڑ پر قریب سے آواز آئی۔

”چوہدری! تیرے پاس ماچس تو ہوگی؟“

لالی سنی ان سنی کر کے آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ ایک شخص اندھیرے سے نکل کر اس کی جانب بڑھا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“ وہ سائیکل پر سوار تھا۔ لالی نے دھندلی دھندلی چاندنی میں فوراً بھانپ لیا کہ وہ سادہ لباس میں پولیس کا کانسٹیبل ہے۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ڈھلتی عمر کے باعث اس کی کمر ذرا جھک گئی تھی۔ لالی نے ٹالنے کے لیے کہا۔

”میرے پاس ماچس نہیں ہے۔ میں سگریٹ نہیں پیتا۔“

وہ آگے بڑھ گیا۔ لیکن کانسٹیبل نے اسے جانے نہیں دیا، پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”چوہدری! اگل سن۔“

لالی ٹھہر گیا۔ مگر خاموش رہا۔ کانسٹیبل نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی اور جھک کر اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”گتا ہے، تجھے کیس دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟“ وہ لالی کو مشتبہ نظروں سے گھورنے لگا۔

لالی نے جھٹ کہا۔ ”تجھے ایسے ہی شبہ ہوا۔ میں تو اس پنڈ میں پہلی بار آیا تھا۔“ اس نے چاہا کہ بڑھ کر آگے نکل جائے۔ لیکن کانسٹیبل نے اس کا بازو تھام کر روک لیا۔ ”بات تو سن۔“ وہ لمبے بھر کے لیے رکا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”تو لالی تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ لالی نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں نے کہا نہیں، تجھے شبہ ہوا۔“

”میری نظریں دھوکا نہیں کھا سکتیں۔“ کانیشیل نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”تو لالی ہے۔ پچھلے دنوں جیل سے نکل کر بھاگا ہے۔“

”تجھے کیسے معلوم ہوا میں لالی ہوں۔“ لالی نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے اسے دیکھا۔ ”خالی پہلی تھانے داری جمانے کھڑا ہو گیا۔“

”میں نے تھانے میں تیری تصویر دیکھی ہے۔ تو لالی ہی ہے۔“ کانیشیل نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”تو میری نظروں کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ ۳۰ سال ہو گئے، پولیس کی نوکری کرتے۔ ایک سے ایک اونچا بجرم دیکھا ہے اور ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔“

لالی نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ دس روپے کا نوٹ دھوتی کے ڈب سے نکالا اور کانیشیل کی طرف بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔

”لے لے اسے رکھ لے“

کانیشیل نے دس روپے کا نوٹ تولے لیا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ ”تیرے لیے تو دو ہزار روپے کا انعام ہے۔ تیرا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟“

لالی نے ایک نوٹ اور نکالا اور کانیشیل کو دے کر بولا۔ ”میرے پاس اب صرف ریل کا کرایہ رہ گیا ہے، وہ تجھے نہیں دوں گا۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔ ”ساتھ ہی یہ بھی سن لے۔ میرا رستہ روکا تو ہمیں لٹا دوں گا۔“

لالی نے جھپٹ کر اس کی گردن دبوچ لی۔ ہلکا سا جھکا دے کر ہاتھ کا ٹکڑہ کساتا دھیر عمر کانیشیل غیس غیس کرنے لگا۔ ”خانہ خراب، میری گردن تو چھوڑ۔ میں نے کب تیرا رستہ روکا۔“ لالی نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ اپنی گردن سہلاتے ہوئے بولا۔ ”تیرے ہاتھ تو لوہے کے لگتے ہیں۔ تو نے تو میری گردن ہی توڑ دی تھی۔“ وہ ذرا سار کا۔

”جائے گا کہاں؟“

”بیکار کی ٹرژنہ کر۔“ لالی نے اسے ڈانٹا۔

”نراض نہ ہو۔ میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ پولیس کی ایک پارٹی ذرا دیر پہلے ادھر سے گزری ہے۔ سب کے سب مسلح ہیں۔ صوبے دار بھی ان کے ساتھ ہے۔“

”راؤنڈ پر نکلے ہیں؟“ لالی نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے تشویش جھلک رہی تھی۔

”نہیں۔“ کانیشیل ابھی تک رک رک کر اپنی گردن سہلا رہا تھا۔ ”پرسوں رات یوسف والا

رہوے کرا سٹک پر زبردست ڈاکا پڑا۔ ڈاکوؤں نے بس لوٹ لی۔ گولی بھی چلائی۔ ایک زخمی اسپتال جاتے جاتے راستے ہی میں چل بسا۔ جب سے یہ واردات ہوئی ہے پولیس ہر طرف بھاگ دوڑ کرتی پھر رہی ہے۔ ویسے میں تو اپنے بھائی کے پنڈ جا رہا تھا۔ وہ سخت بیمار ہے۔“ اس نے توقف کیا۔ ”مجنوں نے بتایا ہے، ڈاکو ادھر ہی کہیں چھپے بیٹھے ہیں۔“

”صوبے دار کدھر گیا ہے؟“

کانیشیل نے شمال کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”پوری پارٹی ادھر گئی ہے۔“ لالی کو بھی اسی طرف جانا تھا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اسے کوئی دوسرا راستہ معلوم نہیں تھا۔ کانیشیل نے اسے خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔ ”تس نوں کتھے جانا ہے؟“

”جہد پولیس پارٹی گئی ہے۔“

”پر تو تو شیش جائے گا۔“

”ہاں۔“ لالی نے انکار نہیں کیا۔ حالانکہ اسے اسٹیشن ہرگز نہیں جانا تھا۔ مگر وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ قادر آباد اسٹیشن کے قریب پہنچ کر اسے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا راستہ مل جائے گا۔

”میری مان تو اس طرف سے نکل جا۔“ کانیشیل نے اس راستے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف اشارہ کیا۔ ”یہ رستہ جھوٹا ہے اور تیرے لیے ٹھیک بھی رہے گا۔ ایسا کرسید ہا سیدھا چلا جا۔ آگے باکر چوٹے گا۔ یہ برساتی نالا چک ۲۰۰ بی کے نزدیک سے گزرتا ہے۔“ وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ پھر وہاں سے چار میل تو ہو گا۔ اس پر پہنچ کر ایسا کرنا، اس پار نہ جانا۔ چو کے کنارے کنارے چلا اٹا۔ اس رستے پر جھنگ ہے، جھاڑیاں بہت ہیں۔ تجھے کوئی دیکھ بھی نہ پائے گا۔ جہاں چوڑا ہے اس سے پورب کی طرف جانے والا رستہ پکڑنا۔ آگے جا کر نہر ملے گی وہ قادر آباد اسٹیشن کے نزدیک سے گزر کر لوہا باری دو آب سے مل جاتی ہے۔ سمجھ گیا؟“

”سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔“ لالی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”پر تجھے ایک گل بتا دوں۔ اگر دو ہزار نام کے چکر میں تو نے مجھے پھنسا دیا اور میں پکڑا گیا تو اتنا سمجھ لے، میں جیل سے سیدھا یہاں آں گا۔ تجھے چھوڑوں گا نہیں۔“ یہ کہہ کر لالی نے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ ”میرا نام لالی ہے۔ اتنا یاد دلاؤ۔“

”تو کس چکر میں پڑ گیا۔ میرا نام واحد ہے۔ ادھر مجھے سب جانتے ہیں۔ پہلے بھی کئی مجرم پکڑا چکا۔ دو بار اسی چکر میں زخمی ہو کر اسپتال بھی گیا۔ ان پر تجھ سے زیادہ انعام تھا پر ہر بار انعام اوپر لے لے گا۔ کسم کی وردی میں ایک سے دو پھول لگ گئے۔ مجھے کیا ملا۔ کپتان صاحب نے ہاتھ ملایا

اور کندھا تھپک دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ میری تنخواہ ۲۰ روپے سے آگے نہ بڑھی۔ ۵ بچے ہیں۔ گھر والے ہے اور اندھی ماں ہے۔ ”اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ ”ذرا سوچ تو اپنے پر کیا بنتی ہے۔ میری ماں؟ اندھی ہے۔ اوپر والوں کی دونوں آنکھیں ہیں۔ تب بھی اندھے ہیں۔“

لالی بہت متاثر ہوا۔ اس نے کانٹیل کی باتوں پر اعتبار بھی کر لیا۔ ڈب سے دس روپے کا ایک نوٹ اور نکالا اور کانٹیل کو دے کر بولا۔ ”لے، یہ بھی رکھ لے۔ پروا نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔“ وہ اس سمت بڑھا جہاں کانٹیل نے جانے کی ہدایت کی تھی۔

کانٹیل نے چلتے چلتے ٹوکا۔ ”دیکھ بھال کے رستہ چلنا۔ اتنا دھیان رکھنا، ڈاکوؤں کی دھاڑ بھی اسی علاقے میں ہے۔“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ اس راستے پر چل پڑا جو کانٹیل نے بتایا تھا۔

چار، ساڑھے چار میل راستے طے کر کے وہ برساتی نالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کانٹیل نے ٹھیک کہا تھا۔ اس راستے پر جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں، گھنی بھی اور اونچی بھی۔ لالی جھاڑیوں کی اوٹ میں تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھتا گیا۔ وہ مڑمڑ کر چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ پولیس کا بھی خطرہ تھا اور ڈاکوؤں سے بڑبھڑ ہونے کا بھی مدھمکا تھا۔



ایک گھنی جھاڑی کے قریب اندھیرے میں دو سائے لہرائے۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے دبوچ لیا۔ ایسی مضبوطی سے گرفت میں لیا کہ لالی بے بس ہو گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا، ایک قوی ہیکل نوجوان اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچے خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے۔ آن کی آن میں اسی وضع قطع کے دو اور نوجوان جھاڑیوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے کرتے اور خوب گھیردار شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے چہرے پر ڈھانا بھی بندھا تھا۔ لالی فوراً سمجھ گیا کہ وہ کون ہیں۔ یہ وہی ڈاکو تھے جنہوں نے پرسوں رات ریلوے کراسنگ پر بس لوٹی تھی۔ ایک ڈاکو نے لالی سے پوچھا۔

”کون ہے تو؟“

لالی نے غصے سے دے کر نکل جانا چاہا۔ ”شیش جا رہا ہوں۔ میں نے ملتان کے لیے گڈی پکڑنی ہے۔“

پیچھے کھڑے ہوئے ڈاکو نے جو دونوں ہاتھوں سے لالی کو جکڑے ہوئے تھا، اونچی آواز سے کہا۔ ”مجھے تو پولیس جان پڑتا ہے۔“

”مجبر ہوگا۔“ دوسرے نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”نہیں۔“

”ٹھیک ٹھیک بتا، کون ہے؟“ سامنے کھڑے ہوئے ڈاکو نے لالی کے منہ پر تڑاق سے تھپھر سید کیا۔ لالی کا ایک گال اور کان جھنجھٹا کے رہ گئے۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”یارو! مارتے کیوں ہو؟ میں جج جج بتا دوں گا۔“ اس نے اپنا گال سہلایا۔ ”میرا نام لالی ہے۔ میں جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔“

چند لمبے وہ خاموش کھڑے رہے۔ ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں لالی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ایک نے شے کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ادھر کس لیے آیا تھا؟“

”پولیس کے ڈر سے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔ دو ہزار کا انعام میری گرفتاری پر رکھا گیا ہے۔“

”دو ہزار کا انعام؟“ دوسرے نے حیرت سے کہا۔ ”اوئے پھیرو! یہ تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔“ پھیرنے لالی کے بازو کا گوشت ٹٹولا اور اس کی مونچھ مروڑ کر اونچی کی۔ مسکرا کر بولا۔ ”لگتا بھی زور آور ہے۔“

لالی نے عاجزی سے کہا۔ ”یار! میری کمر تو چھوڑ۔ میں بھاگا نہیں جا رہا ہوں۔“ پھیرنے اونچی آواز سے کہا۔ ”عالم! چھوڑ دے اسے۔“ عالم نے لالی کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔

لالی گڑگڑا کر بولا۔ ”جو پوچھنا ہے، پوچھ لو۔ ابھی اندھیرا ہے، میں شیش چلا جاؤں گا۔“ مگر انھوں نے لالی کو جانے نہیں دیا۔ اسے اپنے زرخے میں لے کر ایک طرف چل دیئے۔ انھوں نے خشک برساتی نالہ عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ کر گھٹے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف بڑھنے لگے۔

قریب جا کر لالی نے دیکھا، وہاں بھی دو ڈاکو موجود ہیں۔ ایک مٹی کے تودے پر درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بارہ بور کی دو ٹالی بندوق رکھی تھی۔ اپنی آن بان سے وہ ان کا سرغند لگتا تھا۔ اس نے لالی کو دیکھ کر دودھ سے پوچھا۔

”کون ہے یہ؟“

”بھ۔“ نے جواب دیا۔ ”ٹھیک سے پتہ نہیں۔ کتا ہے، جیل سے نکل کے بھاگا ہے۔“

”چل لالی ہی سہی۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا اور بندوق پر اپنے ہاتھ کی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بھی جان لے، میرا نام داد محمد ساہو ہے۔ تجھے خون کرچکا ہوں، پرسوں رات والا ساواں تھا۔ تو چوری چکاری کرنے والا مجھے کیا جانے۔ پولیس جانتی ہے مجھے۔ میرے سر کی بولی بیچ ہزار رکھی گئی ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے ساہو، میں تجھے نہیں جانتا۔“ لالی اس کے پیر دباتے ہوئے بولا۔ ”تجھے کون نہیں جانتا؟ مگر مجھے گلہ ہے پولیس تو مجھے جانتی ہے، توں نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو میرا رستہ نہ روکتا۔ مجھ سے تو تیں نوں کوئی خطرہ نہیں۔“

”اب تو اجالا بھی پھیل گیا۔ یہاں سے نکل کے کہاں جائے گا؟“ داد محمد ساہو نے لالی کو حیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو نے تو اپنا ٹھکانا بھی دیکھ لیا۔ ابھی تجھے نہیں جانے دوں گا۔ دن بیس کاٹ لے۔ رات کو اپنے ساتھ نکل چلنا۔ رشید بلا آجاتا تو میں آج ہی نکل جاتا۔ مجھے اسی کا انتظار ہے۔ شام تک آئی جائے گا۔“

لالی دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور خاموشی سے ساہو کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد ساہو درخت سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ ”لے ذرا کندھے بھی دباوے۔ بہت تھک گیا ہوں۔ رات بھر راؤنڈ پر رہا۔ پولیسے گھات میں ہیں۔ اپنے کو بھی چوکس رہنا پڑتا ہے۔“ وہ چند لمبے آنکھیں بند کئے چپ بیٹھا رہا پھر لالی سے مخاطب ہوا۔ ”لگتا تو جی دار ہے۔ کہاں پڑ گیا چوری چکاری میں؟ کیا دھرا ہے اس میں؟ پوچھو چڑایا کیا؟ صرف ایک سیکل ملا کیا؟ دو سو سے بھی کم اور سزا دو سال سے اوپر ہی ہوئی ہوگی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”جی کرے تو لگ جا اپنے ساتھ لین میں۔ ڈکیتی کا مزہ بھی دیکھ لے۔ لومڑی سے ایک دم شیر بن جائے گا، شیر۔ کیا سمجھا؟“

”ڈاکے تو میں نے بھی ڈالے ہیں۔ راشن ڈپو لوٹا تھا، ایک پیڑول پپ بھی لوٹا۔“ لالی اپنی بات کہتے کہتے ذرا سار کا۔ ”پر اس دکھت تو مجھے رحیم داد کے پاس جانا ہے۔“

”کون رحیم داد؟“

”وہی جو میرے ساتھ جیل سے فرار ہوا ہے۔“

”گولی مارا ہے۔ اپنی سوچ۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”میں اس سے دھوکا نہیں کر سکتا۔“

”جیسی تیری مرضی۔ لیکن جب تک اپنا ادھر پڑاؤ ہے، تو نہیں جا سکتا۔ دن تو تجھے بیس کاٹنا پڑے گا۔ رات کو تیرے بارے میں سوچو لگا۔“

عالم بولا۔ ”یہ بھی کہتا ہے، اس کی گرفتاری پر دو ہزار کا انعام ہے۔“

سرغنہ نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ ”سنا تو میں نے بھی ہے کہ پچھلے دنوں دو کیدی جیل سے نکل بھاگے۔“ اس نے لالی سے پوچھا۔ ”جیل کس چکر میں گیا تھا۔ کسی کا خون کیا تھا؟“

لالی نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“

”ڈکیتی کی تھی؟“

”نہیں۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

”فیہ جیل کیوں ہوئی تھی؟ کوئی چھوہری شوہری بھگائی تھی؟“

”نہیں جی، میں ایسا کام نہیں کرتا۔“ لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”سیکل چرائی تھی۔“

”اوئے چٹو! اتی وڈی توپ چلائی۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”لو سن لو۔ اس نیولے کے جیل سے بھاگنے پر دو ہزار کا انعام رکھا ہے۔ پولیس کی مت ماری گئی ہے۔“ اس نے ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ ”اوئے نیولے! ادھر آ میرے نزدیک۔“

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ وہ اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”لے، میری ٹانگیں دبا۔“ لالی خاموشی سے اس کے نزدیک بیٹھ کر ٹانگیں دبائے لگا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے عالم کی جانب مڑ کر دیکھا۔

”رشید بلا ابھی تک نہیں لوٹا؟“

عالم نے جواب دیا۔ ”اب تو جی مشکل ہی لگتا ہے۔ اجالا ہو گیا ہے۔ شام کو آئے گا وہ۔“ سرغنہ اونچی آواز سے گرجا۔ ”تم سبھی چلے آئے۔ چاروں طرف پولیس پھیلی ہے اور تم یہاں کھڑے ہو۔ جاؤ، جا کر ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھتے رہو۔ خطرہ ہو تو فوراً سیٹی مارو۔“ وہ پاس کھڑے ہوئے ڈاکو سے مخاطب ہوا۔ ”کبیرے، تو بھی جا۔ کسی اونچے درخت پر چڑھ کر دو دور تک نظر ڈال لیتا۔“

سب چلے گئے۔ صرف لالی رہ گیا۔ وہ گردن جھکائے سرغنہ کے پیر دباتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ ”نیولے!“

اس دفعہ لالی بھڑک اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ”دیکھو جی! مجھے نیولا شیولا مت کہو۔“ ڈاکو نے جھٹ بندوق پر ہاتھ رکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر چیخا۔ ”کیا کہا؟“

لالی مرعوب نہیں ہوا۔ گردن اونچی کر کے گویا ہوا۔ ”میرا نام لالی ہے، نیولا نہیں۔“

بندوق اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی تھی۔ ذرا دیر بعد اندھیرے میں کوئی تیز تیز قدموں چلتا ہوا آیا۔ یہ عالم تھا۔

ساہو نے پوچھا۔ ”عالم! یہ آوازیں کیسی آرہی ہیں؟“
”رشید بلے نے مڑا دیا۔“

”بات کیا ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا؟“

”پولیس نے چاروں طرف سے گھرے میں لے لیا ہے۔ انسپکٹر منہ سے بھونپو لگا کر بول رہا ہے۔ کہتا ہے، ہتھیار ڈال دو۔“ یہ کہہ کر عالم رکا، پھر غصے سے چیخا۔ ”کہاں گیا وہ حرام دا؟ میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ پولیس کا تجربہ ہے۔“ یہ کہتا ہوا عالم اندھیرے میں انکل سے آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ کر اس نے زور سے کمر پر لات ماری۔ لالی بلبلاتا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ لالی کو اور مارتا مگر ساہو نے روک دیا۔ ”رہنے دے عالم! اس سے بعد میں نمٹ لیں گے۔“
وہ لالی سے مخاطب ہوا۔ ”یہاں سے ہلا تو تیرے لیے فضول ایک کارتوس خراب کرنا پڑے گا۔“
”مجھے ایک کارتوس خراب ہی کر لینے دے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔“

ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ ”نکو اس نہ کر۔ اس چڑی چور کو گولی مار، کام کی بات کر۔ رشید بتا جانے کس چکر میں پھنس گیا۔ راشن پانی اپنے پاس مک گیا ہے۔ ہمیں جو کچھ کرنا ہے آج ہی کرنا ہوگا۔ کل پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلتا مشکل ہو جائے گا۔ یہ بتا انسپکٹر کتھے ہے؟“
”چو کے اس پار بھاڑیوں کے پیچھے۔ آواز وہیں سے آرہی ہے۔ میں نے اپنے کانوں سے سنی ہے۔“

”ایسا کر، کھیرے کو میرے پاس بھیج دے۔ تو ملنگی کے ساتھ مورچہ لگا کر انسپکٹر کی پارٹی پر فار کھول۔ پھیرو سے کہہ وہ اور دارا تھوڑے تھوڑے فاصلے سے مورچے لگا دیں۔ سمٹ کر رہنا۔ دور دور نہ بکھر جانا۔ فار ایک ساتھ کھولنا۔ ایسا لگے جیسے چاروں طرف سے فائرنگ ہو رہی ہے۔“
”اب میں چلوں؟“

ساہو زور سے دھاڑا۔ ”پوری گل تو سن۔ جھیتی نہ کر، ورنہ مڑا دے گا۔ میں کھیرے کے ساتھ پیچھے سے پولیس کا گھیرا توڑ کر نکلنے کی کوشش کروں گا۔ مال پانی اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا۔ جب میری طرف فائرنگ ہلکی پڑ جائے، تو تم چاروں تیز فائرنگ کرتے ہوئے پیچھے ہٹنا شروع کرنا اور اندھا دھند گولی چلاتے ہوئے نکل جانا۔ میں منہ کی پلی کے پاس تمہارا انتظار کروں گا۔ ہر بات پوری ہو گیا؟“

ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لالی کو اس بیگار سے نجات مل گئی۔ داد محمد ساہو بولا۔ ”بس کر۔ نیند آ رہی ہو تو بیس لیٹ جا۔ پروا نہ کر۔ دوپہر کی روٹی تجھے بھی ملے گی۔“
لالی اٹھا اور کچھ فاصلے پر ایک درخت کے نیچے گٹھری سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ نرم نرم جھونکوں سے آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کو لالی بیدار ہوا۔ ساہو کھیس بچھائے بے خبر سو رہا تھا۔ سامنے فقیرا بندوق سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ لالی بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فقیرا اس کے لیے کھانا لے آیا۔ باسی روٹی تھم، اور اس کے ساتھ صرف پیاز اور ہری مرچ تھی۔ البتہ پینے کو پانی گلاس بھر کر ملا۔ کھانا کھا کر لالی پھر لیٹ گیا مگر اسے نیند نہیں آئی۔ وہ پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ فقیرا خاموش بیٹھا لالی کو گھورتا رہا۔ عالم ایک بار آیا مگر ساہو کو سوتا پا کر چپ چاپ واپس چلا گیا۔

لالی پیشاب کرنے اٹھا۔ اس نے کچھ دور آگے جانا چاہا تو فقیرا بھی بندوق سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لالی نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ پیشاب کرنے کے بعد اپنی جگہ آکر لیٹ گیا۔ مگر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کی کڑی نگرانی کی جا رہی ہے۔ اس نگرانی سے لالی سخت پریشان ہوا۔ رات کا جانا بھی مشکل نظر آیا۔

اسی پریشانی میں شام ہو گئی۔ داد محمد ساہو بیدار ہو گیا۔ مگر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ کچھ دیر بیٹھا انگڑائیاں لیتا رہا۔ اس نے پانی منگوا کر پیا۔ بندوق سنبھالی اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فقیرا جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔

لالی اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے بعد ساہو واپس آیا۔ اس کے ہم راہ پھیرو بھی تھا۔ دونوں کھیس پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ وہ اس قدر آہستہ آہستہ بول رہے تھے کہ لالی ٹھیک سے کچھ نہیں سن سکا۔ البتہ ان کی باتوں سے اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ رشید بٹا ابھی تک واپس نہیں آیا اور اس کے نہ آنے سے ساہو بہت پریشان ہے۔

اندھیرا خوب گہرا ہو گیا تھا۔ ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی۔ پھیرو جا چکا تھا۔ فقیرا بھی اس کے ساتھ ہی چلا گیا۔ ساہو اکیلا بیٹھا تھا اور سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ دھوئیں کی تیزبو سے لالی تازہ گیا کہ وہ چرس بھری سگریٹ پی رہا ہے۔ لالی اور ساہو ایک دوسرے سے چند گز کے فاصلے پر بیٹھے تھے۔ گردنوں خاموش تھے۔ اسی دوران سکنا لے کے اس پار سے ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے کوئی اونچی آواز سے بول رہا ہو۔ ساہو نے سگریٹ بجھا دی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”پروانہ کر۔ پولیس سے پہلی بار ٹاکرا نہیں ہے۔ پہلے بھی بہت گولی چلی ہے۔ اس دفعہ صاف نکل جائیں گے۔ راؤنڈ بھی اپنے پاس کافی ہیں۔“

”اب توجا۔ کھیرے کو بھیج دے۔“

عالم چلا گیا۔ ساہو بندوق سنبھال کر آہستہ آہستہ ٹپٹنے لگا۔

لالی زمین پر سہا ہوا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور ساہو کے قریب جا کر صفائی پیش کرنے لگا۔ ”بچ کہتا ہوں، میں لالی ہی ہوں، جیل سے بھاگا ہوا اکیڈی۔ میں پولیس کا بھڑ نہیں ہوں۔ نہ جانے کیسے میرے بارے میں تجھے شبہ ہو گیا۔ میری بات کا۔ لیکن مان۔ جیسی چاہے کم لے لے۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔

ساہو بے نیازی سے بولا۔ ”میں کب کہہ رہا ہوں، تو لالی نہیں ہے۔ پولیس کا مجھ تو تجھے عالم بتاتا ہے۔ پتہ نہیں، کیسے اسے تجھ پر مجھ بونے کا شبہ ہو گیا۔ کوئی بات تو ضرور ہوگی۔“

”میں تو صبح سے تیرے سامنے ہوں۔ کہیں گیا بھی نہیں۔“

”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ تیرا ادھر آنا ہی کم شبے کی بات نہیں۔ تو کتنا تھا شیٹن جانا ہے۔ کون سا شیٹن؟ ادھر کوئی شیٹن نہیں ہے۔ تو نے خود ہی شبہ پیدا کیا۔“

لالی عاجزی سے بولا۔ ”رب سو نہ، میں لالی ہوں، جیل سے.....“

ساہو نے اس کی بات کاٹ کر غصے سے کہا۔ ”سن لیا، تو لالی ہے، جیل سے بھاگا ہوا اکیڈی ہے۔ میں نے تیری بات سچ مان لی۔ تو میرا حیرانہ کھا، کبواس بند کر اور چپ کر کے بیٹھ جا۔“

لالی نے اس کے بعد ایک لفظ نہیں کہا۔ خاموشی سے اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد فقیرا آگیا۔ اس کے پیچھے ہی ساہو درخت کے تنے کے پاس اندھیرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں گٹھری تھی۔ اس نے گٹھری مضبوطی سے فقیرے کی پیٹھ پر باندھی، مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

”ادھر آ۔ تجھے بھی میرے ساتھ چلنا ہے۔“

لالی لرزا اٹھا۔ انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے لائچی وہیں چھوڑ دی مگر اپنی گٹھری نہیں چھوڑی۔ اسے بغل میں دبا اور ساہو کے پاس پہنچ گیا۔

تینوں درختوں کے نیچے گھپ اندھیرے میں آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ لگ بھگ سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد داد محمد ساہو ٹھہر گیا۔ پلٹا اور منہ میں انگلیاں ڈال کر زور سے سٹی بجائی۔ سٹی بلند ہوتے ہی رات کے سائلے میں برساتی نالے کے قریب گولیاں چلنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ساہو اور فقیرا چپ کھڑے رہے۔ لالی بھی دم بخود تھا۔ عجب میں تاہر توڑ گولیاں چلتی رہیں۔ لالی نے

تاہو کی پشت پر لٹکی ہوئی فاضل بندوق دیکھ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”تیرے پاس کاربین ہے، مجھے بندوق دے دے۔ میں بالکل منتا ہوں۔ تیری مدد بھی کر سکوں گا۔“ ساہو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”دے دوں گا۔ ضرور دے دوں گا۔“ مگر اس نے بندوق دی نہیں۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے لالی کو ہولے سے دھکا دیا۔

”آگے چل۔“

لالی آگے بڑھا۔ ساہو اور فقیرا اپنی جگہ کھڑے رہے۔ انھیں اپنے ہم راہ نہ پا کر لالی ٹھنکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ساہو نے ڈپٹ کر کہا۔ ”دیکھتا کیا ہے؟ آگے بڑھ۔“ اس نے لالی کو قرابین کی زد پر رکھ لیا۔

لالی آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ آگے پولیس تھی، پیچھے ساہو اور فقیرا تھے۔ ادھر بھی بندوقیں تھیں اور ادھر بھی۔ لالی دونوں کے پیچ میں تھا اور بالکل غیر مسلح تھا۔ بھاگنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اس کی پشت پر ساہو اور فقیرا بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ وہ ڈمگاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا۔ خشک پتے اس کے پیروں کے نیچے آہٹ پیدا کرتے رہے۔ جیسے ہی وہ درختوں سے نکل کر کھلی جگہ آیا سامنے سے پولیس نے بندوقوں سے باڑھ ماری۔ گولیاں چبھتی ہوئی چلیں۔ لالی دھڑام سے زمین پر گر پڑا۔

فائرنگ مسلسل ہوتی رہی۔ گولیاں لالی کے سر پر سے، سینے پر سے، ٹانگوں پر سے سنساتی ہوئی گزرتی رہیں۔ وہ دم سادھے پڑا رہا۔ موت اس کے چاروں طرف منڈلاتی رہی۔ وہ رک رک کر سانس لیتا رہا۔

ساہو اور فقیرا نے جوابی فائرنگ نہیں کی۔ کچھ دیر بعد پولیس نے گولی چلاتا بند کر دی۔ لیکن برساتی نالے کے آس پاس فائرنگ پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔ لالی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کوئی گولی اس کے جسم کے کسی حصے میں لگی بھی ہے یا نہیں۔ اسے صرف اس قدر ہوش تھا کہ وہ زندہ ہے۔ لالی کی سمجھ میں یہ بات بھی نہ آئی کہ ساہو نے اسے تنہا آگے کیوں بڑھایا اور اسے پولیس کی گولیوں کی بوچھاڑ میں بالکل سامنے کیوں کر دیا؟ اپنے منصوبے کے مطابق نہ اس نے جوابی فائرنگ کی نہ ہی پولیس کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی۔ لالی ذرا دیر دم سادھے پڑا رہا پھر آہستہ آہستہ کھٹکتا ہوا درختوں کی جانب بڑھنے لگا۔ آخر وہ درختوں تلے اندھیرے میں آگیا۔ پولیس نے پھر فائرنگ شروع کر دی۔

مگر اب لالی فائرنگ کی زد سے باہر تھا۔ ساہو اور فقیرے نے اس بار بھی پولیس کے جواب میں

گولی نہیں چلائی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ وہ فائرنگ کی زد سے زیادہ سے زیادہ دور چلا جانا چاہتا تھا۔ کچھ فاصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ٹھہر گیا اور ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ گٹھری ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبی ہے۔ پولیس رک رک کر فائرنگ کرتی رہی۔ لالی نے اپنے بہت قریب چاپ سنی۔ ساتھ ہی دھیسے لہجے میں باتوں کی آوازیں بھی ابھریں۔

”لالی مارا گیا۔“ یہ فقیرے کی آواز تھی۔

فقیرے کے ساتھ ساہو تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اسے تو مارا ہی جانا تھا۔ آگے بھیجا اسی لیے تھا۔ دیکھ، پولیس کیسے چکر میں آگئی۔“

”پولیس ابھی تک اسی طرف گولی چلا رہی ہے۔“

”چلانے دے۔ چلانے دے۔ اپنے لیے ادھر کا راستہ صاف ہو گیا۔ چلا آ میرے پیچھے پیچھے۔“

دونوں دبے دبے قدموں آگے بڑھ گئے۔ لالی سانس روک کر کھڑا رہا۔ ان کی آہٹ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ پھر ختم ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد اس طرف بھی گولیاں گونجیں جدھر ساہو اور فقیرا گئے تھے۔



لالی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کدھر جائے؟ ہر سمت گولیاں تزا تزیج رہی تھیں۔ مگر ٹھہرنا بھی خطرناک تھا۔ اسے جلد سے جلد وہاں سے نکل جانا چاہئے تھا۔ وہ چونکنا نظروں سے اُدھر ادھر دیکھتا ہوا ایک طرف بڑھا اور کچھ دور تک بڑھتا گیا۔ وہ اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ اسی وقت دور سے ٹارچ کی روشنی ابھری۔ لالی نے دیکھا کہ پھیر و خون میں لت پت پڑا ہے۔ وہ مہرکا تھا۔ ٹارچ بجھ گئی، مگر اس کے ساتھ ہی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ لالی جھٹ زمین پر گر پڑا۔ گولیاں سنسناتی ہوئی اس کے برابر سے گزرتی رہیں۔ قریب ہی پھیرو کی لاش پڑی تھی۔

چاند نکل آیا تھا۔ مگر آسمان پر غبار اس قدر گہرا تھا کہ چاندنی بہت پھینکی اور دھندلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے نیچے گہرا اندھیرا تھا۔ لالی زیادہ دیر اس جگہ نہیں ٹھہرا۔ جیسے ہی فائرنگ ذرا تھمی، وہ درختوں کی آڑ لیتا ہوا تیزی سے بھاگا اور دور تک بھاگتا چلا گیا۔

وہ درختوں کے نیچے سے نکل کر باہر آ گیا۔ مگر یہ دیکھ کر حواس باختہ ہو گیا کہ دھندلی چاندی میں ا۔ کانٹیل عین اس کے سامنے کھڑا ہے۔

کانٹیل بھی اسے دیکھ کر بھونچا رہ گیا۔ لالی سراپد ہو کر ٹھنکا۔ ذرا ہوش ٹھکانے آئے تو تیزی سے دوڑتا ہوا سامنے کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کچھ دور آگے گیا تھا کہ اس نے سنا، کانٹیل کہہ رہا تھا۔

”نہیں جی! وہ لالی ہی تھا۔ کانٹیل واحد نے جو کپڑے بتائے تھے، وہی پہنے ہوئے تھا۔ میرے سامنے بالکل اس طرح کھڑا تھا جیسے تم کھڑے ہو۔“

”تم نے جھپٹ کر دبوچ نہ لیا؟“

”موقع ہی نہیں دیا اس نے۔ چھلا دے کی طرح نکل گیا، پر جائے گا کہاں؟“

لالی ان کی باتیں سنتا، جھاڑیوں میں دکتا، گھبرایا ہوا اندھیرے میں تیزی سے چلتا رہا۔ پچاس ٹھ گز فاصلہ اس نے جلدی جلدی طے کر لیا۔

اس کے آس پاس گہری خاموشی تھی۔ لیکن برساتی نالے کی طرف ابھی تک رک رک کر ولیاں چل رہی تھیں۔ چلتے چلتے وہ ایک طرف مڑا تو قریب سے بھاری بھاری بولوں کی آہٹ مری۔ ساتھ ہی آواز بھی آئی۔

”محمد خاں! ادھر اندھیرے میں جھاڑیوں تلے کوئی سفید چیز ہلتی نظر آتی ہے۔“

لالی نے جھٹ راستہ بدل دیا اور تیزی سے بھاگا۔ مگر ایک جھاڑی سے اس کی دھوتی ایسی ابھی لہ وہ نگا ہو گیا اور وہیں دب کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہولے ہولے دھوتی جھاڑی سے علیحدہ کی۔ ڈب سے نوٹ نکل کر گر گئے تھے انھیں ٹٹول ٹٹول کر اکٹھا کیا اور دھوتی کے پلو میں باندھ لیا۔ مرد دھوتی دوبارہ نہیں باندھی بلکہ جلدی جلدی قمیص بھی اتار دی۔

قمیص اور دھوتی سفید تھی۔ ان کا اجلا پن اندھیرے میں دور سے جھلکتا تھا۔ لالی نے جوتے بھی تار دیئے۔ جوتوں سے آہٹ پیدا ہوتی تھی۔ اس نے دھوتی کے ساتھ قمیص اور جوتے بھی گٹھری میں باندھ لیے۔ اب وہ مادر زاد برہنہ تھا۔

کچھ دیر وہ جھاڑی کے نیچے دہکا بیٹھا رہا۔ جب قدموں کی آہٹ دور ہو گئی تو اس نے گٹھری بغل میں دبائی اور جھاڑیوں کے درمیان چھپتا چھپتا آگے بڑھا۔ اسے پولیس والوں کی چاپ برابر سنائی دے رہی تھی۔ کبھی چاپ قریب آ جاتی، کبھی دور ہو جاتی۔

کئی منٹ تک وہ اسی طرح جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتا رہا۔ بار بار راستے بدلتا رہا۔ کہیں قدموں

کی رفتار تیز کردیتا، کہیں بھاڑی کی آڑ لے کر دیک جاتا۔ بھاڑیوں میں کانٹوں کی بہتات تھی۔ لالی کے برہنہ جسم پر کانٹوں سے جگہ جگہ خراشیں پڑ گئیں۔ خون رسنے لگا۔ مگر اس پر ہنگامی سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ وہ اندھیرے میں گھل مل گیا۔ پولیس کے لیے اس کا سراغ لگانا مشکل ہو گیا۔ چلتے چلتے وہ ایسی جگہ آگیا جہاں جھنگ ختم ہو گیا تھا۔ ساتھ ہی بھاڑیوں کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ سامنے چھیل میدان تھا اور اس سے آگے کسی قدر بلندی پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کی آڑ سے زور زور روشنی کا ایک دھبہ نظر آ رہا تھا۔

لالی نے چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سر ہٹ بھاگا۔ وہ میدان سے گزرتا ہوا بلندی کی جانب لپکا۔ دور سے کوئی چیخا۔ ”ٹھیر جا لالی!“ مگر لالی ٹھہرا نہیں۔ دوبارہ اور زیادہ زور سے چیخنے کی آواز ابھری۔

”ٹھیر جا، نہیں تو گولی چلا دوں گا۔“

لالی پھر بھی نہ ٹھہرا۔

گولی گہرے سائے میں زور سے گونجی اور لالی کے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ لالی نے بدحواس ہو کر اپنی رفتار اور تیز کردی۔



لالی ایک گھنے درخت پر بندر کی طرح پھرتی سے چڑھ گیا۔ کچھ دیر شاخوں کی اوٹ میں دبکا ہوا بیٹھا رہا اور چونکنا نظروں سے مڑ کر دیکھتا رہا۔ جب درخت کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا تو وہ ایک مضبوط ڈال سے چمٹ کر آہستہ آہستہ آگے کھینے لگا۔

اس نے ڈال کو دونوں ہاتھوں سے تھاما۔ ٹانگیں نیچے لٹکائیں۔ ہنگلے کی چار دیواری پر پیر نکائے اور نہایت ہوشیاری سے نیچے اتر گیا۔ ہنگلے سامنے ہی تھا۔ ہنگلے کی ایک کھڑکی سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی۔ وہ پودوں اور بھاڑیوں کی آڑ لیتا، دبے دبے قدموں چلتا، سیدھا اس کھڑکی پر پہنچا، جس سے روشنی جھلک رہی تھی۔ اس نے شیشے سے قریب ہو کر اندر جھانکا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

کھڑکی کا ایک شیشہ چٹھا ہوا تھا۔ لالی نے انگلی پھنسا کر شیشہ نصف سے زیادہ توڑ دیا۔ گھر ٹوٹے ہوئے شیشے کی تیز دھار سے انگلی کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ اس نے انگلی ہونٹوں میں دبا کر خون چوسا اور گردن جھکا کر زمین پر تھوک دیا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے اندر جلدی سے ہاتھ ڈالا اور چنچنی کھول دی۔ آہستہ سے کھڑکی کا ایک پٹ ہٹا کر راستہ بنایا۔ اوپر چڑھا اور اندر کود گیا۔

سامنے میز پر لمپ رکھا تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہر چیز نظر آرہی تھی۔ لالی سراپستگی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ چار دیواری کے اس پار آہٹ ابھر رہی تھی۔ ساتھ ہی زور زور سے سیٹیاں بھی بجتے لگیں۔ لالی اور سراپہ ہو گیا۔

ہنگلے کے بیرونی پھانک کے کھینے کی آواز سنی۔ وہ بدحواس ہو کر آگے بڑھا اور ایک کرسی

سے نکرا کر گرتے گرتے بچا۔ کرسی الٹ گئی۔ کرسی الٹنے سے آواز پیدا ہوئی۔ ساتھ ہی سامنے کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص دھاری دار گاؤں پنے دروازے سے نمودار ہوا۔ وہ گوار چٹا دہرے بدن کا آدمی تھا۔ چہرے پر بھوری بھوری پروکار مونچھیں تھیں۔ عمر چوالیس پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پستول دبا تھا۔ دوسرا ہاتھ گاؤں کی جیب میں تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر لائی کو دیکھا۔ لائی اس کے سامنے بالکل تنک دھڑنگ کھڑا تھا۔ سر کے بال گردے اٹے ہوئے تھے۔ جسم پر بھی گرد ہی گرد تھی۔ جگہ جگہ آڑی ترچھیں خراشیں بھی تھیں۔ ہونٹوں کے نیچے تازہ تازہ خون کا دھبہ تھا جو ٹھوڑی سے نیچے تک چلا گیا تھا۔ وہ شخص لائی کی یہ میت دیکھ کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”کون ہے تو؟ اندر کیسے آگیا؟“

ابھی اس نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ بنگلے کے باہر زور زور سے بولنے کی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ لائی دہشت زدہ ہو کر بولا۔ ”وہ وہ پولیس۔“ گھبراہٹ میں وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔ خوف اور بھاگ دوڑ سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ ہانپ رہا تھا۔

”کیا پولیس تیرا پیچھا کر رہی ہے؟“

لالی نے اقرار میں گردن ہلا دی۔ اس شخص نے دریافت کیا۔ ”پولیس تیرا پیچھا کیوں کر رہی ہے؟“

لالی گڑگڑانے لگا۔ ”مجھے پچالہجے۔ میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ ننگا دھڑنگ خاک سے اٹا ہوا لالی دھندلی روشنی میں بڑا مسکین نظر آ رہا تھا۔ اس شخص نے اسے مسکرا کر دیکھا اور تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ اس نے ذرا تامل کیا۔ ”میں کھڑا رہ۔ میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ جس کمرے سے نکلا تھا پھر اس میں چلا گیا۔

لالی ایک گوشے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا، کمرے میں ہر طرف اونچی اونچی الماریاں ہیں۔ الماریوں کے شیشوں کے پیچھے ترتیب سے رکھی ہوئی طرح طرح کی کتابیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف بڑی سی جھلکتی ہوئی میز تھی۔ میز پر لیپ روشن تھا۔ اس پر دو دوہیا سرپوش تھا جس نے روشنی دھیمی کر دی تھی۔ میز پر کاغذات اور چند موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں۔

بنگلے کے پچانک پر آوازیں بند ہو گئیں تھیں۔ لالی ہنوز خاموش کھڑا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ لالی نے اس کھڑکی کی جانب دیکھا جسے چاند کر وہ کمرے کے اندر آیا تھا۔ کھڑکی کا ایک پتہ ابھی تک کھلا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کھڑکی کی جانب بڑھا۔ اس اثناء میں بنگلے کے صدر دروازے کے کھلنے اور بند

ینے کی آواز سنائے میں ابھری۔ لالی ٹھہریا۔ وہ دم بخود اور سہا ہوا تھا۔ کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ شخص کمرے میں دوبارہ داخل ہوا۔ اس نے تکیہ نظروں سے لائی کو دیکھا، غصے سے ڈانٹا۔ ”کپڑے تو پہن لے۔“

لالی نے منہ سے ایک لفظ نہ نکالا۔ چپ چاپ گٹھری کھولی اور دھوتی نکال کر کمر کے گرد باندھنے لگا۔ اس شخص نے پوچھا۔ ”کیا تو جیل سے بھاگا ہو ا قیدی ہے۔“

”ہاں جی۔“ لالی نے آہستہ سے گردن ہلائی۔

”میں نے تجھے پولیس سے پچالیا ہے۔ اس لیے کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا تھا۔“ اس نے لائی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”میں میاں حیات محمد خان وٹو ہوں۔ تو میری پناہ میں ہے۔“

لالی نے نظریں نیچے کر کے آہستہ سے کہا۔ ”آپ نے جی مجھ پر بہت احسان کیا۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”بات یہ ہے جی.....“

حیات محمد نے اس کی بات نہیں سنی۔ رعب اور دبے سے بولا۔ ”تجھ سے صبح بات ہوگی۔“ وہ چند لمحے خاموش کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس نے انگلی کے اشارے سے لائی کو اپنے قریب بلایا۔ ”میرے ساتھ آ۔“ وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

کمرے کا دروازہ کھول کر دونوں راہ داری میں داخل ہوئے اور کچھ دور جا کر ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ دروازہ کھلا تھا۔ حیات محمد خاں وٹو نے لالی سے کہا۔ ”اندر جا کر سوجا۔ دروازہ بند کر لیتا۔ اب تو بالکل محفوظ ہے۔“

لالی اندر چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ یہ مختصر سی کوٹھری تھی۔ ایک دیوار کی بلندی پر روشن دان تھا۔ اس پر لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ روشن دان سے ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ لالی دروازے کے پاس خاموش کھڑا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کی نظریں کوٹھری کے اندھیرے سے مانوس ہو گئیں۔ اس نے دیکھا، دیوار کے ساتھ اونچا چوترہ ہے۔ لالی نے اس پر ہاتھ پھیرا۔ چوترے صاف ستھرا تھا۔ وہ خاموشی سے چوترے پر بیٹھ گیا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی اور ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ مگر اسے فیند نہیں آئی۔

وہ چپ لیٹا رہا۔ گھٹنے سوا گھٹنے بعد وہ چوترے سے نیچے اترا، گٹھری بغل میں دبائی ہوئے ہوئے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا اور کان لگا کر سن گئی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ چند لمحے دروازے کے قریب بت بنا کھڑا رہا۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ باہر سے

بند تھا۔ لالی نے پریشان ہو کر دروازہ دھیرے سے ہلایا۔ باہر سے کسی کی کھکارا بھری۔ لالی ایسا دہشت زدہ ہوا کہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ گہری سانس بھری اور دل گرفتہ ہو کر دروازے پر سر نہکا دیا۔

صبح کو خوری کا دروازہ کھلا۔ لالی نے دھڑکتے دل اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا، دروازے کے پتوں بچ اونچے قد کا ایک بھاری بھر کم آدمی کمر سے ریو اور لگائے کھڑا ہے۔ تھمتایا ہوا گہرا سانولا چہرہ، سر پر گھٹے بال، ڈاڑھی مونچھ صاف، آنکھیں موٹی موٹی اور سرخی مائل۔ اپنے ذیل ڈول اور وضع قطع سے وہ خاصاً ہیبت ناک لگتا تھا۔

اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ گردن کو ذرا سا خم دے کر باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آگیا۔ وہ شخص آگے بڑھا، لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں ایک تنگ غلام گردش سے گزر کر بنگلے کے باہر آ گئے۔

لالی نے چلتے چلتے اسے ٹوکا۔ ”مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ دونوں ایک پر فضا باغ کے کنارے کنارے پگ ڈنڈی پر چل رہے تھے۔ پگ ڈنڈی خاصی کشادہ تھی۔ اس پر سرخ بجری بھی تھی جو جوتوں کی رگڑ سے ہلکی ہلکی آہٹ پیدا کر رہی تھی۔ سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر آگیا تھا۔ ہر طرف ہستی دھوپ پھیلی تھی۔ مارچ کا تیسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ دھوپ میں ہلکی ہلکی تمازت تھی۔ پت جھڑ ختم ہو رہا تھا۔ ہمار کی آمد آمد تھی۔ باغ بہت وسیع تھا۔ جگہ جگہ رنگا رنگ پھولوں کے تختے ہوا سے جھوم رہے تھے۔

باغ میں پھلوں اور میوؤں کے درخت تھے۔ نرم نرم گھاس کا دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ درمیان سے پتھر کی بنی ہوئی پختہ نہر گزرتی تھی۔ نہر دو بڑے بڑے فوارے تھے۔ فواروں سے پھونتی ہوئی پانی کی جھال دھوپ میں جھللا رہی تھی۔ باغ کے اس پار درختوں کی اوٹ سے بنگلے کی اونچی چار دیواری نظر آتی تھی۔

پگ ڈنڈی سے ذرا ہٹ کر ایک بوڑھا شخص گردن جھکائے، ترنگی سے خشک پتے اکٹھا کرنے میں مصروف تھا۔ دونوں اس کے قریب پہنچے تو اس نے مڑ کر دیکھا اور ترنگی کا لمبا دستہ سنبھال کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور مسکرا کر آہستہ سے کہا۔

”کتے چلا دیو؟“

دیوہور نے کوئی جواب نہیں دیا، نہ اس کی جانب دیکھا۔ وہ لالی کے آگے آگے مرغ کی طرح

ردن اونچی کئے چلتا رہا۔ مگر وہ جتنا قد آور جوان تھا، چال سے اتنا ہی ڈھیلا ڈھالا لگتا تھا۔ چلتا تو کمر و اس طرح ہلکا سا خم دیتا کہ اس کے بھاری بھاری کولھے ہولے ہولے لچکتے۔ کچھ دور جا کر دیوہور سر گیا اور باغ کے اس گوشے کی جانب دیکھنے لگا جہاں چینی کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے کچ کے نیچے ند کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ کرسیاں خالی تھیں۔ میز پر پانی سے بھرا واشیٹے کا قرابہ اور دو گلاس رکھے تھے۔ قریب ہی الیش ٹرے بھی موجود تھی۔ میز دیکھ کر اندازہ ہوتا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے کوئی اٹھ کر گیا ہے۔ دیوہور ذرا دیر رک کر واپس مڑا۔ اب وہ لالی کے م راہ بنگلے کے صدر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ دروازے کے سامنے اونچے، اونچے ستونوں کا پورچ تھا۔ پورچ کے نیچے ایک لمبی چوڑی سیاہ ہوک کھڑی تھی۔ ڈرائیور جھاڑن سے کار کو بھاڑ پونچھ رہا تھا۔

بنگلے قدیم طرز کا تھا۔ مگر خوب بڑا اور نہایت شاندار تھا۔ جگہ جگہ عشق پتچاں کی بلیں چڑھی تھیں اور کچھ بیلوں کی خمیدہ چھت پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی نے بنگلے کی وہ کھڑکی بھی دیکھی اس کا ایک شیش ٹوٹا ہوا تھا۔ یہ شیش اس نے پچھلی رات توڑا تھا۔ اس کی اس انگلی میں جو شیش ٹوٹنے سے زخمی ہو گئی تھی، ابھی تک کک تھی۔ دیوہور بنگلے کی سمت بڑھتے بڑھتے لمحے بھر کو ٹھنکا۔

دونوں آگے بڑھے۔ سامنے چار دیواری کا اونچا چوٹی پھانک تھا۔ اب وہ اس راستے پر چل رہے تھے جو پھانک سے بنگلے کے پورچ تک جاتا تھا۔ راستہ سرخ اینٹوں سے بنا تھا۔ دونوں جانب سائے رد درخت تھے۔ پھانک سے کچھ فاصلے پر پختہ سائبان تھا۔ سائبان کے نیچے بجلی پیدا کرنے کا جزیئر تھا۔ اس کا انجن، شور کرتا ہوا چل رہا تھا۔ قریب ہی باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے کا کشادہ بو ترافرش سے لگ بھگ چار فٹ اونچا تھا۔ چوڑے کے پتوں بچ تھوڑا تھا۔ دو تند دریے اس کے دیک بٹھے جھپا جھپ روٹیاں لگا رہے تھے۔ تور سے ذرا ہٹ کر مٹی کا بڑا سا چولہا تھا، جس پر کچا چڑھا تھا۔ دھپکے کے نیچے لکڑیاں جل رہی تھیں۔ باورچی خانے سے متصل نوکروں اور کیوں کے کچے مکانات تھے۔ مکانات کا سلسلہ خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ لیکن ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ نوکر چاکر ادھر ادھر چل بھر رہے تھے۔ مگر وہ چپ چاپ چلتے تھے۔ کوئی اونچی آواز سے نہیں آتا تھا۔ جب لالی اور دیوہور پھانک سے کچھ فاصلے پر رہ گئے تو لالی نے بے چین ہو کر ایک بار پھر دریافت کیا۔

”مار، تو بتا، مجھے کہاں لیے جا رہا ہے؟“

اس دفعہ بھی دھیور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور خاموشی سے پھانک کی جانب بڑھنے لگا۔ پھانک کھلا تھا اور اس کے قریب دو مسلح سپریدر فرش پر بیٹھے تھے۔ گونگزار رہے تھے۔

انہوں نے لگا ہی انکار دھیور اور لالی کو دیکھا، لیکن کوئی بات نہیں کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پھانک سے گزر کر باہر آگئے۔ پھانک کے آگے کنکر کی بنی ہوئی نیم پختہ سڑک تھی جو شیشم اور بکائین کے درختوں کے سائے میں دور تک چلی گئی تھی۔

سڑک کے اس پار تاحہ نظر کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ کھیتوں کے ایک طرف آم کے باغ تھے۔ درختوں سے پورے بھر چکا تھا۔ کہیں کہیں شاخوں میں کیڑیاں بھی جھول رہی تھیں۔ دونوں نے سڑک پار کی۔ دوسری جانب پہنچے اور کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ کھیتوں میں گندم کے پودے لہرا رہے تھے۔ پودوں کی لمبی لمبی پتیاں اور ان کے اوپر بھومتی ہوئی گندم کی بالیاں زرد پڑ گئی تھیں۔ دھیور اور لالی آگے بڑھتے گئے۔ دھیور آگے تھا اور لالی پیچھے چلتے چل رہا تھا۔ وہ گندم کے پودوں کو دیکھتا رہا اور پتوں اور بالیوں کا بدلتا ہوا رنگ دیکھ کر سوچتا رہا کہ ربیع کی فصل ابھی پک کر تیار نہیں ہوئی۔ اس کی کٹائی میں لگ بھگ مینہ بھرتا رہا ہے۔ مگر فصل بہت اچھی تھی۔ بالیاں گندم کے دانوں سے لدی ہوئی تھیں۔

گندم کے کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو درختوں کے نیچے ایک ٹریکٹر نظر آیا جس کا بونٹ کھلا ہوا تھا۔ ایک ادھیر شخص، جو وضع قطع سے مکینک نظر آتا تھا، ٹریکٹر کے انجن پر جھکا ہوا کسی پرزے کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ٹریکٹر کے عقب میں کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر نیوب دیل تھا۔ نیوب دیل سے نکلتی ہوئی پانی کی موٹی دھار، آبشار کی مانند اوپر سے نیچے بم بم میں گر رہی تھی۔ بم بم میں بھرا ہوا پانی آؤ اور تالیوں کے ذریعے سروسوں اور پنے کے کھیتوں میں پہنچ رہا تھا۔ سروسوں کے ہستی بھول ہوا کے جھمکوں سے جھوم رہے تھے۔

دھیور کچھ اور آگے بڑھا۔ سامنے دور تک پھیلا ہوا سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے ارد گرد تالی، شہینہ اور سرس کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ دھیور چلتے چلتے رک گیا اور گردن اٹھا کر تجسس انگیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ لالی بھی اس کے قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔ اس نے دھیور سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔

ذرا سی دیر بعد گھوڑے کے دوڑنے اور کتوں کے بھٹکنے کی آوازیں دور سے سنائی دیں۔ دونوں

ی سمت دیکھنے لگے، جدھر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دیکھتے، دیکھتے درختوں کے ایک جھنڈ سے ایں حیات محمد خاں وٹو نمودار ہوا۔ وہ اس وقت گھڑ سواری کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک ہاتھ میں زے کا چابک دبا تھا۔

وہ پیروں سے ایڑا دیتا ہوا گھوڑے کو دوڑا رہا تھا۔ عقب میں شکاری کتوں کا غول تھا جو زور زور سے بھونک رہے تھے اور گھوڑے کے پیچھے، پیچھے بھاگ رہے تھے۔ حیات محمد نے نہ دھیور اور لالی کو دیکھا اور نہ ہی ان کی طرف آیا۔ بائیں موڑیں اور اس راستے پر گھوڑا دوڑانے لگا جو گھنے درختوں کے درمیان سے گزرتا تھا۔ جب میاں حیات محمد وٹو نظروں سے اوجھل ہو گیا تو دھیور پس مڑا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔

دونوں جنگل کے پھانک پر پہنچے۔ دھیور نے ہاتھ کے اشاروں سے منہ پھاڑ کر طرح طرح کی واژوں سے سپریدروں سے بات کی۔ لالی کو پہلی بار اس حقیقت کا سراغ ملا کہ دھیور بالکل گونگا ہے۔ پھانک پر تعینات ایک سپریدر نے اس کے اشاروں کو سمجھتے ہوئے جنگل کے صدر دروازے کا جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

”میاں صاحب اندر چلے گئے۔“

دھیور خاموشی سے جنگل کی جانب چل دیا۔ وہ لالی کے ہم راہ پورچ میں پہنچا۔ کارا بھی تک وہیں لٹری تھی۔ ذرا سیور، دروازے کے سامنے سیڑھیوں پر خاموش بیٹھا تھا۔ دھیور کو دیکھ کر وہ ایک ریف سرک گیا۔ مگر اس نے دھیور یا لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ دھیور اس کے قریب سے گزرتا رہا آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا اور لالی کے ہم راہ اندر داخل ہو گیا۔ یہ خاصا طویل لاؤنج تھا۔ جگہ، لہ کیکنس اور پام کے پودے گھلوں میں لگے تھے۔ گھلوں کے درمیان دو گرے ہائینڈ کتے چڑے کے موٹے موٹے گدوں پر بیٹھے لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ انھوں نے قدسوں کی آہٹ نہ کر تیز نظروں سے دھیور اور لالی کو دیکھا۔ لیکن خاموش بیٹھے رہے۔

لاؤنج سے گزر کر دونوں وکٹورین طرز کے کشادہ بال میں داخل ہوئے جس میں دیر قالین کا فرش ما۔ بال کی چھت، لاؤنج سے خاصی اونچی تھی۔ چھت کے تنچوں سے بڑا بلوریں بھار لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر چیتے اور تیندوے کے سروں اور کھالوں کے علاوہ قسم قسم کی تلواریں، خنجر، عابلیں، پرانی وضع کی لمبی لمبی بندوقیں اور قرابین آویزاں تھیں۔ دیواروں پر چند بڑی بڑی روغنی ماویر بھی لگی تھیں۔

ایک تصویر میں جو سب سے بڑی تھی اور نہایت نمایاں طور پر آویزاں تھی، حیات محمد مٹھی

مونچھوں والے ایک قد آور انگریز سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مصافحہ کرتے ہوئے وہ اس قدر باادب بالملاحظہ بنا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔ ہال میں محفل اور زرہ گت کے صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر نرم اور باریک ریشم کے پردے لہرا رہے تھے۔

دونوں جوان خادما میں جھاڑن سے کھڑکیوں کے شیشے اور تصاویر جھاڑ پونچھ کر چکا رہی تھیں۔ ایک شوخ اور عشوہ طراز خادمہ نے اپنی جھینٹ کی گھگرل ایک طرف سے پکڑ کر گھٹنے تک اوپر اٹھائی اور برہنہ پنڈلی کھاتے ہوئے المیزین سے مسکرا کر دھوڑ کو دیکھا۔ دھوڑ نے غصے سے اس پر نظر ڈالی اور نفرت سے منہ بگاڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ہال عبور کر کے لالی کے ساتھ ایک طویل غلام گردش میں داخل ہوا۔

غلام گردش میں بھی سرخ قالین کا فرش تھا۔ دیواروں پر دل فریب مناظر کی تصاویر آویزاں تھیں۔ دیوار گیر یوں سے پھونتی ہوئی ہلکی ہلکی نیل گوں روشنی میں ہر چیز گویا خواب کے سایوں میں تیرتی نظر آتی تھی۔

غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر ریشمی پردے پڑے تھے۔ دھوڑ ایک بند دروازے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ اندر جھانکا، لالی کی جانب متوجہ ہوا اور کمرے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا۔

لالی اس قدر گرم صم تھا جیسے پگھل کر بنگلے کی طلسمی فضا میں تحلیل ہو گیا ہو۔ اندر جاتے ہوئے اس کے قدم نہ اٹھتے تھے۔ دھوڑ نے اپنی لال لال آنکھوں سے اسے گھورا اور ہولے سے دھکا دیا۔ لالی جھٹ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں روشنی بہت دھیمی تھی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر دھیز پردے جھول رہے تھے۔ کمرے میں تمباکو کی تیز بو بسی ہوئی تھی۔ لالی ہکا بکا دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے دروازہ بند ہونے کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا، دھوڑ وہاں موجود نہیں تھا۔ اسی وقت کمرے کی پر اسرار خاموشی میں بھاری بھر کم آواز ابھری۔

”ادھر آ۔“

لالی نے چونک کر دیکھا، کمرے کے ایک گوشے میں میاں حیات محمد خاں وٹو چوڑے چکلے صوفے پر بیٹھا ہے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے روبرو جا کر کھڑا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر سوچ دیا۔ قریب رکھا ہوا بیڈ شل لیٹ روشن ہو گیا۔ حیات محمد خاں خاموش بیٹھا پاپ پر ہلکے ہلکے کش

ہج رہا تھا اور لالی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے برابر والے صوفے پر جرمن شیفز نسل کا موٹا تازہ ایشن لینا تھا۔ کتے کا چہرہ نہایت خوفناک تھا۔ رنگ گمراہ سیاہ تھا۔ صرف ناگوں اور منہ کا کچھ حصہ بھورا تھا۔

وہ لالی کو قریب پا کر غرائے لگا۔ لالی نے اس پر نظر ڈالی تو دہشت زدہ ہو کر سسم گیا۔ کتا غرا کر اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس پر جھینٹا ہی چاہتا ہو۔ وہ گردن اٹھا کر زور سے بھونکا۔ اس کی آواز اس قدر ڈراؤنی تھی کہ پورا کمرہ گونج اٹھا۔ لالی لرز کر رہ گیا۔

حیات محمد نے گردن موڑ کر کتے کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ وہ اس کی پیٹھ ایک ہاتھ سے آہستہ آہستہ تھپکنے لگا۔ کتے نے گردن نیچی کر لی اور غرانا بند کر دیا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے پائپ کی راکھ میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں جھاڑی اور لالی سے مخاطب ہوا۔

”میں نے تجھے سنور میں بند کر دیا تھا۔ پتہ ہے میں نے ایسا کیوں کیا تھا؟“

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ”مجھے نہیں ملوم جی۔“

”مجھے شبہ تھا، تو فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔“ حیات محمد نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نہایت بارع انداز میں دیکھا۔ اس کی تیوری پر پل پڑ گئے۔ ”میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میری بدنامی کا سبب بنے۔“

لالی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ وہ مجرم کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے کہا۔ ”فی الحال یہاں سے جانے کا خیال چھوڑ دے۔ میں تیرے ہی بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ پورے علاقے میں پولیس پھیلی ہے۔ کل رات ڈاکوؤں سے پولیس کی مذبحیز ہوئی تھی۔ دونوں طرف سے زبردست فائرنگ ہوئی۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ دو پولیس والے زخمی ہوئے۔ پولیس نے پورے علاقے کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔“ اپنی بلیت کتے، کتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکا۔

”کیا تو بھی ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہے؟ اگر ایسا ہے تو مجھے صاف صاف بتا دے۔“

”میں تو جی انھیں بالکل نہیں جانتا۔ مجھے تو انھوں نے زبردستی پکڑ رکھا تھا۔ رات پولیس کے ساتھ ان کی گولی چلی تو میں ان کے چنگل سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا؟“

”سچ کہہ رہا ہے تو؟“ میاں حیات محمد وٹو نے دریافت کیا۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا جی۔“ لالی نے عاجزی سے کہا۔ ”آپ نے جی مجھے

گرفتاری سے بچایا ہے۔“

”بندوق شندوق چلائی تو تجھے آتی ہی ہوگی؟“

”آتی ہے جی، بالکل آتی ہے۔“ لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”مجھے تو کاربین اور ریشل بھی چلائی آتی ہے۔ نشانہ بھی میرا سچا ہے۔“

حیات محمد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ”اب تو جا۔ رات کو بات ہوگی۔ دھیور تیرے ٹھیرنے اور کھانے پینے کا بندوبست کر دے گا۔ دھیور گونگا ہے، بول نہیں سکتا۔ مگر سن سکتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دینا۔ یہاں تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔“ اس نے قدرے قائل کیا۔ ”اب تو جا سکتا ہے۔“

لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔



برآمدہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے سے رابداری گزرتی تھی۔ برآمدے میں دروازے کھلتے تھے۔ دھیور نے ایک بند دروازہ کھولا۔ یہ کوٹھری نما مختصر کمرہ تھا۔ اس میں چارپائی تھی۔ چارپائی پر معمولی بستر تھا۔ کمرے میں کھڑکی بھی تھی۔ اس میں لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔ کھڑکی کے عین سامنے منظر تھا۔ کوڑے کرکٹ کے اس ڈھیر کے ارد گرد جھاڑیاں اور گھنے درخت تھے۔ کمرے سے ملحق اتنا ہی بڑا ایک اور کمرہ تھا۔ اس میں دھیور کا قیام تھا۔ دونوں کمرے بچکے کے عقبی حصے میں واقع تھے اور ایک بڑے کمرے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے بنائے گئے تھے۔

دروازہ کھول کر دھیور نے لالی کی طرف دیکھا اور کمرے کے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے کمرے میں جا کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دھیور دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ لالی نے اپنی بڑھی ہوئی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دھیور سے کہا۔ ”یار، کوئی ٹائی شائی ہوگا؟ میں نے ڈاڑھی بنوائی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔“ دھیور نے اس کی بات سن کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ایک طرف چا گیا۔ لالی بستر پر بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہم راہ ٹائی بھی تھا۔ وہ دلا پٹا اور ادھیڑ تھا۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ برآمدے میں دروازے کے سامنے اکڑوں بیٹھ گیا۔ لالی کمرے سے باہر آیا اور ٹائی کے سامنے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ڈاڑھی بنوائی ہے۔“ ٹائی نے کوئی جواب نہ دیا۔

استرے سے اس کی ڈاڑھی موڑنے لگا۔

دھیور برآمدے میں رکھے ہوئے ایک چوڑے اسٹول پر بیٹھا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ڈاڑھی

موڑنے کے بعد ٹائی نے اپنی کبست سے آئینہ نکالا اور لالی کی طرف بڑھا دیا۔ لالی نے آئینہ ہاتھ میں لے کر اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معاہدے اپنا حلیہ بدلنے کا خیال آیا۔ اس نے ٹائی سے کہا۔ ”یار، مونچھیں بھی صاف کر دے۔“ اس نے گردن موڑ کر دھیور کی جانب دیکھا، زیر لب مسکرایا۔ ”مجھے بھی دھیور کی طرح صفا چٹ بنا دے۔“ اس کی بات سن کر دھیور نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

ٹائی بھی نہیں بولا۔ اس نے استرے سے لالی کی مونچھیں صاف کر دیں۔ جامت بنا کر ٹائی نے اپنا سامان کبست میں رکھا اور لالی سے کچھ کہے بغیر چپ چاپ اٹھ کر چلا گیا۔ لالی نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا۔ اور دھیور کو مخاطب کرتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ ”لے یار تیری محبت میں، میں نے بھی اپنی مونچھیں صاف کرا دیں۔ کیا یاد کرے گا، کوئی لالی ملا تھا۔ اب یہ بتا، نما نے دھونے کا کیا بیٹا ہوگا؟ میں نما نا چاہتا ہوں۔ بھوک بھی زوروں کی لگی ہے۔ توں نے سویرے سے روٹی بھی نہیں کھائی۔“

دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ برآمدے کے برابر ہی دروازہ تھا۔ دھیور نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ یہ غسل خانہ تھا۔ سامنے دیوار پر آئینہ لگا تھا۔ اس کے برابر ہی لکڑی کے تختے پر کنگھا، صابن اور سر میں ڈالنے کے لیے شیشی میں نیل بھی موجود تھا۔ غسل خانے میں ایک طرف نکا تھا اور اس کے نیچے فٹ بھرا اونچا چوڑا تھا۔ لالی نے غسل خانے کا دروازہ بند کیا۔ کپڑے اتارے اور نلکے کے نیچے چوڑے پر بیٹھ کر نما نے لگا۔ وہ صابن مل کر دیر تک نما تاربا۔

نما نے سے فارغ ہوا تو اس نے کھونٹی پر لٹکے ہوئے تولیے سے بدن پونچھا۔ کپڑے پہنے۔ سر میں نیل ڈالا۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نتھنے سے بال سنوارے اور تروتازہ ہو کر غسل خانے سے باہر آیا۔

دھیور برآمدے کے سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولا۔ ”یار! میری گٹھڑی تو لادے۔“ اس نے اپنے لباس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”یہ کپڑے تو بہت گندے ہو گئے ہیں۔ گٹھڑی میں میرے کپڑے ہیں۔ انھیں نکال کر پین لوں گا۔“ دھیور نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

لالی اپنے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس کی آنکھیں نیند سے پو جھل ہو رہی تھیں۔ مگر وہ سویا نہیں۔ کمرے میں سٹنے لگا۔ چند منٹ بعد دھیور واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں گٹھڑی دبی

تھی۔ اس نے گھری لالی کودی اور اسٹول پر جا کر بیٹھ گیا۔ لالی نے کپڑے تبدیل نہیں کئے۔ گھری لے کر ایک طرف رکھ دی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ ایک بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی۔ اس نے دھیرور کی جانب دیکھا اور کمرے میں داخل ہو کر کھانا لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ ”بے بی اپنی بھی پلا دے۔“ عورت نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے میں ایک طرف المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ عورت نے گلاس اٹھایا، خاموشی سے غسل خانے میں گئی اور پانی سے بھرا ہوا گلاس سر جھکا کر چپ چاپ سامنے رکھ دیا۔

لالی نے حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”بے بی کیا تو بھی گوئی ہے؟“ بوڑھی عورت نے اسے ٹیکھی نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہری۔ اگلے قدموں واپس چلی گئی۔

لالی کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں تنوری روٹی اور پننے کی وال تھی۔ اس کے ساتھ جند کی پھلیوں کا اچار بھی تھا۔

لالی نے کھانا کھایا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک بیٹکے کے پر اسرار ماحول کے بارے میں غور کرتا رہا۔ وہاں حیات محمد کے سوا ہر شخص گونگا تھا یا خاموش اور سما ہوا نظر آتا تھا۔ سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ دن ڈھلے وہ نیند سے بیدار ہوا۔ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دروازے کے سامنے اسٹول خالی تھا۔ دھیرور وہاں نہیں تھا۔ لالی چارپائی سے نیچے اترا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں آگیا۔ اسی وقت دھیرور بھی اپنے کمرے سے نکل کر باہر آگیا۔

لالی نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”یار دھیرور! چائے شائے بھی ملے گی؟“

دھیرور نے حسب معمول آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور راہ داری میں اس طرف چل دیا جدھر سے بوڑھی عورت کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی کا جی چاہا کہ وہ بھی دھیرور کے پیچھے پیچھے چلا جائے، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ برآمدے میں خاموش کھڑا چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مگر ہر طرف دیواریں تھیں اور جھکی ہوئی نیچی پھت تھی۔ ذرا دیر بعد دھیرور مٹی کی ٹھونھی میں چائے لے کر آگیا۔ چائے گرم تھی اور بہت میٹھی۔ اس میں شکر کے بجائے گڑ ڈالا گیا تھا۔ مگر دودھ کی مقدار زیادہ تھی۔

لالی نے چائے پی کر دھیرور سے یارانہ گانٹھنے کی کوشش کی۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ ”دھیرور!

تیری گھروانی اور پننے کہاں ہیں؟“

دھیرور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنا اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے دھیرور کو کریدا۔ ”تو نے ویاہ نہیں کیا؟“ دھیرور نے انکار میں گردن ہلا دی۔ مگر اس کے چہرے سے ہزاری ٹپک رہی تھی۔

لالی نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”اپنے توبی تین پنچے ہیں۔ بہت یاد آتے ہیں۔ میٹوں ہو گئے دیکھے ہوئے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ویسے تو یاد گھر والی بھی آتی ہے اور رات کو تو بہت یاد آتی ہے۔ سونے سے پہلے بہت چاؤ سے اپنی کاکو سا پلاتی تھی۔ ایسا گرم اور گاڑھا گاڑھا دودھ کہ پی کر مزا آ جاتا تھا۔“

دھیرور نے اس کی باتیں سن کر کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری اور بالکل سپاٹ تھا۔ لالی کہتا رہا۔ ”جاؤے کی راتوں میں گھر والی ساتھ ہو تو یار، کوسا کیا ہمار دکھاتا ہے۔ ایسی الیل ہوتی ہے، تجھے کیا بتاؤں۔“ یہ کہہ کر اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ دھیرور کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجھلاہٹ بکھرنے لگی۔ اس نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھورا۔ لیکن لالی اس کے گھورنے پر ذرا خائف نہ ہوا، بے تکلفی سے آنکھ مار کر بولا۔

”یار! تیرا ایسا ڈھو جوان، گھر والی کے بغیر تیرا گزارہ کیسے.....“

دھیرور نے اسے آگے کچھ نہ کہنے دیا۔ تیزی سے جھپٹا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا سر اور ٹھوڑی اس زور سے جھٹکا دے کر دبا یا کہ لالی کی زبان دانتوں کے درمیان آکر زخمی ہو گئی۔ وہ تھملا کے رہ گیا۔ دیر تک اس کی زبان میں ٹیس اٹھتی رہی۔ تکلیف سے وہ بول بھی نہ سکا۔ بھونچکا کھڑا سوچتا رہا کہ دھیرور اچانک اس قدر خفا کیوں ہو گیا؟ اس نے تھوکا تو تھوک کے ساتھ خون بھی آیا۔ لالی چند لمحے غصے سے بانپتا رہا آخر وہ اس دروازے کی جانب بڑھا، جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔ وہ میاں حیات محمد ونو کے پاس جا کر دھیرور کے وحشیانہ رویے کے خلاف فریاد کرنا چاہتا تھا۔ مگر دھیرور نے اسے آگے جانے نہ دیا۔ لپک کر سامنے آگیا۔ لالی نے آگے بڑھنا چاہا تو دھیرور نے اس کے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی سنبھل نہ سکا۔ لڑھکتا ہوا کمرے کی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔

وہ گہری سانسیں بھرتا رہا اور قہر آلود نظروں سے دھیرور کو گھورتا رہا۔ کچھ دیر وہ اسی عالم میں پڑا بانپتا رہا۔ پھر ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کر سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اٹھا اور دھیرور سے دھیرور کی طرف بڑھا۔ دھیرور خاموش کھڑا رہا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دو بچے لے۔ لیکن دھیرور نے نہایت پھرتی سے اس کے دونوں ہاتھوں کی کلاسیاں پکڑ لیں۔ لالی نے

بھٹکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو اسے اندازہ ہوا کہ دھیور کے ہاتھ لوہے کے شکنجوں کی مانند سخت اور مضبوط ہیں۔

ذرا دیر تک دونوں میں زور آزمائی ہوتی رہی۔ لالی نے بہت زور مارا، مگر وہ دھیور کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہ چھڑا سکا۔ دھیور چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ وہ شش سے مس نہ ہوا۔ لالی نے کبڈی کے کھلاڑیوں کی طرح حلق سے ”دھو“ کی آواز نکالی۔ اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ اس کے دونوں ہاتھ دھیور کی پکڑ سے آزاد ہو گئے۔ دھیور کے قدم لڑکھڑا گئے۔ لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ اچھلا اور سر جھکا کر پوری قوت سے دھیور کے سینے پر ٹکرماری۔ وہ دھڑام سے پیٹھ کے بل گرا۔ لالی نے چاہا کہ جھپٹ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھے، مگر دھیور نے گرتے ہی جھٹ ہو لسنر سے ریو اور نکال لیا اور تیندوے کی مانند تیز نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

لالی جہاں تھا وہیں رک گیا۔ دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا اور قریب جا کر ایک ہاتھ لالی کی گردن پر رکھ کر پوری قوت سے دھکا دیا۔ لالی دبلیز سے ٹکرا کر لڑھکتا ہوا اپنی چارپائی کے پاس جا گرا۔ اس کے سر میں کراری چوٹ آئی۔ مگر سر پیٹنا نہیں۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ سر میں شدید ٹیس اور کک تھی۔ دھیور سامنے دروازے پر خاموش کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریو اور دبا تھا۔

لالی نے اس کی جانب نہیں دیکھا۔ سر کی چوٹ سے زیادہ لالی کو احساس ہزیمت نے تڑپا دیا۔ اپنی بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے ٹپ، ٹپ آنسو گرنے لگے۔ دھیور ذرا دیر تک کھڑا اسے گھورتا رہا، آخر دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔

☆

شام کا چھینٹا ہوا تاند میرے کے ساتھ ہی بنگلے میں ہر طرف موت کی سی خاموشی چھا گئی۔ لالی چارپائی کے پاس فرش پر گم صم بیٹھا رہا۔ جب اندھیرا زیادہ بڑھا تو دھیور نے لالین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ اس نے لالین ایک طرف رکھ دی۔ لالی نے اس کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ دھیور کمرے سے باہر چلا گیا، سنانا اور بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سنانے میں چاپ سنا کی دی۔ لالی نے گردن اٹھا کر دیکھا، سامنے بوڑھی عورت کھڑی ہے۔ وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ عورت لمحہ بھر کو ٹھکی۔ اس نے لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جھک کر کھانا لالی کے سامنے رکھا۔ دن کے برتن اٹھائے اور سائے کی طرح خاموشی سے چلی گئی۔ لالی نے کھانا کھایا۔ مگر وہ ایک روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ چپ چاپ جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ خود کو بہت مضطرب اور تھکا ہوا محسوس کر رہا

فان۔ دیر تک خاموش پڑا رہا، پھر سو گیا۔

دس بجے کے قریب دھیور نے لالی کو جگایا۔ باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اٹھ کر گٹھری کھولی۔ پتلون اور بٹن شرٹ نکال کر پینے۔ خاموشی سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ چلنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ میاں حیات محمد کے سامنے کھڑا تھا۔ سیاہ الیشن اس وقت بھی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات محمد ہسکی سے شغل کر رہا تھا۔

اس نے لالی کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مونچھوں سے صاف چہرے اور سلوٹیں پڑی ملٹی پتلون اور ش شرٹ کو دیکھا مگر ان کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ صرف اتنا پوچھا۔
”ٹھیک ٹھاک ہے، کوئی تکلیف ٹھیکیت تو نہیں؟“

لالی نے دھیور کی زیادتی اور اشتعال انگیزی کے خلاف احتجاج کیا۔ ”ویسے تو میں ہر طرح کا آرام ہے، پُر دھیور نے میرے ساتھ خاما خا کاٹھا کیا۔ مجھے دھکا دے کر گرادیا۔ پستول تان کر کھڑا ہو گیا۔“
”میں اسے سمجھا دوں گا۔ آگے وہ ٹھیک طرح پیش آئے گا۔“ حیات محمد نے ہسکی کی چسکی کاٹے ہوئے کہا۔ ”مگر وہ ضروری بات کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دے گا اور جیسا کہے گا تجھے یہاں ہی کرنا ہو گا۔ تو اس کے چارج میں ہے۔ تجھے یہ بات نہیں بھولی چاہئے۔“

لالی اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”ساب، میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہو سکتا۔ وہ اگر گرمی دکھائے گا، اپنا گلابھی چل جائے گا۔ خاما خا، فیر کسی دن جھگڑا مٹنا ہو جائے گا۔ آج تو میں چپ کر گیا۔ پر آگے اس نے گرمی دکھائی تو۔۔۔“

حیات ایک دم بھر گیا۔ لالی کی بات کاٹ کر زور سے چیخا۔ ”کیا کہتا چاہتا ہے؟“ اس کی برہمی کے ساتھ ہی کتے نے گردن اٹھائی اور زور زور سے غرائے لگا۔

لالی نرم پڑ گیا۔ سر جھکا کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔ ”میاں صاحب! مجھے جانے کی اجازت دے دیجئے۔ آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔“

حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ ”جیل جانا چاہتا ہے؟“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد خاں چند لمحے چپ بیٹھا رہا۔ در قریب بیٹھے ہوئے کتے کی پیٹھ پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ ”شام کو ڈی ایس پی میرے پاس یا تھا۔ یہ تو اسے جرات نہ ہوئی کہ کھل کر تیرے بارے میں مجھ سے پوچھتا۔ مگر اس کی باتوں سے ناف معلوم ہوتا تھا کہ اسے شبہ ہے، تو میرے بنگلے میں ہے۔“

”۔۔۔“ مجھے فوراً یہاں سے چلا جانا چاہئے۔“

”یوقوف۔“ حیات نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ ”یہاں سے نکلتے ہی تو گرفتار کر لیا جائے گا۔ پولیس تیری گھات میں ہر طرف بیٹھی ہے۔“ اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ لیا۔ لمبے میں ٹھہراؤ پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

”تو یہاں سے جانے کے لیے اتنا بے چین کیوں ہے؟“

”آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ صاف بات یہ ہے جی! مجھے رحیم داد کی بہت فکر ہے۔ میں بھتیختی نال اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ رحیم داد وہی قیدی ہے ناجو تیرے ساتھ جیل سے فرار ہوا تھا؟“

”جی سب! آپ اسے جانتے ہیں؟“

”نہیں۔“ میاں حیات نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”اس کے بارے میں ڈی ایس پی نے صرف اتنا بتایا ہے کہ اسے اقدام قتل کے جرم میں سزا ہوئی تھی۔“ وہ چند لمبے خاموش رہا۔ ”سنا ہے دونوں پارٹیوں کے درمیان مسلح تصادم ہوا تھا۔ کچھ زخمی بھی ہوئے، مگر ان میں سے ایک زخمی پچھلے دنوں چل بسا۔“

لالی نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”پر سب! مجھے سات مہینے تو کیس چلا۔ رحیم داد نے تین مہینے سے اوپر جیل میں سزا کے گزارے۔ اب تو یہ بات بہت پرانی ہو گئی۔“

”میں یہ سب کچھ نہیں جانتا۔“ حیات محمد نے بے زاری سے کہا۔ ”مجھے تو یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ بندہ مر گیا جو اس کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ اب پولیس اس کے خلاف قتل کے الزام میں ۳۰۲ کا مقدمہ قائم کرنا چاہتی ہے۔ پہلے اسے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی۔ اب جرم کی نوعیت بدل کر زیادہ سنگین ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ترمیم مقدمہ کی کارروائی بھی شروع ہو گئی ہے۔“

لالی نے کچھ نہ کہا۔ حیات بھی چپ بیٹھا رہا اور آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔ ”پولیس تجھے گرفتار کرنے کی سرٹوڈ کوکوشش اس لیے کر رہی ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے حیات محمد ذرا الجھا۔ ”کیا نام ہے دوسرے مفرد قیدی کا؟“

لالی نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”رحیم داد۔“

”رحیم داد۔“ حیات محمد نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”پولیس تیرے ذریعے رحیم داد کا سراغ لگانا چاہتی ہے۔ پولیس کو ایسی اطلاعات ملی ہیں کہ کچھ دنوں پہلے وہ تیرے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ بعد میں روپوش ہو گیا اور اب تک لاپتہ ہے۔“

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ میاں حیات محمد وٹو نے ذرا دیر چپ رہنے کے بعد کہا۔ ”میں تجھے یہ بھی بتا دیتا چاہتا ہوں کہ جو بندہ رحیم داد کے ہاتھوں قتل ہوا، وہ صوبائی وزیر زراعت کا قریبی عزیز ہوتا تھا۔ بھانجیا یا بھتیجا تھا۔ شاید کوئی اور رشتہ ہو۔ مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم۔ وزیر کا بیٹا پہلے ادھر ہی ہوتا تھا۔ بعد میں لہور چلا گیا اور وہیں کوٹھی بنا کر رہنے لگا۔ اب تو وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ کسی زمانے میں وڈا سیاست داں ہوتا تھا۔ مقتول کے گھر والے اس پر اور اس کے پتر بہت دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لہذا وہ تیری اور تیرے ساتھی رحیم داد کی گرفتاری میں ذاتی دلچسپی لے رہا ہے۔“

حیات نے اپنی بات کہتے کہتے قدرے تامل کیا۔ ”جب کوئی وزیر کسی معاملے میں ذاتی دلچسپی لیتا ہے تو پولیس کی راتوں کی نینداڑ جاتی ہے۔ ملازمت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سن لیا تو نے؟“

لالی نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”یہ بات ہے، تب تو جی مجھے ساری بات رحیم داد کو فوراً بتا دینی چاہئے۔“

اس کی بات سن کر حیات محمد شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر بولا۔ ”تو بالکل الو کا بچھا ہے۔“

لالی اس کے برہم ہونے پر ڈر گیا۔ گڑگڑا کر گویا ہوا۔ ”سب جی! نراض نہ ہوں۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے، پولیس کو جب یہ شبہ ہے کہ میں یہاں ہوں تو وہ کسی دن چھاپا مار کر مجھے پکڑ بھی سکتی ہے۔“

”پولیس کی اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ میرے بیٹکے پر چھاپا مارے اور تلاشی لے۔“ حیات نے نہایت رعوت سے کہا۔ ”شاید تجھے پتہ نہیں۔ کل رات جو پولیس انسپکٹر میری اجازت کے بغیر بیٹکے کی چار دیواری کے اندر داخل ہوا تھا، اسے میرے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکھڑانے پر تین کانسٹیبلوں کے ساتھ آج معطل کر کے لائن حاضر کر دیا گیا۔ ڈی ایس پی کل رات ہی کے واقعے کے بارے میں معذرت کرنے میرے پاس آیا تھا۔“ اس نے وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ ”میں نے سہ پہر کو وزیر زراعت سے بھی گل بات کی تھی۔ وہ میرا پرانا یا رہے۔ کالج میں ساتھ پڑھتا تھا۔ میری ہی کوششوں سے وزیر لگا ہے۔“ لالی بت بنا خاموش کھڑا رہا۔ میاں حیات محمد کہتا رہا۔

”تو یہاں ہر طرح محفوظ ہے۔ رہ گیا رحیم داد تو اسے اب بھول جا۔“

لالی خاموش نہ رہ سکا۔ بے چین ہو کر بولا۔ ”میاں صاحب، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

پر رکھا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور آگے بڑھتے ہوئے بولا۔
”میرے ساتھ آ۔“

الیشن بھی صوفے سے اتر کر نیچے آگیا اور میاں حیات محمد کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ لالی کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ مگر وہ سہا ہوا حیات محمد کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ حیات محمد غلام گردش میں کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ اسے کھولا۔ باہر دھوڑ کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اسے کمرے کے اندر بلایا۔

دھوڑ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ میاں حیات محمد نے جنوبی دیوار کا بند دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ یہ دروازہ کمرے کے دوسرے دروازوں سے کسی قدر مختصر تھا۔ اس میں تالا بھی پڑا تھا۔

دھوڑ نے شلوار کی چور جیب سے کنبی نکالی اور نہایت مستعدی سے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
میاں حیات محمد اپنے الیشن کے ساتھ ذرا سا جھک کر اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

لالی بھی اندر چلا گیا۔ دھوڑ باہر رہ گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دیوار میں لگا ہوا بجلی کا سوچ دبایا۔ ایک بلب روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی بہت دھیمی تھی۔

سانے زینہ تھا جو نیچے جاتا تھا۔ دونوں آگے پیچھے نیچے اترے۔ یہ کشادہ ترہ خانہ تھا۔ فرش کچا تھا۔ ترہ خانے میں نمی تھی، ٹھنڈی تھی اور عجیب طرح کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ ترہ خانے میں بھی دھندلا بلب روشن تھا۔ ہوا کی آمد و رفت کے لیے چنی تھی جو کھیریلوں کی چھت کے اوپر نکلے ہوئی تھی۔ چنی کے نیچے آتش دان تھا۔ اس میں ترہ خانہ گرم رکھنے کے لیے موسم سرما میں لکڑی کے ٹکڑے اور کوئلے سلگائے جاتے تھے۔



دھندلی دھندلی روشنی میں ایک بوڑھا شخص زمین پر لیٹا تھا۔ اس کی ڈاڑھی اور سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ وہ جیل کے قیدیوں کا سالباںس پنہ ہوئے تھا۔ اس کے ایک پیر میں لوہے کی موٹی زنجیر تھی جس میں وزنی گولا پڑا تھا۔ قریب ہی تام چینی کا بوسیدہ تسلا رکھا تھا۔ ایک طرف مٹی کا گھڑا اور المونیم کا گلاس تھا۔ آہٹ سن کر بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میاں حیات اور لالی کو گھورنے

”ایسے ہی جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ رحیم داد جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا یا ہلاک کر دیا جائے گا۔ مقتول کے بھائی اور خاندان والے بھی اس کی تلاش میں ہیں۔ دیکھتے ہی اسے قتل کر دیں گے۔ پولیس کے ہاتھوں اگر وہ پکڑا گیا تب مقدمے کی سماعت کے دوران ہی اسے مار ڈالیں گے۔ تجھے تو پتہ ہی ہو گا کہ خون کا بدلہ یہاں ایسے ہی لیا جاتا ہے۔ عدالت کے فیصلے کا انتظار نہیں کیا جاتا، بلکہ عدالت کے احاطے کے اندر بھی قتل ہو جاتا ہے۔“

حیات محمد نے بول اٹھائی، خالی گلاس میں وہسکی ایڈیلی، تھرماس سے برف نکال کر ڈالی، شیشے کے قراپے سے پانی ڈالا اور پیٹ بنا کر وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ پھر سمجھانے کے انداز میں نرمی سے بولا۔
”دیکھ، رحیم داد کے ساتھ ہمہ ردی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ مجھے ڈر ہے اس کا ساتھ دینے کی کوشش میں تو بھی مارا جائے گا۔ گرفتار تو بہر حال کر ہی لیا جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو میرے پاس ٹھہرا رہ۔“ وہ چند لمبے خاموش رہا۔ ”رحیم داد زیادہ دنوں تک روپوش نہیں رہ سکتا۔ پولیس اس کا سراغ لگالے گی۔ اس کی گرفتاری کے بعد پولیس تیری طرف سے غافل ہو جائے گی۔ میں اپنے اثر و رسوخ سے تجھے جیل جانے سے بچا لوں گا۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔“
لالی نے سر جھکا کر نہایت عاجزی سے کہا۔ ”ساب، آپ رحیم داد کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؟ گل امہ ہے میاں جی، جیل سے میں ہی اسے نکال کر لایا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا۔“

حیات نے لالی کو آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ ”رحیم داد کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ سمجھ لے، وہ مر گیا۔“ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ صرف تجھے بچا سکتا ہوں۔“

لالی نے ہچکچاتے ہوئے ایک بار پھر درخواست کی۔ ”آپ کی بہت مہربانی ہے جی، مگر۔“
”اگر مگر چھوڑ۔“ حیات محمد نوٹے توری پر پل ڈال کر کہا۔ ”مجھے دو نوک جواب چاہئے۔ جیل جانا چاہتا ہے یا یہاں رہنا چاہتا ہے۔“ اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ ”مجھے صرف ٹیلیفون کرنا ہو گا۔ گھنٹے بھر کے اندر تو پولیس کی حراست میں ہو گا۔ بول کیا چاہتا ہے؟“

لالی اس کی دھمکی سے مرعوب ہو گیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ ”میاں جی، میری کیا مرضی، جو آپ حکم کریں گے وہی کروں گا۔“

”شباباش۔“ حیات محمد دونوں نے اونچی آواز سے کہا۔ اس کا چہرہ غکفہ ہو گیا۔ وہ خاموش بیٹھا اپنے الیشن کی نرم نرم پیٹھ پر محبت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ کتا دھیرے دھیرے غراتا رہا۔ میاں حیات محمد نے گلاس اٹھایا اور ساری وہسکی غماغٹ چڑھا کر ایک بار پھر اسے خالی کر دیا۔ اس نے گلاس میز

لگا۔ اس کی آنکھیں غصے اور نفرت سے جلدی ہی بھڑکتا ہوا شعلہ بن گئیں۔ چرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ منہ بگاڑ کر چیخنے لگا۔

”تو آگیا۔ کتے! ذلیل! دور ہو جا میری آنکھوں کے سامنے سے۔ میں تیری صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔ دفع ہو جا یہاں سے۔“

وہ چیخ چیخ کر حیات محمد کو گالیاں دیتا رہا اور گمری گمری سانس بھر کر بانپتا رہا۔ حیات ٹھنکا۔ ذرا دیر خاموش کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے چلتا ہوا بوڑھے کی جانب بڑھا۔ حیات جس قدر قریب ہو آگیا بوڑھے کی دیوانگی میں اسی قدر اضافہ ہو آگیا۔ وہ اور زیادہ غصے سے چیخنے لگا۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں وحشت سے ابل پڑیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حیات محمد پر تیزی سے جھپٹا مگر لوہے کے ذئی گو نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے پیر میں پڑی ہوئی زنجیر جھن جھنا اٹھی۔ حیات کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ وہ بوڑھے کے عین مقابل کھڑا تھا۔ بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

وہ تھملا کر اٹھا کھڑا ہوا اور نفرت سے حیات کے منہ پر تھوک دیا۔ حیات نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ جب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ پونچھا۔ مڑ کر اپنے ساتھ کھڑے ہوئے الیشن کو دیکھا۔ اسے آہستہ سے شکرا۔ کتا غرایا، زور سے بھونکا اور اچھل کر بوڑھے پر حملہ آور ہوا۔ بوڑھا زمین پر گر پڑا۔ کتا اسے زور زور سے خنبروٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

بوڑھا پھولی ہوئی سانس سے چیخا۔ ”ماروے، ماروے۔ مجھے جان سے ماروے۔“

میاں حیات چپ چاپ کھڑا رہا۔ بوڑھا بے بسی سے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔ کتا اس کے پھڑکتے ہوئے جسم کو جگہ جگہ سے خنبروٹنے لگا۔ سینے پر سوار ہو کر اس نے بوڑھے کی گردن اپنے دانتوں سے دوپٹے کی کوشش کی۔ بوڑھے نے پھٹی پھٹی خوف زدہ آنکھوں سے حیات محمد وٹو کی جانب دیکھا۔

حیات نے ڈپٹ کر کتے کو اپنے پاس بلایا۔ کتے نے بوڑھے کو چھوڑ دیا۔ خاموشی سے حیات کے پاس آگیا اور اس کے پیروں کے قریب زمین پر لیٹ گیا۔ کتے کے خنبروٹنے سے بوڑھے کا لباس کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ مگر جسم پر کیس کھردنچا بھی نہیں آیا۔ وہ کروٹ کے بل زمین پر لیٹا ہوا بانپ رہا تھا۔ حیات محمد خاموش کھڑا بوڑھے کو گھورتا رہا۔ پھر واپس مڑا۔ اس نے زینے کے برابر دیوار میں لگی ہوئی الماری کھولی۔ لالی سما ہوا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

میاں حیات نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔ ”ادھر آ۔“

لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حیات نے الماری کے اندر سے ایک ڈبا نکالا۔ ڈھکنا کھول کر ڈبالی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کھلے ہوئے ڈبے کے اندر سے سرنج اور شیشی باہر نکالی۔ لالی کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ حیات محمد ایک بار پھر بوڑھے کے پاس گیا۔ لالی اس کے عقب میں خاموش کھڑا رہا۔

سرنج دیکھتے ہی بوڑھا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چرے پر خوف طاری ہو گیا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ ہلا کر انکار کیا اور گھگھیا کر بولا۔ ”نہیں نہیں۔“

حیات نے اسے خوں خوار نظروں سے گھورا۔ بوڑھا سم کر ایک طرف جھک گیا۔ حیات محمد اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ بوڑھے نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ بے چارگی سے گردن جھکا دی۔ حیات نے اس کے بازو پر روٹی سے اسپرٹ لگائی اور سرنج کی سوئی کھال میں داخل کر کے دو اڑگوں میں اتار دی۔ انجیکشن لگا کر وہ کھڑا ہو گیا۔ تہہ خانے میں ممری خاموشی چھائی تھی۔ بوڑھا گم صم بیٹھا رہا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ حیات محمد وٹو اور لالی چپ کھڑے رہے۔

بوڑھا گردن کو ذرا سا خم دے کر اس طرح سکر کر بیٹھ گیا گویا کچھ سننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے چرے پر اچانک گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ حیات سے مخاطب ہوا۔ ”سن رہا ہے حیات۔ بہت تیز ہوا چل رہی ہے۔ طوفان آنے والا ہے۔ آندھی کے ساتھ بارش بھی ہوگی۔“ وہ زور سے چیخا۔ ”غضب ہو جائے گا۔ کک کی واڈھو فصلیں تباہ ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گا حیات؟“

”ابھی فصلیں پک کر تیار نہیں ہوئیں۔ کٹائی میں دیر ہے۔“

”سچ۔“ وہ خوشی سے چمک کر بولا۔ ”سچ سچ بتا۔ فصلوں کی واڈھی میں ابھی کتنی دیر ہے؟“

”اس بار مئی سے پہلے واڈھی نہیں ہوگی۔ یہ تو مارچ کا مہینہ ہے۔“ حیات محمد وٹو نے اسے تسلی دی۔ ”اب تم سو جاؤ۔“

بوڑھے نے بچوں کی سی معصومیت سے کہا۔ ”اب میں سو جاؤں؟“

”ہاں، ہاں، اب تم سو جاؤ۔“

بوڑھے نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ذرا دیر چپ بیٹھا جھومتا رہا اور جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ لالی خوف اور حیرت سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟

جب بوڑھا سو گیا تو حیات واپس ہوا۔ اس نے سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی۔ الماری کا

دروازہ کھولا اور ڈبا اس میں رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ وہ مڑا لالی کے ہم راہ زینے کی سیڑھیاں طے کیں اور اوپر پہنچ گیا۔ بلب بجھایا۔ دونوں باہر آگئے۔ کتا بھی باہر آگیا۔ دھیور دروازے کے قریب مستعدی سے کھڑا تھا۔ ان کے باہر آتے ہی اس نے بڑھ کر تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ کنجی اپنے پاس رکھ لی۔

حیات نے دھیور کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے سے چلا گیا۔ لالی نے بھی دھیور کے ساتھ باہر جانا چاہا۔ حیات نے اسے ٹوکا۔

”لالی تو ٹھہر جا۔“

میاں حیات محمد آگے بڑھا اور تھکا ہوا سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ قریب کے صوفے پر اس کا لیشن بھی بیٹھ گیا۔ حیات نے وہسکی کا بڑا پیئنگ بتایا اور آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔ لالی اس کے روبرو خاموش کھڑا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ بجٹلے کے باہر ہوا کے جھونکوں سے پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ سنانے میں خشک پتوں کے کھڑکھڑانے کی ہلکی ہلکی آہٹیں سنائی دی رہی تھیں۔ گہری خاموشی میں حیات کی آواز آہری۔ وہ لالی سے کہہ رہا تھا۔ ”دیکھ لیا تو نے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”یہ میرا ڈا بھرا میاں ریاض محمد خاں وٹو ہے۔ پاگل ہو گیا ہے۔“

”میاں ساب! آپ انھیں پاگل خانے کیوں نہیں بھیج دیتے۔“

”فضول بات نہ کر۔“ حیات محمد نے خفا ہو کر کہا۔ ”میرا بھائی پاگل خانے نہیں جاسکتا۔ وہ یہیں رہے گا۔“

لالی کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے۔ مگر وہ حیات کی برہمی کے ڈر سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سر تھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات محمد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میں اس لیے تجھے اپنے ساتھ تہہ خانے میں لے گیا تھا کہ جو کام آج میں نے کیا ہے، کل سے تجھے کرنا ہو گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تیری صرف اتنی ہی ڈیوٹی ہوگی۔ باقی وقت میں عیش کر۔ کھانی، موجدان کر۔“

لالی نے دہلی زبان سے پہلو تہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے جی یہ کام کبھی نہیں کیا۔“ ”کوئی بات نہیں۔“ حیات نے بے نیازی سے کہا۔ ”بہت معمولی کام ہے۔ دوا کی شیشی تو دیکھ ہی لی ہے۔ سرنج میں دوا بھرتا۔ مریض کا ہاتھ پکڑتا اور کھال میں سوئی چھو کر دوا اندر داخل کر دیتا۔ کام ختم۔“

لالی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”میاں جی! یہ کام تو دھیور بھی کر سکتا ہے۔“

”نہیں۔“ میاں حیات محمد نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ ”دھیور یہ کام نہیں کر سکتا۔ وہ

کیلا تہہ خانے کے اندر بھی نہیں جاسکتا۔“ اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا۔ وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”دھیور اگر اس کے پاس گیا تو ہو سکتا ہے، وہ اس کا خون کر دے۔ میرے بھائی نے باراض ہو کر دھیور کی زبان کٹوا دی تھی۔ تب سے وہ گونگا ہے۔ مگر دھیور اس سے جتنی نفرت کرتا ہے، میرا اتنا ہی وفادار ہے۔ دھیور بہت ہی وفادار ہے۔ میرے دو بی وفادار ہیں۔“ اس نے قریب بیٹھے ہوئے لیشن کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایک یہ، دوسرا دھیور۔“

لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”میاں ساب! اپنے بھرا کا کسی چنگے ڈاکٹر سے علاج کرائیے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔“

”مجھے تیرے مشورے کی ضرورت نہیں۔“ حیات نے لالی کو ڈانٹ دیا۔ ”میں خود ڈاکٹر ہوں۔“

”اچھا جی! آپ ڈاکٹر بھی ہیں؟“ لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔“

”میں نے ڈاکٹری لہور میں نہیں پڑھی۔“ حیات نے بڑے فخر سے کہا۔ ”انگلستان میں پڑھی ہے۔“

لالی نے اور زیادہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میاں ساب! آپ ولایت میں بھی رہ چکے ہیں؟“

”برسوں رہا ہوں۔“

کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد لالی نے خاموشی توڑی اور عاجزی سے بولا۔ ”برانہ منائیں تو ایک بات کہوں؟“

”کہہ، کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”میری کوئی اور ڈیوٹی لگا دیجئے۔“

حیات محمد چند لمحے لالی کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر مسکرایا۔ ”مجھے معلوم ہے، تو بدوقت چلانا بھی جانتا ہے۔ نشانہ بھی تیرا بہت ٹھیک ٹھاک ہے۔“ اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ گلاس میز پر رکھا۔ ”میں تیری نشانے بازی اور زور آوری بعد میں دیکھوں گا۔ تو کام کا بندہ لگتا ہے۔“ حیات نے ایک بار پھر اسے بغور دیکھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔ ”مگر فی الحال تجھے یہی کام کرنا ہو گا۔ بات یہ ہے کہ میں تہہ خانے میں جا کر انجیکشن خود لگاتا نہیں چاہتا۔ وہ پاگل بندہ ہے۔ اس کے پاگل پن پر مجھے غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی ہوتا ہے۔ وہ میرا بھائی ہے نا۔“

”ساب! آپ کو ان پر غصہ نہیں کرنا چاہئے۔“

”فہ فضول باتیں شروع کر دیں۔“ حیات نے بڑبڑ کر کہا۔ ”میں چاہتا ہوں، تو اس کے بارے میں

اشھنڈا پڑ جاتا ہے۔“

لالی نے دیکھا کہ کتا بڑا حال پڑا ہے۔ حیات محمد نے پوزہ بند اس کے منہ سے اتار دیا اور تیکھے لمبے بولا۔ ”لیکن یہ کبھی کبھی نہایت خطرناک بھی ہو جاتا ہے۔“ اس نے میز پر رکھی ہوئی دوسری شی اٹھائی۔ ”اگر اس کا انجیکشن لگا دیا جائے تو یہ کتا اتنا خوں خوار ہو جاتا ہے کہ جس پر حملہ رے اسے چیر پھاڑ کر ختم بھی کر سکتا ہے۔“

لالی نے خوف زدہ نظروں سے شیشی دیکھی اور سرنج ہاتھ میں دبائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے اس سے سرنج لی اسے میز پر رکھا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ ”یاد رکھ، جیسا تجھ سے کہا جائے تجھے باہمی کرنا ہوگا۔ میرے حکم کی خلاف ورزی تجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ کچھ عرصے تک تیری کڑی رانی کی جائے گی۔ اگر تو نے ہر کام ٹھیک ٹھاک کیا تو عمرانی ختم کر دی جائے گی۔“ اس نے دھمکی مٹھوٹ بھرا اور بھاری بھر کم لمبے میں بولا۔

”جا، جا کر سو جا۔“

لالی نے سر ہٹھا کر خاموشی سے حیات محمد کی باتیں سنیں۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر نچا۔ دروازہ کھولا۔ باہر دھوڑ مستعدی سے کھڑا تھا۔ وہ اس کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا اور تربیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد دھوڑ نے اپنی چارپائی نکالی اور عین دروازے کے سامنے برآمدے میں لی۔ بستر لگایا اور لیٹ گیا۔

دھوڑ کچھ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا پھر سو گیا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ وہ سخت بے چین تھا۔ اس سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہ کرے؟

رات کے چھپتے پہر وہ آہستہ سے اٹھا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر زور زور چاندنی بکھری تھی۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ لالی نے کھڑکی کی آہنی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورا زور لگایا مگر سلاخیں بہت مضبوط تھیں۔ ایک بھی سلاخ لٹس سے مس نہ ہوئی۔

اچانک اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا، لائینن کی مدھم روشنی میں میور اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ خوں خوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور لالی کا بازو پکڑ کر اس زور سے دھکا دیا کہ لالی لڑکھڑاتا ہوا بستر پر جا کر گر ا۔ اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا۔ بستر پر اموش پڑا رہا۔ دھوڑ نے کھڑکی کے دونوں پٹ بند کر کے چٹخنی لگائی اور کمرے سے باہر جا کر اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔

چارپائی سے نکلنے کے باعث لالی کے کندھے میں چوٹ بھی آئی مگر وہ خاموش رہا اور کروٹ

بالکل نہ سوچ۔ یہ تیرا کام نہیں۔ تیرا کام صرف اتنا ہی ہے جس کے لیے میں نے تیری ڈیوٹی لگائی ہے۔ تجھے روزانہ دو بار اسے انجیکشن لگانا ہوگا۔ اور اس وقت لگانا ہوگا جب دھوڑ تجھے کے گا۔ تمہ خانے کی کینچی اسی کے پاس رہتی ہے۔ تمہ خانے کے اندر صرف تو جائے گا، وہ نہیں جائے گا۔ سمجھ گیا؟“

”جی، بالکل سمجھ گیا۔“

”اور یہ بھی جان لے کہ تمہ خانے میں تیرے علاوہ صرف مائی جنتے جاتی ہے۔ وہ تمہ خانے کی صفائی کرتی ہے۔ روٹی لکڑ پینچاتی ہے۔ وہ گوشت بھی اور بری بھی۔ تجھے بھی یہاں گونا گونا اور سرہ بن کر رہنا ہوگا، صرف آنکھیں کھلی رکھنا۔ منہ اور زبان بند رکھنا۔“ حیات محمد نے قریب رکھی ہوئی میز کی دراز کھولی۔ اندر سے سرنج اور دو شیشاں نکالیں۔ ایک شیشی اس نے میز پر رکھ دی، دوسری شیشی کی دوا سرنج میں بھری اور سرنج لالی کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ ”میں چاہتا ہوں تو میرے سامنے انجیکشن لگا کر دکھا۔“

لالی نے گھبرا کر کہا۔ ”کس کے لگاؤں جی؟“

”میں تو بہر حال تجھ سے انجیکشن نہیں لگوا سکتا اور نہ ہی تو اپنے بدن میں انجیکشن لگا سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور اپنے خوفناک الیشن کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے انجیکشن لگانا ہوگا۔“

”اسے؟“ لالی نے خوف زدہ نظروں سے دیکھا، کتا صوفے پر لیٹا اسے گھور رہا ہے۔ ”میاں، ساب! اس سے تو مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”ڈر نہیں، یہ تجھے کانے کا نہیں۔“ یہ کہہ کر حیات نے میز کی دراز سے چڑے کا پوزہ بند نکالا۔ اسے کتے کے منہ پر چڑھایا اور اس کی پشت آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ کتا سر نیچے جھکا کر لیٹ گیا۔ حیات نے اس کی ران پر ایک جگہ انگلی رکھ کر حکم دیا۔ ”یہاں انجیکشن لگا دے۔“ لالی جھجکا۔ حیات نے ڈپٹ کر کہا۔ ”منہ کیا تک رہا ہے؟ لگا انجیکشن۔“

لالی نے جھٹ کتے کی کھال میں سرنج کی سوئی داخل کر کے دوا اندر آتا رہی۔ کتا خاموش پڑا رہا۔ جب لالی انجیکشن لگا چکا تو حیات محمد نے مسکرا کر کہا۔ ”بالکل اسی طرح تجھے تمہ خانے میں اس پاگل کو انجیکشن لگانا ہوگا۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تو اس کتے سے ڈر رہا تھا۔ یہ نہ کاٹتا ہے، نہ پنچے مارتا ہے اور اس انجیکشن کے بعد تو یہ بالکل

خانے میں چلا گیا۔

بوڑھا ریاض محمد خاں وٹو آتش دان کے قریب زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے کھانے کے برتن پڑے تھے۔ اس وقت وہ ہونٹوں سے گلاس لگائے پانی پی رہا تھا۔ پانی پیتے پیتے اس نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ خاموشی سے گلاس ایک طرف رکھا اور لمبے بھر تک لالی کو گھورتا رہا۔ لالی میزچھوٹوں کے پاس ٹھہر گیا۔ دبے دبے خوف اور حیرت سے ریاض کو کتنے لگا۔ ذرا دیر تہہ خانے میں خاموشی رہی، پھر بوڑھے میاں ریاض محمد کی آواز ابھری۔

”آ، میرے نزدیک آجا۔“

مگر لالی جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس دفعہ بوڑھے نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ ”ڈر نہیں، نزدیک چلا آ۔“ لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ آہستہ، آہستہ اس کی جانب بڑھا، مگر نزدیک جانے کے بجائے کچھ فاصلے پر رک گیا۔

میاں ریاض محمد نے کہا۔ ”میں نے کل رات ہی اندازہ لگالیا تھا کہ اب تیری ڈیوٹی لگائی جائے گی۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”دور کیوں کھڑا ہے؟ نزدیک آجا۔ تو کھڑا جوان ہے اور میں بوڑھا، کمزور۔ پاؤں میں زنجیر بھی پڑی ہے۔ فیر بھی تو مجھ سے ڈر رہا ہے۔“

لالی نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آگے بڑھ کر نزدیک چلا گیا۔ ریاض محمد وٹو تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”جب کوئی نیا نیا ڈیوٹی پر لگایا جاتا ہے، وہ مجھ سے اسی طرح ڈرتا ہے۔ سمجھتا ہے میں پاگل ہوں۔ کیا میں تجھے پاگل نظر آتا ہوں۔“ لالی بدستور خاموش کھڑا رہا۔ بوڑھے ریاض نے گہری سانس بھری۔ ”تو میری گل بات کیوں ماننے لگا؟“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی گم صم کھڑا رہا۔ تہہ خانے میں گہرا سناٹا چھا گیا۔

میاں ریاض محمد نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور کسی قدر بیزار سی بولا۔ ”کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔ جا، جاکر الماری سے سرخ نکال اور گھسیڑ دے اس کی سوئی میری کھال میں۔ یہی تیری ڈیوٹی ہے اور اسی کے لیے تو یہاں آیا ہے۔ خاما خا کیوں وقت برباد کر رہا ہے۔“

لالی نے پھر بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا۔ اسے کھولا۔ سرخ میں دوا بھری۔ میاں ریاض کے پاس پہنچا۔ جھک کر اس کا ہاتھ پکڑا اور بازو میں انجیکشن لگانا چاہا۔ مگر ریاض نے منع کر دیا۔ نرم لہجے میں کہا۔ ”آرام سے بیٹھ جا۔“ لالی اس کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا ہاتھ پکڑا۔ بوڑھے ریاض نے ٹوکا۔ ”میرا ہاتھ چھوڑ دے۔“ اس نے کرتے کا دامن اٹھایا اور اپنی برہنہ کمر کا رخ لالی کی طرف کر دیا۔

بدل کر لیٹ گیا۔ آخر اسے نیند آگئی۔ وہ سو گیا۔ صبح مائی جتنے نے لالی کو آہستہ سے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ وہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تھی۔ چائے کے ساتھ روٹی اور ساگ بھی تھا۔ یہ صبح کا ناشتا تھا۔ مائی جتنے نے لالی کی جانب نظر بھر کر بھی نہ دیکھا۔ وہ چپ چاپ آئی اور چپ چاپ چلی گئی۔ لالی منہ دھونے کے لیے غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو اس نے دیکھا، دھیور اپنے کمرے میں چٹائی پر بیٹھا ناشتا کر رہا ہے۔ لالی کے کمرے کی کھڑکی بھی اب کھلی ہوئی تھی۔

لالی ناشتے سے فارغ ہوا تو دھیور اسٹولی پر آکر بیٹھ چکا تھا۔ وہ چپ بیٹھا لالی کو تک رہا تھا۔ لالی نے جتنی بار نظر اٹھائی، اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس طرح گھورنے پر لالی جھنجھلا گیا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دھیور کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر تک دونوں پلک جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ آخر دھیور کی پلک جھپک گئی۔ لالی مسکرانے لگا۔ اسے مسکراتا دیکھ کر دھیور کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور نفرت سے منہ بگاڑ کر زمین پر تھوک دیا۔ اس کی اس اشتعال انگیزی پر لالی کا خون کھول گیا۔ مگر وہ طرح دے گیا۔ وہ نہتا تھا اور دھیور مسلح۔ لالی نظریں جھکا کر بستر پر لیٹ گیا اور کھڑکی کی سلاخوں سے باہر دیکھنے لگا۔ باہر ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک نوجوان غیار نوکری میں کوڑا کرکٹ بھر کر لائی اور اسے جھاڑیوں کے پاس انڈیل دیا۔ کوڑے میں شیشے کی ٹوٹی ہوئی بوتلیں بھی تھیں۔ ان کے گرنے سے چھنکا ہوا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر بستر پر لیٹے ہوئے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اس نے اپنی اوڑھنی کے پلو سے سر ڈھکا اور شرما کر زیر لب مسکرائی۔ لالی بھی مسکرانے لگا۔ دھیور جھٹ کمرے کے اندر داخل ہوا، کھڑکی کے پاس پہنچا اور قہر آلود نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ لڑکی خالی نوکری بغل میں دبا کر سہمی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

دھیور نے ایک بار پھر کھڑکی کے پٹ بند کر کے چٹنی لگا دی۔ لالی تمللا کے رہ گیا۔ اس نے دھیور کی طرف نہیں دیکھا۔ کروٹ بدل کے منہ دوسری طرف کر لیا۔ دھیور اس کے پاس نہیں آیا، باہر چلا گیا۔

لالی خاموش لیٹا رہا۔ اس کے لیے وقت کا نا عذاب ہو گیا۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ ٹھیک بارہ بجے دھیور اس کے پاس آیا اور باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ لالی خاموشی سے اٹھا اور دھیور کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں غلام گردش کے راستے حیات محمد کے کمرے میں داخل ہوئے۔ حیات کمرے میں موجود نہیں تھا۔ دھیور نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور لالی کو ٹوکا دے کر اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ لالی نے اندر جا کر سوچ بچا دیا۔ بلب روشن ہو گیا۔ اس کی روشنی میں لالی میزچھوٹوں سے نیچے تہہ

”ہاتھ میں نہیں، کمر میں انجیکشن لگا دے۔“

لالی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ سرنج کی سوئی ریاض کی کمر میں چھونے کی کوشش کی تو وہ بلبلانہ کر چٹا۔ ”تو تو بالکل اناڑی لگتا ہے۔ پہلے کبھی انجیکشن لگایا ہے؟“ لالی نے زبان سے تو کچھ نہ کہا، صرف انکار میں گردن ہلا دی۔ ریاض نے سرنج اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور اس کی نوک کمر پر لگا کر بولا۔ ”لے اب لگا دے انجیکشن۔“

لالی نے اس کی ہدایت کے مطابق انجیکشن لگایا۔ ریاض نے نہایت اطمینان سے انجیکشن لگوا لیا۔ مسکرا کر کہا۔ ”اب تجھے انجیکشن لگانا آگیا۔ کچھ دنوں بعد تو فنانٹ انجیکشن لگانے لگے گا۔“ لالی نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر الماری کے پاس گیا۔ سرنج صاف کی۔ ڈبے میں رکھی اور الماری میں بند کر دی۔

لالی ایک بار پھر ریاض کے قریب گیا۔ مگر اس نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ آنکھیں بند کئے دھیرے دھیرے سانس بھرتا رہا۔ چند لمبے بعد اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا ہلکا بخار تھا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ”اب تو جاسکتا ہے۔ تیری ڈیوٹی ختم ہو گئی۔ میں تھوڑی دیر بعد سو جاؤں گا۔“ مگر لالی نہیں گیا۔ ریاض نے بھی کچھ نہ کہا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر آنکھیں بند کئے جھومتا رہا۔ اور جھومتے جھومتے فرش پر لڑھک گیا۔

لالی واپس ہوا اور آہستہ آہستہ میڑھیاں طے کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ وہ سخت حیرت زدہ تھا۔ اس نے پچھلی رات جس ریاض محمد کو دیکھا تھا وہ اس ریاض محمد سے قطعی مختلف تھا، جس سے ذرا دیر پہلے اس کا سابقہ پڑا تھا۔ نہ وہ اسے دیکھ کر دیوانوں کی طرح چیخا، نہ گالیاں دیں اور نہ مارنے کے لیے جھپٹا، بلکہ نرمی اور شفقت سے پیش آیا۔ حتیٰ کہ انجیکشن لگانے میں بھی اس کی رہنمائی کی۔ پورا پورا تعاون کیا۔

لالی نے اوپر جا کر بجلی بھجائی۔ بند دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھل گیا۔ دھیور اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے تمہ خانے کا دروازہ بند کیا اور تالا ڈال دیا۔ لالی کے ہم راہ کمرے میں واپس آگیا۔ لالی نے دوپہر کا کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔

رات کے گیارہ بجے وہ پھر دھیور کے ساتھ تمہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ حیات کمرے میں اس وقت بھی موجود نہ تھا۔

لالی تمہ خانے کے اندر گیا۔ ریاض محمد دو ٹوک دیکھا، وہ جاگ رہا تھا۔ مگر اس نے لالی سے کوئی

بات نہیں کی۔ لالی بھی خاموش رہا۔ ریاض نے انجیکشن لگوا لیا اور سو گیا۔ لالی واپس ہوا۔ دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کھڑکی سے ہوا کے نرم نرم جھونکے اندر آرہے تھے۔ باہر چاندنی چھٹکی تھی۔ مگر دھیور کے ڈر سے لالی کھڑکی پر نہیں گیا۔



لالی دن کے بارہ اور رات کے گیارہ بجے دھیور کے ہم راہ تمہ خانے کے دروازے پر جاتا۔ تنہا اندر داخل ہوتا اور بوڑھے ریاض کے جسم میں انجیکشن لگاتا۔ انجیکشن لگاتے وقت کبھی کبھار ریاض نے بات کرنے کی کوشش بھی کی مگر لالی نے مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ حیات محمد کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے بالکل خاموش رہتا۔ لیکن ریاض کبھی ناراض نہ ہوا۔ نہ چیخا نہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔ بلکہ عام طور پر خاموش ہی رہتا۔

لالی واپس کمرے میں جاتا تو دھیور اس کی کڑی نگرانی کرتا۔ ہر وقت اس کے سر پر سوار رہتا۔ نہایت بے رخی اور حقارت سے پیش آتا۔ لالی تنہائی سے اکتا کر کبھی کھڑکی کی جانب جانے کی کوشش کرتا تو دھیور جھٹ کمرے میں جاتا اور لالی کی گردن پکڑ کر زور سے دھکا دیتا۔ دوبار ایسا ہی ہوا۔ لالی اس سے جھگڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کھڑکی پر جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیا۔ بستر پر لیٹتا تو کروٹ بدل کر منہ موڑ لیتا۔

کمرے سے نکل کر وہ صرف برآمدے میں آسکتا تھا یا غسل خانے تک جاسکتا تھا اور چوبیس گھنٹے میں صرف دوبارہ راہ داری سے گزر کر تمہ خانے میں جاسکتا تھا۔ دھیور ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا۔ کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔ مائی جینے بھی گونگی تھی اور دھیور بھی گونگا تھا اور بوڑھے ریاض سے اسے بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔ اس دوران حیات محمد دنوں سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

لالی اس ماحول سے جلد ہی اکتا گیا۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ دھیور اس کے راستے میں دیوار بنا کھڑا تھا۔ دھیور پر قابو پانا یا اسے رام کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کا رویہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ لالی نے جب بھی اس کی طرف دیکھا، ہمیشہ قرآنی نظروں سے اپنی جانب گھورتے پایا۔ دھیور صرف رات کو سوتا تھا اور لالی کے کمرے کے دروازے کے سامنے چارپائی ڈال کر سوتا تھا۔ مگر وہ اس قدر چوکنا اور چوکس رہتا کہ اگر لالی رات کو پیشاب کے لیے بھی اٹھتا تو اس کی چاپ کے ساتھ ہی دھیور جھٹ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا۔ صبح ہوتی، شام ہوتی۔ مگر لالی نے سورج نہ طلوع ہوتے دیکھا، نہ

لالی نے جھٹ بتایا۔ ”نہیں میاں جی، بالکل تنگ نہیں کیا۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے حیات محمد کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”ویسے تو جی وہ پاگل لگتے نہیں۔“

”نہیں۔“ میاں حیات نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”وہ پاگل ہی ہے۔ تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا۔“

لالی نے سر جھکا کر دھیرے سے کہا۔ ”سمجھ نہیں آتی جی۔“

”اس کے ساتھ تیری بات چیت تو نہیں ہوئی؟“

”انھوں نے جی بات کرنے کی کوشش تو بہت کی، پر میں بولا ہی نہیں۔ بالکل چپ رہا۔ اب تو جی وہ بھی نہیں بولتے۔ چپ کر کے انجیکشن لگوا لیتے ہیں۔“ لالی نے میاں حیات کی طرف نظریں اٹھائیں۔ ”میں جی آپ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے، تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

لالی نے ایک بار پھر ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میاں جی، آپ تمہ خانے میں بھی گئے تھے؟“

حیات نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔ ”تجھے کیسے پتہ چلا، میں تمہ خانے میں گیا تھا؟“

لالی نے اس کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ کے جوتوں میں جی ابھی تک تمہ خانے کی کچی زمین کی مٹی لگی ہے۔ آج تمہ خانے کا دروازہ بھی کھلا تھا، دھیور بھی دروازے پر نہیں تھا۔“

”تو دیکھنے میں جتنا گھامڑ لگتا ہے، اتنا ہے نہیں۔“ حیات نے مسکرا کر کہا۔ ”خاصا تیز ہے۔ عادی مجرم جو ٹھیرا۔“

لالی نے ہاتھ باندھ کر انکساری کا اظہار کیا۔ ”میاں ساب، میں آپ سے بہت ڈرتا ہوں۔ اتنا تو کبھی پولیس سے بھی مجھے ڈر نہیں لگا۔“

میاں حیات نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی ٹھیک ہی ہوا کہ تجھے یہ معلوم ہو گیا کہ میں خفیہ طور پر معائنہ کرنے تمہ خانے میں گیا تھا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا، یہ بات تجھے معلوم ہو جائے تاکہ تو آئندہ بھی اسی طرح احتیاط سے کام لے۔“

”جیسا آپ حکم کریں گے جی، ویسا ہی کروں گا۔“

”میں چاہتا ہوں، تو اس پاگل سے بالکل بات نہ کر۔“ حیات محمد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”وہ بات بھی کرے تو سختی سے روک دے۔ ضد کرے تو منہ پر تھپڑ مار کر اس کی زبان بند کر دے۔ وہ پاگل پن میں الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تو ایسے باتیں نہ سن۔ ان پر بالکل دھیان نہ دے۔ میں ایک بار فیروزہ تجھے خبردار کرتا ہوں، میرے اس حکم پر سختی سے عمل کرنا۔ ٹھیک اسی طرح

غروب ہوتے۔ جنگل کے باہر کی دنیا کے بارے میں اسے کچھ بھی پتہ نہ تھا۔ اسے رہ رہ کے رحیم داد کا خیال آتا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا کہ رحیم داد اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچتا ہوگا۔ حیات محمد کا کہنا تھا کہ وہ رحیم داد کو بھول جائے۔ اس کا خیال دل سے نکال دے۔ اسے مردہ سمجھ لے۔ مگر لالی کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔

وہ رحیم داد کو بھولنا بھی چاہتا تو بھول نہیں سکتا تھا۔ اس نے رحیم داد سے ہر حال میں مدد کرنے کا عہد کیا تھا اور وہ اپنا یہ عہد پوری نیک نیتی سے نبھاتا چاہتا تھا۔ لیکن میاں حیات محمد خاں وٹو کی قید میں رہ کر وہ رحیم داد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ پولیس رحیم داد کی تلاش میں سرگرداں تھی اور رحیم داد کے مخالف اسے قتل کرنے کے لیے گھات میں لگے تھے۔ لالی کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے؟

☆

رات کے گیارہ بجے وہ معمول کے مطابق دھیور کے ہم راہ تمہ خانے کے دروازے پر پہنچا۔ اس وقت بھی میاں حیات محمد کا کمرہ خالی تھا۔ لالی تمہ خانے کے اندر گیا۔ بوڑھے ریاض نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ انجیکشن لگوا دیا اور سونے کے لیے فرش پر لیٹ گیا۔

لالی بیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ خلاف معمول تمہ خانے کے دروازے کا ایک پت ذرا سا کھلا ہے۔ وہ بھونچکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثنا میں حیات محمد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

”دھیور کمرے کے باہر کھڑا ہے۔ تمہ خانے کا دروازہ بند کر دے اور میرے پاس چلا آ۔“

لالی تمہ خانے کا دروازہ بند کر کے حیات محمد خاں وٹو کے پاس چلا گیا۔ وہ مدھم روشنی میں صوفے کی پشت سے سرٹکائے اس طرح بیٹھا تھا کہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلی تھیں۔

وہ اس وقت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے جوتوں کے ٹکوں میں تازہ تازہ مٹی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ بھی تمہ خانے میں گیا تھا اور غالباً ”اس وقت گیا تھا، جب لالی گردن جھکائے ریاض کے جسم میں انجیکشن لگا رہا تھا۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ حیات محمد بھی نہایت رازداری سے اس کی نقل و حرکت کی نگرانی کر رہا ہے۔“

حیات محمد وٹو کا سیاہ الیشن قریب ہی صوفے پر بیٹھا تھا۔ حیات کی آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ ”اس پاگل نے تجھے تنگ تو نہیں کیا؟“

جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ سمجھ گیا؟

”بالکل سمجھ گیا۔“ لالی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”فکر نہ کریں جی۔“

”امید تو یہی ہے تو ایسا ہی کرے گا۔ تو خاصا تیز اور ہوشیار ہے اور کوئی ہوشیار بندہ جانے بوجھنے گڑھے میں گرنے کی کوشش نہیں کرتا۔“

کمرے کی خاموشی میں صرف الیشن کے دھیرے دھیرے غرائے کی آواز ابھرتی رہی۔ حیات محمد نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ ”میں صبح گورنر کے ساتھ شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ شام کو واپسی ہوگی۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے پروگرام لمبا ہو جائے۔ دو تین روز بعد واپس آؤں۔ میری غیر حاضری میں ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتا چاہئے۔“ اس نے قریب رکھی ہوئی بڑی میز کی دراز کھولی، سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے لالی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ رکھ لے۔ ویسے جس چیز کی ضرورت ہو دھیور سے منگو لیتا۔“

لالی نے نوٹ لے کر کہا۔ ”ساب، ویسے تو کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ پر میرے پاس کپڑے بالکل نہیں، جو ہیں بہت میلے ہو چکے ہیں۔ دھونے سے بھی صاف نہیں ہوتے۔ میرے لیے کمیس شلوار بنوا دیجئے۔ برسوں سے شرم میں رہتا ہوں۔ ایسے ہی کپڑے پہنتا ہوں۔“

میاں حیات محمد نے غور سے لالی کا لباس دیکھا۔ ”ہاں، تیرے کپڑے بہت گندے ہیں۔ میں شکار پر روانہ ہونے سے پہلے دھیور سے کتا جاؤں گا وہ تیرے لیے نئے کپڑے سلوا دے گا۔ بنگلے میں درزی موجود ہے۔ وہ کل تیرے پاس آجائے گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اور کوئی بات؟“

”کمرے میں پڑے پڑے جی بہت گھبراتا ہے۔ دھیور بنگلے سے باہر نکلنے ہی نہیں دیتا۔ وہ تو جی اتنی سختی کرتا ہے، کھڑکی پر کھڑا ہو جاتا ہوں تو گردن سے پکڑ لیتا ہے۔ میرا مطلب ہے۔“

”میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔“ حیات نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”ابھی تو بنگلے سے باہر نہیں جاسکتا۔ تیری کچھ دنوں اور اسی طرح سختی سے نگرانی ہوگی۔“

”جیسی آپ کی مرضی جی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تو اس معاملے میں کچھ نہ کہہ۔ ٹھیک ٹھاک رہے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ تو یہاں محفوظ بھی رہے گا اور آرام سے بھی رہے گا۔ میں تیری تنخواہ بھی لگا دوں گا اور بھی تیرے لیے بہت کچھ کروں گا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو گا جب تو آزمائش پر پورا اترے گا۔ جیسا میں کہوں گا تجھے ٹھیک ویسا ہی کرنا ہو گا۔“ لالی گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ حیات ذرا

دیر چپ بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ”کوئی اور ضرورت ہو تو صاف صاف بتا دے۔ نشہ و شر تو نہیں کرتا؟“

”کرتا تو ہوں جی!“ لالی نے دہلی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ ”پر بہت دنوں سے بالکل نشہ پانی نہیں کیا۔ سگریٹ بھی پینے کو نہیں ملی۔“

میاں حیات مسکرا کر بولا۔ ”مجھے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے یہاں سے بھاگ جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب تیری یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ دروازہ کھول، اندر جا۔ جو بوتل پسند آئے اٹھا لے۔ سگریٹ کل مل جائے گی۔“

لالی خاموشی سے آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا، اندر گیا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرہ نہایت کشادہ تھا۔ جگہ جگہ قیمتی صوفے پڑے تھے۔ فرش پر نرم نرم قالین بچھا تھا۔ ہر طرف ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ ایک گوشے میں نہایت شان دار بار تھا۔ شیشے کی الماریوں میں قسم قسم کی شراب کی بوتلیں تھیں، کنسر تھے۔ ہر رنگ کی شراب تھی اور ہر وضع کی بوتل۔ اسکاچ، وہسکی تھی۔ عام وہسکی بھی اور ڈی کس بھی۔ جونی واکر، بیگ، اولڈ اسمگلر، وپائٹ ہارس، ڈیپل، بلیک ڈاگ، شیوا زریگل، جونی واکر، بلیک لیبل، رائل سلوٹ۔ وہسکی کے علاوہ سببیں تھیں، شیریں تھیں، مارینی تھیں، دود کا تھی، جن تھیں، پورٹ تھی، رم تھی، ہر طرح کی برانڈی اور کو نیک تھی۔ خوشنما بلوری کٹھنوں میں فراہمی دانسز، چمبلس، تھورن، چمبلس اردت تھی۔ بلیو تن تھی۔ لالی گھبرائی ہوئی نظروں سے ہر ست دیکھتا تھا۔ کبھی ادھر نظر ڈالتا، کبھی ادھر۔ اس کے لیے انتخاب کرنا مشکل ہو گیا۔ آخر اس نے اسکاچ وہسکی کی دسی ہی بوتل اٹھالی جیسی اس نے حیات محمد کی میز پر دیکھی تھی۔ بوتل عام سازن کی بوتلوں سے بڑی بھی تھی۔

وہسکی کی بوتل ہاتھ میں دباؤ وہ واپس آیا۔ میاں حیات نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”جامو جاں کر۔ آگے تیرے نشے پانی کا بندوبست دھیور کر دے گا۔ مگر ایک بات یاد رکھنا۔ تو شراب پی کر کبھی میرے سامنے نہیں آئے گا۔ نہ نشے کی حالت میں کوئی گزبہ کرے گا۔“ اس نے پیچھے دیوار پر کھوئی سے لٹکے ہوئے چمڑے کے ہنر کو ہاتھ بڑھا کر زور سے کھینچا اور اونچی آواز سے ڈپٹ کر کہا۔ ”کبھی ایسا ہوا تو چمڑی ادھیڑ والوں گا۔“ لالی سہا ہوا خاموش کھڑا رہا۔

کمرے کی خاموشی میں حیات کی آواز ابھری۔ ”جا، باہر دھیور تیرا انتظار کر رہا ہے۔“ بان سے ایک لفظ نکالے بغیر کمرے سے چلا گیا۔ دھیور دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے لالی

کے ہاتھ میں دبی ہوئی دہسکی کی بوتل حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھی۔ مگر بالکل چپ رہا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ لالی نے اپنے کمرے میں پہنچ کر بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ وہ بہت سہا ہوا تھا۔ خاموشی سے بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ صبح دن چڑھے اٹھا۔ رات کو دیر سے سونے کے باعث اب وہ دیر ہی سے بیدار ہوتا تھا۔



دروازے کے پیچھے سے چیخنے چلانے کی آوازیں، رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی کو سخت حیرت ہوئی۔ وہ ڈرتے ڈرتے تہ خانے کے اندر داخل ہوا۔ زینے سے اتر کر نیچے پہنچا۔ سامنے بوڑھا ریاض بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی آنکھیں نکال کر بولا۔ ”آگیا کتا میری ہڈیاں چوڑنے۔“ لالی کو تعجب تو ہوا مگر بالکل خاموش رہا اور آہستہ آہستہ ریاض کی جانب بڑھنے لگا۔ ریاض محمد خاں دُٹو نے لالی کو اپنی جانب آتے دیکھا تو زور سے چیخا۔ ”ہٹ جا میری نظروں کے سامنے سے، حرام کے تخم!“

لالی اس کے روپے میں یہ اچانک تبدیلی دیکھ کر بہت سنبھلا۔ جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ میاں ریاض اور زیادہ غضب ناک ہو کر چلایا۔ ”بے غیرت دے! میں تیری منجوس صورت دیکھنا نہیں چاہتا۔“ اس نے جھٹ سامنے رکھی ہوئی المونیم کی پلیٹ اٹھا کر ماری۔ پلیٹ لالی کے ماتھے پر کھٹاک سے لگی۔ ساتھ ہی ریاض کی آواز ابھری۔

”دفع ہو جا یہاں سے۔“

لالی چوٹ کھا کر تھلا اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بوڑھے پر جھپٹا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مار کر چیخا۔ ”اوئے چپ کر کے کھڑا ہو جا۔“ اس نے ریاض کی گردن ایک ہاتھ سے دبوچی اور جھٹکا دے کر کھڑا کر دیا۔

ریاض محمد خاں اپنی گردن بے بسی سے ادھر ادھر جھٹک کر چلانے لگا۔ ”مار دے مجھے، جان سے مار دے۔“

لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ میاں ریاض محمد زمین پر گر کر بانپنے لگا۔ لالی نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ الماری سے سرنج نکالی۔ دوا بھری اور قریب بیٹھ کر ریاض کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس نے نہ مزاحمت کی نہ چیخا۔ خاموشی سے انجیکشن لگوا لیا۔ جب واپس جانے لگا تو لالی نے گہری گہری سانسوں کی سرسراہٹ سنی۔ پلیٹ کر دیکھا، بوڑھا ریاض دونوں گھٹنوں پر سر رکھے سسکیاں بھر رہا ہے۔ اسے روتے دیکھ کر لالی کے دل کو نہیں لگی۔ وہ اداس ہو گیا۔

لالی تہ خانے سے باہر نکلا اور دھیور کے ہم راہ اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ آج کے واقعے کے بعد ریاض اس کے لیے معہ بن گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اسی روپ میں نظر آیا، جو اس نے حیات محمد کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا۔ اس نے سوچا حیات محمد ٹھیک ہی کتا ہے۔ میاں ریاض واقعی پاگل ہے۔

دوپہر کا کھانا کھا کر لالی بستر پر لیٹا ہی تھا کہ درزی آگیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چہرے پر سفید چٹکی ڈاڑھی تھی۔ اس نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ نہ مسکرایا نہ نظر ملائی۔ گردن جھکائے مختلف زاویوں سے لالی کے جسم کی ناپ لیتا رہا۔ لالی نے اس کی خاموشی پر ہنس کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔

”بابے تو بھی گونگا ہے؟“

درزی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی نے کہا۔ ”ایک کمیض اور شلوار تو فٹ تیار کر دے۔ دیکھ تو میرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔“ درزی پھر بھی خاموش رہا۔ لالی کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ کمرے سے باہر چلا گیا۔

سہ پہر کو دھیور دہسکی شراب کا ادھا اور ستے براؤڈ کی سگریٹوں کے کئی پکٹ لایا۔ لالی کے حوالے کئے اور دروازے کے باہر اسٹول پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ادھا بھی دہسکی کی بوتل کے پاس رکھ دیا۔

دن گزرا، جھپٹا ہوا تو لالی کا دل مچلا۔ اس نے دہسکی کی بوتل اٹھائی۔ اسے آنکھوں کے سامنے کیا۔ مسکرا کر ہونٹوں سے چوما۔ بوتل کھولی، ناک سے لگا کر سونگھی۔ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے دہسکی گلاس میں انڈیلی، پانی ڈالا اور گلاس سامنے رکھ لیا۔ دھیور خاموش بیٹھا لالی کو دیکھتا رہا۔ لالی نے دھیور کی جانب دیکھا۔ گلاس اٹھا کر اس کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر گلاس اس کے سامنے کیا۔

”لے یا ر تو بھی ذرا سی لگا لے۔ ولایتی شراب ہے۔ فرٹ کلاس چیز ہے۔ مزا آجائے گا۔“

دھیور اس حرکت پر لالی سے ذرا بھی خفا نہیں ہوا۔ صرف انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ لالی نے ماتا۔ بار بار گلاس دھیور کی طرف بڑھاتا رہا۔ جب مسلسل اصرار کے باوجود دھیور پینے پر رضامند نہ ہوا تو لالی نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”یار اگر تو نہیں پئے گا تو میں نے بھی نہیں پینی۔“ اس نے شراب پھینکنے کے لیے ہاتھ موڑا، دھیور جھٹ اپنی جگہ سے اٹھا۔ مسکرایا اور گلاس لالی کے ہاتھ سے لے کر غٹا کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی اس قدر خوش ہوا کہ اس نے بے ساختہ دھیور کا منہ چوم لیا۔ دھیور نے خلاف معمول اس

بے تکلفی پر نہ لالی کو گھورانہ مارنے کے لیے جھپٹا، بلکہ کھل کر مسکرانے لگا۔ اس نے گلاس لالی کی طرف بڑھایا۔ لالی نے بھی تھوڑی سی دہسکی پی۔

ذرا دیر بعد دونوں لالین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اطمینان سے فرش پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ دھیور بھی اپنا گلاس اٹھا لایا تھا۔ دونوں دہسکی کی چسکی لگا رہے تھے۔ گلاس نکرا رہے تھے۔ بے تکلفی سے ہنس رہے تھے۔ کھڑکی کے باہر اندھیرا مگرا ہو گیا تھا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا دامن پھیلا رہی تھی۔ دونوں دیر تک دہسکی سے شغل کرتے رہے۔ انھوں نے آدھی سے زیادہ بوتل ختم کر دی۔ کھانا بھی ساتھ بیٹھ کر کھایا اور دیر سے کھایا۔

گیارہ بجے دھیور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کی جانب دیکھا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ دونوں راہ داری میں داخل ہوئے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ ہلکی ٹل گوں روشنی میں ہر چیز خواب میں تیری تیر نظر آتی تھی۔ ان کی آنکھیں نٹے سے محمور تھیں۔

دھیور کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اس نے بے تکلفی سے لالی کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ دونوں جھومتے جھومتے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوئے۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ایک دم سنبھل گئے۔

کمرہ خالی تھا۔ حیات محمد ابھی شکار سے واپس نہیں آیا تھا۔ دھیور نے تہ خانے کا دروازہ کھولا۔ لالی بیڑھیوں سے نیچے اترتا۔ اس کے قدم نٹے سے کسی قدر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ تہ خانے میں پہنچا تو بوڑھے ریاض محمد خاں ٹوکی آواز ابھری۔

”آگیا تو؟ میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ریاض نے اس کی نٹے سے چڑھی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ ”چھا تو یہ رنگ ہے۔ کتنی پی؟“ لالی پھر بھی نہ بولا۔ ریاض نے ایک بار پھر اسے حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس وقت وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھا اور دوپہر والے شوریدہ سر ریاض سے بالکل مختلف تھا۔ لالی کو خاموش دیکھ کر ریاض نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس بیٹھ جا۔ لگا دینا انجیکشن۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ مگر لالی بدستور کھڑا رہا۔ ریاض مسکرایا۔ ”ذرا کیوں رہا ہے؟ بیٹھ جا۔ میں تجھے کاٹ نہیں کھاؤں گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”تیرے پاس سگریٹ تو ہوگی؟“

لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”نہیں۔“

”تیرا نام کیا ہے؟“

”لالی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تو مجھے آباد کار نہیں لگتا۔“ بوڑھے ریاض نے اسے غور سے دیکھا۔ ”دیکھنے میں تو جا لنگی لگتا ہے۔ تو جا لنگی ہے نا؟“

”میری ماں بھی یہی کہتی تھی۔“

”تو رہنے والا کہاں کا ہے؟“

”گوگیرہ کے نزدیک اپنا پنڈ ہے جی۔ پر میں زیادہ تر لمبور میں رہا۔“

”تب تو تو اسی ضلع کا ہوا۔“ ریاض نے مسکراتے ہوئے لالی کو دیکھا۔ ”مگر تو لمبور میں رہ کر بھی ڈے لڑی لگتا ہے۔ شراب پی کر تو اپنی آنکھوں سے اور بھی زیادہ خوف ناک ڈے لڑ لگتا ہے۔“ اس نے آنکھ مار کر سرگوشی کی۔ ”یہ بتا تو کس چکر میں یہاں آگیا؟“

لالی اس کی بات ٹال گیا۔ خاموشی سے الماری کے پاس گیا اور دوا سے بھری ہوئی سرنج نکال کر ریاض کے پاس واپس آگیا۔ وہ انجیکشن لگانے کے لیے اس کے نزدیک بیٹھا تو ریاض نے کہا۔ ”ٹھیک سے بیٹھ جا۔ آرام سے لگا دینا انجیکشن۔ مجھے ایسی کوئی جلدی نہیں۔“

”پر مجھے تو جلدی ہے۔“ لالی نے کسی قدر بے رخی سے کہا۔ ”نیزد آ رہی ہے، جا کر سو جاؤں گا۔“

”نیزد آ رہی ہے تو یہیں سو جا۔ ایک دن تو، تجھے یہاں سونا ہی ہو گا۔“

لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ ”کیوں؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”ہر نیا آنے والا یہی بات پوچھتا ہے۔ میں اسے جواب دیتا ہوں تو وہ یقین نہیں کرتا۔ تو بھی میری بات پر یقین نہیں کرے گا۔ ایسی بات پوچھنے سے کیا فائدہ جس پر یقین نہ آئے۔“ ریاض کے لہجے میں دبا دبا کر ب تھا۔ اس کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔

لالی اور پریشان ہو گیا۔ گھبرا کر بولا۔ ”مجھے ایسا لگتا ہے، بابے تو پاگل شاعری نہیں ہے؟“ ریاض صرف مسکرا کر رہ گیا۔ مگر یہ مسکراہٹ نہیں تھی، زہر خند تھا۔ لالی نے اصرار کیا۔ ”بابے، کیا تو بچ چچا گل نہیں ہے؟“

”یہ سوال نہ کر۔ تیری زندگی اور مختصر ہو جائے گی۔“ ریاض نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جس نے بھی مجھ سے یہ سوال کیا، وہ کچھ ہی دنوں بعد غائب ہو گیا۔ فیہاں نہیں آیا، اس کی لاش آئی۔ یہ جگہ جگہ سے کھدی ہوئی زمین دیکھ رہا ہے؟“ اس نے تہ خانے کے فرش کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہاں ان کی لاشیں دبی ہیں۔ اب تک ایسی تین لاشیں یہاں دبا کی جا چکی ہیں۔ پچھلے چار مہینے سے

بوڑھے ریاض محمد وٹو نے دریافت کیا۔ ”تجھے ٹھیک سے پتہ ہے حیات آج رات شکار سے نہیں لوٹے گا۔“

”مجھ سے تو جی بچھلی رات انھوں نے یہی بتایا تھا، شام کو نہ لوٹے تو دو تین روز بعد واپسی ہوگی۔“

میاں ریاض محمد خاں نے لالی کی بات سنی تو مہمتری سوچ میں ڈوب گیا۔ لالی زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے بوڑھے ریاض کو کرایا۔

”میاں ساب، آپ کے جی سکے بھائی ہیں؟“

”ہاں۔“ ریاض نے مختصر جواب دیا۔ وہ ابھی تک سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

لالی نے اس کی خاموشی سے اکتا کر استفسار کیا۔ ”پر انھوں نے آپ کو یہاں تہہ خانے میں کیوں ڈال دیا؟ کوئی بات تو ہوگی۔“

”تو بھی سن لے۔ کوئی لمبی چوڑی داستان نہیں، پر تو نہ سن تو اچھا ہے۔“ اس نے چونکا نظروں سے زینے کی جانب دیکھا۔ خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ ”تجھے پورا یقین ہے حیات آج شام واپس نہیں آیا اور دھیور نشے میں مدہوش سو رہا ہے۔“

”میں جی کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ ابھی آپ کے سامنے ہی تو دیکھ کے آیا ہوں۔“ لالی کھٹک کر ریاض کے اور قریب ہو گیا اور اپنی بے چینی ظاہر کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے کچھ تو بتائیے جی۔ کچھ نہیں آتی، یہ سارا پکڑ کیا ہے؟ سوچتے، سوچتے تھک گیا۔ اپنا تو بھیجا کام نہیں کرتا۔“

”بات صرف اتنی ہے۔ حیات جب بہت جھوٹا تھا۔ مشکل سے دو سال کا رہا ہو گا کہ ماں فوت ہو گئی۔ سال بھر بعد جیسو بھی نہ رہے۔ میری پہلی گھر والی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ میں نے حیات ہی کو اپنی اولاد سمجھا، اور اولاد ہی کی طرح اسے پالا پوسا۔ وہ میرا اکلوتا بھائی ہے۔ مجھ سے لگ بھگ ۲۰ برس چھوٹا ہے۔ میری کوئی بھین بھی نہیں۔ میری تمام جائیداد کا وارث حیات ہی تھا۔ وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ ساری جائیداد کا وارث وہی بنے گا۔“

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے لقمہ دیا۔ ”ویسے بھی جی آدمی جیداد تو ان کی بنتی ہے۔“

”نہیں، ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ میاں ریاض نے فوراً وضاحت کی۔ ”یہ جائیداد مجھے اپنے جیسوے ورثے میں نہیں ملی۔ وہ تو بہت معمولی زمیں دار تھے۔ ان کے پاس ۲۵ ایکڑ سے بھی کم اراضی تھی۔ ان کو زمیں داری سے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہ تھی۔ وہ چاہتے تھے میں پولیس میں بھرتی

یہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تو چوتھی لاش بن کر یہاں نہ آئے اور مجھے بھوت بن کر رات کی تمنائیں میں نہ ڈرائے۔“ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ ”ہر رات جب میں اکیلا ہوتا ہوں تو یہ بھوت اپنی کئی ہونی گردنیں اور زخمی سینے لے کر خون میں تھڑے ہوئے یہاں آتے ہیں۔ ہنستے ہیں، ناپتے ہیں، شور مچاتے ہیں۔ کبھی میری گردن مروڑتے ہیں۔ کبھی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹتے ہیں۔ میں ڈر کر چیختا ہوں تو حیات آجاتا ہے۔ مجھے ہنترے سڑاک سڑاک مارتا ہے۔ یہ دیکھ میری پیٹھ۔“ اس نے کرتا اٹھا کر اپنی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے کر دی۔

ریاض کی پیٹھ اور کمر پر لمبی لمبی سیاہ دھاریاں اور بلیں پڑی تھیں۔ لالی نے یہ بھی دیکھا کہ تہہ خانے کا کچا فرش جگہ جگہ سے کھدا ہوا ہے۔ لالی نے گنا، فرش تین جگہ سے ادھڑا ہوا ہے۔ گویا ریاض ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ لالی کسی ان جانے خوف سے لرز کر رہ گیا۔ اس نے سرنج ایک طرف رکھی اور ریاض کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر کسی قدر عاجزی سے بولا۔

”بابے! یہ تو بتا، یہ سب چکر کیا ہے؟“

”تو زیادہ دیر یہاں ٹھہرے گا تو حیات آجائے گا۔ مجھ سے باتیں کرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تو میرے ساتھ تیری چمڑی بھی ادھڑ ڈالے گا۔“

لالی نے جھٹ کہا۔ ”وہ تو شکار پر گئے ہیں جی! اکل یا پرسوں آئیں گے۔“ اسے فوراً دھیور کا خیال آیا۔ لالی کو اس سے بھی خطرہ تھا۔

وہ میاں ریاض سے کچھ کے بغیر اٹھا اور تیزی سے بیڑھیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچا۔ دروازہ کھولا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کمرہ ہنوز خالی ہے۔ دھیور دروازے کے قریب فرش پر بے خبر سو رہا تھا۔ لالی تہہ خانے میں واپس پہنچا۔ ریاض نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تو اچانک کہاں چلا گیا تھا؟“

”میں دھیور کو دیکھنے گیا تھا جی۔“

دھیور کا نام سن کر بوڑھے ریاض کا چہرہ مکدر ہو گیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”وہ نمک حرام حیات کا پالتو کتا ہے۔ اس کے پاس دو کتے ہیں۔ ایک اسیٹن دو سرا دھیور۔ ہر قتل کے لیے وہ انھی کو استعمال کرتا ہے۔ حیات ہیر سڑ بھی ہے۔ ہر جرم میں اپنا ہاتھ صاف رکھتا ہے۔ قانون کو پوری طرح جانتا ہے۔“

”پر ابھی تو دھیور سو رہا ہے۔ اس نے بھی میرے ساتھ ہی پی تھی اور زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ اب نشے میں دمت پڑا ہے۔“ لالی نے مطلق کیا۔

ہو جاؤں یا پڑاری لگ جاؤں۔ اسی لیے انھوں نے مجھے مل تک تعلیم دلوائی۔“ اس نے اپنا ماضی کریدتے کریدتے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مگر انھوں نے جو چاہا، وہ نہ ہوا۔ ہوتا تو ویسی ہے جو اللہ چاہتا ہے۔“ میاں ریاض محمد نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ ”یہ اتنی وڈی جاگیر میں نے اپنی صلاحیت اور محنت سے حاصل کی ہے۔“

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ ریاض محمد خاں وٹو بتاتا رہا۔ ”غیر ایسا ہوا کہ میں نے دوسرا ویاہ کر لیا۔ تب تک میں اس جائیداد کا مالک نہیں تھا۔ منیجر لگا ہوا تھا۔ دوسری گھر والی سے میرا پتر نیاز پیدا ہوا۔ حیات تب جوان تھا۔ ان دنوں وہ لمور میں پڑھتا تھا۔ جب یہ جاگیر میری ہو گئی تو وہ بھی ادھر ہی آگیا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال میں میرا ہاتھ بٹانے لگا۔ سچ پوچھو تو ساری ہی ذمہ داریاں میں نے اسے سونپ دی تھیں۔ اب نیاز بھی کچھ لمبا ہو گیا تھا اور سکول میں پڑھتا تھا۔“ اس کا لہجہ قدرے نیکیا ہو گیا۔ ”پر حیات اس سے خوش نہ تھا۔ خار کھاتا تھا۔ پریشان رہتا۔ میں نے جلد ہی اس کی پریشانی کا سبب جان لیا۔“

”وہ پریشانی کیا تھی جی؟“ لالی بیچ میں بول پڑا۔

”سیدھی سادی گل ہے۔“ ریاض نے لالی کو مطلع کیا۔ ”نیاز کے ہوتے ہوئے حیات میری جائیداد کا وارث کیسے بن سکتا تھا۔ میں نے حیات کی پریشانی کا علاج یہ نکالا کہ اسے اپنے دوست کرتل جانن کے پاس پڑھنے کے لیے لندن بھیج دیا۔ یہ جاگیر اور تمام فارم شام پبلے کرتل جانن ہی کی ملکیت ہوتے تھے۔“

”پر جی، یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کرتل نے اتنی وڈی بیکہ کیسے دے دی؟“ لالی ایک بار پھر بیچ میں بول پڑا۔ ”دیکھو نا، کوئی اپنی جیداد کسی کو کیسے دے سکتا ہے؟“ اس نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ ”کوئی اونچائی چکر چلایا ہو گا۔“

”نکو اس نہ کر۔“ میاں ریاض محمد نے لالی کو غصے سے ڈانٹا۔ ”بیچ میں بولے گا تو میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ وہ روٹھنے کے انداز میں منہ موڑ کر بیٹھ گیا۔

مگر لالی نے اسے خاموش نہ رہنے دیا۔ ریاض کا گھٹنا چھو کر گزر گزائے لگا۔ ”غلطی ہو گئی جی۔ اب نہیں بولوں گا۔“

لالی نے منت سماجت کر کے میاں ریاض کو منالیا۔ وہ بتانے لگا۔ ”میں چاہتا تھا حیات بہت تعلیم حاصل کرے۔ اسے بچپن میں ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ وہ ڈاکٹری پڑھنے لندن چلا گیا۔ پر ڈاکٹری پڑھتے پڑھتے اچانک اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ مجھے لکھا کہ بیرسٹری پڑھوں گا۔ میں نے اسے خوش

سے اجازت دے دی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مگر لالی کی جانب دیکھا۔“ بیرسٹری کو میں نے ہاں بھی پسند کیا کہ میں چاہتا تھا وہ بیرسٹر بن کر سیاست میں حصہ لے۔ اسمبلی کا ممبر بنے۔ وزیر بنے۔ نور نرنگے۔ سارے ہی سیاست داں عام طور پر وکیل یا بیرسٹری ہوتے ہیں۔“

”غیر اہمہ گل بھی تو ہے۔“ لالی نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ ”بیرسٹری کے ساتھ ساتھ وہ سیاست میں لگ جاتے تو جگہ پر اور جیداد کی طرف ان کا دھیان ہی نہ جاتا۔ ورثے کی سوچتے اور نہ نیاز سے خار کھاتے۔“ لالی نے داوطلب نظروں سے ریاض کو دیکھا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا جی؟“

”تیرا خیال ٹھیک ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔“ میاں ریاض نے اس دفعہ لالی کی مداخلت پر فحش کے بجائے تائید کی۔ ”ویسے یہ بھی ہے کہ اپنی برادری کے کئی زمیں دار سیاست میں ہیں۔ پچھلے صوبائی الیکشن میں، جو ۱۹۵۱ء میں ہوئے تھے، ادھر سے میاں خدایار خاں وٹو جیتا تھا۔ اس کے سرخاں بہادر میاں نواز احمد خاں مانیکا کا نام تو نے بھی سنا ہو گا۔ اپنی ہی قوم کا بندہ ہے۔“

”نہیں جی، میں اسے نہیں جانتا۔“ لالی نے گردن ہلا کر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

”حد ہو گئی۔ تو اسے نہیں جانتا۔ اسے تو سب ہی جانتے ہیں۔“ ریاض نے حیرت زدہ ہو کر کما ”خاں بہادر نور احمد مانیکا، پاک چین کا بہت وڈا زمیں دار ہے۔ وہ تو پاکستان بننے سے بھی پہلے پنجاب اسمبلی کا ممبر رہ چکا ہے۔“

”وہ تو جی مانیکا ہوا اور تم ٹھہرے وٹو۔ فیروہ تمہاری کوم کا کیسے ہوا؟“

”مانیکا بھی وٹو ہی ہوتے ہیں۔“ ریاض نے لالی کو بتایا۔ ”سارے ہی وٹو دراصل سورج بنسی راجپوت ہیں۔ پہلے ہندو ہوتے تھے۔ کہتے ہیں بابا فرید گنج شکر نے انھیں مسلمان بنایا تھا۔ اور اب تو بابا فرید کے خاندان سے وٹوؤں کی رشتہ داری بھی ہو گئی ہے۔ خاں بہادر میاں نور احمد مانیکا کی ایک دھمی، بابا فرید کے گدی نشین دیوان غلام قطب الدین چشتی سے ویاہی ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مانیکا، کالو کا، تیجے کا، ٹھاکر کا، لالیکا، وٹوؤں کی گوتیں ہیں۔ اور بھی نہ جانے کتنی ہیں۔ ہماری گوت کالو کا ہے۔“

”میرے ساتھ جیل میں ایک کیدی ہوتا تھا۔ وہ اپنے کو راجپوت بتاتا تھا۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”پر وہ سیال تھا۔ میاں نہیں چوہدری کہلاتا تھا۔“

”چوہدری اور ملک تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“ میاں ریاض محمد نے وضاحت کی۔ ”چوہدریوں اور ملکوں کی کوئی ذات، کوئی برادری نہیں ہوتی۔ چوہدری اور ملک تو ایک طرح کا خطاب ہوتا ہے۔ لیکن میاں صرف راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ ویسے تو اب آرائیں اور شیخ بھی خود کو میاں

کھلاتے ہیں۔ مگر اصل میں یہ اونچی ذات کے راجپوتوں کا خطاب ہوتا ہے۔ خاص طور پر پھاڑی علاقے کے راجپوت جو یہاں ہوتے ہیں، اس معاملے میں بہت سخت ہوتے ہیں۔ وہ کھیتی باڑی نہیں کر سکتے۔ اپنی دھمی کسی چلی ذات کے راجپوت کو نہیں دیاہ سکتے۔ نہ وہ اپنی دھمی کے لیے روپیہ پیسہ لیتے ہیں۔ ان کی زنانیاں سخت پردہ کرتی ہیں۔ اگر کوئی میاں راجپوت خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ میاں نہیں رہتا۔ نچلے درجے کا راجپوت بن جاتا ہے۔ اس کو ہل یاہ یاہلی کہا جاتا ہے۔ راجپوت تو چھتری ہوتے ہیں ناں۔ ان کی شان تو کموار ہوتی ہے۔ وہ فوجی بننا پسند کرتے ہیں۔ میاں سب سے اونچی ذات کے راجپوت ہوتے ہیں۔ ان کے بعد رانا ہوتے ہیں۔ فیرونگا ہوتے ہیں۔ اور سب سے نچلے درجے کے راؤ ہوتے ہیں۔ وہ رانگھڑ کہلاتے ہیں۔ سیال، چوان، بجوا، مہر، ٹوانے اور رانھور بھی راجپوت ہوتے ہیں۔ جنجوعہ بھی رانھوروں ہی کی ایک گوت ہے۔“

میاں ریاض محمد کو عرصے سے کسی کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ لالی نے اسے کرایہ اتو بات سے بات نکلتی رہی۔ میاں ریاض ٹھہر، ٹھہر کر بولتا رہا۔ اپنی اور اپنی ذات برادری کی برائی جتانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر لالی اس کی باتوں سے جلد ہی اکتا گیا۔ اسے نہ راجپوتوں سے دلچسپی تھی، نہ دونوں سے اور نہ ان کی مختلف گوتوں سے۔ اسے صرف میاں حیات محمد سے دلچسپی تھی، جس نے اسے اپنے بنگلے میں اس طرح قید کر دیا تھا کہ نہ وہ باہر نکل سکتا تھا اور نہ رحیم داد کے پاس پہنچ سکتا تھا۔ لہذا میاں ریاض کی بات نظر انداز کر کے اس نے ایک بار پھر میاں حیات محمد کا ذکر چھیڑ دیا۔

”یہ تو بتائیں جی، میاں سب نے بیرسٹری پڑھی یا اسے بھی ڈاکٹری کی طرح چھوڑ دیا؟“

”نہیں، وہ ۵ سال بعد بیرسٹر بن کر لندن سے واپس آگیا۔ لندن سے اپنے ساتھ میم بھی لایا تھا۔“

”میں نے تو جی یہاں کوئی میم شیم دیکھی نہیں۔“

”وہ تھوڑے ہی دنوں بعد انگلستان چلی گئی۔ فیرواپس نہیں آئی۔ میں نے حیات کا ویاہ کر دیا۔ اس سے ایک بچی بھی ہے۔ مگر گھر والی حیات کے ساتھ نہیں رہتی۔ وہ بری کڑی نہیں ہے۔ پڑھی لکھی اور سمجھدار ہے۔ یہی کمینہ اور بد معاش ہے۔ شراب کے نشے میں دھت ہو کر اسے ہنرے مارتا ہے۔ وہ لنگر والوں کی دھمی ہے۔ اتنے اونچے گھرانے کی بیٹی کب تک اس کا ظلم برداشت کرتی، آخر روٹھ کر اپنے میکے چلی گئی۔ کبھی کبھار آجاتی ہے۔“ ریاض نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ ”لندن سے واپسی کے بعد حیات نے کبھی بیرسٹری نہیں کی۔ میرے بار بار کہنے پر بھی اس نے

پریکٹس شروع نہیں کی۔ ہاں سیاست میں ضرور حصہ لینے لگا۔ مگر نہ وزیر لگانہ گورنر اور نہ کبھی اسمبلی کی ممبری کی کوشش کی۔ وہ صرف بادشاہ گری کرتا ہے۔“

لالی نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔ ”یہ بادشاہ گری کیا ہوتی ہے جی؟“

”وہ یہ ہوتی ہے۔ کسی کو اسمبلی کا ممبر بنوایا، کسی کو وزیر لگوایا۔ کسی پارٹی کو اوپر کر دیا کسی کو نیچے۔ کبھی اس ٹولے کے ساتھ، کبھی اس ٹولے کے ساتھ۔ کہتا ہے، اصلی سیاست یہی ہے۔ پیچھے بیٹھے ڈوری ہلاتے رہو۔“

”اپنا میاں سب تو بہت اونچا کاری گر طوم ہوتا ہے۔“ لالی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ نشے کا ایک بار پھر ریلا آیا۔ لالی ہنسنے لگا۔ ”وہ قلم تو آپ نے دیکھی ہوگی جی، استاد چکرم، کیا زور، دس کی قلم تھی۔“

لالی نے نیم وا آنکھوں سے ریاض کو دیکھا اور جھوم کر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنائے لگا۔ ”آنکھیں شرابی، چہرہ گلابی۔“

ریاض نے غصے سے گھورا۔ ”فیرو تو نے بکواس شروع کر دی۔“

لالی چونک پڑا۔ کھسیانی ہنسی ہنس کر بولا۔ ”معاف کرنا جی! تھوڑی سی چڑھ گئی ہے۔“ لالی نے منانے کے لیے ایک بار پھر اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔ ”اب نہیں بولوں گا جی۔ رب سوہنہ بالکل نہیں ہنسوں گا۔“

”معلوم نہیں، میں کیا کہہ رہا تھا۔“ ریاض کچھ دیر خاموشی سے سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”یاد آیا۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا، حیات سیاست میں چور دروازے سے حصہ لینے لگا۔ مگر وہ زمیں داری کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا۔ فیرو اس نے ایک بہت کمینہ حرکت کی۔ ادھر ادھر یہ مشہور کر دیا کہ نیاز میرا نہیں، کرئل جانسن کا پتر ہے۔“

لالی پھر بیچ میں بول پڑا۔ ”یہ تو بہت شرم کی گل ہے جی! بہت بدنامی ہوئی ہوگی۔“

لالی کی مداخلت پر ریاض خفا نہیں ہوا، مگر سانس بھر کر بولا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ نیاز کی ماں نے یہ بات سنی تو اسے اتنا دکھ ہوا کہ خود کشی کر لی۔ میں نے تب ہی سوچا تھا، حیات کو دھکار کر نکال دوں۔ مگر وہ میرے پیر پڑ کر رونے لگا۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔ پر نیاز نے معاف نہیں کیا۔ وہ مشکل سے ۱۹ سال کا تھا۔ لیکن اتنا زراش ہوا کہ اس کا بس چلتا تو حیات کو گولی سے اڑا دیتا۔ وہ بہت سرکش اور ضدی ہے۔ میں نے سوچا، کسی روز چاچا جیتھے میں گولی نہ چل جائے، نیاز کو پڑھنے کے لیے امریکہ بھیج دیا۔ اسے وہاں گئے ہوئے لگ بھگ ڈیڑھ سال ہو چکا ہے۔ ابھی سال بھر اور امریکہ میں تعلیم حاصل کرے گا۔“

”آپ نے جی! اپنے لیے یہ ٹھیک نہیں کیا۔“

ریاض سمجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا کرتا۔ کوئی اور رستہ بھی نہیں تھا۔ مگر سال بھر بعد میں نے اسے واپس بلانا چاہا۔ ہوا یہ کہ نیاز کے امریکہ جانے کے چند ہی مہینوں بعد میری پہلی گھروالی بھی مر گئی۔ میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ میں چاہتا تھا، میرا پتر میرے پاس رہے۔ لیکن حیات نے کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے واپس نہ آنے دیا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں نے یہ بھی غور کیا کہ زمیں داری کے معاملوں میں حیات من مانی کرنے لگا تھا۔ میری ذرا پرواہ نہ کرتا۔ جو جی چاہتا، فیصلہ کرتا۔ مجھے سے دور دور رہتا۔ بلاتا تو نہ آتا۔ ٹال مٹول سے کام لیتا۔“

”آپ کو تو جی تب ہی ہوشیار ہو جانا چاہئے تھا۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ بوڑھے ریاض نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے یہی غلطی ہوئی۔ کیا کرتا، بھائی کی محبت نے اندھا کر دیا تھا۔“ اس نے لالی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”اٹھی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک رات میں دیر سے واپس آ رہا تھا۔ بنگلے سے کوئی فلائنگ بھر کے فاصلے پر اندھیرے میں مجھ پر اندھا دھند فائرنگ ہوئی۔ میں بال بال بچ گیا۔ البتہ میرا ایک کندہ بری طرح زخمی ہو گیا۔ بعد میں پوچھنا چھ کرنے پر پتہ چلا، مجھ پر یہ قاتلانہ حملہ حیات کے اشارے پر دھوور نے کیا تھا۔ دھوور کو تو میں نے ایسی سزا دی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ حیات کو جاگیر سے علیحدہ کر دوں تاکہ اس کے دماغ سے وارث بن جانے کا خناس ہی نکل جائے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں اسے ہٹاتا، اس نے مجھے اپنے راستے سے ہٹا دیا۔ لگ بھگ چار مہینے سے اس تہ خانے میں بند ہوں۔“

”پر یہ چکر کب تک چلے گا؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ وہ مجھے قتل بھی کرنا نہیں چاہتا۔“

لالی نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

”مجھے قتل کرنے سے ابھی اسے کیا ملے گا۔ میری جائیداد کا وارث حیات نہیں میرا پتر نیاز ہے۔“

حیات میرے سامنے بار بار وصیت نامے کی دستاویز لے کر آتا ہے، جس کے ذریعے وہ چاہتا ہے میں نیاز کو عاق کر دوں اور تحریری طور پر یہ تسلیم کر لوں، نیاز میرا نہیں کسی اور کا لطفہ ہے۔ اس طرح نیاز کو جائیداد سے محروم کر کے حیات کو اپنا وارث بنا دوں۔“

”میں تو کہتا ہوں جی، آپ دستاویز پر دستخط کر دیں۔ کید سے تو چھٹکارا مل جائے گا۔ فیعدالت میں جا کر کہہ دیجئے گا، مجھ سے زبردستی دستخط کرائے گئے تھے۔“

”وہ تیری طرح بیوقوف نہیں ہے۔ دستاویز پر دستخط کرتے ہی مجھے مار کر میس تہ خانے میں دبا دے گا۔ وہ ایک سال پہلے کی دستاویز پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتا ہے۔ وہ بیدار ہے، بیدار قانون کو ہر معاملے میں سامنے رکھتا ہے۔“

ریاض نے اپنی بات ختم کی تو تہ خانے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ چند لمحے بعد لالی نے کہا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا جی کہ آپ پاگل شاعری بالکل نہیں ہیں؟“

”ویسے تو اس نے مجھے پاگل ہی بنا رکھا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کچھ مدت بعد جج پاگل ہو جاؤں گا۔ کبھی کبھی مجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑتا بھی ہے۔ میں بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کرتا ہوں۔ تب مجھے کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ جب سے حیات نے یہ انجیکشن لگانے شروع کئے ہیں اس وقت سے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا ہے۔“

”یہ بات تو میں نے بھی نوٹ کی۔ مجھے بھی ان انجیکشنوں کا ایسا ہی چکر لگتا ہے۔“

”ویسے تو مجھے ان سے نیند آ جاتی ہے۔“ ریاض ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا۔ ”انجیکشن لگنے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے میں بادل کی طرح بالکل ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ کبھی تیز ہواؤں کی آوازیں سنتا ہوں، کبھی پانی کا شور۔ کبھی اوپر سے نیچے جاتا ہوں، کبھی خود کو ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ فیہ میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو جاتی ہیں۔“

”نیاز کو ان باتوں کا پتہ ہے؟“

”نہیں۔ میرا خیال ہے، اسے کچھ نہیں معلوم۔ اسے معلوم ہوتا تو فوراً یہاں آتا اور مجھے قید سے نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ ضرور ایسا کرتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا، اسے یہ باتیں معلوم ہوں اور وہ چپ کر کے بیٹھا رہے۔ تمہی سوچو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ میرا پتر ہے، میرا اپنا خون ہے۔“

ریاض جذباتی ہو گیا۔

لالی بھی اس کی باتوں سے متاثر ہوا۔ ”مجھے نیاز کا پتہ بتائیں جی۔ میں ساری باتیں خط کے ذریعے اسے بتا دوں گا۔“ لالی نے گرم جوشی سے ریاض کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دلوچ لیا اور بڑے جوش سے یقین دلایا۔

”پروانہ کریں جی، یہ کام تو میں ضرور کر دوں گا۔“

لالی کی بات سن کر ریاض پریشان ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ انکار میں دونوں ہاتھ ہلا کر بولا۔ ”نہیں، نہیں تو ایسا نہیں کر سکتا۔“ وہ گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ ”تجھ سے پہلے ان تینوں نے بھی ایسی ہی کوشش کی تھی۔ اب وہ اس تہ خانے میں دفن ہیں۔ میں نے منع بھی کیا

مگر نہیں مانے۔ اب مجھے رات کی تنہائی میں اپنے کئے ہوئے سراور زخمی سینے دکھا کر ڈراتے ہیں۔“

ریاض کسی ان جانے خوف سے لرزے لگا۔ ”حیات تجھے ایسا نہیں کرنے دے گا۔ وہ خوں خوار چیتے کی طرح بہت چوکنا رہتا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔“ یہ کتے کتے لیک ایک اس کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ وہ انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے زور سے چیخا۔
”دیکھ، وہ آگیا۔“

لالی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا، میاں حیات زینے کے پاس کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہنڑ تھا اور سرخ سرخ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ وہ خوں خوار نظروں سے دونوں کو گھورتا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کے ساتھ اس کا سیاہ کتا بھی تھا۔ لالی ذرا دیر تو سما ہوا خاموش بیٹھا رہا، مگر جب حیات اس کے قریب پہنچ گیا تو اس نے انھنے کی کوشش کی۔ حیات محمد نے گرج دار لہجے میں کہا۔ ”بیٹھارہ۔“ لالی جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔

ریاض نے حیات سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس نے خوف سے آنکھیں بند کر کے گردن جھکا لی حیات تیزی سے ریاض پر جھپٹا اور اسے ہنڑ سے سزاک سزاک مارنے لگا۔ بوڑھے نے بے بسی سے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ گڑگڑا کر بولا۔ ”نہیں، نہیں۔“ مگر حیات باز نہ آیا۔ گھما گھما کے ہنڑ چلاتا رہا۔ ریاض بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ خوف اور دہشت سے اس کا پیشاب نکل گیا۔ دونوں ٹانگیں شرابور ہو گئیں۔ فرش بھی گیلیا ہو گیا۔ حیات نے ہاتھ دوک لیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے لالی سے دریافت کیا۔
”انجیکشن لگا دیا تو نہ؟“

لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”ابھی نہیں۔“
”انجیکشن لگا۔“

لالی نے خاموشی سے سرنج اٹھائی اور ریاض کی کمر میں انجیکشن لگا دیا۔ ریاض فرش پر پڑا آہستہ آہستہ کراہتا رہا مگر مگر مگر سانس بھرتا رہا۔ جب لالی انجیکشن لگا چکا تو حیات نے اس کے ہاتھ سے سرنج لے کر الماری میں رکھ دی اور لالی کو مخاطب کیا۔
”میرے ساتھ آ۔“

لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں میڑھیوں کے قریب پہنچے تو پیچھے سے ریاض کی آواز ابھری۔ ”سنو۔“

لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ریاض اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا چہرہ میلا پڑ گیا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر اس سے کہہ رہا تھا۔ ”لاش بن کر یہاں آتا تو مجھے بھوت بن کر نہ ڈرانا۔ اپنی کٹی ہوئی گردن اور خون سے تھرا ہوا سینہ نہ دکھانا۔“

حیات نے تکیلی نظروں سے لالی کو دیکھا اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ دونوں زینے کی بیڑھیاں ملے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ لالی سما ہوا جو تھل قدموں سے چل رہا تھا۔ تہ خانے کے دروازے سے گزر کر دونوں کمرے میں آگئے۔ دھوڑ مدھم روشنی میں ایک طرف کھڑا تھا۔ اس نے بدھ کر تہ خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

حیات محمد آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ہنڑ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ لالی اس کے روپہ رو نظریں جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ اس کی پشت پر دروازے کے قریب دھوڑ موجود تھا۔ حیات تھوڑی دیر خاموش بیٹھا رہا پھر لالی کی طرف متوجہ ہوا۔ تکیے لہجے میں گویا ہوا۔ ”کیا کتا تھا یہ؟“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گردن جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

حیات غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ ”خاموش کیوں ہے؟ بولتا کیوں نہیں؟“
لالی گڑگڑانے لگا۔ ”ساب غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجئے۔“

حیات تیوری پر بل ڈالے خوں خوار نظروں سے اسے گھورتا رہا، گردن کو ذرا سا خم دے کر بولا۔ ”مجھے معلوم ہے اس نے کیا کیا ہو گا۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”وہ بہت مظلوم ہے۔ خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے اس نے تجھے بھی ایک دردناک داستان سنائی ہو گی۔ مگر اس نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ خود اس نے کتنا ظلم ڈھایا ہے۔ اس کے ظلم و ستم کا جیتا جاگتا ثبوت یہ کھڑا ہے۔“ اس نے دھوڑ کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کی زبان اس نے صرف اس لیے کٹا دی کہ یہ اس کے گرے ہاؤنڈ کتوں کے راتب سے گوشت چرا کر کھا جاتا تھا۔ یہ دھوڑ تیرے سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

لالی نے مڑ کر دیکھا، دھوڑ دروازے کے قریب کھڑا آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کر رہا ہے۔ حیات کہتا رہا۔ ”اس سے یہ بھی پوچھ، اس نے اسے خسی بھی کرا دیا ہے۔ یہ اکیلا نہیں، اس بنگلے میں اور بھی ایسے ہی کئی کھسرے ہیں۔ ان سب کو اس نے خسی بتایا ہے۔ پتہ ہے اس نے ایسا کیوں کیا؟“

لالی نے آہستہ سے انکار میں گردن ہلا دی۔

حیات نے بتایا۔ ”اسے اپنی دونوں گھروالیوں پر اعتماد نہیں تھا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”اس

نے یہ بھی نہیں بتایا ہوگا کہ یہ جائیداد اور جاگیر اس نے کرئل جانسن سے کس طرح حاصل کی۔ ریاض تو اس کا معمولی کردہ تھا۔ ایسا خوشامدی اور وفادار تھا کہ اس کی خاطر مزارعوں کے کھیت کھلیاں جلوادیتا، ان کے گھریا تہا کرا دیتا، ان کی کڑیوں اور گھروالیوں کو اٹھوا لیتا۔ انھیں بے دخل کرتا، ان کے خلاف جھوٹے مقدمے بنواتا، انھیں جیل بھجواتا، قتل کرا دیتا اس کے نزدیک بہت معمولی بات تھی۔ اس کا رگزاری کے صلے میں وہ کردے سے ترقی کر کے منیجر بن گیا۔ ”حیات محمد تمہ خانے کے دروازے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”یہ تمہ خانہ پہلے بھی جیل خانہ تھا۔ اس کے اندر نہ جانے کتنی لاشیں دفن ہیں۔ اس بنگلے میں ایسے دو تمہ خانے اور بھی ہیں۔ ان میں ہمیشہ قیدی بند رہے اور بہت سوں کا قبرستان بھی بنے۔ اب تو صرف وہ اکیلا قیدی رہ گیا ہے۔ دوسرے تمہ خانے میں نے گودام بنادیئے۔“

حیات نے قدرے توقف کے بعد اونچی آواز سے کہا۔ ”من لیا تو نے؟“

”میاں ساب! آپ نے تو ایسی باتیں بتائیں کہ اپنا سر چکر گیا۔“

”وہ کتا ہے“ یہ جاگیر اور جائیداد اس نے اپنی محنت اور صلاحیت سے حاصل کی ہے۔ جانتا ہے اس نے کیسی صلاحیت دکھائی۔ اس نے اپنی عزت بھی داؤ پر لگا دی۔ اپنی توجہ گھروالی کو کرئل جانسن کی رکھیل بنا دیا، پھر گلا گھونٹ کر اس کا خون بھی کر دیا۔ مشہور کر دیا کہ اس نے خود کشی کر لی۔“

حیات محمد خاموش ہو کر بے چینی سے اپنا ایک پیر آہستہ آہستہ ہلانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی پھیل گئی۔ چند لمحوں بعد حیات کی آواز ابھری۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”نیا اس کا پتر نہیں ہے۔ وہ جھوٹ بولتا ہے، بکواس کرتا ہے۔ دربار ہال میں کرئل جانسن کی تصویر لگی ہے۔ نیا کو تصویر کے برابر کھڑا کر دے اور دیکھ لے، وہ جانسن کا پتر ہے یا ریاض کا۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے۔ وہ جھوٹے بھائی کو جائیداد کا وارث بنانا نہیں چاہتا۔ کرئل جانسن کے پتر نیا کو وارث بنانا چاہتا ہے۔ اس کا وفادار جو ہے۔“ حیات نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”او نہ، یہ اس کا بھی تو وفادار نہیں۔ پاکستان بنا اور انگریزی راج ختم ہوا تو اس نے جاگیر اور جائیداد ہتھینے کے لیے اس کے خلاف سازشوں کا جال پھیلادیا۔ میرے ذریعے مزارعوں کو بھڑکایا، سرکشی پر اکسایا۔ مزارعوں سے کہا، بٹائی دینا بند کرو، فارموں پر کام کرتا چھوڑ دو۔ دوسری طرف کرئل کی حمایت میں ان پر فائرنگ بھی کرائی۔ ایسے سنگین حالات پیدا کر دیئے کہ جانسن سخت خوف زدہ ہو گیا۔ اپنا پریشان ہوا کہ دولاکھ روپے سالانہ پر اپنے تمام فارم اور پوری زمینداری اس کے سپرد کر کے لندن چلا گیا اور اب تو وہ

کرئل جانسن کو کچھ بھی نہیں دیتا۔ ساری جاگیر تیا کر اپنے نام کرائی۔“

حیات محمد چند لمحوں خاموش بیٹھا رہا۔ پھر تھکے لمحوں میں گویا ہوا۔ ”مجھے کتا ہے، میں بے ایمان وں، ظالم ہوں۔ اب تو بتا۔ بے ایمان اور ظالم کون ہے؟“ لالی نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا۔ نظریں نیچے کئے چپ کھڑا رہا۔ حیات نے اونچی آواز سے پوچھا۔ ”بول، جواب دے۔ خاموش کیوں ہے؟“

لالی نے ایک بار پھر گڑگڑا کر کہا۔ ”میاں ساب! غلطی ہو گئی۔ معاف کر دیجئے۔“

حیات محمد خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”وہ ایسا ہوا جی، کچھ زیادہ ناچڑھ گئی تھی۔ بہت دنوں بعد پی تھی۔ بالکل یاد نہیں رہا۔ میں تو جی ان سے کبھی بات ہی نہیں کرتا تھا اور نہ ان کی سنتا تھا۔ فنانس انجیکشن لگا کر آجاتا تھا۔ وہ تو جی مجھے بھی گونگا بھرا سمجھتے تھے۔ آج اپنی مت ماری گئی۔“

حیات محمد نے تھکے لمحوں میں کہا۔ ”تیری نہیں، اس کی مت ماری گئی تھی۔“ اس نے دھیور کی انب گردن موڑ کر دیکھا۔ ”مگر اسے یہ بھی پتہ چل گیا کہ میرا حکم نہ ماننے کی کیا سزا ہوتی ہے۔ اس اچرہ ٹھیک سے دیکھ۔“

لالی نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھا کر غور سے دھیور کی طرف دیکھا۔ اس کی پیشانی سے کنبشی کے نیچے تک سیاہ لکیر پھیلتی چلی گئی تھی۔ حیات بولا۔ ”قیص اٹھا کر اس کی پیٹھ بھی دیکھ لیتا۔ میں نے تجھے اس کی نگرانی میں اس لیے نہیں دیا تھا کہ یہ نشے میں مدہوش ہو کر تمہ خانے کے دروازے پر دجائے۔ اور تو تمہ خانے کے اندر آرام سے بیٹھ کر میرے خلاف اس بڑھے کھوسٹ کی بکواس دے۔“

لالی عاجزی سے بولا۔ ”ساب! معاف کر دیجئے۔ اب کبھی ایسی غلطی نہیں کروں گا۔ آپ سے لکل کچ کہہ رہا ہوں۔“ حیات محمد وٹو نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ چپ بیٹھا ہنر مروڑتا رہا۔ لی نے چند لمحوں خاموش رہ کر ایک بار پھر التجا کی۔ ”ساب جی اس بار معافی دے دیجئے۔ آگے ایسی طی ہو تو گولی مار دیجئے۔“

حیات نے اسے جیہتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور اونچی آواز سے بولا۔ ”اس تمہ خانے میں پہلے چند مہینوں میں تین لاشیں دبائی جا چکی ہیں۔ یہ بات شاید اس نے بھی تجھے بتائی ہوگی۔ میں جتا ہوں چو تھی لاش تیری نہ ہو۔“ اس نے قریب بیٹھے ہوئے اپنے الیشن کی طرف اشارہ کیا۔

جس پر جھپٹتا ہے، اسے چیر پھاڑ کر ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے۔ تو نے دوسرا انجکشن بھی دیکھا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھا، اس کے گلے کے بعد یہ کتنا خوفناک بن جاتا ہے۔“ لالی خوف سے لرز گیا۔

الیشن حیات محمد کے پیروں کے پاس لیٹا دھیرے دھیرے غرا رہا تھا۔

لالی نے الیشن کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ سما ہوا خاموش کھڑا رہا۔ یکایک کتا زور سے بھونکا رات کے گھرے سنائے میں اس کی آواز بہت ڈراؤنی معلوم ہوئی۔ لالی اور زیادہ خوف زدہ ہو گیا۔ حیات محمد جھک کر الیشن کی پیٹھ سے ہاتھ لگاتے ہوئے بڑبڑانے لگا۔ ”نہیں، ابھی وقت نہیں آیا۔“ اس نے گردن اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر بھاری بھر کم لہجے میں بولا۔ ”لالی!“ وہ لمحہ بھر خاموش رہا۔ ”آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ میں تجھے آخری موقع دے رہا ہوں اور اس لیے دے رہا ہوں کہ وہسکی کی بوتل میں نے ہی تجھے دی تھی۔ اس کے نشے میں تو سب کچھ بھول گیا۔ میرا حکم بھی بھول گیا۔ تجھے یہ پتہ نہیں، میں کبھی غافل نہیں رہتا۔ ہمیشہ چوکنا رہتا ہوں۔“

لالی نے دونوں کان انگلیوں سے پکڑ کر کہا۔ ”میاں ساب، اب شراب کو کبھی ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔“

”میں تجھ پر ایسی کوئی پابندی نہیں لگانا چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں، میں جیسا کہوں، تو بالکل ویا ہی کر۔ جب تک یہاں رہتا ہے، تجھے گونگا اور ہرا بن کر رہنا ہو گا بلکہ آنکھوں سے بھی کم سے کم کام لینا ہو گا۔ سمجھ گیا؟“

”سمجھ گیا جی، بالکل سمجھ گیا۔“

حیات نے حکم دیا۔ ”جا، جا کر اب اپنی جگہ سو جا۔“

لالی نظریں جھکائے دروازے پر پہنچا۔ دھیور نے دروازہ کھول دیا، اور لالی سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ لالی باہر آگیا۔ مگر دھیور نہ آیا۔ کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ لالی کو دھیور کے نہ آنے پر تعجب تو ہوا مگر وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں پہنچ کر بستر پر لیٹ گیا۔



رات کے پچھلے پہر اچانک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کمرے کے دروازے کے سامنے دھیور حسب معمول اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ لالی کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ مگر جب دھیور مسلسل کراہتا رہا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ دھیور بستر پر اونڈھا پڑا تھا۔

لالی اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور دھیرے دھیرے اس کا سر دبانے لگا۔ دھیور نے اسے منع نہیں

نیا، نہ گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ بے حال پڑا کراہتا رہا۔ لالی نے اس کی قمیص کا دامن نکھایا۔ لالین کی مدھم روشنی میں دیکھا، دھیور کی پیٹھ پر ہنر کی مار سے نیل پڑ گئے ہیں۔ کھال جگہ بگہ سے پھٹ گئی ہے۔ زخموں سے خون نکل کر جم گیا ہے۔ لالی پریشان ہو کر بولا۔ ”اوے رہا! میاں باب نے توجہ مچ تیری چڑی ادھیڑ ڈالی۔ کیسے لمبے لمبے لاس پڑے ہیں۔“

دھیور خاموش لیٹا رک رک کر کراہتا رہا۔ لالی ذرا دیر دھیور کی زخمی پیٹھ ٹکتا رہا، پھر اٹھا۔ کمرے کے اندر گیا۔ کونے میں رکھی ہوئی وہسکی کی بوتل اٹھائی اور دھیور کے پاس آگیا۔ اس نے بوتل کھولی۔ تھوڑی سی وہسکی پھیلی پر ڈالی اور اسے دھیور کے زخموں پر آہستہ آہستہ لگایا۔ وہسکی لہتے ہی دھیور نے تکلیف سے بلبلایا کراہنے کی۔

لالی نے اس کا سر پیار سے تھپک کر نرم لہجے میں کہا۔ ”صبر کر۔ ذرا دیر میں چنگا ہو جائے گا۔“

دھیور نے مزاحمت نہیں کی۔ کراہتا رہا اور گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ لالی چپ بیٹھا اس کی پیٹھ وہسکی لگاتا رہا۔ وہ اپنی چوٹ اور زخموں کا علاج بھی اسی طرح کرتا تھا۔ یہ نسخہ اس نے درڈشکرے سے سیکھا تھا۔ ان دنوں انور اس کے گردہ کا سرغٹہ تھا۔ وہ لسا چوڑا قوی ہیکل جوان ا۔ لگتا بھی ڈشکرا تھا۔

لالی دھیور کی پیٹھ کے زخموں پر ہولے ہولے وہسکی لگاتا رہا۔ دھیور کچھ دیر تو بے قرار ہو کر ادھر دھر گردن ہلاتا رہا۔ رفتہ رفتہ زخموں کی ٹیس کم ہوتی گئی۔ سکون ملا تو اس نے کراہنا بند کر دیا۔ کچھ بعد وہ سو گیا۔ لالی اس کے قریب خاموش بیٹھا رہا۔ دھیور منہ اونڈھا کیے پیٹ کے بل بے سدھ اٹھا۔

اس کا ریو اور تکیے کے نیچے رکھا تھا۔ لالی نے اسے دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی۔ چمڑے کے ہولسٹر سے نہایت ہوشیاری سے ریو اور نکالا۔ اسے گھما پھرا ردیکھا۔ دھیور کو مطلق خبر نہ ہوئی۔

لالی آہستہ سے نیچے اترا اور چند لمحوں تک دھیور کے سرہانے چپ چاپ کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا ٹاچھایا تھا۔ لالی نے وہیں کھڑے کھڑے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ دھیور گہری نیند سو رہا تھا اور ا کا ریو اور لالی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا غلام گردش کے دروازے پر پہنچا۔ سامنے ہولے سے دروازہ کھولا۔ سامنے نیل گوں روشنی میں سیاہ الیشن بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی پھاڑ کر غرایا۔

لالی نے جھٹ غلام گردش کا دروازہ بند کر دیا۔ الٹے قدموں واپس ہوا۔ دھیور کے سرہانے پہنچ

نے میڑھیوں پر آہٹ سنی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا، حیات محمد میڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچ چکا ہے۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔

”تو نے انجیکشن لگا دیا؟“

”جی سب!“

”کیا تو آج مقررہ وقت سے پہلے یہاں نہیں آگیا؟“

”مجھے نہیں ملو م جی۔“ لالی نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے تو دھیور جب اشارہ کرتا ہے، میں اس کے ساتھ آجاتا ہوں۔“

میاں حیات محمد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ اس نے بوڑھے ریاض محمد کی طرف دیکھا، وہ زمین پر سکتا سکتا، آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ حیات نے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میڑھیاں چڑھنے لگا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں تہ خانے سے باہر آئے۔ دروازے پر دھیور بت بنا کھڑا تھا۔ حیات محمد نے اس سے بھی بات نہیں کی۔

دھیور نے تہ خانے کا دروازہ بند کر کے قفل لگایا اور لالی سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ میاں حیات محمد نو صوفے پر خاموش بیٹھا رہا۔ الیشن اس وقت بھی اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ وہ گردن اٹھائے لالی اور دھیور کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں آگے بڑھے اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر لالی بڑھال ہو کر بستر پر گر گیا۔ تھوڑی دیر بعد مائی جتنے کھانا لے کر آگئی۔ لالی نے کھانا رغبت سے نہیں کھایا۔ وہ ذہنی طور پر اس قدر پریشان تھا کہ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور سر گریٹ پر سر گریٹ پھونکتا رہا۔ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے جتنی بار باہر نظر ڈالی ہر بار دھیور کو اسٹول پر بیٹھے ہوئے پایا۔ وہ اس وقت ڈھیلا ڈھالا سفید کرتا اپنے ہوئے تھا۔ دھوتی بھی اچلی تھی اور اس کا چوڑا کنارہ سرخ تھا۔ کندھے پر پڑا پڑا تھا جس سے وہ بار بار منہ پونچھتا۔ پیروں میں نئی گائے شاہی جوتی تھی۔ بالوں میں تیل پڑا تھا اور بیچ سے مانگ نکال کر لمبے لمبے پٹے قاعدے سے جمائے گئے تھے۔ وہ خوب بن سنو کر بیٹھا تھا۔

لالی اسے دیکھتا تو وحشت ہوتی۔ بے چینی بڑھ جاتی۔ دن اسی بے چینی میں گزر گیا۔ سورج غروب ہو گیا۔ کمرے میں شام کا دھند لگا پھیلنے لگا۔ دھیور نے لالین روشن کی۔ لالی کے کمرے میں آیا۔ مگر اس نے لالی سے نظر نہ ملائی۔ چپ چاپ لالین رکھ کر چلا گیا۔ لالی دیوار سے سر نکائے مار مارا، خاموش بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ رات ہو گئی۔ مائی جتنے کھانا لے کر آئی اور لالی کے

کر اس نے جس ہوشیاری سے ریوالور نکالا تھا، اسی ہوشیاری سے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

دوسرے روز دن چڑھے درزی کرتا اور شلوار سی کر لے آیا۔ لالی نے غسل کیا۔ نیا لباس پہنا اور دوپہر کو دھیور کے ہم راہ تہ خانے کے دروازے پر پہنچا، اندر گیا، الماری سے سرنج نکالی، اس میں دوا بھری اور ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ لالی نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بات کرتا بھی تو لالی نہ بولتا۔ وہ یہی طے کر کے تہ خانے میں گیا تھا۔ ریاض بھی خاموش رہا۔ مگر جب لالی نے جھک کر اس کی کمر میں انجیکشن لگایا تو ریاض بے سرگوشی کی۔

”بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔ آج رات تجھے قتل کر دیا جائے گا۔“

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے بوڑھے ریاض کو دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ریاض نے گردن اٹھا کر زینے کی جانب دیکھا اور لالی کے چہرے کے قریب منہ لاکر بولا۔ ”بچھلی رات حیات اور دھیور یہاں آئے تھے۔ انھوں نے تیری لاش دفن کرنے کے لیے قبر کا نشان بھی ڈال دیا ہے۔ وہ دیکھ۔“ اس نے انگلی اٹھا کر ایک طرف اشارہ کیا۔ لالی نے دیکھا، آتش دان سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس فرش تازہ تازہ اکھڑا ہوا ہے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ وہ بدستور خاموش رہا۔ ریاض مدھم لہجے میں اس طرح بولنے لگا جیسے بڑبڑا رہا ہو۔

”ٹھیک بارہ بجے رات کو جنگلے کی تمام بتیاں بجھ جائیں گی۔ ہر طرف اندھیرا چھا جائے گا۔ فیر رات کے سنائے میں حیات کے الیشن کے زور زور سے بھونکنے کی خوف ناک آواز ابھرے گی۔ جب بتیاں دوبارہ جلیں گی تو ایک لاش یہاں آئے گی۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔“ میاں ریاض محمد نو ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ ”ایک لاش، دوسری لاش، تیسری لاش اور اب چوتھی لاش آنے والی ہے۔“ اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ ”ابھی تو میرے سامنے زندہ بیٹھا ہے۔ جب رات آدھی ہو جائے گی، تو خون میں لتھری لاش بن جائے گا۔ دھیور لاش اٹھائے کبڑوں کی طرح جھکا جھکا زینے سے نیچے اترے گا۔ اس کے پیچھے حیات ہو گا۔ دھیور لاش ایک طرف ڈال دے گا۔ فیر نہ تو رہے گا نہ لاش۔“ یہ کہتے کہتے بوڑھے کے چہرے پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ ٹٹھما کر زور سے ہنسا۔

لالی کا تمام جسم ستار کے تاروں کی مانند جھنجھٹا اٹھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے انجیکشن لگایا۔ اور بوڑھے ریاض کی جانب دیکھے بغیر جلدی سے اٹھا۔ مگر جب سرنج الماری میں رکھ رہا تھا تو اس

سامنے رکھ کر ہوا کے جھونکے کی مانند باہر چلی گئی۔
لالی نے کھانا نہیں کھایا۔ دھیور نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ اسٹول پر خاموش بیٹھا رہا۔ رات کا ایک پہر گزر گیا۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دھیور اپنی جگہ سے اٹھا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ لالی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ اور لمبے بھر تک آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتے رہے۔ دھیور نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا اور بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

لالی چارپائی سے نیچے اترتا، مگر دھیور اس کے پاس نہ آیا۔ اس نے جھک کر وہسکی کی بوتل اٹھائی اسے کھولا اور منہ سے لگا کر غناغٹا کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ اس نے بوتل لالی کی طرف بڑھا دی۔ لالی نے بوتل ہاتھ میں لے لی۔ وہ کچھ دیر بوتل ہاتھ میں لیے خاموش کھڑا رہا۔ پھر اس نے بھی بوتل منہ سے لگائی اور تھوڑی سی وہسکی پی کر بوتل دھیور کو واپس دے دی۔

انھوں نے کھڑے کھڑے بوتل خالی کر دی۔ دھیور دہی شراب کا ادھا بھی اٹھا لایا۔ دونوں فرش پر بیٹھ کر پینے لگے۔ ادھا بھی خالی ہو گیا۔ وہسکی اور ٹھہرے نے مل کر نشتے کو کریلا اور نیم چڑھا بتا دیا۔ لالی نے کھانا اٹھا کر دھیور کے سامنے رکھ دیا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔ کھانا کھاتے کھاتے نہ جانے کیا سوچ کر دھیور بطحی طرح قین قین کر کے ہنسنے لگا۔ لالی نے غمار آلود نظروں سے دھیور کو دیکھا اور وہ بھی ہنسنے لگا اور ہنسنے ہنسنے بولا۔

”ہنس لے پیارے! ہنس لے۔ میں نوں پتہ ہے، تو کیوں ہنس رہا ہے؟“

دھیور نے گردن اونچی کی۔ لالی کو جھپتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ لالی ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے انگلیوں میں دبا ہوا نوالہ پلیٹ میں ڈال دیا۔ اونچی آواز سے بولا۔ ”تو مجھے کتل کرنا چاہتا ہے۔ بوڑھے ریاض نے مجھے یہی بتایا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ دھیور نے اس کی بات سن کر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ نظرس نپچی کر کے کھانا کھانے لگا۔ لالی کہتا رہا۔ ”تو مجھے کیوں کتل کرنا چاہتا ہے؟ مجھے نہیں ملوم، پر تجھے یہ ضرور بتا دینا چاہتا ہوں، میں چاہتا تو کل رات تجھے کتل کر دیتا۔ میں نے تیرا پستول نکال لیا تھا۔ فیر جیسے نکالا تھا، ویسے ہی اسے رکھ بھی دیا۔ تجھے بالکل پتہ نہیں چلا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔“ دھیور نے نظرس اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

”دیکھ کیا رہا ہے؟ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ لالی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ نشتے کی جھونک میں جھوم کر بولا۔ ”پر یار! میں تجھے کیسے کتل کرتا؟ تجھ پر مجھے کدہ ہی نہیں آیا۔ جب تک کدہ نہ آئے، کوئی کسی کو کیسے کتل کر سکتا ہے۔ کبھی تو نے یہ بات سوچی؟ پر تو سوچتا ہی کب ہے؟“ لالی ہنسنے لگا۔

دھیور نے کھانا چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ ”میری بات تو سن۔“ لیکن دھیور نے اس کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

وہ کمرے سے باہر نکلا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

لالی دیر تک بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ واپس نہیں آیا۔ لالی اٹھ کر دروازے تک گیا۔ اس نے گردن باہر نکال کر دھیور کے کمرے میں دیکھا۔ دھیور وہاں بھی نہیں تھا۔ نہ جانے کہاں پلا گیا تھا۔ لالی کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ باہر گھپ اندھیرا تھا اور لالی کے ذہن میں بہت سی نیاں جل رہی تھیں۔ تجھ رہی تھیں۔ تیز نشتے کا ریلا سمندر کی سرکش موجوں کے مانند بار بار اندتا ورجھاگ بن کر بکھر جاتا۔ ایک بار زور کا ریلا آیا۔ لالی نے لڑکھڑا کر کھڑکی کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھام لیں۔ انھیں پوری قوت سے کھینچا۔ کئی بار زور آزمائی کی مگر سلاخیں نہیں ہلئیں۔ لالی ہانپنے لگا اور جھومتا ہوا بستر پر جا کر دراز ہو گیا۔ لیکن قرار نہ آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دھیور ابھی تک غائب تھا۔

وقت قطرہ قطرہ بن کر رات کے سناٹے میں تحلیل ہوتا گیا۔ لالی نے کھائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ یہ تہہ خانے میں جانے اور انجینکشن لگانے کا وقت تھا۔ لالی اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا۔ اب دھیور کو واپس آجانا چاہئے تھا۔ کئی منٹ گزر گئے، دھیور نہیں آیا۔ لالی برآمدے میں خاموش کھڑا رہا اور وہیں کھڑے کھڑے اس نے بنگلے سے فرار ہونے کا ایک بار پھر تہہ کیا۔ وہ اس راہ داری کی جانب بڑھا جس سے گزر کر وہ کچھ عرصہ قبل دھیور کے ہم راہ باغ میں پہنچا تھا۔

راہ داری میں اندھیرا تھا۔ لالی لڑکھڑاتے قدموں سے آگے بڑھتا گیا اور دیوار کا سہارا لیتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے ٹٹول کر دیکھا کہ دروازہ بند ہے۔ لالی نے دروازہ آہستہ سے ہلایا۔

دروازہ تو نہ کھلا البتہ باہر سے کسی کی کھٹکارا بھری۔ لالی سہم کر رہ گیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا واپس ہوا۔ وہ ایک بار پھر برآمدے کے سامنے کھڑا تھا۔ دھیور وہاں نہیں تھا۔

لالی برآمدے کے سامنے زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ غلام گردش کی جانب بڑھا اور اندر داخل ہو گیا۔ غلام گردش میں گہرا سناٹا تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا جس میں داخل ہو کر تہہ خانے میں جاتا تھا۔

آہستہ سے دروازہ کھولا، اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہ چپ چاپ کمرے میں چلا

گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تہ خانے کا دروازہ کھلا ہے۔ وہ کھلے دروازے کو ٹٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر جھومتا جھامتا اندر داخل ہو گیا۔ زینے سے نیچے اتر کر اس نے دیکھا، بوڑھا ریاض محمد و نو دھندلی روشنی میں فرش پر لیٹا ہے۔

لالی نے الماری سے سرخ نکالی اور انجیکشن لگانے کے لیے ریاض کے قریب پہنچ گیا۔ ریاض چت لیٹا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے چھت تک رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا، زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک کان اور رخسار کا نچلا حصہ خون سے لت پت تھا۔ فرش پر بھی خون پھیلا تھا۔ زنجیر اور اس میں لگے ہوئے لوہے کے گولے پر بھی گاڑھا گاڑھا خون تھا۔ لالی نے گھبرا کر میاں ریاض محمد کو جھنجھوڑا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا جیسے پھوٹنے والی ڈنک مار دیا۔ اسے اپنے چاروں طرف خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ سرخ دیوہ چھوڑ کر گھبرایا ہوا تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ میڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ دروازے سے گزر کر باہر آیا۔ کمرہ ابھی تک خالی تھا۔ لالی جلدی سے کمرے کا دروازہ کھول کر غلام گردش میں پہنچ گیا۔



دیوار گیرلوں کی ہلکی، ہلکی روشنی میں ہر چیز اوجھتی ہوئی نظر آتی تھی۔ غلام گردش کے آخری سرے پر ہال کا دروازہ تھا۔ دروازے کے شیشوں سے ہال کی روشنی جھلک رہی تھی۔ ہال بالکل خالی تھا۔ غلام گردش میں کئی دروازے کھلتے تھے۔ ان پر خوش رنگ پردے پڑے تھے۔ لالی نے گھڑی دیکھی، بارہ بجنے میں تین منٹ باقی تھے۔

لالی بدحواس ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ دھیور اس کی گھات میں کیس قریب ہی چھپا بیٹھا ہے۔ ذرا دیر میں بتیاں بجھ جائیں گی، اور دھیور اندھیرے میں کسی دروازے سے نکل کر اس پر تیندوے کی طرح چھپے گا۔

لالی نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ چھپنے کی کیس گنجائش نہیں تھی۔ فرار ہونے کے لیے ہال سے گزرنا ضروری تھا۔ اس نے سوچا، جب روشنیاں گل ہو جائیں گی تو وہ اندھیرے میں ہال کے اندر داخل ہو جائے گا اور بنگلے سے نکل کر چار دیواری تک پہنچ جائے گا۔ چار دیواری پھاندنا اس کے لیے دشوار نہ تھا۔ مگر اندھیرا ہونے سے پہلے ہی اسے ہال کے دروازے تک پہنچ جانا چاہئے۔

وہ آہستہ آہستہ ہال کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب، قریب، اور قریب ہوتا گیا۔

مگر جب ہال کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا تو اس نے دیکھا، حیات محمد وٹوہال میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ لالی نے دروازے کے شیشوں سے دونوں کی ہلکی سی جھلک دیکھی۔ وہ خوف سے لرز کر رہ گیا۔ جلدی سے مڑا۔ غلام گردش خاصی طویل تھی۔ وہ غلام گردش سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا تو حیات محمد اسے دوری سے دیکھ لیتا۔ اس نے گھبرا کر چاہا کہ کوئی دروازہ کھول کر اندر چلا جائے۔ اس نے ایک دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اندر سے بند تھا۔ لالی لپک کر دوسرے دروازے پر پہنچا۔ وہ بھی بند تھا۔

لالی دیوار سے لگا لگا آگے بڑھا۔ اس نے مڑ کر ہال کی جانب دیکھا۔ میاں حیات محمد وٹوہال کے قریب پہنچ چکا تھا۔ لالی نے سرا سید ہو کر ادھر ادھر دیکھا اور جو دروازہ قریب ترین پایا اس کے پردے کے پیچھے دبک گیا۔ اس نے آہستہ سے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ کھل گیا۔ لالی جھٹ اندر چلا گیا اور دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔

یہ خواب گاہ تھی۔ نہایت نفاست سے آراستہ کی گئی تھی۔ کمرے کے وسط میں چوڑی چمکی مسری تھی۔ مسری کے قریب اونچے اسٹول پر پتیل کا اجلا اجلا گل دان تھا۔ اس میں گلاب کے سفید اور گمرے سرخ پھول تھے۔ مسری سے ذرا ہٹ کر صوفہ سیٹ قریب سے رکھا تھا۔ دروازوں پر جھللاتے ہوئے ریشمی پردے تھے۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا اور ہلکی ہلکی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ کمرے میں گمرہ سبز بلب روشن تھا۔

لالی دروازے کے قریب سما ہوا کھڑا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ باہر غلام گردش میں قدموں کی آہٹ ابھر رہی تھی اور رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ دھب، دھب، دھب، آہٹ دروازے کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

لالی کا بے قرار دل دھڑکتے دھڑکتے بل بھر کے لیے ٹھہر گیا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر مسری کے نیچے دبک جائے۔ مگر فوری طور پر مسری تک پہنچنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ دروازے سے ہٹ کر ایک کونے میں دیوار سے چمٹ کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ایک عورت بھی تھی۔ وہ سفید ساڑھی باندھے ہوئے تھی۔ اس کے داخل ہوتے ہی تیز خوشبو کا جھونکا آیا۔ حیات نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی چٹنی چڑھا دی اور یہ کہتا ہوا عورت کے قریب پہنچ گیا۔ ”تامرہ تمہارے بغیر یہ کمرہ کتنا دیران، دیران لگتا ہے۔“ حیات محمد نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے سمیٹ کر اپنے قریب کر لیا۔

ناصرہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے بڑے ناز سے کہا۔ ”ایسی باتیں سوچنے کی تمہیں فرصت مل جاتی ہے؟“

”نہیں جان من! ایسی بات نہیں ہے۔ کبھی کبھی تو تم شدت سے یاد آتی ہو۔“ میاں حیات محمد نے گہری سانس بھری۔ ”جب تم آجاتی ہو تو ایسا محسوس ہوتا جیسے دیرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔“

”آج کچھ زیادہ ہی مہربان نظر آرہے ہو۔“ ناصرہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”بات کیا ہے؟“

”میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ حیات محمد دو ٹو صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بڑے پیار سے ناصرہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ بازو کے حلقے میں لے کر اس کا سراپے سینے سے لگالیا اور اس کے بال انگلیوں سے آہستہ آہستہ سلانے لگا۔ چند لمحے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔ ”کل رات بنگلے میں بڑی شاندار پارٹی ہے اور تم تو اس پارٹی میں جان محفل ہوگی۔ میں تو صرف میزبان ہوں گا۔“ ناصرہ نے اپنا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کسی قدر بیزار سے کہا۔ ”میں سمجھتی ہوں، میرا اس میں موجود ہونا ضروری نہیں۔“

”جان من! پہلے میری بات تو سن لو۔“ حیات محمد نے اسے پھر سینے سے لگایا۔ ”یہ پارٹی میں نے ایک ایم سی اے کے اعزاز میں دی ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں اس نے اپنا انگڑا گروپ بنالیا ہے۔ تم تو اسے جانتی بھی ہو۔ میرا مطلب ہے۔۔۔۔“

ناصرہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ عورتوں سے باتیں کرتے ہوئے تم نے کبھی اس کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھا ہے؟ مجھے تو اس کی صورت دیکھ کر وحشت ہوتی ہے۔“

”کاک ٹیل پارٹی ہوگی۔ تم شیریں چینی رہنا۔ میں نے سیریشن کریم اور ڈرائی فلالی پچھلے ہی دنوں منگوائی ہے۔ دونوں ہی اعلیٰ درجے کی شیریں ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”فیروزی وحشت وحشت نہیں رہے گی۔“ اس نے ہولے ہولے ناصرہ کا رخسار تھپ تھپایا۔ ”جان من! مجھے اس کے گروپ کے دو ٹوٹوں کی شدید ضرورت ہے۔“

”کسی کو مرکزی وزیر بنوانا ہو گا۔“

”بالکل ٹھیک سمجھیں تم۔“ حیات نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”اب تو تم سیاست کو پوری طرح سمجھنے لگی ہو۔“

”نہیں حیات! اپنی اس گندی سیاست میں مجھے نہ گھینوں۔“ ناصرہ نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

”تم جو چاہتے ہو اب وہ مجھ سے نہیں ہو گا۔ میں تمہاری اس سیاست سے اتنی عاجز آچکی ہوں کہ مجھے خود اپنے وجود سے نفرت ہونے لگی ہے۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ مجھ میں اور ایک۔۔۔۔“

حیات نے محبت سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”فضول باتیں نہ کرو۔“ اس کے لمبے میں جلیکھاپن تھا۔ ”تم دو تین روز میاں رہو گی اور پارٹی میں بھی شریک ہو گی۔“ اس نے قدرے تامل کیا، پھر ناصرہ کے ہونٹ چوم کر بولا۔ ”ناصرہ، میری جان! مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے اور تم اس میں میری مدد کرو گی۔ یوں سمجھ لو، وہ مرکزی وزیر بن گیا تو حکومت میں اپنی پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔ جو چاہوں گا، حکومت سے کروالوں گا۔ کیا سمجھیں؟“ اس نے قہقہہ لگایا اور ناصرہ کو اپنے سینے سے چٹالیا۔

ناصرہ اس کے پہلو میں اس طرح دکی بیٹھی تھی کہ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ حیات محمد اسے رام کرنے کے لیے سر جھکائے پوری طرح اس کی جانب متوجہ تھا۔ دونوں صوفے پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ لالی خوف زدہ نظروں سے انھیں دیکھتا رہا۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہلٹ کر دیکھتا تو ہلکی ہلکی سبز روشنی میں وہ دیوار کے ساتھ سائے کی طرح چٹنا ہوا نظر آتا۔ مگر جب ناصرہ کسماکس حیات کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کے لیے مڑی تو اس کا چہرہ لالی کی طرف تھا۔ عین اس وقت خواب گاہ کا سبز بلب بجھ گیا۔ ناصرہ کے ہونٹوں سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ پھر اندھیرے میں حیات کی آواز ابھری۔

”معلوم ہوتا ہے جنرل میں فیر کڑبڑ ہو گئی۔“

چند لمحے خاموشی رہی پھر ناصرہ کی قہر قہرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”آدھی رات کو جب اس طرح بلیک آؤٹ ہو جائے تو یہ بنگلہ کتنا خوف ناک لگتا ہے۔ ہر طرف موت کی آہٹ سنائی دیتی ہے۔“ اسی وقت باہر غلام گردش میں تیز تیز قدموں سے چلنے کی آہٹ ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ گھپ اندھیرے میں الیشین کے زور زور سے بھونکنے کی آواز بھی ابھری۔ ناصرہ نے خوف زدہ لمبے میں کہا۔ ”یہ خوف ناک آوازیں سن رہے ہو۔ یہ سب کیا ہے حیات؟ موت کا یہ کھیل کب تک چلتا رہے گا؟ آج کون۔۔۔۔۔“

حیات نے اس کی بات کاٹ کر اونچی آواز سے کہا۔ ”خواہ مخواہ کی باتیں نہ کرو۔ ذرا دیر میں روشنی ہو جائے گی۔ میں تو کل صبح تمہارے پاس آنے ہی والا تھا۔ مگر تم اتنی رات گئے اچانک کیسے آگئیں؟“

”میں موت کا کھیل دیکھنے نہیں آئی تھی۔ تمہیں یہ بتانے آئی تھی کہ نیاز کل رات کیلی فورنیا

سے واپس آگیا ہے۔

حیات کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”نیا زنیاز واپس آگیا؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کیسے واپس آ سکتا ہے؟“

”میں تم سے غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔“

”کہاں ہے وہ؟ یہاں کیوں نہیں آیا؟“

لالی دیوار کا سہارا لیتا ہوا دھیرے دھیرے دروازے کی جانب کھٹکنے لگا۔ اس نے سنا، ناصرو کہہ رہی تھی۔ ”نیا زنیاز اپنے ماماں کے پاس ٹھہرا ہے۔“ وہ کچھ رکی۔ اس نے رسان سے بتایا۔ ”وہ تمہارے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری کر رہا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے سب کچھ معلوم ہو گیا؟“

”نہیں! وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ صرف جائیداد اور زمینداری پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اپنے پیڑ کی جاگیر کا وارث ہو ا۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ مقدمے کی تیاری کر رہا ہے؟“

”آج شام وہ میرے پاس آیا تھا۔“

حیات غصے سے چیخا۔ ”وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟“

”میرا خیال ہے اس کے ساتھ کوئی سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔ اس کی باتوں سے ایسا ہی لگتا تھا۔“

”نہیں! ایسا بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ جاگیر نہ اس کی ہے نہ اس کے پیڑ کی۔ اور نہ وہ کسی طور اس کا وارث ہے۔“ حیات تیز لہجے میں بول رہا تھا۔ ”میں اسے جاگیر پر قبضہ کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ وہ سمجھتا کیا ہے؟ میں اس کی لاش بھی یہیں تہ خانے میں لا کر دبا دوں گا۔“

”حیات! ناصرو کے لہجے میں التجا تھی۔ ”یہ خطرناک کھیل اب ختم ہو جانا چاہئے۔“

”نیکو اس نہ کرو۔“ حیات تملاکر بولا۔ ”مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، تمہی نے اسے بلایا ہے۔“ وہ لہجے بھر کے لیے رکا۔ ”تم نے اسے سب کچھ بتا دیا۔“

”پاگل نہ بنو۔“ ناصرو نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تمہیں میرے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔ میں تمہاری بیوی ہوں، تمہاری بیٹی موتا کی ماں ہوں۔ تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا چاہئے۔“

”میں کسی پر اعتماد شیداد نہیں کرتا۔ مجھے معلوم ہے، تم یہاں کس لیے آئی ہو۔ تم میرے خلاف اس سازش میں برابر کی شریک ہو۔“

لالی کھٹکتا ہوا اب دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے سنا۔ حیات اندھیرے میں بیچ رہا تھا۔ ”میں یہ سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہ اسے زندہ چھوڑوں گا نہ تجھے۔“

اندھیرے میں کسی چیز کے زور سے ٹکرانے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی ناصرو کی تیز کراہ سنائی دی۔ ”ہائے۔“ چند لمبے خاموشی رہی پھر صوفے پر گتھم گتھا ہونے کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی نے آنکھیں پھاڑ کر اس طرف دیکھا۔ گھپ اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ لالی دروازہ کھولنے کے لیے انگلیوں سے جتنی ٹٹولنے لگا۔ یکایک اسے عقب میں ناصرو کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ وہ گڑگڑا رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔ خدا کے لیے نہیں۔“

لالی نے ایک بار پھر گردن موڑ کر ادھر نظر ڈالی۔ اسی وقت کمرے کا سبز بلب روشن ہو گیا۔ لالی نے دیکھا، ناصرو کا سر صوفے کی پشت سے نکلا ہے۔ حیات دونوں ہاتھوں سے اس کی گردن دبوچے ہوئے تھا۔ ناصرو کے بال بکھر کر اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔

”وہ وہ۔“

حیات نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ناصرو کی گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”تو ابھی تک زندہ ہے۔“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑا رہا۔ حیات نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”تو یہاں آ کیسے گیا؟“

”میں یہ بتانے آیا تھا، آپ کا بھائی میاں ریاض محمد مرگیا۔“

حیات بوکھلا گیا۔ ”نہیں، وہ نہیں مر سکتا۔ وہ کیسے مر سکتا ہے۔ تو جھوٹ بول رہا ہے۔“

لالی نے نہایت اعتداس سے کہا۔ ”میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

حیات سخت بدحواس ہو رہا تھا۔ ”مگر وہ کیسے مر گیا؟“ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگا۔ ”اس نے وصیت نامے کی دستاویز پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے اپنا وارث نہیں بتایا۔ اسے ابھی نہیں مرنا چاہئے۔“ وہ بے قرار ہو کر بولا۔ ”اسے کس نے مار ڈالا؟ اسے تو نے قتل کیا ہے۔“

”میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔“

”غیر اسے کون قتل کر سکتا ہے۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”دھیرو؟ ہاں دھیرو ہی ہو سکتا ہے۔“ وہ ہولے ہولے اپنی گردن ہلانے لگا۔ ”دھیرو نے آج اپنا بدلہ لے ہی لیا۔“ پھر وہ غصے سے پاگلوں کی

”طرح پیچھے لگا۔ ”مگر اس کتے کو ایسی جرات کیسے ہوئی؟ کہاں ہے دھیور؟ کہاں ہے وہ؟“
”مجھے نہیں پتہ۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔ تجھے ضرور پتہ ہو گا۔“

”میاں ساب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نوں تو یہ پتہ ہے، جب بارہ بجے سب بتیاں بجھ گئی تھیں، اس وقت آپ کا خونی کتا مجھے چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ میری لاش ترہ خانے میں زمین کھود کر بدادی جاتی۔“

حیات نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا اور سر تھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی بیوی ناصرہ صوفے پر خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر پیچھے کر لیے تھے۔ اس کا حسین چہرہ اجلی چاندنی کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں خوف تھا۔ وہ اپنی لمبی گردن دابنے ہاتھ کی انگلیوں سے بار بار سلارہی تھی۔ کمرے کی فضا پر گہرا سکوت طاری تھا۔ لالی نے سکوت توڑا۔ عاجزی سے بولا۔ ”ساب، میں جسے انجکشن لگاتا تھا، وہ تو مر ہی گیا۔ ساتھ ہی میری ڈیوٹی بھی ختم ہو گئی۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”اب مجھے بھی چھٹی دے دیجئے۔ آپ کی مہربانی ہوگی جی۔“

”نہیں، تو ابھی نہیں جاسکتا۔ یہاں سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔“

لالی نشے کی ترنگ میں تھا۔ جل کر بولا۔ ”گرفتار کر لیا جاؤں گا تو کیا ہو گا۔ جیل ہی تو چلا جاؤں گا۔ گولی تو نہیں ماری جائے گی۔“

”تو یہاں کے کئی راز جانتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تو پکڑا جائے اور میرے خلاف قانون کے ہاتھ مضبوط کرے۔“

”ساب، کون سا کون، کیسا کون؟“ اب وہ خوف اور دہشت کا خول توڑ کر رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ ”کون تو میرے جیسے چھوٹے آدمی کے لیے ہے۔ میں تین بار جیل کاٹ چکا ہوں۔ میں نے تو کسی وڈے آدمی کو اپنی طرح جیل کاٹنے نہیں دیکھا، نہ پھانسی پر چڑھتے دیکھا۔“ لالی کھل کر مسکرانے لگا۔ ”میاں جی، آپ وڈے آدمی ہیں۔ آپ کون کون سے کیوں ڈرتے ہیں؟ آپ کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ اس نے قسم کھا کر حیات کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”رب سونہ، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو یہاں سے سیدھا راجھے کے پاس جاؤں گا۔ اس کے ساتھ آج ہی رات، بہت دور نکل جاؤں گا۔ آپ میری بات مان لیں۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

ناصرہ، جواب تک خاموش بیٹھی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی، لالی کی حمایت میں بولی۔ ”اے جانے دو حیات۔“

”تاکہ میرے خلاف تمہارے ہاتھ چشم دید گواہ آجائے۔“ میاں حیات محمد نے قرآلود نظروں سے ناصرہ کو دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں، تم اس کی سفارش کیوں کر رہی ہو؟“

”تم میرے بارے میں اتنی بدگمانی میں مبتلا کیوں ہو؟“

”یہ بدگمانی خود تم نے پیدا کی ہے۔ نیاز کیوں واپس آگیا؟ وہ کیوں تمہارے پاس گیا؟ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

حیات محمد نے اونچی آواز سے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے، وہ کیوں واپس آیا اور کیوں تمہارے پاس پہنچا؟“ وہ اپنی مونچھوں کی نوکیں انگلیوں سے مروڑنے لگا۔ ”میرے علاوہ صرف تین بندے ہیں جو ریاض کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ مگر وہ بنگلے سے باہر نہیں جاسکتے۔ تم اور صرف تم ہو جو بنگلے سے باہر بھی رہتی ہو۔ یہ راز صرف تمہارے ذریعے نیاز تک پہنچا۔ مجھے یقین ہے، تمہی نے اسے نیاز تک پہنچایا ہے۔“

”افوا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ سراسر وہم ہے۔“ ناصرہ نے زچ ہو کر کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ حیات اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”دو ہفتے پہلے فون پر نیاز سے میری بات ہوئی تھی۔ اس کا امریکہ سے یہاں آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ اسی روز کی بات ہے جس روز تم مجھ سے لڑ بھگڑ کر روتی ہوئی یہاں سے گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے، اس روز تم نے خود کشی کر لینے کی دھمکی بھی دی تھی۔“ اس نے ناصرہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

”اس روز تم غصے سے پاگل ہو رہی تھیں۔ تم نے یہاں سے جاتے ہی غصے کی حالت میں نیاز کو خط لکھا اور اسے ساری باتیں بتا دیں۔“

”تم، تم پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ جل کر بولی۔ ”ریاض کے جسم میں پاگل آدمی کے جراثیم، انجیکشن کے ذریعے داخل کرتے کرتے خود بھی پاگل ہو گئے ہو۔“

حیات کی آنکھیں بھڑکتا شعلہ بن گئیں۔ وہ سانپ کی طرح پھنکارنے لگا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ ٹنگلی باندھے بیوی کو گھورتا رہا، پھر تیزی سے جھپٹا اور اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے لگی۔ لالی ذرا دیر تک یہ لرزہ خیز منظر دیکھتا رہا۔ اس نے

حیات کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”میاں ساب! یہ کیا کر رہے ہیں؟“

حیات محمد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ڈپٹ کر کہا۔ ”بکو اس نہ کر۔“ اس نے بیوی کو نیچے گرا دیا اور دونوں ہاتھوں کی پوری قوت سے اس کا گلا دبانے لگا۔ ساتھ ہی وہ غصے سے بڑبڑاتا رہا۔ ”میں یہ ثبوت بھی مٹا دوں گا۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

لالی لپک کر دونوں کے قریب پہنچ گیا۔ ناصرو صونے پر بے بس پڑی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ حیات کی گرفت سخت ہوتی جا رہی تھی۔ ناصرو آنکھیں پھاڑے بے بسی سے لالی کو دیکھ رہی تھی۔ لالی بے قرار ہو گیا۔ اس نے حیات کا کندھا پکڑ کر کھینچا اور گڑبڑا کر بولا۔

”ساب جی! اب چھوڑ دیجئے۔“

حیات نے پلٹ کر لالی کو دیکھا، غصے سے اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ”ہٹ جا میرے سامنے سے۔“ اس نے لالی کو دھکا دیا۔ لالی لڑکھڑا کر گرا۔ اس نے اٹھنا چاہا تو حیات نے اور بھی زیادہ زور سے دھکا دیا۔ اس دفعہ وہ لڑھکتا ہوا میز سے جاکر نکل آیا۔ میز الٹ گئی اور لالی کے سر پر گری۔ چوٹ ایسی سخت آئی کہ وہ چکر اکر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ نظریں دھندلی پڑ گئیں۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ رک رک کر سانس بھرنے لگا۔

ناصرہ نے اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر حیات نے جھپٹ کر اس کی ساڑھی کا پلو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ ساڑھی کھل کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے غصے سے ساڑھی ایک طرف پھینک دی۔ ناصرو کے منہ پر تابڑ توڑ کئی تھپڑ مارے۔ پیٹ پر اس زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ ڈگمگا کر صونے پر گر پڑی۔ حیات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ جھپٹ کر ایک بار پھر اس کی گردن دبوچ لی۔ ناصرو گلا پھاڑ کر چیئی۔

”نہیں، نہیں۔“

لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ میاں حیات محمد خاں صونے پر جھکا ہوا تھا۔ ناصرو کی دونوں ٹانگیں بالکل برہنہ تھیں اور خزاں رسیدہ درخت کی شاخوں کے مانند جھول رہی تھیں۔ لالی ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حیات کی جانب بڑھا۔ حیات نے چاپ سنی۔ پلٹ کے دیکھا اور زور سے چیخا۔

”ہٹ جا میاں سے کجرا!“

لالی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ نہیں ہوگا۔“ حیات نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ لالی نرم پڑ گیا۔ گڑبڑا کر لگا۔ ”ساب! تم نے اس کے کپڑے اتار دیئے۔ وہ تمہاری گھروالی ہے، تمہاری عزت ہے۔“ حیات اور غضب ناک ہو گیا۔ اس نے جھنجھلا کر لالی کے منہ پر تھپڑ مارنا چاہا۔ لیکن لالی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

حیات نے جھنک دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیزی سے مسری کی جانب لپکا۔

ناصرہ نے ہانپتے ہوئے نحیف آواز میں لالی سے کہا۔ ”وہ وہ پستول لینے گیا ہے۔“

لالی نے دیکھا کہ حیات مسری کے تکیے کی جانب جھک رہا ہے۔ لالی تیزی سے اس پر جھپٹا اور اس زور سے دھکا دیا کہ حیات چاروں خانے چت بستر پر گر گیا۔ وہ دانت پیتا ہوا اٹھا، چیخ کر بولا۔

”کتے! نمک حرام! اتیری یہ ہمت۔“ اس نے لالی کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔

لالی کا ایک کان جھن جھن کے مانند جھن جھن کرنے لگا۔ وہ تکلیف سے تمللا اٹھا۔ نشے کا ایسا زبردست جھوٹا آیا کہ وہ حیات کے نشتے اور طعرات کے حصار سے باہر نکل آیا۔ اس نے خوں خوار نظروں سے حیات کو دیکھا اور دونوں ہاتھ بڑھا کر جھومتا ہوا اس کی جانب بڑھا۔

حیات محمد نے رعب اور دبدبے کے ساتھ اسے ڈانٹا۔ ”آگے نہ بڑھ۔“

مگر لالی نہیں رکا۔ نشے کے غلبے نے اونچ نیچ کے تمام بندھن توڑ دیئے تھے۔ اس کا اٹھنا ہوا سیلاب خوف و دہشت کے سارے پشتے اور رکاوٹیں اپنے ساتھ بھا کر لے گیا۔ حیات نے جلدی سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔

لالی نے اچھل کر اس کی کمر پر لات ماری۔ میاں حیات پھر بستر پر لڑھک گیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی۔ مگر لالی نے جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ حیات غمیں غمیں کرنے لگا۔ اس نے گرفت سے نکلنے کے لیے لالی کا منہ نوچ لیا۔ لیکن لالی نے اسے نہیں چھوڑا۔ گریبان پکڑ کر اٹھایا اور ڈھکیٹا ہوا دیوار تک لے گیا۔

حیات گھٹی ہوئی آواز سے چیخا۔ ”دھیرو!“

لالی نے دیوار سے اڑا کر اس کا سر زور سے دیوار کے ساتھ ٹکرایا۔ آگے کھینچا، پھر ٹکرایا۔ کھٹ، کھٹ، کھٹ۔ لالی نشے کی جھوٹ میں پاگوں کی طرح اس کے سر کو جھٹکے دے دے کر دیوار سے ٹکراتا رہا۔

لالی کا چہرہ کھٹ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔ میاں حیات محمد خاں وٹو کے سر

دھار نکلی اور پیشانی سے ٹپکتی ہوئی چہرے پر پھیلتی گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

گردن لٹک کر ڈمگانے لگی۔



ناصرہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ساڑھی اٹھائی۔ اسے باندھا۔ جلدی، جلدی اپنا بے ترتیب لباس درست کیا۔ حیات محمد کی جانب بڑھی۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔ ناصرہ نے جھک کر دیکھا۔ حیات کا چہرہ خون سے تر ہوا تھا۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ رک، رک کر سانس لے رہا تھا۔ ناصرہ نے پریشان ہو کر لالی کی جانب دیکھا۔ لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

”یہ کیا کر دیا؟“

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ وہ مرا نہیں ہے۔“

دونوں خاموش کھڑے رہے۔ مگر لالی اب وہاں مزید ٹھہرنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھا، جو غلام گردش میں کھلتا تھا۔

”کہاں جا رہا ہے؟“ ناصرہ نے پوچھا۔

”باہر“ لالی نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا۔ ”مجھے اب یہاں سے نکل جانا چاہیے۔“

”ٹھہر جا۔“

”تم ٹھہر جاؤ۔“ لالی دروازے کے قریب پہنچ گیا۔ ”یہاں رک کر تم اپنے کھیم کی مرہم پٹی کرو تاکہ وہ تمہیں اطمینان سے کتل کر سکے۔ میں نہیں ٹھہر سکتا۔“

”سماعت نہ کر۔ باہر حیات کے بہت سے کتے پھر رہے ہیں۔ وہ تجھے جنگلے سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔“ وہ سختی سے بولی۔

”تمہارا مطلب شکاری کتوں سے ہے؟“ لالی رک گیا۔ اور مرکز ناصرہ کی جانب دیکھنے لگا۔

”نہیں، میں اس کے خونخوار کردندوں کی بات کر رہی ہوں۔ انھیں پتہ چل گیا تو تجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”میں بھی یہاں نہیں ٹھہروں گی۔“ ناصرہ نے اپنے بکھرے ہوئے بال ایک بار پھر سنوارے، ساڑھی کی شکلیں اور سلوٹیں درست کیں۔ دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر آہستہ سے دروازے کی چٹختی کھولی۔ گردن بڑھا کر باہر دیکھا۔ رسان سے بولی۔

”باہر کوئی نہیں ہے۔“

لالی نے پلٹ کر میاں حیات محمد کو دیکھا۔ وہ ٹانگیں پھیلائے مروے کی طرح دیوار کے پاس بے حال پڑا تھا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ پہلے ناصرہ باہر نکلی۔ اس کے پیچھے لالی باہر آئی۔

ناصرہ بال کے دروازے کی جانب نہ گئی۔ اس کمرے کی جانب بڑھی، جس میں تہہ خانہ تھا۔ لالی نے ناصرہ کو ادھر جاتے دیکھا تو سرگوشی کی۔

”اس کمرے میں نہ جاؤ۔“

ناصرہ نے دھیرے سے بتایا۔ ”اس کمرے کا ایک دروازہ باغیچے میں کھلتا ہے۔ یہ سب سے محفوظ راستہ ہے۔“ وہ آگے بڑھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچی۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا۔ مگر دروازہ اندر سے بند تھا۔

ناصرہ نے اسے کھولنے کے لیے آہستہ آہستہ ہلایا تو اندر سے الیشن کے غرانے اور زور زور سے بھونکنے کی آواز ابھری۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس کی خوفناک آواز سن کر دونوں سسم گئے اور جہاں تھے وہیں دم بخود کھڑے رہے۔

غلام گردش میں پراسرار سناٹا تھا۔ دونوں خاموش کھڑے رہے، ناصرہ مڑی۔ وہ اس دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی جو بال میں کھلتا تھا۔ لالی اس کے پیچھے، پیچھے چلا۔ ناصرہ کشیدہ قامت خوبصورت عورت تھی۔ وہ سفید ساڑھی میں ملبوس راج ہنس کی طرح گردن اونچی کئے چل رہی تھی۔ اس کی چال میں وقار تھا، تحملت تھی۔ لالی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دونوں دروازے سے گزر کر بال میں آگئے۔

بال میں دھیمی دھیمی روشنی تھی۔ صرف ایک بلب روشن تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ مگر جب بال عبور کر کے باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا، دروازے پر مسلح پیریدار کھڑا ہے۔ ناصرہ کو دیکھ کر وہ ادب سے جھک گیا۔ ناصرہ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ گردن اٹھائے آہستہ آہستہ پھانک کی سمت بڑھنے لگی۔

لالی اس کے پیچھے، پیچھے چلتا رہا۔ پھانک کے قریب درختوں کے نیچے ایک سیاہ سیڑیاں کھڑی تھی۔ ناصرہ نے آہستہ سے آواز دی۔ ”چوکیدار۔“ اس کی آواز سننے ہی پھانک پر کھڑا ہوا چوکیدار اپنا بندوق سنبھالے دوڑتا ہوا قریب آیا۔ ناصرہ نے پوچھا۔

”میرا ڈرائیور کہاں ہے؟“

”وہ توجی سو گیا۔ وہ تو شاید ہی گاڑی چلا سکے۔“

ناصرہ نے تکیے لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں؟ کیا ہو گیا اسے؟“

اس نے ہچکچاتی ہوئے کہا۔ ”ڈرائیور نے توجی نشہ و شکر رکھا ہے۔“

”ا۔۔۔۔۔۔“ ناصرہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ چوکیدار کو مخاطب کیا۔ ”تم جاکر جلدی سے اس

کی جیب سے گاڑی کی چابی نکال کر لاؤ۔ میں خود راہیور کروں گی۔“

چوکیدار تیز قدم اٹھاتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ناصرہ اور لالی خوف زدہ نظروں سے بال کی جانب دیکھنے لگے۔ دروازے پر مسلح پیریدار مستعدی سے کھڑا تھا۔ بال خالی تھا۔ یکایک باغ کی جانب سے کتوں کے بھونکنے کی آواز آئی۔ دونوں گھبرا گئے۔ چوکیدار ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں بے چین ہو کر بار بار اس سمت دیکھتے جدھر چوکیدار گیا تھا۔ کتوں کی آواز کے ساتھ ساتھ قدموں کی آہٹ بھی ابھری۔ لالی نے جھک کر سرگوشی کی۔

”کوئی آ رہا ہے؟“

”ہاں۔“ ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”مگر وہ حیات نہیں ہو سکتا۔ اسے اب تک ہوش نہیں آیا ہو گا۔“ اس نے بال کی جانب دیکھا۔ ”حیات آئے گا تو بال ہی کے دروازے سے آئے گا۔“

خلک چٹوں پر آہٹ بڑھتی گئی۔ لالی نے ناصرہ کی طرف جھک کر کہا۔ ”میں دیوار پھاند کر باہر نکل جاؤں گا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑا۔

ناصرہ نے اسے حیرت سے دیکھا اور رسان سے کہا۔ ”ٹھیر جا۔“

آہٹ اور قریب آگئی۔ لالی سہا ہوا کھڑا رہا۔ مگر آہٹ کچھ فاصلے پر بند ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اس طرف آتے آتے یکایک ٹھک کر رہ گیا ہے اور ان کے قریب ہی درختوں تلے اندھیرے میں کھڑا ہے۔ دونوں کی بے چینی بڑھ گئی۔ مگر نہ چاپ سنا دی، نہ کوئی ان کے پاس آیا۔ چوکیدار اینٹوں کے پختہ فرش پر تیز تیز چلتا ہوا اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ اس نے قریب آکر کار کی کنجی ناصرہ کو دیتے ہوئے کہا۔ ”ڈریور تو جی ایسا پڑا ہے کہ اسے بالکل ہوش نہیں میں نے بہت مشکل سے چابی تلاش کر کے اس کی جیب سے نکالی۔“

”گیٹ کھول دو۔“

چوکیدار نے لالی کی طرف دیکھا۔ ”کیا اس نے بھی باہر جانا ہے؟“

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے جی! بنگلے کا کوئی بندہ میاں ساب کے حکم کے بغیر رات کو باہر نہیں جاسکتا۔“

چوکیدار نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تو جی ہرگز نہیں جاسکتا۔“

ناصرہ نے کار کا دروازہ کھولا اور تیوری چڑھا کر کہا۔ ”نہیں، یہ میرے ساتھ ہی جائے گا۔“

چوکیدار عاجزی سے بولا۔ ”میاں ساب کو تو آپ جانتی ہی ہیں جی۔ آپ سے تو وہ کچھ نہیں

کس گئے، میں غریب اس دیں مارا جاؤں گا۔ میری تو وہ چڑی ادھیڑ ڈالیں گے۔“ اس نے مڑ کر بال کے دروازے کی جانب دیکھا۔

ناصرہ نے پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نوں جیتی نال جانا ہے۔ میاں صاحب کی طبیعت خراب ہے۔ ٹیلی فون میں بھی گڑبڑ ہے۔ میں نوں خود جاکر ڈاکٹر کو لانا ہے۔“

”ایسی گل بات ہے جی تو میں ساب کے ڈریور کو بولتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر کو لے آئے گا۔“

”فضول بحث نہ کر۔ جو میں کہتی ہوں وہ کر۔“ ناصرہ نے چوکیدار کو تکیھی نظروں سے دیکھا اور ڈپٹ کر حکم دیا۔ ”جا، جاکر گیٹ کھول۔“

چوکیدار چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر آہستہ آہستہ گیٹ کی جانب بڑھا۔ ناصرہ فوراً اسٹرنگ وھیل سنبھال کر بیٹھ گئی۔ اس نے سیڈان کا پچھلا دروازہ کھولا۔ کچھ سوچ کر لالی سے مخاطب ہوئی۔ ”نہیں، تم آگلی ہی سیٹ پر میرے برابر بیٹھ جاؤ۔“ لالی کار کے اندر جاکر بیٹھ گیا۔

ناصرہ نے کار اشارت کی۔ کار کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ لالی نے ان کی تیز روشنی میں دیکھا بائیں ہاتھ پر ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی اندھیرے میں دکھا کھڑا ہے۔ اس کے پیروں کا نچلا حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ نئی گامے شاہی جوتی پہنے ہوئے تھا اور اس کی اچلی دھوتی کا نچلا کنارہ گہرا سرخ تھا۔ لالی کو محسوس ہوا کہ وہ دھیور ہے۔ کار تیزی سے آگے بڑھی اور پھانک سے گزر کر باہر آگئی۔ لالی چپ بیٹھا دھیور کے بارے میں سوچتا رہا۔

اسے گم سم دیکھ کر ناصرہ نے دریافت کیا۔ ”کیا سوچ رہا ہے؟“

”میں نوں ایسا لگتا ہے جی، دھیور ہمارے نزدیک ہی درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔“

”دھیور!“ ناصرہ نے حیرت سے کہا۔ ”نہیں، وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ بہت سنگدل اور خونخوار ہے، تجھے ہرگز گیٹ سے باہر آنے نہ دیتا۔“

”یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ سیاہ سیڈان دھول اڑاتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ لالی بھی چپ بیٹھا تھا۔ کچھ دور جاکر نہر آگئی۔ سیڈان نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی۔ یہ راستہ بھی کچا تھا مگر کشادہ تھا۔ زمین بھی قدرے نرم تھی۔ اب زیادہ دھول نہیں اڑ رہی تھی۔ ایک طرف نہر تھی، دوسری طرف گندم اور جو کی فصلیں لہلہا رہی تھیں۔ چاند چڑھ کر آسمان کے بچوں بچ گیا تھا۔ ہر طرف اچلی اچلی چاندنی بکھری تھی۔ لگ بھگ چار میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سیڈان بائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک نیم پختہ سڑک پر آگئی۔

لالی نے منہ باہر نکال کر پیچھے دیکھا اور دبی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”اگر میاں سب کو ہوش آگیا اور انھوں نے ہمارا پیچھا کیا تو کیا ہو گا؟“

”موت۔“ ناصروہ نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ ہم دونوں کو قتل کر دے گا۔ اس کے لیے قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے بچے کے لیے کھلونا توڑنا۔“

ناصرہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ کار ہچکولے کھانے لگی۔ اس نے رفتار سست کر دی اور گھبرائے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”پچھلے پسے میں پکچر ہو گیا۔“ اس نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر دی۔

دونوں کار سے اتر کر باہر آ گئے۔ سڑک کے دونوں طرف ویران اور بنجر کڑ تھا۔ البتہ کچھ دور آگے سڑک کے دائیں طرف درختوں کا گھٹا جھنڈ تھا۔ رات چپ چاپ کھڑی تھی۔ ہوا میں شوریدہ سری تھی۔ تیز جھونکوں سے ناصروہ کے بال بکھر گئے تھے۔ ساڑھی کا آئٹل بار بار ڈھلک جاتا۔ وہ اپنے بال درست کرتی، ساڑھی سنبھالتی کار کے پچھلے حصے کی جانب گئی۔ اس نے کار کی ڈکی جلدی سے کھولی۔ لالی سے پوچھا۔

”تین نوں پسید لانا آتا ہے؟“

”میں نے تو جی کہی یہ کام نہیں کیا۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔

”کوئی گل نہیں۔ جیسا میں کموں ویسے کرنا۔ یہ ایسا مشکل کام نہیں۔“ ناصروہ نے اسٹپنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ پسید باہر نکال اور کوئے میں رکھا ہوا جیک اور ٹول باکس بھی نکال لے۔“

لالی اسٹپنی اٹھانے لگا۔ اسی وقت عقب میں تیز روشنی ابھری۔ ناصروہ نے روشنی دیکھی۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ وہ بدحواس ہو کر بولی۔

”وہ آ رہا ہے، وہ آ رہا ہے۔“

لالی نے مڑ کر روشنی دیکھی۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے جلدی سے اسٹپنی نکالنے کی کوشش کی۔ ناصروہ نے اسے روک دیا۔ ”بچے ہوئے لمبے میں بولی۔“ اسٹپنی باہر نہ نکال۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ لالی خاموش کھڑا رہا۔

ناصرہ نے ایک بار پھر روشنی کی سمت دیکھا اور ڈکی کے ڈھکنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے لالی سے کہا۔ ”بھاگ سکتا ہے تو بھاگ جا۔“ اس نے ڈکی بند کر دی۔

”نہیں جی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟“

”نہیں، میں میاں سے نہیں جاؤں گی۔ مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ ورنہ تو بھی میرے ساتھ مارا جائے گا۔“ ناصروہ نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ ”مگر وہ مجھے قتل نہیں کر سکے گا۔ میں اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔“ وہ آگے کے دروازے کی جانب بڑھی۔

لالی نے گھبرا کر کہا۔ ”کہاں جا رہی ہو؟“

وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ ”میں خود کشی کر لوں گی۔ خود کو گولی مار لوں گی مگر اس کے ہاتھوں نہیں مروں گی۔ میرے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔“

لالی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ناصروہ دروازے کے اندر جھک کر ڈیش بورڈ کے خانے کا ڈھکنا کھولنے لگی۔ لالی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”میری گل تو سنو۔“

ناصرہ نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ گھبرائے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”جلدی سے بھاگ جا۔ تو کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ زور سے چیخی۔ ”جا میاں سے۔“ اس کے بال بکھر کے چہرے پر آ گئے تھے۔ آنکھیں تیزی سے چمک رہی تھیں۔

”تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے، فیر پروانہ کرو۔“

”تو کچھ نہیں کر سکتا۔ وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ اپنے خوں خوار کرندوں کے ساتھ ہو گا۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے جی۔“ لالی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”کیا گڈی آگے نہیں جا سکتی؟“ ”جا تو سکتی ہے، مگر اس سے کیا ہو گا؟“

”گڈی سامنے درختوں کے نیچے لے چلو۔ سڑک سے اتار کر کپے میں ڈال دینا۔“ اس نے دور تک پھیلے ہوئے بنجر میدان پر نظر ڈالی۔ ”یہاں تو چھپنے کی بھی کوئی جگہ نہیں۔“

دیکھتے دیکھتے روشنی بہت قریب آ گئی۔ سڑک پر کسی گاڑی کے تیزی سے دوڑنے کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ ناصروہ نے اس کی طرف دیکھا اور بدحواس ہو کر بولی۔ ”لو، وہ آگیا۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”فکر نہ کرو۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لاؤ پستول مجھے دو، بھیتی نال۔“

ناصرہ نے ڈیش بورڈ کے خانے سے پستول نکال کر لالی کو دیا۔ پستول لے کر لالی بولا۔ ”تم یہیں گڈی کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

ناصرہ ہزاری سے بولی۔ ”یہ تو کیا کر رہا ہے؟ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”زبان بند رکھو۔ جیسا کہتا ہوں، وہ کرو۔“

۔۔۔ ان کے پچھلے حصے کی جانب بڑھا اور گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ روشنی اور قریب آ گئی۔ اتنی

قریب کے لالی نے یہ بھی دیکھ لیا کہ آنے والی سفید رنگ کی کار ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا، کار کی رفتار سست پڑی، بریک لگانے کی آواز ابھری۔ کار کچھ فاصلے پر رک گئی۔ لالی نے نشانہ باندھا اور چوکس ہو کر سامنے دیکھنے لگا۔

ذرا دیر بعد کار کا دروازہ کھلا۔ ایک شخص نکل کر باہر آیا۔ مگر وہ حیات محمد نہیں تھا۔ میانہ قد و قامت کا نوجوان تھا۔ وہ پتلون اور بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ لالی اندھیرے میں اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ اس کے نیچے اترتے ہی ایک اور شخص بھی دروازہ کھول کر باہر آیا۔ دونوں سیڈان کی جانب آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ وہ کچھ فاصلے پر رک گئے۔ ایک نے تبصرہ کیا۔ ”کیسی ڈنٹ تو نہیں لگتا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکا اور اونچی آواز سے بولا۔ ”کوئی ہے یہاں؟“ لالی اس کی آواز سن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ پیچھے کر لیے۔ دونوں سیڈان کے قریب آگئے۔ بش شرٹ والے نوجوان نے پوچھا۔

”کیا ہو گیا جی؟“

لالی نے جواب دیا۔ ”پتھر ہو گیا ہے۔“

ناصرہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنے کھڑے ہوئے بال درست کر رہی تھی۔ نوجوان نے اسے دیکھ کر حیرت سے کہا۔ ”ارے آپ! آپ تو میاں حیات محمد نو کی بیگم ہیں نا؟“

ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں جی۔“

نوجوان مسکرا کر بولا۔ ”میرا نام چوہدری ولی داواں بھٹی ہے۔ اوہراپنی بھی زمیں داری ہے۔“ اس نے توقف کیا۔ ”میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“

ناصرہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ”شکریہ! میرا ڈرائیور اسٹپنی لگا دے گا۔“

بھٹی نے کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی۔“

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں واپس چلے گئے۔ اپنی کار میں جا کر بیٹھے۔ اسے اشارت کیا ذرا دیر میں ان کی کار سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ جب کار دور چلی گئی اور اس کی پچھلی سرخ بتیاں دھندلی پڑ گئیں تو ناصرہ نے ایک بار پھر ڈکی کھولی۔ لالی نے اسٹپنی اور ٹول بکس نکالا۔ ناصرہ کی ہدایت کے مطابق لالی نے جیک لگا کر کار کا پچھلا حصہ اونچا کیا۔ دھیل کیپ اتار کر ٹ بولٹ کھولے اور پسپا نکال کر اسٹپنی لگا دی۔ ناصرہ اس کے قریب بیٹھی ضروری ہدایات دے رہی تھی اور اس کی مدد بھی کر رہی تھی۔

لالی نے پسپا اور ٹول بکس ڈکی میں رکھ دیئے اور اسے بند کر دیا۔ دونوں پھر کار میں بیٹھ گئے۔ لالی

نے پستول ناصرہ کو واپس دے دیا۔ ناصرہ نے پستول ڈیش بورڈ کے خانے میں بند کیا۔ کار اشارت کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوئی۔

”جانتا ہے میں نے کیا سوچا تھا؟ اگر حیات آجاتا تو تجھے کتنی مجھ پر گولی چلا دے۔“

”نہیں جی! میں ایسا کام نہیں کرتا۔ میں کسی زنانی کا خون کرنے کے بارے میں تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ کام تو میاں حیات محمد کر سکتا ہے۔ وہ تو جی بہت ہی ظالم ہے۔ اس نے تو جی تمہیں مار ہی ڈالا تھا۔ ایسا گلا دوچا تھا، چھوڑتا ہی نہ تھا۔“ لالی یہ کہتے ہوئے نشتے سے جھوم کر مسکرانے لگا۔ ”برانہ مٹاتا۔ تیس صرف بیگم ہو۔ تاش کی بیگم۔ اس کی مونچھیں ہی نوج لیتیں، کاٹ کھاتیں، منہ پر تھوک دیتیں۔ کچھ تو کرتیں۔ نہ ہوئی شاداں، میاں حیات اس کا گلا دبا تو وہ اس کی گردن چھری سے کاٹ کر سرا لگ کر دیتی۔“

”کون ہے وہ؟“

”ہے کوئی۔ پر وہ بہت زور آور ہے جی!“

”تیری گھر والی ہے۔“

”اپنی کوئی گھر والی شروالی نہیں۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”اپنے سے بھلا کون کڑی دیاہ کر سکتی ہے۔“

”کیا یہ سچ ہے تو تین بار جیل کاٹ چکا ہے؟“

”ہاں جی۔“ لالی انکار نہ کر سکا۔ ”اور چوتھی بار جیل میں بند کرنے کے لیے پولیس میری تلاش میں ہے۔“

”سمجھ نہیں آتی، تم لوگ جرائم پیشہ کیسے بن جاتے ہو؟“

”چھوٹا سا تھا تو ماں مر گئی۔ بیوہ جیل چلا گیا۔ پتہ نہیں، زندہ ہے کہ مر گیا۔“ لالی افسردہ ہو گیا۔

”میں تو جی کوڑے کا ڈھیر ہوں۔ کوڑے کے ڈھیر پر پلا اور کوڑے کا ڈھیر ہی رہا۔ کھاد بھی نہ بن سکا۔“

مگر تمہارا کھسم۔“ لالی جھجکا پھر مسکرا کر بولا۔ ”معاف کرنا جی! میں ایسے ہی بولتا ہوں۔“

”کہتا جا۔ میں تیری گل سن رہی ہوں۔“

”میں یہ کہہ رہا تھا، تمہارا کھسم، میاں حیات محمد کیسے جرائم پیشہ بن گیا؟ وہ تو جی ولایت سے

بیرسٹری پڑھ کر آیا ہے۔ کون کو پوری طرح جانتا ہے۔“

ناصرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی خاموش ہو گیا۔ ذرا دیر بعد لالی کی آواز ابھری۔ ”میاں

ریاض تو مر گیا۔ اب کیا ہو گا بی بی جی؟“

”وہ زندہ ہی کب تھا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ اس کی تو قبر بھی موجود ہے۔“

لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”اور وہ جو تمہ خانے میں تھا، وہ کون تھا؟“

”وہ ریاض ہی تھا؟“

”فیروہ کبر کس کی ہے؟“ لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔

”یہ تو حیات ہی جانتا ہو گا، اس قبر میں کس کی لاش دفن ہے۔ مگر اس نے مشہور یہی کر رکھا ہے کہ وہ ریاض کی قبر ہے۔“

لالی اور حیرت زدہ ہو گیا۔ ”تو یہ چکر بھی چل رہا تھا۔“

”حیات نے جب اپنے بھائی ریاض کو تمہ خانے میں بند کیا تو چند ہی روز بعد یہ خبر پھیلا دی کہ ریاض کار کے ایکسی ڈنٹ میں مر گیا۔“ ناصرہ نے بتایا۔ ”حیات کسی لاوارث کی لاش بھی لے آیا۔ اسپتال کے مردہ خانے سے رشوت دے کر منگوائی تھی یا کسی قبر سے نکالی تھی۔ لاش رات کو آئی تھی۔ ایسی کٹی پھٹی اور مسخ تھی کہ نہ چہرہ نظر آتا تھا، نہ گردن۔ اس میں اتنی سڑاند تھی، اتنی بدبو تھی کہ میرا جی مٹا گیا۔ نہ معلوم لاش کو غسل بھی دیا کہ نہیں۔ رات ہی کو فنافٹ دفن کر دیا۔ قبر بھی بنا دی گئی۔“

”میے میں جی بہت طاقت ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ بنا سکتا ہے۔“

”شروع میں تو میں یہ سمجھی میاں ریاض مر گیا۔ مگر ایک روز ایسا ہوا، میں حیات کی تلاش میں تمہ خانے میں چلی گئی۔ اس وقت دروازہ کھلا تھا اور دھیور بھی پرے پر موجود نہیں تھا۔ میں تمہ خانے کے اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں، ریاض زندہ بیٹھا ہے۔ حیات بھی وہاں موجود تھا۔ وہ اتنا ناراض ہوا کہ دھیور کو ہنر سے ڈنکر کی طرح پینا۔ مجھے بھی مارا۔“

”ریاض کے پتر میاں نیاز محمد کو بھی یہ گل بات ملو م ہے؟“

”نہیں۔ نیاز کو کچھ نہیں معلوم۔ وہ یہی جانتا ہے، اس کا پیو مر گیا۔ حیات نے اسے جو کچھ

بتایا، اس نے مان لیا۔“

”فیروہ مکدمہ مکدمہ کیوں چلا رہا ہے؟“

”جاگیر اور جائیداد اپنے قبضے میں لینے کے لیے۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے یہ سارا منصوبہ نیاز کے ماماں کا ہے۔“ ناصرہ چند لمحے خاموش بیٹھی رہی اور وٹا سکرین سے سنسان سڑک کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر یکایک جھنجھلاہٹ آگئی۔ کسی قدر تھکے لہجے میں بولی۔ ”یہ جاگیر، سچ پوچھو تو ایسی

ہڈی ہے، جس کے لیے تین کتے لڑ رہے تھے۔ ایک مر گیا، دوا بھی رہ گئے ہیں۔“

”کیا یہ سچ ہے کہ نیاز، میاں ریاض کا نہیں، کرنل جاسن کا پتر ہے؟“

”میں نوں اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ ناصرہ نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ ”مگر حیات یہی کہتا ہے۔“

”وہ تو یہ بھی کہتے ہیں جی، ریاض اپنی گھر والی کو کرنل کے پاس سونے کے لیے بھیجتا تھا۔ مجھے خود انھوں نے بتایا تھا۔ میں غلط نہیں کہہ رہا۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ ناصرہ نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے بھی یہی بتاتا ہے۔ وہ سب سے یہی کہتا ہے۔“ اس کے چہرے پر برہمی چھا گئی۔ ”ریاض بھی بے غیرت تھا اور حیات بھی بے غیرت ہے۔ دونوں ایک جیسے ہیں۔“

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہارا کھم بھی ایسا ہی چکر چلاتا ہے؟ میرا مطلب ہے۔۔۔“

”میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”ایسی بات پر میرا اس کا بھگڑا شروع ہوا۔ وہ چاہتا ہے کہ میں اس کے مہمانوں کے دل بسلاؤں۔ ان کے ساتھ سوؤں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں اب تک آٹھ مہمانوں کے ساتھ سو چکی ہوں۔ کل رات وہ مجھے نویں کے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ اسے وہ سیاست کہتا ہے۔ بادشاہ گری بتاتا ہے۔ جب میں اس کی اس سیاست اور بادشاہ گری میں مدد کرنے سے انکار کرتی ہوں تو مجھے بے رحمی سے مارتا ہے۔ ہڈی چلی توڑ دیتا ہے۔ لو لہان کر دیتا ہے۔ تجھے کس طرح بتاؤں۔ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔“ ناصرہ کی آواز میں کک تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

لالی اندھیرے میں ناصرہ کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ لالی بھی اداس ہو گیا۔ سیاہ میڈان سنسان سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

لالی اسے تسلی بھی نہ دے سکا۔ بت بنا خاموش بیٹھا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ، کئی منٹ گزر گئے۔

لالی نے خاموشی سے اکٹا کر کہا۔ ”بی بی جی، ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے۔“

”کیا نیاز کو امریکہ سے تم نے بلایا ہے؟“

”نہیں، وہ خود آیا ہے۔“ ناصرہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ جاگیر اور جائیداد نیاز کو مل جائے۔“

”اس لیے کہ وہ اصلی وارث ہے۔ جیداد پر اس کا حکم بنتا ہے؟“

”کسی کا حق وق نہیں بنتا۔ اور نہ مجھے کسی کے حق سے کوئی دلچسپی ہے۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جاگیر حیات کے پاس نہ رہے۔ اگر جاگیر اور زمینداری اس کے پاس رہے گی تو وہ ساری عمر اپنی اکلوتی بیٹی کا دیاہ نہیں کرے گا۔ اس دُر سے کہ جاگیر اور جائیداد اس کے خاندان سے باہر چلی جائے گی۔ وہ جاگیر کم کرنے کی بجائے بڑھانا چاہتا ہے۔ یہ بات وہ مجھ سے صاف صاف بتا چکا ہے۔ وہ جاگیر اور جائیداد کے سوا کسی سے بھی محبت نہیں کرتا۔“ ناصرہ نے گہری سانس بھری۔ ”جب تک یہ جاگیر اور زمینداری ہے، نہ وہ اپنی بیٹی کا بیٹو بن سکتا ہے نہ میرا شوہر۔“

”جیداد اور زمینداری تو جی وہ چھوڑے گا نہیں۔ یہ بالکل سچی گل ہے۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”پر بی بی جی تم اتنی پڑھی لکھی ہو۔ وڈے گھر کی دھبی ہو۔ تمہارے لیے کسی چیز کی کمی نہیں۔ فیر تم اس کی پروا کیوں کرتی ہو؟ کاگز لکھو اگر اس سے چھٹکارا کیوں نہیں پالیتیں۔“

”کیسے چھٹکارا پالوں۔ میرا بیٹو نہیں مانتا۔ وہ خاندانی جاگیر دار ہے۔ کتا ہے ہمارے خاندان کی کسی زنانی نے آج تک طلاق نہیں لی۔ جس کے ساتھ ایک بار دیاہ ہو گیا، ساری زندگی اسی کے نام پر کاٹ دی۔ میں نے کاغذ لکھوایا تو خاندان کی ناک کٹ جائے گی۔“ ناصرہ نے تامل کیا۔ ”مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ میری بچی مونکا مستقبل خراب ہو جائے گا۔ سب کہیں گے طلاقن کی بیٹی ہے۔“

”تمہاری مونکا کتنی عمر کی ہوگی؟“

”ابھی تو بہت چھوٹی ہے اور بہت معصوم ہے۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں جانتی۔ اسے کچھ پتہ نہیں۔“

”جب میں چھوٹا سا تھا تو ساری گالاں سیکھ گیا تھا۔ ان کا کچھ کچھ مطلب بھی جان گیا تھا۔“ یہ کہتے کہتے لالی یادوں کے دھند لکوں میں گم ہو گیا۔ ایک بار پھر نشہ اس پر حملہ آور ہوا۔ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ جھوم کر بولا۔ ”ایک بار ایسا ہوا جی کہ میں نے پنڈ کی ایک سلے بار میار کو آنکھ مار دی۔ وہ فصل کی واڈھی کے بعد کھیت میں پڑے ہوئے کنک کے سٹے جن رہی تھی۔ اس نے آنکھیں نکال کر مجھے گھورا اور دبا کے پٹائی کی۔ فیر تو جی چاچا نے مجھے اینٹوں کے بھٹے پر لگا دیا۔ سویرے تڑکے کام پر جاتا اور شام کو گھر آتا۔ چلپاتی دھوپ میں تھیموں کے ساتھ کام کرتا۔ بہت دنوں اینٹیں ڈھوتا رہا۔ ہاتھوں میں گھاؤ پڑ گئے۔ سر کے بال ایسے اڑے کہ بالکل گھون مون ہو گیا۔ کرتا بھی کیا۔ کھانے کو نہ ملا۔“

ناصرہ خاموش بیٹھی رہی۔ لالی کتا رہا۔ ”میرا چاچا بے چارہ بہت بوڑھا تھا۔ اوپر سے اسے دمہ ہا تھا۔ پڑا پڑا، کھوں کھوں کھانستا رہتا۔ میری چھوٹی بھین پورے دس سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ چانے اس کا دیاہ کر دیا۔ وہ کھاتی ڈھیر سا تھی اور گھر میں کھانے کو نہ تھا۔ دیاہ کے بعد اسے سب نہ ملو ہو گیا۔ کھانا کھٹ بچے جننے لگی۔ اس نے تین کسم کئے۔ پر روٹی کو ترستی ہوئی مر گئی۔“

”ہمارے گھرانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ ہمارا خاندان بہت اونچا ہے۔“ ناصرہ نے فخر سے گردن نیچی کی۔ ”ہم کوٹ کمالیہ کے لنگریال ہیں۔ تمیں نوں پتہ ہے لنگریال کون ہوتے ہیں؟“

”اپنے کو تو جی کچھ پتہ نہیں۔“

”پرانے زمانے میں ہمارے وڈوں اور بزرگوں کے گھر کے دروازے محتاج اور حاجت مندوں کے لیے دن رات کھلے رہتے تھے۔ وہ بہت امیر ہوتے تھے۔ ان کی حویلیوں میں لنگر خانے ہوتے تھے۔ جس کا جی چاہتا، لنگر سے روٹی کھاتا۔ کوئی بھوکا نہ جاتا۔ ان کے لنگر خانے اتنے مشہور تھے کہ ری برادری کا نام لنگریال پڑ گیا۔“ ناصرہ چند لمحے خاموش رہی۔ ”حیات کی ذات کا کچھ پتہ نہیں۔ دو کو ڈو کتا ہے۔ لیکن کوئی ڈوگر جاتا ہے کوئی آرائیں۔ ڈوگروں کے بارے میں مشہور ہے، ڈوگر رہتے تھے اور آرائیں پہلے شاہی مالی ہوتے تھے، اب تو خود کو میاں کھلاتے ہیں۔“ اس نے رت سے منہ بگاڑا اور تھیکے لہجے میں بولی۔ ”نہ جانے ابا جی نے کیا سوچ کر مجھے حیات کے پلے نہ دیا۔“

لالی اس کی باتیں سن کر بے تکلفی سے ہنس پڑا۔ ”یہ خاندان اور برادری کا بھی عجیب چکر ہے۔ یہ ہے جی، اپنا تو سرے سے کوئی خاندان ہی نہیں۔ میں نوں تو ٹھیک سے یہ بھی پتہ نہیں میرا بیٹو۔“

ناصرہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ ”تو کیا تیری ماں....“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”نہیں جی، وہ کجری شجری نہیں تھی، بہت نیک بندی تھی۔“ لالی نے تھیکے لہجے میں کہا۔ ”برا تو زمیندار تھا، جس کی حویلی میں دیاہ سے پہلے میری ماں کام کاج کرتی تھی۔ غریب کی تھی۔ زمیندار نے اسے خراب کر دیا۔ فیر ایسا ہوا جی کہ میرا نانا اپنا پنڈ چھوڑ کر میری ماں کے ساتھ گویہ کے نزدیک ایک چک میں آکر بس گیا۔ جب اس نے میری ماں کا دیاہ کیا تو میں اس کے پیٹ میں تھا۔“

ناصرہ خاموش ہو گیا۔ ناصرہ بھی خاموش بیٹھی رہی۔

کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے آرہے تھے۔ نشے کا تیز رپلا آیا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ ”جب میں ٹھٹھا جوان ہو گیا اور چوری چکاری بھی کرنے لگا تو مجھے اپنی ماں کے بارے میں بہت سی باتوں کا پتہ

چل گیا۔ مجھے زمیندار پر بہت رحم تھا۔ ایک رات میں کتل کرنے کے ارادے سے اس کی حویلی میں گھسا۔ جیسے ہی کھڑکی کے رستے کمرے میں گیا، کیا دیکھتا ہوں، وہ ایک چھوہری کے ساتھ بالکل بے کھڑا ہے۔ وہ اس کی دھبی سے بھی چھوٹی تھی۔ میں نے چاکو کھول کر دکھایا۔ اسے کہنا ابھی کھسی کردوں گا۔ وہ ایسا ڈرا کہ تھر تھرا کانپنے لگا۔ مجھے ہنسی چھوٹ گئی۔ میں نے اسے کتل کرنے کا ارادہ چھوڑ دیا اور اس سے پورے چار ہزار روپے لے کر چلا آیا۔ وہ بہت مالدار ہے جی۔ وڈا زمیندار ہے۔ سنا ہے ملوث کا جنموہ ملک ہے۔ اسمبلی کا ممبر شمبر بھی رہ چکا ہے۔ اخباروں میں اس کی تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ آج کل وہ اپنی زمین داری میں بہت شاندار مسجد بنوا رہا ہے۔ اس کے ساتھ یتیم خانہ اور مدرسہ بھی ہو گا اور میں نے جو تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا سیکھا، وہ جیل میں سیکھا۔ لالی ٹھٹھا مار کر ہنسا۔

ناصرہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی لمبی چوڑی کار تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی، ایک موڑ کاٹ کر پختہ سڑک پر آگئی۔ کچھ دیر بعد ناصرہ نے پوچھا۔ ”تس نوں کتھے جاتا ہے؟“

”میں نوں توجی کادر آباد شیشن جاتا ہے۔“

”قادر آباد تو ادھر رہ گیا۔“ ناصرہ نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”آگے تو منگمری شہر ہے۔ مگر میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ کچھ دور جا کر نہر آئے گی اور اس کے ساتھ ہی میں لال ٹبے کی جانب مڑ جاؤں گی۔ میں اپنی بھین کے گھر جاؤں گی۔“

”ایسا ہے جی تو مجھے یہیں اتار دو۔ اب تمہیں اپنے کھسم کا بھی ڈر نہیں رہا۔“

ناصرہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولی۔ ”حیات کے سر سے بہت خون بہہ گیا تھا۔ جانے اب اس کا کیا حال ہو گا۔“

لالی بے نیازی سے بولا۔ ”مر گیا ہو گا۔“

ناصرہ غصے سے پھٹ پڑی۔ ”تو بالکل جانلگی ہے اور بے رحم بھی ہے۔“

لالی اس کی برہمی خاموشی سے بلی گیا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ نہ ناصرہ نے اسے روکا نہ لالی نے روکنے کے لیے کہا۔ دونوں چپ بیٹھے تھے۔ کار کسی بہتی کے قریب سے گزر رہی تھی۔ درختوں کے جھنڈ کے پیچھے اکا دکا چراغ ٹٹمارہے تھے۔

کار آن کی آن میں بہتی کے آگے سے گزر گئی۔ سڑک کے دونوں طرف درخت اور ہرے بھرے کھیت تھے۔ پت جھڑ کے مارے ہوئے درخت اجڑے اجڑے نظر آتے تھے۔ فضا غبار آلود تھی۔ چاندنی دھندلی پڑ گئی تھی۔ لالی گری سوچ میں ڈوبا نظر آ رہا تھا۔ ناصرہ نے خاموشی سے اکتا کر

چھا۔

”کیا سوچ رہا ہے؟“

”تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔“

ناصرہ نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”میرے بارے میں؟“

”ہاں۔“ لالی نے رمان سے کہا۔ ”میں سوچ رہا تھا، جب وہ جھکا ہوا دونوں ہاتھوں سے تمہارا

دبا رہا تھا۔ میں نیچے زمین پر پڑا تھا۔ تمہاری ساڑھی الگ پڑی تھی۔ تمہاری سوہنی سوہنی

بھینس پھٹی ہوئی تھیں، بال بکھر گئے تھے۔“

لالی بالکل بھول گیا کہ وہ شاداں سے نہیں میاں حیات محمد خاں وٹو کی بیگم ناصرہ سے بات کر رہا ہے، جو ایک خاندانی جاگیردار کی بیٹی بھی تھی۔ لالی نشے کی ترنگ میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔

ایت بے باکی سے کہتا رہا۔ ”تمہاری دونوں ٹانگیں تنگی تھیں۔ ایک دم تنگی۔ ہری، ہری روشنی۔۔۔۔۔“

ناصرہ نے فوراً بریک لگایا۔ کار کے پینے سڑک کی تیز رگڑ سے سناٹے میں زور سے جھٹکے۔ لالی کی تادھوری رہ گئی۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ ناصرہ غضب ناک ہو کر چیخی۔ ”بے غیرت! تیز! فوراً گاڑی سے نیچے اتر جا۔ نکل باہر۔“

لالی کھینا تا ہو کر بولا۔ ”اتنا نراض کیوں ہوتی ہو۔“

وہ ڈپٹ کر بولی۔ ”میں کتنی ہوں نکل باہر۔“ اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھایا اور ڈیش بورڈ کا نہ کھولنے لگی۔

”میں نوں پتہ ہے، تمہارے پاس بھرا ہوا پستول ہے۔ پستول نہ نکالو۔ میں چلا جاؤں گا۔“

لالی نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا، ناصرہ کی طرف مڑا اور ڈھیت بن کر مسکراتے ہوئے لا۔ ”مجھے جی زنانیوں کی تنگی ٹانگیں دیکھنے کا چکا نہیں ہے۔ وہ تو میں دس روپے خرچ کر کے بھی لے سکتا ہوں۔ صرف ٹانگیں نہیں، پورا بدن دیکھ سکتا ہوں۔ میرے پاس بگیر اور پسند ہوئی تو دز زنانیوں کو نیچا کر کے دیکھتا۔ خود بھی دیکھتا، دوسروں کو بھی دکھاتا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا تھا، تمہارا کھسم بے رحم بھی ہے، بے گیرت بھی۔ میں نے اس کے منہ پر سی لیے تھوکا تھا اور اسی لیے اس کا سر دیوار سے ٹکرا کر پھوڑا تھا کہ وہ بہت وڈا بے گیرت دلا ہے۔“

لالی نے کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ ناصرہ گردن موڑے اسے غور سے دیکھتی رہی، پھر

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹھیکر جا۔“ وہ اپنا پرس کھولنے لگی۔

لالی نے کار کا دروازہ دھیرے سے بند کیا اور اس کا سہارا لے کر زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔
 ”اسے نہ کھولو۔ اس میں ۷۰ روپے تھے، وہ میں نے پہلے ہی نکال لئے ہیں۔ پروا نہ کرو۔ اپنا کام چل جائے گا۔ اب تیس جاؤ۔“

لالی الگ ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ ناصرہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ کار اشارت کی، گیسٹر میں ڈالی اور جھنجلا کر ایکسی لیٹر اس قدر زور سے دیا کہ سیاہ سیڈان چیختی ہوئی تیزی سے بھاگی اور آن کی آن میں بہت دور نکل گئی۔



ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سڑک نیم پختہ تھی اور زیادہ کشادہ بھی نہ تھی۔ سڑک کے دونوں طرف نہ درخت تھے۔ لالی آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ کچھ ہی دور آگے گیا تھا کہ درختوں کی اوٹ سے روشنی آئی۔ وہ اسی سمت بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا تو پتھروں کی بنی ہوئی دو منزلہ عمارت نظر آئی۔ یہ ریسٹ ہاؤس تھا۔

لالی ٹھہر گیا اور چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسی اثناء میں درختوں کے نیچے سے کتوں کا ہلکا۔ کتے زور زور سے بھونکتے ہوئے لالی پر جھپٹے۔ وہ گھبرا کر سرپٹ بھاگا۔ کتوں نے اس کا قبضہ کیا۔ لالی دوڑتا ہوا ریسٹ ہاؤس کے قریب پہنچ گیا۔ مگر کتوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ زور زور سے بھونکتے اور دانت نکال کر غراتے ہوئے اس پر جھپٹتے۔ ان کے زرخے سے بچنے کے لیے قریب نہ کوئی بھاڑی تھی نہ درخت تھا۔ پتھر بھی نہ تھے کہ اٹھا، اٹھا کر مارتا اور کتوں کو گانے کی کوشش کرتا۔

اس کے پیروں کے نیچے خشک اور ریتیلی زمین تھی۔ لالی جھٹ زمین پر جھکا اور دونوں ہاتھوں سے نی اڑانے لگا۔ یہ حربہ کارگر ثابت ہوا۔ کتے بکھر کے پیچھے ہٹے۔ گرد کا غبار چھا گیا۔ لالی کو ریسٹ ہاؤس کی دیوار تک پہنچنے کا موقع مل گیا۔ اس نے زغند بھری اور دیوار پھاند کر اندر چلا گیا۔ دیوار کے باہر کتے مسلسل بھونک رہے تھے۔

ریسٹ ہاؤس میں ہر طرف ویرانی تھی۔ وسط میں دو منزلہ عمارت تھی۔ اوپر کی منزل کے ایک رستے سے ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ عمارت کے ارد گرد وسیع احاطہ تھا۔ احاطے میں اونچے

اونچے درخت تھے۔ درختوں کے پتے گر چکے تھے۔

برہنہ شاخیں تاریکی میں مکڑی کے جالوں کی مانند ابھی ابھی نظر آتی تھیں۔ خزاں کی اجازت رات بڑھال کھڑی تھی۔ ہوا چلتی تو خشک پتے کھڑکھڑاتے اور دور تک بکھر جاتے۔ لالی احاطے میں پہنچنے کے بعد اندھیرے میں دیوار کے ساتھ دبک کر بیٹھ گیا۔ چار دیواری کے اس پار کتے ابھی تک بھونک رہے تھے۔

لالی نے دم بھی نہ لیا تھا کہ عمارت کے عقب سے ایک شخص بھپاک سے نکلا اور عین اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لمبی لائٹ تھی، دوسرے میں لائٹیں لٹک رہی تھیں۔ وضع قطع سے وہ ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ لائٹیں ایک طرف رکھی اور لالی پر لائٹیں تان کر بولا۔
”کون ہے تو؟“

چوکیدار اس طرح آٹا ”فانا“ نکل کر سامنے آیا کہ لالی کے لیے راہ فرار اختیار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور آہستہ سے کہا۔
”چاچا! ڈر نہیں۔“

”پر تو ہے کون؟“ چوکیدار بدستور لائٹیں تانے کھڑا تھا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز سے کہا۔
”ٹھیک، ٹھیک بتا، یہاں آیا کیسے؟“

وہ دھلا پتلا ادھیڑ آدمی تھا۔ لالی نے اسے کمزور اور سن رسیدہ پایا تو تندر ہو کر بولا۔ ”چاچا! خاما خا گری نہ دکھا۔“ وہ مسکراتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اپنی ڈانگ تو ہٹا۔ ذرا دم لے۔ میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

چوکیدار نے لائٹیں نیچے کر لی۔ چند لمبے خاموش رہا پھر اس نے لائٹیں اٹھائی اور لالی کے چہرے کے سامنے لا کر اس طرح جھپتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے پوچھا۔ ”تو عید و کاہت ملی تو نہیں ہے؟ لگتا تو کچھ ویسا ہی ہے۔“

”نہیں جی، نہ میں عید و کاہت ہوں، نہ ملی ہوں۔“ لالی نے اس کا ٹنک بفع کیا۔ ”مگل ایمر ہے جی! میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ کتے بھونکتے ہوئے پیچھے لگ گئے۔ گھبرا کر بھاگا اور یہاں آ گیا۔“
چوکیدار نے مڑ کر دیکھا، چھانک کر قریب ہی تھا۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”چھانک میں تو تالا لگا ہے۔ تو آیا کیسے؟“

”چھانک پھاند کر اندر آ گیا۔“ لالی ایک بار پھر مسکرایا۔ ”کرتا بھی کیا۔ یہاں نہ آتا تو کتے مجھے نہ

چھوڑتے۔ ایک دو نہیں، پورا غول ہے۔“ احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی نے پشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”سن رہا ہے؟ ابھی تک کھڑے بھونک رہے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ چوکیدار نے لائٹیں زمین پر رکھ دی۔ ”بچھلے دنوں ادھر ایک کھوتا مر گیا تھا۔ جانے کہاں کہاں کے کتے اسے کھانے آ گئے۔ رات بھر بھونکتے ہیں۔“ چوکیدار کا رویہ اب نرم ہو گیا تھا۔ وہ مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے بولا۔ ”یہاں کھڑا کیوں ہے؟ ادھر منجی پر آجا۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔“ چوکیدار مڑا، لائٹیں اٹھائی اور آگے بڑھ گیا۔

لالی بھی ساتھ ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے پوچھا۔ ”چاچا یہ کس کی حویلی ہے؟“
چوکیدار نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”یہ حویلی نہیں، ریسٹ ہاؤس ہے۔ یہاں سرکاری افسر آکر ٹھہرتے ہیں۔“

لالی نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”آج یہاں کوئی ٹھہرا ہے؟“
”نہیں!“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”ریسٹ ہاؤس بالکل خالی ہے۔“
دونوں باتیں کرتے ہوئے درختوں کے نیچے پہنچ گئے۔ قریب ہی نیچی چھت کا پختہ کوارٹر تھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا۔ اس کے سامنے بوسیدہ چارپائی پڑی تھی۔ چوکیدار نے چارپائی کے نزدیک جا کر کہا۔

”اے، اب تو آرام سے یہاں بیٹھ۔“

لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے لائٹیں ایک طرف رکھ دی۔ لائٹیں کی لودھیگی کی اور اسے بھی چارپائی کے قریب رکھ دیا۔ وہ لالی کے نزدیک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے ذرا دیر خاموش رہ کر پوچھا۔ ”جب یہاں کوئی ٹھہرا نہیں ہے تو یہ اوپر بتی کیوں جل رہی ہے؟“ اس نے گردن اونچی کی اور اوپر کی منزل کی وہ کھڑکی دیکھنے لگا جس کے شیشوں سے زرد زرد روشنی چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔

”وہ تو میں اس لیے روز جلا دیتا ہوں کہ صاحب لوگ ادھر آئیں تو دور سے ریسٹ ہاؤس نظر آجائے۔ پر اب یہاں آتا ہی کون ہے۔ جو افسر کبھی دورے پر ادھر آتے بھی ہیں، وہ لمبردار اور نرس داروں کی حویلیوں میں ٹھہر جاتے ہیں۔ مہینوں میں کوئی بھولا بھٹکا ادھر آ جاتا ہے۔“

کتے اب ریسٹ ہاؤس سے دور جا چکے تھے۔ مگر ان کے بھونکنے کی آوازیں رات کے ستارے میں برابر سنائی دے رہی تھیں۔ لالی نے سوچا، ابھی باہر جانا مناسب نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ریسٹ ہاؤس

سے نکلتے ہی کتے پھر پیچھے لگ جائیں اور کسی نئے خطرے کا باعث بن جائیں۔ ریسٹ ہاؤس محفوظ جگہ تھی۔ چوکیدار سے اس نے یارانہ بھی گانٹھ لیا تھا۔ لالی نے کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کا ارادہ کیا۔ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔

”چاچا! سگریٹ پئے گا؟“

”پلاؤ۔“ چوکیدار نے بے نیازی سے کہا اور ایک سگریٹ پیکٹ سے نکال لی۔ ”سگریٹ پیئے سے کھانسی بہت ہوتی ہے پر طبیعت بھی تو نہیں مانتی۔“ لالی نے اپنی اور چوکیدار کی سگریٹیں باچس جلا کر سلگائیں۔ چوکیدار سگریٹ پر شش لگاتے ہی کھانسنے لگا۔ ذرا دیر کھانستا رہا، کچھ سکون ہوا تو پوچھنے لگا۔

”تیرا ناں کیسہ ہے؟“

لالی ایسے سوالات کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ اس نے نہایت دھشائی سے جھوٹ بولا۔ ”ناں تو جی اپنا محمد ابراہیم ہے، پر سب مجھے ہیما کہتے ہیں۔“

”نکے! یہ تو بتا، اتنی رات گئے ادھر آیا کیسے؟“ چوکیدار نے دریافت کیا۔ ”تیس نوں شمس پور تو نہیں جانا؟“

”جانا تو جی مجھے بہت آگے ہے۔“ لالی نے گول مول جواب دیا۔ ”سوچا، اسی رستے سے چلا جاؤں۔“

چوکیدار نے سگریٹ کا کش لگایا، لالی کے کرتے شلوار کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”تو کرتا کیا ہے نکے؟“

”میں جی اوکاڑہ ڈیری فارم میں نوکری کرتا ہوں۔“

چوکیدار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”تو کیا تو اوکاڑے جا رہا تھا؟“ مگر لالی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ مسکرا کر بولا۔ ”پیدل اوکاڑے کیسے جا سکتا ہے؟ وہ تو بہت دور ہے۔“ اس نے ذرا تامل کیا۔

”تیس نوں کہیں اور ہی جانا ہو گا۔ کہاں کا ارادہ ہے؟“

”میں نوں تو جی کادور آباد سٹیشن جانا ہے۔ ایک دو روز ادھر ٹھہر کر اوکاڑے چلا جاؤں گا۔“

”پر کادور آباد سٹیشن بھی یہاں سے دور ہے۔ ۲۰ میل سے کم نہیں ہو گا۔ تیرے لیے تو سیدھا رستہ منٹگری کا ہے۔ لاری پکڑتا، منٹگری جاتا اور وہاں سے ریل یا راوی ٹرانسپورٹ کی لاری سے کادور آباد چلا جاتا۔ تجھے اس طرف کا رستہ کس نے بتایا؟“

”اب تجھ سے کیا بتاؤں چاچا!“ لالی نے بات بتائی۔ ”ہوا یہ کہ میں جہاں خان پنڈ میں اپنے ایک دوست کے ویاہ میں آیا تھا۔ وہاں ہنسی محول میں ہو گیا ٹٹا۔ میں ایسا گرمی میں آگیا کہ آدھی رات ہی

کو اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔“

”کچھ زیادہ جھگڑا تو نہیں ہوا؟“ چوکیدار نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”میرا مطلب ہے، کوئی خون شون تو نہیں ہو گیا جو تجھے اس طرح رات ہی کو وہاں سے بھاگنا پڑا؟“

”نہیں چاچا! ایسی کوئی گل نہیں۔“ لالی نے ہنس کر کہا۔ ”جھگڑا بڑھ تو جاتا پر میں ٹال گیا۔ جیسے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھ کر چل کھڑا ہوا۔ کپڑے لٹے بھی ساتھ لایا تھا، وہ بھی وہیں چھوڑ آیا۔ میرے دوست اور دوسرے بندوں نے روکا بھی، پر میں نے کسی کی نہ مانی۔ پنڈ سے نکل کر آگے بڑھا تو پکی سڑک آگئی۔ سڑک کے دوسری طرف تیرے ریسٹ ہاؤس کا رستہ نظر آیا۔ میں اسی پر چل کھڑا ہوا۔ سوچا، آگے جا کر کسی راہ گیر سے کادور آباد کا رستہ پوچھ لوں گا۔“ اس نے باتوں باتوں میں چوکیدار سے کادور آباد اسٹیشن کا راستہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ”کوئی نہ کوئی رستہ تو ادھر سے کادور آباد جاتا ہی ہو گا۔ چاچا تجھے تو رستے کا پتہ ہو گا؟“

”رستہ تو ادھر سے جاتا ہے۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”اگے گورداد پورہ ہے۔ یہاں سے چار میل کے لگ بھگ ہو گا۔“ اس نے شمال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”وہاں سے نہر ملے گی۔ سیدھی کادور آباد جاتی ہے اور وڈی نہر، لوہاری دو آب سے جا کر مل جاتی ہے۔ اب تو رات بہت ہو گئی۔ ویسے نہر کے کنارے کی کسی بستی سے کادور آباد تک جانے کے لیے تانگا بھی مل جائے گا۔ زیادہ پھیر کا رستہ نہیں۔ نہر کے کنارے کی سڑک، ہے تو کچی پر ٹھیک ٹھاک ہے۔ صرف برسات میں کہیں کہیں سے خراب ہو جاتی ہے۔“

لالی ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”چاچا! اب میں چلوں گا۔“

”تو اس دکھت جائے گا؟“ چوکیدار نے کسی قدر حیرت سے پوچھا۔ ”ذرا اپنی گھڑی دیکھ کرتا، بجا کیا ہے؟“

لالی نے لائین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ ”اڑھائی بجا ہے۔“

”نہیں جی، اتنی رات گئے جانا ٹھیک نہیں۔ گورداد پورے کا رستہ بھی ٹھیک نہیں۔“

”تو فکر نہ کر چاچا! میں بے کھٹکے چلا جاؤں گا۔ ڈرنے شرنے کی کوئی بات نہیں۔“

”ڈرنے کی بات نہیں۔ پر گورداد پورے تک رستہ ذرا پھیر کا ہے۔ اندھیرے میں بھٹک کر جانے کا دھوکہ نہ لے جائے گا۔ ساری رات پریشان ہو گا۔ ایسا کیوں نہیں کرتا، صبح تک میں ٹھہر جا۔ پاک ٹھہر روڈیہ سانسے رہی۔“ چوکیدار نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”سویرے سویرے چلا جانا۔ دوپہر تک پہنچ جائے گا۔ اتنی رات کو کہاں بھٹکتا پھرے گا۔“

مگر لالی آمادہ نہ ہوا۔ ”نہیں چاچا! میں چلا جاؤں گا۔ مجھے نہ روک۔ صبح ہونے تک تو میں کادر آباد کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔ ۲۰ ہی میل کا تو رستہ ہے۔ ابھی سورج نکلنے میں بہت دیر ہے۔ اتنی دیر میں تو بہت سارے طے ہو جائے گا۔“ یہ کہتا ہوا لالی اٹھنے کے لیے کسمایا۔ اب وہ مزید ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا اور جلد سے جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔

لیکن چوکیدار نے اسے اٹھنے نہیں دیا۔ اپنی بات پر اڑا رہا۔ لالی کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”میرا کہا مان، اس دکھت یہاں سے جانے کا وچار چھوڑ دے۔“ اس نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ ”خاما خاخذ نہ کر۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”میں تیرے سونے کا بندوبست کرتا ہوں۔“

لالی نے چوکیدار کو اس قدر مہمان پایا تو انکار نہ کر سکا۔ ویسے بھی سورج نکلنے سے پہلے قادر آباد پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ دن میں کہیں نہ کہیں ٹھہرنا پڑتا اور نیا خطرہ مول لیتا پڑتا۔ ”تو کہتا ہے تو میں نہیں جاؤں گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”چاچا! میری فکر نہ کر۔ میں کہیں بھی سو جاؤں گا۔ چند گھنٹے کی تو بات ہے۔“ اس نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”مجھے تو تیرے سوا یہاں کوئی دکھائی نہیں پڑتا۔ کیا یہاں اور کوئی نہیں رہتا؟“

”کیوں نہیں رہتا۔ میری گھر والی بھی ساتھ رہتی ہے۔“

”وہ تو کوارٹر میں پڑی سوتی ہوگی۔“

”نہیں وہ اپنے بھرا کے گھر چک ۶۸ گئی ہے۔ بھتیجے کا ویاہ ہے، اس میں شریک ہونے گئی ہے۔ تین روزہ ہو گئے گئے ہوئے۔ کوارٹر میں صرف نیچا ہے۔ نیچا میری سب سے چھوٹی دھی ہے۔ بہت کام کاج کرتی ہے جی۔ کوئی افسر اگر رست ہاؤس میں ٹھہرتا ہے تو وہی چائے بناتی ہے، روٹی ٹوٹی تیار کرتی ہے۔ خاناماں یہاں رہتا ہی کب ہے۔“

”خاناماں کہاں ہوتا ہے؟“

”ویسے تو رست ہاؤس ہی کا نوکر ہے پر کام ایس ڈی، او صاحب کے جنگلے پر کرتا ہے۔ رہتا بھی وہیں ہے۔ کبھی کبھار آجاتا ہے۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ اسے گئے دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سنا ہے، اس نے ملتان میں کوئی دھندا شروع کر رکھا ہے۔“ چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دونوں ہاتھوں سے سینہ بھینچ کر دیر تک کھانسا رہا، جب ذرا قرار آیا تو گویا ہوا۔

”خاناماں کا کوارٹر خالی ہے، اسی میں سو جا۔“

چوکیدار آگے بڑھا اور اپنے کوارٹر پر پہنچ کر کٹدی کھٹکھٹانے لگا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا

اس کی اوٹ دھندلا سایہ نظر آیا۔ یہ چوکیدار کی بیٹی نیچا تھی۔ اس نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز پوچھا۔ ”کیا بات ہے بابا؟“

”خاناماں کے کوارٹر کی چابی تو لا دے۔“

”کیا خاناماں چاچا آگیا؟“

”نہیں۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”اس کی منجی باہر نکالنی ہے۔“

ذرا دیر خاموشی رہی۔ لالی بھی چپ بیٹھا رہا۔ چوکیدار نے نیچا سے خاناماں کے کوارٹر کی کنجی رز کر لالی کی جانب دیکھا اور اونچی آواز سے پوچھا۔

”چائے پئے گا؟“

”چاچا! یہ چائے پینے کا کون سا ٹیم ہے۔“

”یہ سرکاری رست ہاؤس ہے۔ یہاں ہر دکھت چائے چلتی ہے۔“ چوکیدار نے بے تکلفی سے۔ ”اب تو نیچا جاگ ہی گئی۔ فافٹ چائے بنا دے گی۔“

مگر لالی چائے پینے پر آمادہ نہ ہوا۔ ”نہیں چاچا! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔ نیند آرہی۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ چوکیدار نے آہستہ سے پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔ ”دروازہ بند کر لے نیچا۔“ نیچا نے خاموشی سے دروازہ بند کر لیا۔ چوکیدار لالی کے پاس آگیا۔ ”آمیرے ساتھ۔“ دونوں کر درختوں کے نیچے چلے گئے۔ چوکیدار کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔ خاناماں کا کوارٹر اب ہی تھا۔ چوکیدار نے تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر بولا۔ ”اندرو آجا۔“ لالی اس ہم راہ کوارٹر میں چلا گیا۔ کوارٹر میں صرف ایک کمرہ تھا۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ برآمدے ساتھ مختصر آگن تھا۔ کوارٹر کی چار دیواری اونچی تھی۔ برآمدے میں ایک چارپائی بچھی تھی۔

یدار نے چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کمرے میں بستر بھی ہے، بچھالے۔ جی کرے تو کوارٹر سے باہر نکال لے یا آگن میں ڈال لے۔ ساجی چاہے اور جیسے جی چاہے آرام سے سو۔“

لالی بے نیازی سے بولا۔ ”نکرنہ کر۔ میں سو جاؤں گا۔“

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کمرے کے اندر جا کے ایک کھیس اور ٹکیہ اٹھالایا۔ ”جی میں نے تو کھیس بچھالے۔ درمی میں نہیں لایا۔ بہت میلی ہو رہی ہے۔“

الہ! دکھ! اور ٹکیہ چوکیدار سے لیا اور نظریں جھکا کر نرم لمبے میں کہا۔ ”چاچا! تو نے خاما

اتنی تکلیف اٹھائی۔

وہ مسکرا کر بولا۔ ”اب باتیں چھوڑ اور آرام سے سو۔ رات بہت ہو گئی۔“ لالی خاموش رہا۔
چوکیدار کو ارٹھر سے چلا گیا۔



دھوپ دیوار سے اتر کر کو ارٹھر کے آنگن میں پھیل گئی تھی۔ لالی نے آنکھیں کھول کر دیکھا
چوکیدار چارپائی کے نزدیک کھڑا ہے۔ وہ اس کے لیے ناشتا لایا تھا۔ ناشتے میں چائے کے ساتھ حلوہ
تھا، پرائیٹھے تھے۔

لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چپ چاپ ناشتا کرنے لگا۔ چوکیدار اس
کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ ”لاری سے جانا ہے تو فنانٹ تیار ہو جا۔ میں سیکل پر ایس ڈی، او صاحب
کے بیٹکلے جا رہا ہوں۔ سویرے سویرے صاب کا فون آیا تھا۔ مجھے بلایا ہے۔ میں تجھے لاری کے
اڈے تک پہنچا دوں گا۔“

لالی دن میں سفر نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ چوکیدار کے ساتھ جانے پر آمادہ
نہیں ہوا۔ ”چاچا! مجھے تو سخت نیند آرہی ہے۔ کچھ دیر اور سو لینے دے۔ دن ڈھلے لاری سے چلا
جاؤں گا یا تیرے بتائے ہوئے رستے پر نہر کے کنارے نکل جاؤں گا۔“

”نیند تو تیری آنکھوں سے صاف نپک رہی ہے۔ آرام سے سو لے۔ میں دوپہر تک واپس
آ جاؤں گا۔ دوپہر کی روٹی دونوں ساتھ ہی کھائیں گے۔“

لالی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ ”نہیں چاچا! مجھے اب اور کچھ نہیں کھانا۔ اپنے لیے اتنا ہی کافی
ہے۔“

”جیسی تیری مرضی، اب اطمینان سے سو۔ میں چلا صاحب کے بیٹکلے کی طرف۔ واپسی پر آرام
سے گل بات ہوگی۔“

وہ کو ارٹھر سے چلا گیا۔ لالی پھر بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اٹھا۔ کو ارٹھر کے
دروازے پر گیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ لالی نے اس کی آڑ سے دیکھا، چوکیدار سائیکل کا ہینڈل
سنہالے رستہ باؤس سے باہر نکل رہا ہے۔ اس نے سائیکل ایک طرف کھڑی کی۔ گیٹ بند کیا اور
سائیکل پر سوار ہو کر چل دیا۔ لالی چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا رہا، پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا
ارادہ یہ تھا کہ دن خالصتاً کے کو ارٹھر میں گزار دے اور سورج ڈوبنے کے بعد جھٹ پنے میں
گوردا پورہ کے رستے نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا قادر آباد اسٹیشن پہنچ جائے۔ وہ رات بھر سفر

کر کے سویرا ہونے سے پہلے رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ لالی کچھ دیر تو کونٹیں بدلتا رہا، پھر
دوبارہ مگرمی نیند سو گیا۔

دن ڈھلے آنکھ کھلی۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکی تھی۔ کو ارٹھر میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا
اور چوکیدار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ لالی نے چوکیدار کو
دیکھا تو جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ ”دوبار پہلے آیا اور تجھے بے خبر سوتا پایا،
نوالی کی نیند بھی کیا نیند ہوتی ہے۔“ اس نے چائے کی پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ ”لے گرم گرم
چائے پی۔ بت سوچکا، اب شام ہو رہی ہے۔“

لالی نے چائے کی پیالی سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”چاچا! تو کب واپس آیا؟“
”میں تو دوپہر ہی کو آ گیا تھا۔“ چوکیدار اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”سیدھا تیرے پاس آیا
فا۔ پر تو تو بے سدھ پڑا سو رہا تھا۔“
”مجھے جگایا کیوں نہیں؟“

”کیا کرتا جگا کر؟ لاریوں کی سویرے سے ہڑتال ہے۔ ایک بھی لاری سڑک پر نہیں چل رہی۔
جاتا کیسے؟“

”لاریوں کی ہڑتال کیوں ہے؟“

”پولیس نے کسی لاری کا چالان کیا اور اس کے ڈریور کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ سنا ہے، وہاں
س کی دبا کے چٹائی کی گئی اور حوالات میں بند بھی کر دیا۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”لاری والوں نے
زمان کر دی۔ ڈاکیا آیا تھا۔ بتاتا تھا، لاریوں کے مالکوں اور پولیس کے افسروں کے درمیان بات
یت ہو رہی ہے پر ڈریور بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے۔ تھانے والوں کے
لاف سخت کارروائی کی جائے۔ ایسا لگتا ہے، ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔ سڑک پر کوئی لاری نظر نہیں
آتی۔“

”میں گوردا پورے کے رستے نہر کے کنارے کنارے پیدل چلا جاؤں گا۔ تا نکال گیا تو پکڑ لوں
ا۔ کچھ رستے تانگے سے کٹ جائے گا۔“ لالی نے نظریں اٹھا کر ڈوبتے ہوئے سورج کی دھوپ
نیم، چائے کی پیالی ختم کر کے ایک طرف رکھی اور چارپائی سے نیچے اترتے ہوئے بولا۔ ”مجھے
ب چلنا چاہئے۔ شام ہو رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔“

”کیوں خاماخا اس چکر میں پڑتا ہے۔ رات بھر یہاں اور ٹھیر جا۔ سویرے سرکاری گڈی ایس،
ی، او صاحب کی ڈاک لے کر لو رہ جائے گی۔ تو چاہے تو سیدھا اوکاڑے چلا جایا کا در آباد۔ دونوں

ہی رستے میں پڑیں گے۔ میں نے ڈریور سے بات کر لی ہے۔ وہ کل صبح گڈی لے کر یہاں پہنچ جائے گا۔“ چوکیدار زرب لب مسکرایا۔ ”ڈریور کو چائے پانی کے لیے ۸ آنے دے دیتا۔ تیرا بھی کام بن جائے گا، وہ بھی خوش ہو جائے گا۔“

”نہیں چاچا! میں پیدل ہی چلا جاؤں گا۔“ لالی رضامند نہ ہوا۔ ”فکر نہ کر۔ میں آرام ٹال کادر آباد پہنچ جاؤں گا۔“

چوکیدار لمبے بھر مشبہ نظروں سے لالی کو دیکھتا رہا۔ ”بھٹے! کوئی واردات کر کے تو نہیں آیا؟ تیری باتوں سے تو یہی پتہ چلتا ہے۔ سچ جانتا، اصل بات کیا ہے؟“

لالی اس کی بات سن کر پہلے تو ذرا پریشان ہوا پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ مسکرا کر بولا۔ ”نہیں چاچا! ایسی کوئی گل بات نہیں۔“

”فیر کیا بات ہے جو تو پیدل جانے پر اڑا ہوا ہے؟ ایک دو میل نہیں، ۲۰ میل سے اوپر کا سفر ہے۔ جب سرکاری گڈی میں بیٹھ کر آرام ٹال کادر آباد پہنچ سکتا ہے تو خاما خا اس چکر میں کیوں پڑ رہا ہے؟“

لالی نے اس کا شبہ دور کرنے کے لیے جھٹ کہا۔ ”تو کہتا ہے تو سرکاری گڈی ہی سے چلا جاؤں گا۔ آج رات بھی تیرے پاس ٹھہر جاؤں گا۔“

”باہر آجا۔ یہاں اندھیرا بھی ہو گیا ہے۔“ چوکیدار اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”باہر منجی پر بیٹھ کر گپ شپ ہوگی۔ وہیں بیٹھ کر روٹی ٹکڑی کھا لیں گے۔“

چوکیدار بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کو ارڑے نکل کر احاطے میں آگئے۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ شام کا دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ اس چارپائی کے نزدیک پہنچے جو چوکیدار کے کوارٹر کے سامنے درختوں تلے بکھی تھی۔ لالی چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر چوکیدار نہیں بیٹھا۔ وہ کوارٹر کے اندر گیا۔ ذرا دیر بعد واپس آیا تو جلتی ہوئی لائین اس کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔ مگر لالی کی جانب آنے کے بجائے وہ ریسٹ ہاؤس کی دو منزلہ عمارت کی طرف گیا اور اس میں داخل ہو گیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے دیکھا، ریسٹ ہاؤس کی بالائی منزل کے ایک درخت کے پیچھے روشنی جھللا رہی ہے۔ چوکیدار نے وہاں لیمپ روشن کر دیا تھا۔ عمارت سے نکل کر وہ لالی کے پاس آیا۔ اس نے لائین ایک طرف رکھی اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔

اندھیرا اب بڑھ گیا تھا۔ ریسٹ ہاؤس پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ لالی نے سناٹے کی شدت محسوس

کرتے ہوئے پوچھا۔ ”چاچا! یہاں تو ابھی سے اتنا سناٹا ہے۔ لگتا ہے جیسے آدمی رات ہو گئی۔ یہاں تیرا جی نہیں گھبرا تا؟“

”گھبراتا تو ہے پر نوکری جو کرنی ہوئی۔ اکیلے میں جی نہ گھبراتا تو تجھے اس طرح کیوں روکتا؟ آج کل گھر والی بھی نہیں ہے۔ تیرے ساتھ بات چیت میں ٹیم کٹ جائے گا۔“ لالی نے اندھے میں ادھر ادھر نظریں گھما کر کہا۔ ”دیکھ تو، یہاں کتنی دیرانی ہے۔ لگتا ہے جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔“

پت جھڑکے مارے ہوئے درختوں سے زرد زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ہوا کا جھونکا آتا۔ گہری خاموشی میں ان کی کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوتی۔ یکایک چوکیدار کو کھانسی کا ٹھکڑا لگا۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ چند لمبے کھانسا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور بجھے ہوئے لمبے میں گویا ہوا۔ ”ایک زمانہ تھا، جب ریسٹ ہاؤس میں کوئی نہ کوئی ضرور ٹھہرا رہتا، خوب چل پھل ہوتی۔ ایک جاتا، دوسرا آتا۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوتا، مجھے بھی صاحب لوگوں کے لیے اپنی منجی دینی پڑتی۔ تب بھی کتنے ہی افسرواپس چلے جاتے۔ دن کا الگ، رات کا الگ، پورا شاف تھا۔“ وہ افسردہ ہو گیا۔ ”پر اب تو یہاں الو بولتا ہے۔“

”ایسا کیوں ہو گیا چاچا؟“

چوکیدار نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی ذرا دیر تک خاموش رہا، پھر اس نے کہہ کر پوچھا۔ ”کوئی خاص بات ہو گئی؟“

”خاص ہی بات کہہ لو۔“ چوکیدار نے آہستہ سے کہا۔ ”کتنے ہیں ریسٹ ہاؤس میں رات کو کسی زنتانی کی روح بھٹکتی پھرتی ہے۔“

”روح بھٹکتی پھرتی ہے؟ نہیں چاچا! کوئی اور بات ہوگی۔“

”اللہ جانے، کتنے یہی ہیں، آدمی رات کے بعد وہ نظر آتی ہے۔ کبھی زور زور سے چیختی ہے کبھی روتی ہے۔ کبھی ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے۔“

”دوسروں کی چھوڑ، اپنی بتا۔ کبھی اسے دیکھا بھی؟“

”نہ جی، نہ میں نے اسے دیکھا نہ اس کی آواز سنی۔ ویسے شبہ تو مجھے کئی بار ہوا پر ایمان لگتی بات یہ ہے، ٹھیک سے کچھ دیکھا نہیں۔ اپنے کو ویسے ہی رات کو کم دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں نے اسے دیکھا ہے۔ کئی تو اسے دیکھ کر ڈر کے مارے پیچھے چلانے لگے۔ کسی کی گھٹکی بندھ گئی۔ کوئی بے ہوش ہو گیا۔ نمر کے محکمے کا ایک افسر ایسا ڈرا کہ بیمار پڑ گیا۔ کتنے ہی دن اسپتال میں رہا۔ بس جی

مکی وجہ ہے لوگ یہاں ٹھہرنے سے گھبراتے ہیں۔“

لالی نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ ”تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“ پھر کچھ سوچ کر اس نے دریافت کیا۔

”یہ چکر شروع کب سے ہوا؟“

”یہاں ایک زبانی کا خون ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہی یہ چکر شروع ہوا۔“ چوکیدار آہستہ آہستہ بتانے لگا۔ ”اب تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ ۳ سال سے بھی اوپر ہو گئے۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”مجھے اب تک یاد ہے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی۔ شام ہی سے بوند باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھی تیز تھی۔ فیر خوب زور کی بارش ہونے لگی۔ ریسٹ ہاؤس اس روز بالکل خالی تھا۔ ایک ذیل دار ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ بھی شام ہونے سے پہلے ہی جا چکا تھا۔ کوئی دس بجے رات کو موٹر میں ایک افسر آیا۔ کوئی وڈا افسر لگتا تھا۔ لہور سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی گھر والی بھی تھی۔ میں اس روز اکیلا ہی تھا۔ خاناماں بیمار تھا۔ رات والا پیرا بھی ڈیوٹی پر نہیں آیا تھا۔ انچارج بھی غائب تھا۔“

”چاچا! مجھے تو آج بھی تو اکیلا ہی نظر آ رہا ہے۔ خاناماں تو ایس۔ ڈی۔ او کے بنگلے پر کام کرتا ہے۔ ایک ہیرا چھٹی پر ہے، دوسرے ہیرے اور انچارج کہاں چلے گئے؟“

”جب کوئی آتا ہی نہیں تو دو بیروں کی چھٹی کردی گئی۔ دونوں انچارجوں کا دوسرے محکموں میں تبادلہ کر دیا گیا۔ یہاں کام ہی کون سا ہے۔ سمجھو! اب تو میں اکیلا ہی یہاں رہ گیا ہوں۔“ چوکیدار پر ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ دیر تک کھانستا رہا۔ جب کھانسی چکا تو بتانے لگا۔ ”ہاں، تو میں یہ کہہ رہا تھا۔ اس رات میں اکیلا ہی ڈیوٹی پر تھا۔ صاحب کے آنے کے بعد میں نے نیچے کے کمرے میں اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ آتش دان میں کوئلے سلگا کر کمرہ خوب گرم کر دیا۔ گیارہ بجے تک میں صاحب کے کمرے کے آس پاس ہی رہا۔ صاحب اور اس کی گھر والی دونوں خوش خوش تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔“

لالی چپ بیٹھا چوکیدار کی باتیں سن رہا تھا۔ چوکیدار کہتا رہا۔ ”جب صاحب کے کمرے میں خاموشی چھا گئی اور روشنی بھی دھیمی پڑ گئی تو میں اپنے کواٹر میں آ گیا۔ صاحب کا ڈیور بھی میرے ساتھ آ گیا۔ اچھا گھردوان تھا، یہ لبا چوڑا۔ طبیعت کا بھی بہت بھلا تھا۔ چوی پچی سال سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ میرے ساتھ کواٹر میں بیٹھا آگ تاپتا رہا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے چائے بھی پلائی۔“

”وہ بنگلے میں نہیں سویا؟“

”چپ کر کے سنتا جا۔“ چوکیدار کولالی کی مداخلت ناگوار گزری۔ اس نے منہ بگاڑ کر اسے جھڑک دیا۔ ”کوئی ایک بجایا ہو گا۔ ڈیور میرے پاس سے اٹھ کر چلا گیا۔ یہ زینہ دیکھ رہا ہے۔“ اس نے لوہے کے اس زینے کی جانب اشارہ کیا جو دو منزلہ عمارت کے عقبی حصے میں باہر سے اوپر کی منزل پر گیا تھا۔ ”اس زینے سے میں نے اسے اوپر جاتے دیکھا۔ وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں گیا اور میں نے باہر نکل کر بنگلے کا ایک روٹ لگایا۔ ابھی تک ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ واپس آکر میں نے کواٹر کا دروازہ بند کیا اور آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔“ چوکیدار چند لمبے خاموش رہا، پھر اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

”بھئی! سگریٹ ہو تو پلا دے۔“

لالی نے ایک سگریٹ سلگا کر اسے دی اور اپنی سگریٹ سلگا کر آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔ چوکیدار نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے کہا۔ ”اب آگے کی سن۔ ڈیور کے جانے کے بعد میں دیر تک جاگتا رہا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ ذرا سی چھپکی آئی تھی کہ اوپر کی منزل پر ڈز، ڈز دو فیرو ہوئے۔ میں نکل کر باہر آیا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ مگر ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ گولی کی آواز سن کر خاناماں بھی گھبرا کر اپنے کواٹر سے نکل آیا۔ اسے بخار تھا، وہ کبیل اوڑھے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ہم دونوں ڈرتے ڈرتے بنگلے کے اندر گئے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ اوپر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں، لیپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں ڈیور اور صاحب کی گھر والی دونوں خون میں لت پت پڑے ہیں۔“

”دونوں ہی مر گئے؟“

”نہیں۔“ چوکیدار نے بتایا۔ ”زبانی تو بستر پر پڑی تھی۔ اس کا سر بنگ سے نیچے جھول رہا تھا۔ وہ مرجھ چکی تھی اور بالکل تنگی تھی۔ میں نے جھیتی ٹال اس کے بدن پر چدر ڈال دی۔ ڈیور دیوار کے پاس زمین پر پڑا تھا۔ وہ بھی تنگا تھا۔ مگر زندہ تھا۔ دھیرے دھیرے سانس لے رہا تھا۔ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی۔ میں نے نیچے سے چدر لا کے اس کا تنگا بدن ڈھک دیا۔ پتوئل بھی کمرے میں ایک طرف پڑا تھا۔“

”گولی کس نے چلائی تھی؟“

”صاحب نے چلائی تھی۔ ڈیور یہی کہتا تھا۔ ہوا یوں کہ ذرا ہی دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اس نے پینے کو پانی مانگا۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ پوچھا تو اس نے صرف اتنا بتایا کہ صاحب نے کمرے میں گھسے ہی ڈز ڈز فیرو کرنے شروع کر دیے۔“

لالی کھٹک کر چوکیدار کے قریب ہو گیا۔ ”اور صاب کیا کتا تھا؟“

”ہم دونوں تھوڑی دیر بعد نیچے آئے۔ صاحب کمرے میں تھا۔ پر دروازہ اندر سے بند تھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹایا تب بھی وہ باہر نہ آیا۔ ہم سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ کمرے کے اندر بیٹھائیلی فون پر کسی سے دھیرے دھیرے باتیں کر رہا تھا۔“

لالی کی سمجھ میں ابھی تک پوری بات نہیں آئی تھی۔ ”چاچا، چکر کیا تھا؟“

چوکیدار مسکرا کر بولا۔ ”ارے بھی! گل امیرہ تھی، ڈریور سے صاحب کی گھروالی کی پہلے سے لگ سٹ تھی۔ صاحب تھا پکی عمر کا اور اس کی لگائی تھی جوان پٹھیا۔ میں تو کتا ہوں دوسری تھی۔ مگر یہ بھی سننے میں آیا کہ گھروالی نہیں تھی، صاحب اسے پھانس کر لایا تھا۔ اسی کے جھکے میں کام کرتی تھی۔ اللہ جانے کون سی بات سچ ہے۔ جتنے منہ اتنی باتیں، پر اتنا ضرور ہے وہ صاحب کے جوڑ کی ہرگز نہیں تھی۔“

”پر وہ اوپر ڈریور کے پاس پہنچی کیسے؟“

”تو بھی کیا بچوں جیسی باتیں کر رہا ہے۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ خود گئی تھی۔ پہلے سے پروگرام بنا رکھا ہو گا۔ ہوا یوں کہ صاحب نے دبا کے شراب پی۔ خاناماں کا کتا ہے، زنانی نے جان بوجھ کر اسے زیادہ ہی پلا دی۔ خاناماں ٹھیک ہی کتا ہے۔ تھی بھی وہ بہت فروٹ۔ بانو نام تھا اس کا۔ ایسی آنکھیں منکا منکا کر باتیں کرتی تھی، میں تجھے کیا بتاؤں۔ بھرپور جوان تھی، اوپر سے رات کو بھی خوب سرنخی پوڈر لگائے ہوئے تھی۔“

چوکیدار کو پھر کھانسی کا ٹھک لگا۔ تھوڑی دیر کھانتا رہا، پھر بتانے لگا۔ ”صاحب جب نشے میں دھت ہو کر سو گیا تو وہ چپکے سے اٹھی اور ڈریور کے پاس چلی گئی۔ ادھر صاحب کی آنکھ کھل گئی، وہ اسے دھوڑتا ہوا اوپر پہنچا۔ کچھ شہ اسے ضرور تھا۔ تبھی تو بھرا ہوا پستول لے کر گیا تھا۔ دونوں کو ایک ہی بستر پر دیکھا تو گھسے سے پاگل ہو گیا۔ گولی چلا کر دونوں کو وہیں ڈھیر کر دیا؟“

”پولیس شولیس تو نہیں آئی؟“

”آئی تھی۔“ چوکیدار نے جواب دیا۔ ”صاحب نے خود نیلی فون کر کے پولیس کو بلایا تھا۔ کمرہ بند کر کے پولیس کے ساتھ اس نے جانے کیا کھسر پھسری۔ بس جی رات ہی کو پولیس نے ساری تفتیش بھی پوری کر لی۔ لکھا پڑھی کی۔ تفتیشی رپوٹ تیار ہو گئی تو اس پر مجھ سے اور خاناماں سے بھی انگوٹھا لگوا لیا۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے لاش بھی چلی گئی، زخمی ڈریور بھی گیا اور صاحب بھی اپنی گڈی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ دن چڑھے تھانے دار دو کاشیلوں کے ساتھ آیا۔ اوپر والے کمرے کا

فرش دھلوا لیا۔ جہاں جہاں خون کے دھبے تھے، تھانے دار نے اپنے سامنے صاف کروائے اور خون میں ڈوبے ہوئے سارے کپڑے اور بستر بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ ریٹ ہاؤس کے سارے بندوں میں سے کسی کو بھی اندر نہ آنے دیا۔“

چوکیدار خاموش ہو گیا۔

لالی بھی خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”پھر کیا ہوا چاچا؟“

”ہونا کیا تھا؟“ وہ تلخی سے بولا۔ ”پولیس نے سارا معاملہ دبا دیا۔ بعد میں سننے میں آیا۔ گولی، پستول صاف کرتے ہوئے اتفاقاً یہ چل گئی تھی۔ ڈریور بھی اسپتال میں کچھ دنوں رہ کر ٹھیک ہو گیا۔“

چوکیدار نے ایک بار پھر کھٹکار کر گھا صاف کیا۔ زیر لب مسکرایا۔ ”گل امیرہ ہے جی! وڈے بندوں کی بات بھی وڈی ہوتی ہے۔ پولیس بھی ان پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی۔ کون شتون بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اپنے جیسا کوئی مولیٰ بندہ ہوتا تو کب کا پھانسی پر لٹک چکا ہوتا۔ ہڈیاں بھی اب تک کبر میں گل سڑ کر برابر ہو گئی ہوتیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا۔“ لالی نے گہری سانس بھری۔ ”کتوں بھی تو ایک نہیں۔ وڈوں کا الگ، چھوٹوں کا الگ۔“

چوکیدار لمبے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ ”۲۵ سال سے اوپر ہو گئے یہاں کام کرتے ہوئے۔ انگریزوں کے زمانے سے ملازم ہوں۔ ان آنکھوں نے یہاں کیا کیا ہوتے نہیں دیکھا۔“ اس کے لمبے میں ہلکا ہلکا کرب تھا۔ ”پر وہ بھی کیا دن تھے۔ ہر دھت بھاگ دوڑ مچی رہتی۔ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا۔ اب رات آتی ہے تو ریٹ ہاؤس کبرستان بن جاتا ہے۔ بانو کا خون ہونے کے بعد سے ایسا اڑا کہ لوگ ادھر آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نور محمد بیرا ایک پیر بابا کو بھی لایا تھا۔ یہ ملی داڑھی تھی ان کی۔ انھوں نے گول کمرے میں بیٹھ کر چلہ کھینچا۔ چار کیلیں پڑھ کر دیں۔ ریٹ ہاؤس کے چاروں کونوں میں وہ کیلیں گاڑی بھی گئیں، پر کچھ بھی نہ ہوا۔“

☆

اندھیرے میں نیچا کی آواز ابھری۔ ”بابا! روٹی تیار ہے۔ لے آؤں؟“ وہ کوارٹر کی دہلیز پر کھڑی تھی۔ لالین کی دھندلی روشنی میں پرچھائیں کے مانند نظر آ رہی تھی۔ چوکیدار مسکرا کر بولا۔ ”نو جی! باتوں میں روٹی کا دھیان ہی نہ رہا۔“ اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ ”تو نے تو دھپہری روٹی بھی نہیں کھائی۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز میں نیچا سے کہا۔

”وہیں ٹھہر۔ میں خود روٹی لینے آ رہا ہوں۔“

وہ اپنے کوارٹر کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا اور اندر داخل ہو گیا۔ ریسٹ ہاؤس پر چھائی ہوئی گرمی خاموشی میں صرف خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات اب اور سیاہ ہو گئی تھی۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ یہ بات ضرور کھلکی کہ چوکیدار نے نیچا کو آنے نہیں دیا۔ خود ہی کھانا لینے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار لکڑی کی ٹرے میں کھانا لے کر آیا اور چارپائی پر رکھ دیا۔ اس نے لائین کی لواؤچی کی اور اسے قریب کے ایک درخت کی شاخ سے لٹکا دیا۔ اس نے لالی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ”اب تو سنبھل کر بیٹھ جا۔ میں پانی اور گلاس لے کر آتا ہوں۔“ چوکیدار ایک بار پھر کوارٹر میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ایک ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا المونیم کا جگ تھا، دوسرے میں گلاس دیا تھا۔ جگ اور گلاس اس نے چارپائی کے قریب فرش پر رکھ دیا اور خود چارپائی پر بیٹھ گیا۔

دونوں اطمینان سے کھانا کھانے لگے۔ کھانا مزیدار تھا۔ لالی بھوکا بھی زیادہ تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر چوکیدار کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ ریسٹ ہاؤس کے بارے میں چھوٹے موٹے واقعات سناتا رہا۔ خاناماں اور بیروں کا تذکرہ کرتا رہا۔ دونوں کھانے سے فارغ ہوئے تو چوکیدار نے کھانے پینے کے برتن اٹھا کر کوارٹر میں پہنچائے اور واپس آکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

لالی کے پیکٹ میں ابھی چند سگریٹیں موجود تھیں۔ اس نے اور چوکیدار نے ایک ایک سگریٹ سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگے۔

دونوں تمباکو نوشی سے لطف اندوز ہو رہے تھے اسی اثناء میں ایک بار پھر نیچا کی آواز ابھری۔ وہ چوکیدار سے کہہ رہی تھی۔

”بابا! جی بھ گئی۔ مچس دے دے۔“

لالی نے مڑ کر کوارٹر کی جانب دیکھا۔ لائین کی ہلکی روشنی میں درختوں کے تلے اسے نیچا نظر آئی۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ روشنی اتنی کم تھی کہ لالی اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ مگر قد و قامت دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ بھرے بھرے بدن کی نوجوان لڑکی ہے۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھی ہوگی کہ چوکیدار نے چارپائی پر رکھی ہوئی لالی کی مچس اٹھائی اور لپک کر نیچا کے پاس پہنچا۔ اسے مچس دی اور واپس آ گیا۔

نیچا کوارٹر میں چلی گئی۔ کچھ دیر لالی اور چوکیدار چپ بیٹھے سگریٹ کے کش لگاتے رہے، آخر چوکیدار نے پوچھا۔

”کیا کادر آباد جانا ضروری ہے؟ میں تو کہتا ہوں سیدھا ڈیوٹی پر اوکاڑے چلے جا۔“

”اوکاڑے بھی جاؤں گا پر کادر آباد دو روز ٹھیر کر جاؤں گا۔ ایک دوست سے ملتا ہے، وہ میرا نظار کر رہا ہوگا۔“

”سیدھا اوکاڑے جاتا تو میرا ایک کام کر دیتا۔ اوکاڑے کے نزدیک ہی چک ۶-بی ہے، وہاں۔“ چوکیدار نے اپنی بات پوری نہیں کی تھی کہ رات کے سائے میں ٹیلی فون کی تھن بجی۔ اس نے اپنی ت ادھوری چھوڑ دی، جھٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ درخت کی شاخ سے لٹکتی ہوئی لائین اتار کر ہاتھ میں بھالی اور عمارت کی جانب تیزی سے بڑھا۔ وہ عمارت کے اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد چوکیدار کی آواز ابھری۔ مگر اس قدر دھیمی تھی کہ لالی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ موش بیٹھا رہا۔ چند منٹ بعد چوکیدار واپس آیا تو لالی نے پوچھا۔

”کس کا ٹیلی فون تھا؟“

”خاناماں تھا۔“ چوکیدار نے لائین نیچے رکھی اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ایس ڈی، او جب کے جنگل سے بول رہا تھا۔“

”کیا کہتا تھا؟“

”وہ گھٹے ڈیرھ گھٹے میں یہاں پہنچ جائے گا۔ پی ڈیو ڈی کا کوئی افسر ریسٹ ہاؤس میں ٹھیرنے آ رہا۔ خاناماں بھی اس کے ساتھ ہی آئے گا۔ ابھی تو وہ ایس ڈی، او کے جنگل پر ہے۔“

لالی یہ سنتے ہی پریشان ہو گیا۔ اس نے خود کو سنبھالا، دبی زبان سے پوچھا۔ ”خاناماں تو اپنے ہی ٹر میں ٹھیرے گا؟“

”ٹھیرے گا تو وہ اپنے ہی کوارٹر میں۔ تو بھی اسی کے ساتھ ٹھیر جانا۔“ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ”پر کے پاس منجی تو ایک ہی ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”بیرے کا کوارٹر بند ہے۔ چابی بھی نہ ساتھ لے گیا ہے۔“ چوکیدار کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”چاچا! تو خاما غا پریشان نہ ہو۔ اب مجھے جانے دے۔ روٹی بھی میں نے کھالی اور رات بھی زیادہ گزری۔“ لالی نے لائین کی جانب ہاتھ بڑھا کر گھڑی دیکھی۔ ”ابھی تو تو بھی نہیں بیچے۔ یوں کی رات ہے۔ میں۔۔۔۔۔“

چوکیدار اس کی بات کاٹ کر کسی قدر تھکے لہجے میں بولا۔ ”تو بار بار جانے کی گل کیوں کرتا ہے؟ رات بھر ہی تو یہاں ٹھیرتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں کہیں بھی رات گزار سکتا ہے۔“

تو برا مانتا ہے تو نہیں جاؤں گا۔ لالی نے چوکیدار کے لہجے کی تلخی سے مرعوب ہو کر کہا۔

”میں نے تیری پریشانی کے خیال سے ایسا سوچا تھا۔“

”ایسا کر، تو اس منجی پر سو جا۔ میں ادھر لیٹ جاؤں گا۔“ اس نے جنگلے کے عقبی حصے کے برآمدے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”صاحب کے آنے کے بعد آدھی سے زیادہ رات تو اسی کی اردلی میں کٹ جائے گی۔ ویسے مجھے رات کو نیند ہی کہاں آتی ہے۔ سینکڑوں راتیں جاگتے گزر گئیں۔ ایک رات اور جاگتے گزر جائے گی تو کیا ہو جائے گا۔ ویسے برآمدے کا فرش صاف ستھرا ہے۔ روزانہ سویرے پورے رست ہاؤس کی صفائی ہوتی ہے۔“

”یہ نہیں ہو گا چاچا! میں منجی پر سوؤں اور تو رات بھر جاگتا رہے یا برآمدے کے فرش پر سوئے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

چوکیدار چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”ویسے تو رست ہاؤس میں کئی کمرے ہیں۔ صاحب کے آنے کے بعد بھی خالی رہیں گے۔ تو کسی میں بھی رات بھر کے لیے ٹھہر سکتا ہے۔“ وہ اپنی بات کہتے کہتے لمحے بھر کو رکا۔ ”پر صاحب کو پتہ چل گیا تو جانے وہ کیا سوچے۔ یہ بھی پتہ نہیں، طبیعت کا کیا ہے۔“

”میرا کہا مان تو مجھے جانے دے۔“ لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”خامًا خاوند نہ کر۔“

”ضد کی بات نہیں۔ رات کے سفر کے لیے یہ رست ٹھیک نہیں۔ ادھر ذکیٹی کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ پچھلے ہی ہفتے ریلوے کراسنگ پر ڈاکوؤں نے لاری لوٹ لی تھی۔ سنا ہے، بعد میں پولیس کا ان سے ٹاکرہ بھی ہوا۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ پولیس بھی زخمی ہوئے پر ابھی تک پولیس کسی کو پکڑ نہیں سکی۔“

”سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر اپنے پاس رکھا ہی کیا ہے۔ ویسے میں ڈرنے والا نہیں۔“ لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس نے گردن اونچی کی اور سینہ تان کر مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ ”تو کہتے تو میں اوپر والے اس کمرے میں جا کر لیٹ جاؤں جس میں بانو کا خون ہوا تھا؟“

چوکیدار ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”کمرہ تو وہ فٹ کلاس ہے۔ ہوا بھی خوب آتی ہے۔“ اسی وقت اوپر کھڑکی کے پیچھے جلتا ہوا لیپ زور سے بھڑکا اور بجھ گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ درختوں تلے خشک پتے آہستہ آہستہ کھڑکڑائے۔ ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی دبے دبے قدموں چل رہا ہو۔

چوکیدار زور سے کھنکرا۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔

”نہیں جی! اس کمرے میں تیرا سونا ٹھیک نہیں۔“

”چاچا! تجھے اس کمرے میں کبھی ڈر لگا؟“

”میری بات چھوڑ۔“ چوکیدار بے نیازی سے بولا۔ ”میں کیا، میری نیچا تک نہیں ڈرتی۔ آج

شام اس کمرے کی صفائی کر رہی تھی اور میں تو روز اوپر کی منزل پر لیپ جلانے جاتا ہوں۔ کچھ پہلے حیرے سامنے لیپ جلانے گیا تھا۔“

”جب تو میں اسی کمرے میں جا کر سوؤں گا۔“ لالی کھل کر مسکرایا۔ ”ارے چاچا! ڈرنا شرنا کیا۔ زبانی ہی سے تو نمٹتا ہے اور زبانی کا معاملہ یہ ہے، ذرا ہاتھ لگا اور وہ نئی گھوڑی کی طرح بدک کر باقی ہے۔“

”کہتے ہیں چڑیل سے کبھی ٹاکرا ہو جائے تو اسے کا بو کرنے کا ایک ہی گرہ ہے اور وہ یہ ہے، جھٹ کی چوٹی پکڑ لو۔“ فیروہ ہاتھ جوڑے گی، پیر پڑے گی۔“

”یہ تو زبردست ترکیب بتائی۔“ لالی ہنس کر بولا۔ ”اب تو میں اسی کمرے میں رات گزاروں۔“

”ایک گل اور بھی ہے۔ اس کمرے میں بانو کی واردات کے بعد سے نہ کوئی سہانہ جاتا ہے نہ راتا ہے۔ ویسے میں کسی کو ادھر جانے ہی نہ دوں گا اور ادھر جانے گا بھی کون۔ نیچے کی منزل کے رے کمرے خالی ہیں۔ لمبے چوڑے بھی ہیں۔ ان میں فرنیچر بھی زیادہ عمدہ لگا ہے۔“

”تو فیروہ طے ہو گیا، میں اسی کمرے میں سوؤں گا۔“ لالی نے ہمای لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے نیند بھی نلگ رہی ہے۔“

لالی چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چوکیدار بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے لالین اٹھائی۔ دونوں ٹ ہاؤس کے عقبی حصے کی جانب بڑھے۔ لالی نے قریب جا کر دیکھا کہ برآمدے سے ذرا ہی لمبے آہنی زینہ ہے۔ اس نے گردن اونچی کی۔ زینے کے آخری سرے پر نظر ڈالی۔ کمرے کا بند ازہ دھندلی روشنی میں اس کے سامنے تھا۔ راستہ باہر سے تھا اور کمرے کی کھڑکی کے قریب سے مائے گھنے درخت کی موٹی سی ڈال اس طرح گزرتی تھی کہ خطرے کے وقت وہ آسانی سے اس ذریعے رست ہاؤس کی چار دیواری سے باہر جاسکتا تھا۔ اس پہلو سے لالی کو وہ کمرہ زیادہ محفوظ مناسب لگا۔

دونوں آہستہ آہستہ زینے کے پاس پہنچ گئے۔ چوکیدار زینے پر چڑھنے لگا۔ لالی بھی اس کے پیچھے چلا۔

زینہ طے کر کے دونوں اوپر پہنچے۔ چوکیدار نے دروازہ کھولا۔ دونوں اندر گئے۔ کمرہ صاف ستھرا دیواروں پر اجلی قلعی تھی۔ کھڑکی کے برابر پٹنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر بچھا تھا۔ پٹنگ سے ذرا ہٹ میز اور دو کرسیاں تھیں۔ میز پر لیپ رکھا تھا۔ چوکیدار نے ماچس جلا کر لیپ روشن کیا اور کھڑکی

کے پٹ کھول دیئے۔ کھڑکی کھلتے ہی کمرے میں ہوا کے نرم نرم جھونکے آنے لگے۔ چوکیدار نے کہا۔

”اب تو سو جا۔ تجھے سویرے اٹھنا بھی ہے۔ کوئی ایسی دلی بات ہو تو مجھے فوراً آواز دے۔ میں تو جاگ ہی رہا ہوں۔ جھٹ آجاؤں گا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔“

”فکر نہ کر چاچا! مجھے ڈر خوف نہیں لگتا۔“

”لگتا تو جی دار اور زور آور ہے۔ صاحب لوگوں کی طرح نہیں۔ وہ تو اپنے سائے سے بھی ڈر جاتے ہیں۔“ اس نے نظر بھر کر لالی کا چہرہ دیکھا۔ ”سچ پوچھ تو میں خود چاہتا تھا، تیرے جیسا کوئی زور آور جوان اس کمرے میں ٹھہرے۔ یہ بھوت پریت کا چکر ختم ہو اور صاحب لوگوں کا آنا جانا پہلے کی طرح شروع ہو۔“

چوکیدار کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جب سے یہ چکر شروع ہوا ہے، اپنا تو سمجھو کبڑا ہو گیا۔ صاحب لوگ آتے تھے تو بخشش اور انعام دے کر جاتے تھے۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اب تو سوکھی تنخواہ پر گزارہ ہے۔ پیٹ بھرنا مشکل ہے۔ نیچا جوان ہو گئی ہے۔ رشتہ بھی طے ہو چکا ہے۔ پیسہ ہو تو کل اس کا ویاہ کر دوں۔“

لالی نے جیب سے دس دس روپے کے دو نوٹ نکالے اور چوکیدار کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”لے یہ رکھ لے چاچا!“

چوکیدار نے انکار کیا۔ ”تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔ میں تجھ سے کچھ نہیں لوں گا۔ تو میرے ممان کی طرح ہے۔“

”دیکھ چاچا! نہ یہ بخشش ہے نہ انعام۔ دیے بھی میں نہ افسر ہوں نہ صاحب جو تجھے بخشش یا انعام دوں۔ میری خوشی ہے تو اسے رکھ لے۔ انکار نہ کر۔“

چوکیدار نے پھر انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کر کے اسے نوٹ دے ہی دیئے۔ تھوڑی دیر بعد چوکیدار چلا گیا۔



لالی نے دروازہ بند کیا، لیپ دھیم کیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں۔ اس کمرے میں وہ سونے کے لیے آیا بھی نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد رحیم داد کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اور خالی ہاتھ بھی جانا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد کے لیے اس نے جو کپڑے گٹھری میں باندھ کر رکھے تھے، وہ گٹھری کے ساتھ میاں حیات محمد وٹو کے بنگلے میں رہ گئے تھے۔

اس نے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ کچھ نہیں تو ایک چادر ہی اٹھا کر لے جائے گا۔ اس سے رحیم داد کا کچھ تو کام چل ہی جاتا۔ مگر اب اسے ایک چھوڑ دو چادریں مل گئیں۔ ایک بستر پر بھی تھی، دوسری اوڑھنے کے لیے تھی۔

لالی بستر پر خاموش لیٹا رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دیران، نیلیوں اور ٹیوں کے درمیان بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر اب تک جیل کی وردی تھی اور جب تک یہ وردی موجود تھی، نہ وہ باہر نکل سکتا تھا، نہ کسی سے مل سکتا تھا اور نہ لاری یا ٹرین سے سفر کر سکتا تھا۔ لالی کو سب سے زیادہ فکر اسی بات کی تھی۔ وہ شرمندہ بھی تھا کہ اس نے تو اپنی جیل کی وردی اتار پھینکی تھی، مگر رحیم داد کو اس سے نجات نہ دلا سکا۔ چلتے وقت رحیم داد نے دلی زبان سے گلہ بھی کیا تھا۔ اس کا گلہ بھی بجا تھا۔ اسے جیل سے فرار ہونے پر لالی ہی نے آمادہ کیا تھا۔ اسے وہ رہ کر یاد آ رہا تھا کہ رحیم داد بڑی مشکل سے فرار ہونے پر رضامند ہوا تھا۔ وہ لالی کی طرح عادی مجرم نہیں تھا۔ لہذا ڈر رہا تھا۔

لالی بستر پر لیٹا یہی سوچ رہا تھا کہ میز پر آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ کھڑکی کے باہر درخت کی ڈال زور سے جلی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ لیپ کی لو بھڑکی۔ سامنے دیوار پر پرچھائیں لہرائیں۔ لالی چونک پڑا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ ادھر ادھر دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ دروازہ بند تھا۔ چنچنی اس نے اپنے ہاتھ سے لگائی تھی۔ مگر اسے تسلی نہ ہوئی۔ بستر سے اتر، میز دیکھی۔ میز ٹھیک ٹھاک تھی۔ لیپ بھی اپنی جگہ تھا اور روشن بھی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے پاس پہنچا اور اس کی چوکھٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔

رات جاگ رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول روشن تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ لالی نے کھڑکی کے برابر سے گزرتی ہوئی پتیل کے درخت کی ڈال دیکھی۔ ہاتھ بڑھا کر اسے مضبوطی سے پکڑا۔ دھیرے دھیرے ہلایا۔ ڈال خوب موٹی اور مضبوط تھی۔ اس پر وہ آسانی سے چڑھ سکتا تھا اور رست ہاؤس کی چار دیواری سے باہر بھی جاسکتا تھا۔ چار دیواری کے اس پار لاگھا تھا جس میں رست کے اونچے نیچے نیلیوں کے درمیان کیس کیس کھیت تھے۔ دور تک پھیلا ہوا یہ ریتلا اور ناہموار میدان اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔

اس نے کھڑکی کے پاس کھڑے کھڑے رست ہاؤس سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کیا۔ اب وہ زیادہ دیر ہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی پھر رات گزری تھی اور اسٹیشن پہنچنے کا راستہ چوکیدار نے بتا ہی دیا تھا۔ قادر آباد پہنچ کر وہ ریل کی پٹری عبور کر کے سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنے خفیہ ٹھکانے پر پہنچ

سکتا تھا۔

وہ کھڑکی سے ہٹ کر بستر کے قریب آیا اور بستر کی دونوں چادروں میں جوتے پیٹ کر گتھری باندھنے کا ارادہ کرنے لگا۔ اسی اثناء میں باہر سے چوکیدار کے کھانسنے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی زمین پر لاشی بچنے کی آہٹ بھی ہوئی۔ آہٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ چوکیدار اسی طرف آ رہا تھا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے عین نیچے پہنچ کر چاپ بند ہو گئی۔ لالین کی روشنی لالی کو کھڑکی کے باہر دکھائی دے رہی تھی۔

ذرا ہی دیر بعد چوکیدار زور سے کھنکرا۔ اس نے کھڑکی کے نیچے سے اوپنی آواز میں لالی سے پوچھا۔

”بھہ! جاگ رہا ہے؟“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بالکل خاموش رہا۔ چوکیدار ذرا دیر ٹھہر کر آگے بڑھ گیا۔ خشک پتوں پر اس کی چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ لالی ایک بار پھر کھڑکی کے قریب پہنچا۔ گردن بڑھا کر دیکھا، درختوں کے نیچے چوکیدار آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالین تھی اور دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی لاشی زمین سے ٹکرا کر آہٹ پیدا کر رہا تھا۔ اس کے ہم راہ کوئی اور بھی تھا۔ وہ نیچا تھی۔ اس کی کھالوں میں پڑی ہوئی چوڑیاں چلتے وقت آہستہ آہستہ بج رہی تھیں۔

دونوں مڑ کر اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ روشنی کا زرد زرد دھبہ کچھ دیر تک نظر آتا رہا اور جب وہ بھی دھندلا پڑ گیا تو لالی بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، مگر وہ سوتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چوکیدار کے چارپائی پر لیٹ جانے کا انتظار کر رہا تھا جس کی کھانسی پھانک کے پاس بار بار سنائی پڑ رہی تھی۔ کھڑکی کے راستے ہوا کے جھونکے اندر آرہے تھے۔

لالی کی آنکھیں غودگی سے بار بار بند ہو جاتیں۔ آخر نیند کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ اس کی آنکھیں بند ہو کر کھل نہ سکیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

☆

کمرے میں تیز خوشبو پھیلی تھی۔ لالی غودگی کے عالم میں تھا۔ ایسا محسوس ہوا، کوئی سرہانے کھڑا آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہا ہے۔

اب وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور سسکیاں سن رہا تھا۔ سسکیوں کے ساتھ رک رک کر چوڑیاں بھی بجتیں۔ ذرا دیر تک وہ سکتے کے عالم میں چپ لیٹا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے

لگا۔ وہ اچھل کر بستر پر بیٹھ گیا۔ لیپ کی دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ میز سے ذرا ہٹ کر دیوار کے پاس ایک نوجوان عورت کھڑی ہے۔ وہ گردن جھکائے رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے بال بکھر کر چہرے پر آگئے تھے۔ وہ خوب ستھار کئے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی تھی۔ لباس بھی بھڑکیلا اور خوب چست تھا۔ اتنا چست کہ اس کی بھرپور جوانی لباس سے بے محابا بھانک رہی تھی۔ وہ تیز خوشبو میں اس طرح بسی ہوئی تھی کہ پورا کمرہ مک رہا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کے لالی کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ لالی چند لمحے اسے گھورتا رہا، پھر پلنگ سے کود کر نیچے آ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بالکل خاموش کھڑے تھے۔

کھڑکی کے باہر پیپل کی ڈال ہوا کے تیز جھونکوں سے جھول رہی تھی۔ خشک پتے اس طرح کھڑکھڑاتے گویا آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے ہوں۔ لالی چند لمحے چپ چاپ کھڑا رہا پھر دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ عورت نے اسے اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو دیوار سے لگ کر آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگی۔ نہ اس نے نظریں نیچی کیں نہ زبان سے کچھ کہا۔ برابر اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی اور ہولے ہولے کھسکتی رہی۔ وہ مڑ کر دروازے کی جانب لپکی۔ لیکن لالی نے اسے دروازے تک پہنچنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لی۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ ”کون ہے تو؟“ وہ بلبلہ کر بولی۔ ”میری چوٹی تو جھوڑ۔“

لالی نے چوٹی چھوڑنے کے بجائے اور زور سے مروڑ دی۔ عورت نے پلٹ کر بے بسی سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلما رہے تھے۔ یکایک تیز جھونکا آیا۔ لیپ زور سے بھڑکا اور جھٹ لیا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھا گیا۔ باہر درختوں میں الو کے زور زور سے بولنے کی آوازیں کی خاموشی میں ابھری۔ لالی کسی ان جانے خوف سے کپکپا کے رہ گیا۔ مگر وہ اس کی چوٹی مضبوطی سے پکڑے رہا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر لالی نے پوچھا۔

”تو بانو ہے؟“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

لالی نے اس کی چوٹی کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور ایک بار پھر پوچھا۔ ”بولتی کیوں نہیں۔ تو بانو ہے؟“

”کون بانو؟“ وہ تکیے لمبے میں بولی۔ ”میں کسی بانو کو بانو نہیں جانتی۔“

”سچ سچ بتا کون ہے تو؟“

وہ تکلیف سے منہ بگاڑ کر بولی۔ ”کہہ تو دیا“ میں بانو نہیں ہوں۔“

لالی ٹھٹھے میں پڑ گیا۔ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ ”تو چوکیدار کی بیٹی نجیا تو نہیں ہے؟“

”میں کیوں ہونے لگی چوکیدار کی بیٹی۔“

لالی اور زیادہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس دفعہ اس نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”ٹھیک ٹھیک بتا۔ زیادہ کڑکڑکی تو لگاؤں گا ایک پیچڑ۔“ اس نے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔

”بتاتی ہوں، بتاتی ہوں۔“

لالی اس کی چوٹی ہلا کر بولا۔ ”تو فیہر بتانا۔“

اس نے منہ بسور کر کہا۔ ”میں زرینہ ہوں۔ صفدر علی اور سیز کی بیوی۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہ کر عاجزی سے بولی۔ ”اب تو میری چوٹی چھوڑ دو۔“ لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے؟ وہ اس کی چوٹی گھوڑے کی لگام کی طرح کھینچنے ہوئے چپ کھڑا رہا۔ مگر وہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہی۔ اس نے گردن ہلائی اور جھنجھلا کر بولی۔

”دیکھو! میری چوٹی چھوڑ دو، نہیں تو میں چیخنے لگوں گی۔“

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے چوٹی چھوڑ دی۔ مگر وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ ”تو یہاں پہنچی کیسے؟ دروازہ تو بند ہے۔“ لالی نے اس دروازے کی جانب اشارہ کیا جو باہر لوہے کے زینے پر کھلتا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔

”تو کھڑکی کے رستے تو اندر نہیں آئی؟“

”کچھ داغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ میں کھڑکی کے رستے کیسے اندر آ سکتی ہوں۔“ اس نے ٹیکھے لمبے میں کہا۔ ”اور یہ دروازہ نہیں ہے۔“ زرینہ نے کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”میں اسی دروازے سے بیڑھیاں چڑھ کر نیچے سے آئی ہوں۔ تو بہ تو بہ، کتنی بیڑھیاں ہیں۔ چڑھتے چڑھتے میرا تو سانس پھول گیا۔“ اب وہ کسی قدر اطمینان سے بول رہی تھی۔ لالی نے اس کی بات سن کر کچھ نہیں کہا۔ میز کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر اس نے لیپ روشن کیا۔ زرینہ کمرے سے باہر جانے کے ارادے سے دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی نے ٹوکا۔

”ٹھہیر جا۔ یہ تو بتا، تو ریسٹ ہاؤس میں آئی کیسے؟“

”سرکاری جیب میں آئی تھی۔ صفدر علی لے کر یہاں آیا تھا۔ مجھے تو یہاں آئے ہوئے بھی آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا۔ تم کو خبر ہی نہیں۔“

”تیرا کھم صفدر علی کہاں ہے؟“

”وہ جیب میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔“

لالی پھر الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے ٹیکھی نظروں سے زرینہ کو دیکھا اور ڈپٹ کر بولا۔ ”صاف

ناف بتا۔ تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے، اس کمرے میں کیوں آئی؟“

”میں تو یہاں چھپنے کے لیے آئی تھی۔“ وہ آنکھیں مٹکا کر الحظین سے بولی۔ تھی بھی الحظ۔ اس کا عمر سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ شکل و صورت معمولی تھی مگر اس کی جوانی سمندر کا جوار بھاتا لی۔ انگ انگ سے اہل رہی تھی۔

اس کی بات سن کر لالی اور چکرایا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”یہاں چھپنے آئی تھی۔ مگر کیوں؟“

”کچھ ہے ایسی بات۔“ زرینہ نے گول مول جواب دیا۔

لالی نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا اور ہاتھ بڑھا کر پھر اس کی چوٹی پکڑ لی۔ ”ٹھیک ٹھیک ا۔“

”ارے ارے، میری چوٹی تو چھوڑ۔“ وہ گھبرائے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”وہ بڑا انجینئر ہے۔“ زرینہ اپنی بات کتے کتے رک گئی۔

لالی نے حیرت سے پوچھا۔ ”کون انجینئر؟“ اس نے زرینہ کی چوٹی چھوڑ دی۔

”وہی جو یہاں ٹھہرا ہوا ہے۔“ زرینہ نے جواب دیا۔ ”وہ ہمارے بچنے سے پہلے یہاں آ گیا۔“ اس نے ذرا رک کر بتایا۔ ”صفدر کے ساتھ وہ بھی جیب میں گیا ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس جائے گا۔“

”صفدر واپس نہیں آئے گا؟“

وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ ”صفدر تو گھر گیا ہے۔ سویرے آئے گا۔ مجھ سے یہی کہہ کر گیا ہے۔“

بات اب لالی کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگی تھی۔ اس نے غور سے زرینہ کو دیکھا۔ ”تیرا کھم کلا تو نہیں چلاتا؟“

”ایسی بات نہیں ہے جی۔ ہے تو وہ اوور سیز ہی۔“ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ ”بات یہ ہے۔

ایک چکر میں آ گیا ہے۔ دو مہینے سے معطل ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔“ وہ جھکی۔ ”سڑک کے ٹیکے میں صفدر نے ایک ٹھیکیدار سے رشوت لی تھی۔ کسی نے اوپر شکایت لگا

دی۔ اب بڑا انجینئر انکوائری کرنے آیا ہے۔ جو رپورٹ وہ دے گا، اسی پر صفدر کے کیس کا فیصلہ ہوگا۔

”اب اصلی گل سمجھ آئی۔ صفدر نے تجھے رشوت میں انجینئر کو پیش کیا ہے۔ تیرا کس قسم ہے بہت تیز۔ رشوت لینا بھی جانتا ہے اور رشوت دے کر بیچ نکلنے کا رستہ بھی جانتا ہے۔“ اس نے مسکرا کر زرنہ کو دیکھا۔ ”رشوت بھی اس نے کھڑی دی ہے۔ جیسی تو اتنی بن ٹھن کر آئی ہے۔“

”توبہ کرو جی۔“ وہ بے باکی سے بولی۔ ”انجینئر کو دیکھ کر تو مجھے گھن آگئی۔ وہ کوئی آدمی ہے، بالکل گینڈا لگتا ہے۔ سر بھی گنجا ہے۔ روشنی میں تالوٹ کی طرح چمکتا ہے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسی مگر جلد ہی اس کا مختلف چہرہ بچھ گیا۔ ”صفدر باہر گیا تو انجینئر کمرے میں میرے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لگا مجھے دوپٹے۔ زبردستی میرے ہونٹ چوم لیے۔ اس کے منہ سے ایسی کڑوی کڑوی بو نکلی۔ اٹھ تھو۔“ اس نے نفرت سے زمین پر تھوک دیا۔ ”انجینئر کے جانے کے بعد مجھے اتنا ڈر لگا کہ رونا آگیا۔ میں روتی ہوئی چھپنے کے لیے یہاں آگئی۔“

لالی نے بے رخی سے کہا۔ ”اب روتی کیوں ہے؟ گھر سے تو خوشی خوشی بن ٹھن کر آگئی۔ اب کتنی ہے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے غصے سے منہ بگاڑا۔ ”ایسا ہی ڈر تھا تو گھر سے نکلی ہی کیوں؟“

”کرتی بھی کیا۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”صفدر میرے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ رورو کر کہنے لگا۔ زرنہ! مجھے بچالے۔ نوکری بھی جائے گی اور جیل بھی ہو جائے گی۔ تم ہی بتاؤ، جب اپنا آدمی اس طرح رورو کر مگر گزرائے تو میں کیسے انکار کرتی۔ ابھی تو ہمارے بیاہ کو تجھے مینے بھی نہیں ہوئے، یہ مصیبت پھٹ پڑی۔“

”تو فیہر بچالے اپنے کس قسم کو اس مصیبت سے۔ نکھر اکیوں کرتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں اس کی بات مان لے۔ فیہرہ جیل بھی نہیں جائے گا، نوکری بھی بیچ جائے گی اور اب تو چالو ہو ہی گئی۔ اپنے کس قسم کو ترکی دلو اور انجینئر بھی لگوا دے گی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نامی نا۔ ایسی بات نہ کرو۔“ وہ عاجزی سے بولی۔ ”تم مجھے انجینئر سے بچالو۔“

”میں کوئی تھانیدار لگا ہوں جو تجھے بچالوں۔“ لالی نے نہایت بے مروتی سے کہا۔ ”جا جا کر انجینئر کا دل خوش کر اور اپنے کس قسم کو بچا۔ مجھے سونے دے۔“

زرنہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، منہ لٹکائے کھڑی رہی۔ اس کے چہرے کی چمک دک ماند پڑ گئی۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ زرا دیر تک کمرے میں سکوت رہا۔ زرنہ نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا اور افسرہ لہجے میں بولی۔

”تم مجھے نہیں بچا سکتے؟“

لالی نے اس دفعہ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”کچھ تو گم سے کام لے۔ مان لے کہ آج میں نے تجھے بچالیا۔ کل پھر تیرا کس قسم تیرے پیر پکڑ کر روئے گا۔ تو فیہرہ ایسے ہی بن ٹھن کر چلی آئے گی۔ نہیں آئے گی تو انجینئر تیرے کس قسم کے خلاف رپورٹ دے دے گا۔ اسے جیل ہو جائے گی اور نوکری بھی جائے گی۔ میں تجھے کہاں کہاں بچاؤں گا۔ کب تک ہتھیلی لگاؤں گا۔“

”تم مجھے آج بچالو۔ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“ اس نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

الحدین سے بولی۔ ”میں تمہارے پلنگ کے نیچے چھپ جاؤں گی۔ انجینئر یہاں آکر تم سے پوچھے تو کہہ دیتا، کون زرنہ، کیسی زرنہ؟ یہاں کوئی زرنہ ور نہ نہیں آئی۔ وہ تمہارا کیا بکاڑے لے گا؟“

”نہیں جی، میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔“ اس نے بیزاری سے کہا۔ ”اب یہاں سے جا۔“

لالی جہاں تھا کہ زرنہ چلی جائے تاکہ وہ چادر میں اٹھا کر جلد سے جلد بنگلے سے نکل سکے۔ اب وہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

مگر زرنہ اس کا صاف جواب سن کر بھی کمرے سے نہیں گئی۔ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ زرا دیر بعد کمرے کی خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ وہ رو رہی تھی۔ لالی اسے روتا دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ گھبرا کر بولا۔

”ارے ارے تو روئے لگی۔“

زرنہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی سسکیاں بند ہو گئی تھیں۔ لالی مسکرا کر بولا۔ ”علوم ہوتا ہے، سینما بہت دیکھتی ہے۔ دیکھتی ہے نا؟“

”دیکھتی ہوں، ضرور دیکھتی ہوں۔“

”جیسی تو ایسی اکیٹنگ کر لیتی ہے۔“

زرنہ جلدی جلدی آنسو پونچھ کر گویا ہوئی۔ ”تو میں پلنگ تلے چھپ جاؤں۔ انجینئر اب آتا ہی ہوگا۔“

”ایسا کر، بستر پر لیٹ جا۔ میں منجی کے نیچے دبک جاؤں گا۔“

”اس سے کیا ہوگا؟“

”اس سے یہ ہوگا۔ جب انجینئر تجھ سے چھپر چھاڑ کرے گا تو میں نیچے سے نکل آؤں گا اور تھانے دار بن کر کھڑا ہو جاؤں گا۔ ٹھیک ہے نا۔“

”نہیں جی، یہ ٹھیک نہیں۔ کچھ اور سوچنا ہوگا۔“

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر سنجیدگی سے پوچھا۔ ”سچ انجینئر سے بچنا چاہتی ہے؟“
”کسمہ تو رہی ہوں اور کیسے کموں۔“ زینہ نے کسی قدر حسیلے لہجے میں کہا۔ ”بس تم مجھے اپنے
پنگ تلے چھپ جانے دو۔“

”کیا بچوں کی سی باتیں کرتی ہے۔“ لالی نے اسے ڈانٹا، ذرا دیر خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر بولا۔
”چھپنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کر۔ نیچے جا اور بنگلے سے نکل کر باہر برآمدے میں کھڑی ہو جا۔ جب
انجینئر واپس آئے تو رونا شروع کر دیتا۔ وہ پوچھے کیوں روتی ہے؟ کہنا مجھے بنگلے میں ڈر لگتا ہے۔ میں
یہاں نہیں ٹھہروں گی۔ یہاں ایک چڑیل ہے۔ میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے سینے سے
خون بہہ رہا تھا۔ کبھی روتی تھی، کبھی ٹھنھا مار کر ہنستی تھی۔ کستی تھی، میرا نام بانو ہے۔ مجھے اوپر
والے کمرے میں کتل کر دیا گیا۔“

”وہ میری بات کا یقین مان لے گا؟“

”کیوں نہیں مانے گا؟ بانو کو اسی کمرے میں کتل کیا گیا تھا۔ اب یہاں اس کی روح بھٹکتی پھرتی
ہے۔ اسی لیے تو میں نے تجھ سے پوچھا تھا، کیا تو بانو ہے؟“

”ہائے۔“ وہ منہ پھاڑ کر بولی۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

”بالکل سچ ہے۔ چونکہ اوروں تو موجود ہی ہے جس کے سامنے بانو کا کتل ہوا تھا۔ میں نے تجھے بچنے کی
ترکیب بتادی۔ ایکٹنگ تو کر ہی لیتی ہے۔ اس طرح رونا اور چیخنا چلانا کہ انجینئر بھی ڈر جائے۔ سمجھ
لے، تیرا کام بن گیا۔ اس طرح تیرے کھسم پر بھی بات نہیں آئے گی۔ اب جا، مجھے سونے
دے۔“

دو بستر کی جانب بڑھا۔

زینہ نے ٹوکا۔ ”میری بات تو سنو۔“ لالی رک گیا۔ زینہ نے سہمی ہوئی نظروں سے اسے
دیکھا۔ ”تم نے ایسی بات سنائی کہ مجھے ڈر لگنے لگا۔ میں بیڑھیوں سے نیچے کیسے جاؤں گی۔ زینہ میں
تو بالکل اندھیرا ہے۔“

”ڈر کیوں رہی ہے؟“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تو تو خوب کھڑی ہے۔ اندھیرے میں بانو
سے مذہم ہو جائے تو جھٹ اس کی چوٹی پکڑ لیتا، جیسے میں نے تیری چوٹی پکڑی تھی۔ چوٹی پکڑتے ہی
کیسی میرے کاہو آگئی تھی۔ ایسے ہی اسے کاہو کر لیتا۔“

”نہیں جی، یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔“ وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ ”میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ تم بھی
میرے ساتھ چلو۔“

لالی اب سخت بیزار ہو گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ وہ ریسٹ ہاؤس سے جلد از جلد نکل بھاگنا چاہتا
ا۔ مگر زینہ اس کی راہ میں دیوار بن کر حائل ہو گئی تھی۔ اس نے بکڑ کر کہا۔ ”خانا خا کھرانہ
لما۔“ اس نے غصے سے ہاتھ اٹھایا۔

”جاتی ہے یا لگاؤں ایک چپوڑ۔“

”دیکھو ہاتھ نہ چلاتا۔“ وہ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ ”۳ تہی ہمت تو کبھی صفر کو بھی نہیں ہوئی۔“
”وہ تو دلا ہے۔ اس کی بات مت کر۔“

اس دفعہ زینہ نے عاجزی سے کہا۔ ”تم مجھے نیچے پہنچا دو۔ پھر میں یہاں نہیں آؤں گی۔ بالکل
میں آؤں گی۔“

لالی نے زنج ہو کر کہا۔ ”اس طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ چل، میں تیرے ساتھ چلتا
ہوں۔“

لالی آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا، کمرے سے نکلا۔ زینہ بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھی۔ لالی آگے
ا۔ زینہ اس کے پیچھے چل رہی تھی۔ زینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بیڑھیوں پر گھپ اندھیرا تھا۔
نوں سنبل سنبل کر قدم رکھتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔

”انجینئر سے تو تجھے اتنا ڈر لگتا ہے، مجھ سے نہیں لگتا؟ مان لے، میں تجھے اندھیرے میں دبوچ
ں تو؟“

”میرے ہاتھ نہیں ہیں کیا؟“ اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ ”منہ نوج لوں گی، دانتوں
سے کانوں گی۔ چیخوں گی، چلاؤں گی۔“ وہ آہستہ سے ہنسی۔

”مجھ پر ہاتھ ڈالنا ہنسی ٹھنھا نہیں ہے۔“

”فیر اس گینڈے سے اتنا کیوں ڈرتی ہے؟ یہ کارروائی اس کے ساتھ کیوں نہیں کرتی؟“
”اس کی بات دوسری ہے۔“ زینہ دھیرے سے بولی۔ ”صفر خفا ہو جائے گا۔ کہتا تھا، انجینئر
کے ساتھ کوئی گڑبڑ کی تو سمجھ لیتا کھڑے کھڑے طلاق دے دوں گا۔“

لالی جل کر بولا۔ ”وہ کنجریہ بھی کہتا ہے۔ ولاگیری کرتا ہے اوپر سے آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔“
زینہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چپ چاپ بیڑھیوں سے نیچے اترتی رہی۔ لالی بھی خاموش
ا۔ اندھیرے میں دونوں رینگ کاسارا لے کر پنے تلے قدم اٹھا رہے تھے۔ ناگاہ زینہ نے چونک
کر پوچھا۔

”کیا تم نے میری چوٹی کھینچی تھی؟“

”تیرا کمزور نہیں چل گیا۔“ لالی نے اس کی جانب گردن موڑے بغیر کہا۔ ”میں آگے آگے چل رہا ہوں۔ پیچھے سے تیری چوٹی کیسے کھینچ سکتا ہوں؟“

وہ سہمی ہوئی آواز میں بولی۔ ”جج، مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میری چوٹی پکڑ کر کھینچی ہے۔“
 ”بانو ہوگی۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ زربہ خاموش رہی۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے، تو ہی بانو ہے۔“
 لالی نے توقف کے بعد پوچھا۔ ”تو بانو تو نہیں ہے؟“ زربہ ہنوز خاموش رہی۔ ذرا دیر تک گہری خاموشی رہی۔ لالی اس خاموشی سے گھبرا گیا۔ اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ زربہ اندھیرے میں پرچھائیں کی طرح دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ لالی نے اس دفعہ کسی قدر تھکے لہجے میں کہا۔
 ”بول، بولی کیوں نہیں؟“

”ہاں، میں بانو ہوں۔“ لالی کے عقب سے منمنی آواز ابھری۔ وہ لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ اس نے خوف زدہ نظروں سے زربہ کو دیکھا۔
 وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”بڑے بہادر بنتے تھے۔ ڈر گئے نا؟“

دونوں زینے سے اتر کر نیچے کو ریڈور میں آگئے تھے۔ سامنے گول کمرہ تھا۔ اس میں لیپ روشن تھا۔ زربہ جھٹ لالی کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک شوخی سے مسکرا رہی تھی۔ لالی نے جھنجھلا کر اسے دیکھا۔ ”تو بھی ایک نمبری ہے۔ میں جج جج ڈر گیا تھا۔“ اس نے آہستہ سے پوچھا۔
 ”انجینئر، کس کمرے میں ٹھہرا ہے؟“

”یہ رہا وہ کمرہ۔“ زربہ نے ٹکڑوالے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر لیپ روشن تھا۔ لالی آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ بڑھ کر دیکھا، کمرہ خالی ہے۔ زربہ بھی اس کے ساتھ ساتھ دروازے تک پہنچ گئی۔ لالی نے دریافت کیا۔
 ”انجینئر کے ساتھ ڈروپور بھی ہے؟“

”ہے تو۔“ زربہ نے جواب دیا۔ ”وہ آتے ہی ادھر پچھلے کمرے میں سو گیا تھا۔ اسے بخار ہے۔ جیسی تو انجینئر خود صفدر کو چھوڑنے گیا ہے۔ گاڑی چلانا جانتا ہے۔“

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ایک طرف کھوئی پر انجینئر کا دھاری دار سیلینگ سوٹ لٹکا تھا۔ قریب ہی میز پر چڑے کا سوٹ کیس رکھا تھا۔ سوٹ کیس بند تھا۔ کمرے میں ایک طرف سنگھار میز تھی۔ اس پر شیو کرنے کا سامان بے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے کسی نے شیو کیا ہے۔

لالی دھیرے دھیرے کھڑکی کے پاس گیا۔ چوکنا نظروں سے باہر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ درختوں کے نیچے گہرا سناٹا تھا۔ البتہ بنگلے کے پچھواڑے بوڑھے چوکیدار کی کھانسی رک رک کر سنائی دے رہی تھی۔

زربہ بھی لالی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ پوچھنے لگی۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“
 لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“

اسی وقت گیٹ پر گاڑی رکنے اور ہارن بجنے کی آواز ابھری۔ زربہ نے گھبرا کر کہا۔ ”انجینئر واپس آگیا۔ اب کیا ہو گا؟“

لالی بھی گھبرا گیا۔ مگر اس نے اپنی گھبراہٹ ظاہر نہیں کی۔ ”ہونا کیا ہے۔ باہر برآمدے میں جا کر کھڑی ہو جا۔ جیسے ہی انجینئر آئے رونا شروع کر دیتا۔ وہی کہتا جو میں نے بتایا ہے اور دیکھ، میرے بارے میں بالکل کوئی بات نہ کرنا۔ ورنہ سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔“ زربہ گھبرائی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھتی رہی۔ لالی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے ڈانٹا۔
 ”میرا منہ کیا تک رہی ہے؟ اب جا باہر۔“

زربہ دروازے کی جانب بڑھی۔ لالی بھی اس کے ساتھ چلا۔ چلتے چلتے اس نے سرگوشی سے انداز میں رمان سے کہا۔ ”ذرا اپنے بال وال تو کھیر لے۔“ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور خود ہی اس کے بال اس طرح کھیر دیئے کہ وہ بے ترتیب ہو کر چہرے اور شانوں پر پھیل گئے۔ زربہ چپ کھڑی رہی، پھر بکھری ہوئی لٹیں لہراتی کمرے سے نکلی اور کو ریڈور کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں چلی گئی۔

لالی فوراً انجینئر کے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے سوٹ کیس کا تالا ہلا کر دیکھا۔ مگر تالا آسانی سے کھلتا معلوم نہ ہوا۔ ادھر بنگلے کے باہر گیٹ کھلنے اور گاڑی احاطے میں داخل ہونے کی آواز ابھری۔

لالی نے لپک کر فوراً کھوئی سے سیلینگ سوٹ کا پاجامہ اتارا۔ قمیص اتاری، بستر سے اچلی چادر کھینچی۔ چادر میں سیلینگ سوٹ لپیٹا اور اسی میں سنگھار میز سے شیوگ کا سامان اٹھا کر رکھا۔ جھٹ پٹ گٹھری باندھی اور کمرے سے نکل کر زینے کی جانب بڑھا۔

زینے کی میز پر حیاں چڑھتے ہوئے اس نے سنا، ”انجینئر باہر برآمدے میں زربہ سے کہہ رہا تھا۔“
 ”ارے، تم رو رہی ہو؟“

اس کی آواز بھاری تھی۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”یہاں کیوں کھڑی ہو؟ آؤ اندر چلیں۔“

ذرا دیر خاموشی رہی پھر زینہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گی۔ وہاں مجھے ڈر لگتا ہے۔“

لالی اس سے زیادہ کچھ نہ سن سکا۔ وہ اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا اوپر پہنچ گیا۔ اپنے کمرے میں داخل ہو کر اس نے جلدی سے جوتے بھی گٹھری میں باندھ لیے۔ میز کے قریب گیا اور پھونک مار کر لمپ بچھا دیا۔

نچلی منزل سے ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی نے ان آوازوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس نے گٹھری کندھے پر لٹکائی۔ بڑھ کر کھڑکی پر پہنچا۔ اس پر چڑھا اور پیپل کی ڈال پر چھلانگ لگا کر پہنچ گیا۔ ڈال اس کے بوجھ سے ہلی۔ لالی ذرا دیر تک ڈال سے چمٹا رہا پھر شاخوں کا سارا لیتا دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔

نیچے پہنچ کر اس نے چوکنانظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا کہیں چوکیدار ادھر نہ آجائے۔ مگر وہ اس وقت برآمدے میں تھا جہاں سے زینہ کی آواز آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ پیپل کا تنا احاطے کی دیوار سے ملا ہوا تھا۔ وہ دیوار پر پہنچا اور آہستہ سے باہر لاگے میں اتر گیا۔

لالی نے ایک سنسان مقام پر ماچس جلا کر گھڑی دیکھی۔ دو بجتے والے تھے۔ لالی پریشان ہو گیا۔ گیارہ بجتے سے پہلے ہی وہ ریسٹ ہاؤس چھوڑ چکا تھا اور اب اسے چلتے چلتے تین گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ اسے بہت پہلے گوردادپورہ پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر اسے دور دور تک کوئی بستی نظر آئی نہ نہر۔ وہ راستے سے بھٹک گیا تھا۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی وہ پریشان ہو گیا۔ لالی آگے بڑھا اور تیز تیز قدموں سے ایک سمت چلنے لگا۔

اس نے لگ بھگ تین میل راستہ طے کیا ہو گا کہ قبرستان آگیا۔ قبرستان کے آگے بستی تھی۔ نزدیک پہنچ کر وہ ایک بار پھر ٹھہر گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ قبرستان پر ویرانی چھائی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

قبرستان بہت پرانا تھا۔ جگہ جگہ جنگلی جھاڑیاں اور بھول کے درخت تھے۔ ان کے درمیان ٹوٹی پھوٹی، اونچی نیچی قبریں بکھری ہوئی تھیں۔ قبرستان کے ایک گوشے میں نیم اور سرس کے درختوں کا جھنڈ تھا۔

درختوں کے نیچے مٹی کا بنا ہوا مکان تھا۔ مکان میں چراغ روشن تھا جس کی دھندلی روشنی دور سے زرد دھبے کی طرح نظر آتی تھی۔

لالی اس طرف نہیں گیا۔ آگے بڑھا اور ایک گنڈمڑی پر چلتا ہوا قبرستان کے اندر داخل ہو گیا۔ گنڈمڑی قبروں کے درمیان سے تیچ و خم کھاتی ہوئی گزرتی تھی اور اس کی سڑک سے مل جاتی تھی جو دھندلی روشنی میں قبرستان کے دوسرے سرے پر نظر آرہی تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا

آگے بڑھتا گیا۔

اس نے قبرستان کا نصف سے زیادہ حصہ طے کر لیا۔ اب کچی سڑک صاف نظر آرہی تھی۔ وہ سڑک کی جانب چلا۔ مگر کچھ ہی دور گیا تھا کہ قبرستان کی گہری خاموشی میں تقبہ بلند ہوا۔ لالی سرا سید ہو کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ گردن تھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف اونچی نیچی قبریں تھیں۔

وہ چونکا نظروں سے دائیں بائیں دیکھتا ایک بار پھر آگے بڑھا۔ ذرا ہی دیر بعد اسے ملی جلی سرگوشیاں سنائی دیں۔ آوازیں بہت دھیمی تھیں اور داہنے ہاتھ کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے ابھر رہی تھیں۔

لالی نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا تو اسے درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی بھی نظر آئی۔ وہ گھبرا کر واپس مڑا اور پگھڑی چھوڑ کر قبروں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔ کئی بار ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ مگر وہ قبروں سے ٹھوکریں کھاتا، جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا سڑک سے قریب ہوتا گیا۔ وہ قبرستان کے ڈراؤنے اور آہستی ماحول سے جلد سے جلد نکل کر کچی سڑک پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سڑک اب بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر یہ دیکھ کر سخت پریشان ہوا کہ سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا ہے۔ وہ خوف سے جہاں تھا وہیں ٹھہر گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک کے پچھلے حصے سے پولیس والے کوڈ کوڈ کر باہر نکلنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی لٹائیاں تھیں۔ چند ہی لمحے بعد تھانے دار بھی اگلی نشست سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے گردن اونچی کی۔ کانسٹیبلوں پر نظر ڈالی اور انھیں حکم دیا۔

”قبرستان چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔“

لالی بدحواس ہو کر تیزی سے پلٹا اور قبریں پھلانگتا ہوا سرپٹ بھاگا۔ ناگاہ اس نے اندھیرے میں ٹھوکر کھائی اور ایک ٹوٹی قبر میں دھڑام سے منہ کے بل گرا۔ قبر قد آدم گہری تھی۔ مگر اندر سے کچی تھی۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی۔ پھر بھی اس کے دودانت بل گئے۔ ایک گھٹنے میں بھی درد ہو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر بیٹھنا چاہا۔ عین اس وقت قبر کے آس پاس تیز تیز قدموں سے بھاگتے دوڑنے کی آوازیں ابھریں۔ وہ جس طور گرا تھا اسی حالت میں چپ پڑا رہا۔

ذرا دیر بعد کوئی دھم سے قبر کے اندر کودا۔ مگر وہ لالی پر نہیں گرا۔ لالی نے بدحواس ہو کر سر اٹھایا۔ وہ پولیس والا نہیں تھا۔ اس کی سفید قمیص اندھیرے میں جھلک رہی تھی۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی بھی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر اس شخص نے پلٹ کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں شیشے کی گولیوں کی مانند چمک رہی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہے۔ اس شخص نے سرگوشی کی۔

”کون ہے تو؟“

”میں کبر کا مردہ ہوں۔“ یہ کہہ کے لالی نے جھپٹ کر ایک ہاتھ سے اس کی گردن دلوچ لی اور دیوار سے اڑا کر بے بس کر دیا۔

مگر وہ بھی جاندار اور ٹھکڑا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر جھکا دیا اور اپنی گردن لالی کی لرفت سے پھڑالی۔ ”صاف بتا کون ہے تو؟“

”کہہ تو دیا“ میں اس کبر کا مردہ ہوں۔“ لالی نے ناک سے منٹنا کر اسے پھر دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی اور بدستور اس پر جھکا بیٹھا رہا۔

وہ نذر ہو کر بولا۔ ”یار! مسخری نہ کر، ٹھیک ٹھیک بتا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”نہ جانے کتنی ایسی راتیں قبرستانوں میں گزر گئیں۔ مجھے تو آج تک کوئی مردہ شردہ ملا نہیں۔ تو نرالا مردہ ہے۔ بولتا بھی ہے اور کپڑے بھی پہنے ہوئے ہے۔“

وہ شخص قبر کے ایک کونے میں سکڑا سکڑایا بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ لالی کو اس کی بے باکی بہت شاق گزری۔ جی چاہا کہ اس کے منہ پر زور سے ایسا تھپڑ مارے کہ ساری ہیکڑی نکل بائے۔ مگر اب دور سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھرنے لگا تھا۔ شور سن کر لالی خود خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے سنبھل کر آہستہ سے پوچھا۔ ”یہ تو بتا یہ شور کیسا ہے؟“ لالی اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”پولیس نے چھاپا مارا ہے۔“

”پولیس نے چھاپا مارا ہے۔“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”پولیس نے کیوں چھاپا مارا ہے؟“

”ایک قبر میں ادھر جوا ہو رہا تھا۔“ اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

”تم بھی جوا کھیل رہے تھے؟“

”میں تو خاما خا پھنس گیا۔“ وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”نوے روپے بھی ہار گیا۔“

”جوا کھیلنے کے لیے جنگی جگہ تلاش کی۔“

”آج ہفتہ ہے نا۔ ہر بخت کو یہاں ضرور جوا ہوتا ہے۔ کوٹ سلیم کے علاوہ شہر سے بھی کئی بندے جوا کھینٹے آتے ہیں۔ اپنا کھیل ہوتا ہے۔ پولیس کو بھی پتہ ہے۔“

”پولیس کی مرضی کی بنا دیا دھندا چل ہی نہیں سکتا۔ پر آج چھاپا کیسے پڑ گیا؟ پولیس کا بہتا نہیں پہنچا ہو گا؟“

وہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”یار! میں تو بال بال بچ گیا۔ جیسے ہی پتہ چلا کہ دوڑ آگئی، میں نکل بھاگا۔ سامنے سے ایک کانشیل آگیا۔ اس نے جھپٹ کر اس طرح دبوچ لیا، میں تو سمجھا، لے بھی بشیر نے آن دھر لیا گیا۔ مگر میں نے زور سے جھٹکا دے کر بیٹھک لگائی۔ داؤایا فٹ بیٹھا کہ اس کے ہاتھ کھل گئے۔ ادھر میں نے زمین پر بیٹھے ہی پیچھے ہاتھ ڈال کر اس کی ٹانگ پکڑ کر زور سے کھینچی۔ وہ دھڑام سے گرا، فیر میں کہاں ہاتھ آتا۔“

”یار تو توں توں...“ لالی اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت قبر کے قریب بھاری بھاری قدموں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ بشیر نے جھٹ لالی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ لالی خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں دم سادھے بیٹھے رہے اور دھڑکتے دلوں سے آنے والے خطرے کا انتظار کرتے رہے۔ آہٹیں اور قریب آگئیں۔ پھر کسی کانشیل کی آواز سنائی دی۔

”وہ آٹھواں جوا ری کہاں کیا جی؟“

ایک اور آواز ابھری۔ ”بہ وہ کہاں ہاتھ آتا ہے“ اندھیرے میں نکل گیا ہو گا کسی طرف۔“

”اور بھی کئی ہوں گے۔“

”مگر یہ سب تو یہی بتاتے ہیں، کل آٹھ جوا ری تھے۔“

لالی اور بشیر اسے ہوئے ان کی باتیں سنتے رہے۔ وہ قبر کے بہت ہی قریب سے گزر رہے تھے۔

لیکن نہ وہ ٹھہرے نہ انھوں نے قبر کے اندر جھانکا۔

پولیس والوں کے پاس ہر جیس بھی تھیں اور تارچوں کی رک رک کر ابھرتی ہوئی تیز روشنی دونوں اپنے سروں کی بلندی پر دیکھ رہے تھے۔

ٹلی جلی آوازیں اور آہٹیں رفتہ رفتہ دور ہوتی گئیں۔ جب آوازیں خاصی دور ہو گئیں تو بشیر آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ وہ لمبا ترنگا جوان تھا۔ چھ فٹ سے بھی اونچا قد تھا۔ وہ گردن اٹھا کر باہر دیکھنے لگا۔

لالی بھی کھڑا ہو گیا۔ قبر کی اونچائی اس کی پیشانی تک تھی۔ اس نے بچوں کے بل اٹھ کر دیکھا۔ ساتوں جوا ری پولیس والوں کے زونے میں سڑک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک جوا ری

لوکھڑا کر گرا۔ پولیس والوں نے سہارا دینے کے بجائے اسے اندھا دھند پٹینا شروع کر دیا۔ چیخ چیخ کر گالیاں بھی دیں۔ وہ بدحواس ہو کر فوراً کھڑا ہو گیا۔

دونوں خوف زدہ نظروں سے یہ منظر دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد پولیس والے جوا ریوں کو مویشیوں کی طرح ہنکاتے سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے سڑک کے قریب پہنچ گئے۔ سب اس میں سوار ہو گئے۔ ٹرک اسٹارٹ ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔ جب وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا تو لالی نے بشیرے کا کندھا تھپک کر کہا۔

”لے یار! صاف بچ گیا۔“

وہ بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ ”ویسے ہوتا ہوا نا کیا تھا۔ سو دو سو روپے دے کر ہر جوا ری جھوٹ جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ رات بھر حالات میں بند رہے گا۔ سویرے ضمانت پر رہا ہو جائے گا۔ پر میں اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔“ اس نے سڑک لالی کی طرف دیکھا۔ ”پر تو قبر کے اندر بیٹھا کیا کر رہا تھا؟ میں نے جوا ریوں کے ساتھ تو تجھے دیکھا نہیں۔“

”نہیں یار! میں جوا شوا نہیں کھیلتا۔“ لالی نے حیلہ جوئی سے کام لیا۔ ”میں تو اس ٹوٹی کبر میں بیٹھ کر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ ۴۰ دن کا چلہ ہے۔“

”پر تجھے یہ پتہ نہیں، یہاں جوا بھی ہوتا ہے؟“

”چلے کا آج پہلا ہی دن تھا۔ تو نے آکر میرا وظیفہ خراب کر دیا۔“

بشیرے نے آنکھ مار کر بد معاشی سے کہا۔ ”یاری آشنائی کا چکر ہے کچھ؟“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”کسی سے آنکھ لڑ گئی؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ ورنہ تیرے جیسا جوان کہاں قبروں میں بیٹھ کر چلے کشی کرتا ہے۔“

”نہیں جی! میرے ساتھ ایسا کوئی چکر نہیں۔ میں ایسے دھندوں میں نہیں پڑتا۔“

”کسی مقدمے میں پھنس گیا ہو گا۔“ اس نے سڑک لالی کی جانب دیکھا۔ ”یار اب اس قبر سے تو نکل۔“

بشیرے نے دونوں ہاتھ باہر زمین پر نکائے، اچھلا اور دونوں ٹانگیں قبر کے اندر کی دیوار سے ٹکا کر دھیرے دھیرے گھسٹتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں اور کپڑوں پر سے خاک جھاڑی، جھک کر لالی کو دیکھا۔ ہنس کر بولا۔ ”یار! تو اتنی گہری قبر سے باہر کیسے نکلتا ہے؟“ اس نے اپنا ہاتھ لالی کے طرف بڑھایا۔

”لے میرا ہاتھ پکڑ لے۔“

”رہنے دے۔“ لالی نے اس کے ہاتھ کا سارا لینے سے انکار کر دیا۔ جھک کر اپنی گٹھری اٹھائی۔ اسے کندھے پر لٹکایا۔ دونوں ہاتھ اونچے کئے۔ قبر کے باہر کی زمین تھامی۔ اچھلا اور ایک ہی زغند میں اس صفائی سے باہر آیا کہ بشیر ادنگ رہ گیا۔

”یار توں تو کوئی اونچی چیز لگتا ہے۔“

لالی اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”یہ بتا، تیں نوں اب کتھے جاتا ہے؟“

”میں نے تو کس نہیں جانا۔ یہیں قبرستان میں رہوں گا۔“

”تو گور کن تو نہیں ہے؟“

”یار! تو نے حد کر دی۔“ وہ کسی قدر تیکھے لہجے میں بولا۔ ”میں تجھے گور کن لگتا ہوں۔“

لالی نے اس کی سفید قیص اور خاکی چٹلون غور سے دیکھی۔ چند لمبے خاموش رہا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھنے میں تو پوسیا لگتا ہے۔“

وہ ہنس کر بولا۔ ”ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔“

لالی گھبرا گیا۔ بشیر نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ ہلکا سا تقمہ لگایا۔ ”دور نہیں، دو سال ہوئے میں نے پولیس کی ملازمت چھوڑ دی۔“

”چھوڑ دی یا نکال دیا گیا۔“

”نکال دیا گیا، یوں ہی سمجھ لے۔ ویسے پولیس کی نوکری مجھے پسند نہیں تھی۔ تنخواہ کم اور ہر وقت کی دلیل، رشوت نہ بھی لو تب بھی بدنام۔“

لالی خاموش رہا۔ بشیر ابھی چپ ہو گیا۔

اب رات کا چل چلاؤ تھا۔ مشرق میں صبح کا ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے اذان بلند ہوئی۔ لالی پریشان ہو گیا۔ اب قبرستان میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس نے بشیر سے کہا۔

”تو یہاں ٹھہر۔ میں نوں تو اب جاتا ہے۔“ وہ چلنے کے لیے مڑا۔ بشیر نے اسے روک لیا۔

”یار! ایسی بھی کیا جلدی چائے پی کر جانا۔“

”چائے؟“ لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”چائے یہاں کہاں ملے گی؟“

”کیوں نہیں ملے گی۔“ بشیر اہنس کر بولا۔ ”ابھی تجھے چائے پلواتا ہوں۔“

”نہیں جی! میں نے چائے شائے نہیں پینی۔“

”چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔“ بشیر ابے تکلفی سے بولا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا

پیک نکالا۔ لالی کی طرف بڑھایا۔ ”لے، پہلے ایک سگریٹ پی۔“ لالی نے سگریٹ پینے سے بھی انکار کر دیا، مگر بشیر انا مانا۔ اس نے سگریٹ سلگائی اور اصرار کر کے لالی کے ہونٹوں سے لگا دی۔ پھر لالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”آمیرے ساتھ۔ آرام سے بیٹھ کر چائے پییں گے، فیر جہاں تیرا جی کرے، چلا جانا۔“

اس نے ایسا مجبور کیا کہ لالی کے لیے مزید انکار کی گنجائش نہیں رہی۔ وہ بشیرا کے ہم راہ چپ چاپ آگے بڑھنے لگا۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلنے لگے۔ قریب جا کر بشیرا نے مکان کے بند دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھے نے جھک کر بشیرے کو دیکھا اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اندر آجاؤ، اندر آجاؤ۔“

اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے۔ بشیرا اور لالی خاموشی سے اندر چلے گئے۔ بوڑھے نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ وہ ابھی تک گھبرایا ہوا تھا، بشیرے کو مخاطب کر کے بولا۔ ”کہاں چلا گیا تھا؟ پولیس نے چھاپا مار کر کئی جوار یوں کو پکڑ لیا۔ پولیس ذرا ہی دیر پہلے یہاں سے گئی ہے۔“

”مجھے سب معلوم ہے۔“ بشیرا قریب پڑی ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے لالی کو بھی ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ ”چاچا! تو تو کہتا تھا، پولیس کل چھاپا مارے گی۔ آج کیسے دوڑ آگئی؟“

”مجھے تو شیر محمد کاشمیل نے یہی بتایا تھا۔“

بشیرا شکوہ کرنے لگا۔ ”چاچا! تو نے تو آج مروا ہی دیا تھا۔ بال بال بچ گیا۔“

”کیا تو بھی جوا کھیلنے بیٹھ گیا تھا؟“

”میں تو ایسے ہی کھیل دیکھنے گیا تھا۔ انھوں نے زبردستی بٹھالیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔

”چاچا! اب تو فناف گرم گرم چائے پلوا دے۔ سر میں درد ہو رہا ہے۔“

”بکستاور نے مجھے دوہلی تو ابھی چائے آجائے گی۔“

”سکندر واپس آگیا؟“

”نہیں جی! وہ شام تک شہر سے لوٹے گا۔“ بوڑھے نے بشیرا کو بتایا۔ ”تم آرام سے بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنوا کر لاتا ہوں۔“ اس نے گھر کے اندر جانے والا دروازہ کھولا اور کمرے سے چلا گیا۔

بشیرے نے لالی سے کہا۔ ”یہ پیر بخش ہے، قبرستان کا گورکن۔ اپنا پراتا یا رہے۔ سمجھو یہ اپنا ہی

گھر ہے۔“ چند لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔

”یار! تو نے اپنا نام نہیں بتایا؟“

لالی نے اس کے سوال کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ ”میرا نام روشن ہے جی۔“

مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ دونوں رات بھر کے جاگے ہوئے تھے۔ تھکن سے نڈھال تھے۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا پیر بخش اندر آیا، کہنے لگا۔ ”ادھر ڈیرے پر آجاؤ۔ میں نے تیری منجی کے ساتھ ایک کھٹ اور ڈلوادی ہے۔ ساری رات جاگتے گزر گئی۔ اب تو سو جا۔“

بشیرا کسی قدر تکیے لہجے میں بولا۔ ”سونا سلا تا بعد کی بات ہے۔ چاچا! پہلے یہ بتا، چلے کا کیا بتا؟“

”خالی چائے سے کیا بنے گا۔ بیٹ میں تھوڑی سی روٹی بھی جانی چاہئے۔“ پیر بخش نے مسکرا کر کہا۔ ”اب کھڑا ہو جا۔“

بشیرا اور لالی کھڑے ہو گئے۔ پیر بخش کے پیچھے چلتے ہوئے کمرے سے نکل کر دالان میں آگئے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ تینوں صحن میں پہنچ گئے۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ چمپر پرا تھا۔ یہ جھلیانی تھی۔ اس میں چولہا تھا جس میں آگ جل رہی تھی۔ چولہے کے قریب ایک نوجوان عورت بیٹھی پراٹھے تیار کر رہی تھی۔ وہ پیر بخش کی ہونٹیاں دیکھ کر آہٹ سن کر اس نے ان کی طرف دیکھا۔ سر سے ڈوپٹے کا آئینل کھینچا اور بکل مار کر چہرے کو کسی قدر چھپالیا۔

پیر بخش نے اسے مخاطب کیا۔ ”بکھتا اور! ہمتی تھ چلا۔ دونوں رات بھر کے بھوکے ہیں۔“ تینوں نے صحن عبور کیا۔ پیر بخش نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ باہر آگئے۔ صحن کے دروازے کے سامنے بڑا آمدہ تھا۔ اس کے پیچھے کرہ تھا۔ درمیان سے پتلی سی گلی گزرتی تھی۔ گلی عبور کر کے تینوں برآمدے میں پہنچے اور کمرے کے کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ کرہ صاف ستھرا تھا۔ اس میں دو چار پائیاں تھیں۔ ان پر بستر لگے تھے۔ فرش پر چٹائی بچھی تھی۔ تینوں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ پیر بخش زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرا۔ واپس آنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔ مگر آئیاں۔ کچھ دیر بعد بختاور کمرے کے اندر آئی۔ اس نے اس وقت بھی ہلکا سا گھونٹ نکال رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں المونیم کا تھال تھا جس میں پراٹھوں کے ساتھ ساتھ دو پیالوں میں چائے بھی تھی۔ اس نے نظریں نیچی کئے ہوئے کہا۔

”چاچا باہر کسی سے گل بات کر رہا ہے۔ ادھر بستی میں موت ہو گئی ہے۔ کبر تیار کرنے کی گل ہو

ہی ہے۔“

وہ جھکی اور تھال بشیرا اور لالی کے درمیان رکھ کے واپس چلی گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد لوٹنے میں

اپنی لے کر آئی۔ کہنے لگی۔ ”کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے لیتا۔“

وہ باہر چلی گئی۔ بشیرا اور لالی اٹھ کر برآمدے میں گئے اور لوٹے سے پانی لے کر کلیاں کرنے لگے۔ انہوں نے منہ دھویا اور اندر واپس آگئے۔

دونوں چٹائی پر بیٹھ کر پراٹھے کھانے لگے۔ پراٹھے گرم تھے۔ دونوں بھوکے بھی تھے۔ مزے لے لے کر سارے پراٹھے کھا گئے۔

چائے پیتے ہوئے بشیرا نے لالی سے پوچھا۔ ”روشن! یہ بتا، تجھے جانا کہاں ہے؟“

”سٹیشن۔“ لالی نے مختصر جواب دیا اور جان بوجھ کر اسٹیشن کا نام نہیں لیا۔

”سٹیشن سے کہاں جائے گا؟“

”کراچی کی گندی پکٹنی ہے۔“

”لے یار! ملا اسی بات پر ہاتھ۔“ اس نے گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”کراچی تو مجھے بھی جانا ہے۔ دونوں کل صبح کی ٹرین سے اکٹھے چلیں گے۔ رات کو تھوڑا سا کام کرنا ہے۔ تو بھی ساتھ لگ جاؤ کام جلد ہی منٹ جائے گا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”سچ پوچھ تو میں نے تجھے اسی کام کے لیے روکا تھا۔“

”کام کیا کرنا ہو گا؟“

”یہ میں تجھے رات ہی کو بتاؤں گا۔“

لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”تو کفن چور تو نہیں ہے؟“

”نہیں یار! میں ایسا گھنیا کام نہیں کرتا۔“

”فیر کیا کام ہے؟“

”کہہ تو دیا، رات کو آرام سے بات ہوگی!“

بشیرا اٹھا اور چارپائی پر جا کر دروازہ ہولیا۔ لالی کچھ دیر چٹائی پر گرم صم بیٹھا رہا پھر وہ بھی اٹھ کر دوسری چارپائی پر لیٹ گیا۔ بشیرا ذرا ہی دیر بعد خراٹے بھرنے لگا۔ مگر لالی کو نیند نہیں آئی۔ بشیرا کی باتوں نے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ کمرے میں مختصر سی کھڑکی بھی تھی جو کمرے کے پچھواڑے کھلتی تھی۔

لالی کروٹ بدل کر کھڑکی کی جانب دیکھنے لگا۔ باہر الماس کا اجڑا ہوا درخت تھا۔ درخت کے پتے

گر چکے تھے۔ شاخوں میں کوئٹلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ہر طرف زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ لالی کئی منٹ تک چپ لیٹا رہا۔

غنودگی کا غلبہ ہوا تو وہ بھی گہری نیند سو گیا۔

دوسرے کو آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا بخٹاور دہلیز پر کھڑی ہے۔ وہ لالی کو بیدار کرنے کے لیے دروازے کی کنڈی آہستہ آہستہ بجاری تھی۔ کھانا لے کر آئی تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بخٹاور نے کھانا چٹائی پر رکھ دیا اور قریب بیٹھ کر کھانے پر مہذبہ تاقی ہوئی کھیاں ہاتھ ہلا کر اڑانے لگی۔ لالی نے بشیرے کی چارپائی پر نظر ڈالی۔ اس کا بستر خالی تھا۔ لالی چارپائی سے اتر کر نیچے آیا۔ اس نے بخٹاور سے پوچھا۔

”بشیر اکہاں ہے؟“

بخٹاور نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔ ”وہ چاچا کے ساتھ کوٹ سلیم گیا ہے۔ دن ڈھلے لوٹے گا۔ اس نے روٹی کھالی ہے۔ توں اس دھکت سورہا تھا۔“

”کتنی دیر ہوئی دونوں کو گئے ہوئے؟“

”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ جانا تو انہیں سویرے ہی تھا پر چاچا کو ایک میت دفن کرنی تھی۔ اسی میں دیر ہو گئی۔“

لالی نے پھر کوئی بات نہیں کی۔ وہ کھانا کھانے لگا۔ کھانے میں روٹی تھی۔ ساگ تھا۔ اچار اور مکھن بھی تھا۔ بخٹاور چٹائی پر خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ ندامتور کر آئی تھی۔

اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ بال خشک تھے۔ سانولی رنگت تھی۔ بدن مضبوط اور صحت مند تھا۔ ناک نقشہ سبک تھا۔ عمر بھی بائیس تیس برس سے زیادہ نہیں تھی، مگر اس کے چہرے پر عجب دیرانی برستی تھی۔ وہ بھیجھی دکھائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے چہرے کی دیرانی محسوس کی اور یہ بھی محسوس کیا کہ قبرستان کی طرح گھر میں بھی گہری خاموشی ہے۔ اس نے بخٹاور سے پوچھا۔

”تیرے سوا یہاں اور کوئی نہیں؟“

”اس دھکت تو کوئی نہیں ہے۔“ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو گھورا۔ ”پر تو یہ کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”نراض کیوں ہوتی ہے۔“ لالی مسکرا کر بولا۔ ”تیرے بال بچے نہیں ہیں؟“

”نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔ ”بچ سال پہلے مرا ہوا نکا پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد کوئی نہیں ہوا۔“ اس کے سانولے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔

لالی نے اس کی افسردگی کا سبب فوراً تاڑ لیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”فکر کیوں کرتی ہے۔ بال بچے بھی ہو جائیں گے۔ ابھی تو بوڑھی تو نہیں ہو گئی۔“

بخٹاور نے نگاہ اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں دیران اور خالی خالی تھیں۔ وہ نظریں نیچی کئے چند لمحے گم صم بیٹھی رہی۔

اس نے گہری سانس بھری اور آہستہ سے بولی۔ ”چاچا کو پوتا پوتی کا بہت چاؤ ہے۔ وہ سکندر کا دوسرا دیاہ کرنا چاہتا ہے۔“ دل کی بات بے اختیار بخٹاور کی زبان پر آ گئی۔

”سکندر تیرا کھسٹ ہے نا؟ وہ کیا کہتا ہے؟“

”وہ کیا کہے گا۔ جو پیو کہے گا، وہی کرے گا۔ ایک وڈی ننائی ہے، پڑوس کے چک میں دیا ہی ہے۔ جب آتی ہے، وہ بھی پیو اور بھائی کو اکساتی ہے۔“

لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل بتائے۔ وہ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ بخٹاور خاموش بیٹھی رہی۔ ”ایک گل پوچھوں، برا تو نہیں منائے گا؟“

”پوچھ، کیا پوچھنا چاہتی ہے۔“

بخٹاور ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”یہ گندا کام کرتے تمیں نوں برا نہیں لگتا؟“

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”کیسا گندا کام؟“

”مہی جو بشیرا کرتا ہے۔“

”بشیرا کیا کرتا ہے؟“ لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

اس بار وہ زیر لب مسکرائی۔ ”تمیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔“

”مجھے کیا پتہ۔ میں تو بشیرا کو ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔ میرا تو اس سے کل رات ہی میل ملاپ

ہوا ہے۔“

بخٹاور نے تعجب سے کہا۔ ”رات توں بھی ادھر ٹوٹی کبر میں جو اکیل رہا ہو گا؟“

”نہیں جی، میں جو اشوا نہیں کھیلتا۔“ وہ تھکے لہجے میں بولا۔ ”تو نے یہ نہیں بتایا، بشیرا کیا کام کرتا

ہے!“

”اسی سے پوچھ لینا۔ چاچا خاما خامیرے گلے پڑ جائے گا۔“

لالی اب کھانا کھا چکا تھا۔ بختاور نے برتن اٹھائے اور کمرے سے جانے لگی۔ لالی نے اسے روکا۔ ”گل سن بختاور۔“

”کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“ اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا۔

”ڈرتی کیوں ہے؟ میں تیرا نام نہیں بتاؤں گا۔ اب بتا بات کیا ہے؟“

مگر بختاور نہیں رکی۔ ”مجھے جانے دے۔ ابھی ڈھیر سارے کام کرنے ہیں۔“ وہ کمرے سے چلی گئی۔



لالی سخت غصے میں پڑ گیا۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ بشیرا ایسا کون سا کام کرتا ہے جسے بختاور بہت برا سمجھتی ہے، اور بتانے سے بھی ڈرتی ہے۔

بختاور کی باتوں سے اس نے یہ بھی اندازہ لگا لیا کہ پیر بخش گور کن بھی اس دھندے میں بشیرا کے ساتھ شریک ہے۔ لالی کے ذہن میں کریڈ پیدا ہوئی کہ کسی طرح یہ بھید معلوم کیا جائے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا، مگر قرار نہ آیا۔

اس نے کمرے کا دروازہ کھولا اور برآمدے میں آگیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برآمدے کے سامنے کی گلی بھی دیران تھی۔ گلی کے دوسری طرف پیر بخش کے گھر کا دروازہ تھا جو صحن میں کھلتا تھا۔

لالی برآمدے میں کھڑا دروازہ تکتا رہا اور انتظار کرتا رہا کہ شاید بختاور باہر نکلے۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ بختاور نظر آئی۔ آخر لالی خود ہی آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ دروازے پر پہنچا۔ دستک دینے کے لیے اس نے ہاتھ رکھا تو دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ بختاور پڑ چھتی کے نیچے چوڑے پر ٹانگیں پیارے بیٹھی تھی، چٹائی میں مدھانی ڈالے اطمینان سے دودھ پلو رہی تھی۔ بختاور نے آہستہ سن کر دروازے کی جانب نظرس اٹھائیں۔ لالی کو اس نے وہاں کھڑے دیکھا تو دوپٹے کا پلو کھینچ کر گھونگھٹ نکال لیا، آہستہ سے پوچھا۔

”کیسے آیا؟“

”ماچس ہو تو دے دے۔“

بختاور فوراً کھڑی ہو گئی۔ ”کمرے میں چل، میں ابھی ماچس لے کر آئی۔“ وہ پڑ چھتی سے نکل کر صحن میں آگئی۔

لالی دروازے سے ہٹ کر کمرے میں پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد بختاور بھی کمرے میں آگئی۔ اس نے

اچس لالی کے سامنے ڈال دی۔ لالی نے ماچس اٹھا کر سگریٹ سلگائی اور ایک کش لگا کر بختاور کی جانب دیکھا۔

”کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“

”کوئی اور کام ہو تو بتا دے۔“ وہ بدستور کھڑی رہی۔ ”میں نوں ابھی دودھ بلوٹا ہے۔ نمی پر چائی چھوڑ کر آئی ہوں۔“

لالی اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”کبھی سر میں تیل اور آنکھوں میں کاجل تو ڈال لیا کر۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”کبرستان میں رہتے رہتے تو بھی ٹوٹی پھوٹی کبریں گئی۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔“

”تیں نوں کیسہ پتہ، مجھ پر کیا نیت ہے۔“ بختاور نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مردا یسا ملا ہے، نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا اور چاچا تو صرف پیسہ جوڑتا ہے۔ جو آتا ہے، سیدھا اس کے گلک میں جاتا ہے۔“

”تیرے ماں بیو نہیں ہیں؟“ یہ بات پوچھ کر لالی نے گویا بختاور کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”اپنا تو کوئی بھی نہیں۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہی۔

”اماں تھا، وہ بھی دو سال ہوئے گزر گیا۔“

لالی نے خاموشی سے جب میں ہاتھ ڈالا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر بختاور کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے، یہ رکھ لے۔ اپنے لیے تیل، کاجل اور دندا سا شند اس خرید لے۔“

بختاور نے نوٹ لینے سے انکار کیا۔ مگر لالی نے اصرار کیا تو اس نے نوٹ لے کر دھوئی کی ڈب میں رکھ لیا۔ ذرا دیر دونوں خاموش رہے پھر لالی نے دریافت کیا۔

”تیرا بیو بھی گور کن تھا؟“

”نہ جی، میرے تو تاتے داروں میں بھی کسی نے یہ دھندا نہیں کیا۔ کبر کھودنا، مردے دفن کرنا، یہ بھی کوئی کام ہے۔ شروع شروع میں تو میاں اتنا جی گھبراتا تھا، ایسا ڈر لگتا تھا، سوتے سوتے اٹھ کر بیٹھ جاتی۔ گھنٹوں رویا کرتی، بالکل پیلی پڑ گئی تھی۔ بکھار رہنے لگا تھا۔“ وہ بیٹے دنوں کی یادوں میں کھو گئی۔ اس کا لہجہ رفتہ رفتہ افسردہ ہوتا گیا۔ ”اماں بے چارہ گریب مزارع تھا۔ اوپر سے مامی ہر دھت کرکڑ کرتی رہتی تھی۔ سو اماں نے مجھے سکندر کے پلے باندھ دیا اور میں جیتے جی کبرستان میں آگئی۔“ وہ بے خیالی میں زمین پر انگلی سے لکیریں بنانے لگی۔

”اب چاچا کہتا ہے، سکندر کا دوسرا ویاہ کروں گا۔“

”اے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔“ لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”یہ تو بتا، تیرا گھروالا سکندر کیسا بندہ ہے؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔“

”تجھے کیا بتاؤں۔“ بختاور نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ دل گرفتہ تھی۔ نہ جانے کب سے ہمدردی کے دیوبول سننے کے لیے ترس رہی تھی۔ لالی نے اس کی ذات میں دلچسپی لے کر اظہار ہمدردی کیا تو موسم کی طرح پکھل گئی۔ وہ اس وقت اپنے دل کی بھڑاس نکال دیتا چاہتی تھی۔ ”جب میرا ویاہ ہوا تو سکندر ۱۳ سال کا چھوہرا تھا اور میں ۱۶ سال سے بھی اوپر کی ہو چکی تھی۔ ویاہ کے دکھت پوری جوان تھی۔“ یہ بتاتے بتاتے اس کے لہجے میں اچانک تنگی آئی۔ ”پہلے پونے چوروہنا کر رکھا۔ فیروہوں نے۔ چاچا اتنا بوڑھا ہو گیا پر اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا۔“

”بیر بخش اتنا بچہ اور بے گیرت ہے، یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“

”ایک دم بے گیرت ہے۔ سکندر بھی بے گیرت ہے۔“ بختاور نے غصے سے منہ بگاڑا۔ ”سب کچھ بناتا ہے پر بیو کے سامنے کتے کی طرح دم ہلاتا ہے۔“

لالی نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ ”بشیرے کا کیا معاملہ ہے؟“

”وہ مجھے کبھی چنگا بندہ نہیں لگا۔“ بختاور نے جواب دیا۔ ”پر اس نے کبھی مجھے بری نظر سے نہیں دیکھا۔“

لالی نے تعجب سے کہا۔ ”سکندر کی طرح بشیرا بھی تیری طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ دیکھنے میں تو بری نہیں لگتی۔“ لالی نے نظر بھر کر دیکھا۔ اسے بختاور میں شاداں کی جھلک نظر آئی۔ لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”ابھی تو جوان میاں ہے۔ ذرا بناؤ سنگھار کر لے تو سوہنی نظر آنے لگے گی۔“

بختاور کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ شرما گئی۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”ایسی گلاں کر کے کیوں مجھے بہکانے کی کوشش کر رہا ہے؟“ یہ کہتی ہوئی وہ اٹھنے کے لیے کسمائی۔ ”چاچا آتا ہی ہو گا۔“ اس کے چہرے کی ٹکفلی فوراً ماند پڑ گئی، ہلکا ہلکا خوف منڈلانے لگا۔

مگر لالی نے اسے اٹھ کر جانے نہیں دیا۔ ”میں تجھے کبرستان سے نکال کر باہر لایا، تو فیہ کبرستان کی طرف چلی۔ زندہ رہتا ہے تو زندہ بن کر رہ۔ نہیں تو جلد ہی مرجائے گی۔“

”یہ تو مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔“ وہ ہلکے لہجے میں بولی۔ ”سچ کہتی ہوں، میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گی۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وہ اور افسردہ ہو گئی۔ ”کوئی بھی تو کشمی نہیں، کچھ بھی نہیں۔ ایسا جینا کس کام کا۔ مراؤں گی تو ٹھیک ہی ہو گا۔“

”کیا ٹھیک ہو گا؟“ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”بیر بخش تو خوش ہو گا۔ وہ سکندر کا جھٹ دوسرا ویاہ کر دے گا۔ جو بھی نئی ویاہ کر آئے گی، اسے بھی تیری طرح اپنی جو روہنا لے گا۔ سکندر تو کچھ کے گا نہیں۔ یہ تجھے بھی پتہ ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

بختاور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہ زمین پر انگلی سے الٹی سیدھی لکیریں بنا رہی تھی۔ لالی نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

”میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”بتا، میں کیا کروں؟“

”بتاتا ہوں، ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے یہ بتا، بشیرا کیا دھندا کرتا ہے؟“

بختاور کو لالی کی بات پسند نہیں آئی۔ تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ ”مجھے اسی لیے روکا تھا؟ تو فیہ سن لے۔ بشیرا کبروں سے مردوں کے بنجر نکالتا ہے۔“

”مردوں کے بنجر نکالتا ہے؟“ لالی نے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے دیکھا جیسے یقین نہ آیا ہو۔ ”مگر وہ انہیں کس لیے نکالتا ہے؟“

”پتہ نہیں۔“ بختاور نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میں نوں تو اتنا پتہ ہے وہ بنجروں کی ہڈیاں بکسوں میں بند کر کے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔“ وہ چند لمحے چپ بیٹھی رہی۔ ”اس نے چاچا اور سکندر کو بھی اسی رستے پر لگا دیا ہے۔ ذرا سوچ کتنا گندہ کام ہے۔ مردوں کی مٹی کھراب کرتے انہیں ذرا بھی تو ڈر نہیں لگتا۔“

”بشیرا ایسے رہتا ہے؟“

”نہ جی، وہ یہاں کیوں رہنے لگا۔ مینے، ڈیڑھ مہینے میں ادھر کا پھیرا کرتا ہے۔ اس دفعہ تو کوئی تین مہینے بعد آیا ہے۔ پر جب بھی آتا ہے، تین چار روز ضرور ٹھیرتا ہے۔ اب کے وہ کئی دنوں سے ٹھیرا ہوا ہے۔ جواریوں کو پکڑنے پولیس کی جو دوڑ آئی تھی، بشیرا ہی نے چاچا کے ذریعے بلوائی تھی۔ چاچا کھبری کرنے خود تھانے گیا تھا۔“ لالی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بختاور کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

”اب مجھے جانے دے۔“

”چاچا کا ڈر لگ رہا ہے، یہی بات ہے نا؟“

”تمیں توں پتہ نہیں، وہ کیسا بندہ ہے۔“

”اس کے بارے میں جاننے کو اب رہ کیا گیا ہے۔ سبھی کچھ تو بتا دیا۔ پر اس سے اتنا ڈرتی کیوں ہے؟“

”ڈروں نہیں تو کیا کروں۔ کٹا اپنے کھونے پر اچھلتا ہے۔ میرا کوئی بھی کھونا نہیں۔“

”مجھے پتہ ہے۔ پر تو جوان ہے اور جوان میاں کو جوان اور سوہنی ہی بن کر رہنا چاہئے۔ جس زنانی کا کوئی نہیں ہوتا، وہ اسی کے سارے زندہ رہتی ہے۔ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے؟“

”سمجھ رہی ہوں، سب سمجھ رہی ہوں۔“

دو دنوں چند لمحے خاموش رہے۔ لالی نے کہا۔ ”جانے سے پہلے ایک بار تیرے پاس ضرور آؤں گا“ صرف ایک بات کہنے کے لیے۔ سونا نہیں، رات کو میرا انتظار کرتا۔“

وہ بے چین ہو کر بولی۔ ”ابھی بتا دے۔“

”ابھی نہیں، رات کو بتاؤں گا۔ اب توڑ جا۔“

بختاور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے مڑ کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہی شاداں کی چال، وہی گھڑی کے پنڈولم کے مانند ادھر سے ادھر جھولتے ہوئے کولھے، وہی پتھر کی طرح ترشا ہوا ٹھوس بدن۔ لالی اسے دیکھتا رہا۔

جب وہ صحن کا دروازہ کھول کر گھر کے اندر چلی گئی تو لالی اٹھا۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔



لالی بیدار ہوا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلا تھا۔ بشیرا چارپائی کے پاس کھڑا سے آہستہ آہستہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ لالی نے آنکھیں کھولیں تو وہ ہنس کر بولا۔ ”یار! بہت سو لیا۔ شام ہو رہی ہے۔ اب تو اٹھ جا۔“ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”منہ دھو لے، نیند کا شمار اتر جائے گا۔“

لالی چپ چاپ چارپائی سے نیچے اتر کر کمرے سے باہر گیا اور منہ ہاتھ دھو کر واپس آگیا۔ بشیرے نے مسکرا کر کہا۔ ”دھر، میرے پاس آکر بیٹھ۔ اب تجھ سے کچھ کام کی باتیں ہو جائیں۔“

مگر لالی اس کے پاس نہیں گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ ”پہلے یہ بتا، کیا تو کبروں سے مردوں کے پنجر نکالتا ہے؟“

”نکالتا تو ہوں۔“ وہ انکار نہ کر سکا۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا، مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ ”مگر یہ بات

تجھے بتائی کس نے؟“

”کسی نے بھی بتائی، پر میں اس چکر میں نہیں پڑوں گا۔“

بشیرا نے کسی قدر پریشان ہو کر کہا۔ ”بات کیا ہے؟“

”بات یہ ہے کہ یہ بہت گند اکام ہے۔ میں ایسے کام نہیں کرتا۔“

بشیرا لمحے بھر تک لالی کو گھورتا رہا پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کر۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا نیک اور بھلا مانس ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”کہتا تھا، میں قبر کے اندر وظیفہ پڑھ رہا تھا۔ لیکن تیرا ۴۰ دن کا چلہ ایک ہی رات میں ختم ہو گیا اور اب کراچی جانے کو کہتا ہے۔“

لالی نے فوراً بات بنانے کی کوشش کی۔ ”کہنے کو تو میں نے یہ بھی کہا تھا، میں کبر کا مردہ ہوں۔“

بشیرا ذرا متاثر نہ ہوا۔ اسی طرح تیکھے لہجے میں بولا۔ ”زیادہ باتیں نہ بنا۔ کسی مغالطے میں نہ رہتا۔ میری آنکھ پولیس والے کی آنکھ ہے۔ میں نے رات ہی کو تیری باتوں سے ماڑ لیا تھا، کوئی واردات کر کے بھاگا ہے۔ جیسی تو پولیس کے ڈرے قبر میں چھپا بیٹھا تھا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ پیر بخش لالین سنبھالے ہوئے داخل ہوا۔ اس نے لالین چھت سے لٹکائی اور بشیرے سے پوچھنے لگا۔ ”تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔ کام کب شروع کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ذرا اندھیرا اور بڑھ جائے تو سکندر کے ساتھ کھدائی شروع کر دیتا۔ میں آج ہی رات چلا جاؤں گا۔ ٹرک ایک بجے تک پہنچ جائے گا۔ لیکن تب تک سارا کام پورا ہو جانا چاہئے۔“

”فکر نہ کر۔ سارا کام ٹھیک ٹھیک پر ہو جائے گا۔“ پیر بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”پر کام شروع کرنے سے پہلے کچھ کھا پی لے۔“

”مجھے تو بالکل بھوک نہیں۔“ بشیرا نے لالی سے کہا۔ ”پنہ لیے روٹی منگوا لے۔“

”بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے۔ میں بعد میں کھاؤں گا۔“ لالی نے پیر بخش کی جانب دیکھا۔

”چاچا! میرے لیے روٹی پیس رکھو اور بنا۔ جب بھوک لگے گی، کھاؤں گا۔“

”جیسی تم دونوں کی مرضی۔“ پیر بخش کمرے سے چلا گیا۔

لالی اپنی چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ بشیرا نے لالی کو ٹٹولا۔ ”یار! اتنا گھبرا کیوں رہا ہے؟ یہ تو سیدھی سیدھی برٹس ہے۔“ اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا۔

”تیری برٹس شنز نس سمجھ نہیں آئی۔ نہ جانے کیا چکر ہے۔“

- ”وہ زیر لب مسکرایا۔ ”تجھے ایک راز کی بات بتاؤں، ہر وڈا سرکاری اسپتال مردوں کے نیچے فروخت کرتا ہے۔“

لالی کو اس کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ”نہیں جی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔“ بشیرا نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ ”یہ جو مالوں میں لاوارث لاشیں رہ جاتی ہیں، تیرے خیال میں کیا انہیں کفن میں لپیٹ کر دفن کیا جاتا، قبر بنائی جاتی ہے؟ یا ر! کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایسی لاشیں کچھ عرصے تک اسپتالوں کے مردہ س میں پڑی رہتی ہیں، بعد میں ڈاکٹری پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں ان کی چر بھاڑ کرتے ہیں۔ فیروہ بن اسپتال ہی کے ایک حصے میں زمین کھود کر دبا دی جاتی ہیں۔ سال سوا، سال بعد جب کھال اور ت گل سڑ کر مٹی بن جاتے ہیں اور صرف ہڈیوں کا بچہ رہ جاتا ہے تو اسے نکال کر فروخت کر دیا ہے۔“

”حد ہو گئی جی۔“ لالی منہ بگاڑ کر نفرت سے بولا۔ ”سرکاری اسپتال یہ دھند ابھی کرتے ہیں۔“

”اگر اسپتال یہ دھند نہ کرتے تو اپنا دھند کیسے چلتا؟ یوں سمجھ لے، اسپتالوں کے نام پر اپنا ر ابھی چل رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سرکاری اسپتال سے ۱۰ بچہ خریدے جاتے ہیں تو رجسٹر میں نا کر دکھائے جاتے ہیں۔ جو کی رہ جاتی ہے وہ ہماری سلائی سے پوری کر دی جاتی ہے۔“

لالی ذرا دیر بھونچکا بیٹھا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ”یار بشیرے! تو اس چکر میں کیسے پڑ گیا؟“

”یہ نہ پوچھ۔ اسی چکر میں تو پولیس کی ملازمت گئی۔“ بشیرے نے گہری سانس بھر کر بتایا۔ ”چار سال ادھر کی بات ہے۔ میں ان دنوں کراچی میں تعینات تھا۔ ہوا یہ کہ پولیس کو ایک رات پر ایک لاش ملی۔ لاش بری طرح کچلی ہوئی تھی۔ بظاہر ایکسڈنٹ کا کیس لگتا تھا۔ پولیس کی ای ٹی تفتیش کے بعد لاش کئی روز تک اسپتال کے مردہ خانے میں پڑی رہی۔ جب کوئی لینے نہیں ڈ اسپتال والوں نے لاش لاوارث قرار دے کر اسپتال کے اس حصے میں دبا دی جہاں ایسی لاشیں اکی جاتی ہیں۔ یادداشت کے لیے اس جگہ رجسٹر کے اندراج کے حساب سے تختی پر نمبر بھی لگا آتا ہے۔“

لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اطمینان سے بتاتا رہا۔ ”فیر ایسا ہوا کہ چار مہینے بعد اوپر والوں کو یہ اطلاع ملی کہ وہ ایکسڈنٹ کا نہیں قتل کا کیس تھا۔ متونی سرگودھا کا نہ والا تھا، کاروبار کے سلسلے میں کراچی آیا تھا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”ایک مجسٹریٹ کی فی میں عدالتی انکوائری ہوئی۔ جس جگہ لاش دفن تھی اس کی نگرانی کے لیے میری اور عبداللہ

کوئی چکر شکر نہیں۔“ بشیرے نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ ”میں تجھے سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔ بات صرف اتنی ہے، میں کراچی کی ایک کمپنی کو مردوں کے بچہ سلائی کرتا ہوں اور بھی کئی بندے یہ دھند کرتے ہیں۔“

”پر کمپنی بچہ لے کر کرتی کیا ہے؟“

”باہر کے ملکوں کو ایکسپورٹ کرتی ہے۔ آج کل مال یونان اور اٹلی جا رہا ہے۔ پانچ سو ڈھانچوں کا آؤر ہے۔“

لالی بدستور حیرت زدہ تھا۔ ”مگر مردوں کے یہ بچہ کس کام آئیں گے؟“

”یار! حد ہو گئی۔“ بشیرا ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”یہ میڈیکل کالجوں میں جو لڑکے لڑکیاں ڈاکٹری پڑھتے ہیں، انسانی ڈھانچوں اور بچہ لے کر غیر ان کی پڑھائی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ڈھانچے ایسے ہی کالجوں کے لیے سلائی کئے جاتے ہیں۔ اسپتالوں اور دوا خانوں والی کمپنیوں کو بھی ان کی ضرورت پڑتی ہے اور بھی ایسے ہی دوسرے کاموں میں استعمال ہوتے ہیں۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہا پھر اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”تو نے کبھی یہ بھی سوچا، اپنے اسپتالوں اور میڈیکل کالجوں میں جو انسانی ڈھانچے لٹکے نظر آتے ہیں، وہ کہاں سے آتے ہیں؟“

”مجھے کیا پتہ۔“ لالی نے جواب دیا۔ ”پر مجھے یہ پتہ ہے، ایسا کرنا جرم ہے۔“

”جرم تو ہے۔“ بشیرا نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”اور مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ قبروں کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں تقریرات پاکستان کی دفعہ ۲۹۷ کے تحت ضابطے کی کارروائی بھی ہو سکتی ہے۔“

لالی نے خبردار کیا۔ ”کسی دن دھر لیا گیا تو سیدھا جیل جائے گا۔“

”چھوڑ یار! کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔“ بشیرا نے بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”حکومت بھی جانتی ہے یہ ڈھانچے کہاں سے آتے ہیں؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ انسانی ڈھانچے درختوں میں نہیں اگتے اور مردے قبروں سے نکل کر میڈیکل کالجوں اور اسپتالوں میں نہیں جاتے؟ کسی نہ کسی قبری سے کھود کر نکالے جاتے ہیں۔“

”تیری بات کچھ کچھ سمجھ آتی ہے۔“

”کمپنی کے پاس حکومت کی طرف سے باقاعدہ ایکسپورٹ لائسنس ہے اور کمپنی بھی کوئی ایسی ویسی نہیں، برٹش کمپنی ہے۔ دوائیں تیار کرتی ہے۔ پاکستان میں کمپنی کا سول ایجنٹ اپنا حاجی صالح بنائی لال جی کا فور والا ہے۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ مجھ سے تو بچہ اور ڈھانچے وہی خریدتا

”اس کام میں مٹی سے سونا بنتا ہے۔ کیا سمجھا؟“

لالی متاثر نہ ہوا۔ ”یار! میں تو یہ سمجھتا ہوں، پیسہ بنانے کے چکر میں مرنے والوں کی مٹی خراب کر رہا ہے۔ تیرا یہ دھندا اچلتا رہا تو کسی دن کبر میں ایک بھی مردہ نہ رہے گا۔ یہ تو سوچ، ایک دن تجھے بھی مرنا ہے۔“

”شروع شروع میں ایسی باتیں میں بھی سوچتا تھا۔ ڈرتا بھی تھا، پر اب تو اس کام میں مزہ آنے لگا ہے۔ ادھر مال اٹھایا، ادھر پہنچایا، اپنے پیسے کھرے کئے۔ ایک ہی آرڈر سپلائی کرنے میں ہزاروں کے دارے نیارے ہو جاتے ہیں۔“

”کئی سال سے یہ کام کر رہا ہے، لاکھوں بنا لیے ہوں گے۔ ابھی تک تیری ہوس پوری نہیں ہوئی۔“

”نہیں یار، ایسی کوئی نوٹ پڑی ہے۔ روز روز سپلائی کہاں ہوتی ہے؟ مینے دو مہینے بعد کام نکلتا ہے۔ یوں سمجھ لے، اب تک میں نے زیادہ سے زیادہ ۵۰ ڈھانچے یا پنجر سپلائی کئے ہوں گے۔“

”یہ تعداد کم ہے؟ تیرے ہی حساب سے دیکھا جائے تو اب تک ساٹھ ستر ہزار تو کمائی چکا ہے۔ اتنے روپے سے کوئی بھی کاروبار شروع کر سکتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں، اب یہ کام چھوڑ، کوئی اور دھندا کر۔“

بشیرے نے سگریٹ کا لمبا کش لگا کر دھواں اڑایا۔ ”کہتا تو ٹھیک ہے۔ اپنا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ میرا پروگرام یہ ہے کہ سو ڈھانچے سپلائی کرنے کے بعد یہ دھندا ختم کر دوں گا۔“

”یار! یہ سو کی شرط کیوں رکھی ہے؟“

”تب تک اتنی رقم اکٹھی ہو جائے گی کہ میں کاٹن جنگ فیکٹری لگا سکوں گا۔ اس کا سودا بھی ہو چکا ہے۔ ایڈوانس بھی دے چکا ہوں۔ مجھے مینے کے اندر اندر پوری رقم ادا کرنی ہے۔“

”گراچی میں سودا کر رکھا ہے؟“

”لائسنس پور میں چینیو شیخ برادی کا اپنا ایک یار ہے، سینٹھ حمید اللہ گول۔ بہت وڈا کاروبار ہے اس کا۔ کئی فیکٹریاں اور کارخانے ہیں۔ اسی کی معرفت سودا طے ہوا ہے۔ اس کے ساتھ میری باری دوستی بھی عجب طرح سے ہوئی۔ پتہ ہے کیسے ہوئی؟“

لالی خاموش بیٹھا رہا۔

”ہوایہ کہ سینٹھ حمید گول کی بیٹی، لاکھ ڈیڑھ لاکھ نقدی اور زیور لے کر ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی۔ میں ان دنوں لائل پور میں تعینات تھا۔ سینٹھ حمید گول خود تھانے آیا۔ رات کا وقت تھا، میں

خان کاسٹیل کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ لاش زمین سے کھود کر نکالنے پر بھی ہم دونوں کو لگایا گیا۔ ایک روز ہم دونوں اسپتال میں تھے کہ صالح بھائی لال جی کافور والا بھی وہاں آگیا۔ وہ اسپتال والوں سے ڈھانچوں کا سودا کرنے آیا تھا۔ مگر دراصل وہ ہم دونوں کی تلاش میں تھا۔ اس نے ہم سے راز داری میں بات چیت شروع کی تو پتہ چلا کہ لاش سرے سے وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ اس نے تین ہزار رشوت دے کر ہم دونوں کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اس جگہ کوئی اور لاش دبا دی جائے تاکہ ضابطے کی کارروائی پوری ہو جائے۔“

”مگر صالح بھائی، وہ لاش لایا کہاں سے تھا؟“

”اسپتال کے مردہ خانے سے لایا ہو گا یا کسی قبر سے کھود کر نکالی ہو گی۔ یہ لاش اس نے ہمیں دی۔ لاش بری طرح گل سڑ چکی تھی۔ ہم نے رات کے اندھیرے میں دیکھا بھی نہیں۔ فنا فٹ زمین کھود کر اسے دبا دیا۔ اسپتال کے عملے کو صالح بھائی نے کھلا پلا کر پسلے ہی پکا کر لیا تھا۔ اس لیے کام آسانی سے ہو گیا۔ پوسٹ مارٹم ہوا تو پتہ چلا کہ لاش مردے بجائے کسی زانی کی ہے۔ بس اسی سے معاملہ بگڑ گیا۔ ہم دونوں معطل کر دیئے گئے۔ سیدھی سیدھی جیل ہو جاتی مگر حاجی صالح بھائی بہت حوصلے والا بندہ ہے۔ اس نے بھاگ دوڑ کی، روپیہ پانی کی طرح بہایا اور ہم دونوں کو صاف بچا لیا۔ لیکن نوکری نہ بچ سکی۔ عبداللہ خان نے تو کوئی اور دھندا شروع کر دیا۔ مجھے صالح بھائی نے اس لائن پر لگا دیا۔“

لالی کے بھرانہ ذہن میں کھلبلی مچی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”یہ بتا کتل صالح بھائی نے کرایا تھا؟“

”یہ تو آج تک پتہ نہیں چل سکا، قتل کس نے کیا تھا اور کس نے کرایا تھا۔“ اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ ”میرا خیال ہے صالح بھائی اس میں شریک نہیں تھا۔ وہ کسی اور کے لیے کام کر رہا تھا۔“

”یار بشیرے کوئی اور دھندا کر، یہ تو بہت واہیات کام ہے۔“

بشیرا نہایت ڈھٹائی سے بولا۔ ”مگر یار، اس کام میں فائدہ بہت ہے۔ میں دو ہزار میں حاجی صالح بھائی کو ایک پنجر سپلائی کرتا ہوں۔ چار پنچ سو روپے اس کے نکالنے اور پہنچانے پر خرچ آتا ہے۔ دو سو تو مگر کن ہی لے لیتا ہے۔ فیر کر ایہ بھاڑا ہے۔ ریلوے اور پولیس کو رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔ اس طرح مجھے ایک پنجر پر لگ بھگ ڈیڑھ ہزار مل جاتا ہے۔ میں یہاں سے چار پنجر لے جاؤں گا۔ چھ ہزار سیدھے سیدھے ہاتھ آجائیں گے۔ اب تو ہی بتا، کسی اور دھندے میں اتنی کمائی ہو سکتی ہے؟“ وہ ٹٹھا مار کر ہنسا۔

لمبی لمبی خشک گھاس کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف لکڑی کے دو کپے رکھے تھے۔ ان کے ڈھکنے کھلے ہوئے تھے۔ بکے چیز کی لکڑی کے تختوں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔ پیر بنش اور سکندر ان میں گھاس کی تہہ بچا رہے تھے۔

بشیر نے کوٹھری میں داخل ہوتے ہی کہا۔ ”تم دونوں نے ابھی تک کھدائی شروع نہیں کی؟“
پیر بنش ہنس کر بولا۔ ”میں نے سوچا جب تک اندھیرا ہوا، اتنی دیر میں یہ کام کر لیا جائے۔“ اس نے بکے میں کچھی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ کام بھی تو ضروری ہے۔“
”یہ کتنی دیر کا کام ہے، بعد میں ہو جاتا۔ پہلے کھدائی ہونی چاہئے۔ یہ سمجھ لے، ترک زیادہ دیر نہیں ٹھیرے گا۔“

پیر بنش اطمینان سے بولا۔ ”فکر نہ کر۔ ادھر کا کام تو ہم نے نمٹا ہی دیا۔ بس اب کھدائی کا نمبر ہے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

سکندر بھی باپ کے ساتھ ہی اٹھ گیا۔ لالی نے سکندر کو غور سے دیکھا۔ وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔ لیکن پیر بنش کا بدن جس قدر گھسا ہوا اور مضبوط تھا، سکندر اسی قدر دھلا پتلا، مرل سا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں، چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ وہ تمام وقت خاموش رہا۔ پیر بنش نے کوٹھری کے ایک کونے میں پڑی ہوئی کد الیں اٹھائیں اور سکندر کو دے دیں۔ اس نے چپ چاپ کد الیں کندھے پر رکھ لیں۔

پہلے پیر بنش نے سنبھال لیے۔ دونوں کوٹھری سے چلے گئے۔ پیر بنش نے جاتے جاتے دروازے پر ٹھک کر بشیر سے کہا۔

”چاروں کبروں پر نشان تو میں نے دن ہی کو لگا دئے تھے۔ ہم دونوں جا کر پہلے پچھم والی کبروں کی کھدائی شروع کرتے ہیں۔ تیس کتنی دیر میں پہنچو گے؟“

”تم کھدائی شروع کرو، میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔“ بشیر نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔
”روشن میرے ساتھ ہو گا، یہ بھی تمہارے ساتھ کام کرے گا۔“
پیر بنش اور سکندر چلے گئے۔

بشیر نے لالی سے کہا۔ ”اب یہ بھی سمجھ لے سارا کام کیسے ہو گا۔“ اس نے دونوں کبروں کی طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”ان جہتیوں میں ڈھانچے بند کئے جائیں گے۔ ایک جہتی میں دو ڈھانچے رکھے جائیں گے۔ انہیں گھاس میں اس طرح سنبھال کر رکھا جاتا ہے کہ ہڈیاں سفر میں ٹوٹنے

ڈوبنی پر تھا۔ سینٹھ حمید کو شبہ تھا کہ دونوں ٹرین سے کراچی جانے والے ہیں۔ میں فوراً اسٹیشن پہنچا۔ دیکھا، دونوں ٹرین میں سوار ہونے جا رہے ہیں۔ میں نے وہیں انہیں دھریا۔ سارا کام خاموشی سے ہو گیا۔ نہ بدنامی ہوئی، نہ ہنگامہ۔ گوں بہت خوش ہوا۔ اس نے مجھے ہزار روپے بھی دئے۔ اسی روز سے اس کے ساتھ میری یاری بھی ہو گئی۔“ بشیر نے لالی کو غور سے دیکھا، ہنس کر بولا۔ ”میں تو کہتا ہوں، اپنے ساتھ لگ جا، عیش کرے گا۔ بول، کیا کہتا ہے؟“

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں جی! میں ایسے دھندے میں نہیں پڑتا۔“
”نہ پڑ، تیری مرضی۔ مگر آج رات تو میرے ساتھ کام کرے گا۔ دیکھ، انکار نہ کرنا۔“
لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ذرا دیر سر جھکائے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا۔ ”یہ بتا، مجھے دے گا کیا؟“
”چار سو روپے۔ مطلب یہ کہ ایک بنجر کے سو روپے۔“
”پورے پانچ سو کر دے۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”مگر میرے حصے کا روپیہ تجھے پہلے دینا ہو گا۔“

”منظور ہے۔“ بشیر نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور لالی کے حوالے کرتے ہوئے خبردار کیا۔ ”ایک بات کان کھول کر سن لے، میرے ساتھ کوئی داؤ کیا تو یہ سمجھ لے، میں بہت خطرناک بندہ ہوں۔“

لالی نے روپے جیب میں رکھے اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں نوں پتہ ہے تو کتنا خطرناک بندہ ہے۔ مگر میں بھی ایسا ویسا بندہ نہیں ہوں، اپنی بات کا پکا ہوں۔ وعدہ کروں گا تو پورا کروں گا۔ میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں۔ دکھت پڑے تو آزما لیتا۔“

بشیر اٹھتا ہوا اٹھا، لالی کے پاس گیا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہوئے بے تکلفی سے بولا۔ ”زیادہ باتیں نہ بنا۔ چل اٹھ۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔“ لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
دونوں دروازے کی جانب بڑھے اور کمرے سے باہر چلے گئے۔



شام اب تاریک ہو چکی تھی۔ ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ بشیر اور لالی اندھیرے میں آگے بڑھنے لگے۔ چند ہی قدم چلنے کے بعد بشیر اور ختوں کے نیچے بنی ہوئی کوٹھری کے دروازے پر ٹھہر گیا۔ دروازہ بند تھا مگر اندر روشنی تھی۔

اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ کوٹھری میں چراغ جل رہا تھا۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بنش اور سکندر فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے قریب

پھوٹے نہ پائیں۔“

”انہیں ریل سے لے جائے گا؟“

”میں اس دفعہ ٹرین سے مال نہیں لے جاؤں گا۔“

لالی نے چونک کر پوچھا۔ ”فیر کیسے لے جائے گا۔“

”ٹرک سے مال جائے گا۔“ بشیرا نے جواب دیا۔ ”اپنے جاننے والے ایک پولیس انسپکٹر کا کراچی تبادلہ ہو گیا ہے۔ اس کا سامان ٹرک سے جا رہا ہے۔ میں نے اس سے معاملہ طے کر لیا ہے۔ دوپہر کو اسی کے پاس گیا تھا۔ اس کے سامان کے ساتھ اپنی دونوں بیٹیاں بھی چلی جائیں گی۔ راستے میں کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ شہر سے ایک کانسیبل بھی اپنے ساتھ جائے گا۔“

”تب تو تیرا سٹیشن جانا نہیں ہو گا۔“

”اب سٹیشن جا کر کیا کروں گا۔ تجھے بھی تو کراچی ہی جانا ہے نا؟“

”نہیں یار! میں تو ٹرین سے جاؤں گا۔“

بشیرا نے لالی کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ ”پولیس سے ڈر رہا ہے؟“ وہ غصہ مار کر ہنسا۔ ”پردانہ کر! اپنے ساتھ رہے گا تو تجھ پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکے گا۔“ اس نے رازداری کے انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

”یہ تو بتا! بات کیا ہے؟ کوئی اونچا پھندا ہو گیا؟“

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں جی! ایسی کوئی بات نہیں۔“

”فیر تو اپنے ساتھ کیوں نہیں چلتا؟ ٹرک میں ٹرین سے زیادہ آرام سے وقت گزرے گا۔ میں تو کہتا ہوں، تو بھی اپنے ساتھ ہی چلا چل۔“

لالی چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر وہ آمادہ ہو گیا۔ ”تیرے ہی ساتھ چلوں گا پر کراچی تک نہیں جاؤں گا۔ مجھے شہر پہنچنے سے پہلے اتار دینا۔ میں نے پہلے کا درآباد سٹیشن جانا ہے۔ وہاں ایک دوست میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں اسے ساتھ لیے بنا کراچی نہیں جاسکتا۔“

”یہ بات تو نے پہلے کیوں نہ بتائی؟“ بشیرا نے مسکرا کر کہا۔ ”اپنی باتوں سے تو خود ہی شبہ پیدا کرتا ہے۔“

لالی نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”بشیرے! تو اس طرف آتا جاتا ہی رہتا ہے۔ یہ بتا، گورداپورہ کتھے ہے؟“

بشیرا نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”وہ تو اس طرف رہا۔“

”یہاں سے کتنی دور ہو گا؟“

”یہاں سے ۱۵ میل تو ہو گا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”پر تو

گورداپورے کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”کل اسہ ہے، میں گورداپورے ہی جا رہا تھا۔ کل رات اندھیرے میں رستہ بھٹک کر ادھر آ گیا۔“

”بہت دور نکل آیا۔ یہ تو اپنے میاں حیات محمد خاں وٹو کی جاگیر کا علاقہ ہے۔ یہاں سے تو گورداپورے کو کوئی کچارستہ بھی نہیں جاتا۔“

حیات محمد وٹو کا نام سن کر لالی پریشان ہو گیا۔ ”نہیں، اب مجھے گورداپورے نہیں جانا، تیرے ہی ساتھ چلوں گا۔“

بشیرا نے گھاس کے ڈھیر کے پیچھے سے بڑا سا تھیلہ نکالا اور اندر ہاتھ ڈال کر دو بڑی بڑی ٹارپس نکالیں۔ انہیں جلا کر دیکھا۔ اس نے ایک ٹارچ لالی کو دی۔ تھیلہ اپنے ہاتھ میں لٹکایا اور لالی کو مخاطب کیا۔

”چل یار! اب کام شروع کیا جائے۔ بہت باتیں ہو گئیں۔“

دونوں کوٹھری سے باہر نکلے۔ بشیرے نے دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ درختوں کے نیچے گمراہ اندھیرا تھا۔ بشیرے نے ٹارچ روشن کی تو پگڈنڈی نظر آئی۔ یہ پگڈنڈی قبرستان کی طرف جاتی تھی۔ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ قبرستان اندھیرے میں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔

کچھ دور آگے جا کر انہیں ایک طرف ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ دونوں قبروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے روشنی کی طرف بڑھے۔ قریب جا کر انہوں نے دیکھا، ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں لالین رکھی ہے۔ اس کی دھندلی روشنی میں پیر بنش کدال سے ایک قبر کا بالائی حصہ کھود رہا ہے اور سکندر نیچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ایک طرف ڈالتا جا رہا ہے۔ قبر کچی تھی اور مٹ مٹا کر برابر ہو چکی تھی۔

بشیرے اور لالی کے پہنچنے کے بعد بھی دونوں اپنے کام میں جڑے رہے۔ قبر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کھدائی شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔

جب قبر اتنی کھد گئی کہ تختے نظر آنے لگے تو دونوں نے ہاتھ روک دیے۔ تختے بھی گل سڑ گئے تھے۔ پیر بنش نے کدال اڑا کر ایک تختہ نکالا، فوراً بوجھا اٹھا۔ لالی کا جی متلانے لگا۔ بشیرے نے

ہڈیاں باہر نکالی گئیں۔ پیر بخش اور سکندر انہیں چادر میں لپیٹ کر ایک بار پھر کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

بشیرا، لالی کو تیسری قبر پر لے گیا۔ لالی نے اسے بھی کھود ڈالا اور اس دفعہ پیر بخش اور سکندر کے آنے سے پہلے پہلے قبر کے بوسیدہ تختے بھی نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ جب تیسرے ڈھانچے کی ہڈیاں بھی قبر سے باہر نکال لی گئیں اور پیر بخش اور سکندر اسے لے کر چلے گئے اور لالی نے تختے لگا کر ان پر مٹی بھی ڈال دی تو بشیرے نے منہ سے ڈھانٹا کھول دیا اور لالی سے مخاطب ہوا۔ ”یار! تو نے تو کمال کر دیا۔ فناف تین بنجر نکال لیے۔ اب تو بھی منڈا سا کھول دے۔“

لالی نے چہرے سے ڈھانٹا کھول کر کہا۔ ”یار! میرا تو ارادہ تھا کہ کام ختم کرنے کے بعد ہی منہ کھولوں گا۔“

بشیرے نے محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ ”پیارے! دل خوش کر دیا۔ اب ایسا کر۔ کرے میں جا کر منہ ہاتھ دھو۔ کچھ کھا پی لے۔ بہت کام کر لیا۔“

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ تھک گیا تھا، بھوک بھی لگ رہی تھی۔ اس نے بشیرے کی بات مان لی، اس سے دریافت کیا۔ ”تیرا روٹی کھانے کا ارادہ نہیں؟“

”نہیں یار! مجھے بالکل بھوک نہیں۔ میں تو سارا کام ختم کر کے صرف چائے پیوں گا۔ تو اب جا اور تازہ دم ہو کر آ۔“ دیکھ کر اب کام زیادہ نہیں رہا۔ ایک ہی بنجر تو نکالنا رہ گیا ہے۔ ”اس نے نارنج روشن کر کے کھائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”ابھی تو گیارہ بھی نہیں بجے۔ بہت ٹیم ہے اپنے پاس۔“

لالی خاموشی سے درختوں کی جانب چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ راستے میں پیر بخش اور سکندر مل گئے۔ پیر بخش نے پوچھا۔ ”کتنے چلا؟“

”بھوک لگ رہی ہے۔ روٹی کھا کر آؤں گا۔ جب تک تم دونوں بھی آرام کر لو۔“

پیر بخش بولا۔ ”بھکتا تو نے تیرے لیے روٹی کمرے میں رکھ دی ہے۔ بالٹی میں پانی بھی ہے۔ روٹی کھانے سے پہلے ٹھیک طرح صابن سے ہاتھ اور منہ دھو لیتا۔ صابن بالٹی کے پاس ہی رکھا ہے۔“

سکندر اس دفعہ بھی نہ بولا، خاموش کھڑا لالی کو ٹکڑے ٹکڑے کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ پیر بخش کے ہم راہ آگے بڑھ گیا۔

لالی قبروں کے درمیان سے گزرتا ہوا پیر بخش کے ڈیرے کی جانب چلے لگا۔ درختوں کے نیچے

تھیلے سے چادر نکالی اور چہرے پر اس طرح ڈھانٹا باندھ لیا کہ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اس نے تھیلے سے دوسری چادر نکال کر لالی کو دی۔ اس نے بھی ڈھانٹا باندھ لیا۔ پیر بخش اور سکندر نے بھی اپنے سروں سے چڑیاں اتار کر ناک اور منہ کے گرد لپیٹ لیں۔ مگر انہوں نے بشیرے اور لالی کی طرح پورے ڈھانٹے نہیں باندھے۔

ایک ایک کر کے تمام تختے نکال کر الگ کر دیئے گئے۔ لالی نے بھی تختے نکالنے میں پیر بخش اور سکندر کی مدد کی۔ البتہ بشیرا الگ کھڑا رہا اور بار بار کہتا رہا۔ ”دیکھو، مٹی اندر نہ گرنے پائے۔ کوئی ٹوٹا ہوا تختہ بھی نیچے نہ گرے۔“

پیر بخش اور سکندر تو اپنے کام میں منجھے ہوئے تھے لیکن لالی اناڑی تھا۔ بشیرے کو اسی سے خدشہ تھا۔ مگر لالی نے زیادہ اناڑی پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔

تختے ہٹ گئے تو قبر کا منہ کھل گیا۔ بشیرے نے نارنج سے قبر کے اندر روشنی کی۔ لالی نے جھک کر دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ قبر میں مردے کا ڈھانچا پڑا تھا۔ کھال اور گوشت گل سڑ کر مدت ہوئی خاک میں مل چکا تھا۔ اب تو صرف سفید سفید ہڈیاں رہ گئی تھیں۔ ان پر جگہ جگہ مٹی جبی تھی۔ سرخ سرخ بیونے اور دوسرے کپڑے لکڑے اور ادھر ادھر رنگ رہے تھے۔ لالی یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔

پیر بخش نے ربوے کے بڑے بڑے سیاہ جوتے پہنے۔ بشیرے سے ربوے کے دستانے لے کر ہاتھوں پر چڑھائے اور قبر کے اندر اتر گیا۔ بشیرے نے تھیلے سے ایک اور چادر نکالی اور قبر کے قریب بچا دی۔ پیر بخش قبر کے اندر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکال، نکال کر سکندر کو دینے لگا۔ اس نے سب سے پہلے کھوپڑی نکالی، پھر دوسری ہڈیاں نکالیں۔ سکندر انہیں سنبھال، سنبھال کر چادر پر رکھتا رہا۔

ڈھانچے کی تمام ہڈیاں باہر نکالنے کے بعد پیر بخش قبر سے نکل کر باہر آ گیا۔ ہڈیوں کو نہایت احتیاط کے ساتھ چادر میں لپیٹا گیا۔ پیر بخش اور سکندر اسے سنبھال کر اس کو ٹھری کی طرف روانہ ہو گئے جہاں جیسے رکھے تھے۔ ادھر بشیرے کی ہدایت پر لالی نے قبر کے منہ پر تختے لگائے اور پیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر تختوں پر اس طرح ڈھیر بنا دیا کہ قبر ٹھیک ٹھاک نظر آنے لگی۔

دوسری قبر جس کے اندر سے ڈھانچا نکالنا تھا، زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ بشیرے کی نشاندہی پر لالی نے کدال اٹھا کر اسے کھودنا شروع کر دیا۔ وہ کھودتا بھی جاتا اور پیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر الگ رکھتا جاتا۔ جب پیر بخش اور سکندر واپس آئے تو دوسری قبر کے تختے نظر آ رہے تھے۔ لالی نے ان دونوں کی مدد سے ذرا ہی دیر میں تختے نکال کر علیحدہ رکھ دیئے۔ دوسری قبر سے بھی ڈھانچے کی کھوپڑی اور

پہنچ کر اس نے تارچ روشن کی۔ پیر بخش کے گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ گلی کے اس پار برآمدے میں کوئی اندھیرے میں کھڑا تھا۔

لالی نے تارچ بجھادی، آہستہ آہستہ برآمدے میں داخل ہوا۔ دروازے کے قریب اسے بختاور نظر آئی۔ وہ آہٹ پر سنبھل کر کھڑی ہو گئی۔ مگر لالی نے کوئی بات نہیں کی۔ خاموشی سے کمرے میں چلا گیا۔ بختاور بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں پہنچی۔

”بہت دیر کی کر دی۔ میں تو گھنٹے بھر سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔“

لالی نے مڑ کر اسے دیکھا۔ لالین کی روشنی میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ کانوں میں چاندی کے مندرے تھے۔ بال سلیقے سے سنوارے گئے تھے۔ ان میں تیل چمک رہا تھا۔ دنداسا لگانے سے ہونٹ گلابی ہو گئے تھے۔

لالی نے اس کی یہ جھجک دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ ”بختاور اب تجھے کسی کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ تیرا انتظار کرنے والے تو خود پیدا ہو جائیں گے۔ ایک دم سوہنی غیار بن گئی۔ مانجھے کی جٹی لگ رہی ہے۔“

بختاور ذرا شرمائی، مسکرا کر بولی۔ ”یہ بتاؤں کیا کہتا چاہتا تھا؟“

لالی نے جیب سے پانچ سو روپے نکالے اور بختاور کو دے کر بولا۔ ”لے، یہ رکھ لے۔ یہ کمائی میں نے تیرے ہی لیے کی تھی۔ میں مردوں کا مال نہیں کھاتا۔“

وہ تنک کرنا زے بولی۔ ”اور مجھے مردوں کا مال کھانا چاہتا ہے؟“

”تیری بات دوسری ہے۔ برسوں سے مردوں کا مال کھا رہی ہے۔“ یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے چلا گیا۔ باہر برآمدے میں جا کر اس نے صابن مل کر اچھی طرح ہاتھ دھوئے، منہ صاف کیا اور تازہ دم ہو کر کمرے کے اندر آیا۔ بختاور ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ لالی آتے ہی چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ بختاور نے پوچھا۔

”توں نے وہ بات نہیں بتائی؟“

لالی نے ان جان بن کر کہا۔ ”کون سی بات؟“

”وہی بات جسے بتانے کا دن کو وعدہ کیا تھا۔“ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”میں تو یہ چاہتا ہوں اگر تجھے کبرستان ہی میں رہنا ہے تو مردوں کی بجائے زندوں کی طرح رہے۔“

وہ افسردہ ہو گئی۔ ”کس کے لیے زندہ رہوں؟ کیسے زندہ رہوں؟“

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ بختاور چند لمحوں تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے نظریں جھکالیں آہستہ سے بولی۔ ”مجھے اس طرح کیوں گھور رہا ہے؟“

لالی نے گہری سانس بھری۔ ”اس لیے کہ تو مجھے بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ پتہ نہیں میرے بارے میں تو کیا سوچتی ہے۔“

”توں برا بندہ نہیں ہے۔“

”میں کموں تو میرے ساتھ بھاگ چلے گی؟ بول، کیا کہتی ہے؟“

”ڈر لگتا ہے۔ پتہ نہیں، توں کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ مجھے تو تیرے بارے میں کچھ بھی نہیں ملوم۔“

”ٹھیک ہی ہے کہ تجھے کچھ نہیں ملوم۔“ لالی کسی قدر جذباتی ہو گیا۔ ”میرے ہاتھ میں ایسی کیر ہی نہیں کہ کسی غیار سے پیار کروں اور اسے اپنی گھر والی بناؤں۔“

”تیری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔ صاف صاف بتا؟“

لالی کچھ کہنے ہی والا تھا، اچانک دروازہ کھلا۔ سکندر اندر داخل ہوا۔ لیکن جیسے ہی بختاور پر اس کی نظر پڑی، ایک دم بھڑک اٹھا۔ تیوری پر تل ڈال کر بولا۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہے؟“

بختاور کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔ مگر لالی نے اسے اٹھنے نہیں دیا، ڈپٹ کر بولا۔ ”بیٹھی رہ۔“

”میں ابھی بابا کو لے کر آتا ہوں۔ وہی اسے پوچھے گا یہاں کیوں آئی؟“

لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”اس کا کھسم تو ہے یا تیرا بیٹا؟“

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا، لالی کو گھورتا رہا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر اس نے کہا۔ ”توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟“

”خانا خاگرمی نہ دکھا۔ یہاں آکر میرے پاس بیٹھ۔ فیر بتاؤں گا، میں اس معاملے میں بولنے والا کون ہوں؟“

سکندر چپ چاپ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ لالی نے بختاور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ذرا اس کی طرف دیکھ اور سوچ، تجھے کیسی سوہنی گھر والی ملی ہے۔ تو اس کا مرد ہے۔ کبھی اسے پیار بھری نظروں سے بھی دیکھا؟“

بختاور بیچ میں بول پڑی۔ ”یہ کیا دیکھے گا۔ چاچا دیکھنے ہی کب دیتا ہے۔ جو وہ کہتا ہے، وہی یہ کرتا ہے۔ بول میں کوئی جھوٹ کہہ رہی ہوں؟“

سکندر مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”مجھے اس سے ڈر جو لگتا ہے۔“

”یوں ہی ڈرتا رہا تو فیروز بھی سن لے، یہ کسی دن پھر سے اڑ جائے گی اور یہ سمجھ لے ایسی گھر والی تجھے دوبارہ نہیں ملے گی۔“ لالی نے اسے خبردار کیا۔

”پر میں کیا کر سکتا ہوں؟“

”اس سے پہلے کہ یہ کسی اور کے ساتھ بھاگے، اسے لے کر یہاں سے بھاگ جا۔“

”نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ سکندر خوف زدہ ہو گیا۔ ”بابا مجھے جان سے مار دے گا۔ توں جانتا نہیں وہ کیسا بندہ ہے؟“

لالی نے اندازہ لگا لیا کہ سکندر بھی اپنے باپ کے رویے سے خوش نہیں ہے، مگر اس سے ڈرتا بھی بہت ہے۔ لالی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ”مردین۔ وہ تیرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ تجھے اس نے کیا بتا دیا ہے؟ کیسا تیار اور مرل لگتا ہے۔“

بختاور تھکے لہجے میں بولی۔ ”یہی گل بات میں کہتی ہوں تو مجھ سے لڑتا ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ تو ایک دم بے گیرت ہے۔ چاچا اس کے سامنے مجھے زبردستی اپنی کوٹھری میں لے جاتا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھتا رہتا ہے، کچھ بھی تو نہیں کہتا۔“ اس نے ذرا سائل کیا۔ ”اب اس کا دوسرا ویاہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ آئے گی تو اس کے ساتھ بھی یہی بے گیرتی کرے گا۔“

سکندر ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”زیادہ کڑکڑ نہ کر۔ بند کر اپنی بکواس۔“

”نراض کیوں ہوتا ہے؟ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ اس طرح کب تک کام چلے گا۔“

سکندر زچ ہو کر بولا۔ ”تو میں کیا کروں؟“

”وہی جو میں کہہ رہا ہوں۔“ لالی نے مشورہ دیا۔ ”اسے لے کر شہر چلا جا۔ بیچ سو روپے میں نے اسے دے دیے ہیں۔ کچھ دن اس سے کام چلانا، بعد میں کوئی نہ کوئی دھندامل جائے گا۔ بول، کیا کہتا ہے؟“

”میں تو تیار ہوں، پر یہ تیار نہیں ہوگا۔“ بختاور نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔

”ہو جائے گا، ہو جائے گا۔ اسے میں تیار کر لوں گا۔“ لالی نے سکندر کی پیٹھ تھپکی۔ ”ہمت سے

کام لے، سب ٹھیک ہی ہوگا۔“

سکندر پہلے تو جھجکا۔ پھر لالی کے سمجھانے بھانے پر رضامند ہو گیا اور یہ طے ہوا کہ جس روز

پیر بخش شہر جائے گا، دونوں میاں بیوی چپکے سے نکل بھاگیں گے۔



لالی اور سکندر ڈیرے سے نکل کر بشرے کے پاس پہنچے۔ اس اثناء میں پیر بخش نے قبر کھود ڈالی تھی اور تختے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پیر بخش نے سکندر کو دیکھ کر غصے سے کہا۔ ”اتنی دیر کہاں لگا دی؟“

لالی فوراً بیچ میں بول پڑا۔ ”چاچا! نراض نہ ہو۔ میں نے اسے روک لیا تھا۔ میں روٹی کھا رہا تھا، کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو کس سے منگواتا۔“

پیر بخش خاموش ہو گیا۔ لالی اور سکندر نے چروں پر ڈھائے باندھے اور تختے اکھاڑنے لگے۔ تختے علیحدہ کر کے انھوں نے قبر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نکالیں۔ پیر بخش اور سکندر انھیں چادر میں لپیٹ کر لے گئے۔

لالی نے جلدی جلدی قبر کے تختے لگائے اور پیچھے سے مٹی اٹھا اٹھا کر ان پر ڈال دی۔ اب کام کا ایک مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجنے والے تھے۔ بشرے اور لالی نے اپنے چروں سے ڈھائے ہٹا دیے۔

بشرے نے تمام سامان قبیلے میں ڈالا، اپنی اور لالی کی سرکٹ سلگائی۔ دونوں کش لگاتے ہوئے کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئے۔

جب وہ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچے تو دھندلی روشنی میں سڑک پر ایک لمبی چوڑی کار کھڑی نظر آئی۔ کار دیکھتے ہی دونوں ٹپکے۔ لالی کو شبہ ہوا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ وہ اسے حیات محمد کے بنگلے کے باہر دیکھ چکا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ حیات محمد نوکی بیوک اتنی رات گئے وہاں کیوں آئی ہے؟ کار دیکھ کر بشرے ابھی پریشان ہو گیا۔ دونوں جہاں تھے وہیں ٹھہر گئے اور کار کی جانب دیکھتے رہے۔

کار کے قریب آہستہ آہستہ باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر آوازیں اس قدر دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بشرے اور لالی کان لگا کر باتیں سننے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دونوں سہمے ہوئے خاموش کھڑے رہے۔ کچھ دیر بعد کار کی بتیاں روشن ہوئیں، انجن اشارت ہوا اور کار تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ اس طے جانے کے بعد دھندلی روشنی میں کوئی آتا ہوا نظر آیا۔ قریب آیا تو انھوں نے پہچان لیا۔ وہ پیر بخش تھا، مگر گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

بشیرے نے پوچھا۔ ”چاچا! اس سے بات کر رہا تھا؟ یہ کار کس کی تھی؟“
 ”ذرا صبر کر۔ سب کچھ بتا دوں گا۔“

مگر بشیرا بے چین تھا۔ ”بتا تا کیوں نہیں۔ چبا چبا کے کیوں بات کر رہا ہے؟“
 ”ارے ارے، توں تو خاما خا خا زاض ہو گیا۔“ پیر بخش نے نرمی سے کہا۔ ”میاں حیات محمد کانجیر آیا تھا۔ سویرے بھی آیا تھا۔“
 ”کس لیے آیا تھا؟“

پیر بخش لمحے بھر خاموش رہا پھر سرگوشی کے انداز میں رسان سے بولا۔ ”تجھ سے کیا چھپانا۔ وہ جو اونچی کبر و دیکھ رہا ہے۔“ اس نے قبرستان کے شمال کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”وہ میاں حیات محمد کے بھائی میاں ریاض محمد کی کبر ہے۔ میاں حیات چاہتا ہے اس سے مردہ نکال کر دوسرا مردہ رکھ دیا جائے۔“

بشیرے نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”یہ چکر کیا ہے؟“

پیر بخش گردن ہلا کر بولا۔ ”اپنے کو تو کچھ پتہ نہیں۔“

لالی فوراً تازہ گیا کہ حیات محمد نے قبر میں پہلے جو لاش دفن کرائی تھی، اب اس کی جگہ ریاض محمد کی اصل لاش رکھنا چاہتا ہے جسے دھو رنے تہ خانے میں قتل کر دیا تھا۔
 پیر بخش نے بتایا۔ ”یہ کام بھی آج ہی ہو گا۔ کام مشکل بھی ہے۔ کبر بہت نیچے سے کھودنی ہو گی اور نیچے ہی نیچے پرانی لاش نکال کرنی لاش رکھنی ہو گی تاکہ اوپر سے کبر و دیکھ کی دیکھی رہے۔“
 بشیرا گھبرا گیا۔ ”یہ کام کب شروع ہو گا؟“

”میں نے انھیں دو بجے بلایا ہے۔ وہ تو ابھی شروع کرنے کو کہتے تھے پر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا مجھے پہلے ایک اور کبر تیار کرنی ہے۔ اب میاں حیات کے کرنڈے دو بجے سے پہلے پہلے لاش لے کر آجائیں گے۔“

بشیرے نے کہا۔ ”تب تو ہمیں اپنا کام جلد سے جلد ختم کرنا ہو گا۔“

پیر بخش بولا۔ ”میں تو کہتا ہوں، اپنا کام کل پر چھوڑ دے۔ مان لے ٹرک دیر سے آیا تو کیا ہو گا؟“
 بشیرے نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”ٹرک تو ٹھیک ایک بجے پہنچ جائے گا۔“ اس نے تارج جلا کر گھڑی دیکھی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”چاچا! بارہ بجنے والے ہیں، بجتی کر۔ ابھی تو بہت کام پڑا ہے۔“

تینوں آگے بڑھے اور درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گئے۔

کوٹھری میں چاروں ڈھانچوں کی ہڈیاں علیحدہ علیحدہ ڈھیریوں میں گھاس پر رکھی تھیں۔ ہر طرف تیزبو پھیلی تھی۔

سکندر ایک بڑے ڈبے سے سفید سفید پاؤڈر نکال کر ہڈیوں پر چھڑک رہا تھا۔ بشیرے نے دونوں کبوں میں جھک جھک کر دیکھا۔ اندر ہاتھ ڈالا اور ان میں بچھی ہوئی گھاس جگہ جگہ دبا تا رہا۔ اس نے پیر بخش سے کہا۔

”چاچا دیری نہ کر۔ ایک ایک پنجر کی ہڈیاں سنبھال سنبھال کر رکھنی شروع کر دے۔“

پیر بخش نے ہدایت کے مطابق ایک ڈھانچے کی ہڈیاں اٹھا کر یکے میں گھاس کی تہہ پر رکھیں۔ جب وہ ایک ایک ہڈی رکھ چکا، تو اس نے ہڈیوں پر گھاس کی دوسری تہہ جمائی۔ اس نے گھاس کی اس موٹی تہہ پر دوسرے ڈھانچے کی ہڈیاں ترتیب سے جما کر رکھ دیں۔ ایک بار پھر ہڈیوں پر گھاس کی تہہ جمائی گئی۔ یساں تک کہ کبسا پوری طرح گھاس سے بھر گیا۔ بشیرا نے ہر یکے کا ڈھکنا بند کیا، تالا لگایا اور کنبی اپنے پاس رکھ لی۔ بقیہ دو ڈھانچے بھی اسی طرح دوسرے یکے میں بند کر کے تالا لگا دیا گیا۔

جب یہ کام ہو گیا تو بشیرے نے جیب سے آٹھ سو روپے نکالے اور پیر بخش کو دے دیے۔ اس نے پچاس روپے اور نکالے اور پیر بخش کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ تیرے چائے پانی کے لیے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”چاچا! اسی بات پر گرما گرم چائے پلوادے۔“

”روٹی لکڑ کھالے، توں نے تو کچھ بھی نہیں کھایا۔“

”میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔ صرف چائے پلوادے۔“

پیر بخش کوٹھری سے چلا گیا۔ سکندر وہیں ٹھہرا رہا۔ کچھ دیر بعد تینوں کوٹھری سے نکل کر ڈیرے میں آگئے۔ بشیرے نے چارپائی کے نیچے سے اپنا سوٹ کیس نکالا۔ اسے کھولا۔ اجلی بٹ شرٹ اور بٹون نکالی اور وہیں کھڑے کھڑے تبدیل کئے۔ اس نے میبلے کپڑے اور تھیلے کا سارا سامان سوٹ کیس میں رکھا اور اسے بند کر دیا۔ لالی نے اپنی گٹھری اٹھا کر ہاتھ میں لٹکائی۔ مگر پیر بخش ابھی تک چائے لے کر نہیں آیا تھا۔ خاصی دیر ہو گئی۔ بشیرے نے مڑ کر سکندر کو دیکھا۔ قدرے جیسے لہجے میں بولا۔

”جا کر دیکھ، چائے کا کیا بنا؟“

مگر وہ جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔

لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ ”یار! تو کیسا مرو ہے۔ بخاور تیری گھروالی ہے، تو کسے گا تو ٹافٹ چائے بنا دے گی۔ جا کھڑا منہ کیا تک رہا ہے۔“

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد صحن سے پیر بخش کے زور زور سے بولنے کی آواز ابھری۔ بشیرا اور لالی خاموش بیٹھے رہے۔ چند منٹ بعد پیر بخش بڑبڑاتا ہوا آیا۔ وہ دو پیالیوں میں چائے بھی لایا تھا۔ بشیرے نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔

”کیا ہو گیا چاچا؟ بہت زراض نظر آ رہا ہے۔“

”جھک گیا ہے جی، جھک۔“ وہ شکوے کے انداز میں بولا۔ ”سکندر مجھ پر آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔ آج تک اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔“

لالی نے چائے کی پیالی لے کر پوچھا۔ ”بات کیا ہوئی؟“

”ہونا کیا تھا جی! گھروالی کی حمایت کر رہا تھا۔“

پیر بخش نے اپنا جملہ پورا ہی کیا تھا کہ سکندر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے بخاور بھی تھی۔ سکندر کمرے میں داخل ہوتے ہی بولا۔ ”میں اس کی حمایت کر رہا تھا۔ تم دونوں خود دیکھ لو۔“

اس نے کیا کیا ہے۔“

سکندر نے بخاور کا ہاتھ پکڑ کر سامنے کر دیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، جھکے کا گریبان پھٹ گیا تھا اور سینہ عریاں ہو کر جگہ جگہ سے جھلک رہا تھا۔ بخاور کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔

پیر بخش غضب ناک ہو کر چیخا۔ ”اوئے سو دے پتر! تیری اب اتنی ہمت ہو گئی؟“

”چاچا! گرمی نہ دکھا۔ یہ بتا اس کے ساتھ مار پیٹ کیوں کی؟“ لالی نے بخاور کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ تیری نوہ ہے، گھروالی تو نہیں۔“

پیر بخش نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”کیوں نہ کر۔ توں ہمارے معاملے میں بولنے والا کون ہوتا ہے؟“

بشیرا نے لالی کو سمجھایا۔ ”یار! اس معاملے میں نہ پڑ۔“

پیر بخش کو بشیرا کی شہرہ ملی تو اس نے لالی کو ڈانٹا۔ ”یہ بتا، توں نے ہمارے معاملے میں کیوں ناگ اڑائی؟ توں ہوتا کون ہے؟“ اس نے لالی کو گندی سی گالی دی جھنجھلیا ہوا اس پر جھپٹا۔ اور اس کا گریبان پکڑنا چاہا۔

لالی کے ہاتھ سے پیالی اچھل کر دور گری اور ساری گرم گرم چائے لالی کے منہ پر آگئی۔ لالی کے

اگ ہی تو لگ گئی۔ اس نے جھپٹ کر پیر بخش کی گردن دوپچی اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا کر ٹکرایا۔

پیر بخش نے اٹھنے کی کوشش کی تو لالی نے ایک بار پھر اسے دھکا دیا۔ پیر بخش نے پھر اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ زور زور سے ہانپتا رہا اور خوں خوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔

لالی نے کپڑوں سے چائے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”تو نے مجھے بھی سکندر سمجھا تھا۔ کچھ اور گرمی رہ گئی ہو تو وہ بھی اتار دوں؟“

سکندر اور بخاور خاموش کھڑے رہے۔ بشیرے نے لالی سے کہا۔ ”یار! جانے دے، بہت ہو گیا۔ بیکار کا ٹھکانہ کر۔“ اس نے پیر بخش کو سمجھایا۔ ”چاچا! اب تو بوڑھا ہو گیا۔ اتنا غصہ نہ کیا کر۔“ وہ پیر بخش کے پاس گیا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔ گھڑی دیکھی، ایک بج رہا تھا۔ بشیرا پریشان ہو گیا۔ ”رک اب پہنچنے والا ہی ہو گا۔“ وہ سکندر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”باہر جا کر سڑک پر دیکھ، رک تو نہیں آگیا۔“

بخاور بولی۔ ”پہلے ایک بات کا فیصلہ ہو جائے۔ ہم دونوں یہاں نہیں رہیں گے۔ تم ہمیں بھی اپنے ساتھ لے چلو۔“

سکندر نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں جی! آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔“

”مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا؟ میں نے اسی دن کے لیے تجھے پال پوس کر جوان کیا تھا؟“ یہ کہتے کہتے پیر بخش افسردہ ہو گیا۔

بشیرے نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”چاچا! پریشان نہ ہو۔ کوئی نہیں جا رہا۔“

سکندر نے کہا۔ ”نہیں بشیرے بھائی! اب ہم دونوں کا گزارہ یہاں نہیں ہو سکتا۔“

”اتنی بگاڑ ٹھیک نہیں۔ چل، میرے کہنے سے اسے ایک موقع اور دے دے۔ یہ اب کے لڑائی بھڑا کرے تو مجھے بتانا۔ میں مینے بھر بعد آؤں گا، تم دونوں کو اپنے ساتھ کراچی لے جاؤں گا۔ میرا وعدہ رہا۔“ بشیرے نے پیر بخش کو مخاطب کیا۔

”چاچا! اب تو بھی غصہ کرنا چھوڑ دے۔“

سکندر بولا۔ ”بات صرف گسے کی نہیں۔ یہ اور ہی بات ہے۔ اب میں تمہیں کس طرح بتاؤں۔“

بشیرا ہنس کر بولا۔ ”مجھے سب پتہ ہے، مجھے نہ بتا۔ میں جانتا تھا ایک دن یہی ہو گا۔ اب تو جا کر رک دیکھ۔“

سکندر چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔ بخاور بھی اس کے ساتھ ساتھ گئی۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پیر بخش مجرموں کی طرح سر جھکائے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ بڑھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سکندر کئی منٹ تک واپس نہیں آیا۔ بشیرا بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔ اب سوانح رہا تھا۔ آخر بشیرا خود باہر نکلا۔ لالی اور پیر بخش بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے جا کر ٹھہر گئے۔

سڑک بالکل ویران تھی۔ ٹرک کا دور دور نشان نہ تھا۔ سکندر سڑک پر انتظار کرتے کرتے واپس آ گیا تھا۔ کچھ اور وقت گزر گیا۔ اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔

پیر بخش نے گھبراہٹ ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میاں حیات کے کمرے آتے ہی ہوں گے۔“
بشیرا اور پیر بخش ہو گیا۔ اسی اثناء میں دور سے تیز روشنی ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔
بشیرے نے اس دفعہ پیر بخش کو سڑک پر بھیجا۔ اس کے دل میں دھڑکا تھا کہ اگر یہ میاں حیات محمد کی کار ہوئی تو کیا ہو گا؟

لالی بھی کم پریشان نہ تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ حیات محمد وہ بھی آ گیا تو دیکھتے ہی اس پر گولی چلا دے گا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پیر بخش نے آکر خوش خبری سنائی کہ ٹرک آ گیا۔

بشیرا نے جلدی جلدی کوٹھری سے دونوں بکسے نکلوائے اور انھیں ٹرک میں بھرے ہوئے سامان کے نیچے رکھوا دیا۔

ٹرک میں فرنیچر کے علاوہ گھر گریہستی کا دوسرا سامان بھی تھا۔ ٹرک اور صندوق بھی تھے۔ بشیرا کے بکسے بھی ان کے ساتھ انپیکٹر کے سامان کا حصہ بن گئے۔

بکسے رکھوانے کے بعد بشیرا اور لالی اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گئے۔ اسی وقت سامنے سے تیز روشنی ابھری۔

بشیرے نے ڈرائیور کو ٹرک اشارت کرنے کی ہدایت کی۔ ٹرک اشارت ہو کر آگے بڑھا تو سامنے سے آنے والی گاڑی کی جتیاں بجھ گئیں۔ ٹرک رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ لالی دم بخود بیٹھا تھا۔ ٹرک قریب پہنچا تو ایک بار پھر جتیاں روشن ہو گئیں۔ لالی نے دھڑکتے دل سے دیکھا کہ سڑک کے کنارے کار کھڑی ہے۔ اس نے پہلی ہی نظر میں تازہ لیا کہ وہ میاں حیات محمد کی بیوک ہے۔ مگر نہ کوئی کار سے اترا نہ کسی نے ٹرک روکنے کی کوشش کی۔ ٹرک گرد کے بادل اڑاتا تیزی سے کار کے برابر سے گزر گیا۔

ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔ ہوا کے تیز جھونکے اندر آنے لگے۔ لالی پہلے ہی جھٹکن سے

بڑھال تھا، جھونکے لگے تو اس کی آنکھیں نیند سے بند ہونے لگیں۔ وہ ذرا دیر جھومتا رہا پھر سیٹ کی پشت سے ٹپک لگا کر سو گیا۔ ٹرک تیزی سے دوڑتا رہا۔ خنک جھونکے اندر آتے رہے۔

لالی بے خبر سوتا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے گھبرا کر دیکھا کہ ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا ہے۔ ٹرک سے تھوڑے فاصلے پر بشیرا دو کانشیلوں سے آہستہ آہستہ باتیں کر رہا ہے۔ لالی سخت پریشان ہوا۔

فرار کا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ کانشیل دروازے کے عین سامنے تھے۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد اس نے دیکھا، کانشیل سائیکلوں پر سوار ہو کر آگے بڑھ گئے۔

بشیرا ٹرک کی جانب واپس آیا۔ وہ دروازے کے قریب پہنچا، مگر اندر نہیں آیا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو باہر آنے کا اشارہ کیا۔ لالی نیچے اتر کر اس کے پاس گیا۔ بشیرے نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اسے اپنے ساتھ ٹرک سے ذرا دور لے گیا۔ اس نے رازدارانہ انداز میں آہستہ سے پوچھا۔

”یار! حیرانم لالی ہے؟ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے؟“

”کیا یہ بات تجھے کانشیلوں نے بتائی ہے؟“

”ہاں، انھوں نے ٹرک رکھوایا اور ٹارچ کی روشنی ڈال کر اندر جھانکنے لگے۔ میں جھٹ نیچے اتر آیا۔ انہیں بتایا کہ ٹرک میں انپیکٹر شاہنواز کے گھر کا سامان بھرا ہے۔ ان کا کراچی تبادلہ ہو گیا ہے۔ سامان وہیں جا رہا ہے۔ یہ سن کر کانشیلوں نے سامان کی تلاشی نہ لی۔ مگر تیرے بارے میں انھیں شبہ تھا کہ تو مفرور قیدی لالی ہے۔“ وہ آہستہ سے مسکرایا۔ ”پر میں نے تجھے انپیکٹر شاہنواز کا لازم بتا کر ان کا شبہ دور کر دیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”دونوں چلے گئے، لیکن ایسا لگتا ہے انھوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ سچ بتا، اصل بات کیا ہے؟“

لالی انکار نہ کر سکا۔ ”اب تجھ سے کیا چھپانا، بات کچھ ایسی ہی ہے۔“

”یار! یہ بات مجھے پہلے کیوں نہ بتائی؟“

”اب تو میں نے سب کچھ بتا دیا۔“

بشیرے نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے، آگے بھی پولیس والے ملیں گے اور اس دفعہ تجھ سے پوچھ گچھ بھی کریں گے۔ کانشیلوں کی زبانی مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ پولیس نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے۔“

”یہ کون سی جگہ ہے؟“

بشیر نے جواب دیا۔ ”یہ پاک پتہ روڈ ہے۔ آگے منگھری ہے۔“ اس نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ دور درختوں کے پیچھے شہر کی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔

”مجھے یہیں چھوڑ دے۔“

”مگر جائے گا کہاں؟“

”میری فکر نہ کر۔“ لالی نے اعتماد سے کہا۔ ”میں کچے رستے سے کسی طرف نکل جاؤں گا؟“

”جیسی تیری مرضی۔ سوچ لے۔“

”سوچنا کیا ہے۔ اب تیس اپنے رستے جاؤ۔ میں اپنے رستے چلا۔“

دونوں سڑک کے کنارے کھڑے ہاتھ رکھے تھے کہ دور سے تیز روشنی ابھری۔ لالی روشنی دیکھتے ہی سڑک کی جانب جھپٹا۔ اس نے اگلی سیٹ سے اپنی گھڑی اٹھائی اور تیز تیز قدموں چلتا ہوا قریب کے کھیتوں میں گھس گیا۔

بشیر انٹک پر جا کر بندہ آیا۔ رات اسٹارٹ ہوا اور آگے بڑھ گیا۔

راستہ ایک پیب بی کے پاس جا کر ختم ہو گیا تھا۔ اب لالی کے سامنے پیب بی کی صورت میں اونچا اور ابھرا ہوا ناہموار میدان تھا۔ لالی آہستہ آہستہ پیب بی پر چڑھنے لگا، اوپر پہنچا، میدان عبور کیا، نیچے آیا تو پختہ سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی اور بالکل ویران تھی۔ سڑک کے دونوں جانب کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ درختوں کے پیچھے نشیب میں جھنگر تھا۔ جھنگر جنگلی پودوں اور جھاڑیوں سے بھرا تھا۔

لالی سڑک پر آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے مشکل سے چند فرلانگ راستہ طے کیا تھا کہ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے ایک کار نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ ٹھنکا۔ کار کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ وہ ممکنہ باندھے اس طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحہ ایسا بھی آیا، جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ مگر وہ لوٹ کر جاتا بھی کہاں؟ لگ بھگ دو منٹ تک وہ گم سم کھڑا رہا۔ کار کوئی سوز کے فاصلے پر بالکل اس کے سامنے تھی۔ مگر اس جگہ گہری خاموشی چھائی تھی۔

سڑک کے نشیب میں بکھری ہوئی جنگلی جھاڑیاں، تاروں کی مدد ہم روشنی میں سایوں کے مانند دھندلی نظر آرہی تھیں۔ لالی نے ہمت سے کام لیا اور کار کی سمت بڑھنے لگا۔ کار جس قدر قریب آتی گئی، اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ لالی چاہتا تھا کہ کار کے سامنے رکے بغیر تیزی سے آگے نکل جائے۔ وہ رفتہ رفتہ کار سے نزدیک ہوتا گیا۔ جب کار کا فاصلہ چند قدم رہ گیا تو کار کے اندر سے آواز آئی۔ ”ہے، ٹھیر جاؤ۔“ ساتھ ہی ایک شخص دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ لالی اسے دیکھ کر بھی نہیں رکا۔ اس نے چاہا کہ لپک کر نشیب میں اتر جائے اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا

چھپاتا کسی طرف نکل جائے، لیکن اس نے رفتار تیز ہی کی تھی کہ وہ شخص چھپاک سے عین اس کے سامنے آگیا۔

”بات تو سنو۔“

لالی نے بے رخی سے کہا۔ ”کیہ گل ہے جی؟“

اس نے گردن موڑ کر اس شخص کو غور سے دیکھا اور ایک ہی نظر میں اندازہ لگالیا کہ وہ اسے آسانی سے زیر کر سکتا ہے۔ اس کا قد لالی کے برابر تھا۔ چہرہ جسم، اجلی سفید قیص اور پتلون، آنکھوں پر چشمہ، سر پر گھنے بال، ڈاڑھی موچھ صاف، صورت شکل اور وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا معقول آدمی لگتا تھا۔

اس نے لالی کو اپنی جانب گھورتے دیکھا تو مسکرا کر مخاطب ہوا۔ ”یار، اس قدر ناراض کیوں ہو رہے ہو؟“

لالی پھر بھی نہ پگھلا، اکھڑپن سے گویا ہوا۔ ”کو، کیا کہنا چاہتے ہو؟“ وہ شخص اور کھل کر مسکرایا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ”کیا بیوی سے جھگڑا کر کے آئے ہو؟ بات کیا ہے؟“

لالی نے اس دفعہ بھی بے رخی کا مظاہرہ کیا۔ ”خانا خاکی باتیں نہ کرو۔ مطلب بتاؤ، فناف۔ کیا چاہتے ہو تم؟“

”چاہتا ہوں کیا ہے۔ یار! تھوڑی سی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“ وہ نرم لہجے میں بولا۔ ”درا گاڑی کو دھکا لگا دو۔“ اس نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا۔ ”لو، یہ رکھ لو۔“

لالی نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں جی! میں دھکا شکانیں لگاؤں گا۔ مجھے جلدی ہے۔“

اس شخص نے جیب سے ایک نوٹ اور نکالا۔ ”لو، اب تو مان جاؤ۔“

”سوروپے دو گے، تب بھی تمہاری گڈی کو دھکا نہیں لگاؤں گا۔“ لالی نے تھیکے لہجے میں کہا۔

”صاف بات یہ ہے جی! میں اس دکھت رک نہیں سکتا۔“ یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔

اس شخص نے ہاتھ بڑھا کر لالی کا بازو تھام لیا۔ ”یار ایسی بھی کیا بے مروتی۔ آدمی سے آدمی کا کام پڑتا ہے۔“

لالی نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”پرے ہٹ کے بات کر۔“ اس نے آنکھیں نکال کے اسے گھورا۔ ”کہہ دیا، میں نہیں رک سکتا۔ ایویں گلے پڑا جا رہا ہے۔“

وہ شخص ڈھیٹ بن کر بولا۔ ”یار! گالیاں دے لو۔ مگر گاڑی کو دھکا لگا دو۔“

لالی کا سارا طظنہ جاتا رہا۔ اس نے چاہا بھی کہ غصہ آجائے اور اس شخص سے پیچھا چھوٹ جائے۔ لیکن اس نے تو غصے کا کوئی جواز ہی نہیں چھوڑا تھا۔ لالی چند لمحے خاموش کھڑا رہا پھر کسی قدر نرم لہجے میں اپنی مجبوری بیان کی۔

”دیکھو جی! نرا ضکی شرا ضکی کی گل نہیں۔ میں تمہاری مدد ضرور کرتا۔ پر مجھے بہت بھتیجی ہے۔“

”کہاں جانا ہے تمہیں؟“

”میں نے جی اسٹیشن جانا ہے۔ لمبور کی گڈی پکڑنی ہے۔“

”اسٹیشن یہاں سے خاصی دور ہے۔ تم پیدل تو صبح تک نہیں پہنچ سکتے۔“ وہ شخص سوچنے لگا۔ ”چار بجنے والے ہیں۔ ٹرین سوا چار بجے اسٹیشن پہنچے گی۔ ایکسپریس ہے۔ مشکل سے چند منٹ ٹھہرتی ہے۔ تم اسے کیسے پکڑ سکتے ہو؟“

لالی اڑا رہا۔ ”نہیں جی! میں سیدھا اسٹیشن جاؤں گا۔ اگر پہلی چھوٹ گئی تو دوسری سے چلا جاؤں گا۔“

”دوسری گاڑی دوپہر کو جاتی ہے۔ میں تمہیں اپنی کار سے اسٹیشن پہنچا دوں گا۔“ اس نے نرم اور شفقت لہجے میں کہا۔ ”اس وقت رات کو کہاں بھٹکتے پھرو گے اور ادھر سے تو کوئی راستہ اسٹیشن جاتا بھی نہیں۔ تمہیں ملتان روڈ جانا ہو گا۔“

لالی غصے میں پڑ گیا۔ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اس نے دریافت کیا۔ ”تمہیں کتنی دور جانا ہے؟“

”پانچ میل سمجھ لو۔“

”پانچ میل؟“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”اتنی دور تک تو میں دھکا نہیں لگا سکتا۔ دھکا لگاتے لگاتے اپنا جینتھن نکل جائے گا۔“

”تم اکیلے نہیں ہو، میں بھی تمہارے ساتھ دھکا لگاؤں گا۔“

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ کار کے قریب گیا، اس کا بوٹ چھو کر دیکھا اور اس پر ہاتھ بھیرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا یہ شارٹ بھی نہیں ہو سکتی؟“

”نہیں یار! یہ اشارٹ نہیں ہو سکتی؟“ وہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پنٹرول ختم ہو گیا ہے۔“ اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے سر کے بال کریدتا رہا۔ پھر بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ ”سخت حماقت ہو گئی۔ آج ایک جگہ کھانے پر گیا تھا، پھنس گیا ہے۔“

وہاں۔ رات زیادہ ہو گئی۔ ڈرائیور کو پہلے ہی چھٹی دے دی تھی۔ اس کی بیوی بیمار ہے۔ حرام زادے نے یہ بھی نہیں بتایا کہ گاڑی میں پیٹرول کم ہے۔ ورنہ راستے میں کسی پیٹرول پمپ سے ڈلو لیتا۔ بس ہو گئی حماقت۔ اب اس کی سزا بھگت رہا ہوں۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔

”یار! میل بھر تو میں نے دھکا لگایا، پھر اپنی ہمت نے جواب دے دیا۔“

لالی بے تکلفی سے بولا۔ ”بے کار اس چکر میں پڑے۔ مزے سے گڈی کے اندر سوتے۔ سویرے کوئی نہ کوئی دھکا لگانے والا مل جاتا۔“

”سویرے تو دھکا لگانے والے بہت مل جائیں گے۔ دوسری گاڑی بھی آسکتی ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ مجھے صبح چھ بجے کمشنر صاحب کو چھوڑنے اسٹیشن جانا ہے۔ وہ ملتان جا رہے ہیں۔ انھیں کچھ ضروری فائلیں دینی ہیں جو میری گاڑی میں پڑی ہیں۔ ورنہ گاڑی چھوڑ کر پیدل ہی چلا جاتا۔“

لالی کسی قدر مرعوب ہو گیا، پوچھنے لگا۔ ”جی! آپ ادھر کوئی افسر لگے ہوئے ہیں؟“

”یہ نہ پوچھو۔“ وہ ایک بار پھر ہنسا۔ ”تم سے پہلے بھی ایک راہ گیر ملا تھا۔ میں نے اس پر رعب بھانا چاہا۔ اسے بتایا کہ میں کون ہوں۔ میری بات سنتے ہی وہ بٹٹ بھاگا اور سڑک سے نشیب میں اتر کر جھاڑیوں میں گھس گیا۔ یہ بھی سراغ نہ ملا، کہاں گیا، کدھر گیا؟“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مشکل یہ ہے کہ اس سڑک پر نہ کوئی لاری چلتی ہے نہ ادھر سے ٹرک گزرتے ہیں۔ یہ سڑک سیدھی میری کوٹھی تک جاتی ہے۔“

”میں تو کہتا ہوں جی! پیدل ہی چلے جاتے تو ٹھیک تھا۔“

”بھئی مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔“ اس دفعہ وہ بھنٹا گیا۔ ”لگا سکتے ہو تو گاڑی کو دھکا لگا دو۔ مجھے ہر حال میں صبح چھ بجے سے پہلے پہلے کوٹھی پہنچنا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہاتھ سے اسٹینرنگ سنبھالا اور دوسرے سے کار آگے ڈھکیلنے لگا۔

لالی چند لمبے خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر کچھ سوچ کر وہ بھی اس کے ساتھ کار کو دھکا لگانے لگا۔ چھوٹی مورس کار تھی، نئی تھی اور ہلکی پھلکی بھی تھی۔ سڑک صاف ستھری تھی اور آگے ڈھلان بھی تھی۔ لالی کو زیادہ زور نہیں لگانا پڑا۔ کچھ دور تک دونوں دھکا دے کر کار آگے بڑھاتے رہے۔ لالی نے چلتے چلتے پوچھا۔

”آپ نے یہ نہیں بتایا جی! آپ یہاں کیا لگے ہوئے ہیں؟“

اس نے لالی کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔ ”یار! میں اس ضلع کا ڈپٹی کمشنر ہمدانی ہوں۔“ لالی کے کان کھڑے ہوئے، اس کے قدم رک گئے۔ ہمدانی بھی رک گیا۔ اس نے مڑ کر لالی

پر نظر ڈالی۔ ”تم گھبرا کیوں گئے؟“ وہ آہستہ آہستہ بانپتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔ ”قتل کر کے بھی آئے ہو تو پروا نہ کرو۔ تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ڈرو نہیں۔ لگاؤ دھکا۔“

لالی نے دھکا نہیں لگایا، آہستہ سے بولا۔ ”قتل شل تو میں نے نہیں کیا۔ بات کچھ اور ہے۔“

”چوری کی ہے؟ ڈاکہ ڈالا ہے؟ عورت وورت بھگائی ہے؟“ ہمدانی کھل کر مسکرانے لگا۔

”صاف صاف بتاؤ، بات کیا ہے؟“

لالی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”صاف بات یہ ہے جی! میں جیل سے بھاگا ہوا کیدی لالی ہوں۔ میری گرفتاری پر دو ہزار انعام بھی رکھا گیا ہے۔“

ہمدانی اسی بے نیازی سے بولا۔ ”یار! جیل سے تو قیدی بھاگتے ہی رہتے ہیں۔ تم نے ایسا کون سا عین جرم کیا ہے۔“ وہ خاموش ہو گیا اور چند لمبے سوچتا رہا۔ ”یاد آیا۔ تمہارے معاملے میں وہ اپنے وزیر زراعت کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اسی لیے تمہاری گرفتاری پر انعام و نعام بھی رکھا گیا ہے۔ پولیس بھی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم اس وقت میرے ساتھ ہو۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”یار تم بالکل پریشان نہ ہو۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع کا بادشاہ ہوتا ہے۔“

”یہ تو مجھے پتہ چل گیا جی کہ آپ دؤے افسر ہو۔“ لالی نے قدرے تامل کیا۔ ”میاں حیات محمد نے بھی ایسا ہی وعدہ کیا تھا۔ وہ بھی بہت دؤے زمیں دار ہیں، پر انھوں نے توجی ایسے چکر میں ڈال دیا تھا میں آپ کو کیا بتاؤں۔“

”حیات محمد تو نہایت دہلیز آدمی ہے۔ بیگم اس کی البتہ بڑی آب و تاب کی عورت ہے۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”ہیرے کی طرح جگمگاتی ہے۔ تم نے اسے دیکھا ہو گا؟“

”کیا بات ہے جی ان کی۔“ میاں حیات محمد ٹوکی بیوی ناصرہ کے ذکر پر لالی نے بھی لذت محسوس کی، چمک کر بولا۔ ”میں نے توجی انھیں ننگا بھی دیکھا ہے۔“

”نہیں یار!“ ہمدانی حیرت سے اچھل پڑا۔ ”تو تو بڑا چھپا رستم نکلا۔ وہ تو بہت اونچی چیز ہے۔ کہاں لکر گئی تجھ سے؟“ اس نے توقف کیا۔ ”یار! سچ بتا جی؟“

”سچ ہی کہہ رہا ہوں!“ لالی نے سینہ پھلا کر فخر سے کہا۔ ”پچھلے سوموار ہی کی تو بات ہے۔ ہوا یہ کہ میاں حیات محمد نے گتے میں اس کی ساڑی نوچ کر پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دوڑچ لیا۔ وہ اپنی ننگی ننگی ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ میں صوفے کے نیچے زمین پر پڑا تھا، بالکل اس کے سامنے۔“ لالی نے گہری سانس بھری۔ ”میاں حیات تو اسے جان سے مار دیتا پر میں بیچ میں آگیا۔“

ی سانسیں بھر رہا تھا۔

ہمدانی خاموش بیٹھا رہا، پھر کچھ سوچ کر اس نے کہا۔ ”یار! تو ٹھیک ہی کہتا تھا۔ گاڑی یہیں بھڑکتے ہیں۔ دونوں پیدل چلتے ہیں۔ لیکن تم فائلوں اور سرکاری کاغذات سے بھرا ہوا ٹرنک لاد کر پل سکو گے؟“

لالی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اب تو تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا ہے۔ آپ کو جی کار ہی میں بٹھا کر کوٹھی تک لے جاؤں گا۔“

ہمدانی نے کچھ نہیں کہا۔

مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹنے لگا تھا۔ ستاروں کی چمک دمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔ لالی نے تازہ دم ہو کر پھر دھکا لگانا شروع کر دیا۔ دوسرے پہلے میں وہ ستائے بغیر کار ہمدانی کی کوٹھی تک لے گیا۔ کوٹھی دور سے نظر آنے لگی تھی۔ قریب پہنچ کر لالی نے صبح کی ہلکی ہلکی دودھیا روشنی میں دیکھا۔ کوٹھی کی بلندی پر قومی پرچم لگا تھا۔ چھانک پر مسلح پولیس کا پیرا تھا۔ کار پر نظر پڑتے ہی دوسرے دار بھاگتے ہوئے آئے۔ ہمدانی کار سے باہر آگیا۔ پھرے داروں نے اسٹیشن ہو کر اسے کھٹاک کھٹاک سلیوٹ کیا۔

سلیوٹ کے ساتھ ہی وہ ہمدانی سے ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ ہونٹوں سے مسکراہٹ عائب ہو گئی۔ گردن اکڑ گئی، چہرے پر خشونت آگئی۔ اس نے پھرے داروں کو بڑی رعونت سے مخاطب کیا۔ ”گاڑی کی ڈکی کھولو۔“ اس نے کار کی کنجی ایک پھرے دار کی جانب اچھال دی۔ پھرے دار نے کنجی سنبھالی اور ڈکی کھولنے لگا۔

ذرا سی تاخیر ہوئی تو ڈپٹی کمشنر زور سے چیخا۔ ”کیا کرتا ہے؟ ڈکی تک نہیں کھلتی۔“ پھرے دار کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ بار بار کنجی گھماتا رہا مگر ڈکی نہ کھلی۔ ڈپٹی کمشنر نے دوسرے پھرے دار کو ڈانٹا۔ ”تم کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ، اس کی مدد کرو۔“ دوسرا پھرے دار بھی لپک کر ڈکی کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں نے ڈکی کھولی۔ اندر ایک سیاہ ٹرنک رکھا تھا۔ خاصا وزنی بھی تھا۔ دونوں پھرے داروں نے مل کر اسے نکالا۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا۔ ”میرے کمرے میں پہنچا دو۔“ وہ آگے بڑھ گیا۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ ”گاڑی گیرج میں کھڑی کر دو۔ ڈرائیور آئے تو اس حرام زادے کو فوراً میرے سامنے پیش کرو۔“ ساتھ ہی اس نے انگلی سے لالی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لالی گردن جھکا کر سٹرا سٹرا یا ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلتے لگا۔

اس نے مجھ پر بھی ہاتھ چلایا۔ بس جی! فیر تو میں نے بھی گتے میں آتا ہی تھا۔ جھٹ میں نے اس کا گلا پکڑ لیا۔ اس نے بہت زور مارا، پر جی اپنے ہاتھ بھی لوہے کے ہیں۔ میں نے دیوار سے اڑا کر ٹھکا ٹھک جو اس کا سر ٹکرایا، تو وہیں ڈھیر ہو گیا۔“

”گلتے تو تم جان دار ہو۔“ ہمدانی نے لالی کا ایک بازو انگلیوں سے ٹٹولا۔ ”یہ تو بتاؤ، اب میاں حیات محمد کی بیگم کہاں ہے؟ بعد میں اس پر کیا گزری؟“

لالی نے اسی جوش و خروش سے بتایا۔ ”میں اسے صاف نکال لایا۔ وہ اپنی بھین کے پاس لال ٹیے کی طرف گئی ہے۔ خود ہی گتھی چلا رہی تھی۔“

”یار! تم تو بڑے کام کے آدمی گلتے ہو۔“

”آپ نے جی مجھ سے جو وعدہ کیا ہے، مرد کا وعدہ ہے؟“

”بالکل مرد کا وعدہ۔ ملاؤ اسی بات پر ہاتھ۔“ ہمدانی نے ہاتھ بڑھا کر گرم جوشی سے لالی کا ہاتھ دبایا۔ ”اور یہ بھی وعدہ رہا کہ میں خود تمہیں چھوڑنے جاؤں گا۔ مگر آج دوپہر کو نہیں، کل صبح پانچ بجے والی ٹرین پر۔ چلو، اب لگاؤ دھکا۔“

”پر میں نے تو قادر آباد اسٹیشن جانا ہے۔“

”قادر آباد؟“ ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ تو یہاں سے دور ہے۔ تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو؟ قادر آباد تو لاہور جاتے ہوئے راستے ہی میں پڑے گا۔“

”اب تو جی میں اپنے بارے میں آپ کو صاف صاف بتا ہی چکا ہوں۔“ لالی نے ہچکچاتے ہوئے ہمدانی کو بتایا۔ ”اب آپ سے کیا چھپانا۔ وہاں میرا ساتھی رحیم دادا انتظار کر رہا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانا ہے۔“

”چلو، تمہیں قادر آباد ہی پہنچا دوں گا۔ اب تو خوش ہو؟“

لالی واقعی خوش ہو گیا۔ چمک کر بولا۔ ”یہ بات ہے جی تو آپ اندر بیٹھ جائیں۔ میں اکیلا ہی دھکا لگاؤں گا۔ آپ بالکل فکر نہ کریں، بیچ ہی میل کا تو رستہ ہے۔“

”تم اپنی گٹھری تو اندر رکھ دو۔“ ہمدانی نے مسکرا کر لالی کے کندھے سے گٹھری اتار کے کار کی پیچلی نشست پر ڈال دی اور خود اگلی نشست پر اسٹیرنگ سنبھال کر بیٹھ گیا۔ لالی اکیلا کار کو دھکا لگانے میں جٹ گیا۔ وہ بہت جوش میں تھا۔

لالی کار کو دھکا دیتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ تین میل تک کار ڈھکیلا ہوا لے گیا۔ پھر بری طرح ہانپنے لگا۔ ہمدانی نے کار ٹھہرا کے لالی کو ذرا دیر سستانے کا موقع دیا۔ لالی کار کا سہارا لیے لمبی

اب ڈپٹی کمشنر کی چال میں تمکنت آگئی تھی۔ وہ پختہ سڑک پر جوتوں سے آہٹ پیدا کرتا پھانک کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو ایک بار پھر پولیس کے مسلح سپرے داروں نے کھٹاک سے اسے سلیوٹ کیا۔ اس نے گردن کو خفیف سی جنبش دی اور بے نیازی سے آگے بڑھتا ہوا کوٹھی کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک اردلی سر پر پگڑی جماتا، وردی کے بٹن لگاتا، کمر پر سنراٹکا درست کرتا کوٹھی کے عقب سے نکلا، برساتی میں پہنچا اور کوٹھی کے اندر جانے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے سر کی جنبش سے اسے قریب بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا آیا۔ ڈپٹی کمشنر نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی جانب دیکھا اور نہایت بے نیازی سے پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

لالی سٹ پٹا کے رہ گیا۔ وہ گھبرا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ڈپٹی کمشنر نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اردلی سے کہا۔ ”نذیر بیگ! اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دو۔ شام کو اس کی پیشی کرنا۔“ یہ ہدایات دے کر ہمدانی آگے بڑھ گیا۔

لالی چند ہی قدم گیا تھا کہ دہرے بدن کا ایک ادھیڑ آدمی سامنے باغ میں ایک درخت کے نیچے سے نکلا۔ وہ لمبا گاؤں پہنے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، چہرے پر رعب اور بدبویہ۔ یہ ڈویرٹل کمشنر تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ڈپٹی کمشنر کی جانب دیکھا۔ ڈپٹی کمشنر کی اس سے نظریں ملیں تو افسر سے جھٹ ماتحت بن گیا۔ اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی پڑ گئی، ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ چہرے پر خشونت کے بجائے شگفتگی پھیل گئی۔ وہ تیزی سے کمشنر کی جانب لپکا، قریب پہنچا اور اس کے روپہ روادب سے گردن جھکا کر گھلایا لے لگا۔

لالی نے ہمدانی کو اس طرح گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے دیکھا تو سخت حیرت ہوئی۔ مگر نذیر بیگ اردلی نے اسے وہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنے دیا۔ وہ لالی کو اپنے ہم راہ لے گیا اور انیکسی کے ایک کمرے میں ٹھہرا دیا۔ کمرہ مختصر تھا مگر ہوا دار تھا۔ اس میں چار پائی تھی۔ اس پر بستر لگا تھا۔ کمرے کے قریب ہی غسل خانہ تھا۔ نذیر بیگ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ رہا غسل خانہ، تم ذرا نہادھولو۔ بہت تھکے ہوئے نظر آ رہے ہو۔“

لالی کو سب سے زیادہ اپنی گٹھری کی فکر تھی۔ ”میری گٹھری ساب کی گڈی میں پڑی ہے۔ وہ مجھے پہنچا دو۔“

نذیر بیگ مسکرا کر بولا۔ ”پروا نہ کرو۔ تمہاری گٹھری آجائے گی، کہیں جائے گی نہیں۔“ وہ

بروازے کی جانب بڑھا۔ ”میں تھوڑی دیر بعد تمہارے لیے ناشتا بھجوا دوں گا۔ سونا نہیں۔“ وہ کمرے سے چلا گیا۔

لالی ذرا دیر تک بستر پر خاموش بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ نہا کر غسل خانے سے نکلا تو دن نکل آیا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ درختوں کی بلندیوں پر جھلملانے لگی تھی۔ اس نے کوٹھی کی طرف دیکھا۔ ایک گہری نیلی شیورٹ پھانک کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس پر کمشنر کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ پچھلی نشست پر ہمدانی بھی کمشنر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پھانک پر سنتری، بندوقیں سنبھالے ایک ہاتھ پیشانی پر رکھے چاق چوبند کھڑے تھے۔ کار پھانک سے گزر کے آگے بڑھی۔ لالی اسے دور تک دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں، غسل کرنے کے بعد نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ بستر پر لیٹ کر سونے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ ناشتا آگیا۔ لالی نے ناشتا کیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔

دن ڈھلے نذیر بیگ نے اسے جگایا۔ وہ اس کی گٹھری بھی لایا تھا۔ لالی نے گٹھری کھول کر شیو کرنے کا سامان نکالا۔ غسل خانے میں گیا۔ ڈاڑھی مونڈی۔ منہ ہاتھ دھوئے اور تازہ دم ہو کر باہر آگیا۔ نذیر بیگ کمرے میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اسے پیشی کے لیے لے گیا۔



ڈپٹی کمشنر مینس کورٹ میں ٹینس کھیل رہا تھا۔ لالی درختوں کے نیچے خاموش بیٹھا کھیل دیکھنے میں مگن تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے مقابل اس کی بیوی کھیل رہی تھی۔ وہ بھی ہمدانی کی طرح سفید نیکر اور آدھی آستینوں کی اسپورٹنگ شرٹ پہنے ہوئے تھی۔ شرٹ کے بٹن دور تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کا گورا گورا سینہ صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ چہرے پر دل کشی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور غزالی تھیں۔ بدن سڈول تھا۔ لالی کو بہت اچھی لگی۔ وہ اسے بھاگتے دوڑتے اور اچھل اچھل کر ریکٹ سے گیند اچھالتے دیکھتا رہا۔

کھیل ختم ہوا تو دونوں مینس کورٹ سے باہر آگئے۔ خدمت گاروں نے آگے بڑھ کر دونوں کے ہاتھوں سے ریکٹ لیے۔ ابلے ابلے تو لیے پیش کئے۔ انہوں نے تو لیے لے کر چہرے اور گردن سے ہینز پونچھا۔ سفید وردی میں ملبوس ایک بیرے نے دو گلاسوں میں لیمو کا تازہ رس پیش کیا۔ دونوں نے گلاس خالی کیے، بیرے کو دیے۔ اسی اثنا میں ایک آیا، ڈپٹی کمشنر کے دو بچوں کو لے کر آگئی۔ دونوں لڑکے تھے۔ بڑے کی عمر پانچ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ چھوٹا اس سے دو ڈھائی برس کم عمر تھا۔

دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ نہادھو کر، تروتازہ ہو کر آئے تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے گال تھپک کر بچوں کو پیار کیا۔ ماں نے جھک کر دونوں کے گلابی رخسار چومے۔ آیا بچوں کو لے کر ایک طرف چلی گئی۔

ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کوٹھی کی جانب چلا۔ اس نے لالی پر اچھتی ہوئی نگاہ ڈالی مگر کوئی توجہ نہیں دی۔ بیوی کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ لالی نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ نذیر بیگ نے آنکھ مار کر لالی کو ڈپٹی کمشنر کے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا۔ لیکن لالی آگے نہیں بڑھا۔ نذیر بیگ نے ڈپٹی کمشنر کی نظر بچا کر دوسری بار ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی نے قدم اٹھائے اور سہما سہما ڈپٹی کمشنر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی کرنیں ڈپٹی کمشنر اور اس کی بیوی کے چہروں پر پڑ رہی تھی۔ دونوں کے چہرے سنہری دھوپ سے دک رہے تھے۔ سفید لباس میں دونوں راج ہنس کے جوڑے کے مانند خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر بیوی کے ساتھ ہنستا مسکراتا کوٹھی کے اندر چلا گیا۔ اس نے پلٹ کر لالی کی جانب دیکھا تک نہیں۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ لالی اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔

نذیر بیگ نے لالی کو کوٹھی کے باہر ہی روک لیا۔ ”صاحب تھوڑی دیر میں باہر نکلیں گے۔ تم ان کا ہمیں انتظار کرو۔“ یہ کہہ کر وہ بھی چلا گیا۔

لالی کوٹھی کے باہر پڑی ہوئی لوہے کی بچ پر بیٹھ گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام کا دھندلا پھیلنے لگا کوٹھی میں جگہ جگہ بجلی کے بلب روشن ہو گئے۔ مگر سنا بہت گہرا تھا۔ اردلی اور خدمت گار ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ لیکن سب خاموش تھے۔ وہ صرف اشاروں میں باتیں کرتے یا اس قدر آہستہ بولتے گویا سرگوشی کر رہے ہوں۔ کچھ دیر بعد ڈپٹی کمشنر کوٹھی سے باہر آیا۔ بیوی اس وقت بھی اس کے ساتھ تھی۔ دونوں نہا کر آئے تھے اور زیادہ شگفتہ، زیادہ تروتازہ لگ رہے تھے۔ ان کے لباس بھی بدلے ہوئے تھے۔

ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی لالی جھٹکھٹا ہوا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس دفعہ بھی لالی پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیوی سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ”الی پھر بچ پر بیٹھ گیا۔ اب وہ بہت ہزار اور اکتا ہوا لگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نذیر بیگ اردلی آگیا اور اسے اپنے ہم راہ باغ میں لے گیا۔ ڈپٹی کمشنر، بیوی کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ہی لوہے کے

قد آدم کھمبوں پر بجلی کے دودھیا بلب روشن تھے۔ ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر ٹیلی فون تھا۔ اسی میز پر دھسک سے بھرا ہوا گلاس بھی رکھا تھا۔ ڈپٹی کمشنر گلاس اٹھا کر آہستہ آہستہ چسکی لگا رہا تھا۔ لالی اور نذیر بیگ ذرا ہٹ کر ایک طرف خاموش کھڑے ہو گئے۔

نذیر بیگ چلا گیا۔ لالی اکیلا رہ گیا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا انتظار کرتا رہا کہ کب ڈپٹی کمشنر اشارہ کرے اور وہ اس کے قریب جائے۔ جب کئی منٹ تک ڈپٹی کمشنر نے اس کی جانب توجہ نہیں دی تو لالی کا جی چاہا کہ خود ڈپٹی کمشنر کے سامنے پہنچ جائے۔ لالی ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

ڈپٹی کمشنر نے بیوی کو اشارہ کیا۔ اس نے رسیور اٹھایا اور آہستہ سے کہا۔ ”ملا دو۔“ چند لمحے وہ رسیور کان سے لگائے خاموش بیٹھی رہی پھر اونچی آواز سے بولی۔ ”ہیلو!“ اس نے ٹیلی فون پر کچھ سنا، مسکرائی اور رسیور ڈپٹی کمشنر کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

”یاد ہے، آج پولیٹیسن کلب کی ٹائٹ آف دی گریٹ پنسن ہے۔ مرسلیمان اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا ہے۔“

ڈپٹی کمشنر نے رسیور سنبھالا۔ ”ہیلو سلیمان! مجھے یاد ہے۔ یار! یہ بھی کوئی بھول جانے والی بات ہے۔ کمال کر دیا تم نے۔“ وہ مسکراتا رہا اور رسیور پر سلیمان کی باتیں سنتا رہا۔ اسی اثنا میں اس کا چھوٹا بچہ آگیا۔ ماں نے اٹھ کر اسے گود میں اٹھالیا، سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مڑ کر بیوی کی جانب دیکھا مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ بچے کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتی رہی اور اس کے رخسار چومتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ بچے کے ساتھ اس کی والدہانہ محبت دیکھ کر لالی بھی بے اختیار مسکرا دیا۔

ڈپٹی کمشنر نے ٹیلی فون پر باتیں سنتے سنتے ایک دفعہ چونک کر حیرت سے کہا۔ ”سرا صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے؟ یار! اب کنڈکٹ کون کرے گا۔ ان کا سا امپائر کہاں ملے گا؟“ بات کتے کتے وہ تہقہ لگا کر ہنسا۔ ”وہ بوڑھے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ رنڈوے بھی ہیں۔ وہ امپائرنگ کیا کرتے ہیں گویا عمر رفتہ کو آواز دیتے ہیں۔ قسم خدا کی ان پر جوانی آ جاتی ہے۔ کبھی کنڈکٹ کرتے وقت ان کا چہرہ دیکھا ہے۔ بھی کیا باغ و بہار آدی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، کسی طرح انہیں اسپتال سے اٹھالاؤ۔ ان کا دل بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے پھر تہقہ لگایا۔ چند لمحوں تک ہوں ہوں کرتا رہا اور رسیور پر سلیمان کی بات سنتا رہا، پھر اس نے کہا۔ ”امپائر کا بندوبست کرنا میرے لیے مشکل ہو گا۔ یار، ڈپٹی کمشنر ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ میرے حکم پر ہر کام ہو جائے۔ کم از کم بتا

نہیں۔ تم خاصے تیز آدمی ہو۔ آسانی سے امپائر کا رول ادا کر لو گے۔ اس میں رازداری بنیادی شرط ہے۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ویسے تو تم خود ہی ایسا راز ہو جسے چھپائے پھرتے ہو۔ کسی سے کچھ کہو گے بھی تو وہ تمہیں لپاڑیا سمجھ گا۔“

”اگر لاٹری شاعری کا معاملہ ہے تب تو جی آپ بالکل پروا نہ کریں۔ میں ڈیڑھ سال تک سرکس میں لاٹری کھلاتا رہا ہوں۔“ لالی مسکرایا اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ ”مگر جی وہ تو صاف چار سو بیسی تھی۔ ایسا تو کوئی چکر نہیں؟“

”ہش، ایسا کوئی چکر نہیں۔“ ڈپٹی کمشنر نے تیوری پر بل ڈال کر اسے گھورا، چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ ”چلو یہ بھی اچھا ہے کہ تم جانتے ہو، لاٹری کس طرح کھیلی اور کھلائی جاتی ہے، مگر یہ ویسی لاٹری نہیں۔ یہ اور قسم کی لاٹری ہے۔ بلکہ اسے قرعہ اندازی کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ لاٹری تو سیدھی سیدھی قمار بازی ہوتی ہے۔“

اس نے قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے تو اذنین پوری تفصیل سے لالی کو سمجھائے۔ ہر بات کئی کئی بار بتائی تاکہ ذہن نشیں ہو جائے اور وہ امپائر کا کردار اچھی طرح ادا کر سکے۔ لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جو بات سمجھ میں نہ آتی، اس کے بارے میں سوال بھی کرتا جاتا۔ ڈپٹی کمشنر اسے سمجھاتا جاتا۔ جب لالی ہر تفصیل سمجھ گیا اور اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا تو ڈپٹی کمشنر نے سامنے کھڑے ہوئے اردلی کو اشارے سے قریب بلایا۔ اسے کانڈ جینسل لانے کا حکم دیا۔ ذرا دیر بعد وہ کانڈ جینسل لے کر واپس آیا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے میز پر رکھ کر اٹنے قدموں چلا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے جینسل اٹھائی۔ مسکرا کر لالی سے کہا۔ ”مسٹر امپائر! اب ذرا تمہارا امتحان بھی ہو جائے۔“ اس نے کانڈ پر کچھ لکھا۔ اور لالی کی طرف بڑھا کر بولا۔

”اے پڑھ کر سناؤ۔“

لالی نے جھٹ پڑھ دیا۔ ”مین۔“ اس نے لمحے بھر تامل کیا پھر ہچکچاتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ بھی دہاں ہوں گی جی؟“

ڈپٹی کمشنر ایک دم ہمدانی بن گیا، ہنس کر گویا ہو۔ ”ہائے، یہی تو شہر میں قاتل بچا ہے۔ تین راؤنڈ ہو چکے ہیں، مگر اب تک نہیں جاگا میری قسمت کا ستارہ!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری، لالی کی طرف ذرا سا جھکا۔ ”یار! آج تو تمہاری چودھراہٹ ہے۔ تمہارے ہی ہاتھوں کچھ ایسا ہو جائے کہ میں دروازے پر دستک دے کر کہوں، کھل جا سم سم، اور کھٹ سے سم سم کھل جائے۔ کیا سمجھ؟“

اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری اور کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

بنایا امپائر تو میرے حکم پر فی الفور سہیا نہیں ہو سکتا۔ ویسے کسی کو بھی امپائر بنا دو، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ وہ ریسپور کان سے لگائے چپ بیٹھا رہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اچھا، میں ہی کچھ کرتا ہوں۔ پروگرام ڈسٹرب نہیں ہو سکتا۔“ اس نے ریسپور رکھ دیا اور سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

اسی عالم میں اس نے گردن اٹھائی، لالی کو دیکھا۔ لالی بائیں طرف کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ ڈپٹی کمشنر اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ وہ قریب آگیا تو ڈپٹی کمشنر نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ہنس کر بولا۔

”ٹھیک ہے، امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

لالی نے سادگی سے پوچھا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے جی؟“

”پروا نہ کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ بتاؤ، کچھ انگریزی ونگریزی بھی جانتے ہو؟“

لالی نے انکار میں گردن ہلا دی۔ ”ساب! انگریزی تو میں بالکل نہیں جانتا۔ میرے پیونے تو کبھی مجھے سکول بھیجا نہیں، پرنسپل میں ضرور پڑھا ہے۔ بات یہ ہے جی۔“

ڈپٹی کمشنر نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ بات کاٹ کر بولا۔ ”اردو میں کم از کم نام تو پڑھ لو گے؟“

لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”وہ تو جی میں صاف پڑھ لیتا ہوں۔ کبھی انگوٹھا نہیں لگایا۔ ہمیشہ دستخط کرتا ہوں۔“

”بس۔ بس۔“ ڈپٹی کمشنر نے ہاتھ اٹھا کر بے زاری کا اظہار کیا۔ ”انتا کافی ہے۔ اب تم امپائر بننے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مگر دیکھو، تم کم سے کم بولنا بلکہ سرے سے بات ہی نہ کرنا تو اچھا ہے۔“

ڈپٹی کمشنر نے ریسپور اٹھایا۔

”مہر سلیمان سے ملا دو۔“

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ لالی سر جھکائے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر بے چینی سے اپنا ایک پیر ملاتا رہا۔ ذرا دیر بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ڈپٹی کمشنر نے ریسپور اٹھا کر کہا۔ ”سلیمان! امپائر کا بندوبست ہو گیا ہے۔ اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ یار فضول باتیں چھوڑو، کام کی بات سنو۔ اس دفعہ ٹوکن انگریزی کے بجائے اردو میں ہوں گے۔ تم ٹوکن تیار کر آؤ۔ میں آٹھ بجے تک نوشاہہ کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔“

اس نے بات ختم کی۔ ریسپور رکھا۔ لالی کو ذرا اور قریب بلایا۔ ”پریشان ہونے کی کوئی بات

”بجایا تھا، بالکل بتایا تھا۔ بات بھی یہی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ہمدانی نے پھر قہقہہ
 - ”جانا! یہ صرف امپائر ہے، کھیل کا کھلاڑی نہیں ہے۔ اس دفعہ امپائر کے معاملے میں بھی
 س رہے گا۔ ہو جائے یا روں کے ساتھ تھوڑی سی اکٹی وٹی۔ کیا خلیل ہے؟“

”اور جو کسی نے اسے پہچان لیا تو؟“

اسی وقت اردلی طشتری میں وزینگ کارڈ رکھے ہوئے آیا۔ اس نے طشتری ہمدانی کے سامنے
 دی اور نظریں نیچی کر کے ادب سے کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کارڈ اٹھا کر دیکھا اور فوراً ہمدانی سے
 ن کشن بن گیا۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا، ہونٹ سمٹ کر جڑ گئے۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر اردلی
 دیکھا اور خفا ہو کر بولا۔ ”میں نے ہدایت کی تھی کہ آج کسی کو ملاقات کا وقت نہ دیا جائے۔ پھر یہ
 رڈ کیوں آیا؟“

اردلی نے اٹکتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”سرکار! بات یہ ہے۔۔۔“

ہمدانی نے اسے آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”مجھے معلوم ہے کیا بات ہے۔“
 اس نے قدرے تامل کیا۔ ”جاؤ، جاکر خان بہادر کو بھیج دو، اب اور کوئی ملاقاتی نہیں آئے گا۔ سمجھ
 لے۔“

اردلی اٹنے قدموں واپس ہوا۔ نوشابہ بھی کوٹھی کی جانب چلی۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا
 کوٹھی کے اندر چلا گیا اور نوشابہ کے ہم راہ ڈپٹی کشن کے ڈریسنگ روم میں پہنچ گیا۔ نوشابہ نے
 ارڈروب کھولا۔ لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا، ارڈروب قسم قسم کے کپڑوں سے بھرا
 ہے۔ بڑی تعداد سونوں کی تھی۔

نوشابہ نے لالی کے ڈیل ڈول کی مناسبت سے کئی کپڑے نکال کر دیکھے، پھر ایک پتلون اور بش
 ٹرٹ لالی کو دے دی۔ دونوں کپڑے نہایت نفیس سلے ہوئے تھے۔ ان پر عمدہ استری بھی کی گئی
 تھی۔ نوشابہ نے ایک جوڑی جوتے کی بھی لالی کو دی۔ لالی نے کپڑے اور جوتے سنبھال کر حیرت
 سے پوچھا۔

”یہ واپس تو نہیں کرنے ہوں گے؟“

نوشابہ نے غصے سے اسے ڈانٹا۔ ”احقانہ باتیں نہ کرو۔ تمہیں آج رات امپائر کا رول ادا کرنا
 ہے۔“

”وہ تو جی میں بالکل ادا کر لوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔ سب نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔“

”یہ بھی بتا دیا کہ اس کھیل میں رازداری نہایت ضروری ہے؟“

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ہمدانی بھی کچھ دیر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ ”اب تمہارا ایک عدد نام بھی
 ہو جائے یہ لالی والی نہیں چلے گا۔“ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ ”تم اپنے ڈیل ڈول اور نیلے سے
 تو بالکل مکر قصاب لگتے ہو۔ تمہارا نام بھی کچھ ایسا ہی ہونا چاہئے۔“ وہ ذرا دیر سوچتا رہا پھر چٹکی بجا کر
 بولا۔ ”مل گیا نام۔ سردار نور محمد خاں بزدار کیسا رہے گا؟“ اس نے ذرا سا توقف کیا۔ ”یہی ٹھیک
 رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی تم مظفر گڑھ کے رئیس اور زمیندار بھی بن گئے۔ تمہارا تعارف اسی
 طرح کرایا جائے گا۔ مگر اپنی چونچ بند رکھنا۔ نام یاد رکھنا، سردار نور محمد خاں بزدار۔ اب ذرا تم اپنا
 حلیہ ٹھیک کر لو۔ نما کر کپڑے بدل لو۔“

”میرے پاس تو جی بھی کپڑے ہیں۔“

”کپڑوں کی تم فکر نہ کرو۔ میرے وارڈروب میں بڑی گنجائش ہے۔“

لالی نے کسی قدر گھبرا کر کہا۔ ”ساب! مجھے ٹائی شائی باندھنی نہیں آتی۔“

”کون کہہ رہا ہے، تم ٹائی باندھو۔ ٹائی باندھ کر اور سوٹ پہن کر تم نہایت عمدہ قسم کے بینڈ ماسٹر
 لگو گے۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”پتلون اور بش شرٹ چلے گی۔“

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ ہمدانی گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ تھوڑی دیر
 بعد اس کی بیوی نوشابہ آگئی۔ مگر کچھ سوچ کر فوراً جانے کے لیے مڑی۔ ہمدانی نے اسے ٹوکا۔ ”بات
 تو سنو جان من! جانا من!“ اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے میرے وارڈروب سے بش
 شرٹ اور پتلون نکال کر دو۔ یہ آج کی پنس ٹائٹ کا ایپائزر ہے۔ اس کا نام سردار نور محمد خاں
 بزدار ہے۔“

نوشابہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”اور سر صاحب؟ کیا انہوں نے امپائر بننے سے انکار کر دیا؟“

”نہیں جان من! وہ سخت بیمار ہیں۔“ ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”تم بھی تیار ہو جاؤ۔ حشر مجسم“

فتنہ بد اماں۔

نوشابہ نے ناز سے ہمدانی کو دیکھا۔ پلٹ کر لالی پر نظر ڈالی اور منہ بگاڑ کر بولی۔ ”کیا یہ امپائر کے
 لیے مناسب رہے گا؟“

”بالکل رہے گا۔ اس سے زیادہ مناسب امپائر فی الحال دست یاب نہیں ہو سکتا۔“

وہ کسی قدر بے زاری سے بولی۔ ”ہمدانی! کبھی کبھی تو تمہاری باتیں بالکل سمجھ میں نہیں
 آتیں۔“ اس نے ایک بار پھر لالی کی جانب دیکھا۔ ”یہ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ تم نے اس
 کے بارے میں کئی تو بتایا تھا۔“

”کیوں نہیں بتایا جی! سارا کھیل تو رازداری ہی کا ہے اور رازداری بھی ایسی ہونی چاہئے کہ ساری زندگی کسی کو پتہ نہ چلے۔ بات تو تب ہوگی۔“

اس دفعہ نوشاہہ نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ ”تم تو کچھ کچھ سمجھ دار بھی معلوم ہوتے ہو۔“

”سمجھ داری کی بات تو یہ ہے جی کہ سب کسمت کا کھیل ہے۔“

”کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ تم کم بولا کرو۔ کم سے کم امپائر بننے کے بعد تم اپنا منہ بالکل بند رکھنا۔“ اس نے بے رخی سے کہا۔ ”اچھا“ اب جاؤ اور تیار ہو کر برساتی میں پہنچو۔“

لالی نے بیگر میں لٹکے ہوئے کپڑے اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ میں جوتے سنبھالے۔ خاموشی سے چلتا ہوا انیکسی میں پہنچا۔ اپنے کمرے میں گیا اور فوراً نہانے کے لیے غسل خانے میں گھس گیا۔ اس روز وہ بڑے اہتمام سے نہایا۔ ہدانی کے دیے ہوئے کپڑے پہنے۔ کپڑے ذرا تنگ تھے مگر انہیں پہن کر وہ خوش تھا۔ اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بال سنوارے۔ مختلف زاویوں سے گھوم پھر کر اپنی جج دیکھی۔

☆

پونے آٹھ بجے ڈپٹی کمشنر بیوی کے ہم راہ کو غشی سے برآمد ہوا۔ نوشاہہ ہلکے گلابی رنگ کا کرتا شلوار پہنے ہوئے تھی۔ میک اپ بھی اس نے بہت نفاست سے کیا تھا۔ چہرے کے نقش و نگار بلور کی طرح ترشے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں کوہستانی جھیلوں کی تابانی تھی۔ وہ ڈپٹی کمشنر کے بازو کا سہارا لیے بچے تلے قدموں سے چل رہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر بھی خوب بن سنور کر نکلا تھا۔ گہرے نیلے سوٹ میں وہ خاصا اسماٹ اور وجیہ لگ رہا تھا۔ اس کے انداز میں تمکنت تھی۔

دبدبہ تھا۔

ڈرائیور نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ دونوں میاں بیوی خراماں خراماں کار کی کچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ لالی نظریں جھکائے ایک طرف ادب سے کھڑا رہا۔ ڈپٹی کمشنر نے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے لالی کو اگلی نشست پر اپنے برابر بٹھالیا۔ کار روانہ ہوئی۔ چھانک پر مسلح پہرے داروں نے سلامی دی۔ لالی کی گردن بھی ذرا سی تن گئی۔

کار آگے بڑھی اور ملتان روڈ پر آگئی۔ منگمری شہر سے گزری۔ عارف والا روڈ پر مڑی۔ کچھ دور جا کر نہر کا پل عبور کیا۔ نشیب میں اتری اور راجباہ بیر والا کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ ہوا کے بھیکے بھیکے جھوکے کھلی کھڑکیوں سے کار میں آرہے تھے۔ لالی خاموش بیٹھا قریب بہتی ہوئی نہر کا جھل مل کرتا پانی دیکھتا رہا۔

کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ پھر وہ کنکر کی بنی ہوئی پتلی سڑک پر مڑ گئی۔ کار اب مرسلیمان خاں کی جاگیر میں داخل ہو چکی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف آم اور مالٹے کے باغات تھے۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ آم اور مالٹے کے درختوں کا سلسلہ حد نظر تک پھیلا تھا۔

سوا آٹھ بجے کار مرسلیمان کے بنگلے پر پہنچی۔ بنگلہ کھیتوں اور باغوں سے الگ تھلگ اونچے ٹیلے پر بننا تھا۔ گرد و نواح میں جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ خود رو پودے تھے۔ بنگلے میں بجلی بھی تھی اور اس کی روشنی رات کے اندھیرے میں دور سے نظر آتی تھی۔ نشیب میں ایک طرف رانی واہ بہتی تھی۔ یہ قدرتی نہر تھی۔ کسی زمانے میں اس جگہ برساتی نکلتا تھا جس میں صرف برسات کے موسم میں پانی ہوتا تھا۔

نہر کے آس پاس کی لگ بھگ چار ہزار ایکڑ زمین سلیمان کے سر مرندا محمد خاں کی ملکیت تھی۔ اس کے انتقال کے بعد تمام زمین اور جائیداد سلیمان کی بیوی راحیلہ کو ترکے میں ملی۔ راحیلہ اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس وقت اس زمین کا بیشتر حصہ بنجر اور غیر مزروعہ تھا۔ یہ بنجر اور غیر مزروعہ زمین سلیمان کی تحویل میں آئی تو اس نے آم اور مالٹے کے باغات لگانے کا منصوبہ بنایا اور منصوبہ یہ دیکھ کر بتایا کہ برساتی نکالا راجباہ بیر والا کے بہت قریب سے بہتا تھا۔ اس نے اپنے مزارعوں اور کھیتوں کو بیگار پر لگا کر برساتی نکالے کی کھدائی کرائی اور اسے بیر والا کی بڑی نہر سے ملا دیا۔ اس طرح برساتی نکالا قدرتی نہر میں تبدیل ہو گیا۔ اب یہ نہر بنگلے کے عین نیچے مل کھاتی ہوئی بہتی تھی۔ اس کے قرب و جوار میں اعلیٰ قسم کے خمی اور پیوندی آموں اور ریڈیلڈ مالٹوں کے باغات تھے اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن ابھی تک ہزار ڈیڑھ ہزار ایکڑ اراضی بنجر اور غیر مزروعہ تھی۔ اس میں جھاڑیوں سے بھرے ہوئے جھنگر اور چھتر تھے۔ انھی اجاڑ اور ویران جھنگروں اور چھتروں کے درمیان مرسلیمان کا بنگلہ تھا۔

کار بنگلے کے چھانک سے گزر کر پور ٹیکو میں جا کر ٹھہر گئی۔ سلیمان اور اس کی بیوی راحیلہ نے ہدانی کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ سلیمان خوب لبا تڑنگا تھا، سر پر گھوگر والے بال تھے۔ ان میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ رنگ کھلتا ہوا تھا۔ راحیلہ کا قد بھی اونچا تھا۔ بدن کسی قدر بھاری، اعلیٰ رنگت، چہرہ سب کی طرح سرخ۔ مگر اس کے چہرے پر نہایت کم تھی۔ آواز بھی بھاری تھی۔ وہ اس وقت ٹھاٹ سے سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی عمر ۴۵ سال کے لگ بھگ تھی۔

لالی ڈرائیور کے ساتھ کار سے نیچے اتر کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ ہدانی نے اس کی جانب

اشارہ کرتے ہوئے سلیمان اور راحیلہ سے کہا۔ ”ان سے ملو۔ یہ آج کی سپنس ٹائٹ کے امپائر ہیں، سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قابل اعتماد بھی ہیں۔“ سلیمان اور راحیلہ نے باری باری ہاتھ بڑھا کر لالی سے مصافحہ کیا۔ لالی راحیلہ سے ہاتھ ملاتے وقت جھجکا۔ مگر راحیلہ نے جھٹ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ لیکن اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ ہمدانی نے لالی کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس نے فوراً جیترا بدلا۔

”تم نے اتنا اصرار کیا کہ میں مسٹر بزدار کو مجبور کر کے لے آیا۔ ابھی آئندہ مجھے امپائر و مپائر کے چکر میں نہ ڈالنا۔ اس کا بندوبست پہلے سے کر لیا کرو۔“

مرسلیمان نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”مجھے چھ بجے شام کو اچانک اطلاع ملی کہ سر صاحب پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ تمہی بتاؤ، اتنے شارٹ نوٹس پر میں کیا کر سکتا تھا۔ تم جانتے ہو، میزبان کی حیثیت سے یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ بہر حال، تمہارا اور مسٹر بزدار دونوں کا بہت بہت شکریہ۔“

سلیمان اور ہمدانی باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے مگر وہ بنگلے کے اندر نہیں گئے۔ سلیمان سب کو باغ میں لے گیا۔ باغ میں گھاس کے خوبصورت قطعے پر نیم دائرے میں صوفے رکھے تھے۔ روشنی بہت ہلکی تھی۔ صوفوں پر پہلے سے کچھ مہمان بیٹھے تھے، کچھ کھڑے تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سب ملے جلے تھے۔ دھیمی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ ہمدانی اور نوشابہ پہنچے تو غلغلہ پڑا۔ دونوں نے مسکرا مسکرا کر سب سے مصافحہ کیا اور درمیان کے صوفوں پر ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیٹھ گئے۔ لالی بھی ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گیا۔

صوفوں سے خاصے فاصلے پر درختوں کے نیچے باقاعدہ بار تھا۔ کاؤنٹر پر قسم قسم کی بوتلیں رکھیں تھیں۔ درختوں پر ننھے ننھے رنگ برنگے بلب روشن تھے۔ دو بارمین جھلکتی ہوئی سفید وردیاں چنے کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے تھے۔ وہ بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں میں شراب انڈیل رہے تھے۔ بیروں کی وردیاں بھی کلف لگی سفید سفید تھیں۔ شراب کے بار سے ذرا ہٹ کر روشنیوں سے جگمگاتے درختوں تلے اسٹیک بار بھی تھا۔ کاؤنٹر پر کھانے کے لئے مختلف اسٹیکس قریب سے رکھے تھے۔ اجلی وردیوں میں ملبوس خائناں کمر پر سنہرے پٹکے لگائے، نہایت مستعدی سے پلیٹوں میں کھانے کی اشیاء سجا کر رکھ رہے تھے۔ بیرے، ٹرے سنبھالے ہوئے آتے اور اپنے اپنے کاؤنٹر سے شراب کے گلاس اور پیالے، سوڈے کی بوتلیں، پانی بھرے جگ اور کھانے کی اشیاء سے جی سجائی پلیٹیں

اٹھا کر لے جاتے۔ وہ علیحدہ علیحدہ ٹرے میں شراب اور اسٹیکس اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے۔

اس وقت اسکاچ وہسکی کا دور چل رہا تھا۔ البتہ عورتیں مارنٹی، شیری اور ہلکی فرانسیسی سرخ اور سفید وائن سے شغل کر رہی تھیں۔ صوفوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی میزیں تھیں۔ ان پر چاندی کی خوبصورت طشتریوں میں ماچس اور سگریٹیں رکھی تھیں۔ بعض عورتیں نہایت دھڑلے سے سگریٹ پی رہی تھیں۔

سب عورتیں اور مرد ایک دوسرے سے شاسا اور بے تکلف معلوم ہوتے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے اور بے تکان باتیں کر رہے تھے۔ محفل میں چھ مرد تھے، چھ عورتیں تھیں۔ ان کی عمریں چالیس اور پچاس کے درمیان تھیں مگر دیکھنے میں اتنی نہیں لگتی تھیں۔ سبھی صحت مند اور زندہ دل تھے۔ سب جوڑے جوڑے تھے۔ صرف لالی لٹوڑا تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ ایک صوفے پر خاموش بیٹھا تھا۔

محفل کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر لالی دیر تک حیران و پریشان رہا اور نظریں جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ اس محفل رنگ دبو میں جہاں زبان کے ساتھ ساتھ جسم بھی چمک رہے تھے، وہ خود کو بے حد اجنبی اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو اٹھ کر بھاگ جاتا۔ ایک بیرا اس کے پاس بھی شراب کی ٹرے لے کر آیا مگر اس نے انکار کر دیا۔ کئی بار اس نے یہی کیا۔ البتہ اسٹیکس کی ٹرے سے کھانے کی چیزیں بار بار اٹھاتا اور پلیٹ میں رکھ کر کھاتا رہا، طشتری سے سگریٹ اٹھا اٹھا کر پھونکتا رہا۔

ایک بیرا، شراب کی ٹرے لے کر آیا۔ تھوڑا سا اصرار بھی کیا، لالی اس دفعہ انکار نہ کر سکا۔ اس نے وہسکی کا گلاس اٹھا لیا۔ بیرے نے اس میں سوڈا ڈال دیا۔ لالی آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا۔ گلاس ختم ہوا تو اس نے ایک بیرے کو اشارے سے قریب بلایا، دوسروں کی دیکھا دیکھی ٹرے میں خالی گلاس رکھا اور بھرا ہوا گلاس اٹھا لیا۔ وہسکی کے دو پیگ لگا کر طبیعت میں سرخوشی آگئی۔ اجنبیت کا احساس کم ہو گیا۔ وہ اطمینان سے نظریں اٹھا اٹھا کر سب کو دیکھتا رہا۔ محفل میں کوئی شخص لطیفہ سناتا، قہقہے بلند ہوتے۔ لالی بھی بے ساختہ ہنسنے لگتا۔

ہمدانی ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا، جسے وہ ٹھہر ٹھہر کر اٹھاتا، ہونٹوں سے لگاتا، وہسکی کی چسکی لگاتا۔ ہمدانی کبھی بیٹھ جاتا، کبھی کھڑا ہو جاتا اور زور سے قہقہے لگاتا۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتا۔ مگر نوشابہ بہت دیر سے ایک ہی جگہ بیٹھی تھی۔ وہ شیشے کے نازک گوبلٹ سے آہستہ آہستہ گہری سرخ اطالوی وائن پی رہی تھی۔ اس سے پہلے وہ مارنٹی سے شغل کر چکی تھی۔

پہرات گزر گئی۔ ستارے زیادہ تاب ناک ہو گئے۔ ہوا میں ٹیکھا پن آگیا۔ محفل کا رنگ نکھرتا جا رہا تھا۔ قہقہے تھے۔ آوازوں کا زیروم تھا۔ چہرے سرخوشی سے دھکتے تھے۔ جسم جل ترنگ تھے، آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔ سب آپس میں اس طرح گھل مل گئے تھے کہ ہم اور تم کی تیز نہ رہی۔ صرف لالی اکیلا اور الگ تھلگ تھا۔ وہ صوفے پر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ مگر محفل میں عملی طور پر شریک نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا حصہ بن گیا تھا۔ اسے بت مڑا آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا کوئی سانا خواب دیکھ رہا ہو۔

ٹھیک دس بجے سلیمان نے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔ ”لیڈیز اینڈ جینٹل من!“ سلیمان کی آواز کے ساتھ ہی خاموشی چھا گئی۔ قہقہے سرد پڑ گئے، آوازیں مدھم ہو گئیں۔ سب چپ چاپ صوفوں کی طرف بڑھے۔ ہریوی اپنے میاں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اب ان کی تعداد چودہ تھی۔ سات مرد، سات عورتیں۔

بیرے محفل سے چلے گئے۔ صرف سلیمان اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے اونچی آواز سے بولنا شروع کیا۔ ”لیڈیز اینڈ جینٹلمن! آج کی ٹائٹ آف دی گریٹ پنس میں ہمیں تھوڑی سی تبدیلی کرنی پڑی۔ یہ امپائر کی تبدیلی ہے۔ بات یہ ہے، مسٹر کرم علی سرا اچانک شدید بیمار پڑ گئے۔ اب وہ اسپتال میں ہیں۔ یہ اطلاع بھی آج ہی شام کو ملی۔ ان کی جگہ دوسرے امپائر کا فوری انتخاب خاصا پیچیدہ مسئلہ تھا۔ مسٹر ہمدانی نے میری مدد کی۔ اس طرح یہ مسئلہ حل ہوا۔ ایک ممبر غیر حاضر ہیں۔ میری مراد مسٹر رؤف سے ہے۔ وہ اپنی بیگم کے ساتھ گزشتہ ہفتے کینیڈا چلے گئے۔ انہوں نے روانگی سے پہلے فون پر معذرت کر لی تھی۔“

سلیمان نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی ایک بار پھر گھبرا گیا اور بوجھل قدموں سے سلیمان کے برابر جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان نے لالی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ ہیں سردار نور محمد خاں بزدار۔ مظفر گڑھ کے رئیس اور بڑے زمیں دار ہیں۔ ان پر پورا، پورا اعتماد بھی کیا جاسکتا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”اکثر خاندانی رئیسوں کی طرح ان کے ساتھ بھی یہ حادثہ ہے کہ انگریزی نہیں جانتے۔ کوشش ہی نہیں کی۔ ان سے آپ کو اردو یا پنجابی میں بات کرنی ہوگی۔ یہ بات میں پہلے بتائے دے رہا ہوں تاکہ بعد میں کوئی غلط فہمی نہ ہو۔“ اس نے لمبے بھر توقف کیا۔ ”آئیے، اب میں آپ کو ان سے ملوادوں۔ یہ ضروری بھی ہے۔ سر صاحب کی بات دوسری تھی۔ سب کے ساتھ ان کی اچھی جان پہچان تھی۔“ اس مختصر تقریر کے بعد سلیمان خاموش ہو گیا۔ لالی بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ نہ وہ بولا، نہ کسی نے اس سے بولنے کی فرمائش کی۔

اس کا گلابی چہرہ اور نکھر گیا تھا۔ آنکھوں میں چراغ جھل مار رہے تھے۔ وہ سلیمان کی بیوی راحیلہ سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ نوشتابہ نہ زور زور سے قہقہے لگا رہی تھی نہ تتلی کے مانند ادھر ادھر منڈلا رہی تھی۔ لالی کو وہ سب عورتوں سے زیادہ دل ربا اور باوقار نظر آئی۔

نوبجے سے پہلے ایک نیا جوڑا آیا۔ اس کے آتے ہی شور مچا۔ یہ مسعود تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی امینہ تھی۔ لالی کی نگاہیں دیر سے اسے تلاش کر رہی تھیں۔ اس نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ سادہ سلونی بنگالن تھی۔ لمبے لمبے بال اور پیچ سے نکلی ہوئی سیدھی مانگ۔ ماتھے پر جگمگ جگمگ کرتی بنڈیا۔ تازہ کنول کی طرح شفاف آنکھیں۔ میانہ قد، چہرہ رابدن، پتلی کر۔ چلتی تو جسم اس طرح لچکتا جیسے نیا دھیرے دھیرے ڈولے۔ وہ زعفرانی ساڑھی باندھے ہوئے تھی مگر بدن پر بلاؤز قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ سینے پر دھجی کی طرح زرتار چولی تھی۔ ساڑھی ناف سے اس قدر نیچے بندھی تھی کہ کولہ کے دائرے صاف نظر آرہے تھے۔ پیٹھ بالکل برہنہ تھی اور نشیب میں دور تک کھلتی چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی برہنہ پیٹھ کی ستر پوشی لمبے لمبے چمک دار بالوں سے کر رکھی تھی۔ سن و سال چالیس سے تجاوز کر چکا تھا مگر کاٹھی بہت اچھی تھی۔ پتلی نظر میں وہ الھزدو شیزہ نظر آتی تھی۔

لالی نے سوچا ہمدانی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ بہت زوردار رن ہے۔ لیکن امینہ بھرتکتا شعلہ تھی تو اس کا شوہر مسعود اتنا ہی سنجیدہ اور کم گو تھا۔ وہ اونچے قد کا ادھیڑ آدمی تھا۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ تھا۔ رنگ ذرا کھلتا ہوا تھا، سر پر بال کم تھے۔ مگر مانگ نکال کر اچھی طرح جمائے گئے تھے۔ وہ ہونٹوں میں پائپ دبائے ہلکا ہلکا دھواں اڑا رہا تھا۔ ہمدانی نے امینہ کو نظر بھر کر دیکھا اور زور سے قہقہہ لگا کے چیخا۔ ”یارو! اب روشنی گل دو۔“ امینہ نے گردن کو ذرا سا خم دے کر ہمدانی کی جانب دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ دنبالے کاجل کے حلقوں میں جگمگاتی آنکھیں گنگنا رہی تھیں۔ ہمدانی نے لہک کر شعر پڑھا۔

لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے

اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

محفل میں زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ ہمدانی ہاتھ پکڑ کر مسعود کو اپنے ساتھ لے گیا اور ایک صوفے پر بیٹھ کر اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگا۔ امینہ آگے بڑھی اور سلیمان کے پاس ٹھہر گئی۔ لالی نے دہسکی کے تین بڑے پیگ لگا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ البتہ اس نے کھانا زیادہ کھایا۔ صبح سے بھوکا بھی تھا۔

سلیمان اسے اپنے ہم راہ آخری سرے پر لے گیا۔ لالی بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ سلیمان نے باری باری ہر شخص کا لالی سے سرسری تعارف کرایا۔ سب سے پہلے وہ شیخ عبدالحمید گلوں سے ملا۔ شیخ حمید چنیوٹ کا رہنے والا تھا۔ لائل پور میں اس کے دو کارخانے تھے۔ شیخ عبدالحمید گلوں کا نام سن کر لالی چونکا۔ اسے یاد آیا کہ بچپنی رات بشیرے نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔

اس نے شیخ حمید کو غور سے دیکھا۔ حمید گلوں کے ساتھ اس کی بیوی مہ جبین تھی۔ وہ گدا زدن کی گوری جی عورت تھی۔ ناک نقشہ سبک تھا مگر آنکھیں ذرا چھوٹی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں تھیں۔ جھریاں چھپانے کے لیے خاصا میک اپ کیا گیا تھا۔ وہ ہاتھوں اور کانوں میں قیمتی جڑاؤ زیور پہنے ہوئے تھی۔ چشم و ابرو اور ٹھٹھا صاف چغلی کھاتا تھا کہ اس کا تعلق کبھی ارباب نشاۃ سے رہ چکا ہے۔ شیخ حمید گلوں خاصا تومند تھا۔ اس کا پیٹ ذرا سا آگے نکلا ہوا تھا۔ رنگ سانولا تھا، بات بھی کم کرتا تھا۔ وہ نہایت نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی عمر ۴۵ سے اوپر تھی۔ مہ جبین بھی تقریباً اسی عمر کی تھی۔

دوسرے نمبر پر چوہدری محمد نواز بھنڈر تھا۔ وہ پولی لیسین کلب کا بنیادی رکن تھا۔ سپنس ٹائٹ میں شرکت کے لیے لاہور سے آیا تھا۔ وہ ریلوے میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا۔ ادھیڑ عمر، مگر خوش رو اور خوش طبع۔ فاخرہ اس کی بیوی تھی۔ دہلی پتلی کامنی سی۔ چمپنی رنگت، چہرہ تروتازہ اور صراحی دار گردن۔ گردن میں سونے کا جڑاؤ گلو بند تھا۔ سر پر بالوں کی پتی سی سفید لٹ تھی جس نے اس کے چہرے کی دل کشی میں تنوع پیدا کر دیا تھا۔ وہ خاصی طرح دار عورت تھی۔ بات کرتی تو گردن کو ذرا سا خم دیتی اور نظریں ترجھی رکھتی۔

نواز بھنڈر کے قریب مرزا ابوالحسن بیٹھا تھا۔ وہ ایس پی تھا اور گھسے ہوئے بدن کا تندرست آدمی تھا۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال تھے۔ رنگت گندمی تھی۔ وہ بات بات پر زور سے قہقہے لگاتا۔ اس کی بیوی سائرہ تھی۔ خوش شکل، رنگ صاف اور قد قدرے چھوٹا۔ چھوٹے قد کے باعث وہ اپنی عمر سے کم نظر آتی تھی۔ بات کرتی تو دانت چینیلی کی کلیوں کی طرح خوبصورت لگتے۔ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ہلکے ہلکے نشے سے غماز آلود تھیں۔ لالی نے ایس پی مرزا کو دیکھا تو سراپد ہو گیا۔ مرزا نے اس کی گھبراہٹ بھانپ لی۔ اس کے چہرے پر پولیس والوں کی مخصوص خشونت جھلکنے لگی۔ اس نے لالی کو بغور دیکھا اور مسکرا کر بہت آہستہ سے بولا۔ ”تم نے مونچھیں بھی صاف کرا دیں؟“

لالی لرز کر رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش کھڑا رہا۔ ایس پی نے تیوری پر ہلکا سا

بل ڈال کر سرگوشی کی۔ ”تم تو لالی ہو، نور محمد بزدار کب سے بن گئے؟“ اس نے ذرا تامل کیا۔ ”تسار سا تھی رحیم دار کہاں ہے؟“ لالی اور پریشان ہو گیا۔

ہمدانی قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے صورت حال کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے فوراً مداخلت کی۔ ”مرزا! نو آفیشل برنس پلینز۔“ اس نے پہلو بدلا اور مسکرا کر بولا۔ ”پارٹی میں آیا کرو تو اپنا پولیس مین گیٹ کے باہر چھوڑ دیا کرو۔“

مرزا نے گردن موڑ کر ہمدانی کو دیکھا اور سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”سرا! مجھے کچھ شبہ ہوا تھا۔“ ہمدانی ایک دم ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”یہاں ہم اپنا شک و شبہ رفع کرنے کے لیے اکٹھا نہیں ہوئے ہیں۔“

ایس پی صفائی پیش کرنے لگا۔ ”بات یہ ہے سرا! وزیر زراعت نے فون پر فون کر کے اپنی دلیل بولادی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ڈپٹی کمشنر لہجے بھر خاموس رہا۔ ”یار! تم کی نوکری والے، ان کچی نوکری والے وزیروں کو گھاس ہی کیوں ڈالتے ہو؟ یہ تو چڑھتی اترتی دھوپ چھاؤں ہیں۔ ان کا تو کام ہی سفارشیں کرنا ہے۔ کسی کو چھڑوا دیا، کسی کو اندر کرا دیا، یا پھر انہیں الٹ منٹوں اور لائسنسوں کا عارضہ ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ان لوگوں سے لمبی چوڑی امیدیں باندھ رکھی ہیں۔ لاکھ کارگزاری دکھاؤ، تم پانچ سال سے پہلے ڈی آئی جی نہیں بن سکتے۔ وزیر زراعت کو مکھن لگانے سے بھی نہیں بن سکتے۔ دن یونٹ تو سمجھو بن ہی چکا ہے۔ چند مہینے کی بات اور ہے۔ پھر نہ یہ صوبہ رہے گا اور نہ اس کا کوئی صوبائی وزیر۔ کیا سمجھے؟“

ہمدانی خاموش ہوا تو مرسلیمان نے بھی اظہار ناپسندیدگی کیا۔ ”مرزا! تم کس کی لیگ پولنگ کر رہے ہو، میری یا ہمدانی کی؟ تم وردی اتار کر بھی وردی میں رہتے ہو۔ خواہ مخواہ کا ایک شوشا چھوڑ دیا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

بات چیت بہت آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ لہذا دوسرے مہمان ایس پی کی باتوں کی تہہ تک نہ پہنچ سکے۔ پھر بھی کسی نے مرزا کا رد یہ پسند نہ کیا۔ چوہدری نواز بھنڈر نے ہنس کے کہا۔ ”بھئی مرزا! اس دیرانے میں مہینے بھر بعد تو ایک خوبصورت رات ملتی ہے۔ تم اس کا بھی سارا حسن اور سارا مزہ کر کر کر دینا چاہتے ہو۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”یار! ہم غریب و مساکین پر کچھ تو رحم کھایا کرو۔“

کچھ اور احتجاجی آوازیں بھی بلند ہوئیں۔ عورتوں نے سب سے زیادہ ناک بھوں چڑھائی۔ خود

مرزا کی بیوی سارہ نے اسے ڈانٹا۔ ”مرزا! ڈونٹ بی سلی۔“ ایس پی ان تابوڑ حملوں سے گھبرا گیا۔
شرمندہ ہو کر ہر ایک سے معذرت کرنے لگا۔ اس نے کئی بار اونچی آواز سے کہا۔

”سوری“ آئی ایم ویری سوری۔“

لالی نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، چپ کھڑا سب کی باتیں سنتا رہا۔ ذرا دیر بعد وہ سلیمان کے ہم راہ آگے بڑھا اور ڈاکٹر بٹ کے پاس پہنچا۔ بٹ محکمہ صحت کا ڈائریکٹر تھا اور شام ہی کو ملتان سے سیدھا سلیمان کے ہنگامے پہنچا تھا۔ پچاس کے لگ بھگ سن، مگر زندہ دل اور یار باش۔ سر کے بال خشک اور کسی قدر لمبے تھے۔ لباس کے معاملے میں بھی وہ خاصا بے نیاز تھا۔ سرسری پتلون پر کارڈرائے کا بش شرٹ نما فاقہ کی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹائی گہری سرخ تھی۔ وہ آنکھوں پر چشمہ لگائے آہستہ آہستہ پائپ پر کش لگا رہا تھا۔ وضع قطع سے اٹلکچوئل لگتا تھا اور شکل و صورت کے اعتبار سے جاذب نظر تھا۔

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ اس سے بھی زیادہ آشفستہ مزاج تھی۔ وہ سرخ ریشمی شلوار اور نہایت باریک ململ کا کڑھا ہوا سفید کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کرتے کے نیچے اور کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اندر سے اس کی گوری گوری جلد صاف جھلک رہی تھی۔ ناک ذرا چھوٹی تھی، مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور شبخیم کے قطروں کی طرح جھل ملاتی تھیں۔ وہ سن سے اتر چکی تھی۔ لیکن بدن اب تک سڈول تھا اور اسے سڈول رکھنے کے لئے وہ پابندی سے ریاض بھی کرتی تھی۔

سب سے آخر میں لالی مسعود کے پاس پہنچا۔ مسعود محکمہ آباد کاری میں ایڈیشنل کمشنر تھا۔ چند سال تک بنگال میں مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہ چکا تھا۔ اس نے کلکتے میں امینہ سے شادی کی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی بنگال میں کئی سال گزارے، اب ادھر آ گیا تھا۔ اس کی بیوی امینہ کو موسیقی سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ رقص کرنا بھی جانتی تھی۔ ہنسی تو گلے میں گھنکرو کا چھنا کا ہوتا۔ اشتی تو بدن پھولوں سے لدی شاخ کی طرح جھومتا۔ چلتی تو بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آ جاتا۔

ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں!

نئے امپائر سے مہمانوں کے تعارف کی رسم ختم ہوئی تو سب کھڑے ہو گئے۔ روشوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باغ کے ایسے حصے میں پہنچے جو سرس اور شربتہ کے اونچے اونچے گنجان درختوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ درختوں کے درمیان جدید طرز کی دو منزلہ عمارت تھی جو کلب کے ممبروں میں پلے ڈر ہاؤس کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ نہ اس کے نیچے ہی بستی تھی۔ عمارت کے درپچوں سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ ہمدانی نے چلتے چلتے سلیمان سے کہا۔

”سلیمان! امپائر کو پلے ڈر ہاؤس اچھی طرح دکھا دو تاکہ وہ اس کے جغرافیے سے واقف ہو جائے۔“

مرسلیمان نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”مجھے اپنی ذمہ داری کا بخوبی احساس ہے۔ امپائر نیا ہے، میں تو نیا نہیں ہوں۔“



سب مہمان پلے ڈر ہاؤس میں داخل ہوئے اور کوریڈور سے گزر کر ایک کشادہ ہال میں پہنچ گئے۔ صرف سلیمان اور لالی زینے کی میزٹھیاں طے کر کے اوپر چلے گئے۔ بالائی منزل پر طویل غلام گردش تھی۔ اس کے ایک طرف کمرے تھے۔ کمروں کے دروازے ایک سلسلے سے دور تک چلے گئے تھے۔

پلے ڈر ہاؤس کے طرز تعمیر سے مشرقیت جھلکتی تھی۔ غلام گردش کی آرائش میں بھی مشرقیت کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ جگہ جگہ محرابیں تھیں۔ ان میں پیتل کی منقش قدیلیں آویزاں تھیں۔ کہیں کہیں چھت سے فانوس لٹک رہے تھے۔ مگر روشنی مدہم تھی۔ اتنی مدہم کہ غلام گردش میں چلنے والے پر چھائیوں کے مانند دھندلے دھندلے نظر آتے۔ غلام گردش میں دیوار قایلین کا فرش تھا۔ محرابوں کے نیچے ہر کونے میں ذرا اونچائی دے کر لکڑی کے خوش نما تختے لگائے گئے تھے۔ تختوں پر چھوٹے چھوٹے گولوں میں خوب صورت پودے تھے۔ ان کے قریب قد آدم سیاہ اور سفید مجسمے نصب تھے۔ دیواروں پر دل فریب تصاویر آویزاں تھیں۔ ان میں قرون وسطی کے مشرقی شہنشاہوں کے رومانی مناظر پیش کیے گئے تھے۔ مجسموں کی طرح تصاویر بھی بیجان انگیز تھیں اور جذبات میں تلاطم برپا کرتی تھیں۔

غلام گردش میں دس کمرے تھے۔ کمروں کے دروازوں کے درمیان خاصا فاصلہ تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمرے بڑے اور کشادہ ہیں۔ ان کی کھڑکیاں نہر کی طرف کھلتی تھیں۔ ہر کمرے کے دروازے کے مقابل ذرا ہٹ کر غلام گردش میں جگہ جگہ صوفے پڑے تھے۔ دروازوں پر ریٹم کے باریک پردے جھول رہے تھے۔ ہر دروازے پر پیتل کی تختی آویزاں تھی۔ تختی پر کمرے کا نمبر درج تھا۔ مگر ہر دروازہ موقوف۔ ہر قفل میں کنجی لگی تھی اور ہر کنجی پر کمرے کا نمبر لکھا تھا۔ سلیمان سنا ایک ایک دروازے کا تالا کھول کر لالی کو دکھایا اور کنجی، تالے میں لگی چھوڑ دی۔ مگر وہ لالی کو کمرے کے اندر نہیں لے گیا۔ لالی نے بھی اندر جانے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ تالوں اور کنجیوں کا معائنہ کر کے دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

مرسلیمان نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہمدانی، لالی کو قرعہ اندازی کا طریقہ اور اس کے قاعدے قوانین بتا چکا ہے، ایک بار پھر قرعہ اندازی کے بارے میں تمام تفصیلات دہرائیں۔ اس نے لالی سے پوچھا۔

”مسٹر بزدار! میں نے یہاں کی ہربات بتا دی۔ اب بھی آپ نے کچھ پوچھنا ہے، تو پوچھ لیجئے۔ میں بعد میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔ ہربات کا فیصلہ آپ ہی نے کرنا ہو گا اور آپ کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کرے گا۔“

لالی نے اعتماد سے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے جی! آپ پروا نہ کریں۔ میں نے ہربات سمجھ لی ہے۔“

اس نے سلیمان سے صرف اتنی ہی گفتگو کی۔ باقی تمام وقت خاموش رہا اور ہر چیز حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے کرید کر کوئی بات نہیں پوچھی۔ وہ ہمدانی کی تنبیہ کے مطابق کم سے کم بلکہ سرے سے بولنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

اوپر کی منزل سے اتر کر دونوں ہال میں آئے۔ سارے مہمان بے چینی سے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی لالی چپ چاپ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سلیمان بولنے کے لئے کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت اس کا بوڑھا مینجر ہال کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ چہرے مرے سے خراٹ لگتا تھا۔ مینجر دروازے کے قریب سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر مرسلیمان نے حیرت سے پوچھا۔

”سکھیرا! تم یہاں کیسے آگئے؟“

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”سر! میں جانتا ہوں، مجھے یہاں نہیں آنا چاہئے۔ مگر بار بار ٹیلی فون آرہے ہیں۔ بہت ارجنٹ کالز ہیں۔ مجھے مجبوراً آنا پڑا۔ یہاں ٹیلی فون بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں فون پر آپ سے کنٹیکٹ کرتا۔“

سلیمان نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ ”کیسے فون آرہے ہیں؟ کیوں آرہے ہیں؟“

سکھیرا نے بتایا۔ ”سر! کوئی دو گھنٹے پہلے گنیمبر شیش کے نزدیک دو ٹرینیں ٹکرا گئی ہیں۔ زبردست حادثہ ہوا ہے۔ ابھی تک گیارہ کے مرنے کی اطلاع ہے۔ زخمی تو بہت سے ہیں۔ ہر طرف ہچکچاہٹ مچی ہوئی ہے۔“

بال پر سناٹا طاری ہو گیا۔

سلیمان نے بے رخی سے کہا۔ ”تو میں کیا کروں؟“

”نہیں سر!“ سکھیرا نے فوراً وضاحت کی۔ ”ساری کالیں چوہدری نواز بھنڈر صاحب، اپنی مکشرف صاحب، ایس پی صاحب اور ڈاکٹر بٹ صاحب کے لیے ہیں۔“

”یار سکھیرا! تم اس وقت کہاں کباب میں بڈی بن کر آگئے۔“ ہمدانی نے ہنس کر کہا۔ ”بہر حال، میرا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔“ اس نے مرکز نواز بھنڈر کی طرف دیکھا۔ ”یہ تمہارا درد سر ہے۔ معلوم نہیں، مجھے کیوں ان کانٹوں میں گھسیٹ لیا گیا؟“

”ایسا نہیں ہے۔“ نواز نے سنجیدگی سے کہا۔ ”زے داری تو میری بھی ہے، تمہاری بھی، مرزا اور بٹ کی بھی ہے۔“

ایس پی مرزا نے اس کی بات پر احتجاج کیا۔ ”مجھے کیوں انوالو کر رہے ہو؟ نواز! تمہاری ریلوے پولیس کس مرض کی دوا ہے؟“

سکھیرا نے ہچکچاتے ہوئے مطلع کیا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ جہاں حادثہ ہوا ہے، وہاں بہت اندھیرا ہے۔ آس پاس کے پنڈوالوں نے لوٹ مار شروع کر دی ہے۔ شیش پر صرف ایک کانٹیل تھا۔ وہ جائے حادثہ کی جانب گیا ہے۔ سر! وہ اکیلا کیا کر سکتا ہے؟ اسٹنٹ شیش ماسٹر نے مجھ سے خدو بات کی ہے۔ وہ بہت پریشان لگتا تھا۔“

مرزا خاموش رہا۔ مگر نواز بھنڈر گویا ہوا۔ ”ریلوے ٹریفک کا اتنا شاف موجود ہے۔ حادثے کی جگہ کوئی بھی پہنچ سکتا ہے۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟“ اس نے کچھ تامل کیا۔ ”فون موجود ہوتا تو نا ایس کو وہاں پہنچنے کا حکم جاری کر دیتا۔ اور میں کیا کر سکتا ہوں؟ اتنی سی بات انہیں سمجھ نہیں آئی۔ بس ٹیلی فون کھڑکھڑانے شروع کر دیئے۔“ اس نے جھنجھلائی ہوئی نظروں سے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ ”اور تم انہیں ٹالنے کی بجائے فریاد لیے یہاں آگئے؟“

ڈاکٹر بٹ نے سکھیرا کو مخاطب کیا۔ ”سکھیرا! تم ایسا کرو، اسپتال ٹیلی فون کر کے میری طرف سے ڈیوٹی انچارج سے کو، جتنی ایسولینس اسپتال میں موجود ہوں، ڈاکٹروں اور نرسوں کی ایک ٹیم کے ساتھ فوراً جائے حادثہ پر پہنچا دی جائیں۔“

”یار ڈاکٹر! تم کس چکر میں پڑ گئے۔ یہ بتا کر کہ تم یہاں موجود ہو، اخبارات کے لیے خواہ مخواہ ایک اسکینڈل کا میٹرل فراہم کر دو گے۔“ ہمدانی نے سکھیرا کی جانب دیکھا۔ ”فون پر تمہاری کس کس بات ہوئی؟“

سکھیرا نے جواب دیا۔ ”منشروں کے سیکریٹریوں اور دوسرے افسروں کے فون آرہے ہیں۔ ہتھوڑا سبلی کے ایک ممبر نے بار بار فون کیا۔ وہ حادثے والی ایک ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔“

وہ بھی بہت پریشان لگتے تھے۔“

ڈاکٹر بٹ کی بیوی ماہ رخ نے گھبرا کر کہا۔ ”کیا ایسا نہیں ہو سکتا، آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟“

ہمدانی مسکرا کر بولا۔ ”ڈونٹ بی سلی ماہ رخ! پروگرام کیسے کینسل ہو سکتا ہے؟“

وہ بولی۔ ”بھئی دیکھئے نا، کتنے بہت سے لوگ نہر گئے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ کوئی ریلیف ورک ہے نہ میڈیکل ایڈ۔ بہت سیریس بات ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی چاہئے۔ ایمر جنسی جو ٹھہری۔“

مرزا نے اسے پریشان دیکھ کر کہا۔ ”ماہ رخ! تم تو ایسی رقت کے ساتھ بات کر رہی ہو گویا سارے جہاں کا درد تمہارے جگر میں ہے۔“ ایس پی کے اس جملے پر ہلکا قدمہ بلند ہوا۔

نواز کی بیوی فاخرہ کسی قدر بے چین ہو کر بولی۔ ”بھئی! آپ لوگ ہم عورتوں کے جذبات کا بالکل لحاظ نہیں کرتے۔“

ہمدانی نے اس کی بات نظر انداز کر کے کہا۔ ”سکھیرا! یہ بتاؤ، تم نے جواب کیا دیا؟ کوئی حماقت تو نہیں کر بیٹھے؟ یہ تو نہیں بتا دیا کہ ہم سب یہاں موجود ہیں؟ ویسے اصولی طور پر تمہیں یہ بات معلوم نہیں ہونا چاہئے۔“ اس نے مسکرا کر اسے تکیھی نظروں سے دیکھا۔ ”یار تم بوڑھے ہو گئے اور ابھی تک تمہیں یہ معلوم نہیں کہ فیجریا سیکرٹری کیا چیز ہوتا ہے؟“

سکھیرا نے جواب دیا۔ ”سر! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ بنگلے میں ایک پارٹی ہے۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کون کون موجود ہے۔ پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔ یہ بات بھی میں نے اس لیے کہی کہ فون کرنے والوں کو آپ لوگوں کے بنگلوں سے اطلاعات ملی ہیں کہ آپ لوگ یہاں ہیں۔“

مرزا نے اونچی آواز سے کہا۔ ”لو، بھئی سن لو۔ آئندہ یہ پروگرام ٹاپ سیکرٹ رکھنا ہوگا۔ ورنہ ایسی مصیبتیں اکثر نازل ہوتی رہیں گی۔“

”ویسے تو یہ ٹاپ سیکرٹ ہی ہے۔“ نواز نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”مگر حادثے کے سلسلے میں ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”یار! پروگرام ڈسٹرب کرنے کی کوشش نہ کرو۔“ ہمدانی نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا۔ اس نے مرکز سکھیرا کو دیکھا۔ وہ دروازے کے قریب سہا ہوا کھڑا تھا۔ ”سکھیرا! ایسا کرو، لاہور یا کراچی سے کوئی اہم کال آئے تو صاف انکار کر دینا کہ ہم چاروں میں سے کوئی یہاں نہیں آیا۔ اس کے بعد فون ڈیڈ کر دو اور اطمینان سے سو جاؤ۔ آئندہ سے تمہارے لیے یہ قطعی ممنوعہ علاقہ ہوگا۔“

ڈاکٹر بٹ نے ہمدانی سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ”اس طرح کام نہیں چلے گا۔ ہمیں خانہ پری کے لیے تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

مرسلیمان اب تک خاموش کھڑا تھا۔ وہ کسی قدر بیزار سی بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آج کا پروگرام کینسل کر دیا جائے؟“

ڈاکٹر بٹ نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں۔“ اپنی بات کتے کتے وہ ٹھٹکا۔ ”مگر تم اس سے بھی انکار نہیں کر سکتے کہ معاملہ بہت سیریس ہے اور بات اوپر تک پہنچ چکی ہے۔ میں خود جاکر فون پر اسپتال سے کنٹیکٹ کرتا ہوں اور ڈیوٹی انچارج کو ہدایت دیتا ہوں کہ وہ میڈیکل ٹیم لے کر جائے حادثہ پر پہنچ جائے۔“ اس نے سلیمان کی طرف نظریں اٹھائیں۔ ”سلیمان پروگرام ختم کرنے کی بجائے کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اسے تھوڑی دیر کے لیے ملتوی کر دیا جائے؟“

”پروگرام تو ڈلے کیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ سوچ لو، تمہاری خانہ پری کی کارروائی سے کوئی پھندا نہ ہو جائے۔“ ایس پی مرزا نے خبردار کیا۔

”نہیں! ایسا نہیں ہوگا۔“ بٹ نے بہت اعتماد سے کہا۔ ”میں پوری احتیاط سے کام لوں گا۔ ڈیوٹی انچارج میرے اعتبار کا ڈاکٹر ہے۔ اس کا ایک کیس بھی میرے پاس دیا ہوا ہے۔“ اس نے چوہدری نواز کی جانب رخ کیا۔ ”نواز! تمہیں بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔ تم ٹیلی فون پر فوراً لاہور سے کنٹیکٹ کرو۔ کسی ریلوے افسر کی ڈیوٹی لگاؤ کہ وہ ایک ریلیف ٹرین لے کر فوراً حادثے کی جگہ پہنچ جائے۔ اگر اتنا کام ہو جائے تو سمجھ لو، نہ صرف ہم دونوں کی بلکہ سب کی ذمہ داری پوری ہوگئی۔“

نواز بھڑ رنے ڈاکٹر بٹ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

ہمدانی بھی رضامند ہو گیا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر پروگرام زیادہ ڈلے نہیں ہو سکتا۔“

سازو نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا خیال ہے، یہ ٹھیک ہے۔“ اس نے ڈاکٹر بٹ اور نواز کی طرف دیکھا۔ ”اب آپ دونوں دیر نہ کیجئے۔ جلدی سے یہ کام نمٹا کر آجائیے۔“

ڈاکٹر بٹ اور نواز اپنی نشستوں سے اٹھے اور سکھیرا کے ہم راہ ہال سے چلے گئے۔ سلیمان اب تک کھڑا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ اس کے برابر شیخ حمید گلوں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل گم صم تھا۔ ریلوے کا حادثہ اس سے اس کا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ بار بار دزدیدہ نگاہوں سے سلیمان کی بیوی راحیلہ کو دیکھ رہا تھا۔ راحیلہ کی سفید بناری ساڑھی کا پلو ڈھلک کر نیچے گر گیا تھا اور وہ نہایت اشتعال انگیز انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگریٹ کے کش لگا رہی تھی۔

کرنے کے لیے نہایت سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔" اس نے پائپ میں تازہ تمباکو بھری اور اسے لگا کر کش لگایا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ حادثات سے زیادہ ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے پر غور کرنا چاہئے۔ خصوصاً خواتین کو اس مسئلے پر اور زیادہ سنجیدگی سے سوچنا چاہئے۔" مسعود کی باتیں سب خاموشی سے سنتے رہے۔ اس نے بات ختم کی تو ہال پر ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا۔

لالی گم صم بیٹھا، حیرت سے ایک ایک کامنہ تک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کس قسم کی باتیں ہیں؟



ڈاکٹر بٹ اور نواز بھنڈر ہال میں داخل ہوئے۔ دونوں تھکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ڈاکٹر بٹ نے بیٹھے ہی کہا۔ "حد ہو گئی ہے بے پروائی کی۔ اسپتال میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں۔" مرزا نے ہنس کر کہا۔ "آج ہفتے کی رات ہے۔ نرسوں کے ساتھ کہیں ٹھکر لگا رہے ہوں گے۔"

"ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔" ڈاکٹر بٹ نے جواب دیا۔ "بہت مشکل سے ایک ڈاکٹر کو تلاش کیا۔ اسے میں نے ایک میڈیکل ٹیم جائے حادثہ پر لے جانے کی ہدایت بھی کر دی ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ صرف ایک ایمبولینس ہے۔ وہ بھی پرانی اور بوسیدہ۔ ہفتے بھر سے مرمت کے لیے لاہور کے کسی آٹو ریکشاپ میں پڑی ہے۔ میں نے حکم دیا، کوئی ٹرانسپورٹ نہیں ہے تو بس اور ٹرک ہی کا بندوبست کر کے چلے جاؤ۔ بہر حال میں جو کر سکتا تھا، وہ میں نے کر دیا۔"

مسعود نے کہا۔ "تم نے تو خانہ پری کر دی۔ چلو، یہ بھی ٹھیک رہا۔" وہ نواز بھنڈر سے مخاطب ہوا۔ "تم پر کیا جتنی؟"

نواز نے بتایا۔ "لہور کی لائن بے حد خراب تھی۔ فون پر کنٹیکٹ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح کنٹیکٹ ہوا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ریلیف ٹرین روانہ کرنے کے انتظامات ہو رہے ہیں۔" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مگر حادثہ بہت سنگین ہے۔ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ زخمی بھی بہت ہیں۔ نہ معلوم، کتنی لاشیں اور زخمی ٹوٹے پھوٹے ڈبوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ابھی تک ریلیف کا کوئی کام شروع نہیں ہوا۔" پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص خاموش اور بندھال نظر آ رہا تھا۔ ہال میں سب کے داخل ہوتے وقت فضا میں جو گھما گھمی اور شوریدہ سری تھی، اب غبار آلود ہو چکی تھی۔

مگر یہ بوجھل سکوت زیادہ دیر طاری نہ رہا۔ ہمدانی دیر سے چپ بیٹھا تھا، اس نے اچانک زور کا

ہمدانی خمار آلود نظروں سے امینہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور امینہ کا شوہر مسعود خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ پائپ کے کش لے رہا تھا۔ وہ سب سے الگ تھگ اور قطعی بے نیاز نظر آ رہا تھا۔

ماہ رخ نے چند لمحوں بعد خاموشی توڑی اور مسعود کو مخاطب کیا۔ "مسعود صاحب! آپ تو ایسے بے نیاز لگ رہے ہیں، جیسے حادثے کا آپ پر کوئی ری ایکشن نہیں ہوا؟"

مسعود نے ماہ رخ کو نظر بھر کر دیکھا اور ایش ٹرے میں پائپ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں سوچ رہا تھا، کون سی ایسی قیامت آگئی۔ گیارہ افراد ہی تو ہلاک ہوئے ہیں۔ کچھ اسپتال جاتے جاتے یا اسپتال پہنچ کر مر جائیں گے۔"

نوشابہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کو اتنا کیلس اور بے حس نہیں ہونا چاہئے۔ آپ کا تعلق تو محکمہ آباد کاری سے ہے۔"

مسعود مسکرا کر بولا۔ "نوشابہ! تم میری نفسیات نہیں سمجھ سکتیں۔ میں برسوں مشرقی بنگال میں رہا ہوں۔ وہاں ہر سال قحط، سیلاب اور سانیکلوں سے ہزاروں افراد مر جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ تعداد لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جتنے لوگ ہر سال مر جاتے ہیں، اس سے لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ موت اور زندگی کا کھیل ہے۔ ایک جاتا ہے، دوسرا آجاتا ہے۔" اس کے چہرے پر فلسفیانہ سنجیدگی چھا گئی۔ "اس طرح بنگالیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کسی حد تک خود بخود حل ہوتا جا رہا ہے۔"

مرسلیمان نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "آبادی میں اضافہ صرف مشرقی بنگال کا نہیں، اس صوبے کا بھی مسئلہ ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو یہ انٹرنیشنل مسئلہ ہے۔ میں نے پچھلے دنوں عالمی ادارہ صحت کی ایک رپورٹ دیکھی تھی۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ صدی کے آخر تک دنیا کی آبادی اتنی بڑھ جائے گی کہ شدید غذائی بحران پیدا ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ سمندر کی غذا پر بھی انحصار کرنا پڑے گا۔ اس کے لیے ابھی سے کوششیں شروع کر دی گئی ہیں۔"

مسعود نے ہنس کر کہا۔ "سلیمان! تم آج کی بات کر رہے ہو۔ مائتس نے تو اٹھارویں صدی کے آخر میں دنیا کو اس خطرے سے خبردار کر دیا تھا۔ وہ تھا تو پادری مگر انگریز تھا اور آکناسٹ بھی تھا۔ اس نے بڑھتی ہوئی انسانی آبادی اور اس کے لیے ناکافی پیداوار کے پیش نظر جنگیں، دیہاتی امراض اور ناگہانی آفات ناگزیر قرار دی تھیں۔ آبادی ہر قیمت پر کم کرنے پر زور دیا تھا۔ اس کے یہ خیالات ماتمیزم کے نام سے مشہور ہوئے اور آج اس نظریے کی بنیاد پر بڑھتی ہوئی آبادی پر کنٹرول

اور جانچ پڑتال کے بعد سب ڈھکنے بند کر دیئے۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ گیارہ بجے میں چند منٹ باقی تھے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا بار بار کلاک دیکھتا رہا۔ اور بھی بہت سی نگاہیں بے چینی سے کلاک کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

کلاک نے ٹن ٹن گیارہ بجائے۔ دلوں کی دھڑکنیں اچانک تیز ہو گئیں۔ ہال کے سکوت میں گہری سانسوں کی سرسراہٹیں ابھرنے لگیں۔ لالی کا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس نے قہر اندازی کا آغاز کیا۔ کپکپاتے ہاتھ سے دائیں جانب کی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا اٹھایا۔ اپنا دایاں ہاتھ اندر ڈال کے ایک ٹوکن نکالا۔ شمع کی روشنی میں اسے پڑھا۔ اس پر ماہ رخ کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے پکارا۔ ”ماہ رخ!“ اس نے ٹوکن، ریک کے اوپر والے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔

ماہ رخ اپنی نشست سے اٹھی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی لالی کے قریب آئی اور میز کے پاس عین اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ لالی نے درمیان کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا۔ ماہ رخ نے اس کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن نکال کر لالی کو دیا۔ لالی نے اسے پڑھا۔ اس پر پانچ کا نمبر درج تھا۔ لالی نے ٹوکن ماہ رخ کو دکھایا اور اسے ریک کے نچلے بے نمبر خانے میں رکھ دیا۔ وہ اٹھا اور ماہ رخ کے ہم راہ ہال سے چلا گیا۔

دونوں میز پر ہال طے کر کے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ لالی آگے چل رہا تھا۔ ماہ رخ اس کے پیچھے تھی۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ لالی کمرہ نمبر ۵ پر پہنچا۔ کمرہ بند تھا۔ دروازے میں لگی ہوئی کنجی سے اس نے تالا کھولا اور پلٹ کر دیکھا۔ ماہ رخ اس کے بالکل قریب کھڑی تھی۔ باریک کرتے کے پیچھے سے اس کا گورا گورا سینہ جھلک رہا تھا۔ لالی نے اپنے جسم میں ہلکی سی جھرجھری محسوس کی۔ اس نے دروازہ کھولا اور ایک طرف ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

ماہ رخ نے کمرے میں داخل ہوتے وقت لالی کی جانب دیکھا، مسکرائی اور آہستہ سے کہا۔ ”شکریہ!“ لالی نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں لے کر ہال میں واپس آ گیا۔ اپنی نشست پر بیٹھ کر اس نے کنجی ریک کے نمبر خانے میں رکھ دی۔ دائیں طرف رکھی ہوئی صندوقچی میں اس نے پھر ہاتھ ڈال کے ٹوکن نکالا۔ اس پر ماہ جبیں کا نام درج تھا۔ لالی نے ماہ جبیں کا نام پکارا۔ وہ میز کے نزدیک پہنچی۔ بیچ میں رکھی ہوئی صندوقچی کے کھلے ہوئے ڈھکنے کے اندر ہاتھ ڈالا۔ ٹوکن پر نمبر ۷ درج تھا۔ لالی نے نام اور نمبر کے ٹوکن ریک کے خانوں میں رکھے اور ماہ جبیں کو کمرہ نمبر ۷ میں پہنچا کر تالا لگا دیا۔ واپسی پر اس نے کنجی، نمبر ۷ کے خانے میں رکھ دی۔ ماہ رخ کی طرح ماہ

تقبہ لگایا اور اونچی آواز سے بولا۔ ”یارو! یہ بیوست ختم کرو۔ جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے۔“

ہر طرف سے ہلکے ہلکے قہقہے پھوٹنے لگے، جسم ٹپکنے لگے، لب چمکنے لگے، آنکھیں بولنے لگیں، دھواں دھواں محفل میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ سلیمان نے کھڑے ہو کر اونچی آواز سے نعرہ بند کیا۔ ”سپنس سپنس۔“

سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور راہداروں سے گزرتے ہوئے دوسرے ہال میں پہنچ گئے۔ یہ ہال بھی خاصا وسیع تھا۔ مگر روشنی برائے نام تھی۔ ہال کے وسط میں خاصی بڑی میز تھی اس پر چاندی، خوشنما شمع دان رکھا تھا۔ شمع دان میں شمع روشن تھی۔ ہال میں اس شمع کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی۔

نشستوں کی ترتیب اس طرح تھی کہ میز کے دائیں طرف عورتیں اور بائیں طرف مردوں کے لیے صوفے رکھے تھے۔ ہال میں داخل ہو کر عورتیں اور مرد اپنی اپنی نشستوں پر خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہال کے دونوں بازوؤں میں روشنی اس قدر کم تھی کہ چہرے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آتے تھے۔ سلیمان نے لالی کو بڑی میز کے پاس اونچی کرسی پر بٹھا دیا۔

ہال میں چھائے ہوئے گہرے سکوت اور دھیمی دھیمی روشنی نے ماحول پر اسرار بنا دیا تھا۔ لالی سخت پریشان ہوا۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ اس کے سامنے میز پر اخروٹ کی لکڑی کی تین متقش صندوقچیاں رکھی تھیں۔ بیچ کی صندوقچی ذرا بڑی اور اونچی تھی۔ ہر صندوقچی میں روپے کے برابر گول گول ٹوکن پڑے تھے۔ دائیں صندوقچی میں جو ٹوکن تھے، ان پر عورتوں کے نام اور بائیں صندوقچی کے ٹوکنوں پر مردوں کے نام جلی حروف میں لکھے تھے۔ دونوں صندوقچیوں میں سات سات ٹوکن تھے۔ البتہ درمیان کی صندوقچی میں دس ٹوکن تھے۔ ان پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ صندوقچیاں کوئی پون فٹ اونچی اور اسی قدر چوڑی تھیں۔ تینوں صندوقچیاں بند تھیں۔ مگر ہر ایک کے اوپر اتنا بڑا ڈھکنا تھا کہ صرف ایک ہاتھ آسانی سے اندر جا سکتا تھا۔ صندوقچیوں کی قطار کے پیچھے لکڑی کا مختصر ریک تھا۔ اس میں بارہ خانے تھے، چھ اوپر اور چھ نیچے۔ خانوں پر ایک سے دس تک نمبر درج تھے۔ اوپر نیچے دو خانے ایسے بھی تھے جن پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ سب خانے بالکل خالی تھے۔ ریک کے خانوں کا رخ لالی کی جانب تھا۔ پچھلا حصہ اس طرح بند تھا کہ خانے صرف سامنے بیٹھا ہوا امپارڈیکھ سکتا تھا۔

لالی نے قاعدے کے مطابق ہر صندوقچی کھولی، ٹوکن گنے، ان پر لکھے ہوئے نام اور نمبر پڑے

عورت کی نظریں بھی اس کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے اور دونوں بالکل برہنہ تھے۔ لالی نے مجھے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
”یہ سب چکر کیا ہے؟“

”کوئی چکر وکر نہیں۔“ نوشابہ نے رمان سے کہا۔ ”دیکھو نا، یہ کتنا اجازت علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں تو سرکاری افسر اسے کالا پانی کتے تھے۔ اب تو ویسے حالات نہیں رہے۔ پھر بھی کوئی سوشل لائف نہیں۔ ویرانے میں الگ تھلگ پڑے ہیں۔ تمہیں کیا پتہ، میاں دل کتنا گھبراتا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”مہینے میں ایک رات سب کچھ بھول بھال کر زرا دل بھلا لیتے ہیں۔“
لالی بھی مسکرانے لگا۔ ”دل بھلانے کی ترکیب بہت چنگی نکالی ہے۔“

”میاں کوئی مرد کسی کا شوہر اور کوئی عورت کسی کی بیوی نہیں ہوتی، صرف رات بھر کے لیے۔“ نوشابہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”جب ایک سا کھانا کھاتے کھاتے اور ایک سالباں پہنتے پہنتے طبیعت آتا مکتی ہے تو ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت کے ساتھ رہتے رہتے بھی طبیعت آتا سکتی ہے۔“ وہ کچھ ٹھہری۔ ”چھپ کر گناہ کرنے سے کیا یہ اچھا نہیں کہ گناہ، زندگی کی ایک ضرورت سمجھ کر کیا جائے۔ اس میں کتنا رومانس ہے، کتنا مزا ہے۔“

”وہ تو جی ضرور ہے۔ مجھے بھی بہت مزا آرہا ہے۔“ لالی چند لمحے خاموش رہا۔ ”پر سب یہ بات کیے برداشت کر لیتے ہیں؟ بعد میں جھگڑا مٹا نہیں ہوتا؟“

”نہیں بالکل نہیں۔“ نوشابہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر ایسی رات کے بعد ہمارے درمیان محبت کم ہونے کے بجائے بڑھ جاتی ہے۔ سچ کہتی ہوں، میرا تجربہ یہی ہے۔ کلب کی دوسری ممبر عورتوں کا بھی یہی خیال ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو یہاں آتی کیوں؟ تم نے دیکھا نہیں، خوشی سے کیسی چمک رہی ہیں؟“

”کچھ سمجھ نہیں آتی جی۔“ لالی نے رمان سے کہا۔ ”دیر ہو رہی ہے۔ چلو، میں تمہیں کمرے میں پہنچا دوں۔“ وہ آگے بڑھا۔ کمرے کا تالا کھولا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ کمرے میں داخل ہونے لگی تو لالی بولا۔ ”طیعتان رکھو۔ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔ اور سب کو تو بچنے پر بھی ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ بلکہ کسی کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ لالی نے اٹھنا اور جذبے سے اسے یقین دلایا۔ ”مرد آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کہوں گا پورا نکالوں گا۔“

نوشابہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی اور آہستہ سے بولی۔ ”شکریہ۔“

جیسے سے بھی لالی کی کوئی بات نہیں ہوئی۔

قرعہ اندازی میں نوشابہ کا نمبر ۱۰ نکلا۔ لالی اس کے ساتھ ہال سے نکلا۔ دونوں نے نہ نہ ملے کیا اور بالائی منزل پر پہنچ کر غلام گردش میں چلے گئے۔ ایک محراب کے قریب نوشابہ نے رک کر لالی کو خبردار کیا۔ ”سنو، کہیں خیر خواہی جتانے کے لیے ہمدانی کو یہ نہ بتاؤ تاکہ میں کس کمرے میں رہی اور نہ یہ بتانا کہ میرا کمرہ کسے الاٹ ہوا۔“

لالی کو اس کی یہ بدگمانی ناگوار گزری۔ ”کیا سراسر صاحب سے بھی یہی بات کہی تھی؟“
”نہیں۔“ نوشابہ نے کسی قدر تکیے لہجے میں کہا۔ ”تم سراسر صاحب نہیں ہو۔ وہ ذمے دار اور قابل اعتماد شخص ہیں۔ سیشن جج رہ چکے ہیں اور تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو، عادی مجرم ہو۔“
لالی امپاڑی کی ترنگ میں تھا، وہ ہنسی کے نشے نے بھی اثر دکھایا، بے رخی سے بولا۔ ”جب یہ پتہ تھا، میں عادی مجرم ہوں تو.....“

نوشابہ نے اس کی بات کاٹ کر ترشی سے کہا۔ ”تمہارا اس طرح بات کرنے کا انداز مجھے بالکل پسند نہیں۔“

”بی بی جی! میں نے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے کہ مجھے امپاڑی بناؤ۔ میں تو خود اس چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔“ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”یہ میرا نہیں، ہمدانی اور سلیمان کا فیصلہ تھا۔“
”کھسم کا اتنا ہی ڈر تھا تو یہاں آئی کیوں؟“ لالی اور زیادہ بے باک ہو گیا۔ ”اس دکھت تو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر خوب بن ٹھن کر چلی آئیں اور اب۔“

نوشابہ نے لالی کو پوری بات نہیں کہنے دی، تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ ”کیا کتنا چاہتے ہو تم؟“
لالی اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ اسے فوراً احساس ہوا کہ وہ ڈپٹی کمشنر کی بیوی ہے۔ نرم لہجے میں بولا۔ ”میں تو یہ کتنا چاہتا ہوں، سب کو پتہ چل گیا تو کیا ہو گا؟ وہ سب ہی کچھ جانتے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے ہی ہو رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ نوشابہ کا لہجہ بھی نرم پڑ گیا۔ ”مگر یہاں سے جانے کے بعد ہم سارے باتیں بھول جاتے ہیں۔ کبھی اس کے بارے میں بات نہیں کرتے۔“

دونوں کمرہ نمبر ۱۰ کے قریب کی محراب کے نیچے کھڑے تھے۔ محراب کے کونے میں سیاہ مجسمہ نصب تھا۔ مجسمے میں ایک صحت مند اور جوان عورت کو ایک مرد کی آغوش میں دکھایا گیا تھا۔ عورت مرد کا سہارا لیے لیٹی تھی۔ مرد کی گردن جھکی ہوئی تھی وہ عورت کی جانب دیکھ رہا تھا۔

اپنی انگلیاں جھلسا چکا تھا۔ امینہ کو کمرے میں مقفل کر کے لائی لوتا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔



قرعہ اندازی کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ لالی نے تین خالی کمروں کے نوکن بے نمبر خانے میں رکھ دیے۔ ان پر نمبر ۱، نمبر ۲ اور نمبر ۳ درج تھے۔ نمبروں کے باقی سات نوکن اس نے پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیے۔ اب بال کا وہ حصہ بالکل خالی تھا جس میں خواتین کی نشستیں تھیں۔ بال کے دوسرے حصے میں بھی خاموشی تھی، صرف گہری سانسیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس حصے میں مردوں کی نشستیں تھیں۔ ان کی بے قراری سوانیزے پر تھی۔ وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ کھار کھار کر گلے صاف کر رہے تھے۔ مگر کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ لالی نے نظریں اٹھا کر کلاک دیکھا۔ ساڑھے گیارہ بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ بارہ بجے تک قرعہ اندازی ختم ہو جانا چاہئے تھی۔ اس کے پاس نصف گھنٹہ تھا۔ اتنے وقت میں پروگرام کے مطابق قرعہ اندازی اطمینان سے بنگائی جاسکتی تھی۔

لالی خاموش بیٹھا مردوں کی بے چینی اور ذہنی کشمکش سے لطف اٹھاتا رہا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی بے قراری کا علاج صرف اس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایسی لذت تھی جو اس سے پہلے کبھی اس نے محسوس نہیں کی تھی۔

بال میں صرف ایک شمع روشن تھی۔ اس کی ہلکی ہلکی کافوری روشنی میں سات مرد گم صم بیٹھے تھے۔ ان میں بڑے سرکاری افسر بھی تھے جو پورے ضلع کے سپاہ سفید کے مالک تھے۔ ان کے سامنے بڑے بڑوں کے سر جھک جاتے تھے۔ مگر اس وقت وہ لالی کی نگاہ کرم کے منہر تھے۔ لالی جیل سے بھاگا ہوا قیدی تھا، یہ بات ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو معلوم تھی اور ایس پی بھی جانتا تھا۔ گردوونوں اندر قیدی جیل کی کوٹھریوں کے بجائے پلے ڈر ہاؤس کے بند کمروں کے بارے میں سوچ رہے تھے اور یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ان کی قسمت کی لائری میں کیا نکلتا ہے۔

آخر لالی نے بانیں ہاتھ کی صندوقچی کا ڈھکنا کھولا اور مقررہ قاعدے کے مطابق اپنا بایاں ہاتھ اندر ڈال کر ایک نوکن نکالا۔ اسے پڑھا۔ نوکن پر چوہدری نواز بھنڈر کا نام درج تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے نام پکارا۔

نواز اندھیرے سے نکلا اور لالی کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا ڈھکنا بند کر کے لیے جو قاعدہ وضع کیا گیا تھا، اس کے مطابق اس دفعہ لالی نے ہاتھ اندر ڈال کے 'ن' نکالا اور ہاتھ کی آڑ میں اس طرح پڑھا کہ میز کے سامنے کھڑا ہوا شخص اسے نہ دیکھ سکے۔

لالی نے دروازہ بند کیا، تالا لگایا اور کنجی ہاتھ میں دبا کر تیز تیز قدموں سے واپس ہوا۔ بال میں پہنچا تو وہ گھبرایا ہوا تھا۔ سب اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ لالی اپنی کرسی پر بیٹھا چند لمبے خاموش رہا پھر کسی طرف دیکھے بغیر اس نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں اونچی آواز سے کہا۔

”معاف کرنا جی! تالے میں کچھ گڑبڑ تھی، اسے کھولنے میں دیر ہو گئی۔“

اندھیرے میں مرسلیمان کی آواز ابھری۔ ”کوئی بات نہیں، آپ امپائر جی! آپ کو کوئی معذرت شازرت کرنے کی ضرورت نہیں۔“

لالی چپ چاپ صندوقچیں سے عورتوں کے نام اور نمبر نکالنے لگا۔ راجیلہ کا نمبر آٹھ، فارخہ کا ۶، امینہ کا ۲ اور سائرہ کا ۴ نکلا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ باری باری بالائی منزل پر گیا۔ دروازہ کھولا ہر ایک کو تالا لگا کر کمرے میں بند کیا اور واپس آکر ہر کمرے کی کنجی اسی نمبر کے خانے میں رکھتا گیا۔ راستے میں کسی سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ چپ چاپ جاتا اور خاموشی سے لوٹ آتا۔ البتہ امینہ کے ہم راہ جاتے ہوئے کئی بار اس پر وارفتگی طاری ہوئی۔ وہ نہایت ہیجان انگیز خوشبو لگائے ہوئے تھی۔ آنکھوں سے شراب کا نشہ جھلک رہا تھا۔ بدن کا ایک ایک عضو بولتا تھا، جھکتا تھا۔ وہ تند و تیز شراب سے بھرا ہوا ایسا پیالہ تھی جس میں طوفان اٹھتے تھے۔

لالی، غلام گردش میں کچھ دور تک امینہ کے آگے آگے چلتا رہا پھر خود بخود اس کے قدم سے پڑ گئے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ چلتے چلتے امینہ ایک بار لڑکھڑائی۔ اس کی ساڑی کا آنچل ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ دور تک نشیب میں کھلی ہوئی برہنہ پیٹھ لالی کے سامنے آگئی۔ لالی تڑپ اٹھا۔ اس نے جھٹ امینہ کا نرم بازو تھام لیا اور اس وارفتگی سے تھما گویا اب چھوڑے گا نہیں۔ امینہ نے ٹھہر کر اپنا آنچل درست کیا۔ مدھ ماتنی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مسکرائی اور اپنا بازو جھڑانے کے لیے آہستہ سے کسمائی۔

لالی نے اس کا بازو چھوڑ دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سکی کا نشہ اچانک تیز ہو گیا۔ اس کے قدم ہلکنے لگے۔

لالی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ امینہ نے اندر داخل ہوتے ہوئے نہ لالی سے کوئی بات کی نہ اس کا شکریہ ادا کیا۔ صرف خمار آلود نظروں سے لالی کو دیکھا، مسکرائی اور کمرے میں چلی گئی۔ لالی نے گہری سانس بھری، دروازہ بند کیا، تالا لگایا اور پیتل کی تختی پر لکھا ہوا نمبر ذرا دیر تک غنمی باندھے ٹکٹا رہا۔

کمرے کا نمبر ۲ تھا۔ اس کے بند دروازے کے پیچھے ایک دکھتا ہوا شعلہ فروزاں تھا جس سے لاند

ٹوکن پر نمبر لکھا تھا۔ لالی نے چوہدری نواز بھنڈر کو ٹوکن کا نمبر دکھایا، نمبر کے خانے سے کنجی اٹھائی اور اسے دے دی۔ کنجی لیتے ہوئے نواز کے ہاتھ میں ہلکی سی کپکپاہٹ تھی۔ لالی نے ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھ دیا اور نام کا ٹوکن بے نمبر خانے میں ڈال دیا۔ نواز کنجی لے کر بال سے چلا گیا۔

لالی نے ایک بار پھر کلاک دیکھا۔ میز پر رکھی ہوئی چاندی کی مشتری سے سگریٹ اٹھا کر سلگائی اور آہستہ آہستہ کش لینے لگا۔ ہال میں سگریٹ پینے کی صرف اسی کو اجازت تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر اب چھ مرد بیٹھے تھے۔ وہ نہ بول رہے تھے نہ ہنس رہے تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ نواز بھنڈر اوپر پہنچ کر اس کی دی ہوئی کنجی سے کمرہ نمبر کھولے اور اندر جا کر دروازہ بند کر لے۔ اس کے لیے تین منٹ مقرر تھے۔

تین منٹ بعد لالی نے دوسرا ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ کو بلایا۔ بٹ آگیا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی سے ٹوکن نکالا اور ڈاکٹر بٹ سے چھپا کر پڑھا۔ اس پر نمبر ۵ لکھا تھا۔ لیکن یہ اس کی بیوی ماہ رخ کے کمرے کا نمبر تھا۔ قاعدے کی رو سے یہ کمرہ اسے الاٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ لالی نے ٹوکن پلٹ کر میز پر رکھ دیا۔ ٹوکن کا دوسرا رخ بالکل سادہ تھا۔ لالی نے ڈاکٹر بٹ کی جانب دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میز پر رکھا ہوا ٹوکن کس عورت کے کمرے کا ہے۔ لالی نے پھر درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈال کر ٹوکن نکالا۔ اس پر نمبر ۳ لکھا تھا۔ یہ مرزا ابوالحسن کی بیوی سائہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ لالی نے ٹوکن ڈاکٹر بٹ کو دکھایا اور ریک کے خانے سے کمرہ نمبر ۳ کی کنجی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔ بٹ اپنی منزل کی جانب چلا گیا۔ لالی نے التارکھا ہوا ٹوکن اٹھا کر پھر درمیانی صندوقچی میں ڈال دیا۔ دوسرے دونوں ٹوکن بھی نام اور نمبر کے خانوں میں رکھ دیے۔ لالی خوش تھا کہ ابھی تک کمرہ نمبر ۲ کا ٹوکن نہیں نکلا۔ یہ امینہ کا نمبر تھا۔

ٹھیک تین منٹ بعد سلیمان آیا۔ ٹوکن نمبر ۲ اس کے نام بھی نہیں نکلا۔ اس کے لیے نمبر ۱ نکلا۔ یہ نواز بھنڈر کی بیوی فاخرہ کا نمبر تھا۔ سلیمان گیا تو ہمدانی آیا۔ اس کے آتے ہی لالی کے ذہن میں ٹوکن نمبر ۲ سوائے نشان بن کر گردش کرنے لگا۔ لالی نے نظریں اٹھا کے اسے دیکھا۔ ڈپٹی کسٹرن ہمدانی اس کے روبرو سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک تھے۔ چہرے کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ لالی ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ڈپٹی کسٹرن اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا جیسے عدالت میں ملزم گردن نیچی کئے بے قراری سے اپنے مقدمے کا فیصلہ سننے کے لیے کھڑا ہو۔ لالی کو معلوم تھا کہ ڈپٹی کسٹرن کس کمرے کے الاٹمنٹ

کے لیے بے قرار ہے اور کس نمبر کا ٹوکن چاہتا ہے۔ وہ ٹوکن ابھی تک صندوقچی میں موجود بھی تھا۔

لالی نے درمیانی صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ اس دفعہ اس کا دل بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ٹوکن نکال کے پڑھا۔ اس کی نظریں دھندلا گئیں۔ قسمت نے ڈپٹی کسٹرن کا ساتھ نہیں دیا۔ یہ ٹوکن نمبر ۸ تھا۔ یہ امینہ کا نہیں، راحیلہ کا نمبر تھا۔ راحیلہ کے چہرے پر نرمی سے زیادہ سرخی تھی، اس کی آواز بھاری تھی اور اپنی بھاری بھر کم آواز کے باعث وہ گوگلوں کی طرح خاموش رہتی تھی۔ مردوں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے سگریٹ کا دھواں اڑاتی تھی۔ اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں لالی کو دھیور یاد آتا تھا۔ دھیور جو میاں حیات محمد نو کے بیٹے کا تومند خواجہ سرا تھا اور اس کی زبان کٹی ہوئی تھی۔

لالی کو ایسا محسوس ہوا کہ میز کے سامنے ڈپٹی کسٹرن ہمدانی نہیں، صرف ہمدانی کھڑا ہے اور اندھیرا بہت گہرا ہے۔ وہ لمحہ بھر تک ٹوکن تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آخر اس نے ٹوکن پلٹ کے رکھ دیا۔ اس نے صندوقچی سے نیا ٹوکن نکالا، مگر ہمدانی کی قسمت ہی کھوٹی تھی۔ یہ بھی کمرہ نمبر ۲ کا نہیں، نمبر ۱ کا ٹوکن تھا۔ اس میں امینہ نہیں، نوشابہ تھی۔ لالی الجھن میں پڑ گیا۔ یہ ٹوکن وہ پلٹ کر نہیں رکھ سکتا تھا، نہ قاعدے کی رو سے اس کمرے کی کنجی ہمدانی کو دے سکتا تھا۔ اسے جو کچھ کرنا تھا، فوراً کرنا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ پر تین مرد اندھیرے میں بیٹھے تھے۔ ان کی نظریں لالی کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں مرزا بھی تھا۔ وہ پولیس والا تھا۔ اس کی نگاہیں سب سے زیادہ تیز تھیں۔ لالی کے جرائم پیشہ ذہن نے اس مرحلے پر کام دکھایا۔ اس نے ٹوکن ہمدانی کے سامنے کیا اور کنجی خانے سے نکالنے کے لیے اتنا جھکا کہ اس کا چہرہ اندھیرے میں آگیا۔ اس نے کنجی خانے سے ٹکرا کر ہولے سے آہٹ پیدا کی اور ساتھ ہی سرگوشتی کی۔ ”کمرہ نمبر ۲۔“ اس نے نمبر ۲ کی کنجی نکال کے ہمدانی کے حوالے کر دی۔ کنجی لیتے ہوئے ہمدانی کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اسے مسکراتا دیکھ کے لالی بھی خوش ہوا۔ ہمدانی کی دلی مراد بر آئی۔ وہ کمرہ نمبر ۲ کی جانب روانہ ہو گیا۔

اب لالی ایک نئی الجھن میں پڑ گیا۔ کمرہ نمبر ۲ کی کنجی ہمدانی کے پاس تھی اور اس نمبر کا ٹوکن صندوقچی میں تھا۔ طرفہ تماشیا کہ وہ دو ٹوکن صندوقچی میں تھے اور دو باہر۔ مگر امیدوار صرف تین رہ گئے تھے۔ لالی چند لمحے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر اس نے کمرہ نمبر ۱ کا ٹوکن اسی نمبر کے خانے میں رکھنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مگر ٹوکن رکھا نہیں انگلیوں کے درمیان دبایا۔ اس نے میز پر التارکھا

ہوا کمرہ نمبر ۸ کا ٹوکن نہایت صفائی سے اسی ہاتھ سے اٹھایا اور دونوں ٹوکن درمیانی صندوقچی میں ڈال دیے۔ ہمدانی کے بعد ایس پی مرزا کی باری آئی۔ ایس پی میز کے قریب آکر کھڑا ہوا تو لائی امپائر سردار نور محمد خاں بزدار سے ایک دم مغرور قیدی بن گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایس پی کی جانب دیکھا۔ ایس پی اسے گھور رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خفی تھی۔ لالی اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ اس نے گردن جھکا کر صندوقچی میں ہاتھ ڈالا۔ ساتھ ہی اسے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ ٹوکن نمبر ۲ نہ نکل آئے۔

اس نے ٹوکن نکالا تو ڈیہ سوچ کر زیادہ احتیاط سے پڑھا کہ اگر نمبر ۲ ہو تو اسے پلٹ کر میز پر رکھ دے گا۔ مگر اسے خدشہ تھا کہ بار بار ٹوکن پلٹنے سے ایس پی کو شبہ بھی ہو سکتا ہے۔ لائی نے دھڑکتے دل سے دیکھا۔ ٹوکن نمبر ۲ نہیں، نمبر ۸ تھا۔ ایس پی خاموش کھڑا تھا اور مسلسل لالی کو گھور رہا تھا۔ لالی نے اسے ٹوکن کا نمبر دکھایا اور کمرہ نمبر ۸ کی کنجی اس کے سپرد کر دی۔ ایس پی کنجی لے کر بال سے جانے لگا۔ لالی کے ہونٹوں پر تبسم آیا۔ کرخت چہرے والے ایس پی کے، جسے میں کمرہ نمبر ۸ آیا تھا۔ اس میں مرسلیمان کی بیوی راحیلہ تھی۔

اب مسعود آیا۔ اس کے نام کمرہ نمبر ۲ کے بجائے نمبر ۵ آیا۔ لالی ایک بار پھر ٹوکن پلٹنے اور دوبارہ قرعہ اندازی کرنے کے جھنجھٹ سے بچ گیا۔ سب سے آخر میں شیخ عبدالحمید گلوں آیا۔ وہ لالی کے لیے خاصا میزھا مسئلہ بن گیا۔ پیچیدگی یہ پیدا ہوئی کہ امیدوار ایک تھا اور صندوقچی میں ایک کے بجائے ٹوکن دو تھے، نمبر ۲ اور نمبر ۱۰۔ اگر نمبر ۱۰ نکل آتا تو کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہوتی۔ وہ کمرہ نمبر ۱۰ کی کنجی اسے دے دیتا۔ لیکن ٹوکن نمبر ۲ نکلتا تو وہ اسے النار کھ کر دوبارہ قرعہ اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ نہ ہی وہ ٹوکن نمبر ۲ کی کنجی دے سکتا تھا۔ اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ لالی نے جھٹ پیتہ بدلا، مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔

”اب لائری شائری کیا نکالنی ہے جی! اپنے پاس صرف ایک چابی ہے اور اسی کا ٹوکن ڈبے میں پڑا ہے۔“

وہ کنجی خانے سے نکالنے کے لیے جھکا۔ حمید گلوں نے کچھ کہنا چاہا مگر لالی نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ کنجی اس کے طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لوجی یہ رہی نمبر ۱۰ کی چابی۔ جا کر تالا کھولو اور دیکھو تمہارے نصیب میں کون سی لگائی آئی ہے۔“ وہ ذرا کھل کر مسکرایا۔ ”پر اس کمرے کے تالے میں ذرا گڑبڑ ہے۔ ہوشیاری سے کھولنا، بہت دیر میں کھلتا ہے۔ یاد ہے نا، میں اوپر سے دیر میں لوٹا تھا۔ وہ اسی کمرے کے تالے کا چکر تھا۔“

حمید گلوں نے کنجی ہاتھ میں نہیں لی۔ ”ایسی بات ہے جی تو یہ چابی اپنے ہی پاس رہے دو۔ میرے ساتھ اوپر چل کر تالا کھول دو۔ مریانی ہوگی۔ میں کہاں تالے کے ساتھ مغز ماری کروں گا۔“ کلاک نے ٹن ٹن بارہ بجائے۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ قرعہ اندازی کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ لالی نے حمید گلوں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ وہ حمید کے ساتھ بال سے نکلا۔ دونوں زینے طے کر کے اوپر پہنچ گئے۔ میزھیاں چڑھنے کے بعد شیخ حمید گلوں ٹھہر کر آہستہ آہستہ بانپنے لگا۔ لالی نے ہنس کر کہا۔ ”سیٹھ حمید! تیس تو بانپنے بھی لگے۔ نمبر ۱۰ تو ابھی دور ہے۔“ لالی نے کمرہ نمبر ۱۰ کی جانب دیکھا، وہ طویل غلام گردش کے دوسرے سرے پر تھا۔

”میں ادھر کے ۸ چکر لگا چکا ہوں۔ یہ نواں ہے۔“

حمید نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”میں ذرا دیر میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اس نے چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ لالی کی جانب ذرا سا جھکا، آہستہ سے پوچھا۔ ”وس نمبر میں کون ہے جی؟“

”میں تو جی اتنا جانتا ہوں، اس میں تمہاری گھر والی نہیں ہے۔“

”اتنا تو میں نوں بھی پتہ ہے۔“

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ حمید بھی خاموش رہا۔ دونوں غلام گردش میں چلتے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے کمرہ نمبر ۲ کو دیکھا۔ اس میں امینہ تھی جس کا انگ انگ چمکتا تھا۔ مدھاتی آنکھیں شب خون مارتی تھیں۔ بیٹ ناف سے نیچے تک کھلا تھا، پیٹھ نشیب میں دور تک برہنہ تھی۔ امینہ اب ہمدانی کے پہلو میں تھی۔ اس کا شوہر محکمہ آباد کاری کا بڑا افسر تھا اور ماتنخزم کے نظریے کی بنیاد پر آبادی کم کرنے کا فلسفہ بگھارتا تھا۔ وہ اس وقت کمرہ نمبر ۵ میں ڈاکٹر بیٹ کی بیوی ماہ رخ کے ساتھ تھا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور آگے بڑھتا گیا۔ حمید گلوں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ توند سے پھسلتی ہوئی پتلون بار بار درست کر رہا تھا۔

لالی جس کمرے کے سامنے سے گزرتا، اس کے متعلق سوچتا کہ بند دروازے کے پیچھے کون کس کے ساتھ ہے۔ حمید نے چلتے چلتے ایک بار پھر سرگوشی کی۔

”یار! بتاؤ تو سہی، آج اپنے ہمسے میں کون آئی ہے؟“

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے دریافت کیا۔ ”سیٹھ حمید! تم بشرے کو جانتے ہو؟“

”جانتا تو ہوں۔“ حمید نے مشتہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”پر یہ نہیں جانتا کہ وہ دھندا کیا کرتا ہے؟“

”بزدل صاحب! تھوڑی سی تم بھی لگا لو۔ بہت پیش چیز ہے۔“

لالی نے انکار نہیں کیا۔ کنڑاس کے ہاتھ سے لیا اور غناغٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ بہت تیز شراب تھی۔ منہ کانوں تک جھن جھینا اٹھا۔ حلق جلنے لگا۔ لالی نے کنڑاشیخ حید کو واپس کیا اور آگے بڑھ کے کمرے کے بند دروازے پر پہنچا۔ تالے میں کئی ڈالی اور چند لمبے تک خواہ مخواہ اسے ادھر ادھر گھماتا رہا۔ آخر اس نے تالا کھول دیا۔ مڑکر حید کو دیکھا۔ حید کھلا ہوا کنڑا ہاتھ میں دبائے اپنی گول گول آنکھوں سے لالی کو تنک رہا تھا۔ لالی کو وہ بالکل الو کا چٹھا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ شیخ حید گول نے تیل کی طرح گردن ہلا کر انتظار کرنے کی ہامی بھری۔



لالی نے آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ آگے ایک اور پردہ پڑا تھا۔ لالی نے پردہ سرکا کے اندر جھانکا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں پیڈل سلیمپ روشن تھا۔ اس کے سرپوش سے گہری سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ دروازوں کے پردے بھی سرخ تھے۔ فرش کا قالین بھی سرخ تھا۔ کمرے کی ہر چیز سرخ تھی یا سلیمپ کی روشنی میں سرخ نظر آ رہی تھی۔ وسط میں جدید طرز کی نہایت نفیس مسہری تھی۔ جھلکتے ہوئے ابلے ابلے بستر پر گلاب کے سرخ سرخ پھول بکھرے تھے۔ مسہری کے سرہانے موتے اور چنبیلی کے بار جھول رہے تھے۔ کمرے میں ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی۔

لالی پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر پہنچ گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جگہ عروسی میں آگیا ہو۔ مگر جگہ عروسی سے دلہن غائب تھی۔ وہ ہکا بکا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شیخ حید گول کی ”پیش“ آہستہ آہستہ رنگ دکھا رہی تھی۔ لالی کی نظروں میں سامنے خوابوں کے دھندلے منڈلانے لگے۔ چند لمحوں بعد بغلی دروازہ آہستہ سے چرچا تا ہوا کھلا۔ نوشاہہ دروازے سے مسکراتی ہوئی نکلی۔ اس کے گلے میں تازہ پھولوں کا گجرا تھا۔ ہاتھ میں بھی گجرا لٹک رہا تھا۔ اس کا تاب ناک گلابی چہرہ دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی میک اپ کیا ہے۔ آنکھوں میں گہرا کاجل، ہونٹوں پر سرخی، پشت پر مہکتا جوڑا، جوڑے میں موتے کی کلیوں کا ہار گندھا ہوا اور پیشانی پر قمقمے کے مانند بڑی سی جگمگاتی بندیا۔

وہ جنوبی ہند کے قدیم مندروں میں رقص کرنے والی دیوداسیوں جیسا لباس پہنے ہوئے تھی۔ سینے پر کھاتو کے جھلملاتے دائرے بناتی مختصر چولی تھی۔ ناف سے نیچے بندھی ہوئی زر۔ نغت کی گہری نارنجی ساڑھی۔ ساڑھی کا ایک پلو لانگ لگا کر پیچھے اڑس لیا گیا تھا۔ دو سرا پلو پٹکے کی طرح آگے

”میں جانتا ہوں۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ ڈریوروں کے ساتھ گھر سے بھاگنے والی کڑیاں برآمد کرنے کا دھندا کرتا ہے۔“

سیٹھ حید گول اس کی بات سن کر بہت سٹ پٹایا۔ ”کیا بشرے نے تم کو یہ بات بھی بتائی تھی؟“ اس نے حیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”لگتا ہے، تم بھی پولیس میں رہ چکے ہو۔“ اس نے کچھ رک کے کہا۔ ”چلو، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔“ اس نے کوٹ کی جیب سے نوٹوں سے بھرا ہوا بیوہ نکالا اور اسے کھولتے ہوئے آنکھ ماری۔ ”کچھ رشوت و شوت لے لو۔ یہ بتا دو کہ کمرے میں کون ہے؟“

”ایں ویں گلاں نہ کرو۔ سیٹھ! جو بھی ہوگی، تمہارے جوڑ کی ہوگی۔“

مگر حید باز نہ آیا، جلدی سے بولا۔ ”بات یہ ہے جی۔ آج کی سپنس ٹائٹ کے لیے میں بہت شاندار تحفہ لایا ہوں۔ ہوا یوں کہ سویرے ہی سویرے اپنے شاہ جی آگئے۔ بہت وڈے بزرگ ہیں۔ کیا بتاؤں، کیا تاثیر ہے ان کی زبان میں۔ نئے کا بھاؤ جب بھی بتایا، ٹھیک ہی نکلا۔ آئے تو دیر تک میرا متھا تکتے رہے۔ کہنے لگے، حید! آج تین نوں کوئی بہت شاندار چیز ملنے والی ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”اب میں یہی خوش خبری تم سے سننا چاہتا ہوں۔“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموشی سے چلتا رہا۔ حید گول کو قرار نہ آیا۔

”اتنا تو بتا دو راحیلہ بھائیہ تو نہیں ہے؟“

”پتہ نہیں، وہ بھی ہو سکتی ہے۔“ لالی نے اس دفعہ بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نمبر ۱۰ میں نوشاہہ ہے۔ دل کش دل آرا نوشاہہ جس کی جوانی کا فوری شمع کے مانند دھیرے دھیرے پگھل رہی تھی۔ لالی نے نظریں موڑ کر حید گول کو دیکھا۔ اس کا جسم خاصا بے ڈول تھا۔ ٹاک نقشہ بھی موٹا موٹا تھا۔ سر پر بال کم تھے۔ اندر سے جلد صاف نظر آتی تھی۔ لالی کو نوشاہہ پر بڑا ترس آیا۔ وہ اس کے بارے میں سوچتا رہا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ آخر کمرہ نمبر ۱۰ آگیا۔ لالی نے کہا۔ ”لو جی! تمہارا کمرہ آگیا۔“ یہ کہتے ہوئے لالی کمرے کی جانب مڑا۔ لیکن حید گول اس کے ساتھ نہیں بڑھا۔ وہ دروازے کے سامنے رکھے ہوئے نرم نرم صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ حید نے اشارے سے لالی کو اپنے قریب بلایا۔ لالی اس کے پاس چلا گیا۔ حید نے کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا خوش نما کنڑ نکالا، اس کا دھکنا کھولا، مسکرایا۔ آنکھ مار کے رنڈی بازوں کی طرح بولا۔ ”ذرا گرم ہو جاؤں جی۔ تم دروازہ کھول کر دیکھو، اندر کون ہے۔“ اس نے کنڑ منہ سے لگایا اور چند گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر کنڑ لالی کی طرف بڑھا دیا۔

لالی نے جل کر طنز کیا۔ ”قاعدہ تو میں نے پوری طرح دیکھ لیا۔ رہ گیا کنون تو ساتھ والے کمروں میں کنون کے رکھوالے خود کنون کی ایسی تیسی کر رہے ہیں۔ آج اتفاق سے وہ نہیں ہیں جو کبھی انصاف کی ترازو میں کنون تو لا کرتے تھے۔ اندھیرے ہال میں بیٹھ کر کنون کی ایسی تیسی کرنے والوں کے لیے لائری نکالتے تھے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟“

نوشابہ نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا، دھیرے دھیرے مسہری کے قریب گئی اور سرہانے کی طرف پیرنکا کر بیٹھ گئی۔ اس نے تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر بولی۔ ”میں یہ جانتا چاہتی ہوں کہ تمہیں یہاں آنے کی جرات کیسے ہوئی؟ تم... تم۔“ اس نے غصے سے دانت پیسے، آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

لالی اس کا غصہ نظر انداز کر کے بولا۔ ”میں اتنا بد صورت تو نہیں ہوں۔ یہاں مجھ سے بھی زیادہ بد صورت بندے موجود ہیں۔ ایک تو باہری بیٹھا ہے۔“

”یہ تمہارے سوچنے کی بات نہیں۔ میں سب کو جانتی ہوں۔ انھیں منتخب کرنے والوں میں کلب کی دوسری ممبر عورتوں کے ساتھ میں بھی شریک تھی۔“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ آگیا۔ ”اگر سارے مرد اور ساری عورتیں خوبصورت ہی ہوتیں تو پھر قرعہ اندازی کیوں ہوتی؟ اس کھیل میں کوئی رومانس نہ ہوتا۔ کوئی بے قراری، کوئی سپنس نہ ہوتا۔ مگر تم یہ باتیں نہیں سمجھ سکتے۔“

نوشابہ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ ”تم جاؤ گے نہیں یہاں سے؟“

شیخ حمید گلوں کی شراب دو آتشہ کا تند و تیز نشہ کام کرتا رہا۔ لالی اور بے باک ہو گیا۔ ”ارادہ تو نہیں ہے۔ یہ لال لال روشنی، یہ مہکتے پھول، یہ بھینی بھینی خوشبو اور تم۔ تمہاری تو بات ہی کیا ہے۔ ایسے لشکارے مارتی البیلی کہاں نظر آتی ہے؟“ اس کی آنکھیں اس طرح جھلکانے لگیں جیسے شیشہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ ”یہاں آکر بھی کوئی واپس جاسکتا ہے۔“ اس نے ہاتھ میں دبی ہوئی کنجی دکھاتے ہوئے کہا۔

”کمرے کی چابی تو اپنے ہی پاس ہے نا۔“

”تم سمجھتے ہو، میں یہاں اکیلی ہوں اور کمرے کا دروازہ بند ہے۔“ نوشابہ نے غصے سے آنکھیں نکال کر خبردار کیا۔ ”تم نرے احق ہو، اٹو ہو۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا اور مسہری کے سرہانے لگا ہوا سوکچ دکھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ سوکچ دیکھ رہے ہو۔ اسے دباتے ہی خطرے کا الارم بجنے لگے گا۔ ذرا دیر میں کمرے کا دروازہ بھی ڈپلی کیٹ چابی سے کھل جائے گا۔ اور تم کچڑ لیے جاؤ گے۔ مگر تم جیل

جھول رہا تھا۔ اس لباس میں اس کی دونوں ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر تک کھلی ہوئی تھیں۔ چوٹی کے سوا اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ہاتھ بھی برہنہ تھے۔ ان پر صرف پھولوں کے بازو بند تھے۔ کانوں میں چپا کے اچلے اچلے پھول تھے۔ نوشابہ کی یہ سچ دھج دیکھ کر لالی کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہو گئی۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سانس تیز ہو گئی۔

لالی کو دیکھتے ہی نوشابہ کے ہونٹوں پر کھکھی ہوئی مسکراہٹ بگھ گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم؟ تم یہاں کیسے آگئے؟“

لالی مسکرانے لگا۔ ”بس آگیا جی۔“

وہ غصے سے تیوری پر بل ڈال کر بولی۔ ”کیا مطلب؟“

لالی مسکراتا رہا۔ ”مطلب یہ کہ جی، یہ کمرہ مجھے الاٹ ہو گیا ہے۔“

”ہش؟“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟“

”اس میں دماغ خراب ہونے کی کون سی بات ہے۔“ اس نے نوشابہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈھٹائی سے کہا۔ ”یہ امپائر کا فیصلہ ہے اور اتنا تو تیس جانتی ہی ہو کہ امپائر کے فیصلے کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔“

”بکو اس بند کرو اور فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔“

لالی ڈھٹ بنا کھڑا رہا۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھورتی رہی پھر اس نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”تم چاہتے کیا ہو۔“

”چاہنا واپس آنا کیا ہے جی؟“ لالی بچوں کی طرح مچل گیا۔ ”یہ کمرہ مجھے کیوں الاٹ نہیں ہو سکتا؟“

اس نے مسکرا کر نوشابہ کو چھیڑنے کے لیے جھوٹ بولا۔ ”اپنی بھی گھر والی ہے، تین بچے ہیں۔ میرا مطلب ہے....“

وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”میں تمہارا مطلب خوب سمجھتی ہوں۔“ اس نے سیدھی سیدھی دھمکی دی۔ ”جیل جانا چاہتے ہو؟“

لالی مرعوب نہیں ہوا، اڑیل ٹٹو کی طرح اڑا رہا۔ ”جیل تو جانا ہی ہے، پہلے بھی تین بار جا چکا ہوں۔ چوتھی بار تم بھجوا دو۔ چلو، اس دفعہ تمہارے نام پر جیل کاٹ لوں گا۔“

نوشابہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی، پھر اس نے ذرا نرم لہجے میں لالی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو، ضد مت کرو۔ اس کھیل میں تم شریک نہیں ہو سکتے۔ اس کا ایک مقررہ قاعدہ اور مقررہ

قانون ہے۔“

نہیں جاؤ گے۔ یہ جو نیچے سر بہ رہی ہے، تمہاری لاش کلڑے کلڑے کر کے اس کے کنارے دبا دی جائے گی۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوگی کہ ایک مفروضہ قیدی کا کیا حشر ہوا۔ تم جانتے ہو، اس ضلع کی حکومت ساتھ والے کمرے میں موجود ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو اس ضلع کا سب سے بڑا حاکم ڈپٹی کمشنر ہے اور میں اس کی بیوی ہوں۔

”وہ کیا کرے گا؟“ لالی بدستور مسکراتا رہا۔ ”وہ تو خود کسی دوسرے کی گھر والی کو لیے بیٹھا ہے۔

پر میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کون ہے۔“

”میں یہ بات تم سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی۔“ اس نے سوچ پر انگلی رکھ دی۔ ”میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ دبا دوں یہ سوچ؟ بولو، کیا کہتے ہو؟“

نٹے کا زوردار ریلا آیا۔ لالی اس ریلے میں بہ گیا۔ اس نے نٹے سے جھوم کر نوشابہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”دبا دو۔ موت اسی طرح آتی ہے تو یوں ہی سہی۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”پر ایک شرط ہے۔ تم اپنے سوہنے، سوہنے ہاتھوں سے میرے ٹوٹے کرتا۔ ہائے بھی نہیں کروں گا۔“

وہ جل کر بولی۔ ”کم بخت! تو میرا عشق کب سے بن گیا؟“

”یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔“ لالی نے اس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ اتنا بہت ما سنگھار تم نے کس کے لیے کیا ہے۔ وہ میں کیوں نہیں ہو سکتا؟“

وہ آہستہ آہستہ نوشابہ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے، چہرے پر وحشت طاری تھی۔ نوشابہ نے اسے آگے بڑھتے دیکھا تو زور سے ڈانٹا۔ ”رک جاؤ۔“ لالی اس کی ڈانٹ سن کر چونک پڑا، جھج کر کھڑا ہو گیا۔ نوشابہ نے تملکا کر کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتے ہو میں یہ سنگھار نوچ کر پھینک دوں؟“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”لو یہ بھی دیکھ لو۔“ اس نے گردن میں پڑا ہوا گجرا پکڑا اور غصے سے جھنکا دے کر توڑ ڈالا۔ گجرے کے پھول دور تک بکھر گئے۔ نوشابہ نے فرش پر پڑے ہوئے پھول مسلتے ہوئے بازو بند کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

لالی یہ وار جھیل نہ سکا۔ گھبرا کے بولا۔ ”نہ نہ ایسا نہ کرو۔“

نوشابہ کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے خون خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”اگر تم یہ نہیں چاہتے تو فوراً کمرے سے نکل جاؤ۔“

”نراض کیوں ہوتی ہو۔“ اس دفعہ لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم کہتی ہو تو چلا جاؤں گا۔“ وہ جھینپ کے مڑا۔ پھر ٹھنکا۔ ”جانے سے پہلے اتنا ضرور پوچھوں گا۔ کیا میں صرف اس لیے تمہارے اس ٹانگ میں شریک نہیں ہو سکتا کہ میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں؟“ اس کے چہرے پر

دکھ کا ہلکا سا سایہ پھیل گیا۔

”یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔“ نوشابہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”مگر اور بھی بہت سی باتیں ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔“ وہ ذرا رکی۔ ”یوں سمجھ لو کہ یہ چند شادی شدہ مردوں اور عورتوں کا خفیہ کلب ہے۔ اس کا نام پولی نیسن کلب ہے۔“

”یہ کیا نام ہوا جی؟“

وہ ہنسی سے بولی۔ ”کیا کرو گے جان کر۔ تم کبھی اس کلب کے ممبر نہیں بن سکتے۔“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں، پر جب بتایا ہے تو یہ گل بھی بتا دو۔“

نوشابہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ ”پولی نیسن، جنوبی مسندروں کے علاقے پولی نیسیا کے باشندوں کو کہتے ہیں۔ ان میں مختلف قبائل ہیں۔ تقریباً تین سو پچاس جزیروں میں صدیوں سے آباد ہیں۔ ان جزیروں میں نیوزی لینڈ، ایسٹرن آئی لینڈ، ہوائی اور تانزانیہ بھی شامل ہیں۔ پولی نیسنوں کے نزدیک مورت اور مرد کے جنسی تعلقات ایسی ہی عام بات ہے جیسے کھانا کھانا، پانی پینا۔ کوئی بھی عورت، جب چاہے کسی بھی مرد سے تعلقات قائم کر سکتی ہے۔ شادی سے پہلے بھی اور شادی کے بعد بھی۔ گئے، رقص کرنے، تیراکی اور مچھلی کا شکار کرنے کی طرح وہ اسے بھی تفریح یا کھیل سمجھتے ہیں۔ بلکہ آنا اور ناریل کے کج میں بعض عورتیں گھر بنا کر رہتی ہیں اور جو مرد انہیں پسند آجاتا ہے، اس کے ساتھ جب تک جی چاہتا ہے، رہتی ہیں۔ ایسے گھر پلے ڈر ہاؤس کہلاتے ہیں۔ مگر اب یہ باتیں رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔“

”ہاں ختم ہو رہی ہیں اور یہاں شروع ہو رہی ہیں۔“

”یہ بات نہیں۔“ نوشابہ نے لالی کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تم مر سلیمان سے تو مل ہی پڑے ہو۔ دوسری جنگ عظیم میں وہ رائل انڈین نیوی میں افسر تھے۔ جنگ کے دوران ان کا جہاز بالائی ایر فورس کے حملوں سے بھاگ کر جزائر مار کوئیس کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو گیا تھا۔ یہ جزائر نیو پونسیا کا حصہ ہیں۔ سلیمان وہاں دو ہفتے تک پولی نیسن باشندوں کے ساتھ ٹھہرے رہے۔ ج پچھو تو یہ کلب انھوں نے ہی قائم کیا، اس کا نام پولی نیسن کلب اور اس عمارت کا نام پلے ڈر ہاؤس رکھا۔ شروع میں چار جوڑے اس کے ممبر تھے۔ اب آٹھ ہیں۔ انھیں سب نے مل کر منتخب کیا ہے۔ سبھی نے مل جل کر اس کلب کے اصول اور قاعدے بنائے ہیں۔ رازداری کا باقاعدہ خزانہ لایا ہے۔“ اس نے چند لمبے توقف کیا۔ ”ویسے تو میری زبان راحیلہ ہے مگر ممبر پانچ سو روپے فی ماہ دیتا ہے۔ ممبر شپ کی فیس دو ہزار روپے ہے۔ وہ ماہانہ چندے سے الگ ہے۔ یہ جشن

جسے نائٹ آف دی گرینٹ سپنس کہا جاتا ہے، مینے میں صرف ایک رات منایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ مقرر ہوتی ہے اور پہلے سے باقاعدہ تیاریاں کی جاتی ہیں۔“

لالی خاموش کھڑا نوشاہی کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولتی رہی۔ ”اس رات کے لیے ہر عورت اپنی پسند کا لباس منتخب کرتی ہے۔ ایسا لباس ہر کمرے کے ڈریسنگ روم میں موجود رہتا ہے۔ اگر پہلے سے کاسٹیوم اسٹور میں نہیں ہوتا تو میا کر دیا جاتا ہے۔ ہار پھول اور سنگھار کا سارا سامان بھی یہاں موجود رہتا ہے۔ آج کی رات ہر عورت یہاں نئے سرے سے دلہن بنتی ہے۔“ نوشاہی نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لرلایا۔

”دیکھ رہے ہو؟ یہ سب کیا ہے۔ کیا تمہیں یہ پہلی رات کی دلہن کا کمرہ نہیں نظر آتا۔ ویسے آج کی رات عام طور پر عورتیں پولی لیسین لباس پہنتی ہیں۔ یہ لباس یارک جھار نما ہوتا ہے اور کمرے گھنٹوں تک ہوتا ہے۔ سینہ بالکل کھلا ہوتا ہے۔ مگر میں نے اپنے لیے آج مختلف لباس چنا تھا۔“ وہ کسی قدر افسردہ ہو گئی، دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”تم بڑے سنگدل ہو۔ تم نے آج کی رات کا سارا حسن، سارا ساگ اجاڑ دیا۔ میری ساری انگلیں، سارے دلوں کے خاک میں ملا دیے۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میری خوشیاں چھین کر تمہیں کیا ملا؟“

لالی اس کی باتوں سے متاثر ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ ”بات یہ ہے جی! مجھے تم پر بڑا ترس آیا۔ تیس اتنی سوہنی ہو! اتنی کہ میں کیا بتاؤں اور وہ.... وہ۔“

نوشاہی اس کی بات کاٹ کر بے رخی سے بولی۔ ”وہ کوئی بھی ہے، اسے یہاں بھیج دو اور خدا کے لیے مجھ پر مزید ترس نہ کھاؤ۔“

لالی چپ چاپ دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔ شیخ حمید گلوں صوفے پر پریشان پریشان بیٹھا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی تھکے لہجے میں بولا۔ ”بہت دیر لگا دی جی؟“

”وہ ڈریسنگ روم میں بیٹاؤ سنگھار کر رہی تھی۔ بہت دیر بعد نکلی۔“

”اوہ! یہ بات ہے۔ ٹھیک کہہ رہے ہو جی تم۔ کبھی کبھی تو سنگھار کرنے میں یہ زنانیاں گھنٹہ گھنٹہ بھر لگا دیتی ہیں۔“ حمید گلوں کھڑا ہو گیا اور کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے آنکھ مار کر بولا۔ ”بزدل صاحب! اب تو بتاؤ! اندر کون ہے؟“

لالی نے نظر بھر کر اس کا چہرہ دیکھا، پھر جذباتی ہو گیا۔ ”سینٹھ حمید! تو جی جی کمت کا دھنی ہے۔ مٹی کو ہاتھ لگا دے تو سونا بن جائے۔ تو کیوں گھبراتا ہے۔ تیری کمت تو جاگ رہی ہے۔ جا! اندر؟ کر دیکھ لے۔ دروازہ کھلا ہے۔ تجھے کوئی روکنے والا نہیں۔“

حمید گلوں بدحواس ہو گیا۔ شراب کا خالی کنٹر لالی کے ہاتھ میں تھا کہ تیزی سے آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

لالی خواب ناک نظروں سے چپ چاپ دروازہ تکتا رہا۔ چند لمحوں بعد دروازہ آہستہ سے بند ہو گیا۔ لالی نے گہری سانس بھری اور نڈھال ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر تک وہ گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے خالی کنٹر اپنے ہاتھ میں دیکھا۔ سخت تاؤ آیا۔ جی چاہا کہ شیشے کا کنٹر کمرے کے دروازے پر زور سے دے مارے اور وہ چھٹانے کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ مگر لالی ایسا نہ کر سکا۔ کنٹر صوفے پر ایک طرف رکھ کے اٹھا اور آہستہ آہستہ زینے کی طرف بڑھنے لگا۔ غلام گردش کا نصف سے زیادہ راستہ طے کیا۔ پھر کچھ سوچ کر لوٹ آیا۔

کمرہ نمبر ۱ کی کنجی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے کمرے کے قریب پہنچ کر آلا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ آہستہ سے سرکا کر اندر چلا گیا۔ پردہ ہٹانے کے سانسے نظر ڈالی، زور کا جھکا لگا۔ جسم میں بجلی کا کرنٹ سا دوڑ گیا۔ مسہری پر حمید گلوں بیٹھا تھا۔ نوشاہی کی انھیں اس کے گلے میں پڑی تھیں۔ وہ اس کے زانو پر لیٹی تھی۔ حمید کے گلے میں پھولوں کا گجرا تھا۔ اور نوشاہی کے گلے میں سفید موتیوں کا قیمتی ست لڑا ہار تھا۔ اس کی چوٹی اتر چکی تھی۔ سینہ بالکل برہنہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں نہایت والمانہ انداز سے جھانک رہے تھے۔ ٹھیک اس محبت کے مانند جو کمرے کے باہر محراب کے نیچے ایک گوشے میں رکھا تھا۔

نوشاہی نے آہستہ سنی۔ پلٹ کر لالی کو دیکھا اور غصے سے پھٹ پڑی۔ ”تو اپنے کینے پن سے باز نہیں آئے گا؟“

لالی گھبرا گیا۔ ”میں چاہی دینے آیا ہوں۔ چاہی میرے ہی پاس رہ گئی تھی۔“

نوشاہی نے ڈپٹ کر کہا۔ ”ادھر میز پر ڈال دے اور فوراً کمرے سے نکل جا۔“

لالی نظر جھکائے آہستہ آہستہ میز کے پاس گیا۔ میز پر شیخ حمید کے اترے ہوئے کپڑے رکھے تھے۔ لالی دونوں کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلوں کے کوٹ کی جیبیں ٹٹولیں اور نہایت صفائی سے نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ پار کر دیا۔ کنجی میز پر رکھ کر وہ دروازے کی جانب چلا۔ پیچھے سے حمید کی آواز ابھری۔

”دروازہ بند کر دینا جی۔“

لالی کو اس کا لہجہ نہایت تحقیر آمیز معلوم ہوا۔ اس نے چلتے چلتے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا۔ نوشاہی کا ایک ہاتھ ابھی تک حمید کی گردن میں حائل تھا۔ اس کے عیاں گلابی سینے پر موتیوں کا ہار

اٹھا اٹھا کر صندوقچی میں ڈالنے لگا۔ جب وہ سب ٹوکن ڈال چکا تو صندوقچی کا ڈھکنا بند کر دیا۔ اس نے ناموں والے خانے دیکھے۔ ان میں سات ٹوکن موجود تھے۔ اس نے ایک ٹوکن اٹھا لیا، اس پر شیخ حمید گلوں لکھا تھا۔ لالی نے نفرت سے ٹوکن دیکھا۔ ہاتھ اٹھایا۔ چاہا کہ اسے دروازے سے باہر پھینک دے، مگر کچھ سوچ کر ہاتھ روک لیا۔ دوسرے ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی جیب میں بڑھ موجود تھا۔ لالی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔



ہال میں چاپ ابھری۔ لالی نے چونک کر دیکھا۔ ہمدانی اندھیرے سے نکل کے یکایک اس کے سامنے آگیا۔ وہ مسکراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔ جھٹ لالی کا ہاتھ پکڑ کے جوش سے چوا۔

”یار! تو تو زبردست کلا کار ہے۔ بہت اونچی چیز ہے۔ مان گئے تھے۔“

”مجھے تو یہ خوشی ہے جی، آپ کا کام بن گیا۔“ لالی احترا م کھڑا ہو گیا۔ ہمدانی نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے بٹھادیا۔ وہ کھنڈرے موڈ میں تھا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ ”یار بیٹھا رہ۔ تکلف و کلف چھوڑ۔“ وہ اچک کر میز پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا، ہلکا قہقہہ لگا کے بولا۔ ”ایسا ویسا کام بنا ہے۔ نہ پوچھ، اپنے ساتھ کیا واردات گزری۔ جیسے ہی کمرے میں پہنچا، وہ ڈرننگ روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ کیا آئی۔ قیامت ہم رکاب آئی۔ امینہ پولی لیسین کے سمو قیلے کی دو شیرازوں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بال کھلے تھے۔ ایک کان کے اوپر بالوں میں سفید گلاب کا بڑا سا پھول لگا تھا۔ گلے میں چمپا کی کلیوں کا گجر تھا۔ کمرے گھنٹوں تک سنہرے ریشی دھاگے میں پروئے ہوئے گل چاندنی کے پتوں کا لباس۔ یار! لباس کیا تھا، چلن پڑی تھی اور سینہ کچے ناریل کی طرح بالکل عریاں۔“ اس نے وارفتگی کے عالم میں لالی کی پیٹھ پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”اف، کیا گدرائی ہوئی عورت ہے امینہ۔ بالکی چوتھوں کے کیا بان چلاتی ہے۔ ہائے، نہ پوچھو، ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے!“ ہمدانی نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگا۔

جس کو ہوزندگی عزیز، اس کی گلی میں جائے کیوں!

”یہ بات ہے جی، تو آپ چلے کیوں آئے؟“

”یار! یہ پوچھنے چلا آیا، بعد میں کوئی فوٹا تو نہیں ہوا؟ میرا مطلب ہے، کسی قسم کی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں جی! سب کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہوا۔ اناڑی نہیں ہوں۔ برسوں لائری کھلاتا رہا ہوں۔“

”مگر یار تو نے تو کمال کر دیا۔ ایسی باتھ کی صفائی دکھائی، میں تو دنگ رہ گیا۔“ ہمدانی نے ہنستے

جنگلگ رہا تھا۔ لالی کے دل کو شدید پھیس لگی۔ اس نے گلوں کو مخاطب کیا۔ ”سینٹھ حمید! میں نے تیری جیب سے بڑا نکال لیا ہے۔ تو مجھے رشوت دے رہا تھا، یہ رہا تیرا بڑا۔“ اس نے بڑھ حمید کو دکھایا۔ حمید گلوں گھبرا گیا۔ ”نہیں، نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ بڑے میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ روپے ہیں، تم اتنے روپے نہیں لے جا سکتے۔“

لالی نے ہنس کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”حمیدے! تو بننے کا بنیا ہی رہا۔ تیرے پاس ایسی بالکی جیلی میا ر چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ بیچ ہزار کیا، اس کے لیے بیچ لاکھ بھی کم ہیں۔ اگر یہ مانگے تو اس کے لیے سرکاک کے ہتھیلی پر رکھ کے پیش کر دوں۔“ اس کی نظریں نوشاہیہ کے چہرے پر جم گئیں۔ ”آزمائے نوشاہیہ! غیر کبھی نہیں ملوں گا۔ چاہنے والے تو نے بہت دیکھے ہیں، مرنے والا بھی دیکھنے لے۔“ وہ نشے سے جھوم رہا تھا۔

نوشاہیہ کا منہ فٹ ہو گیا۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھا اور حمید کو مخاطب کرتے ہوئے گھبرا کر بولی۔ ”اسے نہ روکو حمید۔ جانے دوا سے۔“

لالی مڑا اور کمرے سے نکل گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بو جھل قدموں سے چلنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے غلام گردش میں جلتی ہوئی تمام روشنیاں بجھ گئیں اور ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔ اس نے غلام گردش طے کی، زینے سے نیچے اترا اور چند لمبے گم صم کھڑا رہا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا قرعہ اندازی والے ہال میں داخل ہو گیا۔ ہال میں کوئی نہیں تھا۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ شمع دان میں موم جی ابھی تک روشن تھی اور کچھل کچھل کر چوتھائی سے بھی کم رہ گئی تھی۔

لالی تھکا ہوا امپائر والی اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگا ہوا کلاک دیکھا۔ ایک بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ اس نے نمبروں والے خانوں پر نظر ڈالی، دو خانے خالی تھے۔ ان میں کوئی ٹوکن نہیں تھا۔ لالی نے درمیانی صندوقچی کا بالائی ڈھکنا کھولا۔ ہاتھ اندر ڈالا۔ دو ٹوکن ابھی صندوقچی میں موجود تھے۔ اس نے ایک اٹھا لیا اور دھندلی روشنی میں ہتھیلی پر رکھ کے دیکھا۔ اس پر ۱۰ کا بندہ لکھا تھا۔ یہ نوشاہیہ کے کمرے کا نمبر تھا۔ نوشاہیہ جو حمید گلوں کی گردن میں محبت سے بانٹیں ڈالے لیٹی تھی۔ لالی ابھی ابھی نظروں سے ٹوکن تکتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری اور آنکھیں بند کر لیں۔

دو گرم گرم آنسو اس کی پلکوں میں الجھ کر رہ گئے۔

اس نے آنکھیں کھولیں۔ ٹوکن نمبر ۱۰ صندوقچی میں ڈال دیا اور دوسرے ٹوکن بھی خانوں سے

ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے کہ ہم نے ایسا فول پروف سٹم رکھا ہے کہ کسی ہیر پھری گنجائش ہی نہیں۔“

”میں نے تو جی آپ کے لیے دوپار ٹوکن نکالے اور دونوں ہی بار معاملہ الٹا گیا۔“
 ”دوبار؟“ ہمدانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”کیا پہلا ٹوکن نوشاہہ کے کمرے کا نہیں تھا؟“

”پہلا نہیں، دوسرا تھا۔ پہلا تو راحیلہ کے کمرے کا تھا۔“

”ارے بار دیا ظالم!“ ہمدانی نے حیرت سے پلکیں پٹ پٹائیں۔ ”تب تو یار! تو نے زبردست کام دکھایا۔“ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گیا پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”اچھا، اب کام کی بات ہو جائے۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ سالائیں، پی تمہاری گھات میں ہے۔ تمام وقت بیٹھا تمہی کو گھورتا رہا۔ وہ ضرور اپنی کارگزاری دکھانے کی کوشش کرے گا۔ میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ الہ آباد میں میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا۔ وہ تو پیدا انٹی پولیس والا ہے۔ باپ بھی اس کا پولیس انسپکٹر تھا۔“
 اس نے مڑ کر کلاک کی جانب دیکھا۔ ”یہ بتاؤ ایس پی مرزا کے ساتھ کمرے میں ہے کون؟“
 لالی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ”ساب! یہ بات نہیں بتاؤں گا، چاہے آپ نراض ہو جائیں۔“

”ناراض و ناراض ہونے کی بات نہیں۔“ ہمدانی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہارے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر مہ جبین یا راحیلہ اس کے پلے پڑ گئیں، تب تو سالامارا گیا۔ گھنٹے دو گھنٹے کے لیے اجازت لے کر باہر آجائے تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ بالکل کاٹھ کا الو ہے۔ البتہ اس کی جو رو سارہ بڑی کانٹے کی عورت ہے۔ اس پر تو کبھی کبھی عاشق ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔“

لالی نے بے چین ہو کر کہا۔ ”تب تو جی، مجھے اب چلنا چاہئے۔“
 ”قادر آباد اسٹیشن تو تم اس وقت نہیں پہنچ سکتے۔ وہ تو بہت دور ہے، مگر تمہیں یہاں سے جلد از جلد نکل جانا چاہئے۔“

”آپ تو میرے ساتھ اسٹیشن جائیں گے نہیں؟“

”یار! یہ ظلم نہ کرو، میں کیسے جا سکتا ہوں۔ آج تو وصل کی رات ہے۔“ ہمدانی ہنس کر بولا۔

”تمہیں راستے کا بھی کچھ اتنا پتا ہے؟“

”مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔ یہ بھی نہیں طوم، یہاں سے کون سا راستہ جاتا ہے۔“

”تم ایسا کرو۔ یہ جو نیچے نہر بہتی ہے، اسے پار کر کے دوسری طرف چلے جاؤ۔ میل سو میل بعد

کچی سڑک آئے گی۔ وہ بڑی نہر تک جاتی ہے۔ نہر عبور کرنے کی ضرورت نہیں۔ کنارے کنارے چلے جاؤ۔ عارف والا روڈ آئے گی، اور آگے بڑھو گے تو پاک چین روڈ آجائے گی۔ تم اس پر نہ جانا۔ آگے نکل جانا۔ قادر آباد کے نزدیک ہو جاؤ گے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”اس سڑک سے جاؤ گے جو سلیمان کے بنگلے کے سامنے سے گزرتی ہے تو یہ راستہ بھی لمبا ہے اور اگر ایس پی تمہاری تلاش میں نکل آیا تو راستے ہی میں دھر لے گا۔“

لالی جلدی جلدی ناموں کے ٹوکن خانے سے نکال کر بائیں ہاتھ کی صند دھکی میں ڈالنے لگا۔ اس نے ڈھکتا بند کیا اور کھڑا ہو گیا۔

”چلو میں تمہیں یہاں سے تو اپنی حفاظت میں باہر نکال دوں۔ یہاں سے نکلتا بھی آسان کام نہیں۔ ہر طرف سخت پرا ہے۔“

اس نے پھونک مار کر موم بتی بجھائی اور لالی کے ساتھ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ہال سے باہر آگیا۔ دونوں ایک طویل غلام گردش میں آہستہ آہستہ چلتے گئے۔ لالی نے چلتے چلتے کہا۔ ”ایک بات پوچھوں جی! آپ نراض تو نہیں ہوں گے؟“

”پوچھو، ضرور پوچھو۔“ ہمدانی نے ہلکا قہقہہ لگا کر کہا۔ ”اس وقت تو تمہیں سات خون معاف بنا۔“

”آپ کو جی، اس بات پر ذرا بھی برا نہیں لگتا کہ آپ کی گھر والی ساتھ والے کسی کمرے میں اسے مود کے ساتھ سو رہی ہے؟“

”برا لگتا تو ہے۔“ ہمدانی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ”مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا تم سمجھتے ہو۔“

”یہ بات سمجھ نہیں آئی جی!“

”یار! سیدھی سادی بات ہے۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہو گا کہ پرانی عورت اور پرانی دولت سب کو اچھی لگتی ہے۔ اسے اڑا لینے کو ہر ایک کا دل مچلتا ہے۔ تم نے کبھی سوچا، ایسا کیوں ہے؟“ ہمدانی نے لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”مگر یہ بات تم نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بتاؤ، تمہاری جو رو ورو ہے؟“

”وہ تو نہیں ہے جی۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔

”مگر تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔“ ہمدانی ہنسنے لگا۔ ”ایک عدد جو رو بیابا کر لے آؤ۔ کبھی نہ کبھی تو تمہارا لباس سے بھر ہی جائے گا۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ شروع میں عورت محبوبہ ہوتی ہے، بیوی بن جاتی ہے۔ پھر ایسا وقت آتا ہے کہ محبوبہ اور بیوی ختم ہو جاتی ہے اور عورت صرف

بچوں کی ماں رہ جاتی ہے۔ جب وہ صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور اس میں تمہارے لیے کوئی کشش، کوئی دلچسپی نہ رہے تو اس کا ایک عدد یا پیدا کر دو۔ پھر دیکھو کیا ہوتا ہے؟“

”ساب! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ جب اس کا یا پیدا ہو جائے گا تو وہ جوان اور خوبصورت ہونا شروع ہو جائے گی۔ بچوں کی ماں ایک دم محبوبہ بن جائے گی اور تم اس کے عاشق بن جاؤ گے۔ ہر وقت اس کے یار سے اسے چھین لینے کے چکر میں رہو گے، اور جب وہ واپس ملتی نظر نہ آئے گی تو اس کے عشق میں ایسے پاگل دیوانے ہو جاؤ گے کہ اس کے یار کو قتل کر دو گے۔ بلکہ اسے بھی قتل کر دو گے اور ٹھنڈے ٹھنڈے جا کر پھانسی کے پھندے سے لٹک جاؤ گے۔“

لالی قائل نہ ہوا۔ ”ساب! عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”یار! یہ عزت وزت سب بکواس ہے۔“ ہمدانی بے تکلفی سے مسکرانے لگا۔ ”چلو، تمہاری بات مان لی۔ جب تمہاری جو رو صرف بچوں کی ماں رہ جائے اور تمہارا دل اس سے اکتا جائے تو اسے طلاق دے دینا۔ پھر تو عزت کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ طلاق کے بعد وہ کسی اور سے نکاح پڑھا کر بیٹھ جائے گی۔ تم اسے دوسرے کے پلو میں دیکھو گے تو دل میں کڑھو گے۔ اپنی آگ میں خود جلو گے۔ اس سے چھپ چھپ کر ملنے کی کوشش کرو گے۔ اس کی منت سماجت کرو گے کہ پھر تمہارے قبضے میں آجائے اور اگر وہ راضی نہ ہوئی یا اس کا شوہر آمادہ نہ ہو تو تم شوہر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کرو گے اور وہ تمہیں اپنی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔“

”ساب! کیا ایسا ہوتا ہے؟“

”کیوں نہیں ہوتا؟ میرے سامنے روز ایسے مقدمات پیش ہوتے ہیں اور اکثر اس وقت پیش ہوتے ہیں جب کسی کا قتل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے تو فساد کی جڑ زر اور زمین کے ساتھ زن کو بھی قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ کہا تو یہاں تک جاتا ہے کہ ہر قتل کے پیچھے کوئی عورت ہوتی ہے۔“ ہمدانی بولنا رہا۔ ”یار! بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اپنی جو روؤں کے ایک چھوڑ چھوڑ سات یا پیدا کر دیے ہیں۔ جب سے ان کے یا پیدا ہوئے ہیں، وہ روز بہ روز زیادہ جوان اور زیادہ خوبصورت ہوتے رہی ہیں۔ ادھر ہم رقابت کی آگ میں اندر ہی اندر سلگتے ہیں اور اپنی اپنی جو روؤں کے عشق میں دیوانے رہتے ہیں۔ کل صبح سے عشق کا شدید دورہ پڑے گا۔ سچ پوچھو تو ابھی سے ہولے ہولے ابھرنے لگا ہے۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”اس یاری آشنائی کا فائدہ یہ ہے کہ اپنی جو رو بھی بانو سے نہیں جاتی اور پرانی جو رو کا ذائقہ بھی چکھنے کو مل جاتا ہے۔ نہ اغوا کرنے یا پھانسنے کا چکر نہ

نی شادی رچانے کا جھنجٹ۔ اس میں عجب مزہ، عجب نشہ ہے۔ میاں بھی خوش، بیوی بھی خوش۔“ اس نے مسکراتے ہوئے مڑ کر پلے ڈر باؤس کی دوسری منزل پر جانے والے زینے کی جانب نظر ڈالی۔ ”اوپر کے کسی کمرے میں جا کر دیکھو۔ یہی عورتیں جو چند مہینے پہلے باسی ٹائٹوں کی طرح بھدی اور پٹیلی لگتی تھیں، اس وقت ایسے جوبن پر ہیں کہ کوہ قاف کی پریوں کو بھی مات کر رہی ہیں۔“

لالی کسی قدر پریشان ہو گیا۔ ”ساب! کیا کہاں ہوتا ہے؟ ہو بھی نہیں سکتا۔“

”ہو کیوں نہیں سکتا۔“ ہمدانی نے بے نیازی سے کہا۔ ”غڈرا کے رہنے والے اسکیو، بڑی خوشی سے اپنی بیویوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں اور جب تک جی چاہتا ہے، ساتھ رہتے ہیں۔ نہ بیوی کو اعتراض ہوتا ہے نہ شوہر کو۔ ان کے نزدیک یہ کوئی عیب نہیں۔ جب جی چاہا، جس وقت جی چاہا، آپس میں بیویاں بدل لیں۔ پولی ٹینس قبائل تو نہ صرف بیویوں کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں بلکہ گھر میں مسمان آئے تو میزبان خوشی سے اپنی بیوی رات کے وقت مسمان کو پیش کرتا ہے۔ یہی نہیں، جس کا جس وقت جی چاہا، دوسرے کی جو رو کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ مگر اس کے لیے ایک دوسرے کی رضامندی ضروری ہے۔“

”ساب! میں نے تو ایسی بات نہ دیکھی، نہ سنی۔“

”تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔“ ہمدانی کھل کھلا کر ہنسا، چند لمحے خاموش رہا پھر کسی قدر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”یار! راز کی بات یہ ہے کہ ڈپٹی کمشنری خوب صورت بیوی کے بغیر نہیں چلتی۔ خصوصاً انگریز کے راج میں تو چل ہی نہیں سکتی تھی۔ انگریزوں نے اپنے آئی سی ایس افسروں کے لیے خوبصورت بیوی رکھنا، خوب صورت انگریزی بولنا اور خوب صورت انگریزی لکھنا بنیادی شرط رکھی تھی اور یہ بنیادی شرط آج بھی نہیں بدلی۔ کیا سمجھے؟“

لالی نے معصومیت سے پوچھا۔ ”تو کیا سارے ڈپٹی کمشنر اور وڈے افسر یہی دھندا کرتے ہیں؟“

”نہیں یار!“ ہمدانی نے تردید کی۔ ”ہمت سے تو بالکل ہی صوفی ہیں۔ رؤف اسی لیے اپنی جو رو کو لے کر کینڈا چلا گیا۔ جو رو بھی ایسی چھانٹ کر لایا ہے، بالکل مرقع چغتائی لگتی ہے، پھولوں کی طرح نازک اور شفاف۔ ایسی اجلی کہ ہاتھ لگاؤ تو میلی ہو جائے۔ پچھلی قرعہ اندازی میں وہ میرے حصے میں آئی تھی۔ عورت کیا ہے، نسن بلیک لیل ٹمپن ہے۔ جس قدر آہستہ آہستہ پو، اتنا ہی خسار ہوتا جائے اور رؤف تو ایک دم کاٹھ کا الو ہے۔ صبح جب وہ اسے اپنے ساتھ لے کر گیا تو گاڑی میں بیٹھے ہی سینے سے چمٹا کر رونے لگا۔ میں نے اسی روز بھانپ لیا تھا، اب یہ دوبارہ سپنس ٹائٹ میں شریک

نہیں ہوگا۔ یہی ہوا چند روز پہلے ہی وہ سرکاری دورہ نکال کر جو روکے ساتھ کینڈا چلا گیا۔“

لالی چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”ساب! برا نہ منائیے گا“ میں چھوٹا اور غریب بندہ ہوں۔ میں تو یہ جانتا ہوں میری ماں کے ساتھ لمبردار نے زبردستی منہ کالا کر لیا تھا۔ وہ بہت غریب زبانی تھی۔ میرے پونے اس کا یہ گناہ کبھی معاف نہیں کیا۔ روزگالاں نکالتا تھا، مارتا تھا اور مارتے مارتے آخر اس نے اس کا کام تمام کر دیا۔ بات یہ ہے جی! دنیا میں سارا کھیل پیسے کا ہے۔ پیسہ آدمی کے سب عیب چھپا دیتا ہے۔“ لالی غم زدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

ہمدانی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دونوں چپ چاپ چلتے ہوئے پلے ژر ہاؤس کی دو منزلہ عمارت سے نکل کر باغ میں آگئے۔ چند ہی قدم چلے ہوں گے کہ قریب کے درختوں کے نیچے آہٹ ہوئی، ساتھ ہی آواز آئی۔

”کون ہے۔“

انہوں نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ ہمدانی فوراً ڈپٹی کمشنر بن گیا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو گئی، گردن تن گئی۔ اس نے حکم دینے کے انداز میں بلند آواز سے کہا۔ ”سامنے آؤ۔“ درختوں تلے آہٹ تیز ہو گئی۔ اندھیرے سے ایک مسلح سپاہی کے درختوں سے سامنے آگیا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو دیکھتے ہی دونوں جوتے بجا کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا اور انیشن ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے اس پر اچھتی ہوئی نظر ڈال کر بے نیازی سے پوچھا۔ ”کیا نام ہے تمہارا؟“

پہرے دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”تاج محمد۔ میں جی ساہیوال کا رہنے والا ہوں۔“ اس کے لمبے سے گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔ ”منگھری کو جی پہلے ساہیوال ہی کہا جاتا تھا۔“ ڈپٹی کمشنر نے اس کی گھبراہٹ نظر انداز کرتے ہوئے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ ”تاج محمد! اسے اپنے ہم راہ لے جاؤ اور جہاں یہ جانا چاہے، اس جگہ کا پتہ معلوم ہو تو بتا دو۔ یہ نہر کے اس پار جائے گا۔ یہ اسی راستے سے جانا چاہتا ہے۔“ ہمدانی مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھر عمارت میں داخل ہو گیا۔

ڈپٹی کمشنر چلا گیا تو پہرے دار نے لالی سے پوچھا۔ ”تیں نوں کتھے جاتا ہے؟“

لالی نے مختصر جواب دیا۔ ”مکاور آباد شیشن۔“

پہرے دار نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”ٹیشن تو یہاں سے دور ہے۔ توں سویرا ہونے تک

وہاں نہیں پہنچ سکتا۔“

”فکر نہ کر۔ مجھے نہر کے اس پار پہنچا دے۔“

دونوں درختوں کے نیچے ایک گنڈ ندی پر چلنے لگے۔ کچھ دور جا کر نشیب میں اتر گئے۔ سامنے نہر تھی۔ دونوں نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ اس جگہ روشنی تھی اور یہ جگہ پلے ژر ہاؤس کے عین نیچے تھی۔ لالی اور پہرے دار جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ سے نکل کر کھلے میدان میں آگئے تھے۔ لالی نے چلتے چلتے گردن اٹھا کر پلے ژر ہاؤس کی دوسری منزل کی طرف دیکھا۔ کھڑکیوں سے گرمی سرخ سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک کھڑکی پر اس کی نظر پڑی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ ایس پی مرزا کھڑکی میں کھڑا تھا اور گردن جھکائے دونوں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ کمرہ نمبر ۸ تھا۔ جس میں اس کے ساتھ راحیلہ تھی۔ لالی نے پہرے دار سے کہا۔

”اب میں چلا جاؤں گا۔“

”نہر میں گرمی ہے۔ یہاں سے جائے گا تو بھیگ جائے گا۔ کمر تک پانی ہے۔ نہر کا بہاؤ بھی آج کل تیز ہے۔ رات کا ٹیم ہے، کہیں پیر ڈگمگائے تو بہتا ہوا نہ جانے کدھر نکل جائے گا۔“

لالی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”نہر کے اس پار کیسے جاؤں؟“

”گھبرا نہیں۔ پوری گل سن لے۔“ پہرے دار نے جواب دیا۔ ”فرانگ، سو فرانگ آگے جا کر نہر میں پانی بھی کم ہے اور بیچ میں جگہ جگہ اونچے اونچے پتھر ہیں، انہی پتھروں پر چل کر سارے بندے انبار جاتے ہیں۔ نہر کے پار جانے کے بعد سب ہاتھ کو مڑ جاتا۔ میل بھر آگے کبھی سڑک ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔“

”جیسی تیری مرضی۔ میں تو چاہتا تھا، تجھے نہر کے اس پار پہنچا دوں۔ ڈپٹی کمشنر صاحب کا حکم ہے۔“

لالی نے اصرار نہیں کیا تو سپردار بھی خاموش ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ مڑا اور کچھ دور جا کر نشیب سے اوپر چڑھنے لگا۔ لالی مڑا مڑ کر اسے دیکھتا رہا۔ جب سپردار نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لالی نے پلے ژر ہاؤس کی جانب گردن اونچی کر کے دیکھا، کمرہ نمبر ۸ میں سرخ بجی جل رہی تھی۔ مگر ایس پی جنگلی پر نہیں تھا۔ لالی پریشان ہو گیا۔ اس نے رفتار تیز کر دی۔ آگے گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان کے نمایاں سے گزرتے ہوئے اسے بار بار ٹھہرنا پڑتا۔ مشکل یہ تھی کہ جھاڑیوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ لالی کچھ دور تک جھاڑیوں سے الجھتا ہوا چلتا رہا۔ آخر اس نے آگے جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔ اسے ڈر تھا، کیس ایس پی نہ پہنچ جائے۔ وہ کھڑکی سے اسے دیکھ ہی چکا تھا۔ لالی جلد سے جلد

نہر کے اس پار پہنچ کر دور نکل جانا چاہتا تھا۔

اس نے جلدی جلدی جوتے اتارے، پتلون کے پائچے چڑھائے اور نہر میں اتر گیا۔ کنارے پر پانی کم تھا۔ وہ رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا، پانی اونچا ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ کمر تک آگیا۔ لالی نہر کے نیچوں پہنچ چکا تھا۔ پہرے دار نے ٹھیک کہا تھا۔ پانی کا دھارا تیز تھا۔ لالی کے قدم بار بار ڈنگا جاتے۔ مگر وہ سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتا گیا۔ اچانک پانی کا زور دار رپلا آیا۔ لالی کے قدم لڑکھڑکے۔ وہ سنبھل نہیں سکا۔ اس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ پانی کے تیز ریلے میں بہتا ہوا آگے نکل گیا۔



نہر نیم دائرہ بناتی ہوئی مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ موڑ پر بائیں جانب کھال تھا، جو کنارے کاٹ کر آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ کھال تنگ تھا۔ گہرائی بھی کم تھی۔ لالی، پانی کے تیز ریلے کے ساتھ بہتا ہوا کھال میں داخل ہو گیا۔ وہ گردن، پانی سے باہر نکالے آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ کھال کے ایک طرف گندم اور جو کے کھیت لہلہاتے تھے۔ کھال کی گہرائی اتنی کم تھی کہ کچھ ہی دور جانے کے بعد لالی آسانی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ مگر اس طرف گندم اور جو کے کھیت نہ تھے۔ سرکنڈوں اور بھیلی کے اونچے، اونچے گھنے پودوں کی بھاڑیاں تھیں اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ لالی، پانی سے شرابور اور تھکن سے نڈھال تھا۔ وہ کھال کے کنارے ایک بھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ کر سستانے لگا۔

ذرا سکون ملا تو اس نے پتلون کی جیب ٹولی۔ بوہ موجود تھا۔ لالی نے بوہ نکالا۔ بوہ بھیگا ہوا تھا۔ اس میں رکھے ہوئے نوٹ بھی کسی قدر بھیگ گئے تھے۔ لالی نے مسکرا کر بوہ دیکھا اور سنبھال کر پھر جیب میں رکھ لیا۔

رات کے آنگن میں ستاروں کے کنول جھللا رہے تھے۔ ہلکے ہلکے جھونکوں سے پودوں میں ابراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔ لالی کئی منٹ خاموش بیٹھا گہری گہری سانسیں بھرتا رہا، پھر اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

کھیتوں کے اس پار جوہ تھا اور اس کے آگے گاؤں کے مکانات تھے۔ ستاروں کی مدہم روشنی ماٹنی کے مکانات دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ رات کے پچھلے پہر کی گہری خاموشی میں

بس ہو کر غصے نہیں کرنے لگا۔

لالی نے غصے سے اس کے منہ پر ترقاق سے تھپڑ مارا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ ”ہند کی ہے تو؟“

”نہیں جی، میں چوری چکاری نہیں کرتا۔ میں ڈھنڈی راج پوت ہوں۔“ اس نے ہانپتے ہوئے رک رک کر کہا۔ ”میرا تاں اللہ دتا ہے۔“

لالی نے ایک ہاتھ سے پتلون کی جیب ٹٹولی۔ یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ بڑھ موہو ہے۔ لالی نے اللہ دتا کے گلے پر رکھا ہوا ہاتھ علیحدہ کیا اور اس کے سینے سے اتر کر ایک طرف ہو گیا۔ اللہ دتا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی پگڑی کھل کر نیچے گر گئی تھی۔ دونوں خاموش بیٹھے ہانپتے رہے۔ ذرا دیر بعد اللہ دتا نے اپنی گردن سہلاتے ہوئے عاجزی سے کہا۔

”میری دھوتی دے دے۔“

”اٹھالے۔“ لالی نے قریب پڑی ہوئی دھوتی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے تھکے لہجے میں کہا۔ ”پر بھاگنے کی کوشش نہ کرنا۔ تو مجھ سے زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا۔ میں تجھے ابھی جانے نہیں دوں گا۔“

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اطمینان رکھ، میں بھاگوں گا نہیں۔“ اس نے دھوتی اٹھا کے باندھی اور لالی کے نزدیک آکر بیٹھ گیا۔

لالی نے قبر آلود نظروں سے اسے گھورا۔ ”سچ بتا، کیا کرتا ہے تو؟“

”میں جی چاک ہوں۔ داؤد پور کے زیں دار کے چوکھر اور مویشی چراتا ہوں۔“

”یہ داؤد پور کدھر ہوا؟“

”یہاں سے بہت دور ہے۔“ وہ مشرق کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”آگے عارف والا روڈ ہے۔ لال ٹبے سے اوپر چلو تو پاک پتن روڈ آجاتی ہے۔ روڈ کے اس پار پنج میل دور داؤد پور ہے۔“

”تب تو بہت دور ہوا۔ تو یہاں کیسے آگیا۔“

”بس جی آئی گیا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”جھنگر کے ادھر علی شاہ ہے۔ میں پہلے اس پنڈ میں مزارع تھا۔“

لالی کو یاد آیا کہ پچھلی رات وہ اسی گاؤں کے کھیتوں سے گزرتا ہوا ادھر آیا تھا۔ اس نے اللہ دتا سے دریافت کیا۔ ”تو مزارع تھا۔ کھیتی باڑی چھوڑ کر چاک کیوں بن گیا۔“ وہ بے تکلفی سے مکر کیا۔ ”مزارع تو زیں دار بننے کی سوچتا ہے، تو کئی کیسے بن گیا؟“

”مگل امہ ہے جی، علی شاہ کا زیں دار نور علی کھوکھر ہے۔ وڈا زیں دار ہے۔“ اس نے خیر

گاؤں بالکل سناں تھا۔ لالی اس طرف نہ گیا۔ وہ کتھیں کے درمیان سے گزرتے ہوئے پی ہے پر چلنے لگا۔

کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا تو جھنگر شروع ہو گیا۔ جھنگر کے آگے چٹیل میدان تھا۔ وہ جھنگر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ مگر تین میل سے زیادہ نہ چل سکا۔ اس کے برہنہ پیر جنگلی جھاڑیوں کے کانٹوں سے لہولہاں تھے۔ اب اس میں آگے جانے کی سکت نہیں تھی۔ وہ بہت تھک چکا تھا اور کہیں ٹھہر کر آرام کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ فراش کے درختوں کا کج تھا۔ کج کی زمین ہموار تھی اور خاردار جھاڑیوں سے صاف تھی۔ وہ کج میں روپوش ہو کے رات بسر کر سکتا تھا۔

لالی فراش کے درختوں تلے چلا گیا اور نڈھال ہو کے اندھیرے میں زمین پر لیٹ گیا۔ اس کے کپڑے ابھی تک گیلے تھے۔ اسے سردی محسوس ہوئی۔ اس نے کروٹ لے کر جسم سیڑھ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد اسے نیند آگئی۔

وہ گہری نیند سو رہا۔ رات گزری، صبح ہوئی۔ سورج چڑھ کر پچ آسمان پر آگیا۔ آنکھ کھلی تو چونک کر دیکھا، ایک شخص اس پر جھکا ہوا کلائی سے گھڑی اتارنے کی کوشش کر رہا ہے۔ لالی نے جھکا دے کر ہاتھ چھڑایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ شخص بھاگنے کے لیے تیزی سے مڑا۔ لیکن لالی نے اسے فرار ہونے کا موقع نہیں دیا۔ جھٹ اس کی ٹانگ پکڑ لی اور زور سے کھینچی۔ وہ لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔

لالی نے چیل کی طرح چھپٹ کے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ اس شخص کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ اس نے زور لگایا اور لالی کی گرفت سے خود کو آزاد کرالیا۔ لالی پھر اس سے لپٹ گیا۔ دونوں تھکے تھکے گتھے ہو گئے اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگے۔

دونوں خاک میں لتھڑے ہوئے ہانپ رہے تھے۔ اس شخص نے ایک بار پھر نکل بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی دھوتی لالی کے ہاتھ میں آگئی۔ اس نے جھکا دے کر دھوتی کھینچ لی۔ اس شخص کا نچلا دھڑ برہنہ ہو گیا۔

وہ ٹھنک کر جہاں تھا وہیں رک گیا۔ لالی نے ہاتھ میں دبی ہوئی دھوتی ایک طرف پھینکی اور اچھ کر اس کی کمر پر زور سے لات ماری۔ وہ گرا اور زمین پر لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے اسے سنہلنے کا مدد نہیں دیا۔ جلدی سے اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ

اس میں مشینوں سے شورہ صاف کیا جاتا ہے اور صاف کر کے کھلی شورہ بنادیا جاتا ہے۔ میں نے جی وہ کارخانہ دیکھا ہے۔“

”تو کیا ادھر کھراڑھی میں بہت کڑ ہے؟“

”بہت زیادہ ہے جی۔“ اللہ دتہ نے لالی کو بتایا۔ ”کھراڑھی کے آس پاس کی ساری زمین اتنی کڑ ہے، جدھر نظر ڈالو، سب کچھ سفید ہی سفید نظر آتا ہے۔ کھراڑھی کے نزدیک کسی پرانی اور اجڑا ہستی کے کھولے اور کھنڈر ہیں۔ اس کی دیواروں پر زمین پر ہر جگہ اتنا کھار اچڑھتا ہے کہ سارا ہی کھنڈر دور سے کپاس کی ڈھیری دکھائی پڑتا ہے۔ ہر سال یہ سارا کھرج کر اتار لیا جاتا ہے۔ بھٹیوں میں اس کا شورہ بنایا جاتا ہے اور جی سال گزرتا بھی نہیں کھنڈر کھارے سے فیر ایک دم سفید پڑ جاتا ہے۔“

”ادھر بہت زیادہ کڑ ہو گا پر یہاں تو اتنا نہیں ہے۔ یہ تو زیادہ تر بنجر ہی زمین ہے۔ یہ کھیتی باڑی کے کام آسکتی ہے۔“

”پر کھیتی باڑی کے لیے پانی بھی تو چاہئے۔ یہ تو نہر کی پو بنجر ہی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے پو بنجر می میں تو پانی ہمیشہ کم ہی پہنچتا ہے۔ تب ہی تو سوکھی پڑی رہتی ہے۔ سارا پانی تو اوپر ہی اوپر ہضم کر لیا جاتا ہے۔ ادھر تو اتنا ہی پانی ملتا ہے کہ علی شاہ یا ایسے دو چار اور پنڈاس نہر کے کنارے آباد ہو سکتے ہیں۔ پر بنجر زمین بھی بالکل بیکار نہیں جاتی۔ اس پر لانے کے بوٹے لگتے ہیں اور ادھر تو کاؤگان لانا اور پھوگ کے بوٹے ہوتے ہیں۔ آگے جاؤ تو بہت نظر آئیں گے۔ تو نے لانے کا بوٹا دیکھا ہے؟“

”دیکھا تو ہے۔ یہ بھی پتہ ہے، لانا کے بوٹے سے جی بنتی ہے اور جی سے کپڑے لے دھو کر صاف کئے جاتے ہیں۔“

”کاؤگان لانا سے بہت زیادہ جی نکلتی ہے۔“ اللہ دتہ نے پوچھا۔ ”تو نے کبھی جی دیکھی ہے؟ میں تجھے بتاتا ہوں، جی کیسے بنتی ہے۔ جی بنانے کے لیے لانے کے بوٹے جڑ کے پاس سے کاٹ لیے جاتے ہیں۔ زمین میں گڑھا کھود کر کٹے ہوئے بوٹے اس طرح بھر دیئے جاتے ہیں کہ اوپر تک ڈھیری بن جاتی ہے، ڈھیری میں آگ لگا دی جاتی ہے۔ پتیاں جل جاتی ہیں اور ڈھیلوں سے رس بہہ بہہ کر نیچے گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈا پڑ کر ایسا جم جاتا ہے کہ پتھر کی طرح سخت لگتا ہے۔ جی اسی طرح بنتی ہے، پر کھراڑھی کے پاس تو جی بنانے کی بھٹیاں لگی ہیں۔ ڈھیروں جی روزانہ بنتی ہے۔ کچا شورہ بھی اتنا ہی ڈھیر کا ڈھیر ہر روز تیار ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہو ا کہ کچے شورے اور جی سے کھوکھر کو بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہوگی۔ جی تو اس نے اتنی بہت سی زمین کڑ اور بنجر بنا رکھی ہے۔“

میدان کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ہزاروں کلا زمین اسی کی ہے۔“

”پر یہ بنجریوں پڑی ہے؟“ لالی نے حیرت سے کہا۔ ”پاس ہی نہر بھی بہتی ہے۔“

”یہ نہر شہر کہاں ہے جی؟ یہ تو رانی واہ ہے۔ اس میں تو جی برسات کا پانی آتا ہے۔ کچھ راجہاہ بیروالا سے آ جاتا ہے۔ اوپر کرم والا میں مرسلیمان خاں کے باغ ہیں۔ سینکڑوں کٹے پر کھیتی باڑی بھی ہے۔ سارا پانی تو اس کے باغ اور کھیت کھا جاتے ہیں۔ ویسے بھی جی یہ مرسلیمان کی اپنی نہر ہے۔ پہلے یہاں سک ٹالا ہوتا تھا۔ اس میں صرف برکھا کا پانی آتا تھا۔ مرسلیمان نے سک ٹالہ بیروالا کی وڈی نہر سے ملا دیا۔ آٹھ نو برس ادھر کی بات ہے۔ میرے سامنے ہی یہ سک ٹالے سے نہر بنی۔ تیں نوں پتہ ہو گا، پہلے زمیں دار اپنی نہر بنوا سکتے تھے اور آبیانہ بھی نہیں دیتے تھے۔ اب ادھر پچھلے کئی سال سے سرکار نے یہ کنون بنادیا ہے، کوئی زمیں دار اپنی نہر نہیں بنوا سکتا۔“

”اس وکت تو نہر میں بہت پانی ہے اور اتنی تیزی سے بہہ رہا ہے کہ میں نے پچھلی رات کرم والا میں نہر کے پار جانا چاہا تو دھارے میں بہہ گیا۔ پانی گہرا بھی ہے۔ تیرنا نہ جانتا تو کب کا ڈوب گیا ہوتا۔ گہرا بھی اتنا گیا تھا کہ ہاتھ میں دبے ہوئے جوتے چھوٹ گئے۔ رات کے اندھیرے میں بہہ کر جانے کدھر چلے گئے۔“ اس نے اپنے برہنہ پیروں کو دیکھا۔

”تو اس طرح یہاں پہنچا۔“ اللہ دتہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”لگتا ہے مرسلیمان نے نہر کے افسروں سے مل کر بیروالا کی نہر میں شگاف ڈال دیا۔ اس دفعہ کچھ زیادہ ہی چوڑا شگاف ڈالا ہے۔ جی تو اتنا بہت سا پانی یہاں تک آگیا۔ بات یہ ہے جی، گرمیوں میں جب نہر سوکھ جاتی ہے تو مرسلیمان اپنے باغوں اور کھیتوں میں پانی دینے کے لیے ایسا ہی کرتا ہے۔ اس کے خلاف پانی کی چوری پر نہ پرچہ کستا ہے نہ کوئی کارروائی ہوتی ہے۔ وہ تو جی بگیر دار ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری ہے۔“

”علی شاہ کا زمین دار نور علی کھوکھر بھی تو بگیر دار ہے۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”اس کے پاس بھی ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرکاری افسروں سے اس کی بھی یاری ہوگی۔ فیر اس نے اپنی زمین کیوں بنجر اور کھراڑھی بنا رکھی ہے؟“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ کھوکھر کی بھی افسروں سے یاری ہے۔ اس کا میرا اسمبلی کا ممبر ہے۔ پر کھوکھر اپنی زمین بنجر اور کھراڑھی رکھنا چاہتا ہے۔“ اللہ دتہ نے سامنے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہاں سے ڈیڑھ میل آگے کھراڑھی ہے۔ وہاں بھٹیاں لگی ہیں۔ ان میں شورہ بنتا ہے۔ اسے اوٹھوں پر لاد کر ٹیشن پہنچایا جاتا ہے۔ فیر ریل گاڑی سے اوکاڑے بھیجا جاتا ہے۔ وہاں بہت وڈا کارخانہ ہے

نے تو کھرا بھی پر کام کرنے سے انکار بھی کر دیا۔ فیروز جی کھوکھرا ایسا نراض ہوا، جس جس نے انکار کیا، اسے زمین سے بے دخل کرنا شروع کر دیا۔
”تو نے بھی کھرا بھی پر کام کرنے سے انکار کر دیا تھا؟“

”ہاں جی، میں نے بھی انکار کر دیا تھا۔ ایک تو گار کرنی پڑتی تھی۔ اوپر سے مجھے کھانسی بھی ہو گئی تھی۔ اس نے مجھے بے دخل کرنے کے لیے طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ میرے مویشی اور چوکھراٹھوا لیے۔ ربیع کی واڈھو فصل بھی کنوا کر اٹھالے گیا۔ میں نے تھانے میں اس کے منشی اور کندوں کے خلاف پرچہ چاک کرایا تو پولیس نے الٹا میرے خلاف مویشی چوری کا مقدمہ بنادیا اور مجھے جیل میں بند کر دیا۔ چار مہینے سے بھی زیادہ مکدمہ چلا۔ میں جھوٹ گیا۔ پر ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ کھوکھرنے میری گھروالی کو اٹھوایا اور کھوکھراں میں اپنی حویلی کے اندر بند کر دیا۔ اس دھت میرے وہ چھوٹے چھوٹے نکتے تھے۔ ماں کے بنا روتے تھے، پھلتے تھے، ضد کرتے تھے۔ اللہ دینو کا ویاہ نہیں ہوا۔ گھر میں کوئی زانیہ نہیں تھی جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی، روٹی پکا کر کھلاتی، مویشیوں اور چوکھروں کا سویرے پچھا دھتا کرتی، دوپہر کو کھیت پر بھٹا پہنچاتی۔ میں تو جی گھروالی کے بنا بالکل تباہ ہو گیا۔ وہ تو میرا بازو ہے۔“

”تو نے پولیس میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟“

”ایک بار کرایا تھا تو چار مہینے جیل میں بند رہا۔“ اللہ دتا کہ ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”اس دفعہ نہ جانے کتنے جھوٹے مکدمے میرے خلاف بنائے جاتے۔ اس ڈر سے میں نے پرچہ شرجہ تو چاک کرایا نہیں۔ کھوکھرو کو سفارشیں پہنچائیں پر اس نے کسی کی نہ مانی۔ اس چکر میں ڈیڑھ سال گزر گیا۔ میری گھروالی کھوکھر کی حویلی میں تھی۔ اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ میں ہر طرف سے مایوس ہو کر آخر ایک روز خود اس کے پاس کھوکھراں گیا۔ پگڑی اتار کر اس کے پیروں پر ڈال دی۔ ہاتھ جوڑ کر گڑا دیا۔ ”زمیں دار! میرا بازو مجھے واپس دے دے۔ پہلے تو وہ بہت گرم ہوا۔ دیر تک گلاں نکالتا رہا۔ میں نے منت سماجت کی تو اس نے گھروالی کی واپسی کے تین ہزار روپے مانگے اور دھننے کی مہلت دی۔ میں پہلے ہی تباہ ہو چکا تھا۔ اتنی زیادہ رقم کہاں سے لاتا۔“

”دوبارہ کھوکھر کے پاس جاتا۔ اس کے فیروز پکڑ لیتا۔“

”یہ کیا جی۔ اس دفعہ اس نے گھروالی کو واپس کرنے کی یہ شرط لگائی کہ مجھے اور اللہ دینو کو سال ٹھیک کھرا بھی پر وگار کرنی پڑے گی۔ میں نے اللہ دینو سے بات کی۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے، سخت تیار ہو گیا۔ میں نے کھوکھر سے وگار کرنے کی ہامی بھری۔ اس طرح مجھے اپنا بازو واپس مل

”ایسا ہی ہو گا جی۔ میں نوں ٹھیک سے پتہ نہیں۔“
لالی نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”تو نے علی شاہ کیوں جھوٹا دیا؟ تو مزارع تھا نا؟“
”مزارع ہی تھا پر کچھ ایسا چکر چلا میں نوں پنڈ چھوڑنا پڑا۔“
”کوئی خاص بات ہو گئی؟“

”یہ نہ پوچھ۔ یوں سمجھ کیا نہیں ہوا۔“ اللہ دتا نے مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اپنا تو بھی کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے ساتھ جھوٹا بھائی اللہ دینو بھی تھا۔ دوہل تھے۔ سولاں نکتے سے اوپر زمین پر اپنے کھیت تھے۔“ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ ”سچ پوچھ تو اس کھرا بھی نے اپنا ناس مار دیا۔ پہلے اس کا مالک سردار سنتو کھ سنگھ ہوتا تھا۔ بہت زور آور جوان تھا۔ رہتا تو ادھر کھوکھراں میں تھا پر روز ہی اپنی سفید گھوڑی پر بیٹھ کر کھرا بھی آتا تھا۔ علی شاہ بھی آتا جاتا رہتا تھا۔ کھرا بھی پر کام کرنے کے لیے ادھر سے مزدور بھی لے جاتا تھا۔ فصل پکنے لگتی تو پنڈ کے مزارع بھی کیوں کے ساتھ کھرا بھی پر کام کرنے آتے۔ سنتو کھ مزدوری بھی چنگی دیتا تھا۔ شام کو جب چٹھا بٹتا تو منشی کے ساتھ خود بھی موجود ہوتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کی مزدوری نہیں ماری اور نہ مزدوری پر جھگڑا کیا۔“
”تو نے بھی کھرا بھی پر مزدوری کی ہے؟“

”کی تو ہے، پر جی وہاں کام کرنے سے مجھے ایسی کھانسی ہو گئی تھی کہ کھانتے کھانتے رات جاگتے ہوئے کھتی۔ وہ ایسا ہے جی، کھوکھوتے ہوئے کھارا ایسے اڑتا ہے جیسے دھواں ناک میں گھس کر اندر چلا جاتا ہے۔ اسی لیے منہ پر منڈا سا باندھ کر کھرا بھی پر کام کرنا پڑتا ہے۔ فیروز بھی بہت کھانسی آتی ہے۔ کتنے ہی مزدوروں کو دمہ ہو گیا۔“ اللہ دتا چند لمحے چپ رہا۔ ”پاکستان بنا اور فسادات ہوئے تو سنتو کھ سنگھ بھی بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ کھرا بھی پر مہینوں کام بند رہا۔ نور علی کھوکھر بھی کھوکھراں ہی میں رہتا ہے۔ وہاں اس کی حویلی ہے۔ سردار سنتو کھ سنگھ کے جانے کے بعد کھوکھر نے افسروں سے مل کر ایسا پکر چلایا کہ کھرا بھی اور سنتو کھ سنگھ کی ساری زمین اس کے کنبے میں چلی گئی۔ یہ بنجر اور کھڑ زمین پہلے سنتو کھ سنگھ ہی کی ہوتی تھی۔“

”سنتو کھ نے بھی بنجر زمین پر کھیتی باڑی کی کوشش نہیں کی؟“

”اس کی زمین کئی میل آگے ہے۔ ادھر بالکل پانی نہیں۔ کتوں کھودو تو بہت زیادہ گہرائی میں جا کر پانی ملتا ہے۔ چند ہی برسوں میں سوکھ کر ڈل بن جاتا ہے۔ پر کھرا بھی جب کھوکھر کے کنبے میں آئی تو علی شاہ کے مزارعوں اور کیوں کے لیے مصیبت آگئی۔ کھوکھرنے سب سے وگار لینی شروع کر دی۔ پہلے پہلے تو تھوڑی بہت مزدوری بھی دیتا تھا، فیروز بھی بند کر دی۔ پنڈ والوں نے گلہ کیا۔ کئی

گیا۔

لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”آگے کیا ہوا؟“

”آگے کیا ہونا تھا جی۔ کھوکھرنے کلراٹھی کے پاس اپنی جیل بنا رکھی ہے۔ مجھے اور اللہ دیو کو اس میں ڈال دیا گیا۔ دن بھر ہم دونوں بھائی کلراٹھی پر کام کرتے اور شام کو دوسرے کیدی مزدوروں کے ساتھ بند کر دیے جاتے۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں انھیں کوئی پھاند نہیں سکتا۔ صرف ایک دروازہ ہے اور اس پر تالا ڈال دیا جاتا ہے۔ باہر رکھے ر۔ غل سنبھالے کڑی نگرانی کرتے ہیں۔ فیر بھی کیدی مزدور جب تک اندر رہتے ہیں، دو کیدیوں کے ایک ایک پیر ملا کر پنڈلیوں میں لوہے کے کڑے ڈال دیئے جاتے ہیں۔ درمیان میں ہاتھ بھر لمبی زنجیر ہوتی ہے۔ کڑوں میں تالے پڑے ہوتے ہیں اور ان کی چابیاں راکھوں کے انچارج کے پاس رہتی ہیں۔ ان پر نمبر پڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح جی ایک زنجیر کے دونوں کیدی ایک ساتھ لیتے ہیں، ایک ساتھ اٹھتے ہیں، ایک ساتھ سوتے ہیں۔ ایک کڑے بدلے تو دوسرا جاگ اٹھتا ہے۔ ایک کو ٹٹی پیشاب لگے تو دوسرے کو بھی ساتھ ساتھ جانا پڑتا ہے، ساتھ ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے کیدیوں میں روز بھگڑا ہوتا ہے، مار کٹائی ہوتی ہے۔ جب دنگ زیادہ ہوتا ہے تو راکھے اندر آکر دونوں ہی کیدیوں کو ٹھڈے مارتے ہیں۔“

لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”یہ تو سرکاری جیل سے بھی زیادہ کڑی سزا ہوئی۔“

”نہ پوچھ میں نے اٹھ مہینے کس طرح کلراٹھی پر گزارے۔“ اللہ دتا نے گہری سانس بھری۔ ”دن بھر مویشیوں اور چوکھوں کی طرح بھٹیوں پر کام کرنا پڑتا۔ کھدائی کرنی ہوتی۔ راکھے چڑے کے لمبے لمبے چھاننے اور کوڑے ہاتھوں میں دبائے شکاری کتوں کی طرح مزدوروں کو تاکتے رہتے ہیں۔ کسی نے ذرا سستی سے کام لیا، راکھا جھپٹ کے اس پر سڑاک سڑاک چھانٹنے لگاتا ہے۔ میری کمر دکھ۔“

اس نے کرتا الٹ کر اپنی پیٹھ پر ہنہ کر دی۔ اس کی کمر اور پیٹھ پر اب تک سیاہ اور بھوری لکیریں موجود تھیں۔ ”یہ لاسے، چھانٹوں کے نشان ہیں۔ کھارے میں کام کرنے سے مجھے کھوکھری بھی ہو گئی تھی۔ بار بار کھانٹا۔ دن کا تو کچھ نہیں تھا پر رات کو کھانٹا تو دوسروں کی نیند خراب ہوتی۔“ نراض ہو کر گاللاں نکالتے۔ میں جب کلراٹھی پر وگار کرتا تھا تو ۵۲ کیدی مزدور تھے۔ شام کو ان کی گنتی ہوتی تھی اور بند کرنے سے پہلے ہی روٹی کھلا دی جاتی تھی۔“

”سارے کیدی تیرے ہی پنڈے کے تھے؟“

”نہیں جی، اپنے پنڈے کے تو اس وکھٹ اٹھ کیدی تھے اور ان میں ہم دونوں بھائی بھی شامل تھے۔ کھوکھرجس مزارے یا کٹی سے نراض ہوتا ہے اسے کلراٹھی میں وگار پر لگا دیتا ہے۔ کھوکھرجس مزارے دار ہے۔ اس کے اور بھی کئی پنڈے ہیں۔ ہزاروں کلا زمیں داری ہے اور اب توجی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر کبندہ کر کے اس نے اپنی زمیں داری، بست بڑھالی ہے۔ اس کی پوری بگیر ہے جی۔ لہور میں کوٹھی بنوا رہا ہے۔ یہ لٹی موٹر خریدی ہے۔ دوپٹر ولایت پڑھنے بیچے ہیں۔ بست عیش ہیں جی اس کے۔“

”کلراٹھی کی جیل میں تیری گھروالی تجھے سے ملنے نہیں آئی؟“

”کیدی مزدوروں سے کسی کو ملنے کی بالکل اجازت نہیں۔“ اللہ دتا نے جواب میں مطلع کیا۔ ”کسی کو ان کے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں جاتا۔ انھیں پکڑ کر رات کے اندھیرے میں اونٹھ پر بٹھا کر کلراٹھی میں لایا جاتا ہے اور جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ان کے گھروالوں کو بالکل پتہ نہیں چلتا وہ کہاں گئے؟ میری گھروالی کو بھی دو ہفتے تک میرے اور اللہ دیو کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا، ہم دونوں کہاں ہیں؟ وہ نور علی کھوکھری کو بلی پر گئی، پر وہ اسے نہیں ملا۔ فیر وہ اس کے منشی دلا اور لنگاہ کے پاس گئی۔ وہ اسے لارے لپے دیتا اور رات کو اپنے پاس بلا لیتا۔ ایک روز اس نے شراب پی رکھی تھی۔ اس رات میری گھروالی اس کے پاس تھی۔ لنگاہ نے نشے میں مست ہو کر بتادیا کہ مجھے اور اللہ دیو کو کلراٹھی کی جیل میں رکھا گیا ہے۔ پر وہ ہم دونوں کو چھوڑنے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔“

”اللہ دتا! تجھے تو کھوکھرنے سال بھر کے لیے وگار پر کید میں ڈالا تھا۔ تو چار مہینے پہلے کیسے باہر نکل آیا؟“

”جب میں نے تجھے سبھی کچھ بتادیا، تو امیہ گل بھی سن لے۔“ اللہ دتا نے جواب دیا۔ ”علی شاہ یہاں سے نزدیک ہے۔ کلراٹھی کے راکھے کبھی کبھار وہاں جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک راکھے میران خاں سے میری گھروالی نے میل جول پیدا کر لیا۔“

لالی نے ہنس کر کہا۔ ”یاری لگالی ہوگی۔“

”ایسی ہی گل تھی۔“ اللہ دتا نے جھینپ کر نظریں جھکالیں۔ ”پر میران کے ذریعے وہ چپکے چپکے ٹھیکیدار، مروڑے اور حلوہ پکا کر بھجوا دیتی، میں اور اللہ دیو چھپ چھپ کر کھا لیتے۔“

”دوسرے بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے؟ ایسے ہی جیسے سرکاری جیلوں میں باہر سے چوری چھپے مالمان اندر آ جاتا ہے۔“

ری اور حرام کا ٹکا بھی جن کرساتھ لائی تب توں نے کچھ نہ کہا۔ اب میں نے تجھے چھڑانے کے لیے میران سے یاری لگلی تو ناراض کیوں ہوتا ہے؟“

”گل تو اس نے ٹھیک ہی کسی تھی۔“ لالی بس کر بولا۔ ”پر تو نے اپنے بھائی اللہ دینو کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کا کیا بنا؟“

”وہ جی، ابھی تک کلراٹھی کی جیل میں ہے۔ نور بخش کھوکھرنے اسے سال بھر بعد بھی نہیں چھوڑا۔ وہ میرا بدلہ اس سے لے رہا ہے۔“ اللہ دتا نے لالی کو مطلع کیا۔ ”وہ ایسا ہوا جی کہ اللہ دینو اور میں شروع میں رات کو ایک ہی زنجیر سے پیروں میں کڑے ڈال کر جکڑ دیئے جاتے پر بعد میں ہم دونوں کو الگ الگ کیدیوں کے ساتھ کر دیا گیا۔ میں نے جیل سے باہر آنے کے بعد میران خاں کی بت منت کی۔ گھروالی نے بھی اس کو منانے کی کوشش کی پر وہ کسی طرح اللہ دینو کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا۔ بلکہ میرے گڑگڑانے پر ایک دم بھڑک اٹھا۔ ایسا ناراض ہوا کہ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اسے اتنا گرم دیکھا تو ڈر گیا۔ بات یہ ہے کلراٹھی کے سارے ہی راکھ بہت ظالم اور خوں خوار ہیں۔ میران خاں تو سب سے زیادہ ظالم اور خونی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ایک کیدی کو جھگڑا کرنے پر میران خاں نے گولی سے اڑا دیا۔ ڈنڈ ڈنڈ فریکے۔ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ وہ گھرو جوان تھا۔ کچھ دیر اپنے ہی خون میں پڑا ترپتا رہا۔ فیر اس نے دم توڑ دیا۔ کسی نے ڈر کے مارے اس کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ سب اپنا کام کرتے رہے۔“

”کسی کیدی نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی؟“

”دو نے ایسی کوشش کی تھی۔ ان میں سے ایک تو بھاگتے ہوئے راکھوں کی گولیوں سے مارا گیا۔ دوسرا نکل گیا۔ مگر راکھ بعد میں اسے بھی پکڑ لائے اور گولی مار کر اس کا بھی خون کر دیا۔ جو بھی راکھوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، اسے کلراٹھی سے کچھ دور گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔ نہ اس پر کفن ڈالا جاتا ہے نہ اسے سنلایا جاتا ہے۔ رات کے اندھیرے میں چپ چاپ زمین میں گاڑ دیتے ہیں۔ میرے سامنے تین کیدی مارے گئے۔“

”اللہ دینو کے بارے میں تمیں نول پتہ ہے، وہ زندہ ہے؟“ لالی نے پوچھا۔

”ہن جی، یہ تو پتہ ہے۔ ویسے وہ ہے تو ٹکڑا جوان، پر اسے گھمہ کم ہی آتا ہے۔ ویسے بھی سارے ٹاکیدی راکھوں سے بہت ڈرتے ہیں۔ جیسا راکھ کتے ہیں، ویسا ہی کرتے ہیں۔ ہریات چپ کر کے مان لیتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”زمیں دار تو میرے سامنے کبھی کلراٹھی پر نہیں آیا، پر اس کا منشی دلاور لگا ہفتے میں ایک بار دورے پر ضرور آتا ہے۔“

”ایسا ہوتا تو ہوگا پر مجھے پتہ نہیں۔ اب اگے کی سن۔ ایک رات ڈیوٹی پر میران خاں اکیلا رکھوالی پر تھا۔ دوسرے روز عید کی چھٹی تھی۔ کام بند تھا۔ کلراٹھی پر چار راکھے تھے۔ ان میں سے تین شام کو کام بند ہوتے ہی اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ میران خاں کا گھر میاں والی میں تھا۔ اس لیے وہ ٹھیر گیا۔ یہ بات اس نے میری گھروالی کو بتادی تھی اور اسے رات کو کلراٹھی پر اپنے پاس بلایا۔ اندھیرا ہوتے ہی وہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ آدھی رات تک اس کے ساتھ رہی۔ پنج سو روپے رشوت بھی دی تاکہ وہ مجھے چھوڑ دے۔“

”لگتا ہے، تیری گھروالی بہت تیز ہے۔ سوہنی بھی ہوگی۔“

اللہ دتا اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”فیر ایسا ہوا جی، آدھی رات کے بعد میران خاں اندر آیا۔ اس رات اس نے مجھے اور میرے ساتھی کیدی کو کونے والی کوٹھڑی میں سلایا تھا۔ کیدیوں کو راکھ اپنی مرضی کی جگہ سلاتے ہیں اور سونے سے پہلے ان کے معانے پر بھی آتے ہیں۔ ان کی گنتی بھی کرتے ہیں۔ اس دھت سارے کیدی بے خبر سو رہے تھے۔ کئی کوٹھڑیوں میں اور کئی کوٹھڑیوں کے باہر دLAN میں سو رہے تھے۔ میران خاں میری کوٹھڑی میں آیا۔ چپکے سے میرے کڑے کا تالا کھولا، کڑا پیر سے نکال دیا، آہستہ سے جھنجھوڑ کر مجھے جگایا۔ میں نے گھبرا کر بولنا چاہا تو اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرا پیر ہلا کر بتایا، کھلا ہوا ہے۔ کوٹھڑی میں اتنا اندھیرا تھا کہ میں میران خاں کو پہچان نہیں سکا۔ وہ کوٹھڑی سے باہر چلا گیا اور میں دم سادھے پڑا رہا۔ کچھ دیر بعد میں نے آہستہ سے کروٹ لی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھ والا گہری نیند سو رہا تھا۔ میں کوٹھڑی سے باہر آیا۔ دLAN سے گزر کر وڑے میں گیا اور دے دے چلتا ہوا دروازے پر پہنچا۔“

”تمیں نول پتہ تھا دروازہ کھلا ہے؟“

”ہاں جی، میں نول اسی وکت کچھ اندازہ ہو گیا تھا جب میرے پیر کا کڑا کھولا گیا تھا۔“ اللہ دتا نے بتایا۔ ”میرا وچار ٹھیک نکلا۔ میں نے باہر والے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ میں باہر نکلا۔ گھروالی میرا انتظار کر رہی تھی۔ میران خاں دروازے کا تالا بند کرنے لگا اور ہم دونوں آگے بڑھ گئے۔ کلراٹھی سے نکل کر پنڈ پنچے، بچوں کو ساتھ لیا، ضرورت کا سامان گٹھڑی میں باندھا اور نکل کھڑے ہوئے۔ سویرا ہونے تک ہم پنڈے بہت دور نکل جانا چاہتے تھے۔“

”تیری گھروالی نے بتایا، اس نے تجھے کس طرح چھڑایا؟“

”اس نے رستے میں مجھے سب کچھ بتادیا تھا۔ میں نے میران خاں سے اس کی یاری کی گل سنی تو بہت گرم ہوا۔ وہ بھی گرم ہو گئی، بکڑ کر بولی۔ زمیں دار کے پاس جب میں ڈیڑھ برس سے بھی اوپر

”یہ بتا، تو نے اللہ دینو کو چھڑانے کے لیے کیا کیا؟“

”نہ پوچھ، کیا نہیں کیا۔ میں نے پولیس میں پرچہ چاک کرایا۔ اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی تو اوپر درخواستیں لگا کیں، چٹھیاں بھیجیں، خود شہر گیا۔ افسروں کے سامنے گڑگڑایا، فریاد کی پر کچھ بھی نہ بنا۔ نور علی کھوکھر کو ان باتوں کا پتہ چل گیا۔ اس نے مجھ پر حملہ کرایا۔ میں ان دنوں نیلا ڈوبا میں تھا۔ علی شاہ چھوڑ کر وہیں چلا گیا تھا۔ ادھیارے پر نوکڑا زمیں لے لی تھی۔ اس طرح میں پانی بن گیا۔ ادھیارے کی پہلی فصل خریف کی تھی۔ میں نے بڑی محنت کی۔ بھٹی اور کمادست چنگی رہی۔ فصل تیار کھڑی تھی۔ بھٹی کی چٹائی شروع ہونے والی تھی۔ میں نے چٹائی کے لیے چوگیوں سے بات بھی کر لی تھی۔ لوجی، ایک رات کھوکھر کے کرندے رہے۔ غلوں اور بھٹیوں سے مسلح ہو کر نیلا ڈوبا پہنچے۔ سروی تو اس رات زیادہ نہیں تھی۔ پر دھند بہت تھی۔ انھوں نے پنڈ میں گھسے ہی اندھا دھند گولیاں چلائی شروع کر دیں۔ پر ان کے پتھنے سے پہلے ہی میں نے گھروالی کا ہاتھ پکڑا اور گھر سے نکل کر مٹی کے کھیت میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ وہ دروازہ توڑ کر گھر میں گھس گئے اور توڑ پھوڑ کر کے چلے گئے۔ جاتے جاتے میری واڈھو فصل کو آگ لگا دی، گھر کو نہیں لگائی۔ اس میں تینوں بچے تھے، جل کے راکھ ہو جاتے۔ میں نے تب نیلا ڈوبا چھوڑ دیا اور اپنے ایک شریک کے پاس داؤد پور چلا گیا۔ نیلا ڈوبا نہ چھوڑتا تو کھوکھر مجھے جان سے مار دیتا۔“

”جب یہ بات ہے تو ادھر کیسے آگیا؟“

”میں جی اللہ دینو کو چھڑانے آیا ہوں۔ کل کلرا بھی پر کام بند رہے گا۔ آج رات بھی ایک ہی راکھا ڈیوٹی پر رہے گا۔“

”پر کل تو عید نہیں ہے۔ کلرا بھی پر چھٹی کیسے ہو گئی؟“

”کل رات نور علی کھوکھر کی ماں کی موت ہو گئی۔ اس لیے کلرا بھی پر دو روز کام بند رہے گا۔ یہ بات مجھے کل سویرے کلرا بھی کے ایک راکھے کے ذریعے معلوم ہو گئی۔“

”وہ راکھا میران خاں ہو گا؟“

”نہیں جی، میران خاں کو تو کھوکھر نے نوکری سے نکال دیا۔ اسے تو کلرا بھی چھوڑے ہوئے ہی دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔ پتہ نہیں کہاں گیا۔ مجھے کلرا بھی کا جو راکھا ملا تھا، اس کا ناں طور محمد نکھیرا ہے۔ آج رات وہ اکیلا کلرا بھی کی رکھوالی کرے گا۔ دوسرے راکھے شام کو اپنے گھروں کو چلے جائیں گے۔“

لالی نے اسے چھیڑا۔ ”آج بھی تو اپنی گھروالی کو ساتھ لایا ہو گا؟“

”ہاجی، ایسی کوئی گل نہیں۔“ اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”طور محمد نکھیرا ایک ہزار روپے لے کر اللہ دینو کو چھوڑنے پر راضی ہو گیا ہے۔ طور محمد نکھیرا خود بھی کلرا بھی چھوڑ کر بھاگنا چاہتا ہے۔ ہزار روپے مل گئے تو وہ آج ہی بھاگ جائے گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ”تو جانتا ہے، میرے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔ چوکھر چرانے والا غریب چاک ہوں۔ ہزار روپیہ کہاں سے لاتا۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو گھروالی کو داؤد پور کے سناڑے کے پاس سرگانے پر رکھ کر ہزار روپیہ ادھا ر لیا۔ تین نوں تو پتہ ہی ہے، جب تک ادھا ر ادا نہ ہو گا تب تک وہ اس کے گھر میں ویگا کرے گی۔ ہر طرح کا کام کرے گی۔ یوں سمجھو اس کے پاس گروی رہے گی۔ کیا کریں جی، اللہ دینو کو رہائی دلانی بھی تو ضروری ہے۔ وہ اہری اور مخنتی ہے۔ وہ آگیا تو ہم دونوں بھائی محنت کر کے گھروالی کو سال بھر میں ادھا ر ادا کر کے سرگانے سے چھڑا کر واپس لے آئیں گے۔“

لالی نے اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھا۔ ”تو کبھی جمائگیرہ گیا ہے؟“

”کیوں نہیں گیا۔ سڑک کے ساتھ ہی ہے۔ وہاں میرا ایک چچیرا رہتا ہے۔ میں تو جمائگیرہ کے لبردار ملک اللہ نواز خاں کو بھی جانتا ہوں۔ ویسے تو اس کی کوم کھٹیا نہ ہے، پر اس کا پو خوشاب سے ملکوں کی کڑی دیاہ لایا تو خود ملک بن گیا اور اس کا پتہ تو بالکل ملک بن گیا۔ یہ لے طرے کی پگ لگاتا ہے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر ایسی آکڑ کے ساتھ نکلتا ہے جیسے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تین نوں پتہ نہیں وہ زبردست رسا گیر ہے اور جب سے اس کا ایک بھرا تھا نے دار لگ گیا ہے، اس وکت سے تو وہ ایسا نڈر ہو گیا کہ کھلم کھلا رسا گیری کا دھندا کرتا ہے۔ میں تجھے اس کے بارے میں ایک گل بتاؤں۔“

”نہ بتا تو ٹھیک ہے۔“ لالی جمائگیرہ کے زمیں دار ملک اللہ نواز کے ذکر سے بے زار ہو کر بیچ میں بول پڑا۔ ”یہ بتا، داؤد پور سے جمائگیرہ کتنی دور ہے؟“

”باراں میل سے زیادہ نہیں ہو گا۔ پر تیس جمائگیرہ کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟ تین نوں تجھے وہاں جانا ہے؟“

”ہاں میں نوں وہاں جاتا ہے۔ مجھے جمائگیرہ پہنچا دیتا، میں ہزار روپے رشوت دیے بنا اللہ دینو کو نکال لاؤں گا۔ اللہ دینو کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور ہزار روپے سرگانے کے دے کر اپنی گھروالی کو لے آتا۔ وہ سرگانے پر گروی نہیں رہے گی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اللہ دتا نے حیرت سے منہ پھاڑ کر کہا۔ ”تیری گل بالکل سمجھ نہیں آئی۔“

”ابھی نہیں سکتی۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اسے مجھ پر چھوڑ دے۔“

اللہ دتائے کچھ نہیں کہا۔ وہ ابھی تک حیرت زدہ تھا۔



فراش کے گھنے درختوں کے نیچے روشنی دھندلی تھی۔ آس پاس جھنگر تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ ہر طرف گمراہ سناٹا چھایا تھا۔ سامنے چینل میدان تھا، جس پر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ میدان کے آخری سرے پر اونٹوں کی قطار گرد کے بادل اڑاتی گزر رہی تھی۔ اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی بیتل کی گھنٹیاں آہستہ آہستہ جھٹکار رہی تھیں۔

اللہ دتائے لالی کو مخاطب کیا۔ ”یہ اونٹ دیکھ رہا ہے۔ لگتا ہے، کھراٹھی سے آرہے ہیں۔ ان پر کچا شورہ لاد کر میٹھن بھیجا جا رہا ہے۔ وہاں کھوکھرا مٹی ہوگا۔ وہ ریل سے اوکاڑے بھیج دے گا۔ وہاں کارخانے میں اسے صاف کیا جائے گا۔“

مگر لالی کو شورے سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے سویرے سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اب دوپہر ہو چکی تھی۔ اسے سخت بھوک لگی تھی۔ اس نے اللہ دتا سے پوچھا۔

”تو یہاں کب آیا تھا؟“

”سویرے ہی آگیا تھا۔ میں نے تجھے دیکھا تھا۔ دو تین بار نزدیک سے گزرا، توں بے خبر سو رہا تھا۔ میں سمجھا کوئی تجھے مار کر یہاں ڈال گیا ہے۔ تیرے ہاتھ کی گھڑی دیکھ کر میں نوں لالچ آگیا۔“ اس نے شرمندہ ہو کر نظریں جھکا لیں۔ ”معاف کرنا جی، غلطی ہو گئی۔ میں تو یہاں چھپنے کے لیے آیا تھا۔“

”پر تو نے صبح سے کچھ کھایا نہیں۔ تجھے بھوک نہیں لگی؟“

”لگ تو رہی ہے، گھر سے روٹی لایا تھا۔“ اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”ادھر جھنگر میں چدرے باندھ کر رکھ دی ہے۔“

”یہ چنگا کام کیا۔ میں تو تجھے علی شاہ بھیجنے والا تھا، وہاں سے جا کر روٹی شونٹی لے آ۔“

”نہیں جی، علی شاہ جانا ٹھیک نہیں۔ وہاں گیا تو کھوکھرا کو پتہ چل جائے گا۔ سارے کئی اور مزارعے اسی کے بندے ہیں۔ کسی نے کھوکھراں جا کر اسے میرے بارے میں بتایا تو وہ چونکا ہو جائے گا۔ فیرو اللہ دینو کو نکال لانا مشکل ہو جائے گا۔ وہ ضرور اپنے کسی کردے کو شام سے پہلے کھراٹھی پر بھیج دے گا۔ میں تو کہتا ہوں جی، علی شاہ میں کسی کو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“

”اب باتیں چھوڑ، جا کر روٹی لکر لا۔“ لالی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”میں نوں سخت بھوک لگی ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ کچھ کھاؤں گا۔“

”پروانہ کر۔ روٹی اتنی ہے، دونوں کھا سکتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”پینے کو مین کے ڈبے میں پانی بھی ساتھ لایا ہوں۔ نہر کا تو میں نوں پیتے ہی نہیں تھا اس میں پانی ہوگا۔ آج کل تو بالکل سوکھی رہتی ہے۔“

اللہ دتا اٹھ کر درختوں کے نیچے چلے لگا۔ کچھ دور جا کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اللہ دتا ایک گھنے درخت کی آڑ سے نمودار ہوا۔ قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں پوٹلی اور مین کا ڈبلا لٹک رہا تھا۔

وہ لالی کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے چادر کھولی۔ اندر سے چار موٹی موٹی روٹیاں نکلیں۔ ان کے ساتھ چنے کی نرم کونپلوں کا پکایا ہوا پلی کا ساگ اور پیاز کی دو گٹھیاں تھیں۔ اللہ دتا نے مسکرا کر روٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ گوگیاں ہیں۔ میاں آنے سے پہلے میں نے ہی پکائی تھیں۔ کیا کریں جی، گھروالی تو ہے نہیں۔ خود ہی روٹی پکانی پڑتی ہے۔“

لالی نے کچھ نہیں کہا، لقمہ توڑا اور ساگ ملا کر کھانے لگا۔ اللہ دتا بھی کھانے لگا۔ روٹی باسی تھی۔ سخت بھی تھی، مگر دونوں بہت بھوکے تھے۔ اطمینان سے بیٹھے کھاتے رہے۔ نوالہ حلق میں پھنسا تو ڈبائے سے لگا کر پانی پی لیتے۔ چار روٹیوں میں دونوں کا پیٹ بھر گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ دتا نے پوچھا۔ ”یہ تو بتایا نہیں توں طور محمد نکھیرا کو ہزار روپے دیئے بنا اللہ دینو کو کیسے نکال لائے گا؟“

”اندھیرا ہو جانے دے۔ میں تیرے ساتھ کھراٹھی چلوں گا۔“ لالی نے جواب دیا۔ ”وہاں جا کر آس پاس کا معائنہ کروں گا۔ جیسا تجھ سے کموں ویسا ہی کرنا۔“

”پر یہ جان لے۔ رائے کے پاس بھری ہوئی رہنمائی رہتی ہے۔“ اللہ دتا کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ ”کوئی گڑبڑ ہو گئی تو دونوں مارے جائیں گے۔“

”حوصلے سے کام لے۔“ لالی نے اس کی بیٹھ تھکی۔ ”پروانہ کر، سب ٹھیک ہی ہوگا۔“

”توں پولسیا تو نہیں ہے؟“ اللہ دتا نے لالی کی ملگجی پتلون اور بش شرٹ غور سے دیکھی۔ ”لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔“

”نہیں جی، میں پولسیا سٹیا نہیں ہوں۔ خاما خا کی باتیں سوچنا چھوڑ۔ اب توں آرام کر اور اندھیرا پھیلنے کا انتظار کر۔“

اللہ دتا نے زمین پر چادر پھیلا دی۔ دونوں اس پر لیٹ گئے۔ لالی ذرا دیر آنکھیں بند کئے پڑا رہا، پھر اسے نیند آگئی۔

اسے حیرت سے دیکھا اور ہاتھ اٹھا کر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
”ادھر اتنا پانی کہاں سے آگیا؟“

”تو اسے پانی کی پتلہ سمجھ رہا ہے؟“ اللہ دتا ہنس کر بولا۔

”تب تو یہ ڈاہر ہو گا۔ روہی کے علاقے میں ریت کے نیلوں کے درمیان میں نے ایسے ڈاہر دیکھے ہیں۔ بہت دن ہوئے، میں ایک بار گرمیوں میں ادھر گیا تھا۔“

اللہ دتا نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”نہیں جی! یہ تو باڑہ ہے۔ اس سے بہت دھوکا ہوتا ہے۔ اس دکت تو خشک ہے اور بہت سخت ہے۔ پر جب بارش ہوتی ہے تو باڑھے کی مٹی بھیک کر اتنی نرم پڑ جاتی ہے کہ لدل بن جاتی ہے۔ یہ لدل بہت خطرناک ہوتی ہے۔ پیر رکھتے ہی بدن اندر دھنستا چلا جاتا ہے۔“

لالی نے اس کی باتیں توجہ سے سنیں۔ دونوں آگے بڑھتے رہے۔ اللہ دتا کی بات ٹھیک تھی۔ باڑہ مانند سراب تھا۔ دونوں جس قدر آگے بڑھتے، پانی کی جھلملاتی جھیل نظروں سے دور ہوتی جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ باڑھے کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ اس کی مٹی سخت، چکنی اور چمک دار تھی۔ اس میں نمکیات اور اقلی کی آمیزش تھی۔ زمین اتنی سخت تھی کہ چلتے ہوئے قدموں کی آہٹ صاف سنائی دیتی تھی۔

دور دور تک سبزے کا نام و نشان نہ تھا۔ پودوں اور جھاڑیوں کا ذکر کیا، جنگلی جڑی بوٹیاں تک نہ تھیں۔ صرف اجلا اجلا سفید چھیل میدان تھا۔ دونوں نے باڑہ عبور کیا تو ایک مرتبہ پھر لانا اور پھوگ کے جھنڈ نظر آنے لگے۔

وہ آگے بڑھتے گئے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ انھوں نے لگ بھگ چار میل فاصلہ طے کیا تو دور سے روشنی ٹٹماتی نظر آئی۔

اب لانا کے پودوں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں جال کے درخت بھی سر اٹھائے کھڑے تھے۔ ان کے تنے چھوٹے چھوٹے تھے۔ مگر شاخیں خوب گھنی اور گول دائرے میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جال، خود در صحرائی درخت ہے۔ اس کی شاخوں اور جڑوں کی مسواک بنتی ہے۔ جون کا پتہ ہوا مینہ ختم ہوتے ہی جب بادل گھر کر آتے ہیں اور رم جھم مینہ برستا ہے تو جال کے درختوں میں پھل لگتے ہیں۔ یہ سرخ سرخ پیلو ہوتے ہیں جنہیں ذوق و شوق سے کھایا جاتا ہے۔ میاں والی کے قہل میں، بڑستان اور بھادل پور کے ریگستانوں میں جال کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں۔ ان میں پیلو لگتے ہیں۔ ریگ زاروں کی پروردہ الھزدو شیرازوں کی ٹولیاں پیلو چننے کے لیے صحرا میں نکل جاتی ہیں۔ پیلو

دن ڈھلنے لگا۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب میں اترنے لگا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی۔ سائے طویل ہوتے گئے۔ فراش کے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا۔ جھاڑیوں میں چڑیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اللہ دتا موجود نہیں تھا۔ لالی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑا کر اللہ دتا کو تلاش کرنے لگا۔ مگر اس کا دور دور پتہ نہ تھا۔ لالی کو تشویش ہوئی۔ وہ حیران و پریشان بیٹھا سوچتا رہا کہ اللہ دتا کہاں چلا گیا۔ دو منٹ گزرے، پانچ منٹ گزرے، دس منٹ گزر گئے۔

لالی کی تشویش بڑھتی گئی۔ وہ اٹھ کر میدان میں جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ درختوں کے خشک پتوں پر آہٹ ابھری۔ لالی چونکا نظروں سے اس طرف دیکھنے لگا۔ آہٹ قریب، اور قریب آتی گئی۔ ایک درخت کے تنے کے پیچھے سے اللہ دتا نکل کر سامنے آگیا۔

”کہاں چلا گیا تھا؟“

”میں جی، ادھر جھنگر میں ٹپنی کرنے گیا تھا۔“

اللہ دتا آگے بڑھا اور لالی کے قریب بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش رہے۔ شام کا دھندلا پھیلنے لگا تھا۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا گیا۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ جھنگر میں جھینگروں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ رات ہو گئی۔

جب سپر رات گزر گئی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری ہو گیا تو دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ دتا نے چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالی۔ لالی آگے بڑھا۔ اللہ دتا اس کے ساتھ چلا۔ دونوں درختوں کے نیچے سے نکل کر کھلے میدان میں آ گئے۔

آسمان پر تارے چمکے ہوئے تھے۔ نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔ وہ چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے احتیاط سے کلراٹھی کی جانب بڑھنے لگے۔ دونوں کچھ دور آگے گئے تو میدان میں جگہ جگہ لانا کے پودوں کے جھنڈ نظر آنے لگے۔ لانا کے پودے کمر کر تک اونچے تھے۔ وہ کھلے میدان سے ہٹ کر لانا کے پودوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ خطرے کے وقت وہ لانا کے پودوں کی اوٹ میں چھپ سکتے تھے۔ انھوں نے نصف میل سے زیادہ راستہ لانا کے پودوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے طے کیا۔ آگے لپ واپس ریتلا میدان تھا۔

میدان کے سرے پر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں پانی کی وسیع جھیل جھلملا رہی تھی۔ لالی نے

چن چن کر جگہ جگہ اونچی اونچی ڈھیریاں لگاتی ہیں۔ جال کے گھنے درختوں کے سائے میں بیٹھ کر پیلو کے گیت گاتی ہیں۔

آجنوں رل مل یار

پیلو پکیاں نی

پکیاں گل گلنار

پیلوں پکیاں نی

پیلوں چٹرویں جیٹھ مینے

تھل دیاں جیاں مارن سینے

وہ پیلو چنتی ہیں۔ قہقہہ لگاتی ہیں۔ لہک لہک کر گاتی ہیں اور گیت کے بولوں کے ذریعے آپس میں یوں چھیڑ چھاڑ کرتی ہیں۔ ”آ، میرے محبوب! مل جل کر پیلو چنیں۔ پیلو پک کر گل گلنار کے مانند سرخ پڑ گئے ہیں۔ جیٹھ کا مہینہ ہے۔ ریگستان میں پلنے والی کنواریاں سینہ ابھار کر چلتی ہیں اور پیلو چنتی ہیں۔“

مگر اس سنان رات میں نہ جال کے درختوں میں پیلو لگے تھے اور نہ صحرائی دو شیرائیں پیلو چنتے ہوئے لہک لہک کر گارہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اللہ دتا اور لالی روشنی کی جانب بڑھتے جا رہے تھے۔ روشنی قریب آگئی۔ اللہ دتا نے روشنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مدھم لہجے میں لالی کو بتایا۔

”سامنے کلراٹھی ہے۔ بول آگے کیا کرتا ہے؟“

”سیدھا پہرے دار طور محمد لکھیرا کے پاس چلا جا۔ ہزار روپے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دینا۔ روپے دیکھ کر وہ مگن ہو جائے گا۔ میں جال کے درختوں کی آڑ لیتا ہوا اس کے نزدیک پہنچ جاؤں گا۔“

اللہ دتا نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”غیر کیا ہوگا؟“

”آگے جو کچھ ہوگا، اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔“ لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”تو آگے

بڑھتا جا۔“

اللہ دتا نے ایک بار پھر خدشہ ظاہر کیا۔ ”سوچ لے، کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ راکھ کے پاس بھری ہوئی ر۔ غل ہے۔“ اس کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔ وہ گھبرا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”میں نوں پتہ ہے پہرے دار کے پاس بھری ہوئی ر۔ غل ہے۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ڈر نہیں، حوصلے سے کام لے۔ سب ٹھیک ہوگا، پروا نہ کر۔“

بلکی روشنی میں بیگار کیمپ کے دھندلے دھندلے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ آگے بہت وسیع کٹر میدان تھا جس کی تھور زدہ زمین پر کھار کی جی ہوئی سفید تہہ دور سے اجلی اجلی نظر آرہی تھی۔ میدان کے آس پاس جال کے گھنے درخت تھے۔ میدان سے ذرا ہٹ کر ایک کچا راستہ بیگار کیمپ تک جاتا تھا۔

لالی نے اللہ دتا کو اس راستے پر چلنے کا اشارہ کیا اور خود علیحدہ ہو کر درختوں کی آڑ میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس کی چاپ ابھری تو دور سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“

اللہ دتا نے آواز پہچان لی۔ یہ پہرے دار کی آواز تھی۔ اللہ دتا نے جواب دیا۔ ”میں ہوں جی، اللہ دتا۔“ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا گیا۔

پہرے دار ایک ہاتھ میں لالین اور دوسرے میں ہندوق سنبھالے اس کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر ٹھٹکا۔ ہاتھ اٹھا کر لالین اونچی کی اور اللہ دتا کو پہچاننے کی کوشش کی۔ جب اسے اطمینان ہو گیا تو اس نے کہا۔ ”تو آگیا؟“

اللہ دتا نے جواب دیا۔ ”تو نے بلایا جو تھا۔“

اللہ دتا اس کے بالکل قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ طور محمد لکھیرا نے مسکرا کر کہا۔ ”بہت دیر کی کردی تو نے۔ میں دیر سے تیرا انتظار کر رہا ہوں۔“

اللہ دتا نے معذرت کے انداز میں کہا۔ ”ہاں جی، کچھ دیر ہو گئی۔“

”روپے لایا ہے؟“

اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”بالکل لایا ہوں۔ روپے نہ لاتا تو تیرے کول کیوں آتا۔“

”آمیرے ساتھ، ادھر منجی پر بیٹھ کر آرام ٹال گل بات ہوگی۔“

دونوں کلراٹھی کی اس عمارت کی جانب بڑھنے لگے جس میں بیگار کرنے والے مزدور قیدی رکھے جاتے تھے۔

لالی ایک درخت کی آڑ میں دم سادھے کھڑا تھا۔ عمارت اس کے بالکل سامنے تھی۔ یہ عمارت مٹی کی بنی ہوئی تھی اور کسی پرانے قلعے کے مانند نظر آتی تھی۔ اس کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواروں کی فصیل تھی۔ قریب ہی چند نیم پختہ مکانات تھے۔ ان میں پہرے دار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ کلراٹھی میں جگہ جگہ بھٹیاں تھیں۔ ایک بڑی بھٹی بھی تھی جس کی پختہ چینی بلندی تک چلی

گئی تھی۔

کلراٹھی اور اس کے بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف ایک پہرے دار طور محمد لکھیرا ڈیوٹی پر تھا۔ دوسرے پہرے دار اور نوکر چاکر شام کو اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ کلراٹھی پر کام بند ہوتا تو وہ اسی طرح چپکے سے کھسک جاتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے یہ حکم تھا کہ منشی کی اجازت کے بغیر بیگار کیمپ چھوڑ کر نہ جائیں۔ مگر رات کو اس دیرانے میں نور علی کھوکھر اور اس کے منشی کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا، لہذا وہ چھٹی کے موقع پر رات کو چلے جاتے اور صبح ترکے واپس آ جاتے۔

پہرے دار اور اللہ دتا آہستہ آہستہ قید خانے کی عمارت کے قریب پہنچ گئے۔ قید خانے میں آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا اور اس پر تالا پڑا تھا۔ دروازے کے عین سامنے چارپائی بچھی تھی۔ پہرے دار نے لائین چارپائی کے قریب رکھ دی۔ البتہ بندوق اس کے ہاتھ میں بدستور دبی ہوئی تھی۔

وہ اللہ دتا کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے ذیل ڈول کے اعتبار سے برچھا لگتا تھا۔ اس کا قد لمبا، جسم چوڑا چکلا اور مضبوط تھا۔ مونچھیں گھنی تھیں۔ چہرہ ایسا کرخت اور درشت تھا کہ سخت ہیبت ناک نظر آتا تھا۔

لالی درختوں کی آڑ لیتا کھنڈر کے قریب پہنچ گیا۔ یہ کوئی اجڑی ہوئی قدیم بستی تھی۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی دیواریں اس قدر شور زدہ تھیں اور ان پر کھار کی تہہ اس طرح بہتات سے چڑھی تھی کہ وہ برف پوش نظر آتی تھیں۔

شور زدہ کھنڈر سے قید خانے کی عمارت زیادہ دور نہیں تھی۔ لالی وہاں سے پہرے دار اور اللہ دتا کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ وہ شکستہ دیوار کی آڑ میں دبکا ہوا تھا۔ اس کی نظریں پہرے دار اور اللہ دتا کی جانب تھیں۔

لالی سانس روکے چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے لائین کی روشنی میں دیکھا۔ اللہ دتا نے دھوتی کے ڈب سے نوٹوں کی گندی نکالی اور پہرے دار کو تھما دی۔ پہرے دار گردن جھکا کر نہایت انہماک سے نوٹ گننے لگا۔ کھنڈر اور عمارت کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ اسے عبور کرنا سخت خطرناک تھا۔ پہرے دار کی نظر لالی پر پڑ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نوٹ گننے میں محو تھا۔

لالی نے جھپاک سے درمیانی فاصلہ طے کیا۔ لائین کی دھندلی روشنی میں اس کا سایہ لہرایا۔ پہرے دار نے پلٹ کر دیکھا۔ لالی فوراً قید خانے کی دیوار سے چٹ کر کھڑا ہو گیا۔ پہرے دار گردن

موڑے دیکھتا رہا۔ اللہ دتا کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھائی۔ وہ نظریں جھکائے پہرے دار کے برابر خاموش بیٹھا رہا۔ کوئی نظر نہیں آیا تو پہرے دار نے گردن جھکا کر پھر نوٹ گننا شروع کر دیے۔

لالی دیوار سے لگا دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ اس کے عقب میں پہنچا۔ تیزی سے اچھلا، پہرے دار کے سر پر پہنچا اور ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کی گردن دبوچ کے تیزی سے جھٹکا دیا۔ پہرے دار کے زانو پر رکھی ہوئی بندوق پھسل کر نیچے گر گئی۔ اللہ دتا ہکا بکا ہو کر خوف زدہ نظروں سے لالی کو نکلنے لگا۔ لالی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

”منہ کیا تک رہا ہے۔ اٹھالے بندوک۔“

اللہ دتا نے جھٹ کر بندوق اٹھالی۔ پہرے دار نے گردن نیچی کرتے ہوئے زور آزمائی کی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر لالی کی کلائی پکڑ لی اور اسے زور سے کھینچا۔ اس طرح لالی کی گرفت سے اس نے اپنی گردن چھڑالی۔

پہرے دار طور محمد لکھیرا بندوق چھیننے کے لیے اللہ دتا پر جھپٹا۔ لالی نے تیزی سے ہٹ کر پھر اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ مگر پہرے دار بہت مضبوط اور طاقت ور تھا۔ اس دفعہ وہ لالی کی گرفت میں نہیں آیا۔ اس نے اٹھ کر اللہ دتا کے ہاتھ پر زور سے تھپکی دی۔ بندوق اللہ دتا کے ہاتھ سے پھوٹ گئی۔

پہرے دار اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ لیکن لالی نے اسے اتنی مہلت نہیں دی۔ وہ پیچھے ہٹ کر اچھلا اور سر جھکا کے پہرے دار کے منہ پر پوری قوت سے ٹکرماری۔ چوٹ کاری آئی۔ پہرے دار سنبھل نہ سکا، چارپائی پر چاروں خانے چٹ گرا۔ لالی نے اسے کوٹ بھی نہ لینے دی۔ چارپائی اٹھا کر پلٹ دی۔

پہرے دار لڑھک کر نیچے آ گیا۔ چارپائی اس کے اوپر گری۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے نکلنے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ چارپائی ہٹا کر باہر آتا، لالی نے جھٹ بندوق اٹھالی۔ بندوق ہاتھ میں لیتے ہی لالی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بندوق نہیں را نقل ہے۔ لالی نے را نقل کی نال پہرے دار کی جانب کر دی۔ ڈپٹ کر خبردار کیا۔

”اٹھنے کی کوشش کی تو گو لی چلا دوں گا۔“

پہرے دار نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ جس طرح چارپائی کے نیچے فرش پر پڑا تھا، ویسے نہا رہا۔ اس کا چہرہ اور دھڑکا اوپری حصہ چارپائی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ لائین اپنی جگہ رکھی تھی۔

اس کی روشنی میں نوٹ ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ پہرے دار خاموش پڑا لالی کو خوں خوار نظروں سے گھورتا رہا۔

لالی رانقل تانے کھڑا رہا۔ اللہ دتا جلدی جلدی بکھرے ہوئے نوٹ اٹھانے لگا۔ نوٹ اکٹھے کر کے اس نے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی نے اسے مخاطب کیا۔ ”اللہ دتا! پگڑی اتار۔“ اس نے پہرے دار طور محمد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے باندھ دے۔“

اللہ دتا نے سر سے پگڑی اتاری۔ لکھیرا کے پاس گیا اور اس کے دونوں ہاتھ پگڑی سے کس کر باندھنے لگا۔ پہرے دار غصے سے بولا۔ ”تو نے میرے ساتھ ہوا کیا۔“

اللہ دتا تو خاموش رہا لیکن لالی نے اسے ڈانٹا۔ ”بکو اس نہ کر، چپ کر کے پڑا رہ۔“ پہرے دار نے پھر کچھ نہیں کہا۔

اللہ دتا نے اس کے دونوں ہاتھ باندھ کر مضبوط گرہ لگا دی۔ لالی نے اسے حکم دیا۔ ”اب منجی اٹھا دے۔“ اللہ دتا نے پہرے دار پر پڑی ہوئی چارپائی اٹھا دی۔

لالی نے پہرے دار سے پوچھا۔ ”اٹھ کر بیٹھ۔ بتا جیل کے دروازے کی چابی اور دوسری چابیاں کہاں ہیں؟“

لکھیرا نے کمر بکنی مار کر اشارہ کیا۔ اللہ دتا نے بڑھ کر اس کا کرتا اٹھایا۔ کمر پر کنبیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ اللہ دتا نے گچھا کھول کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ لالی نے کہا۔ ”اللہ دتا! دروازہ کھول کے اندر جا اور اللہ دینو کو نکال لا۔“

اللہ دتا آگے بڑھا۔ اس نے لالین اٹھائی، تالا کھولا اور قید خانے کے اندر چلا گیا۔ لالی رانقل کی نال پہرے دار پر تانے چوکس کھڑا رہا۔ پہرے دار گردن جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔



اللہ دتا ہاتھ میں لالین لٹکائے دروازے سے نکلا۔ اس کے ہم راہ اللہ دینو بھی تھا۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال ہوگی۔ چہرہ مرجھا ہوا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھ کر بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ وہ پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص پہنے تھا۔ دھوتی بھی میلی کپیلی تھی۔ نہ پیروں میں جوتے تھے نہ سر پہ پگڑی۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو دیکھنے لگا۔

اللہ دتا بولا۔ ”یہ اللہ دینو ہے جی۔“

لالی نے اللہ دینو کو قریب بلایا اور ایک ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ ”اتنا ڈرا سا

کیوں ہے؟ اب تو اس جیل سے چھوٹ گیا۔“ اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ”فناٹ اس کی اداؤں کھول لے۔“

اللہ دینو خاموشی سے آگے بڑھا اور اداؤں کھولنے لگا۔ اللہ دتا نے بھی اس کی مدد کی۔ دونوں نے اداؤں کھول کر رسی نکال لی۔ لالی نے پہرے دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ دینو سے کہا۔

”پگڑی کھول۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کر کے رسی سے باندھ دے۔ اللہ دتا! تو بھی لگ جا۔ فناٹ باندھ۔ دکھت کم ہے۔“

دونوں بھائیوں نے پگڑی کھول کر چارپائی کی مضبوط اداؤں سے پہرے دار کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ وہ چپ بیٹھا رہا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔

لالی نے لالین کی روشنی میں رانقل کا میگزین کھول کے دیکھا اس میں نو کار توں موجود تھے۔ دواں جیبر میں تھا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر رانقل اللہ دتا کو دی اور کنبیوں کا گچھا اس سے لے لیا۔

اللہ دتا نے پوچھا۔ ”ان کا کیا کرے گا؟ اب ہمیں چلنا چاہئے۔“

”ابھی چلتے ہیں، تھوڑا سا کام اور کرتا ہے۔ دوسروں کو بھی تو رہا کرتا ہے۔“

”انھیں چھوڑ، ہم نے ان سے کیا لینا؟“

”بیکار کی کڑکڑ نہ کر، چپ کر کے کھڑا رہ۔“ لالی نے اسے ڈانٹا۔ ”انھیں رہا کرنا ضروری ہے۔ اگر سب نہ چھوٹے تو نور علی کھوکھر تھے اور دینو کو اپنے کرندوں سے کتل کر دے گا۔ سب چھوٹ گئے تو کس کس کو کتل کرے گا۔ ویسے وہ بھی تو اللہ دینو کی طرح دیگاہ کے لیے پکڑ کر بند کئے گئے ہیں۔ انھوں نے کوئی جرم تو نہیں کیا اور یہ بھی تو سوچ، ان کے بھی گھروالے پریشان ہوں گے، انظار کرتے ہوں گے۔“

پہرے دار طور محمد بولا۔ ”ایسا نہ کر۔ سب نکل گئے تو منشی مجھے جان سے مار دے گا۔“

لالی قریب گیا اور اس کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مار کر بولا۔ ”فکر نہ کر لکھیرے۔ تجھے بھی رہا کر دوں گا۔ تو بھی بھاگ جانا۔ کوئی اور دھندا کر لیتا۔ یہاں رہے گا تو ایک نہ ایک دن مارا جائے گا۔

یہ بھی یہاں کی سپرداری گندہ کام ہے۔ تجھے ان بے چارے کیدیوں پر ظلم کرتے دکھ نہیں ہوتا؟

نفل نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ اب چپ کر کے بیٹھا رہ۔ گڑبڑ کی کوشش کی تو گوئی چلا دوں گا۔ اور جیسے تیرے کیدیوں کو کتل کر کے ان کی لاشیں دبا دی ہیں، ویسے ہی گڑھا کھود کر تجھے بھی دبا دوں گا۔ کسی کو

پیشگی نہ چلے گا۔ بول کیا کہتا ہے؟“

نے اونچی آواز سے کہا۔ ”میں تالے کھول کر تم سب کو رہا کروں گا پر کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“ اس کا لہجہ جھکا ہوا تھا۔ ”کسی نے گڑبڑ کی کوشش کی تو مگولی سے اڑا دوں گا۔“

چند لمبے وہ خاموش بیٹھے رہے پھر ایک قیدی نے جو دوسروں سے کسی قدر سن رسیدہ تھا، سب کی ترجمانی کرنے کے انداز میں کہا۔ ”ہمیں جی گڑبڑ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ توں ہمیں رہا کر دے گا تو دعا ہی دیں گے۔ گڑبڑ کیوں کریں گے؟ تو جیسا کہے گا، ویسا کریں گے۔“

”میں یہی چاہتا ہوں۔“ لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ اللہ دینو کو کنجیوں کا گچھا دیا۔ ”دینو! باری باری سب کے تالے کھول دے۔“

اللہ دینو ہاتھ میں لالٹین سنبھالے آگے بڑھا۔ وہ ایک ایک قیدی کے پاس گیا اور کنزوں کے تالے کھولنے لگا۔ اس نے جلدی جلدی سارے قیدیوں کے تالے کھول دیئے۔ جب سب آزاد ہو گئے تو لالی نے باہر چلنے کی ہدایت کی۔ وہ اٹھے، دلان سے نکل کر صحن میں آئے اور دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔

آگے آگے لالٹین سنبھالے اللہ دینو تھا۔ اس کے پیچھے قیدیوں کا غول تھا۔ سب سے پیچھے رانقل سنبھالے لالی چل رہا تھا۔ قیدی دروازے سے گزر کر باہر آ گئے۔

لالی بھی باہر آ گیا۔ اس نے انھیں ایک بار پھر مخاطب کیا۔ ”سنو! اب تم سب آزاد ہو۔ جس کا جہاں جی کرے نکل جائے۔ ابھی تو رات آدھی بھی نہیں ہوئی۔ بھاگنے کے لیے تمہارے پاس بہت دھت ہے۔ پر یہاں سے نکل بھاگنے سے پہلے تم سب کو ایک کام کرنا ہو گا۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔

”کھراٹھی پر کھدائی کرنے کے لیے کد الیں تو ہوتی ہیں نا؟“

”ہاں جی، کیوں نہیں ہوتیں۔“ کئی آوازیں ایک ساتھ ابھریں۔ ”بہت ہیں۔“

”کد الیں جہاں رکھی ہیں، تم سب جا کر وہاں سے نکال لاؤ۔“ لالی نے مٹی اور اینٹوں سے بنی ہوئی بھٹیوں کی جانب ہاتھ لہرایا۔ ”یہ ساری بھٹیاں توڑ پھوڑ کر برابر کر دو، قفافٹ۔ اس کے بعد یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

بیگار کیمپ کے پہرے داروں اور نوکروں کی کوٹھریاں سامنے تھیں۔ ان کے قریب ہی ٹین کا لمبا سائبان تھا۔ اس کے نیچے کھدائی کا سازو سامان رکھا تھا۔ اس میں کد الیں اور بیلچے بھی تھے۔ سارے قیدی سائبان کے اندر چلے گئے اور کد الیں ہاتھ میں سنبھالے باہر آ گئے۔ وہ ادھر ادھر بکھر گئے اور کدالوں سے بھٹیاں کھودنے لگے۔ کھدائی اور توڑ پھوڑ کی آوازیں رات کے سنانے میں

پہرے دار نے اسے یقین دلایا۔ ”جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کروں گا۔ پر مجھے بھی رہا کر دینا۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”میں یہاں بندھا ہوا رہا تو زمین دار اور اس کا منشی مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

اس نے اللہ دتا کی طرف اشارہ کیا۔ ”میراں خاں راکھے نے یہاں سے نکل جانے میں اس کی اور دو کیدیوں کی مدد کی تھی۔ اس پر منشی نے پچھلے دنوں میراں خاں کو قتل کرا دیا اور اس کی لاش جال کے درخت کے نیچے دبا دی۔ مشہور کر دیا اسے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی کرے گا۔“

لالی نے اسے باور کرایا۔ ”پروا نہ کر، تجھ سے جو وعدہ کیا ہے، پورا کروں گا۔“

لالی نے اللہ دتا سے رانقل لے کر اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ اللہ دتا کو چوکس رہنے کی ہدایت کی۔ اسے پہرے دار کی نگرانی پر مامور کیا اور اللہ دینو کے ہم راہ قید خانے کے اندر چلا گیا۔ اللہ دینو لالٹین اٹھائے آگے آگے تھا۔ لالی اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

لالی نے عمارت میں داخل ہو کر دیکھا۔ اندر بہت وسیع صحن تھا۔ اس میں دو طرف سلسلے سے تنگ و تار یک کوٹھریاں تھیں۔ نہ کسی کوٹھری میں کھڑکی تھی نہ روشن دان تھا۔ کوٹھریوں کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس پر پھوس کی خمیدہ چھت تھی۔

قید خانے میں ہر طرف بدبو اور سڑنا پھیلی تھی۔ شام کو جب تمام قیدی ایک بار بند کر دیے جاتے تو کسی کو باہر جانے کی مطلق اجازت نہ ہوتی۔ رات کو وہ صحن ہی کے ایک حصے میں پیشاب اور رفع حاجت کرتے تھے جسے صاف کرنے کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ قید خانے کی تمام عمارت کا تھی اور اس کی دیواریں شور زدہ تھیں۔

قید خانے میں اس وقت ۴۳ قیدی تھے۔ وہ برآمدے میں مونچ کی بوسیدہ اور کھردری چٹائیاں لیٹے تھے۔ ان کے پاس نہ تکیے تھے اور نہ اوڑھنے کے لیے چادریں تھیں۔ ویسے گرمی شروع ہو چکی تھی۔ چٹائیوں میں کھٹل تھے۔ قیدی اپنی کمر اور ٹانگیں بار بار کھجاتے۔ وہ خوف زدہ اور گھبرا ہوئے نظر آتے تھے۔

قیدی جوڑیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ان کے ایک ایک پیر میں لوہے کے کڑے پڑے تھے۔ کڑوں کے درمیان فٹ بھر کی زنجیر تھی اور ان میں تالے لگے تھے۔

لالی ہاتھ میں رانقل سنبھالے ہوئے تمام قیدیوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ تمام قیدی خاموش بیٹھے رہے۔ انھوں نے کوئی بات نہیں کی۔ لالی ان کا معائنہ کر چکا

ابھر رہی تھیں۔

لالی اور اللہ دینو پیردار کے پاس چلے گئے۔ اس کے ہاتھ اور پیرسی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے عین سامنے کچھ فاصلے پر اللہ دتا کھڑا تھا۔

لالی کو دیکھ کر پہرے دار نے حیرت سے پوچھا۔ ”توں بھٹیوں کی توڑ پھوڑ کیوں کروا رہا ہے؟“
لالی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اللہ دتا اور دینو سے کہا۔ ”تم دونوں بھی کدالیں لے کر کھدائی میں لگ جاؤ۔ کام پختی نال ہونا چاہئے۔ ابھی بہت دور جانا ہے۔“
اللہ دتا نے کہا۔ ”میں تو کتا ہوں‘ توں بھٹیوں شیوں کے چکر میں نہ پڑ۔ ہم نے اب پختی نال یہاں سے نکل جانا چاہئے۔“

”بچ میں ٹانگ نہ اڑا۔“ لالی نے اسے ڈانٹا۔ ”جیسا کتا ہوں‘ ویسا کر۔“

اللہ دتا خاموش ہو گیا اور اللہ دینو کے ہم راہ کدالیں لینے سانبان کی جانب چلا گیا۔ لالی نے رانقل ایک طرف رکھی‘ الٹی چارپائی اٹھا کر بچھائی۔ رانقل سنبھالی اور چارپائی پر چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ توڑ پھوڑ کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ طے سے گردوغبار اڑا کر پھیل رہا تھا۔ پہرے دار سر جھکائے لالی کے سامنے فرش پر خاموش بیٹھا تھا۔

رات کا اندھیرا بڑھتا گیا۔ کدالیں چلنے اور لمبے گرنے کی آوازیں سنائے میں ابھرتی رہیں۔ آخر آوازیں بند ہو گئیں۔ خاموشی چھا گئی۔ قیدی ٹولیوں میں بکھرے ہوئے لالی کے قریب آئے۔ لالی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ دتا آگے آگے تھا۔
لالی نے پوچھا۔ ”ساری بھٹیاں توڑ ڈالیں؟“

”ہاں جی۔“ اللہ دتا نے جواب دیا۔ ”جا کر دیکھ لے‘ سب توڑ کر برابر کر دیں۔“

قیدی اس کے سامنے ہجوم کی صورت میں چپ کھڑے تھے۔ لالی نے لالین کی روشنی میں انھیں دیکھا۔ سب کے چہرے اور بال گردوغبار سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں دبی تھیں۔

لالی نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے ہدایت کی۔ ”کدالیں وہیں رکھ دو جہاں سے اٹھا کر لائے تھے اور جدھر تمہارا جی کرے‘ چلے جاؤ۔“

ان کے چہروں پر مسرت پھیل گئی۔ وہ مسکراتے ہوئے سانبان کی طرف چلے گئے۔ ذرا دیر بعد سانبان کے نیچے کدالیں رکھنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لالی نے لالین کی ہلکی ہلکی روشنی میں دیکھا۔ قیدی سانبان کے نیچے سے ٹولیوں میں باہر نکلے اور تیز قدم اٹھاتے مختلف سمتوں میں

چلے گئے۔ کچھ دیر تک وہ دھندلی دھندلی پرچھائیوں کی مانند نظر آتے رہے‘ پھر رات کے اندھیرے میں گم ہو گئے۔

بیگار کیمپ پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ اللہ دتا اور دینو موجود تھے۔ وہ لالی کے قریب کھڑے تھے۔ لالی نے اللہ دتا کو پہرے دار کی نگرانی پر مقرر کیا اور اللہ دینو کے ساتھ سانبان کی جانب بڑھا۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی بھٹیوں کا لمبا بکھرا ہوا تھا۔ اللہ دینو ہاتھ میں لالین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ سانبان کے قریب پہنچ کر لالی رک گیا۔ اس نے اللہ دینو سے پوچھا۔

”کلراٹھی پر شورہ لے جانے کے لیے اوٹھ بھی رہتے ہیں‘ ان کا ڈھارا کتنے ہے؟“

”اتھ ہے۔“ اللہ دینو نے عمارت کے پچھواڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”پر سارے اوٹھ تو آج شورہ لاد کر ٹیشن چلے گئے۔ سویرے واپس آئیں گے۔“

”تیرا مطلب ہے‘ اب ڈھارے میں کوئی اوٹھ نہیں رہا؟“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔ آج بہت مال بھیجا گیا تھا۔“

”مجھے ڈھارا تو دکھا۔ شاید کوئی اوٹھ مل جائے ورنہ صبح تک ہم تینوں داؤد پور کیسے پہنچ سکیں گے؟“ لالی کچھ پریشان نظر آنے لگا۔

دونوں عمارت کے عقب میں گئے۔ جال کے ایک درخت کے قریب مٹی کی اونچی اونچی دیواروں پر چھپر کی چھت تھی۔ یہ اونٹوں کا باڑا تھا۔ دونوں اس طرف بڑھے۔ لالین کی روشنی میں انھیں دو اونٹ چھپر کے نیچے بیٹھے نظر آئے۔ لالی کے چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

”کام بن گیا۔ تجھے اوٹھ کی سواری آتی ہے؟“

”کیوں نہیں آتی جی۔ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے۔ میں تو بچپن سے اوٹھ چلا رہا ہوں۔“

”اللہ دتا بھی جانتا ہوگا؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”بالکل جانتا ہے جی۔ وہ تو کئی مہینے اوٹھ چلانے والا جتوال بھی رہ چکا ہے۔“ اللہ دینو نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”دونوں اوٹھ کھول کر باہر نکال لوں؟ ان پر بیٹھ کر نکل جائیں گے۔ اب زیادہ دیری نہیں کرنی چاہئے۔“

”ابھی نہیں۔ پہلے میرے ساتھ اس طرف چل جہاں کلراٹھی کا سامان رکھا جاتا ہے۔“

اللہ دینو خاموش رہا۔

دونوں ایک بار پھر سانبان کی جانب چلے۔ وہاں کدالیں اور پیچھے رکھے تھے۔ مٹی کے تیل کے دو پیٹے بھی تھے۔ پیٹے پرانے کپڑے اور بہت سا کاٹھ کباڑ تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ خالی

بوریوں کا ڈھیر تھا۔ شورے اور تپتی سے بھری ہوئی بوریاں بھی تھیں، مگر زیادہ نہیں تھیں۔

لالی نے اللہ دینو کی مدد سے مٹی کے تیل کے پیپے سائبان سے نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اس کے بعد وہ اللہ دینو کے ساتھ پہرے دار طور محمد لکھیر اور اللہ دتا کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پیرداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اللہ دتا سے کہا۔ ”اس کے ہاتھ اور پیر کھول دے۔“ اللہ دتا اس کے ہاتھ پیر کھولنے لگا۔ پہرے دار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے رات نقل اس کی جانب کرتے ہوئے کہا۔ ”تو بھی بھاگ جا۔“

پہرے دار چپ چاپ اٹھ کر ایک طرف چل دیا۔ لالی، رات نقل سنبھالے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ کچھ دور جا کر اس نے ڈانٹا۔ ”زنائیوں کی چال نہ چل۔ دوڑ لگا۔“ پہرے دار تیزی سے بھاگا اور اندھیرے میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

لالی نے واپس آ کے اللہ دتا اور اللہ دینو سے کہا۔ ”ڈھارے میں جا کر دونوں اوٹھ باہر نکال لو۔“ اس نے جال کے ایک درخت کی جانب اشارہ کیا جو بیگار کیپ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ ”تم دونوں اوٹھ اٹھ لے جاؤ اور میرا انتظار کرو۔ میں نوں ابھی ایک کام اور کرنا ہے۔ میں جیتیتی نال تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

دونوں بھائی اونٹوں کے باڑے کی طرف چلے گئے۔ لالی سائبان کی سمت بڑھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رات نقل اور دوسرے میں لالین تھی۔ اس نے رات نقل ایک طرف میدان میں رکھ دی۔ سائبان کے نیچے گیا۔ وہاں سے پھٹے پرانے کپڑے اور خالی بوریاں نکالیں۔ انھیں اٹھا کر باہر لایا۔ مٹی کے تیل کے پیپے کھولے۔ تیل پھٹے پرانے کپڑوں اور بوریوں پر چھڑکا۔ لالین ہاتھ میں لی اور تیل سے بھیگی ہوئی دو بوریاں اٹھا کر قید خانے کی عمارت میں گیا۔ لالین کی چینی اوپچی کی اور اس کی لو سے ایک جیتھڑا جلایا۔ جلتے ہوئے جیتھڑے سے اس نے ایک بوری میں آگ لگائی اور جلتی ہوئی بوری برآمدے کے چھپر کی جانب اچھال دی۔ چھپر جلنے لگا۔ لالی نے دوسری بوری میں بھی آگ لگائی اور دالان میں بھی ہوئی مونج کی چٹائیوں پر ڈال دی۔ اس نے چینی نیچے کی اور لالین اٹھائے باہر نکل آیا۔

لالی نے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑوں اور بوریوں میں لالین کے ذریعے آگ لگائی اور انھیں جلدی جلدی کو ٹھروں کی چھتوں پر پھینک دیا۔ کچھ جلتے ہوئے کپڑے سائبان کے نیچے رکھے ہوئے سامان پر ڈال دیئے، کچھ جلتی ہوئی بوریوں سے دروازوں میں آگ لگا دی۔ اس نے رات نقل اٹھائی۔ لالین ہاتھ میں لٹکائی اور اونٹوں کے باڑے میں پہنچا۔ تیل سے بھیگی ہوئی ایک بوری میں اس نے

آگ لگائی اور اسے پھوس کی بنی ہوئی باڑے کی چھت پر پھینک دیا۔ لالین اس نے چھت کے نیچے بکھری ہوئی خشک گھاس پر ڈال دی اور تیز تیز قدموں سے جال کے اس درخت کی جانب لپکا جہاں اللہ دتا اور دینو اونٹوں کے ساتھ کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اللہ دتا نے لالی کو اپنے ساتھ اونٹ کی پیٹھ پر بٹھایا، دوسرے اونٹ پر اللہ دینو سوار ہوا۔ دونوں نے اونٹ آگے بڑھائے اور تیز رفتار سے دوڑانے لگے۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ بیگار کیپ کے درو دیوار جل رہے تھے۔ سرخ سرخ شعلے بھڑک رہے تھے۔ دیواریں چنچ رہی تھیں، چنگاریاں اڑ رہی تھیں۔ ہر طرف آگ ہی آگ پھیلی تھی۔ دھوئیں کے سیاہ بادل فضا میں پھیلنے جا رہے تھے۔



دونوں اونٹ داؤد پور میں داخل ہوئے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ اللہ دتا نے اونٹ اپنے گھر کے سامنے ٹھہرائے۔ تینوں نیچے اترے۔ اللہ دتا نے آگے بڑھ کر تالا کھولا۔ وہ اندر داخل ہو گئے۔ اللہ دتا کے تینوں بچے گھر میں نہیں تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے وہ انھیں بیوی کے پاس چھوڑ گیا تھا۔ یہ مٹی کا بنا ہوا چھوٹا سا گھر تھا۔ اس میں صرف ایک کمرہ اور دو کوٹھریاں تھیں۔ اللہ دینو نے گھر پہلی بار دیکھا تھا۔ مگر وہ بالکل خاموش تھا۔

اللہ دتا نے کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر بستر بچھا دیا، لالی کے پاس آیا۔ ”تو اب سو جا۔ تھکا ہوا بھی ہے اور رات بھر جاگا ہے۔“ لالی نے کچھ نہیں کہا۔ وہ کمرے میں گیا اور نڈھال ہو کے بستر پر لیٹ گیا۔ دوپہر کو اللہ دتا نے اسے جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ دتا اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”بہت سولیا، اب روٹی کھالے۔“

لالی خاموشی سے نیچے اتر آ۔ اللہ دتا کے ساتھ صحن میں گیا۔ منہ دھویا، کٹی کی اور کمرے میں واپس آ گیا۔ ابھی تک اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں چنگیری تھی۔ اس میں روٹیاں تھیں۔ دوسرے ہاتھ میں دال سے بھرا ہوا پیالہ تھا۔

اس نے چنگیری اور پیالہ فرش پر بھیجی ہوئی چٹائی پر رکھ دیا اور دوپٹے کا پلو سر سے کھینچ کر آگے گر لیا۔ وہ ایک طرف ہو کر کھڑی ہو گئی۔

اللہ دتا نے کہا۔ ”یہ سرداراں ہے، میری گھر والی۔“

لالی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگت گیندے کے

تھی۔“

لالی ان دنوں کی نوک جھونک نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”سرداراں! میری بٹش شرٹ اور پتلون دھو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں دھو سکتی۔“ اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”تو نے اللہ دتا کی اتنی مدد کی۔ میں تیرے لیے کیا نہیں کر سکتی۔ کپڑے اتار کر چدڑیا دھوتی باندھ لے۔ میں تیرے کپڑے دھو کر دھوپ میں ڈال دوں گی۔ شام تک سوکھ جائیں گے۔ پہن لیتا۔“

”اللہ دتا تیرے بارے میں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ تو زبردست اہری ہے۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کوئی چدڑیا اللہ دتا کی دھوتی لا دے۔ میں اپنے کپڑے اتار کر دھونے کے لیے تجھے دے دوں گا۔“

سرداراں باہر چلی۔ لالی اور اللہ دتا کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ لالی نے بٹہ نہیں نکالا۔ جب سے تیس روپے کے کھلے ہوئے نوٹ نکالے اور اللہ دتا کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ”اتنے روپے سے کام چل جائے گا؟“

اللہ دتا نے نوٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”چل تو جانا چاہئے۔“

سرداراں، ملگجی سی دھوتی ہاتھ میں دبائے اندر آئی اور لالی کو دے دی۔ اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ لالی نے بٹش شرٹ اور پتلون اتار کر دھوتی باندھ لی اور اللہ دتا سے کہا۔ ”یہ کپڑے دھونے کے لیے سرداراں کو دے دے۔ بازار جا اور جو کچھ میں نے بتایا ہے، خرید لا۔ میں تب تک سوتا ہوں۔ مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔“

اللہ دتا نے لالی کے میلے کپڑے اٹھائے اور باہر جانے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ ”اندھیرا ہوتے تو میں تیرے ساتھ جما گلیہر چلوں گا۔ لے چلے گا؟“

”کیوں نہیں لے چلوں گا؟“ اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ ”جما گلیہر کیا، جہاں کسے وہاں لے چلوں گا۔ اب تو میرے پاس ایک چھوڑا دوٹھ ہیں۔“

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اسے مشورہ دیا۔ ”دونوں اوٹھ جتنی تھمتی ہو سکے، بیچ دے۔ انھیں رکھنا ٹھیک نہیں۔ نور علی کھوکھر کے کرندے تیری تلاش میں ہوں گے۔ وہ اوٹھوں سے تیرا پتہ چلائیں گے۔ اس دفعہ وہ تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ تجھے اور اللہ دتا، دونوں کو مار کے گھر میں آگ لگا دیں گے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہے۔“ اللہ دتا سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”کھوکھر بہت ظالم ہے۔ وہ ضرور مجھ پر حملہ

پھول کی طرح زردی مائل تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روش تھیں، چہرہ بیضوی تھا، جسم بھرا ہوا گداز اور سڈول تھا۔ وہ خوش شکل عورت تھی مگر اپنے سن سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔ سرداراں نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ وہ کسی طور اتنی تیز اور ہوشیار نظر نہیں آتی تھی جیسا اللہ دتا نے بتایا تھا وہ سیدھی سادی عام دیہاتی عورت تھی۔

لالی نے مسکرا کر قریب کھڑے ہوئے اللہ دتا کو دیکھا اور سرداراں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اسے سرگانے سے چھڑا کر کب لایا؟“

”سویرے ہی سویرے سارے گھر پہنچا۔ اس کے ہزار روپے واپس کئے اور سرداراں کو لے آیا۔ بچے بھی آگئے، باہر کھیل رہے ہیں۔“

لالی نے پوچھا۔ ”تو سویا نہیں؟“

”کیسے سوتا؟ میں نے کئی کام کرنے تھے۔“ وہ کھانے کے سامنے چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ”پہلے روٹی کھالے۔ آرام سے باتیں کریں گے۔“ لالی بھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سرداراں باہر چلی گئی۔ لیکن ذرا ہی دیر بعد دو کٹوروں میں لسی لے کر واپس آگئی۔ لالی اور اللہ دتا کھانا کھانے لگے۔ لالی نے لسی کا گھونٹ بھرا اور کٹورا رکھتے ہوئے بولا۔ ”داؤد پور تو مضع لگتا ہے۔“

”بالکل موضع ہے جی۔“ اللہ دتا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”یہاں پڑاری ہے۔ تین زمیں دار رہتے ہیں۔ ان کی اونچی اونچی ماٹیاں ہیں۔ سارے بھی اپنی ماٹیاں بھولی ہے۔ بچوں کی پڑھائی کا سکول بھی ہے۔ داؤد پور میں دکانیں ہیں۔ بازار ہے۔ اس موضع کے کئی پنڈ ہیں۔“

”اللہ دتا! تو مجھے بازار سے ایک دھوتی، ایک چدڑا، جو تارے برباندھنے کی پگڑی لا دے۔ جما گلیہر اتنا وڈا نہیں ہے۔ وہاں یہ چیزیں نہیں ملتیں اور ہاں روپے رکھنے کے لیے میانی بھی چاہئے۔ مل جائے گی؟“

”مل جائے گی اور بھی چیزیں مل جائیں گی۔“ یہ کہتے کہتے اس نے سرداراں کی طرف دیکھا۔ ”بازار جا کر یہ چیزیں خرید لا۔“ وہ مسکرایا۔ ”تو سستا ہی خرید کر لائے گی۔ دکان داروں سے مول تول پر جھگڑا بھی کر سکتی ہے۔“

”میں تو کسی سے جھگڑانا نہیں کرتی۔“ سرداراں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”تجھ سے جھگڑا کرتی ہوں؟ ایمان نال بتا، جو کہتا ہے، وہ کرتی ہوں۔“

”کرام بھری نراض کیوں ہوتی ہے؟“ اللہ دتا مسکرا کر بولا۔ ”میں نے تو ایسے ہی گل بات کی

کرائے گا۔ پتہ ہے، وہ کتنا ظالم ہے؟“

”داؤد پور بھی چھوڑ دے۔ کسی اور طرف نکل جا۔“ لالی نے خبردار کیا۔ ”یہاں رہے گا تو تیرے لیے ہر دھت خطرہ ہی رہے گا۔ کھوکھراں یہاں سے دور تو ہے پر بہت زیادہ دور نہیں، ایک ہی تحصیل ہے۔“

اللہ دتا خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے کہا۔ ”حاصل پور میں سرداراں کی ایک پھپھی ہے، اس سے پیار بھی کرتی ہے۔ اس کے پاس بھی جاسکتا ہوں۔ حاصل پور تو بھاول نگر میں ہے۔ میں وہاں جاتا رہتا ہوں۔“

”اوٹھ بیچ کر مل خرید لینا۔ کسی زمیں دار کا مزارع بن جانا۔“ لالی نے اللہ دتا کا سما ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”آج ہی رات اللہ دینا اور بال بچوں کے ساتھ دونوں اوٹھ لے کر یہاں سے نکل جا۔ رستے میں اوٹھ بیچ دیتا۔“

اللہ دتا نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”ایسا ہی کروں گا۔ تیس نوں جمائیکو چھوڑ کر واپسی پر حاصل پور نکل جاؤں گا، سرداراں سے کتا جاؤں گا، چلنے کی تیاری کر لے۔“ اللہ دتا چلا گیا۔ لالی بستر پر لیٹ کے سو گیا۔

شام کو لالی بیدار ہوا۔ کمرے میں چراغ روشن تھا۔ سرداراں دبیز خاموش بیٹھی تھی۔ لالی اٹھ کے بیٹھ گیا۔ سرداراں مسکرا کر بولی۔ ”تو سوتا بہت ہے۔ اللہ دتا تو بالکل نہیں سویا۔ تیری ساری چیزیں بازار سے لے آیا۔ میں نے تیرے کپڑے لٹے بھی دھو دیئے، سوکھ بھی گئے۔ یہ سامنے پڑے ہیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کے چٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

لالی نے دیکھا، چٹائی پر پتلون اور بٹش شرٹ کے علاوہ ویسی جوتوں کی ایک جوڑی، دھوتی، چادر اور ہیمانی رکھی ہے۔ لالی بستر سے اتر کر نیچے آگیا اور انگڑائی لے کر بولا۔

”سب ہی کچھ آگیا۔ اللہ دتا بہت کام کا بندہ ہے۔“

”پر دوسری کمیص تو تیرے پاس ہے نہیں۔ اللہ دتا کے پاس ایک پرانی کمیص پڑی ہے، پر بہت پھٹ گئی۔ تو اسے پن نہیں سکتا۔ میں سارے کے گھر سے ایک کمیص مانگ کر لائی ہوں۔ ہے تو وہ بھی پرانی پر پھٹی ہوئی نہیں ہے۔ یہ رہی۔“ اس نے زانو پر پڑی ہوئی قیص لالی کے سامنے ڈال دی۔

لالی نے قیص الٹ پلٹ کے دیکھی۔ ”ٹھیک ہی ہے۔ یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔“ لالی کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”سرداراں! تو بہت کام کی زنانی ہے۔ اللہ دتا نصیبوں والا ہے کہ

اسے تیری ایسی اہری اور سمجھ دار گھروالی ملی۔“

”کیا کریں جی! ہنسی خوشی علی شاہ میں رہتے تھے۔“ وہ بچھے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”کھوکھرا کا بیڑا گرک ہو۔ اس نے ہمیں تباہ کر دیا، کچھ بھی نہیں رہا۔ اللہ دتا حاصل پور چلے کوکتا ہے، پر اپنے پاس تو کھانے کو بھی نہیں۔ تجھ سے تو کوئی بات چھپی ہوئی نہیں ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے۔ اللہ دتا مجھے بتا چکا ہے، تیری اس سے کیا کیا بات ہوئی۔ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔“

لالی نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جب سے بڑا نکالا۔ سو روپے کا ایک نوٹ کھینچ کر انگلیوں میں دبایا۔ سرداراں کی جانب بڑھا کے گویا ہوا۔ ”لے یہ رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔ اوٹھ بک گئے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے اللہ دتا سے یہی کہا ہے۔“

سرداراں نوٹ لیتے ہوئے بولی۔ ”تو نے پہلے ہی ہماری بہت مدد کی ہے۔ اللہ دتا کی مدد نہ کرتا تو جانے میں کب تک سرگائے پر سناڑ کے گھر میں بندھک رہتی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”دن بھر اس کی ماٹی میں کام کاج کرتی تھی۔ سناڑ کی گھروالی بھلی زنانی نہیں ہے۔ مجھے بالوں سے کچڑ کھارتی۔ نوچتی کھسوٹی، چیخ چیخ کر گالاں نکالتی۔“ سرداراں کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔

”رونا دھونا چھوڑ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تو اب ٹرجا۔ میں ذرا کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤں۔ شام ہو گئی، مجھے اللہ دتا کے ساتھ جمائیکو جانا ہے۔“

سرداراں چلی گئی۔ لالی نے قیص پہنی، دھوتی باندھی۔ سر پر پگڑی لپیٹی۔ جوتے پہنے اور وضع قطع سے دیہات کا رہنے والا پنڈو بن گیا۔ اس نے ہیمانی میں بڑے سے روپے نکال کر رکھے اور اسے کمر کے گرد مضبوطی سے باندھ لیا۔ تھوڑے سے روپے رکھ کر بڑے قیص کی جیب میں ڈال لیا۔

اس نے کونے میں رکھی ہوئی رائفل اٹھائی۔ اس میں بھرا ہوا کارتوس نکال کر میگزین میں لگا دیا۔ رائفل اپنے کپڑوں میں لپیٹی، چادر پر رکھی اور لمبی سی گٹھری بنائی۔ یہ تیاری کر کے وہ اللہ دتا کا انتظار کرنے لگا۔

باہر صحن میں شام اتر آئی تھی۔ اندھیرا دھیرے دھیرے بڑھتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اللہ دتا آگیا۔ اس کے پیچھے ہی سرداراں کھانا لے کر آگئی۔ کھانے میں پرائیڈ اور تلا ہوا مرغ تھا۔ سرداراں نے مرغ کی طرف اشارہ کر کے لالی سے کہا۔

”یہ ٹکڑیوں نے تیرے ہی لیے تیار ہے۔“

اللہ دتا نے مسکرا کر کہا۔ ”میرے لیے نہیں؟“

”توں بھی کھا لیتا۔“ وہ شرمائی۔ ”ویسے یہ تیرا بھی مسمان ہے۔ توں مجھ سے الگ تو نہیں ہے۔“

وہ ذرا دیر بعد چلی گئی۔

لالی کو بھوک نہیں تھی۔ اس نے تلے ہوئے مرغ سے تھوڑا گوشت نوج کر کھایا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ اللہ دتا نے اصرار بھی کیا۔ مگر اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اللہ دتا کھانا کھاتا رہا۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوا تو لالی اور اللہ دتا گھر سے باہر چلے گئے۔ دروازے کے قریب ہی اونٹ موجود تھا۔ اللہ دتا نے ساری تیاری پہلے ہی مکمل کر لی تھی۔ اندھیرا خاصا بدھ گیا تھا۔ دونوں اونٹ پر سوار ہوئے اور جمائیکہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اللہ دتا کا اندازہ غلط تھا۔ جمائیکہ بارہ نہیں، سترہ میل سے بھی زیادہ فاصلے پر تھا۔ جب وہ جمائیکہ پہنچے تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ لالی گاؤں سے دور اتر گیا۔



جمائیکہ میں داخل ہو کر لالی نے چوکنٹا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور ہستی کی جانب بڑھنے لگا۔ رانفل گھڑی میں بندھی ہوئی اس کی پشت پر لٹک رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ نیم کے درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑا تھا۔ گاؤں پر گہری خاموشی چاری تھی۔ کہیں کہیں مکانوں میں چراغوں کی روشنی ٹٹمٹما رہی تھی۔ جب دیر تک کوئی آہٹ اور آواز نہیں ابھری تو وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا شاداں کے گھر کے قریب پہنچا اور آنگن کی چار دیواری سے لگ کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے اچھل کر دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑی اور اوپر پہنچ گیا۔ وہ چند لمحوں تک دیوار سے چمٹا ہوا لیٹا رہا۔ آنگن بالکل سنسان تھا۔

لالی دھیرے سے نیچے اتر آ۔ آنگن میں پہنچ کر سب سے پہلے اس نے دالان کی جانب دیکھا۔ دالان کے ایک کونے میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی لودھم تھی۔ دالان میں چارپائی بچھی تھی اس پر کوئی سو بھی رہا تھا۔

لالی ہولے ہولے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ بستر کے قریب گیا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ شاداں ہے۔ شاداں بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ لالی نے پشت پر لٹکتی ہوئی گھڑی اتار کر دالان میں ایک طرف رکھی۔ ایک بار پھر شاداں کے نزدیک گیا اور اسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ شاداں نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور خوف و حیرت کے طے جلعے لہجے میں بولی۔ ”لالی! وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔“

لالی نے کمرے کے بند دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”اندروں کوئی نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ وہ اپنے بکھرے ہوئے بال سمیٹ کر جوڑا باندھتے ہوئے بولی۔ ”میرے سوا گھر میں کوئی نہیں ہے۔“

لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”اب کس لیے آیا ہے؟“

”تو کہتی ہے تو نہیں آؤں گا۔“

”یہ بات نہیں۔“ شاداں نے آہستہ سے بتایا۔ ”پولٹے تیری تلاش میں دو بار یہاں آچکے ہیں تھانیدار نے بھی ایک روز مجھے بلایا تھا۔ تیں نوں پتہ ہے، وہ ملک کا بھرا ہے۔ اس نے ڈرایا دھمکایا، اٹلے سیدھے سوال کر کر کے میرا مگر خراب کر دیا۔“

”تو نے کیا کہا؟“

”کہنا کیا تھا۔“ شاداں نے جواب دیا۔ ”میں نے ہر بار یہی کہا، وہ بالے کا یار ہے۔ اسی سے ملنے آیا تھا۔“

”بالے کے بارے میں تو کچھ نہیں پوچھا؟“

”کیوں نہیں پوچھا۔ پر میں نے یہی کہا، مجھے کیا پتہ، وہ کہاں ہے؟ وہ تو تین مہینے سے اوپر ہو گئے، میرے پاس آیا نہیں۔ تاجی جانتی ہوگی۔ بالے اسی کے پاس رہتا تھا۔ اس نے ویسا بھی کر لیا تھا۔“

”تاجی کہاں ہے؟“

”اس کا بھرا کراچی سے آیا ہے۔ وہ اسی کے پاس رہتی ہے۔ کہتی تھی، کراچی جاؤں گی۔ بالے وہیں گیا ہے۔“

چل، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تاجی کا تیرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں تھا۔“

”نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہوا۔“ شاداں نے بکھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں چاہتی تھی، وہ میرے ساتھ رہے۔ اس کے بچہ پیدا ہو۔ وہ بالے ہی کا تو ہو گا۔ میں اسے پالتی، اپنے پاس رکھتی۔“

”تجھے اپنے بچے یاد نہیں آتے؟“

”یاد کیوں نہیں آتے۔“ شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”پر جس دن میں نے بالے کے سنگ گھر جھوڑا، اسی دن بچوں کو بھی چھوڑ دیا۔ اب وہ میرے پاس کیسے آسکتے ہیں؟“

”کیسے نہیں آسکتے۔“ لالی نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بچھلے دنوں تیرا کھسم آیا تھا، بچے بھی

آئے ہوں گے۔ ان میں سے کسی کو اپنے پاس رکھ لیتی۔ گھر میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ تیرا جی نہیں گھبراتا؟“

شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جی تو بہت گھبراتا ہے پر میرا گھروالا مانے گا نہیں۔ کہتا تھا، میرے ساتھ چل۔“

”جلی جا اس کے پاس۔ یہاں کب تک اکیلی پڑی رہے گی۔ اب تو بالے بھی نہیں رہا جس کے لیے تو نے گھریا چھوڑا، بچے چھوڑے۔“

شاداں نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی بھی ذرا دیر خاموش رہا۔ اس نے اصرار کر کے پوچھا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

مگر شاداں نے پھر بھی جواب نہ دیا، بات کا رخ پلٹتے ہوئے بولی۔ ”تیں نوں پتہ نہیں، آج کل مجھ پر کیا بیت رہی ہے؟“

لالی نے کسی قدر پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیوں، کیا ہو گیا تجھے؟“

”مجھے تو کچھ نہیں ہوا پر بوری کا دودھ روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ گھبنے ہے۔“ وہ لمبے بھر خاموش رہی۔ ”تو ہی بتا، وہ دودھ دینا بالکل بند کر دے گی تو کیا ہوگا۔ اسے کہاں سے کھلاؤں گی اور اپنا گزارہ کیسے کروں گی؟ مجھے ہر دم یہی فکر رہتی ہے۔“ شاداں غم زدہ ہو گئی۔

مگر لالی ذرا بھی متاثر نہ ہوا، مسکرا کر بولا۔ ”پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پہلے مجھے روٹی ملے۔ سخت بھوک لگی ہے۔“

”شام کو تو میں نے کچھ پکایا نہیں۔ دن کی روٹی پڑی ہے، کسے تو لے آؤں؟“

”لے آ، پر جھیتی نال۔“

شاداں خاموشی سے اٹھی، کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالین کی لواؤں کی۔ چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے سے چنگیری آتاری اور لا کر لالی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں دو روٹیاں تھیں۔ لالی نے روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور اسے چبانے لگا۔ شاداں نے اسے روکھی روٹی کھاتے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ ”بہت کھکھا لگتا ہے۔ روکھی روٹی کیسے کھائے گا۔ ذرا صبر کر۔“ وہ دالان سے نکل کر آنگن میں چلی گئی۔

لالی ایک کے بعد دوسرا لقمہ چبا تا رہا۔ ذرا دیر بعد شاداں واپس آئی۔ وہ پیالے میں مکھن لے کر آئی۔ دوسرے ہاتھ میں پیاز کی گٹھی تھی۔ اس نے مکھن اور پیاز لالی کے سامنے رکھ دی۔ ”گھر میں

اور کچھ نہیں تھا۔ یہی ملا، پر اس سے کام چل جائے گا؟“ اس نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ ”مجھے تو دھیری فصاحت کرتا ہے۔ کبھی یہ بھی سوچا، تیرا کام اس طرح کب تک چلے گا؟“

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے مسکرا کر شاداں کی جانب دیکھا، مگر کوئی بات نہیں کی۔ چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ دونوں روٹیاں، مکھن اور پیاز سب چٹ کر گیا۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے شاداں سے پانی منگوایا اور ایک ہی سانس میں پورا گلاس غناغٹ پی گیا۔ وہ شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔

”اب بتا، کیا کہہ رہی تھی؟“

”کہتا ہے۔“ شاداں نے لالین کی لودھی کی۔ اسے کونے میں رکھا اور لالی کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تو سوچ تیرا کیا بنے گا؟ کب تک پولیس سے چھپتا پھرے گا۔“

”میری فکر نہ کر۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”پہلے اپنے بارے میں سوچ۔“

”وہ تو میں ہر دکت سوچتی رہتی ہوں۔“ شاداں نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”جب سے تیری لائی ہوئی بوری کے گھبنے ہونے کا پتہ چلا ہے، میرا تو سوچتے سوچتے برا حال ہو گیا۔“

”مجھے پکڑوا دے۔ دو ہزار روپے انعام ملے گا۔“

شاداں نے غصے سے لالی کو دیکھا۔ ”تیرے دل میں ابھی تک میل ہے۔ مجھے تیری یہ گل بالکل بند نہیں۔ تو یہاں نہ آیا کر۔ کسی روز دوڑ آگئی۔ پولیس نے تجھے پکڑ لیا تو یہی سمجھے گا، میں نے پکڑوا دیا۔“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر ترش روٹی سے کہا۔ ”تیری باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے، ضرور یہی سمجھے گا۔ رب سوں.....“

لالی نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”اب چپ بھی کر، بہت کہہ لیا۔“ لالی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سچ بتا، تو مجھے کیسا بندہ سمجھتی ہے؟“

”تو برا بندہ نہیں، حوصلے والا بھی ہے پر.....“

لالی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نوں پتہ ہے، تو کیا کہتا چاہتی ہے۔“

شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لالی بھی ذرا دیر چپ رہا۔ اس نے کمرے بندھی ہوئی ہسیانی مٹائی اور دو ہزار روپے نکال کر شاداں کو دیتے ہوئے بولا۔ ”لے، ان سے دوسری خرید لیتا۔“

شاداں نے روپے ہاتھ میں لے لیے۔ چند لمبے حیرت سے لالی کا منہ دیکھتی رہی۔ اس نے دریافت کیا۔ ”اسنے ڈھیرے روپے کہاں سے لے آیا؟“ اس نے تامل کیا۔ ”چوری کی ہوگی؟“

”چوری چکاری تو میں نے بہت کی ہے۔ پر اس دفعہ چوری نہیں کی، ایک زانی کا سودا کیا تھا۔“

بانگی سجلی تار تھی۔ ایسی سوہنی کہ تجھے کیا بتاؤں۔“

شاداں نے جھنجلا کر لالی کو دیکھا۔ ”تو جانگی ہے، یہ تو میں جانتی ہوں۔“ اس نے تیوری پر ہل ڈال کر کہا۔ ”جانگی ہو کر چوری چکاری کر سکتا ہے پر تو یہ دھند ابھی کرتا ہے، یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔“ وہ لمحے بھر کی اور ہاتھ میں دبے ہوئے روپے لالی کی جانب پھینک کر بولی۔

”مجھے ایسے روپے نہیں چاہئیں۔ میں تجھے ایسا بندہ نہیں سمجھتی تھی۔“ وہ چارپائی سے نیچے اتر کر لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”اب سبھی تو کیوں بار بار میرے پاس آتا ہے۔“ لالی نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”گل تو سن۔“

شاداں نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑا لیا۔ ”میں نے اب تیری کوئی گل بات نہیں سن نی۔“ اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ ”اٹھا اپنے روپے اور ابھی میرے گھر سے نر جا۔“

”اتنا نراض کیوں ہوتی ہے؟“ لالی بھی چارپائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تو میری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“

مگر شاداں کی برہمی کم نہ ہوئی۔ اس نے قبر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا اور تھکے لہجے میں کہا۔ ”تو مجھے کوم کا باہنی وال لگتا ہے۔“

”تو کوم کی بات کرتی ہے، میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں، میرا پیو کون تھا۔“ لالی بے نیازی سے مسکرا کر بولا۔ ”ویسے تو کہاں کی لنگریال ہے۔ کون سے تیرے گھر پر لنگر کھلے ہیں۔“

”لنگریال تو نہیں ہوں۔ پر میرا پیو داد خیا نے کا تھا۔“ شاداں نے فخر سے گردن اوٹپی کرنے ہوئے کہا۔ ”میں خیا نوں کی بیٹی ہوں۔“

”ہوگی، ضرور ہوگی۔“ لالی نے اسے متانے کی کوشش کی۔ ”پہلے میری بات تو سن لے۔“

”میں اب تیری کوئی بات نہیں سنوں گی۔“ وہ غصے سے ہانپ رہی تھی۔ ”دلا، بکھر، عورتوں کو بھگا کر چکلوں میں بیچتا ہے۔ بے گیت، آخ تھو۔“ اس نے حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔

لالی کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شاداں کو دیکھا۔ ”زیادہ کڑکڑ نہ کر۔ ورنہ۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”ورنہ کیا کرے گا؟“ شاداں کے لہجے میں زہر گھلا ہوا تھا۔ ”دلا گیری کرتا ہے، اوپر سے آنکھیں دکھاتا ہے۔“

لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ غصے سے بے قابو ہو کر بھڑکتا شعلہ بن گیا۔ اس نے ایک ہونٹ دانتوں میں دبا کر شاداں کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ ہاتھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ شاداں سنبھل نہ

سکی۔ لڑھکتی ہوئی دہلیز پر جا کے گری۔ اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے زور سے ٹکرایا۔ چند لمحوں تک وہ خاموش پڑی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ غصے سے ہانپتے ہوئے بولی۔

”میںاں سے چلا جا۔ نہیں تو چیخ چیخ کر سارے پنڈ کو اکٹھا کر لوں گی۔“

”سب کو اکٹھا کر لے۔ مجھے پکڑو دے، پر تو ایسی بات نہیں کہہ سکتی۔ میں ایسی گالی نہیں سن سکتی۔“ لالی نے اس کی دھمکی سے بے نیاز ہو کر کہا۔ ”میں چوری و دیکتی ضرور کرتا ہوں پر ایسا گندا

بھدا نہیں کرتا۔ اور یہ بھی سن لے، میں بالے نہیں ہوں۔ زنانی کی کمائی نہیں کھاتا۔ اسے دینا ہوتا ہوں، اس سے لینا نہیں جانتا۔“

شاداں دروازے سے بیٹھ نکائے خاموش بیٹھی رہی۔ لالی نے لالین کی دھندلی روشنی میں دیکھا، خون کی ایک پتلی دھار شاداں کے سر سے بہہ کر ماتھے اور کنپٹی پر پھیلتی جا رہی ہے۔ لالی کا

مارا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ تڑپ کر شاداں کی جانب بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے خون ہانچنے کے لیے ہاتھ بڑھا تو شاداں نے غصے سے جھٹک دیا۔ منہ بگاڑ کر بولی۔

”رہنے دے اپنا لاڈ۔ برا آیا، مہرا سا بن کر۔“

”پاگل نہ بن۔“ اس نے شاداں کا خون پونچھا تو اس کا ہاتھ ترہتر ہو گیا۔ لالی نے گھبرا کر کہا۔ ”تیرے تو بہت چوٹ آگئی۔“

شاداں چپ رہی۔ خون کے سرخ سرخ قطرے ٹپ ٹپ شاداں کے رخساروں پر گرتے رہے لالی نے جھٹ اس کا دوپٹا اتارا، جھٹکا دے کر جھرے پھاڑا اور اس کے ایک ٹکڑے سے خون

ماف کرنے لگا۔ مگر خون نہیں رکا۔ چوٹ گہری آئی تھی۔ لالی تیزی سے آنگن میں گیا۔ کنوڑے لہا پانی بھر کر لایا۔ اس نے دوپٹے کا ایک ٹکڑا اور پھاڑا۔ اسے پانی میں بھگو کر سراور رخساروں

سے خون صاف کرنے لگا۔ خون پونچھنے کے بعد اس نے زخم پر کپڑے کی گدی بنا کر رکھی اور دوپٹے اوجھڑے باقی بچا تھا، اسے سر سے پلیٹ کر پٹی باندھ دی۔ شاداں نے زبان سے ایک لفظ نہیں

نالا۔

لالی نے اس کا بازو تھام کر آہستہ سے کہا۔ ”چل، بستر پر لیٹ جا۔“

شاداں نے بے رخی سے کہا۔ ”مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔“ اس کی ناز گل گیری ہو گئی۔ ”تو نے اکیلی اور لاوارث جان کر مجھے مار لیا۔“ وہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اس نے

نڈول ہاتھ اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھ لیے اور تڑپ کر بولی۔ ”ہائے ربا! میں مر گئی۔ میرا کوئی

رات کے گہرے سنائے میں شاداں کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ لالی اس کے قریب چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے شاداں کے سر پر ہاتھ رکھ کر اظہار معذرت کیا۔ ”شاداں! معاف کر دے۔ میں نوں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں نے بہت برا کیا۔“ شاداں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سسکیاں بھرتی رہی۔ لالی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹائے۔ چہرہ اوپر اٹھایا، مگر شاداں نے نظریں نہیں ملائیں۔ لالی نے نرمی سے کہا۔ ”نہ رو شاداں!“ وہ پھر بھی روتی رہی، آنسو پکٹے رہے۔ لالی جذبات سے بے قرار ہو گیا۔ تڑپ کر بولا۔

”تو نے رونا بند نہ کیا تو میں بھی اپنا سر پھوڑ لوں گا۔“

وہ تڑپ کر اٹھا۔ آگے بڑھا اور پانچوں کی طرح دیوار پر دھم سے ٹکرایا۔

شاداں نے رونا بند کر دیا۔ پریشان ہو کر لالی کو دیکھا۔ لالی نے ٹکڑے مارنے کے لیے دوبارہ سر جھکایا۔ شاداں نے جھٹ اس کا سر تھام لیا۔ گھبرا کر بولی۔ ”یہ کیا کر رہا ہے؟ تیرا مگر تو نہیں چل گیا؟“

”ہاں، میرا مگر ہی چل گیا ہے۔“ لالی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں تجھے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔“

شاداں نے آنکھیں مل کر آنسو پونچھے۔ ”لے، میں نے رونا بند کر دیا۔ سمجھ نہیں آتی تو کیسا بنا ہے؟“

”بات یہ ہے شاداں! تو لاوارث نہیں، لاوارث تو میں ہوں۔ میرا تو اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔“ لالی کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ اس کا لہجہ اور جذباتی ہو گیا۔ ”تو تو جوان ہے، سو اور متمہلی ہے۔“

شاداں بات کاٹ کر جھٹ بولی۔ ”کہاں رہی جوان اور متمہلی۔ اب تو جل کر راکھ ہو گئیں۔“

لالی نے اسے بھرپور نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر گم صم بیٹھا رہا، پھر اس نے پوچھا۔ ”ایک بات شاداں! تیری کتنی عمر ہوگی؟“

”پتہ نہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”جب میرا ویاہ ہوا تھا تو میں تیرا سال کی تھی۔ تین سال! میری پہلی پٹی پیدا ہوئی پر وہ چھ مہینے بعد مر گئی۔ دو سال بعد جیجا پیدا ہوا۔“ اس نے قدرے توجہ کیا۔ ”کتنے سال ہوئے یہ؟“

”تیرا اور تین، سولہ ساڑھے سولہ اور دو اٹھارہاں۔“ یہ حساب لگا کر اس نے شاداں

پوچھا۔ ”جیجا اب کتنے برس کا ہے؟“

”پچھلے جاڑوں میں نوں سال میں لگ گیا۔“

”اس حساب سے تو تیری عمر ۲۲ سال ہوگی۔“

”تو یہ کم عمر ہوئی؟“ شاداں مسکرا کر بولی۔

”ارے یہ تو کچھ بھی نہیں ہوئی۔“ لالی کھل کر مسکرایا۔ ”میں نے تو ۳۵ سے بھی اوپر کی زنانیاں دیکھی ہیں۔ ایسی جوان، ایسی باگلی بچیلی۔ دیکھو تو دیکھتے رہ جاؤ۔ بالکل مٹیاری لگتی تھیں۔“

”ہٹ، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”میں کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔“ لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”کل ہی رات کی تو بات ہے۔ پوری سات زنانیاں تھیں۔ کوئی بھی ۳۰ سال سے کم نہیں تھی پر اتنا زوروں کا ٹکھار کیے ہوئے تھیں کہ ہر ایک اتنی سوہنی اور جوان لگتی تھی، میں تجھے بتا نہیں سکتا۔“

شاداں نے اسے مشتہ نظروں سے دیکھا۔ ”کسی چپکے میں تو نہیں چلا گیا تھا؟“

”نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔ بہت وڈے افسروں کی گھر والیاں تھیں۔ ان کے کھم بھی موجود تھے۔“

”پر تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟ تیں نوں ڈر نہیں لگا؟“

”وہ کچھ اور ہی چکر تھا۔“ لالی نے مسکرا کر بتایا۔ ”سب لائری ڈال کر ایک دوسرے سے اپنی گھر والیاں بدلتے تھے اور میں اس لائری کا امپائر تھا۔ امپائر جانتی ہے؟ وہ لائری کا جج ہوتا ہے۔ میں باری باری ہر ایک کی لائری نکالتا تھا۔ جو زنانی جس مرد کے حصے میں آئی، وہ رات بھر کے لیے اسے لے جاتی۔“

شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیسی زنانیاں تھیں، انھیں ذرا بھی لاج نہ آئی؟“

”تو زنانیوں کی بات کرتی ہے۔ مرد تو زنانیوں سے بھی زیادہ بے گیرت تھے۔ ہنسی خوشی اپنی گھر والی کو دوسرے مرد کے پاس سونے کے لیے بھیجتے تھے۔ اسی چکر میں تو میں نے نوٹوں سے بھرا ہوا یہ ہواڑا لیا۔“ لالی نے جیب سے ہوا نکال کر دکھایا۔ ”چوری کر کے نہیں لایا۔ دکھا کر اور بتا کر لایا ہوا۔ بعد میں اس میں سے روپے نکال کر میں نے ہمیانی میں باندھ لیے۔“

شاداں ابھی تک حیرت زدہ تھی۔ ”یہ تو نے عجب گل سنائی۔“

”عجب گل تو ہے، پر تیں نوں کیسے پتہ دنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔“

”میرا پوٹھیک ہی کہتا تھا۔ یہ چودھویں صدی ہے۔ جگجگ ہے جگجگ۔ جو کچھ نہ ہو جائے، تھوڑا

ہے۔“

”چھوڑیہ بھگت بھگت۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب یہاں کب تک بیٹھی رہے گی۔ چل اٹھ، منجی پر جا کر لیٹ۔ تیں نوں بہت چوٹ آگئی ہے۔ یہ کہہ بھی بہت حرام دا ہوتا ہے۔“ اس نے شاداں کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا۔ شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور لالی نے جسم کا سہارا لیے ہوئے چارپائی پر جا کر بیٹھ گئی۔ مگر بستر پر لیٹی نہیں۔ لالی کے اصرار پر بھی نہیں لیٹی۔

لالی نے بستر پر بکھرے ہوئے دو ہزار کے نوٹ اٹھائے اور شاداں کی طرف بڑھا کر بولا۔ ”اب تو انھیں رکھ لے۔ دوسری بچ خرید لیٹا۔“

شاداں نے نوٹ لینے سے انکار کر دیا۔ ”انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔“

”ابھی تک زراض ہے؟“

”نہیں، یہ بات نہیں۔“ شاداں نے آہستہ سے کہا۔ ”بوری مرگئی تھی تو تو نے مجھے دوسری لادی۔ اب تو مجھے اتنے روپے کیوں دینا چاہتا ہے؟“

”خانا خاکی باتیں نہ کر۔“ لالی نے پیار سے ڈانٹا۔ ”انھیں یہ سمجھ کر رکھ لے کہ بالے مر گیا۔“

”پروہ تیرا کون لگتا تھا۔“

”میرا تو کوئی نہ تھا پر تیرا تو تھا۔ جب کسی کا کوئی مر جاتا ہے تو جات برادری والوں کو کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔“ اس نے ذرا سناٹا مل کیا۔ ”میں اس کا نہیں پر تیرا تو کچھ لگتا ہی ہوں۔ نہ مان، بات دوسری ہے۔“ شاداں خاموش بیٹھی رہی مگر لالی خاموش نہیں رہا۔ ”میرا بیو کوم کا کھل تھا۔ میں نے سنا ہے، کھل، ہرل، لکھیرے، اپیڑے اور فیانے، سب ایک ہی کوم کے ہوتے ہیں۔“

کھل کر مسکرایا۔ ”لے، اب انکار نہ کر۔“

لالی نے اصرار کر کے نوٹ شاداں کو دے دیے۔ اس دفعہ اس نے انکار نہ کیا، خاموشی سے سارے نوٹ لے کر دھوٹی کے ڈب میں رکھ لیے۔ لالی اس کے قریب ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد خاموشی میں شاداں کی آواز ابھری۔

”لالی! ایک بات پوچھوں، سچ ج بتائے گا؟“

”پوچھ! ضرور پوچھ۔“

شاداں نے ہچکچاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بتا، تو اس طرح راتوں کو چھپ لک کر میرے کول کیوں آتا ہے؟ میری ہر طرح مدد بھی کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں کرتا ہے؟“

”سچ ج بتا دوں؟“

”میں سچ ج ہی سنتا چاہتی ہوں۔“

”سچ تو یہ ہے شاداں! میں نوں خود نہیں ملوم، میں تیرے کول کیوں آتا ہوں۔“ لالی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”مجھے پتہ ہے، تو نے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔ وہ مر گیا پر تو آج بھی اسی سے پار کرتی ہے اور اسی کے پیار کی کارن ابھی تک اسی گھر میں رہتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نہیں! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ شاداں نے اعتراف کیا۔

”اور میں یہ بھی جانتا ہوں، مجھ سے تجھے ذرا بھی پیار نہیں، ہو بھی نہیں سکتا۔ میں چور اچکا جو ہوں۔ جیل سے بھاگا ہوا کیدی ہوں۔ ایسے بندے سے کوئی زنانی، کوئی غیار، پیار نہیں کر سکتی اور تو ذباکل نہیں کر سکتی۔“ اس نے شاداں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”تو مجھ سے ڈرتی ہے اور اس لیے ڈرتی ہے کہ میں بالے کے کتل کا راز جانتا ہوں۔“

شاداں چپ بیٹھی رہی۔ لالی ذرا دیر خاموش رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے ایک چڈر دے دے، رحیم داد کو دوں گا۔ ویسے میرے پاس چڈر ہے۔ ایک اور دے دے۔ میں اب سیدھا اسی کے پاس جاؤں گا۔ جانے وہ کس حال میں ہو گا۔“

شاداں خاموشی سے اٹھی۔ کمرے کے اندر گئی اور ایک چادر لے کر واپس آئی۔ چادر دیتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ ”ذرا دیر ٹھیر جا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں۔ کل کیا کھائے گا؟“

”تو نے پہلے کبھی یہ بات نہیں کہی، آج کیا بات ہے؟“

”میں نے پہلے بھی کہا تھا، میں تجھے برا بندہ نہیں سمجھتی۔ تجھ سے نفرت بھی نہیں کرتی۔“ وہ لمبے لمبے لیے رکی۔ ”لالی! تو چوری چکاری کا دھندا نہیں چھوڑ سکتا؟“

”تو کہتی ہے تو چھوڑ دوں گا، پر ایک شرط ہے۔“

”کیا شرط ہے؟“ شاداں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”بتا، وہ بھی بتا۔“

”میرے ساتھ بھاگنے پر تیار ہو جا۔“

”تو نے فیر مسکری شروع کر دی۔“

”نہیں! میں مسکری بالکل نہیں کر رہا۔“ لالی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میں تجھے بھاگا کر لے جاتا ہوں۔ اسی طرح جیسے بالے تجھے بھاگا کر یہاں لایا تھا۔“

شاداں چند لمبے خاموش رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ”مان لے، میں تیرے ساتھ جانے کو تیار بھی ہوں! تو مجھے کہاں لے جائے گا۔ خود بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ پولیسوں کے ڈر سے چھپتا لکتا رہتا

ہے۔“

”میرا انتظار کر سکے گی؟“ لالی نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں ایک رات آؤں گا اور بچھتی آؤں گا۔ تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ اس روز میں نئی زندگی شروع کروں گا؛ تیرے ساتھ لبوریا کراچی چلا جاؤں گا۔ محنت مزدوری کروں گا۔ کوئی بھی دھندہ کرلوں گا پر چوری ڈکیتی ہرگز نہیں کروں گا۔ تجھے خوش رکھوں گا۔“ اس نے شاداں کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چراغ جھلکانے لگے۔ ”بول، کیا کہتی ہے؟“ لالی بہت جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلا کر شاداں کو اپنے سینے سے لگایا اور اس کے سر کا زخم چوم لیا۔ ”اب تو ہاں کہہ دے۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”مجھ سے دھوکا تو نہیں کرے گا؟“

”یہ مرد کا وعدہ ہے۔ تجھ سے دھوکا کروں تو مجھے بھی بالے کی طرح چھری سے ٹوٹنے کے زمین میں دبا دیتا۔ میں نے تیرا پیار دیکھا ہے، تیری نفرت اور گھن بھی دیکھی ہے۔ میں تجھے پہچان گیا ہوں۔ مجھے پتہ ہے، تو کیسی زنانی ہے۔“ شاداں، لالی کے سینے سے لگی خاموش کھڑی رہی۔ رات ساکت اور بڑھال تھی۔ دونوں کونے میں رکھی ہوئی لائٹن کی دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھڑے تھے۔ چند لمحوں بعد لالی کی آواز ابھری۔ ”شاداں! مجھے اپنے پیو کا لاڈلہ نہ ماں کی ماستا ملی اور نہ بھینس بھائیوں کا پیار۔ مجھے دنیا میں کچھ بھی نہیں ملا۔ تو مجھے سب کچھ دے سکتی ہے۔“ اس کی آواز گلو گلو ہو گئی۔ وہ بے قرار ہو کر رو پڑا۔ اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو ٹپک کر شاداں کے سر اور ماتھے پر گرنے لگے۔

شاداں کسمائی۔ اس نے پریشان ہو کر گردن اٹھائی۔ لالی کو دیکھا۔ ”رو رہا ہے؟“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا، روتا رہا۔ اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ شاداں نے پیچھے ہٹ کر ہاتھ اٹھایا۔ لالی کے آنسو پونچھے۔ ”میں تیرا انتظار کروں گی، یہ شاداں کا وعدہ ہے۔ میں نے کبھی جھوٹا وعدہ نہیں کیا۔“ وہ چند لمحے خاموش کھڑی رہی، پھر تڑپ کر بولی۔ ”سمجھ لے، آج بالا میرے لیے مر گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مر گیا۔“

لالی نے دونوں ہاتھوں سے شاداں کے رخسار تھام کر اس کا چہرہ اوپر کیا، چند لمحے اس کی کنول کے مانند خوبصورت اور شفاف آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ پھر رخسار اور آنکھیں چوم کر بولا۔ ”شاداں! اب میں چلوں گا۔“

شاداں نے آہستہ سے کہا۔ ”ٹھہر جا، کل چلا جانا۔ میں تیرے لیے روٹی پکا دوں، ساتھ لے جانا۔“

جانے اب تو کب آئے۔“

”تو کہتی ہے تو کل ہی چلا جاؤں گا۔“

شاداں چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ لالی دالان میں رکھی ہوئی لائٹن کی جانب بڑھا۔ اسے اٹھایا اور پھونک مار کر بچا دیا۔ دالان میں اندھیرا چھا گیا۔ باہر صحن میں ستاروں کی روشنی پھیلی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ لالی آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور چارپائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ شاداں اب کروٹ کے بل خاموش لیٹی تھی۔ رات دھیرے دھیرے گزرتی رہی۔



اچانک آہٹ ہوئی۔ لالی نے نظریں گھما کر دیکھا۔ آنگن کی دیوار پر دھندلی روشنی میں ایک سر ابھرا ہوا نظر آیا۔ دیکھتے دیکھتے ایک شخص چڑھ کر دیوار پر آگیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا اور گردن ادھر ادھر موڑ کر چوکنا نظروں سے دیکھتا رہا۔ وہ دروازے پر گیا اور اس کی کندھی آہستہ سے کھول دی۔

وہ دروازے کے پاس کھڑا رہا۔ وہاں سے دبے قدموں پتل کی جانب بڑھا۔ چھپر کے نیچے شاداں کی بھوری بھینس بندھی تھی۔ لالی چپ رہا۔ چند لمحے گزر گئے۔ وہ شخص چھپر کے نیچے سے نہیں نکلا۔ لالی فوراً تازہ گیا کہ وہ کس ارادے سے دیوار پھاند کر گھر میں آیا ہے۔

لالی آہستہ سے اٹھا۔ اس نے جوتے اتار دیے۔ دالان سے اتر کر آنگن میں آگیا۔ جھک کر دبے قدموں پتل کی سمت بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس نے دیکھا، دھندلی روشنی میں وہ شخص اکڑوں بیٹھا ہے۔ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ وہ بھینس کی رسی آہستہ آہستہ کھونٹے سے کھول رہا تھا۔ لالی تیزی سے جھپٹا اور ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ مضبوطی سے دبوچ لیا۔ وہ آواز بھی نہ نکال سکا۔ لالی کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگا۔ وہ اکڑے بدن کا نوجوان تھا۔ لالی نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کپٹی پر زناتے کا تھپڑ مارا۔ وہ سم کر رہ گیا۔ لالی نے ہاتھ ہٹا لیا۔ ساتھ ہی ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ وہ گڑگڑا کر بولا۔

”مارو نہیں۔“

”کون ہے تو؟ اٹھانے آیا تھا؟“

”ہن جی! آیا تو اسی لیے تھا۔“ وہ گھٹکیا کر بولا۔ ”زمین دار نے بھیجا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر

لارنل ادھر اہر لے جانا تھا۔“

لالی نے عقب میں چاپ سنی، وہ پلٹا۔ دھندلی روشنی میں شاداں کھڑی تھی۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ ”یہاں پتل کے نیچے کیا کر رہا ہے؟“

لالی نے موٹی چور کی گردن دبوچی اور اسے اٹھا کر شاداں کے سامنے لایا۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”ہائے! یہ کہاں سے آگیا؟“

”تیری بٹا اٹھانے آیا تھا۔ اس سے پوچھ لے۔“ اس نے موٹی چور کے منہ پر ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ”بتا، اسی لیے آیا تھا؟“

وہ گردن ہلا کر مری ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہن جی! اسی لیے آیا تھا۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”مجھے جانے دے۔ غلطی ہو گئی معافی دے دے۔“ وہ لالی کے قدموں پر گر پڑا۔ پیر پڑ کر گڑ گڑانے لگا۔ ”اب کبھی اتنے نہیں آؤں گا، اگر آؤں تو جان سے مار دیتا۔“

شاداں نے لالی سے کہا۔ ”جانے دے اے۔“

لالی نے جھک کر ایک بار پھر گردن دبوچی۔ اسے اٹھایا اور کھینچتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ دروازہ کھول کے اس نے چور کو زور سے دھکا دیا۔ وہ اندھیرے میں دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ لالی نے دروازہ بند کر لیا۔

پاس پڑوس کے گھروں سے کھانسنے کھنکانے کی آوازیں ابھرنے لگیں تھیں۔ لالی پریشان ہو گیا۔ لپک کر دالان میں گیا۔ چادر کھول کر راقول نکالی۔ شاداں بھی اس کے قریب پہنچ گئی۔ راقول دیکھ کر گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ہائے تیرے پاس تو بندوک بھی ہے۔“ لالی خاموش رہا۔ جیمبر میں کارتوس چڑھا کر راقول لوڈ کرنے لگا۔ اس نے بھری ہوئی راقول کندھے پر لٹکائی۔ شاداں کی دی ہوئی چادر، قمیص اور شلوار کے ساتھ رکھ کر گٹھری بنائی اور اسے بھی پیٹھ پر لٹکالیا۔ شاداں حیرت سے دیکھتی رہی۔ بے چینی ہو کر پوچھا۔

”یہ سب کیا کر رہا ہے؟“

”مجھے اب جانا ہے۔ یہاں ٹھیرنا میرے لیے خطرناک ہے۔“

شاداں کھسک کر اس کے قریب آگئی۔ ”کب آئے گا؟“

”میرا کمان، اپنی بٹا فوراً چ دے۔ ملک اللہ نواز اسے اٹھوالے گا اور یہاں رہی تو تجھے بھی اٹھوالے گا۔ وہ زبردست رسا گیر ہے۔ تیس نوں پتہ ہی ہے، اس کا بھائی ادھر تھانے دار لگا ہے۔“

”پر میں جاؤں گی کہاں؟“

”کادر آباد جانتی ہے؟“

”جانتی ہوں۔ ادھر تو شیش بھی ہے۔“

”وہاں تیرا کوئی جاننے والا ہے؟“

وہ سوچنے لگی۔ لالی نے کہا۔ ”بھیتی نال بتا۔ میں نوں اب جانا ہے۔“

شاداں نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ ”ادھر میرا ایک ماما ہے۔ چھوٹی تھی تو اس کی پاس جا کر رہتی بھی تھی۔ پر یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”تو اس کے پاس چلی جا۔ میں تجھے وہیں آکر ملوں گا۔“

”پر مجھے وہاں کیسے ملے گا؟“ شاداں نے دریافت کیا۔ ”ویسے میرے ماما کا نام کرامت ہے۔ وہ دودھی ہے۔ گھروں سے دودھ اکٹھا کر کے دکان داروں کو بیچتا ہے۔“

”بس اتنا کافی ہے۔ میں تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

”پر مجھے کادر آباد کیوں بھیجنا چاہتا ہے؟ صاف صاف بتا، مجھ سے چھپا نہیں۔“

”تجھ سے اب کیا چھپانا، اب تو میری بن ہی چکی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”میں کادر آباد کے اس بارو باری دو آب نہر کے پیچھے بیوں پر رخصے کے ساتھ چھپا ہوا ہوں۔ پر جلد ہی وہ ٹھکانا چھوڑ دوں گا۔ شام کو نہر پر آجائے گی تو تجھے آسانی سے مل لوں گا۔ نہر تو کادر آباد سے بالکل نزدیک بہتی ہے۔“

”میں صرف سڑک ہے۔“

”میں وہیں جا رہا ہوں۔ تو جلد سے جلد وہاں پہنچ جا۔ کادر آباد جا کر جی چاہے تو دوسری بٹا خرید لیتا۔ تیرے پاس روپے ہیں اور تیرا ماما دودھی بھی ہے۔ تجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

لالی آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دروازے پر پہنچ کر بولی۔ ”میں تیرے ساتھ رڑی تک چلوں گی۔“

”نہیں، تو گھر ہی میں رہ۔“ لالی نے اسے منع کر دیا۔ ”آج خطرہ بہت ہے۔ ڈگر چور مار کھا کر میدھا اللہ نواز کے پاس گیا ہوگا۔ ویسے اس کے ساتھی بھی باہر ہوں گے۔ تیرا اس دھت میرے ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔“

لالی نے راقول کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لے لی۔ شاداں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ لالی نے بار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ ”بھیتی نال کادر آباد پہنچ جانا۔“ لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

وہ راقول سنبھالے، چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا، گلی سے نکلا۔ رڑی میں پہنچ کر اس نے

نصف سے بھی کم راستہ طے کیا تھا کہ سامنے سے کسی نے اونچی آواز میں ٹوکا۔ ”کون ہے جی؟“ لالی نے جھٹ راستہ بدل لیا۔ تیزی سے کھیتوں کی جانب لپکا اور گندم کے ایک کھیت میں گھس گیا۔ اسے عقب میں آہٹ سنائی دی۔ لالی گندم کے پودوں کی اوٹ میں چھپا ہوا کھسک کھسک کر آگے بڑھنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی اور سناٹے میں رڑکی طرف سے بولنے کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی آرہی تھیں۔ لالی کے لیے پودوں کے درمیان سے گزرتا مشکل تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح کھیت سے نکل کر پگڈنڈی پر آگیا اور گردن جھکا کر راستے کا اندازہ کیے بغیر تیزی سے آگے بڑھا۔



لالی ایک لقمہ دوق میدان کے نشیب میں آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ یہ دریا ئے بیاس کی قدیم رگاہ سے نکلنے والا بڑہ تھا، جو کسی زمانے میں مشرق سے جنوب کی جانب بہتا تھا۔ بیاس اور ستلج اپنے راستے بدلے تو بیاس، فیروز پور کے قریب، ہری کے پتن پر، دریا ئے ستلج سے مل گیا۔ اس کی پرانی گزرگاہ خشک اور خنجر ہو گئی۔ اس کا یہ بڑہ بھی خشک ہو کر اجاڑ ہو گیا۔ نہ جانے یہ بڑہ بے خشک پڑا تھا۔ اس کی مٹی نرم اور ریتیلی تھی۔ جگہ، جگہ ریت کے تودے تھے۔ تودوں کے بیاس کیس کیس کیکر، کیریل اور لانا کے اکا دکا پودے بکھرے ہوئے تھے۔

دور، دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ اجالا زور سے بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی مسلسل چلتے چلتے تھک چکا تھا۔ مگر اسے اپنی تھکن کی فکر نہیں تھی۔ ایسے ٹھکانے کی تلاش تھی جس میں روپوش ہو کر دن بسر کیا جاسکے۔ ایسا کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا تھا۔ نہ کیس جھنگر تھا نہ جنگلی پودوں کی کوئی بڑی جھاڑی تھی۔ اس کی تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

اجالا اب گہری سرخ روشنی میں بدلتا جا رہا تھا۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ لالی کی تشویش اور بڑھ رہی تھی۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ خشک اور خنجر بڑہ سے کچھ فاصلے پر ایک اجڑی ہوئی بستی کے کھنڈر نظر آئے۔

وہ نشیب سے نکل کر اوپر آگیا اور کھنڈر کی جانب بڑھنے لگا۔ کھنڈر کی دیواریں مٹی کی تھیں اور پتھر کے پائوں کا ڈھیر بن گئی تھیں۔ نہ کیس چھت تھی، نہ کوئی دروازہ بچا تھا۔ صرف اونچی

اونچی دیواریں تھیں اور خود روپوں کی جھاڑیاں تھیں۔ لالی کو یہ کھنڈر غنیمت نظر آیا۔ وہ اس میں ٹھہر کر دن گزار سکتا تھا۔ اس نے چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا، آگے بڑھا اور کھنڈر میں داخل ہو گیا۔

یہ کھنڈر کوئی قدیم گاؤں تھا۔ قلعہ سالی کے باعث اجاڑ اور ویران ہو گیا تھا۔ کھنڈر میں گھس کر اس نے چھپنے کی جگہ تلاش کی اور اسے ایسی جگہ مل بھی گئی۔ یہ قد آدم دیواروں کے درمیان صاف ستھری اور ہموار زمین کا ٹکڑا تھا جو کبھی کمرے یا کونٹری کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ اس نے کندھے پر لٹکی ہوئی گٹھری اتار دی۔ اسے ایک طرف رکھا۔ رانقل بھی پاس رکھ دی اور زمین پر پھسکر مار کر بیٹھ گیا۔

وہ بہت تھکا ہوا اور نڈھال تھا۔ دیر تک چپ چاپ بیٹھا رہا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں پر پھیلتی جا رہی تھی۔ دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔

لالی رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ جلد ہی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ غودگی بڑھنے لگی۔ اس نے گٹھری کھولی، اندر سے وہ چادر نکالی جو پچھلی رات شاداں نے دی تھی۔ لالی نے زمین پر بکھرے ہوئے شکریرے صاف کیے۔ چادر بچھائی۔ گٹھری ایک بار پھر باندھی اور تکیے کے طور پر سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ رانقل بھی اس نے اپنے سرہانے ہی رکھ لی۔ تھوڑی دیر تک وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹا رہا پھر سو گیا۔

دوپہر کو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ ہر طرف تیز دھوپ پھیلی تھی۔ سورج ٹھیک اس کے سر کے اوپر تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہیں سایہ نہیں تھا اور اسے سخت پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔

وہ پانی کی تلاش میں نکلا۔ کھنڈر خاصی دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ٹوٹی پھوٹی اور اونچی نیچی دیواروں کے درمیان سے گزرتا، خود روپوں سے روندنا، خاردار جھاڑیوں سے الجھتا، ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ مگر کہیں پانی کا گڑھا تک نہ تھا۔

وہ اپنے ٹھکانے کی جانب لوٹ رہا تھا کہ کچھ دور دور راہ گیر نظر آئے۔ وہ بڑے کے نشیب سے گزر کر اوپر آئے اور آگے بڑھنے لگے۔ مگر وہ کھنڈر کی جانب نہیں آئے۔ لالی بھی ان کے پاس نہیں گیا اور نہ اس کا کوئی ایسا ارادہ تھا۔ ان سے ملنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ لیکن انھیں دیکھ کر اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ میل دو میل کے گرد و نواح میں کوئی بستی ہے۔ وہ راہ گیروں کی نظروں سے بچنے کے لیے

ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کی آڑ میں دبک گیا۔ قریب ہی ملتا تھا۔ یہ خاردار جھاڑی تھی۔ اس میں بھونے کو کن بیر لگے تھے۔

کو کن پک کر پیلے پڑ گئے تھے۔ لالی انھیں توڑ توڑ کر کھانے لگا۔ کو کن کھانے سے پیاس کم ہو گئی۔ ہاتھ کر کھڑا ہو گیا۔ گردن اونچی کی۔ کھنڈر کے باہر دیکھا۔ دونوں راہ گیر بہت دور جا چکے تھے۔

لالی ہاتھ میں دبے ہوئے کو کن کھاتا ہوا اس طرف چلا جہاں کچھ دیر پہلے وہ سو رہا تھا۔ گردواں بھی تک تیز دھوپ پھیلی تھی۔ گٹھری پر ایک کالا ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ لالی اسے دیکھ کر ناٹف ہوا اور شش و پنج میں پڑ گیا۔

رانقل بھی گٹھری کے پاس ہی رکھی تھی، ورنہ وہ اس کے بٹ سے سانپ کا منہ کھل دیتا۔ ایک ار پھر وہ باہر آیا۔ بول کے درخت سے موٹی شاخ توڑی، اس کے پتے صاف کیے اور شاخ ہاتھ میں باکر گٹھری کے پاس پہنچا۔ مگر سانپ اب گٹھری سے نیچے اتر رہا تھا۔ لالی نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

سانپ لگ بھگ دو گز لمبا تھا۔ وہ زمین پر رینگتا ہوا آگے بڑھا اور دیوار میں بنے ہوئے ایک بل بن گھس گیا۔ لالی یہ سوچ کر لرز گیا کہ چادر پر سوتے وقت اس کا ایک پیر بل کے عین منہ پر تھا۔ ب یہ جگہ محفوظ نہیں رہی تھی۔ دھوپ بھی بہت تھی۔ اس نے چادر سمیٹ کر کندھے پر ڈالی۔ رانقل اٹھائی اور سائے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ اسے ایک ایسی دیوار نظر آئی جس کے قریب ہی بول کا گھنا درخت تھا۔ درخت زیادہ اونچا نہیں تھا۔ دیوار اور درخت کے درمیان کھلی جگہ تھی۔ اس پر سایہ بھی تھا۔ یہ جگہ صاف ستھری نہیں تھی۔ اس پر گھاس پھوس اور بھونے چھوٹے خود روپوں سے تھے۔ مگر سایہ ہونے کے باعث اس نے یہی جگہ منتخب کی اور چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔

لالی زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ ایک بار پھر نیند کا غلبہ ہوا۔ اس نے گٹھری سر کے نیچے رکھی۔ رانقل بھی اس کے ساتھ ہی پڑی تھی۔ وہ ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا اور دوبارہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ سائے پھیلتے جا رہے تھے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب پیاس کے ماتھے ساتھ بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چادر تہہ کی اور گٹھری میں رکھ دی۔ شام آہستہ آہستہ کھنڈر کی ٹوٹی پھوٹی دیواروں سے نیچے اترنے لگی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ کھنڈر زیادہ ویران در پر بول نظر آئے لگا۔

اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ ایک سانپ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ نہ جانے کھنڈر میں اور کتنے

سانپ ہیں۔ وہ کھنڈر سے نکلا مگر زیادہ دور نہیں گیا۔ ٹھہر کر اندھیرا بڑھنے اور پھیلنے کا انتظار کرنے لگا۔ ہر طرف گہرا سناٹا طاری تھا۔

شام تاریک ہو کر رات میں ڈھل گئی۔ لالی نے اپنے سفر کا آغاز کیا اور اس سمت چلنے لگا جہم اس نے دوپہر کو دور راہ گیر جاتے ہوئے دیکھے تھے۔ وہ بجز میدان میں آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ اس نے دو ڈھائی میل راستہ طے کیا تھا کہ کھیت نظر آنے لگے۔ جگہ جگہ سرس اور جند کے درخت تھے۔ وہ کھیتوں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے ٹھہر گیا۔ اسے کھیتوں کے اس پار گاؤں میں ٹھماتے چراغوں کی روشنی نظر آرہی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔ اسے یہ آوازیں ختم ہونے اور خاموشی میں ڈوب جانے کا انتظار تھا۔ بھوک اور اس سے بھی زیادہ پیاس اسے پریشان کر رہی تھی۔

مگر اس نے پیاس اور بھوک قابو میں رکھنے اور دبانے کی کوشش کی۔ وہ گاؤں میں جانا چاہتا تھا، مگر سناٹا پھیلنے سے پہلے گاؤں میں داخل ہونا خطرناک تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ خاموشی اور گہری ہو گئی۔ لالی کے حلق میں شدید پیاس سے کانٹے چبھ رہے تھے۔

گرمیوں کی رات تھی۔ نوبے کا عمل تھا۔ گاؤں کی طرف ابھی جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ مگر لالی کے لیے پیاس اب ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ گھڑی کندھے پر لٹکائی، رانٹل ہاتھ میں سنبھالی اور چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا کھیتوں کی جانب بڑھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔

کھیتوں کے درمیان سے ایک پیہا گزرتا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں پی ہے پر چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ گھپ اندھیرے میں اس کا ایک پیر آڑ میں چلا گیا۔ آڑ کے ذریعے کھیتوں میں پانی پہنچایا جا رہا تھا۔ لالی کو اسی کی تلاش تھی۔ اس نے جھٹ اپنا پیر آڑ سے باہر نکالا اور ایک کھیت کی سبڈ پر بیٹھ کے چلو بھر بھر کے بے صبری سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا تو بھوک کا غلبہ بڑھا۔ اس نے کھڑے ہو کر نظریں دوڑائیں۔ وہ چنے کے کسی کھیت میں گھس جانا چاہتا تھا، جہاں کچے چنوں سے اپنی بھوک مٹا سکتا۔ مگر چنے کا کوئی کھیت قریب نہیں تھا۔ دونوں طرف کھیتوں میں چری کے پودے کھڑے تھے۔ گندم کے نہیں تھے، ورنہ وہ گندم کے دانے کھا کر بھی کام چلا سکتا تھا۔ لیکن دور دور تک صرف چری کے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

چلتے چلتے وہ ایک موڑ پر پہنچا تو خاموشی میں یکایک کس قریب ہی زور کا نقبہ بلند ہوا۔ ساتھ ہی اس کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ ٹھٹکا، کچھ دیر سما ہوا چپ چاپ کھڑا رہا، پھر چند قدم آگے بڑھا۔ اس کے پودوں کی آڑ سے اس جانب دیکھا جہر سے آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سامنے کھیتوں کے میان کچھ فاصلے پر کھلی جگہ تھی۔ وہاں دھبی دھبی آگ جل رہی تھی۔ آگ پر لوہے کا لمبا نڈا مارتا تھا۔ قریب ہی دو آدمی لمبا نڈے میں گھی ڈال کر مرغ قتل رہے تھے۔ مرغ تلنے کی تیز خوشبو نفا پھیلتی جا رہی تھی۔

آگ سے ذرا ہٹ کر آڑ سے کھیتوں کو سیراب کرنے کا نڈا تھا۔ نڈا اس وقت کھلا تھا۔ نکتے پر بھی آدمی بیٹھے تھے۔

لالی نے آگ کی سرخ روشنی میں انھیں دیکھا۔ وضع قطع سے وہ مزارعے نظر آتے تھے۔ آڑ کے لے نکتے سے اپنے کھیتوں میں پانی پہنچا رہے تھے۔ مرغ تلنے کی مک نے لالی کی بھوک اور بڑھا۔

وہ ابھی یہ طے نہ کر سکا تھا کہ کس طرف جائے۔ معا" نکتے سے ایک شخص اٹھا اور اس کی جانب ما۔ بھاگنے کی گنجائش نہیں تھی۔ لالی جھٹ چری کے قریبی کھیت میں دبک گیا۔ اس نے رانٹل ہاتھوں میں سنبھالی اور آنے والے خطرے سے نمٹنے کے لیے خود کو تیار کر لیا۔ قدموں کی ٹ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی چوکس بیٹھا راستہ نکلتا رہا۔ آنے والا عین اس کے سامنے با۔

وہ چند فٹ کے فاصلے پر تھا۔ مگر نہ وہ ٹھٹکا نہ جھجکا بلکہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ جب وہ دور چلا تو لالی کو اپنے ارد گرد منڈلاتے ہوئے خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اب کھیتوں میں ٹھہرنا نا طور مناسب نہ تھا۔ لالی پلٹا اور پی ہے پر چلتا ہوا کھیتوں سے باہر نکل گیا۔ سامنے جوہ تھا۔ اس تلی چراگاہ میں دن کو گاؤں کے چاک اور چرواہے مویشی چراتے تھے۔ اس وقت جوہ بالکل مان تھا۔ اس میں جگہ جگہ جند، ٹاہلی اور بیری کے بیڑے تھے۔ جوہ کے اس پار گاؤں تھا۔ لالی جوہ میں لہ ہوا اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ گاؤں پر سناٹا چھایا تھا۔ گلی کو چے ویران۔

لالی ایک گلی میں داخل ہوا مگر آگے نہیں گیا۔ وہ ٹکڑے مکان کی چار دیواری کے قریب جا کر ٹھہر۔ چند لمحے دم سادھے خاموش کھڑا رہا، پھر اس نے زغند بھری اور دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑ کر پھینچ گیا۔

اس نے گردن جھکا کر اندر بھانکا۔ گھر پر خاموشی چھائی تھی۔ صحن میں ایک طرف جھلیانی تیر۔ یہ مختصر سایا و رچی خانہ تھا۔ اس میں چراغ جل رہا تھا۔ لالی دبے دبے قدموں چلتا ہوا جھلیانی قریب گیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ جھلیانی میں داخل ہو گیا۔ چولہا ابھی گرم تھا۔ انگارے دھک رہے تھے۔ چولہے پر المونہ کی گڑوی رکھی تھی۔ اس میں دودھ گرم ہو رہا تھا۔ لالی چولہے کی جانب بڑھا۔ عین اسی وقت صحن میں آہٹ ہوئی۔ لالی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

جھلیانی میں تھکے نقش و نگار کی ایک سانولی سلونی نوجوان عورت داخل ہوئی۔ وہ اپنے بھرے ہوئے بالوں کا جوڑا باندھتی ہوئی چولہے کی سمت بڑھی۔ لالی نے جھٹ ہاتھ بڑھا کر اس کا منہ دبوچ لیا۔ عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ مگر لالی نے اس قدر زور سے منہ بھیجا کہ اس کی آواز نہ نکل سکی۔

وہ دہشت زدہ ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھنے لگی۔ لالی ذرا دیر اس کا منہ دبائے خاموش کھڑا رہا، پھر اس نے سرگوشی کی۔ ”گھر میں تیرے علاوہ اور کوئی بھی ہے؟“ عورت نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

لالی نے کرید کر پوچھا۔ ”تیرا کھسہ ہے؟“ عورت نے انکار میں صرف گردن ہلا دی۔ لالی نے مسکرا کے استفسار کیا۔ ”تیرا یا رہے؟“ عورت نے کوئی جواب نہیں دیا، نظریں جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

لالی نے دریافت کیا۔ ”تیرا گھر والا کہاں ہے؟“ عورت نے دھیرے سے جواب دیا۔ ”کھیتوں کو پانی لگائے گیا ہے۔“ ”کب تک واپس آئے گا؟“

”وہ تو پہلے آئے گا۔ رات بھر کھیتوں پر رہے گا۔“ عورت نے لالی کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”تو ہے کون؟“

”میں کوئی بھی ہوں، پہلے مجھے روٹی نکل کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔“

عورت نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”تو چور تو نہیں ہے؟“

”بکواس نہ کر۔“ لالی نے اسے ڈانٹا۔ ”غناٹ روٹی دے۔ میں روٹی کھا کر چلا جاؤں گا۔ میں تجھ سے اور کچھ نہیں لیتا۔“ اس نے چولہے پر رکھی ہوئی گڑوی کی طرف اشارہ کیا۔ ”پہلے مجھے دودھ دے، بھتیجی نال۔ ڈرنا شرنا چھوڑ۔ میں نوں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھیرتا۔“

عورت نے کچھ کئے بغیر بڑھ کر گلاس اٹھایا۔ چولہے کے پاس گئی اور گڑوی اٹھا کر گلاس میں دھاندلنے لگی۔ اسی اثناء میں باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ ساتھ ہی چاپ بھی ابھری۔ لالی نے اٹکل اٹھائی اور نشانہ باندھ کر باہر صحن کی جانب دیکھنے لگا۔ عورت گلاس چھوڑ کر تیزی سے لالی کی طرف لپکی۔ راتکل پر ہاتھ رکھ کر بے قراری سے بولی۔

”وے گولی نہ چلاتا۔“

”چپ کر۔“ لالی نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ”میں نے گولی چلا کر سارے پنڈ کو جگانا ہے؟“ وہ اس کی جانب دیکھے بغیر کھل کر مسکرایا۔ ”تو بھی پکڑی جائے گی، تیرا یا رہی پکڑا جائے گا اور میں بھی پکڑا جاؤں گا۔ میں ایسے خطرناک کام نہیں کرتا۔“

عورت چپ چاپ اس کے قریب کھڑی رہی۔ چند لمحوں بعد جھورا نمودار ہوا۔ وہ مضبوط جسم کا چھا خوش شکل جوان تھا اور دھوتی باندھے ہوئے تھا۔ اوپر کا دھڑ بالکل برہنہ تھا۔ اس نے لالی کو دیکھا اور اس کے ہاتھ میں دبی ہوئی راتکل دیکھی تو خوف زدہ ہو کر جہاں تھا، وہیں رک گیا۔ چند لمحوں سما کھڑا رہا پھر اس نے عاجزی سے کہا۔ ”میرا کرتا ادھر حجرے میں پڑا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے، لے لے، اور بھی جو جی چاہے اٹھالے۔“ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

”دھیما بول۔ میں نوں کچھ نہیں لیتا۔“ لالی نے عورت کو شوکا دیا۔ ”اے اندر لے آ۔“ عورت آگے بڑھی اور جھورا کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”اندر آجا۔“ اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ ”اے چوری چکاری نہیں کرنی، کھکا ہے۔ روٹی کھا کر چلا جائے گا۔“

جھورا، عورت کے ساتھ جھلیانی کے اندر آگیا۔ لالی نے راتکل نیچے جھکالی۔ جھورا نے عورت سے پوچھا۔ ”میدان! یہ ہے کون؟ اور یہاں آیا کیسے؟“ میدان نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میں نوں کیہ پتہ؟ اے نوں پچھ۔“ وہ چولہے کے پاس گئی، گلاس دودھ سے بھرا اور لالی کو دے دیا۔

لالی نے گلاس منہ سے لگایا اور غناٹ پورا گلاس چڑھا گیا۔ اس نے میدان کی طرف مڑ کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”روٹی شوٹی بھی لے آ۔ ابھی پیٹ نہیں بھرا۔“

میدان نے بڑھ کر چوترے پر رکھی ہوئی چنگیری اٹھائی۔ دوسرے ہاتھ سے قریب رکھا ہوا پیالہ اٹھایا اور لالی کے نزدیک آگئی۔

وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے راتکل اپنے زانو پر رکھی۔ میدان نے چنگیری اس کے سامنے رکھ لی۔ سال بھی رکھ دیا۔ میدان اس کے روبرو بیٹھ گئی۔ لالی نے جھورا سے کہا۔ ”کھڑا کیوں ہے؟ تو

بھی بیٹھ جا۔“

وہ دیوار سے ٹیک لگا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ لالی نے لقمہ تو ذکر منہ میں رکھتے ہوئے مڑ کر جھورا کو دیکھا۔ وہ ابھی تک سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ لالی نے لقمہ چبا کر حلق سے نیچے اتارا اور مسکرا کر جھورا سے مخاطب ہوا۔ ”رات کو چھپ کر مشوکا سے ملنے آیا اور دل چڑی کی طرح اتنا چھوٹا ہوا ہے۔“ لالی نے دوسرا لقمہ توڑا۔

”جھورے! تو رہتا کہاں ہے؟“

”رہتا تو میں ساتھ والے چک میں ہوں۔“ جھورا نے رسان سے پوچھا۔ ”پر تو ہے کون؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ لالی بے تکلفی سے بولا۔ ”میں نوں تو صرف روٹی کھاتی ہے۔ میدان سے یاری نہیں لگانی۔“ اس نے مڑ کر میدان کو دیکھا۔ ”ویسے تو ہے سوہنی اور جھورے سے زیادہ حوصلہ رکھتی ہے۔ تو مجھ سے اتنا نہیں ڈری جتنا یہ ڈرا سہا نظر آتا ہے۔“

جھورے نے کچھ نہیں کہا۔ میدان بھی خاموش رہی۔ لالی نے ایک روٹی ختم کرنے کے بعد دوسری روٹی سے لقمہ توڑا اور میدان سے مخاطب ہوا۔ ”پینے کو پانی تو دے۔“ وہ چپ چاپ اٹھی۔ گلاس سنبھالا اور باہر جانے کے لیے مڑی۔

جھورائے اسے ٹوکا۔ ”گل سن میدان! اجڑے سے وہ مٹھائی بھی لیتی آجو تو نے اپنے گھروالے کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔“ اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ زیر لب مسکرایا اور لالی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ تیرا مہمان ہے۔ مہمان کو ٹھیک سے روٹی نکر کھلا۔“ میدان خاموشی سے باہر چلی گئی۔

”جھورے! تو میدان سے ملنے روز اسی طرح چھپ کر آتا ہے؟“

”نہیں جی۔ ایسی گل بات نہیں ہے۔ بہت دنوں بعد آج رات موکا ملا تھا۔“ اس نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”میدان کا گھر والا روز روز رات کو پانی نہیں لگاتا۔ آج ہی سے رات کو اس کی پانی لگانے کی باری شروع ہوئی ہے، پر تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔“

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ ابھی تو ساری رات پڑی ہے۔“ وہ آہستہ سے ہنسا۔

جھورا نے پریشان ہو کر سرگوشی کی۔ ”دھیما بول۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”ساتھ والے مکان میں میدان کے گھروالے کا بیوہ رہتا ہے۔ اسے نیند بھی کم آتی ہے۔ تیرے آنے سے پہلے وہ دیر تک کھانا رہا۔“

لالی خاموش رہا۔ جھورا نے بھی کچھ نہیں کہا۔ میدان واپس آگئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا لالی کے سامنے رکھ دیا۔ لالی نے گلاس اٹھا کر پانی پیا۔ جب وہ پانی پی چکا تو میدان نے دوپٹے کھول کر کانڈ میں لپیٹی ہوئی مٹھائی نکالی اور لالی کے سامنے رکھ دی۔ لالی نے دیکھا کہ کانڈ میں کے تین ٹکڑے رکھے ہیں۔ لالی نے ایک ٹکڑا اٹھایا اور دانتوں سے توڑ کر کھانے لگا۔ برنی سا ذائقہ تھی۔ لالی کو پسند آئی۔

جھورا خاموش بیٹھا تھا۔ میدان بھی چپ تھی۔ لالی نے نصف ٹکڑا کھایا تھا، ناگاہ جھورا پر اس نظر پڑی۔ اسی وقت جھورا نے میدان کی جانب دیکھ کر آنکھ ماری۔ آنکھ مارنے کا انداز کچھ ایسا نہ لالی کو شبہ ہوا۔ اس نے فوراً ہاتھ روک لیا۔ برنی کا بچا ہوا ٹکڑا کانڈ میں ڈال دیا۔ گلاس اٹھا بانی پیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جھورائے حیرت کا اظہار کیا۔ ”کہاں چلا؟ تو نے مٹھائی بھی نہیں کھائی۔ تھوڑی ہی سی تو ہے۔“

”کھالے۔“ فیر چلا جاتا۔

”میں نوں اب جاتا ہے۔“ لالی نے گٹھری کندھے پر ڈالی، رانقل سنبھالی اور چلنے کے لیے تیار یا۔ اس نے جھورا سے پوچھا۔ ”جھورے! تجھے کادور آباد کے رستے کا پتہ ہے؟ میں نے وہیں جانا۔“

”کادور آباد تو یہاں سے بہت دور ہے۔ ایسا کریوسف والا چلا جا۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔“

”سے کادور آباد چلا جاتا۔ یوسف والا ٹیشن ہے۔ تجھے کادور آباد کے لیے گڈی مل جائے گی۔ لاری لے ہے۔ تاکے بھی جاتے ہیں۔“

”یوسف والا کارستہ بتا دے۔“

”پنڈ سے نکل کر پورب کو جائے گا تو نہر ملے گی۔“ جھورائے بتایا۔ ”نہر پر پل آئے گی۔ اس پار جانا۔ سامنے ہی سڑک ہے۔ سڑک پر آگے جائے گا تو نہر ملے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ چلا جاتا۔“

”خف والا پہنچ جائے گا۔“

لالی نے مڑ کر میدان کو دیکھا۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر راہٹ اور پریشانی تھی۔

لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”میدان! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تجھے بہت پریشان کیا۔ تو سوہنی ہے رطیعت کی بھی چنگی ہے۔“ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور میدان کی رنٹ بڑھا دیا۔ ”یہ روٹی فکر کی کیمت نہیں۔ تیری مہمان داری کا دتا ہے۔ اسے رکھ لے۔ دیکھ،“

انکار نہ کرنا۔“ لالی نے نوٹ میدان کے ہاتھ میں دے دیا۔ میدان کا ہاتھ کچکپایا۔ نوٹ نیچے گر گیا۔ لالی نے جھک کر نوٹ اٹھایا اور میدان کے ہاتھ میں رکھ کر آہستہ سے اس کی مٹھی بھینچ دی۔ لالی نکل کر صحن میں آگیا۔ میدان بھلیانی میں گم صم کھڑی رہی۔ مگر جھورا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے آنگن عبور کیا۔ جھورا نے آگے بڑھ کر آہستہ سے دروازے کی کندی کھولی۔ لالی نے اس کی پیٹھ تھپک کر مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ ”جامو جاں کر۔ ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔“

جھورا نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ لالی دروازے سے گزر کر باہر گلی میں آگیا۔

گلی بالکل سناں تھی۔ لالی آگے بڑھا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گاؤں سے نکل کر ایک بار پھر جوہ میں آگیا۔ اس نے جوہ عبور کیا اور جھورا کے بتائے ہوئے راستے پر پورب کی سمت کھیتوں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہوا نرم اور سبک تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ ختم ہوا، نہر آگئی۔ لالی نہر کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جا کر پلایا آگئی۔ پلایا سے گزر کر وہ نہر کے دوسری جانب چلا گیا۔

نہر کے کنارے کھجور کے درخت تھے۔ وہ ان کے نیچے پہنچا۔ گٹھری کھولی۔ ہاتھ میں دبی ہوئی رائفل اس میں رکھ کر پھر گٹھری باندھی اور کندھے پر لٹکائی۔ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے دو ڈھائی فرلانگ راستے طے کیا ہو گا کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں اسے پاک پتن روڈ چمکتی نظر آئی۔

وہ سڑک کی سمت بڑھا۔ یکایک اسے گھبراہٹ اور بے کلی محسوس ہوئی۔ پیٹ میں سخت مروڑ اٹھی۔ جی متلایا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور سڑک کی جانب بڑھنے لگا۔

سڑک کے کنارے پیچھے پیچھے اس کی طبیعت اور بگڑ گئی۔ قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ ہمت کر کے کچھ اور آگے بڑھا۔ مگر سڑک کے کنارے پہنچ کر اس کے قدم ڈگمگائے۔ وہ خود کو سنبھال نہیں سکا۔ ہڈیال ہو کر زمین پر گر گیا۔ اسے زور کی ابکائی محسوس ہوئی۔ وہ اٹھا۔ اندھیرے میں تے کی۔ پھر لیٹ گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکا۔ نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اس کا سارا جسم پیسے سے

شرابور تھا۔ آنکھوں کے آگے سیاہ پردے لہرا رہے تھے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔



لالی سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ یکایک تیز روشنی نمودار ہوئی۔ ایک کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی نظر آئی۔ لیکن لالی کے قریب پہنچتے پہنچتے کار کی رفتار ست پڑ گئی۔ ڈرائیور نے گردن نکال کر بھانکا، نیچے اترا۔ لالی کے نزدیک گیا۔ حیران اور پریشان ہو کر اسے دیکھا اور آہستہ آہستہ جھنجھوڑ کر بولا۔ ”لالی! لالی!“ اس نے لالی کا سر پکڑ کر ادھر ادھر ملایا۔ لالی نے آنکھیں کھول دیں۔

”کون ہے؟“ اس کی آواز میں نقاہت تھی۔

”لالی! میں شادو ہوں۔ تیرا لاکل پورا والا یار، شادو۔“

لالی نے ہمت سے کام لیا۔ اٹھ کر بیٹھا۔ شادو کو دیکھا۔ شادو کار کی تیز روشنی میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا جی متلایا اور اس نے ابکائی کے ساتھ تے کر دی۔

تے میں خون ہی خون نکلا۔ لال لال خون سڑک پر پھیل گیا۔ خون دیکھ کر شادو پریشان ہو گیا۔ لالی پر تے کرتے ہی پھر غشی کا دورہ پڑا۔ وہ بے حال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔ شادو نے اسے دھیرے دھیرے جھنجھوڑا۔ ”لالی! لالی! تجھے کیا ہو گیا ہے تو بہت بیمار لگتا ہے۔“ لالی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

شادو نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پیچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ شادو نے گٹھری اٹھائی۔ اسے بھی لالی کے قریب ہی کار میں رکھ دیا۔ کار نئے ماڈل کی کو زلر تھی۔ لی چوڑی تھی۔ سیٹیں بھی کشادہ اور نرم تھیں۔ لالی کار میں آرام سے لیٹا رہا۔ شادو اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھا۔ کار کا انجن اشارت تھا۔ اس نے گئیر بدلا۔ ایکسی لیٹر پیر سے دبایا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

رات ڈھلتی گئی۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ تیز جھونکے کار کے اندر آتے رہے۔ لالی کی طبیعت تدرے سنبھلی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اسے شادو یاد آگیا۔ لالی نے نحیف آواز میں کہا۔

”شادو! تو شادو ہی ہے یا؟“

شادو نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ہاں میں شادو ہی ہوں۔ اب تیری طبیعت کیسی ہے؟“

”شادو! تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟“

”میں تجھے سرکاری اسپتال لے جا رہا ہوں۔ منگمری آگے ہی ہے۔“

”تو مجھے وہاں نہ لے جا۔“ لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔“

”بکواس نہ کر۔ چپ کر کے پڑا رہ۔“ شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے اسپتال لے جانا ضروری ہے۔“

لالی تھوڑا سا اوپر ہو کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے دھیسے لہجے میں کہا۔ ”شادو! میں نوں پتہ ہے، میں جیل سے بھاگا ہوا ہوں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میری گل سن رہا ہے شادو؟“

”سن رہا ہوں۔ میں نوں پتہ ہے، تو جیل سے بھاگا ہوا ہے۔“

”تب بھی تو مجھے اسپتال لے جانا چاہتا ہے؟“ لالی نے شکوے کے انداز میں کہا۔ ”تو مجھے گرفتار کروانا چاہتا ہے؟“

”بکواس نہ کر۔“ شادو نے اسے پھر ڈانٹا۔ ”اسپتال میں اس ٹیم رات کو تجھے کون پہچانے گا۔“

لالی آمادہ نہیں ہوا۔ ”گڈڈی روک لے۔“ مجھے یہیں اتار دے۔ میں اسپتال نہیں جاؤں گا۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔“

”وہاں جا کر کیا کرے گا؟ ادھر تیرا جانے والا کوئی ڈاکٹر یا حکیم ہے؟“

”کادر آباد کے نزدیک نہر کے اس پار بٹوں میں رحیم داد چھا ہوا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی جیل سے بھاگا تھا۔ وہ میرا وہاں انتظار کرتا ہو گا۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔“ لالی کے لہجے میں عاجزی آگئی۔

”شادو تیری مہربانی ہوگی۔“

”پر تیری طبیعت بہت خراب ہے۔ تجھے خون کی الٹی ہوئی تھی۔“ شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”بٹوں پر تیرا علاج کون کرے گا؟ وہاں جنگل اور ویرانہ ہے۔“

”پر میں اسپتال ہرگز نہیں جاؤں گا۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔“

”ہرگز ٹھیک نہیں ہے۔ تو اسپتال جانا نہیں چاہتا تو میں تجھے حکیم چشتی کے پاس لے جاؤں گا۔“ منگمری سے آگے کمال گڑھ ہے۔ حکیم وہیں رہتا ہے۔ بہت ٹھیک ٹھاک علاج کرتا ہے۔ اس کی دوائی سے تو بالکل چنگا ہو جائے گا۔“

”اسی کے پاس لے چل۔ حکیم سے دوائی لینے کے بعد تو مجھے کادر آباد پہنچا دینا۔ میں نوں رحیم

دار کے پاس ضرور جاتا ہے۔“

”چلا جاتا۔ ضرور چلا جاتا۔ پر ابھی اس کے پاس نہیں جاسکتا۔ میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“ فیروز جہاں کے گاؤں میں پہنچا دوں گا۔“

لالی رک رک کر گہری سانسیں بھرتا رہا۔ شادو اسٹیرنگ وھیل سنبھالے سانسے دیکھتا رہا۔ کار سڑک پر دوڑتی رہی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ پھر لالی کی آواز ابھری۔ ”شادو! تو یہ کار کہاں سے لے آیا؟“

”یہ میاں عبدالسمان کی کار ہے۔ میں نے اس کی نوکری کر لی ہے۔ ڈرائیور لگ گیا ہوں۔“

میاں سمان وڈا زمین دار ہے اور بہت نیک بندہ ہے۔“

لالی خاموش رہا۔ اس کی طبیعت پھر بگڑنے لگی تھی۔ پیٹ میں مروڑاٹھی۔ ماتھے پر پسینے کی نمی محسوس ہوئی۔ وہ لیٹ گیا اور رک رک کر سانس لینے لگا۔ اس کی طبیعت بگڑتی گئی۔ ایک بار پھر غشی طاری ہوئی اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ بے حال پڑا رہا۔

کار منگمری شہر سے گزری۔ لالیاں والا سے آگے نکلی۔ لالی نے کار روکوائی، ایک بار پھر خون کی تہ کی اور بے سدھ ہو کر کار میں لیٹ گیا۔



کار کمال گڑھ کی جانب مڑنے لگی۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ کار کہاں جا رہی ہے۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ کار کمال گڑھ میں داخل ہوئی اور حکیم نذر محمد چشتی کے گھر کے سامنے جا کر رک گئی۔ شادو کار سے نکلا۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ کسی نے دروازے کی آڑ سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ یہ حکیم کی بیوی تھی۔ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شادو نے پوچھا۔ ”حکیم جی ہیں، جی؟“

”وہ تو سو رہے ہیں۔ آج تو ویسے بھی دیر سے سوئے ہیں۔ اب تو نہیں اٹھ سکتے۔“

شادو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے کے پیچھے سے حکیم چشتی کی آواز ابھری۔ وہ اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا۔ ”نیک بخت! میں نے ہزار بار کہا، کوئی مریض آئے تو مجھے فوراً جگا دیا کر۔“ حکیم نے دروازہ کھولا۔ باہر آیا اور نرم لہجے میں پوچھا۔

”اس وقت کون آیا ہے؟“

”میں ہوں جی شادو۔“

”اچھا تو ہے۔“ حکیم آنکھیں ملنے لگا۔ ”میں سویرے بوٹیاں چننے بوٹوں کی طرف چلا گیا۔ شام کو

گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس کے پیٹ میں سکھیا کی زیادہ مقدار نہیں گئی ہے۔“ حکیم نے
 کو اطمینان دلایا۔ ”دو چار دن میں بھلا چنگا ہو جائے گا۔ کسی سے دشمنی تھی اس کی؟“
 نادو نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بتایا۔ ”پتہ نہیں جی! یہ تو مجھے سڑک پر پڑا ہوا ملا تھا۔“
 سی انشاء میں لالی نے آنکھیں کھولیں۔ حکیم کو اپنے قریب بیٹھے دیکھا۔ حکیم نے اسے ہوش
 بایا تو نرم لہجے میں پوچھا۔ ”کیا کھایا تھا؟“

لالی نے نحیف آواز میں رک رک کر جواب دیا۔ ”روٹی تھی، سروس کا ساگ تھا۔“ وہ چند لمحے
 شربا اور گہری گہری سانسیں بھرتا رہا۔ ”بنی بھی کھائی تھی۔ لگتا ہے، اس میں زہر تھا۔ میں
 ادھائی ٹکڑا کھایا تھا۔“

”جی تو بچ گیا۔ بنی میں زہر ہی تھا۔“ حکیم نے تسلی دی۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تو
 شربا پڑا رہ۔ زیادہ بات چیت نہ کر۔“

حکیم گھر میں کھلنے والے دروازے تک گیا۔ ایک پٹ کھولا اور جھانک کر اونچی آواز سے کہا۔
 ”نہ کی ماں! جاگ رہی ہو؟“
 ندر سے آواز بھری۔ ”کیا کام ہے جی؟“

”گھر میں دودھ تو ہو گا اور گرم بھی ہو گا۔ پیتل کے بڑے گلاس میں دودھ ڈالو اور اس میں تقریباً
 ماپاؤ گھی ملا کر مجھے دے دو۔“

حکیم یہ ہدایت دے کر لالی کے پاس آگیا اور تخت پر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ مگر اس نے لالی سے
 اچیت نہیں کی۔ لالی آنکھیں کھولے چت لیٹا تھا اور چپ چاپ چھت تک رہا تھا۔ حکیم نے
 اسے پوچھا۔

”میاں سبحان کا کیا حال چال ہے؟ لائل پور میں ہیں یا رحیم یا رخاں گئے ہیں؟“
 ”رحیم یا رخاں تو جی وہ کم ہی جاتے ہیں۔ ادھر کی زمیں داری کی دیکھ بھال ان کا چھوٹا پت کرتا
 - دیے میاں صاحب ان دنوں ذخیرے کے جھل میں شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔“
 ”وہ تو ہر سال کرتے ہیں، سنا ہے۔ بہت شاندار شکار ہوتا ہے۔ دور دور سے بڑے بڑے افسر اور
 مادر شکار کھینچتے آتے ہیں۔“

حکیم نے بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر آہٹ ہوئی۔ حکیم اٹھ کر گیا۔ اس کی بیوی نے
 زسے کی آڑ سے دودھ کا گلاس دیا۔ حکیم نے گلاس سنبھالا اور لالی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔
 ”وہ اسے گاؤ تکیے کے سارے بٹھا دے۔“ شادو بڑھ کر لالی کے پاس گیا۔ کراور گردن کے نیچے

لوٹا۔ بہت تھک گیا تھا۔ ایسی گہری نیند سویا کہ تیرے بار بار کھٹ کھٹانے پر بھی آنکھ نہیں کھلی۔“
 حکیم نے تامل کیا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”یہ بتا کیسے آیا اتنی رات کو؟ تیری گھروالی اور بچے تو خیریت
 سے ہیں؟“

”رب کا شکر ہے جی۔ وہ سب تو ٹھیک ٹھاک ہیں۔ میں تو جی ایک مریض کو دکھانے لایا تھا۔“
 ”کہاں ہے مریض؟“

شادو نے کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کار کے اندر پڑا ہے۔ اس کی طبیعت بہت
 خراب ہے۔“

”کار میں تو اندھیرا ہو گا۔ تو اسے اٹھا کر لے آ۔ میں ابھی مطب کھولتا ہوں۔ تو اسے لے کر
 مطب میں آجا۔“ حکیم گھر میں چلا گیا۔

شادو کار کی جانب بڑھا، دروازہ کھولا۔ وہ مضبوط جسم کا لمبا چوڑا جوان تھا۔ لالی کو ایک بار پھر اس
 نے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ لالی ابھی تک بے حال تھا، اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ شادو اسے
 اٹھائے ہوئے مطب کی جانب بڑھا۔ مطب کا دروازہ کھلا تھا۔ شادو اندر داخل ہوا۔ حکیم چشمی ہاتھ
 میں لالٹین لٹکائے اس کا منتظر تھا۔ مطب میں دیوار سے لگا ہوا تخت تھا۔ اس پر چٹائی بچھی تھی۔
 چٹائی پر سفید چادر کا فرش تھا۔ تخت پر گاؤ تکیہ بھی رکھا تھا۔ تخت کے سامنے کئی مونڈھے پڑے
 تھے۔

حکیم نے اشارہ کیا۔ شادو نے لالی کو تخت پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے سدھ پڑا رہا۔ حکیم
 نے شادو سے دریافت کیا۔ ”اسے کیا ہو گیا؟“

”یہ تو جی پتہ نہیں۔ یہ میرا پرانا بیمار ہے۔ میں میاں صاحب کے ایک دوست کو چھوڑ کر حسین
 والا سے واپس آ رہا تھا۔ مجھے یہ سڑک کے کنارے پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے اسے جھنجھوڑا تو اس نے
 آنکھ کھولی۔ مجھے پہچان لیا۔ اٹھ کر بیٹھ بھی گیا۔ اسے الٹی آئی۔ الٹی کے ساتھ خون ہی خون تھا۔
 میں نے اسے اٹھا کر کار میں ڈالا اور ادھر لے آیا۔ رستے میں اس نے مجھ سے بات چیت بھی کی
 تھی۔ فی ایک الٹی اور آئی اور اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ اس کے بعد سے اسے کچھ ہوش نہیں ہے۔“
 حکیم نے ہاتھ بڑھایا اور لالی کی نبض دیکھنے لگا۔ نبض دیکھنے کے بعد اس نے شادو سے کہا۔
 ”اسے کسی نے سکھیا کھلا دی ہے۔“

شادو نے گھبرا کر پوچھا۔ ”حکیم جی! اب اس کا کیا بنے گا؟ سکھیا کھانے سے تو موت ہو جاتی
 ہے۔“

ہاتھ ڈال کر اسے اٹھایا اور گاؤں کیلے سے ٹیک لگا کر بٹھادیا۔ لالی خاموش رہا۔ اس کا چہرہ مٹا لاپڑ گیا تھا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلکا رہے تھے۔ حکیم اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور گلاس اس کے منہ سے لگا کر ہولا۔

”اسے پی لے۔“

لالی نے چند گھونٹ پئے اور منہ ہٹا لیا۔ حکیم نے دل جوئی کی۔ ”چوٹلے سے کام لے۔ اسے پینے کے بعد تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔“ لالی نے گلاس سے منہ لگایا اور آنکھیں بند کر کے دھیرے دھیرے سارا دودھ پی گیا۔

دودھ پیتے ہی اسے ابکائی آئی۔ حکیم آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ سسلانے لگا۔ لالی کو ذرا قرار آیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد بے چین ہو کر ادھر ادھر گردن ہلانے لگا۔ حکیم نے پوچھا۔ ”الٹی کرے گا؟“ لالی نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ حکیم نے شادو سے کہا۔

”اسے اٹھا کر باہر لے جا۔“

شادو نے لالی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور مطب سے باہر لے گیا۔ لالی اکڑوں بیٹھ گیا اور ابکائیاں لینے لگا۔ پھر اس نے قے کی۔ حکیم نے لالٹین کی روشنی میں دیکھا۔ قے میں دودھ کے ساتھ خون بھی نکلا۔ قے کرتے ہی لالی بڑھال ہو کر زمین پر لیٹ گیا۔ شادو نے اسے اٹھاتا چاہا۔ مگر حکیم نے منع کر دیا۔

”اسے یوں ہی پڑا رہنے دے۔ یہاں ہوا اور ٹھنڈک ہے، اسے آرام ملے گا۔“

قے کرنے کے بعد لالی کو سکون محسوس ہوا۔ الجھن اور گھبراہٹ کم ہو گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

پچھلی رات کی ہوا کے نرم اور خشک جھونکے جسم کو لگے تو لالی کو نیند آگئی۔ حکیم نے اسے سوتے دیکھا تو شادو سے کہا۔ ”اسے گاڑی میں لٹا دے۔“ شادو نے آہستہ سے لالی کو ہاتھوں پر اٹھایا اور کار کی پچھلی نشست پر لٹا دیا۔

شادو واپس حکیم کے پاس آیا۔ حکیم نے کہا۔ ”اب اسے لے جا۔ راتے میں الٹی ہو تو کرا دینا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سٹکیا کا سارا زہر الٹی کے ساتھ نکل جائے گا۔ اسے کوئی اور دوائی دینے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اس کا صحیح علاج کر دیا۔ کل شام تک بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ اسے کل تک صرف دودھ یا لسی پلانا۔ دو ایک روز کمزوری رہے گی پھر ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“

ان ہے اور حوصلے والا بھی ہے۔“

شادو اظہار معذرت کرتے ہوئے بولا۔ ”حکیم جی! میں نے اتنی رات کو تمہیں تکلیف دی۔“

”کوئی بات نہیں۔“ حکیم نے مسکرا کر نرم لہجے میں کہا۔ ”اپنا تو کام ہی بیماروں کی خدمت کرنا ہے۔ میرے لیے دن رات سب برابر ہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔“

شادو نے جیب سے دو روپے نکال کر حکیم کو دیئے۔ اس نے خاموشی سے روپے لے لیے۔ شادو نے کار میں بیٹھ کے اسے اشارت کیا۔ کار آگے بڑھی۔ چند میل کچے راستے پر چلنے کے بعد ملتان وڈ پر آگئی اور تیز رفتار سے سڑک پر دوڑنے لگی۔

☆

کار ضلع لائل پور کی حدود میں داخل ہوئی۔ کمالیہ پہنچی۔ آگے جا کر سمندری کی جانب مڑی۔ رید والا کے قریب لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے کار روکا کے قے کی۔ اس دفعہ خون کی مقدار ت کم تھی۔

شادو نے سارا دے کر لالی کو پھر پچھلی سیٹ پر لٹا دیا۔ وہ بڑھال ہو کر دھیرے دھیرے ہانپنے لگا۔ ب دن نکل آیا تھا۔ سورج چڑھ کر اوپر آگیا۔ ہر طرف دھوپ پھیلی تھی۔ لالی پھر سو گیا۔

کار سمندری تک نہیں گئی۔ راستے ہی میں شادو نے کار موڑی اور اسے سنڈیا نوالا جانے والی کچی سڑک پر دوڑانے لگا۔ گاؤں سنڈیا نوالا سے آگے تھا۔ گاؤں پہنچ کر اس نے پرانی وضع کی ایک دیہی کے سامنے کار روک لی۔ حویلی کی دیواروں پر کائی جی تھی۔ اس نے لالی کو بیدار کیا۔ اب لالی لاطیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔

وہ شادو کے سہارے چلتا ہوا حویلی کے مہمان خانے میں گیا۔ مہمان خانے کے پچھواڑے کدوں کے لیے ایک ہی قطار میں سسلے وار کئی کوٹھریاں تھیں۔ ان کے آگے ٹین کی چھت کا مہمان تھا۔

شادو اسے مہمان خانے کے اسی حصے کی ایک کوٹھری میں لے گیا۔ کوٹھری خاصی کشادہ تھی۔ ل میں چارپائی بچھی تھی۔ چارپائی پر بستر لگا تھا۔ شادو نے لالی کو بستر پر لٹا دیا، باہر گیا۔ کار سے لالی ل گٹھری اٹھا کر لایا اور چارپائی کے سرہانے ایک کونے میں رکھ دی۔ لالی کچھ دیر آنکھیں بند کئے پڑا، پھر سو گیا۔

شام کو اس کی آنکھ کھلی۔ شادو اسی وقت واپس آیا تھا۔ اس نے لالی کو بیدار پایا تو قریب ہی بستر بیٹھ گیا۔ ”اب لاطیعت کیسی ہے؟“

دلہز کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ مگر لالی نے اس سے بات چیت نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے نیند آگئی۔

دوسرے روز بھی وہ ستر پر لیٹا ہی رہا۔ سویرے اس نے لٹی پی۔ دوپہر کو خدا داد نے اسے دودھ میں بھگو کر روٹی کھلائی۔ شادو سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے آیا۔ وہ لالی کے لیے تازہ پھل لایا تھا۔ اپنی ایک اجلی قمیص اور شلوار بھی لایا تھا۔

”کل صبح نماز کپڑے بدل لیتا۔ تیرے کپڑے بہت میلے ہو رہے ہیں۔“

”یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔ کچھ اور میلے کپڑے بھی ہیں۔“ لالی نے سر ہانے رکھی ہوئی گٹھری کی جانب اشارہ کیا۔ ”انھیں میں سویرے دھو ڈالوں گا۔“

”یہ کام تجھے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کل میاں سبحان کو لے کر لائل پور جا رہا ہوں۔ گھر والی کو تیرے کپڑے دے دوں گا، وہ انھیں دھو ڈالے گی۔ میں نے سویرے گھر والی سے تیری بیماری کا کہا تو وہ گھبرا گئی۔ یہاں آنے کو کتنی تھی پر بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ انھیں گھر میں چھوڑ کر وہ کیسے آسکتی ہے۔ اسی لیے میں اسے نہیں لایا۔“

”ٹھیک ہی کیا۔ خاما خا پریشان ہوتی۔ ویسے میری طبیعت اب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ لالی نے مسکرا کر شادو کی طرف دیکھا۔ ”بھابی اب تجھ سے جھگڑا مٹا تو نہیں کرتی؟“

”جب سے میں نے نوکری کی ہے، بہت راضی خوشی ہے۔“ شادو بھی مسکرانے لگا۔ ”ویسے اس کی نراضی ٹھیک ہی تھی۔ روز پولیس والے گھر پر رات کو آواز لگاتے تھے۔ تھانے بلاتے تھے۔ اسے تکلیف ہوتی تھی۔ پاس پڑوس میں بدنامی ہوتی تھی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنا ایک کان پکڑا۔ ”یار اللہ کسی کو سبزی شیر نہ بنائے۔ پولیس ایک بار پیچھے لگ جائیں تو جان نہیں چھوڑتے۔ ہزار نیک چلتی کا ثبوت دو، مانتے ہی نہیں۔“

”تجھے میاں سبحان نے پولیس کے چکر سے نکلوا دیا۔ تو بال بچے والا ہے، تیرے لیے یہ بہت ٹھیک ہوا۔“

”سوچتا ہوں، تیرا کیا بنے گا؟“ شادو نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو کہہ تو میاں سبحان سے تیرے لیے بات کرو؟ اس کا بہت اثر و رسوخ ہے۔ سارے سرکاری افسر اس کی بات مانتے ہیں، اس کے دو بہت بھی وڈے افسر لگے ہوئے ہیں۔“

”تو میرے بارے میں میاں سبحان سے بالکل بات نہ کرنا۔ جانے کیا گڑبڑ ہو جائے۔“ لالی نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ”تو مجھے جتنی ہی مال کا در آباد پنچا دے۔ میں نوں رحیم داد سے ملنا

”ٹھیک ہے۔“ لالی نے نقاہت سے کہا۔ ”پر کمزوری بہت ہے۔“

”فکر نہ کر۔ کمزوری بھی ختم ہو جائے گی۔ تو جلد ہی بھلا چنگا ہو جائے گا۔“ شادو نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی۔ ”بھوک تو نہیں لگ رہی ہے؟“

”بھوک بالکل نہیں ہے۔“

”ایسا کر، تو گرم دودھ پی لے۔ کمزوری کم ہو جائے گی۔ حکیم جی نے دودھ پینے کو بتایا ہے۔ میں تیرے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکوں گا۔ میں نے جیب لے کر ٹوبہ نیک سنگھ جانا ہے۔ کل دوپہر تک واپسی ہوگی۔ میں خدا داد خاں سے کتا جاؤں گا۔ وہ تجھے دودھ پلا دے گا۔“ اس نے دروازے کی طرف منہ کیا اور اونچی آواز سے پکارا۔ ”بابے! ادھر آ۔“ خدا داد خاں کو ٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین لٹک رہی تھی۔

کوٹھری میں روشنی ہوگئی۔ خدا داد نے لالٹین طاق میں رکھ دی۔ وہ بوڑھا اور لاغر تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال سفید تھے۔ شادو نے کہا۔ ”بابے! اسے دودھ لا دے۔ روٹی نہ دینا۔ ویسے اسے بھوک ہے بھی نہیں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”بابے! یہ بیمار ہے۔ اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال کرنا۔ میرا پرانا اور گریا رہا ہے۔“

خدا داد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ ”پر و نہ کر۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نوں پتہ ہے، یہ بیمار ہے۔ آیا تھا تو چلا بھی نہیں جاتا تھا۔“

شادو نے لالی سے کہا۔ ”اب میں چلوں گا۔ بابا خدا داد موجود ہے، بہت بھلا اور نیک بندہ ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے یہاں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوگی۔“ شادو کوٹھری سے چلا گیا۔ خدا داد خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔

لالی چپ لیٹا رہا۔ کمرے میں لالٹین کی زرد روشنی پھیلی تھی۔ باہر صحن میں اندھیرا تھا۔ لال پچھلی رات کے واقعات یاد کرنے لگا۔ اسی اثناء میں بوڑھا خدا داد خاں آہستہ آہستہ کھانا ہوا آیا۔

اس کے ہاتھ میں دودھ سے بھرا ہوا گلاس تھا۔ لالی تکیے سے نیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے خدا داد سے دودھ کا گلاس لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔ دودھ گرم اور میٹھا تھا۔ اس نے دودھ پی کر خدا داد گلاس خدا داد کو دے دیا۔ وہ گلاس لے کر چلا گیا۔

لالی تمہارہ گیا۔ وہ کچھ دیر تکیے کے سہارے بیٹھا رہا پھر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آئی۔ خدا داد خاں واپس آگیا اور کوٹھری کے باہر سائبان کے نیچے برآمدے میں فرش پر بیٹھا۔

ہے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہوگا۔“

”جیسی تیری مرضی۔ میں نوں اب جاتا ہے۔ میاں صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔“

شادو نے لالی کے سرہانے سے گٹھری اٹھائی۔ اسے کھول کر میلے کپڑے نکالے۔ رانقل الر پلٹ کر دیکھی۔ ”یہ ر۔ غل تیرے ہاتھ کیسے آگئی؟“

”بس ایک چکر میں مل گئی۔ آگے کام دے گی۔“

شادو نے کچھ نہیں کہا۔ رانقل پھر چادر میں پیٹ کر رکھ دی۔ وہ لالی کے کپڑے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔ کہنے لگا۔ ”کل لائل پور جاتے ہوئے تیرے کپڑے لے جاؤں گا۔“ وہ چلا گیا۔

لالی نے رات کا کھانا کھایا اور کوٹھری سے نکل کر کھلے صحن میں ٹپٹنے لگا۔ اب اس کے جسم میں دھیرے دھیرے توانائی لوٹ رہی تھی۔ دوسرے روز اس نے غسل کیا۔ اگلے کپڑے پہنے۔ اب کمزوری بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ غسل کے بعد وہ تازگی اور سکون محسوس کر رہا تھا۔ مگر مسمان خانے سے باہر نہیں گیا۔

شام کو اس نے چارپائی کو ٹھری سے نکال کر باہر صحن میں ڈالی۔ بستر بچھایا اور اس پر لیٹ گیا۔ اسے شادو کا انتظار تھا۔ شادو چراغ جلے آیا مگر ٹھہرا نہیں۔ لالی کے میلے کپڑے لے کر چلا گیا۔

بابا خداداد خاں آگیا۔ وہ کھانا لایا تھا۔ لالی کھانا کھانے لگا۔ خداداد چارپائی کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

مسمان خانے میں خاموشی طاری تھی۔ لالی نے کھانا کھاتے ہوئے بوڑھے سے پوچھا۔ ”بابا! یہاں تیرے سوا کوئی دوسرا نوکر چاکر نہیں ہے؟“

”کئی ہیں جی، پر سارے ہی نوکر ادھر جالی فت یا نہ سے آگے جھل کے سامنے میدان میں خیمے لگا رہے ہیں، شکار کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ کل سویرے سے شکار شروع ہوگا۔ نوکروں کے علاوہ پنڈ کے لگ بھگ سو مزارے اور کئی بھی شکار کے لیے ویگا پر لگائے گئے ہیں۔“

”تیری باتوں سے لگتا ہے بہت زوروں کا شکار ہوتا ہے۔“

”نہ پوچھ، کیسا زور دار شکار ہوتا ہے۔“ خداداد خاں نے بتایا۔ ”شکار کھیلنے والے بھی بہت ہوتے ہیں۔ اونچے اونچے افسر، وڈے وڈے زمین دار، دوسرے ضلعوں تک سے شکار کھیلنے والے آتے ہیں۔ کئی تو اپنی گھروالیوں کو بھی ساتھ لاتے ہیں۔ سارے ہی مسمان پھولدار یوں میں ٹھہرنے ہیں۔ دن بھر شکار کھیلا جاتا ہے۔ رات کو زبردست دعوت ہوتی ہے۔ دبا کے شراب پی جاتی ہے، ناچ گانا ہوتا ہے۔ زبردست موج میلا ہوتا ہے۔“

”ہر سال ایسے ہی شکار کھیلا جاتا ہے؟“

”ایک بار نہیں، سال میں دوبار کھیلا جاتا ہے۔ گرمیوں میں پت جھڑکنے کے بعد ادھر شکار ہوتا ہے۔ یہ تو سرکاری جھل ہے۔ میاں سبحان کے پاس برسوں سے اس کا ٹھیکا ہے۔ پر اصلی شکار تو برسات کے بعد ادھر راجیم یا ر خاں میں ہوتا ہے۔ وہاں ریتی میں میاں سبحان کی اپنی شکار گاہ ہے۔ میں تو شکار کے دنوں میں وہاں بھی جاتا ہوں۔ بہت شان دار شکار گاہ ہے۔ میاں سبحان نے شکار کے لیے ادھر طرح طرح کے پرندے، خرگوش اور دوسرے جانور پال رکھے ہیں۔ شکار کا مزہ تو راجیم یا ر خاں میں آتا ہے۔“

لالی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہ ہوا۔ میاں سبحان وڈا زمیں دار ہے؟“

”تم نوں پتہ ہے، وہ کتنا وڈا زمیں دار ہے؟ بگیر دار ہے، بگیر دار۔“ خداداد نے جوش و خروش سے اظہار کیا۔ ”ادھر لائل پور میں تو اس کے صرف ۳۰ مرتے ہیں، پر راجیم یا ر خاں میں تو لگ بھگ چار سو مرتے ہوں گے۔ ۲۵ مرتے پر تو اس کی شکار گاہ ہے۔ دو سو مربع زمین پر کھیتی باڑی ہوتی ہے۔ سو پر آم، امرود اور مالٹے کے باغ ہیں۔ باکی زمین پر جھاڑیاں اور جھنگر ہیں۔ سنا ہے میاں سبحان اسے بھی صاف کرا کے مویشی فارم بنانا چاہتا ہے۔“

”جب ادھر اس کی دس ہزار ایکڑ زمین ہے تو یہاں لائل پور میں کیوں رہتا ہے؟“

”یہاں وہ اپنے تیسرے پت کے لیے کپڑا بنانے کا کارخانہ لگانے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس کا پت ابھی لاہور میں پڑھ رہا ہے۔ میاں سبحان اسے کاروباری لین میں ڈالنا چاہتا ہے۔ سننے میں تو یہی آیا ہے۔ ویسے جی، اسے کیا پروا۔ اللہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اس کے دو پت وڈے افسر لگے ہیں۔ ایک لاہور میں ہے۔ دوسرا پنڈی میں لگا ہے۔ فوج میں کرنیل ہے۔“ خداداد کو کھانسی کا ٹھکا لگا۔ جتنے وہ کھانسا رہا۔ ذرا اقرار آیا تو بتانے لگا۔

”کچ پوچھو تو جی، شکار کا بندوبست تو میاں کا لاہور والا پت ہی کرتا ہے۔ میاں سبحان تو آج لائل پور چلا گیا۔ اب نہیں آئے گا۔“

”ویسے شکار کا سلسلہ تو میاں سبحان نے شروع کیا ہوگا؟“

”نہیں جی، یہ بات نہیں ہے۔“ خداداد خاں نے بتایا۔ ”شکار تو اس کا پو بھی اسی شان سے چلاتا تھا۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ میں پہلے اسی کے پاس نوکر تھا۔ اسی نے راجیم یا ر خاں میں شکار گاہ کے لیے جنگل لگوا دیا تھا۔ انگریز افسروں، راجوں اور نوآبادیوں کو شکار کھیلنے کے لیے

بلاتا تھا۔ سردی شروع ہوتے ہی شکار کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ شکاریوں کے ٹھہرنے کے لیے چھوٹا دریاں لگائی جاتیں۔ انگریز افسروں کے ساتھ ان کی میس میں بھی شکار کے پیچھے گھوڑے دوڑاتیں۔ شام کو شکار سے تھک کر آتے تو بیوں میں نہانے کے لیے گرم گرم پانی بھرا ہوتا۔ ”زیر لب مسکرایا۔ ”بالکل ننگی ننگی نہاتیں۔ انھیں ذرا لاج نہ آتی۔ زور زور سے ہنستیں۔ ٹھٹھے لگاتیں۔“

”اب ایسا نہیں ہوتا؟“

”ہوتا تو اب بھی ایسا ہی ہے۔ پر اب وہ بات نہیں رہی۔“ وہ ہنچے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بات ہے جی! وہ اپنی جوانی کے دن تھے۔ اب بڑھاپے میں کچھ چنگا نہیں لگتا۔ اسی لیے ادھر پرارتا ہوں۔ شکار دیکھنے نہیں جاتا۔“

”میاں سبحان کا دادا بھی وڈا زمیں دار ہوگا؟“

”پہلے تو نہیں تھا، بعد میں وڈا زمیں دار بن گیا۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں، پر سننے میں ایسا ہی آتا ہے۔“

لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ”بابے! وہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟ کہاں سے اس کے پاس اتنی بہت ساری زمین آگئی؟“

”میرا پپو اسے ٹھیک طرح جانتا تھا۔ وہی اس کے بارے میں بتاتا تھا۔ میاں سبحان کے دادا کا نام رحمان تھا۔ وہ ملتان کے انگریز کمشنر برکے کا سائیس تھا۔“

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”سائیس تھا؟“

”ہاں جی، سائیس ہی تھا۔“ خدا داد خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”برکے تھا تو اسٹنٹ کمشنر اس نے بہادری میں بہت نام پیدا کیا۔ میراثی اس کی بہادری کے گیت بتاتا کر گاتے تھے۔ بگے داروں، سرکاری افسروں اور انگریزوں سے خوب انعام پاتے تھے۔ کچھ تو ڈھڈے اور سارنگی، مرزا صاحبان کی دھن پر گاتے تھے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کر لمبی تان سے برکے کی بہادری کی سدا لگاتے تھے۔ کچھ میراثی برکے کی شان میں دار بھی گاتے تھے۔ میں نے ایسے سدا اور وار بہت سنے ہیں۔ اب بھی کوئی بوڑھا میراثی مل جائے تو اسے ایسے گیت یاد ہوں گے۔ اب ان کا رواج نہیں رہا انگریزوں کے راج میں تو بہت گائے جاتے تھے۔“

”یہ تو نے عجب گل سنائی۔“ لالی نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”میاں سبحان کا دادا برکے کا سائیس ہوتا تھا۔ پر سائیس کی کرتے کرتے وہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟“

”وہ ایسا ہوا جی، جب ۱۸۵۷ء کا غدر ہوا تو احمد خاں کھل بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ تو تین نو پتہ ہی ہو گا کہ کھل، گوگیرہ اور اس کے آس پاس راوی کے دونوں کناروں پر آج بھی بے ہیں۔ جڑا نوالا، تاندلیا نوالا، کھڑیا نوالا اور اس سے بھی آگے دار برٹن اور سید والا تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان دنوں گوگیرہ سرکاری ہیڈ کوارٹر ہوتا تھا۔ برکے بھی وہیں ہوتا تھا۔“

لالی خود بھی گوگیرہ میں پیدا ہوا تھا اور اس کا باپ بھی کھل تھا۔ مگر اس نے اس کا اظہار نہ کیا۔ ناموش بیٹھا خدا داد خاں کی باتیں سنتا رہا۔

”پر احمد خاں کا گھر جھمرے میں تھا۔ وہ کھل اپیروں کا سردار ہوتا تھا۔ تب ہی تو اسے احمد خاں اپرا بھی کہا جاتا ہے۔ بہت ہی بہادر اور حوصلے والا بندہ تھا۔ سنا ہے ڈیڑھ ڈیڑھ گز لمبے تو اس کے ہاتھ تھے۔ پھاڑ کی طرح اونچا اور یہ چوڑا سینہ۔“ خدا داد نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ”بہت لمبا رنگ اور زور آور تھا۔ ایسا زور آور تو کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ شیر کی طرح جھپٹ، جھپٹ کر تلے کرتا تھا۔“

لالی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا، لیکن اس نے مداخلت نہ کی۔ خدا داد خاں پر جوش لہجے میں بولتا رہا۔ ”گوگیرہ کا سردار رائے ساون خاں اور اس کا پت، سادو خاں بھی احمد خاں کے ساتھ شریک ہو گئے۔ فٹ یا نوں اور وٹوؤں کو بھی احمد خاں نے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سچ پوچھ تو راوی سے ستلج تک سارے ہی سردار لڑائی میں احمد خاں کے ساتھ تھے۔ صرف جویا الگ رہے۔ ستلج کے اس پار جو دو تھے وہ بھی اس کے ساتھ نہ آئے بلکہ انگریزوں سے مل گئے۔ اسی وفاداری کے صلے میں ان کو مرٹے ملے۔ جائیدادیں اور لمبرداریاں ملیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پاکستان بنا تو وہ پناہ گیر بن کر ادھر آ گئے اور جی انگریزوں کی دی ہوئی زمینوں کے بدلے یہاں بھی متروکہ جائیداد ملے اسے اتنی اراضی الاٹ کرائی کہ کئی تو وڈے بگیرہ دار بن گئے۔“

”ایسا تو بہت ہوا۔ متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹ کرنے والے افسر تو وہی تھے جو انگریزوں کے وفا دار رہ چکے تھے۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔ ”وہی کیا، سارے ہی افرایے تھے۔ کسی کو بھی ہٹایا نہ گیا بلکہ ملے سے تو سنا ہے، ان کے عہدے اور بڑھادیے گئے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔“

”بابے! تو احمد خاں کھل کے بارے میں بتا رہا تھا۔“ لالی نے خدا داد کو یاد دلایا۔

”ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا، احمد خاں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ بھڑکانا شروع کر دی۔“ خدا داد خاں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”اس نے گوگیرہ میں بھی بغاوت کرادی اور

ایر ریاستی فوج انگریزوں کی مدد کے لیے دے دی۔“ اس نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔
دھرم خاں کھل نے سید والا کے نزدیک راوی کے کنارے ایک پنڈ، سرآباد، میں پڑاؤ ڈال رکھا تھا
انگریزوں کو پنجاب سے نکال دینے کی تیاری کر رہا تھا۔“

”انگریزوں کو اس کی تیاریوں کا پتہ نہیں تھا؟“
”بالکل پتہ تھا۔ اسی لیے تو انھوں نے اپنی فوجی طاقت بڑھانے کے لیے یہ چال چلی کہ اپنے
لرندوں کے ذریعے ایک رات چپکے سے جھمرے میں آگ لگوا دی۔ ساری ہستی جل کر راکھ کا ڈھیر
ہو گئی۔ جھمرے اور آس پاس کے دوسرے سرداروں میں یہ افواہ پھیلادی، آگ احمد خاں نے
لگوائی ہے اور ان کے سیکڑوں مویشی بھی اٹھا کر لے گیا۔ کھل سردار انگریزوں کے بھکانے میں
آگئے اور اتنے نراض ہوئے کہ احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔“

خدا داد خاں کو کھانسی کا ٹھک لگا۔ وہ دیر تک کھانستا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ ”ہاں تو
جی میں یہ کہہ رہا تھا۔ کھل سرداروں نے احمد خاں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس طرح وہ بہت کمزور پڑ
گیا۔ پریشان بھی ہوا۔ پر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ ادھر کے وٹو اور فت یا نے تو اس کے ساتھ
تھے ہی، اب کے کھلوں کے سردار سارنگ خاں کو بھی اس نے اپنی ساتھ ملا لیا۔ سرآباد کو چھوڑا
اور اس بار گنگٹوری کے جنگل میں اپنا ٹھکانا بنایا۔ انگریزوں کی اتنی وڈی فوج سے کھل کر لڑنے کی تو
اس کے پاس طاقت نہیں تھی۔ اب اس نے نئی طرح کی لڑائی شروع کی۔ جنگل سے اچانک نکلتا۔
انگریزوں کی فوج پر چھاپے مارتا اور فیر جنگل میں گھس جاتا۔ انگریز اس کے ان اچانک حملوں سے
بہت پریشان ہو گئے۔ انھوں نے فوجی مدد منگوائی۔ بہت زبردست فوج انھیں کی اور گنگٹوری کے
جنگل کا محاصرہ کر لیا۔ ایسی سخت ناکہ بندی کی کہ احمد خاں کی فوج کو رسد ملنی بالکل بند ہو گئی۔“

”تب تو وہ انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہوگا۔“ لالی نے قیاس آرائی کی۔
”نہیں جی، اس نے ایسا نہیں کیا۔“ بوڑھے خدا داد نے کڑک کر کہا۔ ”وہ ہمارے بندہ تھا۔
بزدلوں کی موت مرتا نہ چاہتا تھا۔ جب حالات بہت خراب ہو گئے تو ایک روز وہ جنگل سے نکل کر
انگریزوں کی فوجوں کے سامنے آیا۔ ایسی زبردست لڑائی ہوئی کہ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں دکھائی
دیتی تھیں۔ احمد خاں اور سردار سارنگ اس لڑائی میں مارے گئے۔ کہتے ہیں احمد خاں آخر دم تک
لڑتا رہا۔ اس کے بدن پر زخم ہی زخم تھے۔ وہ خون میں نہایا ہوا تھا۔ جب وہ زخموں سے بڑھال ہو کر
گھوڑے سے گرا تو ایک گورا اس کا سر کاٹنے کے لیے جھپٹا، پر احمد خاں کھل نے گرتے گرتے بھی
تکوار کا ایسا ہاتھ مارا کہ حملہ کرنے والے انگریز فوجی کا سر گردن سے کٹ کر دور جاگرا۔“ خدا داد

ایسی بغاوت کرا دی کہ کیدیوں نے جیل کا پھانک توڑ ڈالا، پر باہر نکلنے نہ پائے۔ تب تک دہلی سے
انگریزوں کی مدد پہنچ گئی۔ اس فوج نے نئے کیدیوں پر فائر کھول دیا۔ کیدیوں کے پاس صرف ہتھیار
لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اندھا دھند فائرنگ کے سامنے کب تک ٹھیرتے؟ ۵۱ مارے گئے اور زخمی
تو بہت ہوئے۔ جیل کی زمین اور دیواریں ان کے خون سے لال ہو گئیں۔“

”احمد خاں کھل نے ان کی کوئی مدد نہیں کی؟“

”اس کے پاس ان دنوں بہت تھوڑی فوج ہوتی تھی۔ تب تک وہ چھپ چھپ کر انگریزوں کی
فوجوں پر حملے کرتا تھا اور اس کے ساتھ اپنی طاقت بھی بڑھاتا جا رہا تھا۔“ خدا داد نے لالی کو
مطلع کیا۔ ”میں نے تو سنا ہے تھوڑی فوج ہونے پر بھی احمد خاں نے جیل کے کیدیوں کی مدد کے لیے
جم کر لڑائی لڑی۔ پر انگریزوں کے پاس بہت زیادہ فوج تھی۔ احمد خاں کے کتنے ہی ساتھی اس لڑائی
میں مارے گئے۔ ان میں رائے ساون خاں بھی شامل تھا۔ ساون خاں بہت بہادر سردار تھا۔ اس
کے مرنے پر احمد خاں کھل کمزور پڑ گیا۔ وہ گوگیرہ سے نکل کر اپنے پنڈ جھمرے کی طرف پلٹا۔ برٹے
اپنی فوج لے کر اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ راوی پار کرنے سے پہلے ہی احمد خاں کو گرفتار کر لینا چاہتا
تھا۔ پر وہ گولیوں کی بوچھاڑ میں راوی کے پیچھے گھوڑا دوڑاتا ہوا صاف نکل گیا۔“
”برٹے نے راوی پار کرنے کی کوشش نہیں کی؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”نہیں وہ راوی سے آگے نہ بڑھا۔“ بوڑھے خدا داد خاں نے بتایا۔ ”جھمرے پہنچ کر احمد خاں
نے دوبارہ اپنی فوج اکٹھی کی اور دہلی کے بادشاہ کے ساتھ کھل کرو فاداری کا اعلان کر دیا۔ دوسرے
سرداروں نے بھی اس کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ فیر توجی چناب سے
ستلج تک ہر طرف بغاوت پھیل گئی۔ باغیوں نے کمالیہ پر کبضہ کر لیا۔ کمالیہ کا سردار رائے سرفراز
خاں انگریزوں سے ملا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ سکھ سردار بیدی بھی شریک تھا۔ دونوں بھاگ کر
گوگیرہ چلے گئے۔ احمد خاں کھل اور اس کے ساتھی سرداروں نے ان کا پیچھا کیا۔ راوی سے گزر
کر دوبارہ گوگیرہ پہنچے۔ زبردست معرکہ ہوا۔ احمد خاں اور اس کے ساتھی ایسی بہادری سے لڑے کہ
انگریزوں کی فوجیں ٹھہرنہ سکیں۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ میدان جنگ سے بھاگ کھڑی ہوئیں
فتح نے احمد خاں کھل کا حوصلہ اور بڑھادیا۔“

”انگریزوں کا کیا ہوا؟“ لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”انگریز بہت گھبرا گئے۔ انھوں نے مدد کے لیے الفسٹن کو بھاری فوج دے کر بھیجا۔ اس میں
زیادہ تر سکھ فوجی تھے۔ فیر یہ بھی ہوا کہ بھاول پور کے نواب صادق مھر خاں نے بھی

ہمت کی جانب سے اسے وفاداری کا صلہ دیا جائے۔ لوجی اس کاغذ سے رحمان کا نصیب جاگ
-ما۔“

لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”وہ کیسے؟“
”ہوایہ کہ انگریزوں نے جب بغاوت کچل ڈالی اور ان کی فتح ہوئی تو وہ فتح کے نفع میں جگہ جگہ
پہریاں لگاتے، باغیوں کو پکڑ کر چھانسی پر لٹکاتے اور انگریزوں کے وفاداروں کو انعام اور بخشش
دیتے۔ کرنیل جینسن ادھر کی انگریز فوج کا کمانڈر تھا۔ وہی ہر جگہ جا کر پکھری لگاتا۔“ بابا خداداد خاں
بہر گھر کرتا رہا۔

”رحمان سیدھا کرنیل جینسن کے پاس پہنچا۔ کرنیل ان دنوں رحیم یار خاں میں تھا۔ اس نے اپنی
پکھری لگا رکھی تھی۔ رحمان پکھری میں گھس گیا۔ کرنیل نے نراض ہو کر اسے گھورا۔ رحمان نے
جوتی کے ڈپ سے جھٹ برکے کا خون سے لکھا ہوا پرچہ نکالا اور اس کے سامنے پیش کیا۔ کرنیل
جینسن نے اسے پڑھا تو اس کی ساری نراضی جاتی رہی۔ پچھتی نال انھ کر کھڑا ہو گیا۔ سر سے ٹوپی
اتار کر رحمان کو سلام کیا، ہاتھ ملایا اور اپنے برابر کرسی پر بٹھا کر بولا۔ دل مسٹر رحمان! کہنی ہمدار کی
حکومت تمہاری وفاداری کی پوری پوری کد رکرتی ہے۔ تمہیں اس وفاداری کا صلہ بھی ملے گا۔ تم
اصطبل سے ہمارا گھوڑا لو، اس پر بیٹھو، جتنی زمین پر تم گھوڑا دوڑاؤ گے وہ سب تمہاری ہوگی۔ اس
نے فوراً حکم بھی جاری کر دیا۔“

”رحمان نے فیر کیا کیا؟“

”کرنا کیا تھا جی، اس نے جا کر اصطبل سے گھوڑا نکالا۔ اس پر سوار ہوا۔ اسے دوڑایا اور دوڑاتا
چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو گھوڑا تھک کر اتنا تڑھال ہو چکا تھا کہ رکتے ہی لڑکھڑا کر گرا اور مر گیا۔ رحمان
کا یہ حال ہوا کہ ہانپتے ہانپتے زمین پر لیٹ گیا۔ کرنیل جینسن نے اپنے گھوڑے کی موت کا بالکل برا
نہیں منایا۔ اس نے رحمان کو شاباشی دی۔ خوش ہو کر اس کی پیٹھ ٹھوکی اور جتنی زمین پر رحمان نے
گھوڑا دوڑایا تھا، ساری کی ساری رحمان کو بخش دی۔“

لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”تو اس طرح میاں سبحان کے دادا کو اتنی وڈی زمیں داری ملی۔“
”ہاں جی بالکل اسی طرح۔ میرا پیو یہی بتاتا تھا۔“ خداداد خاں نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔
”میاں سبحان کے دادا نے انگریزوں کا ساتھ دیا، وفاداری دکھائی، وہ سائیس سے بگیر دارین گیا۔
خان ہمداری کا خطاب بھی پایا۔“ اس کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ ”میرے دادا محمد خاں نے
انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ کرنیل جینسن ہی کے حکم پر چھانسی پر لٹکایا گیا۔ وہ بھی کھلوں کا

کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”زمین پر آکر احمد خاں کھلنے
سجدے کے لیے سر جھکا دیا اور کلمہ پڑھنے لگا۔ سردار سرفراز خاں اور سردار بیدی گھات میں تھے۔
جھٹ آگے بڑھے اور احمد خاں کھل کا سر کاٹ دیا۔ اسے لے کر خوشی خوشی انگریز افسر کے سامنے
پہنچے۔ وہ بہت خوش ہوا۔ اس کی سفارش پر سردار سرفراز خاں کو نواب کا خطاب اور کمالیہ کی بگیر
ملی۔ سردار بیدی کو پاک پتن میں سیکڑوں مرتے ملے۔ یہ مرتے اب انگریزوں کے وفاداروں کو
الاث کر دیئے گئے ہیں۔“

خداداد خاں کی آواز بھرا گئی۔ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ لالی دم بخود بیٹھا رہا۔ چند لمحے خاموشی
رہی، پھر خداداد کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”آج احمد خاں کھل کو کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس کا
ذکر نہیں کرتا۔ اس کی ہمداری کی شان میں کسی میراثی نے گیت نہیں گایا۔ کوئی سد نہیں لگایا۔ لگاتا
تو جیل میں بند کر دیا جاتا یا گولی سے اڑا دیا جاتا۔ میں تو کہتا ہوں اسے سد بھی کسی نے انگریزوں کو
خوش کرنے کے لیے بتایا ہو گا۔“

بوٹیاں دے گیت کوئی نہیں گاؤندا

بز دلاں دی سد کوئی نہیں لاؤندا

لالی مسکرا کر بولا۔ ”بابے! توجی مچ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اب تیرا بھیجا کام نہیں کرتا۔ میں نے میاں
سبحان کے دادا کے بارے میں پوچھا اور تو نے احمد خاں کی گل چھیڑ دی۔“

”تمہیں کیسے پتہ؟“ میرا دادا ابھی احمد خاں کھل کے ساتھ انگریزوں کے خلاف لڑا تھا۔ اسے پکڑ
کر چھانسی پر لٹکایا گیا۔ وہ بھی اپیرا سردار تھا اور بہت جی دار بھی تھا۔ خداداد خاں نے گردن اونچی
کرتے ہوئے فخر سے کہا۔ ”اب اپنے مطلب کی گل سن۔ احمد خاں کے مارے جانے کے بعد بھی
باغیوں نے انگریزوں کے آگے ہتھیار نہیں ڈالے۔ ان میں فتن یا نوں اور وٹوؤں کے ساتھ تڑانے
اور سیال بھی شامل تھے۔ کوڑے شاہ کے نزدیک راوی کے کنارے ان کا برکے سے ٹاکرہ ہوا۔ اس
لڑائی میں انگریزوں کی زبردست ہار ہوئی۔ ان کے ۵۵ فوجی مارے گئے۔ برکے بری طرح زخمی ہوا۔
سبحان کا دادا رحمان اس کے ساتھ تھا۔ اس نے زخمی برکے کو گھوڑے پر ڈالا اور لڑائی کے میدان
سے نکال کر نزدیک کے پیلے میں لے گیا۔ اس نے برکے کی جان بچانے کی بہت کوشش کی۔ وہ بچ تو
نہیں سکا پر رحمان کی وفاداری اور خدمت سے اتنا خوش ہوا کہ مرتے دم اس نے اپنے خون سے
کاغذ کے ایک پر زے پر یہ لکھ دیا کہ رحمان انگریزوں کا زبردست وفادار ہے۔ اس نے میری جان
بچانے کے لیے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ اس کی وفاداری اور خدمت کو تسلیم کیا جائے اور

سردار ہوتا تھا۔ اس کی تمام جائیداد اور زمین ضبط کر لی گئی۔ موٹی بھی سارے کے سارے چھپ لیے گئے۔ سب کچھ چلا گیا۔ سرداری بھی گئی۔ انگریز، باغی سرداروں اور ان کی آل اولاد کو جانچ کتے تھے، سو میں اور میرا پوجا نگلی کے جانے لگے۔ سجان اور اس کا بیو میاں بن گئے۔ اب رحمان سائیس کا پوتا زمیں داری کرتا ہے اور سردار محمد خاں کھل کا پوتا خدا داد خاں اس کی نوکری کرتا ہے۔ ”اس نے دل گرفتہ ہو کر آہ سرد کھینچی۔ ”اپنا اپنا نصیب ہے جی۔“

”بابے! تیرا کوئی پتر نہیں ہے؟“

”دو ہیں جی۔“ خدا داد نے بے نیازی سے کہا۔ ”وڈا پت تو ایک رسا گیر زمیں دار کے لیے ڈگر چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ اب جیل کاٹ رہا ہے۔ دوسرا میاں سجان کے فارم پر رحیم یار خاں میں مزدوری کرتا ہے۔“ اس کے لہجے میں درد کی جھین تھی۔ ”جاننگلی پو کے جاننگلی پتر اور کر بھی کیا سکتے ہیں جی!“

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ بوڑھا خدا داد خاں کھل بھی خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے کی جھریاں اور نمایاں ہو گئیں۔ آنکھوں سے دیرانی تھلکنے لگی۔ وہ کچھ زیادہ بوڑھا اور کمزور نظر آنے لگا۔ کچھ دیر اسی عالم میں گم صم بیٹھا یا دوں کی دھندلی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا، پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کے سامنے سے اس نے کھانے کے برتن اٹھائے اور باورچی خانے کی جانب چلا گیا۔



شادو سویرے آیا اور لالی کو اپنے ہم راہ چپ میں بٹھا کر شکار دکھانے لے گیا۔ چپ گلیوں سے گزرتی ہوئی گاؤں سے باہر نکلی اور ایک کچے راستے پر جنگل کی جانب دوڑنے لگی۔ جنگل زیادہ دور نہیں تھا۔ خوب گھٹا تھا اور دریاے راوی کے کنارے دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جنگل کے سامنے کھلا میدان تھا۔ میدان میں جگہ جگہ خیمے لگے تھے۔ ہر طرف چم چم پھل اور گھما گھما کھی تھی۔ شکاری رات ہی کو پہنچ گئے تھے۔

چپ خیموں کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ لالی نیچے اترا۔ شادو بھی اترا اور ایک خیمے میں داخل ہو گیا۔ ابھی سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ آسمان پر اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ شکاری بیدار ہو چکے تھے۔ خیموں کے اندر ان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ سور کے شکار کا ہانکا کرنے والے کئی اور مزارے لمبی لمبی لٹھیاں اور برتھے ہاتھوں میں دبائے ایک جگہ جمع تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے اور ان کے راکھے بھی تھے۔

سورج نکلا۔ زرد زرد دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جگمگانے لگی۔ ہانکا کرنے والے اور راکھے

ری کتوں کے ساتھ جنگل میں گھس گئے۔ وہ جنگل کے لدلی حصے کی جانب جا رہے تھے جہاں گنے زرخیز تھے۔ ان چھتروں کے اندر جنگلی سور دن میں چھپے رہتے ہیں۔ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی ان کے غول جنگل سے نکلتے ہیں۔ آس پاس کے دیہات کی جانب جاتے ہیں۔ کھیتوں میں گھس جاتے ہیں۔ ریت کی فصل ہو تو گندم اور جو کے خوشے اور پنے اور سرسوں کے پودے کھا جاتے ہیں۔ خریف کی فصل ہو تو مکئی کے تے اور کپاس کے ڈوڈوں سے نکلی ہوئی سیفد پھٹی کھا جاتے ہیں۔ لکھت میں گھستے ہیں، اسے روند ڈالتے ہیں۔ ان کھیتوں سے ایسی بدبو نکلتی ہے کہ موٹی بھی ان پودے نہیں کھاتے۔

دھوپ رفتہ رفتہ ہر طرف پھیل گئی۔ سورج چڑھ کر اوپر آگیا۔ شکاری ناشتے سے فارغ ہو کر وں سے باہر نکلنے لگے۔

وہ تین ٹولیوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی جیپوں میں بیٹھ کر سور کے شکار کے لیے چھتروں کی جانب لہہ ہو گئی۔ اس میں اکثریت زمیں داروں کی تھی۔ دوسری ٹولی کے شکاری جیپوں کے علاوہ وڑوں پر بھی سوار تھے۔ ان کے ساتھ شکاری کتے بھی تھے۔ وہ خرگوش اور ہرن کا شکار کھیلنے جا رہے تھے۔ تیسری ٹولی کے شکاری بھی جیپیں اور گھوڑے دوڑاتے ہوئے جنگل میں گھس گئے۔ وہ لدوں کے شکاری تھے۔

بیشتر شکاری بڑے افر تھے۔ شکاریوں میں اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ بڑے زمیندار بھی تھے۔ بہت سے شکاریوں کے ساتھ ان کی بیویاں بھی تھیں۔ وہ تیز خوشبوؤں سے مہکتی، مٹی سنوری پنے شوہروں کے پہلو سے لگی جیپوں میں بیٹھی تھیں۔ لالی نے حیرت سے دیکھا، کئی پالکیاں بھی میں اور انھیں کمی اور مزارے اٹھائے ہوئے چل رہے ہیں۔ پالکیوں میں بھی شکاریوں کی بیویاں رہنمائی سوار تھیں۔ وہ نئے نئے فیشن کے خوب صورت لباس پہنے ہوئے تھیں۔ انھوں نے ایت اہتمام سے میک اپ کیا تھا۔ بال طرح طرح سے سنوارے تھے۔ وہ خوبصورت اور طرح ر نظر آ رہی تھیں۔ کھلی پالکیوں میں بیٹھی وہ ہنستی مسکراتی، پرندوں، خرگوشوں اور ہرنوں کا شکار لکھنے جا رہی تھیں۔

سور کا شکار کھیلنے والی پارٹی میں صرف دو شکاریوں کی بیویاں شریک تھیں۔ وہ نصف آستینوں کی اکی قیص اور پتلونیں پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے ہاتھ میں بندوقیں دبی تھیں۔ وہ صرف شکار دیکھنے میں آئی تھیں بلکہ سور کا خطرناک شکار کھیلنے کا حوصلہ بھی رکھتی تھیں۔ لیکن پرندوں، خرگوشوں اور ہرنوں کا شکار کھیلنے والی بیگمات کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں بھی قیص اور پتلون پہننے والیاں

شامل تھیں۔

شادو نے لالی کو بھی جنگل میں لے جانا چاہا مگر وہ نہیں گیا۔ کچھ دیر بعد شکاری اپنی بیویوں کے ساتھ جنگل میں داخل ہو کر گھنے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ لالی خیموں کے ارد گرد گھومتا رہا، پھر جلی کی جانب واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور سو گیا۔ دن ڈھلے وہ سو کر اٹھا۔ اس نے غسل کیا اور تروتازہ ہو کر شادو کا انتظار کرنے لگا۔ اب اس کی طبیعت بالکل ٹھیک تھی۔ کمزوری بھی بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ وہ قادر آباد جانا چاہتا تھا اور اسی روز جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

سورج غروب ہو گیا۔ مگر شادو نہیں آیا۔ لالی اس سے ملنے کے لیے اس میدان کی جانب چل دیا، جس میں شکاریوں کے خیمے تھے۔ شادو وہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے لالی کو یہی تاثر دیا تھا۔ لالی میدان میں پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جنگل میں منگل کا سماں ہے۔ مٹی کے تیل سے چلنے والے جزیئر کے ذریعے بجلی پیدا کی جا رہی تھی۔ ابھی شام ہی تھی مگر خیموں کے اندر اور باہر ہر طرف بلب روشن تھے۔

نوکر چاکر نہایت مستعدی سے ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ خیموں سے کچھ فاصلے پر میدان میں بڑے بڑے چولھوں میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ ان پر رکھی ہوئی دیگوں میں طرح طرح کے کھانے پکائے جا رہے تھے۔ کہیں دہکتے ہوئے سرخ سرخ انگاروں پر مرغ تلتے جا رہے تھے کہیں کباب بنائے جا رہے تھے۔

شادو کی تلاش میں لالی ادھر ادھر نظریں دوڑاتا خیموں کے درمیان گھومتا پھرتا رہا۔ مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اس نے ایک ملازم کو ٹوکا جو قریب کے خیمے سے نکلا تھا۔

”گل سن! تیں نوں پتہ شادو کتھے ہے؟“

ملازم نے ایک خیمے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”وہ تو جی، میاں سجان کے وڈے پت میاں سلیم کے پاس اس خیمے میں ہے۔“

لالی نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اس خیمے کی طرف بڑھا، قریب پہنچا، خیمے کا پردہ کھلا تھا۔ میاں سلیم چوڑی چوڑی دھاریوں کی ریشمی قمیص اور ویسا ہی پاجامہ پہنے، آنکھیں بند کئے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ و سفید تھا، سر کے بال آگے سے کسی قدر اڑے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی موچھ صاف تھی۔ قد اونچا تھا اور جسم خاصا بھاری بھر کم تھا۔ عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ صوبائی حکومت کے محکمہ زراعت و خوراک کا سیکرٹری تھا۔

شادو فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا میاں سلیم کے پیر دبا رہا تھا۔ شادو نے مڑ کر لالی کو دیکھا، رایا اور اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔ لالی خیمے میں چلا گیا۔ شادو نے میاں سلیم کو مخاطب تے ہوئے کہا۔ ”صاحب جی! یہ خود میاں آگیا۔ میں اسی کے پاس جانا چاہتا تھا۔ میرا بہت پرانا ہے۔“

سلیم نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”تب تو یہ بھی جراثیم پیشہ ہو گا؟“

شادو نے جھٹ بات بتائی۔ ”نہیں جی! ایسی کوئی گل بات نہیں۔ یہ بہت نیک بندہ ہے۔“

سلیم نے لالی سے کہا۔ ”تو میرے کندھے اور بازو دبا دے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ سارا جسم رہا ہے۔“ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

شادو نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ لالی کرسی کے پیچھے گیا اور چپ چاپ میاں سلیم کے کندھے اور دبانے لگا۔

خیمے میں خاموشی تھی۔ خیمہ خاصا بڑا اور کشادہ تھا۔ ایک طرف لوہے کا فولڈنگ بلیک تھا۔ اس کا سپرنگ لگے ہوئے تھے۔ بلیک پر موٹا گدا بچھا تھا اور اس پر اجلی چادر اور نرم نرم تکیوں کا بستر

بلیک کے اوپر چھروانی تھی۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس کے سامنے کرسی تھی۔ میز پر سنگھار کا لٹان اور ملکی وغیرہ ملکی عطریات کی چھوٹی بوی شیشیاں تھیں۔



پنہتیس چھتیس سال کی ایک عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ وہ سلیم کی بیوی تھی۔ سرو قامت، وری جیتی اور طرح دار۔ اس کا باپ، مخدوم نور علی شاہ گیلانی، خانقاہ عالیہ کا گدتی نشین تھا، لٹان لے بڑے جاگیرداروں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ بڑے باپ کی بیٹی ہونے کے باعث اس کا فٹسا بھی ات زیادہ تھا۔

آہٹ سن کر سلیم نے آنکھیں کھول دیں۔ بیوی کو مسکرا کر دیکھا اور نرم لہجے میں گویا۔

فرخندہ! تم نے ابھی غسل نہیں کیا؟“

وہ اٹھ کر بولی۔ ”میں برابر کے ٹینٹ ہی سے ہو کر آرہی ہوں۔ نہانے کا پانی بہت گرم ہے۔ پتہ میں اس موسم میں اتنا گرم پانی ٹب میں بھرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”مگر ہاں تو ایسی گرمی نہیں ہے۔ ڈارلنگ! ویسے گرم پانی سے نہانے کے بعد ساری تھکن دور دھاتی ہے۔ آج تم نے بھاگ دوڑ بھی بہت کی ہے۔ تھک گئی ہو گی۔“

”جھکن تو بہت معلوم ہوتی ہے۔ مگر میں غسل ابھی نہیں کروں گی۔“

وہ میز کے سامنے جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”میں دائی کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ اب تک آئی کیوں نہیں؟“

”اسے اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ آتی ہی ہوگی۔“ میاں سلیم نے قیاس آرائی کی۔

فرخندہ نے کچھ نہیں کہا۔ کنگھا اٹھا کر اپنے بال سنوارنے لگی۔ اس کے بال گردن تک ترے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات چمک رہے تھے۔ سلیم نے آنکھیں بند کر لیں۔ لالی اس کے کندھے اور بازو دباتا رہا اور شادو سامنے فرش پر بیٹھا انگلیوں سے اس کی پنڈلیوں کا مساج کرتا رہا۔ فرخندہ بالوں میں کنگھا پھیرتی رہی اور آئینے میں اپنا چہرہ مختلف زاویوں سے دیکھتی رہی۔

چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ایک ایسی عورت خیمے میں داخل ہوئی جو وضع قطع سے حویلی کی خادمہ یا کسی مزارعے کی بیوی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی عمر فرخندہ سے کم تھی۔ رنگت کبھی گوری رہی ہوگی مگر تیز دھوپ میں محنت مشقت کرنے سے اس کا رنگ جھلس کر زردی مائل لاپڑیا تھا۔ چہرے پر ابھی سے بدھاپے کی لکیں ابھرنے لگیں تھیں۔ اس کا بدن مضبوط اور چھریا تھا۔ اسے دیکھ کر فرخندہ نے پوچھا۔

”کیا نام ہے تیرا؟“

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ”میراناں کریمیاں ہے جی۔“

”ادھر آ میرے نزدیک۔“ فرخندہ نے نہایت رعب اور دبدبے سے اسے بلایا۔ وہ چپ چاپ اس کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی۔ فرخندہ نے اپنی ناک آگے بدھا کے اس کا لباس سونگھا۔

”نہادھو کر آئی ہے؟“

”ہاں جی، ٹھیک طرح نہا کر آئی ہوں۔ کپڑے لتے بھی آج ہی دھو کر پہنے ہیں۔ انھیں سوکنے میں دیر ہوگئی۔ اسی لیے آنے میں دیر ہوگئی جی۔“

فرخندہ نے نظریں اٹھا کر کریمیاں کے لباس کا جائزہ لیا۔ وہ سفید دھوٹی باندھے ہوئے تھی۔ جگلی بھی سفید ہی تھی۔ البتہ دوپٹا گہرا نیلا تھا۔ فرخندہ منہ بگاڑ کر بولی۔ ”پتہ نہیں کیسے نہائی تھی۔ ابھی تک پسینے کی سڑی ہوئی بو نکل رہی ہے۔“

فرخندہ نے میز پر سے صندل کے عطر کی شیشی اٹھائی اور کریمیاں کی جانب مڑی۔ ”ہاتھ کھول۔“ کریمیاں نے ہاتھ بدھا کر کھول دیا۔ فرخندہ نے شیشی کھولی اور کریمیاں کی ہتھیلی پر عطر کی چند بوندیں پٹکا دیں۔

”اسے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں چپڑ کر گردن، ناک، ہاتھوں اور کپڑوں پر لگا لے۔“

کریمیاں اس کی ہدایت کے مطابق عطر لگانے لگی۔ وہ عطر لگا چکی تو فرخندہ نے کہا۔ ”یہ شیشی لے۔“ انگلیوں کے ناخنوں پر بھی خوشبو لگا لے۔ ”اس نے عطر کی شیشی کریمیاں کو دے دی اور ایک بار رمنہ بگاڑا۔“ نہ جانے ان جانگلی عورتوں کے ناخنوں سے اتنی بدبو کیوں نکلتی ہے۔ داغ ستر جاتا ہے۔“ کریمیاں خاموش رہی۔ اس نے عطر کی شیشی کھولی اور گردن جھکا کر اپنے ناخن خوشبو سے مانے لگی۔

فرخندہ نے کنگھا میز پر ڈالا۔ اٹھ کر کھڑی ہوئی، پلنگ کے پاس گئی، چمھردانی کا پردہ اٹھا کے اوپر الا اور شلوار کے پائینچے گھٹنوں تک چڑھا کے نرم نرم تکیے پر چہرہ نکا کر اوندھی لیٹ گئی۔ کریمیاں آگے بڑھی، چمھردانی میں داخل ہو کر فرخندہ کے قریب بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کی گوری گوری پنڈلیاں اور کمر ہولے ہولے دبائے لگی۔ فرخندہ کچھ دیر خاموش لیٹی رہی پھر اس نے اپنے نوہر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

”سلیم! تم جا کر غسل کرلو۔ تمہیں اب تیار ہو جانا چاہئے۔ یہ نہ بھولو کہ تم میزبان بھی ہو۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ مجھے اب تیار ہو جانا چاہئے۔“ اس نے آنکھیں کھول کر خیمے کے باہر دیکھا ہوا اندھیرا دیکھا اور کھڑا ہو کر شادو کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تو نمبر انوار خاں کے پاس چلا جا۔ جو کام وہ بتائے کرنا۔ انوار خاں، میرے پی اے ماجد کے خیمے میں ہوگا۔“

شادو خاموشی سے اٹھا اور خیمے سے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ نکلا۔ خیمے سے دور جا کر اس نے کہا۔ ”یہاں تو عیش ہو رہے ہیں جی!“

”تو کیا تو یہ سمجھ رہا تھا، خالی شکار ہی ہوتا ہے؟“ شادو نے ہنس کر بتایا۔ ”کچھ دیر بعد شراب کا دور چلے گا۔ فیروز دراد دعوت ہوگی۔ مجرا بھی ہوگا۔ لہور اور ملتان سے کچھیاں بلائی گئی ہیں۔ زوروں کا جشن ہوتا ہے اور برابر تین روز تک ہوتا ہے۔ دیکھے گا تو پھر نک اٹھے گا۔“

”میں تو آج ہی جانا چاہتا ہوں۔ تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ میں اسی لیے تیرے کول آیا تھا۔“

”چلا جانا، چلا جانا۔“ شادو بے نیازی سے بولا۔ ”پورا جشن دیکھ کے جانا۔“

”نہیں شادو! میں اب نہیں رک سکتا۔“ لالی نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ ”تو مجھے کادر آباد پہنچا دے۔ رحیم داد میرے انتظار میں بہت پریشان ہوگا۔“

شادو آمادہ نہیں ہوا۔ ”آج رات تو میرا جانا بہت مشکل ہوگا۔“

”جیم، تیری مرضی۔ میں نے تو آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر

سکتا۔

”تیرا دماغ تو نہیں چل گیا؟“ شادو نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”تو پیدل یہاں سے کادور آباد جائے گا۔ کادور آباد پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ تو ہے کس خیال میں؟“

”اسی لیے تو میں تیرے ساتھ آنا نہیں چاہتا تھا۔“ لالی نے گلہ کیا۔ ”تو مجھے خاما خامیاں لایا۔“
”تو کیا تجھے سڑک پر مرجانے دیتا؟ حکیم کے پاس نہ لے جاتا تو زندہ بچ سکتا تھا؟ پتہ ہے، تجھے سکھایا کھلائی گئی تھی۔“

”میں تو آج ہی جاؤں گا۔“ لالی اڑا رہا۔ ”آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔“

”میرا کہا مان، رحیم داد کا چکر چھوڑ۔ وہ اپنی فکر آپ کر لے گا۔“ شادو نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تو میرے ساتھ لائل پور چل۔ ایک بار ضلع منگمری سے نکل آیا، دوبارہ وہاں جانے کی غلطی نہ کر۔ ادھر کی پولیس تیری تلاش میں ہے۔ یہاں تیرے لیے زیادہ خطرہ نہیں ہے۔“

”نہیں جی، یہ نہیں ہو گا۔ میں رحیم داد کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ میں نے اس سے جو وعدہ کیا ہے اسے ضرور پورا کروں گا۔ میں تو آج ہی رات جاؤں گا اور ابھی جاؤں گا۔“ لالی کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔

”تیری بہت بہت مہربانی۔ آگے مجھے تیری مہربانی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”انتا نراض کیوں ہوتا ہے۔“ شادو نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”تیری مرضی جانے ہی کی ہے تو رات ہونے کا انتظار کر۔ روٹی کھانے کے بعد ناچ گانا شروع ہو جائے گا تو میں تجھے کادور آباد لے جانے کی کوشش کروں گا۔ میاں سلیم سے اجازت لینی ہوگی۔ امید تو ہے وہ اجازت دے دے گا۔ طبیعت کا بھلا بندہ ہے۔“

لالی نے اور کوئی بات نہیں کی۔ شادو بھی خاموش رہا۔ دونوں خیموں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ کئی خیموں کے پردے کھلے تھے۔ انھوں نے دیکھا، اکثر خیموں میں سرکاری افسروں کی بیگمات ابلے ابلے بستروں پر لیٹی ہیں۔ حویلی کی خادماں یا مزارعوں اور کیتوں کی عورتیں، ہاتھوں کے ناخنوں میں طرح طرح کی بھینی بھینی خوشبوئیں لگائے بیگمات کے نرم و گداز بند دیا کران کی تھکن اتار رہی ہیں۔

شادو چلتے چلتے ایک خیمے کے قریب رکا اور اندر داخل ہو گیا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ چلا گیا۔ یہ خیمہ نوکروں کے لیے تھا، مگر اس وقت خالی تھا۔ اس میں مونج کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ شادو نے لالی سے کہا۔

”تھوڑی دیر یہاں لیٹ کر آرام کر لیں۔ تو بھی تھکا تھکا نظر آ رہا ہے اور میرا تو دن بھانگے

نہ جلیتھن نکل گیا۔“

”انوار خاں کے پاس نہیں جائے گا؟“

”چلا جاؤں گا، ذرا آرام کر لوں۔ تو بھی لیٹ جا۔ حویلی جا کر کیا کرے گا۔ یہیں میرے ساتھ کھالینا۔ اکٹھے چلیں گے۔“

”تو مجھے کادور آباد لے چلے گا نا؟“

”کہہ تو دیا، کچے کانڈ پر لکھ کر دے دوں؟“ شادو نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”پر میاں سلیم سے تو زت لینی ہی پڑے گی۔“

لالی چٹائی پر شادو کے قریب ہی لیٹ گیا۔ اسے تھکن بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں لرلیں۔ نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گیا۔

لالی کی آنکھ کھلی تو شادو موجود نہیں تھا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ بیٹھا رہا، پھر شادو کی تلاش میں خیمے سے نکلا۔ بیستر خیموں میں سناٹا تھا۔ وہ لے بڑھا۔

خیموں سے ذرا ہٹ کر کھلے میدان میں ایک جگہ جگمگاتی روشنیوں میں عورتیں اور مرد جمع تھیں۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ لالی اس طرف چلا گیا۔ قریب جا کر دیکھا، ایک برف بار بنا ہے۔ کاؤنٹر پر طرح طرح کی شراہیں رکھی ہیں۔ بار میں اجلی اجلی دروہیاں پینے، کمر اور رکے صاف پر سنہری پٹکے لگائے نہایت مستعدی سے بوتلیں کھول کھول کر گلاسوں اور گوبلیوں، طرح طرح کی شراہیں انڈیل رہے تھے۔ شیشے کے بڑے بڑے پیالوں میں برف کے ٹکڑے بھرے تھے۔ جگہوں میں پانی یا سوڈا ڈال رہے تھے۔

کاؤنٹر خاصا لمبا تھا۔ اس کے ایک حصے میں تلے ہوئے مرغ، کباب اور کتے بھی پلیٹوں میں کھے تھے۔ سفید وردیوں میں لمبوس بیرے خالی گلاس، جگ اور پلیٹیں ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے تھے۔ انھیں ایک طرف رکھتے اور دوسری ٹرے اٹھاتے۔ ان پر شراب کے گلاس اور گوبلیٹ، نس سے بھرے ہوئے شیشے کے پیالے، پانی اور سوڈے سے لبریز جگ یا تلے ہوئے مرغ، کباب اور کتے رکھتے اور مہمانوں کے پاس پہنچ جاتے۔ یہ کاک ٹیل پارٹی تھی۔ مہمان ہاتھوں میں گلاس نبھالے گھونٹ گھونٹ شراب پی رہے تھے۔ بے تکان باتیں کر رہے تھے، نس رہے تھے۔ لالی ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر نہ۔ شادو کاؤنٹر کے پاس آیا۔ لالی لپک کر اس کے نزدیک پہنچا، آہستہ سے پوچھا۔ ”تو چپکے

سے اٹھ کر کتھے ٹر گیا تھا؟“

”میں دوڑا ہی گھٹنے سو کر ادھر آگیا۔ تو گمری نیند سو رہا تھا اس لیے تجھے جگایا نہیں۔“ وہ ایک بوڑھے بارمین سے مخاطب ہوا۔ ”چاچا! دو پیگ وہسکی کے مجھے بھی بتا دے۔“ اس نے لالی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرا یا ر لمور سے آیا ہے۔ اس کے ساتھ بیٹھ کر ذرا شغل کر لوں گا۔“ بارمین نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ بوتل کھول کر دو گلاسوں میں وہسکی انڈیلی۔ برف کے ٹکڑے ڈالے اور شادو سے پوچھا۔

”پانی ڈالو یا سوڈا؟“

شادو نے ہنس کر کہا۔ ”سوڈا ہی ڈال دے چاچا!“

بارمین نے بوتل کھول کر گلاس میں سوڈا ڈال دیا۔ شادو نے دونوں گلاس اٹھائے اور کاؤنٹر کے پیچھے چلا گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں ایک درخت کی آڑ میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس جگہ روشنی کم تھی۔

شادو نے ایک گلاس لالی کو دیا اور آٹھ مار کر بولا۔ ”اسکاچ وہسکی ہے، تھوڑی سی لگائے ساری کمزوری اور تھکن دور ہو جائے گی۔“ اس نے اپنا گلاس لالی کے گلاس سے ٹکرایا، گلاس ہونٹوں سے لگایا اور کئی گھونٹ چڑھا گیا۔

لالی بھی پینے لگا۔ گلاس ختم ہوئے تو شادو اور لے آیا۔ دونوں نے وہسکی کے دو بڑے پیگ لگائے۔ ان پر سرخوشی طاری ہو گئی۔ لالی اپنے جسم میں حرارت اور توانائی محسوس کرنے لگا۔ کاک ٹیل پارٹی دس بجے ختم ہو گئی۔ مہمان بکھر کر شامیانے کے نیچے چلے گئے۔ شامیانے میں کھانے کا بندوبست تھا۔ شادو اور لالی بھی نوکروں کے خیمے میں چلے گئے۔ خیمہ ابھی تک خالی تھا۔ شادو کھانا وہیں لے آیا۔

دونوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی شادو کھڑا ہو گیا۔ ”میں میاں سلیم کے پاس جا رہا ہوں۔ اس سے اجازت لے کر تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔“ شادو چلا گیا۔ لالی خیمے میں خاموش بیٹھا اس کی واپسی کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ ایسا گیا کہ دیر تک نہیں لوٹا۔ لالی بے چین ہو کر خیمے سے نکلا اور شامیانے کی جانب گیا۔ مگر اب وہاں شانا تھا۔



میدان کے ایک گوشے میں ایک اور بڑا شامیانہ تھا۔ اس کے چاروں طرف قاتیں لگی تھیں۔ شامیانے میں تیز روشنی تھی۔ اندر سے ناچ گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ لالی کو اناڑہ ہو گیا

شروع ہو چکا ہے۔ شادو بھی وہیں ہو سکتا ہے۔

اسی طرف چل دیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کے خیمے سے ایک شخص نکلا۔ لالی نے ہل ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ ہمدانی تھا۔

انی نے بھی لالی کو پہچان لیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی ٹھنکا، مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ ”یار، تو می آگیا؟ مگر یہاں پہنچا کیسے؟“ اس کے انداز میں بے تکلفی کے ساتھ حیرت بھی تھی۔ ہمدانی نے نظریں جھکا کر کہا۔ ”بس جی پہنچ ہی گیا۔“

وہ بے بہت تیز۔ اس رات ایس پی کے پھندے سے صاف بچ نکلا۔ ”ہمدانی نے قلعہ لگایا۔ نے تجھے گرفتار کرنے کا پورا بندوبست کر لیا تھا۔ تو فرار کس راستے سے ہوا؟“

وہ ایسا ہوا جی، نہر میں پانی زوروں سے بہہ رہا تھا۔ میں نہر میں اترا تو پانی کے تیز بہاؤ میں پیرا کھڑ رہا۔ دور تک بہتا چلا گیا۔“

اندر خیمے میں آجا۔ ”ہمدانی نے اپنے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے ہمدانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی اس کے سامنے مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ذرا دیر خاموشی رہی پھر ہمدانی کی آواز ابھری۔

”نہیں لائل پور میں روپوش ہے یا کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟“

صاحب! آپ سے کیا چھپانا۔“ لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”میں نے رحیم داد سے ملنے آباد جانا ہے۔ ابھی تک اس کے پاس نہیں پہنچ سکا۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔“

وہاں جانا تو تیرے لیے خطرناک ہوگا۔ ایس پی مرزا کو مرسلیمان خاں کی کوٹھی کے چوکیدار سے رات اطلاع مل گئی تھی کہ تو قادر آباد جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس نے وہاں پولیس لگا کر نی شروع کر دی ہے۔“

صاحب! آپ نے پہلے بھی میری مدد کی ہے۔“ لالی نے عاجزی سے کہا۔ ”اس بار اتنی مدد اور ماکہ اپنی موٹر میں مجھے کادر آباد پہنچا دیں۔ آپ کی موٹر دیکھ کر پولیس والے کچھ نہیں بولیں۔ میں نہرا کر کے رحیم داد کے پاس بیٹوں پر پہنچ جاؤں گا۔“

”نہیں یار! میں تیری ایسی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ ہمدانی نے صاف انکار کر دیا۔ ”میں تو تجھے یہ دونوں گاکہ تو خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دے۔ رحیم داد کو پکڑو ادے اور خود سرکاری گواہ

بن۔ مقدمہ میری عدالت میں پیش ہوگا۔ میں کوشش کروں گا تو بری ہو جائے، ورنہ تیری سزا کم بہت کم ہو جائے گی۔ میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں۔“

”صاحب! یہ نہیں ہو سکتا کہ میں رحیم داد کو گرفتار کروا دوں۔ میں اس کے ساتھ دغا نہیں کر سکتا۔“

”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تو اتنا کوڑھ مغز بھی ہو سکتا ہے۔“ ہمدانی چند لمحے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”پولی لیسن کلب کی ٹائٹ آف دی گرینٹ سپنس میں تو نے بہت ہوشیاری اور اعتماد سے ایپارنگ کی تھی۔ میں تو دنگ رہ گیا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”نو کنوں کے الٹ پھیر میں تو کمال کر دیا تھا۔“

”صاحب! صبح شکاریوں کے ساتھ آپ مجھے دکھائی نہیں دیئے، آپ کدھر تھے؟“

”میں آج دوپہر یہاں پہنچا ہوں۔“

”بیگم صاحبہ بھی آپ کے ساتھ آئی ہیں؟“

”نہیں۔“ ہمدانی نے بتایا۔ ”نو شاہ ان دنوں اپنے بھائی کے پاس پنڈی میں ہے۔ وہ فوج میں میجر ہے۔“

لالی نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”انھوں نے بعد میں میرے بارے میں تو کچھ نہیں کہا؟“

”کبھی تیرا تذکرہ نہیں کیا۔ یاد ہی نہیں آیا ہو گا۔ البتہ مجھے بعد میں تو بہت یاد آیا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اس رات تو ایپارنگ نہ ہوتا تو امینہ ہرگز میری پارٹنر نہ بنتی۔ تو نے ہاتھ کی ایسی صفائی دکھائی کہ وہ کپکپ پھل کی طرح میری جھولی میں آگری۔ یار مزا آگیا۔“ اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”آج رات بھی تجھ سے ایک ایسا ہی کام لیتا ہے۔“

”کیا یہاں بھی لائری شازری ڈالی جائے گی؟“ لالی نے سادگی سے پوچھا۔ ”پر آپ تو آج اکیلے ہی ہیں۔“

”نہیں یار۔ یہ کچھ اور ہی چکر ہے۔ تجھے نواب فخر کے خیمے جانا ہو گا۔ وہاں سے تو ان کی بیٹی گیتی آرا کو میرے خیمے میں لے آتا۔ وہ خزا تو بہت کرتی ہے مگر آجائے گی۔ تو اسے لے کر ہی آتا۔“ لالی نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ ”صاحب! میں تو انھیں جانتا ہی نہیں۔“

”اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ان کے خیمے پر جا کر صرف اتنا کہنا کہ مجھے ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔ زیادہ بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ بات پہلے ہی طے ہو چکی ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”میں اپنے ڈرائیور یا اردلی کو ادھر بھیج دیتا، دونوں میرے ساتھ آئے ہیں۔ میاں سلیم کے کسی نوکر چاکر سے بھی کام چل سکتا تھا مگر تو مجھے سب سے موزوں معلوم ہوتا ہے۔ تجھ پر مجھے اعتماد بھی ہے۔ کسی اسکیٹل کا بھی خطرہ نہیں اور ایسے معاملوں میں تو ہوشیار بھی ہے۔“

”نہیں صاحب! میں نے دلا گیری کا دھندا کبھی نہیں کیا۔“ لالی نے دلی زبان سے انکار کر دیا۔

”یار! خواہ مخواہ کا خزانہ دکھا۔ مجھے یقین ہے، تو ضرور پکڑا جائے گا اور یہ بھی جان لے، کبھی نہ بھی تو میرے ہی سامنے پیش ہو گا۔ اس وقت تجھے معلوم ہو گا میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ وہ ریل مسکرایا۔ ”تجھے کم سے کم سزا دوں گا۔ میرے فیصلے کے خلاف اپیل نہ کرنا، ورنہ ہو سکتا ہے یا وہ ہی لمبی سزا کاٹنی پڑے۔“

لالی اس کی دھمکی سے ڈر گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر فرش کو نکتے لگا۔ ہمدانی کھڑا دگیا۔ خیمے کے پردے کے قریب پہنچا۔ لالی کو اپنے پاس بلایا اور ایک خیمے کی طرف اشارہ کرتے دئے بولا۔

”دوسری لائن میں وہ جو ساتواں خیمہ ہے، وہی ہے نواب فخر کا خیمہ۔ وہاں جا کر تجھے اتنی ہی ت کہنی ہے جتنی میں نے تجھ سے کہی ہے۔ اب تو ادھر جا۔ میں تیرا انتظار کرتا ہوں۔“

لالی باہر آیا اور ہمدانی کے بتائے ہوئے خیمے کی طرف روانہ ہو گیا۔ خیموں میں خاموشی چھائی تھی۔ دور شامیانے کے نیچے طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کے چھناکے کے ساتھ رات کے سنائے میں گانے کی آواز ابھر رہی تھی۔

لالی آہستہ آہستہ چلتا ہوا نواب فخر کے خیمے پر پہنچا۔ خیمے کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا۔ اس نے برہہ کر دیکھا۔ گیتی آراء کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر آمینہ رکھا تھا۔ وہ آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھ رہی تھی۔ ہونٹوں پر لپ اسٹک کی ہلکی ہلکی تہہ جمارہی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں میں دنبالہ کا جل تھا۔ چہرہ بیضوی تھا، رخسار گلابی تھے اور بلب کی تیز روشنی میں تھمتارہے تھے۔ بدن نرم اور گداز تھا۔ اس میں دائرے تھے، پیچ و خم تھے۔ وہ تینیس چوبیس سال کی خوبصورت لڑکی تھی۔ سنگھار کے بعد وہ اور زیادہ دل کش نظر آ رہی تھی۔

قریب ہی نواب فخر بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بال کھڑی ہو گئے تھے۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ چہرے پر وقار اور دبدبہ تھا جسے اس کی چڑھی ہوئی مونچھوں نے اور بارعب بنا دیا تھا۔ وہ دراز قند تھا اور گہرے سرمئی سوٹ میں معزز نظر آ رہا تھا۔ نواب فخر سے ذرا ہٹ کر اس کی بیگم بستر پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔

وہ گوری جی عورت تھی۔ چہرے کے اجڑے نقوش بتا رہے تھے کہ جوانی میں وہ بھی گیتی آرا کی طرح حسین اور دل کش ہوگی۔ اس کا جسم خاصا پھیل گیا تھا جس نے اسے بے ڈول اور بد وضع بنادیا تھا۔ لالی تینوں کو صبح شکاریوں کے ساتھ دیکھ چکا تھا۔ نواب فخر بدوق سنبھالے جیب میں بیٹھا

تھا۔ بیٹی اور بیگم پالکی میں سوار تھیں۔

لالی ذرا دیر پردے کے قریب کھڑا رہا پھر آہستہ سے کھنکارا۔ نواب فخر نے اونچی آواز سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ وہ اٹھ کر پردے کے پاس آگیا۔

”مجھے جی ہمدانی صاحب نے بھیجا ہے۔“

”اچھا اچھا، تم یہیں بیٹھو۔ تمہیں ذرا دیر انتظار کرنا پڑے گا۔“ وہ واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ لالی بھی چپ چاپ خیمے کے پردے سے لگ کر فرش پر بیٹھ گیا۔

نواب فخر نے اپنی بیگم سے کہا۔ ”ہمدانی صاحب کا ملازم آیا ہے۔“

”سن رہی ہو گیتی آرا۔“ بیگم نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ ”ہمدانی صاحب کا ملازم لینے آگیا ہے تمہیں۔“ گیتی آراء آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی رہی اور لپ اسٹک سے اپنے ہونٹوں کو سرخ گلاب کی چمکھریاں بناتی رہی۔

ماں نے چند لمحے بیٹی کے جواب کا انتظار کیا پھر کسی قدر تھکے لمبے میں بولی۔ ”اے، میں نے کہا، گیتی آراء! تم نے سنا نہیں۔ بیٹی، میں کیا کہہ رہی ہوں؟“

”امی حضور! میں کسی کے پاس نہیں جاؤں گی۔“ گیتی آرا نے ماں کی جانب دیکھے بغیر بیڑی سے جواب دیا۔ ”میں اسی لیے یہاں نہیں آ رہی تھی۔ آپ اصرار کر کے زبردستی مجھے لے آئیں۔

اب یہ حکم صادر کئے جا رہے ہیں اس سے مل لو، اس کے پاس جاؤ۔ واہ، یہ خوب رہی۔“

”اے، میں نے کہا، سن رہے ہو نواب فخر الدولہ، تمہاری صاحب زادی کیا فرما رہی ہیں؟“ بیگم نے شکایت کے انداز میں شوہر سے کہا۔ ”اب تمہی اسے سمجھاؤ۔ میری تو یہ سننے لگی نہیں۔ تمہی

مناؤ، تمہی نے سر پر چڑھا کر اس کا دماغ خراب کیا ہے۔“

”سر پر تو ہم نے تمہیں بھی چڑھا رکھا ہے۔“

”اے، بڑے آئے مجھے سر پر چڑھانے والے۔“ بیگم تنک کر بولی۔ ”تمہارے سر پر تو دل آرام کا بھوت سوار تھا۔ اس موٹی حرافہ کے ہوتے ہوئے تم مجھے کیسے سر پر چڑھاتے۔ تمہیں اتنا ہوش ہی کب تھا۔“

”مگر تمہاری تو ہم نے کبھی حق تلفی نہیں کی۔“ نواب فخر نے رسان سے کہا۔ ”ہم نے تمہارے ساتھ تو کوئی زیادتی نہیں کی۔“

”اے میں کہتی ہوں کیا نہیں کیا تم نے؟“ بیگم کا لہجہ بدستور تلخ تھا۔ ”لاکھ لاکھ خاک میں ملا دیا۔ ساری جائیداد اور زمیں داری لالہ گردھاری لال رستوگی کے پاس رہن رکھ دی۔ میرا زیور

تک نہ چھوڑا۔ اب بیٹھے فرما رہے ہیں، ہم نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ ریس اور رنڈی بازی میں سب کچھ تباہ کر دیا۔“

”یہ طعنہ نہ دو۔“ نواب فخر کا لہجہ بھی تیز ہو گیا۔ ”یہ نہ بھولو کہ تمہیں بھی ہم بالا خانے سے اتار کر گھر میں بیگم بنا کر لائے تھے۔ ہم نے شمع محفل سے تمہیں شمع خانہ بنا دیا۔ نہ خلد آشیانی قبلہ! ہاں حضور کی برہمی سے خائف ہوئے، نہ اماں جان کی پروا کی۔ سارے خاندان سے تمہاری خاطر مخالفت مول لی۔“

”میرا منہ نہ کھلاؤ۔ تمہاری ثانی کون سی شریف زادی تھی۔ وہ بھی تو ذات کی ڈومنی تھیں۔ ویسے بھی تم نے کیا احسان کیا مجھ پر۔ گھر میں قیدی بنا کر ڈال دیا۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ ”ہر وقت تو ایک ایک کے طعنے سنتی تھی۔ تمہارے خاندان والوں نے تو مجھے ٹکوتا دیا تھا۔ تمہیں کیا خبر، میں نے کیا کیا ظلم نہ سہے۔ تم تو اس وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ تم نے میری بات ہی کب سنی۔ میرا کمانا لیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ یہاں آگریہ ذلت و خواری نہ دیکھنا پڑتی۔ سفارشوں کے لیے یوں ایک ایک در کی خاک نہ چھانا پڑتی۔“

”سفارشیں بھی تو کام نہیں آئیں۔“ نواب فخر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بیویوں بیویوں تک رسائی حاصل کی۔ صاحب زادے کو کسٹرن میں ایسی اچھی ملازمت دلوائی۔ اب وہ کراچی میں بیٹھے اپنے بال بچوں کے ساتھ عیش کرتے ہیں۔ پلٹ کر یہ بھی خبر نہیں لیتے کہ ماں باپ زندہ ہیں یا مر گئے۔“

”اس کا تو تم میرے سامنے نام بھی نہ لو۔“ بیگم بجھے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”وہ تو ہمیشہ کا خود غرض ہے۔ اوپر سے بیوی اس کی ایسی شطاح ہے۔ ایسا اسے اپنے جال میں پھانسا ہے کہ ہر وقت اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا رہتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اسے آلو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ دوسرے صاحبزادے ہیں، انھیں ایکٹنگ کا شوق چڑایا ہے۔ بمبئی میں جوتیاں چٹاتے پھرتے ہیں یا آغا جانی کے در پر پڑے رہتے ہیں۔ کتنے خط لکھے کہ لکھنؤ جا کر جائیداد کے کاغذات بھجوا دو۔ ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔“

”کیا جواب دیتا۔“ نواب فخر نے اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف سے صفائی پیش کی۔ ”کون سی جائیداد کے کاغذات بھجواتا۔ ساری جائیداد فروخت ہو چکی ہے یا رہن پڑی ہے۔“

”اے میں کہتی ہوں، کس نے ایمانداری سے کلیم حاصل کیا ہے۔“ بیگم نے جھنجھلا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”کس نے جعلی دستاویزیں نہیں بنوائیں؟ دو رکیوں جاتے ہو، وہ تمہارے بٹ

صاحب کہاں کے مہاجر ہیں۔ زندگی بھر سیالکوٹ میں رہے، اب مہاجر بن بیٹھے۔ لاہور میں ایک کوٹھی الاٹ کر والی۔ آج کل کوئی فیکٹری الاٹ کرانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ خود ان کی بیوی نے بتایا ہے مجھے۔“

”یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ متروکہ جائیداد کی تو ایسی لوٹ مار چلی ہے کہ نہ کبھی سنی تھی نہ دیکھی۔ وہ اپنے دلی کے نواب اختر مرزا ہیں، دو کوٹھیاں اور ایک کارخانہ کلیم میں الاٹ کرا چکے ہیں۔“ نواب فخر نے مسکرا کر کہا۔ ”خود کو بہادر شاہ کا پوتا بتاتے ہیں۔ انھوں نے تولال قلعے کے بدلے لاہور کا شاہی قلعہ الاٹ کرنے کا کلیم بھرا ہے۔ کمال ہو گیا بھئی۔ سنا ہے گلی قاسم جان میں کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ دروازے پر ٹاٹ کا پھنسا پردہ پڑا رہتا تھا۔“

بیگم کی نظر اچانک لالی پر پڑ گئی۔ وہ خیمے کے پردے کے پاس بیٹھا ان کی جانب دیکھ رہا تھا۔ بیگم تملاکر بولی۔ ”اے میں نے کہا، نواب فخر الدولہ! یہ موا جانگوس یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ کیا دیدے نکالے اجڈ پن سے تنک رہا ہے۔“

”بیگم تم تو ہر ایک کے سر ہو جاتی ہو۔ اسے ہدانی نے بھیجا ہے۔ ہم نے اس سے یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا۔“ اس نے مڑ کر گیتی آرا کو دیکھا۔ ”بیٹی! اب کھڑی ہو جاؤ۔ ہدانی صاحب انتظار کرتے ہوں گے۔“

گیتی آرا نے باپ کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”ابا حضور! آپ آخر مجھے کس کس کے پاس بھیجیں گے؟ آپ کے حکم پر میں محکمہ بحالیات کے کمشنر کے بنگلے پر چلی گئی۔ آپ کا اتنا بڑا کلیم منظور کرا دیا۔ تصدیق کے لیے کاغذات ہندوستان بھی نہیں بھیجے گئے۔ سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گیا۔ چچے وطنی میں ڈھائی سو ایکڑ زمین، عارف والا میں آئس فیکٹری اور لاہور میں رہنے کے لیے کوٹھی، آخر کس طرح آپ کے نام ہوئی۔ سب آپ کی مرضی کے مطابق ہی تو ہوا۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ بیٹے تو دونوں ہی تھکے اور خود غرض نکلے۔“ نواب فخر نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔ ”واللہ، تم نے بیٹی ہو کر بیٹوں کا حق ادا کر دیا۔“ نواب نے آہ سرد کھینچی۔ ”کیا کریں بیٹی! اللہ نے ہم پر وقت ہی ایسا ڈالا ہے۔ تم اتنی قربانی نہ دیتیں تو فائدہ کرتے کرتے مر جاتے۔ اس عمر میں مجھے کون ملازمت دیتا۔ تعلیم بھی میری صرف انٹرنس تک ہے۔“ گیتی آرا خاموش رہی۔ نواب فخر اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ پیار سے گویا ہوا۔ ”بیٹی! چلی جاؤ گی تو کام بن جائے گا۔ اب تو صرف آنکھوں کی سویاں رہ گئی ہیں۔ زمین اور فیکٹری کا الاٹمنٹ تو ہو گیا مگر قبضہ ہدانی کے مدد کے بغیر نہیں مل سکتا۔“

وہ اس کا سر آہستہ آہستہ سہلانے لگا۔ ”بیٹی عزت کی زندگی گزارنے کا یہ آخری موقع ملا ہے۔ زمین اور فیکٹری کا قبضہ مل گیا تو آرام و سکون سے گزر بسر ہوگی۔ تمہارے لیے رشتہ بھی اچھا مل جائے گا، بلکہ ایک لڑکا میری نظر میں ہے بھی۔ وہ سی، ایس، پی ہے۔ شکل و صورت کا بھی اچھا ہے۔ فائدہ ان بھی ہماری طرح شرفا کا ہے۔“ گیتی آرا گم صم بیٹھی رہی۔ نواب فخر کے لہجے میں عاجزی اور رقت پیدا ہو گئی۔

”بیٹی! تم اپنے بوڑھے باپ کی مدد نہیں کرو گی؟“

گیتی آرا نے آہستہ سے کہا۔ ”ابا حضور! میں نے پہلے بھی کب آپ کا حکم ٹالا ہے۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ماں پلنگ سے اتری۔ گیتی آرا کے نزدیک پہنچی۔ اس کے سر پر ہاتھ لگا کر چٹ چٹ بلائیں لیں۔ مسکرا کر نواب فخر کو کی طرف دیکھا۔ ”دیکھ رہے ہو نواب فخر الدولہ! میری بچی کتنی فرماں بردار ہے۔ چاند کا ٹکڑا لگ رہی ہے۔ اے، میری نظر نہ لگ جائے۔“ اس نے پیار سے تھکارا۔

گیتی آرا مسکرا کر بولی۔ ”امی حضور! آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“

وہ آگے بڑھی، خیمے کے پردے تک پہنچی۔ بیگم فخر و بیٹی کی ساتھ ساتھ چلیں اور اسے رخصت کرتے ہوئے بولیں۔ ”بیٹی! اللہ کے سپرد۔“

گیتی آرا ریشمی غرارے کے پانسے ایک ہاتھ سے سنبھالے بڑے ٹھٹے سے باہر نکلی۔ لالی اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گیتی آرا کے ہم راہ چلنے لگا۔ دونوں دھندلی روشنی میں خیموں کے درمیان سے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ لالی نے چلتے چلتے نشے کی ترنگ میں گیتی آرا کو پھینٹا۔

”صاحب ٹھیک ہی کہتے تھے، تمہارا نکھر اہست زیادہ ہے۔“

گیتی آرا نے جھنجھلا کر اسے ڈانٹا۔ ”بد تمیز۔“

”میں تو بی بد تمیز ہوں۔ جانگی جو ٹھیرا بلکہ جانگوس ہوں۔ تمہاری ماں نے تو یہی کہا تھا۔“ وہ

ڈھٹائی سے بولا۔ ”پر تم تو اس دکھت تمیز کا دھندا کرنے جا رہی ہو۔“

”اجڈ نگوار کہیں کا۔“ وہ تملاکر بولی۔ ”ایسی باتیں کیوں تو میں نہیں جاؤں گی۔“

”نہ جاؤ۔“ لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ ”تم میرے لیے تو جا نہیں رہی ہو۔“

وہ روٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے مسٹر ہدانی کا خیمہ بتا دو۔ میں خود چلی جاؤں گی۔“

”چلو چلو، خاماخا کا نکھر ا نہ دکھاؤ۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”وہ رہا صاحب کا خیمہ۔“

گیتی آرا خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ آگے بڑھی اور غرارے کے پانسے

سنجھاتی، آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی، لالی کے ہم راہ چلتی رہی۔ ہمدانی کے خیمے پر پہنچ کر لالی نے پُر آرا سے کہا۔ ”تم اندر جا کر عیش کرو۔ میں اب چلا۔“ گیتی آرانے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھ کر اور پردہ اٹھا کر خیمے میں داخل ہو گئی۔

لالی مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اب اسے شادو کی تلاش تھی۔ وہ پھر اسی خیمے میں پہنچا جس میں شادو اسے چھوڑ گیا تھا۔ خیمے میں شادو چٹائی پر لیٹا ہوا جاگ رہا تھا۔ لالی کو دیکھتے ہی بولا۔ ”کدھر چلا گیا تھا؟ یہاں آکر تجھے نہ پایا تو میں پریشان ہو گیا۔“

”ایک چکر میں پڑ گیا تھا۔“ لالی مسکرا کر بولا۔ ”میاں سلیم نے تجھے جانے کی اجازت دے دی؟“

”اجازت تو دے دی، پر صبح تک واپس آنے کو بھی کہا ہے۔“

”توفیر دیر کیوں کر رہا ہے، کھڑا ہو جا۔ گڈی کتھے ہے؟“

شادو کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”باہر میدان میں ہے۔“

دونوں خیمے سے نکلے۔ کار زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ کار میں سوار ہونے سے پہلے لالی نے کھانا منگوایا۔ شادو دیکھتی میں قورمہ بھر کر لے آیا۔ قورمے کے ساتھ آٹھ روٹیاں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ کباب تھے اور پلاؤ بھی تھا۔ لالی نے صرف دیکھتی میں بھرا ہوا قورمہ اور روٹیاں رکھ لیں باقی کھانا واپس کر دیا۔

شادو نے لالی کو اپنے پاس بٹھایا۔ کار اشارت کی اور حویلی پہنچا۔ لالی مہمان خانے میں گیا اور چادر میں لپیٹی ہوئی رانٹل لے آیا۔ کار میں بیٹھ کر لالی نے چادر کھولی۔ رانٹل نکال کر کچھلی نشست پر رکھ دی۔ روٹیاں اور کھانے کی دیکھتی چادر میں باندھ کر آگے رکھ لی۔ اس نے شادو سے پوچھا۔ ”تو میرے کپڑے لائل پور سے دھوا کر لے آیا نا؟“

شادو نے کار اشارت کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو گھر ہی میں پڑے ہیں۔ لائل پور سے واپسی پر میں گھر جا ہی نہیں سکا۔ ویسے بھی میرا خیال تھا تو دو تین روز یہاں ٹھہر کر جائے گا۔“

لالی نے پریشان ہو کر کہا۔ ”مارو یا ظالم! سارا کام خراب کر دیا۔“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کار کچی سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھی اور پختہ سڑک آگئی۔

شادو نے رفتار تیز کر دی۔ کار کمالیہ سے آگے بڑھی۔

ملتان روڈ پر پہنچتے ہی اس نے رفتار اور تیز کر دی۔ شادو بڑا ہوشیار ڈرائیور تھا۔ وہ سڑا سی میل

کی رفتار سے کار دوڑاتا رہا۔ جب کار منگھری کے قریب پہنچی اور دور سے شرکی روٹیاں نظر آئیں تو لالی کے چہرے پر گھبراہٹ پھیل گئی۔ مگر کار آنا ”فانا“ شر سے گزرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ کار سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ یوسف والہ سے آگے بڑھتے ہی لالی سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے شادو سے کہا۔

”گڈی کی سپڈ کم کرو۔“

”کیوں، کیا تمیں نوں کادر آباد نہیں جانا؟“

”نہیں مجھے کادر آباد نہیں جانا۔ تو مجھے پہلے ہی اتار دیتا۔“

شادو نے رفتار کم کر دی۔ لالی نے قادر آباد سے میل، سو میل پہلے ہی کار رکوالی اور دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ شادو اس کے پاس آیا۔ دونوں گرم جوشی سے گلے ملے۔ شادو پھر کار میں بیٹھ گیا، اسے موڑا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا واپس چلا گیا۔



رات سنان اور تاریک تھی۔ دور سڑک کے اس پار اندھیرے میں قادر آباد اسٹیشن کے آؤٹر سنگل کی روشنی نظر آرہی تھی۔ قریب ہی نہرو برباری دو آب بہہ رہی تھی۔ لالی نہر کے ساتھ ساتھ کچھ دور تک چلتا رہا۔ وہ مڑا اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرے میدان میں گھس گیا۔

اس نے میدان عبور کیا اور اونچے نیچے نیلیوں پر چڑھنے لگا۔ رات اب ڈھل چکی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔

بلندی پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ نہر کا پانی پچھلے پھر کے روشن ستاروں کی روشنی میں جھل لہا رہا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ لالی نیلیوں کے درمیان راستے سے گزرتا ہوا اپنے ٹھکانے کی جانب بڑھنے لگا۔

وہ ٹھکانے پر پہنچا۔ اس نے صبح کاذب کی دھندلی دھندلی روشنی میں دیکھا، رحیم دادو خمیدہ نیلیوں کے اتصال سے بنی ہوئی محراب کے نیچے ایک کونے میں سکتا ہوا پڑا ہے۔ وہ کمزور اور لاغر نظر آ رہا تھا۔

اس کے جسم پر ابھی تک جیل کی ملگجی وردی تھی۔ بال بے حد بڑھ گئے تھے۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے کھانے کی گھڑی کندھے سے اتار کے ایک طرف رکھی اور رانٹل بھی اس کے قریب نکا کر کھڑی کر دی۔

دو رحیم دادو کے نزدیک گیا۔ سرہانے بیٹھ کر اس کا بازو ہلایا۔ رحیم دادو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت

سے آنکھیں پھاڑ کے لالی کو نکتے لگا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر کہا۔ ”لالی! تو آگیا؟“ اس نے دونوں ہاتھ بدھائے اور چٹ گیا۔

لالی نے محسوس کیا کہ رحیم داد اس کے شانے پر سر رکھے آہستہ آہستہ رو رہا ہے۔ لالی نے اس کی بیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ ”تو رو رہا ہے رخصے؟“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گھرے سانے میں اس کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لالی چپ بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد رحیم داد علیحدہ ہوا اور آنسو پونچھے ہوئے بولا۔ ”میں تو سمجھا تھا، اب تو لوٹ کر نہیں آئے گا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا تھا۔“ لالی نے اعتماد سے کہا۔ ”پکڑ لیا جاتا، تب تو گل ہی اور تھی ورنہ میرے واپس نہ آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بھلا میں تجھے چھوڑ سکتا ہوں۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تو تو میرا رہے، میرا بگڑے۔“

”تو نے لوٹنے میں اتنی دیر کی کر دی۔ میں سمجھا، مجھے چھوڑ کر کسی طرف نکل گیا یا پکڑا گیا۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ ”یہ بتا، اتنے دنوں رہا کہاں؟“

”ایک چکر کے بعد دوسرے چکر میں پھنسا گیا۔ تجھے کیا کیا بتاؤں، پر میں جہاں بھی رہا، رب سونہ تجھے ہر دم یاد کرتا رہا۔“

”کیا یاد کرتا رہا۔“ رحیم داد نے شکوہ کیا۔ ”یہ نہ سوچا ادھر مجھ پر کیا جیتی۔“

”مجھے اس کا اندازہ تھا۔ پر کیا بتاؤں، میں کیسے کیسے چکروں میں الجھا رہا۔“

”شاداں نے پھنسا دیا ہو گا کسی چکر میں۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”بتے ہے، وہ کتنی خطرناک ہے۔“

”اس کی گل نہ کر۔ تو اسے سمجھ ہی نہیں سکا۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”باتیں بعد میں ہوں گی۔ پہلے یہ بتا، روٹی پانی کا کیا بنا؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ رحیم داد بیزاری سے بولا۔ ”آخر میں تو روٹیاں بالکل سوکھ گئی تھیں، پیڑ اور شند پہلے ہی کھ گیا تھا۔ سوکھی روٹیاں پانی میں بھگو بھگو کر کھاتا رہا۔“

”کب تک ان سے کام چلا؟“

”پچھلے دو روز سے نہ روٹی ملی ہے نہ پانی۔“ رحیم داد نے بجھے ہوئے لمحے میں بتایا۔ ”ادھر ایک ٹبے کے پاس جنڈا کا پیڑ ہے۔ اس میں پھلیاں آگئی ہیں۔ انھیں توڑ توڑ کر کھاتا رہا۔ پر اس سے پیاس نہیں جاتی۔“

”نہر سے پانی لے آتا۔“ اس نے قریب پڑے ہوئے مشکیزے کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ بوکی تو نہرے پاس موجود ہی تھی۔ اس میں پانی بھر کر لے آتا۔“

”پانی تو تیرے جانے کے بعد تیسرے ہی دن کم گیا تھا۔ میں شام کو اندھرا بڑھنے کے بعد نہر پر گیا۔ بوکی میں پانی بھر لایا۔ پانی تو ایسے ہی لاتا رہا، پر پچھلے دنوں نہر سے بوکی میں پانی لا رہا تھا تو سڑک پر پولیس نظر آئے۔ میں پریشان ہو گیا۔ دوسرے دن میں نے بیٹوں پر سے چھپ کر دیکھا۔ پولیس کی ایک ٹولی گشت کرتی دکھائی دی۔ ان کے پاس ہندو کیس بھی تھیں۔ تیسرے دن بھی مجھے سڑک اور نہر کے آس پاس پولیس والے نظر آئے۔ تب سے میں نہر پر نہیں گیا۔ پانی بو بند ہونے کی کام چلایا۔ آخر وہ کب تک چلتا، کم گیا۔“

”مجھے بھی آج رات پتہ چل گیا تھا، پولیس ہم دونوں کی ادھر نگرانی کر رہی ہے۔“

”تجھے یہاں آتے ہوئے پولیس ملی ہوگی۔ تو اس سے بچ کر کیسے نکل آیا؟“

”میں یہاں آتے ہوئے کچھ دور پہلے ہی کار سے اتر گیا تھا۔ میں لائل پور کے ایک پنڈ میں تھا۔ شادو مجھے وہاں لے گیا تھا۔ وہ آج کل میاں سبحان کا ڈریور لگ گیا ہے۔ وہی کار میں بٹھا کر لایا بھی تھا۔ تیرے لیے کپڑے نہیں لاسکا۔ میلے تھے۔ شادو انھیں دھلوانے اپنے گھر لائل پور لے گیا تھا۔ واپسی میں بھول گیا۔“

رحیم داد نے جل کر کہا۔ ”تو مجھے جیل کی وردی سے چھٹکارا دلانا نہیں چاہتا۔“

”ایسی گل بات نہ کر رخصے! تین نوں کیہ پتہ، مجھے یہ جان کر کتنا دکھ ہوا۔ ویسے چدر تو ہے، اسے اونڈھ کر تو اپنی یہ وردی تو چھپا ہی سکتا ہے۔“ لالی صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ”اب چدر کھول کر روٹی نکر کھا۔“ اس نے مشکیزے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بوکی مجھے دے۔ میں نہر سے بنا کر اس میں پانی بھر لاؤں۔“

رحیم داد نے خدشے کا اظہار کیا۔ ”نہر پر تیرا جانا ٹھیک نہیں، پولیسے تاک میں لگے ہیں۔“

”ابھی تو وہاں کوئی نہیں ہے۔ میں نے بیٹوں پر چڑھ کر ادھر دیکھا تھا۔ بالکل سناٹا ہے۔“ لالی نے ننگ کر بھر دیکھا۔ اب اندھیرا چھٹنے لگا تھا۔ ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ ”ابھی زیادہ اجالا نہیں ہوا۔ سنا جاکر پانی بھر لاؤں۔“

لالی نے مشکیزہ اٹھایا اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہر کی جانب چلا۔ میدان میں اترنے سے پہلے اس نے ٹیلوں کی بلندی سے نہر کی سمت دیکھا۔ وہاں ابھی تک گھرا سناٹا چھایا تھا۔ سڑک نچلی سنسان تھی۔ وہ نشیب میں اترتا اور جھاڑیوں سے بھرے ہوئے میدان کے آخری سرے پر پہنچ

گیا۔ مگر وہ جھنگر سے باہر نہیں نکلا۔

اس نے گردن اٹھا کر چوکتا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اجالا اور بڑھ گیا تھا۔ اسے دور دور تک کوئی نظر نہیں آیا۔ اسی اثناء میں سڑک پر ایک لاری ملتان کی سمت سے نمودار ہوئی اور تیزی سے گزر گئی۔

لالی آگے بڑھا۔ اس نے منکیزے میں پانی بھرا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا۔ اس نے میدان طے کیا۔ ٹیلوں پر چڑھتے ہوئے بار بار پلٹ کر نہر اور اس سے کچھ فاصلے پر گزرتی ہوئی سڑک دیکھتا رہا۔ مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔

وہ درختوں اور ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا اپنے ٹھکانے پر پہنچا۔ رحیم داد مخراب کے باہر کھڑا بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”پولیسے تو نہر پر نہیں ملے؟“

”مجھے تو وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ سڑک بھی سنسان ہے۔“

رحیم داد نے بے صبری کے ساتھ منکیزہ اس کے ہاتھ سے لیا اور منہ سے لگا کر غٹ پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس نے منکیزے کا منہ چمڑے کی ڈوری سے بند کیا۔ لالی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”لگتا ہے جیسے دوبارہ زندگی مل گئی۔“

”تو نے روٹی کھالی؟“

”روٹی تو تیرے جاتے ہی کھالی تھی، پر پیاس بہت ستا رہی تھی۔ جی بھی گھبرا رہا تھا۔“ ”ج، تجھے نہر پر پولیس نہیں ملی؟“

”میں نے تجھے بتایا نہیں، وہاں کوئی دکھائی نہیں دیا۔ لگتا ہے، پولیس بٹالی گئی۔“

لالی، مٹی کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے منکیزہ را نقل کے قریب رکھا۔ واپس آکر لالی کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہ رہا۔ غل کہاں سے لے آیا۔ رہا۔ غل ہی ہے نا؟“

”تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ بندوک ہے یا را نقل؟“

”میں نوں بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔ بندوک اور رہا۔ غل دونوں چلانا جانتا ہوں۔ نشانہ بھی بہرہ بہت سچا ہے۔ احمد کوٹ سے آگے بیلا ہے۔ اس کے چھتروں میں باہر والے بہت ہیں۔“

”تیرا مطلب ہے جنگلی سور؟“

”ہاں، میں نے زمیں داروں کے ساتھ سور کا شکار بہت کھیلا ہے۔ بہت خطرناک ہوتا ہے۔“

کی کھال اتنی موٹی ہوتی ہے کہ گولی اس پر بیکار ہو جاتی ہے۔“

”میں نوں بھی اتنا پتہ ہے۔“

”یہ بتا، اب پروگرام کیا ہے؟ کپڑے تو میرے لیے لایا نہیں، پر پتھر سے کام چل جائے گا۔ اب یہاں زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی یہ روٹی کتنے دن چلے گی۔“

”میرا بھی یہی ارادہ ہے۔ میں آج رات کا در آباد جاؤں گا۔ کوشش کروں گا تیرے لیے کیس اور دھوٹی لے آؤں۔ یہ کام ہو جائے تو دونوں اطمینان سے سفر کر سکتے ہیں۔“

رحیم داد نے تعجب سے پوچھا۔ ”کا در آباد میں تیرا کون ہے؟“

”شاداں ہے۔“ لالی نے آنکھ مار کر کہا۔ ”میں نے اس سے کا در آباد آنے کو کہا تھا۔ وہ وہاں ضرور پہنچ گئی ہوگی۔ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔“

”ادھر تیرا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ پولیسے ہمارے پیچھے لگے ہیں۔ میں نے انھیں سڑک اور نہر پر ٹٹ کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تو شاداں کا چکر چھوڑ۔“

”وہ تو اب چھوٹ نہیں سکتا۔“ لالی کی آنکھوں سے مسرت جھلکنے لگی۔ ”تجھے پتہ نہیں، وہ اب میری بن چکی ہے۔ اب میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“

رحیم داد نے جل کر کہا۔ ”تجھے بھی بالے کی طرح کسی رات سوتے میں چھری سے کاٹ کر ٹوٹے باڈالے گی۔ اتنا سوچ لے۔“

”مجھے پتہ ہے۔ دھوکا کروں گا تو وہ میرا گلا بھی چھری سے کاٹ سکتی ہے۔ پر شاداں اگر جان لے سکتی ہے تو اپنے یار کے لیے جان دے بھی سکتی ہے۔ مجھے ایسی ہی عورت چاہئے تھی۔ تجھے پتہ نہیں، وہ کتنی زور آور اور محبت کرنے والی زنانی ہے۔“ لالی کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔

”میں نے اس سے وعدہ کیا ہے۔ میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا۔ کا در آباد میں وہ اپنے ماے کے پاس ٹھہری ہوگی۔“ لالی نے گہری سانس بھری۔ ”رہے! مجھے اس سے بہت پیار ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”اس سے ملنے کے بعد میں تجھے لے کر شادو کے پاس لاکل پور جاؤں گا۔ شاداں سے کہوں گا وہ بھی لاکل پور پہنچ جائے۔ کچھ دن ہم تینوں لاکل پور ٹھہریں گے۔ فیر آگے کا پروگرام بنائیں گے۔“

”جنانی چاہتا ہے تو شاداں سے ملنے ضرور جا، میں تجھے نہیں روکتا۔ لیکن لاکل پور جانے سے پہلے میں اپنی گھروالی نوراں اور بچوں سے ملنے احمد کوٹ جاؤں گا۔ مجھے نوراں اور اپنے بچے بہت یاد آتے ہیں۔“ رحیم داد کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ ”تیں نوں پتہ نہیں، میں بھی نوراں سے بہت پیار کرتا ہوں۔ تو نے اسے دیکھا ہی ہے۔ کتنی سوہنی ہے اور مجھے کتنا چاہتی ہے۔ جیل میں

جب ملے آتی تھی پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ تو نے تو اپنی آنکھوں سے اسے روتے ہوئے دیکھ ہے۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے، پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ اس نے دو مہینے بعد اچانک تیرے پاس جیل پہنچوڑ دیا تھا۔“

”بیمار پڑ گئی ہوگی اور میرے ہی دکھ میں بیمار پڑی ہوگی۔ ورنہ یہ ہو ہی نہیں سکتا وہ میرے پاس آئے۔ بعد میں ضرور مجھے ملنے جیل گئی ہوگی۔“ رحیم داوے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”لالی! مجھے نورائے بہت پیار ہے۔ میں اسے اور اپنے تینوں بچوں سے ملنے احمد کوٹ ضرور جاؤں گا۔ نہ تو نورائے میرے لیے روتے روتے مرجائے گی۔“

”پر یہ سوچ لے، احمد کوٹ جاتے ہی پولیس تجھے گرفتار کر لے گی یا تیرا خون کر دیا جائے گا۔“ لالی نے اسے خبردار کیا۔ ”میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گیا، جھگڑے میں جو بندہ تیرے ہاتھوں زخمی ہو گیا تھا، وہ پچھلے دنوں اسپتال میں مر گیا۔“

”تو سیف اللہ کی گل کر رہا ہے؟“ رحیم داوے نے پریشان ہو کر کہا۔ ”پر میں نے تو سنا تھا وہ بالکل چنگا ہو گیا تھا۔ اسپتال سے اسے چھٹی بھی مل گئی تھی۔“

”تو نے ٹھیک سنا تھا۔ پر اس کا زخم پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسپتال میں داخل ہوا اور اس کی موت ہو گئی۔ اب پولیس گرفتار کر کے تجھ پر کتل کا مقدمہ چلانا چاہتی ہے۔ پہلے تجھے دفعہ ۳۰۷ میں سزا ہوئی تھی، اب ۳۰۲ میں مقدمہ چلے گا۔ جب سے سیف اللہ مرا ہے، اس کے بھائی اور شریکے تجھے کتل کرنے کی تاک میں ہیں۔ سیف اللہ کا ایک شریک بھی آج کل وزیر لگا ہوا ہے۔ اسی کے حکم پر تو پولیس ہم دونوں کی تلاش میں اتنی بھاگ دوڑ کر رہی ہے۔ ہماری گرفتاری؟ اسی لیے دو ہزار کا انعام بھی رکھا گیا ہے۔“

رحیم داوے گردن جھکا کر گری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمحے بعد اس نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”جھگڑا تو سیف اللہ ہی نے کھڑا کیا تھا۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر شروع ہوا تھا۔ فیر اس نے میری کمان سے بھی زیادہ زمین دہالی۔ میں نے اس کے خلاف مقدمہ کر دیا۔ دو سال تک مقدمے بازی چلی۔ عدالت سے مقدمہ جیت گیا تو سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ جمال دین اور اللہ وراہو میرے ساتھ نہ ہوتے تو انھوں نے مجھے مار ہی دیا تھا۔“

”رحیم! یہ باتیں تو مجھے جیل میں بھی سنا چکا ہے۔ میں تو تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں احمد کوٹ تیرے لیے بہت خطرناک ہے۔ گھروالی اور بچوں سے تجھے ملنا ہی ہے تو پڑوس کے کسی پنڈ میں چلا۔“

اور چپکے سے انھیں وہاں بلا لے۔“

”یہ تو نے ٹھیک کہا۔“ رحیم داوے نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ”تیری بات سمجھ آتی ہے۔ اس میں زیادہ خطرہ بھی نہیں۔ نورائے اور بچوں سے بھی مل لوں گا اور نورائے سے کسوں گا بچوں کے ساتھ لائل پور آجائے۔“

”انھیں لائل پور بلانا ٹھیک نہیں۔ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا، انہیں کہاں بلایا جائے۔“ لالی نے اسے مشورہ دیا۔ ”ایک گل اور سمجھ آتی ہے۔ تو اپنی گھروالی سے کہتا وہ سیف اللہ کے گھر جائے اور اس کی رائٹ کے سامنے اپنے دوپٹے کا پلو پھیلا کر کھڑی ہو جائے۔ جب کاتل کی گھروالی بھین یا دھی، اس طرح پلو پھیلا کر داد فریاد کرتی ہے تو کاتل کے گھروالے خون معاف کر دیتے ہیں۔ یہ پرانی ریت ہے۔ اسے کوئی نہیں توڑ سکتا۔“

”نہیں جی، یہ نہیں ہو سکتا۔“ رحیم داوے نے ترش روئی سے کہا۔ ”میرے پاس ویسے تو اب صرف ۱۲ کلا زمین رہ گئی ہے، پر ہوں تو میں زمیں دار۔ میری گھروالی اس طرح پلو پھیلا کر فریاد نہیں کر سکتی۔ میں آباد کار ہوں۔ کوم کا آرائیں۔ آباد کاروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ تو جانگلی ہے نا، یہ جاگلیوں کی ریت ہے۔“

”تو فیر جو تیرا جی کرے کر۔“ لالی نے تلخی سے کہا۔ ”میں کچھ نہیں کہتا۔“

”نراض نہ ہو۔“ رحیم داوے نرم پڑ گیا۔ ”بات یہ ہے، آباد کاروں کی زنانیاں خون معاف کرانے کے لیے دہائی نہیں دیتیں۔ یہ عزت آبرو کا سوال ہے۔ یہی تو آباد کاروں اور جاگلیوں میں فرق ہے۔ تو شاداں ہی کو دیکھ۔ گھروالے کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ بھاگی۔ فیر اس کا خون کر دیا۔ اب اس نے تجھ سے یاری لگالی۔ میری گھروالی ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔ وہ مرتے دم تک میرے نام پر بچی رہے گی۔“

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داوے بھی چپ رہا۔ اب صبح ہو چکی تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ محراب نیلوں کی چوٹیوں اور درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر جھلک رہی تھی۔ لالی نے منہ کھول کر نہایتی اور کھڑا ہو کر آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”مجھے اب نیند لگ رہی ہے۔“ وہ محراب کے نیچے گیا اور فرش پر بچھے ہوئے نمدے پر لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد گری نیند ہو گیا۔



شام ہونے سے کچھ دیر قبل رحیم داوے نے اسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ لالی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ

گیا۔ اس نے دیکھا، محراب کے نیچے روشنی دھندلی پڑ چکی ہے۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ ”ابھی روشنی ہے۔ روٹی کھالے۔ تو نے تو سویرے سے کچھ بھی نہیں کھایا۔“

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد روٹیاں اور دیکھی اٹھا کر لے آیا۔

لالی نے دیکھی کا ڈھکنا ہٹا کر سونگھا۔ اور مہ سڑ گیا تھا۔ اندر سے کھنی کھنی بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے دیکھی ایک طرف رکھتے ہوئے منہ بگاڑا۔

”رہے! گوشت تو خراب ہو گیا، کھانے کا نہیں رہا۔“

دونوں نے باسی روٹیاں کھائیں۔ شکیزے سے پانی پیا اور محراب کے نیچے سے نکل کر باہر آگئے۔ سورج اونچے اونچے نیلوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ لالی نے کہا۔

”رہے! میں کادر آباد جا رہا ہوں۔“

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”اندھیرا بڑھ جائے تب جانا، ابھی اجالا ہے۔ اس دکھت جانا ٹھیک نہیں۔“

”جھیتی چلا جاؤں گا تو جھیتی لوٹ بھی آؤں گا۔ اب یہاں ٹھیرنا ٹھیک نہیں ہے۔ آج ہی رات ہم دونوں یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں شاداں سے تیرے لیے کمیص، دھوتی اور جوتی لے آؤں گا۔ شاداں اپنے مامے ہی کے پاس ٹھیری ہوگی۔ اس نے مجھے یہی بتایا تھا۔“

”جیسی تیری مرضی، سوچ لے۔ میرے احمد کوٹ جانے کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟“

”سویرے تجھ سے اس بارے میں بات تو ہوئی تھی۔“ لالی نے جواب دیا۔ ”یہاں سے چلنے سے پہلے آگے کا پروگرام بنالیں گے۔“

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ لالی آگے بڑھا۔ نیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نیچے میدان میں اترا اور جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں سے الجھتا ہوا نہر کی جانب چلے لگا۔ جھنگر ختم ہوا تو نہر نظر آنے لگی۔ لالی نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا نہر کے کنارے پہنچ گیا۔

وہ پل کی جانب بڑھنے لگا۔ تھوڑی ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کے کانوں میں یہ آواز پڑی۔ ”یہ تو جی لالی لگتا ہے۔“ لالی ٹھٹکا۔ اس نے گھبرا کر نہر کے اس پار نظر دوڑائی۔ کھجور کے ایک درخت کے نیچے دھندلی دھندلی روشنی میں دو کانٹیل دکھائی دیے۔ وہ بالکل اس کے سامنے تھے۔ درمیان میں

نہر تھی۔

کانٹیلوں کو دیکھتے ہی وہ سرا سہ ہو کر پلٹا اور تیزی سے جھنگر کی جانب لپکا۔ اسے اپنے عقب میں نہر کے اس پار سے ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ لالی نے آوازوں پر مطلق دھیان نہیں دیا۔ جھنگر میں گھسا اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے بڑھنے لگا۔ اس نے جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا میدان طے کیا اور نیلوں پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا، پولیس والوں کا ایک جتھہ پل عبور کر کے نہر کے دوسری طرف بڑھ رہا ہے۔ لالی اونچے نیچے نیلوں پر چڑھتا اترتا تیزی سے اپنے ٹھکانے کی جانب لپکا۔ محراب کے قریب پہنچا تو وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے اس عالم میں دیکھا تو پریشان ہو کر پوچھا۔

”تو اتنا گھبرا ہوا کیوں ہے؟“

”نہر پر پہنچا تو پولیس مل گئے۔“ لالی نے پھولی ہوئی سانس قابو میں کرتے ہوئے کہا۔ ”انہوں نے مجھے پہچان لیا۔“

”یہ تو خطرناک بات ہو گئی۔“

لالی نے کچھ نہیں کہا۔ تیزی سے محراب کے نیچے پہنچا۔ راتقل اٹھائی۔ چیمبر میں کارٹوس چڑھایا اور قریب کے نیلے پر چڑھتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ وہ چونکنا نظروں سے سامنے دیکھنے لگا۔ یکایک پتھر لے راستوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آہٹ ابھری اور اس کے ساتھ ساتھ گرمی خاموشی میں ملی جلی انسانی آوازیں بھی سنائی دیں۔ لالی نے گھبرا کر اس طرف نظر ڈالی۔ ایک اونچے نیلے کے پیچھے سے پولیس والے نکلے، سب مسلح تھے۔ ان کے ساتھ ایک انسپٹر بھی تھا۔ اس نے لالی کو نیلے کی بلندی پر دیکھ لیا۔

لالی جھٹ ایک ابھرے ہوئے پتھری آڑ میں راتقل سنبھال کر بیٹھ گیا۔ پولیس والے تعداد میں درجن بھر سے زیادہ تھے۔ وہ نیلے کے عقب سے نکل نکل کر اوپر آ رہے تھے۔ جب پولیس کی پوری نفری نیلے پر پہنچ گئی تو انسپٹر نے انھیں آگے بڑھنے سے روک دیا۔ وہ اس کی ہدایت پر تین نیلوں میں بٹ گئے۔

لالی پتھری آڑ سے ان کی نقل و حرکت دیکھتا رہا۔ وہ لالی سے دو ڈھائی سو گز کے فاصلے پر عین اس کے سامنے والے نیلے پر تھے۔

لالی نے ان پر گولی نہیں چلائی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی نشیب سے نکل کر لالی کے قریب

”بھیتی آنے کی کوشش کرنا۔“

”آجاؤں گا، آجاؤں گا۔“ لالی نے اسے ڈانٹا۔ ”تو اب پھوٹ جا۔ بھیتی ٹال نہ جا۔ ورنہ تیرا نکتنا مشکل ہو جائے گا۔“ اس نے گولی چلائی۔ ”میگزین میں ابھی چھ کارٹوس ہیں۔ میں ان سے پولیس کو روکے رکھوں گا۔ تو فٹ نکل جا۔ دیری نہ کر۔“

رحیم داد کھسکا ہوا نیچے اترا۔ محراب کے نیچے پہنچا۔ ہیبانی کمرے باندھی، چادر اٹھا کر اوڑھی۔ باہر نکلا اور ٹیلوں کی آڑ میں دبا دبا پیچھے کی ڈھلان سے نیچے اترا۔ اندھیرے میں اونچے نیچے راستوں پر تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے، اور آگے بڑھتا گیا۔



لالی ٹیلے پر پتھر کی آڑ میں مورچا سنبھالے بیٹھا تھا۔ پولیس اس پر دو جانب سے اندھا دھند فائرنگ کرتی رہی۔ اب رات ہو چکی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ اسے پولیس والے دھندلے دھندلے سایوں کے مانند نظر آرہے تھے۔

وہ رک رک کر گولی چلاتا رہا تاکہ پولس اس کے عقب میں نہ پہنچ سکے اور اس اثناء میں رحیم داد اس کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ جائے۔

اندھیرا بڑھتا گیا۔ گولیاں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان رات کے سناٹے میں چھتی رہیں۔ لالی کی رائفل کے میگزین میں کارٹوسوں کا ذخیرہ رفتہ رفتہ کم ہوتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کو گئے ہوئے لگ بھگ پون گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لالی کے اندازے کے مطابق اب رحیم داد کو برساتی نالے کے اس پار جنگل میں پہنچ جانا چاہئے تھا۔

لالی نے گولی چلائی۔ اب اس کی رائفل میں آخری کارٹوس رہ گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کھسکا ہوا نیچے اترنے لگا۔ نشیب میں آیا اور اس ٹیلے کی جانب بڑھا جس کے قریب سے پیچھے کی ڈھلان کی جانب راستہ جاتا تھا۔

لالی ٹیلے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے گولی چلائی اور آخری کارٹوس بھی ختم کر دیا۔ وہ تیزی سے ڈھلان کی جانب دوڑا۔ مگر اندھیرے میں اس نے ٹھوکر کھائی۔ لڑکھڑا کر گرا۔ اس کا سر ایک الجھے ہوئے پتھر سے اس قدر زور سے ٹکرایا کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ دودھ مارا اور بے سدھ پڑا رہا، پھر ہمت کر کے اٹھا اور آگے بڑھا۔ مگر چکر اکر گرا اور ایسا گرا کہ دور تک اڑھٹا چلا گیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر کوشش کے باوجود نہ اٹھ سکا۔ سکھیا کھانے کے بعد وہ بہت

اٹھیا اور اس کے برابر ہی پتھر کی آڑ لے کر بیٹھ گیا۔

دونوں نے دیکھا، پولیس کی ایک ٹولی دھیرے دھیرے ٹیلے سے نیچے اتری۔ مگر آگے آنے کے بجائے دائیں ہاتھ کو مڑی اور ایک ٹیلے کی آڑ لے کر بڑھنے لگی۔ لالی فوراً بھانپ گیا کہ وہ اس کے عقب میں پہنچنا چاہتی ہے۔ یہ دونوں کو گھیرے میں لینے کا منصوبہ تھا۔ لالی نے نشانہ باندھا اور اس ٹولی پر گولی چلا دی۔

گولی شام کے سناٹے میں چھتی ہوئی تیزی سے گزری۔ پولیس والے گھبرا کر جھپاک سے زمین پر لیٹ گئے اور دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے پتھروں کے پیچھے دھنکنے کی کوشش کرنے لگے۔ ان کی نقل و حرکت میں اس اچانک تبدیلی سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ لالی کے مسلح ہونے سے قطعی بے خبر تھے۔

پولیس کی جو ٹولی ٹیلے پر موجود تھی گولی کی آواز سنتے ہی نشیب میں اتر گئی۔ پولیس والے بکھر ادھر ادھر دھنکنے لگے۔ لالی نے اس ٹولی پر ایک اور گولی چلائی جو دھیرے دھیرے اس کے عقب میں جانے کے لیے کوشاں تھی۔ دوسری گولی چلا کر وہ پولیس کی اس ٹولی کو آگے بڑھنے سے روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر اب پولیس نے بھی دو طرف سے اس پر جوابی فائرنگ شروع کر دی تھی۔ گولیاں چھتی ہوئی لالی اور رحیم داد کے سروں پر سے گزرتی رہیں۔ ایک گولی اس پتھر پر لگی جس کے پیچھے دونوں چپے ہوئے تھے۔ پتھر کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر لالی کے کندھے پر لگا مگر چوٹ خفیف سی آئی۔ لالی اور رحیم داد جھٹ زمین پر لیٹ گئے۔

لالی نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر سرگوشی کی۔ ”رہو! تو پیچھے سے نکل جا۔ میں نے ادھر بڑھنے والی پولیس پارٹی کو روک دیا ہے۔“ اس نے ایک گولی اور چلائی۔ ”تو ٹیلوں کے اندر اندر ہوتا ہوا ڈھلوان سے اتر کر سکنالے کے اس پار نکل جا۔ آگے اونچائی پر جھل ہے، تو وہاں چھپ کر میرا انتظار کرنا۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو نہیں چلے گا؟“

”میری پروا نہ کر۔“ لالی نے قیص کے اندر ہاتھ ڈال کر ہیبانی کھولی اور اسے رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے، لے، اسے رکھ لے۔ اس میں تین ہزار سے اوپر روپے ہیں۔ اور دیکھ، یہاں سے نکلتے ہوئے چدر ضرور اوڑھ لیتا۔“

رحیم داد نے ہیبانی لیتے ہوئے کہا۔ ”تو کتنی دیر میں پہنچے گا؟“ وہ آہستہ آہستہ نیچے کھسکے لگا۔

جھٹک گیا تھا، کمزور اور لاغر ہو گیا تھا۔ اس میں پہلے جیسی قوت اور توانائی نہیں رہی تھی۔

وہ نیلے کے دامن میں پڑا رہا اور گہری گہری سانسیں بھر کر بانپتا رہا۔ اب ٹیلوں پر بھاری بھاری بوٹوں کی آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔

ناگاہ بائیں ہاتھ کے نیلے سے نارچ کی تیز روشنی ابھری۔ روشنی اس کے چہرے پر پڑی۔ لالی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسی وقت قریب کے نیلے کی بلندی سے ایک کانٹیل کود کر نیچے آیا۔ اس نے جھپٹ کر لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔



رات آدمی ہو گئی، کاجل کی طرح کالی ہو گئی۔ جھل سانسیں سانسیں کر رہا تھا۔ رکڑویران تھا۔ نیچے نیچے اور مٹے دم بخود تھے۔ ہوا کا تیز جھونکا آتا، خشک بے کھڑکڑاتے، خاموشی کا طلسم ہم پر ہم ہو جاتا۔ رحیم داد چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا۔ رات ڈھلنے لگی۔ رحیم داد کی نگاہیں رکڑویران کے عقب میں ابھرے ہوئے ٹیلوں اور بوٹوں کی سمت اٹھی ہوئی تھیں۔ مگر ٹیلوں پر نہ کوئی چاپ بھری نہ سایہ نظر آیا۔

رحیم داد تھکن سے مضطرب تھا۔ ہوا میں خشکی بڑھ گئی تھی۔ وہ اپنے جسم کو چادر سے ڈھانپنے، مکر اسکاڑا یا ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ نیند بار بار یلغار کرتی۔ وہ جھومنے لگا اور بھومتے جھومتے لڑھک گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے رکڑویران زرد زرد دھوپ پھیلی تھی۔ مگر اب تک نہیں پہنچا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ بہت دیر ہو گئی۔ دھوپ درختوں سے چھن چھن کر جھل میں پھیلنے لگی۔

اب جھل میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ رحیم داد کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ایک طرف چلنے لگا۔ فراش کے گنجان درختوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آگے جھنگر تھا۔ جھنگر میں گھنی جھاڑیاں تھیں، خود رو جنگلی پودے تھے۔ زمین سخت اور ناہموار تھی۔ جھنگر نشیب میں دور تک پھیلتا چلا گیا تھا۔ رحیم داد جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے آگے بڑھتا گیا۔ جھنگر سے نکل کر چنیل میدان میں پہنچ گیا۔

دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے پیاس محسوس ہوئی۔ پانی کی تلاش میں رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ کچھ دور سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کنویں کی منڈیر نظر آئی۔ وہ اس جگہ پہنچا۔ کنواں پرانا اور بہت بڑا تھا۔ آب پاشی کے لیے بنایا گیا تھا۔ منڈیر کے قریب چونچے جیسا چلھا تھا۔ اس میں رہٹ کے نیار سے کنویں کا پانی گرتا تھا۔ بنٹھے سے کھیتوں میں پانی پہنچانے کے لیے آؤ اور نالیاں نکلتی تھیں۔ مگر اب کنویں کی منڈیریں منہدم ہو چکی تھیں۔ پلٹا ٹوٹ پھوٹ کر گرہا بن گیا تھا۔ آؤ اور نالیوں کے نشانات دھندلے پڑ چکے تھے۔ کھیت اجڑ کر غیر میدان میں تبدیل ہو گئے تھے۔ رحیم داد نے جھک کر کنویں میں نظر ڈالی۔ کنواں بالکل خشک تھا، اس کی تہ میں جھاڑیاں اور خود رو پودوں کے جھنڈ تھے۔ یہ اندھا کنواں تھا۔ اسے ڈل کما جاتا ہے۔

ڈل سے سو سو سو گز دور کسی ویران بستی کے ٹوٹے پھوٹے مکانات کے کھولے اور کھنڈر تھے۔ کھنڈر کے عقب میں بھی دور تک پھیلا ہوا لٹوق و دق میدان تھا۔ میدان کے ایک حصے میں مزدور کھدائی کرتے نظر آ رہے تھے۔

وہ مختلف ٹولیوں میں بٹے ہوئے تھے۔ کچھ مزدور کدالوں سے سخت اور پتھر ملی زمین کھود کر نکل نکال رہے تھے۔ کچھ نیچے سنبھالے زمین کے اندر سے نکلنے والے نکلروں کی ڈھیریوں کے پتے بنا رہے تھے، کچھ بوے اور گمرے گڑھے مٹی سے بھر کر ہموار کر رہے تھے۔ ان گڑھوں سے نکل نکالے جا چکے تھے۔ دو ڈھائی سال بعد مٹی سے بھرے جانے والے ان گڑھوں میں پھر نکل پیدا ہو جاتے ہیں۔ انھیں کھود کر نکال لیا جاتا ہے۔

مزدور اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ چمکتی دھوپ میں ان کے چہرے تھما رہے تھے۔ وہ بار بار پیشانیوں سے پسینہ پونچھتے۔ قریب ہی بوسیدہ چھو لدا ری استادہ تھی۔ چھو لدا ری کے سامنے ٹکے دار کا نشی چارپائی پر بیٹھا حقہ گزگڑا رہا تھا۔ وہ اونچی آواز سے مزدوروں کو ہدایات دیتا اور ڈانٹا پھینکارتا۔

رحیم داد منڈیر کی آڑ سے مزدوروں کو کام کرتے دیکھتا رہا۔ نشی کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ رحیم داد خوف زدہ ہو گیا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ وہ پلٹا اور تیز تیز قدم اٹھاتا پھر جھنگر میں گھس گیا اور چلتے چلتے جھل میں پہنچ گیا۔ فراش کے درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اسے ابھی تک لالی کے آنے کی توقع تھی۔ ہر

ٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے۔ چونک کر ادھر ادھر نظریں دوڑاتا، مگر لالی کو نہ پا کر سخت س ہوتا۔

وقت گزرتا رہا۔ اسے بھوک نے ستایا مگر پیاس کا غلبہ زیادہ تھا۔ وہ بے قرار ہو کے کھڑا ہو گیا اور اس کی تلاش میں سک نالے کی جانب بڑھا۔ جھل کے بائیں کنارے پہنچ کے اس نے درختوں کی سے دیکھا۔ سامنے نشیب میں سک نالائیوں اور بیٹوں کے درمیان سے بل کھاتا ہوا گزرتا تھا۔ سک نالے کی خشک ریت کے ذرے دوپہر کی زرد زرد دھوپ میں جھللا رہے تھے۔ ایک نیلے دامن میں جگمگ کرتی چھوٹی سی جھیل تھی۔ یہ ٹوبھا تھا۔ اس میں ابھی تک پچھلی بارش کا پانی بودھا تھا۔

ہوا کے جھوکوں سے ٹوبھے میں ہلکی ہلکی لہریں ابھر رہی تھیں۔ ٹوبھا زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ پانی تہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ دھیرے دھیرے نشیب میں اترنے لگا۔ کچھ ہی نیچے اترا ہو گا کہ نشیب میں اسے بھاڑیوں کے قریب انسانی سایہ نظر آیا۔ رحیم داد کا گردن بڑھا کر چونکا نظروں سے دیکھا کہ ایک شخص گردن جھکائے جنگلی پودوں کی پتیاں توڑ توڑ ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال رہا ہے۔

وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کی سفید قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پر مٹھی، سوا مٹھی ل کترواں ڈاڑھی، آنکھوں پر پرانی وضع کی عینک اور سر پر اونچی باڑی سیاہ جناح کیپ۔ وہ حکیم رحمہ بخشی تھا۔ رحیم داد سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ لیکن پتیاں توڑنے کی محویت میں مانے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔

سامنے ٹوبھا تھا۔ اس کا پانی دھوپ میں جگمگا رہا تھا۔ رحیم داد کو بہت شدت کی پیاس لگی تھی۔ مانے بہت سے کام لیا، چادریں سے جیل کی وردی اچھی طرح چھپائی اور حکیم بخشی کی نظروں سے بچاتا ٹوبھے کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ احتیاط سے نشیب میں اتر رہا تھا۔ پھر بھی پتھر کا ایک ٹکڑا اس کے پیروں سے ٹکرا گیا اور ملکا ہوا نیچے چلا گیا۔ آہٹ پر حکیم نے گردن موڑی اور رحیم داد کو دیکھ کے سیدھا ہو کر کھڑا لیا۔ رحیم داد اسے نظر انداز کرتے ہوئے نیچے اترنے لگا۔

حکیم نے اسے ٹوکا۔ ”گل سنتا جی!“

رحیم داد نہیں رکا۔ وہ ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوبھے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھتا گیا۔

وہ کے درمیان فاصلہ اور کم ہو گیا۔

اس دفعہ حکیم چشتی نے اسے کسی قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ”میں نے کہا، باشا ہوا کرتے بڑے چلے جا رہے ہو؟ بات تو سنو۔“ رحیم داد ٹھنکا لیکن اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ حکیم چشتی نے مسکرا کر پوچھا۔

”ٹوہیے پر پانی پینے جا رہے ہو؟“

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ ”ہاں جی! پانی ہی پینے جا رہا ہوں۔ سخت پیاس لگی ہے۔“

”ناں ناں۔“ حکیم نے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔ ”ٹوہیے کے پانی میں جو نکلیں ہیں۔“ آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھا۔ ”تم ادھر کھالے کے پاس کنکرتو نہیں نکالتے؟“ اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

”تم مجھے نئے مزدور لگتے ہو۔ پہلی بار، ادھر آئے ہو کیا؟“

رحیم داد نے مختصر جواب دیا۔ ”ہاں جی!“

”میں نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”میں یہاں اکثر آتا ہوں۔ کنکرتی کھدائی کرنے والے مزدور بھی کبھی کبھار ٹوہیے پر نہانے یا پانی پینے ادھر آ نکلتے ہیں۔“ حکیم نے قدرے تامل کیا۔

”ایک بار ایسا ہوا کہ ایک مزدور میرے سامنے ٹوہیے پر آیا۔ اس نے چلو بھر بھر کر پانی پیا۔ بہت زیادہ پیاسا لگتا تھا۔ پانی پی کر سستانے کے لیے ایک بھاڑی کے سائے میں بیٹھ گیا۔ یہی آتی گرمیوں کے دن تھے۔ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ میں نے اس کی جانب دھیان نہیں دیا، گردن جھکائے بوٹیاں توڑتا رہا۔ اچانک میں نے ابکائی کی آواز سنی۔ پلٹ کر دیکھا کہ وہ الٹی کر رہا ہے۔ الٹی میں خون ہی خون نکلا۔ الٹی کے بعد وہ نڈھال ہو کے زمین پر لیٹ گیا اور اکھڑی اکھڑی سانسیں بھرے لگا۔ میں جھٹ اس کے پاس پہنچا اور کھائی تھام کے نبض دیکھنے لگا۔“

”لگتا ہے جی! تیس حکیم ہو؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ہاں، میں حکیم ہوں۔“ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”میرا نام صوفی حکیم نذر محمد چشتی ہے۔“ حکیم نے بات جاری رکھی۔ ”ہاں تو جی! میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ مگر اس کی بیماری میری سمجھ میں نہیں آئی۔ بہت غور کرنے پر اتنا پتہ چلا کہ اس کے پیٹ میں کوئی زہریلی چیز چلی گئی ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ اسے پیٹ سے کیسے نکالا جائے۔ اس وقت اپنے پاس کوئی دوائی بھی نہیں تھی۔ فیراہا ہوا کہ مریض نے خون کی ترقی کی۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔“

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اسے بیماری کیا تھی جی؟“

”وہ بیماری کوئی بہت ہوشیار اور تجربہ کار حکیم ہی سمجھ سکتا تھا۔ مریض کی بگڑتی ہوئی حالت دیکھ میں خود پریشان ہو گیا تھا۔ فوری طور پر علاج نہ کیا جاتا تو وہ مر جاتا۔ میں نے مرض کی تشخیص تو ملی تھی۔ غور کرتے کرتے علاج بھی سمجھ میں آ گیا۔ جھٹ ٹوہیے پر پہنچا۔ پانی پر جگہ جگہ کاٹی جمع کی۔ میں نے کندھے پر پڑا ہوا پرنا اتارا اور اس میں ڈھیر ساری کاٹی بھر لی۔ گھڑا بھر کاٹی ہوگی۔ پیس کے پاس پہنچا اور اسے کاٹی کھلانے لگا۔“

”اس نے کاٹی کھالی جی؟“

”نہیں جی! وہ کاٹی کھانے پر بالکل تیار نہیں تھا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے، بڑی ضد کی۔ مگر میں نے کام نہ کھول کے زبردستی ساری کاٹی کھلا دی۔“

”ذرا بعد اس نے ابکائیاں لینی شروع کر دیں۔ الٹی کی۔ الٹی میں کاٹی کے ساتھ خون بھی آ۔ میں جو چیز باہر نکالنا چاہتا تھا، وہ الٹی کے ساتھ پیٹ سے باہر آ گئی۔ وہ جو تک تھی۔ یہ لمبی۔“

”میں نے ایک انگلی بڑھا کے رحیم داد کے سامنے کر دی۔“ جو تک ٹوہیے کے پانی کے ساتھ اس کے منہ میں چلی گئی تھی۔ جو تک باہر نکلتے ہی مریض کی حالت سنبھلنے لگی۔ الٹی بند ہو گئی۔ بالکل چنگا لیا۔ صرف کمزوری رہ گئی تھی۔“

”یہ کب کی گل ہے جی؟“

”پچھلے ہی سال کا واقعہ ہے۔ اس کے بعد کنکرتی کھدائی کرنے والوں میں سے کوئی ادھر پانی پینے نہ آتا۔ میں نے تو سنا ہے کہ بھٹیکے دار نے پینے کے پانی کا ادھر ہی بندوبست کر دیا ہے۔ تم کیسے ٹرا گئے پانی پینے؟“

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ جھٹ بات بتائی۔ ”وہ ایسا ہے جی! میں پہلی بار مزدوری کے لیے ٹر گیا تھا پر کام نہیں ملا۔ میں اس طرف چلا آیا۔ ٹوہیہ دیکھ کر پیاس لگی۔“ اس نے مڑ کر ٹوہیے کی بوند دیکھا جس میں ہلکی ہلکی لہریں اٹھ رہی تھیں، چمکیلی دھوپ میں آئینے کی کڑیچوں کے مانند مل رہی تھیں۔ رحیم داد کو ایک بار پھر شدت سے پیاس محسوس ہوئی۔ بے قرار ہو کر بولا۔

”زبردستی پیاس لگی ہے جی! کیا کروں؟“

”پریشان نہ ہو۔“ حکیم نے اسے تسلی دی۔ ”میرے پاس پینے کا پانی ہے۔ میں جب بھی یہاں ہوں، روٹی پانی ساتھ لاتا ہوں۔“

رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ ”حکیم جی! مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو۔“ اس نے خشک ہونٹوں پر

زبان پھیری اور منہ کھول کر آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ حکیم نے اس کی بے قراری محسوس کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔ چند ہی قدم پر ایک گھٹی بھاڑی تھی۔ بھاڑی کے قریب پہنچ کر حکیم ٹھہر گیا۔ رحیم داد بھی رک گیا۔ بھاڑی کے نیچے مٹی کے تودے پر المونیم کا ناشتہ دان رکھا تھا۔ قریب ہی چھوٹا سانسری تھراں بھی تھا۔

حکیم نے آگے بڑھ کر ناشتا دان اور تھراں اٹھایا اور بھاڑی کے نیچے صاف ستھری جگہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے تھراں کھولا، ڈھکنے میں پانی اٹھایا اور رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ ”تو پیاس بھانے کے لیے تھوڑا سا پی لو۔“ رحیم داد سارے پانی ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ حکیم نے تھراں کا خالی ڈھکنے اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”میں تمہیں پینے کے لیے اور پانی نہیں دوں گا۔ اب روٹی کھاؤ، پھر پانی پینا۔ خالی پیٹ پانی پینا مناسب نہیں ہوتا۔ لگتا ہے تم نے سویرے سے کچھ کھایا بھی نہیں ہے؟“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ حکیم نے ناشتہ دان کھولا۔ اس میں بھنا ہوا گوشت تھا اور روٹیاں تھیں۔ حکیم نے ایک روٹی نکالی، رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ دوسری اپنے ہاتھ میں دبا کر بولا۔ ”جی! بسم اللہ کرو۔“ اس نے لقمہ لیا۔

رحیم داد بھی کھانا کھانے لگا۔

حکیم نے کھانا کھاتے کھاتے کہا۔ ”میں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا تم پہلی بار ادھر آئے ہو۔ اتفاق سے میں آج یہاں موجود تھا ورنہ تم بھی ٹوہیے کا پانی پی کر بیمار پڑ جاتے۔“

”کیا ٹوہیے کا پانی پی کر سہی بیمار پڑ جاتے ہیں؟“

”نہیں“ صرف وہ بیمار پڑتے ہیں جن کے پیٹ میں پانی کے ساتھ جو نمکیں چلی جاتی ہیں۔ ویسے ٹوہیے کا پانی پینے سے پیٹ کی دوسری بیماریاں بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ ٹھہرا ہوا پانی صحت کے لیے مضر ہوتا ہے۔“

”حکیم جی! تیس روز ادھر آتے ہو؟“

”نہیں، مجھے اتنی فرصت کہاں کہ روز روز آؤں۔ کبھی تو مہینوں نہیں آتا۔“ وہ مسکرایا۔ ”نم

سوچ رہے ہو گے، میں اس دیرانے میں کس لیے آتا ہوں۔ یہی سوچ رہے ہوتا؟“

رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ ”ہاں جی۔“

”میں یہاں جزی بوٹیوں کی تلاش میں آتا ہوں۔“ حکیم چشتی نے ہاتھ اٹھا کر ادھر ادھر لہرایا۔

”یہ بھاڑیاں اور بوٹے دیکھ رہے ہو۔ یہ قدرت کا ان مول خزانہ ہے۔ ان بوٹیوں کی پتیوں، جڑوں، پھلوں میں نہ جانے کیسی کیسی بیماریوں کا علاج چھپا ہوا ہے۔ مگر اسے ڈھونڈنے اور پہچاننے کے لیے نظر چاہئے۔“ عینک کے شیشوں کے پیچھے حکیم چشتی کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ دلچسپی اور توجہ سے رحیم داد کو بتاتا رہا۔

”یہ خود رو بوٹے ہیں۔ ہر موسم میں آگتے ہیں۔“

”کئی بوٹے تو جی فصلوں کے ساتھ کھیتوں میں نکل آتے ہیں۔“ رحیم داد نے بھی اپنی معلومات کا اظہار کیا۔

”یہ عجب بات ہے۔“ حکیم مسکرا کر بولا۔ ”کھیتوں میں بوٹی سے پہلے پوری طرح صفائی کی جاتی ہے تب بیج ڈالے جاتے ہیں۔ مگر فصل کے ساتھ ایسے خود رو بوٹے ضرور نکلتے ہیں جو دوا کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی زمین پر ایک ہی سی کھاڈا ڈالنے اور ایک ہی طرح پانی لگانے کے باوجود دونوں فصلوں پر مختلف بوٹے آگتے ہیں۔ ربیع کے الگ ہوتے ہیں، خریف کے الگ۔ ان میں السی، سداب، حرل، کاسنی، کلکھی، منڈی، کچری، سرپھوکہ، شاہترا، تھوڑا اور ایسی ہی نہ جانے کتنی جزی بوٹیاں شامل ہوتی ہیں۔“ حکیم نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”بتے ہے، یہ کتنی مفید اور کارآمد بوٹیاں ہوتی ہیں؟“

”میں ان کے بارے میں کچھ پتہ نہیں جی؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔“ حکیم کھل کر مسکرایا۔ ”تمہاری طرح اور بھی بہت ہیں جن کو یہ پتہ نہیں کہ السی، اخراج، بلغم کے لیے نہایت مفید ہے۔ محلل اور ام ہے، مسکن ہے۔ تم نے سداب کا بوٹا دیکھا ہوگا۔ گندم کے بوٹیوں کے ساتھ ہی آگتا ہے۔ دوگز تک اونچا ہوتا ہے۔ سداب پیٹ کی کئی بیماریوں کے علاوہ تشنج، قوچ اور نفخ شکم رفع کرتا ہے۔ اسی طرح حرل، جسے اسپند بھی کہتے ہیں، شوقی اعصاب ہے۔ اس کے بیجوں میں تل وافر مقدار میں ہوتا ہے جو بدن سے رطوبت خارج کرتا ہے۔ کاسنی کی بوٹی جگر کے امراض کے لیے مخصوص دوا ہے۔ اس کے پتے، بیج اور جڑ، سب کام آتے ہیں۔ یہ حرارت بخاتی ہے۔ پیاس کی شدت دور کرتی ہے۔ محلل اور مسکن ہے۔ یرقان کے مریض کو شفا دیتی ہے۔“

حکیم نذر محمد چشتی نہایت سنجیدگی سے علم طب کے اسرار و رموز بیان کرتا رہا۔ ”منڈی اور سرپھوکہ، منصفی خون ادویات ہیں۔ کلکھی مشہور بوٹی ہے۔ پھری توڑتی ہے۔ کچری، پیٹ کے مروڑ اور بطنی امراض کے لیے نہایت مجرب ہے۔ اسی طرح دوسری جزی بوٹیوں کے بھی خواص ہیں۔

جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ ربا وہ بوٹا۔“

پودا باشت سوا باشت اونچا تھا۔ اس کی پتیاں نوکیلی تھیں۔ شاخوں میں باریک باریک کانٹے تھے اور چند ننھے، ننھے زرد پھول بھی لگے تھے۔

حکیم نے جھک کر پودا اکھاڑا اور رحیم داد کو دکھا کر بولا۔ ”اس بوٹے کا نام سنگھنی ہے۔ یہ ندی بالوں کے کنارے پتھریلی زمین میں اگتا ہے۔ اس کی عجب تاثیر ہے۔ اس کی جڑا بال کرپو، خونی یا بادی کسی بھی بوا سیر ہو، فوراً افاقہ ہوگا۔ بچوں کے پیٹ میں کیڑے پڑ جائیں، جڑ پیس کر، ذرا سا شند ملا کر چٹاؤ، سارے کیڑے فضلے کے ساتھ پیٹ سے نکل جائیں گے۔ کالی کھانسی ہو تو اسے جلا کر ہاون دستے میں کوٹ لو، باریک کیڑے سے چھان کر سفوف بنا لو۔ تھوڑا سا نمک ملاؤ، رات کو سوتے وقت مریض کو ایک چمکی کھلا کر گرم پانی پلا دو۔ چوتھے روز کالی کھانسی جاتی رہے گی۔ جڑ قوت باہ کے لیے بھی نہایت مفید ہے۔ گھیکوار کے ساتھ پیس کر حلوہ بنا لو۔ اس میں حسب ضرورت پتے، بادام ڈالو۔ جاڑوں میں استعمال کرو۔ نہایت مسک ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”لیکن یہ تو ریسوں کے چونچلے ہیں، تم کہاں اس چکر میں پڑو گے؟“

”اپنی توجہ ساری گل ہی سمجھ نہیں آئی۔ اس چکر میں کیا پڑنا۔“

”اچھا ہی ہے تم اسے نہ سمجھو۔ تم ابھی بکڑے جوان ہو۔ تمہیں کسی ایسے نسخے کی کیا ضرورت لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ آزمودہ اور تجربت نسخہ ہے۔“ حکیم چشتی سنگھنی کا پودا گھما پھرا کر دیکھنے لگا۔

”بڑی اور بھی بہت خوبیاں ہیں، کہاں تک بیان کروں۔“

”پر میں نے توجہ تمہیں اس کی پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتے دیکھا تھا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ حکیم مسکرانے لگا۔ ”میں تو تمہیں اس بوٹے کی خصوصیات بتا رہا تھا۔ بڑی طرح اس کی شانیں اور ڈھنصل بھی بہت سی بیماریوں کا علاج ہیں۔ اسی طرح اس کے پھولوں اور پتیوں کی بھی خصوصیات ہیں۔“ وہ پتیاں توڑ توڑ کر ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈالتے لگا۔ ”مجھے آج کل اس کی پتیوں کی شدید ضرورت ہے۔ میں ان پتیوں سے کئی پیچیدہ امراض کا علاج دریافت کرنے کا تجربہ کر رہا ہوں مجھے اس میں کامیابی بھی ہوئی ہے۔“

حکیم نے تمام پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالیں اور پودا ایک طرف پھینک دیا۔ رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ حکیم آگے بڑھا۔ چند ہی قدم کے فاصلے پر سنگھنی کے پودوں کا جھرمٹ نظر آیا۔ حکیم کے

کہاں تک بیان کروں۔“

”حکیم جی! تیس انھیں اتنی کام کی بوٹیاں بتاتے ہو پر کھیتوں کی گوڈی اور ٹلائی کرتے ہوئے ان کو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے۔“ رحیم داد نے حکیم کو مطلع کیا۔

”یہی تو ظلم ہے۔“ حکیم چشتی بے قرار ہو کر بولا۔ ”افسوس کہ لاعلمی کے باعث اتنی کار آمد جڑی بوٹیاں کھیتوں سے اکھاڑ کر ضائع کر دی جاتی ہیں۔ جنگل یا ویرانے میں پیدا ہوں تو موشیوں کی خوراک بن جاتی ہیں۔ موسم کے سرد و گرم کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں۔“ رحیم داد سر جھکائے چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

حکیم نے بات جاری رکھی۔ ”میں ان جڑی بوٹیوں سے مختلف دوائیاں تیار کرتا ہوں۔ کمال گڑھ میں میرا مطب ہے۔ دور دور سے مریض آتے ہیں۔“ کھانے سے فارغ ہو کر حکیم نے ناشتے دان میں بچا کچھا کھانا ڈالا اور اسے تھرموس کے ساتھ ایک طرف سنبھال کر رکھ دیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ میں خشک برساتی ٹالا، ریگ زار جیسا نظر آ رہا تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ مگر جھاڑی کے سائے میں سکون تھا، ٹھنڈک تھی۔ ہلکے ہلکے جھونکے چل رہے تھے۔ ٹوٹے پانی جھللا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں نیند سے بند ہو رہی تھیں مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ نیند کا غلبہ بہت بڑھا تو وہ کھڑا ہو گیا۔ حکیم نے اسے حیرت سے دیکھا۔

”کہاں چلے؟“

”میں نے توجہ اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔“

حکیم نے اسے جانے نہیں دیا۔ ”اس وقت دوپہر میں جا کر کیا کرو گے؟ میرا کہا مانو تو ٹھیر جاؤ۔ دن ڈھلے دونوں اکٹھے چلیں گے۔ میں کمال گڑھ جاؤں گا۔ تم اپنے پنڈ چلے جانا۔“ رحیم داد ننھے میں پڑ گیا۔ وہ ٹھہرا بھی نہیں چاہتا تھا اور اسے یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ وہ خاموش مڑ رہا۔ حکیم مسکرا کر بولا۔

”دھوپ ڈھلنے تک یہاں ٹھیر جاؤ۔ بوٹیاں چننے میں میری مدد کرو۔ تمہیں اور کوئی کام بھی نہیں ہے۔ گھر ہی تو جانا ہے۔ چلے جانا۔“

”میں نوں توجہ یہ بھی پتہ نہیں کون سی بوٹی توڑنی ہے؟“

حکیم بے تکلفی سے ہنسا۔ ”تم فکر نہ کرو۔ آسانی سے شناخت کر لو گے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ دونوں جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈھلان کے پاس پہنچے۔ حکیم نے ایک پودے کی

چہرے پر مسرت پھیل گئی۔

”لو جی! اپنا کام تو بن گیا۔“ اس نے پودوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ سب سنگھنی کے بوئے ہیں۔ اب تو تم بھی انھیں پہچان سکتے ہو۔ اچھا، اب ان کی پتیاں توڑ توڑ کر انھی کرو۔“ اس نے اپنا تھیلا رحیم داد کو تھما دیا۔

رحیم داد خاموشی سے پتیاں توڑ توڑ کر تھیلے میں ڈالتا رہا۔ حکیم کچھ دور کھڑا تھا۔ رحیم داد کو جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کی آڑ سے اس کی پیٹھ کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ جھکا ہوا یا تو پتیاں توڑ رہا تھا یا کسی پودے کا معائنہ کر رہا تھا۔

رحیم داد پتیاں توڑ کر تھیلے میں ڈالتا اور تجسّس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بھی جاتا۔ اسے ابھی تک لالی کا انتظار تھا۔ ساتھ ہی یہ دھڑکا بھی تھا کہ اگر لالی گرفتار ہو گیا تو پولیس اب سرگرمی سے اس کی تلاش میں ہوگی۔



سائے سینتے جا رہے تھے۔ سک نالے کی ریت کے ذرے دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد سائے میں کھڑا تھا۔ مگر موٹی چادر نے اس کا جسم پسینے سے تر کر دیا تھا۔ حکیم کے سامنے وہ چادر اتارنا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے سنگھنی کے تمام پودوں کی پتیاں تھیلے میں بھر لیں۔ مگر تھیلا ابھی خالی تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں دبائے حکیم کی جانب چلا۔ حکیم پتیاں توڑ توڑ کر اپنی ٹوپی میں بھر رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر حکیم نے گردن موڑی اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد کیکر کے ایک گھنے درخت کے نیچے سے گزرتا ہوا آگے بڑھا۔ یکایک وہ ٹھوکر کھا کے لڑکھڑایا۔ اس کی چادر کیکر کی خاردار شاخوں میں الجھ گئی۔ رحیم داد دھڑام سے زمین پر گر ا۔ سب کچھ آنا فنا ہوا۔ رحیم داد جیل کی وردی میں زمین پر پڑا تھا اور اس کی چادر ایک شاخ سے الجھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ حکیم لپک کے اس کے نزدیک پہنچا۔ رحیم داد گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔

حکیم نذر محمد چشتی نے ہمدردی سے کہا۔ ”چوٹ تو نہیں آئی؟“ اس نے رحیم داد کے جسم پر جیل کی وردی اور اس پر پڑا ہوا دھندلا نمبر مشتبہ نظروں سے دیکھا اور حیرت زدہ ہو کر ہکھلانے لگا۔

”تم.... تم؟“

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے چادر شاخ سے اتار کر اوڑھ لی مگر حکیم سے نظریں نہیں ملائیں۔ اس کا تھیلا گرتے وقت ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔ تھیلے سے پتیاں بھی نکل کر بکھر گئیں

میں۔

رحیم داد اکڑوں بیٹھ کر خاموشی سے پتیاں اٹھا اٹھا کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔ حکیم اس کے قریب ہی مڑا تھا۔ رحیم داد نے ساری پتیاں تھیلے میں بھر دیں اور کھڑا ہو گیا۔

چند لمبے دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے آنے سامنے کھڑے رہے، پھر حکیم کی آواز مری۔ ”کیا تم جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہو؟“

رحیم داد گردن جھکا کر آہستہ سے بولا۔ ”ہاں جی!“

”تمہارا روٹیہ اور حلیہ دیکھ کر مجھے پہلے ہی شک گزرا تھا۔“ حکیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”مجھے یہ پتا ہے کہ کل رات نمر کے کنارے تپوں پر پولیس کے ساتھ تمہاری گولی چلی تھی۔ تم فرار نے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر تمہارا ساتھی پکڑا گیا۔“

رحیم داد نے گھبرا کر پوچھا۔ ”تین نوں کیسے پتہ چلا وہ پکڑا گیا؟“

”سویرے جب میں ادھر آ رہا تھا تو شہرے بس میں تین کا نشیبل بھی سوار ہوئے۔ وہ قادر آباد آئے۔ ان میں سے ایک کا نشیبل میرا جاننے والا نکل آیا۔ اس کی گھروالی میرے زیر علاج رہا ہے۔ بے چاری کو عرق النساء کی بیماری ہے۔ اسی کا نشیبل سے دوران گفتگو معلوم ہوا کہ تمہارا قہی پکڑا گیا اور اب پولیس کی حراست میں ہے۔“ رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ حکیم دیر خاموش رہ کر نرم لہجے میں بولا۔

”تم کوئی بھی ہو، مجھے تم سے کیا لینا۔ پر میں اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ پولیس تمہاری تلاش ہے۔“

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ ”فیرتے میں نوں یہاں سے بھجھتی نال ٹر جانا چاہئے۔“ اس نے خوف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

”تم اس وقت کہاں جاؤ گے؟“ حکیم چشتی نے دریافت کیا۔

”مجھے خود پتہ نہیں جی کہاں جانا ہے۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو یہ ہی نہیں تھا۔ لالی جہاں لے جاتا، میں وہیں چلا جاتا۔ وہی مجھے جیل سے نکال کر لایا تھا۔ آگے کا کی کو پتہ تھا۔“

”خطرہ تو تمہارے لیے یہاں بھی ہے۔ مگر اس وقت کہیں جانا اور بھی زیادہ خطرناک ہو گا۔“ نے اسے مشورہ دیا۔ ”میری مانو تو سورج ڈوبنے تک یہیں رہو۔ شام ہو جائے تو اندھیرے میں تمہارا جانا آگے تمہاری مرضی۔“

رحیم داد نے حکیم کا مشورہ قبول کر لیا اور اس کے ساتھ سنگھنی کے پودوں سے پتیاں توڑتوڑ کر تھیلے میں ڈالنے لگا۔

دونوں جھاڑیوں کے درمیان ادھر ادھر گھومتے رہے۔ رحیم داد ابھی تک اپنا جسم چادر سے چھپائے ہوئے تھا۔

حکیم نہایت انہماک سے پتیاں توڑتوڑ کر اپنی ٹوپی میں ڈالتا جا رہا تھا۔ ٹوپی بھر جاتی تو پتیاں رحیم داد کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھیلے میں ڈال دیتا۔ رحیم داد نے پتیاں توڑتے توڑتے حکیم سے دریافت کیا۔

”حکیم جی! تیس خالی پتیاں کیوں اکٹھی کر رہے ہو؟“

حکیم چشتی اس کی بات سن کر مسکرایا۔ ”جز اور ڈنٹھلوں کا میرے پاس پہلے ہی وافر ذخیرہ ہے۔ آج کل مجھے صرف پتیوں کی ضرورت ہے۔ میں ان دنوں ایک نئی دوا تیار کر رہا ہوں۔ اس کی تیاری پر بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔“ اس نے ٹوپی میں بھری ہوئی پتیاں تھیلے میں ڈال دیں۔ ”انھیں بھیگنے کے لیے رات بھر اس میں رکھوں گا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے اٹھا کر کورے گھرے میں بھر دوں گا۔ پھر گھرے پر ڈھکنا رکھ کر گیلی مٹی کے لپ سے اس کا منہ اچھی طرح بند کر دوں گا۔ اس کے بعد زمین میں کمر تک گرا گڑھا کھودوں گا، اس میں گھڑا رکھوں گا۔ اسے اہلوں سے بھر کر مٹی سے ہموار کروں گا۔ جب برسات گزر جائے گی تو زمین کھود کر گھڑا باہر نکال لوں گا۔ اس وقت تک گھرے میں خوب خیر اٹھ آئے گا۔ پتیاں گل سڑ کر گاڑھی گاڑھی لگدی سی بن جائیں گی۔ اس لگدی میں حسب مقدار عود صلیب، زراوند طویل، عاقر قرحا، زیرہ سیاہ، خوتجان، رب السوس اور اسطوخودوس شامل کروں گا۔ پھر اسے کھل میں پیس کر مٹر کے دانے برابر گولیاں بنالوں گا۔ یہ گولیاں سائے میں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد سمجھو، دوا تیار ہوگئی۔“

رحیم داد حیرت سے حکیم کی باتیں سنتا رہا۔ ”دوائی کی تیاری میں تو جی بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔“

”محنت تو واقعی بہت کرنی پڑتی ہے۔“ حکیم نے گردن اٹھائی اور کھل کر مسکرایا۔ ”مگر یہ ایسے مرض کی دوا ہے جسے لاعلاج کہا جاتا ہے۔ یہ مرگی کا مرض ہے۔ اسے طب یونانی میں ام الصیان اور عربی میں صرع کہا جاتا ہے۔ تم نے مرگی کے مریض تو دیکھے ہوں گے؟“

”دیکھے ہیں جی، بالکل دیکھے ہیں۔ میرے پڑوسی کرامت کو یہی روگ ہے۔ بہت علاج کئے پر اب تک اس کی بیماری نہیں گئی۔“

”اس مرض کا سبب وہ سہہ ہوتا ہے جو دماغ کے بعض بطون اور اعصاب کے بعض حصوں میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ وہی اعصاب ہوتے ہیں جو اعضا کو حرکت دیتے ہیں اور قوت حس ان کی طرف پہنچاتے ہیں۔ جب تک اس سہے کو رفع نہ کیا جائے مرض ختم نہیں ہوتا۔“ حکیم چشتی نہایت بلیغ انداز میں مرگی کے مرض کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حکیم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”تم اپنے پڑوسی کو میرے پاس لانا۔ میری گولیوں کے استعمال کے بعد اسے یہ بیماری کبھی نہیں ہوگی۔ بالکل چنگا ہو جائے گا۔ کہتے ہیں، مرگی لاعلاج مرض ہے مگر میں نے اس کا علاج دریافت کر لیا ہے۔“ وہ ہاتھ اٹھا کر جوش و خروش سے بولا۔ ”کتنے ہی مریضوں کو اس دوا سے بھلا چنگا کر چکا ہوں۔ یہ تیر ہدف علاج ہے۔ نہایت مجرب اور آزمودہ ہے۔ میرا دعویٰ ہے۔“ حکیم کی زبان اچانک لٹکھڑانے لگی۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور خاموش ہو گیا۔ آنکھوں کی پتلیاں چڑھ گئیں۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ لٹکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ حکیم پر مرگی کا دورہ پڑا تھا۔

وہ بے ہوش تھا اور رحیم داد اسے حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے جھک کر حکیم کو آہستہ آہستہ جھنجھوڑا۔ مگر حکیم بے سدھ پڑا رہا۔ اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی اور حلق سے ہلکے، ہلکے خراٹوں کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ رحیم داد حیران و پریشان کھڑا اسے نکتا رہا۔



ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ دھوپ ریت کے ذروں پر جھللا رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں اچانک تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے چوکس نظروں سے ادھر ادھر دیکھا مگر دور دور تک نہ آدم تھا، نہ آدم زاد۔

رحیم داد نے جھٹ چادر ایک طرف پھینکی۔ جلدی جلدی جیل کی وردی اتاری اور حکیم کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے حکیم کی شلوار اتاری اور اسے پن کر قیص بھی اتارنے لگا۔ اس نے حکیم کی قیص بھی پن لی۔

حکیم زمین پر نگاہ ڈھنگا پڑا تھا۔ اس کے منہ سے سفید سفید جھاگ نکل کر ہونٹوں کے گوشوں پر پھیل گیا تھا۔ حکیم مردے کے مانند بے جان نظر آ رہا تھا۔

درخت سے چند قدم دور ایک اونچے ٹیلے کی چوٹی تھی اور اس کے نشیب میں جنگلی جھاڑیوں اور خود رد پودوں کا بہت گھنا جھنڈ تھا۔

رحیم داد نے سوچا، ہاتھ میں دیا ہوا تھیلا جھاڑیوں کے پیچھے چھپا دے۔ وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچا اور خود رد پودے روندتا ہوا جھنڈ کے اندر چلا گیا۔

جھاڑیوں کے پیچھے اسے غار نظر آیا۔ غار دیکھ کر وہ ٹھنک گیا۔ اس نے گردن جھکا کے غار میں جھانکا۔ غار بالکل خالی تھا۔ اور اتنا گہرا اور کشادہ تھا کہ وہ اس میں اطمینان سے روپوش ہو سکتا تھا۔ گردہ نمربنا نہیں چاہتا تھا، جلد سے جلد کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس نے تھیلا غار کے ایک گوشے میں رکھ دیا۔

جھاڑیوں سے باہر نکلتے ہوئے اس نے سک نالے کی جانب دیکھا۔ عینک کے مونے مونے ٹیٹوں سے صاف نظر نہیں آیا۔ اس نے عینک اتار کر قیص کی جب میں رکھ لی۔ اب اس کے سامنے نشیب میں سک نالا تھا جس کی ریت کے ذرے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ بامیں ہاتھ پر ٹوہتا تھا۔ اس کا پانی بھی جھللا رہا تھا۔ ٹوہیے کے پار ایک جھاڑی کے قریب حکیم چشتی کی لاش پڑی تھی۔

رحیم داد لگ بھگ نصف فرلانگ کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ مگر ٹیلے کی بلندی سے لاش صاف نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد سہمی ہوئی نگاہوں سے لاش تکنے لگا۔ پھر اس کی نظر نشیب سے بلندی کی جانب گئی۔ وہاں جھل تھا اور اسی جھل سے گزر کر وہ سک نالے میں اترا تھا۔ اس نے دیکھا کہ جھل کے گھنے درختوں سے نکل کر ایک شخص باہر آ رہا ہے۔

رحیم داد گہرا کے جہاں تھا وہیں دبک گیا۔ مگر چونکہ نظروں سے اسے دیکھتا بھی رہا۔ وہ وضع قطع سے لکڑی کھدائی کرنے والا مزدور لگتا تھا۔ مزدور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا ڈھلان سے نیچے اترا اور ٹوہیے کی جانب نظریں اٹھائے آگے بڑھنے لگا۔ رحیم داد جھاڑیوں کی آڑ سے بغور اسے دیکھتا رہا۔

چلتے چلتے مزدور نے گردن ذرا جھکا کر حکیم کی لاش کی طرف دیکھا اور جھجک کر کھڑا ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد لاش دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ لاش کے قریب گیا۔ جھک کر اسے دیکھا، لیکن فوراً سر اسید ہو کر پیچھے ہٹا، پلٹا اور تیزی سے چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ بلندی سے اس نے ایک بار پھر لاش دیکھی اور ہلکتا ہوا فریاد کے درختوں کے نیچے چلا گیا۔ ذرا دیر میں وہ رحیم داد کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد نے حکیم کے کپڑے پہننے کے بعد چاہا کہ وہاں سے بھاگ جائے۔ وہ چند قدم چلا پھر ٹھہر گیا۔ اس نے حکیم کے پیروں سے جوتے نکالے اور انھیں پہننے لگا۔ جوتے ذرا تنگ تھے، مگر اس نے کسی نہ کسی طرح پن ہی لیے۔ حکیم ابھی تک بے حس و حرکت پڑا تھا۔ رحیم داد قریب کمرہ تکیھی نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

اس نے جیل کی وردی حکیم کو پہنا دی۔ حکیم نذر محمد چشتی کی ٹوپی اٹھائی، آنکھوں سے عینک اتاری، ایک بار پھر چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اس ٹیلے پر چڑھ گیا جس کے نیچے حکیم بے ہوش پڑا تھا۔

ٹیلے پر پہنچ کر اس نے نیچے دیکھا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ٹیلے کے نیچے حکیم چشتی نہیں، جیل کی وردی میں ملبوس وہ خود بے سدھ پڑا ہے۔ وہ اسے گھورتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر وحشت اور سختی چھا گئی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی۔

حکیم کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ رحیم داد نے جھٹ قریب پڑا ہوا بھاری پتھر اٹھایا، سر سے بلند کیا اور ناک کر حکیم کے چہرے کی جانب پھینکا۔ پتھر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ حکیم کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ بھاری پتھر سے کپکنے کے بعد بری طرح مسخ ہو گیا۔ نہ آنکھیں نظر آ رہی تھیں، نہ ناک اور کان۔ اس کا پورا چہرہ گوشت کا کٹنا پھٹنا لوتھرا بن گیا تھا۔ حکیم کا جسم ذرا دیر تک پھڑکتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا۔

رحیم داد چٹان سے اتر کے حکیم کی لاش کے قریب گیا۔ اس نے پتھر اٹھا کر حکیم کا چہرہ اور منہ کر دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی پتھر سے کچل ڈالے۔ وہ کوئی ایسا نشان چھوڑنا نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی شناخت ہو سکے۔

لاش پوری طرح مسخ کرنے کے بعد وہ اس جھاڑی کے نیچے گیا جہاں حکیم کا ناشتہ دان اور تھرماس رکھا تھا۔ اس نے ناشتہ دان اور تھرماس پتیوں سے بھرے ہوئے تھیلے میں ٹھونے۔ حکیم کی ٹوپی اوڑھی، عینک لگائی۔ اپنی چادر لاش کے قریب ڈالی۔ ٹوہیے پر پہنچا۔ خون سے بھرے ہوئے ہاتھ پانی سے دھوئے۔

ہاتھ دھو کے وہ ٹوہیے کے کنارے کنارے کچھ دور چلتا رہا، پھر جھاڑیوں میں گھس گیا اور جھاڑیوں سے گزر کر ایک ٹیلے پر چڑھنے لگا۔

بلندی پر پہنچ کے اس نے دیکھا دور دور تک اونچے نیچے ٹیلے اور مٹے ہیں۔ آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ ہر طرف ویرانی تھی۔ وہ آگے بڑھا اور فراش کے ایک گھنے درخت کے سائے میں ٹھہر گیا۔

رحیم داد نے چاہا کہ جھاڑیوں سے نکل کر دور چلا جائے مگر وہ سہا ہوا بیٹھا رہا۔ اس کے آس پاس چھیل نیلے دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ٹیلوں پر چلنا خطرے کو دعوت دیتا تھا۔ خوف اور پریشانی سے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا خاموشی سے غار میں داخل ہو گیا۔ اس نے تیلے سے تھرماس نکالا۔ ڈھکنا کھول کر دیکھا کہ تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود ہے۔ اس نے تھرماس سے لگا کر گھونٹ بھر پانی پیا۔ پانی پینے سے کسی قدر سکون ملا۔ اس نے غار سے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

غار کی زمین خشک اور صاف ستھری تھی۔ رحیم داد سورج خوب ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ غار میں نرم نرم جھونکے آرہے تھے۔ رحیم داد نے تھیلے سے ناشتے دان نکال کر تھرماس کے ساتھ ایک کونے میں رکھ دیا اور پتلیوں سے بھرا ہوا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر غار اتنا طویل نہیں تھا کہ وہ پوری طرح ٹانگیں پھیلا سکے۔ اس نے اپنا جسم کسی قدر سیڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن نیند نہیں آئی اسے بار بار حکیم کا خون میں لتھڑا ہوا خوف ناک چہرہ نظر آتا۔ گھبرا کر وہ آنکھیں کھول دیتا۔

وقت گزرتا رہا۔ رحیم داد بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسی عالم میں اسے نشیب میں ملی جل انسانی آوازیں سنائی دیں۔

وہ پریشان ہو کر اٹھا اور غار سے نکل کر دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ اس نے جھاڑیوں کی آڑ سے دیکھا کہ حکیم نذر محمد چشتی کی لاش کے قریب کچھ لوگ کھڑے ہیں۔ وہ کنکر کی کھدائی کرنے والے مزدور تھے۔ ان میں وہ مزدور بھی شامل تھا جس نے لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ وہ گرد و نواں کے ٹیلے اور ٹیٹے بھی محتسب انداز سے دیکھ رہے تھے۔ چند مزدور ٹوہٹے پر پہنچے۔ انھوں نے ٹوہٹے کے پانی سے منہ ہاتھ بھی دھویا۔ وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور پریشان اور سسے ہوئے نظر آتے تھے۔

مزدور لگ بھگ نصف گھنٹے تک لاش کے نزدیک کھڑے رہے یا اس کے آس پاس منڈلاتے رہے۔ آخر بلندی پر چڑھ کر جھل کے گھٹے درختوں میں داخل ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ویرانی چھا گئی۔

حکیم کی لاش جھاڑی کے پاس پڑی تھی۔ سورج اب ایسے رخ پر آگیا تھا کہ دھوپ پوری طرح لاش پر پڑ رہی تھی۔ رحیم داد دوبارہ غار میں چلا گیا۔ مگر اس دفعہ لیٹا نہیں، سر جھکائے خاموش بیٹھا

رہا۔ اب دن ڈھلنے لگا تھا، سائے طویل ہو گئے تھے۔

رحیم داد بے چین ہو کر پھر غار سے نکلا۔ اس نے جھاڑیوں کی الجھی ہوئی شاخوں کے درمیان حکیم کی لاش دیکھی۔

دو گدھ لاش کے کپلے ہوئے چہرے سے گوشت نوج نوج کر کھا رہے تھے۔ گدھوں اور چیلوں کا ایک غول اوپر فضا میں منڈلا رہا تھا۔ دھوپ ٹیالی پڑ گئی تھی۔ سورج مغرب میں فراش کے اونچے اونچے درختوں کی چوٹیوں پر پہنچ چکا تھا۔ سک نالے پر گھرا سناٹا چھایا تھا۔ گدھوں کے ساتھ اب چیل بھی لاش سے گوشت نوج نوج کر کھا رہی تھیں۔

رحیم داد جھاڑیوں کی اوٹ سے حکیم چشتی کے مردہ جسم کی درگت بننے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دیکھا کہ گدھ بھرا مار کر اڑ گئے۔ چیلیں بھی اڑ کر ادھر ادھر فضا میں بکھر گئیں۔ پولیس کا ایک انسپٹر چار کانسیلوں کے ہم راہ ڈھلان سے نیچے اتر رہا تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ مردہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

پولیس والے نشیب میں اترنے کے بعد لاش کی جانب بڑھے اور جھک جھک کر لاش کا معائنہ کرنے لگے۔ گدھوں اور چیلوں کا غول ابھی تک فضا میں منڈلا رہا تھا۔ انسپٹر نے لاش کے بعد خون سے بھرے ہوئے پتھر کا بھی معائنہ کیا جس سے رحیم داد نے حکیم کا چہرہ اور ہاتھ کچل کر مسخ کر دیئے تھے۔

انسپٹر نے رحیم داد کی چادر بھی دیکھی۔ چادر لاش کے قریب ہی پڑی تھی۔ انسپٹر لاش کے آس پاس گھومتا رہا۔ وہ قریب کی جھاڑیوں میں بھی گیا۔ چڑھ کر ٹیلے پر پہنچا۔ بلندی سے جھک جھک کر لاش دیکھتا رہا۔ نیچے اترا اور لاش کے نزدیک کھڑے ہو کر قدموں کے نشانات دیکھنے لگا۔

وہ قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوہٹے کی جانب بڑھا اور کنارے پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اس کے ہم راہ ایک کانسیبل بھی تھا۔ انسپٹر ہاتھ اٹھا کر کانسیبل کو قدموں کے نشانات دکھا رہا تھا۔

جنرل میں جرائم پیشہ قیدیوں کے ساتھ رہنے کے باعث رحیم داد جرائم کے بارے میں بہت سے گراں دہانے جان گیا تھا۔ اس نے حکیم چشتی کو قتل کرتے ہوئے اپنے طور پر پوری کوشش کی تھی کہ پولیس کو مغلے میں ڈال دے۔ وہ اپنی کامیابی پر مطمئن تھا۔ مگر جب انسپٹر قدموں کے نشانات دیکھتا ہوا ٹوہٹے تک پہنچ گیا تو رحیم داد کو اپنے اناڑی پن کا احساس ہوا۔ لاش کے قریب سے نزار ہوتے وقت اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ ریت پر اس کے قدموں کے نشان صاف نظر آرہے ہیں۔

لیکن یہ سوچ کر اسے کسی قدر ڈھارس ہوئی کہ کنکر کھودنے والے مزدوروں کے قدموں کے نشانات بھی اس کے قدموں کے نشانات کے ساتھ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ چند مزدور منہ ہاتھ دھوئے نوٹے پر بھی پہنچے تھے۔

رحیم داد نے غور کیا کہ قدموں کے طے جلے نشانات نے انیسٹر کو الجھن میں ڈال دیا۔ انیسٹر ٹوہیے کے کنارے کھڑا تھا اور مڑمڑ کر نشانات کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کچھ دیر تک متحسّس نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا پھر ٹوہیے کے کنارے کھڑا چلتا جھاڑیوں میں داخل ہوا۔ جھاڑیوں سے گزر کر وہ نیلوں پر پہنچنے کے لیے چڑھائی کی جانب بڑھا۔ کانسیل اس کے ساتھ تھا۔

رحیم داد جھاڑیوں کی شاخوں کے پیچھے سے دونوں کو چوکتا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مگر جب اس نے انھیں اوپر آتے دیکھا تو سخت پریشان ہوا۔ وہ جنگلی پودوں کے درمیان سے کھسکتا ہوا غار میں داخل ہو گیا۔ غار کے ایک گوشے میں جا کے وہ دم بخود بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد سخت اور چٹیل زمین پر بھاری بھاری یونوں کی آواز ابھری، کھٹ کھٹ کھٹ۔ آواز قریب آتی گئی۔ رحیم داد کی دھڑکن تیز ہوتی جا رہی تھی۔ خوف اور ڈر سے اس کا چہرہ پسینے سے بھیگ گیا۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے جھاڑیوں کی جانب نمٹتی باندھے دیکھتا رہا۔

قدموں کی آہٹ عین غار کے سامنے سنائی دی۔ رحیم داد کو الجھی ہوئی شاخوں کے پیچھے انیسٹر اور کانسیل نظر آئے مگر وہ ان کا صرف نچلا دھڑ دیکھ سکا۔

کانسیل کہہ رہا تھا۔ ”لاش تو جی میل کی وردی سے رحیم داد ہی کی لگتی ہے۔“
”لیکن اسے اتنی بے دردی سے کیوں قتل کیا گیا؟ لاش ایسی مسخ ہو گئی ہے کہ شناخت کرنا مشکل ہو گیا۔“

”میں تو یہ کہتا ہوں جی....“

رحیم داد کانسیل کی پوری بات نہیں سن سکا۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھ گئے۔ ان کے قدموں کی آہٹیں دھیمی پڑ گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ مگر وہ ہنوز خوف زدہ تھا۔ سما ہوا چپ چاپ دونوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پانچ منٹ، دس منٹ، پندرہ منٹ، آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ پتھر ملی زمین پر ان کے یونوں کی آواز نہ ابھری۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ غار میں اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سائے پھیل کر اور طویل ہو گئے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

رحیم داد دیر تک ڈرا سہما بیٹھا رہا۔ نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز آئی۔ وہ غار سے نکلا۔ جنگلی پودوں میں دبک کر گردن ذرا اونچی کی۔ ڈوبتے ہوئے دن کی ہلکی ہلکی روشنی میں حکیم کی لاش جھاڑی کے قریب پڑی تھی۔ مگر اب اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ کچھ فاصلے پر دو کانسیل بیٹھے لاش کی نگرانی کر رہے تھے۔ انیسٹر دوسرے کانسیلوں کے ہم راہ جائے واردات سے جا چکا تھا۔

رحیم داد بلندی سے لاش کی نگرانی کرنے والے کانسیلوں کو دیکھتا رہا۔ سورج جنگل کے گھنے درختوں کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ برساتی نالے کے نشیب میں شام آہستہ آہستہ اتر رہی تھی۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد نے غار میں واپس جا کے ناشتے دان کھولا۔ ناشتے دان میں ابھی ایک روٹی باقی تھی۔ توڑا سا سالن بھی تھا۔ اس نے آدھی روٹی سالن سے کھائی اور آدھی ناشتے دان میں رکھ کر ڈھلکا بند کر دیا۔

رحیم داد نے تھرا س سے پانی کے چند گھونٹ پئے اور غار سے باہر نکلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔



پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے چپ لیٹا تھا۔ کہیں قریب ہی گیدڑوں کی آوازیں گہرے سناٹے میں ابھریں۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ عین اسی وقت نشیب میں کانسیل زور سے کھکارے۔ گیدڑوں کا غول غار کے سامنے سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ رحیم داد کو وہ دھندلی پڑ چھائیوں کے مانند نظر آئے۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تو ایک بار پھر لیٹ گیا۔ رات گزرتی گئی، کالی سیاہ ہو گئی۔ سویرا ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو غار کے باہر دھوپ پھیلی تھی۔ وہ غار سے نکلا۔ پودوں کے درمیان دبک کر اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے نیچے دیکھا۔ چادر سے ڈھکی ہوئی حکیم نذر محمد چشتی کی لاش ابھی تک اپنی جگہ موجود تھی۔

لاش کی نگرانی پر تعینات رات والے دونوں کانسیل جا چکے تھے۔ مگر انیسٹر موجود تھا۔ اس کے ہم راہ پانچ کانسیل بھی تھے اور لالی بھی تھا۔

رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں لالی کو پہچان لیا۔ لالی کا لباس وہی تھا جو لائل پور سے پنن کر آیا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ وہ کانسیلوں کے درمیان خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی انسپکٹر مٹی کے تودے پر بیٹھا تھا۔ وہ گردن جھکائے مشیر نامہ لکھنے میں مصروف تھا۔ لکھتے لکھتے اس نے گردن اٹھائی اور ایک کانسیل کو اشارہ کیا۔ کانسیل نے بڑھ کر لاش پر پڑی ہوئی چادر ہٹا دی۔ انسپکٹر کی ہدایت پر لالی لاش کے قریب گیا۔ اس نے جھک کر لاش دیکھی، پھر انسپکٹر کی جانب ہر آہستہ آہستہ گردن ہٹائی۔ انسپکٹر اس سے سوالات کرتا رہا۔ لالی جوابات دیتا رہا۔ رحیم دادا اتنی دیر بیٹھا تھا کہ دونوں کی بات چیت بالکل نہیں سن سکا۔ مگر یہ اندازہ ہو گیا کہ لالی نے لاش اسی کی بتائی ہے۔

لاش پھر ڈھانک دی گئی۔ انسپکٹر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ابھی اس کی تفتیش ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے گھوم پھر کر لاش کے آس پاس کی جھاڑیوں کا معائنہ کیا اور نیلے کے نیچے کھڑے ہو کر دیر تک اوپر دیکھتا رہا۔

رحیم دادا نے اسی نیلے سے حکیم کے چرے پر بھاری پتھر بھینکا تھا۔

انسپکٹر دو کانسیلوں کے ہم راہ ٹوہے کی جانب بڑھا۔ اسے اپنی سمت آنا دیکھ کر رحیم دادا گھبرا گیا۔ اس نے جھٹ گردن نیچے کی اور دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا غار میں چلا گیا۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔

خوف اور دہشت سے رحیم دادا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کے کان بھاری بونوں کی آہٹوں پر لگے ہوئے تھے۔ خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ رحیم دادا پچھتاتے لگا کہ رات کے اندھیرے میں اس مقام سے دور کیوں نہ چلا گیا۔ تمازت بڑھتی جا رہی تھی مگر نیلوں کی پتھریلی زمین پر بونوں کی آہٹ نہیں ابھری۔

رحیم دادا سہما ہوا بیٹھا رہا۔ نشیب سے رک رک کر مدھم آوازیں ابھرتی رہیں۔ پھر یہ آوازیں بند ہو گئیں۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔ لیکن رحیم دادا غار سے باہر نہیں نکلا۔ خطرہ ابھی تک سر پر منڈلا رہا تھا۔

سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آگیا۔ دوپہر ہو گئی، گرمی بڑھ گئی۔ رحیم دادا غار سے باہر آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ٹوہے کے پار دیکھا۔ مگر اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ لاش بھی نہیں تھی۔ جس جگہ لاش پڑی تھی وہاں پتھروں سے حصار بنادیا گیا تھا۔

رحیم دادا نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر ہر طرف ویرانی تھی۔ اسے اطمینان ہوا۔ چرے سے خوف کے سائے مٹنے لگے۔ وہ دیر تک جنگلی پودوں کے درمیان بیٹھا رہا، پھر غار میں چلا گیا۔ اس

نے ناشتے دان میں پڑی ہوئی باسی روٹی نکالی۔ اسے کھا کے تھرماس سے پانی پیا۔ اب ناشتے دان بالکل خالی تھا لیکن تھرماس میں تھوڑا سا پانی موجود تھا۔ وہ پھر لیٹ گیا اور شام کے اندھیرے کا انتظار کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے تھرماس منہ سے لگایا اور اسے خالی کر دیا۔

لالی کا دیا ہوا چاقو اس کے پاس موجود تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور غار کے دہانے سے زراہٹ کے گڑھا کھودا۔ گڑھے میں تھرماس، ناشتے دان، مقتول کی ٹوپی اور سنگھنی کی پتیوں سے بھرا ہوا تھیلا رکھ دیا۔

اس نے گڑھا مٹی سے بھر دیا۔ جنگلی پودوں کی شاخیں اور پتھروں کے ٹکڑے اس طرح بکھیر دیے کہ گڑھا بالکل چھپ گیا۔

رحیم دادا غار میں نہیں گیا۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں بیٹھا رہا۔ وہ بار بار اس طرف دیکھتا تھا جہاں اب لاش کی جگہ صرف پتھروں کا حصار رہ گیا تھا۔

سورج کا دھکتا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں میں پرندے شور مچا رہے تھے۔ پھکی، پھکی دھوپ غائب ہوتی گئی۔ اندھیرا دم بدم پھیلتا گیا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ جنگل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ فراش کے اونچے، اونچے درخت دم بخود نظر آرہے تھے۔

رحیم دادا جھاڑیوں سے باہر نکلا۔ اس نے چوتنا نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی نہ تھا۔

وہ آگے بڑھا اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا نیلوں اور ٹپوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔ اس نے میل، میل، سو میل راستہ طے کیا۔ برساتی نالے کے نشیب میں اترا اور خشک ریت پر چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

برساتی نالا دائیں ہاتھ کو نیم دائرہ بناتا ہوا کچھ دور جا کر اونچے، اونچے نیلوں کی اوٹ میں او جھل ہو گیا تھا۔ وہ اسی طرف مڑ گیا۔ کچھ دور تک نیلوں کے درمیان چلتا رہا، اس نے سک نالا عبور کیا اور دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

سانے چڑھائی تھی۔ وہ ناہموار راستوں پر چلتا ہوا بلندی پر پہنچ گیا۔ دور دور تک اونچے نیچے نیلے اور تپے پھیلے ہوئے تھے۔

وہ رکائیں بلکہ قدموں کی رفتار کچھ اور تیز کر دی اور جھاڑیوں اور خود رو جنگلی پودوں کے

درمیان سے راستہ بتاتا ہوا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔

ٹیلوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اس نے ٹھٹک کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور نشیب میں اترنے لگا۔ سامنے کچا راستہ تھا۔ دن میں اس راستے پر آمد و رفت رہتی ہوگی۔ لیکن اس وقت سناں تھا۔ وہ اس راستے پر چلنے لگا۔

۱۳

شام کا دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر طرف دیرانی چھائی تھی۔ رحیم داد چلتے، چلتے ایک دم چونکا۔ اسے کچھ فاصلے پر دھندلی، دھندلی روشنی میں سڑک کنارے ایک سائیکل نظر آئی۔ قریب ہی ایک شخص زمین پر بیٹھا باپ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی تھی۔ آنکھیں اندر دبی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر رحیم داد ٹھٹکا۔ اس نے چاہا کہ آگے نکل جائے مگر یہ سوچ کر ٹھہر گیا کہ آگے جانے سے پہلے اس شخص سے راستے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کر لے۔ ڈرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ وہ شخص تنہا تھا اور لاغر بھی تھا۔

رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔ ”میں نے کہا جی! یہ رستہ کدھر جاتا ہے؟“
”یہ رستہ تو تخت ہزارہ جاتا ہے۔“ اس شخص نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تخت ہزارہ جاتا ہے تو سدھا چلا جا۔ تجھے وہیں جانا ہے نا؟“

وہ شخص دھیرے دھیرے ہانپتا رہا۔ رحیم داد نے ہمدردی سے دریافت کیا۔ ”تیس کچھ بیمار ہو؟“
”ہاں جی، بیمار ہی ہوں۔ بخار آتا ہے حکیم، ڈاکٹر ٹی۔ بی بتاتے ہیں۔“
”جب اتنا بیمار ہے تو سیکل نہیں چلائی چاہئے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہے۔“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”حکیم نے بھی سیکل چلانے سے منع کیا ہے پر ایک کام ایسا پڑ گیا کہ سیکل اٹھائی اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ قادر آباد گیا تھا۔ اب واپس جا رہا ہوں۔“

”کہاں جاتا ہے؟“

”چک ۵۸“ رستے ہی میں پڑتا ہے۔ ”اس کے لہجے میں عاجزی آگئی۔ ”تو ادھر ہی جا رہا ہے۔ سیکل چلانی جانتا ہو تو مجھے چک تک چھوڑ دے۔ تیری مہربانی ہوگی۔ میرا پنڈ بہت دور نہیں۔ تین ساڑھے تین میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔“

رحیم داد کو سائیکل چلانا آتی تھی۔ وہ جلد سے جلد زیادہ سے زیادہ دور نکل جانا بھی چاہتا تھا۔ اس نے سائیکل کا ہینڈل تھاما، اس شخص سے کہا۔ ”آگے بیٹھ جا۔ مجھے بھی اسی طرف جانا ہے۔ تجھے چک ۵۸ پہنچا دوں گا۔“

وہ اپنی گڈری درست کرتا ہوا اٹھا اور سائیکل پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد سائیکل پر سوار ہوا اور آہستہ آہستہ چلانے لگا۔ سائیکل چلاتے چلاتے رحیم داد نے پوچھا۔ ”گھر میں تیرا اور کوئی نہیں جو بیماری میں سیکل چلانی پڑی۔ کوئی تو ہو گا ہی؟“

”نہیں جی، میرا ادھر کوئی نہیں۔ میں بالکل اکیلا ہوں۔ میرا ناں چوہدری نور الہی ہے۔ میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔ پچھلے کئی مہینے سے ادھر چک ۵۸ میں ہوں۔“

”تیرے بال بچے تو ہوں گے؟ وہ کہاں ہیں؟“

”یہ نہ پوچھ۔“ چوہدری نور الہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پورا ٹبر تھا۔ گھر والی تھی۔ دو بیٹیاں تھیں، تین پتر تھے۔ وڈا پتر تو جوان تھا۔ ۷۱ سال کا رہا ہوگا۔ گورنمنٹ سٹی ہائی اسکول، پٹیالہ میں دسویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ اب وہ ۲۵ سال کا ہوتا۔“

”کدھر ہے وہ؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”وہ تریموں کے پتن پر میرے سامنے شہید ہوا۔“ نور الہی بجھے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ”پاکستان بنا تو میں نصیر پور میں تھا۔ نصیر پور، ضلع گورداس پور کا موضع ہے۔ میں پہلے تو ریاست پٹیالہ کے ضلع ٹارنول میں تھا۔ محلہ لوہاراں میں اپنا مکان بھی تھا۔ جب وہاں گزربوچی تو مہاراجہ کے حکم پر فوج اور پولیس کے سارے مسلمانوں سے ہتیار رکھوا لیے گئے۔ ان کو غیر مسلح کر کے بہار گڑھ فورٹ میں بھیج دیا گیا۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن میں وہاں ہفتہ بھر بھی نہ رہا۔ ایک رات جب بارش ہو رہی تھی میں فورٹ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ساتھ ریاست کے دو مسلمان فوجی بھی تھے۔“

”ان دونوں کا کیا ہوا؟“

”پتہ نہیں رات کے اندھیرے میں کدھر نکل گئے۔“ چوہدری نور الہی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”گھر والی اور بچوں کو میں نے پہلے ہی نصیر پور بھیج دیا تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح نصیر پور پہنچ گیا۔ دپے

میں رہنے والا نصیر پور ہی کا ہوں۔ وہاں اپنی زمیں داری تھی۔ شریکے اور کنبے دار تھے۔ پٹیلے میں زمین نوکری کرتا تھا۔ پولیس میں حوالدار تھا۔ اس وقت سب یہی کہتے تھے گورداس پور تو پاکستان کے حصے میں آئے گا۔ مسلمان تھے بھی وہاں زیادہ، پر نصیر پور کے آس پاس دس بارہاں میل تک سکھوں کی بستیاں تھیں۔ مسلمانوں کو ذرا بھی فکر نہ تھی۔ مسلمان افسر تو اتنے جوش میں تھے کہ انھوں نے سرکاری دفاتروں پر پاکستانی جھنڈے لہرا دیئے۔ فیرا ایسا ہوا جی نصیر پور والے عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ اتیسواں یا تیسواں روزہ تھا۔ ٹھیک سے کچھ یاد نہیں۔ بیماری سے اب تو دماغ بھی کام نہیں کرتا پراتنا ضرور یاد ہے۔ میں چھت پر مٹی کے پاس کھڑا چاند دیکھ کر دعا مانگ رہا تھا۔ ابھی میں نے دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ سکھوں کی بستیوں کی طرف سے بہت زور کے دھماکے اُبھرے۔“

وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو بتانے لگا۔ ”میں نے گھبرا کر دیکھا، سامنے رڑی میں ہنڈا کا ایک نوجوان تیزی سے سیکل دوڑاتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے کپڑوں پر خون ہی خون تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور زور زور سے چیخ رہا تھا۔ فساد ہو گیا، فساد ہو گیا۔ شور سن کر پنڈ کے لوگ اس کے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے۔ میں باہر جانے کے لیے بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں، مغرب کی طرف گرد کے بال اٹھ رہے ہیں۔ سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے ادھر ہی آرہے ہیں۔ سکھوں کی بستیوں سے بھی دھول اور سکھ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”میری گل سن رہا ہے؟“

رحیم داد نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر آہستہ سے کہا۔ ”سن رہا ہوں۔“ اسے نور الہی کی باتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ غٹگری میں مدت تک مہاجر کیمپ قائم رہ چکا تھا۔ ضلع بھر میں مہاجر جگہ جگہ بکھرے ہوئے تھے۔

رحیم داد ان لٹے پٹے مہاجرین سے مل چکا تھا۔ ان کی زبانی سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں کی ایسی ہی ہولناک داستانیں سن چکا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں سنبھل کر سائیکل چلاتا رہا۔

”ہاں تو جی، میں یہ کہہ رہا تھا۔“ نور الہی چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔ ”میں چھت سے اتر کر بھاگتا ہوا رڑی میں پہنچا۔ پنڈ کے سارے ہی لوگ بھاگ کر وہاں پہنچ رہے تھے۔ سب پریشان اور گھبرائے ہوئے تھے۔ پورے پنڈ میں کسی کے پاس ایک بھی بندوق نہیں تھی۔ صرف بے بھیاں

واہوں کی طرف منہ کیا، ڈپٹ کر انھیں لٹکارا۔ اوئے تیس، مسلمان ہو کر ڈرتے ہو۔ میں اللہ کا نام لے کر اکیلا ہی حملہ کروں گا۔ میرے رب نے چاہا تو سب حملہ آوروں کو بھگا دوں گا۔ سائیں جی نے دوبارہ نعرہ تکبیر بلند کیا اور تیزی سے حملہ آور سکھوں پر بھپٹے۔ سائیں جی کو اکیلے بڑھتے دیکھا تو پنڈ کے مسلمانوں کی غیرت بھی جاگ اٹھی۔ سوجوانوں کو پنڈ کی حفاظت پر لگا کر سب سائیں کے پیچھے پیچھے چلے، پر سائیں جی پہلے ہی حملہ آور سکھوں کے سروں پر پہنچ چکے تھے۔ گھوڑے زور زور سے ہنسانے لگے۔ گرد کے بادل اٹھنے لگے۔ نزدیک جا کر دیکھا تو حملہ آور بھاگ چکے تھے۔ تین چار سکھ خون میں لت پت زمین پر پڑے تھے۔ سائیں جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ذرا دیر بعد دور سے سائیں کی آواز آئی، بڑھے چلے آؤ۔ نکل کر جانے نہ دینا۔ پنڈ والے آگے بڑھے۔ پر حملہ آور اپنے گھوڑے بھگاتے دور جا چکے تھے۔ سائیں جی تلواریں سونٹے ان کے پیچھے دوڑتے چلے جا رہے تھے۔ سب نے پکار کر انھیں آگے جانے سے روکا۔ سائیں واپس ہوئے تو جگہ جگہ سے ان کا بدن زخمی تھا۔ زخموں سے لال لال خون بہہ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ اس پر بھی خون کے دھبے تھے۔ مگر زخمی ہونے پر بھی سائیں کا حوصلہ ویسا ہی تھا۔ وہ تو یہ چاہتے تھے، بیالے کی ملٹری پہنچنے سے پہلے پہلے آس پاس کی سکھ بستیوں پر چڑھائی کر دی جائے تاکہ انھیں دوبارہ حملے کی جرات نہ ہو، پر پنڈ کے دوسرے مسلمان تیار نہیں ہوئے۔

رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”سائیں بہت زور آور تھا۔ اکیلے نے اتنے بہت سے سکھوں کو بھگا دیا۔“

”ہاں جی، بہت زور آور تھا۔“ نور الہی نے اس کی تائید کی۔ ”حملہ آوروں کو بھگانے کے بعد آگے کا حفاظتی پروگرام طے کیا جا رہا تھا کہ دور سے تیز روشنیاں دکھائی دیں۔ یہ روشنیاں اس طرف سے نہیں ابھر رہی تھیں جدھر سکھ حملہ آور بھاگ کر گئے تھے۔ یہ ریاست بیالہ کی ملٹری تھی۔ سکھ فوجی جیپوں اور لاریوں پر مشین گنیں لگائے نصیر پور کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیسے ہی ریاستی ملٹری کے حملے کا پتہ چلا، سب تیزی سے پنڈ کی طرف لوٹے۔ پر مسلح ملٹری کا حملہ کون روک سکتا تھا۔ سمجھ نہیں آتی تھی کیا کریں۔ فوجی جیپوں اور لاریوں کی تیز روشنی دم بہ دم نزدیک آتی جا رہی تھی۔ ملٹری کا نام سن کر بوڑھے، بچے اور زنانیاں، سبھی گھروں سے نکل نکل کر باہر آگئے۔ بہت سروں پر منڈلا رہی تھی۔ سب گڑگڑا کر گڑا کر دعائیں مانگنے لگے۔“

”ریاستی ملٹری آئی بھی کہ نہیں؟“

”آئی تھی، بالکل آئی تھی۔ پر گیانی ہرنام سکھ نے سب کو بچالیا۔“

کھانڈیاں اور ڈانکیں تھیں۔ انھی کو لے کر سب نے پنڈ کی حفاظت کے لیے فٹ پاتھ تمام ناکوں پر مورچے سنبھال لیے۔ سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے چلے آ رہے تھے۔ وہ نزدیک آگئے پر انھوں نے حملہ نہیں کیا۔ وہ پنڈ سے کوئی فرلانگ بھر دور ٹھہر گئے۔ نہ وہ آگے بڑھے نہ نصیر پور والوں نے انھیں لٹکارا۔ حملہ آور تعداد میں پنج سو سے اوپر رہے ہوں گے۔ ادھر مسلمان تین سو سے بھی کم تھے۔ نہ بندوق تھی نہ کسی کے پاس پستول تھا۔ ”نور الہی نے گہری سانس بھری۔“ ”حملہ آور چپ کر کے کھڑے تھے۔ ان کے گھوڑے زور زور سے ہنسا رہے تھے۔ سکھ بستیوں سے ڈھول اور سکھ کی آوازیں مسلسل ابھر رہی تھیں۔“

”چوہدری، انھوں نے حملہ کیوں نہیں کیا؟“

”وہ جی ڈر گئے تھے۔ اس معاملے میں رہے کہ نصیر پور کے مسلمانوں کے پاس بہت اسلحہ ہے۔ ان کا خیال غلط بھی نہیں تھا۔ گورداس پور کے مسلمانوں کے لیے اسلحہ پہنچا بھی تھا۔ اس میں زیادہ تعداد میں رائفلیں اور بندوقیں تھیں۔ ضلع کا ایس پی مسلمان تھا۔ پر گورداس پور کے لیگیوں نے یہ اسلحہ مسلمانوں کو دینے کی بجائے ہندوؤں اور سکھوں کے ہاتھوں پہنچ دیا۔ مسلمانوں کے پاس ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں اتنا پیسہ ہی کہاں تھا۔ انھوں نے چندا کر کے جو اسلحہ حاصل کیا، وہ بھی ہندوؤں اور سکھوں کو منہ مانگے دام دے کر خریدا تھا۔ ذرا غور تو کر۔ کیا ظلم ہوا۔ انھی دنوں مجھے کسی نے بتایا بیالہ کے ایک سکھ زمین دار نے کسی مسلم لگی سے رائفل خریدی اور قیمت اپنے گھر چل کر دینے کے بہانے اسے ایک ویران جگہ لے گیا۔ وہاں اس نے کرپان نکالی اور پیسے دینے کی بجائے اس بے غیرت کے پیٹ میں پوری اتار دی۔ وہ وہیں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ ٹھیک ہی ہوا۔ ایسوں کو ایسی ہی سزا ملنی چاہئے۔“

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”چوہدری! توں تو سکھ حملہ آوروں کی گل کر رہا تھا؟“

”ہاں جی، یاد آگیا۔“ نور الہی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ”ہوا یہ کہ سکھ حملہ کرنے سے ڈر رہے تھے اور ادھر مسلمان انتظار میں تھے، سکھ حملہ کریں تو وہ بڑھ کر ان کا مقابلہ کریں۔ اس شش و پنج میں بہت دیر ہو گئی۔“

وہ کھانسنے لگا۔ ”فیرا ایک عجب گل ہوئی۔ نصیر پور میں ایک سائیں جی تھے۔ وہ پنڈ کے قبرستان کی دیکھ بھال کرتے تھے اور اس کے پاس ہی جھگی میں رہتے تھے۔ بالکل اکیلے تھے، نہ گھر والی نہ بچے۔ پنڈ والے جو دیتے، وہی کھاپی کر گزارا کرتے۔ ادھر تو سب ڈرے سہے ہوئے تھے۔ ادھر کیا دیکھتے ہیں، سائیں جی کندھے پر تلوار رکھے ایک طرف سے نکلے۔ بڑے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ پنڈ

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”ہر نام سنگھ بھی تو سکھ ہی تھا نا؟“

”ہاں جی۔ وہ سکھ ہی تھا۔“ نور الہی نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”وہ بوڑھا سکھ تھا اور نصیر پور ہی میں رہتا تھا۔ ملٹری کو اس نے نصیر پور کی طرف آتے دیکھا تو بھاگتا ہوا ہماری طرف آیا اور چیخ کر سب سے کہنے لگا۔ اوئے مسلو! فٹ پھپ جاؤ۔ فصلوں میں گھس کر بیٹھ جاؤ۔ ریاستی ملٹری حملہ کرنے آرہی ہے۔ جھیتی کرو جھیتی، میں منت کر کے سکھ فوجیوں کو واپس بھیج دوں گا۔ اس کے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ سب کھیتوں کی جانب دوڑے اور فصلوں میں گھس کر اندھیرے میں چھپ گئے۔ فوجی جھپیں اور لاریاں دھیرے دھیرے نزدیک آتی گئیں۔ ہڈ کے نزدیک پہنچ کر رک گئیں۔ گیانی ہر نام سنگھ اندھیرے سے نکل کر سکھ کمانڈر کی جانب بڑھا۔ ادھر پنڈ کے سارے مسلمان فصلوں میں دیکے سانس روکے بیٹھے تھے۔ ماؤں نے بچوں کے منہ ہاتھوں سے دبا رکھے تھے تاکہ کسی بچے کے رونے اور بولنے کی آواز نہ ابھرے۔ ادھر بوڑھا ہر نام سنگھ فریادیوں کی طرح گلے میں پگڑی ڈالے سکھ فوجی کمانڈر کے آگے ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہا تھا۔ سردار جی! پنڈ کے سارے ہی مسلے چلے گئے۔ یہاں سے جاتے ہوئے انھوں نے اپنے سامان کو بھی آگ لگا دی، کچھ بھی نہ چھوڑا۔ کمانڈر جب سے اترا اور آگے بڑھ کر غصے سے ہر نام سنگھ کے منہ پر دو تین چیر میں ماریں۔ چیخ کر بولا۔ بڑھے کھوسٹ، توں نے فوراً ہمیں اطلاع کیوں نہیں پہنچائی؟ ہم سارے مسلوں کو ختم کر دیتے، انھیں نکل کر نہ جانے دیتے۔ ہر نام سنگھ مار کھا کر بھی گڑگڑاتا رہا، معافی مانگتا رہا۔ اس کے سر کے کیس کھل کر بکھر گئے تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ کچھ دیر بعد سکھ فوجی گالاں نکالے ہوئے جدھر سے آئے تھے، اسی طرف لوٹ گئے۔“

”ہر نام سنگھ بہت نیک بندہ تھا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”بہت ہی نیک بندہ تھا جی۔ ملٹری کے جاتے ہی زور کی بارش شروع ہو گئی۔ کھیتوں سے باہر نکلتا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ سب بھوکے پیاسے بھی تھے۔ بوڑھا ہر نام سنگھ ایک ایک کھیت کے اندر جاتا۔ کھانے کو روٹی پہنچاتا۔ زنانیوں کو تسلی دیتا۔ بچوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتا۔ سب کے حوصلے بڑھاتا۔ کتا، فکر نہ کرو۔ حوصلے سے کام لو۔ واہ گرو کی کرپا سے سب ٹھیک ہی ہو گا۔ روٹی کھا کر وہ سائیں جی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دونوں نے آپس میں صلاح مشورہ کیا۔“ نور الہی نے کھکار کر گلا صاف کیا۔ ”خطرہ ابھی تک سروں پر منزل رہا تھا۔ ریاستی ملٹری کو آس پاس کی بستیوں کے سکھوں سے خبر ہو سکتی تھی کہ نصیر پور کے مسلمان ابھی تک پنڈ میں موجود ہیں۔ یہ خبر ملنے ہی سکھ فوراً لوٹے اور کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑے۔ یہ خطرہ محسوس کرتے ہوئے سائیں جی اور گیانی ہر نام سنگھ نے اسی

رات پنڈ سے نکل بھاگنے کی سکیم بنائی۔ جو جس حالت میں تھا، ویسے ہی چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سب قافلہ بنا کر نصیر پور سے نکلے۔ مڑ مڑ کر گھردوں کو دیکھتے اور پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔ سائیں جی اور ہر نام سنگھ تلواریں اٹھائے آگے، آگے چل رہے تھے۔ بارش اب رک گئی تھی۔ قافلہ رات کے اندھیرے میں آگے بڑھ رہا تھا۔ چلتے چلتے ہم تریموں کے پتوں پر پہنچ گئے۔ سامنے راوی بہ رہا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد شروع ہوتی تھی۔“

”چوہدری! تیری گھر والی اور بچے بھی ساتھ ہی تھے؟“

”تریموں کے پتوں تک تو ساتھ ہی تھے۔“ نور الہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہم نے صرف راوی پار کرنا تھا۔ پر راوی پار کرنا آسان نہیں تھا۔ پتوں پر صرف چند بیڑیاں اور کشتیاں تھیں۔ ملاح دریا کے اس پار لے جانے کے سو روپے فی سواری مانگتے تھے۔ ادھر مسلمانوں کا یہ حال تھا کہ بھی لٹے پٹے تھے۔ جیبوں میں چند روپے تھے یا تنباکو اور نسوار کی تھیلیاں تھیں۔ ملاح بھی مسلمان تھے۔ پر وہ تو زیادہ سے زیادہ کمائی پر لگے تھے۔ ایسے ظالم اور بے درد تھے، جب مسافر منہ بانگا کرایہ دینے پر جھگڑا مٹا کرتے تو وہ بیڑی بیچ دریا میں کھڑی کر دیتے۔ اوپر سے تیز بارشیں ہو رہی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ لہروں کے تیز بہاؤ میں ملاحوں کی ان بد معاشیوں سے تین بیڑیاں تو میرے سامنے ڈوبیں۔ کہتے ہیں ان میں ۱۹۲ مسافر تھے۔ صرف ۱۲ بچے۔ دوسرے سب دریا کے پیٹ میں چلے گئے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”ڈلہوڑی سے ملالے تک جتنے بھی مسلمان تھے، ان کے لیے پاکستان پہنچنے کا یہی رستہ تھا۔ ویسے گرداسپور کے کتنے ہی لٹے پٹے قافلے داؤد کے پتوں بھی پہنچے، پر وہاں امرتسر سے آنے والے زیادہ تھے۔ ملاح ادھر بھی اسی طرح تنگ کرتے تھے۔ راوی کے پار پہنچانے کے لیے اپنی مرضی کا کرایہ وصول کرتے تھے۔“ اس نے ندرے نال کیا۔ کھکار کر گلا صاف کیا۔

”تریموں کے پتوں کا ان دنوں حال یہ تھا کہ ندی کنارے ہزاروں مسلمان پڑے تھے۔ روز نئے قافلے پہنچتے تھے۔ میرے پاس اس وقت اچھی خاصی رقم تھی۔ میں ملاحوں کو کرایہ دے کر دریا کے برابر اپنے مبر کے ساتھ جاسکتا تھا۔ پر سب نے منع کیا اور ناراض ہوئے کہ تم اپنے فائدے کے لیے ”کسے غریب بندوں کا بیڑا غرق کر دیتا چاہتے ہو۔ ساتھ ہی یہ خبریں بھی سننے میں آرہی تھیں کہ حکومت پاکستان نے کشتیاں اور ملٹری کے سنیر بھیجے ہیں، جو مہاجرین کو مفت دریا پار پہنچا دیں گے۔“

”مڑک کے دونوں جانب رینج کی فصیلیں تھیں، جن میں ہوا کے جھونکوں سے رک رک کر

سرسراہٹیں ابھر رہی تھیں۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد چپ چاپ سائیکل چلاتا رہا۔ نورانی آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”روز کشتیوں اور سینہروں کا انتظار کیا جاتا۔ پر نہ کشتیاں اور بیڑیاں آئیں نہ سینہر۔ دوسری طرف تریموں کے چین پر لٹ پٹ کر آنے والے مسلمانوں کی تعداد ہر روز بڑھتی جا رہی تھی۔ چین پر دریا کے کنارے جہاں تک نظر جاتی، بندے ہی بندے نظر آتے۔ ان میں بوڑھے تھے، جوان تھے، زنانیاں تھیں اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ بارش ختم جاتی، نہ شروع ہو جاتی اور مسلسل ہوتی رہتی۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں تھی۔ سب کھلے آسمان کے نیچے بیٹھے بھیگتے رہے، کشتیوں، سینہروں کا انتظار کرتے رہے۔ ملاح پارلے جانے کا کرایہ کم کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہیں تھے۔ وہ تو دبا کے کما کر رہے تھے۔ تباہ حال مہاجرین کی بے بسی اور پریشانی سے خوب فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کئی بار مغربی پنجاب کی حکومت کے ہوائی جہاز بھی دریا کے اوپر اڑتے دکھائی دیے۔ کسی نے بتایا، اس میں وزیر سوار ہیں۔ چین پر پڑے ہوئے مہاجروں کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔ جب بھی جہاز نظر آتے ہر طرف یہ خبریں پھیل جاتیں سرکاری بیڑیاں اور کشتیاں آنے والی ہیں۔“

وہ کچھ دیر کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ آخر نورانی کی آواز ابھری۔ ”اس روز بارش تھی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور نیلا نظر آ رہا تھا۔ سورج ایسے چمک رہا تھا جیسے آگ برسا رہا ہو۔ بہت سخت گرمی تھی۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اچانک دور سے گھوڑوں کی ہنہانٹ سنائی پڑی۔ ذرا دیر بعد سکھوں کے غول کے غول گھوڑے دوڑاتے نظر آئے۔ دو ہزار سے زیادہ ہی تھے، کم نہیں۔ حملہ آوروں کو دیکھتے ہی جس کا جدمرہ اٹھا، بھاگا اور نزدیک کے کھیتوں میں گھس گیا۔ میں بھی بھاگ کر فصلوں میں چھپ گیا۔ ہر طرف سے چیخنے چلانے اور زنانیوں اور بچوں کے رونے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں کھیت میں دم سادھے بیٹھا رہا۔ سکھ حملہ آور خون میں ڈوبی ہوئی تلواریں اٹھائے، بندوقوں سے گولیاں چلاتے اپنے گھوڑوں سے کھیت روندتے پھر رہے تھے۔ جو نظر آتا، اسے قتل کر دیتے۔ پتہ نہیں، میں کیسے بچ گیا۔ وہیں مر جاتا تو ٹھیک تھا۔“

چوہدری نورانی کے لہجے میں درد کی چھین تھی۔ اس نے لمبی سانس لی۔ ”سورج ڈوبا تو میں کھیتوں سے باہر نکلا۔ اب حملہ آور جا چکے تھے۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آ رہی تھیں۔ زخمی خون میں ڈوبے ہوئے تڑپ رہے تھے، کراہ رہے تھے۔ زنانیوں اور بچوں کے رونے اور سکھیاں بھرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں لاشوں اور زخمیوں کے درمیان ادھر ادھر ہوا ہوا گلوں کی

طرح گھوم رہا تھا۔ اپنے بال بچوں کو تلاش کر رہا تھا۔ چین کے پاس سائیں جی اور گیانی ہرنام سنگھ زخموں سے چور پڑے تھے۔ دونوں مر چکے تھے۔ وہ آخر دم تک حملہ آوروں کے سامنے ڈٹے رہے۔ نزدیک ہی میرا وڈا پتر کرم الٹی پڑا تھا۔ وہ تب تک زندہ تھا اور بے چینی سے ادھر ادھر گردن بلاتا تھا۔ میں اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، کراہتے ہوئے بولا۔ وہ، وہ صابرہ کو لے گئے۔ وہ مجھے پکارتی رہی پر میں اسے بچا نہیں سکا۔ وہ اسے لے گئے۔ صابرہ میری ۱۱ سال کی جوان بیٹی تھی۔ سکھ حملہ آور اسے اٹھا کر لے گئے۔ کرم الٹی یہی بتانے کے لیے زندہ تھا۔ اس نے میرے ہاتھوں میں دم توڑ دیا۔“ نورانی گلوں گھر گیا۔

رحیم داد ہمدردی کا اظہار بھی نہ کر سکا۔ وہ پھولی ہوئی سانس سے پیڈلوں پر پیر مارتا سائیکل دوڑاتا رہا۔ نورانی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بتایا۔ ”شام ہو گئی تھی۔ میں کھیتوں کے اندر گھس گیا اور اندھیرے میں اونچی آواز سے گھر والی اور بچوں کو پکارنے لگا، پر گھر والی یا بچوں میں سے کسی کی آواز سنائی نہ دی۔ کچھ ہی دیر بعد فیر شور مچا، سکھ حملہ کرنے آ رہے ہیں۔ دور سے گھوڑوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ چین پر ایک بیڑی کھڑی تھی۔ ملاح دریا پار لے جانے کے اڑھائی سو روپے مانگتے تھے۔ میں نے ایک بار فیر چیخ چیخ کر گھر والی اور بچوں کے نام لے کر ہانک لگائی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ گھوڑوں کی ہنہانٹ اب صاف سنائی پڑ رہی تھیں۔ میں نے ملاح کے ہاتھ میں کرائے کے اڑھائی سو روپے رکھے اور بیڑی میں سوار ہو گیا۔ اس طرح میں سب کچھ لٹا کر پاکستان پہنچا۔“ نورانی چپ ہو گیا۔



سائیکل کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ کچھ دور آگے جا کر گاؤں کے گھروں میں جلنے والے چراغوں کی روشنیاں نظر آنے لگیں۔ روشنیاں دیکھ کر نورانی نے کہا۔

”لوئی، چک ۵۸ آگیا۔“

رحیم داد سائیکل چلاتا ہوا گاؤں میں داخل ہوا۔ نورانی راستہ بتاتا رہا۔ اس کا گھر گاؤں کے ٹہنڈے ہی میں تھا اور الگ تھلگ بھی تھا۔ گھر کے آس پاس نیم اور شیشم کے گھنے درخت تھے۔ گھر کے قریب پہنچ کر رحیم داد نے سائیکل ٹھہرائی۔ دونوں نیچے اترے۔ دروازے پر تالا تھا۔ نورانی نے تالا کھولا۔

”دونوں اندر داخل ہو گئے۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک کمرہ اور اس کے ساتھ کوٹھری تھی۔ کمرے

رحیم داد کا چہرہ قح ہو گیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا، مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔
 ”نہیں چوہدری ایسی کوئی گل نہیں۔“ وہ مڑا اور دیوار کے قریب رکھے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔
 نور الہی گلاس متہ سے لگا کر دھیرے دھیرے پانی پینے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار رحیم داد کو دیکھتا رہا۔ پانی پی کر اس نے گلاس فرش پر رکھ دیا۔ یکایک کھانسی کا ٹھکا لگا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سینہ
 تھام کر دیر تک کھاتا رہا۔ کھانتے کھانتے مڑھا ہوا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ لمبی لمبی سانس بھر رہا تھا
 اور غصا بے چین نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نور الہی کو قرار آ گیا تھا مگر اس نے رحیم
 داد سے بات نہیں کی۔ خاموش لیٹا رہا اور نظریں اٹھائے چھت نکلتا رہا۔ باہر اندھیرا بڑھتا جا رہا
 تھا۔ سکوت زیادہ دیر نہیں رہا۔ باہر دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی آنگن میں کسی کی چاپ
 سنائی دی۔

نور الہی نے کمر بٹ بدل کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ دھیرے سے بولا۔ ”جیناں روٹی لے کر آئی
 ہے۔“ اس نے کوٹھری کے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ”کوٹھری میں چلا جا۔“
 رحیم داد نے گھبرا کر اسے دیکھا، اٹھا اور کوٹھری میں داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ وہ
 خوف زدہ اور سہما سہما ہوا تھا۔ اسے جیناں کی آواز سنائی دی۔ وہ کمرے میں پہنچ کر نور الہی سے کہہ رہی
 تھی۔ ”چوہدری! آتوں نے بہت دیر کر دی۔ میں روٹی لے کر پہلے بھی آئی تھی۔“
 ”ہاں! ایسی میں کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔“
 ”کچھ پتہ چلا؟“ جیناں نے پوچھا۔ ”توں کا در آباد اپنی گھر والی اور بچوں کا کھوج لگانے ہی تو گیا تھا
 ناں؟“

”ہاں جیناں! انھی کو دیکھنے گیا تھا۔“ نور الہی کا لہجہ بجا بجا تھا۔ ”پر اس دفعہ بھی کوئی پتہ نہیں
 چلا۔ اطلاع صحیح نہیں تھی۔“

”تس نوں کس نے بتایا تھا وہ ادھر کا در آباد میں ہیں؟“
 ”کل دن ڈھسے میں نمبردار کی ماڑی پر گیا تھا۔ وہاں قادر آباد کا شیشن ماسٹر بھی موجود تھا۔ وہ بھی
 نماز ہے۔ اسی نے بتایا تھا، گورداس پور کے کچھ مہاجر خاندان ٹرین سے پہنچے ہیں۔ شیشن کے
 بکن درختوں کے نیچے انھوں نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ ان میں ایک لاوارث زنانی ہے۔ ساتھ
 مس سٹے بھی ہیں۔ شیشن ماسٹر نے کسی کا نام شام تو بتایا نہیں۔ میں نے سوچا کہیں وہ میرے ہی بال
 بچہ نہ ہوں۔“ نور الہی چند لمحے خاموش رہا۔ ”وہ نبی پور کے نکلے۔ میرا پند تو نصیر پور تھا۔“
 ”چوہدری! توں نے ان سے اپنی گھر والی اور بچوں کے لیے پوچھا تو ہوتا۔“

کے آگے برآمدہ تاجس پر پھوس کا چھپر تھا۔ البتہ آنگن کشادہ اور کھلا ہوا تھا۔ گھر پر دیرانی چھائی
 تھی۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ نور الہی نے سائیکل اپنے ہاتھ میں سنبھالی اور چھپر کے نیچے ایک طرف
 دیوار سے نکلا کھڑی کر دی۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھولا، اندر گیا۔ طاق سے ماچس اٹھائی اور
 لالٹین روشن کر دی۔

دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر نور الہی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”باہر کیوں کھڑا ہے۔ اندر
 آجا۔ ذرا دیر آرام کر لے فیر چلا جانا۔“
 رحیم داد چپ چاپ کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر ملگجا بستر تھا۔ بستر
 کے قریب کی دیوار میں طاق تھا۔ طاق میں دوا کی دو شیشیاں رکھی تھیں۔ کوٹھری کا دروازہ بھی
 کمرے ہی میں کھلتا تھا مگر اس وقت بند تھا۔

کوٹھری سے ذرا ہٹ کر روشن دان جیسی کھلی کھڑکی تھی جس پر حفاظت کے لیے درختوں کی
 سوکھی شاخیں کیلوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ کھڑکی کے باہر گہرا اندھیرا تھا۔ کھڑکی سے ہلکے ہلکے
 جھونکے آرہے تھے۔ پھر بھی کمرے میں گرمی تھی۔ نور الہی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”یہاں گرمی
 تو ہے پر میں بیٹیں سوتا ہوں۔ مجھے بخار رہتا ہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر ماتھے پر رکھا۔ ”اس وقت
 بھی بخار ہے۔ زیادہ ہی تیز لگتا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ ”نبی بی بھی بہت موزی روگ ہے۔
 ایک بار لگ جائے فیر نہیں جاتا۔“

رحیم داد کو شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے نور الہی سے پوچھا۔ ”چوہدری! گھر میں پانی
 تو ہوگا؟“

”ضرور ہوگا۔“ اس نے کونے میں رکھے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ رہا پانی، پوری
 طرح پیاس بجھالے۔ مجھے بھی پانی پلا دے۔“

رحیم داد گھڑے کے پاس گیا۔ قریب ہی المونیم کا گلاس رکھا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی سے
 بھرا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ گلاس میں دوبارہ پانی اٹھڑا اور اسے لے کر نور الہی کے قریب پہنچا۔
 نور الہی نے گلاس لیتے ہوئے رحیم داد کو مشتبہ نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے پوچھا۔ ”تیری قمیص
 کی آستین اور شلوار پر یہ خون کیسا لگا ہے؟“ وہ چند لمحے اسے غور سے دیکھتا رہا۔ ”مجھے قادر آباد میں
 پتہ چلا تھا کہ نہریاری دو آب کے بس پار ادھر ٹیوں پر ایک مفروز قیدی کو کسی نے قتل کر دیا۔“ اس
 کے لہجے میں ہلکی سی تھر تھر ہٹ تھی۔ ”تیرا تو اس واردات میں کوئی ہاتھ نہیں؟“ نور الہی کے
 چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

”پوچھا تھا۔ ان کے بارے میں انہیں کچھ خبر نہیں۔ آٹھ دس میل کا چکر ہو گیا۔ نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔“

”تو اس طرح کب تک انہیں ڈھونڈتا رہے گا؟ مجھے تو ایسا لگتا ہے، وہ تریموں کے پتوں پر مارے گئے۔“

”ایسا نہ کہہ جیناں!“ نور الہی نے تڑپ کر کہا۔ ”میں انہی سے ملنے کی امید پر زندہ ہوں۔ ہر جگہ انہی کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے، ایک نہ ایک روز وہ ضرور مل جائیں گے۔ یہ تو مجھے پتہ ہے گھر والی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچ گئی تھی۔ اسے لمور کے والٹن کیمپ میں میرے کئی ملنے والوں نے دیکھا بھی تھا۔ میں ان دنوں منگمری کے مہاجر کیمپ میں تھا۔“

”تو یہ گل پہلے بھی بتا چکا ہے۔ پر یہ تو سوچ، اٹھ برس ہو گئے۔ وہ تجھے اب تک کیوں نہیں ملے؟ ویسے جو تیری مرضی، پر بیماری میں سیکل نہ چلایا کر۔ تیری طبیعت اور گڑبڑ ہو جائے گی۔ دیکھ تو کتنا کمزور اور بیمار لگ رہا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہے۔ مجھے سیکل نہیں چلانی چاہئے۔ پر کیا کروں، جب سے شیش ماسٹرے بات ہوئی تھی، تب سے بے چین تھا۔ رات بھر نیند نہیں آئی۔ سویرے اٹھتے ہی سیکل اٹھائی اور قادر آباد روانہ ہو گیا پر واپسی میں بہت مشکل پڑی۔ جگہ جگہ ٹھہر کر آرام کرتا رہا۔ تبھی تو اتنی دیر ہو گئی۔“

چوہدری نور الہی نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو جا۔ میں ذرا دیر بعد روٹی کھاؤں گا۔ ابھی بھوک نہیں ہے۔“

جیناں چلی گئی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ نور الہی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلا لیا۔ رحیم داد چپ چاپ کوٹھری سے باہر آگیا۔ اس کا جسم پسینے سے بیگا ہوا تھا۔ کوٹھری میں سخت جس تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی برس رہی تھی۔ وہ قریب آیا تو نور الہی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”حوصلے سے کام لے، جو ہونا تھا ہو گیا۔ فکر نہ کر، میرا گھر بہت محفوظ ٹھکانا ہے۔ ہنڈ سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہاں کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ صرف جیناں روٹی لے کر آتی ہے۔“ وہ زبردست مسکرایا۔ ”میری طرف سے اطمینان رکھ۔ ویسے میں تیرے کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھتے ہی تازہ تھا کوئی واردات کر کے آیا ہے۔ ۱۸ سال سے اوپر پولیس کی نوکری کی۔“ اس نے آہ سرد کھینچی۔ ”اب تو بیماری نے کھوکھلا کر رکھ دیا ہے۔“ رحیم داد چپ کھڑا رہا۔ نور الہی ذرا دیر خاموش رہ کر

گیا ہوا۔ ”یوں کب تک کھڑا رہے گا؟“ اس نے مونڈھے پر رکھی ہوئی چنگیری کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ روٹی رکھی ہے۔ تو بھی کھا اور مجھے بھی کھلا دے۔“ اس نے گردن موڑ کر باہر صحن میں دیکھا۔ ”پہلے باہر جا کر دروازے کی زنجیر لگا دے۔ اب دروازہ بند ہی رکھنا پڑے گا۔“

رحیم داد کمرے سے گیا اور باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگا دی۔



نور الہی بستر پر آتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے چنگیری اٹھائی اور نور الہی کے سامنے رکھ دی۔ چنگیری میں تین روٹیاں اور ساگ تھا۔ نور الہی نے دو روٹیاں اٹھائیں اور ان پر ساگ رکھ کر رحیم داد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میرے لیے ایک روٹی کافی ہے۔ بھوک ہی نہیں لگتی۔ منع بھی کرتا ہوں پر جیناں نہیں مانتی۔ کہتی ہے، چوہدری! خوب پیٹ بھر کر روٹی کھایا کر۔ بہت کمزور ہو گیا ہے مگر آج تو اس نے ٹھیک ہی کیا، تیرا بھی کام بن گیا۔ اب آرام سے بیٹھ کر روٹی کھا۔“ اس نے نالہ توڑا اور کھانا کھانے لگا۔

رحیم داد بھی مونڈھے پر بیٹھ گیا اور ہاتھ میں روٹیاں تھام کر کھانے میں مصروف ہو گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کھانا اسے مزے دار لگا۔

کھانے سے فارغ ہو کر نور الہی نے پوچھا۔ ”یہ تو بتا، تجھے جانا کہاں ہے؟“

رحیم داد نے گردن جھکا کر جواب دیا۔ ”چوہدری اپنا تو اب کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔“

”جب تک تیرا جی چاہے، بیس رہ۔ میں گھر میں اکیلا پڑا پڑا گھبراتا ہوں۔ تیرے ساتھ بات بہت میں دل بہل جائے گا۔ توں میری کچھ مدد بھی کر سکے گا۔“

”مردہ کروں گا، تیرا ہر کام کروں گا۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ ”تیری مہربانی ہے۔ کچھ دن بیٹھ کر رہوں گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا، پھر دبی زبان سے بولا۔ ”چوہدری! اب تجھے کیا ہٹاؤں، میں کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔ بات یہ ہے جی۔“

نور الہی اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”مجھے کچھ نہ بتا۔ میں تیرا نام بھی نہیں پوچھوں گا اور تجھے یہی مشورہ دوں گا، آگے بھی کسی سے اپنے بارے میں بات نہ کرنا۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”ویسے بھی ابھی مجھے کچھ بات نہیں بتائے گا۔ پر توں ہے حوصلے والا۔ واردات کے بعد ملزم جتنے گہرائے ہوئے ہوتے ہیں تو اتنا پریشان نہیں لگتا۔“ اس نے طاق کی طرف ہاتھ اٹھا کر ایک شیشی کی جانب اشارہ کیا۔ ”مجھے یہ دوائی پلا دے۔“ رحیم داد نے شیشی اور اس کے ساتھ رکھی ہوئی مٹی کی پیالی اٹھائی اور نور الہی کو دے دی۔

دوا پینے کے بعد نور الہی بستر پر لیٹ گیا۔ کمرے میں ذرا دیر خاموشی رہی پھر نور الہی نے رحیم داد سے دریافت کیا۔ ”تجھے نیند تو نہیں لگ رہی؟“

”نہیں“ ابھی تو نہیں لگ رہی۔“

”میں تو دیر ہی سے سوتا ہوں۔ نیند بہت کم آتی ہے۔ تجھے نیند لگے تو کوٹھری سے چٹائی نکال لیا۔ باہر برآمدے میں بچھا کر سو جانا۔ یہاں کمرے میں تجھے گرمی لگے گی۔“ اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔

”سویرے اٹھ کر اپنے کپڑے دھو لینا۔ کپڑوں پر اس طرح خون نہیں لگا رہنا چاہئے۔“

رحیم داد نے جھک کر قمیص اور شلوار پر خون کے دھبے دیکھے۔ ”میں نے تو پہلے ان پر دھیان نہیں دیا تھا۔ تو نہ بتاتا تو مجھے پتہ ہی نہ چلتا۔“

”گھبراہٹ اور پریشانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ویسے دھبے زیادہ نمایاں نہیں ہیں۔ غور سے دیکھنے پر نظر آتے ہیں۔“ نور الہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”واردات کے بعد طرم سے ایسی غلطی اور چوک نہ ہو تو پولیس کو جرم کا سراغ کیسے ملے۔“

”تجھے تو اب پتہ چل ہی گیا۔“ رحیم داد نے اس کے سامنے ہتھیرا ڈال دیے۔ ”میں تجھے سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔“

”سچ سچ بتا دے گا تو میں تجھے ٹھیک ہی مشورہ دوں گا۔ آگے تیرے کام آئے گا۔ پر مجھے اپنے بارے میں بت بتانا، جب تجھے مجھ پر بھروسہ ہو جائے۔“

”نہیں چوہدری! مجھے، تجھ پر بھروسہ ہے۔“ رحیم داد نے اعتماد کا اظہار کیا۔ ”بات یہ ہے، توں بیمار ہے اور دلچسپی بھی۔ میں تیرا دکھ ٹھیک طرح سمجھتا ہوں۔ میری بھی گھر والی ہے، بچے ہیں۔ ممی نے انھیں بہت دنوں سے نہیں دیکھا۔ میں تیری اور جیناں کی باتیں کوٹھری میں بیٹھناں رہا تھا۔ مجھے اپنی گھر والی اور بچے اتنے یاد آئے کہ آنکھوں میں آنسو آگئے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ نور الہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ”میرا اور تمہارا حال ایک ہی سا ہے۔“

”پر توں مجھ سے زیادہ دکھوں کا مارا ہوا ہے۔“ رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”مجھے تو پتہ ہے؟ میری گھر والی اور بچے کہاں ہیں، پر تجھے تو اپنے بال بچوں کے بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں ہے؟ بات سمجھ نہیں آئی؟ جب تو پاکستان پہنچ گیا تھا تو لاہور میں ٹھہر کر انھیں تلاش کیوں نہیں کیا؟ منگمری کے کیسے نہ جاتا۔“

”میں اپنی مرضی سے تو نہیں گیا تھا۔ کیپ اتنا بھر گیا تھا کہ حکومت تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کو دوسرے شہروں کے کیسوں میں بھیجنے لگی۔ لیکن میں منگمری سے کئی بار لوہور گیا۔ فیر کلیم اور الاٹمنٹوں کا چکر شروع ہو گیا۔ میں اس میں بھض گیا۔“

”تیرے کلیم کا کیا پتا؟ کہیں زمین شمین بھی الاٹ کرائی؟“

”کلیم تو میرا منظور ہو گیا پر یہ نہ پوچھ اسے منظور کرانے کے لیے مجھے کتنی پریشانی اٹھانی پڑی۔ میں نے ۱۹۴۸ء میں تحصیل سیلی، ضلع ملتان سے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔ میں نصیر پور میں سات مرتبے اور پٹیا لے میں اٹھائی مرتبے سے زیادہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ نصیر پور میں اپنی پکی ماڑی تھی۔ پٹیا لے میں بھی مکان تھا۔ میں اپنے پیو کا اکلوتا پتر تھا۔ وہ بھی پولیس میں تھا۔ اس نے درتے میں میرے لیے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ ویسے میری اپنی آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔“ چوہدری نور الہی نے قدرے توقف کیا۔ ”مہینوں پر مہینے گزرتے گئے پر سنٹرل ریکارڈ آفس لاہور سے میری اراضی کی تصدیق ہو کر نہیں آئی۔ میں دفتروں کے چکر کاٹتا رہا۔ دو سال بعد معلوم ہوا، کلیم فارم تصدیق کے لیے ریکارڈ آفس پہنچ ہی نہیں، رستے ہی میں کہیں گم ہو گئے۔ دوبارہ کلیم فارم اسی تحصیل سے داخل کیے۔ سات اٹھ مہینے اور گزر گئے۔ ان کا بھی پتہ نہ چلا۔ فیر عذر داری کی، اس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔“

رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”پر کہیں زمین پر تو کب نہ کبھی لیا ہوتا۔ بہت سے پناہ گیروں نے ایسا ہی کیا۔ ہندوؤں اور سکھوں کی لاکھوں ایکڑ زمین پڑی تھی۔ ملتان میں بھی ان کی چھوڑی ہوئی بہت زمین تھی۔“

”میں نے سیلی میں، موضع منل چراغ میں متروکہ اراضی پر قبضہ کر لیا تھا۔ سچ سو روپے رشوت دے کر اس کا عارضی الاٹمنٹ بھی اپنے نام کر لیا تھا۔ اسی لیے اس تحصیل سے میں نے اپنا کلیم داخل کیا تھا۔“ چوہدری نور الہی نے بتایا۔ ”دس ایکڑ کے لگ بھگ نہری زمین تھی۔ بہت مشکل سے قبضہ ملا تھا۔ ایک ہندو زمین دار کی زمین تھی۔ قبضہ حاصل کرنے کے بعد میں کلیم کے چکر میں لہجہ گیا۔ ایک روز معلوم ہوا، پڑاری یہ زمین اپنے کسی رشتے دار کے نام الاٹ کروانا چاہتا ہے۔ میں اسے ملا۔ منت سماجت کی پر وہ کسی طرح نہ مانا بلکہ مجھے طرح طرح سے تنگ کرنے لگا۔ جب اس نے بہت تنگ کیا اور زمین ہاتھ سے جاتی نظر آئی تو میں نے اس کے خلاف اوپر درخواستیں کائیں۔ گورنر، وزیر اعلیٰ، وزیر بحالیات، فنانشل کمشنر، سبھی کو لکھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ پڑاری کے خلاف ضرور کارروائی ہوگی اور معاملے کی پوری پوری تفتیش ہوگی۔ مگر ہوا یہ کہ ایک روز پڑاری

”بہت زیادہ۔ غصے سے لال پیلی آنکھیں نکال کر مجھ سے بولا۔ اب جا کر گورنر جنرل اور وزیر اعظم کو میرے خلاف شکایت لگا۔ پر جس کو بھی لکھے گا تیری ہر درخواست آخری کارروائی کے لیے میرے ہی پاس آئے گی۔ فی اس نے سارے ہی اوپر والوں کی ماؤں اور مہینوں کو تنگی تنگی گالاں نکالیں اور درخواست اٹھا کر اپنے بستے میں رکھی۔“

”تجھی تو سب کہتے ہیں۔ اتے باری تھلے پٹواری۔“ رحیم داد نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”توں نے خاما خاس سے جھگڑا کیا۔ اس کی منھی گرم کر دیتا، تیرا سب کام بن جاتا۔“

”گرچو بدری! وہ پٹواری ہے تو میں بھی پولیس میں حوالدار رہ چکا ہوں۔“ نور الہی نے کڑک کر کہا۔ ”میں نے بھی بار نہیں مانی۔ تحصیل اور ضلع کے دفتر کے چکر کاٹتا رہا۔ کئی مہینے بعد ڈپٹی کمشنر کے دفتر کے ایک کلرک نے مجھے اپنی درخواست اور اس کی تمام نقلیں ایک مسل میں دکھائیں۔ پٹواری نے درخواست پر جو رپورٹ لگائی تھی، وہ بھی دکھائی۔ نور الہی نے ہاتھ بدھا کر درخواست رحیم کے داد کے حوالے کر دی۔ رحیم داد نے لالین کی روشنی میں پڑھا، پٹواری نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا۔

جناب عالی!

سائل مسی چو بدری نور الہی کی جملہ درخواست ہذا کی مکمل پڑتال کی گئی۔ اس جانچ پڑتال سے ظاہر ہوا کہ سائل فضول درخواست دینے کا عادی ہے۔ اسے متعدد بار سرزنش کی جا چکی ہے کہ اس طرح حکام کا قیمتی وقت ضائع کرنا درست نہیں۔ لیکن سائل اپنی عادت سے مجبور ہے۔ سائل کا حال چلن بھی مشتبہ ہے۔ اس کا اصل ذریعہ معاش فرضی گواہیاں دینا ہے۔ مشرقی پنجاب میں اس کے پاس کوئی اراضی نہیں تھی۔ نہ کسی قسم کی منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد تھی۔ اسی وجہ سے اس کے کلیم فارم بھی ابھی تک تصدیق نہیں ہوئے۔ سائل نے دو مرتبہ عذر داری بھی کی لیکن بے سود۔ متعدد مہاجرین اور گواہان کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ تحقیق ہوا کہ گورداس پور اور ریاست بنیالہ میں سائل کی ملکیت میں کوئی زمین نہیں تھی۔ چنانچہ کمیونٹ ہمبر ۱۵، مقدمہ نمبر ۲۸، موضع نمل پراگ میں دس ایکڑ متروکہ اراضی، جس پر سائل کا ناجائز قبضہ تھا، اس کے نام سے منسوخ ہو کر کسی فضل دین کے نام پر رویت قانون رائج باضابطہ کفرم ہو چکی ہے۔ مسی فضل دین، ضلع ہاندھڑ کا مہاجر اور سابق سفید پوش ہے۔ اس کے تصدیق شدہ کلیم بھی موصول ہو چکے ہیں۔ لہذا موضع نمل پراگ میں متروکہ اراضی ہذا الاٹ کر کے اس کی حق رسی کر دی گئی ہے۔

پٹواری کی رپورٹ پر گرد اور قانون گونے یہ نوٹ لگایا۔ ”رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ بہ

نے مجھے بلایا۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ اپنا بستہ کھول کر ایک مسل نکالی اور میرے منہ پر مار کر غصے سے بولا۔ لے اسے پڑھ۔ میں نے اسے اٹھا کر پڑھا تو میری آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مسل میں میری درخواست اور اس کی وہ تمام نقلیں موجود تھیں جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھیں۔“ نور الہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”مجھے حیرت زدہ دیکھ کر اس نے اور زیادہ تنگی تنگی گالاں نکالیں۔“

”توں خاموش بیٹھا رہا، کچھ نہیں کہا؟“

نور الہی خاموشی کے ساتھ چارپائی سے اترا۔ قریب رکھے ہوئے ٹرنک کے اندر سے کپڑے میں لپٹے ہوئے کاغذات کا پلندہ نکالا اور پھر بستر پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑے کی گرہ کھول کر ایک فائل نکالی اور اس کے اوراق الٹ پلٹ کر ایک کاغذ توجہ سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ میری وہ درخواست ہے جو میں نے اوپر والوں کو بھیجی تھی۔“ وہ اونچی آواز سے اسے پڑھنے لگا۔

رحیم داد نے درخواست سن کر کہا۔ ”چو بدری! عرضی تو تیری زوردار لگتی ہے۔ پٹواری کا تو بڑا گر کر کر دیا۔“

”اس کا بیڑا تو کیا غرق ہوتا البتہ اس نے میرا بیڑا غرق کر دیا۔ ہوا یہ کہ اوپر والوں نے میری تمام درخواستیں ضروری کارروائی کے لیے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کو بھیج دیں۔“ نور الہی نظریں جھکائے کاغذات دیکھتا رہا اور رحیم داد کو بتاتا رہا۔ ”ڈپٹی کمشنر کے دفتر والوں نے میری درخواست اور اس کی تمام نقلیں نتھی کر کے حسب ضابطہ اس پر نوٹ لکھا، درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخد مت جناب افرمال صاحب مرسل ہوں۔ ڈپٹی کمشنر نے نوٹ کے نیچے اپنے دستخط لگا دیے۔ درخواست افرمال کو بھیج دی گئی۔ افرمال نے تحصیل دار کو لکھا، درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بخد مت جناب تحصیل دار صاحب مرسل ہوں۔ تحصیل دار نے اس پر اپنا نوٹ لگایا۔ درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بنام قانون گو مرسل ہوں۔ قانون گو کے پاس درخواست پہنچی تو اس نے اپنے حکم میں لکھا۔ درخواست ہذا بہ طلب رپورٹ بجان پٹواری حلقہ مرسل ہوں۔“ نور الہی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”اس طرح وہ درخواست جو میں نے گورنر صاحب، وزیر بحالیات اور فاضل کمشنر کو بھیجی تھی، اوپر سے سیڑھی سیڑھی نیچے اترتی ہوئی آخری کارروائی کے لیے اسی پٹواری کے پاس پہنچی جس کے خلاف میں نے شکایت کی تھی۔“

”تب تو وہ بہت گرم ہوا ہو گا؟“

نوں پتہ ہے کتنا وڈا کلیم منظور ہوا؟“

رحیم داد ہونق کی طرح اس کا چہرہ نکلتا رہا۔ نور الہی نے بتایا۔ ”۶۸ مربع اراضی اور دو حویلیوں کا کلیم منظور ہو کر آیا۔ جب سچا حلف نامہ لگایا تھا اور سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک تحریر کیا تھا تو صرف ساڑھے ۵ مربع اراضی اور ایک مکان کا کلیم اڑھائی تین برس کی بھاگ دوڑ اور تمام منت سماجت کے بعد بھی دفتروں کی فائلوں میں دبا رہا۔ عذر داری بھی کی، کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ جیسے ہزار کے جادو سے ہر کام اوپر سے نیچے تک ایسے فنافٹ ہوتا چلا گیا جیسے میرے کلیم کی فائل کو پینے لگ گئے ہوں۔ لطف یہ کہ جھوٹا کلیم ایک دم سچا بن گیا۔ نہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑی، نہ کسی کے سامنے جا کر فریاد کرنے کی ضرورت پیش آئی۔“

”تجھے کلیم کی منظوری کے ساتھ ساتھ الاٹمنٹ بھی فنافٹ مل گئی ہوگی؟“

”تین نوں پتہ نہیں، کلیم منظور کرانا تو ایسا مشکل کام نہیں پر الاٹمنٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔“ نور الہی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”الاٹمنٹ کے چکر میں فیروپڑاری سے ٹاکہ ہوا اور اس بار مجھے سچ اندازہ ہوا، پڑاری کتنا طاقت ور ہوتا ہے۔“

”اس بار کیا ہوا؟“

”یہ پوچھ کیا نہیں ہوا؟ تجھے ان کاموں سے واسطہ نہیں پڑا۔ تجھے کیا معلوم، الاٹمنٹ کے چکر میں کیا کیا پاپڑیلنے پڑتے ہیں۔ شل چراغ میں تو ایک ملنے والے کی مدد سے زمین پر قبضے کے ساتھ ہی عارضی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔ ویسے اس وقت متروکہ اراضی بھی بہت تھی۔ اب تلاش کرنی پڑتی ہے۔ ساری عمدہ زمینیں تو اوپر ہی اوپر بھائی بھتیجیوں، شریکیوں اور یاروں دوستوں میں بٹ گئیں۔ ادھر وڈے زمیں داروں نے ہندوؤں اور سکھوں کے پرانے مسلمان مزارعوں سے معاملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ یہ الاٹمنٹ کا چکر بھی عجب چکر ہے۔“ نور الہی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”اوپر والوں کے پاس جاؤ تو حکم ملتا ہے، تحصیل دار کے پاس جاؤ۔ تحصیل دار کے سامنے درخواست پیش کرو تو وہ اس پر لکھتا ہے، نائب تحصیل دار رپوٹ کریں۔ نائب تحصیل دار کے سامنے درخواست جاتی ہے تو وہ اپنا نوٹ لگاتا ہے، گرد اور حلقہ رپوٹ لریں، آیا کوئی اراضی برائے الاٹ موجود ہے؟ گرد اور حلقہ اپنے حکم میں تحریر کرتا ہے، پڑاری حلقہ رپوٹ کرے آیا کوئی اراضی حلقہ مذکور میں برائے الاٹ پائی جاتی ہے؟ اس طرح اوپر سے جو فائل چلتی ہے، وہ پڑاری ہی کے پاس آکر ٹھہرتی ہے۔“

”یہ تو ویسا ہی چکر ہوا جو پڑاری نے شل چراغ کی الاٹمنٹ ختم کرانے کے لیے تیرے خلاف

مراد حکم مناسب بخد مت جناب نائب تحصیل دار صاحب پیش ہو۔“ نائب تحصیل دار نے بھی اسی طرح درخواست پر اپنا نوٹ لگایا۔ ”رپوٹ پڑاری مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب بخد مت صاحب مال افسر بہادر پیش ہو۔“ فرمال نے تحریر فرمایا۔ ”رپوٹ مفصل ہے۔ بہ مراد حکم مناسب صدر میں پیش ہو۔“ صدر کے مسل خواں نے حکم لکھا۔ ”رپوٹ مفصل ہے۔ درخواست بائے مسی چوہدری نور الہی فضول ہیں۔ داخل دفتر کی جائیں۔“

رحیم داد نے درخواست نور الہی کو واپس کرتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ ”چوہدری! تجھے اپنی درخواست اور اس پر کی گئی کارروائی اور پڑاری کی رپوٹ کہاں سے مل گئی؟“

”ارے یار! یہ کام بھی کوئی کام ہے۔ اڑھائی سو روپے کا خرچہ اور ہوا۔“ نور الہی نے ہنس کر بتایا۔ ”اس پر افسر کے دستخط بھی نہیں ہوئے تھے۔ پڑاری نے تو میرا عارضی الاٹمنٹ منسوخ کرانے اور اپنے رشتے دار فضل دین کے نام پکا الاٹمنٹ کرانے کا پورا بندوبست کرا ہی لیا تھا، اس کا کسی پولیس والے سے ٹاکہ انہیں ہوا تھا۔“

”پڑاری آخر پڑاری ہوتا ہے۔ اس نے تجھے بعد میں تنگ کیا ہوگا؟“

”میں نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ ہو شیار پور کا ایک مہاجر متروکہ اراضی کی تلاش میں تھا۔ اس کے پاس تصدیق شدہ کلیم بھی تھا۔ میں نے ساڑھے سات ہزار میں اس سے سودا کر لیا اور نل چراغ کی دس ایکڑ زمین پر اسے قبضہ دے دیا۔ وہ صوبائی اسمبلی کے ممبر کا کچھ لگتا تھا۔ اس کی سفارش پر زمین کا اس کے نام اوپر ہی اوپر پکا الاٹمنٹ بھی ہو گیا۔“ نور الہی مسکرانے لگا۔ ”جب اس کا الاٹمنٹ پوری طرح ہو گیا تو میں پڑاری کے پاس گیا۔ اسے گریبان سے پکڑا۔ جتنی بھی گندی گندی گالاں معلوم تھیں، ساری ہی خالص پولیسوں کی زبان میں نکالیں اور اس سے کہا۔ توں پڑاری ہے تو میں نے بھی پولیس کی حوالداری کی ہے۔“

”چوہدری! توں نے اسے ٹھیک سبک سکھایا۔“ رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے زمین کے ساڑھے سات ہزار لے کر گھائے میں نہیں رہا۔“

”ان ساڑھے سات ہزار کے علاوہ اسی زمین کی بنیاد پر میں مویشی اور بیج کی خریداری، مکان بنانے اور دوسرے اخراجات کے لیے سرکار سے ۵ ہزار روپے کا قرضہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا۔“ نور الہی نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس قرضے کی کچھ رقم میرے پاس موجود تھی۔ میں نے بھاول نگر سے نئے کلیم فارم داخل کیے۔ جیسے ہزار روپے اوپر سے خرچ ہوئے۔ فیڈ لہور کے سینٹرل ریکارڈ آفس سے تصدیق بھی ہو گئی۔ دو ہفتے کے اندر اندر کلیم منظور ہو گیا۔ تین

چلایا تھا۔“

”سچ تو یہ ہے جی، پٹواری الاٹمنٹ منسوخ بھی کرا سکتا ہے اور وہی الاٹمنٹ دلا بھی سکتا ہے۔“ نور الہی نے گہری سانس بھری۔ ”الاٹمنٹ کی منظوری یا منسوخی کی پوری عمارت پٹواری کی رپورٹ ہی پر کھڑی ہوتی ہے۔ الاٹمنٹ کی درخواست اوپر سے چلتی ہوئی جب پٹواری کے پاس پہنچتی ہے تو پہلے تو وہ اسے دبا کر بیٹھ جاتا ہے اور درخواست لگانے والے کا انتظار کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے پاس نہیں پہنچتا اور اوپر ہی اوپر کارروائی کرانے کی کوشش کرتا ہے تو پٹواری درخواست پر لکھ دیتا ہے حلقہ مذکورہ میں کوئی اراضی برائے الاٹ موجود نہیں ہے۔ اور اگر درخواست لگانے والا صرف منت ساجت سے کام نکالنا چاہتا ہے تو پٹواری اسے ٹر خا دیتا ہے یا بنجر زمین دلا کر اپنا پیچھا چھڑا لیتا ہے۔ درخواست پر اپنی رپورٹ میں لکھ دیتا ہے۔ موضع فلاں فلاں میں کسی قدر بنجر قدیم اراضی برائے الاٹ موجود ہے۔ اگر ساکلی یہ زمین لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔ اب درخواست فیرالے پیروں چلتی ہوئی اوپر جاتی ہے۔“

”چوہدری! تو تحصیل دار، نائب تحصیل دار اور گرد اور کے چکر میں پڑنے کی بجائے سیدھا پٹواری کے پاس کیوں نہیں پہنچا؟ سب کچھ تو اسی کی رپورٹ پر ہوتا ہے۔“

”ہاں جی، محکمہ مال کا سارا انتظام پٹواری ہی کے بل پر چلتا ہے۔ افسر تو صرف حکم چلاتے ہیں۔ بہت ٹھوکریں کھانے اور دفتر کے چکر کاٹ کاٹ کر جب مجھے پٹواری کی اہمیت معلوم ہوئی تو میں اوپر والوں کے پاس جانے کی بجائے پٹواری کے پاس پہنچا۔ دو ہزار میں اس سے معاملہ لے کیا اور اسی پٹواری کے پاس عمدہ نری زمین نکل آئی جسے اپنے حلقے میں بنجر اور کلر زمین بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے اپنے بستے سے نقشہ نکالا اور رپورٹ لکھ دی۔ لوجی، تحصیل دار تک درخواست فٹ پہنچ گئی اور زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی۔“

”مجھے متروکہ اراضی کی الاٹمنٹوں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں، پر اتنا میں نے بھی سنا ہے پٹواریوں نے تو یہاں تک کیا، جس نے ان کی مٹھی گرم کی، اسے الاٹمنٹ دے دی۔ ایک ہی زمین کئی کئی کے نام الاٹ ہوئی۔ بعد میں دنگے فساد ہوئے۔ مکدمہ بازی ہوئی۔ میرے نزدیک کے موضع میں ایک ہی زمین کے چار الاٹ ہیں۔ ان میں پچھلے اڑھائی سال سے زبردست مکدمہ بازی ہو رہی ہے۔“

”میرے ساتھ بھی دوبارہ یہی ہوا۔“ نور الہی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”تحصیل منجن آباد میں مجھے ۷۶ اکنال زمین الاٹ ہوئی۔ میں قبضہ لینے پہنچا تو پتہ چلا وہی زمین مجھے دعویٰ داروں کو پہلے ہی الاٹ

ہو چکی ہے اور ان میں سے چار نے نالش بھی کر دی ہے۔ مہینوں سے عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اسی تحصیل میں بعد میں میرے نام ۳۰ ایکڑ زمین کی الاٹمنٹ ہوئی۔ میں پہلے سے زیادہ زمین ملنے پر خوش تھا پر جلد ہی ساری خوشی جاتی رہی۔ پتہ چلا وہ زمین بھی کئی دعویٰ داروں کو مجھ سے پہلے الاٹ کی جا چکی ہے۔ قبضہ حاصل کرنے کے چکر میں دو فریقوں نے تو بندو قوں اور کلھاڑیوں سے مسلح ہو کر ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ پولیس نے دونوں گروہوں کے خلاف مقدمہ قائم کیا۔ کئی کو گرفتار بھی کر لیا۔ زمین کی بجائے انھیں قید کانٹے کے لیے جیل کی کوٹھری الاٹ ہوئی۔ ان کا انجام دیکھ کر میں نے توبہ کی۔ فوراً اپنی الاٹمنٹ منسوخ کرائی۔ ویسے منجن آباد میں جعلی فرد حقیقت اور بوٹس کلیم فارموں کے ذریعے زبردست دھاندلی ہوئی۔ میں نے توجی وہاں زمین الاٹ کرانے کا خیال ہی چھوڑ دیا تھا۔“

”غیر تجھے کہاں الاٹ ہوئی زمین؟“

”مجھے کئی مہینے بھاگ دوڑ کرنے کے بعد بھاول پور کے موضع نذر محمد جھلن میں پورے چار مرعے الاٹ ہو گئے۔“ نور الہی کے مرعہائے ہوئے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی سرخی پھیل گئی۔ ”جھلن میں ایک سکھ زمین دار سردار کھڑک سنگھ کی ۲۷ مربع متروکہ اراضی تھی۔ اس پر کھڑک سنگھ کے پرانے مزار سے کاشت کرتے تھے۔ شروع میں انھوں نے ساری زمین پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی لیے اس زمین کی الاٹمنٹ بہت بعد میں ہوئی۔ اس طرح میرے حصے میں بھی ۱۰۰ ایکڑ زمین آئی۔“

”۱۰۰ ایکڑ تو بہت ہوئے۔“ رحیم داد نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ ”پر تیرا کلیم بھی تو ۶۸ مرعے کا منظور ہوا تھا۔ وہ زمین ابھی تک تیرے ہی پاس ہے نا؟“

”وہ زمین میرے پاس رہتی تو میں یہاں کیوں پڑا ہوتا۔“ نور الہی کا چہرہ لالین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اور زیادہ زرد نظر آنے لگا۔ اس پر غم کی پرچھائیاں منزلانے لگیں۔ وہ نیچے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

”موضع نذر محمد جھلن جس علاقے میں ہے اس علاقے کا سب سے وڈا زمین دار مخدوم رحمان شاہ ہے۔ اس کے پاس بیس بیس ہزار ایکڑ سے بھی زیادہ زمین ہے۔ وہ میران والی میں رہتا ہے جو صادق آباد سے نزدیک ہے۔ ویسے میران والی بھی وڈا قصبہ ہے۔ آبادی اس کی بیس ہزار سے اوپر ہی ہوگی۔ میران والی کے چاروں طرف اونچی اونچی فصیل ہے۔ فصیل کے دو بڑے پھانک ہیں۔ رات کو یہ پھانک بند کر دیے جاتے ہیں۔ میران والی سمجھو، بہت وڈا قلعہ ہے جہاں صرف مخدوم رحمان شاہ

کی حکومت ہے۔ بسیں اور لاریاں تک اس کی چلتی ہیں۔ ایسی واہیات اور کھٹارا کہ سیٹوں پر گدیاں تک نہیں ہوتیں، مگر میران والی کا رہنے والا کوئی بندہ اس کی لاریوں کے علاوہ کسی اور سے سفر نہیں کر سکتا۔ میران والی میں اس نے اپنی کپڑے کی دوکانیں بھی کھول رکھی ہیں۔ اس کے مزارعوں کو صرف انھی دکانوں سے کپڑا خریدنا پڑتا ہے۔ ورنہ سزا ملتی ہے۔“

نور الہی نے قدرے توقف کیا۔ چند لمحے گہری گہری سانسیں بھرتا رہا، پھر گویا ہوا۔ ”میران والی کے رہنے والوں کو وہ اپنی رعایا کہتا ہے۔ روزانہ عدالت لگاتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ اس کی ذاتی جیل بھی ہے، حویلی کے ساتھ ہی ہے۔ جسے چاہتا ہے، سزا دے کر اپنی جیل میں ڈال دیتا ہے۔ اس نے ۱۰۰ کے لگ بھگ مسلح کندے رکھے ہوئے ہیں۔ یہ کندے رانکھوں اور پستولوں سے مسلح ہو کر پورے علاقے میں گشت کرتے رہتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں پر مزارعوں کو گرفتار کر کے رحمان شاہ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اگر کوئی اس کی کماد کی فصل سے ہاتھ بھر کاٹنا بھی توڑ کر چوپ لے تو جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔“

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”چوہدری! تجھے میران والی اور مخدوم رحمان شاہ سے کیا لینا۔ تجھے تو موضع جھلن میں زمین الاٹ ہوئی تھی۔ یہی بتایا تھا نا؟“

”میں نے یہ بھی تو بتایا تھا جھلن اسی علاقے میں ہے۔ میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا مخدوم رحمان شاہ کتنا وڈا اور زور آور زمین دار ہے۔ وہ جھلن کی متروکہ اراضی پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ نئے زمین داروں اور الاٹوں کو طرح طرح سے تنگ کرتا رہتا۔ میرے پاس دوسرے نئے زمین داروں سے کچھ زیادہ ہی زمین تھی اس لیے وہ مجھے زیادہ ہی تنگ کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے میرے مزارعوں کو سرکشی پر اکسایا۔ وہ اپنی مرضی کی فصل بوتے، فصل کی واڑھی پر راہ کی اور بٹائی میں زیادہ حصہ مانگتے۔ خاماخا کا جھگڑا مٹا کھڑا کرتے۔“

”راہ کی میں جھگڑے مٹنے کی کون سی بات۔ وہ تو زمین دار اور مزارع کے درمیان آدمی آدمی ہوتی ہی ہے بلکہ زمین دار ہی کئی طرح کے ٹیکس لگا کر زیادہ حصہ وصول کرتے ہیں۔ چوہدری توں بالکل نئی گل کر رہا ہے۔ ظلم تو زمین دار مزارعوں پر کرتے ہیں۔“

”پر جھلن میں مخدوم رحمان شاہ کے کندوں کے ہشکانے اور شیریں دینے پر مزارعے، مہاجر زمین داروں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے ہتھکنڈوں سے گھبرا کر کئی الانی اپنی زمینیں چھوڑ کر چلے گئے۔ پر میں نے مزارعوں سے جھگڑا مٹنا نہیں کیا۔ انھیں راضی خوشی رکھنے کی ہر طرح کوشش کی۔ بات یہ تھی، زمین زرخیز تھی اور پانی بھی بہت تھا۔ میں نے اپنی ایک

زارعے پیر بخش کے ہاتھ ۲۵ ہزار میں بیچ دیا۔ اس رقم سے تیس ایکڑ پر آم، اور مالے کے باغ بنے۔ مزارعوں کے بچوں کے لیے پرائمری اسکول بھی بنانے کی کوشش کی۔ یہ کام میں نے پیر بخش کے پتر، امیر بخش کے کہنے پر کرنا چاہا۔ وہ کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس نے مزارعوں کے ساتھ بل جوں بنانے میں میری بہت مدد کی تھی۔“

چوہدری نور الہی سنبھل، سنبھل کر بولتا رہا۔ تھک جاتا تو دم لینے کو رک جاتا۔ رحیم داد توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ”سکول شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ رحمان شاہ نے ایک روز مجھے میران والی لایا۔ ایسے ہی شروع گرمیوں کے دن تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ شاہ جی اپنی حویلی کے باغ میں تھا۔ وہ جلی شلوار اور قمیص پہنے ہوئے تھا۔ قمیص کے اوپر لمبا کوٹ تھا۔ گلے میں ٹائی بندھی تھی اور سر پر ال رومی ٹوپی تھی۔ وہ کرسی پر شان سے اٹھا ہوا بیٹھا تھا۔ ایک نوکر پیچھے کھڑا دھیرے دھیرے پنکھا بھل رہا تھا۔ اس نے عدالت لگا رکھی تھی۔ باری باری ہر ایک کی پیشی ہو رہی تھی۔ ویسے وہ انزیری مجسٹریٹ بھی ہے۔ میری پیشی ہوئی تو اس وقت اس کے سامنے موضع شیخ بکھر کا ایک دکان دار سر جھکائے ملازموں کی طرح کھڑا تھا۔ مخدوم سید رحمان شاہ نے اس سے پوچھا۔ تو نے مسجد بنائی ہے؟ اس نے گردن ہلا کر ہائی بھری۔ مخدوم رحمان نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ کیوں مسجد بنائی؟ اور اس کے جواب دینے سے پہلے خود بول پڑا۔ تیس نوں پتہ ہے حاکم کی اجازت کے بغیر رعایا کو مسجد بنانے کا حکم نہیں۔ رحمان شاہ نے اسے پیچھے مینے کی سزا بھی دے دی۔ اس کے مسلح کندے دکان دار کو پکڑ کر اسی وقت جیل میں ڈالنے لے گئے۔“

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”مسجد بنانے پر جیل میں بند کر دیا؟“

”مجھے بھی تیری طرح حیرت ہوئی تھی۔“ نور الہی نے جواب دیا۔ ”مخدوم رحمان شاہ نے مجھے کتنے ہی تیوری پر بل ڈال کر پوچھا، تو پناہ گیرا ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں جی، میں گوردار اس پورے کاما جر ہوں۔ موضع جھلن میں میری زمین داری ہے۔ وہ ٹوک کر بولا۔ میں نوں پتہ ہے، میں نوں یہ بھی پتہ ہے تو جھلن میں سکول بنانا چاہتا ہے۔ کیوں سکول بنانا چاہتا ہے؟ مزارعوں کے منڈوں کو بمعاشی سکھانی ہے؟ تیس نوں پتہ ہے، وہ تیری.... کی چٹائی بنا کر اس میں مدھانی ڈالیں گے۔ اور ایسا بڑا لگاؤ گئے تیری ساری زمین داری لسی بن کر نکل جائے گی۔ جا میراں انکھیاں آگوں دور ہو جا۔ سکول شکول کے چکر میں نہ پڑ۔ اس بار دار تنگ دے کر چھوڑے دیتا ہوں۔ اگے ایسی گل نہ سنوں۔ میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا پر یہ ضرور سمجھ گیا اس نے مسجد بنانے پر موضع شیخ بکھر کے انڈار کو میرے سامنے پیچھے مینے کی سزا کیوں سنائی تھی۔“

وہی وڈی زمیں داریاں اور بگیس ہیں۔“ رحیم داد نے نورالہی کی باتیں سن کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”انھوں نے بھی اسی طرح ہزاروں ایکڑ متروکہ اراضی دیا رکھی ہے۔ اپنی اپنی زمیں داریوں میں وہ بھی ایسے ہی حکومت کرتے ہیں۔ موج مستی کرتے ہیں۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہو سکتا۔“

”ویسے رحمان شاہ نہ گدڑی نشین ہے، نہ بیر ہے نہ سائیں، پر مخدوم الملک کہلاتا ہے۔“ نورالہی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”سنا ہے جب ریاست بھادل پور میں آیا تھا تو اس کا حال یہ تھا کہ رہنے کا ٹھکانا بھی نہ تھا۔ ملتان روڈ پر گدڑوں کی سرائے میں رہنے کو ایک آنہ روز کرائے پر منجی لے رکھی تھی۔ بچوں کو کلام مجید پڑھاتا تھا۔ ان کے گھروں سے روٹی نکر کھانے کو مل جاتا۔ کبھی کبھار مردوں کی فاتحہ کا کچھ مل جاتا۔ اسی سے گزر بسر ہوتی تھی۔“

”پتہ نہیں۔“ نورالہی مسکرا کر بولا۔ ”ویسے بھی فاتحہ کی روٹی کھانے والے ملاں سے کون اپنی کڑی کا دیا کرتا ہے۔“

”تب رحمان شاہ اتنا وڈا زمیں دار کیسے بن گیا؟“

”وہ ایسا ہوا کہ منت سماجت کر کے کسی کی سفارش پر نواب صاحب کو کلام مجید پڑھانے پر لگ گیا۔ فیرو توجی اس کے دن ہی بدل گئے۔ ایسا نصیب بدلا کہ نواب صاحب نے کسی بات پر خوش ہو کر میران والی کی پوری جاگیر ہی بخش دی۔ ساتھ ہی مخدوم الملک کا خطاب بھی دے دیا۔ ریاستوں میں ایسے ہی جاگیریں اور خطاب دے جاتے تھے۔ میں تو ریاست پٹیا لہ میں رہ چکا ہوں۔ ایسی بخشش ہوتی بہت دیکھی ہیں۔“

”موضح نذر محمد جھلن سے نکل کر تو کہاں گیا؟“

”کئی مہینے تک الاٹمنٹ کے چکر میں ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتا پھرا۔“ نورالہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمبے خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ جب ذرا قرار آیا تو دل گرفتہ ہو کر بولا۔ ”فیر ہاں آگیا۔ یہاں الاٹمنٹ ٹلاٹمنٹ تو ابھی تک ہوئی نہیں۔ جیناں کے گھروالے اکبر نے باراں ایکڑ متروکہ زمین پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ چاہتا ہے، میں یہ زمین اپنے نام الاٹ کروالوں۔ وہ میرا مزارع بن کر رہے گا بلکہ وہ تو ابھی سے خود کو میرا مزارع سمجھنے لگا ہے۔“

”توں نے یہ زمین الاٹ کرانے کی کوشش نہیں کی؟“

”ہاں نے اس کا قائل نہیں رکھا۔“ نورالہی نے کلیم کے کاغذات اور دوسری دستاویزات

”فیر تو نے کیا کیا؟“

”میں تو سکول بنانے کا خیال چھوڑ دیتا، پر امیر بخش تیار نہیں ہوا۔ چنگا ٹکڑا جوان تھا اور جبر والا بھی۔ رحمان شاہ کو پتہ چلا تو بہت خفا ہوا، اس نے امیر بخش اور اس کے پیو بیر بخش کے غارز ڈنگر چوری کا جھوٹا مقدمہ بنوا کر دونوں کو بند کروادیا۔ ان کے گھروالوں اور رشتے داروں کو بڑ پولیس نے بہت تنگ کیا۔ بیر بخش اتنا ڈرا کہ اس نے اپنی ۲۵ ایکڑ زمین مخدوم رحمان شاہ ہاتھوں صرف ۱۵ ہزار میں بیچ دی اور جھلن چھوڑ کر چلا گیا۔“

”تجھے تو مخدوم نے تنگ نہیں کیا؟“

”اس کے کندے ایک رات بندوقوں سے مسلح ہو کر آئے۔ انھوں نے مجھے گرفتار کر لیا اور مخدوم رحمان شاہ کی ذاتی جیل میں لے جا کر ڈال دیا۔ جیل میں چھوٹی چھوٹی کئی تنگ داتا یک کو ٹھڑیاں تھیں۔ مجھے بھی دوسرے قیدیوں کی طرح ایک کو ٹھنڈی میں بند کر دیا گیا۔ اس میں روشن دان تھا، نہ ہوا آنے کا کوئی رستہ۔ اتنی گندگی اور بدبو تھی سانس بھی نہ لی جاتی۔ اوپر سے دن گرمی پڑ رہی تھی۔ کھٹل اتنے تھے کہ دیواروں پر، زمین پر، جگہ جگہ ریگتے پھرتے۔ ساری رات دن کھجائے کنتی۔ دو روز تو کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ بعد میں جو روٹی کھانے کو ملتی رہی اس میں آٹے سے زیادہ ریت ہوتی اور دال میں کنکر ہوتے، اوپر کھیاں تیرتی ہوتیں۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”رحمان شاہ کو سکول سے اتنی نفرت کیوں تھی؟ اس کے پال بچے تو بالکل پڑھتے لکھتے نہیں ہوں گے۔“

”نہیں جی، اس کے خاندان کے صرف منڈے ہی نہیں، کڑیاں تک لندن اور امریکہ میں رہی ہیں۔ بالکل میموں کی طرح رہتی ہیں۔ مخدوم رحمان شاہ کو نفرت تو مزارعوں کے بچوں کی پڑھائی سے ہے۔ پڑھ لکھ جائیں گے تو اس کی عمل داری کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔“

”تو کتنے دن جیل میں رہا؟“

”چار مہینے سے اوپر ہی رہا۔“ نورالہی نے چند لمبے خاموش رہ کر بتایا۔ ”وہیں مجھے کھانسی شربت ہوئی۔ فیر بلغم کے ساتھ خون بھی آنے لگا۔ بخار بھی رہنے لگا۔ یہ نی بی کی بیماری مجھے وہیں لگی۔ اس شرط پر مجھے رہائی ملی کہ پہلے الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی درخواست لگائی۔ تب جیل سے رہائی ملی۔ میری خریف کی واڈھو فصل تھی۔ پھٹی تو چٹائی کے لیے بالکل تیار تھی۔ پر رحمان شاہ کرندوں نے مجھے نذر محمد جھلن تک جانے بھی نہیں دیا۔“

”لگتا ہے رحمان شاہ بھی ملتان کے مخدوموں کی طرح کسی درگاہ کا گدی نشین ہے۔“

”دوائی منگوالوں؟“

”سورے اکبر کو میرے پاس بھیج دیتا۔ میں اسے حال بتا دوں گا۔ وہ حکیم کے پاس بلا جائے گا۔ حکیم دوسری دوائی دے گا تو لے آئے گا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”میں خود عیم کے پاس چلا جاتا مگر کل اٹھ دس میل سیکل چلائی تو طبیعت اچانک گڑبڑ گئی۔ بخار بھی کچھ زیادہ لگتا ہے۔ آج تو مجھ سے چلا بھی نہیں جاتا تھا۔“

”تو نے دروازہ کیوں بند کر رکھا ہے؟ اسے کھولنے کے لیے تیں نوں بکھار میں اٹھنا پڑا۔ پہلے دایا نہیں کرتا تھا۔“ جیناں چند لمبے خاموش رہی۔ ”کل رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟“

نورالہی نے صاف انکار کر دیا۔ ”میرے پاس تو کوئی نہیں آیا۔ تیں نوں کیسے پتہ چلا؟“

”اکبر رات تیرے پاس آیا تھا۔ وہ شام کو ساتھ کے پنڈ گیا تھا۔ واپسی پر ادھر آیا۔ تیرے بال بچوں کے بارے میں پتہ کرنا چاہتا تھا۔ اکبر کہتا تھا، تیرے کمرے سے دھیرے دھیرے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔“

”رات تو میرے سوا میاں کوئی نہیں تھا۔ اکبر کو ویسے ہی شبہ ہوا ہو گا۔“

”شبہ تو مجھے بھی ہوا۔ میں دن میں تیرے پاس روٹی لے کر آئی تو باہر کپڑے بھی سوکھ رہے تھے۔ اب وہ کپڑے توں نے پن نہ بھی نہیں رکھے۔“

”میں نے دھو کر ٹنک میں رکھ دیے ہیں۔“ نورالہی نے فوراً بات بتائی۔ ”کپڑے دھونے ہی سے تو آج میری طبیعت اتنی گڑبڑ ہو گئی۔“

”تو نے کپڑے کیوں دھوئے؟ مجھے دے دیتا۔ کیا پہلے دھونے کو نہیں دیتا رہا ہے؟ تیں نوں باری میں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اکبر تیرا مزارع بھی تو ہے۔“

”ایسی گل بات نہ کر۔“ نورالہی نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔ ”کوئی مزارع شزارع نہیں۔“

”نیک بندہ ہے۔ اور تو بھی میرا بہت خیال رکھتی ہے۔ صبح شام روٹی کھلاتی ہے، دوائی منگوا کر دیتی ہے۔ کیا نہیں کرتی؟ تو نہ ہوتی تو میں کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔“

”لے میں تیرا کیا کام کرتی ہوں۔ چوہدری! ایسی گلاں کر رہا ہے۔ گھر کے دھندوں سے چھٹی ہی نہیں ملتی۔ چھوہری الگ بیمار ہے۔ اسے حکیم نے کالی کھانسی بتائی ہے۔ اسی لیے تیرے پاس زیادہ نہیں آتی۔“

”اب جا۔ اکبر تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔ چھوہری بیمار ہے۔ روتی ہو گی۔“

نورالہی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ جیناں چلی گئی۔

کپڑے میں احتیاط سے پلیٹ کر گرہ لگائی۔ چارپائی سے اترا اور کاغذات کا بستہ ٹنک میں رکھ کر باہر ڈال دیا۔ وہ دوبارہ بستر پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تو دل میں کہتا ہو گا، چوہدری باتیں بہت کرتا ہے۔“

زیر لب مسکرایا۔ ”اس طرح دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہوں۔ توں آگیا تو ذرا جی بمل گیا۔ ورنہ اکیلا پڑا کھانا رہتا۔ نیند بھی تو کم آتی ہے۔“ نورالہی بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔

”لگتا ہے تجھے نیند آ رہی ہے۔ چٹائی نکال لے اور باہر جا کر سو جا۔“

رحیم داد نے کوٹھری سے چٹائی نکال کر برآمدے میں بچھائی اور تھکا ہوا سالیٹ گیا۔



صبح بہت تڑکے رحیم داد بیدار ہوا۔ اس نے نورالہی کی دعوتی باندھی اور اپنے کپڑے دھونے بیٹھ گیا۔ اس نے قیص اور شلوار رگڑ رگڑ کر خون کے دھبے صاف کرنے کی کوشش کی اور کچلے کپڑے دھوپ میں سوکھنے کے لیے آنگن میں ڈال دیے۔

دوپہر کو جیناں کھانا لے کر آئی۔ رحیم داد کمرے کے اندر دروازے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ نورالہی برآمدے میں تھا۔ جیناں اسے کھانا دے کر چپ چاپ چلی گئی۔ نورالہی کھانا لے کر کمرے میں آیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔

نورالہی آدھی روٹی سے زیادہ نہ کھا سکا۔ وہ صبح سے مسلسل کھانسنے لگا تھا۔ کھانسی کے ساتھ خون بھی آیا۔ دن ڈھلے بخار تیز ہو گیا۔ وہ بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ نقاہت اتنی بڑھ گئی تھی کہ رحیم داد سے زیادہ بات چیت بھی نہیں کر سکا۔

کپڑے سوکھ چکے تھے۔ رحیم داد کپڑے پن کر نورالہی کے قریب موڑھے پر بیٹھا تھا۔ شام کا دھند لکا چھیلتا جا رہا تھا۔ نورالہی آنکھیں بند کیے بستر پر بڑھال پڑا تھا۔ رحیم داد نے لائین روشن کی۔ کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔ ذرا دیر بعد بیرونی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ساتھ ہی جیناں کی آواز بھی ابھری۔

وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ رحیم داد محضے میں پڑ گیا۔ نورالہی نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہانپنے کے انداز میں سانس بھرتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو کوٹھری میں جانے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر گیا۔

رحیم داد کوٹھری کے بند دروازے کے پیچھے دم سادھے کھڑا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے جیناں کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”چوہدری! آج تیری طبیعت کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔ توں کے تو اکبر کو تخت پہ“



رحیم داد کو ٹھری سے باہر آگیا۔ اس نے آنگن میں جا کر بیرونی دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔
 واپس کمرے میں آیا تو نور الہی نے کہا۔ ”سنا، جیناں کیا کہہ رہی تھی؟“
 رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”لگتا ہے اسے کچھ شبہ ہو گیا ہے۔“
 ”میں نے اسے مطمئن تو کر دیا ہے۔ پر اب زیادہ احتیاط کرنی ہوگی۔“
 دونوں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے کھانا کھایا۔ نور الہی نے اس وقت بھی تھوڑا
 کھانا کھایا اور کھاتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔
 لالین کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ میلا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نمایاں ہو گئے
 تھے۔ ڈاڑھی اور سر کے بال بے ترتیب تھے۔ ان پر ہلکی ہلکی گرد بھی نظر آتی تھی۔ قادر آباد سے
 آنے کے بعد اس نے اب تک غسل نہیں کیا تھا۔ وہ چت لیٹا تھا اور آنکھیں کھولے چھت کو تک
 رہا تھا۔

رحیم داد کچھ دیر اس کے قریب موندھے پر بیٹھا رہا اس نے اٹھ کر چٹائی نکالی اور برآمدے میں
 جا کر لیٹ گیا۔ آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ اس نے نور الہی کی آواز سنی۔ وہ اسے بلا رہا تھا۔ رحیم داد اس
 کے پاس گیا۔ نور الہی کہنے لگا۔ ”ذرا مجھے پانی پلا دے۔ سخت پیاس لگی ہے۔“ رحیم داد نے اسے
 پانی پلایا۔ پانی پی کر وہ بولا۔ ”ذرا دیر میرے نزدیک بیٹھ جا۔ جی بہت گھبرا رہا ہے۔ فیند بھی نہیں
 آ رہی ہے۔“

رحیم داد موندھا کھسکا کر اس کے سرہانے بیٹھ گیا۔ اس کا ماتھا چھو کر بولا۔ ”تجھے تو ابھی تک تیز
 بخار ہے۔ دوائی پلا دوں؟“
 ”دوائی تو میں نے شام ہی کو پی لی تھی۔“

رحیم داد ہاتھ بڑھا کر دھیرے دھیرے نور الہی کا سرہانے لگا۔ کمرے میں گہری خاموشی تھی۔ بہر
 رات گزر چکی تھی۔ گاؤں پر سناٹا طاری تھا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی میں نور الہی کی آواز ابھری۔
 ”ایسا محسوس ہوتا ہے اب میں زیادہ دن زندہ نہیں رہوں گا۔“ اس کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔ اس میں درد
 کی کک تھی۔

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ ”چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ کچھ دنوں میں چنگا ہو جائے گا۔“
 ”میں نوں پتہ ہے کیا ہونے والا ہے۔“ نور الہی نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کہا۔ ”یہ بہت
 موزی بیماری ہے۔ مشکل ہی سے کوئی اس سے بھلا چنگا ہوتا ہے۔ میرے پاس لاکھور، روئے کا کلیم

ہے پر کس کام کا۔ کسی کے بھی کام نہیں آسکتا۔“
 ”تیرے بال بچوں کے تو کام آتی سکتا ہے۔“

نور الہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پتہ نہیں وہ زندہ بھی ہیں کہ تریموں کے پتن ہی پر کرم الہی کی
 حشید ہو گئے۔“

”تو بتاتا تھا وہ پاکستان آگئے تھے اور لہور کے والٹن کیپ میں ٹھہرے بھی تھے؟“
 ”سنا ہی سنا ہے۔ جانے ان کا کیا بنا۔ لگ بھگ ۸ سال ہو گئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔“ وہ
 ہوش ہو گیا۔ چند لمحے بعد اس نے کہا۔ ”میرا دوسرا پتر ارشاد الہی اب ۱۸ برس کا ہو گا۔ وہ میرا
 ارا بن سکتا تھا۔“ اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پر رب کو یہ منظور ہی نہیں۔“
 رحیم داد نے اس کا کندھا ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ ”چوہدری! حوصلہ رکھ۔ تیرا پتر تجھے ضرور
 جائے گا۔ رب نے چاہا، تیری گھر والی اور کڑی بھی مل جائے گی۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک
 جائے گا۔“

”تو مجھے نیک بندہ لگتا ہے۔“ نور الہی نے رحیم داد کی ہمدردی سے متاثر ہو کر کہا۔ ”پر قتل کی
 رات میں کیسے پھنس گیا؟ مجھے جراثیم پیشہ نہیں لگتا۔ تیرا چہرہ اور تیری بات چیت کا انداز یہی بتاتا
 ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”تو نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔ کچھ اپنے بارے
 میں بات کر، خاموشی میں میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ تبھی تو میں تیرے ساتھ کل رات دیر تک
 نیا کرتا رہا۔ دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا تو تیرے جاتے ہی فیند بھی آگئی۔“

”چوہدری! میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے کسی کا قتل نہیں کیا۔“ رحیم داد
 نے صاف جھوٹ بولا۔ ”میں اس کے ساتھ سک نالے میں ایک جھاڑی کے نیچے کھڑا تھا۔ پاس ہی
 نیچے اونچے تھے۔ فیرایا ہوا جی، اوپر سے ایک بھاری پتھر لڑھ کر نیچے گرا میں تو بچ گیا۔ پتھر
 میرے سر پر گرا۔ وہ اسی وقت مر گیا۔ میں بہت ڈر گیا۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ میں
 بھاگ کر بھاگ کھڑا ہوا۔“

نور الہی نے مشتبه نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”پر ادھر دیرانے میں گیا کس لیے تھا؟ ادھر تو
 کوئی نہیں جاتا۔ میں نے سنا ہے.....“ وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکا۔ باہر درختوں تلے خشک پتوں
 چاہ بھری۔ دونوں نے چونک کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔

رحیم داد چپکاپک سے چارپائی کی اوٹ میں دبک گیا۔ ذرا دیر بعد کھڑکی پر ایک سایہ ابھرا۔ نور الہی
 بہت سے کھکارا۔ سایہ فوراً غائب ہو گیا۔ نور الہی نے اونچی آواز سے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ کوئی

جواب نہیں ملا۔ نور الہی کراہتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔ نیچے اترا اور لڑکھڑاتے قدموں سے جا کر کھڑکی پر کھڑا ہو گیا۔

وہ واپس آکر بستر پر بیٹھا تو رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ ”کون تھا؟“

اس نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ ”مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا۔“ دونوں خاموش رہے۔ چند لمحوں بعد نور الہی نے رحیم داد سے کہا۔ ”اب جا کر لیٹ جا۔ جی ذرا دھیمی کر دے۔“

نور الہی بستر پر لیٹ گیا۔ رحیم داد نے طاق میں رکھی ہوئی لائین کی لودھی کی کمرے سے نکلا اور چٹائی پر جا کے لیٹ گیا۔ مگر وہ سویا نہیں۔ جیناں نے نور الہی سے جس طرح شک کا اظہار کیا تھا، اسے سن کر رحیم داد گھبرا گیا تھا۔ بعد میں درختوں کے نیچے آہٹ ابھری اور پراسرار سایہ بھی کھڑکی پر نظر آیا۔ رحیم داد اور خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی صفائی میں اس نے جس حیلے کا سہارا لیا تھا، اس پر نور الہی نے یقین نہیں کیا۔ وہ اس سے کرید کر اور بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ رحیم داد نے سوچا، سویرے نور الہی اس سے مزید پوچھ گچھ کرے گا۔ وہ پولیس میں رہ چکا ہے، لہذا اسے غمناک آسان نہیں۔

رحیم داد نے طے کیا کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی کہیں اور چلا جائے گا۔ وہ آنکھیں بند کر کے خاموش لیٹا رہا۔ کمرے سے رک رک کر نور الہی کے کھانسنے اور آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔

پھر رات گزر چکی تھی۔ نور الہی کی کھانسی بند ہو گئی اور دیر تک سنائی نہیں دی۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا، دبے قدموں دروازے پر پہنچا۔ جھک کر کمرے میں دیکھا، نور الہی چارپائی پر سوتا ہے۔ وہ کمرے میں چلا گیا۔

نور الہی آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چارپائی کے قریب ہی ٹرک رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ وہ ٹھنکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اسے بستر پر ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا کہ نور الہی آنکھیں کھولے اس کی جانب دیکھ رہا ہے۔ وہ آہستہ سے کھٹاکر کر بولا۔ ”ٹرک میں کچھ نہیں ہے۔ میرے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ ڈاک خانے میں جمع کرادی۔ صرف کلیم کے کاغذات ہیں، وہ تیرے کسی کام کے نہیں۔“ اس نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر کنبی نکالی۔ ”یہ چابی لے اور ٹرک کھول کر دیکھ لے۔“ اس نے کنبی رحیم داد کی جانب بڑھائی۔

رحیم داد گم صم کھڑا چوہدری نور الہی کا چہرہ تکتا رہا۔ نور الہی کھانسنے لگا اور کھانسنے کھانسنے اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جھک کر چارپائی کے نیچے رکھی ہوئی مٹی کی کنالی میں تھوکا۔ غلغم کے ساتھ جیتا جیتا بہت سا خون نکلا۔ نور الہی لمبی لمبی سانس بھر کر ہانپنے لگا اور نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کنبی اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر بستر پر ایک طرف گر گئی۔

رحیم داد نے کنبی دیکھی پھر نور الہی پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ دھندلی روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی گہری ہو گئی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اس کے سر ہانے کھڑے ہو کر اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے اور نور الہی کا گلہا دبوچ لیا۔

نور الہی نے آنکھیں کھول دیں۔ رحیم داد نے ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر دی۔ نور الہی نے بے بسی سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے حلق سے لمبی کی طرح غرغرائی کی سی آوازیں نکلیں۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد اس کی آنکھیں پھڑک گئیں۔ منکا ڈھلک گیا۔ رحیم داد خاموش کھڑا اس کا بے جان چہرہ تکتا رہا۔ اس کے ہونٹوں کے ایک گوشے سے گاڑھے گاڑھے خون کی پتی سی دھار نکل کر نیچے ٹھوڑی تک پھیل گئی تھی۔

اس نے نور الہی کی لاش کے قریب پڑی ہوئی کنبی اٹھائی، ٹرک کا تالا کھولا۔ ٹرک میں پسینے کے چند کپڑے رکھے تھے۔ اس نے کپڑے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ نور الہی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ٹرک میں کوئی رقم نہیں تھی۔

رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ باہر نکالا۔ شلوار اور قمیص نکالی۔ اپنے کپڑے اتارے اور نور الہی کی قمیص اور شلوار پہن لی۔ حکیم چشتی کے جو کپڑے اب تک اس کے جسم پر تھے، اس نے ٹرک میں نہیں رکھے۔ بستہ کھولا، کپڑے پلیٹ کر کلیم کے کاغذات کے ساتھ رکھے اور ان کی گتھری بنائی۔ اس نے ٹرک کا ڈھکنا بند کیا، تالا لگایا اور کنبی نور الہی کی لاش کے سر ہانے تکیے کے نیچے رکھ دی۔

وہ کمرے سے باہر گیا، چٹائی اٹھائی اور لیٹ کر کوٹھری میں رکھ دی۔ اس نے نور الہی کی لاش پر گہری نظر ڈالی۔ بے جان آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں کے گوشے سے بہتا ہوا خون جم کر سیاہی مائل سرخ ہو گیا تھا۔

وہ کمرے سے نکل کر آنگن میں گیا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی کھولی مگر کچھ سوج کر باہر نہیں گیا۔ کنڈی دوبارہ لگائی اور آنگن کی چار دیواری کا جائزہ لیا۔ دیواریں زیادہ اونچی

نہیں تھیں۔

اس نے گھڑی کندھے پر لٹکائی۔ آنگن میں گھوم پھر کر ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ایک ٹوٹی ہوئی گھڑوچی مل گئی۔ گھڑوچی اس نے دیوار سے لٹائی اور اس کے سارے اوپر پہنچ گیا۔ اس نے ایک پیر نیچے لٹکایا اور آہستہ سے ٹھوکر مار کر گھڑوچی نیچے گرا دی۔

وہ دھیرے سے باہر اتر گیا۔ آگے بڑھا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں دبے دبے قدموں چلنے لگا۔ گاؤں سے نکل کر کچے راستے پر آگیا۔ وہ تخت ہزارہ کی جانب بڑھنے لگا۔ میل، ڈیڑھ میل کے بعد ویران اور بخر میدان آگیا۔

رحیم دادا کچا راستہ چھوڑ کر بول کی جھاڑیوں کی جانب بڑھا۔ جھاڑیوں کے نیچے اس نے نرم اور پوئی زمین تلاش کی، چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا، گھڑی سے مقتول حکیم چشتی کے کپڑے نکالے اور گڑھے میں دبا کر زمین ہموار کر دی۔

رحیم دادا نے حکیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور کچے راستے پر چلنے لگا۔ تخت ہزارہ قریب آتا گیا مگر وہ بستی میں نہیں گیا۔ داہنے ہاتھ کے ایک راستے پر مشرق کی طرف مڑ گیا۔

رات کسی قدر گرم تھی، اور ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ دور سے بیلوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی ٹھیلوں کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ رحیم دادا ان آوازوں کو سن کر ٹھٹکا اور گردن اٹھا کر اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھٹیوں کی جھنکار رات کے سنائے میں بلند ہو رہی تھی۔ رحیم دادا کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والے سنان پلے ہے پر کھڑا تھا۔ چند لمحے ٹھہر کر وہ آگے بڑھا اور چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا پلے ہے پر چلنے لگا۔ بیبا ختم ہوا تو کچی سڑک آگئی۔

اس نے دیکھا، سائبے سڑک پر ایک قطار میں کئی بیل گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ رحیم دادا نے پہلی بیل نظر میں اندازہ لگا لیا کہ بیل گاڑیوں میں لاوے سوار ہیں۔ وہ اجرت پر فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور تھے۔

جیت کا مینہ ختم ہو چکا تھا، بیساکھ کے ابتدائی دن تھے۔ ربیع کی کٹائی کہیں کہیں شروع ہو چکی تھی۔ لاوے کام کی تلاش میں جا رہے تھے۔

رحیم دادا نے ایک درخت کے نیچے رک کر بیل گاڑیوں کو غور سے دیکھا۔ ہمت سے کام لیا۔ آگے بڑھا، ایک بیل گاڑی کے قریب پہنچا اور اس میں بیٹھے ہوئے لاوے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”گل سن۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔

”تمیں نوں کتھے جاتا ہے؟“

لاوے نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم توجی کریم کوٹ سے آرہے ہیں اور گنہر ہوتے

ہیں بوہڑ پور جائیں گے۔ اتھے جانا ہو تو گڈے میں بہ جا۔“
 ”جانا تو میں نے آگے ہے۔ بوہڑ پور ہی پہنچا دے۔“

لاوے نے نیل گاڑی روک لی۔ رحیم داد اس پر سوار ہو گیا۔ نیل گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی سڑک پر چلنے لگی۔ رحیم داد بہت تھکا ہوا تھا۔ کچھ دیر بیٹھا جھومتا رہا، آخر لڑھک کر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ نیل گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی تھیں۔ قریب ہی کوئی بستی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے آنکھیں ملنے ہوئے لاوے سے پوچھا۔
 ”بوہڑ پور آگیا؟“

”ابھی تو کوٹ عالم بھی نہیں آیا۔ بوہڑ پور تو بہت آگے ہے۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”ادھر کیسے آگیا؟“

”ادھر فصل کی واڈھی کا کام مل گیا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تیں نوں بوہڑ پور نہیں جانا۔“

”ہاں جی، اب تو ادھر کا کام پورا کرنے کے بعد ہی آگے جانا ہوگا۔“

قریب کھڑے ہوئے دوسرے لاوے نے کہا۔ ”ایسا کر، اس ٹرک میں بہ جا۔“ اس نے کچھ دور سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ٹرک کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ کھڑا ہے ٹرک۔ بوہڑ پور سے بھی آگے جا رہا ہے۔ دو روپے ڈیور کو دینا۔ رستے میں جہاں کہے گا، وہیں پہنچا دے گا۔ چل، میں تیری ڈیور سے گل بات کر دیتا ہوں، اپنا جانے والا ہے۔“

رحیم داد نیل گاڑی سے نیچے اترا اور لاوے کے ساتھ ٹرک کی جانب بڑھا۔ قریب جا کر لاوے نے ٹرک ڈرائیور سے کہا۔ ”جیو! اتوں بوہڑ پور ہی کی طرف جا رہا ہے نا؟“ اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ ”اے اپنے ساتھ بٹھالے۔ اسے بھی اتھے ہی جانا ہے، پہنچا دے۔ دو روپے اس سے لے لیتا۔“

ڈرائیور نے رحیم داد سے کہا۔ ”میں نے تو چک بیدی جانا ہے۔ تجھے ادھر جانا ہو تو اگلی سیٹ پہ بیٹھ جا۔“

”ہاں جی، میں نے بھی ادھر ہی جانا ہے۔“ رحیم داد نے ڈرائیور کو دو روپے دیئے۔ اور ٹرک میں بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ٹرک اشارت ہوا اور سڑک پر دوڑنے لگا۔

رحیم داد نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”ٹرک ادھر کیوں کھڑا کر رکھا تھا؟“

”انجن گرم ہو گیا تھا۔“ ڈرائیور نے بتایا۔ ”ریڈ سیٹر میں پانی بھی ڈالنا تھا۔“ اس کے بعد کوئی بات چیت نہیں ہوئی، ٹرک سڑک پر دوڑتا رہا۔ رحیم داد کی پھر آنکھ لگ گئی۔

وہ بیدار ہوا تو ٹرک پختہ سڑک پر دوڑ رہا تھا۔ رات ختم ہو چکی تھی۔ مغربی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد نے صبح کی روشنی دیکھی تو گھبرا گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔
 ”جیو! ٹرک روک لے۔ میں نوں میس اترتا ہے۔“

ڈرائیور نے ٹرک روک لیا۔ رحیم داد نے اپنا بستہ بغل میں دبایا اور ٹرک سے نیچے اتر گیا۔ ٹرک آگے بڑھا اور تیزی سے دوڑتا ہوا کچھ ہی دیر بعد درختوں کی اوٹ میں اوجھل ہو گیا۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ دونوں طرف کھیت تھیں، جن کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ اجالا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ سڑک پر چلتا رہا۔ میل ڈیڑھ میل بعد وہ کھیتوں میں گھس گیا اور ایک گڈنڈی پر چلنے لگا۔

ربع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ اپریل کا سورج شہینہ کے گھنے درخت کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ گندم اور جو کے پودے دھوپ سے سنہرے پڑتے جا رہے تھے۔

ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ابھرتیں، مدھم سروں میں جل ترنگ بجتے۔ ہر طرف ویرانی چھائی تھی۔ مگر دور سے ڈھول پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

رحیم داد آگے بڑھتا گیا۔ وہ ایسی جگہ پہنچ گیا، جہاں راستے کے ایک طرف کھیتوں میں گندم اور جو کی بالیاں ہوا کے جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔ دوسری طرف اجاڑ کھیت تھی۔ فصل تازہ تازہ لٹی تھی۔ جگہ جگہ کئی ہوئی فصل کے ترنڈے ابھرے ہوئے تھے۔ گندم کے خوشے اور سلے کھڑے تھے۔

گڈنڈی سے ذرا ہٹ کر چھ سات سٹلے بار عورتیں زمین پر جھکی ہوئی خوشے اٹھا اٹھا کر دوپٹوں کی جھولیوں میں ڈال رہی تھیں۔ ان کے بوسیدہ اور میلے کپیلے لباس صاف چٹکی کھا رہے تھے کہ وہ تسلیں اور کٹیوں کے گھروں کی عورتیں ہیں۔

اس نے ایک سرسری نگاہ سٹلے بار عورتوں پر ڈالی۔ ان میں ایک سانولی سلونی مٹیا رہی تھی۔ وہ لمبا دھوئی کا ادھر نوچا باندھے ہوئے تھی اور پلو کندھے سے اتار کر اس میں گندم کے خوشے چن چن کر ڈال رہی تھی۔

چاپ سن کر اس نے گردن کو ذرا سا خم دے کر نظریں موڑیں۔ اس کی ناک میں فیوزے کا ہوا تھا۔ آنکھوں سے بھری جوانی کی دھوپ جھلکتی تھی۔

وہ رحیم داد کو دیکھ کر اٹھ پین سے مسکرائی۔ وہ چند ہی قدم کے فاصلے پر تھی، اس قدر قریب کہ رحیم داد اس کے بھرے بھرے کو لھوں کا ہر دائرہ اور ہر خم دیکھ سکتا تھا۔ رحیم داد لمبے بھر کو ٹھکا ہوا جھٹ نظریں نیچی کر کے آگے بڑھ گیا۔

ڈھول بجنے کی آوازیں اب قریب آتی جا رہی تھیں۔ آوازیں دائیں ہاتھ کی کھڑی فصلوں کے پیچھے سے آرہی تھیں۔ وہ کچھ اور آگے بڑھا۔ لگ بھگ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر ایک اجازت کھیت کے اس پار گندم کی فصل کٹ رہی تھی۔ بھرائی اور ڈھولی زور زور سے ڈھول پر چوٹ لگا رہے تھے۔

فصل کی کٹائی کرنے والے ہاتھوں میں دراختیاں سنبھالے تیزی سے ہاتھ چلاتے، ڈھول کی تھاپ پر رک رک کر اونچی آواز سے بلے بلے کہتے۔ فصل کاٹنے والے لاوے نہیں تھے۔ مزارے تھے اور ماگی پر فصل کاٹنے آئے تھے۔



دو سال پہلے ربیع کی فصل پر رحیم داد نے بھی انہی دنوں اسی طرح ماگی پر اپنی فصل کٹوائی تھی۔ واڑھی سے پہلے حسب دستور اس نے ماگی کے لیے پتی کٹیوں کے ذریعے گاؤں والوں کو پیغام بجا دیا تھا۔ ان دنوں زمین کے مسئلے پر سیف اللہ سے اس کی لاگ ڈاٹ چل رہی تھی۔ معاملہ عدالت تک پہنچ چکا تھا۔

سیف اللہ گاؤں کا کھانا پیتا زمیں دار تھا اور رحیم داد کے پاس صرف بارہ ایکڑ زمین تھی۔ مگر مقدمہ رحیم داد کے حق میں جا رہا تھا۔ گواہ بھی اس کے کچے تھے۔ پڑاری نے سو روپے اور چار روپے گندم رشوت میں لے کر رحیم داد کا مقدمہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

سیف اللہ اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا تھا۔ اس نے اور اس کے بھائیوں نے گاؤں والوں کو ورغلا یا کہ رحیم داد کی ماگی پر فصل کاٹنے نہ جائیں۔ مگر صبح جب رحیم داد بیوی بچوں کے ساتھ اپنے کھیتوں پر پہنچا اور ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور سے چوٹ لگائی تو گاؤں والے گھروں سے نکل کر فصل کی کٹائی کے لیے پہنچنے لگے۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی باتوں پر ان کے اپنے مزارعوں کے سوا کسی نے کان نہ دھرا۔

دھوپ تیز ہوئی اور اس کی نمی ذرا خشک ہوئی تو سب دراختیاں سنبھال کر کٹائے، رات جتنے

انہوں نے رحیم داد کو کٹائی میں ہاتھ بھی نہیں لگانے دیا۔ وہ الگ بیٹھا حقہ گڑ گڑاتا رہا۔ ڈھول بجتے رہے، فصل کٹتی رہی۔

فصل کاٹنے والے سب مرد تھے۔ عورت صرف رحیم داد کی بیوی نوران تھی۔ وہ کٹے ہوئے پودوں کے پولے باندھ باندھ کر ڈھیر لگاتی جا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے تر تھا، تیز دھوپ اور سخت محنت سے گلابی پڑ گیا تھا۔ بچے بھی اس کا ہاتھ بنا رہے تھے۔ ننھی زینو ضد کرتی یا روتی تو نوران غصے سے جھڑک دیتی۔ رحیم داد زینو سے بہت پیار کرتا تھا۔ تھی بھی وہ بہت بھولی بھالی اور ماں کی طرح خوب صورت۔ نوران، جب اسے جھڑکتی یا غصے سے آنکھیں نکال کر چیختی تو وہ حقے کی نے منہ سے ہٹا کر بیوی کو نرمی سے سمجھاتا، کبھی ڈانٹتا، مگر فوراً ہی بے تکلفی سے مسکراتے بھی لگتا۔

اس روز وہ بہت موج میں تھا۔ عالم وارفتگی میں زور زور سے قمقمے لگاتا۔ بار بار کٹائی کرنے والوں کے پاس جاتا، ان کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا۔ جب ڈھولی کٹائی کرنے والوں کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے ڈھول کی تھاپ تیز کرتے تو ہر طرف سے بلے بلے کی آوازیں ابھرتیں۔ رحیم داد بھی ان کے جوش و خروش میں شامل ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کے اونچی آواز سے بلے بلے کی صدا لگاتا۔ کٹائی کرنے والوں کے ہاتھ اور تیزی سے چلتے۔

سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے فصل کٹ گئی۔ کٹائی کرنے والے موبیشیوں کو چارہ دینے اور دوسرے کام کاج کرنے گھروں کو چلے گئے۔ مگر فصل کی اجتماعی کٹائی، ماگی کے رواج کے مطابق رات کو وہ منگ کے لیے پھر رحیم داد کے گھر پر اکٹھا ہوئے۔ رحیم داد کے گھر پلاؤ کی دیگ چڑھی تھی۔ اس نے ایک ایک کو بڑی محبت اور چاؤ سے کھانا کھلایا۔ اس ضیافت کے لیے اس نے کھانے میں خاص اہتمام کیا تھا۔

اس رات مشعلوں کی روشنی میں ڈھولوں کی تھاپ پر بھنگو ڈالا گیا۔ بھنگو ڈالنے والوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنالیا تھا۔ رحیم داد نے ابلے کپڑے پہنے تھے۔ سر میں تیل ڈال کر بچ سے مانگ نکالی تھی۔ دونوں طرف بالوں کی پٹیاں بھائی تھیں۔ مونچھیں مروڑ کر خوب نیکی بنائی تھیں۔ اس کے قریب ہی نوران کھڑی تھی۔

اس نے نما دھو کر ٹنک سے راکھواں کپڑے نکال کر پہنے تھے۔ سوتی دھوتی اتار کر ریشتی سلارا باندھا تھا، جس پر تلے کی دھاریاں تھیں اور تیز روشنی میں خوب جھلک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دندرا ملا تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاجل ڈالا تھا۔ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود وہ جوان اور

دکھ لگ رہی تھی۔

خینگی کے عالم میں زور زور سے نعرہ بلند کرتا۔

ہو ہو، علی علی، لڈی گھم لڈی

فتح کے اس جشن کے چند ہی روز بعد سیف اللہ اور اس کے بھائیوں نے اپنے حامیوں کے ساتھ 'شام' کے چھپٹے میں رحیم داد پر حملہ کیا۔ حملہ آور آٹھ تھے اور پوری طرح مسلح بھی تھے۔ رحیم داد کے ساتھ صرف جمال دین اور اللہ وراہو تھے۔ مگر وہ بھی نیتے نہیں تھے۔ رحیم داد کے ہاتھ میں کھڑی تھی۔ جمال دین اور اللہ وراہو کے پاس لمبی لمبی ڈانکلیں تھیں۔ تینوں نے جم کر مقابلہ کیا، زخمی بھی ہوئے مگر پیچھے نہیں ہٹے۔

رحیم داد کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لولہمان تھا۔ رحیم داد نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ہاتھ میں بھرا ہوا اپنا جیتا جیتا خون دیکھا۔ وہ جوش سے تڑپ اٹھا۔ اس نے ہونٹ دانتوں میں بھیچے، بڑھ کے کھڑی کا بھرپور وار کیا۔ کھڑی سیف اللہ کا کندھا کاٹتی ہوئی پسلیوں تک اتر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔

سیف اللہ کے گرتے ہی اس کے بھائی اور حمایتی بھاگ کھڑے ہوئے۔ بعد میں سیف اللہ کو زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ اسے تین دن بعد ہوش آیا۔ رحیم داد، جمال دین اور اللہ وراہو گرفتار کر لئے گئے۔

پولیس نے نگہی رشوت لے کر سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کی پوری طرف داری کی۔ رحیم داد اور اس کے ساتھیوں پر تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۰ کے تحت بلوے اور اقدام قتل کا مقدمہ قائم کر کے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

تینوں ملزموں کو تفتیش کے لیے کچھ عرصہ ریمانڈر پر حوالات میں رکھا گیا۔ بعد میں منگمری جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ نوران ملاقات کے دن جیل میں ملنے رحیم داد کے پاس آتی اور اس کے لیے میوے اور چینی سے بنا ہوا گیور ضرور لاتی۔ گیور رحیم داد بڑی رغبت سے کھاتا تھا۔ جب سے رحیم داد جیل گیا تھا نوران نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ اس کا گفتگو چہرہ مرجھا گیا تھا۔ وہ بیمار اور لاغر نظر آتی۔

مقدمے کی پیشیاں پڑتی رہیں۔ رحیم داد کی ضمانت بھی نہ ہو سکی۔ مقدمے کا فیصلہ ہوا تو جمال دین اور اللہ دینو بری ہو گئے۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔ اب نوران مینے میں دوبار رحیم داد سے ملنے جیل پہنچتی۔

انہی دنوں رحیم داد کو نوران کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے زمین، کھیتی باڑی کے لیے

رحیم داد نے بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور سب کی نظریں بچا کر ہو لے سے اس کے رخسار کی چٹکی بھری۔

وہ من چلے نوجوانوں کی طرح سینہ تان کر آگے بڑھا۔ ایک ڈھولی سے ڈھول لے کر گلے میں ڈالا۔ ایک ہاتھ سے ڈھول پر تھاپ دی اور دوسرا کان پر رکھ کر اونچے سر میں ڈھولے کا ایک نچا لاپنے لگا۔

وہ اپنے بالوں کے پٹوں کو جھٹکا دے کر تیزی سے لہراتا اور جھوم جھوم کے نچا لاپتا۔ دوسرے مل کر آخری بول دہراتے اور بانیں الارا الار کر تیز رقص کرتے۔

بھنگوے کا مزا اس وقت سوا ہوا جب جمال دین بھی بڑھ کر آگے آگیا۔ وہ گھرو جوان تھا۔ اس کا بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ اب رحیم داد اور جمال دین ایک دوسرے کو لکارتے اور ڈھول پر دھنکڑے کے ساتھ لہک لہک کر نچا لاپتے۔ رحیم داد مسکرا مسکرا کر نوران کو دیکھتا۔ وہ کبھی شرماتی، کبھی کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

رحیم داد ڈھول پر زور سے تھاپ دے کر زیادہ اونچی تان لگاتا۔ بول اونچے اور اونچے ہوتے گئے۔ رقص تیز اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد بیتے دنوں کی یادوں میں مگن آگے بڑھتا گیا اور سوچتا رہا کہ اس بار اس کی فصل ابھی کئی بھی ہوگی یا نہیں۔ وہ خود تو خریف کی فصل کے لیے بھی اپنے کھیتوں میں مل نہیں چلا سکا تھا۔ حالانکہ ربیع کی فصل کی کٹائی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ زمین کا مقدمہ جیت گیا تھا۔ رات کو مقدمہ جیتنے کی خوشی میں اس کے گھر خوب جشن رہا۔ پیڑو کس کی تیز روشنی میں لڈی ناچ ہوا۔ بیچ میں ڈھولی تھے اور ان کے گرد رقص کرنے والے باری باری پاؤں اٹھاتے، بانیں سر کی سیدھ میں لہراتے اور ایک ایڑی پر بیٹھ کر ڈھولیوں کے چاروں طرف تیزی سے گھومتے۔

رقص کرنے والوں میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ اس کے سر پر سرخ جیرا تھا جو پاک چن میں بابا فرید سچ شکر کے مزار پر چادر چڑھانے کے بعد نیک شگون کے طور پر نوران نے اپنے ہاتھ سے باندھا تھا۔ نوران اس وقت عورتوں کے جھرمٹ میں سب سے آگے نظر آرہی تھی۔ وہ ریشمی پٹانگل پہنے، بنی سنوری ایسی جج دھج سے کھڑی تھی کہ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ستارے جھللا رہے تھے۔

ناچنے ناچنے بیوی پر رحیم داد کی نظر پڑتی تو وہ ترنگ میں آکر ایڑی کے بل تیزی سے گھومتا اور

رہے تھے۔

جوہ کے اس پار گاؤں کے مکانات نظر آرہے تھے۔ مگر رحیم داد اس طرف نہیں گیا۔ راستہ ابھی سنسان تھا۔ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ کھیتوں کی منڈیر پھاند کر ایک شخص نکلا اور رحیم داد کے عین سامنے آگیا۔ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ لیکن رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ پیسا عبور کر کے جوہ کی طرف جانے لگا اور مزمر کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ رحیم داد اس کی جانب دیکھے بغیر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

سو سو اسو گز طے کرنے کے بعد اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ کچھ دور اسے چھوٹی سی مسجد نظر آئی۔ مسجد گاؤں کے آخری سرے پر تھی۔ آس پاس درختوں کا جھنڈ تھا۔ مکروہاں بالکل خاموشی پھائی تھی۔

پی ہے سے نکل کر ایک تنگ پلڈنڈی کانگری کی فصلوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی مسجد کی سمت جاتی تھی۔ رحیم داد کہیں ٹھہر کر سستانا چاہتا تھا۔ ٹھہرنے کے لیے مسجد اسے مناسب جگہ معلوم ہوئی۔

وہ مسجد کی جانب بڑھا اور رفتہ رفتہ اس سے قریب ہوتا گیا۔ جب وہ چری کے کھیتوں سے نکل کر باہر آیا تو درختوں کے نیچے ایک ادھڑ آدمی دکھائی دیا۔ وضع قطع سے وہ مسجد کا ملاحظہ کرتا تھا۔ رحیم داد کی جیب میں ابھی تک مقتول حکیم چشتی کی عینک موجود تھی۔ اس نے اپنا حلیہ تبدیل کرنے کی غرض سے جھٹ عینک نکالی اور آنکھوں پر لگالی۔

عینک لگا کر اسے ہر چیز بے ڈول اور دھندلی دھندلی نظر آنے لگی۔ مگر وہ آہستہ آہستہ بڑھتا گیا۔ چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ درختوں تلے کوئی زور سے کھنکرا۔ کھنکرا سن کر رحیم داد کے قدم ڈنگائے۔ وہ غراپ سے پانی سے بھرے ہوئے گڑھے میں گر گیا۔ عینک بھی آنکھوں سے ڈھلک کر پانی میں چلی گئی۔

گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ پانی گھٹنوں سے کچھ اونچا تھا۔ رحیم داد نے گہرائی ہوئی نظروں سے دیکھا، ملا اس کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ دھلا پتلا اور پست قد تھا۔ سر پر ملنجی پگڑی تھی۔ چہرے پر بالشت بھر سے زیادہ لمبی ڈاڑھی تھی جس میں جگہ جگہ سفید بال جھلک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں پر عینک تھی۔

ملا نے غور سے رحیم داد کو دیکھا، مسکرا کر بولا۔ ”بچھے اتنا بڑا پانی کا گڑھا نظر نہیں آیا؟“
رحیم داد نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں ملتے ہوئے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ”مجھے جی کم نظر

جمال دین کو نصف پیداوار کے عوض ادھیارے پر دے دی۔ کرتی بھی کیا۔ دونوں لڑکے ابھی زور تھے اور کسی طور کھیتی باڑی کا کام سنبھالنے کے قابل نہ تھے۔ ادھیارے پر زمین دینے کا مشورہ رحیم داد ہی نے دیا تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ نوراں نے اچانک جیل آنا بند کر دیا۔ جس وقت وہ لالی ساتھ جیل سے فرار ہوا، نوراں مینے بھر سے نہیں آئی تھی۔ شاید بیمار پڑ گئی ہو۔ رحیم داد نے یہ سوچا تھا۔ لالی نے جب جیل سے فرار ہونے پر اکسایا تو تھوڑی سی جیل و جت کے بعد اس لیے ہی آمادہ ہو گیا کہ وہ نوراں سے ملنے کے لیے بے قرار تھا اور بچوں کی یاد بھی ہر وقت ستاتی تھی۔

☆

رحیم داد آگے بڑھتا اور سوچتا رہا، نہ جانے نوراں اور بچے کس حال میں ہوں گے۔ نوراں اور بچوں سے ملنے اور انھیں دیکھنے کے لیے اس کا دل تڑپ اٹھا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور آگے بڑھتا رہا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہاں جا رہا ہے؟ ڈھولوں کی آواز پیچھے رہ گئی تھی۔ راستے سے کچھ فاصلے پر بکائین کے ایک درخت کے نیچے جوہ میں لڑکے جمع تھے۔ وہ کیر لڑاکا کھیل رہے تھے۔

رحیم داد نے دیکھا، ایک کھلاڑی لڑکے نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے ایک ٹیڑھی سی لکڑی پوری قوت کے ساتھ پھینکی۔ لکڑی سیدھی رحیم داد کی جانب آئی اور بچتے بچتے بھی رحیم داد کی پٹلی سے ٹکرائی۔

وہ ٹھک کر رہ گیا۔ ایک لڑکا دوڑتا ہوا آیا مگر رحیم داد کو دیکھ کر سہم گیا اور چند قدم کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ اس وقت کھیل میں چھوٹی تھا۔ اسے جلد سے جلد لکڑی اٹھا کر درخت کے نیچے بے ہونے دائرے میں رکھنا تھی اور دوسرے کھلاڑیوں کو درخت پر چڑھنے سے پہلے چھونے کی کوشش بھی کرنا تھی۔ مگر لکڑی اٹھانے کے بجائے لڑکا رحیم داد کے رو بہ رو سما ہوا کھڑا تھا۔ وہ سب سے آخر بھی نظر آتا تھا۔

اسے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بڑا بیٹا کریم یاد آگیا۔ وہ لگ بھگ اتنا ہی بڑا تھا اور صورت شکل سے اسی کی طرح معصوم بھی لگتا تھا۔ رحیم داد اسے اس طرح زیادہ دیر پریشان نہ دیکھ سکا۔ اس نے جھک کر لکڑی اٹھائی اور مسکرا کر لڑکے کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لے پتر! ٹانف گھیرے میں جا کر رکھ دے۔“

لڑکے نے چپ چاپ لکڑی رحیم داد کے ہاتھ سے لی اور درخت کی جانب تیزی سے بھاگا۔ لیکن اس وقت تک تمام کھلاڑی درخت پر چڑھ چکے تھے اور شاخوں کے درمیان سے جھانک کر قہقہے

آتا ہے۔ میری ٹینک بھی پانی میں گر گئی۔" وہ گڑھے سے نکل کر باہر آگیا اور جھک کر اپنی شلوار اور جوتے دیکھنے لگا۔

جوتے پانی اور کچڑ سے لت پت تھے۔ شلوار بھی گڑھے کے نیچے پانی سے شرابور تھی۔ مگر یکم کے کاغذات کا بستہ حفاظت سے بغل میں دبا ہوا تھا۔

ملا نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "تیرے تو سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ گڑھے کا پانی بھی نجس ہے۔"

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ ملا نے اسے خاموش پایا تو نرم لہجے میں بولا۔ "اس حالت میں کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ آ میرے ساتھ۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے چلنے کا اشارہ کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے بتایا۔ "مسجد کے نزدیک ہی میرا جڑو ہے۔ اسی میں مدرسہ بھی ہے۔ آنگن ہے۔ آنگن میں کوئی بھی ہے۔ اس سے پانی نکالنا اور اپنے کپڑے دھو کر دھوپ میں سکھانے کے لیے ڈال دینا۔ میں باندھنے کے لیے تجھے دھوتی دے دوں گا۔"

رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ "بہت مہربانی ہے جی۔" وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا رہا۔ دونوں مسجد کے سامنے سے گزر کر ایک کچے مکان کے بند دروازے کے سامنے ٹھہر گئے۔ ملا نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ "اندر آجا۔" رحیم داد اس کے ہم راہ گھر میں داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے کشادہ آنگن تھا۔ آنگن میں ایک طرف کنواں تھا۔ قریب ہی پڑھتی تھی۔ اس کی چھت کے نیچے مٹی کا بڑا سا چبوترہ تھا۔ پڑھتی خالی تھی۔ آنگن کے آگے دالان تھا۔ فرش پر کھجور کی شاخوں کی بنی ہوئی چٹائی بچھی تھی۔ دالان سے ملحق کوٹھری تھی۔ اس کے دروازے پر قفل پڑا تھا۔

ملا نے آنگن میں پہنچ کر پوچھا۔ "میں نے تجھے یہاں پہلی بار دیکھا ہے۔ پنڈ میں تیرا کوئی شریکا یا عزیز دار ہے؟"

"نہیں جی، میرا یہاں کوئی جان پہچان کا نہیں۔ میں پہلی بار ادھر آیا ہوں۔"

"جی تو میں نے کہا کہ تجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ تیرا چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔" ملا نے اسے تسلی دی۔ "فکر نہ کر۔" اس نے کنویں کی جانب اشارہ کیا۔ "وہ رہی کوئی۔ ڈول سے پانی نکال، کپڑے دھو اور غسل کر۔ میں تیرے لیے دھوتی لاتا ہوں۔"

وہ دالان میں گیا۔ جیب سے کبھی نکال کر قفل کھولا اور کوٹھری کے اندر چلا گیا۔

بک دھوتی ہاتھ میں دبائے کوٹھری سے باہر آیا، رحیم داد کے قریب پہنچا اور دھوتی اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔

"لے لے! یہ باندھ لے۔"

رحیم داد دھوتی سنبھال کر پڑھتی کے نیچے گیا۔ شلوار اور قمیص اتاری۔ دھوتی باندھی اور اس کے ڈب میں ہمیانی، چاقو اور کھلے ہوئے روپے اڑس لیے۔ بستہ چبوترے پر سنبھال کر رکھا اور اپنے نڈے کپڑے اٹھا کر کنویں پر پہنچ گیا۔

ملا نے اسے دیکھا، قریب گیا اور اپنے بارے میں بتانے لگا۔ "میرا نام مولوی فضل احمد ہے۔ اس پنڈ میں آئے دو سال سے اوپر ہو گئے۔ میں پہلے ملتان میں ہوتا تھا۔ وہیں مدرسہ قاسم العلوم میں تعلیم پائی اور ایک مسجد میں پیش امام لگ گیا۔ وہاں سے حاجی صاحب مجھے یہاں لے آئے۔ حاجی صاحب پنڈ کے سب سے وڈے زمین دار ہیں۔ بہت پرہیزگار اور نیک بندے ہیں۔" اس نے دالان کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ جگہ انھوں نے پنڈ کے سارے ہی بچوں کی دینی تعلیم کے لیے بنوائی ہے۔ لیکن اس پنڈ کے بچے سخت نالائق اور پاجاتی ہیں۔ مدرسے میں آتے ہی نہیں۔ دن بھر ادھر ادھر آوارہ گردی کرتے ہیں۔ کھیل کود میں وقت برباد کرتے ہیں۔ مشکل سے چند بچے پڑھنے کے لیے تیار ہوئے، وہ بھی بدبخت آئے دن ناغہ کرتے ہیں۔ میں خود ان کی تلاش میں جاتا ہوں، پکڑ کر مدرسے میں لاتا ہوں۔"

رحیم داد نے خالی دالان کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ "لگتا ہے، آج تو کوئی بھی منڈا پڑھنے نہیں آیا؟"

"آج میں نے انھیں چھٹی دے رکھی ہے، کل بھی مدرسہ بند رہے گا۔ بات یہ ہے جی، میں حاجی صاحب کے ہم راہ آج شہر جا رہا ہوں۔ کل عشا کی نماز سے پہلے واپس آجاؤں گا۔" اس نے چند لمحوں کے لیے تامل کیا، رحیم داد سے پوچھا۔ "تیرا کیسے ادھر آتا ہوا؟" رحیم داد خاموش کھڑا رہا۔ مولوی فضل نے دھوتی ڈال کر جوتے پہنے۔

"کیا بات ہے، اتنا چپ کیوں ہے؟"

"کیا بتاؤں ملاں جی۔" رحیم داد لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "یوں سمجھ لو، نصیب کا بڑے۔ بہتی بہتی گھومتا پھرتا ہوں۔ یہاں بھی اسی پکر میں آگیا۔"

رحیم داد کا، باتوں میں درد کی کک تھی۔ مولوی فضل احمد خاصا متاثر ہوا۔ شفقت سے بولا۔

”تو مجھے دکھی اور غم زدہ معلوم ہوتا ہے۔ تیرا گھریا نہیں؟ بال بچے تو ہوں گے؟“

”گھریا بھی تھا، بال بچے بھی تھے۔“ رحیم داد کو اپنا گھریا بوی بچے یاد آگئے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری اور تڑپ کر بولا۔ ”سب کچھ اجڑ گیا۔ کچھ بھی نہ رہا۔“

”تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“ مولوی فضل احمد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو گیمبر سٹیشن پر پچھلے دنوں ریل کا حادثہ ہوا تھا، تیرے بال بچے اس میں تو کام نہیں آگئے؟“

”نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔“

”پھر کیا بات ہے جی۔“ مولوی فضل احمد نے کرید کر پوچھا۔ ”کسی سے پرانی دشمنی چل رہی تھی جس نے تیرا گھریا جلادیا، بوی بچوں کو اٹھوا لیا؟“

”امیرہ گل بھی نہیں۔“ رحیم داد نے جھٹ کہا۔ ”بات یہ ہے جی، جب پاکستان بنا تو میں گورداس پور کے موضع نصیر پور میں تھا۔ فسادات ہوئے تو سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بہت تباہی مچائی۔ میں تو کسی نہ کسی طرح بچ نکلا اور پاکستان آگیا۔ میرے بعد گھریا والی اور بچوں پر کیا گزری، میں نوں کچھ پتہ نہیں۔“

مولوی فضل احمد گویا ہوا۔ ”ہاں جی مشرقی پنجاب کے مسلمانوں پر بہت ظلم و ستم ہوا۔“ اس نے رحیم داد کے غم زدہ چہرے کی جانب دیکھا۔ ”یہ بھی پتہ چلا، تیرے بال بچوں کا کیا بنا؟ زندہ بچے یا سب وہیں شہید ہو گئے؟“

”وڈا پتر تو راوی کے کنارے تریبوں کے پتن پر سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔ جوان دمی تھی، سکھ اسے بھی اٹھالے گئے۔“ رحیم داد افسردہ لہجے میں مقتول چودھری نور الہی کی دکھ بھری داستان اپنی ذات سے منسوب کر کے سنانے لگا۔ ”گھریا والی بچوں کو لے کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گئی۔ لہور کے والٹن کیپ میں کئی جاننے والوں نے اسے دیکھا بھی۔ میں ان دنوں منگھری کے مہاجر کیپ میں تھا۔ یہ خبر ملتے ہی لہور پہنچا۔ والٹن کیپ گیا مگر نہ گھریا والی کا کھوج لگا، نہ بچوں کا۔ اب وہ کہاں ہیں؟ کس کے پاس ہیں؟ میں نوں کچھ نہیں معلوم۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”۸ سال سے اوپر ہو گئے انھیں ڈھونڈتے ہوئے۔ جہاں کسی سے پتہ چلتا ہے، وہاں پہنچ جاتا ہوں، اسی چکر میں ادھر آگیا۔“

”میرے خیال میں تو نہ صرف اس پنڈ میں بلکہ پورے موضع میں ایسا کوئی مہاجر کنبہ نہیں ہے۔ میں انھیں جانتا بھی ہوں۔ گورداس پور کا تو کوئی نہیں۔“ مولوی فضل احمد کچھ دنا مشا کھڑا

پتہ بار پھر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”حاجی صاحب سے پوچھوں گا، شاید انھیں کچھ خبر ہو۔ وہ اس موضع کے پرانے زمیں دار ہیں۔ سب کو مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔“

رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہاں سے بھی خالی ہاتھ چلا جاؤں گا۔ پہلی بار ایسا نہیں ہوا۔ بار بار ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔“

”مایوس نہ ہو۔ میں نے کہا نا، حاجی صاحب سے پوچھ لوں گا بلکہ خود تجھے ان کے ڈیرے پر لے چلوں گا۔“

”ان کے پاس بھی چلا جاؤں گا۔ ویسے تیس خود ہی پوچھ لیتا۔“

”مسلمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ وہ تیری ضرور مدد کرے گا۔“ مولوی فضل احمد نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات سمجھ آتی ہے۔ میں جن دنوں لہان میں تھا تو لدھیانے کے ایک مولوی صاحب ملے تھے۔ وہاں مشتاق گنج میں ہوزری کا کارخانہ چلاتے تھے۔ پاکستان بنا تو وہ بھی لدھیانے سے لٹ لٹا کر لہور آگئے۔ اپنے ساتھ بیس یتیم بچے بھی لائے۔ ان کا نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں پر اتنا پتہ ہے کہ سکھر میں اب یتیم خانہ چلاتے ہیں۔ بتاتے تھے کہ وہ اور ان کے ساتھی کئی بار مشرقی پنجاب گئے اور کتنی ہی مسلمان زانیوں اور بچوں کو سکھوں اور ہندوؤں کے قبضے سے نکال کر لے آئے۔ بہت نیک بندے ہیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔“

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ان کے یتیم خانے کا کیا نام ہے ملاں جی؟“

”فیض الاسلام۔“ مولوی فضل نے بتایا۔ ”یہی نام یاد پڑتا ہے۔ ویسے سکھر میں سب اس یتیم خانے کو جانتے ہیں۔ میرا کہا مان تو سکھر چلا جا۔ امید ہے، وہاں سے تیرے بال بچوں کا سراغ مل جائے گا۔“

”چلا جاؤں گا۔ ضرور چلا جاؤں گا۔ اپنا تو برسوں سے یہی کام ہے۔ جہاں امید نظر آتی ہے، پہنچ جاتا ہوں۔“ رحیم داد کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ ”ملاں جی! میرے لیے دعا کرو، مجھے اپنے بال بچے مل جائیں۔ ان کے بغیر زندگی میں کوئی مزا نہیں۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔“

”میں تیرے لیے ضرور دعا کروں گا۔ تیرے بچھڑے ہوئے بال بچے ضرور ملیں گے۔ اللہ تعالیٰ تیری مشکل آسان کرے گا۔“

”ہاں ملاں جی۔“ اس نے آسمان کی جانب انگلی اٹھا کر کہا۔ ”اب تو اوپر والے ہی کا آسرا ہے۔“

دیکھو، کب میری سنی جاتی ہے۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”لوگ کہتے ہیں، کہاں تک انھیں تلاش کرے گا، دوسرا ویاہ کر کے گھر بسالے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انکار میں ہلایا۔ ”نہیں، یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ میں اپنی گھر والی کے سوا کسی زنانی کو نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے اور وہ بھی مجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔ بچے تو میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔ ان سب کو کیسے بھلا دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

رحیم داد نے اپنی آواز میں سوز پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر مولوی فضل اس کی باتوں سے زیادہ متاثر نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی نہ بیوی تھی نہ بچے تھے۔ شادی ہی نہیں کی تھی۔ بیوی کے انتظار میں سر اور ڈاڑھی کے بال کچھڑی ہو گئے۔ اسے مردوں کو نسلانے والا اور خیرات کی روٹی کھانے والا کی قرار دے کر کوئی اس سے اپنی بیٹی بیابنے کو تیار نہیں ہوا۔

مولوی فضل اس کی باتیں سن کر خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ ذرا دیر بعد مولوی فضل کی آواز ابھری۔ ”مجھے اب حاجی صاحب کی حویلی جانا ہے۔ وہاں میرا انتظار ہوتا ہوگا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”شہر سے کچھ منگوانا ہو تو بتا دے، لیتا آؤں گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔

”پر تو کل تک یہاں ٹھہر سکے گا؟“

”ٹھہر جاؤں گا۔ حاجی سے بھی تو ملتا ہے۔ شہر سے میرے لیے ایک کمیص اور شلوار مل جائے تو لے آتا، یہ کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔ دھونے پر بھی ٹھیک سے صاف نہیں ہوں گے۔ سرب باندھنے کے لیے پگڑی بھی خرید لیتا۔“

مولوی فضل نے نہایت مستعدی سے کہا۔ ”قمص اور شلوار تیار تو نہیں ملے گی۔ جاتے ہی کپڑا خرید کر درزی کو دوں گا۔ کون گا، واپسی سے پہلے پہلے ہی کر تیار کر دے۔“ اس نے رحیم داد کا تہہ وقامت غور سے دیکھا۔ بالشت سے قمیص اور شلوار کے لیے اس کے جسم کی ناپ لی۔ ”شلوار تو لٹھے کی ٹھیک رہے گی۔ قمیص کس کپڑے کی ہو؟“

”دھاری دار کپڑا مل جائے تو اس کی ٹھیک رہے گی۔ ویسے جو تیں نوں پسند آئے، لے آتا۔ میں پہن لوں گا۔“ رحیم داد اپنی بات کتے کتے رکا پھر اس نے پوچھا۔ ”ملاں جی، وہاں عینک بھی مل جائے گی؟“

”مل تو جانی چاہئے۔ لیکن اس کے لیے تیرا موجود ہونا ضروری ہوگا۔“

”میں وہاں کیسے جا سکتا ہوں؟ عینک کے بغیر مجھے ٹھیک سے نظر بھی نہیں آتا۔“ اس نے مولوی

کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”ذرا اپنی عینک تو دیکھ ملاں جی۔“
مولوی فضل نے اپنی عینک اتاری اور رحیم داد کو دیتے ہوئے حیرت سے بولا۔ ”اس کا کیا کرے گا؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ رحیم داد نے عینک اپنی آنکھوں پر لگائی۔ ادھر ادھر نظریں گھما کر دیکھا پھر عینک اتار کر بولا۔ ”یہ تو جی اونچے نمبروں کی ہے۔ کوئی بہت کم نمبر کی لے لیتا۔ میں اسی سے کام چلا لوں گا۔ میری عینک تو گڑھے میں گرنے کے بعد پیر کے نیچے ایسی آئی کہ بالکل چکنا چور ہو گئی۔ اسے گڑھے سے نکال لیا جائے، تب بھی کسی کام کی نہیں۔“

رحیم داد نے عینک مولوی فضل کو دے دی۔ مولوی نے عینک آنکھوں پر لگائی۔ کوٹھری میں گیا، اندر سے پرانا رجسٹراور تینسل نکال کر لایا۔ رحیم داد کے قریب آکر بولا۔ ”مجھے ڈر ہے کہیں بھول نہ جاؤں۔ تجھے جو کچھ منگانا ہے، لکھ کر اپنے پاس رکھ لوں۔ یہ ٹھیک رہے گا؟“
”جیسی تیری مرضی۔“

مولوی فضل نے کچھ نہیں کہا۔ رجسٹر کھولا اور اس کے سادہ ورق پر تینسل سے لکھنے لگا۔ رک رک کر رحیم داد سے پوچھتا بھی جاتا۔ جب وہ رحیم داد کی ہر فرمائش لکھ چکا تو اس نے رجسٹر کا ورق بھاڑا، تہہ کیا اور قمیص کی جیب میں رکھ لیا۔

رحیم داد نے کہا۔ ”تینسل اور کاغذ کی تو مجھے بھی ضرورت ہے۔ اپنا کچھ حساب کتاب لکھتا ہے۔ مجھے یہ تینسل اور کاغذ دے دے۔ تیرے جانے کے بعد اکیلا بیٹھایی کام کرتا رہوں گا۔“ رحیم داد مسکرایا۔

”ایسا کر۔ اگر تیرے کام کا نہ ہو تو یہ رجسٹر بھی مجھے دے دے۔ شہر سے دو رجسٹراور دو تینسل بھی خرید لیتا۔“

”یہ تو بہت پرانا رجسٹر ہے۔ کبھی اس میں مدر سے کے بچوں کی حاضری لگاتا تھا مگر اب تو بیکار پڑا ہے۔ تجھے چاہئے ہے تو لے لے۔“ مولوی فضل نے رجسٹر رحیم داد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ تینسل بھی دے دی۔ رحیم داد نے دھوتی کے ڈب میں ہاتھ ڈال کر پچاس روپے کے نوٹ نکالے اور مولوی فضل کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اسے روپوں سے کام چل جائے گا؟“

مولوی نے روپے لے کر گئے اور سر ہلا کر بولا۔ ”ہاں جی، ان سے کام چل جائے گا۔“ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”جو ہداری اتوں کیا کام کرتا ہے؟“ وہ لمحے بھر کے لیے ٹھنکا۔ ”توئی

”بالکل ہوں جی! جو جراثیم میں جی اپنا ڈھلائی کا کارخانہ ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے ٹھیک ٹھاک کام چل رہا ہے۔“

”بس جی! اللہ کی مہربانی ہے۔“ رحیم داد نے مولوی کی جانب دیکھ کر پوچھا۔ ”ہنڈ میں نائی تو ہو گا؟“

سر اور داڑھی کے بال بڑھ گئے ہیں۔“

مولوی فضل نے اس کے چہرے کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ ”بہت بڑھ گئے ہیں جی۔ میں ابھی“

جا کر نائی کو بھیجتا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔“

”میں کپڑے دھولیتا ہوں۔ داڑھی اور سر کے بال بنا کر نماؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔ تو نے صبح سے کچھ کھایا یا بھی نہیں۔ رات کی بجی ہوئی روٹی ہے، مروٹے“

ہیں۔ ابھی تو اسی سے کام چلا لے۔ دوپہر کی روٹی مدر سے کا کوئی منڈا لے آئے گا تو کھا لیتا۔“

مولوی فضل ایک بار پھر دالان میں گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں

مٹی کی پرات دبی تھی۔ اس میں رات کی دو باسی روٹیاں تھیں اور مٹی ہی کی ٹھوٹھی میں مروٹے

تھے۔ مولوی نے کوٹھری کی کنڈی لگائی، قفل ڈالا اور کھانے کی اشیاء دالان میں پھٹی ہوئی چٹائی پر

رکھ کر بولا۔

”لے، یہ کھالے۔ میں غریب بندہ ہوں۔ تیری اس وقت اور کوئی خاطر نہیں کر سکتا۔“ مولوی

فضل کے رویے سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ رحیم داد سے اب خاصا مرعوب ہو چکا ہے۔ وہ اپنی

ناداری اور پریشان حالی کا اظہار کرنے لگا۔

”چوہدری! اپنی تو ایسے ہی گزر بسر ہوتی ہے۔ حاجی نیک بندہ ہے۔ مدر سے کے نام پر میرے لیے

اتنا وڈا حجرہ بنا دیا۔ رات کی روٹی بھی روز اسی کے گھر سے آتی ہے۔ ویسے بھی مجھے کچھ نہ کچھ دیتا

ہی رہتا ہے۔“ اس نے تامل کیا۔ ”اب میں چلوں گا۔ دیر ہو رہی ہے۔ چوہدری! شام کو اندھیرا

ہو جائے تو چراغ جلا لیتا۔ دالان میں چراغ رکھا ہے۔ اس میں تیل بھی کافی ہے۔ ماچس بھی موجود

ہے۔ نائی بھی تھوڑی دیر میں آجائے گا۔“

مولوی فضل احمد دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ مولوی نے

دروازہ عبور کرتے ہوئے کہا۔ ”اب تجھ سے کل شام کو ملنا ہو گا۔ پریشان نہ ہوتا۔“ وہ اسے تسلی

دیتا ہوا چلا گیا۔



رحیم داد کنوئیں کے قریب گیا۔ ڈول سے پانی نکالا اور کچھ زور گندے پانی سے لہڑ

نیں دھونے بیٹھ گیا۔ کپڑے بار بار رگڑنے کے باوجود صاف نہیں ہوئے۔ صابن تھانہ تھی۔ وہ

ہاتھ بھر کے ڈنڈے سے پیٹ پیٹ کر کپڑے صاف کرنے کی دیر تک کوشش کرتا رہا۔ اس نے بھیگے

ہوئے کپڑے نچوڑے اور کنوئیں کی پختہ منڈیر پر سوکھنے کے لیے ڈال دیے۔ اس کام سے نمٹ کر

دالان میں پہنچا۔

اس نے روٹی کھائی اور مروٹے بھی کھائے۔ مروٹے ڈالتے میں مزے دار تھے۔ کھانے سے

فارغ ہو کر اس نے پانی پیا اور نائی کا انتظار کرنے لگا۔ مگر نائی نہیں آیا۔ دھوپ تیز ہو گئی۔ پھر دن

گزر گیا۔

رحیم داد رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ رہ رہ کر غنودگی کا غلبہ ہوتا۔ کچھ دیر وہ جماہیاں لیتا رہا پھر اس

نے کلیم کے کاغذات کا بستہ سرہانے رکھا اور چٹائی پر لیٹ گیا۔ وہ بار بار بند دروازے کی جانب

دکھتا۔ دروازے کی کنڈی اس نے نہیں لگائی تھی، مگر نہ دروازہ کھلا نہ کسی نے دستک دی۔ تھوڑی

دیر بعد وہ سو گیا۔

رحیم داد کی آنکھ کھلی تو کوئی اسے آہستہ آہستہ جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”میں رجب نائی ہوں۔ بال کاٹنے

آیا ہوں۔“

رحیم داد نے نائی کو غور سے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رجب نے مسکرا کر کہا۔ ”توں نے روٹی

بھی نہیں کھائی۔“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ رحیم داد نے حیرت سے اس طرف دیکھا۔ چنگیری

میں روٹیاں تھیں اور ان پر پنے کے نرم پتوں کی بکی ہوئی پٹی رکھی تھی۔ رحیم داد ایسی گہری نیند سویا

کہ اسے مطلق خبر نہ ہوئی، کون کھانا لایا اور کب رکھ کر چلا گیا؟ رجب اسے خاموش دیکھ کر بولا۔

”لگتا ہے بہت بے خبر ہو کر سویا۔“ اس نے چھت کی منڈیر کی طرف اشارہ کیا۔

”نینے پر دھوپ پہنچ گئی اور توں پڑا سو تا رہا۔“

رحیم داد نے بات بتائی۔ ”رات ریل میں سو نہیں سکا تھا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”اب دیری نہ

کر۔ نفاٹ سر اور داڑھی کے بال کاٹ دے۔“

”ایسا کر، کنارے آجا۔ چٹائی پر بال گرے تو ملاں ناراض ہو گا۔“

رحیم داد چپ چاپ اٹھا اور رجب کی ہدایت کے مطابق دالان کے ایک کونے میں جا کر بیٹھ گیا۔

رجب نے اس کے بالوں میں انگلیاں ڈال کر پھرائیں۔ ”توں نے کب سے بال نہیں کٹوائے؟ نہ نیا

نیا نہیں۔ دیکھ تو بال کیسے میلے ہو رہے ہیں۔“ وہ بال کنگھے سے سلجھانے لگا۔ ”ریل کے سفر میں تو

”جیل سے بھاگ نکلا۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”وہ ایسا لگتا تو نہیں تھا۔ سیدھا سادا نیک بندہ تھا۔ سمجھ نہیں آتی، اس نے یہ سب کیسے کیا؟“

”گل تو جی بہت لمبی ہے۔“ اس نے حجامت بناتے ہوئے کہا۔ ”پر اتنا سن لے، پچھلے دنوں رحیم داد کو بھی کتل کر دیا گیا۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے؟“

”میں نوں تجھ سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں تو اس روز احمد کوٹ ہی میں تھا، جب اس کے کتل ہونے کی خبر وہاں پہنچی تھی۔“

”یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ اس کے تو بال بچے بھی تھے۔ جانے اس خبر سے ان پر کیا ہتی ہوگی۔“

”پر اب تو اس کا وہاں گھریا رہا، نہ بال بچے۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ”وہ گھریا چھوڑ کر کہاں چلے گئے؟“

”لگتا ہے، تیں نوں کچھ بھی پتہ نہیں۔ سیف اللہ کے مرنے کے بعد اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اندھیرے میں رحیم داد کے گھر پر حملہ کیا اور آگ لگا دی۔ پورا گھر جل کر راکھ ہو گیا۔ سنا ہے سیف اللہ کے بھائی تزا تزا گولیاں چلاتے رہے۔ کوئی بھی ڈر کے مارے گھر سے باہر نہیں نکلا۔ انھوں نے رحیم داد کی کھڑی فصلیں بھی جلا دیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔

”رحیم داد کے تیں چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ چھوٹا تو آگ میں جل کر مر گیا۔ گھروالی دو کو لے کر کئی نہ کسی طرح پڑوس کے مکان میں جا کر چھپ گئی۔ حملہ آور تو پاگل ہو رہے تھے۔ اسے اور دونوں بچوں کو بھی کتل کر دینا چاہتے تھے۔ پر رحیم داد کی گھروالی ان کے ہاتھ نہیں آئی۔ ایندھن رکھنے کے اونٹے میں بچوں کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گئی، سورج نکلنے سے پہلے پہلے اندھیا رے میں بچوں کو لے کے احمد کوٹ سے بہت دور نکل گئی۔“

چھوٹے بیٹے کے جل کر ہلاک ہونے اور گھریا کی تباہی پر رحیم داد کا دل بھر آیا۔ مگر اس نے خود کو کسی نہ کسی طرح سنبھالا اور آنکھوں میں اُمڈے آنسو پی گیا۔

اسے خاموش پا کر رجب ثانی نے کہا۔ ”لگتا ہے تجھے یہ باتیں سن کر بہت دکھ ہوا۔“

”بال۔“ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ اس کی آواز گلو گیر ہو رہی تھی۔ آگے نہ بولا گیا۔ رجب ثانی چپ رہا۔ وہ سر کے بال تراش چکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”پولیس نے کوئی ڈروا، اندھیا کی؟“

بالوں اور کپڑوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب قہنجی سے بال کاٹنے لگا۔ رحیم داد ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔

”رہے، بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟“

”وہ ایسا ہوا جی، میں ہفتے بھر سے احمد کوٹ گیا ہوا تھا۔ آج جیسے ہی واپس ہوا، گھروالی نے بتایا، ملاں جی نے اپنے مسمان کے بال کاٹنے کے لیے بلایا ہے۔ بس جی، میں فنانٹ آگیا۔“

احمد کوٹ کا نام سن کر رحیم داد کسی قدر گھبرا گیا۔ اس نے گردن ذرا سی جھکا لی۔ اسے خدشہ پیدا ہوا کہ رجب کہیں اسے جانتا نہ ہو۔ مگر وہ اس کی گھبراہٹ سے بالکل بے نیاز تھا۔ اطمینان سے رحیم داد کی گدی کے بال مشین سے مونڈ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ بال کاٹنے کاٹنے اس نے کہا۔

”احمد کوٹ میں تو آج کل بار آئی ہوئی ہے۔“ رحیم داد سما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ رجب بتاتا رہا۔

”میں تو جی پہلی بار احمد کوٹ گیا تھا۔ ساتھ والے پنڈ کی ایک کڑی ادھر دیا ہی ہے۔ میں پہلے اسی پنڈ میں ہوتا تھا۔ اس رشتے سے وہ میری انگ ہوتی ہے۔ اس کے دیاہ پر تو میں جانے سا، بکھار میں پڑا تھا۔ اب اس کے میاں پتر ہوا ہے۔ اس کی جھنڈ لہائی کے لیے اس نے مجھے بلوایا۔ کتنی تھی، میں اپنے کا کے سر کے بال رجب کے سوا کسی اور سے نہیں اترواؤں گی۔ تو جی اس طرح ادھر جانا ہوا۔ چنگا وکت گزرا۔“

رحیم داد نے اس کی باتیں سن کر قدرے سکون محسوس کیا، آہستہ سے پوچھا۔ ”ادھر کتنے روز رہا؟“

”آج نواں دن تھا۔“

رحیم داد کو وہ رہ کر احمد کوٹ یاد آرہا تھا۔ احمد کوٹ اس کا آبائی گاؤں تھا۔ وہاں اس کی بیوی تھی، بچے تھے۔ وہ مدت سے ان سے مل نہیں سکا تھا۔ ان کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین بھی تھا۔

اس نے ہلکیا پتے ہوئے پوچھا۔ ”احمد کوٹ میں اپنا ایک ملنے والا ہے۔ رحیم داد نام ہے اس کا۔ وہ بھی تجھے وہاں ملا؟“

”اس رحیم داد کی بات تو نہیں کر رہا جس نے سیف اللہ کو کتل کر دیا؟“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔“ رحیم داد نے جھٹ بات بتائی۔ ”کئی سال سے میں اسے ملا نہیں۔“

”تب تو یہ بھی پتہ نہ ہوگا، اسے جیل ہو گئی تھی۔ پر وہ جیل سے بھاگ نکلا۔“

شریک ہو جائے گا۔ تسلی بھی دے دے گا۔

”پر میں رحیم داد کے بال بچوں کا پتہ کیسے چلاؤں گا؟“

”احمد کوٹ میں مجھے کسی نے بتایا تھا، رحیم داد کی گھر والی اپنے بچوں کے ساتھ اکال گڑھ میں سکول کے پچھواڑے رہتی ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”ضرور وہاں چلا جا۔ رحیم داد تیرا پرانا یار تھا۔ اس کی گھر والی اور بچوں کو اس کے مرنے کی خبر تو ہونی چاہئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”پر جس نے تجھے اس کا ٹھکانا بتایا، اسی نے یہ خبر بھی اسے پہنچا دی ہوگی۔ میں اب جا کر کیا کروں گا؟ ویسے بھی میں نے بھتیجی لوٹا ہے۔ کچھ دنوں بعد ان کے پاس چلا جاؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ رجب نائی ڈاڑھی کے بال تراشا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے ڈاڑھی گول کتراں بنا دی۔ جب رجب حجامت بنا چکا تو رحیم داد نے آئینہ لے کر اپنا چہرہ دیکھا۔ ڈاڑھی رکھنے سے اس کا حلیہ خاصا تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے خوش ہو کر دھوئی کے ڈب سے ٹول کر ایک روپے کا نوٹ نکالا اور نائی کو دے دیا۔

رفیقہ پا کر وہ ایسا نہال ہوا کہ فوراً بولا۔ ”لا، تیرے بدن کی مالش بھی کروں۔“ وہ بہت مسرور نظر آ رہا تھا۔ بال اور ڈاڑھی بنانے کی اجرت اسے توقع سے بہت زیادہ ملی تھی۔ ”میں تو مالش کے لیے تیل نہیں۔ میں گھر سے سرسوں کا تیل لے کر آتا ہوں۔ مالش سے ساری تھکن دور ہو جائے گی۔“

مگر رحیم داد مالش کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔ ”نہیں رجب! میں نوں اب نہاتا ہے۔“

”نہالیتا۔ آرام سے نہالیتا۔ ایسی بھتیجی کیا ہے؟ میرا کہا مان، مالش کے بعد نہا۔ دیکھ تو بدن میں کیسی چستی آ جاتی ہے۔ جھڑپا لگانے کو جی کرے گا۔ اپنے پنڈ کے زمیں دار حاجی صاحب تو ہر جیسے کو پہلے مجھ سے مالش کرواتے ہیں، تب نہاتے ہیں۔“

رحیم داد اس کے اصرار کرنے پر بھی راضی نہ ہوا۔ جب سے اپنے چھوٹے بیٹے کی موت اور گھر بار کی تباہی کی خبر مئی تھی، اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ رجب سے جلد سے جلد پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے اب نہانا ہے، شام ہو رہی ہے۔“ وہ کنویں کی جانب بڑھا۔

رجب نے مزید اصرار نہیں کیا، چپ چاپ باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازے کی کندی لگائی، دالان میں گیا اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل بے اختیار بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”کچھ بھی نہیں ہوا جی۔ سیف اللہ کے بھائی شان سے بھڑکیں مارتے پھرتے ہیں۔ ان کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے؟ ان کا ایک شریکا وزیر جو لگا ہے۔ ان کی تو سمجھو، آج کل حکومت ہے۔ جب رحیم داد کے کتل کی خبر آئی تو سیف اللہ کے بھائی بہت خوش تھے۔ پنڈ میں اینڈے پھرتے تھے۔“ رحیم داد خاموش رہا۔ رجب سر کے بال تراش کر سامنے آ گیا۔ ”توں نے کب سے ڈاڑھی کے بال نہیں کٹوائے۔ دیکھ تو بالوں کے کیسے جیسے ہو گئے ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”لگتا ہے، نئی نئی ڈاڑھی چھوڑی ہے۔“ رحیم داد پھر بھی خاموش رہا۔ مگر رجب خاموش نہیں ہوا، پوچھنے لگا۔ ”کس سوچ میں پڑ گیا۔“

”مجھے رحیم داد یاد آ رہا ہے۔ مرنے والا برا بندہ نہیں تھا۔ رجب تو اسے نہیں جانتا۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے، احمد کوٹ کے دوسرے بندے بھی یہی کہتے تھے۔ میں جس کے گھر جھنڈا لٹائی پر گیا تھا، اس کا نام شیداں ہے۔ شیداں کا گھر والا بھی رحیم داد کی بہت تعریف کرتا تھا۔ پر جی، ابھی تو سبھی سیف اللہ کے بھائیوں سے ڈرتے ہیں۔ جسے جی چاہیں پکڑوا دیں، جسے چاہیں مکدے میں پھنسا دیں۔ تھانے دار، تحصیل دار سبھی ان کے کہنے پر چلتے ہیں۔ انھوں نے رحیم داد کی زمین پر بھی کبفہ کر لیا۔ کسی نے کچھ نہیں کیا۔ رحیم داد کی گھر والی ہوتی تو کوئی کنوئی کارروائی کرتی۔ اب تو رحیم داد کا وہاں کوئی نہیں رہا۔“

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ ”رجب! تجھے یہ بھی خبر ملی، رحیم داد کے بال بچے اب کہاں ہوتے ہیں؟“

”سنا ہے جی، وہ اکال گڑھ میں ہیں۔“

”کس کے پاس رہتے ہیں؟“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔“ رجب نے ڈاڑھی کے بال تراشتے ہوئے بتایا۔ ”کسی شریکے بارشتے دار ہی کے پاس رہتے ہوں گے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”توں ان کے پاس جانا چاہتا ہے؟“

”ارادہ تو نہیں، تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔ ایک زمانے میں تو رحیم داد سے میری بہت یاد تھی۔“

”تب تو اس کی گھر والی بھی تجھے جانتی ہوگی۔ پر جانے اسے یہ بھی پتہ ہے، رحیم داد مر گیا۔ مجھے ہی دنوں تو اس کا کتل ہوا ہے۔ اتنے تھوڑے دنوں میں اسے کیسے ملوم ہو جائے گا۔“ رجب نے قہقہے چلاتے چلاتے ہاتھ روک لیا۔ ”ایسا کر، جا کر انھیں خبر کر دے۔ اس کے سامنے میں بھی

دھوپ اب گرمی زرد پڑ گئی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا، سائے طویل ہو گئے تھے۔ رحیم داد سکیاں بھرتا رہا۔ کھانا اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس پر توجہ نہ دی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔

جب رو دھو کر دل کی بھڑاس ذرا کم ہوئی تو اس نے طے کیا کہ وہ نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ ضرور جائے گا۔ وہ انھیں دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے بے قرار تھا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ اٹھ کر کنویں کے پاس گیا۔ پانی نکالا اور دھوتی اتار کر نہانے لگا۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ رحیم داد کو اپنا جسم سلگتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد قدرے سکون ملا۔ اب اس کے کپڑے سوکھ چکے تھے۔

اس نے کپڑے پہنے اور دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔ وہ دیر تک کھویا کھویا بیٹھا رہا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام آگن کے در و دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگی۔ دن کے ہنگامے سرد پڑ چکے تھے۔

ہر طرف شام کا سناٹا پھیلنے لگا تھا۔ گھروں کو لوٹتے ہوئے کسانوں اور مویشیوں کی آوازیں شام کی بڑھتی ہوئی خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

جب اندھیرا بڑھ گیا تو رحیم داد اٹھا اور طاق میں رکھا ہوا چراغ روشن کر دیا۔ قریب ہی چٹائی پر کھانا رکھا تھا۔ اس نے ایک روٹی توڑ کر پنے کے ساگ کے ساتھ چند لقمے کھائے۔ روٹی خشک اور ٹھنڈی تھی۔ وہ پوری روٹی نہیں کھا سکا۔

اس نے اٹھ کر مٹی کے پیالے میں قریب رکھے ہوئے گھڑے سے پانی نکالا اور پورا پیالہ خالی کر دیا۔ رحیم داد کچھ دیر جاگتا رہا پھر چٹائی پر لیٹ کر سو گیا۔

سویرے سو کر اٹھا تو اس نے چنگیری میں رکھی ہوئی باسی روٹی کھائی، پانی پیا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا اس بے کھجور تاربا جس میں کلیم کے کاغذات تھے۔

اس نے بے کھولا، کاغذات نکالے اور ان کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ اس نے چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ دو بہنیں تھیں مگر ایک بچپن ہی میں مر گئی تھی۔ اسی لیے وہ ماں باپ کا بہت لاڈلا تھا۔ باپ معمولی زمین دار ہونے کے باوجود اسے اچھی تعلیم دلانا چاہتا تھا۔ مگر رحیم داد نے پڑھنے لکھنے میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اس واجبی تعلیم کے باوجود سرکاری اور قانونی دستاویزات نہ صرف پڑھ سکتا تھا بلکہ انھیں بخوبی سمجھ بھی سکتا تھا۔ اس کا جب مقدمے بازی تھی۔ وہ دو سال سے اوپر سیف اللہ کے ساتھ مقدمے بازی کرتا رہا۔ اس سے پہلے

بھی وہ پانی کے جھگڑے پر کئی سال تک مقدمہ لڑتا رہا۔ وہ ہر مقدمے کے کاغذات بڑے غور سے پڑھتا۔ جو قانونی نکتہ سمجھ میں نہ آتا، اسے اپنے وکیل سے سمجھنے کی کوشش کرتا۔ مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر وکیل سے بحث بھی کرتا اور اسے مشورہ بھی دیتا۔ مقدمے لڑتے لڑتے اسے مقدمے بازی کا چسکا پڑ گیا تھا۔ وہ خود کو کسی وکیل سے کم ماہر قانون نہیں سمجھتا تھا۔ جیل میں لالی اور دوسرے قیدیوں سے بڑے جوش میں کہتا تھا کہ پولیس سیف اللہ کی کھلم کھلا طرف داری نہ کرتی تو اسے کبھی سزا نہ ہوتی۔ اس کا مقدمہ بہت مضبوط تھا۔ مقدمے کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوتا۔

رحیم داد نے غیر ضروری دستاویزات اور درخواستیں علیحدہ کر لیں اور اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق وہ کاغذات اور دستاویزات محفوظ کر لیں جن کی بنیاد پر متروکہ جائیداد کا الاٹمنٹ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ اس نے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات کپڑے میں دوبارہ پیٹ کر رستہ بنالیا اور غیر ضروری کاغذات اور درخواستیں آگن کے ایک کونے میں رکھ کر مچاس سے آگ لگا دی۔ انھیں جلا کر اس طرح تلف کر دیا کہ صرف راکھ رہ گئی۔

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے وہ رجسٹر نکالا جو اسے مولوی فضل احمد نے دیا تھا۔ اس نے جینسل اٹھائی اور ایک ایسی سرکاری دستاویز سامنے رکھی جس پر چوہدری نور الہی کے تصدیق شدہ دستخط تھے۔ وہ جینسل سے رجسٹر کے سادے ورق پر چوہدری نور الہی کے دستخط کی ہوہو نقل اتارنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس کوشش میں اس نے کئی ورق سیاہ کر دیے۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ سورج چڑھ کر بیچ آسمان پر آگیا، دھوپ ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ وہ سر جھکائے اپنے کام میں منہمک تھا کہ اسی اثنا میں دروازے پر آہٹ ہوئی۔

رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا، بستہ کھول کر اس میں دستاویز اور رجسٹر رکھا اور کپڑے میں گرہ لگا کر رستہ بند کر دیا۔ اٹھ کر دروازے پر گیا۔ کنڈی کھولی۔ گاؤں کا ایک لڑکا اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا لیا، دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کھانا سنبھالے ہوئے دالان میں گیا۔ کھانے میں روٹیاں تھیں، سرسوں کا ساگ تھا اور پیاز کی گٹھی تھی۔

اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور پانی کا بھرا ہوا پیالہ چڑھا کر لیٹ گیا، مگر سویا نہیں۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اٹھ بیٹھا۔ بستہ کھولا، رجسٹر نکالا، جینسل نکالی، دستاویز سامنے رکھی اور مقتول چوہدری نور الہی کے دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔



شام ہو گئی۔ رحیم داد نے چراغ روشن کیا۔ عین اسی وقت دروازے پر کسی نے دستک دی۔

رحیم داد دروازے پر پہنچا، کندھی کھولی۔ توقع تھی کہ مولوی فضل احمد ہو گا مگر وہ مولوی فضل احمد نہیں تھا۔ اس کی سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ وہ تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے گردے اٹے تھے۔ وہ نوجوان تھا۔ بدن مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کا کرتا پہن ہوئے تھا۔ اس کی دھوٹی ملنگی تھی۔ سربرہنہ تھا۔ اس کے لمبے لمبے پٹے کانوں سے نیچے تک ملے ہوئے تھے۔ ان پر خاک کے ذرات بکھرے تھے۔ ہاتھ میں لمبی ڈانگ تھی۔ جسم سے پسینے کی بواٹھ رہی تھی۔ وضع قطع سے وہ کسان لگتا تھا۔ اس نے شام کی دھندلی روشنی میں رحیم داد کو غور سے دیکھا اور حیرت سے بولا۔

”تو مجھے ملاں تو نہیں لگتا۔“

”ہاں میں ملاں نہیں ہوں۔ ملاں شہر گیا ہے۔“

”ملاں جی کی کب تک واپسی ہوگی؟“

”کہتا تھا، آج عشاء کی نماز سے پہلے لوٹ آئے گا۔“

”ٹھیک ہے، تب تو وہ آتا ہی ہو گا۔ میں اس کا انتظار کر لوں گا۔“ وہ آنگن میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ ”میرا نام نور دین ہے جی۔“

رحیم داد نے خاموشی سے دروازہ بھینڑ دیا۔ دونوں چپ چاپ دالان میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ نور دین تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ دالان کے تھم کا سہارا لیے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔

”ملاں جی کے پاس تیرا کیسے آتا ہوا؟“

”کیا بتاؤں جی! ایک چکر میں پڑ گیا ہوں۔“ نور دین نے بیزارگی سے کہا۔ ”اسی کے لیے ملاں کے پاس آیا ہوں۔“

”ملاں سے تعویذ شویز لیتا ہے؟ جھاڑ پھونک کرانی ہے؟“

”نہیں جی، ایسی کوئی گل نہیں؟ یہ دوسرا ہی چکر ہے۔“

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ”نورے! تو مجھے پریشان دکھائی دے رہا ہے۔“

نور دین نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”پانی ہو تو پلا دے۔ مجھے تو جیسے بھڑکی لگ گئی ہے۔ جتنا پانی پیتا ہوں، اتنی ہی زیادہ پیاس لگتی ہے۔“

رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ ”بھوکا بھی لگتا ہے۔ روٹی رکھی ہے، کھالے۔“ اس نے دن کے بچے ہوئے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں، مجھے صرف پانی پلا دے۔“

رحیم داد خاموشی سے اٹھا، ملکے سے پیالے میں پانی نکالا اور نور دین کے پاس گیا۔ پیالہ ہاتھ میں لے کر وہ ایک ہی سانس میں غٹاٹ سارا پانی پی گیا۔ رحیم داد اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ باہر آنگن میں رات کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ دونوں چراغ کی دھندلی روشنی میں خاموش بیٹھے رہے۔ کچھ دیر بعد نور دین نے پوچھا۔

”ملاں جی نے آج ہی رات آنے کو کہا تھا ناں؟“

”مجھ سے تو یہی کہہ کر گیا تھا۔ فکر نہ کر، ملاں آتا ہی ہو گا۔“

”میں ۱۳ میل سے زیادہ ہی پیدل چل کر آیا ہوں۔ ملاں سے مل کر ہی جاؤں گا۔ رات یہیں ٹھہر جاؤں گا۔ ملاں سے ملنا بہت ضروری ہے۔“

”کوئی بہت ہی ضروری کام ہے؟“

”ہاں جی ضروری ہی کام ہے۔“ نور دین نے رحیم داد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نوں کیسہ پتہ میں کس پریشانی میں ہوں۔“ اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں، چہرے پر جھنجھلاہٹ آگئی۔ ”اٹھ مہینے سے اوپر ہو گئے چکر کاٹنے ہوئے۔ اب کے میں دو ٹوک بات کر کے ہی جاؤں گا۔“ وہ کندھے پر پڑی ہوئی چادر سے پسینہ پونچھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدستور جھنجھلاہٹ تھی۔ وہ بے چین بھی نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے اسے اس قدر پریشان دیکھا تو دل جوئی کرنے کے انداز میں نرمی سے دریافت کیا۔

”نورے! بات کیا ہے؟ تو کہے تو میں ملاں جی سے تیرے لیے بات کروں۔ وہ میرا کہا مان لے گا۔“

رحیم داد کے نرم لہجے اور اظہار ہمدردی پر نور دین کسی قدر متاثر ہوا۔ ”گل ایسہ ہے جی۔ میرا باؤ اس پنڈ کے زمیں دار حاجی کے پاس ہے۔ یوں سمجھ، حاجی نے اسے دھرو رکھ چھوڑا ہے۔“

”حاجی یہ کام بھی کرتا ہے۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”حاجی سے ادھار شدہ ہار لیا ہو گا، ورنہ وہ تیری گھروالی کو کیسے اپنے پاس دھرو یا گروی رکھ سکتا ہے۔“

”نہیں جی، میں نے اس سے کوئی ادھار شدہ ہار نہیں لیا۔“ نور دین نے تکیے لہجے میں کہا۔ ”گل کچھ اور ہی ہے۔“

”گول مول بات نہ کر۔“ رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”بتانا ہے تو صاف صاف بتا۔“

”گل تو بہت لمبی ہے۔ وہ ایسا ہے جی۔ میرے پیو کے پاس تین کلا زمین ہے۔ وہ تھ راوہ ہے۔“

خود ہی کھیتی باڑی کرتا ہے۔ بہت تنگی میں گزر بسر ہوتی تھی۔ میں جوان ہوا تو لاوی ہار بن گیا۔ مزدوری پر دوسروں کی فصل کی واڈھی کرتا تھا۔ میں کئی سال لاوی ہار رہا۔ فیراپنے پنڈے کے لمبردار میاں داد سے ادھلا پی پر ۲۷ کنال زمین لے لی۔ بہت خراب اور پڑیلی زمین تھی۔ اس پر جھنگر تھا۔ میں نے زبردست محنت کی۔ جھاڑیاں کاٹ کے صاف کیں۔ زمین تیار کی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ ”نہ بچھ“ میں نے کتنی محنت کی۔ ادھار لے کر ایل چنبلی خریدی، بوائی کی۔ ہر فصل بہت چنگی ہوئی۔ انورندا کے حساب سے فصل کا آدھا اور اوپر سے اٹھواں حصہ بھی زمیں دار کو دے کر میرے پاس اتنا بچنے لگا کہ میں نے ادھار ادا کر دیا۔ تیسرے سال ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد پونے میرا دیاہ کر دیا۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نور دین دالان کے قہم سے پیٹھ ٹکائے آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ ”راجو میری گھر والی بن کر آئی تو فصل اور چنگی ہونے لگی۔ وہ محنت کرتی، روٹی پکاتی، دوپہر کو میرے لیے کھیت پر بھتا لے کر آتی۔ مویشیوں اور ڈنگروں کے لیے سویرے ہی سویرے دھتا بھتا کرتی۔ چانی میں دودھ بلو کر مکھن نکالتی۔“ اس نے کھکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔

”فصل تیار ہونے کے بعد میں راجو کو اس کی دیکھ بھال پر لگا دیتا۔ وہ کھیتوں میں پانی لگاتی اور نگرانی بھی کرتی۔ میں لاوی پر فصلیں کاٹنے نکل جاتا یا شہر میں محنت مزدوری کرتا۔ ہم دونوں مل کر محنت کرتے۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی تھی۔ فیراپسا ہوا جی، ایک رات پنڈ میں دھاڑا پڑا۔ شور مچا تو میں بھی نکل آیا۔ ہاتھ میں ڈانگ بھی تھی۔ ڈاکوؤں کو مار بھگایا۔ انھیں دور تک کھدیرتا ہوا گیا۔“

رحیم داد نے نور دین کو غور سے دیکھا، مسکرا کر بولا۔ ”دیکھنے میں بھی تو زور آور لگتا ہے۔“ نور دین اس کی بات نظر انداز کر کے بتاتا رہا۔ ”نوجی، میں نے تو ڈاکوؤں کو بھگا کر اپنے تئیں نیک کام کیا پر یہی نیکی گلے پڑ گئی۔ میاں داد نے دوسرے ہی روز سویرے سویرے مجھے اپنی حویلی پر بلایا۔ میری پیٹھ ٹھوکی۔ بہت شاباش دی۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”کچھ ہی روز پہلے پنڈ میں میلہ لگا تھا۔ اس میں دنگل بھی ہوا۔ دوسرے پنڈ کے بھی پلوان اس میں کشتی لڑنے آئے تھے۔ میں نے اس دنگل میں اپنے سے کٹڑے پلوان کو بچھا دیا۔ بہت واہ واہ ہوئی جی۔ یار۔ بیلوں نے مجھے کندھے پر بٹھا کر پنڈ کا چکر لگایا۔ ڈھولیوں نے ڈھولوں پر زور زور سے چومیں لگائیں۔ میاں داد نے بھی میری جیت کا یہ جشن دیکھا۔ بہت خوش لگتا تھا۔“

”میاں داد کو تو خوش ہونا ہی چاہئے تھا۔ اس کے پنڈ کا نام اونچا ہوا تھا۔“

”اب آگے کی سنو۔ میاں داد مجھ سے کچھ دیر ادھر ادھر کی گپ شپ کرتا رہا۔ فدا اگ لے جا کر

مجھ سے ایسا کام کرنے کو کہا کہ میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے مجھے رجھانے کی بہت کوشش کی۔ میں تیار نہ ہوا۔ بس جی اس بات پر وہ مجھ سے سخت نراض ہو گیا۔“

رحیم داد نے بے چینی اور حیرت سے پوچھا۔ ”وہ تجھ سے کیا کام کروانا چاہتا تھا؟“

”کل امہ ہے جی۔ وہ زبردست رسا گیر ہے۔“ نور دین نے حیکمے لہجے میں بتایا۔ ”وہ مجھ سے ڈنگروں کی چوری کرانا چاہتا تھا۔ میں ایسا گندا دھندہ کیسے کرتا۔ پہلے تو اس نے مجھے تنگ کرنے کے لیے فصل کی بٹائی پر جھگڑا کیا۔ بٹائی کے لیے اپنے وندٹاؤ لے کر آیا۔ مجھے کم راہ کی دی اور اپنے حصے سے زیادہ غلہ اٹھوا کر لے گیا۔ میں چپ رہا پر وہ مجھے تنگ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے مجھے بے دکل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی کچھ نہ چلنے دی۔ بس مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ اسی غلطی نے لاوی کے لیے پنڈ سے باہر چلا گیا۔ میں نے اس دفعہ اپنی فصل کی پہلے ہی واڈھی کر لی تھی۔“

رحیم داد بچ میں بول پڑا۔ ”غلطی کی اس میں کون سی گل ہے۔ تو ہر فصل کی تیاری کے بعد لاوی پر جاتا ہی تھا۔“

”پر اس دفعہ مجھے پنڈ سے جانا نہیں چاہئے تھا۔ میاں داد سے دشمنی جو ہو گئی تھی۔“ نور دین نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں ادھر لاوی پر دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر رہا تھا، ادھر ایک رات زمیں دار نے اپنے بد معاشوں اور کرندوں کو میرے گھر بھیجا۔ وہ منہ پر منڈا سا باندھ کر آئے اور راجو کو اٹھا کر لے گئے۔ میں ہفتہ بھر بعد واپس آیا۔ راجو کو نہ پایا تو بہت پریشان ہوا۔ پڑوسیوں سے پوچھا۔ کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ میرے پیو کو بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ جن کو پتہ تھا وہ زمیں دار کے ڈر سے چپ رہے۔“

”تھانے میں پر چا چاک نہیں کرایا؟“

”خود تھانے گیا تھا۔ پر تھانے دار نے رہٹ نہیں لکھی۔ کئی بار تھانے کے چکر لگائے۔ کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ایک پولیسا جاننے والا تھا۔ اس سے معلوم ہوا، تھانے دار کی میاں داد سے باری ہے۔ اس لیے وہ کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔ میں نے اوپر درخواست لگائی۔ بہت بھاگ دوڑ کی بکچھ بھی نہ ہوا۔“ نور دین نے گہری سانس بھری۔

”جب میں راجو سے مایوس ہو چکا تو ایک شام زمیں دار نے مجھے اپنے ڈیرے پر بلایا۔ اس روز مجھے معلوم ہوا، راجو کو میاں داد نے اپنے پنڈ سے دور یہاں دیدار پور میں حاجی حبیب کے پاس پہنچا دیا ہے؟“

”راجو کو اس نے اپنی حویلی میں کیوں نہیں رکھا؟ حاجی کے پاس کیوں پہنچا دیا؟“

”جگل اصلی ایسہ ہے جی، دونوں ہی رسا گیر ہیں۔“ نور دین نے تعنی سے کہا۔ ”دونوں چوری کے ڈھور ڈنگر اٹھوا کر ایک دوسرے کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ مانو پولیس چھاپا مارے بھی تو راجو اس کی حویلی سے برآمد نہ ہو۔“ وہ چند لمحے خاموش رہ کر گویا ہوا۔

”میں نے زمیں دار کی بہت منت کی تو اس نے راجو کی واپسی کے لیے یہ شرط لگائی، میں اس کے لیے ڈنگروں کی چوری کروں۔ دس ڈنگروں کی چوری کے بعد اس نے راجو کو واپس کرنے کا وعدہ کیا۔“

”تو نے میاں داد کی یہ شرط مان لی؟“

”ہاں جی، ماننی ہی پڑی۔ پولیس کو اور اوپر والوں کو سبھی کو آزمایا۔ کسی نے میری کوئی مدد نہیں کی۔“

”تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔“

”مستجاب کیا کیا ہوا۔“ نور دین بتانے لگا۔ ”تو جی اس طرح میں مویشی چور بن گیا۔ رات کے اندھیرے میں میاں داد کی حویلی سے نکلتا۔ کبھی اکیلا ہوتا، کبھی دوسرے مویشی چور بھی ساتھ ہوتے۔ دور دور کے پنڈے ڈنگر چراتا۔ کھرے کے نشانات مٹانے کے لیے مویشیوں کے پیروں میں کھسے ڈالتا۔ لادھ ہوتا تو پیچھا کرنے والوں پر پلٹ کر حملہ بھی کرتا۔ کبھی ان کو بھگانے کے لیے گولی چلائی، کبھی غلط رستے پر ڈالنے کے لیے وڑوچ سے بھی کام لیا۔ کئی بار پکڑے جانے سے بال بال بچا۔ چوری کے مویشی چھپانے کے لیے میاں داد نے اپنا اہر دور جھل میں بنایا ہے۔ چوری کے بعد مویشی وہاں پہنچتا۔ فیر تو جی میں نے کسی نہ کسی طرح دس مویشی میاں داد کے لیے چرائے۔“

اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ”مویشیوں کی اس چوری میں سب سے زیادہ دکھ مجھے دوبار ہوا۔ میں نے دو مزارعوں کے ڈنگے چرائے اور اس لیے چرائے کہ میاں داد انھیں بے دھل کرنا چاہتا تھا۔ جب ڈنگے نہ رہے تو وہ ہل کیسے چلاتے۔ دونوں برباد ہو گئے۔ پنڈ چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک کے بارے میں تو سنا ہے ملتان میں بھیک مانگتا ہے۔ گھر والی بھی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ ایک پتر تھا، اسے بھی ساتھ لے گئی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے یہ سب کچھ راجو کے لیے کیا۔ وہ تب بھی نہ ملی۔“

”ایسا کیوں ہوا؟“ رحیم داد نے چونک کر سوال کیا۔ ”تو نے تو زمیں دار کی شرط بھی پوری کر دی تھی۔“

”میں نے یہی بات زمیں دار سے کہی تھی۔ جب میں نے اس کے لیے دس مویشی چرائے تو اس نے مجھے کہا، ویدار پور چلا جا اور حاجی حبیب کی مازنی سے راجو کو واپس لے آ۔ میں اس کے کہنے پر ہاں حاجی کے پاس آیا۔ وہ صاف مکر گیا۔ مجز کر بولا، میرے پاس کوئی راجو شاہو نہیں۔ میاں داد نے تجھے بھکا دیا۔ میں ایسا گنداکام نہیں کرتا۔ اس کی باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔ واپس میاں داد کے پاس گیا۔ میں نے اسے ساری بات بتائی۔ وہ شرمندہ ہونے کی بجائے ٹھٹھا مار کر ہنس، میری پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگا۔ مل جائے گی، تیری راجو ضرور مل جائے گی۔ پہلے میرا ایک کام کر دے۔ اس دفعہ اس نے بہت خطرناک کام بتایا۔“

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”مویشی چوری سے بھی زیادہ خطرناک؟“

”ہاں جی، اس سے بھی زیادہ خطرناک۔ ہوا یہ کہ ایک کھوجی نے میاں داد کے اہر کا کھوج نکال لیا۔ وہاں سے چوری کے کئی مویشی پکڑے گئے۔ میاں داد جیل جاتے جاتے بچا۔ کئی ہزار روپے رشت میں دینے پڑے۔ خود میاں داد کے اپنے کرندے، بھولا نے مرخائی کے لالچ میں تجبڑی کی تھی۔ وہ بھاگ کر کریشیوں کے پاس چلا گیا۔ وہ جی بہت وڈے زمیں دار ہیں۔ ان کی ہزاروں کھلا زمین ہے۔ اوپر بھی ان کی پہنچ ہے۔ میاں داد کو جب بھولا کی غداری کا علم ہوا تو سخت نراض ہوا۔ وہ چاہتا تھا میں بھولا کا خون کر دوں۔ میاں داد کی بات سن کر میں چپ رہا۔ دو روز تک سوچتا رہا۔ کریشیوں کے علاقے میں گولی چلانا آسان کام نہیں۔ وہاں تو مانوان کی حکومت ہے۔ تھانہ، پولیس، سب کچھ ان کا ہے۔“

نور دین لمحے بھر خاموش رہ کر بتانے لگا۔ ”ادھر میاں داد کو ملوم ہو گیا، میں بھولا کا خون کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ اس نے رات کو مجھے بلایا۔ بہت نراض ہوا۔ کار بین میرے ہاتھ میں دے کر بولا۔ بھولا کو ختم کر کے آنا ورنہ مجھے اپنا منہ نہ دکھانا۔ تجھے رات بھر کی مملت دیتا ہوں۔ کام نہ ہوا تو راجو تو تجھے ملے گی ہی نہیں اور تو بھی اس سے ملنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔ ہاں، کام پورا کر کے آیا تو راجو کو اپنے ساتھ لے جانا۔ یہ میرا تجھ سے پکا وعدہ رہا۔ اس کے نراض ہونے سے میں ڈر گیا۔ راجو کو بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں تیار ہو گیا۔ میاں داد کے کرندوں نے اسی رات مجھے کریشیوں کی زمینوں کے نزدیک پہنچا دیا۔“

”کرندے اس کام میں شریک نہیں ہوئے؟“

”توبہ کرو جی۔ وہ مجھے چھوڑ کر فوراً اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں آگے گیا اور رات بھر درختوں کے نیچے بھولا کی گھات میں بیٹھا رہا۔ ابھی صبح کا ذرا اجالا ہوا تھا، کیا دیکھتا ہوں، بھولا اپنے

گھر سے نکلا اور ادھر ادھر دیکھتا ہوا سامنے کے نیائین کی طرف بڑھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ سویرے سویرے ٹٹی کے لیے نیائین ضرور جائے گا۔ میں نیائین کے سامنے ہی اندھیرے میں درلکا بیٹھا تھا۔ جیسے ہی وہ دھوٹی اٹھا کر بیٹھا، میں نے جھٹ اس پر گولی چلائی۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ وہ چیخ مار کر اٹھا۔ میں نے دوسری گولی چلائی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ میں نے اسے زمین پر ترپتے دیکھا اور کھیتوں کے اندر اندر رستہ بناتا ہوا بھاگا۔ کریشیوں کی مسلح کردے گولی کی آواز سننے ہی شور مچاتے پہنچے۔ انھوں نے میرا پیچھا بھی کیا۔ بار بار گولیاں چلائیں، پر میں بچ کر صاف نکل آیا۔

”تو نے کمال کر دیا۔“ رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”کریشیوں کی زمیں داری سے اس طرح بچ کر نکل آنا معمولی بات نہیں۔“

”پر میرا کام تب بھی نہ بنا۔“ نور دین نے ہجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میاں داد نے مجھے فیہ حاجی حبیب کے پاس بھیجا۔ اس دفعہ حاجی نے یہ تو بتایا، راجو اس کی ماڑی میں ہے پر اس نے راجو کو دیا نہیں۔ کہنے لگا، کچھ دنوں بعد آتا۔ میں نے میاں داد کو بتایا۔ اس نے مجھے اپنے منشی کے ساتھ حاجی کے پاس بھیجا۔ حاجی نے فیہ ٹال مٹول سے کام لیا۔“ اس نے گہری سانس لی۔ ”میں بار بار حاجی کے پاس جاتا، وہ مجھے لارے لپے دیتا۔ پچھلے دنوں اس کے پاس آیا تو اس نے نئی گل بات کہی۔“

”کیا نئی گل کہی؟“

”حاجی نے کہا، جو زنانی اٹھ مہینے تک دور رہی، وہ اب تیرے ساتھ کیسے رہ سکتی ہے۔ یہ شرعی مسئلہ ہے، مسجد کے ملاں سے پوچھنا پڑے گا۔“

”اس چکر میں پڑا ہی کیوں؟ میاں داد سے کہتا، وہ خود تیری گھر والی کو حاجی کے پاس سے واپس لائے اور تیرے حوالے کرے۔ تیری تو اس سے یہی بات طے ہوئی تھی نا؟“

”میں نے میاں داد سے پہلے ہی کہا تھا۔ مگر جب میں نے زیادہ زور دیا تو وہ ایک دم گرم ہو گیا۔ دھمکی دینے لگا کہ بھولا کے کتل کے الزام میں مجھے پولیس کے حوالے کر دے گا۔ میں تو جی یہ بات سن کر ہی ڈر گیا۔ ویسے بھی ان دنوں بھولا کے کتل کے سلسلے میں پولیس نے زبردست بھاگ دوڑ چا رکھی تھی۔ کریشیوں نے بہت زور ڈالا۔ پولیس تو مجھے پکڑ کر لے بھی جاتی پر میاں داد نے بچار کھا تھا۔ وہ کریشیوں کے اتنا ڈاڑ زمین دار تو نہیں پر اس کے بھی شریکے اور رشتے ناتے دار دڑے سرکاری افسر لگے ہیں۔“

نور دین سر جھکا کر چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب تو جی، حاجی ہی میرا کام کر سکتا ہے۔ اسی لیے میں ملاں کے پاس آیا ہوں۔ پہلے بھی آیا تھا۔ ملاں کی منت سماجت کی تو

اس نے کہا اسے ملتان جانا ہو گا۔ شرعی مسئلہ ہے، وہاں کے مفتی سے فتویٰ لینا ہو گا۔ اب تک تو وہ نپٹی لے آیا ہو گا۔“

اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ ”تو کہتا تھا، ملاں تیری بات مان لے گا۔ توں بھی ملاں سے کہتا، میرا بازو مجھے مل جائے، تیری بہت مہربانی ہو گی۔“ رحیم داد گردن جھکائے اس طرح خاموش بیٹھا رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ نور دین نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھا تو کرایہ کر دیا۔

”کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”سوچ رہا ہوں، میاں داد تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔“

”بے دخل کرنا چاہتا ہے تو کر دے۔“ وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ ”جب سے راجو گئی ہے، زمین کا ستیاناس ہو گیا۔ میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟ وہ میرے ساتھ برابر سے کام کرتی تھی۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بنا میں کیسے کھیتی باڑی کر سکتا ہوں۔“ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

”غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے، میاں داد اور حاجی حبیب، دونوں نے اس معاملے میں مسکوٹ کر رکھی ہے۔ میاں داد تجھے بے دخل کر کے زمین، تھینا چاہتا ہے۔ حاجی تیری گھر والی کو اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ دونوں یہی چاہتے ہیں، رسا گیری کے دھندے میں تجھے استعمال کریں۔ تجھ سے مویشیوں کی چوری کرائیں، خون کرائیں، ڈکیتی کروائیں۔ تیں نوں پتہ نہیں، سارے ہی دڑے زمین داری دھندا کرتے ہیں۔“ اس نے انگلی سے سر کھجاتے ہوئے نور دین کی جانب نظریں اٹھائیں۔ ”نورے! مجھے تو راجو کا واپس ملنا مشکل ہی نظر آتا ہے۔“

”ایسا نہ کہہ۔“ نور دین تڑپ کر بولا۔ اس نے جھٹ دھوٹی کے ڈب سے دہی ساخت کا پنتول نکالا۔ ”میں حاجی اور میاں داد دونوں کو جان سے مار دوں گا۔“

”ایک تو یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا سمجھتا ہے۔“ رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”غیر یہ بھی تو سوچ، تو خود بھی پھانسی پر لٹک جائے گا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”راجو کا خیال اپنے دل سے نکال کیوں نہیں دیتا؟“

”نہیں جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ راجو میرا بازو ہے، میں اسے نہیں بھول سکتا۔“ نور دین نے بڑے

جوش سے کہا۔ ”ویسے مجھے راجو سے پیار بھی ہے۔ اب مجھے ویسی گھروالی کہاں ملے گی؟ وہ زبردست مخفی اور اہری ہے۔“



آنگن کا دروازہ کھلا۔ دونوں نے چونک کر دیکھا، چراغ کی دھندلی روشنی میں ایک عورت سر پر کھانے کی چنگیر رکھے اندر داخل ہوئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ نور دین نے پستول فوراً دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔

عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی قریب آتی گئی۔ وہ گداز بدن کی نوجوان عورت تھی۔ خوب گھیردار گھکھرا پنپے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر ملگجا تنگ جھگا تھا۔ گردن میں بھی ملگجا دوپٹا پڑا تھا۔ لباس تو اس کا میلا پھیلا تھا مگر تھی اٹھراور چلی۔ چلتی تو کولھوں کو خم دے کر قدم بڑھاتی۔

وہ دالان میں پہنچی، دوپٹے کے آئچل سے سر ڈھک کر چہرے پر بکل مارا اور جھک کر کھانا رکھتے ہوئے بولی۔ ”زمیں دار کے گھر سے ملاں جی کے لیے روٹی ٹکرائی ہوں۔“

وہ واپس جانے کے لیے مڑی۔ نور دین نے ٹوکا۔ ”تیرا ناں کیا ہے؟“

”ہے کچھ۔“ وہ تنک کر بڑے ناز سے بولی۔ ”تو میرا ناں کیوں پوچھتا ہے؟“

”اتنا نراض کیوں ہوتی ہے؟“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”نام ہی تو پوچھا ہے بتادے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔“

”میرا ناں پتھلی ہے جی۔ زمیں دار کی ماڑی میں کام کرتی ہوں۔“

نور دین نے ہلکے پکڑتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک گل پوچھوں بتادے گی؟“

اس نے گردن کو خم دے کر نور دین کی جانب دیکھا۔ ”بتانے کی ہوگی بتا دوں گی۔“

”راجو کو جانتی ہے؟ وہ بھی تو حاجی کی ماڑی میں ہوتی ہے۔“

”راجو!“ پتھلی نے نور دین کو مشتبہ نظروں سے دیکھا، بے رخی سے بولی۔ ”میں نوں کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ”اللہ تعالیٰ نے تجھے ایسی سوہنی شکل صورت دی ہے بات بھی اسی طرح کیا کر۔“

پتھلی کی شکل و صورت ایسی اچھی نہ تھی۔ مگر سانولا رنگ تھا، ناک نقشہ بھی بھدا تھا۔ رحیم داد کی بات سن کر وہ خوش ہوئی۔ زیر لب مسکرائی۔ رحیم داد کو مخاطب کر کے بولی۔

”تیں نوں کچھ پوچھنا ہے؟“

”پہلے بیٹھ تو جا۔“ رحیم داد نے شفقت سے کہا۔ ”کھڑی کیوں ہے؟ چلی جانا، ایسی بچھیتی کیا ہے۔“

پتھلی نے اپنا گھکھرا سینا اور دونوں سے ذرا ہٹ کر چٹائی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”بول، تیں نوں کیا کہتا ہے؟“

”میں نوں تو کچھ نہیں کہتا۔“ رحیم داد نے نور دین کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ جو کچھ پوچھتا ہے بتادے۔ بہت دور سے چل کر آیا ہے۔“

پتھلی نے نگاہیں موڑ کر نور دین کو دیکھا۔ مسکرا کر بولی۔ ”تو راجو کا گھر والا نور دین تو نہیں ہے؟“

”ہاں، میں نور دین ہی ہوں۔ یہ بتا، راجو کیسی ہے؟ تیری مہربانی ہوگی۔“

”مہربانی کی کون سی گل ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”زمیں دار سے ڈر لگتا ہے۔ ویسے راجو ٹھیک خاک ہے۔“

نور دین نے دریافت کیا۔ ”تجھ سے تو ملتی ہی ہوگی؟“

”روز ملتی ہے۔ میرے ساتھ ہی ماڑی میں کام کاج کرتی ہے۔ پردہ ماڑی سے باہر نہیں نکلتی۔

زمیں دار کا اس کے لیے یہی حکم ہے۔“

”کبھی مجھے بھی یاد کرتی ہے؟“

”کرتی تو ہے۔“ پتھلی نے جواب دیا۔ ”پر یاد کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تیرے پاس نہیں جاسکتی۔“

اس دفعہ رحیم داد نے سوال کیا۔ ”کیا اس کی مرضی اپنے گھر جانے کی نہیں ہے؟“

”اس کی مرضی سے کیا ہوتا ہے جی۔“ پتھلی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”مرضی تو اصلی زمیں دار کی

ہے۔ اس نے چونکا نظروں سے آنگن کے دروازے کی جانب دیکھا اور کھٹک کر دونوں کے

قریب ہو گئی۔ ”زمیں دار اسے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھنا چاہتا ہے۔ ویسے جی اس کی پہلے ہی دو گھر

والیاں ہیں۔ دونوں ہی ماڑی میں رہتی ہیں۔ روز آپس میں لڑتی جھگڑتی ہیں۔ پر راجو سے دونوں ہی

کھار کھاتی ہیں۔ اسے بہت تنگ کرتی ہیں۔ زمیں دار کا وڈا پتر کمال بھی راجو کو تنگ کرتا ہے۔ ویسے

تو وہ ماڑی میں کام کرنے والی بھی زنانیوں کو تنگ کرتا ہے۔ ایک نمبر حرام دا ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ

ہو گیا۔

”ابھی میں روٹی لے کر ماڑی سے نکلی تو وہ بھی کہیں جا رہا تھا۔ اندھیرے میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لگا

نویسنے کھ۔ روٹی ہاتھ میں نہ ہوتی تو ابھی پکڑ کر کھیتوں میں لے جاتا۔“ وہ شرانگی۔

پھلی نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ تولے لیا مگر خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے کہا۔ ”حوصلے سے کام لے، حوصلے سے۔“ اس نے نور دین کی جانب مڑ کر دیکھا اور اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”نورے! بتا تیرا کیا پروگرام ہے۔ کب اور کیسے راجو سے ملنا چاہتا ہے؟“

”ابھی تو جی جگا رہے۔ میں آدھی رات کو ماڑی کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے پھلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”آگے یہ جیسا بتائے گی، ویسا کروں گا۔“

”ایسا کر۔“ پھلی نے نوٹ گھگھرے کے نے فی میں اڑتے ہوئے کہا۔ ”ماڑی کے کتبے تھ پہنچ جانا۔ وہاں ٹاہلی کے پیڑوں کا جھنڈ ہے، اندھیرا بھی ہے۔ ماڑی کا ایک دروازہ ادھر کھلتا ہے۔ میں راجو کو وہیں بھیج دوں گی۔ پر آدھی رات گزرنے کے بعد ہی آنا۔“ اس نے خوف زدہ نظروں سے نور دین اور رحیم داد کو دیکھا۔ ”کوئی گڑبڑ ہو جائے تو میرا ناں نہ لینا، ہرگز نہیں۔ ورنہ میں دار مجھے جان سے مار دے گا۔“

”پکا وعدہ۔ تیرا ناں ہرگز نہیں لوں گا۔ چاہے وہ مجھے جان سے مار دے۔“ نور دین نے سینہ تان کر اسے یقین دلایا۔ ”بالکل فکر نہ کر۔“ اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ ”میں آدھی رات کے بعد اس جگہ پہنچ جاؤں گا۔“

”کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“ پھلی کھڑی ہو گئی۔ ”میں نوں بہت ڈر لگتا ہے۔“

وہ واقعی خوف سے گھبرائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس نے مزید بات چیت نہیں کی۔ دالان سے نکل کر چپ چاپ آنگن میں پہنچی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی باہر چلی گئی۔ نور دین نے اٹھ کر دروازہ بند کیا مگر کنڈی نہیں لگائی۔

نور دین واپس آیا تو خوشی سے چہرہ دک رہا تھا۔ رحیم داد کے قریب بیٹھے ہوئے گویا ہوا۔ ”تو نے اس دکت وہ کام کیا میرا کوئی سگا بھی نہ کرتا۔ میں نوں پتہ نہ تھا، توں اتنا بھلا اور نیک بندہ ہے۔“ اس کے انداز میں خوشامد تھی۔

”نورے! مجھے تو تب خوشی ہوگی، جب راجو تجھے مل جائے گی۔“

”میں تو کہتا ہوں جی، بس ایک بار راجو مل جائے، غیر میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا۔“

”ایسا ہو تو سکتا ہے۔ حاجی کی گھر والیاں مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائیں تو کام آسان ہو جائے گا۔“

”میری ایک گل مان لے گا؟“

”کیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”تیرا گھروالا نہیں ہے؟“

”ہے تو جی۔“ وہ سمجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”ہم کئی کمین ہیں جی، ہماری کیا عزت کیا آبرو۔ میں دار کے پتر کے خلاف ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ماڑی میں کام نہ کریں تو گزارہ کیسے ہو۔“

نور دین بے قرار ہو کر بولا۔ ”پھلی! مجھے راجو سے ملو اداے، تیری بہت مہربانی ہوگی۔“

”ناجی نا، ایسی گل نہ کر۔“ وہ خوف زدہ ہو کر بولی۔ ”میں دار کو پتہ چل گیا تو جان سے مار دے گا مجھے۔“

”اسے پتہ ہی کب چلے گا۔“ رحیم داد نے سفارش کی۔ ”تو بھی کسی کی گھر والی ہے، ذرا سوچ تو اور اسے دیکھ۔“ اس نے نور دین کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”کنتا پریشان اور دکھی ہے۔ اٹھ مینے سے اوپر ہو گئے، اس نے اپنی گھر والی کو نہیں دیکھا۔“

وہ بے مروتی سے بولی۔ ”میں کیا کر سکتی ہوں جی؟“

”تو حاجی کی دونوں گھروالیوں کو راضی کرنے کی کوشش کر۔“ رحیم داد نے اسے ترکیب بتائی۔

”وہ تو راجو کو نورے کے ساتھ بھگانے پر بھی تیار ہو جائیں گی۔ اسے اپنی سوکن جو سمجھتی ہیں۔ اس کام میں وہ ضرور مدد کریں گی۔“

”نہیں جی، تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔“ پھلی نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”ویسے تو دونوں ہر دکت کڑکڑاتی رہتی ہیں۔ پر زمین دار سے بہت ڈرتی ہیں۔ باہر وہ جتنا نیک بندہ نظر آتا ہے، گھر کے اندر اتنا ہی ظلم کرتا ہے۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ وہ اٹھنے کے لیے کسمائی۔

”میں نوں اب جانا ہے، کام بھی کرنا ہے۔“

”میں دار تو ملاں جی کے ساتھ شہر گیا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”غیر تو اتنا کیوں ڈرتی ہے۔“

وہ بولی۔ ”میں دار اب آتا ہی ہوگا۔“

نور دین نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔ ”مجھے راجو سے نہیں ملو سکتی؟ ملو اداے، تیری بہت مہربانی ہوگی۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”نہیں جی، میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”نراض کیوں ہوتی ہے۔“ اس نے دھوٹی کا ڈب ٹٹولا اور دس روپے کا نوٹ نکال کر پھلی کی جانب بڑھایا۔ ”لے اسے رکھ لے، نئے کپڑے لے بنو لیتا۔ دیکھ تو تیرے کپڑے کتنے گندے ہو رہے ہیں۔“

”میرے ساتھ ماڑی تک چل سکے گا؟“ نور دین نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں، توں میرے ساتھ جوتا۔ جیسے کہے گا، ویسا ہی کروں گا۔ راجو بھی تیری گل بات مان لے گی۔ وہ ضرور تیری گل بات مان لے گی۔ میں اسے جانتا ہوں۔ وہ میری گھروالی ہے۔“

”مجھے نہ لے جا۔“ رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔ وہ کوئی ایسا خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا جس میں گرفتاری کا خدشہ ہو۔ ”اکیلا ہی چلا جا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ نور دین نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ویسے ساتھ رہتا تو ٹھیک تھا۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ نور دین بھی چپ تھا۔ دونوں چٹائی پر گرم صم بیٹھے تھے۔ طاق میں چراغ روشن تھا مگر اس کی روشنی بہت کم تھی۔ باہر آنگن میں اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔



مولوی فضل احمد دروازے پر نمودار ہوا۔ آگے بڑھا۔ خاموشی میں اس کے قدموں کی آہٹ ابھری۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دالان میں پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی سی گٹھری دبی تھی۔ اس نے گٹھری رحیم داد کے سامنے ڈال دی۔

”لے بھئی، تیرا سامان آگیا۔“

مولوی فضل ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے اور لباس پر خاک کے ذرات بکھرے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے گٹھری کھولی۔ اندر سے گڈی، شلوار اور قمیص نکلی۔ شلوار سفید لٹے کی تھی۔ قمیص پر ہلکی ہلکی سبز دھاریاں تھیں۔ کپڑا بھی چمکتا اور نرم تھا۔ ساتھ میں ایک پرنا اور دو رجسٹر تھے، پنسلیں بھی تھیں۔ رحیم داد نے ایک ایک چیز غور سے دیکھی، مسکرا کر بولا۔

”ملاں جی، تم نے تو کمال کر دیا۔ اتنی جلدی کمیض اور شلوار تیار کرالی۔“

”میں نے شہر پہنچتے ہی بازار سے کپڑا خریدا۔ درزی کو دے کر کہا، کل دوپہر بارہ بجے تک تیار کر دے۔ مزدوری کی فکر نہ کرنا۔“ مولوی فضل آہستہ آہستہ بتاتا رہا۔ ”بس جی، اس نے قافٹ کپڑے تیار کر دیئے۔ میں نے سوچا، کندھے پر ڈالنے کے لیے پرنا بھی چاہئے ہوگا۔ ہر دم منہ ہاتھ پونچنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ سو میں نے ایک پرنا بھی تیرے لیے خریدا۔“ اس نے اپنے کرنے کی جیب سے عینک نکالی اور رحیم داد کے ہاتھ میں دے دی۔ ”لے، یہ تیری عینک بھی آگئی۔“

نہیں، تیری آنکھوں پر ٹھیک بھی لگتی ہے کہ نہیں۔ ویسے میں نے عینک ساز کو بتا دیا تھا کہ کم نمبر کی ہو، جو ان بندے کے لیے چاہئے ہے۔“

رحیم داد نے عینک دیکھی۔ اس کا فریم تھا تو استعمال شدہ مگر جدید وضع کا تھا۔ رحیم داد چاہتا بھی بی تھا۔ بات یہ تھی کہ حکیم چشتی کی عینک کا فریم چاندی کے پتلے تاروں کا تھا۔ رحیم داد حلیہ بدل کر اب رحیم داد نہیں رہا تھا۔ مگر وہ مقتول حکیم چشتی بھی بننا نہیں چاہتا تھا۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے خطرہ تھا۔

عینک پا کر وہ خوش ہوا۔ عینک کے شیشے ہلکے اور صاف تھے۔ اس نے عینک لگا کر ادھر ادھر نظریں گھمائیں۔ ہر چیز قدرے بڑی اور صاف نظر آئی۔

رحیم داد نے مسکرا کر اپنی پسند کا اظہار کیا۔ ”بالکل فٹ بیٹھی ہے جی۔ مجھے ایسی ہی عینک چاہئے تھی۔“

”وہ تو میری طرح کا فریم لگا رہا تھا۔“ مولوی فضل نے اپنی عینک کی طرف اشارہ کیا، اس کا فریم پرانی وضع کا تھا۔ ”پر میں نے کہا، نہیں جی، یہ نہیں چلے گا۔ کوئی عمدہ فریم لگا۔ اپنا چوہدری جوان بندہ ہے۔ شہر کا رہنے والا ہے۔“ وہ اپنی کارگزاری سنا رہا۔ ”خریداری کے معاملے میں، میں کبھی دوکاندار سے مار نہیں کھاتا۔“

اس نے جیب سے تین روپے نکالے اور رحیم داد کی جانب بڑھائے۔ ”لے بھئی چوہدری! تیرا سب سامان بھی آگیا اور ۵۰ روپے سے یہ روپے بھی بچ گئے۔“

رحیم داد نے روپے نہیں لیے۔ مسکرا کر کہا۔ ”ملاں جی! اسے اپنے ہی پاس رکھ لو۔ میری خوشی کچھ کر رکھ لو۔“

”تیری یہی خوشی ہے تو رکھے لیتا ہوں۔“ مولوی فضل نے روپے بھر جیب میں رکھ لیے۔ رحیم داد کی اس فراخ دلی پر وہ بہت خوش ہوا۔ ”اب پڑچھتی میں جا کر کپڑے بدل لو اور یہ دیکھ لو، ٹھیک سے فٹ آتے ہیں کہ نہیں۔ میں نے قمیص میں چار جیبیں لگوائی ہیں، دو نیچے ایک اوپر اور ایک روپے پیسے رکھنے کے لیے اندر۔ ٹھیک کیا تا میں نے؟“ مولوی فضل نے داد طلب نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔

”یہ تو بہت چنگا کام کیا۔“

رحیم داد کپڑے اٹھا کر دالان سے باہر گیا اور آنگن عبور کر کے پڑچھتی میں پہنچا۔



مولوی فضل احمد نے نور دین کی جانب توجہ دی، کسی قدر تلخ لہجے میں پوچھا۔ ”نورے! تو کیسے آیا؟“

”یہ پوچھنے آیا تھا راجو کے معاملے میں توں نے کیا طے کیا؟ اب تک ملتان سے فتویٰ بھی منگوا رہا ہوگا۔“

مولوی فضل نے بے رخی سے کہا۔ ”میں ملتان گیا ہی کب۔ وہاں جانے پر خرچ آتا ہے۔ مجھے کچھ دے کر گیا تھا جو میں وہاں جاتا۔“

”میری حالت کا تیں نوں پتہ ہی ہے۔“ نور دین نے عاجزی سے کہا۔ ”میرا تو سب کچھ ہوا گیا۔ نہ زمین پر بل چلا سکا نہ بوائی کی نہ فصل ہوئی۔ زمین بخر ہوئی جا رہی ہے۔ ادھیارے پر زمین دینی چاہی تو زمین دار نے منع کر دیا۔“

”یہ سب کچھ میں نہیں جانتا۔“ مولوی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ ”یہ تیرا اور تیرے زمین دار کا معاملہ ہے، میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”پر راجو کا معاملہ تو طے کر سکتا ہے۔“ نور دین گڑگڑانے لگا۔ ”تیری بہت مرہانی ہوگی۔ میں سارے چکروں سے بچ جاؤں گا۔ میں نوں کچھ اور نہیں چاہئے۔“

مولوی فضل چند لمحے خاموش رہا پھر اپنی ڈاڑھی کریدتے ہوئے مشورہ دیا۔ ”میرا کہاں راجو کو تو اب بھول ہی جا۔ اب وہ تیرے کام کی نہیں رہی۔ مجھے پتہ چلا ہے وہ رات کو دیر تک حالی صاحب کے کمرے میں اکیلی رہتی ہے۔ سبھی کچھ ہو سکتا ہے، شیطان کے بہکانے میں دیر نہیں لگتی۔“

”نہیں جی، ایسا نہیں ہو سکتا۔“ نور دین تڑپ کر بولا۔ ”راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔“

”میرا خیال ہے، تو اسے جان کر بھی نہیں جان سکا۔“ مولوی نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے حکیکی نظروں سے دیکھا۔ ”میں نے تو یہاں تک سنا ہے، وہ تیرے ساتھ جانے پر بالکل رضا مند نہیں۔“

”نہیں ملاں جی، یہ بالکل غلط ہے۔ راجو ایسا نہیں کر سکتی۔“

”میں کہتا ہوں تو ابھی نادان ہے۔ تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔“ مولوی فضل احمد نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ”آٹھ مہینے میں وہ بالکل بدل چکی ہے۔ وہ اب تیری پہلے جیسی راجو نہیں رہی۔ تو مہینے بات کیوں نہیں مانتا؟“ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ ”میں تیری ایک ہی مدد کر سکتا ہوں۔“

نور دین نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”وہ کیا ہے؟“

”وہ یہ ہے کہ میں راجو کے عوض تجھے حاجی صاحب سے کچھ روپیہ دلوا دوں۔ تو راجو کو طلاق نامہ لکھ دے۔ میں تجھے ہزار روپے تک دلوا دوں گا۔ حاجی صاحب تو پانچ سو سے زیادہ دینے کو تیار نہیں تھے میں نے منت سماجت کی تو ہزار پر تیار ہو گئے۔“ مولوی فضل کھل کر مسکرایا۔ ”ویسے تو حاجی کے بارے میں کچھ ہی کہہ، پر وہ دل کا برا نہیں۔ وہ چاہتا تو راجو کو یوں ہی رکھ لیتا، ایسے ہی جیسے دوسرے دڑے زمین دار داشتہ بنا کر رکھ لیتے ہیں۔ پر وہ نیک اور صالح مسلمان ہے، برائی سے ہمیشہ بچتا ہے۔ وہ باقاعدہ نکاح پڑھوا کر، راجو کو حوالہ عقد میں لانا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے جی، راجو اس کی بہت خدمت کرتی ہے، اس سے پیار کرتی ہے۔ اسی کے پاس رہنا چاہتی ہے۔ اسے ماڑی میں بہت آرام ہے۔ عیش کرتی ہے۔ تیرے گھر میں اسے یہ عیش آرام کہاں ملے گا؟ تو اسے ڈنگروں کی طرح کام لیتا ہے۔ ہر زانی عیش آرام چاہتی ہے، راجو بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔ اس میں کون سی غی بات ہے۔ پر تو یہ باتیں نہیں سمجھتا۔“

نور دین نے تیل کی طرح گردن ہلائی۔ ”سمجھ نہیں آتی راجو ایسی ہو سکتی ہے۔“

”اب تو الٹی سیدھی باتیں سوچ کر اپنا مغز خراب نہ کر۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کر۔ ہزار روپے کم نہیں ہوتے۔ اس سے اپنا کام دھندا چلا سکتا ہے، دوسرا دیاہ کر سکتا ہے۔ ساتھ ہی میں تجھے یہ بھی بتا دوں۔ پچھلے دنوں تیرا زمین دار میاں داد مویشیوں کا سودا کرنے حاجی صاحب کے پاس آیا تھا۔ میں بھی موجود تھا، تیرا ذکر بھی چلا۔ میاں داد تجھے زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ کہتا تھا، تو نے زمین کا ناس مار دیا۔ کھیتی باڑی میں دلچسپی نہیں لیتا۔ زمین بالکل بخر پڑتی جا رہی ہے۔ وہ اس پر باغ لگانا چاہتا ہے۔ یہ بات اس نے میرے سامنے حاجی صاحب سے کہی تھی۔ ذرا یہ تو سوچ، زمین ہاتھ سے نکل گئی تو کیا ہوگا۔ بھوکا مرے گا یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جرائم پیشہ اور مویشی چور بن جائے گا۔“ مولوی فضل احمد نے شفقت کا اظہار کرتے ہوئے اسے رضامند کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نہیں چاہتا، تو چوراہا چکا بن جائے۔ یہ تباہی کا رستہ ہے۔ عذاب الہی سے ڈر۔ ایسے رستے پر نہ چل۔ میرا کہاں، ہزار روپے لے لے اور راجو کو اس کے حال پر چھوڑ دے۔ بول کیا کہتا ہے؟“

”کہنا کیا ہے جی۔“ نور دین نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”کچھ سمجھ نہیں آتی۔“

”اکیس جلدی نہیں۔ گھر جا کر آرام سے سوچ لے۔ فیہ مجھے آکر جواب دے، پر زیادہ دیر نہ لگنا۔“

نور دین نے بھی نہیں ملیں گے اور راجو تو تجھے مل ہی نہیں سکتی۔“

نور دین منہ لٹکائے چپ بیٹھا رہا۔

رحیم دادالان میں داخل ہوا۔ وہ سر پر پگڑی باندھے ہوئے تھا۔ آنکھوں پر سیاہ فریم کا چشمہ تھا۔ نئی قمیص اور شلوار چراغ کی روشنی میں جھلک رہی تھی۔

مولوی فضل نے اس کی یہ جھج دیکھی تو مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! اس لباس میں بہت بچہ با ہے بلکہ میں تو یہ کہوں گا، دیکھنے میں سکول کا ہیڈ ماسٹر لگ رہا ہے۔“ ”بھئی بچ کہہ رہا ہوں، تجھ پر بہت شان آگئی۔“

رحیم داد اس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”تیری مہربانی ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”میرے معاملے میں حاجی سے تو بات نہیں کی؟“

”ضرور کی تھی۔“ مولوی نے جواب دیا۔ ”پر اس کا بھی یہی خیال ہے، اس پنڈ میں تیرے بال بچوں کی طرح کا کوئی کنبہ نہیں۔ پورے موضع میں صرف ایک مہاجر کنبہ ہے۔ وہ کرنال کے ہیں اور گھروالا، بیوی بچے سب کے سب شروع ہی سے ایک کنبے کے چلے آ رہے ہیں۔ ویسے صبح حاجی صاحب سے مل لے۔ چاہے تو وہ ان کو اپنے ڈیرے پر بھی بلا لے گا۔ اپنا اطمینان کر لیتا۔“

رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نہیں ملاں جی، اب اس کی ضرورت نہیں۔ سوچتا ہوں، آج ہی چلا جاؤں۔“

”جیسی تیری مرضی، ویسے میں تو چاہتا تھا آج رات یہیں ٹھہر جاتا۔“

”مجھے جانے ہی دے۔ کل کچھ ضروری کام بھی کرنے ہیں۔“

”ایسی گل ہے تو میں تجھے نہیں روک سکتا۔“ مولوی نے کھانے کی طرف اشارہ کیا۔ ”روٹی تو کھالے۔“ اس نے نور دین کو مخاطب کیا۔ ”نورے! تو بھی روٹی کھالے۔ میں نہیں کھاؤں گا۔ شام کو رستے میں حاجی صاحب کے ساتھ کچھ کھا پلایا تھا۔“

مولوی فضل احمد نے نور دین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے، اس پر گھر جا کر آرام سے سوچ اور تین چار روز بعد آکر بتا دے۔ ویسے میری بات مان لے گا تو خوش خرم رہے گا۔ مجھے دل سے دعا ہی دے گا۔“

مولوی فضل کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اور نور دین کو مخاطب کر کے بولا۔ ”تم دونوں روٹی کھاؤ۔ میں نے اب مسجد جانا ہے۔“ وہ آگے بڑھا۔ دالان کے کمر پر پہنچ کر رکا۔ ”جانا تو باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دینا۔“



رحیم داد نے کھانا کھسکا کر سامنے کیا اور نور دین کے ساتھ کھانے لگا۔

کھانا کھاتے ہوئے رحیم داد نے نور دین سے دریافت کیا۔ ”ملاں سے راجو کے بارے میں بات کی تھی۔“

”ہاں۔“ نور دین نے جواب دیا۔ ”پر وہ دوسرا ہی چکر چلانا چاہتا ہے۔ کہتا ہے، ہزار روپے لے لے اور کاغذ لکھ دے، راجو اب تیرے کام کی نہیں رہی۔“

رحیم داد نے کسی قدر تعجب سے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا، حاجی نے اسے خراب کر دیا۔“ ”ملاں کے کہنے کا تو کچھ ایسا ہی مطلب ہے۔ پر مجھے اس کی باتوں پر اعتبار نہیں۔ راجو ایسی نہیں ہو سکتی۔“

”مان لے ملاں نے ٹھیک ہی کہا ہے، تب تو کیا کرے گا۔“

”تب بھی ساتھ لے جاؤں گا۔“ نور دین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”رہے گی تو میری ہی گھر والی۔“

”پر ایسی گھر والی کو کیسے رکھا جاسکتا ہے جو دوسرے کے ساتھ سو چکی ہو۔“ رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔ ”صاف بات یہ ہے میں تو ایسی رن کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔“ ”تو مجھے آباد کار لگتا ہے۔“ نور دین نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”جیسی ایسی گل کر رہا ہے۔“

”یہ تو سوچ عزت آبرو بھی کچھ ہوتی ہے۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔

”ٹھیک ہے۔ پر گھر والی مرد کا بازو بھی ہوتی ہے، ایسے ہی جیسے ہالی کے لیے مل۔ توں ٹھہرا پیسے والا اور آباد کار۔ توں جس طرح گھر والی کے بارے میں سوچتا ہے، ہم جانگی اس طرح نہیں سوچتے۔ یہ عزت آبرو کیا ہوتی ہے، پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے تو کیسی عزت، کہاں کی آبرو؟ اب کیا دیکھ، راجو تھی تو میری فصل کیسی چنگی ہوتی تھی۔ میں لاوی پر بھی نکل جاتا تھا۔ دوسروں کی فصلوں کی واڈھی کر کے کمائی کر لیتا تھا۔ راجو جب سے گئی ہے، میں نہ ٹھیک سے کھیتی باڑی کر سکا، نہ لاوی پر جاسکا۔ میرے باہر رہنے پر فصل کی دیکھ بھال کون کرتا؟“ کھیتوں کو پانی کون لگاتا؟ نور دین نے گہری سانس بھری۔ ”ذرا سوچ تو، راجو میرے لیے کتنی ضروری ہے۔ اس کے بنا تو میرا بازو نہٹ گیا۔“

”تو بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔“ رحیم داد نے بحث میں الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”یہ تو اپنی اپنی

سوق کی بات ہے۔ اب یہ بتا، ملاں کی باتیں سن کر کیا طے کیا؟“

”طے کیا کرتا ہے جی۔“ نور دین نے گردن اونچی کر لی۔ ”راجو سے تو آج رات ملنا ہی ہے۔ پھلی

نے اسے ملوایا تو سمجھ لے کام بن گیا۔

”پراتنی دیر رہے گا کہاں؟ اگر آدھی رات کو یہاں سے اٹھ کر گیا تو مجھے ڈر ہے، ملاں کو شہر ہو جائے۔ ایسا نہ ہو، ادھر تو راجو سے ملنے نکلے، ادھر ملاں جا کر حاجی سے مخبری کر دے۔ تب معاملہ بہت گڑبڑ ہو جائے گا۔“

”میں ایسا کروں گا“ روٹی کھا کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔ زمیں دار کی ماڑی کے پاس کہیں جھاڑیوں میں چھپ جاؤں گا اور آدھی رات ہونے کا انتظار کروں گا۔“

دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ کھانا کھا کر انھوں نے پیالے سے پانی پیا۔ نور دین کچھ دیر ٹھہر کر جانے لگا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

”نورے! ایک بات تو بتاتا جا۔“

”پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“

”میں نے اکال گڑھ جانا ہے۔ تیں نوں ملوم ہے، اکال گڑھ کدھر ہوتا ہے؟“

”کیوں نہیں ملوم۔“ نور دین نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”چک ۵۵ کے رستے میں پڑتا ہے۔ ادھر کچے رستے سے چلا جا۔“ اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھایا۔ ”پہلے چک بیدی آئے گا غیر نظام اولیا۔ اگے نہر ہے۔ نہر کے کنارے کنارے چلا جانا۔ اگے اکال گڑھ آجائے گا۔ یہاں سے ۹ میل سے زیادہ نہیں ہوگا۔“

”کوئی سڑک وہاں تک جاتی ہے؟“

”سب کچے رستے ہیں۔ نہر کے کنارے کا رستہ سب سے ٹھیک ہے۔“

”اب تو جا۔“ رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”راجو مل جائے تو مجھے نہ بھولنا۔“

”کیسی گل کر رہا ہے چوہدری!“ نور دین نے بڑے جوش سے کہا۔ ”ایسا کیوں نہیں کرتا، میرے ساتھ ہی چل۔ میں نے تو چک ۵۵ جانا ہی جانا ہے۔ اکال گڑھ رستے ہی میں ہے۔ میں تجھے وہاں پہنچا دوں گا۔“

”نہیں، تو اب جا۔“ رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ ”میں جاؤں گا تو سویرے جاؤں گا اور یہ بھی ملے نہیں کہ اکال گڑھ جاؤں بھی یا نہ جاؤں۔ ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔“

نور دین باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے مقتول چوہدری نور الہی کی قیص اور شلوار سمیٹ کر گٹھری بنائی۔ دونوں رجسٹر اور پنسلیں، کلیم کے کاغذات کے بستے میں رکھے۔ مولوی فضل کے رجسٹرے تین ورق پھاڑ کر علیحدہ کر لیے۔ ان پر اس نے چوہدری نور الہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کی

نہی۔

وہ اٹھا اور تینوں ورق چراغ کی لو سے جلا کر ضائع کر دیے۔ اس کام سے فارغ ہو کر چٹائی پر لیٹ آیا مگر سویا نہیں۔ چپ چاپ لیٹا مولوی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ اس سے ملے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ بت دیر ہو گئی، مولوی نہیں آیا۔

ساڑھے گیارہ کا عمل ہوگا، مولوی فضل واپس آیا۔ آہستہ سے کھٹکارا۔ ”چوہدری! جاگ رہا ہے؟“

”تیرا انتظار کر رہا تھا۔“ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”تجھ سے ملے بنا کیسے جا سکتا تھا۔“

مولوی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے جمای لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دیر ہو گئی۔ پنڈ کے ایک مزارع کی گھر والی پر آسیب ہے۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر چیختی ہے۔ میں اس کا آسیب اتارنے گیا تھا۔ اسی میں اتنی دیر ہو گئی۔“

رحیم داد نے کپڑوں کی گٹھری سنبھالی، کلیم کے کاغذات کا بستہ بغل میں دبایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”ملاں جی! مجھے اب جانا ہے۔ تیری بہت بہت مرہانی۔“

”نہیں بھئی؟ مرہانی کی کون سی بات ہے۔ میں چاہتا تھا، رات کو یہیں رہتا، سویرے چلا جاتا۔“ اس نے رحیم داد کو روکنے کے لیے اصرار کیا۔

”پنڈ کے ساتھ ہی تو سڑک ہے۔ ابھی تو جانے کے لیے لاری بھی مل جائے گی۔“ رحیم داد ٹھہرنے پر رضامند نہ ہوا۔ ”اس سڑک پر تو آدھی رات کے بعد بھی لاریاں چلتی ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”زندگی رہی تو فیر ملاپ ہوگا۔“

مولوی فضل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے بغل گیر ہوا، اسے چھوڑنے بیرونی دروازے تک لایا۔



ہر طرف رات کا اندھیرا پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گاؤں کے گھروں میں کہیں کہیں روشنی نکل رہی تھی۔ رحیم داد، جھاڑیوں اور گڑھوں سے بچتا بچتا کھیتوں کے درمیان سے گزرنے والی ایک گڈنڈی پر پہنچ گیا۔ مگر سڑک کی جانب نہیں گیا۔ چپ چاپ گڈنڈی پر چلتا رہا۔ کچھ دور آگے جا کر گڈنڈی کے ساتھ ایک جگہ زمین اس قدر پوٹی تھی کہ رحیم داد کا ایک پیر تھوڑا سا دھنس گیا۔ اُنک پاس خود رو پودوں کے جھرمٹ بھی تھے۔

رحیم داد اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے جیب سے چاقو نکالا اور خاصا گہرا گڑھا کھودا۔
کپڑوں کی گٹھری گڑھے میں ڈالی اور زمین ہموار کر دی۔

وہ آگے بڑھا اور پگڈنڈی سے گزر کر گاؤں میں داخل ہو گیا۔ گاؤں بالکل سنان تھا۔ وہ ایک
گلی میں داخل ہوا۔ گلی کے کنارے گاؤں کے زمیں دار حاجی حبیب کا دو منزلہ بچتہ مکان تھا۔ وہ چونکا
نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اندھیرے میں آگے بڑھنے لگا۔ زمیں دار کی ماڑی کے قریب سے
گزرا۔ آگے بڑھتا ہوا راستہ تھا۔ راستے کے ارد گرد کھیت اور جھاڑیاں تھیں۔ چلتے چلتے وہ ٹھکا اور
متحسّس نظروں سے کھیت اور جھاڑیاں دیکھنے لگا۔

رحیم داد کو نور دین کی تلاش تھی۔ وہ اسے ڈھونڈنے کے لیے ادھر آیا تھا۔ اس کے ہم راہ
نوراں اور بچوں سے ملنے اکال گڑھ جانا چاہتا تھا۔

مگر نور دین کہیں نظر نہیں آیا۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ گاؤں کی رڑی سے کتوں کے
بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اپنے ارد گرد خطرہ منڈلاتا محسوس ہوا۔ اس نے
رفقار تیز کر دی۔

وہ جلد سے جلد گاؤں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ قریب کی جھاڑیوں سے کسی
نے ہولے سے سیٹی بجائی۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نگاہوں سے اس طرف دیکھا، وہاں کوئی نہیں
تھا۔

ذرا دیر بعد جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ ایک سایہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ اس کی
جانب بڑھنے لگا۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بھٹ چاقو نکال لیا۔ اسی وقت مدھم سی آواز
آئی۔

”گھبرا نہیں، میں ہوں نور دین۔“

رحیم داد نے چاقو جیب میں ڈالا اور جہاں تھا وہیں رک گیا۔ نور دین نزدیک آگیا۔ رحیم داد نے
سرگوشی کی۔ ”تو یہاں چھپا تھا، حاجی کی ماڑی تو ادھر ہے۔“ اس نے دو منزلہ مکان کی طرف ہاتھ
سے اشارہ کیا۔

”وہاں میں آدھی رات کے بعد جاؤں گا۔ چوہدری! تمہیں یاد نہیں، پھلی نے کیا کہا تھا۔“

”آدھی رات ہونے میں اب دیر ہی کتنی رہ گئی ہے۔“

”اب آہی گیا ہے تو میرے ساتھ چل۔“

”تو اکال گڑھ ہی کے رستے اپنے پنڈ جائے گا نا؟“

”ہاں، اسی رستے جاؤں گا۔ اکال گڑھ ہے تو رستے سے ذرا ہٹ کر پر میں تیرے ساتھ وہاں تک
پلوں گا، فکر نہ کر۔“ نور دین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”آ میرے ساتھ۔“ وہ آگے بڑھا۔
”تو ماڑی سے دور کھڑا رہنا۔“

اس کے لمبے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ”تمہیں نوں پتہ ہے، میرے ڈب میں بھرا ہوا پستول
ہے۔ فیڈر مایکوں ہے؟ مریجاؤں گا پر تجھے پھنسنے نہیں دوں گا۔“
رحیم داد خاموش رہا۔

دونوں دبے دبے قدموں ماڑی کی جانب بڑھے۔ نور دین آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل
رہا تھا۔ دونوں اندھیرے میں چلتے ہوئے ماڑی کے بائیں جانب پہنچ گئے۔ قریب ہی شیشم کے
درختوں کا جھنڈ تھا۔

پھلی نے ٹھیک بتایا تھا۔ درختوں کے عین سامنے ماڑی کا چھوٹا دروازہ تھا۔ نور دین نے چاہا کہ
رحیم داد دو رہی ٹھہر جائے، مگر وہ اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔

دونوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ ماڑی پر
خاموشی چھائی تھی۔ البتہ بالائی منزل کے کمرے میں روشنی تھی۔ کھڑکی کی شیشوں سے روشنی چھن
چھن کر باہر نکھر رہی تھی۔

موشیوں کا ڈھارا دوسری جانب تھا۔ وہاں کوئی رک رک کر کھانسی رہا تھا۔ ہر بار جب کھانسی
اُبھرتی، دونوں چونک کر اس طرف دیکھتے۔ رحیم داد بہت سما ہوا تھا۔ نور دین نے پستول نکال لیا تھا
اور اسے ہاتھ میں دبلے چوکس کھڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی مگر ماڑی کا دروازہ نہیں
کھلا۔

رحیم داد نے اکتا کر کہا۔ ”مجھے تو راجو آتی معلوم نہیں ہوتی۔“

مگر نور دین مایوس نہیں ہوا۔ ”اسے آنا تو چاہئے۔ پھلی نے پکا وعدہ کیا تھا۔“ اسی وقت دروازہ
آہستہ سے کھلا۔ نور دین نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔

”دیکھ، میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔“

دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا، لیکن کوئی باہر نہیں آیا۔ دونوں آنکھیں پھاڑے بے چینی
سے ادھر دیکھتے رہے۔ ذرا دیر بعد کوئی باہر آیا۔ کھڑکی کے شیشوں سے پھوٹی ہوئی دھیمی دھیمی
روشنی میں نور دین نے اسے پہچان لیا، آہستہ سے بولا۔ ”راجو ہے، ہاں وہی ہے۔“ اس کی آواز
میں ہلکی سی تھر تھراہٹ تھی۔

رحیم داد نے راجو کی جانب دیکھا۔ وہ چھری بے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ اس کے عقب میں پھلی بھی تھی۔ دونوں خوف زدہ نظروں سے دائیں بائیں دیکھتی ہوئی آگے بڑھیں اور جھپاک سے درختوں کے نیچے آگئیں۔ نور دین آگے بڑھا، اس نے بے قرار ہو کر راجو کو سینے سے لگا لیا۔ بچان انگیز لہجے میں بولا۔

”راجو! میں تیرا نور اہوں۔“

راجو کچھ نہ بولی۔ اس کے سینے سے لگی کھڑی رہی۔ پھلی نے قریب آکر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ، میں تیری راجو کو لے آئی۔ تجھ سے جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔“

عین اس وقت اوپر کی منزل کے کمرے میں مردانہ کھٹکار ابھری۔ نور دین اور رحیم داد نے پریشان ہو کر اوپر دیکھا۔ راجو ہٹ کر نور دین کے پیچھے چلی گئی مگر پھلی اطمینان سے کھڑی رہی۔ اٹھلا کر بولی۔ ”زمین دار جاگ رہا ہے۔“ وہ مسکرانے لگی۔

”پروانہ کر، وڈی زمین دارنی اس کے پاس ہے۔ وہ اسے باہر نہیں آنے دے گی۔ زمین دار نے راجو کو بلوایا تھا پر وہ خود پہنچ گئی۔“

رحیم داد نے دھیرے سے پوچھا۔ ”اسے پتہ ہے، راجو یہاں ہے؟“

”بالکل پتہ ہے۔ تیرے کہنے پر میں نے ڈرتے ڈرتے پھوٹی زمین دارنی سے بات کی۔ وہ بھی مجھ سے اپنے من کی ہریات بتاتی ہے۔ پہلے تو وہ ڈری، میں نے اسے رجھانا شروع کیا۔ منت بھی کی۔ وہ تیار ہو گئی۔ وڈی کے پاس گئی۔ دونوں بند کمرے میں دیر تک مسکوت کرتی رہیں۔ فیر چھوٹی نے مجھے کہا۔ نورے اپنی گھر والی کو لے جانا چاہے تو خوشی سے لے جائے۔“ پھلی نے شوخی سے نور دین کو دیکھا۔

”بول کیا کہتا ہے؟“

”تو نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔“ نور دین نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”پھلی! تو اتنی سوہنی ہے، جی کرتا ہے راجو کے ساتھ تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں۔“

”میں کیوں تیرے ساتھ جانے لگی۔“ وہ منہ بگاڑ کر تیکھے لہجے میں بولی۔ ”میرا گھر والا نہیں ہے؟“ اس نے راجو کو مخاطب کیا۔

”سن رہی راجو! ابھی سے یہ بڑھکیں مارنے لگا۔“

راجو خاموش کھڑی رہی۔ وہ بہت سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے دو نوٹ نکالے اور پھلی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔ ”لے، یہ رکھ لے۔ گھر والے

کو نہ بتانا، پٹری بنوا کر گلے میں پہننا، سوہنی لگے گی۔“

پھلی نے دونوں نوٹ لے کر اپنے گنگھڑے کے زینے میں اڑس لیے۔ رحیم داد نے نور دین سے کہا۔ ”چلتا ہے تو فائنٹ نکل چل، کب تک یہاں کھڑا رہے گا؟ حاجی جاگ رہا ہے۔ آگیا تو سمجھ لے، سارا معاملہ گزر بڑھو جائے گا۔“

”نہیں، وہ نہیں آسکتا۔“ پھلی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”وڈی زمیں دارنی اس کے پاس ہے اور چھوٹی دروازے پر کھڑی چونکی داری کر رہی ہے۔ دونوں نے پہلے ہی سے مسکوت کر رکھی ہے۔“

”نہیں جی، اب چلتا چاہئے۔ پھلی! تیری بہت بہت مہربانی۔“ نورے نے گردن موڑ کر راجو کو دیکھا۔ ”چل راجو!“

تینوں آگے بڑھے۔ نور دین راجو کا ہاتھ تھام کر آگے آگے چل رہا تھا۔ رحیم داد دونوں کے پیچھے تھا۔ پھلی درختوں کے پیچھے اندھیرے میں چپ چاپ کھڑی انھیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دور ہوتے گئے۔ جب وہ ایک موڑ پر پہنچ کر مڑنے لگے تو رحیم داد نے گردن پیچھے کر کے دیکھا، شیشم کے درختوں کے نیچے دھندلی روشنی میں اسے پھلی نظر نہیں آئی۔ وہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ کچھ دور جا کر تینوں کچے راستے پر آگئے۔ راستے کے دونوں جانب تیار فضلیں کھڑی تھیں۔

انھوں نے رفتار تیز کر دی۔ وہ جلد سے جلد گاؤں کی حدود سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ نور دین بہتول ہاتھ میں سنبھالے ہوئے تھا اور چونکنا نظروں سے اوجھڑا دیکھتا جا رہا تھا۔

انھوں نے فرلانگ بھر سے زیادہ راستہ طے کیا ہو گا کہ رات کے سانے میں ٹاپیں سنائی دیں۔ آواز سامنے ہی سے آ رہی تھی۔

تینوں خوف زدہ ہو گئے۔ گھوڑے کے دوڑنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ہنہاٹ بھی اب قریب آتی جا رہی تھی۔ نور دین نے راجو کو ہاتھ پکڑ کر گھسیٹا اور قریب کے ایک کھیت میں گھستے ہوئے رحیم داد سے بولا۔

”چوبھری! اتھے آجا۔“

رحیم داد بھی ان کے ساتھ کھیت میں گھس گیا۔ مگر وہ زیادہ اندر نہ جاسکا۔ دیکھتے دیکھتے کوئی گھوڑا دوڑتا ہوا ان کے سامنے سے گزرا اور اپنے پیچھے گرد کے بادل چھوڑ گیا۔ راجو نے اسے پہچان لیا۔ جب وہ آگے نکل گیا تو اس نے سسے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ہائے یہ تو کمال تھا۔“

نوردین نے پوچھا۔ ”کون کمال؟“

”حاجی کا وڈا پتر۔“ راجو نے جواب دیا۔ ”چک بیدی سے آ رہا ہو گا۔ وہاں جا کر جو اکیلے ہے، شراب پیتا ہے۔ روز رات کو دیر سے آتا ہے۔ کبھی کبھی تو سویرا ہو جاتا ہے۔“

”حاجی کچھ نہیں کہتا؟“

”کیوں نہیں کہتا؟ نراض بھی ہوتا ہے، پر وہ اس کی کب پروا کرتا ہے۔ اب وہ ماڑی میں جائے گا تو جاگ ہوگی۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“

رحیم داد پودوں میں پھنسا بیٹھا تھا۔ ایک پودے کا ڈنٹھل ٹوٹ کر اس کی کمر میں اڑا ہوا تھا۔ وہ بے چین ہو کر بولا۔ ”اب باہر تو نکل، ساری باتیں یہیں بیٹھ کر کرے گا۔“ یہ کہتا ہوا وہ کھیت سے باہر نکلا۔

نوردین اور راجو بھی کھیت سے باہر آ گئے۔ تینوں خاموش تھے۔ اب انھوں نے اپنی رفتار بھی تیز کر دی تھی۔ راجو بہت ڈری ہوئی تھی۔ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتی جاتی۔ مگر عقب سے کوئی آہٹ نہیں ابھری۔

وہ کھیتوں سے نکل کر دور آ گئے۔ آگے میدان تھا۔ زمین کھنڈل تھی، جگہ جگہ گڑھے تھے۔ ان میں چوہوں کے بل بھی تھے۔ ایک موٹا چوہا راجو کے پیر کے نیچے آ گیا۔ وہ ننگے پیر تھی۔ چوہے سے ڈر کر اس کی چیخ نکلی۔ نوردین نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

”چپ کر۔ ایسے ڈرے گی تو کیسے کام چلے گا۔“

اسی وقت رحیم داد کا پیر ایک گڑھے میں پڑا۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ بیزار ہو کر بولا۔ ”یار، تو نے اندھیا رے میں یہ کھنڈل کا رستہ کیوں پکڑا؟“

”چوہدری! یہ چھوٹا رستہ ہے۔ آگے ٹھیک ٹھاک رستہ مل جائے گا۔ اس کے کنارے گھنے بڑے ہیں۔ ذرا سنبھل کے چل، زیادہ وڈا کھنڈل نہیں ہے۔“

واقعی میدان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ تینوں گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان عبور کر کے ایک پانی ہے آ گئے۔ جیسا خاصا کشادہ تھا۔ کچھ ہی دور آگے جا کر آم کے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رات سنان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔

تینوں چپ چاپ چلتے رہے۔ انھوں نے دو ڈھائی میل فاصلہ طے کر لیا۔ وہ اب دیدار پور سے بہت دور آ گئے تھے۔

رحیم داد نے نوردین سے پوچھا۔ ”کیا راجو کو بھی اپنے ساتھ چک ۵۵ لے جائے گا؟“

”کیوں نہیں لے جاؤں گا۔“ نوردین نے جھٹ کہا۔ ”اسے لایا کس لیے ہوں۔“ رحیم داد چپ رہا۔ نوردین نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔

”چوہدری! ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟“

”میں اس لیے کہہ رہا ہوں، میاں داد فیروز راجو کو اٹھوا لے گا اور حاجی کے پاس بھجوا دے گا۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”وہ حاجی کو نراض نہیں کر سکتا۔ دونوں رسا گیر ہیں اور اس دھندے میں ایک دوسرے کے شریک دار ہیں۔ یہ بات تو بھی جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے حاجی کے مکا بلے میں میاں داد کے سامنے تیری کوئی حیثیت نہیں۔ تو اس کا مزاج ہی تو ہے۔“

”یہ بات تو ہے پر اب وہ کیا کر سکتا ہے؟“

”وہ یہ کر سکتا ہے، راجو کو اپنے کرندوں سے اٹھوا کر حاجی حبیب کے پاس دیدار پور پہنچا دے گا۔“ رحیم داد نے اس کی سادہ لوحی پر جل کر کہا۔ ”تجھے زمین سے بے دخل کر کے بھولا کے کتل یا موشیوں کی چوری کے الزام میں پکڑا دے گا۔“

”کہتا تو یہ ٹھیک ہے۔“ راجو بیچ میں بول پڑی۔ اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بھی ڈنگر چوری کرتا ہے؟“

”تیرا گز تو نہیں چل گیا۔“ نوردین نے اسے ڈانٹا۔ ”چوہدری سے میرا آج ہی میل ملاپ ہوا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو پھلی یہ کام کبھی نہ کر سکتی۔ چوہدری نے پورے دس روپے اسے دیے تب وہ تیار ہوئی۔ میری تو اس نے بات ہی نہیں مانی تھی۔ یہ نہ ہوتا تو تو مجھے کیسے ملتی۔“ اس نے مڑ مڑ کر راجو کی جانب دیکھا۔

”۲۰ روپے تو چوہدری نے تیرے سامنے ہی پھلی کو انعام کے دیے۔“

رحیم داد نے کسر نفسی سے کام لیا۔ ”میں نے کیا کیا جی، سب اوپر والے کی مرضی تھی۔“ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ ”نورے! تیری گھر والی تو مل گئی، اب آگے کی سوچ۔“

”سمجھ نہیں آتی۔ بتا، اب کیا کروں؟“

رحیم داد ذرا دیر سر جھکائے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”میں تو یہ کہتا ہوں، اسے اپنے یا اس کے کسی شریک کے گھر چھوڑ دے۔ اکیلا اپنے پنڈ چلا جا۔ میاں داد اگر راجو کے بارے میں پوچھے تو صاف انکار کر دیتا۔ مگر راجو کے حاجی کی ماڑی سے غائب ہونے کی اطلاع چک ۵۵ پہنچنے سے پہلے پہلے تجھے ہال پہنچ جانا چاہئے۔ کسی کو شبہ ہی نہ ہو گا۔“ وہ لمحے بھر خاموش رہا۔ ”ادھر کوئی ایسا پنڈ ہے جہاں

آئی۔

تینوں نظام اولیاء کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ نظام اولیاء سے نکلتے ہی نہر آگئی۔ وہ نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔

رات ڈھل رہی تھی۔ راستے سنان تھے۔ میل سوا میل راستہ طے کرنے کے بعد ایک پلایا آگئی۔ تینوں پلایا سے گزر کر نہر کے اس پار چلے گئے۔ مگر نہر کے کنارے کنارے چلتے رہے۔ چلتے چلتے نور دین نے رحیم داد سے پوچھا۔

”چوہدری! توں کرتا کیا ہے اور رہتا کہاں ہے؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”یوں سمجھ لے، نہ اپنا کوئی ٹھکانا ہے، نہ کوئی اپنا ہے۔“

نور دین نے پریشان ہو کر کہا۔ ”تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔“

”سمجھ آجھی نہیں سکتی۔ میں نے تجھے بتایا تھا میں گورداس پور کا مہاجر ہوں۔“

”کیا ہوا تھا تیرے ساتھ؟“

”یہ پوچھ، کیا نہیں ہوا۔“ اس نے نور دین کو وہی باتیں بتائیں جو مولوی فضل احمد سے کل صبح بیان کی تھیں اور اس کی ہمدردی حاصل کی تھی۔

نور دین بھی اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ”توں اتنا دکھی ہے یہ میں نوں پتہ نہیں تھا۔ کیا تو اکال گڑھ بھی اپنے بال بچوں کی تلاش میں جا رہا ہے؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ ”ادھر اپنا ایک پرانا ملنے والا ہے، اس کے پاس جا رہا ہوں۔“

راجو نے کہا۔ ”اٹھ برس سے اوپر ہو گئے، توں نے اب تک اپنا گھر بھی نہیں بسایا۔ اس طرح کب تک کام چلے گا؟“

”بس جیسے چل رہا ہے، ایسے ہی چلتا رہے گا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو نہیں بھول سکتا۔“

”چوہدری توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ نور دین نے اس کی تائید کی۔ ”بچہ تو اپنا کوئی ہے نہیں پر گھر والی کو بھی نہیں بھلایا جاسکتا۔“ اس نے مسکرا کر راجو کا چہرہ دیکھا۔ ”جب تک تو نہیں ملی تھی، میں تیرے لیے پاگل رہتا تھا۔ پر تیں نوں کیہ پتہ؟“

راجو شرما کر خاموش ہو گئی۔ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”ہاں جی، جس پر یقینی ہے، وہی جانتا ہے۔ میں کسی کو اپنا دکھ کیسے بتاؤں۔ برسوں ہو گئے اس آگ میں جلتے ہوئے پر اب تک

تو راجو کو چھوڑ دے؟“

”آگے تو چمک بیدی ہے اور اس سے آگے نظام اولیا۔“ راجو نے کہا۔ ”وہاں میرا کوئی شریک یا سچا نہیں، نورے کا بھی نہیں۔“ وہ خاموش ہو گئی اور گردن جھکا کر سوچنے لگی۔ نور دین بھی سوچ میں غرق تھا۔ ذرا دیر بعد راجو گردن ہلا کر بولی۔

”ہاں کرتار پور میں میری ایک مسیرویا ہی ہے۔ میری سنگی ماسی کی دھی ہے۔ ایک بار میں اس کے پاس گئی بھی تھی۔ اس کا گھر والا منصور بہت نیک بندہ ہے۔“ اس نے نور دین کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔

”نورے! وہیں چلا چل۔ منصور کو جانتا ہے۔ فصل کی واڈھی پر کئی بار اس کے پاس جا چکا ہے۔ مجھے بھی اس کے پاس لے کر گیا تھا۔ یاد ہے، کیسے پیار سے دونوں ملے تھے۔“

”تب تو کرتار پور ہی ٹھیک رہے گا۔“ رحیم داد گردن اٹھا کر آسمان دیکھنے لگا۔ ”اب تو رات توڑی رہ گئی ہے۔ تو سویرا ہونے تک چمک ۵۵ پہنچ جائے گا؟“

”مشکل ہے۔ دن نکلنے کے بعد ہی پہنچ سکوں گا۔ اب تو دو بج رہا ہو گا۔ یوں سمجھ لے جتنی دور یہاں سے کرتار پور ہے، اس سے کچھ دوری پر میرا پنڈ ہے۔ کرتار پور پہنچتے پہنچتے سویرے کی بجائے پھلنے لگے گی۔“

راجو نے کہا۔ ”ذرا دم لے کر پنڈ روانہ ہو جانا۔“

رحیم داد نے راجو سے اتفاق نہیں کیا۔ ”نہیں، اس کا دن میں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے نور دین تو سوچ لے۔“

”نہیں جی، دن ہی میں چلا جاؤں گا۔ تب تک حاجی بھی میاں داد کو خبر نہیں بھجوا سکے گا۔ حاجی کسی کو بھیجے گا بھی تو وہ شام ہونے سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔“

”بات تو تیری بھی ٹھیک ہے۔“ رحیم داد نے تائید کی۔ ”تو فیروی پروگرام بنا۔ یہاں سے سیدھے کرتار پور چلتے ہیں۔“

نور دین اور راجو پہلے ہی تیار تھے۔ تینوں آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ چمک بیدی نظر آیا۔ مکانوں میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ وہ ادھر نہیں گئے اور پنڈ تیزیوں اور پیسوں سے گزرتے ہوئے دور ہی سے نکل گئے۔ موٹی چوری کا دھندا کرنے کے باعث نور دین کو اس علاقے کی ہر بستی اور راستے کا بخوبی علم تھا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ان راستوں سے بار بار گزرا تھا۔ لہذا اسے راستہ تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ

ٹھنڈی نہیں پڑی۔“

نوردین اور راجو چپ رہے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ رحیم داد سے کس طرح اظہارِ ہمدردی کریں۔ رحیم داد بھی خاموش ہو گیا۔



کرتار پور بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی پختہ مکانات تھے اور دو منزلہ بھی تھے۔ چھوٹا سا بازار بھی تھا مگر رات کے پچھلے پہر ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ تینوں سنان گلیوں اور راستوں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھے۔ کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ قریب کی گلی سے ایک شخص نکلا اور بالکل ان کے سامنے آگیا۔ اس نے راجو کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے پچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

راجو کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا، گہرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”نورے! یہ زمین دار کا کردہ فیدو لگتا ہے۔ اس نے مجھے پچان لیا ہے۔ ابھی جا کر حاجی سے کھبری کرے گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“

نوردین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو اندھیرا ہے۔ اس نے تجھے کیسے پچان لیا۔ اگر پچان بھی لیا ہے تو پروا نہ کر، منصور کے گھر سے وہ تجھے نہیں اٹھا سکتا۔“
تینوں آگے بڑھے۔ منصور کے مکان کے سامنے پہنچے۔ منصور کا مکان تھا تو کچا مگر کشادہ اور بڑا تھا۔ نوردین نے ہانک لگائی۔

منصور جھٹ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ وہ جاگ رہا تھا۔ آتے ہی نوردین سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا اور جیسے ہی راجو پر نظر پڑی، خوشی سے چیخ پڑا۔ ”ارے! تو اسے لے آیا۔“ اس نے دروازے کے اندر جھانک کر بیوی کو آواز دی۔ ”سا جاں! دیکھ تو کون آیا ہے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”سب باہر کیوں کھڑے ہو، اندر آ جاؤ۔“

تینوں گھر میں داخل ہوئے۔ راجو کی خالہ زاد بہن ساہاں بھاگتی ہوئی آئی اور راجو سے چہرہ گئی۔ ”ہائے، تو آگئی۔“

راجو، ساہاں کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ساہاں اس کا بدن ٹٹولتے ہوئے بولی۔ ”کتنی دلی ہو گئی۔“ وہ خود دہرے بدن کی نوجوان عورت تھی۔ عمر میں راجو سے بڑی، رنگ کھلتا ہوا مگر ناک نقشہ کسی قدر بھدّا۔

سب آگن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ منصور کے دونوں بچے بھی بیدار ہو گئے تھے اور قریب آکر حیرت سے راجو کو دیکھ رہے تھے۔ راجو بار بار دوپٹے سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اب اجالا خوب پھیل گیا تھا۔

رحیم داد نے اجالے میں راجو کو غور سے دیکھا۔ اس کی عمر بیس ایکس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ چمپی رنگت تھی، ناک سبک تھی، آنکھیں غزالی تھیں۔ وہ خوش شکل عورت تھی۔ ساہاں کے پلو میں بیٹھی ہوئی وہ اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

کچھ دیر بعد منصور اٹھا۔ رحیم داد اور نور دین کو ڈیرے میں لے گیا۔ ڈیرا گھر کے برابر ہی تھا، اس میں کھلا صحن تھا۔ صحن کے دو طرف چھپر کی خیدہ چھت کا برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے تین کمرے اور دو کوٹھریاں تھیں۔

تینوں ایک کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں کھڑکی تھی اور ایک دروازہ باہر گلی میں کھلتا تھا۔ کمرے میں چارپائی بچھی تھی۔ اس پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ منصور صحن میں گیا اور ایک چارپائی اور اٹھا کر کمرے میں لے آیا۔ ایک چارپائی پر رحیم داد اور نور دین بیٹھ گئے۔ دوسری پر منصور بیٹھ گیا۔

منصور نے رحیم داد کے بارے میں پوچھا۔ نور دین کی زبانی جب یہ معلوم ہوا کہ راجو کو حاجی کی قید سے رہائی دلانے میں رحیم داد نے بڑی مدد کی ہے تو منصور بہت خوش ہوا۔ نور دین اسے ایک ایک بات تفصیل سے بتاتا رہا۔

منصور دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اب ہلکی ہلکی دھوپ دیواروں کی بلندی پر جھلکنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر میں ساہاں پیتل کے تھال میں پرائٹھے لے کر آئی۔ اس کے ساتھ کانسی کے گلاسوں میں لبالب بھری ہوئی لسی تھی۔ پرائٹھوں پر مکھن کا مسخرو تھا، تلے ہوئے انڈے اور اچار تھا۔

ساہاں نے تھال نور دین اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں ناشتا کرلو۔ رات بھر کے بھوکے اور تھکے ہوئے ہو۔“ وہ منصور سے مخاطب ہوئی۔ ”راجو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ انھیں کھانے دے، اچھے راجو کے پاس آ جا۔ تیری تو اس سے کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔ کچھ تو اس کا کیا حال ہو گیا ہے۔“

منصور چپ چاپ بیوی کے ساتھ چلا گیا۔ نور دین اور رحیم داد ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی نور دین چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت تک منصور واپس آ گیا تھا۔ اس نے نور دین کو روکنا چاہا۔ ”نورے! تو رات بھر کا جاگا ہوا ہے، لمبا سفر بھی کیا ہے، ذرا آرام کر لے۔ دوپہر کو روٹی مکر کھا کر چلا جانا۔ ایسی پختہ کسیدہ ہے؟ میری سیکل لے جا۔“ مگر نور دین راضی نہیں ہوا۔

”مجھے اب جانے دے۔ سیکل دے دے تو فائٹ پنڈ پینچ جاؤں گا۔“

رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ ”منصور کی سیکل لے کر نہ جا۔ میاں داد کو شبہ ہوگا، تو پیدل ہی جا۔“

”ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔“ نور دین نے اتفاق کیا۔ ”آگے آنا گا بھی مل جائے گا۔ ویسے میں پیدل بھی جا سکتا ہوں۔ شام تک واپس آ جاؤں گا۔“

”شام کو واپس نہ آنا۔“ رحیم داد نے منع کیا۔ ”کیوں خاما خاشبہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ تین چار روز بعد آنا جب معاملہ ذرا دب جائے۔ ابھی تو میاں داد اور حاجی، دونوں تجھ پر شبہ کریں گے۔ تیری نگرانی بھی کریں گے۔ تو دیدار پور حاجی کے پنڈ جا چکا ہے۔ رستے میں حاجی کا کردہ فیدو ملا تھا، تجھ پر انھیں شبہ ہونا بھی چاہئے۔ راجو میاں ہر طرح ٹھیک ہے، آرام سے بھی رہے گی۔“

”بالکل آرام سے رہے گی۔“ منصور نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کر۔ فکر نہ کر، راجو میاں ہر طرح ٹھیک ٹھاک رہے گی۔“

نور دین نے کچھ نہیں کہا۔ ڈیرے سے نکل کر اپنے گاؤں، چک ۵۵ کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی منصور بیٹھا رہا۔ مگر جلد ہی کھڑا ہو گیا۔

”چوہدری! تو ساری رات کا جاگا ہوا ہے۔ تھکا ہوا بھی بہت ہے، اب سو جا۔ تجھ سے بعد میں پُپ شپ رہے گی۔ میری فصلوں کی واڈھی ہونے والی ہے۔ لاوے آئے ہوئے ہیں، ان سے واڈھی کے بارے میں بات چیت کرنی ہے۔“

رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی، تھکن سے جسم میں اینٹھن بڑھ رہی تھی۔ منصور کی باتیں سن کر وہ خاموش رہا۔ منصور باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے آنکھوں سے

عینک اتاری۔ عینک سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور لیٹتے ہی سو گیا۔

دوپہر کو منصور نے اسے بیدار کیا اور کھانا کھانے کے لیے کہا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہیں تھی۔ منصور نے اصرار بھی کیا، وہ کھانا کھانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ بیدار ہونے کے بعد وہ سویا بھی نہیں۔ باتیں کرنے لگا۔

منصور کی باتوں سے جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ موروثی مزارع ہے۔ اس کے پاس تیس ایکڑ سے اوپر مزروعہ نہری زمین ہے۔ منصور کے ساتھ اس کا منجھلا بھائی خالد بھی رہتا تھا۔ دونوں مل جل کر کھیتی باڑی کرتے تھے۔

مزارع ہونے کے باوجود منصور کھانا پیتا کسان تھا۔ اس کا ڈھارا بھی بڑا تھا۔ اس میں بیلوں کی دو جوڑیوں کے علاوہ دو بھینسیں اور ایک گائے بھی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی شاکر، کرتار پور ہی میں تھا مگر علیحدہ رہتا تھا۔ ماں زندہ تھی۔ کبھی بڑے کے پاس رہتی، کبھی چھوٹے کے پاس۔ مگر زیادہ وقت شاکر کے پاس گزرتا تھا۔



رحیم داد نے باہر نکل کر گاؤں کا چکر لگایا اور ٹمٹما ہوا کرتار پور کے بازار میں چلا گیا۔ بازار سے اس نے ایک چادر، صابن اور کنگھی خریدی۔ بازار ہی میں پیپل کے ایک درخت کے نیچے موچی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس جوتے کا ایک جوڑا تیار رکھا تھا۔ رحیم داد نے پہن کر دیکھا۔ اس کے پیروں میں بالکل فٹ تھا۔

وہ ابھی تک مقتول حکیم چشتی کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جوتے تنگ تھے اور پرانے ہو کر جگہ جگہ سے پھٹنے لگے تھے۔ دیے بھی وہ حکیم کی کوئی نشانی اپنے پاس رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر خطرہ تھا۔ اس نے جوتا خرید لیا۔

خریدی ہوئی ساری اشیاء اس نے چادر میں لپیٹ لیں مگر منصور کے گھر نہیں گیا۔ نہری طرف چلا گیا۔ نہر گاؤں سے نصف میل کے فاصلے پر تھی۔ نہری جانب جاتے ہوئے اس نے پرانے جوتے گندے پانی کے ایک گڑھے میں ڈال کے نئے جوتے پہن لیے۔ اب اس کے جسم پر حکیم چشتی اور نور الہی کی کوئی نشانی باقی نہیں تھی۔

نہر پہنچ کر رحیم داد نے کپڑے اتارے اور صابن سے جسم رگڑ رگڑ کر نہانے لگا۔ گرمی اس روز کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ دیر تک نہر میں نہاتا رہا۔ نہادھو کر اس نے چادر سے جسم ڈھکا۔ کہا۔ کپڑے

رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے طے کیا کہ نوران اور بچوں کو لے کر سندھ چلا جائے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے زیادہ رقم اس کے پاس تھی۔ اس رقم سے وہ رشوت دے کر مرحوم چوہدری نور الہی کے کلیم کی بنیاد پر خاصی بڑی اور عمدہ زمین الاٹ کرا سکتا تھا۔ گورداس پور کا مہاجر چوہدری نور الہی بن کر خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا۔ نوران سخت محنتی اور سلیقہ مند تھی۔ دونوں مل کر زندگی کا نیا سفر شروع کر سکتے تھے۔ اپنا اجڑا ہوا گھر ایک بار پھر آباد کر سکتے تھے۔

رحیم داد سوچتے سوچتے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے سر پر پگڑی باندھی، عینک لگائی، جوتے پہنے، کلیم کے کاغذات کا برتہ حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھا۔ کمرے سے باہر آیا اور دروازہ بند کر کے زنجیر چڑھادی۔

وہ ڈیرے سے ایک بار پھر باہر نکلا اور کرتار پور کے بازار پہنچ گیا۔ اس نے سارے نوران کے لیے جھمکے اور اپنی لاڈلی بیٹی زینو کے لیے چاندی کی بگیتیاں خریدیں۔ کریمہ کے لیے بازار میں کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ چھوٹا ساقبائی بازار تھا، چند دکانیں تھیں۔ اس نے بازار کے کئی چکر لگائے۔ طوائف سے آدھ سیر مٹھائی خرید کر کندھے پر پڑے ہوئے پرانے کے ایک پلو میں باندھی اور واپس

آگیا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ شام کے سائے گاؤں کے در دیوار پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ منصور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ البتہ راجو کمرے میں آئی۔ اس کے ہاتھ میں لالین تھی۔ اس نے لالین طاق میں رکھی اور ماچس جلا کر اسے روشن کرنے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجو نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔

”چوہدری! یہاں گرمی میں کیوں لیٹا ہے۔ باہر دھڑے میں منجی پر جا کر بیٹھ جا۔ میں تیرے لیے روٹی لے کر آتی ہوں۔“

راجو چلی گئی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر صحن میں گیا۔ منہ دھویا اور برآمدے کے سامنے کچھ ہوئی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا، رات کا پہلا پھر تھا۔ راجو کھانا لے آئی اور رحیم داد کے سامنے چارپائی پر رکھ دیا۔ وہ کمرے کے اندر گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں لالین لٹک رہی تھی۔

اس نے لالین برآمدے کے ایک کھمبے پر لگی ہوئی کیل سے لٹکا دی۔ رحیم داد لالین کی روشنی میں کھانا کھانے لگا۔ بھوکا بھی تھا، اس نے رغبت سے کھانا کھایا۔ راجو کچھ دیر ٹھہر کر گھر کے اندر چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد کمرے میں گیا۔ اس نے کنگھی سے سر کے بال جمائے، ڈاڑھی سنواری، جھمکے اور گیتیاں کاغذ کے ٹکڑے میں لپیٹ کر احتیاط سے قمیص کی اندرونی جیب میں رکھیں۔ مٹھائی پر نے سے نکال کر رومال میں باندھی۔ بغل میں کلیم کے کاغذات کا بستہ دبایا، کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ ڈیرے سے باہر جانے لگا۔

آنگن میں راجو مل گئی، اس نے پوچھا۔ ”چوہدری! اکال گڑھ تو نہیں جا رہا؟“

رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ہاں، میں اکال گڑھ ہی جا رہا ہوں۔“

”کب تک لوٹے گا؟“

”کچھ پتہ نہیں۔ جس سے ملنے جا رہا ہوں، مل گیا تو دیر سے واپسی ہوگی۔ تو منصور کو بتا دیتا۔“

راجو خاموش رہی۔ رحیم داد ڈیرے سے باہر چلا گیا۔ گاؤں کی گلیوں سے نکل کر کھیتوں کے درمیان سے گزرتا ہوا نہری کی جانب چل دیا۔

اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ نہر پر پہنچا تو ہر طرف سناٹا پھیل چکا تھا۔ اس نے پلایا عبور کی اور نہر کے اس پار پہنچ گیا۔ کچھ دور تک نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا پھر کپا را۔

نہا کا کشادہ تھا۔ میل گاڑیوں اور ریزھوں کے پیوں نے راستے میں جگہ جگہ گڑھے ڈال دیے تھے۔

وہ چپ چاپ کچے راستے پر چلنے لگا۔ آگے بڑھا تو سامنے سے ایک سائیکل سوار آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے روک کر اکال گڑھ کا راستہ پوچھا۔ وہ وہیں سے آ رہا تھا، کہنے لگا۔ ”یہ سداہ راستہ اکال گڑھ ہی جاتا ہے۔“

رحیم داد نے اکال گڑھ کے پرائمری اسکول کا پتہ دریافت کیا۔ اس نے وہ بھی بتا دیا۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ سائیکل سوار نے پیدل پر پیر مارا اور آگے بڑھ گیا۔ دیکھتے دیکھتے دور نکل گیا۔



راستہ سنان تھا۔ دونوں طرف کھیت تھیں۔ کبھی فصلیں تیار کھڑی تھیں، کبھی کٹ چکی تھیں۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ نورائیں اور بچوں کے بارے میں سوچتا رہا اور یادوں کی دھندلی پگھندلیوں پر بھٹکتا رہا۔ بچے دنوں کے خوشگوار لمحات، جو اس نے نورائیں اور بچوں کے ساتھ گزارے تھے، روشن چراغوں کی طرح نظروں میں جھلملاتے رہے۔ وہ جتنا آگے بڑھتا گیا بیوی بچوں سے ملنے کا شوق بھجان انگیز ہو گیا۔

رحیم داد اکال گڑھ میں داخل ہوا۔ بستی کی رونق اجڑ چکی تھی۔ گلی کو بچے سنان تھے۔ کبھی کبھی گھروں سے باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ایک گلی سے نکل کر وہ کھلی جگہ پہنچا تو دھندلی روشنی میں کچھ فاصلے پر اسے ایک راہ گیر نظر آیا۔

رحیم داد ٹھٹکا۔ اسے شبہ ہوا کہ وہ اس کا پرانا یا رجمال دین ہے۔ رحیم داد نے تو اس سے ملنا چاہتا تھا، نہ قطعی طور پر فیصلہ کر سکا کہ وہ کون ہے؟ ویسے جمال دین کے وہاں ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے تو احمد کوٹ میں ہونا چاہئے تھا۔

راہ گیر اندھیرے میں او جھل ہو گیا۔ رحیم داد چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اسکول کی جانب بڑھا۔ اکال گڑھ بھی بڑا موضع تھا۔ اس میں کئی گاؤں شامل تھے۔ کتا رپور سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ آبادی بھی زیادہ تھی۔ پختہ مکانات بھی تعداد میں زیادہ تھے۔ رحیم داد گلی کوچوں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ وہ اسکول کی عمارت کے قریب پہنچ گیا۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ مگر اسکول کا چوکیدار جاگ رہا تھا۔ سامنے کھلا میدان تھا۔ چوکیدار اسکول کی عمارت کے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ گزرتا رہا تھا۔ وہ ادھیڑ اور دہلا پٹلا تھا۔ بار

بار کھانستا اور کھنکار کر اونچی آواز سے بلغم تھوکتا۔

رحیم داد اس کے قریب پہنچا۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ ”کون ہے؟“ وہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”میرا نام چوہدری نور الہی ہے۔“
”اتنی رات گئے ادھر کیسے آتا ہوا؟“

رحیم داد ایسے سوالوں کے جواب کے لیے خود کو پہلے ہی سے تیار کر چکا تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”چاچا! تجھ سے یہ پوچھنا تھا، تیرے سکول میں جن واٹ کے سکول ماسٹر عبدالغفور کا چالہ ہونے والا تھا، وہ اُگیا کہ نہیں؟ اگر اُگیا تو اس کا مکان کون سا ہے؟“

رحیم داد کی بات سن کر چوکیدار سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا دیر خاموش رہ کر بولا۔ ”نہیں جی، اس نام کا اپنے سکول میں کوئی ماسٹر نہیں اور نہ ادھر کوئی نیا ماسٹر تبدیل ہو کر آیا ہے۔ تبدیلی کا اگر حکم جاری ہو چکا ہے تو اس کا اپنے کو پتہ نہیں۔“ وہ آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔ ذرا قرار آیا تو اس نے بتایا۔ ”اس بات کا پتہ تو ہیڈ ماسٹر ہی سے چلے گا اور وہ یہاں ہے نہیں۔ پاک چن گیا ہے۔ دو تین روز میں واپسی ہوگی۔ ادھر اس کے کسی شریکے کے گھر میں موت ہو گئی ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ حقے کے کٹ لگانے لگا۔

”اس کا مطلب یہ ہوا تیں نوں عبدالغفور کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“

”ہاں جی، میں نوں کچھ پتہ نہیں۔“ چوکیدار نے نرمی سے کہا۔ ”کھڑا کیوں ہے، بیٹھ جا۔ لگتا ہے، دور سے چل کر آیا ہے۔“

رحیم داد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چوکیدار نے حقہ رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ حقہ لے کر رحیم داد کٹ لگانے لگا۔ مگر اسے حقے سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے چند کٹ لگانے کے بعد حقہ چوکیدار کو واپس دے دیا۔

رحیم داد نے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار باتوں میں لگ گیا۔ وہ حقہ گزگڑاتا رہا اور رک رک کر بولتا رہا۔

رحیم داد اپنے بڑے بیٹے کریم کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا تاکہ اس مکان کا سراغ مل جائے جس میں نوران بچوں کے ساتھ مقیم تھی۔ مگر یہ پوچھتے ہوئے وہ جھجک رہا تھا۔ اسی اثنا میں ایک عورت باہر آئی، چوکیدار نے اسے دیکھ کر پوچھا۔

”جیراں! تو ابھی تک جاگ رہی ہے؟“

”تیں نوں تو کچھ پتہ نہیں۔ بیٹھا حقہ پیتا رہتا ہے یا کھانستا رہتا ہے۔“ وہ کڑوے لہجے میں بولی۔
”میں ابھی کیسے سو سکتی ہوں۔ حیدر کے ہاتھ میں درد ہے۔ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اس پر تیل مل رہی تھی۔“

چوکیدار نے بیوی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا حیدر کو؟ اس کے ہاتھ میں درد کیوں ہے؟“
”کریے نے آج فیرا سے مارا ہے۔ ایسا ہاتھ مروڑا اب تک درد کر رہا ہے۔“ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ غصے سے بولی۔ ”میں نے کریے کی ماں سے آج صاف صاف کہہ دیا، سنبھال کر رکھ اسے۔ اب جو اس نے میرے پت کو مارا تو اس کا ہاتھ پتھر پر رکھ کر توڑ دوں گی۔“
کریے کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ اسے یقین ہو گیا کہ رجب نانکی نے غلط اطلاع نہیں دی۔ مگر وہ بالکل خاموش رہا۔

چوکیدار نے بیوی کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جیراں! تیں نوں ایسی گل نہیں نکالنی چاہئے۔ یہ چھوہرے تو لڑتے جھگڑتے ہی رہتے ہیں۔ ساتھ کھیلیں گے تو آپس میں لڑائی جھگڑا بھی کریں گے۔“
جیراں بگڑ کر بولی۔ ”تو کچھ ہی کہہ، میں اب نہیں ماننے کی۔ دیکھ لیتا، اس کا ہاتھ نہ توڑ دیا تو میرا ناں جیراں نہیں۔“

چوکیدار نے ایک بار پھر نرمی سے بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اللہ سے ڈر جیراں! یہ تو سوچ کریم ابن پیو کا بچہ ہے۔ یتیم مسکین ہے۔“

رحیم داد تڑپ کر بیچ میں بول پڑا۔ ”کہاں رہتا ہے کریم؟“

”سکول کے برابر والی گلی میں جاؤ تو پچھواڑے سجے ہتھ کو تیرا مکان ہے۔“ چوکیدار نے بتایا۔
”پراس کا پتہ کیوں پوچھ رہا ہے۔ اسے جانتا ہے؟“

”نہیں جی! میں اسے نہیں جانتا۔“ رحیم داد صاف مکر گیا۔ ”میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا۔ تیرے تو پڑوس کا چھوہرا ہے۔ پڑھتا بھی تیرے سکول ہی میں ہوگا؟“

”ناجی نا، وہ سکول شکول میں نہیں پڑھتا۔“ جیراں نے منہ بگاڑ کر حقارت سے کہا۔ ”وہ تو دن بھر شور شرابا کرتا ہے۔ لڑائی جھگڑے کرتا ہے۔ اسے اور کام ہی کیا ہے۔“

چوکیدار نے مسکرا کر کہا۔ ”اب تو جا کر سو رات بہت ہو گئی۔ تیں نوں سویرے پوہ پھٹالے اٹھنا ہوتا ہے۔“

جیراں نے ایک بار پھر منہ بگاڑا۔ شوہر کو حیکمی نظروں سے دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی گھر کے اندر

چلی گئی۔

رحیم داد نے کریم کے بارے میں مزید کچھ نہیں پوچھا اور نہ چوکیدار نے اس کا ذکر چھیڑا۔ رحیم داد نے ہیڈ ماسٹر اور اسکول کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔ چوکیدار بہت باتوں ہی تھا اور اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے باتیں کرتا رہا اور حقہ گزگرتا رہا۔ رحیم داد مزید رات گزر جانے کا انتظار کرتا رہا۔

رات اور کالی ہو گئی۔ گاؤں کا سناٹا زیادہ گہرا ہو گیا۔ چوکیدار بھابھیاں لینے لگا۔ اسے اب نیند آ رہی تھی۔ رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ بوڑھے سے رخصت ہوا اور اندھیرے میں ایک طرف چل دیا۔

میدان سے گزر کر وہ اس گلی میں چلا گیا جو اسکول کے پچھواڑے تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا عین اس جگہ پہنچ گیا جہاں اسکول کے برابر سے گزرنے والی گلی ملتی تھی۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا، پھر آہستہ آہستہ تیسرے مکان پر پہنچا۔ خاصی دیر ان جگہ تھی۔ مکان بھی کم تھے، کپے اور چھوٹے تھے۔



رحیم داد دروازے کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل سے دروازے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ اس نے دروازہ آہستہ آہستہ کھٹکھٹایا اور بے قراری سے کندھی کھٹنے کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے سوچا کہ دروازے کا ایک پٹ دھیرے سے چرچراتا ہوا کھٹے گا۔ اس کی آڑ سے نوران کا خوبصورت چہرہ نمودار ہو گا۔ وہ نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں پوچھے گی۔ ”کون ہے؟“ وہ جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دے گا۔ اسے چمکا کر ہولے سے پیار کرے گا۔ اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر سرگوشی کرے گا۔ نوران! میں ہوں تیرا رشتے۔ اور جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر گھر کے اندر چلا جائے گا۔

مگر اندر سے نہ کوئی آواز ابھری، نہ دروازہ کھلا۔

رحیم داد بے چینی کے عالم میں کھڑا رہا۔ وہ اس ڈر سے دروازہ زور زور سے کھٹکھٹاتا نہیں چاہتا تھا مبادا پڑوسیوں کی آنکھ کھل جائے۔ وہ خاموشی سے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا تاکہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، وہ نوران سے تنہائی میں ملے اور اسے اپنے بارے میں ساری باتیں بتا دے۔ پھر دونوں سر جوڑ کر بیٹھے اور آئندہ کا منصوبہ بناتے۔

اس نے دروازے پر مزید دستک دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گھر کے برابر گلی تھی وہ گلی میں داخل ہو گیا۔ گلی تنگ تھی، اندھیرا بھی زیادہ تھا۔ اس طرف گھر کا آگن تھا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔

رحیم داد کو جیل میں لالی دیوار پھاندنے اور دیوار پر چڑھنے کے گرتا چکا تھا۔ جیل سے فرار ہونے سے پہلے تو وہ ہر روز ایسے ہی ہٹھکنڈے اور گرتا تھا۔ اس نے لالی کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھل کر دیوار کا بالائی حصہ پکڑنے اور اسے پکڑ کر اوپر چڑھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

اس کی دونوں ہتھیلیاں دیوار کی رگڑ سے چھل گئیں۔ وہ گھپ اندھیرے میں کچھ دیر خاموش کھڑا رہا پھر آگے بڑھا۔

گھر کے آگن میں شیشم کا درخت تھا۔ درخت کی ایک ڈال دیوار چھوتی ہوئی گلی میں نکل آئی تھی۔ ڈال مضبوط اور خاصی نیچی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گلی کے بچوں نے لنک لنک کر اسے نیچے جھکا دیا ہے۔

رحیم داد نے درخت کی جھکی ہوئی شاخ دیکھی اور اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ اس نے پیروں سے جوتے اتارے اور دیوار کے ساتھ اندھیرے میں اس طرح رکھ دئے کہ صاف نظر نہ آئیں۔ کلیم کے کانڈات کا بستہ بھی وہیں رکھ دیا۔ مٹھائی کی پوٹلی دانتوں میں دبائی۔ گردن اٹھا کر ڈال دیکھی۔ اچھلا اور دونوں ہاتھوں سے اسے تھام لیا۔ اس نے اپنے پیر دیوار سے ٹکاے اور ڈال کے سارے کھٹکھٹا ہوا آگے پڑھنے لگا۔ ڈال اس کے بوجھ سے آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ مگر رحیم داد دیوار پر چڑھ گیا۔ اس نے آگن میں نظر ڈالی۔ وہاں سناٹا تھا۔

وہ کچھ دیر دیوار پر بیٹھا درخت کی آڑ سے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ وہ دیوار سے لنک کر دھیرے سے آگن میں اتر گیا۔

اس نے اندر جا کر دیکھا۔ آگن خاصا مختصر تھا۔ اس کے ایک طرف دیوار پر چھپر بڑا تھا۔ چھپر کے ساتھ ہی کوٹھری جیسا چھوٹا کمرہ تھا۔ رحیم داد دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ آگن میں صرف ایک چارپائی تھی۔ اس پر چادر اوڑھے کوئی سو رہا تھا۔ وہ چارپائی کے قریب پہنچا۔ اس کا بیٹا کریم لیٹا تھا۔ ساتھ ہی اس کی بیٹی زینو سکڑی سکڑائی پڑی تھی۔ رحیم داد نے پہلی ہی نظر میں دونوں کو پہچان لیا۔

دونوں گری نیند سو رہے تھے۔ مگر نوران وہاں نہیں تھی۔ اس نے گردن موڑ کر چھپر کے نیچے

دیکھا وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اس کی ایک جھری سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔

رحیم داد نے سوچا، نوران کمرے میں ہوگی۔ وہ بچوں کے سرہانے اندھیرے میں بت بنا کھڑا تھا۔ دونوں بچے ستاروں کی روشنی میں آنکھیں بند کئے لیٹے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا، کریسے کا قد کچھ لمبا ہو گیا ہے۔ زینو کے چہرے پر وہی پہلی سی معصومیت ہے، وہی بھوپین۔ اس نے دھیرے سے اپنا ایک ہاتھ بڑھایا۔ زینو کے بال چھوئے۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا۔ زینو کے بال خاک اور میل سے چیکٹ ہو رہے تھے۔

اسے دکھ ہوا کہ نوران نے بچوں پر توجہ دینا چھوڑ دی ہے۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری، جھکا اور زینو کے ایک رخسار پر اپنے لرزتے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ بے خبر سوتی رہی۔ اس نے آہستہ سے کریسے کی پیشانی چومی۔ وہ بے چین ہو کر کلبلا یا۔ رحیم داد جھٹ چارپائی کے سرہانے دبک کر بیٹھ گیا۔ کریسے نے کروٹ بدلی اور پھر گہری نیند سو گیا۔

رحیم داد چارپائی کی آڑ میں بیٹھا رہا اور گردن اٹھائے حسرت بھری نظروں سے بچوں کو تکتا رہا۔ اسے بے اختیار اپنا چھوٹا بیٹا یاد آ گیا۔ وہ بھی دونوں بچوں کے ساتھ چارپائی پر لیٹا ہوتا۔ مگر اسے تو سیف اللہ کے بھائیوں نے جلا کر ختم کر دیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی رحیم داد کا دل بھرتا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ چپ چاپ بیٹھا روتا رہا اور گہری بے سرو سامانی دیکھ کر اپنی مجبوری اور بے بسی پر کڑھتا رہا۔

رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا چھپرے کے نیچے پہنچ گیا۔ وہ چپ چاپ کھڑا کمرے کا بند دروازہ تکتا رہا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس نے قمیص کی اندرونی جیب کے اندر ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپیٹے ہوئے جھیکے انگلیوں سے ٹٹولے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ نوران کو جھیکے بست پسند ہیں۔ اس کے پاس کانوں میں پہننے کے لیے مندرے تھے۔ مگر وہ ہر فصل کی کٹائی کے بعد رحیم داد سے جھمکنی کی فرمائش کرتی۔ وہ اس کے لیے جھیکے نہیں بنوا سکا تھا۔ اس نے سوچا، جھیکے دیکھ کر نوران کا چہرہ پھول کی طرح کھل جائے گا۔ وہ اپنے ہاتھ سے اس کے کانوں میں جھیکے پہنائے گا۔ اس کا دل کش چہرہ نظر بھر کر دیکھے گا اور بے اختیار اسے گلے لگالے گا۔ وہ بانپنے کے سے انداز میں رک رک کر گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازے میں خاصی چوڑی جھری تھی۔ اس نے جھری سے ایک آنکھ لگا کر اندر نظر دوڑائی۔ مگر اندر جھانکتے ہی اس کے دل کا

لگا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔

اس نے دیکھا، کمرے کے اندر چارپائی پر نوران لیٹی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مرد تھا جس کے سینے پر ایک ہاتھ پھیلائے وہ کروٹ کے بل سو رہی تھی۔ مرد کا چہرہ وہ نہیں دیکھ سکا۔ اس کا صرف ہاتھ اور سر کے بال نظر آرہے تھے۔ چہرہ نوران کے بازو کی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ یہ ہولناک منظر وہ زیادہ دیر نہیں دیکھ سکا، الگ ہٹ گیا۔ غصے سے اس کا خون کھول رہا تھا۔ وہ ذرا دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔

اس نے جھری سے پھر اندر دیکھا۔ اس کا غصہ اور شدید ہو گیا۔ اس نے نظریں ہٹالیں۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر چاقو نکالا۔ اسے آہستہ سے کھولا۔

وہ دونوں کو سوتے ہی میں قتل کر دینا چاہتا تھا۔ دل میں یہ ٹھان کر اس نے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازہ چرچاتا ہوا ذرا سا کھل گیا۔ مگر دروازے کی چرچاہٹ کے ساتھ ہی نوران کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ رحیم داد دروازے کے پتوں بچ کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں خوں خوار ہو رہی تھیں۔ چہرے پر دشت برس رہی تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ نوران نے پہلے تو اسے حیرت سے دیکھا، پھر اس کی آنکھیں خوف سے پھٹ گئیں۔ اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد جھٹ دروازے کے سامنے سے ہٹ گیا۔ چھپرے سے باہر نکلا۔ قریب ہی گھاس پھوس کا مٹھا تھا اور خاصا بڑا تھا۔

فرار ہونے کی گنجائش نہیں تھی۔ رحیم داد مٹھے کی آڑ میں دبک کر بیٹھ گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں تھام لیا۔ ذرا دیر بعد کوئی دھوٹی باندھتا ہوا دروازے سے نکل کر چھپرے کے نیچے آ گیا۔

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ وہ جمال دین تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہ کمرے کے اندر سے نکلتی ہوئی چراغ کی روشنی میں کھڑا دھوٹی باندھ رہا تھا۔ اس کے پیچھے نوران تھی، دروازے کی دہلیز سے ذرا آگے بڑھ کر سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ رحیم داد دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

جمال دین نے گہرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”یہاں تو کوئی نہیں۔ جانے تو کیا دیکھ کر ڈر گئی۔“

وہ آہستہ سے بولی۔ ”میں نے اسے خود دیکھا تھا۔“

”ہمارے پاس دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے۔“

”وہ چور تو نہیں لگتا تھا۔“

”فیہ کیا لگتا تھا؟“

”اس کی داڑھی تھی۔ مونچھیں تھیں۔ اجلا کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھا۔“

”چور تو وہ نہیں ہو سکتا۔“ جمال دین نے قیاس آرائی کی۔ ”چور تو منہ پر منڈا سا باندھ کر آتے

ہیں۔ ان کی تو صرف آنکھیں نظر آتی ہیں۔ جانے تو نے کیا دیکھا۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔“

”نہیں دینے، میں نے اسے ٹھیک طرح دیکھا ہے۔ بچ دروازے میں کھڑا مجھے لال لال آنکھوں

سے گھور رہا تھا۔“ اس نے ذرا رک کر کہا۔ ”ہائے کیسی ڈراؤنی آنکھیں تھیں۔ ڈر کے مارے

میری توجہ بھی نہ نکل سکی۔“

جمال دین جھٹ اندر گیا اور لمبی لاٹھی نکال کر لایا۔ وہ زور زور سے کھکھارتا ہوا آگن میں آیا۔

شیشم کے درخت کی طرف گیا۔ بچوں کی چارپائی کے پاس پہنچا۔ وہ ابھی تک بے خبر سو رہے تھے،

جب وہ گھاس پھوس کے ڈھیر کی طرف بڑھا تو رحیم داد سکر کر اور دب گیا۔ اس نے چاقو مضبوطی

سے انگلیوں میں بھینچ لیا۔

جمال دین قریب آگیا۔ جب تک وہاں کھڑا رہا رحیم داد سانس روکے رہا۔ جمال دین چند لمے

ٹھہرا۔ اسے جمال دین کے صرف پیر نظر آرہے تھے۔ جمال دین مڑا اور بیردنی دروازے کی جانب

بڑھا۔ قریب جا کر اس نے دروازہ کھولا اور گھر سے باہر چلا گیا۔

نوراں چھپر کے نیچے دھندلی روشنی میں تنہا کھڑی تھی۔ رحیم داد دکھ اور نفرت کے ملے جلے

احساسات کے ساتھ ٹٹکنی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ گردن اٹھائے دروازے کی جانب دیکھ رہی

تھی۔ اسے جمال دین کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اس کی خوش نمالہ گردن میں اس وقت بھی وہی

خم تھا جسے دیکھ کر وہ وارفتہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لمبے چمکیلے بال پیٹھ پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے

چہرے کا نصف حصہ روشنی میں تھا جو خوب صورت بھی تھا اور دل آویز بھی۔ اس کے ہونٹ ذرا

سے کھلے تھے اور ہولے ہولے کپکپا رہے تھے۔

کچھ دیر بعد جمال دین واپس آگیا۔ اس نے دروازے کی کنڈی لگائی اور لاٹھی اٹھائے سیدھا

نوراں کی جانب بڑھا۔ قریب گیا اور سینہ تان کر بولا۔ ”کوئی بھی تو نہیں۔ میں نے ہر طرف دیکھا۔

کوئی نظر نہیں آیا۔ تو اس ویں ڈر گئی۔“

”تجھے کیسے بتاؤں، میں نے اسے دیکھا تھا۔“ نوراں کی آنکھوں سے خوف صاف جھلک رہا تھا۔

”مجھے تو ایسا لگا جیسے وہ رخصت ہو۔“

”حد کردی تو نے۔ رحیم اب کیسے آسکتا ہے۔“ نور دین نے ہلکا تھقہ لگایا۔ ”اسے تو کتل کر دیا

گیا۔ تجھے کتنی بار بتاؤں۔ میں احمد کوٹ میں سیف اللہ کے چھوٹے بھائی بلے سے خود ملا تھا۔ بلے

نے اپنی آنکھوں سے رخصت کی لاش دیکھی تھی۔ جیل کی وردی اس کے بدن پر تھی۔“ اس نے اپنی

لاٹھی دیوار سے ٹکا دی۔ ”اب تو رخصت کی لاش بھی دفن کر دی گئی۔ وہ کبر سے اٹھ کر تو یہاں آنے

سے رہا۔“ وہ ایک بار پھر بے نیازی سے ہنسا۔

”تو نے سنا دیکھا ہوگا۔“

”میں تجھے کیسے بتاؤں۔“ نوراں نے دروازے کی دہلیز کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ اس جگہ آنکھیں

نکالے مجھے گھور رہا تھا۔“ وہ چند لمے خاموش کھڑی سوچتی رہی، پھر بڑوانے کے سے انداز میں

دیرے دیرے بولنے لگی۔ ”رخصت کے داڑھی نہیں تھی پر لگتا وہی تھا۔“

”اس کا بھوت آیا ہوگا۔“ جمال دین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے تو اسے بھولی نہیں!“

نوراں نے کچھ نہیں کہا۔ جمال دین نے اسے خاموش پا کر چھیڑنے کی کوشش کی۔ ”لگتا ہے ابھی

تک اسی کے چکر میں رہتی ہے۔ یاد تو آتا ہوگا؟“

”یاد تو آتا ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”سات برس اس کا ساتھ رہا ہے۔ ذرا سوچ، سات برس

تھوڑے نہیں ہوتے، فیروزہ بچے موجود ہیں۔“ اس نے آگن میں پڑی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ

کیا۔ ”یہ اسی کے تو ہیں۔ وہ میرے بچوں کا پیو تھا۔“

”فضول باتیں چھوڑ۔“ جمال دین نے کسی قدر تھکے لہجے میں کہا۔ ”اب تو رہا آنے سے رہا۔

ٹھیک ہی ہوا۔ جب تک زندہ تھا، ہر دم اس کا کھنکا لگا رہتا تھا۔“ وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے

لگا۔ ”میں نے اپنی مسجد کے ملا سے بات کی تھی۔ کہتا تھا، عدت کے چار مہینے دس دن پورے کر لینے

دے۔ اس سے پہلے نکاح حرام ہے۔ عدت ختم ہونے کے بعد تیرا نکاح پڑھاؤں گا۔ فیروزہ ہمیشہ

کے لیے میری ہو جائے گی۔ نہ کسی کا ڈر، نہ کسی کا خوف۔“

”یہ تو ٹھیک ہے پر تو کوئی ٹھیک ٹھاک دھندا تو کر۔“ نوراں نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”دیکھ تو

گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“

”کرلوں گا، کرلوں گا۔ اب تو ضرور کوئی ٹھیک سا دھندا کرنا پڑے گا۔“

”ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتا ہے۔“ نوراں نے گلہ کیا۔ ”تیری انھی باتوں میں آکر میں نے اپنا خانہ

”کراماں بھری! یکار میں اپنا گم خراب نہ کر۔“ جمال دین نے نرم لہجے میں اسے منانے کی کوشش کی۔ ”پروانہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ایسا کر احمد کوٹ والی زمین واپس لینے کی کوشش کر۔ اب تو سیف اللہ کے بھائیوں کا سہ ختم ہو گیا ہو گا۔ رختے بھی نہیں رہا جس سے ان کی دشمنی تھی۔ اب انھیں ہم سے کیا لینا۔ انھوں نے تو زبردستی ہماری زمین دبا رکھی ہے۔“

”کہتی تو ٹھیک ہے۔“ جمال دین نے اتفاق کیا۔ ”میں تجھے اور دونوں بچوں کو احمد کوٹ لے جاؤں گا۔ تو سیف اللہ کی ماں کے پاس جانا۔ اس کے سامنے رونا پیٹنا۔ سنا ہے کہ تو اس کا تیز بہ پر دل کی بری نہیں۔ تجھ پر اور بچوں پر ترس کھا کے زمین واپس کر دے تو کوئی تعجب کی گل نہیں۔“

”ویسے بھی تو ان کا کبضہ غیر کنونی ہے۔ ان کے خلاف تو مقدمہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”مقدمے سکتے ہیں پھر میں نہ پڑ۔ ان کی اوپر تک پہنچ ہے۔ مقدمہ سے کچھ نہیں بنے گا۔ بہت لٹا چکر ہے۔“ جمال دین اسے سمجھانے لگا۔ ”اور سب سے زیادہ مشکل یہ کہ مقدمہ لڑنے کے لیے روپیہ بھی چاہئے۔ یہ تو سوچ۔“

”کیا باراں کلا زمین ہے۔ باراں کلا زمین کم نہیں ہوتی۔“

”میں کب کہتا ہوں کم ہوتی ہے۔“ جمال دین نے مسکرا کر کہا۔ ”پر جیسا میں کہتا ہوں ویسا کر۔ اس طرح کام آسان ہو جائے گا۔ بول کیا کہتی ہے؟“

”جیسا تو کہتا ہے وہی کروں گی۔ پہلے بھی تیری بات میں نے کب نہیں مانی۔“ اس نے ایک خاص ادا سے جمال دین کو دیکھا اور زیر لب مسکرانے لگی۔ ”رختے جیل میں تھا تبھی تیری بن گئی تھی۔ تو نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔“

”میں نے جادو کر دیا تھا تو نے؟ ذرا اپنی موٹی موٹی آنکھیں دیکھ۔“ جمال دین ہنس کر بولا۔ ”میں نے تیرے لیے پنڈ چھوڑا۔ گھروالوں سے جھگڑا کیا۔ سب کو چھوڑ دیا۔ تیرا بن گیا۔“

”اور بھی باتیں ہیں۔“ نوران نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”اس رات مجھے احمد کوٹ سے نکال کر یہاں نہ لانا تو سیف اللہ کے بھائی مجھے اور میرے ان دو بچوں کو بھی ختم کر دیتے۔“

”تجھے کیا پتہ تیرے لیے تو میں جان کی بازی لگا سکتا ہوں۔“ جمال دین نے بڑے جوش سے کہا۔ ”تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔“

”کیا بات ہے مجھ میں کچھ بھی تو نہیں۔“ وہ بڑے ناز سے مسکرائی۔ اس کے

تھی۔ ”پر اتنا ضرور ہے میں اب تیری ہو گئی۔ تجھے نہیں چھوڑوں گی۔ کبھی نہیں چھوڑوں گی۔ تو مجھے چھوڑ دے یہ دوسری بات ہے۔“

”میں تجھے چھوڑوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس نے سینے پر دھنکا ہاتھ رکھا اور گہری سانس بھر کر بولا۔ ”ہائے میں کربان! تجھے پانے کے بعد بھی کوئی چھوڑ سکتا ہے ایسی چاندنی کی طرح لشکارے مارتی ہوئی سوہنی کو۔“ اس نے شوخی سے نوران کی کمر میں چٹکی بھری۔ وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ اس کی کمر بل کھا کر دہری ہو گئی۔ جمال دین نے جھپاک سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ نوران نے پیار سے اس کے گلے میں بانیں ڈال دیں اور سینے سے چمٹ گئی۔ رحیم داد اندھیرے میں بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہا۔

جمال دین آگے بڑھا۔ وہ نوران کے چہرے پر جھکا ہوا پیار سے کہہ رہا تھا۔ ”دل جانی! منجی پر لیٹ کر آرام ٹال گلاں ہوں گی۔“ جمال دین اسے اٹھائے ہوئے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

نوران کمرے کے اندر تھی۔ اس کے بچے آنگن میں کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر بے خبر سو رہے تھے اور رحیم داد گھاس کے ڈھیر کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ کمرے سے نوران اور جمال دین کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے اور ہنسنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد کے دل پر آئے چل رہے تھے۔ کمرے میں زوردار فتنہ ابھرا۔ غصے اور نفرت سے رحیم داد کا خون کھول اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس نے چاقو مضبوطی سے تھام لیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ چاقو ہاتھ میں سنبھالے دھیرے دھیرے چھپر کی جانب بڑھا۔ اس کی نظریں کمرے کے دروازے کی جانب تھیں۔

ایکایک کمرے میں جلتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی گہری خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جسم کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ واپس مڑا اور ڈوگلاتے قدموں سے چلتا ہوا آنگن میں آگیا۔ سامنے چارپائی پر اس کے دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے مگر وہ اس طرف نہ گیا۔

اس نے کھلا ہوا چاقو بند کر کے احتیاط سے جیب میں رکھا۔ شیشم کے درخت کے نیچے پہنچ کر ڈال پر چڑھا۔ دیوار پار کر کے باہر گلی میں آگیا۔ دیوار کے قریب اندھیرے میں رکھے ہوئے جوتے پہنے۔ کلیم کے کانڈات کا بستہ اٹھا کے بغل میں دبایا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا اندھیری گلی سے نکل کر اسکول کے پچھواڑے پہنچا۔ میدان عبور کیا اور سنسان گلی کچوں سے گزرتا ہوا اکال گڑھ

کی حدود سے باہر نکل گیا۔



رحیم داد دل گرفتہ اور نڈھال تھا۔ نور اس کی بے وفائی نے اس کے وجود میں غم و غصے کا جوالاؤ بھڑکایا تھا، اس آگ میں سلگتے سلگتے اب وہ راکھ کا ڈھیر بن چکا تھا، سب کچھ لپٹا چکا تھا۔

رات دم بخود کھڑی تھی۔ ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ اپنے ماضی کا لاشہ اٹھائے بو جھل قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ آگے جا کے اس نے نہر کی پلایا عبور کی۔ سامنے کرتار پور کی بستی اندھیرے میں لپٹی اوگھ رہی تھی۔

اس نے نظر بھر کر اس طرف دیکھا۔ ٹھنکا اور دوسری طرف مڑ گیا۔ کرتار پور نہ گیا۔ اب اسے کرتار پور سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اکال گڑھ جانے سے پہلے اس نے بیوی بچوں کے ساتھ ایک نئی زندگی بسر کرنے کے جو منصوبے باندھے تھے، سب ملیا میٹ ہو چکے تھے۔ اس کے ذہن پر ابھی تک نور اس اور جمال دین بھیا تک خواب بن کر چھائے ہوئے تھے۔ اس نے اندرونی جیب سے کانڈ میں لپٹے ہوئے جھمکے نکالے۔ ان پر نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں غصے سے دھنکے لگیں۔ چہرے پر وحشت برسنے لگی۔ اس نے جھمکے نہر میں پھینک دیئے۔ پرنا کھول کر مٹھائی نکالی اور اسے بھی تھارت سے پھینک دیا۔ وہ نور اس اور بچوں سے اب کوئی رشتہ کوئی واسطہ رکھنا نہ چاہتا تھا۔

وہ نہر کے کنارے کنارے چلتا رہا۔ رات تاریک اور بو جھل تھی۔ رحیم داد تھکن اور ذہنی کرب سے نڈھال تھا۔ دل ڈوب رہا تھا۔ آگے جانے کی سکت رفتہ رفتہ کم ہو رہی تھی۔ کھیتوں کا سلسلہ کب کا ختم ہو چکا تھا۔

نہر سے ہٹ کر جھنگر تھا، ویران اور جنگلی جھاڑیوں سے بھرا ہوا۔ وہ جھنگر میں داخل ہوا۔ لیکن زیادہ دور نہ گیا۔ مٹی کے ایک تودے کے قریب بے حال ہو کر بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

رات اس نے جھنگر میں بسر کی۔ تاروں کی چھاؤں میں اٹھا۔ نہر پر جا کے منہ ہاتھ دھویا۔ نسیم بحر کے نرم نرم جھونکوں میں فرحت اور تازگی تھی۔ زندگی کی ہلچل تھی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں ریت کے ذرے جگمگا رہے تھے۔

رحیم داد راہ گیروں کی نظروں سے چپتا چپتا ویران اور سنسان راستوں سے گزرتا ڈھولا امیر خاں کی جانب گامزن تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر سونے کے

رے جھللا رہے تھے۔

جمال دین خطرہ بن کے اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ اسی کے خوف سے رحیم داد نے کرتار پور کو یاد کیا تھا۔ وہاں سے چلتے وقت اسے ایک ہی محفوظ ٹھکانا نظر آیا تھا، اور وہ تھا ڈھولا امیر خان، اس کی چھوٹی بہن بیگماں کا گھر تھا۔ ماں باپ بہت پہلے مر چکے تھے۔ بیگماں کے سوا رحیم داد کی کوئی بہن تھی نہ بھائی۔

بیگماں کی شادی چچا زاد بھائی مولا داد سے ہوئی تھی۔ رحیم داد کا چچا ابھی زندہ تھا۔ وہ ڈھولا امیر اس میں رہتا تھا۔ خاصا کھانا پیتا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس چالیس ایکڑ سے اوپر نہری زمین تھی اس پر وہ اپنے دو بیٹوں کے ساتھ کاشت کرتا تھا۔

بیگماں کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد چچا سے رحیم داد کے تعلقات خراب ہو گئے۔ سبب یہ تھا کہ بیگماں کی شادی کے وقت رحیم داد کنوارا تھا۔ جب رحیم داد کی شادی کا سلسلہ چھڑا تو چچا نے چاہا کہ رحیم داد کا بیاہ اس کی منجھلی بیٹی بیدی سے ہو جائے۔ مگر رحیم داد وٹے شے کی شادی پر رضامند نہیں ہوا۔

اس نے نور اس سے بیاہ کر لیا۔ نور اس پر وہ بہت پہلے سے فریفتہ تھا۔ یہ بات بیگماں کو معلوم تھی اور مولا داد کو بھی۔ چچا اس قدر ناراض ہوا کہ نہ تو شادی میں خود شریک ہوا، نہ بیٹے اور بہو کو شریک ہونے دیا۔ تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ شادی کے بعد بیگماں اور اس کئی مسرال سے کوئی بھی رحیم داد کے گھر نہیں آیا۔

رحیم داد بھی نہیں گیا۔ سالہا سال گزر گئے۔ مگر جن دنوں رحیم داد بنگلہ جیل میں تھا، ایک روز بیگماں سر اور شوہر سے چھپ کر اس سے ملنے آئی۔ اسے دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ وہ بے قرار ہو کے سلاخوں سے سر ٹکراتی تھی اور تڑپ کر کہتی تھی۔ ”ہائے ویر! تو نے یہ کیا کر لیا؟“ رحیم داد اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ بیگماں اس سے ٹوٹ کر ٹبت کرتی ہے۔ لیکن بیگماں اس سے ملنے دوبارہ جیل نہیں آئی۔ آنے کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا۔

رحیم داد کو یقین تھا کہ اس کے مرنے کی خبر سن کر بیگماں احمد کوٹ ضرور پہنچی ہوگی اور اب تک اسے یاد کر کے آنسو بہاتی ہوگی۔ وہ اگر اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ بھائی کو زندہ دیکھ کر خوشی سے دیوانی ہو جائے گی۔ اسے اپنے گھر میں ضرور پناہ دے گی۔ مولا داد بھی نیک اور بھلا مانس تھا۔ بیوی کو چاہتا بھی بہت تھا۔ لہذا رحیم داد سے خلوص اور ہمدردی رکھتا۔ خفگی صرف چچا کی تھی۔

شام کا دھندلا چھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا سوچ رہا تھا کہ آیا اسے فوراً بیگماں کے پاس

پہنچ جانا چاہئے یا نہیں۔ اس تذبذب کی وجہ اس کا چچا تھا۔ وہ بڑا ضدی اور سخت گیر تھا۔ رحیم داد کو خدشہ تھا کہ اسے دیکھ کر کہیں وہ بھڑک نہ اٹھے، ایسا ہنگامہ نہ برپا کر دے کہ اس کا راز فاش ہو جائے گاؤں والوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کون ہے۔

وہ ایسا کوئی خطرہ ہرگز مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ اب وہ رحیم داد کے بجائے چوہدری نور الہی کے روپ میں زندہ رہنا چاہتا تھا جس کے کلیم کے کاغذات کا بستہ وہ نہایت احتیاط سے سنبھالے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا کہ گھر جانے کے بجائے اسے پہلے کسی نہ کسی طرح بیگماں سے ملنا چاہئے اور اس کے مشورے سے ڈھولا امیر خاں میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے۔ وہ ہر خطرے سے بچتا چاہتا تھا۔

۱۶

ڈھولا امیر خاں پرانا گاؤں تھا۔ عام رواج کے مطابق گاؤں کے شروع میں قبرستان تھا۔ جھٹ پے میں قبرستان بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اونچی نیچی قبریں خود رو جنگلی جھاڑیوں کے درمیان دھندلے دھندلے دھبوں کے مانند نظر آرہی تھیں۔

رحیم داد ٹھنکا اور قبرستان سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ وہ مختصے میں پڑ گیا۔ سوچنے لگا کہ اسے ڈھولا امیر خاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ فی الحال کرتار پور ہی میں ٹھہرنا چاہئے تھا۔ مگر کرتار پور اب اس کے لیے محفوظ ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ اکال گڑھ نزدیک ہی تھا اور وہاں جمال دین موجود تھا جو کسی بھی وقت کرتار پور پہنچ سکتا تھا۔ اگر جمال دین نے اسے پہچان لیا تو ذرا بھی مروت نہیں کرے گا، جھٹ پولیس سے مجبوری کر دے گا۔ اب وہ اس کا جگری دوست نہیں، رقیب بن چکا تھا۔ نوراں ان کی دوستی کے درمیان دیوار بن کے حائل ہو گئی تھی۔

رحیم داد نے گاؤں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا، مڑا اور کھیتوں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پہلے بھی کئی بار ڈھولا امیر خاں آچکا تھا۔ لہذا راستوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ کچھ دور جانے کے بعد چاب سائی دی۔ رحیم داد نے رفتار سست کر لی اور چونکنا نظروں سے چاپ کی سمت دیکھنے لگا۔ اندھیرا دیر سے دیر سے نیچے اتر رہا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے موسیوں اور انسانوں کی ملی جلی آوازیں شام کے بڑھتے ہوئے سناٹے میں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

ایک شخص اچانک جھاڑیوں کے عقب سے نکل کر رحیم داد کے سامنے آگیا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد لمحے بھر کے لیے پریشان ہوا مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے

پوچھا۔ ”میں نے کہا جی! ڈھولا امیر خاں یہی ہے نا؟“

”ہاں جی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تیس نوں کے ملنا ہے؟“

رحیم داد اس کا سوال صاف نظر انداز کر گیا۔ لمبے میں کسی قدر رقت پیدا کر کے بولا۔ ”سخت پیاس لگی ہے۔ پانی ہو تو پلا دے۔“

”فکر نہ کر، تجھے ابھی پینے کو پانی مل جائے گا۔“ اس نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تجھے اس پنڈ میں پہلے نہیں دیکھا۔“ اس نے رحیم داد کا گرد سے اٹا ہوا چہرہ اور لباس غور سے دیکھا۔ ”بہت تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے سویرے سے روٹی بھی نہیں کھائی۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”پانی بھی پی لیتا۔ روٹی لکڑ بھی کھالے۔“ امیرے ساتھ۔

وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں کھیتوں کے درمیان ایک گنڈنڈی پر چل رہے تھے۔ رحیم داد کچھ دور تک چپ چاپ چلتا رہا پھر اس نے کسی قدر حیرت سے دریافت کیا۔

”تو مجھے آڑ سے پانی پلائے گا؟“

”نا جی، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ دھیرے سے جواب دیا۔ ”ادھر مھنا ہے۔“ اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھایا۔ ”وہاں پانی ہے، روٹی لکڑ بھی ہے۔“ اس نے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ ”دوپہر سے مروڑ ہو رہی ہے۔ میں اسی لیے ادھر آیا تھا۔ روٹی نہیں کھاؤں گا، توں کھا لیتا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھلی جگہ پہنچے۔ سامنے مٹی کا بنا ہوا کسی قدر اونچا چوڑا تھا جس پر چڑھ کر کھیتوں کی رکھوالی کی جاتی ہے۔ یہ مھنا تھا۔ اس کے ارد گرد تار فصلیں کھڑی تھیں۔ رحیم داد نے فصلیں دیکھ کر کہا۔

”فصلیں تو پک کر بالکل تیار ہو چکی ہیں۔ ابھی ان کی واڈھی نہیں ہوئی؟“

”بس جی ہوئے ہی والی ہے۔“ وہ چوتھے کی جانب بڑھا جس پر ایک طرف پانی کا گھڑا رکھا تھا۔ اس کے ڈھکنے پر کپڑے میں لپٹا ہوا کھانا دھرا تھا۔ وہ چوتھے پر چڑھ کر اوپر گیا۔ رحیم داد بھی اوپر چلا گیا۔ اس شخص نے کھانا اٹھایا اور رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”لے، یہ روٹی بکڑ۔“ کھانا رحیم داد کے سپرد کر کے اس نے قریب رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ اس میں گھڑے سے پانی ڈالا اور رحیم داد کے حوالے کیا۔ ”پہلے پیاس بجھالے۔ پر زیادہ پانی نہ پینا۔ الٹی ہو جائے گی۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھا سکے گا۔“

رحیم داد نے بھرا ہوا پیالہ ہاتھ میں سنبھالا۔ اسے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے

پالہ ہونٹوں سے لگایا اور آدھا خالی کر دیا۔ پانی پی کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھانا سامنے رکھ لیا۔ وہ شخص بھی قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس نے کپڑا کھول کے روٹیاں نکالیں۔ روٹیوں کے ساتھ پلی کی چٹنی تھی۔ ایک گٹھی پیاز کی بھی تھی۔ رحیم داد نے روٹی توڑ کر لقمہ بناتے ہوئے کہا۔

”دو روٹیاں ہیں۔ میں دونوں نہیں کھا سکوں گا، تو بھی تھوڑی سی روٹی کھالے۔“

”مجھے نہ کھلا، میری طبیعت کچھ گڑبڑ ہے۔“

”رات بھر بھوکا رہے گا؟“

”ایسا کر، آدھی روٹی میرے لیے چھوڑ دیے۔“ اس نے پیاز کی گٹھی اٹھا کر رحیم داد کے سامنے کی۔ ”یہ گند ابھی جی چاہے تو چھوڑ دے۔ تو پلی سے روٹی کھالے۔ رات کو بھوک لگی تو آدھی روٹی گنڈے کے ساتھ کھا لوں گا۔ اپنا کام چل جائے گا۔ ویسے تو میری فکر نہ کر۔ مجھے بالکل بھوک نہیں۔“

رحیم داد دھندلی روشنی میں چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹی اور پلی کی چٹنی مزے دار لگی۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے کھاتا رہا پھر اس نے پوچھا۔

”تو راکھا ہے؟“

”ہاں جی، راکھا ہی ہوں۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولا۔

رحیم داد نے اس کے لمبے کی کک محسوس کی۔ ”کتنے دنوں سے یہ کام کر رہا ہے؟“

”دو برس تو ہو گئے ہوں گے۔ پر ڈھولا امیر خاں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے۔ پہلے میں چک ۲۲ میں ہوتا تھا۔“

”ادھر کیا کرتا تھا؟“

”کرنا کرنا کیا ہے جی! وہ بیزاری سے بولا۔ ”کبھی مویشی چرانے لگ گیا تو چاک بن گیا۔ کبھی گڑ بنانے والا گڑالا۔ کبھی راکھا۔ جو کام مل گیا، کرنے لگا۔“

”کسی زمین دار کا مزارع کیوں نہیں بن جاتا؟“

”مزارع بھی رہ چکا ہوں۔“

”زمین دار نے بے دخل کر دیا؟“

”ہاں جی، پہلے میں بھی زمین دار ہوتا تھا۔“

”اسی ضلع میں تیری داری تھی؟“

”نہیں جی۔“ اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”لمتان کی تحصیل دہاڑی میں اپنا پنڈ

کوڑا نجیب تھا۔ مستاجری پر ۲۵ کلا زمین لے رکھی تھی۔ نہری زمین تھی۔ پانی بھی پورا پورا ملتا تھا۔ ساتھ میں گھروالی کے بھائی اور لیس کو بھی لگا رکھا تھا۔ آرام سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ پنڈ کا وڈا زمین دار عارف سدیرا تھا۔ وہ میری زمین ہتھیانا چاہتا تھا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا۔ کبھی موٹی اٹھوالیے، کبھی پانی کاٹ دیا۔ فیرایا ہوا جی، ایک دن اس نے مجھے اپنی حویلی میں بلوایا۔ اور لیس میرے ساتھ تھا۔ سدیرے نے مجھ سے صاف صاف کہا۔ دلدار اپنی زمین میرے حوالے کر دے۔ ورنہ پچھتائے گا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تیرا نام دلدار ہے؟“

”ہاں جی، کبھی میرا یہی نام ہوتا تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو سب دارا کہتے ہیں، کئی کمین سمجھتے ہیں۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”ہاں تو جی، میں بتا رہا تھا۔ عارف سدیرا نے مجھے سیدھی سیدھی دھکی دی۔ میں تو چپ رہا پر اور لیس گرمی میں آگیا۔ وہ تھا بھی ٹکڑا اور زور آور جوان۔ سدیرے سے ذرا نہ ڈرا۔ جب زیادہ گرما گرمی ہوئی تو میں نے اور لیس کو منع کیا اور اپنے ساتھ لے آیا۔ کچھ دنوں بعد سدیرے کے پتر کا دیا ہوا۔ اس نے پورے پنڈ پر ٹیکس لگایا کہ ہر گھر سے دو بھیڑ بکریاں دی جائیں۔ اس کے کرندے زبردستی بھیڑ بکریاں وصول کرتے۔ وہ میرے گھر آئے تو اور لیس نے صاف انکار کر دیا۔ کرندے چپ کر کے چلے گئے، پر رات کو انھوں نے میری چار بھیڑیں اٹھانے کی کوشش کی۔ اور لیس پہلے ہی چوکس تھا۔ اس کے ساتھ کئی یار دوست بھی تھے۔ اس نے کرندوں کو ٹوکا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور لیس اور اس کے ساتھیوں نے چیچا کیا اور دو کرندوں کو پکڑ لیا۔ ان میں سے ایک نے بھیڑ بھی کندھے پر اٹھا رکھی تھی۔“

رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے پوچھا۔ ”دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا ہو گا؟“

”ہاں جی، ارادہ تو یہی تھا۔“ دارا نے بتایا۔ ”پر سویرے سویرے سدیرے نے پنچایت بھیجی۔ منت سماجت کی۔ اور لیس پنچایت پر تیار نہیں تھا، پر میں نے معافی دے دی۔ کرندوں کو چھوڑ دیا۔ گل ائمہ ہے جی، میں سدیرے سے جھگڑا بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بہت وڈا زمین دار ہے۔ اور جی، ادھر سدیریوں کا زور بھی بہت ہے۔ خا کو انیوں، صاحب زادوں، دولتانوں اور گدئی نشینوں سے سدیریوں کا بہت میل جول ہے۔ وہ اتنے طاقت ور ہیں، سمجھو حکومت ہی ان کی ہے۔ تھانیدار ہو یا تحصیل دار، کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ سارے سرکاری افسر اور حاکم ان کے بندے ہیں۔“

رحیم داد نے مٹی کا پیالہ دارا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھوٹھے میں گھرے۔“

ہے۔“

دارا نے پیالے میں پانی اٹھیل کر رحیم داد کو دے دیا۔ رحیم داد نے پانی پیا، گیلی موٹھیں ہاتھ سے پونچھیں، مسکرا کر بولا۔ ”ہاں، اب آگے کی بتا۔“

”بتانا کیا ہے جی، سدیرے نے وہی کیا جو چاہتا تھا۔“

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کیا کیا اس نے؟“

”سدیرے نے گرد اور اونچاری کے ساتھ جوڑ توڑ کر کے بندوبست اراضی کے کاغذات میں اختلافات منسوخ کر دیئے۔ شاملات دہسہ کی شکل بدلوا کر میری زمین کی مستاجری اپنے نام کرائی۔

دیے مستاجری میں میرے لگ بھگ تین سال رہتے تھے۔“

”مستاجری تو سرکاری ٹھیکا ہوتا ہے۔ ٹھیکے کی مدت ختم ہونے سے پہلے مستاجری سدیرے کے نام کیسے ہو گئی؟“

”اب کیا بتاؤں، یہ سب کیسے ہو گیا۔“ دارا نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ”ویسے میری رنج کی فصلیں واڈھی کے لیے، تیار کھڑی تھیں۔ فصلوں کی واڈھی سے پہلے تو مزارعے کی بھی بے دخلی نہیں ہوتی۔ مستاجری ختم ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو نے عدالتی چارہ جوئی نہیں کی؟“

”میرا تو ایسا ارادہ نہیں تھا پر اور لیس نے مکدمہ دائر کر دیا۔“

”مکدمے کا کیا بنا؟“

”مکدمہ شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ سدیرا ایک روز اپنے کرندوں کو لے کر پنچا۔ پولیس بھی اس کی ساتھ تھی۔ اس نے میری زمین اور اس پر کھڑی ہوئی فصلوں پر کبضہ کر لیا۔ میرے وکیل نے سدیرا کا کبضہ رکوانے کے لیے، عدالت سے حکم امتناعی بھی لے لیا تھا۔ میں اور اور لیس عدالت سے خوش خوش لوٹ رہے تھے۔ ادھر سدیرے نے دوسرا ہی منصوبہ بنایا۔ تمام سڑکیں جو عدالت سے لاریوں کے اڈے کی طرف جاتی تھیں، ان کی ناکابندی کی جا بچی تھی۔ ایک سڑک کے ناکے پر سدیرے اور دین دار، زمین دار بیٹھے تھے۔ دوسری پر منگھیرے اور دولتانے تھے اور تیسری پر خاکوانی اور گھٹانے رسا گیر مور چالگائے ہوئے تھے۔“ دارا نے لمبی سانس بھری۔ ”ادھر تو پوری تیاری تھی ادھر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور لیس آگے آگے چل رہا تھا۔ مجھ سے کوئی تیس چالیس گز کے فاصلے پر تھا۔ اچانک شفیع سدیرا، سکندر کھنڈ اور تادور دین دار ایک گلی سے نکلے اور اور لیس پر کھڑکیوں اور گنداسوں سے حملہ کر دیا۔ اور لیس خون میں لت پت پڑا تھا اور قاتل ہوائی فیر کرتے“

کھٹاٹیاں لہراتے صاف نکل گئے۔

”ادریس کا کیا ہوا؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”اس نے وہیں سڑک پر دم توڑ دیا۔“ دارا نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”اس کی لاش لے کر پنڈ پنا تو شام ہو چکی تھی۔ سدیرے کے کندے میرے گھر کے سامنے موجود تھے۔ انھوں نے مجھ پر ڈانگیں برسانی شروع کر دیں۔ میں چوٹ کھا کر نزدیک کے کھیتوں میں گھس کر دبک گیا۔ وہ ادریس کی لاش اٹھا کر لے گئے۔ سدیرے کے حکم پر اسے پنڈ کے پتوں بیچ ایک درخت سے لٹکا دیا گیا۔“

”تھانے جا کر تو نے پرچہ چاک کرایا ہوتا۔“

”وہ تو جی، میں پہلے ہی کرا چکا تھا۔ پر تھانے دار تو اس رات عارف سدیرا کے ساتھ حویلی میں بیٹھا شراب پی رہا تھا اور ادریس کی لاش درخت سے لٹک رہی تھی۔ اس کے قاتل بھی نشہ کر کے پنڈ میں بڑھکیں مارتے پھر رہے تھے۔ خوشی سے بانہیں الارا الار کے بھگڑا ڈال رہے تھے۔ پٹے الاپ رہے تھے۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں آدھی رات کے بعد اندھیرے میں چھپتا لٹکا کسی طرح اپنے گھر میں گیا۔ پر سویرا ہوئی ہی کندے مجھے پکڑ کر سدیرے کے سامنے لے گئے۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی نگلی نگلی گالاں نکالیں۔“

رحیم داد کھانا کھا چکا تھا۔ اس نے بچی ہوئی روٹی اور پیا زکڑے میں لپیٹ کر ایک طرف رکھی۔ مٹی کے پیالے سے پانی پیا۔ دارا سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔“

”سدیرے نے پہلے تو اپنے کندوں سے پٹوایا۔“ دارا نے آہ سرد بھر کر بتایا۔ ”میرا چہرہ کالا کر دیا، منہ میں جوتا دیا اور پورے پنڈ میں گھمایا۔ ایک ڈھولی میرے پیچھے پیچھے ڈھول بجاتا تھا۔ میری کمر میں رسی کا پھندا پڑا تھا جسے ایک کندے نے پکڑ رکھا تھا۔ منہ میں جوتا دبائے گردن جھکائے میں پنڈ کے ایک ایک گھر کے سامنے سے گزرتا تھا۔“

”ادریس کی لاش کا کیا ہوا؟“

”لاش ساری رات اور سارا دن درخت سے لٹکی رہی۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”ایسے ہی گرئی کے دن تھے۔ لاش سے سخت بدبو نکلنے لگی۔ پنڈ کے کچھ بوڑھے سدیرے کے پاس پہنچے اس کی منت سماجت کی۔ سارے پنڈ میں بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ سدیرے کی حویلی میں بھی بدبو پہنچ رہی تھی۔ اس لیے اس نے لاش دفن کرنے کی اجازت دے دی۔“

”تو نے پنڈ چھوڑ دیا ہو گا؟“

”نہیں، ادریس کو دفن کرنے کے بعد میں گھر میں جا کر بیٹھ گیا۔ کسی کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ ویسے بھی سدیرے نے پورے پنڈ میں ایسا خوف بٹھادیا تھا کہ اس کی نراضی کے ڈر سے کوئی میرے گھر کے سامنے سے بھی نہ گزرتا۔ اپنا حال یہ تھا کہ گھروالی بھائی کی موت پر ہر دم روتی رہتی۔ میں چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہتا۔ کئی دن ایسے ہی گزر گئے۔ ادھر سدیرے کے منشی نے میری فصل کی واڈھی کرائی۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا؟ تو تو گھر میں بند بیٹھا تھا۔“

”گھروالی نے فصلوں کی واڈھی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ وہ ادریس کی کبر پر گئی تھی۔ واپس آئی تو درود کر مجھے یہ بات بتائی۔“

”تو نے کوئی کارروائی نہیں کی؟“

”تو بھی کیسی گلاں کرتا ہے۔ کارروائی میں نے کیا کرنی تھی۔“ دارا کے ہونٹوں پر زہر خندہ تھا۔ ”میں نے صرف یہ کیا، ایک رات چتر سے منہ چھپا کر سدیرے کی حویلی پر گیا۔ پکڑی اتار کر سامنے ڈالی اور اس کے پیر پکڑ لیے۔ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ سدیرا ایک دم بھڑک اٹھا۔ ٹھوکر مار کر چنچا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟ تھانے جا کر میرے خلاف پرچہ کرا۔ عدالت میں کیس چلا۔ حکم امتناعی نکلوا۔ میں نے اس کی نراضی کا ذرا برا نہ منایا۔ ہاتھ جوڑ کر گزرنے لگا۔ نمبردار معافی دے دے۔ غلطی ہو گئی۔ جو تو کسے گا وہی کروں گا۔ مکدمہ مکدمہ بھی واپس لے لوں گا۔ زمین بھی تیری، فصلیں بھی تیری۔ میں تیرا مزارع بن کر کام کروں گا۔“

”تب تو وہ راضی ہو گیا ہو گا۔ وہ یہی تو چاہتا تھا۔“

”میں نوں پتہ تھا، وہ یہی چاہتا ہے۔ تجھی تو میں اس کے پاس گیا تھا۔ میری منت سماجت پر وہ تھوڑی دیر چپ کر کے بیٹھا سوچتا رہا۔ فیرولا۔“ تجھے شامپ پیپر پر راضی نامہ کرنا ہو گا۔ میں اپنے وکیل سے کانڈ تیار کروالوں گا۔ تجھے اس پر انگوٹھا لگانا ہو گا۔ اب تو جا، میں بعد میں بلوالوں گا۔ میں چپ کر کے چلا آیا۔“

”بعد میں اس نے تجھے بلایا؟“

”بال جی، اس نے مجھے بلایا۔“ دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ ”وہ اونچی رنگیل کھٹ پر نیکیے سے نیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ اپنے پاس بٹھایا۔ محبت سے پوچھا۔ حال سنا دوا! میں خیر صلا ہے سیں کتا ہوا اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے نوکر سے لے کر کاگلاس منگوا کر پینے کو دیا۔ مکدمہ آزدہ کر کے سامنے رکھوایا۔ تھوڑی دیر بعد سدیرے نے اپنے منشی کو بلایا۔ اس نے شامپ پیپر

میرے سامنے نکال کر رکھ دیا۔ سدیرے نے ہنس کر کہا۔ یہ راضی نامہ وہی ہے جو اس روز تیرے ساتھ ملے ہوا تھا۔ اس نے میری پیٹھ تھکی اور بولا۔ دیکھ کیا رہا ہے۔ انگوٹھا لگا دے۔ منشی نے میرے انگوٹھے پر فائنٹ روشنائی لگائی اور دو کاغذوں پر مجھ سے انگوٹھا لگوا لیا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”دوسرا کاغذ کس لیے تھا؟“

”وہ راضی نامے کی نکل تھی۔ منشی تو نکل دینے کو تیار نہیں تھا پر میرے مانگنے پر سدیرا ہنس کر بولا۔ کوئی گل نہیں، دے دے اسے نکل۔ منشی نے مجھے نکل دے دی۔“ دارا نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”راضی نامے پر انگوٹھا لگوانے کے ذرا ہی دیر بعد سدیرے کے ہونٹوں سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ مونچھ پر ہاتھ پھیر کر کڑک دار آواز سے بولا۔ دارا! اب تو نیچے زمین پر بیٹھ۔ آج سے تو میرا مزارع بن گیا۔ تیں نوں پتہ ہے مزارع، زمین دار کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ میں چپ کر کے اٹھا اور سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔“

”مزارع بننے کی گل تو نے ہی کی تھی نا؟“

”کیا کرتا، کوئی اور راستہ بھی نہ تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے ذلیل کر چکا تھا۔“ دارا کے لہجے میں درد کی محسوس تھی۔ ”پر وہ مجھے ابھی اور ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگا، کل شام میرے پتر کی جین چڑھے گی۔ تیری گھروالی جین کے آگے آگے جھومر ڈالے گی۔ میں نے سنا ہے، وہ بہت زبردست ناچتی ہے اور ہاں، یہ بھی سن لے، میں جیسا کہتا ہوں، ویسا ہی کرنا ہوگا۔ میں انکار شکار سنتا نہیں چاہتا۔ اب تو ٹرجا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور گھرواپس آگیا۔ پر گھروالی کو کچھ نہیں بتایا۔ دوسرے روز بھی کچھ نہ کہہ سکا۔ پر جب دن ڈھلنے لگا تو میں نے گھروالی کو ہمت کر کے پوری بات بتائی۔ مجھے جو ڈر تھا وہی ہوا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ بجز کربولی۔ سدیرے نے پہلے ہی جین کے آگے ناچنے کے لیے کنجریاں بلا رکھی ہیں۔ اس نے کیا مجھے بھی کنجری سمجھا ہے جو مجھ سے جھومر ڈالوانا چاہتا ہے؟ پر جب میں نے اس کی بہت منت سماجت کی تو وہ رونے لگی۔ چپ چاپ انھی، نمائی، کپڑے بدلے اور شام ہونے سے پہلے پہلے سدیرے کی حویلی پر پہنچ گئی۔“

”واپسی پر نراض تو نہیں ہوئی؟“ رحیم داد نے اس کی روداد میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”یہ نہ پوچھ، جب وہ واپس آئی تو کیا ہوا۔“ دارا نے تڑپ کر بتایا۔ ”تیسرے روز وہ لوٹی تو اس کا منہ لال ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی زور زور سے چیخنے لگی، میں نے تیرے ایسے بے گیرت کے ساتھ نہیں رہنا۔ توں نے سدیرے کے پتہ کی جین میں مجھے کنجریوں کے ساتھ نچوایا۔ اب مٹا، نکھڑا،

ہی بن کے رہنا ہے۔ اس نے میرے منہ پر تھوکا، نکلے کو گود میں دبایا اور گھر سے چلی گئی۔“

”اسے روکا نہیں؟“

”رہتا بھی تو نہ رکتی۔ کتے سے پاگل ہو رہی تھی۔ گھروالی کے اس طرح چلے جانے پر مجھے بہت شرم آئی۔ سدیرے پر سخت گتہ آیا۔ جی چاہا حویلی میں جا کر اسے کتل کر دوں۔ پر میں سدیرے کی حویلی نہیں گیا۔ گھر سے نکلا اور سیدھا اپنے وکیل کے پاس پہنچا۔ اسے راضی نامے کی نکل دکھائی۔ اس نے کئی بار اسے پڑھا۔ متھے پر ہاتھ مار کر بولا، یہ کیا کیا۔ راضی نامہ کرنے سے پہلے مجھ سے تو ملاح مشورہ کر لیا ہوتا۔ سدیرے نے تیری زمین بھی اپنے کہنے میں کر لی اور تجھے اس طرح باندھ دیا ہے کہ اس کے خلاف کچھ بھی کارروائی نہیں کر سکتا۔ وہ جب چاہے گا تجھے بے دخل کر دے گا۔ مزارع بن کر بھی زیادہ دن نہیں رہ سکتا۔ راضی نامے میں اس نے ایسی ہی شرٹیں ڈالی ہیں۔ اس کی باتیں سن کر میں بہت پریشان ہوا۔“

”وکیل ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ کپے کاغذ پر انگوٹھا لگانے سے پہلے تجھے وکیل سے ضرور گل کر لینی چاہئے تھی۔“

”گل ایسے ہے جی، میں سدیرے سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ ادیس کے کتل کے بعد میں بالکل بے سارا ہو گیا تھا۔ پنڈ میں ہر بندہ مجھ سے بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔“ دارا نے صفا کی پیش کی۔ ”اب آگے کی سن۔ وکیل نے میرا حوصلہ بڑھایا تو میں سدیرے کے خلاف ایک بار فیہ عدالتی چارہ جوئی کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے وکیل کے ساتھ تھانے جا کر رہٹ لکھائی کہ سدیرے نے ڈرا دھکا کر زبردستی مجھ سے راضی نامے کے شامپ پر انگوٹھا لگوا لیا۔ اس کے بعد وکیل نے میری طرف سے عدالت میں نئی عرضی لگائی۔ یہ توہین عدالت کا مکدمہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ سدیرے نے حکم امتناعی نہیں مانا اور میری زمین پر ابھی تک کبضہ کئے ہوئے ہے۔ فصلوں کی واڈھی کرائی اور اسے اٹھا کر بھی لے گیا۔ وکیل نے زور دار مکدمہ بنایا تھا۔ عدالت نے فوراً سدیرے کے خلاف گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔“

”لگتا ہے، نکڑا وکیل کیا تھا۔ وارنٹ دیکھ کر سدیرے کے بھی ہوش اڑ گئے ہوں گے۔ حوالات میں بھی بند رہا ہوگا۔“

”سدیرا گرفتار کر لیا گیا تھا پر ضمانت پر اسی روز چھوٹ گیا۔ نہ حوالات میں رہا، نہ جیل گیا۔“ دارا نے بتایا۔ ”وکیل نے مجھے اپنے ایک ملنے والے کے پاس ٹھہرا دیا تھا۔ اس کا پنڈ کو ڈانجیب کے نزدک ہی تھا۔ چند ہی روز گزرے تھے کہ ایک رات پولیس مجھے گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔“

بست مارا پینا اور حوالات میں بند کر دیا۔ پولیس نے سدیرے کے ایک کمرے کی سیٹ پر میرے خلاف کی چوری کا مقدمہ بنایا تھا۔ وکیل نے ضمانت کی درخواست لگائی پر وہ منظور نہ ہوئی۔ مجھے حوالات سے جیل بھیج دیا گیا۔

”سدیرے کی ضمانت ہو گئی اور تیری نہ ہو سکی؟ یہ عجیب گل سائی۔“ رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

”سدیرا وڈا زمیں دار ہے۔ صاحب زادوں اور مخدوموں سے اس کی یاری بھی ہے۔“ دارا گہری سانس بھر کر بولا۔ ”اس کی ضمانت کیسے نہ ہوتی۔ میں متاجر زمیں دار سے گھٹ کر مزارعہ رہ گیا تھا۔ مجھے حوالاتی بنا کر پولیس جیل لے گئے۔ وہاں پہنچا تو حکم دیا گیا، کھنٹی گھر جاؤ۔ کھنٹی گھر گیا تو حکم ہوا، سکول جاؤ۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا، سکول شکوٹ تو کس تھا نہیں، بہت سے کیدی مونج کی رسیاں بننے تھے۔ مجھے بھی ان کے ساتھ شکوٹ پر لگا دیا گیا۔ میں نے انکار کیا تو سڑاک سڑاک چھتر لگائے گئے۔ گندی گندی گالاں نکالی گئیں۔ میں جھٹ مونج بننے لگا۔ روزانہ شکوٹ کرنی پڑتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا جو حوالاتی کھاتا پیتا ہوتا، جیل کے حکام کو خوش رکھتا، اسے ذرا شکوٹ نہ کرنی پڑتی۔ ادھر میں شکوٹ کرتے کرتے آدھا رہ گیا۔ ڈاکٹری کے لیے بھیجا گیا۔ گھنٹوں کڑی دھوپ میں بیٹھا رہا، تب ڈاکٹری ہوئی۔ وزن لیا گیا تو مشین نے اتنا ہی وزن بتایا جتنا جیل میں داخل ہوتے وقت تھا۔ مشین میں کچھ ایسا باگڑ پیدا کیا گیا تھا، جب چاھو وزن بڑھا دو جب چاہے گھٹا دو۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے لیے یہ انوکھی باتیں نہیں تھیں۔ وہ بھی حوالاتی کے طور پر مینوں ایسی مصیبتیں اسی جیل میں بھگت چکا تھا۔ دارا بتاتا رہا۔ ”حوالاتیوں کو چکیوں اور بارکول سے باہر نکال کر ہر روز سویرے سویرے گنتی کی جاتی۔ شکوٹ پر لے جانے کے لیے، ان کی چھاتی کی جاتی۔ وہ اس طرح ہوتی۔ گھر خوراک الگ کر دیے جاتے۔ صاحب بہادر کے علیحدہ کمرے جاتے۔ دوسرے افروں کے سفارشی الگ کر دیے جاتے۔ جن حوالاتیوں نے شکوٹ سے بچنے کے لیے ہابانہ بھٹا باندھ رکھا تھا، وہ بھی الگ کر دیے جاتے۔ صرف میرے ایسے بے سارا حوالاتیوں کو شکوٹ خانوں میں لے جایا جاتا اور دبا کے کام لیا جاتا۔ نہ پوچھ، جیل میں کیسی زبردست رشوت چلتی ہے۔ آزادی سے چلنے پھرنے تک کے لیے مٹھی گرم کرنی پڑتی۔ پر وڈے لوگوں کے پیش ہوتے۔ اول تو ایسا کوئی بندہ جیل جاتا نہیں اور جاتا بھی ہے تو سرداری کرتا ہے۔ حکم ماننے کی بجائے الناکھ چلاتا ہے۔ تجھ سے کیا کیا بتاؤں۔“

اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”ہر ۸ روز بعد وڈے جیلر کا دورہ ہوتا۔ اس روز اور مصیبت پڑتی۔ حوالاتیوں کو مکمل پریڈ لگا کر تین تین گھنٹے سخت دھوپ میں بٹھایا جاتا۔ دورہ شروع ہوتے ہی حوالاتیوں کو بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلائے پڑتے ہیں۔ اگر کوئی حوالاتی نظریں اٹھا کر اوپر دیکھتا یا حاکم اعلیٰ کے سامنے فریاد کرنے کی کوشش کرتا تو سڑاک سے چھتر پڑتا۔ دورہ ختم ہونے کے بعد بھی ایسے حوالاتی کی زبردست پٹائی ہوتی۔“

رحیم داد نے ان جان بن کر تبصرہ کیا۔ ”جیل میں بہت ظلم ہوتا ہے جی۔“

”یوں سمجھ لے، کون سا ظلم نہیں ہوتا۔ بیمار پڑ جاؤ تو خطرناک بیماریوں تک کا کوئی علاج نہیں۔ اوپر سے سخت شکوٹ کرنی پڑتی ہے۔ گندی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ بات بات پر پٹائی ہوتی ہے۔ ایک تکلیف ہو تو بتائی جائے۔“ دارا نے قدرے تامل کیا۔ ”بارک کے اندر سب حوالاتی بند کر دیئے جاتے ہیں۔ ٹٹی کرنے کے لیے، صرف ایک ٹٹی خانہ ہے جس میں دو بندے بیٹھ سکتے ہیں۔ ایک بارک میں ڈیڑھ سو کے لگ بھگ حوالاتی اور کیدی ہوتے ہیں۔ انھیں بارک کے ٹٹی خانے کا پانی ڈولوں سے نکالنا پڑتا ہے۔ کچی جیل ہے، اسی گندے پانی سے روز حوالاتیوں سے ہر جگہ لیپا پوتی کا کام بھی کرایا جاتا ہے۔ میں نے تجھے بتایا تھا تا کہ رشوت تو ہر معاملے میں چلتی ہے۔ مٹھی گرم کر دو تو گندے بدو دار پانی سے لیپنا پوتنا نہ پڑے۔ رشوت کی خاطر ملاکاتیوں کو طرح طرح سے تنگ کیا جاتا۔ دو دو منٹ بعد حوالاتیوں اور کیدیوں کو ملاکاتیوں سے بات چیت ختم کرنے کو کہا جاتا۔ ملاکاتی تھوڑی تھوڑی دیر بعد روپے دو روپے دیتے تو بات کر سکتے تھے۔“ اس نے بڑی ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پر اپنا تو کوئی ملاکاتی ہی نہیں تھا۔“

”تیری گھروالی ملاکات کے لیے، نہیں آئی؟“

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے چپ چاپ زمین پر انگلیوں سے آڑی ترچھی لکیریں بناتا رہا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ ”تیری گھروالی کیا دوبارہ نہیں آئی؟“

”ہاں جی۔“ دارا نے مختصر جواب دیا۔

”پتہ کیا، اب وہ کہاں ہے؟“

دارا نے رحیم داد کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”جب میں نے تجھ سے ساری ہی باتیں بتا دیں تو یہ

مجھ سے سن لے۔ وہ جیسا کہ کر گھر سے نکلی تھی، اس نے وہی کیا۔“

”کیا وہ سچ کچھ بن گئی؟“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں جی، وہ کبجری بن گئی ہے۔“ دارا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے اسے پچھلے سال ملتان کے حرم گیت میں دیکھا تھا۔ خوب بناؤ سنگھار کیے چکلے میں بیٹھی تھی۔ میں دوبارہ ادھر نہیں گیا اور نہ کبھی اسے دیکھا۔ پتہ نہیں اب کہاں ہے۔ کس کے پاس ہے؟ نکلے کا بھی کچھ پتہ نہیں، زندہ ہے یا مر گیا؟“

”تیری زمین کا کیا پتا؟“

”اس پر تو سدرے کا پہلے ہی کبنا تھا۔ جیل میں حوالاتی کے طور پر تین مہینے سے زیادہ گزرے تو ایک روز پنڈ کالوہار مجھے ملنے جیل آیا۔ اس کے ذریعے میں نے ایک بار فیئر سدرے کی منت سماجت کی۔ لگتا ہے، اسے سدرے ہی نے بھیجا تھا۔ پر سدرے نے مجھے اس شرط پر معافی دے دی کہ میں اس کے خلاف سارے مکدے واپس لے لوں۔ میں نے اس کی شرط مان لی۔ سدرے کا وکیل جیل میں آیا۔ اس نے جس کاغذ پر کہا، میں نے انکو ٹھاکا دیا۔ اس کے بعد پولیس نے میرے خلاف ج کی چوری کا مقدمہ ختم کر دیا۔ میں جیل سے نکلا تو کوڑا نجیب کی طرف جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ سدرے نے کھلو دیا تھا، اگر پنڈ میں گیا تو مجھے گولی سے اڑا دے گا، میری لاش بھی ادریس کی طرح درخت سے لٹکا دے گا۔“ اس نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تبھی سے ملتان چھوڑ دیا، ادھر آگیا۔“

”تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ تو تو بالکل تباہ ہو گیا۔“

دارا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رحیم داد بھی چپ رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔

☆

شام تاریک ہو کر رات کے اولین مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے گندم اور جو کی تیار فصلوں میں سرسراہٹ ابھر رہی تھی۔ دارا اور رحیم داد گم صم بیٹھے تھے اور اپنی اپنی سوچ میں مگن تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

دارا نے پہلو بدلا اور رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”ادھر کیسے آیا؟ بتایا نہیں، تمیں نوں کس سے ملتا ہے؟“

رحیم داد نے آہستہ سے پوچھا۔ ”مولا داد کو جانتا ہے؟“

”کیوں نہیں جانتا۔“ وہ مستعدی سے بولا۔ ”اے جانتا ہوں۔ اس کے بھائی اللہ داد کو جانتا ہوں۔ دونوں کے پیو کو بھی جانتا ہوں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”تجھے مولا داد سے ملتا ہے؟“

”مولا داد اور اللہ داد اپنے پیو کے ساتھ ہی رہتے ہیں نا؟“

”سمجھو، ساتھ ہی ساتھ رہتے ہیں۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”مکان تو ایک ہی ہے پر دہڑے کے بیچ میں دیوار اٹھا کر دو گھر بنا لیے ہیں۔ اللہ داد اور اس کا پیو ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔“

رحیم داد کو اس اطلاع سے کسی قدر تقویت ملی۔ اس نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”تب تو مولا داد کی گھر والی بیگماں کو بھی تو جانتا ہو گا؟“

”بالکل جانتا ہوں۔ تجھے بیگماں سے ملتا ہے؟“

”ہاں، میں نے اسی سے ملتا ہے۔“

”تمیں نوں پہلے مولا داد سے ملنا چاہئے۔“ دارا نے مشورہ دیا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا۔“

”اے سے بھی ملوں گا۔ پر مجھے پہلے بیگماں ہی سے ملنا ہے۔“

”کوئی ایسی ویسی گل تو نہیں۔“ دارا نے رحیم داد کو مشتہ نظروں سے دیکھا۔ ”بیگماں سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟ مجھے سچ بتا دے۔“

”رب سونہ، ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ رحیم داد نے قبیلے کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر قسم کھائی۔

دارا نے اس کی بات پر یقین کرتے ہوئے کہا۔ ”پر یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ پہلے بیگماں سے کیوں ملنا چاہتا ہے۔“

”گل ہی کچھ ایسی ہے۔ مجھے پہلے بیگماں سے ملنا ہو گا اور اس طرح ملنا ہو گا، کسی کو پتہ نہ چلے۔ تو میرا یہ کام کر سکتا ہے۔“

”تیری گل ابھی تک سمجھ نہیں آئی۔“ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو شے سے دیکھا۔

”میں تجھے بعد میں سب کچھ بتا دوں گا۔“ رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

دارا نے پھر شک ظاہر کیا۔ ”یہ تو سوچ، میں ایسی بات بیگماں سے کیسے کہہ سکتا ہوں؟ وہ برا نہیں منائے گی؟ تیرے بارے میں پوچھے گی تو میں کیا بتاؤں گا؟ اس طرح تو وہ میرے کہنے پر ہرگز تجھے ملنے نہیں آئے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے خن سازی سے کام لیا۔ ”پر تو نے میری پوری گل کہاں کی۔ وہ ایسا ہے جی، بیگماں کا ایک بھائی تھا، رحیم داد۔ احمد کوٹ میں رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کا کتل ہو گیا۔ وہ میرا گمراہ تھا۔ اے ایک جھگڑے میں سزا ہو گئی تھی۔ میں اسے جیل ملنے گیا تھا۔ اس نے مجھ سے ایک بات کہی تھی، وہ میں نے بیگماں کو بتائی ہے۔ اس نے مجھے سونہ دی تھی کہ میں یہ بات بیگماں کے سوا کسی کو ہرگز نہ بتاؤں۔“ رحیم داد نے نظر بھر کر دارا کو دیکھا۔ ”اب مرنے والے

مرد ملوٹوں گا۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا، پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تیرا اب یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ کوئی اتھے آگیا تو معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔ جیسا تو نے کہا، میں ویسا ہی چاہتا ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“

”مجھے کہاں لے جائے گا۔“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”پنڈ میں جانا تو ٹھیک نہیں۔ بیگماں کو یہاں بلا کر نہیں لاسکتا؟“

اس ٹیم تو مولا داد گھر پر ہو سکتا ہے۔“ دارا نے قیاس آرائی کی۔ ”بیگماں سے ایسی بات میں کیسے کر سکتا ہوں اور اسے یہاں کیسے لاسکتا ہوں؟ میرے گھر چل۔ میرا ٹھکانا ادھر پنڈ سے الگ جھنگر کے پاس ہے۔ ادھر کوئی نہیں جاتا۔ میں اکیلا ہی رہتا ہوں۔ وہیں ٹھہر جانا۔ میں موکل لگتے ہی بیگماں سے بات کر لوں گا اور اسے تیرے پاس لے آؤں گا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟ یہ مجھ پر چھوڑ دے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آ میرے ساتھ۔“

رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلا گیا۔



ہر طرف سناٹا تھا۔ دارا اور رحیم داد نے جوہ عبور کیا اور ویرانے کی طرف بڑھنے لگے۔ گاؤں کے گھروں میں ٹھنڈے چراغ دور ہوتے گئے۔ جھنگر نظر آنے لگا۔ وہ اس سے قریب ہوتے گئے۔ مگر جھنگر میں داخل نہیں ہوئے۔ جھنگر سے پہلے ہی درختوں تلے دھندلی دھندلی روشنی میں ایک مکان نظر آیا۔

دارا آگے بڑھ کر مکان کے دروازے پر پہنچا۔ باہر سے کنڈی لگی تھی۔ دارا نے کنڈی کھولی۔ دروازے کا ایک پٹ سرکایا اور رحیم داد کے ساتھ اندر چلا گیا۔ سامنے مختصر صحن تھا۔ ایک طرف مٹی سے بنی ہوئی کوٹھری تھی۔ اس کے ساتھ ہی چیمبر تھا۔ اس کے نیچے کھانا پکانے کے لیے چولہا تھا۔

مکان کی دیواریں بھی کچی تھیں اور زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مکان پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ دارا نے صحن میں ایک بوسیدہ چارپائی ڈال دی۔ کوٹھری کے اندر گیا مگنڈا سا کھس نکال کر لایا۔ اسے چارپائی پر بچھایا اور رحیم داد سے گویا ہوا۔

”اب آرام کر۔ میں مولا داد کی طرف جاتا ہوں۔ اگر وہ گھر پر نہ ہو اور بیگماں اکیلے ہوئی تو ابھی تیرے بارے میں بات کروں گا۔ تیار ہو گئی تو ساتھ لیتا آؤں گا۔ ویسے رات کو مشکل ہی لگتا ہے۔“

”ن کو تو اس سے گل بات کرنے کا ضرور کوئی بہانہ مل جائے گا۔“

کی گل کا تو مجھے لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔“

”تیری گل کچھ کچھ سمجھ تو آتی ہے۔“ دارا نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”ویسے مجھے بیگماں کے بھائی رحیم داد کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ میں نے تجھے کہا تھا، مجھے اس پنڈ میں آئے زیادہ مدت نہیں ہوئی۔“

”بیگماں سے ملنا تو اسے بتانا، تیرے مرحوم بھائی کا بہت پرانا یار احمد کوٹ سے آیا ہے اور تجھے اس کی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔“

دارا تذبذب میں پڑ گیا۔ ”ایسا کر، مولا داد سے مل لے۔ اگر وہ تجھے مہمان بنا کر ٹھہرا لے تو جب وہ گھر پر نہ ہو، بیگماں کو اس کے بھائی کی بتائی ہوئی گل بتا دیتا۔“

رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ ”میں چاہتا ہوں بیگماں سے ملنے سے پہلے، مولا داد، اس کے بھائی باپ کو بالکل پتہ نہ چلے، میں ڈھولا امیر خاں میں ہوں۔ گل ہی کچھ ایسی ہے، جسے تو نہیں سمجھ سکتا اور میں تجھے بتا بھی نہیں سکتا۔“ رحیم داد نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکالا۔ ”دارا! میرا یہ کام کر دے، تیری مہربانی ہوگی۔“ اس نے نوٹ دارا کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”لے، اسے رکھ لے، نئی کمبص اور دھوتی لے آنا۔ تیرے کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔“ اس نے دارا کا بوسیدہ لباس گہری نظروں سے دیکھا۔

دارا نے چپ چاپ نوٹ لے کر دھوتی کے ڈب میں رکھ لیا۔ اس کا روپیہ اب بدل گیا تھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”میں بیگماں کے پاس چلا جاؤں گا۔ پر تو نے مجھے اب تک اپنا نام نہیں بتایا۔ بیگماں پوچھے گی تو کیا بتاؤں گا۔“

”کیا کرے گا جان کر۔“ رحیم داد نے مسکرا کر بے پروائی کا مظاہرہ کیا۔ ”بیگماں پوچھے تو اسے کہہ دیجئے تجھے نام یاد نہیں رہا۔ بس اتنا کہہ دینا احمد کوٹ سے تیرے بھائی رحیم داد کا پرانا یار آیا ہے اور تجھے اکیلے میں کوئی ضروری گل بتانا چاہتا ہے۔ اسے منع کر دینا وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہ بتائے۔ مولا داد کو بھی نہیں۔“

”کام تو ٹھیکھا لگتا ہے۔ پر اب تو کرنا ہی پڑے گا۔ تجھ سے وعدہ جو کر لیا۔“

رحیم داد نے گرم جوشی سے دارا کا ہاتھ پکڑ کر بھیج لیا۔ ”تو بہت نیک بندہ ہے۔ میرا یہ کام کرادے تو میں تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ آرام سے رہے گا۔ پروانہ کر، یہاں سے زیادہ آرام سے رہے گا۔“

دارا پر رحیم داد کی باتوں کا خوش گوار اثر پڑا۔ جوش سے بولا۔ ”فکر نہ کر، میں بیگماں سے تجھے

”میں تیری واپسی کا انتظار کروں گا۔“

”نہیں، میرا انتظار نہ کرنا۔ میں نے کہا تھا، اس ٹیم مشکل ہی ہوگا۔ اگر بیگماں سے تیرے بارے میں بات نہ ہوئی تو میں ادھر نہیں آؤں گا، مولا داد کے گھر سے سیدھا منھا چلا جاؤں گا۔ مجھے فصلوں کی رکھوالی کرنی ہے۔“

”بیگماں سے بات کرنے کا موقع مل جائے تو ادھر ادھر دیکھ لیتا۔ بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ کسی کو میرے بارے میں بالکل پتہ نہ چلے۔“ رحیم داد نے اسے ایک بار پھر خبردار کیا۔
”فکر نہ کر۔ میں کوئی غلط کام نہیں کروں گا۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا۔ ”اب میں چلوں گا۔ دروازہ بند کر لے اور منجی پر آرام کر۔“

دارا باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ کلیم کے کانڈات کا بستہ سرہانے رکھا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک دارا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہیں آیا۔ رحیم داد سو گیا۔

سویرے بہت ترکے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ باہر سے دارا کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے دروازہ کھول دیا۔ دارا اندر آگیا۔ وہ اکیلا تھا۔
”رات مولا داد کے گھر گیا تھا؟“

”یہاں سے نکل کر اسی طرف گیا تھا۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”مولا داد گھر پر ہی تھا۔ بیگماں بھی جاگ رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور وہاں سے منھا کی طرف چلا گیا۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔“

”اس کا مطلب یہ ہے، کام نہیں بنا۔“ رحیم داد نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔
”اب یہ مجھ پہ چھوڑ دے۔“ دارا نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”یہاں آرام سے رہ۔ میں آج کسی نہ کسی طرح بیگماں سے ضرور تیرے بارے میں بات کر لوں گا۔“
رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ ”آج اس سے ملاکات ہو جائے گی؟“
”ٹھیک سے نہیں بتا سکتا۔ وہ مان گئی تو خود تیرے پاس پہنچ جائے گی۔ میں اسے بتا دوں گا توں میرے گھر ٹھہرا ہے۔“

رحیم داد اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ صحن کے ایک گوشے میں کنواں تھا۔ رحیم داد نے پانی نکالا۔ غسل کیا۔ اپنے گرد آلود کپڑے دھوئے اور سوکھنے کے لیے پھیلا دیئے۔ وہ دارا کی دھوئی باندھے ہوئے تھا۔

رحیم داد نما دھو کر کوٹھری میں گیا۔ وہاں مونج کی چٹائی بچھی تھی۔ دارا نے اس عرصے میں روٹی پکائی تھی۔ گاؤں کے کسی گھر سے لسی بھی لے آیا تھا۔ اس نے روٹی اور لسی رحیم داد کے سامنے چٹائی پر رکھ دی۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا ناشتے کے بعد لیٹ گیا۔ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد گہری نیند سو گیا۔ رحیم داد کو نیند نہیں آئی، وہ لیٹا بھی نہیں۔ صحن میں بے چینی سے ٹھٹھاتا رہا۔ پہرہ گزرا تو اس نے باہر کھلنے والے دروازے کی کنڈی لگائی اور چٹائی پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا رہا، پھر وہ بھی سو گیا۔

دوپہر کو دارا نے رحیم داد کو بیدار کیا۔ کھانے کے لیے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد کو مطلق بھوک نہ تھی۔ دارا نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ بچی ہوئی روٹی چنگیری میں رکھ کر چھت سے لٹکے ہوئے چھینکے میں رکھ دی۔

دارا نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ”میں مولا داد کے گھر جا رہا ہوں۔ اس ٹیم بیگماں اکیلے ہوگی۔ اس سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔“
”واپسی پر ادھر ہی آئے گا؟“

”ہاں جی، ادھر ہی آؤں گا۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”پر تو آرام کر۔ بھوک لگے تو روٹی کھا لیتا۔“
اس نے ہاتھ اٹھا کر چھینکے کی طرف اشارہ کیا۔ ”روٹی کے ساتھ سرسوں کا ساگ بھی ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”میں باہر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دوں گا۔“

دن ڈھلے دارا واپس آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دارا بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ میں چل کر آیا تھا، پسینے سے اس کا چہرہ بھیگا ہوا تھا۔
رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”بیگماں سے تیری بات ہوئی؟“

”ہاں جی، ہوئی تھی۔“ دارا نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بتایا۔ ”مولا داد گھر پر نہیں تھا۔ وہ فصل کی داؤدھی کی تیاری میں لگا ہے۔ بیگماں اکیلے تھی۔“
”تب تو آرام سے گل بات کرنے کا موقع ملا ہوگا۔“

”ہاں، بات تو اس سے آرام ہی سے ہوئی۔“ دارا کا لہجہ بجا بجا تھا۔
رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”تیری بات سن کر وہ کیا بولی؟ لگتا ہے، کام بنا نہیں؟“
”بات تو اس نے میری پوری سنی پر وہ تجھے پہچان نہیں سکی۔ کچھ دیر سوچتی رہی فیر کئے گئی، مجھے کچھ پتہ نہیں۔ جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس کیسے جاسکتی ہوں۔“

”لگتا ہے اسے پوری طرح سمجھا نہیں سکا۔“

”تجھے کیا پتہ؟ میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے کی کوشش کی۔“ دارا نے اپنی کارگزاری سنائی۔ ”وہ تو اپنے بھرا کو یاد کرتی رہی اور روتی رہی۔“

”اسے یہاں لانے کی کوشش نہیں کی؟“

”میں نے تو بار بار کہا۔“ دارا نے صفائی پیش کی۔ ”یہاں تک کہا، ایک بار چل کر مل تو لے۔ اس نے کوئی ضروری گل بتائی ہے۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کسی طرح یہاں آنے پر راضی نہیں ہوئی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ بیگماں سے ملنا نہیں ہو سکتا۔“ رحیم داد کے لہجے میں مایوسی اور افسردگی تھی۔

”کیوں پریشان ہوتا ہے۔“ دارا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”تو اس کے بھلے ہی کی کوئی گل بتانا چاہتا ہو گا۔ وہ نہیں سننا چاہتی تو چھوڑا اسے۔ خاما خاجی خراب کرنے سے کیا فائدہ۔“

”بات اس طرح نہیں ہے جیسے تو سوچ رہا ہے۔“ رحیم داد نے بیگماں سے ملاقات کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”مرنے والے سے میں نے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنا چاہتا تھا۔ بیگماں سے گل بات ہو جاتی تو میرے دل کا جو بھگھا ہو جاتا۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ دارا نے اس کی تائید کی۔ ”اب میں تجھے اصلی گل بتاتا ہوں۔ ہوا یوں کہ پہلے تو وہ یہاں آنے کو کچھ کچھ تیار تھی۔ اچانک اس نے تیرا نام پوچھا۔ میں نے وہی کہا جو تو نے بتایا تھا۔ بس جی تیرا نام نہ بتانے پر وہ ایک دم اکھڑ گئی۔ کسنے لگی، جانے کون ہے۔ میں اس کے پاس نہیں جاتی۔ اس نے انکار کر دیا اور مجھے شک بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔“

چند لمحے بعد رحیم داد نے بیزار سی سے کہا۔ ”اب اس کا ذکر چھوڑ۔ آگے کی سوچ۔“

”آگے کی تو تجھے سوچنا ہے۔ مجھے کیا سوچنا۔ کہہ تو دوبارہ بیگماں سے بات کر لوں؟ شاید مان جائے۔“

”تیرا خیال ہے وہ مان جائے گی؟“

”مشکل ہی لگتا ہے۔“ دارا نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ویسے کوشش کر کے تو دیکھنا ہی چاہئے۔ بول کیا کہتا ہے؟“

”ایک بار اور کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔“ رحیم داد نے اس سے اتفاق کیا۔ ”میں یہاں ایک روز اور ٹھہر جاؤں گا۔“

”آج تو اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔ کل دوپہر کو جاؤں گا۔ دوپہر کو وہ گھر میں اکیلی ہے۔“

رحیم داد نے ایک بار پھر دارا کو سمجھایا کہ وہ بیگماں سے کس ڈھب سے بات کرے۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ کپڑے اب سوکھ گئے تھے۔ رحیم داد نے لباس تبدیل کیا۔

شام ہو گئی۔ دارا فصلوں کی رکھوالی پر چلا گیا۔ رحیم داد اکیلا رہ گیا۔



دوسرے روز دوپہر کو دارا ایک بار پھر بیگماں کے گھر گیا۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر دارا جب واپس آیا تو سورج ڈوب چکا تھا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دارا کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ اس دفعہ بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ دارا تھکا ہوا سا رحیم داد کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے بات چیت نہیں کی۔ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ اندھیرا بڑھتا رہا۔ کچھ دیر بعد رحیم داد کی آواز خاموشی میں ابھری۔

”لگتا ہے، بیگماں نے آج بھی تیری بات نہیں مانی۔“

”ہاں جی، بالکل نہیں مانی۔“ دارا نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کبھی تھی، اسے مجھ سے کوئی بات کہنی ہے تو وہ میرے پاس کیوں نہیں آتا۔ تجھے بار بار کیوں بھیجتا ہے؟“

”تو نے کیا کہا؟“

”مجھے کیا کہنا تھا جی! اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا۔“

”لگتا ہے ٹھیک سے سمجھا نہیں سکا۔“ رحیم داد گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔

”ایسا نہ کہہ۔“ اس دفعہ دارا کے لہجے میں قدرے ٹیکھا پن تھا۔ ”تجھے کیا پتہ؟ میں نے اسے کس کس طرح سمجھانے بجھانے کی کوشش کی۔“

”پر ایسی کیا بات ہے کہ وہ یہاں آنے پر تیار نہیں ہوئی؟“

”مجھے تو ایسا لگا وہ مجھ پر شبہ کرنے لگی ہے۔“

”تو برا بندہ تو نہیں لگتا۔ اس نے تیرے بارے میں ایسا کیوں سوچا؟“

”دیسے تو پنڈ میں سبھی مجھے نیک بندہ سمجھتے ہیں۔“ دارا نے صفائی پیش کی۔ ”اسے کیوں شبہ ہوا؟ یہ تو وہی جانتی ہوگی۔“

”اب تک بیگماں کے پاس بیٹھا تھا؟“

”ناجی! اس نے زیادہ بات ہی نہیں کی۔ میں نے کئی بار اپنی بات دہرائی تو ایک دم بھڑک اٹھی۔ نراض ہو کر بولی، تو نے منع کیا تھا اس لیے میں نے گھر والے سے تیرے بارے میں بات نہیں کی۔“

پر اب ایسی بات کہنے میرے پاس آیا تو اسے صاف صاف کہہ دوں گی۔ تجھے پتہ ہے اس کا سگتہ کتنا خراب ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں سیدھا سادہ لگتا ہے پر جب سگتہ آجائے تو پاگل ہو جاتا ہے۔ میں یہ بات سن کر گھبرا گیا۔ چپ کر کے اپنے زمین دار کے پاس چلا گیا۔ وہیں سے آ رہا ہوں۔ تیرے لیے روٹی بھی وہیں سے لایا ہوں۔“

دارا نے کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں نکال کر رحیم داد کے سامنے رکھ دیں۔ اٹھا اور ماچس جلا کر چراغ روشن کر دیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ اس قدر دل گرفتہ تھا کہ آدمی روٹی کھانے کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ دارا کے اصرار کے باوجود اس نے اور کھانا نہیں کھایا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے کہا۔

”جس کام کے لیے آیا تھا وہ تو بننا نہیں۔ مجھے اب واپس جانا ہے۔“

”اب تو اندھیرا ہو گیا۔ جانا ہے تو سویرے چلا جانا۔“

”تو کہتا ہے تو سویرے چلا جاؤں گا۔“

دارا کھانے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب آرام سے سو‘ میں نوں جانا ہے۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ دارا چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر آنگن میں گیا۔ چارپائی پر کھس بچھایا۔ چراغ بجھایا اور لیٹ گیا۔

وہ بے چینی سے کوٹیں بدلتا رہا اور رات کے تاریک ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسے رات ہی کو دارا کے گھر سے جانا تھا۔ دن کے اجالے میں نکلنا خطرے سے خالی نہیں تھا، مگر سوال یہ درپیش تھا کہ وہ ڈھولا امیر خاں سے جاتا کہاں؟ صرف بیگماں کا گھر ہی محفوظ ٹھکانا تھا جہاں وہ روپوش رہ سکتا تھا۔ حالات نے ایسے دھارے پر ڈال دیا تھا کہ وہ اپنی اکلوتی بہن سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اپنی مجبوری اور بے بسی پر اس کا دل بھر آیا۔ بے قرار ہو کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے سینے سے غم کا غبار دھواں بن کر اٹھا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

وہ سسکیاں بھرتا رہا۔ رات کا اندھیرا بڑھ کر پھیلنے لگا۔ رحیم داد نے قیص کے دامن سے آنسو پونچھے، چارپائی سے نیچے اترا۔ گھڑے سے پیالے میں پانی اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر غناغٹ چڑھا گیا۔

اس کے دل کا بوجھ کسی قدر ہلکا ہو چکا تھا۔ وہ صحن میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے اس نے سوچا کہ دارا کے بجائے اسے خود بیگماں کے پاس جانا چاہئے تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی تو ہو تا کہ مولا داد سے ملے بھیڑ ہو جاتی۔ مولا داد اپنے باپ کی طرح نہ ضدی ہے نہ اس سے شدید نفرت کرتا۔

بری کے ساتھ شادی نہ کرنے کا مولا داد کو ملال ضرور تھا۔ رحیم داد سے اس کا اظہار بھی کر چکا تھا۔ روہ پولیس سے مخبری کر کے اس کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کا بڑا سبب بیگماں ہی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔

رحیم داد نے طے کیا کہ اسے بیگماں کے پاس جانا چاہئے۔ مولا داد مل جائے تو اسے اپنے بارے میں صاف صاف بتا دینا چاہئے۔ رحیم داد کو امید تھی کہ وہ اس کی ضرورت مدد کرے گا۔ باپ کے ڈر سے اگر اپنے پاس نہ ٹھہرا سکے گا تو کسی قابل اعتماد دوست کے پاس بندوبست کروے گا۔ اسے مولا داد سے خیر کی توقع تھی، شرکی نہیں۔ رحیم داد نے بہت غور و فکر کے بعد اسی وقت بیگماں کے گھر جانے کا منصوبہ بنایا۔ آگے بڑھا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر باہر سے کنڈی چڑھی تھی۔ رحیم داد چند لمحوں جھنجھلایا ہوا کھڑا رہا پھر اس نے چارپائی اٹھا کر دیوار سے ٹکائی۔ اس کے سارے دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف اتر گیا۔ قریب ہی جھنگر تھا۔ جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے تھے۔



رحیم داد بستی کی جانب بڑھا۔ وہ راستوں سے بخوبی واقف تھا۔ بارہا ڈھولا امیر خاں آچکا تھا، کئی کئی روز قیام کر چکا تھا۔ سنان گلیوں سے گزرتا ہوا وہ بیگماں کے گھر کے دروازے پر بے کھٹکے پہنچ گیا۔ گلی ویران تھی۔ قریب ہی کسی گھر میں کوئی بچہ رو رہا تھا۔ لیکن بیگماں کے گھر پر گہری خاموشی طاری تھی۔

رحیم داد دم بخود اور سما ہوا تھا۔ اس نے چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور دستک دینے کی غرض سے ایک ہاتھ بڑھا کر دروازے پر رکھا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ ہاتھ رکھتے ہی دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ اسی وقت گلی میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ جھٹ اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔ سامنے کشادہ صحن تھا۔ دو چارپائیاں پڑی تھیں۔ ایک چارپائی پر دو بچے گہری نیند سو رہے تھے۔ دوسری خالی تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ رحیم داد نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔

باورچی خانے میں چراغ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی صحن تک پھیلی ہوئی تھی۔ باورچی خانے سے ملا ہوا برآمدہ تھا۔ باورچی خانے اور برآمدے کے درمیان دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہ بچتہ چوہرا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا، بیگماں سر جھکائے کھرے پر بیٹھی برتن دھو رہی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ دبے دبے قدموں بیگماں کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا تو اس کا سایہ دیوار پر لہرایا۔ بیگماں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

”کون ہے؟“

اس کے لہجے میں گہرا ہٹ اور سرا سبکی تھی۔ رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بیگماں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بیگماں نے دھندلی روشنی میں رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور ایک دم پریشان ہو کر بولی۔ ”توں توں.....“ اس کی آنکھیں پٹی ہوئی تھیں اور چہرے پر خوف چھایا تھا۔

رحیم داد نے رمان سے کہا۔ ”میں رخصت ہوں تیرا دیر۔“

”نہیں، نہیں۔“ اس نے انکار کرنے کے انداز میں جلدی جلدی گردن ہلائی۔ ”توں رخصت کیے ہو سکتا ہے۔ میرا دیر تو مرچکا ہے۔ توں.....“ اس کے چہرے سے اور زیادہ وحشت برسنے لگی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ پھاڑا۔ رحیم داد نے جھٹ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”ڈر نہیں، میں رخصت ہی ہوں۔ میں مرا نہیں زندہ ہوں۔ تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بیگماں! تو بھی مجھے نہیں پہچان سکی۔ میرے منہ کی طرف دیکھ۔ میں تجھے رخصت نہیں لگتا؟“ اس نے بیگماں کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اس کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔

وہ بدستور خوف زدہ تھی۔ الجھے ہوئے لہجے میں انک انک کر بولی۔ ”لگتا تو رخصت ہی ہے پر.....“

رحیم داد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”پہلے یہ بتا، مولا داد کہاں ہے؟“

”وہ چک ۱۹ گیا ہے۔“ اس دفعہ بیگماں کا لہجہ قدرے سنبھلا ہوا تھا۔ ”مجھے یکن نہیں آتا تو رخصت ہے۔“

رحیم داد نے اس کے سر پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ”تیرے سر کی سونہ، میں رخصت ہی ہوں۔ تیرا ماں جایا، تیرا دیر۔ میری آواز نہیں پہچانتی؟ میں مرا نہیں جو مرا ہے، وہ کوئی اور تھا۔ وہ کسی اور کی لاش تھی۔ ایسا ہوا تھا کہ.....“ اچانک گلی سے آواز ابھری۔

”بھاؤ! او بھاؤ۔“

بیگماں نے رحیم داد کو آہستہ سے دھکا دیا اور کمرے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب اشارہ کر کے بولی۔ ”اندر چلا جا۔“ رحیم داد تیزی سے لپکا اور کمرے میں چلا گیا۔

بیدی دروازہ کھول کر صحن میں داخل ہوئی۔ اس کی نگاہیں بیگماں کی طرف تھیں۔ بیگماں اسے

دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”بیدی اس دکت کیسے آگئی۔ سوئی نہیں ابھی؟“

اس نے بیگماں کی بات نظر انداز کرتے ہوئے مولا داد کے بارے میں پوچھا۔ ”کیا دیر لوٹ

آیا؟“

”نہیں۔“ بیگماں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”وہ تو سویرے لوٹے گا۔ یہی کہہ کر گیا تھا۔“

بیدی اس کی جانب بڑھتے ہوئے بولی۔ ”فیر تو کس سے گل کر رہی تھی؟“

”لے، میں نے کس سے گل کرنی تھی۔“ بیگماں نے اپنی گہرا ہٹ کی پردہ پوشی کے لیے مسکرائے

کی کوشش کی۔ ”وہم تو نہیں ہو گیا؟“

”میں تو سو گئی تھی۔ ایسا لگا، تو کسی سے گل بات کر رہی ہے۔“ بیدی نے وضاحت کی۔ ”میں نے

سوچا، دیرن آگیا ہے۔ اس سے کہتا تھا، سویرے مجھے کوٹ بہادر پہنچا دے۔ گھر والے کی طبیعت گڑ

بڑ ہے۔ میں نوں کل واپس جاتا ہے۔“

”تیرا بھرا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ تیں نوں تو پتہ ہی ہے۔ اللہ داد بھی اس کے ساتھ ہی گیا

ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی کل تیرے گھر پہنچا دے گا۔ اب تو جا کر آرام سے سو۔ دیے میں مولا

داد کو بتا دوں گی۔ تیں نوں واپس گھر جاتا ہے۔“

بیدی خاموش رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب دیکھا

جس کے پیچھے رحیم داد اندھیرے میں سما ہوا کھڑا تھا۔ وہ چند لمحے چپ چاپ کھڑی رہی پھر مڑی اور

آہستہ آہستہ بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔

بیگماں نے اسے روکنے کی کوشش کی نہ کوئی بات کی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی گہرا ہٹ چھائی

تھی۔ بیدی باہر چلی گئی۔ بیگماں نے ہاتھ دھوئے اور اپنی دھوتی سے پونچھے، چوتڑے سے اتری۔

اس نے گلی میں کھلنے والا دروازہ بند کیا۔ باورچی خانے میں گئی، لالینین روشن کی اور اسے ایک ہاتھ

میں لٹکائے ہوئے کمرے میں گئی۔ رحیم داد دروازے کے قریب خاموش کھڑا تھا۔ بیگماں نے لالینین

اٹھا کر رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تجھے اب تک شبہ ہے میں تیرا دیر رخصت نہیں ہوں؟“

”دیکھنے میں تو رخصت ہی لگتا ہے۔“ بیگماں نے دلی زبان سے بے یقینی اور تنذیب کا اظہار کیا۔

”میں مولا داد کے ساتھ احمد کوٹ گئی تھی۔ لاش تو دیکھی نہیں پر سب تیرا ہی نام لیتے تھے۔ پولیسے

بھی یہی کہتے تھے رحیم داد کو قتل کر دیا گیا۔ بھابی تو وہاں تھی نہیں۔ جانے کہاں چلی گئی۔ پنڈوالوں

نے لاش دفن کی، کبر بنائی۔ میں کبر پر گئی، اسے دیکھا اور جینیں مار کر روئی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔
 ”تو نہیں تھا تو وہ کسی لاش تھی؟ کسے دفن کیا گیا تھا؟“
 ”میں تجھے یہی بتا رہا تھا کہ بیدی آگئی۔ وہی تھی نا؟“
 ”ہاں وہی تھی۔ وہ کئی روز سے یہیں ہے۔“

”وہ کسی اور بندے کی لاش تھی۔“ رحیم داد نے بیگماں کو مطلع کیا۔ ”وہ ادھر نہریاری دو آب کے پاس بٹوں میں مر گیا تھا۔ میں نے اس کے کپڑے اتار کر پن لیے، اپنی جیل کی وردی اسے پہنا دی۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہوگا، میں جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ پولیس سے چھپتا لکھا پھرتا تھا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”میں نے لاش کا منہ پھر سے اس طرح کچل دیا تھا کوئی پہچان نہ سکے۔ جیل کی وردی سے سب کو یہی دھوکا ہوا وہ میری لاش ہے۔“

”سچ کہہ رہا ہے؟“ بیگماں نے تڑپ کر پوچھا۔ ”ہاں، تو رخصت ہی ہے۔ وہی آنکھیں، دہی ہی آواز، ہائے ربا، میرا دیر زندہ ہے۔“ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔ رحیم داد کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اس کے سر پر شفقت سے آہستہ آہستہ ہاتھ بھرنے لگا۔ دونوں سسکیاں بھرتے رہے۔

کچھ دیر بعد رحیم داد نے آنسو پونچھے۔ آہستہ سے بولا۔ ”رونا دھونا بند کر بیگماں! مجھے تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

بیگماں نے علیحدہ ہوتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا دارا کو توں نے ہی میرے پاس بھیجا تھا؟“
 ”ہاں، میں نے ہی بھیجا تھا۔“

”ہائے، میں مر گئی۔“ بیگماں نے پشیمانی کا اظہار کیا۔ ”میں نے سوچا، جانے کون ہے؟ کیوں بلاتا ہے؟ تیرا یا ربیلا بتا کر اکیلے میں بات کرنا چاہتا ہے۔ میں تو واپسی پر مولاداد کو بھی بتانا چاہتی تھی۔“
 ”یہ ٹھیک کیا کہ مولاداد کو نہیں بتایا۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”بات یہ ہے، میں ابھی تک پولیس سے چھپتا پھر رہا ہوں۔ اگر پولیس نے مجھے پہچان لیا تو میں فیئر جیل میں بند کر دیا جاؤں گا۔ اس بار میرے خلاف جیل سے فرار ہونے کے علاوہ کتل کا مکدمہ بھی چلے گا۔“

”جس کی لاش کو توں نے اپنی جیل کی وردی پہنائی تھی۔“ بیگماں نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا اسے توں نے کتل بھی کیا تھا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے حکیم نذر محمد چشتی کے قتل کا اعتراف نہیں کیا۔ ”پر سیف اللہ، جس کے ساتھ جھگڑے میں مجھے جیل ہوئی تھی، تجھے پتہ ہے، بعد میں اسپتال میں مر گیا۔ پولیس اسے کتل

تھی ہے۔ اس نے میرے خلاف کتل کا مکدمہ بھی بنالیا ہے۔“
 ”اب کیا ہوگا؟“ بیگماں کی آنکھوں میں خوف تھا۔

”میں تیرے گھر چھپنے آیا ہوں۔ مولاداد تو مان جائے گا پر چاچا سے ڈر لگتا ہے۔ وہ مجھ سے بہت نراض ہے۔“

”چاچا سے بھی زیادہ بیدی نراض ہے۔ ہمیشہ تجھے برا بھلا کہتی ہے۔ میرا کتنی بار اس سے جھگڑا ہوا۔ وہ سمجھتی ہے، توں نے ویاہ نہ کر کے اس کی بے عزتی کی۔ تیرا ذکر آتا ہے تو اس کا منہ لال ہو جاتا ہے۔“

”میں نے اس سے ویاہ نہ کر کے برا کیا۔“ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”تو اس کے لیے میں نے بیدی اور چاچا کو اتنا نراض کیا پر وہ میری نہ بن سکی۔ بے وفا اور دھوکے باز نکلی۔“

بیگماں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر استفسار کیا۔ ”کیا بھابی کے پاس گیا تھا؟“
 ”ہاں، پہلے میں اسی کے پاس گیا تھا۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔ جب میں جیل میں تھا، تبھی سے اس نے جمال دین سے یاری لگالی تھی۔“
 ”تب تو وہ پولیس سے تیرے خلاف مخبری کر سکتی ہے۔“

”نہیں، میں رات کے اندھیرے میں چھپ کر اس کے پاس گیا تھا۔ نہ میں اسے ملانے بات کی۔ اس نے مجھے دیکھا بھی نہیں۔“

”اب وہ کہاں رہتی ہے؟“

”اکال گڑھ میں جمال دین کے ساتھ رہتی ہے۔“ رحیم داد کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ ”اس مخبری کو پتہ چل گیا تو مجھے پکڑوا دے گی۔“ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ ”تیرے گھر کے علاوہ مجھے چھپنے کا کوئی ٹھکانا نظر نہیں آتا۔ چھپا چھپا پھرتا ہوں۔ ہر دم خطرہ سر پر منڈلاتا ہے۔ جب ہر طرف سے ڈنکے ہو گیا تو تیرے پاس آ گیا۔“

قریب کے گھر سے رات کے سائے میں کوئی رک، رک کر کھانسنے لگا۔ بیگماں نے پریشان ہو کر منہ لگتا ہے، چاچا جاگ رہا ہے۔ وہ ادھر بھی آسکتا ہے۔“

”تب تو مجھے چلا جانا چاہئے؟“

”دارا ہی کے گھر جائے گا نا؟“ بیگماں نے دریافت کیا۔ ”وہ بتاتا تھا، توں اس کے گھر میں ٹھہرا ہے؟“

”ہاں، میں اسی کے گھر میں ہوں۔“

”وہاں جا کر سو۔ میں سویرے مولا داد سے تیرے بارے میں بات کروں گی۔ وہ میرا کتا نہیں نالے گا۔ اللہ داد بھی مان جائے گا۔ وہ برا بندہ نہیں ہے صرف چاچا کو متانا پڑے گا۔ بیوی کا ہے، وہ تو کل اپنے گھر جا رہی ہے۔ میتوں بعد آتی ہے۔“

”میں کل رات کو آ جاؤں گا۔“

”نہیں، تیرا آنا ٹھیک نہیں۔“ بیگماں نے منع کر دیا۔ ”میں مولا داد کو تیرے پاس بھیجوں گی۔ ویسے وہ آج کل فصل کی واڈمی کی فکر میں لگا ہے۔ وہ واڈمی کے لیے لاوے لانے اللہ داد کے ساتھ چک رہا ہے۔“

”میں دارا کے گھر میں مولا داد کا انتظار کروں گا۔“

بیگماں خاموش رہی۔ رحیم داد آگے بڑھا۔ بیگماں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے۔ بیگماں نے آگے بڑھ کر کنڈی کھولی گردن باہر نکال کر گلی میں جھانکا اور رجم داد کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد گلی میں آگیا۔ اس نے چوتنا نظروں سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ گاؤں سنسان تھا۔ دور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد اس سمت نہیں گیا۔ گلیوں سے گزرتا ہوا کھیتوں کی طرف نکل گیا مگر دارا کے پاس جانے کے بجائے اس کے گھر پہنچا۔ کنڈی باہر سے لگی ہوئی تھی۔ رحیم داد اندر گیا، دروازہ بند کیا اور زنجیر چڑھا دی۔

سویرے دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دارا سامنے کھڑا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا۔ دروازے کی کنڈی لگائی۔ وہ حیرت زدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔

”رات تیرے پاس کوئی آیا تھا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔

”باہر سے دروازے کی کنڈی کیسے کھل گئی؟ میں شام کو کنڈی چڑھا کر گیا تھا۔ مجھے صاف یاد ہے۔“

”میں رات بیگماں کے گھر گیا تھا۔ باہر سے دروازہ بند تھا۔ مجھے دیوار چھاند کر باہر جانا پڑا۔“

”تو دیوار بھی چھاند سکتا ہے؟“ دارا نے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد نے اس کا شبہ دور کرنے کی غرض سے وضاحت کی۔ ”میں نے منجی دیوار سے لگائی۔ باہر چڑھا اور باہر کود گیا۔ واپسی پر میں کنڈی کھول کر اندر آیا تھا۔ پر مجھ سے ایسی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

دارا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”بیگماں کے گھر گیا تھا، کوئی گڑبڑ تو نہ ہوئی؟“

”نہیں۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ میں نے جو کچھ کہنا تھا، کہہ دیا۔“

”یہ تو بہت ہی ٹھیک ہوا۔ بیگماں نے تجھے ملنے سے انکار کیا تو مجھے برا دکھ ہوا تھا۔“ دارا نے رجم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ”اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”میں ابھی بیس ٹھیکروں گا۔“ رحیم داد نے اسے آگاہ کیا۔ ”مولا داد میرے پاس آئے گا۔“

”مولا داد تیرے پاس آئے گا۔“ دارا کے لمبے لمبے میں تعجب تھا۔ ”وہ کیوں آ رہا ہے؟ تجھے اس سے الینا؟“ وہ لمبے بھر خاموش رہا۔ ”تیرے پاس تو بیگماں کو آنا چاہئے۔ تجھے تو اسی سے ملنا ہے۔“

”میں شونی سے آنکھ ماری۔“ تو مجھ سے چھپا رہا ہے۔ پہلے کچھ اور ہی گل کی تھی۔“

”تجھے ابھی تک میرے بارے میں شبہ ہے؟“ رحیم داد نے اسے ایک بار بھر مطمئن کرنے کی شش کی۔ ”میں نے تجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھیک بتا دیا، تجھے میری باتوں پر بار نہیں آتا؟ اگر کوئی ایسی ویسی گل ہوتی تو مولا داد میرے پاس کیوں آتا؟ اپنے دل سے شبہ نکال۔“

”تو ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔“ دارا نے مطمئن ہونے کے انداز میں کہا۔ ”میں نوں کیہ لیتا ہے۔ مجھے خوشی ہے تیرا کام بن گیا۔ توں جو چاہتا تھا وہ ہو گیا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا روٹی پکانے جھلیانی میں چلا گیا۔

دونوں نے ناشتا کیا۔ دارا رات بھر کا جاگا ہوا تھا ناشتے سے فارغ ہوتے ہی سو گیا۔ رحیم داد نے ا کے کاندھات کا بستہ کھولا۔ ایک سادہ کاندھ کالا۔ چوہدری نور الہی مرحوم کے دستخط سامنے رکھے ان کی نقل بنانے کی مشق کرنے لگا۔ فرصت کے لمحات میں وہ چوہدری نور الہی کے جعلی دستخط بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ جب سے نور الہی کے کلیم کے دستاویزات اس کے قبضے میں آئی تھیں، نہ کائنات کے لیے یہ اس کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔

دارا اسے پہر کو بیدار ہوا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ منہ ہاتھ دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوا۔ رحیم داد سے اس نے کہا۔ ”تجھے روٹی کھانی ہو تو چھینکے سے اتار لیتا۔ سویرے کی بچی ہوئی

روٹی اس میں رکھی ہے۔“

”تجھے روٹی نہیں کھانی؟“

”نہیں، میں زمین داری کی حویلی جاؤں گا۔ اس نے مجھے بلایا ہے۔ وہیں روٹی کھالوں گا۔“

”شام کو تو واپس آئے گا نا؟“

”اب کل سویرے ہی تجھ سے ملنا ہوگا۔ مجھے زمین دار کے یہاں کچھ کام کرنا ہے۔ حویلی سے سیدھا رکھوالی کے لیے کھیتوں کی طرف چلا جاؤں گا۔“ دارا نے توقف کیا۔ ”تجھے رات کو تو یہاں سے جانا نہیں۔ جائے گا تو سویرے ہی جائے گا نا؟“

”رات کو جاؤں یا سویرے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تجھے مل کر ہی جاؤں گا۔“

دارا بھی مسکرایا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے کنڈی لگائی، بستے سے کاغذات نکالے اور ایک بار پھر چوہدری نور الہی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلا، سائے طویل ہو گئے۔ اپریل کے صاف ستھرے نیلے آسمان کی رنگت دھندلی ہوتی گئی۔ رحیم داد بار بار نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ دن ختم ہوا۔ شام نیچے اترنے لگی۔ مگر دروازے پر کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ گھر میں اندھیرا پھیل گیا۔ رحیم داد نے چراغ روشن نہیں کیا۔ روشنی دور سے نظر آتی تھی جو صاف چغلی کھاتی کہ گھر میں کوئی موجود ہے۔ رحیم داد یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بیگماں سے ملنے کے بعد اسے خوشی حاصل تھی، اطمینان ملا تھا۔ مگر ساتھ ہی خطرہ بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ ہر خطرے سے بچنے کے لیے پوری پوری احتیاط برتا چاہتا تھا۔



شام تاریک ہو گئی۔ رات آگئی۔ رحیم داد اندھیرے گھر میں خاموش بیٹھا رہا۔ یکایک دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چونک کر اس طرف دیکھا، اٹھا اور آہستہ آہستہ دروازے پر پہنچا۔ آہٹ رک رک کر ابھرتی رہی۔

اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“ کوئی جواب نہ ملا۔ چند لمحوں تک خاموش رہا۔ رحیم داد نے پگڑی کھولی۔ چہرہ چھپانے کے لیے ڈھانٹا باندھا۔ جیب سے چاقو نکالا، کھول کر ہاتھ میں ہو شیاری سے سنبھالا۔ کنڈی آہستہ سے کھولی اور پوری طرح چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔

دروازہ کھلا مگر وہ مولا داد نہیں تھا۔ بیگماں دہلیز پر کھڑی تھی۔ وہ اندر آگئی۔ رحیم داد نے ہنسنے لگا دی۔ بیگماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہاں تو بہت اندھیرا ہے۔ توں نے روشنی بھی نہیں کی؟“

”یہ بتا، تو کیسے آگئی؟ مولا داد کیوں نہیں آیا؟“

”وہ آج بھی لاوے لینے چک گیا ہے۔ پر توں نے منہ پر منڈا سا کیوں باندھ رکھا ہے؟ ہاتھ میں چاکو بھی دبا ہے۔ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔“

”تجھے کیا پتہ، مجھے ہر دم کتنا ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔“ وہ مسکرایا اور ڈھانٹا کھولتے ہوئے بولا۔ ”اتھے منجی پر بیٹھ جا۔“

دونوں چارپائی کے پاس گئے اور ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ بیگماں کے ہاتھ میں پوٹلی دبی تھی۔ رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“

”تیرے لیے روٹی لائی ہوں۔“ اس نے پوٹلی کھول کر کھانا نکالا۔ ”تیز خوشبو ابھری۔ بیگماں نے گرم گرم پر اٹھے اور تھلا ہوا مرغ رحیم داد کے آگے رکھ دیا۔ پیار بھرے لہجے میں بولی۔ ”پہلے روٹی کھالے، بعد میں گل بات ہوگی۔“

رحیم داد آلتی پالتی مار کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ بھوکا بھی تھا۔ کئی روز بعد اتنا اچھا کھانا ملا تھا۔ پر اٹھے کے لئے تو زور زور جلدی جلدی کھانے لگا۔ بیگماں ہنس کر بولی۔

”بہت بھوکا لگتا ہے۔“

رحیم داد نے مرغ کی ٹانگ سے گوشت نوچتے ہوئے کہا۔ ”پرو نٹے بہت مزے دار ہیں، مگر بھی زوردار تھلا ہے۔“ اس نے گھڑے کی طرف اشارہ کیا۔ ”پینے کو پانی دے دے۔“

بیگماں اٹھی، اس نے پیالے میں پانی اٹھایا۔ پیالہ لا کر رحیم داد کو دیا۔ اس نے چند گھونٹ پیئے اور پیالہ سامنے رکھ دیا۔

رحیم داد نے بیگماں کی جانب دیکھا۔ وہ زمین داروں کی عورتوں کی طرح ریشمی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی ریشمی تھا۔ بالوں میں خوشبو دار تیل پڑا تھا، آنکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ وہ غسل کر کے عمدہ لباس پہن کر آئی تھی۔ بیگماں نے پوچھا۔

”کیا دیکھ رہا ہے؟“

”تو نے بہت بناؤ سنگھار کر رکھا ہے۔“

”تجھے کیا پتہ، میں رات سے کتنی خوش ہوں۔ یہ جان کر، توں زندہ ہے، مجھے اتنی خوشی ہوئی، اتنی خوشی ہوئی، بس کیا بتاؤں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”میرا ایک ہی دیر ہے۔ تیرے سوا میرا اور کون

ہے؟ میں نہ خوش ہوں گی تو کون ہوگا؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

”لے، تو نے تو رونا بھی شروع کر دیا۔“ رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلا۔ ”یہ بتا، مولاداد کیوں نہیں آیا؟ میرے بارے میں اس سے بات کی تھی؟“

”نہیں۔“ بیگم نے جواب دیا۔ ”تیرے بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ سویرے وہ آیا تو اللہ داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اللہ داد کے سامنے تو ایسی بات کر نہیں سکتی تھی۔“

”بعد میں کر لیتی۔“

”دونوں ساتھ ساتھ آئے تھے اور ساتھ ہی ساتھ چلے گئے۔ مولاداد دوسرے کو روٹی کھانے آیا تھا پر تھوڑی دیر ٹھیرا۔ روٹی کھاتے ہی باہر چلا گیا۔ وہ اپنے بچے کے پاس گیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہیں بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ سب فصلوں کی واڈھی کی تیاری میں لگے ہیں۔ کل سویرے نہیں تو پر سوں سے واڈھی شروع ہو جائے گی۔ اب زیادہ دیر نہیں کی جاسکتی۔ بیساکھی شروع ہو چکی ہے۔ ہر طرف فصلوں کی واڈھی ہو رہی ہے، جیسی تو واڈھی کرنے والے لاوے مل نہیں رہے۔ مولاداد اللہ داد اسی لیے تو روز روز لاؤں کو بلانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔“

”جب مولاداد روٹی کھانے آیا تھا تب تو وہ اکیلا تھا۔ میرے بارے میں بات چھیڑ کر تو دیکھی ہوتی۔“

”نہیں ابھی نہیں۔ میں نے جان کر اس سے کوئی بات نہیں کی۔“ بیگم نے وضاحت کی۔ ”بیدی کو آج سویرے اپنے گھر والے کے پاس کوٹ بہادر جانا تھا پر وہ گئی نہیں۔ جب تک وہ موجود ہے، میں تیرے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے بیدی سے ڈر لگتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں وہ کتنی کمینہ اور چنڈال ہے۔ تیرے تو نام ہی سے اسے آگ لگ جاتی ہے۔ ذرا ابھی پتہ چل گیا تو وہ ضرور اپنا کمینہ بن دکھائے گی۔“

”وہ کب تک اور ٹھیرے گی؟“

”کل سویرے جانے کو کتنی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہی مولاداد سے تیرے بارے میں بات کرنا ٹھیک رہے گا۔“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”بیدی کو میرے بارے میں کوئی شبہ تو نہیں ہوا؟“

”پتہ نہیں۔ کل تو بالکل اچانک کھس آئی تھی۔ دروازہ بھی تو کھلا رہ گیا تھا، پر میں نے اسے اپنے طور پر سمجھا بھادیا تھا۔ ویسے وہ ہے بہت مکار۔“

وں گا۔ ویسے یہ گھر چھپنے کے لیے ٹھیک ہے۔ پنڈ سے الگ ہے اور جھنگر کے پاس دیرانے میں۔ ادھر دن میں بھی کوئی نہیں آتا۔“

”پر دیوا تو جلا لیا ہوتا۔ تجھے اندھیرے سے گھبراہٹ نہیں ہوتی؟“

”میں نے جان کے دیوا نہیں جلا یا۔ اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں، کوئی دیکھے تو سمجھے گھریا کل خالی ہے۔“

”اور جو کوئی چور شور آگیا؟“

”یہاں دھرا ہی کیا ہے جو کوئی چوری کرنے آئے گا۔“

رحیم داد نے کورا اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ بیگم نے کہا۔ ”میں تو تجھے یاد کر کے رات روتی تھی۔ کہیں دل نہیں لگتا تھا۔ پر تو نے بھی کبھی مجھے یاد کیا؟“

”کیوں نہیں یاد کیا؟ تجھے یاد نہ کرتا تو تیرے پاس آتا کیوں؟ کسی اور طرف نکل جاتا۔“ رحم داد نے پانی کا خالی کورا رکھتے ہوئے اس کی دل جوئی کی۔ ”تجھے پتہ ہی ہے۔ ماں اور بچہ کا مرن ہوا تب تو ت چھوٹی تھی۔ میں نے تجھے اولاد کی طرح پالا ہے۔ ویسے میں بھی چھوٹا ہی تھا۔ چاچا تجھے اپنے اٹھ لے جانا چاہتا تھا پر میرا جی نہ چاہا تجھے اپنے سے دور رکھوں۔ جب تیرا دیاہ ہوا تو میں کتنا رویا ا۔ تجھے یاد ہے نا؟“

”ہاں مجھے یاد ہے۔ بار بار روتا تھا۔ سب تجھے سمجھاتے تھے۔ پر میں بھی تو بہت روٹی تھی۔“

”میں برابر تیرے گھر آتا تھا۔ تجھے اپنے ساتھ لے آتا تھا۔ تیرے آنے سے ایسا لگتا جیسے میرے مدیرے گھر میں اجالا ہو گیا۔“ رحیم داد بیٹے دنوں کی راکھ کریدنے لگا۔ ”پر نورائے دیاہ کے بعد اچانے مجھے تجھ سے جدا کر دیا۔ میں ان دنوں چھپ چھپ کر روتا تھا۔“ رحیم داد کی آنکھوں میں

نسوا گئے۔ اس نے قیص کی آستین سے آنسو پونچھے۔ بیگم بھی رونے لگی۔ دونوں خاموش بیٹھے

”دل کی پگڈنڈیوں پر بھکتے رہے۔“

کچھ دیر بعد بیگم کی آواز ابھری۔ ”پر نورائے بھابی تو تجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس نے تجھ سے دھوکا کیوں کیا؟ وہ ایسی تو نہیں تھی اور جمال دین تو تیرا بہت گھریا تھا۔ ہر دم تیرے ساتھ

ساتھ رہتا تھا۔ سیف اللہ اور اس کے بھائیوں سے جھگڑا ہوا تو وہ تیرے ساتھ جم کر لڑا۔ زخمی ہوا۔ بل میں بھی بند رہا۔ چھوٹ گیا تب بھی جیل میں تجھے لے جاتا تھا۔ جب میں تجھے لے جیل گئی تھی،

ن روز وہ بھی موجود تھا۔ بعد میں اس نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں تو مجھے دکھ ہے۔ نورائے میرے ساتھ ایسا دھوکا کیا کہ مجھے بچوں سے بھی گھن آنے

گئی۔ میں نے سب کو بھلا دیا۔ نوراں کو بھی، بچوں کو بھی۔ اب تیرے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں رہا۔“

رحیم داد کی آواز بھرا گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ بیٹھے رہے۔ ذرا دیر بعد بیگماں نے کہا۔ ”روٹی تو کھا، توں نے روٹی بھی چھوڑ دی۔“

”نہیں، اب میں نہیں کھاؤں گا۔“

”اب میں تجھے جانے نہیں دوں گی۔ اپنے ساتھ ہی رکھوں گی۔“

”چاہتا تو میں بھی یہی ہوں پر چا چا بھی راضی ہو جائے گا؟“

”مولاداد اسے راضی کر لے گا۔“ بیگماں نے اسے تسلی دی۔ ”فکر نہ کر۔ مولاداد میری بات ضرور مان لے گا۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔ وہ کہے گا تو چا چا بھی ضرور مان جائے گا۔ ویسے بھی اب وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ چاچی کے مرنے کے بعد تو زیادہ ہی کمزور ہو گیا۔ طبیعت میں پہلی جھین گری بھی نہیں رہی۔“

”پر بیدی جو موجود ہے۔ وہ ضرور رولا ڈالے گی۔“ رحیم داد نے خدشہ ظاہر کیا۔

”وہ روز روز تھوڑا ہی آتی ہے، مہینوں بعد آتی ہے۔ اب اس کا پورا ٹبر ہو گیا۔ گھر والا ہے، ہمارے بچے ہیں۔ انھیں چھوڑ کر کیسے آسکتی ہے؟ سب کو ساتھ لانا بھی آسان نہیں۔ ویسے بھی اس کا گھر والا روز ہی بیمار رہتا ہے۔“ بیگماں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”نکل سویرے وہ جا رہی ہے۔ کئی مہینے بعد آئے گی۔ تب تک کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔ اتنے دنوں میں تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ ”کبھی تو ٹھیک ہے۔ تین چار مہینے مل جائیں، تب تک میں کہیں زمین بھی الاٹ کرالوں گا۔“

”زمین الاٹ کرالے گا؟ کیسے؟ توں پناہ گیر تو ہے نہیں۔“ بیگماں نے حیرت ظاہر کی۔

”دیکھ لیتا، میں کیسے زمین الاٹ کراتا ہوں۔“ اس نے سرہانے رکھے ہوئے بستے کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس میں کلیم کے کانڈ ہیں۔ بہت وڈا کلیم ہے، ہزاروں کلا زمین کا۔“

”کیسی باتیں کر رہا ہے؟“ وہ اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئی۔ ”تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔“

”ابھی تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ پر جب میں زمین الاٹ کرالوں گا تب خود دیکھ لے گی۔ میں تجھے اور مولاداد کو بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔“

”ایسا ہو جائے تو بیدی کا بچہ سے کاغذ ہی نکل جائے۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”پر کچھ ہو گا۔“

ہے؟“

”میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا پر ابھی نہیں۔ مجھے چند مہینے اطمینان سے رہنے کا ٹھکانا مل جائے، بردہ کھنا کیا ہوتا ہے۔“

”بھابی نے برا کیا ورنہ وہ تیرے ساتھ عیش کرتی۔“

”اس کی گل نہ کر۔“ رحیم داد نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں اب اس کا نام بھی نہیں مانتا چاہتا۔ یوں سمجھ لے، میرے لیے وہ مر گئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مر گئے۔“

”دیر ایسا نہ کہہ۔“ بیگماں تڑپ کر بولی۔ ”بچے تیرے ہی ہیں۔ ان کا تو کوئی کسور نہیں۔“

”بچہ نہیں وہ میرے بچے ہیں یا جمال دین کے۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے اپنے کانوں سے نوراں کو یہ کہتے سنا، جمال دین سے اس کی بہت پرانی یاری تھی۔“

”یہ گل اس نے تجھ سے کسی تھی؟“

”مجھے کتنی تو میں اسے زندہ کب چھوڑتا۔ مجھے اتنا بے غیرت سمجھتی ہے؟“ رحیم داد نے تلخ لہجے میں بتایا۔ ”میں رات کو اس کے گھر چھپ کر گیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ وہ تو جمال دین سے باتیں کر رہی تھی۔“

”سمجھ نہیں آتی۔ وہ ایسی لگتی تو نہیں تھی۔“

”میں بھی تیری طرح دھوکے میں رہا۔ وہ کیسی ہے؟ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس رات کی باتیں یاد کرتا ہوں تو سینے میں آگ جل اٹھتی ہے۔“ رحیم داد کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔

بیگماں نے بات بدلنے ہوئے پوچھا۔ ”تیری احمد کوٹ کی زمین کا کیا بنے گا؟“

”گولی مار اس زمین کو۔ تھی ہی کتنی۔“ رحیم داد نے جوش سے کہا۔ ”اب تو میں مرتے الاٹ کراؤں گا اور بہت عمدہ زمین دیکھ بھال کر لوں گا۔ الاٹمنٹ ہو جانے دے۔ تب تو دیکھنا، زمیں داری کیا ہوتی ہے۔ بارہاں چوداں کلا زمین کی بھی کوئی داری ہوئی۔“

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ رحیم داد نے جھٹ ایک بار چہرہ منہ پر ڈھٹاٹا باندھا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو باہر سے آواز آئی۔

”دروازہ کھول، میں ہوں دارا۔“

رحیم داد نے کنڈی کھولی، دارا اندر داخل ہوا۔ رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ ”تو نے تو سویرے آنے کا کہا تھا، اب کیسے آگیا؟“

”میں تیرے لیے روٹی لایا تھا۔“ اس نے کپڑے میں لپیٹی ہوئی روٹیاں اس کی طرف بڑھائیں۔ رحیم داد نے کھانا نہیں لیا۔ ”میں تو روٹی کھا چکا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لے جا۔ مجھے اب کچھ نہیں کھانا۔“

دارا نے دھندلی روشنی میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی بیگماں کو غور سے دیکھا اور پہچان بھی لیا۔ مگر کہو بولا نہیں۔ چند لمحے گم صم کھڑا رہا پھر رحیم داد سے باہر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”میرے ساتھ باہر آ۔ تجھ سے بات کرنی ہے۔“

رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ باہر گھرا سناٹا تھا۔ اندھیرا ہر طرف پھیلا تھا۔ دارا نے رازداری کے انداز میں دہی زبان سے کہا۔

”توں نے تو کہا تھا، مولاداد تیرے پاس آئے گا۔ پر یہ تو بیگماں ہے، وہی ہے نا؟“ ”ہاں، وہی ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”میرے لیے روٹی لے کر آئی تھی۔ پروتھے تھے، سلا ہوا ٹکڑا تھا۔ میں نے ساری روٹی نہیں کھائی۔ تیرے لیے رکھ چھوڑی ہے۔ جی چاہے تو ابھی کھالے نہیں تو سویرے کھا لیتا۔“

”میں روٹی کھا کر آیا ہوں۔ اب بالکل بھوک نہیں ہے پر مولاداد تیرے پاس کیوں نہیں آیا؟“ ”وہ دن ڈھلے اپنی فصلوں کی واڑھی کے لیے لاوے لینے چک ۱۹ چلا گیا۔ رات دیر سے لوٹے گا اس لیے نہیں آیا۔“

”تجھے کس نے بتایا، مولاداد چک ۱۹ گیا ہے۔“ دارا نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں نے تھوڑی دیر پہلے اسے اپنے زمیں دار کی حویلی میں دیکھا تھا۔ توں کہتا ہے، وہ دن ڈھلے چک ۱۹ چلا گیا۔“ ”مجھے تو یہی معلوم ہوا تھا۔“ رحیم داد بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ ”تیری اس سے کوئی گل بات تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“ دارا نے انکار میں گردن ہلائی، دہی زبان سے بولا۔ ”مجھے سچ بتا دے، اصل معاملہ کیا ہے؟ بیگماں سے تیری یاری ہے، تب بھی میں نے کیا لیتا۔“ ”ہر بار ایسی گل بات کرتا ہے۔“ رحیم داد جھنجھلا گیا۔ ”میری بات کا اعتبار کیوں نہیں کرتا؟ تو کیا بندہ ہے؟“

”نراض نہ ہو۔“ دارا نرم پڑ گیا۔ ”میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔ اگر کوئی ایسی گل ہے تو میں تیری مدد ہی کروں گا۔“ اس نے تامل کیا۔ ”مجھے تو یہ ڈر ہے کوئی گزبوند ہو جائے، توں کسا مشکل میں نہ پڑ جائے۔“

”دارا! میں نے تجھے اپنا یار کہا ہے، تجھ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔ سب کچھ سچ بتا دوں گا پر جو تو سوچ رہا ہے، ایسا بالکل نہیں ہے۔“ رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”توں ٹھیک ہی کہتا ہوگا۔“ اس نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں۔ ”اب میں چلوں گا سویرے آؤں گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ دارا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد گھر میں واپس آگیا۔ اس نے کنڈی لگائی اور بیگماں کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”دارا باہر گلی میں تجھے کیا کہتا تھا؟“

”اس نے عجب گل بتائی۔ تو کہتی ہے، مولاداد چک ۱۹ چلا گیا۔ دارا کہتا ہے وہ اسے زمین دار کی حویلی میں تھوڑی ہی دیر پہلے ملا تھا۔“

بیگماں بھونچکا ہو کر بولی۔ ”مجھ سے تو وہ یہی کہہ کر گیا تھا۔ تب تک سورج بھی نہیں ڈوبا تھا۔ میں نے تیرے لیے روٹی تیار کی، نہائی، کپڑے بدلے اور اندھیرا ہوتے ہی یہاں آگئی۔“

”مولاداد نے تجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟“ ”پتہ نہیں۔“ وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ ”وہ مجھ سے جھوٹ تو نہیں بولتا۔ ہو سکتا ہے، چک ۱۹ جاتے ہوئے کوئی کام یاد آگیا اور وہ زمیں دار کے پاس چلا گیا۔“

”ایسا ہی ہوگا۔ اب تجھے جانا چاہئے۔ مولاداد گھر پہنچا اور تجھے وہاں نہ پایا تو جانے کیا سوچے۔“ ”ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے اب چلنا چاہئے۔“ بیگماں بھی جانے پر آمادہ ہو گئی۔ ”میں آج ہی رات مولے سے گل بات کروں گی۔ فکر نہ کر، وہ میری بات مان جائے گا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہوگا۔“



رحیم داد نے بچا ہوا کھانا کپڑے میں لپیٹا اور اسے چنگیری میں رکھ کر چھینکے پر لٹکا دیا۔ واپس آیا تو بیگماں کھڑی ہو چکی تھی۔ رحیم داد نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

”مولاداد اور چاچا کو راضی کر لیا تو میں تیرے ساتھ ہی رہنے کو آجاؤں گا۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ بیگماں نے اسے یقین دلایا۔ ”آگے جو کچھ کرنا ہے، وہ مجھ پر چھوڑ دے۔“ ”ہاں تجھے یہ کام کرنا ہے۔“

”میں تو ہر طرح کوشش کروں گی میرا جھجھکا ہوا دیر میرے پاس آجائے۔“ بیگماں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں کتنی خوش ہوں، تجھے جانا نہیں سکتی۔ بچے بھی اپنے ماماں کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔“

کبھی کبھی تو تجھے بہت یاد کرتے ہیں۔ تیرے آنے سے میرے گھر میں جیسے روشنی آجائے گی۔ ہائے کتنا چنگا لگے گا۔“

دونوں دروازے کی جانب بڑھے۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ مگر دروازہ کھولتے ہی وہ سہٹا کے رہ گیا۔ سامنے مولاداد کھڑا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ہاتھ میں لمبی کھماڑی دبی تھی۔ وہ جھپاک سے اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے اللہ داد بھی اندر آگیا۔ مولاداد ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانس بھر رہا تھا۔ اس نے بیگماں کو خوں خوار نظروں سے دیکھا۔

بیگماں نے گہرائے ہوئے لہجے میں مولاداد سے پوچھا۔ ”یہاں کیسے آگیا؟“

مولاداد نے چند لمبے خاموش رہ کر تھکے لہجے میں کہا۔ ”مجھے پتہ چل گیا تھا تو، یہاں اپنے یار سے ملنے آئی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ”یہ کل رات بھی میرے جانے کے بعد چسپ کر تیرے پاس آیا تھا۔“

بیگماں نے مڑ کر اللہ داد کو دیکھا پھر اکتاتے ہوئے مولاداد سے کہا۔ ”کیسی گل کر رہا ہے؟ مولے تجھے پتہ ہے، یہ کون ہے؟“

”مجھے سب پتہ ہے۔ بیدی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تیرے یار کو کل رات ہی دیکھ لیا تھا۔“ مولاداد نے ترش روئی سے کہا۔ ”تو نے اسے کمرے میں چھپا دیا تھا۔“

”وہ جھوٹ بولتی ہے۔“ بیگماں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”آرام سے بیٹھ، میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔“

”بیدی جھوٹ بولتی ہے، دارا بھی جھوٹ بولتا ہے، سب جھوٹ بولتے ہیں۔ صرف تو سچی ہے۔“ وہ غصے سے چیخنے لگا۔

رحیم داد نے کہا۔ ”مولے! تجھے کچھ پتہ نہیں۔“

اللہ داد نے اسے ڈانٹا۔ ”بکواس نہ کر۔“

مولاداد تیزی سے جھپٹا۔ اس نے بیگماں کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ جاہلیاں پر جا کر گر گئی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، گڑگڑا کر بولی۔ ”میری گل تو سن مولے۔“ اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ، یہ۔“ مگر مولاداد نے اسے پوری بات نہیں کہنے دی۔ غضب ناک ہو کر کھماڑی چلائی۔ ہاتھ بھر پور پڑا۔ کھماڑی بیگماں کی گردن کاٹتی ہوئی اندر اتر گئی۔ بیگماں کے منہ سے دل دوزخ نکلے۔

مولاداد ایک کے بعد دوسرا وار کرتا رہا۔ کھماڑی نے بیگماں کے جسم کے ٹکڑے کر دیے۔ رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ پھر تیزی سے لپکا اور مولاداد کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی۔ مولاداد اس کی جانب پلٹا۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس نے رحیم داد پر بھی کھماڑی سے وار کیا۔ مگر رحیم داد جھکا کر دے کر صاف بچ گیا۔ مولاداد نے دوسرا وار کرنے کے لیے کھماڑی اٹھائی۔ رحیم داد نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”مولے! تو نے بہت برا کیا۔ میری گل سن۔“

مگر مولاداد نے ایک نہ سنی۔ اس نے کھماڑی سے وار کرنا چاہا۔ رحیم داد نے جھپٹ کر کھماڑی پکڑ لی، جھکا دیا اور کھماڑی چھین لی۔ اسی وقت اللہ داد نے اس پر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے سر اس طرح جھکایا کہ وار خالی گیا۔ مگر مولاداد نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے تڑاق سے رحیم داد کے منہ پر تھپڑ مارا اور کھماڑی چھیننے کی کوشش کرنے لگا۔

اب رحیم داد بھی غصے سے بے قابو ہو چکا تھا۔ وہ پیچھے ہٹا۔ کھماڑی سنبھالی، مولاداد پر وار کیا۔ کھماڑی کندھا کاٹتی ہوئی اندر اتر کر پھنس گئی۔ مولاداد کے منہ سے ہائے کی آواز نکلی۔ وہ خون میں لٹ پٹ ہو کر زمین پر تر پڑنے لگا۔

رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہوا تو اللہ داد نے پھر ڈانگ سے وار کیا۔ رحیم داد نے بچنے کی کوشش کی مگر پچھتے پچھتے بھی ڈانگ اس کے بائیں بازو پر لگی۔ رحیم داد تھلا کے رہ گیا۔ اس نے اچھل کر اللہ داد کے سینے پر لات ماری۔ وہ دور جاگرا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ رحیم داد نے اسے جھپٹ کر اٹھالیا۔

اللہ داد اٹھ کر رحیم داد پر جھپٹا مگر رحیم داد نے اسے قریب نہیں آنے دیا۔ گھما کر ڈانگ کا ہاتھ چلایا۔ ڈانگ اللہ داد کے سر پر لگی۔ اس کا سر پھٹ گیا۔ خون بہہ کر چہرے پر آگیا، وہ زمین پر گر گیا۔ رحیم داد بڑھ کر بیگماں کے پاس گیا مگر وہ دم توڑ چکی تھی۔ مولاداد زمین پر پڑا سسک رہا تھا اور اللہ داد بے ہوش تھا۔ رحیم داد خاموش کھڑا زور زور سے ہانپتا رہا، تینوں کو جلتی بجھتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

مگر اب وہاں ٹھہرنا خطرناک تھا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ اٹھالیا۔ بیگماں کی لاش کے پاس گیا۔ جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو اہل پڑے۔ وہ ہاتھ سے آنسو پونچھتا ہوا گھر سے باہر آیا۔

رحیم داد تیزی سے ایک طرف بڑھا مگر اس سمت سے آہٹ سنائی دی۔ اس نے راستہ بدل

دیا۔ اندھیرے میں اسے دارا کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”ٹھہر جا۔ میری گل سن لے۔“

مگر رحیم داد نہیں ٹھہرا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا جھنگر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا کہ اسے اپنی پشت پر چاپ سنائی دی۔ کوئی اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر راستہ بدلا، کھیتوں کی جانب بدھا اور ان میں گھس کر ایک پگڈنڈی پر دوڑنے لگا۔

ڈھولا امیر خاں کی حدود سے نکل کر باہر آیا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ لیکن وہ رکا نہیں، آگے اور آگے بڑھتا گیا۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے نیم پختہ سڑک پر چل رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی اور رات کے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کدھر جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے؟ نہ اس کی کوئی منزل تھی، نہ ٹھکانہ۔

کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء

کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء
کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء
کراچی، ستمبر ۱۹۷۸ء

شوکت صدیقی

جائنگلوں



دیپال پور روڈ پر نیلی بارٹرانسپورٹ کی ایک لاری شور مچاتی پاک پتن کی سمت جا رہی تھی۔ رحیم داد لاری کو دور تک دیکھتا رہا۔ آخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے سڑک عبور کی، نشیب میں اترا اور آگے بڑھنے لگا۔

شام کا دھند لکا پھیلنے لگا۔ رحیم داد کہیں ٹھہرے بغیر چلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ وہ حویلی روڈ سے گزر کر دیپال پور تحصیل کی حدود میں داخل ہوا تو رات ہو چکی تھی۔ رحیم داد تھکن سے بے حال ہو رہا تھا۔ راستہ صاف ستھرا اور کشادہ تھا۔ پیاس لگتی تو پینے کو نہر کا پانی مل جاتا۔

ہر سمت اندھیرا چھایا تھا۔ اس کے پیر بو جھل ہو گئے تھے۔ اب اس میں زیادہ دور جانے کی سکت نہ تھی۔ وہ کہیں ٹھہر کر رات بسر کرنا چاہتا تھا۔ مگر کوئی مناسب اور محفوظ ٹھکانا نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہر کے کنارے کہیں کہیں کھجور کے درخت تھے، ٹیکر کی جھاڑیاں تھیں جن کی شاخیں پیلے پیلے پھولوں سے لدی جھوم رہی تھیں۔ گندم اور جو کی تیار فصلیں بھی کھڑی تھیں۔ جہاں فصلیں کٹ چکی تھیں وہاں اجاڑ کھیت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

رحیم داد ٹھکانے کی تلاش میں تھکے ہارے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ یکایک عقب میں ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا دوڑاتا اسی طرف آ رہا تھا۔ آواز رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ رحیم داد راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ قریب ہی کھیت تھے۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ گھڑسوار بالکل نزدیک آگیا۔ اس کا گھوڑا زور سے ہنسنایا، ٹھوکر کھائی اور راستے سے اتر کر رحیم داد کی جانب بڑھا۔

رحیم داد سرا سمہ ہو کر پیچھے ہٹا اور کھیت کی مینڈ سے ٹکرا کر گر پڑا۔ گرتے ہی اندھیرے میں گھوڑے کا سم کچھ اس طرح اس کے چہرے پر پڑا کہ سر چکرا گیا۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ سانس رک رک کر چلنے لگی۔

ذرا دیر بعد اس نے سنا، کوئی اس پر جھکا ہوا معذرت کے انداز میں کہہ رہا ہے۔ ”معاف کرنا بی! گھوڑی ذرا چمک گئی تھی۔ میں نے بہت روکا پر کابو سے نکل گئی۔ رستے سے اتر کر ادھر آگئی۔“ اس نے سارا دے کر رحیم داد کو اٹھایا۔ رحیم داد کراہتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

گھڑسوار نے نرمی سے پوچھا۔ ”کیسے چوٹ تو نہیں آئی؟“ رحیم داد سے تکلیف کے مارے بولا نہ گیا۔ اس نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو ہاتھ خون سے تر ہو گیا۔ رحیم داد نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ اپنا خون آلود ہاتھ سامنے کر دیا۔ دھندلی روشنی میں اس نے خون سے بھرا ہاتھ دیکھا۔ رحیم داد کے چہرے کا زخم دیکھا، پریشان ہو کر بولا۔

”لگتا ہے تیرے تو بہت چوٹ آئی ہے۔“ چوٹ واقعی سخت آئی تھی۔ گھوڑے کی پوری ٹاپ رحیم داد کے چہرے پر بیٹھ گئی تھی اور لوہے کی نئی نعل رخسار کی جلد کا نئی چار انچ تک چلی گئی تھی۔ رحیم داد نے خون بند کرنے کے لیے زخم پر بایاں ہاتھ رکھ لیا تھا۔ وہ نہیں برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھڑسوار لمبا چوڑا جوان تھا۔ سفید قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ تھی۔ وضع قطع سے بڑا زیں دار لگتا تھا۔ اس نے جھٹ اپنی پگ اتاری۔ شملہ جھر سے پھاڑا اور پھٹا ہوا ٹکڑا لے کر تیزی سے نہر کی جانب گیا۔ اسے پانی سے تر کیا۔ واپس آیا۔ رحیم داد کا ہاتھ ہٹایا۔ گیلیے کپڑے کے ایک کونے سے خون صاف کیا، پھر کپڑا تہہ کیا، گلدی بٹائی اور زخم پر رکھ دی۔ اس نے پگ کا ایک حصہ اور پھاڑا اور اسے سر سے ٹھوڑی تک چہرے کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر گرہ لگا دی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رک رک کر کراہتا رہا۔ زخم پر پانی باندھ کر اس شخص نے پوچھا۔ ”تیرا ناں کیسہ ہے؟“

رحیم داد نے بولنے کے لیے منہ کھولا اور صرف ”چوہدری“ کہہ سکا۔

وہ شخص بولا۔ ”چوہدری! میرا نام اللہ وسایا ہے۔ ادھر کو ٹہہ ہر کشن میں اپنی زمین داری ہے۔“ اس نے رحیم داد کی پیٹھ تھپک کر دل جوئی کی۔ ”چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں درد کم ہو جائے گا۔“ وہ رحیم داد کے قریب ہی زمین پر بیٹھا تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر اس کی مشکی

گھوڑی کھڑی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اللہ وسایا نے کہا۔ ”تیری طبیعت سنبھل گئی ہو تو میرے ساتھ گھوڑی پر بیٹھ جا۔ کو ٹہہ ہر کشن یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ وہاں پہنچ کر ٹھیک سے مرہم پٹی ہو جائے گی اور تو آرام سے لیٹ جائے گا۔“

اللہ وسایا نے سارا دیا، رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کا بستہ مضبوطی سے ہاتھ میں دبایا۔ اللہ وسایا گھوڑی کے پاس گیا۔ اس کی راس پکڑ کر نہر کے کنارے لے گیا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ اس کے قریب چلا گیا۔ اللہ وسایا گھوڑی پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر سارا دیا اور وہ بھی اللہ وسایا کے پیچھے گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اللہ وسایا کی کمر تھامی اور جم کر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا نے گھوڑی کو ایڑھ لگائی اور آہستہ آہستہ دوڑانے لگا۔ نصف گھنٹے سے بھی کم عرصے میں دونوں کو ٹہہ ہر کشن پہنچ گئے۔ اللہ وسایا نے حویلی کے سامنے پہنچ کر گھوڑی ٹھہرائی۔ نیچے اترا۔ اس کے نوکر چاکر قریب پہنچ چکے تھے۔ اللہ وسایا کی ہدایت پر انھوں نے سارا دے کر رحیم داد کو گھوڑی کی پشت سے نیچے اتارا۔ گھوڑی کی لگام ایک ملازم نے تھام لی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! میرے ساتھ آ۔“

رحیم داد خاموشی سے اللہ وسایا کے ہم راہ حویلی کے مسمان خانے میں چلا گیا۔ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ کشادہ اور ہوا دار تھا۔ طاق میں لیپ روشن تھا۔ ایک طرف خوب چوڑا چمکا پلنگ تھا۔ اس پر اجلا بستر لگا تھا۔

اللہ وسایا نے بستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری! اب تو منجی پر آرام کر۔ میں تھوڑی دیر میں واپس آجاؤں گا۔“ وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ نوکرانی کانسے کے بڑے سے گلاس میں دودھ لے کر آئی۔ رحیم داد نیکیے کے سارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے گلاس نوکرانی سے لے لیا اور دونوں ہاتھوں سے تھام کر دھیرے دھیرے دودھ کے گھونٹ حلق سے نیچے اتارنے لگا۔ دودھ گاڑھا اور نیم گرم تھا۔

رحیم داد دودھ پیتا رہا۔ نوکرانی نے کمرے کی دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ کمرے کی پشت پر باغیچہ تھا۔ اس میں لیموں کی درخت بھی تھے اور کھڑکیوں کے قریب ہی تھے۔ لیموں کے درختوں میں پھول آگئے تھے۔ ان کی مکھ ہلکے ہلکے جھونکوں میں رچی ہوئی کمرے کے اندر آرہی تھی۔ دودھ پی کر رحیم داد نے گلاس نوکرانی کو دے دیا۔ وہ اسے لے کر خاموشی سے چلی گئی۔

وہ روٹھنے کے انداز میں جانے کے لیے مڑا۔

اللہ وسایا نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”بابے! کدھر چلا۔ میری گل تو سن۔“

بوڑھا منہ بگاڑ کر بولا۔ ”جب کام نہ بنے تو مجھے بلا لیتا۔ ابھی تجھے میری ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے مڑ کر اللہ وسایا کی طرف نہیں دیکھا۔ کمرے سے نکل گیا۔ جیلہ نے بوڑھے کی بات پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی چھوٹی سی میز گھٹ کر بلیک کے قریب کی اور اس پر اپنا فرسٹ ایڈ بکس رکھ دیا۔

اللہ وسایا نے اظہارِ تاسف کیا۔ ”جی لے! تو نے بابے کو نراض کر دیا۔“ جیلہ خاموش رہی۔ اللہ وسایا بتانے لگا۔ ”میں نے اپنی پگ پھاڑ کر چوٹ پر پلیٹ دی تھی تاکہ خون بند ہو جائے۔ زخم گہرا آیا ہے۔ بہت خون نکل رہا تھا۔ بابا تو چلا گیا! اب تو ٹھیک سے چوہدری کی مہم پٹی کر دے۔“ جیلہ بدستور خاموش تھی۔ اس نے رحیم داد کی پٹی آہستہ آہستہ کھولی۔ ”پٹی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ جیلہ نے اسے میز پر ڈال دیا۔ جھک کر دیکھا۔ زخم آنکھ سے ڈیڑھ انچ نیچے ہلال کی شکل بناتا ہوا رخسار کے نشیب میں پھیلتا چلا گیا تھا۔ خون ابھی تک رس رہا تھا۔ اللہ وسایا نے لپک لپک روشنی میں رحیم داد کا زخم غور سے دیکھا۔ پریشان ہو کر بولا۔ ”لگتا ہے گھوڑی کا کھرا سیدھا گال پر لگا۔ خیریت گزری کہ آنکھ بچ گئی۔“ رحیم داد آنکھیں کھولے چپ پڑا رہا۔

جیلہ نے اس کے رخسار پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔ اس کے نرم نرم ہاتھ کے لمس سے رحیم داد کو بڑا سکون ملا۔ جیلہ نے رخسار کی ہڈی ہولے سے دبا کر پوچھا۔

”چوہدری! ہڈی میں درد تو نہیں ہوتا؟“

رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی، مدھم لہجے میں بولا۔ ”تھوڑا تھوڑا ہوتا ہے۔“

جیلہ کے چہرے سے پریشانی کا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”لگتا ہے، ہڈی میں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ مجھے اسی کا ڈر تھا۔ گھوڑی کے کھڑے سے صرف کھال کٹی ہے۔“ اس نے بکس کھول کے روٹی کا گالا نکالا، اسپرٹ سے اسے تر کیا اور دھیرے دھیرے زخم صاف کرنے لگی۔ زخم پر اسپرٹ لگی تو رحیم داد تکلیف سے بلبلایا۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنے دانت سختی سے بھینچ لیے۔ جیلہ نے اس کی تکلیف محسوس کی۔ تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری! حوصلے سے کام لے۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔“ وہ اسپرٹ میں بھیگا ہوا گالا زخم پر ہولے ہولے رگڑتی رہی۔ رحیم داد بے چین ہو کر گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ جیلہ نے اپنا نرم و گداز ہاتھ اس کی پیشانی پر رکھ دیا۔

دودھ پینے کے بعد رحیم داد کو خاصا سکون مل گیا تھا۔ نقاہت بھی کم ہو گئی تھی۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر چٹ لیٹ گیا اور خاموشی سے چھت تکتے لگا۔ چند منٹ بعد اللہ وسایا واپس آگیا۔ اس کے ہم راہ ایک بوڑھا بھی آیا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ سر پر گڈڑی تھی۔ لباس بوسیدہ اور ملگجھا تھا۔ دونوں آہستہ آہستہ رحیم داد کے نزدیک آئے۔ بوڑھے کے جسم سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ اس نے جھک کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”بکھار تو نہیں لگتا۔ چوٹ زیادہ گہری نہیں آئی۔“

اسی وقت ایک سروقامت نوجوان عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ تازہ پھول کے مانند نرم اور گلابی تھا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پچھلی رات کے ستارے جھلکاتے تھے۔ نقش و نگار بھی سبک اور تھکے تھے۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کا ریشمی کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی آسمانی تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لکڑی کا چھوٹا سا بکس لٹک رہا تھا، جس پر صلیب احمر کا بڑا نشان بنا تھا۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو مبہوت ہو کر رہ گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ کمرے میں رنگ و بو کا سیلاب اند آیا ہے۔ رحیم داد کی سانس لمحے بھر کو ٹھہر گئی، آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر عورت کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ جیلہ ہے، میرے گھر والی۔“ جیلہ کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے دوپٹے کا آئچل سر پر ڈال لیا۔

بوڑھے نے رحیم داد کی پیشانی سے ہاتھ ہٹا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ ”فکر کی کوئی گل نہیں۔ پا تھی کی گرم گرم راکھ چوٹ پر باندھ دے۔ دو تین دن میں چنگا ہو جائے گا۔ ویسے نیم کے پتے پھل کر باندھنے سے بھی آرام آجائے گا۔“

جیلہ بڑھ کر دونوں کے قریب پہنچ گئی۔ اس نے مسکرا کر بوڑھے کو دیکھا، بے نیازی سے بولی۔ ”بابے! تو اپنا کچا علاج رہنے دے۔ میں نے پہلے گھاؤ دیکھنا ہے۔ اسے دیکھے بنا کیسے علاج ہو سکتا ہے۔“

اللہ وسایا نے نظر بھر کر بیوی کو دیکھا، ہنس کر بولا۔ ”جی لے! تیں نوں پتہ ہے، اپنا بابا بھی بہت سیانا اور تجربہ کار ہے۔“ اس نے بوڑھے کی دل جوئی کی۔ ”دور دور سے بیمار اور روگی اس کے پاس علاج کرائے آتے ہیں، چنگے ہو کر جاتے ہیں۔“

”تیری گھر والی ڈاکٹرنی بن گئی ہے۔ اسے ہی علاج کرنے دے۔“ بوڑھے کے لہجے میں تلخی تھی۔

مرا، آہستہ سے بولا۔ ”میرا نام احمد ہے جی۔ میں رات کو بیس رہوں گا۔ باہر میری منجی پڑی ہے۔ کوئی کام ہو تو بلا لیتا۔ میں آجاؤں گا۔“ وہ دروازے کی جانب بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔



رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔ اس کے رخسار میں رک رک کر ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مگر اس میں پہلی سی شدت نہیں تھی۔ البتہ اس کا جسم جگہ جگہ سے دکھ رہا تھا۔ کمر اور پنڈلیوں میں سخت اینٹھن تھی۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر بے چین رہا، نیند نہیں آئی۔ اسے اپنی تکلیف کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اسے بہت بھلا مانس لگا۔ کوئی اور بڑا زمین دار ہوتا تو اسے روندتا ہوا گزر جاتا، پلٹ کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر اللہ وسایا نے نہ صرف پگ پھاڑ کر اس کے زخم پر پٹی باندھی بلکہ علاج معالجے کے لیے اپنی حویلی میں بھی لے آیا۔ اس کی بیوی رحیم داد کو اور بھی زیادہ بھلی معلوم ہوئی۔ وہ جس قدر خوب صورت اور دل ربا تھی، اتنی ہی زیادہ نیک دل اور ہمدرد تھی۔ اس نے رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو اسے ایسا لگا جیسے زخم سے اٹھتی ہوئی ٹیس گھٹ کر آدھی رہ گئی ہو۔ اس کے لمس کی لذت رحیم داد اب تک محسوس کر رہا تھا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ رحیم داد نے ایک بار اٹھ کر پانی بھی پیا۔ پچھلے پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔

سورج طلوع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد اللہ وسایا کمرے میں آیا۔ جیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ مگر اس کا جسم تیز بخار سے بس رہا تھا۔ اس کے زخمی رخسار پر سو جن تھی اور اس قدر زیادہ تھی کہ ایک آنکھ پوری طرح نہیں کھلتی تھی۔ جیلہ نے قریب جا کر اس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس کے تروتازہ اور دکتے چہرے پر پریشانی چھا گئی۔ اس نے جھک کر رحیم داد کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ گھبرا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ ”اے تو تیز بخار ہے۔“ اس نے رحیم داد کا جسم کھس ڈال کر سینے تک ڈھک دیا۔

اللہ وسایا نے پوچھا۔ ”طبیعت کچھ زیادہ گڑبڑ ہے؟“ اس نے رحیم داد کا سوجا ہوا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”منہ پر درم بھی آگیا ہے۔“

”ہاں۔“ جیلہ بولی۔ ”پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو بلوالے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”ڈاکٹر کے پاس اسے لے جانے میں بہت تکلیف ہوگی۔“

ان کے جانے کے بعد رحیم داد کراہتا ہوا اٹھا اور پیشاب کرنے کمرے سے باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ اسے لیٹے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ احمد دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر آیا مگر رحیم داد سے دودھ نہ پیا گیا۔ اس نے بے دلی کے

رحیم داد نے اپنے چہرے پر جھکی ہوئی جیلہ کو دیکھا۔ وہ اس قدر قریب تھی کہ رحیم داد اس کے دل کش خدو خال کا ایک، ایک خم اور ایک، ایک زاویہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ حسین اور طرح دار عورت تھی۔ اسے نزدیک اور مہربان پا کر رحیم داد کو بڑی فرحت محسوس ہوئی۔ بار بار اٹھتی ہوئی ٹیس کا احساس بھی کم ہو گیا۔

جیلہ نے بکس سے ایک شیشی نکالی۔ اس میں مرکبور کروم بھرا تھا۔ جیلہ نے اسے روٹی پر ڈالا اور روٹی آہستہ سے زخم پر رکھ دی۔ پھر اس پر احتیاط سے پٹی باندھ دی۔ مرکبور کروم لگانے کے بعد جیلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”چوہدری! میں نے تیرے گھاؤ پر لال دوائی لگا دی ہے۔“ اس نے ہولے سے اس کا سر تھپکا۔ ”چنانچہ کر۔ جلد آرام آجائے گا۔“ رحیم داد چپ پڑا جیلہ کا مسکراتا ہوا انگشت چہرہ تکتا رہا۔

اللہ وسایا نے دبی زبان سے اندیشہ ظاہر کیا۔ ”جی لے! گڑبڑ کی تو کوئی گل نہیں؟ تیری مرضی ہو تو سویرے پاک پتن سے ڈاکٹر بلوالوں یا چوہدری کو اس کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ ٹھیک طرح دوا دارو کر دے گا۔“

”ویسے تو چننا کرنے کی کوئی گل نہیں لگتی۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں۔ ہڈی پر بھی چوٹ نہیں آئی۔ فوری طور پر جو علاج ہو سکتا تھا، وہ میں نے کر دیا۔ رات آرام سے گزرے گی۔ صبح تک دیکھتے ہیں، طبیعت گڑبڑ ہوئی تو ڈاکٹر کو بلوالیتا یا سرکاری اسپتال لے جاتا۔“

جیلہ نے بکس بند کیا، ہینڈل تمام کر اسے ہاتھ میں لٹکایا اور باہر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اللہ وسایا نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ آہستہ سے بولا۔ ”گیارہ بجتے والے ہیں۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد پر نظر ڈالی، اس کا بازو تھپ تھپایا۔

”چوہدری! تو اب آرام سے سوجا۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔ صبح تک چنگا ہو جائے گا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”تو نکلا جو ان ہے۔ ایسی چوٹیں تو روز آتی رہتی ہیں۔“ رحیم داد نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

اللہ وسایا اپنی بیوی کے ہم راہ کمرے سے چلا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد ایک نوکر اندر آیا۔ اور میز پر پڑی ہوئی پٹی اور روٹی کے خون آلود ٹکڑے اٹھا کر لے گیا۔ کمرے میں خاموشی ہو گئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ چاپ سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا کہ نوکر کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔

وہ آگے بڑھا اور میز پر جگ اور گلاس رکھ دیا۔ اس نے لیپ کی لودھم کی۔ رحیم داد کی جانب

ساتھ نصف سے بھی زیادہ دودھ چھوڑ دیا۔ گلاس میز پر رکھ دیا۔ وہ بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔

دوپہر کو ڈاکٹر آیا۔ اس کے ساتھ صرف جیلہ تھی۔ اللہ وسایا نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے رحیم داد کے رخسار ہوئے ہوئے ایک انگلی سے دبائے۔ جیلہ اسے بتانے لگی۔ ”ڈاکٹر! میں نے فرسٹ ایڈ کے طور پر گھاؤ اسپرٹ سے صاف کر کے لال دوائی لگا دی تھی۔ رات بہت بیت چکی تھی۔ اس سے میں اور کمر بھی کیا سکتی تھی۔“

”یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ”سپینک ہونے کا ڈر نہیں رہا۔ ویسے زخم خاصا گہرا آیا ہے۔“

”وہ ہوا یہ جی کہ اندھیرے میں اللہ وسایا کی گھوڑی چمک گئی۔ چوہدری ایک دم سانسے اٹھیا۔ گھوڑی کا کھرا اس کے منہ پر پڑا۔ گھاؤ تو فیر آتا ہی تھا پر آنکھ بچ گئی۔ بالکل آنکھ کے نیچے چوٹ آئی ہے۔“

ڈاکٹر اس کی باتیں سنتا رہا اور خاموشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر انگلیوں سے اس کی نبض دیکھتا رہا۔ رحیم داد چپ چاپ لیٹا سانسے کی دیوار تنکٹا رہا۔ نبض دیکھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنا چرمی بیگ کھولا، سرنگ نکالی۔ اس میں دوا بھری اور رحیم داد کے بازو میں انسپیکشن لگا دیا۔ اس نے پٹی کھولی۔ اسپرٹ سے بیگی ہوئی روئی سے از سر نو زخم صاف کیا۔ رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ جب زخم اچھی طرح صاف ہو گیا تو ڈاکٹر نے اس پر مرہم لگایا۔ روئی کا گالا رکھا اور اسے اسٹینک پلاسٹر کی پتلی پتلی پیٹوں سے اچھی طرح رخسار پر چپکا دیا۔

ڈاکٹر نے تسلی دینے کی غرض سے آہستہ آہستہ رحیم داد کا بازو تھپکا۔ مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا، شام تک چہرے کی سوجن بھی ختم ہو جائے گی۔ تین چار روز میں طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔“ اس نے اپنا بیگ بند کیا۔ دروازے میں کھڑے ہوئے نوکر نے آگے بڑھ کر بیگ سنبھال لیا۔

ڈاکٹر کمرے سے چلا گیا۔ جیلہ بھی اس کے ہم راہ چلی گئی۔ رحیم داد انھیں نظرس اٹھائے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جیلہ اس وقت ہلکا گلابی لباس پہنے ہوئے تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین نظر آرہی تھی۔ اس کے بال سیاہ اور گھنے تھے۔ ہلکے ہلکے گھونگریا لے بھی تھے۔ چوٹی لمبی تھی اور کمر سے نیچے جھول رہی تھی۔ کمر پتلی تھی مگر کولھے قدرے بھاری تھے۔ وہ اپنے کولہوں کو آہستہ آہستہ خم دیتی ڈاکٹر کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

رحیم داد تنکٹی باندھے جیلہ کو دیکھتا رہا اور اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مسمان خانے کا آنگن عبور کر کے بیرونی دروازے سے باہر نہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ روشنی دھندلی پڑ گئی ہے، ہوا ٹھہر گئی ہے۔ کمرے میں جس اتنا بڑھ گیا کہ اس کا دم گھٹنے لگا۔ اس نے گہری سانس بھری اور چھت تنکٹے لگا۔

رات کو جیلہ پھر رحیم داد کے پاس آئی۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کمرے میں پڑی ہوئی بید کی کرسیاں کھسکا کر رحیم داد کے بستر کے قریب بیٹھ گئے۔ رحیم داد کو اب خاصا افاقہ تھا۔ رخسار کا ورم کم ہو گیا تھا، بخار بھی اتر گیا تھا۔

اللہ وسایا نے ہاتھ بڑھایا۔ رحیم داد کا ہاتھ چھو کر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری! اب تو تجھے بخار نہیں ہے۔“

رحیم داد نے نحیف آواز میں اس کی تائید کی۔ ”لگتا تو ایسا ہی ہے۔ چوٹ میں تکلیف بھی پہلے سے کم ہے۔“

”اب تو تیری طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ بول بھی سکتا ہے۔“ اللہ وسایا نے پوچھا۔ ”یہ بتا تیرا پنڈ کدھر ہے؟ میں چاہتا ہوں، تیرے گھروالوں کو خبر بھیج دوں۔ تیرے گھر نہ پہنچنے پر وہ پریشان ہوں گے، تیرا انتظار کرتے ہوں گے۔ تجھے ڈھونڈتے ہوں گے۔ ان کو ضرور پتہ چلنا چاہئے کہ تو یہاں ہے۔“

رحیم داد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بتاتا بھی کیا۔ اب اس کا نہ گھریار تھا نہ ٹھکانا۔ کوئی اس کا نہیں تھا۔ بیوی بچے پرائے ہو چکے تھے۔ اکلوتی بہن اس کی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر دم توڑ چکی تھی۔ سارے رشتے، سارے بندھن ٹوٹ پھوٹ کر اس طرح کچھ چکے تھے کہ وہ لمبے کا ڈھیر رہ گیا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر دکھ کے سائے منزلانے لگے۔ آنکھیں گویا منجمد ہو گئی تھیں۔

اللہ وسایا نے اسے خاموش پایا تو اصرار کر کے دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

رحیم داد نے مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا اور ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ غم کے بوجھ سے دبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اپنا جی نہ کوئی گھر ہے نہ گھروالے ہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ جیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”کوئی تو تیرا۔“

”کیسے گھر بھی ہو گا۔“

”کبھی گھر تھا، گھروالے بھی تھے۔“ رحیم داد دل گرفتہ ہو گیا۔

رحیم داد کچھ دیر خاموش لیٹا رہا پھر اٹھا۔ میز پر رکھے ہوئے جگ سے اس نے گلاس میں پانی اڈیل کر پیا۔ دروازے سے جھانکا۔ احمد اس وقت موجود نہیں تھا۔ اس کی چارپائی خالی تھی۔ رحیم داد پلنگ سے نیچے اترتا۔ لمپ کی لودھی کی اور ستر پر آکر لیٹ گیا۔



سویرے سویرے اللہ وسایا آیا مگر جیلہ اس کے ساتھ نہیں تھی۔ رحیم داد کی طبیعت اب خاصی سنبھل گئی تھی۔ چہرے پر سو جن بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ کمزور ہو گیا تھا۔ رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اللہ وسایا اسے اپنے ہم راہ مہمان خانے سے باہر لے گیا۔ سورج شیشم کے درختوں کے پیچھے سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ سنہری دھوپ گاؤں کے مکانوں کی منڈیروں پر جھللا رہی تھی۔ کوئلہ ہر کشن اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ گھروں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

دونوں بستی کی جانب نہیں گئے، کھیتوں کی طرف نکل گئے۔ فصلوں کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں کیس کیس کئی ہوئی فصل کے تڑے دور سے دکھائی دے رہے تھے۔ کیس خریف کی کاشت کے لیے تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ کیس واہن کھیت تھے، جن میں ہل چلا یا جلیجکا تھا۔ مگر نہ ساگا پھرا تھا نہ فصل کی بوائی کے لیے زمین تیار ہوئی تھی۔ رحیم داد کو اپنا گاؤں، احمد کوٹ یاد آ گیا۔ اور اس کی یاد کے ساتھ ساتھ اپنے کھیت کھلیان یاد آ گئے۔ وہ اللہ وسایا کے ہم راہ چلتا رہا۔ دونوں خاموش تھے۔ صبح کی ہوا کے نرم نرم جھونکے خوش گوار تھے۔ ان میں تازگی اور فرحت تھی۔

چلتے چلتے اللہ وسایا نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! جب تک تیری طبیعت پوری طرح ٹھیک ٹھاک نہ ہو جائے، میں رہ۔ ویسے اپنا گھر سمجھ کر جب تک جی چاہئے، ٹھہرا رہ۔ مہمان گھر میں ہو تو ذرا ہمارا رہتی ہے۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”تیری مہربانی ہے۔“ رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ ”پر میں اس طرح کب تک یہاں رہ سکتا ہوں؟“

”چلا جانا، چلا جانا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو تیری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔“ دونوں حویلی کے سامنے کے وسیع میدان سے گزر رہے تھے۔ قریب ہی ایک نیم پختہ عمارت تھی۔ اس کی دیواریں اینٹوں سے جنی ہوئی تھیں۔ البتہ پختہ چھت کے بجائے چھپر بڑا تھا۔ اندر سے بچوں کی ہلکی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”گلتا ہے، یہ تو سکول ہے؟“

اللہ وسایا نے تائید میں گردن ہلائی۔ ”ہاں جی! سکول ہی ہے۔“

جیلہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”سب کہاں گئے؟ کیا ہو گیا؟“

رحیم داد رک، رک کر بولنے لگا۔ ”میں جی گور داس پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں مشرکی پنجاب کے مسلمانوں پر جو جیتی، وہ تو تین نو پتہ ہی ہو گا۔ ادھر اپنی زمینداری تھی۔ رہنے کو ماڑی تھی۔ گھروالی تھی، چار بچے تھے۔ بیٹی سب سے وڈی تھی۔ اسے بلوائی اٹھا کر لے گئے۔ اس سے چھوٹا پتر تھا۔ وہ میرے سامنے مارا گیا۔ میں بلوائیوں سے بچ بچا کر کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ گیا۔“ اس نے چوہدری نور الہی کی الم ناک داستان اپنی بنا کر سنائی دی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔ اس کا پیار چہرہ اور مرجھا گیا۔ اللہ وسایا اور جیلہ کے چروں پر بھی غم کا ہلکا ہلکا غبار بکھرتا جا رہا تھا۔ جیلہ کچھ زیادہ ہی متاثر نظر آتی تھی۔ اس نے رحیم داد کا سوگوار چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔ ”چوہدری! تو بہت زراش اور دکھی لگتا ہے۔ تو نے بہت کٹھنایاں جھیلی ہیں۔“ اس کے لمبے میں دبا دبا کر ب تھا۔

”یہ تو بتا، تیری گھروالی اور دو بچوں کا کیا بنا؟“

”بعد میں پتہ چلا، گھروالی دونوں بچوں کے ساتھ پاکستان آ گئی تھی۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ لہجہ اور دل دوز ہو گیا۔ ”وہ کہاں ہے، کس کے پاس ہے؟ بچوں کا کیا بنا؟ یہ اب تک پتہ نہیں چلا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”۸ سال سے انھیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ ادھر بھی انھیں ڈھونڈنے ہی آیا تھا۔ اندھیرے میں گھوڑی سامنے آ گئی۔“ اس کے لمبے میں سکیوں کی سرسراہٹ تھی۔ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد وہ تڑپ کر بولا۔ ”مر جاتا تو ٹھیک تھا۔“ رحیم داد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جیلہ کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ سر جھکا کر رونے لگی۔ اس کا چہرہ بجھ گیا۔ اللہ وسایا نے اسے روتے دیکھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس کا سر آہستہ آہستہ تھپکا، دل جوئی کی۔ ”لے، تو بھی رونے بیٹھ گئی۔“ وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ کسی کو دکھی دیکھتی ہے تو اس کی آنکھوں میں ایسے ہی آنسو آ جاتے ہیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ویسے جی فسادات میں بہت ظلم ہوا۔“ اس نے رحیم داد کو تسلی دی۔

”چوہدری! رہنے چاہا، تیری گھروالی اور بچے ایک نہ ایک دن تجھے ضرور مل جائیں گے۔“ انہیں بچوں کی خاموش رہا۔ اللہ وسایا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیلہ کا بازو تھاما۔ ”چل چوہدری کو نیچے جھول رہی۔ بہت رات ہو گئی۔“ جیلہ نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے اور خاموشی سے دیتی ڈاکٹر کے ساتھ۔ اس آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر آنگن میں پہنچ گئے۔

”سرکاری سکول ہوگا؟“

”نہیں۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”سرکاری سکول تو یہاں سے دس میل ادھر تازی والا میں ہے۔ یہ سکول تو جمیلہ نے کھولا ہے۔ خود بھی پڑھاتی ہے۔ دو ماستر بھی رکھ لیے ہیں۔ اب تو سکول کو چلتے لگ بھگ تین سال ہو گئے۔“

”تیری گھروالی پڑھی لکھی بھی ہے؟“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بہت پڑھی لکھی ہے جی۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”لہور میں پڑھتی تھی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”جب اس کے ساتھ میرا ویاہ ہوا تو میں بالکل ان پڑھ تھا۔ اس نے سب سے پہلے تو مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا۔ ویسے وہ تھوڑی بہت ڈاکٹری بھی کر لیتی ہے۔ تو نے تو دیکھا ہی ہے۔“

”ہاں جی، بالکل دیکھا ہے۔ اس رات وہ میری مرہم پٹی نہ کرتی تو زخم سڑ جاتا۔ پتہ نہیں کیا ہوتا۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کی تائید کی۔ ”میں تو اسے ڈاکٹری ہی سمجھا تھا۔ وہ سب کچھ ڈاکٹروں ہی کی طرح کر رہی تھی۔“

”اب تو اس پر پنڈ میں ہنسنے کی دھن سوار ہے۔ پر کوئی ہوشیار ڈاکٹری نہیں ملتا۔ چھوٹا موٹا علاج تو وہ خود کر لیتی ہے۔ وہ حویلی میں ٹھہرتی ہی کب ہے۔ سکول سے بچوں کو پڑھا کر نکلتی ہے تو مزارعوں کے گھروں میں گھس جاتی ہے۔ کیوں کے پاس بھی بے دھڑک چلی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ گھل مل کر گپ شپ کرتی ہے۔ منع کرتا ہوں تب بھی نہیں مانتی۔“

”ویسے تو جی یہ بری عادت نہیں۔ پر تیرے جیسے وڈے زمین داروں کی گھر والیاں اور زنانیاں ایسا کرتی نہیں۔ وہ تو حویلیوں اور ماڑیوں سے باہر ہی نہیں نکلتیں۔ ایسا کریں تو ان کے کھم ہلاک کا کاغذ ہاتھ میں تھمادیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ زمین داروں میں یہی ہوتا ہے۔ تبھی تو آس پاس کے وڈے زمین دار جمیلہ سے نراض ہیں۔ کہتے ہیں، اس نے زمین داروں کی ساری لشک پشک اور عزت خاک میں ملا دی۔ ان کی پگ کے اونچے طرے نیچے کر دیے۔“ اللہ وسایا کا لہجہ بو جھل ہو گیا۔ ”کیا بتاؤں جی! سبھی مجھ سے خار کھاتے ہیں۔“

”وہ بھی ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ زمین دار میں اکثر اور آن بان نہ ہو تو کام کیسے چلے۔“ رحیم داد نے زمینداروں کی نفسیات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ”مزارعے فصل سے کچھ بھی نہ دیں۔ اپنی راکھی کے ساتھ زمین دار کا حصہ بھی دبائیں۔ ویسے تیں نوں ایسہ پتہ ہی ہو گا کہ فصل کی واڈھی ہوتے ہی مزارعے اس میں سے چوری شروع کر دیتے ہیں۔ زمین دار اور اس کے کرمندے کڑی نظر

نہ رکھیں اور چوری چکاری کرنے والے مزارعوں کو الٹا لٹکا کر پٹائی نہ کریں تو ساری فصل واڈھی سے پہلے ہی پہلے غائب ہو جائے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”پر اپنی زمین داری میں ایسا نہیں ہوتا۔“ اللہ وسایا نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر نہ فصلوں کی چوری ہوتی ہے، نہ پٹائی کی۔ نہ پٹائی دینے میں مزارعے رولا کرتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”جب پاکستان بنا تو شروع شروع میں میری زمین داری میں بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ تو جی عجب زمانہ تھا۔ مزارعے تو ان دنوں زمین دبا کر بیٹھ گئے تھے۔ پٹائی دینے سے صاف انکار کرتے تھے۔ انھوں نے ہنگڑا سے اور ڈانگیں اٹھا کر حویلی پر ہلا بولنے کی بھی کوشش کی تھی۔“

”پولیس کو خبر نہیں کی؟ پرچہ چاک کرایا ہوتا۔ پولیس سب کو الٹا لٹکا دیتی۔ حوالات میں بند کر کے چڑی ادھیڑ دیتی۔ سب بالکل ٹھیک ہو جاتے۔ پولیس کو ساتھ ملائے بنا تو زمینداری چل ہی نہیں سکتی۔“

”پر مجھے پولیس تھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جمیلہ نے سب ٹھیک کر لیا۔“ اللہ وسایا بے تکلفی سے کھکھلا کر ہنسا۔ ”سچ پوچھ چوہدری، زمین داری تو وہی چلاتی ہے۔ نہ اس نے فٹنی رکھا، نہ کاردار، نہ مینجر۔ خود ہی ساری لکھا پڑھی کرتی ہے۔ فصل کی پٹائی بھی اپنے سامنے کراتی ہے۔ پٹائی کے لیے وندڑے بھی نہیں ملاتی۔ مزارعوں ہی سے وندڑائی کراتی ہے۔ پٹائی کے بعد کیوں کے لیے انگی کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دانے کھلوڑے پر چھوڑ دیتی ہے۔ تبھی تو پنڈ کے سارے مزارعے اور کمی اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ عزت اور محبت سے بھین جی کہتے ہیں۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”یہ لمی، لمی سفید داڑھی والے بھی اسے بھین جی کہتے ہیں۔ جمیلہ بھی ذرا برا نہیں مناتی۔ بلکہ بہت خوش ہوتی ہے۔“

اللہ وسایا اور رحیم داد باتیں کرتے ہوئے اسکول کے نزدیک پہنچ گئے۔ رحیم داد نے کھلے ہوئے دروازے سے دیکھا، باقاعدہ کلاس لگی ہے۔ لکڑی کی بینچوں پر بچے قطاروں میں بیٹھے ہیں۔ جمیلہ بیٹھ موڑے بلیک بورڈ پر چاک سے کچھ لکھ رہی تھی۔ دونوں اندر نہیں گئے۔ حویلی کی جانب واپس ہوئے۔

دھوپ اب ہر طرف پھیل گئی تھی۔ گرمی بھی بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد تھکا ہوا اور نڈھال نظر آرہا تھا۔ مگر دونوں مہمان خانے میں نہیں گئے۔ باغ میں چلے گئے۔ جامن کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دھوپ میں چلنے سے پسینہ آ گیا تھا۔ سائے میں بیٹھ کر پسینے پر ہوا کے جھونکے لگے تو

”کون ہے تو؟“

”میرا ناں ماکھا ہے جی۔“

”مزارع ہے یا حویلی کا نوکر ہے؟“

”میں توجی پرلے پنڈ، پیراں والدہ میں رہتا ہوں۔“ اس نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”میاں سے چارنچ میل ہوگا۔“

”میاں کس لیے آیا ہے؟“

”ایک کام تھا جی۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”تیری بہت مہربانی ہوگی۔ میں تیرے پیر پکڑتا ہوں۔“ اس نے پنڈلیاں چھوڑ کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ رحیم داد نے پریشان ہو کر جھٹ اپنی ٹانگیں سمیٹ لیں۔

”کیا کام ہے تیرا؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

”میرا بازو واپس دلوا دے۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔

”میں کیسے واپس دلوا سکتا ہوں۔“ رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”تیری گھروالی کس کے پاس ہے؟“

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”وہ جی بہت دڈا زمیں دار ہے۔ اسے شاہ جی کہتے ہیں۔ اس نے میری گھروالی کو اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ پنج سال سے اوپر ہو گئے۔ سال بھر کا اس سے ایک نکا بھی تھا۔ ماں کے لیے بلکتا ہوا مر گیا۔ زمیں دار سے بہت منت کی۔ پیروں پر پگڑی رکھ دی پر وہ میری ایک نہیں سنتا۔ توں اپنے زمیں دار سے شاہ جی کے نام چھٹی لکھوا دے۔ اس کی گل وہ ضرور مان لے گا۔“ ماکھا ہاتھ جوڑ کر بے بسی سے گویا ہوا۔ ”تین بچے ہو چکے ہیں اس کے۔ اب تو شاہ جی کے کام کی بھی نہیں رہی۔“

”اور تیرے کام کی کب رہ گئی۔“ رحیم داد نے تھکے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”کیوں نہیں رہی جی۔“ اس نے بے جھجک کہا۔ ”وہ میرا بازو ہے۔ تجھے کیا پتہ؟ اس کے جانے کے بعد میں تباہ ہو گیا۔ گھر میں بوڑھی ماں ہے۔ اسے بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ تو ذرا یہ تو سوچ۔ سویرے ڈھور ڈنگروں کا چھٹا دھاکون کرے؟ روٹی پکا کر دوپہر کو کھیت میں مجھے بھٹا کون پہنچائے؟ چائی میں دودھ بلو کر کھن کون نکالے؟“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”وہ کپڑے لتے دھوتی تھی، صفائی اور جھاڑ پونچھ کرتی تھی۔ فیریہ بھی تو ہے جی، خریف کی فصل پر پھٹی چنتی۔ چوگی میں جو روٹی ملتی، اس کا چرنے پر سوت کا تھی۔ چولھا جلانے کے لیے جھنگر سے نکڑیاں اور کما کی کھوری چن

تازگی اور فرحت محسوس ہوئی۔

رحیم داد نے شیشم کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تیرے پنڈ میں ٹاہلی کے پیڑ کچھ زیادہ ہی ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟“

”جیلہ نے خاص طور پر ٹاہلی کے پیڑ لگوائے ہیں۔ کتنی ہے جب سکول وڈا ہو جائے گا اور ڈپنٹری بھی بن جائے گی تو ان میں ٹاہلی کا فرنیچر بنا کر لگواؤں گی۔“

”اور حویلی کے لیے فرنیچر نہیں بنے گا؟ ٹاہلی کی لکڑی تو بہت مہنگی ہوتی ہے۔“

اللہ وسایا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”چوہدری! اس کی باتیں وہی جانے۔ میں نے یہی گل کسی تو بولی۔“ حویلی میں پہلے ہی بہت فرنیچر ہے۔ ہمیں اور زیادہ فرنیچر بنا کر کیا لیتا۔ چھوٹا سا تو اپنا میز ہے۔ ہم دونوں کے علاوہ صرف دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“

”تیرے ساتھ اور کوئی نہیں رہتا؟“

”نہیں جی، اپنا بس اتنا ہی میز ہے۔“

نوکروں نے ناشتے کا سامان میز پر رکھ دیا۔ ناشتے میں لسی تھی، ساگ تھا، تلا ہوا مرغ تھا، پرائٹھے تھے اور گرم گرم حلوہ تھا۔ رحیم داد نے مرغ اور پرائٹھے نہیں کھائے۔ اس نے پرائٹھے کا ایک لقمہ بنا کر منہ میں رکھا، چپایا تو زخم میں کسک ہونے لگی۔ اس نے لسی کے گھونٹ پی کر لقمہ حلق سے نیچے اتارا۔

اللہ وسایا نے رحیم داد کے چہرے پر کرب اور بے چینی دیکھ کر ٹوکا۔ ”چوہدری! تو پروں نہا نہ کھا، حلوہ کھا۔ یہ تیرے ہی لیے بنایا گیا ہے۔ میں ناشتے میں حلوہ نہیں کھاتا۔ عام طور پر شام کی چائے کے ساتھ حلوہ کھاتا ہوں۔“

ناشتے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری! میں نے کچھ ضروری کام کرنا ہے۔ اب میں چلوں گا۔ تو یہیں بیٹھا رہ۔ دل بیلے گا۔ دھوپ بڑھ جائے تو اندر چلا جاتا۔“



ہوا کے نرم اور ٹنک جھونکے چل رہے تھے۔ رحیم داد نے میز پر دونوں ٹانگیں پھیلا دیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذرا دیر بعد وہ خراٹے بھرنے لگا۔

اس کی آنکھ کھلی تو دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ گردن خستوں تلے بدستور ٹھنڈک تھی۔ ایک شخص گھاس پر اکڑوں بیٹھا ہولے ہولے رحیم داد کی پنڈلیاں دبا رہا تھا۔ وہ وضع قطع سے مزارع لگتا تھا۔ رحیم داد آنکھیں کھولے لمحے بھر تک حیرت سے اسے تکتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔

کبو تر بن گیا تھا، جو نہ اڑ سکتا تھا، نہ کہیں جاسکتا تھا۔ بیکار دن تھے اور بیکار راتیں۔ وقت زخمی چھپکلی کے مانند آہستہ آہستہ ریگ رہا تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ مہمان خانہ سنان تھا۔
دوپہر ہونے سے کچھ دیر پہلے جیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے کمرہ اچانک روشن ہو گیا، فضا میں رنگ نکھر گیا، خوشبو بس گئی۔ جیلہ گہرا ہنسی لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ گلابی چہرے پر شگفتگی اور رعنائی تھی۔ ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں نئے سٹے ہوئے کپڑے تھے اور دوسرے میں سرخ گلاب کا گلدستہ تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جیلہ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اب طبیعت کیسی ہے چوہدری؟“
”ٹھیک ہی ہے جی۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”میں تو سویرے ٹھٹھا ہوا سکول کی طرف بھی گیا تھا۔“

”تو نے سکول دیکھا؟“ جیلہ کا چہرہ اور شگفتہ ہو گیا۔ ”ابھی تو چھوٹا سا سکول ہے۔ میں اسے بہت دڑا بناؤں گی۔ اس میں آس پاس کی بستیوں کے بچوں اور بچیوں کو بھی پڑھانے کا انتظام ہو گا۔ بچوں کا الگ اور بچیوں کا الگ۔“ وہ زیر لب تبسم کے ساتھ بتاتی رہی۔ ”میں نے تو دو اعلاج کے لیے ڈپنری اور زنانیوں کے لیے زچہ گھر بنانے کی سکیم بھی تیار کر رکھی ہے۔ وہ بھی بن جائیں گے جی! کام کرنے کے لیے من میں لگن اور شکتی بھی ہونی چاہئے۔“
”پیسہ بھی تو چاہئے۔“ رحیم داد ہنس کر بولا۔

”ہونا تو چاہئے۔“ وہ بدستور مسکراتی رہی۔ ”پر خالی پیسے سے کچھ نہیں بنتا۔“
جیلہ نے کپڑے میز پر رکھ دیئے۔ گل دستہ رحیم داد کو دیا۔ بے تکلفی سے بولی۔ ”چوہدری! اپنے باغ میں گلاب کے بہت بوٹے ہیں۔ گوجرانوالہ سے منگوا کر لگائے ہیں۔ دیکھ تو کتنے سندر پھول ہیں۔ تھوڑے ہی سے پہلے میں نے انھیں تو ذکر تیرے لیے گل دستہ بنایا تھا۔“
رحیم داد کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ پھول سوگندہ کر بولا۔ ”خوشبو بھی بہت چنگی ہے۔ سوگندہ تولر آتی ہے۔“

جیلہ نے کپڑے اٹھا کر رحیم داد کو دکھائے۔ ”چوہدری! تیرے لیے یہ کپڑے بھی لائی ہوں۔ تیرے اپنے کپڑے تو بہت گندے ہو گئے ہیں۔ کل دوپہر تک ڈاکٹر آئے گا۔ اس نے اجازت دی تو نما کر کپڑے بدل لینا۔ دو جوڑے ہیں۔ ایک تو ابھی بدل لے۔“
رحیم داد نے کپڑے دیکھے۔ دو قمیصیں، دو شلواریں اور دو دھوتیاں تھیں۔ خوش ہو کر بولا۔

کر لاتی تھی۔ اور جی....“

رحیم داد نے اکتا کر بیزاری سے کہا۔ ”یار! اب بس کر۔ کام کی گھل کر۔“

”وہی تو کر رہا تھا جی۔“ ماکھانے سادگی سے اظہار خیال کیا۔ ”اب یہی دیکھ، پچھلی برکھا میں آدھے سے زیادہ گھر ڈھے گیا۔ اپنا بازو ہوتا تو دونوں کب کے اسے ٹھیک ٹھاک کر چکے ہوتے۔“
اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”میرا یہ کام کر دے۔ جنم جنم تجھے دعائیں دوں گا۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔“

”ایسا کیوں نہیں کرتا؟ دوسرا دیاہ کر لے۔ نیا اور زیادہ کام کا بازو مل جائے گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر مشورہ دیا۔

”حد کردی توں نے۔“ ماکھانہ بگاڑ کر بولا۔ ”دیاہ کرنا کوئی محول ہے۔ پہلے جب دیاہ کیا تھا، نو سو ادھار لیا تھا۔ اب تک وہی نہیں چکا سکا۔ ہاں، اپنا بازو ہوتا تو کب کا ادا ہو جاتا۔“
”میں آج یا کل سویرے زمیں دار سے بات کروں گا۔“ رحیم داد نے ٹالنے کی غرض سے وعدہ کیا۔

”بس، توں مجھے اس سے چٹھی لکھوا دے، میرا کام بن جائے گا۔“ اس نے اصرار کیا۔ ”تیری مہربانی ہوگی۔“

”کہہ تو دیا تجھ سے۔“ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مہمان خانے کی جانب بڑھا۔ ماکھانہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے گھلایا تا رہا۔ ”تو جی، میں سمجھ لوں، میرا کام بن جائے گا؟ کب آؤں تیرے کول؟“

”چار روز بعد آنا۔“ رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

ماکھانہ مستعدی سے بولا۔ ”آجاؤں گا جی، بالکل آجاؤں گا۔“

رحیم داد چپ چاپ آگے بڑھتا ہوا مہمان خانے میں داخل ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر ماکھے کو دیکھا بھی نہیں۔ اسے ماکھا اور اس کے بازو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے راجو کو حاجی کی قید سے آزاد کرانے میں نور دین کی صرف اس لیے مدد کی تھی کہ اس وقت اسے نور دین کی ہمدردی حاصل کرنا تھی۔ ماکھا کی ہمدردی کی اسے کیا ضرورت تھی۔ خود اس کے بازو، نورال، کو جمال دین لے اڑا تھا۔ وہ اسے نہ واپس لاسکتا تھا نہ ماکھا کی طرح کسی سے فریاد کر سکتا تھا۔

رحیم داد کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے کمرے میں گیا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ مضطرب اور دل گرفتہ تھا۔ اپنی بے مصروف زندگی پر دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ وہ پرکٹا

”کپڑے تو بہت چنگے ہیں زمیں دارنی! تو نے اتنی تکلیف کیوں کی۔“

”لے، اس میں تکلیف کی کون سی گل ہے۔“ جیلہ نے ہلکا تھقہ لگایا۔ کپڑے میز پر رکھ دیئے اور معذرت کے انداز میں بولی۔ ”اللہ وسایا کی گھوڑی سے تجھے جو چوٹ لگی ہے، چوہدری بیج مان، ہم دونوں کو اس کا بہت دکھ ہے۔“ اس کا لہجہ قدرے دل گرفتہ ہو گیا۔ ”اور تو تو ویسے بھی بہت دکھیا رہا ہے۔ گھریار، بال بچے، سب کچھ لٹا کر آیا ہے۔“ اس کا شگفتہ چہرہ مرجھا گیا۔ رخساروں کی دھوپ پر بدلی چھا گئی۔

رحیم داد نے جیلہ کے چہرے پر افسردگی دیکھی تو اسے تسلی دینے کی فوراً کوشش کی۔ ”وہ تو جی گھوڑی چمک کر بے قابو ہو گئی تھی۔ زمیں دار کی اس میں کون سی غلطی تھی۔ وہ تو جی ہونے والی گل تھی، ہو کے رہی۔“

”چوہدری! میں تیرے لیے روٹی کے ساتھ دودھ بھجوا دوں گی۔ روٹی دودھ میں بھگو کر کھا لینا پر دودھ زیادہ پینا۔ خون بھی تو کتنا نکل گیا۔ گھاؤ گھرا لگا تھا۔ ابھی روٹی چبانے میں تجھے تکلیف ہوتی ہوگی۔ ڈاکٹر نے چاول کھانے سے منع کیا ہے ورنہ چاول کی کھجڑی تیرے لیے ٹھیک رہتی۔“ جیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”چنانچہ کر چوہدری! جلد ہی تو سب کچھ کھانے پینے لگے گا۔“ وہ دروازے کی جانب مڑی۔ ”اب میں نوں جاتا ہے۔ روٹی کھانی ہے۔ سکول سے سیدھی تیرے پاس آگئی تھی۔“ جیلہ چلی گئی۔ رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا کہ کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی دھوپ دھندلی پڑ گئی۔ کمرہ سنسان ہو گیا۔

وہ خاموش لیٹا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ احمد نے کھانا لا کر رکھا۔ کھانے میں دودھ اور نرم نرم توری پرائٹھے تھے۔ رحیم داد نے جیلہ کی ہدایت کے مطابق پرائٹھے دودھ میں بھگو کر کھائے۔



باہر تیز دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا بھی گرم تھی۔ رحیم داد کمرے میں لیٹا رہا۔ شام ہو گئی۔ احمد نے کرسی باہر صحن میں ڈال دی۔ رحیم داد کی بے چین نگاہیں بار بار اس دروازے کی جانب اٹھ جاتیں جو حویلی میں کھلتا تھا۔ اسے جیلہ کا انتظار تھا، جس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ دیکھ کر وہ خود بھی شگفتہ ہو جاتا تھا۔

اندھیرا بدھتا گیا۔ رات ہو گئی مگر جیلہ نہیں آئی۔ اللہ وسایا بھی نہیں آیا۔ وہ صبح آیا۔ رحیم داد کو اپنے ہم راہ باغ میں لے گیا۔ دونوں آم کے درختوں کے ایک کج میں پڑی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ دھوپ ابھی بہت بلکی تھی۔ ہوا کے نرم جھونکے چل رہے تھے۔ فضا خوش گوار تھی۔

نو کروں نے ناشتا لگا دیا۔

رحیم داد نے اسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے ماکھے کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”کل جی، دور کے پنڈ کا ایک مزارع آیا تھا۔ ماکھا نام بتاتا تھا۔ بہت پریشان نظر آتا تھا۔ اس کا ایک کام ہے تجھ سے۔“

”کیا کام ہے اس کا؟“ اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

”اس کی گھروالی کو زمیں دار نے اٹھوا کر اپنی حویلی میں رکھ لیا ہے۔ وہ اپنا بازو واپس لینے کے لیے بہت بے چین اور پریشان ہے۔“

اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔ ”چوہدری! تو کس چکر میں پڑ گیا۔ وہ کوئی دواہی زمیں دار ہوگا اور ایسے زمیں داروں کو دوسرے کے ڈھور ڈنگر چوری کروا کے ادھر سے ادھر کرنے اور مزارعوں اور کیوں کی جوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر اپنی رکھیل بنانے کا چکا ہے۔ پوچھو تو کہیں گے ایسا کیسے بنا زمیں داری نہیں چل سکتی۔ مزارعوں اور کیوں پر زمیں داروں کا رعب اور بدبہ نہیں بیٹھ سکتا۔ ایسا نہ کیا جائے تو وہ سراونچا کر کے چلیں گے۔ بد معاشی اور سرکشی کریں گے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا، لہجہ کسی قدر ٹیکھا ہو گیا۔ ”چوہدری! تو کس کس کا بازو واپس دلوائے گا۔ میرا کھانا، اس چکر میں نہ پڑ۔“

”پر ماکھا بہت دکھیا رہا ہے۔“ رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سفارش کی۔ ”بیچ سال سے اس کی گھروالی زمیں داری کی حویلی میں کید ہے۔ تین بچے اس سے پیدا کر چکا ہے۔ تب بھی نہیں چھوڑتا۔ ادھر ماکھے کا حال یہ ہے کہ گھر میں صرف بوڑھی ماں ہے۔ پچھلی برکھا میں اس کا مکان بھی ڈھے گیا۔ بے چارہ پیر پکڑ کر روتا تھا، گڑگڑاتا تھا۔ تو اس کے زمیں دار کے نام چھٹی لکھ دے، میرے کہنے سے لکھ دے۔ ماکھے کا کام بن جائے گا۔“

”زمیں دار کون ہے؟“ اللہ وسایا نے رحیم داد کی سفارش سے متاثر ہو کر نیم رضامندی ظاہر کی۔ ”اس کا کچھ اتا پتہ ماکھے نے بتایا تھا؟“

”ادھر اتریں اس کا پنڈ ہے۔ پیراں والہ نام ہے۔“ رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”زمیں دار کوم کا سید ہے۔ شاہ جی کہلاتا ہے۔ اس کا پورا نام مجھے معلوم نہیں۔“

”ضرورت بھی نہیں۔ میں سمجھ گیا، وہ کون ہے۔“ اللہ وسایا بولا۔ ”اس کا نام احسان شاہ ہے۔ ادھر کا وڈا زمیں دار ہے، بلکہ بہت وڈا بگیرہ دار ہے۔ اس کی حویلی نہیں، وڈا کوٹ ہے۔ ایسی اونچی اونچی دیواریں ہیں کہ پرانے زمانے کے کسی نکلے کی فسیل لگتی ہیں۔ ان فصیلوں کے پیچھے بہت سی کوٹھڑیاں ہیں۔ ہر زبانی کو اٹھوانے کے بعد انھی کوٹھڑیوں میں سے کسی میں رکھا جاتا ہے۔ کوٹ

”یہ تو جی اندھیر گردی ہے۔“

”ہے تو۔“ اللہ وسایا نے اتفاق رائے کیا۔ ”پر ایک احسان شاہ کیا، سارے ہی وڈے زمیں دار اور بگیہ دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ اس دوڑ میں کوئی بہت آگے ہے، کوئی ذرا پیچھے۔ کوئی کشتے اور انجیکشن آزمانے کے لیے مزارعوں اور کیوں کی گھروالیاں اور کڑیاں اٹھواتا ہے، کوئی انھیں صرف ڈرانے، دھمکانے کے لیے ایسا کرتا ہے۔ چوہدری تو یہ باتیں سمجھ سکتا۔ مزارعے یا کی کی گھروالی کا جوان اور خوبصورت ہوتا، اس کی بد نصیبی بھی ہوتی ہے۔ وہ ایسے وڈے زمیں داروں کے چنگل سے نہیں بچ سکتی۔“

”تو بھی تو دوازمیں دار ہے پر تیری حویلی میں تو مجھے ایسا کوئی چکر نظر نہیں آیا۔“

”میری گل چھوڑ۔“ اللہ وسایا مسکرایا۔ ”میں کب زمیں داری کرتا ہوں، زمین داری تو جیلہ کرتی ہے۔“ بات کرتے کرتے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے سے تشویش جھلکنے لگی۔ رحیم داد نے پوچھا۔ ”کس فکر میں پڑ گیا؟“

اللہ وسایا نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ ”چوہدری! سچ پوچھ تو مجھے جیلہ کی طرف سے بھی دھڑکا لگا رہتا ہے۔ منع بھی کرتا ہوں پر وہ نہیں مانتی۔ دن ہو یا رات، پنڈ میں ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہے۔ ذرا پروا نہیں کرتی۔ ڈرتا ہوں، کوئی وڈا زمیں دار اسے بھی نہ اٹھوالے۔ ویسے ہی سب مجھ سے خار کھاتے ہیں۔ حالانکہ سچی گل ایسہ ہے چوہدری، وہ مجھ سے سال دو سال ہی چھوٹی ہوگی۔ ۳۰ سال سے کم نہیں۔ کچھ اوپر ہی ہوگی۔ دو بچے بھی ہو چکے ہیں۔“

”پر تیری گھروالی اتنی لگتی نہیں، جتنی تو اس کی عمر بڑا رہا ہے۔“

”بات یہ ہے جی، وہ سخت مخنتی اور اہری ہے۔ ہر دکت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی ہے۔ ادھر وڈے زمیں داروں کی گھروالیوں کا حال یہ ہے، حویلیوں اور بنگلوں میں بند رہتی ہیں۔ بھر بھر گلاس دودھ اور لسی چڑھاتی ہیں۔ دبا کے گھی اور مکھن کھاتی ہیں۔ کچھ کرنا دھرتا تو ہوتا نہیں۔ کام کاج کے لیے نوکرانیوں کی پوری بٹالین ہوتی ہے۔ ان کا کام تو منجیاں توڑنا اور کھٹا کھٹ بچے جننا ہوتا ہے۔ اس طرح چند ہی سال میں پھیل کر نیلی بار کی بُن جاتی ہیں۔“ وہ شوخی سے ہنسا۔ ”نُ تو جی! بُن ہی ہوتی ہے۔ سو وڈے زمیں دار کچھ ہی مدت بعد اپنی گھروالیوں کو بُن سمجھ کر حویلی کے کسی ڈھارے شاڑھے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور دوسروں کی جوان اور سوہنی گھروالیوں کو اڑانے کی تاک میں رہتے ہیں۔ مزارعوں اور کیوں کی گھروالیاں تو اس طرح اٹھوا لیتے ہیں جیسے شیر کٹمانہ میں دبا کر لے جاتا ہے۔“

کے دروازے پر مسلح راکھے دن رات پہرا دیتے ہیں۔ کوئی زنانی دروازے تک نہیں پہنچ سکتی۔ باہر نکلنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”اتنی زنانیاں اٹھوا کر اس نے کیوں رکھ چھوڑی ہیں؟“

”رات کو نشے میں وڈن ہو کر شاہ جی کو ٹھڑیوں کے معانے پر نکلتا ہے۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”جس زنانی پر طبیعت آجاتی ہے، اسے اپنے کمرے میں بلوا لیتا ہے۔ سنا ہے کبھی کبھی تو ایک رات میں کئی کئی بلواتا ہے۔ دلی کے دو حکیم اس نے نوکر رکھ چھوڑے ہیں۔ وہ اسے ٹکڑا جوان رکھنے کے لیے نئے نئے کشتے اور معجون بناتے ہیں۔ شاہ جی ادھلڑا ہو چکا ہے پر مونچھوں اور سر کے بالوں پر خضاب لگا کر جوان گھرو کی طرح گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھتا ہے۔“

”وہ جیسا بھی ہے، ہم نے اس سے کیا لیا۔ تو صرف اس کے نام چٹھی لکھ دے۔ ہا کھائی چاہتا ہے۔ کہتا تھا، تیری چٹھی سے اس کا کام بن جائے گا۔“

”بننے کی بجائے اور بگڑ جائے گا۔“ اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”میری چٹھی دیکھ کر تو اتنا زراغ ہو گا کہ ماٹھے کو ہرگز اس کی گھروالی واپس نہیں کرے گا۔“

”گل سمجھ نہیں آئی۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”گل ایسہ ہے جی۔ میری اس کے ساتھ لگتی ہے۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”وہ مجھ سے سخت خار کھاتا ہے۔ میرے خلاف اوپر طرح طرح کی شکایتیں پہنچاتا ہے۔ کتنی بار اس نے میرے چوکھر اٹھوا لیے۔ کھڑی فضلیں جلوادیں۔ جھوٹے کیس بنوائے۔ چوہدری، تو نہیں جانتا، وہ کتنا برا اور خطرناک بندہ ہے۔“

”مطلب یہ ہوا کہ ماٹھے کے لیے تو کچھ نہیں کر سکتا۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بتا، میں کیا کر سکتا ہوں۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”شاہ جی کی حویلی میں اس کی مرضی کے بنا کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ چاروں طرف مسلح پہرا رہتا ہے۔ پولیس اور حکومت بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری دوستی ہے۔ ایم ایل اے، ایم سی اے اور وزیر اس کی حویلی میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ وہ انھیں ولایتی شراہیں پلاتا ہے۔ جوان اور سوہنی میاں پر پیش کرتا ہے۔“ اللہ وسایا زیر لب مسکرایا۔ ”وہ شاہ جی کی مدد کرتے ہیں، شاہ جی ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ اس کی سفارشوں پر کام کر دیتے ہیں۔ شاہ جی ان کے لیے اوپر سفارشیں پہنچاتا ہے۔ تبھی تو تھانے دار، تحصیل دار اور دوسرے افسر اس کی مرضی کے لگائے جاتے ہیں۔ ذرا اس کے خلاف کوئی کام کریں، بختی ان کا تبادلہ کرا دیتا ہے۔“

اللہ دسایا کو کچھ یاد آگیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری! میں نوں اب جانا ہے۔ شام کو تیرے پاس آؤں گا۔“

اللہ دسایا چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں دیر تک بیٹھا رہا۔ جب دھوپ میں شدت آگئی اور درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر اس پر بھی پڑنے لگی تو وہ بھی اٹھ کر مسمان خانے میں چلا گیا۔ دوپہر کو ڈاکٹر خان آیا۔ اس کے ساتھ جیلہ بھی تھی۔ ڈاکٹر نے اسٹنٹ پلاسٹر اور روئی ہٹا کر زخم دیکھا۔ زخم اب بھر گیا تھا۔

ڈاکٹر نے رحیم داد کے بازو میں انسٹیشن لگایا اور ایک شیشی میں مرہم دے کر بولا۔ ”اے صبح شام لگاتے رہنا۔ اب پٹی شئی کی ضرورت نہیں۔ لیکن زخم پر مکھی نہ بیٹھنے پائے۔ ویسے تو یہ صاف ستھری جگہ ہے پر احتیاط کرنا بہت ضروری ہے۔“ ڈاکٹر نے اسے غسل کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کی کہ گرم پانی سے نہا۔ در زخم پر مرہم لگانے سے پہلے نہالے۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ جیلہ بھی اس کے ساتھ چلی گئی۔

رحیم داد نے ٹائی بلوایا۔ حجامت بنوائی اور مسمان خانے کے غسل خانے میں گرم پانی سے دیر تک صابن مل مل کر نہاتا رہا۔ غسل سے فارغ ہو کر اس نے اگلے کپڑے پہنے، بالوں میں کنگھی کی اور زخم پر مرہم لگایا۔

دوپہر کو کھانا کھایا مگر بستر پر آرام کرنے کے بجائے اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔ اندر سے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کانڈات کا بستہ کھولا، سادہ کاغذ نکالا اور اس پر مقتول چوہدری نورانی کے جعلی دستخط بنانے کی پوری توجہ سے مشق کرنے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ مسلسل مشق کرتا رہا۔ جب کمرے میں روشنی دھندلی پڑ گئی تو اس نے کاغذ نکلے نکلے کر دیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ احمد مسمان خانے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کاغذ کے نکلے ایک کونے میں ڈال کر مچس سے آگ لگا دی اور ان کی راکھ مٹی میں ملا دی۔

☆

دھوپ گھروں کے منڈیروں پر پہنچ چکی تھی۔ سائے طویل ہو کر دور دور تک پھیل گئے تھے۔ رحیم داد مسمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ جیلہ پہلے سے وہاں موجود تھی۔ وہ گلاب کے پودوں کے تنخے کے پاس کرسی پر بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کے دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بیٹا اور دوسری بیٹی۔ بیٹا پانچ سال کے لگ بھگ تھا۔ بیٹی اس سے سال سوا سال چھوٹی تھی۔ دونوں بچے تن درست اور خوب صورت تھے۔ پھولوں کے مانند شکفتہ اور تروتازہ۔ جیلہ گردن جھکائے ایک

بوڑھے کے پیر کے زخم پر دوا لگا کر پٹی باندھ رہی تھی۔ آہٹ سن کر جیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دیا، رحیم داد کو دیکھا، مسکرا کر بولی۔

”آچوہدری! ادھر بیٹھ جا۔“ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ رحیم داد خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

جیلہ نے زخم پر اچھی طرح پٹی باندھ کر بوڑھے سے کہا ”چاچا! جب تک چوٹ ٹھیک نہ ہو جائے، منجی پر پڑا رہ۔ دو تین روز میں چنگا ہو جائے گا۔“ بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”جیلہ نے اسے ٹوکا۔“ یہ تو بتا، تیری گھر والی کا کیا حال چال ہے؟“

”بھین جی! اس کا بھکار نہیں جاتا۔ ہر تیسرے روز اسے زور سے ٹھنڈ چڑھتی ہے۔ جانے کیسا بھکار ہے، جاتا ہی نہیں۔“ بوڑھے نے تشویش کا اظہار کیا۔

”اسے لیوا ہے۔ میں رات کو اس کے لیے دوائی لے کر تیرے گھر آؤں گی۔ چنانہ کر، اس کا بخار جاتا رہے گا۔“ جیلہ نے اسے تسلی دی۔ ”دعا کر اپنی ڈپنری بن جائے تو سارے پنڈ کا دوا دارو ہمیں ہو گا۔ دے پال پور یا پاک پتن نہیں جانا پڑے گا۔“

بوڑھا اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

جیلہ کے سامنے گھاس پر تین عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک عورت سے پوچھا۔ ”بھیراں! زمیں دار کدھر ہے؟ حویلی میں نو ہے نہیں۔“

جیلہ کرسی سے اتر کر عورتوں کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گئی، مسکرا کر بولی۔ ”وہ اس طرح بیٹھنے پر برا مناتا ہے۔ زمیں دار جو ٹھیرا۔“ وہ ایک اور عورت کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”تو کیسے آئی پھاتاں! ٹھیک ٹھاک تو ہے؟“

”ٹھیک ٹھاک ہی ہوں جی۔“ پھاتاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بٹیاں فصل کی واڈھی کی آس لگاتی ہیں۔ واڈھی ہو تو ان کا دیاہ ہو۔ اپنی تو زمین ہے، نہ فصل۔ گھر والا بھی نہ رہا۔ دھی جوان ہو گئی۔ اس کا دیاہ کیسے کروں؟ بے ساکھی کے بعد پنڈ کی کئی بٹیاں کا دیاہ ہو رہا ہے۔“ اس کا چہرہ سو گوار ہو گیا۔ ”مجھے تو کوئی ادھار بھی نہیں دے گا۔ میں کیا کروں بھین جی؟“

”تو اپنی تاجاں کی گل کر رہی ہے؟“ جیلہ نے مسکرا کر دریافت کیا۔ ”تو نے اس کے لیے در بھی ڈھونڈا؟“

”در تو کب کا دیکھ بھال لیا، پر اپنا نہیں، اپنی ہی برادری کا ہے۔ سکے دیر کا پت ہے۔ اس کے گھر والے تو بالکل تیار ہیں۔ تاجاں انھیں پسند بھی ہے۔ پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔“

”چتنا نہ کر پھاتاں!“ جیلہ نے چمک کر کہا۔ ”تاجاں اپنے پنڈ کی دھی ہے، میری دھی ہے۔ میں اس کی سگائی کروں گی۔ بیس حویلی سے اس کا ویاہ ہو گا۔ تو اپنی بھرجائی سے کہہ دے، تیاری کرے۔“

”بھین جی! میری دھی بھی جوان ہو گئی۔“ بشیراں نے جھٹ اپنا مسئلہ پیش کر دیا۔ ”مجھے کچھ اور نہیں چاہئے، ادھار مل جاتا تو میں ویاہ کر کے اسے اس کے گھریار کا کر دیتی۔“

”تو گلو کی گل کر رہی ہے؟“ جیلہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”ارے وہ تو ذرا سی چھوہری ہے۔ تو اس کی سگائی کرنا چاہتی ہے۔ حد کر دی تو نہ۔“

”بٹی کا بوجھ جتنی پختی سر سے اتر جائے، اتنا ہی چنگا ہے جی۔“ بشیراں نے اپنی دلیل کا سارا لیا۔

”اس پر کار نہ سوچ، ابھی تو وہ بہت نرم ہے۔ مشکل سے بارہاں برس کی ہوگی۔ اسے کچھ دن تو کھیل کود لینے دے۔ جوان ہو جائے تو ویاہ کرنا۔ کم سے کم چار سال بعد اس کام کے لیے میرے پاس آنا۔ میں تیری ضرور سہایتا کروں گی۔“

جیلہ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ دور سے اللہ وسایا آتا نظر آیا۔ جیلہ اٹھ کر بھٹ کر سی پر بیٹھ گئی۔ تینوں عورتیں چلی گئیں۔ اللہ وسایا تھکا ہوا ایک کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ وہ مدھال اور بجا بجا نظر آ رہا تھا۔

جیلہ نے تشویش سے دریافت کیا۔ ”کیا بات ہے۔ اللہ وسای! تو کچھ پریشان اور نراش نظر آ رہا ہے؟“

”پریشانی کی گل ہی ہے۔“ وہ ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پڑ میں گاھی ہوئی کنگ پڑی ہے۔ دھڑکو پچھوڑنے اور پھٹنے کے لیے منلی نہیں مل رہے۔“ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”بارش یا آندھی آجائے تو سب کچھ برباد ہو جائے گا۔“

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا میں بھی قدرے تیکھا پن تھا۔ جیلہ نے بھی آسمان کو دیکھا۔ وہ بھی متفکر نظر آنے لگی۔ ”چتنا کرنے کی تو گل ہے پر تو نے کیا پائے سوچا؟“ اس نے بیٹے کو گود میں بٹھالیا اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے آہستہ آہستہ کنگھی کرنے لگی۔

”پرسوں سویرے سے پہلے منلی نہیں آسکتے۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”آج کی رات اور کل کے دن رات ٹھیک سے گزر جائیں تو سمجھو کام بن گیا۔“

”میں کہتی ہوں، مزارے اور زمیں داریہ کام کیوں نہیں کر سکتے؟“

”نہیں جی! وہ ایسا بچ کام کیسے کر سکتے ہیں۔“ رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔ ”ایسا کام تو منلی اور کٹی ہی کر سکتے ہیں۔“

جیلہ بولی۔ ”اور جو برکھا آجائے، آندھی آجائے؟“ اس کا لہجہ تیکھا اور تلخ تھا۔ رحیم داد نے تاحانہ انداز میں کہا۔ ”یہ تو رب کی مرضی ہے، اس کی مرضی میں کون دخل دے سکتا ہے۔“

”چوہدری یہ باتیں جی لے نہیں سمجھتی۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”شہر میں برسوں رہ چکی ہے نا، پڑھ لکھ بھی بہت گئی ہے۔ اسے کیا پتہ، زمیں داری کیا ہوتی ہے۔“ وہ بازو سے لگی ہوئی بیٹی کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

”پر میں تو گندو کو پہلے ڈاکٹر بناؤں گی۔“ اس نے بیٹے کو سینے سے چمٹا کر پوچھا۔ ”گندو! تو ڈاکٹر بنے گا نا؟“

گندو نے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا اور اپنا گول مٹول سر آہستہ آہستہ ہلایا۔

جیلہ نے بیٹی کو دیکھا، ہنس کر بولی۔ ”ڈاکٹر تو نینا بھی بنے گی۔ دونوں مل کر میری ڈپنری کو بہت ڈوا ہسپتال بنا دیں گے۔ اپنے ہی پنڈ کا نہیں، دور دور کے پنڈ والوں کا علاج کریں گے۔“

”جی! تو سنا تو نہیں دیکھ رہی؟“ اللہ وسایا ہنسنے لگا۔ ”تیری ڈپنری بنی بھی نہیں اور تو نے خواب دیکھنے شروع کر دیئے ابھی سے۔“

”منش پہلے سننے ہی دیکھتا ہے۔“ جیلہ نے بوئے اعتماد سے کہا۔ ”من میں لگن ہو تو سپنا ایک روز بیچ بن کر سامنے آجاتا ہے۔ سدا ایسا ہی ہوتا ہے۔“

شام دھیرے دھیرے باغ میں تاریکی کے ڈیرے ڈال رہی تھی۔ اللہ وسایا نے اٹھتے ہوئے جیلہ سے کہا۔ ”اندھیرا پھیل رہا ہے، کب تک یہاں بیٹھنے کا ارادہ ہے؟“ جیلہ بھی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ اللہ وسایا اور جیلہ حویلی کی سمت بڑھے۔ دونوں گردن اٹھا کر بار بار آسمان پر چھایا ہوا غبار دیکھتے تھے۔ وہ بارش اور طوفان کے خطرے سے فکر مند نظر آتے تھے۔ اسی خدشے سے سسے ہوئے دونوں بچوں کے ہم راہ حویلی میں داخل ہو گئے۔

رات گزری، دن گزرا، دوسری رات بھی گزر گئی مگر نہ بارش ہوئی، نہ طوفان آیا۔ سویرے سویرے منلی آگئے اور گاہی ہوئی گندم پچھوڑ کر بھوسا اور دانے الگ کرنے لگے۔ پچھوڑنے کے بعد جگہ جگہ مزارعوں کے کھلیانوں میں گندم اور چنے کی ڈھیریاں نظر آنے لگیں۔ کس کس ڈھیریوں پر مٹی اور راکھ کا لیپ لگا کر ہلکا سا پلستر چڑھا دیا گیا تاکہ چوری چکاری کا امکان نہ رہے۔

اسی طرح بھوسے کی بھی ڈھیریاں بنا کر اوپر سے مٹی کا گاڑھا گاڑھا لپ چڑھا دیا گیا۔

مجھے کے مبارک دن سے بٹائی کا آغاز ہوا۔ اس روز کو منہ ہر کشتن میں بڑی چل پل اور رونق تھی۔ مزارعوں اور کمیوں نے نہادھو کر ابلے کپڑے پہنے۔ نوجوان عورتیں رنگ برنگے راکھواں لباس میں ہنسی مسکراتی ادھر ادھر پھر رہی تھیں۔ وہ کنواریاں جن کی بٹائی کے بعد شادی ہونے والی تھی، شرمائی شرمائی نظر آتیں، سیلیاں ان سے چھیز چھاڑ کر تیں۔ اس روز گاؤں میں میلے کا سماں تھا۔

پہر دن گزرا تو اللہ وسایا اپنے مزارعے کمال کے کھلیان پر جمیلہ اور رحیم داد کے ہم راہ پنچا۔ فصل کی بٹائی کا آغاز وہیں سے ہوا۔ کمال کے گھروالے اور پٹی کی پیلے سے وہاں موجود تھے۔ مسجد کا ملا بھی ایک طرف بیٹھا تھا۔ سب اللہ وسایا کے منتظر تھے۔ مٹی سے لپے پتے کھلواڑ پر گندم اور چنے کی ڈھیریاں موجود تھیں۔ اللہ وسایا کے بیٹھتے ہی غلغلہ پڑا۔ گندم اور چنوں کی ڈھیریوں پر چڑھا ہوا پلستر اتار گیا۔ کھلواڑ ایک بار پھر بھاڑو سے صاف کی گئی۔ عمو دلوبان سلگایا گیا۔ دھواں لہراتا ہوا فضا میں خوشبو بکھیرنے لگا

ہر ڈھیری اس انداز سے بٹائی گئی تھی کہ اس میں لگ بھگ آٹھ من غلہ ہو۔ اللہ وسایا اور کمال نے جوتے اتارے اور کھلواڑے کے چبوترے پر برہنہ پیر چڑھ گئے۔ دونوں ڈھیریوں کے قریب خاموش کھڑے ہو گئے۔ ملا نے کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ کھلواڑ کے ارد گرد کھڑی ہوئی عورتوں اور لڑکیوں نے دوپٹوں کے آچل سے سر ڈھک لیے۔ سب ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر ادب سے خاموش کھڑے رہے۔

تلاوت ختم کر کے ملا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ سب نے اس کے ساتھ ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دعا کے بعد بٹائی شروع ہوئی۔ بٹائی کی ذمہ داری پیشہ ور دنداوے کے بجائے گاؤں کے ایک بوڑھے کے سپرد کی گئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹوپا دیا تھا۔ ٹوپے میں تقریباً ڈھائی سیر غلہ آتا تھا۔ بٹائی شروع ہونے سے پہلے جیلہ نے بوڑھے سے اونچی آواز میں کہا۔ ”چاچا! پتہ ہے، یہ ڈھیریاں زمیں دار اور مزارعے کا مشترکہ کھاتا ہے۔ انھیں دونوں کے درمیان آدھا آدھا بانٹنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کے قانونی حکوک بھی پوری طرح دھیان میں رکھتے ہوں گے۔ سرکاری کاغذات میں انھیں اس پر کار بتایا گیا ہے۔“ اس نے لمبا کاغذ نکالا اور سنہیل سنہیل کر پڑھنے لگی۔ ”ڈھیری جنس بحسب نصف نصف مابین مالک و مزارع بعد وضع خرچ بائے ذیل :

خرچ کیاں :

ترکھان	ساڑھے چار پائی فی ہل
لوبار	ساڑھے چار پائی فی ہل
چھاجی	۹ پائی فی ڈھیری
موچی	۹ پائی فی ڈھیری
نائی	۹ پائی فی ڈھیری

جنس یافتنی مالک از ڈھیری مشترکہ

مصل (لازم مالک)	ایک پائی فی ڈھیری
محاصل	ایک ٹوپائی ڈھیری
مالک کا پیواری	۳ ٹوپے فی ڈھیری
منشی ذیرے دار	۲ پائی فی ڈھیری
داد (میراثی)	ایک پائی فی ہل
دھواں دار (برائے نکلیہ فقیراں)	ایک پائی فی ڈھیری
خرچ گھوڑا کا بیاں	دوپائی گندم فی ڈھیری

یہ تفصیلات سنانے کے بعد جیلہ نے بوڑھے کی طرف دیکھا، مسکرا کر بولی۔ ”چاچا! تیں نوں تو پتہ ہی ہوگا ایک پائی چار ٹوپے کے برابر ہوتی ہے۔ ویسے سرکاری کاغذات میں خرچ و ذاک بنگلہ برائے افسران دورہ گشتی کے لیے دوپائی فی ڈھیری بھی درج ہے۔ پیواری کا فصلانہ اور تھانے دار کا نذرانہ الگ ہوتا ہے۔ پر ہم نے یہ سب کچھ نہیں دیتا اور اپنا پیواری شواری تو ہے ہی نہیں۔ اسے کچھ بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

بوڑھے نے جیلہ کی تمام باتیں سنیں، مسکرا کر گویا ہوا۔ ”فکر نہ کر، میں نوں سب پتہ ہے۔ تیں نوں یاد نہیں، پچھلے سال رنج پر بھی میں نے ہی بٹائی شروع کی تھی اور توں نے مجھے سب کچھ ایسے ہی پڑھ کر سنایا تھا۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔“

”پر چاچا! قانونی کارروائی تو پوری ہونی ہی چاہئے۔ جس کا جتنا حصہ بنتا ہے، اسے پورا پورا ملنا چاہئے۔“

آواز ملا کر بلے بلے کے نعرے بلند کر رہا تھا۔

بھنگڑا ختم ہو گیا تھا۔ اللہ وسایا حویلی میں داخل ہوا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے وسیع صحن میں ابھی تک ڈھول بج رہا تھا۔ وسط میں جازم کافر ش تھا۔ اس پر گاؤں کی عورتیں بیٹھی تھیں۔ چاروں طرف شعلیں روشن تھیں۔ عورتیں ڈھولک کی تھاپ پر لہک لہک کر گارہی تھیں۔ اسان ڈھولکی وجانی، ساڈی ریت اے پرانی

اللہ وسایا اور رحیم داد ایک گوشے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے دیکھا کہ گانے والی عورتوں میں جیلہ بھی شامل ہے۔ اس کی آواز سریلی اور خوب صورت تھی۔ وہ گردن کو بار بار خم دے کر گارہی تھی، اونچی تان سے گیت کے بول اٹھا رہی تھی۔ وہ اس وقت سنہری طے کا لاجا باندھے ہوئے تھی۔ لاپے کا رنگ زعفرانی تھا، کرتا بھی اسی رنگ کا تھا، گریبان پر سبز اور سیاہ دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ دوپٹا سبز تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ ماتھے پر جڑاؤ ٹیکا جھلک رہا تھا۔ آنکھوں میں دنبالہ کا جل تھا۔ شعلوں کی لہراتی روشنی میں وہ بہت دل کش اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

گانا ختم ہوا تو جیلہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ”ہو جائے جی، ہو جائے۔ گدھا ہو جائے۔“ چٹکیاں بجنے لگیں اور کچھ دیر بجتی رہیں۔ جیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ نوجوان عورتیں اور میاں بھی کھڑی ہو گئیں۔ جیلہ تالیاں بجاتی ہوئی آگے آگئی۔ عورتیں اور میاں اس کے گرد حلقہ بنا کر ساتھ ساتھ تالیوں کی تھاپ دینے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ تالیوں کی تھاپ کے ساتھ ساتھ پاؤں گردش کرنے لگے۔ جیلہ نے ایک ہاتھ اٹھا کر اونچے سروں میں گدھے کی مناسبت سے گیت چھیڑا۔

کزیاں سد کے گدھے پائے

ستیاں گلاں جگائے!!

گیت کے دوسرے بول ہم نوا عورتوں نے اٹھائے۔ تالیوں کی مسلسل تھاپ پر بول اونچے اور اونچے ہوتے گئے۔ تھرکتے، ٹپکتے، جسموں کی گردش تیز ہوتی گئی۔ ناچ تیز ہوا تو عورتوں نے رک رک کر دائرے میں جیلہ کے گرد پھیراں لینا شروع کر دیں۔ ان کے پاؤں ایک ہی انداز میں زمین پر پڑ رہے تھے اور اسی ترتیب اور تواتر سے ہاتھ اوپر اٹھ کر تالیوں کی تھاپ پر ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ ایک نوجوان لڑکی کے پیر غلط پڑے تو سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں میں زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ وہ اس قدر خجل ہوئی کہ سر جھکا کر رقص کرنے والیوں کے حلقے سے باہر نکلنے کی کوشش کی۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر بوڑھے نے ٹوپے میں پہلے گندم کی ڈھیری سے دانے بھرے اور دو بوریوں میں ایک ایک نوپا ڈالنے لگا۔ ایک بوری زمیں دار کی اور دوسری مزارعے کی تھی۔ بوڑھا بوریاں غلے سے بھرتا رہا۔ جیلہ اپنے مزارعے کمال کی بیوی کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ بیچ بیچ میں بولتی جاتی۔ اونچی آواز سے بٹائی کرنے والے بوڑھے کو ٹوکتی، ہنس ہنس کر کہتی۔

”چاچا! تو زمیں دار کی بوری میں زیادہ کنک ڈال رہا ہے۔“

”اوپر والا دیکھ رہا ہے چاچا۔“

”ڈنڈی نہ مار۔ کمال کی را کی کاٹپا پورا بھر۔“

جیلہ کی باتوں پر بار بار قہقہہ بلند ہوتا۔ زمیں دار اور مزارعے کے نصف نصف حصے کی بٹائی کے بعد مقررہ مقدار کے مطابق کیوں اور دوسرے حق داروں کو بھی فصل کی پیداوار میں ان کا حصہ مل گیا تو جیلہ نے ضد کر کے خاصی مقدار میں اگنی کا گندم فقیروں اور دوسرے حاجت مندوں کے لیے پڑا رہنے دیا۔

شام تک یہ سلسلہ چلتا رہا، دوسرے دن بھی جاری رہا اور مسلسل کئی روز تک جاری رہا۔ آخر بٹائی ختم ہو گئی۔

رحیم داد حیرت زدہ تھا۔ اس نے کسی بڑے زمیں دار کو اس طرح بٹائی میں شریک ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ یہ کام فشی یا کاردار انجام دیتے۔ وہ اپنے ساتھ بٹائی کرانے والے وٹاؤے بھی لاتے، جو ہر طرح یہ کوشش کرتے کہ مزارعے کے مقابلے میں زمین دار کو فصل کا زیادہ حصہ ملے۔ مزارعے یا اس کے کنبے کا کوئی فرد احتجاج کرتا تو اسے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا جاتا۔ زمیں دار فصل کا نصف نہ لیتے، ہمیشہ زیادہ لیتے۔ اکثر و بیشتر دو تہائی کے لگ بھگ وصول کرتے۔

جب بٹائی کے حصے کا غلہ بند بوریوں کی صورت میں حویلی کے گودام میں پہنچ گیا تو پاک چٹن کی غلہ منڈی کے آڑھتی اللہ وسایا کی حویلی کے چکر کاٹنے لگے۔ سال بھر کی ضرورت کا غلہ رکھ کر بقیہ فروخت کر دیا گیا۔ یہ گویا آخری مرحلہ تھا۔ پھر دیگیں چڑھیں، طرح طرح کے پکوان پکے۔ سب نے کھانا کھایا۔

حویلی کے سامنے میدان میں مردوں نے بھنگڑا ڈالا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگائی۔ من چلے نوجوانوں نے ان کے گرد حلقہ بنا کر رقص کیا۔ ایک دوسرے کو لٹکا کر پٹے کے بول اٹھائے۔

اللہ وسایا اونچی چارپائی پر بیٹھا تھا اور رقص کرنے والوں کا حوصلہ بڑھ رہا تھا۔ ان کی آواز میں

جیلہ کی اس پر نظر پڑی، اس نے آگے بڑھ کر جھٹ اس کا ہاتھ پکڑا اور حلقے سے علیحدہ نہ ہونے دیا۔

مشعلوں کے بھڑکتے شعلوں کی مچلتی روشنی میں جوان اور صحت مند جسم پھڑکتے رہے، لہراتے رہے۔ پازیب اور پاکلیں جھنکارتی رہیں۔ گیت کے سریلے بول فضا میں بکھرتے رہے۔ ناچ تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ رقص کرنے والیوں کے چہرے خون کی گردش سے گلابی پڑ گئے۔ دیکھنے لگے، دیکھنے لگے۔

جیلہ کا دل نواز چہرہ ان کے حلقے میں طلوع ہوتے ہوئے سورج کے مانند جگمگا رہا تھا۔ اس کی لمبی چوٹی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ چوٹی میں بندھا ہوا روپلا پراندا جھللا رہا تھا۔ وہ اس قدر حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی کہ رحیم داد مبسوت ہو گیا۔ ٹکنکی باندھے اس کا تانبہ اور رخشندہ چہرہ تکتا رہا۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح اس کے لچکتے بل کھاتے جسم کے پیچ و خم دیکھتا رہا۔ ناچ ختم ہوا تو رحیم داد کو ایسا لگا جیسے کوئی سانا خواب دیکھتے دیکھتے اچانک بیدار ہو گیا ہو۔ جیلہ اس کے ذہن پر برسات کی گھنی گھٹاؤں کی طرح چھائی ہوئی تھی۔

آدھی رات کے بعد رحیم داد مہمان خانے میں گیا۔ بستری لیٹا تو ناچ کے آہنگ اور گیت کی نغمی سے مسحور تھا۔ وہ خاموش لیٹا دیر تک لطف اندوز ہوتا رہا۔

صبح وہ دیر سے بیدار ہوا۔ آنکھ کھلی تو مہمان خانے کے صحن کی دیواروں سے دھوپ نیچے اتر رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر غسل خانے میں گیا۔ واپس آیا تو میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ احمد ابلے لباس میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

”حمہ! آج تو بہت لشکارے مار رہا ہے؟“

وہ کسی قدر شرما کر بولا۔ ”زمیں دارنی نے نئے کپڑے سلوا کر دیئے ہیں۔ ہر فصل پر وہ حویلی کے سارے نوکروں اور نوکرانیوں کو نئے کپڑے دیتی ہے۔“

”تب تو تیرے عیش ہو گئے۔“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔

احمد نے دبی زبان سے کہا۔ ”وہ ہے توجی ہندنی پر دل کی بہت بھلی ہے۔“

رحیم داد چونک پڑا، پرائے لقمہ ہاتھ میں رہ گیا۔ ”زمیں دارنی ہندنی ہے۔ توجی کہہ رہا ہے؟“

”چوہدری! میں تجھ سے کوئی جھوٹ بول رہا ہوں۔ پر اب وہ ہندنی نہیں رہی۔ زمیں دار سے نکاح پڑھانے سے پہلے مسلمان ہو گئی تھی۔ اپنی مسجد کے ملاں نے اسے کلمہ پڑھا کر مسلمان بنایا تھا۔“ احمد نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں اُل کر دیکھا۔ ”میں توجی اس پنڈ کا پرانا رہنے والا

ہوں۔ اس زمانے سے رہتا ہوں جب پاکستان نہیں بنا تھا۔ تب یہ ساری زمیں، زمیں دارنی کے پیو کی تھی۔ یہ حویلی بھی اسی کی تھی۔ بہت دُعا زمیں دار ہوتا تھا وہ۔“

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ گوگو کے عالم میں بولا۔ ”تیری باتیں سمجھ نہیں آئیں۔“

”چوہدری! میں نے غلط گل نہیں کی۔“ احمد نے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ تو سارا پنڈ جانتا ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں چلا؟“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”پر زمیں دارنی اتنی بھلی ہے کوئی بھی اس کے بارے میں ایسی گل نہیں کرتا۔ سب اس سے پیار کرتے ہیں۔ بھین جی کہتے ہیں۔ سچ مان، میں نے یہ گل برائی سے نہیں کہی۔ بس ایسے ہی زبان سے نکل گئی۔“ اس نے ایک ہاتھ سے دونوں کان باری باری چھو کر گردن ہلائی۔ ”توبہ جی توبہ۔ رہا جائے، زمیں دارنی کا تو میں کبھی برا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

رحیم داد نے خاموشی سے ناشتا ختم کیا۔ احمد خالی برتن لے گیا۔ وہ دیر تک احمد کی باتوں پر غور کرتا رہا پھر اٹھ کر باغ میں گیا۔ وہاں بھی وہ احمد کی باتوں کی روشنی میں جیلہ اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچتا رہا۔

رحیم داد نے جیلہ کے بارے میں نہ کسی سے کرید کر پوچھا، نہ احمد کی باتوں کی تصدیق چاہی۔ اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اسے کچھ عرصے کے لیے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی، وہ اسے مل گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام کاج تو تھا نہیں، کمرے کا دروازہ بند کرتا اور اطمینان سے چوہدری نور الہی کے دستخط کی مشق کرتا رہتا۔

رفتہ رفتہ رحیم داد کو اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ نور الہی کے دستخط کی ہو ہو نقل کرنے لگا۔ اس کامیابی پر وہ خوش بھی تھا، مطمئن بھی۔

ایک شام رحیم داد اللہ وسایا کے ساتھ باغ میں بیٹھا تھا۔ اس نے دبی زبان سے رخصت ہونے کی خواہش ظاہر کی، مگر اللہ وسایا نے اصرار کیا تو اس نے مزید زور نہیں دیا۔ وہ فی الحال وہاں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ صرف یہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اللہ وسایا اس سے اکتا تو نہیں گیا۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ اللہ وسایا اور جیلہ ہر طرح اس کی دل جوئی کرتے، پورا خیال رکھتے کہ کسی طرح اسے تکلیف نہ ہو، اس کے دل کو نہیں پہنچے۔

رحیم داد کا وقت اچھا کٹ رہا تھا۔ مہمان خانے میں اسے ہر طرح کا آرام اور سکون میسر تھا البتہ مکھا بری طرح کھلتا۔ بار بار کے انکار کے باوجود وہ رحیم داد کے پاس آتا، گزرتا، اپنی پتا سنا تا۔ احسان شاہ نے ابھی تک اس کی بیوی واپس نہیں کی تھی۔ اس کے پیٹ میں چوتھا بچہ بھی آچکا تھا۔

یہ بات بھی اسے ماکھانے بتائی تھی۔ مگر رحیم داد اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ وسایا بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ نہایت صاف گوئی سے اپنی مجبوری بتا چکا تھا۔



گرمی خوب بڑھ چکی تھی۔ درود یوار سے چنگاریاں نکلتیں۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اللہ وسایا کی زمینوں پر خریف کی فصل کے لیے کئی کئی کھاد، کپاس اور باجرے کی بوائی ہو رہی تھی۔ وہ کھیتوں میں کھڑے ہو کر اپنے سامنے بیج ڈلواتا، طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ دن دن بھر چلا جاتی دھوپ اور لو میں کھڑے رہنے سے اس کا چہرہ جھلس کر سانولا پڑ گیا تھا۔

جیلہ نے سرکاری اسکولوں کی طرح اپنے اسکول میں بھی موسم گرما کی تعطیل کر دی تھی۔ اسکول بند تھا۔ وہ اکثر اللہ وسایا کے ساتھ کھیتوں پر نکل جاتی اور ادھر ادھر گھومتی پھرتی۔ رحیم داد نے دونوں کو جب بھی کھیتوں سے آتے دیکھا، پسینے سے شرابور اور دھول سے اٹا ہوا پایا۔

ان دنوں اللہ وسایا سے رحیم داد کی ملاقات عام طور پر شام کو ہوتی۔ اللہ وسایا کبھی کبھی رات کا کھانا رحیم داد کے ساتھ مہمان خانے کے صحن میں بیٹھ کر کھاتا۔ زیادہ گرمی ہوتی تو کھانا باغ میں بھی کھایا جاتا۔ گھاس پر دری بچھا دی جاتی، وسط میں چھوٹے پایوں کی لمبی میز رکھ دی جاتی۔ اس پر کھانا چنا جاتا۔ سب دری پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ جیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ موجود ہوتی۔ جس روز باغ میں کھانا کھایا جاتا، رحیم داد بہت خوش ہوتا۔ خود کو اللہ وسایا کے کنبے کا فرد سمجھتا۔ اللہ وسایا اور جیلہ کے رویے سے بھی رحیم داد کو بیگانگی مطلق محسوس نہ ہوتی۔

ایک صبح اللہ وسایا مہمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا۔ رحیم داد ذرا ہی دیر پہلے ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ خلاف معمول اللہ وسایا کے ہاتھ میں دو ٹالی بندوق تھی۔ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

”سویرے سویرے بندوک لے کر کیسے نکل آیا؟ شکار پر جانے کا ارادہ ہے؟“

اللہ وسایا نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ”محکمہ آباد کاری میں میری زمین اور جائیداد کا مکدمہ چل رہا ہے۔ اس سلسلے میں ملتان جا رہا ہوں۔ کل صبح پیشی ہے۔“

”کب تک واپسی ہوگی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”دو تین روز تو لگ ہی جائیں گے۔ اگر تاریخ پڑگئی اور لی پیشی نہ لگی تو ہفتہ بھر ٹھہرنا پڑے گا۔ وکیل یہی بتاتا تھا۔ میں دوپہر کو روٹی کھا کر ملتان کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔“

”بندوک اپنی حفاظت کے لیے لے جا رہا ہے؟ مکدمہ بازی چل رہی ہو تو حفاظت کے لیے اسلحہ رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

”میرا مکدمہ ایسا نہیں جس میں کسی جھگڑے کا ذرہ ہو۔ مکدمہ سرکار کے ساتھ چل رہا ہے۔“ اللہ وسایا نے مطلع کیا۔ ”ویسے سفر میں اپنے ساتھ میں بھرا ہوا پستول رکھتا ہوں۔ دو نوکر بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ وہ بھی مسلح ہوں گے۔ بندوک تو میں تیرے لیے لایا تھا۔ آج کل ڈکیتیاں بہت ہو رہی ہیں۔ فصل کی واڑھی کے بعد عام طور پر ڈکیتی کی وارداتیں بڑھ بھی جاتی ہیں۔ سنا ہے، لائل پور سے ڈکیتوں کی ایک دھاڑ ادھر آئی ہوئی ہے۔ اس نے بڑا رولا کر رکھا ہے۔ روز ہی کہیں نہ کہیں سے ڈکیتی کی خبر سننے میں آتی ہے۔ ایک نیا چکر بھی چل رہا ہے وہ بھی کم خطرناک نہیں۔“

”وہ کیسا چکر ہے؟ کسی سے تیرا جھگڑا منٹا ہو گیا؟“

”میرا تو نہیں پر میرے مزارعے کا دو اور اس کے پتر صابر کے ساتھ جھگڑا چل رہا ہے۔ ہے تو پرانی دشمنی پر اب زیادہ سنگین ہو گئی ہے۔“

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ ”جھگڑا ہوا کس بات پر؟“

”میں نے بتایا تا، پرانی دشمنی ہے۔ لی کہانی ہے۔ ڈیڑھ پونے دو سال ادھر کی بات ہے، کا دو کی دھمی مجید اس کو پڑوس کے چک کا ایک نوجوان طاہر اٹھا کر لے گیا۔“

”زبردستی اٹھا لے گیا یا آپس میں یاری آشنائی تھی؟“

”یاری آشنائی ہی تھی۔“ اللہ وسایا ہنسا۔ ”میں نے تو یہی سنا تھا پر کا دو اور اس کا پتر نہیں مانتا۔ مجید اس کی واپسی کے لیے میں نے صلح صفائی کی بھی کوشش کی۔ مگر طاہر اور اس کا پیو راضی نہیں ہوئے۔ کہتے تھے، مجید اس اپنی مرضی سے آئی ہے، یہاں راضی خوشی ہے۔“

”ایسی گل تھی تو کا دو اور اس کے پتر کو چاہئے تھا کہ طاہر سے مجید اس کا ویاہ کر دیتا۔“

”پر کا دو اس کا ویاہ اپنے بھانجے سے کرنا چاہتا تھا۔ طاہر اسے بالکل پسند نہیں۔ ویسے اصلی گل ایسہ تھی کہ مجید اس کے بھاگ جانے سے کا دو کی بہت بدنامی ہوئی۔ کئی روز تو شرم کے مارے گھر

سے نہیں نکلا۔“

”عزت بھی تو آخر کوئی چیز ہوتی ہے کا دو اور اس کے گھر والوں کی زبردست بے عزتی ہوئی، اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

”یہی عزت کا معاملہ تو سارے جھگڑے کی جڑ تھا۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”کا دو کو رہ رہ کر اسی پر گھماتا تھا۔ بات کرتا تو منہ سے جھاگ نکلتے، آنکھیں لال انگارا ہو جاتیں۔ بات ختم ہونے کی بجائے بڑھتی گئی۔ کا دو اور اس کا پتر مجید اس کو کسی نہ کسی طرح واپس لانا چاہتے تھے تاکہ طاہر اور اس کے پیو کو نچا دکھا سکیں۔ پاس پڑوس اور برادری میں ان کا سراونچا ہو جائے اسی چکر میں دو مہینے سے اوپر ہو گئے۔“

”کا دو نے تھانے میں پرچہ چاک نہیں کرایا؟“

”نہیں۔ وہ کتنا تھا، تھانے دار کچھ نہیں کرے گا۔ طاہر نے اس کی مٹھی گرم کر دی ہے۔“

اللہ وسایا بتاتا رہا۔ ”پر کا دو چپ کر کے نہ بیٹھا۔ وہ اور اس کا پتر تاک میں لگے رہے۔ طاہر ایک روز پاک پترن بابا فرید کی درگاہ پر گیا۔ مجید اس کے ساتھ تھی۔ دونوں منت ماننے گئے تھے۔ کا دو کو پتر چل گیا۔ وہ اپنے پتر کے ساتھ نکلا۔ ادھر طاہر اور مجید اس کو واپسی میں دیر ہو گئی۔ لاری سے اتر کر دونوں پنڈ کی طرف چلے تو کافی رات ہو گئی۔ کا دو اور اس کا پتر ایک سسنان جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچے، طاہر کو دونوں نے گھیر لیا۔ وہ نہتا بھی تھا۔ کلوے کے پتلے ہی وار میں گر پڑا۔ کا دو اور صابر گئے سے پاگل ہو رہے تھے۔ انھوں نے طاہر کے ہاتھ کاٹے، پیر کاٹے اور آنکھیں بھی نکال لیں۔ اس کی لاش جھاڑیوں میں ڈالی اور مجید اس کو اپنے ساتھ لے آئے۔“

”پولیس نہیں آئی؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”کیوں نہیں آئی۔“ اللہ وسایا نے جواب دیا۔ ”کا دو اور اس کے پتر صابر کو گرفتار کر کے لے گئی۔ دونوں پر طاہر کے کتل کا کیس چلایا۔ بعد میں سیشن سے دونوں کی ضمانت ہو گئی۔ ضمانت میں نے ہی دی تھی۔ دونوں میرے مزارعے جو تھے۔ دوسرے یہ کہ کا دو کی گھر والی صبح شام جیلہ کے سامنے آکر روتی۔ تین نوں پتہ ہے، جیلہ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتی۔ وہ مجھ سے کہتی اور اس کا کما میں ٹال نہیں سکتا۔ مجھے کا دو کے کیس کے لیے وکیل بھی کرنا پڑا۔ دوسری طرف طاہر کے پنڈ کا زمیں دار بھی مددگار بن کر سامنے آگیا۔ سال بھر سے اوپر مکدمہ چلا۔ یعنی گواہ تو کوئی تھا نہیں۔ شک کا فائدہ ملزموں کو ملا۔ عدالت نے کا دو اور صابر کو پچھلے ہفتے بری کر دیا۔ جب دونوں گھر پہنچے تو جھگڑا

ڈالا گیا۔ جشن منایا گیا۔ تجھے بھی پتہ چلا ہوگا۔

”نہیں، میں کسی سے ملتا جلتا ہی کب ہوں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر ادھر تو خوشیاں منائی جا رہی ہیں، ادھر طاہر کے گھر والوں کے سینوں میں آگ بھڑک رہی ہے۔ وہ طاہر کے خون کا بدلہ لینے کے لیے تاک میں ہیں۔ کاوہ اور اس کا پتر تو ہر وکت چوکس رہتے ہیں۔“ اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی نکلنے لگی۔ ”میں جب تک باہر رہوں تو بھی چوکس رہنا، خاص طور پر رات کو۔ ویسے بندوک چلانا تو جانتا ہی ہوگا؟ تو نے بھی زمیں داری کی ہے۔“

”برسوں شکار کھیلتا رہا ہوں۔“ رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ ”تیں نوں پتہ نہیں، میں نے کیسی زمیں داری کی ہے۔“ اس نے اپنے ہنسنے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تو نے میرا کلیم نہیں دیکھا۔ سو مرنے سے اوپر اپنا کلیم ہے۔“

”سو مرنے سے اوپر؟“ اللہ وسایا نے حیرت سے چونک کر پوچھا۔

”یہ کانڈ رکھے ہیں، دیکھ لے۔“ رحیم داد نے فخر سے گردن اونچی کی۔

”میں نوں بالکل پتہ نہ تھا، تو اتنا ڈاڑھیں دار ہوتا تھا۔“ اللہ وسایا نے بندوق رحیم داد کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”اسے اپنے پاس رکھ لے۔ اور یہ رہی کار تو سوں کی تھیلی۔“ اس نے چمڑے کی تھیلی بھی رحیم داد کو دے دی۔ ”ویسے بندوک استعمال کرنے کی تجھے ضرورت نہیں پڑے گی۔ پر خطرہ ہو تو ہمیشہ ہوشیار اور چوکس رہنا چاہئے اور دیکھ، یہ خیال رکھنا، بندوک بھری ہوئی ہے۔ ویسے رات کو حویلی کی آگواڑے پہرا رہتا ہے۔ یوں بھی بہت نوکر چاکر ہیں۔ تیری ایک ہانک پر وہ کیا، پورا پنڈ نکل آئے گا۔ گھبرانے کی کوئی گل بات نہیں۔“

”فکر نہ کر میں ڈرنے والا بندہ نہیں۔“ رحیم داد نے بڑے اعتماد سے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔

”کتنی بار گولی چل چکی ہے۔ کبھی پیچھے نہیں ہٹا۔ ہمیشہ جم کر لڑا۔“

”ویسے دیکھنے میں بھی توجہ دار لگتا ہے۔ اچھا نکلوا جوان ہے۔“

اللہ وسایا نے غلط نہیں کہا تھا۔ حویلی میں رہ کر رحیم داد کا رنگ بھی نکھر گیا تھا۔ جسم پر خوب گوشت چڑھ گیا تھا۔ وہ خاصا ہٹا نکل لگتا تھا۔ ناشتے کے علاوہ دونوں وقت لذیذ اور مرغین غذا کھانے کو ملتی۔ کوئی کام کاج نہ کرنا پڑتا۔ تمام دن کمرے میں بستر پر لیٹا رہتا یا مقتول چوہدری نور الہی کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا۔ صبح شام باغ میں گھٹنے دو گھٹنے بیٹھتا۔ زندگی نہایت عیش اور آرام سے بسر ہو رہی تھی۔

اللہ وسایا اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔ رحیم داد نے بندوق کھونٹی پر دیوار کے ساتھ نکا دی مگر کار توں نکال کر تھیلی میں ڈال دیئے اور تھیلی سرہانے بستر کے نیچے رکھ دی۔ پچھلی رات سے احمد کو بخار تھا۔ اس کی غیر حاضری میں حویلی کی ایک بوڑھی نوکرانی کھانا لائی تھی۔ دوسرے کام بھی اسی نے کئے۔

اللہ وسایا پروگرام کے مطابق اسی روز ملتان چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں رہا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بڑا جس تھا۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔

رحیم داد نے دن ڈھلے غسل کیا۔ اگلے کپڑے پہنے اور باغ میں بھیجی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد جیلہ بھی آگئی۔ گڈو اور نینا، دونوں بچے اس کے ہم راہ تھے۔ جیلہ ملل کا کڑھا ہوا سفید کرتا اور فیروزی شلوار پہنے ہوئے تھی، دوپٹا بھی فیروزی تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو تڑپ کر رہ گیا۔

جیلہ دور سے چل کر آئی تھی۔ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلما رہے تھے۔ رخساروں پر سرخی بکھری ہوئی تھی۔ کرتا بدن سے چپکا ہوا تھا۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں وہ خوب صورت اور دل آرا نظر آ رہی تھی۔

”زمیں دارنی! اٹھئی ہوئی دکھائی پڑ رہی ہے۔ کہاں گئی تھی؟“

”میں کاوہ کی دھی مجیداں کو دوائی دینے گئی تھی، اسے بخار ہے۔ لگتا ہے لوگ لگ گئی۔“

”یہ مجیداں وہی تو نہیں ہے جس کے لیے طاہر کا کتل ہوا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ہاں وہی ہے۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”تیں نوں کیسے پتہ چلا؟“

”اللہ وسایا نے سویرے بتایا تھا۔ لگتا ہے، مجیداں بہت سوہنی ہوگی۔ جیہی تو اس کے لیے خون خرابہ ہوا۔“

”ایسی تو اس کی سندر تا نہیں کہ خون خرابہ ہو۔“ وہ ہسکرا کر بولی۔

رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ ”وہ تیری طرح تو سوہنی نہیں ہوگی۔ تیری تو بات ہی اور ہے۔ اس پنڈ میں کیا، دور دور تک کوئی اتنی سوہنی زنانی نہ ہوگی۔“ دل کی بات زبان پر آگئی۔

”میں اب کیا رہ گئی۔“ اس نے شرما کر آچٹل سر پر ڈال لیا۔ ”میری سندر تا تو نینا اور گڈو ہیں۔

عورت جب ماں بن جاتی ہے تو اس کی سندر تا اس کے بچے چوری چوری لے جاتے ہیں۔ سدا ایسا

ہی ہوتا ہے۔“

رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلنے کی کوشش کی۔ ”پر مجیداں کے بارے میں جو کچھ ہوا برا ہوا۔“

”بہت برا ہوا۔“ جیلہ نے اظہارِ تاسف کیا۔ ”جب طاہر کے ساتھ چلی گئی تو میں نے کاڈو کو بہت سمجھایا، جو ہوتا تھا، ہو گیا۔ طاہر کو اپنا بنالے۔ پر وہ اسے جنوائی ماننے کو کسی طرح تیار نہ ہوا۔ عجب اکھڑ بندہ ہے اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ طاہر کا خون کیا اور پیو پتروں پھانسی پر لٹکنے سے بال بال بچ نکلے۔ ضمانت سے پہلے مینوں جیل میں بند رہے۔ آگے دیکھ، کیا ہوتا ہے۔ دشمنی نے جڑ تو پکڑ لی۔ ایک بار ایسی دشمنی پڑ جائے تو پیڑھیوں تک خون خرابے کا سلسلہ چلتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہے۔ کاڈو اور اس کے پتر کی جان کو ہر دم خطرہ ہے۔ دوسری پارٹی بدلہ لینے کی ناک میں لگی ہوگی۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔“ جیلہ نے اس کی تائید کی۔ ”اور یہ خون خرابہ کر کے ملا کیا۔ جان بھی خطرے میں اور ادھر مجید اداں رو رو کر آدھی بھی نہیں رہی۔ طاہر کا خون اسی کے کارن ہوا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ وہ یہ بات کیسے بھول سکتی ہے۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ چنگا گبرو جوان تھا۔“

”بات یہ ہے جی! جب غیرت کا سوال سامنے آجاتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بس ایک ہی چکر سر پر سوار رہتا ہے۔“

جیلہ خاموش رہی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔

وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ شام کا اندھیرا پھیلنے ہی اٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ بچے بھی اس کے ساتھ چلے گئے۔ رحیم داد مسمان خانے میں گیا۔ کھانا کھایا اور چھت پر چلا گیا۔ جب سے گرمی بڑھی تھی، اس نے چھت پر چارپائی ڈلوادی تھی اور اسی پر سوتا تھا۔ شام ہوتے ہی احمد یا کوئی دوسرا نوکر چھت پر چھڑکاؤ کرتا اور صاف ستھرا بستر لگا دیتا۔ رات ہوتے ہوتے چھت اتنی ٹھنڈی ہو جاتی تھی کہ گرم گرم بھگے نہیں نکلتے تھے۔



اس رات اس کچھ زیادہ تھی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بھری ہوئی بندوق اس کے سرہانے رکھی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ غنودگی میں رحیم داد کو کھٹکا محسوس ہوا۔ چارپائی کا سرہانا آنگن کی طرف تھا۔ کھٹکا اسی طرف ہوا تھا۔ رحیم داد کی نیند اچاٹ گئی۔ وہ چند لمحے خاموش لیٹا رہا۔ آسمان پر ابھی تک گاڑھا گاڑھا غبار چھایا تھا۔ ہوا دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔

حویلی کی بالائی منزل کے ایک کمرے میں مدھم روشنی جھللا رہی تھی۔ مسمان خانے کا اگلا حصہ

صاف نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے گردن ذرا سی اٹھائی، جھک کر نیچے دیکھا۔ وہ سرا سید ہو گیا۔ اسے ایک آدمی چار دیواری کی بلندی سے چمٹا ہوا نظر آیا۔ وہ ہولے سے پھسل کر نیچے آنگن میں اترا۔ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ بیرونی دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چار آدمی اندر داخل ہوئے۔

رحیم داد نے جھٹ گردن جھکا لی۔ چند لمحے دم بخود پڑا رہا۔ اس نے خوف اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کی۔ ایک بار پھر گردن اٹھائی اور منڈیر کی آڑ لے کر چوکنٹا نظروں سے پانچوں کو دیکھنے لگا۔ ان کے چروں پر ڈھائے بندھے تھے۔ تین آدمی دھوتیاں اور لمبے لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں قرابین اور بندوقیں دبی تھیں۔ دو قمیصیں اور شلواریں پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس کوئی اسلحہ نہیں تھا۔ مگر جو مسلح تھے، ان میں دو سکھ بھی تھے۔ ان کے بڑے بڑے کیس ڈھانٹوں سے صاف نظر آرہے تھے۔ دھندلی روشنی میں وہ ان کے بارے میں اس سے زیادہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ سکھوں کو دیکھ کر اسے سخت حیرت ہوئی۔ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا کہ وہ کیوں آئے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟

پانچوں کچھ دیر آنگن میں خاموش کھڑے رہے۔ جب آس پاس کوئی کھٹکا نہیں ہوا تو ایک مسلح شخص آگے بڑھا اور بندر کی طرح اچھل کر قد آدم دیوار پر چڑھ گیا۔ یہ دیوار مسمان خانے کو حویلی سے جدا کرتی تھی۔ اس کا دروازہ حویلی کی جانب سے بند تھا۔

آنگن میں اب صرف چار افراد رہ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد درمیانی دیوار کا بند دروازہ کھلا اور وہ شخص باہر آگیا جو دیوار سے حویلی کے اندر کودا تھا۔ اس کے نکلنے ہی ان دونوں نے، جو بظاہر غیر مسلح تھے، قمیصوں کے اندر ہاتھ ڈال کر کمر سے لٹکتے ہوئے پستول نکالے اور تینوں کو بیرونی دروازے کی جانب جانے کا اشارہ کیا۔ وہ چلے گئے تو دونوں حویلی کے اندر داخل ہو گئے۔

رحیم داد کے پاس بھری ہوئی بندوق موجود تھی۔ مگر وہ اکیلا تھا اور پانچوں نوادہ پوری طرح مسلح تھے۔ تین دروازے پر پہرہ دے رہے تھے، دو اندر جا چکے تھے۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ رات تاریک اور بوجھل تھی۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ سنانے میں حویلی کی بالائی منزل سے گھنٹی ہوئی نسوانی چیخ بلند ہوئی۔ رحیم داد بے قرار ہو گیا۔ بالائی منزل پر صرف دو کمرے تھے۔ گرمی کے موسم میں اللہ وسایا، بیوی بچوں کے ساتھ رات کو کمروں کے سامنے کھلی چھت پر سوتا تھا مگر وہ لمٹان میں تھا۔ بالائی منزل پر صرف بچے تھے اور جمیلہ تھی۔ چیخ جمیلہ ہی کی ہو سکتی تھی۔

رحیم داد کو خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ اس نے سرہانے سے بھری ہوئی بندوق اٹھائی۔

نظریں کمرے کے دروازے پر لگی تھیں۔

دروازے کے پیچھے سے بہت مدھم لہجے میں باتوں کی مبہم آوازیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم داد نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے جیلہ کسی مصیبت میں مبتلا ہے۔

اس نے ہندوق سنبھال کر کمرے کے دروازے کا نشانہ لیا اور کبڑوں کی طرح جھکا جھکا کرے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازے پر زور سے ٹھوکر ماری۔ دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں دو آدمی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ان کے عین سامنے پلنگ پر پیر لٹکائے جیلہ بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے نشانہ باندھ کر دونوں کو ہندوق کی زد پر رکھ لیا۔ وہ بھونچکا رہ گئے۔ ان کے چروں پر دہشت اور پریشانی طاری ہو گئی۔ رحیم داد ان کے سروں پر ملک الموت بنا کھڑا تھا اور انھیں قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔

جیلہ نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوف تھا، نہ گھبراہٹ تھی۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! بندوک ہٹالے۔“
رحیم داد نے ہندوق نیچے کر لی۔ کمرے میں یسپ روشن تھا۔ مگر اس کی لومدھم تھی۔ رحیم داد نے دونوں اجنبیوں کا جائزہ لیا۔ انھوں نے ڈھائے ہٹا دیے تھے۔ اب ان کے چہرے صاف نظر آرہے تھے۔ ان میں سے ایک گورا چٹا جوان تھا۔ اس کی ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔ سر کے بال آڑی مانگ نکال کر جمائے گئے تھے۔ قد اونچا، جسم مضبوط اور بھرا بھرا تھا۔ وہ ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی۔ ہاتھ کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جڑا ہوا پتھر جگمگا رہا تھا۔ دوسرا شخص ادھیڑ تھا۔ اس کے سر کے بال کھجوری تھے۔ مونچھیں گھنی تھیں، ان میں کہیں کہیں سفید بال جھلک رہے تھے۔ چہرے پر عمر رفتہ کی دھندلی پرچھائیاں تھیں۔ وضع قطع سے وہ بھی کھاتا پیتا آدمی لگتا تھا۔ جیلہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ ”یہ میرا چاچا ہے اور یہ میرا ویر ہریال ہے۔“ اس نے دوسرے کی سمت نظریں گھمائیں۔ ”دونوں مجھے لینے آئے ہیں۔“ رحیم داد نے محسوس کیا کہ ہریال کے چہرے سے جیلہ کی شباب صاف جھلک رہی ہے۔

جیلہ کے پچانے رحیم داد کو بغور دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ حویلی کا چوکیدار ہے؟“
”نہیں چاچا!“ جیلہ نے تردید کی۔ ”ایسی گل نہ کر۔ چوہدری، ہمارا مہمان ہے۔ سمجھو گھری کا بندہ ہے۔“ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! کھڑا کیوں ہے، بیٹھ جا۔“

آہستہ سے اتر کر نیچے آیا۔ چند لمحے دم سادھے پڑا رہا۔ پھر زمین پر دھیرے دھیرے کھسکتا ہوا چھت کی منڈیر کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے گردن قدرے بلند کی۔ آنگن میں نظریں دوڑائیں۔ بیرونی دروازہ کھلا تھا۔ مہمان خانہ بالکل خالی تھا۔ البتہ دھندلی روشنی میں ایک شخص باہر اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پشت نظر آرہی تھی۔ رحیم داد ٹکلی باندھے اسے تکتا رہا مگر اس شخص نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

رحیم داد کھسکتا ہوا زینے کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہندوق دبلی تھی۔ نظریں مسلح شخص کی جانب اٹھی ہوئی تھیں جو دروازے کی جانب پیٹھ موڑے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے ہولے ہولے قدم رکھتے ہوئے بیڑھیاں طے کیں۔ نیچے اترا۔ آنگن میں پہنچ کر وہ دیوار سے لگ گیا۔ اس جگہ اندھیرا بہت گہرا تھا۔

وہ دم سادھے دیوار سے چپکا ہوا دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ حویلی کے اندر کھلنے والے دروازے پر پہنچا۔ قریب پہنچ کر اس نے حویلی کے اندر نظر ڈالی۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ اس نے مڑ کر جو کس نظروں سے بیرونی دروازے پر کھڑے ہوئے مسلح آدمی کو دیکھا اور بھپاک سے حویلی میں داخل ہو گیا۔ حویلی کا اندرونی حصہ وہ پہلے بھی کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے کسی اور سمت جانے کے بجائے دالان کا رخ کیا جہاں اوپر جانے کا زینہ تھا۔

دالان بالکل خالی تھا۔ سامنے وسیع صحن تھا۔ اس میں دور دور تک چارپائیاں پڑی تھیں جن پر نوکرانیاں سو رہی تھیں۔ گرمی کی راتوں میں ان کے شوہر اور جوان بیٹے باہر میدان میں چارپائیاں ڈال کر سوتے تھے۔ رحیم داد نے صحن میں پڑی ہوئی چارپائیوں پر مطلق توجہ نہیں دی۔ نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر زینے سے اوپر پہنچا۔ سامنے کھلی چھت تھی۔ دو پلنگوں پر دونوں بچے گرمی نیند سو رہے تھے۔ لیکن جیلہ کا پلنگ خالی تھا۔ وہ اسے کہیں نظر نہیں آئی۔ پلنگوں کے قریب ہی کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔

رحیم داد نے ہندوق پر ہاتھ کی گرفت مضبوط کی۔ زینے کی مٹی سے باہر نکلا۔ جھکا جھکا آگے بڑھا۔ اسی وقت کمرے کا دروازہ چرچاٹا ہوا کھلا۔ رحیم داد جھٹ ایک پلنگ کی آڑ میں دبک گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا۔ رحیم داد دم بخود بیٹھا جو کتنا نظروں سے دروازہ تکتا رہا۔



گرم اور غبار آلود رات دم بخود کھڑی تھی۔ حویلی پر گہرا سکوت طاری تھا۔ دونوں بچے پلنگوں پر بے خبر سو رہے تھے۔ جیلہ کمرے کے اندر تھی۔ رحیم داد ایک پلنگ کی آڑ میں دبکا بیٹھا تھا۔ اس کی

پاروتی تو اسی روز مرگئی تھی جب تو اسے بصیر پور سٹیشن پر بلوائیوں کے ہاتھوں میں اکیلا چھوڑ کر ستلج پار چلا گیا تھا۔

”تجھے پتہ ہے، وہ کیسا کڑا سے تھا۔“ ہریال نے صفائی پیش کی۔ ”میں بالکل مجبور تھا۔ یہ تو سوچ، کوئی بھائی اپنی بھین کو اس پر کار چھوڑ سکتا ہے۔ یہ گل میں نے تجھے پہلے بھی بتائی ہے۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا۔ ستلج پار کرنے سے پہلے میں نے تجھے بار بار پکارا تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے لہجے میں درد کی کک تھی۔ ”پارو! اٹھ سال سے تو ہم سب کو سزا دے رہی ہے۔ اب تو چھما کر دے۔“

”بھاجی! تو تین بار پہلے بھی آچکا ہے۔“ جیلہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”دوبار پولیس اور سرکاری افسروں کو لے کر آیا۔ تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے، میں نے اب یہاں سے نہیں جانا۔ میں اب تیری پارو نہیں رہی۔ اب میں جیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھروالی اور نینا اور گندو کی ماں۔“ اس کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ ”میں ۲۲ برس تک پاروتی رہی۔ ۱۹۴۷ء میں پاروتی کا مرن ہو گیا۔ اور میں نے جیلہ کے روپ میں دوسرا جنم لیا۔ اب تو مجھے یہاں سے لے جائے گا۔ ہر دواریا کاشی میں پنڈتوں اور پردہتوں کے ہاتھوں میری شدھی کرائے گا۔ جیلہ کو قتل کر کے ایک بار فی پاروتی بنائے گا۔“ اس کی آواز میں تلخی تھی۔ ”بھاجی! میں کتنی بار قتل ہوں گی، کتنی بار مروں گی۔ یہ تو سوچ، مجھے وہاں کون چھما دے گا۔ ایسی نار کو کون چھما دے سکتا ہے جو اٹھ برس تک ایک مسلمان کی گھروالی رہ چکی ہو اور اس کے دو بچوں کی ماں بھی ہو۔“

”تو چتنا نہ کر پارو! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ چچا نے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”ہم نے تیرے سنبوگ کے لیے ور بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ اپنی ہی جات برادری کا ہے، بہت بھلا....“

جیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”چاچا! توں میرے ساتھ میرے بچوں کو بھی تباہ کرنا چاہتا ہے۔ اتنا تو سوچ، ان دونوں کا اس معاملے میں کیا دوش ہے؟“

”صاف گل امہ ہے پارو! ہم سے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہمارے جیتے جی تو ایک مسئلے کے گھر میں رہے۔“ چچا کا لہجہ تند اور تیز تھا۔ ”اور وہ بھی ہمارے ایک مزارعے کی پتی بن کر۔ کچھ تو اپنے دھرم کا اپنے اونچے خاندان کا دھیان کر۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہا، کیسا کجنگ ہے۔“

”چاچا! تو بھی ٹھیک کہتا ہے۔“ جیلہ نے دکھ سے کہا۔ ”جب بیٹیوں اور حسینوں کو ننگا کر دیا جائے اور بازاروں سے ان کا جلوس نکال کر دھرم کا نام اونچا کیا جائے۔ دھرم کے نام پر کنیاؤں اور مددوں کی آبرو لوٹی جائے۔ کتوں کی طرح ان کو محسوس ڈا جائے۔ ان کی بڑیاں چچوڑی جائیں تو یہ

رحیم داد نے دیوار کے قریب رکھے ہوئے سرکنڈوں کے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے جیلہ کو دیکھا اور بڑے جوش سے بولا۔ ”جب تک اللہ وسایا نہیں آئے گا، میں تجھے یہاں سے نہیں جانے دوں گا۔“ اس نے بندوق زانو پر رکھی۔ ”یہ تجھے یہاں سے مجھے ختم کر کے ہی لے جاسکتے ہیں۔“

کمرے میں پر اسرار سکوت چھا گیا۔ ہریال اور اس کا چچا چپ بیٹھے رہے مگر جیلہ خاموش نہیں رہی۔ اس نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! تو چپ کر۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ ”اس معاملے میں نہ بول۔ تجھے چتنا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ میرا اپنا معاملہ ہے۔ اس میں تو اللہ وسایا بھی نہیں بول سکتا۔“

چچا نے ہنستے ہوئے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر ہریال نے کھٹاکر جیلہ کو مخاطب کیا۔ ”پارو! کیا سوچا تو نے؟ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا اور تلخ ہو گیا۔

”آج ہم تجھے لے کر ہی جائیں گے۔“

”بھاجی! دھیرے بول۔ جاگ ہو گئی تو پورا پنڈا اکٹھا ہو جائے گا۔“ جیلہ نے نرم لہجے میں اسے خبردار کیا۔ ”دھیرج سے گل کر، دھیرج سے۔“

چچا بولا۔ ”تیرا پتا تیرے لیے ترپتا ہوا پچھلے برس سورگ باشی ہو گیا۔ آخری سے اس کی زبان پر تیرا ہی نام تھا۔ مزمز کر ادھر ادھر دیکھتا تھا۔ تجھے ڈھونڈتا تھا۔ ایک ایک سے پوچھتا تھا، میری پارو کہاں ہے؟ کیسے بتاؤں تیرے لیے وہ کیسا بیکل تھا۔ میں تو کہتا ہوں، مگر کبھی اس کی آتما کو شانتی نہیں ملی ہوگی۔“ اس کے لہجے میں دبا دبا کرب تھا۔ ”پاروتی! تو بہت کٹھور ہے۔ تیرے سینے میں ہر دے نہیں، پتھر ہے۔ تو نے میرے بھائی کو مار ڈالا۔“

”ماتا جی کا بھی سمجھ لے، چل چلاؤ ہے۔“ بھائی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”تیرے لیے روتے روتے اس کی آنکھوں کی روشنی اتنی کم ہو گئی ہے کہ ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں سکتی۔ اتنی کمزور اور بیمار لگتی ہے، دیکھ گئی تو پہچان نہیں پائے گی۔ اس کا تو کب کا دیہانت ہو گیا ہوتا پر اس کا دم تو تجھ میں اٹکا ہے۔“ ہریال کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ”پارو! چل کر ماتا جی کو بچالے۔ پتا چھوٹا، ماتا بھی چھوٹ جائے گی۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جیلہ سر جھکا کر رونے لگی۔ بوجھل فضا کرب ناک ہو گئی۔ کمرہ مرگھٹ کی طرح دیران نظر آنے لگا۔ ہریال نے گہری سانس بھری، آنسو پونچھے اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”پارو! میری بھین!“

وہ پھر رونے لگا۔

جیلہ نے ہریال کو دیکھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”بھاجی! تیری بھین

ہریال پیار سے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جیلہ سکیوں کے ساتھ رک رک کر کستی رہی۔ ”ویرا! میرے سینے میں ہر دے نہیں رہا۔ میں زخموں سے چور چور ہو چکی ہوں۔ مجھے اور دکھ نہ پہنچا۔ میرے سارے زخم کھل جائیں گے۔“ وہ ہانپنے لگی۔ ”مجھ مری ہوئی کو ایک بار پھر مارنا چاہتا ہے تو مار دے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی، کچھ بھی نہیں۔“

وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ بھائی بھی بے قرار ہو کر رو پڑا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔ کمرے میں سسکیاں ابھرتی رہیں۔ چچا بھی خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کی آنکھیں بھی اشکبار ہو گئیں۔ وہ روتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ نتیجے کے قریب گیا اور اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

”ہریال! تو کب تک روتا رہے گا۔ یہ نہیں جائے گی۔“

”ہاں چاچا! یہ نہیں جائے گی۔“ ہریال نے مایوسی سے کہا۔ ”اس کی مرضی یہیں رہنے کی ہے تو یہ یہیں رہے گی۔ اس کی خوشی میں میری خوشی ہے۔ میں اسے دکھی نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ جیلہ کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔

مہمان خانے کی جانب سے سناٹے میں ہلکی سیٹی ابھری۔ چچا پریشان ہو کر بولا۔ ”ہریال! اب یہاں سے چلنا چاہئے۔“

ہریال نے بہن کا سر جو ما اور اسے علیحدہ کر دیا۔ پھر ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اٹھایا اور بھیگے ہوئے رخسار تھپ تھپائے۔ ”آنسو پونچھ لے۔ میں تجھے نہیں لے جاؤں گا۔ توجیت گئی۔ میرا ماں ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ تو پاروتی بن کر زندہ رہے یا جیلہ بن کر، میں تجھے زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تو جس حال میں بھی رہے، میری لاڈلی بھین پارو ہی رہے گی۔ میرے گھر کے دروازے سدا تیرے لیے کھلے رہیں گے۔ جب چاہے چلی آنا۔ میں اتم بار نہیں آیا ہوں۔ جب چاہے مجھے بلا لیتا۔ سمگلر مجھے حفاظت سے تیرے پاس پہنچا دیں گے۔ وہ نہ ہندو ہوتے ہیں، نہ سکھ، نہ مسلمان۔ وہ صرف سمگلر ہوتے ہیں۔“ وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔ کمرے کی فضا آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔ ملگبی غبار آلود رات نڈھال ہو گئی تھی۔ سناٹا راکھ بن کر بکھرتا جا رہا تھا۔ ہوا دم بخود تھی۔ ”چاچا! اب یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ بہت دیر ہو گئی۔“ ہریال کی آواز ابھری۔

وہ چچا کے ہم راہ دروازے کی جانب بڑھا۔ جیلہ چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے دروازے تک گئی۔ تیزی سے بڑھ کر دبلیر پہنچی، ہاتھ اٹھا کر ہریال سے بولی۔ ”غصہ جا دیر! تو بھین کے گھر سے ایسے نہیں جائے گا۔ میں تجھے یوں بدلائیں ہونے دوں گی۔“ وہ کمرے کے اندر گئی، نرنگ سے ایک

گجگج ہی ہوا۔ ”اس نے چچا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔“ اللہ وسایا اگر ہمارا مزارع تھا تو کیا ہوا؟ اس نے میرے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کیا جو ادھر اور ادھر دونوں طرف دھرم کے نام پر ہوا۔ اس کے اندر کا پرش اس سے بھی زندہ تھا اور آج بھی زندہ ہے۔“

”یہ باتیں تو بار بار کہتی ہے۔ تیری ضد اور ہٹ دھرمی اب تک نہیں گئی۔“ ہریال کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”دیکھ پارو! میں اس بار ماتی کو وچن دے کر آیا ہوں۔ آج خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔“ اس نے جھپاک سے پستول نکال لیا۔ ”تو میرے ساتھ چلے گی۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔“ اس نے جھپٹ کر جیلہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چل اٹھ۔ اگر تو چاہتی ہے، دو چار لاشیں یہاں گر جائیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہو کے آیا ہوں۔“ اس کا لہجہ تیز ہوتا گیا۔

”میرے بندے کاربنیں اور بندوکیں سنبھالے پنڈ کے ٹکڑ پر جو کس کھڑے ہیں۔ تین جیسیں، ہتھیار بند بندوں سے بھر کر لایا ہوں۔ اس بار ہر طرح تیار ہو کر آیا ہوں۔ میرا رستہ تو پولیس بھی نہیں روک سکتی۔“

”بھائی! میرا ہاتھ چھوڑ دے۔“ جیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں نوں پتہ ہے، توں بہت زور آور اور دیر ہے۔ مجھے مان ہے کہ تو میرا دیر ہے۔“

ہریال نے بہن کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جیلہ اٹھی اور تن کر بھائی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”بھائی! دوسروں کی لاشیں کیوں کر اٹا چاہتا ہے، ایسا کر، میرے سینے میں اپنے پستول کی ساری گولیاں اتار دے اور میری لاش ماتی کے پاس لے جا۔ وہاں میری ارتھی کو شمشان میں اپنے ہاتھوں سے آگ لگا دینا۔ تیرے دھرم کا پراپت ہو جائے گا۔ میری مکتی اسی میں ہے۔“ اس نے بھائی کو لاکارا۔ ”چلا گولی۔“

بھائی خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ چچا بھی چپ تھا۔ رحیم داد دم بخود تھا۔ کمرے میں ایک بار پھر گمراہ سکوت چھا گیا۔ ذرا دیر بعد ہریال کھڑا ہو گیا۔ اس نے قہر آلود نظروں سے جیلہ کو دیکھا۔ ”تو نہیں چلے گی میرے سنگ؟“

”تو کس کی بات کر رہا ہے؟ میری؟ میں تو اٹھ برس پہلے ہی مر گئی تھی۔ جیلہ تو ایک ملا کا نام ہے۔ اس کا کوئی بھی نام ہو سکتا ہے۔ وہ تو دوسروں کو خوش دیکھنے کے لیے ہنستی ہے، بولتی ہے، چلتی پھرتی ہے۔ میں تو مانو، اب ایک لاش ہوں۔ تو لاش اٹھا کر لے جانا چاہتا ہے تو ضرور لے جا۔ پر اس طرح نہیں، خون سے ننلا کر۔“ وہ آگے بڑھی اور بھائی کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

صبح رحیم داد کی طبیعت بوجھل تھی۔ ایسا محسوس ہوا گویا رات کو کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو۔ حویلی کا ملازم، احمد ابھی تک بیمار تھا۔ ناشتا اور دوپہر کا کھانا ایک نوکرانی لے کر آئی۔ دن ڈھلے رحیم داد باغ میں گیا۔ آسمان ہنوز غبار آلود تھا۔ اس تھی گرمی تھی۔ فضا بے کیف اور دھواں دھواں تھی۔ اللہ وسایا واپس نہیں آیا۔ دوسرے روز بھی نہیں آیا۔ ان دونوں میں جیلہ بھی اسے نظر نہیں آئی۔



رات کو بارش کا ہلکا سا چھینٹا پڑا۔ آسمان سے غبار چھٹ گیا مگر گرمی بڑھ گئی۔ زمین سے گرم گرم بھیکے نکلتے تھے۔ رحیم داد کی وہ رات بھی بے چینی میں کٹی۔ سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ باغ میں گیا۔ دن ڈھلے بھی گیا۔ اب موسم قدرے خوش گوار تھا۔ جیلہ باغ کے ایک گوشے میں چپ بیٹھی تھی۔ رحیم داد اس کی جانب بڑھا۔

جیلہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔ ”آچہداری!“

رحیم داد خاموشی سے اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیلہ کے چہرے پر ابھی تک غم کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں۔ وہ بھی اور اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچ میں ڈوبے رہے۔ کچھ دیر بعد جیلہ نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ زیر لب مسکرائی، یہ مسکراہٹ نہیں تھی۔ کلی مس کر کھ گئی تھی۔

”چہداری! توں نے بہت دنوں تک سید ہی کو دیکھا تھا۔ اس رات پا لیا۔ میں لیا۔“

”حمہ نے یہ بات مجھے بتائی تھی۔ پر مجھے یقین نہیں آیا تھا۔“

”یہ گل خالی حوا ہی نہیں جانتا، سارا پنڈ جانتا ہے۔“ سید نے بتایا۔ ”اور میں اب چھپاتی ہی نہیں۔ سچ بات کبھی نہیں چھپتی۔ اسے چھپانا، اپنے کو دھوکا دیتا ہے۔“

”پر یہ بات اب تک سمجھ نہیں آئی۔“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

اللہ وسایا تیرے پیو کا مزارع تھا؟“

”تھا، بالکل تھا۔“ جیلہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”پر وہ مزارعے سے زمیں دار بن کر بھی زمیں دار نہیں بن سکا۔ وہ عجیب بندہ ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کوئی نہیں جانتا۔“ وہ بات کرتے کرتے گرمی سوچ میں کھو گئی۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ پھر جیلہ ہی نے خاموشی توڑی۔ ”میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو ڈر گئی تھی۔ اس سے وہ بہت زور آور اور کڑوا تھا۔ بات بات پر شعلے کی طرح بھڑک اٹھتا تھا۔“

ڈیبا نکال کے لائی۔ ڈیبا کھول کر بھائی اور چچا کی پیشانیوں پر سیندور کا تلک لگایا۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر بھائی اور چچا کو پر نام کیا۔

دونوں آگے بڑھے۔ جیلہ دبیز پر رک گئی۔ انھوں نے چھت عبور کی، زمین کی مٹی پر پہنچے۔ ہریال نے مڑ کر جیلہ کی جانب دیکھا، لمحے بھر کو ٹھنکا اور پھر اندھیرے میں چچا کے ساتھ گم ہو گیا۔

رات زخمی پرندے کے مانند پھڑپھڑانے لگی۔ جیلہ واپس آ کر کرسی پر تھکی ہوئی سی بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوچ گئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہچکیاں لے رہی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ مٹیالا پڑ گیا تھا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ کچھ دیر بعد کہیں دور رات کے سنائے میں جیپوں کے انجن اشارت ہونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو ذرا سا خم دیا اور جیپوں کی آوازیں توجہ سے سننے لگا۔ آوازیں رفتہ رفتہ گہری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

اس نے جیلہ کو مخاطب کیا۔ ”زمیں دارنی! وہ چلے گئے۔“

وہ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بولی۔ ”ہاں چہداری، وہ چلے گئے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے منہ چھپایا اور بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے جیلہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”زمیں دارنی! اب رونے سے کیا ہوگا، جو ہوتا تھا، ہو گیا۔“

”چہداری! تو جا۔“ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اکیلا چھوڑ دے۔ مجھے جی بھر کے رولینے دے۔“

کمرے کی خاموشی میں جیلہ کی سسکیاں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ مگر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس نے بندوق سنبھالی اور کمرے سے چلا گیا۔ جیلہ نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور سسکیاں بھرتی رہی۔

رحیم داد بیڑھیوں سے نیچے اترا۔ والان میں پہنچا۔ سامنے وسیع صحن تھا جس میں کچھ ہی عرصہ پہلے اس نے شعلوں کی لہرائی روشنی میں جیلہ کو اٹھڑ مٹاؤں کے ساتھ گدھا ناچتے دیکھا تھا۔ اب اسی صحن میں چارپائیوں پر نوکرانیاں بے خبر سو رہی تھیں اور جیلہ اوپر کمرے میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر مسمان خانے میں گیا۔ بیرونی دروازہ ابھی تک پاٹوں پاٹ کھلا تھا۔ اس نے دروازہ بھیڑ کر زنجیر چڑھائی۔ چھت پر گیا، بندوق احتیاط سے سرہانے رکھی اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ چپ لینا اجڑی ہوئی رات کو گزرتے دیکھتا رہا۔

”دیکھنے میں تو بالکل کڑوا نہیں لگتا۔“

”اب تو گنو بن گیا ہے۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”اٹھ برس ادھر کی مغل ہے۔ جب فسادات کی آگ بھڑکی، ہر طرف خون خرابہ ہونے لگا۔ میں ان دنوں لمور میں ہوتی تھی۔ وہاں میں پڑھتی تھی۔ میرا بی اے کا آخری سال تھا۔ پر فسادات شروع ہونے کے بعد کالج بند کر دیا گیا تھا۔ میں ماڈل ٹاؤن میں اپنے ماما کی کوٹھی میں ٹھہری تھی۔ فیذا ہوا کہ فسادات کم ہونے کی بجائے بڑھتے چلے گئے۔ لمور کے ہندو گھربار چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ تب میرا بیوی ویر ہر دیال مجھے لمور سے دیپال پور لے آیا۔“

”پر یہ حویلی تو تیرے پیو کی تھی۔ تیرے گھروالے یہاں نہیں رہتے تھے؟“

”نہیں! یہاں ہمارا مینجر بنی لال رہتا تھا۔ وہ اور اس کے بال بچے اسی مہمان خانے میں رہتے تھے جس میں آج کل توں ٹھہرا ہے۔ حویلی عام طور پر خالی رہتی تھی۔ ہم بھائی بھین تو یہاں گرمیوں کی چھٹیوں میں کبھی کبھار آجاتے تھے۔ پتا جی بھی بہت کم آتے تھے۔ ان کا نام لالہ کرشن دیال تھا۔“ جیلہ آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ ”یہ جو دیپال پور میں کیا سبیلنے کی کرشنا کائن فیکٹری ہے، یہ میرے پتا نے ۱۹۳۳ء میں لگائی تھی۔ ان کا اور بھی بہت کاروبار تھا۔ کئی دکانیں تھیں، ساہوکارہ تھا، کئی کمپنیوں اور ایک بینک کے وہ ڈائریکٹر بھی تھے۔ کاروبار میں اتنے الجھے رہتے تھے کہ کئی کئی سال ادھر نہ آتے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال ہر دیال کرتا تھا یا بنی لال۔“

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو اتنے دڈے گھرانے کی دھی ہے، توں نے اپنے مزارعے سے کیسے ویاہ کر لیا؟ بہت عجیب مغل ہے۔“

”یہی تو میں تجھے بتا رہی تھی۔“ جیلہ نے جواب دیا۔ ”جب فسادات کی آگ ٹنگری میں بھی پھیل گئی تو آس پاس کے دیہات کے ہندو دیپال پور آگئے۔ وہاں پہلے ہی ہندو بہت تھے۔ پر زیادہ تر کھتری ہیں۔ ہماری گوت کھتہ ہے۔ دیپال پور میں کھتریوں کی مشہور تیرتھ بھی ہے۔ یہ بابا لالہ جس راج رائے کی سادھی ہے۔ سادھی کے ساتھ مندر ہے، دھرم شالہ ہے۔ ایک دھرم سبھا بھی ہوتی تھی۔ جانے اس کا کیا ہوا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ ”۵ برس ادھر کی بات ہے۔ میں اللہ وسایا کے ساتھ دیپال پور گئی تھی۔ سادھی، مندر، دھرم شالہ، ہر جگہ مہاجروں نے کب نہ کر رکھا تھا۔ کبھی اس جگہ زبردست میلہ لگتا تھا۔ ماگہ کے مہینے میں کھتری دور دور سے تیرتھ یا تزا کے لیے آتے تھے۔ جب کھتریوں کا کوئی منڈا دس برس کا ہو جاتا تو بابا جس راج کی سادھی کے سامنے اس کا مونڈن ہوتا۔ سر کے بال صاف کر دیئے جاتے۔ کیول بودھی چھوڑ دی جاتی۔ وہ کبھی نہیں کاٹی جاتی

تھی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی منو ہر دیال کا مونڈن ہوتے دیکھا تھا۔ اس دن گھر میں زبردست جشن ہوا۔ مہمانوں کے لیے پکوان پکے۔ طرح طرح سے بھوجن پروسے گئے، کیرتن ہوا، بھجن ہوا۔ ہمارا گھر بہت شان دار تھا۔ دو منزل کا تھا۔ اس روز دیوے جلا کر گھر پر خوب روشنی کی گئی تھی۔ بالکل دیوالی کا سماں تھا۔“

”جب تیس دیپال پور گئی تھیں تو اپنا گھر بھی دیکھا ہو گا۔ کیا حال ہے اس کا؟“

”یہ نہ پوچھ۔“ جیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے اسے دیکھا تو بے کل ہو کر بن سوچے ایک دم اندر ٹھس گئی۔ اس میں مہاجر کنبے ٹھہرے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ چولہے تھے۔ دھوئیں سے ساری دیواریں کالی پڑ گئی تھیں۔ ماما جی جہاں پوجا پاٹ کرتی تھیں، وہاں پکا چوڑا تھا۔ اوپر آلا تھا۔ اس میں کرشن جی کی مورتی رکھی رہتی تھی۔ چوڑے کے پاس ہی تلسی کے بوٹے ہوتے تھے۔ ماما جی ہر روز سورج نکلنے سے پہلے ان میں پانی دیتی تھیں۔ چوڑے کے پاس کوئی آستان کیے بنا نہیں جاسکتا تھا۔ پر اب چوڑے پر بھی چولہا بن گیا تھا۔ آلے سے مورتی اٹھا کر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس میں چراغ جلتا تھا۔ تلسی کے بوٹے سوکھ کر کرب کے ختم ہو چکے تھے۔“

وہ پھر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکارا تو وہ چونکی۔ ”پتا جی نے بہت چاؤ سے گھر کے لیے ساگون کا شان دار فرنیچر بنوایا تھا۔ کچھ تو توڑ پھوڑ کر روٹی پکانے کے لیے چولہوں میں جلا دیا گیا۔ چونچ گیا تھا، وہ بھی ٹوٹ بھوٹ کر کاٹھ کباڑ بن گیا تھا۔ ہر طرف گندگی ہی گندگی تھی۔ بندے بھی بھلے نہیں تھے۔ زنانیاں مجھے گھور گھور کر دیکھنے لگیں، میں ڈر گئی۔ میرا کمرہ اوپر تھا۔ میں اسے دیکھنا چاہتی تھی پر حوصلہ نہ ہوا۔ میں جلد ہی گھر سے باہر چلی گئی۔ چوہدری! ذرا سوچ، کیسی عجیب مغل ہے۔ اپنا گھر پرایا ہوا سو ہوا، اس سے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔ دوبارہ میں کبھی ادھر نہیں گئی۔ جا کے کرتی بھی کیا، دکھ ہی ہوتا۔“

زمین دارنی! تجھے اپنے گھروالے تو یاد آتے ہوں گے؟“

”تجھے اپنی گھروالی اور بچے یاد نہیں آتے؟“

”کیوں نہیں آتے۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”تمہی تو تجھ سے پوچھ رہا

ہوں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا دکھ تو سمجھ سکتا ہے۔ میری طرح توں بھی گھاگل ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کی جانب افسردہ نظروں سے دیکھا۔ ”چوہدری! ہم ۵ بھائی بھین ہوتے تھے۔ میں چار بھائیوں کی اکلوتی بھین تھی۔ پر اب تین رہ گئے ہیں۔ چوتھا بل ہر دیال تھا۔ وہ ہر دیال سے چھوٹا اور مجھ سے بڑا

”آگے کیا ہوتا تھا۔ بس اتنا یاد ہے، بلوائی شور مچاتے آگے بڑھتے آرہے تھے۔ میں ڈر کر ایک طرف بھاگی اور کسی سے ٹکرا کر زور سے گری۔ پر زمین تک نہیں پہنچی۔ ایسا لگا جیسے کوئی مجھے اپنی پیٹھ پر لادے بھاگا جا رہا ہے۔ پتہ نہیں، کون تھا۔ پوچھا بھی تو نہیں بولا۔ تب میں نے اس کے ہاتھوں کی پکڑ سے نکلنے کی کوشش کی، منت سماجت کی، گڑگڑائی اور روئی بھی۔ پر اس نے نہیں چھوڑا۔ ڈیڑھ میل آگے نہر تھی۔ اس نے نہر کے نزدیک جنڈ اور کیکر کی گھنی جھاڑیوں میں بنی ہوئی ایک سنسان دھڑ میں مجھے اپنی پیٹھ سے ایسے پھینکا جیسے اتانچ تولنے والا دھڑوائی کنگ کی بوری ایک جگہ سے دوسری جگہ ڈالتا ہے۔“

”بہت ظالم تھا۔“ رحیم داد نے نفرت سے منہ بگاڑا۔

”وہ تیری سوچ سے بھی زیادہ ظالم اور کٹھور تھا۔“ جیلہ کی آواز میں درد کی چھین تھی۔ ”وہ اکیلا بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جیسے اور کتے تھے۔“ جیلہ کی نظریں جھک گئیں۔ افسردہ چہرے پر ہلکی ہلکی سرخی بکھر گئی۔ ”وہ سب تین روز تک باری باری میری ہڈیاں چوڑتے رہے۔ نہ کھانے کو روئی دی، نہ پینے کو پانی۔ نہ میں رو سکتی تھی نہ بول سکتی تھی۔ میں تو مانو لاش تھی، ٹھنڈی اور بے جان۔ مجھے سب کچھ ڈراؤنا پہنا لگا۔ آنکھیں بند تھیں اور میں بے سدھ پڑی تھی۔ چوتھے روز دوپہر کو مجھے ہوش آیا۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو دھڑ خالی تھی۔ اس وہڑ کو چاروں اور باڑ لگا کر جھنگر میں بتایا گیا تھا۔ وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ لگتا تھا، مجھے مردہ جان کروہ چھوڑ گئے تھے۔ مجھے خود اچنبھا تھا کیسے بچ گئی۔ و شوا، ہی نہیں آتا تھا کہ زندہ ہوں۔“

چند لمحے رک کے اس نے پھر کتنا شروع کیا۔ ”میں کئی گھنٹے آنکھیں کھولے بے حال پڑی رہی۔ اٹھا ہی نہیں جاتا تھا۔ دن ڈھلے نزدیک رکھی ہوئی کھلی کا سارا لے کر اٹھی۔ وہڑ میں ہر طرف گوبر ہی گوبر تھا۔ میرے کپڑے پیٹھ، ہاتھ پیر اور سر کے بال گوبر سے لٹھڑے ہوئے تھے۔ کھلی میں جھانکا تو اس میں موشیوں کے لیے گستاوا پڑا ہوا نظر آیا۔ توڑی کے ساتھ ونڈلا کر بتایا گیا تھا۔ میں نے جن جن کردند کھانے شروع کر دیے۔ چھوٹے کے یہ دلے ہوئے دانے کھا کر بدن میں تھوڑی سی جان آئی پر پیاس بہت لگی۔ وہڑ کی باڑ کے اس پار نہر نظر آتی تھی۔ سوچا نہر پر جا کر پانی پی لوں لیکن کھڑے ہوتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑی۔ دیر تک پڑی بانپتی رہی۔ ذرا جی سنبھلا تو ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ ایک کونے میں تور کا ڈھیر نظر آیا۔ کھسکتی کھسکتی اس طرف بڑھی، پاس جا کر اٹھی اور تور کے ٹوٹے چوہے لگی۔ اس کے رس میں مٹھاس تھی۔ نہ پوچھ کیا سواوا آیا۔“

”تو ویسے تو چری ہے پر چوہو تو کماد کی طرح میٹھی لگتی ہے۔“ رحیم داد نے جیلہ کی تائید کی۔

تھا۔ بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہر دیال بتاتا تھا، پتا جی نے اس کی لاش دیکھی تھی۔ بعد میں جانے اس کا کیا بنا۔ چیلپیں اور گلدھ ماس نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں گے، بنجر کیس دبا دیا گیا ہوگا۔ چوہدہری! توں نے اسے نہیں دیکھا۔ ہائے کیسا سندھ اور سوہنا تھا۔“ اس نے لمبی سانس بھری۔ ”سنا ہے، تینوں بھائیوں کا ویاہ ہو گیا ہے۔ بچے بھی ہیں۔ میں نے نہ کسی بھرجائی کو دیکھا نہ بچوں کو۔ سب کو دیکھنے کے لیے من تو بہت مچلتا ہے، پر اب میں ان کے پاس نہیں جاسکتی۔ میں نے سوچ لیا ہے، وہ سب مر گئے۔“

جیلہ اس المیے کے ورق پلٹتی رہی جس میں بنیادی کردار خود اس نے ادا کیا تھا۔ رحیم داد ہمہ تن گوش رہا۔ وہ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا چاہتا تھا تاکہ اس کے زیادہ سے زیادہ قریب ہو جائے۔ وہ خاموش ہو جاتی تو رحیم داد کرید کر پوچھتا۔ اس دفعہ بھی جیلہ بات کرتے کرتے رکی، مگر رحیم داد نے اسے خاموش نہیں رہنے دیا۔

”تیرے گھروالے تو سرحد پار نکل گئے تھے، توں کیسے ادھر رہ گئی؟“

”اب تو تجھے پتہ چل ہی گیا۔ جو نہیں پتہ، وہ بھی سن لے۔ تجھ سے اب کیا چھپانا۔ ویسے چھپانے کو رہ ہی کیا گیا ہے۔ سب کو پتہ ہے۔“ جیلہ نے درد میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہ بہت ڈراؤنی رات تھی جب میں اور میرے گھروالے ٹرک میں سوار ہو کر دہ پال پور سے نکل کر بھاگے۔ اب وہ رات یاد کرتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھیاک سپنا دیکھ رہی ہوں۔ رستے میں دوبار بلوائیوں نے ٹرک پر ہٹا بولا، پر ڈرائیور بہت ہوشیار تھا۔ صاف بچا کر نکال لے گیا۔ آدھی رات کے بعد سب بصیر پور سٹیشن پر پہنچ گئے۔ وہاں پہلے ہی دور دور سے بھاگ کر آئے ہوئے ہندو اور سکھ پڑے تھے اور کسور کے راستے ٹرین سے کھیم کرن اور امرتسر نکل جانا چاہتے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی منو ہر دیال پہلے ہی امرتسر پہنچ چکا تھا اور ہم سب کا انتظار کر رہا تھا۔ ادھر ہم ٹرین کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین تو نہیں آئی، بلوائی آگئے۔ اندھیری رات تھی۔ تڑنگولیاں چلتی تھیں۔ بچے روتے تھے۔ ملائیں جینتی تھیں۔ ہر طرف ہابا کار مچی تھی۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔“

”تریموں کے بچن پر راوی کے کنارے میں نے بھی یہی سنا دیکھا۔“ رحیم داد نے بھی جیلہ کی طرح خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لیے مقتول چوہدہری نورانی سے سنی ہوئی باتیں دہرائیں۔ جیلہ خاموشی سے سنتی رہی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری اور افسردہ لہجے میں بولا۔ ”اس طرح جی! میں راوی پار کر کے اکیلا پاکستان پہنچا۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”ہاں اب تو بتا، آگے کیا ہوا؟“

”میں نے تو اپنے جیون میں پہلی بار اسے چوہا تھا۔ پر اس سے ایسا سوا ملا جیسے لمبور میں گرمی کے دنوں میں ٹھنڈی ٹھنڈی گندیریاں چوہنے پر آتا تھا۔ وند کھا کر اور تور کارس چوہ کر اتنا آند ملا کہ میں پڑ کر سو گئی۔ رات کو کوئی نہیں آیا، دن کو بھی نہیں آیا۔ میں چن چن کر وند کھاتی رہی اور توری ٹوٹے دانٹوں میں دبا کر چوٹی رہی۔ وہ ٹرسے باہر نہیں گئی۔ دوسری رات دوبندے ایک بجے لے کر آئے۔ تب مجھے پتہ چلا وہ وہ ٹرسے نہیں کسی رسا گیری کی اہر تھی جس میں چوری کے موٹی اور چوکھر چھا کر رکھے جاتے تھے۔“

”تجھے پتہ ہی نہ چلا وہ رسا گیریوں کی اہر ہے۔ گوبر اور کھلی میں گتا واپڑا دیکھ کر بھی تجھے پتہ نہ چلا؟“ رحیم داد کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔

”لے“ مجھے کیا پتہ اہر ایسی ہوتی ہے۔ میں نے کوئی رسا گیری یا موٹی چوری تو کی نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہ تھا رسا گیری کیا ہوتی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ رحیم داد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”ہاں، تو جی فیر کیا ہوا؟“

”دونوں نے مجھے اہر میں دیکھا۔ پہلے تو وہ گہرائے۔ تھوڑی دیر آپس میں کھسر پھسری۔ ایک وہیں ٹھہر گیا۔ دوسرے نے مجھے اپنے گڈے میں بٹھالیا۔ وہ اسی گڈے کے پیچھے چوری کی ٹباندھ کر لایا تھا۔ یہ بھی مجھے بعد میں پتہ چلا۔ وہ مجھے صابے والا لے گیا۔ اس کی گھروالی تھی۔ بچے تھے۔ مجھے کچھ اطمینان ہوا۔“

جیلہ کا لہجہ اچانک تلخ ہو گیا۔ ”پر وہ بھی کتا نکلا۔ مجھے گھسیٹ کر زبردستی کوٹھری میں لے گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ میں نے اس کی منت سماجت کی۔ ہاتھ جوڑے۔ گزگڑا کے اسے پچھلے تین روز کی ساری پچاسائی۔ پر اس نے ایک نہ سنی۔ رات بھر میری ہڈیاں چوڑتا رہا۔“ جیلہ روہانسی ہو گئی۔ اس نے آنسو پونچھے اور دکھ بھرے لہجے میں بولی۔ ”سویرے اس کی گھروالی نے زبردست رولا کیا۔ روٹی پیٹی، شور مچایا۔ اس کا گھر والا ڈھیٹ بنا ہنستا رہا۔ کچھ دیر بعد بل پنجابی سنبھال کر کھیتوں پر چلا گیا۔ گھروالی نے اس کے جانے کے بعد میرے بال کھسولے، منہ نوچا۔ دونوں ہاتھوں سے خوب مارا پیٹا۔ میں نے مجبوری بتائی۔ پر اس نے میری ایک نہ مانی، بس مارتی چلی گئی۔ مارتے مارتے تھک گئی تو رونے بیٹھ گئی۔ میں بھی روتی رہی اور روتے روتے بے ہوش ہو گئی۔ تب اسے کچھ ترس آیا۔ اس نے مجھے پانی پلایا۔ دوپہر ہوئی تو کھانے کو روٹی بھی دی۔ شام کو اس کا گھر والا لوٹا۔ اس کا نام گاما تھا۔ رات کو فیر اس نے مجھے گھسیٹ کر کوٹھری میں بند کر لیا۔ چار روز تک یہی ہوتا رہا۔ اس کی گھروالی روز بھگڑا کرتی پر وہ باز نہ آیا۔“

”گاما تو اور بھی زیادہ گندہ اور کمینہ نکلا۔“ رحیم داد نے جمل کر کہا۔

”ہاں، وہ بہت گندہ اور کمینہ تھا۔“ جیلہ خلا میں گھورتی رہی اور بولتی رہی۔ ”جب گامے کی گھر والی نے ایک روز بہت شور مچایا اور دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگی تو پاس پڑوس والے گاما کے گھر اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے گاما پر دباؤ ڈالا کہ وہ مجھے اپنے گھر سے نکال دے۔ اس نے سب کے سامنے وعدہ کیا اور وعدہ پورا بھی کیا۔ پر اس نے مجھے اپنے گھر سے اس طرح نکالا کہ تین سو روپے میں دلایا کہ ہاتھ چپکے سے بچ دیا۔“

رحیم داد نے استفسار کیا۔ ”دلایا بھی صابے والے میں رہتا تھا؟“

”نہیں! وہ مجھے بھومان شاہ لے گیا۔ اس کی گھروالی اسے چھوڑ کر تیلی کے منڈے کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“ جیلہ نے مطلع کیا۔ ”دلایا کا بوڑھا پیو تھا۔ چھوٹا بھائی تھا اور چھوٹے بھائی کی گھر والی بھی تھی۔ بچے بھی تھے۔ سب ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔“ جیلہ نے بڑی گہری سانس بھری۔ ”دلایا کے ساتھ میں دو مہینے سے اوپر رہی۔ دلایا ادھڑکھا تھا۔ پر اس کا بھائی جوان تھا۔ مجھے اس کے گھر میں بچے تھوڑے ہی دن گزرے تھے کہ دلایا کا بھائی مجھے بری نظروں سے گھورنے لگا۔ اکیلے میں پاتا تو نوچتا کھسوتا۔ ایک روز اس کی گھروالی نے دیکھ لیا۔ اس نے رو کر سارا گھر سربرا اٹھالیا۔ دلایا کے پیو کو پتہ چلا تو وہ الٹا مجھ پر زرا ض ہوا۔ سرور نوہ دونوں مجھے گالان نکالتے اور مارتے پیٹتے۔“

”انھیں اصل گل نہیں بتائی؟“

”کیا بتائی۔ میرے پاس بتانے کو رہ کیا گیا تھا۔“ جیلہ نے اداسی سے کہا۔ ”گالاں سنتی تھی، مار کھاتی تھی اور چپ کر کے بیٹھی رہتی تھی۔ فیر سرور نوہ نے مل کر مسکوٹ کی۔ مجھے گھر سے نکالنے کی سکیم بتائی۔ ایک روز دلایا کا پیو ایک موٹی سی زنانی کو لے کر آیا۔ اس کے بدن کا ماس تھل تھل کرتا تھا۔ وہ سگریٹ پیتی تھی اور پان چاکر جگہ جگہ لال لال پیک تھوکتی تھی۔ بات کرتی تو ہاتھ بھی چلاتی اور آنکھیں بھی منکاتی۔ لمبور سے آئی تھی۔ ہیرا منڈی کی کنجری تھی۔“

”کنجری تھی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”کس لیے آئی تھی؟“

”وہ فسادات میں اٹھائی جانے والی ان نوجوان ملاؤں اور کنیاؤں کو خریدنے کا دھندا کرتی تھی جنہیں مغویہ کہا جاتا ہے۔ دلایا کے پیو نے ۵ سو روپے میں میرا سودا کر دیا۔“

”تیس نوں اس سوڈے کا پتہ تھا؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”بالکل تھا۔ میرے سامنے ہی تو طے ہوا تھا۔ اس سے دلایا اور اس کے بھائی نہیں تھے۔ اللہ دسایا کی دلایا کے چھوٹے بھائی سے جان پہچان تھی۔ اتفاق سے اسی شام اللہ دسایا اس سے ملنے

آیا۔ وہ آنگن میں منجی پر بیٹھا ولایا کے بھائی سے باتیں کر رہا تھا۔ میں آنگن سے گزری تو اللہ وسایا نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً پہچان لیا۔ اس نے مجھے اپنے پاس بلایا، پوچھا، تو یہاں کیسی آئی؟ میں تو چپ رہی پر ولایا کا بھائی بولا ولایا اسے خرید کر لایا ہے۔ اللہ وسایا نے تیوری پر ہل ڈال کر کہا۔ یہ میرے زمیں دار کی دھی ہے، یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں اسے اپنے پنڈ لے جاؤں گا۔ ولایا کا بھائی تو کچھ نہیں بولا پر اس کے پیو نے بگڑ کر کہا۔ یہ اس گھر سے نہیں جاسکتی۔ اس کی نوہ بھی کڑکڑ کرنے لگی۔ دونوں مجھے کنجری کے ہاتھ بچ کر رات کو ۵ سو روپے وصول کرنا چاہتے تھے۔ وہ مجھے کیسے جانے دیتے۔“

”اللہ وسایا ان کی باتیں سن کر کیا بولا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”وہ آنکھیں نکال کر کھڑا ہو گیا۔“ جیلہ کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی میں ہلکی ہلکی سرخنی جھلکنے لگی۔ ”اس نے کرتے کی دونوں آستینیں چڑھائیں اور اپنی لمبی ڈانگ اٹھا کر جوش سے بولا۔ بابے! میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور ابھی لے جاؤں گا۔ بلا لے اپنے پنڈ کے جوانوں کو دیکھتا ہوں کون میرا رستہ روکتا ہے؟ یہ کہہ کر اس نے میرا ہاتھ تھاما اور اونچی آواز سے بولا۔ چل پاروتی۔ ولایا جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پر اللہ وسایا کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ڈر گیا۔ ویسے بھی وہ بھگڑا لو بندہ نہیں تھا۔ کہنے لگا، اللہ وسایا تو اسے ضرور لے جا پر میرے تین سو روپے دیتا جا۔ میں نے اسے اتنے ہی میں خریدا ہے۔ میری بات کا تجھے وشواس نہ ہو تو صابے والے کے گامے سے پوچھ لے جس سے میں نے اسے خریدا ہے۔ اللہ وسایا نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے ۵۰ روپے نکالے اور ولایا کے سامنے ڈال کر کہا۔ یہ ۵۰ رکھ لے۔ اڑھائی سو کل شام اپنے بھائی کو بھیج کر منگوا لیتا۔ ویسے تجھے میرا اعتبار ہو تو کل میں خود تیری رقم تیرے گھر پہنچا دوں گا۔ اللہ وسایا وہاں ذرا دیر بھی نہیں ٹھہرا۔ مجھے گھر لے آیا۔ سب چپ کر کے بیٹھے رہے۔ کسی نے اس کا رستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔“

”اپنا زمیں دار اتنا زور آور اور جی دار ہے، یہ تو میں نوں پتہ ہی نہیں تھا۔“

”چوہدری! وہ بہت جی دار ہے۔ ان دنوں تو خوب ٹکڑا جوان تھا۔ اس کے شریر میں بڑی شکتی تھی۔“ اللہ وسایا کا ذکر کرتے وقت جیلہ کا مرحمایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ ”بھومان شاہ سے اپنے پنڈ تک دس میل سے کم فاصلہ نہیں ہو گا۔ میں فرلانگ دو فرلانگ چل کر بیٹھ گئی۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ پر اللہ وسایا ذرا بھی نراش نہ ہوا۔ اس نے مجھے اٹھا کر پیٹھ پر لا دیا۔ دس میل تک وہ مجھے اسی طرح اٹھائے اٹھائے چلتا رہا، کہیں دم نہ لیا۔ اپنے گھر پہنچ کر بی رکا۔ میں

آئے کو تو اس کے ساتھ آگئی پر بعد میں مجھے بہت ڈر لگا۔ بات یہ تھی بنی لال نے اللہ وسایا اور اس کے پیو کو نراش ہو کر بے دخل کر دیا تھا اور ایسے سے بے دخلی کی تھی جب اس کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔“

”فصل واڑھو ہو تو مزارعے کو بے دخل نہیں کیا جاسکتا، ایسا کبھی نہیں ہوتا۔“ رحیم داد نے بنی لال کی کارروائی کی مذمت کی۔

”پر بنی لال نے ایسا ہی کیا۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”اللہ وسایا کے پیو نے دیپال پور جا کر ہرویل سے فریاد کی، پر اس نے بنی لال ہی کی بات مانی۔ اللہ وسایا اور اس کے گھر والے پنڈ سے نکل کر ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتے پھرے۔ اس کا پیو اسی دکھ سے مر گیا۔ چھوٹا بھائی شیخو پورہ جا کر اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنے لگا۔ جب فسادات بھڑکے تو بنی لال حویلی چھوڑ کر سرحد پار چلا گیا۔ اللہ وسایا اپنی ماں کے ساتھ واپس پنڈ آ گیا۔ اس نے بنی لال کے نئے مزارعے سے اپنی زمین خالی کرانی۔ اس پر کھیتی باڑی بھی شروع کر دی۔ پر مجھے جس بات کا ڈر تھا، وہ سامنے آئی۔ اللہ وسایا کی ماں کو پتہ چلا، میں پنڈ کے زمیں دار لالہ ہرکشن کی دھی ہوں تو وہ آگ بگولا ہو گئی، بہت ججٹی چلائی۔ مجھے دوش دینے لگی، تیرے پیو نے میرے گھر والے کو بے دخل کر کے مار ڈالا۔ اس کی نراشی پر میں نے سوچا کہ اللہ وسایا بھی مجھ سے اپنے پیو کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ تھا بھی ان دنوں بہت کمزور اور غصے والا۔ دور دور تک اس کی ککر کا جوان نہیں تھا۔ ہر سے مونچھیں مروڑتا رہتا اور شیر کی طرح چھاتی تان کر چلتا تھا۔“

رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”پر اب تو اس کی مونچھیں سیدھی سادی رہتی ہیں۔ کبھی نہیں مروڑتا شروڑتا۔“

”ان دنوں توں نے اسے نہیں دیکھا۔ بہت زور آور ہوتا تھا۔“ جیلہ نے فخر سے گردن اونچی کی۔ ”میں اتنی ڈری کہ رات بھر جاگتی رہی۔ پردہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔ دوسری رات بھی نہیں آیا۔ نہ اس نے مجھ سے بات کی، نہ کسی طرح کی چھیڑ چھاڑ کی۔ کئی راتیں گزر گئیں۔ البتہ اس کی ماں روز نراش ہوتی۔ ہر سے غصے سے کڑکڑ کرتی رہتی۔ ایک روز اس نے مجھے بار ابھی۔ ٹھیک اسی سے اللہ وسایا آ گیا۔ حویلی خالی پڑی تھی۔ اللہ وسایا نے ماں سے تو کچھ نہیں کہا، مجھے حویلی میں لے آیا۔ حویلی پہنچ کر مجھے اور ڈر لگا۔ اکتوبر کا مینہ تھا۔ میں کمرے میں سوتی اور وہ کمرے کے باہر منجی ڈال کر لیت جاتا۔ رات کو وہ کبھی کمرے میں نہیں آیا۔ دوپہر اور شام کو میرے لیے روٹی لے کر آتا مگر بات چیت بہت کم کرتا۔“

”مماجرین نے تو اس پنڈ میں گڑبڑ نہیں کی؟“

”کیوں نہیں کی؟ بہت گڑبڑ کی۔“ جیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”مماجرین کا کیپ لہور کی طرح منگھری میں بھی کھل گیا تھا۔ انھیں جہاں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمیں یا مکان نظر آتا، اس پر جھٹ کبندہ کر لیتے۔ ویسے ادھر کے وڈے زمین داروں نے پہلے ہی ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی زمین اور جائیداد طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے دبا رکھی تھی۔ مماجرین کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ کسی طرح انھیں پتہ چل گیا کہ حویلی کسی ہندو زمین دار کی ہے۔ وہ تو چلا گیا، اس میں اس کی ہندو پتڑی رہتی ہے۔ فیرو توجی، انھوں نے حویلی پر کبندہ کرنے کی سوچی۔ غول کے غول پنڈ میں آگئے اور حویلی چھیننے کی کوشش کرنے لگے۔ اللہ وسایا اور اس کے ساتھیوں نے ان کی کوئی کوشش سہل نہ ہونے دی۔ حویلی میں ایک بندوک موجود تھی، یہی جو تیرے پاس ہے۔ کار تو سبھی تھے۔ اللہ وسایا کے ساتھیوں میں سے کئی کے پاس ویسی کار نہیں تھیں۔ سب نے جم کر مکالمہ کیا۔ حملہ آوروں کو پنڈ سے باہر نکال دیا۔ دوسرے تو کسی اور طرف نکل گئے، پر جلندھر کے پٹھان مماجر نہ گئے۔ انھوں نے پنڈ کے باہر پاؤ ڈال دیا۔“

”ان کے بارے میں تو مشہور ہے، اراضی کیسے بھی ہو۔ کہیں بھی ملے، ہرگز نہیں چھوڑتے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”کہتے ہیں کہ ایک بار دوزخیوں نے دیکھا، جلندھری پٹھانوں کے غول کے غول دوزخ میں چلے آ رہے ہیں۔ گھبرا کر ان سے پوچھا، بادشاہو! اتھے کہاں چلے آئے؟ یہ تو دوزخ ہے۔ وہ بولے، یہ تو ہم نے بھی پتہ ہے، پر سنا ہے، ادھر زمینوں کی الاٹمنٹ ہو رہی ہے۔“

”چوہدری! توں تو خول کر رہا ہے۔“ جیلہ نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ ”پر میں ان کے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی، انھوں نے بہت تنگ کیا۔ روز اکٹھے ہو کر ہلا بولتے تھے۔ اتنا شور شرابہ کرتے تھے، میں تجھے کیا بتاؤں۔“ جیلہ نے لمبی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے ایک بار پھر پھیل گئے۔ ”مجھے ہوئے لہجے میں بولی۔“ رات کو جسے کا بہت ڈر رہتا تھا۔ اللہ وسایا بندوک تھامے اپنے دس بارہاں ٹکڑے ساتھیوں کے ساتھ رات بھر کھواں کرتا۔ میں نے روز روز کے خطرے سے گھبرا کر ایک بار اسے صاف صاف کہہ دیا۔ دیکھ اللہ وسایا! سارا جھگڑا میرے کارن ہے۔ مجھے ان کے حوالے کر دے یا گولی مار دے۔ میرے ختم ہوتے ہی سارا انٹھا مٹ جائے گا۔ اللہ وسایا آنکھیں نکال کر بولا۔ بیکار کی کڑکڑ نہ کر، چپ کر کے بیٹھی رہ۔ جب تک میری جان میں جان ہے، کوئی یہاں نہیں آسکتا۔ میری لاش پر سے گزر کر ہی کوئی حویلی میں داخل ہو سکتا ہے۔ فیرو تیرا

جی کرے، کرنا۔ دن اسی ڈر اور خوف میں گزرتے رہے۔ ایک اندھیری رات انھوں نے اکٹھے ہو کر حویلی پر ہلا بول دیا۔ اللہ وسایا اور اس کے ساتھیوں نے بھی مورچے سنبھال لیے۔ زبردست ٹاکہ ہوا۔ دونوں طرف سے تڑتڑ گولیاں چلیں۔ میں نے جی میں ٹھانی اگر بلوائی حویلی میں آئے تو میں ان کے پیچھے سے پہلے ہی خود کشی کر لوں گی۔ میری آشا تھی کہ انھیں میں نہ ملوں، میری لاش ملے۔“

”توں نے کیا کیا؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”میں نے دیوار میں لگی ہوئی ایک اونچی کھونٹی میں اپنی اوڑھنی کا ایک پلو مضبوطی سے باندھا، دوسرے پلو کا پھندا بنایا۔ کھونٹی کے نیچے لکڑی کا سٹول رکھا، اس پر چڑھ کر پھندا اپنی گردن میں ڈال لیا۔“ جیلہ ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔ ”حویلی کے باہر شور ہوتا رہا، گولیاں تڑتڑاتی رہیں۔ بہت دیر بعد شور بند ہوا۔ گولیاں بھی رک گئیں، تھوڑی دیر بعد حویلی کے آگن میں بول برالا ہوا۔ ملی جلی آوازوں کے ساتھ زور زور سے چلنے کی آہٹ ہوئی۔ مجھے ایسا لگا، بلوائی حویلی میں گھس آئے ہیں۔ میں نے جھٹ اپنا ایک پیر اٹھایا، دوسرے پیر کے بوجھ سے سٹول ڈمگا کر گر گیا۔ ساتھ ہی میں بھی گری اور اوڑھنی کے ساتھ لٹکنے لگی۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا، فیر کیا ہوا۔“

رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تیس پھندے لگی رہی تھیں؟“

”بالکل لگی رہی تھی۔“ جیلہ نے سکون سے جواب دیا۔ ”رات گئے مجھے ایسا لگا میں زندہ ہوں۔ میری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے دکھ ہوا کہ کیوں بچ گئی؟ میں اس زک میں دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی جس سے نکل کر آئی تھی۔ ڈرتے ڈرتے آنکھیں گھما کر دیکھا تو حیران رہ گئی۔ اللہ وسایا میرے سرہانے بت بنا بیٹھا تھا۔ اس نے میری آنکھیں کھلی دیکھیں تو بھاگا بھاگا گیا، گلاس میں پانی لے کر آیا۔ ایک ہاتھ سے میرا سراونچا کیا اور میرے منہ میں پانی ڈالا۔ مجھے بہت پیاس لگی تھی۔ سارا پانی پی گئی۔ مانو میں تو مری چکی تھی۔ یہ اللہ وسایا تھا جس نے مجھے مرنے سے بچالیا۔“

”ہاں! وہ نہ ہوتا تو ہرگز نہ بچتی۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

”پانی پی کر ذرا جان آئی تو میں نے اللہ وسایا سے پوچھا، بلوائیوں کا کیا بنا؟ وہ ہنس کر بولا، بننا کیا تھا۔ سب بھاگ گئے۔ میں نے کچھ دیر چپ رہ کے کہا۔ پردہ کل نہیں تو پرسوں ضرور ہلا بولیں گے۔ اللہ وسایا ذرا بھی نہ گھبرایا، مسکراتا رہا۔ میں نے دیکھا، اس کے کرتے کی آستین خون سے لال ہو رہی ہے۔ کپڑوں پر بھی جگہ جگہ خون کے دھبے تھے۔ میں گھبرا گئی۔ وہ ہنس کر بولا، گولی بازو میں لگی تھی۔ پر اندر نہیں اتری۔ گولی چلتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں تکیے کے سارے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اللہ وسایا نے بار بار منع کیا پر میں نے جھٹ اپنی اوڑھنی پھاڑ کر اس کے

گھاؤ پر پٹی باندھ دی۔“

”بلوائیوں نے دوبارہ حملہ کیا ہوگا۔ اللہ وسایا تو زخمی تھا۔ اس نے کیسے ان کا سامنا کیا؟“ رحیم داوے استفسار کیا۔

”اس رات کے بعد حملہ نہیں ہوا۔“ جمیلہ نے رحیم داو کو وضاحت سے بتایا۔ ”میں نے اسی رات فیصلہ کر لیا تھا، مجھے اللہ وسایا سے فوراً ویاہ کر لینا چاہئے۔ ورنہ وہ مجھے بچانے کی کوشش میں مارا جائے گا۔ میں نے جب اسے یہ بات کہی تو وہ تیار نہیں ہوا، کہنے لگا۔ میں ٹھہرا جا نگلی اور تو اتنے وڈے زمیں دار کی دھی۔ مزارے کا زمیں دار کی دھی سے کیسے رشتہ ہو سکتا ہے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب اللہ وسایا نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے آنسو پونچھے۔ اسی صبح میں اللہ وسایا کے ساتھ پنڈی مسجد میں گئی۔ ملاں جی نے سب کے سامنے مجھے کلمہ پڑھایا۔ میں مسلمان ہو گئی۔ میرا نام جمیلہ رکھا گیا۔ اسی روز ملاں نے اللہ وسایا کے ساتھ میرا نکاح پڑھا دیا۔ بس جی اس طرح ہمارا ویاہ ہوا۔ میں پاروتی نہ رہی، اللہ وسایا کی جمیلہ بن گئی۔ یہ میرا نیا جیون تھا اور یہ نیا جیون مجھے اللہ وسایا ہی نے دیا تھا۔“

”اللہ وسایا کی ماں بھی نکاح میں شامل ہوئی تھی؟“

”نہیں جی، وہ تو اتنی زراض ہوئی، اسی روز پنڈ چھوڑ کر اپنے چھوٹے پتر کے پاس شیخوپورہ چلی گئی۔ اللہ وسایا اسے واپس لانے کئی بار شیخوپورے گیا پر وہ نہ آئی۔ بہت ضدی اور مثیلی تھی۔ دو برس ہوئے اس کا مرنا ہو گیا۔ اللہ وسایا کا بھائی بھی کبھی یہاں نہیں آیا۔ سنا ہے وہ کراچی چلا گیا۔ اس کے بارے میں کچھ اور پتہ نہیں چل سکا۔“



سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ بلندیوں پر پہنچ چکی تھی۔ مزارے اور کسان مویشیوں کو ہنکاتے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ رحیم داو اور جمیلہ خاموش بیٹھے تھے۔ نوکرنے لسی سے بھرے ہوئے گلاس دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ جمیلہ نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”برسوں بعد میں نے اپنے بارے میں کسی کو اتنی باتیں بتائی ہیں۔ لگتا ہے، بہت ہلکی پھلکی ہو گئی ہوں۔ اس رات سے میں بہت بے کل تھی جب ہریال اور چاچا مجھے لینے یہاں آئے تھے۔ کچھ بھی چنگا نہیں لگتا تھا۔ بار بار روتے کو جی کرتا، رات کو نیند بھی نہ آتی۔ آج میں آرام ٹال سو سکوں گی۔ مانو میرے من کا بوجھ اتر گیا۔“

رحیم داو فوری رد عمل کا اظہار نہ کر سکا۔ وہ جمیلہ کی چپٹا کے ہوش رہا اور حیرت انگیز تانے بانے میں الجھ کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں حویلی کے اندر سے جمیلہ کی بیٹی نینا کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ جمیلہ بڑبڑاتی ہوئی انھی۔ ”لگتا ہے بھین بھائی میں جھگڑا ہو گیا۔ کھیلنے کھیلنے لڑنے لگتے ہیں۔“ وہ تیز قدم اٹھاتی حویلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داو اسے دور تک دیکھتا رہا اور اس کے جانے کے بعد گم صم بیٹھا رہا۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رحیم داو اٹھا اور بو جھل قدموں سے مہمان خانے کی سمت بڑھا۔ وہ نڈھال نظر آ رہا تھا۔

تیسرے روز اللہ وسایا واپس آ گیا۔ شام کو وہ باغ میں رحیم داو سے ملا۔ خلاف معمول وہ بجھا بجھا لگ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں خالی خالی اور ویران تھیں رحیم داو نے چاہا، اس کی پریشانی کا سبب معلوم کرے۔ مگر اللہ وسایا زیادہ دیر نہیں بیٹھا، معذرت کے انداز میں بولا۔ ”معاف کرنا چوہدری، میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ کل تجھ سے آرام سے گل بات کروں گا۔“ وہ چلا گیا۔

جمیلہ کے بھائی ہریال اور چچا کے بارے میں نہ اللہ وسایا نے کچھ کہا نہ رحیم داو نے ان کا ذکر چھیڑا۔

اللہ وسایا اب ہر وقت چپ چاپ رہتا۔ بہت کم بات کرتا اور بات کرتے کرتے کھو جاتا۔ جب بھی ملتا کچھ سوچتا نظر آتا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر اللہ وسایا کے چہرے پر پہلی سی تازگی اور شگفتگی دکھائی نہ دی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اندر ہی اندر سلگ رہا ہو۔ اسے کوئی برا صدمہ پہنچا تھا۔ رحیم داو نے کئی بار ہمت کر کے پوچھا بھی مگر وہ ٹال گیا۔

انھی دنوں ایک شام جمیلہ باغ میں آئی۔ رحیم داو پہلے سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی ایک طرف بیٹھ گئی۔ اللہ وسایا گاؤں میں نہیں تھا۔ کہیں گیا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد پھاتاں آ گئی۔ وہ جمیلہ کے پیروں کے پاس گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”بھین جی! تاجاں کی سرال والے اگلے مینے کے پہلے جمعے کو آرہے ہیں۔“ اس نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ ”آج کے چھٹی ویں دن ویاہ کی تاریخ مانگنے آرہے ہیں۔“ ”کب تک ویاہ کرنا چاہتے ہیں۔“ جمیلہ نے پوچھا۔

”ان کا ارادہ تو بحیثی ٹال کرنے کا ہے۔“ پھاتاں نے جواب دیا۔ ”پر اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں۔“

”تو کیوں چتا کرتی ہے۔ تجھے مجھ پر دشواس نہیں؟ تجھ سے کہہ تو چکی ہوں، میں تاجاں کا ویاہ

خوب دھوم دھڑکے سے کروں گی۔ تاجاں تیری نہیں، میری بھی دھی ہے۔“

پھاتاں کا چہرہ کھل اٹھا۔ ”تو جی میں کھلوادوں، وہ ساہے کے لیے آجائیں۔“

”بالکل کھلوادے۔ ان کو بیس حویلی میں لانا۔ پر یہ تو سوچ، جلدی کیسے دیا ہو سکتا ہے اتنی گرمی میں؟“ اس نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا، چند لمبے سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”ساوَن ٹھیک رہے گا۔“ مگر فوراً اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ”پر ساوَن میں تو زبردست برکھا ہوتی ہے۔ سگائی کا کیا مزا آئے گا۔ یہ کیا گل ہوئی، جنج چڑھے اور اوپر بادل گر جتے ہوں۔ بجلی چمکتی ہو، چاروں طرف پانی ہی پانی ہو۔ نہ ٹھیک سے ملنی ہو نہ سٹھیاں۔ ماگھ کیسا رہے گا؟“

”نا بھین جی! ماگھ تو بہت دور ہے۔“ پھاتاں رضا مند نہیں ہوئی۔ ”وہ لوگ دیاہ میں اتنی دیری نہیں چاہتے۔“

”سوچ لے۔ جب کسے گی، تیاری ہو جائے گی۔“ جیلہ نے اڑنے کی مطلق کوشش نہیں کی۔ ”تیری تاجاں تو بہت سندر مٹیار ہے۔ اس کا دیاہ بھی سندر ہونا چاہئے۔ سے بھی دیاہی ہونا چاہئے۔ آگے تیری مرضی۔ میں نے کیا لیتا۔“

”میرا کیا ہے جی! تیس سسرال والوں کو تیار کر لیتا۔“ پھاتاں نے مسکرا کر کہا۔

”اسے گل ہے تو ساہے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ میں انھیں راضی کر لوں گی۔ کوئی شہ گھڑی ہونی چاہئے۔ اس کے بارے میں مل جل کر طے کر لیں گے۔“

پھاتاں اٹھتے ہوئے بولی۔ ”بھین جی ساہے کا دن یاد رہے گا نا؟“

”بالکل یاد رہے گا۔“ جیلہ بھی کھڑی ہو گئی اور پھاتاں کے ساتھ ساتھ باغ سے چلی گئی۔

رحیم داد کو حیرت ہوئی، اللہ وسایا کے برعکس جیلہ کے چہرے پر پہلی سی تازگی تھی اور دیاہی نکھار تھا۔ اس کے رویے میں بھی وہی شگفتگی تھی جو مسکراہٹ بن کر اس کے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں رہتی تھی۔

اللہ وسایا نہ باغ میں آیا نہ رات کو مہمان خانے میں۔ وہ دوسرے روز، دن چڑھے رحیم داد کے پاس آیا۔ اس کا چہرہ اب بھی اترا ہوا تھا۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری میں دو گھنٹے بعد لہور جا رہا ہوں۔ جیلہ اور دونوں بچے میرے ساتھ جائیں گے۔“

”کوئی خاص کام ہے لہور میں؟“ رحیم داد کے استفسار میں حیرت تھی۔

”خاص ہی کام ہے۔“ اللہ وسایا نے کام کی نوعیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ”تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میں نے نوکروں کو بول دیا ہے۔ آرام سے رہ، یہ تیرا ہی گھر ہے۔ جس چیز کی

ضرورت ہو منگوا لیتا۔“

”کب تک واپسی ہوگی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔ زیادہ دن بھی ہو سکتے ہیں۔“

رحیم داد دریافت کرنا چاہتا تھا، وہ ملتان سے واپسی کے چند ہی روز بعد لاہور کیوں جا رہا ہے اور جیلہ کو کس لیے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے؟ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ مگر اللہ وسایا نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ فوراً باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا اسی روز بیوی بچوں کے ہم راہ لاہور روانہ ہو گیا۔ رحیم داد بالکل تیار رہ گیا۔ وہ بار بار اللہ وسایا کے بشرے سے ٹپکتی ہوئی پریشانی کے بارے میں غور کرتا۔ جتنا وہ غور کرتا، اللہ وسایا کا رویہ اسے پر اسرار نظر آتا۔ وہ دن دن بھر کمرے میں بند ہو کے حسب معمول چوہدری نورانی مرحوم کے جعلی دستخط بنانے کی مشق کرتا رہتا۔ شام کو نہادھو کر ٹمٹا ہوا باغ کی جانب نکل جاتا۔ رات کا کھانا مہمان خانے یا باغ میں کھاتا۔ مہمان خانے کی پھت پر بندوق سرھانے رکھ کر سوتا اور بہت چوکنا سوتا۔ ذرا کھٹکا ہوتا، وہ بندوق پر ہاتھ رکھ کر اٹھ بیٹھتا۔ احمد صحت یاب ہو گیا تھا۔ وہ رات کو آنگن میں سوتا۔ اس کے آنے سے رحیم داد کو خاصی ڈھارس ہو گئی۔

اللہ وسایا نویں روز بیوی بچوں کے ساتھ صبح واپس آگیا۔ مگر رحیم داد سے نہیں ملا۔ شام کو رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا، اللہ وسایا آیا۔ جیلہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس دفعہ نہ صرف اللہ وسایا کے چہرے پر بلکہ جیلہ کے چہرے پر بھی پریشانی برس رہی تھی۔ دونوں کچھ دیر گم صم بیٹھے رہے پھر اللہ وسایا نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بچے ہوئے لمبے میں بولا۔

”چوہدری! یہ حویلی ہم نے جلد ہی خالی کرنی ہوگی۔“

رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیوں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”ہم کدمہ ہار گئے۔ پہلے ملتان میں ہارے، فیملیور میں ایڈیشنل کمشنر بحالیات کے پاس اپیل کی۔ اس نے اپیل نام منظور کر دی۔ حویلی اور ہماری ساری اراضی متروکہ جائیداد قرار دے دی گئی۔“ اللہ وسایا نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”یہ حویلی اور زمین جیلہ کے بیٹوں کی ملکیت تھی۔ اس کی دھی ہونے کے ناتے جیلہ کے نام پر یہ میرے پاس تھی۔ پر سرکار نے جیلہ کو وارث ماننے سے انکار کر دیا۔“

”چوہدری! یہ تو دیکھ، میرے بیٹوں کی تو بہت اراضی تھی۔ اس کی دو ہزار ایکڑ سے اوپر زمین احسان علی شاہ نے دہائی۔ پر اس کا سبنا مان لیا گیا۔“ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر گلہ کیا۔ ”ویسے اس کے پاس

”سکول سے کیوں خار کھاتا ہے؟ سکول نے احسان شاہ کا کیا بگاڑا ہے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اللہ وسایا سے دریافت کیا۔

”وہ میرے سکول سے سخت نراض ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا، جانگیوں اور کیوں کے بچے پڑھ لکھ کر یہ جان لیں کہ وہ جانگی اور کیوں ہیں اور احسان شاہ کیسے بگیرہ دار بن گیا؟ انھیں پتہ چل جائے گا کہ اس کے پرکھے اپنے انگریز حاکموں کے جوتے چاٹتے تھے۔ ان کے سامنے کتوں کی طرح دم ہلاتے تھے۔“ جمیلہ کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”یہ ہے احسان علی شاہ کی اصلیت جس کے بل پر وہ شاہ جی بنا پھرتا ہے، اپنے کو خاندانی بگیرہ دار رکھیں بتاتا ہے۔“

اللہ وسایا اور رحیم داد خاموش بیٹھے رہے۔ جمیلہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور نفرت سرخی بن کر پھیل گئی۔ وہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

”اب کیا ہو گا؟“ رحیم داد نے سکوت توڑا۔

”ہو تا کیا ہے، وہی جو میں نے کہا ہے۔“ اللہ وسایا نے جواب دیا۔

”کب تک حویلی خالی کرنی ہو گی؟“

”دس روز کے اندر اندر حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

اللہ وسایا کھڑا ہو گیا، جمیلہ اور رحیم داد بھی کھڑے ہو گئے۔ تینوں باغ سے نکلے اور مہمان خانے میں پہنچے۔ مگر اللہ وسایا ٹھہرا نہیں، حویلی میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ جمیلہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ رحیم داد نے شام کی دھندلی روشنی میں دیکھا، جمیلہ تھکی ہوئی اور مڑھال نظر آ رہی ہے۔ اس کے قدم ڈگمگائے۔ اللہ وسایا نے اسے سنبھال لیا۔ جمیلہ نے اس کے بازو پر اپنا سر ٹکا دیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ رحیم داد اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ صرف یہ دیکھ سکا، اللہ وسایا اس کا کندھا بڑے پیار سے تھپک رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے سہارے سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے حویلی میں داخل ہو گئے۔

رحیم داد مہمان خانے میں تنہا رہ گیا۔ احمد بھی نہیں تھا۔ وہ آگن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہ دیران اور اداس شام تھی اور اس سے بھی زیادہ اداس رحیم داد تھا۔ اب کیا ہو گا؟ وہ کس کے پاس جائے گا؟ کہاں جائے گا؟ کیسے جائے گا؟ ان سوالات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ زندگی ایک بار پھر اسے بوجھ نظر آنے لگی۔

وہ بے چین اور مضطرب تھا۔ احمد کھانا لایا مگر وہ آدمی روٹی بھی نہ کھا سکا۔ بستر پر لیٹا تو آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ رات کروٹیں بدلتے کسی نہ کسی طور کئی۔ سویرے اٹھا تو وہی الجھن اور پریشانی

پہلے ہی دو سو مرنے کے لگ بھگ اراضی تھی۔ یہ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی مدد کرنے اور وفاداری دکھانے پر اس کے پرکھوں کو ملی تھی۔ ”اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔“ انگریز کا راج تھا، تب اس کی چلتی تھی۔ اب انگریز کا راج نہیں رہا تب بھی اس کی چلتی ہے۔ اس نے ہمارے خلاف درخواست لگائی تھی۔ ہم نے اپنی زمین کی واپسی کے لیے اس کے خلاف درخواست لگائی تو کوئی انکوائری شکوائری نہ ہوئی کیوں اس کی درخواست پر فائٹ انکوائری کا حکم جاری کر دیا گیا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اللہ وسایا بار گیا۔ احسان شاہ جیت گیا۔“

”اسے تو جیتنا ہی تھا۔ اس کی اوپر تک پہنچ ہے۔ وزیروں اور افسروں سے یاری ہے۔ اس کے پتر اور جنوائی بھی دڑے افسر ہیں۔ وہ نہ جیتے گا تو کیا میں جیتوں گا۔“ اللہ وسایا نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

”ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ جمیلہ کا لہجہ ٹیکھا اور مزید تلخ ہو گیا۔ ”احسان شاہ نے تو جیتنا ہی جیتنا تھا۔ احسان شاہ کے پرکھے بھی تیرے پرکھوں سے جیتے تھے، جنھوں نے اپنی دھرتی کو انگریزوں کی غلامی سے بچانے کے لیے جنگ لڑی تھی، بغاوت کی تھی۔ وہ باہنی وال تھے۔ ہار گئے تو ان سے زمین، مویشی، عزت، آبرو، سب کچھ چھین لیا گیا۔ انھیں تباہ و برباد کر کے جانگی بنا دیا گیا۔ احسان علی شاہ کے پرکھوں نے انگریزوں کے کارن غداری کی، آزادی کا سودا کیا، ان کے ساتھ مل کر باہنی وال باغیوں اور وردرھیوں کو کچل دیا۔ انگریزوں نے خوش ہو کر انھیں عزت دی، شان دی۔ سید اور شاہ جی کہا اور سید اور شاہ جی بنا بھی دیا۔“

”ایسی باتیں کیوں کرتی ہے۔“ اللہ وسایا نے ہچکے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔“ جمیلہ اسی تلخی سے بولی۔ ”میں نے تاریخ کی کتابوں میں جو پڑھا ہے، وہ بتا رہی ہوں۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”سر ڈنزل ایبٹ سن بہت دڑا انگریز افسر ہوتا تھا۔ اس نے پنجاب کی قوموں اور جات برادریوں کے بارے میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس کا نام ہے، پنجاب کا سنس۔ ایبٹ سن نے اس میں لکھا ہے، ۱۸۵۷ء کے غدر میں باہنی وال وردرھیوں نے انگریز فوج کو بہت تنگ کیا۔ وہ لیرے اور جانگی تھے۔ سو باہنی وال آج تک جانگی کہلاتے ہیں۔ تو خود سوچ، انگریز کی مونچھ کا بال خاندانی بگیرہ دار سید احسان علی شاہ، ایک باہنی وال جانگی اور معمولی مزارعے اللہ وسایا کو کیسے زمیں وارد دیکھ سکتا ہے۔ تب ہی تو اس نے اللہ وسایا سے زمیں داری چھین لی۔ اس کی پگ کا طرہ اور اونچا ہو گیا۔“

”احسان شاہ میری زمیں داری ہی سے نہیں، تیرے سکول سے بھی خار کھاتا ہے۔“

فضول۔



احمد ناشتا لے کر کمرے میں آیا۔ اس کا چہرہ بھی مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اداس اور مضطرب لگ رہا تھا۔ رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ ”حمہ! تو پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟“

”پریشانی کی توجی گل ہی ہے۔“ وہ بچھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تیں نوں تو پتہ ہی ہے، زمیں دار مکدمہ ہار گیا۔ وہ زمیں دارنی کے ساتھ پنڈ چھوڑ کر جا رہا ہے۔“

”تیں نوں کیسے پتہ چلا؟“

”میں نوں توجی پتہ چل ہی جاتا۔ میں توجو جلی کا نوکر ٹھیرا۔ پر اب تو یہ بات سب جانتے ہیں۔ زمیں دار ہی نے سب کو بتایا ہے۔ پنڈ میں ہر جگہ اسی کا چرچا ہے۔ سب دکھی ہیں۔ کیا مزارعے کیا کی۔ سبھی زمیں دار اور زمیں دارنی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میں نے توجی کتنوں ہی کو روتے دیکھا۔“

”دکھ کی تو گل ہی ہے۔“ رحیم داد نے احمد کی تائید کی۔ ”پنڈ والوں کو ایسا زمیں دار نہیں ملے گا۔“

”توبہ کرو جی! وہ زمیں دار ہی کب تھا۔ وہ اور زمیں دارنی تو سب سے اس طرح گھل مل کر رہتے تھے جیسے اس کے اپنے شریکے اور گھروالے ہوں۔“ احمد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”وڈے زمیں دار تو جی! وہاں ہوا موت، ہر مزارعے سے بھیڑ بکری، بھاڑو یا چھندر لیتے ہیں۔ بیماری ہو یا مہمان آئے، جتنے کلو چاہے منگوا لیتے ہیں۔ مزارعے کی دودھ دینے والی جھوٹا دھکی، جب تک جی چاہے اپنے پاس رکھتے ہیں۔ گاہ کے وکھت ایک جوڑا ڈنگر اور جتنے بندے چاہتے ہیں بلا لیتے ہیں۔ ماڑی یا حویلی کی لپائی، تنک کی پسائی، سب مفت کراتے ہیں۔ ایسی ہی جانے کتنی طرح کی مزارعوں سے دیگار لیتے ہیں۔ مویشی اور چکر تو اٹھواتے ہی ہیں جو ان گھروالیوں اور کڑیوں تک کو اٹھوا لیتے ہیں۔ واپس کرنے کی سٹری رکھتے ہیں یا بیچ دیتے ہیں۔ کیا کیا بتاؤں جی، وڈے زمیں دار کتنا ظلم کرتے ہیں۔ پر اپنا زمیں دار تو نیک بندہ ہے۔ اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ جہی تو سب اس کے لیے رو رہے ہیں۔“

”اس کے جانے کے بعد تو کیا کرے گا؟“

”میں توجی اس کے ساتھ ہی جاؤں گا۔“ احمد نے جواب دیا۔

دامن گیر تھی۔ دوپہر ہوئی، رات ہوئی۔ نہ اللہ وسایا نظر آیا نہ جمیل۔ دوسرا دن بھی گزر گیا۔ رحیم داد نے سوچا، دونوں گاؤں چھوڑنے کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ زمیں داری کا بہت بڑا بکھیرا ہے۔ انھیں جانے سے پہلے ہر کام نمٹانا ہے۔

رحیم داد کو بھی اب کوئی ہر کشن سے کہیں نہ کہیں جانا تھا۔ اللہ وسایا اسے پہلے ہی صورت احوال سے خبردار کر چکا تھا۔ اس نے سویرے سویرے ٹائی بلوایا، بال کٹوائے، ڈاڑھی کی تراش خراش کرائی، حجامت بنوانے کے بعد غسل خانے میں گیا۔ نہادھو کر اگلے کپڑے پہنے۔ کنگھی سے سر اور ڈاڑھی کے بال سنوارے۔ آنکھوں پر عینک لگائی اور دیوار میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا زخم کب کا مند مل ہو چکا تھا۔ مگر اس کے بائیں رخسار پر لگ بھگ چار انچ لمبا نشان ہلال کی شکل میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر اپنے چہرے پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالی، زیر لب مسکرایا۔ اب اس کی شکل و شبابت میں اتنا فرق آچکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔ چہرے مہرے سے وہ اس قدر مختلف بن چکا تھا۔ لاری یا ٹرین سے بھی ستر کر سکتا تھا۔

آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اس نے طے کیا، وہ کوئی ہر کشن، شام ہونے سے پہلے چھوڑ دے گا۔ منگمری اسٹیشن جانے کے بجائے لاری سے پاک چن جائے گا اور رات کی ٹرین سے لودھراں پہنچ کر بہاول پور کے راستے سندھ کی طرف نکل جائے گا۔ سکھر، ٹکڑ پور، نواب شاہ یا سندھ کے کسی بھی علاقے میں چلا جائے گا۔ چوہدری نور الہی کے کلیم کی بنیاد پر زرعی زمین اور مکان الاٹ کرانے کی کوشش کرے گا۔ جب تک الاٹمنٹ نہیں ملے گا، کہیں کان کھول لے گا یا کوئی اور کاروبار شروع کر دے گا۔ لالی کی دی ہوئی تین ہزار سے اوپر رقم اس کے پاس موجود تھی۔ اس رقم سے وہ بہت کچھ کر سکتا تھا۔ سندھ میں کسی جان بچان والے کے ملنے کا امکان بھی کم تھا۔ وہ چوہدری نور الہی کے روپ میں اطمینان سے نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔

وہ اب چوہدری نور الہی بن کر ہی زندہ رہنا چاہتا تھا۔ رحیم داد کو وہ بہت پہلے ختم کر چکا تھا۔ بیگانہ کے قتل کے بعد رحیم داد سے اس کے سماجی وجود کا آخری رشتہ بھی ٹوٹ گیا تھا۔ یہ پھانسی کا خطرہ مول لے کر رحیم داد کو زندہ رکھنے کی آخری کوشش تھی جس میں وہ اپنی اکلوتی بہن کو بھی داؤ پر لگا چکا تھا۔ وہ کس کے لیے رحیم داد بن کر زندہ رہتا؟ نوراں کے لیے؟ بچوں کے لیے؟ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ نوراں مر گئی۔ اس کے ساتھ بچے بھی مر گئے۔ اب اس کا کوئی رشتہ نہیں رہا تھا۔ رحیم داد اس کے لیے ماضی کے کباڑ خانے کا حصہ بن چکا تھا۔ زنگ خوردہ، بوسیدہ، بیکار اور

”اگر وہ تجھے اپنے ساتھ نہ لے گیا تو کیا کرے گا؟“

”تب تو جی میں یہ پنڈ ہی چھوڑ دوں گا۔ اس کے جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ پنڈ کے جانے کتنے لوگ سوچ رہے ہیں، زمین دار اور زمین دارنی کے جاتے ہی کسی اور پنڈ کو چلے جائیں گے۔ جانے یا زمین دار کون ہو؟ کیسا ہو؟ اور جی کوئی بھی ہو۔ ہو گا تو وہاں ہی زمین دار اور ایسے سب زمین دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔“ اس کی آواز بھر آگئی۔ آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔ ”یہ تو جی بہت برا ہوا۔ بہت ہی برا ہوا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ احمد سانسے فرش پر خاموش بیٹھا بار بار آنسو پونچھتا رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو وہ برتن اٹھا کر باہر چلا گیا۔

پیردن گزر گیا۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ لو کے جھکڑ چلنے لگے تھے۔ مہمان خانے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا بوجھل اور غبار آلود تھی۔ رحیم داد بستر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوسرے کو قدموں کی آہٹ سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے دیکھا، اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس کے ساتھ جیلہ بھی تھی۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اللہ وسایا اور جیلہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے آنکھیں ملٹے ہوئے کہا۔ ”باہر زبردست گرمی ہے۔“

”ہاں جی! آج گرمی کچھ زیادہ ہی ہے۔“ اللہ وسایا بولا۔ ”سویرے سے لو چلتی شروع ہو گئی۔“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ ”میرا تو آج شام سے پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ ہے۔ سوچا تھا، روٹی کھا کر تیرے پاس آؤں گا۔ تم دونوں سے مل کر چلا جاؤں گا۔“

جیلہ چپ بیٹھی رہی۔ اللہ وسایا نے کہا۔ ”چلا جانا ایسی کیا پختی ہے۔ دو چار روز ٹھیر جا۔ ہم نے بھی یہاں کب تک رہنا ہے۔ حویلی تو خالی ہی کرنی ہے۔“

”آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟“

”ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔“ اللہ وسایا نے سادگی سے جواب دیا۔

”سوچنا کیا ہے۔“ جیلہ نے کمری پر پہلو بدلا اور اللہ وسایا کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”تیرے پاس ۱۵ ہکڑ زمین تو رہے گی۔ مزارع بن کر تو ہم اس پنڈ میں رہ ہی سکتے ہیں۔“

”لو جی! اس کی سنو۔“ اللہ وسایا نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”جس پنڈ میں اٹھ سال تک زمین داری کی، اب تو اسی میں مجھے مزارع بنا کر ٹھیرانا چاہتی ہے۔ ذرا سوچ تو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”نہیں جی! یہ نہیں ہو سکتا۔“ رحیم داد نے بھی اللہ وسایا کی تائید کی۔ ”زمین دار اپنے ہی پنڈ

میں مزارع بن کر نہیں رہ سکتا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ عزت اور آبرو بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔“

”چھوڑ چوہدری کیا رکھا ہے ان باتوں میں۔“ جیلہ تھکے لمبے میں بولی۔ ”سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور جی سب سے وڈی گل ابرہ ہے، میں نے اپنا سکول نہیں چھوڑا۔ اللہ وسایا! تو زمین داری بھول جا۔ اپنے تئیں مزارع سمجھنے کی کوشش کر۔ ویسے بھی زمین دار بن کر تو کب زمین دار رہا۔ نہ وہ تیری نور تھی، نہ وڈے زمین داروں والی آن بان تھی۔ مجھے تیری یہی سادگی چنگی لگتی تھی۔“

”چل، تیری گل میں نے مان لی۔ میں تو مزارع بن جاؤں گا۔ پہلے بھی مزارع ہی تھا۔ میرا پیو بھی مزارع تھا۔ زمین دار تو مجھے تو نے بنایا۔“ اللہ وسایا کھل کر مسکرایا۔ ”پر تو مزارع کے گھر والی بن سکے گی؟“

”بالکل بن سکتی ہوں۔“ جیلہ نے جوش سے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”آزما کے دیکھ لے۔“ وہ اور زیادہ جوش میں آگئی۔ کرتے کی دونوں آستینیں چڑھا لیں۔ اس کے گورے گورے ہاتھ دور تک عیاں ہو گئے۔ ”تو نے مجھے سمجھا کیا ہے؟ سویرے سویرے اٹھ کر مویشیوں کے لیے پٹھا دانا کروں گی۔ چائی میں مدھانی ڈال کر دودھ بلوؤں گی۔ تو کھیتوں پر جائے گا اور میں بچوں کو لے کر سکول چلی جاؤں گی۔ دوسرے کو روٹی پکاؤں گی اور سر پر چنگیری میں رکھ کر تیرے لیے بھتا لے کر کھیتوں پر جاؤں گی۔ تیرے کپڑے دھوؤں گی۔ چرنے پر سوت کا توں گی۔ چکی میں دانا پیسوں گی۔ میں کیا نہیں کر سکتی؟“

”چوہدری! سن رہا ہے، اس کی باتیں۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا پھر مڑ کر جیلہ کی جانب دیکھا۔ ”تجھ سے یہ سب کچھ ہو سکے گا؟ جیلہ! ایسا کرنا تیرے بس میں نہیں۔ تیرا یہ سارا رنگ روپ مٹ جائے گا۔ آئینہ دیکھے گی تو خود کو پہچان بھی نہ سکے گی۔ کسے گی، ہائے ربا! میں تو برباد ہو گئی۔ یہ کیا ہو گیا؟ تو نے یہ بھی سوچا؟“

”اللہ وسایا! روپ رنگ کا کیا ہے۔ یہ تو دھوپ چھاؤں ہے۔ آج نہیں تو کل اسے مٹا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے اپنی بات پر اڑی رہی۔ ”میں نے تھوڑا جیون گزار کر ہی بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ کبھی اپنے کو اس پاروتی کے روپ میں دیکھا جو لہور میں پڑھتی تھی۔ ایک سے ایک عمدہ کپڑے پہنتی تھی۔ کالج کے ڈراموں میں سوانگ بھر کر ایکٹنگ کرتی تھی، ہنستی تھی، ہنساتی تھی۔ سکیوں کے ساتھ ناچتی گاتی تھی۔ چمک مینا تھی۔ شام کو راوی پر کشتی چلاتی تھی۔ کار میں سواری کرتی تھی۔ شان دار کوٹھی میں رہتی تھی۔“ اس کا لہجہ دھیما پڑ گیا۔ ”میں نے اس پاروتی کو بھی دیکھا جسے ستمبر

۱۹۳ء کی رات بصیر پور سٹیشن سے بلوائی اٹھالے گئے۔ فیروزہ پاروتی نہ رہی۔ بھوکے کتوں کے لیے ہڈی بن گئی۔ کبھی تین سو میں بکی کبھی بیس سو میں۔ ”اس کا چہرہ مرجھا گیا، لہجہ تلخ ہو گیا۔“ تو مجھے دیا کے گھر سے نکال کر نہ لاتا تو آج میں ہیرامنڈی کی کسی کجری کے کوٹھے پر اپنا روپ رنگ اور جوانی بچ رہی ہوتی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تجھے پتہ ہی ہے میں پاروتی سے کیسے جیلہ بنی اور زمیں دارنی کھلانے لگی۔ اب زمیں داری کے ساتھ زمیں دارنی بھی نہ رہی۔ جس طرح پاروتی مر گئی ویسے ہی زمیں دارنی بھی مر گئی۔ اب میں اللہ وسایا مزارعے کی گھروالی بن جاؤں گی۔ بول میں مزارعے کی گھروالی کیوں نہیں بن سکتی؟ یہ کیوں نہیں کہتا؟ تو زمیں داری کی شان میں مزارعے بنانا نہیں چاہتا۔“

”چل تو ہی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے تیری بات مان لی۔“ اللہ وسایا نے جیلہ کے جوش و خروش کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”پر یہ تو سوچ، اگر نئے زمیں دار نے مجھے بے دخل کر دیا۔ ایسے ہی جیسے بنسی لال نے میرے پیو کو اور مجھے بے دخل کر دیا تھا۔ تب کیا بنے گا؟“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”کوئی زمیں داریہ نہیں چاہے گا کہ ایسے بندے کو اپنا مزارعے بنا کر رکھے جو اسی پنڈ کا اٹھ سال تک زمیں دار رہ چکا ہو۔ مزارعوں پر اپنا رعب بھانے کے لیے وہ سب سے پہلے اللہ وسایا کو بے دخل کرے گا۔ زمیں داری جو چلائی ہوئی۔“

”چوہدری! توں یہ کہتا چاہتا ہے، ہم یہ پنڈ چھوڑ دیں۔“ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”پر میرے سکول کا کیا بنے گا؟“

”سکول کو تو اب بھول ہی جا۔“ اللہ وسایا بولا۔ ”کوئی بھی وڈا زمیں دار اپنی زمیں داری میں سکول شکول نہیں دیکھ سکتا۔ سرکار نے کتنے ہی زمیں داروں کے پنڈ میں سکول کھولنے چاہے پر انھوں نے نہ صرف زبردست مخالفت کی بلکہ محکمی رشوت دے کر روک دیا۔“

”اللہ وسایا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے تائید کی۔ ”میں تجھے ایک واردات کا حال سناتا ہوں۔ ملتان کی تحصیل میلیس میں دو وڈے زمیں داروں میں زبردست جھگڑا چل رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان میں سے ایک میرا جاننے والا تھا۔ اس سے ڈپٹی کمشنر نے سکول کھولنے کے لیے چندا مانگا۔ چندا تو اس نے دگنا دے دیا پر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی، سکول اس کے پنڈ کی بجائے، مخالف زمیں دار کے پنڈ میں کھول دیا جائے۔ ڈپٹی کمشنر نے اس کی شرط مان لی اور حکم جاری کر دیا۔ بعد میں سنا، زمیں دار گالاں نکالتا تھا۔ کہتا تھا، میرے ساتھ دھوکا

کیا گیا۔“

”ہاں جی، ایسا ہی ہوتا ہے۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ ”یہ پنڈ چھوڑنا ہی ہو گا۔ اب تو کچھ اور سوچنا ہو گا۔“

جیلہ خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔

”اب اس پنڈ میں تم دونوں کا رہنا کسی طرح ٹھیک نہیں۔ کوئی اور ہی رستہ دیکھنا ہو گا۔“ رحیم داد نے دہلی زبان سے کہا۔

اللہ وسایا ہزاری سے بولا۔ ”کچھ سمجھ نہیں آتی۔ میں نے تو ملتان میں کیس بارنے کے بعد ہی سوچنا شروع کر دیا تھا۔“

”چنتا نہ کر، تو مزارعے بننا نہیں چاہتا تو نہ بن۔“ جیلہ نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

اللہ وسایا اس کی بات کاٹ کر گویا ہوا۔ ”میں مزارعے بننے کو تیار ہوں پر اس پنڈ میں نہیں۔ کسی اور زمیں داری میں مزارعے بن کر رہ سکتا ہوں۔“

”یہ بات دل سے نکال دے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”اللہ وسایا! اب تو مزارعے نہیں بن سکتا۔ کوئی زمیں دار تجھے مزارعے بنائے گا بھی نہیں۔ تو اسے جتنا آسان سمجھتا ہے، ایسا ہے نہیں۔ اب تیں نوں کچھ اور سوچنا ہو گا۔“

”یہ میں کہہ رہی تھی۔ مگر اس نے مجھے یہ بات کہنے ہی نہیں دی۔“

”کہہ کیا کہنا چاہتی ہے؟“ اللہ وسایا بولا۔

”اگر اس پنڈ میں نہیں رہنا تو ایسا کرتے ہیں، لہو چلتے ہیں۔“

”وہاں جا کر کیا کریں گے؟“ اللہ وسایا نے حیرت سے پوچھا۔

”میں وہاں کسی سکول میں پڑھانے پر لگ جاؤں گی۔ مجھے کسی نہ کسی سکول میں نوکری ضرور مل جائے گی۔“

”یہ کہنا چاہتی ہے تو نوکری کرے اور میں ہڈ حرام بن کر تیری کمائی کھاؤں؟“ اللہ وسایا نے منہ بگاڑا۔ ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ ”چوہدری! اس کی گل سن رہا ہے؟“

”اتنا برا کیوں مانتا ہے۔“ جیلہ نے روٹھے ہوئے اللہ وسایا کو منانے کی کوشش کی۔ ”میں نے اپنی طرف سے ایک اپائے بتایا تھا۔ تو اس کے لیے تیار نہیں تو کچھ اور چار کرتے ہیں۔“

رحیم داد نے کہا۔ ”ہاں، کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔“

اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری! تو ابھی نہ جا۔ چند روز بعد چلا جانا۔ ویسے اس پنڈ سے تو اب

جانا ہی ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ اللہ وسایا کھڑا ہوا تو جیلہ بھی کھڑی ہو گئی۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد نے کوئلہ ہرکشن چھوڑنے کا ارادہ فی الحال ترک کر دیا۔ وہ اللہ وسایا اور جیلہ کی دل آزاری نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی اسے جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔

اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکال کے کھولا۔ چوہدری نور الہی کے دستخط بغور دیکھے، سادہ کاغذ پر جعلی دستخط بنائے۔ دونوں کو برابر رکھا۔ ان پر تنقیدی نظر ڈالی۔ دستخط بالکل ہو بھوتے۔ کسی نقطے، شوٹے، میاں تک کہ اعراب میں بھی سرمو فرق نہ تھا۔ رحیم داد کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ مہینوں کی مسلسل مشق کا نتیجہ آج اس کے سامنے تھا۔ وہ دیر تک دستخط دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔

رحیم داد نے کاغذات الٹ پلٹ کے دیکھے۔ جو کاغذ اردو میں تھے، وہ اس نے پڑھ لیے۔ انگریزی میں لکھی ہوئی درخواستیں اور ان پر متعلقہ محکموں کے افسران کے احکام پڑھنے سے وہ قاصر تھا۔ ان کا مفہوم وہ مطلق نہ سمجھ سکا۔ ویسے بھی متروکہ جائیداد اور اس کے الاٹمنٹ کے بارے میں اس کی معلومات نہایت محدود تھی۔ تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ مہاجر نہیں تھا۔ لہذا اس نے کبھی یہ باتیں جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ نور الہی نے مرنے سے پہلے اپنے کلیم کے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہی اس کی کل معلومات تھیں اور انہی کی بنیاد پر وہ اتنا ضرور جانتا تھا کہ کلیم منظور شدہ ہے اور اس کے عوض وہ زرعی اراضی اور املاک کا الاٹمنٹ حاصل کر سکتا ہے۔

کاغذات دیکھتے دیکھتے اس کے ذہن میں یکایک خیال آیا کہ جیلہ کی زمین اور حویلی مقدمہ ہارنے کے بعد متروکہ جائیداد قرار دی جا چکی ہے۔ چوہدری نور الہی کے کلیم کی بنیاد پر وہ یہی زمین الاٹ کرا سکتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ وسایا اور جیلہ کو پریشانی اور اضطراب سے بچا سکتا ہے اور سب سے بدھ کر یہ کہ اسے کوئلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں جانے کا خطرہ مولیٰ نہیں لیتا پڑے گا۔ کوئلہ ہرکشن اس کے لیے محفوظ ٹھکانا تھا۔ میاں وہ کئی ماہ سے مقیم تھا۔ اس ماحول سے وہ پوری طرح مانوس ہو چکا تھا۔ اللہ وسایا اور جیلہ اس پر مہربان تھے اور اس کے آرام کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اس کی دل جوئی کرتے تھے۔ مہمان کے بجائے اسے اپنے ہی کنبہ کا فرد تصور کرتے تھے۔

اسے اللہ وسایا اور جیلہ کا احسان چکانے کا نہایت عمدہ موقع ملا تھا۔ اس میں اس کا اپنا فائدہ بھی تھا۔ وہ راتوں رات مہمان سے مالک و مختار بن جاتا، زمین دار بن جاتا۔ وہ اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا۔ مگر اس کے ساتھ اندیشوں نے بھی سرابھارا

اور ان کی نوعیت یہ تھی کہ پنجاب کے کسی دور دراز علاقے میں اگر وہ الاٹمنٹ حاصل کرتا تو خطرہ بہت کم تھا۔ سندھ میں بہت ہی کم تھا۔ ضلع ٹنگمری میں خطرہ زیادہ اور بہت زیادہ تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس ضلع میں اراضی اور املاک الاٹ کرانے کے لیے چوہدری نور الہی مرحوم طویل عرصے تک کوشش کرتا رہا تھا۔ دفنوں کے چکر کاٹتا رہا تھا۔ افسروں اور ماتحت عملے سے ملتا رہا تھا۔ ان میں اس کے جاننے والے بھی ہو سکتے تھے۔

کوئلہ ہرکشن کی حویلی اور اراضی کے الاٹمنٹ کو جب اس نے اس پہلو سے دیکھا تو گھبرا گیا، خوف زدہ ہو گیا۔ جعلی دستخط سے حاصل کیا ہوا الاٹمنٹ اگر کسی وقت پکڑ لیا جاتا تو اس میں صرف جیل جانے کا خطرہ نہیں تھا بلکہ اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہوتا۔ وہ چوہدری نور الہی کا قاتل تھا اور ایک بار جب راز افشا ہو جاتا تو سارے دوسرے راز پیاز کے پھنکوں کی طرح اترتے چلے جاتے۔ وہ حکیم چشتی کا قاتل تھا، سیف اللہ کا قاتل تھا اور جیل کا مفرد قیدی بھی تھا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس نے کلیم کے کاغذات کپڑے میں لپیٹ کر گرہ لگائی اور حفاظت سے تکیے کے نیچے رکھ دیئے۔

شام کو اس نے اللہ وسایا اور جیلہ کے ساتھ کھانا کھایا۔ دونوں شش و پنج میں مبتلا تھے اور آئندہ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکے تھے۔ ان کے چرے مرجھائے ہوئے تھے اور آنکھیں ویران ویران نظر آتی تھیں۔ نہ اللہ وسایا نے اس کے کلیم کے بارے میں تذکرہ کیا نہ ہی رحیم داد نے ایسی کوئی بات کی۔ وہ دوسری کوٹے کرچکا تھا کہ نہ صرف کوئلہ ہرکشن کی متروکہ املاک بلکہ ضلع ٹنگمری میں کہیں بھی الاٹمنٹ حاصل کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرے گا۔ وہ کوئی خطرہ مول لینے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔

صبح جیلہ مہمان خانے میں آئی۔ وہ اس وقت تنہا تھی۔ رحیم داد ناشتا کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو نے اور اللہ وسایا نے آگے کے لیے کیا سوچا؟“

”میں تیرے پاس اسی بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔“ جیلہ نے جواب دیا۔

”کیا بات کرنی ہے؟ کیا تو نے کچھ سوچ لیا؟“

”ہاں! ایک ہی گل سمجھ آتی ہے۔ میں برابر اسی پر سوچ بچار کر رہی ہوں۔ اور تو کچھ مجھے نظر نہیں آتا۔“

”اللہ وسایا کو نہیں بتایا؟“

”اسے میں نے بتایا تو تھا۔ تیرے سامنے ہی تو بات کی تھی پر وہ کہاں راضی ہوا۔ ایک دم نراض ہو گیا۔“

”وہی لمور جانے کی گل؟“

”ہاں۔“ جیلہ نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ ”تو خود ہی سوچ ہم اور کہاں جاسکتے ہیں؟ لمور میں مجھے آسانی سے کسی سکول میں پڑھانے کی نوکری مل سکتی ہے۔“

”پر یہ بات تو وہ ہرگز نہیں مانے گا کہ تو کمائے اور وہ بیٹھ کر کھائے۔“

”بات اس پر کار نہیں ہے۔ جاتے ہی تو نوکری نہیں مل جائے گی۔ پر لمور وڈا شہر ہے۔ وہاں مجھے نوکری ملنے میں زیادہ مشکل نہیں پڑے گی۔ جب تک نوکری نہیں ملے گی، تب تک گزارے کے لیے اپنے پاس کچھ نہ کچھ تو ہے۔ زیور کس دن کے لیے ہیں۔ انھیں بیچ کر بھی کام چلایا جاسکتا ہے۔“

”اللہ وسایا تو اس روز صاف انکار کر چکا ہے۔“

”تو اسے سمجھائے گا تو وہ مان جائے گا۔ میں اسی لیے تیرے پاس آئی ہوں۔“

”کیا تو سمجھتی ہے کہ وہ میری بات مان لے گا؟“

”مجھے پورا دوشواس ہے۔“ جیلہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تیری بات نہیں ٹالے گا۔ کہہ کے تو دیکھ۔ اس میں برائی کیا ہے۔“

”تو کہتی ہے تو میں اسے ضرور کہوں گا۔ اسے راضی کرنے کی پوری پوری کوشش کروں گا۔“

رحیم داد نے جیلہ کو یقین دلایا۔

”چوہدری! تو بھی ہمارے ساتھ لمور چلنا۔“ وہ خوش ہو کر بولی۔

مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ وہ لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہاں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ منگمری سے نزدیک ہونے کے باعث کوئی نہ کوئی ایسا جان پہچان کا وہاں کسی بھی وقت پہنچ سکتا تھا جو اسے شناخت کر لیتا۔ حالانکہ وہ اپنا حلیہ بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا۔ مگر کسی ایسے خطرے سے دوچار ہونے کے لیے تیار نہ تھا جو اسے پھانسی گھاٹ تک لے جاتا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں“ میں نے لمور نہیں جانا۔ میں اپنی گھر والی اور بچوں کو تلاش کرنے رحیم یا رخاں جاؤں گا۔ وہاں بھی بہت مہاجر ہیں۔ کسی سے گھر والی اور بچوں کا اتنا پتہ مل سکتا ہے۔ ویسے تو اور اللہ وسایا پہلے ہی پریشان ہیں۔ اب میں تم دونوں کے لیے اور بوجھ بننا نہیں چاہتا۔“ رحیم داد لمحے بھر خاموش رہا۔ ”میری فکر نہ کر۔ اپنے اور اللہ وسایا کے بارے میں سوچ۔“

”وہ تو میں دن رات سوچتی رہتی ہوں۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ جیلہ گردن جھکائے کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے پوچھا۔ ”چوہدری! تجھے ہم دونوں کے چھوٹے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ میری بات کا دوشواس کر، مجھے تو بہت دکھ ہوگا۔ سدا یاد آئے گا۔“

جیلہ کے انداز میں لگاوٹ تھی، دبی دبی چاہت تھی۔ رحیم داد نے یہی محسوس کیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر جیلہ کو دیکھا۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں، وہی پھول سا گھٹتہ چہرہ، وہی دل کشی، وہی رعنائی، جسے دیکھ کر اس پر خود فراموشی طاری ہو جاتی تھی۔ وہ اس کے اس قدر قریب بیٹھی تھی کہ رحیم داد اس کے خوب صورت بدن کی منک سونگھ سکتا تھا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ اس نے اب تک سوچا ہی نہیں تھا کہ جیلہ سے دور ہونے کے بعد اس پر کیا بیٹے گی۔ نہیں، وہ اس سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ اس پر گویا درافنگی طاری ہو گئی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

”تو یہ پنڈ چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ میرے کلیم سے حویلی اور زمین کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔“

”تیرا کلیم ہے؟“ جیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”ضرور ہوگا۔ تو مہاجر ہے نا۔ تو نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

عین اسی وقت اللہ وسایا کمرے میں داخل ہوا۔ جیلہ نے اسے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ ”اللہ وسایا! تجھے پتہ ہے، اپنے چوہدری کا کلیم موجود ہے۔ اس نے مجھے ابھی بتایا ہے۔“

”بتایا تو اس نے مجھے بھی تھا۔“ اللہ وسایا نے کہا۔ ”پر ایسی پریشانی رہی کہ یاد ہی نہیں آیا۔ یہ تو کتنا تھا، بہت وڈا کلیم ہے۔“

”وڈا کلیم ہے تو حویلی اور ساری اراضی کا الاٹمنٹ ہو سکتا ہے۔“ جیلہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”اب تو سب کچھ متروک جائیداد وڈیکٹیر کر دیا گیا ہے۔“

جیلہ اور اللہ وسایا کے چروں پر سرخی دوڑ گئی۔ انھیں مسرور دیکھ کر رحیم داد بھی جذبات کے سیلاب میں بہہ گیا۔ نہ اسے اندیشہ یاد آئے، نہ خطرات نے لرزہ برانداز کیا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور اللہ وسایا کو دے کر بولا۔

”یہ رہے! میرے کلیم کے کاغذات۔“

اللہ وسایا نے بستہ جیلہ کی طرف بڑھا دیا۔ ”جی لے! لے چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ۔ تو انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے۔ سب کچھ سمجھ لے گی۔“

جیلہ نے بستہ کھولا۔ کانغذات نکالے اور الٹ پلٹ کر پوری توجہ سے پڑھنے لگی۔ ذرا دیر بعد اس نے حیرت زدہ ہو کر اونچی آواز سے کہا۔ ”اللہ وسایا! اپنے چوہدری کا تو بہت وڈا کلیم ہے۔ منظور شدہ بھی ہے۔ اس میں زرعی اراضی اور املاک بھی شامل ہے۔“

”تب تو زمین کے ساتھ حویلی کی الاٹمنٹ بھی ہو سکتی ہے۔“

”بالکل ہو سکتی ہے۔“ جیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”چوہدری نے تو پہلے ہی یہ گل کی تھی۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”چوہدری زمیں دار بن جائے گا، تب تو مزارع بن کر بھی تو اس پنڈ میں رہ سکتا ہے۔ میرا سکول بھی رہے گا۔ نہ کہیں جانا پڑے گا نہ اس بارے میں سوچ سوچ کے بھیجا خراب کرنا پڑے گا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا اور مسکرائی۔ ”چوہدری! تو اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنالے گا نا؟“

”ایسی باتیں نہ کر۔“ رحیم داد نے ناراض ہونے کے انداز میں کہا۔ ”تو مجھے اتنا کمینہ اور بچ سمجھتی ہے کہ میں اللہ وسایا کو اپنا مزارع بنا کر رکھوں گا؟ اللہ وسایا زمیں دار تھا، الاٹمنٹ کے بعد بھی زمیں دار ہی رہے گا۔ تو آگے ایسی بات نہ کہنا۔ مجھے بہت دکھ ہو گا۔“

اللہ وسایا بولا۔ ”یہ باتیں چھوڑ۔ سب سے پہلے تو وکیل کو کلیم کے کانغذات دکھانے ہوں گے۔ وہی بتا سکتا ہے آگے کیا کرنا ہے۔“

”وکیل کو آج ہی بلوالے۔“ جیلہ نے اللہ وسایا سے کہا۔

”میں خود اس کے پاس چلا جاؤں گا۔ اب دیر بالکل نہیں ہونی چاہئے۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”پہلی لاری سے شہر چلا جاؤں گا۔“

اللہ وسایا اور جیلہ کے مرجھائے ہوئے چہرے روشن ہو گئے۔ دونوں کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد انھیں دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو ایک بار پھر طرح طرح کے اندیشوں نے اس پر یلغار کی۔ کلیم کے کانغذات کا بستہ سامنے میز پر رکھا تھا۔ وہ اسے خوف زدہ نظروں سے گھور رہا تھا۔



دن ڈھل رہا تھا۔ ہوا کی ہوئی تھی۔ فضا دھندلی دھندلی تھی۔ شدید گرمی تھی۔ جس تھا۔ رحیم داد خوف زدہ اور پریشان تھا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ اب وہ کمرے میں خاموش بیٹھا سورج غروب ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اللہ وسایا رات گئے لوٹے گا۔ رحیم داد اس کی واپسی سے پہلے ہی کوئلہ ہر کشن چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر چوہدری نور الی مرحوم کے کلیم کی بنیاد پر حویلی اور زمین الاٹ کرانے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر اب بچھتا رہا تھا۔ اسے طرح طرح کے اندیشے ستارہ تھے۔ جیل اور پھانسی کا پھندا رہ کر ڈر رہا تھا۔

اللہ وسایا اور جیلہ کے رخصت ہوتے ہی وہ اس ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ضلع منٹگری میں جہاں ہر طرف مشرقی پنجاب کے مہاجرین بکھرے ہوئے تھے، الاٹمنٹ حاصل کرنے میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ وہ اپنے پیچھے منصوبے کے مطابق کسی ایسے علاقے کی جانب نکل جانا چاہتا تھا جہاں اس کے جعلی کلیم کے پکڑے جانے کا امکان بہت کم ہو اور کسی جان پہچان والے کے ملنے کا بھی خوف نہ ہو۔ وہ شام کا اندھیرا پھیلنے ہی کلیم کے کانغذات کا بستہ سنبھال کر خاموشی سے نکل جانے کا تہیہ کر چکا تھا۔

وہ اسی ادھیرین میں الجھا ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ جیلہ اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہم راہ اللہ وسایا نہیں تھا، وکیل تھا۔ وہ دہرے بدن کا سنجیدہ اور بردباد شخص تھا۔ آنکھوں پر مونے مونے شیشوں کی عینک تھی۔ سر کے بال اڑے ہوئے تھے۔ اس کا نام محمد عثمان رندھاوا تھا۔ جیلہ نے رحیم داد کا اس سے تعارف کرایا۔

”اتنا تو مجھے بھروسا ہے کہ حکم انتاعی مل جائے گا۔ تو فکر نہ کر۔“ وکیل نے جیلہ کو اطمینان دلایا۔

جیلہ تو خاموش رہی مگر رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”پر اس سے حویلی اور زمین واپس تو نہیں مل جائے گی۔“

”چوہدری! اصل میں تو یہ کیس وراثت کا ہے۔“ وکیل محمد عثمان رندھاوا نے مقدمے کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے رحیم داد کو سمجھایا۔ ”اس کا فیصلہ محکمہ بحالیات سے نہیں عدالت دیوانی سے ہونا ہے پر یہ ہے پیچیدہ کیس۔ ہندو ہونے کے ناتے اس پر جیلہ کا حق نہیں بنتا۔ یہ جائیداد کے مالک لالہ کرشن دیال کی بیٹی جو ہوئی۔ ہندوؤں میں بیٹی کا جائیداد پر حق نہیں بنتا۔ اس کے مسلمان ہو جانے کے بعد کیس کی نوعیت بدل گئی۔ مسلم قانون میں بیٹی کا حق بنتا ہے۔ اب پیچیدگی یہ پیدا ہو گئی کہ جائیداد تو ہوئی ہندو کی اور بیٹی مسلمان ہے۔ اس کا فیصلہ آسان نہیں۔ بڑی قانونی پیچیدگیاں ہیں۔“

”رندھاوا جی! بحالیات والوں نے تو اس کا فیصلہ کر ہی دیا۔“ جیلہ نے اپنے در عمل کا اظہار کیا۔ ”آگے کیس لے بھی گئے تب بھی کیا اس فیصلے کا اثر نہیں پڑے گا؟“

”پڑ تو سکتا ہے۔ پر یہ کوئی نظیر نہیں بنتی۔“ وکیل نے جیلہ کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔

”زمین دارنی! تو فکر نہ کر۔ میں ہائی کورٹ بلکہ فیڈرل کورٹ تک کیس لے جاؤں گا۔ صرف یہ زمین اور حویلی نہیں بلکہ وہ زمین بھی دلوادوں گا جو احسان شاہ نے دبا رکھی ہے۔“

”وہ تو بعد کی گل ہے۔ یہ بتا، اب کیا ہو گا؟“

”دیے کیس تو تیرا اب تک مضبوط ہے۔ اسے لڑنے کی بہت گنجائش ہے۔“ وکیل نے جیلہ کو سمجھایا۔ ”تیرے حق میں سب سے اہم بات یہ جاتی ہے کہ حویلی اور زمین پر تیرا قبضہ ہے۔ متروکہ جائیداد کے معاملے میں قبضے کی زبردست اہمیت ہے۔“

رحیم داد کی پریشانی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اپنے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ ملتا نظر آ رہا تھا۔ بات عدالت اور مقدمے بازی کی ہو رہی تھی۔ جس میں نہ وہ کسی طور فریق تھا، نہ اس کے لیے کوئی کردار ادا کرنے کی گنجائش تھی۔ مگر خطرہ ٹل کر بھی ملا نہیں۔

جیلہ نے وکیل سے کہا۔ ”میں تو کتنی ہوں مکدمے بازی کے بکھیرے میں پڑا ہی کیوں جائے۔ میں نے تو یک اور اپائے سوچا ہے۔ اسی کے بارے میں بات کرنے اور تجھے یہاں لانے کے لیے اللہ وسایا تیرے پاس گیا تھا۔“

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ مگر اسے نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور اللہ وسایا کے بارے میں پوچھا۔ ”زمین دار نہیں آیا۔ وہ تو تمہارے ہی پاس گیا تھا وکیل صاحب؟“

”جیلہ نے بھی مجھے یہ بتایا تھا۔“ وکیل نے جواب دیا۔ ”میں سنجے آباد گیا تھا۔ واپسی پر سوچا“

اللہ وسایا سے ملتا چلوں۔ وہ میرے دفتر منگمری پہنچ گیا ہو گا۔ اسے وہاں پتہ چل گیا ہو گا، واپس آتا ہو گا۔“

”جب سے کیس کا فیصلہ ہمارے خلاف ہوا ہے، وہ بہت پریشان ہے۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”پریشان تو میں بھی ہوں، پر وہ کچھ زیادہ ہی ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کیا جائے؟ پنڈ چھوڑ کر کہاں جائیں؟ اب تو یہاں زیادہ ٹھہر بھی نہیں سکتے۔“

”پریشانی کی تو ویسے بات ہی ہے، پر ابھی پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی کیا ہے۔“ وکیل نے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”تمیں نوں پتہ ہی ہے۔ دس دن میں حویلی خالی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ وکیل بدستور مطمئن نظر آتا تھا۔ ”ابھی کسٹرن بحالیات سے اپیل کرنے کی گنجائش ہے۔ اس کے بعد اور اوپر جاسکتے ہیں۔ زمیندارنی، تو فکر نہ کر۔“

”کیسے فکر نہ کروں۔“ جیلہ ہچکے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”کسٹوڈین والے تاک میں ہیں۔ دس روز گزرتے ہی حویلی اور زمین خالی کرانے سرکاری کرندے پولیس کے ساتھ پہنچ جائیں گے۔ متروکہ جائیداد ڈیکلیئر ہونے کے بعد پہلے سب کچھ کسٹوڈین ہی کی تحویل میں جاتا ہے ناں۔“

”کسٹوڈین کے پاس جانے سے پہلے میں ہائی کورٹ سے حکم انتاعی حاصل کر لوں گا۔“ وکیل نے جیلہ کو آگاہ کیا۔ ”میں کل ہی لہور پہنچ کر حکم انتاعی کے لیے درخواست لگا دوں گا۔ درخواست میں نے تیار کر لی ہے۔ اس پر تجھ سے دستخط کرانے ہیں۔“

”مکدھر ہے درخواست؟“ جیلہ نے دریافت کیا۔

”یہ رہی۔“ وکیل نے اپنا بریف کیس کھولا۔ اندر سے ایک فائل نکالی۔ ”یہ تیرے کیس کی فائل ہے۔“ وکیل نے فائل کے کاغذات الٹ پلٹ کر ایک ٹائپ شدہ درخواست نکال کر جیلہ کو دی۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔ میں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا، آگے کیا کرنا ہے۔“

جیلہ نے درخواست توجہ سے پڑھی اس پر دستخط بھی کر دیے۔ مگر اس کے خدشات کم نہ ہوئی۔

”مان لیا، حکم انتاعی مل گیا، پر آگے کیا ہو گا؟ ویسے یہ بھی تو ہو سکتا ہے درخواست منظور نہ ہو اور حکم انتاعی نہ ملے۔“

”وہ کیا پائے ہے؟ تو نے اور اللہ وسایا نے مسئلے کا کیا حل سوچا ہے؟“ وکیل نے کسی قدر حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

”اپنے چوہدری کے پاس منظور شدہ کلیم موجود ہے۔“ اس نے رحیم داد کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ضلع گوداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کے کلیم سے حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ لی جاسکتی ہے۔ چوہدری پر اپنا بندہ بھی نہیں۔ بہت سے چکروں میں پڑنے سے یہ کہیں سیدھا سا راستہ ہے کہ الاٹمنٹ ہی کرائی جائے۔ اب تو یہ متروکہ جائیداد بتائی دی گئی۔“

”اگر ایسا ہے تو کیس پر اس پہلو سے بھی غور کیا جاسکتا ہے۔“

جیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! اپنے کلیم کے کاغذات رندھاوا جی کو تو دکھا۔“

رحیم داد سناٹے میں آگیا۔ پریشانی اور گھبراہٹ نے اچانک اس کے ذہن پر شبِ خوف مارا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بددلی سے ہاتھ بڑھایا۔ تکیے کے نیچے سے بستہ نکالا اور کلیم کے کاغذات وکیل کی طرف بڑھا دیے۔

وکیل نے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ کچھ دیر ان کا مطالعہ کرتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ جیلہ بھی کچھ نہ بولی۔ کاغذات سرسری طور پر دیکھنے کے بعد وکیل نے کہا۔

”کلیم تو پکا ہے۔ منظور شدہ ہے اور بڑا بھی ہے۔“

اس سے کام بن سکتا ہے ناں؟“ جیلہ نے دریافت کیا۔

”کیوں نہیں بن سکتا۔“ وکیل مسکرا کر بولا۔ ”میں یہ کاغذات اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دفتر میں اطمینان سے انھیں پڑھوں گا۔ اس کے بعد اگلی کارروائی کی جائے گی۔ فی الحال یہی ہو سکتا ہے۔ میں اس بارے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔“

”دیے کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے ناں؟“ رحیم داد کے دل کا چور بول پڑا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے بھی اسے پڑھا تھا۔“ جیلہ نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”منظور شدہ پکا کلیم ہے۔ کیوں رندھاوا جی! میں نے غلط بات تو نہیں کہی؟“

”تو نے ٹھیک ہی کہا۔ بالکل یہی بات ہے۔“ وکیل مسکرا کر بولا۔ ”لیکن سب سے پہلے مجھے بائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کرنا ہو گا۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ایک بار جائیداد قبضے سے نکل جائے اور کنشودین کی تحویل میں چلی جائے تو اسے دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے کلیم منظور ہوئے ہیں، متروکہ جائیداد اس سے بہت کم ہے۔ تبھی تو یہ صورت ہے کہ متروکہ

جائیداد کا پتہ ملتے ہی کلیم ہولڈر ایسے جھپٹتے ہیں جیسے چیل گوشت پر گرتی ہے۔ سفارش، رشتے داری، رشوت، کبھی جھکڑے الاٹمنٹ کے لیے چلائے جاتے ہیں۔“ اس نے جیلہ کی جانب دیکھا۔ ”میں تجھے کیا بتاؤں، متروکہ جائیداد کی کیسی لوٹ مار مچی ہے۔ جسے کچھ نہیں ملا، وہ تو بھاگ دوڑ کرتا ہی ہے۔ مگر جسے مل چکا ہے، وہ اور زیادہ لینے کے چکر میں رہتا ہے۔“

”تب تو جی سب سے پہلے حکم امتناعی حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔“ جیلہ نے پریشانی کا انہماک کیا۔ ”کلیم ہولڈروں کو پتہ چل گیا تو وہ ابھی سے الاٹمنٹ کی درخواستیں لگانی شروع کر دیں گے۔“

”پتہ چلنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“ وکیل ہنس کر گویا ہوا۔ ”محکمہ بحالیات والوں نے تو اب تک کتنے ہی کلیم ہولڈروں کو پتہ بھی دیا ہو گا۔ ایسی بات چھی کہاں رہتی ہے؟“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”اب میں چلتا ہوں۔“ اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری! جلد ہی ملاقات ہوگی۔ میں کلیم کے کاغذات اطمینان سے دیکھوں گا۔ ابھی تو مجھے حکم امتناعی لینے کی تیاری کرنی ہے۔“

وکیل نے جیلہ کے مقدمے کی فائل کے ساتھ کلیم کے کاغذات بھی اپنے بریف کیس میں رکھ لیے۔ رحیم داد پریشان تو ہوا مگر خاموش رہا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا؟ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ وکیل وردازے کی جانب بڑھا۔ جیلہ بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ دونوں کے جانے کے بعد اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ کلیم کے کاغذات اب وکیل کی تحویل میں تھے۔ وہ پوری طرح پھنس چکا تھا۔ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس نے کوئلہ ہرکشن چھوڑ کر کہیں اور جانے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ خاک میں مل چکا تھا۔ مجبوری یہ تھی کہ نہ وہ کسی کو اپنی پریشانی بتا سکتا تھا نہ کوئی مشورہ کر سکتا تھا۔ اس کی بے چینی اور اضطراب میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

رات کو اللہ وسایا واپس آگیا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔

رحیم داد کے دن رات الجھن اور طرح طرح کے دوسموں میں کٹ رہے تھے۔ وہ ہر وقت گم صم رہتا۔



موسم بدل رہا تھا۔ لو کے جھلسا دینے والے گرم گرم بھکڑ چلنا بند ہو گئے تھے۔ پچھلی رات ہلکی ہلکی بارش بھی ہوئی تھی۔ دن میں بھی ابر چھایا رہا۔ ہوا کے نرم اور خشک جھوکوں میں تازگی اور فرحت تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ درختوں کے پتے رات کی بارش سے

دھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اٹھ جاتی، ہریالی نظر آتی۔

یہ ایک خوش گوار سر پہر تھی۔ رحیم داد کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ وہ نماز کے لیے غسل خانے جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اللہ وسایا نے اسے باغ میں بلوایا۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ اس نے اللہ وسایا اور جیلہ کے ساتھ وکیل کو دیکھا۔ اس پر گھبراہٹ کا دورہ پڑا مگر وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا قریب پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! تجھے خوش خبری سنانے کے لیے بلایا ہے۔“

”حکم اقتاعی مل گیا ہے۔“ جیلہ نے اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی مطلع کیا۔ اس کے چہرے پر خوشی، سرنخی بن کر نکھری ہوئی تھی۔ اس نے وکیل کی جانب دیکھا۔ ”وکیل صاحب یہی بتانے آئے ہیں۔“

”یہ تو بہت چنگا کام ہوا۔“ رحیم داد نے سکون کی سانس لی۔

اللہ وسایا گویا ہوا۔ ”ہاں جی یہ بہت زبردست کام ہوا۔ اب حویلی خالی کرنے اور پنڈ چھوڑنے کی ایسی جلدی نہیں رہی۔“

رحیم داد نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ کلیم کے چکر سے اپنی جان چھڑانے کے لیے وکیل کو مشورہ دیا۔ ”اب تو جی آگے یہی ہونا چاہئے کہ زمیں دارنی کی طرف سے مقدمہ کرویا جائے۔ جیسا اس روز بتایا تھا، وہی ٹھیک لگتا ہے۔“

”میں نے بعد میں اس پر سوچا تھا پر کیس بہت کمزور ہے۔“ اس نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ ”زمیں دار! ویسے تیری مرضی ہو تو میں کیس کی تیاری کروں؟“

”جب کیس ہی مضبوط نہیں تو اس چکر میں کیوں پڑا جائے۔“ جیلہ بولی۔ ”چوہدری کے کلیم کے کاغذات تو دیکھ ہی لیے ہوں گے۔ الاٹمنٹ کی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ اس بارے میں کیا سوچا؟“

”کلیم تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے سارے کاغذات اچھی طرح دیکھ لیے ہیں۔“ وکیل نے آگاہ کیا۔ ”اس کی بنیاد پر الاٹمنٹ حاصل کرنے میں مشکل بھی نہیں پڑے گی۔“

”میں نے سنا ہے قانون تو یہ ہے کہ حویلی کے علاوہ اڑھائی سوا یکٹر سے زیادہ زمین کی الاٹمنٹ نہیں مل سکتی۔“ جیلہ نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”اس طرح تو صرف دس مرنے کی الاٹمنٹ ملے گی۔ میرے تو ۲۲ مرنے ہیں۔ ۱۳ مرنے کا کیا بنے گا؟“

”زمیں دارنی! تو نے ٹھیک ہی سنا ہے۔“ وکیل نے اس کی تائید کی۔ ”چوہدری کو ایک جگہ

اڑھائی سوا یکٹر ہی کی الاٹمنٹ ہو سکتی ہے۔ ویسے کلیم تو بہت بڑا ہے۔ دوسرے کسی بھی علاقے میں مزید الاٹمنٹ لی جاسکتی ہے۔“

”یہ تو ٹھیک نہیں ہوگا۔“ اللہ وسایا پریشان ہو کر بولا۔

”زمیں دار! ایسا کربا رہ مرنے کا کلیم کسی کلیم ہولڈر سے خرید لے اور اپنی وہ زمین الاٹ کرالے جو چوہدری کے الاٹمنٹ کی بعد رہ جائے۔“ وکیل نے تجویز پیش کی۔ ”میرا ایک مہاجر موکل ہے۔

اس کے پاس پکا کلیم ہے۔ بیچنا بھی چاہتا ہے۔ ضرورت مند بھی ہے، سستے داموں میں دے دے گا۔ تو تیار ہو تو میں اس سے بات کروں۔“

”اپنے پاس تو سمجھو، کچھ بھی نہیں۔“ اللہ وسایا نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”سوچ لے۔ ابھی تو تیرا قبضہ ہے۔ آسانی سے الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔“ وکیل نے کہا۔ ”ورنہ حال یہ ہے کہ ہزاروں مہاجر کلیم کے کاغذات دبائے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ ہی نہیں ملتی۔ تبھی تو سستے داموں کلیم مل رہا ہے۔ اب یہی دیکھ، چوہدری کا اتنا بڑا کلیم ہے پر اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملی۔“

”ہاں جی، کلیم اتنا مشکل نہیں، جتنا الاٹمنٹ لیتا۔“ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”دفتروں کے چکر کاٹنے کاٹنے ہی جوتے ٹوٹ گئے۔ منت سماجت اور رشوت الگ، پر کام کہیں نہیں ہتا۔ کلر زمین تک نہ ملی۔ تبھی تو میں نے کدمہ کرنے کی بات کی تھی۔“

”پر اب آسانی سے تیرے کلیم پر الاٹمنٹ مل جائے گی۔ قبضہ جو اپنے پاس ہے۔“ وکیل نے وضاحت کی۔ ”وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوا۔“ زمیں دار! تو نے اپنے بارہ مربعوں کے لیے کلیم خریدنے کے بارے میں کیا سوچا؟“

اللہ وسایا نے وکیل کی بات کا جواب نہیں دیا، جیلہ سے مخاطب ہوا۔ ”تو نے کچھ جمع جوڑ کر رکھا ہی نہیں۔ کچھ ہوتا تو آج کام آتا۔“

جیلہ نے سراٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ ”چتنا نہ کر۔ میرے پاس سکول اور ڈپنٹری بتانے کا فنڈ ہے۔ اسے میں الگ رکھتی تھی۔“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”پر یہ روپیہ ایک شرط پر دوں گی۔ ادھار رہے گا، تیس نوں لوٹانا ہوگا۔“

”منظور ہے، تیری یہ شرط بالکل منظور ہے۔“ اللہ وسایا خوش ہو کر بولا۔ ”میں تیرے ادھار کا ایک ایک پیسہ ادا کر دوں گا۔“

”یہ دونوں گواہ موجود ہیں۔ تو ان کے سامنے وعدہ کر رہا ہے۔“ جیلہ نے ہنس کر وکیل محمد عثمان

”اللہ وسایا نے مجھے تیرے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے، تو بہت مصیبت زدہ ہے۔ پر درخواستوں پر دستخط کرنے اور افسروں کے سامنے پیشی کے لیے تیری ضرورت تو پڑے گی۔“

”صاف گل ایسہ ہے جی، میں پہلے بھی الاٹمنٹ ٹلائمنٹ کے چکر میں نہیں پڑا۔ تبھی تو مجھے اب تک کہیں الاٹمنٹ نہیں ملی۔ تیس کاغذات دیکھ ہی چکے ہو۔“ وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”میں تو جی اللہ وسایا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا مجھ پر بہت احسان ہے۔ اس نے مجھے اپنے پاس ٹھہرایا۔ ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ ایسا پیار دیا کہ میرا غم ہلکا ہو گیا۔ لگتا ہے، میں اپنے سگوں کے ساتھ ہوں۔“ اس نے وکیل کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ ”مجھ سے تو جی، جس کاغذ پر اور جس درخواست پر چاہو، دستخط کراؤ۔ آگے جو کچھ کرنا ہے، اللہ وسایا ہی کو کرنا ہے۔ پہلے بھی یہ زمیں داری چلاتا رہا ہے۔ آگے بھی یہی چلائے گا۔ مجھے زمیں داری زمینداری سے کچھ نہیں لینا۔ سچ پوچھو تو مجھے زندگی ہی سے کچھ دلچسپی نہیں۔“ رحیم داد نے کچھ ایسے درد بھرے لہجے میں بات کی کہ فضا سوگوار ہو گئی۔ سب خاموش بیٹھے رہے۔

وکیل سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”چوہدری! اگر تو پیش ہونا نہیں چاہتا تو ایسی صورت میں تجھے اللہ وسایا کو مختار نامہ دینا ہوگا۔“

”بالکل دے دوں گا جی!“ رحیم داد نے مستعدی سے کہا۔ ”مجھے اللہ وسایا پر پورا بھروسہ ہے۔“

”اچھا جی! یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔“ وکیل نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ”میں کل مختار نامہ تیار کروالوں گا۔“ وہ مسکرایا۔ ”ایک نہیں، دو تیار کرنے ہوں گے۔ ایک چوہدری کی طرف سے اور دوسرا زمیں داری کی طرف سے۔“ اس نے جیلہ کو مخاطب کیا۔ ”تو بھی دفتروں کے چکر کاٹنے اور بیٹھیوں سے بچ جائے گی۔“

”بالکل ٹھیک ہے جی!“ وہ کھکھلا کر ہنسی۔ ”ایک مختار نامہ تو اسے نکاح کے سے پہلے ہی دے چکی ہوں۔ دوسرا بھی دے دوں گی۔ میں کہاں افسروں کے سامنے پیش ہوتی پھروں گی۔ میرے دونوں بچے چھوٹے ہیں۔ انھیں یہاں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ ان کی دیکھ بھال کروں گی۔ اللہ وسایا سب کام کر لے گا۔ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ مکدے بازی کر کے اب تو تجربہ کار بھی بن گیا ہے۔“

”ایسا ویسا تجربہ کار بن گیا۔“ وکیل بھی ہنسنے لگا۔ ”اب تو یہ مجھے بھی قانونی نکتے سمجھانے لگا ہے۔“

”ایسی گل نہ کریں جی۔“ اللہ وسایا نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا۔ ”اب آگے کی

رندھاوا اور رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”بعد میں پلٹ نہ جانا۔“

وکیل نے جیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تو گویا یہ طے ہو گیا کہ حویلی اور زمیں کی الاٹمنٹ ہی کرائی ہے۔ اب اس کام میں کوئی تاخیر نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے لیے جلد سے جلد کام شروع کرنا ہوگا۔“

”جب تیرے پاس روپیہ موجود ہے تو اپنے پورے ۲۲ مرنے کا کلیم کیوں نہیں خرید لیتی؟“ رحیم داد نے ایک بار پھر اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔

”نہیں چوہدری، اتنا روپیہ میرے پاس نہیں ہے۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”زیور بیچ کر بھی مشکل سے ۱۳ مرنے کا بندوبست ہو سکے گا۔“

وکیل نے مسکرا کر کہا۔ ”زمیں دارانی! تجھے اللہ وسایا کو ادھار نہیں دینا پڑے گا۔ کلیم تو تیرے ہی نام سے خریداجائے گا۔ قبضہ تو تیرے ہی نام سے ہے۔ تجھے آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گی۔ اللہ وسایا کے نام سے کلیم خرید کر الاٹمنٹ لینے میں کوئی رخنہ پڑ سکتا ہے۔“

”میرے نام سے ہو یا اللہ وسایا کے نام سے۔ بات تو ایک ہی ہے۔“ جیلہ ہنس کر بولی۔ ”میں اور اللہ وسایا الگ تھوڑا ہی ہیں۔ زمیں دار تو اسی کو رہتا ہے، میں نے زمیں داری سے کیا لینا۔“

”لو جی، اس کی سنو۔“ اللہ وسایا بھی ہنسنے لگا۔ ”میں کب زمیں دار رہا۔ ساری زمیں داری تو یہی چلاتی رہی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے اور یہ بھی۔“ وکیل سنجیدہ ہو گیا۔ ”اب کام کی بات ہونی چاہیے۔ میں اپنے ایک موکل زمیں دار کی کار میں آیا ہوں، ادھر حویلی کے اگواڑے کھڑی ہے۔ اللہ وسایا! تو ابھی میرے ساتھ چل۔ رات میرے ساتھ ٹھیرنا۔ سویرے کلیم کا سودا ہو جائے گا۔ سودا طے ہوتے ہی فنانس الاٹمنٹ کے لیے کام شروع کر دیں گے۔“ وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہوگا۔ الاٹمنٹ کے لیے تجھے بھی موجود رہنا ہوگا۔“

”مجھے لے جا کر کیا کرنا ہے۔ اللہ وسایا تو موجود ہی ہوگا۔“ رحیم داد نے پیچھا چھڑانا چاہا۔ وہ شہر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے کسی ان جانے خطرے سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

”چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔“ وکیل نے اصرار کیا۔

”بات یہ ہے جی، وکیل صاحب! میں نے کلیم ختم سے کچھ نہیں لینا۔“ اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”گھر والی اور بچے ہوتے تو اس طرف دھیان دیتا۔ انھیں ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ لگ بھگ اٹھ سال ہو گئے۔“

سوچیں۔ ”اس نے تجویز پیش کی ”ایسا کریں، آج یہیں ٹھہر جائیں۔ سویرے سویرے نکل کھڑے ہوں گے۔ جیلہ اور چوہدری کو بھی ساتھ لے لیں گے۔ یہ مختار ناموں پر دستخط کر دیں گے۔ کسی اور درخواست پر دستخط کرانے ہوں تو اس پر بھی کر دیں گے۔ میں تیرے ساتھ الاٹمنٹ کے لیے ٹھہر جاؤں گا۔ یہ دونوں واپس آجائیں گے۔“

مگر رحیم داد رضا مند نہ ہوا۔ وہ ان کے ہم راہ جانے سے کترا رہا تھا۔ اس نے فوراً عذر پیش کیا۔ ”مجھے نہ لے جا۔ میری طبیعت آج کچھ گڑبڑ ہے۔ مختار نامہ بھجوا دینا۔ میں دستخط کر دوں گا۔“ ”تو چلا جائے گا تو کام جلدی نمٹ جائے گا۔ ممکن ہے دستخط کی توثیق کے لیے تجھے جمنسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت پڑے۔ ویسے اس کا امکان کم ہی ہے۔ پھر بھی تیرا موجود ہونا مناسب رہے گا۔“

وکیل نے صورت حال کی وضاحت کی۔ ”سویرے تک تیری طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ پروانہ کر، طبیعت بگڑی تو شہر میں بہت ہوشیار ڈاکٹر موجود ہیں۔ یہاں سے بہتر ہی علاج معالجہ ہو جائے گا۔“

اللہ وسایا نے کہا۔ ”تو یہ طے ہو گیا کہ چاروں صبح چلیں گے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ وکیل نے تاکید کی۔ ”ہاں جی، یہی ٹھیک رہے گا۔ میں رات یہیں گزار لوں گا۔“

سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادلوں کے باعث روشنی پہلے ہی کم تھی۔ شام جلد ہی ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ نوکروں نے لیپ روشن کیا اور ایک اسٹول پر رکھ دیا۔ جیلہ نے کھانا لگانے کی ہدایت کی۔ گھاس پر دری بچھائی گئی۔ لمبی میز لا کر رکھی گئی اور اس پر کھانا چن دیا گیا۔

سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن گھوم پھر کر ایک بار پھر کلیم اور الاٹمنٹ کا موضوع چھڑ گیا۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ رحیم داد نے بات چیت میں کم ہی حصہ لیا۔ مگر اسے بہت سی ایسی باتوں کا علم ہو گیا جن سے وہ اب تک بے خبر تھا۔

رات کا ایک پہر گزرا تو سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اللہ وسایا اور جیلہ نے حویلی کا رخ کیا۔ رحیم داد اور وکیل محمد عثمان رندھاوا مہمان خانے میں پہنچے۔ آنگن میں پہلے سے دو پلنگ بچھے تھے۔ ان پر اچلے اچلے بستر لگے تھے۔ دونوں میں مزید بات چیت نہیں ہوئی۔ وہ اپنے اپنے بستروں پر لیٹے

اور سو گئے۔



سورج طلوع ہونے سے پہلے ہی احمد نے رحیم داد اور رندھاوا کو جگا دیا۔ دونوں نے غسل کیا۔ ہاشتا میز پر لگ چکا تھا۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ اللہ وسایا پہنچ گیا۔ جیلہ اس کے ساتھ تھی۔ اللہ وسایا کرسی پر بھی نہیں بیٹھا۔ وہ سفر کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ جیلہ بھی پوری طرح تیار تھی۔ ذرا دیر بعد وکیل رندھاوا اور رحیم داد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ مہمان خانے سے باہر نکلے۔

کار حویلی کے سامنے پیل کے گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی قریب ہی موجود تھا۔ نوکروں نے ضرورت کا سفری سامان پہلے ہی کار میں رکھ دیا تھا۔ چاروں کار میں سوار ہوئے۔ روانگی سے پہلے اللہ وسایا نے دو نوکروں کو لاری کے ذریعے پہنچنے کی ہدایت کی۔ کار آگے بڑھی اور نہر کے کنارے کنارے دوڑنے لگی۔

صبح کا سہانا وقت تھا۔ ہوا میں تازگی اور فرحت تھی۔ اللہ وسایا، جیلہ اور وکیل عثمان رندھاوا کے چروں پر گفتگو تھی۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ مگر رحیم داد خاموش اور سہما ہوا تھا۔ دوسرے ہونے سے پہلے ہی کار شہر کی حدود میں داخل ہوئی اور وکیل کے دفتر کے سامنے جا کے ٹھہر گئی۔ چاروں کار سے اتر کے دفتر میں چلے گئے۔ دفتر اور گھر علیحدہ علیحدہ نہیں تھے۔ مگر جس کمرے میں دفتر تھا، وہ خوب کشادہ اور ہوادار تھا۔ کسی زمانے میں بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا ہو گا۔ بچھلے حصے میں وکیل اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔

مکان پختہ تھا۔ بالائی منزل پر آگے کے رخ کمرہ تھا۔ دفتری دیواروں میں لگے ہوئے خوش رنگ ٹائل، قیمتی فرنیچر اور الماریوں میں آویزاں قد آدم آئینے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ مکان کسی کھاتے پیتے سکھ یا ہندو کی ملکیت رہ چکا ہے۔

اتفاق سے وکیل کا وہ موکل بھی دفتر میں پہلے سے موجود تھا جس سے کلیم کا سودا کرنا تھا۔ وکیل نے اسے دیکھتے ہی مسکرا کر اللہ وسایا کو مخاطب کیا۔ ”لو جی، اپنے شیخ عنایت اللہ بھی موجود ہیں۔ یہ ہوشیار پور کے مہاجر ہیں۔ انھی سے کلیم کا سودا کرنا ہے۔“ اس نے شیخ عنایت اللہ سے اللہ وسایا کا تعارف کرایا۔ ”اور شیخ صاحب! یہ کوئٹہ ہر کشن کا زمیں دار اللہ وسایا ہے۔“ شیخ عنایت اللہ کرسی پر بیٹھا تھا، جھٹ کھڑا ہو گیا۔

اللہ وسایا نے بڑھ کر گرم جوشی سے مصافحہ کیا، مڑ کر جیلہ کی سمت دیکھا، مسکرا کر شیخ عنایت کو بتایا۔ ”یہ میری گھروالی ہے جی۔ سودا تو دراصل اس نے کرتا ہے۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کو بھی

شیخ عنایت سے ملایا۔ چاروں کرسیاں سنبھال کر بیٹھ گئے۔

اللہ وسایا ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جلد ہی حرف مطلب پر آگیا۔ اس نے گفتگو کلیم اور متروکہ جائیداد کے الاٹمنٹ کی جانب موڑ دی۔ شیخ عنایت کے پاس کلیم کے کاغذات موجود تھے۔ اس نے اللہ وسایا کے استفسار پر زیادہ تفصیل میں جانے کی کوشش نہیں کی۔ کلیم کے کاغذات نکالے اور اللہ وسایا کی جانب بڑھا دیے۔ اللہ وسایا نے کاغذات الٹ پلٹ کر سرسری مطالعہ کیا۔ رحیم داد قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے بھی کاغذات پر نظر ڈالی مگر جیلہ نے پوری توجہ سے ضروری دستاویزات اور کاغذات پڑھے۔

وکیل نے اس عرصے میں اللہ وسایا کے لیے اسٹامپ پیپروں پر دو مختار نامے تیار کرائے، ان پر جیلہ اور رحیم داد سے دستخط کرائے۔ دستخط کرتے وقت رحیم داد کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور مختار نامے پر چوہدری نور الہی مرحوم کے جعلی دستخط بنا دیے۔ وکیل دستخطوں کی توثیق کے لیے اپنے منشی کے ساتھ کھمبہ چلا گیا۔ وہ بارسوخ اور منجھا ہوا وکیل تھا۔ رحیم داد اور جیلہ کو اپنے ہم راہ نہیں لے گیا۔ واپس آیا تو دونوں مختار نامے مکمل تھے۔ ان کی تصدیق بھی ہو چکی تھی اور توثیق بھی۔

مختار ناموں سے فارغ ہو کر وکیل نے نہایت خوش اسلوبی سے کلیم کا سودا بھی طے کر دیا۔ شیخ عنایت کے رویے سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ مالی طور پر بہت زیادہ پریشان اور ضرورت مند ہے۔ وکیل نے اس کے بارے میں بالکل صحیح بتایا تھا۔ سودا اتنی سستی قیمت پر ہو گیا کہ جیلہ کو اپنے زیورات فروخت کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ حالانکہ وہ زیور اپنے ساتھ ایک پوٹلی میں باندھ کر لائی تھی کہ اگر نقد رقم سے کام نہ بنا تو زیورات بیچ کر کمی پوری کر دے گی۔

ہر کام توقع سے زیادہ اطمینان بخش طور پر ہو گیا۔ مگر جب وہ تمام لکھت پڑھت سے فارغ ہوئے تو دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ دونوں نوکر بھی پہنچ چکے تھے۔ جیلہ واپس جانے پر مصر تھی۔ وہ اپنے بچوں کو نوکریوں کی نگرانی میں چھوڑ کر آئی تھی۔ اب ان کی یاد ستا رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی جیلہ کی تائید کی۔ وہ بھی فوری واپسی کے حق میں تھا۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ اسے ہر طرف خطرہ نظر آتا تھا۔

وکیل کے دفتر میں وہ جتنی دیر رہا، خوف زدہ اور پریشان رہا۔ لمحے بھر کے لیے بھی باہر نہیں گیا۔ تمام وقت کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اسے دن ختم ہونے اور شام کا دھندلا پھیلنے کا بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ شہر سے جلد از جلد دور چلا جانا چاہتا تھا اور خطرات سے بچنے کی خاطر رات کے

اندھیرے میں سفر کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وکیل نے جیلہ اور رحیم داد کو جانے نہیں دیا۔ اس کے خیال میں اس وقت سفر کرنا مناسب نہیں تھا۔ وہ صبح سے پہلے کوئلہ ہرکشن نہیں پہنچ سکتے تھے۔ راستہ طویل تھا۔ ویران اور اجازت علاقوں سے گزرتا تھا۔ رات کے سفر کے لیے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ ہی عرصے قبل اسی راستے پر دن ڈھلے ایک لاری لٹ چکی تھی۔ کوئلہ ہرکشن سڑک سے دور بھی تھا۔ کچا راستہ تھا اور خاصے پھیر کا تھا۔ دونوں کو، خصوصیت کے ساتھ جیلہ کو، سفر میں طرح طرح کی مشکلات اور پریشانیوں سے سابقہ پڑتا۔

شیخ عنایت کلیم کا سودا مکمل ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا۔ اللہ وسایا، جیلہ اور رحیم داد نے وکیل کے ساتھ کھانا کھایا اور اسی کے مکان پر رات بسر کی۔ صبح ہوئی تو اللہ وسایا طے شدہ پروگرام کے مطابق وکیل کے پاس ٹھہر گیا۔ اس نے ایک نوکر کو اپنے کام کاج کے لیے روک لیا، دوسرے کو جیلہ اور رحیم داد کے ہم راہ کر دیا۔

راوی ٹرانسپورٹ کی ایک لاری سے تینوں واپس ہوئے۔ جیلہ کو ڈرائیور کے ساتھ والی اگلی نشست پر جگہ مل گئی۔ اس کے برابر دو عورتیں اور بیٹھی تھیں۔ دونوں برقع اوڑھے ہوئے تھیں۔ رحیم داد اور ملازم، عالم، پچھلی نشست پر تھے۔

رحیم داد خوف زدہ اور سہما ہوا تھا۔ اسے طرح طرح کے خدشات اور دوسے پریشان کر رہے تھے۔ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی اسے پہچان نہ لے۔ لاری جس قدر آگے بڑھتی گئی، رحیم داد کی پریشانی میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ سویرا رفتہ رفتہ ختم ہو رہا تھا۔ زندگی کی چمک پھل اور گہما گہمی بیدار ہو رہی تھی۔

لاریوں کے اڈے پر رحیم داد کو کوئی پولیس والا نظر آتا تو وہ لرز جاتا، سراپد ہو جاتا، عینک فیض کے دامن سے صاف کر کے دوبارہ آنکھوں پر لگاتا اور گردن جھکا کر اخبار پڑھنے لگتا۔ اخبار اس نے شہر میں ایک ہا کر سے خریدا تھا۔ دھوپ کی تمازت میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ ہوا گرم ہو گئی گولو کے تیز جھکڑ نہیں چل رہے تھے، لیکن رحیم داد نے لوے پچاؤ کی آڑ میں گردن اور کانوں کے گرد چادر لپیٹ رکھی تھی۔ اس طرح اس کا چہرہ خاصا چھپ گیا تھا۔ لوتیز ہوتی تو وہ ڈھانے سے چہرہ پوری طرح چھپانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔ اسے سب سے زیادہ خطرہ پولیس کی جانب سے تھا۔ لیکن اتفاق سے اس روز کوئی پولیس والا لاری میں سوار ہی نہ ہوا۔

سیر کو... اک چن پہنچے۔ مگر وہاں رکے نہیں۔ نیلی ٹرانسپورٹ کی پہلی لاری سے دیپال پور کی



چک بیدی کے اڈے پر اللہ وسایا کا مزارع قادر اور اس کا بیٹا صابر لاری میں سوار ہوئے۔ دونوں نے رحیم داد کو پہچان لیا۔ ادب سے سلام کیا اور ایک طرف بیٹھ گئے۔ وہ بھی کوئلہ ہر کشن رہے تھے۔ اللہ وسایا کے ملازم عالم کو جو شہر سے جیلہ اور رحیم داد کے ہم رہ سفر کر رہا تھا، انھوں نے یہی بتایا تھا۔ دونوں مسلح تھے۔ قادر کے پاس مضبوط اور اونچی ڈانگ تھی۔ اس کے دونوں کناروں پر لوہے کی شام چیزھی تھی۔ ایک طرف کی شام میں سیسہ بھرا تھا۔ صابر کے پاس بھی مضبوط اور لمبے ہتھے کی تیز کھڑی تھی جس کا چوڑا پھل تیز اور چک دار تھا۔

لاری مسافروں سے بھری ہوئی تھی اور ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔ آسمان پر چھائے ہوئے گرد کے میالے غبار کے پیچھے ڈوبتا سورج الاؤ کی مانند دھک رہا تھا۔ مغرب میں سرمئی مائل سرخ روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لاری بھی اسی سمت جاری تھی۔ سڑک ویران تھی۔ دونوں طرف کیکر کے درختوں اور گھنی جھاڑیوں کا جھنگ تھا۔ کہیں کہیں اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے بھی تھے۔

لاری دو ٹیوں کے درمیان سے ڈھلان پر اترتے ہوئے دائیں ہاتھ کو مڑی تو اس کی رفتار سست پڑ گئی اور کچھ ہی دور جانے کے بعد ٹھہر گئی۔

ڈرائیور لاری سے نیچے اترتا۔ باہر کچھ ملی جلومدھم آوازیں ابھریں۔ رحیم دار کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ اس نے گردن باہر نکال کر نظریں دوڑائیں۔ اگلے دروازے کے عین سامنے دو آدمی نہایت مشتبہ حالت میں کھڑے تھے۔ ایک وضو قطع سے کسان نظر آتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لمبی لاٹھی تھی جس پر گنڈا سا لگا تھا۔ لاٹھی کندھے پر رکھی تھی اور پشت کی جانب اس میں ایک گٹھری اس طرح جھول رہی تھی کہ گنڈا سے کا تیز پھل دور سے صاف نظر نہیں آتا تھا۔ دوسرے کے چہرے پر ڈھانٹا بندھا تھا۔ اس کے پاس پرانی وضع کی دیسی بندوق تھی۔ یہ مسکٹ تھی جو عام پیدل سپاہیوں کے پاس ہوتی ہے۔

ڈرائیور ان کے زونے میں خاموش کھڑا تھا۔ دیکھتے دیکھتے قریب کی جھاڑیوں سے تین آدمی نکلے اور ڈرائیور کے قریب پہنچ گئے۔ ان کے چہروں پر بھی ڈھانٹے بندھے تھے۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں جو تیزی سے ادھر ادھر گردش کر رہی تھیں۔ تینوں نیزوں اور کھڑیوں سے مسلح تھے۔ رحیم داد خوف زدہ ہو گیا۔ لاری کے دوسرے مسافر بھی دم بخود اور سسے ہوئے تھے۔ ان میں مرد تھے۔

عورتیں تھیں، بچے تھے۔ مگر نہ کوئی بولانہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

مسلح افراد نے مسافروں کو مزید دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ جس شخص کے ہاتھ میں مسکٹ تھی، اس نے ٹال آسمان کی سمت بلند کی اور ٹھانسیں ٹھانسیں دو ہوائی فیر کیے۔ ان میں سے جو اونچے تھے کاٹھا، ڈپٹ کر زور سے چیخا۔

”سارے بندے باہر آجائیں۔ اپنا سامان اندر ہی رہنے دیں۔“

رحیم داد کے پیچھے بیٹھے ہوئے بوڑھے نے ساتھ والے مسافر سے کھسر پھسری۔ ”ڈکیت جان پڑتے ہیں۔ دھاڑا پڑا ہے۔“

لباس کی سرسراہٹیں ابھریں۔ مسافر نشستوں سے اٹھنے لگے۔ ایک عورت کی بغل میں دبا ہوا بچہ منہ پھاڑ کر رویا۔ عورت نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا منہ بند کر دیا۔ بچہ سسہ ہوئی نظروں سے ماں کا جھنجھلایا ہوا چہرہ دیکھنے لگا۔

کند کڑ جو کلیز بھی تھا، سب سے پہلے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے مسافر لاری سے اترنے لگے۔ رحیم داد بھی اترتا۔ وہ ابھی تک پریشان اور ڈرا ہوا تھا۔ وہ سڑک پر ایک طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ قادر اور صابر بھی مسافروں کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔

ان دونوں کو دیکھ کر مسلح افراد میں سے ایک غصے سے دھاڑا۔ ”یہ رہا کا دو اور اس کا پتر۔“

قادر اور صابر نے جھٹ اپنی ڈانگ اور کھڑی اٹھائی اور اچھل کر مسلح افراد پر جھپٹے۔ انھوں نے پتیرا بدل کر تیزی سے حملہ کیا۔ پانچوں حملہ آور بدحواس ہو گئے۔ ایک تو پہلے ہی ہلے میں تیورا کر گرا۔ اس کی کنپٹی سے لال لال خون نکل کر گردن اور کپڑوں پر پھیلنے لگا۔ بقیہ چاروں مسلح افراد سرا سدا ہو کر ادھر ادھر تہتر تہتر ہو گئے۔ ان کے بکھرتے ہی مسافروں میں جھکڑ مچ گئی۔ جس کا جادھر منہ اٹھا، ادھر بھاگا اور درختوں کے نیچے گھس گیا۔

رحیم داد بھی ایک گھنی جھاڑی کی آڑ میں حیران و پریشان کھڑا تھا۔ جب وہ ذرا سنبھلا تو اسے جیلہ کا خیال آیا۔ اس نے نظریں گھما پھرا کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ وہ کچھ فاصلے پر جھڑی جیسے ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑی تھی اور نگاہیں اٹھائے بے چینی سے لاری کی جانب دیکھ رہی تھی۔

قادر اور اس کا بیٹا تیزی سے اپنی ڈانگ اور کھڑی گھما رہے تھے۔ جھپٹ جھپٹ کر وار کر رہے تھے۔ صورت حال اب رحیم داد پر واضح ہوتی جا رہی تھی۔ مسلح افراد جو ڈاکو سمجھے جا رہے

بدلی۔ قادر اور صابر چند گز کے فاصلے پر تھے اور پھر پھر کر حملے کر رہے تھے۔ وہ دونوں کو ٹکٹنی باندھے رکھتا رہا۔ وہ ان کے عقب میں تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نیزہ مضبوطی سے تھام لیا۔ اٹھا اور دونوں ہاتھوں میں نیزہ دبائے ہوئے تیزی سے قادر پر جھپٹا، وار کیا، نیزے کا نصف سے زیادہ پھل قادر کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ تلملا کر پلٹا۔ اسی وقت سامنے سے کھڑی کا وار ہوا، ہاتھ بھر پور پڑا۔ قادر کا ایک بازو جھول گیا۔ ڈانگ اس کے ہاتھ سے جھوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش کی مگر نیزے کے تازہ وار نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس دفعہ نیزے کا پھل اس کے پیلو میں گوشت چیرتا ہو پیلوں تک اتر گیا۔

قادر ڈمگایا۔ گرمی سانس بھری، دونوں ہاتھوں سے نیزہ پکڑا اور سڑک پر گر پڑا۔ نیزہ بدستور اس کی پیلوں میں پھنسا ہوا تھا۔

قادر نے زور لگا کر نیزہ کھینچا۔ نیزہ تو باہر نکل آیا، مگر ساتھ ہی پیلو سے خون کا فوارہ ابل پڑا۔ قادر نے ایک ہاتھ زخم پر رکھا، اٹھنے کی کوشش کی مگر جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے اچھل کر پوری قوت سے قادر کے منہ پر لات ماری۔ وہ اس حملے کی تاب نہ لاسکا۔ بے سدھ ہو کر گر گیا۔ حملہ آور نے مسکٹ ایک طرف رکھی، دھوتی کے ڈب سے چھری نکالی اور قادر کے سینے پر سوار ہو گیا۔ اس کا گلا ایک ہاتھ سے دبا کر بولا۔ ”میں طاہر کا بیٹا عطا محمد ہوں۔“ اس نے غصے سے قادر کے منہ پر تڑاق سے تھپڑ مارا۔

قادر کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے لڑکھڑاتی نظروں سے عطا محمد کو دیکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ عطا محمد نے چھری ایک آنکھ میں بھونک دی اور اسے نکالنے کے لیے بے دردی سے گھمانے لگا۔

قادر تڑپ کر بے بسی سے گردن ادھر ادھر بلانے لگا۔ صابر پلٹ کر باپ کی جانب دیکھ بھی نہ سکا۔ حملہ آوروں نے اسے زخموں میں لے لیا تھا اور ہر طرف سے تاب توڑ حملے کر رہے تھے۔ صابر کے جسم پر جگہ جگہ زخم تھے لیکن وہ ڈٹا رہا اور ہر وار کھڑی کے ڈنڈے پر روکتا رہا۔ موقع ملتا تو بیتر ابدل کر حملہ کرنے سے بھی نہ چوکتا۔

چار افراد کے مقابلے میں صابر زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اس کے زخموں سے برابر خون بہہ رہا تھا۔ قدم بار بار ڈمگاتے۔ کھڑی پر انگلیوں کی گرفت کمزور پڑنے لگی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کھڑی کا لہبا ڈنڈا بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اب وہ اپنا موثر دفاع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آوروں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ گھیر کے ہر طرف سے پے در پے وار کر رہے تھے۔ صابر

تھے دراصل مقتول طاہر کے شریکے اور بھائی بند تھے۔ انھوں نے طاہر کے قتل کا انتقام لینے کے لیے لاری رکوائی تھی۔ انھیں قادر اور صابر کی تلاش تھی جو ان سے مقابلہ کرنے کے لیے سامنے آچکے تھے۔

قادر کی عمر ۲۵ سے تجاوز کر چکی تھی مگر اس کا جسم مضبوط اور گھٹا ہوا تھا۔ اس میں توانائی کے ساتھ ساتھ پھرتی بھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں دہی ہوئی ڈانگ بجلی کے مانند لہرا رہی تھی۔ صابر بیس بائیس سال کا قد آور نوجوان تھا۔ اس میں بھی باپ کی طرح پھرتی اور حوصلہ تھا۔ حملہ آور اب سنبھل چکے تھے۔ وہ بھی گھوم پھر کر وار کر رہے تھے اور قادر اور اس کے بیٹے کو زخموں میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دونوں ہر بار ان کا گھیرا توڑ کر نکل جاتے۔ وہ جھک کر، سمٹ کر، پلٹ کر ہر طرح اپنا سر بچانے کے لیے کوشاں تھے۔ جھکائی دے کر اور پیتھے بدل بدل کر جیلے بھی کر رہے تھے۔

دونوں فریق لڑائی میں اس طرح گتے ہوئے تھے کہ جس کے پاس مسکٹ تھی، وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ فاصلہ اس قدر کم تھا اور فریقین اس طرح جلدی جلدی اپنی جگہ بدل رہے تھے کہ گولی چلانے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں مسکٹ سنبھالے ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ آخر اس نے ایک بار ٹریگر دبا ہی دیا۔ گولی چیخنی ہوئی نکلی مگر کسی کے جسم میں نہیں لگی۔ گولی کی آواز سن کر مسافر اور بدحواس ہو گئے۔ بھاگے اور درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے دور دور تک بکھر کر دبکتے اور روپوش ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

قادر اور اس کے بیٹے کے مقابلے پر دراصل تین ہی مسلح افراد تھے۔ دونوں اس بے جگری سے جم کر لڑ رہے تھے کہ تینوں حملہ آوروں میں سے ہر ایک چوٹ کھا چکا تھا۔ کسی کے ہونٹ سے، کسی کے کندھے سے اور کسی کی ٹانگ سے خون رس رس کر پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر کسی کو کاری زخم نہیں آیا تھا۔

قادر اور صابر بھی گھائل ہو چکے تھے۔ زخموں سے بے نیاز ہونو بڑھ بڑھ کر تیزی سے وار کر رہے تھے۔ تینوں حملہ آوروں کو اپنے بچاؤ کے لیے زیادہ کوشاں ہونا پڑا۔ اب ان میں پہلی سی پھرتی اور حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ کسی قدر پریشان اور تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور رفتہ رفتہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔

وہ حملہ آور جسے قادر اور صابر نے پہلے ہی ہلے میں شدید زخمی کر دیا تھا، سڑک پر چت لیٹا تھا۔ قریب ہی اس کا نیزہ پڑا تھا۔ وہ کچھ دیر بے حال پڑا رک رک کر سانس بھرتا رہا، پھر اس نے کروٹ



سورج ڈوب چکا تھا۔ مغربی افق پر ابھی تک لہو رنگ روشنی بکھری ہوئی تھی۔ شام بلندی سے نیچے اترنے کے لیے پر تول رہی تھی۔ دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جیلہ درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک کے اس جانب بڑھی جدھر قادر اور صابر زخموں سے بڑھال پڑے تھے۔ عطا محمد ابھی تک قادر کے سینے پر سوار تھا۔ جیلہ زور سے چیخی۔ ”بہت ہو گیا۔ اب بند کرو یہ ہتیا چار۔“ اس کے لہجے میں بے قراری اور جھنجھلاہٹ تھی۔

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے چاہا کہ جیلہ کو آگے جانے سے روکے۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے بولا۔ ”ٹھہر جا زمیں دارنی! ادھر نہ جا۔“ جیلہ نے پلٹ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اسی وقت ہارن کی آواز ابھری۔ سڑک کی مخالف سمت سے ایک لاری آتی نظر آئی۔ سب ادھر دیکھنے لگے۔ عطا محمد نے بے سدھ پڑے ہوئے قادر کو جھوڑ دیا۔ اس کے سینے پر سے نیچے اتر ا۔ مسکت سنبھالی اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔ ”کام ہو گیا۔ اب نکل چلو۔“ سب نے جلدی جلدی اپنے اسلحہ سنبھال لیے۔ عطا محمد نے مسکت کی ٹال اونچی کی۔ خوف اور دہشت پھیلانے کے لیے تتر بتر ہوائی فائر کیے۔ وہ فائر کرتا ہوا اپنے ساتھیوں کے ہم راہ سڑک پر دوڑنے لگا۔ فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ راستہ طے کرنے کے بعد سڑک سے اتر کر نشیب میں چلا گیا اور گھنے درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کے اندر داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سامنے سے آنے والی لاری قریب آکر ٹھہر گئی۔ اس میں بھی مسافر سوار تھے اور کھڑکیوں سے گردنیں نکال کر قادر اور صابر کو دیکھ رہے تھے جو خون میں لت پت سڑک کے بچوں بچ پڑے تھے۔ جیلہ بڑھ کر زخموں کے پاس پہنچی۔ رحیم داد، ڈرائیور، کلینز اور مسافر بھی درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ سے باہر نکلے اور سسے ہوئے قادر اور صابر کی جانب بڑھے۔ دوسری لاری کا ڈرائیور بھی اپنے مسافروں کے ساتھ نیچے اتر ا۔

جیلہ نے دیکھا کہ عطا محمد نے قادر کی دونوں آنکھیں نکال دیں ہیں۔ وہ گردن پر بھی چھری چلا چکا تھا مگر صرف اوپر کی ذرا سی کھال کاٹ سکا تھا۔ جیلہ نے کلائی تھام کر قادر اور صابر کی باری باری نبض دیکھی پھر گردن ہلا کر بولی۔ ”ابھی زندہ ہیں، پر بری طرح گھائل ہوئے ہیں۔“ اس نے مڑکر دوسری لاری کے ڈرائیور کی جانب دیکھا۔ ”تیں نوں پاک پتن جانا ہے؟“

”جانا تو ہے جی۔“ اس نے زخموں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ جھگڑے میں زخمی ہوئے ہیں؟“

”ہاں جھگڑا ہی ہوا تھا۔“ جیلہ نے آہستہ سے جواب دیا۔

ڈرائیور نے پوچھا۔ ”دوسری پارٹی کدھر گئی؟“

”انہوں نے جی لاری رکوائی، سارے مسافروں کو باہر بلایا۔“ ایک بوڑھا مسافر بتانے لگا۔ ”وہ ان دونوں کی کھونج میں آئے تھے۔ دیکھتے ہی حملہ کر دیا۔ پر جی یہ دونوں بھی زبردست حوصلے والے نکلے۔ وہ بچ تھے اور یہ صرف دو۔ انہوں نے ڈٹ کر ٹاکرہ لیا۔“

بوڑھے نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں۔ جو جس کے جی میں آ رہا تھا، کہہ رہا تھا، اپنی سوجھ بوجھ کے اعتبار سے اظہار خیال کر رہا تھا۔ مگر جیلہ بہت پریشان تھی۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”بے کار کی باتیں چھوڑ۔ ان دونوں کو پاک پتن کے سرکاری اسپتال لے جا۔ اگر ان کی جلد ہی مرہم پٹی کر دی گئی تو بچ جائیں گے۔ ویسے خون بہہ گیا۔“ وہ دونوں زخموں کے قریب بیٹھ گئی اور خون بند کرنے کے لیے انہی کی پگڑیاں پھاڑ پھاڑ کر زخموں کے گرد پٹینے لگی۔

ڈرائیور زخموں کو اسپتال کے جانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ ”میں جی انھیں نہیں لے جاؤں گا۔“ ”کیوں نہیں لے جائے گا؟“ جیلہ نے تکیے لہجے میں پوچھا۔ ”تو چاہتا ہے، یہ دونوں یہیں سڑک پر مرجائیں۔ تو اتنا بے رحم اور کٹھور کیوں ہے؟“

”گل امیہ ہے جی۔“ ڈرائیور نے صفائی پیش کی۔ ”بعد میں پولیس بہت ستاتے ہیں۔ روز روز گواہی کے لیے بلاتے ہیں۔ اوپر سے وکیل الٹے سیدھے سوال کر کے بھیجا خراب کر دیتے ہیں۔ دوسری پارٹی کا بھی ڈر رہتا ہے۔ گواہی خلاف دو تو عدالت سے نکلنے ہی حملہ ہوتا ہے۔“

”تو گواہی شواہی نہ دینا۔“ جیلہ نے اسے سمجھایا۔ ”میں اپنے نوکر کو زخموں کے ساتھ بھیج رہی ہوں۔ وہی تھانے میں پرچہ چاک کرائے گا۔ اسپتال میں بھی لے جائے گا۔ تیں نوں تو انھیں صرف اسپتال تک پہنچانا ہے۔ گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔“

ڈرائیور نے پھر بھی کترانے کی کوشش کی۔ جیلہ نے جھٹ اس کے ہاتھ پر دس روپے کا نوٹ رکھا۔ مسافروں نے بھی اصرار کیا، سمجھایا بھجایا۔ آخر وہ زخمی قادر اور صابر کو پاک پتن لے جانے پر رضامند ہو گیا۔ جیلہ کا ملازم، عالم زخموں کے ساتھ پاک پتن جانے والی لاری میں سوار ہو گیا۔ جیلہ نے اسے ضروری ہدایات دیں، پینتیس روپے بھی دیے۔ لاری پاک پتن کی سمت روانہ ہو گئی۔ دیوال پور جانے والی لاری کے مسافر بھی سوار ہو گئے۔ ان میں قادر اور صابر نہیں تھے جن کا لال لال خون سڑک پر جگہ جگہ پھیلا ہوا تھا۔ جیلہ اپنی نشست پر بیٹھی ان دونوں کے بارے میں

ماری! تو مرکیوں نہ گئی؟ تیرے یار کے پیونے اس کے خون کا بدلہ چکا لیا ناں!“ مجید ایں پھر بھی کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

قادر کی بیوی اور بسو کے رونے اور چیخنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھریں تو گاؤں میں کھلبلی مچ گئی۔ گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ سب قادر کے گھر پہنچنے لگے۔ آن کی آن میں خاصا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ ان میں مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سبھی پریشان تھے، تشویش میں مبتلا تھے۔ قادر اور صابر کی بیویاں بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

جیلہ نے دونوں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”چنتا نہ کرو۔ سب ٹھیک ہی ہوگا۔“ ساتھ ہی انہیں ڈانٹا بھی۔ ”تم نے تو خاما خا کی پٹی شروع کر دی۔ یہ برا شکون ہے۔ ٹوے بھانا بند کرو۔ دونوں کی دیکھ بھال کے لیے کسی کو اسپتال بھیجو۔ ابھی تو لاری مل جائے گی۔“

”مجید ایں کے دونوں ماما جائیں گے۔“ قادر کی بیوی نے رونا بند کر دیا۔ ”میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔“

”چاچا اکبر کو بھی ساتھ لیتی جا۔“ بسو نے مشورہ دیا۔

اکبر وہاں موجود تھا، مستعدی سے بولا۔ ”ہاں جی، میں بھی چلوں گا۔“ اس نے قادر کی بیوی کی طرف دیکھا۔ ”بھابی تو فائنٹ چلنے کو تیار ہو جا۔“

قادر کی بیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے دونوں بھائی اور بھادھیں بھی موجود تھیں۔ رواجی کا پروگرام فوراً بن گیا۔ جیلہ اور رحیم واد جس تانگے سے پہنچے تھے، وہ ابھی تک کھڑا تھا۔ قادر کی بیوی اپنے بھائیوں اور دیور کے ساتھ تانگے میں سوار ہو گئی۔ جیلہ نے ایک بار پھر اسے تسلی دی۔ ”مجید ایں کی ماں! حوصلے سے کام لے۔ کوئی پریشانی کی گل ہو تو مجھے فوراً اطلاع بھیجنا۔ عالم تو وہاں موجود ہی ہوگا، میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں گی۔ ویسے تو سویرے سویرے عالم کو واپس بھیج دینا تاکہ پتہ چل جائے، دونوں کیسے ہیں۔“

قادر کی بیوی نے جیلہ کی ہر ہدایت پوری توجہ سے سنی اور عالم کے ذریعے اطلاع دینے کا وعدہ کیا۔ تانگا آگے بڑھا اور گاؤں سے دور نکل گیا۔

بھڑاب چھٹ چکی تھی۔ جانے والے واپس گھروں کو جا چکے تھے۔ مگر جیلہ نہیں گئی۔ اس کے دونوں بچے سوچکے تھے۔ نوکرانیوں سے اسے یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ قادر کے گھر کے دروازے پر صابر کی بیوی ابھی تک مضطرب اور بے حال کھڑی تھی۔ اس کی اوٹ میں مجید ایں تھی۔ وہ پتھر کی مانند ساکت تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ جیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب گئی

سوچ رہی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ افسردہ اور مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ باہر شام کا اندھیرا پھیلنا جا رہا تھا۔ مغرب میں دھکتا ہوا الاؤ بجھ چکا تھا۔ ڈرائیور نے انجن اسٹارٹ کیا۔ لاری سڑک پر دوڑنے لگی۔

نئی رحمان کے اڈے پر لاری ٹھہری۔ جیلہ اور رحیم داد نے لاری سے اتر کر تانگا لیا۔ دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ تانگا نہر کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ جب تانگا کوئلہ ہر کشن میں داخل ہوا تو پھر رات گزر چکی تھی۔ جیلہ حویلی میں نہیں گئی، سیدھی قادر اور صابر کے گھر پہنچی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ اطلاع ملتے ہی قادر کی بیوی ایک ہاتھ میں لالٹین سنبھالے باہر آئی۔ اس کے ساتھ بسو بھی تھی۔ دونوں کے پیچھے مجید ایں تھے۔ وہ کمزور اور بیمار نظر آ رہی تھی۔

قادر کی بیوی نے جیلہ کو دیکھتے ہی کہا۔ ”بھین جی! تو اس دھت کیسے آگئی؟“ وہ مسکرائی۔ ”اے اندر آجا۔ منجی پر آرام سے بیٹھ۔“

”نہیں“ میں نے اندر نہیں جانا۔ تجھے یہ بتانا ہے کہ کاڈو اور صابر کا طاہر کے پیو عطا محمد اور اس کے شریکوں سے جھگڑا ہو گیا۔“

”ہائے رہا۔“ وہ اپنے ماتھے پر ہاتھ مار کر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”زمیں دارنی! ٹھیک ٹھیک بتا۔“

”میں لاری میں چوہدری اور عالم کے ساتھ شہر سے آرہی تھی۔ چک بیدی کے اڈے پر کاڈو اور صابر بھی لاری میں سوار ہو گئے۔ رستے میں عطا محمد اور اس کے ساتھیوں نے کسی بھانے سے لاری روکوائی، مسافروں کو نیچے اتروایا۔ وہ ۵ تھے اور سب مسلح تھے۔ انھوں نے کاڈو اور صابر پر ہلا بول دیا۔“ جیلہ نے مطلع کیا۔

”ہائے میں مر گئی۔“ قادر کی بیوی بے قرار ہو کر چیخی۔ ”صابر اور اس کا پیو کہاں ہے؟ دونوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لائی؟“

”وہ گھائل ہو گئے ہیں۔ میں نے عالم کے ساتھ دونوں کو لاری میں ڈال کر پاک پتن کے سرکاری اسپتال بھیوایا ہے۔“

قادر کی بیوی یہ سنتے ہی دروازے کی دہلیز پر بیٹھ کر بین کرنے لگی۔ بسو بھی سینہ پیٹتے ہوئے ساس کے ساتھ رونے لگی۔ مجید ایں بت بنی گم صم کھڑی تھی۔ نہ وہ بولی، نہ روئی۔ لالٹین کی زرد روشنی میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ مٹی کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھائی اور ماں کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ ماں نے پلٹ کر اسے تہہ آلود نظروں سے دیکھا۔ زور سے اس کی پیٹھ پر دو ہتھ مار کر چیخی۔ ”کرماں

رحیم داد نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”زمین دارنی! توں نے اپنے کو کیوں پریشانی میں ڈال لیا؟ ایسے جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کس کس کا دکھ اٹھائے گی۔“ اس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ ”یہ بتا، عالم کدھر ہے؟“

”تو اس سے کا دو اور صابر کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے؟“

”نہیں، ان کے بارے میں توں نے بتا ہی دیا۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”میں تو عالم سے اپنی دھوپ کی عینک کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ شہر میں اسے اپنی عینک فریم بدلوانے کے لیے دی تھی۔ پچھلے دنوں فریم کی ایک کمانی ٹوٹ گئی تھی۔ پتہ نہیں، عینک کا کیا بنا۔ اس نے مجھے بعد میں کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”اب تو شام سے پہلے پتہ نہیں چلے گا۔ میں نے عالم کو اللہ وسایا کے پاس بھیجا ہے۔ وہ اسے کا دو اور صابر کے بارے میں بتا دے گا۔“

”اللہ وسایا کو اس جھگڑے میں نہیں ڈالنا چاہئے۔ یہ ٹھیک نہیں کیا۔“ رحیم داد کو جیلہ کا اقدام پسند نہیں آیا۔ وہ قادر اور صابر کے معاملے کو اتنی زیادہ اہمیت دینے کے حق میں نہیں تھا۔

”اس میں غلط بات کیا ہوئی؟“ جیلہ کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ رحیم داد کے رویے سے اس کے احساسات کو ٹھیس پہنچی تھی۔ ”کا دو کیول مزارع ہی نہیں، اس پنڈ کا رہنے والا بھی ہے۔ مزارع بھی ہوا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کا دو فصل پیدا کرے تو اللہ وسایا زمیں دار بن کر اپنا حصہ لینے تو پہنچ جائے، پر وہ گھائل ہو کر موت کے منہ میں پڑا ہو تو اللہ وسایا اس کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھے۔ نہ اس کی خبر گیری کرے، نہ اس کی مدد کرے، نہ اسے حوصلہ دے۔ تو خود ہی سوچ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

رحیم داد نے خاموشی سے جیلہ کی باتیں سنیں۔ لہجے کی تلخی بھی محسوس کی۔ مگر کسی روعمل کا اظہار نہیں کیا۔ جیلہ بھی کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی۔ وہ انھی اور باہر چلی گئی۔ وہ مضطرب اور بے چین نظر آرہی تھی۔

اللہ وسایا رات گئے واپس آیا۔ رحیم داد اس وقت جاگ رہا تھا۔ حویلی کی چھت پر اسے اللہ وسایا کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ رحیم داد کے پاس نہیں آیا۔ زیادہ دیر ٹھہرا بھی نہیں۔

وہ کیوں آیا تھا اور کیوں چلا گیا؟ رحیم داد کو دو روز تک کچھ پتہ نہ چلا۔ نہ جیلہ آئی اور نہ احمد نے کچھ بتایا۔ چوتھے روز اللہ وسایا آیا تو رحیم داد سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد اپنی بے قراری کی زیادہ دیر پردہ پوشی نہ کر سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔

”تو منگل وار کی رات کو بھی آیا تھا؟“

شفقت سے سر پر ہاتھ پھیرا۔

وہ جیلہ کے سینے پر سر رکھ کر جیسے پھٹ پڑی۔ ”بھین جی! میں بہت پاپی ہوں۔ مجھ بختاں ماری کو موت کیوں نہیں آجاتی؟“ اس کی سسکیاں خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ جیلہ اس کا سر آہستہ آہستہ تھکنے لگی۔ اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا، البتہ اس کی آنکھیں چمک پڑیں۔ آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے رخساروں پر ٹپکنے لگے۔

رحیم داد خاموش کھڑا مجیداں اور جیلہ کو روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ مگر وہ یہ رقت انگیز منظر زیادہ دیر نہ دیکھ سکا۔ اسے مجیداں کے باپ قادر کی آنکھیں یاد آگئیں جنہیں مقتول طاہر کے باپ نے چھری ڈال کر نکال دیا تھا۔ وہ خون سے تھڑے ہوئے دو بھیاک غار بن کر رہ گئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر خوف اور کراہیت محسوس ہوتی تھی۔ رحیم داد سے وہاں نہ ٹھہرا گیا۔ وہ خاموشی سے مہمان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔



بستر پر لیٹ کر رحیم داد دیر تک بے چینی سے کوٹیں بدلتا رہا۔ بوجھل رات بھی زخمی تھی اور رحیم داد کی نیند بھی زخمی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔

دن چڑھے جیلہ مہمان خانے میں آئی۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ جیلہ کو دیکھتے ہی اس نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کا دو اور صابر کے بارے میں کچھ پتہ چلا؟“

”ہاں، عالم آیا تھا۔ بتاتا تھا۔ صابر کی حالت تو زیادہ خراب نہیں، پر کا دو کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔“

”کا دو کو زخم بھی زیادہ آئے تھے۔ توں نے تو دیکھا ہی تھا۔ سارا بدن خون سے لت پت تھا۔ طاہر کے بیٹو نے اس کی آنکھیں تو نکال ہی لیں، وہ تو اس کی گردن بھی کاٹ دینا چاہتا تھا۔ بہت ظالم ہے۔“

”یہ غصہ بتا رہا ہوتا ہے۔ اندھا بنا دیتا ہے۔“ جیلہ نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب طاہر کا کتل ہوا تھا، تبھی میں نے کہا تھا، یہ جھگڑا اب کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ویسے کا دو اور صابر کتل کے مکدے سے صاف جھوٹ گئے تھے۔ پر طاہر کے بیٹو، بھائیوں اور شریکوں نے تو بدلہ لینے کا ارادہ نہیں چھوڑا تھا۔ آخر انھوں نے بدلہ لے لیا۔ کا دو مر گیا تو صابر اور اس کے چاچے، مامے بدلہ چکا نہیں گئے۔ یہ جھگڑا ایسا ہی چلتا رہے گا۔ جانے کب تک چلے۔“ جیلہ کا چہرہ افسردہ ہو گیا، آنکھیں ویران ہو گئیں۔ وہ پریشان اور مضطرب ہو گئی۔

”ہاں آیا تو تھا۔“ اللہ وسایا نے بے نیازی سے کہا۔

”میں اس وکت جاگ رہا تھا۔ پر تو ٹھیرا نہیں، تھوڑی ہی دیر بعد چلا گیا تھا۔ کیوں آیا اور کیوں اتنی بھینتی چلا گیا، یہ بھی نہ کھلا۔“

”تجھے جیلہ نے نہیں بتایا؟“

”وہ آج کل نظر ہی نہیں آتی۔ جانے کہاں رہتی ہے۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”ویسے یہ تو میں نوں پتہ ہے، وہ تیرے ساتھ نہیں گئی تھی۔“

”سمجھ گیا، وہ تجھے کیوں نظر نہیں آتی۔“ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ ان دنوں کاڈو کے گھر میں زیادہ رہتی ہے۔ مجیداں اور صابر کی گھر والی کو تسلی دیتی رہتی ہے۔ چوہدری! اسے تو ایسے کاموں کے لیے حیلہ چاہیے۔ وہ کسی کو دکھی دیکھ نہیں سکتی۔“

”اس نے دکھ بھی تو بہت سے ہیں۔“ رحیم داد نے جیلہ کی حمایت کی، چند لمحے خاموش رہا پھر دریافت کیا۔ ”یہ تو جتنا کاڈو اب کیسا ہے؟ جیلہ بتاتی تھی، ایک رات تو اسے ہوش ہی نہیں آیا۔ اسے زخم بھی تو بہت آئے تھے۔ میں نے تو سارا خون خرابہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔“

”کاڈو کو دوسرے روز بھی ہوش نہیں آیا تھا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”مجھے جیسے ہی پتہ چلا، میدھا ہا ہسپتال پہنچا۔ کاڈو چپ پڑا تھا۔ صرف سانس لے رہا تھا۔ وہ بھی بہت دیر سے دیر سے۔ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا، اسے لہور لے جاؤ، شاید بچ جائے۔ ویسے امید کم ہی لگتی ہے۔ میرے پاس وکیل کے زمین دار دوست کی کار تھی۔ میں نے کاڈو اور صابر دونوں کو اس میں ڈالا۔ جیلہ بھی ہسپتال پہنچی ہوئی تھی۔“

”یہ مجھے پتہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے حیرت سے کہا۔

”میں جیلہ ہی کو چھوڑنے منگل وار کی رات یہاں آیا تھا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”وہ تو لہور جانے کو بھی کہتی تھی پر میں نے سمجھا بھرا کر اسے روک۔ دونوں زخمیوں کو لہور لے گیا۔ ہسپتال میں داخل کرایا۔ کاڈو کو تو شام کو ہوش آیا۔ مرتے مرتے بچا ہے۔ اب تو کچھ ٹھیک ہے پر اندھا ہو گیا ہے۔“

”طاہر کے بیٹے کاڈو کے سینے پر چڑھ کر میرے سامنے چھری ڈال کر آنکھیں نکالی تھیں۔ کاڈو ایسا زور سے چیخا اور اس کی آنکھوں سے ایسے خون نکلا کہ مجھے متلی ہونے لگی۔ مجھ سے ادھر دیکھا نہ گیا۔“

”عالم نے مجھے بتایا، جیلہ تو رو پڑی تھی۔“

”صابر تو اب بالکل بنگا ہو گیا ہوگا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل چنگا تو نہیں ہوا پر اٹھ دس روز بعد اسے ہسپتال سے جھنسی مل جائے گی۔ البتہ کاڈو کو زیادہ دن ہسپتال میں رہنا پڑے گا۔“

”حملہ کرنے والوں کے خلاف پولیس نے بھی کوئی کارروائی کی؟“

”تین ملزم تو دوسرے ہی روز گرفتار کر لیے گئے تھے۔ طاہر کا بیٹا عطا محمد اور چاچا سلطان محمد ایک روز مفروز رہے، بعد میں وہ بھی پکڑ لیے گئے۔ پانچوں ابھی تک پولیس کی حراست میں ہیں۔ کیس رجسٹر کر کے پولیس نے ابھی عدالت میں چالان پیش نہیں کیا۔“

”ملزموں کے خلاف پرچہ تو نے چاک کرایا تھا؟“

”نہیں! عالم تھا نے گیا تھا، اسی نے ربٹ لکھوائی تھی۔ یعنی گواہ بھی دی ہے۔ بعد میں وکیل کے ساتھ میں بھی تھا نے گیا تھا۔“

”وکیل نے الاٹمنٹ کے لیے کیا کیا؟“

”ابھی تو کچھ نہیں ہوا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”ادھر تو میں کاڈو اور صابر کے معاملے میں پھنسا رہا۔“

”اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ کوئی گزبوند ہو جائے۔“ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں اب اسی طرف دھیان دیتا ہے۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔

جیلہ بھی آگئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اللہ وسایا سے پوچھا۔ ”تین نوں شہر نہیں جانا؟ وکیل انتظار کرتا ہوگا۔“

اللہ وسایا مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری سے اسی بارے میں بات کر رہا تھا۔ فکر نہ کر، الاٹمنٹ ٹھانٹ کا سارا کام کر کے ہی لوٹوں گا۔“

رحیم داد نے جیلہ سے کہا۔ ”زمین دارنی! کھڑی کیوں ہے؟ آرام سے بیٹھ کے بات کر لے۔“

”چوہدری! اب اسے نہ روک۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے آج ہی شہر جانا ہے۔“

”پر ابھی تو بہت گرمی ہے۔ ایسے میں یہ کیسے سفر کر سکتا ہے؟“

”جانا تو اسے دن ڈھلے ہے پر کچھ دیر آرام تو کرنا ہوگا۔ سفر بھی لمبا ہے۔ رات دیر سے پہنچے گا۔“

ایا کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری! یہ زمیں دارنی نہیں

”یہ ساہے کے لیے آئے ہیں۔“ رحیم داد نے مسکرا کر رو برو بیٹھے ہوئے مردوں کو دیکھا۔ ”یہ تو نیک کام ہے۔ اس میں دیری کیا کرنی۔“

”لے زمیں دارنی! چوہدری بھی وہی گل کہہ رہا ہے، جو ہم اتنی دیر سے کہہ رہے ہیں۔“ سامنے بیٹھے ہوئے سفید ڈاڑھی والے بوڑھے نے حقے کی منہ سے ہٹائی اور بے تکلفی سے جیلہ کو دیکھ کر مسکرانے لگا۔

”دیکھ بابے! جیحتی نہ کر۔ تاجاں اب پھاتاں کی نہیں، میری دھی ہے۔ میں اس کا ویاہ دھوم دھام سے کروں گی۔ اس کا پیو نہ ہوا تو کیا ہوا، میں تو ہوں۔“ جیلہ نے اپنے سینے پر ہولے سے ہاتھ مارا۔ ”تو اس بات کی ذرا چٹانہ کر۔ میں چاہتی ہوں، تو اپنے پتر کی جننے لے کر آئے تو ذرا موسم اچھا ہو۔ ساری ہی رسمیں ریتاں ہوں۔ ملتی ہو، سٹھیاں ہوں، چھاتی دکھاؤنی ہو۔“ وہ گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکرائی۔ ”چپچلاتی گرمی یا بھری برکھا میں کیا مزا آئے گا۔ جنے چڑھے اور دھوم دھڑکانہ ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

بوڑھا ہنس کر بولا۔ ”ہم نے اڑنا نہیں ہے۔ زمیں دارنی! چل تیری ہی بات اپنی۔ توں ہی ویاہ کے لیے دن تار کھیتا دے۔ ویسے بھی تار کھیتو تو وہی کے گھر والے ہی دیتے ہیں۔“

”ماگھ کیسا رہے گا؟ تین ہی مہینے تو بچ میں ہیں۔“ جیلہ نے تجویز پیش کی۔ ”اس سے تک خریف کی فصل کی واڑھی بھی ہو جائے گی۔ پھنی کی چٹائی ہو چکی ہوگی۔ بہت سانا موسم ہوگا۔ گلابی سردی ہوگی۔“

”چلو جی ماگھ ہی رہا۔“ بوڑھے نے رضامندی کا اظہار کیا۔ ”اب تار کھیتے طے کرنی ہوگی۔“

”وہ تو زنانیاں ہی بیٹھ کر طے کریں گی۔“ جیلہ نے نظریں جھکا کر قدرے آہستہ سے کہا۔

”تو نے اپنی بھر جائی سے اس بارے میں گل بات تو کی تھی۔“ ایک ادھیڑ شخص بولا۔ وہ پھاتاں کا بڑا بھائی اور ہونے والا سدھی، ”اللہ یار، تھا۔“ گھر والی کہتی تھی، ”ماگھ کی سات تار کھیت کی گل ہوئی تھی۔“

”ایسی گل ہوئی تو تھی۔“ پھاتاں نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا۔ ”دن کون سا ہوگا؟“ وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگی۔

”جھرات یا جے کا دن ہوگا۔ چاند کی ۱۳ یا ۱۷ ہوگی۔“ بوڑھے نے آہستہ آہستہ گردن ہلاتی اور زیر لب مسکرا کر گویا ہوا۔ ”ہم نے پہلے ہی حساب لگالیا تھا۔“

جیلہ ہنس کر بولی۔ ”بابے! یہ گل تھی تو پہلے ہی بتا دی ہوتی۔ اتنی دیر جھک جھک کیوں کی؟“

تھانے دارنی ہے۔ اس کی بات تو مانتی ہی پڑے گی۔ اب تجھ سے واپسی پر ملوں گا۔ جیحتی نال لوئے کی کوشش کروں گا۔“ اللہ وسایا دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا باہر گیا۔ جیلہ بھی اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔



شام کو رحیم داد نما دھو کر باغ میں گیا۔ خلاف معمول باغ میں خوب چل پل تھی۔ گھاس پر قالین بچھا تھا۔ جیلہ بڑی جوج دھج سے قالین پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت ہلکا گلابی کرتا اور گلابی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹا بھی اسی رنگ کا تھا۔ اس کا سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ کرتے کے گربان اور آستینوں پر کلاہتو کی کشیدہ کاری تھی۔ پیشانی پر جڑاؤ داؤنی جھللا رہی تھی۔ کانوں میں سونے کے مندرے، گلے میں گتھیوں کا بار اور ہاتھوں میں جڑاؤ کنگن تھے۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ وہ باوقار اور حسین نظر آ رہی تھی۔

جیلہ کے قریب ہی پھاتاں سیاہ پھلکاری سے سر اور چہرے کا کچھ حصہ چھپائے بکل مارے بیٹھی تھی۔ اس نے بھی غسل کیا تھا۔ اجلی دھوتی باندھی تھی اور اس کے اوپر بوئی دار سفید جھکا پھٹا تھا۔ دونوں کے رو برو کچھ فاصلے پر نیم دائرے میں سات مرد بیٹھے تھے۔ وہ سفید کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی دھوتیاں اور پگڑیاں بھی سفید اور اجلی تھیں۔ درمیان میں ایک بوڑھا بیٹھا آہستہ آہستہ حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ اس کی لمبی سفید ڈاڑھی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اور بوڑھا تھا۔ پانچ ادھیڑ تھے۔ ان کی ڈاڑھیوں اور سروں کے بال کچھڑی تھے۔

جیلہ نے رحیم داد کو آتے ہوئے دیکھا تو مسکرا کر اونچی آواز سے کہا۔ ”چوہدری! ادھر ہی آجا۔“

رحیم داد آگے بڑھا اور جیلہ اور پھاتاں سے ذرا ہٹ کر قالین پر بیٹھ گیا۔ اسے اللہ وسایا نظر نہیں آیا۔ بیٹھتے ہی دریافت کیا۔ ”زمیں دار دکھائی نہیں دے رہا، کدھر ہے؟“

”وہ تو سہ پہری کو شہر چلا گیا۔“ جیلہ نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ ”تیرے سامنے ہی تو پروگرام بنا تھا۔“

رحیم داد خفیف ہو کر بولا۔ ”مجھے بالکل یاد نہیں رہا۔“

”ویسے اللہ وسایا نے وعدہ کیا تھا، پر تجھے تو پتہ ہی ہے، اسے ضروری کام سے جانا پڑا۔ میں تجھے بلوانے ہی والی تھی۔“ جیلہ نے سامنے بیٹھے ہوئے مردوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تاجاں کے سنگ کے لیے دن متھے آئے ہیں۔ اب کوئی شہ گھڑی سوچ کر ویاہ کی تاریخ طے کرنی ہے۔“

”زمیں دارنی! شادی ویاہ میں تھوڑی جھک جھک بک بک نہ ہو تو مزا نہیں آتا۔“ بوڑھا بدستور مسکراتا رہا۔

”مجھے تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ سمجھو پورن ماشی ہی ہوگی۔ دودن میں چند رما زیادہ نہیں گھٹتا۔ بھری چاندنی رات ہوگی۔“ جیلہ نے مڑ کر پھاتاں کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک ہی رہے گا ناں؟“

پھاتاں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انگلیوں پر خاموشی سے حساب لگاتی رہی پھر مسکرا کر بولی۔ ”ٹھیک ہے جی! ٹھیک ہے۔ ویسے جو دن ویاہ کا سب نے طے کیا، میں نے اس میں کیا بولنا۔“

”توفیر جی دن تاریک تو طے ہو گیا۔“ بوڑھے نے یہ کہہ کر ذرا دور بیٹھے ہوئے نائی کی جانب دیکھا جو ان کے ساتھ ہی آیا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ”وینے! انڈالے آ۔“

نائی نے قریب رکھا ہوا مٹھائی کا نوکرا سنبھالا اور آگے بڑھ کر بوڑھے کے سامنے رکھ دیا۔ بوڑھے نے نوکرے کے اوپر رکھا ہوا رنگ برنگے سوت کا کلاوا اٹھایا۔ اس میں دو گرہیں لگائیں اور نوکرے پر رکھ دیا۔ نائی نے جھک کر مٹھائی کا نوکرا پھر اٹھایا اور جیلہ کے آگے رکھ دیا۔ جیلہ نے اسے پانچ روپے لاگی کے دیئے۔ لاگی لے کر وہ اونچی آواز سے دعائیں دیتا ہوا اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔

جیلہ نے پیچھے کھڑے ہوئے ملازم کو شربت لانے کا اشارہ کیا۔ شام کا دھندلا پھیل گیا تھا۔ باغ میں گیس بتی روشن کر دی گئی تھی۔ اس کی تیز روشنی میں بوڑھے نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو دوسروں نے بھی ہاتھ اٹھا دیئے۔ دعا کے بعد سب کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ذرا دیر میں دودھ کا شربت آگیا۔ جیلہ نے اپنے ہاتھ سے شربت کا گلاس بوڑھے کو پیش کیا۔ اس نے گلاس لیتے ہوئے بڑی شفقت سے کہا۔

”زمیں دارنی! تو جتنی سوہنی ہے، اتنی ہی بھلی اور نیک بھی ہے۔ رہائش نون زمیں دارنی سے رانی بنائے۔ تیرے لیے تو اندر سے دعا ہی دعا نکلتی ہے۔“

پھاتاں کے بھائی نے بھی جیلہ کو کلمہ خیر سے یاد کیا۔ ”تیری ایسی زمیں دارنی تو نہ دیکھی، نہ سنی۔ کون وڈا زمیں دار مزارعوں کے ساتھ ایسا میل جول رکھتا ہے۔ انھیں اس طرح اپنے ساتھ بٹھاتا ہے۔ ان کی آؤ بھگت کرتا ہے۔“

جیلہ نے کچھ نہ کہا۔ مسکرا مسکرا کر سب کے سامنے خود ہی گلاس بھر بھر کر شربت رکھا۔ پھاتاں نے اس کا ہاتھ بٹانا چاہا تو جیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹ دیا۔ ”چپ کر کے بیٹھی رہ۔ ابھی تیں نون بہت کام کرنے ہیں۔“

سب مہمانوں نے شربت پیا۔ رحیم داد نے بھی پیا۔ شربت پینے کے کچھ دیر بعد گلاس پر درمی

ڈالی گئی۔ اس پر دسترخوان بچھایا گیا۔ نوکروں نے نہایت مستعدی سے کھانا چٹا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مہمانوں نے واپس جانے کی خواہش کا اظہار کیا مگر جیلہ نے اصرار کر کے انہیں روک لیا۔

حویلی کے سامنے کے میدان میں خوب چھڑکاؤ کیا گیا۔ چارپائیاں بچھا کر اگلے بستر گادیے گئے اور یہ طے ہوا کہ مہمان رات بسر کرنے کے بعد سویرے تاروں کی چھاؤں میں اپنے گاؤں واپس چلے جائیں گے۔

پھاتاں، بیٹی کا رشتہ اس شان سے طے ہو جانے پر بہت خوش تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ مسرت جیلہ کے چہرے پر نکھری ہوئی تھی۔ وہ بات بات پر ہنستی، مہمانوں کی دل جوئی کرتی۔ رات گئے تک محفل جی۔ پھر سب سونے چلے گئے۔ رحیم داد بھی ساہے کی رسم میں شریک ہو کر بہت خوش تھا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔ دوسرے روز مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد جیلہ پھاتاں کے گھر گئی اور تاجاں کو اپنے ہم راہ حویلی میں لے آئی۔ اب وہ ساہے بندھی لڑکی تھی اور ایسی لڑکی گھر کی لاج اور عزت ہوتی ہے۔ نہ وہ کھیتوں پر جاسکتی ہے نہ پانی بھرنے کو نکلیں یا پگھٹ پر۔ اسے گھر کی دہلیز سے آگے قدم نکالنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تاجاں حویلی میں آنے کے بعد جیلہ کے لیے امانت بن چکی تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر صرف اپنے دوہا کے ساتھ ہی رخصت ہو کر جاسکتی تھی۔



گرمی کم ہونے کے بجائے اور بڑھ گئی تھی۔ صبح ہی سے لو چلنے لگتی۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہر طرف سناٹا چھا جاتا۔ گاؤں کا جو بڑن بھر بیٹھنوں سے بھرا رہتا۔ وہ کچھ اور پانی میں لٹٹی جگالی کرتی رہتیں۔

اللہ وسایا ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ایک شام جیلہ باغ میں بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ نضا بو جھل اور ٹیالی تھی۔ جیلہ مسکرا مسکرا کر رحیم داد کو تاجاں کی شادی کی تیاریوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسرت کی ایسی لہریں چل رہی تھیں جیسے وہ اپنی سگی بیٹی بیاہنے جا رہی ہو۔ اسی اثنا میں قادر کی بیوی آگئی۔ اس کا چھوٹا بھائی سردار بھی ہم راہ تھا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کا مضبوط اور توانا جوان تھا۔ مونچھیں نوکیلی اور گھٹی تھیں، چہرہ کسی قدر کرسٹ تھا۔

جیلہ نے قادر کی بیوی سے پوچھا۔ ”تو لہور ہی سے آرہی ہے ناں؟ کاڈو اور صابر اب کیسے ہیں؟“

”اب تو دونوں ٹھیک ہی ہیں۔ صابر کو جلد ہی اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔“ قادر کی بیوی نے

جواب دیا اور مڑ کر سردار کی جانب دیکھا۔ ”بھین جی! یہ نئی کھرب لایا ہے۔ میں اسی کے بارے میں تجھے بتانے آئی ہوں۔“

جیلہ نے قادر کی بیوی کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست سردار سے دریافت کیا۔ ”کیا نئی خبر لایا ہے؟ کوئی پریشانی کی گل تو نہیں؟“

”پریشانی ہی کی گل ہے جی!“ سردار نے بتایا۔ ”عطا محمد اور اس کے ساتھ کے چاروں دوسرے لازم ضمانت پر چھوٹ گئے ہیں۔“

”ضمانت پر تو انھیں چھوٹنا ہی تھا۔ اس میں پریشانی کی کون سی گل ہوئی؟“

”تیرے لیے یہ پریشانی کی گل ہی نہیں ہے۔“ سردار کا لہجہ قدرے ٹیکھا تھا۔ ”تیس نوں تو پتہ ہی ہے، انھوں نے کاڈو کی آنکھیں نکال لی ہیں۔ یہ معمولی جرم نہیں۔ اس پر تو ان کی ضمانت ہی نہیں ہونی چاہیے تھی۔ عطا محمد کی تو بالکل نہیں ہونی چاہیے تھی۔ مگر پانچوں کی نہ صرف ضمانت ہو گئی بلکہ اتنی بھینتی ہو گئی کہ ان کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔ ہر طرف بڑھیں مارتے پھر رہے ہیں۔“

”اب کیا کر سکتے ہیں وہ؟“ جیلہ نے دریافت کیا۔

”میں نے سنا ہے جی! وہ کاڈو اور صابر پر دوبارہ حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ یہی پریشانی کی گل ہے۔“

”ان کی طرف سے ایسا خطرہ ہو تو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے بھی سردار کے خدشات کی تائید کی۔

”پر کاڈو اور صابر تو سرکاری اسپتال میں ہیں۔“ جیلہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”وہ اسپتال میں گھس کر کیسے حملہ کر سکتے ہیں؟“

”بالکل کر سکتے ہیں۔“ سردار نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”تیس نوں ان کے بارے میں اندازہ نہیں، وہ کتنے خطرناک ہیں۔ کتے ہیں، طاہر کے خون کا تو ابھی بدلہ لینا ہے۔ وہ تو کاڈو اور صابر کا خون کرنے کے بعد ہی پورا ہو گا۔“

”تو اب کیا کرنا ہو گا؟“ جیلہ کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”اللہ وسایا بھی موجود نہیں۔ میں کل ہی صبح اس کی طرف کسی نوکر کو بھیج دوں گی۔ وہ اسے سب کچھ بتادے گا۔ کیوں نہ تم دونوں نوکر کے ساتھ اللہ وسایا کے پاس چلے جاؤ۔ اسے خطرے سے آگاہ کر دو۔“

”زمیں دارنی! تو فکر نہ کر۔“ سردار نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”میں اور میرا بھائی ابھی موجود ہیں۔ صابر کا چاچا اکبر بھی ہے۔ اور بھی اپنے شریکے ہیں۔ ڈٹ کر سامنا کریں گے۔ ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھی ہیں۔ دیکھیں وہ کاڈو اور صابر پر کیسے حملہ کرتے ہیں۔ اس بار ایک بھی ان

میں سے بچ کر نہیں جائے گا۔“

”یہ تو ٹھیک نہیں ہو گا۔“ جیلہ اور پریشان ہو گئی۔ اس نے جھگڑا ختم کرنے کی غرض سے تجویز پیش کی۔ ”پنچایت بھیج کر صلح صفائی نہیں ہو سکتی؟“

”میں نوں پتہ ہے، وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“ قادر کی بیوی نے خدشہ ظاہر کیا۔

رحیم داد نے جیلہ کی تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”پر کوشش تو کرنی چاہیے۔“

”اس میں برائی کیا ہے؟“ جیلہ بولی۔ ”پنچایت تو میں اپنی طرف سے بھیجوں گی۔ تمہاری آن پر کوئی آنچ نہیں آئے گی؟“

”آئے گی تو۔ وہ یہی کہیں گے، کاڈو اور اس کے شریکے ڈر گئے۔“ سردار بولا۔ ”پر تیری بات بھی ماننی ہے۔ یہی چاہتی ہے تو کوشش کر کے دیکھ لے۔“

”یہ تو ہمارے گا۔ پر تم کو چوکس رہنا پڑے گا۔“ رحیم داد نے سردار کو خبردار کیا۔

”میں اسی لیے تو یہاں آئی ہوں۔“ قادر کی بیوی نے کہا۔ ”ضمانت کی خبر ملے ہی میں سردار کے ساتھ لہور سے چل کھڑی ہوئی۔ آج ہی شام تیاری کر کے سب کے ساتھ واپس جانے کا ارادہ ہے۔“

”تجھے تو بتانے آئے تھے۔ ویسے صابر کے چاچا اور اپنے دیر کو لہور چھوڑ کے آئی ہوں۔“

”اب تو اندھرا ہو گیا۔ کل سویرے جانا۔“ جیلہ نے کہا۔

”نہیں، بھین جی! ہم نے آج ہی جانا ہے اور ابھی جانا ہے۔“ قادر کی بیوی آمادہ نہیں ہوئی۔

”لہور ہم نے بھینتی نال پہنچ جانا چاہیے۔“

رحیم داد نے بھی اس کی تائید کی۔ ”زمیں دارنی! انہیں نہ روک، جانے دے۔ تیس نوں پنچایت بھیجی ہے تو کل یا پرسوں تک بھیج دینا۔“

”نہیں۔“ جیلہ نے کہا۔ ”پنچایت تو میں کل سویرے ہی بھیجنے کی کوشش کروں گی۔ اس معاملے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ قادر کی بیوی نے کہا۔ ”ہم نے اب جانا ہے۔“

جیلہ اور رحیم داد خاموش رہے۔ قادر کی بیوی اپنے چھوٹے بھائی کے ہم راہ چلی گئی۔ شام کا دھند لگا رہا تھا۔ جیلہ بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہری۔ وہ حویلی کی جانب روانہ ہو گئی۔ مگر رحیم داد باغ ہی میں بیٹھا رہا۔ اس نے کھانا بھی وہیں کھایا۔ رات گئے وہ مہمان خانے کی چھت پر جا کر سو گیا۔

”مجید اے مائے چاچے کو پتہ چلے گا تو غصے سے پاگل ہو جائیں گے۔ یہ ان کی عزت اور آن کا معاملہ ہے۔ وہ پہلے ہی جوش میں تھے اب تو ان کے آگے ہی لگ جائے گی۔“ رحیم داد نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”وہ مجید اے کو واپس لانے کی ضرورت کو شش کریں گے۔“

”مجید اے کو واپس لانا اب آسان نہیں رہا۔“

”یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ پر مجید اے کے گھروالے اور شریکے چپ کر کے تو نہیں بیٹھیں گے۔ کسی نہ کسی طور ضرور بدلہ لینے کی کوشش کریں گے۔ پہلے اتنا خون خرابہ نہیں ہوا، جتنا اس دفعہ ہو گا۔ دونوں ہی پارٹیاں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔“

”سویرے سے اب تک میں اسی بارے میں سوچتی رہی۔“

”تو نے کوئی فیصلہ بھی نہیں کیا؟ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔ زمیں دار کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتی اور خود بھی کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ اب بے گام کیا؟“

”ایک ہی گل سمجھ آتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

”ظاہر کے پیو عطا محمد کے پاس پنچایت بھیجی جائے۔“

”تو سمجھتی ہے وہ پنچایت کی بات مان لے گا؟“ رحیم داد نے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ ”اب تو مشکل ہی لگتا ہے، مجید اے جو ان کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اسے ہرگز واپس نہیں کریں گے۔ سارا جھگڑا تو اسی کا ہے۔“

”میں خود پنچایت لے کر جاؤں گی۔ تو بھی میرے ساتھ چلنا۔“

”زمیں داری تو پنچایت لے کر کیسے جاسکتی ہے۔“ رحیم داد کا لہجہ قدرے ٹھکھا تھا۔ ”وہ مزارے ہیں۔ تیرے نہ سہی کسی اور کے تو ہیں۔ سمجھ تو مزارے ہی جائیں گے۔ اور تو ٹھیکری زمین داری۔ تیرا جانا بالکل ٹھیک نہیں۔ یہ بات تو اپنے دل سے نکال دے۔“

”تجھے زمیں داری کی ایسی ہی شان ہے تو نہ جا پر میں تو جاؤں گی۔“

”یہ شان اور گھمنڈ کی گل نہیں۔ پر عزت کا بھی تو کچھ خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو مزارے اور زمیں داری میں فرق ہی کیا رہا۔“

”تیرا مطلب ہے، عزت اور مان کے کارن میں چپ کر کے خون خرابہ ہوتے دیکھتی رہوں۔“ جیلہ نے رحیم داد کی دلیل سختی سے مسترد کر دی۔ ”میں چلی جاؤں گی تو ہو سکتا ہے، عطا محمد اور اس کے شریکے صلح صفائی پر راضی ہو جائیں اور مجید اے کو واپس بھیج دیں۔ میں انہیں سمجھانے بھانے

کی کوشش کروں گی۔ میں نے سنا ہے، عطا محمد کا پیو بہت نیک بندہ ہے۔ کلا نور خاں موضع ہے۔ اس کے سارے ہی مزارے اور زمیں دار عطا محمد کے پیو کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ میری بات ضرور مان لے گا۔“

”اور جو تیری پنچایت کی بات نہ مانی گئی تو؟“

”تو کیا ہو گا؟ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کوشش تو کر کے دیکھ ہی لینا چاہیے۔“ جیلہ بے نیازی سے بولی۔ ”میری عزت اور آن ایسے نہیں جاتی۔ تیں نوں کیسہ پتہ؟ میں نے عزت اور لاج کو برباد ہوتے کیسے کیسے دیکھا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جو بدری! یہ عزت اور شان کا بھی عجب چکر دیکھا۔ جب سے یہ سب کچھ دیکھا ہے، میرا تو عزت اور آن پر سے وشواس ہی اٹھ گیا۔“

”تیری یہی مرضی ہے تو میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے جیلہ کے عزم کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ”یہ بتا، کب تک پنچایت لے جانے کا ارادہ ہے؟“

”یہ کام تو جیتھتی ٹال ہونا چاہیے۔ کل سویرے ہی چلیں گے۔ رواگئی سے پہلے کسی بندے کو بھیج کر عطا محمد کو اطلاع کرادیں گے۔“ جیلہ نے اپنا پروگرام بتایا۔ ”اور ہاں، تو نے اپنے جانے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”جب تو جا رہی ہے تو میں بھی تیرے ساتھ چلا جاؤں گا۔“ رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد جیلہ نے رحیم داد کے ساتھ ہی باغ میں کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر جیلہ نے گاؤں کے ان بڑے بوڑھوں کو بلایا، جنہیں پنچایت میں شریک کر کے اپنے ہم را موضع کلا نور خاں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ رات گئے تک صلاح مشورہ کرتی رہی۔

سویرے سویرے اس نے اپنے ایک ملازم کو عطا محمد کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ پنچایت کی آمد سے اسے مطلع کر دے۔ دن چڑھے اس نے تین تانگے بلوائے۔ سب اس میں سوار ہوئے۔ پنچایت اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گئی۔ کلا نور خاں لگ بھگ نو میل تھا۔

جیلہ کی سربراہی میں پنچایت جب عطا محمد کے گاؤں میں داخل ہوئی تو سورج آسمان کے بچوں بیچ پہنچ چکا تھا۔ گرمی شباب پر تھی، البتہ لو نہیں چل رہی تھی۔ جس اور اس سے سب پسینے میں شرابور تھے۔

تانگے گاؤں کے گلی کوچوں سے گزرتے ہوئے عطا محمد کے گھر پہنچے۔ جیلہ نے دیکھا، گھر کے

سامنے ایک درخت کے نیچے گاؤں کے کچھ بوڑھے اور جوان جمع ہیں۔ ان میں عطا محمد بھی شامل تھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چروں پر افسردگی تھی، سنجیدگی تھی۔ ایک کانٹیل بھی موجود تھا۔ اسے دیکھ کر رحیم داد پریشان اور خوف زدہ ہو گیا۔

جیلہ تانگے سے نیچے اتری۔ رحیم داد اور دوسرے لوگ بھی اترے۔ عطا محمد نے جیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا، آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا۔ سر جھکا کر بچے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”زمین دارنی! تو جسے لینے آئی تھی، اس نے تیرا انتظار بھی نہیں کیا۔ وہ چلی گئی۔“

جیلہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”تیرا مطلب مجیداں سے ہے؟ وہ کہاں چلی گئی؟ کس کے پاس چلی گئی؟“

ایک بوڑھے نے اپنی لمبی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتایا۔ ”وہ اپنے رب کے پاس چلی گئی۔ جس کی امانت تھی، اسی کے پاس پہنچ گئی۔ ایک دن سب کو وہیں جانا ہے۔“ وہ کلا نور خاں کی مسجد کا ملاح تھا۔

جیلہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔ اس نے عطا محمد سے پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”لگتا ہے، تو نے اس کا خون کر دیا۔ ظاہر کا بدلہ مجیداں سے لے کر تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ وہ تو پہلے ہی بہت دکھی تھی۔ وہ ابھاگن تو خود اپنی آگ میں اندر ہی اندر سگ رہی تھی۔“ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ”کہاں ہے وہ؟ کدھر ہے اس کی لاش؟“

”اندر منجی پر پڑی ہے۔“ عطا محمد دل گرفتہ ہو کر بولا۔ ”زمین دارنی! تو بھی پولیس کی طرح مجھ پر شبہ کر رہی ہے؟ میں نے اس کا خون نہیں کیا۔ اس نے رات کو اپنے کپڑوں پر لالین سے تیل چھڑک کر آگ لگالی اور جل کر مر گئی۔ اس کا کسی نے خون نہیں کیا۔ جاندار جا کر دیکھ لے۔“

جیلہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نپٹنے لگے۔ وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ آگن کے ایک طرف چھپر کے نیچے چارپائی پر سیاہ چادر بچھی تھی۔ اس کے نیچے مجیداں کی لاش تھی۔ چارپائی کے قریب چنائی پر دو بوڑھی عورتیں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھیں۔ ہر طرف جلع ہوئے گوشت کی بو پھیلی تھی۔ جیلہ آگے بڑھی اور چارپائی کے سرہانے کھڑے ہو کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔



آسمان دھواں دھواں تھا۔ فضا تڑھال اور بو جھل تھی۔ باغ میں جیلہ خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد بھی موجود تھا۔ جیلہ کا شگفتہ اور حسین چہرہ مر جھایا ہوا تھا۔ وہ دیر تک نظر اٹھا کر کچھ سوچتی رہی پھر اس نے گردن اونچی کر کے رحیم داد کو دیکھا اور بچے ہوئے لہجے میں بولا۔

”چوہدری! سمجھ نہیں آتی، اللہ وسایا اب تک کیوں نہیں لوٹا؟ اسے گئے دس بارہ روز ہو گئے۔“

”ہام میں پھنسا ہو گا۔ الاٹنٹ کرانی آسان نہیں۔ لما چکر ہوتا ہے۔“

”پر اس نے کوئی اطلاع نہیں بھیجی؟ پہلے تو اس نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“ جیلہ کے چہرے پر غم کا ہلکا سا سایہ پھیلنے لگا۔ ”سویرے سے جانے کیوں میرا من بے کل ہے۔ بار بار رونے کو جی چاہتا ہے۔“

”زمین دارنی! تو بہت جلد گھبرا جاتی ہے۔ پریشان نہ ہو، وہ دو چار دن میں آجائے گا۔“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”لگتا ہے، تجھے اللہ وسایا سے بہت پیار ہے۔“

”ہے تو۔“ جیلہ نے سرد پٹے کے آئچل سے ڈھانکا اور شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں۔ ”وہ میرے بچوں کا بیٹہ ہے۔ اٹھ سال سے میرا اس کا ساتھ ہے۔ مجھے ذرا نراش دیکھتا ہے تو گھبرا جاتا ہے۔ پوچھتا ہے، جی لے! تجھے کیا ہو گیا؟ تو اتنی پریشان کیوں ہے؟ جب وہ میرے لیے اتنا بے کل ہو جاتا ہے تو میں اس کے لیے کیوں نہ چتا کروں؟ چوہدری، تالی تو دونوں ہاتھ سے بکتی ہے نا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے پر تجھے خاما خا تا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ چند روز انتظار کر لے۔ وہ واپس آتا ہی ہو گا۔ حوصلے سے کام لے۔“

”میں اس کا کل تک اور انتظار کروں گی۔“ جیلہ نے اپنا عندیہ بتایا۔ ”اگر وہ چراغ جلے تک نہ پلٹا تو میں شام کو حویلی سٹیشن چلی جاؤں گی۔ یہاں سے حویلی سٹیشن نزدیک ہی ہے۔ دونوں بچوں اور ایک نوکر کو ساتھ لیتی جاؤں گی۔ رات کی ٹرین سے کسور کے رستے رائے وندڑ ہوتی ہوئی لمور پہنچ جاؤں گی۔“

”تمیں نوں پتہ ہے، وہ لمور ہی میں ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”وہ ملتان میں بھی ہو سکتا ہے۔“

”مجیداں کا اما، سردار پر سوں آیا تھا۔ بتاتا تھا، اللہ وسایا کو اس نے لمور میں دیکھا تھا۔“ رحیم داد خاموش رہا۔ جیلہ کھڑی ہوئی، آگے بڑھی اور جھٹ پٹے میں درختوں کے نیچے او جھل ہو گئی۔ وہ بڑی بے قرار نظر آرہی تھی۔ اسے اس طرح پریشان دیکھ کر رحیم داد کو بھی اللہ وسایا کے بارے میں تشویش ہوئی۔

دوسرے روز سہرے پر رحیم داد ٹھٹھا ہوا کھیتوں کی جانب چلا گیا۔ کما اور کپاس کے پودے ہاتھ ہاتھ بھراؤںچے ہو گئے تھے۔ ان کے پتوں سے خاک کے ذرے چپے ہوئے تھے۔ مٹی کے پودوں پر پل

جیلہ نے سامنے کھڑے ہوئے ایک ملازم کو لسی لانے کی ہدایت کی اور اللہ وسایا سے پوچھا۔
”یہ تو بتا، جس کام سے تلوور گیا تھا، اس کا کیا بنا؟“

اللہ وسایا نے ہنس کر جواب دیا۔ ”فکر نہ کر۔ تیس نوں خوش خبری ہی سناؤں گا۔“

جیلہ نے کرسی کھسکا کر اللہ وسایا کے قریب کرلی۔ ”کیا خوش خبری سنانا چاہتا ہے؟“

”سارا ہی کام ٹھیک ٹھیک ہو گیا۔“

”کیا کیا ہو گیا؟“ جیلہ نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”چوہدری کے نام حویلی اور اڑھائی سوا یکٹر زمین کی الاٹمنٹ ہو گئی۔ خریدے ہوئے کلیم کی بنیاد پر اپنی ۱۲ مربع زمین کی بھی تیرے نام الاٹمنٹ ہو گئی۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔
”لے بھی چوہدری تجھے حویلی اور دس مربع زمین کی الاٹمنٹ مبارک ہو۔“

”میرا کیا ہے اللہ وسایا! سب تیرا ہی ہے۔ تیری ہی کوششوں سے اور تیرے ہی خرچے سے سب کچھ ہوا ہے۔“ رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ میرا تیرا چھوڑ۔ مجھے تیری یہ گل چنگی نہیں لگی۔ آگے ایسی گل نہ سوچتا۔ مجھے دکھ ہو گا۔“

”تو برا متا تا ہے تو نہیں کموں گا۔“ اللہ وسایا نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ ”پر یہ ضرور سن لے، احسان شاہ تڑپ کر رہ گیا۔ اس کے تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ بھی لہور پھنچا ہوا تھا۔ بہت بڑھکیں مار رہا تھا۔ اس نے تو اپنے تئیں حویلی اور زمین کو اپنی ہی ملکیت سمجھ لیا تھا۔ پر ہائی کورٹ کے حکم اقتاعی نے اس کا سارا کھیل بگاڑ دیا۔ ویسے جی اپنا وکیل بھی بہت زوردار ہے۔ اس نے ادھر حکم اقتاعی لیا اور دوسری طرف فافٹ الاٹمنٹ کی درخواست بھی لگا دی۔ کب نہ تو اپنا تھا ہی، اس نے بہت کام کیا۔ احسان شاہ نے بہت زور لگایا، الاٹمنٹ نہ ہو پر اس کی ایک نہ چلی۔“ اللہ وسایا نے مڑ کر جیلہ کو دیکھا، محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”اب تو تیس نوں پتہ چل گیا۔ اتنی دیر کیوں ہوئی؟ الاٹمنٹ کے چکر میں دن رات پھنسا رہا، اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اپنی خیر خبر سمجھو ادیتا۔ ویسے یہ بات بھی تھی، میں الاٹمنٹ ملنے کی خوش خبری تجھے خود سنانا چاہتا تھا۔ تو سن کر خوش تو ہو جاتی پر یہ مزانہ آتا جواب آ رہا ہے۔“

”تجھے کیا پتہ، تیرا انتظار کرتے کرتے میں کتنی بے کل رہی۔ ہر سے تیرا دھیان رہتا۔ بار بار من گھبراتا۔ رات کو سوتے سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھتی۔ پر تو یہ باتیں کیوں سوچنے لگا۔“ جیلہ نے گلہ کیا۔
”میں تو آج ہی شام بچوں کے ساتھ تیرے پاس لہور پہنچنے والی تھی۔ چوہدری سے پوچھ لے۔ اسے سب پتہ ہے۔ ساری تیاری کر لی تھی۔“ وہ گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے مسکرائی۔ ”اللہ

چلا کر ڈنھل توڑے جا رہے تھے تاکہ زیادہ شاخیں پھوٹیں اور زیادہ ٹے لگیں۔ جیلہ کا مینہ ختم ہو رہا تھا۔ چلچلاتی گرمی کا زور ٹوٹ رہا تھا۔ فضا ہنوز غبار آلود تھی۔ سانس لیتے ہوئے ٹھن محسوس ہوتی۔ دھوپ میلی اور نمیالی تھی۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔

رحیم داد باغ میں پہنچا۔ جیلہ پہلے سے وہاں تھی۔ موسم گرما کی سلگتی شام کے دھندلکے میں جیلہ کا چہرہ نیالے آسمان کے مانند اجڑا اجڑا لگ رہا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد جیلہ نے بتایا کہ وہ گھٹے سوا گھٹے میں لاہور روانہ ہو جائے گی۔ اتنا بتا کر وہ پھر چپ ہو گئی۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ یکایک قریب بیٹھے ہوئے نوکروں میں سے ایک کی آواز ابھری۔
”لوئی، زمیں دار تو آ گیا۔“

جیلہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا دیر بعد اللہ وسایا درختوں کے ایک جھنڈے سے نکل کر سامنے آ گیا۔ جیلہ نے اسے دیکھا تو جہاں تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔ اللہ وسایا آہستہ آہستہ نزدیک آ گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہرہ اور کپڑے خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ جیلہ کو دیکھ کر وہ مسکرایا۔
”مجھے پتہ تھا، تو ادھر ہی ہو گی۔ سامان نوکروں کے حوالے کیا اور سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔“ جیلہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بت بنی کھڑی رہی۔

اللہ وسایا نے اس کا سنجیدہ اور سپاٹ چہرہ دیکھا اور بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”کیا بات ہے جی لے! بہت نرا ض لگ رہی ہے۔“ اس کے لہجے میں پیار کی محاس تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔
”تجھے میری نرا ضی کی کیوں چھتا ہونے لگی۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولی۔ ”توں، تلوور میں عیش کر رہا تھا۔“

”لے چوہدری، اس کی گل سن۔“ اللہ وسایا نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”کہتی ہے، میں لہور میں عیش کر رہا تھا۔ یہ تو پوچھا نہیں، میں اتنے دنوں کیسے کیسے چکروں میں پھنسا رہا۔“
”تو نے بتایا تھا؟“ جیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترجمی لگا ہوں سے اللہ وسایا کو دیکھا۔
”کسی نوکر ہی کو بھیج کر اپنی خیر خبر سمجھو ادیتا۔ میں نے تو تیرے پاس پہلے ہی ایک نوکر اور بھجوا دیا تھا۔“

”ہاں جی، اپنے سے یہ غلطی ہو گئی۔“ اس نے آہستہ آہستہ سر ہلا کر نہایت معصومیت سے اعتراف کیا۔ ”لے اب گدہ تھوک دے۔ لسی شربت پلا، سخت پیاس لگی ہے۔“

وسایا! تو نے اس بار مجھے بہت تنگ کیا۔

”روٹی تو نہیں تھی؟“ اللہ وسایا نے ہنس کر پوچھا۔

”روٹی بھی تھی پر مجیداں کے لیے۔“ جیلہ کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تجھے تو پتہ چل گیا ہو گا۔ اس نے کپڑوں میں آگ لگا کر خوش کنی کر لی۔“

”مجھے تو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ پولیس نے مجیداں کی موت پر عطا محمد اور اس کے بھائی کو قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ مجھے لائسنسوں کے چکر سے جب بھی فرصت ملتی، کاڈو اور صابر کو دیکھنے اسپتال چلا جاتا۔ وہیں مجھے مجیداں کے چاچا، اکبر نے یہ خبر دی۔ میں تو پند واپس آنا چاہتا تھا پر ان دنوں روز ہی پیشی لگ رہی تھی۔ حاضر نہ ہوتا تو کام بگڑنے کا ڈر تھا۔ احسان شاہ ضرور گڑ بڑ پیدا کرنے کی کوشش کرتا۔“

”فیروز ٹھیک ہی ہوا، جو تو نہیں آیا۔ تجھے دکھ ہی ہوتا۔“ جیلہ کی آواز بھر ا گئی۔ ”پوسٹ مارٹم کے بعد لاش پنڈ میں آئی تو سبھی رو پڑے۔ سنا ہے، جب اسے قبر میں اتارا گیا تو کرام مچ گیا۔ ہائے، کیسی ابھا گئی تھی مجیداں۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو پونچھے۔ ”اس کا جیون تو دکھ جھیلنے ہی کٹا۔ کیسا کیسا اس پر اپرا دہ ہوا۔ زندہ رہنے کو اس کے پاس رہ ہی کیا گیا تھا۔ سب کچھ تو ملیا میٹ ہو گیا تھا۔“

”بہت ظلم ہوا جی اس کے ساتھ۔“ رحیم داد نے جیلہ کی تائید کی۔

”دیے مکر اس کی کتنی ہو گئی۔ سارا جھگڑا تو اسی کے کارن تھا۔“ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔

”وہ تو جان سے گئی پر جھگڑا تو جہاں تھا، ابھی تک وہیں ہے۔“ اللہ وسایا نے کہا۔

”اب تو اسے ختم ہو جانا چاہیے۔“ جیلہ نے مشورہ دیا۔ ”اللہ وسایا! جھگڑا چکانے کے لیے صلح صفائی کرادے۔ جھگڑا ختم نہ ہوا تو آگے نہ جانے کتنے اور خون ہوں گے۔“

”یہ تو پنجائیت لے کر مجیداں کو واپس لانے کے لیے طاہر کے بیٹے کے پاس گئی بھی تھی۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کو مطلع کیا۔

”کیا بنا پنجائیت کا؟“ اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

”بنا کیا تھا۔ جسے لینے گئی تھی وہی نہ رہی۔ پر جھگڑا ختم کرنے کے لیے تین نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہی ہو گا۔“

”تو کتنی ہے تو ضرور کوشش کروں گا۔“ اللہ وسایا نے جیلہ کو اطمینان دلایا۔

”کاڈو اور صابر کا کیا حال ہے؟“ جیلہ نے پوچھا۔

”صابر کو تو اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ میرے ساتھ ہی واپس آیا ہے۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”کاڈو ابھی کچھ دن اسپتال ہی میں رہے گا۔ اس کی گھر والی اور چھوٹا بھائی دیکھ بھال کے لیے لہور ہی میں ہیں۔“

نوکر لسی لے کر آگیا۔ اللہ وسایا نے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ نوکر گلاس اٹھا کر چلا گیا۔ جیلہ نے کہا۔ ”اللہ وسایا! اب تو نمالے۔ دیکھ تو تیرے بدن اور کپڑوں پر کتنی گرد جی ہے۔“ وہ خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جیلہ بھی کھڑی ہو گئی۔

دونوں حویلی کی جانب روانہ ہو گئے۔ رحیم داد بیٹھا رہا۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ نوکروں نے لیپ جلا کر اسٹول پر رکھ دیا۔

اللہ وسایا نما دھو کر ابلے کپڑے پہنے ہوئے جیلہ اور دونوں بچوں کے ہم راہ واپس آگیا۔ اس کے پیچھے ہی کھانا چن دیا گیا۔ سب نے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اللہ وسایا کھانے کے بعد زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ وہ بہت تھکا ہوا تھا، جلد ہی سونے چلا گیا۔

چند روز بعد اللہ وسایا نے مقدمہ جیتنے کی خوشی میں جشن منایا۔ حویلی کے سامنے کھلے میدان میں چھڑکاؤ کیا گیا۔ شام ہوتے ہی گیس پتیاں روشن کی گئیں، دیکھیں چڑھیں، طرح طرح کے پکوان پکے۔ گاؤں کے تمام مزارعوں اور کمیوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد محفل میں اللہ وسایا کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس روز وہ ابلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ سر پر اونچے طرے کی پگ تھی جو اللہ وسایا اس کے لیے خاص طور پر لاہور سے لایا تھا۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کا ایک ایک مزارعے اور کمی سے تعارف کرایا۔ انھیں صاف صاف بتایا کہ حویلی اور گاؤں کی زیر کاشت ڈھائی سو ایکڑ زمین رحیم داد کے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ اب وہ گاؤں کا دوسرا زمین دار بن گیا ہے۔

مگر رحیم داد نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے ہر ایک سے یہی کہا کہ اللہ وسایا اس کے بھائی کی مانند ہے۔ پہلے کی طرح سب کچھ اسی کا ہے اور وہی پورے گاؤں کا زمین دار ہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے اعلان کیا۔ ”مگل ایسہ ہے جی! اللہ وسایا کی کوششوں ہی سے میرے نام لائسنس ہوئی ہے۔ زمین داری اسی نے چلائی ہے اور وہی چلائے گا۔“ اس نے اپنی پگ اتاری اور اللہ وسایا کے سر پر رکھ دی اور اس کی پگ اپنے سر پر رکھ لی۔ سب نے خوش ہو کر قہقہے لگائے۔

پہر رات گزری تو نوجوانوں نے لڈی ناچ شروع کیا۔ ڈھولیوں نے جھوم جھوم کر ڈھوکوں پر چوٹ لگائی۔ رقص کرنے والے نوجوان باری باری پاؤں اوپر اٹھاتے، بانیں سر کی سیدھ میں

لہراتے آگے بڑھتے۔ انھوں نے ڈھولیوں کے گرد حلقہ بنالیا اور ایک ایڑی کے بل بیٹھ کر دائرے میں رقص کرنے لگے۔ وہ چٹکیاں بجاتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ سر سے اوپر اٹھاتے۔ کبھی سینے کے سامنے اور کبھی گھٹنوں کے قریب لاکر ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ ساتھ جسم کو اس طرح حرکت دیتے کہ کمر اور کولہوں کے ساتھ ساتھ ایک ایک عضو چلتا اور لہراتا نظر آتا۔ رقص رفتہ رفتہ تیز ہوتا گیا۔ ڈھولیوں نے گردنیں جھٹک جھٹک کر ڈھولکوں پر تیزی سے چوٹ لگانا شروع کر دی۔ رقص تیز اور تیز ہوتا گیا۔ اور جب شباب پر پہنچا تو سرخوشی کے عالم میں ناچنے والوں کے منہ سے اونچے سروں میں گیت کے بول نکل نکل کر فضا میں گونجنے لگے۔ وہ اونچی آواز میں الہا پتے۔

ہو، ہو، علی علی، لڈھی سمم مڈھی

آدھی رات تک رقص و موسیقی کا سلسلہ جاری رہا۔ رقص کرنے والے اور ڈھولی پسینے میں شرابور ہو گئے۔ رقص ختم ہوا تو ستاروں کے کنول روشن ہو چکے تھے۔ ہوا گنگنا رہی تھی۔ رات نشے سے مدہوش تھی۔

رحیم داد بھی اب بڑے زمیں داروں کی طرح اونچے طرے کی پگ سر پر رکھ کر باہر نکلتا۔ مگر اس کا بیشتر وقت مہمان خانے میں گزرتا۔ البتہ وہ اکثر گھوڑی پر سوار ہو کر دن ڈھلے اللہ وسایا کے ہم راہ نہر کی طرف چلا جاتا۔ نہر گاؤں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دونوں گھوڑیاں آہستہ آہستہ دوڑاتے ہوئے نہر کے کنارے کنارے دور تک چلے جاتے، باغ میں واپس آتے اور عام طور پر وہیں ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھاتے۔ جیلہ اور اس کے دونوں بچے بھی کھانے میں شریک ہوتے۔

اساڑھ کا مہینہ لگ چکا تھا۔ لیکن گرمی کم نہیں ہوئی تھی۔ موسم میں صرف اس قدر تبدیلی ہوئی تھی کہ لو کے جھکڑوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی ہوتی تو جس بڑھ جاتا۔ آسمان پر سفید سفید بادلوں کے لکے بگلوں کی ڈار کی مانند منڈلاتے۔ کبھی کبھار بادل سرمئی غبار بن کر چھا جاتے۔ مگر بارش نہیں ہوئی۔

ایک روز سخت گرمی اور جس کے بعد شام کو بارش کا پہلا چھینٹا پڑا۔ گرد و غبار بیٹھ گیا۔ فضا نکھر کر اجلی ہو گئی۔ ہوا خوش گوار اور بھیگی ہوئی تھی۔ زمین سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی تھی۔ دن ڈھلے اللہ وسایا اپنے دونوں بچوں اور جیلہ کے ہم راہ ٹھلتا ہوا نہر کی طرف پیدل ہی چلا گیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا تھا۔ شام سہانی اور فرحت افزا تھی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ اس نے دونوں ٹانگیں سامنے رکھی ہوئی میز پر پھیلا دیں اور موسم کی ٹھنکی سے لطف اٹھانے لگا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ کسی نے اس کے پیروں پر ہاتھ رکھا اور ہولے ہولے دبانے لگا۔ رحیم داد نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ اس کے پیروں میں ماکھا بیٹھا تھا۔

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”تو فرم گیا؟“

”نفر کس کے پاس جاؤں گی۔“ اس نے رحیم داد کے پیر دباتے ہوئے عاجزی سے کہا۔ ”پیارا تو جی دوڑ کر کھوٹی پر ہی جاتا ہے۔“

”میں کتنی بار تجھے کہہ چکا ہوں، اللہ وسایا تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“ رحیم داد نے بیزارگی سے کہا۔

”میں نوں پتہ ہے، وہ کچھ نہیں کرے گا۔ پر چوہدری! اب تو میرا کام توں بھی کر سکتا ہے۔“ ماکھا مسکین سی شکل بنا کر بولا۔ ”اب توں بھی دو زمین دار بن گیا ہے۔ توں چاہے تو میرا بازو شاہ جی سے واپس دلا سکتا ہے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔“

”میری گل وہ کیسے مان سکتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے اللہ وسایا کی احسان شاہ سے لگتی ہے۔“ رحیم داد نے ماکھا سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

ماکھا گڑگڑا کر بولا۔ ”شاہ جی کی اللہ وسایا سے لگتی ہے پر تجھ سے تو نہیں لگتی۔ سچ جان، وہ بہت خوش ہے کہ اللہ وسایا اب اس پنڈ کا زمیں دار نہیں رہا اور تو ڈا زمین دار بن گیا ہے، حویلی بھی اب تیری ہی ہے۔ اللہ وسایا کے پاس تو خالی پٹی رہ گئی۔ سب کچھ تیرا ہی ہے۔“

رحیم داد نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تیں نوں کیسے پتہ چلا احسان شاہ اس طرح سوچتا ہے؟ وہ اللہ وسایا کا دشمن ہے تو میرا بھی ہے۔“

”چوہدری! تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔“ ماکھا مسکرا کر بولا۔ ”اللہ وسایا سے تو شاہ جی اس لیے خار کھاتا ہے، وہ مزارے سے دو زمین دار بن گیا۔ اس کے برابر پہنچ گیا۔ اسے تو اللہ وسایا سے خار کھانا ہی چاہیے۔ تجھے تو وہ خاندانی زمیں دار بتاتا ہے۔ رب سونہ، میں نے اپنے کانوں سے سنا، شاہ جی کہہ رہا تھا، چلو جی، یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ پتہ چلا ہے، چوہدری ویسے جات کا ہے تو جات پر خاندانی زمیں دار ہے۔ اللہ وسایا کی طرح مزارع یا جانگی نہیں رہا۔“

”وہ میرے بارے میں کچھ ہی کئے، میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ اللہ وسایا یہ بات پسند نہیں کرے گا اور میں اسے نراض نہیں کر سکتا۔“

”چوہدری! میرے لیے ایک بار چپکے سے شاہ جی سے مل لے۔“ اس نے رحیم داد کے پیر ایک بار پھر پکڑ لیے۔ ”اللہ وسایا کو پتہ ہی نہیں چلے گا۔ شاہ جی تیری گل مان لے گا۔ میرا بازو مجھے مل جائے گا۔ پنج سال ہو گئے اسے دیکھے ہوئے۔“ اس نے آسمان کی سمت نظریں اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جب سے وہ گئی ہے، میرا گھرا بالکل تباہ ہو گیا۔“

رحیم داد نے اپنے دونوں پیر سمیٹ لیے اور بے رخی سے بولا۔ ”صاف صاف سن لے۔ احسان شاہ اگر اللہ وسایا سے خار کھاتا ہے تو وہ میرا بھی دشمن ہے۔ میں اس کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔ تو کوئی اور رستہ ڈھونڈ۔ میں تیرے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“ رحیم داد کے چہرے پر ہنسنے کا چھٹا ہٹ چھا گیا۔ ”اور دیکھ، آگے بھی تو میرے پاس نہ آتا۔ مجھے تیرا یاں آنا بالکل پسند نہیں۔ اب توڑ جا۔“ رحیم داد کا لہجہ تیکھا اور تلخ ہو گیا۔

ماکھا سر جھکائے کچھ دیر بت بنا بیٹھا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری، اٹھا اور چپ چاپ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ وہ بیزار ہو کر اٹھنے ہی والا تھا کہ احمد آگیا۔ اس کے ہاتھ میں لیپ تھا۔ اس نے لیپ اسٹول پر رکھا، اسے روشن کیا اور رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”زمیں دار حویلی میں ہے۔ اس نے کہا ہے۔ چوہدری سے کہنا باغ میں ٹھہرے۔ میں بھی ذرا دیر میں پہنچ جاؤں گا۔ روٹی اس کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“

رحیم داد کو احمد کی زبانی اللہ وسایا کا پیغام ملا تو اس نے سمان خانے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا، باغ میں بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اللہ وسایا آگیا۔ اس کے ساتھ جیلہ بھی تھی۔ ان کے پیچھے ہی نوکروں نے کھانا لگایا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اللہ وسایا بولا۔ ”آج تو بہت چنگا موسم ہے۔ بارش کا ایک ہی چھینٹا پڑا۔ نہ جس رہا، نہ گرمی۔ ہوا بھی ٹھنڈی چل رہی ہے۔“

جیلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”موسم کو تو بدلنا ہی تھا۔ جولائی کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔“

رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ”ابھی تو آسمان بالکل صاف ہے۔ پر پتہ نہیں، کب برکھا شروع ہو جائے۔“

”کوئی پتہ نہیں، کب بادل گھر کر آجائیں۔“ جیلہ بولی۔ ”چوہدری! توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس مہینے ایسا ہی ہوتا ہے۔ یاد آتا ہے، جب کالج میں چھٹیاں ہوتیں تو ہم بھین بھائی، ماں جی کے ساتھ عام طور پر ڈلہوزی چلے جاتے۔ مجھے تو ڈلہوزی ہمیشہ مری سے بہتر لگا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”دین کنڈ اور دھولہ ہر کی صنوبر کے درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیاں اور ان کی برف پوش سفید سفید چوٹیاں، بہت سندر دکھائی پڑتی تھیں۔ بارش ہوتی تو اور مزا آتا۔ ادھر برکھا ہوتی، ادھر ذرا ہی دیر میں سڑکیں اور رستے ایسے صاف ستھرے، مانو پانی برسا ہی نہیں۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری، تو ڈلہوزی تو گیا ہو گا؟ ضلع گورداس پور ہی میں تو ہے؟“

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس نے نہ گورداس پور دیکھا تھا، نہ کبھی ڈلہوزی گیا تھا۔ وہ سوچ ہی

رہا تھا کہ کیا جواب دے، اتنے میں اللہ وسایا بول پڑا۔ ”جی لے! ڈلوڑی اور گورداس پور کو چھوڑ، یہ بتا کنبل پور جانے کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ اگلے جسے کو چلنا ہے۔“

”چنتا نہ کر۔“ میں نے سفر کی پوری تیاری کر لی ہے۔ ”جیلہ نے اعتماد سے کہا۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”اللہ وسایا! کیا تو کنبل پور جا رہا ہے؟“

”جانا ہی پڑے گا جی! اللہ وسایا نے جواب دیا۔ ”میری بھیمیری شرفاں کا ویاہ ہے۔ اس میں شرکت ضروری ہے۔ جیلہ اور بچے بھی ساتھ جائیں گے۔“ اس کا لہجہ دھیمہ پڑ گیا۔ ٹھنڈی سانس لے کر اس نے بتایا۔ ”بات یہ ہے چوہدری! اس کا نہ پیو ہے، نہ ماں۔ بھین بھائی بھی سکے نہیں۔ میرا پھوپھا فون میں تھا۔ بچھلی جنگ میں جاپانیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ سرکار نے اس کے مرنے کے بعد کنبل پور میں تھوڑی سی زمین گزارے کے لیے دی تھی۔ تب سے پھوپھی وہیں رہنے لگی تھی۔ پر بے چاری زیادہ دن زندہ نہیں رہی۔ اس کے مرنے کے بعد سرکاری پشن بھی بند ہو گئی۔ اب پھوپھی کی نشانی شرفاں ہی رہ گئی ہے۔ چاچے نے اسے پالا ہے۔ وہ بھی کنبل پور میں ہوتا ہے۔ میں نے تو شرفاں کو برسوں سے نہیں دیکھا اور جیلہ نے تو اسے صرف ایک بار دیکھا ہے۔ گڈو کے موذن پر میں نے اسے یہاں بلایا تھا۔“

”اس سے تو وہ بارہ تیرہ برس کی چھوہری تھی۔ پر اب تو جوان میار ہوگی۔ پر بہت سیدھی سادی تھی۔ سدا چپ، چپ رہتی۔“ جیلہ کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ”جس کے سب مرجائیں، اس کا یہی حال ہوتا ہے۔“

”پر تجھ سے تو وہ بہت پیار کرتی تھی۔ ہر وقت تیرے ہی ساتھ لگی رہتی تھی۔“

”ایسے ہی پیار نہیں کرتی تھی۔“ جیلہ کے لہجے میں درد کی کسک تھی۔ ”تمیں نوں کیسہ پتہ میں کتنی بار اسے چھاتی سے لگا کر روٹی ہوں۔“

”ضرور روٹی ہوگی۔“ اللہ وسایا بولا۔ ”کسی کڑی کا پیو یا ماں گزر جائے تو سب سے بڑھ کر تو ہی جا کر سیپا کرتی ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری! اس کا دل بہت کمزور ہے۔ ذرا سی بات پر اسے رونا آجاتا ہے۔ ویسے گلاں بہت کرتی ہے۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کنبل پور سے واپسی کب تک ہوگی؟“

”ہفتہ بھر تو لگ ہی جائے گا۔ زیادہ دن بھی لگ جائیں تو کوئی تعجب نہیں۔“

”ایک روز تو لمور ٹھہرنا پڑے گا۔ میں نے شرفاں کو ناک کی چھک دینے کے لیے کپڑے لٹے اور تو

زور بھی اتار کھلی سے خریدنے ہیں۔ دو ریشمی پٹا نگل تو میں نے پہلے ہی تیار کر لیے ہیں۔“ جیلہ نے مسکراتا بتایا۔

اللہ وسایا حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”وہ تو نے کب تیار کیے؟ میں نوں پتہ ہی نہ چلا۔“

”لے یہ بھی کوئی بتانے کی گل ہے۔“ جیلہ نے شوخی سے کہا۔ ”یہ تو سوچ نہ خیال میں تیرے علاوہ شرفاں کا اور کون ہے۔ ویسے تو دو ڈاڑھیں دار بھی کہلاتا ہے۔ میں کنبے برادی میں تیرا سری نیچے نہیں ہونے دوں گی۔“ جیلہ نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”چنتا نہ کر، شرفاں کی ماں نہیں، میں تو موجود ہوں۔ دیکھ لینا، کیسی دھوم دھام سے سگائی ہوگی۔ ویاہ کی ساری ریتاں رساں ہوں گی۔ شرفاں کے سرال والوں کے سامنے میں نے ناک نہیں کٹوائی۔“

”میں نوں پتہ ہے، تو سب کچھ کرے گی۔“ اللہ وسایا نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ڈھو لکی بجائی گی، گھوٹیاں اور سناگ کے گیت گائے گی۔ جھمیریا ماگھانا بچے گی اور سلامی میں سب سے بڑھ چڑھ کر روپیہ بھی دے گی۔ اسی لیے تو اپنے پاس کچھ بچتا بچاتا نہیں۔“

”کیا کرے گا پیسہ جوڑ کر۔“ جیلہ نے تکیے لہجے میں کہا۔ ”اس کے لالہ میں پڑ کر مورکھ نہ بن۔ اس میں کچھ نہیں رکھا۔ جتنا جوڑ جمع کرو، اتنا ہی لالچ بڑھتا ہے۔ منش خود غرض اور کٹھور بن جاتا ہے۔ دن رات اسی چکر میں رہتا ہے۔“

اسی وقت ہوا کا تیز جھونکا آیا۔ اسٹول پر رکھا ہوا الیمپ بھڑکا اور بجھ گیا۔ روشنی نہیں رہی تو اندھیرا چھا گیا۔ تینوں ذرا دیر گھور اندھیرے میں خاموش بیٹھے رہے، پھر محفل برخاست ہو گئی۔ اللہ وسایا اور جیلہ حویلی کی سمت چلے گئے۔ رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا۔

اللہ وسایا اور جیلہ سفر کی تیاریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ رحیم داد سے شام کو ان کی سرسری ملاقات ہوتی۔ ایک صبح تاروں کی چھاؤں میں دو تانگے حویلی کے سامنے نظر آئے۔ ایک میں جیلہ اور دونوں بچے اور دوسرے میں دونوں نوکر سامان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے وہ اللہ وسایا سے ملا۔ اللہ وسایا نے رخصت ہوتے وقت رحیم داد کو گلے سے لگایا اور پیٹھ محبت سے تھپک کر بولا۔

”چوہدری! میں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کروں گا۔ تو زمیں داری کی دیکھ بھال کرتا رہنا۔ ویسے بھی اب تجھے زمیں داری کے معاملات میں پوری دلچسپی لینی چاہیے۔ تو بھی اس پنڈ کا زمیں دار بن چکا ہے۔“

”ایسی گل نہ کر اللہ وسایا! رحیم داد نے جھٹ اسے ٹوکا۔ ”اس پنڈ کا زمیں دار تو ہی ہے اور تو

ہی رہے گا۔“

”یہ تو تیری محبت ہے چوہدری۔ میں نوں پتہ نہیں تھا، تیرا دل اتنا وڈا ہے۔“

”میرا دل کتنا وڈا ہے، یہ تو تیں نوں آگے پتہ چلے گا۔“ رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔
”جو کہہ رہا ہوں وہی کروں گا اور ثابت کر کے دکھاؤں گا۔“ اس کا چہرہ مضحل ہو گیا۔ ”یہ تو سوچ“
تیرے سوا دنیا میں اب میرا کون ہے۔ میرے لیے تو سب کچھ تو ہی ہے۔“

جیلہ ہنس کر بولی۔ ”تم دونوں ساری گلاں اسی سے کر لو گے۔ کچھ واپسی کے لیے بھی چھوڑ دو۔“
رحیم داد نے جیلہ کی بات سن کر اللہ وسایا سے کہا۔ ”اب تو جا۔ ویر ہو رہی ہے۔ دیکھ، جلد آنے کی کوشش کرنا۔“

اللہ وسایا خاموشی سے تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیلہ اور بچے بھی اسی تانگے میں تھے۔
دونوں تانگے آگے پیچھے روانہ ہوئے۔ رحیم داد حویلی کے نوکروں اور نوکرانیوں کے ساتھ خاموش کھڑا ناگوں کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تانگے دھول اڑاتے رفتہ رفتہ دور ہوتے گئے۔ آخر ایک موڑ پر درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد بو جھل قدموں سے چلتا ہوا مسمان خانے میں واپس آگیا اور اپنے کمرے میں جا کر تھکا ہوا سا کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ مضحل نظر آ رہا تھا۔ اس نے ناشتا بھی رغبت سے نہیں کیا۔ دن بھر کمرے میں رہا۔ شام کو باغ میں گیا مگر وہاں بھی دل نہ لگا۔ اسے تنہائی کا شدید احساس تھا۔ وہ جلد ہی اٹھ کر مسمان خانے میں چلا گیا اور کھانا کھا کے بستر پر لیٹ گیا۔

دوسرے روز بھی اس کی طبیعت اچاٹ رہی۔ موسم بھی دھندلا دھندلا اور بے کیف تھا۔ آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ بارش بھی نہیں ہوئی۔ فضا میں جس تھا، کھٹن تھی۔ رحیم داد مسمان خانے سے نکلا۔ کھیتوں کی طرف گیا۔ مزارعوں سے فصل کے بارے میں ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ واپس آیا تو جسم پسینے پسینے تھا۔ اس نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا۔



دن ڈھلے رحیم داد کا دل اور بو جھل ہو گیا۔ اس روز وہ باغ میں نہیں گیا۔ گھوڑی نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور دل بھلانے کے لیے نہر کی طرف چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور بادلوں کے ایک ٹکڑے کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ اس کی نارنجی روشنی سے نہر کا پانی جھللا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا اور نکل گیا۔ ہلکے ہلکے جھوٹے اس کے جسم سے ٹکرا رہے تھے۔ ان میں تازگی اور فرحت تھی۔ فضا میں جنگلی پھولوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ وہ گھوڑی

دوڑاتا چلا گیا۔ سورج ڈوب گیا۔ شام نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ فضا میں تاریکی گھٹنے لگی۔

رحیم داد نے واپسی کے ارادے سے گھوڑی کی رفتار ست کی۔ گھوڑی پیاسی بھی تھی۔ وہ نیچے اڑا اور اسے پانی پلانے کے لیے نہر کے قریب لے گیا۔ گھوڑی پانی پی چکی تو رحیم داد نے اسے کچھ دیر ستانے کا موقع دیا۔ اس کا جسم پسینے سے جھجک کر سیاہ پڑ گیا تھا۔ رحیم داد نہر کے قریب ریت کے ایک تودے پر بیٹھ گیا۔ اس کی قمیض پسینے سے شرابور تھی۔ نہر کی سمت سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔

واپسی کے لیے وہ گھوڑی پر سوار ہوا۔ عین اسی وقت بجلی کے اونچے اونچے پودوں کے گھنے جھنڈ کے پیچھے سے لاکھا ٹکڑے گر سائے آگیا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

”اوئے ماکھے! تو ادھر کیسے آگیا؟“

”چوہدری! تیں نوں یہ بھی پتہ نہیں۔ وہ ادھر درختوں کے اس پار اپنا پنڈ پیراں والا ہے۔“ ماکھا نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

رحیم داد مزید بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے نظر انداز کرتے ہوئے اس نے گھوڑی موڑی مگر ماکھا جھپاک سے گھوڑی کے سامنے آگیا۔ گڑگڑا کر بولا۔ ”چوہدری! میری ایک گل سن لے۔“
رحیم داد نے گھوڑی ٹھراتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تجھے کیا کہنا ہے؟“ اس نے خکی نظروں سے ماکھا کو دیکھا۔ ”میں تجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ چکا ہوں، میں تیرا کام نہیں کر سکتا۔ میرا پیچھا چھوڑ دے۔“

”میری گل تو سن لے۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”شاہ جی اپنی گھوڑی پر آگے گیا ہے۔ واپس آتا ہی ہو گا۔“

”میں نوں اس سے کیا لینا۔ سامنے سے ہٹ۔“ رحیم داد نے ڈپٹ کر بے رخی سے کہا۔ ماکھا ڈھیٹ بن کر بولا۔ ”تو اسے میرے بازو کے بارے میں کہے گا تو وہ ضرور مان لے گا۔“

”پر میں نے اس سے کوئی گل شل نہیں کرنی۔“ رحیم داد کے لہجے میں بدستور بیزاری تھی۔
”الگ ہٹ۔ میرا رستہ چھوڑ۔“

ماکھا گھوڑی کے سامنے سے تو ہٹ گیا مگر اس نے جھٹ رکاب میں پڑا ہوا رحیم داد کا پیر تھام لیا۔ ”چوہدری! تیری ایک گل سے مجھے اپنا بازو مل جائے گا۔ مجھے تباہی سے بچالے۔ تیری مہربانی ہوگی۔“ اس نے رحیم داد کے پیر پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ رحیم داد تذبذب میں جھٹا ہو گیا۔ وہ گھوڑی پر گرم مہم بیٹھا رہا۔ شام کے سائے میں ماکھا کی دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں

اور اس کی پیشانی رحیم داد کے پیروں پر رکھی ہوئی تھی۔ اسی اثنا میں دور سے ٹاپیں ابھریں۔ ماکھانے گردن اٹھا کر رحم طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ گلوگیر آواز میں بولا۔
”چوہدری! وہ آرہا ہے۔ بس ذرا دیر ٹھہر جا۔ وہ ہمیں سے گزرے گا۔ تو شاہ جی سے گل کر کے تو دیکھ۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ٹاپیں رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ ماکھا گھبرائے ہوئے لمبے میں بولا۔ ”شاہ جی پہنچنے ہی والا ہے۔ مجھے تیرے پاس دیکھے گا تو نراض ہوگا۔“ یہ کہتا ہوا وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ساتھ ہی گزر گزاتا رہا۔ ”چوہدری! اس سے میرے بارے میں گل کر لے۔ تو کسے گا تو میرا کام بن جائے گا۔ زندگی بھر تجھے دعاؤں دوں گا۔“ ماکھا آنسو پونچھتا ہوا لپک کر کیکر کی ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چلا گیا۔

رحیم داد پس و پیش میں جہاں تھا، وہیں کھڑا رہا۔ ٹاپیں بالکل قریب سنائی دینے لگیں۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شام کے دھندلکے میں احسان شاہ اپنی گھوڑی دوڑاتا، گردے کے بادل اڑاتا، ایک موڑ سے نمودار ہوا۔ وہ رحیم داد ہی کی طرف آرہا تھا۔ آن کی آن میں وہ نزدیک پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑی کی راسیں زور سے کھینچیں۔ گھوڑی اونچی آواز سے ہنسنائی اور ٹھہر گئی۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ رحیم داد نے سلام کیا۔

احسان شاہ نے سلام کا جواب دیا اور گردن اٹھا کر پوچھا۔ ”میں نے تجھے پہچانا نہیں۔ پہلی بار اوھر دیکھ رہا ہوں۔“

رحیم داد نے بتایا۔ ”میرا نام جی، چوہدری نور الہی ہے۔ کوئلہ ہر کشن میں اپنی زمیں داری ہے۔“
”تو ہے چوہدری نور الہی!“ احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”نام تو تیرا سنا تھا، آج تجھے دیکھ بھی لیا۔“ اس کے چہرے کا تناؤ کم ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”پر آج تو ادھر کیسے نکل آیا؟“

رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کو دیکھا۔ سن و سال کے اعتبار سے وہ چھپن ستاون سال کے پینے میں تھا مگر جسم مضبوط اور بھاری بھر کم تھا۔ چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں۔ پگ کا اونچا طرہ ہوا سے آہستہ آہستہ لہرا رہا تھا۔ وہ اپنے ذیل ڈول اور وضع قطع سے بہت بارعب لگتا تھا۔

رحیم داد اس کی شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا، ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی! تجھ سے ایک گل کرنی تھی۔“

”ضرور کر۔“ احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”پر یہاں کھڑے کھڑے کیا گل ہو سکتی ہے۔ اپنی حویلی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ موسم بھی سہانا ہے، وہیں آرام سے بیٹھ کر بات

بیت ہوگی۔“

رحیم داد اس کی حویلی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کترانے کی کوشش کی۔ لمبے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”کوئی لمبی چوڑی گل نہیں کرنی۔“

”چھوٹی ہو یا لمبی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”پر یہ تو کوئی بات کرنے کی جگہ نہیں۔“

احسان شاہ نے بات ختم ہی کی تھی کہ ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ وہ بے تکلفی سے تہقہ مار کر بولا۔ ”لے چوہدری! اب تو بوندا باندی بھی شروع ہو گئی۔ آمیرے ساتھ۔ اب حویلی میں بیٹھ کر آرام سے گل بات ہوگی۔“

بارش اور تیز ہو گئی۔ رحیم داد کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔ احسان شاہ نے ایدلگا کر گھوڑی آگے بڑھائی۔ رحیم داد بھی چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلے لگا۔ دونوں گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے پیراں والہ کی جانب روانہ ہوئے۔

بارش بتدریج تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ پیراں والہ میں داخل ہوئے تو بارش خاصی تیز ہو چکی تھی۔ دونوں جلدی جلدی اترے۔ گھوڑیاں ملازموں کے حوالے کیں اور حویلی کے اندر چلے گئے۔ حویلی نہایت شاندار تھی۔ اس کے چاروں طرف فصیل نما اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کو ٹھیک ہی بتایا تھا کہ احسان شاہ کی حویلی دور سے پرانے زمانے کا قلعہ لگتی ہے۔ اس کا پھانک اس قدر اونچا تھا کہ باقی گزر سکتا تھا۔ دروازے بھاری اور مضبوط لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ پھانک پر مسلح پھرتا تھا۔

حویلی کے تین حصے تھے۔ ایک حصے میں احسان شاہ کی منکوحہ بیویاں اور بچے رہتے تھے۔ یہ حویلی کا عقبی حصہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ڈیرا تھا جو دیوان خانہ کہلاتا تھا۔ حویلی کے نوکر چاکر اسے مہمان گھر بھی کہتے تھے۔ دیوان خانہ پھانک سے اندر داخل ہوتے ہی نظر آتا تھا۔ احسان شاہ اس دیوان خانے میں صبح شام کچری لگاتا تھا۔ منجہر، منشیوں اور کارندوں کے ساتھ بیٹھ کر زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ مزارعوں کے خلاف شکایات پیش ہوتیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ بھی دیوان خانے ہی میں کرتا تھا۔

دیوان خانے کے آگے وسیع پائیں باغ تھا۔ دیوان خانے سے متصل اونچی اونچی دیواروں سے گھرا ہوا حصہ کوٹ کہلاتا تھا۔ کوٹ میں احسان شاہ کی داشتائیں اور مزارعوں کی وہ نوجوان عورتیں قید رکھی جاتی تھیں جنہیں اغوا کر کے لایا جاتا تھا۔ کوٹ میں آمدورفت کا صرف ایک دروازہ تھا اور

اس پر چوبیس گھنٹے مسلح پہرا رہتا تھا۔

دیوان خانے میں کشادہ ہال تھا جس پر دبیز قالین کا فرش تھا۔ جگہ جگہ صوفے اور دیوان قرینے سے رکھے تھے۔ صوفے پرانی وضع کے مگر قیمتی اور آرام دہ تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر ہلکے ریشمی پردے پڑے تھے۔ احسان شاہ دیوان خانے میں داخل ہوتے ہی ہال کی جانب بڑھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں ہال میں پہنچے تو نوکروں نے نہایت مستعدی سے پردے ہٹا دیئے اور کھڑکیوں کے پٹ کھول دیئے۔ ہال کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ اس میں بید کی کرسیاں پڑی تھیں۔ احسان شاہ نے ہال میں پہنچ کر گری محسوس کی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! یہاں تو جس ہے۔ باہر برآمدے میں بیٹھا جائے۔“ اس نے قریب کھڑے ہوئے ملازم کی جانب دیکھا۔ ”شیدے! دروازہ کھول دے۔ کرسیاں اور میز برآمدے میں ٹھیک سے لگا دے۔ یہاں گری ہے۔ ہم نے برآمدے میں بیٹھنا ہے۔“

”شیدا آگے بڑھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھولا۔ باہر گیا، کرسیاں قرینے سے لگائیں اور درمیان میں میز رکھ دی۔ احسان شاہ اور رحیم داد ہال سے نکل کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ برآمدے کے آگے دور تک پھیلا ہوا نرم نرم گھاس کا لان تھا۔ اونچے اور گھٹے درخت تھے۔ ان کے درمیان جگہ جگہ روشیں اور کھیریاں تھیں۔ پھولوں سے مستکی ہوئی بیگی بیگی شاخیں تیز جھونکوں سے جھوم رہی تھیں۔

باغ میں رم جھم بارش ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بارش کے چھینٹے کبھی کبھار برآمدے میں بھی آجاتے۔ رحیم داد حویلی کی شان و شوکت اور احسان شاہ کی آن بان سے بڑا مرعوب نظر آتا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ احسان شاہ کی پشت پر شیدا سر جھکائے مودب کھڑا تھا۔

احسان شاہ نے اپنی پگ اتار کر شیدے کو دی، ہنس کر بولا۔ ”کچھ پینے پلانے کو لا۔ دیکھ تو کیسا ظالم موسم ہے۔“

شیدے نے پگ سنبھالی اور ہال کے اندر چلا گیا۔ رحیم داد ہنوز خاموش تھا۔ احسان شاہ نے اس کی جانب دیکھا، مسکرا کر پوچھا۔ ”ہاں چوہدری، اب بتا تو کیا کہنا چاہتا تھا؟“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے ماکھا کا ذکر چھیڑا۔ ”شاہ جی! میں نے جو گل کرنی ہے، وہ ایسہ ہے۔“

”کوئی خاص گل ہے؟“ احسان شاہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”خاص ہی گل ہے۔“ رحیم داد نے آہستہ آہستہ اثبات میں گردن ہلائی۔

”تب تو آرام سے گل ہوگی۔ ایسی جلدی کیا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”اس بارش میں تو واپس جانے سے رہا۔ کوئلہ ہر کشتن دور ہے اور رستہ بھی کچا اور پیچ کا ہے۔ بارش ختم جائے تو روٹی کھا کر چلا جانا ورنہ رات بیس ٹھہر جاتا۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”میں نے سنا ہے، اللہ وسایا تو گھر والی اور بچوں کے ساتھ پنڈ سے باہر گیا ہے۔“

”وہ اپنی بھیمیری کے ویاہ میں شرکت کے لیے کسبل پور گیا ہے۔“

”جب ہی تو ادھر نکل آیا۔“ احسان شاہ نے بے تکلفی سے تقہر لگایا۔ ”وہ پنڈ میں ہوتا تو تجھے ادھر آنے نہ دیتا۔“

رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا، خاموش بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد شیدا ایک ٹرے میں دہسکی کی بوتل، دو گلاس اور پانی سے بھرا ہوا جگ لے کر آگیا۔ اس نے بوتل، جگ اور گلاس میز پر رکھ دیئے۔ رحیم داد نے یہ رنگ ڈھنگ دیکھا تو بہت گھبرایا۔ اس نے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی۔ البتہ میلوں ٹھیلوں میں بھنگ اور ساوی باربا پی چکا تھا۔ جن دنوں شنگری جیل میں تھا، لالی اور دوسرے قیدیوں کے اصرار پر چرس بھری سگریٹیں بھی پی لیتا تھا۔ مگر چرس پینے کی لت نہیں لگی تھی۔

شیدے نے پہلے احسان شاہ کے لیے دہسکی کا پیگ بنایا اور گلاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ مگر جب وہ دوسرا پیگ بنانے لگا تو رحیم داد کسی قدر پریشان ہو کر بولا۔ ”میرے لیے نہ بنا۔“ شیدے نے ہاتھ روک لیا۔

”کیسی گل کر رہا ہے چوہدری! ایسے کافر موسم میں تو وڈے، وڈے زاہدوں اور پرہیزگاروں کی توبہ ٹوٹ جاتی ہے۔“ وہ کھکھلا کر ہنسا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ ”منہ کیا تک رہا ہے؟ اپنا کام کر۔“

اس نے نہایت مستعدی سے پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ دیا۔ احسان شاہ نے اشارہ کیا۔ شیدا فوراً چلا گیا۔ احسان شاہ نے گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔

”چوہدری! اٹھا اپنا گلاس۔“

لیکن رحیم داد نے گلاس نہیں اٹھایا، حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے اصرار کیا۔ ”اب تکلف شکن چھوڑ۔ گلاس اٹھا۔“

”شاہ جی، گل ایسہ ہے۔ میں نے آج تک نہیں پی، مجھے نہ پلا۔“

”نہیں پی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آج سے شروع کر دے۔“ احسان شاہ کا اصرار جاری

رہا۔ ”اللہ وسایا کے رستے پر نہ چل۔ وہ تو مزارع تھا، زمین دار بن کر بھی مزارع ہی رہا۔ وہ تجھے بھی زمین دار نہیں بننے دے گا۔“ احسان شاہ نے گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہاتھ میں تھام دیا، اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا۔ ”چل، شروع ہو جا۔ میں نے آج تک کسی مہمان کی اس طرح ناز برداری نہیں کی۔“ اس نے ایک ہاتھ مونچھ پر پھیرا۔ ”میں متروکہ جائیداد کی لوٹ مار سے زمین دار نہیں بنا، خاندانی بیکہ دار ہوں۔ یہ حویلی میرے داد نے بنوائی تھی۔ وہ بہت وڈا زمین دار ہوتا تھا۔ لاث گورنر کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔ کیا سمجھا؟“

احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد اس کی باتوں سے ایسا مرعوب ہوا کہ گلاس اس کے ہونٹوں تک پہنچ گیا۔ اس نے بھی گھونٹ بھرا اور منہ ذرا سا بگاڑ کر بولا۔

”شاہ جی، توں نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔“

”بچوں جیسی گلاں نہ کر۔“ احسان شاہ نے ہنس کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”تیں نوں ابھی پتہ نہیں۔ زندگی کا اس کے بناں کیا مزا۔ تھوڑی سی اور لگا۔ تیں نوں خود ہی اندازہ ہو جائے گا، یہ کیا بہار دکھاتی ہے۔“

اسی وقت بادل زور سے گر جا۔ رحیم داد نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا، خاموشی سے ایک گھونٹ اور بھرا اور بیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے پونچھنے لگا۔ بارش تیز ہو گئی۔ ہوا کے نم آلود جھونکے برآمدے کے اندر آنے لگے۔ فضا میں خنکی رچ گئی۔

شیدادو پلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور سٹکے لے آیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد پیتے رہے، مرغ اور سٹکے کھاتے رہے۔ باہر موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔

احسان شاہ بولا۔ ”ہاں چوہدری، اب سنا اپنی گل، تیں نوں کیہ کہتا ہے؟ بار بار ذکر کرتا تھا۔ ایسی کیا خاص گل ہے؟“

”گل شل کیا ہے جی، اوہ تیرا ایک مزارع ہے نا۔ ماکھا نام ہے اس کا۔“ رحیم داد نے جان بوجھ کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ احسان شاہ کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔

مگر احسان شاہ پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔ ”یاد تو پڑتا ہے، اپنا ایک مزارع ماکھا بھی ہے، پر چوہدری، تجھے اس سے کیا لیتا۔“

رحیم داد نے ہنچکپاتے ہوئے کہا۔ ”اس کی گھروالی تیری حویلی میں ہے۔“

”ہوگی۔“ احسان شاہ نے ایک ٹکا اٹھا کر چباتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”تجھے کیسے اس کی یاد آگئی؟“

”ماکھا کنی بار میرے پاس آچکا ہے۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”وہ اپنی گھروالی واپس لے جانا چاہتا ہے۔“

”اس کی بات نہ کر۔ وہ تو ایسے ہی سب کے پاس پہنچتا رہتا ہے۔ تیرے پاس بھی جا کر گڑ گڑایا ہو گا۔ یہی گل ہے نا؟“

”ہے تو جی یہی گل۔“ رحیم داد نے وہسکی کی چسکی لگا کر کہا۔ ”ماکھا اپنے بازو کے لیے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا، اس کے بغیر وہ تباہ ہو گیا۔“ رحیم داد پر اب وہسکی اپنا اثر دکھانے لگی تھی۔ وہ پہلی بار کھل کر مسکرایا۔ ”شاہ جی، وہ ۵ سال سے تیری حویلی میں ہے۔ کئی بچے بھی جن چکی ہے۔ اب وہ تیرے کس کام کی رہ گئی؟“

”کام کی تو وہ اب بھی ہے۔ چوہدری، تو نے اسے دیکھا نہیں۔“ احسان شاہ نے ہلکا تھپہ لگایا۔ ”بچہ جن نے کے بعد وہ اور ریلی ہو جاتی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام ریلی رکھ چھوڑا ہے۔ اب تو یہ بھی یاد نہیں پہلے اس کا کیا نام ہوتا تھا۔ اب تو میں اسے ریلی ہی کے طور پر پہچانتا ہوں۔ چچ کہتا ہوں، وہ ہے بھی ریلی۔“

”اب تو وہ بوڑھی ہو گئی ہوگی؟“

”لگتی تو وہ ابھی تک جوان ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تیری گل سمجھ نہیں آتی۔“ رحیم داد نے چہرے کے تاثرات سے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں نے تو جی یہ دیکھا ہے، دو تین بچوں کے بعد تو مزارعوں اور کمیوں کی گھروالیاں ایسی مرمل اور بوڑھی لگتی ہیں کہ دیکھنے کو جی نہیں کرتا۔“

”چوہدری تو بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ احسان شاہ نے اس کی تائید کی۔ ”بات یہ ہے جی! مزارعے اور کمی ان سے دن رات سخت محنت کراتے ہیں۔ پر روٹی نکر دینے کو ان کے پاس اتنا ہوتا نہیں کہ انھیں ٹھیک ٹھاک رکھیں۔ وہ بوڑھی اور مرمل نہیں لگیں گی تو اور کیا لگیں گی۔“

”پر یہ بھی تو ہے جی، ادھر کڑی تیراں چوداں کی ہوئی، ادھر جھٹ اس کا دیا ہو جاتا ہے۔ پوری طرح جوان بھی نہیں ہوتی کہ ٹھکا ٹھک بچے پیدا ہونے لگتے ہیں۔“

”جیسی تو مزارعوں اور کمیوں کے گھروں میں جوان اور خوب صورت زنانیاں نظر نہیں آتیں۔“ احسان شاہ نے منہ بگاڑا۔ ”میں جسے بھی اٹھواتا ہوں، پہلے اسے مکھن دودھ کھلا پلا کر تیار کراتا ہوں۔ تب اس پر جو بن آتا ہے۔ وہ نکھرتی ہے۔ چہرے پر رنگ روپ آ جاتا ہے۔ بدن بھی گداز اور کسا ہوا ہو جاتا ہے۔“

”دیکھ لوں گا، پر آج نہیں۔“ رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ ”ویسے بارش بھی ہو رہی ہے۔“

”اب میں تجھے راز کی گل بتاتا ہوں۔ ان رکھیلوں سے بہت کام نکلتا ہے۔ میں تو ان کو اپنے کمرے میں رات کو کم ہی بلاتا ہوں۔“ اس نے دھسکی کی چسکی لگائی۔ ”تھانے دار، تحصیل دار، اور سبھی کبھی تو ان سے بھی وڈے افسر، بلکہ اسمبلی کے ممبر بھی میری حویلی میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ تیرے ایسے یار دوست بھی آتے ہی رہتے ہیں۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ نشے کی جھونک میں لہرا کر بولا۔

”شراب کا دور بھی چلتا ہے۔ مہمانوں کی خاطر مدارت تو کرنی ہی پڑتی ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے آنکھ ماری۔ ”ان میں رنگین مزاج بھی ہوتے ہیں۔ ان کا دل ہسلانے کے لیے یہ زنانیاں بہت کام آتی ہیں۔ نہ کسی کو بلوانے کی ضرورت نہ ڈھونڈنے شونڈھنے کا چکر۔ کوٹ میں ہر طرح کی رن موجود ہے۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

نشے کا ریلا آیا۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں دیا ہوا گلاس جھلک اٹھا۔ اس نے گلاس میز پر رکھ دیا۔

”ہنس کر گویا ہوا۔“ چوہدری اک گل اور بھی ہے۔ پتر جوان ہو گئے ہیں۔ تین نوں پتہ ہے، جوانی تو دیوانی ہوتی ہے نا۔ چھپ چھپ کر کنجریوں کے پاس جائیں گے۔ لمور جا کر ہیرا منڈی کے چکر کاٹیں گے۔ روپیہ پیسہ برباد کریں گے۔ بدنامی الگ ہوتی ہے۔ فیر ایسا بھی تو ہے۔ کنجریوں کے پاس جائیں گے تو پوشیدہ اور خطرناک بیماریاں لگا کر لائیں گے۔“ اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ ”کوٹ کی یہ رکھیلیں ان کے کام بھی آتی ہیں۔“

”پر شاہ جی! تجھے یہ بات بری نہیں لگتی؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”چوہدری! تو برائی کی گل کر رہا ہے۔ میں پوری طرح جوان بھی نہ ہوا تھا کہ پنڈ کی ایک چھوہری پر دل لگیا۔ میں نے اسے اٹھا کر زبردستی گھوڑی پر ڈالا اور حویلی میں لے آیا۔ میں نے ایک فلم میں ہیرو کو اسی طرح ہیروئن کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ احسان شاہ بتاتا رہا۔ ”وہ جی کہماروں کی چھوہری تھی۔ وہ اکٹھے ہو کر پیچھے پیچھے آئے۔ بہت رولا گولا کیا۔ اسی دیوان خانے میں میرے بیو کے سامنے مکدمہ پیش ہوا۔ میں بہت ڈرا۔ میرا پیو بہت رعب داب والا زمیں دار تھا۔ کہماروں کی شکایات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ سب کو الٹا لٹکا کر جوتے لگوائے۔ اسی روز ان کی کئی کڑیاں اور جوان زنانیاں اٹھوالیں۔ کئی روز سب کو جیل میں بند رکھا۔ اس کی اپنی جیل ہوتی تھی۔ اسی حویلی میں ایک تہہ خانہ ہے۔ پہلے وہ جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ جو مزارع یا کسی سرکشی یا نافرمانی کرتا، اس میں ڈال دیا جاتا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ چپ بیٹھا مرغ کی ٹانگ چباتا رہا۔ بارش کا زور اب ٹوٹ گیا تھا البتہ ہوا کی شوریدہ سری کم نہیں ہوئی تھی۔ دونوں کی آنکھوں میں نشے سے ستارے جھلما رہے تھے۔

احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہیں رہا۔ اس نے ہنس کر پوچھا۔ ”چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”سوچ رہا تھا، تیری تن درستی بہت شان دار ہے۔ اب بھی جوان گھرو لگتا ہے۔“ رحیم داد نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

”اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ دو سال ادھر میرا جگر خراب ہو گیا تھا۔ تب سے صحت ذرا اگر گئی۔ تو نے اس زمانے میں مجھے نہیں دیکھا۔“

”برانہ منا تو ایک گل پوچھوں۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”شاہ جی! تو مزارعوں کی گھر والیاں کیوں اٹھواتا ہے؟“

”مزارعوں کی زنانیاں تب اٹھواتا ہوں جب وہ سرکشی کرتے ہیں۔ دیگار سے جی چراتے ہیں۔ حرام خوری اور بد معاشی کرتے ہیں۔“ احسان شاہ تکیے لہجے میں بولا۔

”ایسے مزارعوں کو بے دخل کیوں نہیں کر دیتا؟“

”بے دخل کرنے کا سب سے آسان اور مجرب نسخہ یہ ہے، جس مزارع کو بے دخل کرنا ہو، اس کی گھر والی اٹھوالو۔ سمجھو اس کا ایک بازو کٹ گیا۔ وہ بالکل بے بس ہو جاتا ہے۔“ احسان شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے کبھی کبھی مزارعوں اور کیوں پر رعب اور دہشت بٹھانے کے لیے بھی ایسا کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ تیں نوں تو پتہ ہی ہے، مزارعوں میں ایک سے ایک نمبری، نکما اور ہڈ حرام پڑا ہے۔ ذرا ڈھیل دو، جھٹ کانوں چھانٹا ہے، اوپر درخواستیں پہنچاتا ہے۔ خود بد معاشی کرتا ہے دوسروں کو بھی اکساتا ہے۔ زمیں داری کرنا ہنسی ٹھنھا نہیں۔ زمیں دار کا رعب اٹھ جائے تو سمجھ لے، گئی زمیں داری۔ اسے چلانے کے لیے ضروری ہے، ایسا وار کرو کہ مزارع سر ہی نہ اٹھا سکے۔ عورت تو مرد کی عزت ہوتی ہے نا۔ بس اس سے وہی چھین لو۔ ہمیشہ کے لیے اس کا سر جھک جاتا ہے۔“

”پر شاہ جی! تو نے تو بہت زنانیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ میں نے تو سنا ہے، ان کے لیے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”تو نے ٹھیک ہی سنا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”کوٹ ساتھ ہی ہے۔ دیکھنا چاہے تو ابھی دیکھ لے۔ بول کیا کہتا ہے؟“

”تو بھی اسے جیل کی طرح کام میں لاتا ہے؟“

”نہیں میں نے اسے ختم کر دیا۔ دو کیدی مرگئے تو پنڈ کے مزارعوں اور کیوں نے بہت شور مچایا۔ آس پاس کے مزارعے اور کسان بھی ان کے ساتھ لگ گئے۔ انھیں دبانے کے لیے پولیس کو بلانا پڑا۔ معاملہ تو دب گیا پر میں نے اس کے ساتھ ہی جیل بھی ختم کر دی۔ تمہ خانے میں اب تو غلہ رکھا جاتا ہے۔“

”کھساروں کی چھوہری اٹھالایا تو تیرے پیو نے تجھے کچھ نہیں کہا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔
”کچھ تو نزاع ہوا ہو گا؟“

”بالکل نزاع نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ ماں جی کے پاس جا کر ہنستے ہوئے بولا،
”لے نیک بخت! تیرا پتر جوان ہو گیا۔ زور آور بھی ہے۔ نکڑا زمین دار بنے گا۔“ احسان شاہ ٹھٹھامار کر ہنسا۔
”میں اپنے پیو کا اکھوتا پتر تھا۔ لاڈلا بھی بہت تھا۔“ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔
”بعد میں تو جی اس کی رکھیلیں اپنے کام میں آنے لگیں۔ اس نے ایک سے ایک زبردست دانچا چھانٹ کر رکھ چھوڑا تھا۔ میرا پیو بھی یوں سمجھ لے بادشاہ ہوتا تھا۔ رعب ایسا زبردست تھا کہ مزارعے اور کمی اس کے نام سے کانپتے تھے۔ سرائٹھا کر اس کے روبرو بات نہیں کر سکتے تھے۔“
”ایک گل سمجھ نہیں آئی۔ تو جن زنانیوں کو اٹھواتا ہے، کوٹ میں رکھتا ہے، ان کے گھروالے انھیں واپس لے جاتے ہیں۔ وہ برا نہیں مناتے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔
”ان کی غیرت ذرا نہیں جاگتی؟“

”تو غیرت کی گل کر رہا ہے۔ وہ تو انھیں واپس لینے کے لیے منت کرتے ہیں، پیر پکڑتے ہیں۔ کئی تو ایسے ہوتے ہیں، منہ مانگی کیمت ادا کر کے لے جاتے ہیں۔“

”یہی تو میں جانتا چاہتا ہوں۔ ایسا کیوں ہے؟“

”یہ سوال تو اسمبلی میں بھی اٹھایا گیا تھا۔ ہوا یہ کہ بیگم شاہنواز نے زنانیوں کے حکوک کے لیے اسمبلی میں بہت زبردست تکریر کی۔ گلہ کیا کہ انھیں کوئی حکوک حاصل نہیں۔ مردوں نے ان کے سارے حکوک دبا رکھے ہیں۔ اپنا غلام بنا کر رکھ چھوڑا ہے۔ ملک فیروز خاں نون بھی ان دنوں اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا۔ وہ جھٹ کھڑا ہو گیا۔ ایسا مسکت جواب دیا کہ بیگم شاہنواز چپ کر کے رہ گئی۔“

”کیا جواب تھا اس کا؟ میں بھی سنوں۔“

”اس نے گرج کر کہا، بیگم شاہنواز کو پتہ نہیں، پاکستان میں زنانیوں کو کتنے حکوک حاصل ہیں۔“

میں اس سلسلے میں اپنے ایک مزارعے کا ذکر مثال کے طور پر ایوان کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، جس سے پوری طرح اندازہ ہو جائے گا، مردوں کے مکالمے میں عورتوں کو کتنے زیادہ حکوک ملے ہوئے ہیں۔ میرے مزارعے کا نام کرم دین ہے۔ اس کے بارے میں میرے پاس شکائتیں پہنچیں کہ اسے اپنی عزت آبرو کا ذرا لحاظ نہیں۔ میں نے اسے بلا کر ایک روز پوچھا، کرے! میں نے سنا ہے تیری گھروالی نے کسی سے یاری لگا رکھی ہے۔ تو اسے کچھ نہیں کہتا۔ تیری غیرت نہیں جاگتی؟ وہ بولا، ملک صاحب! ہے تو یہ بالکل جی گل۔ میری گھروالی نے پنڈ کے لوہار سے یاری لگا رکھی ہے۔ وہ ہر رات اس کے پاس چلی جاتی ہے۔ میں نے اسے بہت منع کیا۔ جھگڑا کیا، پر وہ نہیں ماننی۔ میں اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ گل ایسا ہے جی۔ وہ سویرے ہی سویرے واپس آ جاتی ہے۔ ڈھور ڈنگروں کو چارہ پانی دیتی ہے۔ میرے لیے روٹی تیار کرتی ہے۔ شام تک سارے ہی کام کرتی رہتی ہے۔ بچوں کو روٹی کھلا کر سلاتی ہے۔ میرے پاس آکر پوچھتی ہے اور کوئی کام تو نہیں کرنا؟ میں جب تک روکتا ہوں، رک جاتی ہے، فیروہار کے پاس چلی جاتی ہے۔ ملک صاحب! میں نے اس سے اور کیا لیتا۔ دن بھر تو وہ میری گھروالی ہی رہتی ہے نا۔ ویسے کبھی کبھار رات کو میرے پاس ٹھہر بھی جاتی ہے۔ پر یہ اس کی مرضی پر ہے۔“ احسان شاہ نے نشے کی ترنگ میں زور کا تہقہ لگایا۔ ”تو ہی بتا فیروز خاں نے کیسی زبردست دلیل پیش کی۔ اور سچ پوچھ تو بالکل صحیح پیش کی۔“
”تو نے جو کچھ بتایا، کیا یہ سچ ہے؟“

”بالکل سچ ہے۔“ احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”ملک فیروز خاں نوں کی یہ تکریر تو دستور ساز اسمبلی کے ریکارڈ میں موجود ہے۔ سارے ہی اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ میں نے بھی اسے اخبار ہی میں پڑھا تھا۔ میں کب اسمبلی میں بیٹھا تھا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ بارش اب رک چکی تھی۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر باہر دیکھا اور برآمدے میں چھائی ہوئی خاموشی توڑی۔ ”پانی تو اب تھم چکا ہے۔“ اس نے احسان شاہ کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔

”شاہ جی! میری گل کا اب تک کوئی جواب نہیں ملا؟“

”کون سی گل؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”وہی ماٹھے کے بازو کی واپس کی گل۔“ رحیم داد نے لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی! میری خوشی ہے کہ تو اس کی گھروالی واپس دے دے۔“
”چوہدری، تو کہتا ہے تو دے دوں گا۔“ احسان شاہ رضامند ہو گیا۔ ”پر ماٹھا اس کا ناس ماروے“

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا۔ شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو اسے کھانا چنے کی ہدایت کی۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔

کھانے کا کمرہ برابر ہی تھا۔ دونوں نے وہاں جا کر کھانا کھایا۔ کھانا مرغن اور خوش ذائقہ تھا مگر رحیم داد زیادہ نہ کھاسکا۔ کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی کے زنان خانے کی جانب چلا گیا۔



دیوان خانے کا ایک دروازہ ایک طویل راہداری میں کھلتا تھا۔ آگے مختصر یاغیچہ تھا۔ باغیچے کے ایک طرف برآمدہ تھا۔ اس میں ایک سلسلے سے کئی کمرے تھے جو مہمانوں کے قیام کے لیے تھے۔

شیدا نے ایک کمرے میں رحیم داد کو پہنچا دیا۔ کمرہ خوب ہوا دار تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ کمرے کے ایک طرف مسہری بچھی تھی۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ قریب ہی میز رکھی تھی۔ اس پر لیپ روشن تھا۔ شیدا اسے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے لیپ کی لودھم کردی۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بجلی بھی کڑک رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی باغ کی جانب کھلتی تھی۔ ہولہ کے پیچھے ہوئے جھونکے اندر آرہے تھے۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر زبا ہی دیر بعد دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ مڑکر دروازے کی جانب دیکھا کہ دھندلی روشنی میں ایک عورت دہلیز کے پاس کھڑی دروازہ بند کر رہی ہے۔ اس کی پشت رحیم داد کی جانب تھی۔ وہ سبز کنارے کا سرخ ریشمی لاچا باندھے ہوئے تھی۔

دروازہ بند کرنے کے بعد وہ مڑی۔ اس کا رنگ چمپئی تھا۔ صورت شکل گوارا تھی۔ البتہ آنکھیں روشن اور خوب صورت تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی ناک کا کاد درست کیا اور آہستہ آہستہ رحیم داد کی جانب بڑھنے لگی۔ وہ پچیس چھیس سال کی جوان اور صحت مند عورت تھی۔ رحیم داد خاموش لیٹا رہا۔

عورت چپ چاپ آکر پانچت کی جانب بستر پر لیٹ کر بیٹھ گئی۔ بادل ایک بار زور سے گرجے۔ بارش تیز ہو گئی۔ رحیم داد تکیے کے سارے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت کو ایک نکل دیکھتا رہا، پھر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔

”تو ماکھ کی گھروالی ہے؟“

”ہاں جی! میں اس کی گھروالی ہوں۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔

”تیرا نام کیا ہے؟“ رحیم داد نے بات چیت آگے بڑھائی۔

”گا۔ تو نے اسے دیکھا نہیں۔ بہت زوردار جٹی ہے۔ ایک نمبر دانا ہے۔“

”وہ جیسی بھی ہے، میں چاہتا ہوں تو اسے ماکھ کے حوالے کر دے۔“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”شاہ جی! تیس نوں یہ بات مانی ہوگی۔“

”میں نے کب انکار کیا۔ تیری گل ضرور مانوں گا۔ اب تو تجھ سے یاری ہو گئی ہے۔“ احسان شاہ نے سرخوشی کے عالم میں کہا۔ ”پر ایک شرط پر واپس کروں گا۔“

”کیا شرط ہے؟ وہ بھی بتا دے۔“

”تو آج رات یہیں ٹھہرے گا۔ ویسے بھی رستہ خراب ہے۔ بارش کچھ میں اتنی رات گئے کیسے واپس جائے گا؟“

”شاہ جی! تیری یہی شرط ہے تو ٹھہر جاؤں گا۔“ رحیم داد ہنس کر بولا۔ وہ واپسی کے متعلق پہلے ہی تذبذب میں مبتلا تھا۔ احسان شاہ نے زور دیا تو وہ بلا جھجک ٹھہرنے پر راضی ہو گیا۔

”پر چوہدہری تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔“

”وہ بھی بتا دے۔“ رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

”شرط ورط کیا ہے، یوں سمجھ لے، یہ میری خوشی ہے۔ ریشمی آج تیرے کمرے میں رہے گی تاکہ تجھے بھی پتہ چل جائے، میں نے ۵ سال سے اسے اپنے پاس کیوں رکھ چھوڑا ہے۔“

”نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہو گا۔“ رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔

”تو جوان بندہ ہے۔“ احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر تیکھے لہجے میں کہا۔ ”جانے تو نے کیسی زمیں داری کی ہے۔ اللہ وسایا کی طرح تو بھی پہلے مزارع تو نہیں رہ چکا ہے؟“

رحیم داد سرا سید ہو گیا۔ اس نے جھٹ صفائی پیش کی۔ ”یسی گل نہیں۔ میں کتنا وڈا زمیں دار تھا، یہ تو میرا کلیم دیکھ کر تو اندازہ لگا سکتا ہے۔“ اس نے بات بتائی۔ ”گل امیر ہے جی! میرا پیو تھا تو وڈا زمیں دار پر بہت نیک بندہ تھا۔ اس نے میری ماں کے سوا زندگی بھر کسی دوسری زنانی کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔“

”پر تو اپنے پیو کے رستے پر چل کر ادھر زمیں داری نہیں چلا سکتا۔ مزارع تیرے بس میں نہیں آئیں گے۔ ان کو دبا کر رکھنے کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا۔“ احسان شان نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے اصرار کیا۔

”تجھے میری یہ گل تو مانی ہی پڑے گی۔ دیکھ، ضد نہ کر۔ میں نے تیری گل مانی ہے تو تجھے بھی میری گل مانی ہوگی۔“ وہ نشے سے جھوم کر ہنسا۔ ”اب یاری کی ہے تو اسے نباہنا بھی پڑے گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔“

”نام تو جی میرا سگراں ہے پر شاہ جی مجھے رسیلی کہتا ہے۔ اب سب اسی نام سے پکارتے ہیں۔“
 وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ ”تو نے مکے کا نام لیا تو اسے جانتا ہے؟“
 ”ہاں۔“ رحیم داد نے گردن ہلا کر اقرار کیا۔ ”یہ بتا، تجھے کبھی وہ یاد بھی آتا ہے؟“
 ”آتا تو ہے۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے جی۔“ رسیلی کا لہجہ بھجا بھجا تھا۔ ”بچ سال سے اوپر ہو گئے۔
 میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

”اگر شاہ جی تجھے واپس بھیج دے تو اس کے پاس چلی جائے گی؟“
 ”کیوں نہیں چلی جاؤں گی۔ وہ میرا گھر والا ہے۔“

”وہ تجھ سے دن رات محنت کرائے گا نہ کھانے کو ٹھیک طرح روٹی دے گا۔ نہ ایسے عمدہ کپڑے
 لے لے پسنے کو دے گا اور نہ تجھے ایسا آرام ملے گا جو یہاں حویلی میں مل رہا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا
 کر کہا۔ ”تو یہ سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس چلی جائے گی؟“

”یہ بھی کوئی زندگی ہے جی۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی، دبا دبا کرب تھا۔ ”کبھی شاہ جی کے
 ساتھ سوتی ہوں، کبھی اس کے پتروں کے ساتھ۔ تیرے ایسے مہمان ادھر آکر ٹھہرتے ہیں تو ان
 کے ساتھ بھی سونا پڑتا ہے۔“ اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”کئی تو ایسے مہمان آتے ہیں کہ
 پوری روشنی میں سارے کپڑے لے لے اترا دیتے ہیں۔ شراب کے نشے میں جانے کیسی گندی گندی
 حرکتیں کرتے ہیں۔ میں تجھے کیا کیا بتاؤں؟ کیسے بتاؤں مجھ پر کیا کیا بنتی ہے؟“ اس نے گہری سانس
 بھری، چہرہ غم زدہ ہو گیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ رحیم داد دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ ٹھیک سے نہ
 دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ رسیلی بھی خاموش رہی۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے بھگے
 ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے، لیمپ کی لو بار بار بھڑکتی، دونوں کے سائے دیوار پر لہرا لہرا کر گزرتے
 ہو جاتے۔ پھر رسیلی کی آواز خاموشی میں ابھری۔ ”مجھے جھونک آ رہی ہے، تو نہیں سوئے گا؟“ اس
 نے انگڑائی لی۔

”تو کم تو لیمپ بجا کر کپڑے اتار دوں۔“

اس نے یہ باتیں ایسی بے باکی اور دھڑلے سے کہیں کہ رحیم داد حیرت سے چونک پڑا۔ نظریں
 اٹھا کر رسیلی کو دیکھا، منہ بگاڑ کر کسی قدر حقارت سے گویا ہوا۔ ”تجھے اس طرح گل کرتے لاج بھی
 نہیں آتی؟“

”کیسی لاج، اور کیسی عزت۔“ اس نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”بچ سال سے اوپر

ہو گئے، اور توں مجھ میں لاج ڈھونڈتا ہے۔ وہ میرے پاس رہی کہاں۔ مزار عوں اور کیوں کی کڑیوں
 اور گھر والیوں کی عزت اور آبرو ہوتی ہی کب ہے؟ عزت ثبوت تو زمیں دارینوں کے پاس ہوتی
 ہے۔ وہ تو اپنے شریکوں کے سامنے بھی اڑھنی کا بیکل مار کر، منہ چھپا کے بیٹھتی ہیں۔ تانگے اور
 مون میں سوار ہو کر کہیں جاتی ہیں تو چاروں طرف چدر باندھ دی جاتی ہے۔“ اس کے چہرے پر دکھ
 کے سائے منڈلانے لگے۔ ”اپنا حال ایسہ ہے۔ دو برس ہوئے۔ اسی کمرے میں ایک وڈا افسر آکر
 ٹھہرا۔ اس نے ایک نہیں، دو لیمپ جلوائے اور سویرے تک ننگا نچوایا۔“
 ”وہ تجھ سے اتنا نراض کیوں ہو گیا تھا؟“

”میں نے جی اس سے صرف اتنی گل کی تھی کہ جب اس نے پوری روشنی میں میرے کپڑے
 اتراوئے چاہے تو میں نے انکار کر دیا۔ صاف صاف کہہ دیا، میں کبھی نہیں ہوں۔ فیر تو جی، وہ اتنا
 نراض ہوا کہ خود تو آرام سے بیٹھا شراب پیتا رہا، اور مجھے ننگا نچوایا رہا۔ تھک جاتی تو گالوں نکالتا۔
 کسے سے گلاس میں بھری ہوئی شراب اچھالتا۔ گر پڑتی تو اپنی چمڑے کی پٹی سے مار لگاتا۔ منہ میں
 پیشاب کرنے کی دھمکی دیتا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”تو نے منت سماجت نہیں کی؟“ رحیم داد نے کیرد کر پوچھا۔

”بہت کی جی۔ پر وہ تو جی نشے میں دھت ہو رہا تھا۔“ رسیلی نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اب
 تو یہ بات پرانی ہو گئی۔ اس کے بعد تو جو جیسا کہتا ہے، ویسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ مہمان نراض ہو جائے
 اور شاہ جی سے شکایت لگا دے تو وہ گندی گندی گالوں نکالتا ہے۔ زور زور سے ٹھڈے مارتا
 ہے۔“

”شاہ جی، جن دوسری زنانیوں کو اٹھوا کر یہاں لاتا ہے، وہ سب ایسا ہی کرتی ہیں؟“

”کرنا ہی پڑتا ہے جی۔ ایسا نہ کریں تو شاہ جی چمڑی ادھیڑ ڈالے۔“ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ
 پھیل گیا۔ ”روٹی لکڑی کر دیتا ہے۔ کئی کئی روز بھوکا رہتا ہے۔“

”میں بھی شاہ جی کا مہمان ہوں۔“ رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔ ”میرے بارے میں تو نے
 کیا سوچ رکھا ہے؟“

”میں نوں کیسہ پتہ تو کیسا بندہ ہے۔“ اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”جب تو نے مجھے اپنے کول
 بلوایا لیا تو میں نوں تیرے بارے میں کیسہ سوچتا۔“

”میں نے تجھے نہیں بلوایا۔ تو واپس چلی جا۔“

”کیسے جاسکتی ہوں۔ دروازے پر شیدے کی ڈیوٹی لگی ہے۔ اس نے شکایت لگادی تو شاہ جی

میرے گلے پڑ جائے گا۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ روٹی تو ٹھیک ٹھاک کھاتا ہے، کپڑے لے لے بھی بنا کر دیتا ہے پر ظلم بھی ایسے ہی کرتا ہے۔“

”ایسا کر رسیلی!“ رحیم داد نے کمرے میں پڑے ہوئے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو اس پر سوجا۔ میں نوں تجھ سے کچھ نہیں لیتا۔“

وہ حیرت زدہ ہو کر بولی۔ ”تو ج کہہ رہا ہے۔“ مگر فوراً ہی اس کا چہرہ مرجھا گیا۔ ”لگتا ہے، میں تجھے پسند نہیں آئی۔“

”ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ چند لمحے خاموش رہا، پھر اس نے کیرد کر پوچھا۔ ”یہ بتا، تیرے پیٹ میں تو بچہ تھا؟ یا کھایا ہی بتاتا تھا۔“

”تھا تو، پر حکیم جی نے پرانے چھپر کا پھوس اور گڑلا کر کھلایا۔ دوائی بھی دی۔ نخل گر گیا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ پر بہت تکلیف ہوئی جی۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے پوچھا۔ ”باکھا تجھے کہاں ملا تھا؟“

”وہ مجھے کئی بار مل چکا ہے۔ تیرے لیے بہت پریشان رہتا ہے۔“

”پریشان تو جی رہتا ہی ہو گا۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ”میں اس کے لیے کم پریشان رہتی ہوں۔ شروع شروع میں تو بہت یاد آتا تھا۔ چھپ چھپ کر روتی تھی۔ شاہ جی کو پتہ چل جاتا تو گالاس نکاتا روٹی بند کر دیتا۔ وہ تو جی رونے بھی نہیں دیتا۔“ وہ اپنی بات کتے کتے گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ رحیم داد نے پوچھا۔ ”کیا سوچنے لگی؟“

”ماکھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“ اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں منڈلانے لگیں۔ ”کیسا ہے وہ؟“

”لگتا ہے، تو اسے ابھی تک بہت یاد کرتی ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”پر اب تو اس کے لیے پریشان نہیں رہے گی۔ کل سویرے وہ یہاں آکر تجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

”نہیں جی! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ شاہ جی کے پاس بار بار آتا رہا، منت سماجت کی، پیروں پر سر رکھ دیا پر شاہ جی نہ مانا۔ اب وہ کیسے مان جائے گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”کوٹ کی جس زبانی سے اس کا جی بھر جاتا ہے، اسے بچا دیتا ہے۔ واپس بھی کر دیتا ہے پر اس کے لیے لی رکم مانگتا ہے۔ ماکھا مجھے واپس لینے کے لیے کہاں سے اتار دے گا؟ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“

”کل سویرے تجھے سمجھ آجائے گی۔“ رحیم داد نشتے سے جھوم کر بولا۔ رسیلی نے رحیم داد کو

سمری نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات صاف چغلی کھا رہے تھے کہ اسے رحیم داد کی بات پر یقین نہیں آیا۔ مگر اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد کسی قدر بیزاری سے بولا۔ ”اب میں نوں سونے دے اور خود بھی سوجا۔ کل تیرا ماکھا، تجھے آکر لے جائے گا۔“ وہ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

رسیلی خاموشی سے انھی اور قالین پر جا کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی، پھونک مار کر لیپ بچھادیا۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ باہر ابھی تک بارش ہو رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھ کر پھڑپھڑا رہی تھی۔ رحیم داد پر نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔

سویرے اس کی آنکھ کھلی تو کمرہ خالی تھا۔ رسیلی جا چکی تھی۔ بارش بھی بند ہو چکی تھی۔ کمرے کے باہر صبح کا اجالا پھیلا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد شیدا آگیا۔ کمرے سے متصل غسل خانہ تھا۔ شیدا نے رحیم داد کو غسل خانے میں پہنچا دیا۔

رحیم داد نہادھو کر غسل خانے سے نکلا تو برآمدے کے سامنے باغیچے میں ہلکی ہلکی دھوپ پھیلی تھی۔ درخت رات کی بارش سے ابھی تک بھگے ہوئے تھے۔ وہ شیدا کے ہم راہ کھانے کے کمرے میں چلا گیا۔ میز پر ناشتا لگایا جا چکا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد احسان شاہ بھی آگیا۔ وہ اس وقت بوسکی کا لبا کرتا اور سفید شلوار پہنے ہوئے تھا۔ کرتے میں سونے کے بٹن لگے تھے جن پر جڑے ہوئے پکھراج کے ٹکینے جھل مار رہے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”چودھری! آرام ٹال نیند آئی؟ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“ وہ کرسی کھسکا کر رحیم داد کے مقابل بیٹھ گیا۔ اس نے لسی کا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں، کھل کر مسکرایا۔ رحیم داد کی جانب ذرا سا جھکا۔

”رن کیسی تھی؟“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی! میں نوں اپنے پنڈ واپس جانا ہے۔ ادھر سب پریشان ہوں گے۔ کسی کو پتہ نہیں، میں رات تیری حویلی میں رہا۔“

”کسی کو پتہ نہ چلے تو ٹھیک ہی ہے۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”اور اللہ وسایا کو تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔“

”یہ تو میں بھی چاہتا ہوں، اسے پتہ نہ چلے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”میں نوں پتہ ہے، تیری اس کے ساتھ پرانی لگتی ہے۔ اسے معلوم ہو گیا تو برا منائے گا۔“

”اس بارے میں تو میں تجھ سے آگے آرام سے گل بات کروں گا۔ تجھے کئی باتیں بتانی ہیں۔ تو

ابھی کچھ نہیں جانتا۔“

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلا اور مطلب پر آگیا۔ ”شاہ جی! تو نے ماکھے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”سوچنا کیا ہے۔ تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروں گا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ویسے بھی اب تیری گل تو مانی ہی پڑے گی۔ یا راندہ جو ہو گیا۔ ساتھ بیٹھ کر پیٹنے کے بعد تو سمجھ لے، یاری کی ہو گئی، اس پر سر مل گئی۔ ایسی یاری دوستی کبھی نہیں ٹوٹتی، زندگی بھر چلتی ہے۔ ابھی نہیں، آگے تجھے اس کا ٹھیک سے اندازہ ہو جائے گا۔“

رحیم داد مسکرایا اور احسان شاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گرم خوشی سے بھینچ لیا۔ رحیم داد کا قیاس غلط نہیں نکلا۔ احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شیدا کو بلایا۔ اسے ہدایت کی کہ ماکھا کو اس کے گھر سے بلالائے۔ پھر وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چوہدری! تیں نوں اتنا بتا دوں کہ ماکھا، ریلی کا ناس مار دے گا۔ دو چار مہینے بعد ہی دیکھ لیتا، وہ کھا کھڑا اور مرل بن کر رہ جائے گی۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ”میں نوں تو یہ خوشی ہے، شاہ جی، تو نے میری بات مان لی۔“

احسان شاہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

دونوں ناشتے سے فارغ ہو کر برآمدے میں گئے اور اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سامنے لان پر ہلکی زرد دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ بھیگی ہوئی گھاس پر بارش کے قطرے جھل مار رہے تھے۔ آسمان بارش کے بعد گہرا نیلا نظر آ رہا تھا۔ بادلوں کے ہلکے پھلکے کتلے بلندی پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ ہوا دھیمی تھی۔ حویلی کی دیواریں ابھی تک گیلی تھیں۔ احسان شاہ خوش گوار موڈ میں تھا۔ چہرے پر تازگی اور ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

مگر جیسے ہی ماکھا سر جھکائے شیدا کے ہم راہ سامنے آیا، احسان شاہ کے چہرے سے تازگی اڑ گئی، تیوری پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں سے جھنجھلاہٹ جھلکنے لگی۔ ماکھا چند لمحے خاموش کھڑا رہا، پھر وہ جھکا اور تیزی سے آگے بڑھ کر احسان شاہ کے قدموں پر گر پڑا، پیر پکڑے اور زار و قطار رونے لگا۔

احسان شاہ اور برہم ہو گیا۔ اس نے غصے سے ماکھا کی کمر پر ٹھوکر لگائی۔ گرج کر بولا۔ ”سدا کھڑا ہو۔ زنانیوں کی طرح میرے سامنے ٹسوے نہ بہا۔“

احسان شاہ خاموش بیٹھا غصے سے پیچ و تاب کھاتا رہا۔ ماکھا اٹھ کر سیدھا ہو گیا تھا اور ایک

موشے میں ڈرا سہا نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا، تیکھے لہجے میں گویا ہوا۔

”شیدے! ریلی اور اس کے بچوں کو یہاں لے آ۔“

رحیم داد نے احسان شاہ کو اس طرح جلال کے عالم میں دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ چپ بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیدا کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی ریلی بھی آگئی۔ اس کے ہم راہ چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ ریلی کا لباس بدلا ہوا تھا۔ وہ نمادھو کر آئی تھی اور نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ مگر اس کے بچے اتنے ہی گندے تھے۔ لباس بھی ان کے جسم پر میلے اور بوسیدہ تھے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر ریلی کو دیکھا اور حاکمانہ انداز میں پوچھا۔ ”ماکھا تجھے لینے آیا ہے، تو اس کے ساتھ جائے گی؟“ ریلی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے گھرائی ہوئی خاموش کھڑی رہی۔ ماکھا ہونق کی طرح منہ اٹھائے اسے بے چینی سے دیکھتا رہا۔ رحیم داد بھی ریلی کی خاموشی پر حیرت زدہ تھا۔

احسان شاہ نے ریلی کی جانب ایک بار پھر دیکھا، اونچی آواز سے بولا۔ ”چپ کر کے کیوں کھڑی ہے؟ صاف صاف بتا، تو نے ماکھے کے ساتھ جانا ہے کہ نہیں۔ اپنی مرضی بتا، کیا چاہتی ہے؟“

”میری کیا مرضی ہے جی!“ ریلی نے سر اٹھائے بغیر رسان سے کہا۔ ”جو حکم کرے گا ویسا ہی کروں گی۔“

”میرے حکم کو چھوڑ، اپنی گل کر۔“

”چلی جاؤں گی جی اس کے ساتھ۔“ ریلی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا گھر والا ہے، دیاہ کر لایا ہے۔“

”لے سنبھال اپنا بازو اور اس کے چھوہرے، چھوہریاں۔“ احسان شاہ نے ماکھا سے کہا۔ پھر رحیم داد کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”چوہدری کی خاطر واپس دے رہا ہوں۔ اس کی گل تو میں نے مانی ہی تھی۔“

ماکھا ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگا۔ ”تیری مہربانی ہے شاہ جی۔“

احسان شاہ خاموش بیٹھا رہا۔ ماکھا نے چھوٹے بچے کو گود میں اٹھالیا، ریلی کا ہاتھ تھاما، احسان شاہ کی جانب خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے اجازت چاہی۔

”اسے لے جاؤں جی؟“

”لے جا۔ دفع ہو یہاں سے۔“ احسان شاہ نے بے زاری سے کہا۔

ماکھا آگے بڑھا، ریلی اس کے ساتھ چلی۔ بچے بھی اس کے ہم راہ تھے۔ وہ سب آہستہ آہستہ برآمدے سے نکل گئے۔

رحیم داد نے احسان شاہ کا شکریہ ادا کرنے کے انداز میں کہا۔ ”شاہ جی! تیری بہت بہت مہربانی۔ تو نے میری بات کی لاج رکھی۔“ اس کے لہجے سے خوشامد آشکارہ تھی۔

”چوہدری میں یاروں کا یار ہوں۔“ احسان شاہ نے مسکرائے کی کوشش کی۔ ”آگے بھی آزا لینا۔ احسان شاہ کو اپنی بات کا ہمیشہ دھنی پائے گا۔ ایک بار وعدہ کر لوں گا تو اسے ضرور پورا کروں گا۔“

رحیم داد نے کچھ دیر ٹھیر کر جانا چاہا تو احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ ”اب تجھ سے آئندہ بھی ملنا جانا رہنا چاہیے۔ تو اپنا پڑوسی زمیں دار ٹھیرا۔ آپس میں میل ملاپ بہت ضروری ہے۔ ایک دوسرے سے کام پڑنا ہی رہتا ہے۔“ وہ بے تکلفی سے ہنسا۔ ”دیکھ یہ آخری ملاکات نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں آتا جاتا رہے گا تو میرا بھی چنگا وکت کئے گا۔ تیرا دل بھی بھل جائے گا۔“

رحیم داد نے ایک بار پھر احسان شاہ کا شکریہ ادا کیا۔ احسان شاہ اسے رخصت کرنے حویلی کے پھانک تک آیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ پیٹھ تھپک کر بولا۔ ”تجھ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ اپنی گھوڑی پر سوار ہوا اور کوئلہ ہرکشن کی سمت روانہ ہو گیا۔

رات بھر کی بارش کے بعد پانی اور کچھڑے راستہ بہت خراب ہو گیا تھا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑا رہا تھا۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا تو پھر دن گزر چکا تھا۔ مہمان خانے کا ملازم ”احمد اس کے انتظار میں پریشان بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے جلدی سے پوچھا۔

”چوہدری! تو اب تک کہاں رہا؟ رات زبردست بارش ہوئی۔“

رحیم داد نے حیلے سے کام لیا۔ ”گھوڑی دوڑاتا نہر کے پار دور تک نکل گیا۔ واپسی پر بارش شروع ہو گئی۔ عالم پور نزدیک ہی تھا، ادھر چلا گیا۔ وہاں کے ایک زمیں دار سے اپنی جان پہچان ہے۔ بارش بہت تیز تھی۔ رات اسی کے پاس ٹھیر گیا۔“

”ہاں جی! اتنی زور کی برکھا میں واپسی کیسے ہو سکتی تھی؟“ احمد نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

”ناشتا لے آؤں تیرے لیے؟“

احمد چلا گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ دن ڈھلے تک پڑا سوتا رہا۔ بیدار ہوا تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور باغ میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہ شام تک تنہا بیٹھا رہا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ مہمان خانے میں واپس چلا گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ اللہ وسایا ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ اس کے بغیر رحیم داد کو شدید احساس تنہائی ہوا۔ گاؤں میں کسی اور سے اس کا میل جول نہیں تھا۔ نہ ہی کوئی ایسا تھا جس سے میل جول پیدا کیا جاتا۔ سارے ہی مزارعے اور کمی تھے۔ مگر تنہائی سے اکتانے کے باوجود نہ اس نے گھڑسواری کی نہ نہر کی جانب گیا۔ اسے خدشہ تھا کہ احسان شاہ سے دوبارہ مدد بھیڑنے ہو جائے اور وہ اصرار کر کے اپنے ہم راہ پیراں والہ نہ لے جائے۔ وہ اب احسان شاہ سے ملنا اور اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔



اس شام موسم بڑا سہانا تھا۔ دوپہر تک بارش ہوتی رہی۔ دن ڈھلے بادل چھٹ گئے، مطلع صاف ہو گیا۔ گردوغبار سے اٹے ہوئے درختوں اور پودوں کے پتے بارش سے دھل کر خوب صاف ستھرے ہو گئے تھے، ڈوبتے سورج کی تاریخی کرنوں میں دمک رہے تھے۔ ہوا سنساتی ہوئی چل رہی تھی۔ اس میں فرحت اور تازگی تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا کھری کھری خوش گوار فضا سے لطف اٹھا رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہ چلا کہ ماکھا کب اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ آہستہ سے کھنکارا تو رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ماکھا اپنے گندے دانت نکال کر مسکرائے لگا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو کب آیا اور کیسے آیا؟“

”بس جی آہی گیا۔“ اس کے لہجے میں خوشامد تھی۔ ”چوہدری! تو نے میرا بازو واپس دلا دیا، میں تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”ریلی ٹھیک ٹھاک ہے؟“

”کیوں نہیں ٹھیک ٹھاک ہوگی جی!“ ماکھا خوشی سے چمک کر بولا۔ ”اپنے گھر میں لوٹ آئی ہے۔ بہت خوش ہے۔ اپنا گھر جی اپنا ہی ہوتا ہے۔ وہ بھی تیرے پاس آنا چاہتی تھی پر میں اسے نہیں لایا۔ سوچا، پہلے تجھ سے پوچھ لوں۔“

”تو اسے نہیں لایا۔ یہ ٹھیک کیا۔ بلکہ تو بھی نہ آیا کر۔ تو احسان شاہ کا مزارع ہے۔ اللہ وسایا کو تیرا اس طرح بار بار آنا برا لگے گا۔ تیرا کام بن گیا۔ جامو جاں کر۔ اب یہاں نہ آنا۔“ اس نے ماکھا کو تنبیہ بھی کی۔ ”اور دیکھ، کسی کو پتہ نہ چلے، میں شاہ جی کی حویلی میں ٹھیرا تھا۔“

”طمینان رکھ، میں کسی سے ایسی گل نہیں کروں گا۔ پر میں آج تیرے پاس ایک ضروری کام سے آیا تھا۔“ اس نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ ”شاہ جی نے تجھے بلایا ہے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہے۔ کہا ہے، آج ہی شام آجا۔“

”نہیں جی! میں اب اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں صرف تیری خاطر گیا تھا۔ تیرا کام بن گیا، اس کے ساتھ ہی میرا آنا جانا بھی بند ہو گیا۔“

”پر وہ کوئی بہت ضروری گل کرنا چاہتا ہے۔“ ماکھانے چوکنٹا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”سن لینے میں کیا جاتا ہے۔ وہاں دیر تک نہ ٹھہرنا۔ نہیں جائے گا تو مجھ پر زرا ض ہو گا۔“

”تیں نوں پتہ ہے، وہ کیا کتنا چاہتا ہے؟“ رحیم داد کے لمبے میں پہلی سی بیڑاری اور بے رخی نہیں تھی۔

ماکھانے اس کے رویے میں چلک پائی تو مسکرا کر بولا۔ ”یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔ پر اتنا ضرور لگتا ہے، گل کچھ تیرے کام ہی کی ہوگی۔ شاہ جی کتنا بھی یہی تھا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ سر جھکا کر سوچنے لگا کہ احسان شاہ کون سی ایسی اہم بات کہنا چاہتا ہے جس کے لیے ماکھا کو بھیج کر اسے بلایا ہے۔ ماکھانے رحیم داد کو خاموش پایا تو قدرے عاجزی سے بولا۔ ”تو چلا جائے گا تو شاہ جی مجھ سے خوش ہو جائے گا۔ تیں نوں تو ذرا دیر گل بات کرنی ہے۔ جب جی چاہے، لوٹ آنا۔ ہو سکتا ہے، کوئی بہت کام ہی کی گل ہو۔“

رحیم داد نے احسان شاہ کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ماکھا سے کہا۔ ”تو جا، میں آج ہی شاہ جی کی حویلی پر پہنچ جاؤں گا۔ اسے بتا دیتا۔“

ماکھا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باغ سے چلا گیا۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ گھاس پر ٹھٹھکا رہا اور سوچتا رہا کہ احسان شاہ اس سے کیا کتنا چاہتا ہے؟ اس کے ذہن میں کرید پیدا ہوئی، جس نے دھیرے دھیرے تجسس پھر بے چینی کی کیفیت اختیار کر لی۔

رحیم داد نے گھوڑی اصطبل سے نکلوائی۔ اس پر سوار ہوا اور احسان شاہ کی حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا مگر شفق کی سرخی نے فضا کو لالہ رنگ بنادیا تھا۔ وہ گھوڑی دوڑاتا ہوا کوئلہ ہر کشن سے نکلا، نہر کی طرف بڑھا۔

شفق کی گہری سرخ روشنی میں اسے نہر کے کنارے ایک شخص نظر آیا جسے دیکھتے ہی وہ سراپد ہو گیا۔ وہ دارا تھا۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے اسے اچھی طرح پہچان لیا، ہاں وہ دارا ہی تھا۔

رحیم داد نے اڑنا لگا کر گھوڑی کی رفتار میں اضافہ کیا اور تیزی سے دارا کے قریب سے گزرتا ہوا آگے نکل گیا۔ اسے گمان گزرا کہ دارا نے اسے روکنے کے لیے ہاتھ بھی اٹھایا تھا۔ مگر رحیم داد نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی، پلٹ کر دیکھا بھی نہیں، گھوڑی سرپٹ دوڑاتا رہا۔ وہ پیراں والہ کی جانب بڑھ رہا تھا اور دارا خطرہ بن کر اس کے سر پر منزل لا رہا تھا۔ وہ رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ دارا، اس کی مقتول بہن بیگماں کے گاؤں ڈھولہ امیر خان سے ادھر کیوں آگیا؟ کیسے آگیا؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں منڈلاتے رہے اور وہ آگے بڑھتا گیا۔ دارا بہت پیچھے رہ گیا۔



احسان شاہ اپنی حویلی کے سبزہ زار پر تنہا بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد کئی خالی کرسیاں رکھی تھیں۔ میز پر اسکاچ کی بوتل، گلاس اور ٹھنڈے پانی سے بھرا ہوا جگ رکھا تھا۔ رات کھری کھری تھی، آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ قریب ہی برآمدہ تھا۔ اس میں لیپ روشن تھا۔ لیپ کی روشنی میں احسان شاہ کا چہرہ نشے سے تھکتا رہا تھا۔ وہ رک رک کر دھسکی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ اس کی نظریں بار بار برآمدے کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ بے چینی سے رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد برآمدے سے گزر کر لان میں پہنچا۔ احسان شاہ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری! بہت انتظار دکھایا۔ کہاں لگا دی اتنی دیر؟“ اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھاما اور اپنے برابر ہی ایک کرسی پر بیٹھایا۔

رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کے انداز میں کہا۔ ”میں تو ماکھے سے تیرا پیغام ملتے ہی چل کھڑا ہوا تھا، پر تیں نوں پتہ ہے، برسات کے دن ہیں۔ ہر طرف پانی اور کچڑ ہے، رستہ کچا ہے۔ یہاں بجپتے بجپتے رات ہو گئی۔ گھوڑی کو سنبھال سنبھال کر دوڑانا پڑا۔“

”ایسے موسم میں تو ان راستوں پر جیپ بہت کام دیتی ہے۔“

”وہ تو اپنے پاس ہے نہیں۔“

”اللہ وسایا نے تو تانگا بھی نہیں رکھا۔ وہ تو کسی طور زمیں داری ہی نہیں لگتا۔“ احسان شاہ نے اللہ وسایا کے خلاف اپنی کدورت کا اظہار کیا۔ ”بہن لال، تھا تو منیجر پر اس کے زمانے میں ایک چھوڑ دو تانگے ہوتے تھے اور ہر دیال تو بیشہ جیپ ہی میں کوئلہ ہر کشن آتا جاتا تھا۔ اس میں زمیں داروں کی شان تھی۔ تھا بھی وڈے زمیں دار کا پتر۔“

”میں نے تو جی، ایک بھی تانگا نہیں دیکھا۔“

”فسادات شروع ہوئے تو بنی لال بھاگ گیا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”کوچوانوں نے لوبٹ مار سے فائدہ اٹھایا۔ دونوں ہی تانگے لے کر نکل گئے۔“ احسان شاہ نے خالی گلاس میں بوتل سے اسکاچ وہسکی انڈلی پانی ڈالا اور پیسک بنا کر رحیم داد کی جانب بڑھا دیا۔ ”لے، پہلے تھوڑی سی لگالے۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔“

رحیم داد نے گلاس تولے لیا مگر دبی زبان سے بچنے کی کوشش بھی کی۔ ”شاہ جی! آج رہنے دے۔ میں نوں پنڈواپس بھی جانا ہے، زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ تو نے بلایا، میں چلا آیا۔“

”چوہدری! خاما خا کی بات نہ کر۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”بس اب شروع ہو جا۔ واپسی کی بعد میں دیکھی جائے گی۔“

احسان شاہ نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرا کر ہاتھ اونچا کیا، ہلکا تھنہ لگایا اور گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا، بھیگی ہوئی مونچھیں ہاتھ سے صاف کیں اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”شاہ جی! ایسی کون سی خاص گل تھی جس کے لیے تو نے مجھے بلوایا؟“

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”بس تجھ سے ذرا گپ شپ کرنے کو جی کرتا تھا۔ سوچا تو ادھر اکیلا ہے، آجائے گا تو تیرے ساتھ اپنا دل بھی بھل جائے گا۔“

”پر ماکھا تو کہتا تھا، کوئی خاص گل کرنی ہے، فوراً آنے کو کہا ہے۔“

”ماکھا ٹھیک ہی کہتا تھا۔“ احسان شاہ نے غماز آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”خاص گل شل کیا ہے۔ تجھ سے کچھ پوچھنا تھا۔ تیرے ہی مطلب کی گل ہے۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”ہاتھ کیوں روک لیا؟ سارا گلاس دیا ہی رکھا ہے۔ اسے آدھا تو کر۔ تجھے کچھ سرور ضرور ہو جائے تو گل کرنے میں مزا بھی آئے۔“

رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور ایک تہائی گلاس خالی کر دیا۔ اس نے منہ بگاڑا۔ احسان شاہ نے تنکوں کی پلیٹ سامنے کر دی۔ رحیم داد ایک تنکا اٹھا کر چبانے لگا۔ چٹ پٹا تھا۔ رحیم داد کے منہ کی کڑواہٹ کم ہو گئی۔ تھوڑا سا سرور بھی ہوا مگر وہ یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ احسان شاہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ تجسس کے ساتھ ساتھ خدشات اور دوسے بھی تھے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کو زیادہ دیر ذہنی خلفشار میں مبتلا نہیں رکھا۔ اس نے قدرے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو نے اپنی زمیں داری کا مختار تو اللہ وسایا کو بنا دیا، پر یہ بھی پتہ ہے کہ مختار نامے میں لکھا کیا تھا؟“

”یہ تو جی پتہ نہیں۔ میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ مختار نامہ انگریزی میں تھا۔“ رحیم داد نے سادگی سے کہا۔ ”دکیل نے جہاں جہاں بتایا، میں نے دستخط لگا دیے۔“ اس کے لمبے میں تجسس پیدا ہو گیا۔ ”پر یہ گل تو کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”لگتا ہے تو اپنی زمیں داری کے بارے میں لکھا پڑھی کے سارے کام نشی یا کاردار کے ذریعے کرتا رہا ہے۔ تجھے اس پر پورا پورا بھروسہ بھی ہو گا۔“ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا، بالکل یہی بات ہے۔“ رحیم داد نے احسان شاہ سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی لاعلمی کی پردہ پوشی کی۔

”تجھی تو نے آنکھ بند کر کے ایسی کچی دستاویز پر دستخط کروئے۔ مختار نامہ تو شامپ پیپر ہی پر ہو گا؟“

”ہاں جی، شامپ پیپر ہی پر تھا۔“ رحیم داد کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔ ”پر تو اس کے بارے میں کیا بتانا چاہتا ہے؟“

”یہ بتانا ہے، تو نے یہ غلط کام کیا۔ اس طرح دستخط نہیں کیے جاتے۔“

”وہ تو ہو گئے۔ اب اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”اللہ وسایا نے اگر مختار نامے کی بجائے بیج نامے پر تجھ سے دستخط کروا لیے تو؟“ احسان شاہ نے رحیم داد کے ذہن میں شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد نے تذبذب میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کا اظہار نہیں کیا۔ ”نہیں شاہ جی! میں نوں پتہ نہیں، اللہ وسایا میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔“

”یہ جائیداد اور ملکیت بہت ظالم ہوتی ہے۔“ احسان شاہ نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے کہا۔ ”بھائی کو بھائی کے خلاف، بیٹے کے خلاف پتر کو مدعی اور مدعا علیہ بنا کر عدالت تک پہنچا دیتی ہے۔ ایسی دشمنی ڈالتی ہے کہ خون ہو جاتے ہیں۔ تو نے بھی ایسے کتنے ہی جھگڑے دیکھے ہوں گے۔ اللہ وسایا سے تیرا رشتہ بھی نہیں۔ فیروہ ایسا کیوں نہیں کر سکتا؟“

”یہ تو ٹھیک ہے جائیداد اور زمین کی ملکیت پر سنگے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کدے بازی بھی ہوتی ہے۔ خون بھی ہو جاتے ہیں، پر میں نوں اتنا پتہ ہے، اللہ وسایا ایسا نہیں ہو سکتا۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”یہ بتا، ایسی گل تو نے اللہ وسایا کے بارے میں کیوں سوچی؟“

”ٹھیک ٹھیک سننا چاہتا ہے تو سن لے۔“ احسان شاہ کے لمبے میں گہری سنجیدگی تھی۔ ”میں

نولپتہ چلا ہے، اللہ وسایا نے تجھ سے بیچ نامے ہی پر دستخط کرائے ہیں۔ وہ زمیں اور حویلی کی ملکیت اپنے نام کرانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا فیخیر مہربان علی ایک کیس کی پیروی کے سلسلے میں کل شہر گیا تھا۔ وہیں صدر دفتر کے ایک محرر نے اسے یہ گل بتائی۔ اللہ وسایا بھی وہاں موجود تھا۔ اس کا وکیل کوشش کر رہا ہے کہ کام جھپتی نال پورا ہو جائے۔

”تیرے فیخیر نے غلط بتایا۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کی اطلاع درست تسلیم نہیں کی۔ ”اللہ وسایا تو کیمبل پور میں ہے اور میں نوں پتہ ہے، اس کا شہر میں رکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ وہ تو ابھی تک کیمبل پور ہی میں ہو گا۔ وہاں سے سیدھا اپنے پنڈ آئے گا۔“

”بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ احسان شاہ نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”اللہ وسایا نے یہی بتایا ہو گا۔ پر میرا فیخیر مجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ”یہ بتا، تو جسے مختار نامہ بتاتا ہے، اس کی تیرے پاس کوئی نکل شکل بھی ہے؟“

”تو جی میرے پاس نہیں ہے۔ نہ میں نے مانگی اور نہ وکیل نے مجھے دی۔ میں نے اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ برانہ منانا شاہ جی! تیری گل سمجھ نہیں آتی۔ اگر اللہ وسایا کے دل میں کھوت ہوتی تو وہ حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ کے بعد پنڈ کے سارے مزارعوں اور کیوں کو اکٹھا کر کے یہ بات سب کو صاف صاف نہ بتاتا۔ میں نوں پتہ نہیں، اس نے ایسا ہی کیا تھا۔“

”نرا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ احسان شاہ بھڑک اٹھا۔ ”چوہدری! میں نوں معلوم نہیں، تو کس سے بات کر رہا ہے۔ پہلے میں آنریری مجسٹریٹ ہوتا تھا۔ عدالت لگاتا تھا۔ مکدموں کے فیصلے سناتا تھا، پر میں نے خود ہی مجسٹریٹ چھوڑ دی۔ زمیں داری کے بکھیرے کیا تھوڑے تھے جو اس بکھیرے میں پڑا رہتا۔ بہت اصرار کیا پر میں راضی نہ ہوا۔ دوسرے اس کے لیے جانے کیسی کیسی کوشش کرتے ہیں۔ منتیں کرتے ہیں۔ سفارشیں پہنچاتے ہیں۔“ اس نے جھنجھلا کر منہ بگاڑا۔ ”میں نوں تیری جائیداد اور ملکیت سے کیا لیتا۔ میرے پاس کچھ کم مرتے ہیں۔“ رحیم داد اس کی برہمی سے سخت مرعوب ہوا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی! تو میری بات کا غلط مطلب سمجھا۔“

”تیرا مطلب کچھ ہی ہو۔ گل اصلی ایسہ ہے، میں یاری کرتا ہوں تو اسے نہا ہتا بھی ہوں۔ اب یہی دیکھ مجھے جیسے ہی مہربان علی سے معلوم ہوا، فوراً تجھے بلایا اور سب کچھ بتا دیا تاکہ تو ہوشیار ہو جائے آگے تیری مرضی۔“

”شاہ جی! یہ تیری مہربانی ہے۔“ رحیم داد کے لہجے سے خوشامد صاف جھٹک رہی تھی۔ احسان شاہ یہی سنتا بھی چاہتا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی خشونت مٹنے لگی۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ویسے یہ بتا دوں، مہربان علی پٹواری سے ملا تھا۔ اس نے رجسٹر خسرہ گرداوری دیکھا ہے۔ ابھی تک انتخابات تیرے ہی نام ہیں۔“ احسان شاہ نے وہ سکی کا بڑا گھونٹ بھرا، شید کو بلایا اور کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

کھانے سے فارغ ہو کر احسان شاہ نے رحیم داد کو روکنا چاہا مگر رحیم داد رضامند نہیں ہوا۔ اسے خدشہ تھا کہ صبح واپس گیا تو دارا پھر نہ مل جائے۔ رحیم داد نے جب سے دارا کو دیکھا تھا، سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ اس نے یہ سوچ کر خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ہو سکتا ہے، دارا اسے پہچان نہ سکا ہو۔ وہ منہ موڑ کر تیزی سے گھوڑا دوڑاتا اس کے پاس سے نکل گیا تھا۔ اب وہ دوبارہ ایسا خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ احسان شاہ کے اصرار کے باوجود نہیں ٹھہرا۔

جب وہ گھوڑی پر سوار ہو کر واپس ہوا تو آدھی سے زیادہ رات بیت چکی تھی۔ صاف شفاف آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا۔ ہر طرف اجلی اجلی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ رحیم داد نہر کے ساتھ ساتھ گھوڑی دوڑانے لگا۔ اور رفتار بتدریج تیز کر آگیا۔

وہ کوئلہ ہر کشن میں داخل ہوا تو رات ڈھل رہی تھی۔ مہمان خانے میں پہنچا تو احمد نے دروازہ کھول کر رحیم داد کو پہلی خبر یہ سنائی کہ اللہ وسایا سرشام ہی واپس آگیا۔

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ وہ شراب کے نشے میں چور تھا اور سیدھا احسان شاہ کے پاس سے آ رہا تھا۔ اس نے سوچا، اگر اس وقت اللہ وسایا کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس سے ملنے مہمان خانے میں آگیا تو بڑی مشکل ہو جائے گی، لہذا اس نے احمد سے بات چیت نہیں کی، جو کچھ اس نے کہا خاموشی سے سن لیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ شلواری اتار کر دھوٹی باندھی اور چپ چاپ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر اسے جلد نیند نہیں آئی۔ وہ دیر تک احسان شاہ کی بات پر غور کرتا رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ برابر یہ کوشش کرتا رہا کہ اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بدگمانی دل میں نہ آنے دے۔ مگر شبہات بار بار سر اٹھاتے اور دماغ میں کھلبلی مچا دیتے۔ اسی ذہنی انتشار میں وہ سو گیا۔

سویرے سویرے اللہ وسایا مہمان خانے میں آگیا۔ اس نے دروازے سے داخل ہوتے ہی پوچھا۔ ”چوہدری! رات کہاں رہا؟ میں تو تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد پہنچ گیا تھا۔ پتہ چلا تو

گھوڑی پر بیٹھ کر نہر کی طرف گیا ہے۔ میں دیر تک انتظار کرتا رہا۔“

رحیم داد اس سوال کے لیے خود کو پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولا۔ ”تو چلا گیا تو اکیلے میں جی بہت گھبرایا۔ تیس نوں پتہ ہے، اپنا میاں اور کوئی میل جول کا نہیں۔ کل شام گھوڑی پر بیٹھ کر دل بسلانے نہر کی طرف نکل گیا۔ رستے میں ایک پرانا جانے والا مل گیا۔ ضد کر کے اپنے گھر لے گیا۔ عالم پور کے نزدیک اس کا پنڈ ہے۔ ڈیڑھ سو کلا کے لگ بھگ زمیں واری ہے۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی ہے۔ رات کی روٹی بھی میں نے اس کے ساتھ کھائی۔ بعد میں گپ شپ لگی تو آدھی رات ہو گئی۔ وہ تو روکتا تھا پر میں نہ رکا۔“

”تو پہلے بھی تو ایک رات اسی کے ہاں ٹھیرا تھا۔“ اللہ وسایا نے کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی پرانا یا ر لگتا ہے۔ پر تو نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔“

رحیم داد نے یہ سننا تو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا کہ احمد نے اللہ وسایا کو اس کے بارے میں ایک ایک بات کی رپورٹ پہنچا دی ہے۔ اس نے اپنی جھنجھلاہٹ دبا کے جھٹ بات بنائی۔ ”مجھے تو پہلی بار پتہ چلا کہ وہ ادھر ہے، برسوں بعد ملا تھا۔ شکور نام ہے اس کا۔ پٹیلہ کا مہاجر ہے۔ جن دنوں میں خوشاب میں ہوتا تھا، وہ ساتھ ہی کے مکان میں رہتا تھا۔“ وہ اطمینان سے جھوٹ پر جھوٹ بولتا رہا۔ ”پچھلی بار تو اس لیے اس کے پاس ٹھیرنا پڑا کہ اچانک برکھا شروع ہو گئی، ساری رات ہوتی رہی۔ ایسے میں کیسے واپس آ سکتا تھا۔“

”تو نے ٹھیک کیا جو ادھر ہی ٹھیر گیا۔ بارش میں تو سارے ہی رستے خراب ہو جاتے ہیں۔ برسات کی اندھیری راتوں میں تو ان کچے رستوں پر ہر گز سفر نہیں کرنا چاہیے۔“

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”گھروالی اور بچے بھی تیرے ساتھ ہی واپس آ گئے یا ابھی کیمبل پوری میں ہیں؟“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”تو کچھ جلدی نہیں آگیا؟“

”ہاں جی، میں جلد ہی آگیا۔ کیمبل پور میں گرمی بہت تھی۔ ادھر اب تک بارش نہیں ہوئی۔ میں تو بہت گھبرا گیا تھا۔ پر جیلہ جلد آنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ تو جاتے ہی وہاں کی ریتاں رساں میں ایسی الجھی کہ اس سے ملنا ہی نہ ہوتا تھا۔ وہ تو وہاں کے بعد بھی وہاں کچھ روز ٹھیرنا چاہتی تھی۔ پر میں ضد کر کے اسے اور بچوں کو اپنے ساتھ ہی لے آیا۔“

”وہاں تو ٹھیک ٹھاک ہو گیا؟“

”ہاں جی، سب ٹھیک ٹھاک رہا۔“ اللہ وسایا نے جواب دیا۔ ”جیلہ نے سارے کام کاج ایسی شان سے کیے کہ شرفاں کے سرال والے خوش ہو گئے۔ اتنے خوش کہ چوہدری، میں تجھے کیا

بتاؤں۔ انھوں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی دھوم دھام سے وہاں ہوگا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ادھر جیلہ بھی بہت خوش تھی۔ جب ملی، ہنستی مسکراتی ملی۔ اسے تو مزا آرہا تھا۔ پر اپنا جی اکتا گیا۔ کچھ ضروری کام بھی کرنے تھے۔“

آخری جملہ سن کر رحیم داد چونکا۔ معا سے وہ بات یاد آگئی جو گزشتہ شب احسان شاہ نے اللہ وسایا کے بارے میں بتائی تھی۔ اس نے اللہ وسایا کو ٹولنے کی غرض سے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”تو برسوں شہر میں تھا؟ واپسی میں وہاں بھی ٹھیرا تھا؟“

اللہ وسایا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”ٹھیرا تو تھا پر تیس نوں کیسے پتہ چلا؟“

”شکور ہی نے بتایا تھا۔ وہ بھی اس روز شہر میں تھا۔“ رحیم داد نے بات نباہنے کی کوشش کی۔

”پر میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔“ اللہ وسایا بدستور حیرت زدہ تھا۔

”تو اسے نہیں جانتا پر وہ تو تجھے جانتا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا، اس کے لہجے سے خوشامد عیاں تھی۔ ”تو اتنا دڈا زمیں دار ہے، تجھے ادھر کا کون بندہ نہیں جانتا۔ زمیں دار تو سب ہی جانتے ہیں۔“ اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”وہ تجھ سے بہت ملنا چاہتا ہے۔ تو کہہ تو اسے کسی روز بلوالوں؟“

”ضرور بلوالے۔ تیرا پرانا ملنے والا ہے۔ بھلا ہی بندہ ہوگا۔“ اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔

”میں کسی روز اس کی طرف جاؤں گا اور اپنے ساتھ ہی لیتا آؤں گا۔ اس سے مل کر تو خوش ہوگا۔“

اللہ وسایا نے شکور کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بات کا رخ شرفاں کی شادی کی جانب موڑ دیا اور اس میں جیلہ کی سرگرمی اور انہماک مسکرا مسکرا کر بیان کرتا رہا۔ اس کے طرز اظہار سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ جیلہ نے اس کی پھوپھی زاد بہن کے بیاہ میں جوش و خروش کا جو مظاہرہ کیا تھا، وہ اس سے بہت خوش ہے۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا شرفاں کی شادی کے ہنگاموں کا ذکر کرتا رہا پھر کھڑا ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد رحیم داد فکر مند ہو گیا۔ سوچنے لگا، احسان شاہ نے گزشتہ شب جو کچھ بتایا تھا، وہ درست تھا؟ کیا اللہ وسایا نے وکیل کے ساتھ سازباز کر کے عتار نامے کے بجائے اس سے بیع نامے پر دستخط کرائے ہیں؟ کیا وہ حویلی اور زمیں دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟

والہی میں اس نے شہر میں ایک روز کیوں قیام کیا تھا؟ اور وکیل کے ہمراہ صدر دفتر کس لیے گیا تھا؟ یہ اور ایسے کتنے ہی سوالات اس کے ذہن میں ابھرتے رہے، ڈوبتے رہے، رحیم داد ٹھکے میں پڑ گیا اور تمام وقت اسی فکر میں غلطیاں و چپچاں رہا۔



برسات کی سانی شام تھی۔ گہرا نیلا آسمان آئینے کی مانند جھلک رہا تھا۔ بھیگی بھیگی ہوا میں سرسراہٹ تھی۔ درخت اور پودے جھوم رہے تھے۔ گھاس میں لہریں اٹھ رہی تھیں۔ باغ میں رحیم داد کے ساتھ اللہ وسایا بیٹھا تھا۔ جیلہ بھی موجود تھی۔ وہ نمدادھو کر آئی تھی۔ شگفتہ اور نکھری نکھری نظر آ رہی تھی۔ موسم کی مناسبت سے وہ دھانی کرتا اور اسی رنگ کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ البتہ چندری رنگ برنگی تھی مگر اس پر سبز دھاریں بہت نمایاں تھیں۔ ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی کے پس منظر میں اس کی خوبصورتی میں تابندگی تھی، نئی جوجھ تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو سینے میں دھواں سا اٹھتا محسوس کیا۔ وہ مبسوت ہو کر ایک ٹک اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

جیلہ کا ہر انداز صاف چغلی کھا رہا تھا کہ اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس ہے۔ رحیم داد کی ہنسی، ہنسی نظریں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ اس کے گلابی ہونٹ تازہ پھول کی پنکھڑیاں بن گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پوچھا۔

”چوہدری! کل رات تو کدھر رہا؟“

اللہ وسایا نے رحیم داد کے جواب دینے سے پہلے ہی ہنس کر کہا۔ ”جی لے! اصلی گل امیر ہے، اکیسے اس کا جی گھبراتا ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری! اب تو دیاہ کر لے۔ اس طرح کب تک گزارا ہوگا۔ اٹھ سال تو ہو گئے گھر والی اور بچوں کو ڈھونڈتے ہوئے۔ جانے وہ پاکستان پہنچے بھی کہ نہیں۔“

”ہاں جی، لاکھوں ہی خاندان اور پردار بکھر کے ایسے اجڑے کہ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں۔“ جیلہ بولی۔ اس کا دبا ہوا غم ابھرا اور سورج کی مانند دھکتے چہرے پر بادل کا ٹکڑا بن کر پھیل گیا۔ ”ہر ایک کو نئے سرے سے اپنا جیون شروع کرنا پڑا۔“

”کتنی تو ٹھیک ہی ہے۔“ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”پر اب تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سنہ دیکھ رہا ہوں۔“

”کب تک ایسے سنہ دیکھتا رہے گا۔“ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔ ”ابھی تو جوان ہے۔ تین نوں اب آگے کی فکر کرنی چاہیے۔“

”یہ کام تو تجھے ہی کرنا ہوگا اللہ وسایا۔“ جیلہ نے مشورہ دیا۔
”میں تو اس بارے میں اسی روز سے سوچ رہا ہوں، جب سے چوہدری کے نام حویلی اور زمین کی الاٹمنٹ ہوئی ہے۔“

”ہاں، اب تو اسے یہیں رہنا ہے۔ گھر بھی بسانا ہوگا۔“ جیلہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔
”چوہدری! تو برسوں ادھر ادھر بھٹکتا رہا، اب وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ سے آگیا ہے کہ تو آگے کے لیے سوچ۔“

”سچ پوچھ، میں نے تو اس بارے میں ابھی تک سوچا ہی نہیں۔“
”تو نے نہیں سوچا تو کیا ہوا، اللہ وسایا کو تو سوچنا چاہیے۔“ جیلہ نے اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں الجھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جیلہ نے اسے اس عالم میں پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ ”اللہ وسایا! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”چوہدری کے لیے رشتے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

”کوئی ہے رشتہ تیرے سامنے؟“ جیلہ نے دریافت کیا۔

”چوہدری کے لیے رشتے تو کئی تلاش کرنے پر مل سکتے ہیں۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”پر ایک رشتہ ٹھیک لگتا ہے۔ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“
”اللہ وسایا! تیری گل سن کر مجھے ڈر لگتا ہے۔“

اللہ وسایا حیرت سے رحیم داد کا منہ نکلنے لگا۔ ”ڈر کیوں لگتا ہے؟“

”تیری گل مجھے بھی سمجھ نہیں آئی۔“ جیلہ بھی حیرت زدہ نظر آ رہی تھی۔

”صاف صاف بتا، تو کتنا کیا چاہتا ہے؟“ اللہ وسایا نے پوچھا۔

”دیکھ، ابھی تو میرے اور تیرے درمیان بہت پیار ہے۔ تیرا گھر مجھے اپنا ہی گھر لگتا ہے۔ برسوں بعد مجھے ایسا لگا کہ میرا بھی کوئی ایسا ٹھکانا ہے جہاں میں آرام سے رہ سکتا ہوں۔“ رحیم داد ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ ”سوچتا ہوں، بعد میں شاید تیرے ساتھ یہ پیار محبت نہ رہے۔ پتہ نہیں، کیسی وہی، میری گھر والی بن کر آئے۔ ہمارے اتنے اچھے میل جول کا ناس مار دے۔ ایک دوسرے سے دور کر دے۔“ اس نے اللہ وسایا کو بغور دیکھا۔ ”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے۔“

”چنانچہ کہ چوہدری!“ جیلہ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”اپنا من اجلا ہے اور وڈا بھی ہے۔ ایسے ہی مل جل کر رہیں گے تو آگے بھی گزارا ہو جائے گا۔“ وہ کھل کر مسکرائی، مڑ کر اللہ وسایا کی جانب دیکھا۔ ”یہ تو بتا اللہ وسایا! تو نے چوہدری کے لیے کہاں رشتہ سوچا ہے؟ پہلے تو کبھی اس بارے میں

گل نہیں کی؟

”وہ ایسا ہوا جی لے! کیمبل پور سے واپسی میں تو زنانیوں کے ڈبے میں تھی۔ میرے ساتھ ملتان کا ایک زمیں دار، چوہدری اکرم، سفر کر رہا تھا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”وہ پشاور سے آ رہا تھا۔ ۶۰ برس سے اوپر ہو گا۔ نیک اور بھلا بندہ ہے۔ تحصیل کبیر والا کے احمد پور پنڈ میں اس کی زمیں داری ہے۔“

”جات برادری کے بارے میں کچھ اتا پتہ ہے۔“ جمیلہ نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔“ اللہ وسایا نے مسکرا کر بتایا۔ ”سے پہلے بار نہیں ملا، پرانی جان پہچان ہے۔ اپنے وکیل محمد عثمان رندھاوا نے ملوایا تھا۔ اکرم اس کا بھی موکل رہ چکا ہے۔ کئی بار اس سے وکیل کے دفتر میں ملنا ہوا۔ وہ بھی جاٹ ہے اور ساہو ہے۔ لگتا ہے اس کے وڈیرے اور بزرگ پہلے منگھری میں رہے ہوں گے۔ ملتان اور جھٹکی سے زیادہ وہ اپنی طرح پنجابی بولتا ہے۔ اسی سے میں نے اندازہ لگایا۔“

”ویسے تجھے پتہ نہیں، کبیر والا اور پوربی سیلی میں جھٹکی اور ملتان سے زیادہ پنجابی کا رواج ہے۔ پر ادھر جلال پور اور لودھراں میں ملتان ہی چلتی ہے۔ کوئی اسے جھٹکی کہتا ہے، کوئی اچی۔“ جمیلہ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو نے یہ بھی معلوم کیا، کڑی کی عمر کتنی ہے۔ بھائی بھین کتنے ہیں؟“

”نہ اس کا کوئی بھائی ہے نہ بھین۔ یوں سمجھ لے، اپنی شرفاں کی طرح ہے۔ فرک صرف اتنا ہے کہ اس کا بیٹا زندہ ہے۔“ اللہ وسایا نے جواب دیا۔ ”پر ایک گل ذرا سوچنے کی ہے۔“

”وہ بھی بتا دے۔ تو چبا چبا کر کیوں بول رہا ہے؟“ جمیلہ نے ہنس کر کہا۔

”گل صاف صاف اسے ہے کہ اس کا پہلے بھی ایک ویہ ہو چکا ہے پر کوئی بال بچہ نہیں۔ وہ جھے مینے بھی سرال میں نہیں رہی۔“ اللہ وسایا نے کسی قدر اکتے ہوئے بتایا۔ ”اس کا گھر والا ٹھیک بندہ نہیں تھا، مار بیٹ کرتا تھا، اوپر سے ایک کنجری سے بھی یاری لگا رکھی تھی۔ جب اس نے بت تک کیا تو اکرم نے کاغذ لکھوایا، دھی کو اپنے گھر لے آیا۔“

”ضرور تنگ کرتا ہو گا اس کا گھر والا۔“ رحیم داد بولا۔ ”ملتان میں زن کھلا مشہور ہے۔ مطلب

یہ کہ جیسے گھوڑی کے لیے گھاس ضروری ہے، ویسے ہی زال یا گھروالی کے لیے جتنی سے پٹائی۔“

”فضول باتیں نہ کر۔“ جمیلہ نے تڑپ کر تکیے لمبے میں اسے ٹوکا۔ ”پتہ نہیں تو نے کہاں سے یہ کماوت سن رکھی ہے۔ میری چھوٹی ماسی ملتان شہر میں رہتی تھی، وہاں کھتریوں کے وڈے وڈے کنبے

اور پروار آباد تھے۔ میرا موسا، رائے زادہ رام چند، کھنڈ گھرانے کا تھا۔ مشہور خاندان ہوتا تھا۔ رائے زادہ کو تو میں نے دیکھا نہیں، اس کا تو میرے پیدا ہونے سے پہلے وراثت ہو چکا تھا۔ وہ اپنے زمانے کا بہت مشہور رئیس تھا۔ آنریری مجسٹریٹ بھی تھا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تجھے تو میں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ میں موسیٰ کے گھر ملتان اکثر جاتی تھی۔ ہفتوں اس کے پاس رہتی۔ میرا موسا اتنا بھلا تھا کہ چوہدری، تجھ سے کیا بتاؤں۔ موسیٰ سے تو بہت ہی زیادہ پیار کرتا تھا۔ وہ تھی بھی بہت سندر۔“ جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب تو ملتان کے سارے ہی کھتری محلے اجڑ گئے۔ میری موسیٰ کا گھر بھی برباد ہو گیا۔ سنا ہے اب وہ بہمنی میں ہے۔ اس بات کو سننے ہوئے بھی ایک جگ بیت گیا۔ جانے زندہ ہے یا وہ بھی سورگ باشی ہو گئی۔“

جمیلہ کے دل کش چہرے پر دکھ کے سائے منزلانے لگے۔ رحیم داد نے اسے اس طرح افسردہ پایا تو صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔ زمیں دارنی! تو برا نہ منا۔ میں نے تو ملتانوں کے بارے میں صرف سنا ہی سنا ہے۔ اس ضلعے میں تھوڑے ہی دن رہا ہوں۔ وہاں کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔“

”ویسے جی ایسی باتیں اور کماوتیں ہر شہر اور ضلعے کے بارے میں مشہور ہیں۔“ اللہ وسایا نے بیوی کی جانب پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ”جی لے! میں تو یہ جانتا ہوں کہ چوہدری اکرم بہت بھلا مانس ہے۔ وہ چاہتا ہے اس کی زندگی ہی میں دھی کے لیے کوئی نیک ور مل جائی۔ ترین میں مجھ سے یہی گل کرتا تھا۔ بے چارہ بیمار بھی رہتا ہے۔ دھی کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ کہتا تھا مجھے تو یہ فکر کھائے جاتی ہے، میرے مرنے کے بعد اس کا کیا بنے گا۔ برادری اور کنبے والے بھلے بندے نہیں ہیں۔ زمیں داری پر کنبہ کرنے کے لیے بعد میں جانے کیا کریں۔“

”پر میں پہلے کڑی کو دیکھوں گی۔ اس کے بناں کیسے فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ خود کبیر والا جاؤں گی۔“ جمیلہ نے اپنا عندیہ بیان کیا۔

”تو ضرور کبیر والا چل۔ میں بھی چلوں گا۔ چوہدری بھی ساتھ ہو گا۔“ اللہ وسایا نے جمیلہ کی تائید کی۔

”مجھے لے جا کر کیا کرے گا۔ تو اور جمیلہ جو بھی طے کریں گے، مجھے منظور ہو گا۔“ رحیم داد نے کبیر والا جانے سے انکار کر دیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔“ جمیلہ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ”چوہدری! تجھے تو چلنا ہی پڑے گا۔ اکرم سے تیری ملاکات ہونی ضروری ہے تاکہ وہ بھی تجھ سے مل کر اپنا اطمینان کر لے۔ وہ

پہلے ہی چوٹ کھایا ہوا ہے۔ اس بار پوری طرح سوچ بچار کرنے کے بعد رشتہ طے کرے گا۔
 ”چوہدری! اگر رشتہ ٹھیک ٹھاک ہو تو میں تجھے یہی کہوں گا ضرور دیاہ کرے۔“ اللہ وسایا نے اصرار کیا۔

رحیم داد خاموش رہا لیکن جیلہ خاموش نہیں رہی، مسکرا کر بولی۔ ”پہلے کبیر والا چلنے کا پروگرام بنا۔ اس کے بعد کچھ طے ہو گا۔“ بول، کب کا ارادہ ہے؟“
 ”ابھی تو کبیر پور سے لوٹی ہے، ذرا دم تو لینے دے۔“

”کبیر پور کی بات دوسری تھی۔“ وہ ہچکچم کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”کبیر والا تو یہ رہا۔ منگھری سے خانوال کے لیے ٹرین پکڑیں گے اور خانوال سے کبیر والا دور ہی کتنا ہے۔ پکی سڑک جاتی ہے۔ ویسے تو یہاں سے بھی سڑک کے رستے جاسکتے ہیں۔ پر برکھامیں لاریوں کا سفر کٹھن ہوتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، میں پہلے بھی ایک بار کبیر والا جا چکی ہوں۔ پر اب تو اس بات کو برسوں ہو گئے۔“
 ”تو کہاں نہیں گئی۔“ اللہ وسایا نے ہنس کر کہا۔ ”یہ بتا، کب چلنا ہے؟“

”آج سوم وار ہے۔“ جیلہ چند لمبے سوچتی رہی۔ ”جمرات کی منج روانہ ہو جائیں گے۔ جمعے کو کبیر والا ٹھہریں گے۔ سہجڑ کی رات لوٹ آئیں گے۔ ٹھیک رہے گا پروگرام؟“
 ”مجھے نہ لے جا تو اچھا ہے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر کترانے کی کوشش کی۔

”ویاہ تجھے ہی کرنا ہے نا؟ تو نہیں جائے گا تو کیسے کام بنے گا۔ اکرم نے تجھے بھی دیکھنا ہو گا۔ تو موجود رہے گا تو جلد ہی رشتہ طے ہو جائے گا۔ بار بار چکر نہیں کاٹنا پڑے گا۔“ جیلہ کھل کھلا کر ہنسی۔ ”دوبارہ جائے گا تو وہی کو بد اکرا کے ساتھ ہی لائے گا۔“ رحیم داد نے کچھ کتا چاہا۔ جیلہ نے اسے روک دیا۔ ”اب تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔ مجھ پر دشاں رکھ۔ تیرے لیے چنگی ہی گھروالی لاؤں گی۔“ تجھے اس بارے میں چھتا کرنے کی ضرورت نہیں۔“

رحیم داد چپ رہا۔ جمرات کی رواجی طے ہو گئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر بھی رحیم داد کی شادی کے بارے میں بات چیت ہوتی رہی۔ اللہ وسایا سے زیادہ جیلہ نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔ وہ شادی کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔



جمرات کو تاروں کی چھاؤں میں اللہ وسایا، جیلہ اور رحیم داد کبیر والا کے لیے روانہ ہو گئے۔ جیلہ نے اس دفعہ دونوں بچوں کو ساتھ نہیں لیا۔ انہیں نوکرائیوں کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ اللہ وسایا

نے ایک روز پشتر اپنا ایک ملازم چوہدری اکرم کے گاؤں احمد پور بھیج دیا تھا تاکہ تینوں کی آمد سے اسے مطلع کر دے۔

رحیم داد سفر پر روانہ تو ہو گیا مگر کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔ وہ طرح طرح کے خدشات اور وسوسوں میں مبتلا تھا۔ پاک چن روڈ پر پہنچ کر وہ لاری میں سوار ہوا تو اور زیادہ سہما ہوا نظر آنے لگا۔ اللہ وسایا اور جیلہ نے بار بار ادھر ادھر کی باتیں چھیڑیں مگر وہ مختصر جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

منگھری اسٹیشن پہنچنے پر معلوم ہوا کہ گاڑی آنے میں دو گھنٹے کی دیر ہے۔ اللہ وسایا اور جیلہ کے ہم راہ رحیم داد بھی وینٹگ روم میں چلا گیا۔ وہ اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تھا کہ ایک انسپکٹر دو کانشیلوں کے ہم راہ داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ کچھ دیر سہما ہوا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باہر چلا گیا۔

وینٹگ روم سے نکل کر وہ پلیٹ فارم پر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بار بار خوف زدہ نظروں سے وینٹگ روم کی طرف دیکھتا جاتا۔ پولیس والے وینٹگ روم کے اندر ہی تھے۔ رحیم داد ٹپٹے ٹپٹے پلیٹ فارم کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ گرمی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ رحیم داد کو پیاس محسوس ہوئی۔ پانی پینے کے لیے وہ نلکے کی جانب چلا۔ سامنے سے ایک نوجوان عورت آتی نظر آئی۔ وہ سفید دھوئی باندھے ہوئے تھی۔ نیلی قمیص کے اوپر سیاہ دوپٹہ تھا۔ عورت نے رحیم داد کو بغور دیکھا اور ٹٹکی باندھے دیکھتی رہی۔

رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ شاداں تھی۔ اس کے سر پر گٹھری تھی۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی آن بان تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں بھللا رہی تھیں۔ جسم بدستور مضبوط اور کسا ہوا تھا لیکن اب وہ کسی قدر دلی ہو گئی تھی۔ چہرے کی رنگت بھی خاصی ماند پڑ گئی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو سرا سید ہو گیا۔ وہ عین اس کے سامنے تھی۔ رحیم داد نے چاہا کہ کترا کر قریب سے گزر جائے مگر وہ ٹٹکی اور اس طرح کھڑی ہو گئی کہ رحیم داد کو بھی قدموں کی رفتار روکنی پڑی۔

”گل سن۔“ شاداں نے اسے ٹوکا۔ ”لگتا ہے، میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے؟“

”پر میں نے تو تجھے کبھی نہیں دیکھا۔“ رحیم داد نے بے رخی سے کہا۔

”نرا نہ ہو۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں نوں سوچنے دے۔“

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ یہ سوچ کر گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی کہ اس نے لالی کے ہم راہ شاداں کے گھر میں ایک دن اور دو راتوں سے بھی کم وقت کے لیے پناہ لی تھی اور اس وقت اس کی وضع قطع بھی قطعی مختلف تھی۔ عالم یہ تھا کہ جسم پر جیل کی میلی کپیلی وردی تھی۔ حجامت بڑی

ہوئی تھی۔ وہ اس کے سامنے بھی کم ہی رہا تھا۔ بیشتر وقت اس نے کوٹھری میں زمین کھود کر بالے کی لاش دبانے میں گزارا تھا۔ بالے کو قتل کرنے کے باعث شاداں کے حواس بھی بجا نہیں تھے۔ ہنسی کی باتیں کرتی تھی۔ اب طویل مدت گزرنے کے بعد دوبارہ ملی تھی۔ اس عرصے میں رحیم داد بہت سی تبدیلیوں سے گزر چکا تھا۔ حلیہ اس قدر بدل چکا تھا کہ اسے شناخت کرنا آسان نہیں تھا۔

”لگتا ہے میرے بارے میں تیں نوں دھوکا ہوا۔“ رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے مسکرانے کی کوشش کی۔

”تو رحیم داد تو نہیں ہے؟“ شاداں اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”ہو بھی نہیں سکتا۔ اسے تو مرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے۔ پتہ نہیں اسے کس نے کتل کر دیا۔“ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔ ”تو اس کا بھائی تو نہیں ہے؟ دیکھنے میں ایسا ہی لگتا ہے۔“

”جانے تو کس کی گل کر رہی ہے۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر چہرے پر جھنجھلاہٹ طاری کی۔ مگر وہ اس کی جھنجھلاہٹ سے متاثر نہیں ہوئی۔ اپنی حسین آنکھوں کو گردش دیتے ہوئے بولی۔ ”میں کسی کو ایک بار دیکھ لوں تو بھولتی نہیں۔ سچ مان میں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔“

رحیم داد ایک بار پھر گھبرا گیا اور اپنی گھبراہٹ پر پردہ ڈالنے کے لیے بگڑ کر گویا ہوا۔ ”پر تو نے مجھے پہلے کب دیکھا؟“ اس نے آگے بڑھنے کے لیے قدم اٹھایا۔

شاداں نے اسے روکا، نرم لہجے میں بولی۔ ”نراض نہ ہو۔ آرام سے گل کر۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔ ”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، میں نوں دھوکا ہوا۔ یہ تو بتا دے، تیرا نام کیا ہے؟“

”چوہدری نور الہی۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔

”تب تو ٹھیک ہی سوچا تو نے۔ میں نوں دھوکا ہی ہوا۔“ شاداں نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”پر تو کچھ کچھ رحیم داد سے ملتا ہے۔ میں نوں ایسا ہی لگا تھا۔“

”کون تھا رحیم داد؟“ رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔ اس کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا، گھبراہٹ رفع ہو چکی تھی۔

”وہ لالی کا ساتھی تھا۔ دونوں جیل میں اکٹھے ہوتے تھے اور جیل سے بھاگے بھی اکٹھے تھے۔ لالی اسے اب تک یاد کرتا ہے۔“

رحیم داد کے ذہن میں لالی کے لیے کرید پیدا ہوئی۔ اس نے دریافت کیا۔ ”یہ لالی کون ہے؟ اور اب کہاں ہے؟“

”نیل میں ہے۔ پہلے منگری نیل میں ہوتا تھا، اب ملتان جیل بھیج دیا گیا ہے۔ میں اسی سے ملنے

ملتان جا رہی ہوں۔ کل ملاکت کا دن ہے۔“

”تیرا کون لگتا ہے؟“ رحیم داد نے چند را کر پوچھا۔

”یہ نہ پوچھ۔“ شاداں نے گہری سانس بھری۔ ”کچھ تو لگتا ہی ہے۔“ جیسی تو اسے ملنے جا رہی ہوں۔“ شاداں نے گٹھری اتار کر فرش پر رکھ دی۔ پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ اس کے لہجے سے تھکن کے ساتھ ساتھ افسردگی بھی جھلکنے لگی۔ ”ویسے اس کا میرے سوا کوئی بھی نہیں۔“

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ”تو اس کے لیے بہت دکھی معلوم ہوتی ہے۔“

شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر شاداں نے جھک کر گٹھری اٹھائی۔ ایک بار پھر سر پر رکھی اور چپ چاپ ایک طرف چل دی۔ رحیم داد جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ وہ شاداں کی جانب دیکھتا رہا۔ شاداں پہلے ہی کی طرح خوب صورت اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔ اس کے گھنے بالوں کی لمبی چوٹی کمر کے نیچے تک لٹک رہی تھی۔

رحیم داد کو لالی یاد آ گیا۔ اس کے ساتھ گزارے ہوئے دن رات یاد آ گئے۔ وہ عہد و بیان یاد آ گئے جو دونوں نے ایک دوسرے سے کیے تھے۔ یادوں کا ایک طویل سلسلہ تھا جو دور تک پھیلتا چلا گیا۔

ٹرین آگنی مگر وہ لاہور جا رہی تھی۔ رحیم داد نے دور سے دیکھا۔ انسپکٹر ویننگ روم سے نکلا۔ دونوں کانٹیل اس کا سامان اٹھائے عقب سے نمودار ہوئے۔ انسپکٹر اور کانٹیل ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین لاہور کے لیے روانہ ہو گئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ویننگ روم کی جانب بڑھا۔ اندر پہنچا۔ اللہ دسایا اور جیلہ اس کے لیے بے چین نظر آ رہے تھے۔ جیلہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”چوہدری! تو کدھر چلا گیا تھا؟“

”بیٹھے بیٹھے جی گھرایا تو پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا۔“ رحیم داد نے بات بتائی۔

”پر تو بالکل اچانک اٹھ کر چلا گیا، بتایا بھی نہیں کہاں جا رہا ہے؟“ جیلہ نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

رحیم داد کے بولنے سے پہلے اللہ دسایا بول پڑا۔ ”تو ہر بات پوچھتی ہے۔ اس نے بتا تو دیا، پلیٹ فارم پر ٹہلنے کے لیے نکل گیا تھا۔“ اللہ دسایا بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”تو کوئی تھانے دارنی لگی ہے کہ ہر کام تجھ سے پوچھ کر کرے۔ آگے بھی تو نے ایسا کیا تو اس کی گھر والی تجھ سے خار کھانے لگے

گی۔ یہ سوچ لے۔“

”لے تو نے مجھے ابھی سے دوش دینا شروع کر دیا۔“ وہ تھکے لیے میں بولی۔

رحیم دادو دونوں کی نوک جھونک پر چپ رہا۔ مسکراتا ہوا خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹرین آئی تو قلی نے سامان اٹھایا اور تینوں سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔ رحیم دادو نے کھڑکی سے جھک کر دیکھا۔ شاداں بھی تھرو ڈکلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ ذرا دیر میں ٹرین روانہ ہو گئی۔

خانوال کا اسٹیشن آیا تو اللہ وسایا اور جمیلہ کے ساتھ رحیم دادو بھی اتر گیا۔ اسٹیشن سے نکلے ہی انہیں کبیروالا جانے والی لاری مل گئی۔ وہ اس میں سوار ہو گئے۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ بھگی ہوئی سڑک پر لاری زیادہ تیز رفتار سے نہیں دوڑ رہی تھی۔ مگر جب تینوں کبیروالا کے اڈے پر پہنچے تو بارش رک چکی تھی۔ انھوں نے تانگا کرائے پر لیا اور اس میں بیٹھ کر احمد پور کی جانب روانہ ہو گئے۔

وہ احمد پور پہنچے تو جھٹ پٹا ہو چکا تھا۔ چوہدری اکرم اپنے دو منزلہ مکان کے باہر ان کا منتظر تھا۔ وہ اللہ وسایا اور رحیم دادو سے بڑی گرم جوشی سے ملا۔ جمیلہ تو گھر کے اندر چلی گئی، اللہ وسایا اور رحیم دادو کو چوہدری اکرم ڈیرے پر لے گیا۔ ڈیرا گھر کے ساتھ ہی تھا۔ اس میں دو کشاہدہ کمرے تھے۔ آگے کھلا صحن تھا۔ کمروں میں پلنگ بچھے تھے۔ ان پر صاف ستھرے بستر لگے تھے۔ بیٹھنے کے لیے کرسیاں اور موندھے تھے۔

دونوں کے ڈیرے میں پہنچنے ہی مالیشا آگیا۔ اس کے ہاتھ میں تیل کی شیشی دبی ہوئی تھی، وہ تیل کی مالش اور مساج کے ذریعے سفر کی تکان اتارنے کے لیے نہایت مستعد نظر آتا تھا۔ مگر اللہ وسایا اور رحیم دادو نے مالش کرانے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے نہادھو کر لباس تبدیل کیا اور صحن میں قرینے سے لگی ہوئی کرسیوں پر جا کر بیٹھ گئے۔ غسل کرنے سے اللہ وسایا اور رحیم دادو تروتازہ ہو گئے تھے۔ ذرا ہی دیر میں نوکر لسی لے کر آگیا۔ دونوں نے ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پی۔ بڑا سکون ملا۔

رات کے کھانے پر بات چیت شروع ہوئی۔ اللہ وسایا نے چوہدری اکرم سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ صرف ایک روز ٹھہرے گا اور ہفتے کے روز علی الصباح چلا جائے گا، جو کچھ ملے کرنا ہے، مجھے ہی کو ملے ہو جانا چاہیے۔ رحیم دادو کو چوہدری اکرم نیک اور بھلا مانس لگا۔ وہ کم گو اور حلیم الطبع تھا۔ مزاج میں نرمی اور رکھ رکھاؤ تھا۔

چوہدری اکرم نے مہمانوں کی خاطر مہارت میں سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ ہر طرح ان کی دل داری

کی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر شادی بیاہ کے بارے میں کھل کر گفتگو نہ ہوئی۔ چوہدری اکرم کے ساتھ رشتے کا ایک پچا زاد بھائی بھی تھا۔ وہ اکرم سے عمر میں بڑا تھا۔ اس نے کئی بار شادی کے سلسلے میں بات چیت کی مگر اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ جمیلہ سے مشورہ کئے بغیر اس مسئلے پر کوئی بات چیت کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رات گئے محفل برخاست ہوئی۔

سویرے سویرے جمیلہ ڈیرے پر آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم دادو کمرے میں ناشتا کر رہے تھے۔ چوہدری اکرم بھی موجود تھا مگر ناشتے میں شریک نہیں تھا۔ جمیلہ کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ اٹھ کر باہر چلا گیا۔

اللہ وسایا نے جمیلہ سے پوچھا۔ ”جی لے! کڑی دیکھی تو نے، کیسی ہے؟“

”سندر ہے اور سیدھی سادھی بھی ہے۔ عمر بھی چوی پنچھی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ چوہدری کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔“ جمیلہ مسکرا مسکرا کرتی رہی۔ ”دیکھنے میں تو ایسی شرمیلی اور کومل لگتی ہے، جیسے اس کا کبھی ویاہ ہی نہیں ہوا۔ پتہ نہیں، اس کے پہلے گھروالے نے ایسی بھولی بھالی کڑی کو کیوں تنگ کیا۔“ اس نے منہ بگاڑا۔ ”گل امیہ ہے، بعضے مرد ہوتے ہی خراب ہیں۔ انھیں اپنی گھر والیوں کو تنگ کرنے میں سوا دلتا ہے۔ لگتا ہے، اس کا گھر والا ایسا ہی خراب بندہ تھا۔“

”تیری باتوں سے لگتا ہے کڑی تجھے پسند آگئی۔ ویسے چوہدری اکرم کو تو میں بھی ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ نیک بندہ ہے۔“ اللہ وسایا نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا جی، آج اکرم سے بات چیت شروع کی جائے۔“

”تو نے ابھی تک اس بارے میں گل بات ہی نہیں چھیڑی؟“ جمیلہ نے حیرت سے پوچھا۔

”تجھ سے صلاح مشورہ کیے بناں کیسے شروع کرتا۔“ اللہ وسایا ہنس کر بولا۔

جمیلہ نے کہا۔ ”اکرم کا چچیرا بھی تو آیا ہے۔ لگتا ہے، اکرم نے اسے بات چیت ہی کے لیے بلایا ہے۔ اس کی گھر والی بھی آئی ہے۔ میری تو اس سے کھل کر گل بات ہوئی۔ اس نے اپنے چوہدری کے بارے میں کرید کرید کر ایک ایک بات پوچھی۔ میں نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ لگتا ہے، اس نے اکرم اور اپنے گھر والوں کو بھی یہ باتیں بتا دیں۔ ان دونوں سے میری زیادہ بات چیت نہیں ہوئی۔ شام کو وہ میرے پاس آئے تھے۔ اکرم تو چپ رہا پر اس کے چچیرے نے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے اسے بھی ہر بات صفائی سے بتادی۔“

”ان کے رویے سے تو نے کیا اندازہ لگایا؟“ اللہ وسایا نے دریافت کیا۔

”مجھے تو دونوں خوش اور مطمئن نظر آئے۔ اکرم کی بھر جانی تو بہت مطمئن لگتی ہے۔ سمجھ لے، وہ لوگ تو تیار ہیں۔“

”توفیر بات کچی کر لی جائے؟“ اللہ وسایا نے استفسار کیا۔

”ضرور کر لے۔ مجھے تو یہ رشتہ ہر طرح پسند ہے۔“ جیلہ نے اپنی رضامندی کا اظہار کیا۔ لمحے بھر خاموش رہی پھر اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور اس کی رائے معلوم کرنے کے لیے براہ راست سوال کیا۔ ”بول چوہدری، تجھے کیا کہنا ہے۔ تو اپنی مرضی بتا؟“

”میں نوں اپنی مرضی کیسہ بتانا؟“ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ ”میری مرضی تو وہی جان جو تیری اور اللہ وسایا کی ہے۔ تیں نوں پتہ ہے، میں نے اللہ وسایا کو بھائی کہا ہے، پگڑی بدلی ہے۔ وہ بھائی ہے۔ اور تو بھر جائی۔ تم دونوں جو بھی طے کرو گے، مجھے منظور ہو گا۔“

”تب تو آج ہی ساہا ہو جائے۔“ جیلہ خوشی سے چمک کر بولی۔ ”میرا من کہتا تھا، یہ رشتہ طے ہو جائے گا۔ اللہ وسایا! تجھے پتہ نہیں، میں نے تو مٹھائی اور میوے کا بھی ہندوستان کر لیا ہے۔ ادھر آنے سے پہلے نوکر کو ضروری سامان لانے خانیوال بھیج دیا ہے۔ دوپہر تک آجائے گا۔ شام کو سگائی کے لیے کوئی شہہ دن سوچ کر تاریخ طے کر لی جائے۔“

”ساری تیاری تو کر لی، اب میری اور چوہدری کی مرضی پوچھنے آئی ہے۔“ اللہ وسایا نے ہنس کر بیوی کی جانب دیکھا۔

”ایسے فیصلے زنانیاں ہی کرتی ہیں۔“ جیلہ بھی اللہ وسایا کے ساتھ ہنسنے لگی۔ ”بات کچی کرنے سے پہلے اکرم سے کہہ دیتا، ساہے کے لیے شریکے برادری کے کسی اور کو بلانا چاہے تو بلا لے۔ یہ بات تو اسے دوپہر کو روٹی کھاتے ہوئے بتا دیتا۔ یوں سمجھ لے، آج ویاہ کی تاریخ طے کر کے ہی جانا ہے۔“

جیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ کمرے سے باہر گئی تو کچھ ہی دیر بعد چوہدری اکرم آگیا۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ دوپہر ہو گئی۔ نوکروں نے کھانا چن دیا۔ کھانے پر اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ چوہدری اکرم اور اس کا چچا زاد بھائی بھی شریک ہو گئے۔ رحیم داد تو خاموش بیٹھا رہا مگر اللہ وسایا نے بات پھینچی اور چوہدری اکرم کو اپنی مرضی سے مطلع کر دیا۔ صاف صاف بتا دیا کہ اسے اور رحیم داد کو رشتہ منظور ہے۔ اگر وہ بھی اس کے لیے رضامند ہو تو شام کو ساہے کی رسم ادا کر لی جائے۔ دن تاریخ مقرر کر کے شادی کی تیاری شروع کر دی جائے۔ اکرم اور اس کے چچا زاد بھائی نے اللہ وسایا کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ان کی بات چیت سے صاف اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذہنی

طور پر پہلے سے تیار ہو کر آئے تھے۔

دن ڈھلے صحن میں خوب چمڑکاؤ ہوا۔ کرسیاں نکال کر ترتیب سے لگائی گئیں۔ لیپ کے بجائے پیڑو میکس روشن کیا گیا۔ جب سب کرسیوں اور چارپائیوں پر بیٹھ گئے تو شادی کی باقاعدہ بات چیت شروع ہوئی۔ یہ ساہا تھا۔ اس میں چوہدری اکرم کی طرف سے اس کا چچا زاد بھائی شریک ہوا۔ پردوس کے گاؤں کے ایک زمین دار کو بھی اکرم نے بلالیا تھا۔ وہ اکرم کا ہم عمری تھا۔ اس کے انداز میں معاملہ فہمی اور رکھ رکھاؤ تھا، بات چیت بھی سلیمانی ہوئی کرتا تھا۔

مفتگو کے دوران کسی بھی مرحلے پر الجھن یا تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ ہر بات خوش اسلوبی سے طے ہو گئی۔ چوہدری اکرم نے بات چیت کے آغاز ہی میں اپنی اس خواہش کا صاف گوئی سے اظہار کر دیا تھا کہ نکاح سادگی سے ہو گا اور رخصتی بھی خاموشی سے ہو گی۔ نہ کوئی دھوم دھڑکا ہو گا، نہ شادی کی دوسری رسمیں ہوں گی۔ براتیوں کی تعداد بھی مختصر ہو گی۔ بات معقول تھی لہذا اللہ وسایا نے مطلق حجت نہیں کی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دیہات میں، خاص طور پر جانوں میں بیوہ یا طلاقن کا عقد ثانی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ دھوم دھڑکا کرنے کی صورت میں خوشی کے بجائے ذات برادری والوں کے طعنے سننا پڑتے۔

بات چیت جاری تھی کہ اللہ وسایا اٹھ کر کمرے میں گیا۔ جیلہ کو وہاں بلایا۔ اس سے مشورہ کیا اور اس کی روشنی میں شادی کی تاریخ طے کی، جو ۲ اگست مقرر ہوئی۔ مہمانوں کی دودھ کے شربت سے تواضع کی گئی۔ جیلہ واپس زنان خانے میں جا چکی تھی۔ تاریخ مقرر ہونے کی اطلاع پہنچی تو اس نے اپنے نوکر کے ذریعے چوہدری اکرم کے پاس سگن کی مٹھائی کے ساتھ خشک میوہ بھیجا۔ ساہے کی خوشی میں ٹائی اور لاگیوں کو نقد انعام کے علاوہ ایک ایک لنگی بھی دی۔

رات کے کھانے میں چوہدری اکرم نے خاص اہتمام کیا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر مسکراتا۔ پلیٹیں اٹھا اٹھا کر رحیم داد اور اللہ وسایا کے سامنے رکھتا۔ کھانے پر اصرار کرتا، دل جو بٹی کرتا۔ شفقت اور محبت کا اظہار کرتا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد بھی وہ دیر تک دونوں کے پاس بیٹھا رہا۔

صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی اللہ وسایا اور رحیم داد تیار ہو گئے۔ جیلہ بھی تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہو گئی تھی اور اللہ وسایا اور رحیم داد کے ساتھ سفر کے لیے تیار تھی۔ گھر کے باہر دو تانگے موجود تھے۔ تینوں ان میں سوار ہوئے۔ نوکر بھی ہم راہ تھے۔ چوہدری اکرم ان کے ساتھ کبیرو والا تک آیا۔ اس نے اللہ وسایا اور رحیم داد کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔

”میرا مطلب ہے دونوں مل جل کر ہی زمیں داری چلائیں گے۔“ اللہ وسایا نے زیر لب مسکرا کر وضاحت کی۔



رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اللہ وسایا کی وضاحت کے باوجود اس کا شبہ رفع نہ ہوا۔ رات کو دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

دوسرے روز ایک اور واقعہ پیش آیا۔ رحیم داد زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ہوا یہ کہ اللہ وسایا اچانک اپنے وکیل کے ساتھ رحیم داد کے پاس آیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔ ”چوہدری تیرے کلیم کے کاغذات کہاں ہیں؟“ اس نے وکیل کی طرف اشارہ کیا۔ ”وکیل صاحب کو کاغذات دیکھنے ہیں۔“

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ملحقہ کوٹھری کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ اپنے ٹرک کا تالا کھولا۔ کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا اور کاغذات وکیل کے حوالے کر دیئے۔ وہ کچھ دیر تک پوری توجہ سے کاغذات الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”یہ کاغذات میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا، ان کی ضرورت پڑگئی ہے۔“

رحیم داد تو چپ رہا مگر اللہ وسایا بول پڑا۔ ”ضرورت ہے تو جی ضرور لے جاؤ۔“ وکیل نے کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”ایک درخواست بھی لگانی ہے۔“ اس نے انگریزی میں ٹائپ کی ہوئی ایک درخواست نکالی اور رحیم داد کے سامنے رکھی۔ ”چوہدری! اس جگہ اپنے دستخط لگا دے۔“ اس نے درخواست کے آخر میں ایک جگہ انگلی رکھ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد دستخط کرتے ہوئے جھجکا۔ ہمت کر کے پوچھا۔ ”وکیل صاحب! یہ درخواست کیوں لگانی ہے؟ میں نوں بھی تو کچھ پتہ چلتا چاہیے۔“

”یہ میں بعد میں آرام سے بتاؤں گا۔ اگر ابھی بتاؤں بھی تو تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔“ وکیل ہنس کر بولا۔ ”یہ قانونی نکات ہیں۔ یوں سمجھ لے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے اور جلد سے جلد لگانی ہے۔“

رحیم داد نے درخواست پر دستخط نہیں کئے۔ خاموش بیٹھا رہا۔ وکیل نے اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ اللہ وسایا اٹھ کر رحیم داد کے نزدیک گیا، اس کا شانہ تھپک کر نرم لہجے میں بولا۔ ”لگا دے دستخط۔ تیری جانب سے یہ درخواست لگانی بہت ضروری ہے۔ اس میں دیر

رات گئے تینوں واپس کو ملے ہر کشن پہنچ گئے۔ صبح ہوئی۔ دن گزرا۔ شام کو معمول کے مطابق باغ میں محفل جمی۔ جیلہ اور اللہ وسایا کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ چوہدری اکرم کی بیٹی سے رحیم داد کا رشتہ طے ہو جانے پر دونوں بہت خوش ہیں۔ جیلہ مسکرا مسکرا کر ساہے کی رسم کی ایک ایک تفصیل بیان کر رہی تھی۔ اکرم کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کی تعریف کر رہی تھی۔

رات کا کھانا انھوں نے ساتھ ہی کھایا۔ کھانے پر بھی شادی کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ رحیم داد کم بلکہ بہت کم بول رہا تھا۔ جیلہ نے اس کی جانب دیکھا اور ہنس کر بولی۔ ”تو ابھی سے وٹا بن گیا۔ شرما اور لجا تو اس طرح رہا ہے جیسے آج ہی تیری جنچ چڑھنے والی ہے۔“ وہ اللہ وسایا کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اللہ وسایا! تو دیکھ رہا ہے۔ چوہدری کیسے شرما شرما کر بول رہا ہے۔“ وہ لمبے بھر تک گردن جھکا کر سوچتی رہی۔ ”آج جولائی کی ۱۷ تاریخ ہے۔ یہ ۳۱ دن کا مہینہ ہے۔ ویاہ میں کل سو لاکھ دن رہ گئے ہیں۔“

”تیار ہی کون سی کرنی ہے۔“ اللہ وسایا بولا۔ ”جنچ شیخ تو دھوم دھام سے جانی نہیں۔ بس ایک رسم ادا کرنی ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”ویسے اپنا ویاہ تو بالکل ہی خاموشی سے ہوا تھا۔ پر بہت نیک گھڑی تھی۔ اب تو سب کچھ سنہ لگتا ہے۔“

جیلہ نے کچھ نہیں کہا، رحیم داد بھی چپ رہا مگر اللہ وسایا خاموش نہ رہا۔ اس نے ہلکا ہلکا لگایا۔ ”چلو جی، یہ بہت چنگا ہو گیا۔ چوہدری کا دل اکیلے میں بہت گھبراتا ہے۔ اب نہیں گھبرائے گا۔“ اس نے رحیم داد کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ ”اکرم کی پوری زمیں داری ورثے میں تیری ہونے والی گھروالی ہی کو ملے گی۔ وہ تو یہاں تک کہتا تھا ویاہ کے بعد ہی زمیں داری تیرے حوالے کر دے گا۔ اٹھ مرنے سے اوپر زمین ہے اور بہت زرخیز زمین ہے۔ پانی کی بھی کمی نہیں۔“

”تب تو اپنا چوہدری اور وڈا زمیں دار بن جائے گا۔“ جیلہ بولی۔

”اب تو اس کا ہر گز جی نہ گھبرائے گا۔ وڈی زمیں داری ہو اور بھلی گھروالی تو کس کا جی گھبرا سکتا ہے۔“ اللہ وسایا نے کہا۔ ”میں تو کہوں گا تو احمد پور کی زمیں داری سنبھال لیتا۔ ادھر کی دیکھ بھال تو میں کر ہی رہا ہوں۔ اس کی تو بالکل فکر نہ کر۔“

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ اسے فی الفور احسان شاہ کی باتیں یاد آ گئیں۔ اس کے ذہن میں شبہات اور دوسو سے کلہلانے لگے۔ مگر اس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ مسکرانے کی کوشش کی اور نرم لہجے میں گویا ہوا۔

”یہ زمیں داری بھی تیری اور وہ بھی تیری۔ میں تیرے لیے پرایا نہیں ہوں۔“

نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ آگے گڑبڑ پڑ سکتی ہے۔“ اس طرح اصرار کرنے پر رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب اور بے اطمینانی کے تاثرات تھے۔ اللہ وسایا نے مسکرا کر کہا۔

”چوہدری! تیں نوں مجھ پر بھروسا نہیں؟“

”ایسی گل نہ کر۔“ رحیم داد نے تکیے لہجے میں کہا اور درخواست پر دستخط کر دیئے۔

وکیل نے درخواست رحیم داد کے ہاتھ سے لے کر اپنے بریف کیس میں رکھی اور فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کمرے سے نکلا تو اللہ وسایا بھی اس کے ہم راہ تھا۔

دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اللہ وسایا کے رویے نے اس کے شبہات میں اضافہ کر دیا تھا۔ دن ڈھلے تک وہ اسی الجھن میں مبتلا رہا۔ اسی عالم میں اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور باغ کی جانب روانہ ہوا۔ مہمان خانے کے دروازے پر احمد مل گیا۔ احمد نے بتایا کہ اللہ وسایا بھی وکیل کے ساتھ شہر گیا ہے۔ رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔

اس نے دور سے دیکھا کہ جیلہ باغ میں بیٹھی ہے۔ قریب ہی اسکول ماسٹر بیٹھا تھا۔ جیلہ اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھی۔ رحیم داد باغ کی طرف نہیں گیا، اصلیل پہنچا۔ گھوڑی نکلوائی اس پر سوار ہوا اور جیلہ کو اطلاع دیئے بغیر گھوڑی دوڑاتا نہر کی طرف نکل گیا۔

احسان شاہ کا خاص ملازم شیدا حویلی کے پھانگ ہی پر رحیم داد کو مل گیا۔ اس کی زبانی رحیم داد کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ احسان شاہ حویلی میں موجود ہے۔ شیدا نے رحیم داد کی گھوڑی ایک ملازم کے سپرد کی اور رحیم داد کو دیوان خانے میں لے گیا۔ مگر باغ کی سمت نہیں گیا۔ دیوان خانے کے پچھواڑے کی باڑی میں پہنچا۔ اس نے جھپاک جھپاک کر سیاں نکال کر باہر رکھ دیں اور ایک طرف ادب سے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”شاہ جی، کتھے ہے؟“

”وہ تو جی باغ میں ہے۔ شہر سے کئی دؤے افسر آئے ہوئے ہیں، وہ ان کے ساتھ بیٹھا ہے۔ میں اسے تیرے آنے کی اطلاع کرتا ہوں۔ اتنی دیر تو آرام سے بیٹھ، تھکا ہوا بھی ہے۔ میں جھیتی ٹال والپس آتا ہوں۔“

رحیم داد خاموشی سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شیدا چلا گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ درختوں کی بلند شاخوں پر سنہری دھوپ دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ شام دھیرے دھیرے اپنے بازو پھیلا رہی تھی۔ باڑی میں دھندلا پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے باڑی پہلی بار دیکھی تھی۔ یہ درختوں سے گھرا ہوا ہر ابھر گوشہ تھا۔ وسط میں گھاس کا قطعہ تھا۔ پھولوں کی چند کیاریاں بھی تھیں۔ دائیں طرف نیم کے ایک گھنے درخت کے پہلو میں مختصر سی عمارت تھی جو ایک کمرے اور غسل خانے پر مشتمل تھی۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا، اس پر کچہریل کی خمیدہ چھت تھی۔ کمرے میں لیپ روشن تھا۔ کھلی کھڑکی سے لیپ کی روشنی باہر جھانک رہی تھی۔ باڑی ہر چند کہ حویلی کی چادواری کے اندر تھی مگر الگ تھلگ تھی۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ شام گرمی ہوتی گئی۔ خاموشی اور بڑھ گئی۔ احسان شاہ نہیں آیا۔ کچھ دیر بعد شیدا واپس آیا۔ اس نے رحیم داد کے آگے میز رکھی۔ اس پر وہسکی کی بوتل، پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس سلیقے سے رکھ دیئے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”شیدے! شاہ جی نہیں آیا؟“ اس کے لہجے سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

”شاہ جی نے کہا ہے، میں تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔ چوہدری سے کہنا، روٹی ساتھ ہی کھانی ہے۔ آرام سے گپ شپ ہوگی۔ ابھی میں سرکاری افسروں سے کچھ ضروری باتیں کر رہا ہوں۔“ شیدا نے احسان شاہ کا پیغام رحیم داد کو پہنچا کر وہسکی کا پیگ تیار کیا اور رحیم داد کے سامنے رکھ کر بولا۔ ”تو شروع کر، شاہ جی ادھر بیٹھا لگا رہا ہے۔ بجتیتی تیرے پاس آئے گا۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ شیدا چلا گیا۔ گلاس سامنے رکھا رہا۔ اس میں وہسکی کا رنگ جھلکتا رہا مگر رحیم داد نے گلاس کو ہاتھ نہیں لگایا۔ چپ بیٹھا احسان شاہ کا انتظار کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ باڑی پر پراسرار سکوت طاری تھا۔ آس پاس نہ کوئی آواز تھی نہ آہٹ۔ رحیم داد بالکل تنہا تھا۔ رات باڑی میں اتر کا کالی پڑتی جاری تھی۔ کھڑکی سے جھانکتی ہوئی لیمپ کی روشنی زرد دھبائیں کر رہ گئی تھی۔

لگ بھگ گھنٹے بھر بعد احسان شاہ آیا اور معذرت کے انداز میں بولا۔ ”معاف کرنا چوہدری، مجھے دیر ہو گئی، پر تو آج اچانک کیسے آگیا؟“ وہ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے رحیم داد کے سامنے رکھا ہوا گلاس دیکھا۔ ”اوئے! یہ گلاس ایسے ہی پڑا ہے۔ لگتا ہے تو نے ایک گھونٹ بھی نہیں لیا۔“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”نہیں شاہ جی! میں نے آج نہیں پینی۔“ رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”واپسی میں جیل مل گئی تو گریڈ ہو جائے گی۔ میں اس کے یا اللہ وسایا کے سامنے پی کر جانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ صرف تیرے ساتھ روٹی ٹکڑ کھا لوں گا۔“

احسان شاہ نے اصرار کیا۔ مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا۔ احسان شاہ نے زچ ہو کر کہا۔ ”جیسی تیری مرضی۔“ اس نے گلاس اٹھایا، بڑا گھونٹ بھرا۔ چڑھی ہوئی آنکھیں اور تھمتاتا ہوا چہرہ صاف ظاہر کر رہا تھا کہ وہ پہلے ہی خوب چڑھا چکا ہے۔

”یہ بتا، ادھر کیسے آتا ہوا؟“

”مجھ سے کچھ ضروری گل کرنی تھی۔“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

”کوئی خاص گل ہے؟“

”خاص ہی گل سمجھ لے۔ آج دوپہر اللہ وسایا اپنے وکیل کے ساتھ میرے پاس آیا اور مجھ سے ایک درخواست پر دستخط لگوا لیے۔“

”کیسی درخواست تھی؟“ احسان شاہ نے پوچھا۔

”انگریزی میں تھی۔ میں نوں پتہ ہے میں نوں انگریزی نہیں آتی۔ میں نے اس کے بارے میں وکیل سے پوچھا بھی، پر اس نے کہا یہ کنون کی باتیں ہیں، تیری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ میں بعد میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔ ابھی تو جلدی میں ہوں۔ درخواست فوراً لگانی ہے۔“

”حد کردی تو نے۔“ احسان شاہ نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”جب اس نے درخواست کی نوعیت اور اس کا سبب ہی نہ بتایا تو آنکھ بند کر کے تو نے اس پر دستخط کیوں کر دیئے؟“

”کیا کرتا جی!“ رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ ”اللہ وسایا میرے گلے پڑ گیا۔ بار بار دستخط کرنے کو کہا۔ پہلے تو میں چپ کر کے بیٹھا رہا۔ جب وہ ضد کرنے لگا تو دستخط لگانے ہی پڑے۔ میں اسے نراض بھی تو نہیں کر سکتا۔“

”تو نے بت برا کیا۔“ احسان شاہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ ”لگتا ہے، اللہ وسایا نے اپنا کام پکا کر لیا۔ میں نے پہلے ہی خبردار کیا تھا۔ پر تو نے میری بات پر بھروسہ نہیں کیا۔“ اس کے لہجے میں تلخی کا اضافہ ہو گیا۔ ”کبھی یہ بھی سوچا اس نے دو تین ہزار روپے خرچ کر کے حویلی اور زرعی اراضی تیرے نام کیوں الاٹ کر دی؟ تو اس کا کون سا سا لگتا ہے۔ آخر اس نے الاٹمنٹ کے لیے اتنا پیسہ کیوں خرچ کیا؟ کیوں اتنی بھاگ دوڑ کی؟ تو ہی بتا، اس نے ایسا کیوں کیا؟ کوئی تو بات ہوگی، کچھ تو اسے فائدہ ہو گا۔ اتنا تو کوئی اپنے بھائی کے لیے بھی نہیں کرتا۔ تو اس کا کچھ بھی تو نہیں لگتا۔ پرانی یاری بھی نہیں۔ اپنی سمجھ میں تو یہ چکر آتا نہیں۔ اس میں ضرور کچھ ہیر پھیر ہے۔“

”شاہ جی! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اپنا مغز بھی کام نہیں کرتا۔“ رحیم داد نے تجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وکیل نے درخواست پر دستخط کرانے کے ساتھ میرے کلیم کے سارے کاغذات بھی اپنے پاس رکھ لیے ہیں۔“

”کیا کہا! کلیم کے کاغذات بھی اس نے اپنے کنبے میں کر لیے؟“ احسان شاہ نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اس نے تجھے بالکل ہی ختم کر دیا۔ تو اندھے اعتماد میں مارا گیا۔ اب تو تیرے پاس دستاویزی ثبوت بھی نہیں رہا۔ مختار نامہ اسے پہلے ہی دے چکا ہے۔ اس نے اپنی مرضی کی درخواست پر تجھ سے دستخط بھی لگوا لیے۔ پہلے جو کمی رہ گئی تھی، اب پوری کر لی۔ اب تو وہ جو جی جاسے کر سکتا ہے۔ جب مرضی ہوگی، تجھے بے دخل کر دے گا۔ اب تو اسے صرف پٹاری کے رجسٹر

ملکیت میں اپنے نام کا اندراج کرانے کے بعد تحصیل دار کے پاس جاتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں یہ کام بھی ہو سکتا ہے۔ ”اس نے دہسکی کی چسکی لگائی۔ ”اب تو وہ ساری جائیداد پر اپنا ہی کبندہ رکھے گا۔ ویسے بھی اس کے کسے میں ہے۔ لگتا ہے وہ اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے جلد ہی شہر جائے گا۔“

”وہ تو آج ہی وکیل کے ساتھ شہر چلا گیا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا، وہ اپنی کارروائی مکمل کر کے جلد سے جلد تیرا پتا کاٹ دینا چاہتا ہے۔“

رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

”کس سوچ میں پڑ گیا چوہدری؟“ احسان شاہ نے رحیم داد کو خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔

”شاہ جی! آج پوچھ تو مجھے۔ لیکن نہیں آتا اللہ وسایا میرے خلاف ایسا بھی کر سکتا ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔“ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھ نہیں آتی، وہ ایسا کیسے کر سکتا ہے؟ تجھے پتہ نہیں، پچھلے دنوں وہ مجھے کبیر والا کے ایک زمیں دار کے گھر لے گیا۔ جیلہ بھی ساتھ تھی۔ دونوں اس کی دھمی سے میرا ویاہ کرانا چاہتے ہیں۔ اب تجھ سے کیا چھپانا۔ ویاہ کے لیے اگلے مہینے کی ۲ تاریخ طے بھی ہو چکی ہے۔“ رحیم داد نے نظر بھر کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ ”ان کے دل میں اگر میرے خلاف کوئی بدی ہوتی تو وہ ایسا کیوں کرتے؟ مجھے بے دخل ہی کرنا ہوتا تو اللہ وسایا اور جیلہ میرا گھر بسانے کی کوشش کیوں کرتے؟“

”یہ کب کی گل ہے؟“ احسان شاہ کے لہجے میں تحیر تھا۔

”پچھلے جمعے کی۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”زمیں دار کا نام چوہدری اکرم ہے۔ تحصیل کبیر والا کے پنڈت احمد پور میں اس کی زمیں داری ہے۔ انھ مرنے سے اوپر زمین ہے۔ پکی ماڑی ہے اور جس کڑی کے ساتھ وہ میرا ویاہ کرنا چاہتا ہے، اس کے سوا اس کا کوئی نہیں۔ وہی اس کی ساری جائیداد کی وارث ہے۔ بلکہ اللہ وسایا تو یہ بھی کہتا تھا کہ اکرم ویاہ کے بعد اپنی ساری زمیں داری میرے سپرد کر دے گا۔“

”مجھے تو یہ بھی کوئی اونچا چکر لگتا ہے۔“ احسان شاہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”اپنی سمجھ میں تو یہ گل آتی نہیں۔ جس کی اکلوتی اولاد صرف ایک دھمی ہو اور اچھی خاصی زمیں داری بھی ہو، کیا اسے اپنی جات برادری میں رشتہ نہیں مل سکتا تھا جو وہ تجھے اپنا جنوائی بنانے پر اتنی جلدی تیار ہو گیا؟“

”پر ایک گل اور بھی ہے۔ اس کی دھمی کا پہلے بھی ویاہ ہو چکا ہے۔ جنوائی چنگا بندہ نہیں تھا۔ اس

لے اکرم کاغذ لکھوا کر دھمی کو اپنے گھر لے آیا۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”اکرم بوڑھا ہے اور بیمار بھی رہتا ہے۔ چاہتا ہے اپنی زندگی میں دھمی کا ویاہ کر دے تاکہ اس کے بعد وہ بے سارا نہ رہ جائے۔ شریکے اور برادری والے جائیداد پر کبندہ کرنے کے لیے اسے تنگ نہ کریں۔“

”چوہدری، مجھے تو یہ شادی ویاہ سب ڈھونگ لگتا ہے۔ پتہ نہیں، اکرم کون ہے، کیسا بندہ ہے؟“ سید احسان علی نے نشے کی جھونک میں قہقہہ بلند کیا۔ ”چوہدری تو ٹھہرا مہاجر۔ تو ان لمٹانیوں کو نہیں جانتا۔ ان کے لیے تو مشہور ہے کہ صورت ملاں کی اور آنکھیں چور کی۔ پورے پنجاب میں، لمٹانی زمینداروں سے ہزار رسہ گیر نہیں ملے گا۔ جتنا ڈوا زمیں دار ہو گا، اتنا ہی ڈوا رسہ گیر ہو گا۔ ویسے نام کو کوئی سید ہے۔ کوئی کرشی، کوئی گردیزی ہے۔ کوئی گیلانی ہے۔ کوئی نواب اور کوئی مخدوم ہے۔“ اس نے دہسکی کی چسکی لگائی۔ ”وہ کوئی بھی ہو پر رسہ گیری کو جرم اور برائی نہیں سمجھتا۔ رسہ گیری تو ان کے لیے دل بھلانے کا مشغلہ اور تفریح ہے۔“

”پر چوہدری اکرم ایسا نہیں ہے۔ دیکھنے میں نیک بندہ لگتا ہے۔“

”کسی کی صورت پر تو اندر کا حال لکھا نہیں ہوتا۔“ احسان شاہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”چوہدری تجھے لمٹانی زمیں داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ پنجاب گز۔ شہر میں تو ان کا ذکر کرتے ہوئے یہاں تک بتایا گیا ہے کہ وہ رسہ گیری کو بالکل چوری چکاری نہیں سمجھتے۔ زور آور اور کامیاب نمبر دار وہی سمجھا جاتا ہے جو دن میں حکومت کرے اور رات کو چوری اور رسہ گیری۔ ان کے بارے میں تو جانے کتنی کماتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں چاچا چور، بھتیجا کاغذی۔ ملاں چور موزن گواہ۔ کہاں تک تجھے بتاؤں۔“ اس نے دہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس خالی کر دیا۔ ”نوجوان زنانیوں اور میاروں کو انھوا لینا اور ان کی عزت لوٹنا لمٹانی زمیں داروں میں بالکل عام بات ہے۔ چاہے وہ نواب زادہ ہو یا گدی نشین۔“

رحیم داد نے حیرت سے احسان شاہ کو دیکھا۔ وہ نشے میں بالکل بھول گیا تھا کہ جتنی بھی برائیاں نفرت سے منہ بگاڑ بگاڑ کر وہ لمٹانی زمیں داروں کی گوارا رہا ہے، وہی حرکتیں اور وہی جرائم وہ خود کرتا ہے اور نہایت دھڑلے سے کرتا ہے۔ زمیں داری چلانے کے لیے انھیں ناگزیر قرار دیتا ہے۔

مگر احسان شاہ اس کے احساسات سے بے نیاز رہتا رہا۔ ”تو کس چکر میں پڑ گیا۔ ہر گز ہر گز ادھر ویاہ نہ کرنا۔ بعد میں بہت پچھتائے گا۔ ویسے مجھے تو یہ ویاہ شیاہ ہوتا نظر نہیں آتا۔ اللہ وسایا اس بھانے تجھ سے پیار جتنا چاہتا ہے، پر اس کے ارادے کچھ اور ہی ہیں۔ یوں سمجھ لے، وہ ایک ہاتھ سے حویلی اور زمین تجھے دے کر دوسرے ہاتھ سے چھین لینا چاہتا ہے۔ میرا کام تجھے خبردار کرنا ہے،

آگے تیری مرضی۔“

رحیم داد کو فوراً یاد آگیا، اللہ وسایا نے باتوں باتوں میں یہ بھی کہا تھا کہ چوہدری تو احمد پور کی زمین داری سنبھال لیتا، ادھر کی دیکھ بھال میں کبھی رہا ہوں۔ رحیم داد ایک بار پھر ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”شاہ جی! یہ بتا، اب میں نوں کبیرہ کرنا ہے؟ میں تیرے کول اسی لیے آیا تھا۔“ اس کے لہجے سے بے چارگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

”تو نے تو خود اپنے ہاتھ کٹوا لیے۔“ احسان شاہ نے تنکھے لہجے میں کہا۔ ”اللہ وسایا نے تجھ سے سب کچھ تولے لیا۔ اب میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

”میں اللہ وسایا کو ایسا نہیں سمجھتا تھا۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پر یہ تو جانتا ہی ہے کہ اللہ وسایا صرف مزارع ہی نہیں رہا، کوم کا جانگلی بھی ہے اور وہ جانگلی ہی کیا جو چوری، ڈکیتی اور لوٹ مار نہ کرے۔ جانگلی تو ماں کے پیٹ ہی سے جراثیم پیشہ پیدا ہوتا ہے۔“ احسان شاہ کے چہرے سے سخت برہمی جھلکنے لگی۔ ”مجھے اس سے اتنی سخت نفرت ہی اس لیے ہے کہ ایک جانگلی میرے ضلع، بلکہ میری ہی تحصیل میں زمین دار بننا بیٹھا ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا ہے، اونچے طرے کی پگ لگا کر نکلتا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، اس کی یہ آن بان دیکھ کر میرا خون کس طرح کھوتا ہے۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ، ہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ اس نے کھار کر گلا صاف کیا اور سنبھل سنبھل کر بولنے لگا۔ ”مشکل یہ ہے کہ یہ بھی تو پتہ نہیں، تو نے اللہ وسایا کے لیے مختار نامے پر دستخط کیے ہیں یا بیع نامے پر۔ کلیم کے کاغذات بھی اس نے تجھ سے ہتھیا لیے۔ اب تو معاملہ بہت آگے نکل چکا ہے۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا؟“

”اب تیرے سامنے صرف دو رستے ہیں۔“

”وہ رستے کیا ہیں؟“ رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

”اگر تو کانونی چارہ جوئی کرنا چاہے تو میں تیرا کیس اپنے وکیل سے لڑواؤں گا۔ حالانکہ تو نے اپنا کیس خود اپنے ہاتھوں کمزور کر دیا ہے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کی جانب بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”بول، کیا کہتا ہے؟“

”نہیں شاہ جی!“ رحیم داد نے اتفاق نہیں کیا۔ ”میں مکہ سے بازی کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔ یہ دیوانی مکہ ہے۔ برسوں عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑیں گے۔ کہتے ہیں دیوانی کیس تو دیوانہ بنا دیتا

ہے۔“

انکار کے باوجود احسان شاہ نے مقدمہ لڑنے پر زور دیا مگر رحیم داد تیار نہیں ہوا۔ وہ اس کے لیے تیار ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اس پر تو پولیس کو صرف دیکھ کر گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ عدالت میں پیش ہونے اور بیان دینے کی اس میں جرات ہی نہیں تھی۔ اسے سراسر خطرہ نظر آتا تھا۔ جائیداد اور املاک حاصل کرنے کی کوشش میں اگر اسے شناخت کر لیا جاتا تو صرف جیل ہی نہ جانا پڑتا، حکیم نذر محمد چشتی اور چوہدری نور الہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ اسی کمزوری کے باعث اس نے اللہ وسایا کو مختار نامہ دیا تھا تاکہ اسے عدالتوں میں اور سرکاری افسروں کے سامنے پیش نہ ہونا پڑے۔ وہ ہرگز کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

”مقدمہ لڑنا نہیں چاہتا تو صرف ایک ہی رستہ رہ جاتا ہے۔“ احسان شاہ نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”وہ کون سا رستہ ہے؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”وہ یہ کہ اللہ وسایا کو رستے سے صاف کر دیا جائے۔“ اس کی خمار آلود آنکھوں میں مجرمانہ چمک پیدا ہو گئی۔

”تیرا مطلب ہے، اللہ وسایا کا صفایا کر دیا جائے؟“ رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”بالکل یہی مطلب ہے۔“ احسان شاہ کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔ ”اللہ وسایا کا صفایا کرنے کے بعد حویلی اور زمین پوری طرح تیرے کنبے میں آجائے گی۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔ ”تجھے کبیر والا میں دیاہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں رہے گی۔ جیلہ تو موجود ہی ہے۔ وہ سوہنی ہے اور جوان بھی۔ اس سے نکاح پڑھا لیتا۔ اس کے دس مرعے بھی تیری تحویل میں آجائیں گے۔ تو پورے کوئٹہ ہر کشن کا زمین دار بن جائے گا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو خنکھی نظروں سے دیکھا۔ ”پر تجھ میں اتنی ہمت بھی ہے؟“

”نہیں شاہ جی! یہ ٹھیک نہیں۔“ رحیم داد کے ذہن کو زور کا جھٹکا لگا۔ اس کے چہرے سے پریشانی برسنے لگی۔

”تو یہ بھی سن لے۔“ احسان شاہ کا لہجہ گہیر ہو گیا۔ ”اگر تو نے اللہ وسایا کا صفایا نہ کیا تو وہ جلد ہی تجھے اپنے رستے سے صاف کر دے گا۔“

”تو یہ کہنا چاہتا ہے، اللہ وسایا مجھے کتل کر دے گا؟“

”بالکل کر سکتا ہے۔ مت بھول کہ اللہ وسایا جانگلی بھی ہے۔“ احسان شاہ کے لہجے میں تلخی

تھی۔ ”جانگی تو نہ صرف لوٹ مار کے لیے خون کرتا ہے، بلکہ پیسے لے کر دوسروں کے لیے بھی کتل کرتا ہے۔ وہ تو پیشہ ور قاتل ہوتا ہے۔ اگر اس نے تجھے کتل نہ بھی کیا تو کسی کیس میں پھنسا کر جیل بھیجا سکتا ہے۔ اس کا ذکیل بہت تیز ہے۔ مجھے پتہ ہے، وہ کتنا تیز ہے۔“

رحیم داد نے سرا سمہ ہو کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔ ”شاہ جی! تیری باتیں بالکل سمجھ نہیں آئیں۔“

”سوچ لے، ٹھنڈے دل سے سوچ لے۔“ احسان شاہ اس کی سرا سبکی اور گھبراہٹ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے تیری پریشانی کا پتہ ہے، تبھی میں نے تجھے ہر پہلو دکھا دیا۔ اب تو اپنے طور پر سوچ بچار کر لے۔ مگر تجھے جلد ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ وکت بہت کم ہے۔“

”میں تیرے پاس چند روز بعد آؤں گا۔ اب میں نوں چلنا ہے۔“ رحیم داد کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے اسے جانے نہیں دیا۔ ”ایسی کیا جلدی ہے؟ روٹی کھا کر جانا۔“ احسان شاہ بھی کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد ٹھہر گیا۔ دونوں نے کھانا کھایا۔ رحیم داد کھانے کے دوران خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی کم بات چیت کی۔ لیکن اس نے اللہ وسایا کی جانب سے رحیم داد کو برگشتہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اپنی گھوڑی پر سوار ہو کے واپس ہوا۔

☆

رحیم داد مسمان خانے میں پہنچا تو احمد سو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا مگر بات چیت نہیں کی۔ مہری نیند سے اٹھا تھا، آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ لیکن رحیم داد کو اس کی زبانی یہ اطلاع مل گئی کہ اللہ وسایا شہر سے لوٹا نہیں ہے۔

اللہ وسایا دوسرے روز شام کو واپس آیا۔ رحیم داد باغ میں تنہا بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ اس کے پاس نہیں آیا۔ واپسی کے کچھ ہی دیر بعد وہ قادر کے گھر چلا گیا۔ جیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ یہ اطلاع بھی احمد ہی نے دی تھی۔ رحیم داد کے دریافت کرنے پہ اس نے بتایا۔

”زمیں دار اور زمیں دارنی کا دو کے پاس گئے ہیں۔ وہ آج دوپہر کو لمبور سے لوٹا ہے۔“

”کا دو اب کیسا ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل کمزور پڑ گیا ہے جی! آنکھیں تو اس کی دونوں ہی جاتی رہیں۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اندھا ہو گیا ہے۔“

سہی روز گزر گئے۔ نہ اللہ وسایا اس کے پاس آیا نہ جیلہ۔ دونوں قادر اور عطا محمد کا جھگڑا ختم کرانے کے لیے صلح صفائی کی کوشش کر رہے تھے۔ عطا محمد تو تیار تھا۔ وہ اور اس کا بھائی گرفتار ہونے کے بعد ضمانت پر رہا ہو چکے تھے۔ پولیس نے دونوں کو مجید اس کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔ دوسری طرف قادر صلح کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ وہ ایسی شرائط پیش کرتا جو عطا محمد کے لیے قابل قبول نہ ہوتیں۔

ہر روز دونوں فریقوں کے نمائندے اکٹھا ہوتے۔ پختایت بیٹھتی، لیکن قادر کے بگڑے ہوئے رویے کے باعث کچھ نہ طے ہوتا۔ بار بار تلخ کلامی کی نوبت آ جاتی، بات بنتے بنتے بگڑ جاتی۔ لیکن جیلہ نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے قادر اور اس کے بیٹے صابر کو سمجھا بھجا کر کسی نہ کسی طور راضی کر ہی لیا۔

رحیم داد پختایت میں شریک نہیں ہوا۔ اس کا وقت تنہائی میں کسنا رہا۔ احمد یا دوسرے نوکروں سے اسے اللہ وسایا اور جیلہ کی سرگرمیوں کا پتہ چلتا رہا۔

☆

اللہ وسایا مسمان خانے میں رحیم داد کے پاس آیا مگر وہ کمرے میں نہیں بیٹھا۔ رحیم داد کو باہر لے گیا۔ دونوں ٹہلتے ہوئے کھیتوں کی طرف چلے گئے۔ دن کے ساڑھے بارہ بجے تھے، لیکن دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ بارش کے بعد ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ ہوا قدرے پھری ہوئی تھی۔ درختوں کی شاخیں اور پودے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔

فضا خوشگوار اور سہانی تھی۔ لیکن اللہ وسایا کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ وہ چپ چاپ تھا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کچھ دیر تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی توڑی۔

”تو شہر گیا تھا، درخواست کا کیا بنا؟“

”ذکیل نے دوسرے ہی روز درخواست لگا دی تھی۔“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے استفسار کی۔ ”یہ نئی درخواست کیسی ہے؟ نہ تو نے کچھ بتایا نہ ذکیل نے۔“

”تو درخواست کے بارے میں بار بار اس طرح کیوں پوچھ رہا ہے؟“ اللہ وسایا کالجہ تیکھا تھا۔

رحیم داد نرم پڑ گیا۔ ”برامتا رہا ہے تو نہیں پوچھوں گا۔“ اس نے لمبے بھر خاموش رہ کر پوچھا۔

”میں تو یہ پتہ کرنا چاہتا تھا، الاٹمنٹ میں کوئی گڑبڑ تو نہیں پڑ گئی؟“

”گزر رہا ہو سکتی تھی، اگر فوراً درخواست نہ لگائی جاتی۔“

”پریشانی کی تو کوئی گل نہیں؟“ رحیم داد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”ابھی کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ اللہ وسایا نے بے نیازی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے محسوس کیا کہ اللہ وسایا خلاف توقع کچھ اکھڑا اکھڑا ہے۔ وہ ہریات کا مختصر اور ادھورا جواب دیتا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”تو نے یہ نہیں بتایا، یہ درخواست لگانے کی ضرورت کیوں پڑی؟“

”یہ تو وکیل سے پوچھنا، وہی بتائے گا۔“

”تس نوں کچھ پتہ ہو تو بتا دے۔“ رحیم داد کا لہجہ بہت نرم تھا۔ ”وکیل تو قانونی نکات بتائے گا، وہ سمجھ نہیں آئیں گے۔“

”جب قانونی نکات تجھے سمجھ نہیں آتے تو چپ کر کے بیٹھا رہ۔ آگے تجھے سب کچھ خود ہی پتہ چل جائے گا۔“ اللہ وسایا کے انداز میں ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ وہ چند لمبے خاموشی سے چلتا رہا۔ رحیم داد نے بھی خاموشی توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ آخر اللہ وسایا نے خود ہی گفتگو شروع کی۔ ”تجھ سے ایک ضروری گل پوچھنی ہے۔“

”کیسی گل؟“ رحیم داد نے مضطرب ہو کر دریافت کیا۔

اللہ وسایا کا چہرہ اور گہمیر ہو گیا۔ اس نے مڑ کر تیکھی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تو یہاں آنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا؟“

رحیم داد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکلا۔ نظریں جھکائے چپ چاپ چلتا رہا۔ اس کے چہرے پر اچانک سراپیمگی چھا گئی تھی اور صاف نظر بھی آ رہی تھی۔

اللہ وسایا گردن اٹھائے چلتا رہا۔ اس کا چہرہ اور سنجیدہ ہو گیا۔ چند قدم خاموشی سے آگے بڑھنے کے بعد اللہ وسایا کی آواز ابھری۔ ”تو نے ادھر دو کتل بھی کیے ہیں؟“ رحیم داد کے قدم ڈگمگانے لگے۔ اس پر سکتہ طاری تھا۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اس کا ذہن ستار کے تاروں کی مانند جھن جھن رہا تھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرے کے جال پھیلنے لگے۔

”چپ کیوں ہے، بولتا کیوں نہیں؟“ اللہ وسایا کا لہجہ تیکھا اور قدرے اونچا تھا۔

رحیم داد شدید محضے میں پڑ گیا۔ نہ وہ اعتراف کر سکتا تھا، نہ صاف انکار۔ دونوں صورتوں میں اس کے لیے پریشانی تھی۔ اس نے صاف جواب دینے سے گریز کیا۔ ذہنی خلفشار پر قابو پانے کی

پوری پوری کوشش کی، ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔
”دارا تجھ سے ملا تھا؟“

”ہاں!“ اللہ وسایا نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”بچھلے دنوں وہ تجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آیا تھا۔ دیر تک باتیں کرتا رہا۔“
”کیا کہتا تھا؟“ رحیم داد کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ تھی۔
”وہی جو میں نے تجھے بتایا۔“

رحیم داد نے فوراً جیترا بدلا۔ ”میں نے تجھے بھائی کہا ہے، تجھ سے ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ سب کچھ صاف صاف بتا دوں گا۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔

اللہ وسایا پر خاطر خواہ رد عمل ہوا۔ اس کے انداز میں قدرے نرمی پیدا ہوئی۔ وہ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”چوہدری! میں تجھے اتنا خطرناک بندہ نہیں سمجھتا تھا۔“

”تو پہلے میری پوری گل سن لے۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کو رام کرنے کی کوشش کی۔
”تجھے پتہ نہیں۔ میں نے ان باتوں کا ابھی تک کسی سے بالکل تذکرہ نہیں کیا۔ جیلہ تک کو نہیں بتایا۔ حالانکہ میں اس سے کبھی کوئی بات نہیں چھپاتا۔“ اللہ وسایا نے لمبی سانس بھری۔
”چوہدری! تو نے مجھے سخت الجھن میں ڈال دیا ہے۔ تو خود سوچ، اگر یہ باتیں سچ ہیں تو آگے کیا بنے گا۔“

”تو میری بات پوری طرح سن لے گا تو سب کچھ تیری سمجھ میں آجائے گا۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ ”تو جس طرح سوچ رہا ہے، بات اس طرح نہیں ہے۔“

اللہ وسایا اس کی صفائی سننے پر رضامند نہ ہوا۔ ”تجھے اس معاملے میں جو کچھ کہنا ہے، دارا ہی کے سامنے کہنا تاکہ ہریات کھل کر سامنے آجائے۔ وہ جلد ہی میرے پاس آئے گا۔“

رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”اس کے سامنے بھی بات ہو جائے گی۔ مگر تو اس سے پہلے میری گل بھی سن لے۔“

”تو کہتا ہے تو ضرور سنوں گا۔“ اللہ وسایا نے اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ ”اس بارے میں آرام سے بیٹھ کر تجھ سے گل بات ہوگی۔ آج تو میں نوں وکیل کے پاس شرجانا ہے۔“

”درخواست ہی کے سلسلے میں جا رہا ہے؟“

”ہاں، تجھ سے مختار نامہ لینے کے بعد اب تو مجھی کو ہر افسر کے سامنے پیش ہونا پڑتا ہے۔“

”کر جائے گا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”دوپہر کی روٹی کھا کر روانہ ہو جاؤں گا۔“

”واپسی کتنے روز میں ہوگی؟“

”کچھ پتہ نہیں۔ تین چار روز تو لگ ہی جائیں گے۔“

دونوں باتیں کرتے ہوئے کھیتوں سے گزر کر اسکول کی جانب نکل آئے۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر دیکھا، جیلہ اسکول سے باہر آرہی ہے۔ اس کے ہم راہ دونوں بچے بھی تھے۔ اللہ وسایا نے بھی اسے دیکھ لیا۔ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”لگتا ہے اسکول کی چھٹی ہو گئی۔ زمیں دارنی آرہی ہے۔“

اللہ وسایا نے آہستہ سے کہا۔ ”میرے جانے کے بعد اس معاملے میں جیلہ سے کوئی گل بات نہ کرنا۔ میں تجھے بتا ہی چکا ہوں، میں نے اسے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔ جب تک تجھ سے پوری طرح بات چیت نہ ہو جائے گی، اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ ایسی باتوں سے جلد گھبرا جاتی ہے۔“

”نہیں، میں اس سے کچھ نہیں کہوں گا۔ تو فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کو یقین دلایا۔

جیلہ قریب آگئی۔ اللہ وسایا اور رحیم داد اس کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے حویلی کی جانب چل دیئے۔

رحیم داد مہمان خانے میں پہنچا تو سخت پریشان اور خوف زدہ تھا۔ پریشانی کے عالم میں اس سے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا گیا۔ وہ شام تک کمرے میں بستر پر لیٹا بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا نظر آرہا تھا۔ اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ مہمان خانے سے نکلا۔ باغ میں گیا اور تنہا بیٹھا رہا۔ اللہ وسایا شرجا چکا تھا۔ جیلہ بھی باغ میں نہیں آئی۔

☆

بادل چھائے تھے مگر بارش نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور کھانے سے فارغ ہو کر دیر تک بیٹھا رہا۔ اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ رحیم داد اٹھا اور مہمان خانے کی جانب چلا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھا تھا کہ ایک جھنڈ کے نیچے سے دارا نکلا اور رحیم داد کے سامنے آگیا۔ رحیم داد سراپہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دارا کو دیکھ کر خوف اور پریشانی کے ساتھ ساتھ اس پر غصہ بھی طاری ہوا۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

”تو نے مجھے پہچان لیا؟“ دارا نے آہستہ سے پوچھا۔

”ہاں۔“ رحیم داد آگے بڑھنے لگا۔ ”میرے ساتھ آ۔“

رحیم داد نے مہمان خانے کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر دیا، مڑا اور دارا کے ہم راہ نہر کی

ست بڑھنے لگا۔ عقب میں گاؤں تھا۔ مکانوں میں چراغوں کی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ آسمان پر

لٹکا ابر چھایا تھا۔ درختوں کے نیچے اندھیرا تھا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

کچھ دور جا کے رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو یہاں کیسے آیا؟“ اس کا لہجہ تنکھا تھا۔

”میں نے تجھے اس روز نہر کے کنارے دیکھا تھا۔ یاد ہے نا جب تو اپنی گھوڑی دوڑاتا جا رہا

تھا۔“ دارا آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”تمہی سے میں تیرے پاس آنا چاہتا تھا، پر تو اتنا بدل گیا ہے کہ

بالکل پہچان نہیں جاتا۔ تیرے منہ پر یہ چوٹ کا نشان بھی نہیں تھا۔ تو گھوڑی پر بیٹھا بھی بہت شان

سے تھا۔ سچ کہتا ہوں، میں تجھے پہچان نہیں سکا تھا۔“

”ایسا تھا تو ادھر کیوں آیا؟“

”گل امیہ ہے جی! تیرے بارے میں کچھ شبہ سا ہوا۔“ دارا نے وضاحت کی۔ ”میں نے تجھے

ادھر سے گھوڑی پر نکلتے دیکھا تھا۔ اب تجھ سے صاف صاف بتا دوں۔ میں دوبار پہلے بھی یہاں آیا

اور چھپ کر تجھے خوب غور سے دیکھتا رہا۔“

”پر تو ادھر کیسے آگیا؟ تو دھولہ امیر خاں میں ہوتا تھا نا؟ میں نے تجھے وہیں چھوڑا تھا۔“

”میں نوں پتہ ہی نہ ہوگا، تیرے آنے کے بعد مجھ پر کیا بتی۔“ دارا نے گلہ کرنے کے انداز میں

کہا۔ ”جب تو بیگماں اور اس کے گھر والے مولاداد کا خون کر کے بھاگا۔“

”میں نوں کیسے پتہ چلا، میں نے بیگماں اور مولاداد کا خون کیا؟“ رحیم داد نے اس کی بات کاٹ کر

دریافت کیا۔ اس کی آواز سے بھنبلا ہٹ صاف جھلک رہی تھی۔

”زراض نہ ہو۔ میں نوں پتہ ہی ہے، میں موجود نہیں تھا۔“ دارا سسم کر نرم پڑ گیا۔ ”میں جب

پہنچا تو بیگماں مرچکی تھی، مولاداد دم توڑ رہا تھا۔ اس کا بھائی اللہ داد زخمی تھا، پر زندہ تھا۔ اسی نے بتایا

بیگماں اور مولاداد کا خون تو نے کیا۔“

”بکواس کرتا ہے وہ۔“ رحیم داد برا فروختہ ہو کر بولا۔ ”اے پتہ ہے، بیگماں کو میں نے نہیں،

مولاداد نے کھانسی سے کتل کیا۔ میں نے اسے روکنا چاہا تو اس نے مجھ پر بھی وار کیا۔ میں برابر

بچنے کی کوشش کرتا رہا، پر جب میں نے دیکھا، وہ بیگماں کی طرح مجھے بھی ختم کرنے پر تلا ہوا ہے تو

میں نے اپنے بچاؤ کے لیے وار کیا اور اسی کی کھانسی چھین کر کیا۔ کرتا بھی کیا۔ وہ بالکل پاگل ہو رہا

تھا۔ اللہ داد بھی اسی لیے زخمی ہوا کہ وہ بھی مجھے کتل کرنا چاہتا تھا۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ دارا نے جھٹ اس کی تائید کی۔ ”پر میں نوں یاد ہوگا، جب تو میرے

گھر سے نکل کر کھیتوں کی طرف بھاگا، تو میں نے تجھے روکنے کی کوشش کی تھی۔ تو رک کر اصلی گل

بتا دیتا تو میں اللہ داد کی بات ہرگز نہ مانتا۔“ وہ صفائی پیش کرتے کرتے شکوہ کرنے لگا۔ ”میں نے تو تجھ سے پہلے ہی پوچھا تھا، اگر تو نے بیگماں سے یاری لگا رکھی ہے۔“
رحیم داد نے اسے آگے نہیں بولنے دیا۔ غصے سے آگ بگولا ہو کر ڈانٹا۔ ”چپ کر۔ تو نے فیروسی بکواس شروع کر دی۔“

”اللہ داد بھی ایسی ہی گل کرتا تھا۔ دوسرے بھی یہی کہتے تھے۔“ دارا نے گڑگڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہا۔ ”اللہ داد نے پولیس کو بھی یہی بتایا۔“
”پولیس نے تجھ سے بھی پوچھنا تھا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔
”کیوں نہیں کی۔ میرے گھر ہی میں دونوں کا خون ہوا تھا۔ پولیس مجھے کیسے چھوڑ دیتی۔“
دارا سویرے پہنچا تھا اور مجھے پکڑ کر تھانے لے گیا۔
”تو نے کیا بیان دیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”میں نے کیا بیان دیتا تھا جی! میں نوں تو کچھ پتہ نہیں تھا۔ پولیسوں نے چھتر مار مار کر چڑی اڑھڑ ڈالی۔ بیٹھ اور کمر پر لمبے لمبے لاس پڑ گئے۔ انھوں نے مجھے نکا کیا اور التالٹا دیا۔ ایک پولیس میرے دونوں ہاتھ اپنے بوٹ سے دبا کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرا زور زور سے ٹھٹھے مارتا تھا۔ میں درد سے چیخنے چلانے لگا پر اس نے ترس نہ کھایا۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا تو تھانے دار کے حکم پر ایک اور پولیس لگایا گیا۔ وہ خوب ٹکڑا تھا۔ اس نے سڑاک سڑاک پانی میں بیٹھے ہوئے چمڑے کے چھترے مارے۔ میں نے ڈر کے وہی بیان دے دیا جو اللہ داد نے دیا تھا۔“

”پر تو وہاں موجود ہی کب تھا؟ جب مولاداد نے بیگماں کو قتل کیا اور مجھے قتل کرنے کے ارادے سے کھانڈی اٹھا کر حملہ آور ہوا۔ تو تو پہلے ہی گھر سے نکل کر جا چکا تھا۔ اللہ داد اور مولاداد تو تیرے جانے کے بہت بعد پہنچے تھے۔“

”تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پر میں کب تک مار کھاتا۔“ دارا نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”میں نے تو مار سے بچنے کے لیے ایسا بیان دیا تھا۔“

”تب تو پولیس نے تجھے چھوڑ دیا ہو گا۔“

”کہاں چھوڑا جی! وہ تیرے بارے میں بار بار پوچھتے تھے۔ میں نوں پتہ ہی ہے، میں نوں تیرے بارے میں کچھ بھی علوم نہ تھا۔ نام تک کا پتہ نہ تھا۔ پر تھانے دار نے میری ایک نہ سنی۔ گندی گندی گلاں نکالتا تھا۔ چیخ چیخ کر کہتا تھا، تیرے گھر میں واردات ہوئی۔ قاتل تیرے ساتھ کئی روز ٹھہرا رہا اور میں نوں اس کے بارے میں کچھ اتنا پتہ نہیں؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں جتنی اپنی صفائی

پیش کرتا، اتنی ہی زیادہ دبا کے وہ میری پٹائی کرواتا۔“
رحیم داد اس کی روداد سن کر متاثر ہوا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر بولا۔ ”پولیس نے تجھ پر بہت ظلم کیا۔“

”نہ پوچھ کتنا ظلم کیا۔“ دارا نے بجھے ہوئے لمبے میں بتایا۔ ”تھانے لے جانے کے بعد پولیس نے سہی راتوں تک بالکل نہیں سونے دیا۔ کھانے کو بھی نہیں دیا۔ پیاس لگتی، پانی مانگتا تو تھانے دار پیچھے ہٹا لیتا، پانی نہ پلاتا۔ میں ہتھ جوڑتا، منتیں کرتا پر پانی دینے کی بجائے پولیسے اور پٹائی کرتے۔ کئی بار میں بے ہوش ہوا۔ ہر بار وہ پانی کے چھینٹے میرے منہ پر مار مار کر ہوش میں لاتے اور تیرے بارے میں پوچھتے۔ کبھی نرمی دکھاتے، پیار سے گل بات کرتے۔ کبھی گرمی دکھاتے اور گلاں نکالتے۔ تھانے دار چلا جاتا تو ہیڈ کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ وہ اپنی کارگزاری ڈالنے کے لیے اور زیادہ ظلم کرتا۔“

”تو پولیسوں کے پنجے سے چھوٹا کیسے؟“

”وہ ایسا ہے جی! میرا زمیں دار بہت نیک بندہ ہے۔ تھانے دار سے اس کی یاری بھی ہے۔“ دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ ”وہ ایک روز تھانے آیا۔ میری حالت دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ وہ اپنی ضمانت پر مجھے اپنے ساتھ لے آیا۔ تھانے دار سے اس نے وعدہ کیا، جب ضرورت پڑے گی، مجھے پیش کر دے گا۔“

”پر تو وہاں سے نکل کر ادھر کیسے پہنچ گیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”ویسے تو جی زمیں دار کے پاس جب تک رہا، میری کڑی نگرانی ہوتی رہی۔“ دارا نے رحیم داد کو بتایا۔ ”مجھے باہر جانے کی بالکل اجازت نہیں تھی۔ رات کو تو کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔ فیر ایسا ہوا، ایک صبح میں مٹی کرنے نیامیں کی طرف گیا۔ ایک راکھا میرے ساتھ ساتھ تھا، وہ بھی مٹی کرنے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ میں نے رات ہی کو بھاگنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اٹھ کر اچانک اس پر جھپٹا اور اسے نیچے گرا کر اس کا منہ دبا یا، پگڑی سے اس کے ہاتھ اور پیر باندھے اور پگڑی کا ایک سرا اس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ ہر طرف ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں جھٹ کھیتوں میں گھس گیا، چھپتا لکتا پنڈ سے باہر نکلا اور تیزی سے دوڑ لگا لی۔ میں سورج نکلنے سے پہلے ڈھولہ امیر خاں سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔“ دارا نے گرمی سانس بھری۔ ”کئی روز تک برابر چلتا رہا۔ دن کو کسی جھنگریا ویران بستی کے کھنڈر میں چھپ جاتا۔ رات کو سفر کرتا۔ بھوکا بھی رہا، پیاسا بھی۔ کسی نہ کسی طرح ادھر آگیا۔“

”اب تو کہاں رہتا ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔ ”لگتا ہے‘ نزدیک ہی کے کسی پنڈ میں ٹھہرا ہوا ہے۔“

”ہاں جی! میں چک ۳۸ میں رہتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ۵ میل کے لگ بھگ ہو گا۔“ دونوں باتیں کرتے ہوئے نہر کے قریب پہنچ گئے۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ برسات کی اندھیری رات تھی۔ جگنوؤں کا غول ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک سمت سے نمودار ہوا اور اپنی جلتی بجھتی روشنیوں کا غبار فضا میں بکھیرتا ہوا درختوں کے گھنے جھنڈ میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد نے جگنوؤں کا قافلہ گزرتے دیکھا، ٹھکا اور دارا کی طرف متوجہ ہوا۔

”تو کس کے پاس ٹھہرا ہے؟“

”میں تو جی ریاست بھاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ رستے میں کامل مل گیا۔ میں نے تو چاہا تھا، اس کی نظروں سے بچ کر نکل جاؤں پر اس نے دیکھتے ہی دور سے ہانک لگائی۔ پاس آکر چٹ گیا۔ بہت دنوں بعد ملا تھا۔ میرا پرانا یا رہا ہے۔ وہ میرے گلے پڑ گیا، ضد کر کے اپنے گھر لے گیا۔ وہ اپنے پیو کے ساتھ چک ۳۸ میں رہتا ہے۔“

”کامل زمیں دار ہے یا مزارع؟“

”وہ نہ زمیں دار ہے نہ مزارع۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”وہ تو جی پاکستان سے باہر کوئی جگہ ہے۔ بحرن ادھر ہوتا ہے۔ وہاں بحرن پڑویم کمپنی میں کام کرتا ہے۔ آج کل چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ لگتا ہے، کمائی چنگی ہے۔ شان سے رہتا ہے۔“

”اس کی چھٹی ختم ہو جائے گی تو واپس چلا جائے گا۔“ رحیم داد نے کریدا۔ ”تب تو کیا کرے گا؟ کس کے پاس ٹھہرے گا؟“

”یہی تو جی فکر ہے۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔“ دارا نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تیس نوں پتہ ہی ہے، پولیس میری تلاش میں ہے۔ کامل کے گھر میں آرام سے چھپا بیٹھا ہوں۔ کامل کے بحرن جانے کے بعد وہاں کیسے ٹھہر سکوں گا۔ اس کا پیو مجھے نہیں ٹھہرائے گا۔ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ ویسے ہی میرے ٹھہرنے پر اکثر کڑکڑاتا رہتا ہے۔ وہ تو کامل ہے جس نے روک رکھا ہے۔“

”کامل جانتا ہے، پولیس تیری تلاش میں ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”ہاں جی! اسے پتہ ہے۔ پر اپنے پیو اور چاچا کو اس نے کچھ نہیں بتایا۔ چاچا بھی ساتھ ہی رہتا ہے۔ ۱۸ کلا سے اوپر ہتھ راہہ زمین ہے۔ کامل کا پیو اور چاچا مل جل کر اس پر کاشت کرتے ہیں۔“ دارا اطمینان سے بتاتا رہا۔ ”کامل کمائی کر کے لایا ہے۔ اس سے اور زمین خریدنے کی

کوشش ہو رہی ہے۔ ویسے وڈا تیر نہیں۔ آرام نال گزر بسر ہو رہی ہے۔ کامل کی ایک ہی بھین

ہے۔ اس کا ویاہ بھی پچھلے دنوں ہو گیا۔ کامل اس میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ وہ.....“

رحیم داد کو کامل اور اس کی بسن کی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بات کاٹ کر بولا۔ ”یہ بتا،

تو نے آگے کے لیے کیا سوچا؟“

”کامل کتا ہے تو میرے ساتھ بحرن چل۔ تیس نوں بھی ادھر پڑویم کمپنی میں گلوادوں گا۔ آج

کل کمپنی میں بھرتی بھی ہو رہی ہے۔ مزدوری چنگی ملے گی، عیش کرے گا۔ وہ جی! میرا بہت ہی گمرا

یار ہے۔ میری مدد بھی کرنا چاہتا ہے۔“

”اس میں سوچنا کیا۔ چلا جا اس کے ساتھ۔“ رحیم داد نے مشورہ دیا۔

”کیسے چلا جاؤں جی!“ دارا نے مجبوری ظاہر کی۔ ”پہلے کراچی جانا ہو گا۔ وہاں کمپنی کے لیے

بھرتی کا دفتر ہے۔ بھرتی کرنے والے افسروں کی منہی گرم کرنی پڑتی ہے۔ اس کے بناں کام نہیں

بنتا۔ کامل بتاتا تھا، ۵ سو روپے کی ضرورت ہوگی۔ تیس نوں پتہ ہے، میرے پاس کچھ بھی نہیں۔

اکٹھ ۵ سو روپے تو کامل بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے اس کے پاس اتنے روپے ہیں بھی نہیں۔ میں

نے تو اسے کہا تھا، روپے ادھا روپے دے۔ تو بحرن میں مزدوری کر کے ادا کر دوں گا۔ پر وہ جو کچھ کما

کر لایا تھا، سب اپنے پیو کو دے چکا ہے۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ دونوں چپ چاپ چلتے رہے اور نہر سے ہٹ کر سمجور کے ایک درخت

کے نیچے اندھیرے میں کھڑے ہو گئے۔

دارا زیادہ دیر چپ نہ رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں تیرے پاس اسی لیے آیا تھا۔“

اس کے لہجے میں خوشامد اور عاجزی تھی۔ ”تیری بہت مہربانی ہوگی۔ تو نے مجھے ۵ سو روپے دے

دیئے تو میں کامل کے ساتھ نکل جاؤں گا۔“ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تو وڈا

زمیں دار ہے، میری اتنی مدد کر سکتا ہے۔ میرا بھی پولیس سے پنڈ چھوٹ جائے گا اور تیس نوں بھی

آگے خطرہ نہیں رہے گا۔“ اس نے دہلی زبان سے رحیم داد کو خبردار کیا۔ ”تیس نوں پتہ ہے، پولیس

نے پکڑ لیا تو مار کر تیرے بارے میں سب کچھ اگلوالے گی۔“

رحیم داد نے چونک کر دارا کو دیکھا۔ وہ دیکھنے میں جتنا سادہ لوح نظر آتا تھا، اتنا تھا نہیں۔ اندر

سے گھگا نکلا۔ وہ رحیم داد کو بلیک میل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ رحیم داد نے صورت حال کی نزاکت

محسوس کی۔ دارا اس کے لیے اتنا سنگین خطرہ بن گیا تھا کہ سرکاری گواہ بن کر اسے پھانسی کے

تھیکے لہجے میں بولا۔ ”مجھے کوئی خطرہ شطرہ نہیں۔ اپنے دل سے یہ خیال نکال دے۔ غالی تیرے بیان دینے سے کیا ہوتا ہے۔ تیرے سوا ڈھولہ امیر خاں میں کسی اور نے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک بیگیاں ہی تھی، وہ بھی اب نہیں رہی۔ اللہ داد بھی مجھے پہچان نہیں سکا۔ میں اس کے سامنے منہ پر منڈا مارا باندھے ہوئے تھا۔ تیری اکیلی گواہی سے کیا بنتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ دارا نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”ویسے بھی تو ڈاڑھیں دارا ہے۔ پولیسے تجھ پر آسانی سے جھٹ نہیں ڈال سکتے۔“ اس نے اپنے لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”پر پولیسے مجھے تنگ کر سکتے ہیں۔ تجھے بھی کچھ نہ کچھ پریشانی ہو سکتی ہے۔“

”تو میری فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے اپنے رویے سے خوف کی پردہ پوشی کی۔ چند لمحے خاموش کھڑا سوچتا رہا پھر اس نے اپنے تند و تیز لہجے میں اعتدال پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ سوچ رہا ہوں، پولیس نے تجھے دوبارہ پکڑ لیا تو زبردست مار لگائے گی۔ تیری جان بھی جاسکتی ہے۔ پہلے تھانے میں تجھ پر جو ظلم کیا گیا، اسے سن کر تو ایسا سوچنا غلط نہیں۔“

دارا ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ”تو نے ٹھیک ہی کہا۔ اس بار تو پولیسے مجھے جان سے مار دیں گے۔“ اس نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ ”تو میری اتنی مدد کر دے کہ میں کامل کے ساتھ ادھر سے نکل کر خیرن چلا جاؤں۔ تیرا بہت احسان ہو گا۔ زندگی بھر دعائیں دوں گا۔“

”سیدھا کھڑا ہو۔“ رحیم داد نے ڈپٹ کر کیا۔

دارا اٹھا اور نظریں جھکا کر رحیم داد کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے جان بوجھ کر اللہ وسایا کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ مضمون کی مانند سے ہوئے دارا کو نظر بھر کے دیکھا اور بھاری بھر کم لہجے میں بولا۔ ”دارا تو پریشان نہ ہو۔ تو نے بھی میری مدد کی ہے۔ میں اسے بھولا نہیں ہوں۔“ دارا نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا مگر زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ رحیم داد نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”فکر نہ کر۔ میں تیری ضرورت مدد کروں گا۔ تو کل سورج ڈوبنے کے بعد اسی جگہ پہنچ جانا۔ میرے پاس پنڈ میں آنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا۔ میں تیرے پاس خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ دیر ہو جائے تو انتظار کر لیتا۔ میں ضرور آؤں گا۔“

”جیسا تو نے کہا ہے، ویسا ہی کروں گا۔ تیری بہت بہت مہربانی۔“

”اب توڑ جا۔ میں کل شام تجھ سے یہیں ملوں گا۔“

دارا خاموشی سے چلا گیا۔ رحیم داد کھجور کے درخت تلے چپ کھڑا، اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ اندھیرے میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو رحیم داد مڑا اور گاؤں کی سمت بڑھنے

لگا۔ اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا۔ وہ سہمان خانے میں پہنچا تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کو دیر تک نیند نہیں آئی۔ آدھی رات سے بارش شروع ہو گئی مگر صبح مطلع صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا۔ بجلیکے ہوئے درختوں اور ہرے بھرے پودوں پر سنہری دھوپ چمک رہی تھی۔

رحیم داد کمرے سے باہر نکلا۔ تمام وقت دارا کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے دیوار پر کھونٹی سے لٹکی ہوئی بندوق کی جانب نظریں اٹھا کر کئی بار دیکھا اور ہر بار سوچا کہ شام کو جب دارا انہر کے کنارے ملے تو اسے اندھیرے میں گولی مار کر ٹھکانے لگا دے۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی اسے خوف زدہ کرتا رہا کہ گولی کی آواز سن کر گاؤں والے اکٹھے ہو سکتے ہیں اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو وہ اکیلا لاش کیسے چھپائے گا اور کہاں چھپائے گا؟ لاش سارا بھانڈا پھوڑ سکتی تھی۔ پولیس آتی، تفتیش ہوتی، اللہ وسایا کو خبر پہنچتی۔ وہ لاش دیکھتے ہی دارا کو پہچان لیتا اور فوراً سمجھ جاتا کہ اسے کس نے اور کیوں قتل کیا؟ اللہ وسایا اس کے لیے دارا سے کم خطرناک نہیں تھا۔ وہ بیگیاں اور مولا داد کے قتل کے بارے میں دارا کی زبانی پہلے ہی بہت کچھ سن چکا تھا۔

کیا وہ اللہ وسایا کو بھی قتل کر دے؟ لیکن وہ کتنے قتل کرے گا؟ خود کو پہچانے کے لیے کس کس کی جان لے گا؟ بیگیاں کو اسی پردہ پوشی کی کوشش میں مولا داد کے ہاتھوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مولا داد کا قتل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ بیگیاں اس کی اکھوتی بن تھی، اسے ٹوٹ کر چاہتی تھی۔ اس کا شوہر مولا داد بھی باپ کی خفگی کے باوجود اس سے محبت اور خلوص سے ملتا۔ حالات نے اسے ایسے خطرناک راستے پر ڈال دیا کہ وہ اتنی چاہنے والی بن کے قتل کا سبب بنا۔ بیگیاں کی یاد کے ساتھ سینے میں دھواں سا اٹھا اور آنکھوں میں آنسو بن کر منڈلانے لگا۔ وہ منہ بسور کر رونے لگا۔

دن ڈھلے تک وہ شدید الجھن میں رہا، کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اسے دارا کے ساتھ ساتھ اللہ وسایا کے بارے میں بھی فیصلہ کرنا تھا۔ اور جلد سے جلد کرنا تھا۔ وہ دارا کو پانچ سو روپے دے کر خیرن جانے میں مدد دے سکتا تھا۔ اس طرح اس کی طرف سے جو خطرہ تھا، خود بخود ٹل جاتا۔ مگر اللہ وسایا بھی اس کے سر پر تلوار بن کر لٹک رہا تھا۔ بہت غور و فکر کے بعد رحیم داد نے طے کیا کہ اس معاملے میں احسان شاہ سے رجوع کرنا چاہیے۔ وہ ان خطرات سے نمٹنے میں اس کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ دھوپ، شام کے پھیلتے اور بوڑھے دھندلکے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئی۔ رحیم داد نے گھوڑی نکالی اور نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس نے دارا کو دور ہی سے دیکھ کر پہچان لیا۔ وہ کھجور کے درخت تلے سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ بارش سے نہری سطح بلند ہو گئی تھی۔ پانی گنگنا تا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ رحیم داد نے قریب پہنچ کر کہا۔ ”تو آیا؟“

”کیسے نہ آتا، تو نے بلایا جو تھا۔“ دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد گھوڑی سے نیچے نین اترا۔ اس نے گھوڑی پر بیٹھے بیٹھے طے کیا کہ دارا کو بھی پیراں والہ لے جانا چاہیے۔ اس نے دارا سے کہا۔ ”آ، میرے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ جا۔“ دارا اس کے ہاتھ کا سارا لے کر گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد نے گھوڑی کو ایڑ لگائی، وہ آگے بڑھی۔

دارا حیرت زدہ تھا۔ ”مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟“ اس نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”تو نے پیراں والہ دیکھا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”نہیں جی! میں ادھر کبھی نہیں گیا۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

”آج دیکھ لیتا۔“

”ادھر جا کر کیا لیتا ہے؟“ دارا ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

”تس نوں۔ خیرن جانا ہے کہ نہیں؟“ رحیم داد نے اسے جھڑک دیا۔

دارا سسم کر رہ گیا۔ رحیم داد گھوڑی سنبھال سنبھال کر دوڑاتا رہا۔ بارش سے کچے راستے پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اندھیرا بھی تھا۔ رحیم داد گھوڑی پر چوکس بیٹھا تھا۔ دارا دم بخود تھا۔ مگر رحیم داد کسی قدر پریشان تھا۔ وہ دارا کے ہم راہ پیراں والہ جاتا رہا تھا مگر کچھ دور جانے کے بعد اس کے ذہن میں یہ خدشہ بھی پیدا ہوا کہ دارا نے اگر اللہ وسایا کی طرح احسان شاہ یا اس کے کسی ملازم کو بھی یگانا اور مولاداد کی ہلاکت کے بارے میں بتا دیا تو اس کے لیے نئی الجھن پیدا ہو جائے گی۔ وہ احسان شاہ کو بھی اس معاملے میں اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔

رحیم داد نے دارا کو تنبیہ کی۔ ”تجھے پیراں والہ لیے تو جا رہا ہوں پر وہاں یگاناں اور مولاداد کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا۔ اپنے بارے میں بھی کچھ نہ بتانا۔ ہر ایک سے یہی کہتا، تو میرا پانا نوکر رہ چکا ہے۔ بچ میں کسی اور زمیں دار کی نوکری کر لی تھی، اب میرے پاس واپس آ گیا ہے۔ میری بات سن رہا ہے نا؟“

”بالکل سن رہا ہوں جی!“ دارا نے اونچی آواز میں کہا۔ ”جیسا تو کہہ رہا ہے، دیا ہی کروں گا۔ کسی کو بھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے ایسی باتیں بتا کر اپنے تئیں مصیبت میں

نہیں ڈالتا۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرے لیے تو اب یہی ٹھیک ہے، کسی کو بھی اپنے بارے میں کچھ نہ بتا۔ جلد سے جلد پاکستان سے نکل کر خیرن پہنچ جا۔ کراچی جا کر اپنا نام بدل لینا بلکہ ابھی سے بدل لے۔“

”میں نے جی، یہ پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔ کامل کہتا ہے، خیرن جانے کے لیے کمپنی کی طرف سے وہ کیا ہوتا ہے جی، ہاں یاد آیا، پاسپورٹ بنایا جائے گا۔ اس پر میری تصویر بھی لگے گی۔“ دارا رک رک کر بولتا رہا۔ ”داڑھی بڑھالوں گا۔ تب تصویر اتراؤں گا۔ ویسے بھی جی میرے لیے یہ ضروری ہے۔ پولیس میری تلاش میں ہے۔“

”تو نے نیا نام کیا سوچا؟ مجھے بتا دے تاکہ پیراں والہ میں تیرا وہی نام بتاؤں۔“

”ہاشم۔ میں نے اور کامل نے یہی نام سوچا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟“

”بالکل ٹھیک ہے۔ تو یہ طے رہا کہ پیراں والہ میں تجھے میں ہاشم کے نام سے پکاروں گا اور سب

کو تیرا یہی نام بتاؤں گا۔ یاد رکھنا۔ بھول نہ جانا۔“

”بالکل نہیں بھولوں گا۔ فکر نہ کر۔“

اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ رحیم داد گھوڑی بہت احتیاط سے دوڑا رہا تھا۔ ایک موڑ پر کچڑ میں گھوڑی کا پیر ہٹا، وہ لڑکھڑائی۔ دارا بھی ایک طرف جھکا۔ اس نے رحیم داد کی کمر مضبوطی سے تھام لی اور گرنے سے بال بال بچ گیا۔ رحیم داد نے بھی نہایت ہوشیاری سے گھوڑی کو سنبھال لیا۔ اسے بے قابو نہیں ہونے دیا۔ زیادہ محتاط ہو کر گھوڑی دوڑانے لگا۔

وہ دارا کے ہم راہ پیراں والہ پہنچا تو رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ شیدے نے دونوں کو دیوان خانے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کیا۔

”شاہ جی کدھر ہے؟“

”وہ توجی حویلی میں ہے۔“ شیدا نے جواب دیا۔ ”میں اسے تیرے آنے کی اطلاع کیے دیتا

ہوں۔ تو آرام ٹال بیٹھ۔“

وہ جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”گل سن شیدے۔“ اس نے قریب کھڑے ہوئے دارا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میرا نوکر ہاشم ہے۔ اسے بھی یہیں ٹھہرنا ہے۔ اسے روٹی کھلا دے۔“

شیدا نے دارا کو مخاطب کیا۔ ”ہاشم! ادھر آ میرے ساتھ۔“ دارا اس کے ساتھ چپ چاپ

ساتھ ہی اس نے ایسی باتیں شروع کر دیں جن سے لگتا ہے، وہ مجھے ڈرانا دھمکانا چاہتا ہے۔ کسی کیس میں پھنسانا چاہتا ہے۔“

”اس کے ان ارادوں کے بارے میں مجھے بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا۔ تجھ سے بتا بھی چکا ہوں۔“ احسان شاہ نے لمبے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ، اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ فی الحال تو اس نے حویلی اور زمین اپنے کنبے میں لینے کا چکر چلایا ہے۔“ اس نے مگرمی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”مجھے تو ایسا نظر آ رہا ہے، وہ حویلی اور زمین لینے کے بعد تیرا پورا کلیم ہی ہتھیانے کی کوشش کرے گا۔ جس طرح اس نے پہلے دستاویزوں پر دستخط لگوا لیے، کسی نئے ہمانے سے ایسے شامپ پیپر بھی دستخط لگوالے گا کہ تو اپنے کلیم سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ایک روز اچانک پتہ چلے گا تو اپنا کلیم اللہ وسایا کے ہاتھ کب کا بچ چکا ہے۔“

رحیم داد نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ ”کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟ اس نے دس مرتبے زمین پر دوبارہ جو کنبہ کیا ہے، وہ جیلہ کے نام سے کلیم خرید کر ہی تو کیا ہے نا؟ تجھے تو ٹھیک طرح پتہ ہے۔ تیرے سامنے ہی تو کلیم کا سودا ہوا تھا۔ فرک صرف اتنا ہو گا کہ تیرے کلیم کا سودا بھی ہو جائے گا، اللہ وسایا کے نام مستحل بھی ہو جائے گا اور تجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ کاغذات اور دستاویزات میں جعل سازی اسی طرح ہوتی ہے۔ اللہ وسایا تو وکیل کے مشورے پر ہر کام پکا کر رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے، وہ تجھے اپنے جال میں پوری طرح جکڑ چکا ہے۔“

رحیم داد نے بے بسی سے کہا۔ ”صاف گل امجد جی! میرے ساتھ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ اپنا تو بالکل مغز کام نہیں کرتا۔“ اس کے چہرے پر پریشانی برسنے لگی۔

”میں نے تو تجھے پہلے ہی کہا تھا پر تو نے میری بات مانی ہی کب۔“

”تیرا مطلب ہے، اللہ وسایا کو ختم کر دیا جائے؟“ رحیم داد ہچکچاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

”بالکل یہی مطلب ہے۔ اس کے سوا اللہ وسایا کے پھیلانے ہوئے جال سے بچنے کا تیرے سامنے اور کوئی راستہ نہیں۔“

”پر یہ کام میں کیسے کر سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے تو پہلے کبھی ایسا نہیں کیا۔ ویسے بھی سارے نوکر اور مزارعے اللہ وسایا کے بندے ہیں۔ میرا تو پنڈ میں کوئی بھی نہیں ہے۔“

برآمدے سے چلا گیا۔

رحیم داد کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد احسان شاہ آگیا اور کرسی کھڑک کر بیٹھ ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا چوہدری، میں روٹی کھا رہا تھا۔“

”آج اتنی جلدی روٹی کھائی؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ ”آج سورج ڈوبنے سے پہلے ہی پینے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ دوپرانے یار آگئے تھے۔ موسم بھی سہانا ہے۔ میں نے خاصی لگائی ہے۔ ویسے آج رات اوکاڑے بھی جاتا ہے۔“

”تمیں نوں اوکاڑے جانا ہے تب تو میں نوں چلنا چاہیے۔“ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ ”میں کل شام تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔“ اسے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”پر یہ بھی تو پتہ نہیں، تو کب تک لوٹے گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا، مسکرا کر پوچھا۔ ”تو کل واپس آجائے گا نا؟“

”کل تو نہیں، پرسوں شام تک ضرور آجاؤں گا۔ پر تو اتنی جلدی واپس کیوں جانا چاہتا ہے؟ اب تو آہی گیا ہے میں گھنٹے سوا گھنٹے بعد چلا جاؤں گا۔ ایسی جلدی بھی نہیں۔ اوکاڑہ دور ہی کتنا ہے۔ بارش کی وجہ سے سڑکیں خراب ہو رہی ہیں۔ ورنہ کار سے لگ بھگ گھنٹے بھر کا سفر بنتا ہے۔“ احسان علی شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”میں تو روٹی کھا چکا پر تو نے ابھی تک نہیں کھائی ہوگی۔ تھوڑی سی دھسکی لگالے۔ ساری تھکن دور ہو جائے گی۔ ایک دم تازہ اور چاک چوند ہو جائے گا۔“

رحیم داد نے انکار کر دیا۔ ”میں کچھ لگاؤں گا نہیں۔ روٹی بھی بعد میں کھاؤں گا۔ آج تو میں تجھ سے بہت ضروری گل بات کرنے آیا ہوں۔“

”اللہ وسایا نے کچھ زیادہ گڑبڑ شروع کر دی؟“

”ہاں۔“ رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”تو نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ اس کی نیت میں برائی لگتی ہے۔“

”میں نے تجھے غلط نہیں بتایا تھا۔ میرا میخبر غلط اطلاع دے ہی نہیں سکتا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے، وفادار بھی ہے۔“ احسان شاہ گردن اونچی کر کے بول رہا تھا۔ ”یہ بتانی گل کیا ہوئی؟“

”میں نے درخواست کے بارے میں پوچھا تو اس نے پہلے کی طرح اس بار بھی گول مول جواب دیا۔ کچھ بتانے کی بجائے آنکھیں نکال کر بولا۔ تو بار بار درخواست کے بارے میں کیوں پوچھتا ہے؟“

ٹھیک ہی سوچا، اسے دینے کے ساتھ لگا دوں گا۔ وہ اللہ وسایا کو ٹھکانے لگا دے گا۔“
احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے حکم دیا۔ ”دینا ابھی سوچا تو نہیں ہوگا۔ سو
بھی گیا ہو تو اسے جگا کر لے آ۔“ شیدا چلا گیا۔

احسان شاہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چوہدری! تو اس کی فکر نہ کر، اللہ وسایا کو کس طرح
صاف کیا جائے؟ کیسے اس کا کتل ہوگا؟ یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ وہ اپنی بات کتے کتے ٹھنکا۔ ”تو نے
وہ پھلا تو آتے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا جو نہر کی پٹی سے آگے پنڈی طرف مڑتے ہوئے رستے میں پڑتا
ہے۔“

رحیم داد کو وہ مختصر جنگل یاد آگیا جس کے درمیان سے ایک راستہ پیراں والہ کو جاتا تھا۔ وہ اس
راستے سے کئی بار گزرا بھی تھا۔ اس نے احسان شاہ سے کہا۔ ”بیلہ میں نے دیکھا تو ہے۔“
”تیرا کام صرف اتنا ہے، کسی طرح اللہ وسایا کو شام کا اندھیرا ہونے کے بعد ادھر اپنے ساتھ
لے کر آجا۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دے۔ تو فوراً واپس چلا جانا تاکہ تجھ پر شبہ نہ ہو۔ ویسے بھی تو ایسے
کام کے لیے کچا ہے۔ اللہ وسایا کا خون ہوتے دیکھ کر نہ جانے تیرا کیا حال بنے۔ تجھے تو جائے
واردات پر موجود ہونا ہی نہیں چاہیے۔“

”میں اسے ادھر کسی نہ کسی بہانے لے تو آؤں گا پر تجھے اطلاع کیسے پہنچاؤں گا۔ میرے پاس تو
ایسا کوئی بندہ نہیں۔ باشم اب ادھر ہی تیرے پاس رہے گا۔ ویسے میں اب اسے اپنے ساتھ رکھنا
بھی نہیں چاہتا۔“

احسان شاہ نے دریافت کیا۔ ”یہ بتا، اللہ وسایا کہاں ہے؟“

”وہ وکیل کے پاس شہر گیا ہے۔“

”تب تو اس کی واپسی کے فوراً بعد یہ کام ہونا چاہیے۔“ احسان شاہ کے لہجے میں تشویش تھی۔
”اس بار وہ کام پکا کر کے لوٹے گا۔ تجھے بے دخل کرنے کی کوشش کرے گا یا کوئی نیا چکر چلائے گا؟“
”تو نے اس کا جواب نہیں دیا، میں اللہ وسایا کو بیلے میں لے آیا تو تجھے کیسے پتہ چلے گا؟“

”اللہ وسایا دو تین روز سے پہلے تو نہیں لوٹے گا، اس لیے تو اسے جلدی نہیں لاسکے گا۔ کل تو
دینا بیلے میں جا کر دیکھے گا، کس جگہ اور کہاں گھات لگا کر بیٹھا جائے؟ پر سوں سے میں اس کی ڈیوٹی لگا
دوں گا۔ وہ ہر شام اندھیرا ہوتے ہی اپنے بندوں کے ساتھ ادھر موجود رہے گا اور اللہ وسایا کا
انتظار کرے گا۔ تو جب بھی آئے گا، دینے کو بیلے میں پائے گا۔“
”یہ ٹھیک رہے گا۔“ رحیم داد نے اتفاق کیا۔

”میں تو ہوں۔ تو کیوں فکر کرتا ہے؟“ احسان شاہ نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”ایک بار تجھ
سے یاری کر لی تو پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ہر مشکل میں تیرا پورا ساتھ دوں گا۔ آگے تجھے خود پتہ چل
جائے گا۔“

”یہ کام تو خود کرے گا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”نہیں۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”ایسے کاموں کے لیے میرے پاس کئی بندے
ہیں۔“ وہ لمبے بھر خاموش رہا۔ ”اللہ وسایا پر تو میں دینے کو لگا دوں گا۔ وہ بہت ہوشیار اور زور آور
ہے۔ تو ڈرتا ہے تو میں خود بھی موجود رہوں گا۔ تیری یاری میں ایسا بھی کر لوں گا۔“

احسان شاہ کی بات سن کر رحیم داد کو فوراً یاد آگیا۔ اللہ وسایا کے قتل میں اسے بھی شریک
کیا جاسکتا ہے۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں اس پہلو سے بھی غور کیا تھا اور اسی مقصد سے وہ
اسے اپنے ہم راہ پیراں والہ لایا بھی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل میں دارالموت ہو جائے گا
تو وہ بیگماں اور مولاداد کے قتل کی بنیاد پر اسے خوف زدہ اور ہلک میل نہیں کر سکے گا۔ پولیس سے
بچنے کے لیے سیدھا۔ خیرن جانے کی کوشش کرے گا۔ قاتل بننے کے بعد وہ اس کے لیے اتنا برا خطرہ
نہیں رہے گا۔ رحیم داد کو دارا اور اللہ وسایا دونوں سے شدید خطرہ تھا۔ وہ دونوں ہی سے چھٹکارا
حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دارا کے ہاتھوں اللہ وسایا کا قتل نہایت
کارگر حربہ تھا۔ مگر دارا سے ایسا خطرناک کام لینے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ وہ احسان شاہ کے
مشورے کے بغیر ایسا کوئی قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ ایسے کاموں کے لیے
احسان شاہ نہایت تجربہ کار اور پرانا گھاگ ہے۔ اللہ وسایا کے قتل کے لیے اسی نے رحیم داد کو
اکسایا بھی تھا۔

رحیم داد کو گہری سوچ میں دیکھ کر احسان شاہ نے پوچھا۔ ”چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”میں سوچ رہا تھا جی، میرے پاس بھی ایک ایسا ہی بندہ ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات کرنے
کی کوشش کی۔ ”پہلے وہ میرا نوکر ہوتا تھا۔ برسوں میرے پاس رہا۔ سال سوا سال سے اس نے ایک
اور زمین دار کی نوکری کر لی تھی۔ اب وہ کوئی سنگین جرم کر کے آیا ہے اور میرے ہی پاس چھپا ہوا
ہے۔ وہ اپنے کسی یار کے ساتھ۔ خیرن کی طرف نکل جانا چاہتا ہے۔ وہ اس کے لیے مجھ سے ۵ سو
روپے مانگ رہا ہے۔ اس کا نام باشم ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔“

”یہ تو نے چنگا کام کیا کہ اسے ادھر لے آیا۔ وہ تو بہت کام کا بندہ ہے۔“ احسان شاہ نے ہلکا ہنسنے
لگایا۔ ”جج پوچھ تو سنگین واردات کرانے کے لیے ایسے ہی بندوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ تو نے

ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ ساتھ دیوان خانے کے دروازے تک گیا۔ احسان شاہ کو رخصت کرنے کے بعد رحیم داد نے کھانا کھایا۔



کمرے میں لیپ روشن تھا۔ پلنگ پر صاف ستھرا بستر لگا تھا۔ باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے بھیجے جھونکے آرہے تھے۔ شیدا دہلیز پر چند لمبے خاموش کھڑا رہا پھر اس نے پوچھا۔ ”اور کوئی حکم جی؟“ رحیم داد اس کی بات کا مطلب سمجھ گیا۔ مگر اس نے کوئی فرمائش نہیں کی۔ وہ اکیلا ہی سونا چاہتا تھا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ وہ اللہ وسایا اور دارا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے شیدا کی حوصلہ افزائی نہیں کی، بے نیازی سے بولا۔ ”نہیں، میں نوں اب کچھ نہیں چاہیے۔ اب صرف سونا ہے۔“ شیدا مڑا اور برآمدے کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

سویرے ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے دارا کو بلوایا۔ تھوڑی دیر بعد وہ شیدا کے ہم راہ آیا۔ شیدا چلا گیا تو رحیم داد نے کہا۔ ”دروازہ بند کر دے۔“ دارا نے اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔ رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ دارا اس کے روبرو فرش پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”رات آرام ٹال سویا؟“

”بہت آرام ٹال سویا، روٹی بھی چنگی کھانے کو ملی۔ شاہ جی تو بہت وڈا زمین دار ہے۔ بہت شان ہے اس کی۔ حوبلی بھی بہت شان دار ہے۔ نوکروں چاکروں کی پوری پلٹن موجود ہے۔ پر جی اس کے نام سے سب کی جان نکلتی ہے۔ بہت رعب ہے اس کا۔“

”تو نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تو نہیں؟“

”وی بتایا جو تو نے کہا تھا۔“ دارا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”شیدے اور دوسرے نوکروں کو

یہی پتہ ہے، میرا نام ہاشم ہے اور میں تیرا پرانا نوکر ہوں۔“

رحیم داد نے دارا کو تینکھی نظروں سے دیکھا۔ لمبے بھر تک گھورتا رہا۔ ”تو زمیں دار اللہ وسایا سے بھی ملا تھا؟“

دارا کچھ نہ بولا۔ اس کے چہرے پر پریشانی اور گھبراہٹ چھا گئی۔

رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”چپ کیوں ہے؟ صاف صاف بتا؟“

”ملا تو تھا۔“ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ ”میں نوں تجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔“

”تو نے اپنے اور میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا، یہ ٹھیک ہے نا؟“ رحیم داد کی تیوری پر

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”اطمینان رکھ، اللہ وسایا کا کاٹنا جلد ہی نکل جائے گا۔ پر جیلہ ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔ نرمی اور پیار سے اسے جلد سے جلد کا بو کرنے کی کوشش کرنا۔“ اس نے بد معاشی سے آنکھ دبائی۔ ”جیلہ ایسی سہنی اور پھڑک دار رن مل گئی تو زندگی کا لطف آجائے گا۔ تو ابھی سے اسے اپنی گھروالی کے روپ میں دیکھنا شروع کر دے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”جیلہ کے ساتھ اس کے دس مرنے بھی تو تجھے ہیچ میں ملیں گے۔“ رحیم داد مسکرا کر رہ گیا۔

شیدا آگیا۔ اس کے ساتھ دینا بھی تھا۔ اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ کچی نیند سے بیدار ہوا ہے۔ مگر احسان شاہ پر نظر پڑتی ہی مستعدی سے ایک طرف سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے دینا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہد ری! یہ رہا دینا۔“ وہ دینا کی طرف متوجہ ہوا۔ ”دینے! اکل پیلے میں جا کر موک شوک دیکھ لیتا۔ تجھے ادھر کاروائی کرنی ہے۔ کیسے کرنی ہے اور کیا کرنی ہے، یہ میں اوکاڑے سے واپسی پر بتاؤں گا۔“

”اسے ہاشم سے بھی ملانا ہے۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

”سویرے ملا دینا! جی چاہے تو ابھی ملا دے۔“

”سویرے ہی ملا دوں گا۔“

”جیسے تیری مرضی۔“ احسان شاہ نے شیدا کی جانب دیکھا۔ ”شیدے! تو چوہد ری کے لیے روٹی فکر کا بندوبست کر دینا۔“ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہد ری! تجھے اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلف شیدے کو بتا دینا۔ آرام سے رات بسر کرنا۔“ وہ مسکرایا۔ مڑ کر شیدا اور دینا پر نظر ڈالی۔

”اب تم دونوں جاؤ۔“

دونوں خاموشی سے چلے گئے۔

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”شاہ جی! ایک گل اور ہے۔“

”کیا؟ وہ بھی بتا دے۔ صاف صاف بات کر۔“

”میں سوچ رہا تھا، آگے کیا ہو گا۔“ رحیم داد نے کھل کر کہا۔ ”پولیس بعد میں تفتیش کو آئے گی۔ مجھ سے بھی پوچھ تاچھ کرے گی۔ میں نوں ڈر لگتا ہے، جانے کیا بات زبان سے نکل جائے۔“

”میں نوں پتہ ہے، تو بہت کچا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔ ”پروانہ کوئی پولیس تیرے پاس تفتیش کے لیے نہیں آئے گا۔ ادھر کا تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ سب کام ٹھیک ٹھاک ہو گا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں کبھی کچا کام نہیں کرتا۔“ اس نے پند بولا۔ ”اب تو روٹی کھا، آرام سے سو۔ برسات کی بھیجی رات ہے۔ اکیلے کیسے سوئے گا۔ کسی رن کو بلا لیتا۔ شیدا پہنچا دے گا۔“ احسان شاہ کھڑا

مل پڑ گئے۔

”میں تو جی اسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو تجھے ڈھونڈتا ہوا پنڈ میں گیا تھا۔“ دارا نے گڑگڑا کر کہا۔ ”اس نے ایسے الٹے سیدھے سوال کیے کہ میں تو جی چکر اگیا۔ ویسے اس نے یہ بھی کہا تھا، وہ تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہے۔ تب میں نے اسے بتایا، ڈھولہ امیر خاں میں میرے گھر کے اندر بیگیاں اور مولا داد کا کیسے خون ہوا۔“

”تو نے اور کس کس سے یہ باتیں میرے بارے میں بتائیں؟“

”اور کسی سے بھی ایسی گل بات نہیں ہوئی۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ دارا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”غلط مت بول۔ کامل سے بھی تو نے ایسی ہی باتیں کی ہیں، تو نے مجھے خود بتایا تھا۔“ رحیم داد کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”اب کہتا ہے، میں نے اور کسی کو ایسی باتیں نہیں بتائیں۔“

”میں نے غلط نہیں کہا۔“ دارا نے عاجزی سے کہا۔ ”میری کامل سے جب تیرے بارے میں گل بات ہوئی تب تک تو مجھے تیرا نام بھی ملوم نہیں تھا۔ یہ بھی پتہ نہ تھا تو چوہدری ہے یا میاں، جاٹ ہے یا آرائیں۔“ وہ بہت پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس نے حلق تر کرنے کی کوشش کی۔ ”زمیں دار اللہ وسایا سے ملنے کے بعد میری کامل سے تیرے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔“ اس نے مغرب کی سمت مڑ کر دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔ ”رب دی سونہ، ان دو کے سوا تیرے بارے میں کسی سے بھی میں نے کچھ نہیں بتایا۔“

”پر اللہ وسایا سے تو نے سب کچھ بتا دیا۔“

”ہاں جی، یہ غلطی ہو گئی۔“ اس نے جھک کر رحیم داد کے پیر چڑ لیے۔ ”معافی دے دے، اب ایسی غلطی کبھی نہیں ہوگی۔“

”سیدھا بیٹھ۔“ رحیم داد نے اسے ڈانٹا۔ دارا نے اس کے پیر چھو ڈیئے اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بہت ڈرا سادہ دکھائی دے رہا تھا۔ رحیم داد گردن جھکائے سوچتا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری گردن اٹھا کر دارا کو دیکھا۔ ”تو نے اللہ وسایا کو میرے بارے میں بتا کر بہت خطرناک کام کیا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ مجھے کوئی بھائی شانی نہیں سمجھتا۔ میری اس کے ساتھ سخت لگتی ہے۔ حویلی میری ہے۔ میرے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ وہ اس میں پہلے سے رہتا تھا۔ وہ اسے خالی نہیں کرنا چاہتا۔ تیں نوں کیسہ پتہ، میرا اس کے ساتھ کیسا زبردست جھگڑا چل رہا ہے۔“

”تب تو جی، مجھ سے سخت غلطی ہو گئی۔“ دارا نے تاسف سے کہا۔ ”اب تو غلطی ہو گئی ہے، میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”جو غلطی ہو ہی گئی، اسے ٹھیک بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”کیسے جی؟“ دارا نے حیرت سے منہ پھاڑا۔

”اللہ وسایا میرے ہی لیے نہیں، تیرے لیے بھی خطرناک بن گیا ہے۔ وہ پولیس سے مخبری کر کے دونوں کو پکڑوا سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اسے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ ”اب تو ایک ہی رستہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ وسایا کو قتل کر کے خطرہ ہی مٹا دیا جائے۔“

”پر اسے کیسے قتل کیا جاسکتا ہے۔ اسے کون قتل کرے گا؟“

”تیں نوں اسے قتل کرنا ہوگا۔“ رحیم داد نے لمبے لمبے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”تو نے غلطی کی ہے، اب تو ہی اسے مٹا بھی سکتا ہے۔“

”میں نے تو جی ایسا کام کبھی نہیں کیا۔“ دارا کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ ”ویسے میں اکیلا اسے کیسے قتل کر سکتا ہوں۔ وہ تو مجھ سے بہت نکمرا اور زور آور ہے۔“

”مگر نہ کر، تو اکیلا نہیں ہوگا۔“ رحیم داد نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ ”تیرے ساتھ دینا ہوگا۔ اور بھی کئی بندے ہوں گے۔“

”تو جی یہ کام تو انھی سے کیوں نہیں کرا لیتا؟“ دارا نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”مجھ سے یہ کام نہیں ہوگا۔“

”تجھے بحرن جانا ہے یا نہیں؟“

”جانا تو ہے اور ضرور جانا ہے۔ نہ گیا تو پولیس پکڑ کر اس دفعہ بالکل میری چمڑی ادھیر ڈالے گی۔ پتہ نہیں کیا کیا ظلم کرے۔“ دارا کا چہرہ خوف اور دہشت سے مٹا لاپڑ گیا۔

”حوصلے سے کام لے۔ تو پولیس کے چکر سے بھی بچ جائے گا اور بحرن جا کر کام سے بھی لگ جائے گا۔“ رحیم داد نے اسے پھسلا دیا۔ ”تو بچ سوتا لگتا ہے، میں تجھے ہزار روپے دوں گا۔“

دارا گردن جھکا کر کچھ سوچنے لگا مگر رحیم داد نے اسے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ ”بول کیا کہتا ہے؟“

دارا نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”میں نے کرنا کیا ہوگا؟“

رحیم داد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”یہ دینا بتائے گا۔ میں تجھے اس سے ملا دوں گا۔“

”مجھ لے، اب تو اس کے ساتھ ہی رہے گا۔“

”روپیہ کب ملے گا؟“ دارا خوف اور دہشت کے حصار سے کسی قدر نکل چکا تھا۔ ہزار روپے کی چکا چوند نے اسے گہرا ہٹ اور پریشانی سے خاصا بے نیاز کر دیا تھا۔

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”واردات کے بعد سیدھا میرے پاس حویلی کے مہمان خانے میں آنا۔ ہزار روپے لینا اور رات کے اندھیرے میں چک ۳۸ پہنچ جانا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔“ رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”ٹھیک ہے جی؟“

”ٹھیک ہے جی!“ دارا کے لمبے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

”دروازہ کھول اور شیدے کو میرے پاس بلالو۔“

دارا نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو شیدا اس کے ساتھ تھا۔ رحیم داد اسے دیکھتے ہی بولا۔ ”شیدے! جا کر دینے کو ادھر لے آ۔“

تھوڑی دیر بعد شیدا کے ہم راہ دینا آگیا، ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”کیا حکم ہے جی؟“

رحیم داد نے دارا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ہاشم ہے، میرا پرانا نوکر۔ جو کام شاہ جی کل شام تین نوں بتائے گا، اس میں یہ بھی تیرے ساتھ شریک رہے گا۔“

”ٹھیک ہے جی۔“ دینا نے مستعدی سے جواب دیا۔

”تو اسے لے جا۔ اب یہ تیرے ساتھ ہی رہے گا۔“ رحیم داد نے کہا۔

دینا، دارا اور شیدا کمرے سے چلے گئے۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ سوچ چڑھ کر اوپر آگیا تھا۔ ہر طرف چمکی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا۔ شیدا اس کا منتظر تھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ حویلی کے پھانک پر پہنچا۔ اس کی گھوڑی تیار کھڑی تھی۔ رحیم داد سوار ہوا اور گھوڑی کو ایڑ لگا کر آگے بڑھ گیا۔

نہرے پہلے جنگل تھا۔ جنگل میں شیشم اور سرس کے گنجان درخت تھے۔ جنگل زیادہ وسیع نہیں تھا مگر خوب گھنا تھا۔ جنگل کے درمیان سے ایک راستہ گزرتا تھا۔ رحیم داد نے گھوڑی جنگل کے اندر داخل کی اور اس کی رفتار ست کر دی۔ درختوں کے نیچے خاصا اندھیرا تھا۔ احسان شاہ کی ہدایت کے مطابق اللہ وسایا کو پیس لانا تھا۔ رحیم داد نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ درختوں میں پرندے چہچہا رہے تھے۔ مگر تنہائی اتنی شدید تھی کہ ٹھن محسوس ہوتی تھی۔ اس نے گھوڑی کی رفتار تیز کی اور جنگل سے نکل گیا۔ آگے کھلا میدان تھا۔ پمکلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ نہر کے قریب پہنچا۔ آگے پلایا تھی۔ رحیم داد نہر کے کنارے کنارے گھوڑی دوڑاتا کوئلہ

ہر کشن پہنچ گیا۔ مہمان خانے میں داخل ہوا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔

”آج واپسی میں بہت دیر کی کر دی۔ بتا کر بھی نہیں جاتا۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اللہ وسایا آگیا؟“

”نہیں جی، ابھی نہیں آیا۔“

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ تیز دھوپ میں سفر کرنے سے اس کا جسم شرابور ہو رہا تھا۔ وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ نمدھو کر نکلا تو تازگی اور فرحت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت وہ دھوئی باندھے ہوئے تھا اور اس کے اوپر صرف بنیان تھی۔ وہ تھکا ہوا سا بستر پر دراز ہو گیا۔

دوپہر کو وہ کھانا کھانے بیٹھا تو دھوپ غائب ہو چکی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ شام کو بارش قدرے تیز ہو گئی۔ رحیم داد کمرے سے باہر نہ جاسکا۔ رات کا کھانا بھی اس نے کمرے میں کھایا۔ پہر رات گزری تو بارش بند ہو گئی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے لیکن ہوا بند تھی۔ کمرے میں جس تھا۔ رحیم داد کی ہدایت پر احمد نے پلنگ اٹھا کر صحن میں بچھا دیا۔ اس پر بستر بھی لگا دیا۔

رحیم داد بستر پر نہیں لیٹا۔ تمام دن کمرے میں پڑے رہنے سے اکتا گیا تھا۔ وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ اس کا ارادہ کچھ دیر چل قدمی کرنے کا تھا مگر دور تک نہ جاسکا۔ راستوں میں جگہ جگہ بارش کو پانی کھڑا تھا۔ کچھ بھی تھی اور ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ واپس مہمان خانے میں آیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ رات گئے تک اسے نیند نہیں آئی۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرناک منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا جو اللہ وسایا کے قتل کے لیے احسان شاہ نے تیار کیا تھا۔ اس میں اسے اہم کردار ادا کرنا تھا۔

اس کے تصور میں بار بار اللہ وسایا سامنے آکر کھڑا ہو جاتا۔ اس کے دودھ ضخ روپ تھے۔ ایک اللہ وسایا وہ تھا، جس نے اسے سہارا دیا تھا، پناہ دی تھی۔ اگر اللہ وسایا پناہ نہ دیتا تو عین ممکن تھا کہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا۔ گرفتاری کے بعد اس کے خلاف جیل سے فرار ہونے اور سیف اللہ، حکیم نذر محمد چشتی، چوہدری نور الہی اور مولا داد کے قتل کے الزام میں مقدمہ چلتا اور پھانسی کے پھندے پر لٹکا کر موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ یہ اللہ وسایا، مہمان اور شفیق تھا۔ اس نے نہ صرف اسے سزائے موت سے بچا رکھا تھا بلکہ اپنی کوششوں سے اس کے نام حویلی کے ساتھ ساتھ دس مرتبے بھی الاٹ کروائے تھے، اسے بڑا زمین دار بنادیا تھا۔ دوسرا اللہ وسایا وہ تھا جو دارا سے مل کر نہایت خطرناک بن گیا تھا۔ وہ کسی بھی وقت پولیس سے جبری کر کے اسے تختہ دار تک

بادل ایک بار زور سے گرجے اور بوند باندی شروع ہو گئی۔ بارش سے بھیگے ہوئے جھونکے کھڑکی کی راہ سے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد احمد ہمراہ گھرانے میں صرف لسی کا ایک گلاس لایا۔

رحیم داد نے اسے جیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو سویرے سے اب تک کہاں تھا؟“ وہ دانت نکال کر ہنستے ہوئے بولا۔ ”زمین دارنی نے آج ساؤنی منائی ہے۔“ اس نے باورچی خانے کی جانب ہاتھ اٹھایا۔ ”ادھر پکوان پک رہا ہے۔ تو ابھی صرف لسی پی لے ورنہ پکوان کھانے کا مزا نہیں آئے گا۔“

رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھر کر دریافت کیا۔ ”زمین دار ابھی تک نہیں لوٹا؟“ ”نہیں جی! وہ ابھی تک تو آیا نہیں پر زمین دارنی ادھر باغ میں ساؤنی مٹا رہی ہے۔ درختوں میں جھولے ڈالے ہیں۔ گانے ہو رہے ہیں۔ آج تو جی زبردست جشن رہے گا۔“

”تو ادھر نہیں گیا؟“ رحیم داد نے مسکرا کر استفسار کیا۔

”میں نوں اتھے جا کر کیکہ لینا؟ ادھر تو جی سب زنانیاں ہی ہیں۔“

رحیم داد نے لسی پی کر گلاس خالی کر دیا۔ احمد نے گلاس اٹھایا اور باہر چلا گیا۔ باغ کی سمت سے گانے اور قہقروں کی آوازیں مسلسل بلند ہو رہی تھیں۔ باورچی خانے سے اٹھتے ہوئے دھویں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو فضا میں بکھرتی جا رہی تھی۔ بارش رفتہ رفتہ تیز ہو گئی۔ اب موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ ان کی آواز کمرے کی چھت پر صاف سنائی دے رہی تھی۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بارش بڑھتی جا رہی تھی۔

کس قریب ہی زور کے قہقے بلند ہوئے۔ رحیم داد اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اس نے باغ میں جھک کر دیکھا۔ دائیں ہاتھ کو گل چاندنی کی گھنی جھاڑی کے پیچھے جیلہ دبک کر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھ لیا تھا تاکہ اس کی ہنسی نہ ابھرے۔ مگر اس کے چہرے پر شونہ اور مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ انگ انگ تازہ مچھلی کے مانند پھڑک رہا تھا۔ جھاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر درختوں تلے گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گانے والیاں اونچے سروں میں بار بار گیت کا یہ بول الاپ رہی تھیں۔

گدھے دے پیرے نی!

تیرے روپ نے پایاں دھاماں!

گیت کے اس بول کے ذریعے گانے والیاں جیلہ سے براہ راست مخاطب تھیں۔ ”اے رقص

پہنچا سکتا تھا۔ وہ مختلف جھکنڈوں سے حویلی اور زمین دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد ایک بار بڑا زمین دار بن جانے کے بعد دوست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اللہ وسایا کے ساتھ جیلہ بھی تھی۔ اس کی دل کشی اور رعنائی سے وہ پہلے ہی روز سخت متاثر ہوا تھا۔ اسے اینانے کی خواہش سینے میں کبھی کبھی ہو کر اٹھتی وہ بے قرار ہو جاتا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ دورا ہے پر کھڑا ہے اور یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ کون سا راستہ اختیار کرے؟ اللہ وسایا کے قتل کا خیال دل سے نکال دے، کوئلہ ہر کشن چھوڑ دے اور رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا کسی طرف نکل جائے یا احسان شاہ سے ساز باز کر کے اللہ وسایا کو راستے سے ہٹا دے؟ اس خطرے سے خود کو محفوظ کر لے جو اللہ وسایا کی جانب سے اسے لاحق تھا۔ اپنی زمیں داری برقرار رکھے اور جیلہ سے نکاح پڑھوا کے اس کے بارہ مرتبے بھی اپنے قبضے میں کر لے۔ عیش و آرام سے زندگی بسر کرے؟ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی مگر صبح ہونے سے پہلے پھر بارش شروع ہو گئی۔ احمد نے اس کا پٹنگ اٹھا کر کمرے میں ڈال دیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد سو گیا۔



برسات کی بھیگی، بھیگی صبح تھی۔

رحیم داد کمرے سے باہر نکل کر صحن میں گیا۔ احمد موجود نہیں تھا۔ آسمان پر اودی اودی گھٹائیں تھیں۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ بار بار کوئی تیز جھونکا آتا اور سرسراتا ہوا گزر جاتا۔ موسم بڑا سانا تھا۔ فضا میں فرحت اور شگفتگی رچی ہوئی تھی۔ حویلی کا باورچی خانہ زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ ادھر سے ملی جلی آوازوں کے ساتھ پکوان کی تیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ غسل خانے میں گیا، باہر آیا اور کمرے میں پہنچ کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ اسے باغ کی جانب سے نسوانی قہقروں کے ساتھ ساتھ ڈھولک کی تھاپ پر گانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔

وہ اس کھڑکی پر پہنچا، جو باغ کے ایک گوشے میں کھلتی تھی مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ کچھ فاصلے پر آم اور جامن کے اونچے اونچے درخت تھے۔ رحیم داد ذرا ترچھا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ درختوں میں جھولے پڑے ہیں۔ گاؤں کی نوجوان میاںیں اونچے سروں میں لمک لمک کر گاری ہیں۔ ان کی سرلی آوازوں میں جیلہ کی آواز بھی شامل تھی۔ رحیم داد نے اس کی آواز پہچان لی اور جھک کر دیکھا۔ درختوں کے جھنڈ کے نیچے اسے جیلہ کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ جھولے پر لمبے لمبے پینگ لے رہی تھی، گاری تھی اور رک رک کر قہقے بھی بلند کر رہی تھی۔

کرنے والی حسینہ! تیرے حسن اور رعنائی نے دھاک بٹھادی ہے۔ ”رحیم داد نے جیلہ کی جانب دیکھ کر سوچا، گانے والیاں ٹھیک ہی کہہ رہی ہیں۔ جیلہ اس وقت گمراہ سبز لاچا باندھے ہوئے تھی۔ اس کے اوپر نصف آستینوں کی اودی کرتی تھی۔ گورے گورے سڈول بازوؤں پر ہاتھی دانت کا چوڑا تھا۔ پیروں میں چاندی کی پازیب تھی۔ بالوں میں نلے کا سرخ اور سنہرا پرانہ تھا جس سے اس کی چوٹی کی لمبائی بڑھ گئی تھی اور کمر کے نیچے جھول رہی تھی۔ اوڑھنی بھاگ دوڑ میں کہیں گر گئی تھی۔ رم جھم بارش میں اس کا پورا بدن پانی سے اس طرح شرابور تھا کہ لباس جسم کے ساتھ پیوست ہو گیا تھا۔ اس کے شفاف اور گلابی بدن کے پیچ و خم سنگ مرمر کے ترشے ہوئے مجسمے کے مانند ابھر کر نمایاں ہو گئے تھے۔

رحیم داد نے جیلہ کو اس عالم میں دیکھا تو زرب اٹھا۔ اس نے بے قرار ہو کر سوچا، ”احسان شاہ ٹھیک ہی کہتا ہے، جیلہ کو اس کے قبضے میں ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر نہ وہ زمیں دار بن سکتا ہے نہ ہی زمیں داری کا مزا آئے گا۔“

رحیم داد نے تصور میں پہلی بار اسے اپنی بیوی کی حیثیت سے دیکھا۔ اس کی سانس تیز ہو گئی، دل کی دھڑکن بڑھ گئی اور وارفتگی سی طاری ہو گئی۔ وہ مہسوت ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ اس کے نرم اور گداز جسم کی حرارت اور خوشبو اس نے اپنے قریب، بہت قریب پائی۔ یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

مگر جیلہ اس کی بے قراری اور احساسات سے بے نیاز الھزدو شیزہ کی طرح شوخی سے مسکراتی گل چاندنی کے پودوں کے ساتھ چٹنی کھڑی تھی۔ اس کے دل آویز چہرے پر بکھرا ہوا تبسم دم بدم بڑھتا گیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی کی جھنکار سننے ہی گانے والیاں قہقہے بلند کرتی ہر طرف سے اس کی جانب بڑھیں۔ سب ہی نوجوان، تن درست اور چنچل تھیں اور بارش کے پانی سے شرابور تھیں۔ قریب پہنچ کر وہ ٹھٹھا مار کر نہیں۔ انھوں نے بڑھ کر جیلہ کا بازو پکڑا، اسے آگے کھینچا۔

وہ تملٹائی اور شرما کر سر جھکا لیا۔ وہ سب اس کے گرد حلقہ بنا کر پہلے چٹکیاں بجاتی رہیں پھر دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر تالیاں بجانے لگیں۔ رفتہ رفتہ تالیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوتی گئی۔ ساتھ ساتھ ان کے جسم ڈولنے اور گردش کرنے لگے۔ وہ اپنے بازو اور گردن پکڑتی، کمر کو خم دیتی اسے گھیرے میں لے کر رقص کرنے لگیں۔ رقص کرتے کرتے انہوں نے تالیوں کی تھاپ پر ایک گیت چھیڑ دیا۔

اس دفعہ بھی، وہ جیلہ سے مخاطب تھیں اور اسے خاموش پا کر شوخی سے چھیڑ رہی تھیں۔ ”سکھی گدھاناچ لے، ساون روز روز نہیں آتا۔“ جیلہ گیت کے بول سن کر ذرا دیر تو چپ چاپ کھڑی رہی، پھر وہ بھی ہاتھ اٹھا کر تالیاں بجانے لگی۔ اس نے اپنے جسم کو جھٹکے کے ساتھ لہرایا اور تالیوں کے تال پر رقص کرنے لگی۔ مینہ چھما چھم برس رہا تھا۔ ہوا فرائے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ بادل گرہتے رہے۔ رقص تیز اور تیز ہوتا گیا۔

رحیم داد کھڑکی سے لگا، دم بخود کھڑا تھا۔ اس کی بے تاب نگاہیں جیلہ پر جبی ہوئی تھیں جس کا ترشا ہوا بدن تیز بارش سے بھیگ کر اور نمایاں ہو گیا تھا۔ وہ نوجوان میاروں کے حلقے میں سب سے زیادہ حسین اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد اسے تکیھی اور بھوک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس پر محویت طاری تھی۔ یکایک اس نے اپنے کندھے پر کسی کے ہاتھ کی حرارت محسوس کی۔ چونک کر پلٹا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے سراپہ ہو کر اسے دیکھا پھر سراپسگی پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ ”کب واپس آیا اللہ وسایا؟“

”تھوڑی ہی دیر پہلے لوٹا ہوں۔ سیدھا تیرے پاس چلا آیا۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”تجھے دیر سے کھڑا دیکھ رہا تھا تو کھڑکی سے لگا ایسا ہکا بکا کھڑا تھا کہ تجھے پتہ نہ چلا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”زنانیوں کو ساوئی مناتے دیکھ رہا تھا۔“

رحیم داد نے اللہ وسایا کے لمبے میں ہلکا ہلکا طفر محسوس کیا۔ اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”اکیلے بیٹھے گھبرا رہا تھا۔ اٹھ کر کھڑکی پر چلا گیا۔“

اللہ وسایا نے کھڑکی سے لگ کر دیکھا۔ باغ میں جیلہ نوجوان عورتوں کے ساتھ تالیاں بجا رہی تھی، ناچ رہی تھی، گارہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی، بارش میں بھیگ رہی تھی۔ ساون کا لطف اٹھا رہی تھی۔ اللہ وسایا نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا اور ہنس کر بولا۔ ”جیلہ کو دیکھ رہا ہے۔ اسے تو ایسے ہی کھیل تماشوں میں مزا آتا ہے۔ کس طرح خوشی خوشی ناچ رہی ہے۔“ اس کے چہرے پر یکایک سنجیدگی چھا گئی۔ ”مزارعوں کے گھروں کی زنانیاں اور میاریں ہوں، تب بھی ٹھیک ہے۔ پر کیوں اور لاگیوں کی زنانیوں کے ساتھ ناچتے گاتے، ذرا بھی تو نہیں سوچتی کہ وہ زمیں دارنی ہے۔ اس کی انہی حرکتوں پر آس پاس کے سارے زمیں دار مجھ سے خار کھاتے ہیں۔“

”ویسے برا ماننے کی تو گل ہے جی! زمیں دارنی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ تو زمیں داری کی شان رکھنا چاہیے۔“

”منع کرتا ہوں پر وہ کہاں سنتی ہے۔ ہر یاری کی کتنی ہے تو زمیں دار ہے تو زمیں داری اور اس کی نور اپنے ساتھ رکھ‘ میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ چوہدری! ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے‘ میں اور وہ کوئی الگ تو نہیں ہیں۔“

اللہ وسایا کھڑکی سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ باغ میں شوخ اور چیخلی قہقہوں اور تالیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مینہ رم جھم رم جھم برس رہا تھا۔ بادل زور زور سے گرج رہے تھے۔ احمد دونوں کمرے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے میزاٹھا کر اللہ وسایا اور رحیم داد کے درمیان رکھی اور اس پر طرح طرح کے پکوان چن دے۔ ان میں بھلے اور پکڑے تھے۔ پوریاں تھیں۔ باجرے اور مکئی کی میٹھی روٹیاں تھیں۔ ڈوڈا تھا۔ سوچی کا حلوہ تھا۔ طرح طرح کے ساگ تھے۔ بھابی تھی۔ اچار، رائتا، چٹنی، سبھی کچھ تھا۔ پکوان چٹ پٹا بھی تھا، نمکین بھی تھا، میٹھا بھی تھا۔ سادنی کی خاص سوغات، دودھ اور خربوزے کی کھیر بھی تھی۔ باہر سے اونچے سروں میں گانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

سادن کھیر نہ کھاری تا

کیوں لی تہیں اپرا دھیا!

اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا، مسکرا کر بولا۔ ”سن رہا ہے چوہدری! باہر زنانیاں کیا گارہی ہیں؟“ اس نے کھیر کی طرف اشارہ کیا۔ ”پہلے اسے کھا۔“ باغ میں لٹک لٹک کر گانے والیاں بھی گیت کے بولوں میں کہہ رہی تھیں۔ ”سادن میں بھی تو نے کھیر نہیں کھائی۔ ایسی زندگی کا کیا مزا۔“ دونوں کھلکھلا کر بے تکلفی سے ہنسے۔ انھوں نے پہلے کھیر کھانا شروع کی۔ پکوان ڈھیر سارا تھا۔ ساتھ ہی پیتل کی بڑی بالٹی تھی جس میں اوپر تک آم بھرے تھے۔

اللہ وسایا نے کھیر کھاتے ہوئے رحیم داد سے پوچھا۔ ”میرے پیچھے ادھر دارا تو نہیں آیا؟“

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود پر قابو پایا۔ ”میں نے تو اسے دیکھا نہیں۔ آیا بھی ہوگا تو زمیں داری کو پتہ ہوگا۔ میرے پاس نہیں آیا۔ آئے گا بھی نہیں۔“ اس کے لہجے میں تنہائی کا عنصر غالب تھا۔

اللہ وسایا چند لمحے خاموش رہا۔ باغ میں قہقہے اور گانے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اللہ وسایا نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ قدرے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”جی جی بتا، تو نے جس زنانی کو ڈھولا امیر خاں میں کتل کیا تھا، اس سے تیری یاری تھی؟“

”میں نے کسی کو کتل نہیں کیا۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

ڈھٹائی سے کہا۔ ”میں تیرے ساتھ اتنے دنوں سے ٹھہرا ہوں۔ میں نوں پتہ ہے، میں نے ادھر کتنی زنانیوں سے یاری لگا رکھی ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نوں پتہ ہے، تو ایسا بندہ نہیں۔ برائی زیادہ دن نہیں چھپتی، سامنے آتی جاتی ہے۔“ اللہ وسایا نے اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا۔ ”پردار انے تیرے بارے میں ایسی گل بات کیوں کہی؟“ اس نے لسی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ ”میں نوں ٹھیک ٹھیک بتا، اصلی گل کبہ ہے؟“

رحیم داد کو پورا پور یقین تھا کہ اب اللہ وسایا سے دارا کی ملاقات کا کوئی امکان نہیں لہذا وہ شیر ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ٹھیک گل تو دارا کو سامنے بٹھا کر ہی ہوگی۔ تو نے بھی پہلے یہی کہا تھا۔ اسے آنے دے، تبھی میں اس معاملے میں گل بات کروں گا۔ تجھے بھی پوری طرح پتہ چل جائے گا، میرے بارے میں اس نے تجھ سے جو کچھ کہا ہے، اس میں کتنی سچائی ہے۔“

”ٹھیک ہے، اس کے آنے ہی پر گل بات ہوگی۔“ اللہ وسایا نے بات آگے بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے روپے میں کسی قسم کی تنہائی یا کدورت نہیں تھی۔

دونوں اطمینان سے پکوان کھاتے رہے۔ اللہ وسایا سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بالٹی سے چھانٹ کر اس نے ایک آم نکالا اور چوسنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے جیلہ کا چہرہ ابھرا۔ ہچکے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے اس کے شفاف گلابی رخساروں پر ٹپک کر ٹپکتے جا رہے تھے۔

جیلہ نے شوخ نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا، مسکرا کر پوچھا۔ ”تو آگیا اللہ وسایا؟“ اللہ وسایا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا، اس کا پانی سے شرابور جسم دیکھا۔ قدرے تھکے لہجے میں بولا۔ ”میں تو کب کا آگیا، پر تو کب تک ساؤنی مناتی رہے گی؟ دیکھ تو پانی سے کتنی بھگ گئی ہے۔ ختم کر یہ رنگ رنگیاں۔ جا کر کپڑے بدل۔ بیمار پڑ جائے گی۔“

”ارے ارے۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”تو اپدیشک کب سے بن گیا۔“ اس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ ”سادن روز روز نہیں آتا۔ ایک روز توجی بھر کر ساؤنی منالینے دے۔“

”میں تو تیرے ہی بھلے کی کہہ رہا ہوں۔“ اللہ وسایا نے پیار سے کہا۔

”میرے بھلے کی چھوڑ۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ ”لا مجھے ایک آم تو دے دے۔“

اللہ وسایا نے جھٹ بالٹی میں ہاتھ ڈالا۔ ایک آم نکالا، کھڑکی کے نزدیک گیا۔ آم جیلہ کی طرف بڑھایا۔ جیلہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”یہ نہیں۔“ اس نے ہاتھ آگے کیا اور اللہ وسایا کے ہاتھ سے وہ آم اچک لیا جو وہ چوس رہا تھا۔ جیلہ نے آم چوستے ہوئے محبت سے اللہ وسایا کو دیکھا اور

ٹھکی ہوئی ہوتی۔ شام کو وہ عام طور پر اسکول یا ڈپنٹری کے سلسلے میں کسی نہ کسی سے بات چیت میں مصروف ہوتی۔ کیر والے واپسی کے بعد اس نے جیلہ کو جس وقت بھی دیکھا، وہ مصروف نظر آئی۔ ان دنوں اس پر ڈپنٹری قائم کرنے کی دھن سوار تھی۔ ڈپنٹری کی تعمیر کا کام اس نے شروع کر دیا تھا مگر بارش کے باعث ملتوی کرنا پڑا۔ رحیم داد بھی اس عرصے میں دارا کے باعث ذہنی طور پر بہت پریشان رہا۔

وہ مہمان خانے سے نکلا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور دھوپ بہت تیز تھی۔ وہ کچڑ اور پانی سے بچتا بچتا کچھ دور گیا پھر واپس آگیا۔

شام کو رحیم داد باغ میں پہنچا۔ ہرے بھرے درخت اور پودے بارش کے پانی سے دھل کر نکھر گئے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی، ہریالی ہی ہریالی نظر آتی۔ بادل چھٹ چکے تھے۔ شام کے ہلکے ہلکے دھندلکے میں گھرے نیلے آسمان پر کہیں کہیں تارے ٹٹمٹماتے لگے تھے۔ رحیم داد کو باغ میں بیٹھنے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اللہ وسایا آگیا۔

اللہ وسایا کے چہرے سے پریشانی نپک رہی تھی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد بولا۔ ”اللہ وسایا تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔“
”میری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے۔“ اللہ وسایا نے بتایا۔ ”پر جیلہ کو سخت بخار ہے۔ ویسے طبیعت تو اس کی سویرے سے گزرتی تھی۔ خود ہی دوا دارو کرتی رہی۔“
”اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟“

”بہت تیز بخار ہے۔ اس روز ساؤنی مناتی رہی اور بارش میں بھیگتی رہی۔ تیرے سامنے ہی میں نے منع بھی کیا تھا، پر وہ میری سنتی ہی کب ہے۔ اب بخار میں بھن رہی ہے۔ سر میں درد اتنا ہے کہ بار بار سر ادا دھرا دھرتی ہے۔“

”اب تو شام ہو گئی۔ برکھا سے رستے بھی خراب ہو گئے ہیں۔ پاک چین جانا اور ڈاکٹر خاں کو لانا تو بہت مشکل ہو گا۔“

”یہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔“ اللہ وسایا بولا۔ ”پر کسی ڈاکٹر حکیم کو تولانا ہی پڑے گا۔ جیلہ کی طبیعت بہت گزبہ ہو رہی ہے۔“ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ ”سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔“

”لگتا ہے، زمیں دارنی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔“

”مارا، ابا، بالکل پیلی پڑ گئی ہے۔ بخار سے سارا بدن جل رہا ہے۔ ہائے ہائے کر رہی ہے۔“

”آٹھیں نچا کر بولی۔“ بہت مزے دار ہے۔“ وہ کھکھلا کر ہنسی اور آم چوستی ہوئی دور چلی گئی۔ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر نفرت اور دکھ کے طے جلے تاثرات تھے۔ اس نے جیکھی نظروں سے اللہ وسایا کو دیکھا، جو رحیم داد کے احسانات سے بے نیاز کھڑکی کے نزدیک کھڑا جیلہ ہی کی سمت دیکھ رہا تھا۔ وہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ رحیم داد آہستہ سے کھنکرا۔ اللہ وسایا نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا، زیر لب مسکرایا، بالٹی سے ایک آم نکال کر چوستے ہوئے بولا۔ ”تو نے آم نہیں کھائے؟“

اللہ وسایا آہستہ آہستہ قریب آیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں بالٹی سے آم نکال نکال کر چوستے لگے۔ آم میٹھے اور خوش ذائقہ تھے۔ انھوں نے خوب سیر ہو کر کھائے۔ آموں سے فارغ ہو کر دونوں نے گلاس بھر بھر کر دودھ پیا۔ نوکر بچا ہوا پکوان اور کھانے پینے کی دوسری اشیا اٹھا کر لے گئے۔ اللہ وسایا پر سفر کی تھکن کا غلبہ ہوا۔ اس کی آنکھیں بند ہو جھل ہو گئیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری میں نوں اب آرام کرنا ہے، بہت تھک گیا ہوں۔“ وہ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بھی کرسی سے اٹھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ باغ میں رم جھم برستی ہوئی بوندوں کے مدھم آہنگ کے ساتھ ساتھ نوجوان عورتوں اور لڑکیوں کے جھنکارتے قہقہے اور سریلے گیتوں کے بول ابھر رہے تھے، ڈوب رہے تھے۔ کبھی شور، کبھی خاموشی۔ شور اور خاموشی کے درمیان رحیم داد کا ذہن ڈولتا رہا، جیلہ کی آواز ٹٹولتا رہا، بچپنا رہا، پھر وہ سو گیا۔

اس کی آنکھ کھلی تو شام ہو چکی تھی۔ بارش ابھی بند نہیں ہوئی تھی۔ احمد نے کمرے میں لیپ روشن کر دیا تھا۔ دوپہر کو اتنا کھا چکا تھا کہ رات کے کھانے کی اسے کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس نے صرف لی کا گلاس پیا اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ مچن میں گرتی ہوئی بارش کی بوندوں کی جھل جھل کے تیز جھونکوں سے لہرا رہی تھی۔

رات بھر بارش ہوتی رہی۔ مینہ کی ایسی جھڑپے لگی کہ دو روز تک آسمان پر بادلوں کی سرمی چادر پھیلی رہی۔ تیسرے روز سہ پہر کو بادل ذرا چھٹے۔ ان کے درمیان سے شیشے کی طرح جھلکتا ہوا نیلا نیلا آسمان نظر آنے لگا۔ بارش بند ہو چکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد بادلوں سے دھوپ جھانکنے لگی۔



رحیم داد مسلسل بارش کے باعث کہیں جا نہیں سکا تھا۔ تمام وقت کمرے ہی میں رہا۔ اس عرصے میں اللہ وسایا سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ جیلہ سے تو اور بھی زیادہ عرصے سے نہیں مل سکا تھا۔ وہ سویرے سویرے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کو اپنے دونوں بچوں کے ساتھ لوٹتی تو بہت

اللہ وسایا گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کے بشرے سے شدید پریشانی جھلک رہی تھی۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔ برسات کی بھیگی بھیگی شام سرمئی پڑ گئی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے درختوں کے درمیان سے گزرتے۔ سرسراہٹیں ابھرتیں، ہلکی ہلکی سیٹیاں بچتیں۔ سانوں سلونی شام نگلتا رہی تھی۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ چند لمحوں کا چہرہ نکلتا رہا۔ اس نے کھنکار کر مگھا صاف کیا۔ اللہ وسایا کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”اللہ وسایا! ادھر عالم پور کے نزدیک ایک پنڈ میں حکیم ہے۔ شکور، اس کی بہت تعریف کرتا ہے۔ ایک بار مجھے بھی اس کے پاس لے گیا تھا۔ بیٹ میں کچھ گزربڑ تھی۔ بار بار سخت مروڑا اٹھتی تھی۔ رات بھی زیادہ ہو چکی تھی، درد سے نیند ہی نہیں آتی تھی۔ یہ ان دنوں کی گل ہے، جب تو شریفان کے دیہ میں شرکت کرنے کھیل پوز گیا تھا۔ حکیم کی دوائی سے میں فوراً چنگا ہو گیا تھا۔ ایسا آرام ملا کہ سویرے دیر تک سوتا رہا۔“

”کتنی دور ہے وہ پنڈ جہاں حکیم رہتا ہے؟“

”بچ جیسے میل سے زیادہ دور نہ ہو گا۔“

”فاصلہ تو کوئی زیادہ نہیں۔“ اللہ وسایا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔ ”پر حکیم رات کو یہاں آ بھی جائے گا؟“

”ضرور آجائے گا۔ ابھی تو شام ہے، ویسے وہ بہت نیک بندہ ہے۔ میں تو اس کے پاس آدمی رات کو گیا تھا۔ اس نے نکھرا شکرا نہیں کیا۔ شکور نے ہانک لگائی تو جھٹ باہر آگیا۔ بہت پیار سے حال پوچھا، نبض دیکھی اور دوائی دے دی۔“

”تو کتا ہے تو اس کو لے آتے ہیں ورنہ رات میں جیلہ کی طبیعت اور زیادہ گزربڑ ہو جائے گی۔ تین نوں پتہ نہیں، میں اس کی حالت دیکھ کر کتنا پریشان ہوں۔“

”وہ تو تیرا منہ دیکھ کر ہی پتہ چل رہا ہے فکر نہ کر۔ حکیم کی دوائی سے تیری گھروالی بالکل چنگی ہو جائے گی۔“

”حکیم کے پاس ہی چلتے ہیں۔“ اللہ وسایا کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اللہ وسایا نے کہا۔ ”چوہدری! تو میرا انتظار کر۔ میں ذرا جیلہ کا حال معلوم کر لوں۔ حکیم پوچھے گا تو کیا بتاؤں گا۔“

رحیم داد نے چونک کر اللہ وسایا کو دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جیلہ کو یا کسی کو بھی یہ پتہ نہ چلے کہ وہ اس کے ساتھ گیا ہے۔ اس نے فوراً اللہ وسایا کو منع کیا۔ ”زمین دارنی کو نہ بتانا کہ تو میرے ساتھ

حکیم کو لینے جا رہا ہے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں، وہ حکیم سے علاج کرائے پر راضی نہیں ہوگی۔ وہ تو ڈاکٹری علاج ہی کو مانتی ہے۔“

”کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے تو۔“ اللہ وسایا نے اتفاق کیا۔

رحیم داد نے مشورہ دیا۔ ”اسے تو یہی کہنا ہے، پاک پتن سے ڈاکٹر خان کو لینے جا رہا ہے۔“

”پر جب ڈاکٹر کی بجائے میں حکیم کو لے کر پنچوں گا تو کیا ہو گا؟ یہ بھی تو سوچنا پڑے گا۔“

”تب کی تب دیکھی جائے گی۔“ رحیم داد نے اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”ابھی سے کیوں پریشان ہو رہا ہے؟ کہہ دینا، ڈاکٹر نہیں ملا۔ حکیم کو لے آیا ہوں۔ تو ابھی اس کی دوائی پی لے۔ سویرے ڈاکٹر کو بلوالوں گا۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے، حکیم حال سن کر ہی دوائی دے دے اور اسے لانا نہ پڑے۔“

”یہ ٹھیک ہے۔ حکیم دوائی دے دے تو ٹھیک ہے۔ اسے یہاں لانے میں تو دوائی لینے اس کے ساتھ دوبارہ جانا پڑے گا۔ ڈاکٹروں کی طرح حکیم اپنے ساتھ دوائیاں تو رکھتے نہیں۔ حکیم کو تو لانے کی بجائے حال بتا کر دوائی لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آگے اس کی مرضی۔ جیسا وہ کہے گا، کیا جائے گا۔“

اللہ وسایا حویلی کی جانب بڑھا۔ ”میں جلد ہی واپس آتا ہوں۔“

”میں نہر پر تیرا انتظار کروں گا۔“ رحیم داد بہت محتاط تھا۔ ”میں گھوڑی لے کر اسی طرف جا رہا ہوں۔“

”ذرا دیر صبر کر لے، میں جلد ہی آ جاؤں گا۔“ اللہ وسایا نے اصرار کیا۔

”میں کب کہہ رہا ہوں تو جلدی نہیں آئے گا۔“ رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ ”ادھر ہی آجائے گا تو کیا حرج ہو گا۔ یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے جی گھبرائے گا۔ پہلے ہی بارش کی وجہ سے کئی روز سے کمرے میں اکیلا پڑا ہوں۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ اللہ وسایا نے ضد سے کام نہیں لیا۔ آگے بڑھ گیا۔

رحیم داد اصطبل کی جانب بڑھا، گھوڑی نکالی۔ اس پر سوار ہوا اور تیزی سے دوڑاتا ہوا نہر کی جانب روانہ ہو گیا۔ نہر میں پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ شام کا سرمئی دھندلکا ہر طرف پھیلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد نے نہر کے قریب پہنچ کر گھوڑی روک لی اور اللہ وسایا کا انتظار کرنے لگا۔

مگر اللہ وسایا جلدی نہیں آیا۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ اللہ وسایا کے آنے میں دیر ہوئی تو رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ پندرہ سولہ منٹ گزرے ہوں گے کہ دور سے گھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ٹاپیں

رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئیں۔ اللہ وسایا ایک جھنڈ کی آڑ سے گھوڑی دوڑاتا ہوا نکلا۔ قریب پہنچ کر اس نے معذرت کے انداز میں کہا۔

”معاف کرنا چوہدری مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“

”میں نوں پتہ تھا تو جلدی نہیں آئے گا۔ زمیں دارنی نے روک لیا ہوگا۔“

”تو نے ٹھیک سوچا۔“ اللہ وسایا ہنسنے لگا۔ ”جیلہ نے روکے رکھا۔ بار بار کستی تھی اندھیرا ہو گیا، اس سے نہ جا۔ سویرے ڈاکٹر کو لے آنا۔ میں دیر تک اسے سمجھاتا رہا، تب اس نے آنے دیا۔“

رحیم داد نے دیکھا اللہ وسایا کے آگے بندوق رکھی ہے۔ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”تو بندوق کس لیے لے آیا؟“

”اندھیرا بھی بڑھ گیا ہے اور آگے احسان شاہ کا پنڈ ہے۔ تیں نوں پتہ ہے، اس سے میزی پرانی لگتی ہے۔ اس طرف رات کو مسلح ہو کر ہی چلنا چاہیے۔“ اللہ وسایا نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”زمیں دارنی نے بندوق لے جانے کو کہا ہوگا؟“ رحیم داد نے اللہ وسایا کو ٹٹولا۔

”اسے تو میں نے بتایا ہی نہیں کہ اس طرف جانا ہے۔“ اللہ وسایا نے وضاحت کی۔ ”اسے تو میں نے یہی بتایا، ڈاکٹر خاں کو لینے پاک پتن جا رہا ہوں۔“

”تو ادھر آنے کو کہتا تو وہ تجھے ضرور روک لیتی۔“

”بالکل۔“ اللہ وسایا نے تائید کی۔ ”رات کو تو وہ مجھے ہرگز اس طرف نہ جانے دیتی۔“

دونوں نے اپنی اپنی گھوڑی کو ایڑ لگائی اور نہر کے کنارے کنارے گھوڑیاں دوڑانے لگے۔ کچھ اور اندھیرے کے باعث وہ بہت محتاط نظر آ رہے تھے۔ جھٹ پٹے میں دونوں آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ سناٹا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی گاؤں قریب آتا تو گھروں کی روشنیاں دور سے ٹٹماتی نظر آتیں۔

موشیوں اور انسانوں کی ملی جلی مدھم آوازیں بھی سنائی دیتیں۔ ابھی گاؤں جاگ رہے تھے۔ نہر کا پانی گنگنا رہا تھا۔ آس پاس کے جھنگروں میں مینڈک زور زور سے ٹرا رہے تھے۔

دونوں نہر کی پلایا سے آگے بڑھے تو اللہ وسایا نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا۔ وہ رحیم داد کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی جانب گردن بڑھا کر بولا۔ ”چوہدری! اب چوکس رہنا ہوگا۔ یہ رستہ خطرناک ہے۔ یہاں سے احسان شاہ کا علاقہ لگتا ہے۔“

”میں تو اس رستے سے کئی بار گزرا ہوں۔ میں نے کبھی کھٹکا محسوس نہیں کیا۔“ رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”تیری بات اور ہے۔ شاہ جی تو بچ سے خار کھاتا ہے۔“

”حوصلے سے کام لے۔ تیرے پاس تو بندوق ہے اور بھری ہوئی بھی ہوگی؟“

”بھری ہوئی تو ہے، پر ہم دو ہی ہیں اور بندوق صرف ایک ہے۔“ اللہ وسایا نے صورت حال

رحیم داد پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”احسان شاہ کے پاس تو مسلح غنڈوں کی پوری پلٹن ہے۔“

”ایسا ہے تو بندوق مجھے دے دے۔ میں آگے آگے چلتا ہوں۔“ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر

بندوق مانگی۔ اللہ وسایا نے سادگی سے دے بھی دی، ہنس کر بولا۔ ”تیری مرضی ہے تو رکھ لے۔

ویسے میں ڈرنے شرنے والا بندہ نہیں۔ پہلے بھی احسان شاہ کئی بار مجھ پر کاٹلانہ حملے کرا چکا ہے پر

کبھی سامنے نہیں آیا۔“

رحیم داد نے بندوق سنبھال کر آگے رکھ لی۔ گھوڑی کو ایڑ لگائی اور اللہ وسایا سے کچھ دور آگے

نکل گیا۔ اللہ وسایا اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ دونوں آگے بڑھے تو شیشم ار سرس کے درختوں کے

جھنڈ نظر آنے لگے۔ یہی وہ جنگل تھا جس میں احسان شاہ کے منصوبے کے مطابق دینا کو دارا اور

دوسرے مسلح افراد کے ہم راہ موجود ہونا چاہیے تھا۔ رحیم داد نے اس راہ پر گھوڑی ڈال دی جو

جنگل کے درمیان سے گزرتی تھی۔ اللہ وسایا نے گھوڑی بڑھائی۔ رفتار کسی قدر تیز کی۔ رحیم داد

کے قریب پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

دونوں گھنے درختوں کے نیچے تھے۔ شام کا مدھم اجالا شاخوں کے درمیان سے کہیں کہیں جھانک

رہا تھا مگر ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ وہ چند ہی قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ دبلی دبلی آہٹیں ابھریں مگر کوئی

نظر نہیں آیا۔

اللہ وسایا نے خطرے کی بو محسوس کی۔ اس نے رحیم داد سے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری!

تو نے ٹھیک راستہ نہیں پکڑا۔ یہ بہت ہی خطرناک پتلا ہے۔“

رحیم داد زور سے کھکھارا اور گھوڑی آگے بڑھاتے ہوئے اونچی آواز سے بولا۔ ”اللہ وسایا

حوصلے سے کام لے۔ رستہ ہی کتنا ہے۔ ذرا دیر میں جیلے سے دونوں باہر ہوں گے۔ گھوڑی تیز کر۔“

رحیم داد گھوڑی تیزی سے دوڑاتا آگے نکل گیا۔ اللہ وسایا نے بھی رفتار تیز کی مگر چند ہی قدم

چلنے کے بعد گھوڑی زور سے ہنسنائی۔ اللہ وسایا نے دھندلی روشنی میں دیکھا کہ راستے میں موٹی رسی

تھی ہے۔ اس نے رکابیں سنبھال کر گھوڑی روکنے کی کوشش کی مگر اس کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ

وہ رک نہ سکی۔ رسی سے الجھی اور لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ ہی لڑکھک کر نیچے

اگیا۔ وہ زمین پر آتے ہی زور سے چیخا۔

”چوہدری! بندوق مجھے دے۔“

اسی وقت ایک طرف سے ٹارچ کی تیز روشنی ابھری۔ رحیم داد نے گھوڑی روک لی۔ پلٹ کر دیکھا کہ ٹارچ کی تیز روشنی میں اللہ وسایا زمین پر پڑا ہے اور ادھر ادھر نظریں دوڑا کر بے بسی سے پکار رہا ہے۔ ”چوہدری! چوہدری! تو کدھر چلا گیا؟“ اللہ وسایا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ درختوں کے نیچے سے سات آٹھ آدمی نکلے اور اللہ وسایا کی جانب تیزی سے بڑھے۔ ان کے چروں پر ڈھائے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بندوقوں، کلباڑیوں، گنڈاسوں اور دوسرے خطرناک اسلحہ سے لیس تھے۔



انھیں دیکھ کر اللہ وسایا تڑپ کر چیخا۔ ”چوہدری!“ مگر وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ ڈھائے باندھے ہوئے افراد چاروں طرف سے جھپٹے اور اللہ وسایا کو دبوچ لیا۔ ایک بار وہ زور لگا کر ان کی گرفت سے نکل گیا، تیزی سے پلٹا اور دوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر پیچھے سے کسی نے گنڈاسے کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کا تیز پھل کئی انچ اللہ وسایا کے سر کے اندر اتر گیا۔

اللہ وسایا کے حلق سے ہائے کی دل دوز چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اللہ وسایا کی مشکلیں کس لیں۔ ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔

رحیم داد نے اللہ وسایا کی بندوق وہیں پھینک دی۔ گھوڑی کی باگ موڑی۔ رفتار تیزی اور جنگل سے باہر نکل گیا۔

گاؤں کی چل پہل اجڑ چکی تھی۔ ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ گھروں سے کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی۔ رات کالی کا جل بن چکی تھی۔ بادل گھر گھر کر آرہے تھے۔ آسمان تاریک ہو گیا تھا۔ ہوا تیز اور بھیگی ہوئی تھی۔ رحیم داد گھوڑی دوڑاتا حویلی کے باڑے پر پہنچا۔ باڑے کے موبیشوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیوں اور تھنگرا لوں کی جھنکار سنائے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ باڑے کا رکھولا دروازے پر بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گھوڑی سے نیچے اترا۔ رکھوالے نے بڑھ کر راسیں سنبھال لیں۔

رحیم داد آگے بڑھا تو رکھوالے نے ٹوکا۔ ”زمیں دار تیرے ساتھ نہیں لوٹا؟“

”زمیں دار؟“ رحیم داد پہلے تو گھبرایا پھر سنبھل کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔ ”وہ تو میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ کدھر ہے وہ؟“

”یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔ تیرے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی گھوڑی لے کر نکلا تھا۔ میں سمجھا آگے تجھے مل گیا ہوگا۔ وہ بھی سوئے کی طرف گیا تھا۔“

”سو تو سامنے ہی ہے۔“ رحیم داد نے نہر کی سمت ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”وہ ادھر تو نہیں پہنچا۔ کہیں اور گیا ہوگا۔ آتا ہوگا۔“

رحیم داد مسمان خانے کی جانب روانہ ہوا۔ رکھوالا گھوڑی کی راسیں سنبھالے اصطبل کی جانب بڑھا۔ رحیم داد مسمان خانے میں گیا۔ دروازہ کھلا تھا مگر احمد موجود نہیں تھا۔ رحیم داد نے اطمینان کے لہجے میں کہا۔ ”وہ اس وقت احمد سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ احمد مسمان خانے میں ہوتا تو ضرور

بات کرتا۔ عین ممکن تھا کہ اللہ وسایا کے بارے میں پوچھتا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ اور پریشانی نے یلغار کر رکھی تھی۔ اس عالم میں نہ جانے کیا بات زبان سے نکل جاتی۔

رحیم داد نے صحن عبور کیا۔ کمرے کے آگے برآمدے میں اس کا پلنگ بچھا تھا۔ بستر بھی لگا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں لیپ روشن تھا۔ رحیم داد کمرے میں گیا، کپڑے اتارے دھوئی باندھی۔ لیپ کی لودھم کی اور بندھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ اس نے رات کا کھانا کھانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ وہ دم بخود لیٹا رہا۔ دور دور تک نیند کا نام و نشان نہیں تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں مبتلا تھا۔ اسے رہ رہ کر اللہ وسایا یاد آرہا تھا، اس کا خون میں لتھڑا ہوا چہرہ یاد آرہا تھا، اس کا تڑپ کر بار بار ”چوہدری! چوہدری!“ پکارتا یاد آرہا تھا۔

اس پر خوف اور دکھ کے طے جلے احساسات کا غلبہ تھا۔ وہ بے چین ہو کر ادھر ادھر کروٹ بدلتا مگر کسی پہلو قرار نہ آتا۔ آنکھیں بند کرتا۔ نیند کو بلانے کی کوشش کرتا مگر نیند روٹھی ہوئی تھی۔ اندھیرا کچھ اور گاڑھا ہو گیا۔ سناٹا زیادہ گہرا ہو گیا۔ رات دم بخود کھڑی تھی۔ یکایک گرمی خاموشی میں مہمان خانے کے باہر کتوں کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے بدحواس ہو کر آنکھیں کھول دیں، کروٹ بدلی اور اس دروازے کی جانب دیکھنے لگا جو مہمان خانے کے باہر میدان میں کھلتا تھا۔ کتوں کے رونے کی ڈراؤنی آوازیں سنائے میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔

رحیم داد چپ لیٹا تھا۔ ذرا دیر بعد حویلی سے مہمان خانے میں داخلے کا دروازہ آہستہ سے چرچراتا ہوا کھلا۔ صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد کو گمان گزرا کہ احمد آیا ہو گا۔ اس وقت وہ اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور مٹ مارے اس طرح خاموش پڑا رہا گویا بے خبر سو رہا ہو۔ چپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور اس کے پلنگ کے قریب پہنچ کر رک گئی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھولیں نہ کروٹ بدلی۔ چند لمحے خاموشی سے گزرے پھر اسے اپنے سرہانے چوڑیوں کی ہلکی ہلکی کھنک سنائی دی، ساتھ ہی آواز ابھری۔

”چوہدری! سو گیا؟“

رحیم داد نے آواز پہچان لی۔ یہ احمد کی بیوی تھی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر سوچا کہ اتنی رات گئے وہ اس کے پاس کیوں آئی ہے؟ معا سے خیال آیا، کیس جیلہ کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہو گئی؟ رحیم داد خاموش پڑا رہا۔ احمد کی بیوی زیادہ دیر چپ نہیں رہی۔ اس نے رحیم داد کا بازو پکڑ کر آہستہ سے جھنجھوڑا اور کسی قدر اونچی آواز سے بولی۔

”چوہدری! چوہدری!“

اب رحیم داد کے لیے چپ رہنا ممکن نہ رہا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھوں سے انہیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ احمد کی نوجوان بیوی اس کے سرہانے کھڑی تھی۔ لیپ کی مدھم روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کا رنگ سا نولا تھا مگر نقش و نگار خیکھے تھے۔ جسم سڈول اور صحت مند تھا۔

”میں حمدے کی گھروالی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”میرا نام تاراں ہے جی۔“

اس کی مسکراہٹ سے رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ وہ حیرت کے انداز میں بولا۔ ”یہ میں نوں بھی پتہ ہے کہ تو حمدے کی گھروالی ہے، پر اتنی رات کو تو یہاں کیوں آئی ہے؟“

”وہ ایسا ہی جی، حمدے کو شام سے بکھار ہے۔ اسی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔ تو نے روٹی نہیں کھائی، بھوکا ہی سو گیا۔“ تاراں ایک بار پھر الٹ پلٹ سے مسکرائی۔ ”تیرے لیے روٹی لے آؤں۔ روٹی کھالے، فیر آرام نال سو جاتا۔“

رحیم داد منہ بگاڑ کر بولا۔ ”میرے پیٹ میں گڑبڑ ہے، روٹی نہیں کھاؤں گا۔“

تاراں خاموش کھڑی رہی۔ رحیم داد کا جی چاہا کہ وہ اس سے جیلہ کی طبیعت کا حال معلوم کرے لیکن صورت حال کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ایسی بات نہ پوچھے اور زیادہ سے زیادہ محتاط رویہ اختیار کرے۔ وہ چپ رہا لیکن جو بات معلوم کرنا چاہتا تھا، خود بخود تاراں کی زبان پر آگئی۔ ”آج کل جی موسم بھی بہت گڑبڑ ہے۔ حمدے کو بکھار ہے۔ زمیں دارنی کو بھی بکھار ہے۔ پر اب تو اس کی طبیعت ٹھیک لگتی ہے۔ آرام نال سو رہی ہے۔ میں تھوڑی دیر پہلے اس کے پاس گئی تھی۔“ اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی چھا گئی، لہجے سے بھی تشویش جھلکنے لگی۔ ”پر زمیں دار اب تک نہیں لوٹا۔ ڈاکٹر لینے گیا تھا۔“

رحیم داد نے اس کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”زمیں دارنی کو کب بخار ہوا؟“

”وہ جی ایسا ہے، اس نے پچھلے دنوں ساؤنی منائی تھی۔ برکھامیں سارا دن بھیگتی رہی، ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرتی رہی۔ جھولا جھولتی رہی۔ فیر بکھار تو آتا ہی آتا تھا۔“ اس نے شوخی سے آنکھوں کو گردش دی۔ ”میں نے بھی جی اس کے ساتھ ساؤنی منائی تھی۔ بھیگی بھی بہت تھی، پر اپنے کو تو کچھ ہوا نہیں۔“

”تو زمیں دارنی سے بھی زیادہ جوان ہے۔“ رحیم داد نے اسے چھیڑا۔

”پر اپنی زمیں دارنی ہے بہت سندر۔“

”ویسے تو بھی کم سوہنی نہیں۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”حمہ سے کانہیب نکلا ہے، اسے تیری ایسی چنگی گھروالی ملی۔“

”پردہ میری کب پروا کرتا ہے۔“ تاراں نے گلہ کیا۔ ”وہ تو جی پنڈی ایک ٹیار کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ اس کا نام شدو ہے۔ ویسے اس نے اور بھی کینوں سے یاری لگا رکھی ہے۔ زبردست ٹھکریا ہے۔“ اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔ ”میں نے کتنی بار اسے منع کیا، منت ساجت کی، جھگڑا ٹٹا کیا، پر اسے تو جب موکھ ملتا ہے، شدو کے گھر کی طرف نکل جاتا ہے۔ ایک بار تو اس کے سامنے ہی میں نے حمہ سے جھگڑا کیا پر وہ باز نہیں آتا۔ اب بکھار میں پڑا ہائے ہائے کر رہا ہے۔ مجھ پر حکم چلاتا ہے۔ سردبادے، دودھ گرم کر کے پلا دے۔ یہ کر دے، وہ کر دے۔“ اس کی زبان کترتی کی طرح چل رہی تھی۔ ”اب تیرے پاس بھیجا ہے، روٹی کھلا دوں۔“

تاراں سے باتیں کر کے رحیم داد کو قدرے سکون ملا۔ اس کا ذہنی کرب دب گیا۔ رحیم داد نے ذہنی خلفشار سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی جوانی نے انگریزی کی، موسم بھی فتنہ انگیز تھا۔ بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوند باندی شروع ہو گئی۔ رات اندھیری اور سناں تھی اور تاراں اس کے قریب کھڑی تھی۔ لیمپ کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اسے کسی لمحے قرار نہ تھا۔

رحیم داد جیکھی نظروں سے اسے ٹٹولنے لگا۔ اب اسے اللہ وسایا کا ڈر بھی نہیں تھا۔ اب وہی گاؤں کا زیں دار تھا۔ زیں داری کا ٹھٹ باٹ اور دبہ وہ احسان شاہ کی حویلی میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جان چکا تھا کہ زمین کے ساتھ ساتھ مزارعوں اور کیوں کی نوجوان بیویاں اور بیٹیاں بھی بڑے زیں داروں کی ملکیت ہوتی ہیں۔ زیں دار جب چاہے اور بے چاہے اٹھو لے، اپنی حویلی میں ڈال لے۔ جب تک جی چاہے، داشت یار کھیل بنا کر اپنے پاس رکھے اور جب جی چاہے، کسی دوسرے زیں دار کے ہاتھ فروخت کر دے، قیمت لے کر یا بلایت واپس کر دے۔ مزارع اور کمی نہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے، نہ قانون اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

رحیم داد نے تاراں کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ مسکرا کر گویا ہوا۔ ”لے، اب برکھا شروع ہو گئی۔ کہاں بھیگتی ہوئی جائے گی۔ تو بھی بیمار پڑ جائے گی۔ یہیں ٹھیر جا۔ سویرے چلی جانا۔“

تاراں اس کی بھوکی نظروں کی تاب نہ لاسکی۔ اس نے شرابا کر اوڑھنی کے پلو سے اپنا سر ڈھکا اور آہستہ سے بولی۔ ”نہیں جی، میں نوں جانا ہے۔ حمہ ابکھار میں بھن رہا ہے۔ نہ گئی تو بہت نراض ہو گا۔“

”چلی جانا، ایسی جلدی کیا ہے۔“ رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”حمہ سے تو کیوں ڈرتی ہے؟ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔“

”ایسی گل نہیں۔“ وہ آنکھیں نچا کر بولی۔ ”نراض ہوتا ہے تو مارنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ میں نوں پہنچ نہیں، وہ کیسا زور آور ہے۔“

”زور آور!“ رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بٹھا۔ ”تو نے بھی حد کر دی۔ دیکھنے میں تو وہ نڈا لگتا ہے۔“ رحیم داد نے مرکز صحن کی طرف دیکھا۔ بارش کسی قدر تیز ہو گئی تھی۔ ہوا کے پھرے ہوئے جھونکوں کے ساتھ مینہ کی ہلکی ہلکی پھوار برآمدے میں آ رہی تھی۔ تاراں قریب کھڑی تھی، اتنے قریب کہ اس کے بوسیدہ لباس سے اٹھتی ہوئی پسینے کی تیز بو اس کے منتھنوں میں داخل ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے تاراں کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ ”نہادھو کر کپڑے تو اچلے پہنا کر۔“

”حمہ اچھے کپڑے لے لے لاکر دیتا ہی کب ہے۔“ اس نے منہ بگاڑ کر شکوہ کیا۔ ”اسے میری ذرا پروا نہیں۔“

رحیم داد نے بے تکلفی سے مسکرا کر کہا۔ ”تو بھی اس کی پروا کرنا چھوڑ دے۔ میں تیرے لیے اتنے ڈھیر سے کپڑے لے لے ہوا دوں گا، روز سننے نئے پنہنا۔ فکر نہ کر، حمہ اتھ پر اب نراض نہیں ہو گا۔“ اس نے لہجے میں دبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نوں بھی دیکھتا ہے، وہ کیسے نراض ہوتا ہے۔ میں اس کی چڑی ادھیر ڈالوں گا۔“ رحیم داد نے گردن اوپٹی کی، مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور تاراں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔

وہ خاموش رہی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے حویلی میں کھٹنے والے دروازے کی جانب دیکھا۔ دبی زبان سے کہا۔ ”حمہ امیرا انتظار کرتا ہو گا۔ وہ ابھی سویا نہیں۔“ وہ آگے بڑھی۔

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”کہاں چلی؟“ اس نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”میں نوں اب جانے دے۔ حمہ سو جائے گا تو تیرے پاس آ جاؤں گی۔“ وہ تیز قدموں سے صحن میں پہنچی اور بارش سے بچتی بچاتی حویلی کی سمت بڑھی، ذرا دیر بعد اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مڑ مڑ کر بے چین نگاہوں سے وہ دروازہ تنکے لگا، جس سے گزر کر تاراں نظروں سے اوجھل ہوئی تھی۔ رم جھم ہوتی رہی۔ رات دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتی رہی مگر تاراں نہیں آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

☆

رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ مہمان خانے کے

”ایک نہیں، دو گولیاں چلائی تھیں۔“ دارا نے بتایا۔ ”دونوں ٹھیک نشانے پر بیٹھیں۔ پہلی سینے میں لگی، دوسری سر میں۔ تیس نوں پتہ ہے، میں بھی زمیندار رہ چکا ہوں۔ بہت شکار کھیلا ہے۔ نشانہ بہت سچا ہے۔ پہلی گولی کھا کر وہ زور سے تڑپا پر دوسری پر نہ سنبھل سکا۔ اس نے دم توڑ دیا، چند منٹ میں سارا کھیل ختم ہو گیا۔“

”دینے نے گولی نہیں چلائی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”نہیں جی۔ جب اللہ وسایا نے نکل بھاگنے کی کوشش کی تو اس پر دینے نے ہی گنڈا سا چلایا تھا“ سر پر لگا تھا۔ اس چوٹ کے ساتھ ہی وہ گر پڑا۔ تو اس وکھت تو موجود ہی تھا۔“

”دینے نے گولی نہیں چلائی، یہ تو اچھے کی گل ہے۔“

”شاہ جی سے پوچھ لے۔ وہ تو موجود ہی تھا۔“ دارا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”دونوں بار گولی میں نے ہی چلائی تھی۔“

”شاہ جی وہاں کب پہنچا تھا؟“

”لگتا ہے تیس نوں کچھ پتہ نہیں۔“ دارا نے تفصیل بیان کی۔ ”ہوا یہ کہ سورج ڈوبتے ہی دینا“ میں اور دوسرے بندے سیلے میں پہنچ گئے۔ ساری سکیم تو پہلے ہی سے تیار تھی۔ دو بندے نہر کی پلی سے کچھ آگے لگا دیئے گئے تھے۔ انھوں نے جیسے ہی تم دونوں کی گھوڑیاں دوڑنے کی آواز سنی، فوراً بھاگتے ہوئے آئے اور اطلاع دی۔ اطلاع ملتے ہی سب گھات لگا کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ شاہ جی بھی اسی وکھت پہنچا تھا۔ ویسے اس کا ادھر آنے کا بالکل پروگرام نہیں تھا۔ دینے نے یہی بتایا تھا۔ جانے وہ کیوں آگیا؟ اسی نے سب کی ڈیوٹی لگائی۔“ دارا نے رحیم داد کا پریشان چہرہ غور سے دیکھا۔

”شاہ جی تو جی، ایک نمبر خزانٹ لگتا ہے۔ سارا کام اس طرح کرایا کہ ذرا بھی گڑبڑ نہیں ہوئی۔“

”پر یہ سارا کام ہوا کیسے؟“ رحیم داد نے مزید تفصیل معلوم کرنے کی غرض سے استفسار کیا۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ باخبر رکھنا چاہتا تھا۔ ”میں جب وہاں سے چلا تھا، اللہ وسایا چوٹ کھا کر زمین پر پڑا تھا۔“

”تیرے جانے کے بعد وہی رسی کام میں لائی گئی جسے رستے میں تان کر اس کی گھوڑی کو گرایا گیا تھا۔“ دارا نے بتایا۔ ”وہ ایسے ہوا جی، اللہ وسایا کو زمین سے اٹھایا گیا اور ایک درخت کے ساتھ رسی سے باندھ دیا گیا۔ شاہ جی نے بندوک مجھے دے دی۔ اس نے رسی سے بندھے ہوئے اللہ وسایا پر مارچ سے روشنی ڈالی۔ میں نے دیکھا اس کے کپڑے لٹے کچھڑے گندے ہو گئے تھے۔ پگ ایک طرف پڑی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ سر کے بال بکھر کر منہ پر پھیل گئے تھے۔ ان

بیرونی دروازے پر آہستہ آہستہ آہٹ ہو رہی تھی۔ بارش اب ختم گئی تھی۔ رحیم داد خاموش لیٹ رہا اور چوکنا نظروں سے دروازہ نہ ہٹا رہا۔ دروازے پر کوئی رک رک کر ہوئے ہوئے دستک دے رہا تھا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ زور سے کھکارا، پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا۔ صحن کا کچا فرش بارش سے تر تھا۔ ہر طرف پانی تھا، کچھڑ تھی۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا دروازے پر پہنچا اور چند لمحے حیران و پریشان کھڑا رہا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھولی اور ایک پٹ آہستہ سے کھینچا۔ اندھیرے میں کوئی سائے کی مانند کھڑا تھا۔ اس نے فوراً سرگوشی کی۔

”چوہدری! میں دارا ہوں۔“

رحیم داد نے اسے پہچان لیا۔ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”اندر آجا۔“

دارا اندر آگیا۔ رحیم داد نے جھٹ زنجیر چڑھا دی۔ برآمدے کی سمت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر چل۔“ دارا برآمدے کی طرف چلا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ حویلی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا، دروازے کی کنڈی لگائی اور واپس برآمدے میں آیا۔ لمپ کی بلکی بلکی روشنی میں دارا خاموش کھڑا تھا۔ اس کے پیر کچھڑ میں لت پت تھے۔ لباس بھی بھیگا ہوا تھا۔ رحیم داد بستر پر بیٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”اللہ وسایا کا کیا بیاض؟“

”اسے تو تیرے جاتے ہی ختم کر دیا گیا تھا۔“ دارا نے بتایا۔

رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اس کے ذہن میں غبار منڈلانے لگا۔ سینے سے دھواں اٹھا۔ وہ خاموش بیٹھا خود پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

”اسے کس نے ختم کیا؟“

”میں نے کیا۔“ دارا نے سینے پر ہاتھ مارا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ بار بار اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

”چوہدری! پانی پلا دے۔ میں نوں تو جیسے بھڑکی لگ گئی۔ رستے بھر نہر سے پانی پیتا رہا۔ پر پیاس نہیں بھٹی۔“

رحیم داد نے کمرے کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اندر چلا جا۔ میز پر جگ میں پانی بھرا ہے۔ گلاس بھی پیاس رکھا ہے۔ جتنا جی چاہے، پی لے۔“

دارا کمرے میں چلا گیا۔ وہ پانی پی کر آیا تو کسی قدر پرسکون نظر آ رہا تھا۔ وہ رحیم داد کے سامنے فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”گولی چلائی تھی یا کھڑی سے کتل کیا تھا؟“

پہلے اس کے چہرہ پر جو کدورت نظر آ رہی تھی، مٹ گئی۔ ”تو مجھے یہ بتا، ادھر سے نکل کر بحرین جانے کے لیے تو کراچی جائے گا کیسے؟ یہ سمجھ لے، پولیس تیری ناک میں ہے۔ جو کچھ کرنا ہے، بہت ہی سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔“ رحیم داد نے اسے خبردار کیا۔ ”اب تو پہلے سے زیادہ سنگین جرم کر چکا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!“ دارا کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ شاید اسے پہلی بار اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا۔ ”پتا تو جی یہ ارادہ تھا کامل کے ساتھ اوٹھوں پر بیٹھ کر بھاول پور کی طرف نکل جاؤں۔ ریاستی بولی اچھی طرح بول سکتا ہوں۔ برسوں بولتا رہا ہوں۔ کپڑے لٹے بھی بھاول پور ہی پہن لوں گا۔ کسی کو ذرا شبہ نہ ہوگا۔ ریاست میں پہنچ کر کسی چھوٹے سٹیشن سے کراچی کی گڈی پکڑ لوں گا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یہ ٹھیک نہ ہو تو جیسا تو بتا، دیے کروں؟“

”پر وگرم تو تیرا ٹھیک ہی لگتا ہے۔“ رحیم داد نے اختلاف نہیں کیا۔ ”یہ بتا کامل تیری اتنی مدد کرنے کو تیار ہو جائے گا؟“

”وہ تو جی پہلے ہی سے تیار ہے بلکہ ساری سکیم ہی میں نے اس کے ساتھ بیٹھ کر تیار کی ہے۔“ دارا نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ ”چوہدری! وہ میرا بہت گمراہ رہے۔ سچ پوچھ، میں نوں تو صرف روپے کا بندوبست کرنا تھا۔ اسی کی فکر تھی۔ ورنہ پر وگرم تو بہت دنوں سے بنا رکھا تھا۔ روپیہ پاس ہو تو کیا نہیں ہو سکتا۔ کوئی مصیبت بھی پڑ جائے تو کچھ دے دلا کر جان چھڑائی جاسکتی ہے۔“

رحیم داد اس کی باتوں سے خاصا مطمئن ہو گیا۔ وہ اٹھا، کمرے میں گیا۔ لیپ کی لواؤں کی۔ اسے ہاتھ میں سنبھالے کوٹھری کے دروازے پر پہنچا۔ اس پر تالا لگا تھا۔ رحیم داد نے کنبی سے تالا کھولا۔ لیپ اٹھائے کوٹھری میں گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیا۔ ٹنک کھولا۔ ہزار روپے کے نوٹ نکال کر گنے۔ انھیں دھوتی کے ڈب میں رکھا، باہر آکر کوٹھری کے دروازے میں پھر تالا ڈالا۔

وہ برآمدے میں واپس پہنچا۔ دارا بے چین بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے ڈب سے ہزار روپے نکال کر بڑھائے۔ نوٹ لیتے ہوئے دارا کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے نوٹ گنے اور نہایت احتیاط سے اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے۔

رحیم داد نے کہا۔ ”تو ابھی چک ۵۸ جائے گا نا؟“

”ہاں جی ابھی چلا جاؤں تو ٹھیک رہے گا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”میرا یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ ویسے میرا چک یہاں سے بہت زیادہ دور بھی نہیں۔ فکر نہ کر۔ میں آرام کے ساتھ سویرا ہونے سے پہلے

میں بھی کیچڑ اور مٹی لگی ہوئی تھی۔“ اس نے لمبی سانس بھری۔ ”اللہ وسایا نے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس کا منہ خون سے لتھڑا ہوا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔“ دارا کے چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار پھیل گیا۔

”جی گل ایسہ ہے جی، مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں بندوک تان کر نشانہ باندھے کھڑا رہا۔ مجھ سے گولی نہیں چلائی گئی۔ تب شاہ جی نے نراض ہو کر زور سے ڈانٹا، گولی چلا۔ اس کی ڈانٹ کے ساتھ ہی میں نے گولی چلا دی۔ دوسری بھی اس کے کہنے پر چلائی۔“

”اللہ وسایا کی لاش کا کیا کیا؟“

”وہ دینے نے ٹھکانے لگا دی ہوگی۔ جیسا شاہ جی نے کہا ہوگا، اس نے ویسا ہی کیا ہوگا۔“ دارا نے جواب دیا۔ ”گولی مارنے کے بعد شاہ جی نے مجھ سے کہا، تیرا کام ختم ہو گیا۔ اب تو نس جا۔ میں فوراً ادھر آنے کے لیے نیلے سے باہر آ گیا۔ آگے کیا ہوا، میں نوں کچھ پتہ نہیں۔“

”اللہ وسایا کی گھوڑی کہاں گئی؟“ رحیم داد نے کیرید کر پوچھا۔

”میں نے تو سنا ہے جی! شاہ جی زبردست رس گیر ہے۔ اللہ وسایا کی گھوڑی کو چھپانے کے لیے اس نے اپنے بندوں کے ذریعے فوراً اہر میں پہنچا دیا ہوگا۔“ وہ بے ڈھنگے پن سے مسکرایا۔ ”وہ اتنی زبردست گھوڑی کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ میرا تو جی ایسا ہی خیال ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔“ رحیم داد نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”پر تو یہاں اتنی دیر میں کیسے پہنچا؟ اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”میں نوں تو سب کچھ پتہ ہی ہے۔ میں نے تیرا کام ٹھیک ٹھاک طرح سے کر دیا۔ شاہ جی تجھے خود بتا دے گا۔ اب اپنا وعدہ پورا کر۔ مجھے ہزار روپے دے دے۔ میں کامل کے پاس جاؤں۔ کئی روز ہو گئے چک ۴۸ سے آئے ہوئے۔ کامل پریشان ہوگا۔ میں نوں اس کے پاس اب پہنچ جانا چاہیے۔“

”میں نے جو وعدہ کیا ہے، پورا کر دوں گا۔ ویسے جی گل پوچھ تو مجھے شاہ جی سے ملنے کے بعد ہی تجھے روپیہ دینا چاہیے۔ ایسے معاملوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“

دارا بے چین ہو کر بیچ میں بول اٹھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا، تیں نوں میری بات کا اعتبار نہیں۔“

”تو نے پوری گل بات ہی نہیں سنی۔ میں نے کب کہا، مجھے تجھ پر اعتبار نہیں۔ میں تجھے ابھی اور اسی وکت ہزار روپے دے دوں گا۔“ رحیم داد نے کہا۔ دارا کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ لمحے بھر

وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اب تیرا چک ۳۸ میں زیادہ ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔“ رحیم داد نے مشورہ دیا۔ ”ہو سکے تو کل اندھیرا ہوتے ہی نکل جانا اور راتوں رات ریاست کی سرحد میں داخل ہو جانا۔“

”بالکل ایسا ہی کروں گا۔ روپیہ پاس ہو تا تو میں پہلے ہی نکل جاتا۔“

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ دارا اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں نے صحن عبور کیا، دروازے پر پہنچے۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا۔ دارا نے جھک کر رحیم داد کے گھٹنے کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

رحیم داد نے دروازے کی کنڈی ایک بار پھر چڑھا دی۔ آگے بڑھا، حویلی میں کھانے والے دروازے پر پہنچا اور اس کی کنڈی کھول دی۔ برآمدے میں واپس پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

☆

یہ ایک گرم صبح تھی۔ زرد زرد چمکیلی دھوپ دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ فضا میں جس تھا۔ رحیم داد نما دھو کر اجلا لباس پہن چکا تھا۔

تاراں ناشتالے کر آئی تو رحیم داد کرسی پر بیٹھا تھا۔ تاراں نے جھک کر ناشتا میز پر لگادیا۔

رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی، نہ اس کی جانب متوجہ ہوا۔ خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ تاراں اس کے سامنے خاموش کھڑی رہی۔ ذرا دیر بعد اس نے خود ہی خاموشی توڑی، معذرت کے انداز میں بولی۔ ”معاف کرنا جی! رات حمدے نے آنے ہی نہیں دیا۔ اسے بہت زور کا بکھار ہے۔ رات بھر نہیں سویا۔ ہائے ہائے کرتا رہا۔“

رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔ ”اب کیسی ہے اس کی طبیعت؟“

”اب تو جی ٹھیک ہی لگتی ہے۔ کتنا تھا، زمیں دارنی سے دوائی لے کر کھاؤں گا۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”زمیں دارنی اب کیسی ہے؟“

”میں سویرے سویرے اس کے پاس گئی تھی۔“ تاراں نے بتایا۔ ”اب تو وہ بالکل چنگی لگتی ہے پر بکھارے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا ہے۔ ویسے وہ پریشان بھی ہے۔ زمیں دارشام کا گیا، اب تک نہیں لوٹا۔“

”آتا ہی ہو گا۔“ رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ ”رات بھر بارش ہوتی رہی، آتا کیسے۔ پڑوس کے کسی زمیں دار کے پاس ٹھیر گیا ہو گا۔“

”پر اب تو سویرا ہوئے بہت دیر ہو گئی، اسے اب تک آ جانا چاہیے تھا۔ زمیں دارنی تو اس

بٹھی ہے۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ تاراں نے برتن اٹھائے اور کمرے سے چلی گئی۔ رحیم داد کھڑکی کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گھاس اور پودوں پر بارش کی بوندیں جھلکا رہی تھیں۔ ایک کیاری کے پاس بوڑھا مالی سر جھکائے کھڑکی سے جنگلی بوٹیاں اور گھاس پھوس کھود کھود کر نکال رہا تھا۔ آسمان پر بکھرے ہوئے بادلوں کے سفید سفید گالے تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ ان کے پیچھے گرا نیلا آسمان کہیں کہیں سے جھانک رہا تھا۔ بادل کا ٹکڑا گزرا تو سورج بھی چمکتا نظر آیا۔ بھیگے ہوئے درختوں پر دھوپ پھیل گئی۔ دھوپ کی تیزی اور چمک دمک دیکھ کر رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ پیر دن گزر چکا ہے۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسے اللہ وسایا یاد آ گیا۔ وہ سوچنے لگا، احسان شاہ نے اللہ وسایا کی لاش نہ معلوم کس طرح ٹھکانے لگائی۔

اس کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسمان خانے میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ تاراں بھی دوبارہ نہیں آئی۔ وہ خوف اور تشویش میں جتا چپ بیٹھا تھا۔ اسی اثنا میں حویلی کے اندر سے رونے اور مین کرنے کی آوازیں ابھریں اور رفتہ رفتہ اونچی ہوتی گئیں۔ رحیم داد فوراً تاڑ گیا کہ اللہ وسایا کی ہلاکت کی خبر حویلی میں پہنچ گئی ہے۔

رحیم داد کی پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اسی وقت تاراں صحن میں داخل ہوئی اور سینے پر دو ہتھ مار کر زور سے چیختی۔ ”ہائے رباً میں مر گئی۔ زمیں دار کو کتل کر دیا گیا۔“

رحیم داد تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچا۔ گھبرائے ہوئے لمبے میں پوچھا۔ ”تمیں نوں کیسے پتہ چلا، زمیں دار کو کتل کر دیا گیا؟“

”اس کی لاش نہر میں پڑی ہوئی ملی ہے۔“ وہ سسکیاں بھرتے ہوئے بولی۔ ”پڑوس کے چک کے دو مزارعوں نے لاش پہچان لی۔ وہی ادھر آئے تھے۔ بتاتے تھے، زمیں دار کتل کر دیا گیا۔“

رحیم داد گھبرایا ہوا حویلی کی جانب بڑھا۔ تاراں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں دروازے سے گزر کر حویلی کے اندر پہنچے۔ وہاں ہر طرف کھرام برپا تھا۔ رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر جیلہ کو تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آئی۔ البتہ اس کے دونوں معصوم بچے طویل دالان کے ایک گوشے میں چپ کھڑے تھے۔ وہ حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہے تھے۔ رحیم داد کی ان پر نظر پڑی تو ترپ اٹھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب گیا۔ دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نہ نینا نے کچھ کہا، نہ گندو بولا۔ دونوں بچے گم صم رحیم داد کو منہ اٹھائے دیکھ رہے تھے۔

آگے بڑھا اور سر جھکا کر ان کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ حویلی کے ایک نوکر نے جھٹ چارپائی لا کر ڈال دی۔

رحیم داد بیٹھ گیا۔ بادلوں کے درمیان سے جھانکتا ہوا سورج اب بہت بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ رحیم داد سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ آیا وہ گھوڑی پر بیٹھ کر وہاں جائے جہاں لاش پڑی ہے یا حویلی کے باہر پر سے کے لیے آنے والوں کے درمیان بیٹھا رہے اور لاش آنے کا انتظار کرے؟ وہ اسی تذبذب میں افسردہ بیٹھا تھا کہ نہر کی جانب سے ایک نوجوان سائیکل دوڑاتا ہوا درختوں کی آڑ سے نکلا۔ رحیم داد نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ اللہ وسایا کا ملازم نام دار تھا۔ تمام نظریں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ وہ اطلاع ملتے ہی سائیکل پر لاش دیکھنے چلا گیا تھا، اب واپسی ہوئی تھی۔

نام دار قریب آیا تو سب اس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف سے سوالات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ رحیم داد نے اسے اپنے پاس بلایا۔

”نام دار کیا خبر لایا۔ پتہ چلا لاش کس کی ہے؟“

اس نے منہ بسور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”لاش تو جی اپنے زہن دار ہی کی ہے۔ زہن دارنی بھی پہنچ گئی ہے۔ اس نے بھی لاش پہچان لی ہے۔“

یہ سنتے ہی امید کی ہلکی سی رمت بھی مٹ گئی۔ مجمع میں کھرام مچ گیا۔ کچھ لوگ تو اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ سوگوار چرے اور دھندلے پڑ گئے۔ ویران آنکھیں اٹک بار ہو گئیں۔ آہوں اور سسکیوں سے فضا دھواں دھواں ہو گئی۔

آہ وزاری کا طوفان ذرا تھما تو رحیم داد نے نام دار سے دریافت کیا۔ ”زہن دارنی کب تک آئے گی؟“

”پتہ نہیں جی لگتا ہے، وہ تو دیر ہی سے لوٹے گی۔“

”پولیسے بھی پہنچے کہ نہیں؟“

”کیوں نہیں پہنچے جی۔“ نام دار نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”تھانے دار دو کانشیلوں کے ساتھ سویرے سویرے پہنچ گیا تھا۔ اسی نے لاش نہر سے باہر نکلوائی۔ میں پہنچا تو لاش نہر کے پاس ریت پر چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ تھانے دار ان بندوں سے پوچھ تاچھ کر رہا تھا جنہوں نے سب سے پہلے لاش نہر کی پٹی کے نیچے پڑی دیکھی تھی۔ وہ پاس کے پٹڑے کے رہنے والے ہیں۔“

”تین نوں پتہ ہے، لاش کب تک آئے گی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

والان اور صحن میں گاؤں کی عورتیں اور حویلی کی خادماں اداں اور غم زدہ کھڑی تھیں۔ نوکر چاکر حیران و پریشان ادھر ادھر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ایک کونے میں احمد دیوار سے ٹیک لگائے، منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے نزدیک جا کر دریافت کیا۔

”جہے! زہن دارنی کدھر ہے؟“

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”وہ تو جی لاش دیکھنے نہر کی طرف گئی ہے۔“

”اسے گئے کتنی دیر ہو گئی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”اکیلی ہی چلی گئی؟“

”وہ اکیلی کیسے جاسکتی ہے۔ اسے تو کئی روز سے بکھار بھی ہے۔“ احمد کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ”وہ تانگے میں گئی ہے۔ نوکر بھی ساتھ گئے ہیں۔ اسے گئے ہوئے دیر ہو گئی۔ اب تو وہاں پہنچ بھی گئی ہوگی۔“

”لاش نہر میں کہاں پائی گئی؟“

”یہاں سے چھ سات میل ادھر حویلی روڈ پر ڈیرا میراں کے پاس ملی ہے۔“ احمد نے مشرق کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”لاش نہر کی پٹی کے ساتھ پڑی ہے۔“

رحیم داد خاموشی سے حویلی کے پھانک کی جانب بڑھا۔ احمد کی باتوں سے اسے یہ سراغ مل گیا تھا کہ احسان شاہ نے قتل کے بعد لاش راتوں رات اپنے علاقے سے میلوں دور نہر میں ڈلوادی۔ اس کا گاؤں، پیراں والہ تحصیل دیپالپور میں واقع تھا اور مغرب کی سمت تھا۔ لاش تحصیل دیپالپور کی حدود سے باہر تحصیل پاک پتن کی سرحد پر ڈلوائی تھی تاکہ پولیس کو مغالطے میں ڈال دیا جائے اور قتل کا مقدمہ درج کرنے کے معاملے میں دونوں تحصیلوں کے تھانوں میں تنازع پیدا ہو جائے اور ابتدائی مرحلے ہی میں تفتیش التوا میں پڑ جائے۔

رحیم داد حویلی سے نکل کر باہر گیا۔ پھانک کے سامنے میدان میں درختوں تلے گاؤں کے بہت سے بوڑھے اور جوان جمع تھے۔ جواب تک نہیں پہنچ سکے تھے، وہ کھیتوں اور گھروں سے نکل نکل کر حویلی کی سمت آرہے تھے۔ مرد بھی تھے، عورتیں بھی تھیں۔ سب کے چرے سوگوار اور آنکھیں ویران تھیں۔ کچھ زارد قطار رو رہے تھے، کچھ سر جھکائے غم سے نڈھال کھڑے تھے۔ عورتیں اونچی آواز سے بین کر رہی تھیں۔ رحیم داد کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوا کہ گاؤں کے سبھی رہنے والے اللہ وسایا سے پرستش کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ ان کی گریہ وزاری اور بے قراری یہی بتاتی تھی۔

رحیم داد کو دیکھ کر پھانک کے سامنے کھڑے ہوئے لوگوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ رحیم داد

”میں کیا بتا سکتا ہوں جی!“ نام دار نے سادگی سے کہا۔ ”ابھی تو جی تھانے دار بیانات شہادت لکھ رہا ہے۔ بعد میں اپنی کارروائی ڈالے گا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب غور سے دیکھا۔ ”تمیں نوں پتہ ہی ہوگا۔ کارروائی ختم ہونے کے بعد تھانے دار لاش کو وہ کیا کہتے ہیں جی!“ وہ بولتے بولتے اٹکا۔ ”یاد آیا، پوسٹ مارٹم کے لیے شہر لے جائے گا۔ زمیں دارنی کہتی تھی وہ بھی لاش کے ساتھ شہر جائے گی اور اسے اپنے ساتھ ہی لے کر آئے گی۔“ رحیم داد نے اور کچھ نہیں پوچھا۔ نام دار آگے بڑھا اور تعزیت کے لیے آنے والوں کے ہجوم میں مل گیا۔

رحیم داد چارپائی پر خاموش بیٹھا تھا۔ کتنے ہی مزارے اور کسی اس کی چارپائی کے ارد گرد فرش پر بیٹھے تھے۔ سب اللہ وسایا کی موت پر رنج و الم کا اظہار کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں قتل کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ رحیم داد نے نہ کسی کو ٹوکا، نہ کسی کے سامنے اپنی رائے ظاہر کی۔ وہ غم زدہ بھی تھا اور خوف زدہ بھی۔

آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ کبھی دھوپ نکل آتی، کبھی سایہ ہو جاتا۔ وقت گزرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی، سہ پہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ نہ کوئی اپنے گھر گیا نہ کھیتوں پر۔ کسی نے بھی اللہ وسایا کے سوگ میں کچھ نہیں کھایا۔ پیاس لگتی تو وہ ایک درخت کے نیچے رکھے ہوئے مٹی کے بڑے مٹکے سے پیالے میں پانی نکال کر پی لیتے۔ رحیم داد بھی ان کے ساتھ بھوکا بیٹھا رہا۔ البتہ پانی بار بار پیتا رہا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے سرکاری اسپتال کی ایبوسنس گاؤں میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی ہچکچاٹ مچ گئی۔ ایبوسنس حویلی کے پھانک کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ دروازہ کھلا۔ جیلہ ایک نوکر کے ہم راہ اتری۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سوچ گئی تھیں۔ بال بکھر کر پریشان ہو گئے تھے۔ بھول کی مانند غلغلتہ چہرہ مرجھا کر خیرا پڑ گیا تھا۔ اللہ وسایا کی لاش اسٹریچر پر ڈال کر نیچے اتاری گئی۔ مرد بے قرار ہو کر لاش کی طرف بڑھے۔ عورتیں بھی حویلی سے باہر آگئیں۔ زبردست ماتم ہونے لگا۔ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔

لاش اسٹریچر سے اٹھا کر اس چارپائی پر لٹادی گئی جس پر کچھ دیر پہلے رحیم داد بیٹھا تھا۔ لاش پر اسپتال کی سفید چادر پڑی تھی، اسے جلد ہی ہٹا کر دوسری چادر ڈال دی گئی۔ ڈرائیور اور اسپتال کے دوسرے ملازمین نے، جو لاش کے ساتھ ہی آئے تھے، چادر اور اسٹریچر اٹھا کر ایبوسنس میں رکھا۔ اس میں دوبارہ سوار ہوئے۔ ایبوسنس کا انجن اشارت ہوا۔ ڈرائیور بعد ایبوسنس گاؤں کی حدود سے نکل گئی۔ لاش کچھ دیر پھانک کے سامنے میدان میں رکھی رہی، پھر حویلی کے اندر پہنچادی گئی۔ جیلہ پہلے ہی اندر جا چکی تھی۔

رحیم داد مزارعوں اور کمیوں کے درمیان باہر کھڑا رہا۔ لاش پہنچنے کی اطلاع ملتے ہی آس پاس سے گاؤں اور چکوں کے لوگ بھی پر سے کو پہنچنے لگے۔ مجمع بہت بڑھ گیا تھا۔ حویلی سے عورتوں کے بین کرنے اور زور زور سے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ برسات کی ملجی شام آہستہ آہستہ درود پوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ دھند لگا پھیل کر تاریک ہو گیا۔ گاؤں کی مسجد سے اذان بلند ہوئی۔ رحیم داد دوسرے لوگوں کے ساتھ مسجد کی جانب روانہ ہوا۔

حویلی کی بیرونی دیوار کے ساتھ ٹین کی چھت کا طویل سائبان تھا۔ اس میں کبھی حویلی کے نانگے کھڑے ہوتے تھے۔ مگر فرقہ دارانہ فسادات کے دنوں میں جب نانگے بان دونوں نانگے لے کر چپٹ ہو گئے تو سائبان عرصے تک اجاڑ پڑا رہا۔ پھر اللہ وسایا نے اسے صاف کرایا۔ وہ اکثر شام کو وہاں بکھری لگاتا اور چارپائی پر بیٹھ کر مزارعوں کے ساتھ بات چیت کرتا۔ زمین داری کے مسائل حل کرتا۔ اب اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ ایک پیٹرو میکس روشن کر کے سائبان کے نیچے اسٹول پر رکھ دیا گیا تھا۔

سائبان کے نیچے اور سامنے کے میدان میں دریاں اور چٹانیاں بچھا دی گئی تھیں۔ پر سے کے لیے آنے والے چٹائیوں اور دیروں پر بیٹھے جا رہے تھے۔ سائبان کے قریب ہی ایک درخت کے نیچے گاؤں کا درزی چٹائی پر بیٹھا کفن تیار کر رہا تھا۔ رحیم داد نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے سیدھا سائبان کے نیچے پہنچا اور دیر تک پر سادینے والوں کے درمیان دری پر بیٹھا رہا۔

رات اداس اور تاریک تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ رحیم داد سائبان کے نیچے سے نکلا اور حویلی میں چلا گیا۔ دالان میں بھی پیٹرو میکس روشن تھا۔ اس کی تیز روشنی میں چارپائی پر اللہ وسایا کی میت رکھی تھی۔ اس پر چادر پڑی تھی۔ جیلہ چارپائی کے سرانے بیٹھی تھی۔ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ تڑپ کر زور سے چیخی۔ ”چوہدری! میں لٹ گئی۔ ہائے ربا میں کیا کروں۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ چارپائی کی پٹی پر زور سے مارے۔ کلائیوں میں پڑی ہوئی شیشے کی چوڑیاں چھنکا کے سے ٹوٹ کر دور تک بکھر گئیں۔ وہ ہلک ہلک کر رونے لگی۔ اس کے دونوں بچے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ماں کی آہ و زاری دیکھ کر گڈو سہمی سہمی نظروں سے اس کا منہ ٹکٹے لگا۔ نینا نے رونے کے لیے منہ بسورا۔ چارپائی کے ارد گرد بیٹھی ہوئی عورتیں بھی اونچی آواز سے رونے لگیں۔

رحیم داد کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ وہ سر جھکائے جیلہ کے قریب چپ کھڑا رہا اور آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا رہا۔ اس نے آنسو پونچھے اور جیلہ کو تسلی دینے لگا۔ ”زمیں دارنی! صبر کر۔ اللہ کی یہی مرضی تھی۔“ اس کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ آنکھوں میں دوبارہ آنسو اٹھ آئے۔ وہ مڑا اور جیلہ

سے کچھ فاصلے پر ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔

عورتیں مسلسل پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ جیلہ نے ایک بار پھر بے قرار ہو کر چیخ ماری۔
 ”ہائے وے شیرجوانا۔“ اس نے اپنا سر چارپائی کی پٹی پر رکھ دیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ یکایک
 گریہ وزاری کی دردناک آوازوں کے درمیان ایک اونچی آواز ابھری۔ یہ حویلی کی میراٹن کی آواز
 تھی۔ اس نے جواں مرگ اللہ وسایا کی پٹنی پر الابنی شروع کی۔ اس کی آواز کے ساتھ ہی ساری
 آوازیں دھیمی پڑ گئیں۔ میراٹن سوز کے انداز میں بین کرنے لگی۔

موت چھینندی آئی بیٹھی پاواٹل، ہائے وے شیرجوانا!!

گھنن نہ دیندی ساہ، گرن نہ دیندی گل، ہائے وے شیرجوانا

الابنی کے بول پر عورتیں سینے پر دوہتر مارتیں۔ اونچی آواز سے تڑپ کر کہتیں۔ ”ہائے ہائے“

لیکن جیلہ پٹی پر اپنی پیشانی ٹکائے صرف سسکیاں بھر رہی تھی۔ میت کے سر ہانے عود دلو بان
 سلگ رہا تھا۔ اس کے بل کھاتے، لہراتے مرغولوں میں سارے سوگوار چہرے دھواں دھواں نظر
 آرہے تھے۔ فضا پر موت کا سایہ منڈلا رہا تھا۔ میراٹن درد بھری آواز میں نوحہ کر رہی تھی۔

پانی تات کرایا شرطان نال نہوا یو!!

کھین منگو ایوزری دا، لاڑے نو پوایو!

چونہ جنسیاں رل چکیو، منزل منزل پچایو!

جنگل آئی رات، اوس بنیر کدی نہ مایو

ہائے وے شیرجوانا، ہائے وے شیرجوانا!

ساون کی کالی کلونی رات دم بخود تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا کے جھونکے سوز کی
 لے میں کھل مل کر میراٹن کے ساتھ بین کر رہے تھے۔

پانی گرم کرایا گیا

میت کو رواج کے مطابق غسل دیا گیا

زری کا کفن منگوایا گیا، دو لھا کو پسنا یا گیا

چار آدمیوں نے مل کر جنازے کو کندھا دیا

اسے آخری منزل تک پہنچایا گیا

آج اس کی زندگی کی شام ہے

جنگل کی رات ہے اور تاریکی نے ڈیرا ڈال رکھا ہے

اس اندھیری قبر میں کوئی نہ جائے

ہائے جواں مرگ شیر، ہائے جواں مرگ شیر!

میراٹن دھیمے سر میں الابنی کے بول الابتی رہی، بین کرتی رہی۔ ہوا کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔
 جنازے کے پاس بیٹھی ہوئی عورتیں سینہ کوبی کرتی رہیں۔ بے قرار ہو کر ہائے ہائے ہاکی دل دوز
 مدائیں بلند کرتی رہیں۔ عود دلو بان کا دھواں لہراتا اور پھیلتا رہا، دکھ کا سایہ بین کر فضا میں منڈلاتا
 رہا۔ ساری آوازیں سو گئی تھیں۔ صرف ایک آواز جاگ رہی تھی۔ یہ الابنی کے بولوں کی شکل
 میں موت کی آواز تھی۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رحیم داد خاموشی سے اٹھا اور حویلی سے باہر
 آگیا۔ سا بان کے نیچے پہنچ کر اس نے گاؤں کے بوے بوڑھوں سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا گیا کہ
 لاش اب زیادہ دیر رکھنا ٹھیک نہیں۔ اسے عشاء کے بعد دفن دیا جائے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد رحیم
 داد نے مسجد کے ملا کو بلایا اور اس کے ہم راہ دوبارہ حویلی میں گیا۔ جیلہ ابھی تک چارپائی کی پٹی پر سر
 رکھے سسکیاں بھر رہی تھی۔ دو عورتوں نے اسے سنبھالا۔ ہولے سے کھینچ کر چارپائی کے قریب
 سے اٹھایا۔ چارپائی میت کے ساتھ اٹھا کر صحن کی پڑ پڑتی میں پہنچا دی گئی۔ ملانے میت کو غسل
 دیا۔ درزی نے کفن تیار کر دیا تھا۔ میت کفنا کر اس پر سیاہ چادر ڈال دی گئی اور چارپائی پر رکھ کے
 آخری دیدار کے لیے ایک بار پھر اسے دالان میں رکھ دیا گیا۔ دالان میں ہر سو کافور کی تیز بو پھیل
 گئی۔

کچھ دیر بعد جنازہ حویلی سے باہر لے جایا گیا۔ جیلہ چیخ چیخ کر روتی ہوئی پھاٹک تک گئی۔ کئی
 عورتیں اسے سنبھالے ہوئے تھیں۔ مردوں نے بوہ کر جنازہ اٹھایا۔ ایک بار پھر زبردست کھرام مچ
 گیا۔ رونے کی آوازیں رات کے سناٹے میں گونجنے لگیں۔ جنازہ مسجد کے دروازے تک پہنچایا
 گیا۔ نماز عشاء کے بعد نماز جنازہ ہوئی۔ جنازہ دوبارہ کندھوں پر اٹھایا گیا اور گاؤں کے قبرستان میں
 پہنچا دیا گیا۔ قبر پہلے ہی سے تیار تھی۔ میت قبر میں اتاری گئی۔ مٹی ڈال کر قبر بھر دی گئی۔ مسجد کے
 ملا نے فاتحہ خوانی کی۔ ہاتھ اٹھا کر اللہ وسایا کے لیے مغفرت کی دعا کی۔ سب لوگ واپس حویلی پہنچ
 گئے۔

کوڑا وٹایا کڑوی روٹی مزار سے لائے تھے۔ اللہ وسایا یا جیلہ کا کوئی ایسا رشتہ دار یا شریک نہ تھا جو
 ... ٹالاتا۔ مزار سے یہ جانتے بھی نہیں تھے۔ وہ اللہ وسایا کے غم میں بری طرح دل گرفتہ تھے۔

کے سارے پھوہڑی پر ہڈ حال بیٹھی تھی۔ ہر ایسی عورت جو پہلی بار پاس پڑوس کے کسی گاؤں سے آتی یا اللہ وسایا کے کنبے برادری سے اس کا کوئی رشتہ نانا ہوتا، وہ جیلہ کے گلے سے لگ کر زور زور سے روتی۔ جیلہ کے گرد نیم دائرے میں بیٹھی دو سری عورتیں بھی رونے لگتیں۔ سینے پر دو ہنتر مار تیں اور ہائے ہا! کے نعرے بلند کرتیں۔

حویلی کے اندر سے عورتوں کی آواز سی سن کر ہر پھوہڑی پر بیٹھے ہوئے مرد اونچی آواز سے کلمہ پڑھتے۔ دوپہر کو تعزیت کرنے والوں کی تعداد گھٹ کر بہت کم رہ گئی۔ وہ کھانا کھانے یا اپنے ضروری کام کاج کرنے کے لیے چلے گئے تھے۔ مگر شام ہوتے ہوتے تعزیت کرنے والوں کی تعداد میں پھر اضافہ ہو گیا۔ اندھرا بڑھا تو پیٹرو میکس روشن کر دیا گیا۔ کچھ ہی دیر بعد تاراں خوان پوش سے ڈھکا ہوا تھال سر پر رکھ حویلی سے نکلی اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی ہوئی مسجد کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ ملا کے لیے فاتحہ کا توشہ لے کر جا رہی تھی۔ یہ ج کڑ کا تھا۔

تیسرے روز تھا۔ اس روز بھی گاؤں کے سارے مرد اور عورتیں حویلی پہنچے۔ مسجد کے ملانے فاتحہ خوانی کی۔ سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے ساتھ گیہوں کی گھنگنیاں بھی تھیں۔ رحیم دادوڑا سما ہوا تھا۔ اس کی نظریں بار بار اس راستے کی طرف اٹھ جاتیں جو نہری سمت جاتا تھا۔ اسے پولیس کے آنے کا دھڑکا تھا۔ وہ رات گئے تک پریشان رہا مگر کوئی پولیس والا نہیں آیا۔

تیجے کے چند روز بعد ایک پولیس انسپکٹر دو کانشیلوں کے ہم راہ آیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رحیم دادوڑا مہمان خانے میں کھانا کھا رہا تھا۔ اسے احمد سے پولیس کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ ایک بار پھر سرا سید ہو گیا۔ اس کے لیے کھانا دو بھر ہو گیا۔ لیکن اس روز بھی کوئی پولیس والا اس کے پاس نہیں آیا۔ مگر جب تک انسپکٹر اور کانشیل حویلی میں موجود رہے، اس پر خوف طاری رہا۔ بعد میں اسے احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ پولیس نے جیلہ کا بیان لیا، حویلی کے بعض نوکروں سے پوچھ گچھ کی۔ دن ڈھلے پولیس والے ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے چلے گئے۔

دن گزرتے رہے۔ سات روز تک مسجد میں ہر شام ملا کے لیے ج کڑ کا بھیجا گیا۔ خیرات دی گئی۔ فاتحہ خوانی ہوئی۔ پر سے کے لیے اکٹھا ہونے والوں نے بھی فاتحہ کے بعد کھانا کھایا۔

تیسرے روز تک حویلی کے اندر اور باہر پھوہڑی بیٹھی رہی۔ صبح سے شام تک پر سادینے والے آتے رہے۔ رحیم دادوڑا سانبان میں ان کے ساتھ بیٹھتا۔ بات چیت کرتا۔ اس تمام عرصے میں نہ اس نے جیلہ کو دیکھا، نہ اس سے ملاقات ہوئی۔ عورتیں ہر وقت حویلی میں جیلہ کے گرد اکٹھا رہتیں۔ رات گئے تک اس کے ساتھ بیٹھی رہتیں۔ اس کی دل جوئی کرتیں، تسلی دیتیں۔

اس روز گاؤں کے کسی گھر میں کھانا نہیں پکا۔ کسی باورچی خانے سے دھواں نہ اٹھا۔ کھانے سے فادری ہو کر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔ البتہ گاؤں کی کئی عورتیں حویلی میں موجود رہیں۔

رحیم دادوڑے بھی سب کی ساتھ ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے بعد وہ حویلی میں گیا۔ مہمان خانے پہنچا۔ احمد کی طبیعت ابھی ٹھیک نہیں تھی۔ مگر وہ بھی مہمان خانے میں تھا۔



صبح رحیم دادوڑا حوکر بیٹھا ہی تھا کہ احمد نے آکر اطلاع دی کہ تھانے دار ایک کانشیل کے ہم راہ آیا ہے۔ رحیم دادوڑا چہرہ فاق ہو گیا۔ احمد اطلاع دے کر چلا گیا۔ رحیم دادوڑا کی پریشانی اور گھبراہٹ اس قدر بڑھی کہ اس نے گھوڑی پر سوار ہو کر احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ مگر اس ڈر سے نہیں گیا کہ گاؤں سے باہر جانے پر شک و شبہ پیدا نہ ہو۔ اس نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی اور تھانے دار کا انتظار کرنے لگا۔

رحیم دادوڑا کی نظریں ہر آہٹ پر بیرونی دروازے کی جانب اٹھ جاتی تھیں۔ پھر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر اوپر آگیا۔ مگر تھانے دار مہمان خانے میں نہیں آیا، صرف احمد آیا۔ رحیم دادوڑے پر سے کے لیے آنے والوں کے بارے میں ادھر ادھر کی بات کی پھراکتے ہوئے دریافت کیا۔

”پولیس ابھی تک حویلی میں ہیں؟“

”وہ تو جی کب کے چلے گئے۔ انھوں نے صرف زمیں دارانی سے پوچھنا چھوڑ دیا۔“

”کیا پوچھتے تھے؟“

”پتہ نہیں۔“ احمد نے جواب دیا۔ ”زمیں دارانی ہی کو ملوم ہوگا، پر جی وہ کیا گل بات کر سکتی ہے۔ اس سے تو بولا بھی نہیں جاتا۔ چپ بیٹھی رہتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ اس کا تو جی بہت برا حال ہے۔ کئی بار تو بے ہوش ہو چکی ہے۔“

رحیم دادوڑا مہمان خانے سے نکلا، سانبان کے نیچے پہنچا۔ وہاں سویرے سویرے پھوہڑی بچھا دی گئی تھی۔ پر سے کے لیے آنے والے اس پر بیٹھے تھے۔ رحیم دادوڑا بھی دیوار سے ٹیک لگا کر پھوہڑی پر بیٹھ گیا۔

مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ عورتیں حویلی کے اندر چلی جاتیں۔ دالان میں بھی پھوہڑی بیٹھی تھی۔ یہ دریوں کا فرش تھا، جن پر چھپی ہوئی چادریں پڑی تھیں۔ جیلہ دالان کے ایک ستون

حویلی اجڑ گئی، کچھ بھی نہ رہا۔ مجھ ابھانگن کو وہ اس حویلی میں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔“
 جیلہ سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ پھاتاں نے جیلہ کو روتے دیکھا تو خود
 بھی رونے لگی۔ چند لمحے فضا بے حد سوگوار رہی پھر پھاتاں نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے
 ہوئے دل گرفتہ آواز میں کہا۔ ”بھین جی! اس طرح کب تک روتی رہے گی۔ مجھے دیکھ، سات سال
 پہلے میرا گھر والا بھی ایسے ہی چھوڑ کر اپنے رب کے پاس چلا گیا۔ تاجاں تو ان دنوں ذرا سی چھوہری
 تھی۔“

”پھاتاں!“ جیلہ کی بھرائی ہوئی آواز ابھری۔ ”اب تاجاں حویلی میں نہیں رہ سکتی۔ تو اسے
 اپنے گھر لے جا، میں ٹھہری رائنڈ۔ میرا تو اس پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اب تو سہاگنیں مجھ سے
 دور ہوا گئیں گی۔ تاجاں تو ساہا بندھی کڑی ہے۔ مینے دو مہینے بعد وہ بھی سہاگن بن جائے گی۔ اسے
 اب میرے ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔“

”بھین جی! تو کیسی گل کر رہی ہے۔“ پھاتاں نے کہا۔ ”تو رائنڈ ہے تو میں کون سی سہاگن ہوں،
 میں بھی تو رائنڈ ہوں۔ تاجاں اسی رائنڈ کے سائے میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ یہ تو سوچ، وہ تیرے
 پاس نہیں رہ سکتی تو میرے پاس کیسے رہے گی؟“

”تیری بات دوسری ہے۔ تو اس کی ماں ہے۔ یہ سوچ تیرے کنبے برادری والے کیا کہیں گے؟
 رائنڈ بیوہ کو تو بد شگونئی سمجھا جاتا ہے۔ ویسے میں تو چاہتی تھی تاجاں میرے ساتھ رہے اور میں سے
 ویاہ کر اپنے گھر والے کے سنگ جائے پر کیا کیا جائے، رائنڈ کو برا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کی یہی ریت
 ہے۔“

پھاتاں نے حیکھے لہجے میں کہا۔ ”بھین جی! میں نوں کسی کی پروا نہیں کرنی۔ سات سال سے
 ساری بد شگونیاں دیکھ رہی ہوں اور سن رہی ہوں۔ میرے لیے یہ نئی گل نہیں۔ تو کچھ ہی کہے،
 تاجاں یہیں رہے گی اور تیرے ہی نال رہے گی۔ اس کا ویاہ بھی تو کرے گی اور جب چاہے تب
 کرے گی۔“

”سوچ لے۔“ جیلہ آہستہ سے بولی۔ ”کنبے برادری والوں کے طعنے سننے پڑیں گے۔“
 ”پہلے بھی بہت سن چکی ہوں اور سن لوں گی۔ میں نوں کنبے برادری سے کیہہ لیتا۔“ پھاتاں اپنی
 بات پر اڑی رہی۔ ”ویسے دوسروں کے منہ میں زبان ہے تو میں بھی گوئی نہیں۔ تو بالکل فکر نہ کر۔
 تاجاں حویلی سے جائے گی تو ویاہ کر ہی جائے گی، ایسے نہیں۔ اب وہ میری نہیں، تیری امانت ہے۔
 میرے تو اسے تیرے حوالے کر دیا۔ اب تو جانے اور تیری تاجاں جانے۔ ساہے کے بعد تو نے بھی

رحیم داد نہ حویلی میں گیا نہ اس نے جیلہ سے ملنے کی کوشش کی۔ وہ ایسا کر بھی نہیں سکتا تھا۔
 جیلہ عدت میں تھی۔ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جاسکتی تھی نہ کسی نا محرم کے سامنے
 آسکتی تھی۔ مسجد کے ملانے کی بتایا تھا۔ رحیم داد بھی نا محرم تھا لہذا وہ جیلہ سے نہیں ملا۔ نہ
 احسان شاہ کی حویلی گیا اور نہ اس سے کوئی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔

تیرہویں روز شام کو چھوہری اٹھا دی گئی اور رسمی طور پر اللہ وسایا کا سوگ ختم کر دیا گیا۔ البتہ
 عورتوں کی حد تک تعزیت کرنے کا سلسلہ چلتا رہا۔ گاؤں کی عورتیں جیلہ کی دل جوئی کے لیے آتی
 رہیں۔ جیلہ بات بات پر رونے لگتی۔ اللہ وسایا کی موت سے جو رنج و غم مسلط ہوا تھا، وہ اس سے
 ہنوز نہیں سنبھلی تھی۔

رحیم داد چھوہری اٹھنے کے بعد مہمان خانے ہی میں رہتا۔ بارش نہ ہوتی تو شام کو باغ میں جا کر
 بیٹھ جاتا۔ ایک شام وہ تنہا بیٹھا تھا کہ جیلہ نے اسے حویلی میں بلوایا۔ رحیم داد گیا۔ جیلہ دالان کے
 ایک گوشے میں بیٹھ موڑے کرسی پر بیٹھی تھی۔ وہ سفید چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے پلو سے
 بالکل مار کر اپنا پورا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ قریب ہی فرش پر پھاتاں بیٹھی تھی۔ رحیم داد دونوں سے ذرا
 ہٹ کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جھٹ پٹے میں حویلی پر ویرانی برس رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔
 کچھ دیر بعد جیلہ کی آواز ابھری۔

”چوہدری! میں نے تجھے اس لیے بلایا ہے، کل کبیر والا سے چوہدری اکرم کا چچیرا اور بھرجائی
 آئے تھے۔ ویسے تو اللہ وسایا کے پرے کو آئے تھے پر چلتے چلتے انھوں نے بتایا کہ اکرم نے اپنی
 دمی کا رشتہ تیرے ساتھ توڑ دیا۔“ جیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں تو رائنڈ ہو گئی چوہدری، پر
 میرے رائنڈ ہونے سے تیرا گھر کیوں نہ بس سکا؟ لگتا ہے، اللہ وسایا کی موت کو اکرم نے بد شگونئی
 سمجھا اور رشتہ ختم کر دیا۔“

”زمیں دارنی! تیرے رائنڈ ہونے سے میرے ویاہ کا کیا تا۔ تو خاما خا اپنا دل میلانہ کر۔ میرا تو
 پہلے بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نوں پتہ ہی ہے، رشتہ جوڑنے والا تو اللہ وسایا ہی تھا۔ اس
 کے ساتھ ہی رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ اب چوہدری اکرم کچھ ہی کہے، سچ پوچھ تو میں خود اسے توڑنے والا
 تھا۔ ذرا سوچ، ابھی اللہ وسایا کو گزرے دو ہی ہفتے ہوئے ہیں۔ میں کیسے ویاہ شیاہ کے بارے میں
 سوچ سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے جیلہ کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ ”زمیں دارنی! میری فکر نہ
 کر۔ اللہ وسایا کے بعد مجھے کچھ چگا نہیں لگتا۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری!“ جیلہ نے گلو گیر لہجے میں کہا۔ ”اللہ وسایا کے بٹا ایسا لگتا ہے جیسے

تو یہی گل کسی تھی۔ اپنی ہی گل اور اپنا ہی وعدہ بھول گئی۔

رحیم داد آہستہ سے کھٹکارا اور جیلہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”زیم دارانی! سنا ہے، پولیس تفتیش کو آئی تھی۔ تجھ سے پوچھنا ہے کہ کتنی بارے میں بھی پولیس سے کچھ پتہ چلا؟“

”پولیس نے کیا بتایا۔ اس نے تو اب تک کچھ نہیں کیا۔“ جیلہ کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”پہلے وہ تھانے دار آیا جس نے رپورٹ درج کی تھی۔ تفتیش ٹیم کے ساتھ جائے واردات کا معائنہ کیا تھا۔ نہر سے لاش نکلائی تھی۔ مشیر نامہ تیار کیا تھا۔ ضروری لکھا پڑھی کی تھی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس سرجن کے پاس بھجوائی تھی۔ وہ دیر تک مجھ سے الٹے سیدھے سوال کرتا رہا۔ اس کی باتوں سے تو ایسا لگتا تھا مانو اللہ وسایا کو میں نے ہی قتل کر دیا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تیں نوں کیسے پتہ چلا، اسے تجھ پر شبہ ہے؟“

”کہتا تھا، ہر قتل کے پیچھے کسی رن کا ہاتھ ہوتا ہے اور اگر مقتول کے گھر میں مغویہ رن ہو، تب تو قتل کا سبب عام طور پر وہی ہوتی ہے۔“ جیلہ نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اس کے بعد وہ مجھ سے ایسی گلاں کرنے لگا کہ میرا جی چاہا، اس کا منہ نوج لوں۔ پر میں نے دھرج سے کام لیا۔ رو کر صرف اتنا کہا، قتل کی وجہ پرانی دشمنی بھی ہو سکتی ہے۔ زیم داروں کے قتل تو عام طور پر پرانی دشمنی ہی کے کارن ہوتے ہیں۔ میں نے تو یہی سنا ہے۔ اخباروں میں پڑھا بھی ہے۔“

”یہ بات سن کر وہ کیا بولا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”پہلے تو اس نے کہا کہ اب تک کی کارروائی سے تو کوئی ایسا سراغ ملا نہیں۔ فیرواس نے پوچھا، مجھے کس کس پر شبہ ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا، اللہ وسایا کی صرف احسان شاہ سے دشمنی تھی۔ میں نے اسے دشمنی کی ساری وجہ بھی بتا دی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مجھ سے گل بات کرنے کے بعد اس نے حویلی کے نوکروں سے بھی پوچھنا ہے کہ کتنی بارے میں بھی پولیس سے کچھ پتہ چلا گیا۔“

”وہ دوبارہ پوچھنا ہے کہ کیا تھا؟“

”وہ تو نہیں آیا۔ اتنا بھی نہیں چاہیے تھا اسے۔ میں نے اپنے وکیل عثمان رندھاوا کو بلوایا۔ اسے ساری چٹا سنائی۔ وہ فوراً تھانیدار سے ملا اور جب اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ تھانیدار کیس دیا دینا چاہتا ہے تو اس نے اعلیٰ حکام کو درخواستیں بھیجیں۔ اس کی دوڑ بھاگ اور کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ ایک نئے انسپکٹر کو تفتیش کے لیے لگایا گیا۔ اس نے نئے سرے سے تفتیش شروع کی۔“

جیلہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ ”وہ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا پر اس نے پہلے تھانے دار کی طرح الٹے سیدھے سوال نہیں کیے۔ میرا بیان لکھا، مجھے تسلی دی کہ کاتوں کو جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ اس نے بھی حویلی کے نوکروں سے پوچھنا ہے کہ کتنی بارے میں بھی پوچھنا تھا۔“

”میرے بارے میں؟“ رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر کہا۔ ”میرے بارے میں کیوں پوچھتا تھا؟“

”پولیس کے بندوں کو تو جانتا ہی ہے وہ ہر ایک پر شبہ کرتے ہیں۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”پر میں نے جھٹ اس کا شبہ دور کر دیا۔ اسے صاف صاف کہہ دیا، چوہدری تو میرے بھائی سان ہے۔ اس کے بارے میں تو کسی شک و شبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میری باتوں سے وہ ایسا مطمئن ہوا کہ تیرے پاس پوچھنا ہے کہ کتنی بارے میں بھی نہ گیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اس کے جانے کے بعد اب تک کوئی تفتیش کو نہیں آیا۔“

”تیں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں ہو گا کہ دونوں تھانے داروں کی تفتیش کا کیا نتیجہ نکلا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”جب کوئی آیا ہی نہیں تو کیسے پتہ چلتا۔“ جیلہ نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”میں نے وکیل کو فیرواس بلوایا ہے۔ وہ پتہ لگا کر بتائے گا، پولیس نے اب تک ضابطے کی کیا کارروائی کی ہے۔“

وکیل کے آنے کی اطلاع سے رحیم داد پریشان ہو گیا۔ مگر اس نے خود کو سنبھالا۔ جیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے بولا۔ ”لگتا ہے، پولیس کیس میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی اور جب پولیس ہی دلچسپی نہ لے تو مجرموں کو کیسے پکڑا جاسکتا ہے۔ پر یہ تو بالکل ملے ہے اللہ وسایا کو قتل کیا گیا ہے۔“

”یہ تو سبھی کو پتہ ہے۔ پولیس بھی مانتی ہے۔ تھانے دار کہتا تھا، پوسٹ مارٹم رپورٹ مل گئی ہے، اس میں بتایا گیا ہے اللہ وسایا کو گولی مار کر قتل کیا گیا۔ ایک گولی اس کی چھاتی میں لگی، دوسری سر میں۔ پر کس نے قتل کیا، کیوں کیا؟ اس کا اب تک کوئی سراغ نہیں ملا۔“ جیلہ نے گہری سانس بھری۔ ”وہ جو بھی ہو اس نے مجھے برباد کر دیا۔ ہائے رتبا یہ کیا ہو گیا۔“ جیلہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد اسے تسلی دیتا رہا۔ صبر کی تلقین کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد رحیم داد حویلی سے اٹھ کر مہمان خانے میں آگیا۔ احمد موجود نہیں تھا لیکن کمرے میں لیپ روشن تھا۔ رحیم داد مہمان خانے میں نہیں ٹھہرا۔ جیلہ سے ملنے کے بعد وہ شدید ذہنی الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اسی عالم میں وہ باغ میں پہنچا۔ وہاں گہرا سناٹا تھا۔ رحیم داد وہاں بھی نہیں

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

احمد نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا اور سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا۔
”میں تو جی ایسا لگتا ہے۔ اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کرایا ہے۔ وہ تو جی قتل کر کے کب کے سرحد پار نکل گئے ہوں گے۔ اب انہیں کون پکڑ سکتا ہے۔“

رحیم داد نے چونک کر احمد کو دیکھا۔ دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”تجھے کیسے پتہ چلا اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کیا ہے؟“

”میں نے تو جی یہ بات لہار کے منڈے بابر سے سنی ہے اور اسے پٹاری کے چھوٹے بھائی نے بتائی تھی۔ وہ برابر کے پنڈ میں رہتا ہے۔ بابر سے اس کی پرانی یاری ہے۔“ احمد دھیرے دھیرے بولتا رہا۔ ”ویسے دیکھا جائے تو بات ٹھیک ہی لگتی ہے۔ زمیں دارنی کے بھائی اسے اپنے ساتھ سرحد پار لے جانے کے لیے سمگلروں کے ساتھ کئی بار آچکے ہیں پر وہ نہیں گئی۔ انھوں نے سوچا ہوگا اللہ وسایا کا مٹنا ہی ختم کر دو، تب تو وہ ان کے ساتھ چلی ہی جائے گی۔ اپنی سمجھ میں تو جی یہی آتا ہے۔“
”صرف بابر ایسی گل کرتا ہے یا پنڈ کے دوسرے بندے بھی ایسے ہی سوچتے ہیں؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”جی گل تو اہم ہے جی، جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ۔“ احمد نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائیں۔ ”تیرا اپنا کیا دھار ہے چوہدری؟“
”تیری اور بابر کی گل سمجھ تو آتی ہے۔“ رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”ایسا بالکل ہو سکتا ہے پر زمیں دارنی کو پتہ نہ چلے۔ وہ بہت نراض ہوگی۔ اپنے بھائیوں کے بارے میں وہ ایسی گل کیسے سن سکتی ہے۔“

”توبہ کرو جی! اسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ ایک دم بھڑک جائے گی۔“
رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا۔ احمد برتن اٹھا کر جانے لگا۔ مگر جاتے جاتے ٹھنکا اور اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں جی دیر سے لوٹوں گا۔“

”ویسے بھی رات کی روٹی کھلا کر تو کب بھیتی لوٹتا ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات نہیں آتا۔“
رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تو نے شدو کے پاس جانا ہوگا؟“

”تاراں نے تجھے شکایت لگائی ہوگی۔“ احمد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ ”وہ تو جی ایسے ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتی رہتی ہے۔“

”تو اسے ایسی باتیں سوچنے ہی کیوں دیتا ہے؟“ رحیم داد نے کسی قدر سختی سے کہا۔ ”وہ تیری گھر

رکا۔ باغ سے نکل کر نمرکی سمت چلنے لگا۔ کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ماکھا اندھیرے سے نکل کر اس کے سامنے آگیا۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے پوچھا۔

”ماکھے! تو اس طرح اندھیرے میں کیوں چھپا کھڑا ہے؟“

”میں تو شام سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔“ ماکھا گڑگڑا کر بولا۔ ”کئی بار باغ کی طرف بھی گیا پر تو نظر نہیں آیا۔ تجھ سے ملے بناں واپس بھی نہیں جاسکتا تھا۔“

”مجھ سے ملنا کیوں ضروری تھا؟“

”نراض نہ ہو۔“ ماکھا عاجزی سے بولا۔ ”شاہ جی نے کہلویا ہے، تو کل شام تک اسے ضرور مل لے۔ کوئی ضروری گل کرنی ہوگی۔“

”ابھی تو میں اس کے پاس نہیں جاسکتا۔“ رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا۔ ”شاہ جی سے کتنا موقع ملا تو آجاؤں گا۔“

”میں نے تو جی جو بتانا تھا، بتا دیا۔ آگے تیری مرضی۔“

”اب تو رجا۔“ رحیم داد نے ہزاری سے کہا۔

ماکھا چپ چاپ چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں تلاطم برپا کر گیا۔ وہ احسان شاہ سے ملنا تو چاہتا تھا مگر کچھ عرصے بعد۔ فی الحال وہ اس سے ملنے چلنے میں پوری احتیاط سے کام لیتا چاہتا تھا۔ وہ اپنے کانوں سے سن چکا تھا کہ جیلہ کو احسان شاہ پر شبہ ہے۔ وہ پولیس سے بھی اس کا برملا اظہار کر چکی تھی۔ گاؤں میں ہر طرف ابھی تک اللہ وسایا کے قتل کا چرچا تھا۔ ایسی صورت میں اس کا گاؤں سے باہر جانا خواہ مخواہ بدگمانی پیدا کر سکتا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ خیال بھی رہ رہ کر پریشان کر رہا تھا کہ احسان شاہ نے کوئی اہم اور ضروری ہی بات بتانے کے لیے اسے بلایا ہوگا، ورنہ وہ ماکھا کو اس کے پاس ہرگز نہ بھیجتا۔

رحیم داد کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس نے آگے جانے کا فیصلہ ملتوی کر دیا، مڑا اور آہستہ آہستہ چلنا ہوا ممان خانے میں پہنچ گیا۔ احمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کے پہنچنے ہی وہ کھانا لے آیا اور میز پر چن کر خاموشی سے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد چپ چاپ کھانا کھاتا رہا۔

احمد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”چوہدری! کچھ پتہ چلا، زمیں دار کو کس نے قتل کیا؟“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ رحیم داد بے نیازی سے بولا۔ ”ابھی تو کوئی گرفتاری بھی نہیں ہوئی۔“

”میں نے یہی سنا ہے۔“

”کامل تو جی پکڑے جا بھی نہیں سکتے۔“

آن بان تھی اس کی۔ جب پنڈ میں آتا تھا تو مزار سے اس کے سامنے چپ کر کے کھڑے رہتے تھے۔ اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔“

رحیم داد نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح احسان شاہ کے پاس پہنچے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر وہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ شک و شبہ پیدا ہونے کا خدشہ تھا۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کے لیے سڑک کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ طویل اور خاصے چکر کا راستہ تھا مگر محفوظ تھا۔

رحیم داد نے ناشتے کے بعد احمد سے کہا۔ ”دوپہر کی روٹی کے بعد تانگا لے آنا۔“
”کہاں جاتا ہے؟“

”میں نے چک بیدی جانا ہے۔ وہاں سے لاری پکڑوں گا۔ پاک چن جاؤں گا۔“
احمد نے دریافت کیا۔ ”ادھر کوئی کام ہے؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”پاک چن میں بابا شاہ فرید گنج شکر کے مزار پر حاضری دوں گا۔“

”وہاں جانے کا مزا تو جی عرس پر آتا ہے۔ بیچ محرم کو عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے بندے آتے ہیں۔ زبردست میلہ لگتا ہے۔“

”عرس پر بھی جلا جاؤں گا۔ پہلے بھی عرس پر جا چکا ہوں۔“ رحیم داد نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”سچی گل پوچھ تو اللہ وسایا کے بعد دل بہت گھبراتا ہے۔ مزار پر حاضری دینے سے دل کو آرام ملے گا۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں۔“

”کب تک واپسی ہوگی؟“ احمد نے پوچھا۔

”ارادہ تو رات ہی کو لوٹنے کا ہے پر مشکل لگتا ہے۔ بارشوں نے رستے خراب کر دیئے ہیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ کل شام تک واپس آ جاؤں گا۔ زمیں دارنی پوچھے تو بتا دیتا۔“

”وہ تو جی کچھ نہیں پوچھے گی۔ وہ تو روتی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ بات کرتی ہے۔ اسے تو جی زمیں دار کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں نوں نہیں پتہ تھا، وہ اس سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔“

رحیم داد نے بات کا رخ موڑا۔ ”تاراں بھی تجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔“

”تو بہ کرو جی! وہ میری ذرا پروا نہیں کرتی۔“ احمد نے گلہ کیا۔ ”تیں نوں کیہ پتہ، وہ مجھ سے کتنا جھگڑا کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی گل بات پر رولا گولا کرتی ہے۔“

رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ احمد چلا گیا۔

والی ہے، تیرے بچوں کی ماں ہے۔ تجھے چاہیے کہ اسے خوش رکھے۔“

”میں تو جی اسے خوش رکھنے کی اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں، پر وہ تو بیکار کا جھگڑا کھڑا کر دیتا ہے۔“

رحیم داد نے تاراں کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ وہ اسے احمد کے ذریعے بلانا چاہتا تھا، مگر بہت نہ پڑی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ہوا نرم اور خشک تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل بکھرے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا، بے چہن ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ ادھر بن میں مبتلا تھا۔ بار بار سوچ رہا تھا کہ احمد نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے، اگر اسے گاؤں میں پھیلادیا جائے اور پولیس کے کانوں میں بھی ڈال دیا جائے تو نہ صرف تفتیش کی نوعیت بدل جائے گی بلکہ قتل کی واردات دہانا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر پولیس کو اس انداز سے سوچنے پر صرف احسان شاہ تیار کر سکتا ہے۔

اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ اسے فوری طور پر احسان شاہ سے ملنا چاہیے۔ رحیم داد کو اس نے بلایا بھی تھا۔

احمد رات بھر نہیں آیا۔ مگر صبح وہ مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے ناشتا میز پر چتا۔ رحیم داد ناشتا کرنے لگا۔ احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے رات کو پتہ کیا، پنڈ کے کئی مزارعوں کا بھی یہی خیال ہے، اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کیا ہے۔“
”بابر ہی نے ان سے بھی کہا ہو گا۔“

”پتہ نہیں جی! ویسے گل سمجھ بھی آتی ہے۔ وہ ایسا ہے جی، زمیں دارنی کا پیو ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا اور اس کا پیو تو اس کے بہت معمولی مزار سے تھے۔ میں تو جی ان دنوں بھی اسی پنڈ میں تھا۔ جیسی لال میخجر ہوتا تھا۔ ساری زمیں دارنی کی دیکھ بھال، سچ تو یہ ہے، وہی کرتا تھا۔ اس نے نراض ہو کر اللہ وسایا اور اس کے پیو کو بے دھل کر دیا تھا۔“

رحیم داد درمیان میں بول پڑا۔ ”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“

احمد نے اس کے ٹوکے پر مطلق توجہ نہ دی۔ ”یہ تو سوچ، زمیں دارنی کے بھائی یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں، ان کی بھین انھی کے معمولی مزار سے اور وہ بھی مسلمان کی گھر والی بن کر رہے۔ عزت اور شان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے تو جی زمیں دارنی کے بھائی ہر ویال کو دیکھا ہے۔ کیا اکڑا اور

”بہت نیک بندہ تھا۔ اس کا قتل بہت الم ناک حادثہ ہے۔“ وکیل نے بھی غم لہجے میں اظہار خیال کیا۔

”زمین دارنی کیا کہتی ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ بے چاری کیا کہے گی۔ اسے تو کچھ پتہ نہیں۔ وہ تو حویلی کی چار دیواری کے اندر عدت میں بیٹھی ہے۔“

”ایک چھوڑ دو تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ لگتا ہے کسی نے کچھ نہیں کیا۔ زمین دارنی تو یہی بتاتی تھی۔“

”بتاتی تو مجھ سے بھی یہی تھی۔ پر میں نے کہا ناں، اسے کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے چونکا ہوا کر وکیل کو دیکھا۔ اس نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔ ”کالتوں کا بھی کچھ سراغ ملا؟ کوئی گرفتاری شرفاری ہوئی؟“

”ابھی تک تو کوئی گرفتاری نہیں ہوئی۔ میں یہاں آنے سے پہلے اس سب انسپکٹر سے ملا تھا، جسے اب تفتیش پر لگایا گیا ہے۔ پہلے جو انسپکٹر تفتیش کرتا رہا تھا، اس نے نامعلوم ملزمان کے خلاف صرف کیس رجسٹر کیا تھا اور کیس بگاڑنے کے لیے ایف آئی آر میں توڑ مروڑ کر غلط حالات اور واقعات درج کر دیئے۔ زمین دارنی نے جو ابتدائی رپورٹ لکھوائی تھی، اس میں اس طرح رد و بدل کر دیا جس سے ملزمان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے۔“

”یہ تو اس نے بہت گندی حرکت کی۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر جھنجھلاہٹ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی؟“

”ہو تو سکتی ہے۔“ وکیل نے توجہ پیش کی۔ ”دفعہ ۱۵۳ ضابطہ فوجداری کی رو سے متعلقہ پولیس افسر پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ابتدائی رپورٹ میں کسی بھی قسم کی ترمیم یا تبدیلی نہ کی جائے۔ اگر وہ خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۲۱۸ کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے اور جرم ثابت ہونے پر ایسے پولیس افسر کو تین سال کی قید اور جرمانے کی سزا بھی ہو سکتی ہے۔“ وکیل نے قدرے توقف کیا پھر گویا ہوا۔ ”مگر میں نے اس سلسلے میں قانونی چارہ جوئی کرنے سے گریز کیا۔ سوچا اس مرحلہ پر پولیس سے بگاڑنا مناسب نہیں، البتہ انسپکٹر جنرل پولیس کو میں نے جو درخواست پیش کی تھی اس میں اس قانونی پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔ آئی جی نے اس کا ضرور نوٹس لیا ہو گا۔ چنانچہ اس کے حکم پر ایس پی نے اس کی بجائے ایک اور انسپکٹر کو

افسر مقرر کر دیا۔ لگتا ہے وہ کیس میں پوری دلچسپی لے رہا ہے۔“

رحیم داد مسمان خانے سے نکلا اور کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ مزارعوں سے ملا، خریف کی فصل کے بارے میں ان سے ادھر ادھر کی بات چیت کی۔ اللہ وسایا کے بعد اب زمیں داری کی دیکھ بھال اسی کو کرنا تھی۔ وہ رفتہ رفتہ خود کو اس کے لیے تیار بھی کرنے لگا تھا۔ اس نے زمیں داری کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کر دیا تھا۔

وہ مسمان خانے میں واپس آیا تو دوپہر ہو چکی تھی۔ رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر بیٹھا تھا کہ احمد کھانہ لے کر آگیا۔ کھانا چن کر اس نے بتایا۔ ”زمیں دارنی کے پاس وکیل آیا بیٹھا ہے۔“

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس نے جھٹ گلاس اٹھا کر پانی پیا اور احمد سے پوچھا۔ ”وکیل کب آیا؟“

”اسے آئے تو دیر ہو گئی۔“

”تمیں نوں پتہ ہے، زمین دارنی سے کیا گل بات کر رہا تھا؟“

”میں تو جی زمین دارنی کے پاس گیا ہی نہیں۔“

”ایسی گل ہے تو تمیں نوں وکیل کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟“

”تاراں نے بتایا۔ وہ زمین دارنی کے پاس بیٹھی تھی۔“

”ادھر تو وکیل کا آنے کا ارادہ نہیں؟“

”ہاں جی، تاراں کہتی تھی، وہ تیرے پاس آنے کو بھی کہتا تھا۔“

رحیم داد پر ایک بار پھر گھبراہٹ نے حملہ کیا۔ اس نے روٹی کا لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ گھبراہٹ پر ذرا قابو پایا تو اس نے احمد سے کہا۔ ”تو میرے لیے تانگا نہ لانا۔“

”کیوں، پاک پتن نہیں جانا؟“

”وکیل سے بات چیت میں نہ جانے کتنی دیر لگ جائے۔“ رحیم داد نے بات بتائی۔ ”غیر کسی رشتہ

چلا جاؤں گا۔“

رحیم داد کھانے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ وکیل محمد عثمان رند ہوا آگیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھے ہوئے رسمی انداز میں پوچھا۔ ”چوہدری! کیا حال چال ہے؟“

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کے لیے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی

کوشش کی۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”اب کیا حال چال رہ گیا جی!“ اس نے ٹھنڈا

سانس بھری۔ ”اللہ وسایا کے بعد کچھ بھی چنگا نہیں لگتا۔ وہ اپنے ساتھ حویلی کی ساری خوشیاں اور

ساری چمچل پل لے گیا۔“

طاری ہونے لگی۔ اسے وکیل سے اس رد عمل کی توقع نہ تھی۔ وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ وکیل نے بتایا۔
”میں نے تفتیش کرنے والے پولیس انسپکٹر جنجوعہ سے جو کچھ معلوم کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے
کہ اس نے اللہ وسایا کے قتل کا کچھ سراغ نکال لیا ہے۔ اس نے نئے سرے سے تحقیقات شروع
کی ہے۔ وہ تو بہت پر امید نظر آتا ہے۔ کہتا تھا، جلد ہی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔“

رحیم داد نے بڑی مشکل سے اپنی سراسیمگی چھپائی اور سینے پر ہاتھ مار کے جوش و خروش سے
بولاً۔ ”اگر یہ پتہ چل جائے کہ اللہ وسایا کا خون احسان شاہ نے کرایا ہے تو میں اسے زندہ نہیں
چھوڑوں گا۔ چاہے جان جائے یا بھانسی ہو۔ میں اللہ وسایا کا بدلہ اس سے ضرور لوں گا۔“ اس نے
وکیل کی جانب ٹیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”برانہ منانا، مجھے تو پولیس کچھ کرتی شرتی لگتی نہیں۔ تھانے
دار تو خالی پہلی باتیں کرتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کریں گے۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔“ وکیل نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”پولیس میں سارے
افسرے نہیں ہیں۔ ایسے فرض شناس بھی ہیں، جن کو اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس ہے۔ جو
تھانے دار اب تفتیش کر رہا ہے، وہ بھی ایسا ہی پولیس افسر ہے۔ وہ تیرے پاس بھی آئے گا اور
جلدی آئے گا۔ پوچھ گچھ کرے گا، تیرا بیان بھی لے گا۔ تجھے جو کچھ معلوم ہو، صاف صاف بتا
دینا۔“

”مان لو، قاتل اگر زمیں دارنی کے بھائی ہوئے، تب تھانے دار کیا کرے گا؟“ رحیم داد نے اپنی
گھبراہٹ چھپانے کی غرض سے ایک بار پھر وکیل کو درغلانے کی کوشش کی۔ ”وہ تو اب ہاتھ آنے
سے رہے، راتوں رات سرحد پار چلے گئے ہوں گے۔ وہاں سے انھیں کیسے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔“
”اگر ایسا ہے، تب تو قاتلوں کو گرفتار کرنا ممکن نہیں۔ مگر میرا خیال ہے، اللہ وسایا کو انھوں نے
قتل نہیں کیا۔ زمیں دارنی کا بھی یہی خیال ہے اور انسپکٹر جنجوعہ کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا
ہے۔“

”ایسا ہی ہو گا جی!“ رحیم داد نے ہتھیار ڈال دیئے۔

وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری! میں تیرے پاس یہ بتانے آیا تھا کہ میں تیرے
کلیم کے کاغذات جلد ہی لوٹا دوں گا۔ ابھی مجھے ان کی ضرورت پڑے گی۔“

”جب تک جی چاہے، اپنے پاس رکھیں۔ میں نوں واپس لینے کی جلدی نہیں۔ ان کے بارے
میں مجھے کوئی فکر نہیں۔“

اس درخواست کے بارے میں نہ رحیم داد نے کچھ کہا نہ وکیل نے بتایا، جس پر رحیم داد نے

”وہ کیا بتاتا تھا؟“ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”اس کا خیال ہے، اللہ وسایا کا قتل پرانی دشمنی کا نتیجہ ہے۔ اللہ وسایا کی صرف ایک ہی شخص
سے دشمنی تھی۔ اور وہ احسان علی شاہ ہے۔ زمیں دارنی نے بھی اپنے بیان میں اسی پر شبہ ظاہر کیا
ہے۔“

”میں نے تو جی احسان شاہ کو دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے، بھلا بندہ نہیں ہے۔“ رحیم داد نے صفائی
پیش کی اور وکیل کو گمراہ کرنے کے لیے ہچکچاتے ہوئے کیا۔ ”پر میں نے ایک گل اور بھی سنی
ہے۔“

وکیل رندھاوا نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”وہ کیا گل ہے؟“

”سنا ہے، اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کیا اور رات ہی کو سرحد پار لوٹ بھی
گئے۔“ رحیم داد نے مسکین سی شکل بنا کر کہا۔ ”ایک بار تو آدھی رات کو زمیں دارنی کا بھائی اور
چاچا اسے لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ مسلح بندے بھی تھے، خود ان کے پاس بھی بھرے ہوئے
پستول تھے۔ پر زمیں دارنی نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اللہ وسایا تو اس رات
شہر گیا ہوا تھا پر میں پہنچ گیا۔ ساری گل بات میرے سامنے ہوئی تھی۔“

”چوہدری! تو نے یہ بات کس سے سنی؟“

”مجھے تو حویلی کے نوکر محمد نے سنائی تھی اور اسے لوہار کے منڈے نے بتائی تھی۔“ رحیم داد
نے وضاحت کی۔

”ویسے زمیں دارنی کے کانوں تک یہ گل پہنچ چکی ہے۔“

”اس نے کیا کہا؟“ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔

”وہ کہتی ہے، یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس کے بھائی اور چاچا ہرگز ایسا نہیں کر سکتے۔ وہ اللہ وسایا کو
کیوں قتل کرتے؟ وہ کبھی ان کے راستے میں نہیں آیا۔ اس کا فیصلہ تو اس نے زمیں دارنی ہی پر
چھوڑ دیا تھا۔ وہ خود ہی اپنے بھائیوں کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔“ وکیل نے جیلہ کا موقف بیان
کیا۔ ”زمیں دارنی کا خیال ہے کہ تفتیش کو غلط راستے پر ڈالنے کے لیے یہ افواہ جان بوجھ کر پھیلانی
گئی ہے۔“

”اور وکیل صاحب، تمہارا کیا خیال ہے جی؟“ رحیم داد نے زور زور سے دھڑکتا ہوا دل قابو میں
کرنے کی کوشش کی۔

”چوہدری! میرا بھی یہی خیال ہے۔“ رندھاوا نے نہایت اعتماد سے کہا۔ رحیم داد پر گھبراہٹ

دستخط کیے تھے۔ جلد ہی دکیل کھڑا ہو گیا، مسکرا کر بولا۔ ”مجھے اب جانا ہے۔“ رحیم داد اس کے ہم راہ بیرونی دروازے تک گیا۔

دکیل سے گفتگو کے بعد رحیم داد سخت پریشان ہو گیا۔ اسے سب سے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر پولیس انسپکٹر جنوے تفتیش کے لیے آیا تو اسے تمام وقت یہ دھڑکا لگا رہے گا کہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔ اسی خطرے کے پیش نظر وہ کسی پولیس والے کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا۔ وہ تفتیشی کارروائی میں کسی طور شریک ہونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بات وہ احسان شاہ سے بھی کہہ چکا تھا۔ احسان شاہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ اللہ وسایا کے قتل کے معاملے میں اس سے مطلق پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔ رحیم داد مطمئن بھی ہو گیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد اسے مزید اطمینان ہو گیا تھا کہ دونوں پولیس انسپکٹروں میں سے کوئی بھی اب تک اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ مگر اب دکیل سے ملنے کے بعد اس کا اطمینان اور سکون درہم برہم ہو گیا تھا۔

دن اسی الجھن میں گزرا۔ شام بھی پریشانی میں کئی۔ غروب آفتاب کے وقت ہلکی سی بارش ہوئی مگر اب آسمان صاف تھا۔ کہیں کہیں بادلوں کے ہلکے پھلکے ٹکڑے تیزی سے دوڑتے نظر آ رہے تھے۔ رحیم داد کا پلنگ برآمدے میں بچھا تھا۔ وہ بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ احمد بھی موجود تھا۔ رات گزرتی رہی۔ احمد اپنے بستر سے اٹھا۔ آہستہ سے کھنکارا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا مگر خاموش لیٹا رہا۔ اس نے دیکھا کہ احمد دبے پاؤں دروازے پر پہنچا اور آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔



آدھی رات کے بعد بیرونی دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد ابھی تک جاگ رہا تھا اور کروٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ نظریں دروازے ہی کی جانب تھیں۔ دروازہ کھلا تو اس نے سوچا کہ احمد آیا ہو گا۔ آنے والا دروازے میں داخل ہو کر آگے بڑھا تو تاروں کی دھندلی روشنی میں رحیم داد نے اس کی وضع قطع سے اندازہ لگایا کہ وہ احمد نہیں ہے۔ رحیم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ غور سے دیکھا تو وہ دارا تھا۔ رحیم داد سخت گھبرایا۔

دارا قریب آیا تو رحیم داد نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”دارا! تو کیسے آیا؟“ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رحیم داد نے اسے روک دیا، دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ”پہلے کنڈی چڑھا دے۔“ دارا نے کنڈی لگائی اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحیم داد کے روبرو آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو نے تو مجھے سخت پریشان کر دیا۔ اب تک کہاں رہا؟ تیں نوں تو ریاست بھاول پور کی طرف نکل جانا تھا؟“ دارا فرش پر بیٹھتے ہوئے عاجزی سے بولا۔ ”بالکل یہی ارادہ تھا۔

آج آدھی رات کے حد میں اور کامل بھاول پور جانے کے لیے بالکل تیار تھے۔“

”پر تو ادھر کیسے آیا؟“ رحیم داد جھنجھلا گیا۔

”وہ ایسا ہوا جی میں روٹی کھا کر جلد ہی سو گیا۔“ دارا نے بتایا۔ ”آنکھ کھلی تو کامل سامنے کھڑا جھوڑ رہا تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بتایا پولیس تیری تلاش میں آئے ہیں۔ تو فوراً پیچھے سے نکل جا۔“ دارا نے دھیرے سے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”میں نے جی ایسا ہی کیا۔ دیوار پھاند کر پھوڑاڑے کیا۔ ادھر مکی کے کھیت تھے۔ میں ان میں گھس گیا اور جھپٹا لکتا چک سے باہر نکل گیا۔“ ”کامل نے تجھے یہ نہیں بتایا پولیس تیری تلاش میں کیوں آئے تھے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”یہ تو جی اس نے نہیں بتایا، وہ تو بہت ڈرا ہوا تھا۔ لگتا ہے پولیس نے اللہ وسایا کے قتل کا سراغ لگالیا ہے۔“

رحیم داد کو فوراً دکیل کی بات یاد آگئی۔ وہ خوف زدہ ہو کے دارا کو دیکھنے لگا۔ دارا نے اسے اس طرح گھورتے دیکھا تو پریشان ہو کر بولا۔ ”تو مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے؟“

”تجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ پولیس پہلے ہی ادھر کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ روز ہی تفتیش کے لیے آتے ہیں۔“

”پر جاتا کہاں؟“ دارا نے مجبوری کا اظہار کیا۔ ”چھپنے کا یہی ٹھکانا نظر آیا۔ تیں نوں پتہ ہے کتنی مشکلوں سے پہنچا ہوں۔“ دارا کے لمبے میں عاجزی تھی۔

رحیم داد کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ ”آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟“

”تو مجھے کسی طرح ادھر سے نکال کر ریاست میں پہنچا دے۔ آگے کی فکر نہ کر۔ کامل رحیم یار خاں پہنچ کر میرا انتظار کرے گا۔ وہ اپنے ایک یار کے ساتھ ٹھہرے گا۔ میں نوں اس کا پتہ ملوم ہے۔ کامل کل کسی دھت ادھر نکل جائے گا۔ میں پہلے پہنچ گیا تو رحیم یار خاں میں اس کے یار کے پاس رک کر انتظار کروں گا۔ یہ پروگرام ہم دونوں پہلے ہی بنا چکے ہیں۔ رحیم یار خاں سے ہم گڈی پکڑیں گے اور کراچی نکل جائیں گے۔“

رحیم داد کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اسے بھاول پور کیسے پہنچائے۔ کوئلہ ہر کشن میں اس کے اعتماد کا کوئی ایسا شخص نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنی مجبوری ظاہر نہیں کی۔ دارا کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”تو اب سو جا۔ فکر نہ کر۔ میں کل تجھے ادھر پہنچانے کا بندوبست کر دوں گا۔“ اس نے دارا کو اوڑھنے کے لیے ایک چادر دے دی۔

دارا چادر لے کر برآمدے کے ایک گوشے میں فرش پر خاموشی سے لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ



خراٹے بھر رہا تھا۔ مگر رحیم داد نہیں سویا۔ وہ سخت پریشان تھا۔ دارا خطرہ بن کر بالکل اس کے قریب آگیا تھا۔ وہ خاموش لیٹا اس خطرے سے چھٹکارا پانے کی تدابیر سوچتا رہا۔ نہ وہ اسے بھاول پور پہنچا سکتا تھا نہ اپنے پاس روپوش رہنے کی اجازت دے سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی الجھن میں تھا۔

تھکا ہارا دارا اطمینان سے چادر اوڑھے سو رہا تھا اور رحیم داد بے چینی سے کوٹیں بدل رہا تھا۔ احمد کی طرف سے وہ مطمئن تھا کہ صبح سے پہلے اس کی واپسی ممکن نہیں۔ وہ اکثر رات گئے چپ چاپ نکل جاتا تھا اور صبح تک غائب رہتا تھا۔ رحیم داد نے سوچا رات تو کسی نہ کسی طرح گزر جائے گی۔ صبح دارا کو کوٹھری میں چھپا کر باہر سے تالا ڈال دے گا۔

مگر وہ اسے اس طرح کب تک چھپا کر رکھ سکتا ہے؟ وہ اسے سویرا ہونے سے پہلے گاؤں سے نکل جانے کے لیے بھی کہہ سکتا تھا یا دن کو کوٹھری میں گزارنے کے بعد رات کو چلے جانے کے لیے کہتا۔ گاؤں کی حدود کے باہر نہر کے کنارے تک جا کر اسے چھوڑ بھی آتا۔ مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو کیا ہوگا؟ رحیم داد لرز کر رہ گیا۔ اسے چھانی کا پھندا سانسے لہراتا نظر آنے لگا۔

بہت غور و فکر کے بعد اسے دارا سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک ہی راستہ نظر آیا اور وہ یہ تھا کہ دارا کا خطرہ سرے سے مٹا دیا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے یہ منصوبہ تیار کیا کہ دن بھر دارا کو نہایت رازداری سے کوٹھری میں چھپائے رکھے گا۔ رات کا اندھیرا پھیلنے ہی احمد کو چھٹی دے دے گا۔ احمد خوشی سے چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد دارا اسے کہے گا کہ وہ نہر کے کنارے پہنچ جائے اور اس کا انتظار کرے۔ بعد میں وہ ہندوق لے کر جائے گا۔ دارا کو گھوڑی پر بٹھا کر دور دیرانے میں لے جائے گا۔ اور اسے گولی مار دے گا۔ لاش نہر میں ڈال دے گا۔ بارش کی وجہ سے نہر کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ لاش بہتی ہوئی دور نکل جائے گی۔

یہ منصوبہ باندھ کر اسے کسی قدر سکون ملا۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ صبح ہونے سے بہت پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے پریشان ہو کر دیکھا کہ دارا غائب ہے اور مسمان خانے کا دروازہ کھلا ہے۔

تانگا بچکولے کھاتا ہوا نہر کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ بارش کے باعث راستہ خراب تھا۔ جگہ جگہ کچھ تھیں، گڑھے تھے۔ کوچوان بہت احتیاط سے تانگا چلا رہا تھا۔ مگر جب کوئی پیہ گڑھے میں چلا جاتا تو تانگا ایک طرف جھک جاتا یا الار ہو جاتا۔ رحیم داد کو بار بار پہلو بدلنا پڑتا۔ وہ بہت چوکس اور محتاط بیٹھا تھا۔

آسمان پر ابر چھایا تھا۔ نہر کی جانب سے بھیگے ہوئے جھونکے آرہے تھے۔ فضا سہانی اور خوشگوار تھی۔ مگر رحیم داد گم صم بیٹھا تھا۔ چہرے سے تشویش جھلکتی تھی۔ تانگا چک بیدی کی سمت جا رہا تھا۔ رحیم داد سویرے سویرے کو ٹلہ ہر کشن سے روانہ ہوا تھا۔ اب پھر دن گزر چکا تھا۔ تانگا نشیب سے نکل کر پلایا کی چڑھائی طے کرنے لگا تو معا "رحیم داد کو اللہ وسایا یاد آگیا۔ اسی پلایا کے نیچے اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی تھی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے اس طرف دیکھا تو چہرے پر خوف اور پریشانی طاری ہو گئی۔ کوچوان اس کے احساسات سے بے نیاز گھوڑے کی پیٹھ پر سزاک سزاک چاکیں مار رہا تھا۔ چڑھائی پر اس کی رفتار بہت ست بڑ گئی تھی۔ چاکیں پڑیں تو گھوڑے نے تیز قدم اٹھائے۔ تانگا اوپر پہنچ گیا اور پختہ سزاک پر تیزی سے دوڑنے لگا۔

رحیم داد چک بیدی نہ گیا۔ اسے دراصل وہاں جانا بھی نہ تھا۔ چک بیدی سے پہلے فاضل پورہ کا اڈہ تھا۔ وہاں سے اسے لاری میں سوار ہونا تھا اور پاک پتن کے بجائے حویلی اسٹیشن پہنچنا تھا۔ لیکن اسے فاضل پورہ بھی نہ جانا پڑا۔ نظیر والی کے قریب حویلی اسٹیشن جانے کے لیے نیلی ٹرانسپورٹ کی لاری مل گئی۔ لاری روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی تھی۔

اب تفتیش پاک تین تحصیل کے تھانے دار کے حوالے کروئی گئی ہے۔ وہ بھی جیلہ اور حویلی کے نوکروں سے پوچھ تاچھ کر کے اور ان کے بیانات لے کر چلا گیا۔

”مجھے اس کا پتہ ہے۔“ احسان شاہ بیچ میں بول پڑا۔ ”پر تجھ سے تو کسی نے بیان شیان نہیں لیا۔ نہ تیرے پاس آیا؟“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ پر پچھلے دنوں وکیل آیا تھا۔ بتاتا تھا اس نے زمیں دارنی کی طرف سے اوپر درخواست لگائی تھی۔ اسی درخواست پر تفتیش کا کام دوسرے تھانے دار کو دیا گیا۔ وکیل اس تھانیدار سے ملا تھا۔ کہتا تھا اس نے سراغ نکال لیا ہے۔ جلد ہی گرفتاریاں بھی ہونے والی ہیں۔“

رحیم داد کے چہرے پر سراسیمگی اور پریشانی چھا گئی۔ ”وکیل نے یہ بھی بتایا، تھانے دار جلد ہی میرے پاس بھی پوچھ تاچھ کرنے آئے گا۔“

”تو گویا گل اس طرح ہے۔“ احسان شاہ نے بیڑوانے کے انداز میں آہستہ سے کہا اور گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ ”تجھے یہ اطلاع ملتے ہی فوراً میرے پاس آنا چاہیے تھا۔“ احسان شاہ کے لہجے سے تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”میں نے ماکھ کو تجھے بلانے کے لیے بھیجا بھی تھا۔“

”میں توجہ وکیل سے بات کرنے کے بعد دوسرے ہی روز آتا چاہتا تھا پر کئی روز تک ایسی زبردست برکھا ہوئی کہ رکی ہی نہیں۔ رستے بھی خراب ہیں۔ میں ایسے میں کیسے آتا۔ رات کو مینہ رکا تو میں سویرے سویرے تیرے پاس آنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔

”اچھا کیا تو آگیا اور ساری باتیں مجھے بتا دیں۔“ احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ تھانے دار جواب تفتیش کر رہا ہے، اس کا نام اسلم حیات جنجوعہ ہے نا؟“

”وکیل نے اس کا یہی نام بتایا تھا۔“

”لگتا ہے جیلہ کی درخواست پر ہی اسے ڈی۔ ایس۔ پی نے لگایا ہے۔ جنجوعہ کارگزاری دکھانے پر تلا ہوا ہے۔“ احسان شاہ مسکرایا۔ ”تو اس کی پروا نہ کر۔ اس کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔“

”میں نوں تو اس سے خوف آنے لگا ہے۔ میرے پاس پوچھ تاچھ کے لیے آیا اور اس نے اٹلے سیدھے سوال کیے تو ڈر ہے نہ جانے کیا زبان سے نکل جائے۔ سچ پوچھ تو میں کبھی کتل شل کے معاملوں میں پڑا نہیں۔ اسی لیے تجھ سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ایسا بندوبست کروے کہ میں نوں پولیس کے چکروں میں نہ پڑنا پڑے۔“

احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”ابھی بہت کچا ہے۔ جلدی گھبرا جاتا ہے۔ ڈرتا بھی ہے۔ چوہدری! زمیں داری کرنی ہے تو وڈا دل رکھ۔ حوصلے سے کام لے۔“ اس کا لہجہ بھاری بھر کم ہو گیا۔ ”ایسے

رحیم داد جھٹ تاکے سے اترا۔ کرایہ ادا کیا۔ اور لاری میں جا کر بیٹھ گیا۔ دوسرے کو وہ حویلی اسٹیشن پہنچ گیا۔ وہاں سے اسے احسان شاہ کے گاؤں، پیراں والہ جانا تھا۔ اسٹیشن سے متن والہ تک کنکر کی بنی ہوئی سڑک تھی۔ سڑک بہت دور تک آگے بھی جاتی تھی۔ اسی سڑک سے ایک پینے سڑک پیراں والہ کو جاتی تھی۔ یہ سڑک احسان شاہ کی جاگیر میں واقع تھی۔ اسی نے ہوائی تھی اور اسی کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ متن والہ کی سمت جانے والی کنکر کی سڑک شدید بارشوں سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ لہذا ان دنوں اس پر بہت کم لاریاں چلتی تھیں۔

رحیم داد نے لاری کا انتظار کرنے کے بجائے تانگا لیا اور اس میں بیٹھ کر پیراں والہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ سڑک خراب ہونے کے باوجود تانگا سورج غروب ہونے سے پہلے ہی احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ احسان شاہ گھوڑی پر سوار ہو کر ہوا خوری کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ حویلی کے پھاٹک پر رحیم داد سے اس کی مڈبھیر ہو گئی۔ دیکھتے ہی جھٹ گھوڑی سے نیچے اترا۔ برہہ کر گرم جوشی سے رحیم داد کو گلے لگایا۔ ہوا خوری کا ارادہ ترک کیا۔ رحیم داد کو اپنے ہم راہ دیوان خانے میں لے گیا۔

احسان شاہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو بھی قریب بٹھایا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”چوہدری تو تانگے میں کہاں سے آ رہا ہے؟“

”اتو میں کو ٹڈ ہر کشن ہی سے رہا ہوں۔ آگے بھی اسی رستے سے آتا رہوں گا۔“

”پر یہ تو بہت لمبا اور چکر کا راستہ ہے۔“ احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تو نے یہ راستہ کیوں پکڑا؟“

”نہر کے کنارے کا رستہ چھوٹا ہے۔ میں گھوڑی پر بیٹھ کر آرام سے آجا بھی سکتا ہوں۔ پر اس رستے کو استعمال کرنے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے یہ چکر کا رستہ پکڑا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ احسان شاہ نے ہکا تقہہ لگایا۔ ”اب تجھے کس کی پروا کرنی ہے؟ میں نے تیرا راستہ بالکل صاف کر دیا ہے۔ اللہ وسایا سے ڈرتا تھا، وہ تو اب رہا نہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہے، پر مجھے بہت خوف لگ رہا ہے۔ ہر طرف خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”پروا نہ کر چوہدری۔ کوئی خطرے شطرے کی گل نہیں۔“ احسان علی شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”یہ بتا تیرے پاس کوئی پولیس تو پوچھ گچھ کے لیے نہیں آیا؟“

”ابھی تک تو کوئی نہیں آیا۔ وہ تھانے دار تفتیش کے لیے آئے۔ پہلے اس تحصیل کا پنچا پر

خطرے تو آگے روز ہی آتے رہیں گے۔ کب تک ڈرتا رہے گا؟“ اس نے رحیم داد کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ”پریشان نہ ہو۔ ایسا بھی وکت آئے گا اور جلد ہی آئے گا جب تجھے خطرہ، خطرہ نہ لگے گا بلکہ خطرہ مول لینے میں مزا آئے گا۔“

چوہدری بھی آیا ہوا ہے۔“
شیدا نظرس جھکا کر بولا۔ ”کریاں اور میز تو لگا دی ہیں جی۔ بوتل اور گلاس بھی لیے آتا ہوں۔“
احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری، باہر آجا۔ وہیں گل بات ہوگی۔“
رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں لان میں پہنچے اور کرسیوں پر آسنے سامنے بیٹھ گئے۔ شیدا اسکاچ کی بوتل، گلاس اور جگ میں پانی لے آیا۔ اس نے نہایت مستعدی سے دو پیگ بنائے اور گلاس احسان شاہ اور رحیم داد کے آگے رکھ دیے۔ دونوں نے گلاس اٹھا کر وہسکی کے گھونٹ بھرے۔
رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”تو نے یہ نہیں بتایا دارا اب کہاں ہے؟ اس کا کیا بنا؟“
”وہ ریاست بہاول پور کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے اسی رات اسے ریاست کی حدود میں پہنچا دیا۔“

”تیں نوں ٹھیک طرح پتہ ہے، وہ ادھر پہنچ گیا؟“
”میرے کمرے ساتھ گئے تھے۔ اسے ادھر پہنچا کر مجھے انہوں نے اطلاع بھی پہنچا دی تھی۔“
احسان شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے اب تک وہ کراچی پہنچ چکا ہو گا تو اس کی طرف سے بالکل فکر نہ کر۔ ویسے وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ وہ جلد ہی کراچی سے بحرین کی طرف نکل جائے گا۔ مجھے تو وہیں جانے کے لیے کہتا تھا۔“
رحیم داد وہسکی کی ہلکی ہلکی چسکی لگاتا رہا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”شاہ جی! تجھ سے ایک گل پوچھنی تھی؟“
”ضرور پوچھ۔“ احسان ہنس کر بولا۔

”اللہ وسایا کے کتل کے موکج پر تو بھی موجود تھا؟“

”ہاں!“ احسان شاہ نے اعتراف کیا۔ ”ویسے میں عام طور پر ایسے موکجوں پر موجود نہیں رہتا۔ ایسے کام کے لیے میرے بندے بہت ہوشیار ہیں۔ پر اللہ وسایا ادھر کا وڈا زمین دار تھا۔ ہوشیاری سے سوچ سمجھ کر کام کرتا تھا۔ آگے کا بھی تو دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے میں خود پہنچ گیا۔ تجھے پتہ ہے، بیلا میری حویلی سے بہت زیادہ دور نہیں۔ نزدیک کا معاملہ تھا۔ سوچا، اپنے سامنے ہی یہ کام کرا دوں۔ بات یہ ہے، پہلے بھی کئی بار میرے بندوں نے اسے کتل کرنے کی کوشش کی۔ پر وہ بچ کر صاف نکل گیا۔ میں چاہتا تھا اس بار بچ کر نکلنے نہ پائے۔“ اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”پر یہ بات تجھے دارا نے بتائی ہوگی۔“

بھی بتاتا تھا کہ اسی نے دونوں بار گولیاں چلائیں اور انھیں کے لگنے سے وہ مرا۔“ رحیم

”میں نوں ڈر اس لیے بھی لگ رہا ہے کہ وکیل کہتا تھا، تھانے دار نے اللہ وسایا کے کتل کا پتہ چلا لیا ہے۔ لگتا ہے وہ ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تیں نوں پتہ نہیں پولیس نے دارا کے ٹھکانے پر پچھلے دنوں رات کو چھاپہ مارا۔ وہ کسی نہ کسی طرح بچ کر نکل بھاگا۔ سیدھا میرے پاس آیا۔ میں حویلی کے مہمان خانے میں اس رات اکیلا ہی تھا۔ اسے اپنے ساتھ ٹھیر لیا۔ پر وہ صبح ہونے سے پہلے ہی چپکے سے اٹھ کر بھاگ گیا۔ جانے کہاں ہے؟ پولیسوں کے ہاتھ لگ گیا تب تو بہت گزربو جائے گی۔ اس کے اس طرح فرار ہونے نے مجھے اور بھی زیادہ خوف میں ڈال دیا۔“ رحیم داد کے بشرے سے پریشانی سننے لگی۔ ”شاہ جی! یہ تو سوچ، وہ گرفتار کر لیا گیا تو پولیس کو پکا ثبوت مل جائے گا۔“
”تجھے اب تک یہ بھی پتہ نہیں کہ دارا کہاں ہے؟“

”میں نوں کیسہ پتہ جی۔“ رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ ”اس رات کے بعد سے وہ ملا ہی کب۔“

”میں تجھے بتاتا ہوں، دارا کہاں ہے۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکراتے ہوئے بتایا۔
”تیرے پاس سے وہ سیدھا ادھر آیا۔ اور یہ اس نے ٹھیک ہی کیا۔ شیدا اسے میرے پاس لایا۔ میری اطلاع یہ ہے کہ پولیس نے اللہ وسایا کے کتل کے سلسلے میں چھاپہ نہیں مارا تھا۔ وہ اسے کسی دوسرے ہی کیس میں گرفتار کرنا چاہتی تھی۔“
رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یہ بات تجھے دارا نے بتائی؟“ رحیم داد کا دل خوف سے زور زور سے دھڑکنے لگا۔

”نہیں۔“ احسان شاہ نے جواب دیا۔ ”نہ میں نے اس بارے میں اس سے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ ویسے مجھے اس وکت تک کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ بعد میں معلوم کرنے پر یہ اطلاع ملی کہ پولیس کسی اور کیس میں اسے تلاش کر رہی ہے۔“

اب شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ دیوان خانے اور اس سے متصل برآمدے میں لپ روشن کر دیئے گئے تھے۔ نوکروں نے برآمدے کے آگے لان میں میز اور کرسیاں لگا دی تھیں۔ شیدا آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ نے پوچھا۔ ”شیدے! تو نے اب تک کچھ بندوبست نہیں کیا؟“ وہ مسکرایا۔ ”برسات کی یہ سوہنی شام ایسے ہی گزرتی جا رہی ہے۔“

”دادے۔“

”پروانہ کر۔ بالکل ایسا ہی ہوگا۔“

”ویسے میں تجھے یہ بتا دوں، جیلہ اپنے وکیل کے ذریعے معاملہ اوپر تک لے جائے گی۔“ رحیم دادے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”لے جانے دے۔ جتنا چاہے اوپر لے جائے۔“ احسان شاہ نے پلیٹ سے تلا ہوا مرغ اٹھایا

اور اس کی ایک ٹانگ نوچ کر علیحدہ کرنے لگا۔ ”پر کچھ ہونے کا نہیں۔“

”باتوں میں ایسا پھنسا کہ تین نوں ایک گل بتانا بھول ہی گیا۔ اور وہ بہت کام کی گل ہے۔“

”کیا گل ہے، صاف صاف بتا۔“

”تھانے دار کا خیال ہے اللہ وسایا کا کتل پرانی دشمنی کی وجہ سے ہوا۔“ رحیم دادے احسان کو

آگاہ کیا۔ ”یہ گل جیلہ نے اسے سمجھائی۔ جیلہ نے پچھلے دنوں مجھے بلایا تھا۔ کتنی تھی اس نے

تھانے دار سے یہی کہا ہے۔ پہلا تھانے دار تو نہ مانا۔ پر اب جو تفتیش کر رہا ہے وہ اسے مانتا ہے۔

جیلہ نے تیرے بارے میں تھانے دار سے شبہ ظاہر کیا ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا تھا۔“

”یہ تو بہت پہلے ہی مجھے پتہ چل گیا تھا۔“ احسان شاہ کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ ”تو نے یہ کوئی نئی گل نہیں

بتائی۔ جیلہ کو تو یہ کتنا ہی تھا۔“

”تو نے میری پوری گل نہیں سنی۔“ رحیم دادے کی ترنگ میں مسکرایا۔ ”میں نوں تجھے یہ بتانا

ہے، اللہ وسایا کی پرانی دشمنی تو جیلہ کے بھائیوں سے بھی تھی اور تجھ سے زیادہ تھی۔ اللہ وسایا ان

کا مزارع تھا۔ اپنے معمولی مزارع، اور وہ بھی مسلمان مزارع کے گھر میں اپنی بھین کو اس کی گھر

والی کے طور پر کیسے دیکھ سکتے ہیں۔ وہ بھی تو اسے کتل کر سکتے ہیں۔“

”یہ بات تو نے سوچی ہے؟“ احسان شاہ نے پوچھا۔

”نہیں مجھے حویلی کے ایک نوکر نے بتائی ہے۔“ رحیم دادے کھل کر اظہار خیال کیا۔ ”وہ کتنا

تھا کوئلہ ہر کشن میں اس کا بہت چرچا ہے کہ اللہ وسایا کو جیلہ کے بھائیوں نے کتل کیا اور رات ہی

کو واردات کے بعد سرحد پار چلے گئے۔“

”نکتہ تو یہ بہت زوردار ہے۔“ احسان شاہ نے اظہار پسندیدگی کیا۔ ”ان پر بالکل شبہ کیا جاسکتا

ہے۔ اس طرح تفتیش کو ایسے رخ پر ڈالا جاسکتا ہے کہ آگے بڑھنے ہی نہ پائے۔“

”میں چاہتا ہوں تو اوپر کے پولس افسروں کے کان میں یہ بات ڈال دے۔“ رحیم دادے تجویز

پیش کی۔ ”نیا تھانے دار تفتیش پر لگایا جائے تو وہ اس طرح آسانی سے کیس یہ کہہ کر دبا سکتا ہے کہ

دادے نے پوچھا۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

”دارا نے ٹھیک ہی بتایا۔ میں نے جان بوجھ کر اسی سے گولیاں چلوائیں۔“ احسان شاہ ایک

آنکھ دبا کر عیاری سے مسکرایا۔ ”میں نے تیری باتوں سے اندازہ لگالیا تھا کہ تو اسے کسی سنگین جرم

میں پھنسا کر اپنے کا بومیں رکھنا چاہتا ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“ رحیم دادا انکار نہ کر سکا۔ مگر وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے اپنی پریشانی پر

قابو پانے کے لیے دہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ مسکرانے کی کوشش کی۔ ”شاہ جی! تیرا بھی جواب

نہیں۔ حد کر دی تو نے۔“

”تجھے پتہ نہیں، مجھے روزی طرح طرح کے بندوں سے ملنا پڑتا ہے۔“ احسان شاہ نے فخر سے

گردن اونچی کرتے ہوئے بتایا۔ ”اگر اتنی سمجھ نہ رکھتا تو کوئی میرے پاس مشورے کے لیے کیوں

آنے لگا؟ ساتھ رہے گا تو تجھے خود پتہ چل جائے گا۔ ابھی تو تیرے ساتھ میرا نیا نیا ملنا جلنا ہوا

ہے۔“

”یہ تو بتا شاہ جی، تھانے دار جنجوعہ کا کیا بندوبست کرنے والا ہے۔“ رحیم دادے نے اپنی تشویش

ظاہر کی۔ ”جلد ہی کچھ ہونا چاہیے۔ ورنہ وہ کسی روز میرے پاس پہنچ جائے گا۔“

”فکر نہ کر۔ وہ تیرے پاس کبھی نہیں پہنچے گا۔“ احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”ادھر کا

ایس پی فتح علی مرزا ہے۔ وہ ڈی۔ آئی۔ جی بن نے کے چکر میں لگا ہے۔ ویسے ہے بھی سینئر افسر۔

میرے پاس کئی بار آچکا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، میرا ایک پتر کراچی میں مرکزی حکومت میں وڈا افسر لگا

ہے۔ دوسرا لور میں ہوتا ہے۔ تیسرا پنڈی میں۔ وہ دونوں بھی وڈے افسر ہیں۔ ویسے دوسرے

افسروں اور اسمبلیوں کے ممبروں سے بھی یاری دوستی ہے۔ ان کے کام کرتا ہوں تو ان سے کام لیتا

بھی ہوں۔“ وہ ہنسنے سے جھوم کر مسکرایا۔ ”اطمینان رکھ۔ ایس۔ پی سے کہہ کر جنجوعہ کا تبادلہ

کرادوں گا۔ اور جلد ہی کرادوں گا۔“

”ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک رہے گا۔ وکیل کی باتیں سن کر میں نوں خوف آنے لگا تھا۔“

”تیرے کہنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا، تھانے دار جنجوعہ کا رگزار ہی دکھانے کے لیے کچھ

نہ کچھ گڑبڑ ضرور کرے گا۔ میں نے اس کے تبادلے کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔ کل ہی مرزا سے

بات کروں گا۔“

شیدا بلیٹوں میں تلے ہوئے مرغ اور کباب لے کر آیا اور میز پر رکھ کر چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم

دادے نے کباب اٹھا کر کھاتے ہوئے کہا۔ ”شاہ جی، اس بار کسی اے تھانے دار کو لگوا جو کیس کر

کسی اور دیاہ کرنے کی کیا ضرورت۔ جیلہ موجود ہی ہے۔ اس سے نکاح پڑھا لیتا۔
 ”مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”گلتا ہے، وہ تو اب کسی
 سے نکاح شکاح نہیں کرنے کی۔ تو نے اس کا سیپا نہیں دیکھا۔ ہر دم روتی ہی رہتی ہے۔“
 ”رائہ ہونے کے بعد ہر زانی ایسے ہی سیپا کرتی ہے۔ بعد میں سب کچھ بھول جاتی ہے۔ جیلہ
 زانی زانی نہیں۔ ابھی تو وہ بھرپور جوان ہے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔
 مگر وہ نہ مانا۔ ”شاہ جی، وہ اور ہی طرح کی زانی ہے۔ تیں نوں اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ
 نہیں۔“

”مجھے سب پتہ ہے۔“ احسان علی شاہ ہنس کر بولا۔ ”تو دیکھتا جا۔ جیسا کہوں ویسا کر۔ جلد بازی کی
 ضرورت نہیں۔ ابھی تو چوٹ تازہ ہے۔ اس سے ہمدردی جتا۔ اسے تسلی دے۔ اس کا دل بھلانے
 کی کوشش کر۔ اس کے بچوں سے پیار کر۔ ہر طرح اس کا غم بھلانے اور اس کے دل میں اپنی جگہ
 پیدا کرنے کی کوشش کر۔ فیر دیکھ وہ کیسے کا بو آتی ہے۔ کپے پھل کی طرح تیری جھولی میں گرے
 گی۔“

”پر ابھی تو وہ عدت میں ہے۔ مجھ سے گل بات کی تو منہ بکل مار کر چھپا لیا تھا۔ پیٹھ موڑ کر بیٹھی
 تھی۔ ابھی تو وہ میرے سامنے آتی بھی نہیں۔ نہ ہی میں اس کے پاس جاسکتا ہوں۔ ملاکتا ہے عدت
 کے دنوں میں وہ نامحرم کے سامنے نہیں آسکتی۔ میں اس کے لیے نامحرم ہی تو ہوں۔ میں اس کا کون
 سا گناہ شریک لگتا ہوں۔“

”اور وہ کون سی بچی مسلمان ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کیسے مسلمان ہوئی اور کیوں ہوئی؟“ احسان شاہ
 کا لہجہ قدرے نیکیا تھا۔ ”نہ کبھی اس نے پردہ شرع کیا نہ وڈے زمینداروں کی زانیوں کی طرح گھر
 کے اندر بیٹھی۔ اس کا رہن سہن تو ہمیشہ ہندوئوں جیسا رہا۔ تو نے اسے بہت نزدیک سے دیکھا ہے۔
 خوب بن سنور کر ادھر سے ادھر تلتی کی طرح اڑی اڑی پھرتی تھی۔ وہ زیادہ دن ایسے بند ہو کر نہیں
 بیٹھی گی۔ زیادہ سے زیادہ عدت کے دنوں میں حویلی سے باہر نہیں جائے گی۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ وہ ہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے
 بولا۔ ”چوہدری۔ آج رات ادھر ہی ٹھیر جا۔“

”ایا تو اسی ارادے سے تھا۔ واپسی کے لیے گھوڑی بھی میرے پاس نہیں۔“
 ”گھوڑی تو تجھے مل جائے گی پر اس سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ بکہ آگے بھی تو گھوڑی کی بجائے
 اسی رستے سے آیا کر جس سے آج آیا ہے۔ جیلہ کو ہرگز پتہ نہیں چلنا چاہیے میرا تیرا میل ملاپ

کامل جیلہ کے بھائی تھے جو سرحد پار جا چکے ہیں۔ ان کے خلاف کارروائی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے
 داد طلب نظروں سے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ ”ویسے یہ بات پنڈ میں سب ہی جانتے ہیں کہ جیلہ
 کے بھائی کئی بار اسے لینے آئے۔ ایک بار تو میرے سامنے آئے تھے پر وہ نہیں گئی۔“
 ”تو نے ٹھیک سوچا چوہدری۔“ احسان شاہ نے تقہر لگایا۔ ”یہ نکتہ پیدا کر کے تو نے دل خوش
 کر دیا۔ تو اندر سے اتنا گمراہ ہے یہ مجھے پتہ نہ تھا۔“

احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا اور چند لمحے تک ہنستا رہا۔ وہ بہت خوش اور مگن نظر آ رہا تھا۔ رحیم
 داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”ویسے یہ بات جیلہ تک بھی پہنچ چکی ہے۔ وکیل کہتا تھا، وہ یہ سن کر
 بہت زراض ہوئی۔“

”اے تو زراض ہونا ہی تھا۔ وہ کیسے چاہے گی، اللہ وسایا کے کتل کا الزام اس کے بھائیوں پر
 لگے۔“ احسان شاہ نے وہ ہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”وہ تو اسے کبھی نہیں مانے گی۔ پر اس کے ماننے نہ
 ماننے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

اس نے نشے کی جھونک میں لہرا کر رحیم داد کو دھار آلود نظروں سے دیکھا۔ ”چوہدری تو نے بہت
 چنگا نکتہ نکالا، بہت چنگا نکتہ نکالا۔ اس بنیاد پر آسانی سے کیس دیا جاسکتا ہے۔ شبہ بھی نہ ہوگا۔
 سننے والے اسے مان بھی لیں گے۔ جیلہ کے مغویہ ہونے سے یہ فائدہ تو اٹھایا ہی جاسکتا ہے۔ یہ
 بات تو اس پاس کے علاقے میں بھی پھیلائی جاسکتی ہے۔ جلد ہی پھیل بھی جائے گی۔ یہاں سے
 سرحد ۳۰ میل سے زیادہ فاصلے پر نہیں۔ حویلی شیش سے سرحد تک پکی سڑک جاتی ہے۔ اس
 سڑک پر رات تو رات دن کو بھی سمگروں کے اٹھ اور ٹرک دوڑتے پھرتے ہیں۔ کامل آسانی سے
 واردات کے بعد فرار ہو سکتے ہیں۔“

”ایک گل تجھے اور بتاتی تھی۔“

”بتاتا ضرور بتاتا۔“ وہ خوش ہو کر ہنسا۔ ”آج تو بہت چنگی باتیں کر رہا ہے۔“

”گل امیہ ہے جی، کبیر والا کے جس زمیں دار کی کڑی سے میرا دیاہ ہونے والا تھا، وہ رشتہ اس
 نے خود ہی توڑ دیا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”جیلہ نے یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ اس
 کے پاس چوہدری اکرم کا چچیر اور بھرجائی آئے تھے۔“

”یہ تو بہت ٹھیک ہوا۔ ویسے میں تجھے پہلے ہی خبردار کر چکا تھا کہ یہ بھی اللہ وسایا کا چکر ہے۔ اب
 تو نے خود ہی دیکھ لیا، اس کے مرتے ہی رشتہ ٹوٹ گیا۔ چوہدری! جی گل تو امیہ ہے، تجھ سے حویلی
 اور اراضی ہتھینے کے لیے اللہ وسایا کی یہ بھی چال تھی۔“ اس نے تقہر بلند کیا۔ ”تجھے اب

ہے، ورنہ بھڑک جائے گی۔“

”میں نے یہی سوچ کر یہ رستہ پکڑا ہے۔“

”اللہ وسایا تو مزارع ہی رہا۔ اپنا تانگا بھی نہ رکھا۔ پر تو ایسا نہ کرنا۔ تانگا ضرور رکھنا۔ زمیں داری کے چکر میں روزی ادھر ادھر جانا پڑتا ہے۔ میرے پاس تو کار بھی تھی۔ پر اب تو پرانی ہو کر بے کار پڑی ہے۔ ویسے پچھلے دنوں میں نے ایک جیب خرید لی ہے۔ لہور میں ہے۔ جلد ہی پہنچ جائے گی۔ اس کی مجھے سخت ضرورت تھی۔“

”شاہ جی تو ٹھیرا وڈا زمیں دار بلکہ بگیردار۔ سواری کے لیے چاہے تو نئی موٹر بھی خرید سکتا ہے۔ پر میرے پاس اتنی رقم کہاں۔“ رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”اللہ وسایا کے پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ جو کچھ تھا اس سے ۱۲ مربع کلیم خرید لیا تھا۔ وہ بھی جیلہ نے سکول اور ڈپنری بنانے کے لیے بچا کر رکھا تھا۔“

”سب بکواس ہے۔“ احسان شاہ نے تنخی سے کہا۔ ”اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ یہ تو اس نے تجھ سے چھپانے کے لیے سب کچھ کیا تھا۔ اسے زمیں داری اپنے کہنے میں ہی رکھنی تھی۔ یہ دکھا کر وہ زمیں داری میں سے تجھے کچھ دینا نہیں چاہتا تھا۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”اب تجھے زمیں داری سنبھالنی ہے اور اس طرح نہیں چلانی جیسے اب تک چلتی رہی۔ اللہ وسایا نے تو مزارعوں کے اتنے دماغ خراب کر دیئے تھے کہ سارے ہی اپنے تئیں زمیں دار بن گئے۔ سنا ہے، دیگا روہ نہیں کرتے۔ بٹائی میں بھی پورا پورا نصف حصہ لیتے ہیں۔ ایک گل ہو تو بتاؤں، تیرے پنڈ اور تیری زمیں داری کی ہر گل نرالی ہے۔“ اس نے وہسکی کی چسکی لگائی۔ ”سمجھ نہیں آتی تو ان بگڑے ہوئے مزارعوں اور کیوں کے ساتھ کیسے کام چلائے گا۔“

”شاہ جی! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پنڈ میں بالکل ایسا ہی ہوتا رہا۔ جب تک اللہ وسایا زندہ تھا میں نے زمیں داری کے معاملے میں کبھی نہ کچھ پوچھا اور نہ ہی اس میں حصہ لینے کی کوشش کی۔ ویسے میں نے جیلہ سے بھی ابھی تک زمیں داری کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کی۔“

”ابھی اس سے ایسی گل بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”پر آگے کے لیے تجھے ابھی سے سوچنا ہو گا۔ اور ویسے ہی زمیں داری چلانی ہوگی جیسے زمیں داری چلانی جاتی ہے۔“

”جیسا تو کہتا ہے، ویسا ہی کروں گا۔“ رحیم داد نے مشورہ قبول کرتے ہوئے اسے صورت حال سے بھی آگاہ کیا۔ ”شاہ جی! ویسے تو زمیندار اللہ وسایا ہی تھا۔ پر زمیں داری کے سارے معاملات

ہام طور پر جیلہ ہی طے کرتی رہی ہے۔ حساب کتاب تو سارا ہی اسی کے پاس رہتا ہے۔ کسی مزارعے کو ادھار دینا ہو یا وصولی کرنی ہو، ایسا ہر کام وہی کرتی ہے۔ مزارعے اس سے خوش بھی بت ہیں۔ اسے پیار سے بھین جی کہتے ہیں۔“ اس کے لہجے سے مجبوری جھلکنے لگی۔ ”تو خود سوچ، میں زمیں داری کا کام اپنی مرضی سے کیسے چلا سکوں گا۔“

”پر جیلہ تو اب حویلی سے باہر نہیں جاسکتی۔ اسے تو عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرنے ہیں۔ اس عرصے میں تو بہت کچھ کر سکتا ہے۔“ اس کا لہجہ قدرے ٹیکھا ہو گیا۔ ”لگتا ہے تو زمین داری سنبھالنے کو تیار ہی نہیں۔“

”ایسی گل نہیں۔ میں تو بالکل تیار ہوں۔“ اس نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔ ”ایسا ارادہ نہ ہوتا تو اللہ وسایا کو اپنے رستے سے کیوں ہٹانے پر آمادہ ہوتا۔ مشکل یہ ہے زمیں داری کو کیسے اپنے ہاتھ میں لیا جائے۔ جیلہ سے اس معاملے میں ابھی گل بات کرنی ٹھیک نہیں۔ ڈرتا ہوں اسے شبہ نہ ہو جائے۔“

”نہیں، تو جیلہ سے ایسی بات نہ کرنا۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے۔“

رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”وہ کیا ہے جی؟“

”تو زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے میجر اور منشی رکھ لے۔ اسی کے ذریعے زمیں داری کا کام چلانے کی کوشش کر۔ وہ تیرا تنخواہ دار بندہ ہو گا۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔ یوں سمجھ لے اس کے ذریعے ساری زمیں داری تیرے ہاتھ میں آجائے گی۔“

”گل سمجھ تو آتی ہے۔“ رحیم داد نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ ”پر ایسا بندہ میں لاؤں گا کہاں سے؟“

”فکر نہ کر۔ اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ بلکہ میری نظر میں اس کام کے لیے پہلے ہی سے ایک بندہ ہے۔“ احسان شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا نام نادر خاں ہے۔ محکمہ مال میں رہ چکا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے ایک تمبن دار کا کاردار بھی رہ چکا ہے۔ بہت تجربہ کار اور کام کا بندہ ہے۔ آج کل خالی ہے۔ پچھلے دنوں میرے پاس آیا تھا۔ ادھر رحمت والی میں اس کی سرال ہے۔ بنی الحال وہیں ٹھیرا ہے۔“

”تنخواہ کیا لے گا؟“

”تنخواہ کی فکر نہ کر۔ وہ مجھ پر چھوڑ دے۔ وہ اتنا کام کا بندہ ہے کہ جتنی تنخواہ لے گا اس سے کہیں زیادہ تجھے فائدہ پہنچائے گا۔“ احسان شاہ بے تکلفی سے کھکھلا کر ہنسا۔ ”وہ تجھے پکا زمیں

دار بنا دے گا۔ تو مہاجر ہے، ادھر کی زمیں داری کے رنگ ڈھنگ کا تجھے زیادہ پتہ نہیں۔ ایسا بندہ تجھے دوں گا کہ زمیں داری کا لطف آجائے گا۔“

رحیم داد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یکایک موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ بجلی زور سے کڑکی۔ آسمان میں روشنی کی تیز لکیر دور تک پھیل گئی۔ ساتھ ہی تیز بارش شروع ہو گئی۔ دونوں لان سے اٹھ کر برآمدے میں پہنچ گئے۔ شیدا اور دوسرے نوکروں نے بھاگ بھاگ میز اور کرسیاں اٹھا کر برآمدے میں لگا دیں۔

احسان شاہ اور رحیم داد پھر وہسکی سے شغل کرنے لگے۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل زور زور سے گرتے۔ برآمدے میں تیز ہوا کے جھونکوں کے ساتھ کبھی کبھی ہلکی سی بوچھاڑ بھی آجاتی۔ دونوں بارش سے لطف اٹھاتے رہے اور وہسکی کے نشے کو دو آتشہ بناتے رہے۔ احسان شاہ تو غٹ غٹ چڑھتا رہا۔ مگر رحیم داد بھی اس رات حد سے تجاوز کر گیا۔ احتیاط کے باوجود کچھ زیادہ ہی پی گیا۔ وہ بے تکلفی سے قمقمے لگاتا۔ بات کرتا تو زبان کسی قدر لڑکھاتی۔ ہنک کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ احسان شاہ بھی نشے کے ریلے میں بار بار بہہ جاتا۔ دونوں ہی سرخوشی کے عالم میں تھے۔ دس بجے سے کچھ دیر پہلے دونوں اٹھے اور ڈمگاتے قدموں سے کھانے کی میز پر پہنچے۔ کھانا پر تکلف اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد مزالے لے کر خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر احسان شاہ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے ایک طرف ادب سے کھڑے ہوئے شیدا کو دیکھا۔ اشارے سے قریب بلایا۔

شیدا نزدیک آیا تو احسان شاہ نے کہا۔ ”چوہدری، آج رات یہیں ٹھیرے گا۔ کمرہ ٹھیک ٹھاک کرا دے۔“ اس نے اپنی مخمور آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں کی حالت میں بیٹھا رہا۔ اس نے آنکھیں کھول کر شیدا کی جانب دیکھا۔ ”ناجو کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔“

شیدا خاموش رہا۔ کچھ نہ بولا۔ احسان شاہ نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ ”چپ کر کے کیوں کھڑا ہے؟“

شیدا نے دبی زبان سے کہا۔ ”ناجو تو جی۔“ وہ بات کہتے کہتے رک گیا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے کہا۔ ”کیا ہو گیا ناجو کو؟ صاف صاف بتا۔ کوٹ سے نکل کر بھاگ تو نہیں گئی؟“

”نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں۔“ شیدا بدستور خوف زدہ تھا۔

”فیر یہ۔ گل ہے؟ ٹھیک ٹھیک بتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”وہ ایسا ہے جی۔“ وہ ایک بار پھر اٹکا۔ لمحہ بھر خاموش رہ کر آہستہ سے بولا۔ ”اسے تو جی۔“

چھوٹے شاہ جی نے اپنے کمرے میں بلا رکھا ہے۔“

”اس کھوتی کے بنے نے یہ بھی نہ سوچا ناجو عمر میں اس سے کتنی بڑی ہے۔“ وہ غصہ سے آنکھیں نکال کر بولا۔ مگر جلد ہی نرم پڑ گیا۔ آہستہ سے ہنسا۔ رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”یہ جوانی بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔ نہ جوڑ دیکھے نہ بے جوڑ۔ اندھا بنا دیتی ہے۔“ اس نے زور کا مقدمہ لگایا۔ ”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ جاڑے میں اس کا ویاہ کرنے والا ہوں۔ ناجو اسے سارے گرتا دے گی۔ بہت زوروں کی رن ہے۔“

رحیم داد بے نیازی سے بریانی کی پلیٹ سے لقمے اٹھا اٹھا کر کھاتا رہا۔ شیدا سر جھکائے چپ کھڑا رہا۔ احسان شاہ آنکھیں بند کر کے ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحوں بعد گردن اٹھا کر شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔ ”شیدے!“ وہ بات کہتے کہتے بھٹکا۔ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ بلو کیسی رہے گی؟ بالکل ٹھیک۔ اسے پہنچا دے۔ وہ نکھرا نکھرا بھی نہیں کرے گی۔ چوہدری کو تو ایسی ہی رن چاہیے۔“ اس نے رحیم داد کی سمت دیکھا۔ ”کیوں چوہدری کیا خیال ہے تیرا؟ اگر تجھے تیز اور گرم چاہیے تو بتا دے۔“

”میں نوں تو جی نہ گرم چاہیے نہ ٹھنڈی۔ میں تو ایسے ہی سوجاؤں گا۔ میری فکر نہ کر۔“

”چوہدری تو زنانیوں کی طرح شرما کیوں رہا ہے؟ دائرہ ہی رکھ کر تو بالکل ملاں بن گیا۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”ملاں بن کر زمین داری نہیں چل سکتی۔ اور ملاں بے چارے کو تو زنانی ملتی ہی کہاں ہے؟ وہ تو صرف اس کے خواب دیکھتا ہے۔ اور تو، تو۔“ وہ ایک بار پھر ہکا اور دوسری طرف نکل گیا۔

”جیلہ بھی بہت زوروں کی رن ہے۔ جب اللہ وسایا اسے اٹھا کر لایا۔ یہ کوئی اٹھ سال ادھر کی گل ہے۔ میں اسے دو ہزار دیتا رہا کہ میری حویلی میں بھیج دے۔ پر وہ نہ مانا۔“ اس نے پلٹ کر شیدا کی جانب دیکھا جو سر جھکائے بت بنا کھڑا تھا۔ ”تو ابھی گیا نہیں۔ جا، جا کر چوہدری کے ٹھیرے کا بندوبست کر۔ بلو کو پہنچا دے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو پھر چھیڑا۔ ”چوہدری! سادہ کی یہ گرجتی برستی کالی راتیں روز روز نہیں آتیں۔ کیا سمجھا؟“

شیدا جانے کے لیے مڑا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ ”ٹھیر! میں آج باڑی والے کمرے میں رہوں گا۔ رانی اور دلاران، دونوں کو بھیج دے۔ جو ٹھیک لگے گی اسے روک لوں گا۔ اب تو ٹر جا اور فافٹ سارا بندوبست کرو۔“

شیدا حلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے میں جٹا تھا۔ احسان شاہ نے اسے مخاطب کیا۔

”چوہدری! یہ اپنا شیدا بہت کام کا بندہ ہے۔ تجھے بھی ایسے ہی بندے کی ضرورت پڑے گی۔ فکر نہ کر۔ نادر خاں تیرا میسر لگ گیا تو تیرے لیے کسی ایسے ہی بندے کا انتظام کر دے گا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ پانی کا گلاس اٹھایا۔ اس کا ہاتھ ڈنگایا۔ گلاس چھوٹ کر میز پر گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔ پانی میز پر دور تک پھیل گیا۔ رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ خفیف ہو کر بولا۔ ”معاف کرنا شاہ جی۔“

”کوئی گل نہیں۔“ احسان شاہ نے اسے احساس ندامت میں مبتلا نہ ہونے دیا۔ ”پانی کے بجائے تولی پی لے۔ نشے کی تیزی ذرا کم ہو جائے گی۔“ اس نے ہلکا تھپہ لگایا۔ ”آج تو نے بھی ہم کر لگائی ہے۔“ احسان شاہ نے میز پر رکھے ہوئے جگ سے لسی ایک گلاس میں انڈیلی اور گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔

رحیم داد نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔



بارش کا زور اب ٹوٹ چکا تھا۔ پھری ہوئی ہوا بھی مدھم پڑھ گئی تھی۔ مگر بوند باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ کچھ دیر بعد شیدا آگیا۔ اس کے پیچھے ہی رحیم داد اور احسان شاہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ احسان شاہ باڑی کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد نے شیدا کی رہنمائی میں آگے قدم بڑھائے۔ اس کے قدم ہلکے ہلکے تھے۔ نظریں کسی قدر دھندلی پڑ گئیں تھیں۔ دونوں راہداری سے گزر کر برآمدے میں پہنچ گئے۔

شیدا آگے آگے تھا۔ رحیم داد اس کے پیچھے چل رہا تھا۔

شیدا ایک کمرے کے سامنے جا کر ٹھہر گیا۔ اس نے کمرے کا بند دروازہ کھول دیا۔ اندر لیمپ روشن تھا۔ برآمدے کے آگے باغیچے میں سرس کے دو اونچے اور گھٹے درخت تھے۔ درختوں تلے اندھیرا تھا۔ اندھیرا میں کوئی دھندلے سائے کی مانند چپ چاپ کھڑا تھا۔ شیدا نے مڑ کر ادھر دیکھا اور آہستہ سے کہا۔

”اتھ آجا۔“

درختوں کے نیچے آہٹ ابھری۔ ذرا دیر بعد برآمدے کی سیڑھیاں طے کر کے ایک نوجوان عورت اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ رحیم داد نے دیکھا، کمرے کے اندر سے پھوٹی ہوئی لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ شیدا کے قریب گم صم کھڑی ہے۔ اس کی عمر تیس چوبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ جینٹ کی گھٹھیل پہنے تھی۔ سر پر لہوا دوپٹہ تھا۔ اس کا جسم قدرے پچھا۔

تھا۔ چہرہ بھی چوڑا نکلا تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں میں گہرا کاہل تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ ذرا ہی دیر پہلے اس نے تیل ڈال کر سر کے بال سنورے ہیں، آنکھوں میں کاہل لگایا ہے۔ اس کا لباس شوخ اور اجلا تھا۔ مگر وہ خود سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

شیدا نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”یہ بلو ہے جی۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کمرے کے اندر چلا گیا۔ شیدا نے بلو کا بازو پکڑ کر ہولے سے گھینا اور اس کے ہم راہ کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ اس نے دہلیز کے پاس رک کر کہا۔ ”چوہدری! دروازہ اندر سے بند کر لیتا۔ میں نوں شاہ جی کے پاس جاتا ہے۔“ وہ دروازے کے دونوں ہٹ بھیڑ کر چلا گیا۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے میں گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رات کالی اور بھیگی ہوئی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نرم اور خشک جھونکے اندر آرہے تھے۔ باغ میں بارش کی بوندیں پتوں پر جل ترنگ بجا رہی تھیں۔ رحیم داد نے بلو کو گہری نظروں سے دیکھا۔ نشے کا ایک زور دار رپلا آیا۔ بلو ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی، دھندلی پڑ گئی۔ رپلا گزر گیا تو وہ اور نکھر کر سامنے آگئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں چراغ جل رہے تھے، بجھ رہے تھے۔ بلو ادھل ہو جاتی، نئی چھب دکھا کر سامنے آ جاتی۔ ہوا کا تیز جھونکا آیا اور لیمپ بجھ گیا۔

سویرے سویرے جب رحیم داد کمرے سے نکلا تو بلو موجود نہ تھی۔ اس وقت بھی بوند باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد نے نہادھو کر ناشتا کیا۔ ناشتے پر اس کے ساتھ احسان شاہ بھی موجود تھا۔ اس کی آنکھیں نشے کے غماز سے اب تک سرخ تھیں۔ ناشتے پر وہ خاموش رہا۔

رحیم داد نے ناشتے سے فارغ ہو کر واپس جانے کا اظہار کیا۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ ”چوہدری! اب تو کب آئے گا؟“

”میں خود ہی آ جاؤں گا۔“ رحیم داد نے دبی زبان سی کہا۔ ”پر تو مکھ کو میرے پاس نہ بھیجتا۔ اس کے آنے جانے سے شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔“ اس نے اپنا خدشہ ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”تو کہتا ہے تو اسے تیرے پاس نہیں بھیجوں گا۔ پر تجھ سے ملاکت ہوتی رہنی چاہیے۔“

رحیم داد نے کہا۔ ”میں جلد ہی تیرے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔ ویسے بھی ادھر اکیلے میں بہت جی گھبراتا ہے۔“ وہ بے تکلفی سے ہنسا۔

”پر تو جلدی نہ آتا۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”میں ہفتہ بھر کے لیے لمبور جا رہا ہوں۔ کچھ ضروری کام کر رہا ہوں۔ دس بارہاں روز بعد آتا۔ میں اس بیچ میں نادر خاں کو بھی بلواؤں گا۔ کام کا بندہ

جلد پانی کھڑا تھا یا کچھ نہ تھی۔

پہرہ گزر چکا تھا۔ رحیم داد کرے میں تھا۔ وہ باہر نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور وکیل محمد عثمان رندھاوا اندر داخل ہوا۔

آسمان پر بادلوں کا ہلکا ہلکا غبار چھایا تھا۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ مگر وکیل کا چہرہ خلاف معمول زیادہ سی سنجیدہ نظر آتا تھا۔ وہ بچھا بچھا لگتا تھا۔ جیلہ سے وہ پہلے ہی مل چکا تھا۔

رحیم داد نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا تو اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ ”وکیل صاحب! کیا بات ہے جی۔ بہت پریشان نظر آ رہے ہو؟“

”پریشانی کی بات ہی ہے۔ اندھیر ہے، سراسر اندھیر ہے۔“ وکیل نے شکوہ کیا۔

”کیا ہو گیا جی؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ہونا کیا تھا، پولیس، اللہ وسایا کے قتل کو دبانے کی ہر طرح کوشش کر رہی ہے۔“ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔

”بچھلی بار تو کہا تھا تھانے دار نے قتل کا پتہ چلا لیا ہے۔ جلد ہی ملزموں کی گرفتاریاں شروع ہو جائیں گی۔ اب کیا ہو گیا؟“

”اب کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ وکیل نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”انسپکٹر محمد حیات جنجوعہ پوری تن دہی اور دلچسپی سے تفتیش کر رہا تھا۔ اچانک اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔“

”اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ کیوں؟ کوئی توجہ ہو گی۔“

”یہ تو افسران بالا ہی کو علم ہو گا۔ میں تو یہ جانتا ہوں پچھلے دنوں اس کا تبادلہ کر کے دوسرا تفتیشی افسر لگا دیا گیا۔“ وکیل محمد عثمان رندھاوا نے بتایا۔ ”یہاں آنے سے پہلے میں اس سے ملا تھا۔ کتنا تھا اللہ وسایا کو اس کی گھر والی کے بھائیوں نے رات کے اندھیرے میں قتل کیا اور سرحد پار نکل گئے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس نے اپنی تفتیش ختم کر دی۔ آگے کوئی کارروائی نہیں ہو گی۔“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ رندھاوا نے کہا۔ ”چوہدری! تجھے تو پتہ ہے۔ ایسی افواہ تو پہلے ہی سن نے میں آ رہی تھی۔ تو نے بھی مجھ سے یہی بات بتائی تھی۔ زمیں دارنی کو بھی اس کا پتہ چلا تھا۔ وہ اسے سن کر خفا بھی ہوئی تھی۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں تو کہتا ہوں ایسی افواہ جان بوجھ کر پھیلائی گئی تاکہ کیس دبانے میں آسانی ہو۔ اسی لیے انسپکٹر جنجوعہ کا تبادلہ ہوا۔ مجھے تو اللہ وسایا کے قتل کے پیچھے گہری سازش نظر آتی ہے۔“

ہے۔ کہیں اور لگ گیا تو ایسا میسر نہ ہو گا۔ تیرے لیے تو وہ بہت ضروری ہے۔ تجھے ادھر کی زمیں داری کا کچھ اتنا پتا نہیں۔ نادر تیرے ساتھ لگ گیا تو زمیں داری ایسی چکا دے گا کہ تیرا بالکل جی نہ گھبرائے گا۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”حد ہو گئی جی، زمیں دار کا اپنی ہی زمیں داری میں دل گھبرائے۔“

رحیم داد نے اس کی باتیں سنیں اور صرف مسکرا کر رہ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ احسان شاہ سے رخصت ہوا۔ اسی کے ذاتی تانگے سے حویلی اسٹیشن پہنچا۔ جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے کوئلہ ہرکشن واپس گیا۔ پچھلی رات کی موسلا دار بارش نے سڑکیں اور راستے اس قدر خراب کر دیئے تھے کہ جب وہ مہمان خانے میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔ احمد اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔

”چوہدری! تو نے بہت دیر لگا دی۔ میں تو رات سے تیرا انتظار کر رہا تھا۔“

”تیرا مغز تو نہیں چل گیا۔“ رحیم داد نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں اسے ڈانٹا۔ ”رات بھر بارش ہوتی رہی۔ میں ایسے میں کیسے سفر کر سکتا تھا۔“

احمد اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ جلدی سے صحن میں کرسی لا کر ڈال دی۔ رحیم داد اس پر بیٹھ گیا۔ احمد کمرے کے اندر سے دھوٹی اور سلیر نکال کر لایا۔ اس نے رحیم داد کے جوتے اتارے، پگڑی سنبھالی اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے کپڑے اتار کر دھوٹی باندھی اور غسل خانے میں چلا گیا۔ نماز کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ مہمان خانے سے نکل کر باغ میں چلا گیا۔ ہوار کی ہوئی تھی۔ فضا میں جس تھا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔

رحیم داد دن بھر کا بھوکا تھا۔ احسان شاہ کی حویلی میں ناشتا کرنے کے بعد اس نے راستے میں کچھ نہیں کھایا تھا۔ باغ میں پہنچتے ہی اس نے احمد سے کھانا لانے کو کہا۔ کھانا آیا تو اس نے سیر ہو کر کھایا۔ رات گئے تک باغ میں بیٹھا رہا۔ جب سناٹا گہرا ہو گیا تو وہ مہمان خانے میں گیا۔ دن بھر کر تھکا ہوا تھا۔ بستر لیٹنے ہی سو گیا۔



ساوَن بھادوں مل رہے تھے۔ کالے کالے بادل گھر گھر کر اٹھتے رہے۔ زور زور سے گرجتے رہے، برستے رہے۔ پانچ روز تک مینہ کی جھڑی لگی رہی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، بادل اب برس کرنے رکھیں گے۔ آسمان سرمئی چادر بن گیا تھا۔ چھللی کی مانند پانی برستا تھا۔ خدا خدا کر کے مینہ برسانا بند ہوا۔ ہر طرف جل تھل ہو گیا تھا۔ جدھر نظر اٹھتی پانی ہی پانی نظر آتا۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں جگہ

”آگے کچھ نہیں ہو سکتا؟“ رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

”زمین دارنی گورنر، وزیر اعلیٰ اور آئی۔ جی پولس کو درخواستیں بھیجنے کو کہتی تھی۔ درخواستیں زمیندار اس کے کہنے پر لگا دوں گا پر اب کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیس تفتیش کے ابتدائی مرحلے پر خراب کر دیا جائے تو اس کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ میں نے یہی دیکھا ہے۔“

”اس کا مطلب تو صاف یہ ہوا تفتیش آگے نہیں چلے گی۔“

”فی الحال تو تفتیش کا کام ختم کر کے کیس دبا دیا گیا۔ حالانکہ پولیس کے پاس زمین دارنی کے بھائیوں کو ملزم ٹھہرانے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ تھانے دار نے خانہ پری کے لیے اپنے لگے بندھے گرگوں کی شہادت کا سہارا لیا ہے اور یہ پولس کا پرانا حربہ ہے۔ کوئی نئی گل نہیں۔“ وکیل نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کچھ دنوں بعد سن لینا پولس نے کیس داخل دفتر کر دیا۔“

”یہ تو جی بہت اندھیر گردی ہے۔“

”ہے تو۔“ وکیل نے موضوع بدلتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! میں تیرے پاس اس لیے آیا تھا کہ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مختار نامہ تو خود بخود ختم ہو گیا۔ اب کلیم کے ہر معاملے سے تجھے خود نمٹنا پڑے گا۔“

”میں نوں کیہ نمٹنا نمٹنا جی۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”جیسا کہ دیا کروں گا۔ پر ابھی تو کچھ نہیں کرتا۔“

”بات یہ ہے چوہدری! تیرے کلیم میں کچھ گڑبڑ ہے۔ اللہ وسایا نے اس کے بارے میں تجھے بتایا بھی ہو گا۔“

”اس نے تو جی مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ رحیم داد نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”گھبرانے کی تو کوئی گل نہیں؟“

”معاملہ ویسے تو پیچیدہ ہے۔ پر میں کوشش کر رہا ہوں کہ ٹھیک ہو جائے۔“ وکیل نے اسے آگاہ کیا۔ ”مگر اس کے لیے پیسے کی ضرورت ہے۔ میں نے زمین دارنی سے ذکر کیا تو اس نے ہزار روپے خرچ کے لیے دیے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ویسے اس کے پاس پیسہ بالکل نہیں۔ سب کچھ تو ۱۳ مربع اراضی کے کلیم کی خریداری میں دے دیا۔ ابھی اسے اللہ وسایا کا چالیسواں بھی کرنا ہے۔“

”تمہارا مطلب چاہلیا کرنے سے ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ہاں میرا یہی مطلب ہے۔“ وکیل نے جواب دیا۔ ”زمین دارنی اسے اپنی حیثیت کے مطابق

ی کرے گی۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں ابھی تو ہزار روپے سے کام چلانے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”اگر معاملہ زیادہ الجھ گیا تو بھگڑی رقم کھلائے بغیر کام نہیں بنے گا۔ مہینے دو مہینے کے اندر کم از کم چار ہزار کا بندوبست کرنا ہو گا۔ ویسے یہ بات میں نے زمین دارنی سے نہیں کہی۔ وہ اور پریشان ہو جائی۔ پر اب تم کو ہی زمین داری کی دیکھ بھال کرنی ہے اور اس کلیم کا تو براہ راست تعلق اس جائیداد سے ہے جو تم کو الاٹ ہوئی ہے۔“

رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پروکیل صاحب میں تو ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔ زمین کا الاٹمنٹ ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ خریف کی فصل تیار ہو تو کچھ رقم ہاتھ آئے۔ میں نوں پتہ ہی ہے، پہلے بھی سب کچھ اللہ وسایا اور اس کی گھر والی ہی نے خرچ کیا تھا۔ زمین داری کی اب تک دیکھ بھال بھی وہی دونوں کر رہے تھے۔ میں نے تو اس بارے میں ابھی کچھ سوچا بھی نہیں۔“

”اسی لیے میں نے تم کو دو مہینے دیے ہیں۔ اس عرصہ میں رقم کا بندوبست کرنا ہو گا۔ جی چاہے تو زمین دارنی سے بات کرلو۔ میں نے پہلے سے آگاہ کر دیا۔“

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چلتے چلتے اس نے خبردار کیا۔ ”چوہدری! رقم کا انتظام کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ الاٹمنٹ منسوخ ہونے کا بھی امکان ہو سکتا ہے۔“ وکیل مڑا اور کمرے سے چلا گیا۔

وکیل محمد عثمان رندھاوا سے گفتگو کے بعد رحیم داد کو یہ تو اطمینان ہو گیا کہ تھانے دار جنجوعہ کا تبادلہ کر دیا گیا ہے اور نئے تھانے دار نے ملزموں کو مفرور قرار دے کر تحقیقات ختم کر دی ہے۔ اللہ وسایا کا قتل اب اس کے لیے باعث تشویش نہ رہا تھا۔ احسان شاہ نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا تھا بالکل ویسا ہی ہوا۔ رحیم داد اس کے اثر و رسوخ سے بہت متاثر ہوا۔ مگر اس تشویش سے نجات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ وہ ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ یہ کلیم اور اس کی بنیاد پر الاٹ ہونے والی اراضی اور جائیداد کا مسئلہ تھا۔ وکیل کی باتوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ کلیم میں کوئی گڑبڑ ہے۔ ہر چند کہ وہ بہت معمولی زمین دار رہ چکا تھا مگر ہر زمین دار کی طرح زمین اور جائیداد اس کی بھی بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ ہر قیمت پر کوئلہ ہر کشن کے دس مرعے اور حویلی اپنے قبضے میں رکھنا چاہتا تھا۔ بلکہ جیلہ کے بارہ مربعوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اللہ وسایا کے قتل میں احسان شاہ کا آلہ کار بننے کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی تھی۔

رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے فصلوں کو دیکھا۔ مزارعوں ان کے بارے میں بات چیت کی۔ وہ بہت دیر تک مزارعوں کے ساتھ ہی رہا۔

اب اس کا یہ معمول ہو گیا کہ دن میں کسی وقت کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور مزارعوں کے ساتھ کچھ وقت گزارتا۔ وہ زمیں داری کے کاموں میں ذاتی طور پر دلچسپی لینے لگا تھا۔ شام کو وہ باغ میں بیٹھتا۔ وہاں بھی مزارعوں کو بلالیتا۔ ان کے ساتھ موسم اور فصلوں کے علاوہ بیماری اور شادی بیاہ کے بارے میں بھی باتیں ہوتیں۔ مگر گھوم پھر کر اللہ وسایا کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار اس کا ذکر چھڑ جاتا تو دیر تک چلتا رہتا۔ رحیم داد کو ان کے رویے سے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ اللہ وسایا اور جیلہ دونوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور اس حد تک کرتے ہیں کہ اللہ وسایا مرحوم کے بارے میں گفتگو کرتے کرتے ان کے چہرے اداس اور غم زدہ ہو جاتے۔ وہ دل گرفتہ ہو کر رو پڑتے۔ کبھی کبھی رحیم داد کو ان کا یہ رویہ بڑا شاق گزرتا۔

اللہ وسایا مگر کبھی زندہ تھا۔ اور جب تک وہ کسی نہ کسی روپ میں زندہ تھا، رحیم داد کو زمیں داری کے معاملات میں اپنا سکہ بٹھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے اسے ایک ایسے تجربہ کار اور قابل اعتماد آدمی کی ضرورت تھی جو مزارعوں کے ذہنوں میں جھللاتا ہو اللہ وسایا کی یادوں کا چراغ بجھا کر رحیم داد کی شخصیت کا چراغ روشن کر سکے۔ ایسا آدمی احسان شاہ نے میا کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر وہ اب تک پہنچا نہیں تھا۔ رحیم داد بھی احسان شاہ کے پاس جانہ سکا تھا۔ موقع ہی نہ ملا۔



کئی روز سے بارش نہ ہوئی تھی۔ ہوا بھی بند تھی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے۔ مگر کھل کرنے پرستے۔ کبھی کبھار ہلکا سا چھینٹا پڑتا۔ اس کے بعد جس اور بڑھ جاتا۔ دن بھر سخت تپش رہتی۔ جسم پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ سورج کبھی بادلوں کے پیچھے ردپوش ہو جاتا کبھی نکل کر سامنے آ جاتا۔ اس کی چمک دمک بہت تیز ہوتی۔ دھوپ میں اس قدر تمازت اور چھین ہوتی کہ بدن کچھلتا ہوا محسوس ہوتا۔

انھی دنوں اللہ وسایا کا چالیسواں ہوا۔ جیلہ نے اس سلسلے میں رحیم داد سے کوئی مشورہ نہ کیا۔ صرف اتنا کیا کہ ایک شام جب وہ مہمان خانے سے باغ میں جانے کا ارادہ کر رہا تھا تو احمد حویلی کے دروازے سے نکل کر آیا اور اسے مطلع کیا۔

”چوہدری! زمیں داری نے کہا ہے، اللہ وسایا کا چاہلیا ہونے والا ہے۔“

”کب ہو رہا ہے چاہلیا؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

”کل ہے جی۔“ احمد نے بتایا۔

”اللہ وسایا تو ایسا نیک اور چنگا بندہ تھا کہ اس کا چاہلیا تو اکٹھ کھانا چاہیے۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چہرے کو افسردہ بنانے کی کوشش کی۔ ”دھکت کتنی جلدی گزر جاتا ہے۔ کل اللہ وسایا کی موت کو ۴۰ دن ہو جائیں گے۔ اس کا چاہلیا اور اکٹھ ہوگا۔ سال بھر بعد وڈا اکٹھ ہوگا۔ دوسرے سال در رہیا، تیسرے سال تو رہیا اور چوتھے سال چور رہیا ہوگا۔ دھکت دھیرے دھیرے ایسے دھوپ چھاؤں کی طرح گزر جاتا ہے، کچھ پتہ نہیں چلتا۔“

احمد کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے رحیم داد کا چہرہ کلز کلز سکتا رہا۔ رحیم داد کچھ دیر غم صم کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کے ہلکے ہلکے مائے پھیلے تھے۔ آنکھیں بھیجی بھیجی تھیں۔

جیلہ نے چالیسویں کے لیے بڑے اہتمام سے کھانا پکوا یا۔ گاؤں کے تمام ہی مزارعے اور کئی مردوار عورتیں حویلی کے باہر اور اندر جمع ہوئے۔ پاس پڑوس کے گاؤں اور چکوں سے بھی لوگ آئے۔ مسجد کے ملانے فاتحہ خوانی کی۔ وہ نیا لباس پہنے ہوئے تھا جو جیلہ نے اللہ وسایا کے نام پر اسے خیرات میں دیا تھا۔ فاتحہ کے بعد سب نے کھانا کھایا اور اللہ وسایا کے لیے دعائے مغفرت کی۔ رحیم داد اس روز بہت مصروف رہا۔ رات گئے تک حویلی کے باہر سانبان کے نیچے چالیسویں کی فاتحہ میں شریک ہونے والوں کی ساتھ رہا۔

حویلی کے اندر اور باہر خاصی چہل پھل رہی۔ مگر چالیسویں کے بعد حویلی اور زیادہ اجاڑ اور سنسان نظر آنے لگی۔ رحیم داد کی بیشتر شامیں تنہا گزرتیں۔ جیلہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ نہ اس نے بلایا اور نہ ہی بلائے بغیر وہ اس کے پاس جاسکتا تھا۔ شام کو وہ باغ میں مزارعوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا یا اکیلا بیٹھا رہتا۔



یہ ایک اداس اور بے کیف شام تھی۔ رحیم داد باغ میں خاموش بیٹھا تھا۔ آس پاس کوئی نہ تھا۔ دونوں وقت مل رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ شام کا دھندلا دھیرے دھیرے فضا میں گھل رہا تھا۔

شام کی اس خاموشی میں دھند درختوں تلے قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے گردن کو خم دے کر اس طرف دیکھا، درختوں کے نیچے سے ایک شخص نکل کر آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہا ہے۔ رحیم داد نے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ وہ نظریں جھکائے آگے بڑھ رہا تھا۔ رحیم داد کے سامنے پہنچ کر وہ ٹھہر گیا۔ اس کی عمر پچیس سے تباؤ کر چکی تھی۔ مگر

جسم ابھی تک مضبوط اور صحت مند تھا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی مونچھیں تھیں۔ سر پر گڑی بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ آنکھوں پر عینک تھی۔ وہ قیض اور شلوار پہنے تھا۔ گرمی اور جس کے باوجود کوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ پہچاننے کی کوشش کی۔ مگر پہچان نہ سکا۔ اجنبی نے نظریں جھکا لیں۔ ادب سے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ ”تینوں کے ملنا ہے؟“

”میں نے جی چوہدری نور الہی سے ملنا ہے۔“ اس کا لہجہ نرم اور محتاط تھا۔ ”میرا نام نادر خاں ہے۔ مجھے سید احسان علی شاہ نے بھیجا ہے۔“

”تجھے شاہ جی نے بھیجا ہے۔“ رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یاد آیا شاہ جی نے تیرے بارے میں مجھ سے پچھلے دنوں بات کی تھی۔“

نادر خاں نے جواب تک رحیم داد کے روبرو کھڑا تھا نہایت ادب سے کرسی پر بیٹھنے کی اجازت چاہی۔ ”بیٹھ سکتا ہوں جی؟“

”بیٹھ جا ضرور بیٹھ جا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”شاہ جی آج کل پیراں والہ ہی میں ہوتا ہے نا؟ لمور سے تولوٹ آیا ہو گا۔“

”یہ تو جی میں نول پتہ نہیں۔“ نادر خاں کرسی پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”شاہ جی نے پرسوں مجھے بلوایا تھا۔ دیر تک تیرے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ سمجھاتا رہا مجھے کیا کیا کام یہاں کرنے ہوں گے۔ شام ہونے سے پہلے پہلے وہ اپنی جیب لے کر ادھر آیا تھا اور نہر کے پاس مجھے چھوڑ کر آگے چلا گیا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ جی لمور سے جیب بھی لے آیا۔“

”اس کے لیے ضروری بھی تھی۔ زمیں داری چلانے کے لیے جیب یا کم از کم اپنی سواری بہت ضروری ہے۔ اب خالی گھوڑی سے کام نہیں چلتا۔ ویسے گھوڑی اور سیکل تو اب ہر چھوٹے موٹے زمیندار کے پاس بھی ہے۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کب سے کام شروع کرنے کا ارادہ ہے؟“

”حکم کریں جی۔ میں کل ہی سے کام شروع کر دوں گا۔ میں تو آیا ہی اسی ارادے سے ہوں۔“

نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد نے نادر کو ناندانہ نظروں سے دیکھا جو اس کے سامنے کرسی پر سکڑا سکڑایا، قدرے

آگے جھکا ہوا ادب سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد کی گردن کچھ اور تن گئی۔ اس نے لہجے میں رعب داب پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

”تیرے بال بچے بھی ہیں؟“

”ہیں تو جی۔“ نادر نے مسکین سی شکل بنا کر جواب دیا۔ ”میں جی انھیں بعد میں لے آؤں گا۔ ابھی ایسی جلدی بھی نہیں۔“ اس نے اپنی مستعدی اور فرض شناسی سے رحیم داد کو متاثر کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تو جی سب سے پہلے گھوم پھر کر پنڈ کا جائزہ لیتا ہو گا۔ فصلوں کو دیکھنا ہو گا۔ مزارعوں سے ملنا ہو گا۔ پنڈاری کے پاس جانا ہو گا۔ اس کے بعد میں رپورٹ پیش کروں گا۔ فیروہ فیصل آپ نے کرنا ہے اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ رحیم داد کی آواز گونج دار تھی۔ ”آج رات ادھر ہی ٹھیر جا۔ سویرے سے کام شروع کر دے۔ تیری تنخواہ وغیرہ کا معاملہ شاہ جی سے ملنے کے بعد طے ہو گا۔ میں اسے جلد ہی ملنے کی کوشش کروں گا۔“

”جیسی مرضی جی۔“ نادر نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”شاہ جی نے بھی مجھ سے ایسی ہی گل بات کی تھی۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر گردن جھکائے ادب سے بیٹھا رہا۔ شام کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا تھا۔ نوکر نے لیپ روشن کیا اور احتیاط سے اسٹول پر رکھ دیا۔ نادر نے لیپ کی روشنی میں رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ زیر لب مسکرایا۔ ”چوہدری! تیس دیکھنے میں بلوچ سردار یا تمن دار لگتے ہو۔ ڈیرے جات میں تو پہلے نہیں رہے۔“ اس کے انداز میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔

رحیم داد اس کے رویے سے خوش بھی ہوا۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور مونچھوں کی نوکوں کو مروٹتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جی، میں ادھر نہیں گیا۔“

”حیرت کی گل ہے۔“ نادر نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”میں تو پہلی نظر میں یہ سمجھا تیس کھوسہ تمن دار ہو؟“

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر نادر زیادہ چپ نہ بیٹھ سکا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر اپنی پچھلی ملازمتوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے رحیم داد کو بتایا کہ محکمہ مال کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد وہ ڈیرہ غازی خاں کے ایک دریشک تمن دار کی جاگیر کا کاردار مقرر ہو گیا تھا۔ اس ملازمت کے دوران اس نے کیا کیا کارگزاری دکھائی اور کیسے کیسے کارنامے انجام دیے؟ انھیں وہ تفصیل سے سناتا رہا۔ اس نے تمن داروں اور سرداروں کے رعب و دبدبے کے ساتھ ان کی

دہشت گردی کی ہولناک داستانیں بھی سنائیں۔ مزاروں اور لغاریوں کی رقبہوں اور ان کے صلہ تصادم کی واردات بیان کیں۔ باتوں باتوں میں وہ مزارعوں کو قابو میں رکھنے اور زمین داری پھیلانے اور بدھانے کے ہتھکنڈے اور گر بھی بتاتا رہا۔ سرکاری افسروں سے تعلقات پیدا کرنے، ان سے کام نکلانے اور انہیں خوش رکھنے کے طور طریقے بھی بتاتا رہا۔

نادر خاں کا لہجہ شہری تھا۔ سرکاری نوکری کے سلسلے میں وہ برسوں لاہور اور دوسرے شہروں میں رہ چکا تھا۔ جاگیرداروں اور رئیسوں کی ملازمت میں رہنے کے باعث خاصا مزاج شناس بھی بن گیا تھا۔ نادر خاں نے اپنی دلچسپ اور لچھے دار باتوں سے جلد ہی رحیم داد کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ وہ نادر خاں کے تجربے اور سوجھ بوجھ سے بہت متاثر ہوا۔ وہ اسے کام کا آدمی نظر آیا۔ دیر تک خاموش بیٹھا توجہ اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

جب وہ خاموش ہوا تو رحیم داد نے پوچھا۔ ”نادر! تو نے تمہیں داروں کی نوکری کیوں چھوڑی؟“
 ”وہ ہوا یہ جی کہ میری پہلی گھر والی گزر گئی۔“ نادر نے بتایا۔ ”کچھ عرصے بعد ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کر لیا۔ چھ سات مہینے تو وہ میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں میں رہی۔ فیر اس کا دل ایسا اچاٹ ہوا کہ کسی طور وہاں رہنے کو تیار نہ ہوئی۔ مجبوراً مجھے ملازمت چھوڑنی پڑی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ملازمت نہ چھوڑتا تو گھر والی کو چھوڑنا پڑتا۔ اس طرح میں نوکری چھوڑ چھا اور ادھر آ گیا۔ کچھ مدت تک آڑھت کا کاروبار کیا۔ وہ چل نہ سکا تو اسسٹنٹ کمشنر کے دفتر میں عرائض نویسی کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ کلیم بنوانے اور الاٹمنٹ کروانے کا دھندا بھی کرتا رہا۔ مگر اس دھندے میں اب پہلی سی بات نہیں رہی۔ ایسی اندھیر گردی مچی ہے کیا بتاؤں۔ اوپر سے نیچے تک ہر جگہ رشوت کا بازار گرم ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”چارپانچ مہینے ہوئے عرائض نویسی کا کام ختم کر کے رحمت والی آ گیا۔ اس دوران سردار عزیز اللہ دریشک نے راجن پور بلوایا بھی پر گھر والی کسی طور راضی نہیں ہوئی۔“

”شاہ جی سے تیری کب سے جان پہچان ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

نادر خاں نے بتایا۔ ”ویسے تو جی کوئی سال بھر سے اوپر ہوا۔ مور میں پہلی بار شاہ جی سے ملا تھا۔ لیکن جب میں رحمت والی آ گیا تو ان سے اکثر ملتا رہا۔“

رحیم داد نے سلسلہ گفتگو منقطع کر دیا۔ نوکر سے کھانا لانے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں کھانا چن دیا گیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی کھانے میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر اس نے انکساری اور حفظ مراتب کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ ”میری یہ حیثیت نہیں جی کہ آپ کے ساتھ بیٹھ کر

روٹی کھاؤں۔ میں نے تو صرف یہ معلوم کرنا ہے، مجھے کہاں ٹھہرنا ہوگا۔ اس کا انتظام کون کرے؟“ اگے میرے بارے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

رحیم داد نے احمد کو بلوایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے نادر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ مہمان خانے میں ٹھہرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ٹھہرنے اور روٹی فکر کا بندوبست کر دے۔“

نادر خاں نے احمد کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اس کے ہم راہ چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا مگر فوراً مہمان خانے میں نہ گیا۔ باغ میں بیٹھا رہا۔ پھر اٹھ کر ٹھلنے لگا۔ رات گئے وہ مہمان خانے میں گیا۔ دیکھا صحن کے ایک گوشے میں نادر خاں چارپائی پر گہری نیند سو رہا ہے۔ البتہ احمد جاگ رہا تھا۔ رحیم داد نے اس سے کوئی بات چیت نہ کی۔ کمرے میں گیا۔ کپڑے تبدیل کیے۔ رات گرم تھی۔ آسمان صاف تھا۔ مگر جس تھا۔ احمد نے رحیم داد کا بستر چھت پر پلنگ بچھا کر لگا دیا تھا۔ رحیم داد نے دھوئی باندھی۔ بندوق اٹھائی اور چھت پر چلا گیا۔ اس نے بندوق سرہانے رکھی اور بستر پر لیٹ گیا۔

سویرے وہ چھت سے اتر کر صحن میں آیا۔ نادر خاں کا بستر خالی تھا۔ احمد نے بتایا کہ وہ تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ رحیم داد نے ناشتا کیا مگر نادر خاں ابھی واپس نہ آیا تھا۔ وہ دن بھر نظر نہ آیا۔ غروب آفتاب کے وقت جب رحیم داد باغ میں بیٹھا تھا نادر خاں اسکول کی سمت سے باغ کی طرف آتا ہوا نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ قریب آتا گیا۔ اس کا لباس گردوغبار سے اٹا تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ سامنے آکر کھڑا ہوا تو رحیم داد نے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نادر خاں بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”سویرے سویرے کہاں چلا گیا تھا؟ دوپہر کی روٹی بھی نہیں کھائی۔“

”کیا، کیا جائے جی، کام جو کرنا ہوا۔ ایک نہیں، کئی کام کرنے ہیں اور جلد سے جلد کرنے ہیں۔“ اس نے اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔

رحیم داد اس کی کارکردگی اور فرض شناسی سے متاثر بھی ہوا۔ مسکرا کر بولا۔ ”شاہ جی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ تو لگتا تو سختی بندہ ہے۔ کیا کر آیا آج؟“

”یہ میں بعد میں بتاؤں گا جی۔“ اس نے ہاتھ باندھ کر انکساری سے کہا۔ ”مجھے چند روز کی ملت دیں۔ ہر معاملے کی جانچ پڑتال کرنے کے بعد ہی میں اپنی رپورٹ پیش کروں گا۔“ اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ ”اس دھت تو جی مجھے اجازت دی جائے۔ میں نے ابھی جا کر نماز ہے۔“

روٹی کھانی ہے۔ جلد ہی سو بھی جاؤں گا۔ کل بھی میں نے سویرے سے پنڈ کا راوند لگاتا ہے۔ مزارعوں سے ملتا ہے۔ فصل کے بارے میں گل بات کرتی ہے۔ اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“

وہ اٹھا اور مہمان خانے کی سمت روانہ ہو گیا۔ اس کے بعد کئی روز تک رحیم داد سے نادر خاں کی ملاقات نہ ہوئی۔ رحیم داد جب سو کر اٹھتا تو نادر خاں کا بستر خالی ہوتا۔ پھر رات گئے وہ باغ سے واپس آتا تو نادر خاں گہری نیند سویا ہوتا۔ وہ کھانا کھا کر جلد ہی سو جاتا اور فجر کی اذان سے پہلے ہی بیدار ہو جاتا۔



دوپہر کو بارش کا چھینٹا پڑا تھا۔ دن ڈھلے موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر سرمئی بادل چھائے تھے۔ ہوا فرائے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد باغ میں اجلا لباس پہنے، زمیں دارانہ طمطراق کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا نادر خاں پہلے روز کی طرح خاک دھول سے اتنا اس کی جانب آ رہا ہے۔ وہ قریب آیا تو رحیم داد نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ کرسی پر بیٹھ گیا تو اس کا گہڑا ہوا حلیہ دیکھ کر رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ”نادر! تو نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”کام کرنا جو ہوا جی۔“ نادر خاں نے بے نیازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ ”ہر چیز کو جب تک اپنی نظر سے دیکھنا نہ جائے تب تک نہ کوئی مسئلہ سمجھ آتا ہے اور نہ اس کا حل۔“

”یہ بتا، اتنے دنوں میں تو نے کیا کیا دیکھا، کیا معلوم کیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ زمیں داری کے معاملات جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔

”ایسا لگتا ہے جی، جیسے یہاں کا کوئی زمیں دار ہی نہیں۔ ہر مزارع خود کو زمیں دار سمجھتا ہے۔ کیوں تک کے دماغ آسمان پر ہیں۔“ نادر خاں کا لہجہ قدرے نرم پڑ گیا۔ ”اللہ دسایا مر گیا۔ اب اس کی کیا برائی کرنی جی۔ خدا اسے جنت نصیب کرے۔ پر اسے زمیں داری چلانے کا ذرا تجربہ نہ تھا۔ مزارعوں کے مزاج ایسے بگاڑ دیئے کہ وہ توجہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ جو جس کا جی کرتا ہے، کر رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں۔“

”ویسے فصل تو ٹھیک لگتی ہے۔ پچھلے دنوں میں بھی کھیتوں پر جاتا رہا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”خاص طور پر کماد اور مکئی کی فصل بہت چٹنی جا رہی ہے۔ پھٹی بھی ٹھیک ٹھاک جان پڑتی ہے۔ پر پھٹی کی کاشت کار کبھی نہ مانے

کی ضرورت ہے۔ اصلی کمائی تو آج کل کپاس کی فصل سے ہے۔ ادھر اب تک کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ کوریا کی جنگ کی وجہ سے باہر کے ملکوں میں پاکستانی کپاس کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے۔ کپاس کے اکسپرٹس کے توارے نیارے ہو گئے۔ انھوں نے دبا کے کمائی کی۔“

نادر خاں نے اپنی معلومات سے رحیم داد کو مرعوب کرنے کی کوشش کی اور وہ مرعوب بھی ہو گیا۔ ”تو جن باتوں کو سمجھتا ہے اللہ وسایا نہیں جانتا تھا۔ تب ہی تو اس نے پھٹی کا نہ رقبہ بڑھایا نہ کمائی کر سکا۔ اب تو تیرا پھٹی کی فصل کار کبھی کیسے بڑھایا جائے؟“

”بہت سی زمین پڑی پڑی ہے۔ جگہ جگہ ڈھل اور جھلن ہیں۔ نہر کے نزدیک کا اپنا بہت سا رقبہ جھنگ بن گیا ہے۔ اتنی بہت سی زمین ادھلا پی پر آسانی سے کابل کاشت بنائی جاسکتی ہے۔“ نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ ”اپنی زمین پر آم اور مالٹے کے باغ لگائے جاسکتے ہیں۔ فارم بنائے جاسکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے جی، اتنی بہت ساری زمین بیکار دیکھ کر مجھے بہت دکھ پہنچا۔“

”پر اس میں بہت سی تو شملات کی زمین ہے۔“ رحیم داد نے نادر خاں کو آگاہ کیا۔

”چوہدری تیس کیسی باتیں کر رہے ہو۔“ نادر نے مسکرا کر کہا۔ ”تحصیل دار اور پٹواری کس لیے ہیں۔ ان کی مٹھی گرم کی جائے تو ساری زمین آسانی سے اپنے کھاتے میں منسلک ہو جائے گی۔ ویسے بھی جی شملات والیات کی کون پر داکرتا ہے۔ زمیں دار کا رعب اور دبدبہ ہو تو کوئی چوں بھی نہیں کر سکتا۔“

رحیم داد نے دبی زبان سے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”پر تحصیل دار اور پٹواری شکاری کی مٹھی گرم کرنے کے لیے پیسہ کہاں سے آئے گا؟ اب تک ساری زمیں داری کی دیکھ بھال تو اللہ وسایا کرتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہ چھوڑا۔ جیلہ کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے اللہ وسایا کی فاتحہ اور چالیا پر خرچ کر دیا۔“

نادر نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ ”جو کچھ ہونا تھا جی وہ ہو چکا۔ اب تو اگے کی سوچنا ہے۔ میں نے پتہ کیا ہے۔ مزارعوں پر اللہ وسایا مرحوم بہت ادھار چھوڑ گیا ہے۔ اس کی فوری وصولی ہونی چاہیے۔ کچھ تو ابھی مل ہی جائے گا۔ ورنہ کماد کی فصل سے کرضہ وصول کیا جاسکتا ہے۔“

”کماد کی فصل ہی سے کیسے کرضہ وصول کیا جاسکتا ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

”وہ اس طرح جی کہ کٹائی کے بعد کماد کو شکر مل پہنچانے اور وزن کروانے کی پوری ذمہ داری تو زمیں دار ہی کی ہوتی ہے نا۔ ویسے تو تول ہی میں خاصی گنجائش نکل سکتی ہے۔“ وہ عیاری سے مسکرایا۔ ”میرا مطلب تیس سمجھ گئے نا؟“

”بالکل سمجھ گیا۔ آگے بتا۔“ رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”اس کے علاوہ کماؤ کی سہولت بھی زمین دار ہی کرتا ہے۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”اس میں سے کماؤ سہولت کرنے کا نصف کرایہ بھاڑا مزارعے کے حصے سے کستا ہے۔ آبیانہ اور چری کی فصل کی قیمت مجرا کر کے ہر مزارعے کو رسید دے دی جاتی ہے۔ کانوں تو یہی ہے پر کون زمین دار اس پر عمل کرتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”معاف کرنا جی۔ شاہ جی ٹھیک ہی بتاتا تھا۔ اللہ وسایا تو زمین دار تھا ہی نہیں اور نہ اس نے کبھی زمین دار بننے کی کوشش کی۔ وہ تو پیدا انٹی مزارع تھا۔ مرتے دم تک مزارع ہی رہا۔“

”اس نے کون سی غلطی کی؟“

”ایک غلطی ہو تو بتاؤں۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”شکر مل کو کماؤ کی سہولت کا معاملہ ہی لے لیں۔ اللہ وسایا ہر مزارعے کو پابندی سے رسید دیتا تھا۔ اسے ہرگز ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تب ہی تو وہ مزارعوں سے اپنا کرض وصول نہ کر سکا۔“

”رسید دینے سے کرض کی وصولی کا کیا واسطہ؟“

”بہت اہم واسطہ ہے اور وہ اس طرح ہے کہ مزارعوں کو کماؤ کی سہولت میں سے ان کی پیداوار کی رقم کا جو بھی حصہ دیا جائے، پہلے اس میں سے کرض کی رقم کاٹ لی جائے۔ اس کے بغیر کرض ادھار آسانی سے وصول نہیں ہوتا۔ سارے ہوشیار زمین دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ مزارعوں کو رسید دینے کی صورت میں ادھار کی رقم نہیں کاٹی جاسکتی۔ رسید کو سامنے رکھ کر ادائیگی کرنی پڑتی ہے۔“

”بات تو تیری سمجھ آتی ہے۔“ رحیم داد نے اظہار پسندیدگی کیا۔

”آگے یہ رسید کا چکر ختم کرنا ہوگا۔“

”پر اس میں ایک خطرہ ہے۔“ رحیم داد نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”وہ کیا ہے جی؟“ نادر نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اب تک ایسا ہوا نہیں۔ مزارعے نراض ہوں گے۔ کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو۔“

”فکر نہ کریں جی، کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔“

”مان لے انھوں نے کوئی گڑبڑ نہیں ڈالی، پر وہ جیلہ کے پاس جا کر فریاد کریں گے۔ وہ ان کی بات ضرور مان لے گی۔ میں نوں پتہ ہے وہ ضرور ایسا کرے گی۔“

”اس کا تو مجھے بھی چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا۔“ نادر نے رحیم داد سے اتفاق کیا۔

”مزارعوں کا تو جی یہ حال ہے وہ ہر معاملے میں اللہ وسایا کا حوالہ دیتے ہیں۔ بار بار اس کا ذکر

کرتے ہیں یا جیلہ کا۔“ اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ لمحہ بھر کے لیے بات کتے کتے ٹھنکا۔ ”سچی گل تو اسے ہے جی۔ اللہ وسایا کے بعد پوری زمین داری جیلہ ہی کی سمجھتے ہیں۔ تجھے تو وہ زمین دار مانتے ہی نہیں۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے۔“

”یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے۔“ رحیم داد نے اعتراف کیا۔ ”اسی لیے تو تجھے لگایا ہے۔“

”شاہ جی نے بھی مجھ سے یہ گل بتائی تھی۔ پر فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اللہ وسایا تو اب رہا نہیں۔ جیلہ بھی ان دنوں عدت میں بیٹھی ہے۔ نہ وہ حویلی کی چار دیواری سے باہر جاسکتی ہے نہ مزارعوں سے مل سکتی ہے۔ یہ اچھا موقع ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔“

”کیا کرے گا تو؟“ رحیم داد نے کرب کرپوچھا۔

”جیلہ کا اثر ختم کر کے مزارعوں پر تیری دھاک بٹھانی ہوگی۔ اس کے لیے زمین داروں کا آزمودہ حربہ استعمال کرنا ہوگا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے؟“ رحیم داد بیچ بول پڑا۔

”وہ یہ ہوتا ہے کہ مزارعوں کے درمیان پھوٹ پیدا کرنی ہوگی۔ ہر زمین داری میں مزارعوں کے درمیان چھوٹے موٹے جھگڑے تو ہوتے ہی ہیں۔ اس پنڈ کے مزارعوں میں بھی ہیں۔ ایسے جھگڑوں کو بڑھانا ہوگا۔ کچھ کی طرف داری کرنی ہوگی اور انھیں رعایتیں دے کر اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔“

نادر زیر لب مسکرایا۔ ”جو اپنے ساتھ نہ آئیں ان پر طرح طرح کے دباؤ ڈال کر تنگ کرنا ہوگا۔ فیر ایسا دھت بھی آئے گا جب سارے ہی مزارع تیرے بندے ہوں گے۔ جو کسے گا وہی کریں گے۔“

”تیری گل ویسے تو ٹھیک ہی لگتی ہے۔ میں نوں پسند بھی آئی پر اتنا دھیان رکھنا جب اللہ وسایا

زندہ تھا تب بھی جیلہ زمین داری کے معاملوں میں برابر حصہ لیتی تھی۔ بلکہ سچ پوچھ تو زمین داری

وہی چلاتی تھی۔“ رحیم داد نے نادر خاں کو خبردار کیا۔ ”تو نے یہ بھی اندازہ کر لیا ہوگا سارے ہی

مزارعے اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ پیار سے اسے سمجھ جی کتے ہیں۔ وہی ضرورت پڑنے پر

انھیں ادھار دیتی ہے۔ سارا حساب کتاب اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھے ڈر ہے مزارعوں کو اپنا

طرف دار بنانے میں جیلہ نراض نہ ہو جائے۔ میں نوں پتہ ہے اس کے تو زمین داری میں بار بار

مرنے ہیں۔“

”میں نوں اس کا پتہ ہے جی۔“

”مزارعوں سے کرض ادھار کی وصولی میں سختی کی گئی یا انھیں تنگ کیا گیا تو جیلہ میرے گلے پڑ

جائے گی۔ بہت نراض ہوگی۔ میں اسے نراض نہیں کرنا چاہتا۔ میں چاہتا ہوں آگے بھی زمیں داری اس طرح چلائی جائے نہ جیلہ نراض ہو اور نہ ہی کسی طرح ایسا ظاہر ہو کہ اس کی اور میری زمیں داری الگ الگ ہے۔ ”رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”زمیں داری تو پوری پوری ساتھ ساتھ ہی چلائی ہوگی۔ تیں نوں اسے سامنے رکھ کر کام کرنا ہوگا۔“

”ایسا ہی ہو گا جی۔ فکر نہ کریں۔“ نادر نے اسے اطمینان دلایا۔ ”میں نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ آگے ہر معاملے میں احتیاط سے کام لوں گا۔ جیلہ کو شکایت کا موقع نہ دوں گا۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ نادر خاں نے چند لمحے خاموش رہ کر دریافت کیا۔ ”کس سوچ میں پڑ گئے جی؟“

”سوچ رہا تھا تو نے زمیں داری بڑھانے اور پھیلانے کے بارے میں کہا ہے۔ ہونا تو ایسا چاہیے پر اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔“ رحیم داد نے اپنی مالی مشکلات کا ایک بار پھر اظہار کیا۔ ”خریف کی فصل کی واڈھی میں تو ابھی کئی مینے رہتے ہیں۔ مزارعوں سے کماد کی پیداوار میں کرض کی وصولی بھی تب ہی ہوگی۔ اب کیسے کام چلایا جائے۔“

”مزارعوں سے کچھ نہ کچھ وصولی تو ابھی ہو سکتی ہے۔“ نادر نے تجویز پیش کی۔

رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ”جیلہ سے پہلے مشورہ کرنا ہوگا۔ اس سے بات کیے بنا اس معاملے میں کچھ نہ کرنا۔ تو نہیں سمجھتا یہ بہت ضروری ہے۔“

”ایک تجویز اس سلسلے میں سمجھ آتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔ اسے دراصل اس رقم کی فکر تھی جس کے بارے میں وکیل نے سختی سے تاکید کی تھی۔ اس کے پاس لالی کی رقم میں سے دارا کو ایک ہزار روپے کراب دو ہزار سے کچھ اوپر روپے رہ گئے تھے۔ مگر وکیل زیادہ رقم مانگتا تھا۔ رحیم داد اس سلسلے میں نادر کو ابھی اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔

نادر نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں کہا۔ ”شاہ جی سے بھی کرض ادھار مل سکتا ہے۔ مجھے یکنین ہے وہ ضرور مدد کرے گا۔ وہ تیری بہت تعریف کرتا ہے اور مانتا بھی بہت ہے۔ وہ اتنا ڈاڑھی دار ہے چار پانچ ہزار روپے ادھار دینا اس کے لیے معمولی بات ہے۔“

”امید تو ہے وہ میری مدد کرے گا۔“ رحیم داد نے نادر کی تائید کی۔ ”پر میں چاہتا ہوں تو پہلے اس سلسلے میں گل بات کر۔“

”کر لوں گا جی۔ مجھے اسے ملنا بھی ہے۔“

”اور دیکھ کسی۔ ہرگز یہ نہ بتانا تجھے شاہ جی نے ادھر بھیجا ہے اور نہ ہی کسی کو یہ پتہ چلے تیرا اس کے پاس آتا جاتا ہے۔“ رحیم داد نے تنبیہ کی۔ ”اور نہ کسی کو یہ بتانا میرا اس کے ساتھ میل جول ہے۔“ اس کا لہجہ اور مدہم پڑ گیا۔ اس نے چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”کسی کو ادھر بالکل پتہ نہیں میں اس کے پاس آتا جاتا ہوں۔“

”شاہ جی نے مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی اس بارے میں خبردار کر دیا تھا۔ تب ہی تو میں نے کسی سے یہاں ایسی بات نہیں کی۔ اشارہ تک نہ دیا۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”پر تیں نوں بھی سخت احتیاط کرنی چاہیے۔“

”وہ تو میں کرتا ہی ہوں۔“

”مجھے تو مسمان خانے کا نوکر احمد بھی اعتبار کا بندہ نہیں لگتا۔ وہ باتیں بہت کرتا ہے اور پیٹ کا بھی ہلکا ہے۔ اس پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اسے ہٹا کر اپنے بھروسے کا بندہ رکھنا ہوگا۔ ویسے بھی جی نوکر تو اعتبار ہی کا ہونا چاہیے جیسے شاہ جی کے پاس شیدا ہے۔ مجھے تیرے لیے بھی ایسا بندہ تلاش کرنا ہوگا جس پر پورا پورا بھروسہ ہو اور جس سے ہر طرح کا کام لیا جاسکے۔“

”مجھے بھی احمد ایسا بندہ نہیں لگتا جس پر بھروسہ کیا جاسکے۔ اسی لیے میں نے کبھی اس سے کوئی ایسی گل بات نہیں کی۔ شاہ جی کے پاس بھی جاتا ہوں تو اسے اشارہ تک نہیں دیتا۔ اسے پتہ لگ جائے تو جھٹ جاکر جیلہ سے بتا دے گا۔ وہ ایسا ہی بندہ ہے۔“

”تب تو اسے جلد سے جلد ہٹانا چاہیے۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں جلد ہی ایسا اعتبار کا بندہ تلاش کر لوں گا۔ یہاں نہ ملتا تو اپنے پنڈے لیتا آؤں گا۔“

”ٹھیک ہے، اب نہ کر کپڑے بدل لے۔“ رحیم داد نے نادر خاں کا میلا کچیل لہاس غور سے دیکھا۔ ”تیرے کپڑے لٹے بہت گندے ہو گئے ہیں۔“

”کپڑے لٹے تو جی میں اپنے ساتھ لایا نہیں۔ اپنے پاس تو یہی کپڑے ہیں۔ دوبار انھیں دھو بھی چکا ہوں۔“ نادر نے بتایا۔ ”بات یہ ہے جی، میں یہاں ٹھہرنے کے ارادے سے تو آیا نہیں تھا۔ ورنہ کپڑے لٹے لے کر تیاری سے آتا۔ برانہ منائیں تو جی میں آج ہی اپنے پنڈ چلا جاؤں۔ کل شام نہیں تو پرسوں ضرور واپس آ جاؤں گا۔“

”اس وکت کیسے جائے گا۔“ رحیم داد نے گردن گھما پھرا کر بڑھتے ہوئے اندھیرے کو دیکھا۔ ”پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہے۔ کس طرح جاسکے گا؟“

”فکر نہ کریں جی۔“ نادر نے مسکرا کر بتایا۔ ”سورج ڈوبے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں آرام سے

چلا جاؤں گا۔“

”تو پیدل جائے گا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”حویلی میں نوکروں کے لیے دو سیکیں ہیں۔ ایک مل جائے تو اس پر چلا جاؤں گا۔ جلد ہی اپنے پنڈ پہنچ جاؤں گا۔ ورنہ رات بہت دیر سے پہنچوں گا۔“

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا اور اس سے سائیکل منگوائی۔ وہ سائیکل لینے چلا گیا۔ رحیم داد نے کہا۔ ”نادر! تو جلد ہی آجانا۔ ویسے میرا ارادہ بھی شاہ جی کی طرف کل جانے کا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے وہ اپنے پنڈ میں ہے؟“

”ہاں جی! وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔“ نادر نے جواب دیا۔ ”جہاں تک میرا خیال ہے اس کا فی الحال پنڈ سے باہر جانے کا کوئی پروگرام بھی نہیں۔“

نوکری سائیکل لے کر آگیا۔ رحیم داد کی ہدایت پر اس نے سائیکل نادر خاں کے حوالے کر دی۔ سائیکل سنبھال کر وہ کھڑا ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”مہمان خانے میں جا کر روٹی کھالوں۔ اس کے بعد رحمت والی چلا جاؤں گا۔ اب واپسی ہی پر حاضر ہو سکوں گا۔“

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے باغ ہی میں کھانا کھایا اور دیر تک بیٹھان باتوں پر غور کرتا رہا جو نادر خاں نے پچھلے چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد رپورٹ کی صورت میں اس کے سامنے پیش کی تھیں۔ یہ باتیں رحیم داد کے لیے قطعی نئی تھیں اور معلومات افزا بھی تھیں۔ اسے کوئلہ ہرکشن کے متعلق بحیثیت زمین دار بہت کم بلکہ کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ پہلے بھی وہ نام کا زمین دار رہ چکا تھا۔ صرف گیارہ ایکڑ زمین اس کی ملکیت تھی۔ بنیادی طور پر وہ کاشت کار تھا۔ اس کا شمار چھوٹے کھاتے داروں میں ہوتا تھا۔ بڑے زمین داروں کے ہتھکنڈوں اور طور طریقوں سے وہ بڑی حد تک ناواقف تھا۔ نادر خاں نے اس کے سامنے جو تجاویز رکھیں تھیں وہ اسے پسند آئیں اور اس قدر زیادہ پسند آئیں کہ انھیں عملی جامہ پہنانے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگا۔

رات کو بستر پر لیٹا تو نادر خاں اس کے ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ وہ اسے بے حد ہوشیار اور تجربہ کار آدمی نظر آیا۔ اسے زمین داری چلانے کے لیے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نادر خاں سے ملنے سے پہلے وہ بالکل اندھیرے میں تھا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ مزارعے کس انداز سے سوچ رہے ہیں؟ کتنے خود سر اور بے لگام ہو گئے ہیں؟ انھیں قابو میں لانے کے لیے کیا کیا جائے اور کیسا رویہ اختیار کیا جائے؟ یہ کام وہ نادر خاں کی مدد ہی سے کر سکتا تھا۔



رحیم داد نے نائی بلوایا۔ حجامت بنوائی۔ غسل کیا۔ صاف ستھرا لباس پہنا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جا رہا تھا۔ احمد اس وقت مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”چوہدری آج جمعہ تو نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ ”تیں نوں پتہ نہیں آج تو منگل وار ہے۔“

”لگتا ہے تو کہیں جا رہا ہے۔“

”میں نوں تو کہیں نہیں جانا۔“ رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اس روز ٹانگا بھی نہ بلوایا۔

احمد خاموش ہو گیا۔ رحیم داد کچھ دیر بعد مہمان خانے سے نکلا اور اس راستے پر چل دیا جو کرمان پورہ جاتا تھا۔ کرمان پورہ تین میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے ایک نیم پنڈت سڑک گزرتی تھی۔ کرمان پورہ موضع تھا۔ وہاں ٹانگوں کا اڈا بھی تھا۔ گاؤں سے کہیں دور جانا ہوتا تو کرمان پورہ ہی سے ٹانگا بلوایا جاتا تھا۔

راستے کے دونوں جانب سائے دار درخت تھے۔ کسی زمانہ میں یہ کنکر کی بنی ہوئی پنڈت سڑک تھی جسے جمیلہ کے باپ لالہ کرشن دیال نے بنوایا تھا۔ وہ جب گاؤں آتا تو ہمیشہ کار میں آتا اور اسی سڑک سے آتا تھا۔ ہرویاں اور جمیلہ کے دوسرے بھائی بھی جب یا کار سے اسی سڑک سے آتے جاتے تھے۔ مگر اب یہ سڑک ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ بارش نے جگہ جگہ گڑھے ڈال دیئے تھے جن میں پانی بھرتا تھا۔

سڑک کے نشان دھندلے پڑ چکے تھے۔ وہ کچا راستہ بن کر رہ گئی تھی۔ رحیم داد اس پر چلتا رہا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ پھر دن گزرا تو رحیم داد کمان پورہ پہنچ چکا تھا۔ اس نے تانگا لیا اور اس میں سوار ہو کر حویلی روڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔

حویلی روڈ پر اسے زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ پہلے ہی اڈے پر لاری مل گئی۔ اس نے تانگا چھوڑا، کوچوان کو کرایہ ادا کیا اور لاری کے اندر داخل ہو گیا۔ لاری مسافروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ رحیم داد کو کھڑے ہو کر سفر کرنا پڑا۔ مگر لاری نے میل سوا میل فاصلہ طے کیا تھا کہ ایک بستی آگئی۔ کئی مسافر اتر گئے۔ رحیم داد کو بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

رحیم داد اطمینان سے بیٹھ گیا۔ لاری سڑک پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑتی رہی۔ باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ موسم سہانا ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے مسافروں پر ایک نظر ڈالی۔ مگر ایک مسافر پر نظر پڑے ہی اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ جمال دین تھا اور آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نوراں بیٹھی تھی۔

دونوں بچے، کریم اور زینو، بھی ماں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ رحیم داد نے اپنی بیوی، بیٹے اور بیٹی کو دیکھا۔ وہ خوف زدہ بھی ہو گیا اور اسے دکھ بھی ہوا۔ نوراں کا رنگ روپ دھندلا گیا تھا۔ لباس بوسیدہ اور میلا کچلا تھا۔ بچوں کا لباس اس سے بھی زیادہ پھنسا پڑا تھا۔ نوراں، بچوں کے ساتھ واسے ہاتھ کی انگلی نشست پر بیٹھی تھی۔

رحیم داد دم بخود بیٹھا نوراں اور بچوں کو دیکھتا رہا۔ یکایک نوراں نے گردن موڑی۔ رحیم داد کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ چند لمبے بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے نوراں کی طرف جھپٹتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد نے فوراً نظریں موڑ لیں اور خود بھی اس قدر مڑا کہ اس کا چہرہ دوسری طرف ہو گیا۔

رحیم داد بہت پریشان تھا۔ وہ خود کو خطرے میں گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جمال دین یا نوراں اسے پہچان لیتے تو وہ سخت مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ اگلا اڈا آنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے سرسری نظروں سے دیکھا۔ جمال دین ابھی تک آنکھیں بند کئے اونگھ رہا تھا۔

نوراں خاموش بیٹھی تھی۔ وہ بد حال اور اجڑی اجڑی نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے کا نکھار میلا پڑ گیا تھا۔ آنکھیں بھیجی بھیجی تھیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ دل میں کک اور چھن محسوس کی۔ نوراں نے ایک بار پھر گردن موڑی۔ اسی لمحے لاری ٹھہر گئی۔ رحیم داد لاری سے اتر کر

باہر چلا گیا۔

باہر ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ رحیم داد لاری کی جانب پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا۔ لاری سے کچھ دور مسافر اترے کچھ سوار ہوئے۔ انجن اشارت ہی تھا۔ ذرا دیر میں لاری پھر سڑک پر مڑی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

رحیم داد کے سینے میں دھواں سا اٹھا۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ اس وقت بہت غم زدہ اور دل گرفتہ تھا۔ کچھ دیر بعد مخالف سمت سے ایک لاری آگئی۔ وہ اس میں داخل ہو گیا۔



رحیم داد کو ملے ہر کشتن واپس پہنچا۔ مہمان خانے میں گیا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ بوند باندی جاری تھی۔ رحیم داد کے کپڑے بارش سے بھیگ گئے تھے۔ اس نے کیلے کپڑے اتار کر دھوئی باڑھی۔ غسل خانے میں جا کر نہایا۔ اجلا لباس پہنا۔ دوپہر کا کھانا تاخیر سے کھایا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ بستر لیٹ کر سفر کی تکان دور کرنے لگا۔

نوراں، کریم اور زینو ابھی تک اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔ کریم اس کا پہلوئی کا بیٹا تھا اور زینو لاڈلی بیٹی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کریم یا زینو سے کوئی بیمار پڑتا یا کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا تو وہ تڑپ اٹھتا، بے قرار ہو جاتا۔

آج اس نے دونوں کو طویل مدت کے بعد دیکھا تھا۔ ان کے چہروں پر برستی ہوئی محرومی دیکھی تھی۔ ان کے لاغر اور گندے جسم دیکھے تھے۔ ان کا پھنسا پڑا لباس دیکھا تھا۔ مگر وہ ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی نہ پھیر سکا۔ ان کے رخسار چومنے اور انھیں سینے سے لگانے کے بجائے انھیں کچھ کر ڈر گیا تھا، سہم گیا تھا۔ ایسا محسوس ہوا گویا بھیا تک خواب دیکھ رہا ہے۔ حالات نے اسے کیا سے کیا بنادیا تھا؟

نوراں، جس کی محبت سے سرشار ہو کر اس نے اپنے حقیقی چچا کو دشمن بنا لیا تھا۔ اس کی بیٹی، بیوی کا رشتہ ٹھکرا کر نوراں کو بیاہ کر اپنے گھر لے آیا تھا اور اکلوتی بہن، بیگماں سے اس طرح جدا ہو گیا تھا کہ اس کے گھر کے دروازے ہمیشہ ہمیش کے لیے اس پر بند ہو گئے تھے اور جب وہ چھپ کر اس کے گاؤں ڈھولہ امیر خاں پہنچا اور اس سے ملا تو چوری چھپے کی یہ ملاقات بیگماں اور اس کے شوہر، مولاداد کی ہلاکت کا سبب بن گئی۔ اسے دونوں کو خون میں لت پت تڑپتے اور دم توڑتے دیکھنا پڑا۔

چند ہی گھنٹے پہلے وہی چیمپی نورائے سے نظر آئی تو وہ خوف اور دہشت سے لرز کر رہ گیا تھا۔ اس کے لیے شدید خطرہ بن گئی تھی۔ جب تک وہ لاری میں رہا، اسے رہ کر یہ اندیشہ نہ کہیں وہ اسے پہچان نہ لے۔

اسے نورائے کا اجڑا ہوا چہرہ اور اس پر پھیلی ہوئی دیرانی دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور سخت نفرت ہوئی۔ وہ اپنے آشنا جمال دین کے ساتھ بیٹھی تھی جو کبھی اس کا گہرا دوست تھا۔ ہر وقت کا رہا اور رہتی تھا۔ نورائے کی بے وفائی یاد کر کے وہ غصے سے تھلا اٹھا۔ اس نے بے چین ہو کر کمر بدلی اور ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرنے لگا۔

وہ اسی بے چینی کے عالم لیٹا تھا کہ تاراں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہونٹوں پر بیڑ طرح اس وقت بھی ہلکی ہلکی شوخ مسکراہٹ تھی۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹے لیٹے بے نیازی پوچھا۔

”حمداکدھر ہے؟“

”میں نوں پتہ نہیں جی وہ کدھر ہے۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”شدو کے چکر میں ہوگا۔“

”تو کیسے آئی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”زمین دارنی نے تجھے بلایا ہے۔ وہ حویلی میں تیرا انتظار کر رہی ہے۔“

رحیم داد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ سر پر پگ رکھی۔ بیروں میں جوتے پہنے اور تار کے ہم راہ بوندا باندی سے بچتا بچتا حویلی کے اندر چلا گیا۔ جیلہ اس وقت گول کمرے میں وضع کے چوڑے چپکے صوفے پر بیٹھی تھی۔ اسی کمرے میں کبھی جیلہ کا بڑا بھائی، لالہ ہر دیال بچہ لگاتا تھا۔ زمیں داری کے معاملات طے کرتا تھا۔ سرکاری افسروں، بڑے زمیں داروں، جاگیرداروں سے ملاقات کرتا تھا۔

کمرے میں دیزر قالین کا فرش تھا جس کے نقش و نگار قدرے دھندلے پڑ گئے تھے۔ دروازہ پڑے ہوئے پردوں کے رنگ بھی اڑ گئے تھے۔ کمرے کا فرنیچر پرانا تھا مگر قیمتی تھا۔ کمرے کی آرائش سے جاگیردارانہ آن بان ابھی تک جھلکتی تھی۔

جیلہ اس وقت سفید ملل کا کرتا اور ٹٹے کی شلوار پہنے ہوئے تھی۔ دوپٹہ بھی سفید ہی تھا۔ اس کے اوپر سیاہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے چادر سے سر اور چہرے کو بالکل مار کر بڑی تک چھپا رکھا تھا۔ اس کی گوری گوری کلاسیاں بالکل خالی تھیں۔ چہرہ جو کبھی تازہ پھولوں کی

شکل اور دلکش نظر آتا تھا، اب پچھلی رات کا زرد اور نیلا چاند بن گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا۔ جیلہ نے ہاتھ کے اشارے سے قریبی صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنا چہرہ دیوار کی جانب موڑ لیا۔ تاراں اس کے قدموں کے قریب قالین پر بیٹھ گئی۔ اب جیلہ کا چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحوں بعد جیلہ کی آواز ابھری۔ اس نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

”چوہدری! میں نے سنا ہے، تو نے زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے مینجر رکھ لیا ہے۔“ اپنی بات نہ کہتے نہ دھکیلی۔ ”کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں جی۔“ رحیم داد کے لمحوں سے صاف جھلکتا تھا کہ وہ اس سوال کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہے۔ اس نے بلا جھجک جواب دیا۔ ”تو نے ٹھیک ہی سنا۔“

جیلہ چند لمحوں تک گم صم بیٹھی رہی۔ اس نے گہری سانس بھری۔ شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”تو نے اتنا ڈاڈا فیصلہ کر لیا اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔“

”کیسے پوچھتا۔ تجھ سے ملنا ہی کب ہوا؟“ رحیم داد نے بات بنائی۔ ”غیر یہ بھی تو ہے، تو اللہ وسایا کے پاس میں اتنی کھوئی ہوئی ہے کہ ایسے میں تجھ سے کیا گل بات کی جائے۔“

جیلہ نے سمجھ ہوئے لمحوں میں کہا۔ ”پر تو نے یہ تو سوچا ہوتا، ہمارے پاس کل ۲۲ مربع زمین ہے۔ اب میرے ہتھ کے پاس ۲۲ سو مرنے سے اوپر اراضی تھی تب اس کے پاس مینجر ہوتا تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پاکستان بنا تو سو سے بھی زیادہ مرنے احسان علی شاہ نے دبا لیے۔ کچھ پر ۱۸ مرنے زمیں داروں کے ساتھ مزارعوں نے بھی کب نہ کر لیا۔ ۲۲ مرنے بھی اللہ وسایا نے زوراً نڈر لی دھکا کر بچا لیے۔ اب اتنی سی زمیں داری کے لیے مینجر یا کاردار کی کیا ضرورت ہے؟“ جیلہ کے لمحوں میں تلخی تھی۔

رحیم داد اس کے لمحوں میں رچی ہوئی تلخی نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہے۔ تو عدالت میں بیٹھی ہے۔ حویلی کی چار دیواری سے باہر نہیں جاسکتی۔ اور مجھے یہاں کے حالات کا کچھ اتنا پتا نہیں۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے کوئی تو ہونا چاہیے۔ اس طرح کب نہ کام چلے گا؟“

”مجھے پہلے چل رہا تھا۔“ جیلہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ ”ہمارے مزارے جان لڑا کر محنت کرتے تھے۔ جب ہی تو فصل چنگی ہوتی ہے۔ تو نے رینج کی فصل دیکھی تھی۔ اب خریف کی فصل تیرے مانے ہے۔ ایمان نال بتا کیسی فصل ہے؟“

”فصل تو ویسے چنگی اور ٹھیک ٹھاک ہی لگتی ہے۔“ رحیم داد نے اعتراف کیا۔ ”پر تو نے کچھ بھی سوچا کتنی زمیں پڑی ہے۔ کہیں ڈمڈل اور جھلن ہے کہیں جھنگر۔ یہ ساری غیر مزیدار زمین کاشت لائی جاسکتی ہے۔ اس طرح زمین کے ساتھ ساتھ پیداوار میں بھی اضافہ ہوگا۔ زمین دار کو بھی بڑھایا جاسکتا ہے۔“

”مگر اس میں سے بہت سی زمین تو شملات کی ہے۔ وہ تو سارے پنڈی مشترکہ ملکیت ہے۔ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”ہاں یہ ٹھیک ہے، ہماری ایسی پڑی اور بنجر زمیں بھی ہے جسے کھیتی باڑی کے لیے ٹھیک ٹھاک کیا جاسکتا ہے۔ پر میں اور اللہ وسایا، دونوں غافل نہیں تھے۔ احسان شاہ نے ایک کے بعد دوسرا کیس چلا کر مکدمہ بازی میں ایسا پھنسا یا اللہ وسایا کو اتنی مملت ہی نہ ملی کہ وہ اس کار اور بنجر زمین کی طرف دھیان دیتا۔“ اس کا لہجہ پھر تلخ ہو گیا۔ ”تجھے پتہ ہے احسان شاہ نے یہ کچی زمین بلکہ حویلی تک ہمارے کہنے سے نکلوادی تھی۔ وہ تو ہم کو بالکل تباہ کر دیتا چاہتا تھا۔“

اسی وقت کمرے کے باہر تاراں کی بچی کے زور زور سے رونے کی آواز ابھری۔ تاراں نے چینی سے فوراً پلو بدلا۔ جیلہ نے کہا۔ ”تاراں! دیکھ تو تیری چھوہری کیوں بلک بلک کر رو رہی ہے؟“ تاراں خاموشی سے انہی اور تیز قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ ”جو ہونا تھا جی وہ تو ہو گیا۔“ اس کے لہجے میں قدرے اکھڑن تھا۔ ”صاف بات یہ ہے جی، اب تو میں نے نادر خاں کو میئر لگا ہی دیا۔ وہ جلد ہی کام شروع کر دے گا۔“ رحیم داد کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ نادر خاں کے سلسلے میں وہ اپنی رائے بدلے پر آمادہ نہیں۔

”جب تو نے فیصلہ کر ہی لیا تو اب بات کرنے سے کیا فائدہ۔ تجھے خرچ ہی بڑھانا ہے تو ضرور بڑھا۔ جو مرضی میں آئے کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“ جیلہ کے انداز میں جھنجھلاہٹ تھی۔ رحیم داد نے بھی اس جھنجھلاہٹ کو محسوس کیا۔ فوراً نرم پڑ گیا۔ اپنا رویہ بدلا۔ ”تو فکر نہ کر۔ جتنا خرچہ بڑھے گا، اس سے زیادہ ہی فائدہ ہوگا۔ اپنی سمجھ میں تو یہی آتا ہے۔ یہی سوچ کر نادر خاں لگانے کا بھی فیصلہ کیا تھا۔ میرا مطلب تو صرف اتنا ہے کہ زمیں داری کو بڑھایا جائے۔ ٹھیک ٹھاک طور پر چلایا جائے۔“

”مجھے اس معاملے میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔“ جیلہ نے ٹیکھے لہجے میں کہا۔ ”ہمارا میئر بنی لال تھا۔ تنخواہ تو کیوں اس کی اتنی روپے تھی۔ وہ بھی سولاس، ستاراں برس کی نوکری کے بعد ہوا تھی۔ پر ہیرا پھیری اور گڑبڑ کر کے اس نے لودھراں میں اپنے پتر کے نام سے اتنی زمین خرید لی تھی۔

کہ اس کا شمار تحصیل کے وڈے زمیں داروں میں کیا جاتا تھا۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے اس نے اپنا منشی بھی لگا رکھا تھا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”ایسا بھی نہیں تھا کہ پتاجی یا ہریال کو پتہ نہ تھا۔“

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ ”جب انھیں معلوم تھا تو انھوں نے بنی لال کو کیوں رکھ چھوڑا تھا؟“

”اسے ہٹانا آسان نہ تھا۔ اصلی بکیر دار تو سمجھو بنی لال ہی تھا۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”سب کچھ دبی کرتا تھا۔ ہر کام اسی کی مرضی سے ہوتا تھا۔ وہ تو ہر فصل پر ایک کٹرہ رکم دے دیتا تھا۔ پتاجی اور ہریال ہر بکھیرے سے بچے رہتے۔ نہ بھاگ دوڑ کی ضرورت، نہ مزارعوں کے ساتھ بک بک جک جک۔ انھیں برس کے برس اتنی رکم مل جاتی جتنی وہ چاہتے تھے۔ بنی لال خوشامد اور چالوسی الگ کرتا تھا۔ جب بھی دہپال پور ہمارے گھر آتا، ماتاجی کے لیے طرح طرح کی سوغات اور خچلے کر ضرور آتا۔“

”پر یہ تو زمیں داری نہ ہوئی، ٹھیکیداری ہوئی۔“

”عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے۔“ جیلہ نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”جب میئر زمیں داری پر پوری طرح چھا جاتا ہے تو وہ ایک طرح سے ٹھیکے ہی پر زمیں داری چلانے لگتا ہے۔“

”تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“ رحیم داد نے مزید وضاحت چاہی۔

”بات یہ ہے چوہدری! زیادہ تر وڈے زمیں دار یا بکیر دار شرمش کوٹھیاں بنگلے بنوا کر رہتے ہیں۔ وہاں عیش کرتے ہیں اور زمیں داری میئر، کاردار اور منشی چلاتے ہیں۔ ایسے ہی زمیں داروں کو انگریزی میں اسٹیز لینڈ لارڈز کہا جاتا ہے۔“

”ایسا تو بہت ہوتا ہے۔ میں کئی زمیں داروں کو جانتا ہوں، وہ لمبور میں کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ ان کے میئر اور کاردار زمیں داری چلاتے ہیں۔ اس میں برائی کیا ہے۔ زمینداروں کا تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ انھیں فصل سے جتنا ملنا چاہیے وہ تو مل ہی جاتا ہے۔“

”پر اس طرح کی زمیں داری میں بے چارے مزارعے بالکل تباہ ہو جاتے ہیں۔“ جیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”انھیں زمیں دار کے ساتھ ساتھ فصل میں سے میئر کا حصہ بھی دینا پڑتا ہے۔ اگر ایسا نہ کریں تو انھیں بے دخل کر دیا جاتا ہے۔ بے دخل کرنے کے لیے انھیں جھوٹے مکدموں میں پھنسا جاتا ہے۔ ڈھور ڈھگر اٹھوا لیے جاتے ہیں۔ جوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیا جاتا ہے۔ گھریار جلوا دیا جاتا ہے۔ واڈھو فصلیں کاٹی جاتی ہیں۔ ان پر ہر ظلم اور

اپرا دھ ہوتا ہے۔ انھیں طرح طرح سے تنگ کیا جاتا ہے۔ بنی لال نے اللہ وسایا اور اس کے بیٹے کو اسی طرح بے دخل کیا تھا۔ ”اس نے مگرمی سانس بھری۔“ اللہ وسایا اور میں نے اس پنڈ میں کبھی ایسا نہیں کیا۔ کسی مزار سے کو نہ تنگ کیا نہ بے دخل۔ مجھے ڈر ہے، اگے چل کر کہاں بھی ایسا ہی ہونے لگے گا۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔“ رحیم داد نے جیلہ کو یقین دلایا۔ ”زیں داری! جو تو کہے گی وہی ہوگا۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔ اپنے دل سے ایسا شبہ بالکل نکال دے۔ پہلے بھی تو نے زیں داری چلائی ہے۔ آگے بھی تیں نوں ہی چلائی ہے۔“

”میرا کیا ہے۔ میں تو اب کچھ بھی نہیں رہی۔“ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”اللہ وسایا کے ساتھ میرا سب کچھ چلا گیا۔ سب کچھ اجڑ گیا۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ آگے نہ بول سکی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک بکھرنے لگے۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیل گیا۔ جیلہ سر جھکائے خاموشی سے روتی رہی۔

☆

بوندا باندی کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ کمرے میں بھٹکے ہوئے جھونکے آرہے تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ تاراں ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ ”زیں داری! میں نوں پتہ نہیں تھا، تجھے اللہ وسایا سے اتنا زیادہ پیار ہے۔“

”پیار!“ جیلہ نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ”نہیں چوہدری! مجھے کسی سے پیار نہیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پیار تو وہ کرتا ہے جسے اپنے سے پیار ہو۔ مجھے اپنے جیون سے اپنی ذات سے کوئی پیار نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ تو اس گل کو نہیں سمجھ سکتا۔“

رحیم داد واقعی اس کی بات کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ ہونق کی طرح آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں مگرمی سانس بھرنے کی مدھم آواز ابھری۔ جیلہ بڑبڑانے کے انداز میں آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ ”کبھی ایسا بھی تھا جب مجھے اپنے سے پیار تھا۔ یہ بیٹے دنوں کی گل ہے۔ پر اب تو اسے ایک جگہ بیت گیا۔ اس سے میں پار تو تھی اور کالج میں پڑھتی تھی۔ تب میں نے کسی سے پیار کیا تھا۔ اب تو وہ ساری ہی باتیں ایسی لگتی ہیں جیسے کوئی سانا پھنا دیکھا ہو۔“ اس کے لہجے میں درد کی کک تھی۔ ”ہاں وہ پھنا ہی تھا۔ ایک۔“

ندر کلپنا۔“

”کون تھا وہ؟“ رحیم داد نے نہایت بھونڈے پن سے پوچھا۔

جیلہ نے چونک کر گردن موڑی۔ رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے اس کے چہرے کو کھینچتی رہی پھر اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا افسردہ چہرہ اور مر جھا گیا۔

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ ”لگتا ہے تو نے میری گل کا برا منایا۔“

”ایسی گل نہیں۔“ وہ مدھم لہجے میں بولی۔ ”چوہدری! تجھے سب ہی کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے اب کیا چھپا رہ گیا۔ تو اس کے بارے میں نہیں جانتا، وہ بھی جان لے۔“ جیلہ کی آواز میں درد گھلا ہوا تھا۔ ”اس کا نام ویرندر تھا۔ وہ لمور کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا۔“

”جیرا اس سے میل جول کیسے ہوا۔ تو بھی اسی کالج میں پڑھتی تھی؟“

”نہیں، میں تو کینڈ کالج میں پڑھتی تھی۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”جب تک مجھے ہوسٹل میں رہنے کو جگہ نہ ملی میں ویرندر کے پتا کی کوٹھی میں ٹھہری رہی۔ وہ میرے پتاجی کے بہت پرانے دوست تھے۔ بات کے کھتری تھے اور کھنہ بھی تھے۔ ویسے تو میں ویرندر کو پہلے سے جانتی تھی۔ پر جب ایک ہی کوٹھی میں ساتھ ساتھ رہنا ہوا تو میل ملاپ بڑھ گیا۔ میں ہوسٹل چلی گئی۔ تب بھی اسے ملتی رہی۔ جب ہمارا میل جول زیادہ بڑھا تو بات باتوں تک پہنچی۔“

”تب تو گڑبڑ پیدا ہوئی ہوگی؟“ رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”نہیں، ویرندر کے پتا مجھے اپنی نوہ بنانا چاہتے تھے۔ پر ماں جی نے صاف انکار کر دیا۔“

”ماں جی نے ایسا کیوں کیا؟“ رحیم داد بیچ میں بول پڑا۔

”بات یہ تھی کہ ماں جی نے ہرویاں کا رشتہ ویرندر کی بھین سے بہت پہلے دیا تھا۔ پر ویرندر کی ماما جی نے انکار کر دیا۔ اس کا کارن یہ تھا ہرویاں ان دنوں شراب پی کر گانا سننے اور ناچ دیکھنے کنبڑیوں کے چوہاروں پر جاتا تھا۔“ جیلہ دھیمے لہجے میں بتاتی رہی۔ ”ماں جی کو آٹھ تھی ہرویاں کا دیاہ ہو جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ کنبڑیوں کے پاس جانا چھوڑ دے گا۔ پر ویرندر کی بھین کا ہرویاں سے دیاہ نہ ہو سکا۔“

”یہ تو بڑے سٹے کا دیاہ ہوا۔“

”ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔“ جیلہ بولی۔ ”ویرندر کی بھین کے ساتھ ہرویاں کا رشتہ نہ ہو سکا۔ اسی لیے ویرندر کے ساتھ میرے دیاہ کا معاملہ بھی کھنڈت میں پڑ گیا۔ ہم دونوں کو بہت دکھ ہوا۔ ہرویاں

کو کسی طرح اس کا پتہ چل گیا۔ ہوا یہ کہ ایک روز اس نے مجھے روتے ہوئے دیکھ لیا۔ ان دنوں میں دہپال پور میں اپنے گھر ہی پر تھی۔ اس نے کوشش کر کے ماں جی کو راضی کر لیا۔ بتا جی تو پہلے ہی تیار تھے۔ کچھ سے بعد شہ گھڑی دیکھ کر سگن ہو گئی۔ اور یہ طے ہوا کہ اگلی پورن ماشی کو دیرندر کے ساتھ میری سگائی ہو جائے گی۔ میڈیکل کالج میں دیرندر کا آخری سال تھا اور اس کے بعد ہی ہمارا ویاہ ہونے والا تھا۔

جیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ یادوں کی ادنیٰ نیچی لہروں پر ڈولتی نہ جانے کہاں سے کہاں نکل گئی۔ وہ گم سم بیٹھی تھی اور سامنے کی دیوار تک رہی تھی۔ بارش کا سلسلہ ابھی تک ختم نہ ہوا تھا۔ بھیگی ہوا مدھم سروں میں گنگنا رہی تھی۔ کمرے میں روشنی کم تھی اور سکوت گہرا تھا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”فیر کیا ہوا؟“

”فیر پاکستان بن گیا۔“ جیلہ بدستور دیوار کو ٹکتی رہی۔ ”اس کے بعد مجھ پر جو کچھ بیتی وہ تجھے پتہ ہی ہے۔ مجھے اللہ وسایا کسی نہ کسی طرح ولایا کے گھر سے نکال کر حویلی میں لے آیا۔“ جیلہ نے صوفے پر پہلو بدلا۔

”ادھر دیرندر لہور سے بچ بچا کر اوکاڑے پہنچ گیا۔ وہاں اس کے چاچا کا گھر تھا۔ میں دہپال پور ہی میں تھی تو مجھے اس کے اوکاڑے پہنچنے کی خبر ملی تھی۔ بعد میں اس پر کیا بیتی مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ پر اسے پتہ چل گیا میں کوئلہ ہر کشن میں ہوں۔“

”اسے کیسے پتہ چل گیا تو یہاں ہے؟“

”مجھے نہیں معلوم۔“ جیلہ نے نہایت سادگی سے کہا۔ ”مجھے تو یہ بھی پتہ نہ تھا وہ زندہ ہے یا فسادات میں اوروں کی طرح مارا گیا۔ وہ ایسا سے تھا، کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہ تھا۔ چاروں اور ہا ہا کار مچی تھی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں اسے بھول چکی تھی۔ سب ہی کچھ بھول چکی تھی۔ یہ بھی بھول چکی تھی کہ میں کبھی پاروتی تھی۔ جیون مانو ڈراؤنا سپنا بن گیا تھا۔“

”تیری فیر ملا کات نہیں ہوئی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”بہت دنوں بعد کی گل ہے۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”ان دنوں مردولا سارابائی، مغویہ اور ادھل زنانیوں کا کھوج لگانے اور ان کی واپسی کے لیے پنجاب کا دورہ کر رہی تھیں۔ ایک روز وہ ادھر بھی آگئیں۔ ان کے ساتھ دیرندر بھی تھا۔ وہ لوگ فوجی گاڑیوں میں آئے تھے۔ دونوں طرف کے سرکاری افسر بھی ان کے ساتھ تھے۔ اس روز اللہ وسایا بھی موجود نہ تھا۔ وہ ملتان گیا تھا۔ مجھے جیسے

ہی ان لوگوں کے ہنڈ میں پہنچنے کی خبر ملی، میں جھٹ حویلی سے نکلی اور کھیتوں میں گھس گئی۔ خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ میں کماد کی اونچی اونچی فصلوں کے اندر چھپ کر بیٹھ گئی۔“

جیلہ خاموش ہو گئی۔ رحیم داد بھی چپ بیٹھا رہا۔ جیلہ نے مڑ کر دروازے کی سمت دیکھا مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ دالان خالی تھا اور صحن میں مینہ کی ہلکی ہلکی بوندیں آہستہ آہستہ گر رہی تھیں۔ کمرے کی خاموشی میں جیلہ کی آواز ابھری۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”کماد کے بونوں کی اوٹ میں سے دیرندر کو بہت دنوں بعد پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ بالکل پہلے ہی جیسا تھا۔ وہی ہلکے گھونٹھے پالے بال۔ وہی آنکھوں پر سنہری فریم کا چشمہ اور ان کے پیچھے چمکتی ہوئی اس کی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ رنگ روپ بھی پہلے ہی جیسا تھا۔ بلکہ دھوپ میں اس کا چہرہ اور گلابی ہو گیا تھا۔ پر اب وہ کچھ دلا ہو گیا تھا۔ سوٹ کی بجائے کھادی کا سفید کرتا، پانچامہ اور نہروٹ اونچی جیکٹ پہنے تھا۔“ جیلہ نے ایک بار پھر گمری سانس بھری۔ ”وہ سب سویرے سویرے آئے تھے پر دوپہر تک میرا کھوج نکالنے کی کوشش کرتے رہے۔ حویلی تو انھوں نے پوری طرح چھان ہی ڈالی، ماڈرنڈ کے بھی ایک ایک گھر کی تلاشی لی۔“

”کماد کی فصل میں تلاشی نہیں لی؟“

”اس میں بھی بار بار جھانکا۔ پر میں ایسی دکی بیٹھی تھی کسی کو نظری نہ آئی۔ اس سے میں دہلی بھی تھی۔ میں نے دیکھا دیرندر بہت بے گل تھا۔ کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ پر بھاگ دوڑ سے اس کا سارا بدن پسینے سے بھگ گیا تھا۔ وہ بار بار ماتھے سے پسینہ پونچھتا۔ فیر میں نے یہ بھی دیکھا، جب مردولا سارابائی اور ان کے ساتھ کے تمام ہندے واپس جا رہے تھے تو دیرندر کا چہرہ بیماروں کی طرح مرجھایا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ دور تک پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا رہا اور میں کماد کی فصل کے اندر بیٹھی اسے چپ چاپ بکتی رہی۔ میرا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ ایسا لگا میں اسے بھول کر بھی بھول نہ سکی تھی۔“

”جب ایسی گل تھی تو کماد کی فصل میں کیوں چھپ کر بیٹھ گئی تھی؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”اس کے ساتھ چلی کیوں نہ گئی؟“

”کیسے چلی جاتی۔“ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”ان دنوں نینا میرے پیٹ میں تھی۔ وہ میرے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر جانے کیا سوچتا۔ اسے دکھ ہی ہوتا۔ میں نے سوچا ایسی حالت میں وہ مجھے کیسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ ویسے بھی لاج کے مارے میں اس کے سامنے جانے کے لیے کہاں سے حوصلہ لاتا؟ میں تو ان میں سے کسی کے بھی سامنے جانا نہ چاہتی تھی۔ میں نے بار بار اٹھ کر باہر نکلتا چاہا پر ایسا لگا مانو پیروں میں اٹھنے کی ہمت نہ رہی۔“

”اس کے بعد وہ دوبارہ نہیں آیا؟“ رحیم داد نے ویرندر کے ذکر میں دلچسپی کا اظہار کیا۔

”آیا تھا اور بالکل اکیلا آیا تھا۔“ جمیلہ نے بتایا۔ ”جاڑے کی ٹھنڈی رات تھی۔ اور میں کمرے میں بالکل اکیلی تھی۔ ان دنوں میں اور اللہ وسایا بیچے ہی کے کمروں میں رہتے تھے۔ اس روز بھی اللہ وسایا موجود نہ تھا۔ دوپہر کو عارف والا گیا تھا اور واپس نہ آیا تھا۔ میں اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اچانک دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا، ویرندر دروازے کے پتھوں بیچ کھڑا ہے۔ اس کے کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ اب وہ زیادہ ہی دبلا ہو گیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ رنگ بھی کم پڑ گیا تھا۔ سر کے بال خشک اور بکھرے ہوئے تھے۔ لپ کی پیلی پیلی روشنی میں وہ بیمار بیمار لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بھونچکا رہ گئی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔“

”وہ تیرے کمرے تک پہنچا کیسے۔ حویلی کے راکھے اور نوکر چاکر اسے نہ دیکھ سکے۔ کسی نے اسے نہ روکا۔“

”پتہ نہیں وہ کیسے آیا۔ نہ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ پر اتنا ضرور ہے۔ اس رات کمر بہت زیادہ تھی۔ چاروں اور گہری دھند کی چادر تہی تھی۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لگتا ہے وہ سمان خانے کی اور سے آیا تھا جو ان دنوں بالکل خالی تھا۔“ جمیلہ نے آہستہ آہستہ بتایا۔ ”ہم دونوں ذرا دیر چپ چاپ ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ فیروز آگے بڑھا۔ نزدیک آیا۔ مسکرا کر بولا۔ پارو! میں تجھے لینے آیا ہوں۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور بستر پر سوئی ہوئی نینا کو ایک ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکنے لگی۔ وہ اس سے سال بھر سے کچھ اوپر تھی۔“

”نینا کو دیکھ کر تو وہ پریشان ہو گیا ہو گا؟“

”نہیں! وہ میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور نینا کو دیکھنے لگا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا۔ پارو! یہ تیری بچی ہے؟ میں نے گردن ہلا کر ہاں کی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ آہستہ سے میرے نزدیک بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے نینا کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ مسکرا کر بولا۔ کتنی سوہنی ہے بالکل تیری طرح۔ وہ جھکا اور نینا کا گال چوم لیا۔“

”حد کر دی جی اس نے۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”عجب بندہ تھا۔“

”ہاں وہ عجب ہی بندہ تھا۔“ جمیلہ نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے چاہا وہ چلا جائے پر میں اسے یہ بات کہہ نہ سکی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ وہ چپ نہ رہا۔ میرے منہ کی اور دیکھ کر بولا۔ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے

پوچھا۔ تو اب تک کہاں تھا؟ کہنے لگا کیا کرے گی جان کر۔ ویسے میں ایک بار پہلے بھی تیری کھوج میں ادھر آیا تھا پر تو نہیں ملی۔ لگتا ہے اللہ وسایا تجھے اپنے ساتھ کہیں اور لے گیا تھا۔ کسی نے پہلے ہی مجھری کر دی ہوگی۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔“

”اس نے اپنے بارے میں تجھے کچھ نہیں بتایا؟“

”بتایا تھا۔ کہتا تھا جب فسادات کی آگ بھڑکی تو اس کے ماتا پتا اور ایک بھائی لمور ہی میں مارے گئے۔ وہ دو بھینوں کے ساتھ نکل کر کسی نہ کسی طرح چاچا کے پاس اوکاڑے پہنچ گیا۔ لیکن اس کے پہنچنے کے چند ہی روز بعد بلوائیوں نے ہلا بول دیا۔ ویرندر کے چاچا کا نام زبیر رانا تھا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کے لیے صرف ایک شاٹ گن تھی اور دو درجن کے لگ بھگ کارٹوس تھے۔ وہ اپنی ماڑی کی چھت پر چڑھ گیا اور بلوائیوں کو گولی چلا کر روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ویرندر اس کی مدد کرتا رہا۔ دوسری اور گھر کی زنانیوں نے دیکھا کہ بلوائیوں نے گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور لوہے کا دروازہ توڑ ڈالا تو جن کے بچے تھے انھوں نے بچوں کو چھاتی سے لگا کر دودھ پلایا۔ گھر میں مٹی کے تیل کے دو کنسترو موجود تھے۔ چاچی نے سب پر تیل چھڑکا اور اپنے اوپر بھی ڈالا اور آگ لگلی۔ آگ کے شعلے بھڑکے تو چاچا نیچے بھاگا۔ اس کی بندوک میں صرف ایک کارٹوس رہ گیا تھا۔ ویرندر دیوار پھاند کر برابر والے مکان کی چھت پر چلا گیا اور اس پر بھٹکے ہوئے ایک پیڑ پر چڑھ کر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چاچا کے گھر سے گوشت کے جلنے کی تیز بو ابھر رہی تھی۔ بلوائی لوٹ مار کرنے کے بعد چلے گئے تو رات کے اندھیرے میں وہ درخت سے اتر کر گھر میں گیا۔ دیکھا ساری زنانیاں جل کر مر چکی ہیں۔ ان کی لاشوں کے نزدیک ہی چاچا خوں میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ اس نے گولی چلا کر خود کشی کر لی تھی۔“

”ویرندر وہاں سے کیسے نکلا؟“ رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ سویرا ہونے سے پہلے نکل کر اپنے پتا کے ایک دوست سردار جسونت سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے نمبر کے ساتھ سرحد پار جانے والے تھے۔ انھوں نے ایک ٹرک کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔“ جمیلہ دھیمے لہجے میں بتاتی رہی۔ ”ویرندر بھی ان کے نمبر کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ گیا۔ سردار جسونت سنگھ کے ساتھ اس کے دو پتر بھی تھے۔ ان کے علاوہ گھردالی تھی۔ جو ان بھوٹیایاں تھیں۔ رات کا اندھیرا ہوتے ہی ٹرک روانہ ہوا۔ نہ پال پور ہی کے رستے سے گزرا تھا۔“

”ویرندر تیرے گھر نہیں پہنچا۔ تو بھی تو ان دنوں نہ پال پور میں تھی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

چلےل بسیار دنیا پھانی
کالو بے اکل من گور نہ مانی
من کمین کمترین تو دریائہ کھدایا
ایک چنچ مجھے دے اور جر چنچ نہ بھایا

سردار جی کی زبان پر گورو گرنتھ صاحب کا جاپ تھا اور آنکھوں سے آنسو ٹپکتے تھے۔
رحیم داد نے جیلہ کی بات کاٹ کر کہا۔ ”زین دارنی تجھے گورو گرنتھ صاحب کے شبد کیسے یاد رہ
مئے؟“ اس کے لمبے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

”میں بچپن میں خالصہ سکول میں پڑھتی تھی۔ وہاں گورو گرنتھ صاحب کے اشلوکوں کا ہر صبح
جاپ کرایا جاتا تھا۔ مجھے ان اشلوکوں کے اب تک بہت شبد یاد ہیں۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔
”میں نے تو یہ بات ایسے ہی پوچھ لی تھی۔ تو سردار جسونت کے بارے میں بتا رہی تھی۔ اس کا
کیا پتا؟“

”میں بتا رہی تھی، سردار جی گورو گرنتھ صاحب کے شبدوں کا جاپ کر رہے تھے۔ ریوالور ان
کے ہاتھ میں تھا اور سامنے زمیں پر ان کے گھر کی ملائیں تین لائینوں میں زمیں پر بیٹھی تھیں۔
بلوایوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا، نزدیک ہوتا جا رہا تھا۔“
”سردار نے یہ سب کیوں کیا تھا؟“ رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

”سیدھی سی گل ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کے گھر کی زنانیوں اور کڑیوں کو بلوائی اٹھا کر لے
جائیں۔ ان کی عزت آبرو لوٹیں۔“ جیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”پر بلوایوں کا شور جب بالکل
نزدیک آگیا اور روشنی درختوں کی اوٹ سے صاف نظر آنے لگی تو سردار جسونت سنگھ نے ریوالور
دیرنڈر کے ہاتھ میں دے دیا۔ جیب سے سفید رومال نکالا اور دیرنڈر سے کہا۔ میں رومال ہلا کر تین
تک گنتی گنوں گا۔ جب میں تین کوں تو ریوالور سے سامنے بیٹھی ہوئی زنانیوں پر گولیاں چلنی شروع
ہو جائیں۔“

”یہ کام تو سردار خود بھی کر سکتا تھا؟“

”کر تو سکتا تھا پر اس لیے کرنا نہ چاہتا تھا کہ آخری سے شاید اس سے گولی نہ چلائی جائے۔ کوئی
بھی اتنا کٹھور نہیں ہو سکتا کہ اپنے ہی بال بچوں کو اپنے ہی ہاتھوں کٹل کر دے۔ سردار اسی لیے یہ
کام دیرنڈر سے کرانا چاہتا تھا۔ شور بہت نزدیک آگیا تو سردار جی نے رومال ہلا کر ایک کہا۔ ذرا دیر
بعد دوسری بار رومال ہلایا اور دو کہا۔ اس نے رومال ہلانے کے لیے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو دور

”اس نے کوشش تو کی تھی، پر ڈرائیور تیار نہ ہوا۔ میرا گھر رستے سے تین میل دور تھا۔ ادھر
گڑبڑ بھی بہت تھی۔ فیرویدر کو یہ بھی پتہ نہ تھا میں دیپال پورہی میں ہوں۔ ان دنوں کچھ پتہ نہ تھا
کون کہاں ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”ٹرک دیپال پورہ سے گزرتا ہوا چک بیدی کے رستے
حویلی روڈ پر بڑھا۔ یہی سڑک سرحد پار جاتی تھی۔ پر ٹانک پورہ سے آگے درختوں کو کاٹ کر سڑک پر
رکاوٹ کھڑی کر دی گئی تھی۔ اس سے ڈرائیور آرام کر رہا تھا اور ٹرک سردار جسونت سنگھ کا پتہ چلا
رہا تھا۔ اس نے سڑک پر دور سے رکاوٹ دیکھ لی۔ جھٹ ٹرک کو کچے راستے پر ڈال دیا پر چند ہی
میل جانے کے بعد پٹرول ختم ہو گیا۔ سب نے دھکا لگا کر ٹرک ایک جھنگر میں چھپا کر کھڑا کر دیا۔
پر دیگر ام یہ تھا کہ دن جھنگر میں گزار کر رات کو پیدل سفر کیا جائے۔ دن ٹھیک ٹھاک گزر گیا۔ شام
ہوئی تو آگے جانے کے لیے اندھیرا ہونے کا انتظار ہونے لگا۔ نہ جانے کدھر سے ایک بوڑھا
مسلمان اپنی جھانکاتا ہوا ادھر سے گزرا۔ اس نے سب کو دیکھا تو جھجھوڑ کر بھاگا۔ اس کا پنڈ
نزدیک ہی تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے پنڈ بلکہ آس پاس جتنے بھی پنڈ تھے، سب کو خبر کر دی۔ اندھیرا
بڑھنے کے ساتھ دور سے شور سنائی دینے لگا۔ مشعلوں کی روشنی بھی دکھائی دی۔ بلوائی حملہ کرنے
کے لیے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔“

”سردار اور اس کے پتروں کے پاس کوئی ہتیار دستیار نہیں تھا؟“

”دیرنڈر بتاتا تھا ان کے پاس ریوالور کے علاوہ ایک تھری ناٹ تھری راکفل اور ایک شین گن
بھی تھی؟“

”تب تو ان کے پاس اتنا اسلحہ تھا کہ بلوایوں کو بھگایا جاسکتا تھا۔“ رحیم داد نے اپنی رائے کا
اظہار کیا۔

”پر بلوائی بہت زیادہ تھے۔ ان کے پاس بھی اسلحہ تھا۔ وہ ہوائی فیہر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ
رہے تھے۔ سردار جسونت سنگھ کے دونوں پتہ راکفل اور شین گن کے ساتھ مورچے سنبھال کر بیٹھ
گئے۔ ادھر سردار جسونت سنگھ نے اپنے تمبر کی زنانیوں کو تین لائینوں میں پاس پاس بٹھادیا۔ ہر ایک
کی آنکھ پر اس کی اوڑھنی سے پٹی باندھ دی۔ سردار کی ایک نوہ اپنے ننھے کا کے کو چھاتی سے لگا کر
دودھ پلانے لگی۔ بچ میں وڈی سردارنی تھی۔ اس کے دائیں بائیں جوان کڑیاں تھیں۔ تینوں آگے
کی لائن میں تھیں۔ ان کے پیچھے پتروں کی گھروالیاں اور پوتیاں تھیں۔ سردار جی نے ہولسٹرے
بھرا ہوا ریوالور نکالا اور گورو گرنتھ صاحب کے وارملہار اشوک کے ان شبدوں کا اونچی آواز سے
جاپ شروع کر دیا۔

”اللہ وسایا اسے تیرے ساتھ اس طرح بیٹھے دیکھ کر غصے سے پاگل ہو گیا ہوگا۔“ رحیم داد کے لیے میں استعجاب تھا۔

”نہیں، وہ چپ کر کے کھڑا ہم دونوں کو دیکھتا رہا۔“ جلیلہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ ”ڈرا دیر چپ رہنے کے بعد اس نے دیرندر کی اور ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔ یہ کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ تیرا بھائی بھی نہیں لگتا۔ میں تو خاموش بیٹھی رہی پر دیرندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بتایا۔ میرا نام ڈاکٹر دیرندر ہاتھ کنہ ہے۔ میرا اس کا کیا ناتا ہے؟ یوں سمجھ لے، میں اس کا منگیترا ہوں اور اسے لینے آیا ہوں۔ یہ کہتے کہتے اس نے جھٹ کندھے سے شین گن اتاری۔ اسے اللہ وسایا کی سمت تان کر بولا۔ میں اسے آج اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ میرا رستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اللہ وسایا تو مرنا نہیں چاہتا تو میرے رستے سے ہٹ جا۔ اس کی آنکھیں غصے سے لال ہو رہی تھیں۔“

”اللہ وسایا تو نہتا تھا۔ ڈر کر اس کے سامنے سے ہٹ گیا ہوگا۔“ رحیم داد نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”نہیں! وہ بالکل نہیں ڈرا۔ اسی طرح دیرندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ وہ بہت بڑا اور حوصلے والا تھا۔“ جلیلہ فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بولی۔ ”کچھ دیر تو وہ چپ رہا فی اس نے میری اور ہاتھ اٹھا کر دیرندر سے کہا۔ یہ تیرے ساتھ جانا چاہتی ہے تو خوشی سے جاسکتی ہے۔ اسے پوری طرح پتہ ہے، میں نے کبھی اس کا رستہ نہیں روکا اور اگر یہ نہیں جانا چاہتی تو ڈاکٹر دیرندر تو اسے صرف میری لاش کے اوپر سے گزر کر ہی لے جاسکتا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اگے بڑھا۔ دیرندر کی شین گن کی نالی ایک ہاتھ سے کھسکا کر بولا۔ اسے ہٹا۔ اس نے مڑ کر میری اور دیکھا، پوچھا۔ جی لے! تو کیا کہتی ہے؟ وہ تن کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔“

”تو نے کیا جواب دیا؟ اللہ وسایا نے تجھے کڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“ جلیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آئی، کیا کموں؟ میں خاموش بیٹھی رہی پر دیرندر خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ اس نے کیا کہنا ہے۔ یہ میرے ساتھ جائے گی۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور میرا بازو مضبوطی سے تھام لیا۔ تب اللہ وسایا نے اسے گھور کر دیکھا۔ غصے سے بولا۔ ڈاکٹر اس کا بازو چھوڑ دے۔ تو اسے اس طرح یہاں سے نہیں لے جاسکتا۔ اللہ وسایا اس سے بالکل شین گن کی نالی کے سامنے کھڑا تھا۔“

”دیرندر نے تیرا بازو چھوڑ دیا؟“

”نہیں! اس نے میرا بازو اسی طرح پکڑے رکھا۔ اس نے اللہ وسایا کی اور نہیں دیکھا۔ میرا بازو

سڑک پر تیز روشنی ابھری۔“

”یہ بھی مثالوں کی روشنی تھی؟“

”نہیں، ٹرک کی روشنی تھی اور تیزی سے نزدیک آتی جا رہی تھی۔ دیرندر نے روشنی دیکھی تو مدد کے لیے اس طرف بڑھا۔ سردار جی نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اونچی آواز سے کہا۔ اگر وہ ملے ہوئے تو کیا ہوگا؟ پر دیرندر نہ رکا۔ اس نے سردار جسونت سنگھ کو سمجھایا۔ بلوائی بھی تو ملے ہی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ آنے والے ہندو یا سکھ ہوں۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا سڑک پر پہنچ گیا۔ دیکھا سامنے سے ایک ٹرک آ رہا ہے۔ دیرندر نے ہاتھ ہلا کر اسے روکا۔ ٹرک رک گیا۔“

”اس میں کون سوار تھا؟“ رحیم داد نے سراپا استعجاب بن کر دریافت کیا۔

”وہ مسلمان فوجی تھے۔“

”مسلمان فوجی تھے۔“ رحیم داد حیرت سے چونک کر بولا۔ ”تب تو بہت مشکل پڑی ہوگی۔“

”کوئی مشکل پڑی نہ کھنائی۔“ جلیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ”دیرندر نے ان کی منت کی۔ وہ ٹیک اور بھلے بندے تھے۔ فوراً مدد کرنے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے دیرندر کے ساتھ سردار جسونت سنگھ کے پورے قبیلہ کو اپنے فوجی ٹرک میں بٹھالیا۔ بلوائی شور مچاتے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ پر جب انھوں نے فوجیوں کو برین گنیں اور رائفلس سنبھالے دیکھا تو لوٹ گئے۔ فوجیوں نے دیرندر اور جسونت سنگھ کے بال بچوں کو آرام سے سرحد پار پہنچا دیا۔“

”یہ تو نے عجیب گل سنائی۔“ رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”دیرندر سرحد پار جا کر کیا کرتا رہا؟“

”بتاتا تھا، اس نے آگرہ جا کر میڈیکل کالج میں کسی نہ کسی طرح اپنی پڑھائی پوری کی اور ڈاکٹر بن گیا۔ اس سنسار میں اس کا کوئی نہ رہا تھا۔ سب مارے جا چکے تھے۔ وہ اکیلا بچا تھا۔ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کے مفت علاج کے لیے اسپتال بنانا چاہتا تھا۔ اس کی آشتا تھی کہ اس نیک کام میں اس کی مدد کروں۔ دونوں مل جل کر اسپتال چلائیں۔“

”تو نے اس کی گل سن کر کیا جواب دیا؟“

”میں چپ بیٹھی رہی۔ وہ بولتا رہا۔ میں سنتی رہی۔ سر جھکائے پاس لیٹی ہوئی سینا کو ہولے ہولے تھپکتی رہی۔ دیرندر نہ جانے اور کیا کیا کرتا۔ اچانک کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ میں نے پریشان ہو کر دروازے کی اور دیکھا، اللہ وسایا کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے دیرندر کو میرے برابر بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا تو ٹھک کر دلہیز پر رہ گیا۔“

ہرے ساتھ نہیں جاسکتی، ہرگز نہیں جاسکتی۔ یہ کہہ کر میں نینا کو چھاتی سے لگا کر رونے لگی۔
دیرندر خاموش کھڑا رہا۔

”تیری گل سن کر تو اسے چلا جانا چاہیے تھا۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

”نہیں۔“ جمیلہ نے بتایا۔ ”اس نے درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں مجھے کہا۔ ایک بار فیروزجی لے۔ میں دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا۔ وہ ٹکٹلی باندھے مجھے تکتا رہا۔“ جمیلہ نے لمبی سانس بھری۔
”میں نے سکیاں بھرتے ہوئے اسے کہا۔ میں چاہتی بھی یہی ہوں تو دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ شین گن کندھے پر لٹکائی اور میری اور دیکھے بنا دروازے کی طرف بڑھا۔ اللہ وسایا بھی اس کے ساتھ ہی مڑا، آگے بڑھا۔ دونوں چپ چاپ کمرے سے باہر چلے گئے۔“

”تو نے اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے دیا۔ روکایوں نہیں؟“

”میراجی تو یہی چاہتا تھا، اللہ وسایا کو اس کے ساتھ جانے نہ دل پر مجھ سے یہ بات کہی نہ گئی۔
ہوٹوں پر جیسے تالا لگ گیا۔ میں نینا کو چھاتی سے چمٹائے خاموش بیٹھی روتی رہی۔“ جمیلہ نے بتایا۔
”اللہ وسایا دیر تک نہ لوٹا۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔ وہ صبح تک نہ آیا۔“
”اللہ وسایا کہاں چلا گیا تھا؟“

”وہ دیرندر کے ساتھ سرحدی پنڈ شامار کے گیا تھا۔ دوپہر کو واپس آیا تو بہت تھکا ہوا اور اداس تھا۔ اس نے مجھے بتایا، دیرندر جیب میں بیٹھ کر یہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ دو سمگلر تھے۔ وہ بھی پوری طرح مسلح تھے۔ دیرندر اصرار کر کے اللہ وسایا کو اپنے ساتھ سرحد تک لے گیا تھا۔“
”اور اللہ وسایا اس کے ساتھ چلا بھی گیا۔“ رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر بولا۔ ”اسے دیرندر اور اس کے ساتھ آنے والے مسلح سمگلروں سے ڈر بھی نہ لگا۔“

”وہ ڈرنے والا بندہ نہیں تھا۔ سدا کا نڈر اور جیالا تھا۔“ جمیلہ نے اپنے لمبے میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”تب ہی تو وہ بے دھڑک دیرندر کے ساتھ جیب میں بیٹھ کر چلا گیا۔ رات انھوں نے شامار کے میں گزاری۔ سویرے بہت تر کے پہلے دیرندر اٹھا۔ وہ رات بھر سویا نہیں تھا۔ اس نے اللہ وسایا کو جگایا اور اس کے ساتھ ستلج کی اور چلا۔“ جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر اسے مخاطب کیا۔ ”چوہدری! تجھے پتہ ہے ستلج پار فیروز پور کی سرحد لگتی ہے اور فیروز پور اب ہندوستان میں ہے۔“ جمیلہ نے لمحہ بھر خاموش رہ کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جب دونوں ستلج پر پہنچے تو دیرندر نے اللہ وسایا کو گرم جوشی کے ساتھ گلے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔“

ہولے ہولے جھنجھوڑ کر بولا۔ تجھے میرے ساتھ چلنا ہے؟ صاف صاف بتا دے۔ مجھے پورا دشواں ہے تو انکار نہیں کر سکتی۔ اس کی آواز میں منت تھی۔ آنکھوں میں جیسے آنسو جھللا رہے تھے۔ میں الجھن میں پڑ گئی۔ ایسا لگا میں جمیلہ سے فیرواروتی بن گئی ہوں۔ بھولے برے سنے جاگ اٹھے تھے اور ان سپنوں میں بسنے والا دیرندر میرے سامنے کھڑا تھا۔ ہاں وہی تھا۔ وہی الجھے ہوئے بال، وہی سنہری چشمے کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ وہ سرحد پار سے مجھے لینے آیا تھا۔“ جمیلہ خود فراموشی کے عالم میں ٹھہر ٹھہر کر بول رہی تھی۔ ”میں بالکل چپ تھی۔ کھوٹی کھوٹی بیٹھی رہی۔“

”اللہ وسایا بھی چپ کر کے کھڑا رہا۔ وہ کچھ نہ بولا؟“

”نہیں اس نے اونچی آواز سے کہا تھا۔ بول، بولتی کیوں نہیں؟ تمیں نوں اس کے ساتھ جانا ہے؟ اس کی آواز سے نینا کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ نینا کو روتا دیکھ کر میں چونک پڑی۔ مڑ کر نینا کو دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے یاد آگیا، میں پاروتی نہیں جمیلہ ہوں۔ اللہ وسایا کی گھر والی اور اس کی دھمی، نینا کی ماں ہوں۔ میں بے کل ہو گئی۔ تڑپ کر میں نے نینا کو اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔“ جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے آنسو بہاتے ہوئے دیرندر کی اور دیکھا، اسے کہا۔ ڈاکٹر دیرندر تو جس پاروتی کو لینے آیا تھا وہ تو کب کی مرچکی ہے۔ میں جمیلہ ہوں اور جمیلہ تیرے ساتھ نہیں جاسکتی۔ توجا۔ میرا تیرا کوئی سنبدھ نہیں۔“
”تیری یہ بات سن کر دیرندر کیا بولا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔“ جمیلہ نے جواب دیا۔ ”اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ کہنے لگا تو جمیلہ ہو یا شملہ، میرے لیے تو پارو ہی ہے۔ میں آج یہ طے کر کے آیا ہوں کہ اکیلا واپس نہیں جاؤں گا۔ تجھے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ اس نے شین گن کی نالی کا رخ اللہ وسایا کی اور کر دیا اور میری طرف مڑ کر تیزی سے بولا۔ میں نے یہ سوچ کر ہی سرحد پار کی تھی کہ تجھے اپنے ساتھ لے کر ہی لوٹوں گا۔ جو میرا رستہ روکے گا اسے ختم کر دوں گا یا خود ختم ہو جاؤں گا۔ میں آج سرحد کی بازی لگانے آیا ہوں۔ بول تجھے کیا کہنا ہے۔ اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔“

”تو نے کیا کیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تو ڈر گئی ہوگی۔ دیرندر تو صاف صاف کہہ چکا تھا وہ تیرے بنا نہیں جائے گا۔“

”میں بالکل نہیں ڈری۔ میں نے بھی اسے صاف صاف کہہ دیا۔ تیری پارو مر گئی۔ وہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ میں اب صرف جمیلہ ہوں۔ تو جمیلہ کو کتل کر کے اس کی لاش اپنے ساتھ لے جا۔ میں زندہ

”سرحد پار چلا گیا ہو گا؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔

”نہیں وہ ستلج کے اس پار نہ گیا۔ جہاں دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں وہاں ٹھہر گیا۔ اس نے اچانک کندھے پر لٹکی ہوئی شین گرن اتاری اور کنپٹی پر رکھ کر چلا دی۔“

”تب تو وہ مر گیا ہو گا؟“ رحیم داد کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

”ہاں! اسی سے اس کی مرقی ہو گئی۔ اس کی لاش سرحد کے پتھوں بچ پڑی تھی۔ ادھر پاکستان تھا اور ہندوستان۔“ جیلہ نے رمان سے کہا۔ اس کی آواز میں درد کی کک تھی۔ ”مرنے سے پہلے اس نے اللہ وسایا کو سونے کی ایک انگوٹھی دی۔ اسے بتایا، وہ انگوٹھی کڑمائی پر مجھے پہنانا چاہتا تھا پر وہ دن ہی نہ آیا، کڑمائی ہوتی اور وہ اپنی منگ کے طور پر مجھے انگوٹھی پہناتا۔ اس کی آشا تھی میں اس کی نشانی سمجھ کر اسے پہن لوں۔ ورنہ اس رات مجھے لینے اور کڑمائی کی انگوٹھی پہنانے ہی کے لیے آیا تھا۔“

”اس انگوٹھی کا کیا پتا؟“

”یہ رہی وہ انگوٹھی۔“ جیلہ نے اپنا ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ اس کی ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی جس میں جزا ہوا ہیرے کا سرخ نگینہ بھللا رہا تھا۔ ”میں نے انگوٹھی اسی سے پہن لی تھی۔ اور آج تک نہیں اتاری۔“

”اللہ وسایا نے اس کا برا نہیں منایا؟“

”نہیں!“ جیلہ نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔ ”انگوٹھی اس نے خود اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی۔ اس سے اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڑ رہے تھے۔ انگوٹھی پہنا کر وہ رونے لگا تھا۔“

”اللہ وسایا بھی عجب بندہ تھا۔“

”ہاں! وہ بہت عجب بندہ تھا۔“ جیلہ کے لہجے میں دکھ کی چھین تھی۔ ”اسے تو یہ بھی پتا تھا، میں ڈسپنری، ڈاکٹر ورنہ رہی کی یادگار کے طور پر بنانا چاہتی ہوں۔ میں نے اسے جب اپنی اس آشا سے آگاہ کیا تو اس نے ذرا بھی برا نہ منایا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ چوہدری! سچ پوچھ تو ورنہ کی موت پر اللہ وسایا بھی زراش اور دکھی تھا۔ بار بار کہتا تھا، تو اس کے ساتھ چلی جاتی تو وہ کبھی خود کشی نہ کرتا۔“

”اللہ وسایا ٹھیک ہی تو کہتا تھا۔ تو چلی جاتی تو وہ یوں جان نہ دیتا۔“

”پر میں اس کے ساتھ کیسے جاسکتی تھی۔“ جیلہ نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”میں ورنہ اس کے ساتھ سرحد پار چلی جاتی تو زمیں داری اللہ وسایا کے ہاتھ سے نکل جاتی۔ وہ زمیں دار سے فیرمزارع

بن جاتا۔ جانے کیا ہوتا۔ میری نینا کا کیا بنتا۔ پتہ نہیں ادھر والے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ ایک نہیں، کتنی باتیں تھیں جو زنجیر بن کر میرے پیروں سے چٹ گئی تھیں۔“ اس نے لمبڈی سانس بھری۔ ”اللہ وسایا کو جھوڑ کر ورنہ کے ساتھ جانا آسان نہ تھا۔ میرے تو بھاگ اچھے تھے، مجھے اللہ وسایا کے روپ میں ایسا نیک بندہ مل گیا تھا۔ اس کا من بہت اجلا تھا۔ وہ بہت ہی بھلا بندہ تھا۔“

رحیم داد نے جیلہ سے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ”پر زمیں دارنی تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔“

”میں اکیلی اس ظلم اور اپرا دھ کا نشانہ نہیں بنی۔“ جیلہ نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ ”مجھے بھی پوری طرح پتہ ہے، ادھر اور ادھر، دونوں طرف لاکھوں نیاریں اور زنانیاں اٹھائی گئیں اور اپنا سب کچھ لٹا کر مغویہ کھلائیں۔ میری طرح انھوں نے بھی آئندہ کے لیے جانے کیسے کیسے سمانے پنے دیکھے ہوں گے۔ ان میں خوشیاں تھیں۔ چمکتی دیمکی آشائیں تھیں۔ زندہ رہنے اور سندر جیون بنانے کی انگلیں تھیں۔“ اس کا لہجہ اور غم زدہ ہو گیا۔ ”فیر ایک روز اچانک سب کچھ ملیا میٹ ہو گیا۔ جیون ڈراؤنا پہنا بن گیا۔ مجھے کیا پتہ ان پر کیا کیا نہ بتی اور اب تک بیت رہی ہے۔“

رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری مگر خاموش رہا۔



آسمان پر گمراہ چھایا تھا۔ ہوا تیز نہ تھی مگر بوند باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ کمرے میں رحیم داد اور جیلہ صوفوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں خاموش تھے اور دل گرفتہ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دکھ کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”زمیں دارنی تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ فسادات میں زنانیوں کے ساتھ بہت ہی ظلم ہوا۔“

”نہ پوچھ، کیا کیا ظلم نہیں ہوا۔“ جیلہ نے تڑپ کر کہا۔ ”کالج میں میری ایک کلاس فیلو ہوتی تھی۔ اس کا نام چتر اکپور تھا۔ لگتی بھی سندر چتر کی طرح تھی۔ اسے اپنی سندر تار پان بھی تھا۔ تھی بک چتر کار۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی کٹی پینٹنگ دیکھیں۔ اچھی خاصی سندر تصویریں بنالیتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کی اگلیاں پتلی پتلی تھیں اور لمبی لمبی، بہت کومل اور بہت سوہنی تھی۔ میرے ساتھ اس کی بہت گہری دوستی تھی۔ وہ بی۔ اے کرنے کے بعد پینٹنگ سیکھنے، بہی جانا چاہتی تھی۔ جے۔ بے سکول آف آرٹس میں داخلہ لینے کا ارادہ تھا۔ اسے پینٹنگ سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ تھا۔

”وہ بالکل بدل چکی تھی۔“ جیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس کے گندے اور الجھے ہوئے بال بار بار کھڑکھڑاتے اور وہ ہاتھوں کو چلاتے ہوئے بار بار ایک خاص انداز سے گردن جھٹک کر بالوں کو پیچھے لے جاتی۔ یہ انداز چڑا کپور ہی کا تھا۔ میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔ غور سے دیکھا تو وہ چڑا ہی تھی۔ نہ اب اس کا پہلا سارنگ روپ رہا تھا نہ سندر تاہی رہی تھی۔ کالی کالی جگمگ کرتی آنکھیں مجھ کو دھندلی پڑ گئی تھیں۔ کپڑے لٹے پھٹے پرانے تھے۔ ان پر گوبر اور بچہ کے جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ اس کے بدن سے جو کبھی چنبیلی کی سندر کلیوں کی مانند چمکتا تھا، مٹکا تھا، اس سے گوبر اور پسینے کی تیزبو کے بھیکے اٹھتے تھے۔ صورت سے وہ ادھیڑ اور بیمار لگتی تھی۔ میں دکھ اور خوف سے کپکپا کے رہ گئی۔“

”کیا وہ جگمگ چڑا کپور ہی تھی؟“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں جیلہ سے دریافت کیا۔ ”ہاں وہی تھی۔“ جیلہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”پر اب وہ چڑا سے سیکنہ بن چکی تھی۔ میں نے پاس جا کر پوچھا تو چڑا کپور ہے نا؟ اس نے چونک کر میری اور دیکھا۔ پر کچھ نہ بولی۔ اس کی آنکھوں میں گھڑی بھر کے لیے دیوے جگمگائے اور مجھ گئے۔ میں نے غور کیا، اس کے ہاتھوں کی لمبی لمبی اور کومل انگلیاں بھدی اور کھردری پڑ گئی تھیں۔ اسے ان کی ذرا چٹنا نہیں تھی۔ اسے تو اپنی بھی کوئی چٹنا نہ تھی۔ وہ مڑی اور اس کی انگلیاں ہاتھوں کے ساتھ ساتھ تیزی سے چلنے لگیں۔ وہ برابر تھپائی کرتی رہی۔“

”اس نے تجھے پہچان لیا تھا؟“

”ہاں اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ پر مجھے مل کر وہ ذرا خوش نہ ہوئی۔ اس کے اجڑے ہوئے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجھلاہٹ اور نفرت صاف نظر آ رہی تھی۔ ہونٹ اس طرح سکڑ گئے تھے مانو کڑوے پڑ گئے ہوں۔ وہ پیٹھ موڑے جھک جھک کر گوبر اٹھا رہی تھی۔“

”تو نے اس سے گل بات نہیں کی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”کی تھی۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”میں نے اپنی آواز میں نرمی اور مٹھاس پیدا کرتے ہوئے اس سے کہا۔ چڑا رانی! میں اسے پیار سے چڑا رانی ہی کہتی تھی۔ وہ تب بھی خوش نہ ہوئی۔ بگڑ کر بولی۔ کون چڑا! کیسی چڑا؟ میں کسی چڑا شترا کو نہیں جانتی۔ میرا نام سیکنہ ہے۔ میں نے اس کے نراض ہونے کا ذرا برداشت نہ کیا۔ خاموش کھڑی رہی۔“

”بس اتنی ہی گل بات ہوئی؟“

”نہیں! میں نے کچھ دیر چپ رہنے کے بعد آہستہ سے پوچھا۔ یہ تجھے کیا ہو گیا۔ تیری اندر کی

ویسے بھی بات چیت، کپڑے لٹے، رہن سہن، ہر انداز سے آرٹ لگتی تھی۔“

”کسی اچھے ہی گھر کی کڑی ہوگی؟“

”ہاں!“ جیلہ نے بتایا۔ ”اس کا پتا انجینئر ہوتا تھا۔ میں اس کے پتا سے کئی بار ملی بھی تھی۔ اس میں ذرا بھی اکڑ فون نہ تھی۔ پر چڑا میں ایسی اکڑ تھی، سب اسے گھمنڈی کہتے تھے۔ پر پیار بھی برد کرتے تھے۔ اس میں بات ہی ایسی تھی۔ بادام کی سی لمبی کالی کالی آنکھیں۔ اور رنگت ایسی اہل جیسے صبح کی ہنسی ہوئی دھوپ۔ جب وہ اپنی سوہنی گردن، راج ہنس کی طرح اٹھانے، ماتھے پر بکھری ہوئی بالوں کی لٹوں کو بار بار جھٹکتی ہوئی گزرتی تو دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ مجھے اب تک یاد ہے ان دنوں وہ کتنی سوہنی اور شاندار لگتی تھی۔“

”پر اس کا بتا کیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”یہ نہ پوچھ چوہدری۔“ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”دواڑھائی برس ادھر کی گل ہے۔ میں پڑوس کے ایک زمین دار کے پتر کی جنج کے ساتھ پکھیالہ گئی۔ اللہ وسایا، نینا اور گڈو بھی ساتھ تھے۔ جنج کئی روز پکھیالہ میں ٹھہری۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ ورکھا ختم ہو چکی تھی۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ خریف کی فصلیں سمجھوتیا رہی کھڑی تھیں۔ کپاس کے کھیتوں میں سفید سفید تو بنے پھوٹے لگے تھے۔ ایک روز میں نینا کی انگلی تھامے شعلی ہوئی پنڈ کی ایک گل میں چلی گئی۔“

”یہ پکھیالہ کہاں ہوا جی؟“

”پکھیالہ، ضلع شیخوپورہ کی تحصیل فیروز والا میں ہے۔ اچھا وڈا موضع ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ گلی سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا ایک زنانی دونوں ہاتھوں میں گوبر اٹھا اٹھا کر دیوار پر پاتھیاں تھاپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سرھے ہوئے تھے اور تیز تیز چل رہے تھے۔ دیوار پر تھپ تھپ پاتھیاں بنتی جا رہی تھیں۔ گوبر کے ڈھیر کے پاس دو گندے اور مرل سے بالک بیٹھے تھے۔ ان کے کپڑے میلے پھیلے تھے۔ وہ ٹانگوں سے بالکل ننگے تھے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ لمحہ بھر کے لیے رکی۔

”مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ اس میں مجھے چڑا کی جھلک نظر آئی۔ پر مجھے اپنی آنکھوں پر دھواں نہ آیا۔ اسے اچھٹے سے دیکھتی دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ وہ بالکل بے خبر اپنی دھن میں گمن پاتھیوں کی تھپائی میں لگی تھی۔“

”دیکھنے میں کیسی نظر آتی تھی؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

جلی ہوئی تو پہلے ہی تھی۔ بالکوں کے رونے پر اور جھلا گئی۔ تیزی سے ایک پر جھپٹی اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ وہ بلبل کر زیادہ زور سے رونے لگا۔ یہ دیکھ کر چڑا کا گھر والا اور بھڑک اٹھا۔ وہ گالاں کاٹتا ہوا اس کی اور تیزی سے بڑھا۔ اسے بالوں سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ وہ دور جا کر گر گئی۔ پہنچنے بھی نہ پائی تھی، گھر والا اس کے سر پر پہنچ گیا اور لگا لگاتیں اور ٹھڈے مارنے۔ چڑا کی دھوٹی پٹ گئی۔ ٹانگیں تنگی ہو گئیں۔ تب بھی وہ چپ کر کے پڑی رہی۔ نہ روئی، نہ چیخی۔ آنکھیں کھولے گھر والے کو گھورتی رہی۔ ”جیلہ نے گہری سانس بھری۔ ”لگتا تھا لاج کے ساتھ ساتھ اس کے اندر کی نار بھی مر گئی تھی۔“

”تو بھی چپ کھڑی رہی۔ کچھ نہ بولی؟“ رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں تبصرہ کیا۔ جیلہ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”اس کا گھر والا مارتے مارتے تھک گیا۔ اپنے لگا اور چپ کر کے کھڑا ہو گیا۔ چڑا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے پونجھا بھی نہیں۔ سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ اس کا گھر والا آنکھیں نکال کر چیخا۔ اٹھ اندر چل، پر نہ دھامی اور نہ ہی زبان سے کچھ کہا۔ جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ اس بار گھر والے نے چڑا کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔ دروازے کی اور بڑھا۔ میں اب چپ نہ رہ سکی۔ اس کے سامنے گئی۔ اسے غیرت دلائی۔ غصے سے کہا، ”تیں نوں ایک کزور زنائی پر ایسے ظلم کرتے شرم نہیں آتی۔ تو کیا بندہ ہے؟ اس نے پلٹ کر مجھے، لال لال آنکھوں سے گھورا۔“

”تجھ پر بھی وہ نراض ہوا ہوگا۔“

”بالکل نراض ہوا۔ غصے سے بولا۔ تو ہمارے بیچ میں بولنے والی کون ہوتی ہے؟ یہ میرا اور میری گھر والی کا معاملہ ہے۔ چل اپنا رستہ پکڑ۔ وہ چڑا کو بالوں سے فیر گھیننے لگا۔ میں کچھ بولنے ہی والی تھی کہ پیچھے سے آواز آئی۔ ”کیہ، حل اے جی لے؟ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے اللہ وسایا کھڑا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ میں نے چڑا کی اور اشارہ کیا۔ یہ چڑا پور ہے۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی۔ فیر میں نے گئے کی اور ہاتھ اٹھا کر کہا۔ یہ اس کا گھر والا لگتا ہے۔ چڑا کو مارتا تھا۔ میں نے روکا تو میرے گلے پڑ گیا۔ مجھے اس سے بہت غصہ تھا۔“

”تیری باتیں سن کر اللہ وسایا کیا بولا؟“ رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”وہ چپ رہا۔ پر چڑا کا گھر والا تیوری پر تل ڈال کر بولا۔ ہاں، میں نے اسے مارا ہے۔ ابھی اور ماروں گا۔ یہ کہہ کر اس نے بالوں سے پکڑ کر چڑا کو اٹھایا اور اس کے منہ پر زور زور سے چپڑ مارنے لگا۔ اللہ وسایا نے اسے روکا۔ بس کر۔ وہ نراض ہو کر اللہ وسایا پر چیخا۔ ادے تو کون ہے؟

آرٹس اور اس کا آرٹ کہاں چلا گیا؟ اس نے میری طرف دیکھے بنا گوبر کی تھاپی دیوار پر مارے ہوئے جواب دیا۔ یہ آرٹ دیکھ رہی ہے؟ اس نے دیوار پر تھپی ہوئی پاتھوں کی سمت اشارہ کیا۔ یہ بھی تو آرٹ ہی ہے نا۔ دیوار کو کیونس سمجھ لے۔ اور پاتھوں کو گل بولے۔ دیکھ کیسا شاندار لینڈ سکیپ بن گیا۔ وہ چلی، مجھے تیز اور تھکی نگاہوں سے دیکھا اور گوبر کے ڈھیر کے پاس بیٹھے ہوئے بالکوں کی اور ایک ہاتھ اٹھا کر بتایا، یہ میرے آرٹ کے زندہ شاہکار ہیں۔ وہ ٹھٹھا مار کر پالکوں کی طرح بنی۔ تجھے میرا یہ آرٹ پسند آیا؟ اس نے گوبر پر تیزی سے ہاتھ مارا۔ گوبر کے ڈھیر پر بیٹی ہوئی کھیاں اڑیں اور ہنسناتی ہوئی ادھر ادھر بکھر گئیں۔ میں ہاتھ ہلا کر انھیں منہ پر سے اڑانے لگی پر چڑا نے ان پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ آرام سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ وہ بیمار اور مرل دکھائی دینے کے ساتھ ساتھ پگلی بھی لگ رہی تھی۔ عجیب بسکی بسکی باتیں کرتی تھی۔“

”اسے واپس لینے کوئی نہ آیا؟ اس کا بھی کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔“

”پتہ نہیں۔ نہ میں نے اس بارے میں پوچھا نہ اس نے بتایا۔ اس کے ساتھ زیادہ بات چیت کا موقع ہی نہ ملا۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”میرے پیچھے کے کچھ ہی دیر بعد گھر کا دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک بوڑھی بڑبڑاتی ہوئی نکلی اور چڑا کو چیخ چیخ کر کونے لگی۔“

”وہ اس سے اتنی نراض کیوں تھی۔ کوئی توجہ ہوگی؟“

”وہ اس لیے اتنے غصے میں تھی کہ چڑا نے پاتھیاں تھوپنے میں دیر لگا دی تھی اور گھر والے کے لیے کھیت پر بھتا نہ پہنچا سکی تھی۔ بوڑھی اصل میں چڑا کی ساس تھی۔ بہت کڑوی اور کٹھور لگتی تھی۔“

”چڑا نے اس کے رولا گولا کرنے پر کچھ نہ کہا؟“

”نہیں، وہ خاموشی سے دیوار پر پاتھیاں تھوپتی رہی۔ اس کے ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگے۔ بوڑھی کھڑی چیخ ہی رہی تھی کہ گلی میں ایک ادھڑکنا داخل ہوا۔ اس نے چڑا کو دیکھتے ہی تنگی نکلی گالاں نکالنی شروع کر دیں۔ وہ سخت غصے میں تھا۔“

”چڑا کا گھر والا ہوگا۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”ہاں جی، وہ اس کا گھر والا ہی تھا۔ وہ چھوٹے کد کا بھدا اور بے ڈول بندہ تھا۔ یہ لمبے لمبے تو اس کے دانت تھے۔ پیلے پیلے اور گندے۔“ جیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”ساس اونچی آواز سے کوسی رہی۔ چڑا ساس کے کونے اور گھر والے کی گالیاں آرام سے سنتی رہی۔ زبان سے کچھ نہ بولی۔ پر اس شور شرابے سے گھبرا کر اس کے دونوں بالک منہ پھاڑ کر زور زور سے رونے لگے۔ چڑا

تیس نوں کیسہ لینا؟ تو تھانے وار لگا ہے؟ اس نے اور زور سے چڑا کے گال پر ایک بچہ مارا۔
جیلہ کالجہ تھکھا ہو گیا۔

”اللہ وسایا ایک دم ویسا ہی بن گیا، جیسے میں نے برسوں پہلے اسے ولیا کے گھر میں دیکھا تھا۔
بہت عرصے بعد وہ مجھے اتنا غصے میں نظر آیا۔ زور سے چیخا۔ نکواس بند کر۔ ساتھ ہی تیزی سے جھپڑ
گئے کی کسر پر اس زور سے لات ماری، وہ دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ پر اللہ وسایا کا غصہ کم نہ ہوا۔
نزدیک پہنچا اور اسے گردن سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔ وہ اس کے ہاتھ میں جھولنے لگا۔ اس کی آنکھیں
اٹل پڑیں۔ منہ پھاڑ کر ہائے کرنے لگا۔“
”لگتا ہے اللہ وسایا کو بہت ہی زیادہ غصہ آگیا تھا۔“

”ہاں، وہ بہت غصے میں تھا۔ چڑا پہلے تو چپ کر کے کھڑی رہی فیروزگڑا کر اللہ وسایا کی منہ
کرنے لگی، اسے چھوڑ دے۔ اللہ وسایا نے اسے چھوڑ دیا۔ چڑا بہت سہمی ہوئی تھی۔ اس کا گھر
والا منہ پھاڑ کر زور زور سے سانس بھر رہا تھا۔ چڑا کی بوڑھی ساس نے چیخ چیخ کر سارا پنڈا کٹھا
کر لیا۔ نمبردار بھی آگیا۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”نمبردار کیا بولا؟“

”اس نے بھی چڑا کے گھروالے کو شرم دلائی۔ زراض بھی ہوا۔ اللہ وسایا کو سمجھا بجا کر اپنی
حوٹلی میں لے گیا۔ رستے میں اس نے بتایا، چڑا کے گھروالے کا نام کرم دین ہے۔ وہ معمولی زمین
دار تھا۔ اس کے پاس ۷۰ اکلا خود کاشت زمین تھی۔ اس نے چڑا کو جو پہلے ہی سیکینہ بن چکی تھی، ایک
کانٹیل کے ذریعے مجھے سو روپے میں خرید لیا تھا۔ وہ پہلے ایک جواڑی کے پاس تھی۔ وہ شیخوپورہ میں
جوئے کا اڈہ چلاتا تھا۔ چریا بھی تھا۔ اس نے چڑا کو بھی اپنے رستے پر لگا دیا تھا۔ وہ چرس اور گانجا
پینے لگی تھی۔ جواڑیوں کی سنگت میں کنجریوں کا ساجیون گزارتی تھی۔ فیروسیا ہوا اس کا جواڑی گھر
والا جواخانہ چلانے کے جرم میں پکڑا گیا۔ اسے جیل ہو گئی۔ چڑا بالکل اکیلی رہ گئی اور ایک کانٹیل
کے ہتھے چڑھ گئی۔ اس نے رکھیل بنا کر اپنے پاس رکھا۔ جب اس کا جی چڑا کی طرف سے بھر گیا تو
اس نے کرم دین کے ہاتھ اسے بیچ دیا۔“

”تجھے جب وہ ملی تب بھی چرس پیتی تھی؟“

”مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔“ جیلہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”نمبردار سے نہ میں نے پوچھا اور نہ

ہی اس بارے میں اس نے بتایا۔ پر میرا وچار ہے ان دنوں وہ چرس شرس نہیں پیتی تھی۔ ملتی ہی نہ
ہوگی۔ کرم دین ظالم اور کٹھور ہونے کے ساتھ ساتھ چڑا کی کڑی نگرانی بھی کرتا تھا۔ نمبردار کی

بتاتا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا، چڑا کو بخار رہتا ہے۔ منہ سے خون آتا ہے۔ اسے ٹی۔ بی ہو گئی
تھی۔“

رحیم داد نے مہری سانس بھری۔ وہ چڑا کے بارے میں جیلہ سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا
اسی اثناء میں احمد ٹرے میں چائے لے کر آگیا۔ چائے کے ساتھ سوچی کا گرم گرم حلوہ بھی تھا۔ احمد
نے چائے کی پالیاں اور حلوے کی پلیٹیں جیلہ اور رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیں۔
جیلہ نے احمد سے پوچھا۔ ”تو اب تک کدھر رہا؟“

”میں تو جی باہر دروازے پر دیر سے بیٹھا ہوں۔“ احمد نے جواب دیا۔

جیلہ مسکرا کر خاموش ہو گئی۔ احمد فوراً ہی واپس چلا گیا۔

رحیم داد نے حلوہ کھاتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”زمین دارنی تو نے بہت دردناک بات
سنائی۔“

”ایسی تو ان گنت دردناک اور دکھ بھری کہانیاں ہیں۔“ جیلہ کے لہجے میں درد کی کک تھی۔
”ہر مغویہ اپنی جگہ ایک دکھ بھری کہانی ہے۔“

”چڑا سے تیرا دوبارہ ملنا نہیں ہوا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ابھی تک اس کے ذہن پر چڑا چھائی
ہوئی تھی۔

”نہیں! وہ مجھے بعد میں کبھی نہیں ملی۔ میں دوبارہ پکھیالہ نہیں گئی۔ کسی سے اس کے بارے
میں بات بھی نہیں ہوئی۔“ جیلہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”جانے اب تک زندہ بھی ہے کہ
مردی۔“



ایکایک بادل زور سے گرجے۔ بارش تیز ہو گئی۔ کمرے میں خاموشی پھیلی تھی۔ دونوں ہی خاموش
تھے اور اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔ رحیم داد نے چائے کی پیالی ختم کی۔ کھنکار کر گلا
صاف کیا۔ ہچکچاتے ہوئے جیلہ سے پوچھا۔ ”زمین دارنی، تیری باتوں سے لگتا ہے۔ تیس نوں اللہ
وسایا سے پیار نہ تھا۔ تو اس سے پیار کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ حالات ہی ایسے ہو گئے تھے۔ میں
نے غلط تو نہیں سوچا؟“ رحیم داد نے جیلہ کی طرف دیکھا۔ مگر وہ منہ موڑے دیوار کی سمت دیکھ رہی
تھی۔

”تو نے اپنے تئیں ٹھیک ہی سوچا۔“ جیلہ نے چند لمحے خاموشی اختیار کرنے کے بعد جواب دیا۔
”اور یہ بھی ٹھیک ہے مجھے اللہ وسایا سے ویسا پیار نہ تھا جیسا ویرندر سے تھا۔ یہ بات اللہ وسایا بھی

پوری طرح جانتا تھا۔ پر اس نے اتنا بہت سا پیار دیا کہ اگر وہ مجھے اتنا پیار نہ دیتا تو جانے کب کی میری مرگھپ چکی ہوتی۔ اس نے اپنے پیار سے میرا من جیت لیا۔“

”اس کا نصیب بھی تو چنگا تھا، تیری ایسی سوہنی اور بھاگ بھری گھر والی ملی جس نے مزارعے سے اسے وڈا زمین دار بنادیا۔“ رحیم داد نے جیلہ کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔

گمروہ متاثر نہ ہوئی۔ بے نیازی سے بولی۔ ”چوہدری! تجھے پتہ نہیں، شروع شروع میں تو مجھے اپنے سے سکھن آتی تھی۔ جی چاہتا تھا موت آجائے۔ ان دنوں تو میں کئی کئی روز بے حال پڑی رہتی۔ نہ نہاتی، نہ کپڑے بدلتی، نہ روٹی کھانے کو جی کرتا نہ بات کرنے کو۔ پر اللہ وسایا نے کبھی برا نہ منایا۔ جو میں نے کہا، اس نے وہی کیا۔ وہ مجھے خوش دیکھتا تو خوش ہو جاتا۔ نراش پاتا تو خود بھی نراش ہو جاتا۔“

”تو بھی تو اس کی ہر بات ماننتی تھی۔ اس کے لیے تو نے اپنے بھائی اور چاچا کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے، پر اللہ وسایا نے اپنی بات منوانے کے لیے کبھی ضد نہ کی۔ زمیں دار بن کر بھی وہ کبھی زمیں دار نہ بنا۔ جیون بھرا اپنے تئیں مزارع اور مجھے اپنے زمیں دار کی پتری سمجھتا رہا۔ بلکہ مجھے ہی زمیں دار سمجھتا رہا۔ میں نے بہت چاہا، پر وہ زمیں دار نہ بنا۔ بہت لاؤ آتا تو مجھے زمیں دار بنی کہہ کر پکارتا۔ یہی اس کا پیار تھا۔“ جیلہ کو اللہ وسایا کی خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ روانی سے بولتی رہی۔ ”ایسا پیار کرتا تھا، مجھے پریشان یا بیمار دیکھتا تو گھبرا جاتا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”تجھے شاید پتہ نہیں، آخری بار جب وہ مجھ سے بدلا ہوا تو مجھے تیز بخار تھا۔ سر ہانے بیٹھ کر دیر تک میرا سر دباتا رہا۔ فیروز کہہ کر چلنے کے لیے کھڑا ہو گیا، جی لے! میں تیرے لیے ڈاکٹر بلا کر لانا ہوں۔ میں نے روکا بھی۔ پر وہ نہ رکا۔ ایسا گیا کہ لاش ہی واپس آئی۔“

جیلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ باہر مینہ کی بوندیں جل ترنگ بجاتی رہیں۔ ہوا چلتی تو ایسا محسوس ہوتا سسکیاں بھر رہی ہے۔ بادل رک رک کر گر جتے بارش تیز اور تیز ہوتی گئی۔

رحیم داد نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح کب تک روٹی رہے گی۔“ اس نے لمبی سانس بھری۔ ”اللہ کی یہی مرضی تھی، جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب تو اگے کی سوچ۔“

”کیا سوچوں۔ میرا تو مغز بھی کام نہیں کرتا۔“

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ موسلا دھار بارش ہوتی رہی۔ جیلہ سر جھکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس عالم میں دیکھا تو ٹوہ لگانے کی غرض سے دریافت کیا۔ ”کیا سوچ رہی ہے؟“

جیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے چپ رہنے کے بعد انکلتے ہوئے کہا۔ ”ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہیں منائے گی؟“

”کیا کتنا چاہتا ہے؟“ جیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی کاٹ محسوس کی۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ جو کتنا چاہتا تھا، کہہ نہ سکا۔ اتنی جرات ہی نہ ہوئی۔ صرف اتنا کہا۔ ”تو نے اللہ وسایا کے کتل کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کیا۔“

”میں کیا کر سکتی ہوں؟ حویلی کی چار دیواری سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔“ جیلہ نے اپنی مجبوری بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شکوہ بھی کیا۔ ”پر چوہدری، تو نے اس بارے میں کیا کیا؟“

رحیم داد خفیف ہو کر صفائی پیش کرنے لگا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ پر تین نوں یہ بھی پتہ ہے میں تو ادھر کسی کو جانتا بھی نہیں۔ نہ میرا کبھی کتل شل کے کسی کیس سے کوئی واسطہ پڑا۔ وکیل جب بھی آیا میں نے اس سے گل بات کی۔ پولیس کی تفتیش کے بارے میں پوچھا۔ تھانے دار کو میں بالکل نہیں جانتا۔ تین نوں پتہ ہی ہے کبھی اس سے ملا ہی نہیں۔ تو کہہ تو وکیل کے پاس چلا جاؤں۔ اس کے ساتھ تھانے دار سے مل کر پتہ کروں اس نے اب تک کیا کیا؟ کوئی گرفتاری شرفقاری بھی کی کہ نہیں؟“

”میں نے تو ویسے ہی ایک بات کہی تھی۔“ جیلہ نے اس کی صفائی سے متاثر ہو کر کہا۔ ”مجھے پتہ ہے تیری ادھر کسی سے جان پہچان نہیں۔ ایسے میں تو کیا کر سکتا ہے؟“ اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ ”ویسے اب کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس تھانے دار نے کیس میں دلچسپی لی اور تفتیش کا کام آگے بڑھایا، اس کا تبادلہ کر دیا گیا۔ دوسرے نے کیس دبا دیا۔ تفتیش ختم کر دی۔ اسے لگایا ہی اس لیے گیا تھا۔“

”وکیل نے مجھے یہ باتیں بتائی تھیں۔ وہ بھی پریشان تھا۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”وہ بتاتا تھا، تفتیش کے لیے جو نیا تھانے دار لگایا گیا ہے، اس نے کتل کا الزام تیرے بھائیوں اور

شریکوں پر لگایا ہے۔“

”تفتیش ختم کرنے اور کیس داخل دفتر کرنے کے لیے وہ یہی کر سکتا تھا۔“ جمیلہ نے مگرمی سانس بھری۔ ”یہ اصلی مزموں کو چھپانے کی کوشش ہے۔ اسی لیے پہلے ہی سے ایسی افواہیں پھیلا دی گئیں تھیں۔ میرے بھائی آخر اللہ وسایا کا سئل کیوں کرتے؟ اس نے مجھے ان کے ساتھ جانے سے کب روکا؟ تجھے پتہ ہے میں خود ہی نہیں گئی۔“

”اوپر درخواست نہیں لگائی جاسکتی؟“ رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

”اوپر درخواست لگانے سے بھی کیا ہوگا۔ درخواست بھی دبا دی جائے گی۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“ رحیم داد نے مزید زور نہ دیا۔ وہ چاہتا بھی یہی تھا۔ ”تو اس کا مطلب یہ ہوا“ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ اللہ وسایا کے قاتل کبھی نہیں پکڑے جائیں گے۔“

”نظر تو یہی آرہا ہے۔ لگتا ہے اللہ وسایا کو پہلے سے سوچی سمجھی سیکم کے تحت کتل کیا گیا۔ وکیل کا بھی یہی وچار ہے۔“ جمیلہ کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اٹھا۔ وہ منہ پھیر کر چادر کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

رحیم داد نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ”بہت ظلم ہوا جی۔“

جمیلہ نے کچھ نہ کہا۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہا پھر اس نے لہجے میں اور نرمی پیدا کی۔ ”پر تو اس طرح کب تک اللہ وسایا کے لیے روتی رہے گی؟“

”جب تک آنکھوں میں رونے کے لیے آنسو ہیں۔“ جمیلہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

رحیم داد ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ بارش اب ختم گئی تھی مگر ہوا تیز تھی۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ رمان سے بولا۔ ”اب آگے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔“

”کیا سوچوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑے گا۔ تیرے دونوں بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔“ رحیم داد آہستہ سے بولا۔ ”تو ابھی جوان ہے۔ ایسے کس طرح کام چلے گا۔“

”تو کتنا کیا چاہتا ہے؟ میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھی۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا تھا۔

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تیزی اور کاٹ سموس کی۔ مگر اس نے خاموشی اختیار کرنے کے بجائے جرات سے کام لیا۔ بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ ”میں یہ کہنا چاہتا ہوں جس طرح تو ویرندر کو بھول گئی، تجھے اللہ وسایا کو بھی اسی طرح بھولنا ہوگا۔ حوصلے سے کام لے۔ تو بہت حوصلے

والی ہے۔ پہلے تجھ پر کم ظلم نہیں ہوا۔ پر تو نے اسے جھیل لیا۔ بھول بھی گئی۔“ رحیم داد کے لہجہ میں خوشامد کا پہلو نمایاں تھا۔ ”تیرا دل بہت وڈا ہے۔ تو یہ بھی بھول گئی کہ کبھی تو پاروتی ہوتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ جمیلہ کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا، رحیم داد کی باتوں نے اسے متاثر کیا تھا۔

”تیری طرح مجھ پر بھی ظلم ہوا۔ سب کچھ تباہ ہو گیا۔ بال بچے، گھریا، کچھ بھی نہ رہا۔ فیر بھی زندہ ہوں۔“ اس نے جمیلہ کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی، آواز میں رقت پیدا کی۔ ”کیا کیا جائے جب زندگی ملی ہے تو زندہ رہنا ہی پڑتا ہے۔ پر میرا جو دکھ ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تو میرے دکھ کو سمجھ سکتی ہے تو بھی تو ایسے ہی دکھوں کی ماری ہوئی ہے۔“

”ہاں چوہدری! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔“ جمیلہ کے رویے سے ہمدردی کا پہلو عیاں تھا۔ رحیم داد کی حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے کھل کر کسی قدر اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

”تو چاہے تو ہم دونوں ایک دوسرے کا دکھ بانٹ سکتے ہیں۔ میرا مطلب ہے۔“

جمیلہ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا۔ اسے آگے نہ بولنے دیا۔ ”میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔“

اس کا لہجہ تیز اور ٹیکھا تھا۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجے میں زیادہ نرمی اور حلاوت پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اس میں ہم دونوں کا بھلا ہے۔ پوری زمیں داری بھی اپنے پاس رہے گی۔ اسے پھیلانے اور بروحانے میں دونوں مل جل کر کام کریں گے۔ تو پہلے ہی کی طرح پورے پنڈ کی زمیں دارنی رہے گی۔ ہر کام تیری مرضی سے ہوگا۔“

جمیلہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنکھوں سے آنسو ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ وہ جمیلہ کا رد عمل جاننا چاہتا تھا۔ مگر وہ نہ بولی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نوں اب چلتا ہے۔“ وہ آگے بروحا، ٹھٹکا۔ مڑ کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔

”میں نے جو گل کی ہے، اس پر آرام نال سوچ لے۔ ابھی سوچنے کے لیے بہت وکت پڑا ہے۔ مجھے جلدی بھی نہیں۔ پر یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں، میں نے یہ بات بہت سوچ بچار کر اور اپنے اور تیرے فائدے کو سامنے رکھ کر کہی ہے۔“

جیلہ نے کچھ نہ کہا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے پر رکھ لیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ رحیم داد رووازے کی سمت بڑھا۔ اسے اپنے عقب میں جیلہ کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔



رحیم داد کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچا۔ صحن میں پانی تھا۔ کچڑ تھی۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ رحیم داد سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا مسمان خانے میں پہنچ گیا۔ وہ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔

اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ برسات کی ہینگلی ہوئی شام نے تاریکی کا ڈیرا ڈال دیا تھا۔ احمد نے لیپ روشن کر دیا اور رحیم داد کے پاس خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اس نے احمد کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ احمد آہستہ سے صحن میں اترا اور حویلی میں چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا ان باتوں پر غور کرتا رہا جو اس نے کچھ دیر پہلے جیلہ سے کہی تھیں۔ وہ پہلے سے کوئی منصوبہ بنا کر نہیں گیا تھا۔ گفتگو کچھ اس ڈھب سے چلی کہ دل کی بات زبان تک آگئی۔ اب رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا، اس نے جلد بازی سے کام لیا۔ نہ جانے جیلہ نے اس کے بارے میں کیا سوچا؟ اس نے جیلہ کی آنکھوں سے آنسو بہتے دیکھے تھے اور اس کی سسکیاں بھی سنی تھیں۔

اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ الجھن اور خلفشار سے گھبرا کر وہ کھڑا ہو گیا اور برآمدے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ احمد واپس آیا۔ اس نے کمرے میں میز پر کھانا چن دیا۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے رحیم داد سے کہا۔

”چوہدری، روٹی کھالے۔“

رحیم داد نے ہاتھ دھوئے اور کمرے میں جا کر چپ چاپ کھانا کھانے لگا۔ احمد دہلیز کے پاس فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر احمد کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔

”آج حویلی میں کچھ زیادہ ہی سناٹا لگ رہا ہے۔“

”ہاں جی، اب تو حویلی میں سناٹا ہی رہتا ہے۔“ احمد نے مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”زمیں دار اللہ وسایا کے بعد تو حویلی بالکل اجڑ گئی۔“ اس نے مڑ کر حویلی کی جانب دیکھا۔ ”وکیہ کیسی دیرانی برس رہی ہے۔“

”برسات میں رات کو ویسے بھی سناٹا کچھ زیادہ ہی لگتا ہے۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔

”کچھ یہ بات بھی ہے۔“ احمد نے اس کی تائید کی۔

رحیم داد اپنی بے چینی پر زیادہ دیر قابو نہ رکھ سکا۔ دہلی زبان سے پوچھا۔ ”زمیں دارنی کا کیا حال احوال ہے؟“

”اس کا حال احوال کیا ہوتا ہے جی۔“ احمد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”وہ تو جی گپ چپ رہتی ہے یا روتی رہتی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر غور سے دیکھا۔ ”تجھ سے تو آج دیر تک باتیں کرتی رہی۔“

”ابھی تک کمرے میں بیٹھی ہے؟“

”ناجی، وہ تو تیرے جانے کے بعد ہی اٹھ گئی تھی۔“

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”اب کیا کر رہی ہے؟“

”میں تو جی اس کے پاس گیا نہیں۔ تاراں روٹی لے کر گئی تھی۔ کہتی تھی اس نے روٹی بھی نہیں کھائی، نہ بات کی۔ وہ تو چادر سے منہ ڈھانکے رو رہی تھی۔ تاراں دیر تک بیٹھی رہی۔ پر اس نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔“

رحیم داد گھبرا گیا۔ اس نے گلاس اٹھا کر پانی پیا اور مونچھوں اور ڈاڑھی پر سے پانی کے قطرے پونچھتے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے بھی بات کرتے کرتے کئی بار روٹی۔“

اسی اثنا میں تاراں آگئی۔ اس نے نیکی نظروں سے احمد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ مگر اس نے احمد سے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد سے مخاطب ہوئی۔

”یہ مجھے بہت تنگ کرتا ہے جی۔“

رحیم داد نے احمد کو ڈانٹا۔ ”تو اسے کیوں تنگ کرتا ہے؟“

”میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔ یہ تو ایسے ہی میرے گلے پڑ جاتی ہے۔“ احمد مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

”بتاؤں تو کیا کرتا ہے؟“ تاراں نے دھمکی دی۔

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو زمیں دارنی کے پاس سے آ رہی ہے نا۔ کیسی طبیعت ہے اس کی؟“

”تیرے جانے کے بعد کمرے سے نکلی تو رو رہی تھی۔ اب تک اس کے آنسو نہیں تھے۔ آج تو بہت زیادہ اداس لگتی ہے۔“

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر احمد بول پڑا۔ ”جب سے زمیں دار کی موت ہوئی ہے تب سے اس کے آنسو ہی کہاں رکے ہیں۔ جب دیکھو روتی ہی رہتی ہے۔“

”بات تو یہی ہے۔“ تاراں نے اتفاق رائے کیا۔ ”دونوں میں بہت پیار تھا۔ وہ بھی تو زمیں دارنی کو کتنا چاہتا تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹر لانے ہی تو نکلا تھا، نہ جانے کس نے اسے قتل کر دیا۔“

رحیم داد کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس نے دونوں کو مزید بات چیت کا موقع نہ دیا۔ احمد سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”حمہ! برتن اٹھا اور واپسی میں دیر نہ کرنا۔“

احمد نے برتن اٹھائے اور تاراں کے ساتھ چلا گیا۔ رحیم داد کمرے سے نکل کر برآمدے میں پہنچا۔ صحن میں ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ وہ باہر نہ جاسکا۔ برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر پھر بیٹھ گیا۔

وہ اس وقت بھی جیلہ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پہلے ہی خدشہ تھا، جیلہ نے اس کی بات پسند نہیں کی۔ اسے شدید صدمہ پہنچا تھا۔ تاراں کی باتوں سے نہ صرف اس کی تصدیق ہو گئی تھی بلکہ اس کے اندیشے اور وسوسے سوا ہو گئے۔ وہ اپنی جلد بازی پر پشیمان تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، اس نے جو بے موقع قدم اٹھایا ہے اس کی تلافی کس طرح کرے؟ جیلہ کے دل سے کدورت کیوں کر اور کیسے رفع کرے؟

وہ بستر پر لیٹ کر بھی اسی مسئلہ پر غور کرتا رہا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا کہ جیلہ سے جلد سے جلد ملنے کی کوشش کرے گا۔ معذرت کرے گا اور ایسا روٹیہ اختیار کرے گا کہ جیلہ کی خفگی اور آزدگی کسی نہ کسی طرح دور ہو جائے۔

صبح اٹھ کر اس نے احمد کے ذریعے جیلہ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر وہ شام تک واپس نہ آیا۔ دوپہر کا کھانا حویلی کا ایک اور نوکر لے کر آیا۔

رحیم داد نے اس سے احمد کے بارے میں کچھ نہ پوچھا۔ وہ احمد کا انتظار کرتا رہا۔ شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد احمد آیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں پوچھا۔ ”حمہ! تو دن بھر کہاں رہا؟“

”مجھے جی، زمیں دارنی نے ایک ضروری کام سے پڑوس کے چک بھیجا تھا۔“

”تو نے زمیں دارنی سے میرے بارے میں بات کی تھی؟“ رحیم داد کے انداز سے بے چینی جھلک رہی تھی۔

”تو نے جو کہا تھا وہ میں نے اسے کہہ دیا۔ پر وہ کچھ نہ بولی۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔“

”لگتا ہے اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“ رحیم داد نے بات بتائی۔ ”میں بھی اس کی طبیعت ہی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ کل شام تاراں کی باتیں سن کر میں نے یہی اندازہ لگایا تھا۔“

”ہاں جی اس کی طبیعت گڑبڑ ہی لگتی ہے۔“

”مزیدری طرف سے اس کی طبیعت پوچھنا۔ کہنا میں نے زمیں داری کے بارے میں کچھ ضروری چل کرنی ہے۔“ رحیم داد نے جیلہ سے ملاقات کرنے کا بہانہ تلاش کیا۔

”اب تو جی کل ہی اس سے گل ہوگی۔“

”کوئی حرج نہیں، گل ہی گل کر لیتا۔“

دوسرے روز رحیم داد بے چینی سے احمد کا انتظار کرتا رہا۔ صبح کے ناشتے کے بعد وہ دوپہر کا کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”حمہ! تو نے زمیں دارنی سے بات کی تھی؟“

”ہاں جی! میں نے تیری بات اسے پہنچا دی تھی۔“

”کیا کہا اس نے؟“ رحیم داد اپنی بے چینی چھپانہ سکا۔ احمد بھی بھانپ گیا۔ ”تو اس سے ملنا چاہتا ہے۔ کوئی ضروری کام ہوگا۔ پر ایسا لگتا ہے وہ تجھ سے ملنا نہیں چاہتی۔“

”تو نے کیسے سمجھا وہ ملنا نہیں چاہتی؟“

”میری گل سن کر وہ پہلے کی طرح چپ کر کے بیٹھی رہی۔“ میں نے دوبارہ کہا تو منہ بگاڑ کر بولی۔ ”مجھے زمیں داری سے کیا لینا؟ چوہدری سے کہنا جو اس کا جی چاہے کرے۔ بس جی اس نے اتنا ہی کہا۔“

رحیم داد نے احمد سے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔ مگر رغبت سے کھانا نہ کھا سکا۔ اس کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ دن ڈھلا، شام ہوئی، رات ہو گئی۔ مگر رحیم داد کی ذہنی الجھن کم نہ ہوئی۔ اسی عالم میں وہ سو گیا۔



رحیم داد سویرے بیدار ہوا تو اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ ہاتھ پیروں میں اینٹھن کے ساتھ ساتھ سر میں درد تھا۔ ہلکا ہلکا بخار بھی تھا۔ دوپہر کو دو چار لقمے کھانے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔ کھانا کھایا ہی نہ گیا۔ طبیعت اس قدر مضطرب اور گری گری تھی کہ وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں بھی نہ گیا۔ مٹن میں چھما چھما بارش ہو رہی تھی۔

رحیم داد بستر پر لیٹا بوندوں کا جل ترنگ سنتا رہا۔

شام ہوتے اسے جوڑی چڑھی۔ جسم کپکپانے لگا۔ اس نے کھیں اچھی طرح لپیٹی اور بدن سکیر کر گھڑی بن گیا۔ اب بخار تیز ہو گیا تھا۔ احمد کھانا لے کر آیا تو رحیم داد نے جوڑی سے کپکپاتے ہوئے کہا۔ ”حمہ! کبیل لاکر مجھ پر ڈال دے۔“ احمد نے اس کی پیشانی چھو کر بخار کی شدت کا

اندازہ لگایا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد کا جسم بخار کی تپش سے بھن رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے سکڑا سکڑایا بے سدھ پڑا رہا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی کہ احمد کب واپس آیا۔ کب اس کے ہاتھ تھرتھراتے بدن پر اس نے کبل ڈالا اور کب کمرے سے باہر گیا۔

رحیم داد پر گہری غنودگی طاری تھی۔ آنکھیں سنگ رہی تھیں۔ وہ رک رک کر سانس لے رہا تھا اور آہستہ آہستہ کراہ بھی رہا تھا۔

رات نہ معلوم کتنی گزر چکی تھی۔ باہر چھا جوں پانی برس رہا تھا۔ یکایک رحیم داد نے اپنی تپتی ہوئی پیشانی پر ٹھنڈک محسوس کی۔ یہ کسی کا نرم اور گداز ہاتھ تھا۔ اس نے لمبی سانس بھری اور آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا، جیلہ اس پر جھکی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ رحیم داد کی پیشانی پر تھا۔

رحیم داد کو یقین نہ آیا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ ہاں وہ جیلہ ہی تھی۔ وہی ستاروں کی مانند روشن آنکھیں، وہی گلابی ہونٹ، وہی تابندہ پیشانی۔ لیپ کی زرد زرد روشنی میں اس کا چہرہ سوگوار اور بجھا بجھا ہونے کے باوجود دلکش نظر آ رہا تھا۔

وہ آنکھیں کھولے حیران و پریشان نظروں سے جیلہ کے خوب صورت چہرے کو نکلتا رہا۔ اس کے خشک ہونٹ آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا مگر بول نہ سکا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا خواب دیکھ رہا ہے۔

جیلہ بستر کے قریب پڑے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ ”چوہدری! تجھے تو بہت تیز بخار ہے۔ لیروا لگتا ہے۔ جوڑی چڑھی تھی؟“

”ہاں!“ رحیم داد نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی اور ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتے ہوئے کہا۔ ”طبیعت تو سویرے ہی سے گڑبڑ تھی۔ شام کو جوڑی چڑھی، فیرایا تیز بخار ہو گیا کہ میں نوں بالکل سدھ بدھ نہ رہی۔“

”چنانہ کر۔ کل پرسوں تک چنگا ہو جائے گا۔ تجھے لیروا ہو گیا ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کو تشفی دی۔ مڑ کر دروازے کے پاس کھڑے ہوئے احمد کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ احمد نے بڑھ کر میز پر رکھا ہوا لکڑی کا بسک اٹھایا اور جیلہ کو دے دیا۔ جیلہ نے بسک کھولا۔ تھرامیٹر نکالا۔ اسے ہاتھ میں دبا کر جھٹکا دیا۔ رحیم داد سے کہا۔

”چوہدری! منہ کھول۔“

رحیم داد نے چپ چاپ منہ کھول دیا۔ جیلہ نے تھرامیٹر اس کے منہ میں لگا دیا اور کلائی؛

بندھی ہوئی گھڑی جھک کر توجہ سے دیکھنے لگی۔

جیلہ نے تھرامیٹر رحیم داد کے منہ سے نکالا۔ لیپ کی روشنی میں ہاتھ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی پھیل گئی۔ آہستہ سے بولی۔ ”تجھے تو ۱۰۴ نمبر پڑے ہے۔“ اس نے تھرامیٹر دھو کر حفاظت سے بسک میں رکھ دیا۔ احمد سے گلاس میں پانی منگوایا۔ بسک کے اندر سے کوئین کی نکیہ نکالی۔ احمد نے جیلہ کی ہدایت پر رحیم داد کو نکیہ کے سارے بٹھا دیا۔ رحیم داد گہری گہری سانس بھر کر آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔

جیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے نرم لہجے میں بولی۔ ”چوہدری! یہ دوائی کھالے۔ آرام آجائے گا۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر منہ کھولا۔ جیلہ نے جھک کر کوئین کی نکیہ اس کے حلق میں ڈال دی۔ گلاس اٹھا کر رحیم داد کے ہونٹوں سے لگایا۔ رحیم داد پانی کے ساتھ نکیہ نگل گیا۔ دوا کھلانے کے بعد جیلہ بولی۔

”اب تو آرام سے لیٹ جا۔“

رحیم داد چپ چاپ ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ جیلہ نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چھو کر دیکھی۔ احمد سے کٹورے میں ٹھنڈا پانی منگوایا۔ احمد کمرے سے چلا گیا۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ جیلہ کرسی پر گم صم بیٹھی تھی۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ رحیم داد آنکھیں بند کیے نڈھال لیٹا رہا۔ وہ چند لمحے اسی حالت میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کراہتے ہوئے گردن موڑی۔ جیلہ کی جانب دیکھا۔ رک رک کر کہنے لگا۔

”زمیں دارنی! میں نے پچھلے دنوں تجھ سے ایسی بات کہی تھی جس پر تو نے برا منایا۔ سسکیاں لے کر روئے لگی۔ مجھے ایسی بات نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زمیں دارنی تو۔“

جیلہ نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ بات کاٹ کر بولی۔ ”چپ کر کے لیٹا رہ۔ تجھے بہت تیز بخار ہے۔ سویرے سے تیری طبیعت اتنی گڑبڑ ہے۔ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ احمد تو یہیں تھا۔ مجھے پتہ چل جاتا تو اسی سے دوائی کھلا دیتی۔ اتنا تیز بخار نہ چڑھتا۔“

”میں نے تجھے اس لیے خبر نہ کی تو عدت میں ہے۔ سوچا تو یہاں کیسے آسکتی ہے؟“ رحیم داد نے جیلہ کی جانب دیکھے بغیر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

”ایسے ہی آسکتی تھی جیسے اب آئی ہوں۔ دکھی بیماری کی تو بات ہی الگ ہے۔“ جیلہ نے بتایا۔

”میں نے مسجد کے ملا کو بلا کر پوچھ لیا تھا۔“

احمد کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا بڑا کٹورہ تھا۔ احمد نے کٹورہ میز پر

رکھ دیا اور میزاٹھا کر جیلہ کے سامنے رکھ دی۔ جیلہ نے پانی میں انگلیاں ڈبوئیں۔ پانی ٹھنڈا تھا۔ اس نے بکس کھولا۔ اندر سے ململ کا اجلا کلوا نکالا۔ اسے پانی میں ڈال کر ترکیا۔ تہہ کر کے اس کی چار انگلی چوڑی پٹی بنائی اور بھیگی ہوئی پٹی رحیم داد کی تپتی ہوئی پیشانی پر رکھ دی۔ رحیم داد کو اس کی ٹھنڈک سے بڑا سکون ملا۔

رحیم داد نے ایک بار پھر آنکھیں کھولیں۔ آہستہ سے بولا۔ ”زمیں دارنی، سچ تیرا دل بہت دوا ہے۔ تو۔“

جیلہ نے اسے ٹوکا۔ ”چوہدری چپ کر کے پڑا رہ۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔“
رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ سانس بھرنے لگا۔

جیلہ اس کی پیشانی پر پٹی رکھتی رہی۔ گرم ہو جاتی تو دوبارہ کٹورے کے ٹھنڈے پانی میں تر کرتی اور پیشانی پر رکھ دیتی۔ بخار کی تیزی دھیرے دھیرے کم ہوتی گئی۔ رحیم داد کو ایسا سکون ملا کہ وہ سو گیا۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ جیلہ کتنی دیر اس کے سرہانے بیٹھی رہی اور کب اٹھ کر چلی گئی۔



دن ڈھلے ایک تانگا حویلی کے مہمان خانے کے دروازے پر رکا۔ نادر خاں تانگے سے نیچے اترا۔ اس بار وہ اپنے ساتھ بستر اور ٹنک لے کر آیا تھا۔ وہ سائیکل بھی تانگے میں رکھی تھی، جس پر وہ رحمت والی گیا تھا۔ اس نے تانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ سامان احمد کے سپرد کیا اور سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔

رحیم داد اس وقت کمرے کے باہر آمدے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ صحن میں دھوپ پھیلی تھی۔ مگر اس کی تمازت میں تیزی نہ تھی۔ ہوا فرائے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ درخت جھوم رہے تھے۔ آسمان پر کھمبے ہوئے بادلوں کے سفید سفید لکے سریت بھاگتے نظر آتے تھے۔

نادر خاں کو دیکھتے ہی رحیم داد نے تکیے لمبے میں پوچھا۔ ”تو نے تو دوسرے روز آنے کا وعدہ کیا تھا، اتنے دن کہاں غائب رہا؟ بیمار تو نہیں پڑ گیا تھا؟“ اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”ویسے تو بیمار شمار لگتا نہیں۔“

”نہیں جی، بیمار تو نہیں رہا۔“ نادر خاں سر جھکا کر معذرت کرنے لگا۔ ”معاف کرنا جی، وہ ایسا ہوا کہ مجھے ملتان جانا پڑا۔“

”ملتان کیوں گیا تھا؟ تیں نوں یہاں پہنچنا تھا۔“

”آنا تو جی میں نے یہیں تھا پر کچھ ایسی مجبوری ہوئی کہ اچانک ملتان جانا پڑ گیا۔“

نادر خاں کے لمبے میں عاجزی تھی۔

”کیا مجبوری ہوئی؟ تو کچھ پریشان پریشان دکھائی پڑ رہا ہے۔“ رحیم داد نرمی سے بولا۔ ”کھڑا کیوں

ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بتا بات کیا ہے؟

نادر خاں نے قریب پڑے ہوئے موندھے پر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ ”وہ ایسا ہے جی، میری گھروالی کا چھوٹا بھائی، ملتان ڈسٹرکٹ جیل میں ہے۔“

”جیل میں ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”وہ جیل کیسے چلا گیا؟“

”کتل کے ایک مکدے میں پھنس گیا تھا۔ سال بھر سے اوپر ہو گیا جیل کاتے ہوئے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ ”میں یہاں سے رحمت والی گیا۔ دیکھا، گھروالی بہت پریشان ہے۔ کسی نے اطلاع دی کہ اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ ایک ہی بھائی ہے اس کا۔ روتے روتے برا حال کر لیا تھا اس نے۔ اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اسے تسلی دی اور فوراً ملتان چلا گیا۔“

”اب وہ کیسا ہے؟ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“

”اسے تو جی میں مل ہی نہ سکا۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”بات یہ ہے جی۔ اس بار تو اوپر سخت بارش ہوئی ہے۔ چناب میں زبردست سیلاب آگیا۔ بستیاں کی بستیاں اجڑ گئیں۔ خریف کی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ جلال آباد اور شیر شاہ کو شدید خطرہ ہے۔ نہروں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ ریلوے لائن پانی کے تیز ریلے سے بہہ گئی ہے۔ جگہ جگہ سے اکھڑ گئی ہے۔ جہرہ نظر جاتی ہے پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔“

”اس بار تو بہت تباہی مچا دی سیلاب نے۔“ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”پر یہ تو بتا تیری گھروالی کے بھائی کا کیا بنا؟“

”ہوا یہ جی کہ لوپ بندی کی مرمت کے لیے ڈسٹرکٹ جیل کے کیدیوں کو بھی لگا دیا گیا۔ ان میں میرا سالا بھی ہے۔ میں ملتان پہنچا تو پتہ چلا کیدی بندی کی مرمت کا کام ختم کر کے جلد ہی واپس آجائیں گے۔ میں انتظار کرنے لگا۔ دو ہفتے سے اوپر ہو گئے پر کیدی واپس جیل نہ آئے۔ بندی کی مرمت کا کام ختم ہی نہ ہوا تھا۔“

”پر تیری گھروالی نے تو کہا تھا اس کا بھائی سخت بیمار ہے۔ تو اور ہی گل سنا رہا ہے۔ یہ کیا پتہ ہے؟“ رحیم داد نے مسکرا کر نادر خاں سے پوچھا۔

”اطلاع ٹھیک نہیں ملی تھی جی۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”بات سچی یہ ہے جی بندی کی مرمت کرنے والے کئی کیدیوں نے رات کے اندھیرے میں فرار ہونے کی کوشش کی۔ بلکہ کچھ تو فرار بھی ہو گئے۔“ نادر نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”پر جب وہ فرار ہونے لگے تو ان کی نگرانی کرنے والے پیرے داروں کو پتہ چل گیا۔ انھوں نے بھاگتے ہوئے کیدیوں کا پیچھا کیا۔ گولی بھی چلائی۔“

”کئی تو جان سے مارے بھی گئے ہوں گے۔“ رحیم داد نے لقمہ دیا۔

”نہیں جی مرا تو کوئی بھی نہیں۔ پر چار زخمی ضرور ہوئے۔ زخمی کیدیوں کو سرکاری ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ میری گھروالی کو اطلاع ملی تھی کہ ان میں اس کا بھائی بھی شامل ہے۔ پر وہ ان میں نہیں تھا۔ میں نے اسپتال جا کر خود معلوم کیا تھا۔ جیل کے افسروں سے پوچھ گچھ کرنے پر پتہ چلا، میرے سارے نے فرار ہونے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔ وہ دوسرے کیدیوں کے ساتھ بندی کی ابھی تک مرمت کر رہا ہے۔“

قیدیوں کے فرار ہونے کی اطلاع سے رحیم داد قدرے پریشان ہو گیا۔ اسے فوراً لالی کا خیال آیا۔ ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ اللہ وسایا اور جیلہ کے ہم راہ کبیر والا جاتے ہوئے منگمری اسٹیشن پر اچانک شاداں سے اس کی مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی۔ وہ اسے پہچان تو نہ سکی، لیکن اس کی زبانی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ لالی بھی ڈسٹرکٹ جیل، ملتان میں ہے۔ وہ اس سے ملنے ملتان جا رہی تھی۔ رحیم داد سوچنے لگا، اگر لالی بھی بندی کی مرمت کرنے والے قیدیوں میں شامل ہو گا تو اس نے ضرور نکل بھاگنے کی کوشش کی ہوگی اور کامیاب بھی ہو گیا ہو گا۔ وہ ایسے معاملات میں بڑا ہوشیار اور منجھا ہوا تھا۔ وہ ضرور فرار ہو گیا ہو گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی روز کو ملہ ہرکشن بھی پہنچ سکتا ہے۔ یہ سوال ذہن میں ابھرتے ہی رحیم داد کو تشویش ہوئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے خدشات اور دوسوسوں پر قابو پایا۔

رحیم داد کو معا”خیال آیا کہ لالی، کو ملہ ہرکشن کیسے پہنچ سکتا ہے؟ اسے تو یہی معلوم تھا کہ رحیم داد مرچکا ہے۔ پولس پارٹی کے ساتھ لاش کی شناخت بھی اسی نے کی تھی۔ اسے تو یہ بھی خبر نہ تھی کہ رحیم داد نام بدل کر چوہدری نورالہی کی حیثیت سے کو ملہ ہرکشن میں مقیم ہے۔ ویسے بھی رحیم داد کی وضع قطع اور حلیہ اس قدر تبدیل ہو چکا تھا کہ لالی اسے اب پہچان بھی نہ سکتا۔

وہ خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچتا رہا۔ نادر نے اسے خاموش پایا تو دریافت کیا۔

”چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ ”میں شاہ جی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بہت دنوں سے اس کے پاس گیا نہیں۔ ایک تو مینہ کی بجھری لگی رہی۔ اوپر سے میں بیمار بھی پڑ گیا۔“

”اوہو، تیس پچھلے دنوں بیمار بھی رہے۔“ نادر نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ ”جب ہی تو کچھ کمزور، کمزور دکھائی دے رہے ہو۔ چہرہ بھی مرجھایا ہوا لگتا ہے۔ کس ڈاکٹر سے علاج کرایا تھا؟“

”کئی زبردست برسات میں ڈاکٹر کہاں سے آتا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ رستے بند تھے۔ جیلہ

نے دوائی دی تھی۔ اسی سے چنگا ہو گیا۔“

”زین دارنی ویسے تو بہت پڑھی لکھی ہے پر مجھے یہ پتہ نہ تھا وہ ڈاکٹری بھی کر لیتی ہے۔“

رحیم داد نے مسکرا کر بتایا۔ ”ڈاکٹری شاہکزی تو اس نے نہیں پڑھی۔ پر چھوٹی موٹی پیاریوں کا علاج کر لیتی ہے۔ چوٹ یا زخم آجائے تو مرہم پٹی بھی کر لیتی ہے۔ اس کے پاس دوائیوں سے بھر ہوا بکسا ہے۔ اس میں دوا دارو کا ہر طرح کا سامان رہتا ہے۔ پنڈ میں کوئی بھی بیمار پڑے۔ چاہے مزارع ہو یا کمی، وہ جھٹ دوائیوں کا بکسا سنبھال، اس کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ اس معاملے میں اس کا دل بہت نرم ہے۔ آس پاس کے کسی پنڈ یا چک میں بھی کوئی بیمار پڑ جائے تو پتہ لگتے ہی وہاں پہنچ جاتی ہے۔ اپنے ہاتھ سے دوائی کھاتی ہے۔ خود ہی مرہم پٹی کرتی ہے۔“ رحیم داد کو جیلہ کی درد مندی اور خوبیاں بیان کرنے میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔

نادر خاں نے ہلکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”پر آج کل تو جی وہ عزت میں ہے۔ حویلی سے باہر نہیں جاسکتی۔ تیں نوں دوائی دینے ادھر کیسے چلی آئی؟ ویسے تو اسے تیرے سامنے بھی نہیں آنا چاہیے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ بات تو ایسی ہی ہے۔“ رحیم داد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے بتایا تھا تا کہ اس کا دل بہت نرم ہے۔ وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا، مجھے بہت تیز بخار ہے، فوراً دوائیوں کا بکسا لے کر آگئی۔ ویسے یہ مہمان خانہ بھی حویلی سے الگ کہاں ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”وہ میرے سامنے کب آتی ہے۔ چدر کے پلو سے بکل مار کر منہ اس طرح چھپا لیتی ہے کہ آنکھیں بھی مشکل سے دکھائی پڑتی ہیں۔ عام طور پر تو منہ موز کر دوسری طرف کر لیتی ہے۔ اس معاملے میں اس نے پنڈ کے ملا سے بات کر رکھی ہے۔“

رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ احمد کھانا لے کر آیا۔ اس نے کھانا میز پر لگا دیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ ”تو نے روٹی کھائی؟“

”کھالوں گا جی۔ میں نے تو ابھی نہادھو کر کپڑے بدلنے ہیں۔“

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور احمد کے ہم راہ کمرے سے چلا گیا۔ رحیم داد اطمینان سے کھانا کھانے لگا۔ کھانے سے فارغ ہو کر حسب معمول وہ بستر پر لیٹ کر آرام کرنے لگا۔

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے باہر گیا۔ غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے نکل کر باغ میں پہنچا۔ نوکروں نے پہلے ہی کرسیاں لگا دی تھیں۔ رحیم داد ایک کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ برسات کی سہانی شام تھی۔ مشرق میں شفق کا الاؤ دکھ رہا تھا۔ فضا گل

رنگ تھی۔ ہوا مسکی ہوئی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا موسم کی رنگینی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر تاجاں پر پڑی۔ وہ مہمان خانے کے عقب سے نکل کر مویشیوں کے باڑے کی جانب جا رہی تھی۔

تاجاں کی عمر سولہ سترہ برس کے لگ بھگ تھی۔ مگر وہ صحت مند اور بھرپور جوان تھی۔ حویلی ہی میں رہتی تھی۔ مگر اس کی حیثیت نوکرائیوں اور خادماؤں سے قدرے مختلف تھی۔ جیلہ اس پر بہت مہربان تھی۔ ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتی تھی۔ اسے اپنے پاس ہی رکھتی تھی۔ تاجاں کا باپ مرچکا تھا۔ پھاتاں اس کی بیوہ ماں تھی۔ اس نے تاجاں کو جیلہ کی سپردگی میں دے دیا تھا۔ پچھلے چھ سال سے وہ حویلی میں تھی۔ وہیں پلی بڑھی اور جوان ہوئی۔ کھانے کو اچھی غذا اور رہنے کو بہتر ماحول ملا تو اس کا رنگ روپ نکھر گیا۔ صحت بھی اچھی رہی۔ کام کاج اور محنت سے جسم بھی سڈول اور خوبصورت ہو گیا۔ جیلہ اسے اس قدر عزیز رکھتی تھی کہ اس نے خود تاجاں کا رشتہ طے کیا تھا۔ شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو چکی تھی۔

رحیم داد نے تاجاں کو حویلی میں پہلے بھی دیکھا تھا۔ مگر اس وقت وہ اسے زیادہ ہی خوب صورت اور پرکشش نظر آئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی شلوار اور اسی رنگ کا کرتا پہنے ہوئے تھی۔ سر پر گہرا دھانی دوشہ تھا۔ یہی لباس ایک بار رحیم داد نے جیلہ کے جسم پر بھی دیکھا تھا۔ مگر اللہ وسایا کی موت کے بعد جیلہ صرف سفید لباس پہنتی تھی۔ اس نے اپنے رنگین کپڑے لئے نوکرائیوں کو دے دیئے تھے۔ مگر سب سے زیادہ تاجاں کے حصے میں آئے۔ گلابی لباس میں رحیم داد کو تاجاں میں جیلہ کی جھلک نظر آئی۔

شفق کی گہری نارنجی روشنی میں تاجاں کا چہرہ نکھر کر زیادہ ہی شگفتہ اور زیادہ ہی گلابی ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ تاجاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ رحیم داد چپ چاپ بیٹھا وزیدہ نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ تاجاں قریب، اور قریب آتی گئی۔ چلتے چلتے اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر خاموشی سے سلام کیا۔ رحیم داد مسکرایا۔ انگلی کے اشارے سے اسے بلایا۔ وہ ٹھکی۔ چند لمحے خاموش کھڑی رہی پھر سر کو دوپٹے سے ڈھکتی، شرابی، لجاتی آگے بڑھی اور رحیم داد کے رو برو نظر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ”تو پھاتاں کی دھی ہے نا؟“

”ہاں جی!“ اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر سامان سے جواب دیا۔ ”میرا ناں تاجاں ہے

قدم اٹھاتی ہوئی حویلی کی جانب چل دی۔

نادر خاں قریب پہنچا۔ اس نے گردن کو خم دے کر تاجاں کی سمت دیکھا اور رحیم داد کے رویہ و نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے سر کو خفیف سی جنبش دی بے نیازی سے بولا۔
”بیٹھ جانا در۔“

نادر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر تاجاں کی جانب دیکھا۔ وہ درختوں کے نیچے پھلتے ہوئے شام کے دھندلکے میں گم ہوتی جا رہی تھی۔ نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ دہلی زبان سے بولا۔
”سوہنی میار ہے۔ کون ہے جی یہ؟“

”تاجاں نام ہے اس کا۔ حویلی ہی میں رہتی ہے۔ حمدے کو بلانے ادھر آئی تھی۔“
نادر خاں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔ ”میں نے تو جی حویلی کو اب تک دیکھا ہی نہیں۔“
”دیکھ لینا، ضرور دیکھ لینا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تجھے جیلہ سے بھی ملانا ہے۔ وہ حویلی کے اندر ہی ملے گی۔“ اس نے نظر بھر کر نادر کو دیکھا۔ ”پر وہ تجھ سے خوش نہیں ہے۔ یہ سوچ لے۔“

”مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ پر ایک بار میں اس سے مل لوں۔ فیروہ مجھ سے ناراض نہیں رہے گی۔“

رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”تو اسے جانتا نہیں۔ وہ اور ہی طرح کی زنانی ہے۔ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔“

”میں نے بھی یہی سنا ہے جی۔“ نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”پر بے تودہ وڈے بگیر دار کی دھی۔ ویسے خود بھی چھوٹی موٹی بگیر دارنی ہی ہے۔ میں بگیر داروں کے مزاج بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ برسوں ان کی ملازمت میں رہا ہوں۔ کتنے ہی ٹیڑے اور اونچے طروں والے بگیر داروں اور وڈے زمیں داروں سے اپنا واسطہ رہا ہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انگلیوں سے کان چھوا۔ ”اللہ کے فضل سے کوئی مجھ سے نراض نہیں رہا۔“

”تو کہتا ہے تو جلد ہی تجھے اس سے ملوادوں گا۔“

”میں نے اس سے کئی کام لینے ہیں۔“ نادر خاں نے ذرا آگے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ”اور وہ کام میں ہی کرا سکتا ہوں جی۔ میں نے اس سے زمیں داری کے کاغذات لینے ہیں۔ مزارعوں سے کرض ادھار کی وصولی کے لیے رجسٹر اور بی کھاتے لینے ہیں۔ اور بھی ایسی ہی کئی دستاویزات ہیں جو اس کے پاس ہیں۔ ان کا اب تیری تحویل میں ہونا بہت ضروری ہے۔“

”تو تاجاں ہے!“ رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”پر تو اس وکت کہاں جا رہی ہے؟ تو سا بے بندھی میار ہے۔ حویلی سے باہر کیسے آگئی؟ میں تو تیرے سگن میں بھی شریک ہوا تھا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ لہجے سے بے تکلفی جھلکنے لگی۔ ”تیری سرال سے آئی ہوئی مٹھائی بھی میں نے کھائی تھی۔ بیس باغ میں تو سگن کی ساری رسماں ریتاں ہوئی تھیں۔ پر تمہیں ان کے بارے میں کیسے پتہ؟“

تاجاں اور شرما گئی۔ اس کے چہرے کے گلاب اور دکھنے لگے۔ آنکھوں میں چراغ جل اٹھے۔ وہ نظریں جھکا کر دوپٹے کا آئچل انگلی میں لپیٹتے ہوئے بولی۔ ”وہ ایسا ہے جی۔ بھین جی نے حمدے کو بلایا ہے۔ کوئی کام ہے۔ حویلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ مجھے بھیج دیا۔ پر حمداتو صمان خانے میں نہیں ہے ڈھارے پر ہوگا۔ ادھر ہی جا رہی تھی۔“ اس نے نگاہیں اٹھا کر رحیم داد کی جانب نہ دیکھا۔
”ایسے ادھر ادھر نہ گھوما کر۔“ رحیم داد نے لہجے میں دبدبہ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”تیری سرال والوں کو پتہ چل گیا تو برا منائیں گے۔“ یہ کہتے کہتے وہ زیر لب مسکرایا۔ ”پنڈ کے کسی گھرو کی نظر پڑ گئی تو تجھے اٹھا لے جائے گا۔“

”نہیں جی، میں ایسی نہیں ہوں۔“ وہ گھبرا کر لہزہ بن سے بولی۔ ”میں تو جی حویلی سے کبھی باہر نہیں جاتی۔“

”ٹھیک ہی کرتی ہے۔“ رحیم داد نے دہلی زبان سے اسے ٹٹولا۔ ”تو ہے بھی تو سوہنی میار۔ ان ریٹھی کپڑے لتوں میں تو زیادہ ہی سوہنی لگتی ہے۔“
”پر جی یہ تو مجھے بھین جی نے دیئے ہیں۔“

”میں نوں پتہ ہے۔“ رحیم داد آہستہ سے ہنسا۔ ”یہ کپڑے لتے تجھے زمیں دارنی ہی نے دیئے ہیں۔ پر انھیں پہن کر تو راند پھانٹاں کی دھی نظر نہیں آتی۔ زمیں دارنی لگتی ہے۔“

تاجاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ نظریں نیچی کئے چپ چاپ کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھری تھی۔ شفق کی سرخی کا لالہ ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا فضا میں گھلنے لگا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اور تاجاں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں نادر خاں جامن کے ایک بیڑی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ رحیم داد نے چپ سن کر اس کی جانب دیکھا۔

نادر اس کی طرف بڑھا۔ رحیم داد تاجاں کی سمت مڑا۔ اسے مخاطب کیا۔ ”تاجاں! حویلی میں جا۔ اندھیرا بڑھ گیا ہے۔ میں حمدے کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دوں گا۔ تو اسے بتا دینا۔“

تاجاں نے اس کی جانب دیکھے بغیر دھیمے لہجے میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔“ وہ مڑی اور آہستہ آہستہ

کرتے ہوئے پوچھا۔ ”چوہدری! یہ نادر خاں تو نہیں ہے؟“

”ہاں جی! یہ نادر ہی ہے۔“ رحیم داد نے یہ کہتے ہوئے نادر خاں کو دیکھا۔ ”بیٹھ جانا نادر۔“

نادر خاں دونوں سے ذرا ہٹ کر صوفے کے بجائے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ اس نے جیلہ کی جانب دیکھنے کی کوشش نہ کی۔ جیلہ نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو اسے میرے پاس کیوں لایا ہے؟“ اس کے لہجے سے خفگی صاف عیاں تھی۔

رحیم داد نے جیلہ کے لہجے کی ترشی محسوس کی۔ نرمی سے بولا۔ ”زمین دارنی! میں نے سوچا اسے بھی تجھ سے ملوا دوں۔ اسے کام تو تیری ہی مرضی سے کرنا ہے۔“

”میری مرضی کیا ہے۔“ جیلہ نے بے رخی سے کہا۔ ”تیرا مینجر ہے۔ تو جانے اور یہ جانے۔ مجھے اس سے کیا لینا۔“ اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ ”تو نے اسے مجھ سے پوچھ کر رکھا ہے؟“

”تیری مرضی نہیں تو میں اسے نہیں رکھتا۔ نراض کیوں ہوتی ہے؟“ رحیم داد نے ایک بار پھر مڑ کر نادر کی جانب دیکھا۔ ”سن لے بھی نادر۔“

نادر خاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھا رہا۔

”چوہدری! تو کیا چاہتا ہے؟“ جیلہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ”میرے سامنے ایسی بات کیوں کر رہا ہے؟ تجھے پتہ ہے، اس کے بارے میں تجھ سے میں پہلے ہی گل بات کر چکی ہوں۔“

”تب ہی تو میں اسے تیرے پاس لایا ہوں۔“ رحیم داد کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”زمین دارنی جو تو کہے گی وہی ہو گا۔ یہ بات میں اسے صاف صاف کہہ چکا ہوں۔“ رحیم داد نے پلہ بدلا۔ نادر خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہی گل ہے نا، نادر؟ خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ بولتا کیوں نہیں؟“

”میں نے کیا بولنا جی۔“ نادر خاں نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”چوہدری! تو مجھے یہ بات نہ بھی بتاتا تب بھی میں نون پتہ تھا کہ جو زمیں دارنی کی مرضی ہوگی وہی ہو گا۔ یہ بات تو اس پنڈی کی نہیں، پورے مونے کو معلوم ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ خوشامد پر اتر آیا۔ ”میں نون پتہ ہے یہ بہت

دوڑے زمیں دار کی دھمی ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے جی کہ اس کا دل بھی دڑا ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں تو جی بال بچے دار ہوں۔ پریشان ہوں۔ سوچتا تھا زندگی کے جو دن رہ گئے ہیں، اس حویلی کی خدمت کرتے گزار دوں گا۔ زمیں دارنی کی مرضی نہیں تو میں یہی سمجھوں گا، میرا نصیب ہی خراب ہے۔“

”مجھے کیوں دوش دیتا ہے۔“ مگر اس دفعہ جیلہ کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

”کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔“ رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرتے ہوئے کہا۔ ”پر اتنا دھیان رکھنا، وہ نراض ہو تو چپ کر جانا۔ بات یہ ہے میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔“ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

”ویسے وہ دل کی بری نہیں۔ اب یہی دیکھ۔ میں بیمار پڑا تو عدت میں ہوتے ہوئے بھی گھبرا کر جھٹ چلی آئی۔ دوائی کھلائی۔ صبح تک میرے بستر کے پاس بیٹھی رہی۔ جب تک میں چنگا نہیں ہو گیا روز ہی آتی رہی۔ وہ جتنی خوب صورت اور سونہنی ہے اتنی ہی دل کی چنگی بھی ہے۔“

”سنا تو میں نے بھی یہی ہے کہ زمیں دارنی بہت حسین اور خوب صورت ہے۔“

”اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔ ویسے اللہ وسایا کی موت کے بعد سے وہ مرجھا کر رہ گئی ہے۔ پر اب بھی بہت شاندار لگتی ہے۔“

”ویسے تو جی تاجاں بھی بہت زور دار مٹیا رہے۔“ نادر خاں نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

مگر رحیم داد نے حوصلہ افزائی نہ کی۔ اس کی بات صاف نظر انداز کر گیا۔ کہنے لگا۔ ”نادر! تو دو چار روز آرام کر۔ مزارعوں کے پاس تیرا ابھی جانا ٹھیک نہیں۔ پرسوں جمعرات ہے۔ جیلہ، جمعرات کو اللہ وسایا کی نذر نیاز میں لگی رہتی ہے۔ جیسے یا ہفتے کو تجھے اس کے پاس لے چلوں گا۔“

وہ گردن اٹھا کر سوچنے لگا۔ پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ہفتہ ہی ٹھیک رہے گا۔“

نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ نادر بھی کھانا کھانے مہمان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو دو مزارعے آگئے۔ وہ ان کے ساتھ دیر تک بیٹھا سیلاب اور شدید بارش کی تباہ کاریوں کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔



ہفتے کی صبح ناشتا کرتے ہوئے رحیم داد نے احمد کو جیلہ کے پاس بھیجا اور اس کی خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد احمد نے واپس آکر بتایا کہ جیلہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ رحیم داد نے نادر خاں کو بھی بلوالیا۔ دونوں احمد کے ہم راہ حویلی میں گئے۔ جیلہ بڑے کمرے میں صوفے پر بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت بھی سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے بکل مار کر چادر سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ دونوں نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ جیلہ نے پلہ بدلا اور ترچھی ہو کر اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا منہ دیوار کی طرف ہو گیا۔ رحیم داد قریب پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مگر

نادر خان نہ بیٹھا۔ نظریں نیچی کیے خاموش کھڑا رہا۔

جیلہ نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر سرسری نگاہ سے نادر کی جانب دیکھا۔ رحیم داد کو مخاطب

”تجھے کیوں دوش دینے لگا۔ میں تو اپنی بدنسی کی گل کر رہا ہوں۔“ نادر خاں نے خوشامد کے ساتھ ساتھ لمبے میں رقت پیدا کرنے کی بھی کوشش کی۔

جیلہ پر اس کوشش کا خاطر خواہ اثر بھی ہوا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”تیرا کوئی پتر نہیں؟“
”نہیں زمیں دارنی، اب کوئی نہیں رہا۔ دوا پتر پچھلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں بھرتی ہو کر ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ افریکہ میں الامین کے محاذ پر تھا۔ واپس نہ آیا۔ صرف مرنے کی اطلاع ملی۔“ نادر نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”دوسرا سال ہی بھر بعد ایک جھگڑے میں مارا گیا۔ یہی دو پتر تھے۔ دونوں ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کی موت سے میری کمرٹ گئی۔ گھر والی تو ان کے غم کو برداشت ہی نہ کر سکی۔ روتے ہی روتے ایک روز چل بسی۔“ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اپنی بات کتے کتے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں گی۔

”تب تو تو بالکل اکیلا رہ گیا۔“ جیلہ نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی بھی نہ رہا؟“
”نہیں زمیں دارنی، ایسا نہیں ہے۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”پاکستان بننے کے کچھ ہی دنوں بعد میں نے ادھر رحمت والی میں دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس سے تین اولادیں ہیں۔ پر ان میں پتر کوئی نہیں۔ تینوں ہی چھوہریاں ہیں۔ لگ بھگ سال بھر سے بے روزگار ہوں۔ زندگی بھر نوکری کی۔ وہی کر سکتا ہوں۔ اور کوئی کام نہ آتا ہے نہ کر سکتا ہوں۔“

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ جیلہ اس کی پریشان حالی سے بہت متاثر ہوئی۔ تڑپ کر بولی۔ ”نادر خاں! تو بہت دکھی ہے۔ تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ تجھے دکھ پہنچا کر مجھے کیا لیتا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں تو خود دکھ جھیلنے جھیلنے راکھ ہو گئی۔ اللہ وسایا تھا، وہ بھی مجھے دکھ سننے کے لیے اکیلا چھوڑ گیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں کے آگینے چھلک پڑے۔ فضا میں غم کی پرچھائیاں منزلانے لگیں۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ باہر ملگجی دھوپ پھیلی تھی۔ آسمان پر بادلوں کا غبار تھا۔

جیلہ نے چادر کے پلو سے آنسو پونچھے اور رحیم داک کی جانب متوجہ جوئی۔ ”چوہدری! اب تو نے اسے رکھ ہی لیا ہے تو لگا رہنے دے۔ اپنی مرضی میں میری مرضی بھی شامل کر لے۔“

”ایسا نہ کہہ۔ مرضی تو تیری ہی چلے گی زمیں دارنی۔“ رحیم داد نے جیلہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے چاچلو سے کام لیا۔ ”تین نوں ٹھیک طرح پتہ ہے۔ نہ میں نے پہلے کبھی اپنی مرضی چلائی نہ آگے چلاؤں گا۔ نادر خاں کے معاملے میں یہ بھول ہو گئی کہ جو گل بات آج تیرے سامنے ہوئی ہے، پہلے ہو جاتی تو ٹھیک تھا۔“

جیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کیا۔ نادر خاں کو مخاطب کیا۔ ”نادر! سچی بات یہ ہے کہ ہمیں مینجر شیری ضرورت نہیں۔ اپنی اتنی زمیں داری نہیں۔ اور نہ ہی ہمیں مزارعوں کی چڑی اتارنی ہے۔

یہ بات چوہدری جانتا ہے۔ میں چاہتی ہوں تو بھی جان لے۔“
”میں نے کیا کرتا ہے جی، جیسا حکم ہو گا ویسا ہی کروں گا۔“ نادر نے نہایت مستعدی سے اسے یقین دلایا۔ ”پر ایک گل میں نوں ضرور کہنی ہے۔“
”وہ کیا ہے؟“ جیلہ نے دریافت کیا۔

”اگر پڑی، جھنگریا غیر مزدور زمین کو کابل کاشت بنانے کی کوشش کی جائے، اس میں تو کوئی حرج نہیں؟ میرا مطلب یہ ہے جی، تنخواہ لوں تو اس کے بدلے کچھ کارگزاری بھی دکھاؤں۔ میں نے تجھ سے خیرات تو لینی نہیں۔“ نادر نے نظریں اٹھا کر جیلہ کی جانب دیکھا۔ ”پچھلے دنوں میں نے گھوم پھر کر زمیں داری کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے بہت سی زمین غیر مزدور اور بے کار پڑی نظر آئی۔“
جیلہ نے بتایا۔ ”ایسی غیر مزدور زمین کو اللہ وسایا بھی کابل کاشت بنانا چاہتا تھا پر کدے بازی نے اس طرف دھیان دینے کی اسے مہلت ہی نہ دی۔ کئی بار پروگرام بنایا اور ہر بار کوئی نہ کوئی ازجن کھڑی ہو گئی۔“

”ایک گل اور بھی تجھ سے پوچھنی ہے۔“

”وہ بھی پوچھ لے۔“

”کتے ہی مزارعوں پر برسوں سے ادھار چلا آ رہا ہے۔ ان کی وصولی کی ٹھیک طرح کبھی کوشش نہیں کی گئی۔“ نادر خاں نے تجویز پیش کی۔ ”یہ ادھار فصل کی داڑھی پر، خاص طور پر کماد کی پیداوار سے آسانی کے ساتھ وصول کیا جاسکتا ہے۔“

”ایسے نہیں۔“ جیلہ نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ ”تو روز ناشتے کے بعد میرے پاس آجا۔ میں سارے رجسٹر اور کاغذات تیرے سامنے رکھ دوں گی۔ تجھے بتاتی جاؤں گی، کس سے اگلی فصل کی داڑھی پر کتنا ادھار وصول کیا جاسکتا ہے۔ مجھے سب کا پتہ ہے۔ جو ادھار ادا کر ہی نہ سکتا ہو اس سے زبردستی تو وصولی نہیں کی جاسکتی۔“

نادر خاں انگلی سے گدی کے بال کھاتے ہوئے بولا۔ ”زمیں دارنی! اس طرح تو ادھار وصول کرنا مشکل ہو گا۔“

”ہوا کرے۔“ جیلہ نے تیکھے لمبے میں کہا۔ ”میں نے اپنے کسی مزارع کو بھوکا نہیں مارنا اور نہ ہی بے دخل کرتا ہے۔ یہ بات میں تجھے صاف صاف کہہ دیتا چاہتی ہوں۔ تو نے اپنی کارگزاری

دکھانے کے چکر میں مزارعوں کو تنگ کرنے کی کوشش کی تو یہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تو خود پریشان ہے ویسے ہی دوسروں کی پریشانیوں کا وچار کر۔

”نہیں جی، جیسا کہ گے زمین دارنی ویسا ہی ہوگا۔ میں نوں تیرے حکم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرنی۔“ نادر خاں نے جھٹ پیترا بدلا۔ ”ویسے بھی میں روز کے روز تجھے کام کی رپورٹ پیش کرتا رہوں گا۔ جو بھی اگلی کارروائی کرنی ہوگی تجھ سے اس کے بارے میں مشورہ کر لوں گا۔“

”زمین داری کا سارا بوجھ مجھ پر ڈالنے کی بجائے تو چوہدری کو کیوں نہیں ذمہ داری میں شریک کرتا؟ یہ کب تک زمین داری کے کاموں سے دور دور اور الگ الگ رہے گا۔“ جمیلہ نے بات کتے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اسے براہ راست مخاطب کیا۔ ”چوہدری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ تجھے بھی اب کچھ نہ کچھ ذمہ داری سنبھالنی ہی ہوگی۔ بلکہ ساری ہی سنبھال لے۔“

”جلدی نہ کر۔ تو جو کہے گی ویسا ہی کروں۔“ رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ ”پہلے نادر کو زمیں داری کے معاملات سمجھ لینے دے۔ تو کہہ تو میں بھی اس کے ساتھ آجایا کروں، ابھی تو مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

”ضرور آجایا کر۔ تجھے یہاں آنے سے کس نے روکا ہے۔“ جمیلہ نے اس کی حوصلہ شکنی نہ کی۔ ”چوہدری! جب تو نے اپنی مدد کے لیے نادر کو مینجر رکھ ہی لیا ہے تو زمیں داری کی دیکھ بھال بھی تجھے ہی کرنی چاہیے۔ میں کہاں تحصیل دار اور گرد اور کے دفاتروں اور پکھریوں کے چکر کاٹی پھروں گی۔ زمیں داری تو جیچ پوچھ اسی کا نام ہے۔ ورنہ زمیں دار کون سا مل چلاتے ہیں۔ نہ بوائی کرتے ہیں نہ فصل کی واڈھی۔ پر نتو پیداوار سے آدھا حصہ وصول کر لیتے ہیں۔ عام طور پر تو اس سے بھی زیادہ لیتے ہیں۔ ویسے بھی پیداگیری کے لیے زمیں داروں کے اور بھی نہ جانے کتنے دھندے اور ہتھکنڈے ہیں۔ طرح طرح کے ٹیکس اور ابواب ہیں۔“

نادر خاں نے دبی زبان سے اختلاف کیا۔ ”زمیں داری میں تو جی ایسا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ زمیں دار کا کام کیسے چلے۔ میں تجھ سے کیا بتاؤں زمیں دارنی، ان آنکھوں سے میں نے کیا کیا دیکھا ہے۔“ ”ضرور دیکھا ہوگا۔“ جمیلہ نے بے زاری سے کہا۔ ”مجھے بھی تھوڑا بہت پتہ ہے۔ تب ہی تو میں ہیرا پھیری کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتی۔ میں تو جیچ پوچھ، اب سکول اور ڈپنٹری پر پوری طرح دھیان دینا چاہتی ہوں۔ عدت میں ہونے کے کارن سکول بھی نہیں جاسکتی۔ ڈپنٹری کا کام بھی ٹھیک سے شروع نہ ہو سکا۔“ اس کا لہجہ قدرے تیکھا ہو گیا۔ ”پر میں سکول میں پڑھائی بند نہیں کر سکتی۔ اب تو ایک ہی نیچرہ گیا ہے۔ وہ بھی روز روز بیمار رہتا ہے۔ چھٹی بھی مانگ رہا تھا۔ تب ہی تو بالکوں نے

سکول جانا چھوڑ دیا۔ پہلے تو دور دور کے پنڈ سے بچے بالک پڑھنے آتے تھے۔“ اس کے رویے سے جہنلاہٹ جھلکنے لگی۔ ”میں سکول بند نہیں ہونے دوں گی۔ میں زیادہ دنوں تک اس طرح حویلی میں بند نہیں رہ سکتی۔“

”اماں جی سے پوچھ لے۔“ رحیم داد نے مشورہ دیا۔

”اس سے بھی پوچھ لوں گی۔“ جمیلہ کا لہجہ بدستور تیز اور تیکھا تھا۔ ”ویسے سکول، حویلی کے سامنے ہی تو ہے۔ سو سوا سو گز دور ہوگا۔ اور اس میں کیول بالک ہی تو ہوتے ہیں۔“

کرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد چیپ بیٹھا رہا۔ مگر نادر خاں زیادہ دیر چپ نہ رہ سکا گا۔ اس نے کہا۔ ”اچھا جی یہ تو طے ہو گیا، میں کل سویرے سے زمیں دارنی کے پاس پابندی سے آتا رہوں گا۔ زمیں داری کے معاملات سمجھوں گا۔ آگے جو کرنا ہو گا وہ زمیں دارنی ہی کے حکم اور مشورے سے کروں گا۔“

رحیم داد نے کہا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ آتا رہوں گا۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل تنگ آیا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہنا چاہیے۔“

”چوہدری! تجھے تو اب بہت کچھ کرنا ہے۔“ جمیلہ بولی۔ ”تو نے بہت دن آرام کر لیا۔ تو ضرور نادر کے ساتھ آنا۔ میں تو پہلے ہی یہ کہہ چکی ہوں۔“

بات چیت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ محفل برخواست ہو گئی۔ دونوں جمیلہ سے رخصت ہو کر باہر نکلے۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن اور خوش نظر آتے تھے۔ وہ جو کچھ چاہتے تھے اور جیسا چاہتے تھے وہی ہوا۔ جمیلہ ان کی راہ میں حائل نہ ہوئی۔ وہ بغیر کسی تنخی اور جھک جھک کے سب کچھ ان کے حوالے کرنے پر رضامند ہو گئی تھی۔



مہمان خانہ خالی تھا۔ احمد موجود نہ تھا۔ رحیم داد اور نادر خاں کرے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نادر خاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تو جی ڈر رہا تھا، زمیں دارنی گز بد کرے گی۔ آسانی سے نہ مانے گی۔ جھگڑا کھڑا کرے گی۔ پر اس نے تو کچھ بھی نہ کہا۔ شروع میں ذرا اکھڑی اکھڑی تھی۔ بعد میں تو بالکل پڑی پر آگئی۔“

”میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا، وہ دل کی بری نہیں۔ پر ایک بات ہے۔ تو ہے بہت ہوشیار۔ ایسے بھروسے انداز میں اپنے بارے میں اسے بتایا کہ میرا دل بھی ڈوبنے لگا۔ جمیلہ تو اس معاملے میں ایسے ہی بہت کمزور اور نرم دل ہے۔ وہ کسی کو تکلیف اور دکھ میں تو دیکھ ہی نہیں سکتی۔“

”چوہدری میں نے اسے جو کچھ کہا، ٹھیک ہی کہا تھا۔“ نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ ”یہ بات ہے، میں نے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا، اسے اس طرح بیان کیا کہ وہ موم کی طرح پگھل کر تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ وہ دل کی بری نہیں۔ اور جی یہ بھی سچی گل ہے وہ دل کی جتنی بھلی اتنی ہی خوبصورت اور سونہنی بھی ہے۔ راند ہونے کے بعد بھی اس کا چہرہ اب بھی ایسا دمکسا ہے، نظر نہیں ٹھیرتی۔ جب رنگین ریشمی کپڑے پہن کر، سنگھار کیے ہوتی ہوگی تب تو اس کی اور ہی شان ہوتی ہوگی۔“

”تو نے جیلہ کو ان دونوں نہیں دیکھا۔“ رحیم داد نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر صحن میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد خاموش ہو گیا۔ گردن بدھا کر کمرے سے باہر دیکھا۔ وکیل، مہمان خانہ کے ملازم احمد کے ہم راہ صحن عبور کر کے برآمدے میں داخل ہو رہا تھا۔ وکیل محمد عثمان رندھاوا کمرے کے اندر آگیا۔ احمد واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے اٹھ کر وکیل سے مصافحہ کیا۔ کرسی پر بٹھایا۔ خیریت پوچھی۔ بس کر آنے کا مقصد معلوم کیا۔

”آج کیسے ادھر آتا ہوا؟“

”چوہدری! میں تیرے کلیم کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔“ وکیل بات کہتے کہتے ٹھٹکا۔ پل کر نادر خاں کو مشتبہ نظروں سے دیکھا۔

رحیم داد فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”یہ نادر خاں ہے۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر نادر خاں کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے اسے زمیں داری کے لیے میمنجر لگایا ہے۔ اپنا ہی بندہ ہے۔ بے فکر ہو کر گل بات کرو جی۔“

”یہ تیرا میمنجر ہے۔“ وکیل نے نادر خاں کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”ویسے میں نے اسے باریاں دیکھا ہے۔“

”اسے زیادہ دن نہیں ہوئے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”کچھ ہی دیر پہلے اسے زمیں داری کے بارے میں بھی لے گیا تھا۔ اس نے بھی اسے پہلی ہی بار دیکھا تھا۔“ اس نے بات کا رخ بدلا۔ ”تسلی نہ دارنی سے نہیں ملے؟“

”نہیں، میں اس کے پاس نہیں گیا۔ اس معاملے میں تجھ سے ہی بات کرنی ہے۔ زمیں دارنہ مدت میں ہے۔ ویسے بھی وہ کیا کر سکتی ہے۔“

”میں تو جی ابھی تک یہی نہیں سمجھ سکا، چکر کیا ہے۔ مجھے تو اس بارے میں کسی نے بھی کچھ نہ بتایا۔“ رحیم داد نے اللہ وسایا کے قتل کی تفتیش کے بارے میں بھی پوچھا۔ ”اور جی اللہ وسایا“

”کون کا کیا بتا؟ کوئی گرفتاری شرفاری ہوئی؟“

وکیل نے سمجھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”اب تک کچھ نہیں ہوا۔ لگتا ہے پولس نے کیس بالکل دبا دیا۔ میں نے جب بھی پوچھا، یہی جواب ملا، قاتلوں کا کوئی سراغ نہیں لگا۔ پولس کا خیال ہے، اللہ وسایا کا قتل زمیں دارنی کے بھائیوں نے کرایا ہے۔ قاتل سرحد پار سے آئے اور واردات کے فوراً ہی بدرات کے اندھیرے میں نکل گئے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر نادر خاں بول پڑا۔ ”وکیل صاحب! یہ بات سمجھ نہیں آئی۔ زمیندار اللہ وسایا کے قتل کو اڑھائی مہینے سے اوپر ہی ہو گئے ہوں گے۔ اگر زمیں دارنی کے بھائیوں نے اس کو قتل کرایا ہوتا تو وہ اب تک زمیں دارنی کو اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے۔“

”میں نے بھی پولس سے یہی سوال کیا تھا۔“ وکیل نے بتایا۔

”کیا جواب ملا؟“ نادر خاں نے دریافت کیا۔

”پولس کا کہنا ہے، واردات کے بعد سے اس علاقے کی کڑی نگرانی شروع کر دی گئی۔ زمیں دارنی کے بھائیوں کو کسی نے یہ اطلاع پہنچا دی ہے۔ اس لیے انھوں نے ابھی ادھر آنے کی کوشش نہیں کی۔“

”میں تو کہتا ہوں جی، زمیں دارنی ان کے ساتھ جائے گی بھی نہیں۔“ رحیم داد نے اپنی رائے ابر کی۔ ”وہ جانا چاہتی تو اللہ وسایا کی زندگی ہی میں جاسکتی تھی۔ پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ تو میں رہنا چاہتی ہے۔ سچی بات یہ ہے جی، وہ جیلہ سے دوبارہ پاروتی بننا نہیں چاہتی۔ ایک بار ملتان ہونے کے بعد وہ کیسے ہندنی بن سکتی ہے۔“

”میں نے بھی اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا ہے۔“ وکیل نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”وہ یہاں ہرگز نہیں جائے گی۔“

رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اچھا جی، اب یہ تو ملوم ہونا چاہیے کہ اپنے بھائیوں کی گڑبڑ ہے؟“

”اللہ وسایا تو یہ بات بتانا نہیں چاہتا تھا پر میں تجھے بتاتا ہوں۔“ وکیل نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔ ”بات یہ ہے چوہدری، کسی نے اوپر درخواست لگائی ہے کہ تیرا کلیم جعلی ہے۔ لہذا اس کلیم کی بنیاد جتنے جواز راضی اور جائیداد الاٹ ہوئی ہے، منسوخ کی جائے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اللہ وسایا تجھے اسی لیے کچھ بتانا چاہتا تھا کہ تو پریشان ہوگا۔“

”جس بات ہی ہے۔ پر درخواست لگانے والا ہے کون؟“

کے لیے پہلے بھی معاملے کو دبا دیا گیا تھا۔
 ”یہ تو بہت پریشانی کی گل ہے۔“ رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلکنے لگے جن کو وہ بار بار پونچھتا۔

”اس خطرے سے مکمل طور پر بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”جو کلیم افسر انکوائری کر رہا ہے۔“ وکیل نے بتایا۔ ”وہ پانچ ہزار روپے مانگتا ہے۔ کہتا ہے کہ درخواست کے ساتھ پوری فائل ہی تیرے سامنے پھاڑ کر جلا دے گا۔“

”ایسا ہو جائے تو سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“ رحیم داد کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔ مگر جلد ہی پھر پریشانی چھا گئی۔ اچھے ہوئے لمبے میں بولا۔ ”پر سوال تو یہ ہے کہ پانچ ہزار روپے آئیں گے کہاں سے؟ اتنا روپیہ نہ میرے پاس ہے نہ زمیں دارنی کے۔“

”سوچ لے چوہدری! اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ افسر حقیقت سے کچھ دنوں کی مہلت لے لوں۔“

”کتنے دنوں کی مہلت مل جائے گی؟“ رحیم داد نے وکیل سے پوچھا۔

”میرے کہنے پر وہ مہینہ بھر انتظار کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔“ وکیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”مجھے اب جانا ہے۔ چوہدری! تو جلد سے جلد روپے کا بندوبست کر لے ورنہ الاٹمنٹ ایک بار معطل یا منسوخ ہو گئی تو دوبارہ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔ بات اصلی یہ ہے جی کلیم ہولڈر بہت زیادہ تعداد میں ہیں اور متروکہ جائیداد اب اتنی کم رہ گئی ہے کہ کلیم ہولڈر چھپی ہوئی متروکہ جائیداد کا پتہ لگانے کے لیے روپیہ بھی خرچ کر رہے ہیں اور بھاگ دوڑ میں بھی مصروف ہیں، تاکہ مالیہ سرکاری احکامات کی رو سے اس خدمت کے صلے میں انھیں اس کی الاٹمنٹ مل جائے۔“

”تم نون زمیں دارنی سے نہیں ملنا؟“ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

”میں دوبارہ آؤں گا۔ اس سے بھی لمبوں گا اور تجھے صحیح صورت حال بتاؤں گا۔ اس عرصے میں رقم کا بندوبست کرنے کی کوشش کر۔“

وکیل عثمان رندھاوا چلا گیا۔ کمرے میں سکوت پھیل گیا۔ رحیم داد کے چہرے پر پریشانی چھائی تھی۔ مادر خاں نے اسے اس قدر پریشان پایا تو دل جوئی کی کوشش کی۔

”چوہدری! فکر کرنے کی کوئی گل نہیں۔ ویسے تو شاہ جی سے مل کر پانچ ہزار روپے کا بندوبست کر لیا جاسکتا ہے۔ مجھے پورا پورا بھروسہ ہے وہ انکار نہیں کرے گا۔ تیری ہر طرح مدد کرے گا۔“

”اس کا نام محمد بشیر ہے۔ وہ بھی خود کو ضلع گورداسپور کا مہاجر بتاتا ہے۔“ وکیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

”میں تو کسی محمد بشیر کو نہیں جانتا۔“ رحیم داد بدستور پریشان تھا۔ ”پر اسے میرے غائب درخواست لگانے سے کیا ملے گا؟“

”اگر درخواست درست ثابت ہوئی تو اسے انعام مل سکتا ہے۔“ وکیل نے نہایت بھیدگی۔ کہنا۔ ”حکومت نے جعلی کلیموں کا سراغ بتانے والوں کے لیے انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ بات تو تجھے بھی معلوم ہوگی۔“

”میں نون تو جی کچھ پتہ نہیں۔“ رحیم داد نے سادگی سے اپنی بے خبری کا اعتراف کیا۔ ”پر درخواست کا پتہ کیا؟“

”اس پر انکوائری کا حکم دیا جا چکا ہے۔“ وکیل نے کھل کر بتایا۔ ”کلیم دوبارہ تصدیق کے لیے بھیجا جاسکتا ہے۔ اور اس وقت تک کے لیے تیری الاٹمنٹ بھی معطل ہو سکتی ہے۔“

”تو فیرا اپنی طرف سے کیا کارروائی کی گئی؟ میں نون تو کچھ بھی ملوم نہیں۔“ رحیم داد کے بڑے سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ وکیل کو باور کرانے کے لیے زور دے کر کہا۔ ”ویسے جی، یہ درخواست بالکل جھوٹی ہے۔ میرے کلیم میں ذرا بھی گڑبگ نہیں۔“

”چوہدری! تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ وکیل نے اسے تسلی دی۔ ”لیکن جعلی کلیموں کا کاروبار آج کل اتنا بڑھ گیا ہے کہ سرکار کو ذرا بھی شبہ ہوتا ہے تو فوراً کارروائی کی جاتی ہے۔ محکمہ کاروباری بہت چکن اور چوکس ہے۔ ہر درخواست پر بحث انکوائری کا حکم جاری کر دیا جاتا ہے۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”کیا پتا انکوائری شکوک انکوائری کا؟“

”اللہ وسایا کے مشورے پر میں نے انکوائری رکوا دی تھی اس طرح اس وقت معاملہ دب تھا۔ پر اب اطلاع ملی ہے دوبارہ انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اس سے بچنے کی یہی صورت ہے۔“

کہ فائل ایک بار پھر دوبارہ دی جائے۔ پہلے ہزار روپے دیئے تھے اب دو ہزار دینے پڑیں گے۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دو ہزار روپے دے کر ایک باز فیئر معاملہ دیا بھی دیا گیا تب بھی کسی وقت اٹھ سکتا ہے۔“

”بالکل اٹھ سکتا ہے۔“ وکیل نے اعتراف کیا۔ ”اور یہ بھی سمجھ لے کہ انکوائری اگر ایک شروع ہو گئی تو تیری الاٹمنٹ بھی منسوخ ہو جائے گی۔ یہی سب سے بڑا خطرہ ہے۔“

انہی دنوں کا ذکر ہے۔ ایک شام رحیم دادباغ میں بیٹھا تھا۔ نادر بھی موجود تھا۔ ان کے سروں پر صاف شفاف نیلا آسمان جھلک رہا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ ہوا میں نرمی اور ٹکٹکی تھی۔ برسات کے آخری ایام کی یہ دم بہ دم رنگ بدلتی شام بڑی سانی اور خوشگوار تھی۔ رحیم دادنضا کی رچینی سے کچھ اس قدر متاثر ہوا کہ اس کا چہل قدمی کوئی چاہا۔ وہ اٹھا تو نادر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں شملتے ہوئے نہری طرف نکل گئے۔

سورج کی الوداعی کرنیں درختوں کی بلند یوں پر سونا بکھیر رہی تھیں۔ شام کا دھندلا ہوا ہلے ہلے فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ روشنی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد اور نادر خاں واپسی کا ارادہ کر رہے تھے کہ دور سے شیدا آنا نظر آیا۔ نادر خاں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ کہنے لگا۔ ”چوہدری! یہ تو شاہ جی کا لازم، شیدا نظر آتا ہے۔ لگتا ہے اسے شاہ جی نے تیرے پاس بھیجا ہے۔“ دونوں ٹھہر گئے۔ ذرا دیر میں شیدا قریب آگیا۔

رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ ”شیدے! تو آج ادھر کیسے آگیا؟“

”شاہ جی نے تجھے بلوایا ہے۔ کہا ہے کل شام اس کی جیب میاں پہنچ جائے گی۔ وہ تیرا انتظار کرے گا۔“

”شاہ جی سے بولنا، جیب ادھر نہ بھیجے۔“ رحیم داد نے تاکید کی۔ ”میں کل نہیں، پرسوں شام تک اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچ کر پوچھا۔ ”کوئی بہت ضروری کام تو نہیں؟“

”پتہ نہیں جی۔“ شیدے نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”کوئی کام ہی ہوگا۔ تب ہی تو بلوایا ہے۔“ رحیم داد نے مزید بات نہ کی۔ صرف اس قدر کہا۔ ”اب تو جا۔ شاہ جی سے کتا، میں ضرور آؤں گا۔“

شیدا چلا گیا۔ رحیم داد اور نادر گاؤں کی طرف واپس ہوئے۔ رحیم داد نے چلتے چلتے نادر سے کہا۔ ”میں شاہ جی سے خود بھی ملنا چاہتا تھا۔ ضروری بات چیت کرنی تھی۔ اب تو اس نے خود ہی بلوایا ہے۔ جانا ہی پڑے گا۔“

”شاہ جی، تیس نوں بہت مانتا ہے۔ جب بھی میرے سامنے ذکر آیا اس نے ہمیشہ محبت اور پیار سے یاد کیا۔ کہنے کو تو وہ ادھر کا بہت وڈا بگیر دار ہے پر یاروں کا یار ہے۔ وکت پر کام آنے والا۔ ایک بار جو وعدہ کرے گا اسے پورا کرنے کی ہر طرح کوشش کرے گا۔ بڑے لوگوں کی یہی تو خوبی ہوتی ہے۔“

اس نے نظر بھر کر رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ ”پر میں سمجھتا ہوں اس سے کم میں بھی کام ہو سکتا ہے۔ آباد کاری کے محکمے میں اپنی بہت جان پہچان ہے۔ آئندہ وکیل آئے تو اس سے کلیم کے کاغذات واپس لے لیتا۔ آگے کی تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ایک فائل ہی تو غائب کرانی ہے۔ اس کے لیے پانچ ہزار کی رقم بہت زیادہ ہے۔ میں بہت کم میں کام کرادوں گا۔ ہو سکتا ہے ہزار روپے میں کام ہو جائے۔ میری تو یہی کوشش ہوگی۔“

”صرف ہزار روپے میں!“ رحیم داد حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”نہیں جی۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ نادر نے گردن اونچی کی۔ مستعدی سے بولا۔ ”چوہدری! تو نے مجھے مینجر لگایا ہے۔ اب مجھے اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع بھی تو دے۔ یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ وکت آنے پر تو خود دیکھ لے گا میں کتنے کام کا بندہ ہوں اور کیسی کیسی خدمت انجام دے سکتا ہوں؟ تو مجھ پر پورا پورا اعتماد کر سکتا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو تسلی دی۔ ”فکر کرنے یا پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

دونوں کچھ دیر اس مسئلہ پر بات کرتے رہے۔ رحیم داد اپنے کلیم کے بارے میں بہت پریشان اور گھبرایا ہوا تھا۔ اسے اپنی زمیں داری نکل جانے کا خطرہ رہ رہ کر ڈرا رہا تھا۔ لیکن نادر خاں نے اس طرح تسلی دی اور اس اعتماد کے ساتھ حوصلہ بڑھایا کہ وہ بہت حد تک مطمئن ہو گیا۔ نادر اب اس کی ایک اہم ضرورت بن گیا تھا۔



رحیم داد اور نادر خاں پروگرام کے مطابق جیلہ کے پاس پہنچے۔ وہ گول کمرے میں دونوں کا انتظار کر رہی تھی۔ ان کے پہنچنے ہی اس نے زمیں داری کے کاغذات اور رجسٹر منگوائے۔ وہ انھیں دیکھتی رہی اور ضروری تفصیلات بتاتی رہی۔ نادر خاں بیچ بیچ میں سوالات کرتا جاتا۔ جیلہ ان کے جواب دیتی، وضاحت کرتی۔ جوابات نادر خاں کی سمجھ میں نہ آتی اسے دوبارہ بیان کرتی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا اور زمیں داری کے متعلق اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہا۔

کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نادر خاں ایک ایک دستاویز اور کاغذ دیکھتا۔ رجسٹروں کے اوراق الٹا پلٹا۔ ہر تحریر کو توجہ سے پڑھتا۔ جو پوچھنا ہوتا بے دھرمک پوچھتا۔ کہیں کہیں اپنی رائے کا بھی اظہار کرتا۔ مشورہ بھی دیتا جاتا۔ تبصرہ بھی کرتا۔ اس طرح وہ جیلہ پر اپنے تجربے اور معلومات کا دھاک بھٹانا چاہتا تھا۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی رہا۔ جیلہ اس کی باتوں سے خاصی متاثر نظر آتی تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے نادر خاں کی باتوں پر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ کچھ دور نگر خاموش چلتا رہا، پھر اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

”نادر! تو جیلہ سے زمیں داری کے معاملات جلد سے جلد سمجھنے کی کوشش کر۔“
”وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔“

”یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر اب میں تیرے ساتھ جیلہ کے پاس نہ جاسکوں گا۔ شاہ جی نے پاس جانا ضروری ہے۔ اس نے بلایا بھی ہے۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بھی گجرا ہے۔ شاہ جی کے ساتھ اچھا وکھت گزرے گا۔“

”چوہدری! میں تو کہتا ہوں اس دفعہ شاہ جی کے ساتھ ہفتہ دس روز گزار۔ ذرا طبیعت بہل جائے گی۔“ نادر نے مشورہ دیا۔ ”دوہری فکر نہ کر۔ میں زمیں داری سے سارا حساب کتاب سمجھ لوں گا۔ اگر اس نے کانڈات اور رجسٹر دے دیئے تو انہیں اپنی تحویل میں لے لوں گا۔ شاہ جی کے ساتھ آرام سے وکٹ گزار۔ ادھر مجھے جس کام پر لگایا ہے اسے جیتنی ٹال پورا کر لوں گا۔“

”کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔“ رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کرنے کا عندیہ دیا۔ ”جیلہ کے پاس جا کر میں کرتا بھی کیا ہوں۔ چپ کر کے بیٹھایا رہتا ہوں۔ تم دونوں کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔ زمینداری کے بارے میں میں نوں جو کچھ سمجھتا تھا سمجھ لیا۔ اب تو تیرے سمجھنے اور جاننے کی باتیں ہیں۔ تو انہیں سمجھ ہی لے گا۔ کانڈات اور رجسٹر جیلہ آسانی سے دے سکے تو انہیں ضرور اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کرنا۔“

”وہ تو جی میں کر ہی لوں گا۔ امید تو ہے وہ کانڈات اور رجسٹر میرے حوالے کر دے گی۔“ نادر خاں نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا۔ ”پر ایک گل سمجھ نہیں آ رہی۔“

”وہ کیا ہے؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”چوہدری! تیس اتنے دن پنڈے غیر حاضر رہنے کا زمیں داری سے کیا بہانہ بناؤ گے؟“ نادر خاں نے اپنی الجھن بیان کی۔

”یہ تو تجھ پر چھوڑ دے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

دونوں باتیں کرتے ہوئے باغ میں واپس پہنچ گئے۔ شام کا اندھیرا اب ہر طرف پھیل گیا تھا۔ گاؤں کے گھروں سے چولوں کا دھواں اٹھ رہا تھا۔ جگہ جگہ چراغ جھللاتے نظر آتے تھے۔ باغ کے ایک گوشے میں نوکروں نے لیپ روشن کر دیا تھا۔ رحیم داد تھکا ہوا ایک کرسی پر بیٹھ گیا مگر نادر خاں نہ ٹھہرا۔ وہ رحیم داد سے اجازت لے کر مہمان خانے کی سمت چلا گیا۔

صبح ناشتے کے بعد معمول کے مطابق دونوں جیلہ کے پاس پہنچے۔ نادر دیر تک جیلہ سے زمیں داری کے بارے میں تبادلہ خیالات کرتا رہا۔ ضروری باتیں پوچھتا رہا۔ وہ اسے بتاتی رہی۔ ہریات سمجھانے کی کوشش کرتی رہی۔ گل بھگ سات سال کا حساب تھا۔ کچھ رجسٹروں میں درج تھا، کچھ رسیدوں اور کانڈے کے پرنوں پر متفرق شکل میں تھا۔ دستاویزات بھی اسی طرح منتشر اور بے ترتیب تھیں۔ نادر خاں ہریات اور ہر تفصیل سمجھنا چاہتا تھا۔

جیلہ حافظے اور یادداشت سے کام لیتی۔ بار بار الجھتی اور جب کسی معاملے میں زیادہ الجھن میں پڑ جاتی تو بات ادھوری چھوڑ کر دوسرے روز بتانے کا وعدہ کرتی۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا۔ نادر ایک پرانے بیج نامے کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ جیلہ کو صحیح طور پر اس کی نوعیت کا علم نہ تھا۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دیا مگر کچھ یاد نہ آیا۔ آخر اس نے زچ ہو کر بے زاری سے کہا۔

”نادر! میں اس کے بارے میں کل سوچ کر بتاؤں گی۔ آج مجھے یاد نہیں آرہا۔ اللہ وسایا کے مرنے کے بعد مجھے بھولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ پہلے ایسی نہ تھی۔ دماغ پر ذرا زور دیا فوراً یاد آ جاتا تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”جانے مجھے کیا ہو گیا۔“ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے نادر کو دیکھا۔ ”اب تو جا۔ تجھ سے کل سویرے گل بات ہوگی۔“

نادر خاں نے کسی قسم کا اصرار نہ کیا۔ مودب ہو کر بولا۔ ”ٹھیک ہے زمیں داری! جیسی تیری مرضی۔ گل بات ہو جائے گی۔“ اس نے میز پر کھمرے ہوئے کانڈات سیٹے۔ مسلیں اکٹھا کیں انہیں تہہ کر کے رجسٹروں پر رکھا اور بستہ باندھ کر جیلہ کے سامنے بٹھا دیا۔ وہ رخصت ہونے کے لیے اٹھا۔ جیلہ سے پوچھا۔

”مجھے اجازت ہے جی۔ میں کل صبح آ جاؤں گا۔“

رحیم داد جو دیر سے چپ بیٹھا تھا۔ نادر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”نادر! تو جا۔ میں نوں زمیں داری سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔“
نادر خاں خاموشی سے چلا گیا۔

جیلہ نے رحیم داد سے دریافت کیا۔ ”چوہدری! تجھے ایسی کیا ضروری گل بات کرنی ہے۔ کوئی خاص بات ہے؟“

”خاص بات تو نہیں۔“ رحیم داد نے رساں سے کہا۔ ”تیں نوں یہ بتانا تھا، میں کل بھالو گرجا رہا ہوں۔ اب تجھ سے واپسی پر ہی مل سکوں گا۔“

جیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو بھالو گرجا رہا ہے؟“

والی ہے، تیرے بچوں کی ماں ہے۔ تجھے چاہیے کہ اسے خوش رکھے۔“
”میں تو جی اسے خوش رکھنے کی اپنے طور پر بہت کوشش کرتا ہوں، پر وہ تو بیکار کا جھگڑا کھڑا کر دیتی ہے۔“

رحیم داد نے تاراں کا ذکر جان بوجھ کر چھیڑا تھا۔ وہ اسے احمد کے ذریعے بلانا چاہتا تھا، مگر ہمت نہ پڑی۔ احمد چلا گیا۔

رحیم داد صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ ہوا نرم اور خشک تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل بکھرے ہوئے تھے۔ بارش کا کوئی امکان نہیں تھا۔ رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ بیٹھ سکا، بے چہن ہو کر اٹھا اور آہستہ آہستہ صحن میں ٹہلنے لگا۔ وہ ادھیڑ بن میں مبتلا تھا۔ بار بار سوچ رہا تھا کہ احمد نے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے، اگر اسے گاؤں میں پھیلا دیا جائے اور پولیس کے کانوں میں بھی ڈال دیا جائے تو نہ صرف تفتیش کی نوعیت بدل جائے گی بلکہ قتل کی واردات دبانے کا بھی آسان ہو جائے گا۔ مگر پولیس کو اس انداز سے سوچنے پر صرف احسان شاہ تیار کر سکتا ہے۔

اس نے بستر پر لیٹتے ہوئے طے کیا کہ اسے فوری طور پر احسان شاہ سے ملنا چاہیے۔ رحیم داد کو اس نے بلایا بھی تھا۔

احمد رات بھر نہیں آیا۔ مگر صبح وہ مہمان خانے میں موجود تھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے ناشتا میز پر چتا۔ رحیم داد ناشتا کرنے لگا۔ احمد نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے رات کو پتہ کیا، پنڈ کے کئی مزارعوں کا بھی یہی خیال ہے، اللہ وسایا کو زمیں دارنی کے بھائیوں نے قتل کیا ہے۔“
”بابر بی نے ان سے بھی کہا ہو گا۔“

”پتہ نہیں جی! ویسے گل سمجھ بھی آتی ہے۔ وہ ایسا ہے جی، زمیں دارنی کا پیو ادھر کا بہت وڈا زمیں دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا اور اس کا پیو تو اس کے بہت معمولی مزارعے تھے۔ میں تو جی ان دنوں بھی اسی پنڈ میں تھا۔ جسی لال میمنہ ہوتا تھا۔ ساری زمیں داری کی دیکھ بھال سچ تو یہ ہے، وہی کرتا تھا۔ اس نے نراض ہو کر اللہ وسایا اور اس کے پیو کو بے دھل کر دیا تھا۔“

رحیم داد درمیان میں بول پڑا۔ ”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“

احمد نے اس کے ٹوکے پر مطلق توجہ نہ دی۔ ”یہ تو سوچ، زمیں دارنی کے بھائی یہ کیسے دیکھ سکتے ہیں، ان کی بھین انھی کے معمولی مزارعے اور وہ بھی مسلمان کی گھر والی بن کر رہے۔ عزت اور شان بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے تو جی زمیں دارنی کے بھائی ہر دیال کو دیکھا ہے۔ کیا اکڑ اور

بان تھی اس کی۔ جب پنڈ میں آتا تھا تو مزارعے اس کے سامنے چپ کر کے کھڑے رہتے تھے۔
”کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔“

رحیم داد نے اسے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ کس طرح احسان کے پاس پہنچے۔ گھوڑی پر بیٹھ کر وہ اس کے پاس جانا نہیں چاہتا تھا۔ شک و شبہ پیدا ہونے کا شہ تھا۔ اس نے احسان شاہ کے پاس جانے کے لیے سڑک کا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ پل اور خاصے چکر کا راستہ تھا مگر محفوظ تھا۔

رحیم داد نے ناشتے کے بعد احمد سے کہا۔ ”دوپہر کی روٹی کے بعد تانگا لے آنا۔“
”کہاں جانا ہے؟“

”میں نے چک بیدی جانا ہے۔ وہاں سے لاری پکڑوں گا۔ پاک پتن جاؤں گا۔“
احمد نے دریافت کیا۔ ”ادھر کوئی کام ہے؟“
”نہیں۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”پاک پتن میں بابا شاہ فرید سنج شکر کے مزار پر حاضری دوں گا۔“

”وہاں جانے کا مزار تو جی عرس پر آتا ہے۔ پنج محرم کو عرس ہوتا ہے۔ دور دور سے بندے آتے ہیں۔ زیر دست میلہ لگتا ہے۔“

”عرس پر بھی چلا جاؤں گا۔ پہلے بھی عرس پر جا چکا ہوں۔“ رحیم داد نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”جی گل پوچھ تو اللہ وسایا کے بعد دل بہت گھبراتا ہے۔ مزار پر حاضری دینے سے دل کو آرام ملے گا۔ اسی لیے جانا چاہتا ہوں۔“
”کب تک واپسی ہوگی؟“ احمد نے پوچھا۔

”اراہہ تو رات ہی کو لوٹنے کا ہے پر مشکل لگتا ہے۔ بارشوں نے رستے خراب کر دیئے ہیں۔ رات کو سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ کل شام تک واپس آ جاؤں گا۔ زمیں دارنی پوچھے تو بتا دیتا۔“
”وہ تو جی کچھ نہیں پوچھے گی۔ وہ تو روٹی رہتی ہے۔ نہ بولتی ہے نہ بات کرتی ہے۔ اسے تو جی زمیں داری کی موت کا بہت دکھ ہے۔ میں نوں نہیں پتہ تھا، وہ اس سے اتنا زیادہ پیار کرتی ہے۔“

رحیم داد نے بات کا رخ موڑا۔ ”تاراں بھی تجھ سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔“

”توبہ کرو جی! وہ میری ذرا پر دانا نہیں کرتی۔“ احمد نے گلہ کیا۔ ”تمیں نوں کیسہ پتہ، وہ مجھ سے کتنا جھگڑا کرتی ہے۔ ذرا ذرا سی گل بات پر رولا گولا کرتی ہے۔“
رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ احمد چلا گیا۔

یہیں ٹھہرے گا۔“

”اس بار تو میں تیرے ساتھ زیادہ ہی دن ٹھہرنے کے ارادے سے آیا ہوں۔ کپڑے لے بھی لایا ہوں۔ مہمان خانے میں خالی پڑے پڑے دل بہت گھبراتا تھا۔“

”تیرا ہی گھر ہے۔ چوہدری! جب تک جی چاہے ٹھہر۔“ احسان شاہ نے قہقہہ بلند کیا۔ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی گل ہے۔ مجھے تو خوشی ہوگی۔ تیرے ساتھ اچھا وکٹ کٹ جائے گا۔ اب تو غسل خانے میں جا کر قنات نما لے۔ شام کو تیرے ساتھ محفل جمعے گی۔“

احسان شاہ نے شیدا کو بلایا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ چلا گیا۔ شیدا نے اس کے ٹھہرنے کے لیے پہلے ہی ایک کمرے میں بندوبست کر دیا تھا۔ رحیم داد نے غسل کیا۔ کمرے میں آیا۔ ٹرنک سے ابلے کپڑے نکال کر پینے۔ تروتازہ ہو کر دوبارہ باغ میں پہنچا۔ شام دے قدموں درختوں کی بلندی سے نیچے اتر رہی تھی۔ احسان شاہ باغ کے ایک گوشے میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر اسکاچ و ہسکی کی بوتل اور دو گلاس رکھے تھے۔

رحیم داد بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”شاہ جی! تو شام ہونے سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔“ احسان شاہ نے و ہسکی کا گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھا۔ بھیگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ ہنس کر گویا ہوا۔ ”چوہدری! اس کے بغیر زندگی میں کوئی لطف نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سو رہا ہوں، تھک گیا ہوں۔ طبیعت بھیجی بھیجی رہتی ہے۔ پر دو ذیل لگاتے ہی نہ سستی رہتی ہے نہ تھکن۔ انگ انگ چکنے لگتا ہے۔ ایمان لگتی گل امہ اے چوہدری۔“ اس نے بوتل کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی کیا زور دار چیز ہے۔ وہ کیا کہا ہے، کسی شاعر نے۔“

ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے

اس مصرعے کو اپنی بھونڈی آواز میں گنگناتے ہوئے اس نے میز پر رکھے ہوئے دوسرے گلاس میں و ہسکی انڈلی۔ پانی ڈالا اور ایک بڑا ہیگ بٹا کر بولا۔ ”چوہدری! اب تو بھی شروع ہو جا۔“ رحیم داد نے گلاس اٹھایا۔ گھونٹ بھرا۔ چند لمبے خاموش رہا۔ و ہسکی کی تلخی کا احساس کم ہوا تو بولا۔ ”پچھلے دنوں بہت گڑبڑ معاملہ ہو گیا تھا۔“

”کیا ہو گیا۔ کوئی خاص گل بات؟“

”خاص ہی گل بات کہہ لے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”وہ ایسا ہوا جی میں ایک روز جیلہ کے پاس گیا۔ اس نے باتوں باتوں میں اپنے بارے میں کچھلی باتیں سنائیں۔ سب ہی کچھ بتا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔ اس کی باتیں سن کر طبیعت میں ایسی الیل اٹھی کہ میں نے دل کی بات کہہ دی۔“

”دل کی بات کہہ دی؟“ احسان شاہ نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔ ”صاف صاف بتا۔“ پہلے تو میں نے گول مول بات کی۔ فیروزی زبان سے کہا کہ وہ میری گھر والی بن جائے۔“ رحیم نے بڑا گھونٹ بھرا۔

”کیا بولی وہ؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”بولی تو وہ کچھ نہیں۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خوب ٹسوے بہائے۔ اس نے میری بات کو نہ نہیں کیا۔ اس کے اس طرح رونے پر میں نے یہی اندازہ لگایا۔“

”تو نے جلدی کی چوہدری۔“ احسان شاہ کے لہجے میں تشویش کا پہلو نمایاں تھا۔ ”ابھی ایسی بات بنے کا وکٹ نہیں آیا۔ تجھے صبر سے کام لینا تھا۔ ایسی باتیں اس طرح نہیں کی جاتیں۔ تیس دنوں سے یہ بات کہنی ہی تھی تو کسی اور کے ذریعے کھلواتا۔ یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ نیرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہے؟“ وہ لمحہ بھر سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گردن اٹھا کر قدرے نیچے لہجے میں بولا۔ ”تو نے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ اب....“

”گڑبڑ تو ہو گیا تھا۔“ رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”پر بعد میں سب ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔“ ”وہ کیسے؟“ احسان شاہ نے تعجب سے پوچھا۔

”ہنس ہو گیا۔ شاہ جی تو فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ ”اب اس کے دل میں میری طرف سے کوئی شک و شبہ نہیں رہا۔“

”تجھے کیکن ہے؟“ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

”بالکل کیکن ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”واپس جاؤں گا تو مہمان خانے کی بائے حویلی کے اندر ہی ٹھہروں گا۔ وہ اوپر کی منزل پر رہے گی اور میں نیچے کے حصے میں۔ اس نے ذہنی کہا۔ بلکہ زور دے کر کہا۔ میں تو انکار کرتا رہا۔“

”چوہدری! تو نے کیا چکر چلایا۔ حویلی میں اس کے ساتھ رہا تو وہ آسانی سے تیرے ہاتھ آ جائے لی۔“ احسان شاہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ”پر اب جلد بازی نہ کرنا ورنہ کام خراب ہو جائے گا۔“ رحیم داد نے مزید تفصیل نہ بتائی۔ یہ بھی نہ بتایا کہ وہ تخت محل جا کر اپنے پچھڑے ہوئے بیوی بچوں کو لانے کا بہانہ کر کے پیراں والہ آیا ہے۔ وہ خاموشی سے و ہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ ”نادر کیسا چل رہا ہے؟“

”وہ تو جی بہت کام کا بندہ ہے۔“ رحیم داد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس نے جیلہ کو ایسا رام کیا کہ وہ ساری زمیں داری اور اس کی دستاویزات میرے حوالے کرنے پر خود ہی راضی ہو گئی۔“

پہلے جو غلطی کرچکا ہے اب اسے نہ دھرانا۔ اسے دھیرے دھیرے رستے پر لانا ہوگا، سمجھا؟“
 ”سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔“ رحیم داد گردن ہلا کر بولا۔
 احسان شاہ ٹھنکھار کر ہنسنا۔ رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ احسان شاہ نے ترنگ میں آکر رحیم داد کے
 گھاس سے اپنا گلاس نکرایا، وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔
 ”شاہ جی، میں نے ایک خوش خبری تو سنائی نہیں۔“
 ”سنا، ضرور سنا۔“ احسان شاہ لہرا کر بولا۔

”یہ تو تین نوں پہلے ہی بتا چکا ہوں، جیلہ تھوڑے دنوں بعد زمیں داری کے سارے کاغذات اور
 دستاویزات نادر کے حوالے کر دے گی۔“ رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”وہ تو زمیں داری
 سے بالکل الگ ہونا چاہتی ہے۔ کتنی تھی، میں نے زمیں داری سے کیا لیما۔ تو پوری ذمہ داری
 سنبھال لے میں نے تو اب سکول چلانا اور ڈسپنری بنانا ہے۔“

احسان شاہ کے چہرے پر مسرت کے بجائے جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”یہ
 سکول شکول کا چکر ختم کر۔ اسے تو اللہ وسایا کے ساتھ ہی ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ
 مزارعوں اور کمیوں کے بچے پڑھ لکھ کر ہمارے بچوں کی برابری کریں؟ قانون اور انصاف کی باتیں
 کریں؟ زمیں داروں کو طرح طرح سے تنگ کریں۔ ان کے خلاف گڑبڑ پھیلائیں؟“

”بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے شاہ جی، پر جیلہ اس کے لیے تیار نہیں ہوگی۔“ رحیم داد نے احسان
 شاہ کی خفگی رفع کرنے کی غرض سے اپنی مجبوری بھی بیان کی۔ ”تمیں نوں پتہ ہے، میں ابھی اسے
 نراض نہیں کر سکتا۔ ورنہ سارا معاملہ گڑبڑ ہو جائے گا۔“

”میں فوری طور پر سکول بند کرانے کو نہیں کہہ رہا۔ پر تجھے آگے چل کر ایسا کرنا پڑے گا۔“
 احسان شاہ نے رحیم داد کی مجبوری محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”پر تجھے یہ بات ضرور دھیان میں رکھنا
 چاہیے کہ زمیں داری شان سے چلائی ہے تو مزارعوں کو ان پڑھ رکھنا ہوگا۔ یہ بہت ضروری ہے۔
 ہر دو زمیں دار اور بگیر دار اس معاملے میں چوکس رہتا ہے۔ میں اس سلسلے میں تجھے سردار سرامام
 بخش مزاری کا واسطہ بطور مثال سنا تا ہوں۔“
 ”کون تھا وہ؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”وہ ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل راجن پور میں روجھاں کے مزارعوں کا تہمن دار تھا۔ بہت وڈا
 بگیر دار ہوتا تھا۔ میرے چچا کا گہرا ریا رکھا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں جب بلوچوں نے بغاوت کی تو اسے
 باندھنے میں سردار امام بخش نے بھی انگریزوں کی بہت مدد کی۔“ احسان شاہ نے وہسکی کا گھونٹ بھرا۔

آج کل وہ نادر کو زمیں داری کے بارے میں ایک ایک بات سمجھا رہی ہے۔ ہر کانڈ اور ہر دستاویز
 کے بارے میں بتا رہی ہے۔ دیسے شاہ جی وہ دیکھنے میں جتنی ہوشیار اور تیز لگتی ہے اتنی ہے نہیں۔
 اس کا دل بہت نرم ہے۔ پہلے تو وہ نادر سے بہت نراض تھی۔ اسے میخبر لگانے کے بہت خلاف
 تھی۔ پر جب نادر نے اپنی پریشانی اور بے روزگاری کا حال سنایا تو ایک دم موم کی طرح پگھل گئی۔
 اسے رکھنے پر فوراً تیار ہو گئی۔ چچی گل تو ایسہ اے وہ کسی کو تکلیف اور پریشانی میں نہیں دیکھ
 سکتی۔“

”مجھے جیلہ کے بارے میں زیادہ پتہ نہیں۔ سنا ہی سنا ہے۔ پر نادر بہت اونچی چیز ہے۔ وہ تیرے
 لیے بہت کار آمد ثابت ہوگا۔ اب تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ زمیں داری ایسے چلائے گا
 کہ تجھے بھی زمیں داری کا مزا آجائے گا۔ ابھی تک تو کوئلہ ہر کشن میں مزارعوں کی چل رہی تھی۔
 تجھے پتہ ہے اللہ وسایا تو مزارع تھا اور مزارع ہی رہا۔ اس نے مزارعوں کا ناس مار دیا تھا۔ ان کا
 دماغ خراب کر دیا تھا۔“

”ان کا دماغ تو اب تک خراب ہی ہے۔“ رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
 ”اس کا اثر آس پاس کے زمیں داروں پر بھی پڑا۔ وڈے زمیں دار، جن کے پاس مزارعوں کی
 تعداد بہت زیادہ تھی، بہت پریشان رہتے تھے۔“ احسان شاہ نے اللہ وسایا مرحوم کے خلاف اپنی
 نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ ”تجھے معلوم نہیں اللہ وسایا کے کتل پر ادھر کے سارے ہی وڈے
 زمیں دار کتنے خوش ہوئے۔ سب اس سے خار کھاتے تھے۔“
 ”خطرہ تو اس کی طرف سے مجھے بھی تھا۔“

”بالکل تھا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! تیرے رستے کا کاٹنا صاف ہو گیا۔ آج
 کہتا ہوں اگر اللہ وسایا کا صفایا نہ ہوتا تو وہ کب کا تجھے صاف کرچکا ہوتا۔ وہ تیری جائیداد پر کھنہ
 کرنے کی پوری تیاری کرچکا تھا۔ اس کے ارادے بہت خطرناک تھے۔“
 رحیم داد نے اس کی باتیں سنیں۔ مگر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا
 رہا۔ احسان شاہ کو اس کی خاموشی ناگوار گزری۔ تھکے لہجے میں بولا۔

”چوہدری، تجھے میری باتوں کا کیا نہیں؟“
 رحیم داد ہڑبڑا کر بولا۔ ”ہے، بالکل ہے۔“ اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے بات بتائی۔
 ”وہ ایسا ہے جی۔ میں جیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ شاہ جی وہ بری زنانی نہیں ہے۔“
 ”میں نے کب کہا کہ وہ بری ہے۔ وہ تو ایسی زور دار چیز ہے کہ تیرے تو عیش ہو جائیں گے۔“

سرخوشی کے عالم میں قلعہ بلند کیا۔ ”انگریزوں کی بھی کیا بات تھی۔ اپنے دشمنوں کو کچلنے میں جتنے سخت تھے، دوستوں کے لیے اتنا ہی دوا دل رکھتے تھے۔ سردار امام بخش نے ان کی بھرپور مدد کی تو اس کے صلے میں انھوں نے اسے آنریری مجسٹریٹ بنادیا۔ جب رابرٹ سنڈمین، ڈپٹی کمشنر لگا تو سردار امام بخش نے انگریزوں کی ہر طرح خدمت کی۔“

”یہ فورٹ سنڈمین اسی رابرٹ سنڈمین کے نام پر رکھا گیا؟“

”ہاں جی، یہ وہی سنڈمین تھا۔ اپنے زمانے کا بہت نامور افسر ہوتا تھا۔ بلوچوں نے بار بار بغاوت کی۔ ان میں گبتیوں کے علاوہ مزاری بلوچ بھی شامل تھے۔ پر سردار امام بخش کی مدد سے ان کی بغاوتوں کو دبانے میں زبردست کام کیا۔“ احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ ”اس خدمت پر انگریز بہت خوش ہوئے۔ پہلے اسے نواب، فیر سر اور فیر صوبائی درباری بنادیا۔ خطابات کے ساتھ بہت دوی بکیر بھی دی۔ انگریز اس پر ایسے مہربان ہوئے کہ پنجاب اسمبلی کا ممبر بھی بنادیا۔ ویسے سردار سر امام بخش ان کا بہت وفادار بندہ تھا۔ بہت ہوشیار اور سمجھ دار بھی تھا۔“

تیس اس کے بارے میں کوئی واقعہ سنانا چاہتے تھے۔ ”رحیم داد نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔

”ہاں، میں تجھے یہ بتانا چاہتا تھا کہ سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار تھا۔ ہمیشہ آگے کی سوچتا تھا۔ سچ پوچھ تو دریشکوں نے مزاریوں کو کب کا مٹادیا ہوتا۔ ان کے ساتھ مزاریوں کی مسلسل لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دونوں کیسیلوں کے درمیان زبردست دشمنی رہی ہے۔“

”دشمنی ہوئی کس بات پر؟“ رحیم داد نے جھوم کر پوچھا۔

”ان دنوں مزاری، خانہ بدوش گلے بان اور چرواہے ہوتے تھے۔ اپنی بھیڑ بکریاں اور چوکھر گنڈاری کی پہاڑیوں پر چرایا کرتے تھے۔ دریشک بھی خانہ بدوش ہوتے تھے۔ وہ مزاریوں کے چوکھر اور مویشی اٹھا کر لے جاتے۔ تب جمال خاں مزاریوں کا سردار ہوتا تھا۔ اس نے دریشکوں پر چڑھائی کردی اور کوئی پندرہ دریشک مار ڈالے۔ اس کے بعد دونوں کیسیلوں نے ایک دوسرے پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ دریشکوں کے ایک حملے میں سردار جمال خاں کی گھر والی بھی ماری گئی اور سردار کی ماں بھی زخمی ہو گئی۔ مزاریوں کے لیے یہ بہت بے عزتی کی بات تھی۔ اس بے عزتی کو وہ برسوں نہ بھولے۔ اس کا بدلہ لینے کے لیے دریشکوں سے لڑائیاں لڑتے رہے۔“ احسان شاہ نے اچانک قلعہ بلند کیا۔ ”پر اب مزاری اور دریشک تمہن داروں نے مل کر لغاریوں، لنڈ اور کھتران تمہن داروں کے خلاف مورچہ لگا رکھا ہے۔“

”تیرا مطلب ہے مزاریوں اور دریشکوں کی پرانی دشمنی ختم ہو گئی؟“

”ختم ہی ہو گئی۔ پر جب تک دونوں میں دشمنی رہی بہت خون خرابہ ہوا۔“ احسان شاہ نے بواب دیا۔ ”ویسے رنجیت سنگھ کے زمانے میں سکھوں نے بھی مزاریوں کو بہت تنگ کیا۔ دیوان مازن ل کا نام تو سنا ہی ہو گا تو نے۔ وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے حاکم لگا ہوا تھا۔ اس نے مزاریوں کے سات ہزار فوج کے ساتھ چڑھائی کردی۔ ان کے مال مویشی چھین لیے۔ انھیں بھاگ کر پہاڑیوں میں پناہ لینے پر مجبور کردیا۔ آخر لغاریوں کے سردار رحیم خاں نے سکھوں کے ساتھ مزاریوں کی مدد کر دی۔ ساون مل نے ملتان میں دربار لگایا جس میں مزاریوں کا سردار بہرام خاں خود حاضر ہوا۔ ساون مل نے اسے بکیر کے ساتھ خلعت بھی دی۔“

”یہ عجیب گل سنائی۔ لغاری پہلے مزاریوں کے دوست ہوتے تھے اور اب دشمن ہیں۔“ رحیم داد بہت آہستہ ہنسنے لگا۔ ”یہ سردا بہرام خاں کیا سردار امام بخش کا پوہوتا تھا؟“

”ہاں، پر بہرام خاں کا پتر دوست علی خاں بھی تھا۔ بہرام خاں کے مرنے پر وہی مزاریوں کا سردار بنا۔ اس کے زمانے میں مزاریوں کا سکھوں سے دوبارہ جھگڑا شروع ہوا۔ سکھوں نے مزاریوں کی بغاوت کو کچل دیا۔ انھیں سندھ کی جانب بھگا دیا۔ ادھر دیوان ساون مل بھی کچھ عرصہ بعد ایک لڑائی میں مارا گیا۔ اس کے پتر مول راج نے اس کی جگہ سنبھالی اور مزاریوں سے صلح کر لی۔ پر مراد دوست علی خاں بری عادتوں میں پڑ گیا تھا۔ اس لیے اسے بنا کر اس کے چھوٹے بھائی امام بخش خاں مزاریوں کے سردار کی حیثیت سے جرگے میں منتخب کر لیا گیا۔“

احسان شاہ نشے کی جھونک میں بسک کر اصل موضوع سے ہٹ کر دوسری طرف نکل گیا۔ رحیم داد بھی نشے کی دھن میں بھول چکا تھا کہ بات کہاں سے شروع ہوئی؟ سردار امام بخش کا نام دوبارہ نہ کر دے چوٹا۔ اس نے احسان شاہ کو ٹوکا۔

”شاہی! اس واقعہ کا کیا بنا؟ وہی سردار امام بخش والا جسے تو سنانا چاہتا تھا۔“

”یاد آگیا، بالکل یاد آگیا۔“ احسان شاہ غلج ہو کر بولا۔ ”بات کہدھر سے نکل کر کہدھر چلی گئی۔“ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”وہ ایسا ہوا کہ جن دنوں سردار امام بخش اسمبلی کا ممبر ہوتا تھا اسے کسی گم سے کراچی جانا پڑا۔ شیش سے باہر نکل رہا تھا تو ریلوے کا ایک بابو دوڑ کر آگے بڑھا۔ جھک کر ٹرار کے پیروں کو چھوا اور ہاتھ باندھ کر ادب سے اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سردار اسے پہچان نہ سکا۔“

”وہ بندہ تھا کون؟“ رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ سردار امام بخش مزاری کے ایک مزار سے کا پتر تھا۔ بچپن میں گھر سے بھاگ کر کراچی پہنچ گیا

تھا۔ وہاں کسی پارسی کا نوکر لگ گیا۔ اس نے اسے اتنا پڑھا لکھا دیا کہ جوان ہو کر ریلوے میں لگ گیا۔ ویسا بھی کر لیا تھا۔ بچے بھی تھے۔ اس نے خود ہی سردار کو بتایا۔ سردار میں تیرے بانیے کا بازو ہوں۔ فیذاں نے اپنا اور اپنے پیو کا نام بتایا۔

”کیا نام تھا اس کا؟“ رحیم داد نے نشے سے لہرا کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے پتہ نہیں۔“ احسان شاہ نے جواب دیا۔ ”سردار امام بخش خاں نے اسے غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور سوچ کر پوچھا۔ ادھر تجھے کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ اس نے بتایا اسے ریلوے سے دو روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سردار بولا۔ میں تجھے سو روپے تنخواہ دوں گا۔ ادھر کی نوکری چھوڑ اور میرے ساتھ روجھاں چل۔ وہ تیار ہو گیا۔ سردار امام بخش مزاری اسے اپنے ساتھ روجھاں لے آیا۔ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ ”شاہ جی، بات سمجھ نہیں آئی۔ سردار امام بخش مزاری اسے دگنی تنخواہ پر کراچی سے اپنے ساتھ کیوں لے آیا؟“

”یہ تو اصلی گل ہے جو میں تجھے بتانا چاہتا ہوں۔“ احسان شاہ نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”سردار کے میمنجر کو اس کے بارے میں پتہ چلا تو وہ بھی تیری طرح بہت حیران ہوا۔ اسے یہ بات پسند بھی نہ آئی۔ ایک روز باتوں باتوں میں اس نے سردار سے اس کے بارے میں گلہ کیا۔ سردار ایسا بندہ تو وہ روپے سے بھی کم میں مل جائے گا۔ تو اسے سو روپے تنخواہ دے رہا ہے۔ میمنجر نے اسے بالکل بیکار اور بہت مزگا ثابت کر کے نوکری سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر سردار تیار نہ ہوا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ”چوہدری! تجھے پتہ ہے۔ سردار نے میمنجر کا سارا گلہ شکوہ سن کر کیا جواب دیا؟“

”کیا جواب دیا اس نے؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”سردار نے اپنے میمنجر سے ہنس کر کہا۔ تو اس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ سو روپے مہینے میں بھی بہت سستا ہے۔ اور اس لیے سستا ہے کہ وہ کراچی میں رہتا تو اس کے بال بچے بھی پڑھتے لکھتے ادھر روجھاں میں اپنے رشتے دار مزارعوں کو ملنے آتے تو ان کے دماغ خراب کرتے۔ انھیں ملنے طرح سے بھڑکاتے۔ میں نے وہ رستہ ہی بند کر دیا۔ یہاں رہ کر وہ ان پڑھ کے ان پڑھ ہی رہیں گے کبھی خطرہ بن کر سامنے نہیں آئیں گے۔ یہ بات سردار امام بخش مزاری نے میرے پیو کو سنائی تھی۔ اور میں نے اپنے پیو سے سنی۔“ احسان شاہ نے وہی ہلکی کا گھونٹ بھرا۔ ”چوہدری! غور کر سردار امام بخش مزاری کتنا ہوشیار اور سمجھ دار تھا۔ تب ہی تو مزاریوں کا تہن دار اور اتنا ڈاڑھا تھا۔ اسے خطابات ملے، بگیر ملی، بہت عزت ملی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے۔ اپنا دوست وفادار

بندہ سمجھتے تھے۔“

”سردار امام بخش نے اپنے بال بچوں کو تو بالکل پڑھایا لکھایا نہیں ہو گا؟“

”چوہدری! تو بھی کیسی بچوں کی سی گل کرتا ہے۔“ احسان شاہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ ”امام بخش خاں اپنے کسلے کا سردار تھا۔ بہت وڈا بگیر دار تھا۔ اس کے بال بچے بھی سردار اور بگیر دار کے بال بچے تھے۔ کسی مزارعے کے تو نہیں تھے۔ وہ کیوں نہ پڑھتے؟ انہیں تو تعلیم دلانے کے لیے اس نے لندن بھیجا، امریکہ بھیجا۔ بہت پڑھایا لکھایا۔ وہ اور ان کے پتر بھی وڈے وڈے سرکاری افسر لگے۔ انگریزی راج نہ رہا جی تو کیا فرک پڑتا ہے۔ وہ آج بھی وڈے بگیر دار ہیں، سردار اور ننہ دار ہیں اور سرکاری افسر بھی لگے ہوئے ہیں۔ یہ سب سردار سر امام بخش کی زبردست خدمات کا صلہ ہے۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”سردار امام بخش مزاری کی طرح کے دور اندیش اور سمجھ دار بگیر دار نہ ہوتے تو اب تک کتنی ہی جاگیریں کب کی ختم ہو چکی ہوتیں۔ بلکہ بگیر داری اور زمین داری ہی سرے سے ختم ہو جاتی۔ ایسے ہی جیسے ہندوستان میں ہوا اور مشرقی بنگال میں ہو رہا ہے۔“



شیدا اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا اور ادب سے سر جھکا کھڑا ہو گیا۔ ”احسان شاہ نے پوچھا۔ ”شیدے“ تو نے کچھ کہنا ہے؟“

”ہاں جی، میں نے یہ بتانا ہے، سردار مراد خاں شاہانی آیا ہے۔“

”وہ اپنا بھکرو الا شاہانی؟“ احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”کدھر ہے وہ؟ کب آیا؟“ وہ اٹھ کھڑا ہو گیا اور شیدے کے ہم راہ چلا گیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا، ہسکی سے شغل کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد احسان علی شاہ واپس آیا۔ رحیم داد نے برآمدے میں رکھے ہوئے لیمپ کی روشنی میں دیکھا، مراد خاں شاہانی اس کے ہم راہ ہے۔ شاہانی کا قد اونچا تھا۔ جسم مضبوط اور صحت مند تھا۔ خوب گھیر دار بڑی سی شلوار اور ڈھیلی ڈھالی ڈبل گھوڑا بوسکی کی قمیص میں وہ کچھ زیادہ ہی قوی بیکل لگ رہا تھا۔ رنگت گندمی تھی۔ ڈاڑھی مٹاف تھی۔ مونچھیں زیادہ گھنی نہ تھیں۔ مگر چہرے پر رعب اور دیدہ تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ عمر میں وہ احسان شاہ سے بہت چھوٹا تھا۔ رحیم داد اس کی بھاری بھر کم شخصیت سے خاصا مرعوب ہوا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ بے تکلفی سے ہنستا، قہقہے لگاتا آگے بڑھا۔ رحیم داد کے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے شاہانی سے تعارف کرایا۔

”یہ اپنا یا رچوہد ری نور الہی ہے۔ کوئلہ ہر کشن میں اس کی زمیں داری ہے۔ گورداسپور کا پر ہے۔ میں پہلے بھی تجھ سے اس کا ذکر کر چکا ہوں۔“

مراد خاں شاہانی نے مسکراتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”سینس چوہدری! تو ہے تو جات پر ایسا بنا رکھا ہے کہ پہلی نظر میں بلوچ سردار لگتا ہے۔“ اس نے احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”پتہ نہیں چوہدری نے یہ داڑھی کیوں رکھ چھوڑی ہے۔“ احسان شاہ نے تقہ لگایا۔ ”بھی نہیں ہے۔ ہو بھی نہیں سکتا۔ ورنہ مسجد کا حجرہ چھوڑ کر یہاں کیوں بیٹھا ہوتا؟“

”شاہ جی، تو نے چوہدری کو میرے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”تجھے کون نہیں جانتا۔“ احسان شاہ بولا۔ اس نے مسکراتے ہوئے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”چوہدری! یہ بھکر میں بیٹھ کے علاقے کا وڈا زمیں دار ہے۔ بیٹھ میں تین ہی تو زمیندار غلام ہیں۔ شاہانی، توانی اور ڈھانڈلے۔“ اس نے گلاس میں دھسکی ڈالی۔ ”زمیں داری کیا ان کی تار

اپنی حکمرانی ہے۔ جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ان سے تو پولس اور حکومت بھی ہر ہے۔“ احسان شاہ نے پیگ بنا کر شاہانی کی جانب بڑھایا۔ ”لے میں نے تیرے لیے ڈبل بنا دیا ہے۔ آیا بھی تو دیر سے ہے۔ ہمارا ساتھ کیسے دے گا۔ ہم دونوں تو شام سے لگے ہوئے ہیں۔

شاہانی نے گلاس سنبھالا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ آدھا گلاس پیا۔

”گیا۔ احسان شاہ نے دریافت کیا۔ ”شاہانی! تو اچانک کیسے آگیا؟“

”سینس، بال بچوں کے ساتھ لور آیا تھا۔“ شاہانی نے بتایا تھا۔ ”لور آکر تیرے پاس نہ آ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں نے بال بچوں کو واپس بھکر بھیجا اور خود تیرے پاس آگیا۔ لور سے ایک کی گاڑی مل گئی تھی۔ اچھا سفر گزرا۔“ اس نے گلاس اٹھایا۔ ”پر ادھر تو بارشوں کا کوئی نا دکھائی نہیں دیتا۔“

”سنا ہے بیٹھ کے علاقے میں سیلاب نے بہت تباہی مچائی۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”بہت جھوک اور پنڈ سیلاب کی زد میں آگئے۔ بستیاں کی بستیاں ویران ہو گئیں۔“

”شاہ جی، دستیاں تو اجڑتی ہی رہتی ہیں۔“ شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔ ”برکھا میں بیٹھ چڑھتا ہے اور سال کے سال اپنا بھینٹ اور صد کہ بھی لیتا ہے۔ پر منجی کی فصلوں کو خوب کرتا ہے۔ اگر دریا نہ چڑھے تو بیٹھ کے علاقے میں منجی کے بوٹے سوکھ کر زرد مڑ جائیں۔“

اپنا تو اس مار دے۔“ رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ ”پر سیلاب سے کسان اور مزارعے تو برباد ہو جاتے ہوں گے۔ کتنے تو مر بھی جاتے ہوں گے۔“

”مرتے بھی رہتے ہیں۔ بے گھر بھی ہوتے ہیں۔“ مراد خاں کی بے نیازی میں فرق نہ آیا۔ ”سیلاب کا سیلاب دستیوں میں داخل ہوتا ہے تو مال مویشی سب ہمارا لے جاتا ہے۔ جس کا جدھر منہ

اٹھتا ہے نکل بھاگتا ہے۔ پر سیلاب کے اترتے ہی سب واپس آ جاتے ہیں اور راضی باضی ہو کر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔“ اس نے ہلکا تقہ لگایا۔ ”چوہدری! تو میری طرف کے

مزارعوں کو نہیں جانتا۔ بہت صابر و شاکر بندے ہیں۔ کئی تو ایسے سیدھے سادھے ہیں کہ ہوائی جہاز اڑتا ہوا اوپر گزرتا ہے تو ڈر کر کھٹ کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے بندے تھے

ملیں گے جنہوں نے ریل تک نہیں دیکھی۔“

”اچھا جی، تیرے علاقے میں ایسے بندے بھی ہیں؟“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”یہ تو بہت انوکھی گل سنائی تو نے۔“

شاہانی نے اس دفعہ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ ”شاہ جی، ایسا کہ تو میرے ساتھ چل۔ چوہدری کو بھی لے لے۔ یہ اپنا علاقہ دیکھ لے گا۔ تیرا اچھا وقت کٹے گا۔“

”تیری طرف جانے کا یہ زمانہ نہیں۔ ابھی تک ادھر سیلاب کی تباہی مچی ہوگی۔“ احسان شاہ رضامند نہ ہوا۔ شاہانی نے مطلع کیا۔ ”شاہ جی، تجھے پتہ نہیں۔ سیلاب تو تب کا اتر گیا۔ اب تو بہت عمدہ موسم ہے۔“

”جاڑے میں تیرے پاس آؤں گا۔ چوہدری کو بھی ساتھ لیتا آؤں گا۔“ احسان شاہ نے یہ کہہ کر تقہ لگایا۔ ”ویسے تیرے علاقے میں جنگلی رن نہیں ملتی۔“

”میری بگیر میں رن نہیں ملتی۔ ایسی گامہ نہ کر شاہ جی۔“ مراد خاں شاہانی نے گردن اونچی کی۔ ”سرٹ کا لمبا کش لگایا۔“ بیٹھ میں تو مزارع، سردار کی اجازت کے بغیر دھمی کا پرنا بھی نہیں کر سکتا۔ ”وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”تو کہہ تو شاہ جی ریل کی ویگن بھر کر رن بھیج دوں۔“

”ویگن سے اپنا کیا بنے گا۔ پوری سیکش ٹرین بھیجی ہوگی۔“ احسان شاہ بھی ہنسنے لگا۔ ”ویسے تیرے علاقے کی رن ٹھنڈی ہوتی ہے۔ گوشت تو اس کے بدن پر ہوتا ہی نہیں۔ تو انھیں کھانے کو

روٹی نہیں دیتا۔“

”یہ بات نہیں شاہ جی۔ تیرا علاقہ مانجھ کی سرحد پر ہے، بلکہ مانجھ ہی میں ہوتا ہے۔“ شاہانی نے وضاحت کی۔ ”تجھے تو مانجھ کی جیساں مل جاتی ہیں۔ مکھن کی طرح چکنی اور ملائم۔ ہاتھ رکھو تو پھسل

جائے۔“

”کھلا پلا کرتا رہا ہوں انھیں۔ ایسے ہی چکنی اور ملائم نہیں بن جاتیں۔“ احسان شاہ نے بڑے فخر سے کہا۔ ”جب انھیں اٹھواتا ہوں تو کئی تو کسائی کے کھونے پر باندھنے والی رُک کی مانند کمزور اور مرل ہوتی ہیں۔ دو چار ہفتے یہاں رہنے کے بعد ان کا رنگ روپ نکھرتا ہے۔ ایسی جوانی چڑھتی ہے کہ روکھی سوکھی روٹی سے ایک دم گرم گرم پکوان بن جاتی ہیں۔ کیا سمجھا؟“

”سب سمجھتا ہوں، خوب سمجھتا ہوں۔“ شاہانی نے گھونٹ بھرا۔ ”تیرے پاس تو باقاعدہ حرم ہے۔ ایک سے ایک فٹ کلاس دانا چھانٹ کر رکھا ہے۔“ وہ بے تکلفی سے ہنسا۔ ”اپنا حرم تو دکھا۔ میرا مطلب تیرے کوٹ سے ہے۔ بہت عرصہ ہوا اسے دیکھے ہوئے۔ کچھ نیا تازہ مال آیا؟ کوئی نئی رن، کوئی نئی ڈال؟“

”وہ تو آتی ہی رہتی ہیں۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”تو تھوڑی سی اور لگائے، غیر تجھے کوٹ میں۔ لے چلوں گا۔“ اس نے شیدا کو بلایا۔ وہ آیا تو احسان شاہ نے اسے مطلع کیا۔ ”میں کوٹ میں آ رہا ہوں۔ شاہانی اور چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ تو اندر خبر کر دے۔ میں، پیسچوں تو سب ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ سمجھ گیا؟“

شیدے نے سر کو ذرا سا جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔ ”سب ٹھیک ہی ٹھاک ملے گا جی۔“ شیدا چلا گیا۔ احسان شاہ، سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم دادا دوسکی سے مشغول کرتے رہے۔ ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔

پہرے گزر چکی تھی۔ تینوں نئے میں جھومتے جھامتے کوٹ کی جانب بڑھے۔ شیدا ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ حویلی کے پچھوڑے مختصر سا کھلا میدان تھا۔ اس میں بیل اور بیری کی جھاڑیاں تھیں۔ میدان کی دوسری طرف کوٹ تھا۔ یہ حویلی کی تفصیل نما چار دیواری کے اندر اپنی اپنی دیواروں کا ایک اور حصار تھا۔ دونوں میں فرق صرف اس قدر تھا کہ حویلی کی تفصیل پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور کوٹ کی دیواریں بلندی میں تو اتنی ہی تھیں مگر کچی تھیں۔ کوٹ کا دروازہ خاصا اونچا اور مضبوط تھا۔

کوٹ کی دیوڑھی میں لائین روشن تھی۔ اس کی روشنی میں مسلح پیریدار دروازے کے سامنے فرش پر بیٹھے حقہ گزر رہے تھے۔ قریب ہی دیوار کے سارے ان کی بندوقیں رکھی تھیں۔ شیدا بڑھ کر جھٹ ان کے سامنے پہنچا۔ پیریداروں نے جھپاک جھپاک اپنی بندوقیں سنبھالیں اور نظریں جھپاک کر اب سے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔



دیوڑھی کے آگے دور تک پھیلا ہوا وسیع آنگن تھا۔ آنگن کے تین طرف سلسلے دار کوٹھریاں تھیں۔ کوٹ کی تفصیل نما اونچی چار دیواری کی طرح کوٹھریوں کی دیواریں بھی کچی اینٹوں کی بنی ہوئی تھیں۔ کسی کوٹھری میں نہ کھڑکی تھی نہ روشن دان۔ آمدورفت کے لیے صرف ایک دروازہ تھا۔ کوٹھریوں کے آگے پھوس کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ آنگن کی سطح سے ڈیڑھ دو فٹ اونچا تھا اور اہٹا کشادہ تھا کہ چارپائی بچھانے کے بعد بھی اتنی جگہ بچ جاتی تھی کہ برآمدے میں گزرنے والوں کے لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوتی۔ آنگن کا فرش بھی کچا تھا۔ اس میں کہیں کہیں نیم اور جٹڑ کے گھنے درخت تھے۔ برآمدے میں کوٹھریوں کے آگے جگہ جگہ چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ہر کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔

احسان شاہ، رحیم دادا اور سردار مراد خاں شاہانی کے ہم راہ کوٹ کے صدر دروازے سے دیوڑھی میں داخل ہوا۔ شیدا تیزی سے آگے بڑھا اور اس دروازے کو کھولا جو آنگن میں کھلتا تھا۔ کوٹ میں عورتوں اور بچوں کی ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ مگر احسان شاہ کے داخل ہوتے ہی کوٹ کے صدر دروازے پر لٹکے ہوئے پتیل کے گھٹنے پر گھڑیاں نے چوٹ لگائی۔ رات کے ٹائے میں گھڑیاں کی آواز گونجی۔ کوٹ کے اندر تمام آوازیں اچانک اس طرح گہری خاموشی میں ادب کر گم ہو گئیں جیسے سوچ دبانے سے بجلی کی روشنی بجھ جاتی ہے۔

احسان علی شاہ گردن اٹھائے نہایت رعب اور دبدبے کے ساتھ دیوڑھی سے نکل کر آنگن میں پہنچا۔ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم دادا اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ شیدا، تینوں سے چند قدم

آگے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لالین لٹک رہی تھی۔

آنگن سے گزرتے ہوئے وہ برآمدے میں پہنچے۔ شیدا ایک کونھری کے دروازے پر رکھا اندر چراغ روشن تھا۔ سامنے مونج کی چٹائی پر ایک نوجوان عورت پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کاجل تھا۔ بالوں میں خوشبو دار تیل چمک رہا تھا۔ وہ بھڑک دار لباس پہنے ہوئے تھی۔ چراغ کی ہلکی زرد روشنی میں اس کا چہرہ اجلا اجلا نظر آ رہا تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی وہ اپنا ریشمی لاپہ سنبھالتی ہوئی جھٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

شیدا نے لالین اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ احسان شاہ نے اسے غور سے دیکھا۔ شیدائے پوچھا۔ ”کیا نام ہے اس کا؟“

مگر شیدا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ خود بول پڑی۔ ”میرا نام جیدا ہے جی۔“

جیداں کا جسم چھریا تھا۔ ناک نقشہ ٹیکھا اور سبک تھا۔ عمر بیس سال سے کچھ ہی اوپر تھی۔ اس کی شادی کو تین سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ صرف ایک بچی تھی اور وہ بھی اس کے ساتھ نہ تھی۔ جیداں سہمی ہوئی چپ چاپ کھڑی تھی۔ نظریں جھکی تھیں۔ سردار مراد خاں غمار آلود نظروں سے قصائی کی طرح جیداں کے بدن کا انگ انگ نڈول رہا تھا، پرکھ رہا تھا۔

احسان شاہ نے شاہانی کی بھوکی نظروں پر توجہ نہ دی۔ مڑ کر شیدا کو دیکھا۔ ”شیدے! یہ اتنی دلی پتلی کیوں ہے؟ تو اسے کھانے کو روٹی نہیں دیتا۔“

شیدا نے دلی زبان سے بتایا۔ ”اے آئے ہوئے جی، وہ ہی مہینے ہوئے ہیں۔ میں رتے سے کموں گا، اسے کھانے کو ٹھیک طرح روٹی نکر دے۔ وہی ان کی انچارج ہوتی ہے جی۔“

”رتے کہاں ہے؟“ احسان شاہ نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”وہ کیوں نہیں آئی۔ کدھر ہے وہ؟“

”شاہ جی! شیدا اگر گزرا نہ لگا۔“ اس کے سر میں شام ہی سے سخت درد ہے۔ اوپر چوبارے میں پڑی ہائے کر رہی ہے۔ ”شیدا نے زینے کے اوپر پنی ہوئی مٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں پہلے اسی کے پاس گیا تھا۔ پر اسے تو کھار بھی ہے۔“

احسان شاہ نے رتے کے بارے میں مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ وہ آگے بڑھنے لگا۔ لیکن شاہانی اپنی جگہ جما کھڑا رہا۔ احسان شاہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے ٹوکا۔ ”شاہ جی! ذرا اسے ٹھیک سے دبو لینے دے۔“ وہ جیداں کو چبھتی ہوئی نظروں سے گھور رہا تھا۔ مسکرا کر احسان علی شاہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”سیس شاہ جی! میں تو کہتا ہوں، آج رات یہی چلے گی۔“

”تو یہیں پر گیا۔ اسی کو بلوالینا۔ پر آگے چل کر تو دیکھ۔ تو کوٹ میں میرا حرم دیکھنے آیا ہے ناں؟

برہت مدت کے بعد ادھر آیا ہے۔ پوری طرح دیکھ بھال لے۔ فیڑے کرنا۔“

شاہانی نے اصرار نہ کیا۔ تینوں آگے بڑھ کر دوسری کونھری پر پہنچے۔ اس کونھری میں بھی ایک جوان عورت خوب سنگھار کیے بیٹھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ کر کھڑی ہوئی تو اس کا پھولا ہوا پیٹ ناف نظر آنے لگا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا۔ ”سیس! یہ تو پہلے ہی گنبدن ہے۔ اس سے کیا لینا۔ آگے بڑھ شاہ۔“

احسان شاہ آگے بڑھا۔ شاہانی اور رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ شیدا بھی ان کے ہم راہ لالین سنبھالے آگے آگے چل رہا تھا۔ تیسری کونھری میں جو عورت تھی، وہ دلکش اور طرح دار فی۔ رنگت تو سانولی تھی مگر آنکھیں ایسی خوبصورت تھیں کہ ان میں ستارے جھلکاتے تھے۔ شاہانی اسے دیکھ کر پھڑک اٹھا۔ اس نے گرسنہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ مگر فوراً ہی اس نے بے ارادی سے منہ بگاڑا۔

”یہ تو دھری! گنتی ہے۔“

عورت کی ابھری ہوئی چھاتیوں سے دودھ بہہ بہہ کر اس کے کرتے کے گریبان اور بالائی حصے کو لپٹا کر رہا تھا۔ وہ سر جھکا کر بوتری کی مانند سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ کونھری کے عین سامنے برآمدے میں کچھی ہوئی چارپائی پر دو کم سن بچے سو رہے تھے۔ چھوٹا بار بار کلبلاتا۔ بے چین ہو کر ادھر ادھر تھ پاؤں مارتا۔ وہ ماں کو تلاش کر رہا تھا اور اس کی ماں چراغ کی پیلی پیلی روشنی میں اس طرح پپ چاپ کھڑی تھی کہ نگاہیں زمیں میں گڑی تھیں اور دل زور زور سے دھڑکتا تھا۔

رحیم داد بدستور خاموش رہا۔ شاہانی بولا۔ ”شاہ جی! آگے بڑھ۔“

تینوں آگے بڑھے۔ اگلی کونھری میں جو عورت تھی، وہ بھی بھرپور جوان تھی مگر اس کے چہرے پر زردی چھائی تھی۔ وہ بیمار تھی۔ ماتھے کے گرد دوپٹہ لپیٹے ہوئے تھی۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ اس کا اظہار آنکھوں میں منڈلاتی ہوئی بے چینی اور اضمحلال سے ہوتا تھا۔

احسان شاہ کے چہرے سے جھنجھلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے قہر آلود نظروں سے شیدا کو دیکھا۔ نیچے لہجے میں پوچھا۔ ”نوری کدھر ہے؟“

”وہ آگے ہے جی۔“ شیدا نے خوف زدہ ہو کر آہستہ سے بولا۔

”اور رانو کہاں ہے؟“

شیدانے مستعدی سے جواب دیا۔ ”وہ بھی آگے ہے جی۔“
 مردار خاں شاہانی نے ہنس کر کہا۔ ”سین شاہ جی! جلدی کیا ہے۔ انھیں بھی دیکھ لیں گے۔“
 احسان شاہ کچھ نہ بولا۔ اس کا چہرہ غصے اور جھنجھلاہٹ سے متمایا ہوا تھا۔ تینوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور ہر کوٹھری پر رکتے رہے۔ انھوں نے آٹھ کوٹھریاں دیکھیں مگر کوئی عورت احسان شاہ کی نظروں میں نہ آئی۔ اس کی آنکھوں سے بے قراری جھلک رہی تھی۔ شاہانی کی نگاہوں میں ابھی تک جیداں گھوم رہی تھی۔ کسی اور میں اس نے دلچسپی اور رغبت کا اظہار نہ کیا۔

انھوں نے مزید کوٹھریاں دیکھیں۔ مگر احسان شاہ کی چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کم نہ ہوئی۔ بے چینی سے کسی نوجوان عورت کو تلاش کر رہا تھا۔ اور وہ ہنوز نظر نہ آئی تھی۔ ایک کے بعد دوسری کوٹھری کا دروازہ آتا اور ہر دروازے کی دہلیز کے پاس بناؤ بنگھار کئے ہوئے کوئی نوجوان عورت نظر آتی۔

احسان شاہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہوا ایک دروازے پر ٹھکا اور جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ہونٹوں پر تبسم بکھر گیا۔ سامنے چراغ کی روشنی میں ایک عورت پتھر کے ترشے ہوئے مجسمے کی مانند استادہ تھی۔ کھلتی ہوئی سرمئی رنگت، آنکھیں روشن، بال گھنے اور چمکیلے، کولے چوڑے۔ وہ بھرپور جوان تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گداز تھا۔ ناک میں فیروزے کا کوکا تھا۔ ہونٹ قدرے موٹے تھے اور ان کے بالائی حصے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے جھلملا رہے تھے۔
 احسان شاہ نے نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں مراد خاں شاہانی سے کہا۔ ”لے بھی شاہانی! یہ رہی راتو۔“ وہ کوٹھری کے اندر داخل ہو گیا۔ لڑکھاتے قدموں سے راتو کے پاس گیا۔ ہولے سے اس کے رخسار میں چنگی بھری۔ راتو نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر مسکراتے ہوئے احسان شاہ کو ایک خاص ادا سے دیکھا۔

احسان شاہ نے اونچی آواز سے شاہانی کو مخاطب کیا۔ ”شاہانی! بول کیا کہتا ہے؟“
 ”کہنا کیا ہے، ایک دم فٹ کلاس ہے۔“ شاہانی نے تقہم لگایا۔
 احسان شاہ کوٹھری سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔ ”آگے بھی دیکھ لے۔“
 تینوں آگے کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ وہ ہر کوٹھری میں بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتے پرتے آگے بڑھتے گئے۔ ایک کوٹھری کے دروازے پر رک کر احسان شاہ نے شیدا سے پوچھا۔

”شیدے! یہ نوران ہے ناں؟“
 نوران کا نام سن کر رحیم داد ٹھکا۔ اسے اپنی بیوی نوران یاد آگئی۔ اس نے دھڑکتے دل اور سنی

نظروں سے کوٹھری میں مونچ کی چٹائی پر بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھا۔ وہ فوراً اپنا لاچا سنبھالتی لہجہ کرکھڑی ہو گئی۔ مگر وہ رحیم داد کی نوران نہ تھی۔ اس کی بیوی کی طرح خوبصورت اور طرح بھی نہ تھی۔ مگر یہ نوران بھی بری نہ تھی۔ رنگت اجلی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور گہری سیاہ تھیں۔ لیکن رحیم داد کو اس کا کسا ہوا سڈول جسم زیادہ پسند آیا۔

رحیم داد نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا نوران کو دیکھتا رہا۔ جب تینوں اس کوٹھری کے بازے سے آگے بڑھے تو رحیم داد نے چلتے چلتے مڑ کر نوران کو ایک بار پھر دیکھا۔ اس کے نڈوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ نشے میں ڈوبی ہوئی آنکھوں میں چراغ جھلملا رہے تھے۔

احسان شاہ نوری کی کوٹھری پر رکا۔ اندر گیا۔ نوری کے رخسار میں اس نے پیار سے چنگی بھری۔ لایا اور باہر آگیا۔ آگے بڑھا۔ اس نے نوری کے بجائے اپنے لیے ر۔ شمش کو پسند کیا۔ اسے سال قبل اٹھوا کر کوٹ میں لایا گیا تھا۔ یہیں اس کے دو بچے بھی ہوئے۔ دو پہلے بھی تھے جو اس ہوشہر کے پاس تھے۔ لیکن ر۔ شمش پر چار بچوں کی ماں ہونے کے باوجود پھین تھا۔ اس کا لالچا ہلکا تھا اور قمیص گہری سرخ تھی۔ ہونٹوں پر سرخی تھی اور آنکھوں میں کاہل تھا۔ احسان شاہ کو یہی اس نے اپنا لالچا اشتعال انگیز انداز میں ایک ہاتھ سے سنبھالا اور گردن کو ذرا سا خم دے کر آئی ہو گئی۔ اس نے ترچھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ مسکرا کر اس طرح شرمائی کہ احسان دتھپ اٹھا۔ جھومتا جھومتا اس کی جانب جھپٹا۔ قریب گیا اور ر۔ شمش کو سینے سے لگا کر شیدا کی نب دیکھا۔

”شیدے! اسے میرے کمرے میں پہنچا دے۔“
 تینوں نے ۲۱ عورتیں دیکھیں۔ کچھ کوٹھریوں کے دروازے بند تھے۔ کچھ خالی تھیں۔ ان میں بننے والی عورتیں حویلی میں کام کاج کر رہی تھیں یا اس حالت میں نہیں تھیں کہ نمدھو کر اور بن کر احسان شاہ اور اس کے مہمانوں کے سامنے آسکیں اور ان کے خلوت کدوں کی زینت بن سکیں۔

کوٹ کی کوٹھریوں کا معائنہ کرنے کے بعد احسان شاہ نے چلتے چلتے رحیم داد سے دریافت کیا۔
 ”جودہری! تو نے اپنے لیے کوئی رن پسند نہیں کی؟“
 رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔
 احسان شاہ مسکرایا، اصرار کیا۔ ”جودہری! ایسے کام نہیں چلے گا۔ کھل کر بتا۔ کسے اپنے پاس ناچاہتا ہے؟“

رحیم داد اب چپ نہ رہ سکا۔ نشے سے جھوم کر بولا۔ ”نوراں میرے لیے ٹھیک رہے گی۔“
 ”نوراں!“ احسان شاہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”وہ کون سی تھی؟“ نشے کی جھومک
 میں نوراں کا نام احسان شاہ کے ذہن سے نکل گیا تھا۔

”شاہ جی! تجھے تو سب کے نام بھی یاد نہیں۔“ شاہابی ہنس کر بولا۔ ”یاد پڑتا ہے ان میں نوراں
 بھی تھی اور تو نے ہی اسے پہچانا بھی تھا۔“

”ہوگی“ ضرور ہوگی۔“ احسان شاہ کھلکھلا کر زور سے ہنسا۔ ”کس کس کے نام یاد رکھوں۔
 سوچتا ہوں“ ان کے لیے رجسٹر کھنا پڑے گا۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ شیدا کی جانب متوجہ ہوا۔
 ”نوراں کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دیتا۔“ اس نے مڑ کر مراد خاں شاہابی کی طرف دیکھا۔
 ”تو نے تو رانو کو پسند کیا ہے نا؟“

”پر جیداں کو ایک بار اور دیکھ لینے دے۔“ شاہابی نے نشے کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔
 مراد خاں شاہابی آگے بڑھا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ ”گل سن۔“ مگر شاہابی سنی ان سنی کرتے
 ہوئے جیداں کی کوٹھری کی جانب بڑھنے لگا۔ احسان شاہ نے شیدا کو اشارہ کیا۔ وہ ہاتھ میں لائین
 سنبھالے شاہابی کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں جیداں کے پاس پہنچے۔ وہ دروازے کی جانب پیڑ
 موڑے چراغ کی دھندلی روشنی میں مونچ کی چٹائی پر گم صم بیٹھی تھی۔

قدموں کی آہٹ سن کر جیداں نے مڑ کر دیکھا۔ دہلیز پر شاہابی کھڑا تھا۔ اس کے ہم راہ شیدا بھی
 تھا۔ جیداں ہڑبڑا کر اپنا چالا سنبھالتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں
 کا کاجل پھیل گیا تھا۔

شاہابی نے حیرت سے کہا۔ ”لگتا ہے تو رورہی ہے۔“
 جیداں خاموش کھڑی رہی۔ اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھللا رہے
 تھے اور پلکیں صاف بھیگی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ شاہابی نے اسے غماز آلود نظروں سے دیکھا۔ جھوم
 کر بولا۔ ”تو ضرور رورہی تھی۔ صاف صاف بتا۔ تو رورہی تھی نا؟“

”ہاں جی۔“ جیداں نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ ”مجھے اپنی کلی یاد آرہی ہے۔“ اس کی آنکھوں
 میں آنسو اٹھنے اور چھلک پڑے۔

شاہابی بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ پوچھا۔ ”کماں ہے تیری کلی؟“
 ”میرے گھر والے کے پاس ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے میری کلی سے ملو
 دے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔ شاہابی نے اس کی پیٹھ تپکتے

کہا۔ ”ضرور ملوایوں گا بلکہ اسے تیرے ہی پاس منگوا دوں گا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔
 ”اب تو ہنس دے۔“

ہاں مسکرائی اور جلدی جلدی آنسو پونچھنے لگی۔

سان شاہ بھی رحیم داد کے ہم راہ جیداں کی کوٹھری کے دروازے پر پہنچ گیا۔ شاہابی کو جیداں
 بے کھڑے ہوئے دیکھا۔ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ ”لگتا ہے، تجھے یہ زیادہ ہی پسند آگئی۔“

ہنس شاہ جی! اسی کو میرے پاس بھجوا دے۔“ اس نے احسان شاہ کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔
 ”شاہ نے مڑ کر شیدا کی جانب دیکھا۔ جیداں کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیسا نام ہے اس کا؟“

بدانے مستعدی سے جواب دیا۔ ”جیداں۔“

جیداں، جیداں۔“ احسان شاہ نشے کی ترنگ میں جیداں کے نام کی گردان کرنے لگا۔ پھر وہ
 یہ شیدا کو مخاطب کیا۔ ”شیدے! اسے شاہابی کے کمرے میں پہنچا دیتا۔“

پہنچا دوں گا جی، بالکل پہنچا دوں گا۔“ شیدا نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔

سان شاہ خاموش رہا۔ اس نے نہ جیداں کے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھا اور نہ ہی اس کی
 آنکھوں کے پھیلے ہوئے کاجل کی جانب توجہ دی۔ اس نے شاہابی کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ آہستہ
 آہستہ تھپ تھپایا اور اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ رحیم داد بھی آگے بڑھا۔

بڑوں برآمدے سے اتر کر آگن میں پہنچے۔ اسے عبور کیا۔ ڈیوڑھی میں داخل ہوئے۔ کوٹ کی
 اوپن فیصلوں سے باہر نکلے۔ پیریدار صند دروازے پر سر جھکائے ادب سے کھڑے تھے۔
 نے پیریداروں کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ دیوان
 خانہ کی جانب بڑھنے لگے۔



بدانے ڈیوڑھی کے دروازے ہی پر ٹھہر گیا۔ اسے ابھی کئی اہم کام انجام دینا تھے۔ رہنماں،
 ج اور نوراں کو علیحدہ کوٹھری میں اکٹھا کرنا تھا اور وہاں سے انھیں احسان شاہ، مراد خاں شاہابی

اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچانا تھا۔ ان کی اس وقت تک کڑی نگرانی بھی کرنا تھی جب تک وہ
 نہ ٹھکانوں پر نہ پہنچ جائیں۔ اسے ڈر تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ تینوں عورتوں میں سے کسی کو احسان

شاہ کوئی بیٹا پہلے ہی اچک لے جائے۔ احسان شاہ کے ایک دو نہیں پورے دس بیٹے تھے۔
 ”کاری ملازمتوں میں تھے اور اعلیٰ افسر تھے۔ ایک انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم حاصل کر رہا

تھا اس سے چھوٹا لاہور میں پڑھ رہا تھا۔ حویلی میں چھ بیٹے تھے مگر تین جوان ہو چکے تھے اور سن و

سال کے اعتبار سے کچھ پہلے ہی جوان ہو گئے تھے۔

احسان شاہ کے یہ تمام بیٹے صرف دو نکاحات ہیوں سے تھے۔ ویسے اس نے چار عورتوں سے باقاعدہ نکاح کیا۔ پہلی ٹائینائیڈ میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئی۔ اس سے احسان شاہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ تیسری سے چار بیٹیاں ہوئیں۔ وہ اولاد نہ دینے کے لیے سخت پریشان رہتی تھی۔ چھپ چھپ کر درگاہوں اور مزاروں پر حاضری دیتی۔ فتنیں مانتی۔ گڑگڑا کر دعائیں مانگتی۔ بیٹے کے ارمان میں ہر وقت سرگرداں رہتی۔ اسی ارمان میں وہ ایک پیر کے چکر میں آگئی۔ پیر کے ہجرے میں جاتی تو گھنٹوں اس کے ساتھ خلوت میں رہتی۔ حویلی کی ایک خادمہ، فیروزہ اس کی محرم راز تھی۔ مگر وہ احسان شاہ کی بھی منظور نظر تھی۔ اس نے احسان شاہ کو ایک روز تنہائی میں سب کچھ بتا دیا۔

اسے بیوی کی ان حرکتوں کا علم ہوا تو غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ یہ اس کی عزت و ناموس کا سوال تھا۔ اس نے ایک رات برا فروخت ہو کر بیوی کا اس طرح گلا گھونٹا کہ وہ مر گئی۔ احسان شاہ نے رازداری سے لاش ٹھکانے بھی لگا دی۔ لیکن پیر سے باز پرس کرنے یا انتقام لینے کی اسے جرات نہ ہوئی۔

اب اس کی دو مشکوہ بیویاں رہ گئیں تھیں۔ ان کے تین جوان بیٹے حویلی ہی میں رہتے تھے۔ مزارعوں اور کمیوں کی لڑکیوں اور بیویوں کے بارے میں ان کا رویہ اپنے باپ سے مختلف نہ تھا۔ احسان شاہ جن عورتوں کو اٹھوا کر کوٹ میں قید رکھتا، وہ اس کے تصرف میں بھی رہتیں اور اس کے نوجوان بیٹوں کے شہستانوں کی بھی زیئت بنتیں۔

شیدا حویلی کے ہر راز سے واقف تھا۔ وہ احسان شاہ کا نہایت قابل اعتماد اور منہ چڑھا ملازم تھا۔ مگر اس کے غصے اور خونخوار مزاج سے خائف بھی رہتا۔ کوشش کرتا کہ ہر کام احسان شاہ کی مرضی کے مطابق ہو۔ اگر اس رات احسان شاہ کا کوئی بیٹا، شہماں، جیداں یا نوران میں سے کسی کو بھی اپنے کمرے میں لے جاتا تو احسان شاہ بیٹے سے تو کچھ نہ کہتا مگر شیدا کی شامت آجاتی۔ لہذا شیدا پوری طرح چوکنا اور چوکس تھا۔ اس نے کوٹ سے باہر قدم ہی نہ نکالا۔ وہ ر-شہماں، جیداں اور نوران کو جلد سے جلد احسان شاہ، مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے کمروں میں پہنچانے کے بندوبست میں لگا رہا۔



احسان علی شاہ کوٹ سے نکل کر شاہانی اور رحیم داد کے ہم راہ ایک بار پھر دیوان خانے میں پہنچا۔ تینوں باغ میں نہ بیٹھے۔ اب وہاں خنکی تھی۔ اس بھی پڑ رہی تھی۔ وہ باغ سے ہلکے

برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رات کسی قدر گہری ہو چکی تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے سرسراتے ہوئے چلتے تھے۔ انھوں نے کچھ دیر وہسکی سے اور شغل کیا۔ اس عرصے میں نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ تینوں شراب نوشی سے فارغ ہوئے تو کھانے پر جٹ گئے۔ کھانا کھا کر وہ اپنے اپنے کمروں کی جانب چلے گئے۔

رحیم داد نے کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھولا۔ دیکھا نوران وہاں موجود ہے۔ وہ بستر کے ایک کونے پر پیر نیچے لٹکاے خاموش بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے غماز آلود نگاہوں سے اسے دیکھا اور لمحہ بھر تک غمگین باندھے دیکھتا رہا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کی بیوی، نوران، اپنے آشنا جمال دین، کو چھوڑ کر واپس آگئی ہے۔ وہ ڈمگاتے قدموں سے آگے بڑھا۔ اور نوران کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ نہ پلہ بولانہ کسمائی۔

رحیم داد بھی خاموش رہا۔ کئی لمحے گزر گئے۔ کمرے میں گہرا سکوت چھایا تھا۔ آخر رحیم داد نے خاموشی سے آکٹا کر بات چھیڑی۔ ”تیرا نام نوران ہے ناں؟“

”اوجھو!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ ایک بار پھر رحیم داد نے خاموشی کو توڑا، دریافت کیا۔ ”تیرا گھر والا ہے؟“

وہ رحیم داد کی جانب نظریں اٹھائے بغیر بولی۔ ”ہے تو جی۔“

”بچے بھی ہیں؟“

”دو ہیں جی۔“ نوران نے بتایا۔

رحیم داد نے اجنبیت کا احساس زائل کرنے کی غرض سے بات آگے بڑھائی۔ ”تو اسی پنڈ کی رہنے والی ہے؟“

”نہیں جی، میرا پنڈ تو ادھر ماڑی کبوتہ کے پاس ہے۔“ اس نے مغرب کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔

”میرا زمین دار تو میاں رحمان دٹو ہے۔“

”تو شاہ جی کے کوٹ میں کیسے آئی؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”شاہ جی تو تیرا

زمین دار بھی نہیں۔ فیرو کیسے ادھر پہنچی؟“

”یہ تو میں نول بھی پتہ نہیں۔“ نوران نے سادگی سے بتایا۔ ”میں نول تو جی اتنا یاد ہے۔ سویرے

بہت تر کے ٹی کرنے نیا مین گئی تھی۔ زمین پر بیٹھنے کے لیے جھکی تو کسی نے پچھے سے ہاتھ بڑھا کر

میرا منہ دالیا۔ وہ ۵ تھے۔ منہ پر منڈا سے باندھے ہوئے تھے۔ مجھے اٹھا کر زمیں دار کی ماڑی میں لے

گئے۔ کئی مہینے میں دٹو کی ماڑی میں رہی۔ فیرو ایک رات اس نے مجھے شاہ جی کے پنڈ پہنچا دیا۔ تب

سے جی میں یہاں ہوں۔“

”کتنے دن ہو گئے تیس نوں یہاں آئے ہوئے؟“

”اگلے جاڑوں میں جی پورے دو سال ہو جائیں گے۔“ وہ بچھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”میرے گھر والے کو تو سال بھر بعد پتہ چلا، میں ادھر پیراں والدہ میں ہوں۔ وہ ایک بار یہاں آیا بھی تھا۔“

”تجھے ملا تھا؟“ رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ناجی ناں۔ شاہ جی نے مجھے اس سے بالکل ملنے نہ دیا۔ اسے چار روز حویلی میں کیدی بنا کر رکھا۔ چھت سے الٹا لٹکا کر بہت پٹائی کی۔ فیر پتہ نہیں دوبارہ آیا، میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے، کیسا ہے؟ بچوں کے بارے میں بھی کچھ پتہ نہیں۔“

”یاد تو آتے ہوں گے۔“ رحیم داد نے غیر شعوری طور پر اس کے زخموں کو چھین دیا۔

نوراں تڑپ کر بولی۔ ”کیوں نہیں یاد آتے۔ جب بہت یاد آتے ہیں تو چپکے چپکے رو لیتی ہوں۔“ اس کی آواز گلو گھر ہو گئی۔ آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے بھلوانے لگے۔ رحیم داد نے اس کی جانب نہ دیکھا۔ بستر خاموش بیٹھا رہا۔

باغ میں کھلنے والی کھڑکی سے ہوا کے بے قرار جھونکے اندر آرہے تھے۔ رحیم داد اٹھا اور کھڑکی کے ایک پٹ کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ باغ میں گہرا سناٹا تھا۔ قریب ہی پھولوں سے لدی رات کی رانی منک رہی تھی۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ سونے والے سو رہے تھے، رات جاگ رہی تھی۔ خوشبو میں بے ہوئے جھونکے بار بار امنڈتی لہروں کی مانند آتے۔ رحیم داد گہری سانس بھرتا۔ نشے کا ریلارک رک کر آتا۔ رحیم داد کا سر ہر ریلے کے ساتھ جھومتا۔ قدم ڈمگماتے۔ آنکھوں میں چراغ جلتے بجتے۔ سیاہ پردے لہراتے۔ وہ دیر تک کھڑکی کا سہارا لیے جھومتا رہا۔ کھڑکی کا پٹ ساتھ نہ دے سکا تو اس نے چوکھٹ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

رحیم داد نے پلٹ کر نوراں کو دیکھا اور ٹکٹکی پاندھے دیکھتا رہا۔ نوراں نے بھی نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

”تو نوراں ہی ہے ناں؟“

وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ رحیم داد کا چہرہ دکنے لگا۔ آنکھیں نشے سے مدہوش ہو گئیں۔ وہ وارفتگی کے عالم میں جھومتا جھومتا نوراں کی طرف بڑھا۔ اب وہ تند اور تیز گولہ تھا جو اڈنے اور اڈ کر بکھرنے کے لیے بے تاب تھا۔

سویرے رحیم داد کی آنکھ کھلی تو نوراں موجود نہ تھی۔



سردار مراد خاں شاہانی اب جا چکا تھا۔

وہ پیراں والدہ میں پانچ روز قیام کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ مگر پانچ ہی روز میں وہ رحیم داد سے بہت ٹھٹھل مل گیا تھا۔ وہ بیٹ کے علاقے کا خاندانی جاگیردار تھا۔ لیکن رحیم داد نے اس میں خاندانی جاگیرداروں والا طغظ اور طمطراق نہ پایا۔ وہ یاروں کا یار تھا۔ ہنس کھ اور فراخ دل تھا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے زور دے کر رحیم داد کو اپنی جاگیر میں آنے اور چند روز قیام کرنے کی دعوت دی۔

مراد خاں شاہانی کے جانے کے بعد رات کی محفلیں قدرے سونی پڑ گئیں۔ بات یہ تھی کہ شاہانی بڑا زندہ دل اور یار باش تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ دبا کے شراب پیتا مگر مطلق نہ بہکتا جاگیرداروں اور بڑے زمیں داروں کی عام روایت کے مطابق عورت اس کی بھی کمزوری تھی اور اس حد تک تھی کہ اسے ہر عورت گوارہ تھی۔ اپنی اس کمزوری کو وہ چھپاتا بھی نہ تھا۔ نہایت دھڑلے سے بتاتا تھا۔ لاہور روانہ ہونے سے ایک روز قبل رات کو معمول کے مطابق دھسکی کا دور چل رہا تھا۔ شاہانی عورتوں کے بارے میں اپنے تجربات ہنس ہنس کر سناتا رہا تھا۔ بات کہتے کہتے اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا اور ایک آنکھ دبا کر بولا۔

”مرد کے بڑھاپے کی پہچان تو یہ ہے سیں، جب وہ بڑھی اور جوان، خوبصورت اور بد صورت دن میں فرک محسوس کرنے لگے تو سمجھو وہ بڑھا ہو گیا۔“

رحیم داد اس کی یہ منطق سن کر چونکا۔ حیرت سے بولا۔ ”نہیں جی یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ بھی اس وقت نشے کی ترنگ میں تھا۔ ٹھنھا مار کر ہنسا۔ ”ایسے گل اے تو یہ بتا تو رتختے کے ساتھ سو سکتا ہے؟“

”سو سکتا ہوں، ضرور سو سکتا ہوں۔“ مراد خاں شاہانی اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”آزما کے دیکھ لے۔“

احسان شاہ نے مداخلت کی۔ وہ سردار شاہانی کے مزاج سے بخوبی واقف تھا۔ مدت سے شناسائی تھی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! اس سے اڑی نہ کر۔“ وہ کھکھکلا کر زور سے ہنسا۔ ”یہ بہت خنزیر ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے شاہانی کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ”تو اسے نہیں ہانتا۔ یہ رتختے کے ساتھ بھی سو جائے گا۔“

پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ احسان شاہ اور رحیم داد باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے تھے۔ وہسکی کا درہ چل رہا تھا۔ احسان شاہ تحصیل دار کو دیکھتے ہی اٹھا اور بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ احسان شاہ نے تحصیل دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر رحیم داد سے کہا۔ ”یہ اپنی تحصیل کے تحصیل دار، منور خاں ہیں۔“ تحصیل دار کو اپنے روبرو بیٹھے دیکھ کر رحیم داد بدکا گھبرایا بھی۔ لیکن احسان شاہ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی سے بے نیاز کہتا رہا۔

”اور جی یہ کوئلہ ہر کشن کا زمیں دار، اپنا یار، نور الہی ہے۔“

شیدانے جھٹ گلاس میز پر رکھا۔ احسان شاہ نے گلاس میں وہسکی ڈالی۔ ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”جان پہچان کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔“ اس نے باری باری تحصیل دار اور رحیم داد کو دیکھا۔ ”جو کی رہ گئی ہے وہ تم دونوں ابھی خود ہی پوری کر لو گے۔“ اس نے پیگ بنا کر تحصیل دار کے سامنے رکھا اور بے تکلفی سے بولا۔ ”یار منور خاں! اب تو شروع ہو جا۔“ تحصیل دار نے گلاس اٹھا کر ہاتھ بلند کیا۔ مسکرایا، گلاس ہونٹوں سے لگایا اور فوراً شروع ہو گیا۔

تحصیل دار بھی بڑا یار باش اور زندہ دل تھا۔ رحیم داد کا ہم عمر بھی تھا۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی کمی پوری کر دی۔ ایک ہی رات میں وہ رحیم داد سے اس قدر مانوس اور بے تکلف ہو گیا کہ عورت کا انتخاب بھی اس نے رحیم داد کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ رحیم داد نے گریز کیا تو وہ سر ہو گیا۔ نشے میں جھوم کر بار بار شیدانے سے کہتا۔ ”شیدے! میرے لیے تو وہی آئے گی جسے چوہدری کہے گا۔“ احسان شاہ بے نیازی سے گھونٹ گھونٹ وہسکی پیتا رہا۔

اس کی ضد کے سامنے رحیم داد کو ہتھینار ڈالنا پڑے۔ شیدانے سے کہا۔ ”تحصیل دار کے لیے رانو کو لے آ۔“

شیدانے تھوڑی دیر بعد رانو کو لے آیا۔ اسے دیکھ کر تحصیل دار منور خاں بہت خوش ہوا اور اس قدر خوش ہوا کہ رانو کے بجائے بڑھ کر رحیم داد کا منہ چوم لیا۔ اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ جڑھا بھی زیادہ گیا تھا۔

تحصیل دار سویرے ہی سویرے پر نکل گیا اور شام تک نہ لوٹا۔ احسان شاہ اور رحیم داد حسب معمول وہسکی سے شغل کر رہے تھے۔ شام کی رنگت کالی ہوئی اور اندھیرا بڑھا تو تحصیل دار بھی آگیا۔ سیدھا باغ کے اس گوشے میں پہنچا جہاں احسان شاہ اور رحیم داد بیٹھے تھے۔ تحصیل دار منور خاں کے ہم راہ علاقے کا تھانے دار بھی تھا۔ وہ اس وقت دروی میں تھا۔

تھانے دار کو دیکھتے ہی رحیم داد کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ گلاس بھرا ہوا

رحیم داد کو پھر بھی یقین نہ آیا۔ کہنے لگا۔ ”نہیں شاہ جی! ایسا نہیں ہو سکتا۔“ اس نے شاہانی کی طرف مڑ کر دیکھا۔ ”شاہانی! تو نے رات کو دیکھا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ”شاہ جی! رات کو بلو الے۔ تب دیکھوں گا یہ اس کے ساتھ ہو سکتا ہے کہ نہیں۔“

”شاہ جی! بلو الے! اسے ابھی بلو الے۔“ شاہانی کے رویے میں مطلق فرق نہ آیا۔ وہ زندہ دل سے مسکراتا رہا۔ احسان شاہ نے منع بھی کیا۔ مگر شاہانی باز نہ آیا۔ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ ”یہ شاہ جی! تو رات کو بلو الے۔ میری خاطر بلو الے۔“

احسان شاہ نے شیدانے کو بلایا۔ اس سے کہا۔ ”رات کو یہاں لے آ۔“ شیدانے خاموشی سے مڑا اور برآمدے سے چلا گیا۔ واپس آیا تو رات کو اس کے ساتھ تھی۔ وہ دھلی عمر کی پستہ قد عورت تھی۔ جسم پھیلا ہوا تھا۔ رنگت گہری سانولی تھی۔ چہرہ چوڑا چکلا اور گوشت سے بھرا ہوا تھا۔ ناک بھونڈی اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک رخسار پر بڑا سا مساکھا۔ بال خوب گھنے اور سیاہ تھے۔ جن میں کہیں کہیں سے سفیدی جھلکتی تھی۔ وہ کم رو بھی تھی اور سن بھی چالیس سے اوپر ہی تھا۔ وہ اس وقت میلے کچیلے کپڑے پہنے تھی جن سے پسینے کی تیز بو اٹھتی تھی۔

سردار شاہانی نے نظر بھر کر رات کو دیکھا۔ قہقہہ مار کر ہنسا۔ احسان شاہ کو مخاطب کیا۔ ”شاہ جی! تو نے یہ سانول دانا کہاں چھپا رکھا تھا۔“ یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہسکی سے بھرا ہوا گلاس ہونٹوں سے لگایا اور غناغٹ چڑھا گیا۔ اس نے خالی گلاس میز پر رکھا۔ رات کو کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا اور اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رات کو کے پھولے پھولے گالوں کو انگلیوں سے پکڑ کر ہولے ہولے ہلایا۔ بے تکلفی سے ہنسا۔

”میں صد کے دنجال۔“ اور رات کو کے بازو میں بازو ڈال کر بولا۔ ”ادھر آ دل جانی۔“ رات کو کے پہلو میں کسمائی۔ شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ ”خزا شکرا چھوڑ۔ رتاں دے چالے نہ کر۔ سدھی سدھی چل۔“ شاہانی نے ہولے سے شو کا دیا اور رات کو کے سہارے ڈنگا تے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بڑھنے لگا۔

رحیم داد حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ احسان شاہ بے نیازی سے میٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔

اس واقعے کے دوسرے ہی روز شاہانی چلا گیا۔ مگر رحیم داد ٹھہرا رہا۔ تیسرے روز تحصیل دار آگیا۔ وہ سرکاری دورے پر نکلا تھا۔ لیکن اس کا قیام احسان شاہ کی حویلی میں رہا۔ تحصیل دار جب

رحیم داد کبھی اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا۔ کبھی ہولے سے رخسار میں چٹکی بھرتا۔ کبھی پیار سے اس کا سراپنہ سینے سے لگا لیتا، چھیڑ چھاڑ کرتا۔ ہنستا، قہقہے لگاتا اور ہر رات نوراں کو بانچ روپے دیتا۔ کبھی وہ روٹھ جاتی تو مٹاتا۔ مضحل اور پریشان نظر آتی تو اس کی دل جوئی کرتا۔ نوراں میں رحیم داد کی بوھتی ہوئی دلچسپی دیکھ کر ایک شام وہسکی کا گھونٹ بھرتے ہوئے احسان شاہ نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔

”چوہدری! تجھے نوراں بہت پسند ہے تو اسے ساتھ لے جا۔“

مگر رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔ ”شاہ جی! میں تو یہ بھی نہیں چاہتا کہ جیلہ کو یہ پتہ چلے، میں تیرے پاس ٹھہرا تھا۔ نوراں پہنچ گئی تو جیلہ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ تیس نوں پتہ ہی ہے، میں ہمیشہ اس سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ ”پر جیلہ سے تو اس طرح کب تک ڈرتا رہے گا؟“

”شاہ جی! تو نے ہی تو مشورہ دیا تھا کہ جلد بازی سے کام نہ لے۔“ رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ ”اب خود ہی کہہ رہا ہے کہ ڈرنے سے کام نہیں چلے گا۔ میں تیری کون سی گل ٹھیک سمجھوں۔“

”میرا کمان، تو یہاں سے جاتے ہی جیلہ کو کابو کرنے کی کوشش کر۔“ احسان شاہ نے آنکھ مار کر کہا۔ ”وہ رن ہے اور جوان بھی ہے۔ میں نے تو نہ جانے کتنی ٹیڑھی زنانیوں کو سیدھا کر دیا۔“

اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”جیلہ تیرے کابو نہ آئے تو میرے پاس بھیج دے۔ منہ زور اور اڑیل گھوڑی کو جیسے سدھایا جاتا ہے، ویسے ہی اسے بھی ٹھیک ٹھاک کر دوں گا۔ ایک دم لائن پر آجائے گی۔ کیا سمجھا؟“

مگر رحیم داد نے اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھنے کی کوشش نہ کی۔ اس کی حوصلہ افزائی سے گریز کیا۔ نہایت سنجیدگی سے بولا۔ ”فکر نہ کر شاہ جی، وہ کابو آجائے گی اور تو دیکھ لیتا جلد ہی آجائے گی۔ میں نے اسے رکھیل بنا کر نہیں رکھنا۔ گھر والی بنا کر رکھوں گا۔ ملاں کو بلا کر باقاعدہ نکاح پڑھواؤں گا۔“

”یہ ضروری بھی ہے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ ساتھ ہی مشورہ بھی دیا۔ ”پوری نسل داری اب تیرے ہی پاس ہونی چاہیے۔ ویسے بھی تو جوان ہے۔ تجھے ایک زنانی کی ضرورت بھی ہے۔ جیلہ بہتے چھ گنی تو عیش ہو جائیں گے تیرے۔“ احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ رحیم داد بھی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔

نہ تھا ورنہ جھٹک پڑتا۔ لیکن تھانے دار نے رحیم داد پر کوئی توجہ نہ دی۔ بیٹھے ہی ڈیکٹی کی ایک واردات کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس میں گاؤں والوں نے جم کر ڈاکوؤں سے مقابلہ کیا تھا۔ اور انھیں فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر گاؤں کا ایک نوجوان ڈاکوؤں کی اندھا دھند فائرنگ سے ہلاک بھی ہو گیا تھا۔ تھانے دار اسی واردات کی تفتیش کے بعد لوٹا تھا۔

تھانے دار ڈاکے کی واردات کے بارے میں ایک ایک تفصیل احسان شاہ کو سناتا رہا اور رحیم داد سہما ہوا خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے تحصیل دار اور تھانے دار کے سامنے بوتل کے ساتھ دو گلاس بھی رکھ دیئے۔ دونوں نے خود ہی اپنے لیے پیگ تیار کیے اور گلاس ہونٹوں سے لگا کر ایک ایک گھونٹ بھرا۔

وہسکی کا دور چلتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہونے لگیں۔ حجابات اٹھے لگے۔ مخلفات منٹے گئے۔ قہقہے بلند ہونے لگے۔ نشہ چڑھا اور تیز ہوا تو سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے۔ فاصلے قربتوں میں بدل گئے۔ رحیم داد کے ذہن پر چھایا ہوا خوف اور خطرے کا احساس رنہ رنہ زائل ہوتا گیا۔ وہ بھی گنگو میں حصہ لینے لگا اور پھر ایسا مرحلہ آگیا کہ احسان شاہ اور تحصیل دار منور خاں کی طرح وہ تھانے دار سے بھی مانوس اور بے تکلف ہو گیا۔

شعل بادہ نوشی سے جب چاروں فارغ ہوئے تو رات بیگ چلی تھی۔ رحیم داد اور تھانیدار ایک دوسرے کے اس قدر زیادہ قریب آچکے تھے کہ ہنس ہنس کر بے دھڑک باتیں کرتے تھے۔ مگر رحیم داد نے نشے میں چور ہونے کے باوجود تھانے دار سے اللہ وسایا کے قتل کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ احسان شاہ نے بھی اس سلسلے میں اجتناب برتا اور تھانے دار نے بھی اس کا ذکر نہ چھیڑا۔



تھانے دار نے صرف رات بھر حویلی میں قیام کیا۔ وہ سویرے اٹھ کر چلا گیا۔ البتہ تحصیل دار منور خاں چار روز ٹھہرا۔

رحیم داد نے دو ہفتے سے بھی زیادہ عرصے تک قیام کیا۔

دن کا بیشتر حصہ وہ سو کر گزارتا۔ شام ہوتے ہی احسان شاہ کے ساتھ مے نوشی کرتا۔ ہر رات نوراں کو اپنے کمرے میں بلوا لیتا۔ وہ رحیم داد سے خوش بھی تھی۔ ہر رات خوب بن سنور کے ان کے پاس آتی۔ رحیم داد نشے سے جھومتا جھومتا کمرے میں داخل ہوتا تو وہ ہنستی مسکراتی اٹھ کر کھڑی ہو جاتی۔ آگے بوھتی اور جھٹ رحیم داد کا بازو تھام لیتی۔ اسے سہارا دے کر بستر پر لاتی اور اس کے پیلو میں سمٹ کر بیٹھ جاتی۔

اسی طرح بننے، قہقہے لگاتے اور وہسکی کی چسکی لگاتے سترہ روز گزر گئے۔



”ہاں اس بار بھی تیری گھروالی اور بچے نہیں ملے۔ سلامت نے تجھے غلط اطلاع دی تھی؟“
”نہیں، اس نے ٹھیک ہی اطلاع دی تھی۔“ رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کے
اتھ ساتھ لمبے میں بھی رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”میری گھروالی، رابعہ، تخت محل ہی میں
بچے بھی اس کی ساتھ ہیں۔“

”پر وہ تیرے ساتھ آئی کیوں نہیں؟“
رحیم داد کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ”وہ اب میرے پاس نہیں آسکتی۔“
”وہ تیرے پاس کیوں نہیں آسکتی؟“ جمیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”ایسا کیوں
ہے؟ صاف صاف بتا۔“

”صاف گل سنتا چاہتی ہے تو وہ بھی سن لے۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ چند لمحوں
میں اٹھائے چپ چاپ دیوار کو تکتا رہا۔ اس نے جمیلہ کی طرف نہ دیکھا۔ کھوئے کھوئے انداز
کا آہستہ سے کہا۔ ”وہ اب کسی اور کی ہو چکی ہے۔ اس نے ایک پٹواری سے ویاہ کر لیا ہے اور
ن بات کو بھی تین سال سے اوپر ہو چکے ہیں۔ پٹواری سے اس کے دو بچے بھی ہیں۔“ اس نے مڑ
رافرہ نگاہوں سے جمیلہ کو دیکھا۔ ”زمیں دارنی! تو ہی بتا، اب وہ میرے ساتھ کیسے رہ سکتی
ہے۔“

”پر اس نے ایسا کیوں کیا؟ تیرا انتظار بھی نہ کیا۔“ جمیلہ کا لہجہ بھی دکھ بھرا تھا۔
”پانچ سال تک رابعہ میرا انتظار کرتی رہی۔“ رحیم داد نے بوجھل لمبے میں رک رک کر بتایا۔
”بچوں کو ساتھ لیے جگہ جگہ مجھے ڈھونڈتی رہی۔ زیور بیچ کر اور گھروں میں کام کاج کر کے کسی
کسی طرح اپنا اور بچوں کا پیٹ پالتی رہی۔“ رحیم داد بانپنے کے اندامیں گہری گہری سانسیں بھر رہا
ا۔ ”جب بہت پریشان ہو گئی اور میرے ملنے کی کوئی آس نہ رہی، تب یہ سوچ کر کہ میں بھی
برے مسلمانوں کی طرح فسادات میں مارا گیا، اس نے مجبور ہو کر پٹواری سے نکاح پڑھوا لیا۔ وہ
ن کی دوسری گھروالی ہے۔ پہلی مدت ہوئی مر گئی۔“

”تجھے یہ ساری گل بات کیسے معلوم ہوئی؟“
رحیم داد نے بتایا۔ ”میں دو ہفتے تک تخت محل میں سلامت کے ایک یار کے ساتھ ٹھہرا رہا۔
ابو سے کسی نہ کسی طرح ملنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک رات جب پٹواری بھاؤں مگر گیا تھا میں
پٹے سے اس کے گھر میں گھس گیا۔ رابعہ نے مجھے دیکھا تو حیران رہ گئی۔ دیر تک اسے دیکھتا ہی نہ
دیکھتا میں زندہ ہوں۔“

رحیم داد حویلی اسٹیشن کے راستے واپس کو ملہ ہر کشن پہنچا۔ وہ اسی راستے سے احسان شاہ کے
پاس پیراں والہ آیا تھا۔ گاؤں میں پہنچ کر اس نے تانگا حویلی کے چھانک پر رکوا لیا۔ نوکروں سے
سامان اتروایا اور سیدھا حویلی کے اندر چلا گیا۔ احمد اسے ایک کمرے میں لے گیا۔ کمرہ صاف سترا
تھا اور کشادہ بھی تھا۔ کمرے میں دو بلیک بچے تھے۔ ان پر ابلے بستر لگے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں
پر ہلکے سبز رنگ کے پردے لہرا رہے تھے۔ وسط میں بڑی سی گول میز تھی۔ اس پر رکھے ہوئے گل
دان میں تازہ پھول منک رہے تھے۔

احمد نے بتایا کہ کمرے کی صفائی اور اس کی آرائش جمیلہ نے اپنی نگرانی میں کرائی ہے۔ اسی کی
ہدایت پر ہر صبح گل دان میں تازہ پھول لگائے جاتے۔ جھاڑ پونچھ کی جاتی۔ وہ ہر روز بے چینی سے
رحیم داد کی واپسی کا انتظار کرتی۔ مگر وہ اس وقت اسکول میں تھی۔ رحیم داد کے جانے کے چند ہی
روز بعد اس نے اسکول میں بچوں کو پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

مہمان خانے کی طرح اس کمرے کے ساتھ بھی کوٹھری تھی۔ رحیم داد نے کوٹھری کا دروازہ
کھولا۔ دیکھا، اس کا سامان مہمان خانے سے لا کر کوٹھری میں حفاظت کے ساتھ رکھ دیا گیا ہے۔
کمرے کا ایک دروازہ لمحوں کے میں کھلتا تھا۔ رحیم داد اس کمرے میں گیا۔ اس میں بھی دو بلیک
بچے تھے۔ ان پر بھی بستر لگے تھے۔ دروازے اور کھڑکیوں پر پردے بھی پڑے تھے۔ یہ کمرہ دیکھتے ہی
رحیم داد سمجھ گیا کہ وہ بچوں کے قیام کے لیے ہے۔ اس کی صفائی اور آرائش بھی جمیلہ کی نگرانی ہی
میں کی گئی تھی۔

رحیم داد کمرے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ رحیم داد سفر کی تکان سے
نڈھال ہو رہا تھا۔ کپڑے گرد آلود تھے۔ چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ مگر اس نے غسل نہ کیا۔
چپ چاپ بیٹھا جمیلہ کا انتظار کرنے لگا۔

شام کا اندھیرا پھیلنے ہی جمیلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ لیکن دلمیز ہی پر رک گئی۔ اس نے گہرائی
ہوئے لمبے میں دریافت کیا۔ ”جوہد ری! تو بھابی کو نہیں لایا۔ بچے کدھر ہیں؟“
رحیم داد نے پہلے سے سوچے منصوبے کے تحت کوئی جواب نہ دیا۔ منہ لٹکائے خاموش بیٹھا رہا۔
جمیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہی
تھی۔ چند لمحوں خاموش رہنے کے بعد اس نے بلی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”جب اسے دشواری ہو گیا تو اس کا گھروالا چوہدری نور الہی ہے، تب اس نے کیا کیا؟“ جمیل نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

”وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دیر تک آنسو بہاتی رہی۔“ رحیم داد نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ہولے سے آہ بھری۔ ”اس نے رو رو کر مجھے اپنی چٹا سنائی۔“ اپنی بات کتے کتے وہ ٹھنڈا ”کیا کیا جائے اپنے نصیب ہی میں اس طرح مل کر پھڑنا لکھا تھا۔ مگر گھرایا اجزا کہ اب اس کے دوبارہ بسنے کی کوئی امید نہیں۔“

”ہاں تیری طرح نہ جانے کتنوں کے گھر اسی طرح اجڑ گئے۔“ جمیل کی آواز بھرا گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جمیل بھی چپ ہو گئی۔ اس نے آنکھوں میں اٹھتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کی۔ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”تو اپنے بچوں سے بھی ملا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”انہیں صرف نزدیک سے دیکھا تھا۔ وہ اس وکت سو رہے تھے۔ میں نے انہیں جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اب تو اتنے دن بیت گئے کہ وہ مجھے پہچان بھی نہ پاتے۔“ اس نے جمیل کی طرف غم زدہ نظروں سے دیکھا۔ ”زمین دارنی! ویسے انہیں تو یہی پتہ ہے ان کا پوچھا ہے۔ ماں نے ان کو یہی بتا رکھا ہے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اٹھ سال میں سب کچھ بدل گیا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ ایک بیٹی تو جوان ہو چکی ہے۔“ ”چوہدری! تو ایسا کر جو ان دھمی کو میاں لے آ۔“ جمیل نے مشورہ دیا۔ ”میاں رہے گی تو تجھے بھی آرام ملے گا۔ ٹھیک ٹھاک ور مل جائے تو اس کا ویاہ کر دیتا۔“

”رابعہ اس کے لیے تیار نہ ہوگی۔“ رحیم داد نے فوراً بات بتائی۔

”کیوں نہیں تیار ہوگی؟“ جمیل نے قدرے تھکے لہجے میں کہا۔

”میں تو صرف ایک بیٹی کو نہیں، سب بچوں کو اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”میری یہ بات سن کر رابعہ رونے لگی۔ سکلیاں بھر کر بولی۔ انہیں مجھ سے الگ نہ کر۔ میں نے بہت دکھ جھیل کر انہیں پالا پوسا ہے۔ انہی کے سارے تو میں اب تک زندہ رہی۔ تین نوں ان سے کیا لینا۔ تو انہیں بھی میری طرح مرا ہوا سمجھ کر صبر کر چکا تھا۔ آگے بھی صبر کر لے۔ اس کی باتیں سن کر میں چپ ہو گیا۔ کربھی کیا سکتا تھا۔ چوری سے چھپ کر تو اس کے گھر میں گیا تھا۔“

”پر یہ تو کوئی گل بات نہ ہوئی۔“ جمیل اپنی بات پر بدستور اڑی رہی۔ ”سب نہیں، وڈی کڑی تو تو وہ دے ہی سکتی ہے۔ اس میں اس کا بھی لاجھ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو رابعہ کو بیٹی کا ویاہ کرنا ہی ہوگا۔ وہ ہر طرح کی چٹا سے بچ جائے گی۔“

”وہ یہ بات نہیں سمجھتی۔“

”تو مجھے رابعہ کے پاس لے چل۔ میں اسے راضی کر لوں گی۔“

”نہیں زمیں دارنی! تیرا وہاں جانا ٹھیک نہیں۔ ویسے بھی تو عدالت میں ہے۔ تو کیسے تخت محل کئی ہے؟“ رحیم داد نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تیرے بارے میں رابعہ کو کچھ نہیں پایا۔ تجھے دیکھ کر جانے وہ کیا سوچے۔“

”سوچنے دے۔ اس کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔“ جمیل نے بے نیازی سے کہا۔ ”تو اپنی بتا۔

”یہ کیا مرضی ہے؟“

”پہلے مجھے کوشش کر لینے دے۔ فیر تو کوشش کرنا۔“ رحیم داد نے جمیل کو دلاسا دیا۔ ”میں کچھ دن بعد دوبارہ تخت محل جاؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ جمیل نے مزید اصرار نہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد سے مخاطب

کر بولی۔ ”چوہدری! اب تو اٹھان کر لے۔ تھکا ہوا بھی ہے۔ روٹی کھا کر آرام سے سو جا۔“

جمیل چلی گئی۔ رحیم داد بہت خوش اور مطمئن تھا کہ جمیل نے اس کی ہر بات پر یقین کر لیا۔ کسی ی خیلے بہانے پر اس نے مطلق شک و شبہ کا اظہار نہ کیا۔ وہ جمیل کی ہمدردی حاصل کرنے میں بری طرح کامیاب رہا تھا۔ ساتھ ہی احسان شاہ کے پاس جانے اور اس کی حویلی میں گل چھرے لانے کا موثر بہانہ بھی ہاتھ آ گیا تھا۔

سویرے رحیم داد نے حویلی کے نائی کو بلوایا۔ ویسے اسے نائی کو بلوانے کی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ہر جمعہ کی صبح وہ نہایت باقاعدگی سے رحیم داد کی حجامت بنانے پہنچ جاتا۔ مگر پچھلے سترہ روز کی برحاضی نے اس معمول میں خلل پیدا کر دیا تھا۔ نائی آیا اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے سائے تراشے۔ تیل ڈال کر دیر تک سر کی مالش کی۔ رحیم داد نے اس روز بالوں کی تراش خراش اس سحر کرائی کہ ڈاڑھی ہلکی اور قدرے مختصر ہو گئی۔

حجامت سے فارغ ہونے کے بعد اس نے غسل کیا۔ ابلے کپڑے پہنے۔ ڈاڑھی اور سر کے بالوں کو لکھنوی کی۔ اور جب بن سنور کر حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا تو نادر خاں وہاں پہلے سے موجود تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ ادب سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو غور سے دیکھا، مسکرا کر بولا۔

”چوہدری! سچی بات یہ ہے کہ اب تو تجھ پر بہت شان آگئی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی خوش نودی کے لیے خوشامد سے کام لیا۔ مگر اس خوشامد میں بڑی حد تک صداقت بھی تھی۔ رحیم داد اس وقت اصلا جیہ اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ اس کی رنگت نکھر کر اجلی ہو گئی تھی۔ رخساروں سے سرخی جھلکتی

تھی۔ وہ قدر آور جوان تھا۔ دبے پتلے لمبے جسم پر گوشت چڑھنے اور بڑھنے سے زیادہ ہی چٹنے لگا تھا۔ رحیم داد نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے نادر خاں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خاموشی سے اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرنے لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور دبذبہ تھا۔ عینک کے شیشوں کے پیچھے اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔ احسان شاہ کی صحبت میں رہ کر وہ جاگیرداروں اور رئیسوں کے طور طریق کسی قدر سیکھ گیا تھا اور انھیں اپنا بھی چکا تھا۔

نادر خاں زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ دہلی زبان سے بولا۔ ”اجازت ہو تو جی ایک بات کہوں؟“

”کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“ رحیم داد ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا۔

”جیسے کا یہ فریم ٹھیک نہیں لگتا جی۔“ نادر نے رحیم داد کی آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے تو بدل دینا چاہیے۔“

”اس میں تیس نوں کیسہ خرابی نظر آئی ہے؟ ویسے تیرے خیال میں کیسا فریم ہونا چاہیے؟“

”چوہدری! یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ ویسے تو یہ کپڑے بھی تیری شان کے مطابق نہیں لگتے۔ اور سے میرا ایک بھتیجا آیا ہے۔ شام کو واپس جا رہا ہے۔ وہاں ایک راشن ڈپو پر نوکری کرتا ہے۔ وہ لہور سے تیرے لیے عمدہ فریم کا چشمہ بنا کر اور نئے کپڑے سلوار کر لے آئے گا۔ مجھے اپنا چشمہ اور ناپ کے لیے ایک جوڑا کمیس اور سلوار دے دینا۔ وہ جلدی واپس آجائے گا۔ دیر نہیں لگے گی۔“

”اس پر خرچ کتنا آئے گا؟“

”اس کی فکر نہ کر، تیری غیر حاضری میں مزارعوں سے میں نے کچھ وصولی کی ہے۔ وہ میرے پاس موجود ہے۔ چوہدری! تیرا حکم ہو تو میں نے جیسے اور کپڑوں کے لیے کچھ روپے اپنے بھتیجے کو دے دوں؟“

”دیدے پر یہ بتا مزارعوں سے وصولی کیسے ہوئی اور کتنی ہوئی؟“ رحیم داد نے قدرے ہنسی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ”تو پہلے تو کہتا تھا مزارعے ادھار ادا کرنے کو تیار نہیں۔“

”ویسے تو جی کوئی خاص وصولی نہیں ہوئی۔ باراں سو کے لگ بھگ۔ روپیہ ہے۔ ادھار تو زیادہ ہی وصول ہو جاتا۔ پر زمیں دارنی بار بار اڑچن ڈال دیتی تھی۔ جو مزارع اس کے پاس پہنچ کر فریاد کرتا اسے معاف کر دیتی۔ میں نے اسے کہا بھی یہ طریقہ ٹھیک نہیں۔ وہ ایک دم بھڑک اٹھی۔ میں اس کی نراضی سے ڈر گیا۔ تو نے بھی یہی حکم دیا تھا کہ اسے نراض نہ کیا جائے۔“

”ٹھیک ہی کیا تو نے۔“ رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جتنی بھی وصولی ہو گئی ٹھیک ہے۔ خریف کی فصل تو اب تیار ہی ہونے والی ہے۔ اس کی واڑھی پر اپنی سکیم کے مطابق ادھار وصول

لینا۔“

”مجھے ڈر ہے، فصل کی واڑھی پر بھی زمیں دارنی اڑینگا ڈالے گی۔“

”تو فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا بھالوں گا۔ پیسے کی توجہ پوچھ اسے بھی ضرورت ہے۔ وصولی کی رقم کے بارے میں تو نے زمیں دارنی کو بتا دیا تھا؟“

”بالکل بتا دیا تھا جی۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”ایک ایک پیسے کا اسے حساب دے دیا تھا۔“

”اس نے وصولی کی رقم تجھ سے مانگی تو نہیں؟“

”میں نے اسے کہا بھی تھا۔ پر اس نے رقم نہ لی۔ کہنے لگی اپنے ہی پاس رکھ۔ چوہدری کو بتا دینا۔ رجسٹر میں اسے وصولی کی مد میں لکھ لے۔ جو خرچ ہو وہ بھی روز کے روز رجسٹر میں لکھ لیا کر۔“

”جیسا اس نے بتایا تو ویسا ہی کر رہا ہے نا؟“

”بالکل ویسا ہی کر رہا ہوں جی۔ ویسے میں نے کاغذات دیکھ کر اور مزارعوں سے ملنے جلنے کے بعد زمیں داری چلانے کے لیے آگے کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ اس کے مطابق ہی کام کرنا ہو گا جی۔ ایسے تو زمیں داری نہیں چل سکتی۔“

”تو نے زمیں دارنی کو بھی اپنا پروگرام بتایا؟“

”نہیں جی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”میں تیری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تو جب موجود ہو گا تو تیرے سامنے ہی زمیں دارنی سے اس کے بارے میں گل بات کروں گا۔ مجھے اس کی نراضی سے خوف آتا ہے۔“

رحیم داد نے نادر سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی اس سلسلے میں جیلہ سے ملنے اور بات کرنے کی کوشش کرے گا۔

کئی روز گزر گئے مگر جیلہ سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ منہ اندھیرے چادر سے اپنے جسم کو پوری طرح چھپائے ہوئے اسکول چلی جاتی۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں منگوا لیتی۔ اور جب شام کا دھند لگا ہر سو پھیل جاتا تو وہ بچوں کے ہم راہ اسکول سے واپس آتی۔ ان دنوں وہ اسکول کی ترقی اور ڈپنری کی تعمیر کے کاموں میں ابھی ہوئی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ خریف کی فصل کی کٹائی سے رقم حاصل ہو تو تعمیر کا کام پوری سرگرمی سے شروع کیا جائے۔



اتوار کو اسکول میں چھٹی تھی۔ جیلہ حویلی کی بالائی منزل پر تھی۔ اس کا تمام وقت اب اسکول یا

اوپر کی منزل کے کمروں کے ہی میں گزرتا تھا۔ وہیں وہ گاؤں کی عورتوں سے ملتی چلتی تھی۔ جب سے رحیم داد کا قیام حویلی میں شروع ہوا تھا اس نے یہی معمول بنالیا تھا۔

اس روز رحیم داد نے تاراں کے ذریعے جیلہ کو حویلی کے بڑے کمرے میں بلوایا اور نادر خاں کے ہم راہ اس سے بات چیت کرنے کی غرض سے پہنچا۔ کچھ دیر تک اسکول اور ڈپنٹری کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ جیلہ نہایت جوش و خروش سے اپنا منصوبہ بتاتی رہی۔ رحیم داد اور نادر خاموشی سے سنتے رہے۔ رحیم داد کوئی بات پوچھتا۔ جیلہ اس کا جواب دیتی۔ اپنے منصوبے کی تفصیل سے آگاہ کرتی۔

جیلہ نے اسکول اور ڈپنٹری کا ذکر ختم کیا تو رحیم داد نے نادر خاں کی طرف دیکھا۔ اسے مخاطب کیا۔ ”نادر! تو آگے کے لیے زمیں داری چلانے کی گل بات کرنا چاہتا تھا۔ اب زمیں داری کے سامنے اسے پتا۔“

نادر خاں نے رحیم داد کے بجائے جیلہ ہی کو مخاطب کیا۔ ”زمیں داری! میں نے کاغذات اور حسابات کے رجسٹر ایک بار نہیں، کئی بار دیکھے۔ انھیں دیکھ کر میں تو جی اسے نتیجے پر پہنچا کہ زمینداری اسی طرح چلتی رہی تو حویلی کا خرچ بھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ تیس اسکول کو بڑھانا اور ترکی دینا چاہتی ہو۔ ڈپنٹری لگانا چاہتی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گا؟ کل باوی مرنے کی تو زمیں داری ہے۔ اسے بھی اب تک ٹھیک سے نہیں چلایا گیا۔“

”تو کتنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔“ جیلہ نے حیکھے لہجے میں نادر خاں سے کہا۔ ”برانہ منائے زمیں داری تو میں نے صاف ہی صاف گل بات کرنی ہے۔“ نادر خاں نے لہجے میں نرمی اور عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ سما ہوا نظر آ رہا تھا۔

”میں ہر بات صاف ہی صاف سنتا چاہتی ہوں۔“

”اپنی زمیں داری کا حال تو یہ ہے جی، نہ مزارعوں سے دیگر لی جاتی ہے، نہ خرچہ، نہ منشا اور نہ کیا، یہی وصول کیا جاتا ہے۔“ اس نے کھٹکار کر گلا صاف کیا۔ ”دوسرے سارے ہی وڈے زمیں دار تو مزارعوں سے گھر میں نیا دروازہ یا کھڑکی بنانے پر بھی دروازہ ٹیکس اور کھڑکی ٹیکس وصول کرتے ہیں۔ مزارع نئی ن خریدے تو ٹیکس، گنڈپالے تو کٹو ٹیکس تک وصول کرتے ہیں۔ زمیں دار کے یہاں موت ہو جائے یا بچگی ہو، موٹرن ہو یا ختنہ، سب ہی کا ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔“

”کہہ تو ٹھیک ہی رہا تو۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”سارے ہی وڈے زمیں داری کی کرتے ہیں اور جی سدا سے کر رہے ہیں۔“

”اپنی زمیں داری میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ نادر خاں نے لہجے میں افسردگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”اپنے زمیں دار اللہ وسایا کا انتقال ہوا۔“ اس نے جیلہ کو مخاطب کیا۔ ”زمیں داری! اس کا کفن دفن، تہیہ، چالیسواں، سب تو نے اپنے ہی ڈب سے کیا۔ مزارعوں نے کچھ بھی نہ دیا۔ اپنی زمیں داری میں تو مزارعوں کو بٹائی کا حصہ بھی نصف نصف دیا جاتا ہے جب کہ دوسرے زمیں دار ۷۵ لکھ ۸۰ فی صد سے بھی اوپر حصہ وصول کرتے ہیں۔“

”نادر خاں تو کیسی گل کر رہا ہے؟ جب ۱۹۵۲ء کے قانون میں زمیں دار کا حصہ پیداوار میں ۴۰ فی صد مقرر کیا گیا ہے تو ہم اس سے زیادہ کیسے وصول کر سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ نصف نصف بٹائی بھی لٹا ہی ہے۔ پتہ نہیں اب تک مزارعوں نے چپ کیوں سادھ رکھی ہے۔“

”زمیں داری! تو تو ادھی سے بھی زیادہ بٹائی دینے کی گل کر رہی ہے۔ لگتا ہے، میری باتوں کا تو لٹا ہی اثر ہوا۔“ نادر نے جیلہ کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”میں تو جی ان ٹیکسوں کی گل بات کر رہا تھا جو وصول نہیں کیے جاتے۔ میرا مطلب ہے۔“

”میں تیرا مطلب ٹھیک طرح سمجھتی ہوں۔“ جیلہ اس کی بات کاٹ کر حیکھے لہجے میں بولی۔ ”تیری یہ طرح طرح کے ٹیکسوں والی گل سمجھ نہیں آتی۔ تجھے پتہ نہیں، میں نے تو اللہ وسایا کو ہر دار بھی بننے نہ دیا۔ اسے بار بار نمبر داری پیش کی گئی۔ پر میں نے ہر بار اس کی نندا کی۔“

”تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا زمیں داری۔ نمبر داری سے زمیں داری کی شان اونچی ہو جاتی ہے۔ سے حاصل کرنے کے لیے تو کٹری رشوت چلتی ہے۔ سفارشیں پہنچائی جاتی ہیں۔ افسروں کی منت و بخت کی جاتی ہے۔“ نادر خاں نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ ”برانہ منانا زمیں داری، جب ہی تو اپنی زمیں داری بڑھنے کی بجائے سکرتی جا رہی ہے۔“

”میں نے زمیں داری بڑھانی بھی نہیں۔“ جیلہ نے حیکھی نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ”میرے پتا کی پانچ ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمیں داری تھی۔ اسے اپنے بیوے کی طرف سے ترکے میں تقی وڈی زمیں داری نہیں ملی تھی۔ میرا پتا جات کا کراڑ تو نہیں تھا پر اس کا ساہوکارے کا بھی ڈار ہوا تھا۔ اور بہت پھیلا ہوا تھا۔ سچ پوچھ تو اس نے اپنے ساہوکارے ہی سے اتنی وڈی زمیں داری بٹائی تھی۔“

”وہ کیسے؟“ رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

”وہ زمین اور جائیداد رہن رکھتا تھا۔ اگاہی پر زمیں داروں اور کسانوں کو ادھار دیتا تھا۔ جب ادھار عیاج کے ساتھ بہت بڑھ جاتا تو وہ وصولی کے لیے عدالت میں نالش کرتا۔ زمیں دار اور

ایک بار پھر نظریں اٹھا کر جیلہ کی جانب دیکھا۔ ”زمین دارنی! یہ تو تیں نوں پتہ ہی ہے، ایک بار جب نفرت اور غصے کی آگ سلگ جاتی ہے تو فیر ہر طرف پھیلنے لگتی ہے۔ سوال صرف چنگاری لگانے کا ہے۔ میں نے ان گنگر آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لہور میں کس طرح لیڈروں اور وڈے لوگوں نے مختلف محکمہ داروں سے فسادات کی آگ بھڑکائی۔“

جیلہ تو خاموش رہی، مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ اس نے پوچھا۔ ”فسادات کے دنوں میں تو ادھر ہی ہوتا تھا؟“

”میں ان دنوں لہور میں تھا۔ پر مجھے امرتسر بھی جانا پڑا تھا۔“

”مسلمان بھاگ کر ادھر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تو کیوں امرتسر چلا گیا؟ وہاں تو اس وقت ہر طرف مسلمانوں کا خون بہایا جا رہا تھا۔ گھریا لوٹے جا رہے تھے۔ تجھے اس جلتی آگ میں جانے کی کیا سوچھی؟“

”وہ ایسا ہواجی، میرا وڈا بھرا، منظور خاں، امرتسر کی ایک کپڑا مل میں سپردا زور لگا تھا۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”جب اس نے حالات بگڑتے دیکھے اور آنے والے خطرے کی بو محسوس کی تو گھروالی کو بچوں کے ساتھ لہور بھیج دیا۔ خود نوکری کی خاطر امرتسر میں رہا۔ جب امرتسر اور مشرقی پنجاب کے دوسرے حصوں سے مسلمانوں کے خون خرابے اور لوٹ مار کی خبریں اوسر پہنچنے لگیں تو میری بھابی نے گھروالے کے لیے رو رو کر برا حال کر لیا۔ گڑگڑا کر میری منت کی۔ مجھ سے اس کا یہ دکھ دیکھانہ گیا۔ ویسے بھی منظور میرا سگا بھرا تھا۔ آخر اسے لینے مجھے امرتسر جانا ہی پڑا۔ یہ نہ پوچھ کیسے وہاں پہنچا۔“

”حد کردی تو نے۔“ رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”تو وہاں سے نکل کر ادھر پہنچا کیسے؟ منظور تجھے مل گیا تھا؟“

”ہاں جی! وہ مجھے مل گیا تھا۔ وہ کڑا کنسیاں میں اپنے ایک ہندو جاننے والے، گیش پرشاد کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں امرتسر پہنچنے کے بعد مسجد غزنویہ میں ٹھہر گیا۔ مسجد کے ساتھ مدرسہ بھی تھا۔ اس کے مستم سے میری جان پہچان تھی۔ تب ہی تو میں وہاں ٹھہر کا تھا۔ دوسرے محلوں اور علاقوں کے مسلمان بھی بھاگ بھاگ کر شریف پورہ یا مسجد غزنویہ پہنچ رہے تھے۔ میں نے منظور کو کہی نہ کسی طرح اپنے پہنچنے کی اطلاع بھجوائی اور اسے کہا کہ وہ بھی کوشش کر کے مسجد غزنویہ پہنچ جائے۔ مسجد غزنویہ ان دنوں بہت محفوظ جگہ تھی۔ فیر جی ایسا ہوا کہ ایک رات منظور مسجد غزنویہ پہنچ ہی گیا۔ اس نے ایسا بھیس بنایا تھا کہ پہلی نظر میں تو میں اسے ہندو سمجھا۔ دوسرے بھی یہی سمجھے

کر ضائی کے خلاف ڈگری نکلواتا۔ ان کے گھریا، ڈھور ڈھگر، زمیں کرک کراتا۔ انھیں بے دخل کر کے زمین ہتھیاتا۔ اس طرح وہ اپنی زمیں داری بڑھاتا رہا۔“ جیلہ کا لہجہ تلخ ہو آ گیا۔ ”تجھے یہ پتہ؟ اس کے منیم اور کرندے زمیں سے بے دخلی کے لیے کیسا کیسا ظلم اور اپراہہ کرتے۔ گھروں پر کرکی بٹھاتے۔ فصلیں اٹھوالے جاتے۔ پولیس کو رشوت دے کر گرفتاریاں کراتے۔“ اس کی آواز رفتہ رفتہ تیز اور اونچی ہوتی گئی۔ ”زمیں داری کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے کارن جو ظلم ڈھایا گیا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا؟“

جیلہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ رحیم داد اور نادر کی جانب دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھ رہے۔ جیلہ نے گہری سانس بھری۔ ”یہ فسادات اور بلوے کیا تھے؟ کراڑوں اور ساہوکاروں کے اپراہہ اور لوٹ مار کے خلاف کرض ادھار میں جکڑے ہوئے مسلمان کسانوں اور زمیں داروں کی نفرت ہی تو تھی۔ میں نے تو کتابوں میں پڑھا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں بھی ملتان، مظفر گڑھ، جھنگ اور دوسرے ضلعوں میں اسی طرح کراڑوں اور ساہوکاروں کے خلاف مسلمان کسان اور زمیں دارانہ کھڑے ہوئے تھے۔ کسان دوروہیوں نے ہندو ساہوکاروں کے گھروں پر بلہ بول دیا۔ ان کے گھر لوٹ لیے۔ آگ لگائی۔ بہت خون خرابہ کیا۔ اتنی گڑبڑ چھائی کہ دوردہی کسانوں پر کاہو پانے کے بے انگریزوں کو فوج لگانی پڑی۔ جگہ جگہ دوردہیوں اور فوج کے درمیان زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ یہ گڑبڑ تھوڑے دنوں میں سال ڈیڑھ سال تک چلتی رہی۔“

”پر زمیں دارنی ۷۳ء کے فسادات اور بلووں میں تو ہزاروں کتل ہوئے۔ پورے پورے پنڈاڑ گئے۔ بستیاں کی بستیاں لوٹ لی گئیں۔ بہت زبردست تباہی ہوئی۔ بہت خون خرابہ ہوا۔“ نادر نے جیلہ کی طرف دیکھا اور اس کی خوش نووی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ”تو نے ٹھیک ہی کہا، فسادات اور بلوے ہندو بیویوں اور ساہوکاروں کے ظلم و ستم اور ان کی دھاندلیوں کے خلاف مسلمان کسانوں اور دوسرے کرض داروں کی نفرت کا اظہار تھا۔ مگر فسادات کی صرف یہی ایک وجہ تو نہیں تھی۔“

”اور بھی وجہ تھی۔ کئی طرح کی باتیں تھیں۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی تائید کی۔

”پنڈی، ملتان، منٹگری، لہور اور نہ جانے کتنی جگہ تو یہ بھی ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں کا مال اسباب لوٹنے، ان کی زمینوں اور املاک پر کبضہ کرنے کی غرض سے سیاسی لیڈروں اور وڈے زمین داروں نے باقاعدہ منصوبے کے تحت مسلمانوں کو طرح طرح سے اشتعال دلایا۔ اپنے بندوں کے ذریعہ فسادات اور بلوے کرائے۔ لوٹ مار اور خون خرابہ کرایا۔“ نادر خاں نے اپنی بات کہتے کہتے

”رہائیاں اور غیاریں نہیں تھیں؟“ جیلہ بہت دیر بعد بولی۔
 ”بہت تھیں جی۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”کچھ کی تو تنگی لاشیں مسجد کے صحن میں خون میں لتھڑی
 پڑی تھیں۔ کسی کا پیٹ چاک تھا کسی کی چھاتیاں کٹی ہوئی تھیں۔ کچھ کو حملہ آور فوجی اور بلوائی اٹھا
 زلے گئے۔ کچھ نے اپنی آبرو بچانے کے لیے مسجد کے کونوں میں چھلانگیں لگائیں اور ڈوب کر
 مر گئیں۔ ان کی لاشیں پانی پر تیرتی دکھائی دے رہیں تھیں۔“
 ”بہت ظلم اور اپراہہ ہوا۔“ جیلہ نے دکھ بھرے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے نادر خاں سے دریافت کیا۔ ”تو اور منظور اس خون خرابے کے بعد مسجد ہی میں
 ٹھہرے رہے؟“

”نہیں جی، بلوچ رجسٹ کی نگرانی میں دوسرے مسلمانوں کے ساتھ ہم دونوں کو بھی شریف پورہ
 کے ریلیف کیمپ میں پہنچا دیا گیا تھا۔“ نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”ایک روز ایسا ہوا کہ علاقہ
 بمبڑٹ میجر پورن سنگھ، شریف پورہ کیمپ کے مسلمان پناہ گزینوں کا حال احوال معلوم کرنے آیا۔
 اس سے فریاد گئی۔ ظلم و ستم کا حال بتایا گیا۔ میجر پورن سنگھ بہت متاثر ہوا۔ اس نے شہر کے
 حاکم کو اطلاع دی۔ ساتھ ہی کئی مسلمانوں کو بھی لیا۔ ان میں، میں بھی شامل تھا۔“

”تو بھی معاملے پر مجسٹریٹ کے ساتھ گیا تھا۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”کیا حال تھا شہر
 کا؟“

”حال کی کیا پوچھتے ہو جی۔“ نادر نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ ”مسلمان محلوں میں تو ہر طرف
 ایسی نظر آتی تھی۔ جہدہر نظر اٹھتی جلتے ہوئے مکانات اور کھنڈر دکھائی دیتے۔ شہر کے گلی کوچوں
 ل رستوں اور سڑکوں پر خون نظر آتا۔ لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ کسی کا سر کاٹا ہوا ہاتھ اور کسی کے
 پر۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”کوچہ رنگریزاں سے معائنہ ٹیم میجر پورن سنگھ کے ساتھ باہر نکلی
 ایک مکان کے پرٹالے سے لال لال اور تازہ خون بہہ رہا تھا۔ میجر کے ساتھ مکان کی چھت پر جا کر
 بکھا کہ ایک نوجوان زبانی اور اس کا ننھا سا نکانا خون میں ڈوبے پڑے ہیں۔ زبانی کے بدن کے
 لہسے ہو گئے تھے۔ پر نکاس اس نے چھاتی سے لگا رکھا تھا۔ دونوں ہی مر چکے تھے اور انھیں مرے
 سے زیادہ دیر بھی نہ گزری تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک جلتے ہوئے مکان کی چھت کے جھنگے کی
 لافوں سے ایک زبانی کی جلی ہوئی بے جان ٹانگیں نیچے جھول رہیں تھیں۔ ہر طرف گوشت کے
 لٹکے ہوئے پھیلے تھے اور مردہ زبانی کی جھولتی ہوئی ٹانگوں سے چربی پکھل پکھل کر نیچے گر رہی تھی۔“
 ”بس کر نادر۔“ جیلہ نے پریشان ہو کر نادر خاں کو منع کیا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت ظلم اور

اور اسے پکڑ کر میرے پاس لائے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گلے سے لپٹ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے
 لگا۔“ نادر خاں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”وہ تو جی سمجھو موت کے منہ سے نکل کر آیا تھا۔ ان دنوں
 مسجد میں اور اس کے آس پاس بہت مسلمان اکٹھے تھے اور روز بروز ان کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی
 تھی۔“

”میں نے تو سنا ہے امرتسری مسجد غزنویہ میں مسلمانوں کا بہت خون بہا۔ بہت تباہی ہوئی۔“
 رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سنا؟“

”تو نے ٹھیک ہی سنا چوہدری۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”میں نوں اب تک وہ بھیا تک رات
 یاد ہے۔“ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیلنے لگے۔ ”میں بھولا نہیں۔ ایک ایک بات یاد ہے۔
 رمضان کا مہینہ تھا۔ مسجد میں دن رات کلام پاک کی تلاوت ہوتی، وعظ ہوتا۔ دعائیں مانگی جاتیں۔
 ۱۳ اگست کو جب پاکستان بننے کا اعلان ہوا تو ہم دونوں بھائی مسجد غزنویہ ہی میں تھے۔ رمضان کی ۱۷
 تاریخ تھی۔ نہ پوچھ کیسی خوشی منائی گئی۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے تھے۔ گرم جوشی سے
 گلے ملتے تھے۔“

”اس وقت تک مسجد محفوظ رہی ہوگی؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”ہاں جی۔ پر تباہی بھی اس روز ساتھ ہی آئی۔“ نادر خاں نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عید
 سے تین روز پہلے کا ذکر ہے۔ مجھے ٹھیک طرح یاد ہے۔ مسجد کے صحن میں اور اس کے آس پاس
 پڑے ہوئے مسلمان رات کو بھی جاگ ہی رہے تھے۔ ہر طرف سے تلاوت کی آوازیں آرہی
 تھیں۔ اچانک آدھی رات کو زبردست شور اٹھا۔ پتہ چلا، ریاستی اور گورکھا فوج نے مسجد پر دھاوا
 بول دیا۔“

”فیر کیا ہوا جی؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”ہونا کیا تھا۔ نئے مسلمان فوج کے مسلح سپاہیوں کا کس طرح مقابلہ کر سکتے تھے۔ ڈر کے ادھر
 ادھر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم دونوں بھائی بھی مدر سے کے ایک حجرے میں چھپ گئے۔ رات
 کے اندھیرے میں ہر طرف چیخ پکار مچی تھی۔ کچھ سمجھ نہیں آتی تھی کیا ہو رہا ہے۔ بہت دیر بعد
 جب شور شرابہ رکا اور یہ اطلاع ملی کہ حملہ آور فوجی کتل غارت گری کر کے چلے گئے تو منظور کے
 ساتھ میں حجرے سے نکل کر مسجد میں پہنچا۔ دیکھا صحن میں ہر طرف لاشیں بکھری ہیں کچھ سسک
 رہے تھے۔ کچھ دم توڑ رہے تھے۔ کچھ زخموں سے تڑپ رہے تھے۔ کوئی مرہم پٹی کرنے والا بھی نہ
 تھا۔ مسجد میں جہدہر نظر جاتی، خون ہی خون نظر آتا۔“

اُپر ادا ہوا۔ کہتے ہیں سب پاگل ہو گئے تھے۔ پر سوال یہ ہے وہ پاگل کیوں ہو گئے تھے؟ اس کا کوئی نہ کوئی کارن تو ضرور ہی ہوگا؟ ایسے ہی تو کوئی پاگل نہیں ہو جاتا۔ میں تجھے یہی بتانا چاہتی تھی کہ یہ پاگل پن کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟

نادر خاں نے کہا۔ ”ایک گل اور بھی ہے۔ فسادات اور بلوؤں کے بعد ہندو سنے اور ساہوکار چلے گئے۔ پر ان کی جگہ مسلمان ساریوں اور زمیں داروں نے لے لی۔ وہ بھی اگاہی پر کرض ادھار دیتے ہیں۔ سود اور بیاج کھاتے ہیں۔ فرک کیا پڑا جی۔“

”تیرا مطلب ہے مزارعوں سے دیگاری جائے۔ منشیانا اور کمالیہ لیا جائے۔ زبردستی طرح طرح کے ٹیکس وصول کئے جائیں۔“ جیلہ کے چہرے پر جھنڈا ہٹ بکھر گئی، لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”تو یہی کہنا چاہتا ہے نا؟“ اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”مجھے اس طرح زمیں داری نہیں بڑھانی۔“

”برانہ منا۔“ نادر خاں کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”زمیں داری! تو اپنا سکول وڈا بنانا چاہتی ہے۔ ڈپنری بھی لگانی چاہتی ہے۔ میں کہتا ہوں ضرور ایسا کر۔ مزارعوں سے کوئی اور ٹیکس وصول نہ کر۔ پر سکول اور ڈپنری ٹیکس تو فصل کی واڈھی پر وصول کرنا ہی چاہیے۔“

”کیوں وصول کرنا چاہیے؟“ وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

”اس لیے کہ سکول اور ڈپنری تو انھیں کے لیے ہوں گے نا؟“ نادر خاں نے جیلہ کی خفگی نظر

انداز کرتے ہوئے اپنے مشورے پر زور دیا۔

”نہیں نادر! مجھے سکول اور ڈپنری کے لیے کوئی ٹیکس ٹیکس نہیں لینے۔“ جیلہ کا لہجہ بدستور ٹیکھا تھا۔ ”مجھے ٹیکس کے چکروں میں نہ ڈال۔ ایک بار ٹیکسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو تنٹ نے لگے

شروع ہو جائیں گے۔ فیر بے دخلیاں ہوں گی۔ ظلم ہوگا، اپراہ ہوگا۔ مجھے اس سے خوف آتا ہے۔“ اس نے انکار میں ہاتھ ہلایا۔ ”میں نے تجھے بتایا تاکہ میرے پتا کی بہت وڈی زمیں داری

تھی۔ میں نے وہ زمیں داری دیکھی ہے۔ مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس وصول ہوتے ہوئے بھی دیکھے ہیں اور ان کے بل بوتے پر زمیں داری کے ٹھاٹھ باٹ بھی دیکھے ہیں۔ میں نے بہت کچھ

دیکھا۔“ اس نے بوئے جوش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”فسادات اور بلوے دیکھے۔ بھلے چٹے بندوں کو پاگل اور وحشی ہوتے دیکھا۔ اور اس پاگل پن کا شکار بھی ہوئی۔ تجھے کیا پتہ وہ پاگل پن کب

بھیا نک تھا۔ ایک ڈراؤنا پتہ۔ ہاں، اب تو پستانا ہی لگتا ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ”مجھے اس بھینک کھپنا کی یاد نہ دلا۔“

رحیم داد اور نادر خاں دم بخود بیٹھے رہے۔ جیلہ نے چادر کے پلو سے قطرہ قطرہ ٹپکتے ہوئے آنسو

خچہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ نادر خاں بھی کھڑا ہو گیا۔ جیلہ نے مڑ کر اس کی سمت دیکھا۔ ”نادر! میں بہت ابھاسن اور دکھی ہوں۔ ایسا نہ کر کہ مجھے اور دکھ پہنچے۔“ اس کی آواز میں زخمی دل کی فریاد

نہاں تھی۔

”نہیں زمیں داری! تو ایسا نہ سوچ۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیلہ کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”تو جیسا کہے گی بالکل دیا ہی ہوگا۔ فکر نہ کر۔ تیری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔“

”چوہدری! مجھے تجھ سے یہی امید تھی۔“ جیلہ مطمئن ہو کر بولی۔ ”تو بھی تو کم دکھی نہیں۔ تو نے بھی بہت ظلم اور اپراہ اٹھایا ہے۔ تو جانتا ہے اور ٹھیک طرح جانتا ہے کہ ظلم اور اپراہ کیا ہوتا ہے؟“

جیلہ آگے بڑھی۔ کمرے سے نکل کر دالان میں گئی۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اوپر کی منزل کے زینے پر پہنچی اور سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

اس ملاقات کے بعد جیلہ سے پھر بات چیت نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی جیلہ نے۔



رحیم داد نے زمیں داری کے معاملات میں پوری توجہ کے ساتھ دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ روزانہ نادر خاں کے ساتھ کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ فصلوں کو دیکھتا۔ کپاس کے پودوں میں ڈوڑے پھونٹے لگے تھے۔ مٹی کے لمبے لمبے پتوں کے درمیان گڈیاں اور ٹٹے ہوا کے جھونکوں سے ہلے ہوئے جھومتے اور کما کے اونچے اونچے پودوں پر پاندے پھلتے جا رہے تھے۔

رحیم داد مزاروں سے ملتا۔ بات چیت کرتا۔ فصلوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نجی معاملات میں بھی دلچسپی کا اظہار کرتا۔ ان سے نرمی اور ہمدردی کا اظہار

کرتا۔ دوسرے تک اس کا وقت عام طور پر کھیتوں کے درمیان گھومتے پھرتے اور مزاروں سے باتیں کرتے ہوئے گزرتا۔ دوسرے کا کھانا کھا کر وہ سو جاتا۔ شام کو پابندی سے باغ میں جا کر بیٹھ جاتا۔ وہاں

نئی مزارعوں سے ملتا۔ مگر حویلی کے باہر کے اس سائبان کے نیچے وہ کسی روز نہیں بیٹھا جہاں اللہ علیا مزارعوں سے اکثر و بیشتر ملتا تھا اور گھنٹوں بیٹھا ان کے ساتھ بات چیت کرتا رہتا تھا۔ رحیم داد

مٹی کی ٹمٹا ہوا گاؤں میں چلا جاتا یا نہر کی طرف نکل جاتا۔ نادر ہمیشہ اس کے ہم راہ ہوتا۔ نذر داری کی مصروفیات سے آگتا جاتا تو وہ دل بہلانے کے لیے احسان شاہ کے پاس چلا جاتا۔

دو تین روز ٹھیرتا۔ شام کو وہ سکی کی چسکی لگاتا۔ رات کو کبھی نوراًں اور کبھی کسی اور نوجوان عورت کو کوٹ سے بلوالیتا۔ مگر احسان شاہ کی حویلی میں اس کا قیام اب طویل نہ ہوتا۔ چند ہی روز ٹھیرنے کے بعد واپس کوئلہ ہرکشن آجاتا۔

احسان شاہ کی حویلی میں قیام کرنے اور اس کے ساتھ وقت گزارنے کا رحیم داد کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ سرکاری افسروں اور بڑے زمین داروں سے ملنے اور تعلقات پیدا کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔ اس کے ذہن میں پولیس کے افسروں کی طرف سے جو خوف و خطرے کا احساس تھا وہ بھی رفتہ رفتہ زائل ہو چکا تھا۔ وہ سب سے بے دھڑک ملتا۔ لیکن وہ احسان شاہ کے پاس ہمیشہ چوری چھپے جاتا اور تخت محل جانے کا بہانہ کرتا۔

موسم دھیرے دھیرے بدلتا جا رہا تھا۔ دوپہر کو کسی قدر گرمی ہو جاتی مگر صبح خوش گوار اور سہانی ہوتی۔ شام کو ہلکی ہلکی خنکی ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ رحیم داد نے اب شام کو باغ میں بیٹھنے کا سلسلہ بند کر دیا تھا۔



جیلہ سے پچھلے کئی ہفتوں سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ وہ ان دنوں رحیم داد کو نظری نہ آتی۔ عدت میں ہونے کے باعث اس نے پھاتوں کے مشورے سے تاجاں کی شادی کی تاریخ بڑھا دی تھی۔ سسرال والوں نے بھی اس عذر کو قبول کر لیا تھا۔ جیلہ نے جیسا کہا انھوں نے ویسا ہی کرنے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ نہ حجت کی نہ اصرار کیا۔

عدت ختم ہونے میں اب تھوڑی ہی مدت رہ گئی تھی۔ خریف کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ جیلہ فصل کی کٹائی کے بعد ہی تاجاں کی شادی کر دینا چاہتی تھی۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جیلہ اسکول کی مصروفیات کے ساتھ ساتھ شادی کی تیاریوں میں الجھی ہوئی تھی۔

نادر خاں نے بھی اب اپنی بیوی کو بلالیا تھا۔ بیوی اور تینوں بیٹیوں کے ساتھ وہ مہمان خانے ہی کے ایک حصے میں مقیم تھا۔ مگر وہاں مستقل رہنا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد بھی یہی چاہتا تھا۔ نادر کا ارادہ تھا کہ فصل کی کٹائی کے بعد ڈپنسری کی تعمیر شروع ہو تو بھٹے سے آنے والی اینٹوں سے مہمان خانے کے قریب ہی اپنی رہائش کے لیے مکان بنوالے۔ اپنی اس خواہش کا اظہار وہ رحیم داد سے کر چکا تھا۔ اور رحیم داد نے اسے مکان بنانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔

نادر کی بیوی کا نام جنت بی بی تھا۔ وہ خوب صورت تو نہ تھی مگر رنگ صاف تھا۔ جسم گدازادہ بھرا بھرا تھا۔ عمر ۳۵ برس کے لگ بھگ تھی۔ نادر خاں بھی اس کا دوسرا شوہر تھا۔ پہلے شوہر سے

اس نے طلاق لے لی تھی۔ اس سے دو بچے بھی تھے جو باپ کے ساتھ ہی قصور میں رہتے تھے۔ جنت گھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر روزانہ جیلہ کے پاس چلی جاتی۔ شام کو تو اس کا بیشتر وقت جیلہ ہی کے پاس گزرتا۔ وہ رفتہ رفتہ جیلہ سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ جیلہ کا رویہ بھی اس کے ساتھ خوش گوار اور مشفقانہ تھا۔ تاجاں کی شادی کی تیاریوں میں اس نے جنت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ اس طرح وہ جیلہ سے اور قریب ہو گئی۔ شادی بیاہ کی رسم و رواج کے سلسلے میں وہ جیلہ کو مشورے بھی دیتی۔ جیلہ ان کو مان بھی لیتی۔ وہ ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور اسی ماحول میں پرانا چھڑ کر جوان ہوئی تھی۔ لہذا مسلمانوں کی رسوم اور روایات سے پوری طرح اسے واقفیت نہ تھی۔ جنت اس سلسلے میں اس کی اچھی مشیر ثابت ہوئی۔

جنت بی بی ایک بار عدت کی مدت بھی گزار چکی تھی۔ اس معاملے میں وہ تجربہ کار بھی تھی۔ جیلہ کی عدت ختم ہونے کو آئی تو اس نے نادر کو بتایا کہ عدت کے خاتمہ پر کیا کیا ہونا چاہیے۔ وہ چاہتی تھی کہ عدت جس روز ختم ہو رحیم داد کی جانب سے جیلہ کو نیا جوڑا اور چوڑیاں بھیجی جائیں۔ ویسے جوڑا اور چوڑیاں میکے سے آنا چاہیے تھیں۔ مگر جیلہ کا کوئلہ ہرکشن میں بیٹھا ہی کون تھا جو اس فرض کو ادا کرتا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے اس سلسلے میں بات کی۔ وہ اس وقت رحیم داد کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر کی بات سن کر رحیم داد بولا۔ ”ایسا کر نادر تو جیلہ سے بھی پوچھ لے۔“

”اس سے کیا پوچھنا ہے جی۔“ نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”ویسے تو یہ زمین دارنی کے کسی رشتے نامتے دار کی طرف سے ہونا چاہیے تھا۔ لیکن میں نو پتہ ہی ہے ادھر اس کا کوئی بھی نہیں۔ اب تیری ہی طرف سے اس کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس معاملے میں جیلہ سے بات کرنا مناسب نہیں لگتا۔ یہ رسم اسی طرح ہوتی ہے۔“

رحیم داد نے کوئی حجت نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ ”کسی کو آج ہی لاہور بھیج کر کپڑا منگوالے۔ مگر کپڑا ٹھیک ہو۔“ وہ چند لمحے نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ ”رنگ گلابی ہونا چاہیے۔ جیلہ کو یہ رنگ بہت ندر ہے۔ چوڑیاں بھی عمدہ ہوں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”میں تو کہتا ہوں تو خود ہی چلا جا۔ کپڑا لا کر بنا گھر والی کو دے دینا۔ وہ ناپ لے کر خود ہی تیار کروالے گی۔ یہ زنانیوں کا کام ہے۔ اس کا نہ غصہ ہے اور نہ مجھے۔ ایسے سارے ہی کام ہمیشہ زنانیوں ہی کے لیے چھوڑ دینے چاہئیں۔“ وہ بے لگنی سے ہنسنے لگا۔

”دوسرے ہی روز نادر خاں لاہور چلا گیا۔ دوپہر کو رحیم داد بھی احسان شاہ کے گاؤں پیراں والے



یہ گلابی جھاڑوں کی ہنسی مسکراتی شام تھی۔ فضا میں خنکی تھی۔ کمر کا ہلکا نیل گول دھند لکا ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعوں میں گھلتا جا رہا تھا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں سترے خواب جاگ رہے تھے۔ اس نے دھڑکتے دل سے پڑھیاں طے کیں۔ اوپر پہنچا۔ زینے کی مٹی کے سامنے کھلی چھت تھی۔ چھت کے ایک سرے پر تین کمرے تھے۔ دو کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ تیسرے کی صرف کھڑکیاں چھت کی جانب کھلتی تھیں۔ اس میں آمدورفت کے لیے دروازہ ملحقہ کمرے ہی میں کھلتا تھا۔

رحیم داد نے دیکھا، بائیں ہاتھ کے کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔ اس کمرے میں وہ ایک بار پہلے بھی آچکا تھا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ یسپ کی گہری زرد روشنی میں جیلہ موڑھے پر بیٹھی تھی۔ وہ گلابی لباس میں پھول کی مانند خلقت اور دل کش نظر آ رہی تھی۔ سامنے میز پر طشت میں وہ تمام اشیاء اسی طرح رکھیں تھیں جس طرح رحیم داد نے تاراں کے ہاتھ بھجوائی تھیں۔

رحیم داد کو دیکھ کر جیلہ نے کہا۔ ”چوہدری! اندر آجا۔“ اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھ جا۔“

وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جیلہ نے سامنے رکھے ہوئے طشت کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”تو نے یہ سب کچھ کس لیے بھیجا ہے؟“

”تیرے ہی لیے بھیجا ہے۔“ رحیم داد نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”سوچا تیری عدت تو ختم ہو چکی ہے۔ تجھے ان کی ضرورت ہوگی۔ اب تو انھیں پہن سکتی ہے۔“ وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”ہاں اب میں انھیں پہن سکتی ہوں۔ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“

”ہوایہ کہ تخت محل سے واپسی پر میں بھاول نگر گیا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”بازار گیا تو تیرے لیے یہ چیزیں خرید لیں۔ پہلے بھی خرید لیتا۔ پر تب تو انھیں پہن نہیں سکتی تھی۔“

”لایا تو بہت شاندار چیزیں ہے۔“ جیلہ نے طشت سے کنگن اٹھائے۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں نے ہاتھی دانت کے چوڑے دبائے۔ ”بھاول پوری چوڑی گروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں ناں؟“

”تیری کلائیوں اور باہوں پر بہت شان دار لگیں گے۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ ”انھیں پہن

چلا گیا۔ مگر رحیم داد نے وہاں صرف رات بھر کے لیے قیام کیا۔ سویرے اٹھ کر حویلی اسٹیشن کے راستے پاک پتھر پہنچا۔ بازار گیا۔ بھاول پوری چوڑی گروں کے بنائے ہوئے ہاتھی دانت کے چوڑے خریدے۔ باہوں میں پہننے کے لیے بائیں خریدیں۔ بھاول پوری لہریا ریشمی لٹکی، سرے گل بوٹوں کا کڑھا ہوا دو شالہ، چاندی کے کرن پھول، مندریاں اور پھولوں کے علاوہ ناک میں پہننے کے ناقہتی بھاول پوری پوپا اور سونے کے کنگن خریدے۔ وہ اسی شام واپس آیا۔ نادر خاں دروازے بعد لاہور سے لوٹا۔

عدت کی مدت کے چار مہینے دس دن پورے ہونے سے پہلے ہی جنت نے ریشمی جوڑا سلوا لیا تھا۔ جس روز عدت ختم ہوئی۔ جیلہ نے صبح اٹھ کر غسل کیا۔ جنت نے اصرار کیا تو اس نے گلابی ریشمی جوڑا پہن لیا۔ کلائی میں چوڑیاں بھی ڈال لیں۔ مگر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اللہ وسایا اسے بار بار یاد آتا۔ اس نے آنسو پونچھے۔ کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا۔ جنت نے کنگھی سے جیلہ کے بال سنوارے۔ آنکھوں میں کاجل لگایا۔ پھر وہ حویلی کی چند خادماؤں کے ہم راہ جیلہ کو مسجد لے گئی۔ مسجد کے دروازے پر پہنچ کر جیلہ نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا۔ جنت نے جیلہ ہی کے ہاتھ سے مسجد کے مٹا کو پانچ روپے دلوائے۔

اب جیلہ بر حویلی سے بے دھڑک باہر جانے اور کسی نامحرم کے سامنے آنے کی پابندی اٹھ چکی تھی۔ مگر جیلہ مسجد سے واپس آنے کے بعد سیدھی اوپر کی منزل پر گئی اور اپنے کمرے میں تنہا بیٹھ رہی۔ رحیم داد بڑے کمرے میں بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نیچے نہ اتری۔

دن دھڑلے لگا۔ رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ نہادھو کر ڈبل گھوڑا بوسکی کی نئی قمیص اور شلوار پہنی۔ آنکھوں پر سنہری فریم کا نیا چشمہ لگایا۔ یہ لباس اور چشمہ نادر خاں کا ہتھیار لاہور سے خرید کر لایا تھا۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد رحیم داد نے سر کے بال خوشبو دار تیل ڈال کر جٹائے۔ ڈاڑھی کو کنگھی سے سنوارا۔ آنکھوں میں سرمہ ڈالا۔ عطر لگایا۔ اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر دیر تک اپنی جھج دیکھتا رہا۔ وہ اس وقت وجیہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ چہرے پر تازگی تھی۔ رخساروں پر سرفنی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں طراوت اور تابندگی تھی۔

اس نے احمد کی بیوی تاراں کو بلوایا اور وہ تمام سازو سامان جو اس نے چند روز قبل پاک پتھر سے خریدا تھا ایک طشت میں رکھ کر جیلہ کے پاس بھجوا دیا۔ وہ کچھ دیر اپنے کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر حویلی سے باہر جانے کے ارادے سے نکلا تو تاراں کی زبانی یہ پیغام ملا کہ جیلہ نے اسے اپنے کمرے میں بلایا ہے۔

لے۔

”نہیں! میرے پن نے کا سے بیت گیا۔“ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ ”یہ داجلو گئے پاتے ہیں۔ تاجاں کے دھتے کے لیے ٹھیک رہیں گے۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے بعد مائیاں بیٹھ جائے گی۔“

”اس کی دھتے کے لیے اور لے آؤں گا۔“ رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”میری خوشی ہے تو انھیں ابھی میرے سامنے پن لے۔“ اس نے جیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”تو تاجاں کی فکر نہ کر۔“

”نہیں۔ میں انھیں نہیں پنوں گی۔“ جیلہ نے صاف انکار کر دیا۔

مگر رحیم داد ناامید نہ ہوا۔ بس کرپو چھا۔ ”کیوں نہیں پننے گی؟“

”میرا من نہیں چاہتا۔“ جیلہ کے چہرے پر دکھ کا غبار بکھرنے لگا۔ ”مجھے مجبور نہ کر۔“

رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اور ٹنگی باندھ دیکھتا رہا۔

جیلہ نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ رحیم داد نے آہ بھرنے کے انداز میں گہری سانس بھری۔ آہستہ سے کہا۔

”جی لے!“

جیلہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ رحیم داد نے پہلی بار اللہ وسایا کے پیار بھرے انداز سے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ ”کہہ‘ کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”برانہ منا۔“ رحیم داد موم کی طرح پگھل گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی کے ساتھ ساتھ لگاؤ بھی تھی۔ ”تین نوں پتہ نہیں‘ تو کتنی سوہنی ہے۔ اور جوان بھی ہے۔ کب تک اللہ وسایا کو یاد کرتی رہے گی۔ وہ اب واپس آنے سے تو رہا۔“

”میں نوں پتہ ہے وہ واپس نہیں آسکتا۔“ جیلہ نے بہت سنبھلے ہوئے انداز میں کہا۔ ”جی پوچھ تو اب مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ بہت دن بیتے جب مجھے ایک سارے کی ضرورت تھی۔ اللہ وسایا کے روپ میں مجھے وہ سارا مل بھی گیا تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب میرا سارا نینا اور گڈو ہیں۔ مجھے کسی اور سارے کی ضرورت نہیں۔ میں کیول ان دونوں کے لیے زندہ رہتا چاہتی ہوں۔“

”تو ضرور ان کے لیے زندہ رہ پر کچھ اپنا بھی تو خیال کر۔“ رحیم داد نے لہجے میں رقت پیدا کی۔ ”تین نوں کسی کے سارے کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ پر مجھے تیرے سارے کی ضرورت ہے۔ میں“

چاہتا ہوں۔“

”میں نوں پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے؟“ جیلہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”پر جو تو چاہتا ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اس دچار کو اپنے من سے نکال دے۔ اسے بھول جا۔“

”کیسے بھول جاؤں۔“ رحیم داد نے چہرے پر افسردگی طاری کرنے کی کوشش کی۔ عاجزی سے بولا۔ ”میں بھی تیری طرح دکھی ہوں۔ اجڑا ہوا ہوں۔ برباد ہوا ہوں۔“ اس نے نبھی نبھی نظروں سے جیلہ کو دیکھا۔ ”اگر ایک بار فیئر سنبھلنے کا موقع ملا تھا۔ تین نوں پتہ ہے‘ اب وہ بھی نہ رہا۔ اب کچھ ختم ہو گیا۔ رابعہ دوسرے کی ہو چکی ہے۔ اس نے منت کرنے پر بھی بیٹی کو میرے ساتھ نہ لے دیا۔“

جیلہ نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد چند لمحے خاموش رہنے کے بعد غم زدہ لہجے میں گویا ہوا۔ ”مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ میرا کہ تو جانتی ہے۔“

”میں تجھے اور تیرے دکھ کو ٹھیک طرح جان چکی ہوں۔“ جیلہ کے لہجے میں تکرار کی کاٹ تھی۔ صاف صاف سن نا چاہتا ہے تو سن لے۔ ”وہ ہانپنے کے انداز میں تیز تیز سانس بھرنے لگی۔ ”تو اسے بمانہ کر کے احسان شاہ کے پاس جاتا رہا۔ اس کی حویلی میں ٹھیرتا اور ہر بار مجھ سے جھوٹا رہا۔“

رحیم داد سخت سٹ پٹایا۔ بدحواس ہو کر بولا۔

”تجھے یہ کس نے بتایا؟ یہ بالکل غلط ہے۔“ وہ اپنی بات کتے کتے الجھا۔ ”کسی نے تجھے ہکا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بچوہری! چپ کر۔ زیادہ بکواس نہ کر۔“ جیلہ نے اسے غصے سے ڈانٹا۔ ”احسان شاہ کا پنڈ‘ اللہ والہ یہاں سے دور ہی کتنا ہے۔ چند میل کا تو فاصلہ ہی ہے۔ تو نے یہ نہ سوچا یہ بات کب تک لیا رہے گی۔ کسی پنڈ میں کوئی نیا بندہ آجائے تو اس پاس کے ہرنڈ میں اس کی خبر پھیل جاتی ہے۔ ذہنت دنوں سے احسان شاہ کے پاس جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کئی کئی روز ٹھیرتا رہا ہے۔“

جیلہ ابھی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ اسی اثنا میں تاراں دروازے پر نمودار ہوئی۔ وہ کھانا لے کر آئی۔ جیلہ نے تاراں کو دیکھتے ہی کہا۔

”بچوہری! اب تو جا۔“

رحیم داد خاموشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ کمرے سے باہر آیا۔ رات درود یوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھایا تھا۔ کمر کی دھند میں لپٹی ہوئی حویلی ادھک رہی تھی۔



حویلی کے شمال میں گاؤں کا رڈ تھا۔ رڈ کے اس پار دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ خریف کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ مکئی اور کما کے پودے خوب اونچے ہو گئے تھے۔ ان کے لمبے لمبے پتے کہیں کہیں سے زرد پڑ گئے تھے۔ مکئی کے سنوں سے ادھر ادھر نکلے ہوئے عبلوں کے سفید اور باریک سوت بکھرے ہوتے تو جھار بن کر لہراتے۔ سمٹ کر گتھ جاتے تو پھندے معلوم ہوتے۔ کما کے بعض پودے اتنے زیادہ پک گئے تھے کہ پتوں پر آگری نکل آئی تھی۔

کپاس کے پودے گتھے اور چھوٹے تھے۔ ان کے ڈوڈوں سے روئی کے سفید سفید توبے پھوٹ کر باہر نکل آئے تھے۔ یہ پھٹی تھی۔ مکئی، چری اور کما کے پودوں کی کنائی کے ساتھ پھٹی کی چٹائی بھی شروع ہونے والی تھی۔

رحیم داد ناشتا کر چکا تھا۔ وہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے رڈ کے اس پار کھیتوں کو دیکھ رہا تھا۔ کھیتوں پر ابھی تک پالا پڑ رہا تھا۔ دھند کی ہلکی ہلکی سرمئی تہہ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ پچھلے کئی روز سے وہ کھیتوں کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس کا بیشتر وقت کمرے کے اندر ہی گزرتا۔ دن ڈھلے کبھی کبھار نہر کی طرف نکل جاتا۔ مگر نہ احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ گیانا اس کا ایسا ارادہ تھا۔

نادر خاں سے اس کی ملاقات ان دنوں عام طور پر صبح کے وقت ہوتی۔ نادر نے اس کی خلاف معمول بڑھی ہوئی عزت پسندی اور خاموشی محسوس کی۔ ایک روز کرید کر سبب معلوم کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن رحیم داد نے اس کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ نہ کچھ بتایا نہ اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ اس نے جیلہ سے اپنی ملاقات تک کا اس سے ذکر نہیں کیا۔ البتہ زمیں داری کے

بارے میں وہ ہر روز نادر خاں سے بات چیت کرتا اور اکثر دیر تک کرتا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نادر خاں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں سیڑھیوں پر قدموں کی آہر ابھری۔ رحیم داد نے اندازہ لگا لیا کہ جیلہ اوپر کی منزل سے نیچے آ رہی ہے۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ پچھلے سات آٹھ روز سے جیلہ سے اس کی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ نہ رحیم داد نے کوئی کوشش کی اور نہ ہی جیلہ نے اس کی جانب کوئی توجہ دی۔ جیلہ ہر صبح اوپر سے نیچے آتی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے چپ چاپ گزرتی اور اپنے دونوں بچوں کے ہم راہ اسکول چلی جاتی۔ واپسی پر بھی وہ بے نیازی سے اوپر چلی جاتی۔ اسکول کے علاوہ اس کا زیادہ وقت اوپر کی منزل پر گزرتا۔ کوئی ملنے آتا تو اسے بھی وہ اوپر ہی بلوالیتی۔

جیلہ ذرا دیر بعد رحیم داد کے سامنے پہنچ گئی۔ گڈو اس کی انگلی پکڑے ہوئے تھا۔ اور سینا ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ ان کے پیچھے تاجاں تھی۔ وہ بچوں کے بستے، سرخ اون کا بڑا سا گولا اور اس میں بھنسی ہوئی بنائی کی سلائیاں اٹھائے ہوئے تھی۔ جیلہ کا لباس سفید اور صاف ستھرا تھا۔ وہ ہلکی اونی شال اوڑھے ہوئے تھی۔ سیاہ شال پر سنہری بوٹیوں کی کشیدہ کاری تھی۔ زری کے کام کے ساتھ سبز اور سرخ ریشمی دھاگوں کی کڑھائی بھی تھی۔ وہ گردن اونچی کیے چل رہی تھی۔ رحیم داد اسے بھی بھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

جیلہ چلتے چلتے ٹھکی، دلہیز پر رکی۔ گردن کو خم دے کر اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ رحیم داد جھٹ کھڑا ہو گیا۔ جیلہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”چوہدری! تو آج کل کھیتوں کی اور نہیں جاتا۔ خریف کی فصل تیار ہے۔ اس کی واڑھی کا بھی بندوبست کرنا ہے۔“

”زمیں دارنی! میری طبیعت پچھلے کئی روز سے گڑبڑ ہتی ہے۔“ رحیم داد نے معذرت کے انداز میں رمان سے کہا۔ ”فکر نہ کر۔ نادر خاں ہر کام کی پوری طرح دیکھ بھال کر رہا ہے۔“

”کیا دیکھ بھال کر رہا ہے؟“ جیلہ کا لہجہ تیز اور تیکھا تھا۔ ”اسے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ پھٹی میں لال سوئڈی لگ گئی ہے۔ کئی بوٹوں پر چست تیل اور سفید کھجی بھی نظر آئی۔ ڈوڈے سکر کر رہ گئے ہیں۔ کئی کھیتوں میں تو ڈوڈوں سے تو بنے پھوٹے ہی نہیں۔ مجھے کل ہی رحمان نے بتایا۔ میں خود دیکھنے گئی تھی۔ اپنی آنکھوں سے پھٹی کے بوٹوں میں سوئڈی اور دوسرے کیڑے دیکھے۔“ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجھلاہٹ ابھرنے لگی۔ ”اس طرح کیسے کام چلے گا؟ کپاس کی ساری فصل تباہ ہو جائے گی۔“

”ابھی نادر آتا ہو گا۔ میں اس سے بات کروں گا۔“ رحیم داد نے کرسی کی جانب اشارہ کیا اور

لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”ذرا دیر یہاں ٹھہر جا۔ نادر سے بات کر لے۔ جو کچھ کرنا ہے اسے سمجھا دے۔“ وہ اپنی بات کتے کتے لمحے بھر کے لیے رکا اور سر کے بال انگلی سے کریدنے لگا۔

”سمجھ نہیں آتی پھٹی میں سوئڈی کیسے لگ گئی اور نادر نے اس کے بارے میں کیوں نہیں بتایا؟ روز سویرے میرے پاس آتا ہے۔ پہلے مجھ سے گل بات کرتا ہے۔ بعد میں کھیتوں کی طرف جاتا ہے۔“

”مجھے کیا پتہ؟ وہ کیا کرتا ہے اور تجھے کیا بتاتا ہے؟“ وہ بے زاری سے بولی۔

”تو ذرا دیر کے لیے بیٹھ تو جا۔“ رحیم داد نے نرمی سے اصرار کیا۔ ”نادر آنے ہی والا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ سترے سامنے ہی اس سے گل بات ہو۔ بلکہ میں تو چاہتا ہوں تو خود پوچھ تاچھ کر۔ تنخواہ لیتا ہے مفت تو کام نہیں کرتا۔“

”میں نے تو اب سکول جاتا ہے۔“ جیلہ نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ تو خود ہی نادر سے گل کرنا۔ ویسے بھی زمیں داری تجھے ہی سنبھالتی ہے۔ میں نے اس سے کیا لیتا؟“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے جیلہ کی سمت دیکھا۔ لہجے میں اور زیادہ نرمی پیدا کی۔ ”زمیں دارنی! ایسی بات نہ کر۔ یہ بتا، میں نوں نادر سے کیا کہنا ہے؟“

”کیا کہنا ہے؟“ اس دفعہ جیلہ کے رویے میں جھنجھلاہٹ کے بجائے سنجیدگی کا پہلو نمایاں تھا۔ ”اس سے کہہ کہ پھٹی کے بوٹوں پر فوراً کیڑے مار دو! کپاس کے کرائے۔ ورنہ کپاس کی فصل کا ستیاناس ہو جائے گا۔“

”نہے گڈو نے ماں کے کرتے کا دامن کھینچا اور مچلنے کے انداز میں بولا۔ ”ماں جی! سکول نہیں جانا۔ میں نے پڑھائی کرنی ہے۔“

”چلتی ہوں، ابھی چلتی ہوں۔“ جیلہ نے پیار سے گڈو کا رخسار تھپ تھپایا پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”چوہدری! میں تو سکول جا رہی ہوں۔ تو نادر سے بات کر لیتا۔ بات کیا کرنی ہے۔ یہ کام تو تجھی کو کرنا ہو گا اور ترنت کرنا ہو گا۔ آج ہی بوٹوں پر دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر۔ پہلے ہی بہت خرابی ہو چکی ہے۔“ جیلہ آگے بڑھی۔

”ٹھیک ہے، جیسا تو کہتی ہے وہی کروں گا۔“ رحیم داد رمان سے بولا۔ ”سینا اور گڈو کو سکول جانے دے، تو تھوڑی دیر ٹھہر جا۔“

”اب مجھے ٹھہر کر کیا کرنا ہے؟ جو گل بات نادر سے کرنی تھی وہ میں نے تجھے سمجھائی دی۔ اب مجھے کیوں روک رہا ہے؟“

”میں نوں تجھ سے کچھ اور ضروری گل کرنی ہے۔“ رحیم داد کے لہجے میں التجا تھی۔

جیلہ کچھ نہ بولی۔ آگے بھی نہ بڑھی۔ وہ گردن اٹھائے کچھ سوچتی رہی۔ پھر اس کی آواز ابھری۔ ”میں دوپہر کو واپسی پر تیرے پاس آؤں گی۔“ اس نے رحیم داد کی جانب نہ دیکھا خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ چلے۔ تاجاں بھی ان کے پیچھے پیچھے بڑھی۔

رحیم داد نظریں اٹھائے جیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں وہی پہلی سی تمکنت تھی۔ وہی بانک پن تھا۔ سادگی کے باوجود اس کے گلابی چہرے کے تکیے نقش و نگار دل کش اور حسین نظر آرہے تھے۔ جیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رحیم داد مضمل ہو گیا۔ اس نے گہری سانس بھری، پلٹا اور کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ بڑھا حال اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ رحیم داد کمرے سے باہر نہیں گیا۔

پہر دن گزر گیا۔ سورج چڑھ کر بلندی پر پہنچ گیا۔ مگر نادر نہیں آیا۔ رحیم داد نے حویلی کے ملازم نام دار کو بلایا۔ اسے نادر خاں کی تلاش میں بھیجا۔ وہ جلد ہی واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ نادر کسی ضروری کام سے نزدیک کے چک میں گیا ہے۔ وہ سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ دوپہر تک لوٹے گا۔ یہ اطلاع نادر کی بیوی جنت بی بی نے دی تھی۔ رحیم داد نے نام دار سے مزید بات نہیں کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد بے قراری سے جیلہ کا انتظار کرنے لگا۔



وقت زخمی سانپ بن گیا۔ آہستہ آہستہ ریٹکتا رہا۔ رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ سورج آسمان کے پتوں پتوں پہنچ گیا۔ حویلی کے وسیع صحن میں دور تک پھیلی ہوئی چمکی دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ دوپہر ہو گئی۔ جیلہ واپس ہوئی۔ دونوں بچے اس کے ہم راہ تھے۔ اس دفعہ ان کی کتابیں احمد اٹھائے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قدموں کی آہٹ سن کر رحیم داد کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

جیلہ کمرے کے سامنے پہنچی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی بے نیازی سے آگے بڑھ گئی۔ اس نے رحیم داد کے کمرے کی جانب نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ رحیم داد کا دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ پھر ٹھہر کر گویا سرد پڑ گیا۔ وہ مجھ کر رہ گیا۔ اس نے کرسی کی پشت سے گردن ہٹا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس عالم میں وہ نہ جانے کتنی دیر بیٹھا رہا۔ یکایک چاپ ابھری۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول

دیں۔ دیکھا، دہلیز پر جیلہ کھڑی ہے۔ رحیم داد چند لمحے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا پھر بڑا کر کھڑا ہو گیا۔ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”میں تو سمجھا تھا، آج تو نہیں آئے گی۔“

جیلہ نے کچھ نہیں کہا۔ خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک فائل دبی تھی۔ رحیم داد بھی چپ چاپ قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جیلہ نے چند لمحوں کے سکوت کے بعد پوچھا۔ ”بتا، تو نے کون سی ضروری گل بات کہنے کے لیے مجھے بلایا ہے؟“ اس کے لہجے سے بے زاری صاف ظاہر تھی۔

”تجھ سے کسی نے غلط بتایا میں احسان شاہ کے پاس جاتا ہوں۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ ”اس روز بہت نراض تھی۔ اس لیے میں تجھے ٹھیک سے سمجھا نہ سکا۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں۔“

”مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کو آگے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ”چوہدری! مجھے بہت پتلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ تو احسان شاہ کے پنڈ پیراں والہ جاتا ہے۔ اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھہرتا ہے۔ پر میں نے وشواس نہ کیا۔ ہر بار یہی سوچ کر من کو سمجھا لیا کہ تو ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”اب تو نے کیسے وشواس کر لیا؟“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

”یہ بھی سننا چاہتا ہے تو سن لے۔“ جیلہ کا لہجہ تکیا ہو گیا۔ ”بچھلے دنوں اپنا وکیل محمد عثمان رندھاوا آیا تھا۔ تو اس روز احسان شاہ کے پاس گیا تھا۔“ جیلہ نے رحیم داد کی جانب تکیے نظروں سے دیکھا۔ ”تجھے پتہ نہیں، رندھاوا نے لبور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔ آج کل وہ تیرے اور احسان شاہ کے یار، سردار مراد خاں شاہانی کے ایک کیس میں بیرونی کر رہا ہے۔ شاہانی نے احسان شاہ کے ساتھ تیرے میل ملاپ کے بارے میں جو کچھ بتایا، اس کے بعد میرے وشواس نہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔“ جیلہ نے ہاتھ میں دبی ہوئی فائل رحیم داد کی جانب بڑھا دی۔ ”یہ تیرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ وکیل انھیں واپس دے گیا ہے۔ کلیم میں جو گڑ بڑ ہے وہ تجھے خود ٹھیک کرانی ہوگی۔ وکیل اب یہ کام نہیں کرے گا۔“

رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔ ”میں کلیم تسلیم کو کہاں ٹھیک کراتا پھروں گا؟“ اس نے کاغذات کی فائل سنبھال لی۔

”یہ مجھے نہیں پتہ تو نے کیا کرنا ہے۔“ وہ تلخی سے بولی۔ ”میں تو کیوں یہی کاغذات واپس کرنے لگا تھا۔ ورنہ میں نوں پتہ تھا، تو نے مجھ سے کیا کہنا ہے۔“

کرنے کی بھی کوشش کی۔ ”میرے بارے میں تو نے جو کچھ سنا ہے، اس میں کتنا سچ ہے کتنا جھوٹ میں نوں اب کچھ نہیں کہتا۔“ اس نے آواز میں مزید افسردگی پیدا کی اور آخری حربے کے طور پر جیلہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ”اب تو میرے لیے ایک ہی رستہ رہ گیا ہے۔ کہہ تو میں یہاں سے چلا جاؤں۔“

”نہیں چوہدری! تجھے یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں۔“ جیلہ نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”میں اپنے دونوں بچوں کو لے کر خود یہاں سے چلی جاؤں گی۔ اب یہ حویلی میری نہیں رہی، یہ پنڈ میرا نہیں رہا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں نے بہت پہلے یہ بات سوچ لی تھی۔ تجھے چنتا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ رحیم داؤد منت سماجت پر اتر آیا۔ عاجزی سے بولا۔ ”مجھے معاف کر دے، میں داری! جو کسے گی ویسا ہی ہو گا۔ سچ کہتا ہوں، ویسا ہی ہو گا۔ تو مجھے آزمائے۔“

”دیکھ چوہدری! میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ یہ ہم دونوں کے لیے بہتر ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نے تو اب یہاں سے چلا ہی جاتا ہے۔“

”سرحد پار اپنے گھروالوں کے پاس جائے گی؟“ رحیم داد نے الجھتے ہوئے اپنے شے کا اظہار کیا۔ ”نہیں۔“ جیلہ نے سختی سے انکار کیا۔ اس کے چہرے پر جھلاہٹ آگئی۔ ”ان کے پاس جانا ہوتا تو پہلے کس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا؟ اب تو میرے وہاں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تو کہیں بھی جا۔ پر یہاں سے جا کر کیا کرے گی؟“ رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ ”ایسا خیال دل سے نکال دے۔ یہ تو سوچ، تو یہاں سے جا کر کہاں رہے گی؟ کیا کرے گی؟ کس کے پاس رہے گی؟“

”چنتا نہ کر چوہدری! جیلہ نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”میں اتنی پڑھی لکھی ہوں، آرام سے کسی سکول میں لگ جاؤں گی۔ رہ گئی زمین داری، تو مجھے نہ پہلے اس سے کوئی دلچسپی تھی نہ اب ہے۔ میں تو اپنے گڈو کو بھی زمین دار نہیں بنانا چاہتی۔ میں نے اسے ڈاکٹر بنانا ہے۔ تجھے پتہ ہے میں اسے کیوں ڈاکٹر بنانا چاہتی ہوں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ایسا کر کے میں دیر نہ کر کے آتما کو آئندہ پہچانا چاہتی ہوں۔“

”تو یہاں رہ کر بھی گڈو کو ڈاکٹر بنا سکتی ہے۔“

”چوہدری! مجھے روکنے کی کوشش نہ کر۔ میں یہاں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔“ جیلہ نے دو ٹوک جواب دیا۔ ”میں تو پہلے ہی یہاں سے چلی جاتی پر اب تک اس کا دن نہیں گئی کہ میری آشنا ہے کہ انجان کا دیاہ کروں۔ اسے گلے لگا کر بد کروں۔ میں نے اس کی ماں پھانسی کو جو وچن دیا ہے اسے

رحیم داد نظریں جھکائے پریشان بیٹھا رہا۔ کمرے پر سکوت طاری ہو گیا۔ جیلہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ رحیم داد نے اس کی بے چینی شدت سے محسوس کی۔ دہلی زبان سے پوچھا۔

”وکیل کب آیا تھا؟“

جیلہ نے تیکھے لمبے میں بتایا۔ ”جن دنوں تو تخت محل جانے کا بہانہ کر کے احسان شاہ کی حویلی میں ٹھہرا ہوا تھا۔“

”تیرا مطلب ہے، میں تخت محل نہیں گیا تھا؟“ رحیم داد نے ہڑبڑا کر تردید کی کوشش کی۔ ”پتہ نہیں میرے بارے میں تو نے ایسی باتیں کہاں سے سن رکھی ہیں؟“

”چوہدری! خاما خاٹ دھری نہ کر۔“ جیلہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”مجھے ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ میں نوں پتہ ہے تو کبھی تخت محل نہیں گیا اور نہ تخت محل میں تیرے بال بچے ہیں۔ میں نے کھونج لگایا تو معلوم ہوا تخت محل کے پنواری کی گھروالی کا نام رابعہ نہیں، نسیم بی بی ہے۔ وہ اس کی پہلی گھروالی ہے۔ پچھلے سولہ سال سے اس کے ساتھ ہے۔ وہ بھاول نگر کی رہنے والی ہے۔ کبھی گورداس پور نہیں گئی۔ اس کی کوئی جوان دھی نہیں۔ پتر سب سے وڈا تھا، پچھلے سال مر گیا۔ اور کچھ جانا چاہتا ہے، وہ بھی بتا دوں؟“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جیلہ نے گہری سانس بھری۔ اس کے لمبے کی تلخی افسردگی میں بدل گئی۔ ”میں نے تو یہ بھی سنا ہے، اللہ وسایا کے کتل میں تو بھی احسان شاہ کے ساتھ شریک تھا۔“

اب رحیم داد خاموش نہ رہ سکا، اس نے احتجاج کیا۔ ”یہ بالکل جھوٹ ہے۔“ رحیم داد نے تملاتے ہوئے کہا۔ ”میں نوں تو یہ بھی پتہ نہیں، اللہ وسایا کو کس نے کتل کیا اور کیسے کیا؟ تو مجھے اتنا سچ اور کمینہ سمجھتی ہے۔ میں تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہو۔“ جیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات ظاہر کر رہے تھے کہ رحیم داد نے اپنی باتوں سے اسے خاصا متاثر کیا ہے۔ جیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”میں تجھے دوش نہیں دیتی، کسی کو بھی نہیں دیتی۔ میرے بھاگ ہی میں یہ دکھ جھیلنا لکھا تھا۔ اب ان باتوں میں الجھنے سے کیا ملے گا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔“

اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو اڑے اور پلکوں پر لرزے لگے۔ رحیم داد نے لمبے میں رقت پیدا کرتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ ”زمین داری! تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں نوں پتہ ہے تو بہت دکھی ہے۔ اس طرح نہ رو۔“ اس نے جیلہ کی دل جوئی کے ساتھ ساتھ اپنی صفائی پیش

کوشش کی۔ ”فکر کی کوئی گل نہیں۔ میں نے سوئی لگے بوٹوں پر کرم کش دوائی چھڑکنے کا بندوبست کر لیا ہے۔ اسی سلسلے میں سویرے سویرے نکل گیا تھا۔ آج ہی بوٹوں پر سپرے کر دیا جائے گا۔ پریشانی کی کوئی گل بات نہیں۔ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ پروانہ کر۔ کپاس کی پیداوار اس دفعہ پہلے سے کم نہیں زیادہ ہوگی۔“

”تیرے آنے سے پہلے زمیں دارنی سے بات ہوئی تھی۔“ رحیم داد کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ وہ نادر خاں کی باتوں سے مطمئن ہو گیا تھا۔ ”وہ پھٹی میں سوئی لگنے سے بہت پریشان نظر آتی ہے۔ تو اسے بھی سمجھا دینا۔“

”اطمینان رکھیں جی۔ میں اسے آج ہی سب کچھ بتا دوں گا۔ تو کہہ تو ابھی اس کے پاس چلا جاؤں؟“

”ابھی جانے کی ضرورت نہیں۔“ رحیم داد نے اسے منع کر دیا۔ ”بوٹوں پر کیڑے مار دوائی چھڑک جائے تب جیلہ سے بات کرنا۔“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر پوچھا۔ ”سپرے آج ہی ہو جائے گا ناں؟ اس میں بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”آج ہی سپرے ہو جائے گا۔ بالکل ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں جی۔“ نادر خاں نے اعتماد کا اظہار کیا۔ ”میں فصل کی واڑھی کی تیاری میں پھنسا رہا۔ پھٹی کی طرف پوری طرح دھیان ہی نہ دے سکا ورنہ سوئی لگتے ہی دوائی چھڑکنے کا کب کا بندوبست ہو چکا ہوتا۔ تیس نوں پتہ نہیں چوہدری، میں نے تو پھٹی کی چٹائی کے لیے چوگیوں سے بات چیت بھی کر لی ہے۔“

”پر ابھی تو اپنی فصل پوری طرح تیار نہیں ہوئی۔ تین چار ہفتے تو لگ ہی جائیں گے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے پر کہیں کہیں خریف کی واڑھی شروع بھی ہو چکی ہے۔ اپنی فصل کچھ دیر میں تیار ہوئی۔ پرواڑھی کی تیاری تو پہلے ہی کر لینی چاہیے۔ یہ تو تیس نوں بھی پتہ ہے۔“

رحیم داد نے وہ فائل نادر خاں کی طرف بٹھائی جو جیلہ نے اسے دے گئی تھی۔ نادر خاں نے فائل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟“ ”وہ حیرت زدہ نظر آ رہا تھا۔“

”یہ میرے کلیم کے کاغذات ہیں۔ جیلہ واپس دے گئی ہے۔ آگے جو کچھ کرنا ہے تیس نوں ہی کرنا ہو گا۔ وکیل کا مٹھاچ سے نکل گیا۔“

”یہ تو ٹھیک ہی ہوا جی۔ فکر نہ کریں جلد ہی سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ آباد کاری کے نکلے میں اپنی جان بچان کے بہت بندے ہیں۔ خوشی سے اپنا کام کر دیں گے اور تھوڑی رشوت لے کر کر دیں گے۔“

پورا کرنا چاہتی ہوں۔“ اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ ”چوہدری! تو اگر مجھے سکھ پہنچانا چاہتا ہے۔ مجھے سکھی دیکھنا چاہتا ہے تو اس کام میں میری مدد کر۔ میرا ارادہ ہے فصل کٹنے کے بعد تاجاں کا ویاہ کر دوں۔ اس کے بعد نینا اور گڈو کے ساتھ لمبور چلی جاؤں گی۔“

”مجھ سے نراض ہو کر جا رہی ہے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایسا نہیں ہو گا۔“ رحیم داد نے جوش و خروش سے کہا۔

اسی وقت نادر خاں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مدھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد نے جیلہ کی جانب دیکھا۔ ”لے زمیں دارنی! اب تو نادر آئی گیا۔ تیس نوں پھٹی کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے، خود اس سے کہہ دے۔“

”میں نے اسے کچھ نہیں کہنا۔ سب کچھ تجھے بتا چکی ہوں۔ تو اسے بتا دینا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔

”میں نے جا کر اب روٹی کھانی ہے۔“

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ نادر نے اس کے جانے کے بعد پوچھا۔ ”زمیں دارنی کو مجھ سے کیا گل بات کہنی تھی؟“ وہ پریشان اور گھبرا ہوا لگ رہا تھا۔

”بیٹھ جا۔ آرام سے بات ہوگی۔“ رحیم داد نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر چپ رہ کر بولا۔ ”پریشانی کی تو کوئی گل بات نہیں؟“

”پریشانی ہی کی گل ہے۔“ رحیم داد نے حیکے لہجے میں کہا۔ ”پھٹی میں سوئی لگ گئی اور تیس نوں پتہ ہی نہ چلا؟ میں پوچھتا ہوں تو کرتا کیا ہے؟“ رحیم داد کے چہرے سے جھنجھلاہٹ نکلنے لگی۔

”گلاں تو وڈی وڈی کرتا ہے۔ یہ کر دوں گا جی۔ وہ کر دوں گا جی۔ اور کیا کر لیا کچھ نہیں۔“ اس نے تہر آلود نظروں سے نادر کو دیکھا۔ ”اس طرح تو نے مینجری کی تو اپنی زمیں داری کا تو بیڑا ہی گرک ہو جائے گا۔ میں نوں پتہ ہے، خریف کی فصل کی تو اصل کمائی کپاس سے ہوتی ہے۔ اور تو نے اسی پر دھیان نہیں دیا۔“

نادر نے گردن جھکا کر نرم لہجے میں کہا۔ ”چوہدری! ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ پھٹی میں سوئی لگ گئی ہے۔ بہت تھوڑے سے بوٹوں میں لگی ہے۔ جیسے ہی مجھے پتہ چلا خود جا کر وہ بوٹے دیکھے۔“

”پر تو نے مجھے کچھ نہیں بتایا جب کہ تو روز میرے پاس آتا رہا۔“

”میں نے تجھے اس لیے نہیں بتایا کہ خاما خا پریشان ہو گا۔“ نادر خاں نے اسے مطمئن کرنے کی

”ویسے تو کام جلد ہی کرانے کا ہے۔ پر تو ابھی کہیں نہ جانا۔ میری طبیعت ادھر ٹھیک نہیں رہتی۔ سوچتا ہوں کچھ دنوں کے لیے شاہ جی کے پاس چلا جاؤں۔“

”ضرور چلا جا۔“ نادر نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”میں نے غور کیا ہے، چوہدری تو کچھ عرصے سے پریشان پریشان نظر آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے بیمار ہو۔ شاہ جی کے پاس چلا جائے گا تو وہاں طبیعت بالکل چنگی ہو جائے گی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ادھر کی فکر نہ کر۔ ہر کام بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ پچھلی پر سرے تو آج ہی ہو جائے گا۔ آباد کاری کے محکمے میں کچھ روز بعد چلا جاؤں گا۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”شاہ جی کے پاس کب تک جانے کا ارادہ ہے؟“

”آہستہ بول۔“ رحیم داد نے چونکنا نظروں سے کمرے کے باہر دیکھا۔ ”ارادہ تو آج ہی جانے کا تھا پر اب تو دیر ہو گئی۔ کل چلا جاؤں گا۔ تو جیلہ سے آج ہی ملنے کی کوشش کرنا۔ وہ آج نہ ملے تو کل میرے جانے کے بعد ضرور ملنا۔ بلکہ کل ہی تیرا ملنا ٹھیک رہے گا۔ اس کو پچھلی کے بوٹوں پر سرے اور فصل کی واڈھی کے بارے میں ہر بات اس طرح بتا دینا کہ وہ بالکل مطمئن ہو جائے۔ سمجھ گیا نا؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ نادر نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”پروا نہ کر۔ میں زمیں دارنی کو پوری طرح مطمئن کر دوں گا۔ پر تیرے بارے میں اگر وہ پوچھے تو کیا کہوں؟“

”ویسے تو ہو سکتا ہے وہ یہ بات پوچھے ہی نہ۔ پر تو خود اس کے کان میں ڈال دینا کہ میں کلیم کے چکر میں ملتا ہوں۔“ رحیم داد نے نادر خاں کو سمجھایا۔

نادر خاں نے اسے باور کرایا۔ ”جیسا کہتا ہے وہی کر دوں گا۔ بالکل بے فکر ہو کر شاہ جی کے پاس جا۔ واپسی پر تجھے ہر کام ٹھیک ٹھاک ملے گا۔“ اس نے پہلو بدلا۔ ”اجازت ہو تو جی گھر جا کر روٹی کھا لو؟“

”ضرور روٹی کھا۔“

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا منگوا لیا۔ کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے لیٹ گیا۔ شام کو کچھ دیر کے لیے ٹھٹھا ہوانہ کی طرف چلا گیا۔ واپسی پر وہ جیلہ کا انتظار کرنے لگا۔ جیلہ کچھ ہی دیر قبل پھانٹاں کے ہم راہ حویلی سے باہر گئی تھی۔ رحیم داد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔



رحیم داد چاہتا تھا کہ احسان شاہ کے پاس جانے سے قبل جیلہ سے ایک بار اور مل لے۔ اس کی

تندورت دور کرنے کی کوشش کرے۔

جیلہ واپس آئی تو خاموشی سے رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر کمرے کے دروازے کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ رحیم داد بے چین بیٹھا انتظار کرتا رہا کہ وہ اس کی طرف دیکھے تو بات کرنے کی کوشش کی جائے۔ مگر جیلہ نے یہ موقع ہی نہیں دیا۔ رحیم داد دل برداشتہ ہو کر دیر تک کرسی پر بیٹھا رہا پھر بستر پر لیٹ کر سو گیا۔

سورے جیلہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ سکول چلی گئی۔ اس وقت بھی رحیم داد کی جانب اس نے مطلق توجہ نہ دی۔ گردن اٹھائے بے نیازی سے اس کے کمرے کے سامنے سے گزر گئی۔

پہرہ گزر گیا۔ رحیم داد نے ٹانگ منگوا لیا۔ اس میں ضرورت کا سفری سازو سامان رکھوایا اور احسان شاہ کے گاؤں کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس دفعہ بھی وہ ہفتے بھر سے زیادہ ٹھہرنے کے ارادے سے چلا تھا۔ سہ پہر کو وہ احسان شاہ کی حویلی پر پہنچ گیا۔ شیدا پھانک ہی پر مل گیا۔ اس کی زبانی اطلاع ملی کہ احسان شاہ گاؤں سے باہر گیا ہے۔ رحیم داد کو سخت کوفت ہوئی۔

رحیم داد واپسی کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ شیدا بولا۔ ”چوہدری! تو سردار مراد خاں شاہانی سے تو مل لے۔ وہ کئی روز سے ادھر ہی ٹھہرا ہے۔“

رحیم داد نے واپس کو ٹلے ہر کشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شیدا کے ہم راہ حویلی کے دیوان خانے میں پہنچا۔ شاہانی کچھ ہی دیر پہلے سو کر اٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ ”بھہ کر گرم جوشی سے گلے لگایا۔“ ”سین چوہدری! تو بہت موکے سے آیا۔ میں اکیلا میاں گھبرا رہا تھا۔ تیرے ساتھ چنگی شام گزرے گی۔ سورے میں لمور چلا جاؤں گا۔“

”چند روز ٹھہر نہیں سکتا؟ چلا جائے گا تو میرا کیا بنے گا۔ میں تو یہاں ہفتے دو ہفتے ٹھہرنے کے ارادے سے آیا تھا۔“

”چوہدری، ٹھیک ٹھیک بتا تو یہاں کب تک ٹھہرنا چاہتا ہے؟“

”شاہ جی سے مل کر ہی جاؤں گا۔ آیا تو یہی سوچ کر ہوں۔ اس سے ملنا ضروری بھی ہے۔“

”پر شاہ جی کا تو جلد لوٹنے کا کوئی پروگرام نہیں۔ پتہ نہیں کب تک آئے۔ تو کہاں تک انتظار کرے گا؟“ شاہانی نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”ایسا کر، پہلے نہادھو کر کپڑے بدل۔ جانے کا رستے سے آیا ہے۔ ذرا اپنا حلیہ تو دیکھ، کپڑوں پر کتنی خاک دھول ہے۔ تھکا ہوا بھی نظر آ رہا ہے۔ میں بھی نہانے ہی جا رہا ہوں۔ تو بھی تیار ہو جا۔ فیر محفل جئے گی۔“

مراد شاہانی غسل کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی اس کمرے میں پہنچا جس میں شیدا نے اس کے

”اس کا لہا ہی پروگرام ہے۔ جہاں آباد سے وہ کچھ دنوں کے لیے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ کے کارٹائیٹ جائے گا۔“ شاہانی نے وہ ہسکی کی چسکی لگائی۔ ”ویسے اس کا ارادہ ٹوانوں کے علاوہ سے بھی ملنے کا ہے۔ وہ سردار پور نون، نور پور اور بھلوال شہر جانے کو کہتا تھا۔“ اس نے ہلکا سا لہا لگایا۔ ”سہی! مجھے تو یہ اس کا سیاسی دورہ لگتا ہے۔ تیں نوں پتہ ہے۔ شاہ جی سیاست بھی تو آہے اور بہت اونچی سیاست لڑا تا ہے۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو اس کے ساتھ ہی لہور کیوں نہ چلا گیا؟“

”چلا جاتا۔ ارادہ بھی یہی تھی۔ پر زینت کے لیے ایک رات اور رک گیا۔“

”زینت کون؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”بہت زور دار رن ہے۔ ایک دم پوٹ۔ دیکھے تو دیکھتا ہی رہ جائے گا۔“ شاہانی نے ہنس کر یا۔ ”پچھلے ہی ہفتے شاہ جی اسے اٹھوا کر کوٹ میں لایا ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

یک بات اور بھی ہے اس میں۔ ”سردار شاہانی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”وہ کیا بات ہے؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”پہلے وہ ہندنی ہوتی تھی۔ فسادات کے دنوں میں ایک مسلمان کھمار کے ہتھ چڑھ گئی۔“ شاہانی نے وہ ہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بتایا۔ ”میں اس بار یہاں آیا تو شاہ جی نے زینت کا ذکر اس طرح کیا کہ میں نے زور دے کر اسی رات اسے اپنے کمرے میں بلوایا۔ مجھے اتنی پسند آئی کہ روز ہی اسے لیتا ہوں۔ دو روز تو چپ چاپ رہی۔ پوچھنے پر بھی نہ بولی۔ بعد میں اس نے اپنے بارے میں سب لہجہ بتا دیا۔“

”کیا کیا بتاتی تھی؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”کتنی تھی پہلے اس کا نام نکستلا ہوتا تھا۔ پوستان میں ڈاکٹری کرتا تھا۔“ مراد خاں شاہانی ٹھہر کر کہتا تھا۔ ”فسادات اور بلوؤں میں اس کا سارا ہی تہر تر ہوتا گیا۔ وہ اکیلی رہ گئی تو بندوں کے ہاتھ سرحد پار جانے کے ارادے سے چیچہ وطنی پہنچی۔ وہیں ان کے کارواں پر رات کے ڈیرے میں حملہ ہوا۔ بلوائیوں میں ایک کھمار بھی تھا۔ وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا۔ اسی نے اسے مسلمان بنایا۔ نکستلا سے اس کا نام زینت بی بی رکھا۔“

”اب تک وہ کھمار ہی کے گھر میں تھی؟“

”نہیں!“ شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ کھمار کے گھر میں لگ بھگ تین سال رہی۔ ایک

قیام کا بندوبست کیا تھا۔ رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی ٹرک سے اگلے کپڑے نکالے اور نہانے کے لیے غسل خانے میں ٹھس گیا۔ پانی گرم تھا۔ رحیم داد کو غسل کرنے میں لطف آیا۔ وہ دیر تک نہاتا رہا۔ غسل کرنے کے بعد طبیعت تروتازہ ہو گئی۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور بن سنور کربال میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ وہ رحیم داد کا انتظار کر رہا تھا۔

شام دے قدموں حویلی کی اونچی اونچی فصیل نما دیواروں سے نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا آہستہ آہستہ فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ شیدانے لیمپ روشن کیا اور کونے میں رکھے ہوئے اونچے اسٹول پر رکھ دیا۔ کمرے کے باہر برآمدے میں پیڑ وکس بھی جل رہا تھا۔ اس کی تیز روشنی باغ میں دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ باغ سنسان تھا۔ درختوں پر پالا پڑ رہا تھا۔

شیدانے وہ ہسکی کی بوتل مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کے سامنے پڑی ہوئی میز پر رکھ دی۔ اس کے ساتھ طشت میں گلاس تھے اور پانی سے بھرا ہوا جگ تھا۔ وہ ہسکی کے دو پیگ پہلے شیدانے نے بنائے۔ شاہانی اور رحیم داد کو پیش کیے۔ وہ چند لمحے ان کے قریب ادب سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا دور چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس نکلایا۔ ہاتھ اونچا کیا اور مسکرا کر وہ ہسکی کا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ ذرا دیر تک دونوں چپ بیٹھے سے نوشی کرتے رہے۔ پھر شاہانی کی آواز ابھری۔ اس نے پوچھا۔ ”چوہدری! تیں نوں یہاں کتنے روز ٹھیرتا ہے؟“

”اب یہاں ٹھیر کر کیا کروں گا۔ تو نے ہی بتایا تھا شاہ جی کی واپسی کا کچھ ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جانے کب آئے۔ میں کب تک اس کا یہاں انتظار کروں گا۔“

”تو کیا تو بھی کل صبح یہاں سے چلا جائے گا؟“

”کل صبح نہیں۔“ رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ ”دو تین روز ٹھیر کر ہی جاؤں گا۔“

”نوراں کے لیے ٹھیرنا چاہتا ہے؟“ مراد خاں شاہانی نے آنکھ مار کر قہقہہ بلند کیا۔ ”پر نوراں تو اب یہاں ہے نہیں۔ پچھلے دنوں جہاں آباد سے ملک منصور خاں ٹوانہ ادھر آیا تھا۔ نوراں اسے اتنی پسند آئی کہ وہ اسے لے گیا۔ شاہ جی بھی منصور خاں کے ہم راہ گیا ہے۔“

”تجھے یہ اطلاع کیسے ملی؟“ رحیم داد کا چہرہ اتر گیا۔ نوراں کے جانے کی خبر سن کر اسے ملال ہوا۔ ”شاہ جی اور ملک منصور ٹوانہ کل ہی دوپہر کو یہاں سے گئے ہیں۔ مجھے حویلی میں ٹھیرے ہوئے ۵ روز ہو گئے۔“

”شاہ جی نے بتایا نہیں کب تک لوٹے گا؟“

”پر تجھے تو سوہنی اور جوان رن پسند نہیں۔“ رحیم داد نے مراد خاں شاہانی کو مسکرا کر چھیڑا۔
”تیں نوں تو رتے پسند ہے۔“

”چوہدری! تو اس رمز کو نہیں سمجھ سکتا۔ اناڑی جو ٹھیرا۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”کبھی کبھی تو رتے بھی مزا دے جاتی ہے۔ پر روز روز نہیں۔“ اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگائی۔
”تو نے زینت کو دیکھا نہیں۔ تین شوہروں کے پاس رہ چکی ہے۔ بچے بھی جن چکی ہے پر اب تک اس کا بدن رشیم کی طرح ہے۔ نرم اور ملائم۔ چہرہ تو ایسے دکھتا ہے جیسے صبح کی اجلی دھوپ۔“

”لگتا ہے زینت تجھے کچھ زیادہ ہی پسند آگئی ہے۔“ رحیم داد نے شوخی سے کہا۔ ”ساتھ لے جانے کا تو ارادہ نہیں؟“

”شاہ جی راضی ہو جائے تو ضرور لے جاؤں گا۔“ شاہانی نے نشے میں جھوم کر کہا۔ ”پر وہ زینت کو ابھی اپنے کوٹ سے کہیں جانے نہ دے گا۔ زینت اسے بھی پسند ہے۔“

اس دفعہ رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ شاہانی بھی چپ رہا۔ دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے اور رک رک کر وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ آخر رحیم داد نے خاموشی ختم کی۔
”شاہانی! میں نوں ایک گلہ ہے تجھ سے۔“

”مجھ سے گلہ ہے؟“ شاہانی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کس بات کا گلہ؟“

”محمد عثمان رندھاوا تیرا وکیل ہوتا ہے نا؟“

”بالکل ہوتا ہے۔“ مراد خاں شاہانی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”پر تجھے اس سے کیا لینا؟“

”تیں نوں پتہ ہے، وہ اللہ وسایا کا بھی وکیل ہوتا تھا۔“

”یہ تو رندھاوا ہی نے مجھے بتایا تھا۔“ شاہانی نے وضاحت کی۔ ”میں تو کبھی اللہ وسایا سے نہیں ملا۔ شاہ جی سے کبھی کبھار اس کا ذکر ضرور سنا تھا۔ رندھاوا نے اللہ وسایا کے بارے میں بات کرتے کرتے تیرا بھی تذکرہ کیا تھا۔ ویسے صاف گل بات یہ ہے چوہدری، میں رندھاوا کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا۔ میں نے پہلی بار اپنے کيس کی پیروی کے لیے اسے کھڑا کیا ہے۔“

”پر تو اتنے جلدی اس پر ایسا مہمان ہو گیا کہ میرے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ یہ بھی بتا دیا کہ میں شاہ جی سے برابر ملتا جلتا رہتا ہوں۔ اس کے ساتھ گہری یاری ہے اور اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھیرتا بھی ہوں۔“

”میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔“ مراد خاں شاہانی نہایت سادگی سے بولا۔ ”اس میں برا متانے کی کون سی گالہ ہے۔“

نکا بھی پیدا ہوا۔ بعد میں کہہ مارنے اسے بچ دیا۔ اس بار اسے رکن پور کے ایک سکول ماسٹر کی والی بننا پڑا۔ زینت مجھے بتاتی تھی۔ ماسٹر بہت نیک بندہ تھا اس کے پاس وہ بہت آرام سے تھی۔ اس سے بھی ایک بچہ ہوا۔ دوبارہ حاملہ تھی کہ مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی ایک فوجی پارٹ میں اس کا کھوج نکال لیا اور اپنے ساتھ فیروز پور لے گئی۔ ”شاہانی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔“ فیروز پور میں اس کا ایک چاچا ہوتا تھا۔ زینت کو اس کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ زینت بی بی سے ایک بار نہ نکلتا بن گئی۔“

”پر وہ واپس کیسے آگئی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

شاہانی ہنس کر بولا۔ ”جو ذال تین سال سے بھی اوپر مسلمانوں کے پاس رہ چکی ہو۔ دو بچے ہو جن چکی ہو اور تیسرا پیٹ میں ہو، اسے بندو کیسے قبول کر لیتے؟ کتنی تھی خود اس کا چاچا اور چائیں اس کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ اپنے کھانے پینے کے برتن تک اسے جھوٹے نہ دیتے تھے۔ زینت کے دو چچیرے بھی تھے۔ وہ اس کے دونوں بچوں کو مار ڈالنے کی گھات میں تھے۔ زینت کو اس کا پتہ چل گیا۔ بہت پریشان ہوئی۔ آخر ایک رات وہ گھر سے چھپتی چھپاتی نکلی۔ دونوں بچے ساتھ تھے۔ سرحد کے نزدیک ایک مسلمان سمگلر مل گیا۔ اس نے اپنے سارے زیور اور روپیہ سگلر کو دے دیا۔ اس نے زینت اور اس کے بچوں کو کسی نہ کسی طرح سرحد پار پہنچا دیا۔ وہ دوبارہ رکن پور گئی۔“

”وہاں تو اسے اپنا گھر والا سکول ماسٹر مل ہی گیا ہو گا؟“

”یہ اس کا نصیب ہی خراب تھا۔ سکول ماسٹر کا رکن پور سے دیپال پور تبادلہ ہو گیا تھا۔“ مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”وہ اس کی تلاش میں دیپال پور جا رہی تھی کہ رستے میں شاہانی ایک مزارع، سلامو، اسے مل گیا۔ اس نے زینت کو اکیلا پایا تو ڈرا دھمکا کر زبردستی اپنے گھر لے گیا۔“

”اور سلامو کے گھر سے اسے شاہ جی نے اٹھوا لیا۔“ رحیم داد نے ہنس کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”لگتا ہے زینت بہت سوہنی زنانی ہوگی۔“

”سوہنی ہے۔ بھرپور جوان ہے اور پڑھی لکھی بھی ہے۔ گھروالے نے اسے ایک سکول میں پڑھانے پر بھی لگوا دیا تھا۔ پر دوسری مسلمان استانیات ہند کی کہہ کر اتنا تنگ کرتی تھیں کہ اس سکول کی نوکری چھوڑ دی۔“ شاہانی نے ہلکا قبضہ لگایا۔ ”میں کہتا ہوں زینت اتنی سوہنی ہے کہ اس سے جلتی ہوں گی۔ خار کھاتی ہوں گی۔“

بھر چلیں گے۔ تو کچھ روز میرے ساتھ بھکر میں رہ کر یہاں آجائے۔ تب تک شاہ جی بھی واپس آجائے گا۔“ شاہانی نے اصرار کیا۔ ”اب تو میرے ساتھ تجھے ضرور چلنا ہوگا۔ بھکر میں تیرا دل بہل جائے گا۔ یہاں اکیلا پڑا کیا کرے گا۔ اپنے پنڈ جائے گا تو وہاں بھی پریشان ہی رہی گا۔“ اس نے پار سے رحیم داد کو ڈانٹا۔ ”دیکھ چوہدری، انکار نہ کرنا۔ جیسا کہ رہا ہوں ویسا کر۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔“ اس نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”شاہ جی سے ضرور مل لے۔ وہ بہتر ہی مشورہ دے گا۔“

فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
رحیم داد نے شاہانی کی بات مان لی۔ اس کے ہم راہ جانے پر رضامند ہو گیا۔
دونوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہوا تو میاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ چھری سے بدن کی خوش شکل عورت تھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی وہ اسے احسان شاہ اور مراد خاں شاہانی کے ساتھ کوٹ کی ایک کونہری میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے اچھی بھی لگی تھی۔ میاں کو دیکھ کر اس کی ساری کدورت رفع ہو گئی۔



پہر دن چڑھے رحیم داد اور شاہانی لاہور چلے گئے۔ سہ پہر تک دونوں لاہور پہنچ گئے۔ رات انھوں نے لارنس روڈ پر واقع ایک کونہری میں بسر کی۔ دوسرے روز دوسری ٹرین سے سرگودھا کے راستے بھکر روانہ ہو گئے۔

سرگودھا شہر سے گزر کر ٹرین خوشاب کی حدود میں داخل ہوئی۔ ہڈالی سے آگے مٹھانوانہ ریلوے اسٹیشن تھا۔ ٹرین مٹھانوانہ پہنچی تو رحیم داد نے وہاں اترنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ جہان آباد جا کر احسان شاہ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے بھکر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر مراد خاں شاہانی آمادہ نہیں ہوا۔ اس نے مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

”چوہدری! یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں کہ شاہ جی جہان آباد میں ہے یا کالرا اسٹیٹ میں۔“
رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”جہان آباد سے یہ تو طوم ہو جائے گا، شاہ جی کہاں ہے۔ اس کے مارے پر وگرام کا پتہ چل جائے گا۔“

سرور مراد خاں نے رحیم داد سے اتفاق نہیں کیا۔ ”خاما خا پریشان ہوگا۔ اول تو شاہ جی سے ملنا ہی مشکل ہے۔ مل بھی گیا تو ٹھیک سے بات نہیں ہوگی۔ اسے تو واپسی پر ملنا۔ اس کی حویلی ہی میں ٹھیک سے بات ہو سکتی ہے۔“

رحیم داد جل کر بولا۔ ”بیزاگر کر دیا اپنا۔ اوپر سے پوچھتا ہے اس میں برا منانے کی کون سی گل ہے؟“ نشے کی ایک تیز لہرائی۔ رحیم داد غصے سے بھڑک اٹھا۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھال لیا۔ وہ شاہانی سے خواہ مخواہ الجھتا نہ چاہتا تھا۔ صرف اتنا شکوہ کرنے پر اکتفا کیا۔ ”رندھاوا سے گل بات کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔“

”صاف صاف بتا۔ گالہ کیسے اے؟“ شاہانی نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ ”تیری باتیں اب تک بالکل سمجھ نہیں آئیں۔ تو کہنا کیا چاہتا ہے؟“

”صاف بات یہ ہے جی! میں یہ نہیں چاہتا جیلہ کو یہ معلوم ہو کہ میں شاہ جی سے ملتا ہوں۔“
رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”میں اس سے چھپ کر یہاں آتا ہوں۔“

”یہ جیلہ تو اللہ و سایا کی راند ہے نا؟“
”ہاں وہی ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”اور تجھے یہ بھی پتہ ہے۔ زمیں داری میں وہ میرے ساتھ سا جھے دار بھی ہے۔“

شاہانی نے کسی قدر بے نیازی سے کہا۔ ”پر میں جیلہ کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ تو نے بھی نہیں بتایا۔“ اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”مجھے کیا پتہ تو اس سے چھپ کر یہاں آتا ہے۔ میں نے تو ایسے ہی باتوں باتوں میں وکیل سے تیرا ذکر کیا تھا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”جیلہ کو اس کا پتہ چل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟“

”تجھے کیا پتہ اپنا تو سارا کھیل بگڑ گیا۔ جیلہ مجھ سے سخت زراض ہے۔“
”اے گھر والی بنانے کا تو ارادہ نہیں تیرا؟“ شاہانی نے مسکرا کر بے تکلفی کا اظہار کیا۔ ”سنا ہے جیلہ بہت سوہنری ہے۔ مجھ سے دل کی صاف صاف بات بتا؟“

”دل کی بات پوچھتا ہے تو سن لے۔ جیلہ مجھے نہ صرف پسند بلکہ بہت پسند ہے۔ میں اس سے ویسا کرنا چاہتا ہوں۔ شاہ جی کی بھی یہی رائے ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ ”پر تو نے وکیل سے میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں بات کر کے سارا معاملہ گڑبڑ کر دیا۔ جب سے اسے اس کا پتہ چلا ہے، بہت روٹھی ہوئی ہے۔ سمجھ نہیں آتی اب کیا کروں؟“ رحیم داد نے جلدی سے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”سچ پوچھ تو میں اسی سلسلے میں شاہ جی کے پاس مشورہ کرنے آیا تھا۔ وہ یہاں ہے نہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں کب تک لوٹے گا۔“

”معاف کرنا چوہدری، مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ ورنہ میں وکیل سے کیوں ایسی گالہ کرتا۔“ شاہانی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کر، تو میرے ساتھ لاہور چل۔ وہاں سے دونوں

رحیم داد نے کوشش بھی کی مگر شاہانی کو آمادہ نہ کر سکا۔ مراد خاں شاہانی سیدھا کنڈیاں پہنچنا چاہتا تھا۔ وہاں اسے ضروری کام تھا جو فوری طور پر نمٹانا تھا۔ چنانچہ سفر جاری رہا۔ کنڈیاں پہنچ کر دونوں اسٹیشن سے نکلے۔ انھوں نے میاں شاہ علی کی حویلی میں قیام کیا۔ شاہ علی بڑا زمین دار اور شاہانی کا گھرا یا تھا۔ مگر کنڈیاں میں دونوں صرف ایک روز ٹھہرے۔

کنڈیاں سے وہ بھکر کی جانب ٹرین میں چلے۔ تھل سے گزرے۔ راستے میں دور دور تک بھراور ریتیلے نیلے نظر آتے تھے۔ اس قدر خاک دھول اڑی کہ بھکر پہنچتے پہنچتے دونوں گرد سے اٹ گئے۔ بھکر میں شاہانی کی خاندانی حویلی تھی۔ اس کے آس پاس بھی شاہانیوں کے مکانات اور حویلیاں تھیں۔ مگر مراد خاں دوسرے محلے میں رہتا تھا۔ اس کی یہ حویلی دو منزلہ تھی اور کسی زمانے میں دیوان لڈال کے خاندان کے ایک ہندو رئیس دیوان کرم چند کی ملکیت تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو بھکر بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کرم چند کے کنبے کو بھی شہر کے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھکر چھوڑنا پڑا۔ مراد خاں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ صرف تیرہ ہزار میں کرم چند کی عالی شان حویلی خرید لی اور اسی میں مستقل رہائش اختیار کر لی۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے لبا سفر کیا تھا۔ دونوں تھکن سے نڈھال تھے۔ جوڑ جوڑ دکھتا تھا۔ مراد خاں شاہانی ذرا دیر ٹھہر کر زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کے قیام کا بندوبست مہمان خانے کے ایک کمرے میں کروا گیا۔ یہ مہمان خانہ دیر اکھلاتا تھا۔

رحیم داد کے کمرے میں پہنچتے ہی فوراً ٹائی آگیا۔ اس نے رحیم داد کی ڈاڑھی اور سر کے بال تراشے۔ ٹائی کے جاتے ہی حویلی کا ماشیا آگیا۔ اس نے رحیم داد کے سر میں موٹے کچے پھولوں میں بسا ہوا کرنے کا تیل ڈالا جس کی دور دور تک شہرت ہے۔ بھکر کی خاص سوغات ہے۔ ماشیے نے ایسی چابک دستی اور مہارت سے چچی کی کہ رحیم داد کی آنکھیں غنودگی سے بند ہونے لگیں۔ سر کی چچی کے بعد ماشیے نے بدن کی ماش کی۔ ایک ایک جوڑا اور ایک ایک ہٹھے کی اینٹھن اور تنچہ انگلیوں اور ہاتھوں کے مساج سے رفع کیا۔ رحیم داد کو بہت سکون ملا۔ ساری تھکن کا فور ہو گئی۔ ماش سے فارغ ہو کر اس نے غسل کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر گہری نیند سو گیا۔

شام ہوئی اور اندھیرا پھیلا تو شاہانی کمرے میں آیا۔ رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ مراد خاں شاہانی اسے قریب کے کمرے میں لے گیا۔ ذرا ہی دیر میں بوتل آگئی۔ گلاس آگئے۔ پانی آگیا۔ دونوں شغل کرنے لگے۔ شاہانی بہت مسرور اور تروتازہ نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا۔ مگر رحیم داد چپ چاپ تھا۔ اس کا چہرہ مضطرب تھا اور آنکھوں کی چمک دھندلی اور دھواں دھواں تھی۔

مراد خاں نے اسے افسردہ اور پریشان دیکھا تو سرگوشی کے عالم میں ہنس کر بولا۔ ”چوہدری! تیری نہ دیکھ کر تو صاف پتہ چلتا ہے، تجھے جیلہ سے پیار ہو گیا ہے۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”یہی ہے ہاں؟“

رحیم داد دل کی بات چھپانہ سکا۔ گہری سانس بھر کر بولا۔ ”جب سے جیلہ نے مجھ سے یہ کہا ہے بڑھوڑ کر لبور چلی جائے گی، اس وکت سے جی پریشان رہتا ہے۔“ اس کے لہجے میں کک تھی۔ اکتاہوں کچھ بھی بھلا نہیں لگتا۔“

پریشانی کی ایک بات یہ بھی تو ہے کہ جیلہ کے ساتھ اس کے مرنے بھی چلے جائیں گے۔“ اپنی نے رحیم داد پر چوٹ کی۔ ”تجھے مربعوں کی فکر زیادہ ہوگی۔“ وہ کھکھلا کر ہنسا۔ ”کناج مالے۔ جیلہ کے ساتھ اس کی زمین اور جائیداد سب تیرے ہتھ میں آجائے گی۔ میں نے غلط تو کیا؟“

”مجھے مربعوں کے نکل جانے کی فکر تو ہے پر جیلہ چلی جائے یہ میں کسی طرح برداشت نہیں رکھتا۔ ویسے اس کی باتوں سے لگتا ہے اپنی زمین تو شاید مجھی کو دے جائے۔ وہ بہت حوصلے والی ہے۔ دل بھی اتنا دڈا رکھتی ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ ”سمجھ نہیں آتی، وہ چلی گئی تو ارا کیا بنے گا؟“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ گلاس ہونٹوں سے لگایا اور آہستہ آہستہ گھونٹ رہنے لگا۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیلتا جا رہا تھا۔

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھا اور چند لمحے ٹکٹکی باندھے تکتا رہا۔ اس نے نشہ کی ترنگ میں لہرا کر کہا۔ ”چوہدری! پروا نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ پریشان نہ رہ۔ میں تجھے کل شام تک کھے پیر کی زیارت پر لے چلوں گا۔ تک کھے پیر کے مزار پر دور دور سے لڑے آتے ہیں۔ منت مانتے ہیں اور ان کی مراد پوری ہوتی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”تو بالکل لڑ نہ کر۔ اٹھا گلاس۔ تو نے تو ابھی کچھ پی ہی نہیں۔ جم کر لگا لے۔ طبیعت بالکل جنگی ہو جائے گی۔“ اس نے گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔

دونوں رات گئے تک شغل بادہ نوشی کرتے رہے۔



لڈال ڈھلے مراد خاں شاہانی نے گیرج سے اپنی لمبی چوڑی پیکار ڈنکالی۔ رحیم داد کو ساتھ بٹھایا اور کھے پیر کی درگاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ کار مراد خاں خود چلا رہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے لڈالاتا رہا۔ اچھا اور ماہر ڈرائیور تھا۔ اس نے کئی موڑ خطرناک تیزی سے کاٹے۔ رحیم داد کا

ہے چاندی کا چراغ روشن کیا، آگے بڑھا اور نہایت عقیدت اور احترام سے اسے قبر کے سرھانے رکھ دیا۔ سر سے گہری اتاری۔ شملے میں گرہ لگائی۔ گہری دوبارہ سر پر رکھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر زیر لب یہ دعا مانگی۔

”پیر سس، جیلہ میری بن جائے۔ مجھ سے ویاہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ جب تک میری منت پوری نہیں ہوگی پگ کی گرہ نہیں کھولوں گا۔ میری مراد پوری ہو جائے گی تو میں تیری خنگاہ پر دوبارہ حاضری دوں گا۔ میٹھی روٹیاں چڑھاؤں گا اور نیا چراغ روشن کروں گا۔“

منت ماننے کے بعد رحیم داد اور مراد خاں شاہانی واپس ہوئے۔ باہر جاتے ہوئے شاہانی نے مجاوروں کو دس دس روپے دیئے۔ دونوں اسٹیشن کے احاطے سے نکلے تو شام کا دھند لگا رفته رفته فضا میں تحلیل ہوتا جا رہا تھا۔ مراد خاں نے کار اشارٹ کی اور واپس گھر جانے کے بجائے بھکر کی معروف تفریح گاہ، باغ دل کشا کی جانب روانہ ہوا۔ دونوں وہاں پہنچے تو اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ باغ سنان پڑا تھا۔

خوبی کی سمت لوٹتے ہوئے کار ایک ٹیلے کے قریب سے گزری۔ ٹیلے پر پیلو کے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے مصلیوں اور کٹانوں کا ہنگامہ تھا۔ جھوم جھوم کر بھنگ گھونٹی جا رہی تھی، مٹی کے کوزوں اور المونیم کے گلاسوں میں بھر بھر کر پی جا رہی تھی۔ ایک طرف مشعل روشن تھی۔ اس کی تیز روشنی میں بیچڑے ڈھولک کی تھاپ پر کولے مکا کرناچ رہے تھے۔ لہک لہک کر جھمر کا مقبول مقامی گیت گارہے تھے۔

نائیں ہے باری تولہ پرانا

میں منتاری تروی نہ جاناں

دوی بگیندی لاکھے

دل پہنے تانگے

رکھاں میں امید مانی دے پلٹن دی

ناپنے والوں کے ارد گرد بیٹھے ہوئے بھنگو، مصل اور کٹانے گہرے نیلے نیلے بھٹھے اور دھوتیاں بانڈے اور میلے کچیلے کرتے پنے زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے، تالیاں بجا کر تھاپ دے رہے تھے۔ نشے کی ترنگ میں کوئی من چلا اٹھ کر بیچڑوں کے ساتھ ناپنے لگتا تو قہقہوں کا زبردست شور بلند ہوتا۔ ڈھولک پر زور سے چوٹ لگائی جاتی۔ ناچ اور تیز ہو جاتا۔ مراد خاں شاہانی نے کار ٹیلے سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑی کر دی۔

چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا۔ مگر شاہانی اطمینان سے اسٹرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ ہنس ہنس کر رحیم داد سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

مراد خاں نے روائی سے قبل دودھ اور گھی میں گندھی ہوئی میدے کی پانچ بڑی بڑی میٹھی گوگیاں تیار کر لیں۔ موتی کی یہ گوگیاں حویلی کے توریئے نے غسل کر کے اور ابلے کپڑے پہن کر تور میں لگائی تھیں۔ صاف ستھرے کپڑے میں لپیٹ کر ان کو مٹی کے کورے کوٹڑے میں رکھا تھا۔ گوگیاں اب کار کی پچھلی سیٹ پر احتیاط سے رکھی تھیں۔ منڈی بیلہ کے بڑے بازار سے گزرتے ہوئے مراد خاں شاہانی نے چاندی کا ایک چراغ بھی خریدا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر خوانچے والے بیٹھے تھے اور طرح طرح کی صدائیں بلند کر رہے تھے۔ انگو بیچنے والا جھوم جھوم کر صدا لگاتا۔

”موتی، سچے موتی۔ آج بھی موتے دیاں لڑیاں کھا۔ جن دے میوئے کھا۔“

اسی طرح گڈیریاں بیچنے والا لہک لہک کر گاہکوں کو اس طور بلاتا۔ ”کھن پٹیرے، کھایار آکھن پٹیرے کھا۔“

خوانچے والوں، دکانداروں اور گاہکوں کی ملی جلی آوازیں ابھرتی رہیں۔ رحیم داد منتا رہا۔ مراد خاں شاہانی چراغ خرید کر دکان سے باہر آیا۔

کار آن کی آن میں تیزی سے دوڑتی بازار سے نکل گئی۔ بازار میں ابھرتی ہوئی آوازوں کا شور رفته رفته دھیمّا پڑ گیا۔

دونوں بھکر اسٹیشن پہنچے۔ یہ نیچی چھت کا مختصر سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ گھراس کا احاطہ خاصا وسیع تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں تک کھے پیر کا مزار تھا۔ مراد خاں شاہانی نے کار اسٹیشن کے باہر ایک طرف کھڑی کی اور رحیم داد کے ہم راہ تک کھے پیر کی زیارت کی جانب چلا۔

مزار پر زائرین اور منت مرادیں ماننے والوں کا جھوم تھا۔ عورتیں بڑی تعداد میں تھیں۔ شاہانی کو دیکھتے ہی مجاوروں نے آگے بڑھ کر گرم جوشی اور تپاک سے اس کا اور رحیم داد کا خیر مقدم کیا۔ رحیم داد نے مجاوروں کی ہدایت کے مطابق مزار پر میٹھی گوگیاں چڑھائیں۔

وہ جھکا ہوا گوگیاں چڑھا رہا تھا تو قریب کھڑی ہوئی ایک نوجوان عورت اولاد نرینہ کے لیے گڑگڑا کر منت مان رہی تھی۔ ”سوہتاں چڑھ پیرا، خدا کنوں میکیوں پتر گھن ڈے۔ میں وجدی داجن آؤساں تے تیدی خنگاہے اٹا گھناؤسیاں۔“

میٹھی روٹی اور گوگیاں مزار پر چڑھانے کے بعد ایک مجاور کی ہدایت پر رحیم داد نے اپنے ہاتھ

”کچھ ہی کہہ کر تو پریشان ضرور ہے۔“ مراد خاں نے اس کی دل جوئی کی۔ ”پریشان نہ ہو۔ تجھے والا پیر کے مزار پر بھی لے چلوں گا۔ وہاں بھی منت ماننا۔ ضرور پوری ہوگی۔ زبردست رت ہے۔ بلیاں والا پیر کی خنگاہ پر بھی دور دور سے منتیں ماننے والے آتے ہیں۔ تیری منت ہی ہو جائے تو بلیوں کو دودھ پلا دیتا۔ موتی پیر کی زیارت پر تجھے بہت بلیاں نظر آئیں گی۔ وہ منت دودھ پیتی ہیں۔“

اس نے ایک بار پھر محبت سے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ ”چودھری! پروا نہ کر۔ زیارتیں اور بہت ہیں۔ ان کے بارے میں زبردست کرامتیں اور معجزے مشہور ہیں۔ ویسے زیارتوں کے پیر بھی ہیں۔ یہ میاں والی علاقہ ہے۔ اسے بھی ایک پیر میاں علی نے بسایا تھا۔ اسی کے نام کا نام میاں والی پڑ گیا۔“

”اس ضلع کا نام میاں والی اس لیے پڑ گیا؟“ رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”یہ پیروں اور پنچے ہوئے بزرگوں کی سرزمین ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ ”یہاں ہر نہر ڈھوک بلکہ ہر خاندان کا اپنا پیر ہوتا ہے۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تب تو تیرا بھی پیر ہو گا۔“

”ہاں سس، میرا بھی ایک پیر ہے۔ بہت اللہ والا بزرگ ہے۔ چہرہ ایسا نورانی، دیکھو تو دیکھتے ہی رہ نہ میرا پیر خریف کی واڑھی کے بعد آئے گا۔ دو سال میں ایک بار دورے پر نکلتا ہے۔ اپنے خاص مریدوں کے پاس چند روز کے لیے ٹھہرتا بھی ہے۔“

رحیم داد چپ رہا۔ اس نے شاہانی کے پیر میں دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ مراد خاں نے چند لمحے دوش رہ کر پوچھا۔ ”کیا ارادہ ہے تیرا؟ بلیاں والا پیر کی زیارت پر چلے گا؟ وہاں بھی منت مان

”نہیں جی، ایک ہی منت کافی ہے۔ میرا دل کہتا ہے تک کھے پیر کی منت کا ضرور اثر ہو گا۔“

شاہانی نے مزید اصرار نہیں کیا۔ دونوں کچھ دیر ٹیلے کے پاس ٹھہرے رہے۔ ڈھولک کی تھاپ پر ناپتے گاتے رہے۔ کٹانے اور منلی بھنگ چڑھا کر قہقہے لگاتے رہے، شور مچاتے رہے۔ اب برا بھلا کیا تھا۔ مشعل کی روشنی میں وہ سایوں کی مانند لہراتے نظر آ رہے تھے۔

شاہانی اور رحیم داد کار میں سوار ہوئے اور حویلی میں پہنچ گئے۔



نمائش سے فارغ ہونے کے بعد مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو اپنا ڈاگ ہاوس دکھایا۔ ڈاگ

دونوں کار سے اتر کر باہر نکلے اور کار کے بڈ گاڑ سے ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ مراد خاں شاہانی نے ٹیلے کی سمت ہاتھ اٹھا کر رحیم داد کو بتایا۔ ”چودھری! اس ٹیلے پر اکثر ایسی ہی میل لگتی ہے۔ ساوی پٹی جاتی ہے اور اس کے نشے میں مست ہو کر عیش ہوتے ہیں۔ ہجڑوں اور منشوروں کے علاوہ ناچ گانے کے لیے کنجریاں بھی آتی ہیں۔ زبردست روک رہتی ہے۔“ اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔

”یہ غریب کمی ہیں۔ ان کی یہی تفریح ہے۔ دن بھر ڈر کر محنت مزدوری کرتے ہیں۔ شام کو میل لگا کر ساوی سے شغل کرتے ہیں، تھکن اتارتے ہیں۔ اپنے دل خوش کرتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”لگتا ہے ادھر بھی ساوی کا زیادہ ہی رواج ہے۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”بہت زیادہ“ مراد خاں شاہانی گویا ہوا۔ ”تجھے بھی ساوی پلو اؤں گا۔ میرے پاس ایک مظفر گڑھیا سنگھ ہے۔ بہت محنت سے گھٹائی کر کے ساوی تیار کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تیار کی ہوئی ساوی پٹے گا تو لطف آجائے گا۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے کبھی ساوی پی ہے؟“

”مٹان میں تھا تو کبھی کبھی پی لیتا تھا۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”پر ادھر ایک مدت سے بالکل نہیں پی۔ ملی ہی نہیں۔ جیلہ کسی طرح کا نشہ پسند نہیں کرتی۔ اس لیے میں نے اپنی حویلی میں کبھی نشہ پانی نہیں کیا۔ اللہ وسایا بھی نہیں کرتا تھا۔“

”تب تو تجھے ضرور ساوی پلو اؤں گا۔“ شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ مارا۔ ”تک کھے پیر کی زیارت پر تو نے منت مانی ہے۔ تیری منت ضرور پوری ہوگی۔ جیلہ بھی تجھے ملے گی اور اس کے مرنے بھی۔ تک کھے پیر کی زیارت پر پانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔“ اس نے حسب معمول قہقہہ بلند کیا۔ ”اسی خوشی میں ایک جشن ہو جائے۔ اپنی حویلی میں میل لگے۔ اس میں تجھے بلوچوں کا جھمر دکھاؤں گا۔ اس نے ٹیلے پر ناپتے ہوئے ہجڑوں کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ناچ تو یہ بھی جھمری ہے پر یہ کوئی جھمر ہے۔“ اس نے ناپسندیدگی کے طور پر منہ بگاڑا۔

”میں واپسی پر میل کا بندوبست کراتا ہوں۔“

رحیم داد خاموشی سے شاہانی کی باتیں سنتا رہا۔ تک کھے پیر کے مزار پر منت ماننے کے بعد وہ سکون محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار کسی قدر چھٹ چکا تھا۔ مگر مراد خاں شاہانی نے اسے خاموش دیکھا تو سمجھا کہ منت کے بعد بھی اس کی پریشانی رفع نہیں ہوئی۔ مراد خاں نے رحیم داد کی پیٹھ آہستہ سے تھپ تھپائی۔

”اب تو پریشان کیوں نظر آ رہا ہے؟“

”ایسی تو کوئی گل نہیں۔“

ڈاگ ہاوس حویلی کے بجھواڑے تھا۔ مویشیوں کا باڑا اور گھوڑوں کا اصطبل بھی قریب ہی تھا۔ مراد خاں کے پاس اچھی نسل کے گھوڑے بھی تھے۔ مگر اسے کتوں سے زیادہ دلچسپی اور انسیت تھی۔ جب سے اس نے نئی کار اور جیپ خریدی تھی گھوڑے کی سواری چھوڑ دی تھی۔ ایک زمانہ ناچ وہ صبح تڑکے اٹھ کر اصطبل میں جاتا۔ کوئی گھوڑا نکالتا اور اس پر سوار ہو کر دور تک دوڑاتا بلاتا۔ مگر اب اس نے گھوڑوں پر توجہ دینا کم کر دیا تھا۔ کتوں ہی میں اس کی دلچسپی روز بروز بڑھتی رہی تھی۔

مراد خاں نے چلتے چلتے رحیم داد کو مخاطب کیا اور فخر سے کہا۔ ”چوہدری! اپنے کو تو صرف دو بڑوں کا چکا ہے۔ کتے اور رتائیں۔ پر کتا اونچی نسل کا ہو۔ رن تو جیسی بھی مل جائے کام چل جاتا ہے۔“ اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”مطلب یہ ہے کہ رن ہونی چاہیے اور نئی سے نئی ہونی ایسے۔“

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے نہ کوئی تبصرہ کیا نہ کسی خاص رد عمل کا اظہار کیا۔ بڑوں ڈاگ ہاوس میں داخل ہوئے تو سورج چڑھ کر آسمان کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ رحیم داد نے اندر کر دیکھا۔ سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ سلسلے وار کچے مکانات تھے۔ خانوں کے سامنے جال اور کھنگل کے درخت تھے۔ درختوں کے نیچے کہیں کہیں چارپائیاں پڑی ہیں۔ چارپائیوں کے پائے اونچے اونچے تھے۔ کئی چارپائیوں کے ساتھ چادروں کے بنے ہوئے لوہے لٹک رہے تھے۔ ان میں شیر خوار بچے لیٹے تھے۔ قریب ہی عورتیں بیٹھی چائی میں دودھ بلو رہی تھیں۔ نوکریاں بن رہی تھیں یا کسی اور کام کاج میں مصروف تھیں۔ وہ اپنا کام بھی کرتی تھیں اور رک رک کر پنگوڑا بھی ہلاتی جاتیں۔ دھیسے سروں میں کوئی لوری بھی گنگنائیں۔

کتوں اور کیوں کے کچے اور بوسیدہ مکانات سے ہٹ کر احاطے کے مشرق گوشے میں پختہ ات تھی۔ اس پر کھیر مل کی خنیدہ چھت تھی۔ سامنے کے رخ پر طویل برآمدہ تھا۔ برآمدہ خوب ٹھاٹھ تھا۔ درمیان سے تنگ راستہ گزرتا تھا جس کے دوسرے سرے پر دروازہ تھا۔ وہ ایک بڑے رے میں کھلتا تھا۔ راستے کے دونوں طرف لوہے کی سلاخوں کا مضبوط جنگلا تھا۔ جنگلے کے اندر تین تھتے اور اس وقت رات کھا رہے تھے۔

ڈاگ ہاوس میں ہر طرف کچے گوشت کی بساند پھیلی ہوئی تھی۔ جنگلے کے قریب ہی ایک گھنے خست کے نیچے چند کوئی زمین پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کھانے میں جوار اور باجرے کی روٹیاں تھیں۔ ایسی روٹیوں کو ڈوڈھا کہا جاتا ہے۔ کوئی شلجم کے پتوں کے ساگ اور لسن کے ساتھ

ہاوس حویلی سے متصل ہی تھا۔ ڈاگ ہاوس کیا تھا، اچھا خاصا بڑا مکان تھا۔ طرز تعمیر کے اعتبار سے کسی سرکاری افسر کا بنگلہ لگتا تھا۔

اس میں کتوں کے رہنے اور آرام کرنے کے لیے کمرے تھے، کونٹھریاں تھیں۔ کتوں کو نسلانے کے لیے غسل خانے تھے، چم قادی کے لیے برآمدے تھے۔

ڈاگ ہاوس میں دو درجن سے زیادہ کتے تھے۔ ان میں بیشتر نایاب اور اعلیٰ نسل کے کتے تھے۔ کتوں کو نسلانے دھلانے، رات ب دینے، چم قادی کرانے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے پندرہ ملازم تھے۔ وہ کوئی کھلاتے تھے اور اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ڈاگ ہاوس کے وسیع احاطے کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ کتوں کے علاج معالجے کے لیے ایک سلوتری بھی مقرر تھا۔ وہ صبح شام باقاعدگی سے کتوں کا معائنہ کرتا تھا۔

شہابی کو کتے پالنے کا دیوانگی کی حد تک شوق تھا۔ وہ بھکر میں ہوتا تو ہر صبح کتوں کو دیکھنے ڈاگ ہاوس ضرور جاتا۔ انھیں بڑے لاڈ پیار سے پکارتا۔ ان کے منہ سلالتا۔ پیٹھ اور گردن پر پیارے ہاتھ پھیرتا۔ کوتیوں سے ان کے بارے میں طرح طرح کے سوالات کرتا۔ کسی کتے کو ست پانا، تشویش کا اظہار کرتا۔ فوراً سلوتری کو بلواتا۔ کتے کو دکھاتا اور اس کی بیماری اور تکلیف کے بارے میں تحقیقات کراتا۔ پوری دلچسپی کے ساتھ اس کا علاج کراتا۔ روز اس کے متعلق پوچھ گچھ کرتا۔ کتوں کو سویرے سویرے غسل دیا جاتا تھا۔ دو بکرے روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ ان کے گوشت سے کتوں کے لیے رات ب تیار کیا جاتا۔ رات ب دیتے وقت مراد خاں شہابی عام طور پر خود موجود ہوتا۔ کرسی ڈال کر سامنے بیٹھ جاتا اور کتوں کو گوشت کھاتے دیکھتا رہتا۔

مراد خاں شہابی کو اپنے کتوں پر بڑا ناز تھا۔ وہ بڑے فخر سے مہمانوں کو اپنا ڈاگ ہاوس اور اس میں رہنے والے کتے دکھاتا۔ ہر کتے کے بارے میں ایک ایک تفصیل نہایت وضاحت سے بیان کرتا۔ کسی سرکاری افسر یا جاگیردار کے پاس اعلیٰ نسل کا کتا دیکھتا تو اس کے بچے حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ انھیں چوری چھپے اٹھوا لینے میں مطلق عار محسوس نہ کرتا اور بڑے دھڑلے سے ہنس کر ایسے کتوں کے بارے میں بتاتا کہ انھیں اس نے کس طرح حاصل کیا۔

کتے اس کی جاگیردارانہ شان و شوکت کی علامت تھے اور شکار کے لیے بھی کام آتے تھے۔ اکثر کتوں کی دوڑ کراتا۔ کبھی کبھی انھیں ریچھوں سے بھی لڑاتا۔ اور ان پر لمبی لمبی شرمیلی لگاتا۔ کتوں کی دوڑ کرانا اور انھیں لڑانا، علاقے کے دوسرے بلوچ سرداروں اور جاگیرداروں کی طرف مراد خاں شہابی کا بھی محبوب مشغلہ تھا۔

بات ہے۔ میں نے تو کتوں کے ایسے شوکین اور ان سے گہری دلچسپی رکھنے والے دیکھے ہیں جو ایک سحے کے صرف دو ادارو پر ۵ ہزار خرچ کر دیتے ہیں۔“

”نہیں جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

”میں نے تجھ سے غلط نہیں کہا۔“ شاہانی نے اپنی بات پر زور دیا۔ ”میرا ایک یا درشت خاں جتنی ہے۔ دوا بلوچ سردار ہے۔ زیادہ تر کوئٹہ میں ملتا ہے۔ اسے بھی کتے رکھنے کا زبردست شوک ہے۔ بہت اعلیٰ نسل کے کتے اس کے پاس ہیں۔ میں کبھی کبھی گرمیوں میں اس کے پاس چلا جاتا ہوں۔ سچ پوچھ تو اس کے کتے ہی دیکھنے جاتا ہوں۔“

”اس کے پاس بھی ڈاگ ہاؤس ہوگا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل ہے اور بہت شاندار ہے۔ میں تجھے اس کے ایک کتے کی دوا دارو کے بارے میں بتا رہا تھا جس پر ۵ ہزار روپے خرچ آیا تھا۔“

”پنج ہزار تو بہت ہوا“ اور وہ بھی ایک کتے کے علاج پر۔“

”بالکل اتنا ہی روپیہ خرچ ہوا تھا۔“ مراد خاں شاہانی نے زور دے کر کہا۔ ”میں ان دنوں کوئٹہ میں ہوں تھا جب سردار درشت خاں جتنی کا ایک سینٹیل بیمار ہوا تھا۔ تین ہفتے کے لگ بھگ اس کی دوا دارو ہوتی رہی۔ پہلے اسے گھوڑا ہسپتال میں داخل کیا گیا۔ وہاں اس کی بیماری کم نہیں ہوئی تو بروری روڈ کے ریسرچ سینٹر میں علاج کے لیے بھیجا گیا۔ سینٹر میں چار و نٹری ڈاکٹروں نے تین مرتبہ آپریشن کیا۔ تین انجیکشن روزانہ صبح، دوپہر اور شام کو پابندی سے لگائے جاتے تھے۔ ایک انجیکشن ۳۰ روپے میں آتا تھا۔“

”تیس روپے کا انجیکشن!“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ہائیں! اتنے ہی میں آتا تھا۔ میں تو وہاں موجود تھا۔ کئی بار تو انجیکشن میرے سامنے منگوائے گئے۔“ مراد خاں شاہانی تفصیل سے بتاتا رہا۔ ”ان انجیکشنوں کے علاوہ آپریشن کے دوران کتے کو گلوکووز چڑھایا گیا اور طاقت کے انجیکشن بھی ساتھ ساتھ لگائے جاتے۔ اسے روزانہ ریسرچ سینٹر کار میں بھیجا جاتا۔ سینٹر شہر سے چھ میل دور ہے۔ جب تک کتا بیمار رہا دو نرسیں دن رات اس کی دیکھ بھال کرتی تھیں۔“ سردار شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”مطل کا پورا ایک تھان تو کتے کے زخموں کی مرہم پٹی پر لگا۔“

”تب تو ۵ ہزار سے اوپر ہی خرچ آیا ہوگا۔“ رحیم داد نے شاہانی کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔

”پراسے منگے علاج کے بعد کتا بالکل چنگا ہو گیا ہوگا۔“

ڈوڈھے کھانے میں مشغول تھے۔ مٹی کے ایک پیالے میں مکھن اور دوسرے میں جندکی پھلیوں کا اچار بھی کھانے کے لیے موجود تھا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو دیکھتے ہی وہ کھانا چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ ہر طرف بلبل مچ گئی۔ عورتیں بھی کام کاج چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ہر گوشے اور ہر سمت سے صدائیں بلند ہونے لگیں۔

”سین، صداجیویں، سکھی صحت ہو دیں۔“

دو کوئی بھگم بھگم کر سیاں اٹھا کر لائے اور لوہے کے جنگلے کے عین سامنے درخت کے سائے میں رکھ دیں۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کوئی کرسیوں کے پیچھے نظریں بچا کر ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شاہانی نے کچھ دیر بعد پلیٹ کران کی جانب سرسری سی نظر ڈالی۔ ہاتھ سے اشارہ کیا، اونچی آواز سے کہا۔ ”جاؤ روٹی کھاؤ۔“ اس کے لمبے میں رعوت تھی۔

وہ چپ چاپ چلے گئے اور فرش پر بیٹھ کر ساگ دوڈھا کھانے میں جٹ گئے۔ مراد خاں کتوں کا گوشت کا راتب کھاتے دیکھتا رہا اور ہر کتے کی جانب انگلی اٹھا کر رحیم داد کو جتا رہا۔ ”یہ کالے کالے دھبوں والا فاکس ہاونڈ ہے۔ یہ کوکر سینٹیل ہے، یہ الیشن ہے۔ وہ گرے ہاونڈ ہے، اس کے ساتھ والا میٹ ہے، یہ بل ٹیریر ہے، یہ پوڈل ہے، وہ کونے والا برنارڈ ہے۔ یہ باکسر ہے، یہ براڈ ریٹرور ہے، یہ نیوفاؤنڈ لینڈ ہے۔ وہ دیوار کی ساتھ ایرڈین ٹیریر ہے۔ یہ کولی ہے۔“ وہ جس کتے کی جانب انگلی اٹھاتا اس کی نسل اور خصوصیات کے بارے میں بھی نہایت ذوق و شوق سے بتاتا جاتا۔ رحیم داد کو کتوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ مگر مراد خاں شاہانی کی خوش نودی کی خاطر بات توجہ سے سنتا رہا۔ ویسے وہ شاہانی کا ڈاگ ہاؤس دیکھ کر خاصا مرعوب ہوا تھا۔ حیرت سے نظریں اٹھا کر ایک ایک طرف دیکھتا اور شاہانی کی باتیں سنتا۔

اسی حیرت اور استعجاب کے عالم میں اس نے شاہانی سے پوچھا۔ ”شاہانی! اتنا شان دار ڈاگ ہاؤس رکھنے پر تو بہت خرچ آتا ہوگا؟“

”ہائیں! کوئی دس بارہاں ہزار روپے مہینہ تو خرچ ہوتا ہی ہوگا۔“ سردار شاہانی نے بے ہمتی سے کہا۔

رحیم داد کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ ”یہ تو بہت ہوا جی۔“

”کہاں بہت ہوا۔“ شاہانی بے تکلفی سے قہقہہ لگا کر بولا۔ ”چوہدری! یہ تو اپنے اپنے شوق

”مکھن کھلاتے ہیں۔ تب ہی تو ادھر کھڑے اور جڑیا جوان نظر آتے ہیں۔“ اس نے نگاہیں
عورت کی جانب دیکھا۔ بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”اسے مکھن کھلاتی ہے

”ہائیں!“ عورت نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”کھلاتی ہوں، روز کھلاتی ہوں۔“
سردار مراد خاں شاہانی نے بچے کا رخسار ہولے سے تھپ تھپایا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھا اور
بچے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دریافت کیا۔ ”اس کی شکل تو تیرے خاوند جیسی لگتی ہے۔“
”خاوند سے شکل نہیں ملے گی تو کس سے ملے گی؟“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکرا کر بولا۔
”سردار شاہانی! تو بھی کمال کرتا ہے۔“

”چوہدری! تو یہ گالہ نہیں سمجھ سکتا۔ ایسی چٹی اور پوٹ رن میں چھوڑ سکتا ہوں۔ یہ اس کا
ٹاپہ۔ کس کا ہے؟ اس بھید کو یہ ٹھیک طرح جانتی ہے۔“ شاہانی نے گردن کو خم دے کر تیکھی
دل سے دیکھا۔ مسکرایا اور نہایت ڈھٹائی سے پوچھا۔ ”جانتی ہے نا؟“

عورت نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ البتہ اقرار کرنے کے انداز میں ہولے ہولے گردن
لے اس کا چہرہ شرم سے سرخ پڑ گیا۔ رحیم داد گم صم بیٹھا دونوں کو حیرت سے دیکھتا رہا۔
شاہانی نے بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اونچی آواز سے کہا۔ ”بخاور ہووے۔ بھاگیں بھریا
بے۔“

یہ دعائیہ کلمات سردار کی زبان سے سن کر عورت کا چہرہ خوشی اور وفود جذبات سے دمک اٹھا۔
بے بچے کو سینے سے لگایا اور چپ چاپ چلی گئی۔



کے نہایت انماک سے رات بکھا رہے تھے۔ کتوں کے چڑچڑ گوشہ کھانے اور ہڈیاں چبانے
نوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ یکایک کسی بچے کی چیخ ابھری۔ شاہانی اور رحیم داد نے
ناکراس طرف دیکھا کہ ڈاگ ہاوس کے پھانک کے نزدیک ایک بچہ کھڑا ہے۔ اس کے منہ میں
بوسے گوشت کی بوٹی دبلی تھی۔ ایک عورت اس پر جھکی ہوئی منہ سے گوشت کی بوٹی نکالنے کی
ٹٹل کر رہی تھی۔ وہ اس کی ماں تھی۔ بچہ ضد کر رہا تھا۔ تمللا کر چیخ رہا تھا۔ شاہانی لمحے بھر تک
اس کو دیکھتا رہا۔ پھر دیکھتے دیکھتے اس کا چہرہ غصے سے خونخوار ہو گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ رحیم داد
اس کے چہرے سے چپکتی ہوئی جھنجھلاہٹ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

شاہانی نے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈپٹ کر عورت سے کہا۔ ”اسے ادھر لا۔“

”نہیں! وہ تمام دوداوارو کے بعد بھی نہ بچ سکا۔“ سردار شاہانی نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔
”بیاری ایسی خطرناک تھی کہ اس کی جان ہی لے کر ملی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔
”چوہدری! بہت شاندار کتا تھا۔ ایسے شاندار اور خالص نسل کے کتے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔“
اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ ”سردار دشت خاں بگتی اس کے غم میں پاگل ہو گیا تھا۔
سارے کوتیوں کی مار مار کر چڑی ادھیڑ ڈالی۔ دو کو تو جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے دڑے بلوچ
سرداروں کی طرح اس کی بھی اپنی جیل ہے۔“

رحیم داد نے مزید تبصرے سے گریز کیا۔ سردار شاہانی بھی خاموش رہا۔

سامنے جنگل کے اندر کتے گوشت کھا رہے تھے اور ان کے نزدیک ہی زمین پر بیٹھے ہوئے کتے
شلبم کے بچوں کے ساتھ جوار بارے کا ڈوڈھا کھا رہے تھے۔ خشک ڈوڈھا حلق میں پھنستا تو وہ جلدی
جلدی لسی پیتے یا مٹی کے پیالے میں انگلی ڈال کر ذرا سا مکھن نکالتے اور منہ میں رکھنے سے پہلے
ڈوڈھے پر لگاتے تاکہ آسانی سے حلق کے نیچے اتر جائے۔

سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کتوں کی جانب توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک
نوجوان عورت آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دونوں کے قریب آئی۔ وہ اجلی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔
اس کے اوپر جھینٹ کا کرتا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں نوزائید بچہ دبا تھا۔ بچے کے جسم کے گرد سفید کپڑا
اس طرح کس کر لپیٹا گیا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں جکڑ کر رہ گئے تھے۔ صرف گردن کا کچھ حصہ اور
چہرہ نظر آتا تھا۔ بچے کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ پیشانی پر کاجل کا سیاہ نیکہ لگا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ماں کا
چہرہ تک رہا تھا۔

عورت نے ایک ہاتھ سے بچے کو سنبھالا اور دوسرے سے دوپٹے کا آنچل کھینچ کر سر اس طرح
ڈھکا کہ اس کے چہرے کا بیشتر حصہ بھی چھپ گیا۔ وہ آگے بڑھی اور جھک کر بچے کو مراد خاں شاہانی
کے سامنے کر دیا۔ شاہانی نے پہلے بچے کو دیکھا پھر مڑ کر عورت پر نظر ڈالی۔ مسکرایا اور رحیم داد کو
مخاطب کیا۔

”چوہدری! یہ کچھ کمزور لگتا ہے۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے تعجب سے دریافت کیا۔ ”اس کے بدن پر
کپڑا کیوں لپیٹا ہوا ہے؟ یہ تو ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتا۔“

”ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“ سردار شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایسا نہ کیا جائے تو یہ زور آور
کھڑا کیسے ہوگا۔ بال بھولے کو زور آور بنانے کے لیے اپنی طرف کا یہی دستور ہے۔ ہم تو پیدا ہوئے

عورت نے گردن اٹھا کر سسی ہوئی نظروں سے شاہانی کو دیکھا۔

بچہ بھی خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ جنگلے کے قریب کھانا کھانے والے کویتوں کے ہاتھ رک گئے۔ احاطے کی دوسری عورتوں کے چہرے بھی خوف اور دہشت سے زرد پڑ گئے۔ ڈاگ ہاوس پر گہری خاموشی چھا گئی۔

سردار مراد خاں شاہانی کی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے ڈپٹ کر عورت سے کہا۔ ”تو نے نہیں۔ اسے لے کر میرے پاس آ۔“

عورت نے بچے کا بازو پکڑا اور ڈری سسی ہوئی مراد خاں شاہانی کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”سیں سردار! یہ باہر سے گوشت لایا ہے۔ یہاں تو پکنا ہی نہیں۔ اجازت نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”اس سے بھول ہو گئی، معافی دے دے۔ تیرا لال جیوے۔ رب راضی ہووے۔“

”بکواس نہ کر۔“ مراد خاں شاہانی زور سے دھاڑا۔ ”خانہ خراب تجھے پتہ ہے یہاں گوشت نہر پک سکتا اور نہ اندر آ سکتا ہے۔“

”پتہ ہے سیں، بالکل پتہ ہے۔“ عورت نے جلدی جلدی گردن ہلا کر اس کی تائید کی۔

سردار شاہانی نے اسے نظر انداز کر کے جنگلے کے نزدیک بیٹھے ہوئے کویتوں کی جانب دیکھا اور بلند آواز سے کہا۔ ”رہنے! ادھر آ۔“ فوراً ایک کوتی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تیزی سے مراد خاں کی جانب لپکا، نزدیک آیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ وہ اونچے قد کا قوی بیکل جوان تھا۔ عورت اس کے عقب میں خوف اور دہشت سے آنکھیں پھاڑے خاموش کھڑی تھی۔ بچہ اس کے پلو سے حیران اور ششدر کھڑا تھا۔ اس کی عمر پانچ سال سے زیادہ نہیں تھی۔

سردار شاہانی نے رہنے سے پوچھا۔ ”تجھے پتہ ہے ڈاگ ہاوس میں گوشت پکانے یا لانے کی کیا ہے؟“

”خیر ہو سیں سردار! میں کون سب پتہ ہے۔“ رہنے نے سینہ تان کر نہایت مستعدی سے جواب دیا۔

”تو جیسا ہمیشہ اس معاملے میں ہوتا ہے ویسا ہی کر۔“ سردار شاہانی نے تھکامانہ انداز میں کہا۔ ”دروازہ کھول۔“ اس نے لوہے کے جنگلے کی جانب اشارہ کیا۔ جس میں کتے بند تھے۔ اس نے مزے بچے کو دیکھا۔ ”اسے کھیلے کے سامنے ڈال دے۔“

”سردار سیں! ایسا نہ کر۔“ عورت نے تڑپ کر کہا۔ ”اسے معافی دے دے۔“

”چپ کر۔“ شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔

غمزدہ چپ نہ رہی۔ ”سزا ہی دینی ہے تو مجھے کتوں کے سامنے ڈال دے۔“ یہ کہتی ہوئی وہ مراد خاں کے قدموں پر جھکی۔ مراد خاں شاہانی نے اس کے پیٹ پر زور سے لات ماری۔

”ہٹ جا سامنے سے۔“ عورت لات کھا کر گری اور زمین پر دوڑ تک گیند کی مانند لڑھکتی چلی گئی۔ مراد خاں نے رہنے کو قہر دیا۔ ”منہ کیا تک رہا ہے؟ دروازہ کھول۔“ اس نے بچے کی طرف ہاتھ اٹھایا۔

”اسے اندر ڈال دے۔“ رہنے نے آگے بڑھ کر جنگلے کے دروازے کا قفل کھولا، واپس آیا اور بچے کا ہاتھ پکڑ کر جنگلے کی طرف بھاگا۔ بچے نے تھملا کر اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔ رہنے نے جھٹکا دے کر اسے زور سے کھینچا۔ بچہ سسم کر دم بخود رہ گیا۔ رمضا اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا، دروازہ کھولا اور دھکا دے کر بچے کو جنگلے کے اندر پھینک دیا۔ بچے کے اندر پہنچتے ہی کتے غرا کر زور زور سے بھونکنے لگے۔

بچے کی ماں اٹھ کر بیٹھ پھلی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑے ہوئے تھی۔ اس کے بال ٹھکر منہ پر آگئے تھے۔ ان پر خاک جمی تھی۔ چہرہ خوف اور دہشت سے ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔ انہیں پھٹی ہوئی تھیں۔ وہ بے قرار ہو کر بار بار پہلو بدل رہی تھی اور مراد خاں شاہانی کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

شاہانی نے اس کی جانب مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے جنگلے کے اندر گوشت کھاتے ہوئے ایک فٹل خوار بل ٹیریر کو لٹکارا۔ ”کھیلے!“ کتے نے گردن اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ سردار شاہانی نے بچے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بل ٹیریر کو ششکارا۔ کتے نے غرا کر بچے کو خوف ناک ٹھولے دیکھا۔ بچے نے اسے غراتے دیکھا تو سسم کر پیچھے ہٹنے لگا۔

اس کی ماں اٹھ کر تیزی سے آگے بڑھی اور رحیم داد کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ ادھر جنگلے کے فٹل ٹیریر زور سے بھونکا اور غراتا ہوا بچے پر جھپٹا۔ اس نے دانت نکال کر بچے کی گردن دلوچ پکڑ لی۔ بلٹا کر زور سے چیخا۔ اس کی دل سوز چیخ سن کر ماں رحیم داد کے پیروں سے چٹ کر پھڑکنے لگا اور رو کر فریاد دی ہوئی۔

”سیں! میرے کتے کو بچالے۔“ وہ تڑپ کی چیخی۔ ”سیں! میری زاری سن لے“ اسے بچالے۔ ہراسی ہووے۔ تیرا لال جیوے، میرے کتے کو چھڑا لے۔“

نیم جان ہو رہا تھا۔ بچے کے باہر آتے ہی ماں دیوانہ وار دوڑی، بچے کو اٹھایا اور سینے سے لگالیا۔
 ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے کہا۔ ”اسے فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جایا اسپتال چلی جا۔“

عورت نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ اس کے دل میں رحیم داد کے لیے جو جذبہ عقیدت تھا، وہ پلکوں
 آنسوؤں کے قطرے بن کر جھللا رہا تھا۔ وہ بچے کو اپنے بازوؤں میں دوپے ہوئے چپ چاپ
 انسوہاتی کچے اور بوسیدہ مکانات کی طرف چلی گئی۔ شاہانی گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہنوز
 شونت طاری تھی۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا کتوں کو رات بکھاتے دیکھتا رہا۔ مگر زیادہ دیر نہیں ٹھہرا، اٹھ
 کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ اٹھ گیا۔

رحیم داد اور سردار شاہانی ڈاگ ہاؤس سے باہر نکلے۔ خاموشی سے آگے بڑھے۔ حویلی کے صدر
 دروازے پر پہنچے۔ دروازہ خوب کشادہ ہونے کے ساتھ اس قدر اونچا بھی تھا کہ اونٹ کجاوے کے
 ماتھ اس کے نیچے سے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ حویلی کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم ہڑبوا کر
 کڑے ہو گئے۔

شاہانی نے ان پر توجہ نہیں دی، اندر چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ دروازے کے سامنے
 کلی جگہ تھی۔

یہ حویلی کا چوک تھا۔ چوک کے وسط میں طویل پختہ چبوترہ تھا۔ گرمیوں میں اسے شہ نشین کے
 طور پر استعمال کیا جاتا۔ دن ڈھلتے ہی اس پر جھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ بیچ میں
 سردار شاہانی کی کرسی ہوتی۔ وہ اس پر بیٹھ کر لٹنے جلنے والوں اور سرکاری افسروں سے ملاقات کرتا
 تھا۔ کبھی کبھی کچہری بھی لگاتا۔ اس میں جاگیر کے معاملات طے کئے جاتے۔ یہیں جاگیر سے آنے
 والوں کی پیشی ہوتی۔ وہ اس کے روبرو فرش پر بیٹھتے۔ شاہانی ان کے بارے میں شکایات سنتا اور
 فیصلے صادر کرتا۔

چبوترے کے آخری کنارے سے کچھ ہی فاصلے پر پاکھر کا گھنا درخت تھا۔ اس کے نیچے باورچی
 خانہ تھا۔ قریب ہی پانی کھینچنے کا ہینڈ پمپ تھا۔ چبوترے کے دونوں طرف برآمدے جیسی طویل راہ
 داری تھی۔

راہ داری کے عقب میں کمرے تھے۔ ان کے دروازے برآمدے میں کھلتے تھے۔ البتہ کمروں کی
 دروازیاں پچھوڑے گلی میں کھلتی تھیں۔ گلی حویلی ہی کا ایک حصہ تھی۔ اس کی دیواریں قد آدم

اس کی آہ وزاری پر رحیم داد تڑپ اٹھا۔ بے قرار ہو کر اس نے مراد خاں کو مخاطب کیا۔
 ”شاہانی! اسے معافی دے دے۔“

”چوہدری! چپ کر کے بیٹھا رہ۔“ مراد خاں نے اسے غصے سے جھڑک دیا۔ ”اس معاملے میں ز
 بول۔“

بچے کی ماں رحیم داد کے پیروں سے چٹنی گڑگڑاتی رہی۔ بچہ بار بار تھلکا کر چیختا رہا۔ بل ٹیریر نے
 اسے فرش پر گرا دیا تھا اور دانت نکال کر اس کا بدن خنجر ہو رہا تھا۔ بچہ تکلیف سے بے چین ہو کر
 چیخا۔ ”اماں!“

اس کی آواز کے ساتھ ہی ماں نے رحیم داد کے پیروں پر زور سے سر مارا اور مچھلی کی طرح
 تڑپنے لگی۔ وہ بار بار دہائی دیتی۔ ”میں صد کے تھیواں، سیں! میں کون معافی دلا دے، سردار تیری
 سن لے گا۔“

وہ بلبل کر چیختی۔ ”بچالے میرے نکلے کو۔ سیں بچالے اسے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
 عورت کی بے قراری دیکھ کر رحیم داد کا دل پیچ گیا۔ ماں کی مامتا اس کے قدموں پر تڑپ رہی
 تھی، مگر یہ وزاری کر رہی تھی۔ اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سردار مراد خاں شاہانی کی جانب
 دیکھا، اس کی طرف جھکا، ایک ہاتھ آگے بڑھایا، ٹھوڑی چھو کر عاجزی سے بولا۔

”سردار شاہانی! اسے معافی دے دے۔ میری خاطر معاف کر دے۔“
 مراد شاہانی نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ خونخوار نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے
 چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ وہ چند لمحے رحیم داد کی جانب گھورتا رہا پھر اس نے مڑ کر اپنے بل ٹیریر پر
 نظر ڈالی۔

”بھیلے! چھوڑ دے اسے۔“
 کتے نے دھیان نہیں دیا، بدستور بچے کو خنجر ہوتا رہا۔ سردار شاہانی نے اسے زور سے ڈانٹا۔
 ”ہٹ جا، بھیلے۔“ کتا اس قدر سدھا ہوا تھا کہ ڈانٹ سنتے ہی اس نے بچے کو چھوڑ دیا۔ گردن اٹھا
 کر شاہانی کو دیکھا، اپنی جگہ واپس گیا اور گردن جھکا کر رات بکھانے لگا۔

شاہانی نے رسنے کو حکم دیا۔ ”رسنے! اسے باہر نکال لے۔“ اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”چوہدری! میرا مہمان ہے اور مہمان کی بات مانتی ہی پڑتی ہے۔“

رمضا جنگلے کے اندر گیا اور بچے کو اٹھا کر باہر لے آیا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ بل ٹیریر کے
 دانتوں اور پنچوں کے کھروچے تھے، خراشیں تھیں۔ ان سے خون رس رہا تھا۔ بچہ خوف اور دہشت

اوپنی تعین۔

چوک حویلی کا مرادانہ حصہ تھا۔ اسی میں دیرہ تھا۔ باہر سے آنے والے مہمان دیرے کی دو منزل عمارت میں نیچے یا اوپر کی منزل کے کمروں میں ٹھہرتے تھے۔ مگر حویلی کا دیوان خانہ نیچے ہی تھا۔ اسے بیٹھک کہا جاتا تھا۔ یہ کشادہ ہال تھا۔ اس میں قیمتی قالین کا فرش تھا۔ بڑے بڑے دیواروں پر تھے۔ کرسیاں اور میزیں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ ہال کے پچیس چھت سے بلوریں جھاڑ لٹک رہا تھا۔ دیواروں پر شاہانی کے بزرگوں اور معروف بلوچ سرداروں کی بڑی بڑی روغنی تصویروں کے علاوہ پرانی وضع کی بندوقیں، قرائینیں، ڈھالیں اور تلواریں سیلتے سے آویزاں تھیں۔ کمرے کی آرائش سے مراد خاں شاہانی کی جاگیر وارانہ سطوت اور شان و شوکت جھلکتی تھی۔

مراد خاں بیٹھک میں داخل ہوا اور ایک صوفے پر تھکا ہوا سا چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم داہمی قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

مراد خاں کے چہرے پر خلاف معمول سنجیدگی کی گہری چھاپ تھی۔ رحیم داد نے اسے اس طرح خاموش اور سنجیدہ پایا تو اسے شاہانی کی خفگی کا شدت سے احساس ہوا۔ رحیم داد نے سردار مراد خاں شاہانی کو منانے کی کوشش کی۔ ”تو ابھی تک مجھ سے زرا ملوم ہوتا ہے۔“ اس کے لیے میں نرمی اور معذرت کرنے کا انداز تھا۔

”سین! یہ گالہ نہیں۔ تو ان کیوں اور ہڈ حراموں کو نہیں جانتا۔ ان کے ساتھ ذرا بھی نرمی با رحم دلی دکھائی جائے تو یہ میرے کتوں کو بھوکا مار دیں۔ ان کا سارا راتب چرا کر کھا جائیں۔ بلکہ میری بگیرہ تک کھا جائیں۔“ شاہانی کا لہجہ رفتہ رفتہ تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ ابھر رہی تھی۔

”یہ سارے ہی بے ایمان اور حرام کے ختم ہیں۔ انھیں تو بے رحم اور سخت بن کر ہی کاہل کرنا چاہیے۔ ہمارے دؤے اور جدی پشتی ان کے ساتھ ایسا سخت سلوک نہ کرتے تو یہ زمین دار اور بگیرہ کب کی ختم ہو چکی ہوتی۔ اس علاقے میں زمین داری چھلانا ناخوش نہیں ہے۔ دل کی جگہ چہرہ رکھنا پڑتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے خوش نودی حاصل کرنے کے لیے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”پر یہ بھی تو ہو سکتا تھا تیرا کتا چھوہرے کو چیر پھاڑ کر ختم کر دیتا۔ لگتا تو ایسا ہی تھا۔ تب کیا ہوتا؟“ ”کچھ بھی نہ ہوتا۔“ شاہانی نے نہایت بے نیازی سے کہا۔ ”پہلے بھی کئی بار اب اسے دکا ہے۔“

ہیں۔ پہلے یہ کتوں کے راتب کا گوشت نہ صرف چرا کر کھا جاتے تھے بلکہ بازار میں بیچ بھی دیتے۔ یہ میں نے منع کیا، ڈانٹا، پٹائی بھی کی پر چوری کی عادت ختم نہیں ہوئی تب میں نے ڈاگ ہاوس بنانے والے کتوں اور دوسرے ملازموں کے لیے گوشت کھانے پر سخت پابندی لگا دی۔“

”پر ایسا تو نہیں کیا ہو گا کہ سزا ہی میں کتے چیر پھاڑ کر کھا جائیں۔“

”میں نے کہا، کئی بار ایسا بھی ہوا۔“ شاہانی نے بتایا۔ ”دو کتوں کو تو کتوں نے نہ صرف گرا دیا۔ ان کا گوشت بھی نوچ نوچ کر کھا گئے۔ ان میں سے ایک نے تو میرا بہت اعلیٰ الیشن چوری کیا اور پٹاڑی خاں کے ایک کھوسہ سردار کے پاس پہنچا دیا اور خود تھل کلاں کی ایک جھنگلی میں روپوش ہو گیا۔ میرے کمرے کے اندر کاے تلاش کر کے اسے پکڑی لائے۔ میں نے سویرے سویرے اسے ہال کے سامنے ڈال دیا۔ وہ رات بھر کے بھوکے بھی تھے۔ ایسے جھپٹے کہ ذرا ہی دیر بعد بدن سے لٹ غائب تھا۔ صرف ہڈیوں کا پتھر بڑا تھا۔ دوسرے نے راتب چوری کیا تھا۔ اس کا بھی یہی نام ہوا۔“

”توچ کہہ رہا ہے؟“ رحیم داد نے خوف زدہ ہو کر پوچھا۔ ”کسی نے تیرے خلاف تھانے میں چھاپ نہیں کرایا؟ صاف ۳۰۲ کیس بن سکتا تھا۔“

”سین چوہدری! تو کیسی گل کر رہا ہے۔“ شاہانی نے ناگواری سے گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو بگیرا ہے، تجھے ادھر کا کچھ پتہ نہیں۔ کوئی میرے خلاف پرچہ چاک کرانے جاتا تو انا اس کے ناف چوری کا مکدہ بن جاتا۔ حالات میں بند کر کے چھتر سے ایسی پٹائی ہوتی کہ چڑی ادھر اٹھ۔“

اس نے گردن اوپنی کی اور نہایت رعوت سے بولا۔ ”چوہدری! یہ ہماری جدی بگیرہ ہے۔ لائیش ہماری عمل داری رہی ہے۔ انگریز کے راج میں بھی اور آج بھی۔ ادھری ہمارا ہی کنون ہے۔“

”گور پولیس کیا کرتی ہے؟“ رحیم داد بدستور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

”پہلے اور تھانے دار بھی ہمارے ہی بندے ہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر کوئی بھی سرکاری افسر انہیں ٹھہر سکتا۔“

”بائے تکلفی سے ٹھنھا مار کر پہلی بار ہنسا۔“ سین، تو ابھی اس علاقے کو ٹھیک سے نہیں سمجھ سکتا۔ دوز اپنے ساتھ رہے گا تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ وہ سردار مراد خاں کی باتوں سے بہت مرعوب نظر آ رہا تھا۔ مراد خاں زیادہ

دیر نہیں ٹھہرا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری! مجھے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھا لیتا۔ مجھے بالکل بخیر نہیں۔“

مراد خاں آہستہ آہستہ زنان خانے کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیڑ گیا۔ وہ تڑھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔



شام ہو گئی۔ ایک دن اور ختم ہوا۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ فضا دھواں دھواں ہو گئی۔ سردار مراد خاں شاہانی اور رحیم داد پھر مل بیٹھے۔ شراب کا دور چلا۔ شاہانی نے شیوا زریگل کی بوتل منگوائی تھی۔ قیمتی اور عمدہ اسکاچ وہسکی تھی۔ اس کے ساتھ ویسا ہی اہتمام بھی کیا تھا۔ پانی کی بجائے میز پر بوڑے کی بوتلیں تھیں۔ تلے ہوئے مرغ مسلم تھے۔ نکلے اور کباب تھے۔

مراد خاں نے وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! کل شام میل ہے۔ حویلی کے چوک میں محفل جے گی۔ ساوی کا دور چلے گا۔ ناچ گانا ہو گا۔ راگ رنگ ہو گا۔ کچھ اور مہمانوں کو بھی بلایا ہے۔ اچھا زوردار میل ہو گا۔“

”کون کون آ رہا ہے۔“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”یہ تو کل ہی تجھے پتہ چلے گا۔“ مراد خان شاہانی نے ہنس کر بتایا۔ ”رات بھر جشن رہے گا۔ سب سے تیری جان پہچان ہو جائے گی۔ ویسے سارے ہی اپنے بے تکلف یار ہوں گے۔“ اس نے مسکرا کر آنکھ ماری۔ ”لہور سے بھی میں نے ایک کنجری بلائی ہے۔ ایسی پوٹ اور پھڑک دار ہے کہ بدن میں جیسے بجلی بھری ہو۔ مجرا تو اس کا ایسا زوردار ہوتا ہے کہ محفل میں آگ لگا دیتی ہے۔ اپنی پرانی یاری ہے اس سے۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”تیری رکھیل ہے؟“

”نہیں۔“ شاہانی نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”پر جب بھی لہور جاتا ہوں، گانا سننے کے لیے اس کے کونٹے کا ضرور چکر لگاتا ہوں۔“ اس نے بے تکلفی سے تسمیہ لگایا۔ ”سچ پوچھ تو کبھی کبھی

صرف اس کے مجھے کی خاطر لمور جاتا ہوں۔ اس میں بات ہی کچھ ایسی ہے۔ تجھ سے زیادہ کیا بتاؤں۔ کل خود دیکھ لیتا۔“

رحیم داد طوائف کا نام پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں ابھریں۔ کوئی عورت پاگلوں کی مانند زور زور سے چیخ چلا رہی تھی، آہ وزاری کر رہی تھی۔ چیخوں کے ابھرنے کے ساتھ ہی مراد خاں شہابی کی آنکھوں میں ڈولتا ہوا نشے کا سلاطم غائب ہو گیا۔ دمکرا ہوا چہرہ بجھ گیا۔ اس پر رفتہ رفتہ پریشانی چھانے لگی۔

رحیم داد نے تو پراسرار چیخوں کے بارے میں پوچھا نہ شہابی سے پریشانی کا سبب معلوم کیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ شہابی بھی گم سم تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے چینی جھلک رہی تھی۔ وہ اس عالم میں زیادہ دیر نہیں بیٹھا۔ گلاس میز پر رکھا، گھبرایا ہوا اٹھا، کمرے سے نکلا، ڈبیز پر ٹھک کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ الجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”چوہدری! میں تھوڑی دیر بعد آتا ہوں۔“ اس نے رحیم داد کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا۔ تیزی سے قدم اٹھاتا راہ واری میں داخل ہوا اور اس سے گزر کر زنان خانے کی جانب چلا گیا۔



زنان خانہ دیرے سے ملحق ہی تھا مگر بیچ میں کشادہ گلی تھی۔ زنان خانے کے گرد اونچی چار دیواری تھی۔ چار دیواری کے پیچھے وسیع صحن تھا۔ اس میں تین طرف کمرے تھے، والاں تھے۔ صحن چیاں اور کوٹھریاں تھیں۔ کمروں میں شہابی کی بیوی کے علاوہ بیوہ ماں اور بہنیں رہتی تھیں۔ کوٹھریاں خادماؤں اور باندیوں کے رہنے کے لیے تھیں اور صحن کے ایک گوشے میں کمروں اور صحن چیلوں سے ذرا ہٹ کر الگ تھلگ تھیں۔ یہ ساری تفصیلات حویلی کا ماضیا باتوں باتوں میں رحیم داد کو بتا چکا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا ملازم تھا۔ اس کا بچپن حویلی ہی میں گزارا تھا۔ اب وہ پورا جوان ہو چکا تھا۔ سخت باتوں بھی تھا۔ ماش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلسل بولتا رہتا تھا۔

رحیم داد وہسکی کی چسکی لگاتا رہا اور شہابی کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ زنان خانے سے رک رک کر چیخیں ابھرتی رہیں۔ کبھی دھیمی پڑ جاتیں، کبھی تیز ہو جاتیں۔ اب رات گہری ہو کر کاجل ہو چکی تھی۔ زنان خانے سے بلند ہوتی ہوئی چیخیں بڑی پراسرار معلوم ہو رہی تھیں۔

پہر رات گزر گئی مگر شہابی واپس نہیں آیا۔ رحیم داد تنہائی سے اکتا گیا۔ اٹھا اور باہر چوک میں چلا گیا۔ نوکر چاکر معمول کے مطابق ادھر ادھر آ جا رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ رحیم داد نے غور کیا، نہ وہ پریشان تھے نہ گھبرائے ہوئے۔ حالانکہ زنان خانے کی طرف سے چیخیں بار بار ابھر رہی

نہیں۔ رحیم داد واپس ہوا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم کھانا لے کر آیا۔ اس کے چہرے سے بھی کوئی تشویش ظاہر نہ ہوتی تھی۔ اس نے نہایت اطمینان سے میز پر کھانا لگا دیا۔

رحیم داد اس سے ان پراسرار چیخوں کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا مگر جرات نہ ہوئی۔ ملازم چلا گیا۔ رحیم داد خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔

چینیں اب بند ہو چکی تھیں۔ رحیم داد بھی کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ نوکر برتن اٹھا کر لے گیا مگر مراد خاں شہابی نہ آیا۔

رحیم داد خاموش بیٹھا نسوانی چیخوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ حیرت زدہ بھی تھا اور کسی قدر پریشان بھی۔ رات کالی ہو کر گو گئی ہو گئی۔

رحیم داد کے قیاس کے مطابق گیارہ بجنے والے تھے۔ رات سرد اور کمر آلود تھی۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ ناگہاں کمرے سے جیپ نکلنے اور انجن اشارت ہونے کی آواز ابھری۔ ساتھ ہی زنان خانے میں گانے کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان کے لہجے سے رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ وہ حویلی کی مراشیں اور خادماں ہیں۔ وہ دھیمے سروں میں گا رہی تھیں۔

تیری ڈاچی دے ملیاں

میں پیر مناؤں چلیاں

ڈاچی والیاں موڑ مہاراں

گیت کے بولوں سے صاف عیاں تھا کہ وہ کسی پیر کی زیارت یا خانقاہ کی جانب جا رہی ہیں۔ مگر اونٹ یا ڈاچی کے کباوڑوں میں بیٹھنے کے بجائے وہ جیپ میں سوار ہو کر سفر کر رہی تھیں۔ جیپ آگے بڑھ گئی۔ گیت کے بول دھیمے ہو کر رات کی خاموشی میں تحلیل ہو گئے۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا اور مراد خاں شہابی کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

دوسرے روز دوپہر کو شہابی آیا۔ لیکن رات کے واقعے کے بارے میں نہ اس نے کوئی تذکرہ کیا نہ رحیم داد پوچھ سکا۔ شہابی نے اس سلسلے میں بات کرنے کا موقع بھی نہ دیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی گویا ہوا۔

”سکس چوہدری! رات کو میل ہے۔ تجھے یاد ہے نا؟“

”یاد ہے، بالکل یاد ہے۔“ رحیم داد نے بلند آواز سے کہا۔ ”پر تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“

”نہیں، میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔“ اس نے کلائی اٹھا کر گھڑی دیکھی۔ ”مجھے فوراً سٹیشن جانا

ہے۔ شام کو تجھ سے ملوں گا۔“ شاہانی مڑا اور باہر چلا گیا۔



شام درودیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ حویلی کے چوک میں خوب گھما گھمی تھی۔ بادریچی خانے کے سامنے مرغیاں کٹ رہی تھیں۔ پاکھر کے بیڑے ایک تومند آدمی بہت بڑے کوئٹے میں بولگ گھوٹ رہا تھا۔ اس کا بھن گھٹنا شیشم کی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ وزنی بھی تھا۔ اس میں ریٹم کے دھاگوں کے رنگ برنگے پھندے اور گھنگرد بندھے تھے۔ گھنگرو چھٹا چھن بج رہے تھے۔ ان کی چھنکے کے ساتھ وہ جھوم جھوم کر گنگنا رہا تھا۔

سوہنلال دے پکاراں دھمی دیاں

ڈے خوشیاں غم ٹال دے پکاراں دھمی دیاں

بھنگ گھونٹنے والا بھنگیہ ۲، مظفر گڑھیا تھا۔ مظفر گڑھ ہی میں لال عسین کی درگاہ ہے اس کی زیارت کے لیے مظفر گڑھ کے علاوہ ملتان، جھنگ، میان والی اور دوسرے اضلاع سے ہر سال ہزاروں عقیدت مند آتے ہیں۔ بھادوں کی چودہ تاریخ کو مزار پر بہت بڑا میلہ لگتا ہے۔ میلے میں شرکت کے لیے دور دور سے زائرین آتے ہیں۔ چیت کی ہرجعرات کو بھی صبح سے عقیدت مندوں کے قافلے پہنچنا شروع ہو جاتے ہیں۔ وہ میلوں کا طویل سفر پیدل طے کرتے ہیں۔ رات بھر درگاہ پر جاگتے رہتے ہیں۔ پورے قہل کے علاقے میں لال عسین کے مزار کی زبردست دھوم ہے۔ یہاں آسیب زدہ عورتوں کا علاج معالجہ ہوتا ہے۔ بھوت پریت اور جن اتارے جاتے ہیں۔ زائرین اور عقیدت مند چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ نمیں مانتے ہیں۔ لہک لہک کر یہی گیت گاتے ہیں جو حویلی کا بھنگیہ ۲ اس وقت گنگنا رہا تھا۔

رحیم داد نے غسل کیا، اجلا لباس پہنا اور بن سنور کر کمرے سے باہر نکلا۔ سامنے بیٹھک تھی۔ بیٹھک سے باتوں اور قہقہوں کی ملی جلی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ اسی طرف چلا گیا۔ اندر داخل ہوا تو سردار مراد خاں شاہانی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس کے ساتھ مہمان بھی بیٹھے تھے۔ رحیم داد نے انھیں پہلی بار دیکھا تھا۔ ان میں محکمہ نہر کا ایک انجینئر تھا۔ بھکر کا تحصیل دار تھا۔ بیٹ کے علاقے کا جاگیردار، سردار عبدالرحمان خاں نوانی تھا۔ تھانے دار عطا محمد تھا۔ کنڈیاں کامیاں شاہ کا تھا۔ بھکر آتے ہوئے رحیم داد اس سے مل چکا تھا۔ اس کے پاس شاہانی کے ہم راہ ایک روز نما بھی تھا۔

میاں شاہ علی کے علاوہ ملک نیاز محمد خاں اعوان تھا۔ اس کا تعلق کالا باغ کے نواب زادگان سے

فانہ راجن پور کا سردار سطوت خاں مزاری تھا۔ مظفر گڑھ کا علی نواز گورمانی اور لیہ کا عمر دراز خاں بیکانی بھی تھا۔ سارے ہی مہمان سردار مراد خاں شاہانی کے بے تکلف دوست تھے اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی شاہانی نے ہنستے ہوئے نعرہ بلند کیا۔ ”سین چوہدری، تو کدھر تھا؟“ اس نے کمرے میں بیٹھے ہوئے مہمانوں پر ایک نظر ڈالی۔

”ہو جی، اپنا چوہدری نور الہی بھی آگیا۔“

تمام نگاہیں رحیم داد کی جانب اٹھ گئیں۔ مراد خاں شاہانی نے مسکرا مسکرا کر سب سے اس کا ذوق کرایا۔ سرکاری افسروں کو چھوڑ کر سب ہی جاگیردار اور بڑے زمین دار تھے۔ شاہانی نے اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ رحیم داد اجنبیت محسوس کر رہا تھا۔ وہ خاموش اور کسی قدر گھبرایا ہوا تھا۔

کمرے میں بھنگ کے ساتھ ساتھ وہسکی کا دور بھی چل رہا تھا۔ حویلی کے دو ملازم اجلے لباس پہنے، سروں پر کلف دار پگڑیاں باندھے، ٹرے میں وہسکی کی بوتل، گلاس اور سوڈے کی بوتلیں اور پانی بھرے ہوئے جگ رکھے صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑے تھے۔ صوفوں کے آگے بٹھلی چھوٹی میز پر تھیں۔ ان پر مہمانوں کے گلاس رکھے تھے۔ کسی کا گلاس خالی ہوتا، ملازم فوراً تازہ پینچا، خالی گلاس اٹھا کر ٹرے میں رکھتا اور وہسکی کا گلاس جھک کر میز پر رکھ دیتا۔ مہمان کی رخی کے مطابق جگ سے سوڈا یا پانی گلاس میں ڈال دیتا۔

کچھ ایسے دھاڑ پینے والے بھی تھے جنہوں نے تکلفات سے بے نیاز ہو کر وہسکی کی بوتل اور پانی کا گلاس ہونے جگ سامنے میز پر رکھ لیے تھے۔ خود ہی بوتل سے وہسکی اٹھالتے اور پانی یا سوڈا ملا لے کر پیتے اور غٹاٹ چڑھاتے یا آہستہ آہستہ چسکی لگاتے۔

مراد خاں شاہانی کے سامنے خاصی لمبی میز تھی۔ اس پر وہسکی کی بوتل نہیں تھی۔ بھنگ سے بھرا ہوا سا شیشے کا قرابہ رکھا تھا۔ شاہانی کے ساتھ کچھ دوسرے بھی نہایت ذوق شوق سے بھنگ پی رہے تھے۔

شاہانی نے رحیم داد کے لیے گلاس منگوایا اس میں دودھ کی مانند سفید سفید بھنگ انڈیل کر بولا۔ ”بھئی! تو نے ساوی پہلے بھی پی ہے۔ آج اپنی حویلی کی پی کر دیکھ، اسے پینے کو تو دور دور سے آتے ہیں۔“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے بھنگ سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا، ہونٹوں سے لگایا اور ہلکا سا گھونٹ

ہوئے۔ ڈھول پر چوٹ پڑی اور ناچ شروع ہو گیا۔ ناچنے والے ڈھول کے گرد کچھ دیر دائرے میں رقص کرتے رہے۔ ان کے ہاتھ اور پیر نہایت متوازن انداز میں لہراتے رہے حرکت کرتے رہے۔ رقص کرتے کرتے ایک ناچنے والے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔ اس کی آواز سریلی اور پاٹ دار تھی۔ ڈھول پر زور سے چوٹ پڑی۔ اس نے جھمکا سرا نیکی گیت چھیڑا۔

انہاں سونیاں کوں دل ڈے بیٹھے!

دل دے کے جہاں ارماں تھینڈے!!

گیت کے بول رفتہ رفتہ اونچے ہوتے گئے۔ رقص کرنے والے لہک لہک کر کورس میں گاتے رہے۔ ”ان حسینوں کو ہم بھولے بھالے لوگ دل دے بیٹھے۔ مگر دل دے کے اب بچھتا پڑتا ہے۔“ گیت کے بول جتنے اونچے ہوتے گئے، ڈھول پر اتنی ہی تیزی سے چوٹ پڑتی رہی۔ گانے کے ساتھ ساتھ ناچ کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ رقص کرنے والوں کے ہاتھ اور پیر بھی گردش کرتے رہے۔ وہ ڈھول کے گرد دائرے میں گھوم گھوم کر رقص کی رفتار تیز کرتے رہے۔

رحیم داد نہایت محویت سے رقص دیکھ رہا تھا۔ اس کے خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ سر، ناچ کی تیزی کے ساتھ ساتھ ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی اس کے برابر ہی گاؤ تکیے سے بک لگائے مسند پر بیٹھا تھا۔ ناچ دیکھتے دیکھتے اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔

”چوہدری! اصلی جھمروتیہ ہے۔ یہ اپنے علاقے کے بلوچوں کا خاص جھمر ہے۔ کیسا ہے؟“

”زور دار ہے جی، بہت زور دار ہے۔“ رحیم داد نے بے ساختہ داد دی۔

ناچ تیز ہوتا گیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ ڈھول جھوم جھوم کر ڈھول پر چوٹ لگانے لگا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے چلتا رہا۔ ڈھول کی تھاپ میں تیزی سے رقص میں بھی تیزی اور گرمی پیدا ہو گئی۔ ناچنے والوں کے سروں کے لمبے لمبے بال لہرا رہے تھے ہر گردش کر رہے تھے۔ رقص اس قدر تیز ہو گیا کہ دائرے میں ناچنے والے بلوچ گولے کی مانند نظر آنے لگے۔

رقص اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہو گیا۔ ہر طرف سے ”شائش“ واہ وا“ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ رقص مہمانوں کو بہت پسند آیا اور انھوں نے دل کھول کر داد بھی دی۔ رات اب خاصی لڑ ہو چکی تھی۔ مگر ناچنے والے پسینے پسینے ہو رہے تھے۔ وہ ذرا دیر خاموش کھڑے رہے پھر اپنی بیٹنیوں سے پسینہ پونچھتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ رخصت ہونے سے پہلے سردار شاہانی نے ٹارے سے ڈھول بجانے والے کو قریب بلوایا۔ جب سے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور ڈھول کو

بھرا۔ بھگ خوش ڈانقہ تھی۔ اس میں بادام، پنے، خشاش اور چاروں مغز گھنے ہوئے تھے۔ بھل خاصی گاڑھی تھی اور اس میں زعفران کی ہلکی ہلکی مک بھی تھی۔ رحیم داد نے بھگ کے چہرہ گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیا۔

شاہانی نے داد طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”چوہدری! کیسی ہے ساوی؟ سچ سچ بتا۔“

”مزہ آگیا جی۔ بہت زور دار ساوی ہے۔“ رحیم داد نے مونچھوں اور ڈاڑھی کے بیچھے ہوئے بال ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

مراد خاں شاہانی اس کے جواب پر بہت خوش ہوا۔ ہنس ہنس کر تانے لگا کہ بھگ کے ساتھ کیا کیا ملا کر گھونٹا جاتا ہے۔ جو تھنڈا گھٹائی کرتا ہے اسے مظفر گڑھ سے خاص طور پر بلوا کر ملازم رکھا گیا ہے۔ وہ بھگ گھونٹنے کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا ذکر کرتے کرتے شاہانی نے زور کا قہقہہ لگایا اور اونچی آواز سے بولا۔

”وہ ساوی گھونٹا ہے، ساوی پیتا ہے اور پی کر سوتا رہتا ہے۔ اس بندے کو اور کوئی کام نہیں۔“

وہ سکی اور بھگ کا دور چلتا رہا۔ باتیں ہوتی رہیں۔ قہقہے بلند ہوتے رہے۔ رات تاریک ہو گئی۔ اس عرصے میں کچھ اور مہمان بھی محفل میں شریک ہو گئے۔ پہر رات گزرنے کے بعد سب نے کھانا کھایا۔ کھانے میں خاص اہتمام اور تکلف کیا گیا تھا۔ کھانا مرغن اور خوش ڈانقہ تھا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی مراد خاں شاہانی مہمانوں کے ہم راہ چوک میں پونچھا۔ پختہ چوڑے پر شام ہی سے شامیانہ لگا کر قاتیں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ پختہ زمین پر اجلی چاندنی کا فرش تھا۔ اس کے ایک حصے پر قالین بچھا کر گاؤ تکیے لگا دیے گئے تھے۔ نوکروں نے حقے تازہ کر کے مہمانوں کے لیے رکھ دیے۔ حقوں کے علاوہ چاندی کی منقش طشتیوں میں ماچس اور سگریٹس تھیں اور الائٹل ٹرے بھی تھے۔

سردار مراد خاں اور مہمانوں کے بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد میں بائیس بلوچوں کا طائفہ قاتوں کے عقب سے نکل کر سامنے آیا۔ ان کے قد اونچے تھے۔ جسم مضبوط اور سڈول تھے۔ چروں پر مٹی ڈاڑھیاں تھیں۔ سروں پر گردن اور کانوں تک لٹکے ہوئے لمبے لمبے پٹے تھے۔ وہ لمبل کے لمبے پٹے پہنے ہوئے تھے۔ کمر کے گرد دو پہلوؤں والی چادریں لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کی شلواریں خوب گھیراں تھیں۔ وہ نیم دائرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جھک کر مہمانوں کو سلام کیا۔

مراد خاں شاہانی نے رقص شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ اشارہ ملتے ہی ایک بلوچ گلے میں ڈھول ڈالے ہوئے آگے بڑھ کر بیچ میں آگیا۔ وہ ڈھول تھا۔ دوسرے اس کے گرد دائرے میں کھڑے

ہی کرانچی تان لگاتا اور آواز کے اتار چڑھاؤ سے سامعین کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دیتا۔ اس نے ایک مزاحیہ مقبول گیت ”منڈی گھوڑی“ بھی خوب لہک لہک کر گایا۔ یہ حکایت کے بار میں ایک لنگڑی گھوڑی کی بھوتھی۔ اسے گیت کے بولوں میں اس طرح بیان کیا گیا تھا کہ پیر بن نامی ایک رئیس نے خوش ہو کر شاعر کو ایک گھوڑی بطور انعام عطا کی۔ مگر وہ ذرا لنگڑی تھی۔ پھر نے گھوڑی تو قبول کر لی لیکن قصیدہ گوئی کے طرز پر ایک تند اور تیکھی بھوتھی لکھی۔ اس مزاحیہ گیت نے محفل زعفران زار بنا دی۔ سامعین ہنستے تھے، قہقہے لگاتے تھے۔ گیت کے جملے بند بار بار گانے کی فرمائش کرتے تھے۔ گانے والے کو انعام بھی ملا۔

گایا گیا تو محفل کا جمود اور پھیکا پن دور ہو چکا تھا۔ بے تکلفی اور غیر سنجیدگی کا رنگ غالب آچکا اسی عالم کیف و سرور میں ایک نئی طوائف آئی۔ وہ شوخ اور طرح دار تھی۔ رنگ کھلتا ہوا چہرے کے خدو خال بھی سبک تھے۔ جسم چنبیلی کی شاخ کی مانند پلکتا تھا۔ اس کے پیروں میں رہندے تھے۔ جیسے ہی وہ آئی، گھنگرو کا چھنا کا ہوا۔ اسے مراد خاں شاہانی نے اپنے کاردار کریم رادھانی کے ذریعہ لاہور کی ہیرا منڈی سے بلوایا تھا۔ وہ ابھی نوخیز تھی۔ بیس سال سے زیادہ عمر کی۔ اس کا نام شہناز تھا۔ نائیکہ بھی لاہور سے ساتھ آئی تھی۔ وہ منجھی ہوئی گھاگ طوائف۔ آگرے کی رہنے والی تھی۔ شہناز اس کی نوچی تھی۔ اس نے شہناز کو رقص و موسیقی کی تعلیم استادوں سے دلوائی تھی۔ وہ اسے بڑی گلوکارہ بنانا چاہتی تھی۔ اس کے مستقبل کا سہارا بھی۔ آگرے میں کاروبار نہ جاتا تو وہ شہناز کو بمبئی لے گئی اور یہ کوشش کرتی رہی کہ اسے فلموں نام کرنے کا موقع مل جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ پاکستان بنا تو مہاجر بن کر لاہور پہنچ گئی۔ ہیرا مائل اسے ٹھکانہ بھی مل گیا تھا۔ یہیں شہناز سے مراد خاں شاہانی کے مراسم پیدا ہوئے۔ وہ کے پاس آنے جانے لگا۔ اس نے شہناز کو آج کی تقریب کے لیے خاص طور پر بلوایا تھا۔

لکے گائیکی بھی اچھی تھی۔ رقص و موسیقی کے استزاج نے محفل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ گیت بجان انگیز بولوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ شہناز پر نونوں کی بارش ہونے لگی۔ ہر سمت ”ادواہ کی صدا“ میں بلند ہونے لگیں۔ حوصلہ افزائی ہوئی تو اس نے اور جذبے سے اپنے فن کا اہلکار۔

دیکھیے۔ اس نے ادب سے جھک کر نوٹ لیے، اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

”سین سر دار، فی امان اللہ۔ بالیں بچیں، یاریں دوستیں، سب کو خیر سلا ہووے۔“

ڈھولی لائے قدموں واپس چلا گیا۔

رقص کے کچھ دیر بعد ایک نوجوان طوائف اپنے سازندوں کے ساتھ آئی۔ سازندوں نے ساز چھیڑے۔ طوائف نے دو ہڑا گایا۔ مگر چلا نہیں۔ خواجہ غلام فرید کی کافیاں بھی نہیں چلیں۔ محفل کا رنگ پھیکا دیکھ کر اس نے سینیں چھیڑی۔ سین سے محفل کا رنگ کچھ بدلا مگر جلد ہی پھیکا اور سنا پڑ گیا۔ حالانکہ سینیں تھل کے علاقے کا بے حد مقبول عوامی گانا ہے۔ سینیں گیتوں میں عام طور پر یاس و حرام کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور شاید اس لیے ہوتا ہے کہ اس کے پس منظر میں ایک الیہ داستان کا فرما ہے۔

اس داستان کی نوعیت کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ کسی زمانے میں تونسہ میں ایک بیوہ موچن رہتی تھی۔ اس کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ صرف ایک بیٹی تھی۔ اس کا نام سینیں تھا۔ وہ بہت حسین اور دل ربا تھی۔ ماں کی زندگی کا سہارا اور آنکھوں کا تارا تھی۔ سینیں جوان ہوئی تو اس کے حسن اور رعنائی کا ہر طرف شہرہ ہوا۔ شیرل نامی ایک نوجوان ایسا فریفتہ ہوا کہ اسے اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کبھی واپس نہیں آیا۔ سینیں بھی نہیں لوٹی۔ اس کی بیوہ اور لاوارث ماں جب تک زندہ رہی بیٹی کی جدائی میں تڑپتی رہی اور ایسے حزنِ گیت گاتی رہی۔

آسمیں آسان آؤ چلوں

تھل لہوں وچ چھک

سارا ساتھ سمو لڑا

میں پردہ سن بہک

طوائف خوش شکل تھی۔ خوش گلو بھی تھی مگر محفل کے مزاج کا صحیح اندازہ نہ لگا سکی۔ اس کا رنگ جما نہیں۔ وہ گئی تو دوسری طوائف آئی۔ وہ بھی نہ چل سکی، محفل میں ہلچل اور گرمی پیدا نہ کر سکی۔ صورت شکل واجبی تھی۔ آواز البتہ خوب صورت اور رسیلی تھی مگر خض تھی۔ ناز و آدا میں شوخی اور لگاؤ نہ تھی۔ محفل کا مطالعہ کچھ اور ہی تھا۔ وہ بھی اس کیفیت کو سمجھ نہ سکی۔

وہ محفل سے رخصت ہوئی تو ایک گویا آیا۔ اس نے ماہیا چھیڑا جس میں بعض مقامات ایسے آئے جن میں شوخی کے ساتھ ساتھ عریانی کا پہلو نمایاں تھا۔ گانے والے کی آواز میں شیرینی اور جلاوت بھی تھی۔ اس نے سونی محفل میں کسی قدر گرمی اور حرارت پیدا کی۔ وہ ماہیا کے ہر پے کے آغاز

بھلے، بھلے!

ہائے! میں صد کے ونجاں

رات ڈھلنے لگی۔ شہناز نو عمر اور صحت مند طوائف تھی۔ آواز کے ساتھ بدن میں بھی جان تھی مگر جس تیزی سے وہ رقص کر رہی تھی اور ایک کے بعد دوسرا گیت چھیڑ رہی تھی، اس عمل نے اس کے چمکتے بولتے جسم میں تھکن پیدا کر دی۔ وہ تڑھال نظر آ رہی تھی۔ کئی بار اس نے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ لیکن اسے اصرار کر کے روک لیا جاتا اور ہر بار نئی فرمائش ہوتی۔ نوٹوں کی ہر طرف سے ایسی بارش ہو رہی تھی کہ تھکنے کے باوجود اس کا حوصلہ پست نہیں ہوا۔ وہ ہر بار نئے جوش اور جذبے سے نئے گانے کے بول چھیڑتی۔ البتہ اس نے رقص بند کر دیا تھا۔ مگر بول ادا کرتے وقت بھلاؤ اس طرح بتاتی کہ محفل کی بل چل اور گرمی کم ہونے کے بجائے سوا ہو گئی۔

بولوں پر بوتلیں کھلتی رہیں، خالی ہوتی گئیں۔ سردار مراد خاں شاہانی اور اس کے مہمان ٹافٹ پیتے رہے۔ گلاس پر گلاس چڑھاتے رہے۔ نشے سے مدہوش ہوتے گئے۔ ان میں رحیم داد بھی شامل تھا۔ بھگت کا نشہ ہی کیا کم تھا۔ دھسکی کے چند پیگ لگائے تو نگاہیں بھٹکنے لگیں، زبان ٹوٹنے لگی۔ مگر محفل میں رقص و سرود نے ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ وہ بھی مہسوت ہو گیا۔ گلاس پر گلاس خالی کرنا گیا۔ بہت دیر بعد جب طوائف کا پیکر اسے دھندلا دھندلا نظر آنے لگا اور اس کے ساتھ ہر شے گردش کرتی، جھومتی اور لہراتی محسوس ہونے لگی تو وہ چونکا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور گاؤں کی بے تکلفی سے پھیل کر بیٹھ گیا۔

رات اور ڈھل گئی۔ اب تکلفات کے پردے اٹھ چکے تھے۔ ہر شخص اپنے انداز سے بیٹھا تھا۔ بچے والوں کا یہ عالم تھا کہ جس طرح جس کا جی چاہتا، پیتا تھا، بھک جاتا تھا۔ پھر پیتا شروع کر دیتا۔ محفل میں رفتہ رفتہ بے ترتیبی اور افراطی پیدا ہونے لگی۔ میاں شاہ علی پیتے پیتے مدہوش ہو کر بولیا اور زور زور سے خراٹے لینے لگا۔ کچھ اور مہمان بھی سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔

عبدالرحمان خان نوانی جھومتے جھومتے ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ پھر نہیں اٹھا۔ سردار سطوت خاں مزاری اور علی نواز گورمانی ایک دوسرے کے گلوں میں جاکر نہیں ڈالے لہرا رہے تھے۔ وہ گیت کے کسی بول یا کسی تان سے بہت زیادہ متاثر ہوتے تو تڑپ کر ایک دوسرے کا منہ چوم لیتے۔ وہ لہجے ہوئے تماشا بینوں کی طرح طوائف سے اشارے کئے کرتے۔ کبھی سر پر رکھ کر، کبھی کان لگا کر، کبھی انگلیوں میں دبا کر طوائف کو نوٹ پیش کرتے۔ علی نواز گورمانی بدتمیزی سے ٹانگیں ہارے نیم دراز تھا۔ وہ بار بار ایک آنکھ دبا کر ٹٹلی باندھے طوائف کو تکتے لگتا۔

گیت ختم ہو گیا مگر وہ بیٹھی نہیں۔ اس نے ایک دادر شروع کر دیا۔ تانیکہ چونکی۔ چاہا کہ شہناز باز رکھے مگر وہ گاتی رہی۔ ایک ایک بول ایسے ناز و ادا سے ادا کیا کہ محفل کی گرمی بڑھ گئی۔ رقص کرتی رہی اور لہک لہک کر دادرے کے بول ادا کرتی رہی۔ جسم کو گردش دے کر آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر وہ دادرے کے بول اٹھاتی۔

اندھیرا ہے رات جہن رہو کہ بیو!
پلنگ لچک دار جہن رہو کہ بیو!!

دادرے کے بول ٹھٹ پورہی تھے۔ مگر ہندوستانی فلموں کی مقبولیت کی بدولت محفل کے سامعین کے لیے زیادہ نامانوس نہیں تھے۔ وہ جسم کے پیچ و خم، ہاتھوں کی گردش اور آنکھوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بول اس طرح پیش کرتی کہ وہ گیت کے پیکر سے نکل کر شہناز کا روپ اختیار کر لیتے۔ چلی بھی آگے کا تھا اور شہناز اور اس کی ماں کے ساتھ ہجرت کر کے پاکستان آیا تھا۔ ہر بول پر جھوم جھوم کر طبلے پر تھاپ دیتا، ٹھیک لگاتا، گانے میں شدت اور حرارت بڑھاتا۔ اس نے ایسا سا باندھا، محفل کو اس طرح زیر کیا کہ مراد خاں شاہانی نے لہرا کر اپنے کاردار را دھانی کو شراب لانے کا اشارہ کیا۔ آن کی آن میں بوتلیں کھلنے لگیں۔ جام گردش میں آئے اور رے نوشی کا سر نو دور شروع ہو گیا۔

تانیکہ، سازندوں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ سامنے پاندان رکھا تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر پان باتی اور گوری منہ میں رکھتی۔ اگال دان بھی پاس ہی فرش پر رکھا تھا۔ اسے اٹھاتی اور بار بار پیک تھوکتی۔ اس کی خراٹ اور تنیکی نظریں محفل میں بیٹھے ہوئے ایک ایک فرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دادرے نے رنگ جمایا تو اس کا اعتماد بحال ہوا۔ سازندوں کو اشارہ کیا، سارنگی نواز بھی پرانا اور جہاں دیدہ تھا۔ اور چلی کی طرح آگے سے بائی جی کے ساتھ آیا تھا۔ تانیکہ نے جبک کر سارنگی نواز کے کان میں سرگوشی کی۔ دادر ختم ہوتے ہی سارنگی نواز نے ٹھہری کی ایک دھن چھیڑی۔ ٹھہری بھی اچھی چلی۔

رات گزرتی رہی، بھیکتی رہی، سرد ہوتی گئی۔ محفل میں دھسکی کا دور چلتا رہا۔ شہناز نے محفل کے رنگ کی مناسبت سے اور سامعین کی فرمائش پر ایسے مقبول فلمی گیت گانے شروع کر دیے جو تھکے اور بیجان انگیز تھے۔ وہ گاتی رہی، ناچتی رہی۔ محفل کی شوریدگی بڑھتی گئی۔ بار بار قہقہے بلند ہوتے طوائف سے چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ بازاری اور عامیانہ فقرے چست کئے جاتے۔ نشے میں ڈوبی ہوئی صدائیں بلند ہوتیں۔

رکے لیے بلایا اور تو مند نواب زادے کو ہاتھوں پر اٹھا کر لے گئے۔ وہ نشے میں مدہوش تھا۔ اسے ن بدن کا ہوش نہ تھا۔

رحیم داداٹھ کر کھڑا ہوا تو ڈمگا کر گرتے گرتے بچا۔ محکمہ نہر کے انجینئر نے زور سے قہقہہ بلند کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر خود لڑکھڑا کر دھڑام سے فرش پر گرا۔ رحیم دادا مسکراتا ہوا اس کے قریب گیا۔ اسے اٹھانے کی کوشش کی تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑایا اور ایک طرف لڑھک گیا۔ رحیم دادا بھی بے حال ہو رہا تھا۔ ایک ملازم نے سارا دے کر اسے اٹھایا اور کمرے میں پہنچا دیا۔ یہ سبزی لینا تو ہر شے گردش کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر بے مدہ پڑا رہا۔ اس کا جسم نشے سے اس طرح ڈول رہا تھا جیسے ہنڈولے میں بیٹھا ہو۔ کبھی اوپر چلا جاتا۔ کبھی نیچے آ جاتا۔ آخر اسی عالم میں وہ سو گیا۔



کچھ مہمان صبح ہی چلے گئے۔ البتہ نواب زادہ ملک نیاز محمد خاں اعوان، علی نواز گورمانی اور عمودراز خاں جسکائی موجود تھے۔ رحیم دادا رات کی محفل رقص و سرود میں ان سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ دوسرے کھانے پر بھی ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سارے مہمان رخصت ہو گئے۔ مراد خاں شاہانی بھی عمودراز خاں جسکائی کے ہم راہ لیے چلا گیا۔ شاہانی لیے جانے سے قبل رحیم دادا کے کمرے میں آیا، معذرت کے انداز میں بولا۔ ”سینس چوہدری! برا نہ منانا عمودراز میرے گلے پڑ گیا ہے۔ دیے لیے میں مجھے ایک کام بھی ہے۔ میں اس کے ساتھ لیے جا رہا ہوں۔“

”کب تک واپسی ہوگی؟“ رحیم دادا نے دریافت کیا۔

”کل شام تک آجاؤں گا۔ ارادہ تو یہی ہے پر جسکائی مجھے جلد نہیں آنے دے گا۔ اس نے مجھے روک لیا تو پرسوں ضرور پہنچ جاؤں گا۔“

”تو آرام سے لوٹا۔ ایسا کراب مجھے بھی جانے دے۔ میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔ میں نوں شاہ جی سے ضرور ملنا ہے۔“ رحیم دادا نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ ”یہ بتا لو کہ لیے ٹرین کب جھونتی ہے؟“

”وہ تورات کے نوبے جائے گی۔“ شاہانی نے مطلع کیا۔

”بس میں اسی سے چلا جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔ اپنے کاردار راہانی سے کہتا جا کہ مجھے رات کو ٹرین پہنچا دے۔“

مراد خاں شاہانی بھی اپنے آپے میں نہ تھا۔ دو بار اس کے ہاتھ سے بھرا ہوا گلاس چھوٹا۔ اس کی شلوار اور قمیص جگہ جگہ سے بھگی گئی۔ نشے سے چور آنکھیں بار بار بند ہو جاتیں۔ اچانک وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مہمانوں سے نظر ہچا کر محفل سے نکل جانا چاہا۔ سطوت خاں مزاری نے زور کا قہقہہ بلند کیا۔ شاہانی کو ٹوکا۔ ”سینس شاہانی! میل تو اب جوین پر آیا ہے اور تو اسے چھوڑ کر جا رہا ہے۔“ مزاری کے ساتھ ساتھ گورمانی نے بھی قہقہہ لگایا۔

”نہیں، تو ابھی نہیں جاسکتا۔“

مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر مزاری اور گورمانی کو دیکھا اور جھوم کر بولا۔ ”سینس عیش کر، عیش۔“ مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف بڑھا۔ کریم بخش راہانی نے قریب پہنچ کر اسے سہارا دیا۔ شاہانی آہستہ آہستہ چلتا ہوا محفل سے چلا گیا۔ کچھ دور جا کر اس نے اپنے کاردار کو ہدایت کی۔ ”راہانی! مجرا ختم کرا۔ میاں والی سے جو کجی آئی ہے اسے میرے کمرے میں پہنچا دے۔“ یہ کہتا ہوا وہ بالائی منزل پر جانے والے زینے کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ راہانی بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر شاہانی نے راہانی کو ڈانٹا۔

”میری فکر نہ کر۔ میں آرام سے پہنچ جاؤں گا۔ تو اب جا۔“

کریم بخش راہانی خاموشی سے واپس ہوا۔ شامیانے کے نیچے پہنچا۔ محفل میں شوریدگی اور افزا تفری تھی۔ راہانی سیدھا ٹائیکہ کے پاس پہنچا۔ سرگوشی میں مجرا ختم کرنے کی ہدایت کی۔ ٹائیکہ چاہتی بھی یہی تھی۔ بلکہ مجرا ختم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ اس کی نوجی شہناز بھی اب بت تھک چکی تھی۔ بار بار بے بسی سے ٹائیکہ کی جانب دیکھتی تھی۔

کسی رسمی اعلان کے بغیر مجرا خاموشی سے ختم کر دیا گیا۔ شہناز نے گانا بند کر دیا۔ گانا ختم ہوا تو مہمان اٹھنے لگے۔ ملازم سارا دے کر انہیں دیرے کے کمروں میں پہنچانے لگے۔ جن کی حالت نشے سے ابتر ہوتی انہیں بستروں پر لیٹنے میں بھی مدد دیتے۔

نواب زادہ ملک نیاز محمد اعوان نے قالین پر قے کر دی تھی اور اس میں لت پت پڑا بے چینی سے ادھر ادھر گردن ہلا رہا تھا۔ اس کے قریب ہی سردار عبدالرحمان خاں نوانی بے سدہ پڑا تھا۔ ذرا ہٹ کر بارڈر ملٹری پولیس کا کمانڈر شیر خاں نیازی آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ اور رک رک کر بڑبڑا رہا تھا۔

”گاو، گاو، جان من گاو، گاتی گاتی جاؤ، ناچتی جاؤ۔“

ایک ملازم نے بڑھ کر نواب زادہ نیاز محمد خاں اعوان کا چہرہ تو لیے سے صاف کیا۔ دو ملازموں

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو لاہور جانے کی اجازت نہیں دی۔ زور دے کر بولا۔ ”نہیں! اس طرح نہیں جاسکتا۔ میرے آنے کے بعد ہی جانا۔ ابھی تو شاہ جی بھی نہیں لوٹا ہو گا۔ دو نول اکٹھے اس کے پاس چلیں گے۔ مجھے بھی اسے ملنا ہے۔“

شاہانی کے اصرار پر رحیم داد کو رکنا پڑا۔ ویسے بھی اس کا جلد واپس جانے کا پختہ ارادہ نہیں تھا۔ وہ چند روز شاہانی کے پاس اور رکنا چاہتا تھا تاکہ احسان علی شاہ اس وقت تک اپنے گاؤں بیراں والہ واپس پہنچ جائے۔ وہ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی کوئٹہ ہرکشن جانا چاہتا تھا۔ مراد خاں شاہانی تیسرے روز ضرور واپس آنے کا وعدہ کر کے عمودار خاں جسکانی کے ہم راہ لیہ چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ جاگا تو کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر گیا۔ حویلی کے چوک میں پہنچا۔ دن کا چل چلاؤ تھا۔ ملکی دھوپ کیس کیس بلندی پر جھلک رہی تھی۔ دیر بالکل خالی تھا۔ گذشتہ شب جو رونق اور چل چل پھل تھی وہ یکسر اجڑ چکی تھی۔ نہ شامیانہ تھانہ قائم تھیں۔ چوڑا ویران تھا۔ حویلی میں ٹھہرے ہوئے تمام مہمان جا چکے تھے۔ صرف نوکر چاکر رہ گئے تھے۔ مراد خاں کے جاتے ہی بیشتر نوکر بھی حویلی سے چلے گئے۔

چوک میں ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ صرف باورچی خانے کی سمت بولنے اور باتیں کرنے کی دھیمی دھیمی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شام کا دھندلا فضا میں گھلتا جا رہا تھا۔ یہ نومبر کی آخری تاریخوں کی سنسان شام تھی۔ رحیم داد حویلی سے باہر نہیں گیا۔ چوتھے پر گیا اور آہستہ آہستہ ٹھننے لگا۔ کمرے میں لپٹی ہوئی شام جلد ہی کالی پڑ گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ پکھر کے نیچے نور دھک رہا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی نور سے نکلتی ہوئی چنگاریاں زیادہ روشن اور چمک دار نظر آنے لگیں۔

خنکی میں بھی اب اضافہ ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے بدن میں ہلکی ہلکی تھرتھری محسوس کی۔ سردی بچھلی رات سے زیادہ تھی۔ رحیم داد نے ایسا ہی محسوس کیا اور اس نے ٹھیک ہی محسوس کیا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ ہوا بھی نکلی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر باورچی خانے کی جانب دیکھا۔ نور کے گرد نوکروں کی بھیل بڑھ گئی تھی۔ وہ دور سے سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ رحیم داد چوتھے سے نیچے اترا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں واپس پہنچا۔

کھانا کھانے کے بعد اس نے بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی۔ دن بھر سوتا رہا تھا لہذا نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلنے لگا۔ پہر رات گزر گئی۔ باہر چوک میں ملازموں کی آوازیں دھیمی پڑتے پڑتے اب خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو چکی تھیں۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور باہر گہرا

ٹاپا چھایا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی عالم میں اس نے دروازہ کھلنے کی آہٹ محسوس کی۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر دیکھا، ایک ملازم کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ ادھیڑ تھا۔ رنگ گہرا سا نولا تھا۔ چہرے پر چھدری ڈاڑھی تھی اور چپک کے داغ نمایاں تھے۔ رحیم داد نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ ملازم نے رحیم داد کو بیدار پایا تو خاموشی سے آگے بڑھا اور بستر کے ہنٹی بیٹھ کر ہولے ہولے اس کے پیر دبانے لگا۔ رحیم داد نے کوئی بات نہیں کی۔ ذرا دیر بعد ملازم نے خود ہی بات چھیڑی۔

”سہی! میرا ناں کرامت ہے۔ میں تحصیل علی پور کا رہنے والا ہوں۔ ویسے سب مجھے کراکتے ہیں۔“

”کرے! تو مظفر گڑھ سے ادھر کیسے آگیا؟“

”سہی! وہ ایسا ہوا کہ برکھامیں دریا چڑھا تو اپنا سب کچھ اجڑ گیا۔ تجھے تو پتہ ہی ہو گا، سیلاب آتا ہے تو علی پور تحصیل کا سب کچھ ہمالے جاتا ہے۔ اپنے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ پنڈ چھوڑ کر میں ادھر آیا۔ تب سے یہیں نوکر ہوں۔“ رحیم داد خاموش رہا۔ مگر کرامت خاموش نہ رہا۔ اس نے دہلی زبان سے پوچھا۔ ”سہی! تو سردار کے ساتھ نہیں گیا؟“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”کرے! یہ بتا، باہر چوک میں آج اتنا ٹانٹا کیوں ہے؟ سب کہاں چلے گئے؟“

”وہ ایسا ہی جی! جب سردار نہیں ہوتا اور دیرے میں مہمان بھی ٹھہرے نہیں ہوتے تو نوکر اور کالے کام کاج کر کے اپنے سکوں اور شریکوں سے ملنے جلنے چلے جاتے ہیں اور آج تو کدرا بھی چلا گیا۔ وہ نہیں ہوتا تو سب ہی کھسک جاتے ہیں۔“ کرامت اپنے گندے دانت نکال کر بھونڈے پن سے ہنسنے لگا۔ ”باورچی تک چلا گیا جی۔ اب تو دیرے میں کوئی نہیں رہا۔“

”سردار کے جانے کے بعد ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے؟“

”نا سہی! ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کچھ کالے چلے جاتے ہیں پر کل رات میل تھاناں۔ سب بڑے تک جاگتے رہے۔ اب ادھر ادھر نکل گئے پر کل صبح ہوتے ہی پہنچ جائیں گے۔ اندر پتہ لگانا چلے گا۔“

”تو کیوں نہیں چلا گیا؟“

”میں کیسے جاسکتا ہوں؟ سہی! تو بھی تو مہمان ہے۔ کسی کو تو دیرے میں رہنا ہی چاہیے۔ ویسے

جی ادھر میرا کوئی نہیں۔ میں تو دیرے کی کوٹھڑی ہی میں رہتا ہوں۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ اسے کرامت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نیند کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ وہ بار بار بے چین ہو کر کڑوا بدلتا۔ کرامت ابھی تک پائنٹی بیٹھا تھا اور سدھے ہوئے ہاتھوں سے رحیم داد کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اسے بے چین دیکھ کر کرامت نے ہم دردی کا اظہار کیا۔

”سین لگتا ہے تجھے نیند نہیں آ رہی۔“

”میں دوپہر بعد سو گیا تھا اور شام تک سوتا رہا۔“ رحیم داد نے نیند نہ آنے کا جواز پیش کیا۔

”سین! سچی گالیہ اسے ہے، تو جوان ہے۔ جوان بندے کو اکیلے نیند نہیں آتی۔“ وہ ٹوٹی ہوئی مسکرایا۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اسے خاموش پا کر کرامت کی حوصلہ افزائی ہوئی وہ زیادہ بے پاک ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ایک آنکھ دبا کر گویا ہوا۔ ”سین! تو کہہ تو آلس دور کرنے کو کسی کو تیرے پاس بھیج دوں؟“

رحیم داد اس کی بات سمجھ کر بھی سمجھ نہ سکا۔ اسے معلوم تھا کہ احسان علی شاہ کی طرح سروار مراد خاں شہابی کی حویلی میں کوئی ایسا کوٹ نہیں ہے جس میں مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان عورتوں کو اٹھوا کر قید رکھا جاتا ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو شہابی اس کا اظہار ضرور کرتا۔ وہ اس سلسلے میں کرید کر پوچھنے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ کرامت اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نہیں دیکھا۔ چپ چاپ کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد الجھن میں پڑ گیا۔ نیند پہلے ہی آنکھوں میں نہیں تھی۔ اب بالکل اڑ گئی۔ اس نے بند دروازے کی جانب بے قرار نظروں سے دیکھا۔ کچھ دیر کروٹ کے بل لیٹا رہا اور دروازے کو ٹٹا رہا۔ مگر نہ دروازہ کھلا نہ کوئی اندر آیا۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ سناٹا گہرا ہو گیا۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی، آنکھیں بند کیں اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اس نے کرامت کا خیال جھٹک کر ذہن سے نکال دیا۔

نیند دھیرے دھیرے رحیم داد کی آنکھوں میں اترنے لگی۔ رات خاصی گزر چکی تھی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ یکایک گرمی خاموشی میں کمرے کا دروازہ ہولے سے چرچا یا۔ رحیم داد کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لیپ کی دھندلی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک پرچھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے جھٹ گردن موڑ کر دروازے کی جانب دیکھا کہ دروازے کے قریب کرامت کے بجائے ایک عورت کھڑی ہے۔ اس کی پیٹھ رحیم داد کی جانب تھی۔ اس نے کمرے

دروازہ آہستہ سے بند کیا اور پلٹی۔ رحیم داد نے دیکھا، وہ سرمئی رنگ کی اونٹی دوہراوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ دوہرے اس طرح چھپا تھا کہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سر و قامت تھی۔ جسم عذاب اور قدرے بھاری تھا۔ کولھے چوڑے تھے اور نچلا دھڑ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے رحیم داد کی جانب بڑھی۔

رحیم داد اٹھ کر تکیے کے سہارے بیٹھ گیا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ خوب گھیر دار ریشمی گھگھراپنے ہوئے تھی۔ وہ نظریں جھکائے خاموشی سے قریب آئی اور اپنا گھگھرا سمیٹ کر رحیم داد کے قریب بستر پر بیٹھ گئی۔

وہ ہانپنے کے انداز میں گرمی گرمی سانسیں بھر رہی تھی۔ اس کی سانسیں کمرے کے سکوت میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رحیم داد نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا، ہاتھ بڑھایا اور اس کے چہرے سے دوہر ہٹا دی۔ اس کا چہرہ اب رحیم داد کے سامنے عیاں تھا۔ اس کا رنگ صبح کی دھوپ کی مانند اجلا تھا۔ رخساروں پر خشک کی مرغی تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور کالی تھیں۔ سر کے بال لمبے اور گھنے تھے۔ وہ سرخ اور نیلے دھاگوں سے کڑھا ہوا گویا چولا پہنے ہوئے تھی۔ وہ خوبصورت اور طرح دار عورت تھی۔ آنکھوں میں کاجل لگا کر اور بال سنوار کر رین ٹھن کر آئی تھی۔ مگر اس کا سن چالیس برس سے کم نہیں تھا۔ اس کی جوانی کا سورج ہر چند کہ ڈھل چکا تھا لیکن ابھی تک اس میں غضب کی دل کشی اور رعنائی تھی۔

رحیم داد کو وہ بہت اچھی لگی۔ اس نے مسکرا کر بات چیت شروع کی۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرہ اور سرخ ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے دوبارہ اس کا نام پوچھا وہ پھر بھی نہ بولی۔ رحیم داد نے زچ ہو کر حیکھے لمبے میں کہا۔ ”بولتی کیوں نہیں۔ تو گوئی تو نہیں ہے؟“

اس دفعہ اس نے اپنی نظریں اٹھائیں۔ اس کی سیاہ اور روشن آنکھیں جھلکنا لگیں۔ لمبے بھر کے لمبے دونوں کی نظریں ملیں مگر اس نے جھٹ نظریں ایک بار پھر نیچی کر لیں۔ رسان سے بولی۔ ”میں تم سے باتیں کرنے نہیں آئی ہوں۔“

رحیم داد نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے منہ پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بے ساختہ اس کا نرم و گداز ہاتھ تھام لیا۔ اس کی کلائی میں پڑی ہوئی چوڑیاں آہستہ سے جھن بجھائیں۔ اس کے لب تھر تھرا رہے تھے۔ رحیم داد کو گلو کے عالم میں اسے تنکنا ہوا۔



کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ رات کا قافلہ دھیرے دھیرے اپنا سفر طے کرتا رہا۔ رات کے پچھلے پہر وہ اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد نے اس کی کلائی تھام کر نرم لہجے میں کہا۔ ”چلی جانا۔ ابھی برات رات رہتی ہے۔“

وہ مزید ٹھہرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔ ”سہیں! میگوں اب جانا ہے۔“ اس نے اپنی کلائی جھڑانے کی کوشش کی۔ ”میری نلی چھوڑ دے۔ میں اب نہیں رک سکتی۔“

”تو نے تو کوئی گل بات ہی نہیں کی۔“ رحیم داد نے اس کا ہاتھ نہ چھوڑا۔ ”پنا نام تو بتا دے۔“ وہ قدرے تھکے لہجے میں بولی۔ ”یہ نہ پوچھ۔“ اس نے جھٹکا دے کر اپنی کلائی رحیم داد کی گرفت سے آزاد کرالی۔ بستر پر پڑی ہوئی اوٹی دوہراٹھائی، اسے اس طرح ابوڑھا کہ ایک بار پھر اس کا چہرہ چھپ گیا۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ آہستہ سے ایک پٹ کھولا۔ جاتے جاتے دلہیزر ٹھکی۔ مز کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ ”سردار سے میرے بارے میں گالہ نہ کرنا۔ ہرگز ہرگز نہ کرنا۔“ اس نے سختی سے تاکید کی۔

”کسم کھا۔ اس سے کچھ کہے گا تو نہیں۔“

”جیسی چاہے کسم لے لے۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ ”رب سونہ، میں نوں اسے ایک لفظ نہیں کہنا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھ پر بھروسہ کر۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”کل بھی آئے گی ناں؟ سردار تو کل رات بھی واپس نہیں آئے گا۔ وہ پرسوں شام سے پہلے نہیں آئے گا۔ مجھے یہی بتا کر گیا ہے۔“ اس نے زور دے کر پوچھا۔

”بول، کیا کہتی ہے؟“

اس نے رحیم داد کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ دھیرے سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ رحیم داد گم صم بیٹھا رہا اور نظریں اٹھائے دروازے کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ پٹنگ سے نیچے اترا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر واپس جا کر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ عورت نے اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہاں تک کہ نام بتانے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور کیسے آئی تھی؟ رحیم داد کو کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ نہ جانے کب تک اس پر اسرار عورت کے بارے میں غلطان و جیچان رہا۔ آخر اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح آنکھ کھلی تو رحیم داد نے دیکھا کہ بستر پر ایک طرف چادر کی سلوٹوں میں دبا ہوا سونے کے

ہلے موٹے منکوں کا ایک کنٹھا پڑا ہے۔ کنٹھا خاصا وزن کی اور قیمتی تھا۔ اسے فوراً رات والی عورت ہار گئی۔ اس نے کنٹھا اٹھا کر تکیے کے نیچے رکھ دیا اور خاموش بیٹھا عورت کے بارے میں اندازے ہار رہا۔ مگر بہت سوچ بچار کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔

رحیم داد نے نہادھو کر ناشتا کیا۔ لیکن تمام عرصے وہ اس عورت کے متعلق سوچتا رہا جو ہنوز اس کے لیے ایک معمہ تھی۔ کرامت بھی نہیں آیا۔ اس کی تلاش میں رحیم داد کمرے سے نکل کر چوک میں گیا۔ وہ تمام نوکر چاکر واپس آگئے تھے جو رات کو حویلی سے غائب ہو گئے تھے۔ وہ اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ رحیم داد نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مگر نوکروں میں اسے کرامت نظر نہ آیا۔

دیر ابھی تک خالی تھا۔ شام ہو گئی۔ لیکن نہ کوئی مہمان آکر ٹھہرا نہ سردار مراد خان شاہانی واپس آیا۔ چوک میں کمرے کا نیل گوں غبار گاڑھا پڑتا جا رہا تھا۔ فضا دھواں دھواں تھی۔ خاموشی بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد کو رات کا انتظار تھا اور رات جیسے رینگ رینگ کر بڑھ رہی تھی۔

رحیم داد اول شب ہی اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا باہر سے ابھرنے والی آوازیں سنتا رہا۔ بے قراری کا یہ عالم تھا کہ ٹھیک سے کھانا بھی نہ کھا سکا۔ کبھی اٹھ کر ٹھلنے لگتا کبھی دروازے پر جا کر چوک کی طرف دیکھتا۔ چوک رفتہ رفتہ سنسان پڑ گیا۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھیوں میں جا کر لیٹ پڑے تھے۔ رحیم داد کو توقع تھی کہ وہ ضرور آئے گی۔ اس کا سونے کا کنٹھا رحیم داد کے پاس تھا۔ کنٹھا بالیں لینے اسے آنا چاہیے تھا۔

وہ بے چینی سے اس کی راہ تکتا رہا۔ باہر گونگی رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف پالا پڑ رہا تھا۔ غبار مگر خاموشی چھائی تھی۔

اُسی رات سے کچھ پہلے دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے دروازے کی جانب اشتیاق سے دیکھا۔ مگر دروازے پر وہ نہیں تھی کرامت تھا۔ وہ چپ چاپ چند لمحوں تک دروازے کے قریب کھڑا رہا۔ پھر نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا، دھیرے دھیرے نکلے۔

رحیم داد نے گلہ کیا۔ ”کرے! تو دن بھر کہاں رہا؟ نظریں نہیں آیا۔“

”میں، میں سویرے سویرے دریا خاں چلا گیا تھا۔ اندھا ہونے کے بعد لوٹا ہوں۔“

رحیم داد نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر گرد جمی ہوئی تھی۔ وہ سفر کی تھکان سے تڑھال نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد نے ہمدردی کے طور پر کہا۔ ”کرے! میں نوں پیر نہیں دیوانے۔ تو بہت تھکا ہوا لگتا

”سہ! اسے آنا ہوتا تو ماہان لینے خود آتی۔ میکوں تیرے پاس نہ بھیجتی۔“

”چاہیہ بتا، وہ ہے کون؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”سہ! یہ تو میں ہرگز ہرگز نہیں بتاؤں گا۔ کرامت نے صاف انکار کر دیا۔“ میں اس کے بارے میں تیکوں کچھ نہیں بتا سکتا۔“

”دیکوں نہیں بتا سکتا؟“ رحیم داد نے جھلا کر سوال کیا۔

کرامت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

”ہوتا کیوں نہیں؟“ رحیم داد نے اسے ڈانٹا۔ ”صاف صاف بتا۔“ اس کی آواز قدرے اونچی تھی۔

”سہ! دھیرے بول۔“ کرامت نے مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ ”تیکوں پتہ نہیں، یہ رات اور لاج کی گالہ ہے۔“ اس کا لہجہ جھکھا ہو گیا۔ ”میں تجھے کیسے بتا سکتا ہوں؟“ اس کے چہرے پر خوف کی جگہ جھنجھلاہٹ آگئی۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا اس کے بارے میں نہ پوچھ۔ میکوں کچھ نہیں بتاتا۔“

رحیم داد نے اس کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو رام کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”نہ بتا، تیری مرضی۔ پر اتنا بتا دے اس کا نام کیا ہے؟“

رحیم داد کو توقع تھی کہ کرامت اس کا نام بتا دے گا مگر اس کی توقع پوری نہ ہوئی۔ کرامت آمادہ نہ ہوا۔ ”نا سہ! میں یہ بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کے بارے میں تو میں تجھے کچھ نہیں بتا سکتا۔“

عورت کی شخصیت کا معمہ کرامت نے اپنی باتوں سے اور پیچیدہ بنا دیا۔ رحیم داد کا اشتیاق بڑھا۔ ”تو عجب گل کر رہا ہے۔“ رحیم داد کے لہجے میں اس دفعہ کسی قدر تلخی تھی۔

”ہا سہ! یہ عجب ہی گالہ ہے۔ اس میں بدنامی اور لہک کا ڈر ہے۔“ وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ”تو ہزار پوچھ۔ میکوں اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاتا۔ میں ہرگز کچھ نہیں بتاؤں گا۔“

”تو فریہ بھی صاف صاف سن لے، میں نے ماہان تجھے نہیں دینی۔“ رحیم داد جل کر بولا۔ اس نے کٹھا ایک بار پھر تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ ”اسے کہہ دے، ماہان لینی ہے تو خود آکر لے جائے۔“

”سہ! نراض نہ ہو۔“ کرامت نرم پڑ گیا۔ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ ”ماہان بس تیری مرمانی ہوگی۔ رب راضی ہووے، تو سدا راضی ہو، خوش ہو۔“

”کچھ ہی کہہ ماہان میں نے تجھی نہیں دینی۔“ رحیم داد اپنی بات پر جمارہا۔ ”ماہان صرف

ہے۔ جا کر آرام کر۔“

”سہ! جیسی تیری مرضی۔“ کرامت نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تجھ سے ایک ضرور گالہ پوچھنی تھی۔“

”ضرور پوچھ۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ کرامت نے دلی زبان سے پوچھا۔ ”سہ! تو نے سونے کی ایک ماہان تو نہیں دیکھی؟“

”کیسی ماہان؟“ رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”سہ! رات اس کے گلے سے ماہان اتر کر میاں گر گئی تھی۔ وہ اس کے لیے بہت پریشان ہے میں اس کی ماہان لینے آیا ہوں۔“

رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے کٹھا نکالا، کرامت کے سامنے کیا اور زیر لب مکر کر بولا۔ ”یہ رہی اس کی ماہان۔ اسے لینے تو کیوں آیا؟ وہ خود کیوں نہیں آئی؟“

”یہ تو جی وہی بتا سکتی ہے، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ کرامت نے گول مول جواب دیا۔

”ٹھیک ٹھیک بات کر۔“ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔

”سہ! میکوں کیسہ کہنا اے؟“ کرامت مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”اس کی مرضی ہے، آنا چاہے تو آجائے گی۔“

”پر کل رات تو اسے تو میاں لایا تھا نا؟“

”نا سہ! ایسی گالہ نہیں۔“ کرامت نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”اس کی مرضی نہ ہوتی تو میں اسے کیسے لاتا۔“

”تو اس کے ساتھ ساتھ آیا تھا؟ پر وہ کمرے میں بالکل اکیلی آئی تھی۔“

”میں تو اسے تیرے کمرے تک چھوڑ کر چلا گیا تھا۔“ کرامت نے وضاحت کی۔

”جب وہ واپس گئی تب تو کہاں تھا؟“

”سہ! میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ میکوں پتہ تھا وہ دیر سے لوٹے گی۔“ اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بتایا۔ ”اس نے واپسی پر مجھے بگایا تھا۔“

”آج بھی وہ آئے گی؟“ رحیم داد نے بے قرار نظروں سے کرامت کو دیکھا۔

”پتہ نہیں جی۔“ وہ آہستہ سے بولا۔ ”ویسے سچی گالہ پوچھ تو مجھے لگتا نہیں وہ آج بھی آئے گی۔“

”تو نے کیسے اندازہ لگایا، وہ نہیں آئے گی؟“

ہر خود لے جائے گی۔ فکر نہ کر مالھان میرے پاس حفاظت سے رہے گی۔“
کرامت کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مراد خاں شاہانی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ لیکن کرامت
پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے سے مسکراہٹ اڑ گئی۔ اس نے قبر آلود نظروں سے کرامت کو دیکھا۔
”کرے! تو ادھر کیا کر رہا ہے؟“ اس کا لہجہ تند اور کڑوا تھا۔

رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ ”شاہانی! میں نے اسے بلایا تھا۔“ اس نے مڑ کر کرامت کی
جانب دیکھا۔ ”مجھے فناٹ ایک گلاس پانی لادے۔ تجھے اسی لیے بلایا تھا۔“

کرامت کمرے سے چلا گیا۔ مراد خاں شاہانی کھڑا رہا۔ رحیم داد نے اس کے بشرے سے اندازہ
لگایا کہ کرامت کا وہاں آنا اسے ناگوار گزرا ہے۔ رحیم داد نے غور کیا کہ کرامت اس کے لیے پانی
نہیں لایا بلکہ حویلی کا ایک اور ملازم پانی سے بھرا ہوا گلاس لے کر اندر آیا۔ رحیم داد نے اس سے
کرامت کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ گلاس لیا اور اس طرح ہونٹوں سے لگا کر غنا غٹ پی گیا
گویا بہت پیاسا ہو۔



جیپ حویلی کے صدر دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں جیپ میں
بیٹھ گئے۔ جیپ نے حرکت کی اور آگے بڑھ گئی۔ اسے ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کے برابر شاہانی کا
ایک نوجوان ملازم ہاتھ میں بھری ہوئی بدوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ مراد خاں شاہانی پچھلی نشست پر
رحیم داد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ جیپ گرد کے بادل اڑاتی تیزی سے پر تپج راستوں
پر دوڑ رہی تھی۔

بھکر شہر سے نکل کر جیپ اس سڑک پر پہنچ گئی جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ وہ بھل
اشیئن کی سمت تیز رفتار سے جا رہی تھی۔ سڑک کے بائیں طرف ریلوے لائن تھی اور دائیں
طرف کھیتوں سے گھری ہوئی بستیاں تھیں۔ جھراور جنگل تھے جو حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ
دربائے سندھ کا ساحلی علاقہ ہے جو بیٹ کھلاتا ہے۔ یہ بھکر سے بھل تک پندرہ میل لمبی اور پانچ
میل چوڑی سرسبز و شاداب پٹی ہے اور اپنی زرخیزی کے لیے مشہور ہے۔ جدھر آجکھ اٹھتی ہے۔
ہلالی ہی ہریالی نظر آتی ہے۔

بیٹ کا علاقہ شاہانیوں، ڈھانڈلوں اور نوانیوں کی جاگیروں میں بٹا ہوا ہے۔ مگر ڈھانڈلوں کی زمیں
دائیں شاہانیوں اور نوانیوں کے مقابلے میں زیادہ بڑی ہے۔

بیٹ نشیب میں واقع ہے۔ سامنے دریا سندھ بہتا ہے جس کا پاٹ میلوں تک پھیلا ہے۔ دریا

اور صرف اسی کو دے سکتا ہوں۔“ کرامت سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔
”کھڑا کیوں ہے؟ جو میں نے کہا ہے اسے جا کر بتا دے۔ وہ کوئی بھی ہو مالھان یعنی ہے تو اسے خود چل
کر یہاں آنا پڑے گا۔“ رحیم داد بستر پر دراز ہو گیا۔ ”اب تو یہاں سے پھوٹ جا۔ میں نوں رہا
ہے۔ اوگھ آ رہی ہے۔ رات بھی بہت ہو گئی۔“

کرامت مڑا اور ہولے ہولے کو لے مٹکا تا ہر چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹا انتظار کرتا رہا۔ رات گزرتی گئی۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رات آدھی ہو گئی۔ مگر
ہو کر ڈھلنے لگی۔ لیکن نہ کرامت آیا، نہ وہ آئی۔ رحیم داد انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ صبح اٹھ کر
کمرے سے باہر آیا تو ملازموں کی زبانی معلوم ہوا کہ مراد خاں شاہانی واپس آگیا ہے۔

ناشتے پر شاہانی بھی پہنچ گیا۔ اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر مراد
خاں نے جیپ نکالنے کا حکم دیا اور خود بھی گیرج کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ ہوں
والی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے دروازے پر آہٹ سنی، مڑ کر دیکھا کہ کرامت سامنے کھڑا
ہے۔ رحیم داد نے پوچھا۔

”تو پچھلی رات کیوں نہیں آیا؟ اب کس لیے آیا ہے؟“

”سین! تو نے صاف انکار کر دیا تھا۔ میگوں آکر کیسے لیتا تھا؟“

”اسے اپنے ساتھ لاتا۔ وہ کیوں نہیں آئی؟“

”سین! آہستہ بول۔“ اس نے سرا سید نظروں سے باہر چوک میں دیکھا۔ ”تینکوں پتہ ہے
سردار واپس آگیا ہے۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نوں یہ بتاؤ وہ کیوں نہیں آئی؟“ رحیم داد
کا لہجہ اس دفعہ دھیمہ تھا۔

”سین! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“ کرامت نے سرگوشی کی۔ ”اس کی مرضی! نہیں آئی۔ تو نے جو
کہا تھا، میں نے اسے کہہ دیا۔“

”کیا بولی وہ؟“

”اس نے میری گالہ سنی پر کچھ بولی نہیں۔“ سین! اس کی مالھان ویدے۔“ وہ گڑ گڑانے لگا۔
”تیری بہت مہربانی ہوگی۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”وہ بہت پریشان ہے۔ اسے تک
کرے گا تو وہ تجھ سے نراض ہو جائے گی۔“

”اسے کہنا نراض نہ ہو۔ میں چند روز بعد واپس آ جاؤں گا۔ اس کی مالھان تب ہی دوں گا۔“

ہکتے۔

کچے کا علاقہ اس کے باسیوں کے لیے اس وقت میدان حشر بن جاتا ہے جب دریا میں سیلاب آتا ہے جسے مقامی بولی میں ڈھا کہا جاتا ہے۔ ڈھا آتا ہے اور دریا کا پانی چڑھتا ہے تو ہر چیز کو اپنے اٹھ بھالے جاتا ہے۔ بستیاں پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ کچے مکانات گر جاتے ہیں۔ ہر طرف تباہی مچ جاتی ہے۔ نشیب میں ہونے کے باعث بیت بھی ڈھا سے محفوظ نہیں رہتا۔ وہ بھی تباہی اور بادی کا شکار ہوتا ہے۔ ڈھا بالکل اچانک آتا ہے اور اگر رات کے اندھیرے میں آتا ہے تو لوگوں کے لیے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھتا ہے ادھر بھاگتا ہے۔ جسے بھاگنے کا موقع نہیں ملتا وہ جان بچانے کے لیے درختوں پر چڑھ جاتا ہے۔ ڈھا کی تباہی اور بادی کے باوجود بچے کے رہنے والے اسے چھوڑ کر کہیں اور نہیں جاتے۔ وہ ہر تباہی و بربادی کے بعد از سر نو اپنی بادی کرتے ہیں۔ منہدم مکانوں کی تعمیر کرتے ہیں اور زندگی کا سفر نئے عزم سے شروع کرتے ہیں۔

ڈھا اگر زحمت ہے تو باعث رحمت بھی ہے۔ سیلاب کا زور جب ٹوٹتا ہے اور پانی اترتا ہے تو ڈھا بچے ساتھ جو مٹی لاتا ہے اس سے کچے کی زمین خوب زرخیز ہو جاتی ہے جس پر گندم، چنے، جوار، جے، کدو، تارہ میرا اور گوار کے ساتھ ساتھ بنزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ یہاں خربوزے، ربوڑ بھی پیدا ہوتے ہیں جو نہایت خوش ذائقہ ہوتے ہیں۔ دریا کی رفتار جن دنوں ست پڑ جاتی ہے اور اس میں ٹھہراؤ آ جاتا ہے تو دوسرے خود رو پودوں کی طرح پیڑا بھی اگتا ہے۔ اسے کوند بھی ما جاتا ہے۔ اس کے ریشوں سے بان تیار کیے جاتے ہیں اور تپکی تپکی شاخوں سے جو جھاؤ کھلاتی ہے جھاڑو اور ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں۔ جھاڑو اور ٹوکریاں تیار کرنا کچے کی گھریلو صنعت میں شامل ہے جن کی بازار میں ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔

کچے کے جزیروں کا علاقہ بھی بیٹ کے ساتھ شاہانوں، ڈھانڈلوں اور نوانیوں کی جاگیر میں بنا ہوا ہے۔



جیپ بھل سے پہلے ہی کچے راستے پر مڑ گئی اور پچھولے کھاتی ہوئی موضع ہموں والی کی جانب بڑھ گئی۔ ہموں والی ہی میں مراد خاں کی جاگیر تھی جو کم دیش تین ہزار مربع ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ گاؤں میں داخل ہوئی تو ہر طرف مراد خاں کی آمد کا غلغلہ مچ گیا۔ ڈرائیور نے جیپ اس ناظم گاہ کے سامنے رکی۔ یہ قدیم وضع کی حویلی تھی۔ اس کی بوسیدہ چار دیواری جگہ جگہ سے

کے درمیان جگہ جگہ خٹکی کے دو آجے نظر آتے ہیں جنہوں نے جزیروں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ان جزیروں کو کچے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ کچے غیر آباد اور ویران نہیں ہیں۔ ان میں بستیاں آباد ہیں۔ زمین نہایت زرخیز ہے اور ان کے باشندے سخت محنتی اور جفاکش ہیں۔ کھیتی باڑی کرنا اور مویشی پالنا ان کا پیشہ ہے اور یہی ان کا ذریعہ معاش ہے۔ ان کا رہن سہن بہت سیدھا سادا ہے۔

مکانات مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور ان کی چھتیں عام طور پر پھوس اور پتوار کی ہوتی ہیں۔ گھروں کی چار دیواری کے اندر کشادہ آگن ہیں جن میں گھٹے اور سایہ دار درخت ہوتے ہیں۔ آگنوں میں چارپائیاں بکھی ہوتی ہیں۔ مرد فرصت کے اوقات میں چارپائیوں پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہیں۔ باتیں کرتے ہیں۔ دل بھلاتے ہیں۔ آگنوں میں درختوں اور کھنٹوں سے بندھے ہوئے مویشی جگالی کرتے رہتے ہیں۔ مرغیاں کڑکڑاتی ہوئی ادھر ادھر گھومتی پھرتی ہیں۔ مرد سونچا ظلع ہوتے ہی جب ہل پنجالی سنبھال کر کھیتوں پر کام کرنے نکل جاتے ہیں تو عورتیں گھروں میں مشین پر چارہ کاٹی ہیں۔ گائے بھینسوں اور بکریوں کے لیے غذا مسیا کرتی ہیں۔ گائے بھینسوں کے تھنوں سے بالٹیاں بھر بھر کر دودھ نکالتی ہیں جس سے مکھن اور کھوئے کے علاوہ طرح طرح کے لذیذ مٹھائیاں تیار کی جاتی ہیں۔

مرد دودھ، کھویا اور مٹھائیاں لے کر دریا عبور کرتے ہیں اور گردو نواح کے بازاروں میں فروخت کرتے ہیں۔ دریا عبور کرنا بھی ان کا ایک فن ہے۔ وہ دودھ سے بھری ہوئی گائیں اور مکے، مٹھائیوں اور سبزیوں کے ٹوکے کمر اور ٹانگوں سے باندھ کر یا سر پر رکھ کر اس مہارت اور ہوشیاری سے دریا سے گزرتے ہیں کہ کوئی بھی شے پانی سے خراب نہیں ہوتی۔ دریا پار کرنے کے لیے وہ اپنے سینے سے چمڑے کی چھوٹی سی مشک باندھ لیتے ہیں جسے سندھاری کہا جاتا ہے۔ ان کا یہ سفر بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سندھاری کا چمڑا کہیں سے کھل جاتا ہے یا پانی میں بہتی ہوئی درختوں کی شاخوں کی کوئی نوک یا کانٹا چھ جاتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔ ایسے خطرات سے نمٹنا جانتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ دریا کی لہریں ان کو نگل جاتی ہیں۔

مگر عورتیں، بوڑھے اور بچے ملاحوں کو کرایہ دے کر کشتیوں سے دریا عبور کرتے ہیں اور ایسا سفر وہ شادی بیاہ، میلوں، ٹھیلوں اور کسی خاص تقریب کے موقع ہی پر کرتے ہیں۔ مرد بھی کشتیوں سے سفر کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنا اور اپنے سازو سامان کا بھاری کرایہ ملاحوں کو ادا کرنے کے متحمل نہیں

ہی بھی فیصلہ عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا۔

چار روز تک صبح شام، دونوں وقت یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کسی بھی روز پکھری دو گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوتی۔ کبھی کبھی صبح سے دوپہر ہو جاتی۔ مگر سردار مراد خاں شام کی پکھری زیادہ طویل نہ ہونے دیتا۔ پھر بدھتے ہی اس کے معمولات کا وقت شروع ہو جاتا، بدن ٹوٹنے لگتا اور ذہن بو جھل ہو جاتا۔ مگر باہر نوشی کا تقاضا ہوتا اور اس میں تاخیر رفتہ رفتہ اذیت ناک بنتی جاتی۔ اس کی قوت فیصلہ اب دینے لگتی۔ وہ اکتا کر اچانک کھڑا ہو جاتا۔ راوہانی اس کا مزاج شناس تھا۔ وہ اٹھنے سے پہلے سردار شاہانی کی کیفیت بھانپ جاتا اور پکھری برخاست ہونے کا اعلان کر دیتا۔

پکھری کا سلسلہ ختم ہوا تو مراد خاں بستی چاندیہ کے ایک بڑے زمیں دار اور بارڈر ملٹری پولیس کے ایک کمانڈر کے ہم راہ شکار کھیلنے چلا گیا۔ اس کے ساتھ شکاری کتے تھے اور شکار کا ہانکا کرنے کے ملازم اور مزارعے بھی تھے۔ ان کے پاس لمبی لمبی لٹھیاں، ڈھول اور ٹین کے پیپے تھے۔ کریم شاہ راوہانی بھی سردار شاہانی کے ساتھ چلا گیا۔ مگر کریم داد نہ جاسکا۔ اسے پچھلی رات سے ہلکا ہلکا نار تھا۔ سر میں درد بھی تھا۔ گاؤں کے حکیم نے اسے دوا دی تھی اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ بھی جب سردار مراد خاں شاہانی شکاریوں کے ہم راہ روانہ ہو رہا تھا تو کریم داد اس قدر بحال اور مضحل تھا کہ اس میں شکار پر جانے کی نہ سکت تھی اور نہ کوئی خواہش۔ وہ اپنے کمرے میں بستر لینا رہا۔ سردار شاہانی شکار پر جانے سے پہلے دیر تک اس کے پاس بیٹھا تسلی اور دل جوئی لایا نہیں کرتا رہا۔

مراد خاں دن چڑھے شکار کے لیے روانہ ہوا اور کریم داد سے دوسرے روز صبح واپس آنے کا وعدہ کر گیا۔ کریم داد نے اس روز کھانے کے بجائے صرف گرم دودھ پر گزارہ کیا۔ شام کو بھی وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا۔ مگر اس کی طبیعت میں افادہ تھا۔ بخار اتر چکا تھا۔ صرف کمزوری باقی تھی۔

دوسرے روز صبح پکھری لگائی۔ شام کو بھی پکھری لگائی۔ ہر روز ایسا ہی ہوا۔ مزارعے اور جاگیر میں بسنے والے دوسرے لوگ سردار کے سامنے حاضری دیتے، اپنے تنازعات اور مسائل، مقدمات کی صورت میں اس کے سامنے پیش کرتے۔ سردار شاہانی منصف کی صورت میں ایک کا مقدمہ سنتا۔ ان پر غور کرتا۔ ضروری سمجھتا تو اپنے کاردار راوہانی سے بھی مشورہ کر لیتا۔ راوہانی اس کے قریب ہی ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سردار شاہانی کسی مقدمے کو آگے پیشی کے لیے ملتوی کر دیتا۔ کسی کا فوری فیصلہ سناتا۔ اس کا ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ ان کے

نوٹ پھوٹ گئی تھی۔

سردار شاہانی کا کاردار رحیم بخش راوہانی پہلے ہی سے موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم جیپ سے اتر کر اندر چلے گئے۔ حویلی بہت بڑی تھی۔ اس کا احاطہ کشادہ اور وسیع تھا۔ کھیتیں گھنے اور سایہ دار درخت تھے۔ احاطے کے ایک حصے میں مہمانوں کے قیام کے لیے دیر تھا۔ حویلی کی عمارت سے الگ تھلگ کچھ فاصلے پر تھا۔ دیرے کے ایک کمرے میں رحیم داد کے کمرے کا بندوبست کیا گیا۔

شام کو سردار مراد خاں شاہانی نے پکھری لگائی۔ وہ ایک کرسی پر گردن اونچی کیے نہایت آنکھیں اور دبدبے سے بیٹھا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کمرے کے باہر دالان میں دور تک گاؤں کے مزارعے اور کمی جمع تھے۔ وہ باری باری سردار کے روبرو حاضر ہوتے دروازے سے داخل ہوتے ہی اونچی آواز سے کہتے۔

”سین سردار! سلام دلاؤں، خوش ہو، راضی ہو، بلیں بچیں، جان، مال، ڈھکی خیراے۔ غنیمتی سب خیراے۔“

سردار مراد خاں شاہانی ہولے ہولے نخوت سے گردن ہلا کر جواب دیتا۔ ”شکراے، شکر اے۔“

آنے والے نظریں نیچی کیے سنبھل سنبھل کر آگے بڑھتے۔ قریب پہنچ کر مراد خاں شاہانی کے چہرے چھوتے اور ہاتھ جوڑ کر بلند آواز سے دعائیں دیتے۔

”سین سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ حیاتی والا ہونویں۔“

دو گھنٹے بعد پکھری برخاست ہو گئی۔ باہر بیٹھے ہوئے جن لوگوں کو سردار کے روبرو حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا، وہ دوسرے روز آنے کا ارمان دلوں میں لیے واپس چلے گئے۔ ان میں مرد بھی تھے عورتیں بھی تھیں۔ بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی۔

سردار مراد خاں نے دوسرے روز صبح پکھری لگائی۔ شام کو بھی پکھری لگائی۔ ہر روز ایسا ہی ہوا۔ مزارعے اور جاگیر میں بسنے والے دوسرے لوگ سردار کے سامنے حاضری دیتے، اپنے تنازعات اور مسائل، مقدمات کی صورت میں اس کے سامنے پیش کرتے۔ سردار شاہانی منصف کی صورت میں ایک کا مقدمہ سنتا۔ ان پر غور کرتا۔ ضروری سمجھتا تو اپنے کاردار راوہانی سے بھی مشورہ کر لیتا۔ راوہانی اس کے قریب ہی ذرا پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھا تھا۔ سردار شاہانی کسی مقدمے کو آگے پیشی کے لیے ملتوی کر دیتا۔ کسی کا فوری فیصلہ سناتا۔ اس کا ہر فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ ان کے

رحیم داد نے آنکھیں کھول دیں۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا کہ

کرامت کمرے میں داخل ہو رہا ہے۔ اس نے دروازہ بند کیا اور رحیم داد کے روبرو نظریں جمائیں۔
ادب سے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”کمرے! تو کیسے آیا؟“

”تیکوں پتہ ہی ہے سب میں کیوں آیا ہوں۔“ اس نے رمان سے کہا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ اس نے ہولے سے کراہتے ہوئے کڑھ بدل دی۔ کرامت نے چہرے پریشانی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے اظہار ہمدردی کے طور پر پوچھا۔ ”سب! تیری طبیعت تو خیر ہے؟ خیر و عافیت اے؟“

”سر میں درد ہے۔ بخار بھی تھا۔ پر اب نہیں لگتا۔ حکیم نے دوائی دی ہے۔“ رحیم داد نے ٹھہر کر بتایا۔

کرامت آگے بڑھا اور سرھانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ رحیم داد کا سر دبانے لگا۔ رحیم داد چپکلا رہا۔ سر دباتے دباتے کرامت نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”سب! تو نے مالھان کے بارے میں کیا سوچا؟“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”تو آیا کب؟“

”میں تو جی کل ہی آگیا تھا۔ پر مجھے مالھان لے کر ضرور جانا ہے۔ دے دے تو سویرے سویرے بھکر چلا جاؤں گا۔“

”سردار کو پتہ ہے تو یہاں ہے؟“

”نہیں سب! اسے بالکل پتہ نہیں۔ اسے میرے آنے کا پتہ بھی نہ لگے۔ میں چاہتا ہوں اس کی واپسی سے پہلے ہی یہاں سے چلا جاؤں۔ تو نے دیکھ ہی لیا اس روز تیرے کمرے میں مجھے دیکھ کر کتنا زراض ہوا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تو سب وہ بہت ظلم کرے گا۔ اس کا سہ بہت خطرناک ہے۔“
رحیم داد چند لمحے غمگین باندھے سامنے کی دیوار تنکنا رہا۔ دیوار پر کرامت کا سایہ لپک کی روشنی میں دھیرے دھیرے مل رہا تھا۔ رحیم داد نے لمبی سانس بھری۔ اس کے ہونٹوں پر خفگی مسکراہٹ ابھری۔

”کمرے! سچ بتا، وہ تیری بھین تو نہیں ہے؟“

”توبہ کرو جی۔“ وہ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”سب! تو نے تو حد کر دی۔ وہ میری بھین کیسے ہو سکتی ہے؟ میں تو حویلی کا بہت معمولی نوکر ہوں۔“

”سردار کی رکھیل ہے؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”سب! تو کیسی گالہ کر رہا ہے؟“ کرامت کے لمبے میں ناگواری کا پہلو نمایاں تھا۔ ”تیکوں ایسا ہی سوچتا چاہیے۔“

”غیر کون ہے وہ؟“ رحیم داد نے تھکے لمبے میں کہا۔ ”تو بتاتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بات کر۔“

”سب! میں صاف صاف بات نہیں کر سکتا۔“ وہ عاجزی سے بولا۔

”نہیں بتاتا تو نہ بتا۔“ رحیم داد جھنجھلا کر بولا۔ ”میں تجھے مالھان نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں دوں گا۔“ اس نے نظریں اٹھا کر کرامت کے چہرے کی جانب دیکھا اور سیدھی سیدھی دھمکی دی۔

”تو نہیں بتائے گا تو مالھان سردار کو دے دوں گا۔“

”سب! ایسا نہ کرنا۔“ کرامت کا پورا جسم لرز اٹھا۔ رحیم داد نے بھی اس کی شدید پریشانی محسوس کی۔ کرامت نے رحیم داد کا سر دبا بند کر دیا۔ چند لمحے بتا بیٹھا رہا۔ پھر اس کی مدھم آواز ابھری۔ ”سب! کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔“ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کے لمبے میں ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ پیدا ہو گئی۔ ”سب! سچی گالہ یہ ہے کہ وہ ملوک زادی ہے۔“ کرامت بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ ”وہ سردار کی بھین ہے سب۔“

رحیم داد نے حیرت سے کہا۔ ”تیرا مطلب ہے وہ مراد خاں کی بھین ہے۔“ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”کمرے! تو سچ کہہ رہا ہے؟“

”ہا سب! بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ وہ نہایت اعتماد سے بولا۔ ”وہ سردار کی سگی وڈی بھین ہے۔ اس کا ناں حمیدہ ہے۔“

رحیم داد غصے میں پڑ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا، راز دارانہ لمبے میں بولا۔ ”تو نے میرے پاس اس کے آنے سے پہلے ہی یہ بات کیوں نہیں بتائی؟“

”سب! اس نے منع کر دیا تھا۔ میں اس کے حکم کے خلاف کیسے بول سکتا تھا۔“ وہ صفائی پیش کرنے لگا۔ ”میں مصیبت دامار یا غریب نوکر ہوں۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”سردار کو بالکل پتہ نہ چلے۔“
”جی بہت ظالم ہے۔ اسے پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار دے گا۔ تجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔

”اسی بھین کے چکر میں پہلے بھی دو خون کر چکا ہے۔“

”کون تھے وہ؟“ رحیم داد نے سرا سید ہو کر پوچھا۔

”ایک تو کوندر اس والی کا دواڑ میں دار ہوتا تھا۔ تیری ہی طرح وہ بھی سردار کا یار تھا۔ حویلی کے

دیرے میں کچھ روز کے لیے مہمان کے طور پر ٹھہرا تھا۔ ایسا ڈاڈھا چنگا جوان تھا، تجھے کیا تاؤ لے۔ کرامت رک رک کرتا رہا۔ ”دوسرا سردار کام دار تھا۔ یہ کرم بخش راوہانی تو پچھلے ہی سال پہلے ہے۔ اس سے پہلے جو کم دار ہوتا تھا اس کا ناں اکبر خاں نیازی تھا۔ میانوالی کا رہنے والا تھا۔ پٹا روپ رنگ تھا۔ جڑیا جوان تھا۔“

”پولیس شولیس نہیں آئی؟“

”پولیس کیسے آئی سنیں! کرامت نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پولیس بھی ادھر آتے دُرنے ہیں۔“ اس کے لہجے سے خوف اور گھبراہٹ کا عنصر ختم ہوتا جا رہا تھا۔ ”سارے وڈے افسروں سے سردار کی یاری ہے۔ اس کی ساتھ بیٹھ کر روز ہی رات کو پیتے پلاتے ہیں۔“

رحیم داداس کی باتیں سن کر گمری خاموشی میں ڈوب گیا۔ کرامت نے اسے اس طرح گم سمیلا تو کیرد کے پوچھا۔ ”سین تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”حمیدہ کا گھر والا نہیں ہے؟“ رحیم دادے دریافت کیا۔

”گھر والا کیسے ہو سکتا ہے اس کا پرنا ہی کب ہوا۔“ اس نے چونکا نظروں سے ایک بار بھر دروازے کی جانب دیکھا۔ ”سردار اس کا پرنا کرنا ہی نہیں چاہتا۔“

رحیم دادا کو یہ سن کر سخت تعجب ہوا کہ حمیدہ کا اب تک بیاہ نہیں ہوا اور شاہانی اس کا بیاہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ الجھن میں پڑ گیا۔ اس نے یہ راز معلوم کرنے کی غرض سے دریافت کیا۔ ”کرے! یہ تو بتا، سردار نے اب تک حمیدہ کا پرنا یا وہ کیوں نہیں کیا؟“

”گالہ یہ ہے سین۔“ کرامت نے بتایا۔ ”حمیدہ کا پرنا ہو گیا تو اس کے ساتھ زمیں داری کا حصہ بھی دینا ہو گا۔ اب تو جی اس کی عمر بھی زیادہ ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بھین رشیدہ ہے۔ اس کا بھی پرنا نہیں ہوا۔ اس کی عمر بھی پکی ہوتی جا رہی ہے۔ وہ بھی سردار سے وڈی ہے۔ سردار سب سے چھوٹا ہے۔ اس کا کوئی بھائی نہیں۔ صرف دو بھینیں ہیں۔ تب ہی تو وہ نہیں چاہتا کہ زمیں داری کم ہو جائے۔ وہ تو زمیں داری بڑھانا چاہتا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند ہو رہا ہوا۔ ”ادھر کے تو سارے ہی بگیردار اور وڈے زمیں دار ایسا ہی کرتے ہیں۔ ان کی بھینیں اور بیٹیاں بنا پرنے کے حویلیوں کے کمروں میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جاتی ہیں اور جی ان کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔“

”نگرانی کی جاتی ہے تو حمیدہ اس طرح رات کو کیسے میرے کمرے میں چلی آئی؟ اسے بلا کر تو ہی لایا تھا؟“

”اس کی مرضی جو تھی۔ مجھے اس نے بخشش میں بیچ روپے بھی دیئے تھے۔“ کرامت نے رنج

کو مطلع کیا۔ ”دو شام کو تجھے حویلی کے چوک میں ٹھٹھٹے دیکھ چکی تھی۔ اسے یہ بھی پتہ تھا کہ دیرا ہے۔ تیرے سوا نہ کوئی مہمان ہے، نہ نوکر۔“ اس کا لہجہ مدہم ہو گیا۔ اس پر سنجیدگی غالب آئی۔ ”جوانی تو جی بری ہوتی ہے۔ بس وہ چلی آئی۔“ اس نے قدرے توقف کیا، پھر مسکرا کر گویا۔ ”ابھی تو جی وہ جوان ہی ہے۔ سوہنری بھی ہے۔ ویسے سین، ایک گالہ اور بھی ہے۔ اس کا زہنیک سے کام نہیں کرتا۔ کبھی کبھی تو اتنی چیچنی چلاتی ہے کہ دور دور تک اس کی آواز جاتی ہے۔“

چند ہی روز پہلے حویلی کے زنان خانے سے نسوانی چیخیں رحیم دادے نے بھی سنی تھیں اور سردار اداں شاہانی انھیں سنتے ہی گھبرایا ہوا اٹھ کر زنان خانے میں چلا گیا تھا۔ ذہن میں اس پس منظر کے ساتھ رحیم دادے نے کہا۔ ”ایک رات تو میں نے بھی چیخیں سنی تھیں۔ حمیدہ ہی چیچنی چلاتی ہو گی پر ایسا کیوں کرتی ہے؟“

”اس کے تو سین چیخے چیخے ہاتھ پیر بھی اکڑ جاتے ہیں۔ منہ سے سفید سفید جھاگ نکلتا ہے۔“

”مرگی تو نہیں ہے اسے؟“ رحیم داد کے چہرے پر پریشانی کا غبار بکھر گیا۔ اسے معاکیم نذر محمد ٹٹی یاد آ گیا جسے مرگی کا دورہ پڑنے کے دوران اس نے نہریاری دو آب کے پار ویران ٹیلوں کے میان بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔

”مرگی شرگی بالکل نہیں ہے۔“ کرامت نے رحیم داد کی غلط فہمی رفع کرنے کی کوشش کی۔ اسے تو جی جن تھیوں ہے۔ آسیب بتاتے ہیں۔ جب اس پر جن آتا ہے تو اس کی آنکھیں لال لالار ہو جاتی ہیں۔ ایسی لال لال کہ دیکھ کر خوف آتا ہے۔ اس دکھت تو سین اس کی آواز بھی بدل لایک دم بھاری ہو جاتی ہے۔ کسی ڈال یا رن کی آواز ہی نہیں رہتی۔ لگتا ہے کوئی مرد بول رہا ہے اس آسیب اتارنے کے لیے کتے ہی پیروں، کھیروں اور اللہ والوں کو بلا چکی ہے۔ اس کا اپنا ناموالی پیر بھی ہے۔“ کرامت دھیمے لہجے میں حمیدہ کے بارے میں بتاتا رہا۔ ”کسی نے تعویذ دیا کسی نے جھاڑ چھونک کی۔ ماں اسے زیارتوں اور خنگا ہوں پر بھی لے گئی۔ منت بھی مانی۔ پر سین! کچھ نہیں ہوا۔ جن اب تک اس پر آتا ہے۔ تب ہی تو سردار بھی اس سے ڈرتا ہے۔“ وہ زیر لب لگایا۔ ”ڈرتا تو جی سچ پوچھو وہ اس کے آسیب سے ہے۔ اسے تو کبھی کچھ نہیں کہتا پر اس کے اداں کو ضرور کتل کر دیتا ہے۔ دو تو میرے سامنے ہوئے۔ پہلے بھی ہو چکے ہوں گے۔“

رحیم داد کی سٹی گم ہو گئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا۔ آہستہ سے پلنگ سے اترا۔ کونے میں رکھے نئے ٹرنک کے پاس گیا۔ اسے کھولا، اندر سے سونے کا کنٹھا نکالا، کرامت کے پاس پہنچا۔ کنٹھا

خانہ واپسی پر وہ سیدھا رحیم داد کے پاس پہنچا۔ اس کا حال معلوم کیا۔ رحیم داد کی طبیعت اب ٹھیک تھی۔ بخار اتر چکا تھا۔ سر میں درد بھی نہیں تھا۔ سردار شاہانی اس کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ کچھ دیر شکار کے بارے میں باتیں کرتا رہا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شام کو سردار مراد خاں نے رحیم داد کو اس کمرے میں بلوایا جسے دربار ہال کہا جاتا تھا۔ ہال میں روشنی بھی زیادہ تھی اور فرش پر قالین بچھا تھا۔ مراد خاں اونچی کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی پر زرہ بنت کا غلاف چڑھا تھا۔ غلاف کا رنگ اڑکھچکا پڑ گیا تھا۔ مگر اس کے سنری گل بوئے تیز روشنی میں جھل مار رہے تھے۔ دو نوکر مستعدی سے کرسی کے پیچھے کھڑے تھے۔

سردار مراد خاں نے اس شام دربار لگایا تھا۔ وہ بارہ کلیوں والا ریشمی پیرہن پہنے ہوئے تھا۔ اس میں سامنے کے رخ پر دو ہرے تھے لگے تھے جنہیں تیاں کہا جاتا ہے۔ پیراہین کے تین تھے چاندی کے تھے۔ گریبان اور گلے پر کلا بولا لگا تھا۔ کلمہ بھی کلا جو کا تھا۔ سر پر بڑی سی ریشمی پگڑی تھی۔ کمر پر سنرا پکا تھا۔ یہ وہ خلعت تھی جو اس کے باپ سردار نجیب خاں شاہانی کو انگریزوں کی خدمات کے صلے میں لاٹ گورنر کی جانب سے عطا کی گئی تھی۔ توانی اور دھاندلہ سرداروں کو بھی ان کی وفاداری اور خدمات کے صلے میں ایسی ہی خلعتیں دی گئی تھیں۔ یہ خلعتیں جب علاقے کے خیر خواہ اور جاں نثار بلوچ سرداروں کو پیش کی گئی تھیں تو انگریز ڈپٹی کمشنر نے باقاعدہ دربار لگایا تھا۔ وفادار سرداروں کی اعلیٰ خدمات کو سراہا تھا۔ ان کی کارگزاری کی تعریف اور توصیف کی تھی۔ ہر خلعت کے ساتھ ایک قیمتی پیش قبض بھی دیا گیا تھا۔ اس کا دستہ سونے اور چاندی سے مرصع تھا۔

انگریز افسروں کی تقلید میں بلوچ سردار بھی دربار لگاتے تھے، خاص طور پر ہر فصل کی کٹائی کے بعد جب وہ اپنے مزارعوں سے طرح طرح کے ٹیکس اور نذرانے وصول کرتے۔ انھوں نے اپنی شان دار حویلیوں میں دربار لگانے کے لیے باقاعدہ ہال تعمیر کرائے تھے۔ یہ دربار ہال کہلاتے تھے۔ مراد خاں کا باپ سردار نجیب خاں بھی اسی ہال میں دربار لگاتا تھا۔ اس موقع پر وہ لاٹ گورنر کی عطا کی ہوئی خلعت پہنتا تھا۔ پٹکے کے ساتھ پیش قبض لگاتا تھا۔ اس کرسی پر بیٹھتا تھا جس پر اس وقت مراد خاں شاہانی نہایت آن بان اور کرد فر سے بیٹھا تھا۔ وہ بھی سنرے پٹکے کے ساتھ مرصع دستے کا پیش قبض لگائے ہوئے تھا۔ اس کی مونچھیں موم لگا کر حویلی کے ٹائی نے بڑی مہارت سے چڑھائی تھیں، نوکیلی اور سخت بنائی تھیں۔

سردار مراد خاں شاہانی کے کندھوں پر کشمیری شال پڑی تھی۔ وہ بہت وجیہ اور باوقار نظر آ رہا تھا۔ چہرے سے رعب اور دبدبہ ٹپک رہا تھا۔

کرامت کے حوالے کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”لے، یہ حمیدہ کو دے دینا۔“ اس نے تکیسی نظر سے کرامت کو دیکھا۔ ”کمرے! دیکھ آگے نہ تو میرے پاس کبھی آتا اور نہ حمیدہ کو لانا۔“ اس کا بوجھ تلخ ہو گیا۔ ”ورنہ سردار مجھے بھی کتل کر دے گا اور تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔“ رحیم داد نے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔ ”میں نوں اچھی طرح پتہ ہے سردار کتنا ظالم اور خوں خوار ہے۔“

”سیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ایک گالہ تو تیکوں بتانا بھول ہی گیا۔“ کرامت نے ہاتھ پر دبا ہوا کنٹھار رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ ”یہ مالھان حمیدہ کی نہیں، اس کی بھر جاتی کی ہے۔ وہ سردار کی ذال ہے۔ تب ہی تو حمیدہ اس مالھان کے لیے اتنی پریشان اور گھبرائی ہوئی ہے۔ اسے لیتے تو تیرے پاس ضرور آجاتی۔ لگتا ہے اسے موکھ نہیں ملا۔ ویسے اس کی بھر جاتی کو مالھان کے بارے میں ابھی تک کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور کرامت کو دیتے ہوئے بولا۔ ”یہ رو لے اور اب تو بڑا۔ سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے نکل جانا۔ تیرا اس پنڈ میں زیادہ ٹھہرا خطرے سے خالی نہیں۔“

کرامت نے نوٹ لے کر کنٹھے کے ساتھ ہی اپنے بچھلے کے ڈب میں احتیاط سے رکھے اور رحیم داد سے رخصت ہوتے ہوئے گویا ہوا۔ ”سیں، تو راضی سکھی ہو۔“ وہ آگے بڑھا اور دروازہ کھول کر کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر بتنا بیٹھا رہا۔ ذرا ہی دیر بعد اس نے سنا، کتے زور زور سے بھونک رہے ہیں۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ جلدی سے دروازے پر پہنچا۔ ایک پٹ کھول کر باہر دیکھا۔ کمرے کی دھندلاں قدر گاڑھی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ حویلی کے احاطے کے باہر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

رحیم داد نے دروازہ بند کیا اور نڈھال ہو کر بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ خود کو تھکا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کتے اب حویلی سے کیسے دور بھونک رہے تھے۔ ان کی آوازیں رفتہ رفتہ رات کی خاموشی میں ڈوب کر ختم ہو گئیں مگر رحیم داد دیر تک جاگتا رہا۔ مراد خاں کی بہن حمیدہ کے بارے میں سوچتا رہا۔



مراد خاں شاہانی سہ پہر کو شکار سے واپس آ گیا۔ وہ کئی خرگوش اور بہت سی مرغیاں مار کر لے

دربار ہال کے باہر گاؤں نے مزارعے ٹھنڈے فرش پر جگہ جگہ ٹولیوں میں بٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ سرگوشیوں میں آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔ ان میں اکثریت بوڑھوں کی تھی۔ وہ خریف کی فصل کی کٹائی کے بعد اپنے بیٹوں، بیٹیوں، بھائیوں اور بہنوں کی شادی کرنا چاہتے تھے۔ مگر شادی پہلے سردار کی اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شادی بیاہ نہیں ہو سکتی تھی۔ شادی کی اجازت کے لیے انھیں سردار کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا جسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ یہ پنا ٹیکس تھا۔ اس ٹیکس کی شرح فی مربع ایکڑ زیر کاشت رقبے پر تیس روپے مقرر تھی۔ دوسرے ٹیکسوں کے برعکس پنا ٹیکس کی وصولی غلے کے بجائے نقدی کی صورت میں کی جاتی ہے۔ البتہ کاردار فصل کی کیفیت کے مطابق ٹیکس یا ڈالی کی مقررہ رقم میں کمی بیشی کی سفارش کر سکتا ہے۔ ایسی سفارش سردار عام طور پر منظور کر لیتا ہے۔ علاقے کا ہر جاگیردار اور بڑا زمین دار پنا ٹیکس وصول کرنا اپنا حق سمجھتا ہے۔

کریم بخش رادھانی ایک کرسی پر سردار مراد خاں شاہانی کے بائیں طرف بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے چھوٹی سی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ پہلے ایک بوڑھا ہال میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ بیوی بھی تھی۔ دونوں کے درمیان ان کی نوجوان بیٹی تھی۔ وہ دوپٹے سے اپنا چہرہ تاک تک چھپائے ہوئے تھی۔ تیوں سے ہوئے آگے بڑھے۔ انھوں نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار کو سلام کیا۔ بیٹی چند قدم آگے بڑھنے کے بعد سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ بوڑھا باپ بھی اس کے ساتھ ہی رک گیا۔ البتہ ماں آگے بڑھتی گئی۔ اس نے سردار مراد خاں شاہانی کی درازی عمر اور ترقی درجات کے لیے گڑگڑا کر رداستی دعائیہ جملے کہے، جھک کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور الٹے قدموں واپس بیٹی کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے واپس آنے کے بعد لڑکی کا باپ آگے بڑھا۔ اس نے بھی سردار کے قدم چھوئے۔ بیوی کی طرح اونچی آواز سے دعائیں دیں۔

”سین سدا جیوے۔ سکھی صحت ہووے۔ رب راضی ہووے!“

بوڑھے نے جیب سے نوٹ نکالے اور دونوں ہاتھوں پر رکھ کر سردار مراد خاں شاہانی کو ڈالی پیش کی۔ سردار نے نوٹوں پر آہستہ سے ہاتھ رکھ کر ہٹا لیا۔ بوڑھے نے ٹیکس کی رقم کریم بخش رادھانی کو دے دی۔ اس نے رقم لے کر رجسٹر میں اندراج کر لیا۔ بوڑھا ہاتھ باندھ کر بیوی اور بیٹی کے ساتھ سردار کے درپردہ نظرس جھکائے کھڑا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر کہا۔ ”راضی باضی ہو۔ دھی کا پرہیز کر۔ بختاور ہووے۔“ یہ سردار کی جانب سے شادی کی اجازت تھی۔

بوڑھے نے خوش ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور بلند آواز سے بولا۔ ”رب راکھا، اللہ بلی۔“ وہ بیچے ہٹا اور بیوی اور بیٹی کے ساتھ ہال سے چلا گیا۔

دوسرا آیا۔ وہ ادھیڑ تھا۔ بیٹے کے بیاہ کا طلب گار تھا۔ وہ بھی بیوی اور نوجوان بیٹے کو حسب دستور ساتھ لایا تھا۔ اس نے پنا ٹیکس ادا کیا۔ اجازت حاصل کی اور سردار کی جان و مال کو دعائیں دینا رخصت ہو گیا۔

اسی طرح دوسرے بھی بیٹی یا بیٹے کو اور اگر بیوی حیات ہوتی تو اسے بھی ساتھ لاتے۔ سردار شاہانی کی اجازت حاصل کرتے اور خوش و خرم دعائیں دیتے ہوئے رخصت ہوتے۔ چار ایسی عورتیں بھی بیٹی یا بیٹے کے ہم راہ سردار کے دربار حاضر ہوئیں جن کے شوہر انتقال کر گئے تھے یا بیمار اور معذور تھے یا طلاق دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ایسے نوجوان بھی آئے جن کے ماں باپ مر چکے تھے اور وہی اپنے کنبے کے کفیل تھے۔ وہ بہن یا بھائی کے بیاہ کی اجازت لینے سردار کے دربار میں حاضر ہوئے۔ پنا ٹیکس نذرانے کی صورت میں پیش کیا اور مسکراتے چہروں کے ساتھ دعائیں دیتے واپس گئے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا سردار مراد خاں کا مظنہ اور جاگیردارانہ جاہ و جلال دیکھتا رہا۔ اس نے اس نوجوان کو بھی دربار میں حاضر ہوتے دیکھا جس کا لباس بہت میلہ کچلا اور بوسیدہ تھا۔ دھلا پتلا مرل بدن، ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرے پر ویرانی برستی، کوئی۔ اس کے ساتھ نوجوان لڑکی تھی۔ وہ گلے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

دونوں ڈرے سے لرزتے قدموں سے آگے بڑھے۔ لڑکی چند قدم چل کر دستور کے مطابق رک گئی۔ نوجوان آگے بڑھا، سردار کے قریب پہنچا۔ اس کے قدموں کو ہاتھ لگا کر پیروں پودن کیا۔ سر سے گہری اتاری اور سردار کے قدموں پر ڈال دی۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور ہاتھ باندھ کر سردار کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئیں تھیں۔ اس نے دوسروں کی طرح سردار کو ڈالی کی رقم پیش نہیں کی تھی۔

سردار مراد خاں نے اسے تنکھی نظروں سے دیکھا، رعب دار لہجے میں ڈپٹ کر بولا۔ ”کیا چاہتا ہے؟“

”عاجزی سے گویا ہوا۔“ سین سردار! میں تیرا راجی رعیت ہوں۔ شامت داماریا ہوں۔ میرے میت کھارے دریا کنارے ہیں۔ پچھلی برکھا میں دریا چڑھا۔ ایک رات اچانک زبردت ڈھا آیا۔ نئی ساری رڑھ فصل، چھل میں بہہ گئی۔ پانی کا ریلہ گھریا، جمع جتھا، سب کچھ بہا لے گیا۔ میرے

اس کے کولہہ ایک جوڑی ہل بھی ہے۔ وہ میرا شریکا ہے اور یہ اس کی منگ ہے۔“ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔ ”میں نے اس کا منگڑاں کر دیا پر ڈالی نہ دے سکا۔ سیں! میکوں معافی دے دے۔“ سردار مراد خاں نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

فرید اقدارے تامل کے بعد عاجزی سے گویا ہوا۔ ”سیں اس کا پرتا ہو جائے تو میں لائل پور چلا ہاؤں گا۔ وہاں کسی کارخانے میں لگ جاؤں گا۔ میرا ایک سکالیر وہاں مزدوری کرتا ہے۔ اس نے مجھے لائل پور آنے کو کہا ہے۔“

”فریدے! تو اتنی غریبی میں اس کا پرتا کیسے کرے گا؟ اس کے لیے کچھ نہ کچھ رقم تو چاہیے ہوگی۔“ مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

”خرچ ہی کیا کرتا ہے سیں۔ میں نے تو جی فرض ادا کرنا ہے۔“ فریدانے وضاحت کی۔ ”دو سو روپے دستی کے سناریے نے ادھار دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اتنی رقم سے کام چل جائے گا۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر ایک بار پھر گڑگڑانے لگا۔ ”سیں سردار! معافی دے دے۔ میں بہت غریب مسکین ہوں۔“ اس نے مڑ کر لڑکی کی جانب دیکھا۔ ”اس کا پرتا ہو گیا تو رینج کی بوائی بھی ہو جائے گی۔ میں بھی محنت مزدوری سے کچھ کمائی کر لوں گا۔ یہ ابھی کنواری ہے، بکر ہے۔ میں اسے گھر پر اکیلا چھوڑ کر کیسے لائل پور جاسکتا ہوں۔ اب تو اماں بھی نہیں رہی۔ میری کھیتی باڑی سب تباہ ہو جائے گی۔“ اس نے تڑپ کر دھائی دی۔ ”میکوں بچالے سیں! تو سدا جیوے، رب راضی ہووے۔“ وہ فریاد کرتا رہا۔

سردار مراد خاں شاہانی خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ اس کا کردار کریم بخش رادھانی بھی خاموش تھا۔ مراد خاں نے نگاہیں اٹھا کر لڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے اپنا چہرہ چھپائے بت بنی کھڑی تھی۔ مراد خاں ٹٹکنی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر پشت پر کھڑے ہوئے ملازم کو مخاطب کیا۔

”جوڑے!“ اس نے لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے منہ پر سے مانیجمل بکل تو ہٹا۔“ اللہ بخش جوڑا حکم ملتے ہی لڑکی کے قریب پہنچا۔ لڑکی بے چین ہو کر کسمائی۔ جوڑا نے اس کی بے چینی اور گھبراہٹ پر مطلق توجہ نہیں دی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور آنچل ہٹا دیا مگر لڑکی کا سر اور سینہ ہنوز دوپٹے سے ڈھکا ہوا تھا۔ لڑکی نے اسے اور ڈھانپ لیا۔

سردار کو لڑکی کی یہ ادا ناگوار گزری۔ اس کی تیوری پڑ پڑ گئے۔ اس نے جوڑا کو ڈانٹا۔ ”جوڑے! بوجھن بالکل ہٹا دے۔“

پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ رات کے اندھارے میں ڈھاکا پانی تیزی سے داخل ہوا، سب جان بچانے کے لیے جدھر منہ اٹھا ادھر بھاگے۔ جن کو بھاگنے کا رستہ نہ ملا وہ درختوں پر چڑھ گئے۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ میری بھین ہے۔ یہ میرے ساتھ کسی نہ طرح نکل آئی۔ اماں اندھی تھی، وہ نہیں آسکی۔“ اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بعد میں اس کی لاش دو میل آگے دریا کنارے ملی۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”سیں! میں مصیبت داماریا بالکل تباہ ہو گیا۔“

سردار مراد خاں نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے یہ؟“ ”سیں! ابھی بتاتا ہوں۔“ رادھانی نے سردار سے مہلت مانگی اور نوجوان کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تیرا تاں کیہ ہے؟“

وہ لکنت سے بولا۔ ”سیں! میرا تاں فرید خاں شاہانی ہے۔“ ”یوں کہہ تو فریدا ہے۔“ کریم بخش رادھانی نے درشت لہجے میں اس کے نام کی تصحیح کی۔ فریدا نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کر لی، عاجزی سے بولا۔ ”ہا سیں! میں فریدا ہی ہوں۔ میں تو تیرے پاس پہلے بھی آتا رہا ہوں۔“

رادھانی نے فریدا کی بات نظر انداز کرتے ہوئے سردار مراد خاں شاہانی کو مخاطب کیا۔ ”سیں سردار! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس کی فصل اور گھریار سیلاب میں برباد ہو گئے۔“ مراد خاں نے سرسری نظر سے فریدا کو دیکھا، بے زاری سے پوچھا۔ ”جب تجھے ڈالی نہیں دینی تو یہاں آیا کیوں ہے؟“

”سیں سردار! میرے کولہہ ڈالی دینے کے لیے کچھ نہیں۔ میں سوالی ہوں، اللہ راسی ہوں تو فیاضی اے۔“ فریدا ہاتھ جوڑ کر فریادی ہوا۔ ”سیں میں ابھی ڈالی نہیں دے سکتا۔ رینج کی واڈمی پر ڈالی کی رقم ادا کر دوں گا۔“

”اس کے پرنے کی تیکوں اتنی جلدی کیوں ہے؟“ سردار نے لڑکی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ”پہلے رینج کی بوائی کر۔ فصل کی واڈمی کے بعد ڈالی دنا، تب ہی اس کا پرتا کرنا۔“

”سیں! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تیرا کما سر آنکھوں تے، سرا تھے تے۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”پہلے رینج کی بوائی کیسے کروں گا۔ میرے تو ڈنگر موٹی بھی چھل کا تیز پانی اپنے ساتھ لے گیا۔“ اس نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ ”سیں اس کا پرتا کر دوں گا تو اس کا گھوٹ خاوند بوائی کر سکتا ہے۔“

رحیم داد نے دیکھا، فرید کی بہن میدہ لمحے بھر تک ہونٹ پیچھے خاموش کھڑی رہی۔ پھر اس نے ہٹ کر اپنا دوپٹہ اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جھل ملانے لگے۔ پلکوں پر آنسوؤں کے ندے ابھرے اور ٹپ ٹپ رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ اس نے میلے کچیلے دوپٹے کے آچل سے ہلکے مار کر ایک بار پھر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ جوڑا نے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا اور وہ اس کے پیچھے پیچھے اس دروازے کی سمت بڑھی جو مراد خاں شاہانی کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔

دروازے کے قریب پہنچ کر وہ ٹھکی، مڑ کر فرید کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں مگر فرید نے نظریں موڑ کر سر نیچا کر لیا۔

میدہ آگے بڑھی اور سردار مراد خاں کی خواب گاہ میں داخل ہو گئی۔ مراد خاں نے پلٹ کر کریم بخش رادھانی کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ ”فرید انے سنگتاں کرن سے پہلے ڈالی نہ دینے کی معافی چاہی تھی، اسے معافی دے دی گئی۔ پر میدہ اب ادھر ہی رہے گی۔ یہ فیصلہ بعد میں ہو گا کہ میدہ کو کب فرید کے حوالے کیا جائے۔“

”جیسی سیں کی مرضی۔“ رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا اور جھک کر رجسٹر میں سردار کے حکم کا اندراج کر لیا۔

سردار مراد خاں نے فرید کو مخاطب کیا۔ ”فریدے!“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اب تو راضی باضی ہے۔ اپنے حالات ٹھیک کر لے۔ فیہ جب چاہے میدہ کا پرنا کرنا، مکلاو کرنا، اسے اپنے گھر سے بد کر کے سرال ساہورے بھیجتا۔ ڈالی کی رقم فصل کی واڑھی پر ادا کر دیتا۔“ سردار نے ہلکا سا تقبہ لگایا۔

”فریدے! جامعش کر، ماہاں اڑا۔ میری طرف سے تجھے میدہ کے پرانے کی اجازت ہے۔“

فرید خاں شاہانی عرف فرید اچند لمحے بت بنا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ پھر اس کے جسم میں حرکت ہوئی۔ وہ آگے بڑھا۔ سردار کے قدموں پر پڑی ہوئی اپنی گلیڑی اٹھائی۔ چارپانچ پیچ دے کر اسے سر باندھا۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔ ”سیں سردار! تو سدا جیوے، سکھی صحت ہووے، رب راضی ہووے۔“

اس نے نظریں گھما کر اس دروازے کی جانب دیکھا جس میں اس کی بہن اللہ بخش جوڑا کے ساتھ داخل ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور جوڑا واپس آکر سردار مراد خاں شاہانی کی بٹ پر مستعدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔

فرید اذرا دیر ٹھہر کر آلے قدموں پیچھے ہٹا، مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا دربار ہال کے صدر

اللہ بخش جوڑا نے حکم کی تعمیل میں مستعدی دکھائی۔ پلو پکڑ کر اس قدر زور سے جھٹک دیا کہ دوپڑ لڑکی کے سر سے اتر گیا۔ اس نے دوپٹہ ایک طرف پھینک دیا۔ لڑکی شرم سے سمٹ کر دوسری ہو گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ چھپا لیا۔ گردن اور زیادہ جھکائی۔ اس کی عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی۔ رنگ کھلتا ہوا گندی تھا۔ چہرہ بیضی تھا۔ ناک ستواں، ہونٹ گلابی اور بھرے بھرے تھے۔ وہاں کسی قدر جوڑا، بدن چھری اور سڈول تھا۔ میلے کچیلے بوسیدہ لباس کے باوجود دربار ہال کی تیز روشنی میں اس کا نوخیز سراپا دمک رہا تھا۔ وہ خاصی کشش انگیز نظر آ رہی تھی۔ اس کا پورا بھائی فرید اسما ہوا چپ چاپ کھڑا تھا۔

مراد خاں کو لڑکی کا شرما بلاناہیت شاق گزرا۔ اس نے غصے سے ڈپٹ کر کہا۔ ”اکھ اوپر اٹھا۔“ مگر لڑکی نے نظریں اونچی نہ کیں۔ گردن جھکائے دم بخود کھڑی رہی۔ سردار مراد خاں شاہانی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ زور سے دھاڑا۔ ”سراو نچا کر۔ ٹھیک سے کھڑی ہو۔“ اس دند لڑکی نے ہچکچاتے ہوئے گردن اٹھائی۔ مراد خاں کی جانب بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

مراد خاں نے دیکھا، لڑکی کی آنکھیں بھی خوبصورت اور دل کش ہیں۔ وہ زیر لب مسکرایا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت اور برہمی زائل ہو گئی۔ ”رنگ روپ سے تو یہ انگوری لگتی ہے۔“ اس نے فرید کی جانب رخ کیا۔ ”فریدے! اس کا ناں کیہ ہے؟“

”سیں! اس کا ناں حمیدہ ہے۔“ فرید نے سردار کو بتایا۔

رحیم داد نے چونک کر لڑکی کو دیکھا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی کی نہیں، فرید خاں شاہانی کی بہن تھی جو فرید خاں شاہانی نہیں صرف فرید راہ گیا تھا۔ مراد خاں کا چہرہ بھی متغیر ہو گیا۔ مگر فرید نے بھی شاید اپنی غلطی محسوس کی۔ وہ ہکھلانے لگا۔

”سس سیں! یہ میدہ ہے، میدہ۔ اسے سب میدہ ہی کہتے ہیں۔“

سردار مراد خاں کے چہرے پر چھایا ہوا غبار چھٹ گیا۔ وہ زیر لب مسکراتا رہا۔ اس نے اللہ بخش جوڑا کو مخاطب کیا۔ ”جوڑے! میدہ کو اس کا بوچھن دے دے۔“

جوڑا نے فرش پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا اور لڑکی کے سر پر ڈال دیا لیکن دوپٹہ پھسل کر نیچے گر گیا۔ میدہ خاموش کھڑی رہی۔ اس نے دوپٹے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی حیا پر رفتہ رفتہ جھنجھلاہٹ حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ ہال میں گہری خاموشی تھی۔ چند لمحے بعد سردار مراد خاں کی گرج دار آواز خاموشی میں ابھری۔

”جوڑے! میدہ کو اندر پہنچا دے۔“

دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پشت پر پڑا ہوا پگڑی کا شملہ ایک ہاتھ بڑھا کر پکڑا، چہرے پر لے گیا اور اس سے رک رک کر آنکھوں کو ملنے لگا۔ رحیم داد نے محسوس کیا کہ وہ دروازے پر پہنچا۔

سردار مراد خاں شاہانی اونچی کرسی پر لباس فاخرہ زیب تن کئے نہایت آن بان سے بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ جاہ و جلال سے دمک رہا تھا۔ فریدا کا چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بڑھا، دروازہ عبور کیا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گیا۔



ہوں والی میں رحیم داد کے قیام کا نواں روز تھا کہ سویرے سویرے نادر خاں پہنچا۔ رحیم داد رے میں ناشتا کر رہا تھا۔ نادر خاں کو اچانک اپنے رو برو پا کردہ گھبرا گیا۔ اس نے حیران و پریشان لڑپچھا۔ ”نادر! تو یہاں کیسے پہنچ گیا۔ کوئی پریشانی کی گل بات تو نہیں؟“ اس کے چہرے سے ہلکی سی ہراس تھی۔

”نہیں جی! گھبرانے کی کوئی گل نہیں۔“ نادر خاں نے مسکرا کر رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ کلیم کا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ میں نے محکمہ وکالت کے دفتر جا کر اپنے سامنے وہ درخواست ہی پھڑوا دی جو تیرے خلاف لگائی گئی تھی اور جس نئے کلیم کے بارے میں انکوائری کرنے کے احکامات جاری ہوئے تھے۔ میں نے درخواست، ساتھ متعلقہ کاغذات بھی ضائع کروا دیئے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔“

”اٹنی کارگزاری پر مسرور نظر آ رہا تھا۔“

”یہ تو نے بہت زوردار کام کیا۔“ رحیم داد نے بھی مسرت کا اظہار کیا۔ ”اس پر خرچ کتنا آیا؟“

”صرف چار سو روپے۔“ نادر خاں نے فخر سے گردن اونچی کی۔ ”وکیل اسی کام کے دو ہزار مانگتا تھا۔ یہ تو اکیلے تو ایسے ہی چکر چلا کر جیب کانتے ہیں۔ میرا تو ان سے بہت معاملہ رہا ہے۔“

نادر خاں ابھی تک رحیم داد کے سامنے کھڑا تھا اور نہایت مستعدی سے اپنی کارگزاری سن رہا تھا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر بہت متاثر ہوا۔ ہنس کر بولا۔ ”کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ آرام سے بیٹھ۔“

آرڈر ہوئے تھے۔“

رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر شاہ جی نے میرے خلاف یہ کارروائی کیوں کی؟ وہ تو مجھے اپنا ریلی کتا ہے۔ تیس نوں بھی پتہ ہے، وہ مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی کہا چوہدری! اس نے ہمیشہ میرے سامنے تیری تعریف کی۔ محبت ہی کا اظہار کیا۔“

ایسا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے اس نے یہ کارروائی میرے خلاف کیوں کی؟ تو نے اس بارے میں کچھ سوچا؟“

”مجھے تو ایسا لگتا ہے، شاہ جی نے تیرے خلاف یہ کارروائی اللہ وسایا کی دشمنی میں کی ہوگی۔“

نادر نے اظہار خیال کیا۔ ”اللہ وسایا کا تو نام سننے ہی آج بھی شاہ جی کے منہ پر جھنجلاہٹ چھا جاتی ہے۔ حالانکہ اب وہ زندہ بھی نہیں ہے۔ اسے مرے ہوئے مدت ہو گئی پر شاہ جی کی نفرت کم نہیں ہوئی۔ وہ اس سے سخت نفرت کرتا ہے۔“ نادر نے سوالیہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”مجھے تو جی بھئی وجہ سمجھ آتی ہے۔ سوچنے کی بات تو یہ ہے تجھ سے تو اسے کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ جب بھی تیرے بارے میں اس سے بات چھڑی، اس نے ہریار تجھے اچھے لفظوں سے یاد کیا۔“

”تیرا خیال ٹھیک لگتا ہے۔“ رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔ ”میری وجہ ہو سکتی ہے۔ اللہ وسایا سے شاہ جی بہت زیادہ خار کھاتا ہے۔“ رحیم داد اب کسی قدر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا غبار صاف ہوتا جا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ احسان شاہ کے بارے میں اس کے ذہن میں جو شبہات اور خدشات پیدا ہوئے تھے اب زائل ہو چکے ہیں۔ اس نے سوچا احسان شاہ نے اللہ وسایا سے عداوت کے باعث ہی اس کا کلیم اور الاٹمنٹ منسوخ کرانے کی کوشش کی ہوگی۔ اسے یاد آیا کہ درخواست اس زمانے میں داخل کی گئی تھی جب اللہ وسایا زندہ تھا اور تمام زمیں داری کی دیکھ بھال وہی کرتا تھا۔

رحیم داد اسی سوچ میں غرق تھا۔ نادر خاں نے اسے اس قدر محویت سے سوچتے دیکھا تو خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے دریافت کیا۔ ”چوہدری! کس سوچ میں پڑ گیا؟“

رحیم داد نے چونک کر نادر کو دیکھا اور بات کا رخ موڑتے ہوئے دہلی زبان سے پوچھا۔ ”جیلہ کا کیا حال چال ہے؟ تو نے پھٹی پر کیڑے مار دوئی چھڑ کوادی تھی اور جیلہ کو اس کے بارے میں بتا بھی دیا تھا؟“

”وہ تو جی اب پرانی گل ہو گئی۔“ نادر خاں نے مسکرا کر بتایا۔ ”دوائی تو اسی روز سپرے کرا دی

نادر خاں کرسی پر بیٹھے ہوئے گویا ہوا۔ ”محکمہ آباد کاری میں جانے سے کتنی عجیب باتوں کا پتہ چلا۔“ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”ایک تو بالکل تعجب انگیز بات کا پتہ چلا۔“

”کون سی ایسی عجیب گل تھی جس پر تجھے اتنا تعجب ہوا؟“

”تیس نوں پتہ ہے۔ تیرے خلاف کس نے درخواست لگوائی تھی؟“ نادر خاں نے جواب دینے کے بجائے سوال کیا۔

”ذکیل بتاتا تھا، گورداس پور ہی کا کوئی مہاجر ہے جس نے میرا کلیم ختم کرا کے اپنے نام کو ہر کشن کی اراضی اور حویلی الاٹ کرانے کے لالچ میں درخواست لگائی تھی۔“ رحیم داد نے نادر خاں کو مطلع کیا۔ ”یاد پڑتا ہے، ذکیل نے اس کا نام محمد بشیر بتایا تھا۔“

”اس کا تو جی صرف نام ہی نام تھا۔“ نادر خاں نے ہنس کر کہا۔ ”چوہدری! تجھے یہ سن کر بہت اچنبھا ہو گا کہ تیرے خلاف احسان شاہ نے درخواست لگوائی تھی۔“

”تیرا مطلب ہے اپنے شاہ جی نے؟“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔ ”نادر! کیسے ہو سکتا ہے؟ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔“ اس نے نادر خاں کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”تیس نوں کا یکین ہے؟“

”پہلے تو جی مجھے بھی یکین نہیں آیا۔“ نادر نے اسے باور کرایا۔ ”پر میں نے درخواست خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ اس پر محمد شفیع گیلانی کا پتہ لکھا تھا۔ دستخط البتہ محمد بشیر کے تھے۔ تیس نوں پتہ ہے محمد شفیع گیلانی کون ہے؟“

”میں نے تو اس کا نام پہلی بار سنا ہے۔“ رحیم داد نے استفسار کیا۔ ”کون ہے یہ محمد شفیع گیلانی؟“

”وہ شاہ جی کے پتر حسن شاہ کا سگا سالا ہے۔ لمبور میں رہتا ہے۔ اس کی بیس اور لاریاں چلتی ہیں۔ وڈاٹرا نپور رڑ ہے۔ شاہ جی کا پتر بھی اس کے کاروبار میں ساتھ دار ہے۔“

”سمجھ نہیں آتی، شاہ جی نے ایسا کیوں کیا؟“ رحیم داد بدستور متذبذب میں جھٹلا تھا۔ اس کے رویے سے صاف جھلکتا تھا کہ اسے نادر کے بیان پر ابھی تک شبہ ہے۔ رحیم داد نے اس کا ہر اظہار بھی کیا۔ ”نادر! تو جی بول رہا ہے؟“

”بالکل سچ بول رہا ہوں جی! مجھے تو محکمہ آباد کاری والوں نے یہاں تک بتایا کہ اس معاملے میں شاہ جی محکمہ آباد کاری کے افسروں سے کئی بار ملا بھی۔ اسی کے زور دینے پر انکو اڑی کرانے

گئی تھی اور شام ہی کو میں نے اس کے بارے میں زمیں دارنی کو بتا بھی دیا تھا۔

”اب تو پھٹی پر سوئی نہیں رہی؟“

”نہیں جی، بالکل نہیں رہی۔ سپرے کے بعد ہی ختم ہو گئی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”زمیں دارنی نے پھٹی کے بوٹے خود جا کر دیکھے تھے۔“

”تو اس سے ملتا جلتا رہتا ہے؟“

”روز تو جی وہ ملتی نہیں۔ اسے تو سکول ہی سے فرصت نہیں۔ پر مجھے جب بھی موقع ملا، اسے خریف کی واڈھی اور ربیع کی بوائی کے بارے میں ایک ایک بات بتاتا رہا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا وہ زمیں داری میں دلچسپی لے رہی ہے۔“

”نہیں چوہدری! اس پر تو آج کل تاجاں کے ویاہ کی فکر زیادہ سوار نظر آتی ہے۔“

رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ”میرے بارے میں بھی اس نے کوئی گل بات کی۔“

”مجھ سے تو نہیں کی پر میری گھروالی سے اس نے تیرے بارے میں بہت سی باتیں کیں۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

”کیا کتنی تھی میرے بارے میں؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ ”تیری گھروالی نے تجھے بتایا تو ہو گا۔“

نادر خاں کی تیز نظروں نے رحیم داد کی بے قراری فوراً بھانپ لی۔ اس نے شکوے کے انداز میں کہا۔ ”اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتائیں پر چوہدری! تو نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو تیرا ہی بندہ ہوں۔ مجھے زمیں دارنی سے کیا لینا؟“

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ ”پہلے یہ بتا، جیلہ نے میرے بارے میں تیری گھروالی کو کیا کیا بتایا؟“ ”وہ تجھ سے بہت زراعت تھی۔ چوہدری! تو نے اپنی گھروالی اور بچوں کے بارے میں جو جھوٹ بولا تھا اس کا اس نے بہت برا منایا۔“

رحیم داد بلبل کر رہ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ نادر خاں جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ اگر جیلہ اس کی بیوی کو یہ بات نہ بتاتی تو اسے ہرگز علم نہ ہوتا۔ اس نے نادر کی جانب نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، خاموش بیٹھا رہا۔ نادر بتاتا رہا۔ ”اے یہ بھی پتہ چل گیا کہ تو چھپ چھپ کر شاہ جی کے پاس جاتا ہے۔ اس کی حویلی میں کئی کئی روز ٹھیرتا ہے۔ وہ شاہ جی سے سخت نفرت کرتی ہے۔ کہتی ہے اللہ وسایا کو احسان شاہ ہی نے کتل کرایا ہے۔“

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”اس نے تیری گھروالی سے ایسی بات بھی کہی؟“ نادر خاں

ہے یہ بھی دریافت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے بارے میں تو جیلہ نے کوئی ایسی بات نہیں کہی کہ وہ بھی احسان شاہ کے ساتھ اللہ وسایا کے قتل میں شریک تھا۔ مگر یہ بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا، لہجے میں ٹیکھا پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”اسے شاہ جی کے بارے میں ایسی بات نہیں سوچنی چاہیے۔ شاہ جی ایسا نہیں کر سکتا۔ پتہ نہیں اسے کیسے ایسا شبہ ہوا۔“ احسان شاہ کی حمایت دراصل وہ خود اپنے دفاع میں کر رہا تھا۔

”مجھے تو جی جب اپنی گھروالی سے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں بہت پریشان ہوا۔“ نادر خاں نے اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ ”بچی گل پوچھ تو میں نے شاہ جی کے بارے میں زمیں دارنی سے کوئی بات نہیں کی۔ ورنہ وہ مجھ سے بھی زراعت ہو جاتی۔ زراعت نہ ہوتی تب بھی اس کے دل میں نہ جانے کیسے کیسے شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔“ اس نے رحیم داد کو مرعوب کرنے کا سیدھا مادہ حربہ استعمال کیا۔ ”میں نے تو جی صرف تیرے بارے میں اس سے گل بات کی۔ اس کے دل میں تیری طرف سے جو زراعت اور غصہ تھا اسے دور کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔“

”تو نے اس کی زراعت ختم کرادی؟“ رحیم داد نے بے اختیار پوچھا۔

”چوہدری! ایسے معاملے میں نے بہت نمٹائے ہیں۔“ نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”زمیں دارنی تو زنائی ہی ہے نا۔ میں نے تو بکیرہ داروں اور وڈے وڈے زمینداروں کے نہ جانے کیسے کیسے الجھے ہوئے جھگڑے نمنے طے کرائے ہیں۔“ بات کتے کتے وہ ٹھنکا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”چوہدری! میں تجھ سے ایک گل پوچھوں، صاف صاف بتائے؟“

”پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“

”تو زمیں دارنی سے ویاہ کرنا چاہتا ہے؟“ نادر نے رحیم داد کو اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے نیر پھر کے بجائے براہ راست سوال کیا۔

رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ ”میں نے ایسا سوچا تو تھا۔“ رحیم داد نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ نادر خاں کی توقع کے مطابق وہ خاصا مرعوب نظر آ رہا تھا۔

”نہ بھی بتاتا تب بھی مجھے یہ بات پہلے ہی معلوم ہو گئی تھی۔“ نادر خاں اب اس کی شخصیت پر پوری طرح چھا چکا تھا۔

”جیلہ نے تیری گھروالی کو یہ گل بتائی ہوگی؟“ رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔

”ہاں جی!“ نادر خاں گویا ہوا۔ ”ساتھ ہی زمیں دارنی نے یہ بھی بتایا کہ اس نے صاف انکار

کر دیا۔ ”نادر نے اپنا سکہ اچھی طرح جمانے کے لیے سوال کیا۔ ”یہی گل ہے نا؟“

رحیم داد نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نادر! تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ اس کے چہرے پر افسردگی پھیلنے لگی۔

نادر خاں نے اس کی افسردگی کا فوراً اندازہ کر لیا اور اس کی ہم دردی حاصل کرنے کی غرض سے گویا ہوا۔ ”چوہدری! پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو دیکھنا، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ جو چاہے گا وہی ہو گا۔“

رحیم داد نے مڑ کر کھوئی پر لٹکی ہوئی اپنی پگڑی دیکھی اور وہ گرہ تلاش کی جو اس نے بھکر میں تک کھے پیر کے مزار پر منت ماننے کے بعد پگڑی کے شٹلے میں لگائی تھی۔ گرہ ابھی تک موجود تھی۔ رحیم داد اپنی بے چینی چھپانے کی کوشش کے باوجود چھپا نہ سکا۔

”نادر! تو جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ کیسے ہو گا؟“

نادر خاں اس کی دل جوئی کرتے ہوئے ٹھگتے لہجے میں بولا۔ ”چوہدری! فکر نہ کر۔ جب تو نے اپنا سمجھ کر مجھے دل کی بات بتا ہی دی تو یہ بھی سن لے، زمیں دارنی لوہر شور نہیں جائے گی۔ حویلی ہی میں رہے گی اور تیری بن کر رہے گی۔“ اس نے مسکرا کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا اور اس کا رد عمل چہرے کے تاثرات سے معلوم کرنے کی کوشش کی۔

رحیم داد خود کو سنبھال نہ سکا۔ جذبات کی رو میں بہہ گیا، تڑپ کر بولا۔ ”لیکن نہیں آتا نادر؟“ ”آجائے گا، آجائے گا۔“ نادر نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”پہلے آرام سے میری گل سن لے۔“ ”سنا، ضرور سنا۔“ رحیم داد کی بے قراری بڑھتی گئی۔ ”میں یہی تو سننا چاہتا ہوں۔ یہ بتا، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ صاف صاف بتا۔“

”سب کچھ بتا دوں گا، آرام سے سن۔“ نادر خاں بے تکلفی سے مسکرایا۔ اسے رحیم داد کو اپنے قابو میں کرنے کا نہایت مناسب موقع ملا تھا۔ اس نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی غرض سے کہا۔ ”مجھے گھروالی کے ذریعے ان باتوں کا پتہ چلا تو میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی۔ اسے سمجھا بھجا کر تیار کیا کہ تیری طرف سے زمیں دارنی کے دل میں جو میل پیدا ہو گیا ہے اسے دور کرنے کی کوشش کرے۔“ نادر خاں نے اپنے کارگزاری کی روداد ٹھہر ٹھہر کر سننا شروع کی۔ ”میں نے اسے کہا کہ زمیں دارنی کو سمجھائے کہ چوہدری سیدھا سادہ نیک بندہ ہے۔ احسان شاہ کے برکات نے اور پھسلانے میں آگیا۔ میں نے گھروالی سے یہ بھی کہا کہ زمیں دارنی کے سامنے تیری تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ جی کو برا بھلا بھی کہتی رہے، اس کے بارے میں کڑوی گلاں کرے۔“

”یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔“ رحیم داد کو اس کی بات پسند نہیں آئی۔ ”شاہ جی کو پتہ چل گیا تو بہت راض ہو گا۔ میں اس سے بگاڑ کر نا نہیں چاہتا۔“

”چوہدری! تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے۔ شاہ جی کو پتہ ہی کیسے چلے گا۔ زمیں دارنی تو اسے ہانے سے رہی۔“ نادر نے رحیم داد کو بزرگوں کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ تو تجھے بھی پتہ ہے زمیں دارنی کو شاہ جی سے کتنی نفرت اور گھن ہے۔ جب کسی سے سخت نفرت اور گھن ہوتی ہے تو اس کی برائی سن کر خوشی ہوتی ہے، مزا آتا ہے۔ شاہ جی کو برا بھلا کہہ کر ہی میری گھروالی زمیں دارنی کی ہم دردی اور اعتماد حاصل کر سکتی ہے اور تیرے بارے میں اس کی بدگمانی دور کر سکتی ہے۔“ نادر خاں کھل کر مسکرایا۔ ”نتیجہ وہی نکلا جو میں نے سوچا تھا۔“

”کیا نتیجہ نکلا؟“ رحیم داد نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

”ہوایہ کہ پہلے جب میری گھروالی تیری تعریف کرتی تو زمیں دارنی کے ماتھے پر بل پڑ جاتے۔ منہ ہاڑ کر اسے کہتی۔ جنت! تو چوہدری کو نہیں جانتی۔ وہ بھلا بندہ نہیں ہے۔ یہ بات میری گھروالی نے مجھے کئی بار بتائی۔“

”پر تو کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”آرام سے پہلے پوری گل سن لے۔“ نادر خاں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ تیری تعریف سن کر پہلے تو زمیں دارنی خوش نہیں ہوئی تھی۔ پر جب گھروالی نے میری ہدایت پر شاہ جی کو برا بھلا کہنا شروع کیا تو وہ رفتہ رفتہ بدلنے لگی۔ تیرے بارے میں تعریف کے بول سن کر چپ ہو جاتی۔ اس کے ماتھے پر بل پڑتے نہ منہ بگاڑتی۔“ اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”پر اس کے دل کا میل پوری طرح صاف نہیں ہوا تھا۔“

”کیا ابھی تک صاف نہیں ہوا؟“ رحیم داد نے بے صبری سے پوچھا۔

”اب تو صاف ہو چکا ہے۔ دراصل اسے شبہ تھا، تو شاہ جی کی حویلی میں ٹھہرا ہے۔ اپنے شے کا اٹھار اس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔“

”کیا پوچھا تھا اس نے؟“

”ایک روز باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ سنا ہے چوہدری آج کل احسان شاہ کے پاس ہوتا ہے۔ تجھے پتہ ہے؟ میں اس کی بات سن کر الجھن میں پڑ گیا۔“

”تو نے کیا بتایا؟“ رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”میں کیا بتاتا جی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”وہی کہا جو یہاں آنے سے پہلے تو نے مجھے ہدایت

کی تھی۔ میں نے زمیں دارنی سے کہا چوہدری تو اپنے کلیم کے سلسلے میں ملتان گیا ہے۔ تو نے مجھ سے یہی تو کہا تھا؟“ نادر نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”جیلہ نے تیری بات مان لی تھی؟“

”نہیں۔“ نادر خاں نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”میری گل سن کر وہ چپ ہو گئی۔ بعد میں مجھے پتہ چلا اس نے میری بات پر اعتبار نہیں کیا بلکہ برکت دودھی کے ذریعے کھوج لگایا کہ توشاہ جی کے پڑپیراں والدہ میں تو نہیں ہے؟“

”پر میں تو پیراں والدہ میں تھا ہی نہیں۔ دوسرے ہی روز لہور چلا گیا تھا۔“

”ٹھیک ہی ہوا تو وہاں نہیں تھا۔ ورنہ بہت گڑبڑ ہوتی۔ وہ مجھے بھی جھوٹا فریبی سمجھتی۔“ نادر خاں زیر لب مسکرایا۔ ”میری گل بچی نکلی اور اسے معلوم ہو گیا توشاہ جی کی حویلی میں نہیں ہے۔ نیز تو میرے ساتھ ٹھیک طرح پیش آنے لگی اور میری گھروالی پر تو اتنی مہربان ہو گئی کہ شام کو گھنٹوں بیٹ کر اس کے ساتھ باتیں کرتی۔ گھروالی کی طبیعت گڑبڑ ہوتی وہ نہ جاتی تو خود اسے دیکھنے آتی، دوای کھلاتی۔ دیر تک اس کے پاس بیٹھی تسلی دیتی رہتی۔“

رحیم داد نے نادر خاں کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بیمار کوئی بھی پڑے۔ جیلہ دوائیوں کا بکسا اٹھائے فوراً پہنچ جاتی ہے، دوائی دیتی ہے، دیکھ بھال کرتی ہے۔ اس معاملے میں اس کا دل بہت کھلا ہوا ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہے۔ میرا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”سچ تو یہ ہے چوہدری! وہ جتنی سوہنی ہے، من کی بھی اتنی ہی سوہنی ہے۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ دیکھا جو خوشی سے سرخ ہو رہا تھا۔ ”اب یہی دیکھ، جب ہفتے بھر سے اوپر ہو گیا اور تو واپس نہیں پہنچا تو وہ پریشان ہو گئی۔“

”تم ان کو کیسے پتہ چلا وہ پریشان ہو گئی؟“

”ہو! یہ کہ ایک روز وہ مجھ سے کہنے لگی۔ نادر! لگتا ہے چوہدری نراض ہو کر یہاں سے چلا گیا۔ اس کا ادھر کوئی بھی تو نہیں۔ کہاں جائے گا؟ کس کے پاس جائے گا؟ فیروزہ زمیں دارنی بھی تو اسی کی ہے۔ مجھے اس سے کیا لینا؟ یہ باتیں جب اس نے مجھ سے کہیں تو اس کے منہ پر پریشانی صاف نظر آرہی تھی۔“

”تو سچ کہہ رہا ہے نادر؟“ رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔

”اب میں تجھے صاف صاف ہی بتا دوں۔“

”میں صاف صاف ہی سنتا بھی چاہتا ہوں۔“ اس کی بے قراری سارے بندھن توڑ کر سامنے آئی۔

”چوہدری! سچ تو یہ ہے میں اسی کے کہنے پر ادھر آیا ہوں۔“

”تو اس کے کہنے پر ادھر آیا ہے؟“

”ہاں جی، بالکل یہی گل ہے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو باور کرایا۔ ”زمیں دارنی نے مجھے کہا کہ میں تجھے مناکر کو ملے ہر کشن واپس لے آؤں۔“

”اسے پتہ تھا میں یہاں ہوں؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”اسے کیسے پتہ چلا؟“

”نہیں چوہدری! ایسی کوئی گل نہیں۔“ نادر خاں نے اس کی غلط فہمی رفع کی۔ ”اس کا خیال تھا ملتان میں ہو گا اور محکمہ آباد کاری سے تیرا پتہ معلوم ہو جائے گا۔ میں نے کیا بھی ایسا ہی۔ سیدھا نان پہنچا۔ وہاں دو روز ٹھہر کر تیرے کلیم کا معاملہ طے کرایا اور کوئلہ ہر کشن لوٹنے کی بجائے سیدھا ناہ جی کی حویلی پہنچا۔ وہاں شیدا سے پتہ چلا تو مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھگ گیا ہے۔ بھگ گیا تو حلوم ہوا تو ادھر ہوں والی میں ہے۔ سو میں یہاں آ گیا۔“

”ٹھیک ہی ہوا تو یہاں آ گیا۔ تیرے آنے سے بہت سی باتوں کا پتہ چل گیا ورنہ میں تو پریشان نا۔ سوچ رہا تھا شاہ جی کے پاس جاؤں۔ اس سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد کوئلہ ہر کشن لوٹنے کا بلہ کروں۔ مجھے جیلہ کی نراضی نے بہت تنگ کر رکھا تھا۔“

”پر اب تو وہ تجھ سے ذرا بھی نراض نہیں۔ جی چاہے تو اور گھوم ملے۔ پنڈ پینچ کر خود دیکھ لینا۔ میں دارنی تجھ سے کس طرح پیش آتی ہے۔ اب وہ بہت بدل چکی ہے۔ تیری طرف سے اس کا دل بالکل صاف ہو چکا ہے۔“

”یہ سب تو نے ہی کیا ہے۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی کارگزاری سے خوش ہو کر اپنے رد عمل کا ظہار کیا۔ ”سچ پوچھ، میں تو سمجھتا تھا، جیلہ کی خفگی اب کبھی ختم نہ ہوگی۔ بات ہی اس طرح بگڑی تھی کہ میں چاہتا بھی تو اس کے دل کا میل صاف نہ ہوتا۔“ وہ بے ساختہ مسکرانے لگا۔ ”پر نادر! نے تو نکال ہی کر دیا۔ شاہ جی سچ کہتا ہے، نادر تو بہت کام کا بندہ ہے۔“

نادر خاں کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی مگر اس نے انکسار سے کام لیا۔ ”چوہدری! یہ تو کوئی ایسا عجیبہ معاملہ نہیں تھا۔ تیری مہربانی چاہیے۔ آگے اس سے بھی زبردست کام کر کے دکھاؤں گا۔ مجھے تیری ملازمت کرتے مجھے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔“

”فکر نہ کر۔“ اب تو ہمیشہ میرے پاس رہے گا۔ مجھے تیرے ہی جیسے وفادار اور ہوشیار بندے کی

”دوب سے بات کروں گا کہ معاملہ بگڑنے نہ پائے اور تیری آن بھی رہے۔“
 ”نیک ہے، میں نے ابھی واپس نہیں جانا۔“ رحیم داد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں فصل
 دادھی سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔“

”چوہدری! تو فصل کی واڑھی کی بالکل فکر نہ کر۔ میں نے پوری تیاری کر لی ہے۔ جاتے ہی
 برآمدوں گا۔ ویسے تیری مرضی جب چاہے واپس آ جانا۔ زمیں داری کا کام تو چل ہی رہا ہے۔
 رابا ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے دیکھے گا تو بہت خوش ہو گا۔“

”میں نوں پتہ ہے، تیری میخبری میں کام بالکل ٹھیک ٹھاک چل رہا ہو گا۔“
 نادر خاں نے رحیم داد کو اس قدر مہربان پایا تو خوش ہوا، اپنی کارگزاری اور زیادہ جوش و خروش
 سناتے لگا۔ ریتج کی بوائی، خریف کی کٹائی اور کپاس کی چٹائی کے بارے میں ایک ایک تفصیل
 نے لگا۔ دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ سورج چڑھ کر آسمان کے پتوں پتوں پہنچ گیا۔ نادر
 سے باتیں کرنے کے بعد رحیم داد اتنا مسرور اور مطمئن ہوا کہ دوپہر کا کھانا اس نے نادر کو اپنے
 تھ بٹھا کر کھلایا۔

نادر خاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اس نے رحیم داد سے اجازت لی اور کوئلہ ہرکشن جانے کے لیے
 دیوالی سے بھڑکی جانب روانہ ہو گیا۔



رحیم داد بستر پر لیٹ گیا مگر سویا نہیں۔ گھٹنے سوا گھٹنے بعد وہ کمرے سے نکلا اور دیرے سے حویلی
 بچانک کی جانب چلا۔ اس نے دیکھا، والان کی میٹھیوں پر دھوپ میں حمیدہ بیٹھی ہے جسے سب
 بد کہتے تھے۔ وہ اس وقت چیخٹ کا گھگھرا اور چست آستینوں والا سرخ رنگ کا لنڈا چولا پہنے
 ل۔ چولے کے گلے پر سیاہ اور سبز دھاگے کی خوش نما کشیدہ کاری تھی۔ شانوں پر لہرا چندری پڑی
 ل۔ اس کا لباس نیا اور خوش رنگ تھا۔

حمیدہ کے گیلے بال دیکھ کر رحیم داد کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا ہے۔ اس
 لہجے پر نکھار تھا۔ دھوپ سے رخسار سرخ پڑ گئے تھے۔ وہ خوب رو اور دل کش نظر آ رہی
 ل۔ سر بھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر سلیمہ تھی۔ وہ لکڑی کی کنگھی سے میدہ کے
 لیے بال آہستہ آہستہ سلیمہ رہی تھی، سنوار رہی تھی۔

سلیمہ کی جوانی ڈھل چکی تھی۔ رنگ سائولا تھا مگر نقش و نگار تھکے اور سبک تھے۔ آنکھیں
 لڑی اور خوب صورت تھیں۔ ان میں کابل لگا تھا۔ پوٹ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر وقت

ضرورت تھی۔ ”رحیم داد نے نادر خاں کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ ”یہ بتا، کیا مجھے تیرے ساتھ
 واپس چلنا چاہیے؟ ویسے مراد خاں مجھے ابھی جانے نہیں دے گا۔“ اس نے اچانک بات کا رخ مڑ
 دیا۔ ”اور ہاں! یہ تو بتا، شاہ جی اپنے پنڈو واپس پہنچ گیا کہ نہیں؟“

”جب میں پیراں والہ میں تھا تب تک وہ نہیں لوٹا تھا۔ شیدا کہتا تھا شاہ جی پیراں والہ واپس
 آنے سے پہلے کراچی جائے گا۔ وہاں اسے کچھ ضروری کام ہے۔ مجھے تو اس کا لباس ہی پروگرام
 ہے۔“

”ویسے اب شاہ جی سے ملنے اور مشورہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ رحیم داد نے اپنا ارادہ
 بدل دیا۔ ”تو نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کرادیا۔ اب شاہ جی سے مل کر کیا لیتا؟“ اس نے سوال
 نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ”سچ پوچھ تو مجھے اب شاہ جی کے پاس جانا بھی نہیں چاہیے۔ جیل
 پتہ چل گیا تو فیروزا رض ہو جاتی گی۔ تیری کیا رائے ہے؟“

”چوہدری! تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ تجھے اب شاہ جی سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لینا
 چاہیے۔“ نادر خاں نے اس کی تائید کرنے کے ساتھ مشورہ بھی دیا۔ ”بہتر تو یہی ہے کچھ عرصے کے
 لیے تو شاہ جی سے دور ہی رہ۔ بلکہ میں بھی اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ دراصل زمیں داری کو شاہ
 جی سے اتنی سخت نفرت ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔“

”میں نوں پتہ ہے وہ شاہ جی سے کتنی زبردست نفرت کرتی ہے۔“ رحیم داد نے نادر کی رائے
 سے اتفاق کیا۔ ”یہ بتا میں نوں اب کیسہ کرنا ہے۔ تو کہہ تو آج ہی تیرے ساتھ چل سکتا ہوں۔ مراد
 خاں نے مجھے کید تو کر نہیں رکھا۔ صرف اتنا خیال آتا ہے اس نے بہت محبت سے روکا ہے۔ کل
 اس نے شکار کا پروگرام بنایا ہے اور میری ہی خاطر بنایا ہے۔ بچھلی بار وہ شکار پر گیا تو میں اچانک
 پیار پڑ گیا تھا۔ اس دفعہ بھی نہ گیا تو اسے دکھ ہو گا۔“

”ایسی گل ہے تو چوہدری تو ٹھہر جا۔ فکر نہ کر، میں زمیں داری کو سمجھا دوں گا۔“ نادر خاں نے
 قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”ویسے بھی تجھے ابھی واپس نہیں جانا چاہیے۔“

”کیوں نہیں جانا چاہیے؟“ رحیم داد بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے تاب تھا۔
 ”ابھی نہیں جائے گا تو زمیں داری پر تیرا رعب پڑے گا۔ اسے بھی تو پتہ چلنا چاہیے، تو بھی خفا
 ہو سکتا ہے۔“

”سوچ لے، کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔
 ”پروانہ کر چوہدری! نادر خاں نے اسے یقین دلایا۔ ”میں تیرے بارے میں زمیں داری سے

خوب بنی ٹھنی رہتی تھی۔ مزاج میں ابھی تک شوخی تھی، لگاؤ اور عشوہ طرازی تھی۔ چلی تو جیہٹ کا ایک ایک عضو بولتا تھا، چمکتا تھا۔ اسے اپنی دل کشی اور رعنائی کا پورا پورا احساس تھا۔ وہ خود پہلو سے کشش انگیز بنا کر رکھتی بھی تھی۔ اپنے تین بچوں کے ساتھ حویلی کے عقبی حصے میں رہتی تھی۔ وہ مراد خاں شاہانی کی منہ چڑھی خادمہ تھی۔ حویلی میں مزارعوں اور کیوں کی جو فوجیں لڑکیاں اور بیویاں، سردار مراد خاں شاہانی کا عشرت کدہ آباد کرنے کے لیے اٹھا کر لائی جاتیں۔ سلمہ ہی ان کی دیکھ بھال کرتی اور کڑی نگرانی کا فرض انجام دیتی۔ انھیں بنا سنوار کر سردار کی خواب گاہ میں پہنچاتا بھی اسی کے ذمے تھا۔

رحیم داد نے اپنے قیام کے دوران سلمہ کی شوہر کو کبھی حویلی میں نہیں دیکھا۔ نہ معلوم کون تھا؟ رحیم داد کو اس کے بارے میں مطلق علم نہ تھا۔ اس نے حویلی کے کسی ملازم سے سلمہ کے بارے میں اور نہ ہی اس کے شوہر کے متعلق پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کی۔ البتہ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ مراد خاں اس پر بہت زیادہ مہربان ہے اور مکمل اعتماد بھی کرتا ہے۔

قدموں کی آہٹ سن کر میدہ نے نظریں اٹھائیں۔ رحیم داد کو دیکھا مگر جھٹ گردن جھکا ہوا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ سلمہ نے بھی مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ایک خاص ادا سے مسکرائی اور اونچی آواز سے سلام کیا۔ ”سین چوہدری! سلام دلاؤں۔ سب خیراے، بکڑا اے، راضی اے خوش اے!!“

رحیم داد نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا۔ ”شکرا اے!“

میدہ نے ایک بار پھر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”اس کی آنکھیں بھیجی بھیجی تھیں۔ ان میں ویرانی تھی۔ رحیم داد نے اس کی افسردگی محسوس کی۔ مگر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ نہ رکا نہ بات کی۔ مراد خاں شاہانی سویرے سویرے جھوک مٹھو بندہ چلا گیا تھا۔ کریم بخش راہانی بھی اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔

رحیم داد حویلی سے باہر نکلا۔ پھانک پر خانہ بدوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ حویلی کا پرانا پروردہ تھا۔ خانہ نے رحیم داد کو دیکھا تو جھٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا۔ رحیم داد نے گردن ہلا کر جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ ٹھٹھا ہوا گاؤں کی جانب بڑھا۔ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اس نے دیکھا، حویلی کے احاطے کی اونچی چار دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کے ایک گھنے درخت کے نیچے میدہ کا بڑا بھائی فرید خاموش اور بے ہوا کھڑا ہے۔ اس کی حجامت اور بڑھ گئی تھی۔ سر کے بال خشک اور میلے چپکٹ ہو گئے تھے۔ جڑن

ہیں بڑی تھی، چہرہ اجاڑ اور بے رونق تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا۔ اسے فرید اسے ہم دردی تھی۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ حال احوال معلوم کرنا چاہتا تھا۔ فرید انے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو فوراً ہاتھ پر سلام کیا، دعائیں دیں۔ ”سین سدا جیویں، سین سکھی صحت ہو دیں۔“ رحیم داد نے نزدیک پہنچ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”فریدے، تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟“ ”میدہ سے ملنے آیا تھا۔“ اس کے لہجے میں نرمی اور حلاوت تھی۔

”اسے مل لیا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”میدہ ادھر حویلی میں سلمہ کی ساتھ دھوپ میں لی ہے۔ میں ادھر ہی سے آرہا ہوں۔“

”سین! میں میدہ سے نہیں مل سکتا۔“ اس نے حویلی کے پھانک کی سمت ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”میں اٹھا بیٹھا ہے۔ اس نے نہیں ملے دیا۔“

رحیم داد نے مڑ کر دیکھا، خانہ بدوق سنبھالے پھانک کے باہر اللہ بخش جوڑا کے ساتھ بیٹھا لی کر رہا ہے۔ فرید انے بھی دونوں کو دیکھا اور رحیم داد کو بتانے لگا۔ ”میں نے راکھے سے منت آزاری کی پر وہ نہ مانا۔“ اس کا لہجہ رقت انگیز ہو گیا۔ ”پہلے بھی آیا تھا۔ میدہ سے نہیں مل سکا۔“ ”یہ سردار کی اجازت نہیں۔ راکھا یہی بولتا تھا۔“

رحیم داد اس معاملے میں اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ خانہ ہرگز مراد خاں کی امداد نہیں کرے گا۔ رحیم داد کے کہنے پر بھی نہیں۔ وہ بہت سخت گیر تھا اور مراد خاں کے اعتماد توئی تھا۔ ویسے بھی سردار مراد خاں شاہانی کے سامنے سارے نوکر چاکر مجبور اور بے بس تھے، ان کے غیظ و غضب سے ڈرتے تھے۔ اسے اپنے کسی ملازم یا مزارع کی کوئی بات بری لگتی تو غصے میں آتا۔ قدر دیوانہ ہو جاتا کہ اپنے شکاری کتے خنجر بوڑے اور نوپنے کھوٹنے کے لیے ان پر چھوڑ دیتا۔ انہوں والی میں اپنے قیام کے دوران وہ کئی بار ایسے ہولناک مناظر دیکھ چکا تھا۔ یہ مظالم دیکھ کر فرید سردار شاہانی سے خائف رہتا تھا۔ لہذا رحیم داد نے فرید کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بات کیا۔

”فریدے! یہ بتا میدہ کب تک حویلی میں رہے گی؟“

”سردار کی مرضی ہے سین۔“ فرید افسردہ لہجے میں بولا۔ ”وہ جب چاہے گا تب ہی میدہ حویلی سے باہر نکلے گی۔ ویسے پرنا ٹیکس کی ڈالی نہ ملنے تک وہ اسے اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ریت اور نانٹیک ہے۔“

ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ بادشاہ ہے۔“

”فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر اس کا کندھا تھپکا۔ ”اب تو رجا۔“

فرید نے جھک کر رحیم داد کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور چپ چاپ چلا گیا۔ رحیم داد آگے نہ گیا۔

ابیں حویلی میں آگیا۔ دیرے میں پہنچا اور کمرے کے سامنے کرسی کھسکا کر دھوپ میں بیٹھ گیا۔

سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے مراد خاں آگیا۔ شام کا اندھیرا پھیلا۔ سردی بڑھی۔ سردار

ناہانی اور رحیم داد کمرے میں کرسیوں پر بیٹھے۔ شغل بادہ نوشی شروع ہوا۔ ہموں والی کے قیام کے

وران عام طور پر دسی شراب چلتی جسے مقامی کلال گڑ، آلو یا کھجور سے کشید کرتے تھے۔ اس شام

ہی میز پر دسی شراب کی بوتل تھی مگر کچھ زیادہ ہی تند اور تیز تھی۔ ذائقہ بھی مختلف تھا۔ یہ شراب

ہوک مٹھو بندہ میں اسے ایک نوانی زمیں دار نے تھنے کے طور پر پیش کی تھی۔

سردار شاہانی نے گلاس خالی کیا۔ اس میں دوبارہ شراب انڈھلتے ہوئے گویا ہوا۔ ”عبداللہ خاں

وانی ٹھیک ہی کہتا تھا۔ زور دار چیز ہے ٹھیک مارتی ہے۔“

رحیم داد نے گھونٹ بھرا۔ ”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بہت زور دار لگتی ہے۔“

”تجھے پتہ ہے یہ کیسے تیار کی جاتی ہے؟“

”میں نوں اس بارے میں کبہ پتہ؟“ رحیم داد سادگی سے بولا۔

”تیکوں کچھ بھی پتہ نہیں۔“ سردار شاہانی نے ہنس کر کہا۔ ”یہ لاہن سے بنتی ہے۔ اسے بنانے

کے لیے، بیری، پیپل اور بوہڑ کے درختوں کی چھال مٹی کے کورے گھڑوں میں ڈال کر کچی زمین کھود

کے بادی جاتی ہے۔ جتنے زیادہ دنوں بعد گھڑا باہر نکالا جاتا ہے، اتنا ہی عمدہ خیرا اٹھتا ہے۔ اسی کو

لاہن کہتے ہیں۔ جس سے بعد میں یہ کشید کی جاتی ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ ”میں

نے تو دس بارہا سال پرانے لاہن سے کشید کی ہوئی شراب پی ہے۔ بہت زور دار ہوتی ہے۔ یہ

بھی پرانے لاہن کی لگتی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تجھے کیسی لگی؟“

”زبردست ہے۔ ابھی سے چڑھنے لگی۔“ رحیم داد نے بڑا گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔

”پر لاہن کی تیز دار کے ساتھ رن بھی تیز اور گرم ہونی چاہیے۔ اس کے بغیر اسے پینے کا مزا

نہیں۔“ شاہانی نے ہلکا تھپہ لگایا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔ شاہانی کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہانی! تو نے میدہ کو واپس

نہیں بھیجا۔ کب تک رکھنے کا ارادہ ہے۔“

”چلی جائے گی، چلی جائے گی۔“ مراد خاں نے بے نیازی سے کہا۔ ”جلدی کیا ہے۔“

”پر سردار نے تو تجھے معافی دے دی تھی۔ میرے سامنے دی تھی۔“

”سیں! تو سمجھا نہیں، معافی تو اس نے میدہ کا منگوا کر کرنے سے پہلے ڈالی نہ دینے کے جرم کی

دی تھی۔“ فرید نے وضاحت کی۔

یہ بتا، سردار چاہے تو ڈالی بالکل معاف کر سکتا ہے؟“

”کیوں نہیں معاف کر سکتا، بالکل کر سکتا ہے۔“ فرید نے مستعدی سے جواب دیا۔

”وہ سردار ہے، بادشاہ ہے، سب کچھ کر سکتا ہے۔“

”ایسا کر، تو سردار سے مل لے۔“ رحیم داد نے فرید کو مشورہ دیا۔ ”منت سماجت کرے گا تو

مان جائے گا۔ ڈالی معاف کر دے گا اور میدہ کو بھی واپس کر دے گا۔“

”نہاں سیں! میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ فرید کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ ”میں اس کارانی

رعیت ہوں، اس کا مزارع ہوں۔ میں سردار سے کچھ نہیں بول سکتا۔ وہ نراض ہو جائے گا۔

نراض ہو گیا تو ڈالی دینے پر بھی میدہ کو واپس نہیں کرے گا۔ کسی اور سردار کے پاس بھیج دے گا

اپنے ہی پاس رکھے گا۔ ٹھکا ٹھک بچے جنوائے گا۔ اس کے بعد بھی زاری کرنے پر، منت کرنے پر

اگر واپس کرے گا تو جرمانہ لگا کر زیادہ ہی رقم مانگے گا۔“

”یہ تو نے بالکل نرالی گل سنائی۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”سیں! لگتا ہے تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔ تیکوں یہاں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ یہ میدہ

ہے۔“ فرید کا دبا ہوا غم یکایک ابل پڑا۔ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ ”یہاں اوپر رب

دی خدائی ہے اور نیچے سرداروں کی۔“ اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”سیں! میں

غریب ہوں، حلیم ہوں، شامت دار ماریا ہوں۔“

رحیم داد اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوا۔ چند لمحے سر جھکائے خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر فرید کا

کندھا تھپک کر تسلی دی۔ ”فرید! پریشان نہ ہو۔ میں سردار سے میدہ کے بارے میں بات کر د

گا۔ شاید وہ میری بات مان لے اور ڈالی بالکل معاف کر دے۔ تب میدہ جلد ہی تیرے پاس پہنچ

جائے گی۔ تو اس کا ویاہ کرنا۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ بات کہتے کہتے الجھا۔ ”کیا کہتے ہیں اسے پرنا

ہاں، پرنا کر دینا۔ اس کی مگنی یا منگوا تو پہلے ہی کر چکا ہے۔“

فرید کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ گڑگڑا کر رحیم داد کو دعائیں دینے لگا۔ ”سیں! تو جانی

ہو نوین، رب راضی ہووے، میں صد کے تھیواں۔“ وہ گلے میں پڑی ہوئی پگڑی ایک ہاتھ سے اٹھ

کر آنسو پونچھے لگا۔ ”سیں! سردار تیری گانہ ضرور مان لے گا۔ تو اس کا مہمان۔“

”اب تو اسے اپنے گھر جانے دے۔“ رحیم داد نے نرم لہجے میں سفارش کی۔

”کیوں؟“ مراد خاں شاہانی نے تیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تجھے اس سے کیا لیتا ہے؟“

رحیم داد نے فرید اسے اپنی ملاقات کا ذکر نہ کیا، چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے آج دوپہر اسے دیکھا تھا۔ بیمار بیمار لگتی ہے۔ ویسے بھی وہ کمزور اور دلی پتلی ہے۔“

”چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔“ سردار نشے کی ترنگ میں جھوم کر بولا۔ ”وہ انگوری ہے انگوری۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”انگور کے پکے دانے کی طرح رس بھری۔ تو نے اس کا رنگ روپ دیکھا ہے، سچ بتا، تجھے وہ انگوری نہیں لگتی؟“

”مجھے تو وہ کسی طرف سے انگوری شگوری نہیں لگتی۔“ رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ لہجے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”میں چاہتا ہوں تو اسے واپس بھیج دے۔ اس کی سگائی پہلے ہی ہو چکی ہے۔ میدہ کا منگیدڑ اس کا انتظار کرتا ہوگا۔ اس کا بھرا، فرید ابھی اس کا ویاہ کرنے کو تیار ہے۔“

”تو میدہ کی اس طرح سفارش کیوں کر رہا ہے؟“ سردار نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بات کیا ہے؟“

”کوئی خاص گل بات نہیں۔“ رحیم داد نے فوراً بات بتائی۔ ”میدہ کو دیکھا تو سوچا تھا مجھ سے کہوں گا اسے اپنے گھر جانے دے۔“ اس نے لہجے میں عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”میں تو چاہتا ہوں تو اس کی ڈالی بھی معاف کر دے۔“ رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”معاف کر دے گا ناں؟“

”تو کہتا ہے تو اسے واپس بھیج دوں گا۔ ڈالی بھی معاف کر دوں گا۔“ سردار مراد خاں خلاف توقع فوراً رضامند ہو گیا۔ شاید نشر کچھ زیادہ چنہ گیا تھا۔ ”پر گھر جانے سے پہلے وہ ایک رات تیرے پاس رہے گی اور آج ہی رات رہے گی۔“

”نہیں! تو آج رات بھی اسے اپنے ہی پاس رکھ۔“ رحیم داد رضامند نہ ہوا۔

”میری فکر نہ کر چوہدری! شاہانی لہرا کر بولا۔ ”میں نے اپنے لیے آج رات ایک پولانی اٹھوایا ہے۔ بہت گرم دن ہے۔ دن میں سوت سے کپڑا بننے ہوئے اس کے ہاتھ فافٹ چلتے ہیں پر رات کی نہ پوچھ۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”وہ پہلے بھی ایک بار میرے پاس رہ چکی ہے۔“

”ایسا ہے تو میدہ کو آج ہی رات جانے دے۔“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”ابھی تو رات زیادہ نہیں گزری۔“

”نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آج رات نہیں جائے گی۔ تیرے پاس رہے گی۔ دیکھ انکار نہ

رہا۔“ وہ نشے کی جھونک میں بڑبڑانے لگا۔ ”تو میرا ممان ہے، میرا یا ربیلی ہے۔ میدہ آج رات میرے پاس نہ رہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ نہیں ہوگا۔ ہرگز، ہرگز نہیں ہوگا۔“

رحیم داد نے سردار کی برہمی سے خائف ہو کر خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ سردار مراد خاں شاہانی نے اسی دم سلحری کو بلوایا۔ وہ فوراً آگئی، جیسے شاہانی کے بلاوے کا انتظار ہی کر رہی تھی۔ اس وقت وہ کچھ زیادہ ہی بن سنور کر آئی تھی۔ آنکھوں میں دنبالہ کاجل تھا، ہونٹوں پر سرخی تھی۔ بائیں مونے کے پھولوں میں بے ہوئے کرنے کے تیل سے جگکا رہے تھے۔ سر پر بسنتی دوپٹہ تھا۔ وہ ریشم کی بسنتی منجھلی بھی باندھے ہوئے تھی، دل ربا اور عشوہ طراز نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد کو بھی وہ بت اچھی لگی۔ اس کے لیے دھڑکن اور بے قراری بھی محسوس کی۔

سلحری کو دیکھتے ہی مراد خاں کی آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے پیار بری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا اور جھوم کر گویا ہوا۔

”بند جانی! آج تو بھری ہوئی بندوک لگ رہی ہے۔ ادھر آ میرے پاس۔“

سلحری نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترجھی نظروں سے مراد خاں کو دیکھا۔ اس کے انداز میں ٹاٹ تھی۔ بڑی چاہت سے بولی۔ ”سبس! میں صد کے تھیواں۔“ وہ آگے بڑی اور مراد خاں کے ہلے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

شاہانی نے اسے مخاطب کیا۔ ”سلحری! انگوری کو کیا نام ہے اس کا؟“ نشے کی جھونک میں اسے بیدار کا نام یاد نہیں آیا۔

سلحری نے جھٹ بتایا۔ ”سبس! تو میدہ کو تو نہیں پوچھ رہا؟“

”ہاں! ہاں! بالکل وہی، میدہ، میدہ۔ وہ انگوری ہے نا؟“ شاہانی نے سلحری کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”میدہ کو چوہدری کے کمرے میں پہنچا دے۔ وہ آج رات چوہدری کے پاس رہے گی۔“ اسے اپنے گھر بھیج دینا۔ رادھانی سے کہنا۔ اس کی ڈالی بھی میں نے معاف کر دی۔ سن لیا نہ؟“

”کئی سبس!“ سلحری نے سردار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور ٹھٹھے سے بولی۔ ”ڈالی کو تیرے کوٹھے وچہ پہنچا دوں؟“

”ڈالی کو گولی مار۔ آج تو ہی میرے پاس رہے گی۔“ سردار شاہانی نے سلحری کے لیے حکم صادر کیا۔ ”اب تو جا، میدہ کو چوہدری کے کمرے میں لے جا۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔

اسے کیسے دیکھتی؟ وہ تجھے ملے بنا چلا گیا۔“
 ”ہا سس! وہ میوں کیسے مل سکتا ہے؟“ میدہ نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”سردار کی اجازت نہیں۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”فرید اکیا کستا تھا؟ وہ تجھے ملا تھا؟“
 ”تیرے لیے وہ بہت پریشان ہے۔“

”پر اس کے پریشان ہونے سے کیا ہوتا ہے؟“ میدہ کے چہرے پر غم کی بدلی چھا گئی۔ ”سس! وہ غریبی علمی میں کیا کر سکتا ہے۔ پر نا ٹکس کی ڈالی دے سکتا تو مجھے مل لیتا۔ اپنے ساتھ بھی لے جاتا۔“

”تیرے سوا یہاں اور بھی نیاریں ہوں گی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ہا سس!“ میدہ رفتہ رفتہ رحیم داد سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ ”میری طرح یہاں تین اور بکرید ہیں۔ ان کا پرنا مایو نے سردار کی اجازت کے بنا چوری سے کر دیا تھا۔ ڈالی دینے کو رکم نہیں تھی۔ وہ میرے آنے سے پہلے حویلی میں تھیں۔ انھیں تو بیچ چھ مہینے سے بھی اوپر ہو گئے۔ کنزک دے موسم توں ادھر ہیں۔ اب تک سس نہ ان کی ڈالی سردار کو پہنچی اور نہ وہ جاسکیں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”میں بھی نہیں جاسکتی۔ فرید ڈالی کی رکم کہاں سے لائے گا؟“
 ”تو فکر نہ کر فرید اکو اب ڈالی نہیں دینی پڑے گی۔“ رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔

”سس! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اسے رحیم داد کی بات پر یقین نہ آیا۔

”ایسے ہی، جیسے میں کہہ رہا ہوں۔ تیرا پرنا ٹکس سردار نے معاف کر دیا۔ تو کل سویرے اپنے گھر چلی جائے گی۔“

میدہ کی آنکھوں میں روشنی کے ستارے جگمگائے مگر جلد ہی ان کا چکا چوند ماند پڑ گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”سردار ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔ کل رات ہی اس نے مجھے کہا تھا۔“

”کل کی بات چھوڑ۔ سردار نے آج مجھ سے وعدہ کیا ہے۔“

”سس! تو بچ بول رہا ہے؟“ میدہ کا چہرہ فرط مسرت سے پھول کی مانند کھل گیا۔ ”سردار نے تجھے خود کہا تھا؟“

”ہاں، آج ہی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا۔ میں اس کا مسمان ہوں۔ میں نے تیرے بارے میں اسے کہا تو وہ راضی ہو گیا۔“ رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا۔ ”اس نے سلحہ کی بولا کر میرے سامنے

”یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا انتظار کر۔ میں جلد ہی تیرے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

سلحہ کی چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ آنکھیں مسکرانے لگیں۔ وہ گردن اٹھائے ہوئے ہلے ہلے قدم بڑھاتی چلی گئی۔ سردار شامانی نگاہیں اٹھائے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ بائیں بازو مڑ کر او جھل ہو گئی تو سردار نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! اپنی سلحہ کی کا بھی جواب نہیں سدا بہار ہے۔ برسوں سے میرے پاس ہے پر اب تک پرانی نہیں ہوئی۔ ہر بار کچھ زیادہ ہی پیچھے ہے۔ کیا خیال ہے تیرا؟“

رحیم داد صرف مسکرا کر رہ گیا۔ سردار شامانی نے بھی مزید بات نہیں کی۔ دونوں شراب سے شغل کرتے رہے۔ مراد خاں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اٹھا اور ڈنگاتے قدموں سے جھومتا بھڑکتا آؤ بڑھ گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا اور شامانی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

سلحہ کی خواب گاہ کے دروازے پر مراد خاں کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھتے ہی آؤ بڑھی اور ہاتھ تھام کر مسکراتے ہوئے سہارا دیا۔ دونوں کھلے دروازے سے اندر چلے گئے۔ رجم داد دیرے کی جانب چل دیا۔ کمرے کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا تو ٹھٹھک گیا۔ میدہ بستر پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ آگے بڑھا اور اس کے قریب پہنچا۔ میدہ کسماکسم کرنے لگی۔ اس نے نہ گردن اٹھائی نہ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ پیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ ”میدہ!“ مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بہت سہمی ہوئی اور مضطرب نظر آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی غرض سے بولا۔ ”فرید اتیرا بھائی ہے نا؟ وہ آج دوپہر حویلی سے باہر مجھے ملا تھا۔“

تیر ٹھٹھک نشانے پر بیٹھا۔ میدہ نے فوراً نظریں اٹھائیں اور بے قرار ہو کر پوچھا۔ ”فرید یہاں آ تھا؟“

”ہاں!“ رحیم داد نے بتایا۔ ”وہ تجھے ملے آیا تھا۔“

”پر میں نے تو اسے نہیں دیکھا۔ سس! وہ کب آیا تھا؟“ اس کی آنکھوں سے بے قراری کے ساتھ ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

”میں نے کہا، وہ آج دوپہر کو آیا تھا۔ تو سلحہ کی کے ساتھ دھوپ میں بیٹھی تھی۔ میں نے اسے ملے میں تیرے اور سلحہ کی کے سامنے سے گزرا تھا۔ باہر گیا تو وہ مجھے مل گیا۔“ رحیم داد نے تفصیل بتائی۔ ”پر راکھے نے فرید اکو اندر نہیں آنے دیا۔ وہ حویلی کے اندر نہ آسکا۔ باہر ہی

ہی کہہ دیا کہ وہ کل تجھے فرید کے پاس پہنچا دے۔

”پر سلہری نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ وہ ہنوز تذبذب میں تھی۔ ”سیں! تو اجازت دے تو میں سلہری کے پاس جا کر ابھی پوچھ لوں؟ ذرا دیر بعد لوٹ آؤں گی۔“

”سلہری تجھے نہیں ملے گی۔ وہ اس وکت سردار کے کمرے میں ہے۔ وہ تجھے صبح ملے گی اور تجھے تیرے گھر پہنچا دے گی۔“

”فریدے کو بھی اس کا پتہ ہے؟“

”وہ ابھی تو نہیں جانتا۔ کل جب تو اس کے پاس جائے گی تو جان جائے گا۔“ رحیم داد نے میدہ کو بتایا۔ ”ویسے میں نے اسے دلا سادے دیا تھا۔“

”سیں! تیرے ہی کہنے پر سردار نے ایسا کیا ہے؟“ میدہ نے پوچھا۔ ”تیری باتوں سے ایسا ہی لگتا ہے۔“

رحیم داد نے خوش ہو کر اسے اور مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ”ہاں، میں نے ہی اسے کہا تھا۔ وہ میرا یار رہے، میری بات کیسے نہ مانتا؟“

”سیں! تو سدا جیویں۔ رب راضی ہووے۔“ اس کا چہرہ مسرت سے شگفتہ ہو گیا۔ ”سیں تو کتنا چنگا ہے۔“

”میں تو چنگا ہوں۔“ رحیم داد نشتے سے جھوم کر بولا۔ ”اب تو بھی چنگی بن جا۔“ رحیم داد نے لگا۔ میدہ نے کچھ نہیں کہا۔ اس کا چہرہ شرم سے گلانی پڑ گیا، نظریں جھک گئیں، ”لانی لانی پلکوں کے سائے پھیل گئے۔“

رحیم داد سویرے بیدار ہوا۔ میدہ نہ جانے کب کمرے سے جا چکی تھی۔ رحیم داد اٹھا، نہادو کر شاہانی کے پاس چلا گیا۔ وہ ناشتے پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں نے ناشتا کیا۔ اسی اثنا میں کریم بخش رادھانی آگیا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے چلا گیا۔ اب صبح کی کمر کا دھندلا چھٹ چکا تھا۔ ہر طرف چمکیلی بستی دھوپ پھیلی تھی۔

حویلی کے پچھواڑے سے سلہری نمودار ہوئی۔ اس کے ہم راہ میدہ تھی۔ اللہ بخش جوڑا دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ پھانک کے قریب پہنچ کر سلہری کی آواز سنائی دی۔ ”جوڑے!“ اس نے میدہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اے فرید کے گھر پہنچا دے۔ واپسی پر مجھے بتا دینا۔ دیری نہ کرنا۔“

”جوڑا آگے بڑھا۔ میدہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ پھانک سے گزرتے ہوئے وہ ٹھکی، مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا اجالا تھا۔ ہونٹوں پر دہلی دہلی مسکراہٹ تھی۔

رحیم داد بھی مسکرا دیا۔ میدہ پھانک سے باہر چلی گئی۔ رحیم داد اسے دور تک دیکھتا رہا۔

سلہری پھانک سے واپسی پر رحیم داد کے قریب سے گزری۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”میدہ اپنے گھر چلی گئی؟“

”ہاں سیں! بہت راضی باضی تھی۔“ سلہری نے ٹھک کر زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔ ”تجھے بہت خوش تھی۔ بار بار کہتی تھی، سیں چوہدری بہت چنگا بندہ ہے۔“ اس نے گردن کو خم دے کر ایک خاص ادا سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”سیں! تو نے اسے کیوں جانے دیا؟ کچھ دن تو اپنے پاس رکھا۔ میدہ سوہنری ہے اور بھرپور جوان ہے۔“

”پر تو اس سے بھی زیادہ سوہنی اور چنگی ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر شوخی سے اسے چھیڑا۔ ”میرا تو جی کرتا تھا۔ رات تو میرے پاس ہوتی۔“

سلہری نے رحیم داد کی حوصلہ شکنی نہیں کی۔ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔ ”سیں! تو سردار سے پوچھ لے۔“ اس نے دوپٹہ کھینچ کر ہلکا سا گھونگھٹ نکال لیا۔

رحیم داد اس کی اس ادا پر بے قرار ہو گیا۔ وہ کچھ بولنے ہی والا تھا کہ مراد خاں کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے رادھانی تھا۔ دونوں رحیم داد ہی کی جانب آرہے تھے۔ سلہری نے سردار کو دیکھا تو فوراً آگے بڑھی اور چپ چاپ حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔

مراد خاں قریب آگیا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ ”چوہدری! تو تیار ہے نا؟“ شکار پر چلنا ہے۔“ اس نے مڑ کر رادھانی کی جانب دیکھا۔ ”رادھانی، جیپ باہر نکال۔ شکار پر چلنے کا بندوبست کر۔“ رادھانی حکم ملتے ہی چلا گیا۔

مراد خاں شاہانی دھوپ میں رحیم داد کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد سے وہی بات کہی جو ذرا دیر پہلی سلہری کہہ چکی تھی۔ ”چوہدری تو نے میدہ کو کیوں جانے دیا؟ میں نے تو سلہری سے کہہ دیا تھا، چوہدری کی مرضی ہو تو میدہ کو روک لیتا۔“

رادھانی واپس آگیا۔ اس نے مراد خاں کو اطلاع دی کہ شکار پر چلنے کی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ مراد خاں اور رحیم داد آگے بڑھے، پھانک سے باہر نکلے اور سامنے کھڑی ہوئی جیپ میں جا کر بیٹھ گئے۔



مراد خاں خود جیپ چلا رہا تھا۔ رحیم داد اس کے برابر بیٹھا تھا۔ ہچھلی نشست پر کریم بخش رادھانی اور دو ملازم بیٹھے تھے۔ جیپ میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ بندوقیں تھیں۔ کار تو س

اور شکار کا دوسرا ساز و سامان بھی موجود تھا۔ راستہ کچا تھا، جگہ جگہ گڑھے تھے۔ جیپ ہچکولے کھائی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ مراد خاں اسے بہت سنبھال کر چلا رہا تھا۔

جیپ چار میل سے زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک بستی کے باہر جا کر ٹھہر گئی۔ یہ چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رادھانی نے شکاری کتوں اور ان کی دیکھ بھال کرنے والے کوتیوں کو شکار کا ہانکا کرنے والوں کے ساتھ رات ہی کو بھیج دیا تھا۔ وہ سب راستے کے کنارے ایک سالے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ایسی جھونپڑی تھی جس کی دیواروں پر پھوس اور سرکنڈوں کا چھپر تھا۔ چھپر کے نیچے شہتیر کے بجائے اڈیاں جڑی تھیں۔ اڈیاں مثلث کی شکل کی مضبوط لکڑیاں تھیں۔ سالے میں کئی اڈیاں تھیں جن کے درمیان میڑھی تر چھی کڑیاں اور لڑے تھے۔ ان پر بڑا سا چھپر تھا۔ گاؤں میں عام طور پر ایسے ہی سالے نظر آ رہے تھے۔

گاؤں سے چند فرلانگ پر دریاے سندھ بہتا تھا۔ دریا کے کنارے دور دور تک بھاڑیاں تھیں۔ جنگل اور اوجھڑے۔ گھنے درختوں کے گمنجان بچھ رہے تھے۔ انھی بچھڑوں میں جنگلی سور رہتے تھے۔ وہ دن میں بچھڑوں کے اندر دور تک پھیلی ہوئی دلدل اور کچڑ میں روپوش رہتے۔ رات کی تاریکی پھیلنے ہی ان کے غول کے غول نکلتے اور کھڑی فصلیں تباہ کرتے۔ اس حیثیت سے سور کا شکار زمیں داروں کے لیے مشغلے اور کھیل سے زیادہ ایک بڑی ضرورت بھی تھی۔ یہ فصلوں کی تباہی سے بچانے کی ضرورت تھی۔ سور کا شکار عام طور پر فصلوں کی تیاری کے دنوں میں کثرت سے ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی دن تھے۔ خریف کی فصل کیس کٹ چکی تھی، کہیں کٹائی کے لیے تیار کھڑی تھی۔

مراد خاں کی ہدایت پر رادھانی نے شکاری کتوں اور ہانکا کرنے والوں کو بچھڑوں کی جانب پہلے ہی روانہ کر دیا تھا۔ آگے آگے کوئی تھے۔ وہ کتوں کی زنجیریں مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ہانکا کرنے والے گردنوں میں ڈھول ڈالے، ہاتھوں میں ٹہن کے پیپے، نیزے اور برچھے سنبھالے چل رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے نڈر اور بے باک تھے جن کے پاس صرف لمبے شکاری چاقو یا خنجر تھے۔

اس شکار میں ایسے کتے بڑی تعداد میں تھے جو بل میڑھ اور بونی نسل کے کتوں کے باہمی ملاپ کی پیداوار تھے۔ نسلی طور پر یہ دوغلے کتے سور کے شکار میں بہت موثر اور کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ مراد خاں شاہانی نے سور کے شکار کے لیے ایسے کتوں کی خاص طور پر افزائش نسل کی تھی۔ ان کے دانت اور جڑے اس قدر مضبوط تھے کہ ایک بار گردن منہ میں آجانے کے بعد سور کے لیے ان کی گرفت سے آزاد ہونا ممکن نہیں تھا۔ یہ کتے دوڑتے بھی تیز تھے، خونخوار اور نڈر بھی تھے۔

مراد خاں اور رحیم راجپ کے اندر ہی بیٹھے رہے۔ رادھانی نے قمراس سے چائے انڈیلی۔ دونوں کو ایک ایک پیالی پیش کی۔ دونوں آہستہ آہستہ چائے پینے لگے۔

جب کوئی اور ہانکا کرنے والے جنگلی درختوں سے ڈھکے ہوئے گمنجان بچھڑوں میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گئے تو کچھ ہی دیر بعد مراد خاں شاہانی نے دوبارہ جیپ اشارت کی۔ اب پچھلی نشست پر صرف رادھانی بیٹھا تھا۔ دونوں ملازم بھی ہانکا کرنے والوں کے ساتھ چلے گئے تھے۔ دونوں منجھے ہوئے شکاری تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی بندوقیں اور کارتوس بھی لے گئے تھے۔ سردار مراد خاں اور رحیم داد کے زانوں پر بھی بھری ہوئی بندوقیں رکھی تھیں۔ دونوں بچھڑوں کی جانب دیکھ رہے تھے۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں رک رک کر بچھڑوں میں گونج رہی تھیں۔

رادھانی پچھلی نشست پر بندوق سنبھالے بیٹھا تھا۔ سردار مراد خاں اسے شکار پر ضرور ساتھ لے جاتا تھا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ ویسے مراد خاں بھی بہت اچھا نشانہ باز تھا۔ اس نے کم عمری ہی سے شکار کھیلنا شروع کر دیا تھا اور اب تو وہ ماہر شکاری ہو گیا تھا۔ البتہ رحیم داد نے سور کا شکار بہت کم کھیلا تھا۔ لیکن اس کا نشانہ بھی برا نہیں تھا۔

جیپ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک اوجھڑے آہستہ آہستہ دوڑ رہی تھی۔ یہ اوجھڑ خود رو جنگلی پودوں سے بھرا ہوا دشوار گزار اور دلدلی راستہ تھا۔ جیپ سنبھل سنبھل کر آگے اور آگے بڑھتی گئی۔ آخر ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں اس قدر بہتات سے گھنی بھاڑیاں تھیں کہ ان کے درمیان سے جیپ نہیں گزر سکتی تھی۔ شاہانی نے جیپ روک لی۔ بندوق سنبھالے ہوئے نیچے اترا۔ رحیم داد اور کریم بخش رادھانی بھی باہر آ گئے۔ ہر طرف پرہول سناٹا تھا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد سناٹے میں ایک طرف سے ڈھولوں اور پیپوں کی تیز آوازیں ابھریں۔

تینوں بھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتے ڈھولوں اور پیپوں کی آوازوں کی سمت بڑھے۔ وہ شاخوں سے الجھتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ اب کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھرنے لگی تھیں۔ مراد خاں شاہانی آگے آگے تھا۔ ایک مقام پر وہ ٹھہر گیا۔ ہاتھ اٹھا کر اس نے رحیم داد اور رادھانی کو بھی ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔

سامنے بھاڑی میں ایک سور دکھائی دیا تھا۔ مراد خاں نے اپنی چھوٹی رائفل اٹھا کر نشانہ باندھا اور گولی چلا دی۔ گولی سور کی ٹانگ میں لگی۔ وہ زخمی ہو کر بھاڑیاں جیرا تیزی سے ایک طرف بھاگا۔ مگر ذرا ہی دیر بعد ایک گھنے درخت کے تنے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ چوٹ کھا کر وہ زیادہ خونخوار ہو گیا تھا۔ وہ غراتا ہوا اپنے تیز اور نوکیلے دانت نکالے تینوں پر گولے کی مانند اچانک جھپٹا۔

زخمی کٹانے کا ایک پیرینڈلی سے ران تک جنگلی سور نے اپنے تیز اور خونخوار دانتوں سے چیر ڈالا تھا۔ زخم نہایت گہرا آیا تھا۔ ٹانگ کی چربی اور ہڈی تک نظر آرہی تھی۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ اس کے جسم کے نیچے خون ہی خون تھا۔ رحیم دادا سے دیکھ کر لرز گیا۔

مراد خاں نے زخمی کو فوراً پہچان لیا۔ وہ رادھانی سے مخاطب ہوا۔ ”رادھانی! یہ تو سینا ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم دادا کی جانب دیکھا۔ ”بہت دیر اور زبردست شکاری ہے۔ ایسا زبردست کہ سور جزی سے دوڑ کر حملہ کرنے کے لیے جھپٹے تو یہ بھاگنے کی بجائے اس سے ٹاکرہ لینے کے لیے دونوں ہاتھیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا۔ سور عام طور پر ٹانگوں ہی میں گھس کر حملہ کرتا ہے۔ سینا کا یہ کمال ہے کہ جیسے ہی سور ٹانگوں کے بیچ میں گھستا، یہ نہایت پھرتی سے اس کا پچھلا حصہ ٹانگوں سے دبا کر سوار ہو جاتا اور تیزی سے چاقو پیٹ میں گھسیڑ کر اسے چھیر پھاڑ ڈالتا۔“

رحیم دادا نے حیرت سے کہا۔ ”بہت زور آور اور جی دار لگتا ہے۔“

”میں نے اپنی آنکھوں سے کئی بار اسے اسی دلیری سے سور کا شکار کرتے دیکھا ہے۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”بہت خطرناک انداز میں شکار کرتا ہے۔ میں نے کئی بار منع بھی کیا ہے مگر یہ نہیں مانتا۔“ اس نے مردہ سور کی طرف اشارہ کیا۔ ”لگتا ہے“ اس کا شکار بھی سینا ہی نے کیا ہے۔ پر اس بار کچھ چوک ہو گئی۔ سور نے پھر کر اپنے دانتوں سے پوری ٹانگ چیر ڈالی۔ ”اس کے چرے پر پریشانی پھیل گئی۔ اس نے رادھانی سے کہا۔ ”رادھانی! خون بہت بہہ گیا۔ اس کی مزہم پی کے لیے کسی کو فوراً بلاور نہ یہ مرجائے گا۔“

رادھانی نے حکم ملتے ہی اونچی آواز سے چیخ کر ہانکا کرنے والوں کو پکارا۔ ذرا دیر میں کئی مسل اور کٹانے وہاں پہنچ گئے۔ ایک نے جھٹ پگڑی اتاری اور خون بند کرنے کی غرض سے اسے جلدی جلدی زخم پر پلینے لگا۔ دوسرے بھی زخمی سینا کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ انھوں نے کئی اور پگڑیاں لیں اور زخمی ٹانگ پر پلٹ دیں۔ خون بند ہو گیا۔ سب نے زخمی کٹانے کو ہاتھوں پر اٹھایا اور ایک طرف بڑھنے لگے۔ سینا اب بے سدھ ہو چکا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ جھولتے ہوئے ہاتھ بے جان نظر آرہے تھے۔ وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔

اس خوفناک حادثے کے باوجود شکار کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر جب دن ڈھلے سمجھو کے گھنے درختوں کے نیچے اندھیرا پھیلنے لگا تو شکار ختم کر دیا گیا۔ مراد خاں جیب کی جانب بڑھا۔ رحیم دادا اور رادھانی اس کے ساتھ تھے۔ ہانکا کرنے والے مراد خاں کے مزارعے اور کی ہی تھے۔ وہ بیگار پر

رادھانی نے فوراً گولی چلائی۔ لیکن نشانہ خطا کر گیا۔ مراد خاں نے جھٹ راتقل اٹھائی۔ اس کی انگلیوں سے پھسل کر نیچے گر گئی۔ سور منہ پھاڑے دانت نکالے بالکل سامنے تھا اور پتھر کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا۔ مراد خاں آگے تھا۔ وہ نہتا بھی تھا اور بالکل اس کی زد پر تھا۔ رحیم دادا سے پاس ۱۲ بوری بدوق تھی۔ اس نے نہایت پھرتی سے بدوق اٹھائی، نشانہ لیا اور جھٹ گولی چلا دی۔ نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ گولی سور کا ماتھا چیرتی پھاڑتی اندر اتر گئی۔ سور فوراً وہیں ڈھیر ہو گیا۔ لیکن پلک جھپکتے ہی سور کی مادہ نکلی۔ وہ بھی غراتی چیختی دانت نکالے تیزی سے جھپٹی۔ رحیم دادا نے اس پر بھی گولی چلا دی۔ اس دفعہ بھی نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھا۔ وہ بھی گولی کھاتے ہی گر کر ترپنے لگی۔

سور اور اس کی مادہ چند گز دور کچڑ میں پڑے دم توڑ رہے تھے۔ تینوں چند لمحے انھیں سکتے اور ترپتے دیکھتے رہے پھر مراد خاں ہنستا ہوا آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے رحیم دادا کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اس کی پیٹھ تھک کر بولا۔

”جو ہداری! تو نے تو آج کمال کر دیا۔ ایسا سچا نشانہ لگایا کہ دل خوش کر دیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا تو اتنا زبردست شکاری ہے۔“

رحیم دادا کچھ نہیں بولا۔ صرف مسکرا کر رہ گیا۔ لیکن مراد خاں بہت مسرور تھا۔ رادھانی نے بھی رحیم دادا کے نشانے کی تعریف کی۔ اسی اثناء میں ہانکا کرنے والے اور دوسرے شکاری بھی گولیوں کی آوازیں سن کر پہنچ گئے۔ مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ اس نے جھک کر اپنی راتقل اٹھائی۔ رحیم دادا اور رادھانی کے ہم راہ اس طرف بڑھا جس طرف سے کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

تینوں نے چونک کر دیکھا، کچھ فاصلے پر سوروں کا ایک غول جھاڑیوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ وہ کتوں کے زور سے نکل کر بھاگے تھے۔ تینوں نے بھاگتے ہوئے سوروں پر تابڑ توڑ گولیاں چلائیں۔ دو سور فوراً گر کر ترپنے لگے۔ غول کے بقیہ سور گھنی جھاڑیوں میں گھس کر آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جھک جھک کر ادھر ادھر دیکھنے پر بھی نظر نہیں آئے۔

مراد خاں، رحیم دادا اور رادھانی آگے بڑھے۔ گھنی جھاڑیوں سے گزر کر کھلی جگہ پہنچے تو خوف ناک منظر سامنے تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہانکا کرنے والا ایک شکاری کٹانا خون میں لت پت پڑا تھا۔ تینوں نے جھپاک سے اس کے قریب پہنچے۔ وہ تکلیف سے گردن ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک شکاری چاقو دبایا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ایک سور بھی خون میں ڈوبا بے جان پڑا تھا۔ اس کا پیٹ پھٹا ہوا تھا، آنتیں باہر نکل آئی تھیں۔

لگائے گئے تھے۔ کوئی اور ان کے شکاری کتوں کے ساتھ وہ بستی کی طرف چلے گئے۔ جیب کے قریب پہنچ کر رادھانی نے مراد خاں اور رحیم داد کو تھمراس سے ایک بار پھر چائے پلائی۔ اس دفعہ چائے کے ساتھ پلیٹوں میں بھنا ہوا گوشت اور بسکٹ بھی تھے۔

تینوں جیب میں سوار ہوئے۔ شاہانی نے جیب اشارت کی۔ جیب اوچھڑے نکل کر بستی میں پہنچی۔ مگر شاہانی وہاں نہیں ٹھہرا۔ وہ اس سالہ کے پاس بھی نہیں رکا جس میں ہانکا کرنے والوں اور کوئیوں کے علاوہ زخمی سینا بھی پڑا تھا۔ شاہانی نے نہ زخمی کا حال پوچھا اور نہ ہی اس کے بارے میں رحیم داد اور رادھانی سے کوئی بات کی۔ ویسے اس کے لیے یہ کوئی نیا یا انوکھا حادثہ نہیں تھا۔ سور کے شکار میں پہلے بھی ایسے کئی واقعات پیش آچکے تھے۔ ان حادثات کے نتیجے میں دو ہانکا کرنے والے زخمی ہو کر ہلاک بھی ہو چکے تھے۔



جیب ہچکولے کھاتی کچے راستے پر دوڑتی رہی اور جب ہموں والی میں داخل ہوئی تو سورج مغرب کے اندھیرے غار میں اتر چکا تھا۔ اس کی الوداعی کرنیں درختوں کی اونچی اونچی شاخوں پر دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کمر میں لپٹی ہوئی سرد شام آہستہ آہستہ فصائیں گھسکتی جا رہی تھی۔ شاہانی اور رحیم داد جیب سے اتر کر حویلی کے اندر چلے گئے۔ رادھانی باہری ٹھہرا رہا۔

رحیم داد بہت تھک گیا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور کرسی پر بڑھال ہو کر نیم دراز ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ملازم نے غسل خانے میں گرم پانی کی بالٹی رکھ دی۔ رحیم داد نے گرم پانی سے غسل کیا۔ اگلے کپڑے پہنے اور حویلی کی بیٹھک میں پہنچ گیا۔ مراد خاں شاہانی ابھی تک نہیں پہنچا تھا مگر رحیم داد کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ شاہانی نہادھو کر اور صاف ستھرا لباس پہنے چند ہی منٹ بعد آگیا۔ اس کے چہنچہ ہی بوتل اور گلاس بھی آگئے۔ دو بڑی بڑی تھالیوں میں تلے ہوئے مرغ بھی میز پر رکھ دیئے گئے۔ فوراً اپنے پلانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

شاہانی نے دو گلاس چڑھانے کے بعد تیسری بار گلاس بھرا اور رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! میں آج زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔“ اس نے ہلکا-تھکے بلند کیا۔ ”پولانی میرا انتظار کر رہی ہے۔ ادھر آتے ہوئے میں نے اسے دیکھا تھا۔ ایسی بوڑا اور پوٹ لگ رہی تھی کہ طبیعت ایک دم پھڑک اٹھی۔ جواب نہیں اس کا۔“

”یہی گل تو کل رات سلحری کے بارے میں کہہ رہا تھا۔“

”وہ کچھ اور چیز ہے۔“ شاہانی ہنس کر بولا۔ ”’سچ بتا‘ ہے کہ نہیں؟“

رحیم داد نے نشے میں جھوم کر بے ساختہ کہا۔ ”دل کی بات پوچھ تو سلحری مجھے بھی پسند ہے۔“ جب ہی آج صبح تو اسے مٹھارے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”وہ ٹھنھا مار کر ہنسنا۔“ میں تاڑ گیا تھا کہ طبیعت سلحری پر آگئی ہے۔ وہ رن ہی ایسی پھڑکتا دار ہے۔“

”تیرے پاس تو پولانی رہے گی۔“ دل کی بات رحیم داد کی زبان پر آگئی۔ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”مری تو آج رات خالی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ شاہانی نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ”صاف گالہ کر۔ تو چاہتا کیا ہے؟“ ”تیری مرضی جانا چاہتا ہوں۔“ رحیم داد نے شاہانی سے نظریں نہیں ملائیں۔ قاب سے مرغ اٹک اٹھا کر گوشت دانٹوں سے نوچنے لگا۔

”چوہدری! سلحری کی گالہ نہ کر۔“ شاہانی اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ”سلحری کے معاملے میں بے کئی یار مجھ سے زراض ہو گئے۔ ڈیرہ غازی خاں کے تھن دار سر بلند خاں دریشک سے تو ایسا پیدا ہوا کہ اب تک اس سے بول چال بند ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”وہ میری ہے۔ ایسی چند جانی ہے کہ میں اسے کسی کے پاس نہیں جانے دیتا۔ تینوں پتہ نہیں سولہ سال اوپر ہو گئے۔ وہ میرے پاس ہے۔ پر اس سے کبھی میرا دل نہیں بھرتا۔ سچ پوچھ تو میں اسی کے ہموں والی آتا ہوں۔ وہ اس حویلی کی جان ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ شاہانی نے ایک اور بڑا گھونٹ بھرا۔ رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ ”چوہدری! میں تیرے پاس کسی دوسری پھڑک دار اور پوٹ رن کو بھجوا دوں گا۔ حویلی میں کئی زور اور سوہنری رنان موجود ہیں۔ تیرا جی خوش ہو جائے گا۔“ اس نے نشے میں لہرا کر تقہہ لگایا۔

”لنہ کر۔ اپنی پسند تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ ”پہلے بھی میں نے کب تجھ سے اپنی پسند کی گل کی۔ سلحری کی بات تو ایسے ہی نکل آئی۔“ رحیم داد کا لہجہ دھیمہ اور بجا ہوا تھا۔ ”تو میری بالکل فکر نہ کر۔ کسی کو میرے پاس بھیجنے کی ضرورت نہیں۔“

”اپنی حویلی میں اکیلا ہی سوتا ہوں۔ مدت ہو گئی اس طرح سوتے ہوئے۔“ ”لگتا ہے تو بھی زراض ہو گیا۔“ شاہانی نے رحیم داد کی افسردگی اور دبا دبا احتجاج محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سلحری بہت ظالم رن ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیشہ یار دوستوں سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔“

”پر اس معاملے میں مجھ سے تیرا کوئی بگاڑ پیدا نہیں ہو گا۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”تو میرا یار ہے اور سدا یار رہے گا۔ اول تو میں کسی سے یاری کرتا نہیں اور جب کرتا

ہوں تو جی جان سے کرتا ہوں۔ ابھی تو میرا اور تیرا نیا نیا معاملہ ہے۔“ اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ”آگے تو خود دیکھ لے گا۔ میں خالی پیلی گلاں نہیں کرتا۔“

”میرے دل کی بات جاننا چاہتا ہے تو سن لے۔“ مراد خاں شاہانی نے ایک ہاتھ سے اپنا سیر تھکتے ہوئے کسی قدر جوشیلے لہجے میں کہا۔ ”میرا رب جانتا ہے، میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”چوہدری! میرا کوئی بھائی نہیں۔ سچ کہتا ہوں، تجھے اپنے چھوٹے بھائی سلاں پار کرتا ہوں۔ ویسے بھی تو بہت چنگا بندہ ہے۔“ اس نے شراب کی چسکی لگائی۔ ”اور آج تو تو نے کمال ہی کر دیا۔“ مراد خاں نے حملہ آور سوہ کا حوالہ دیا۔ ”باہر والا مجھ پر کیسا دانت نکال کر جھپٹا تھا۔ تو نے دیکھا نہیں، میری رائفل ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی تھی اور میں بالکل اس کے سامنے تھا۔ تیرے گولی چلانے سے میں بال بال بچ گیا ورنہ میں بھی سینا کی طرح زخمی پڑا ہوتا۔“

”ایسی گل نہ کر۔“ رحیم داد نے انکار سے کام لیا۔ ”میں نے کیا کمال دکھایا۔ شکار میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔ تو تو پرانا شکاری ہے۔ ایسے حادثے تو نے شکار میں بہت دیکھے ہوں گے۔“

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ چپ بیٹھا دانتوں سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچ نوچ کر کھاتا رہا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ خالی گلاس میز پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”چوہدری! اب میں چلوں گا۔ تو بھی اپنا گلاس ختم کر۔“

رحیم داد نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔

”چوہدری! تو اپنے کمرے میں جا۔“ مراد خاں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ”سلمی تیرے پاس پہنچ جائے گی۔“

”رہنے دے شاہانی۔“ رحیم داد نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”سلمی کی گل تو پہلے ہی ختم ہو گئی۔“

”بکو اس نہ کر۔“ سردار شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کو پیار سے ڈانٹا۔ ”سلمی آج رات تیرے ہی پاس رہے گی۔“ وہ نشے سے جھوم کر ڈنگ گیا۔ ”یوں سمجھ یہ تیرے سچے نشانے کا انعام ہے۔ اب تو جا۔“ شاہانی لڑکھڑاتے قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رحیم داد بھی بیٹھک سے نکلا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ تھکا ہوا سا کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔

چند منٹ بعد دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے بے تاب ہو کر پہلو بدلا۔ مگر وہ سلمی نہیں تھی بلکہ کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے کھانا میز پر رکھ دیا اور دبے قدموں واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے کھانا نہیں کھایا۔ اشتہا ہی نہیں تھی۔ اس نے اپنی پگ اتار کر کھونٹی پر لٹکائی۔ جوتے اتارے اور پسینے

ہمیا۔ اس نے رضائی اٹھا کر سینے پر ڈال لی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ لیکن نہ کوئی آہٹ نہ آواز نہ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ رحیم داد جاگ رہا تھا اور بستر خاموش لیٹا تھا۔ مگر وہ زیادہ جی چھین سے نہ لیٹ سکا۔ اس نے کروشلی، بے قرار ہو کر اٹھا اور تکیے کے سارے اونچا ہو کر بیٹھا۔ وقت گزرتا رہا۔ پانچ منٹ گزرے، دس منٹ گزرے، آدھ گھنٹہ گزر گیا۔ کمرے میں لیپ ٹن تھا۔ اس کی زرد زرد روشنی درودیاور پر پھیلی تھی۔

رحیم داد نے کئی بار بے چینی سے پہلو بدلا پھر پٹنگ سے اترا، سیلبر پنے، لیپ کی طرف بڑھا، بٹ گیا، ہاتھ بڑھایا، ٹھنکا اور ہاتھ کھینچ لیا۔ لیپ کی لوہم نہیں کی، واپس آیا اور بستر کے بجائے چھاپ ایک بار پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ رات اور سنسان ہو گئی۔

گھنٹہ بھر سے زیادہ وقت گزر گیا۔ دروازہ بدستور بھڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری، اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر سویا نہیں۔ اسی عالم میں اس نے کمرے، باہر چھاپ سنی۔ چھاپ دھیرے دھیرے قریب آتی گئی۔ دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے آنکھیں دل دیں۔ دیکھا، سلمی، سلمی دہلیز پر کھڑی ہے۔ اس نے زیر لب مسکرا کر رحیم داد پر ایک نظر ڈالی، لی دروازہ بند کیا اور کٹدی چڑھا دی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی رحیم داد کی جانب بڑھی۔ اس کے روبرو تیرے مانند تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سرخ دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی۔ چولا ڈھیلا الا اور سفید تھا مگر منجھلی کے بجائے وہ گھگھرا پنے ہوئے تھی جس پر سرخ اور سیاہ گل بوٹے، آنکھوں میں دنبالہ کا جل تھا۔ ناک میں بڑا سا کو کا تھا۔ ہونٹ گہرے گلابی تھے۔ چہرے پر نکھار، گھٹنگی تھی۔ وہ خوب جج دجج کے ساتھ آئی تھی۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ابھی ابھی مار کیا ہے۔ رحیم داد نے اسے بے قرار نظروں سے دیکھا اور ٹکنکی باندھے دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر گیا، مسکرا کر بولا۔ ”کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا سلمی۔“

”تو نے مجھے بلا ہی لیا۔“ سلمی نے گردن ترچھی کی اور مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”سین بڑی! تو بہت نکھا اور زور آور ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے گھگھرے کا گھیر سنبھالا۔ لچکتی لکھائی آگے بڑھی اور پاؤں لٹکا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ چند لمحے خاموش رہی پھر مسکراتے ہوئے بڑے سے بولی۔ ”سردار مجھے کسی کے پاس جانے نہیں دیتا۔ تیری گالہ اس نے کیسے مان لی۔ یہ بھید نہیں آیا۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بتا، تو نے دیر کیوں لگا دی؟“ اس نے ٹکنکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”سردار نے روک لیا ہو گا؟“

بھی اسی نے خون کیا۔“ سلطہی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے تانبہ چہرے پر دکھ کا ہلکا ہلکا غبار بکھر گیا۔ ”ہوایہ کہ باتو ایک اندھیاری رات کو اٹھ پر بٹھ کر بیل سے ادھر آیا۔ اس نے اٹھ ڈھانڈلے کی حویلی کی دیوار سے لگایا، کود کر اندر پہنچا۔ وہ مجھے لینے آیا تھا۔ بہت جی دار اور دلیر تھا“ ذرا بھی نہ ڈرا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔“

”سب ہی تجھے پیار کرتے ہیں۔“ رحیم دادنٹے میں لہرا کر بولا۔ ”تو ہے بھی تو کتنی سوہنی۔“ وہ بڑھکڑا کر فوراً سنبھل گیا۔ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ”اب آگے کی سنا۔“

”ہاتو حویلی کے اندر پہنچا تو سردار منصور ڈھانڈلے کو کسی طرح اس کے آنے کا پتہ چل گیا۔“ سلطہی نے رحیم داد کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ”ہاتو پڑھتی میں میرے پاس کھڑا تھا اور مجھے اپنے سنگ لے جانے کے لیے گھات میں تھا۔ پر جیسے ہی ہم دونوں حویلی سے نکلے، دیکھا، سامنے ڈھانڈلہ کھڑا ہے۔ اس کے کئی کندے بھی موجود تھے۔ انھوں نے جھپٹ کر ہاتو کو دبوچ لیا۔ مجھے بھی پکڑ لیا۔ سردار نے مجھے تو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا اور ہاتو کو اپنے سنگ لے گیا۔ وہ اتنا گنے میں تھا کہ صبح بھی نہ ہونے دی۔ رات ہی کو ہاتو پر اپنے شکاری کتے چھوڑ دیئے۔ کتوں نے چھیر بھاڑ کے اسے ختم کر دیا۔ اس کی کئی پھٹی لاش میرے پاس کوٹھڑی میں بھجوا دی۔“

”اس کی لاش دیکھ کر تمیں نوں بہت دکھ ہوا ہوگا۔“

”سین! یہ بھی بتانے کی گل ہے؟“ سلطہی کا چہرہ اور افسردہ ہو گیا۔ ”ہاتو کے ساتھ میرا پرانا ہوا تھا۔ وہ پیو کے گھر سے میکیوں ودا کر کے لایا تھا۔ میرے پتر کا پیو تھا، بہت جڑیا اور گھرو جوان تھا۔“ ”ایسی بات تھی تو سوتے میں کسی رات چھری سے ڈھانڈلے کا گلا کاٹ دیتی۔“ رحیم داد نے سردار منصور خاں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

”تو کیسی گالہ کر رہا ہے سین!“ وہ حیران و پریشان ہو کر بولی۔ ”میں ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ سردار منصور بہت جڑیا اور زور آور تھا۔“ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ ”ظالم اور خونی اتنا زبردست تھا کہ ایک بار تو اپنے سکے بھائی کا اس نے خون کر دیا تھا۔ ویسے اس کا بھائی بھی سردار تھا اور زور آور بھی تھا۔ اس کا ناں محمود خاں ڈھانڈلہ تھا۔ وہ بھی بہت ٹھری اور رن ریا تھا۔“

”وہ بھی تجھے پیار کرنے لگا تھا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ایسی ہی گالہ تھی سین!“ سلطہی نے گردن ہلا کر اعتراف کیا۔ ”وہ بھی مجھے پیار کرتا تھا۔ رات کے اندھیارے میں چھپ چھپ کر میرے پاس آتا۔ ایک رات وہ میری کوٹھڑی میں تھا۔“

”نا سین!“ وہ گردن ہلا کر بولی۔ ”وہ تو پولانی کے پاس ہے۔“

”پر وہ تجھے چاہتا بہت ہے۔“ رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ ”تجھ میں ایسی کیا بات ہے جو وہ تجھ کو چاہتا ہے؟“

”پتہ نہیں سین!“ سلطہی نے نظریں جھکا کر شرمائے کی کوشش کی۔ ”پر میں بھی اسے اتنا ہی پیار کرتی ہوں۔ برسوں سے اس کے ساتھ ہوں۔“ اس نے گردن اونچی کی۔ ”اس حویلی میں مجھے بیس سال تو ہو گئے ہوں گے۔“

”بیس سال۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”جب تو یہاں آئی ہوگی شاہانی تب چھوہرا ہوا ہوگا۔ تو اس سے عمر میں زیادہ تو نہیں لگتی۔“

”نا سین! میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہوں گی۔“ سلطہی انکار نہ کر سکی۔ ”سردار کو بھی اس کا پتہ ہے۔“ رحیم داد کا تجسس اور بڑھا۔ اس نے کیرید کر پوچھا۔ ”صاف بتا۔ تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“ ”تو سمجھ بھی نہیں سکتا۔“ وہ شونی سے مسکرائی۔ ”تب وڈا سردار نجیب خاں زندہ تھا۔“ سلطہی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”میں پہلے اسی کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بہت ڈاڈھا اور زور آور سردار تھا۔ کھرا بلوچ۔ یہ وڈی اس کی داڑھی تھی۔“ سلطہی نے ہاتھ پھیلا کر بتایا۔ ”تیری داڑھی اس کے آگے کچھ نہیں۔ وہ بہت رن ریا تھا۔ جو سوہنڑی اور پوہٹ رن نظر آتی اٹھوا کر حویلی میں ڈال لیتا۔ روزی نئی نویلی رن اٹھواتا تھا۔“

”تجھے بھی اس نے اٹھوایا تھا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”میرا مطلب ہے، مراد خاں کے پتر سردار نجیب خاں نے تجھے اٹھوا کر اپنے پاس رکھا ہوا تھا؟“

”نا سین!“ سلطہی نے فوراً وضاحت کی۔ ”اس کا مرن ہو گیا۔ مجھے اس کے پیچھے جھوٹ نہیں بولنا۔ مجھے تو منصور خاں ڈھانڈلے نے اٹھوایا تھا۔ وہ بھی بیٹ کا بہت وڈا سردار تھا۔ میں ان دنوں بیل میں ہوتی تھی۔ میرا پرانا ہو چکا تھا۔ میرا گھرو والا تھا۔ اس کا ناں ہاتو تھا۔ وہ جوال تھا۔ اپنے انڈ پر مال اسباب لاد کر دور دور لے جاتا تھا۔ اس کے پاس دو اٹھ تھے۔ ٹھیک ٹھاک گزر بسر ہوتی تھی۔ اس سے میرا ایک پتر بھی ہوا۔“

”پر تجھے تو ڈھانڈلہ سردار نے اٹھوایا تھا۔“ رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”تو یہی بتاؤ تھی نا؟“

”وہ ایسا ہوا سین! سردار منصور نے جب مجھے اٹھوایا تو میں اس کی حویلی میں لگ بھگ سال رہی۔ ویسے وہ بھی مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ پر بہت ظالم اور خونی تھا۔ اس نے بہت خون کئے۔“

منصور کو پتہ چل گیا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اسے میرے ساتھ دیکھ کر گئے سے پاگل ہو گیا۔ بھری ہوئی ر۔ غل اس کے ہاتھ میں دبلی تھی۔ اس نے ہم دونوں پر گولی چلا دی۔ میں تو صاف بچ گئی۔ پر ایک گولی محمود خاں کے کندھے میں اتر گئی۔ منصور نے تو اپنے تئیں اس کا خون کر ہی دیا تھا پروہ مرا نہیں۔ گھاؤ زیادہ گہرا نہیں تھا۔

”بہت ہنگامہ اور رولا پڑا ہو گا؟“

”مجھے تو سس اتنا پتا ہے کہ جھگڑا دونوں بھائیوں کا تھا پر میں شامت دی مارا ڈھانڈلوں کی نظروں میں بھوت بلا بن گئی۔“ سلحرمی نے بچھے ہوئے لہجے میں آگاہ کیا۔ انھوں نے مجھے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گھسیٹا۔ بہت مارا پیٹا۔ بدن پر ہر جگہ چوٹ آئی پر میں نے کچھ نہیں کہا۔ کوٹھڑی میں ایک پڑی درد سے بلکتی رہی، روتی رہی۔ ادھر ڈھانڈلوں نے طے کیا کہ مجھے حویلی سے نکال دیا جائے۔

”اس طرح تجھے اپنے گھر جانے کا موقع تو مل ہی گیا ہو گا؟“

”ایسا نہیں ہوا سس! سردار منصور مجھے چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ تب ڈھانڈلہ تمہن نے جرمہ بلایا۔ جرمے میں خاندان والے ہی بیٹھے۔ کوئی مکدم یا معتبر نہیں بیٹھا۔ جرمے نے مجھے حویلی سے نکالنے کا فیصلہ کیا پر منصور نے مجھے مایہو کے پاس نہیں جانے دیا۔ وہ تب تک زندہ تھے۔ اس نے مجھے ہو ہزار میں سردار نجیب خاں کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس طرح میں اس حویلی میں آگئی۔“

”تو اس حویلی میں تو اس طرح آگئی۔“ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ ”پر مراد خاں تیرے ساتھ کیسے لگ گیا؟“

”سس! اب تجھ سے کیا چھپانا۔ اس کے بیوہ سردار نجیب ہی نے لگایا تھا۔“ سلحرمی نے حیکے لہجے میں بتایا۔

”سردار نجیب نے لگایا تھا؟“ رحیم داد نے حیرت سے چونک کر سوال کیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”بس ایسے ہی جیسے کہہ رہی ہوں۔“ سلحرمی نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ”میں سردار نجیب کے پاس لگ بھگ تین سال رہی۔ ان دنوں مراد خان لہور میں پڑھتا تھا۔ رہتا بھی وہیں تھا۔ چشتیوں میں صرف بھکر آتا تھا۔ ہموں والی کبھی نہیں آیا تھا۔ کم سے کم میں نے تو اسے ان دنوں نہیں دیکھا۔ فیہا ہوا سس کہ مراد کے پرانے کی بات چلی۔ تب وہ ستارہا اٹھارہ برس کا رہا ہو گا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ ”انھی دنوں وہ پہلی بار میرے سامنے ہموں والی آیا۔ سردار نجیب بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ حویلی میں مراد خان کے رہنے کے لیے علیحدہ کمرے میں بندوبست کیا گیا۔“

”یہی کمرہ ہو گا جس میں وہ آج کل ٹھہرا ہوا ہے؟“

”ہی سس! وہ سدا اسی کمرے میں ٹھہرتا ہے۔“ وہ رحیم داد کو صاف گوئی سے سب کچھ بتاتی۔ ”مراد خان کو ہموں والی میں آئے ہوئے دوسرا یا تیسرا روز تھا کہ ایک شام سردار نجیب نے بلایا کہنے لگا، سلحرمی! تینکوں پتہ ہی ہے۔ مراد کا پرنا ہونے والا ہے پر وہ بالکل بھولا ہوا ہے۔ رن بارے میں اسے کچھ اتنا پتا نہیں۔ تو آج رات اس کے ساتھ سوا اور اسے سب کچھ سمجھا دے۔“ وہ اپنی بات کتے کتے شرمائی۔ دھیسے لہجے میں بولی۔ ”وڈے سردار کے حکم پر میں رات کو دکان کے کمرے میں گئی اور اس کے ساتھ سوئی۔“

”تو یہ گل ہے۔“ رحیم داد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ ”یہ کیوں نہیں کہتی اس لائن پر تو نے مراد کا لگایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”نا سس! ایسی گالہ بالکل نہیں۔“ سلحرمی نے فوراً انکار میں گردن ہلائی۔ ”وہ ایسا بھولا ہوا نہیں جیسا اس کا بیوہ سمجھتا تھا۔ وہ پہلے ہی سے سب کچھ جانتا تھا۔ لہور میں کنبڑیوں کے پاس جاتا رہتا۔“ وہ کھکھلا کر ہنسنے لگی۔ ”ہیرا منڈی کی کنبڑیوں نے اسے ایک دم فروٹ بنا دیا تھا۔ یہ گالہ ہانے مجھے خود بتائی تھی۔“

”یہ بتا اس رات کے بعد مراد خان بعد میں بھی تیرے پاس آیا؟“ رحیم داد نے دلچسپی سے دریافت کیا۔

”بالکل آتا رہا۔ پرنا ہو گیا تب بھی آتا رہا۔“ سلحرمی نے رمان سے کہا۔ ”وڈے سردار سے پچھپ کر میرے پاس آتا تھا۔“

”نردار نجیب خاں کو بالکل پتہ نہ چلا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”کچھ ہی دنوں بعد اسے پتہ چل گیا تھا۔“ سلحرمی نے انکشاف کیا۔ ”مجھ پر وہ بہت نراض ہوا پر دکان سے کچھ نہیں بولا۔ وہ اس کا اکلوتا پتر تھا۔ بہت لاڈلا بھی تھا۔ پہلے تو اس نے گسے میں کئی میری مار کٹائی بھی کی۔ فیہا ایک روز اپنے یار سردار سکندر خان کھوسہ کے پاس راجن پور بھیج مجھے اس کے حوالے کر کے اسے دکھ بھی ہوا۔ وہ مجھے بہت چاہتا تھا۔ اس سے میری ایک کٹی پیدا ہوئی پر وہ کچھ ہی مہینوں بعد مر گئی۔ سردار نجیب خان بھی زیادہ دن زندہ نہ رہا۔ میرے ان پور جانے کے سال ہی بھر کے اندر اندر اس کا مرنا ہو گیا۔“

”تو کھوسہ سردار کے پاس راجن پور میں ہوتی تھی دوبارہ یہاں کیسے آگئی؟“ رحیم داد نے مسکرا کر ایک بار پھر چھیڑا۔ ”کھوسے کے گھر میں بھی تیری وجہ سے جھگڑا کھڑا ہو گیا ہو گا۔“

”ایسا جھگڑا کھڑا تو ہوا تھا۔ سردار سکندر خان کا ایک چاچا بھی مجھ سے چپکے چپکے پیار تھا۔ وہ تو زبردست ٹھکر کیا تھا۔ ادھڑکھڑا تھا پر ایسا رن ریا کہ تجھے کیا بتاؤں۔ وہ مجھے اٹھوا کر اپنا تڑپ میں لے جانا چاہتا تھا۔“ سلطہی مسکرا مسکرا کرتی رہی۔ ”پر چاچا حشر سب سے کا جھگڑا زیادہ پیڑھ نہیں پایا۔ ہوا یہ کہ سردار نجیب کے مرن کے کچھ ہی مہینے بعد مراد خان مجھے واپس لینے سردار مراد خان کھوسہ کے پاس پہنچا اور تین ہزار روپے دے کر مجھے راجن پور سے لے آیا۔ تب سے میں مراد خان کے پاس ہوں۔ اس حویلی سے اب تک کہیں نہیں گئی۔“



سلطہی کے چہرے پر باتیں کرتے ہوئے بار بار مختلف تاثر اہویدا ہوتے۔ کبھی اس کا چہرہ بچہ جی، کبھی دکنے لگتا۔ اسے ماضی کے ہنگامے بیان کرنے میں یکسوئی حاصل ہو رہی تھی۔ رحیم داد پر اپنی اہمیت جتانے کا بہانہ مل گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ صاف گوئی سے ایک ایک تفصیل بتاتی رہی۔ رحیم داد نے گفتگو بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”ایک گل تو بتا۔ تیرا نام سلطہی کیوں ہے؟ سلطہی؟“ سیدھی سادھی گلو کو کہتے ہیں۔ ”رحیم داد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”تو کسی طرف سے سیدھی سادھی نہیں لگتی۔“

”میں جب چھوٹی سی ٹکی تھی تو بہت بھولی بلی تھی۔“ وہ نظریں جھکا کر شرماتے ہوئے بولی۔ ”لال نے اسی لیے میرا نام سلطہی رکھ دیا۔ وہ مجھے یہی بتاتی تھی۔“

”تو کچھ ہی کے پر تو سلطہی تو ہرگز نہیں لگتی۔“ رحیم داد بدستور ہنستا رہا۔ ”تو تو امرتیل ہے۔ ایک بار جس سے لگ جائے فیروہ تیرے پیچ سے نہیں نکل سکتا۔ تجھ میں بات ہی ایسی ہے۔“ اس نے چپھتی ہوئی نظروں سے سلطہی کو دیکھا۔ ”تو نے کبھی یہ بھی سوچا، تیرے اتنے چاہنے والے کیوں ہیں؟“

”میکوں کیسے پتہ؟“ وہ بڑے ناز سے بولی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری اور سلطہی کا چہرہ نکلنے لگا۔ سلطہی کا چہرہ ہلکی ہلکی مسکراہٹ سے نکھر کر اور شگفتہ ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں کلمشاں اتر آئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اٹھال لی۔ سرخ دوشالہ ڈھلک کر نیچے گر گیا۔ اس کے سینے پر لہرس اٹھنے لگیں۔ رحیم داد کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا ہو گئی۔ وہ بے قرار ہو گیا۔

صبح تاروں کی چھاؤں میں سلطہی اٹھ کر جانے لگی تو رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ رسان سے بولا۔ ”سلطہی تو جا رہی ہے!“ سلطہی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکراتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”جی سس!“ وہ آگے بڑھی۔ دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔

شام، کمرے کی چادر اوڑھ کر روز بہ روز دھندل ہوتی جا رہی تھی۔ تیز اور چٹکیلی دھوپ کی زت کم ہو گئی۔ راتیں طویل اور سرد ہو گئیں۔ رحیم داد ہموں والی میں ٹھہرا رہا۔ سردار مراد خان دے اسے واپس کو ملد ہر کشتن جانے نہ دیا۔

سلطہی دوبارہ رحیم داد کے کمرے میں نہ آئی۔ تہائی میں بھی مٹھ بھینٹ نہیں ہوئی۔ نہ بات چیت، نہ نوت آئی۔ نظر بھی آتی تو اپنے پچھلے الجھے جسم کو لراتی ہوئی بے نیازی سے گزر جاتی۔ رحیم داد جانب مطلق توجہ نہ دیتی۔ مگر وہ جتنا نظر انداز کرنے کی کوشش کرتی رحیم داد اس کے لیے اتنا ہی بے قرار ہوتا جا رہا تھا۔ ان دنوں اس کے ذہن پر سلطہی سادوں کی گھٹائیں کر چھائی ہوئی تھیں۔

رحیم داد نے مراد خان کو ٹھولا۔ باتوں باتوں میں سلطہی کا ذکر کئی بار چھیڑا۔ لیکن اس نے حوصلہ ڈالنے نہ کی، صاف ٹال گیا۔ ویسے وہ اپنی زمیں داری کے بکھیرؤں میں کچھ زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ دل والی میں اس کے قیام میں اسی باعث اضافہ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ربیع کی فصل پر بہت توجہ دے رہا تھا۔ اس دفعہ وہ زیادہ بڑے رقبے پر گندم کی بوائی کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے جھنگر پر پتھر بھی صاف کرانے شروع کر دیے تھے۔ یہ زمین وہ قابل کاشت بنانا چاہتا تھا، کھیتی باڑی کے لیے آؤ، سینے اور نکلے درست کرانے اور ایسی ہی دوسری مصروفیت میں گزر جاتا۔ سورج

مراد خان نے اپنی ان سرگرمیوں میں رحیم داد کو بھی شریک کر لیا تھا۔ وہ اسے اپنے ہم راہ ناشتے کے بعد لے جاتا۔ دن کھیتوں کے درمیان ادھر ادھر گھومنے، مزارعوں کو ڈانٹنے ڈپٹنے، فصل کی آب ٹپ کے لیے آؤ، سینے اور نکلے درست کرانے اور ایسی ہی دوسری مصروفیت میں گزر جاتا۔ سورج

ہ قافلے کی صورت میں گاؤں سے نکلیں۔ ایک اونٹ پر نقاروں کی جوڑی سمیت میراثی سوار اس کا اونٹ سب سے آگے تھا جس کی مہار ایک جتوال سنبھالے ہوئے تھا۔ دوسرے تمام نٹ اور اونٹیاں پیچھے پیچھے تھیں۔ ان کے گھنٹوں پر پہنٹے بندھے تھے جن کے گھنگھرو ٹخنوں میں لٹ جھانجروں کے ساتھ بجتے تھے، جھکارتے تھے۔ گلوں میں گانیاں تھیں اور سروں پر بندھے گئے موروں کے پھندوں کے ساتھ ساتھ موتیوں اور کوڑیوں کی جھالیں ادھر ادھر جھول رہی ہیں، لہرا رہی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کے مانند اونٹ اور اونٹیاں بھی خوب جی ہوئی تھیں۔ چند نٹوں پر جتوالوں اور ساربانوں کے ساتھ بین بجانے والے بھی بیٹھے تھے۔

قافلہ روانہ ہوا تو میراثی نے نقارے پر چوٹ لگائی۔ بین بابے والوں نے نقارے کی گت پر ایک بل دھن چھیڑی۔ میراثی کے اونٹ سے بھی آگے نوجوانوں کی ٹولی تھی۔ وہ ریشمی کرتے پہنے گئے تھے۔ سروں پر پگڑیاں بندھی تھیں۔ ان کے منظر بھی ریشمی اور رنگین تھے۔ قافلے کی راگی سے پہلے انھوں نے بھنگ اور ساوی دبا کے پی تھی۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ٹہ سے جھوم جھوم کر اپنے مضبوط اور کھے جسموں کی نمائش کر رہے تھے اور بلوچوں کا ایک نیم جھمرناچ رہے تھے۔

رقص کرنے والے نوجوانوں کے درمیان ڈھولیا تھا۔ وہ گلے میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور زور سے چوٹ لگا کر ٹانپنے والوں کو لگا رہا تھا جو اس کے چاروں طرف دائرے میں ہاتھوں اور پیروں کی لڑائی کے ساتھ لہک لہک کر رقص کر رہے تھے۔

اونٹ ایک قطار میں کچے راستے پر بچکولے کھاتے، گردوغبار کے بادل اڑاتے قافلے کی صورت میں دیرے دیرے آگے بڑھ رہے تھے۔ ان کے گلوں میں لگتی گھنٹیاں اور گھنگھرو اور پیروں میں ہٹی ہوئی جھانجھریں نوجوانوں کے رقص کے ساتھ بج رہی تھیں، جھکارتی رہی تھیں۔ عورتیں اور بچے خوشی سے تھمتے لگا رہے تھے، چمک رہے تھے، اونچی آوازیں سے بول رہے تھے۔ رقص کرتے کرتے ایک نوجوان نے کان پر ہاتھ رکھ کر لمبی اور اونچی تان لگائی۔ اور اپنے علاقے کا ایک عوامی نغمہ گیت چھیڑا۔

رکھال میں امید ماہی دے ملن دی

مکہ وی دور ہے

ونجنال ضرور ہے

حسن حسین دے مانگے

غروب ہوتا تو مراد خاں اور رحیم داد طلوع ہوتے۔ نما دھو کر تازہ ہوتے، صاف ستھرے لباس پہنتے اور شغل بادہ نوشی کرتے۔

حویلی میں نئی نئی نوجوان عورتیں اور لڑکیاں اٹھا کر لائی جاتیں۔ کسی کو رکھ لیا جاتا، کسی کی قہر وصول کر کے واپس کر دیا جاتا۔ کسی کو بلا معاوضہ چھوڑ دیا جاتا۔ کسی کو تختے کے طور پر ششما زیم داروں کو بخش دیا جاتا۔ اس معاملے میں فیصلے کا انحصار سردار مراد خاں کی مرضی اور موڈ پر تھا۔ عام طور پر ان مزارعوں کی نوجوان عورتیں اٹھوائی جاتیں جو جھنگر اور جھجھک صاف کرنے کی بیکار سے کتراتے، احتجاج کرتے اور دوسرے مزارعوں کو اکسانے کی کوشش کرتے۔ مراد خاں زیادہ تر ہوتا تو عورتوں کے ساتھ مویشی بھی اٹھوا لیتا، مزارعوں کو بے دخل کر دیتا۔ ان کے گھروں میں اپنے کارندوں کے ذریعے آگ لگوا دیتا۔ پولیس سے ساز باز کر کے جھوٹے مقدمے بنواتا۔ جب سے ہوں والی آیا تھا اس کی وسیع زمیں داری کے ہر مزارعے اور ہر فرد پر خوف طاری تھا۔

انھی دنوں بیٹ کے ایک جاگیردار، فرط خاں ڈھانڈلہ، کے بچے کے مونڈن کی تقریب ہوئی۔ پہلوٹی کا بیٹا تھا اور بڑی منت مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ لہذا دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔ تقریب کا آغاز حسب دستور پیر کی درگاہ پر حاضری دینے اور منت کے مطابق منوتی پڑھانے سے ہوا۔ سرداروں اور بڑے زمیں دار ڈھانڈلوں کے گھرانوں کی عورتیں اور لڑکیاں تو سہ پہر کو ایلی بھیپوں اور کاروں میں بیٹھ کر درگاہ کی جانب روانہ ہوئیں جن کے گرد چادریں بندھی تھیں تاکہ ملوک زادیوں کی کسی طور بے پردگی نہ ہو اور ان پر کسی نامحرم کی نظر نہ پڑے۔

لیکن مزارعوں کی عورتیں اپنے جاگیردار کی خوشی میں شرکت کے لیے بچوں کے ساتھ سویرے سویرے اونٹوں کے کجاووں میں بیٹھ کر نکل کھڑی ہوئیں۔ وہ منوتی پیر کی زیارت کی جانب جارہی تھیں، خوب بن سنور کر نکلی تھیں۔ آنکھوں میں دنبالہ کا جل تھا، مانگ بھر کر دھڑی گوندھی تھی، ہونٹوں پر سرخی لگائی تھی، شوخ اور بھڑک دار لباس پہنے تھے۔ ریشمی گھگھکھوں پر سہرے لچکے کی چوڑی چوڑی گوٹ لگی تھی۔ چولوں اور کرتیوں کے گریبانوں اور آستینوں پر موتیوں، شیشوں اور رنگین دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سروں پر چچ رنگی چڑیاں تھیں۔ دوپٹے اور بو جھن تھے جن پر ستارے نکلے تھے۔ گلوں میں چاندی یا گلت کے کسمالے اور مالھان تھے۔ ناک میں فیروزہ جڑے تولے اور پوپے جھل ملا رہے تھے۔ ہاتھوں میں چوڑیاں تھیں اور بازوؤں پر چوڑے اور پہنٹے تھے جن کے خوش رنگ دھاگوں کے پھندے ہولے ہولے جھولتے تھے۔ کانوں میں بالیل کے گچے لٹکتے تھے۔

دل پٹی تانگے

رکھال میں امید مابی دے ملٹن دی

گیت کے بول جھرناتنے والے نوجوانوں اور کجادوں میں بیٹھے ہوئی عورتوں اور کنواریوں نے اٹھائے۔ سب آواز سے آواز ملا کر گانے لگے۔ ڈھولے نے ڈھول پر اور زور سے چوٹ لگائی۔ میراثی اور بین والوں نے جھمکی لے کے ساتھ ساتھ فقارے اور بین کے تال سر کو ہم آہنگ کیا۔ گیت کے بول اونچے ہوتے گئے۔ آوازوں کے ساتھ ساتھ ساز بھی تیز ہوتے گئے۔ ساز آواز کے زیر و بم کے ساتھ رقص کی گردش کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ اسی طرح منوتی کے لیے طے والا یہ قافلہ گاؤں سے نکل کر آگے بڑھا۔ دور دور دور ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ گرد کے ابھرتے اور پھلتے ہوئے بادلوں میں گم ہو گیا۔

دن گزرا، شام ہوئی۔ رات کو کھانے کی دعوت کے ساتھ ساتھ مہمانوں کے لیے پینے پلانے اور ناچ گانے کا بھی پروگرام تھا۔ تقریب کی دھوم دھام دوبالا کرنے کی غرض سے ملتان اور لاہور سے طوائفوں کو بھی بلایا گیا تھا۔ رات بھر کا پروگرام تھا اور اس میں شرکت کے لیے سردار مراد خاں شاہانی خاص طور پر مدعو تھا۔ ہوں والی میں اس کے قیام میں اضافے کا سبب مونیٹن کی اس تقریب میں شریک ہونا بھی تھا۔

سورج ڈوبتے ہی مراد خاں شاہانی نے سردار فرط خاں ڈھانڈلہ کی حویلی جانے کی تیاری کی۔ اس نے غسل کیا، بوسکی کی لمبی قمیص اور لٹھے کی خوب گھیر دار اجلی شلوار پہنی۔ قیمتی اونٹنی شال اوڑھ کر کپڑوں پر خوشبو لگائی۔ اسی ج دھج کے ساتھ کمرے سے نکلا تو زیادہ وجہ اور باوقار لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پھبن تھی۔ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ اس کے ہم راہ سلہری بھی تھی۔ وہ بھی پورا سنگھار کئے ہوئے تھی۔ شاہانی آگے آگے تھا۔ سلہری اس سے ایک قدم پیچھے تھی۔

رحیم داد کمرے کے باہر دالان میں موجود تھا۔ مراد خاں شاہانی نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”چوہدری، تجھے ڈھانڈلے کی حویلی نہیں چلنا؟“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”زبردست میل ہے۔ ڈھانڈلے نے شراب بھی عمدہ منگوائی ہے۔ کنجریاں بھی پوٹ اور زور دار ہیں۔“

رحیم دادا نے حیلہ سازی سے کام لیا۔ منہ بگاڑ کر رسان سے بولا۔ ”میرے سر میں بہت درد ہے۔ میں نوں نہیں جانا۔ تیں نوں یہی بتانے آیا تھا۔“ وہ اونٹنی دوہراؤ سے ہوئے تھا، بال پریشان تھے اور چہرہ بھی اجڑا اجڑا نظر آ رہا تھا۔

شاہانی نے اصرار لیا۔ ”غنائت تیار ہو جا۔ اسکاچ و ہسکی کے دو پیگ لگاتے ہی سارا درد شرد رہے گا۔ ایک دم چنگا ہو جائے گا۔“

”میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے نہ لے جا۔ طبیعت اور گر بڑ ہو جائے گی۔“ رحیم داد رضامند نہ ہوا۔ ”چنا تو اچھا ہی تھا۔“ شاہانی نے زور دے کر کہا۔ ”بہت لطف آئے گا۔ طبیعت اگر نہ لگے تو ب تیراجی کرے اٹھ کر چلا آنا۔ پروگرام تو ویسے رات بھر کا ہے۔“

”سب چوہدری! چلا جا۔“ سلہری نے بھی شاہانی کی تائید کی۔ رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا، اس کا مسکراتا چہرہ نکھرا ہوا تھا۔ جسم پھڑک رہا تھا۔ آنکھیں باور دہا رہی تھیں۔ رحیم داد تڑپ کر رہ گیا۔

مراد خاں شاہانی نے ایک بار پھر رحیم داد پر زور دیا۔ ”نکھرا نہ کر۔“ وہ مسکرایا۔ ”تھوڑی ہی دیر کے لیے میل میں شریک ہو جا۔ ڈھانڈلے کا دل خوش ہو جائے گا۔ تجھے ساتھ لانے کے لیے اس نے مجھے بار بار کہا تھا۔“ مگر رحیم داد کسی طور آمادہ نہ ہوا۔ طبیعت ناساز ہونے کا عذر تراشتا رہا۔ شاہانی چلا گیا۔ سلہری اس کے پیچھے پیچھے حویلی کے پھانک تک گئی۔ رحیم داد نظریں اٹھائے مراد خاں شاہانی کے بجائے سلہری کو دیکھتا رہا۔ اس نے گہری سانس بھری، اٹھا اور آہستہ آہستہ درے میں پہنچا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔



رحیم داد بستر پر چپ لیٹا تھا۔ نہ اس نے کھانا کھایا نہ سویا۔ پہر رات گزر گئی۔ حویلی سنان ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی آگئی تھی۔ سرما کی اندھیری رات ساکت کھڑی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

رحیم داد پینک سے نیچے اترا، اونٹنی دوہراؤ دھمی، سلپر پینے، لپک کی لودھی کی، آہستہ سے دروازہ کھولا، کمرے سے نکل کر برآمدے میں آیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ وہ اندھیرے میں دم مارے کھڑا تھا۔ ہر طرف دیرانی تھی۔ سنا بہت گمراہ تھا۔ حویلی کے تمام نوکر اپنی اپنی کونٹھریوں کے دروازے بند کیے گہری نیند سو رہے تھے۔ رحیم داد کی طرح حویلی کے ہر فرد کو معلوم تھا کہ مراد خاں شاہانی سویرے سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ وہ ناچ گانے کا زبردست شوقین تھا۔ ایسی محفل چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا۔

رحیم داد احاطے میں پہنچا اور دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ مڑا اور حویلی کے عقبی حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ خاموشی بہت گہری تھی اور کمرے کی دھند بھی اس قدر تھی

کہ وہ سنبھل سنبھل کر چل رہا تھا۔ وہ سلحہ کی کوٹھری پر پہنچا۔ دروازہ بند تھا۔ مگر دروازے کے
بجریوں سے اندر جلتے ہوئے چراغ کی روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ وہ دروازے کے نزدیک
سانس روکے کھڑا رہا۔

وقت دیرے دیرے گزرتا رہا۔ سناٹا اور بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد نے آہستہ سے دروازے پر ہاتھ
رکھا، ہولے سے دھکا دیا، دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ آہستہ سے اندر داخل ہو گیا۔ سامنے
پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگائے سلحہ فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ رحیم
داد نے مڑ کر نہایت احتیاط سے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا۔

آہٹ سن کر سلحہ نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم داد کو اپنے سامنے پا کر وہ سخت حیرت زدہ ہوئی اور
سٹ پٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔
”سین چوہدری!“ اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ ”تو یہاں کیسے آگیا؟“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی حیرت زدہ تھا۔ یہ وہ سلحہ نہیں تھی جس کی چھب دیکھ کر وہ
بے قرار ہو جاتا تھا، جس کے بدن کے پیچ و خم کے ڈولنے اور گردش کرنے سے اس کا دل ڈولنے لگتا
تھا۔ وہ اسی سلحہ کے لیے بے قرار ہو کر چوروں کی طرح چھپ کر رات کے سناٹے میں آیا تھا۔
مگر اس کے سامنے جو سلحہ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ ویران اور اجڑا تھا۔ آنکھوں کے ہر دم جھل
ملانے والے کنول بجھے بجھے تھے، بال خشک اور الجھے ہوئے تھے۔ وہ میلا پھیلا لباس پہنے ہوئے تھی
اور اس کی آنکھوں کا کاجل پھیلا ہوا تھا، جوانی پھلتی اور ڈھلتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

رحیم داد کو گم صم اور حیرت زدہ دیکھ کر سلحہ نے ایک بار پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔
”سین چوہدری! تو یہاں کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ تیکوں اس طرح میرے پاس نہیں آنا چاہئے تھا۔“
اس کا لہجہ قدرے ٹیکھا ہو گیا وہ بدستور پریشان اور سرا سید نظر آرہی تھی۔

رحیم داد ہکا بکا کھڑا رہا۔ سلحہ بھی خاموش رہی۔ مگر جلد ہی اس نے خود کو سنبھالا۔ کندھوں پر
پڑا ہوا دوپٹہ سر کے پیچھے سے کھینچ کر اس طرح اوڑھا کہ اس کا چہرہ کسی قدر چھپ گیا۔ اس نے
نظریں جھکا لیں۔

رحیم داد ٹنگی باندھے حیران و پریشان سلحہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ چھپانے کی
کوشش کی تو رحیم داد چونکا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دائیں طرف کی دیوار کی کھونٹوں پر
شوخ اور بھڑک دار دوپٹے، چولے اور گھگھرے لٹک رہے تھے۔ ان کے ساتھ ریشمی منجلیاں اور
کرتیاں بھی جھول رہی تھیں۔ سامنے کی دیوار کے طاق میں سرخی، کاجل، کنگھی اور سنگھار کا دوسرا

مازدا سامان رکھا تھا۔ طاق کے قریب ہی دیوار پر آئینہ آویزاں تھا۔
سلحہ کی آواز خاموشی میں ابھری۔ ”سین! تو یہاں کیوں آگیا؟ میری گالہ کا جواب کیوں نہیں
دیتا؟“ اس کے لہجے میں پریشانی اور گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ عاجزی بھی تھی۔ رحیم داد اب
خاموش نہ رہ سکا، آہستہ سے بولا۔ ”تو میرے آنے پر اتنی پریشان کیوں ہو گئی؟“

”پریشانی کی بات ہی ہے۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”سین تیکوں پتہ نہیں، سردار کو ملوم ہو گیا
تو بت گزرو ہوگی۔ تو جانتا ہے، اس کا کتہ کتنا خراب ہے۔ گسے میں وہ پاگل بن جاتا ہے۔“
”یہ تو بتا تو میرے پاس بعد میں کیوں نہیں آئی؟“ رحیم داد نے سلحہ کی سراسیگی نظر انداز
کرتے ہوئے پوچھا۔

”سین! میں سردار کی مرضی بتا تیرے پاس کیسے آسکتی ہوں۔“ اس نے صاف گوئی سے بتایا۔
”اس رات اس نے مجھے تیرے پاس بھیج تو دیا پر بعد میں مجھ پر بہت نراض ہوا۔ گسے سے بار بار
گلاں نکالتا تھا۔“

”تب ہی تو مجھ سے دور دور اور کئی کئی رہتی ہے؟“

”ہاں سین!“ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”سردار یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے سوا
کسی اور کے ساتھ میل جول پیدا کروں۔ یاری لگانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ اس نے
خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ ”سین! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ سردار بہت گسے والا
ہے، ظالم بھی ہے۔ اس کا مزاج بہت گرم ہے۔“

”اس کی پروا نہ کر۔“ رحیم داد نے سلحہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”وہ صبح سے پہلے
واپس نہیں آئے گا۔“ اس نے نظر بھر کر سلحہ کو دیکھا۔ ”ویسے تو کہتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔“
”ہاں سین! اب تو جا۔“ وہ بے رخی سے بولی۔ ”مجھے کچھ بھلا نہیں لگتا۔ میں بہت مو بھنی مانی
اور پریشان ہوں۔“

”سلحہ! تو کچھ زیادہ ہی پریشان اور اداس لگ رہی۔ صاف صاف بتا، بات کیا ہے؟“ رحیم داد
نے سلحہ کے چہرے پر چھائی ہوئی افسردگی شدت سے محسوس کرتے ہوئے دریافت کیا۔
”تیکوں کیسے پتہ، میرا پتہ کتنا بیمار ہے؟“ سلحہ نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”دیکھ کیسا چپ
کر کے پڑا ہے۔ اسے بہت زور کی تپ چڑھی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی طرف افسردہ نظروں سے
دیکھا۔ ”یہ میرا منہ ہے۔ تیکوں بچوں میں سب سے ڈا ہے۔“
رحیم داد نے توجہ سے دیکھا۔ پلنگ پر بوسیدہ اور میلی رضائی میں لپٹا لپٹایا منہوں بے سدھ پڑا

”جاگ لوں گی۔“ وہ مستعدی سے بولی۔ ”سنس! دعا کر۔ میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا آگے کا سارا ہے۔“ اس کا لہجہ دکھ بھرا ہوا گیا۔ ”میں کب تک جوان رہوں گی۔ ایک دن تو بوڑھا ہونا ہی ہے۔ بوڑھی ہو گئی تو سردار مجھے حویلی میں کیوں رکھے گا؟ مجھ بوڑھی ہو جاتی ہے تو اسے کسائی کو دے دیتے ہیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ اس کے چہرے کی افسردگی اور بڑھ گئی۔

”ہا تو سے بھی تو تیرا ایک پتر تھا۔ اس کا کیا کیا؟“ رحیم داو نے پوچھا۔
 ”وہ تو میرا پلہ ٹھا ہے۔ پر وہ کس کام کا۔“ سلہری کا لہجہ پھر غمگین ہو گیا۔ ”ایک بار اس کے پاس بل گئی تھی۔ وہ وہیں رہتا ہے۔ اس نے پرنا کر لیا ہے۔ ڈال ہے۔ اس سے ایک کٹی بھی ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس نے مجھے دیکھا تو نوہ کے سامنے ٹنگی ٹنگی گالاں اور مندا نکالیں۔“ اس کی آواز بھر آگئی۔ ”دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیا۔“ سلہری کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ”سنس! میرا لال چنگا ہو جائے۔ یہ میرا بازو ہے، بڑھاپے کا سارا ہے۔ میرا اور کوئی بھی تو نہیں۔“ وہ سسکیاں بھر کر بے بسی سے رونے لگی۔

رحیم داد مبہوت کھڑا تھا اور ہر دم ہنسی مسکراتی سلہری کو پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس پر پہلی بار یہ راز آشکار ہوا کہ سلہری اندر سے کس قدر غم زدہ اور شکستہ ہے۔ اس نے سلہری کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تو فکر نہ کر، تیرا منہ ضرور چنگا ہو جائے گا۔ حوصلے سے کام لے۔“ رحیم داو نے اس کی جانب دیکھا، دل گرفتہ ہر کر بولا۔ ”سلہری! تو جی جی سلہری ہے۔ میں نوں پتہ ہی نہیں تھا تو اتنی دکھی ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ اس کا بازو تھپکا۔ ”اس طرح نہ رو سلہری! تو کہہ تو میں خود جا کر حکیم کو بلالوں۔ چھانک پر رکھا خانن بیٹھا ہے۔ اس کے ساتھ حکیم کے گھر چلا جاؤں گا۔“

”ناسنس! تو ایسا نہ کرنا۔“ وہ نرم لہجے میں بولی۔ ”میں خود چلی جاتی پر حکیم نہیں آئے گا۔ میں تو اسے سویرے ہی لانا چاہتی تھی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ دوائی دے کر بولا۔ ”یہ کھلاتی رہتا“ چنگا ہو جائے گا۔ وہ تب نہ آیا تو اب اتنی رات کو کیسے آجائے گا۔“

”میں جاؤں گا تو ضرور آجائے گا۔“

”پر تیرا اس کے پاس جانا ٹھیک نہیں۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”سردار تجھے تو کچھ نہیں بولے گا با میرے گلے پڑ جائے گا۔ سخت نراض ہو گا۔“

”تو ایسا کر مندوں کے متھے پر کپڑا گیلیا کر کے رکھ۔“ رحیم داو نے اسے مشورہ دیا۔ ”مجھے بھی ایک بار ایسی ہی زور دہی کی تپ چڑھی تھی۔ گیلیا کپڑا رکھنے سے کم ہو گئی تھی۔“ اس نے کوٹھری میں

تھا۔ اس کی عمر گیارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس نے آنکھیں کھول کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے کے نقوش سے مراد خاں شہابی کی شہادت صاف جھلک رہی تھی۔ ناک اور آنکھیں تو بہو مراد خاں سے ملتی تھیں۔

مندوں نے بے چینی سے پہلو بدلا اور گردن ادھر ادھر ہلانے لگا۔ آہستہ سے بولا۔ ”ماں! دو رک رک کر سانس بھر رہا تھا۔ حلق سے خرخر کی آواز نکل رہی تھی۔“

سلہری جھپاک سے مندوں کے قریب پہنچی، جھک کر اس کی پیشانی چومی اور سرھانے بیٹھ کر ہولے ہولے سر دبانے لگی۔ اس نے پیار بھری نظروں سے مندوں کو دیکھا اور تڑپ کر بولی۔ ”جیوے میرا لعل! میں صد کے ونجاں، تو حیات والہ ہونویں۔“

رحیم داد بھی نزدیک چلا گیا۔ چراغ کی ہلکی زرد زرد روشنی میں مندوں کا چہرہ لال بھوکا ہو رہا تھا۔ رحیم داو نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ آگ کے مانند دھک رہی تھی۔ اسے تیز بخار تھا۔ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”اسے تو بہت تیز تپ ہے۔ تو نے اس کا دوا دارو بھی کیا؟“

”تیرے آنے سے تھوڑی ہی دیر پہلے دوائی کھلائی تھی۔“ سلہری نے رحیم داد کو بتایا۔ ”حکیم سے خود جا کر سویرے لائی تھی۔ مندوں تو پچھلے چار روز سے بیمار ہے پر تپ کم نہیں ہوتی۔ کھانی بھی آتی ہے۔ کل رات تک اتنا بیمار نہ تھا۔ میں نے گرم دودھ پلایا تو پی لیا تھا۔ پر آج صبح سے اس نے کچھ نہیں کھایا پیا۔ ایسے ہی آنکھیں بند کیے پڑا ہے۔ بار بار پانی مانگتا ہے۔“

”بخار بھی بہت تیز ہے۔“ رحیم داو نے پوچھا۔ ”تو نے حکیم سے پتہ کیا؟ اسے روگ کیا ہے؟“
 ”کہتا تھا، نمونیا ہو گیا ہے۔ اسی کی دوائی دی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی کہا ہے کہ تین تین گھنٹے بعد دوائی پلانا۔ سویرے آکر حال بتانا۔“

”تیرے پاس تو گھڑی بھی نہیں۔ تین تین گھنٹے بعد کیسے دوائی پلائے گی۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اتار دی اور سلہری کو دیتے ہوئی کہا۔ ”لے لے اسے رکھ لے۔“

”نہیں! اسے تو اپنے ہی پاس رکھ۔“ اس نے گھڑی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ”سردار نے گھڑی میرے پاس دیکھی تو اسے پتہ چل جائے گا، تو میرے پاس آیا تھا۔ بہت نراض ہو گا۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ”سنس! برا نہ منانا۔ میں اسے دوائی ٹھیک وکھت ہی پر پلاتی رہوں گی۔“
 رحیم داد نے گھڑی اس کے حوالے کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے بولا۔
 ”پر دوائی پلانے کے لیے تیں نوں رات بھر جاگنا پڑے گا۔“

ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ”مجھے کوئی اجلا کپڑا دے دے۔ میں بھگو کر فوراً اس کے متھے پر رکھوں گا۔“ اس نے تیکھی نظروں سے سلہری کو دیکھا۔

”میرا منہ کیا تک رہی ہے۔ جا کپڑا لے کر آ۔“

وہ ابھی اور ٹنک کھول کر کپڑا تلاش کرنے لگی۔ رحیم داد نے انتظار نہ کیا۔ بڑھ کر کھوٹی پر لٹکا ہوا اجلا دوپٹہ اتارا اور کونے میں رکھے ہوئے گھرے سے پانی نکال کر پلو بھگونے لگا۔

سلہری نے اس کی جانب دیکھا تو گھبرا کر بولی۔ ”سُیں! تو نے یہ کیا کر دیا۔ یہ بو چھن تجھے اس طرح خراب نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

رحیم داد نے اس کی سنی ان سنی کرتے ہوئے دوپٹے کا گیلیا پلو تہہ کر کے چار انگلی کی دسکی ہی پٹی بنائی جیسی جیلہ نے ایک بار تیز بخار کی حالت میں اس کے لیے بنائی تھی۔ اس نے گیلی پٹی مندوں کی پیشانی پر رکھی اور سلہری کو مخاطب کیا۔

”سلہری! فکر نہ کر۔ تھوڑی دیر میں اس کی تپ کم ہو جائے گی۔“

سلہری بھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ رحیم داد کے پاس پٹنگ کے سرھانے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے اس سے کنوڑے میں پانی منگوایا۔ پانی سرد تھا۔ رحیم داد بار بار دوپٹے کا پلو پانی میں تر کرتا اور اسے مندوں کی پیشانی پر رکھتا۔ سلہری چپ بیٹھی رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ اس نے مندوں کی گردن کو ہاتھ لگایا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان جھلکنے لگا۔

”لگتا ہے تپ تو کم ہو گئی۔“ سلہری نے رحیم داد سے کہا۔ ”سُیں! تو بہت چنگا اور نیک بندہ ہے۔“ وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ ”سُیں! تو سدا جیویں، رب رضی ہووے۔“ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ ”سُیں! بو چھن اب مجھے دے دے۔“ اس نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب مڑ کر دیکھا۔

”اب تو جا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ تیرا اس طرح یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔“

رحیم داد نے اس کی پریشانی اور سراپیمگی محسوس کرتے ہوئے دوپٹہ سلہری کو دے دیا۔ خاموشی سے اٹھا، کوٹھری سے نکلا، باہر سے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ اپنے کمرے میں نہیں گیا۔ دل ہی نہ چاہا۔ آنکھوں میں دور دور تک فیند نہیں تھی۔ ذہن بو جھل ہو رہا تھا۔ عجیب سا اضطراب تھا۔ اضطراب دور کرنے کی غرض سے اس نے اللہ بخش جوڑا کو آواز دے کر بلایا۔

اس سے شراب اور گلاس لانے کو کہا اور بیٹھک میں جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جوڑا نے

تھوڑی ہی دیر بعد بوتل، گلاس اور جگ میں پانی لا کر میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بیگ بنایا اور ایک بڑا گھونٹ بھرا۔



حویلی کے پھانک پر جیپ ٹھہرنے کی آوازاں کے پر ہول سنائے میں ابھری۔ ذرا ہی دیر بعد قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کے باہر دیکھا، اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا اور مراد خاں شاہانی ڈمگاتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسا۔

”چوہدری! اپنی ہی تھی تو میرے ساتھ چلا۔ ادھر بہت عمدہ، ہسکی تھی۔“

وہ آگے بڑھا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔

”میں نے سوچا، پینے سے سر کا درد کچھ کم ہو جائے گا۔ ویسے میرا بالکل ارادہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ مگر فوراً بات پلٹتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو نے تو سویرے آنے کو کہا تھا۔ ابھی سے اٹھ کر کیسے واپس آگیا؟ لگتا ہے، مجرا زور دار نہیں تھا۔“

”سُیں! ایسی گل نہیں۔“ شاہانی نشے میں جھوم کر بولا۔ ”وہاں ایک کنجری بہت پھڑک دار تھی، خانہ خراب نے ایسی طبیعت گرمائی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔“ اس نے تقہر بلند کیا۔ ”لا مجھے بھی ایک ڈبل بنا کر دے۔ اکیلا ہی پیتا رہے گا؟“

رحیم داد نے مسکرا کر اپنا گلاس مراد خاں شاہانی کے سامنے رکھ دیا۔ دوسرا گلاس ہی نہ تھا۔ شاہانی نے رحیم داد کے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا اور گلاس میز پر رکھتے ہوئے اللہ بخش جوڑا کو آواز دی۔

جوڑا گھبرایا ہوا آیا۔ شاہانی نے حکم دیا۔ ”جوڑے! گلاس لے کر آ۔“ جوڑا چلنے کے لیے مڑا تو شاہانی نے اسے ٹوکا۔ ”اور دیکھ، سلہری کو بھی یہاں بھیج دے۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے فوراً بیمار مندوں یاد آگیا۔ اس نے چاہا کہ شاہانی اس وقت سلہری کو نہ بلائے۔ اس وقت اپنے بیمار بیٹے کے پاس اس کا موجود ہونا ضروری تھا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”سلہری کو بلا کر کیا کرے گا؟ اس نے کسی رن کو پہلے ہی تیرے کمرے میں پہنچا دیا ہو گا۔ سلہری تو اب سوتی ہو گی۔“ رحیم داد مسکرایا۔ ”بہت کام کرتی ہے۔ صبح سے رات گئے تک ادھر سے ادھر بھاگ دوڑ کرتی رہتی ہے۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتی نظر آتی ہے۔ بہت ہی مخنتی رن ہے۔“

”سین سردار!! ایسا نہ سوچ۔“ وہ عاجزی سے بولی۔ ”میں صد کے تھیواں، تو بلائے اور میں نہ
ووں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

شبابانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سٹری کی جانب جھومتا ہوا بڑھا۔ بے قرار ہو کر گویا ہوا۔ ”میرے
گلے سے تو لگ جا جند جانی۔“ اس نے سٹری کو بازوؤں میں دبوچ لیا، مڑ کر رحیم داد کی طرف
دیکھا۔ ”چوہدری! میں تو اب چلا۔ میں تو اسی کے لیے ڈھانڈلے کی میل سے اٹھ کر آیا تھا۔“ اس
نے ہاتھ بڑھا کر گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

رحیم داد نے بھی گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
مراد خاں مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! آج یہ گل چاندنی میرے پاس رہے گی۔ پولانی تیرے پاس
ہنچ جائے گی۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”تجھے وہ پسند بھی ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا، حیرت سے سٹری کو دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے پیار بیٹے مندوں کے بارے
میں مراد خاں شبابانی سے کچھ نہیں کہا جس کے لیے وہ کچھ ہی دیر پہلے اپنی کوٹھری میں رو رہی تھی مگر
یہ وزارت کر رہی تھی۔

مراد خاں جھومتا جھامتا کمرے سے چلا گیا۔ سٹری سہمی ہوئی تھی۔ وہ چہرے پر ابھرتی ہوئی
افسردگی چھپانے کے لیے بار بار مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے سے نکلا، کچھ
دور تک مراد خاں اور سٹری کے پیچھے اندھیرے میں چلتا رہا۔ حویلی سنان تھی۔ ہر طرف ہوکا
عالم تھا۔

رحیم داد مڑا، دیرے کی جانب بڑھا، اپنے کمرے میں پہنچا اور چپ چاپ بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ وہ
سٹری کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کی مجبوری اور بے بسی پر مضطرب تھا۔ اسے رہ رہ کر
سٹری کا بیٹا یاد آ رہا تھا جسے حکیم نے نمونیا بتایا تھا۔ وہ بخار سے بھن رہا تھا اور اس کی ماں سردار
مراد خاں شبابانی کے پھرے ہوئے جذبات کے گرداب میں تھی۔

کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ پولانی اندر داخل ہو رہی تھی۔
اس کا قد نکلتا ہوا تھا۔ رنگ گورا اور زردی مائل تھا۔ جسم مضبوط اور چھریا تھا۔ وہ گاؤں کے
نوجوان جولاہے کی بیوی تھی۔ رحیم داد کی تیز نظروں نے تاڑ لیا کہ بناؤ سنگھار کے باوجود اس کے
چہرے پر خوف کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ آنکھوں میں کچی نیند سے بیدار ہونے کا خمار ہے۔ اس
نے دروازہ بند کیا، مسکرانے کی کوشش کی، آگے بڑھی اور بستر پر سمٹ کر ایک طرف بیٹھ گئی۔

”پروہ ابھی سو نہیں سکتی اور سو بھی گئی ہو تو جاگ سکتی ہے۔“ سردار مراد خاں شبابانی نے نہایت
بے نیازی سے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”سین چوہدری! تو اسے نہیں جانتا۔ وہ میرے لیے ہر دم تیار
رہتی ہے۔“

اللہ بخش جوڑا گلاس بے کر آگیا۔ رحیم داد نے خالی گلاس میں شراب انڈھلتے ہوئے ایک بار
پھر مراد خاں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”سٹری کو چھوڑ، پولانی ٹھیک رہے گی۔“ وہ زیر لب
مسکرایا۔

”میں نے کل ہی اسے دیکھا تھا۔ ابھی تو یہیں ہے۔ سوہنی ہے اور نکڑی جوان ہے۔“
”نہیں! آج سٹری ہی چلے گی۔“ مراد خاں نشے میں لہرا کر بولا۔ وہ خوب چڑھا کر آیا تھا۔ بات
کرنا تو زبان لڑکھاتی۔ آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس نے ہنسی ہنسی نظروں سے جوڑا کو گھور کر
دیکھا۔

”سور دے پتر، تو ابھی تک کھڑا ہے۔ سٹری کو لانے نہیں گیا۔“
”سین! سراکھوں تے۔“ جوڑا سرا سہ ہو کر گڑگڑانے لگا۔ ”ابھی جا کر اسے بوتلا ہوں۔ وہ
ضرور آئے گی۔“

اللہ بخش جوڑا تیز قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔ مراد خاں اور رحیم داد شراب سے شغل کرنے لگے۔
اندھیرا گہرا ہوتا گیا۔ رات بھیگتی گئی۔ مراد خاں نے بے چینی سے دروازے کی جانب دیکھا۔
”سٹری ابھی تک نہیں آئی۔ وہ کیوں نہیں آئی؟“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ رحیم داد نے
کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے گلاس ہونٹوں سے لگا کر آہستہ آہستہ چسکی لگانے لگا۔

وقت کچھ اور گزر گیا۔ مراد خاں شبابانی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ پھیلنے لگی۔ وہ غصے سے بڑبڑانے
لگا۔ ”لگتا ہے، اس کا نکھرا بہت بڑھ گیا ہے۔ سمجھتی ہے، میں اسے بہت چاہتا ہوں۔“ اس کی
آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر چاپ ابھری۔ سٹری اندھیرے سے نکل
کر اندر داخل ہوئی۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا۔ سٹری گونا
گونا رنگ لگا لگا لہی اور گلابی ہی منجھلی باندھے ہوئے تھی۔ بالوں میں چمک دک تھی۔
ماتھے پر میکا سجا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر ملاحظ تھی، نکھار تھا۔ اس کا جسم ہولے
ہولے لہرا رہا تھا، چل رہا تھا۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی اور ایک خاص ادا سے مراد خاں کے روہرو کھڑی
ہو گئی۔

مراد خاں شبابانی نے تیوری پر پل ڈال کر کہا۔ ”بہت دیر لگا دی تو نے۔“ لگتا ہے تیرا نکھرا کچھ زیادہ

نیم داد قریب گیا اور سلمیٰ کا سر آہستہ آہستہ تھپک کر بولا۔ ”صبر کر سلمیٰ! صبر کر! رب کی رضی تھی۔“ اس کا دل بھر آیا، آنکھیں چھلک پڑیں، آنسو پلکوں سے ہمہ کر رخساروں پر ٹپکنے لگے۔ وہ کچھ دیر میت کے نزدیک خاموش کھڑا آنسو بہاتا رہا۔ پھر اس نے آنسو پونچھے مڑا اور کوٹھری نکل گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مراد خاں شاہانی کے کمرے میں پہنچا۔ مراد خاں نہایت اطمینان سے ناشتا ہاتھ۔ رحیم داد کرسی کھسکا کر قریب بیٹھے ہوئے بولا۔ ”شاہانی! تیری سلمیٰ کا پتر مر گیا۔“

”مجھے پتہ ہے۔“ وہ تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوچتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری! تو سلمیٰ کی کوٹھری کیوں گیا تھا؟“ اس کا لہجہ تیکھا تھا اور چہرے پر جھنجھلاہٹ تھی۔ ”تجھے وہاں نہیں جانا چاہیے۔ تجھے پتہ ہونا چاہیے ہم سردار کیوں کے پاس اس طرح نہیں جاتے۔“ مراد خاں کے رویے اور تلخی پیدا ہو گئی۔ ”تو میرا مسمان ہے تجھے اس طرح میری آن اور رتبہ نہیں بگاڑنا چاہیے۔ یہ عزت اور دبدبہ قائم رکھنے کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے خود کو بہت اونچا رکھنا پڑتا ہے۔“

ارغوں اور کیوں کو جتنی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔“

رحیم داد حیران و پریشان بیٹھا رہا۔ سردار مراد خاں تیزی سے بولتا رہا۔ ”وڈے اور بزرگ کہہ لے ہیں۔ سو اور گیدڑ کو گولی مار دو تاکہ وہ فصل خراب نہ کریں۔ مزارعوں اور کیوں کی گردن سدا بٹی رکھنے کے لیے ان کی رن کو اپنا بستر سمجھو تاکہ وہ فصل پر حک نہ جتائیں۔“ اس نے رحیم داد کو مہرور نظروں سے دیکھا۔ ”اسی لیے ہمیں ان کی نوجوان رنوں اور پالٹیاں اٹھوانی پڑتی ہیں تاکہ ان کی آنکھ اونچی نہ ہو۔ ان سے الگ اور دور رہنا پڑتا ہے تاکہ وہ سرنہ چڑھیں۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد اس کے غصے سے مرعوب ہو کر معذرت کے انداز میں بولا۔ ”جی بات یہ ہے، تو سردار ہے، وڈا بگیر دار ہے۔ میں تیرے سامنے معمولی زمیں دار ہوں، مہاجر بھی ہوں۔ میں نوں ان باتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ مراد خاں بھی نرم پڑ گیا۔ اس نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تجھے پتہ نہیں، مجھے بھی سلمیٰ کے پتر کے مرن کا رنج ہوا۔ پر کیا کیا جائے۔ رب کی بھی مرضی تھی۔“ اس نے تولیا اٹھا کر ہاتھ پونچھے۔ ”میں نے آدھ گھنٹہ پہلے سلمیٰ کو بلایا تھا، اس کے سر پر ہاتھ بھیرا تھا۔“

”اسا دیا تھا، حوصلہ بڑھایا تھا۔ سو روپے بھی دیئے۔“

رحیم داد اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس نے نہ مداخلت کی نہ کسی فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ مراد خاں نے ہاتھ پونچھ کر رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری! تو بھی فنافٹ ناشتا کر لے بھکرا واپس جانا



رحیم داد غسل کرنے کے بعد تولیا سے بدن پونچھ رہا تھا کہ حویلی کے پچھواڑے سے عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی ملی جلی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے گھبرا کر تولیا ایک طرف پھینکا۔ جلدی جلدی کپڑے پہنے، باہر نکلا۔ ابھی تک پالا پڑ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی دھند فضا پر چھائی ہوئی تھی۔ سورج طلوع ہو چکا تھا مگر دھند میں لپٹی ہوئی دھوپ نمیالی اور پھسکی پھسکی تھی۔

رحیم داد حویلی کے پچھواڑے بڑھا جدھر سے رونے کی آوازیں صبح کی گہری خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ وہ آگے گیا تو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رونا بیٹنا سلمیٰ کی کوٹھری کے اندر ہو رہا ہے۔

رحیم داد کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بڑھ کر کوٹھری کے دروازے پر پہنچا، اندر داخل ہوا۔ سامنے چارپائی پر سلمیٰ کا بیٹا مندوں بے جان پڑا تھا۔ اس کے مردہ جسم پر میلی سی چادر پڑی تھی۔ سلمیٰ اس کے سرہانے چارپائی کی پٹی سے سر نکائے بین کر رہی تھی۔ چارپائی کے ارد گرد چند عورتیں بھی بیٹھی تھیں۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔ رک رک کر سینے پر ہاتھ مارتیں اور دل گرفتہ ہو کر ”ہائے ہائے ہائے!“ کی صدائیں بلند کرتیں۔ کوٹھری میں عود و لوبان کا دھواں لہرا رہا تھا۔ فضا دھندلی اور افسردہ تھی۔

سلمیٰ نے گردن اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے پوٹے سوچے ہوئے تھے۔ چہرہ اجڑا اجڑا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ بدن پر وہی لباس تھا جسے پن کر وہ پچھلی رات سردار مراد خاں شاہانی کے پاس آئی تھی۔ البتہ اس کا گلابی دوپٹہ ایک طرف پٹا تھا۔ سر پر منہ تھا۔ وہ ٹکلی باندھے، کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھتی رہی۔ پھر سینے پر دو ہتھ مار کر بین کرنے لگی۔

”سین! میں لٹ گئی، میرا مندوں گزر گیا۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ ڈاٹن موت اسے رات ہی کو اپنے ساتھ لے گئی۔ میں سویرے لوتی تو وہ مردا پڑا تھا۔ سین! میں شامت دی مارا، آخری گھڑی اس سے مل بھی نہ سکی۔ میں اس کے لیے کچھ نہ کر سکی۔“ اس نے بے بسی سے گردن ادا ہر ادا ہر ہلائی۔ ”وہ یہاں اکیلا تھا۔ کوئی پانی پلانے والا بھی نہ تھا۔“

سلمیٰ رک رک کر بین کر رہی تھی۔ قریب بیٹھی ہوئی عورتیں اس کے ساتھ ساتھ بیٹھ کر تیں۔ سینے پر بار بار ہاتھ مار کر ”ہائے ہائے!“ کی صدائیں بلند کرتیں۔ سلمیٰ بین کرتے کرتے بے قرار ہو کر چیختی۔ ”ہائے رہا! میں کیہہ کراں۔ میں لٹ گئی۔ میرا سارا ختم ہو گیا۔“ اس نے تڑپ کر اپنا سر چارپائی پر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ہے۔ تجھے بھی ساتھ ہی چلنا ہے۔“

”کیا آج بھکر جانا ضروری ہے؟“ رحیم داد نے اکتے ہوئے پوچھا۔

”بہت ضروری ہے۔ متمان سے میرا یار مرشد علی گردیزی آیا ہے۔ وہ کل رات ہی بھکر پہنچا۔ اور میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ مجھے اپنے ساتھ متمان لے جائے گا۔ اس کی بھین کا پرتا ہے۔ اس نے مجھے شرکت کرنا بہت ضروری ہے۔“

”کیوں بہت ضروری ہے؟“ رحیم داد نے بے بنیاد میں پوچھ لیا۔

سردار مراد خاں شاہانی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”سین چوہدری! تجھے پتہ نہیں۔ مرشد کا پڑ متمان کے گدی نشینوں میں سے ہے۔ اس کا ایک شریکا بھی وزیر لگا ہے، وہ بھی آئے گا۔ اس کے ساتھ دوسرے وزیر اور وڈے سرکاری افسر بھی آئیں گے۔ ان سب سے وہاں ملنا جلنا ہوگا۔ وزیروں اور افسروں سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری چلانے میں ان سے بہت کام ہے۔“ اس نے رحیم داد کا ہاتھ تھام کر مولے سے دیا۔ ”تجھے بھی متمان لے چلوں گا۔ سب سے تجھے ملوؤں گا۔ چوہدری! ایسا موقع روز روز نہیں ملتا۔“

”تیرے ساتھ میں ضرور متمان چلوں گا۔“ رحیم داد نے نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یہ تو سوچ، سلہری کا پتر آج ہی مرا ہے۔ وہ غیری بہت چیتی اور پرانی رکھیل ہے۔ تیرے اس طرح چلے جانے پر اسے بہت دکھ ہوگا۔ تیرے بارے میں وہ کیا سوچے گی؟“

”تو اس کی فکر نہ کر۔“ مراد خاں شاہانی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”چند روز میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی۔ پہلے کی طرح مسکراتی، چلتی، بل کھاتی رات کو میرے پاس آئے گی۔ اسے نہیں جانتا۔ میوں پتہ ہے، وہ میری کسی گالہ کا ذرا برا نہیں مانتی۔ وہ مجھ سے کبھی روٹھ نہیں سکتی۔“ اس نے ہلکا قہقہہ بلند کیا۔ ”بس ذرا کمر پر ہاتھ پھیرا، گلے لگا کر پیار سے کہا، ہائے جد جانی! ایک دم موم کی طرح پگھل جاتی ہے۔ خوشی سے ایسی مست ہو جاتی ہے جیسے پھول کھلتا ہے۔ میرے ساتھ بہت ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ برسوں سے میرے پاس ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جان سکتا ہے۔“

”ویسے جیسی تیری مرضی۔ میں چاہتا تھا تو ایک روز یہاں ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔“ رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے دبی زبان سے اصرار کیا۔

”چوہدری! میرے یہاں ٹھہرنے سے کیا ہوگا۔“ مراد خاں شاہانی رضامند نہ ہوا۔ ”رادرانی موجود ہی رہے گا۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے، گور کفن کا بندوبست کرو۔ وہ سارا کام ٹھیک ٹھاک

مورے کرادے گا۔ تجھے پتہ ہے وہ کتنا ہوشیار بندہ ہے۔“ اس نے گردن اونچی کی اور ذرا پھیل کر بڑھ گیا۔ ”چوہدری! اطمینان رکھ۔ سلہری کے پتر کا کفن دفن پوری شان سے ہوگا۔ غریب غربا کو روٹی کھلائی جائے گی۔ مندر جھوڑے چاول ہوں گے، کل ہوگا، فاتحہ ہوگی۔ جمعراتیں ہوں گی۔ سب ہی کچھ ہوگا اور میری طرف سے ہوگا۔“ اس نے مسکرا کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”چوہدری! تجھے پتہ ہے، میں سلہری کو کتنا پیار کرتا ہوں۔ وہ میری چیتی ڈال ہے۔“

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد ناشتا آگیا۔ رحیم داد نے بے دلی سے ناشتا کیا اور جلد ہاتھ سمجھ لیا۔ وہ خاصا افسردہ اور دل گرفتہ تھا۔ لیکن شاہانی اطمینان سے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر افسردگی کا نام و نشان نہ تھا۔

پہر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کی بلندی پر پہنچا۔ مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا اور اس کے ہم راہ حویلی کے پھاٹک پر پہنچا۔ دونوں جیب میں سوار ہو گئے۔ حویلی کے بھجواڑے سلہری کی کوشری میں پٹی ہو رہی تھی۔ رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں ابھر رہی تھیں۔

جیب آگے بڑھی۔ رحیم داد اور سردار مراد خاں رونے اور بین کرنے کی دل دوز آوازیں دور تک سنتے رہے۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ جیب ہچکولے کھاتی، گرد کے پادل اڑاتی گاؤں کے پچے راستے پر دوڑتی رہی۔ رونے پینے کی آوازیں پیچھے رہ گئیں۔ جیب پختہ سڑک پر آگئی اور تیز رفتار سے بھکر شریک جانب دوڑنے لگی۔

☆

مرشد علی گردیزی حویلی کے چوک ہی میں مل گیا۔ مراد خاں شاہانی کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے سے ہٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کے گلے سے لگے ہوئے خاصی دیر تک جوش و مسرت سے قہقہے کاتے رہے، گلے شکوے کرتے رہے۔ پھر ہنسنے مسکراتے بیٹھک کی جانب بڑھے۔ رحیم داد بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ مراد خاں نے مرشد علی کا تعارف کراتے ہوئے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

”چوہدری! یہ مرشد گردیزی میرا بہت پرانا یار ہے۔ جب میں لہور میں پڑھتا تھا۔ یہ میرا کلاس بلوہو تھا۔ ہم اکٹھے ہوٹل میں رہتے تھے۔“

”اور اکٹھے ہی چھپ چھپ کر کنجیوں کے پاس ہیرا منڈی بھی جاتے تھے۔“ گردیزی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ ”پر اس نے پرتا پہلے کر لیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔“

مراد خاں نے بھی زور کا قہقہہ بلند کیا۔ رحیم داد کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مرشد! یہ چوہدری نورالہی ہے۔ منگمری کا وڈا زمین دار ہے۔ احسان شاہ کی حویلی میں پہلی بار اس سے ملنا تھا۔ تب سے ایسی یاری ہو گئی کہ اب تو یہ میرا جگری یار ہے۔“

مرشد علی نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا، گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر بولا۔ ”چوہدری! تو مراد کا یار ہے تو آج سے میرا بھی یار بن گیا۔“ اس نے بات کا رخ موڑ کر اچانک مراد خاں کو مخاطب کیا۔ ”یار شاہانی! آج تک احسان شاہ سے تیری یاری کا راز سمجھ نہیں آیا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ”خدا جھوٹ نہ بلوائے، وہ عمر میں لگ بھگ تیرے پیو کے برابر ہو گا۔ تیری اس کے ساتھ کیسے یاری ہو سکتی ہے؟“

”تو اس راز کو نہیں جانتا۔“ مراد خاں نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”وہ عمدہ اسکاچ و ہسکی پلاتا ہے اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ اس کے کوٹ میں ایک سے ایک زور دار اور پوٹ رن ہے۔ خود تو عیش کرتا ہی ہے پر یاروں کو کرا کے زیادہ خوش ہوتا ہے۔“

”تو اس سے کہاں ٹکریا؟“ مرشد علی شاہ گردیزی نے پوچھا۔ ”پہلے تو تیری اس سے یاری نہیں تھی۔ سال سوا سال سے سن رہا ہوں تو اس کے پاس بت جانے لگا ہے۔ کئی کئی روز اس کی حویلی میں ٹھیرتا ہے۔ یہ چکر کیا ہے؟“

”بات دراصل یہ ہے سس! شاہ جی کا ایک جنوائی سی ایس پی افسر ہے۔ وہ ضلع میانوالی میں ڈپٹی کمشنر لگا ہے اور میرا ایک کام اس سے انکا ہے۔ اس چکر میں شاہ جی سے ملنا پڑا۔ نواب زادہ نیاز محمد خاں کو تو جانتا ہی ہے۔ وہی اپنا کالا باغ والا۔ اسی نے شاہ جی سے مجھے ملایا تھا۔“ اس نے ہنس کر مرشد علی گردیزی کے زانو پر ہاتھ مارا۔ ”پر یہ باتیں میں تجھے پہلے بھی بتا چکا ہوں۔“

”کہاں بتا چکا ہے؟“ مرشد علی شاہ نے شکوہ کیا۔ ”تجھ سے کچھ دنوں میرا ملنا جلنا ہی کتنا رہا۔ دو تین بار ملا بھی تو کبھی ٹھیک سے بات نہیں ہوئی۔ تو نے ہر بار ملتان آنے اور میرے ساتھ کچھ دن گزارنے کا وعدہ بھی کیا پر کبھی آیا نہیں۔“

”اب تو تیرے ساتھ ملتان چل ہی رہا ہوں۔ روزی مل بیٹھیں گے، جی کھول کر باتیں ہوں گی۔ پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔“

نوکروں نے بیٹھک ہی میں کھانا لا کر میز پر چن دیا۔ تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور مرشد علی شہر چلے گئے۔ رحیم داد زینہ طے کر کے اوپر کی منزل کے اس کمرے میں چلا گیا جس میں اس کے قیام کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرشد علی گردیزی کا کمرہ برابر ہی تھا۔

شام کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مرشد علی گردیزی اور رحیم داد کے درمیان جو حجاب اور تکلف تھا

چند ہی پیگ لگانے کے بعد دور ہو گیا۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ مراد خاں زیادہ دیر ان کے ساتھ نہ بیٹھ سکا۔ ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ ”کہاں چلا شاہانی؟“

”چوہدری! میں نے اب اندر جانا ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”گردیزی تو بڑے ساتھ بیٹھتا ہے۔“

”کچھ دیر اور ٹھیر جاتا تو ٹھیک تھا۔“ رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”چلا جانا، ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔“

”نہیں! اب میں نہیں ٹھیر سکتا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”اپنی ذال انتظار کر رہی ہے۔ ۲۵ روز بعد دیتا ہوں۔ کچھ اس کا بھی تو حک ہے۔“

”جایا رہا۔“ مرشد علی نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ ”چوہدری! اسے جانے دے۔ اس نے ب نہیں رکنا۔“

مراد خاں شاہانی چلا گیا۔

زرا دیر خاموشی رہی۔ مرشد علی نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا اور مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! تجھے پتہ نہیں، شاہانی اپنی گھروالی سے بہت ڈرتا ہے۔“

”میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”اور کسی زنانی سے تو وہ ڈر رہی نہیں سکتا۔ گھروالی تو صرف بچوں کی ماں ہوتی ہے۔ اس سے کیا ڈرنا شرتا۔“

”پر شاہانی کی گھروالی کی بات ہی دوسری ہے۔“ مرشد علی گردیزی نے نشے میں لہرا کر رحیم داد کو گمری نظروں سے دیکھا۔ ”وہ وڈی بگیردانی بھی ہے۔ اسے ترکے میں بہت وڈی جائیداد ملی ہے۔“ وہ کچھ زیادہ ہی چڑھا گیا تھا۔ قہقہہ لگا کر بولا۔ ”ایسی گھروالی سے تو ڈرنا ہی پڑتا ہے۔“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا کہ شاہانی اس کا دوسرا کھسم ہے۔ دھچ میں ایک آگوا یا بھی ساتھ لائی ہے۔“ مرشد علی پر نشہ تیزی سے چڑھا تھا۔ بار بار زور کا ریلا آتا۔ اس کی جھونک میں وہ رحیم داد سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو گیا۔ شاہانی کی نجی زندگی کے بارے میں کھل کر بات کرنے لگا۔ ”اس کا پہلا کھسم بہت وڈا بگیردار ہوتا تھا۔ وہ گھوڑی سے گر کر مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ساری جائیداد اور زمین داری گھروالی اور اس کے اکھوتے پتر کو ملی۔“

”اس کی زمین داری بھی بیٹ میں ہے؟“ رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے

دریافت کیا۔

”نہیں!“ مرشد علی گردیزی نے جواب دیا۔ ”نواں کوٹ میں اس کے مرتے ہیں۔ باغات ہیں۔ ان کی دیکھ بھال شاہانی کا سالا کرتا ہے۔ پر اب تو اس جائیداد اور اراضی کا مالک بھی مراد ہی ہے۔“
مرشد علی گردیزی نے نشے میں جھوم کر قہقہہ لگایا۔ ”اسی بگیرے پکڑ میں تو مراد کے پیونے اس سے پرنا کر دیا حالانکہ عمر میں بھی وہ وڈی تھی اور ایک پتر کی ماں بھی تھی۔ یہ جائیداد اور بگیر بھی بہت ظالم ہوتی ہے۔“

”یہ باتیں تو شاہانی نے مجھے کبھی بتائی ہی نہیں۔“ رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔

”ایسی باتیں کہیں بتانے والی ہوتی ہیں۔ سیں چوہدری! تو نے بھی حد کر دی۔“ وہ رحیم داد کی سادہ لوحی پر ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”مجھے تو اس لیے معلوم ہے کہ مراد کے پر نے میں شریک ہوا تھا۔ ویسے میں اس کی زال کے پہلے کھسم کو بھی جانتا تھا۔“ مرشد علی نے گردن بدھا کر سرگوشی کی۔ ”تجھے راز کی ایک گالہ بتاؤں۔ شاہانی سے اب تک اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں۔ ایک نکی ہوئی تھی۔ بچپن ہی میں مرگئی۔ اب تو پہلے ہی کھسم کا پترہ گیا ہے۔ اسے کا نام محمد سلمان خاں ہے۔ اچھا بگھرو جوان ہے۔ بالکل اپنے پیو پر گیا ہے۔ وہ جڑیا اور نکرزا جوان ہوتا تھا۔“

رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔ ”تب ہی تو شاہانی نت نئی زنانیوں کے پکڑ میں رہتا ہے۔“

”چوہدری! ویسے یہ انوکھی گالہ نہیں۔ سارے ہی وڈے زمین دار اور بگیر دار اسی پکڑ میں رہتے ہیں۔ گھروالیاں بھی سب کچھ جانتی ہیں پر انھیں پتہ ہوتا ہے کہ جائیداد کی اصلی مالکن وہی ہوتی ہیں۔ انھی کی اولادیں جائیداد کی وارث بنتی ہیں۔ یہ حک ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“
مرشد بھکنے کے عالم میں بڑوانے لگا۔ ”یار چوہدری! اپنے بادشاہ اور شہنشاہ بھی تو حرم رکھتے تھے۔ ان میں چھانٹ چھانٹ کر ایک سے ایک خوبصورت اور پوپٹ کنیزیں رکھتے تھے۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”عیش کرتے تھے جی۔ جب چاہتے تھے اور جسے چاہتے تھے اس کے ساتھ سوتے تھے۔ انھیں کوئی روکنے والا یا منع کرنے والا تو ہوتا نہیں تھا۔ پر ملکہ، ملکہ ہی ہوتی تھی۔ تخت و تاج اسی کے پتر سنبھالتے تھے۔ اسی سے ان کی نسل چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ بالکل ٹھیک کہہ رہا۔“ رحیم داد بھی نشے کے ایک زور دار ریلے میں بہ گیا۔ ”اس معاملے میں اپنا مراد خاں بھی کسی بادشاہ سے کم نہیں۔ اسے تو روز نئی رن چاہیے۔“
”پر شاہانی کچھ زیادہ ہی رتاں کے پکڑ میں رہتا ہے۔ میں نے اوروں سے بھی سنا ہے، اب وہ بہت رن ریا ہو گیا ہے۔“

رات گزرتی رہی۔ بے نوشی کا دور چلتا رہا۔ بات سے بات نکلتی رہی۔ شاہانی سے ہٹ کر بات سیاست پر آگئی۔ رحیم داد کو سیاست کے بارے میں کوئی شہد نہیں تھی۔ مگر مرشد علی شاہ سیاسی جوڑ توڑ سے خاصا باخبر تھا۔ وہ ملک کے سیاسی حالات کے بارے میں ایسی باتیں سنا رہا جو رحیم داد کے لیے نئی تھیں اور حیرت انگیز بھی۔

دونوں نے جم کر پی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں میں جا کر بستر پر لیٹ گئے۔

دوسرے روز دوپہر کو ملتان جانے کا پروگرام تھا۔ مگر صبح کی ٹرین سے اچانک مراد خاں کی بیوی کا چھٹک یا آگوا یا محمد سلمان خاں آگیا۔ وہ انیس بیس سال کا خوش شکل اور صحت مند نوجوان تھا۔ گورڈن کالج، راولپنڈی میں پڑھتا تھا اور ہوٹل میں رہتا تھا۔ دو ہفتے کی چھٹی پر بھکر آیا تھا۔ اس کے پیچھے کے بعد مراد خاں کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ وہ ملتان نہیں جاسکا۔ اس نے مرشد علی گردیزی کو بھی روک لیا۔ مراد خاں کا بیشتر وقت سلمان کے ساتھ گزرتا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ اس کی بڑی ناز برداری کرتا۔ اس کے آرام و آسائش کا ہر طرح خیال رکھتا۔

مرشد علی اور رحیم داد ایک دوسرے کے زیادہ قریب آگئے۔ دونوں شام کو دیر تک بیٹھے، شغل بادہ نوشی کرتے اور ہنس ہنس کر بے تکلفی سے باتیں کرتے۔ شاہانی ان کی صحبت میں کم ہی وقت گزارتا۔ پھر رات گزرتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ چار روز گزر گئے۔ مرشد علی کے لیے ہنس کی شادی کے باعث زیادہ قیام کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے بار بار اپنی مجبوری کا مراد خاں سے اظہار کیا۔ اس کے زور دینے پر پانچویں روز مراد خاں اور رحیم داد شام کی ٹرین سے مرشد علی گردیزی کے ہم راہ ملتان روانہ ہو گئے۔



ملتان میں دو روز ٹھہرنے کے بعد مرشد علی سویرے سویرے مراد خاں شاہانی اور رحیم داد کو قاسم بیلے لے گیا۔ وہاں اس کی زمینیں تھیں۔ آم اور مالے کے باغات تھے۔ چند میل کے فاصلے پر دریائے چناب بہتا تھا۔ اس کے کنارے گھنے جنگل تھے جن میں مرشد علی کی اپنی شکار گاہ بھی تھی۔ قاسم بیلے میں اس کی ایک حویلی بھی تھی۔ اسی میں تینوں کے قیام کا بندوبست کیا گیا۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ مراد خاں اور مرشد علی شکار کھیلنے نکل گئے۔ رحیم داد نہیں گیا۔ اسے شکار سے زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ طبیعت بھی کچھ مضطرب تھی۔ پچھلی رات بہت زیادہ شراب پی گیا تھا۔ اس کا شمار ابھی تک باقی تھا۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا۔ لسی کے کئی گلاس چڑھاے لیکن خمار اور ہیگ اور میں کمی نہ آئی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر رحیم داد باغ میں چلا گیا۔ باغ حویلی کی چار دیواری کے اندر ہی تھا۔ خاصا وسیع بھی تھا۔ اس میں پھلوں کے درخت تھے۔ رات کی رانی اور چنبیلی کے بیلوں سے منگتے ہوئے فرحت افزا کج تھے۔ گلاب کے پودے کثرت سے تھے اور قسم قسم کے تھے۔ ان کے چمن بندی سلیقے اور نفاست سے کی گئی تھی۔ سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ میں گلاب کے شگفتہ پھول منک رہے تھے۔ ان کی ہنکھریوں پر شبنم کے قطرے جھل مار رہے تھے۔

رحیم داد کو باغ بہت پسند آیا۔ وہ سبزہ زار میں پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا اور دھوپ سے لطف اندوز ہونے لگا مگر وہ زیادہ دیر باغ میں نہ بیٹھ سکا۔ طبیعت بے مزہ ہو رہی تھی۔ سر چکر رہا تھا اور آنکھیں سلگ رہی تھیں۔ وہ کمرے میں گیا اور بستر پر سو گیا۔

دوپہر کو وہ سو کر اٹھا۔ ایک بار پھر خوب گرم پانی سے غسل کیا۔ اب اسے کچھ قرار آیا۔ وہ فرحت اور تازگی محسوس کرنے لگا۔ اس نے کھانا کھایا اور مرشد علی کے مینجر خادم علی جوہا کے ہم راہ کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ خریف کی فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں جگہ جگہ مکئی اور کما کے کٹے ہوئے پودوں کے ہمارے اور ڈھیر لگے تھے۔

دونوں پگڈنڈیوں اور پیہوں سے گزرتے ہوئے کپاس کے کھیتوں میں چلے گئے۔ کپاس کی فصل بہت اچھی تھی۔ اس کی کاشت بہت بڑے رقبے پر کی گئی تھی۔ سورج بیچ آسمان سے گزر کر تھوڑا سا مغرب کی طرف ڈھلک گیا تھا۔ دھوپ میں تمازت آگئی تھی۔ کپاس کے پودوں میں روئی کے سفید سفید گالے ڈوڈوں سے پھوٹ کر باہر جھانک رہے تھے۔ یہ پھٹی تھی۔ سرائیکی میں اسے نواڑ بھی کہا جاتا ہے۔ اعلیٰ اعلیٰ نواڑ کھیتوں میں حد نظر تک پھیلی ہوئی تھی، سورج کی چمکی اور تر چھی کر نوں میں جھلکتی نظر آ رہی تھی۔ کپاس کے پودے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ نواڑ کی چٹائی بہت پہلے شروع ہو چکی ہے۔

اس وقت بھی نوجوان چوگی عورتیں اور لڑکیاں ٹولیاں بنائے کھیتوں میں جگہ جگہ بکھری ہوئی تھیں۔ وہ نواڑ کی چٹائی کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے دوپٹے پیشانی سے سر تک لپیٹ کر پیچھے کر لیے تھے اور ان کے دوپٹوں کے گرد باندھ رکھے تھے۔ وہ انگلیوں سے نواڑ چمتیں اور دائیں بائیں کمر کے پیچھے ڈالتی جاتیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے، چروں پر پسینے کے قطرے جھل مار رہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہی تھیں اور نواڑ کی چٹائی کے گیت گات رہی تھیں۔ رحیم داد جب خادم علی جوہا کے ہم راہ چوگیوں کے قریب سے گزرا تو انھوں نے نظریں اٹھا کر دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ نواڑ چن چن کر دائیں بائیں تیزی سے اڑ رہی تھیں اور ہنس ہنس کر گار رہی تھیں۔

ملک تاں خیدا یار ہے، تو کیوں میرند کیں بولیاں
موسم آئی دنواڑ دی چرواں کملیاں بھولیاں
خادم علی جوہا گیت کے بول سن کر مسکرایا۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ ”سین چوہدری! تو
مٹانی سمجھتا ہے؟“
”کچھ زیادہ نہیں جانتا جی!“

جوہا نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”یہ چوگیاں تجھے دیکھ کر آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں۔ ایک دوسرے سے کہہ رہی ہیں، زمیں دار تیرا یار ہے۔ تو مجھے کیوں طعنہ دیتی ہے۔ کپاس چن نے کا موسم آگیا ہے۔ بھولی بھالی ٹیاریں کپاس چن رہی ہیں۔ ان بولوں کا یہی مطلب ہے۔“ اس بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔

رحیم داد مسکرایا، اس نے چوگیوں کی جانب دیکھا۔ وہ گار رہی تھیں، ہنس رہی تھیں اور دنواڑ چن نے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دونوں کپاس کے کھیتوں کے درمیان گزرتی ہوئی ایک پگڈنڈی پر آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ کچھ دور جانے کے بعد رحیم داد کپاس کی چٹائی کرنے والی ایک چوگی کو دیکھ کر ٹھنکا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اسے پہچاننے کی کوشش کی۔ وہ شاداں تھی۔ ہاں وہی تھی۔ وہی کسا ہوا سڈول جسم، وہی ملگجے بھگے سے جھانکتا ہوا بھرا بھرا سینہ۔ وہی بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔

شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ چہرہ پسینے سے بھگا ہوا تھا۔ اور دھوپ میں اچلے تانبے کی طرح دک رہا تھا۔ اس کے بالوں میں پھٹی کے ریشے الجھے ہوئے تھے۔ لمبی لمبی پلکوں پر خاک کے ذروں کی تہہ نظر آ رہی تھی۔ وہ انگلیوں سے پھٹی چٹائی، چوگیوں کے غول سے نکل کر کبھی اس پودے پر جاتی کبھی اس پر۔ اس کے چہرے پر نہ شوخی تھی نہ اس کے انداز میں چلبلا پن تھا۔ وہ نظریں جھکائے محویت سے چوگیوں کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر گار رہی تھی۔

روزی دے کھا طر وطن سیٹو سے

ملک بگانے ان دیوں سے

غربت دی مانگ

دلبر دی مانگ

تیراں دی مانگ

دیس دیس وچ پیٹ دی کھا طر در عزتاں رولیاں

خادم علی جويا نے شاداں کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد کو بتایا۔ ”سیں! اس کا
ٹاں شاداں ہے۔ یہ گا نہیں رہی۔ گیت کے بولوں میں اپنے دل کا حال بیان کر رہی ہے۔ یہ کہہ رہی
ہے۔

میں نے روزی کے لیے وطن چھوڑا
اب پرائے دیں میں ماری ماری پھرتی ہوں
غومت کی برجھی ہے
دل برکا انتظار ہے
دونوں ہی تیر کی طرح چھیدتے ہیں

پیٹ کی خاطر دیں بدلیں ٹھوکریں کھا رہی ہوں۔ عزت اور لاج خاک میں ملا دی ہے۔

رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خادم علی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”سیں! یہ
بھی تیرے ہی ضلع کی رہنے والی ہے۔ پچھلے کئی مہینوں سے ادھر آگئی ہے۔ بہت مخفی اور جفاکش
چوگی ہے پر اتنی ہی کڑوی اور سرکش بھی ہے۔“ وہ ایک آنکھ دبا کر شوخی سے مسکرایا۔ ”سونہری
اور پوٹ دن ہے پر جنگلی گھوڑی کی طرح بدکتی ہے۔“ رحیم داد نے خادم علی جويا کی حوصلہ افزائی
نہ کی۔ چپ چاپ چلتا رہا۔

شاداں نے ناگاہ نظریں اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا اور ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ بالکل رحیم
داد کے سامنے تھی۔ دونوں کے درمیان صرف کپاس کے چند پودے حائل تھے۔ رحیم داد نے
جھٹ نظریں گھمائیں اور گردن اٹھائے جويا کے ہم راہ آہستہ آہستہ آگے بڑھ گیا۔ شاداں کو دیکھ
کر اسے لالی یاد آگیا اور وہ دن یاد آگئے جب وہ جیل میں اس کے ساتھ تھا۔ پھر اس کے ساتھ ہی
جیل سے فرار ہوا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے دیرانوں اور جنگلوں میں چھپتا پھرتا تھا۔ ان یادوں کی
یلاخار نے اس کے ذہن میں کھلبلی مچادی۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا۔ حویلی میں واپس آگیا۔

شام کا دھند لکا پھیلنے لگا مگر مرشد علی شاہ اور مراد خاں نہیں آئے۔ دیرے کے ایک دالان میں
چوگیاں پھٹی کی گھڑیاں سنبھالے بیٹھی تھیں۔ رحیم داد بھی ایک کرسی پر الگ تھگک بیٹھا تھا۔ تین
چار کارندے فرش پر بیٹھے تھے۔ وہ خادم علی جويا کی ہدایت کے مطابق چوگیوں کو ان کی چوگائی کے
حصے کی پھٹی دے رہے تھے۔

چٹائی شروع ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر ہر چوگی نے اچھی مقدار میں پھٹی چنی تھی۔
قاعدے کے مطابق چٹائی کے ابتدائی دنوں میں ہر چوگی کو اس کی چنی ہوئی پھٹی یا نواڑ کا سولہ اں

حصہ دیا جاتا ہے۔ بعد میں گزرتے دنوں کے ساتھ ساتھ کپاس کے کھیتوں میں جوں جوں نواڑ کم
ہوتی جاتی ہے چوگائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ چوگیوں کو جنی ہوئی نواڑ میں سے آٹھواں، یہاں تک
کہ چھٹا حصہ ملنے لگتا ہے۔

ہر چوگی باری باری آتی، اپنی گھڑی کھول کر نواڑ سامنے ڈالتی۔ کارندے بارہ حصے کرتے اور
ایک حصہ چوگی کو چوگائی کے طور پر دے دیتے۔ چٹائی کے اس مرحلے پر چوگائی کی تقسیم اسی طرح مقرر
کی گئی تھی۔ حصہ کرتے وقت چوگیاں عام طور پر جھگڑتیں، کارندوں کے خلاف احتجاج کرتیں، جو
ڈھیری سب سے بڑی سمجھتیں، اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتیں۔ مگر یہ فیصلہ خادم علی جويا کرتا
کہ کس چوگی کو چوگائی میں کون سی ڈھیری دی جائے۔ وہ چاہتا تو کسی کو چوگائی میں زیادہ نواڑ دے دیتا
کسی کو کم۔

دالان میں چوگیاں چائیں چائیں کر رہی تھیں۔ اونچی آواز سے بول رہی تھیں۔ لڑنے جھگڑنے
کے ساتھ قہقہے بھی لگا رہی تھیں۔ جويا انہیں بار بار ڈانٹتا۔ وہ چند لمحوں کے لیے خاموش بھی ہو
جاتیں لیکن پھر شور مچانا شروع کر دیتیں۔ چوگیوں میں شاداں بھی تھی۔ ابھی اس کی باری نہیں آئی
تھی۔ وہ ایک کونے میں دیوار سے پیٹھ ٹکائے چپ بیٹھی تھی۔ قریب ہی اس کی نواڑ سے بھری
ہوئی گھڑی رکھی تھی۔ وہ مدھال اور تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد آتا کرتا کھڑا ہوا۔ مہمان سرا کی طرف بڑھا جو دیرے ہی کے ایک حصے میں تھی۔
دیرے میں بھی مہمان ٹھہرتے تھے مگر مہمان سرا میں سرکاری افسر اور بڑے زمیں دار ٹھہرائے
جاتے تھے۔ اس کے کمرے کشادہ تھے۔ بستروں اور فرنیچر بھی عمدہ تھا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا اور
تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مرشد علی اور مراد خاں ہنوز شکار سے نہیں لوٹے تھے۔

کمرے کے باہر کمرے کا دھند لکا پھیلا تھا۔ رات دے قدموں درو دیوار سے اتر رہی تھی۔
دیرے کے جس حصے میں چوگیوں کو چوگائی ادا کی جا رہی تھی، وہاں سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور
ابھر رہا تھا۔ رحیم داد کو کمرے میں آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ شاداں دفعتاً اندھیرے سے
نکل کر کمرے میں داخل ہوئی اور دلہیز کے پاس پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ وہ احاطے میں لگے ہوئے پنڈ
پپ پر منہ دھو کر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی کے قطرے جھل مار رہے تھے۔ کانوں پر پڑی ہوئی
لٹیں بھیگی ہوئی تھیں۔

شاداں نے بیٹھے ہی دوپٹے کے پلو سے منہ پونچھا، مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”لگتا ہے، میں نے
تجھے پہلے بھی دیکھا ہے۔“

”مجھ سے کچھ ملتا جلتا تھا۔“

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس کا چہرہ فٹ ہو گیا۔ مگر شاداں نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”وہ تو جی کب کا مر گیا۔ کسی نے اسے قتل کر دیا تھا۔ سنا ہے پرانی دشمنی تھی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ادھر لالی کی پولیس کے ساتھ گولی چلی۔ زخمی ہوا، پکڑا گیا۔“

”تب تو اسے لی سزا ہوئی ہوگی۔“

”زیادہ لمبی نہیں ہوئی۔“ شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”منگمری کا مجسٹریٹ لالی کو جانتا تھا۔ اس نے بہت کم سزا دی۔ ویسے میں نے اس کے مکدے میں وکیل بھی بٹھا کھڑا کیا تھا۔ ہر چیٹی پر خود عدالت میں جاتی تھی۔“

”ایک گل پوچھوں شاداں!“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”سچ بچ بتانا۔“

”پوچھ، کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“

”یہ بتا لالی چوراہا ہے، نمبری بد معاش ہے، جیل بھی کاٹ رہا ہے۔ تب بھی تو اس سے اتنا پیار کرتی ہے کہ اس کے لیے گھریار چھوڑ کر یہاں آگئی۔“

”پہلے تو جی وہ بالکل چنگا نہیں لگتا تھا۔“ شاداں نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”فیر جانے کیوں اس سے اتنا پیار ہو گیا۔“ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”پر اب تو اس نے مجھ سے پکا وعدہ کر لیا ہے کہ بالکل چوری چکاری نہیں کرے گا۔ لگتا بھی ہے کہ اب وہ ایسا نہیں کرے گا۔“

”تیں نوں کیسے اندازہ ہوا وہ چوری چکاری کی پرانی عادت چھوڑ دے گا؟ یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔“

”سمجھ ابھی نہیں سکتی، پر میں اسے سمجھتی ہوں۔“ شاداں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”اب یہی دیکھ، پچھلے دنوں چناب میں زبردست سیلاب آیا۔ بھکری سے آگے لوپ بند ٹوٹ گیا۔ بہت تباہی ہوئی۔ کئی پنڈ بالکل پانی میں ڈوب گئے۔ جیل سے کیدی بند کی مرمت کرنے بھیجے گئے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ ”میں نے کیدیوں کو بند پر کام کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ دن رات زبردست کام ہوتا تھا۔ کئی کیدی رات کے اندھیرے میں نکل بھاگے۔“

”لالی بھی بھاگنے والوں کے ساتھ نکل گیا ہو گا؟“ رحیم داد نے کیرید کر پوچھا۔

”نہیں۔“ شاداں نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”بھاگنے والے کیدیوں نے لالی سے اپنے ساتھ چلنے کو بہت کہا پر وہ اس چکر میں نہیں پڑا، بند پر محنت سے کام کرتا رہا۔“ اس نے فخر سے گردن

رحیم داد نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ اس کا چہرہ اب تروتازہ اور نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔ ناک سبک اور ستواں تھی، ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ اس کی گول گول سڈول پنڈلیاں سبز لالچے سے جھانک رہی تھیں۔ شاداں اسے دل کش اور طرح دار لگی۔ وہ اس کی نظروں میں اسی روز سا گئی تھی جب اس نے پہلی بار اسے جما گیارہ میں دیکھا تھا۔

شاداں نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے تھکے لہجے میں کہا۔ ”تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟“

”پچان نے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ رحیم داد نے مسکرا کر بات بتائی۔ ”یاد تو میں نوں بھی آتا ہے کہ تیں نوں پہلے کیس دیکھا ہے۔“ وہ سوچنے کے انداز میں گردن جھکا کر چند لمبے خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے نگاہیں اٹھا کر شاداں کی جانب دیکھا۔ ”یاد آیا، تو مجھے منگمری سٹیشن پر ملی تھی۔ کسی کیدی سے ملنے جا رہی تھی۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔

”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں لالی سے ملنے جا رہی تھی۔ تو منگمری سٹیشن پر ملا تھا پر یہ تو بہت پرانی گل ہے۔ میں تو بھول بھی گئی تھی۔“

”تیں نوں ایک بار دیکھ کر کوئی بھول سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ شاداں کے چہرے پر سرخ پھیل گئی۔ وہ شرمانے کے انداز میں فرش پر انگلی سے آڑی ترجمی لکیریں بناتے ہوئے بولی۔ ”لالی بھی جب بہت خوش ہوتا ہے تو یہی کہتا ہے۔“

”یہ لالی کون ہے؟“ رحیم داد نے ان جان بن نے کی کوشش کی۔ ”وہی ہے جسے اس روز ملنے جا رہی تھی۔ ادھر ڈسٹرکٹ جیل میں کید کاٹ رہا ہے۔“

”لالی تیرا کیا لگتا ہے؟“

”کچھ لگتا ہی ہے۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ”اسی کے لیے میں کادر آباد چھوڑ کر یہاں آگئی۔“ اس نے رفتہ رفتہ نظریں بلند کیں، رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”اس سے پہلے میں جما گیارہ میں ہوتی تھی۔ کادر آباد سے ملتان آنے میں جی بہت چکر تھا۔“

”لالی کو جیل کیوں ہو گئی؟“ رحیم داد نے بے نیازی سے پوچھا۔ ”وہ جی ایسا ہے، پہلے تو اسے چوری چکاری میں سزا ہوئی، فیر جیل سے بھاگا۔ اس کے ساتھ ایک کیدی اور بھی فرار ہوا تھا۔ اس کا ناں رحیم داد تھا۔“ وہ بات کہتے کہتے بے تکلفی سے ہنسنے لگی۔

جانتے ہیں، ان سے خوش رہتا ہے، جو نہیں جانتی انھیں پریشان کرتا ہے، طرح طرح سے تنگ کرتا ہے، ڈانٹتا ڈپٹتا ہے، چنگائی بھی کم دیتا ہے۔“

”تو بھی کسی رات اس کے ڈیرے پر چلی جا۔“ رحیم داد نے ہنس کر شاداں کو پھینٹا۔ ”تب خادم علی، دینا تجھ سے بھی خوش رہے گا۔ زیادہ ہی چنگائی دے گا۔“ اس نے شاداں کا رد کس معلوم کرنے کے لیے اس لے چرے کو غور سے دیکھا۔

”ویسے خادم علی چاہے تو تجھے اٹھوا بھی سکتا ہے۔“

”مجھے اٹھوا لینا کوئی محفل ہے۔“ شاداں نے تند و تیز لہجے میں گھور کر رحیم داد کو دیکھا۔ اسے رحیم داد کی بات سخت ناگوار گزری تھی۔ ”تو کیسی گل کر رہا ہے۔“ وہ تیوری پر بلا ڈال کر بولی۔ ”میں کوئی کبجری ہوں، چھٹال ہوں۔ کیوں جاؤں اس کے ڈیرے پر؟“ اس کی جھنجھلاہٹ سوا ہو گئی۔ ”مجھے اٹھوا کر ڈیرے پر بلوایا تو اس کی گردن مروڑ دوں گی۔“ اس نے اپنا مضبوط اور ٹھوس ہاتھ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ ”اس میں بہت زور ہے۔ میں ہوں تو زنانی پر بہت زور آور بھی ہوں۔ تو مجھے ٹھیک سے نہیں جانتا۔“

”اتنا نراض کیوں ہوتی ہے؟“ رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”یہ بتا تو میراں بھی اکیلی رہتی ہے؟“

”میری ایک ممیری ادھر وہاں ہی ہے۔ اسی کے ساتھ رہتی ہوں۔ پر میں نوں اس سے کچھ نہیں لینا۔ میرے پاس دو بچے ہیں، اصلی نیلی بار کی ہیں۔“

رحیم داد نے مداخلت کی۔ ”ویسے تو میں گورداس پور کا مہاجر ہوں پر اب ممیری زمیں داری نیلی بار ہی میں ہے۔ تیں نوں پتہ ہے ستیج کو پاک تین میں نیلی کہتے ہیں اور اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں اس کا پانی نیلا نیلا دکھائی پڑتا ہے۔ پر دیپال پور میں ہے۔ اسے ستیج ہی کہا جاتا ہے۔ میرا پنڈ ہے تو تحصیل دیپال پور میں اور دیپال پور بیاس بار میں ہے۔ میرا پنڈ دیپال پور سے دور اور اس علاقے سے بالکل ملتا ہے جو پاک تین تحصیل کہلاتا ہے۔ پاک تین تحصیل نیلی بار ہی میں ہے۔“

”وے تیرا پنڈ نیلی بار میں ہے۔“ شاداں نے کسی قدر حیرت سے کہا۔ مگر رحیم داد کی بات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ اپنی بھینسوں کی تعریف و توصیف کرتی رہی۔ ”تیں نوں پتہ ہے، ممیری دونوں بچے کتنا دودھ دیتی ہیں؟“ اس نے فخر سے گردن اونچی کی۔ ”من بھر تو روزانہ دودھ لے جاتا ہے۔ جو بچتا ہے اس کا مکھن نکال لیتی ہوں۔ چنگی آہنی ہو جاتی ہے۔“

”لگتا ہے تو مکھن بہت کھاتی ہے۔“ رحیم داد نے اسے ایک بار پھر پھینٹا۔ ”جیسی تو اکیس سوہنی

اونچی کی۔“ جیل کا وڈا افسر اتنا خوش ہوا کہ اس نے لالی کی سزائیں کی کردی اور اب تو اسے پٹی بھی مل گئی ہے۔ میں ہر ملاکات کے دن اسے ملے سویرے سویرے جیل کے پھاٹک پر پہنچ جاتی ہوں۔“

”لگتا ہے تجھے لالی سے بہت زیادہ پیار ہے۔“

”وہ بھی تو جی مجھے اتنا ہی پیار کرتا ہے۔“ شاداں نے نظریں جھکا کر بتایا۔ ”مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھتا ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔“

”کب تک تیرا لالی چھوٹ جائے گا؟“ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے پھیلنے لگے۔

”سال بھر سے کچھ اوپر رہتا ہے۔“ شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ بھی گزر رہی جائے گی۔ جی۔ سزائیں کی بھی ہو سکتی ہے۔ لالی یہی بتاتا ہے۔“

رحیم داد اس اطلاع سے زیادہ پریشان نہیں ہوا۔ لالی کے فوری طور پر رہا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ مگر وہ لالی سے خائف ضرور تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ لالی اس کے ساتھ جیل میں اور جیل سے فرار ہونے کے بعد بھی اتنی زیادہ مدت تک رہا ہے کہ اس کی تیز نظریں اسے پہچان سکتی ہیں۔ لالی اس حیثیت سے اب اس کے لیے سنگین خطرہ بن گیا تھا۔ رحیم داد لالی کے بارے میں سوچنے لگا۔

”تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“ شاداں نے اسے ٹوکا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”یہ بتا تو میرے پاس کیسے آئی؟ تو نے پھٹی پننے کی چنگائی لے لی؟“

”اسی کے لیے تو تیرے پاس آئی ہوں۔“

”میرے پاس کیوں آئی ہے؟“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں نوں تیری چنگائی سے کیا لینا؟“

”تو خادم علی جو یا کو تو جانتا ہی ہے۔ میں نوں اسی کے بارے میں تجھ سے گل کرنی ہے۔“

”کیا گل کرنی ہے؟“

”جو یا میرے حصے کی پوری چنگائی نہیں دیتا۔“ شاداں نے شکوہ کیا۔ ”وہ جس چوگی سے راضی باضی ہوتا ہے اسے زیادہ بھٹی حصے میں دیتا ہے۔ کسبوں کو تو دودھ ڈھیریاں تک دے دیتا ہے۔“

”پر تجھ سے جو یا کیوں نراض ہے؟“

”گل امدہ ہے جی!“ وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ ”وہ رات کو اپنے ڈیرے پر چوگیوں کو بلاتا ہے۔ جو چلی

نیار دکھائی دیتی ہے۔“

”لے“ میں نیار لگتی ہوں؟ تو کیسی گل بات کرتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی چھینچھاڑ پر ناراضگی کا اظہار نہ کیا، شرما کر بولی۔ ”اب تو کچھ بھی نہیں رہی، جل کر راکھ ہو گئی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔“

”اب بھی تو کیا کم ہے۔ تب ہی تو خادم علی جو یا کا تجھ پر دل آگیا۔“

”نہیں جی، وہ بندہ ہی برا ہے۔ تو اسے نہیں جانتا۔“ شاداں نے ایک بار پھر جو یا کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے اس کی شکایت نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تیرے پاس جب نیلی باری دوڑیں ہیں اور ان کے دودھ سے آمنی بھی چنگی ہو جاتی ہے، فیرو پھٹی کی چٹائی کیوں کرتی ہے؟“ اس نے قدرے تامل کے بعد وضاحت کی۔ ”میرا مطلب ہے تو چوگی کیسے بن گئی؟“

”کیا کیا جائے جی! آگے کے لیے بھی تو سوچنا چاہیے۔ لالی جیل سے نکلے گا تو کیا کرے گا؟ اب اس نے چوری چکاری تو کرنی نہیں۔ کوئی نہ کوئی دھندا کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے لیے روپے کی ضرورت ہوگی۔ روپے کے بنا تیس نوں پتہ ہے، کچھ نہیں ہو سکتا۔“

شاداں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ خادم علی جو یا کمرے میں داخل ہوا۔ شاداں کو دیکھ کر تھیکے لہجے میں بولا۔ ”تو ادھر بیٹھی ہے، تیری چگائی کون لے گا؟“

”میں لوں گی اور کون لے گا۔“ وہ خادم علی جو یا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے بولی۔ ”چٹائی میں نے کی ہے اور سب سے زیادہ ہی کی ہے۔“

”تو روز ایسی ہی بڑھکیں مارتی ہے۔“ جو یا نے ڈپٹ کر تھیکے لہجے میں کہا۔ ”کو اس نہ کر، چل اپنی نوٹاڑ کی ڈھیریاں بنا اور اپنی چگائی کی ڈھیری اٹھا کر لے جا۔ دیری کی تو کوئی چگائی شگائی نہیں لے گی۔“

رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے مداخلت کی۔ ”خاما خا زار کیوں ہوتا ہے۔ تو نے ہی تو مجھے بتایا تھا یہ بہت مختی اور اہری چوگی ہے۔ سب سے زیادہ نوٹاڑ چنتی ہے۔ تو نے مجھے یہی کہا تھا نا؟“ رحیم داد کا لہجہ تھیکھا تھا۔

”مختی تو جی یہ ہے۔ پر جھگڑا مثلاً بہت کرتی ہے۔“ خادم علی جو یا نے جھٹ پتیرا بدلا، دبی زبان سے شکوہ کیا۔ ”چوہدری، میں تجھے کیسے بتاؤں یہ کتنا جھگڑا کرتی ہے۔“

”لے“ میں تجھ سے کیا جھگڑا کرتی ہوں۔ جتنی محنت کرتی ہوں، اتنی ہی چگائی مانگتی ہوں۔ تو ایر

پہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔“

خادم علی کے چہرے پر جھنجھلاہٹ نمودار ہوئی۔ رحیم داد نے اس کی خفگی بھانپ لی۔ اس نے مکر کر نرمی سے کہا۔ ”جو یا! اسے ٹھیک ٹھیک چگائی دے دے۔“

”جو یا فوراً نرم پڑ گیا، گردن جھکا کر ادب سے بولا۔ ”سین چوہدری! تو حکم کر، ایک چھوڑ میں سے چگائی میں نوٹاڑ کی دو ڈھیریاں دے دوں گا۔“

”میں نوں تیری دو ڈھیریاں نہیں لینی۔“ شاداں نے تھیکھی نظروں سے جو یا کو دیکھا۔ ”محنت کی ہے، اس کی چگائی لوں گی، کھیرات نہیں لینی۔“

”چپ کر شاداں۔“ خاما خا کی کڑکڑ نہ کر۔ ”رحیم داد نے اسے پیار سے ڈانٹا اور خادم علی جو یا کو اطہ کیا۔ ”خادم! اسے دوہی ڈھیریاں دے دے۔ تیس نوں پتہ ہے۔ یہ اپنے ضلعے کی ہے اور نشان بھی ہے۔ برائی اس میں یہ ہے بول کڑوا بولتی ہے۔“

”سین! تیرا حکم، سراکھیں تے، سراکھیں تے!“ خادم علی جو یا نے خوشامد کے انداز میں کہا۔ میں اسے دو ڈھیری ہی چگائی دوں گا۔“

”آگے بھی اس کا خیال رکھنا۔ اسے تنگ نہ کر۔“ رحیم داد نے شاداں کی سفارش کی۔ ”سین چوہدری! تو بالکل فکر نہ کر۔“ جو یا نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”جیسا نے کہا ہے، ویسا ہی ہو گا۔“

رحیم داد نے شاداں سے کہا۔ ”جا اپنی چگائی لے۔ خادم علی بہت نیک بندہ ہے۔ آگے تجھ سے راض نہیں ہو گا۔“

شاداں خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر شکستگی تھی، آنکھوں میں کنول کھل رہے تھے۔ اس نے رحیم داد سے پوچھا۔ ”چوہدری! تیس نوں ادھر کب تک ٹھیرتا ہے؟“

رحیم داد کے بولنے سے پہلے ہی خادم علی جو یا نے شاداں سے سو قیانا مذاق کیا۔ ”تو نے رات کو دھر آتا ہے؟“

شاداں ایک دم شعلے کی طرح بھڑک اٹھی۔ ”چپ کر۔ تو نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟ میں کنجری وں، پاپی ہوں، کیا ہوں، بتا؟“

رحیم داد نے فوراً مداخلت کی۔ ”خادم! تو اس طرح اس سے چھینچھاڑ نہ کیا کر۔ یہ بہت کڑوی بات ہے۔ خاما خا جھگڑا مثلاً نہ کر۔“

جویا جھینپ کر بولا۔ ”سہیں! یہ تو محول بھی نہیں سمجھتی۔ تیکوں پتہ ہے، میں نے کسی برس ارادے سے گاہہ نہیں کی تھی۔“

شاداں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”میں تیری گل بات کا مطلب ٹھیک طرح جانتی ہوں۔“

”بے کار کی گلاں نہ کر۔“ رحیم داد نے شاداں کو ایک بار پھر ڈانٹا۔ ”میں نے جویا کو سمجھا دیا ہے۔ اب وہ تجھے تنگ نہیں کرے گا۔ اب جا اور اپنی چگائی کی پھٹی لے۔ تیری میری گھر میں انتظار کرتی ہوگی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اتنا زراعت نہ ہوا کر۔“

شاداں خاموشی سے خادم علی جویا کے ہم راہ چلی گئی۔



مرشد علی اور مراد خاں رات گئے واپس آئے تو رحیم داد سوچکا تھا۔ دونوں نے اس کی نیند خراب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ علیحدہ کمرے میں بیٹھے۔ آدھی رات تک باتیں کرتے رہے، قہقہے لگاتے رہے۔

رحیم داد قاسم بیلہ میں مراد خاں اور مرشد علی گردیزی کے ساتھ ٹھہرا رہا۔ شاداں اسے کئی بار نظر آئی۔ مذہبیز بھی ہوئی مگر بات چیت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ رحیم داد نے مراد خاں شہابی سے شاداں کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا۔ خادم علی جویا نے شہابی کی سامنے شاداں کی بات بھی چھیڑی مگر رحیم داد صاف نظر انداز کر گیا۔

قاسم بیلہ میں چار روز قیام کے بعد تینوں ملتان روانہ ہو گئے۔ شام کو پہنچے۔ مگر ملتان پہنچنے ہی مراد خاں کو بھکر سے تار ملا۔ لکھا تھا، محمد سلمان خاں کار کے حادثے میں زخمی ہو گیا ہے۔ تار دیکھتے ہی مراد خاں سخت پریشان ہو گیا۔ وہ رات گئے تک سلمان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بھکر ٹیلی فون کرتا رہا۔ مگر لائن میں ایسی گڑبڑ تھی کہ بار بار کوشش کے باوجود بات نہ ہو سکی۔

مراد خاں شہابی کو جب سے سلمان کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی تھی، اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ ادھر مرشد علی گردیزی کی بہن کی شادی کی تیاریاں مکمل تھیں۔ رات کو صادق آباد سے برات آرہی تھی اور دوسرے روز شام کو پہنچنے والی تھی۔

مرشد علی گردیزی کا اصرار تھا کہ مراد خاں دو روز ٹھہر کر بھکر چلا جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ شادی کی تقریب میں مراد خاں شہابی ضرور شریک ہو۔ شادی کا نہایت دھوم دھام سے اہتمام کیا گیا تھا اور اس میں شریک کرنے کے لیے مرشد علی شاہ خود بھکر جا کر مراد خاں شہابی کو اپنے ہم راہ لایا تھا۔

رحیم داد نے تنہائی میں مراد خاں پر زور دیا۔ ”شہابی! وہاں کے لیے ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔ ایک

روز کی تو بات ہی ہے۔ رات کو نکاح میں شریک ہو کر چلا جانا۔ مرشد علی خوش ہو جائے گا۔“ مگر مراد خاں رضامند نہ ہوا۔ گھبرائے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”چوہدری! مجھے نہ روک۔ مجھے کچھ چنگا نہیں لگ رہا ہے۔“ اس کے چہرے پر دشت برس رہی تھی۔ ”تیکوں پتہ ہے، سلمان میرا اکلوتا پتر ہے۔“

رحیم داد نے چونک کر مراد خاں کو دیکھا۔ اسے مرشد علی کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ سلمان اس کا نہیں، اس کی بیوی کے پہلے شوہر کا بیٹا ہے۔

رحیم داد کو سلحہی کا مندوب یاد آگیا۔ وہ مراد خاں کا سگا بیٹھا تھا مگر اس کے مرنے پر نہ وہ پریشان ہوا، نہ آنسو بہائے، نہ کسی قسم کا سیپا کیا۔ یہاں تک کہ آخری بار اس کا دیدار بھی نہ کیا۔ اس کے جنازے میں بھی شریک نہ ہوا۔ رحیم داد کے اصرار کے باوجود شریک نہ ہوا۔ اس نے ہموں والی میں ٹھہرنا تک گورا نہ کیا۔

رحیم داد کو مراد خاں شہابی کے اس رویے پر سخت حیرت تھی مگر مراد خاں اس کی حیرت سے بالکل بے نیاز تھا۔ وہ اس قدر پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا تھا کہ کھانا بھی نہ کھاسکا۔ رات بھر بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ بار بار اٹھتا اور بے قراری کے عالم میں ٹٹلنے لگتا۔ رحیم داد کی آنکھ کئی بار کھلی۔ اس نے مراد خاں کو پریشانی کے عالم میں دیکھا مگر بات کرنا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش لیٹا رہا۔

صبح بہت ترکے کمرے کی گہری دھند کے باوجود مراد خاں شہابی نے گیرج سے مرشد علی کی کار نکلوائی اور شیر شاہ کی جانب روانہ ہو گیا۔ شیر شاہ کا فاصلہ دس میل سے بھی کم تھا اور وہاں سے بھکر جانے والی ٹرین گیارہ بجے جاتی تھی۔

مراد خاں شہابی نے ناشتا بھی نہ کیا۔ وہ جلد سے جلد شیر شاہ پہنچ کر بھکر جانے والی ٹرین میں سوار ہو جانا چاہتا تھا۔

رحیم داد بھی کار میں مراد خاں کے ہم راہ تھا۔ وہ تمام راستے اسے تسلی دیتا رہا، مگر شہابی کی بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہ بے قرار ہو کر رحیم داد سے بار بار کہتا۔

”چوہدری! اگر میرے سلمان کو خدا نخواستہ کچھ ہو گیا تو میں یہ غم برداشت نہ کر سکوں گا۔ میرا تو داغ کام نہیں کرتا۔“

لیکن رحیم داد کو علم تھا کہ اسے سب سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ اگر سلمان مر گیا تو نواس کوٹ کی جاگیر، جو اس کے قبضے میں ہے، خطرے میں پڑ جائے گی۔ سلمان کے حقیقی چچا اور چچا زاد

بھائی فوراً تنازعہ کھڑا کر دیں گے۔ جائیداد اور جاگیر حاصل کرنے کے لیے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں گے۔

کارملتان اسٹیشن پہنچی تو رحیم دادا تر گیا۔ وہ بھکر نہیں گیا، مراد خاں شاہانی نے بھی اصرار نہ کیا۔ ساڑھے آٹھ بجے صبح لاہور جانے والی ریل گاڑی پہنچی۔ وہ اس میں سوار ہو کر چلا گیا۔ وہ کوئٹہ ہرکشن واپس جا رہا تھا۔

سردار مراد خاں شاہانی تیار رہ گیا۔ وہ سخت بے چینی کے عالم میں پلیٹ فارم پر ٹپٹنے لگا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بہت پریشان اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔



ہوا سرد تھی۔ ہر طرف کمرے کا ٹیل گوں دھندلکا چھایا تھا۔ کوئٹہ ہرکشن پر سرشام ہی سناٹا طاری ہو گیا تھا۔ رحیم دادا گھنٹہ سوا گھنٹہ پہلے واپس پہنچا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ لباس تبدیل کیا اور اب اپنے کمرے میں سفر کی ٹکان دور کرنے کی غرض سے بستر پر ٹانگیں پیارے خاموش لیٹا تھا۔ حویلی پر خاموشی چھائی تھی۔ نادر خاں اور جیلہ سے اس کی اب تک ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ حویلی کا صحن بہت کشادہ تھا۔ اس کے آخری سرے پر درختوں کا جھنڈ تھا۔ درختوں کے آس پاس نوکر چاکروں کی کونھریاں تھیں۔ باورچی خانہ کونھریوں کے عین مقابل تھا۔ اس کی چھت چارستونوں پر قائم تھی۔ کوئی دروازہ یا کھڑکی نہ تھی۔ ہر طرف سے بالکل کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانے میں نور روشن تھا۔

نور کے اندر سے نکلتی ہوئی آج کے ابھرتے لپکتے شعلے کمرے کی دھند میں دور سے سرخ دھبوں کی مانند نظر آرہے تھے۔ یہ روشن دھبے کبھی نمایاں ہو جاتے، کبھی اندھیرے میں گھل مل کر غائب ہو جاتے۔

باورچی خانے سے ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور رک رک کر ابھر رہا تھا اور ہر طرف چھائے ہوئے سکوت میں ارتعاش اور ہلچل پیدا کر رہا تھا۔

ایک نوکر اندھیرے سے نکل کر کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم دادا نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ نادر تھا۔ رحیم دادا کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔ اس نے میز پر کھانا لگا دیا۔ رحیم دادا بھوکا بھی تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

نامدار ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ ”نامدار! یہ تو بتا۔ زمیندارنی اوپر اپنے کمرے ہی میں ہے ناں؟“

”نہیں جی، زمیں دارنی تو پھاتاں کے گھر گئی ہے۔“

”پھاتاں کے گھر گئی ہے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”پھاتاں بیمار ہے کیا؟“

”بیمار شیمار تو نہیں ہے جی۔“ نامدار نے جواب دیا۔ ”وہ ایسا ہے جی، پرسوں تاجاں کے سرال سے بچو لیا آیا تھا۔ سگائی کی انگوٹھی اور دو سراسمان لوٹا گیا۔ بہت برا ہوا۔“

رحیم داد کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ ”پر تاجاں کی سگائی ہوئی کب؟“

”بچھلے ہی دنوں تو بیس حویلی میں اس کی سگائی ہوئی تھی۔ ان دنوں تیس ادھر نہیں تھے۔ بہت روک لگی تھی۔ ڈھسک بجی تھی۔ گانا ہوا۔ زمیں دارنی نے اپنے ہاتھ سے تاجاں کو انگوٹھی پرنائی تھی۔ پر اب تو سگائی ٹوٹ ہی گئی۔“

”کیوں توڑ دی انہوں نے کڑائی، میرا مطلب ہے سگائی؟ ویسے بات ایک ہی ہے۔ کڑائی کو یا سگائی۔ پر ایک بار سگائی ہونے کے بعد ٹوٹ کیسے گئی؟ یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ کوئی نہ کوئی تو اس کی وجہ ہوگی۔ ایسے ہی تو نہیں ٹوٹی ہوگی۔“

”کسی نے جی بھانجی مادی۔ میں تو کہتا ہوں جی، یہ شیرا کا کام ہے۔ اس کے سوا اور کوئی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔“

”یہ شیرا کون ہے، اور اس نے کیوں بھانجی ماری؟“ رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

”وہ تاجاں سے ویاہ کرنا چاہتا ہے۔“ نامدار کا لہجہ تیکھا اور قدرے تلخ تھا۔ ”کرتا دھرتا کچھ نہیں۔ بھومان شاہ کے زمیں دار محمد حنیف وٹو کے لیے مویشی اور چوکر چوری کرتا ہے۔ محمد حنیف وٹو بہت دڑا رس گیر ہے جی۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”چوہدری! تو ہی سوچ۔ پھاتاں کیسے اپنی دھی شیرے کو ویاہ دیتی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ شیرے کے ساتھ اس کے گھر والے بھی نراض ہو گئے۔ بس اس کا بدلہ لینے کے لیے ایسا چکر چلایا گیا کہ سگائی ٹوٹ گئی۔“

”پر تاجاں کے سرال والوں نے شیرے کی بات کیسے مان لی۔ انہوں نے کیوں سگائی توڑ دی؟“ رحیم داد نے روٹی کا لقمہ توڑتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تاجاں کا ساہا تو میرے سامنے ہی ہوا تھا۔ تب تو سرال والے بہت خوش تھے۔ انہوں نے سگائی پر بھی خوشی منائی ہو گئی؟“

”ہاں جی، بہت خوش تھے۔“

”یہ بتا، نامدار، کیا شیرا کسی طرح تاجاں کے سرال والوں کا شریک لگتا ہے؟“

”نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔ اس نے کسی ملا سنانے کے ذریعے تاجاں کے سرال والوں کو ہکا دیا۔ وہ اس کے ہکانے میں آ بھی گئے۔ کہتے ہیں جن اس حویلی میں نہیں اترے گی۔ نہ یہاں ویاہ ہو گا نہ زمیں دارنی ویاہ میں بیٹھے گی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ زمیں دارنی سے انہیں کیا پیر ہے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”اس نے ان کا کیا لگاڑا ہے؟“

”گل امہ ہے جی، وہ کہتے ہیں زمیں دارنی رنڈ بیوہ ہے۔ اس کے بیٹھے سے ویاہ میں بدشگونی اور نحوست ہوگی۔“ نامدار نے ناگواری سے منہ بگاڑا۔ ”زمیں دارنی نے یہ سنا تو اس نے تاجاں کے سرال والوں کی بات مان لی پر تاجاں کی ماں پھاتاں نہ مانی۔ وہ اڑ گئی۔ صاف صاف کہہ دیا، ویاہ ہو گا تو حویلی ہی سے ہو گا اور بھین جی اس میں ضرور بیٹھے گی۔ اس کے بٹاں تو ویاہ ہو ہی نہیں سکتا۔“

”گل تو اس نے ٹھیک ہی کہی۔ پھاتاں ہے حوصلے والی۔“

”سنا ہے جی، وہ تو ان سے لڑ پڑی۔ بولی، رنڈ بیوہ تو میں بھی ہوں۔ میرا گھر والا تو مدت ہوئی گزر گیا۔ فیر میں کیسے ویاہ میں بیٹھ سکتی ہوں۔ میرے گھر تاجاں کی جنج کیسے چڑھ سکتی ہے؟“ نامدار تفصیل سے ایک ایک بات بتاتا رہا۔ ”کبھی تو جی وہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ اگر حویلی سے تاجاں کا ویاہ نہیں ہو سکتا تو پھاتاں کے گھر سے کیسے ہو سکتا ہے؟ گل تو ایک ہی سی ہوئی ناں۔“

”جب سگائی ٹوٹ ہی گئی تو اب زمیں دارنی پھاتاں کے گھر کیوں گئی ہے؟“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”زمیں دارنی سگائی توڑنا نہیں چاہتی۔“ نامدار نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”اس نے تاجاں کی ہونے والی سرال کے وڈوں کو پھاتاں کے گھر بلوایا ہے۔ تاجاں کا سراس کا ماما بھی تو ہوتا ہے۔ پھاتاں کا سگا بھرا ہے۔ لگتا ہے آج زمیں دارنی انہیں سے گل بات کرنے گئی ہے۔“

”کب تک واپس آئے گی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”پتہ نہیں جی۔ دیر ہی سے لوٹے گی۔ لمی گل ہوگی۔ ایک بار سگائی ٹوٹ جائے تو مشکل سے رشتہ جڑتا ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ نامدار نے بھی بات آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ رحیم داد کھانے سے فارغ ہوا تو نامدار نے جھوٹے برتن اٹھائے۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔

”حمدا کہاں ہے نامدار؟ وہ مجھے نظر ہی نہیں آیا۔“

میں چلے گئے تھے۔ حویلی کے پھانک پر پیریدار کے رک رک کر کھانسنے اور کھنکارنے کی آوازیں رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس دروازے کی جانب بڑھا جو مہمان خانے میں کھلتا تھا اس نے دروازے کو دھیرے سے کھولا اور مہمان خانے کے صحن میں پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ احمد اب تک واپس آگیا ہو گا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ مہمان خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مہمان خانے کے باہر کہیں قریب ہی گیدڑ بول رہے تھے۔

اس نے مہمان خانے کو خالی پایا تو رک گیا۔ چند لمحے خاموش کھڑا رہا، سوچتا رہا۔ مہمان خانے سے ملحق دو بڑی بڑی اور کشادہ کونھریاں تھیں۔ ان میں کبھی مہمان خانے کے نوکر چاکر رہتے تھے۔ مگر بعد میں انھیں کاٹ کباڑ رکھنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا تھا۔ نادر خاں نے اپنی رہائش کے لیے انھیں خالی کرایا تھا۔ کونھریوں میں کھڑکیاں نکال کر انھیں کمروں میں تبدیل کر دیا تھا۔ کمروں کے آگے برآمدہ تھا۔ سامنے کھلا صحن تھا۔ صحن کے تین طرف قد آدم چار دیواری تھی۔ اس گھر میں نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ رحیم داد اس طرف بڑھنے لگا۔

مہمان خانے کا ایک بیرونی دروازہ نادر خاں کے گھر کے عین سامنے کھلتا تھا۔ اسے نادر خاں نے اپنی سولت کے لیے کچھ ہی عرصہ قبل لگوا دیا تھا۔ رحیم داد نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے سے باہر چلا گیا۔ قریب ہی نادر خاں کے گھر کا ایک دروازہ تھا۔ لیکن عام آمد و رفت کا دروازہ صحن میں تھا۔ رحیم داد اس طرف نہ گیا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا، پھر ہاتھ بڑھا کر دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

دروازہ دھیرے سے کھلا۔ رحیم داد نے دیکھا، لائین کی مدھم روشنی میں نادر خاں کی بیوی جنت سامنے کھڑی ہے۔ وہ کچی نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ سردی سے کپکپا بھی رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے آنکھیں ملیں۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”چوہدری! تو اتنی رات کو کیسے آیا؟ واپس کب پہنچا؟“ اس کے چہرے پر گھبراہٹ بکھر گئی۔

”تو گھبرا کیوں گئی؟“ رحیم داد نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔ ”میں آج ہی شام واپس آیا ہوں۔“

”باہر اتنی سردی میں کیوں کھڑا ہے؟“ اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ ”اندر آجا۔“

رحیم داد چپ چاپ اندر چلا گیا۔ جنت نے دروازہ بند کیا مگر کٹڈی نہ لگائی۔ جھٹ ایک مونڈھا

”اس کا کیا ہے جی۔ کسی پکڑ میں گیا ہو گا۔ شام ہوتے ہی غائب ہو جاتا ہے۔ شدو کے گھر کے آس پاس منڈلاتا ہو گا۔“ نامدار نے مسکرا کر کہا۔ ”اور آج تو اس کی گھر والی تاراں بھی زمیں دارنی کے ساتھ گئی ہے۔ پر حمد اس کی کب پروا کرتا ہے۔ ویسے تجھ سے کیا چھپاتا۔ تاراں بھی کم نہیں۔ حمد انہیں ہوتا تو وہ بھی اصطبل کے راکھے کے پاس چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو ساری رات اسی کے ساتھ رہتی ہے۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کر کے بولا۔ ”اور ہاں تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں، نادر خاں کدھر ہے؟ وہ بھی نظر نہیں آیا۔“

”وہ تو جی دوپہر کو تانگے میں بیٹھ کر کہیں گیا ہے۔“

”کچھ پتہ ہے، کہاں گیا ہے؟“ رحیم داد نے نادر خاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔

”یہ تو جی، میں نوں پتہ نہیں۔ میں نے تو اسے صرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ زمین دارنی ہی نے کسی کام سے بھیجا ہو گا۔“ نامدار نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے مزید بات چیت نہ کی۔ نامدار باہر چلا گیا۔



رات سنان ہوتی گئی۔ دھند گاڑھی اور بوجھل ہوتی گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ نادر خاں اس طرح اچانک کہاں چلا گیا؟ اسے احسان شاہ کا خیال آیا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد آیا کہ نادر نے وعدہ کیا تھا کہ احسان شاہ کے پاس نہیں جائے گا۔ بلکہ اس نے رحیم داد کو بھی مشورہ دیا تھا کہ احسان شاہ سے ملنے جلنے میں احتیاط سے کام لے۔ پھر وہ کہاں گیا؟ کس کے پاس گیا؟ کس لیے گیا؟ رحیم داد تنہا بیٹھا نادر کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا رہا۔ اسے جیلہ کی واپسی کا بھی بے چینی سے انتظار تھا۔ وہ جلد سے جلد اس کا رد عمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

پہر رات گزر گئی۔ جیلہ ہنوز لوٹی نہ تھی۔ رحیم داد کو نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ کچھ عرصے سے رات گئے تک جاگنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ اس کی غیر حاضری میں کیا کیا ہوتا رہا؟ کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ اسے الجھن ہو رہی تھی۔ آخر اتنا کروہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے اوٹی دھسا اوڑھا۔ سر اور کانوں کو اچھی طرح دھتے سے ڈھک کر کمرے سے باہر نکلا۔ سردی چمک گئی تھی۔ حویلی خاموشی میں ڈوبی اونگھ رہی تھی۔ سارے ہی نوکر چاکر اپنی اپنی کونھریوں

اٹھا کر لائی اور رحیم داد کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ”بیٹھ جا چوہدری۔“

وہ سردی سے بدستور کپکپا رہی تھی۔ ”آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔“

”ہاں، سردی آج زیادہ ہی ہے۔“ رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جنت نے لائین کی مدھم لوانچی کی۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ وہ تھر تھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”آج سردی زیادہ تھی اس لیے میں تو چراغ جلنے کے بعد گھر سے باہر ہی نہیں گئی۔“ اس نے اپنا سر دوپٹے سے ڈھک لیا۔

”کوئی دوہرا کبل اوڑھ لے۔ سردی سے تیرے ہونٹ نیلے پڑتے جا رہے ہیں۔“

جنت نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی موٹی کھیس اتاری۔ اسے اوڑھا اور رحیم داد کے سامنے پٹنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہ گٹھے ہوئے بدن کی گوری جیٹی عورت تھی۔ چہرہ گول اور بھرا بھرا تھا۔ ناک میں بڑا سا فیروزہ تھا۔ آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ تھی۔ کئی بچوں کی ماں تھی۔ تین تو نادر خاں ہی سے تھے۔ ایک شوہر چھوڑ چکی تھی۔ مگر اس کی کاٹھی بہت اچھی تھی۔ نہ اس کا جسم بے ڈھنگے پن سے پھیل کر بگڑا تھا نہ چہرے کے نقش و نگار دھندلے پڑے تھے۔ وہ نادر خاں کے مقابلے میں زیادہ جوان اور تندرست نظر آتی تھی۔ ویسے بھی وہ نادر خاں سے پندرہ سولہ برس کم سن تھی۔

وہ پھول دار قمیص پہنے ہوئے تھی۔ شلوار سفید لٹھے کی تھی۔ دوپٹہ ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ اس کے لباس پر شکنیں اور سلوٹیں پڑی تھیں، مگر میلا نہیں تھا۔ وہ نظریں جھکائے رحیم داد کے ردرو خاموش بیٹھی تھی۔

”نادر کہاں ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ تو جی دہ پال پور گیا ہے۔ زمیں دارنی نے کسی ضروری کام سے بھیجا ہے۔“

”نادر دہ پال پور گیا ہے!“ رحیم داد حیرت سے چونک کر بولا۔ ”تیں نوں پتہ ہے کس کام سے گیا ہے؟“

”یہ تو جی اس نے مجھے بتایا نہیں۔ بس چلتے چلتے اتنا کہہ گیا تھا کہ کل شام لوٹے گا۔ دیری بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے پوچھا بھی۔ تب بھی اس نے آگے کچھ نہ بتایا۔“

”کام کے بارے میں بھی کچھ نہیں بتایا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”میں نے بتایا ناں کہ اس نے زیادہ گل بات ہی نہیں کی۔ جلدی میں لگتا تھا۔ میرے بار بار پوچھنے پر صرف اتنا کہا زمیں دارنی کے ایک ضروری کام سے دہ پال پور جا رہا ہوں۔“

”جیلہ کا کیا حال چال ہے؟“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“ جنت مسکرا کر بولی۔ ”تو اسے نہیں ملا؟“

”نہیں؟“ رحیم داد نے جنت کو آگاہ کیا۔ ”وہ پھاتاں کے گھر گئی ہے۔ ابھی تک لوٹی نہیں۔ باہر ریتا تھا دیر سے لوٹے گی۔“

”سمجھ گئی۔“ جنت نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ ”وہ پھاتاں کے گھر تاجاں کے سسرال والوں سے بات چیت کرنے گئی ہے۔ وہ ایسا ہے جی تاجاں کے رشتے میں کچھ گڑبڑ پیدا ہو گئی ہے؟“

”میں نے تو سنا ہے پچھلے دنوں تاجاں کی سگائی ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟“

”ہاں، ایسا ہی ہوا ہے۔“

”جیلہ سے میرے بارے میں بھی تیری بات چیت ہوئی؟“ رحیم داد نے جنت کو ٹٹولا۔

”کئی بار ہوئی۔ اور دیر تک ہوتی رہی۔ نادر نے تجھے بتایا ہی ہو گا۔“

”کچھ بتایا تو تھا، پر نادر سے ملے ہوئے بہت دن ہو گئے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ ”یہ بتا۔ اب وہ میرے بارے میں کیا کہتی ہے؟ زراض شراض تو نہیں ہے؟“

”پہلے تو سخت زراض تھی۔“ جنت کھل کر مسکرائی۔ ”پر میں نے اس کی ساری زراضکی ختم کرادی۔ اب اس کے دل میں تیری طرف سے بالکل میل نہیں۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا، وہ پنڈ چھوڑ کر لمور جانا چاہتی تھی۔“ رحیم داد نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”اب اس کا کیا ارادہ ہے؟ اس بارے میں بھی تیری اس سے بات ہوئی؟“

”اس بارے میں پہلے بہت بات کرتی تھی۔ پر اب بالکل نہیں کرتی۔“ جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ وہ شوخی سے مسکرائی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”چوہدری! برا نہ منانا۔ تو اسے سمجھ نہ سکا۔ زمیں دارنی جتنی سوہنی ہے، اتنا ہی سوہنا اس کا دل بھی ہے۔ وہ کسی سے بھی زیادہ دنوں تک زراض نہیں رہ سکتی۔ اسے منانا تو بہت آسان ہے۔“ اس نے ہلہ بولا۔ ”ویسے بھی جی وہ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی۔ بلکہ خود پریشان ہو جاتی ہے۔“ اس نے آنکھوں کو گردش دے کر ہونٹوں پر تبسم پیدا کیا۔ ”تیرے بارے میں اس نے مجھے ساری ہی باتیں بتا دیں۔“

”میرے بارے میں کوئی خاص گل بات ہوئی؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔ ”میرا مطلب ہے۔“

”میں تیرا مطلب سمجھ گئی۔“ جنت اس کی بات کاٹ کر بولی۔ ”نادور مجھے بتا چکا ہے تو کیا چاہتا ہے۔“ جنت سنجیدہ ہو گئی۔ ”پر تو جو کچھ چاہتا ہے، ابھی اس سلسلے میں زمیں دارنی سے بات کرنی ٹھیک نہیں۔ آج کل تو وہ تاجاں کے ویاہ میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ اسے کسی اور طرف دھیان دینے کا ہوش ہی نہیں۔ ہر گھڑی اسی کے بارے میں باتیں کرتی رہتی ہے۔“ اس کا لہجہ نرم اور شگفتہ ہو گیا۔ ”چوہدری! ایسی لگن اور چاہ سے ویاہ کی تیا ریاں کر رہی ہے جیسے تاجاں اس کی اپنی دھی ہو۔“ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ”وہ بہت دھوم دھڑکے سے ویاہ کرنا چاہتی ہے پر اب تو تاجاں کی سگائی ٹوٹ گئی۔ بہت برا ہوا۔ زمیں دارنی کو اس کا بہت دکھ ہے۔ جب سے یہ ہوا ہے بہت گھبرائی ہوئی اور پریشان رہتی ہے۔“

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”جنت! تیری تینوں چھو ریاں کدھر ہیں؟“

”برابر کے کمرے میں سو رہی ہیں۔“ اس نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ ”میں بھی وہیں سوتی ہوں۔“

رحیم داد نے جنت کے جسم کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ اس نے کسما کر پہلو بدلا اور ایک ٹانگ پر دوسری رکھ کر ذرا ترچھی ہو کر بیٹھ گئی۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز اچھا لگا۔ مسکرا کر بولا۔ ”جنت تو لالچا کیوں نہیں باندھتی؟“

”نہیں جی، میرے میکے میں زمانیاں دھوتی اور لاچا نہیں باندھتیں۔“ اس نے گردن اونچی کرتے ہوئے ٹھٹھے سے کہا۔ ”میرا بیٹہ زمیں دار ہے۔ اس کی ۳۰ کلا سے اوپر زمیں ہے۔ ویسے بھی جی ہم آباد کار ہیں۔ ادھر کے جا نگلی شانگی نہیں ہیں۔“ وہ اپنی بات کتے کتے نکلی۔ زیر لب مسکرائی۔ ”پر چوہدری تیرے دھیان میں یہ بات کیسے آئی کہ مجھے لاچا باندھنا چاہیے۔ شلو ار مجھے بری لگتی ہے۔“

رحیم داد نے بیجان انگیز نظروں سے جنت کو دیکھا۔ وہ احسان شاہ اور سردار مراد خاں شاہانی کی صحبت میں خاصا اوباش اور بد نظر ہو گیا تھا۔ جنت اس وقت اسے اچھی لگی۔ لالین کی زرد زرد روشنی میں اس کا گورا چٹا چہرہ دمک رہا تھا۔

جنت اس کی چبھتی ہوئی نظروں کی تاب نہ لاسکی۔ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی پھیل گئی۔

”جنت! تو لاچا باندھے تو زیادہ سوہنی لگے گی۔“ رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کہاں سوہنی ہوں جی۔“ وہ بڑے ناز سے بولی۔ ”سوہنی تو چچ پوچھ اپنی زمیں دارنی ہے۔ اسے تو جو بھی دیکھتا ہے، دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ اس کا رنگ روپ ہی ایسا ہے۔“

جیلہ کا ذکر سن کر رحیم داد کے سارے الجھے، مچلتے دلو لے جھاگ کی مانند بیٹھ گئے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جنت نے ٹوکا۔ ”کہاں چلا چوہدری؟“

”نیند لگ رہی ہے۔ جا کر سوؤں گا۔“

”چلا جانا۔ ایک گلاس گرم دودھ تو پی لے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ ”تو پہلی بار میرے گھر آیا ہے۔ میں تجھے ایسے ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ میں ابھی دودھ لائی۔ گرم ہی ہو گا۔ میں رات کو بھڑولی پر دودھ رکھ دیتی ہوں۔ صبح تک گرم رہتا ہے۔“

رحیم داد بیٹھ گیا۔ جنت کمرے سے نکل کر صحن میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں بھڑولی اٹھائے ہوئے آئی۔ یہ پیالے کی شکل کی کھلے منہ اور چوڑے پینڈے کی انگیٹھی تھی۔ اس کے بالائی کناروں میں چاروں طرف چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ اسے چکنی مٹی میں توڑی شامل کر کے اس طرح بنایا گیا تھا کہ پہلے مٹی کو اچھی طرح گوندھا گیا۔ پھر اسے ہاتھوں کی مدد سے تیار کر کے دھوپ میں سکھایا گیا تھا۔ اس میں اوپلے سلگا کر رکھ دیے جاتے جن کی ہلکی ہلکی آہنج رات بھر دھکتی رہتی۔

بھڑولی کے اوپر پیتل کی گڑوی میں دودھ بھرا تھا۔ جنت نے بھڑولی کمرے میں لا کر رکھ دی۔ وہ دوبارہ باہر گئی اور کانسی کا لمبا گلاس لے کر آئی۔ گلاس میں اس نے گڑوی سے گرم گرم دودھ اٹھایا۔ شکر ملائی اور گلاس رحیم داد کی طرف بڑھا کر بولی۔

”چوہدری! لے لے اسے پی لے۔ زیادہ گرم نہیں ہے۔“

رحیم داد نے گلاس ہاتھ میں لیا۔ ہونٹوں سے لگایا اور گھونٹ گھونٹ گرم دودھ پینے لگا۔ جنت نے بھڑولی اپنے سامنے رکھ لی اور اس میں سلگتے ہوئے اپلوں کی آہنج پر دونوں ہاتھ پھیلا کر سینکے لگی۔ رحیم داد نے دودھ پی کر گلاس جنت کو دے دیا۔ اس نے گلاس ایک طرف رکھ دیا اور بھڑولی پر جھک کر ایک بار پھر دونوں ہاتھ سینکے لگی۔

رحیم داد نے دیکھا، بھڑولی کی سرخ سرخ آہنج سے جنت کا چہرہ دمک رہا ہے۔ اس پر بھین آگئی ہے۔ رحیم داد اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ مسکرایا۔ اس نے جنت کو ٹٹولنے کے لیے چھیڑا۔ ”جنت!

صرف دودھ ہی پیائے گی؟“

”اور تجھے کیا چاہیے؟“ وہ بدستور بھڑولی پر جھکی ہوئی بیٹھی رہی۔

”یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔“ رحیم داد دھیرے دھیرے کھلے لگا۔

”مجھے کیا پتہ جی۔“ اس نے رحیم داد کی جانب پھر بھی نہ دیکھا۔

”تو سوہنی تو ہے پراتنی بھولی نہیں کہ تجھے کچھ پتہ نہیں۔“ وہ ہولے ہولے ہنسنے لگا۔

جنت نے زبان سے تو کچھ نہ کہا۔ نظریں اٹھا کر دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ مسکرائی اور پھر گردن جھکائی۔ اس کے رخسار بھڑولی کی آنچ سے لال بھبھوکا ہو رہے تھے۔ لبوں پر دہلی دہلی مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں چراغ جھل مار رہے تھے۔ رحیم داد ٹٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ جنت نے گردن اونچی کی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ آہستہ سے بولی۔ ”چوہدری! تجھے سردی نہیں لگ رہی؟“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ اٹھ کر جنت کے پاس جانے کے لیے کھسکیا۔ اسی وقت دروازہ چرچرایا۔ رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا کہ جیلہ دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ وہ اندر آگئی۔ اس کے پیچھے تاراں بھی تھی۔

”چوہدری! تو ادھر بیٹھا ہے۔“ جیلہ نے کہا۔ ”میں تیرا کھوج لگاتی پھر رہی ہوں۔“ وہ مسکرائی ہوئی آگے بڑھی۔ ”مجھے تو پھانسیاں کے گھر سے واپسی پر پتہ چلا، تو آگیا ہے۔ کب آیا؟“

”میں تو شام ہونے سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ کمرے میں بیٹھا تیرا انتظار کرتا رہا۔ جب تو دیر تک نہ آئی تو نادر سے ملنے ادھر آگیا۔ یہاں جنت سے پتہ چلا، وہ دمپال پور گیا ہے۔“ رحیم داد بولتے بولتے ٹھٹکا۔ ”زمین دارنی! تو اس طرح کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا؟“

”ادھر آجا زمیں دارنی۔“ جنت نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ اور کھڑے ہو کر پٹنگ کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں بیٹھ جا۔“ اس نے اٹھ کر جھپاک جھپاک بستر کی ٹکٹیں درست کرنا شروع کر دیں۔

جیلہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جنت! میں نے یہاں بیٹھنا نہیں ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”چوہدری! میرے ساتھ چل۔ تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ میں تو تیرا کئی روز سے سخت انتظار کر رہی تھی۔“

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ بڑھا۔ تاراں دونوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تینوں باہر نکلے اور مسمان خانے میں داخل ہو گئے۔ تاراں نے مسمان خانے کا دروازہ بند کر دیا۔



رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ جیلہ بھی اس کے ہم راہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ جیلہ

سنری کنارے کی سفید شمال اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا لباس بھی سفید ہی تھا۔ اس سادگی میں بھی اس کا دلکش چہرہ کندن کی مانند دک رہا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھل رہے تھے۔ غزالی آنکھوں میں ستارے جگمگا رہے تھے۔

دونوں کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد نادر نے انگیٹھی لا کر کمرے میں رکھ دی۔ انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔ انگیٹھی رحیم داد اور جیلہ کے درمیان رکھی تھی۔ دونوں جھک کر ہاتھ ناپنے لگے۔ انگاروں کی آنچ سے جیلہ کا گلابی چہرہ اور سرخ ہو گیا، خوبصورت اور تابندہ ہو گیا۔

رحیم داد انگیٹھی پر ہاتھ پھیلا کر جسم میں حرارت اور گرمی پہنچاتا رہا۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے وسوسے اور خدشے منڈلا رہے تھے۔ ہر چند وہ جنت کی زبانی سن چکا تھا کہ جیلہ اب اس سے خفا نہیں ہے، مگر اس کے دل میں چونکہ چور تھا لہذا سہا ہوا تھا۔ بار بار یہ خیال اسے پریشان کرتا کہ جیلہ اتنی رات گئے کون سی اہم بات کرنا چاہتی ہے جس کے لیے اس نے نہ صرف پھانسیاں کے گھر سے لوٹتے ہی اس کی تلاش شروع کر دی تھی بلکہ کئی روز سے اس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہی ہے۔

اس نے نظریں اٹھا کر جیلہ کے دل آویز دیکھتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ لمحہ بھر تک بے قراری سے دیکھتا رہا، پھر اس نے ہولے سے گری سانس بھری اور نظریں جھکا لیں۔

جیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر خاموشی کو توڑا۔ ”چوہدری! اتنے دن کہاں رہا؟“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”خریف کی واڈھی پر تیرا بہت انتظار رہا۔ تجھے واڈھی پر تو یہاں ہونا ہی چاہیے تھا۔“

”خریف کی واڈھی ہو گئی۔ بہت ٹھیک ہوا۔“

”واڈھی تو کرنا ہی تھی۔ جب تو نہیں آیا تو شروع کرانی پڑی۔ بلکہ دیر سے شروع ہوئی۔ ایسا تیرا بہا انتظار کرنے کے کارن کرنا پڑا۔ میں پوچھتی ہوں تو واڈھی پر پہنچا کیوں نہیں؟“

”میں ہوتا بھی تو کیا کرتا؟“ رحیم داد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”تو موجود ہی تھی۔“

”کمال کرتا ہے۔ یہ بھی کوئی گل بات ہوئی۔“ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کا لہجہ ٹیکھا تھا مگر اس کی آنکھوں میں خفگی یا کدورت کا غبار مطلق نہ تھا۔ ”میرا کیا ہے۔ واڈھی پر تو تیرا موجود ہونا ضروری تھا۔ میں نے کون سی زمیں داری چلائی ہے۔“ جیلہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”یہ بتا تو اب تک رہا کہاں؟“

”میں کلیم کے چکر میں پہلے منگمری گیا۔ فیہلمن جانا پڑا۔“

”وہ تو میں نوں پتہ ہے۔ نادر مجھے بتا بھی چکا ہے اور یہ بھی بتا چکا ہے تیرے کلیم کے بارے میں جو گڑبڑ پیدا ہو گئی تھی، وہ بھی بالکل دور ہو گئی۔ یہ بہت ٹھیک ہوا۔ مجھے تیرے کلیم کے کارن بہت چلتا تھی۔“ جیلہ نے اظہار مسرت کرتے ہوئے کہا۔ ”پر اس کے بعد تو رہا کہاں، واپس کیوں نہ آیا؟“

”کیا کرتا واپس آکر۔“ رحیم داد نے چہرے پر افسردگی کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نوں اس زمین اور حویلی کی الاٹمنٹ سے کیا لیتا۔ تو نے ہی دلائی تھی اور تیری ہی زمین اور حویلی تھی بھی۔“ اس نے نظریں اٹھا کر جیلہ کے شگفتہ اور دکتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ ”میں تو برسوں محکم آباد کاری کے دفاتروں کے چکر کاٹ کاٹ کر اور گردا گردوں اور پڑاویوں کی خوشامد کرتے کرتے مایوس ہو کر اپنے کلیم کو بھول ہی چکا تھا۔“

”پر یہ گلاں تو اب پرانی ہو چکی ہیں۔“ جیلہ نے اسے ٹوکا۔

”میں تو یہ سوچ کر یہاں سے گیا تھا کہ اب میں نے واپس نہیں آتا۔“ اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”پہلے ملتان میں کوشش کی۔ وہاں کام نہ بنا تو بھکر چلا گیا۔ سنا تھا وہاں الاٹمنٹ مل رہی ہیں۔ پر ساری زر خیز زمینیں ڈوے زمین داروں نے اپنے مزارعے لگا کر دبائیں یا فیروگس اور جعلی کلیموں کے ذریعے اپنے کہنے میں کر لیں۔ محکم آباد کاری والوں نے وہاں بھی زبردست دھاندلی مچا رکھی ہے۔ چھانٹ چھانٹ کر عمدہ زمینیں اپنے تاتے داروں، شریکوں اور جاننے والوں کے نام الاٹ کرادیں۔“ رحیم داد کے لبوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”اب تو وہاں بخر اور کلر زمین رہ گئی ہے۔ اس کے لیے بھی درخواستوں کے ڈھیر لگے ہیں۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”زبردست اندھیر گردی ہے جی۔ دبا کے رشوت لی جا رہی ہے۔ اس کے بنا تو کوئی بات سن نے کو بھی تیار نہیں۔“

”اس دھاندلی میں تو چھوٹے بڑے سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے لے کر صوبائی اور مرکزی وزیر تک سب ہی شامل ہیں۔ رشوت کے ساتھ ساتھ سفارش بھی چل رہی ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ ”پر چوہدری، تو الاٹمنٹ کے چکر میں پڑا ہی کیوں؟ یہاں کی اراضی کچھ کم ہے۔ تو کیوں الاٹمنٹوں کی لوٹ مار میں شامل ہو گیا؟ تیرے لیے تو یہی زمین بہت ہے۔“

”سوچا تھا، تھوڑی سی زمین کہیں اور مل جائے تو زمین داری شروع کر دوں گا۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس زمین اور جائیداد کو تو کبھی میں نے اپنا سمجھا ہی نہیں۔ یہ تو بھی ٹھیک طرح جانتی ہے۔“

رحیم داد نے آواز میں اور زیادہ رقت پیدا کی۔ ”جب تو مجھ سے نراض ہو گئی تو میں نے یہاں رہ کر کیا کرنا؟“ اس نے بھی بھی نظروں سے جیلہ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”زمین دارانی! تجھے لوہر شور جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ سنا ہے سندھ میں آسانی سے الاٹمنٹ مل جاتی ہے۔ ادھر بہت متروکہ زمین اور جائیداد ہے۔ اب وہیں چلا جاؤں گا۔“

”ایسا ہی ارادہ تھا تو ادھر واپس ہی کیوں آیا؟“ جیلہ کے لہجے میں طنز کا پہلو نمایاں تھا۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لہجے میں اور زیادہ غم گھول کر بولا۔ ”میں تو اس لیے آیا تھا کہ تیرے دل میں میری طرف سے میل نہ رہے۔ جو کچھ ہو گیا اسے بھول جا۔ ہاں، تیرا اور اللہ وسایا کا مجھ پر جو احسان ہے وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ تو نے اور اس نے مجھے ایسے وکت سہارا دیا، جب میرا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، کوئی اپنا نہ تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب تیری زمین اور حویلی تیرے پاس رہے گی۔ وکیل کو بلا لے۔ میں زمین اور حویلی کا بیع نامہ تیرے نام کر دوں۔ میرا کیا ہے۔ جب ایک بار گھر سے بے گھر ہو گیا، جڑ گیا، تباہ ہو گیا، تو کہیں بھی پڑاؤ ڈال لوں گا۔ جیسے تیسے زندگی گزر رہی جائے گی۔“

جیلہ اس کے دکھ بھرے لہجے اور غم زدہ باتوں سے بہت متاثر ہوئی۔ پیار سے ڈانٹ کر بولی۔ ”غفلت باتیں نہ کر۔“ جیلہ مسکرائی۔ ”چوہدری! تو نے مجھے سمجھا ہی نہیں۔ میں تو کسی سے بھی نراض نہیں رہ سکتی اور تو تو میری ہی طرح فسادات کی بھڑکتی آگ کا جھلسا ہوا ہے۔ خون کا دریا تیر کر نکلا ہے۔ میں تیرا دکھ جانتی ہوں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ اس میں تڑپ تھی، درد کی جھین تھی۔ ”میں نے آگ اور خون کا یہ خوف ناک کھیل دیکھا ہے۔ اس دکھ اور اپرا دھ کو جھیلا ہے، بھگتا ہے۔ یہ بھیا تک کلپنا ہے۔ رات کو کبھی اس کی یاد آجاتی ہے تو آج بھی ساری ساری رات نیند نہیں آتی۔“ اس کے خوبصورت اور تابناک چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ ”چوہدری! ایسی باتیں کر کے میرے گھاؤ نہ چھیڑ۔ تیں نوں پتہ نہیں، میں کتنی ابھاگن اور دکھی ہوں۔“

”تو پنڈ چھوڑ کر لوہر تو نہیں جا رہی ہے؟“ رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ ”پہلے مجھے یہ بتا، تو نے اس بارے میں کیا سوچا؟“

”میں تو آج کل، تاجاں کے وہاں کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

”سنا ہے تاجاں کی تو نے سگائی بھی کر دی۔“ رحیم داد نے پوچھا۔

”میری تو آشتی تو اس کی سگائی پر یہاں ہوتا۔ پر تیرا تو کچھ پتہ ہی نہ تھا کہ کہاں ہے اور کب لوٹے گا؟ لوٹے گا بھی یا نہیں۔“ جیلہ کا لہجہ اچانک غم ناک ہو گیا۔ ”پر اب تو تاجاں کے سرال والوں نے سگائی توڑ دی۔“

”سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ نامدار بتاتا تھا، تو آج اسی معاملے میں پھاتاں کے گھر گئی تھی۔ کیا بات چیت کا؟“

”سگائی کے ساتھ رشتہ تو سمجھو ٹوٹ ہی چکا ہے۔ پر تاجاں کا ہونے والا سر نیک بندہ ہے۔ ویسے تاجاں کا سگاما بھی ہوتا ہے۔ اس نے سب کو سمجھا بجھا کر راضی تو کر لیا ہے۔ بہت بک بک، جھک جھک کے بعد فیصلہ ہوا۔“

”کیا فیصلہ ہوا؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”ویاہ نہ حویلی سے ہو گا نہ پھاتاں کے گھر سے۔“ جیلہ نے بتایا۔ ”نادر خاں، جس گھر میں رہتا ہے، وہاں سے تو ویاہ ہو گا۔ جن سکول میں اترے گی۔“

”یہ تو ٹھیک ہی فیصلہ ہوا۔ ویسے حویلی سے ویاہ ہوتا تو ٹھیک تھا۔ تو ویاہ میں بیٹھے گی؟ میں نے سنا تھا تاجاں کے سرال والوں کو تیرے ویاہ میں بیٹھے پر بھی اعتراض تھا۔ یہ تو انھوں نے بہت خراب شرط لگائی تھی۔ ویاہ کے لیے سب کچھ تو کرے اور تجھے ہی ویاہ میں نہ بیٹھنے دیا جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”اب یہ طے ہوا ہے کہ میں ویاہ میں بیٹھوں گی۔ ویسے میں تو خود بیٹھنا نہیں چاہتی تھی۔“ اس کی آواز میں دبا دبا کر بک تھا۔

”تو کیوں نہیں ویاہ میں بیٹھنا چاہتی تھی؟“

”رندو دھوا جو ہوئی۔“ جیلہ کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ ”رندو کا تو ویاہی جانے والی کڑی پر سایہ بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ اسے برا شگون سمجھا جاتا ہے۔ کیا کیا جائے، ریتاں رساں ہی ایسی ہیں۔“

رحیم داد نے جیلہ کو غم زدہ اور دل گرفتہ پایا تو گفتگو کا رخ بدل دیا، پوچھا۔ ”زمیں دارنی! تو نے نادر کو دہپال پور کس لیے بھیجا ہے؟ کوئی خاص کام ہے؟“

”خاص ہی کام ہے تجھ سے اسی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتی تھی۔ بلکہ اس معاملے میں تو مجھے تیرا سخت انتظار تھا۔ نہ آتا تو میں نادر خاں کو دوبارہ تیرے پاس بھیجتی۔“

”گل کیدہ اہمہ۔ خیر اے ناں؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”خیر ہی ہے۔ تو احسان شاہ کو تو جانتا ہے۔“

رحیم داد گھبرا گیا۔ لہجے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ فیر ایسی گل بات کیوں پوچھتی ہے؟“ اس نے لہجے میں تلخی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”پر اب میرے سامنے اس کا نام نہ لے۔ اسی کی جہ سے تجھ سے ساری زراعت ہوئی۔“ اس نے چرے پر غصے اور ہمواری کے تاثرات پیدا کئے، تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”تجھے پتہ نہیں وہ کتنا کمینہ ہے۔ اسی نے میرا ہلم منسوخ کرانے کے لیے درخواست لگوائی تھی۔ تفتیش کروانے کا حکم نکلوا یا تھا۔“

”میں نوں سب پتہ ہے۔ نادر مجھے اس بارے میں پہلے ہی سب کچھ بتا چکا ہے۔ احسان شاہ کتنا کمینہ اور گندہ ہے۔ یہ مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔“

”جب ایسی بات ہے تو اس کا ذکر تو نے میرے سامنے کیوں پھیرا؟“ رحیم داد نے قدرے تکیے لہجے میں کہا۔ ”مجھے شک کرنا چاہتی ہے، ذلیل کرنا چاہتی ہے؟“

”ایسی گل نہیں۔“ جیلہ مسکرا کر نرم لہجے میں بولی۔ ”زراعت نہ ہو۔“ اس نے رحیم داد کے چرے کی جانب نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں پچھلی رات کے چاند کی چاندنی اتر آئی تھی۔ ”مجھے احسان شاہ سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔“

”احسان شاہ سے ضروری کام پڑ گیا ہے! اور تجھے؟“ رحیم داد حیرن و پریشان ہو کر گویا ہوا۔

”ہاں، ایسی ہی گل ہے اور تجھے اس کام کے سلسلے میں احسان شاہ کے پاس جانا ہو گا۔“

”زمیں دارنی تو کیسی گل کر رہی ہے؟“ رحیم داد نے چرے پر ہنسنے لگا ہوا کرتے ہوئے ناگواری سے کہا۔ ”میں نے اس کے پاس نہیں جانا۔ مجھے تو اب اس کے نام سے بھی گھن آتی ہے۔“

”میری گل تو سن۔“ جیلہ نرمی سے بولی۔

”سنا، کیا سنا چاہتی ہے۔“ رحیم داد کے چرے پر بدستور تناؤ تھا۔

”بات یہ ہے۔“ جیلہ نے سنبھل سنبھل کر اپنا مقصد بیان کیا۔ ”یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا، احسان شاہ اپنے مزارعوں اور کمیوں کی نوجوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا کر کید کر لیتا ہے۔ سنا ہے ان کو رکھنے کے لیے اس نے بہت وڈا کوٹ بنوا رکھا ہے۔ سمجھو ایک طرح کی جیل ہے وہ۔ اس کی کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔“

”سنا تو میں نے بھی ہے۔ پر کبھی دیکھا نہیں۔“ رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

”ان ہی کیدی زنائیوں میں سے ایک نے کسی نہ کسی طرح کوٹ کی جیل سے بھاگنے کی کوشش کی اور اس کی کوشش سہل بھی ہو گئی۔“

”جب جیل ہوگی تو زنانیاں اس سے نکل کر بھاگنے کی کوشش بھی کرتی ہوں گی اور کوئی کوئی تو کامیاب بھی ہو جاتی ہوگی۔“ رحیم داد نے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”پر تو نے ان سے کیا لیا؟“

”ہوا یہ کہ ایک ایسی ہی زنانی چند روز ہوئے یہاں پہنچ گئی۔“ جیلہ نے رحیم داد کو اپنی بات وضاحت سے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ایسی کڑا کے کی سردی میں وہ ات بھر جھاڑیوں میں چھپی رہی۔ میں سویرے سکول پہنچی تو وہ جھاڑیوں سے نکل کر میرے پیروں پر گر پڑی۔ سردی سے اس کا بدن مانو برف ہو رہا تھا۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اسے خدشہ لاحق ہوا کہ کوئی ایسی عورت نہ ہو جو احسان شاہ کی حویلی میں اس کے ساتھ رات بسر کر چکی ہو۔ وہ اسے فوراً پہچان لیتی۔ اور اس کے لیے خطرہ بن جاتی۔ جیلہ ایک بار پھر اس سے ناراض ہو جاتی اور اب اسے منانا بھی مشکل ہوتا۔ وہ سخت الجھن میں پڑ گیا۔ ہچکچاتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اب وہ کہاں ہے؟“

”میرے کمرے میں ہے۔“ جیلہ نے بتایا۔

رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔ اور اس قدر بڑھ گئی کہ وہ اس کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہ کر سکا۔ دم بخود بیٹھا رہا۔ جیلہ بولتی رہی۔ ”میری طرح وہ بھی مغویہ ہے۔ پہلے ہندو ہوتی تھی۔ اب مسلمان ہو چکی ہے۔ اس کا نام زینت بی بی ہے۔ میری ہی طرح ابھاگن ہے۔“ جیلہ کا چہرہ ذہنی کرب سے مرجھا گیا۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اسے فوراً یاد آ گیا کہ بچھلی بار جب وہ احسان شاہ کی حویلی میں تھا تو مراد خاں شاہانی نے مزا لے لے کر زینت کا ذکر کیا تھا۔ وہ کوٹ میں ان دنوں نئی نئی اٹھا کر لائی گئی تھی۔ رحیم داد نے اس کے بارے میں مراد خاں سے بہت کچھ سنا تھا۔ مگر زینت سے اس کا آمناسامنا نہ ہوا تھا۔ نہ اس نے رحیم داد کو دیکھا تھا اور نہ ہی رحیم داد نے اسے دیکھا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی اور انجان تھے۔

رحیم داد نے زینت کے بارے میں کسی تبصرے سے گریز کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ جیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس پر بھی بہت اپردہ ہوا۔ جس کے ہاتھوں میں پڑ گئی اس نے نوچا کھوٹا۔ ذرا بھی ترس نہ کھایا۔ آخر اسے ایک نیک بندہ مل گیا۔ وہ سکول ماسٹر تھا۔ اس نے زینت سے باقاعدہ ویاہ کر لیا۔ اب وہ اسی کے پاس جانا چاہتی ہے۔“

”وہ کہاں ہوتا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”وہ آج کل دیپال پور کے پرائمری سکول میں ماسٹر لگا ہے۔ اس کا نام جلیل ہے۔“

”تو نے اسی کو بلانے کے لیے نادر کو دیپال پور بھیجا ہے؟“

”ہاں جی، میں نے نادر خاں کو اسی لیے دیپال پور بھیجا ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”وہ آکر زینت کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔“

”جب ایسی گل بات ہے تو احسان شاہ کے پاس میرے جانے کی کیا ضرورت ہے۔“

اس نے استغما یہ نظروں سے جیلہ کی جانب دیکھا۔ ”میں تو کہتا ہوں زمیں داری، احسان شاہ کو تو اس کا بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے۔ بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔ تیس نوں پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک اور کمینہ ہے۔“ اس کے چہرے سے خوف اور پریشانی صاف عیاں تھی۔

”میں نوں پتہ ہے، وہ کتنا خطرناک ہے۔“ جیلہ نے رحیم داد سے اتفاق کیا۔ ”اس کا اثر و رسوخ بھی بہت ہے۔ وڈے سرکاری افسروں بلکہ اسمبلی کے ممبروں اور وزیروں تک سے اس کی یاری ہے۔ اس کی پہنچ تو بہت اوپر تک ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ چہرے کی شکفتگی اور رعنائی دھندلی پڑ گئی۔ ”سچ پوچھ تو حکومت ہی ایسے بندوں کی ہے۔ اس کے دوپتر تو وڈے سرکاری افسر لگے ہیں۔ جنوائی اور جیتے بھی اونچے عہدوں پر ہیں۔“

”تو بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پر سمجھ نہیں آتی مجھے اس کے پاس کیوں بھیجنا چاہتی ہے؟“

”یہی تو تجھے بتانا ہے۔“ جیلہ نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”زینت کے دو بچے ہیں۔ دونوں احسان شاہ کے مزار سے سلامو کے پاس ہیں۔ سلامو ہی اسے اغوا کر کے پیراں والہ لایا تھا۔ اور اس کے گھر سے احسان شاہ نے اپنے کزنوں کے ذریعے زینت کو اٹھوایا۔“

”زینت کو اپنے بچے تو یاد آتے ہی ہوں گے۔“

”کیوں نہیں یاد آتے۔ زینت کے سینے میں بھی ماں کا ہر دے دھڑکتا ہے۔“ جیلہ نے تڑپ کر کہا۔ ”ان کے لیے وہ بلک بلک کر روتی ہے۔ اسے روتا دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں میں بھی آنسو آ جاتے ہیں۔ میں بھی تو ماں ہوں۔“ اس کے چہرے پر دکھ برسات کے بادلوں کی مانند منڈلانے لگا۔

”چوہدری! تجھے ماں کی ممتا کا پتہ نہیں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔

”تو احسان شاہ کے پاس چلا جا۔“ اس دفعہ جیلہ کے لہجے میں التجا کا پہلو نمایاں تھا۔ ”اس کی منت ساجت کر لیتا۔ میری خاطر کر لیتا۔“ اس کے رویے میں عاجزی اور بڑھ گئی۔ ”چوہدری! تو زینت کے بچے دلوا دے۔ تیری بہت مہربانی ہوگی۔ مجھے وٹو اس ہے احسان شاہ تیری گل ضرور مان

لے گا۔

”بالکل نہیں مانے گا۔ تو نے بالکل غلط اندازہ لگا رکھا ہے۔“ رحیم داد نے جھٹ صفائی پیش کی۔
”میری اس کے ساتھ ایسی یاری نہیں کہ وہ میری ہر گل بات مان لے۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں وہ تیرا دشمن نہ ہو جائے۔“

”ہو جائے کون سا فرک پڑتا ہے۔ پہلے ہی وہ کون سا مجھ پر مہمان رہا ہے۔“ جمیلہ کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”وہ تو مجھے اپنی رکھیل بنانے کے لیے خریدنا چاہتا تھا۔ دو ہزار بولی لگائی تھی۔ پر اللہ وسایا نے صاف انکار کر دیا۔“ جمیلہ نے اپنی بات کا رخ بدل دیا، ایک بار پھر حرف مطلب پر آگئی۔ ”چوہدری! تو زینت کے بچوں کے لیے احسان شاہ سے بات کر کے تو دیکھ۔“

”تو بھی کمال کرتی ہے زمیں دارنی۔“ رحیم داد کسی قدر جھنجھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اس سے بات کرنے کا تو یہ مطلب ہو گا کہ اسے پتہ چل جائے گا زینت یہاں ہے۔“

اس نے جمیلہ کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو نے یہ نہیں سوچا، اگر احسان شاہ نے میری بات نہ مانی تو کیا ہو گا؟ میں تو کہتا ہوں اسے پتہ چل گیا تو زینت اپنے گھر والے کے پاس بھی نہ جاسکے گی۔ احسان شاہ اسے رستے ہی سے اٹھوا لے گا۔ وہ ایسا ہی خطرناک بندہ ہے۔“

جمیلہ تذبذب میں پڑ گئی۔ رحیم داد نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا، ان کی اہمیت کو اس نے بھی محسوس کیا۔



رات کالی کا جل ہو گئی۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ حویلی پر سناٹا چھایا تھا۔ اسی اثنا میں رات کے گمرے سناٹے میں کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ چاپ ہو لے ہو لے قریب آتی گئی۔ دروازے کا ایک پٹ ذرا سا کھلا تھا۔ جمیلہ اور رحیم داد نے گردن موڑ کر اس طرف دیکھا۔

زینت دروازے پر کھڑی تھی۔ مگر وہ اندر نہ آئی۔ جمیلہ نے نری سے کہا۔ ”اندر آجا۔ باہر سردی میں کیوں کھڑی ہے؟“

وہ سہمی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور دہلیز کے پاس فرش پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے نظر بھر کر اسے دیکھا۔ اس کا رنگ ہلکا گلابی تھا۔ بال سنہری مائل تھے۔ آنکھیں بھوری مگر بڑی بڑی اور کشش انگیز تھیں۔ ناک نقشہ سبک اور کھڑا کھڑا تھا۔ جسم نرم اور گداز تھا۔ عمر ۲۴ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مگر وہ اتنی ہی عمر میں ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن چکی تھی۔ آنکھیں ویران اور دھواں دھواں تھیں۔ چہرہ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح ٹکٹکی سے عاری تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی

تھی۔ وہ گہری نیلی دھوئی باندھے ہوئے تھی اور ملکی کھیس اوڑھے سکڑی سکڑائی حسرت کا مرقع اور عبرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

جمیلہ نے پوچھا۔ ”زینت! کیسے آگئی؟“

”بھین جی، زینت نہیں آرہی تھی۔“ وہ بچھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”مجھے پتہ چلا، تو یہاں ہے۔ من گھبرایا تو ادھر آگئی۔ تو نے برا تو نہیں منایا؟“

”ایسی گل نہ سوچ۔“ جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ادھر میرے پاس کرسی پر آکر بیٹھ جا۔“

اس نے گردن ہلا کر آہستہ سے کہا۔ ”نہیں بھین جی، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ وہ اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”چوہدری! اس نے دسویں تک پڑھا ہے۔ پتا ڈاکٹر تھا۔ پنڈتوں کا کھانا پیتا گھرانہ تھا۔ سے بدلا تو سب کچھ بدل گیا۔ اب یہ اپنی ہی نظروں میں اتنی گر گئی ہے کہ خود کو کمی سمجھتی ہے۔ میرے ساتھ کرسی پر بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہے۔“

رحیم داد نے جمیلہ کی بات نظر انداز کرتے ہوئے زینت سے پوچھا۔ ”تو احسان شاہ کے کوٹ سے کیسے نکل آئی؟ سنا ہے ادھر بہت کڑی نگرانی ہوتی ہے۔ ہر وکت مسلح راکھے پہرہ دیتے ہیں۔ میں نے غلط تو نہیں سنا؟“ رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”تو نے ٹھیک ہی سنا۔“ اس نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”وہ ایسا ہوا جی، میں اس رات کوٹ میں نہیں تھی۔ مجھے شاہ جی کے نوکر، شیدائے ان کمروں میں سے ایک میں پہنچا دیا تھا جن میں مسمان ٹھہرتے ہیں۔ وہ جی بہت گندی اور خراب جگہ ہے۔“ اس کا لہجہ دھیما اور افسردہ پڑ گیا۔ ”پہلے بھی ان کمروں میں کئی بار جا چکی تھی۔ اس رات محکمہ آباد کاری کا کوئی وڈا افسر ٹھہرا تھا۔ اس نے دانتوں سے ایسے زور زور سے کاناکہ مجھے روٹا آگیا۔ پر وہ ہنستا رہا، خول کرتا رہا۔ نشے سے بالکل پاگل ہو رہا تھا۔“

رحیم داد نے مسکرا کر جمیلہ کی جانب دیکھا۔ ”سن لے، زمیں دارنی۔ اس طرح ہو رہی ہے آباد کاری۔“ جمیلہ کچھ نہ بولی۔ نگاہیں نیچی کیے خاموش بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نگاہیں گھمائیں۔ زینت کو دیکھا، پوچھا۔ ”یہ بتا زینت، تو وہاں سے نکلی کیسے؟ راکھوں نے تجھے نہیں روکا؟“ اس کی آنکھوں میں حیرت اور استعجاب تھا۔

”بات سچی یہ ہے جی۔“ زینت نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر بتایا۔ ”نشے میں تو وہ تھا ہی۔ ایسا

جیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! یہ بھی ٹھیک ہی ہوا زینت اس سے یہاں آگئی۔ تو نے بھی اس کا دکھ جان لیا۔ یہ اپنے بچوں کے لیے بہت دکھی ہے۔ اسے کچھ چنگا نہیں لگتا۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتی۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”یہ بتا اس کے بچوں کو لانے کے لیے کیا رستہ نکالا جائے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”میں تو کہتا ہوں جی، پہلے اس کے گھر والے کا انتظار کر لیا جائے۔ وہ کل شام تک نادر خاں کے ساتھ پہنچ ہی جائے گا۔ جنت نے مجھے یہی بتایا ہے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشات کا دلی زبان سے اظہار کیا۔ ”پہلے اس کے گھر والے سے گل بات کرنی ضروری ہے۔ مان لے وہ اسے لے جانے پر تیار نہ ہوا تب کیا ہوگا؟ مجھے یا تجھے اس کے دل کا کیا پتہ؟“

”چوہدری! تو کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔ ایسا سے لگا ہے، کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کبھی کبھی تو میں بھی اس پر کار سوچتی ہوں۔“ جیلہ نے بھی رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”سال بھر سے اوپر ہو گیا۔ پتہ نہیں گھر والے کے من میں اس کے بارے میں کیا ہو؟ اس نے کیا سوچ رکھا ہو؟“

”بھین جی، ایسا نہ کہہ۔“ زینت تڑپ کر بولی۔ ”وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ بہت نیک اور بھلا بندہ ہے۔ وہ مجھے اتنا پیار نہ کرتا تو میں اپنے کنبے والوں کو چھوڑ کر فیروزپور سے ادھر واپس ہی کیوں آتی؟ تجھے تو ساری باتوں کا پتہ ہی ہے۔ سب کچھ بتا چکی ہوں تجھ سے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ رحیم داد نے اس کی دل شکنی نہ کی۔ ”پر پہلے اس سے مل کر بات کر لینی ضروری ہے۔“ اس نے جیلہ کو مخاطب کیا۔ ”زمین دارنی! میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں۔ تو کیا کہتی ہے؟“

”دہی جو تیرا دوا چار ہے۔“ جیلہ نے اس کی تائید کی۔ ”زینت کے گھر والے کا پہلے انتظار کر لینا چاہیے۔ اس سے بات چیت کرنے پر صاف پتہ چل جائے گا، وہ کیا چاہتا ہے؟“ اس نے زینت کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”مان لے، وہ تجھے اپنے ساتھ لے جانے پر تیار نہ ہوا۔“ اپنے اس شک و شبہ کے اظہار کے ساتھ ہی اس نے زینت کو یقین بھی دلایا۔ ”چنانچہ نہ زینت۔ میں تجھے اور تیرے بچوں کو اپنے پاس رکھوں گی۔ دیسے تیرا گھر والا جلیل چاہے تو اسے بھی یہاں ٹھہرا لوں گی۔“

”بھین جی! وہ یہاں کیسے رہ سکتا ہے؟ ہسپتال پور میں تو وہ نوکری کرتا ہے۔ سکول میں پڑھاتا ہے۔“

”یہاں بھی سکول میں پڑھائے گا۔“ جیلہ نے مسکرا کر زینت کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

بے خبر ہو کر سویا کہ اسے بالکل سدھ بدھ نہ رہی۔ مجھے نیند نہیں آئی۔ اس نے ایسے کٹھور پن سے بدن میں جگہ جگہ کاٹا تھا کہ بار بار نمیں اٹھتی تھی۔ اس نے سردی سے بچنے کے لیے کھیس ٹانگوں تک پھیلا دی۔

”میر کیا ہوا؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”جب وہ بے سدھ ہو کر سو گیا تو میں اٹھی۔ چپکے سے دروازہ کھولا۔“ زینت آہستہ آہستہ بتاتی رہی۔ ”کمرے کے باہر برآمدہ تھا۔ اس میں راکھا بیٹھا تھا۔ اس کے پاس بندوک تھی۔ پر وہ بھی دیوار سے پیٹھ نکائے اس سے ادنگھ گیا تھا۔ میں چوری چوری چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اتری۔ سامنے گتے بیڑ تھے۔ اندھیرا بھی بہت تھا۔ میں درختوں تلے پہنچ گئی۔ اگے بڑھی اور ایک پیڑ پر چڑھ گئی۔“

”تو پیڑ پر بھی چڑھ لیتی ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں جی مجھے بچپن سے پیڑوں پر چڑھنے کی خوب پریکٹس ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”پیڑ دیوار کے ساتھ ہی تھا۔ میں ایک ڈالی سے لٹک کر جھولتی رہی اور ایک بار جی کڑا کر کے باہر کود گئی۔“

”پر حویلی کی دیوار تو بہت اونچی ہے۔“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”تجھے چوٹ نہیں آئی۔“

”آئی تھی۔ پر زیادہ نہیں آئی۔ اس سے تو بالکل پتہ نہ چلا۔ میں پیراں والہ سے بھاگتی ہوئی رات کے اندھیرے میں نکلی اور نر کے ساتھ ساتھ چلتی ادھر آئی۔ پر بعد میں ایک ٹانگ درد کرنے لگی۔ اب بھی کرتی ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر جیلہ کو دیکھا۔ ”بھین جی کو میں نے بتایا۔ اس نے تاراں سے ماش کرائی۔ اس سے درد کم ہو گیا۔“

جیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”زینت! تیرا اصلی درد تو تیرے بالک ہیں۔ جن کو تو ہر سے یاد کرتی رہتی ہے، روتی رہتی ہے، آنسو بہاتی ہے۔“ جیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”یہی گل ہے نا؟“

”میرا اصلی درد تو بھین جی یہی ہے۔ ان کے لیے تو میں شاہ جی کی حویلی میں بھی روتی رہتی تھی۔“ زینت نے دکھ بھرے لہجے میں جیلہ کی بات کی تائید کی۔ ”کوٹ کی کیدی زنانیوں کی انچارج رتے ہے۔ مجھے روتا ہوا دیکھ کر وہ ڈانٹتی ڈبٹتی تھی۔ بالوں سے پکڑ کر مارتی تھی۔ وہ جی بہت کٹھور ہے۔ اس کے ڈر سے میں چھپ چھپ کر روتی تھی۔“ اس کی آواز گلو گلو گئی، آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ کھیس کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔

”تو نے تو میرا سکول دیکھا ہے۔ وہیں تو مجھے پہلی بار ملی تھی۔ بھول گئی؟“

”زینت نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”پر جلیل تو سرکاری سکول کا ماسٹر ہے۔ وہ کیسے سرکاری نوکری چھوڑ دے گا؟“

”یہ بھی سرکاری سکول بن جائے گا۔“ جلیل نے اسے یقین دلایا۔ ”میں تو یہی چاہوں گی جلیل ادھر ہی ٹھہر جائے اور یہ سکول چلائے۔ مجھے تو ویسے بھی تجربے کار سکول ماسٹروں کی ضرورت ہے۔“ اپنی بات کہتے کہتے وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”چوہدری! میں تجھے یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ اپنے سکول کے بارے میں بات چیت کرنے شرمنگ تھی۔ محکمہ تعلیم والوں نے تو ٹال مٹول سے کام لیا۔ میں ڈپٹی کمشنر سے ملی۔ بہت اچھی طرح پیش آیا۔ چنگا بندہ لگتا ہے۔ اس نے مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ مجھے دشواری دلائی کہ میرے سکول کو سرکاری پرائمری سکول بنادیا جائے گا۔“

”کب تک ایسا ہو جائے گا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”یہ تو بتانا مشکل ہے۔“ جلیل نے جواب دیا۔ ”ڈپٹی کمشنر نے کہا ہے، اگر فوری طور پر ایسا نہ ہوا تو سکول کو منظور شدہ تو ضرور بنادیا جائے گا۔ سرکار کی طرف سے مالی مدد بھی ملے گی۔ اس کی دیے مجھے چنتا نہیں۔ پر ریگنٹا نرڈیا منظور شدہ ہو جانے کے بعد سکول کی اہمیت بڑھ جائے گی۔ ابھی تو وہ کچھ بھی نہیں۔“

”یہ تو بہت زبردست کام ہوگا۔“ رحیم داد نے جلیل کی خوشنودی کے لیے کہا۔ ویسے اسے سکول سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ احسان شاہ سے سکول کے بارے میں تفصیلی بات چیت کرنے کے بعد وہ اس کے قیام کے حق میں نہ رہا تھا۔

مگر جلیل اس کے احساسات سے بے نیاز بڑے جوش و خروش سے بتاتی رہی۔ ”ڈپٹی کمشنر نے تو مجھے یہاں تک دشواری دلائی کہ وہ ڈسٹرکٹ بورڈ والوں سے بات چیت کرے گا اور انسپکٹر آف سکولز کو جلد ہی معائنے کے لیے بھجوانے کی کوشش کرے گا۔ خود بھی ادھر آنے کو کتا تھا۔“

”بھین جی، تیرا سکول سرکاری بن گیا، تب تو جلیل ضرور یہاں آجائے گا۔“ زینت خوش ہو کر بولی۔ ”میں بھی اسے کہوں گی۔ وہ میری بات مان لے گا۔ پر اسے ادھر اپنا تبادلہ کرانا پڑے گا۔“

”پر ابھی اسے آنے تو دے۔ تو نے تو ابھی سے اونچی اونچی گلاں سوچنی شروع کر دیں۔“ رحیم داد نے ہنس کر زینت سے کہا۔ ”پہلے تو اس سے مل کر یہ معلوم کرنا ہوگا اس کا ارادہ کیا ہے؟ یہاں اس سے ملے اور بات کیے تو کچھ بھی نہیں ملے کیا جاسکتا۔“

”چوہدری! تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے جلیل کا انتظار کرنا ہوگا۔“ جلیل نے رحیم داد کی

رائے سے پورا پورا اتفاق کیا۔ ”اسے کل شام تک نادر کے ساتھ یہاں پہنچ جانا چاہئے۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”ساڑھے بارہ بج گئے۔ آدھی رات ہوگئی، باتوں میں سے کا پتہ نہ چلا۔ بہت دیر ہوگئی۔ اب چلنا چاہیے۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

”پر تو نے ملے کیا کیا؟“ رحیم داد نے جلیل کو ٹوکا۔

”ملے کیا کرتا ہے۔“ جلیل نے جواب دیا۔ ”پہلے جلیل سے مل کر بات کرنی ضروری ہے۔ ہونا بھی یہی چاہیے۔ اس کے آنے کے بعد ہی آگے کے لیے سوچ دیا جائے گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ جلیل آگے بڑھی۔ زینت بھی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ دونوں کمرے سے چلی گئیں۔



زینت کے شوہر، جلیل کا صبح ہوتے ہی انتظار شروع ہو گیا۔ دن ڈھلنے لگا۔ سورج غروب ہو گیا۔ شام ہوگئی۔ مگر جلیل نہ آیا۔ نادر خاں بھی نہ لوٹا۔ پھر رات ہوگئی۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ ویسے بھی کچھ عرصے سے اسے دیر سے سونے کی عادت پڑ گئی تھی۔

رات گئے بالائی منزل پر جا۔ اگلے زینے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ رحیم داد پوری طرح بیدار تھا۔ چپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی اور کمرے کے پاس پہنچ کر ختم ہوگئی۔ رحیم داد نے بے چین نظروں سے بند دروازے کی جانب دیکھا۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ رحیم داد نے اٹھ کر لیپ کی لو اونچی کی۔ آگے بڑھا۔ دروازہ کھولا۔ سامنے جلیل کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دوواؤں کا کبکھلا لٹک رہا تھا۔ اس کے قریب حویلی کی نوکرانی ناچو کھڑی تھی۔ وہ ایک ہاتھ میں جلتی ہوئی لالٹین سنبھالے ہوئے تھی۔

جلیل نے رحیم داد کو دیکھتے ہی دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو ابھی سویا نہیں؟“

”نہیں جی، میں جاگ رہا تھا۔ دن میں دیر تک سو تا رہا۔ اب نیند نہیں آرہی تھی۔“ رحیم داد نے وضاحت کی، پوچھا۔ ”پر زمیں دارنی تو اتنی رات کو کہاں جا رہی ہے؟“

”پنڈ کے موچی کی طبیعت بہت گڑبڑ ہے۔“ جلیل نے قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شام سے اسے التیاں ہو رہی ہیں۔ حکیم سے دوا کی بھی لایا تھا۔ پر طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر پہلے حمہ کے ساتھ اس کا پتر آیا تھا۔ بہت پریشان لگتا تھا۔ اسے تو میں نے جھٹ واپس بھیج دیا۔

اب موچی کے گھر جا رہی ہوں۔“

رات تھی۔ رحیم داد کا بدن موٹے دھسے میں بھی کپکپا رہا تھا۔ ناجو بھی سکڑی سکڑائی نظر آتی تھی۔ مگر جیلہ گردن اٹھائے نہایت سکون سے چل رہی تھی۔ تینوں نے رڑ عبور کیا اور گاؤں کی جانب بڑھے۔

ابھی تینوں گاؤں کے مکانات سے دور ہی تھے کہ رات کے پرہول سنائے میں عقب سے تیز ٹاپیں سنائی دیں۔ کوئی گھوڑا سرپٹ دوڑاتا اسی طرف آرہا تھا۔ جیلہ، رحیم داد اور ناجو نے ٹاپیں سنیں تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا، چروں پر پریشانی تھی۔ وہ اس سمت دھڑکتے دل سے دیکھنے لگے جدھر سے آہٹ ابھر رہی تھی اور دم بدم قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گھڑسوار ان کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے گھوڑا ٹھہرایا۔ نیچے اترا اور رکامیں سنبھالے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ تینوں دم بخود تھے۔ پالے کا دھند کا اتنا دبیز تھا کہ آنے والا سائے کی مانند نظر آرہا تھا۔ رحیم داد گوگو کے عالم میں حیران و پریشان کھڑا رہا۔ مگر جیلہ نے جرات سے کام لیا۔ آگے بڑھی۔ ناجو کے ہاتھ سے لالٹین لی۔ اسے اٹھا کر اونچا کیا۔ اور آنے والے کو آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ وہ اب ٹھہر گیا تھا اور دھند لکے میں لپٹا ہوا چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اندھیرے میں ادنیٰ دوہرے اس طرح چہرہ چھپائے ہوئے تھا کہ صرف تیز چمکتی ہوئی آنکھیں لالٹین کی دھندلی روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔

جیلہ نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے تو؟“ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی کپکپاہٹ تھی۔ وہ جہاں تھی وہیں کھڑی رہی۔

وہ کچھ نہ بولا۔ اس نے خاموشی سے قدم اٹھایا اور آگے بڑھنے لگا۔ اب رحیم داد کو بھی اپنی ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ ”بولتا کیوں نہیں۔ صاف صاف بتا۔ تو کون ہے؟ کیا چاہتا ہے؟“

وہ تینوں کے مقابل پہنچ کر پھر رک گیا، مگر کچھ بولا نہیں۔ چہرے پر سے دوہرہٹائی اور جیلہ کو مخاطب کیا۔ ”بھین جی، گھبرا نہیں۔ میں جیرا ہوں۔“

جیلہ نے لالٹین اٹھا کر اس کے چہرے کے سامنے کر دی۔ وہ جیرا ہی تھا۔ اس کے مزارعے دین محمد کا بڑا بیٹا۔ جیلہ نے لالٹین نیچے کر لی۔ اطمینان کی سانس لی، مسکرا کر بولی۔

”جیرے! تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

جیرا نے کچھ نہ کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ جیلہ نے زور دے کر پوچھا۔ ”جیرے! اس سے کہاں سے آرہا ہے؟“

”پر اب تو بہت رات ہو گئی۔“ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔ جیلہ کچھ نہ بولی۔ دواؤں کا کبسا فرش پر رکھا۔ شال دوبارہ اس طرح سنبھال کر اوڑھی کہ کان اور چہرے کا بیشتر حصہ ڈھک گیا۔

”زمیں دارنی! سردی بہت ہے۔ تو نے خالی شال اوڑھ رکھی ہے۔“

”نہیں، میں نے موٹا ادنی سوئیر بھی پہن رکھا ہے۔ تو چھتا نہ کر۔“ جیلہ نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”ویسے مجھ سے کبل یا دھسا اوڑھ کر چلا نہیں جاتا۔ نہ جانے کیا لگتا ہے۔“ بات کہتے کہتے اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلکنے لگی۔ ”چوہدری! میں تیرے پاس اس کارن آئی تھی کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ احسان شاہ کا ایک کردہ شام کو ادھر آیا تھا۔ تجھ سے تو نہیں ملا۔“

”مجھے تو نہیں ملا۔ پر وہ آیا کیوں؟“ رحیم داد بھی گھبرا گیا۔ ”زمین تو تیرے ہی ساتھ ہے نا؟“

”وہ تو میرے ہی کمرے میں ہے۔ اسے سینا اور گڈو کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔ جاگ رہی ہے۔“

”جلیل کا انتظار کر رہی ہوگی۔ پر نہ وہ آیا اور نہ ہی نادر لوٹا۔“

”پتہ نہیں کیوں نہیں آیا۔ لگتا ہے نادر اسے لے کر ہی آئے گا۔ کل تک دونوں کو آجانا چاہیے۔“

”زمیں دارنی! اندر آجا۔ باہر کیوں کھڑی ہے؟“

”میں نے ٹھہرنا نہیں ہے۔ تجھے احسان شاہ کے کردے کے بارے میں بتانے آئی تھی۔ مجھے اب موچی کے گھر جانا ہے۔“

”ٹھہیر جا، میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تیرا اتنی رات گزرے اس طرح جانا ٹھیک نہیں۔“

جیلہ نے منع بھی کیا، مگر رحیم داد بازنہ آیا۔ اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے، سر پر گچڑی رکھی، ادنی دھسا اوڑھا، باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور جیلہ کے انکار کے باوجود اصرار کر کے دواؤں کا کبسا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

رحیم داد کبسا سنبھالے جیلہ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ناجو لالٹین لیے آگے آگے تھی۔ تینوں حویلی سے باہر نکلے۔ پھانک پر پیریدار موجود تھا۔ رحیم داد نے اسے چونکا اور محتاط رہنے کی ہدایت کی۔ حویلی کے باہر پالا پڑ رہا تھا۔ ہر طرف نیل گوں دھند لکا پھیلا تھا۔ اس کی تمہ اس قدر گاڑھی اور دبیز تھی کہ لالٹین کی روشنی ہلکا سا دھبا نظر آتی تھی۔

گاؤں پالے میں لپٹا سو رہا تھا۔ سنا بہت گہرا تھا۔ یہ جاڑے کی سرد اور خون منجمد کر دینے والی

”میں اپنی گھر والی لاڈ کو لینے سلیمان پورے گیا تھا۔“

”تو اسے اپنے ساتھ نہیں لایا؟“ جیلہ نے دریافت کیا۔ ”کہاں ہے وہ؟“

”بھین جی تمہیں تو پتہ ہی ہے۔ وہ دونوں بچے چھوڑ کر اسلم کے ساتھ چلی گئی۔“ جبرائیل نے دہلی

زبان سے بتایا۔

”میں نوں پتہ ہے، بالکل پتہ ہے۔ تیرا بیٹا میرے پاس آیا تھا۔ اس سے دیر تک گل بات ہوئی تھی۔ وہ اسے لینے سلیمان پورہ بھی گیا تھا۔ آگے کا مجھے پتہ نہیں۔ نہ دین محمد نے کچھ بتایا اور نہ تیری ماں نے۔ دونوں میں سے کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔“

”آکر کرتے بھی کیا۔“ جبرائیل نے لہجے میں بولا۔ ”اس نے واپس آنے سے صاف انکار کر دیا۔“
”پر تیرے بیٹے دین محمد کو بتانا تو چاہیے تھا۔“ جیلہ نے نرم لہجے میں کہا۔ ”وہ میرے پاس آتا تو آگے کی سوچی جاتی۔ لاڈ کو واپس لانے کے لیے کوئی پائے کیا جاتا۔ وہ تیری گھر والی ہے۔ تیرا اس پر ادھیکار ہے۔ اسے تیرے پاس آنا چاہئے۔ بچے بھی اس کے ہاں بہت پریشان ہوں گے۔“

”بہت تنگ کرتے ہیں جی۔ چھوٹے چھوٹے نکلے ہی تو ہیں۔ بہت ضد کرتے ہیں جی۔ ہر دم روتے رہتے ہیں۔ بھین جی! تجھ سے اب کیا بتاؤں۔“

”میں نوں پتہ ہے۔ ضرور تنگ کرتے ہوں گے۔“ جیلہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”پر لاڈ کو کسی ماں ہے؟ اسے اپنے بچے بھی یاد نہیں آتے۔ اس کی ممتا بھی نہیں جاگی۔“

”اسے تو جی کسی کی یاد نہیں آتی۔ تین مہینے سے اوپر ہو گئے۔ سب نے مشورہ دیا۔ تھانے میں پرچہ چاک کرادو۔ پر میرے پیو نے منع کر دیا۔ خود اسلم کے گھر گیا۔ لاڈ سے ملا۔ سمجھانے بھانے کی کوشش کی پر وہ آنے پر راضی نہیں ہوئی۔ دوبارہ چاچا کو لے کر گیا۔ اس نے ملنے اور گل بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”وہ بچے ہوئے لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔“ ”آج دوپہر مجھے پتہ چلا، وہ کل سویرے کی گڈی سے اسلم کے ساتھ کراچی جا رہی ہے۔ اپنے پنڈ سے بھاگنے کی تیاری اسلم چپکے چپکے کر رہا تھا۔ پر مجھے کسی نہ کسی طرح معلوم ہو گیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا پھر جیلہ کو بتایا۔ ”میں آج ملے کر کے سلیمان پورہ گیا تھا، لاڈ کو اپنے ساتھ لے کر ہی آؤں گا۔“ بولتے بولتے اچانک اس کا لہجہ تند اور ٹیکھا ہو گیا۔ ”پر اب وہ کبھی نہیں آئے گی۔“

”کیوں نہیں آئے گی؟“ جیلہ نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”تو نے ایسا کیسے سوچا؟“

جبرائیل کا چہرہ کرخت ہو گیا، آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں، منہ بگاڑ کر بولا۔ ”میں اسلم کے گھر اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ گیا۔ یار دوستوں کو پہرے پر لگایا۔ گھوڑی بڑھا کر آگن کی دیوار

کے ساتھ کھڑی کی۔ دیوار پر پانچا اور دھیرے سے کود کر اندر چلا گیا۔“ اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔
”لاڈ! اپنے یار اسلم کے ساتھ لپٹی تھی۔ دونوں کو دیکھتے ہی میں پاگل ہو گیا۔“ جبرائیل نے دہرے اندر سے ہاتھ نکالا۔ اس میں خون دیکھ کر جیلہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ رحیم دہشت زدہ ہو گیا۔

لال لال خون دیکھ کر جیلہ کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔ رحیم دہشت زدہ ہو گیا۔
”ہوئے پیچھے کے لیے منہ پھاڑا مگر آواز نہ نکلی۔ جبرائیل خون آلود چھری ہاتھ میں دبائے تینوں کے عین سامنے، ”تڑ، سواگز کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ وہ اس وقت بہت خونخوار نظر آ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھری سامنے کر دی۔“ ”میں نے جی دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس وقت تک وار کرتا رہا جب تک بالکل ختم نہ ہو گئے۔“ جبرائیل نے گہری سانس بھری اور جیلہ کی جانب ٹکلی باندھے دیکھنے لگا۔

”جبرائیل! تو نے بہت برا کیا۔“ جیلہ اب سنبھل چکی تھی۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”تجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ایسا کر کے تجھے کیا ملا؟“

”جو ہونا تھا جی، وہ ہو گیا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”یہ کب کی گل ہے؟“ جیلہ نے پوچھا۔

”مدھا سلیمان پورے سے آ رہا ہوں میں اپنے گھر جا رہا تھا۔ اب نہیں جاؤں گا۔ بھین جی، تو میرے بیٹے کو بتا دینا تیرے پتر نے اپنی بے عزتی کا حساب چکا دیا۔ اب وہ پنڈ میں گردن اونچی کر کے چلے گا۔“

۱ جیلہ کا چہرہ بدستور پریشان تھا۔ ”تو کچھ ہی کہہ، جبرائیل تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔“

جبرائیل نے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا، جھکا۔ جیلہ کے پیروں کو چھو کر عاجزی سے بولا۔ ”بھین مجھے معاف کر دینا۔“ وہ چند لمحے گردن جھکائے جیلہ کے سامنے کھڑا رہا۔ پھر اس نے دہرے اپنے جبرے کو ڈھانٹا باندھ کر چھپایا۔ گھوڑے کی طرف بڑھا اور اچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔
جیلہ نے گھبرا کر ٹوکا۔ ”جبرائیل! اب تو کہاں جا رہا ہے؟“

”سوئے کے کنارے میرا یار ملکان انتظار کر رہا ہے۔ میں اس کے پاس جا رہا ہوں۔ وہ بھی میرے ساتھ سلیمان پورے گیا تھا۔“

”پر تو اس کے ساتھ کہاں جائے گا؟“

”ملکان کو اس کے گھر بھیج دوں گا۔“ جبرائیل نے جیلہ کی جانب دیکھ کر بغیر کہا۔ ”میں تھانے چلا جاؤں گا۔“

جیلہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ چیخ کر بولی۔ ”جبرائیل! میری گل تو سن۔“

سب برابر ہے۔“

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ خاموشی سے پلٹا اور اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ حویلی پر پہنچا۔

پسیدار جاگ رہا تھا۔ اس نے پھانک کھولا۔ رحیم داد اندر داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر ٹانگیں پھار کر لیٹ گیا۔ وہ بڑھال اور تھکا ہوا تھا۔ اس کے ذہن پر جبراً چھایا ہوا تھا۔ وہ جب تک جاگتا رہا اسی کے بارے میں سوچتا رہا۔



نادر خاں دوسرے روز بھی واپس نہ آیا۔ تیسرا روز گزرا، چوتھا گزرا۔ کئی روز گزر گئے۔ مگر وہ نہ آیا۔ جلیل کی بھی کوئی خبر نہ ملی۔ جیلہ پریشان تھی۔ زینت اس سے بھی زیادہ پریشان تھی۔ وہ ہر وقت روتی رہتی۔ جیلہ اسے تسلی دیتے دیتے خود بھی رونے لگتی۔ جنت موجود ہوتی تو تینوں مل کر رو تیں۔

رحیم داد بھی پریشان تھا۔ مگر زینت اور جیلہ کی پریشانی نے اسے اور پریشان کر دیا تھا۔ جمعے کو دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد اس نے نامدار کے ہم راہ دیپال پور جانے کا منصوبہ بنایا۔ تانگا آچکا تھا۔ رحیم داد حویلی سے نکل کر اس میں سوار ہونے جا رہا تھا کہ منصب داد بھاگتا ہوا آیا۔ وہ بھی حویلی کا ملازم تھا۔ اس نے نادر خاں کے واپس آنے کی اطلاع دی۔ رحیم داد واپس اپنے کمرے میں آگیا۔

نادر خاں کے ہم راہ جلیل بھی تھا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے میں پہنچے۔ رحیم داد ان کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ اس نے جلیل کو دیکھا۔ وہ چہرے پر بدن کا جو ان تھا۔ عمر تیس سال سے نکلتی ہوئی تھی۔ رنگ گندمی تھا۔ صورت شکل بھی گوارہ تھی۔ قد اونچا تھا۔ مگر بیمار اور پریشان حال نظر آتا تھا۔ کم گو بھی تھا۔

جیلہ اس وقت اسکول میں تھی اور زینت کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

”نادر! تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟“ رحیم داد نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ”ادھر تیری گھروالی نے تو رو رو کے برا حال کر ہی لیا تھا، جیلہ اور زینت بھی اس کے ساتھ رونے پٹنے میں شریک ہو جاتیں۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”نادر، تو نے بہت پریشان کیا۔ میں تیری تلاش میں نکلنے ہی والا تھا۔ دیپال پور جا رہا تھا۔ تو نے حویلی کے پھانک پر تانگا بھی دیکھا ہو گا۔“ ”مجھے پتہ تھا،“ ادھر سب پریشان ہوں گے۔“ نادر خاں نے دہلی زبان سے کہا۔

مگر جبراً نے کچھ نہ سنا۔ اس نے گھوڑے کو موڑا، ایزدگائی اور جس طرف سے آیا تھا اسی طرف گھڑا تیزی سے دوڑاتا ہوا آن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ رحیم داد، جیلہ اور نانو کے کے سے عالم میں کھڑے رہے۔ رات کے سناٹے میں دور ہوتی ہوئی ٹاپیں سنتے رہے۔ آخر وہ بھی گمری خاموشی میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں۔

جیلہ نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیسا گھرو جوان ہے۔ غصے میں پاگل ہو کر ہتیا کر بیٹھا۔“ ”اور کیا کرتا؟“ رحیم داد نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی کرتا۔ عزت اور آن بھی تو کچھ ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں، جبراً حوصلے والا اور جی دار جوان ہے۔“ ”چوہدری، چھوڑ جی داری شی داری کو۔ اس میں کیا دھرا ہے۔“ جیلہ نے جل کر تیکھے لہجے میں کہا۔ ”کوئی بیکہ دار اور وڈا زمیں دار کسی بھی زنانی کو اٹھوالے۔ اسے رکھیل بنا کر رکھے۔ بچے جوانے، تب نہ عزت یاد آتی ہے نہ غیرت اور آبرو۔ ساری جی داری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ اس کے تو پیر پکڑتے ہیں۔ فٹیں کرتے ہیں، گزگڑاتے ہیں، میرا بازو واپس دے دے۔“ اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔ ”دھتکارے جاتے ہیں، گاللاں سنتے ہیں۔ بار بار جا کر ہاتھ جوڑتے ہیں، پیروں پر پگڑی ڈال دیتے ہیں اور عام طور پر رگم ادا کر کے واپس لاتے ہیں۔“ اس نے منہ بگاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔

”ایک طرف تو غیرت اور آن کا یہ حال ہے اور دوسری طرف اپنی ہی طرح کا مزارع یا کی بھگالے جائے تو جھٹ غیرت اور آبرو جاگ اٹھتی ہے۔ تب جی داری بھی دکھاتے ہیں۔ کتل کرتے ہیں اور پھانسی کے پھندے پر لٹک جاتے ہیں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ وہ جیلہ کے گبڑے ہوئے تیور دیکھ کر مرعوب ہو گیا تھا۔ جیلہ نے لالین نانو کو دے دی، آگے بڑھی۔

رحیم داد اور نانو نے بھی قدم بڑھائے۔ تینوں گاؤں میں پہنچے اور گلیوں سے گزرتے ہوئے موچی کے دروازے پر جا کر ٹھہر گئے۔

جیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! اب تو جا۔ میں یہاں سے جبراً کے پیو دین محمد کے گھر جاؤں گی۔ اسے ساری گل بات بتاؤں گی۔“

”میں بھی تیرے ساتھ دین محمد کے گھر چلا جاؤں گا۔ تو اکیلی کیسے اتنی رات کو واپس آئے گی؟“ ”مجھے دیر لگ جائے گی۔ تو واپس حویلی میں جا۔ میری چنتا نہ کر۔ میں موچی کے پتر کے ساتھ آجاؤں گی۔ ویسے چوہدری، یہ میرا پنا پنا ہے۔ مجھے یہاں ڈر نہیں لگتا۔ میرے لیے ادھر دن رات

ہے۔ یہ تو بالکل انہونی بات ہے۔“ جلیل نے وضاحت کی۔ ”نادر خاں نے مجھے زینت کے بارے میں بتایا تو پہلے مجھے یقین ہی نہ آیا۔“

”تجھے یہ بھی پتہ ہے، سرحد پار سے واپسی کے بعد وہ سال بھر تک کسی اور کے پاس تھی؟ بلکہ اس کے بچے بھی ابھی تک اس کے پاس ہیں۔“ رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”تجھے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ نے زینت کو اٹھوا کر اپنی حویلی کے کوٹ میں رکھ لیا کر رکھ چھوڑا تھا۔ وہ وہاں سے کسی نہ کسی طرح بھاگ کر ادھر پہنچی ہے۔“

”نادر خاں، کل رات زینت کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔“ جلیل نے پرسکون لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر نہ جھنجھلاہٹ تھی اور نہ ہی کسی قسم کی کدورت نظر آتی تھی۔ ”نادر نے کوئی بھی بات مجھ سے بالکل نہیں چھپائی۔ سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔“

”ٹھیک ہی کیا اس نے۔“ رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”لگتا ہے تو نے پوری طرح سوچ سمجھ کر زینت کو لے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”بات یہ ہے جی، مجھے زینت سے تب شکایت ہوتی جب اس کا اپنا کوئی قصور ہوتا۔“ جلیل بڑے اعتماد سے گویا ہوا۔ ”وہ تو حالات کا شکار ہوئی۔ گیند کی طرح ایک ہاتھ سے دوسرے میں جاتی رہی۔“ اس کے لہجے میں دبا دبا کر ب تھا۔ ”زینت پر جو کچھ بتی اسے میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔“

”تو مارج تو نہیں ہے؟“ رحیم داد نے اس کی بات سن کر معاً سوال کیا۔

”ویسے تو جی میں شیخوپورہ کا رہنے والا ہوں، لیکن جب فسادات کی آگ بھڑکی تو میں ملازمت کے سلسلے میں کرناٹ میں تھا۔ گھر والے بھی ساتھ تھے۔“ جلیل نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ ”ماں تھی، چھوٹا بھائی تھا، دو جوان بہنیں تھیں۔ میرا پیڑا پہلے ہی مر چکا تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ستمبر ۱۹۴۷ء کا مہینہ تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے حملوں سے تنگ آکر میں گھر والوں کے ساتھ پنج بچا کر حصار پہنچ گیا۔ وہاں بھی حالات خراب تھے اور روز بروز گزرتے ہی جا رہے تھے۔ حملے ہوتے، آگ لگائی جاتی۔ خون خرابہ ہوتا۔ آخر کسی نہ کسی طرح میں ریلیف کمپ پنچ گیا۔ گھر سے نکلے ہی بلوائیوں نے اس میں آگ لگا دی۔ میں نے دور سے اپنے گھر کو شعلوں میں جلتے ہوئے دیکھا۔ کیا بتاؤں وہ کتنی بھیانک رات تھی۔“

”کمپ میں پنچ کر تو سب بچ گئے ہوں گے۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”میں صرف اکیلا کمپ میں پنچ سکا تھا۔“ جلیل کا چہرہ مرجھا گیا، آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔

”جب تمیں نوں پتہ تھا، سب پریشان ہوں گے، تب بھی تو نے اتنی دیر کر دی۔ کیا کرتا رہا؟“ رحیم داد نے اسے تکیسی نظروں سے دیکھا۔ ”تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ ایک روز کے لیے کہہ کر گیا اور ہفتہ بھر بعد لوٹا۔“

”کیا کرتا جی۔ یہ لمبہ لگ گیا تھا۔“ نادر خاں نے جلیل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”مجھے اس کا انتظار کرنا پڑا۔ سوچا، اب آیا ہوں تو اسے مل تو لوں۔ دیپال پور میں میرا ایک پرانا یار ہے، عبدالصمد۔ اسی کے ساتھ ٹھہرا تھا۔“

رحیم داد نے جلیل کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر مڑ کر نادر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”یہ کب لمبہ سے واپس آیا؟“

”کل رات ہی آیا تھا جی۔ میں نے اسے کہا تو یہ چلنے کو تیار بھی ہو گیا۔ ہم دونوں سویرے ہی سویرے روانہ ہو گئے تھے۔“ نادر خاں نے لمحہ بھر کی لیے تامل کیا، پھر دریافت کیا۔ ”چوہدری! تو کب واپس آیا؟“

”جس روز تو دیپال پور گیا، میں اسی شام لوٹا تھا۔“

نادر خاں بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بیوی جنت کو اس کی واپسی کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ دوبار تاراں کو اور اپنی بچی کو بھیج چکی تھی۔ ہریار نادر سے گھر پہنچنے کا تقاضا کیا جاتا۔ آخر رحیم داد نے رنج ہو کر نادر خاں سے کہا۔

”نادر تو جا۔ تیری گھر والی تیرے لیے بہت بے چین ہے۔“

نادر خاموشی سے اٹھا اور کمرے سے چلا گیا۔ جلیل کرسی پر گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی نگاہیں بار بار دروازے کی جانب اٹھ جاتیں۔ رحیم داد اس کی بے قراری کا سبب فوراً بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔

”جلیل! لگتا ہے تو زینت کے لیے بہت بے چین ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”یہ بتا۔ تو اسے اپنے ساتھ لے جائے گا؟“

”آیا تو جی بالکل اسی ارادے سے ہوں۔“ جلیل نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”مگر زینت ہے کہاں؟“

”وہ بھی آجائے گی۔“ رحیم داد زیر لب مسکراتا رہا۔ اسے جلیل کی بے قراری میں لذت محسوس ہو رہی تھی۔ ”اب تو اتنا بے تاب ہو رہا ہے۔ پہلے اس کی یاد نہ آئی۔“

”میں تو جی یہ سمجھ ہوئے تھا، وہ ابھی تک اپنے خاندان والوں کے پاس فیروزپور میں ہوگی۔ اس کی واپسی کی امید تو بالکل ختم ہو چکی تھی۔ ایک بار سرحد پار جانے کے بعد کون مغویہ واپس آسکتی

”کہاں گیا وہ؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”حصار سے وہ دہلی گیا۔ وہاں سے ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بال بچوں اور مال اسباب کے ساتھ آرام سے پاکستان پہنچ گیا۔ وہاں ڈپٹی کمشنر تھا۔ یہاں پہنچ کر زیادہ بڑا افسر لگ گیا۔“

”کبھی تجھے ملا بھی؟“

”نہیں۔“ جلیل نے ہنسنے لہجے میں کہا۔ ”سنا ہے پہلے سیشن جج ہوتا تھا۔ اب ترقی کر کے ہائی کورٹ کا جج بن گیا ہے۔“

”حد ہو گئی جی۔“ رحیم داد نے اس کی باتوں سے متاثر ہو کر کہا۔ ”پر جلیل، تو نے بہت دکھ سہ۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔“

”سب کچھ ختم ہو گیا۔ گھر بار۔ ماں، بھائی، بہنیں، سب بچھڑ گئے۔ کوئی بھی تو نہ رہا۔“

”تیری حسینوں کا کیا ہوا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”ان کا پتہ چلانے کی تو نے کوشش نہیں کی؟“

”چوہدری! یہ نہ پوچھ۔“ جلیل بے زاری سے بولا۔ ”تجھے کیا کیا بتاؤں۔“

”جلیل! میں بھی تیری ہی طرح مہاجر ہوں۔“ رحیم داد نے جلیل کی ہم دردی حاصل کرنے کے لیے متونی چوہدری نور الہی کی الم ناک داستان اپنی آپ بیتی بنا کر سنائی۔ ”فسات اور بلوے ہوئے تو میں ضلع گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ پٹیلہ کی ریاستی فوج نے سکھوں اور ہندوؤں کے ساتھ نصیر پور پر حملہ کیا تو رات کے اندھیرے میں کسی نہ کسی طرح سارے ہی مسلمان نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ کافلہ بنا کر ترمیموں کے چتن پر پہنچے۔ وہاں بھی حملہ ہوا۔ میرا پتر میری آنکھوں کے سامنے مارا گیا۔ جوان دھمی کو حملہ آور اٹھا کر لے گئے۔ میں نے بیڑی میں بیٹھ کر راوی پار کیا اور پاکستان کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ گھر والی اور بچے پیچھے رہ گئے۔ وہ بعد میں پہنچے۔ بس سنا ہی سنا ہے۔ انھیں بہت تلاش کیا پر اب تک نہ ملے۔“ اس نے جلیل کے افسردہ چہرے کو دیکھا۔ ”تو کیسے ادھر پہنچا؟“

”میں جی ٹرین سے آیا تھا۔ کیمپ سے دوسرے پناہ گزینوں کے قافلے کے ساتھ نکلا اور ٹرین میں سوار ہو گیا۔ راستے بھر بلوائیوں کے حملے کا خطرہ منڈلاتا رہا۔ پر پورا قافلہ خیریت سے لبور پہنچ گیا۔“

”تو نے بعد میں اپنی حسینوں کا کھوج نکالنے کی کوشش نہیں کی؟“

”کی تھی۔ دوبار فونیوں اور رضا کاروں کے ساتھ سرحد پار گیا۔ مردولا سارا بھائی سے ملا۔ اسی کے رضا کاروں کی کوشش سے دونوں کا سراغ بھی لگایا تھا۔“

”راستے میں بلوائیوں نے حملہ کر دیا۔ ماں اور چھوٹا بھائی میرے سامنے مارے گئے۔ ان کی لاشوں کے درمیان میں خون میں ڈوبا ہوا پڑا تھا۔ بلوائی دونوں بہنوں کو اٹھا کر لے جانے لگے تو وہ مجھے مدد کے لیے پکارنے لگیں۔ ان کی آواز ساری سنتا رہا۔ انھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ لیکن مجھ میں تو اٹھنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ زخموں سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس کا لہجہ اور رقت آمیز ہو گیا۔“

”مر جاتا تو اچھا ہی تھا۔ پر اللہ کو یہ منظور نہ تھا۔“ وہ لہجہ بھرتک گردن جھکائے خاموش بیٹھا رہا، پھر اس نے بتایا۔ ”بعد میں دوسرے زخموں کے ساتھ نہ جانے کس طرح کیمپ میں پہنچا۔ وہیں مرہم پٹی ہوئی۔ میں نومبر تک ریلیف کیمپ میں رہا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ کیمپ محفوظ رہا۔“

”روز ہی اس پر حملے کی خبریں ملتی تھیں، پر حملہ نہ ہو سکا۔“ جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”ویسے کئی دوسرے مسلمان افسروں کے علاوہ حصار کا ڈپٹی کمشنر بھی مسلمان تھا۔“

”اسی نے مسلمانوں کو حملہ کرنے والوں سے بچائے رکھا ہو گا۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ ”تو بے کرو جی۔“ جلیل کے چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔ ”مسلمان وفد بنا کر اس کے پاس گئے۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ ڈپٹی کمشنر کو سکھوں اور ہندوؤں کے ظلم و ستم بتائے۔ پولیس کے بارے میں آگاہ کیا کہ ہندو اور سکھ پولیس والے کس طرح کھلم کھلا ہندوؤں اور سکھوں کی حمایت کر رہے ہیں اور مسلمانوں کو اندھا دھند گولیاں چلا کر ہلاک کر رہے ہیں۔ اس کے دفتر میں کانگریس اور جن سنگھ کے کئی نیا بھی بیٹھے تھے۔ ان کے سروں پر یہ لمبی بودیاں تھیں۔ ماتھے پر تلک تھے۔ وہ بھی اس سے ملنے آئے تھے۔“ جلیل کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ ”انھیں خوش کرنے کے لیے ڈپٹی کمشنر نے مسلمانوں کے وفد کو غصے سے گھورا، منہ بگاڑ کر بولا۔ تم نے پاکستان مانگا تھا۔ اس کی خاطر مسلم لیگ کو الیکشن میں ووٹ دے کر کامیاب بنایا تھا۔ اب پاکستان بن گیا۔ جاؤ اپنے پاکستان۔ یہاں کیوں ٹھہرے ہو؟ اس نے تو مدد کیا کرنی تھی۔ الٹی مسلمانوں کو دھمکیاں دیں۔ سخت زراض ہوا۔“

”وہ کیسا بندہ تھا۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”اسے اپنے مسلمان بھائیوں کا ذرا بھی خیال نہ آیا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”ہندوؤں کے سامنے نمبر بڑھانے کے لیے اس نے ایسا کیا ہو گا۔“

”ایسا ہی ہو گا جی۔“ جلیل نے رحیم داد سے اختلاف رائے نہ کیا۔ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”لیکن ہندوؤں اور سکھوں کی چالپوسی اور خوشامد کے بعد بھی وہ وہاں تک نہ سکا۔ وہ آئی سی ایس تھا اور جلد ہر کار بننے والا تھا۔“

نے منع بھی کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ ”جلیل آہستہ آہستہ بولتا رہا اور رحیم داد توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ ”پھر ایسا ہوا جی، ایک رات زینت منا کی مار کھاتے کھاتے ایسی بدحواس ہو گئی کہ پناہ لینے کے لیے بھاگ کر میرے گھر آئی۔ میں نے اسے واپس منا کے گھر بھیجنا چاہا تو میرے پیر کچڑ کر رونے لگی۔ مجھے بھی اس پر ترس آگیا۔ اس رات کے بعد وہ دوبارہ منا کھمار کے گھر نہیں گئی۔“

”متانے بھگڑا متا تو نہیں کیا؟“ رحیم داد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ صبح میرے پاس آیا۔ ساتھ میں اس کے شریکے اور برادری والے بھی تھے۔“ جلیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”لیکن زینت نے سب کے سامنے منا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ رورو کے منا کا ظلم و ستم بیان کیا۔ اس روز تو وہ چلے گئے پر دوسرے روز فیر آئے۔ کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ زینت کسی طرح منا کے گھر جانے کے لیے تیار نہ تھی۔“
 ”کھمار نے تیرے خلاف تھانے میں اغوا کا پرچہ چاک نہیں کرایا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔
 ”زینت اس کی گھر والی تھی۔ تو اس کی مرضی کے خلاف زینت کو کیسے اپنے پاس رکھ سکتا تھا؟“

”وہ پولیس کے پاس کیسے جاتا؟ ان دنوں مغویہ عورتوں کی بازیابی کرنے والی سرکاری جماعتیں ہر طرف گھوم رہی تھیں۔ ہر طرح ان کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہی تھیں۔“ جلیل نے وضاحت کی۔ ”جیسے ہی کسی مغویہ کا پتہ چلتا فوراً چھاپہ مار کر اسے برآمد کیا جاتا اور سرکاری تحویل میں لے لیا جاتا۔ یہ بات متا بھی جانتا تھا اور میں نے اسے خبردار بھی کر دیا تھا۔ اسی لیے اس نے زیادہ شور شرابا نہیں کیا۔ وہ بات چیت کے ذریعے زینت کو واپس لے جانا چاہتا تھا۔ لیکن جب وہ کسی طرح اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو ایک شام وہ اکیلا میرے پاس آیا۔“ جلیل نے زیر لب مسکرا کر کہا۔ ”اس نے زینت کے عوض مجھ سے پانچ سو روپے مانگے۔ میرے پاس اتنے روپے نہیں تھے۔ میں نے تین سو ادھار لے کر کسی نہ کسی طرح اکٹھے کئے اور متا سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اس سے زیادہ کا بندوبست نہیں کر سکتا۔ وہ اسی پر راضی ہو گیا۔ اس نے روپے لے کر زینت کو طلاق دے دی۔ ایک بچہ تھا وہ بھی دے دیا۔“

”بعد میں تو اس نے تجھے تک نہیں کیا؟“

”وہ بہت کمینہ اور گندہ بندہ تھا۔“ جلیل نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”زینت کبھی گھر سے باہر نکلتی تو راستے میں اسے چھیڑتا۔ اٹھالینے کی دھمکی دیتا۔ میں نے جب یہ صورت دیکھی تو کوشش کر کے سکھان والا سے اپنا تبادلہ رکن پور کرالیا۔ وہیں عدت کی مدت پوری ہونے کے بعد میں نے زینت

”اپنے ساتھ نہیں لایا انہیں؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”کیسے لاتا انہیں۔“ جلیل نے دل گرفتہ ہو کر لمبی سانس بھری۔ ”بڑی حصار ہی میں ہے۔ شیشن کے ساتھ موتی پورہ کی بستی ہے۔ وہاں ایک سکھ کانٹیل کے گھر میں ہے۔ اس کا نام منگل سنگھ ہے۔ وہ اس کا تیرا گھر والا ہے۔ اس نے ملنے ہی نہ دیا۔ ہر بار جب میں مغویہ زنانوں کی بازیابی کرنے والی پارٹی کے ساتھ اس کے گھر پر جاتا تو وہ اسے پڑوس کے کسی مکان میں چھپا دیتا۔ ایک رات جب منگل سنگھ ڈیوٹی پر تھانے میں تعینات تھا۔ میں اکیلا چھپتا چھپاتا اس کے گھر پر پہنچا۔ وہ مل گئی۔ گھر میں اکیلی ہی تھی۔ پر وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی نہ ہوئی۔ منگل سنگھ سے اس کے ایک بچہ بھی ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بچے کو دکھا کر بولی۔ اسے لے کر میں کس منہ سے وہاں جاؤں گی۔ میرے ساتھ جو ہونا تھا ہو گیا۔ تجھے خاما خا بدنامی مول لینی ہوگی۔ میں نے اسے سمجھایا۔ فکر نہ کر میں تیری خاطر سب کچھ برداشت کر لوں گا پر وہ نہ مانی۔ سمجھانے بھانے کے ساتھ ساتھ منت ساجت بھی کی۔ وہ سر جھکائے کچھ دیر چپ کر کے بیٹھی رہی فیر اپنے بچے کو بغل میں دبا کر ایسی تیزی سے باہر چلی گئی کہ میں دیکھتا دیکھتا ہی رہ گیا۔“ وہ ہنسنے لگے۔
 ”بعد میں کئی بار کوشش کی مگر وہ مجھے ملی ہی نہیں۔“

”چھوٹی کا کیا پتا؟“

”اب تجھے کیا بتاؤں چوہدری، اس کا کیا پتا۔ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔“ جلیل نے نظریں نیچی کر کے دبی زبان سے بتایا۔ ”وہ کنجری بن گئی ہے۔ چکلے میں بیٹھتی ہے۔ ان دنوں تو جلدھر میں ہوتی تھی۔ جانے اب کہاں ہے؟ میں اسے ملنے ہی نہ گیا۔ کیا کرتا اسے مل کر۔“ اس کی آواز میں درد کی کک تھی۔ ”ماں اور بھائی کی طرح دونوں بہنیں بھی مرجاتیں تو اچھا تھا۔ میں نے ہی ان کو مار دیا ہوتا تو ٹھیک تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ویسے بھی میرے لیے دونوں مر چکی ہیں۔ کبھی یاد بھی نہیں کرتا۔“

”بہت ظلم ہوا جی۔“ رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ ”تو نے ظلم دیکھا ہے اور اسے جھیلنا بھی ہے۔

تب ہی تو نے زینت کو معاف کر دیا اور اسے لینے چلا بھی آیا۔“

”معاف تو جی میں نے اسے تب ہی کر دیا تھا جب وہ منا کھمار کے گھر سے بھاگ کر میرے پاس آئی تھی۔ میں اس زمانے میں چیچہ وطنی کے نزدیک سکھان والا کے پرائمری سکول میں ماسٹر تھا۔ متا میرے گھر کے پاس ہی رہتا تھا۔ ہر رات شراب پی کر نشے میں دھت ہو جاتا اور گندی گندی گالان نکال کر زینت کو بہت بے رحمی سے مارتا پٹیتا۔ میں نے اور پاس پڑوس کے دوسرے رہنے والوں

سے نکاح کر لیا۔ ہم دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔ ایک پتر بھی ہوا۔ ”اپنی بات کتے کتے دفعتاً“ اس کا چہرہ مرجھا کر راکھ ہو گیا۔ ”زینت حاملہ تھی کہ انھی دنوں کسی نے بخبری کردی۔ بازیابی کرنے والی سرکاری جماعت نے رات کو میرے گھر پر چھاپا مارا۔ زینت کو بچوں کے ساتھ اپنی نگرانی میں سرحد پار پہنچا دیا۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ وہ اپنے چاچا کے پاس فیروز پور گئی ہے۔ فیروز مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔ لیکن میں کبھی اسے بھول نہ سکا۔“

”دیے میں تجھے یہ بتادوں کہ وہ بھی تجھے بالکل نہیں بھولی۔“ رحیم داد نے ہنس کر جلیل کو بتایا۔ ”تجھ سے اتنا پیار کرتی ہے کہ تیرے ہی لیے جھپتی چھپاتی کسی نہ کسی طرح فیروز پور سے بھاگ کر پاکستان پہنچ گئی۔“

”جی بات یہ ہے چوہدری ادھر اس کا کوئی سگا ہے بھی نہیں۔ سارا ہی تیرے بلوائیوں کے ہاتھوں فسادات میں مارا گیا۔ ماں باپ، بھائی، بھین، کوئی نہیں بچا۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ جلیل بھی چپ رہا۔ وہ مڑ مڑ کر بے چینی سے دروازے کی سمت دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد باہر دالان میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دروازے کی جانب دیکھا کہ جمیلہ کمرے میں داخل ہو رہی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے زینت بھی تھی۔ جلیل اسے دیکھتے ہی بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ زینت آنکھیں پھاڑے خوشی اور حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ آگے بڑھی اور جلیل کے بازو پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

جلیل اس کا سراپا ہاتھ سے ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دینے لگا۔ ”اس طرح نہ رو زینت۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھی جھلک پڑیں، پلکیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔

جمیلہ اور رحیم داد گم صم تھے اور دونوں کو تنک رہے تھے۔ لیکن جمیلہ زیادہ دیر خاموش نہ رہی۔ رحیم داد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”لے چوہدری! دیکھ لے۔ زینت ٹھیک ہی کہتی تھی ناں۔“ وہ زیر لب مسکراتی ہوئی زینت کے پاس گئی۔ اس کا بازو تھا، اپنے قریب کیا اور سینے سے لگا کر دل جوئی کرنی لگی۔ ”رونا دھونا چھوڑ۔ اوپر کمرے میں جا۔ منہ ہاتھ دھو۔ کپڑے لتے تبدیل کر۔ جلیل بیس رہے گا۔ مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ تو بھی اس کے ساتھ ہی رہنا۔ جی بھر کے باتیں کرنا۔“ زینت کچھ نہ بولی۔ مڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر چلی گئی۔



دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ پھیل چکی پڑ گئی تھی۔

رحیم داد اور جلیل کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ قریب ہی جمیلہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ جلیل کے چہرے سے اطمینان اور سکون نمایاں تھا۔

جمیلہ نے نظریں اٹھا کر جلیل کو دیکھا۔ آہستہ سے پوچھا۔ ”جلیل! اب تیرا کیا ارادہ ہے؟“

”میں تو جی زینت کو لینے آیا ہوں۔“ اس نے نہایت اعتماد سے اپنے ارادے کا اظہار کیا۔

”ضرور لے جا زینت کو۔ تجھے بلایا ہی اسی لیے ہے۔“ جمیلہ نے مسکرا کر کہا۔ ”پر بچوں کے بارے میں تو نے کیا سوچا؟ وہ تو احسان شاہ کے مزار سے سلامو کے پاس ہیں۔“

”نادر خاں اس بارے میں مجھے پہلے ہی بتا چکا ہے۔ اور یہ بھی بتا چکا ہے کہ زینت بچوں کے لیے

کتنی پریشان اور غم زدہ ہے۔“

جمیلہ نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظریں گھمائیں۔ ”چوہدری! تو نے احسان شاہ کے پاس جانے

کے بارے میں کیا سوچا؟ مجھے آشنا ہے، تیرے کہنے پر وہ سلامو سے زینت کے بچے واپس دلا دے

گا۔“

”مجھے اس کے پاس نہ بھیج۔“ رحیم داد نے انکار کر دیا۔ ”مجھے ڈر ہے، کوئی گڑبڑ نہ پڑ جائے۔“

اس نے جلیل کو مخاطب کیا۔ ”جلیل تو بتا، بچوں کو کیسے واپس لائے گا۔ تو احسان شاہ کے پاس جاسکتا

ہے؟“

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی جمیلہ نے کہا۔ ”چوہدری! اسے احسان شاہ کے پاس نہ بھیج۔ اسے

دیکھ کر تو وہ سخت نراض ہو گا۔ غصے سے بھڑک اٹھے گا۔ فیروزہ ضرور گڑبڑا لے گا۔ مجھے پتہ ہے، وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔“

”میں تو جی احسان شاہ کو بالکل ہی نہیں جانتا۔ نہ کبھی اس کے پنڈ گیا اور نہ ہی کبھی اس سے ملا۔“ جلیل نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ چپ بیٹھا رہا۔ وہ احسان شاہ کے پاس جانے اور زینت اور اس کے بچوں کے بارے میں بات کرنے سے کترا رہا تھا۔ مراد خاں شاہانی کی زبانی رحیم داد پہلے ہی سن چکا تھا کہ زینت احسان شاہ کو بہت پسند ہے۔ اسے خدشہ تھا کہ کوٹ سے زینت کے فرار ہونے پر وہ سخت برہم ہو گا۔ عین ممکن ہے رحیم داد سے بھی خفا ہو جاوے کہ اس نے اپنی حویلی میں زینت کو پناہ کیوں دی؟ وہ احسان شاہ سے کسی طور بگاڑ پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

جلیلہ نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”چوہدری، ایسے تو کام نہیں چلے گا۔ زینت کے بچوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ ان کے بٹا کیسے شانت رہ سکتی ہے۔ انہیں یاد کر کے ہر سے روتی رہتی ہے۔“

”اپنی سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے۔“ جلیل نے کھاکر کر گلا صاف کیا۔ ”دیوال پور کا تھانے دار، زماں خاں، مجھ پر بہت مہربان ہے۔ میں اس کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ وہ ہمیشہ مجھ سے محبت اور پیار سے پیش آتا ہے۔“ اس نے جلیلہ کی جانب دیکھا۔ ”زمیں دارنی! تیرا مشورہ ہو تو میں تھانے دار زماں خاں سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں۔ امید تو یہی ہے کہ وہ میری ضرورت مدد کرے گا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانے کی غرض سے جھٹ جلیل کی تائید کی۔ ”احسان شاہ سے اگر تھانے دار نے کہا تو وہ اس کی بات ٹالے گا نہیں۔ میں نے تو اس کے بارے میں یہی اندازہ لگایا ہے کہ وہ تھانے دار اور دوسرے سرکاری افسروں کو ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔“ اس نے جلیلہ کی طرف دیکھا۔ ”ویسے زمیں دارنی آگے تیری مرضی۔“

جلیلہ نے رحیم داد کو نظر انداز کرتے ہوئے جلیل کو مخاطب کیا۔ ”جلیل اگر تجھے وشواس ہے کہ تھانے دار زماں خاں تیری ضرورت مدد کرے گا تو بچوں کی واپسی کے لیے اس سے ضرورت بات کر۔“

”میں کل ہی دیوال پور چلا جاؤں گا اور تھانے دار سے بچوں کی واپسی کے لیے بات کروں گا۔“ جلیل نے اپنے ارادے سے جلیلہ کو آگاہ کیا۔ ”ویسے بھی میں نے کل ہی واپس جانا ہے۔ پرسوں انسپکٹر آف سکوٹر معائنے کے لیے آ رہا ہے۔ ہیڈ ماسٹر نے تاکید سے کہا ہے کہ معائنے پر میں ضرور

حاضر ہوں۔ بعد میں لمبی چٹھی لے کر آ جاؤں گا۔“

رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”تو کل صبح ضرور چلا جا۔ تھانے دار کی منت سماجت کر کے راضی کر لیتا۔ اس نے تیرے بارے میں احسان شاہ سے کہا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ مجھے اتنا تو پتہ ہے احسان شاہ تھانے دار کی بات آسانی سے ٹال نہیں سکتا۔“

نادر خاں بھی آگیا۔ وہ نمادھو کر اور ابلے کپڑے پہن کر آیا تھا۔ جلیلہ نے اسے دیکھتے ہی جلیل کی جانب اشارہ کیا۔ ”نادر! اسے مہمان خانے میں لے جا۔ یہ وہیں ٹھہرے گا۔“ وہ جلیل کی طرف متوجہ ہوئی۔ ”اب تو جا۔ بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ زینت کچھ دیر بعد تیرے پاس پہنچ جائے گی۔“ جلیل خاموشی سے اٹھا اور نادر خاں کے ہم راہ مہمان خانے کی جانب چلا گیا۔

جلیلہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”تھانے دار زماں خاں نے جلیل کی مدد کرنے کی حامی بھری تو ضرور کام بن جائے گا۔“

”جلیل تو کہتا ہے تھانے دار اس کی ضرورت مدد کرے گا۔ ویسے سچی بات یہ ہے زمیں دارنی۔ اب میں احسان شاہ کے پاس جانا اور اس سے ملنا نہیں چاہتا۔ وہ گندہ اور خطرناک بندہ ہے۔“

”بہت خطرناک اور گندہ ہے۔“ جلیلہ نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”میرا من تو یہی کہتا ہے، اللہ وسایا کا کتل اسی نے کرایا۔ اس کے سوا اللہ وسایا کا کوئی دشمن تھا ہی نہیں۔“

”میں اسے اتنا ظالم نہیں سمجھتا تھا۔“ رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”مجھے ذرا بھی شبہ ہوتا کہ اللہ وسایا کے کتل میں احسان شاہ کا ہاتھ ہے تو کبھی اس سے نہ ملتا۔ ویسے تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ زمیں دارنی! احسان شاہ نے کبھی میرے سامنے اللہ وسایا کی برائی نہیں کی۔“

”چوہدری، تجھے پتہ نہیں، احسان شاہ اس سے کتنا خار کھاتا تھا۔ اس کی جان کا دشمن تھا۔“ جلیلہ نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”اپنے کرندوں اور بد معاشوں کے ذریعے پہلے تو پرانے مزارعوں کو بے دخل کر کے میرے پتا کی بہت سی اراضی پر کسبہ کر لیا۔ میرے اور اللہ وسایا کے خلاف جھوٹے کیس بنوائے۔ وہ تو یہ حویلی اور ساری ہی اراضی ہتیا لیتا چاہتا تھا۔“

رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں نوں تو پہلے ان باتوں کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔“

”تو اس کے پاس پہنچ کیسے گیا؟“ جلیلہ نے پوچھا۔

”مجھے تو ماکھا خوشامد کر کے اس کے پاس لے گیا تھا۔“ رحیم داد نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”میں نے اسے بہت ٹالا پر وہ میرے گلے پڑ گیا۔“

”وہ تجھے احسان شاہ کے پاس کیوں لے جانا چاہتا تھا؟“

”ماکھے کی گھروالی، سگراں، کو اٹھوا کر احسان شاہ نے اپنے کوٹ میں ڈال رکھا تھا۔ ۵ سال سے وہ اس کی کید میں تھی۔ پتہ نہیں کس نے ماکھا کو میرے پیچھے لگا دیا۔ وہ میرے پیر پکڑ کر منت کرنے لگا، چوہدری، میرا بازو دلا دے۔ میں نے اس کے بارے میں اللہ وسایا سے بھی ذکر کیا تھا پر اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا احسان شاہ اس کی بات ماننے کی بجائے ماکھے کا اور دشمن ہو جائے گا۔ اس پر اور اس کی گھروالی دونوں پر بہت ظلم کرے گا۔ میں نے یہ بات ماکھا کو صاف صاف بتا دی تھی۔“

”تب تو اس نے تیرا پیچھا چھوڑ دیا ہو گا؟“

”نہیں جی، وہ فیہ بھی لگا رہا۔ میں اسے ڈانٹا، پر وہ اتنا ڈھیٹ نکلا کہ چھپتا چھپاتا میرے پاس پہنچ ہی جاتا۔ میں ہریار انکار ہی کرتا رہا۔ جب تو کیمبل پور، اللہ وسایا اور بچوں کے ساتھ شرفاں کے ویاہ میں شریک ہونے گئی تھی، انھی دنوں ایک شام میں گھوڑی پر بیٹھ کر نہر کی طرف نکل گیا۔ نہ جانے کدھر سے ماکھا آگیا۔ اس نے میرے پیروں پر پکڑی ڈال کر منت کی کہ میں احسان شاہ سے مل لوں اور اس کے بازو کو دلانے کی سفارش کروں۔ اسی وقت احسان شاہ بھی اپنی گھوڑی پر آگیا۔ ماکھا تو اسے دیکھتے ہی درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ پر ماکھا کی خاطر مجھے احسان شاہ سے ملنا پڑا۔ وہ مجھے اپنی حویلی لے گیا۔ ”رحیم داد نے جیلہ کی طرف دیکھا۔“ ”زمین دارنی، اس طرح میں احسان شاہ سے ملا۔“

”تیرے کہنے پر احسان شاہ نے ماکھے کی گھروالی واپس کر دی تھی؟“

”ہاں جی۔ اس نے میرے کہنے پر دوسرے ہی روز ماکھے کی گھروالی کو اس کے بچوں کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔“

”تب تو مجھے وشواس ہے، تیرے کہنے پر وہ زینت کے بچوں کو بھی سلامو سے واپس دلا دے گا۔“

”تو کہتی ہے تو احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔ اس سے زینت کے بچوں کی واپسی کے لیے بات کر لوں گا۔ آگے اس کی مرضی۔“ رحیم داد نے اس دفعہ جیلہ کی بات مسترد نہ کی مگر ساتھ ہی یہ مشورہ بھی دیا۔ ”پہلے جلیل کو تھانے دار زماں خاں کے ذریعے کوشش کر لینے دے۔ اگر اس طرح کام نہ بنا تو میں احسان شاہ کے پاس چلا جاؤں گا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”زمین دارنی تیری بات ٹالی بھی تو نہیں جاسکتی۔“

جیلہ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے

اب جانا ہے۔ زینت کو لے کر جلیل کے پاس جاؤں گی۔“

رحیم داد چپ رہا۔ جیلہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل کر دالان میں چلی گئی۔



شام گہری ہو چکی تھی۔ دھندلکا ہر طرف پھیل چکا تھا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ دیر تک کرسی پر چپ بیٹھا رہا۔ نہ جیلہ آئی اور نہ ہی نادر خاں۔ پھر رات گزری تو رحیم داد نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ بند کیا۔ لیپ کی لودھی کی اور بستر پر لیٹ گیا۔

صبح دیپال پور جانے سے قبل جلیل اس کے کمرے میں پہنچا۔ کچھ دیر رحیم داد کے پاس بیٹھا رہا۔ جیلہ بھی پہنچ گئی۔ زینت اس کے ہم راہ تھی۔ جلیل سب سے رخصت ہوا۔ تانگے میں سوار ہوا اور دیپال پور کی جانب روانہ ہو گیا۔

جلیل کو گئے ہوئے نو روز ہو گئے۔ دسویں روز وہ واپس آگیا۔ بچوں کو اپنے ساتھ لایا۔ رحیم داد اس وقت کھیتوں پر گیا تھا۔ بوائی کے بعد وہ بیج کی فصل کی دیکھ بھال سرگرمی اور لگن سے کر رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا جب اسے جلیل کے پہنچنے کی اطلاع ملی۔ وہ بے چین ہو کر حویلی کی طرف واپس ہوا۔ مہمان خانے میں پہنچا۔ زینت اپنے بچوں کے ساتھ جیلہ کے پاس بالائی منزل پر جا چکی تھی۔ جلیل مہمان خانے کے صحن میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ بیٹھنے کے لیے بڑی انکساری اور احترام سے کرسی پیش کی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔

اس نے پوچھا۔ ”سنا ہے تو بچوں کو لے آیا ہے؟“

”ہاں جی، لے ہی آیا۔“ جلیل نے بتایا۔ ”زینت بچوں کو لے کر اوپر زمیں دارنی کے پاس گئی ہے۔“

”پر تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟“

”وہ ایسا ہوا جی، میں میاں سے جاتے ہی تھانے دار زماں خاں سے ملا۔“ جلیل نے اپنی روا داد سنائی۔ ”وہ حسب معمول مہربانی سے ملا۔ میں نے اسے زینت اور بچوں کے بارے میں بتایا۔ زینت کی واپسی کی اطلاع پر بہت خوش ہوا۔“ اس نے نظریں جھکا لیں۔ لہجہ دھیم پڑ گیا۔ ”زینت کے بارے میں اسے پتہ تھا اور یہ بھی جانتا تھا مجھے اس کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ میں نے ویاہ کرنے کا ارادہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا میں فوراً زینت کو دیپال پور اپنے گھر میں لے آؤں۔ لیکن میں نے زور دیا، بچوں کی واپسی کے بعد اسے لانا مناسب رہے گا۔“

دینا نے بھی فوراً رحیم داد کو پہچان لیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”جلیل! میں چوہدری کو پہلے سے جانتا ہوں۔“ رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ دینا براہ راست رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ ”چوہدری! تو ٹھیک ٹھاک تو رہا۔ بہت دنوں بعد میں نے آج تجھے دیکھا ہے۔“

رحیم داد نے اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی۔ پوچھا۔ ”شاہ جی کا کیا حال احوال ہے؟“

”ٹھیک ہی ہے جی۔“ دینا نے بے نیازی سے کہا۔ ”ویسے جی میں نے اس کی نوکری بہت دن ہوئے چھوڑ دی۔“

”اب کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”آج کل دیپال پور میں ہوں جی۔ موٹی چوری کے ایک کیس میں پھنس گیا تھا۔“ دینا نے بتایا۔ ”اپنے تھانے دار زماں خاں نے بچالیا۔ تب سے جی ان ہی کے ساتھ لگا ہوں۔ مخبری تکبری کرتا ہوں۔ اکیلا ہوں۔ اسی میں گزارہ ہو جاتا ہے۔ دو تین ڈکیتیوں اور چوریوں کا کھوج لگایا۔ سنگمروں کے ایک وڈے گروہ کو بھی پکڑوایا۔ اس پر انعام بھی ملا۔“ وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ”بس جی ایسے ہی کام چل رہا ہے۔“

”پر تو نے زینت کے بچوں کو واپس دلا کر بہت زبردست کام کیا۔“ رحیم داد نے اسے خوش کرنے کے لیے اچھے الفاظ سے یاد کیا۔ ”دینے! ویسے تو ہے بھی بہت حوصلے والا۔ بہت کام کا بندہ ہے۔ تو نہ ہوتا تو میں کتا ہوں، جلیل کو بچے ہرگز سلامو سے واپس نہ ملتے۔“ رحیم داد نے مڑ کر جلیل کو دیکھا۔ ”یہی گل ہے نا جی؟“

”ہاں جی، دینا نہ ہوتا تو بچے نہ آتے۔ پتہ نہیں کتنی دشواری پڑتی۔“ جلیل نے رحیم داد کی تائید کی۔

”زینت نے تو بچوں کے لیے رو رو کر برا حال کر رکھا تھا۔ روٹی تو اس سے کھائی نہیں جاتی تھی۔“ رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس دس کے تین نوٹ نکالے۔ دینا کی طرف بڑھائے، ہنس کر بولا۔ ”لے رکھ لے۔ یہ میری طرف سے تیرا انعام ہے۔ ویسے تو نے ایسا کام کیا ہے کہ زینت کو تو دوسری زندگی مل گئی۔“ رحیم داد نے گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ ”دینے تو نے رات میں ٹھیرنا ہے؟“

”نہیں جی، میں نوں واپس دیپال پور جاتا ہے۔“

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ دینا جلد سے جلد چلا جائے۔ اس نے جلیل سے کہا۔ ”اے اب بچانے دے ورنہ یہ رات گئے دیپال پور پہنچے گا۔ سردی بھی زوروں پر ہے۔ رستے میں اسے بہت

رحیم داد طویل تفصیل سے جلد ہی اکتا گیا۔ ”یہ بتانے کیسے ملے؟“

”تھانے دار نے اپنے ایک پرچے کے ساتھ مجھے احسان شاہ کے پاس بھیجا۔ میں پیراں والہ گیا۔ احسان شاہ سے ملا۔ تھانے دار کا پرچہ دیا۔ پہلے تو وہ زینت کا نام سنتے ہی ایک دم مجھ پر گرم ہو گیا۔ زینت کو گندی گندی گالاں نکالنے لگا۔ دھمکی دی کہ اسے دوبارہ اٹھوا لوں گا۔ پر جب اس نے زماں خاں کا پرچہ پورا پڑھ لیا تو ذرا نرم پڑ گیا۔ اس نے سلامو کو بلوایا جس کے پاس بچے تھے۔ گروہ آیا نہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا سلامو، مزارع ہو کر احسان شاہ کے بلانے پر نہ آئے۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”سلامو اب احسان شاہ کا مزارع نہیں رہا۔ اسے احسان شاہ نے بے دخل کر دیا ہے۔ پر ابھی رجتا پیراں والہ ہی میں ہے۔ احسان شاہ کا کردہ پیغام لے کر سلامو کے پاس پہنچا۔ اس نے آنے کا بہانہ کیا اور بچوں کو لے کر چک ۷۲ میں اپنے چچیرے کے پاس چلا گیا۔“

”تب تو بہت مشکل پڑی ہوگی؟“

”ہاں جی، بہت مشکل پڑی۔ احسان شاہ کا مینجر کوشش کرتا رہا۔ پر نہ سلامو آیا اور نہ ہی اس نے بچے بھیجے۔ میں ٹھیرا رہا۔ سوچا اب آیا ہوں تو بچوں کو لے کر ہی جاؤں گا۔ اسی میں دیر ہو گئی۔ پانچ روز پیراں والہ میں ٹھیرا رہا مگر کام نہ بنا۔ احسان شاہ لہور جا چکا تھا۔“ جلیل نے بھی بھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”جب کام نہ بنا اور بچوں کے ملنے کی کوئی امید نظر نہ آئی تو میں واپس دیپال پور چلا گیا۔“

”تھانے دار سے ملا تھا؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”سیدھا اس کے پاس پہنچا۔ اسے سب حال بتایا۔“

جلیل نے اپنی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ کمرے سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد کا چہرہ فنی ہو گیا۔ وہ احسان شاہ کا کردہ، دینا تھا جس کے ذریعے رحیم داد نے احسان شاہ سے ساز باز کر کے اللہ وسایا کو دارا کے ہاتھوں قتل کرایا تھا۔ دینا اس سے احسان شاہ کی حویلی میں مل بھی چکا تھا۔

دینا کمرے سے نکل کر دونوں کی جانب بڑھا۔ جلیل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”یہ دینا ہے چوہدری، سچی بات یہ ہے جی، اسی کی کوششوں سے بچے ملے ہیں۔ یہی ان کو لے کر آیا بھی۔ تھانے دار نے بچوں کو سلامو کے قبضے سے نکالنے کے لیے اسی کو لگایا تھا۔“

تنگ کرے گی۔“

جلیل تو خاموش رہا، مگر دیتا چپ نہ رہا۔ اس نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”مجھے تو جی اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ دیر ہو گئی تو بہت مشکل پڑے گی۔ میرے پاس تو صرف ایک کھیس ہے۔ کبل یا دھسا بھی نہیں لایا۔ ادھر سردی بھی بڑھ گئی ہے۔“

دیتا نے مزید بات چیت نہ کی۔ کمرے میں جا کر کھیس اوڑھی۔ لمبی ڈانگ ہاتھ میں دبائی۔ جلیل کے پاس آیا، بولا۔ ”ماسٹر جی! میں تو اب چلا۔ دہپال پور میں ملوں گا۔ تیس تو بعد میں آؤ گے۔ تھانے دار سے بتا دوں گا۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جلیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دیتا کے ساتھ ساتھ مہمان خانے کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔ عین اس وقت جلیل مہمان خانے میں داخل ہوئی۔ جلیل نے اسے دیکھا تو ٹھہر گیا۔ دیتا بھی رک گیا۔ جلیل قریب پہنچ گئی۔ جلیل نے اسے سلام کیا۔

جلیل نے ہاتھ اٹھا کر دیتا کی طرف اشارہ کیا۔ ”دیتا یہی ہے جو بچوں کو سلاموں کی کید سے نکال کر لایا ہے؟“

جلیل کے بولنے سے پہلے ہی دیتا بول پڑا۔ ”یہ تو جی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ ماسٹر جی جانتے ہیں میں نے کیسے کیسے مشکل کام کیے ہیں۔“

رحیم داد کی پریشانی جلیل کو دیکھتے ہی سوا ہو گئی۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جلیل کی طرف دیکھا۔ ”زمیں دارنی! اب دینے کو جانے دے۔ کڑا کے کی سردی ہے اور اسے دور جانا ہے۔“ وہ چاہتا تھا کہ دیتا کو جلیل سے مزید گفتگو کرنے کا موقع نہ ملے اور وہ جلد سے جلد چلا جائے۔

جلیل نے رحیم داد کو نظر انداز کرتے ہوئے نرم لہجے میں دیتا سے کہا۔ ”دینے، تو بہت نیک بندہ ہے۔ زینت کے بچے واپس دلا کر تو نے ایسا بھلا کام کیا ہے، نہ صرف زینت اور جلیل بلکہ میرے من سے بھی تیرے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے سو سو کے دو نوٹ نکالے اور دیتا کو دے دیے۔ ”یہ تیرا انعام ہے۔ ویسے تیری اتنی وڈی نیکی کا یہ کچھ بھی انعام نہیں۔“

رحیم داد کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

دیتا نے دو سو روپے لے کر دعوتی کے ڈب میں اڑس لیے۔ روپے پا کر اتنا خوش ہوا کہ بول بھی نہ سکا۔ دانت نکال کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دیتا سے کہا۔ ”اب تو رجا۔ دیر کرنا تیرے لیے ٹھیک نہیں۔ سردی آج بہت زیادہ ہے۔“

مگر جلیل نے دیتا کو جانے نہ دیا، بولی۔ ”جلدی کیا ہے۔ رات کی روٹی کھا کر جائے گا۔“

رحیم داد نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”زمیں دارنی تو نے بھی حد کر دی۔ اسے روٹی کھلانے کے لیے سردی میں تنگ کرنا چاہتی ہے۔ رات کو یہ کیسے دہپال پور جاسکے گا؟“

”آج ہی اس کا جانا کوئی ضروری ہے؟“ جلیل کا لہجہ بھی تیکھا تھا۔ ”رات کو حویلی میں ٹھہر جائے گا۔ کل دن چڑھے چلا جائے گا۔“

رحیم داد دم بخود ہو کر رہ گیا۔ مگر دیتا رکنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ ”زمیں دارنی! مجھے تو اب جانے ہی دے۔ چک بیدی سے دہپال پور کے لیے لاری پکڑ لوں گا۔ میں ادھر ٹھہر نہیں سکتا۔ تھانے دار سے مجھے ہجیمتی ملنا ہے۔ پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔ اب اور دیری نہ کرا۔“ اس نے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔ ”مجھے نہ روک۔ اب جانے ہی دے۔ تیری بہت بہت مہربانی۔“

جلیل نے مزید اصرار نہ کیا۔ دیتا آگے بڑھا۔ جلیل اس کے ہم راہ چلا۔ دونوں مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔

دیتا کے جانے کے بعد رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی رفع ہو گئی۔ جب تک دیتا موجود رہا، خطرہ اس کے سر پر منزلاتا رہا۔ مگر جلیل اس کے احساسات سے بے نیاز قریب ہی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جلیل واپس آگیا اور دونوں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دھوپ کی رنگت بدلنے لگی تھی۔ دن ڈھل رہا تھا۔

جلیل بچوں کے واپس آنے پر بہت مسرور تھی، جلیل سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے اپنے سکول کے بارے میں بتاتی رہی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ لمبی چھٹی لے کر کوئٹہ ہر کشن آجائے اور اسکول کا انتظام درست کرنے میں اس کی مدد کرے تاکہ وہ نہ صرف منظور شدہ اسکول بن جائے بلکہ بعد میں ڈسٹرکٹ بورڈ اسے اپنی تحویل میں لے کر باقاعدہ سرکاری پرائمری اسکول بنا دے۔ جلیل یہ بھی چاہتی تھی کہ زینت اور جلیل اپنے بچوں کے ساتھ اس کے پاس ہی رہیں۔ لیکن یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا کہ اسکول سرکاری بن جائے اور جلیل دہپال پور سے تبادلہ کرانے کے بعد کوئٹہ ہر کشن آجائے۔

جلیل ہر طرح جلیل کی مدد کرنے کو تیار تھا۔ وہ اس کی درد مندی اور ہنس کھ طبیعت سے بہت متاثر تھا۔ اس کا احسان مند بھی تھا۔ اس کے وسیلے سے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچے مل گئے تھے۔ ویسے بھی زینت اور جلیل کے ساتھ جلیل کا رویہ بڑا مشفقانہ تھا۔ جلیل دیر تک جلیل سے باتیں کرتا رہا۔ کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جلیل اور زینت اپنے بچوں کے ساتھ مہمان خانے میں ٹھیرے رہے۔ جلیل روزانہ جیلہ کے ہم راہ اسکول جاتا۔ تمام وقت وہیں رہتا اور جیلہ کے ساتھ ہی واپس آتا۔ رحیم داد ہر صبح جلیل اور جیلہ کو جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ اس کے کمرے کے سامنے سے گزرتے تھے۔ لیکن پورا ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ وہ زینت اور بچوں کے ساتھ دیپال پور چلا گیا۔ حالانکہ جلیل وہ ہفتے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔ اس نے رحیم داد کو یہی بتایا تھا۔ رحیم داد کو اس کے اچانک چلے جانے پر حیرت ہوئی اور اس سے بھی زیادہ حیرت اور تکلیف ان کے اس رویے پر ہوئی کہ وہ اس سے مل کر بھی نہ گئے۔

سہ پہر کو جیلہ اسکول سے واپس لوٹی تو رحیم داد نے روک کر اس سے اپنی بے چینی اور حیرت کا اظہار کیا۔ ”زمیں دارنی! میں نے سنا ہے جلیل اور زینت دیپال پور چلے گئے۔ جلیل تو لمبی چھٹی پر آیا تھا۔ میں تو ان سے مل بھی نہ سکا۔ جب وہ گئے تو میں کھیتوں کی طرف تھا۔ وہ اس طرح اچانک کیسے چلے گئے؟“

”وہ ایسا ہے چوہدری۔“ جیلہ نے وضاحت کی۔ ”تاجاں کا ویاہ تو نادر خاں کے گھر ہی سے ہونا ہے نا۔ تاجاں اسی کے گھر میں مائیاں بیٹھے گی۔ نادر خاں بیوی بچوں کے ساتھ تب تک مہمان خانے میں ٹھیرے گا۔ اور کہاں جائے گا؟“

”اسکول کا کیا بنے گا؟“ رحیم داد نے لہجے میں پوچھا۔ ”تو مائیاں میں لگ جائے گی۔“

”اسکول بھی بند رہے گا۔ بیج بھی تو اسکول ہی میں اترے گی۔ اور وہیں ٹھیرے گی۔“ جیلہ نے

رحیم داد کو بتایا۔ ”یہی طے ہوا ہے۔ ایسی صورت میں جلیل یہاں کیسے ٹھیر سکتا تھا۔“

رحیم داد سے جیلہ نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ اسکول سے تھکی ہوئی آئی تھی۔ جلد سے جلد اپنے کمرے میں پہنچ کر آرام کرنا چاہتی تھی۔



رحیم داد دوپہر کا کھانا کھا کر کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ نادر خاں اس کے ہم راہ تھا۔ اسکول سامنے ہی تھا۔ رحیم داد کی نظر اسکول کی طرف گئی۔ اس نے ایک شخص کو اسکول سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے چادر اس طرح سر اور کانوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھا کہ چہرہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد کو شبہ ہوا کہ وہ دینا ہے۔ فوراً اس کا ہاتھ ٹھکا۔ طرح طرح کے وسوسوں نے اس کے ذہن میں کھلبلی پیدا کی۔ وہ حیران و پریشان ہو کر سوچنے لگا کہ دینا خلاف توقع جیلہ سے ملنے اسکول میں کیوں آیا ہے؟

رحیم داد نے دیکھا، دینا اسکول سے نکل کر درختوں کے نیچے چلا گیا۔ وہ نہر کی طرف جا رہا تھا۔

رحیم داد نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ ”نادر! مجھے یہ دینا لگتا ہے۔“

”وہی ہو گا جی۔ میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا نہیں۔“ نادر خاں بے نیازی سے بولا۔

اب دینا کی پشت نظر آرہی تھی۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ اس نے نادر سے کہا۔ ”نادر خاں! تو جا کر پتہ کر یہ دینا ہے نا؟ ہو سکے تو یہ بھی معلوم کرنا، وہ زمیں دارنی کے پاس کیسے آیا تھا۔“

رحیم داد نے کھیتوں کی طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ”میں واپس اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ نادر تو وہیں آجا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔“

رحیم داد حویلی کی جانب واپس ہوا۔ نادر قدم بڑھاتا ہوا اس طرف چلا جھڑپا گیا تھا۔

رحیم داد کمرے میں پہنچا اور بے چینی سے نادر خاں کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ گھنٹہ، سوا گھنٹہ بعد نادر خاں لوٹا۔ وہ تھکا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ تیز رفتار سے چل کر آیا ہے۔

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ جب نادر خاں کو ذرا قرار آیا تو رحیم داد نے پوچھا۔ ”وہ دینا ہی تھا نا؟“ اس کے لہجے سے بے قراری صاف عیاں تھی۔

”ہاں جی، دینا ہی تھا۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”میں نے اسے بتا دیا۔“

”تو نے اس سے بات چیت کی تھی؟“

”بالکل کی تھی۔“

”تو نے پوچھا، وہ ادھر کس لیے آیا تھا؟“

”کہتا تھا زمیں دارنی نے بلایا تھا۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”جلیل نے دیپال پور جا کر اسے زمیں دارنی کے پاس بھیجا تھا۔“

”تو نے دینے سے پوچھا کہ زمیں دارنی نے اسے کس لیے بلایا تھا؟“ رحیم داد نے کرید کر دریافت کیا۔

”کہتا تھا زمیں دارنی نے ایک ضروری کام کے لیے اسے بلایا تھا۔“

”اس سے تو نے پوچھا نہیں کہ وہ ضروری کام کیا تھا؟“

”میں نے اس سے پوچھا بھی۔ گھما پھرا کر بات کی پر اس نے کچھ نہ بتایا۔ میں نے تو اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا کہ وہ خود ہی زمیں دارنی کے پاس آیا تھا۔ زمیں دارنی نے اسے بلایا نہیں تھا۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ ”پر یہ مجھ نہیں آئی، اگر وہ جیلہ کے پاس آیا تھا تو کیوں آیا تھا؟“

”میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ زمیں دارنی سے سلامو کے نام پر کچھ اٹھنے کے لیے آیا ہوگا۔ اور تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو بے چین اور پریشان پایا تو زور دے کر پوچھا۔ ”پر اس کے زمیں دارنی کے پیاس آنے سے تو کیوں پریشان ہے؟“

”پریشانی کی گل ہی ہے۔ دینا بہت عرصہ تک احسان شاہ کے پاس ملازم رہ چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا وہ میرے اور شاہ جی کے میل ملاپ کے بارے میں جیلہ کو بتائے۔ اس نے مجھے احسان شاہ کی حویلی میں کتنی ہی بار دیکھا ہے۔“

”پر دینا کے بتانے سے بھی کیا ہوگا۔“ نادر خاں نے دینا کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔ ”اب تو زمیں دارنی کو پتہ چل ہی چکا ہے، تیس شاہ جی کے پاس جاتے رہے ہو۔ زمیں دارنی کے سامنے اسے مان بھی چکے ہو۔ اب دینا یا کسی اور کے زمیں دارنی سے ملنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

رحیم داد اپنی پریشانی کی اصل وجہ نادر خاں کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے اللہ و سایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں نہ لیا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں کبھی تفصیل سے بات ہی کی تھی۔ رحیم داد نے پردہ پوشی کے لیے بات بنائی ”نادر! تین نوں پتہ ہے ادر شاہ جی کی حویلی میں پینا پلانا بھی ہوتا تھا۔ میں چاہتا ہوں جیلہ کو اس کا پتہ نہ چلے۔ وہ شراب بلکہ کسی بھی نشہ بازی کو برا سمجھتی ہے۔“

”چوہدری! میں تو سمجھتا ہوں دینا نے زمیں دارنی سے تیرے بارے میں کوئی ایسی گل بات نہیں کی ہوگی۔“ نادر خاں نے رحیم داد کی تشویش رفع کرنے کی کوشش کی۔ ”اسے تجھ سے کوئی گلہ شکوہ بھی نہیں۔ وہ خانا خا زمیں دارنی سے کیوں تیری برائی کرنے لگا؟ وہ تو اپنے ہی کسی کام سے آیا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جلیل اور اس کے بال بچوں کے بارے میں بتانے آیا ہو۔ جلیل کو چھٹی نہ ملی ہوگی۔ اس نے دینا کو زمیں دارنی کے پاس بھیج دیا ہوگا۔“

نادر نے اپنے طور پر رحیم داد کو ہر طرح مطمئن کرنے اور اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کے ذہن میں وسوسے اور خدشات منڈلاتے رہے۔ نادر خاں اجازت لے کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔

رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھا رہا۔

سہ پہر ہو گئی۔ جیلہ اسکول سے واپس ہوئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری تو مسکرا کر بولی۔ ”چوہدری! کمرے میں خالی پڑے پڑے تیرا من نہیں گھبراتا۔“ مگر وہ رکی نہیں آگے بڑھ گئی۔

اس کے خوشگوار روتیے سے رحیم داد کی پریشانی بڑی حد تک زائل ہو گئی۔ اس نے ذہنی سکون محسوس کیا۔



اس روز اتوار تھا۔ جیلہ حویلی ہی میں تھی اور اوپر کی منزل پر اپنے کمرے میں تھی۔ وہ صبح سے نیچے نہیں آئی تھی۔ دوپہر کو محمد عثمان رندھاوا وکیل آیا۔ وہ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزرا مگر اس سے نہ ملا۔ سیدھا جیلہ کے پاس اوپر کی منزل پر گیا۔ وہ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ تک جیلہ کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ کھانا بھی اس نے جیلہ کے ساتھ ہی کھایا۔ یہ ساری اطلاعات اسے حویلی کے ملازم نادر سے ملتی رہیں جو بار بار جیلہ کے پاس آ جا رہا تھا۔

سہ پہر کو وکیل واپس چلا گیا۔ رحیم داد نے نہ اسے ٹوکا اور نہ ہی اس نے رحیم داد کی جانب کوئی توجہ دی۔ وہ سر جھکائے لیے لیے قدم اٹھاتا کمرے کے سامنے سے گزر گیا۔ رحیم داد خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ وکیل کو دیکھ کر وہ ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ رات ہو گئی مگر جیلہ نیچے نہ آئی۔

سورے وکیل پھر آیا۔ رحیم داد نے اسے زینے پر چڑھتے اور میڑھیاں ملے کر کے اوپر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت کرسی پر صحن میں بیٹھا تھا۔ ہر طرف گہری بستی دھوپ پھیلی تھی۔ رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ جیلہ اور وکیل دونوں کے ہم راہ نیچے آئے۔ نہ جیلہ نے اور نہ ہی وکیل نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ وہ حویلی کا چھانک عبور کر کے باہر گئے۔ تاگوں میں سوار ہوئے اور گاؤں سے باہر چلے گئے۔ رحیم داد کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ دینا کی اچانک آمد ہی سے گھبرا گیا تھا۔ مگر جیلہ سے بات چیت کرنے کے بعد مطمئن بھی ہو گیا تھا۔ وکیل کی آمد و رفت نے اسے ایک بار پھر طرح طرح کے وسوسوں میں مبتلا کر دیا۔

رحیم داد نے اپنی پریشانی اور خدشات کا نادر خاں سے کوئی ذکر نہ کیا۔ وہ جیلہ کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ شام کو جیلہ نوکروں کے ساتھ واپس آئی۔ رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔

وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آگیا۔ بڑھ کر جیلہ کے قریب پہنچا۔ مسکرا کر دریافت کیا۔ ”زمیں دارنی تو سورے ہی سورے وکیل کے ساتھ کہاں گئی تھی۔ کوئی خاص گل بات تھی؟“

”نہیں کوئی خاص گل نہیں۔“ جیلہ نے بے نیازی سے بتایا۔ ”میں نے وکیل سے لہو میں

مکان کا بندوبست کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ اسی کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔
 ”تو کیا تو لمبور جا رہی ہے؟“ رحیم داد نے پریشانی کا اظہار کیا۔
 ”ابھی تو نہیں جا رہی۔“

”زمیں دارنی، تو لمبور جانے کا خیال دل سے نکال دے۔ میں نوں تو ابھی اپنے سکول کو منظور شدہ بنواتا ہے۔ اس روزی کی کتنی تھی۔“
 ”ارادہ تو ایسا ہی ہے۔“

”جب تیرا یہ ارادہ ہے تو لمبور کیوں جا رہی ہے؟“ رحیم داد نے اس کے جواب کا انتظار بھی نہ کیا، مشورہ دیا۔ ”نادر کو لگا دے، وہ تیرے سکول کو منظور شدہ بنوا دے گا۔ فکر نہ کر۔ وہ یہ کام ضرور کر دے گا۔ تو جانتی نہیں، وہ ایسے معاملوں میں بہت ہوشیار ہے۔“

جیلہ خاموش رہی۔ مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ گلہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”تجھے لمبور ہی جانا تھا تو مجھے یہاں کیوں بلوایا؟“ اس نے جیلہ کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر تھکن کے اثرات ہوید اٹھے۔ ”اس دفعہ پچھی اور کماؤ کی فصل بہت چنگی گئی ہے۔ اس کی آمدنی سے شاندار سکول بنا، ڈپنری بنا۔ تجھے روکنے والا کون ہے؟ سب ہی کچھ تیرا ہے۔ میں نے کیا لیتا۔“ اس نے لہجے میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”تو لمبور جانے کا خیال بالکل دل سے نکال دے۔“

”پر میں لمبور جا کب رہی ہوں۔“ جیلہ مسکرا کر بولی۔ ”وکیل تو یہ بتانے آیا تھا کہ لمبور میں اس نے میرے لیے جس مکان کا بندوبست کیا تھا، اس کا معاہدہ ختم کر دیا ہے۔ کل وہ اس سلسلے میں مجھے پوچھنے آیا تھا کہ آگے کے لیے میرا کیا ارادہ ہے؟ جب میں نے اسے بتایا لمبور جانے کا چار چھوڑ دیا ہے تو آج وہ معاہدہ ختم ہونے کی بات بتانے آیا تھا۔“

”تو اس کے ساتھ کہاں گئی تھی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے بھی شہر میں تاجاں کے ویاہ کے لیے خریداری کرنی تھی۔ سو میں اس کے ساتھ ہی چلی گئی۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرائی۔ ”تو کیا سمجھا؟“
 رحیم داد کچھ نہ کہہ سکا۔ جیلہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”تجھ سے کل بات ہوگی۔ اس سے تو میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی زینے کی جانب بڑھی۔

رحیم داد ایک بار پھر پریشانی میں مبتلا ہو گیا اور جیلہ سے گفتگو کرنے کے بعد مطمئن بھی ہو گیا۔ اس کے ذہن میں جو وسوسے اور شبہات کل سہ پہر سے بار بار ابھر رہے تھے، رفع ہو چکے تھے۔ رحیم داد اپنے کمرے میں گیا۔ رات کا کھانا کھایا اور سکون سے گہری نیند سو گیا۔

دن چڑھے نادر نے اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فرسٹ تھی جو اسے جیلہ نے دی تھی۔ اس میں تاجاں کے جیز اور شادی بیاہ کے سازو سامان کی ضروری اشیاء درج تھیں۔ وہ فرسٹ کے مطابق خریداری کرنے لاہور جا رہا تھا۔ مگر لاہور جانے سے پہلے وہ رحیم داد کے ساتھ کپاس کی فروخت کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے رحیم داد کو ضروری اطلاعات فراہم کیں۔
 وہ اٹھا اور لاہور کے سفر کے لیے روانہ ہو گیا۔

شام ہوئی۔ اندھیرا بڑھا۔ رات ہو گئی، مگر نہ جیلہ آئی اور نہ رحیم داد اس کے پاس گیا۔ دوسرے روز شام کا اندھیرا بڑھتے ہی اس نے جیلہ سے ملنے کا ارادہ کیا۔ نادر خاں ابھی تک واپس نہیں آیا تھا اور اس کا فوری طور پر لوٹنے کا امکان بھی نہ تھا۔ اسے خریداری کے لیے وقت درکار تھا۔ لاہور میں اس کا ہتھیجا موجود تھا۔ لہذا ٹھہرنے کا بھی مسئلہ نہ تھا۔

رحیم داد اس وقت جیلہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے اسکول کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے ساتھ وہ کمرے سے نکل کر دالان میں آیا۔ حویلی میں ابھی تک کسی قدر چل پل تھی۔ وہ اوپر کی منزل پر جانے والے زینے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو سیڑھیوں پر جنت مل گئی۔ وہ اوپر سے اتر کر نیچے آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔ ”کہاں چلی جنت؟“
 ”گھر جا رہی ہوں جی۔“ وہ سر کو دوپٹے سے ڈھکتے ہوئے بولی۔ ”چھوہریاں گھر میں اکیلی ڈرتی ہیں۔“

”نادر خاں، کب تک واپس آ رہا ہے؟“

”ٹھیک سے جی پتہ نہیں۔ آج تو آتا ہوا نہیں لگتا۔“

”پوری خریداری کر کے ہی لوٹے گا۔“ رحیم داد نے جنت کو نظر بھر کر دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں۔ اس نے جنت سے پوچھا۔ ”تورات کو جلدی تو نہیں سوتی؟“

”نہیں جی، میں تو دیر ہی سے سوتی ہوں۔“

”پر اس رات تو جلد ہی سو گئی تھی۔“ رحیم داد نے اسے چھیڑا۔ ”تو نے جو گرم گرم دودھ پلایا تھا۔ بہت مزا دیا تھا اس نے۔“

”تجھے پسند آیا؟“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ابھی چل کر پی لے۔ گرم ہو گا۔“

”ابھی تو میں زمیں دارنی کے پاس جا رہا ہوں۔ اس کے ساتھ کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔“

”دودھ بعد میں پی لوں گا۔ پہلے تو دروازے کی زنجیر چڑھا دے۔“ رحیم داداٹھا اور پلنگ پر جا کر بیٹھ گیا۔

جنت اپنے کولہوں کو ہولے ہولے خم دیتی دروازے کی جانب بڑھی۔ کڈی لگائی اور نظریں نیچی سے شرماتی، لجاتی رحیم دادا کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

رات اپنا سفر طے کرتی رہی۔ نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں پریشان ہو گئے۔ جنت نے جھٹ رحیم دادا کا ہاتھ پکڑا اور برابر والے کمرے میں لے گئی۔ اس نے انگلی پر چادر ڈال دی اور رحیم دادا کو اس کے پیچھے چھپا دیا۔

جنت نے رنگین چمڑی اتار کر سوتی کھیس اوڑھی جلدی جلدی لاچا اتار کر ایک طرف ڈالا۔ شلوار پٹی۔ باہر نادر کی آواز ابھری۔ ”جنت دروازہ کھول۔ میرے ساتھ زمیں دارنی بھی ہے۔“

رحیم دادا نے یہ سنا تو تخت سرا سید ہوا۔ اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ سما ہوا پر دے کی آڑ میں دبا ہوا کھڑا رہا۔ جنت لالٹین سنبھالے ہوئے باہر چلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ رحیم دادا اندھیرے میں لمبی لمبی سانس بھرنے لگا اور اپنی گھبراہٹ اور پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

جنت برابر والے کمرے میں پہنچی۔ آگے بڑھی، دروازہ کھولا۔ دیکھا، نادر سامنے کھڑا ہے۔ جیلہ اس کے ہم راہ تھی۔ دونوں کے عقب میں تاراں تھی۔ نادر نے جنت کو مخاطب کیا۔ ”جنت اتنی گہری نیند نہ سویا کر۔ جا زمیں دارنی کے لیے فٹ گرم دودھ لے کر آ۔“ اس نے مڑ کر جیلہ کی طرف دیکھا، مونہٹھا اٹھایا اور اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ ”زمیں دارنی اسی پر بیٹھ جا۔ اپنے پاس کرسی تو ہے نہیں۔“

جیلہ سنجیدگی سے بولی۔ ”میں نے بیٹھنا نہیں ہے۔ میں تو یہ دیکھنے آئی ہوں کہ ویاہ کے لیے تیرا گھر ٹھیک رہے گا ناں؟“ اس نے لمحہ کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”تاجاں اس میں مائیاں بیٹھ سکتی ہے۔“

”بالکل بیٹھ سکتی ہے جی۔“ جنت نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

جیلہ نے نادر سے کہا۔ ”نادر، لالٹین اٹھا، میں ساتھ والا کمرہ دیکھوں گی۔“

جنت نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”کیا کرے گی اسے دیکھ کر۔ زمیں دارنی! وہ کمرہ بھی اتنا ہی دڑا ہے۔“

”نہیں میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“ جیلہ نے اصرار کیا۔

بعد میں....“ رحیم دادا اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسی وقت کمرے کے دھندلے میں بیڑھیوں پر آہٹ ابھری۔ کوئی اوپر سے نیچے آ رہا تھا۔ آہٹ سنتے ہی جنت مہمان خانے میں کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھی اور دروازے سے گزر کر چلی گئی۔

رحیم دادا اوپر جانے کے بجائے آہستہ آہستہ چلتا ہوا واپس اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس نے جیلہ کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ رات کے تاریک اور سنسان ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

☆

حویلی پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ رحیم دادا باہر نکلا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند کیا۔ دالان میں آیا۔ چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سردی زیادہ تھی۔ نوکر چاکر اپنی اپنی کونٹھروں کے اندر جا چکے تھے۔ صحن میں کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی، نہ آواز۔

رحیم دادا مہمان خانے میں پہنچا۔ احمد حسب معمول غائب تھا۔ مہمان خانہ خالی تھا۔ رحیم دادا مہمان خانے سے گزر کر نادر خاں کے گھر پر پہنچا۔ اس نے دروازے پر ہولے سے دستک دینے کے لیے ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ رحیم دادا اندر داخل ہو گیا۔

اس نے دیکھا، سامنے پلنگ پر جنت لہرا چندری اوڑھی۔ آکھوں میں گہرا کاجل تھا۔ ہونٹوں پر سرخی کی دھڑی تھی۔ سر کے بال تیل سے چمک رہے تھے۔ پلنگ کے نیچے انگلیٹھی میں انگارے دبک رہے تھے۔ ان کی تیز روشنی میں جنت کے گورے چٹے چہرے پر تازگی اور نکھار نظر آ رہا تھا۔ اس کی جج دھج صاف چغلی کھا رہی تھی کہ وہ رحیم دادا ہی کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ پلنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت شلوار کے بجائے لاچا باندھے ہوئے تھی۔ لاچا نارنجی رنگ کا تھا۔ اس کا ریشم بھی نرم تھا۔ اور نچلا کنارہ سنہری کلاہو کا تھا۔

رحیم دادا نے مسکرا کر شوخی سے پوچھا۔ ”تو نے تو آج لاچا باندھ رکھا ہے؟“

”تو نے ہی تو مجھے لاچا باندھنے کو کہا تھا۔“ وہ آکھوں کو ترچھا کر کے بے یاسی سے مسکرائی۔ ”میں نے نادر سے کہا مجھے لاچا لا دے۔ میں لاچا باندھوں گی۔ وہ پچھلے دنوں لہو رنگا تو یہ لاچا لیتا آیا۔“

رحیم دادا کچھ نہ بولا۔ غور سے لاچا دیکھتے ہوئے مونہٹھے پر بیٹھ گیا۔

جنت اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اٹھلا کر بولی۔ ”کیسا لگ رہا ہے لاچا؟“

”لٹکارے مار رہی ہے۔ اسے پن کر تو ججج بہت سوہنی لگ رہی ہے۔“

”اب کہاں رہی سوہنی۔ تو نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔“ وہ آکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

”بھڑولی پر تیرے لیے گرم دودھ رکھا ہے۔ لے آؤں؟“

”دیکھنا ہی ہے تو دن میں آرام سے دیکھ لیتا۔“ جنت نے ایک بار پھر جمیلہ کو کمرے میں جانے سے روکنے کی کوشش کی۔ ”کل میں اسے صاف کر دوں گی۔“

مگر جمیلہ نہ مانی۔ اس نے نادر خاں سے کہا۔ ”نادر لائین اٹھا۔ اب آئی ہوں تو اس کمرے کو بھی دیکھ کر ہی جاؤں گی۔ کل مجھے اور بھی بہت کام کرنے ہیں۔“

نادر خاں نے لائین اٹھالی۔ جنت کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس پر خوف اور پریشانی کا غبار چھا گیا۔ مگر جمیلہ اس کی گھبراہٹ اور سراسیمگی سے بے نیاز، نادر خاں کے ساتھ برابر کے کمرے میں داخل ہوئی۔ جنت نہ گئی۔ جمیلہ نے لائین کی روشنی میں دیکھا، کمرے میں دو چار پائیوں پر نادر خاں کی تینوں بیٹیاں بے خبر سو رہی ہیں۔ ایک گوشے میں جنت کا نارنجی لاجپاہے ترتیبی سے بکھرا ہوا تھا۔ قریب ہی لہریاں پڑی تھیں۔

جمیلہ نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ رحیم داد دم بخود کھڑا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس نے سنا جمیلہ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے تو یہ کمرہ برابر کے کمرے سے کچھ وڈا ہی لگتا ہے۔“ وہ الگنی پر پڑی ہوئی چادر کے بالکل برابر پہنچ چکی تھی۔ اتنی قریب کہ رحیم داد اس کے خوبصورت جسم کی منک سونگھ سکتا تھا۔ مگر اس کا خوف سے برا حال تھا۔ اس نے سانس روک لی اور آنے والے خطرے کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے لگا۔

اسے خدشہ تھا کہ الگنی پر پڑا ہوا پردہ ایک طرف کھٹک جائے گا اور جمیلہ اس کے سامنے ہوگی۔ اس تصور ہی سے وہ کانپ اٹھا۔ اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ مگر پردہ بدستور ٹٹکتا رہا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔

جمیلہ کی آواز ابھری۔ ”نادر! مائیاں بیٹھنے کے لیے یہ کمرہ ٹھیک رہے گا۔ اس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا ہے نا؟“

”ہاں جی، بالکل کھلتا ہے۔“ نادر خاں نے الگنی پر لٹکی ہوئی چادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”زمین دارنی اسی کے پیچھے دروازہ ہے۔ پر اس میں تالا پڑا ہے۔ کنجی جنت کے پاس ہوگی۔ اسے دیکھنا چاہتی ہے تو جنت سے چابی لے لے۔“

”نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا۔“

رحیم داد کی پیشانی پر سخت سردی کے باوجود پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ اس کی نظریں سامنے لٹکتی ہوئی چادر پر ٹکی تھیں اور کان قدموں کی آہٹ پر لگے تھے۔ جمیلہ نہ آگے بڑھی اور نہ ہی اس نے چادر ہٹائی۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ نادر خان بھی لائین اٹھائے اس کے ہم

راہ چلا گیا۔

جمیلہ مونڈھے پر بیٹھی نہیں۔ پنگ کے نیچے رحیم داد کے جوتے پڑے تھے۔ جمیلہ کی ان پر نظر پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری، نادر خاں سے مخاطب ہوئی۔

”نادر! تو نے بھی چوہدری کی طرح کے بوٹ پہننے شروع کر دیے؟“

نادر خاں نے جوتوں کو دیکھا تو اس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ مگر اس نے جھٹ اپنی پیشانی پر قابو پالیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”وہ ایسا ہے زمیں دارنی، لمبر سے پچھلے دنوں میرا بھتیجا آیا تھا۔ یہ میرے لیے یہ بوٹ لیتا آیا تھا۔“

جنت دودھ سے بھرا ہوا گلاس لے کر صحن سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے گلاس جمیلہ کی لف بڑھایا۔ ”زمیں دارنی دودھ پی لے۔ گرم گرم ہے۔ کو سا ہے۔“

”میں رات کے سے دودھ نہیں پیتی۔“ جمیلہ نے صاف انکار کر دیا۔ لائین کی روشنی میں اس نے جنت کے چہرے کو جیکھی نظروں سے دیکھا۔ جنت کی نظریں جھک گئیں۔ ”جنت! لگتا ہے۔ تو بے سے پہلے رات کو سنگھار بھی کرتی ہے۔“

”نہیں بھین جی۔ ایسی کوئی گل نہیں۔“ جنت گھبرا کر بولی۔ ”سنگھار سنگھار کیسہ کرنا۔ بس ذرا ہاتھ دھو لیا تھا۔ میں تو تیرے ہی پاس آنے والی تھی۔“

جمیلہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نادر سے کہا۔ ”نادر، کل تو یہ گھر خالی کر کے مہمان آنے میں چلا جانا۔ یہاں کی ٹھیک طرح صفائی بھی کر دینا۔ ویاہ تو یہیں سے ہو گا نا۔“ وہ مڑی۔ لب میں چلوں گی۔ ”جمیلہ دروازے کی جانب بڑھی۔

دالیز کے پاس تاراں بیٹھی تھی۔ جمیلہ اس کے ہم راہ باہر نکلی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی لہ چلی گئی۔

دونوں کے جانے کے بعد نادر نے دروازہ بند کیا۔ جنت سے کہا۔ ”دودھ واپس لے جا۔“

”چپ چاپ صحن میں چلی گئی۔ نادر خاں نے لائین اٹھائی۔ برابر کے کمرے میں گیا۔ الگنی پر لٹکی ہوئی چادر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچا۔ اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر چادر ایک طرف کردی۔ لیکن کی زبرد زرد روشنی میں رحیم داد اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور باخوف اور دہشت کے سائے پھیلے تھے۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سامنے چپ چاپ کھڑے تھے۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے نظریں اٹھائیں۔ نادر اس کے روہو کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر

سہ پہر تک سارے انتظامات مکمل ہو گئے۔ تاجاں کو گھر کے پچھلے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ وہ مرغ سالو باندھے ہوئے تھی۔ سر پر ہلدی میں رنگا ہوا زرد دوپٹہ تھا۔ کرتا بھی زرد ہی تھا۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے تاجاں کی سسرال سے کچھ عورتیں اور نوجوان لڑکیاں آئیں۔ کمروں اور باہر والاں میں بیڑو میکس روشن تھے۔ ان کی تیز روشنی دور تک پھیلی تھی۔ ہر طرف چمک چمک پھلتی تھی۔ اور ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ مسرت و شادمانی تھی۔ بڑا خوشگوار ہنگامہ تھا۔ ہر چہرہ چمکتا تھا، دیکھتا تھا۔

سسرال سے آنے والی عورتیں اور لڑکیاں جب تاجاں کے پاس پہنچیں تو آوازوں اور قہقہوں کا شور اور بھی سوا ہو گیا۔ تاجاں کے چھوٹے ماموں نے، جو دو لہما کا چچا بھی تھا، قریب جا کر اپنا ہاتھ بڑھایا، شفقت سے تاجاں کے سر پر پھیرا۔ بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور سسرال سے کھینچ کر تیل چڑھانے کی چوکی پر لے گیا۔ وہ سر جھکا کر چوکی پر شرماتی لجاتی کسمی سمٹائی بیٹھ گئی۔

سات نوجوان عورتیں آگے بڑھیں اور تاجاں کے ارد گرد بیٹھ گئیں۔ ساتوں سہانگئیں تھیں۔ وہ تاجاں کے گندھے ہوئے بال آہستہ آہستہ کھولنے لگیں۔ لیکن بال کھولنے سے قبل ایک عورت نے تاجاں کی ہتھیلی پر ناریل اور گھی ملی ہوئی تھوڑی سی مندی رکھ دی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور دیوار کے پاس لے گئی۔ تاجاں نے اس کی ہدایت کے مطابق شرم سے جھجکتے ہوئے ہتھیلی کی مندی دیوار پر مل دی۔

وہ عورت پیچھے ہٹی تو دوسری سہانگن نے بڑھ کر تاجاں کی ہتھیلی پر پھر مندی رکھ دی اور تاجاں نے اس کے ہاتھ کی مدد سے اس دفعہ بھی مندی دیوار پر مل دی۔ ساتوں سہانگوں نے باری باری تاجاں کے ہاتھ سے دیوار پر مندی لگوائی۔ لیکن ہر بار جب تاجاں دیوار پر مندی لگاتی، تو ساتوں میں سے ایک سہانگن سرسوں کے تیل میں انگلی ڈبو کر اس کے سر میں لگاتی اور بالوں کی مینڈھی کھول دیتی۔

یہ تیل چڑھانے کی رسم تھی۔ اس رسم کے دوران میں تاجاں کی سہلیاں اور دوسری نوجوان لڑکیاں اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ تاجاں اب سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میراٹوں میں سے ایک نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے یہ گیت چھیڑا۔
میری میڈھی نہ کھولو، میری میڈھی نہ کھولو، سہلیو!
میرے بابل توں پچھو سہلیو، جس میرا داج بنایا!
میرے چاچے توں پچھو، جس میرا کاج رچایا!

ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کا بازو پکڑا۔ آہستہ سے کہا۔
”چوہدری باہر آجا۔ زمیں دارنی چلی گئی۔“

رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کو دیکھا اور خاموشی سے آگے بڑھا۔ نادر خاں کے ہم راہ ملتحمہ کمرے میں گیا۔ جنت ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آئی۔
”چوہدری تو نے اپنے جوتے بھی بیس چھوڑ دیئے تھے۔ زمیں دارنی نے انھیں دیکھ لیا۔ پوچھا بھی۔ پر میں نے جھٹ بات بنادی۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ پلنگ پر جا کر بیٹھا اور سر جھکا کر اپنے جوتے پہننے لگا۔
”چوہدری! میں نے تجھ سے کچھ ضروری گل کرنی ہے۔“

رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ اس کی چہرے پر کچھ دیر کے لیے جو سکون نمودار ہوا تھا، غائب ہو گیا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ جلدی جلدی جوتے پہنے اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر کہا۔
”ابھی گل کرنی ہے؟“

”توں چاہتا ہے تو سویرے کر لوں گا۔“ نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ ”پر گل ہے بہت ضروری۔“
رحیم داد اس قدر خفیف ہو رہا تھا کہ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف نہ دیکھا۔ آگے بڑھا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ مہمان خانے میں احمد موجود تھا مگر بے خبر سو رہا تھا۔ رحیم داد مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ گیارہ کا عمل تھا۔ سردی بھری ہوئی تھی۔ جسم تھر تھرا تھا۔ رحیم داد دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔



دوسرے روز رحیم داد دن چڑھے تک سوتا رہا۔ رات کو اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ شدید انتشار اور غلغلہ میں مبتلا رہا۔

نادر خاں حسب وعدہ رحیم داد کے پاس نہ آیا۔ اس نے نوکروں اور کیوں کی مدد سے اپنا مکان خالی کیا۔ گھر گریہتی کا سامان مہمان خانے کے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ جنت اور اس کی بہن بچیاں بھی مہمان خانے میں منتقل ہو گئیں۔ خالی مکان خوب اچھی طرح جھاڑ پونچھ کر صاف کیا۔ جیلہ نے خود جا کر اس کا معائنہ کیا۔ اپنی نگرانی میں سجا کر اسے شادی کا گھر بنایا۔ کمروں میں ”پچھی تھیں“ ان پر جازم اور چاندنی کا فرش تھا۔ کمروں کے باہر والاں میں بھی دریاں اور چٹا بچھائی گئی تھیں۔

میرے دیر توں پچھو جس مینو پوچھین دوایا!

گیت شروع ہوتے ہی دوسری میرا شیش بھی ڈھولک کی تھاپ پر گانے لگیں۔ تاجاں کے گرد حلقہ بنا کر کھڑی ہوئی لڑکیاں بھی ان کی آواز سے آواز ملا کر گانے لگیں۔ وہ گیت کے بول اٹھاتیں خوشی سے کھلکھلا کر قہقہے بلند کرتیں۔ آپس میں چھیڑ چھاؤ کرتیں، مگر تاجاں حیا سے کئی سانس چپ بیٹھی تھی۔ گیتوں کے بول سن رہی تھی جن میں اس کی آرزوؤں اور خواہشوں کا اظہار اس طرح کیا جا رہا تھا۔

پاری سیلو! میرے بال نہ کھولو، میرے بال پریشان نہ کرو

میرے بابل سے تو پوچھو سیلو جس نے میرا جینز بنایا!!

میرے چاچا سے تو پوچھو جس نے میرا بیاہ رچایا!!

میرے بھائی سے تو پوچھو سیلو جس نے مجھے دوپٹہ اوڑھایا

مگر نہ اس کا باپ تھا، نہ چچا تھا، نہ کوئی بھائی تھا۔ اس کی آنکھوں سے اپنی بے بسی پر پشیمانی آنسو گرنے لگے۔ اور جیلہ جس نے سارا جینز تیار کیا، شادی کا اہتمام کیا، لباس عروسی تیار کر لیا وہاں موجود نہ تھی۔ وہ ساگن نہ تھی، رائے بیوہ تھی اور کسی بیوہ کا سایہ مائیں بیٹھنے والی لڑکی پر پڑا نحوست اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے۔

جیلہ مہمان خانے میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ گیت کے فضا میں بکھرتے ہوئے بولوں کو سن رہی تھی۔ مہمان خانے کے صحن میں بھی گیس بتی جل رہی تھی۔ اس کی ہر سو بکھری ہوئی روشنی میں بڑے بڑے چولہوں پر دیگچے چڑھے تھے۔ کڑاہیاں رکھی تھیں۔ دیگچوں میں گھنگھنیاں ابل رہی تھیں۔ کڑاہیوں میں گلگلے تلے جا رہے تھے۔ گلگلے تلے جانے کے بعد ٹوکروں میں ڈالے جا رہے تھے۔ قریب ہی پیتل کے بڑے بڑے تھالوں میں سوئی کی چوری اور ملیہ تیار کیا جا رہا تھا۔ جیلہ پکوان اپنی مگرانی میں تیار کر رہی تھی۔

مائیں کی رسم پر جیلہ نے کوئلہ ہر کشن کی تمام عورتوں اور لڑکیوں کو مدعو کیا تھا۔ ہر عورت تاجاں کے پاس جانے سے قبل مہمان خانے میں پہنچتی۔ اس کے ہاتھوں میں گندم سے بھری ہوئی تھالی ہوتی۔ وہ جیلہ کے سامنے جاتی۔ اونچی آواز سے کہتی۔ ”سلام بھین جی۔“ اور تھالی میں بھرنے ہوئی گندم والا دان میں رکھے ہوئے مٹی کے بڑے بڑے کوئلوں میں اندھیل دیتی۔ بھرہو دیگچوں کے پاس جاتی۔ ڈونگے کا دستہ پکڑ کر اندر سے گھنگھنیاں نکالتی، ٹوکروں سے گلگلے اٹھاتی، پیتل کے تھالوں سے چوری اور ملیہ لیتی اور اپنی تھالی میں رکھتی جاتی، پھر ہنستی مسکراتی اس طرف چلی جاتی جہاں

تیل چڑھانے کی رسم ادا کی جا رہی تھی۔

تیل چڑھانے کی رسم ختم ہوئی تو تاجاں کے ماموں نے ایک بار پھر اس کا بازو تھاما۔ اسے اٹھایا اور سہارا دے کر اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ اس نے تاجاں کو پردے کے پیچھے بیٹھا دیا۔ تاجاں اب باقاعدہ مائیوں بیٹھ چکی تھی۔ پھاتاں بھاگی بھاگی جیلہ کے پاس آئی، گڑگڑا کر بولی۔ ”بھین جی، تیری تاجاں مائیاں بیٹھ گئی ہے۔ اب تو بھی چل۔“

وہ تیل چڑھانے کی رسم کے موقع پر بھی جیلہ کے پاس آئی تھی اور اس میں شرکت کرنے پر اصرار بھی کیا تھا۔ مگر جیلہ نے انکار کر دیا تھا۔ اس دفعہ بھی اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”پھاتاں، تو جا، میں تھوڑی دیر بعد آجاؤں گی۔ مجھے ادھر کئی ضروری کام نمٹانے ہیں۔ دیکھ رہی ہے ادھر کتنا کام ہو رہا ہے۔“

”وہ تو تیرے بھائی بھی ہوتا رہے گا۔“ پھاتاں نے مانی، اپنی بات پر اڑ گئی۔ اس نے اپنا دوپٹہ اتار کر جیلہ کے قدموں پر ڈال دیا۔ ”بھین جی، میری لاج رکھ لے۔ تو نہ گئی تو میں بھی اب تاجاں کے پاس نہیں جاؤں گی۔“

رحیم داد، جو شام ہی سے مہمان خانے میں پہنچ کر جیلہ کے قریب ہی بیٹھا تھا اور بہت دیر سے خاموش تھا، پھاتاں کے گڑگڑانے سے بہت متاثر ہوا۔ اس نے جیلہ کی جانب دیکھا اور نرم لہجے میں مخاطب کیا۔ ”زمیں دارنی، اب تو چلی جا۔“ اس کے لہجے میں بھی عاجزی تھی۔

جیلہ نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا لباس اس وقت بھی حسب معمول سفید ہی تھا۔ البتہ وہ دوشالہ سبز رنگ کا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے کنارے سنہری تھے۔ آنکھوں میں دنبالہ کابل تھا۔ چہرے پر سردی سے گلاب کھل رہے تھے۔ کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ ہڈیوں کی تیز روشنی میں وہ جگمگا رہی تھی، دل کش اور دل آرا نظر آرہی تھی۔

جیلہ راج ہنس کی مانند اپنی صراحی وار گردن اونچی اٹھائے گم صم بیٹھی سوچتی رہی۔ پھاتاں اس کے روبرو مجسم التجائی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب کے سائے منڈلا رہے تھے۔ رحیم داد نے ایک بار پھر نرم لہجے میں جیلہ سے درخواست کی۔ ”زمیں دارنی، اب چلی بھی جا۔ تاجاں تو پھاتاں سے زیادہ تیری دھی ہے۔ تو اس کے مائیاں بیٹھنے پر نہیں جائے گی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ذرا سوچ تو یہ کیسا لگے گا؟“

جیلہ نے اس دفعہ بھی کچھ نہ کہا۔ جھک کر پیروں پر پڑا ہوا دوپٹہ اٹھایا۔ پھاتاں کے سر پر ڈالا اور

آوازیں ابھر رہی تھیں۔ اس وقت تاجاں کے بدن پر بٹنا ملا جا رہا تھا۔ گیت کے بولوں سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ لڑکیاں بٹنا مل رہی تھیں اور تائیوں کی تھاپ پر لہک لہک کر گاہی تھیں۔ تاجاں سے یوں چھینچھاڑ کر رہی تھیں۔

تم نون مائیں پاؤں آئیاں بی بی
کچھ بھیناں تے کچھ تائیاں بی بی
کچھ چاچیاں تے کچھ تائیاں بی بی
تے کچھ چاچے تائے دیاں جائیاں بی بی

رحیم داد ذرا دیر خاموشی سے گیت سن رہا تھا پھر آگیا تائیوں کی حویلی میں واپس چلا گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اوپر کی منزل پر جائے اور باتوں باتوں میں جیلہ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وکیل اس کے پاس کیوں آیا تھا، کس مقصد سے آیا تھا؟

وہ کمرے سے نکل کر زینے پر پہنچا تو بیڑھیوں پر حویلی کی ملازمہ ناجو نظر آئی۔ وہ اوپر ہی سے آ رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”گل سن ناجو۔ یہ بتا، زمیں دارنی اوپر ہی ہے ناں؟“
”نہیں جی، وہ تو شام ہی سے تاجاں کے پاس ہے۔“
”کب تک واپس آئے گی؟“

”دیر ہی سے آئے گی جی۔“ ناجو نے رحیم داد کو بتایا۔ ”روزی وہاں سے دیر کو لوٹتی ہے۔“
رحیم داد نے ناجو سے مزید بات چیت غیر ضروری سمجھی۔ واپس اپنے کمرے میں چلا گیا اور بستر پر لیٹ کر سو گیا۔ نہ جانے کتنی رات گزری تھی۔ اس کی آنکھ آہٹ سے کھل گئی۔ اس نے سنا دروازے پر آہستہ آہستہ دستک ہو رہی ہے۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ پلنگ سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا، دروازہ کھولا۔ دیکھا، سامنے جنت کھڑی ہے۔ وہ سردی سے تھر تھرا رہی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی جھٹ اندر داخل ہو گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سارے نوکر چاکر تھک کر بستروں میں دیکے گہری نیند سو رہے تھے۔

رحیم داد نے دروازہ بند کرتے ہوئے جنت سے پوچھا۔ ”تو اتنی رات گزرے کیسے آگئی؟ ناور کہاں ہے؟“

”وہ تو جی لمور گیا ہے۔“ جنت نے جواب دیا۔ ”زمیں دارنی نے اسے شام ہی کو بھیجا ہے۔ اب تو وہ کل ہی واپس آئے گا۔“

جنت رحیم داد کے بستر پر بیٹھ گئی۔ اس کا بدن سردی سے ہنوز کپکپا رہا تھا۔ اس نے لحاف اٹھا کر

اٹھ کر کھڑی ہو گئی، آگے بڑھی۔ پھاتاں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد دونوں کو جاتے ہوئے بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہا۔ جب وہ مہمان خانے کا دروازہ کھول کر باہر چلی گئیں تو رحیم داد نے گہری سانس بھری اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا آگے بڑھا۔ اس کمرے کے سامنے سے گزرا جس میں ناور خاں بیوی بچوں کے ساتھ عارضی طور پر مقیم تھا۔ جنت اس وقت کمرے میں موجود نہ تھی۔ وہ اپنی تینوں بچیوں کے ہم راہ مائیوں کی تقریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ ناور خاں بھی کمرے میں نہیں تھا۔ رحیم داد نے کمرے کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر ایک اچھٹی ہوئی نظر ڈالی اور آگے نکل گیا۔ وہ پھر واپس مہمان خانے میں آیا۔



تاجاں کو مائیوں بیٹھے ہوئے چار روز گزر چکے تھے اور ابھی اسے مزید سات روز مائیوں بیٹھنا تھا۔ اس عرصے میں رحیم داد کو ناور خاں کم ہی نظر آیا۔ وہ ان دنوں جیلہ کی اردلی میں تھا اور تاجاں کی شادی کی تیاری میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مگر رحیم داد کو تاجاں کے بیاہ کی سرگرمیوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہر وقت آگیا ہوا سا رہتا۔ خود کو تنہا محسوس کرتا، بے چین اور مضطرب رہتا۔

انہی دنوں ایک سہ پہر کو رحیم داد نے وکیل عثمان رندھاوا کو ایک بار پھر حویلی میں دیکھا۔ وہ سیدھا جیلہ کے پاس اوپر چلا گیا۔ جب وہ جیلہ سے طویل بات چیت کے بعد نیچے آیا تو کمرے کا دھندلا پھیلنے لگا تھا۔ شام مشرقی افق سے زینہ زینہ نیچے اتر رہی تھی۔ وکیل اپنے کسی زمیں دار موکل کی کار میں آیا تھا۔ وہ اس میں بیٹھ کر واپس چلا گیا۔

وکیل کی اچانک آمد رحیم داد کو بہت پر اسرار معلوم ہوئی۔ وہ ایک بار پھر تشویش اور بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں دے دے دے دے وسوسوں اور شبہات نے از سر نو سرا بھارا۔ وہ پریشانی اور اضطراب کے عالم میں تنہا بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔

ملازم کھانا لایا تو رحیم داد ذہنی انتشار کے باعث رغبت سے نہ کھا سکا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وہ مہمان خانے میں چلا گیا۔ مگر نہ وہاں ناور خاں تھا نہ جنت تھی۔ ناور خاں کے کمرے کا دروازہ اس وقت بھی کھلا تھا۔ چار پائیاں خالی تھیں۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ جیلہ بھی اسے مہمان خانے میں کہیں نظر نہ آئی۔ صرف نوکر چاکر ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت مصروف اور سرگرم معلوم ہو رہے تھے۔

تاجاں جہاں مائیوں بیٹھی تھی، وہاں ڈھولک ٹھنک رہی تھی۔ لڑکیوں کے گاؤں، لڑکیوں کے

پہروں پر ڈال لیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”اس رات جب میں تیرے پاس گیا تھا، نادر خاں نہیں ہوا؟ کیا کہتا تھا وہ؟“

”اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ تیرے بارے میں کوئی گل بات ہی نہیں ہوئی۔“

”بعد میں بھی کوئی گل بات نہیں ہوئی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”بس اتنا کہتا تھا، تاجاں کے ویاہ کے بعد اپنے پیو کے پاس رحمت والی چلی جا۔“ جنت نے بتایا۔

”چوہدری! اس نے تجھ سے تو کچھ نہیں پوچھا؟“

”اس رات کے بعد وہ میرے پاس آیا ہی نہیں۔“ رحیم داد نے جنت کو مطلع کیا۔ ”ہاں، مجھ سے یہ کہتا تھا کچھ ضروری گل کرنی ہے۔ پتہ نہیں کیا کہنا چاہتا تھا؟“

جنت اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”میں تو تیرے پاس پہلے ہی آتی پر زمیں دارنی نے مجھے تاجاں کے ساتھ لگا دیا ہے۔ رات کو میں اسی کے پاس ہوتی ہوں۔“

”آج کیسے ادھر نکل آئی؟“

”وہ ایسا ہواجی، نادر لمبور گیا ہے۔ چھوہروں کے پاس کوئی نہیں۔ اکیلے میں ڈرتی ہیں۔ زمیں دارنی نے آج رات پھاتاں کو تاجاں کے پاس لگا دیا ہے۔ میں مہمان خانے کے کمرے میں رہی۔ رات گزری تو تیرے پاس آگئی۔“

”زمیں دارنی نے تو تجھ سے اس رات کے بارے میں پوچھنا چاہے؟“

”وہ ایسا کیوں کرتی؟ اس نے کیسہ پتہ؟“ جنت نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”نادر خاں نے اسی رات مجھے بتایا تھا کہ زمیں دارنی کو میرے جوتے منجی کے نیچے پڑے دیکھ کر شبہ ہو گیا تھا۔“

”مجھ سے تو اس نے کچھ پوچھا نہیں۔“ جنت نے بے نیازی سے کہا۔ ”پر تو اتنا گھبرا گیا تھا کہ جوتے پہن نے بھی بھول گیا۔ حد کردی تو نے۔“

”لگتا ہے نادر مجھ سے کچھ ناراض ہے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”جب ہی تو میرے پاس اب تک نہیں آیا۔“

”مجھے تو ایسا لگتا نہیں۔“ جنت نے اطمینان سے کہا۔ ”ویسے آج کل تاجاں کے ویاہ کی تیاری میں نادر بری طرح الجھا ہوا ہے۔ زمیں دارنی نے ویاہ کا سارا ہی بوجھ اس پر ڈال رکھا ہے۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ جنت بھی خاموش رہی۔

علی الصباح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو جنت اٹھ کر جا رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا مگر خاموش

رہا۔ جنت کمرے سے باہر نکل تو ہوا کا سرد جھونکا اندر آیا۔ باہر ہلکی ہلکی دودھیا دھند کی چادر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جنت نے دلمیز عبور کرنے کے بعد آہستہ سے دروازہ کھینچ دیا۔ ابھی بہت ترکا تھا۔ ہر سو گہری خاموشی طاری تھی۔ سردی بھی شدید تھی۔ رحیم داد لحاف میں دھکا ہوا بستر پر لیٹا رہا۔



پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد کھانا کھا رہا تھا کہ نادر خاں اچانک کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد اسے دیکھ کر قدرے پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر کی جانب دیکھے بغیر نرم لہجے میں دریافت کیا۔

”نادر، تو اتنے روز کہاں رہا؟ میرے پاس آیا ہی نہیں۔“

”زمیں دارنی نے ویاہ کے کاموں میں ایسا الجھا دیا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔“ نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ ”لمبور گیا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے واپس آیا ہوں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ نادر خاں بھی خاموش رہا۔

کمرے میں سکوت چھایا تھا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”چوہدری، تجھ سے بہت ضروری گل کرنی تھی۔“

”اس رات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہے؟“ رحیم داد نے اس کی جانب دیکھے بغیر ہچکچانے ہوئے پوچھا۔

”اے چوہدری، یہ اور ہی گل ہے اور بہت پریشانی کی گل ہے۔“ نادر خاں نے اپنی بات کی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔

رحیم داد نے اس دفعہ مڑ کر اس کی طرف حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ مگر چپ رہا۔

”میں تجھ سے اس بارے میں بہت پہلے بات کرنا چاہتا تھا۔“ نادر خاں نے کہا۔ ”پر موقع ہی نہ ملا۔“

”ایسی کیا پریشانی کی گل بات ہے؟“ رحیم داد کے لہجے سے تشویش آشکارہ تھی۔

”تو نے گاؤں تک نہ گئے۔“ نادر خاں نے کھل کر بات نہ کی۔

”تو فیرتا نا۔ اس طرح چبا چبا کر کیوں بات کر رہا ہے؟“ رحیم داد نے بے چہین ہو کر کہا۔

”شبہ تو جی مجھے پہلے ہی تھا پر اب تو تھدیک بھی ہو گئی۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”اس لیے میں نے تجھ سے اب تک اس معاملے میں بات نہیں کی۔ سوچا پہلے تھدیک کر لوں تب تجھے آگاہ کروں کہ کیا ہو رہا ہے۔“

”کیا ہو رہا ہے؟“ رحیم داد کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔ اس نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ ”صاف صاف

نے وکیل سے بیچ نامہ تیار کرایا ہے۔ ”وہ زیر لب مسکرایا۔ ”منشی سمجھا میں بیچ نامے کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔ اس نے یہ تو بتا دیا کہ بیچ نامہ تیار ہو گیا ہے پر اس کے بارے میں اور کچھ نہ بتایا۔ میں نے بہت کوشش کی پر وہ کچھ بتانے پر آمادہ نہ ہوا۔“

”ایسی بات تھی تو مجھے فوراً بتانا چاہیے تھا۔“

”میں نے سوچا جی، پہلے تصدیق ہو جائے تب ہی اس معاملے میں تجھ سے بات کروں۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”مان لے، میرا شبہ غلط ہوتا اور تو اس بارے میں زمیں دارنی سے بات کر لیتا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ میں بیچ میں مارا جاتا۔ زمیں دارنی مجھ سے ناراض ہو جاتی۔ وڈے لوکان کے جھگڑے میں ہمیشہ چھوٹا ہی مارا جاتا ہے۔ برانہ منانا چودھری، میں اسی وجہ سے تجھ سے بات کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا، تجھ سے بات کروں تو پکی ہو۔ اس میں کوئی اگر مگر نہ ہو۔“

”تو نے تصدیق کیسے کی؟“

”اس بار جب میں لہور گیا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ ”اتفاق سے اس بار بھی وکیل اپنے دفتر میں موجود نہ تھا۔ میں سیدہ منشی کے پاس پہنچا۔ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ گھما پھرا کر بیچ نامے کے بارے میں پوچھا۔ پر وہ کھلا نہیں۔ شاید وکیل نے منع کر دیا ہوگا۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”جب میں نے جی سدھی سدھی ترکیب نمبر ۱۳ استعمال کی۔ دس دس کے دونوٹ اس کے ہاتھ پر رکھے۔ فیر تو جی اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ بیچ نامہ بھی دکھا دیا۔“

رحیم داد نے پریشان ہو کر بولا۔ ”اب تو کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔“

”ہاں جی، اب تو سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ ۲۰ روپے میں نے زمیں دارنی کی رقم میں سے دیئے ہیں۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کے ٹین کے ٹرنک کی جانب دیکھا۔ ”چودھری! تو وڈا زمیں دار ہے۔ تیں نوں یہ ٹرنک لے کر سفر نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تجھے زیب نہیں دیتا۔ میں تیرے لیے چمڑے کا ایک سوٹ کیس بھی خرید کر لایا ہوں۔ بہت عمدہ ہے۔ ۵۰ روپے میں ملا ہے۔ اب سفر پر اسے ہی لے جانا۔ ٹین کا ٹرنک تیری شان کے خلاف لگتا ہے۔“

رحیم داد خاموشی سے اٹھا۔ ٹرنک کا تالا کھولا۔ سو روپے نکالے۔ اٹھ کر نادر خاں کے پاس گیا اور روپے اس کے ہاتھ پر رکھ کر بولا۔ ”لے، یہ روپے رکھ لے۔“

”سوٹ کیس میرے پاس ہے۔ بعد میں تجھے پہنچا دوں گا۔“

”جب جی چاہے پہنچا دینا۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ ”تو مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ وکیل کے

گل کر۔ تو کتنا کیا چاہتا ہے؟“

”لگتا ہے تجھے کچھ پتہ نہیں۔“ نادر خاں نے گردن آگے بڑھا کر رازداری کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ ”تیں نوں پتہ نہیں۔ زمیں دارنی اپنی ساری اراضی بیچ رہی ہے۔“

رحیم داد ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے گھبرا کر کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ہموک اڑ گئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولا۔ ”پر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ نادر! تجھے کس نے بتایا کہ زمیں دارنی اپنی اراضی بیچ رہی ہے؟“

”یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا۔“ نادر خاں گویا ہوا۔ ”پر تیری باتوں سے لگتا ہے تجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ زمیں دارنی نے وکیل عثمان رندھاوا کی معرفت لہور میں کرائے پر مکان بھی لے لیا ہے۔“

”مجھے شبہ تو ہوا تھا اور میں نے اپنے شے کا جیلہ سے اظہار بھی کیا تھا۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ رحیم داد نے قدرے توقف کیا۔ ”لیکن وکیل کا روز روز آتا یہ ظاہر کرتا ہے، تیری بات میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔“

”چودھری! یہ فکر تو بہت دن سے چل رہا ہے۔“

”وکیل، کل بھی جیلہ کے پاس آیا تھا اور شام تک اوپر بیٹھا جیلہ سے باتیں کرتا رہا۔“ رحیم داد نے شکوہ کیا۔ ”میرے دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے پر مجھ سے ایک بار بھی اس نے ملنے اور بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس طرح گزر جاتا ہے جیسے مجھ سے کبھی ملانہ ہو، کوئی جان پہچان نہ ہو۔“ اس نے لمحہ بھر کے لیے تامل کیا پھر گویا ہوا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے دینے نے بھی جیلہ سے کچھ الٹی سیدھی گل بات کی ہے۔“

”دیکھا کیا الٹی سیدھی بات کر سکتا ہے؟“ نادر خاں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

وہ نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ بدل دیا۔ ”یہ بتا، تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟“

”مجھے تو جی اس طرح پتہ چلا کہ پچھلی بار جب میں لہور گیا تھا تو وکیل کے دفتر بھی گیا۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہوگا اس نے اب لہور میں پریکٹس شروع کر دی ہے۔“

”میں نوں اس کا پتہ ہے۔ جیلہ ہی نے بتایا تھا۔“

”وہ ایسا ہوا جی، میں نے وکیل کا بورڈ دیکھا تو اس کے دفتر میں چلا گیا۔ کام تو اس سے کچھ تھا نہیں۔ سوچا سلام دعا کر لوں۔ اس سے میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ زمیں داری میں تو وکیل کی کبھی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“ نادر خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ ”وکیل تو دفتر میں موجود نہ تھا پر اس کا منشی مل گیا۔ اس نے مجھے چائے بھی پلائی۔ باتوں باتوں میں اس سے پتہ چلا کہ زمیں دارنی

منشی سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟ تو نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔“

”پریشانی کی توجہ بات ہی ہے۔“ نادر نے نوٹ کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”منشی نے مجھے بتایا کہ کوئلہ ہر کشن میں زمیں دارنی کی جو اراضی ہے، اس کا سودا پکا ہو چکا ہے۔ وکیل نے بیع نامہ اور دوسری ضروری دستاویزات بھی تیار کر لی ہیں۔ اس نے مجھے سارے ہی کاغذات دکھا دیے۔“

”یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔“ رحیم داد نے کرسی کھسکا کر نادر کے قریب کر لی۔ ”یہ بتا، اب کیا کیا جائے۔ اپنا تو مغز بالکل کام نہیں کرتا۔ سمجھ نہیں آتی کیا کروں۔“

”فکر نہ کر چوہدری، ابھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔“ نادر خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”تیرا حکم ہونا چاہیے، سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ میں تیرا بندہ ہوں۔ سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

”مجھے، تجھ سے ایسی ہی امید ہے۔“ رحیم داد دھتکا ”جذباتی ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نادر خاں کا ہاتھ پکڑ کر گرم جوشی سے دبا یا۔ ”تیرا دل بہت دڑا ہے۔ نادر! میں نے سوچا بھی نہ تھا تو میرا اتنا وفادار ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”سچ کہتا ہوں، میں نے تجھے اب تک اتنا چنگا اور وفادار بندہ نہیں سمجھا تھا۔“

”چوہدری! جب تو نے مجھے اپنا وفادار بندہ کہا ہے تو اب میرا بھی فرض ہے کہ تجھے یہ بتا دوں کہ زمیں دارنی سے نکاح کرنے کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ کبھی تیری نہیں بن سکتی۔“ نادر خاں نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”وہ لہور جاتی ہے تو جانے دے۔ پر اس کی اراضی نہیں جانی چاہئے۔“

”جب تک جیلہ سے نکاح نہ ہو اور دونوں بچے میرے پاس نہ ہوں تب تک اراضی کیسے مل سکتی ہے۔“ رحیم داد نے اپنی سمجھ کے مطابق مسئلہ کا قانونی پہلو پیش کیا۔ ”تو ٹھیک کہتا ہے۔ اراضی کسی طرح نہیں جانی چاہیے۔ نکاح کے بعد وہ میرے کہنے میں آجائے گی۔ شاہ جی کا بھی یہی خیال ہے۔“

”شاہ جی بھی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ہونا تو یہی چاہئے۔“

”میں تو کہتا ہوں نادر، ساری گل بات شاہ جی کو فوراً بتا دینی چاہئے۔“ رحیم داد نے نادر کا عندیہ معلوم کرنے کی غرض سے کہا۔ ”تو کیا کہتا ہے؟ میرا تو خیال ہے وہ بالکل ٹھیک مشورہ دے سکتا ہے۔ ایسے معاملات کو وہ ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔ وہ بہت ہوشیار اور تجربہ کار بندہ ہے۔“

”تب تو شاہ جی سے جلد ہی ملنے اور بات کرنے کی ضرورت ہے۔“ نادر خاں نے اس کی رائے

سے اتفاق کیا۔ ”اب تو فوری کارروائی کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔“

”نادر! ایسا کر۔ تو کل سویرے شاہ جی کے پاس چلا جا۔“

”چوہدری، مجھے اس وکت شاہ جی کے پاس نہ بھیج۔ زمیں دارنی کو فوراً میرے بارے میں۔ شبہ ہو جائے گا۔ ابھی تک اسے پتہ نہیں کہ میرا شاہ جی سے میل ملاپ ہے۔ تجھے تو خود ہی شاہ جی کے پاس جانا ہو گا۔“

”جیلہ کو شبہ تو میرے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”میں اسے کہہ دوں گا، چوہدری کا ویاہ کے شور شرابے سے دل گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے کسی یار دوست سے ملنے ملتان گیا ہے۔“ نادر خاں نے مشورہ دیا۔ ”ویسے اسے شبہ ہو بھی جائے تو کیا ہو گا۔ وہ تو اپنی کارروائی سمجھو پوری کر ہی چکی ہے۔ اب تو تمیں نوں کچھ نہ کچھ کرنا ہو گا اور بھتیجی ٹال کرنا ہو گا۔ میں تو کہتا ہوں تو کل ہی صبح شاہ جی کے پاس چلا جا۔“

نادر خاں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”کہاں چلا نادر؟“

”چوہدری، مجھے اب جانے دے۔ زمیں دارنی میرا انتظار کرتی ہو گی۔“

نادر خان چلا گیا۔ رحیم داد سخت ذہنی خلشار میں مبتلا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں آہستہ آہستہ کمرے میں ٹھلنے لگا۔ اس رات بھی وہ دیر تک جاگتا رہا۔



جنوری کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ مگر سردی میں کمی نہ آئی تھی بلکہ کچھ بڑھ ہی گئی تھی۔ دن چڑھ چکا تھا۔ سرما کی ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ رحیم داد ناشتا کرنے کے بعد صحن میں آگیا تھا اور کرسی پر دھوپ میں بیٹھا تھا۔ وہ پریشانی میں مبتلا تھا۔ اسے رہ کر نادر کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ احسان علی شاہ کے پاس جانے اور اس سے ملنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

رحیم داد کو صحن میں پہنچنے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ جیلہ زینے سے اتری۔ اس نے رحیم داد کو دھوپ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ تاجاں کے پاس جانے کے لیے نکلی تھی۔ مگر کچھ سوچ کر اس نے تاجاں کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مڑی اور رحیم داد کی جانب بڑھی۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔ نوکر نے فوراً اس کے لیے کرسی لا کر رکھ دی۔ جیلہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”چوہدری، تو کچھ پریشان پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ جیلہ کے رویے میں پہلی سی ہم دردی اور لگاؤ تھا۔ رحیم داد نے اسے محسوس کیا، نرم لہجے میں گویا ہوا۔ ”زمین دارنی طبیعت ویسے ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ پر خالی بیٹھے بیٹھے

دل گھبراتا ہے۔ کوئی کام کاج تو کرنے کو ہے نہیں۔“

”وڈا زمین دار بننے میں یہی تو ٹھنڈائی ہے۔“ وہ مسکرا کر بولی۔ ”تو نے اوپر سے منبر بھی لگا رکھا ہے۔ تیرے لیے اب کرنے کو رہ گیا ہے۔ اسی کارن تو جاگیر دار اور وڈے زمین دار رسہ گیری کا دھندا کرتے ہیں۔ مزاروں کی جوان گھروالیوں اور کڑیوں کو اٹھوا لیتے ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے کھلکھلا کر ہنسی۔ ”پنڈ میں من نہیں لگتا تو لہور یا کسی دوسرے شہر میں کوٹھیاں اور بنگلے بنواتے ہیں۔ منبر اور منشی زمین داری چلاتے ہیں اور وہ عیش کرتے ہیں۔ شراب اور دارو پیٹے ہیں۔ نت نئے دیاہے رچاتے ہیں۔ ڈرامنگ روموں میں بیٹھ کر سیاست لڑاتے ہیں۔ من بھلانے کے لیے کوئی تو شغل ہونا چاہئے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”اور سیاست کے مشغلے میں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ جاگیر اور زمین داری کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عیش کرنے کے لیے آمدنی بھی بڑھتی جاتی ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تو بھی تو لہور جانا چاہتی ہے۔“

”میں نے کون سی سیاست لڑانی ہے۔“ جمیلہ نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”میں تو گڈو اور زینا کی پڑھائی کے لیے لہور جانا چاہتی تھی۔ سوچا تھا وہاں کسی اسکول میں نوکری کر لوں گی۔ میری آشنا ایم۔ اے کرنے کی ہے۔“

”زمین دارنی اتنا تو نے پڑھ لیا، اب اور پڑھ کر کیا کرے گی؟“ رحیم داد نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تو اپنے اسکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چلی گئی تو کیا بنے گا؟“

”یہی سوچ کر تو میں نے لہور جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔“ تجھے تو پہلے ہی بتا چکی ہوں۔“ جمیلہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”اسکول کا معاملہ ٹھیک ہو جائے تو میں ڈپنری بنانے کا کام شروع کر دوں گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں ڈپنری کیوں بنانا چاہتی ہوں۔“

”وہی ڈاکٹر ویدر والی گل ہے نا؟“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ ”لگتا ہے تو ابھی تک اسے بھولی نہیں۔“

”بہت سی یادیں ایسی ہوتی ہیں جو کبھی بھولنے والی نہیں ہوتیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ ”اس کی تو بات ہی اور ہے۔ میں تو اللہ وسایا کو بھی نہیں بھول سکی۔ جب تک اس کے دونوں بچے موجود ہیں، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟“

”کیا کیا جائے زمین دارنی رب کی یہی مرضی تھی۔“ رحیم داد نے اظہارِ ہم دردی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے نصیب میں یہی لکھا تھا۔“

”اللہ وسایا نے تو کسی کی ہتیا نہیں کی تھی پر اسے کتل کر دیا گیا۔“ جمیلہ نے رقت انگیز لہجے میں

کہا۔ ”جیرا نے اپنی گھروالی لاڈو کے ساتھ اس کے یار سلیم کا بھی خون کر دیا۔ اب پولیس ریماڈر پر حالات میں پڑا ہے۔ فٹس کرتا ہے، بچھتا ہے۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا جیرا بچھتا ہے۔“ رحیم داد نے استفسار کیا۔ ”وہ تو خود ہی تھانے گیا تھا۔ تو نے روکا تو تیری بات بھی نہ سنی۔“

”اس سے تو اس کے سر پر خون سوار تھا۔ وہ اپنے ہوش ہی میں کب تھا۔“ جمیلہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”پچھلے دنوں اس کا پیو دین محمد آیا تھا۔ روتا تھا، جیرا کا حال بتاتا تھا۔ جوان پتر ہے۔ اسے تو دکھی ہونا ہی چاہئے۔ اس کی تو جیون بھری کمائی ہے۔“ اس نے اپنی شمال اتار کر زانو پر رکھی۔ اس کا گلابی چہرہ دھوپ کی تمازت سے متمل رہا تھا۔ پیشانی پر پینے کے ننھے ننھے قطرے جھلما رہے تھے۔

”دین محمد اب کیا چاہتا ہے؟“

”جیرا کی ضمانت کرانا چاہتا ہے۔ وکیل کھڑا کر کے کیس لڑانا چاہتا ہے۔ اسی کارن میرے پاس آیا تھا۔ اسی کے لیے میں نے اپنے وکیل عثمان اندھاوا کو بلایا تھا۔“

رحیم داد اس کی بات سن کر مختصے میں پڑ گیا۔ جمیلہ کی باتوں سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا لہور جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ اس نے وکیل کو بھی کسی بیج نامے کی تیاری کے لیے نہیں بلکہ جیرا کے مقدمے کی پیروی کی خاطر بلایا تھا۔ مگر نادر خاں کا بیان قطعی مختلف تھا۔ اس نے وکیل کے منشی سے جو کچھ سنا تھا اور جو دستاویزات اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں وہ ساری ہی تفصیلات نہ صرف بے حد پریشان کن تھیں بلکہ اس سلسلے میں جلد سے جلد قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ جمیلہ اور نادر خان میں سے کون سچا تھا اور کون جھوٹا، کس کا بیان درست تھا اور کس کا غلط؟ رحیم داد کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ اس معاملے میں احسان شاہ ہی اس کی رہنمائی کر سکتا تھا۔ وہ پرانا گھاگ اور جہاں دیدہ تھا۔ وہ رحیم داد کی رہنمائی اور مدد کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔

رحیم داد کو گم سم دیکھ کر جمیلہ نے پوچھا۔ ”چوہدری! اس سوچ میں پڑ گیا؟“

”سوچ رہا تھا کچھ دنوں کے لیے ملتان چلا جاؤں۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”ادھر میرا ایک پرانا ملنے والا ہے۔ اس کے ساتھ اچھا وکٹ گزر جاتا ہے۔“

”تجھ پر کسی نئی الاٹمنٹ کی دھن تو سوار نہیں ہو گئی؟“ وہ ہنس کر بولی۔

”نہیں، زمین دارنی ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ اس نے جمیلہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”میاں دل گھبراتا ہے۔ اس کے پاس گیا تو شکار کھیلوں گا۔ تیس نوں تو پتہ نہیں، پہلے میں شکار کا بہت رسیا تھا۔ پچھلے دنوں جب ملتان اور بھکر میں تھا تو زیادہ دن شکار کھیلنے ہی میں گزرے۔“

”میری آشا ہے کہ تاجاں کی جنج چڑھے تو اس کے سرال والوں کا تو سواگت کرے۔ تیرے سوا ادھر کون ایسا ہے؟“ جمیلہ نے نرمی سے کہا۔ ”مکلاوے کے سے تو تیرا موجود ہوتا بہت ضروری ہے۔ تو تاجاں کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرے گا“ اسے بد کرے گا۔ وہ تو اپنے پنڈی کی نہیں اس گھر کی بیٹی ہے۔“ اس کا لہجہ معاً ”غم ناک ہو گیا۔“ اس بے چاری کا تو نہ پیو ہے نہ بھرا۔ ایسے میں تیرا ادھر ہونا بہت ضروری ہے۔ آگے تیری مرضی۔“ اس نے گلہ کیا۔ ”جو من کرے ویسا کر۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

”فکر نہ کر زمین دارنی میں جنج بیچنے سے پہلے ہی واپس آجاؤں گا۔“ رحیم داد نے جمیلہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ”ویسے جنج کے آنے میں تو ابھی ہفتے بھر سے زیادہ رہتا ہے۔ ابھی تو زنانیوں کی شورا شوری ہے۔ میں تو ادھر رہ کر ابھی کچھ نہیں کر سکتا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”ویسے تو جو موجود ہے فیر فکر کا ہے کی۔“

”جانا چاہتا ہے تو چلا جا۔“ جمیلہ نے اسے روکنے پر زیادہ اصرار نہ کیا۔ ”پر جنج آنے سے پہلے ضرور آجانا۔ ورنہ مجھے دکھ ہو گا۔“

”کیسی گل بات کر رہی ہے زمین دارنی۔ تجھے دکھ پہنچانے کی تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“ اس نے کسی قدر جوش و خروش کا اظہار کیا۔ ”جیسا تو کہہ رہی ہے بالکل ویسا ہی کروں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔“ رحیم داد نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ جنت آگئی۔

جنت نے قریب پہنچ کر رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! تو نے زمین دارنی کو ادھر باتوں میں لگا رکھا ہے۔ ادھر سب ہی اس کا انتظار کر رہے ہیں۔ تاجاں تو بار بار پوچھ رہی ہے۔“ رحیم داد خاموش رہا۔ جمیلہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے شمال اوڑھی اور جنت کے ہم راہ چلی گئی۔

رحیم داد بھی زیادہ دیر صحن میں نہ ٹھہرا۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ نادر خان کے لائے ہوئے سوٹ کیس میں اس نے کپڑے اور سفر کا ضروری سامان رکھا۔ تانگا بلوایا، حویلی سے باہر نکلا۔ تانگے میں سوار ہوا اور احسان شاہ کے گاؤں پیراں والہ جانے کے لیے لاری اسٹینڈ کی جانب روانہ ہو گیا۔ مگر جب وہ کوئلہ ہرکشن کی حدود سے باہر نکل رہا تھا تو اس نے دیکھا، دینا سامنے سے آ رہا ہے۔ اسے دیکھتے ہی رحیم داد گھبرا گیا۔ لیکن دینا اسے دیکھ نہ سکا۔



آتش دان میں انگارے دھک رہے تھے۔ ان کی گہری سرخ روشنی کمرے میں پھیلی تھی۔ باہر سرد ہوا درختوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ رات ٹھنڈی اور سنسان تھی۔ رحیم داد اور احسان شاہ آتش دان کے قریب آنے سانسے بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر گلاس تھے، دہسکی کی بوتل تھی اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا جگ تھا۔

احسان شاہ کے بشرے سے غور و فکر کے تاثرات عیاں تھے۔ اس نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور دہسکی کا گھونٹ بھر کے رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ ”چوہدری! اس کا مطلب یہ ہوا کہ جمیلہ ساری تیاریاں کر چکی ہے۔ اس نے اپنی زمین کا سودا کیا۔ وکیل سے بیچ نامہ بھی کرا لیا۔ وہ لبور جا رہی ہے۔ اور وکیل کی معرفت اس نے وہاں مکان بھی کرائے پر لے لیا ہے۔ نادر خاں نے تجھے یہی بتایا ہے نا؟“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”تو نے جمیلہ سے بھی ٹوہ لگانے کی کوشش کی تھی۔ وہ کیا کہتی ہے؟“

”جمیلہ سے میری بات چیت ہوئی تھی۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”اس کی باتوں سے تو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ بلکہ ایسا لگتا ہے کہ نہ تو وہ زمین بیچنے کا کوئی ارادہ رکھتی ہے اور نہ ہی لبور جا رہی ہے۔“ ”تو نے کیسے یہ اندازہ لگایا؟“

”بات یہ ہے شاہ جی، وہ تو اپنے سکول کو سرکاری بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کام کے لیے وہ پچھلے دنوں منگمری میں ڈپٹی کمشنر سے بھی ملی تھی۔ کتنی تھی اس نے مدد کرنے کا وعدہ کیا ہے۔“ رحیم داد مزید بتانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ نے اسے آگے بولنے نہ دیا۔ ”سکول تو سرکاری بننا بتانا

نہیں۔“ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ اور تلخی تھی۔ ”اور نہ ہی تو بننے دیتا۔ اس چکر میں ہرگز ہرگز نہ پڑتا۔ تو نے یہ بھی سوچا۔ مزارعوں اور کیوں کے منڈے پڑھ لکھ گئے تو میرے اور تیرے پتر کیا کریں گے؟ میں اس بارے میں پہلے بھی تجھ سے کہہ چکا ہوں۔ لگتا ہے تو نے میری بات پر پوری توجہ ہی نہیں دی۔“

”ایسی گل بات نہیں۔ میں تو تجھے یہ بتا رہا تھا جیلہ آج کل کیا کر رہی ہے اور کس انداز سے سوچ رہی ہے؟“ رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے اور جیسا تو کہہ رہا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔“ اس نے بات کا رخ بدلا۔ ”شاہ جی! سکول کا چکر تو آگے کی گل ہے۔ یہ بتا میں نے اب کیا کرنا چاہیے؟ اپنی سمجھ کام نہیں کرتی۔ نادر کچھ بتاتا ہے۔ جیلہ کی باتوں سے کچھ اور ہی پتہ چلتا ہے۔ میں تو تیرے پاس آیا ہی اس لیے ہوں کہ تو ٹھیک ٹھیک بتا۔“

”نادر خاں تجھ سے غلط بات نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو مجھے پکا یکن ہے۔“

”میں یہ نہیں کہتا نادر نے مجھ سے جھوٹ بولا۔ پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے دکیل کے فشی ہی نے نادر سے غلط بات کہی ہو۔ یہ میں نے اس لیے سوچا کہ جیلہ کو زمین بچ کر لوہر جانا ہوتا تو وہ اپنے سکول کو سرکاری بنانے کے چکر میں کیوں پڑتی؟ جب اسے کوئلہ ہرکشن میں رہتا ہی نہیں تو سکول سرکاری بنے یا نہ بنے، رہے نہ رہے، اسے کیا لینا۔“ رحیم داد نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ ”پچھلے دنوں جیلہ نے لوہر جانا تھا۔ تب اس نے مجھے صاف صاف بتا دیا تھا اور میں اسے سنتے ہی گھبرا کر سیدھا تیرے پاس آیا تھا۔ پر تو ان دنوں یہاں موجود نہیں تھا۔ اپنا مراد خاں شاہانی ادھر ہی مل گیا تھا۔ میں اس کے ساتھ بھکر چلا گیا۔ اس کے بعد سے اب تجھ سے مل رہا ہوں۔“

احسان شاہ مخمے میں پڑ گیا۔ ذرا دیر تک نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ پھر اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری! یہ بتا جیلہ کا تیرے ساتھ برتاؤ کیسا ہے؟“

”ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”پہلے تو سخت زراض تھی اور اتنی زراض تھی کہ پنڈ چھوڑ کر اپنے بچوں کے ساتھ لوہر جانے کو کہتی تھی۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”تجھے تو پتہ ہی ہے کہ جیلہ سے چھپ کر تیرے پاس آتا ہوں اور ہر بار کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر آتا ہوں، پر اسے پتہ چل گیا۔ جیسے ہی اسے پتہ چلا، ایک دم پھر گئی۔ بات چیت کرنی چھوڑ دی۔ پر جب میں بھکر چلا گیا تو اس کا غصہ ختم ہو گیا۔ ویسے بچ پوچھ تو نادر اور اس کی گھر والی جنت نے جیلہ کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں زبردست کام کیا۔“

”نادر بہت ہوشیار بندہ ہے۔ میں نے خوب سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔ آگے بھی تیرے بہت کام آئے گا۔ وہ بہت وفادار ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں، نادر تجھ سے غلط گل نہیں کہہ سکتا۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب بھر پور نظروں سے دیکھا۔ ”چوہدری! تو نے یہ بھی تو کہا تھا، زمیں کی بیج کے کاغذات اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔“

”کہتا تو وہ یہی تھا۔“ رحیم داد نے اعتراف کیا۔

”تب تو کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔“ احسان شاہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگا۔ ”تجھے جیلہ کی باتوں پر اعتبار ہو تو ہو پر مجھے بالکل نہیں۔ وہ پڑھی لکھی ہے۔ بہت تیز اور چالاک ہے۔ اپنے دل کی بات تجھے ہرگز نہیں بتائے گی۔“

رحیم داد نے احسان شاہ سے اختلاف نہیں کیا۔ ”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ اس کے بارے میں شبہ تو مجھے بھی ہے، تجھی تو تیرے پاس مشورہ کرنے آیا ہوں۔ یہ بتا اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”میں کل سویرے لوہر جا رہا ہوں۔ میرا مینجر، مہریان علی بھی ساتھ ہی ہو گا۔ وہ نادر سے بھی زیادہ ہوشیار بندہ ہے۔ میں اسے لگا دوں گا۔ وہ اپنے طور پر سب پتہ چلا لے گا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”تجھے زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں شام ہی کو لوٹ آؤں گا۔ تب تک تو صبر کر۔ جیلہ نے آگے کے لیے جو بھی منصوبے بنا رکھے ہیں، سب کا سراغ مل جائے گا۔“

”یہ بالکل ٹھیک رہے گا۔“ رحیم داد مطمئن ہو کے بولا۔

احسان شاہ خاموش ہو گیا اور گلاس اٹھا کر وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ چپ دیکھ کے رحیم داد اپنی بے چینی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ”شاہ جی! کیا سوچ رہا ہے۔ کوئی خاص گل ہے؟“

”خاص گل تو نہیں۔ پر مجھے، تجھ سے سخت گلہ ہے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو حکیمی نظروں سے دیکھا۔

”مجھ سے گلہ ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

”تو نے زمین کو اپنی حویلی میں کیوں چھپا کر رکھا؟“ احسان شاہ نے تلخی سے کہا۔ ”تیں نوں پتہ ہے، وہ میرے کوٹ سے فرار ہو کر تیرے پنڈ پہنچی تھی۔ تو نے اسے میرے پاس پہنچانے کی بجائے پناہ دے کر اپنے پاس ٹھیرا لیا۔“

”وہ تو ان دنوں حویلی میں پہنچی جب میں پنڈ میں تھا ہی نہیں۔ مراد خاں شاہانی کے پاس بھکر میں تھا۔ شاہانی سے پوچھ لے۔ زمین کو تو جیلہ نے پناہ دی تھی۔ مجھے تو واپسی پر اس کے بارے میں پتہ

وکیل یا بیرسٹری ہوتے ہیں۔ انہیں کسی کی نوکری چاکری تو کرنی نہیں ہوتی، اپنی مرضی کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ وکالت اور بیرسٹری بھی بہت آزاد پیشہ ہے۔“

رحیم داد کو نہ سیاست سے دلچسپی تھی، نہ وکالت سے اور نہ ہی وکالت کے پیشے کی آزادی سے۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا اور وہ کسی سے شغل کرتا رہا۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ کچھ دیر بعد احسان شاہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”معاف کرنا چوہدری، میں آج تیرے ساتھ زیادہ دیر نہیں بیٹھوں گا۔“

”کیوں شاہ جی؟“ رحیم داد تجسس سے بولا۔ ”بات کیا ہے؟ ابھی رات تو اتنی زیادہ نہیں ہوئی۔“

”گل امیہ اے جی۔“ احسان شاہ مسکرا کے بولا۔ ”میں نے آج اندر حویلی میں اپنی چھوٹی گھر والی کے ساتھ روٹی کھائی ہے۔ وہ تین مہینے سے اوپر میکے میں رہ کر ملتان سے سویرے ہی آئی ہے۔“

”چلا جانا۔ ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔“

”نہیں، اب مجھے جانے دے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”شام ہی کو اس نے مجھے کہہ دیا تھا، انتظار کر رہی ہوگی۔ وڈے گھر کی ہے۔ نخرے بھی اس کے اتنے ہی وڈے اور اونچے ہیں۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ اس نے اپنا گلاس اٹھایا، ہونٹوں سے لگایا اور غناخت چڑھا گیا۔



رحیم داد گرم کمرے میں تنہا بیٹھا تھا۔ قاب سے تلے ہوئے مرغ کا گوشت نوج نوج کر کھا تا رہا۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ باہر ہوا فرائے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ پھر رات گزر گئی۔ رحیم داد ترنگ میں تھا اور اپنے کمرے میں جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا کہ آہستہ سے دروازہ کھلا۔ رحیم داد نے مڑ کے دیکھا، رمتے دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی ہے۔ وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی آتش دان کے قریب پہنچی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھسا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود سردی سے کپکپا رہی تھی۔ اس نے اپنا بدن قدرے ترچھا کیا اور دونوں ہاتھ دھکتے ہوئے انگاروں پر پھیلا دیئے۔

”آج سردی بہت زبردست ہے۔“ خاموشی میں رمتے کی آواز ابھری۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کے رمتے کو دیکھا۔ اس کا سانولا چہرہ انگاروں کی سرخ روشنی میں تانبے کے مانند دک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کامل تھا۔ تیل سے سر کے بال چمک رہے تھے۔ وہ سرخ

چلا۔ ”رحیم داد نے باور کرانے کی کوشش کی۔ ”شاہ جی میں تجھ سے غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی میں نے زینت سے کیا لیتا ہے۔“

احسان شاہ نے پوچھا۔ ”اب زینت کہاں ہے؟“ اس کے رویے سے صاف عیاں تھا کہ وہ رحیم داد کی صفائی سے مطمئن ہو گیا ہے۔

”وہ جلیل کے ساتھ دیپال پور چل گئی۔ یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا جلیل اس کا گھر والا ہے۔ تیرے پاس تو وہ آیا بھی تھا۔“

”آیا تو تھا۔“ تھانے دار زماں خاں کا خط لے کر آیا تھا۔ زینت اپنے گھر والے کے ساتھ چلی گئی۔ چلو یہ بھی ٹھیک ہی ہوا۔ تھی بھی ایک دم ٹھنڈی۔ پتھر کی طرح بے جان۔ ہر دم روتی ہی رہتی تھی۔“

”شاہ جی، میرا کامانا ایسی زبانی اپنے کوٹ میں نہ رکھا کر۔“

”ویسے تو عام طور پر ہر زبانی جب نئی نئی آتی ہے تو ایسے ہی ٹسوے بھاتی ہے۔ بعد میں سب راضی خوشی ہو جاتی ہیں۔“ احسان شاہ نے تہقیر لگایا۔ ”پر اب تو میں نے کوٹ کا بہت سا کوڑا کرکٹ صاف کر دیا۔ جو بھی مزارع اپنی گھروالی لینے آیا اس سے سودا طے کیا، رقم وصول کی اور اس کا بازو اسے واپس دے دیا۔“

”توچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ ”پر تو نے ایسا کیوں کیا؟“

”چوہدری، بات سچی یہ ہے۔ کئی کئی سال سے کوٹ میں پڑی تھیں۔ ان پر خرچ بھی بہت آتا تھا۔ ادھر مجھے روپے کی سخت ضرورت بھی پڑ گئی۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”زمین خریدنے کا ارادہ ہے؟“

”زمین تو اپنے پاس پہلے ہی بہت ہے۔ لہور میں کوٹھی خریدی ہے۔ اگلے مہینے لندن سے میرا ہجر رحمان شاہ آرہا ہے۔“ اس کے چہرے پر خوشی سے سرخی بکھر گئی، آنکھیں جگ مگانے لگیں۔

”بیرسٹریں کیا ہے۔ لہور ہی میں رہے گا۔“

”ادھر کیوں رہے گا؟“ رحیم داد کے انداز میں استعجاب تھا۔

”اسے وہاں پر یکٹس جو کرنی ہے۔ اب مجھے اپنے مکدموں کے لیے وکیلوں کے نخرے نہیں اٹھانے پڑیں گے۔“ احسان شاہ مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔ ”ویسے میں اسے سیاست میں بھی لانا چاہتا ہوں۔ اس کا بھی ایسا ہی ارادہ ہے۔ چوہدری! جج پوچھ تو سارے ہی سیاسی لیڈر عام طور پر

کنارے کا سبز لاجپا بندھے ہوئے تھی اور بچی نظروں سے آتش دان میں دیکھتے ہوئے لال لال انگارے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”رہتے کیسہ حال اے؟ آج بہت صحت لگ رہی ہے۔“

رحیم داد کی جانب نظرس اٹھائے بغیر وہ بولی۔ ”آج میرا جی ٹھیک نہیں ہے۔“

”فیر کیوں چلی آئی؟“ رحیم داد جھوم کر ہنسا۔ ”رہتے! لگتا ہے اب تو بوڑھی ہو گئی ہے۔“

رہتے نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔“

رحیم داد نے رہتے کو دیکھا۔ ”مجھ سے بھی یہی کہہ رہا تھا۔“

”اب تو وہ ایسی ہی گلاں کرے گا۔“ رہتے تلملا گئی۔ ”آٹھ سال پہلے جب میں اس حویلی میں

آئی تھی تب ایسی نہیں تھی۔“ اس کا چہرہ راکھ بن گیا۔ ”ان دنوں تو شاہ جی بہت پیار جاتا تھا۔ کتا

تھا، تیرے بتاں نہیں رہ سکتا۔ تجھ سے ویاہ کر لوں گا۔ زمیں داری بنا کر رکھوں گا۔“

”ایسا ارادہ تھا تو اس نے تجھ سے ویاہ کیوں نہیں کیا؟ اسے کون روک سکتا تھا؟“

”روک تو نہ جب اسے کوئی سکتا تھا، نہ اب۔“ رہتے کے لہجے میں زیادہ تنگی پیدا ہو گئی۔

”چوہدری! اچھی بات تو یہ ہے۔ وہ مجھ سے کیسے ویاہ کر سکتا تھا؟ میں کسی دڑے زمیں دار یا بگیرہ دار کی

تو دھی ہوں نہیں۔ شاہ جی وڈا زمیں دار ہے اور وڈے زمیں دار کا ویاہ وڈے زمیں دار ہی کی دھی

سے ہو سکتا ہے۔“ وہ نظرس جھکا کے سرخ سرخ شعلے تکنے لگی۔ ”میرا بیٹو تو کتا تھا۔ وہ کنوئیں سے

ریت مٹی نکالنے والا ٹوٹا تھا۔ ٹوٹے کی کڑی وڈے زمیں دار کی گھر والی کیسے بن سکتی ہے؟ وہ تو

صرف اس کا بستر ہی گرم کرنے کے کام آ سکتی ہے۔“

رحیم داد کو پہلی بار اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ کوٹ کی قیدی عورتوں میں رہتے جس قدر سفاک

اور سخت گیر مشہور ہے، اندر سے ایسی ہے نہیں۔ یہ بھی غم زدہ اور زخم خوردہ ہے۔ رحیم داد نے

رہتے سے دریافت کیا۔

”شاہ جی نے تجھے بھی اٹھوایا ہو گا؟“

”نہیں جی! میں تو منگھری کے مہاجر کیمپ میں تھی۔“ رہتے نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”بالکل اکیلی اور بے سارا۔“

”تیرا ادھر کوئی نہیں تھا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو مہاجر ہے ناں، تو پاکستان پہنچی کیسے؟“

”کیا کرے گا سن کر۔ اب تو یہ بہت پرانی گل ہو گئی۔“ رہتے آتش دان کے قریب فرش پر بیٹھ

گئی۔ ”میں تو اب تک یاد ہے۔ وہ مجھے کا دن تھا۔ شاہ جی رضا کاروں کے ساتھ کیمپ میں آیا۔ وہ

مہاجرین میں لنگر بانٹنے کے لیے دیکھیں بھی اپنے ساتھ لایا تھا۔“ رہتے کے لبوں پر زہر خند نمودار

ہوا۔ ”رضا کار لنگر بانٹتے تھے اور شاہ جی لئے پٹے بے سارا اور بے گھر مہاجروں کے حوصلے بڑھاتا

تھا۔ آنکھوں میں آنسو لا کر بہت ہم دردی جتا تا تھا۔ میں اب تک اس کی وہ باتیں نہیں بھولی۔ کیا

نیک اور بھلا بندہ لگتا تھا۔“

”پر تو کیسے شاہ جی کے ہتھے چڑھ گئی؟“

”وہ ایسا ہوا جی۔ کیمپ سے واپسی پر شاہ جی اپنی حویلی میں کام کاج کے لیے تین پناہ گیر زنانیوں کو

بھی ساتھ لے گیا۔ دو کو تو اس نے خراب کر کے اپنے مزارعوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ مجھے اپنے پاس رکھ

لیا۔ شاہ جی پیار جتا تا تو مست ہو کر کتا تو مجھے دی جاتی ہے۔“ رہتے نے شرم سے نظرس جھکا لیں۔

”ویسے جی! میں مانجھے ہی کی ہوں۔ فسادات ہوئے اور میرے پنڈ پر رات کے اندھیرے میں حملہ ہوا

تو میں گھر سے نکل کر فھلوں میں چھپ گئی۔ بعد میں ایک کافلے کے ساتھ کسی نہ کسی طرح پاکستان

پہنچ گئی۔“ اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”شاہ جی جتا تا تھا، تو بھی گور داس پور

کا مہاجر ہے۔ اس نے تیرے بارے میں ٹھیک ہی بتایا ناں؟“

”شاہ جی نے ٹھیک کہا۔ میں بھی مہاجر ہوں۔“ رحیم داد نے آہستہ سے گردن ہلائی۔ چند لمحے

خاموش رہا، پھر اس نے اچانک بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”تب تک تیرا ویاہ نہیں ہوا تھا؟“

”کیوں نہیں ہوا تھا۔ دو بیٹے بھی تھے۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولی۔ ”میرا گھر والا لوہار تھا۔

اس کا ٹھیک ٹھاک کام چلتا تھا۔“

”وہ بھی پاکستان آیا یا دوسرے مسلمانوں کی طرح ادھر ہی شہید کر دیا گیا؟“

”وہ بھی بیچ بچا کر پاکستان آ گیا تھا۔“ رہتے نے گہری سانس بھری۔ ”مجھے ڈھونڈتا ہوا شاہ جی کے

پاس آیا تھا۔ بیچے بھی اس کے ساتھ ہی تھے، پر شاہ جی نے مجھے اس سے نہیں ملنے دیا اور نہ جانے

دا۔ وہ مجھے لینے ہی کے لیے یہاں آیا تھا۔“

”پر تو نے تو اس کے ساتھ جانے کی کوشش کی ہوگی۔“ رحیم داد نے رہتے کی آنکھوں میں

جھانک کر ٹوٹ لگانے کی کوشش کی۔ ”وہ تیرا گھر والا تھا، تیرے بچوں کا پیو تھا اور انھیں اپنے ساتھ

بھی لایا تھا۔“

”چوہدری! اب تجھ سے جھوٹ کیا بولنا۔“ رہتے کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی، آنکھوں کے

چراغ دھندلے پڑ گئے۔ ”میں خود اس کے ساتھ جانے پر تیار نہیں ہوئی۔ ان دنوں شاہ جی مجھے اتنا

پیار کرتا تھا جیسے میرے لیے دیوانہ ہو گیا ہو۔ اس کے پیار نے مجھے اندھا کر دیا تھا، نہ بچے یاد آئے،

نہ گھروالا۔ نہ ماما جاگی، نہ آگے کی سوچی۔ لگتا ہے جیسے شاہ جی نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ اس نے گہری سانس بھری۔ ”بہت برا کیا۔ میں نے بہت برا کیا۔“

”ایسا نہ سوچ۔ جو ہوتا تھا ہو گیا۔“ رحیم داد نے ہم دردی سے کہا۔ ”تجھے شاہ جی سے زراض نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے تو لگتا ہے شاہ جی اب تک تجھ سے پیار کرتا ہے۔ تجھے کوٹ کا انچارج لگا رکھا ہے۔ یہ معمولی گل ہے؟“

”چوہدری! تیں نوں کچھ پتہ نہیں۔“ رتھتے کے لمبے میں جھنجھلاہٹ تھی۔ ”زراض ہوتا ہے تو غصے میں ٹھڈے مارتا ہے۔ زمین پر گر ادیتا ہے، بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر کوٹھے پر رکھا۔ ”میری کمر میں ایسے ہی درد نہیں ہوتا۔ شاہ جی نے ایک بار غصے میں زور زور سے ٹھڈے مارے۔ اس کے بوٹ سے میری پسلیاں دب گئیں تھیں۔ ہفتے بھر تک بستر پر پڑی رہی، اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔“

”شاہ جی تجھ سے اتنا زراض کیوں ہو گیا تھا۔“ رحیم داد نے کیرا۔ ”کوئی نہ کوئی تو اتنے زبردست غصے کی وجہ ہوگی؟“

”وہ جی ہوا یہ کہ کوٹ سے ایک زبانی بھاگ گئی۔ ان دنوں کوٹ کے دروازے پر ایک ہی راکھا ہوتا تھا۔ رات کو اسے اونگھ آگئی۔ میں بھی سو گئی تھی۔ وہ چپکے سے نہ جانے کب نکل گئی۔“

”پر تیرا اس میں کیا قصور ہوا؟ تو رات بھر تو جاگنے سے رہی۔ تجھے تو سونا ہی تھا۔ اس میں کون سی غلط بات ہوئی؟“

”شاہ جی تو یہ نہیں سمجھتا۔ سویرے اسے پتہ چلا تو ایسا گرم ہوا کہ بالکل پاگل ہو گیا۔ راکھے کو تو اس نے اٹا لٹکا کر کرندوں سے پٹوایا۔“ رتھتے کا چہرہ مرجھا گیا۔ ”مجھے اس نے کمرے میں بند کیا اور ٹھوکروں سے مار لگائی۔ غصے سے اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔“

”پچھلے دنوں زبنت بھی تو یہاں سے بھاگ گئی تھی۔ تب بھی شاہ جی نے تجھے اس طرح مار لگائی ہوگی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ کوٹ سے نہیں، مہمانوں کے کمرے سے بھاگ گئی تھی۔“ رتھتے نے وضاحت کی۔ ”شاہ جی نے اس کے بھاگنے پر شیدے کو ایسی دبا کے مار لگائی کہ اب تک منجی سے نہیں اٹھا۔ ایک ہاتھ نوٹ گیا۔ اس پر پٹی بندھی ہے۔ ہر دم پڑا ہائے ہائے کرتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تجھی تو شاہ جی نے ادھر میری ڈیوٹی لگائی ہے۔ مجھے تو کوٹ کے اندر زبانیوں کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنی ہوتی ہے۔“

”جسبی شیدا نظر نہیں آیا۔ ایک دوسرا ہی بندہ اس کی جگہ ہر کام کرتا رہا۔“ رحیم داد نے قدرے اہل کے بعد رتھتے سے دریافت کیا۔ ”تجھ سے تو شاہ جی نے کچھ نہیں کہا؟“ مگر سوال کا جواب ملنے سے پہلے اس نے خود ہی صفائی پیش کی۔ ”ویسے تیری تو غلطی بھی نہیں تھی۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے جی۔“ رتھتے کے چہرے پر خوف کی پرچھائیں منڈلانے لگی۔ ”وہ مجھ سے بھی سخت زراض ہوا۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ غصے سے آنکھیں نکال کر ایسے زور سے ٹھڈا مارا کہ میں گر پڑی۔ پر اس کے بعد کچھ نہ بولا۔“

”پر شیدے کی تو اس نے زبردست پٹائی کی۔ تجھے تو صرف ایک ٹھڈا مار کر چھوڑ دیا۔“

”بعد میں اس نے جو چوٹ لگائی، وہ ٹھڈے سے بھی زیادہ سخت تھی۔“

”کیا کیا اس نے؟“ رحیم داد کے لمبے میں تجسس تھا۔

”تیں نوں پتہ ہے، اس نے مجھے کیا کہا۔“ رتھتے آتش دان میں دیکھتے ہوئے انگارے تکتے لگی۔ ”پہلے تو وہ تنگی تنگی گالوں نکالتا رہا۔ فیر غصے سے چیخا، تو اب بڑھی ہو گئی ہے، بالکل بڑھی کھوسٹ۔ میں نوں ایسی رن کی ضرورت نہیں۔ تو یہاں سے چلی جا۔ میں تیرا اور تیرے بچوں کا خرچا اب نہیں اٹھا سکتا۔ سن لیا تو نے چوہدری۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور لکڑی کا دستہ پکڑ کر لوہے کے آنکڑے سے راکھ کی تہ کے نیچے دبے ہوئے انگارے کیرنے لگی۔ آتش دان میں آج تیز ہو گئی۔ کوٹے دیکھنے لگے۔ کمرے میں بکھری ہوئی سرخی گہری ہو گئی۔ ”تو ہی انصاف سے بتا۔ بچے میں اپنے ساتھ تو نہیں لائی تھی۔“

رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ مگر رتھتے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔ ”چوہدری، تو کیا سوچنے لگا؟“

”سوچ رہا تھا، شاہ جی نے اگر تجھے نکال دیا تو کہاں جائے گی؟“

”یہی تو میں سوچتی رہتی ہوں۔“ اس کی آواز میں سکک تھی۔

”یہ بتا رتھتے! تیرا گھر والا اب کہاں ہے؟“

”میں نوں تو جی اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جانے زندہ ہے کہ مر گیا۔“ رتھتے نے بتایا۔

”تیں نوں طوم ہے، میں تو حویلی سے باہر جاتی ہی نہیں۔ شاہ جی کی بالکل اجازت نہیں۔“

”شاہ جی تجھے تنخواہ تنخواہ بھی دیتا ہے؟“

”تو بہ کرو جی! وہ کیا تنخواہ دے گا۔ کبھی ایک پیسہ بھی نہیں دیتا۔“ وہ لمبے بھر خاموش رہی۔ ”پر اتنا ضرور ہے، مہمانوں سے کبھی کبھار کچھ مل جاتا ہے۔ سردار مراد خاں شاہانی وڈے دل والا ہے۔“ اس کے بجھے ہوئے چہرے پر اجالے کی رقت ابھری۔ ”ایک بار تو اس نے مجھے اکٹھے تیرے

روپے دیئے۔“

رحیم داد نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دس کے تین نوٹ نکالے اور رتختے کی طرف بڑھاتے ہوئے مسکرایا۔ ”لے یہ بھی تیرے روپے ہیں۔ اب تو راضی خوشی ہے۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”انہیں رکھ لے اور اب جا کے آرام کر۔“

رتختے نے نوٹ لے کر لاپچے کے ڈب میں نہایت احتیاط سے رکھے۔ اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ”تو ابھی جاگ رہا ہے ناں؟“ وہ رازدارانہ لہجے میں بولی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پوچھا۔ ”کیوں کیا بات ہے؟“

رتختے کچھ نہیں بولی۔ مزی اور خاموشی سے باہر چلی گئی۔



رحیم داد خاموش بیٹھا وہ ہسکی کی چسکی لگا تا رہا۔ آتش دان میں انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخ سرخ روشنی درو دیوار پر بکھری ہوئی تھی۔ کمرہ خوب گرم تھا اور رحیم داد نشے سے جھوم رہا تھا۔

دروازہ آہستہ سے چڑھتا ہوا کھلا۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا ہے۔ سامنے رتختے کھڑی ہے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”چوہدری! امیرے ساتھ۔“

رحیم داد اٹھا مگر لڑکھڑا کر پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ ”مجھے کیس نہیں جانا۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

”چوہدری! تو نے آج بہت پی رکھی ہے۔“ رتختے نے مسکرا کر کہا۔ ”تجھے اب اپنے کمرے میں چل کر آرام کرنا چاہیے۔“ وہ آگے بڑھی اور رحیم داد کے قریب پہنچ گئی۔ ”چوہدری اب کھڑا ہو جا۔“

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رتختے نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو تھام لیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکلے اور برآمدے میں آ گئے۔

ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ شدید سردی تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں سردی سے کپکپاتے ہوئے آگے بڑھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ گہرے سائے میں رک رک کر ابھری رہی تھی۔

برآمدے کے آگے باغیچہ تھا۔ باغیچے کی بیرونی چار دیواری کے پاس سرس کے ایک گھنے درخت کے نیچے کوٹھری تھی۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا۔ دہلیز کے پاس پہرے دار چادر اوڑھے خاموش بیٹھا

اب تپ رہا تھا۔ آہٹ سن کر وہ زور سے کھٹکارا۔ نظریں اٹھا کر اس نے برآمدے کی سمت دیکھا اور قریب رکھی ہوئی لالٹین اٹھائی۔

”کون ہے؟“

رتختے بڑھتی ہوئی برآمدے کے آخری سرے پر پہنچ گئی۔ ایک کمرے کے دروازے کے سامنے ٹھہر کے اس نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری! میں نے اب کوٹ میں جانا ہے۔“ اس نے پہرے دار کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”نواز موجود ہے۔ تیرے کمرے کے دروازے پر کوئی رکھا نہیں رہے گا۔ آج سردی بہت زیادہ ہے۔“ اس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”نواز رات بھر جاگتا رہے گا۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے کہہ دینا۔ میں اب سویرے تیرے پاس آؤں گی۔ تیں نوں پتہ ہے۔ شیدا پیار ہے، تیری دیکھ بھال میں نے ہی کرنی ہے۔“ رتختے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کا ایک پٹ کھولا۔ ”اب تو اندر جا۔“ رحیم داد کمرے میں چلا گیا۔

رتختے باہر رہ گئی۔ رحیم داد نے دروازہ بند کر لیا۔ کمرہ خاصا کشادہ تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ آگے کے حصے میں پرانی وضع کا بھدا سا صوفہ سیٹ پڑا تھا۔ میز تھی، کرسیاں تھیں۔ پچھلے حصے میں خواب گاہ تھی۔ دونوں حصوں کے درمیان پردہ پڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پردہ ہٹایا اور خواب گاہ میں چلا گیا۔ ایک کونے میں اونچا اسٹول تھا۔ اس پر لیپ روشن تھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں مسری تھی۔ مسری کے سرہانے کھڑی تھی، وہ بند تھی۔ مسری سے ذرا ہٹ کر پختہ چوڑا تھا۔ چوڑے کے اوپر دیوار میں مختصر روشن داں تھا۔ چوڑے پر رکھی ہوئی انگیٹھی میں انگارے دہک رہے تھے۔

رحیم داد نے لیپ کی روشنی میں دیکھا، انگیٹھی کے پاس فرش پر ایک نوجوان عورت سر جھکائے بیٹھی ہے۔ وہ کھیس اوڑھے تھی۔ انگاروں کی گہری سرخ روشنی میں اس کا چہرہ گلابی نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد انگیٹھی کے پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ عورت سکڑی سٹھی چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”تیرا ناں کیسہ ہے؟“

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرا ناں جی ہاجراں ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا نہیں۔ اس کی آنکھوں میں دنبالہ کا جل اور بالوں میں تیل تھا۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھایا اور ہاجرہ کے سر سے جھٹ کھیس ہٹا دی۔ اس کا پورا چہرہ سامنے آ گیا۔ وہ بری طرح گھبرا گئی۔ اس کا بدن اور سٹ گیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب عیاں تھا۔ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”ذرا گردن تو اونچی

کر۔ ”مگر اس نے گردن نہ اٹھائی بلکہ کچھ اور سکتی۔

رحیم داد نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اوپر کیا۔ ہاجراں کی پلکیں جھکیں ہوئی تھیں۔ آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک کر اس کے رخساروں پر بکھر گئے۔

”ارے“ تو رو رہی ہے۔ ”رحیم داد بچھے ہوئے انداز میں بولا۔ ”لگتا ہے نئی نئی میاں آئی ہے۔“ وہ چپ بیٹھی رہی۔ رحیم داد کی کیفیت لمحہ بہ لمحہ بدل رہی تھی۔ نئے کا ایسا تیز رپلا آیا کہ اس پر وحشت طاری ہو گئی۔ اس نے جھنجھلا کر ہاجراں کی کھیس کھینچ کر ایک طرف پھینک دی۔ ہاجراں دوپٹہ نہیں اوڑھے ہوئے تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ وہ پھول دار جھگی پینے ہوئے تھی۔ لاجا ہلکا نیلا تھا۔ پنڈلیوں میں چاندی کی پڑیاں پڑی تھیں۔

رحیم داد ڈنگا کر کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ اس نے خود کو سنبھالا اور جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکال کے ہاجراں کی طرف بھسائے۔ ”لے یہ رکھ لے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”رکھ لے۔“ ہاجراں نے نوٹوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا، عاجزی سے بولی۔

”میں کنجری نہیں ہوں۔“

”تو کوئی بھی ہو“ اب تو میاں آئی گئی۔

”میں اپنی مرضی سے تو نہیں آئی۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں تو اپنے گھر میں منجی پر بیٹھی تھی۔ گھروالا فھلوں کو پانی لگانے کے لیے آؤ کا ٹکا کھولنے گیا تھا۔ پانی لگانے کی اس کی باری رات ہی کو آتی ہے۔“

ہاجراں کی عاجزی سے رحیم داد متاثر نہ ہوا۔ اس نے مسکرا کر بے نیازی سے پوچھا۔ ”تو گھر میں بالکل اکیلی تھی؟“

”ہاں جی اکیلی تھی“ یہی سمجھ لو۔ دونوں بچے بہت چھوٹے ہیں۔“

”فیر کیا ہوا؟“ رحیم داد نخوت سے بولا۔

”مجھے تین بندے دہڑے کی دیوار پر نظر آئے۔“ ہاجراں سسے ہوئے انداز میں بولی۔ ”اس دھت میری آنکھ کھلی ہوئی تھی۔ ان کے منہ پر منڈا سے بندھے تھے۔ وہ دیوار سے اتر کر نیچے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر جھٹ میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔“

”فیر تو نے کیا کیا؟“

”وہ مجھے اٹھا کر میاں لے آئے۔“ ہاجراں ٹھنڈی سانس بھر کے بولی۔ ”میرا گھروالا جانے کیا سوچتا ہوگا؟ بچوں کا کیا حال ہوگا۔“

”گھروالے کو پتہ نہیں“ تو میاں ہے؟“

”لگتا ہے“ اسے پتہ نہیں۔ اسے پتہ ہوتا تو مجھے لینے ضرور آتا۔“

”ہاجراں! تیرے گھروالے کا کیا نام ہے؟“

”اس کا نام عالم ہے۔ کیا تو اسے جانتا ہے؟“

”نہیں! رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور چند لمحوں تک خمار آلود نظروں سے گھورتا رہا، پھر اس نے

جبک کراچانک ہاجراں کا بازو پکڑا۔ ”باتیں بند کر۔ رات بہت ہو گئی ہے۔“

ہاجراں نے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد کی گرفت بہت مضبوط تھی۔

☆

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ رحیم داد گہری نیند سو رہا تھا۔ یکایک کمرے میں آہٹ

ہوئی۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ گہری خاموشی میں ایسی آواز سنائی دی جیسے بلی آہستہ آہستہ غرا رہی

ہو۔ رحیم داد نے دوبارہ سونا چاہا لیکن اس کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی تو محسوس

ہوا کہ ہاجراں کمرے میں نہیں ہے۔ رحیم داد نے سوچا، سویرا ہو گیا ہے۔ مگر باہر گہرا سکوت تھا۔ وہ

کچھ دیر لینا غور کرتا رہا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لیپ اسٹول کے بجائے

فرش پر رکھا تھا اور اسٹول غائب تھا۔

رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے والا تھا۔ اس نے حیرت سے آنکھیں

پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر ہاجراں کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ انگیٹھی کے پاس اس کی کھیس پڑی

تھی۔ رحیم داد گھبرا کر بستر سے نیچے اترا، جوتے پہنے اور فوراً کمرے کے دوسرے حصے کی جانب

بڑھا۔ پردہ سرکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے آگے بڑھ کر دیکھا، خوف اور دہشت سے اس کی آنکھیں

پھٹ گئیں۔

رحیم داد کی آنکھوں کے سامنے نہایت ہولناک منظر تھا۔ ہاجراں چھت سے لٹکی ہوئی تھی۔

اس کے پیروں کے نیچے اسٹول پڑا تھا۔ ہاجراں کے نیلے لاپچے کا ایک پلو چھت کی کڑیوں میں ایک

کنڈے سے بندھا تھا اور دوسرے پلو کا پھندا بنا کر اس نے اپنی گردن میں ڈال لیا تھا۔ ہاجراں کی

آنکھیں پٹی ہوئی تھیں۔ زبان ہونٹوں کے بائیں گوشے سے لٹک رہی تھی۔ اس کا گلابی چہرہ سیاہ

پڑ گیا تھا اور گردن کھینچ کر لمبی ہو گئی تھی۔

رحیم داد بدحواس ہو کر کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں پہنچ گیا۔ سرد ہوا کا تیز جھونکا اس

کے چہرے سے ٹکرایا۔ مگر اس نے سردی کی پروا نہیں کی، تیزی سے پہرے دار نواز کی کونھری کی

جانب بڑھا۔ نواز سگتی آگ کے سامنے بیٹھا تھا۔ رحیم داد قریب پہنچا، تو وہ پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا۔
 ”چوہدری! تو اتنی رات کو ادھر کیسے آگیا؟ بہت گھبرایا ہوا نظر آ رہا ہے۔ گل کیہ اے؟“
 ”شید اکدھر ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ تو جی تیار پڑا ہے۔ کئی روز سے نہیں آیا۔“

رحیم داد کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”میں نوں پتہ ہے، وہ تیار ہے۔ میرا مطلب ہے، رتے کہاں ہے؟ تو جا کر اسے فافٹ بلا لا۔“

”کوئی خاص گل ہے جی؟“ نواز نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

”خاص ہی گل ہے۔ بعد میں بتاؤں گا۔ تو پہلے رتے کو یہاں بلا کر لا۔“

نواز نے مستعدی سے اپنی ملگتی چادر سر اور کانوں کے گرد لپیٹی، سردی سے کپکپا کر بولا۔
 ”چوہدری! تو نے چدر بھی نہیں اوڑھ رکھی۔“ رحیم داد نے کچھ نہیں کہا۔ گم صم کھڑا رہا۔ نواز آگے بڑھا اور درختوں کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

رحیم داد کو ٹھری میں چلا گیا۔ دلہیز کے پاس اگلے سگ رہے تھے۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ جھٹ آگ پر پھیلا دیئے۔ ہوا درختوں میں سرسراہٹ پیدا کر رہی تھی۔ ہر طرف دیرانی تھی، سناٹا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے بار بار کمرے کی جانب دیکھتا۔ کمرے کے دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔

درختوں تلے آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی لائین کی دھندلی روشنی میں دیکھا، رتے اوئی دھما اوڑھے تیز تیز قدم اٹھاتی حیران و پریشان کو ٹھری کی طرف آ رہی ہے۔ نواز بھی اس کے ساتھ تھا۔ دونوں کپکپا رہے تھے۔ رتے نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

”چوہدری! تو نے مجھے بلایا ہے؟“ اس کی آنکھیں کچی نیند سے جاگنے کے باعث سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے رحیم داد کو غور سے دیکھا۔ ”چوہدری! تو یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ تجھے تو کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ باجراں کدھر ہے؟“

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کو ٹھری سے نکلنے ہوئے اس نے رتے سے کہا۔ ”میرے ساتھ کمرے میں آ۔“ وہ آگے بڑھا۔ رتے اس کے پیچھے پیچھے چلی۔ نواز بھی ان کے ساتھ تھا۔ تینوں نے باغیچے طے کیا اور بیڑھیوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے۔

رحیم داد کمرے کے دروازے پر ٹھک گیا۔ رتے کو مخاطب کر کے اس نے کہا۔ ”اندر جا کر دیکھ۔“

رتے اور نواز کمرے میں چلے گئے۔ رحیم داد بھی سما ہوا ان کے پیچھے پیچھے بڑھا مگر دلہیز کے قریب رک گیا۔ سامنے پھٹ سے باجراں کی برہنہ لاش لٹکی ہوئی تھی۔ رتے کے چرے سے وحشت برسنے لگی۔ ”ہائے رتہ! یہ کیا ہوا؟“ رتے نے سرا سہہ ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔
 ”چوہدری! یہ کیا ہو گیا؟“

”میں تو سو رہا تھا۔“ رحیم داد نے بے چارگی اور بے بسی سے کہا۔ ”کھٹ پٹ کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔“ اس نے فرش پر پڑے ہوئے اسٹول کی طرف اشارہ کیا۔ ”لگتا ہے یہ گرا تھا۔“

رتے پر وہ سرکا کر خواب گاہ میں گئی۔ بستر سے چادر اٹھا کر لائی، میز پر چڑھی۔ اس نے جلدی جلدی باجراں کی برہنہ لاش کے گرد چادر لپیٹ دی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ رتے جلد ہی کمرے سے باہر چلی گئی۔ نواز بھی اس کے ساتھ نکل کر برآمدے میں آگیا۔ رتے نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ وہ کچھ دیر برآمدے میں سہمی ہوئی کھڑی رہی۔ رحیم داد اور نواز کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

رتے نے دھسا ایک بار پھر اچھی طرح اپنے بدن پر لپیٹا اور رحیم داد سے بولی۔ ”چوہدری میں شاہ جی کو جا کر خبر کرتی ہوں۔“ اس کے لہجے میں تھر تھراہٹ تھی۔ ”پروہ ایک دم گرم ہو جائے گا۔ تنگی تنگی گلاں نکالے گا۔“

”تیری اس میں کیا غلطی۔“ رحیم داد نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”کسی کی بھی غلطی نہیں ہے، یہ تو باجراں نے خود کیا ہے۔“

رتے نے خوف زدہ آواز میں کہا۔ ”پر شاہ جی کیسے جانے گا۔ نیند سے اٹھنے پر اور سردی میں باہر آنے پر ویسے ہی اسے کتہ چڑھا ہو گا۔ میری ایک نہیں سنے گا۔ بتا چوہدری! میں کیا کروں؟ اس معاملے میں میرا کیا دوش؟“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”پر باجراں نے ایسا کیوں کیا؟“
 رتے نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے اوڑے اوڑے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”چوہدری! یہ گلاں چھوڑ، تو نواز کے پاس جا کر بیٹھ۔ میں شاہ جی کے پاس جاتی ہوں۔ فوراً اسے بتانا ہو گا۔ دیر نہیں ہونی چاہئے۔“ وہ آگے بڑھی اور تیز قدموں سے چلنے لگی۔

رحیم داد اور نواز کو ٹھری میں رہ گئے اور آگ تاپنے لگے۔ دونوں گم صم اور سسے ہوئے تھے۔ نواز نے آہستہ سے کہا۔ ”چوہدری! تو بہت ڈرا ہوا لگ رہا ہے۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

جھڑا لو ہے۔“



برآمدے کے پختہ فرش پر رات کے پرہول سناٹے میں آہٹ ابھری۔ رحیم داد نے دھندلی روشنی میں دیکھا۔ احسان شاہ اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ کبل اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے پیچھے رختے سر جھکائے چپ چاپ چل رہی تھی۔ رحیم داد اور نواز اٹھ کر تیز قدموں سے احسان شاہ اور رختے کے قریب پہنچ گئے۔

احسان شاہ نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ کمرے کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا۔ رحیم داد رختے اور نواز جہاں تھے وہیں رک گئے۔ احسان شاہ کے اشارے پر نواز نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ احسان شاہ اندر داخل ہوا۔ نواز اور رختے نے بھی اس کے ساتھ کمرے کی دہلیز عبور کی۔ رحیم داد دروازے کے باہر ہی کھڑا رہا۔ احسان شاہ نے ہاجراں کی لاش دیکھی اور فوراً کمرے سے باہر آگیا۔ رختے بھی باہر آگئی، نواز بھی رختے نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ بند کر دیا۔

احسان شاہ نے نواز سے کہا۔ ”تو جا کر مہربان علی کو بلا لا۔“

نواز نے لالین رختے کے حوالے کی اور برآمدے کی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ احسان شاہ نے اسے ٹوکا۔ ”غصہ جا۔“ نواز رک گیا۔ احسان شاہ نے کہا۔ ”مہربان کے آنے تک میں دیوان خانے کے پچھلے کمرے میں رہوں گا۔“ اس نے برآمدے میں کھلنے والے دروازے کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”تو مہربان کو پہلے ادھر ہی لانا۔ جب وہ لاش دیکھ لے تب اسے میرے پاس بھیج دینا۔“

نواز چلا گیا۔ احسان شاہ نے رختے سے کہا۔ ”رختے! تو جا کر کمرے کے آتش دان میں کوئلے لگا دے۔ میں چوہدری کے ساتھ وہیں آ رہا ہوں۔“

رختے نے خاموشی سے لالین دیوار کے پاس رکھ دی۔ رحیم داد گم صم تھا۔ رات ڈھلنے لگی تھی، سردی بڑھ گئی تھی۔ ہوا میں تیزی اور کاٹ تھی۔ احسان شاہ نے کمرے کے دروازے کی باہر سے کنڈی چڑھا دی اور رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری، میرے ساتھ آ۔“ رحیم داد خاموشی سے اس کے ہم راہ چلنے لگا۔

دونوں کے قدموں کی آہٹ فرش پر آہستہ آہستہ ابھر رہی تھی۔ رحیم داد سردی سے تھر تھرا رہا تھا۔ دونوں نے برآمدہ عبور کیا، کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ آتش دان میں آگ

پہلے بھی ایک دن ایسے ہی خود کشی کر چکی ہے۔ پر اس نے گردن میں پھندا نہیں ڈالا تھا۔“

”وہ کون تھی، اس نے کیا کیا؟“ رحیم داد نے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے توجی لپ سے تیل نکال کر کپڑوں پر جھڑکا، کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگئی۔“ نواز نے رحیم داد کو بتایا۔ ”برسات کی اندھیری رات تھی۔ اوپر بادل گہرے ہوئے تھے۔ اس نے کپڑوں پر آگ لگائی۔ میں پہنچا تو وہ بہت جل چکی تھی۔ سمجھو سبک رہی تھی۔“

نواز تھا تو ادھیڑ مگر اس کا جسم ابھی تک مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ نڈر اور حوصلہ مند بھی تھا۔

رحیم داد نے دہشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

”اس کی لاش شاہ جی نے نہر کے کنارے کئی میل دور ادھر جھنگر میں پھنکوا دی تھی۔ رات ہی کو جانوروں نے گوشت نوج نوج کر لاش اتنی بگڑ دی کہ پہچان میں نہیں آتی تھی۔“

”کیا اس بار بھی وہ ایسا ہی کرے گا؟“ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

”پتہ نہیں جی، اس دفعہ لاش کا کیا بنے؟“ نواز نے آگ کریدتے ہوئے کہا۔ ”ویسے باغیچے کے اس طرف درختوں کے نیچے پہلے بھی دو لاشیں دبائی گئی تھیں۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر جھنڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ”ایک کو توجی نشے میں شاہ جی کے یا رنواب امتیاز خاں اعوان نے گلا دیا کہ مار ڈالا تھا۔ وہ لوہور میں ہوتا ہے۔ پہلے اس کا ادھر بہت آنا جانا تھا۔ پر اب اس کا آنا جانا کم ہو گیا ہے۔ بہت دنوں سے تو آیا ہی نہیں۔ ویسے اس کے پترے شاہ جی کی ایک دھبی دیا ہی ہوئی ہے۔“

رحیم داد سخت پریشان تھا۔ گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ”نواز تو یہاں کب سے لگا ہے؟“

”پندرہ سال سے اوپر تو ہو گئے ہوں گے۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کے بولا۔ ”ہاں جی اتنا ہی عرصہ ہوا ہو گا۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے میں شاہ جی کے پاس لگ گیا تھا۔ ان دنوں توجی ٹکڑا جوان ہوتا تھا۔ ساری جوانی یہاں ختم کر دی۔ میں نے کیا کیا نہیں دیکھا؟ رختے بھی میرے سامنے ہی آئی تھی۔“

”تو نے رختے سے ویاہ کیوں نہ کر لیا؟ تیرے لکر کی ہے۔“ رحیم داد نے ذہن کا بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے اسے چھیڑا۔

”نہیں جی، اب بھی اس کا نکھر بہت ہے۔ ویسے جی، میری اپنی گھروالی ہے۔ حویلی کے اندر نوکرانی ہے۔ وہ رختے سے بہت خار کھاتی ہے۔ حویلی کی ساری ہی زنانیاں اور زمیں داریاں رختے سے خار کھاتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رختے بھی بہت تیز ہے۔ تیس نوں پتہ نہیں، بہت کڑوی اور

روشن تھی۔ رتے سر جھکائے پوکرے کوٹے اور لکڑی کے ٹکڑے الٹ پلٹ کر آج تیز کر رہی تھی۔

احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے قریب ہی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ رتے دونوں سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ ابھری اور تیوری پر ہل پڑ گئے۔ وہ زور سے دھاڑا۔ ”کتی۔“ شدید غصے سے اس کی گھٹی مونچھیں ابابیل کے پردوں کے مانند پھڑپھڑانے لگیں، آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔

رتے نگاہیں جھکائے دم بخود کھڑی تھی۔

احسان شاہ برسنے لگا۔ ”یہ سب کچھ تیری وجہ سے ہوا۔ توں نے اسی کجبری کو چوہدری کے پاس پہنچانا تھا۔ کوٹ میں کوئی اور رن نہیں تھی؟“

رتے نے دبی زبان سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تو جی یہ سوچا۔۔۔“

احسان شاہ نے رتے کو پوری بات کہنے کا موقع نہ دیا۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”تکو اس نہ کر۔ تیرا مغربی کام نہیں کرتا۔“ وہ غصے سے آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ ”اب تو بڑھی ہو گئی۔ تجھ سے یہ کام نہیں چل سکتا۔ کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔“ وہ غیظ و غضب کے عالم میں بیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر ڈپٹ کر رتے سے بولا۔ ”تو اب یہاں کیوں کھڑی ہے؟ ادھر جا جادھر لاش لٹک رہی ہے۔ نواز کی کوٹھری میں بیٹھ کر مہربان علی کے بچنے کا انتظار کر۔“

رتے نے زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا، گردن جھکائے چپ چاپ چلی گئی۔ رحیم داد ہنوز منہ لٹکائے بیٹھا تھا۔ احسان شاہ نے مڑ کر دیکھا اور اس کی دل جوئی کرتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری پریشان نہ ہو، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”شاہ جی! مجھے کیا پتہ تھا، وہ ایسا کرے گی۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔

احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”گلتا ہے، تو بہت گہری نیند سو رہا تھا۔“

”وہ ایسا ہوا کہ تیرے جانے کے بعد بھی پیتا رہا۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ ”آج کچھ زیادہ ہی ہو گئی۔ تب ہی تو ایسا بے خبر ہو کر سویا۔ پتہ ہی نہ چلا، وہ کب کمرے سے گئی اور کب اس نے یہ کارروائی کی؟ میری آنکھ تو شول کے گرنے سے کھلی جس پر چڑھ کر اس نے اپنی گردن میں پھندا ڈالا تھا۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”شاہ جی، ویسے دیکھنے میں تو بہت سیدھی سادی لگتی تھی۔“

”تو ابھی بالکل اتاری ہے۔“ احسان شاہ نے اپنی مونچھ کو انھیں سے آہستہ آہستہ مروا۔ ”ہر

زنانی ایک سی نہیں ہوتی۔ کوئی ایک دم ڈھرے پر آجاتی ہے۔ کوئی بہت دھیرے دھیرے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”گلتا ہے یہ بھی ایسی ہی تھی۔ ابھی کچی تھی۔ رتے اسے جلد ہی نکال لائی۔ مینے دو مینہ کوٹ میں رہتی۔ دوسری زنانوں سے ملتی جلتی۔ انھیں دیکھتی تو خود ہی ایک دم لائن پر لگ جاتی۔ میں تجھے ایک داکھ سنا ہوں۔“

لیکن احسان شان وہ واقعہ نہ سنا سکا۔ مہربان علی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دونوں کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ وہ پست قد اور تنومند تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں مگر ان میں تیز چمک تھی۔ ہلکی ہلکی مونچھوں میں سفید بال زیادہ تھے۔ رنگت سرخی مائل گندمی تھی۔ وہ سانٹھ کے پینے میں تھا مگر کاٹھی اچھی تھی۔ وہ اس وقت اپنی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

”لاش تو نے دیکھ لی؟“ احسان شاہ نے مہربان علی سے پوچھا۔

”دیکھ لی جی۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”اے اتار بھی لیا ہے۔ میں رانا اور علیا کو اپنے ساتھ ہی لے آیا تھا۔ ویسے راکھانواز بھی موجود ہے۔“

”اب کیا ارادہ ہے؟“ احسان شاہ نے مہربان علی کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔ ”رات ہی کو سب کچھ کرنا ہے۔“ احسان شاہ نے مڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”چوہدری ٹائم کیا ہو گیا؟“

رحیم داد نے گھڑی دیکھ کر بتایا۔ ”اڑھائی بجے والا ہے۔“

”ٹائم تو اب زیادہ نہیں رہا۔ جو کچھ کرنا ہے، جھیتی کرنا ہو گا۔“ مہربان علی نے رسان سے کہا۔ ”میں نے تو جی یہ سوچا ہے، سرکٹ کر کسی جھنگر میں دبا دیا جائے اور صرف دھڑچاڑ پانچ میل آگے نہر میں ڈال دیا جائے۔“ وہ نہایت سکون سے سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات سے خالی تھا۔ ”ایسا کرنے سے لاش کے بارے میں سراغ ہی نہ لگ پائے گا۔ ویسے آگے شاہ جی، جیسی نیری مرضی۔“

”کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔“ احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر کہا۔ ”پر یہ بھی سوچ لے پولیس آخر پولیس ہی ہوتی ہے۔ اپنے ہی مونسے کی رن ہے۔ پولیس تفتیش کرتی ادھر بھی آسکتی ہے۔ اسے یہ پتہ تو چل ہی جائے گا، کسی کی گھر والی ادھر غائب ہوئی ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر در سے مہربان علی کا چہرہ دیکھا۔ ”اے پچھلے ہی ہفتے تو اٹھوایا ہے۔ تازہ تازہ معاملہ ہے گڑبڑ نہ دجائے۔ دیسے ہونا ہونا کیا ہے۔ خاما خا ہزار ہزار خرچ ہو جائیں گے۔ مہربان کچھ اور ہی

”سوچنا کیا ہے جی۔“ مریان علی نے فیصلہ کون لے جانے میں کہا۔ ”ہمیں باغیچے میں گڑھا کھود کر دبا دیتے ہیں۔“

”یہی ٹھیک رہے گا۔ تاہم بھی زیادہ نہیں۔ تو ابھی سارے چکروں سے بچ جائے گا۔“ احسان شاہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”توفیر جی میں رانا اور علیا کو گڑھا کھودنے پر لگائے دیتا ہوں۔ ابھی تو رات رہتی ہے۔ سنا تا بھی ہے۔ گڑھا کھودنے کی آہٹ بھی نہ ابھرے گی۔“

”ٹھیک ہے ایسا ہی کر۔“ احسان شاہ نے سر ہلا کر کہا۔ ”اب دیر نہ کر۔ یہاں سے جا۔“

مریان علی خاموشی سے مڑا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ آتش دان میں انگارے خوب دھک رہے تھے۔ کمرے میں بکھری ہوئی روشنی زیادہ گہری سرخ ہوتی جا رہی تھی۔ احسان شاہ کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اس نے منہ پھاڑ کر جمانی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”کہاں چلا شاہ جی؟“

”چوہدری! میں نوں اب جاتا ہے۔ نیند لگ رہی ہے اور میں نے سویرے لیور بھی جاتا ہے۔ تو آرام سے ہمیں بیٹھا رہ۔ تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچنے ہی تجھے لینے کوئی نہ کوئی آہی جائے گا۔ چوہدری فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

احسان علی شاہ دروازے کی جانب بڑھا اور باہر چلا گیا۔ رحیم داد چپ بیٹھا رہا۔ کمرہ اب خوب گرم ہو چکا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ وہیں سو جائے لیکن کچھ ہی دیر بعد رختے کمرے میں داخل ہوئی۔ ”چوہدری! میں نے تیرا سامان دوسرے کمرے میں پہنچا دیا ہے۔ چل میں تجھے بھی وہیں پہنچا دوں۔“ کمرے سے باہر نکل کر رحیم داد سردی کی اچانک یلغار سے کپکپانے لگا۔ چند قدموں کے فاصلے پر اس نے دیکھا، برآمدے کی عکڑ پر نواز لائین لیے کھڑا ہے۔ اس کی زرد زرد روشنی میں رانا اور علیا ہاتھوں پر باجراں کی لاش اٹھائے کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ مریان علی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ دور سے تینوں سایوں کی مانند دھندلے نظر آ رہے تھے۔ انھوں نے برآمدہ طے کیا۔ باغیچے میں پہنچے اور درختوں کے جھنڈ کی جانب بڑھنے لگے۔

رحیم داد انھیں دیکھتے ہی ٹھک کر رہ گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے ان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ نواز لائین سنبھالے آئے آگے چل رہا تھا۔ رختے بھی ٹھہر گئی۔ اس کی نظریں بھی ادھر ہی اٹھی تھیں۔ رانا اور علیا لاش سنبھالے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مریان علی...

اب نظر نہ آتے تھے۔ درختوں کے نیچے لائین کی روشنی، دھندلا زرد دھاباں کر چک رہی تھی۔ رختے زیادہ دور نہ گئی۔ قریب کے ایک کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھول دیا۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ رختے بھی اندر داخل ہو گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ رحیم داد کو رہ کر باجراں کا خیال آ رہا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں، خوف ناک سیاہ چہرہ، ہونٹوں سے باہر نکلی ہوئی زبان اور کھنٹی ہوئی لمبی گردن۔ وہ سخت بے چین اور پریشان تھا، بے زاری سے بولا۔

”رختے تو جا۔ میں سو جاؤں گا، فکر نہ کر۔“

”سوچ لے۔ تو اکیلا گھبرائے گا تو نہیں۔ باجراں کا خیال تجھے زیادہ ہی تنگ کرے گا۔“ اس کے لہجے میں ہم دردی تھی، چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ ”گھبرا نہیں، تو بول تو ادھر ہی رہ جاتی ہوں۔ تو اپنے بستر پر سو۔ میں دھسا اوڑھ کر دری پر پڑ جاؤں گی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر انکلیٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تو سلگ ہی رہی ہے۔ کمرہ گرم ہے، مجھے سردی نہیں لگے گی۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ جوتے اتار کر بستر پر لیٹ گیا۔ رختے بھی انکلیٹھی کے نزدیک ہی اپنا دھسا اوڑھ کر فرش پر بچھی ہوئی دری پر لیٹ گئی۔ دونوں خاموش تھے۔ باہر تیز ہوا درختوں میں سسکیاں بھر رہی تھی۔ ہوا کے شور کے درمیان رک رک کر کدال سے زمین کھودنے کی آواز رات کے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔ کئی منٹ تک یہ آواز ابھرتی رہی۔ پھر پہنچنے سے مٹی اٹھانے اور ڈالنے کی آواز سنائی دی۔ آخر یہ آواز بھی بند ہو گئی۔

بچھلا پڑھا۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کی گہری خاموشی میں باہر برآمدے میں قدموں کی آہٹ ابھری۔ یہ ایک سے زیادہ افراد کی چاپ تھی۔ چاپ رفتہ رفتہ دور ہوتی گئی۔ سناٹے میں ڈوب کر ختم ہو گئی۔



نہ معلوم رات کتنی گزر چکی تھی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند نہ تھی۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا، پھر اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ انکلیٹھی میں انگارے راکھ کی تہ کے نیچے دھندلے پڑ چکے تھے۔ انکلیٹھی کے نزدیک رختے کمرے کے بل سو رہی تھی۔ رحیم داد کا اندازہ یہی تھا۔ وہ ٹانگیں پیارے، تکیے کے سہارے کر نکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

اس نے سامنے دری پر لیٹی ہوئی رختے کو گردن موڑ کر ایک بار پھر دیکھا۔ بستر سے نیچے اترا اور

دبے دبے قدموں چلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ رتمے کی پشت اس کی جانب تھی۔ رحیم داد نے رمان سے پکارا۔ ”رتمے!“ مگر اس نے نہ کروٹ بدلی نہ کچھ بولی۔ خاموش لیٹی رہی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے آہستہ سے جھنجھوڑا۔ وہ اس وقت گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔

اس بار رتمے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لیکن سر جھکائے فرش کو دیکھتی رہی۔

”انگلیکھی بجھ گئی ہے۔“ رحیم داد نے اظہارِ ہم دردی کیا۔ ”تجھے سردی تو نہیں لگ رہی؟“ رتمے نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے اس دفعہ بھی نرمی سے کہا۔ ”لگتا ہے تجھے نیند نہیں آرہی۔“

وہ پھر بھی نہ بولی۔ خاموشی سے گردن کو خم دے کر اپنا چہرہ رحیم داد کے سامنے کر دیا۔ لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد نے دیکھا، رتمے کی پلکیں بھیگی ہوئی ہیں۔ زخموں پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔

”رتمے! تو رو رہی ہے۔“ رحیم داد اس کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گیا۔

”ہاں چوہدری! مجھے نیند نہیں آرہی۔“ رتمے دل گرفتہ ہو کر بولی۔ ”سمجھ نہیں آتی یہ کیا ہو گیا؟“

”جو ہوتا تھا ہو گیا۔“ رحیم داد نے اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش کی۔ ”انتانہ سوچ۔ کچھ دیر آرام کر لے۔“

”کیا کروں، نیند ہی نہیں آرہی۔“ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”غلطی تیری نہیں۔ سارا کعبہ میرا ہی ہے۔ شاہ جی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں باجراں کو تیرے کمرے میں نہ لاتی تو وہ اس طرح گلے میں پھندا ڈال کر نہ مرتی۔ اس کی لاش اس طرح چوری چوری رات کے اندھیرے میں درختوں تلے گڑھا کھود کر نہ دبائی جاتی۔“ رتمے بات کہتے کہتے سکپاں بھرنے لگی۔ رحیم داد بھی افسردہ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے منزلانے لگے۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی تھی۔ چند لمحوں بعد خاموشی میں رتمے کی بوجھل آواز ابھری۔ ”چوہدری! میں نے بہت برا کیا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”باجراں کے دو ننھے ننھے نکے ہیں۔ گھر والا بھی ہے۔ انھیں کچھ پتہ نہیں کہ باجراں کا کیا بنا۔ وہ تو اس کا انتظار کرتے ہوں گے۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ رتمے نے آنسو پونچھے اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں بت بنے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ رک رک کر سانس بھرتے رہے۔ کمرے میں گہرا سکوت تھا اور باہر درختوں میں سرما کی پھری ہوئی ہوا فرانے بھر رہی تھی۔

رحیم داد نے نظر بھر کر رتمے کو دیکھا۔ اس کا بدن قدرے پھیل گیا تھا مگر ابھی تک گداز اور کسا ہوا تھا۔ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بے قرار ہو کر ایک ہاتھ بڑھایا۔ رتمے کی کمر کو آہستہ سے چپکا۔ نرم لمبے میں بولا۔ ”تو نے کوئی غلطی نہیں کی۔ اب باجراں کو بھول جا۔“ اس نے رتمے کو ہولے سے اپنے قریب لانے کی کوشش کی۔ ”چل، ذرا دیر منجی پر آرام کر لے۔“

رتمے کسمائی۔ اس نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے علیحدہ کر دیا۔ عاجزی سے بولی۔ ”نہیں چوہدری! میں نے اب آرام نہیں کرتا۔“ وہ ہٹ کر ذرا دور چلی گئی اور آہستہ آہستہ دروازے کی جانب بڑھی۔

”کہاں جا رہی ہے؟“ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

”مجھے اپنے بچوں کے پاس جانا ہے، وہ اکیلے ہیں۔“ رتمے ٹھہرنے پر رضامند نہیں ہوئی۔

”ایسا ہی تھا تو ادھر آئی کیوں تھی؟“ رحیم داد نے ناگواری سے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”نراض نہ ہو۔“ رتمے نے عاجزی سے کہا۔ ”تو بہت ڈرا ہوا تھا! اکیلا بھی تھا۔ اب تو نہ ڈرا ہوا ہے، نہ اکیلا ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ لمبے میں اور زیادہ نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”چوہدری! مجھے اب جانے دے۔ راکھا اپنی کوٹھری میں موجود ہے۔ جاگ بھی رہا ہے۔ کوئی کام ہو تو اسے بتا دیتا۔“

اسی وقت باہر پیرے دارنواز زور سے کھکارا۔

رتمے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور باہر چلی گئی۔ رحیم داد کو دوبارہ اسے روکنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ برآمدے میں رتمے کے قدموں کی آہٹ چند لمحوں تک سنائی دیتی رہی۔

صبح رحیم داد نے احسان شاہ کے ساتھ ناشتا کیا۔ احسان شاہ نماذھو کر آیا تھا۔ وہ تروتازہ اور شاس باشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے باجراں کی خودکشی اور اس کی لاش ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں کی قسم کا تذکرہ نہ کیا۔ رحیم داد نے بھی ایسی کوئی بات نہ چھیڑی۔

ناشتے سے فارغ ہو کر احسان شاہ حویلی سے باہر نکلا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ تھا۔ حویلی کے ہالک کے عین سامنے احسان شاہ کی لمبی چوڑی امپالا صبح کی ہنسی دھوپ میں جھل ملا رہی تھی۔ حسان شاہ نے یہ کار بچھلے ہی دنوں خریدی تھی۔ وہ رحیم داد کو اسے دکھانے ہی کے لیے حویلی سے ابھرایا تھا۔ رحیم داد چمکتی دمکتی امپالا دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔

احسان شاہ اپنے میجر مریان علی اور ایک خدمت گار کے ہم راہ کار میں سوار ہوا۔ کار کا انجن اگلے سے اشارت ہوا۔ کار آگے بڑھی۔ رحیم داد خاموش کھڑا لاہور کی سمت دوڑتی ہوئی امپالا کو

پہرہوں گزر چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ رحیم داد کو چپکتی ہوئی اجلی اجلی دھوپ خوش گوار معلوم ہوئی۔ وہ حویلی میں واپس نہ گیا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ رینگ کی بوائی ہو چکی تھی۔ گندم کے نازک پودے بیجوں سے پھوٹ کر ہاتھ بھراؤنے ہو گئے تھے۔ سرس اور مٹر کے پودے بھی ہوا کے نرم جھونکوں سے گندم کے ساتھ جھوم رہے تھے۔ کھیتوں میں سبزے کی اونچی نیچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ رحیم داد لوٹی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے نیچے گرم کوٹ بھی تھا۔ سرد ہوا سے محفوظ رہنے کے لیے گردن اور کانوں کے گرد ادنیٰ مظہر لپیٹے ہوئے تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ کی حرارت اور گرمی سے لطف اندوز ہوتا وہ آگے بڑھتا گیا۔

کھیتوں کے ایک طرف جوہ تھا۔ جوہ میں نو عمر لڑکے کو کلا چھپا کی کھیل رہے تھے، شور مچا رہے تھے۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دھوپ اور بھاگ دوڑ سے جسموں میں حرارت اور چستی پیدا کر رہے تھے۔ ان کے آس پاس مویشی اور چوکھر گردنیں جھکائے، جگہ جگہ چرائی میں مصروف تھے۔ ان کے گلوں میں پڑی ہوئی پیتل کی گھنٹیاں رک رک کر بج رہی تھیں۔ جوہ کے اختتام پر مٹی سے لپے پنے مکانات دھوپ میں کچھ اور نکھر گئے تھے۔

رحیم داد ہلپے پر چلتا ہوا ایک موڑ پر مڑا تو سامنے سے ماکھا آتا ہوا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے دور ہی سے پہچان لیا۔ مگر ماکھا نے اسے نہیں پہچانا تھا۔ وہ قریب پہنچا تو رحیم داد کو اپنے روبرو روک کر حیرت سے بولا۔ ”چوہدری! تو ادھر ہے! میں نوں بالکل پتہ نہ تھا تو یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ میں تو تیرے پنڈ آنے والا تھا۔“ خوشی سے اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کے پوچھا۔ ”تیری گھر والی ریلی۔“ وہ ٹٹکا اور بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”میرا مطلب ہے سگراں تو ٹھیک ٹھاک ہے، راضی خوشی ہے۔“

”بالکل راضی خوشی ہے جی۔ تیرے بارے میں تو اکثر پوچھتی رہتی ہے۔ تو میرے ساتھ گھر چل۔ تجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوگی۔“

رحیم داد اس کے ہم راہ چلنے پر رضامند نہ ہوا، سنجیدہ چہرہ بنا کر بولا۔ ”ماکھے مجھے حویلی واپس جانا ہے۔ وہاں کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“

”حویلی تو میں نوں واپس جاتا ہی ہے۔“ ماکھا گڑگڑا کر عاجزی سے بولا۔ ”میں معمولی مزارع ہوں۔ تو میرے گھر چلا جائے گا تو میری عزت بڑھ جائے گی۔ مجھے اور سگراں دونوں کو بہت خوشی

ہوگی۔“ اس کے لمبے میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”چوہدری! تو نے میرا جزا ہوا گھر آباد کر دیا۔ میرا بازو واپس دلا کے مجھے بربادی سے بچالیا۔ تیرے لیے میرے دل سے کتنی دعا نکلتی ہے، میں تجھے بتا نہیں سکتا۔“

رحیم داد پھر بھی ماکھا کے گھر جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ مگر اس کے بار بار انکار کے باوجود ماکھا نہ مانا۔ وہ منت ساجت پر اتر آیا۔ اصرار کر کے رحیم داد کو اپنے گھر لے ہی گیا۔ ماکھا اس کے ساتھ گھر کے صحن میں داخل ہوا۔ اس نے جھپاک سے دھوپ میں چارپائی لا کر ڈالی، کھیس بچھائی۔ رحیم داد سے چارپائی پر بیٹھے کوکھا۔ ماکھا خوشی سے پھولا نہ ساتا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے پکارا۔

”سگراں ادھر تو آ، دیکھ آج اپنے گھر کون آیا ہے۔“

صفراں، اونٹ کے عقب سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس کے دونوں ہاتھ گوبر سے لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو دیکھا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی حیرت مسرت میں بدل گئی۔ اس نے رحیم داد کو سلام کیا اور معذرت کی۔ ”چوہدری، معاف کرنا۔ میں ابھی تیرے پاس آتی ہوں۔“ صفراں کچھ ہی دیر بعد دھوپ کے پلو سے ہاتھ پونچھتی ہوئی واپس آگئی۔

ماکھا نے بیوی سے کہا۔ ”سگراں! تو چوہدری کو لسی پلا۔ آرام سے گل بات کر۔ میں باہر جا رہا ہوں، ٹائف لوٹ آؤں گا۔“

رحیم داد نے ماکھا کو روکنا چاہا مگر وہ تیزی سے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ رحیم داد دھوپ میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ صفراں بھی جا چکی تھی۔ رحیم داد تمہارہ گیا تھا۔ دھوپ میں حرارت بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد نے گردن اور کانوں کے گرد لپیٹا ہوا مظہر اتار دیا۔ لوٹی بھی اتار کر ایک طرف رکھ دی۔

صفراں لسی سے بھرا ہوا گلاس لائی اور رحیم داد کے سامنے جھک کر پیش کیا۔ صفراں نے چہرے کو سوتی دوہرے ڈھک لیا اور رحیم داد کے سامنے فرش پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد نے لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے صفراں کو غور سے دیکھا۔ یہ وہ صفراں نہ تھی جس کے گلابی چہرے پر ہر لمحے بکھرتی ہوئی مسکراہٹ کے باعث احسان شاہ چاہت اور پیار سے ریلی آتا تھا۔ وہ ایک مرتبہ رحیم داد کے پاس بھی آئی تھی۔ مگر اب اس کا نرم و گداز بدن درخت کی خشک شاخ کی مانند مرجھا گیا تھا۔ جھلمل کرتی سیاہ آنکھوں کے چپکتے دکتے ستارے جھگ گئے تھے۔ چہرہ زرد اور مٹایا پڑ گیا تھا۔ وہ لمبھی دوہراوڑھے تھی۔ اس کی بوسیدہ نیلی جھکی کمر کے پاس سے ادھڑی ہوئی تھی۔ وہ میلی سفید

دھوٹی باندھے ہوئے تھی۔ دھوٹی پر جگہ جگہ دھبے تھے۔ وہ اجڑی اجڑی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد اسے حیرت سے دیکھتا رہا۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”سگراں! یہ تجھے کیا ہو گیا؟“
”میں نوں تو جی کچھ نہیں ہوا۔“ وہ سادگی سے بولی۔

”تو پہلی سی سگراں ہی نہیں رہی۔“ رحیم داد کے لہجے میں ہم دردی نمایاں تھی۔ ”جج کہہ رہا ہوں۔ بالکل ہی بدل گئی۔ جب تک شاہ جی کے کوٹ میں تھی، سوہنی اور جوان ہوتی تھی۔ لگتا ہے تو یہاں راضی خوشی نہیں۔“ رحیم داد نے تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ ”تو نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ ماکھانے تیرا ناس مار دیا۔“

”چوہدری! ایسا نہ کہہ۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”ماکھا تو مجھے بہت پیار کرتا ہے۔ سر میں ذرا درد بھی ہو جائے تو گھبرا جاتا ہے۔ بھاگا بھاگا حکیم کے پاس جاتا ہے۔ میرا سر دباتا ہے، اپنے ہاتھ سے دوائی کھلاتا ہے۔“ وہ لہک لہک کر بتا رہی تھی۔

”میں جی اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔“

”مجھے تو خوش نہیں لگتی۔ حویلی میں تو تیری اور ہی بات تھی۔ برا نہ منانا۔ اب تو جیسے لال لال انگارے سے بچھ کر اکھ رہ گئی ہے۔“

”چوہدری! ایسی باتیں نہ کر۔ وہ بھی کوئی زندگی تھی۔“ اس دفعہ مغراں کا لہجہ تند اور تیکھا تھا۔ ”کبجریوں سے بھی خراب زندگی تھی وہ۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”ویسے کھانے پینے کو تو ادھر کوٹ میں بہت چنگا ملتا تھا۔ کام کاج بھی کرنا نہیں پڑتا تھا۔ ہر روز شام کو بتاؤ سنگھار کرنا پڑتا۔ کب شاہ جی کا بلاوا آجائے اور کب اس کا کوئی مسمان آجائے؟ ایک سے بڑھ کے ایک شرابی کبابی مسمان۔ ایک سے ایک گند اکتا۔ تو ہی بتا، یہ کیا زندگی ہوئی؟“

”پر دیکھنے میں تو وہاں بہت خوش نظر آتی تھی۔“

”تجھے کیا پتہ چوہدری۔ توں نیک بندہ ہے۔ میں تیرے پاس پوری ایک رات رہی تو توں مجھ سے الگ رہا۔“ اس کے چہرے پر یاسیت چھا گئی۔ ”پر شاہ جی! میں تجھ کو کیا بتاؤں کیسا گندہ ہے وہ! شراب پی کے تو وہ آدمی ہی نہیں رہتا۔ اور اس کے یار، وہ بھی اتنے گندے اور خراب ہیں کہ ان کے بارے میں جب سوچتی ہوں تو اپنے سے بھی گھن آتی ہے۔ میں پانچ سال تک اس کبجری خانے میں رہی۔ اس میں جاکر زانی، زانی نہیں رہتی کبجری بن جاتی ہے۔“

رحیم داد نے محسوس کیا کہ احسان شاہ کی حویلی کے ذکر نے مغراں کو اداس کر دیا ہے۔ اس کا روکھا اور مرجھایا ہوا چہرہ کھنڈر نظر آنے لگا۔ رحیم داد نے فوراً گفتگو کا رخ موڑ دیا۔ ”ادھر ادھر گردن

تھا کر پوچھا۔

”یہ ماکھا کہاں چلا گیا؟“

”آتا ہی ہو گا جی۔ چوہدری! توں آرام ٹال بیٹھ۔ اب آیا ہے تو روٹی کھا کر ہی جانا۔“
”میں اتنی دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“ رحیم داد نے اپنی مجبوری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔
”حویلی میں میرا انتظار ہوتا ہو گا۔“

”پر شاہ جی تو اپنی موٹر میں بیٹھ کر لوہا لگیا ہے۔ ماکھا مجھے بتاتا تھا۔“ مغراں نے دہلی زبان سے کہا۔
”ویسے میرا کہاں توں شاہ جی کی حویلی میں نہ ٹھہرا کر گندی جگہ ہے۔ میں تو تجھے کہتی ہوں اس کی باری بھی چھوڑ دے۔ وہ بہت خطرناک بندہ ہے، توں اسے نہیں جانتا۔“

”میں تو اس کے پاس ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ کسی کام کے بغیر میں اس کے پاس نہیں آتا۔“

”یہ تو مجھے بھی لگتا ہے۔“ مغراں آزر دگی سے بولی۔ ”میں تجھے ٹھیک طرح جانتی ہوں، سمجھتی ہوں۔ توں بہت نیک بندہ ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مغراں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”چوہدری! میں ابھی آتی ہوں۔“ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ گھر سے باہر چلی گئی۔

رحیم داد اکیلا صحن میں چارپائی پر بیٹھا رہا۔ پانچ منٹ گزرے، دس منٹ گزرے، پندرہ منٹ گزر گئے۔ رحیم داد اکٹا گیا۔ مغراں واپس نہ آئی، البتہ ماکھا آ گیا۔ اس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ دمنع قطع سے وہ بھی مزارع ہی لگتا تھا۔

وہ سانولی رنگت کا دراز قد، مضبوط اور چھریا آدمی تھا۔ سر اور کانوں کو میلی کچیلی چادر کے کونے سے چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے رحیم داد کو اونچی آواز سے سلام کیا۔ ماکھا کیساتھ وہ بھی رحیم داد کے سامنے صحن کے کچے فرش پر بیٹھ گیا۔

ماکھا بولا۔ ”چوہدری! میں اسی کے بارے میں بات کرنے تیرے پاس آنے والا تھا۔“ اس نے رُک کر قریب بیٹھے ہوئے دراز قد شخص کی جانب دیکھا۔ ”اس کی گھر والی کو شاہ جی نے اٹھوایا ہے۔ اس بارہ روز ہو گئے۔“

ماکھا کے لہجے میں التجا تھی۔ ”چوہدری! جیسے تو نے میری مدد کی، ایسے ہی اس کی بھی مدد کر دے۔ اس کا بازو واپس دلادے۔ شاہ جی تیری گل ضرور مان لے گا۔“ ماکھا نے اس شخص کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کا ناں عالم ہے جی۔“

عالم کا نام سنتے ہی رحیم داد سخت پریشان ہو گیا۔ وہ باجراں کا شوہر تھا۔ رحیم داد کو فوراً کمرے کی چھت سے لٹکتی ہوئی برہنہ لاش کا خوف ناک چہرہ یاد آ گیا۔ اس نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا، ماکھا کو بے چینی سے دیکھا۔

”ماکھے! تجھے کیسے پتہ چلا شاہ جی نے عالم کی گھر والی کو اٹھوایا؟“

ماکھا کے بجائے عالم بولا۔ ”وہ ایسا ہے چوہدری، شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔“

”شاہ جی، تجھے کیوں بے دخل کرنا چاہتا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”بہت پرانا جھگڑا ہے جی۔“ عالم نے بتایا۔ ”میرا پنڈ پیلے لالہ کرشن دیال کی زمیں داری میں ہوتا تھا۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ نظر بھر کے دیکھا۔ ”لالہ کرشن دیال تیرے پنڈ کی زمیں داری جیلہ کا پیو تھا۔ سنا ہے اب تو وہ مر گیا۔“

عالم کے چہرے پر جھنجھلاہٹ ابھرنے لگی۔ ”پر جی وہ اور اس کا مینجر بنی لال مزارعوں پر بہت ظلم کرتے تھے۔ میں بھی اس کا مزارع تھا۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے عالم۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا پنڈ کو ٹلہ ہر کرشن بھی اس کی زمیں داری میں ہوتا تھا۔ میرے مزارعے بھی لالہ کرشن دیال اور بنی لال کے بارے میں یہی بتاتے ہیں۔“

”چوہدری! اصل بات یہ ہے۔“ عالم نے بتایا۔ ”ادھار دے دے کر اس نے بیاج کے پھندے میں مزارعوں کو ایسا باندھ رکھا تھا کہ واڈھی کے بعد ساری کی ساری فصل اس کے گوداموں میں چلی جاتی۔ ادھار تب بھی ختم نہ ہوتا۔ اس کے فیم اور نشی اپنے ہی کھاتے میں جو چاہتے لکھ لیتے اور مزارعوں سے انگوٹھا لگوا لیتے۔ تیس نوں پتہ ہے چوہدری، مزارعے پڑھے لکھے تو ہوتے نہیں۔“ اس کی آواز میں غم گھلا ہوا تھا۔

”فیم، ادھار کی رقم جتنی چاہتا بڑھا کر لکھ دیتا۔ کسی بھی مزارعے کو ادھار لے کر انگوٹھا لگاتے ہوئے کچھ بھی ملوم نہ ہوتا۔“

رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ ”تجھے تو شاہ جی سے گلہ ہے۔ یہ لالہ کرشن دیال کی بات کہاں لے بیٹھا؟“

”میں شاہ جی ہی کی گل بتانے لگا ہوں۔“ عالم نے جھٹ وضاحت کی۔ ”گل امہ اے جی، جب ۱۹۳۶ء میں انیشن ہو رہا تھا تو شر سے روز ہی مسلم لیگی لیڈر آتے۔ کہتے پاکستان بن گیا تو ہر مزارع اپنی زمین کا مالک بن جائے گا۔ مزارعوں اور کیوں کو بنیوں اور لالوں کی کرض ادھار کے چکر سے

چھنکارا مل جائے گا۔ زمین اس کی ہوگی جو اس پر مل چلائے گا۔“

”شاہ جی بھی لیگی لیڈروں میں شامل تھا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”نہیں جی، وہ تو سدا کا یونینٹ ہے۔“ عالم نے زہر خند سے کہا۔ ”وہ تب بھی یونینٹ پارٹی میں تھا۔ اس نے پاکستان کی سخت مخالفت کی۔ طرح طرح سے بھکاریا، ڈرایا، دھمکایا، دباؤ بھی ڈالا۔ پر جب انکیشن ہوا تو جی سارے ہی مسلمانوں نے مسلم لیگ ہی کے بکسوں میں پرچی ڈالی اور میں نے تو جی، لیگ کو ووٹ دلوانے کے لیے بہت بھاگ دوڑ بھی کی۔ کسانوں کے جتھے بنا کر دور دور کے پنڈ جاتا تھا۔ ہر مسلمان بندے کو پاکستان کا حامی بناتا تھا۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد بتایا۔ ”میں تو جی شاہ جی اور پولیسوں کی بار بار کی دھمکیوں سے بھی نہ ڈرا۔ ان دنوں جی بہت جوش بھرا ہوا تھا۔“ عالم کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”پاکستان آخر بن ہی گیا۔ پر پاکستان بننے ہی تیس نوں پتہ ہے شاہ جی نے کیا کیا؟“

”کیا کیا اس نے؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ جھٹ مسلم لیگی بن گیا۔ اس نے اپنی حویلی پر لیگ کا ہرا جھنڈا لگایا اور پورے پیراں والہ میں مٹھائی بوائی۔ اس نے لالہ کرشن دیال کے مزارعوں کو اکسایا۔ کہا، اس کی زمین پر زبردستی کبہہ کرلو۔ وہ تو جی مزارعوں کو کرنا ہی تھا۔ یہ تو پہلے ہی طے تھا۔ لالہ کرشن دیال اور اس کا مینجر بنی لال سب کچھ چھوڑ چھاڑ بال بچوں کے ساتھ سرحد پار چلے گئے۔“

ماکھا نے عالم کو ٹوکا۔ ”گل چھوٹی کر، تو نے تولی کمانی شروع کر دی۔“

”ٹھیک ہے جی، چھوٹی ہی گل کروں گا۔“ عالم سنبھل کر بولا۔ ”فیر ایسا ہوا جی، شاہ جی نے لالہ کرشن دیال کی چھوڑی ہوئی زمینوں پر خود کبہہ کرنے کا چکر چلایا۔ وہ محکمہ بحالیات کے افسروں سے ملا، ان کو اپنے ساتھ لایا۔ افسروں نے مزارعوں سے کہا، اپنی اپنی زمیں میں سے مہاجروں کو حصہ دو۔ ان دنوں منگھری میں مہاجرین کا بہت وڈا کیپ لگا تھا۔ سرکاری افسروں کے ساتھ مہاجروں کے بھی جتھے آئے تھے۔“

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”ادھر مزارعے اپنی زمین میں سے کوئی حصہ دینے کو تیار نہ تھے۔ روز مہاجروں اور مزارعوں کے درمیان جھگڑے ہوتے۔ خون خرابہ تک ہوتا۔ پولیس آتی۔ جسے جی چاہتا پکڑ کر لے جاتی۔“ عالم نے دھوپ کی تیش محسوس کرتے ہوئے چادر سر اور کانوں پر سے بنادی۔

”وہی تھانے دار جو پاکستان کو گندی گندی گلاں نکالتا تھا اور یونینٹوں اور ان کی حکومت کو

طرح طرح سے خوش کرنے کی کوشش کرتا تھا، اب ہر گھڑی پاکستان، پاکستان کی رٹ لگاتا تھا۔ اور جن مزارعوں اور کسانوں نے پاکستان کے لیے اپنی پرچی ڈالی تھی ان کو حوالات میں التا لٹا کر زبردست مار لگاتا تھا۔

رحیم داؤد نے دریافت کیا۔ ”اب وہ تھانے دار کہاں ہے؟“

”وہ تو جی بہت وڈا پولس انسر بن گیا۔ اس کے کندھے پر زیادہ ہی پھول نظر آتے ہیں۔ آج کل لہور میں ہوتا ہے۔“ عالم کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ ”ادھر تو مہاجروں اور غیر مہاجروں میں دنگے فساد ہوتے تھے اور دونوں ہی کی پولیس کے ہاتھوں پٹائی ہوتی تھی، دوسری طرف شاہ جی نے اپنے میجر مہربان علی اور کندوں کے ذریعے مزارعوں کو ہسلایا پھسلایا کہ وہ اپنی اپنی زمین کا شاہ جی کے ساتھ بیچ کر لیں ورنہ سرکار سارے ہی کا بیض مزارعوں کو بے دخل کر کے زمین مہاجروں میں بانٹ دے گی۔ پولیس نے پہلے ہی بہت تنگ کر رکھا تھا۔ بعد میں پتہ چلا، پولیس بھی شاہ جی کے اشارے پر مزارعوں اور کسانوں کو تنگ کرتی تھی۔ شاہ جی کیپ میں اپنے بندے بھیج کر مہاجروں کو بھی جھگڑا کرنے پر اکساتا تھا۔ آخر ایک ایک کر کے سبھی نے شاہ جی کے ہاتھ بیچ کر کے اسے تین ہزار ایکڑ سے بھی اوپر زمین کا مالک بنا دیا۔“

اس نے گردن اٹھا کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مزارے مزارے ہی رہ گئے۔ زمین کا مالک بننے کا سفنا، سفنا ہی رہ گیا۔“ عالم نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”اس طرح جی میں بھی شاہ جی کا مزارع بن گیا۔ جب لالہ کرشن دیال کی زمینیں شاہ جی کے پاس چلی گئیں تو مجھے بھی فیہ اس کا مزارع تو بننا ہی بننا تھا۔“

ماکھانے اسے پھرنو کا۔ ”عالم تو گل چھوٹی نہیں کر سکتا۔ تیری ایسی ہی گلاں سے تو شاہ جی خار کھاتا ہے۔ تجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔“

”تو بھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے ماکھے۔“ عالم نے تجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر چوہدری یہ تو بتا، ہندو ننہ اور وڈے زمین دار جب کسی مزارع کو بے دخل کرنا چاہتے تو اس کے خلاف عدالت میں تلاش کرتے، ڈگری نکھواتے، کرک لاتے۔ زمین کرک کراتے۔ مال مویشی کرک کرا کے اٹھالے جاتے۔“

اس کی آنکھوں کی چمک تیز ہو گئی۔ ”پر شاہ جی کسی کو بے دخل کرنا چاہتا ہے تو اس کی گھرواں اور جوان دھی تک کو اٹھوا لیتا ہے۔“ عالم کی آواز بجھنے لگی۔ ”سکھ اور ہندو ادھر سے گئے تو مسلمان کسان اور مزارع بہت خوش تھے کہ بیوں کے ظلم و ستم اور بیاج کے چکر سے چھٹکارا مل

جائے گا۔ پر یہ پتہ نہ تھا کہ اس سے بھی زیادہ ظلم ہو گا۔ عزت اور آبرو بھی جاتی رہے گی۔“ ”چوہدری، یہ تو ایسی ہی گلاں کرتا ہے۔“ ماکھے نے مداخلت کی۔ ”تو شاہ جی سے اس کا بازو دلا دے۔ اس کی گھرواں کا نام باجراں ہے۔“

”شاہ جی مجھے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ چوہدری، میں اس کے لیے تیار ہوں۔ وہ میرا بازو مجھے واپس دے دے۔ میں پنڈ چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔“ عالم کے لہجے میں درد کی کک پیدا ہوئی۔ ”کیا کیا جائے جی، اپنے نصیب میں یہی لکھا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ماں کے لیے ہر دم روتے ہیں۔ انھیں روتا دیکھتا ہوں تو میری آنکھیں بھی بھگ جاتی ہیں۔ کہتے ہیں زمین کسان کی ماں ہوتی ہے۔ وہ اس سے ویسا ہی پیار کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زمین سے ایسا ہی پیار ہے۔ میں اسی پر پیدا ہوا۔ پلا بڑھا، جوان ہوا۔ پر مجھے اپنی گھروالی سے پیار ہے۔ وہ میرا بازو ہے۔ اس کے بنائے یہ زمین کس کام کی۔ باجراں کے جانے کے بعد میں کچھ نہیں کر سکتا۔ کھیتوں کو دیکھوں یا گھر کو۔ دونوں ہی برباد ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی جی، شاہ جی مجھے رہنے نہیں دے گا۔“ اس نے بے بسی سے رحیم داد کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

”چوہدری! مجھے بے دخلی منظور ہے۔ میں ہار گیا، شاہ جی جیت گیا۔“

رحیم داد گیم میٹھا تھا۔ تاہم اسے کچھ نہ کچھ تو کتنا تھا۔ اس نے نرم لہجے میں مشورہ دیا۔ ”عالم تو ایسا کر۔ شاہ جی سے مل لے، خود جا کے اس سے منت سماجت کر۔ شاہ جی سے نہ ملنا چاہے تو مہربان علی سے گل بات کر۔ جب تو بے دخل ہونے کو تیار ہی ہے تو شاہ جی تیری گھروالی کو ضرور واپس کر دے گا۔ اس نے تجھے بے دخل کرنے ہی کے لیے تو تیری گھروالی کو اٹھوایا ہے۔ یہی گل ہے ناں؟“

ماکھا بولا۔ ”سچی بات تو یہی ہے جی۔“ اس نے مڑ کر عالم کی جانب دیکھا۔ ”عالم تو ایسا کر مہربان علی سے ضرور مل لے۔ شاہ جی تو تجھے ملے گا نہیں۔“

ماکھا کھک کر رحیم داد کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے پیروں کو پکڑ کر ہولے ہولے دبائے لگا۔ ”چوہدری، یہ تو مہربان علی سے مل ہی لے گا پر تو بھی شاہ جی سے اس کا بازو دلانے کے لیے کہنا۔ وہ تیری گل ضرور مان لے گا۔“

رحیم داد کے پاس احسان شاہ سے بات کرنے کا وعدہ کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ ان سے کیا کہتا کہ باجراں اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔ وہ چوند خاک ہو چکی ہے۔ اس نے عالم اور ماکھا کو تسلی دی اور کھڑا ہو گیا۔

اسی وقت صغراں بھاگی بھاگی آئی۔ وہ رحیم داد کے لیے مرغ مل رہی تھی۔ سالوں کی تیز خوشبو گھر بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔
صغراں کو جب یہ معلوم ہوا کہ رحیم داد جا رہا ہے تو وہ اسے روکنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔
بار بار عاجزی سے روکا مگر رحیم داد نہ رکا۔



سورج درختوں کی بلندیوں سے اوپر نکل گیا تھا۔ سائے سینٹے جا رہے تھے۔ جاڑے کی چمکیلی اور شفاف دھوپ میں خوش گوار تمازت تھی۔ رحیم داد واپس احسان شاہ کی حویلی میں پہنچا۔ اس نے حیران و پریشان ہو کر دیکھا، نادر خاں باغ میں کرسی پر بیٹھا ہے۔ رحیم داد تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھا۔

نادر اسے دیکھتے ہی احترازا کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے قریب رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو کیسے ادھر آگیا؟“ اس کے لمبے میں حیرت سے زیادہ تشویش غالب تھی۔
”ایک نئی بات کا پتہ چلا ہے، سوچا تجھے بتا دوں۔“ نادر نے جواب دیا۔ ”ویسے مجھے زمیں دارنی نے سامان کی خریداری کے لیے پاک پتن بھیجا ہے۔ پر میں نے تجھ سے ملنا ضروری سمجھا۔ بعد میں پاک پتن چلا جاؤں گا۔“

”تو ابھی تک کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“ رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ ”آرام سے بتا کون سی نئی گل کا پتہ چلا ہے؟“
”تیرے یہاں آنے کے بعد جلیل اور زینت شام کو اپنے بچوں کے ساتھ پہنچ گئے۔“ نادر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

”حویلی ہی میں ٹھہرے ہیں ناں؟“

”ہاں جی، زمیں دارنی نے انھیں حویلی ہی میں ٹھہرایا ہے۔ تیرے برابر والے خالی کمرے میں تاجاں کے دیباہ تک ٹھہرے رہیں گے۔“

”پر یہ کون سی ایسی بات ہے جسے بتانے تو سویرے ہی سویرے آگیا۔“ رحیم داد نے قدرے بے زاری سے کہا۔ ”جلیل اور زینت کو تو تاجاں کے ویاہ میں شریک ہونے کے لیے آنا ہی تھا۔“

”بات تو جی اصل میں وہ ہے جو کل رات جنت کی زینت سے ہوئی۔ میں تجھے وہی بتانے آیا ہوں۔“ نادر خاں کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”ہوایہ کہ زینت نے باتوں باتوں میں جنت کو بتایا کہ وہ دینا تھا، دہی جو سلامو سے زینت کے بچے کے کر آیا تھا، بعد میں زمیں دارنی سے ملا۔ تیرے اور شاہ جی کے بارے میں اس نے بہت خطرناک باتیں بتائیں۔“

”وہ تو جیلہ کے پاس کئی بار آچکا ہے۔“ رحیم داد تذبذب سے بولا۔ ”ایک بار تو تیرے سامنے بھی آیا تھا۔ میں جب یہاں آ رہا تھا تب بھی وہ مجھے نظر آیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ جیلہ ہی کے پاس جا رہا تھا۔ ورنہ وہ کوئٹہ ہر کشن کیوں آنے لگا؟ ادھر تو اس کا کوئی میل جول کا بھی نہیں۔ جلیل اور زینت بھی تب تک نہیں پہنچے تھے۔“

رحیم داد کے چہرے سے دشت صاف عیاں تھی۔ ”یہ بتا، دینے نے کیا خطرناک باتیں میرے اور شاہ جی کے بارے میں جیلہ کو بتائیں؟“

نادر خاں نے کرسی رحیم داد کے اور قریب کر لی، گردن اٹھا کے چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور راز دارانہ لہجے میں بولا۔ ”زینت کہتی تھی، دینے نے زمیں دارنی کو بتایا کہ تو نے شاہ جی کے ساتھ مل کر اللہ وسایا کو کہاں اور کیسے قتل کرایا؟“ وہ کہتے کہتے ٹھٹکا۔ ”اس نے تو یہاں تک کہا کہ اللہ وسایا کا قتل اس کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔“

”بکو اس کرتا ہے وہ۔“ رحیم داد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ نادر خاں نے اس کی تائید کی اور فوراً صفائی پیش کی۔ ”میں نے تو جو سنا وہ بتا دیا۔ یہ میرا فرض تھا۔ پر یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ اس نے زمیں دارنی سے تیرے اور شاہ جی کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کہیں؟ تیرے ساتھ تو اس کا جھگڑا مٹا بھی نہیں۔“

”جھگڑا مٹنا تو تب ہوتا جب میری اس کے ساتھ جان پہچان ہوتی۔ پتہ نہیں اس نے جیلہ سے میرے خلاف ایسی الٹی سیدھی باتیں کیوں کہیں؟“ رحیم داد کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔ ”نادر! یہ بھی پتہ کیا۔ دینے نے یہ باتیں جیلہ کو کب بتائیں؟ یاد پڑتا ہے، پہلی بار جب وہ جلیل کے ساتھ آیا تھا تو میرے سامنے ہی وہ پال پور دایس چلا گیا تھا۔ جیلہ سے اس کی کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی اس نے دوبارہ آنے کو کہا تھا۔“

”پر وہ دوسرے روز آیا اور زمیں دارنی سے سکول میں دیر تک باتیں کرتا رہا۔ جلیل بھی موجود تھا۔ جلیل نے اس کی باتیں سنیں تو اپنی گھر والی زینت کو بھی بتائیں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دینا خود ہی جیلہ کے پاس آیا تھا۔ یہ تو میں نوں بھی پتہ ہے وہ جیلہ کے پاس دوسرے روز آیا تھا۔ میں نے اسے سکول سے نکلتے دیکھا تھا۔“ رحیم داد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ وہ اللہ وسایا کے قتل کے سلسلے میں نادر خاں کو اعتماد میں لینا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اس کا رویہ بہت محتاط تھا۔ مگر وہ اپنی بڑھتی ہوئی سراسیمگی زیادہ دیر نہ چھپا سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔

”زینت نے جنت کو اور کیا کیا بتایا؟“

”زینت کہتی تھی، زمیں دارنی لوہر جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ وہاں اللہ وسایا کے کیس کی نئے سرے سے تفتیش کرانے کے لیے حکام بالا سے ملے گی۔ وکیل محمد عثمان رندھاوا کو اس نے اسی سلسلے میں صلاح مشورہ کرنے کی غرض سے بلایا تھا۔ اسے بلانے جلیل گیا تھا۔ وہ تو جی زمیں دارنی کے بہت بھروسے کا بندہ ہے۔“

”وکیل تو جیلہ کے پاس کئی بار آیا اور ایک بار بھی مجھ سے نہ ملا۔ میرا تو تب ہی ہاتھ ٹھٹکا تھا، کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ میں نے اس کی آمد و رفت کے بارے میں جیلہ سے پوچھا تو اس نے مجھے کچھ اور ہی گل بتائی۔“

”کیا کہا اس نے؟“ نادر خاں نے پوچھا۔

”کہنے لگی، وکیل کو تو میں نے جبرے کے کیس کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا زمیں دارنی نے تجھے مغالطے میں رکھنے کی کوشش کی۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ زینت کی باتوں سے صاف اندازہ ہوتا ہے، اس نے جنت سے جھوٹ نہیں بولا۔ اس نے جو کچھ بتایا، بار بار تائید کی کہ ان باتوں کا تجھے کسی طور پتہ نہ چلے۔“

”تیرا خیال ٹھیک ہی ہے۔ زینت کیوں جھوٹ بولنے لگی؟“

”جنت نے زینت سے یہ باتیں سنیں تو وہ بہت گھبرا گئی۔ سچ تو یہ ہے جی، میں خود بہت گھبرا گیا۔ رات بھر بے چین رہا اور سویرے اٹھتے ہی تیرے پاس چلا آیا تاکہ تجھے پتہ چل جائے زمیں دارنی کے ارادے کتنے خطرناک ہیں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا، خاموش بیٹھا بیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھری ہوئی تھی۔ آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس نے غصے پر قابو پانے کی بہت کوشش کی مگر جب تند و تیز جذبات نے شدت سے یلغار کی تو وہ پھٹ پڑا۔ ”پر اس سو رے پتر دینے نے جیلہ کو یہ

ابھن میں مبتلا تھا۔ وہ مسلسل دینا کے بارے میں سوچتا رہا جو سنگین خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔



شام کو احسان شاہ حسب وعدہ واپس آگیا۔ واپسی کے کوئی دو گھنٹے بعد اس نے رحیم داد کو اپنے پاس بلایا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ آتش دان میں دھکتے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ روشنی نے فضا کو رنگین بنا دیا تھا۔

رحیم داد میز کے قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھے ہوئے خشک میوے، مٹھائی اور پھلوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”شاہ جی، آج یہ تبدیلی کیوں؟“ اس نے مسکرا کے پوچھا۔

”لہور سے میرے ساتھ میاں عبدالسبحان بھی آیا ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”چوہدری، تو میاں سبحان کو نہیں جانتا۔ بہت وڈا زمیں دار ہے۔ تیرے سامنے یہاں کبھی نہیں آیا۔ ویسے بھی بہت ہی کم آتا ہے۔“

”لگتا ہے بالکل ہی صوفی ہے؟“

احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”پہلے تو بہت پیتا پلاتا تھا۔ پر پچھلے کئی سال سے بالکل چھوڑ رکھی ہے۔“

رحیم داد نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”مہراں علی تو تیرے ساتھ ہی گیا تھا ناں۔ اس نے جیلہ کے بارے میں کیا پتہ لگایا؟“

”ابھی تو کچھ پتہ نہیں چل سکا۔“ احسان شاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے مہراں علی کو لہور چھوڑ دیا ہے۔ وہ ساری معلومات حاصل کرنے کے بعد ہی لوٹے گا۔“

”کب تک واپس آجائے گا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”اسے کل شام تک واپس آجانا چاہیے۔ ویسے ساری باتوں کا پتہ کر کے ہی آئے گا۔“

”آج صبح تیرے لہور جانے کے کچھ ہی دیر بعد نادر یہاں آیا تھا۔“ رحیم داد نے گہری سانس لے کے کہا۔

”کیسے آیا تھا وہ۔ کوئی خاص گل بات تو نہیں؟“

”اس نے تو بہت عجیب گل سنائی۔“ رحیم داد نے اضطراب سے کہا۔ ”میں تو اسے سن کر گھبرا گیا۔ تب سے انتظار کر رہا تھا، تو آئے تو ساری گل بات تجھے بتاؤں۔“

”کیا کہتا تھا؟“ احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر بکھری ہوئی سراپیسگی محسوس کی۔ ”تو کچھ

باتیں بتانے کی ہمت کیسے کی؟“ رحیم داد نے جیکھی نظروں سے نادر کو دیکھا۔ ”تفتیش دوبارہ شروع ہوئی تو وہ سب سے پہلے پھنسے گا۔“

نہ بتانے کی کوشش کے باوجود رحیم داد نے جذبات کی رو میں نادر خاں کو بہت کچھ بتا دیا۔ نادر پرانا گھاگ تھا۔ فوراً بات کی تہ تک پہنچ گیا۔ اس نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے رحیم داد کو خطرے سے خبردار کیا۔

”وہ تو وعدہ معاف گواہ بن کر صاف بچ سکتا ہے۔ میرا تو خیال ہے یہ نکتہ اسے کسی نے بتایا نہ ہوگا“ اسے خود پتہ ہوگا۔ وہ پولس کا منبر ہے۔ گواہیاں پیش کرنا اور سرکاری گواہ مہیا کرنا اس کا روز کا کام ہے۔“ اس نے قیاس آرائی کی۔ ”میرا تو یہ بھی اندازہ ہے جی، زمین دارنی نے دینے کو رشوت کے طور پر کچھ روپے بھی دے دیے ہیں۔ آگے بھی دینے کا وعدہ کیا ہوگا۔“

”دو سو روپے تو اسے جیلہ نے زینت کے بچوں کو لانے کے انعام کے طور پر میرے سامنے ہی دیئے تھے۔“ رحیم داد نے سر ہلا کے کہا۔ ”میرا تو خیال ہے اسی سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ جیلہ سے زیادہ روپیہ انٹھنے کے چکر میں وہ خود ہی اس کے پاس آیا ہوگا۔“ ایک بار پھر اس کا لہجہ تلخ ہو گیا، چہرے پر خشونت برسنے لگی۔ ”یہ ساری بکواس اس نے اسی لیے کی ہے۔“

”ایسا ہی لگتا ہے جی۔“ نادر نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اب وہ زیادہ دیر رکنا نہ چاہتا تھا۔ ”میں نوں پاک چن جاتا ہے۔ شام تک واپس پنڈ بھی پہنچتا ہے۔ زمین دارنی انتظار کرے گی۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔ ”ایسی باتیں سننے کے بعد تجھے بتانا نہ صرف ضروری تھا بلکہ یہ میرا فرض بنتا تھا۔“

”تو نے بالکل ٹھیک کیا، یہ باتیں مجھے بتا دیں۔“ رحیم داد نے نرمی سے کہا۔ ”آگے بھی ایسی کوئی گل بات معلوم ہو تو فوراً مجھے بتانا۔ میرا تو خیال ہے، آگے جنت کو لگا دے۔ وہ زینت کے ذریعے یہ معلوم کرتی رہے جیلہ آگے کیا کیا کرنے کا ارادہ رکھتی ہے؟“

”وہ تو میں نے جنت سے پہلے سے ہی کہہ رکھا ہے۔ کوئی حرج نہ ہو تو اس بارے میں شاہ جی سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ ویسے دینے نے اس کے خلاف بھی بہت سنگین الزام لگایا ہے۔ حالانکہ وہ برسوں اس کا ملازم رہ چکا ہے۔ شاہ جی تو اس کو ایسا فٹ کر دے گا کہ ساری بکواس بھول جائے گا۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں شاہ جی سے ضرور مشورہ کر دوں گا۔ ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔“ رحیم داد نے اس کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ ”اب تو جا۔ تجھے زیادہ دیر نہیں کرنی چاہئے۔“

نادر خاں چلا گیا۔ رحیم داد دھوپ میں کرسی پر بیٹھا رہا۔ نادر سے گفتگو کرنے کے بعد وہ سخت

زیادہ ہی پریشان نظر آ رہا ہے۔

”پریشان ہونے کی بات ہی ہے۔ تیرے پاس ایک نوکر ہوتا تھا۔“ رحیم داد کا لہجہ مدہم پڑ گیا۔
”دینا وہی جسے تو نے دارا کے ساتھ اللہ دسایا کے کتل پر لگایا تھا۔“

”اس کی تو میں نے کب کی چھٹی کر دی۔ ایک رات ساوی کے نشے میں دھت ہو کر اس نے
بست رولا کیا۔ میں نے جوتے لگوا کر اسی رات اسے پنڈے سے نکال دیا تھا۔ بہت زیادہ تنگ کرنے لگا
تھا۔“ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کا چہرہ دیکھا۔ ”پر تجھے اس سے کیا لیتا؟“

”تجھے یہ بھی پتہ ہے، اب وہ کہاں ہے؟“

”بالکل پتہ ہے۔“ احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ ”وہ پولیس کا چڑی چور بن گیا ہے۔
تھانے دار زمان خاں نے اسے مخبر لگا رکھا ہے۔“

”پر تجھے یہ پتہ نہیں، دینے ہی نے زینت کے بچے سلامو سے واپس دلوائے تھے۔ بچوں کو لے کر
وہ زینت کے قصم جلیل کے ساتھ جیل کے پاس پہنچا۔ زینت ان دنوں جیل ہی کے پاس تھی۔“
اس نے قدرے تامل کیا، احسان شاہ کی آنکھوں میں جھانک کر گویا ہوا۔ ”تب سے وہ کئی بار جیل
کے پاس جا چکا ہے۔ نادر اسی کے بارے میں بتانے میرے پاس آیا تھا۔“

”کیا کہتا تھا نادر؟“ احسان شاہ نے چونک کر پوچھا۔

”نادر کہتا تھا، دینے نے اللہ دسایا کے کتل کے بارے میں جیل کو سب کچھ بتا دیا۔“

”نادر کو کیسے اس بات کا پتہ چلا، جیل نے اسے بتایا ہے؟“ احسان شاہ کے چہرے پر غبار پھیل
گیا۔

”بات کچھ اس طرح ہے، زینت نے جنت کو بتایا اور اس نے ساری بات نادر کو بتا دی۔“

کمرے میں سکوت چھا گیا۔ دیکھتے انگاروں کی روشنی میں رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے
سنجیدہ نظر آ رہے تھے۔ رحیم داد اور زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ صبح
نادر خاں سے جو کچھ سنا تھا، احسان شاہ کو تفصیل سے بتا دیا۔

احسان شاہ کچھ دیر کے لیے فکر میں ڈوب گیا۔ مگر جلد ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ
زیر لب مسکرایا۔ ”چوہدری، تو فکر نہ کر۔ دینے کا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔“

مگر رحیم داد مطمئن نہ ہوا۔ اس نے دہلی زبان سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”شاہ جی، یہ تو سوچ
دینا اب تیرا نوکر نہیں رہا۔“

”پر وہ تھانے دار زمان خاں کے ساتھ تو لگا ہوا ہے ناں۔ زمان میرا گریا رہا ہے۔ وہ دینے کو بالکل

ٹھیک ٹھاک کر دے گا۔ تجھے پتہ نہیں، دینے کے خلاف ایک نہیں، جانے کتنے جرائم اور خطرناک
وارداتوں کے کیس ہیں۔ کسی میں بھی اس کو جب چاہے اور جس طرح چاہے گردن سے پکڑ کر دیوچ
سکتا ہے۔ وہ اس کی گرفت سے نہیں نکل سکتا۔“

”دینے کو تو زماں خاں سنبھال لے گا پر جیل کا کیا بنے گا؟ اسے تو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔
وکیل بھی اس کی مدد کر رہا ہے۔“ رحیم داد نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

احسان شاہ نے اس دفعہ کچھ نہ کہا۔ وہ نظریں جھکائے سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں کمرے کا دروازہ
کھلا۔ میاں عبدالسبحان داخل ہوا۔ حویلی کا ایک ملازم اس کے ہم راہ تھا۔ وہ نظریں جھکا کر ایک
طرف خاموش کھڑا ہو گیا۔

میاں سبحان ادھیڑ تھا، جسم بھاری بھر کم تھا اور رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ وہ اور کوٹ پہنے
ہوئے تھا۔ احسان شاہ اسے دیکھتے ہی تپاک سے بولا۔ ”بہت دیر کر دی میاں صاحب، میں تو کب
سے انتظار کر رہا تھا۔“ میاں سبحان نے او کو کوٹ اتار کر ملازم کو دیا۔ اس نے اور کوٹ سنبھال کر
احتیاط سے کھونٹی پر لٹکا دیا۔ ملازم چند لمحے ادب سے گردن نیچی کئے کھڑا رہا، پھر چپ چاپ کمرے
سے باہر چلا گیا۔

میاں سبحان آتش دان کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا
تعارف کرایا۔ میاں سبحان بہت بڑا زمین دار تھا۔ رحیم یار خان کے علاوہ لاکھ پور میں بھی اس
کے مرنے تھے۔ ہزاروں ایکڑ اراضی پر پھیلی ہوئی کھیتی باڑی کے ساتھ ساتھ ’آم‘ امرود اور مالٹے
کے باغات تھے۔ ذاتی شکار گاہ تھی۔ لیکن زمین داری سے زیادہ اسے سیاست سے گہری دلچسپی
تھی۔

میاں سبحان نے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد سیاست کا ذکر چھیڑ دیا۔ احسان علی شاہ
سیاسی جوڑ توڑ کا ماہر تھا اور حکمران طبقے میں اس کا اثر و رسوخ بھی بہت تھا۔ میاں سبحان اس کے
پاس ایک سیاسی غرض سے آیا تھا۔

لیکن رحیم داد کو سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ جلد ہی ان کی سیاسی گفتگو سے بے زار
ہو گیا۔ اس نے آتما کر جمای لی۔ احسان شاہ نے اسے دیکھا، مسکرا کر بولا۔ ”چوہدری! لگتا ہے تجھے
نیند آرہی ہے۔ تو روٹی کھا کر سو جا۔ میں نے میاں صاحب سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے، دیر
تک سلسلہ چلے گا۔ تجھ سے اب صبح آرام سے بات چیت ہوگی۔“

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے

ملازم سے کھانا منگوایا اور کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔



مہران علی دوسرے روز بھی نہ آیا۔ تیسرے روز بھی رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ رحیم داد کا اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ باجراں کی خودکشی کے واقعے کے بعد وہ اس قدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ احسان شاہ کے زور دینے پر بھی اس نے کوٹ سے کسی کو نہ بلوایا۔ وہ کمرے میں اکیلا ہی سوتا۔ چوتھے روز مہران علی سہ پہر کو لاہور سے واپس آیا۔ لیکن رحیم داد سے اس کی ملاقات شام کو ہوئی۔

رحیم داد اس وقت احسان شاہ کے ساتھ گرم کمرے میں بیٹھا شغل بادہ نوشی کر رہا تھا۔ کمرے کے باہر سرما کی ٹھنھرتی رات پھیل کر دھواں دھواں ہو گئی تھی۔ ہوا بھری ہوئی تھی۔ اس کے تیز اور تند تھپیڑے دروازوں اور کھڑکیوں پر دستک دے رہے تھے۔ آتش دان کے دھکتے انگاروں کی سرخ آنچ سے رحیم داد اور احسان شاہ کے چہرے دمک رہے تھے۔ غمار آلود آنکھوں میں ستارے جھللا رہے تھے۔

مہران علی سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے اونچی آواز سے سلام کیا اور آہستہ آہستہ آتش دان کی جانب بڑھا۔ احسان شاہ نے پوچھا۔ ”مہران! تو لاہور سے کیا خبر لایا؟ چوہدری تیرا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔“

”میں جی وکیل کے منشی سے ملا تھا اور اپنے طور پر بھی پوری چھان بین اور پوچھ تاچھ کی۔“ مہران علی نے سنبھل سنبھل کر بتایا۔ ”نادر خاں کی اطلاع بالکل درست ہے جی۔ جیلہ نے بیڈن روڈ پر کرائے کے مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ وہ مکان میں نے دیکھا ہے۔ اس کے مالک سے بھی ملا تھا۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”اور زمین کی بیچ کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟“

”زمین کا سودا بھی جی بالکل طے ہو چکا ہے۔ پولیس کا ایک رضاؤ انسپکٹر زمین خرید رہا ہے۔ اس کا نام عبداللہ خان ہے، امرتسر کا مہاجر ہے۔ ویسے اوکاڑے میں اس کے آم اور مالنے کے باغات بھی ہیں۔“

احسان شاہ نے کرید کر پوچھا۔ ”تو نے یہ بھی پتہ چلایا کہ زمین کی لکھا پڑھی کا کام کب تک پکا اور مکمل ہو جائے گا؟“

”وکیل کا منشی کہتا تھا سارے کاغذات تیار ہیں۔“ مہران علی نے بتایا۔ ”جیلہ اگلے مہینے کے

شروع میں لاہور پہنچ جائے گی۔ اس کے پہنچنے کے بعد بیچ کی رجسٹری کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔“ مہران علی اب تو جا آرام کر۔ ”احسان شاہ مزید بات چیت کرنا نہ چاہتا تھا۔ مہران علی چلا گیا۔“

رحیم داد اس کی باتیں سن کر سخت پریشان ہو گیا۔ احسان نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا اور رحیم داد کو تسلی دینے لگا۔ ”چوہدری! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتا، تیرے اندازے میں جیلہ کب تک لاہور چلی جائے گی؟“

”مہران علی نے بتایا تو تھا، وہ اگلے مہینے کے شروع میں لاہور پہنچ جائے گی۔“

”اس کو چھوڑ۔“ احسان شاہ نے تکیے لہجے میں کہا۔ ”اپنی گل کر۔“

”تاجاں کے ویاہ تک وہ کوئلہ ہر کشن میں ضرور ٹھہرے گی۔ ویاہ سے نمٹنے کے بعد لاہور جائے گی۔ مجھے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”اس معاملے میں نادر خان سے بھی گل بات کرنی ہوگی۔ اسے ہر بات کا تجھ سے زیادہ پتہ ہے اسے مشورے کے لیے گل ہی بلانا ہوگا۔“

”ہاں جی اس سے بات کرنی بہت ضروری ہے۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”وہ جنت کے ذریعے جیلہ کے ارادوں کا پتہ چلا سکتا ہے۔“

”تیری باتوں سے لگتا ہے جنت بھی نادر خان کی طرح ہوشیار اور تیز ہے۔“

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”اس سے بھی کچھ زیادہ ہی تیز ہے۔“

”کیا بات ہے چوہدری، تیری طبیعت تو اس پر نہیں آگئی۔“ احسان شاہ نشتے میں جھوم کر ہنسنے لگا۔ ”میں نے تو جنت کو ایک ہی بار دیکھا ہے۔ نادر کے ساتھ آئی تھی۔ رنگ روپ تو اس کا ٹھیک خاک ہے۔ عمر بھی زیادہ نہیں۔“

مگر رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی، چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”نہیں شاہ، جی ایسی کوئی گل شل نہیں۔“

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور خالی کر دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں باہر نکلے۔ احسان شاہ مڑا اور حویلی کے زنان خانے کی جانب روانہ ہو گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

دوسرے روز شام کا اندھیرا پھیلنے ہی نادر خان آگیا۔ احسان شاہ اور رحیم داد آتش دان کے سامنے بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے، کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہو گا۔“
 ”پر تاجاں کے ویاہ سے جیلہ کے لور جانے کا کیا نا تا؟“ وہ ابھی تک احسان شاہ کی بات کا مقصد نہ سمجھ سکا تھا۔

”تو چپ کر کے دیکھتا جا۔“ احسان شاہ بے پروائی سے بولا۔ قدرے تامل کیا، پھر نادر خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تاجاں تو اب مائیاں بیٹھ چکی ہوگی۔“
 ”ہاں جی، مائیاں تو وہ کئی روز پہلے بیٹھ چکی ہے۔“
 ”رات کو اس کے پاس کون رہتا ہے؟“ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

”ویسے تو جی کئی زنانیاں رہتی ہیں۔ تاجاں کی ماں پھاتاں بھی رہتی ہے۔ پر زمین دارنی نے جنت کو خاص طور پر لگایا ہے کہ وہ رات کو تاجاں کے پاس رہے۔“ نادر خان نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”وہ تو جی آج کل تاجاں کے ساتھ ہی سوتی ہے۔“
 ”یہ تو اور بھی بستر ہے۔“ احسان شاہ کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ”اب تو کام آسان ہو جائے گا۔“

رحیم داد نے مضطرب ہو کر پہلو بدلا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”شاہ جی تو کرنا کیا چاہتا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں جنج پیچنے سے پہلے ہی تاجاں کو اٹھوایا جائے۔ اسے لا کر یہاں حویلی میں رکھا جائے۔“ احسان شاہ نے نگاہیں اٹھا کر نادر خاں کو تیز نظروں سے دیکھا۔ ”تو نے بھی سن لیا نادر؟“
 ”بالکل سن لیا جی۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔

احسان شاہ کے چہرے پر خشونت پھیل گئی۔ وہ ایک ہاتھ اٹھا کے انگلیوں سے بائیں طرف کی مونچھ مروڑنے لگا۔ اس نے نادر خاں کو استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔ ”وہ جمعرات کی رات ہوگی۔“ احسان شاہ سنبھل سنبھل کے بولنے لگا۔ ”اس رات فیکا دوسرے کمرہوں کے ساتھ کوئلہ ہر کشن پہنچ جائے گا۔ سب جپ میں ہوں گے۔ جپ درختوں تلے کھڑی کر دی جائے گی۔ فیکا اور اس کے ساتھی بندے آدھی رات سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ اور اس گھر کے پاس چھپ کر بیٹھ جائیں گے جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے۔ اب تو یہ بتا، اس کام میں کوئی مشکل تو نہیں پڑے گی؟“

”نہیں جی، کوئی مشکل نہیں ہوگی۔“ نادر خاں نے جواب دیا۔ ”تاجاں جس گھر میں مائیاں بیٹھی ہے، اس کے نزدیک صرف مسمان خانہ ہے جس میں ان دنوں میں اپنی بچیوں کے ساتھ رہتا ہوں۔“

احسان شاہ نے کسی تمہید کے بغیر پوچھا۔ ”نادر تیری اطلاع کی تو میں نے تصدیق کرائی ہے۔ یہ تو پتہ چل گیا، جیلہ نے لور میں رہنے کے لیے مکان کا بندوبست کر لیا ہے۔ زمین بیچنے کا سودا طے ہو چکا ہے۔ اب رجسٹری ہونی رہ گئی ہے۔“
 ”تو بھی یہی خبر لایا تھا ناں؟“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

لیکن احسان شاہ نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی اور نہ ہی نادر خان کو بولنے کا موقع دیا۔ اس کا چہرہ غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”نادر یہ بتا، تیرے اندازے میں جیلہ کب تک کوئلہ ہر کشن چھوڑ کے لور چلی جائے گی؟“

”مجھے تو جی لگتا ہے کہ وہ تاجاں کے ویاہ کے فوراً ہی بعد لور چلی جائے گی۔ میں نے اس بارے میں جنت سے پوچھا تھا۔ وہ یہی بتاتی تھی۔ میرے خیال میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔“
 ”اس کا مطلب یہ ہوا تاجاں کے ویاہ تک تو وہ اپنے پنڈ میں ضرور ٹھہرے گی۔“ احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”ہاں جی، یہ تو طے ہے۔“ نادر خان نے وثوق سے کہا۔ ”تاجاں کا ویاہ تو وہ ایسے چاؤ اور لگن سے کر رہی ہے جیسے اپنی سگی دھی کا ویاہ کر رہی ہو۔ اس پر تو آج کل اسی کی دھن سوار ہے۔ کسی اور گل بات کا اسے ہوش ہی نہیں۔ جب دیکھو تاجاں کے ویاہ کے باہر کے باہر میں باتیں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔“

احسان شاہ سوچتا رہا۔ اس نے نادر خان کی باتوں پر کسی رد عمل کا فوری طور پر اظہار نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ جلتا ہوا ایک کوئلہ زور سے چٹکا۔ چنگاریاں اڑیں اور آتش دان کے باہر تک بکھر گئیں۔ احسان شاہ نے مڑ کر آتش دان کے دیکھتے ہوئے سرخ سرخ انگارے دیکھے پھر نادر سے پوچھا۔

”نادر یہ بتا، تاجاں کی جنج کس روز آئے گی؟“
 ”آج منگل ہے جی۔“ نادر خان سر اٹھا کر سوچنے لگا۔ ”جیسے کی شام کو جنج چڑھے گی۔ زمین دارنی نے مجھے یہی بتایا ہے اور اسی حساب سے ویاہ کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں۔“

”مطلب یہ کہ اب صرف تین راتیں رہ گئیں ہیں۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”جو کچھ کرنا ہے انھی تین راتوں میں کرنا ہو گا۔ آج کی رات تو سمجھو گزر گئی۔ دو راتیں رہ جاتی ہیں۔“
 رحیم داد اس کی بات کا مفہوم مطلق نہ سمجھ سکا۔ نادر خاں کے بشرے سے بھی ایسی ہی کیفیت ہویدا تھی۔ وہ تو خاموش رہا مگر رحیم داد نے بے چین ہو کر کہا۔ ”اب کیا ہو سکتا ہے؟“

آس پاس اور کوئی مکان شکان نہیں۔ آگے رڑی ہے۔ اس کے ساتھ جھنکر ہے جو گھر کے پچھواڑے تک پھیلا ہے۔ اس سے ذرا ہٹ کر باغ ہے۔“ نادر خاں نے پورا حدود واربعہ بتایا۔
”یوں سمجھ لیں جی، ادھر ادھر ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ احسان شاہ سر ہلا کے بولا۔ ”جس کمرے میں تاجاں مائیاں بیٹھی ہے اس کا کوئی دروازہ آنگن میں یا گھر کے باہر بھی کھلتا ہے؟“

نادر خاں جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ احسان شاہ نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ ”مجھے نہ بتا۔ یہ ساری باتیں تو فیکا کے سامنے ہی بتانا۔ مجھ سے زیادہ اس کے لیے ان کا جانتا ضروری ہے۔“ اس نے اونچی آواز سے کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے ملازم کو اندر بلایا۔ وہ آیا تو اسے ہدایت کی کہ رفتی عرف فیکا کو کمرے میں بھیج دے۔

وہ خاموشی سے چلا گیا۔ ذرا ہی دیر بعد رفتی آگیا۔ چہرے مہرے سے وہ خاصا ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ اس کا جسم لمبا اور مضبوط تھا۔ رنگ سیاہ تھا۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور چمک دار تھیں۔ انداز میں اکھڑیں تھا۔ آواز بھدی اور کرخت تھی۔ وہ احسان شاہ کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

احسان شاہ نے نادر خاں سے کہا۔ ”ہاں، اب بتا۔“
”وہ ایسا ہے جی، تاجاں جس کمرے میں مائیاں بیٹھی ہے، اس کے آدھے سے بھی کم حصے میں پردہ پڑا ہے۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”تاجاں پردے کے پیچھے رہتی ہے۔ اس حصے میں دروازہ بھی ہے جو گھر کے پچھواڑے کھلتا ہے، پر اس میں تالا پڑا رہتا ہے۔ اسے تب کھولا جاتا ہے جب تاجاں مٹی پیشاب کے لیے سویرے ہی سویرے باہر نکلتی ہے۔ وہاں جی کیکر کے درخت اور گھنی جھاڑیاں ہیں۔ اس کے آگے تھوڑا سا کھلا میدان ہے۔ میدان کے ایک طرف باغ ہے۔ جہاں باغ ختم ہوتا ہے وہاں حویلی کا کڑہ ہے جس میں دھور ڈنگر رہتے ہیں۔ اس سے ملا ہوا اصطبل ہے۔ کڑے اور اصطبل کی نگرانی کے لیے رکھوالا موجود رہتا ہے۔“

احسان شاہ نے رفتی کو مخاطب کیا۔ ”فنی کے! تو نے ساری گلاں سن لیں، پر تو آج یا کل رات خود موکے پر جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے، پوری طرح سمجھ لے۔ تجھے پرسوں رات کارروائی کرنی ہے۔“ اس نے مڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

”تو جا کر جنت کی ڈیوٹی لگا دے کہ وہ اس رات فیکا کے پیچھے کے بعد تاجاں کو کسی ہمانے باہر لے جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو چپکے سے دروازے کا تالا کھول دے۔ ہاں، یہ تو بتا، تالے کی چابی کس

کے پاس رہتی ہے؟“

”جنت ہی کے پاس رہتی ہے۔ پہلے میں اسی گھر میں رہتا تھا۔ اسے تو میں نے ویاہ کے لیے خالی کیا ہے۔“

احسان شاہ نے رفتی کو مخاطب کیا۔ ”فنی کے! ویسے تو تیرا کام زیادہ مشکل نہیں پر میں چاہتا ہوں، ذرا بھی گڑبڑ نہ ہو۔ ہر کام خاموشی سے ہو جائے۔“

رفتی سینہ تان کر بولا۔ ”شاہ جی، تیرا حکم چاہیے۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔ فکر کی کوئی گل نہیں۔“

”تو اب بہت پکا ہو گیا ہے۔“ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے مڑ کے نادر کو دیکھا۔ ”جب تاجاں کو فیکا اٹھا کر لے جائے تب تجھے کیا کرنا ہوگا؟ یہ گل بات تجھے مہربان علی سمجھا دے گا۔ اگے جو کچھ ہوگا اسے سب کچھ پتہ ہے۔ اس بارے میں وہ مجھ سے پہلے ہی بات کر چکا ہے۔ جیسا وہ کہے تیس نوں ویسا ہی کرنا ہوگا۔ سمجھ گیا نا؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ نادر خاں نے احسان شاہ کو اطمینان دلایا۔ ”ہر کام ویسے ہی ہوگا جیسی مجھے ہدایت دی جائے گی۔“

احسان شاہ بولا۔ ”اب تو فیکا کے ساتھ جا اور مہربان سے مل لے۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہوگا۔“
نادر خاں اور رفتی چلے گئے۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ احسان شاہ بھی تھوڑی ہی دیر بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ ”تو ابھی سے جا رہا ہے؟ آگے کیا کرنا ہے۔ اس بارے میں تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”اب تو کل ہی بات ہوگی۔“ احسان شاہ نے جواب دیا۔ ”آگے کی فکر نہ کر۔ اسے مجھ پر چھوڑ دے۔ چپ کر کے دیکھتا جا۔“

”پر مجھے یہ تو سمجھ لینے دے کہ کیا کیا کرنا ہوگا؟“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”بہت سوچ سمجھ کر کام کرنا ہوگا۔ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

”پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہی ہوگا۔ میں کل تجھے ہر گل بات ٹھیک طرح سمجھا دوں گا۔ مجھے اب جانا ہے۔ میاں سجان ایک ایم۔ پی۔ اے اور ڈپٹی کمشنر کے ہم راہ لاکل پور سے آرہا ہے۔ قیوں پیچھے ہی والے ہوں گے۔ میں نے ان سے بہت اہم باتیں کرنی ہیں۔“

”ان سے اسی کمرے میں گل بات کرنی ہے؟“ رحیم داد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں، ان سے بڑے کمرے میں بات چیت ہوگی۔ تیرا جی چاہے تو میں بیٹھ۔ پینے پلانے کا

ارادہ ہو تو اپنے لیے منگوا لے۔ میں نے آج نہیں پینی۔“

رحیم داد کی بے قراری دیکھ کر احسان شاہ نے اس کے کندھے پر چھکی دی اور اس کے ساتھ ساتھ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری، تو جا کر آرام سے اپنے کمرے میں روٹی کھا۔“

اپنے کمرے میں پہنچ کر رحیم داد چپ چاپ لیٹا رہا۔ احسان شاہ کے اطمینان دلانے کے باوجود وہ خائف تھا۔ اس نے کھانا بھی نہ کھایا۔ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

صبح ہوئی تو اس کا یہی عالم تھا۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ میاں سبحان اور لائل پور کے ڈپٹی کمشنر کے ساتھ تمام دن اور رات گئے تک مصروف رہا۔ جمعرات کو رحیم داد کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

میاں سبحان اور ڈپٹی کمشنر سہ پہر کو لاہور چلے گئے۔ مگر احسان شاہ سے رحیم داد کی ملاقات شام ہی کو ہوئی۔ وہ حسب معمول مطمئن اور سچا چوبند نظر آ رہا تھا۔ ملازم نے بوتل کے علاوہ گلاس بھی میز پر رکھ دیئے تھے۔ لیکن رحیم داد کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ احسان شاہ کے اشارے پر ملازم بوتل جگ اور گلاس واپس لے گیا۔

رحیم داد اس کے اس رویے کا سبب جاننا چاہتا تھا، لیکن وہ چپ رہا۔ دونوں نے ساتھ کھانا کھایا پھر رات گزری، تاریکی بڑھی، سناٹا گہرا ہوتا گیا۔ رحیم داد کی بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ مگر احسان شاہ سیاسی جوڑ توڑ کے بارے میں اپنے کارنامے سنا رہا۔ رحیم داد بیت بنا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اسے احسان شاہ کی سیاسی سرگرمیوں سے ذرا لگاؤ نہ تھا۔ وہ اپنی سوچ میں گم تھا اور جیلہ کے بارے میں غور کر رہا تھا۔

رات آدھی ہو گئی۔ آتش دان میں انگارے دھکتے رہے۔ کمرے کا دروازہ چرچراتا ہوا کھلا۔ رحیم داد اندر داخل ہوئی۔

رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ رحیم داد کے عقب میں تاجاں بکڑی سکڑائی سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ وہ مانجھے کا زرد لباس پہنے ہوئے تھی۔ جو اب ملگجا ہو گیا تھا۔ وہ سروی سے کپکپا رہی تھی۔ اس کا چہرہ دوپٹے کے آنچل سے چھپا تھا۔ تاجاں کے داخل ہوتے ہی کمرے میں بٹنے کی تیز بو پھیل گئی۔

”یہ تاجاں آگئی ہے جی۔“ رحیم داد نے اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”نیا اسے جیپ میں ڈال کر لایا ہے۔“

احسان شاہ نے تاجاں کو دیکھا اور لمحے بھر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”رحیم! اسے ساتھ کے کمرے میں پہنچا کر باہر سے دروازہ بند کر دے۔ تیں نوں کیس اور نہیں جانا۔ دروازے پر ہی رہتا ہے۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سی مڑی اور تاجاں کے ساتھ باہر چلی گئی۔ دونوں کے جانے کے بعد رحیم داد نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ ”تاجاں تو آگئی پر اس کے آنے سے کیا ہو گا؟ مجھے اس سے کیا لینا۔“

”مجھے اس سے کچھ نہیں لینا پر جیلہ کو تو اس کی سخت ضرورت ہے۔“ احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ ”چپ کر کے دیکھتا جا۔“ احسان شاہ نے قدرے تامل کے بعد پراعتقاد لہجے میں کہا۔ ”تھوڑی دیر میں جیلہ بھی یہاں آجائے گی۔“

”کیا نیکا اسے بھی اٹھا کر لائے گا؟“

”نہیں وہ یہاں اپنی مرضی سے آئے گی۔“ احسان شاہ نے زور دے کر کہا۔ ”اسے یہاں آنا پڑے گا۔“

رحیم داد کو احسان شاہ کی بات پر یقین نہ آیا لیکن وہ خاموش رہا۔ اس کی آنکھوں میں استعجاب جھلک رہا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے دوسوے کلبلا رہے تھے۔

مگر احسان شاہ کا کہا بالکل درست نکلا۔ تاجاں کو پہنچے ہوئے گھنٹہ، سوا گھنٹہ گزرا ہو گا کہ نادر خاں کمرے کے اندر آیا۔ اس کے ہم راہ جیلہ بھی تھی۔ رحیم داد ششدر رہ گیا۔ اس کی رگوں میں خون جمنے لگا۔

آتش دان میں دھکتے ہوئے انگاروں کی سرخ روشنی میں جیلہ کا خوب صورت چہرہ تہمتا رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر ماتھے پر جھول رہی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں جھنجھلاہٹ اور غصے کی تیز چمک تھی۔ وہ سفید ادنی دو شالہ اوڑھے ہوئے تھی۔

وہ احسان شاہ کے روپہ رو سر اٹھا کے کھڑی ہو گئی۔ احسان شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی، مسکرایا اور بے تکلفی سے بولا۔ ”آخر تو آ ہی گئی۔“ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور کھل اٹھی۔

”کھڑی کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ سردی سے ٹھنھرتی ہوئی آئی ہے۔ ذرا گرم ہو جا۔“

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں۔“ جیلہ نے بھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ بتا، تاجاں کہاں ہے؟“

”فکر نہ کر۔ وہ بیس ہے اور بہت آرام سے ہے۔ اسے کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ تجھے خود بتا دے گی۔“

”میں اسے ملنا چاہتی ہوں اور ابھی ملنا چاہتی ہوں۔“ اس کے لمبے میں بڑی سوزش تھی۔ رحیم داد نے نرم لمبے میں اسے تسلی دینے کی کوشش۔ ”تو بالکل فکر نہ کر۔ تاجاں ٹھیک ٹھاک ہے۔“ جمیلہ نے سر کو خم دے کر رحیم داد کو قہر آلود نظروں سے دیکھا، مگر کوئی بات نہ کی۔ احسان شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”شاہ جی! مجھے ٹھیک ٹھیک بتا۔ تو نے تاجاں کو کہاں رکھا ہے؟ مجھے پہلے اسے ملنا ہے۔“

”ضرور مل لے، اپنا اطمینان کر لے۔“ احسان شاہ نے جمیلہ کے لمبے کی تلخی پر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا، زیر لب مسکراتا رہا۔ ”اس سے ملنے اور اطمینان کرنے کے بعد یہاں واپس آجانا۔“ اس نے آواز میں نرمی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”تو اسے واپس لینے ہی کے لیے یہاں آئی ہے ناں؟“

”میں اسے لینے ہی کے لیے آئی ہوں اور اسے لے کر ہی جاؤں گی۔“

”ضرور لے جا۔“ احسان شاہ کا لہجہ بدستور نرم اور شگفتہ تھا۔ ”پر اس سے مل تو لے۔“ احسان شاہ نے رمتے کو بلایا اور جمیلہ کو اپنے ہم راہ لے جانے کا حکم دیا۔

جمیلہ کے جانے کے بعد احسان شاہ نے نادر خان سے دریافت کیا۔ ”نادر یہ تو بتا، تو جمیلہ کو یہاں لایا کیسے؟ چوہدری، یہ راز جاننے کے لیے بہت بے چین ہے۔ دیکھ تو کیسا حیران پریشان بیٹھا ہے۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگا۔

”وہ ایسا ہوا جی جنت نے چپکے سے دروازہ کھول دیا تھا۔“ نادر خان نے بتایا۔ ”فیکا آرام سے اندر پہنچا۔ تاجاں بے خبر سو رہی تھی۔ اس نے نزدیک پہنچ کر تاجاں کا جھٹ منہ دیا۔ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور ایسی خاموشی سے باہر لے گیا کہ کمرے میں سوئی ہوئی زنانوں میں سے کسی کو ذرا بھی پتہ نہ چلا۔“

”پر جنت تو جاگ رہی تھی ناں؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”بالکل جاگ رہی تھی جی بلکہ فیکا کے پیچھے کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہہ جو رکھا تھا۔“ نادر خان نے رحیم داد کو بتایا۔ ”جب فیکا اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاجاں کو جیپ میں ڈال کر لے گیا تب جنت میرے پاس آئی۔ وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے سب کچھ مجھے بتا دیا۔“

”جمیلہ اس وقت کہاں تھی؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”وہ جی اوپر اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔“ نادر خان گویا ہوا۔ ”جنت کی زبانی جب مجھے یہ پتہ چل گیا کہ فیکا تاجاں کو اٹھا کر لے گیا ہے، تب مہمان علی کی ہدایت پر میں زمیں دارنی کے پاس گیا جنت میرے ساتھ تھی۔ اس نے زمیں دارنی کو بگایا اور صاف صاف بتا دیا کہ تاجاں کو اغوا کر لیا گیا۔ یہ سنتے ہی وہ بدحواس ہو گئی۔ گھبراہٹی ہوئی نیچے اتری اور اس کمرے میں گئی جہاں تاجاں مائیاں بیٹھی تھی۔ تاجاں کو وہاں نہ پا کر وہ پریشان ہو گئی۔“

”اس نے کوئی شور شرابا تو نہیں کیا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”نہیں جی، وہ بالکل چپ کر کے رہ گئی۔ اس نے کسی کو بھی تاجاں کے بارے میں کچھ نہ بتایا۔ جنت کو بھی منع کر دیا۔ وہ وہاں زیادہ دیر ٹھہری نہیں، فوراً مہمان خانے میں آ گئی۔ میں اور جنت اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ ساری زنانیاں بے خبر سوئی رہیں۔ انھیں کچھ بھی پتہ نہ چلا؟“

”مہمان خانے میں پہنچ کر تو اس نے تجھ سے بھی پوچھ تاجھ کی ہوگی؟“ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

”پہلے تو جی وہ جنت سے پوچھ تاجھ کرتی رہی پر اس نے زیادہ گل بات نہ کی۔ اسے جلد ہی واپس کمرے میں بھیج دیا۔ ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر لیٹ جائے اور پوری طرح کوشش کرے کہ تاجاں کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلے۔“ نادر خان سنبھل سنبھل کر ایک ایک تفصیل بیان کرتا رہا۔ ”جنت کے جانے کے بعد زمیں دارنی نے مجھ سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تاجاں کو کون اٹھا کر لے گیا۔“

رحیم داد زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ ”تو نے کیا بتایا؟“

”میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا، شاہ جی کے بندے تاجاں کو اٹھا کر جیپ میں لے گئے ہیں۔“

”جمیلہ نے تجھ سے یہ نہیں پوچھا، تجھے کیسے پتہ چلا؟“

”اس نے مجھ سے یہ گل پوچھی تھی۔“ نادر خان نے جواب دیا۔ ”میں نے اسے بتایا، تاجاں کو اٹھا کر لے جانے کے بعد شاہ جی کا ایک کردہ میرے پاس مہمان خانے میں آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول تھا۔ اس نے مجھے کہا، زمیں دارنی اگر تاجاں کو واپس لانا چاہتی ہے تو وہ شاہ جی کی حویلی پہنچ جائے۔ نہر کے کنارے جیپ کھڑی ہے، وہ اسے لے جائے گی۔“

”کیا تیرے پاس شاہ جی کا کوئی کردہ جیج آیا تھا؟“ رحیم داد نے پھٹی ہوئی آنکھوں سے پوچھا۔

رحیم داد کے احمقانہ سوال پر احسان شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر نادر نے نہایت

متانت سے کہا۔

”میرے پاس آنا شاہ کس کو تھا جی۔ میں نے تو مہربان علی کی ہدایت پر یہ بات زمیں دارنی سے کہی تھی۔“ اس نے کھنکار کر گلاف صاف کیا۔ ”یہ سنتے ہی اس کا تو برا حال ہو گیا۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کے بولی۔ یہ کیا ہو گیا نادور؟ میری تو سمجھ کام نہیں کر رہی۔ کل تاجاں کی جنج آ رہی ہے۔ جب تاجاں ہی نہ ہوئی تو کیسے دیا ہو گا؟ میں سب کو کیا جواب دوں گی؟ یہ کہتے کہتے جی وہ بلک بلک کر رونے لگی۔“

”وہ تو بالکل پاگل ہو گئی ہوگی۔“ رحیم داد نے کہا۔

”پاگل تو جی اسے ہوتا ہی تھا۔“ نادور خاں بولا۔ ”میں نے پہلے تو اسے دلا سا دیا۔ جب اس نے رونا بند کیا تو مشورہ دیا اب تو بے عزتی سے بچنے کی یہی صورت ہے، شاہ جی کے پاس چلا جائے اور تاجاں کو واپس لانے کے لیے منت سماجت کی جائے۔ ساتھ ہی میں نے زور دیا وکت بہت کم ہے جو کرنا ہے جلد سے جلد کرنا ہے۔ تاجاں کو سویرا ہونے سے پہلے ہی واپس آ جانا چاہیے۔ ورنہ بات سارے پنڈ میں پھیل جائے گی۔ جنج آئی بھی تو واپس چلی جائے گی۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”یہ سن کر وہ تجھ سے نراض تو نہیں ہوئی؟“

”پتہ نہیں جی، اس نے میرے بارے میں کیا سوچا۔“ نادور خاں کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ ”میری باتیں سنتے ہی وہ ہاتھوں سے منہ چھپا کر ایک بار فیروں لگی۔ میں چپ کر کے بیٹھا رہا پر ذرا ہی دیر بعد وہ ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوئی اور یہاں آنے کے لیے تیار ہو گئی۔ میرے ہم راہ وہ سمان خانے سے باہر نکلی۔ جیپ بھی تب تک تاجاں کو ادھر پہنچا کر واپس آ گئی تھی۔ زمین دارنی میرے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔“

احسان شاہ پوری روداد سن کر بولا۔ ”نادور تو بچ بچ بہت کام کا بندہ ہے۔“ وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔

”چوہدری! تو نادور کو کھڑا انعام دینا۔ اس نے زبردست کام کیا ہے۔“

”کام تو اس نے انعام ہی کا کیا ہے۔“ رحیم داد نے بے ساختہ کہا۔ ”اسے ضرور انعام ملے گا۔ شاہ جی تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ فکر نہ کر۔“

احسان شاہ نے نادور خاں کو جلد ہی رخصت کر دیا۔ ”نادور! اب تو مہربان علی کے پاس جا۔ وہ تیرا انتظار کر رہا ہو گا۔“ یہ کہتے کہتے وہ ٹھٹھا۔ ”اور دیکھ باہر رمتے ہوگی۔ اس سے کہہ کہہ جیلہ کو یہاں بھیج دے۔“

نادور خاموشی سے چلا گیا۔

”لے چوہدری، تیرا کام تو بن گیا۔“ احسان شاہ نے ہنس کر رحیم داد سے کہا۔

رحیم داد سادگی سے بولا۔ ”بچ پوچھ تو اب تک سمجھ نہیں آئی، کیا کام بنا۔“

”گھبرا نہیں، جیلہ کو آنے دے۔ تھوڑی دیر میں سب کام پورا ہو جائے گا اور تجھے بھی سب پتہ چل جائے گا۔“

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اس کی سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ وہ بے چینی کے عالم میں بار بار پہلو بدلنے لگا۔ ٹھہر ٹھہر کر دروازے کی جانب دیکھتا۔ کمرے میں سکوت تھا۔ احسان شاہ بھی چپ تھا۔



جیلہ ٹھٹھکتا خوردہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ سوگوار تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ بڑھال اور بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر کرسی کھسکائی اور احسان شاہ کے رویہ پر بیٹھ گئی۔ رحیم داد کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چہرے پر دکھ کے سائے منڈلا رہے تھے۔

”تاجاں سے مل لی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“ احسان شاہ نے جیلہ سے پوچھا۔

”ہاں، میں اس سے مل لی۔“ جیلہ نے ہنسنے لگے۔ ”مجھے دیکھتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری، نظریں اٹھا کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ ”تمہیں تو پتہ نہیں شاہ جی، وہ مجھے اپنی ماں کی طرح پیار کرتی ہے۔ جھوٹی سی تھی تو اس کا پو مر گیا۔ بعد میں اسے میں نے ہی پالا۔ پچھلے سات سال سے میرے ہی پاس ہے۔ مانو اب تو وہ میری ہی دھی ہے۔“ اس کے لہجے میں فریاد کا انداز تھا۔

”شاہ جی، تو نے ٹھیک نہیں کیا۔ تو اسے کیوں برباد کرنا چاہتا ہے؟ اس کا تو کیول ایک رائڈ ماں کے اور کوئی بھی نہیں۔“

”میں نوں تو اس سے کچھ نہیں لیتا۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”تو چاہے تو وہ تیرے ساتھ واپس جاسکتی ہے۔ اس کی زندگی برباد ہونے سے بھی بچ سکتی ہے۔ سب کچھ تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔“

”شاہ جی، فیروں کیا چاہتا ہے؟“ جیلہ کی آواز بھرا گئی۔ ”میں تاجاں کو برباد ہونے سے بچانے کے لیے تیری ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔“ اس نے کسی مزاحمت کے بغیر احسان شاہ کے سامنے ہتھیار

ڈال دیے۔ وہ اس کے پاس آنے سے پہلے ہی شاید یہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

”میں تاجاں کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔“

جیلہ کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے سر ہٹکا لیا۔ آنکھوں میں ستارے جھل ملائے اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے بے قرار ہو کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ کمرے کی گہری خاموشی میں اس کی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔ آتش دان میں سلگتے ہوئے انگاروں پر راکھ کی تہہ جم گئی تھی۔ احسان شاہ نے قریب رکھے ہوئے پوکر کا دستہ پکڑا اور لوہے کے آنکڑے سے انگارے کریدنے لگا۔

انگاروں کی آنچ تیز کرنے کے بعد اس نے پوکر ایک طرف رکھ دیا۔ مڑکے جیلہ کو دیکھا، بے رخی سے بولا۔ ”اس طرح ٹسوے بہانے سے کام نہیں چلے گا۔“ اس کا لہجہ تند ہو گیا۔ ”تاجاں کو واپس لے جانے کے ارادے سے آئی ہے تو ٹھیک سے گل بات کر۔“

”کیا چاہتا ہے توں؟“ جیلہ کی شکستہ آواز ابھری۔

”میں یہ چاہتا ہوں، نہ تو اپنی زمین بیچ کرے گی اور نہ کوئلہ ہرکشن چھوڑ کر لوہر جائے گی۔“ احسان شاہ کے لہجے میں گونج اور دبہ تھی۔ ”تیرے سارے منصوبوں کا مجھے اور چوہدری کو پتہ چل چکا ہے۔“ اس نے قہر آلود نظروں سے جیلہ کو دیکھا۔ اس کا چہرہ درشت ہو گیا۔ ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔

”اب بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے، جب تو لوہر جانے کے لیے اپنے وکیل رندھاوا سے چپکے چپکے سکیمیں بنا رہی تھی، تب یہ نہ سوچا، تو کیا کرنے جا رہی ہے؟ چوہدری کو معاملے میں رکھ کر کس طرح دھوکا دے رہی ہے؟“

”میں کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کر رہی۔“ اس نے سر اٹھا کے تیکھی نظروں سے احسان شاہ کو دیکھا۔ ”میں اگر اپنی زمین بیچنا چاہوں اور لوہر جا کر رہتا چاہوں تو یہ دھوکا کس طرح ہوا؟ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ توں یا چوہدری اس بارے میں مجھ سے پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟“

”زیادہ تیزی نہ دکھا۔“ احسان شاہ نے ڈپٹ کر کہا۔ ”یہ بتا اور صاف صاف بتا، تاجاں کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتی ہے یا نہیں؟“

”مجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں، میں اسی کارن یہاں آئی ہوں۔“ جیلہ کی آواز پھر بجھ گئی۔ ”میں اسے اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی۔“

”ضرور اسے لے جا، خوشی سے لے جا۔“ احسان شاہ کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”پر تاجاں کے ویاہ سے

پہلے تیرا چوہدری کے ساتھ نکاح ہو گا۔“

جیلہ کرسی پر پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔ اس کے ذہن میں منڈلاتا ہوا جذبات کا سیلاب چہرے پر دھوپ چھاؤں بن کر لہرا رہا تھا۔

مگر احسان شاہ نے اسے زیادہ دیر غور کرنے کا موقع نہ دیا۔ ”مجھے جو کچھ طے کرنا ہے، جلدی کر۔ تاہم کم ہے۔ سویرا ہو گیا تو تاجاں کو واپس لے جانے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ بات پنڈ میں پھیل گئی تو آئی ہوئی جینج واپس چلی جائے گی۔ پوری طرح یہ سوچ لے۔“

جیلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ احسان شاہ کی درشتی پر اس نے ٹوٹی ہوئی آواز میں کہا۔ ”شاہ جی جیت تو ہمیشہ تیری ہی ہوتی ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں تاجاں کو لے کر ہی جاؤں گی۔ تاجاں کو بلا لے۔ میں نے جلد سے جلد پنڈ پہنچنا ہے۔“

”تاجاں بھی آجائے گی۔“ احسان شاہ کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”پر اس کے یہاں آنے سے پہلے چوہدری کے ساتھ تیرا انتظام بھی تو ہو گا۔ نکاح ابھی ہو گا۔ بول کیا کہتی ہے؟“

”میں نے کیا کہنا ہے۔“ اس نے مڑ کر خونخوار نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ رحیم داد نے گھبرا کے نگاہیں نیچی کر لیں۔ جیلہ چند لمحے تک ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں بھرتی رہی۔ ”میں نے تو تاجاں کو یہاں سے لے کر ہی جانا ہے۔ میں اسے وچن دے کر آئی ہوں۔“ اس کے لہجے میں درد کی کلک تھی۔

احسان شاہ نے مزید بات نہ کی۔ فوراً مہربان علی اور نادر خاں کو بلایا۔ ان کے ہم راہ مسجد کا ملا بھی تھا جسے مہربان علی نے عشاء کی نماز کے بعد ہی بلوایا تھا۔ وہ پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے نکاح نامہ تیار کر رکھا تھا۔ اسٹامپ پیپر پر جیلہ کی زمین کی بیع کا رحیم داد کے ساتھ معاہدہ بھی لکھا ہوا اس کے پاس موجود تھا۔

ملانے احسان شاہ کے حکم پر رحیم داد کا جیلہ سے نکاح پڑھایا۔ نادر خاں نے جیلہ کی جانب سے وکیل کے فرائض انجام دیے۔

احسان شاہ اور مہربان علی گواہ بنے۔ ایجاب و قبول ہوا۔ رحیم داد کے ساتھ جیلہ نے بھی ہنگامی بھری۔ نکاح نامے پر دست خط بھی کر دیے۔ مسجد کے ملا، رحیم داد، احسان شاہ، مہربان علی اور نادر خاں نے بھی دست خط کر دیے۔

نکاح کے بعد مہربان علی نے زمین کی بیع کی دستاویز جیلہ کے سامنے پیش کی۔ جیلہ کی آنکھیں آتش دان کے انگاروں کی مانند دھک رہی تھیں۔ اس نے نہ کوئی مین میخ نکالی نہ کسی برہمی کا اظہار

کیا۔ چپ چاپ بیچ نامے پر بھی دست خط کر دیئے۔

مہربان علی، نادر خاں اور ملا باہر چلے گئے۔ احسان شاہ نے رختے کو بلایا۔ وہ جیلہ کو اپنے ہم راہ لے گئی۔

جیلہ کو علیحدہ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ یہ اس کا عجلہ عروسی تھا۔ جیلہ نے بھیجی بھیجی نظروں سے درودیاؤں پر ایک نظر ڈالی، تڑپ کر نچلا ہونٹ دانتوں کے نیچے دبایا اور بندھا ہل کے بستر پر گر پڑی۔

قسم کے ناول، ماسٹرز اور جاسٹ، بچوں کی کہانیاں، عمران سیریز
 آئیڈیل پبلیکیشنز، لاہور
 0301-7283296
 0334-9630911
 عظیم احاطہ طارق
 نروغہ گھر کتابیہ ★

شکست صدیقی

جائنگلوں



۸۶



رحیم داد نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

سامنے مسہری پر جیلہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ خشک اور مٹیالا پڑ گیا تھا۔ اس نے ویران نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”تو جو چاہتا تھا وہ ہو گیا۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ”دو بجنے والے ہیں۔ تاجاں کو جلد سے جلد واپس پہنچنا ہے۔“

”ابھی سویرا ہونے میں بہت دیر ہے۔“ رحیم داد نے بہ مشکل کہا اور کھویا کھویا سا جیلہ کے قریب بیٹھ گیا۔

اسے سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔ جیلہ اب اس سے کچھ دور نہیں تھی۔ وہ جیلہ، جس کے بارے میں وہ مسلسل سوچتا رہا تھا جسے حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کے منصوبے بناتا رہا تھا، اس کے اتنی قریب تھی کہ وہ اس کے دل آویز چہرے کو جی بھر کے دیکھ سکتا تھا۔ اس کے شاخ گل کی طرح مہکتے جسم کی خوشبو سونگھ سکتا تھا، اسے چھو سکتا تھا۔ اب وہ اس کی منکوہ تھی، شریک حیات تھی۔ وہ اور اس کی تمام جائیداد اس کی تھی۔ مگر اتنی بڑی کامیابی کے باوجود اسے یکسوئی اور اطمینان قلب حاصل نہ تھا۔ وہ خوف زدہ اور گھبرایا ہوا تھا۔

رحیم داد نے کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالا اور اسے منانے کی کوشش کی۔ ”بہت زراض معلوم ہوتی ہے۔“ اس نے لہجے میں حلاوت اور نرمی پیدا کی۔ ”پہلے میری پوری گل سن لے۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔“

مگر جیلہ نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے گویا ہوئی۔ ”مجھے

پتہ ہے تو کیا چاہتا ہے، کیا نہیں چاہتا؟ اب بتانے کے لیے رہ گیا ہے۔“
 ”نہیں، تجھے کچھ پتہ نہیں۔ بات اس طرح نہیں ہے جس طرح تو سوچ رہی ہے۔“ رحیم داد کا
 لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس میں معذرت تھی، عاجزی تھی۔

”فضول گلاں نہ کر۔“ جیلہ نے بے زاری سے کہا۔ ”چوہدری، میں ہار گئی۔ شاہ جی جیت گیا، تو
 بھی جیت گیا۔ میں تو سدا سے ہارتی رہی ہوں۔ مجھ ابھاگن کے ہاتھ میں جیت کی ریکھا ہی نہیں۔“
 رحیم داد کھسک کر اور قریب ہو گیا اور ہاتھ بڑھا کر جیلہ کے نرم دناڑک رخساروں کو ہولے
 ہولے تھپکتے ہوئے بولا۔ ”بہت نراض لگتی ہے۔“

”میں تو کبجری ہوں۔ کبجری کی کیا نراضی، کیا خوشی۔“ جیلہ کے لہجے میں کمواڑ کی کاٹ تھی۔
 ”رات گزرتی جا رہی ہے اور مجھے سویرا ہونے سے پہلے پہلے تاجاں کو لے کر پنڈ میں واپس پہنچانا
 ہے۔ میں تو برباد ہو چکی پر اس کا جیون برباد نہیں ہونے دوں گی۔“

”نہ تو برباد ہوئی اور نہ تاجاں ہو گی۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ اب وہ اپنی بدحواسی اور
 سراپیسگی پر قابو پا چکا تھا۔ ”تو فکر نہ کر۔ تاجاں بہت شان سے ویاہ کر اپنی سسرال جائے گی۔“
 ”چوہدری، بکواس بند کر۔ مجھے تیری کوئی گل بات نہیں سننی۔“ اس نے بے زاری سے رحیم داد
 کو جھڑک دیا۔ ”مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”چوہدری دروازہ
 بند کر دے۔“

رحیم داد خاموشی سے اٹھا اور دروازے کی زنجیر چڑھا دی۔



تین بج چکے تھے۔ کمر میں لپٹی ہوئی رات دھواں دھواں تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا، ویرانی تھی۔
 رحیم داد کمرے سے باہر نکلا۔ اس کے عقب میں جیلہ تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ چرا
 اجڑ کے کھنڈر بن گیا تھا۔ روشن آنکھوں کے چراغ بجھ گئے تھے۔ وہ رنجے کے ساتھ سیدھی تاجاں
 کے پاس گئی۔ اسے دیکھتے ہی تاجاں سسکیاں بھرنے لگی۔ جیلہ نے بڑھ کے اسے سینے سے لگایا۔
 اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھالا۔ تاجاں کا ہاتھ
 پکڑا اور اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگئی۔

رحیم داد اور نادر خان برآمدے ہی میں مل گئے۔ چاروں حویلی کے بڑے پھانک سے باہر نکلے
 جیپ تیار کھڑی تھی۔ نادر خان پچھلی نشست پر جیلہ اور تاجاں کے ساتھ بیٹھا۔ جیپ کا انجن
 کرتا ہوا اشارت ہوا اور جیپ تیزی سے روانہ ہو گئی۔

رات کے پچھلے پندرہ کو ملہ ہر کشن میں پہنچ گئے۔ جیلہ نے جیپ منہ کے کنارے درختوں کے
 ایک جھنڈ کے نیچے رکوائی۔ ہر طرف کمر کا غبار پھیلا تھا۔ گاؤں سو رہا تھا۔ جیلہ جیپ سے نیچے
 اتری۔ اس نے تاجاں کا بازو تھام کر نیچے اترنے میں مدد کی۔ تاجاں ابھی تک سہمی ہوئی تھی۔ اسے
 کچھ خبر نہ تھی کہ رات کے اندھیرے میں اسے اغوا کر کے احسان شاہ کی حویلی میں کیوں لے جایا
 گیا؟ نہ یہ معلوم تھا کہ جیلہ اسے کس طرح واپس لائی۔ وہ خاموش اور سراپد تھی۔

رحیم داد جیپ سے اتر کے جیلہ کے پاس پہنچا اور پیار سے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے تسلی دینے کی
 کوشش کی۔ ”تاجاں کی تو بالکل فکر نہ کر۔ نادر خان اسے جنت کے پاس آرام سے پہنچا دے گا۔“
 اس نے ہولے سے جیلہ کے نرم وگداز بازو کو انگلیوں سے دبایا۔ ”تو میرے ساتھ چل۔“

جیلہ نے پلٹ کر اسے گھمسی نظروں سے دیکھا، بے زاری سے بولی۔ ”چوہدری! آپ تو اپنے
 کمرے میں جا کر سو۔ سویرے تجھے کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“

رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔ وہ جیلہ کی بے رخی پر کبیدہ خاطر نہ
 ہوا۔ اپنی کامیابی پر خوشی سے وارفتہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مسمان خانے کے دروازے پر پہنچا۔
 دروازہ کھلا تھا۔ اس نے صحن عبور کیا اور دبے قدموں حویلی کے اندر پہنچ گیا۔

جیلہ نے جیپ کے ڈرائیور کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ جیپ مڑی اور احسان شان کے گاؤں
 پیراں والہ کی سمت دوڑنے لگی۔ جیلہ نے نادر خان کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں ہدایت کی
 کہ وہ جنت کے پاس جائے اور نہایت احتیاط سے اس کمرے کا دروازہ کھلوائے جہاں تاجاں مانجھے
 بیٹھی ہوئی تھی۔

جیلہ نے تاجاں کو اپنے پہلو سے قریب کر لیا۔ تاجاں کے ہلدی میں رنگے ہوئے مانجھے کے زرد
 اور لکچھے کپڑوں سے بٹنے اور پسینے کی ملی جلی بو اٹھ رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ سردی بڑھ گئی
 تھی۔ دونوں سردی سے تھر تھرائی، کمر کی دھند میں لپٹی سنبھل سنبھل کر بڑھتی رہیں۔ جب گھر کے
 پچھواڑے پہنچیں تو انھوں نے چراغ کی زرد زرد روشنی میں دیکھا، جنت دروازہ کھولے دہلیز پر کھڑی
 ان کا انتظار کر رہی تھی۔

نادر خان دروازے کے باہر اندھیرے میں خاموش کھڑا تھا۔ جیلہ نے تاجاں کو سہارا دیا اور اس
 کے ساتھ ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔ جنت نے آہستہ سے دروازہ بند کیا۔ کندی لگائی اور تال
 ڈال دیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں پردا پڑا تھا۔ پردے کے دوسری طرف مسمان عورتیں اور بچے
 گہری نیند سو رہے تھے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ تاجاں کب کمرے سے گئی اور کس وقت

واپس آئی۔

جیلہ تاجاں کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ احتیاط سے قدم اٹھاتی ہوئی باہر نکلی۔ حویلی میں پہنچی اور زینے کی بیڑھیاں ملے کر کے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ سینا اور گڈو لحاف میں دیکے بے خبر سو رہے تھے۔ جیلہ کا بدن سردی سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے بستر پر دراز ہو کر لحاف اپنے ٹھہرتے ہوئے جسم پر ڈال لیا۔ جسم میں حدت اور حرارت پیدا ہوئی تو اسے احسان شاہ کی حویلی کی ایک بات کچھ کے لگانے لگی۔ وہ بے قرار ہو کر رونے لگی۔



صبح ہو گئی۔ نیلگوں کمر کا گاڑھا گاڑھا غبار پھیلنے لگا۔ رات اب رخصت ہو چکی تھی۔ دودھیا روشنی دھیرے دھیرے فضا میں پھیلتی جا رہی تھی۔ سورج مشرقی افق پر ابھرنے لگا۔ کمر میں لپٹی میالی دھوپ منڈیروں پر جھلکنے لگی۔ حویلی میں رفتہ رفتہ چہل پھل ہونے لگی۔ پھاتاں کے کچھ رشتے دار اور شریکے پہلے ہی آگئے تھے اور اب تک جو آنے کے تھے وہ بھی سویرے سویرے پہنچ گئے۔ جیلہ نے پورے گاؤں کو تاجاں کے بیاہ میں شریک ہونے کا بلاوا دیا تھا۔ سورج اوپر چڑھ کر درختوں کی شاخوں کی آڑ سے جھلکانے لگا۔ ہر طرف سنہری دھوپ بکھرنے لگی۔ حویلی کی رونق اور گھما گھمی اور بڑھ گئی۔ عورتوں اور بچوں کے شوخ اور بھڑک دار لباس سرما کی گہری ہستی اور چمک دار دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

جیلہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شام کو تاجاں کی برات آرہی تھی۔ برات کے پہنچنے سے پہلے پہلے اسے شادی کی تمام تیاری مکمل کرنا تھی۔ اس نے نہادھو کر جلدی جلدی ناشتا کیا۔ اونی شال اوڑھی۔ مسمان خانے میں پہنچی۔ نادر خاں اور جلیل وہاں موجود تھے اور اس کا انتظار کر رہے تھے۔ جیلہ نے دونوں کو اسکول کی جانب روانہ کیا۔ برات کے ٹھہرنے کا بندوبست اسکول ہی میں کیا گیا تھا۔

دن ڈھلے چہل پہل اور بڑھ گئی۔ شام کا جھپٹا ہوتا ہی جگہ جگہ گیس کے ہنڈے اور پیڑو میکس روشن کر دیے گئے۔ برات کے پہنچنے کا وقت لمحہ بہ لمحہ قریب آتا جا رہا تھا۔ اپنا دکھ درد بھول کر جیلہ سرگرمی سے ادھر ادھر گھومتی پھر رہی تھی۔ پڑھتی کے قریب نوجوان سہاگتیں اور المزدور شیزائیں چادریں تانے کھڑی تھیں۔ تاجاں کو تنی ہوئی چادروں کے پیچھے سرکنڈوں کی تیلیوں سے بنے ہوئے کھارے میں غسل کے لیے بٹھا دیا گیا تھا۔ میراٹن اور نوجوان لڑکیوں نے ڈھونک کی تھاپ پر اونچی آواز سے گیت چھیڑا۔

بدل گئے کھارے نی بی بی، آج ہوئی پرانی

ناتن نے کھارے کے نیچے دیا روشن کر دیا۔ جیلہ قریب ہی کھڑی تھی۔ دیے کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے خوبصورت چہرے پر مسرت سے مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ آگے بڑھی، چادروں کے عقب میں پہنچی، جھکی اور مٹھی بھر ریز گاری جھللاتے ہوئے دیے کے پاس نیک شگون کے طور پر رکھ دی۔ ناتن نے ساری ریز گاری اٹھائی اور اپنی دھوتی کے ڈب میں رکھ لی۔ یہ اس کا حق تھا۔

ناتن نے تاجاں کے میلے کچیلے مانجھے کے زرد کپڑے اتار کے ایک طرف رکھ دیے۔ اس نے ڈونگے میں گرم پانی بھر بھر کے تاجاں کے بدن پر ڈالا اور خوش بودار صابن سے مل مل کر اسے غسل دینے لگی۔ جب تک تاجاں نہاتی رہی کھارا لمائی کی رسم کے مطابق پھاتاں سات بار کھارے کے سامنے سے گزری۔ مراٹن نے اونچی آواز سے گیت چھیڑا۔

کھارا چتر مٹر، کھارا اڈیا، کھارے توں اتارویر وڈیا

میراٹن کے ساتھ آواز ملا کر نوجوان لڑکیاں اور عورتیں بھی گانے لگیں۔ پھاتاں بھی ان کے ساتھ گارہی تھی۔ گاتے گاتے اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ تاجاں غسل کر چکی تھی اور اس کا بھیگا ہوا بدن خشک کر کے چادر اوڑھا دی گئی تھی۔ مگر وہ کھارے میں بیٹھی رہی۔ اس کا کوئی بھائی نہ تھا جو ناتن کو کھارا لمائی دیتا اور اس کا بازو تھام کر کھارے سے اٹھاتا۔ پھاتاں اپنی بیٹی کی اس محرومی پر آنسو بہا رہی تھی۔

جیلہ تڑپ کے پھاتاں کے قریب پہنچی، تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”تو رو رہی ہے پھاتاں۔ حد کر دی تو نے۔ چتا نہ کمر۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”تاجاں کا کوئی دیر نہیں تو کیا ہوا۔ میں کھارا لمائی دوں گی۔ آنسو پونچھ۔ خوشی کے سہ اس طرح آنسو نہیں بہاتے۔“

جیلہ نے ناتن کو کھارے لمائی کے پچاس روپے دیے۔ مگر ناتن اڑ گئی۔ وہ زیادہ نیگ چاہتی تھی، ہنس کر بولی۔ ”زمین دارنی، میں نے کھارے لمائی میں تجھ سے تو نی لینی تھی۔ نہ دے پر اپنی شان دیکھ کر تو نیگ دے۔“ جیلہ نے حیل جبت نہ کی۔ ناتن کو سو روپے اور دیے۔ خوشی سے ناتن کی باچھیں کھل گئیں۔

جیلہ نے چادر میں لپٹی، سردی سے تھر تھراتی تاجاں کا بازو پکڑ کے اٹھایا اور سارا دے کر کھارے سے نیچے اتارا۔ اپنی اونی شال کا پلو اس کے سر پر ڈالا، سہاگتوں اور میاریوں کے جھرمٹ میں تاجاں کو پڑھتی سے بکمرے کی جانب لے گئی۔ تاجاں کے غسل کرنے سے کچے فرش کی جو مٹی اس کے شگون کے طور پر اٹھا کر چھت پر پھینک دیا گیا۔

چہرہ چھپائے گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے گھوڑوں، ٹانگوں اور ریزموں پر سوار براتی تھے۔ نوجوانوں کی ایک ٹولی پیدل چل رہی تھی۔ وہ رک رک کر ہنگڑا ڈالتے اور کانوں پر ایک ہاتھ رکھ کر اونچی آواز سے تان لگاتے۔ کوئی ٹپا لاپتے۔ برات میں شامل عورتیں اور لڑکیاں سر سے سرلا کر بیاہ کے گیت گارہی تھیں۔

گاؤں کی عورتیں اور خیاہیں چوباروں اور چھتوں سے برات گزرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ برات حویلی کے عین سامنے پہنچی تو منڈیروں کی آڑ سے جھانکتی ہوئی تاجاں کی سیلیاں اور نوجوان رشتے دار عورتیں تالیوں کی تھاپ پر ہنس ہنس کے سُٹنی اور کامن گیت گانے لگیں جن میں دولہا اور براتیوں پر پھبتیاں کسی جارہی تھیں۔

چرکا کیوں ڈھکا لاڑیا، وے چرکا کیوں ڈھکا؟
جلی سکے پانی وے، تیری ماں سکے پانی وے!
لاڑیا کسوتیا، تیری ماں منجے تے موتیا!!
نک وڈھیاوے، تیری ماں منجے تے گیا!

مگر براتی عورتوں اور لڑکیوں نے اس طعنہ زنی پر نہ جوابی گیتوں کے ذریعے دلہن اور اس کے رشتہ داروں اور شریکوں کی دل آزاری کی کوشش کی اور نہ کسی طرح کی جھنجھلاہٹ اور خفگی کا اظہار کیا، مسکراتی رہیں اور گیتوں کی تسخنی اور استہزا برداشت کرتی رہیں۔
دولہا کی ماں کا اشارہ ملتے ہی برات کے ساتھ آنے والی میراٹن نے اونچی آواز سے ایک گیت پھیرا۔ برات میں شامل لڑکیوں اور عورتوں نے بھی اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ اس گیت میں طغور طعنہ زنی کے بجائے محبت کی حلاوت رہی ہوئی تھی۔

ہنس کے بلا، دل ہو گیا رضا
ساڈا پردیاں دا رکھا اے خدا
ڈھوکی بجا، ذرا ہنس کے بلا
لوکاں بے سمجھیاں دی جانے کی بلا
گولی ہاں میں تیری، میرا جاندا خدا
ماپے تیرے آپے پئے کرن گے نکاح

حویلی کی چھت پر کھڑی ہوئی لڑکیوں اور عورتوں نے یہ گیت سنا تو ان کی آوازیں مدھم پڑ گئیں۔ مگر یہ خاموشی زیادہ دیر نہیں رہی۔ دفعہ ”قہقہے بلند ہوئے اور تالیاں بھی بجنے لگیں۔ دولہا کا ہنس

تائن بھی تاجاں کے ساتھ ساتھ پڑھتی سے نکل کر کمرے میں پہنچی۔ اس نے سرال سے آیا ہوا سرخ اور سنہری کانڈ کا ساگ پڑا کھولا۔ اس میں آئینہ، کنگھی، مندی، خوش بودار تیل، سرمہ، کاجل، زعفران، موتی، صندل اور سنگھار کی دوسری اشیاء موجود تھیں۔ تائن نے تاجاں کے سر کے بالوں کو ابلے کپڑے سے خشک کیا۔ تھوڑا سا تیل تاجاں کے سر میں ڈالا۔ کنگھی سے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا، آنکھوں میں کاجل لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی کی ہلکی ہلکی تہہ جمائی، پیشانی کے بالائی حصے اور بالوں پر افشاں چھڑکی۔ سرال سے آیا ہوا بری کا جھملا تا ہوا سرخ جوڑا پہنایا۔ ناک کے سورخ میں ننھ ڈالی۔ کانوں میں جھیمکے پہنائے، گلے میں تختیاں ڈالیں۔ ماتھے پر ٹیکا سجایا۔ کلائیوں میں چوڑیوں کے علاوہ کنگن پہنائے۔ پیردوں میں جھانجھر ڈالیں۔

تاجاں کو دلہن بنانے اور اس کا سنگھار کرنے میں نوجوان سائیں اور دوشیزائیں نہایت ذوق و شوق کے ساتھ تائن کا ہاتھ بٹاتی رہیں۔ دلہن کا بناؤ سنگھار ہوتا رہا۔ ساتھ ساتھ ڈھولک پر سنگھار کے گیت بھی گونجتے رہے۔

کنگھے نی رنگ رتے، میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے تائناں تو بچھو
مندى نی رنگ رتے، میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے پنساری تو بچھو
دلیرے سرب سامنے میری نازو سنگاریں
میں کی جاناں باوری، جا کے سنیرے تو بچھو
سنگھار کے بعد تاجاں کا چہرہ تروتازہ گلاب کے مانند شگفتہ اور دل آویز نظر آ رہا تھا۔ گونا گونا رنگ لگے سرخ عروسی جوڑے میں، زیورات سے سجی بنی وہ گردن جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ جلیب نے گھونگھٹ اٹھایا۔ تاجاں کا تابندہ چہرہ دیکھ کے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ٹھوڑی اٹھا کے تاجاں کا چہرہ اوپر کیا اور بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔
سنگھار کے گیت گونجتے رہے۔ کھٹکتی ہنس کی چھا گئیں بجتی رہیں۔ یکایک غلغلہ پڑا۔ ”جنگ آگئی جنگ آگئی۔“ نوجوان عورتیں، لڑکھنوا ریاں اور بچے برات دیکھنے دوڑے۔

برات گاؤں کی گلیوں سے گزر کر حویلی کی جانب بڑھ رہی تھی۔ برات کے آگے ڈھول اور بین باجے بج رہے تھے۔ پٹائے دانے جارہے تھے۔ پھل جھڑیاں اور ماہ تالیاں چھوڑی جارہی تھیں۔ برات کے ساتھ گیس بٹیاں روشن تھیں۔ ان کی تیز روشنی میں دولہا پھولوں کے زرتار سرے۔

ہنس کر اس طور خیر مقدم کیا گیا۔

کی کراں کرباں، آج بنا تھی آیا مہمان

برات دیرے دیرے حویلی کے سامنے سے گزرتی ہوئی اسکول کے قریب پہنچی۔ وہاں برات کا خیر مقدم کرنے کے لیے رحیم داد پہلے سے موجود تھا۔ اس نے بڑھ کر براتیوں کا استقبال کیا۔ ایک ایک سے مصافحہ کیا، گلے ملا، خیریت پوچھی، دولہا کو مسند پر بٹھایا۔ مسند پر حویلی کے بڑے کمرے کا قالین بچھا تھا۔ آگے دریاں تھیں جن پر چاندنی کا فرش تھا۔ دولہا کے بیٹھتے ہی حویلی کے نائی نے اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ڈالی اور دودھ پلایا۔ یہ پُش کارہ تھا۔

دش کارے کی رسم کے بعد براتیوں کے سامنے حقے تازہ کر کے رکھے گئے۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا بھی چل رہی تھی۔ مگر براتیوں کے لیے ہر کمرے میں اینگلیٹھی روشن تھی۔ رضائیوں کا بھی بندوبست تھا۔

کھانے کے بعد رات گئے تک رونق رہی۔ رحیم داد دولہا کے باپ اور رشتے داروں کی خاطر مدارات کرتا رہا۔ اسکول کی عمارت میں گیس بیٹوں کی تیز روشنی تھی اور ملی جلی آوازوں کا شور ابھر رہا تھا۔



آدھی رات ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ نادر خاں اور جلیل کو مہمانوں کی دیکھ بھال پر لگا کر وہ حویلی میں چلا آیا اور چوکنٹا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا زینے کے قریب پہنچ گیا۔ سیڑھیاں طے کیں، جیلہ کے کمرے کی جانب چلا، آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مگر اس کی لودہم تھی۔ بستر پر جیلہ کی بیٹی بیٹھا لیٹی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لحاف میں دبا ہوا گندو بھی سو رہا تھا۔ ایک گوشے میں اینگلیٹھی رکھی تھی۔ اس کے قریب ہی چٹائی پر دو ہراوڑے حویلی کی ملازمہ تاراں بے خبر سو رہی تھی۔

کمرے میں جیلہ نہیں تھی۔ مگر کچھ ہی دیر بعد کمرے کے باہر چھت پر آہٹ ابھری۔ رحیم داد چونکا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ آگے بڑھا، باہر نکلا۔ ایک بار پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ کمرے کی گاڑھی گاڑھی دھند میں رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر ہر طرف دیکھا۔ لیکن کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ چاب رفتہ رفتہ مدھم مدھم بڑگئی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ رحیم داد دیر تک ہٹکا کھڑا رہا۔ پھر نیچے اتر گیا اور اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ زیادہ دیر نہیں سو سکا۔ نکاح کے لیے فجر کی نماز کے بعد کا وقت مقرر ہوا تھا۔ اذان ہونے سے

پہلے پہلے رحیم داد بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا اور کپڑے بدل کے جلدی جلدی اسکول کی عمارت میں پہنچ گیا۔ تمام براتی جاگ رہے تھے۔ جو سو گئے تھے وہ بھی اب بیدار ہو چکے تھے۔ نکاح خواں وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ نماز کے بعد نکاح پڑھایا گیا۔ براتیوں کی جانب سے چھوڑے اور کھانے بچھاؤ رکھے گئے۔ رحیم داد نے دولہا اور اس کے باپ کو مبارک باد دی اور گرم جوش سے دولہا کو گلے لگایا۔

جیلہ بھی نکاح کے وقت دوسری عورتوں کے ساتھ عروسی جوڑے میں ملبوس تاجاں کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ ایجاب و قبول کا مرحلہ طے ہو گیا اور نکاح کی رسم مکمل ہو گئی تو جیلہ نے آگے بڑھ کر تاجاں کو سینے سے چمٹا لیا۔ تاجاں رو رہی تھی۔ جیلہ کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر بکھرنے لگے۔

جیلہ آنسو پونچھتی ہوئی انھی۔ پھاتاں نزدیک ہی کھڑی تھی۔ اس کی پلکیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے جیلہ کو اشارہ کیا اور دونوں آنگن میں پہنچ گئیں۔ پھاتاں حیران و پریشان نظر آ رہی تھی۔ جیلہ کو بھی فکر ہوئی۔ لیکن اس نے تحمل کیا اور خاموش کھڑی رہی۔

پھاتاں ہچکچاتے ہوئے بولی۔ ”بھین جی! برانہ منا تو ایک گل پوچھوں؟“

”پوچھ، ضرور پوچھ۔“ جیلہ نے مسکرا کر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”پر تو تو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔“

”گل ہی ایسی ہے جی۔“ پھاتاں بے قراری سے بولی۔ ”میں نے سنا ہے تو نے پرسوں رات پیراں والہ میں احسان شاہ کے سامنے چوہدری سے نکاح پڑھوایا۔“ اس کی آواز اٹکنے لگی۔ ”مجھے تو شام ہی کو پتہ چل گیا تھا۔ میں تو سنتے ہی اچنبھے میں رہ گئی۔ بھین جی! یہ سب ہوا کیسے؟ سمجھ نہیں آتی، توجہ دیج بتا۔“

جیلہ کا چہرہ فٹ ہو گیا۔ اسے دکھ بھی ہوا اور غصہ بھی آیا کہ یہ راز رحیم داد یا نادر خاں کے سوا کوئی اور افشا نہیں کر سکتا تھا۔ جیلہ اپنا غم و غصہ پھاتاں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور پھاتاں سے صرف اتنا پوچھا۔

”تجھے یہ بات کس نے بتائی؟“

”یہ بات تو سبھی کو ملوم ہے۔ براتیوں تک کو پتہ ہے۔“ پھاتاں نے مطلع کیا۔ ”مجھ سے تو اس بارے میں پھاتاں کی ساس بھی پوچھتی تھی۔“ اس نے جیلہ کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”کیا یہ سچ ہے بھین جی؟“

مہمان کھانے سے فارغ ہوئے تو جیلہ نے تاجاں، پھاتاں، جنت اور زینت کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے کچھ دیر بستر پر لیٹ کر آرام کیا۔ سورج مغرب کی سمت ڈھلکنے لگا تھا۔ دھوپ کی رنگت بدلتی جا رہی تھی۔ سائے بڑھنے اور پھیلنے لگے تھے۔ وہ جلد ہی اٹھ گئی۔ اس نے گرم پانی سے غسل کیا، بال خشک کئے۔ تھوڑا سا تیل ڈال کر اہتمام سے بال سنوارے، آنکھوں میں دجالہ کاجل لگایا۔ ہونٹوں پر سرخی کی ہلکی سی تہہ جمائی۔ ماتھے پر جڑاؤ جھومر سجایا، کانوں میں مندرے پنے، گلابیوں میں نگن ڈالے۔ بائیں ہاتھ میں ہاتھی دانت کا منقش چوڑا پہنا۔ گہری نارنجی ریشمی شلوار اور اسی رنگ کی قمیص پہنی۔ قمیص کے گریبان اور آستینوں پر سبز اور سیاہ دھماگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ اس نے آئینے کے روبرو اپنے سنگھار کا جائزہ لیا اور سترے کنارے کی فیووزی شال اوڑھ لی۔

اس صبح دھج سے وہ دلہن کے پاس پہنچی تو دیکھنے والوں کو ایسا محسوس ہوا جیسے محفل میں چاند اتر آیا ہو۔ اس کے شکفتہ اور تابندہ چہرے پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ وہ راج ہنس کی طرح گردن اٹھائے ہنسی مسکراتی چکا چوند پیدا کرتی مہمان عورتوں کے درمیان بیٹھ گئی۔

دن ڈھلے دولہا زنان خانے میں بلایا گیا۔ پھاتاں کے اصرار پر جیلہ نے دولہا کو نیم گرم دودھ پلایا۔ پھاتاں نے مٹھائی کی تھالی بوحا کے اس کے سامنے کر دی۔ جیلہ نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور دولہا کی جانب ہاتھ بوحایا۔ مسکرائی اور دل جوئی سے اسے مٹھائی کھلائی۔ سلامی میں پانچ سو روپے اور ایک گھڑی دی۔ تاجاں کی رشتہ دار اور دوسری عورتوں نے بھی حسب توفیق سلامی دی۔

سلامی کے دوران تاجاں کی سیلیاں اور دوسری مہمان لڑکیاں دولہا سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہیں۔ اسے طرح طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کرتی رہیں۔ دولہا کی ہمیں سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ انھوں نے اپنے دوپٹوں کے جھل ملاتے آنچلوں سے اس کے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ قہقہے گونجتے رہے۔ میراٹن نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے ایک چھنڈ گیت شروع کیا۔ گیت کے بولوں میں بھی دولہا سے چھیڑ چھاڑ کی گئی تھی۔

چنڈیر آگے آئے جائے، چھنڈیرا گے شگنا
اک ویاہ کے لے چلے دو جا تیتے شگنا!
چھنڈیرا گے آئے جائے، چھنڈیرا گے کولا
پرہاں ہو کے بولو کزبو، خیرا پالیا رولا

”ہاں پھاتاں! میں نے چوہدری سے ویاہ کر لیا۔“ جیلہ انکار نہ کر سکی۔ لیکن اس نے فوراً بات بتائی۔ ”تجھے تو پتہ ہے۔ تاجاں کے سسرال والوں نے جھڑا ڈالا تھا کہ میں رنڈ بیوہ ہوں، اس کارن تاجاں کے ویاہ میں نہیں بیٹھ سکتی۔“ اس نے ہونٹوں پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”پر تاجاں تو میری دھی سمان ہے ناں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس کے ویاہ میں نہ بیٹھوں، سو میں نے نکاح کر لیا۔ رنڈ نہیں رہی، ساگن بن گئی۔ تو تاجاں کی ساس سے کہہ دینا، اب تو اسے میرے بارے میں کوئی گلہ نہیں رہا۔“

پھاتاں اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”بھین جی! میں تاجاں کی ماں ہوں پر اس کے پیار میں تو مجھ سے بھی آگے نکل گئی۔ بھین جی! تو کتنی چنگی ہے، میرے پاس تیرے لیے دعا نکالنے کو بول نہیں رہے۔“ وہ جیلہ کے کندھے سے سر نکا کر رونے لگی۔

جیلہ نے اس کی پیٹھ ہولے ہولے تھپ تھپائی۔ ”خوشی کے سے تو رو رہی ہے پھاتاں!“ وہ زیر لب مسکرائی۔ ”اب یہ رونا رلانا چھوڑ۔ تو نے ابھی کئی کام کرنے ہیں۔“

پھاتاں نے دوپٹے کے آچل سے آنسو پونچھے اور جیلہ کے ساتھ بھرتاجاں کے پاس پہنچ گئی۔ دونوں سب کچھ بھول بھال کر ایک بار پھر شادی کے ہنگاموں میں کھو گئیں۔



سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ گیا۔ حویلی کے سامنے میدان میں دیکھیں چڑھی تھیں۔ پلاؤ، زردہ اور قورمہ پک رہا تھا۔ ایک طرف بڑا سا تندور لگا تھا جس سے تندور یا گرم گرم روٹیاں نکال رہا تھا۔ ہر طرف طرح طرح کے کھانوں کی مہک پھیلی تھی۔

دوپہر کے کھانے پر بھی رحیم داد موجود تھا۔ وہ ہر براتی اور مہمان سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا تھا اور اصرار کر کے کھانا کھلا رہا تھا۔ اس کے روپے میں میزبان کے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حویلی کے سربراہ کا ظنہ بھی جھلک رہا تھا۔ ہر کام اس کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ وہ اونچے طرے کی پگ سر پر رکھے، آن بان سے کرسی پر بیٹھا احکام جاری کر رہا تھا۔

مرد کھانا کھا چکے تو رحیم داد نے نادر خاں کو طلب کیا اور گردن اونچی کرتے ہوئے بولا۔ ”نادر! اب تو زمیں درانی کے پاس جا۔ اسے کہہ کہ زنانیوں کے لیے روٹی کا بندوبست کرے۔“

نادر خاں اس کی ہدایت پر فوراً حویلی کی جانب چلا گیا۔ جیلہ پہلے ہی عورتوں کے لیے دسترخوان بچھو کر کھانا لگوا چکی تھی۔ وہ مہمانوں کے درمیان سرگرمی سے ادھر ادھر بھاگتی دوڑتی پھر رہی تھی۔ وہ بظاہر بہت مسرور اور شادمان نظر آ رہی تھی۔

دن اور ڈھل گیا۔ سائے طویل ہو گئے۔ رحیم دادو لھا کے باپ اور دوسرے براتیوں کو کھٹ دکھائی کے لیے اپنے ہم راہ سمان خانے میں لایا۔ یہاں صحن میں چار پائوں پر جینز کے رنگین اور چمکتے ہوئے لمبوسات اور دیگر ساز و سامان سجا کر رکھا گیا تھا۔ براتی جینز سے بھی ہوئی کسی چارپائی کی جانب بڑھتے تو ڈھولی گردن میں پڑے ہوئے ڈھول پر زور سے چوٹ لگاتا۔ حویلی کا میرائی آگے بڑھ کر ہر سامان کے بارے میں براتیوں کو بتاتا۔ براتی باری باری ہر چارپائی کے قریب جاتے۔ سلیقے سے سجا جایا جینز دل چسپی اور اشتیاق سے دیکھتے۔ وہ خاصے مرعوب نظر آرہے تھے۔ جیلہ نے بڑے اہتمام اور لگن سے جینز تیار کیا تھا۔ جینز براتیوں کی توقع سے زیادہ قیمتی اور شان دار تھا۔ وہ حیرت سے ہاتھ بدھا کر ہر چیز احتیاط سے چھوتے اور مسکرا کر اپنی پسند نا اظہار کرتے۔

شام کا بجٹ پتا ہوتے ہی براتیوں کی جانب سے رخصتی کا تھنا شروع ہوا۔ انھیں لگ بھگ آٹھ میل فاصلہ طے کرنا تھا۔ اندھیرے کے ساتھ سردی بھی :۔ جتنی جاری تھی۔ سورج کی کرنیں حویلی کی منڈیروں پر دھندلی پڑتی جاری تھیں۔ شام ہولے ہوئے نیچے اتر رہی تھی۔

رخصتی کے وقت تاجاں بلک بلک کر رونے لگی۔ ہر چہرہ سرگوار ہو گیا۔ جیلہ تاجاں کو تسلی دینے لگی۔ مگر تسلی دیتے دیتے بے اختیار خود جیلہ کا دل بھر آیا۔ اس نے آنچل سے آنسو پونچھے، تاجاں کو دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر کھڑا کیا اور سارا دیتی ہوئی کمرے سے نکل کر آگن میں پہنچی۔

بیرونی دروازے کی دہلیز پر ڈولی رکھی تھی۔ جیلہ اور دوسری عورتیں تاجاں کے ہم راہ ڈولی کی جانب بڑھیں۔ پھانسیاں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ میراٹن نے رخصتی کا گیت چھیڑ دیا۔

لے چلے بابلا لے چلے

مینوں ڈولی پا کمار

بابلا لے چلے

رکھ لے بابلا، ہن دہاڑے چار

ہن کی بابلا تیرا دعوا

وس پرانی کوڈا بابلا

میراٹن سوز بھری لے میں منڈھا گا رہی تھی۔ گیت کے بولوں میں ایسا درد تھا، ایسی کک اور جھپن تھی کہ ہر شخص تڑپ اٹھا۔ ہر آنکھ پر نم ہو گئی۔ گیت کے اتار چڑھاؤ میں وہی بل چل تھی جو دلہن بن کر ہر دہلیز کے دل میں رخصتی کے وقت طرح طرح کے خدشات اور دوسووں میں ڈھل

کر موج زن ہوتی ہے۔ یہ اس کے چمکتے اٹھتے اور تڑپتے احساسات تھے جو منڈھے کے بولن بن کر اس طرح فریاد کناں تھے۔

بابل، میری ڈولی لے کر کمار جارہے ہیں

بابل، مجھے چند روز کے لیے اپنے پاس اور رہنے دے

دیکھ بابل، اب مجھ پر تیرا کیا دعوا

میں تو پرانے دیس کی ہو چکی

تاجاں زار و قطار رو رہی تھی۔ جیلہ کی آنکھوں سے بھی جھری لگ گئی تھی۔ اس کے سلکتے ارمان سینے میں دھواں بن کر اٹھ رہے تھے، بادل بن کر برس رہے تھے۔ اسے اپنے بابل کے گھر سے دلہن بن کر اس طرح رخصت ہونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ بہت دن ہوئے اس نے بھی ایک المیز دو شیزہ کی طرح دلہن بننے کے خواب دیکھے تھے۔ اس کے خواب ادھورے ہی رہ گئے۔ رخصتی کے درد کی کک محسوس کرنے کا اسے کبھی موقع نہیں ملا۔ آج تاجاں کو رخصت کرتے ہوئے وہ اس درد کی لذت محسوس کر رہی تھی۔ میراٹن گا رہی تھی۔

لے چلے بابلا، لے چلے

مینوں ڈولی پا کمار

ڈولی میں سوار ہونے سے پہلے تاجاں تڑپ کے جیلہ کے سینے سے چٹ گئی۔ جیلہ اسے سینے سے لگائے آنسو بہاتی رہی۔ سورج کب کا ڈوب چکا تھا۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ گیس بتیاں روشن کر دی گئی تھیں۔

جیلہ نے تاجاں کے سر پر ہاتھ بھیرا۔ پھانسیاں اور دوسری عورتوں کی مدد سے تاجاں کو ڈولی میں سوار کرایا۔ منڈھے کے بول اوچے اور اونچے ہوتے گئے۔ میراٹن کی آواز کا سوز فضا میں بکھرتا جا رہا تھا۔

سربا کی کمر آلود شب اداس اور نڈھال کھڑی تھی۔ ہر طرف سسکیاں ابھر رہی تھیں اور آنکھوں سے آنسو برس رہے تھے۔

کماروں نے ڈولی اٹھائی۔ برات، ڈھول اور بین باجے بجائی، پٹائے چھوڑتی رخصت ہو گئی۔ تاجاں اپنے دو لھا کے ساتھ سسرال چلی گئی۔ حویلی کی چل چل ماند پڑنے لگی۔ کھکتے قمتوں کے جل تڑک خاموش ہو گئے۔

کچھ سمان عورتیں شام ہی کو رخصت ہو گئی تھیں۔ جو ٹھہر گئی تھیں، جیلہ ان کے ساتھ کچھ دیر

بیٹھی رہی۔ وہ بہت بھی بھٹی تھی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور مہمان خانے سے گزر کر حویلی میں پہنچی۔

رحیم داد دروازے پر موجود تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جمیلہ نے اٹک آلود نظروں سے اسے دیکھا، گردن جھکائی اور زینے کی سیڑھیاں ملے کرتی ہوئی اوپر پہنچ گئی۔ وہ بہت شکستہ اور دل گرفتہ تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور بے حال ہو کر بستر پر دراز ہو گئی۔



پہر رات گزر چکی تھی۔ حویلی پر گہرا سناٹا چھایا تھا۔ جمیلہ کمرے میں تنہا تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔ اچانک کمرے کا دروازہ چڑھتا ہوا کھلا۔ جمیلہ نے حیرت سے دیکھا، رحیم داد دروازے پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جمیلہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ رحیم داد مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اطمینان سے جمیلہ کے قریب بستر بیٹھ گیا۔ کمرے میں کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ پھر رحیم داد کی آواز ابھری۔

”جی لے!“

جمیلہ نے چونک کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس نے پہلی بار جمیلہ کو اس قدر بے تکلفی سے مخاطب کیا تھا۔ صرف اللہ و سایا مرحوم اسے پیار سے ”جی لے“ کہتا تھا۔ کمرے میں سکتی ہوئی اٹھ بھٹی کی ہلکی ہلکی روشنی میں رحیم داد کی آنکھوں سے سرنخی جھلک رہی تھی۔ ان میں ایسی تیز اور چھپتی ہوئی چمک تھی کہ وہ دم بہ خود ہو گئی۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ رحیم داد اس کے دل میں امدتی ہوئی ہل چل سے بے نیاز زیر لب مسکراتا رہا۔ اس نے پیار جتانے کی کوشش کی۔

”جی لے! تو اتنی اداس اور پریشان کیوں ہے؟“

”ہاں چوہدری! میں بہت زحمت اور دکھی ہوں۔“ جمیلہ نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔“

”تو نے خاما خا کی پریشانی مول لے رکھی ہے۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”لگتا ہے، جانے کب سے بیمار ہے۔ تو نے تاجاں کا دیا وہ ایسی دھوم دھام سے کیا جیسے تیری اپنی دھمی ہو۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ وہ میری دھمی سان ہے۔“ جمیلہ نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”نہ اس کا پیو ہے نہ دیر ہے نہ کوئی بھین، میرا بھی کوئی نہیں۔ میں اسے۔۔۔“

رحیم داد اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”ایسا کیوں سوچتی ہے۔ تو مجھے اپنا نہیں سمجھتی؟“

جمیلہ گم سم بیٹھی رہی۔ رحیم داد نے دل جوئی کی کوشش کی۔ ”لگتا ہے، تجھے تاجاں سے بہت

پیار ہے۔“

جمیلہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس سے اتنا پیار نہ ہوتا تو میں احسان شاہ کی حویلی میں کیوں جاتی۔ اسے واپس لانے کے لیے تیری اور احسان شاہ کی ہر گل بات کیوں مان لیتی۔ پر چوہدری تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا۔“

رحیم داد نے اس کے لہجے کی تقلید اور کات محسوس کی۔ آواز میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”جو ہونا تھا ہو گیا۔ اس کے بارے میں نہ سوچ۔ آگے کی سوچ۔“

”آگے کی کیا سوچتا۔“ جمیلہ نے رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”میں نے تو اسی حویلی میں رہنا ہے۔ تیری گھروالی ہی بن کے رہتا ہے۔“

رحیم داد جھوم اٹھا مگر اس نے اپنی وارفتگی کا اظہار نہیں کیا۔ نادم اور پشیمان ہونے کے انداز میں نظریں جھکا کر گویا ہوا۔ ”تیری زراعتی بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے اس رات تجھے بہت دکھ پہنچایا۔ مجھے بھی اس کا دکھ ہے۔ تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ اس نے جمیلہ کے چہرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ گرمی سانس بھری اور چہرے پر انفرادی طاری کرنے کی کوشش کی۔ ”جی لے! تو اتنی سوہنی ہے، اتنی خوبصورت ہے کہ بس یہی جی کرتا ہے تو میرے سامنے بیٹھی رہے اور میں تجھے دیکھتا رہوں۔“ وہ بہت جذباتی ہو گیا۔ اس نے جمیلہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی انگلیوں میں سمجھ لیا۔ جمیلہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا، مسکرائی اور گردن کو خم دے کر دیکھا۔

”پیار ہی جتنا ہے تو آرام سے جتنا۔ آج مجھے نیند لگ رہی ہے۔ طبیعت بھی گزبڑ ہے۔ تو بھی اپنے کمرے میں جا کر سو۔“

”نہیں، میں اب کہیں نہیں جاؤں گا۔“ وہ بچوں کی طرح پھٹنے لگا۔ جمیلہ کے رخسار پر ہولے سے جھلکی بھر کر بولا۔ ”میں تجھے اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تو بہت پریشان پریشان لگ رہی ہے۔“

”چوہدری! ضد نہ کر۔“ جمیلہ نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ ”میں نے کہہ دیا کہ میری طبیعت آج ٹھیک نہیں۔ سر میں درد بھی ہے۔“

”تو آرام سے لیٹ جا۔“ رحیم داد خوشامد پر اتر آیا۔ ”لا، میں تیرا سردبا دوں۔ تو سو جائے گی تو میں چپ چاپ چلا جاؤں گا۔“

”مجھے تنگ نہ کر۔“ اس دفعہ جمیلہ نے ہزاروں سے کہا۔ ”اب تو جا۔ مجھے اس سے اکیلا ہی چھوڑ دے۔ مجھے اکیلے ہی میں آرام ملے گا۔“ اس نے ٹیکسی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے پہلے ہی کم گھاؤ لگائے ہیں، اب اور تنگ نہ کر۔“

رحیم داد نے جیلہ کے بدلے ہوئے تیر دیکھے تو نرم پڑ گیا۔ ”جیسی تیری مرضی۔“ وہ روٹنے کے انداز میں بولا۔ ”میرے یہاں ٹھہرنے سے تجھے تکلیف ہوتی ہے تو میں چلا جاتا ہوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”برانہ مٹا۔“ جیلہ تھکے ہوئے لمبے میں بولی۔ ”سچ جان، میری طبیعت اس سے ٹھیک نہیں۔ میں سویرے تیرے پاس آؤں گی۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ منہ لٹکائے باہر چلا گیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ جب ستائے میں کھل مل کر ڈوب گئی تو جیلہ بستر سے نیچے اتری، آگے بڑھی۔ اس نے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور بستر پر لیٹ گئی۔

دوسرے روز وہ رحیم داد کے پاس نہیں گئی۔ اس نے سویرے ہی سویرے جلیل کو اپنے کمرے میں بلایا۔ جلیل ابھی تک اپنی بیوی، زینت اور بچوں کے ساتھ حویلی میں ٹھہرا تھا۔ جیلہ نے اپنا ایک خط دے کر جلیل کو نہال دین کے پاس شمار کے روانہ کر دیا۔

جلیل کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہ نیچے اتری اور سیدھی ان مہمانوں کے پاس چلی گئی جو تاجاں کے بیاہ میں شرکت کرنے آئے تھے۔ وہ تمام وقت انھی کے ساتھ رہی۔ دونوں وقت کا کھانا بھی ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا اور رات گئے تک بیٹھی باتیں کرتی رہی۔ جب اندھیرا بڑھ گیا اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو وہ زینت کے ہم راہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ جلیل ابھی تک شمار کے سے واپس نہیں آیا تھا۔

رحیم داد اپنے کمرے میں بیٹھا جیلہ کا انتظار کرتا رہا۔ اس کی مضطرب نظریں دالان میں کھلنے والے دروازے کی جانب بار بار اٹھ جاتیں لیکن دروازہ نہ کھلا۔ رحیم داد نے بھی جیلہ کے کمرے کی جانب جانے سے خود کو روکے رکھا۔ ایک اور رات گزر گئی۔

دوپہر تک رحیم داد، جیلہ کے آنے کی آس میں کمرے میں ٹھہرا رہا اور آخر اکتا کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ ادھر ادھر بے زاری سے گھومتا رہا۔ کچھ ہی دیر بعد واپس اپنے کمرے میں آیا اور کھانا کھا کے تھکا ہوا سا بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو وہ کمرے میں تھا تھا۔ جیلہ اس کے دروازے کے سامنے سے گزری۔ اس کے ہم راہ جلیل، زینت اور ان کے بچے تھے۔ وہ دیپال پور واپس جا رہے تھے۔ جیلہ انھیں رخصت کرنے حویلی کے چھانک تک گئی۔ چھانک کے عین سامنے تانکا کھڑا تھا۔ جلیل، بیوی بچوں کے ساتھ تانگے

میں سوار ہو گیا۔

واپسی پر جیلہ ایک بار پھر رحیم داد کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ رحیم داد بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز سے جیلہ کو ٹوکا۔ ”جی لے!“

وہ خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔

رحیم داد نے شکوہ کیا۔ ”تو کل سویرے آئی نہیں۔ میں رات کو بھی دیر تک تیرا انتظار کرتا رہا۔ تو مہمانوں کے پاس بیٹھی گلاں کرتی رہی۔ وہاں سے انھی تو ادھر نہیں آئی۔ زینت کے ساتھ سیدھی اوپر چلی گئی۔“

جیلہ خاموش بیٹھی رہی۔

مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ لہجہ بدل کے قدرے مسکرایا۔ ”اب تو تجھے دیاہ کے چکڑوں سے چھٹی مل گئی۔ سوچتا ہوں، سامان اوپر بھیج کر میں بھی تیرے پاس پہنچ جاؤں۔ یہاں تو اکیلے بہت جی گھبراتا ہے۔“

”تو پہلے بھی تو اسی کمرے میں اکیلا رہتا تھا، چند روز اور ٹھہر جا۔ فیر آجا۔ اب تجھے روک بھی کون سکتا ہے۔“

”سامان تو کل سویرے بھی پہنچ سکتا ہے۔“ جیلہ کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو وہ اترانے لگا اور بے تکلفی سے بولا۔ ”میں تو آج تیرے ہی پاس رہوں گا۔ تیرے بنا اب مجھے نیند نہیں آتی۔“ اس نے ایسی جھپٹی ہوئی نگاہوں سے جیلہ کی جانب دیکھا کہ اس کی نظریں جھک گئیں۔

رحیم داد اور بے قابو ہو گیا۔ ”سچ“ آج تو بہت سوہنی لگ رہی ہے۔ دیکھ انکار نہ کرنا۔“

جیلہ نے نرمی سے انکار کر دیا۔ ”تجھے تو پتہ ہی ہے، تاجاں آج ہی بکلاوے پر آئی ہے۔ وہ میرے ہی ساتھ ٹھہری ہے۔“

”تو نے اس کا دیاہ کر دیا اور بہت دھوم دھام سے کر دیا۔“ رحیم داد نے برہمی کا اظہار کیا۔

”اب مٹاؤ اشکلاوا چھوڑ، اس چکر میں زیادہ نہ پڑ۔ بہت ہو گیا۔“

”چوہدری! تو کیسی گلاں کر رہا ہے۔“ جیلہ نے کسی قدر تازہ گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”جب اس کا دیاہ کیا ہے تو ساری ہی رستاں رساں کرنی پڑیں گی۔ مٹاؤ ابھی کرنا پڑے گا۔ ایسا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“

رحیم داد تیوری پر پل ڈال کر تیز لمبے میں بولا۔ ”میں چاہتا ہوں اب یہ چکر ختم ہو جائے۔“

”زراض نہ ہو۔“ جیلہ نے رمان سے کہا۔ ”دو تین روز اور شانت رہ۔ تاجاں روز روز تو آنے

سے رہی۔ اب وہ پرانے گھر کی ہو چکی ہے۔“

”تو نے تاجاں کے بست لاڈ کر لیے، آگے جو ہوتا ہے، پھاتاں سے کہہ کہہ کرے۔ وہ اس کی ماں ہے۔ اس نے بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔ تو نے ہر بات کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔“

”ٹھیک ہے، جیسا تو کہہ رہا ہے ویسا ہی ہو گا۔“ جمیلہ اس دفعہ بھی نرمی سے بولی اور کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے اب جانا ہے۔“

”چلی جانا۔ کچھ دیر اور ٹھیر جا۔“

”مجھے اب نہ روک۔“ وہ آگے بڑھتی ہوئی بولی۔ ”مہمانوں میں میرا انتظار ہو رہا ہو گا۔ تو روٹی کھا اور سو جا۔“

جمیلہ نے رحیم داد کو مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ آگے بڑھ گئی۔ رحیم داد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

دو دن اور گزر جانے کے باوجود جمیلہ اس کے پاس نہیں آئی۔ تیسرے روز تاجاں اپنے دولہا کے ہم راہ چلی گئی۔ رحیم داد نے دوپہر کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے ہی میں بیٹھا رہا مگر زیادہ دیر کمرے میں نہ ٹھہر سکا باہر نکل گیا۔



سہ پہر کو نہال دین آگیا۔ رحیم داد اس وقت تک واپس حویلی میں نہیں آیا تھا۔ وہ رنج کی فصلوں کی دیکھ بھال کی غرض سے کھیتوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ نادر خان لاہور گیا تھا۔ جمیلہ نے اس سے کچھ ایسی دوائیں منگوائی تھیں جو لاہور ہی میں مل سکتی تھیں۔

جمیلہ اپنے کمرے ہی میں تھی۔ اس نے نہال دین کو وہیں بلوایا۔ وہ اسے بہت عرصے سے جانتی تھی۔ اللہ وسایا سے ملنے پہلے بھی نہال دین کئی بار حویلی میں آچکا تھا، مگر اللہ وسایا کے قتل کے بعد اس روز پہلی بار آیا تھا اور جمیلہ کے بلوانے پر آیا تھا۔ وہ جمیلہ کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ آدھ گھنٹے بعد نیچے اترا اور خاموشی سے چلا گیا۔

غروب آفتاب سے کچھ ہی دیر قبل رحیم داد اپنے کمرے میں واپس آیا۔ اس نے منہ ہاتھ دھو کر ایک پیالی گرم گرم چائے پی۔ شام ہو گئی۔ رحیم داد نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اندھیرا گہرا ہوا تو اس نے جمیلہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ جمیلہ دروازہ کھول کر داخل ہوئی۔ وہ ہلکے گلابی رنگ کی قمیص اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر تابندگی اور نکھار تھا۔ وہ اس وقت بن سنور کر آئی تھی اور کچھ زیادہ ہی حسین اور دل ربا لگ رہی

تھی۔ حاری ہیں۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو بے قرار ہو گیا۔ سینے میں ہوک سی اٹھی لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جمیلہ کرسی پر اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔ رحیم داد پھر بھی نہ بولا۔ آخر جمیلہ نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”چوہدری! تو چپ کر کے اس طرح کیوں بیٹھا ہے؟“

”یہ بتا تو مجھ سے کب تک دور دور رہے گی۔“ رحیم داد نے شکوہ کیا۔ ”اب تو سارے مہمان شیمان چلے گئے پر تیرے دھندے ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔“ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجھلاہٹ ابھرنے لگی۔ ”صاف صاف بتا تو چاہتی کیا ہے؟“

رحیم داد کے چہرے کی تقنی جمیلہ نے بخوبی محسوس کی۔ لیکن وہ مرعوب نہیں ہوئی، کھل کر مسکرائی۔ ”ایک گل پوچھوں، صاف صاف بتائے گا؟“

”پوچھ، کیا پوچھنا چاہتی ہے؟“ رحیم داد نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

”چوہدری! کیا تو سچ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے؟“

”جتنے کیا پتہ، میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔“ رحیم داد وارفتہ ہو کر بولا۔ ”تیرے لیے تو میں نے بھکر میں تک کھے پیر کی زیارت پر منت تک مانی۔ میری ایک پگ میں اب تک منت کی گرہ لگی ہے۔ میں نے اس پگ کو سنبھال کر الگ رکھ چھوڑا ہے۔“

”تو بھکر بھی گیا تھا؟“ جمیلہ نے دریافت کیا۔

”جن دنوں تو مجھ سے نراض تھی اور بات کرنی چھوڑ رکھی تھی، میں بھکر چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے منت مانی کہ تو سدا کے لیے میری بن جائے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت خالی نہیں جاتی۔ تو نے دیکھ لیا میری مراد کس طرح پوری ہوئی اور تو مجھے مل گئی۔ یہ سب کچھ منت ہی کا نتیجہ ہے۔“

”کہتا تو ٹھیک ہی ہے۔“ جمیلہ نے نظریں نیچی کر لیں۔ ”لگتا ہے بھکھا پیر بہت زبردست بزرگ رہا ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ اس کی زیارت کو بھکر چلوں گی۔“

”مردو چل، بھکر میں میرا یار سردار مراد خاں شاہانی رہتا ہے۔ دونوں اس کی حویلی میں ٹھہرے گئے۔“ رحیم داد نے خوش ہو کر کہا۔ ”مراد خاں، بیٹ کا وڈا زمیں دار ہے۔ بہت شان ہے اس کی۔ حویلی بھی شان دار ہے۔“

”مراد خاں شاہانی سے تیری کب کی دوستی ہے؟“ جمیلہ نے پوچھا۔

سے رہی۔ اب وہ اِزْوَالی بن گئی ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سب کچھ تجھے صاف صاف بتا دوں گا۔ پر تو میرے پاس بیٹھتی ہی کب ہے۔ اب تک تجھے بتا بھی چکا ہوتا۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”پر پہلے مجھے یہ بتا“ آج رات تو میرے پاس بیٹھیں رہے گی یا میں تیرے ساتھ اوپر چلوں؟“

”تو نے ابھی روٹی نہیں کھائی۔ روٹی کھا کر میرے پاس آ جانا۔“

”میں روٹی تیرے ساتھ ہی کھاؤں گا۔“ رحیم داد ضد کرنے لگا۔ ”میں تو ابھی تیرے ساتھ چلوں گا۔ تو میری گھر والی ہے۔ اب یہ کوئی راز نہیں رہا۔ سب کو پتہ ہے۔“

”تو نے ہی سب کو بتایا ہے۔“ جیلہ نے خٹکے لہجے میں کہا۔

”جھوٹ تو نہیں بتایا۔ نراض کیوں ہوتی ہے۔“ رحیم داد ڈھٹائی سے ہنس کر بولا۔ ”تیرے ساتھ میرا باقاعدہ نکاح ہوا ہے۔ پیراں والہ کے ملائے پڑھایا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں؟“

”تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں نے کب انکار کیا۔“ جیلہ نرم پڑ گئی۔ ”تو اپنی سیدھی گلاں سوچ کر اپنے تئیں پریشان نہ کر۔“ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر ترجمی نگاہوں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”بات کیوں اتنی ہے کہ میرے پاس پھانسی اور پنڈ کی کئی دوسری زنانیاں آ رہی ہیں۔ ان سے کچھ ضروری گل بات کرنی ہے۔ سمجھ گیا ناں؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ رحیم داد تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”پر تو پھانسی شاتاں کا چکر اب چھوڑوے تو زمین دارنی ہے، مزارعوں اور کیوں کی زنانیوں سے تیرا میل ملاپ مجھے بالکل پسند نہیں۔“

”لے“ تو نے ابھی سے مجھ پر رعب جمانا شروع کر دیا۔ ”وہ کھل کھلا کر ہنسی۔ چینیلی کی کلیوں کے سے اس کے سفید سفید دانت جھلکنے لگے۔ اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی ہاتھ بڑھا کر لپٹ کی روشنی میں دیکھی۔ ”چوہدری! ابھی سات بجے ہیں۔ وہ دو اڑھائی گھنٹے سے کم تو میرے پاس نہیں ٹھہریں گی۔ تو دس بجے تک آ جانا۔ کل سویرے اپنا سامان بھی اوپر بھجوا دینا۔ اب تجھے وہیں رہنا ہے ناں۔“ وہ ایک بار پھر ہنسی۔ فضا میں جل ترک بجنے لگی۔ ”لے اب تو خوش ہو جا۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی اونٹنی شال درست کر کے اوڑھی اور آہستہ آہستہ کمرے سے نکل کر دالان میں پہنچ گئی۔

رحیم داد اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ملازم سے کھانا منگوایا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رحیم داد کو قرار نہیں آیا۔ وہ اٹھ کر بستر سے نیچے اتر آیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔

بست دیر بعد اس نے اوپر کی منزل پر جانے والے زینے پر آہٹ سنی۔ ساتھ ہی نسوانی آوازیں

ابھریں۔ رحیم داد نے اندازہ لگا لیا کہ پھانسی اور گاؤں کی دوسری عورتیں واپس جا رہی ہیں۔ کمرے کے دروازے کا صرف ایک پنٹ کھلا تھا۔ رحیم داد نے مڑ کر باہر دیکھا۔ وہ دھیمے لہجے میں باتیں کرتی صحن سے گزریں، پھانک پر پہنچیں اور چوکی دار سے کچھ دیر باتیں کرتی رہیں۔ رحیم داد کا کمرہ دور تھا اور دھند بہت گاڑھی تھی۔ وہ انھیں دیکھ نہیں سکا اور یہ بھی نہیں سن سکا کہ وہ چوکی دار سے کیا باتیں کر رہی ہیں۔ وہ حویلی سے چلی گئیں۔ چوکی دار نے پھانک بند کر دیا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ کبھی کبھی چوکی دار کی کھٹکار اور کھانسی گہری خاموشی میں ابھرتی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔ رحیم داد نے گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ اس نے کپڑے اتار کر اجلا لباس پہنا۔ سوٹ کیس سے شیشی نکال کر کرتے اور ڈاڑھی پر عطر لگایا۔ سر میں خوشبو دار تیل ڈالا۔ کٹنگھی سے سر اور ڈاڑھی کے بال سنوارے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا اور آئینے کے رو برو کھڑے ہو کر مختلف زاویوں سے اپنی ج دج دیکھنے لگا۔ وہ زیر لب مسکرا رہا تھا اور گنگنا رہا تھا۔ اس نے اونٹنی دوہراؤ ڈھی، کمرے سے نکلا اور دروازہ باہر سے بند کیا۔

دھند میں لپٹی ہوئی حویلی اوگھ رہی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ حویلی کے تمام نوکر چاکر اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کر کے بستروں میں دیکے ہوئے تھے۔ صرف چوکی دار باگ رہا تھا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ زینے کی جانب بڑھا۔ ابھی وہ قریب نہیں پہنچا تھا کہ دالان کے اندھیرے میں ایک دھندلا سایہ لہرایا۔ رحیم داد ٹھٹک گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے دیکھا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ دھند اتنی زیادہ تھی کہ وہ اسے پہچان نہ سکا۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ کوئی سر سے پیر تک چادر لپیٹے ہوئے پر اسرار انداز میں دیوار سے لگا کھڑا ہے۔

رحیم داد نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ”کون ہے؟“

کوئی جواب نہ ملا۔ البتہ سائے میں حرکت ہوئی۔ پھر قریب سے اندھیرے میں آواز ابھری۔ ”چوہدری میں ہوں جنت۔“ وہ سامنے آگئی اور رحیم داد کے پہلو سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

”تو اتنی رات گئے کیسے آگئی؟“

”تجھے پتہ ہے، نادر لہور گیا ہے۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے بولی۔ اس کا جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ ”میں تو بہت دیر سے جاگ رہی تھی، انتظار کر رہی تھی کہ تو آج ضرور آئے گا۔ پر تو نہ آیا تو سوچا، خود جا کے دیکھوں۔“

رحیم داد نے جنت کو ٹرخانے کی کوشش کی۔ ”تو اپنے کمرے میں جا۔ تیری بیچیاں اکیلی ہیں۔“

جنت نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو کدھر جانے کے لیے نکلا تھا۔ میری

طرف آ رہا ہو گا؟

”نہیں! رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”میں جیلہ کے پاس جا رہا ہوں۔“

”اب تو وہ تیری گھر والی بن چکی ہے، جب چاہے اس کے پاس جاسکتا ہے۔“

”میں نے تو اس سے شام کو وعدہ کیا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ اب وہ پہلی سی جیلہ نہیں رہی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔“

”مجھے سب پتہ ہے۔ ایک ایک بات کا پتہ ہے۔ نادر مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔“ اس کے لیے میں تلخی تھی۔ ”پر تجھے یہ پتہ نہیں، زمین دارنی تجھ سے نکاح کرنے پر خوش نہیں۔ اس کی باتوں سے یہی لگتا ہے۔“ اس نے رحیم داد کو بد ظن کرنے کی کوشش کی۔ ”اب یہی دیکھ، وہ روز اپنے کمرے میں اکیلی سوتی ہے۔ تیری بالکل پرواہ نہیں کرتی۔ تو کیسا گھروالا ہے؟“ وہ آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ ”میں تو کہتی ہوں، وہ آج بھی آرام سے سو رہی ہوگی۔ تو اس کے لیے اب تک جاگ رہا ہے۔“

”نہیں، وہ بھی جاگ رہی ہوگی۔“ وہ جنت کا رخسار تھپ تھپاتے ہوئے بولا۔ ”تجھے پتہ نہیں میں اس کے پاس نہیں گیا تو وہ نیچے اتر کر میرے کمرے میں پہنچ جائے گی۔ میں وہاں نہ ملتا تو ہو سکتا ہے مجھے ڈھونڈتی ہوئی تیرے گھر پہنچ جائے۔ سوچ تب کتنی گڑبڑ ہوگی۔“ اسی وقت میزبیلوں پر آہٹ ابھری۔ رحیم داد سرا سید ہو گیا۔ اس نے جنت سے کہا۔ ”وہ نیچے آ رہی ہے۔ وہ جیلہ ہی ہو سکتی ہے۔“

جنت نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بھی خوف زدہ ہو گئی تھی۔ رحیم داد کا کمرہ فاصلے پر تھا اور زینہ قریب ہی تھا۔ کمرے کے کھانے میں خطرہ تھا۔ دونوں اندھیرے میں دیوار سے چپنے ہوئے دم بخود کھڑے رہے۔

چاپ قریب آتی گئی۔ چند لمحوں بعد دونوں نے سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ جیلہ نیچے آگئی ہے۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے موٹا اوننی دھسا اوڑھے ہوئے تھی۔ اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ رحیم داد اور جنت سانس روکے کھڑے تھے۔ جیلہ چند قدم کے فاصلے پر زینے کی نزدیک کھڑی تھی۔ رحیم داد کو خدا شہ تھا کہ جیلہ اس کے کمرے میں نہ پہنچ جائے مگر وہ اس طرف نہیں گئی۔ مہمان خانے کے دروازے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا اور مہمان خانے میں داخل ہو گئی۔

رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ ”میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی۔“

”پر وہ تیرے کمرے کی طرف نہیں گئی۔“ جنت نے سرگوشی کی۔ ”مہمان خانے میں کیوں گئی ہے؟“

”لگتا ہے تیرے گھر کی طرف گئی ہے۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

جنت نے دہلی زبان سے تائید کی۔ ”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“

”اس نے تجھے گھر میں نہ پایا تو کیا سوچے گی؟“

”تو فکر نہ کر۔“ جنت نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دوں گی۔ وہ میری بات مان لے گی۔“ وہ مزی۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔“

”تو اب کہاں جائے گی؟“

”یہ سب تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ جنت نے کہا۔ ”اب تو اپنے کمرے میں جا۔ کچھ دیر بعد جیلہ کے پاس جانا۔ تب تک وہ اپنے کمرے میں واپس پہنچ جائے گی۔ ہو سکتا ہے وہ تیرے ہی کمرے میں آجائے۔“

”یہ تو بتا، اتنی رات کو وہ تیرے گھر کیوں گئی ہے؟“ رحیم داد نے اکتتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے ڈھونڈنے کے ارادے سے تو نہیں گئی؟ اس رات اسے کچھ شبہ تو ہو گیا تھا جب میں تیرے گھر کے پچھلے کمرے میں چھپا ہوا تھا اور وہ نادر کے ساتھ اچانک پہنچ گئی تھی۔“

”مجھے تو نہیں لگتا کہ اسے کوئی شبہ ہوا تھا۔ ایسا ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طور مجھ سے ضرور پوچھتی۔“

وہ کسی اور ہی کام سے میرے گھر گئی ہوگی۔ تجھے ڈھونڈنا ہوتا تو پہلے تیرے کمرے میں جاتی۔“

”تیری گل ٹھیک ہی لگتی ہے۔ اب توڑ جا۔“

جنت دروازے سے گزر کر مہمان خانے میں چلی گئی۔ جیلہ بھی ادھر ہی گئی تھی۔ رحیم داد کچھ دیر بعد زینے کی جانب بڑھا اور میزبیلوں سے مل کر ہوا اوپر پہنچ گیا۔ جیلہ کے کمرے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ رحیم داد اندر چلا گیا۔ کمرے میں اٹیکٹھی دھک رہی تھی۔ اٹیکٹھی کے پاس دو کرسیاں رکھی تھیں۔ کرسیوں سے ذرا ہٹ کر دیوار کے ساتھ مسری تھی۔ اس پر صاف سٹرا بستر بچھا تھا۔ رحیم داد چند لمبے بستر کو تکتا رہا پھر اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے قریب رکھا ہوا الحاف کھینٹا اور ٹانگوں پر ڈال لیا۔ وہ جیلہ کے انتظار میں دروازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔



چھت پر چاپ سنائی دی اور رفتہ رفتہ نزدیک آئی گئی۔

دروازہ آہستہ سے کھلا اور جیلہ اندر آگئی۔ اس نے سردی سے قہر قہراتے ہوئے دروازہ بند

کیا۔ مگر کنڈی نہیں لگائی۔ لپٹ کی ہلکی ہلکی روشنی میں جیلہ نے رحیم داد کو بستر پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھرے لیکن جلد ہی غائب ہو گئے۔ وہ مسکرائی۔ ”چوہدری، تو کب آیا؟“

”مجھے تو آئے دیر ہو گئی۔“ رحیم داد بھی مسکرانے لگا۔ ”پر تو اتنی رات گزرے سردی میں کہاں گئی تھی؟“

جیلہ نے دھسا اتار کر ایک طرف رکھا۔ کھوئی پر لٹکی ہوئی سرخ شال اتار کر اوڑھی۔ کرسی پر بیٹھی اور دونوں ہاتھ انگلیٹھی پر پھیلا کر تاپنے لگی۔ انگاروں سے ابھرتی ہوئی ہلکی ہلکی آج میں جیلہ کا چہرہ شوق کے مانند سرخ ہو رہا تھا۔ وہ خوب صورت اور دلکش نظر آ رہی تھی۔ وہ گردن جھکائے دیکھتے انگاروں کو تک رہی تھی۔ رحیم داد بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بے قرار ہو کر گہری سانس بھری اور آہستہ سے پوچھا۔

”تو نے بتایا نہیں تو کہاں گئی تھی؟“

”سوچا تھا نادر خان لہور سے واپس آگیا ہو گا۔“ جیلہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ ”میں نے اس سے دو ایک منگائی تھیں، وہ لینے گئی تھی۔“

”نادر خان لہور سے لوٹ آیا؟“

”نہیں!“ جیلہ نے نہایت مختصر جواب دیا۔

”تو نادر کے گھر گئی تھی؟“

”نہیں، میں اس کے گھر نہیں گئی۔ ضرورت ہی نہیں پڑی۔ مسمان خانے سے باہر نکل تو حمدا مل گیا۔ جانے اتنی رات کو کہاں سے آ رہا تھا۔ اسی نے بتایا کہ نادر ابھی نہیں لوٹا۔ اس سے باتیں کرتے کرتے مجھے ایک کام یاد آگیا۔ میں نے اسے نور محمد کے گھر کی طرف بھیجا ہے۔“

”تاراں نہیں تھی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”مجھے تو نظر آئی نہیں۔ لگتا ہے، حویلی میں ہوگی۔ ویسے بھی عام طور پر وہ حویلی میں رہتی ہے۔“

”مجھے پتہ ہے، وہ حمدا سے خوش نہیں۔“ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”اس کی زراعتی ہے بھی ٹھیک۔ شام ہوتے ہی نکل جاتا ہے اور کبھی کبھی تو رات بھر نہیں لوٹتا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔

”مسمان خانے کی دیکھ بھال کے لیے کوئی اور ہی بندہ لگانا پڑے گا۔ حمدا تو وہاں رات کو بھی نہیں ٹھہرتا۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ جیلہ نے اس سے اتفاق کیا۔ ”میں نے پہلے بھی سوچا تھا پر تاجاں کے

دیاہ میں ایسی پھنسی کہ یاد ہی نہ رہا۔ ویسے ان دنوں نادر خان بھی اپنے بال بچوں سمیت مسمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پہلے تو وہاں ہوتا تھا۔ پر اب کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”مسمان خانہ اس طرح رات کو خالی نہیں رہتا چاہیے۔ حمدا کا کیا ہے، من موچی بندہ ہے، جب چاہا اٹھ کر چلا گیا۔ میرے سامنے بھی روزی ایسا کرتا تھا۔ سنا ہے پنڈی کسی میار کے چکر میں رہتا ہے۔“

جیلہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ رحیم داد بے قرار ہو کر بولا۔ ”اُدھر کیوں بیٹھی ہے، اُدھر میرے پاس آجا۔ تجھے سردی نہیں لگ رہی؟ ویسے آج سردی کچھ زیادہ ہی ہے۔“

”ہاں، آج سردی زیادہ ہے۔“ جیلہ بولی۔ ”انگلیٹھی کی آگ سے ہاتھوں کو سینکنے میں بہت سواد مل رہا ہے۔“ رحیم داد بستر سے اٹھا اور جیلہ کے روپر کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی گردن جھکا کر اپنے ہاتھ انگلیٹھی کے اوپر پھیلا دیے۔ دونوں گردن جھکائے انگارے تک رہے تھے۔ انگاروں پر سفید راکھ کی ہلکی تہ جم گئی تھی۔

رحیم داد نے گردن کو ہلکا سا خم دیا اور بڑے چاؤ سے بولا۔ ”جی لے! میں تبھی یہاں آیا جب تو نے بلایا۔“ اس کے لمبے میں ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ نمودار ہوئی۔ ”تو سوچ بھی نہیں سکتی، میں تجھے کتنا چاہتا ہوں۔ تجھے کتنا پیار کرتا ہوں۔“

”مجھے پتہ ہے۔ بالکل ٹھیک طرح پتہ ہے۔“ جیلہ کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا۔ ”اسی لیے تو نے احسان شاہ سے مل کر اللہ وسایا کا خون کرا دیا۔“

رحیم داد سٹپٹا گیا۔ پریشان ہو کر بولا۔ ”یہ بات تجھے اس سو روپے پتہ دینے نے کہی ہوگی۔“

”کسی نے بھی کہی ہو، پر جھوٹ تو نہیں ہے۔“

”جس نے بھی تجھ سے ایسی گل کی، بالکل بکواس کی۔“ رحیم داد نے جیلہ کو مٹانے کی کوشش کی۔ ”تو میرے دل میں جھانک۔ دیکھ اس میں تیرے لیے کتنا پیار ہے۔ تجھے کیا پتہ، میں تیرے پیار کی آگ میں کب سے جل رہا ہوں۔“

جیلہ نے گردن اونچی کی اور رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ”ایسی گلّاں تو کتنی اور زنانوں سے پہلے کہہ چکا ہے۔“ وہ مسکرائی مگر اس مسکراہٹ میں پیار یا لگاؤ نہیں تھا۔ ”اس رات جنت سے بھی تو نے یہی بات کہی ہوگی جب تو اس کے گھر کے پچھلے کمرے میں پردے کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ تیرے ننگے پیر چادر کے نیچے سے صاف نظر آ رہے تھے اور تیرے جوتے اگلے کمرے میں منجی کے نیچے پڑے تھے۔“ اس کے لمبے میں تعنی نمایاں ہو گئی۔ ”جنت کے ساتھ تو نے

کب سے یاری لگا رکھی ہے؟ تو نے اسی لیے تو نادر کو منیجر نہیں لگایا؟“

رحیم داد بول کھلا کر بولا۔ ”تو ایسی کڑوی گلاں کیوں کر رہی ہے؟“ وہ سخت حیران نظر آ رہا تھا۔
جیلہ نے تڑ سے جواب دیا۔ ”اور کیسی گلاں کروں۔ تیری طرح جھوٹا پیار جتاؤں، یہی چاہتا ہے نا؟“

رحیم داد دم بخود بیٹھا رہا۔ انگلیٹھی میں انگارے سلگ رہے تھے۔ رات دبے قدموں گزرتی رہی۔ رحیم داد نے دونوں ہاتھ اٹھا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تجھے سونا نہیں ہے؟ بہت رات ہو گئی۔“ اس نے جیلہ کا ہاتھ تمام کے اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ ”بہت ہو گئی نراضی۔ اوھر آ میرے ساتھ۔“

جیلہ نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور جیکھے لہجے میں کہا۔ ”بیٹھ، ابھی میں نے تجھ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

”صبح کر لیتا۔“ رحیم داد نے جیلہ کا شانہ تھپکا۔ لیکن جیلہ کرسی پر بیٹھی رہی۔ ”تجھے نہیں اٹھنا؟“ اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ درشت تھا۔ جیلہ انگلیٹھی پر ہاتھ تاپتی رہی۔ رحیم داد کے صبر کا پیمانہ چمک اٹھا۔ اس نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ ”کان کھول کر سن لے، میں نے اللہ وسایا کی طرح تجھو ہوں نہ کہی اس کی طرح تیرے پیو کا مزمارع رہا۔ میرا نام چوہدری نور الہی ہے۔ میں جتنا سیدھا سادا بندہ نظر آتا ہوں اتنا ہی اندر سے ٹیڑھا بھی ہوں۔“

”مجھے پتہ ہے تو کیسا بندہ ہے، بہت ٹھیک طرح پتہ ہے۔“ جیلہ نے اس کی جانب دیکھے بغیر تلخ لہجے میں کہا۔ وہ رحیم داد کے غصے سے ذرا مرعوب نہ ہوئی۔

رحیم داد کے چہرے پر جھلاہٹ برسنے لگی۔ اس نے جیلہ کا بازو پکڑ کے زور سے جھٹکا دیا۔ جیلہ کرسی سے لڑھک کر فرش پر گر گئی۔ رحیم داد نے جھک کر اسے ہانہوں میں اٹھا لیا۔ جیلہ نے اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئی۔ رحیم داد نے اسے بستر پر پھینک دیا۔

جیلہ کے بال بکھر کر منہ پر آ گئے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے بال درست کرتے ہوئے جل کر بولی۔ ”چوہدری! تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔ میں تجھے اتنا گرا ہوا نہیں سمجھتی تھی۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

رحیم داد کے روپے میں کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے غصے سے جیلہ کو ڈانٹا۔ ”چپ کر میں نے بہت سن لی تیری کڑکڑ۔“ وہ بستر پر بیٹھ گیا۔

جیلہ نے سہمی ہوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا اور دور سرکنے کی کوشش کی مگر رحیم داد نے

ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیا۔ جیلہ اس کے ہاتھوں کے حصار سے نکلنے کے لیے تلملائی بھی، تڑپتی بھی لیکن خود کو آزاد نہ کرا سکی۔ ناچار اس نے رحیم داد کے بازو میں اپنے دانت گاڑ دیے۔ رحیم داد کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اس کے چہرے پر خون ابل آیا۔ اس نے غضب ناک ہو کر جیلہ کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ جیلہ زور زور سے ہانپنے لگی۔ رحیم داد نے جھک کر دوبارہ اسے گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ عین اسی وقت کمرے کے باہر جھٹ پر قدموں کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا۔ دروازہ کھلا اور ڈھانٹے باندھے ہوئے دو آدمی آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ قد و قامت اور چال ڈھال سے دونوں خاصے دہنگ نظر آتے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور کندھے پر اسٹین گن لٹک رہی تھی۔ دوسرے کے ہاتھوں میں بھی چھوٹی رائفل دبی تھی۔



رحیم داد سکتے میں رہ گیا۔ دونوں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ آگے والے شخص نے جھٹ ڈھانٹا ہٹایا۔ رحیم داد نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ جیلہ کا بڑا بھائی ہر دیال تھا۔ ایک بار پہلے بھی وہ اسی طرح رات کے اندھیرے میں جیلہ کو لینے آیا تھا۔ اس وقت اللہ وسایا زندہ تھا اور جیلہ نے ہر دیال کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ رحیم داد کو وہ رات یاد آ گئی۔

جیلہ تڑپ کر بستر سے نیچے اتری اور بے قرار ہو کر بولی۔ ”میرا دیر آ گیا۔“ وہ ہر دیال کے سینے سے لگ کر بے اختیار روئے لگی۔

ہر دیال نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پیار سے کہا۔ ”پارو! تو ابھی تک ویسی ہی پگلی ہے۔ رو کیوں رہی ہے؟ میں تو تجھے لینے آیا ہوں۔“

رحیم داد نے کسمسا کر پہلو بدلا۔ دوسرے آدمی نے جھٹ آگے بڑھ کر رائفل کی ٹال اس کی طرف موڑ دی اور ڈپٹ کر کہا۔ ”چپ کر کے بیٹھا رہ۔ گڑ بڑ کی کوشش کی تو گولی بھیجا پھاڑ کر باہر نکال دے گی۔“ رحیم داد بستر پر جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح دم سادھے بیٹھا رہا۔

ہر دیال نے شفقت سے جیلہ کا سر پکڑ کر چہرہ سامنے کیا۔ اس کی پیشانی چومی اور وارفتگی سے بولا۔ ”نمال دین نے سنتو کھ کے ہاتھ جیسے ہی مجھے تیرا پتہ پہنچایا، میں نے اسی سے تیرے پاس آنے کی تیاری کر لی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو سندیا بھیجے اور میں نہ آؤں۔ میں تو اس دن کا برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔“

جیلہ نے علیحدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”نمال دین میرے پاس دن ڈھلے آیا تھا۔ کہتا تھا تو آج رات

ساڑھے دس بجے تک یہاں پہنچ جائے گی۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ ”میں تجھے دیکھنے سمان خانے سے باہر بھی گئی تھی پر تو دکھائی نہیں دیا۔ تو نے آنے میں دیر کر دی۔“

”ہاں، مجھے کچھ دیر ہو گئی۔“ ہریال نے بتایا۔ ”وہ ایسا ہوا کہ ایک جیب میں پنچر ہو گیا تھا۔ پیٹا بدلنے اور اسٹپنی لگانے میں سے لگا۔ ویسے آج دھند بھی بہت ہے۔ رستہ صاف نظر نہیں آتا تھا۔“

”ماتا جی کا کیا حال ہے؟“ جیلہ نے پوچھا۔

”تجھے دیکھے گی تو اسے دوسرا جیون مل جائے گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہتا جی تو تجھے یاد کرتے کرتے سورگ باشی ہو گئے اور ماتا جی تیرے لیے روتے روئے سوکھ کر کاٹنا ہو گئی۔ آنکھوں سے اب تو دکھائی بھی کم پڑتا ہے۔ پارو! تو ہمارے گھر کا اجالا تھی۔ تو پہنچے گی تو ہمارے آگن میں سورج اتر آئے گا۔“

”بھاجی، تو چچ کہہ رہا ہے؟ مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔ جانے کیا ہو۔“ اس نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا اور مڑ کے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”ویسے میں کبھی واپس نہ جاتی۔ تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔ پر حالات ایک دم اس طرح پلٹ جائیں گے۔ ایسا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔“

ہریال دل جوئی کرنے لگا۔ ”تو ہماری پاروتی تھی، پاروتی ہی رہے گی۔ زناش نہ ہو۔ تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بالکل چننا نہ کر۔“ جیلہ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ ”جو کچھ ہوا اس میں تیرا دوش ہی کیا تھا۔“ ہریال بولتا رہا۔ ”بھگی! تو اپنی ہی ماتا اور بھائیوں سے ڈر رہی ہے۔ تو ہم چار بھائیوں کی اکوتی بھین ہے۔ تجھے کیا پتہ، تیرے بنا ہم پر کیا بیتی۔ آٹھ برس سے اوپر ہو گئے پر ہم تجھے نہ بھول سکے۔ ہم تجھے کیسے بھول سکتے ہیں، پارو میری بھین۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے جیلہ کا سراپے سینے سے لگا لیا۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جیلہ بھی سسکیاں بھرنے لگی۔

دوسرے آدمی نے ہریال کو ٹوکا اور سر پر منڈلاتے ہوئے خطرے سے خبردار کیا۔ ”جی جاجی! ردنا دھونا چھوڑ۔ سے بہت کم ہے۔ ہمیں سورج نکلنے سے پہلے ہی بارڈر کراس کرنا ہے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔“

ہریال نے آنسو پونچھتے ہوئے جیلہ سے پوچھا۔ ”پارو! یہ بتا، سینا اور گڈو کدھر سو رہے ہیں؟ تو انھیں فوراً جگا دے۔ بتنا سامان چاہے لے چل۔ میرے پاس دو جھپیں ہیں۔“ وہ اپنے سالے کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کشوری! تو جلدی سے رام مورتی اور شیدے کو بلا لا۔ سامان اٹھانا ہے۔ بچے نیند میں ہوں گے۔ انھیں گود میں اٹھا کر چلنا ہو گا۔“

کشوری چلا گیا۔ ہریال نے ریو الوار کا رخ رحیم داد کی جانب کر دیا۔ پیر سے کرسی کھسکائی۔ اور اس پر بیٹھ گیا۔ جیلہ برابر والے کمرے میں گئی۔ وہ باری باری تین سوٹ کیس اٹھا کر لائی اور دروازے کے پاس ہی رکھ دیے۔ کچھ دیر بعد کشوری واپس آگیا۔ اس کے ہم راہ ڈھانٹے باندھے ہوئے دو اور آدمی آئے۔ ان کے کندھوں پر بھی رانفلین لٹک رہی تھیں۔ دونوں نے سوٹ کیس اٹھائے اور باہر چلے گئے۔

جیلہ سوتی ہوئی سینا کو اٹھا کر لائی اور اسے ہریال کے ہاتھوں میں دے دیا۔ ہریال نے اسے سینے سے لگایا اور ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ جیلہ برابر والے کمرے میں چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کی گود میں گڈو تھا۔ وہ بھی گہری نیند سو رہا تھا۔

جیلہ آگے بڑھی اور عین رحیم داد کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”چوہدری! خوش ہو۔ تجھے میری زمیں داری بھی مل گئی۔ یہ حویلی، یہ زمین یہ کھیت، سب کچھ اب تیرا ہی ہے۔ آرام سے جیون گزار۔ موجد کر۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”تو جاری ہے جیلہ۔“ رحیم داد پہلے بار بولا۔ اس کا لہجہ نرم تھا۔

”تو کس جیلہ کی بات کر رہا ہے۔“ جیلہ کی تیوری پر مل پڑ گئے۔ ”جیلہ کو تو نے اسی رات مار ڈالا تھا جب احسان شاہ کی حویلی میں نکاح کا ٹانک رکھایا گیا تھا۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا اور ہانپتے ہوئے بولی۔ ”اللہ وسایا کی جیلہ تو مر گئی۔ میں تو اب پاروتی ہوں۔“ اس نے ہریال کی جانب اشارہ کیا۔ ”دیکھ یہ میرا دیر کھڑا ہے۔ یہ اپنی بھین پاروتی کو لینے آیا ہے۔“

”یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔“ رحیم داد کا لہجہ بدستور نرم تھا۔ اس نے جیلہ کو روکنے کی کوشش کی۔ ”تجھے اس طرح اپنی زمیں داری، اپنا گھر بار چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے۔“

”میں نے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں، یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔“ جیلہ نے بے رخی سے کہا۔

”تجھے میرے بارے میں چننا کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو زمین اور جائیداد چاہتا تھا، وہ تجھے مل گئی۔ تھکانے پر تو پہلے ہی مجھ سے زبردستی دستخط کرا چکا ہے۔ اب اور کیا چاہتا ہے۔ جو کچھ تجھے چاہیے تھا، سب مل گیا۔“ جیلہ مڑی۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ ”جی لے گل سن۔“

وہ ایک دم پھر گئی۔ ”تو مجھے جی لے کہنے والا کون ہوتا ہے؟ میرا تیرا کیا ناتا۔ تو مجھے جی لے کہتا ہے تو میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ جی چاہتا ہے، تیرا منہ نوج لوں۔ اللہ وسایا کو مار کر تو اللہ وسایا بننا چاہتا ہے۔ پاپی، خونی۔“ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں اور سانس پھول گئی۔

رحیم داد تھلا کر بولا۔ ”تو ہندنی تھی ناں، ہندنی ہی نکلی۔“
”میں نے بھی تیرا مسلمان دیکھ لیا۔ بالکل ٹھیک طرح دیکھ لیا۔“ وہ آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔

رحیم داد غضب ناک ہو کر چیخا۔ ”کیو اس نہ کر۔“ وہ بستر سے کودا اور نیچے آگیا۔ ”میں تجھے نہیں جانے دوں گا۔ تو یہاں سے نہیں جاسکتی۔“ وہ تیزی سے دروازے کی جانب لپکا۔
کشوری جھٹ سامنے آگیا۔ ”چپ کر کے بیٹھ جا۔“ اس نے رانفل کا ہٹ گھما کر رحیم داد کے سر پر مارا۔ سر تو نہیں پھٹا مگر چوٹ ایسی کراری آئی کہ رحیم داد ڈگمگا گیا۔ کشوری نے اسے زور سے دھکا دیا۔ رحیم داد لڑکھڑاتا ہوا بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

ہر دیال نے جیلہ سے کہا۔ ”پارو! دیر نہ کر۔ تو کشوری کے ساتھ چل۔“ اس نے نینا کو کشوری لال کی گود میں دے دیا۔ جیلہ نے گڈو کو سینے سے چمکا کر شال کا پلو اس پر ڈال دیا۔
کشوری لال آگے بڑھا۔ جیلہ اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں کمرے سے نکل کر پھت پر پہنچ گئے۔

ہر دیال بڑھ کر رحیم داد کے پاس گیا۔ اس نے جھک کر اسے دیکھا۔ چوٹ بھر پور آئی تھی۔ رحیم داد کی سانس دھیمی تھی اور رک رک کر چل رہی تھی۔ وہ بے سدھ پڑا تھا مگر ہر دیال کوئی خطرہ مول لیتا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رحیم داد کے منہ میں کپڑا ٹھوسا۔ دونوں ہاتھ پیچھے کیے اور جیلہ کے ایک پرانے دپٹے سے مضبوطی سے باندھ دیے۔ رحیم داد نے مطلق مزاحمت نہیں کی۔ وہ بستر پر کروٹ کے بل بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

ہر دیال دروازے کے قریب پہنچا۔ اس نے ٹھک کر ایک بار پھر رحیم داد پر نظر ڈالی۔ لپک کی زرد روشنی میں وہ مردے کی طرح بے جان نظر آ رہا تھا۔ ہر دیال نے کمرے سے نکل کر باہر سے دروازے کی زنجیر چڑھا دی اور تیزی سے زینے کی جانب لپکا۔ اس نے سیڑھیاں طے کیں اور حویلی سے گزر کر مہمان خانے میں چلا گیا۔ مہمان خانہ سنسان تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ مہمان خانے سے باہر نکلا۔ جیلہ دروازے کے پاس کشوری لال کے ساتھ کھڑی تھی۔ دونوں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ہر دیال نے ایک بار پھر منہ پڑھا نا باندھا۔ ریو الوور، جیب میں رکھا اور اسٹین گن کندھے سے اتار کر ہاتھ میں دہالی۔

ہر طرف کمر کی گاڑھی گاڑھی دھند کانٹیل گوں جال پھیلا تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ ہوا دم بخور تھی۔ تینوں تیز تیز قدم اٹھاتے نہری جانب بڑھے۔ ان کی چاپ، آہستہ آہستہ ابھرتی رہی۔ یکایک

تائے میں مویشیوں کے پاؤں کی رکھوالی کرنے والے پہرے دار کی کھنکار سنائی دی۔ وہ رک رک کر کھنکار رہا تھا مگر تینوں رکے نہیں۔ انھوں نے رفتار اور تیز کر دی۔ ہر دیال نے اسٹین گن مضبوطی سے تھام لی اور چوکنا ہو کر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

پت جھڑلگ چکا تھا۔ وہ درختوں کے نیچے پھٹے تو خشک پتے پیروں تلے چمرا کر آہٹ پیدا کرنے لگے۔ جیلہ نے گڈو کو سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ مگر اسے زیادہ دور نہیں چلنا پڑا۔ درختوں کے نیچے اندھیرے میں جیسیں کھڑی تھیں اور دھند میں سیاہ دھبوں کے مانند نظر آرہی تھیں۔

ہر دیال کے بازو کے سارے جیلہ جیب کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ ہر دیال اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کشوری نے نینا کو ہر دیال کی گود میں دے دیا اور خود دوسری جیب میں جا کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد جیبوں کے انجن اشارت ہونے کی آواز سنائے میں ابھری۔

دونوں جیسیں خشک پتے روندتی، آہٹیں پیدا کرتی تیزی سے دوڑنے لگیں۔ ہر دیال کی جیب پیچھے تھی۔ اس نے نینا کو جیلہ کی گود میں دے دیا۔ اب وہ اسٹین گن سنبھالے چوکس بیٹھا تھا۔ اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ ایک اور شخص بیٹھا تھا۔ وہ بھی اپنی رانفل سنبھالے اندھیرے میں ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جیسیں ہچکولے کھاتی نہر کے کنارے کنارے دوڑ رہی تھیں۔ کمر کی دھند میں لپٹا ہوا کوئلہ ہر کشن سو رہا تھا۔ جیلہ مڑ مڑ کر حسرت بھری نظروں سے گاؤں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے کوئلہ ہر کشن کے دھند میں الجھے ہوئے مکانات اور کھیت کھلیان نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ جیسیں آگے بڑھتی رہیں۔ گاؤں پیچھے رہ گیا۔



رحیم داد حویلی کی بالائی منزل کے کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ رات آہستہ آہستہ تاریک ہوتی گئی، گزرتی گئی۔ رحیم داد کو ہوش آیا تو اس نے اپنے سر میں ہلکا ہلکا درد محسوس کیا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا تھا اور دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ کسمایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔ کونے میں لیپ روٹن تھا لیکن انکیشی میں سلگتے ہوئے انگارے بجھ کر راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے۔

رحیم داد دروازے پر جانے کا ارادہ کر رہی رہا تھا، اسی اثنا میں باہر سے کنڈی کھلنے کی آواز ابھری۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ جنت سردی سے کپکپاتی اندر داخل ہوئی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی رحیم داد کے قریب پہنچی۔ اس کے منہ میں ٹھنسا ہوا کپڑا نکالا اور جلدی جلدی اس کے ہاتھ کھول دیے۔

رحیم داد نے دونوں کلاسیاں سلاتے ہوئے پوچھا۔ ”جنت تو کیسے آگئی۔ کیا جیلہ چلی گئی؟“

”ہاں جی، وہ چلی گئی۔“ جنت نے بتایا۔ ”اسے گئے ہوئے بھی دیر ہو گئی۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا وہ چلی گئی؟“

”مجھے سب پتہ ہے کیا کیا ہوا۔“ وہ بستر پر رحیم داد کے قریب بیٹھ گئی۔ ”جب وہ آئے تھے تو میں جاگ رہی تھی۔ پورے چھ بندے تھے۔ منہ پر منڈا سے باندھے ہوئے تھے۔ سب کے ہاتھوں میں بندوکیں دبی تھیں۔ چار تو مسمان خانے کے باہر ہی ٹھہر گئے۔ پہلے دیوار پھاند کر دو اندر گئے۔ انھوں نے دروازہ کھول دیا۔ دو اور اندر چلے گئے۔ دو بندے بندوکیں سنبھالے دروازے پر کھڑے

رہے۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تو نے انھیں کیسے دیکھا؟“

”دروازے کی آڑ سے۔ میرے ہی سامنے زمین دارنی گڈو کو گڈو میں اٹھائے باہر نکلی۔ فیر دوسرے بھی باہر آگئے اور وہ ان کے ساتھ باہر چلی گئی۔ تیس نوں پتہ ہے وہ چپوں میں بیٹھ کر آئے تھے۔ میں نے نہری طرف چپوں کی آواز سنی تھی۔“

”میں نوں پتہ ہے وہ چپوں میں ہی بیٹھ کر آئے تھے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”یہ بتا انھیں گئے ہوئے کتنی دیر ہو گئی۔ مجھے تو ایک نے ر۔۔۔ غل کاٹ اس زور سے سر پر مارا کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ مجھے بالکل پتہ نہیں چلا وہ کب گئے اور کیسے گئے۔“

”میں نے بتایا نہیں،“ انھیں گئے ہوئے تو بہت دیر ہو گئی۔ اب تو میلوں دور چلے گئے ہوں گے۔ میں تیرے پاس پہلے ہی آجاتی پر اتنی ڈری ہوئی تھی کہ باہر نکلنے کی دیر تک ہمت نہیں ہوئی۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”کون تھے وہ؟ تجھے پتہ ہے؟“

”ایک تو جیلہ کا ڈاڈا بھرا ہر دیال تھا۔ دوسرا ہر دیال کا سالا کشوری لال تھا۔ وہ جیلہ کو لینے آئے تھے۔ جیلہ نے انھیں خود بلایا تھا۔“ رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”اب جیلہ نہیں آئے گی۔ وہ چلی گئی۔“

”چوہدری! یہ ٹھیک ہی ہوا وہ چلی گئی۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا وہ تیری کبھی نہیں بن سکتی۔“ اس نے منہ بگاڑ کر نفرت کا اظہار کیا۔ ”وہ ہندنئی تھی ناں، اسے تو ایک روز یہاں سے جانا ہی تھا۔“ جنت مسکرانے لگی۔ ”پر اس کے جانے سے کیا ہوتا ہے، پوری زمیں داری تو اب تیرے ہی پاس آگئی۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بے نیازی سے بولا۔ ”میرے سر میں بہت درد ہے۔“

”تو بیٹھا کیوں ہے؟ لیٹ جا۔“ جنت نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”لگتا ہے، سر میں زیادہ چوٹ آئی ہے۔ لائیں تیرا سر دبا دوں۔“

رحیم داد تڑھال ہو کر خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ جنت نے اس کے جسم پر لحاف ڈال دیا۔ کھسک کر قریب ہو گئی اور سرہانے بیٹھ کر رحیم داد کا سر ہونے ہولے دبانے لگی۔



رحیم داد دن چڑھے تک بستر پر رہا۔ اس نے کمرے ہی میں ناشتا کیا۔ دوپہر کا کھانا بھی وہیں

کھایا۔ نہ وہ کمرے سے باہر نکلا اور نہ نیچے اترا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان تھا۔ جیلہ کے چھوٹ جانے کا اسے سخت ملال تھا۔

جیلہ کا جانا زیادہ دیر چھپا نہ رہ سکا۔ حویلی کے نوکروں کو صبح ہی معلوم ہو گیا تھا۔ سہ پہر تک پورے کوئٹہ ہر کشن میں یہ خبر پھیل گئی۔ کچھ مزارعے رحیم داد سے ملنے آئے بھی مگر اس نے کسی سے ملنا اور جیلہ کے بارے میں بات کرنا گوارا نہیں کیا۔ وہ بستر پر لیٹا رہا یا پھر بے چینی سے ٹھٹھا رہا۔

دن ڈھلے، غروب آفتاب سے کچھ پہلے نادر خاں لاہور سے آگیا۔ رحیم داد نے بچھے ہوئے لمبے میں نادر خاں کو بتایا۔ ”نادر! جیلہ کل رات اپنے بھائی ہر دیال کے ساتھ سرحد پار چلی گئی۔“
”مجھے پتہ ہے جی! جنت نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ پر گل جی! اس نے تو ایک روز میاں سے جانا ہی تھا۔ اس کا مجھے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔“
”تو نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“

”میں تاجاں کے ویاہ کی بھاگ دوڑ میں پھنسا رہا۔ تجھ سے گل کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔“
نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ ”ویسے تجھے پتہ چل بھی جاتا تو تو اسے روک نہیں سکتا تھا۔ وہ بہت تیز اور ہوشیار ہے۔“

رحیم داد نے نادر خان کی تائید کی۔ ”مجھے تو اس نے آخر تک دھوکے میں رکھا۔ اس کی کسی بات سے شبہ ہی نہیں ہوا کہ وہ میاں سے جانے کی تیاری کر چکی ہے۔“
”وہ تو جی، لگتا ہے ہر طرح تیاری کر چکی تھی۔“ نادر خان نے کہا۔ ”مجھی تو اس نے مجھے دوایاں خریدنے لہور بھیج دیا تھا۔ میں تو کہتا ہوں، اسے دوایوں شوائیوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ مجھے میاں سے ہٹانے کا بہانہ تھا۔ دیکھ لے، جو دوایاں میں خرید کر لایا ہوں، وہ میرے ہی پاس پڑی ہیں۔ اور وہ چلی بھی گئی۔“

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میاں سے چلی گئی۔“
”چوہدری! فکر نہ کر۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو تسلی دی۔ ”وہ وہاں رہ نہ سکے گی۔“
”کیوں؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”وہاں رہنا نہ ہوتا تو میاں سے جاتی ہی کیوں؟“

”زینت بھی تو چلی گئی تھی۔“ نادر خاں نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل پیش کی۔ ”پر وہ نہ سکی، واپس آگئی۔“

نادر خاں نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ حویلی کے چھانک پر چپ ٹھہرنے کی آواز سنائی دی۔ رحیم داد نے چونک کر کہا۔ ”نادر! لگتا ہے، باہر چپ آکر رکی ہے۔ دیکھ کون آیا ہے؟“ وہ زیر لب بدبویا۔ ”جیلہ تو ہو نہیں سکتی۔“ نادر نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد بے چین ہو کر سوچنے لگا کہ اس وقت چپ میں کون آسکتا ہے۔ وہ بار بار دروازے کی جانب دیکھتا۔ ذرا دیر بعد نادر خاں کے ساتھ احسان شاہ آتا نظر آیا۔ رحیم داد نے اسے دور سے پہچان لیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ قریب پہنچ کر گرم جوشی سے احسان شاہ کا خیر مقدم کیا اور اسے کرسی پر لا کر بٹھایا۔ احسان شاہ سیڑھیاں چڑھ کر آیا تھا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے الجھے ہوئے لمبے میں کہا۔

”چوہدری! مجھے دوپہر ہی کو پتہ چل گیا تھا کہ رات جیلہ چلی گئی۔“
”ہاں شاہ جی! وہ چلی گئی۔“ رحیم داد کے لمبے میں حزن و ملال تھا۔
”کیا اس کا بھرا ہر دیال اسے لینے خود آیا تھا؟“

”ہاں جی، ہر دیال خود آیا تھا۔ اس کا سلا کسٹوری لال بھی تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”چار بندے اور تھے۔ سب پوری طرح مسلح تھے۔“

”مسلح ہو کر تو انھیں آنا ہی تھا۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”پر بہت حیرت کی بات ہے، وہ کسی روک ٹوک کے بغیر اتنی آسانی سے جیلہ کو پنڈے سے نکال کر لے گیا۔“ اس نے مڑ کر نادر خاں کی طرف دیکھا۔ ”تو کہاں تھا؟“

”مجھے تو جی زمیں دارانی نے سویرے سویرے دوایاں خریدنے لہور بھیج دیا تھا۔“ نادر خان نے صفائی پیش کی۔

”تو نہیں تھا تو کیا ہوا۔“ احسان شاہ تکیے لمبے میں بولا۔ ”حویلی کے راکھے، نوکر چاکر، سب ہی ہوں گے۔ وہ سب کے سب پڑے مردوں کی طرح سوتے رہے۔ کسی کی آنکھ بھی نہ کھلی؟ کوئی انھیں نہ روک سکا؟“ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ پھیلنے لگی۔ ”یہ بتا نادر! وہ آئے کس رستے سے تھے؟“

”جب وہ آئے تو میری گھر والی جاگ رہی تھی، پر وہ بالکل اکیلی تھی۔ گھر میں صرف چھوٹی چھوٹی بچیاں تھیں۔“ نادر خان نے بتایا۔ ”وہ مسمان خانے کی دیوار پھاند کر داخل ہوئے تھے۔“
”مسمان خانے میں کوئی نہیں تھا؟“

”کوئی مسمان خانے میں نہ ہو“ تب بھی حوا ضرور رہتا ہے۔ اس کی گھر والی بھی عام طور پر وہیں رہتی ہے۔ حوا تو جی مسمان خانے ہی کے کام کاج کے لیے ہے۔ وہ رات کو تو ضرور رہتا ہے۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”ویسے جی حویلی کے پھانک پر راکھا بھی رہتا ہے۔“

”پر یہ سارے ہڈ حرام اس کو کت کہاں تھے؟“ احسان شاہ نے تیوری پر بل ڈال کر دریافت کیا۔ ”کم سے کم شور تو مچا سکتے تھے۔ پنڈ میں جاگ ہو جاتی تو ہریال اتنے آرام سے جیلہ کو نہیں لے جا سکتا تھا۔“

”میں تو کہتا ہوں جی، نوکر چاکر سب ملے ہوئے تھے۔“ نادر خاں نے اظہار خیال کیا۔ ”حوا تو ضرور ملا ہوا تھا۔ اسے تو مسمان خانے میں موجود ہونا چاہیے تھا۔ جنت بتاتی تھی حوا مسمان خانے میں تھا ہی نہیں۔ اس کی گھر والی بھی غائب تھی۔“

”جی تو وہ آرام سے مسمان خانے کے رستے آئے اور جیلہ اور اس کے بچوں کو سامان کے ساتھ لے گئے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”جیلہ ذرا بھی ڈری ہوئی نہیں لگتی تھی۔ اس نے آرام سے اپنے سوٹ کیس نکالے۔ بچوں کو ہریال اور کشوری لال کی گود میں دیا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں نے اسے روکنے کی کوشش کی اور چاہا کہ دروازے سے نکل کر پنڈ والوں اور حویلی کے نوکروں کو جگانے کے لیے شور مچاؤں پر کشوری لال نے میرا راستہ روک لیا۔“

احسان شاہ گردن جھکائے سوچتا رہا، ذرا دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”چوہدری! ایسے تو تیری زمیں داری نہیں چلے گی۔ حویلی کے سارے راکھے اور نوکر چاکر نکال باہر کر۔ سب کینے اور حرام خور ہیں۔ بالکل تیرے کام کے نہیں۔“ وہ نادر کی جانب متوجہ ہوا۔ ”نادر! یہ کام تجھے کرنا ہو گا۔ ان سب کو ہر طرف کر کے مضبوط اور ٹکڑے بندے لگا۔ کرندے اور راکھے تو زور آور اور حوصلے والے ہونے ہی چاہیں، پر پکے وفادار بھی ہوں۔ انھیں مسلح کرنے کے لیے اسلحہ کی بھی ضرورت ہوگی۔“

”ایسا ہی کر لوں گا جی!“ نادر نے احسان شاہ کو یقین دلایا۔ ”پر اسلحہ تو میراں مجھے نظر نہیں آیا۔“ ”اللہ وسایا کے پاس تو ایک رائفل تھی۔ اتنا تو پتہ ہے۔ کہاں ہے وہ رائفل؟“ احسان شاہ نے رحیم داد سے پوچھا۔

”وہ تو جیلہ کے پاس ہی رہتی تھی۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو بتایا۔ ”مگر وہ ر۔ غل اپنے ساتھ لے کر نہیں گئی۔ برابر کے کمرے میں ہوگی، اور بھی سامان پڑا ہے۔“

”نادر! تو رائفل کالائسنس چوہدری کے نام تبدیل کرا لے۔ ایک ریوالور کالائسنس نکوانے

کے لیے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں عرضی لگا۔“ احسان شاہ ہدایت دیتا رہا۔ ”لائسنس کا بندوبست تو میں کرا دوں گا۔ کچھ اسلحہ چوری اور سفلنگ کا خرید لے۔ یہ کام تجھے فائدہ کرنا ہو گا۔“

”شاہ جی! میں کل ہی اس کام پر لگ جاؤں گا۔“ نادر خاں نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”میںاں کا تو جی اب تک یہ حال رہا ہے کہ کہیں آنے جانے کے لیے اپنا تانگا تک نہیں۔ گھوڑیاں ہیں، وہ تو مزارعوں کے پاس بھی ہوتی ہیں۔ پر ان سے آج کل زمیں داری کا کام نہیں چل سکتا۔ میں لمور میں ایک تانگے کی خریداری کی بات کر کے آیا ہوں۔ تانگا تو جی بہت ضروری ہے۔“

”تیرا خیال بالکل ٹھیک ہے۔ تانگا ضرور ہونا چاہیے۔ تانگے کا سودا پکا کر لے۔ میرے پاس دو جھپیں ہیں۔ جب سے نئی کار لی ہے، ایک جپ خالی کھڑی ہے۔“ وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ ”چوہدری! وہ جپ میں تیرے لیے بھیج دوں گا۔“

”پر میں اس کی کمیت کیسے ادا کروں گا۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”زمین داری کی ساری آمدنی تو جیلہ کے پاس رہتی تھی۔“

”فکر نہ کر چوہدری۔“ احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ ”میں تجھ سے ابھی کچھ نہیں مانگ رہا۔ ربیع کی فصل کی واڈھی کے بعد دے دینا۔ تجھ سے میں نے سوڈے بازی تو کرنی نہیں، جتنے کی دو سال پہلے خریدی تھی اس سے ہزار ڈیڑھ ہزار کم دے دینا۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔ ”چوہدری، تو بہت پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”جیلہ کے جانے کے بعد سے میں بہت پریشان ہوں۔“

”اب جیلہ کا خیال دل سے نکال دے۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”شاہ جی! یہ بات سمجھ نہیں آتی، ہریال بے کھٹکے ادھر آجاتا ہے۔ میں نے دوبار دیکھا ہے۔ دونوں بار وہ بالکل بے خوف اور بے ڈر لگا۔ کیا پاکستان میں اسے کوئی خطرہ نہیں؟“

”چوہدری، سچی بات یہ ہے ادھر کے سمگلروں سے اس کی یاری ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”ہریال خود ڈا سمگلر ہے۔ بارڈر پولیس اور ریجنرز سب کا اس نے بھتا باندھ رکھا ہے۔ اسے ادھر آنے سے کون روک سکتا ہے۔ اس کے کرندے ادھر اور ادھر، دونوں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ خود کبھی نہیں نکلتا۔ بھین کو لینے آگیا تھا۔ اس کا سارا دھندا کرندوں کے ذریعے چلتا ہے۔ ویسے اس کا ادھر بھی بہت اثر و رسوخ ہے۔ وزیروں اور وڈے سرکاری افسروں سے اس کا رابطہ ہے۔“

”وزیر ذرا سے بھی اس کا میل ملاپ ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”اس کا مطلب تو یہ

ہوا کہ سگنگ میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔“

احسان شاہ نے قہقہہ لگایا۔ ”کیا کیا بتاؤں تجھے؟ نہ پوچھ چوہدری۔ زبان مت کھلوا۔ تجھے اتنا تو پتہ ہی ہو گا کہ پنجاب اور سندھ سے سرحد پار کنگ سگنگ کر کے اتنی بھیجی گئی کہ ادھر کھانے کو بھی نہیں رہی۔ کتنے ہی وڈے زمیں داروں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا۔ کنگ کے ذخیرے روک لیے۔ حالات اور بگڑ گئے۔ پنجاب نے کنگ کی ایسی کمی بھی نہیں دیکھی تھی۔ بہت گڑبڑ مچی۔ مجھے یاد ہے، فروری ۱۹۵۲ء میں لہور میں کنگ کی منگائی کے خلاف آٹا ڈے منایا گیا اور ایک آٹا جلوس بھی نکلا۔ میں ان دنوں لہور میں ہوتا تھا۔“

”مجھے بھی یاد پڑتا ہے۔ بہت گڑبڑ ہوئی تھی۔ پر کنگ کی جو کمی اور منگائی تب سے ہوئی ہے اب تک ختم نہیں ہوئی۔“

”اس لیے نہیں ہوئی کی غلے کی سگنگ اب تک ختم نہیں ہوئی۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”جیسی تو امریکہ سے کنگ منگوانی پڑی اور اب تک برابر ادھر ہی سے آرہی ہے۔ سگنگ سے کنگ کی جو کمی پڑی، اس نے سندھ میں اور بھی حالات خراب کیے۔ گورنر نے وزیر اعلیٰ کھوڑو اور صوبائی وزیر مال فضل اللہ کے خلاف پیروڈا کے تحت مکدمہ قائم کیا اور دونوں کو ان کے عہدوں سے برطرف کر دیا۔“ اس نے بے تکلفی سے قہقہہ بلند کیا۔ ”تجھے کہاں تک بتاؤں۔ یوں سمجھ لے۔ سگنگ کا چکر نیچے سے اوپر تک پھیلا ہوا ہے۔“

ایک نوکر نے انگریزی روشنی کر کے کمرے میں رکھ دی تھی۔ کمرہ خوب گرم ہو گیا تھا۔ انگارے دہک رہے تھے۔ ان کی سرخی نے احسان شاہ اور رحیم داد کے چہرے گلابی بنا دیے تھے۔

”شاہ جی! کیا تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟“ رحیم داد نے اچانک احسان شاہ سے پوچھا۔ ”کوئی خاص گل بات ہے؟“ احسان شاہ نے اس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”بول! کیا مدد چاہتا ہے؟“

”میں جیل سے ایک بار ملنا چاہتا ہوں۔“ رحیم داد نے نظریں جھکا کر دلی زبان سے کہا۔ ”حان سے مارا جائے گا؟ اس چکر میں نہ پڑ۔“ احسان شاہ نے اسے خبردار کیا۔ ”ویسے تو اب اسے مل کر کرے گا بھی کیا۔ وہ تیرے ساتھ رہنا چاہتی تو یہاں سے جاتی ہی کیوں۔ وہ تیری نہیں بن سکتی۔“

”تجھے پتہ نہیں شاہ جی! مجھے اس سے کتنا پیار ہے۔“ رحیم داد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس کے جانے کے بعد مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ حویلی ویران کر گئی۔ اب یہاں کچھ نہیں رہا۔“

اس کے لہجے میں التجا کا عنصر نمایاں ہو گیا۔ ”شاہ جی! تجھے میری مدد کرنی ہی پڑے گی۔ میں اس سے ایک بار ضرور ملنا چاہتا ہوں۔“

”کیا کرے گا مل کر؟“

”صرف اتنا کہوں گا، وہ جب بھی واپس آتا چاہے، آسکتی ہے۔ اس حویلی کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔“

”پر اب وہ تیرے پاس آنے ہی کیوں لگی۔“ احسان شاہ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”تو خود سوچ، ایک بار یہاں سے جانے کے بعد وہ کیسے واپس آسکتی ہے۔“

”جلیل کے گھروالی زینت بھی تو اپنے رشتے داروں اور برادری والوں کے پاس سرحد پار چلی گئی تھی۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”پر نہ اسے کسی نے وہاں قبول کیا اور نہ اس کے بچوں کو۔ اسے اتنا تنگ کیا، اتنا دکھ پہنچایا کہ ایک رات چھپتی لپکتی بھاگ کر واپس آگئی۔ مجھے بتاتی تھی اسے کیسے کیسے وہاں تنگ کیا گیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”شروع شروع میں تو بہت آؤ بھگت ہوئی۔ خوب پیار بھی بتایا گیا۔ پر جوں جوں دن گزرتے گئے سب کی نظریں بدلتی گئیں۔ اسے اچھوت اور کیوں سے بھی زیادہ برا سمجھا جانے لگا۔ گھنٹوں بیٹھی روتی رہتی، کوئی دلا سا بھی نہ دیتا۔ سب دور دور رہتے۔ اس کے بچوں کو نفرت سے دھتکارتے۔ ان سے گھن کھاتے۔“

احسان شاہ ہزار ہو کر بولا۔ ”زینت کو بلی مار، یہ بتا تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔“

”شاہ جی! گل سمجھنے کی کوشش کر۔“ رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔ ”دیکھ زینت اور جیلہ کا معاملہ ایک ہی جیسا ہے۔ زینت کی طرح جیلہ بھی ایک مسلمان کے پاس اس کی گھروالی بن کر رہی۔ اس سے دو بچے بھی ہوئے۔ جس طرح زینت اور اس کے بچوں کو قبول نہیں کیا گیا، ٹھیک ایسا ہی کچھ عرصے بعد جیلہ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا، اور میں کہتا ہوں ضرور ہو گا، تب تو جیلہ واپس آنے کا سوچ سکتی ہے۔ ادھر اس کی زمیں داری تھی۔ بہت شان تھی۔ میرے ساتھ کچے کاغذ پر اس کا نکاح بھی ہو چکا ہے۔ وہ اپنے گھروالوں سے لڑ بھگڑ کر واپس میرے پاس آجائے تو تعجب کی کون سی گل ہے۔“

”سن لی، میں نے تیری ساری گل سن لی۔ اور سمجھ بھی لی ہے۔“ احسان شاہ نے اکتا کر کہا۔ ”چچ پوچھ تو میں جیلہ کے بارے میں زیادہ جانتا بھی نہیں ہوں۔ تو اسے ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”پر ایک بات کان کھول کر سن لے۔ تو جیلہ سے نہیں مل سکتا۔ ہر دیال بہت زور آور ہے۔ تو نے جیلہ کے پاس جانے کی کوشش کی اور ہر دیال

کو پتہ چل گیا تو سمجھ لے، زندہ بچ کر نہیں آسکتا۔ میں تو کہتا ہوں، تو ادھر جانے کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔“

”تو کہتا ہے تو میں خود ادھر نہیں جاؤں گا۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کی بات مان لی، مگر باز نہیں آیا۔ ”پر تو میری اتنی مدت تو کر سکتا ہے کہ کسی کے ذریعے میرا یہ پیغام جیلہ تک پہنچا دے۔ وہ جب بھی واپس آنا چاہے میں اسے کچھ نہیں کہوں گا۔ وہ پہلے جس طرح یہاں رہتی تھی اسی شان سے رہے گی۔“

احسان شاہ نے کچھ نہیں کہا۔ رحیم داد بے قرار ہو کر بار بار اس کی جانب دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد احسان شاہ کی آواز ابھری۔ ”چوہدری! ایمان کی بات یہ ہے کہ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ ہر دیال کس شہر میں ہے۔“

”مجھے اتنا تو پتہ ہے وہ فیروز پور میں ہے۔“

”اگر تیری اطلاع صحیح ہے تو کام بن سکتا ہے۔ رفیع سہ سے اس کام میں مدد مل سکتی ہے۔ اس سے میری دوستی یاری ہے۔ میرے پاس آتا رہتا ہے۔ اس کا بھی سہنگنگ کا دھندا ہے۔ ہر دیال سے تو شاید اس کی جان پہچان نہیں، پر اس کے کرمندوں سے اس کی یاری ہے۔ ایک بار مجھے اس نے بتایا تھا۔ ویسے سہ خود بھی وڈا زمیں دار ہے۔ اور رسا گیر تو بہت زبردست ہے۔ پر بہت زندہ دل اور یاروں کا یار ہے۔ رہتا بھی بارڈر کے نزدیک ہے۔“

”شاہ جی! تو مجھے رفیع سہ سے ملو دے۔ وہ میری مدد کر سکتا ہے۔ تو مجھے اس سے کب ملوائے گا؟“

”اتنا بے چین نہ ہو۔ صبر سے کام لے۔ مجھے پتہ ہے، تو جیلہ کے لیے بہت پریشان ہے۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا امید افزا نظروں سے احسان شاہ کا چہرہ نکلتا رہا۔

”چوہدری! میں تیری ضرور مدد کروں گا۔ تجھ سے یاری جو ٹھہری۔ رفیا مجھ سے ملنے آیا تو اسے لے کر تیرے پاس آجاؤں گا یا تجھے اپنی حویلی پر بلواؤں گا۔ وہ کچھ ہی دنوں بعد آنے والا ہے۔ پر تو بے صبری سے کام نہ لے ورنہ مجھے ڈر ہے، کوئی گزبزنہ ہو جائے۔“ احسان علی شاہ کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”ویسے تجھے اتنا تو سوچنا چاہیے۔ جیلہ نئی نئی اپنے گھر والوں کے پاس گئی ہے۔ ان سے اس کا بگاڑ ہونے میں کچھ مدت ضرور لگے گی۔ تجھے کچھ عرصہ انتظار کرنا پڑے گا۔“

رحیم داد نے احسان شاہ کی بات کی اہمیت اور نزاکت محسوس کی اور اسے یقین دلایا۔ ”شاہ جی! تو جیسا کہتا ہے، میں ویسا ہی کروں گا۔“

رات بھینکنے لگی تو احسان شاہ نے جانے کا ارادہ کیا۔ رحیم داد نے اسے روکنا چاہا مگر وہ نہ رکا۔ جب تک پہنچتے پہنچتے رحیم داد اس سے مسلسل اصرار کرتا رہا۔



دیکھتے ہی دیکھتے حویلی میں نت نئی تبدیلیاں ہونے لگیں۔ اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ان میں اضافہ ہوتا گیا۔ بیشتر پرانے ملازمین نکال دیے گئے۔ ان کی جگہ نئے ملازم رکھے گئے۔ نادر خان نے اس سلسلے میں بڑی مستعدی دکھائی۔ اس نے احسان شاہ کی سفارش سے اللہ وسایا مرحوم کی عہد ساخت کی راقط کا لائسنس تبدیل کرایا۔ رحیم داد کے لیے ریوالور کا لائسنس حاصل کیا اور جرمن ساخت کا ایک عہد ریوالور خرید بھی لیا۔ چھ سات کڑیل جوان حویلی جی نگرانی اور زمیں داری کا کام چلانے کے واسطے کارندوں کے طور پر ملازم رکھے۔ انھیں مسلح کرنے کے لیے چوری اور اسمگلنگ کا اسلحہ خریدا۔ آمد و رفت کے لیے ایک ٹانگا بھی خریدا لیا گیا۔ احسان شاہ نے حسب وعدہ جیب بھی بھجوا دی اور ڈرائیور کا بھی بندوبست کر دیا۔

رحیم داد نے جیب پر سوار ہو کر گاؤں کا ایک چکر لگایا۔ نہر کے کنارے کنارے دور تک گیا۔ وہ جیب میں بیٹھ کر احسان شاہ کے پاس جانا چاہتا تھا مگر احسان شاہ اپنے گاؤں پیراں والہ میں نہ تھا، لاہور جا چکا تھا۔

ایک عرصے سے ویران پڑے ہوئے مہمان خانے پر بھی توجہ دی گئی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے ڈالے گئے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کے نیا ڈالا گیا۔ مالی نے مہمان خانے کے وسیع صحن میں جگہ جگہ کیاریاں بنا کر قسم قسم کے پودے لگائے۔ موسم بدلا۔ پودوں میں شگوفے پھوٹے اور وہ پھولوں سے لد گئے۔ ان کی خوشبو سے صحن ہر وقت مہکتا۔ مہمان خانے میں اب رونق اور چل پھل رہتی۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے احمد کے بجائے ایک نیا ملازم مقرر کیا گیا۔

موسم گرما شروع ہو چکا تھا۔ آفتاب غروب ہوتا، شام کا دھندلا پھیلتا، مہمان خانے میں میوزیکس روشن کر دیا جاتا۔ صحن میں کرسیاں ڈال دی جاتیں۔ مہمان خانے کے پچھواڑے، باغ میں رحیم داد کبھی کبھار بیٹھتا۔ دن ڈھلتے ہی عام طور پر مہمان خانے میں بھی پہنچ جاتا اور شام ہوتے ہی صحن میں بیٹھ کر دھڑلے سے شغل سے نوشی بھی کرتا۔

ان تبدیلیوں کے ساتھ رحیم داد خود کو بھی بڑی حد تک تبدیل کر چکا تھا۔ مگر وہ اب تک جیلہ کے نہیں بھولا تھا۔ اس کی یاد اکثر ہو کہ بن کر سینے سے اٹھتی۔ احسان شاہ سے وہ اپنی اس بے قراری کا کھل کر اظہار بھی کر چکا تھا۔ وہ اسے اپنا وعدہ یاد دلانا چاہتا تھا۔ لیکن احسان شاہ لاہور سے ہنوز

ہوئی خاموشی میں ہارن بجنے کی تیز آواز ابھری۔ رحیم داد کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا۔ اسے توقع تھی کہ احسان شاہ آیا ہو گا مگر وہ احسان شاہ نہ تھا، سردار مراد خان شاہانی تھا۔ وہ دروازے کے پچوں بچ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد نے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں جوش و خروش سے بھینچ لیا، شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔ ”شاہانی تو اتنے دنوں کہاں غائب رہا؟“

”آرام سے گل بات ہوگی۔“ مراد خان نے جواب دیا۔

دونوں ہنستے مسکراتے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ مراد خان نے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا۔ ”شاہ جی بتاتا تھا، جیلہ تجھے چھوڑ کر سرحد پار چلی گئی۔“

”ہاں، وہ چلی گئی۔ شاہ جی نے ٹھیک ہی بتایا۔“

”سنا ہے اس کا بھرا آیا تھا اور رات کے اند میرے میں اپنے ساتھ لے گیا۔“ مراد خان شاہانی نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”تو نے اسے کیسے جانے دیا۔ روک بھی نہ سکا؟“

”میں اکیلا تھا اور وہ کئی تھے، پوری طرح مسلح تھے۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”تیرے تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت نے بھی کام نہ کیا۔“

”اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ وہ تجھے مل گئی تھی۔ شاہ جی کہتا تھا جیلہ کے ساتھ اس نے تیرا نکال بھی پڑھوایا تھا۔ تو نے زیارت پر جو منت مانی تھی، وہ تو پوری ہو گئی۔“

”ایسی منت پوری ہونے سے کیا فائدہ جب وہ میرے پاس ٹھہری ہی نہیں۔“

”مجھے کیا پتہ تو نے کیا منت مانی تھی۔ میں تو یہ جانتا ہوں، تو نے یہ چاہا تھا کہ وہ تیری بن جائے۔“ شاہانی زیر لب مسکرایا۔ ”سچی بات یہ ہے کہ منت تو ایک طرح سے پوری ہو گئی۔ وہ تیرے ساتھ جڑ گئی۔“

دروازے پر آہٹ ہوئی۔ رحیم داد نے چونکا ہوا کر دیکھا۔ رختے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ صحن میں داخل ہو رہی تھی۔ تینوں بیٹے ہی تھے۔ وہ ماں کے ساتھ چل رہے تھے۔ رختے کے سر پر بڑی کی گٹھری تھی اور ہاتھ میں ٹین کا پرانا ٹریک لٹک رہا تھا۔

رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”شاہانی یہ تو رختے ہے، تو اسے اپنے ساتھ کیسے لے آیا؟“

”اب اسے میرے ہی ساتھ رہتا ہے۔“

رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا، اس نے کیرد کر پوچھا۔ ”شاہ جی نے اسے تیرے ساتھ آنے کی اجازت کیسے دے دی؟“

”وہ تو اسے اپنی حویلی سے نکال رہا تھا۔“ مراد خان نے بتایا۔ ”میں نے شاہ جی سے کہا، اسے

اپس نہیں آیا تھا۔ اس کا بڑا بیٹا، انگلستان سے بیرسٹر بن کر واپس آ گیا تھا۔ لاہور میں اس نے پریکٹس بھی شروع کر دی تھی۔ ساتھ ہی وہ سیاست میں بھی داخل ہونا چاہتا تھا۔ احسان شاہ بیٹے کے لیے فضا سازگار رہتا تھا اور اسی مقصد سے اپنی نئی کوٹھی میں مقیم تھا۔

نادر خان اب زمیں داری کے کاموں میں زیادہ تن دی اور سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ اس کی بیوی، جنت اپنی بچیوں کے ہم راہ میکے گئی ہوئی تھی اور وہاں چھوٹے بھائی کی شادی کے بنگاموں میں مصروف تھی۔ اس کے بھائی کی شادی فصل کی کٹائی کے بعد ہونے والی تھی۔ شادی سے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہ تھا۔

گندم کے پودے پک کر سنہری پڑ گئے تھے۔ اپریل کا دوسرا ہفتہ شروع ہو چکا تھا۔ گاؤں میں فصل کی کٹائی کی تیاری زور و شور سے ہو رہی تھی۔ اس دفعہ ربیع کی فصل بہت اچھی تھی۔ مزارعوں کے چہرے خوشی اور شادمانی سے دمک رہے تھے۔ نادر خان بھی اسے اپنی کامیابی سمجھ کر مسرور نظر آتا تھا۔

لیکن رحیم داد کو فصل سے کوئی خاص رغبت اور دل چسپی نہیں تھی۔ اس نے فصل کی طرف کوئی توجہ ہی نہ دی۔ نادر خان نے کارندوں کے ساتھ فصل کی دیکھ بھال کے لیے موجود ہی تھا۔ نادر سویرے سویرے کھیتوں کی طرف چلا جاتا اور دن ڈھلے تک مزارعوں کے ساتھ رہتا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں تنہا پڑا رہتا۔ سہ پہر کو غسل کرتا، لباس تبدیل کرتا اور شام ہوتے ہوتے مہمان خانے میں پہنچ جاتا۔

نادر خان ہر شام گھر جانے سے پہلے رحیم داد کو فصل کی کٹائی کے بارے میں رپورٹ دیتا۔ رحیم داد کبھی کبھار کوئی بات پوچھ لیتا ورنہ عام طور پر چپ رہتا۔ وہ ان دنوں بہت بچھا بچھا رہتا تھا۔ تنہا اور آکٹا ہٹ سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ احسان شاہ کے ساتھ پیراں والہ میں کچھ عرصہ قیام کرنا چاہتا تھا۔ وہاں اس کی دل بستگی کا سامان میا ہو سکتا تھا مگر شاہ جی لاہور میں جم کر بیٹھ گیا تھا پیراں والہ آنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔



گرمی بڑھ گئی تھی۔ دوپہر ہوتے ہوتے در و دیوار سلگتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس دفعہ گرم جلد ہی شروع ہو گئی تھی اور کچھ زیادہ بھی تھی۔ ہوا چلتی تو گرد کے گرم گرم گولے تیزی سے اٹھتے۔ ہوا ٹھہری ہوتی تو جس ہو جاتا۔ آسمان غبار آلود ہوتا۔ فضا اداس اور بے کیف محسوس ہوتی۔ ایک ایسی ہی بے کیف شام کو رحیم داد مہمان خانے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ اچانک شام کی

مجھے دے دے۔ وہ خوشی سے تیار ہو گیا۔

”شاہ جی اب کہاں ہے۔“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”آج ہی صبح میرے ساتھ لہور سے پیراں والہ آیا تھا۔“ مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”رات ہی بھر ٹھیرے گا، صبح واپس آجائے گا۔“

”دو چار روز بھی نہیں ٹھیرے گا؟“ رحیم داد مضطرب ہو گیا۔

”نہیں۔“ مراد خاں شاہانی نے کہا۔ ”اس نے اب لہور ہی رہنا ہے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال اس نے اپنے پتر نعمان شاہ کے حوالے کر دی ہے۔“

”پروہ لہور میں کر کیا رہا ہے؟ بہت عرصے سے ادھر ہی ہے۔“ رحیم داد ایک آنکھ دبا کر مسکرایا۔ ”بات کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔ تجھے تو پتہ ہی ہو گا اسے مل کر رہا ہے۔“

”وہاں بیٹھا وہ سیاست لڑا رہا ہے۔ گورنر سے اس نے پاری کر لی ہے۔ اس سے اکثر ملتا بھی رہتا ہے۔“ سردار مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ ”آج کل شاہانی کی کوششی پر ہر شام سیاست دانوں کی بیٹھک ہوتی ہے اور رات دیر تک چلتی ہے۔“

”تب تو اس کا ادھر ٹھیرنے کا نام ہی پروگرام لگتا ہے۔“

”ارادے تو اس کے کچھ ایسے ہی ہیں۔ ابھی تو اس نے وہیں ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہاں بک رہے گا۔ کچھ پتہ نہیں۔“ مراد خاں نے قہقہہ لگایا۔ ”سچ پوچھ تو خود شاہ جی کو بھی پتہ نہیں اس نے کب تک لہور ٹھیرا ہے۔“

رحیم داد نے رتختے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنے تینوں بچوں کے ساتھ ایک طرف کھڑی تھی۔ ”رتختے، تو اس طرح کب تک کھڑی رہے گی؟“ رحیم داد نے اونچی آواز سے سمان خانے کے لئے ملازم کو پکارا۔ ”گھماں ادھر آ۔“

وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور رحیم داد کے روبرو ادب سے کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے رتختے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گھماں سے کہا۔ ”اس نے ادھر ہی ٹھیرا ہے۔ اس کے رہنے اور سونے کا بندوبست اپنی کونٹھری میں کر دے۔ تو حویلی میں جا کر سو جانا۔ اس کے لیے روٹی شونی کا بھی انتظام کر دے۔ اس نے ابھی روٹی کہاں کھائی ہوگی!!“

گھماں نہایت مستعدی سے بولا۔ ”فکر نہ کریں جی۔ سارا بندوبست ہو جائے گا۔“

وہ رتختے اور اس کے بچوں کو اپنی کونٹھری کی جانب لے جانے کے لیے مڑا۔ رحیم داد نے ٹوکا۔

”پہلے ایک گلاس تولو۔“

وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور آن کی آن میں ایک گلاس لا کر رحیم داد کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ رحیم داد نے بوتل کھولی اور سردار مراد خاں شاہانی کے لیے پیگ بنانے لگا۔

رحیم داد نے مراد خاں سے پوچھا۔ ”تو نے رتختے کو کہاں لے جانا ہے۔ اسے بھکری میں رکھے گا؟“

”نہیں، میں نے اسے بیٹ لے جانا ہے۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”رتختے وہیں رہے گی۔“

”سلطہ می کا کیا بنے گا۔ وہ برا نہیں منائے گی؟“

”میں نے اسے نکال دیا۔“ مراد خاں نے بے پروائی سے کہا۔

”تو نے اسے نکال دیا؟“ رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ ”وہ تو تیری جند جانی تھی، بہت چہیتی تھی۔“

”جب سے اس کے پتر کا مرن ہوا، ہر دم روتی رہتی تھی۔“

”جس روز وہ مرا، میں تو بیٹھ ہی میں تھا۔“

”سین، اس دن سے جو اس نے سوئے بہانے شروع کیے تو بند ہی نہ ہوئے۔ جب دیکھو بیٹھی رو رہی ہے۔“ مراد خاں نے تلخی سے کہا۔ ”میں نے منع کیا تو چھپ چھپ کے روتی تھی۔ میں تو عاجز آ گیا۔ ویسے بھی وہ کام کی نہ رہی تھی۔ رو رو کر بیمار اور مرل لگنے لگی تھی۔ ایک رات مجھے غصہ آیا تو میں نے اسی دم اسے نکال دیا۔“

”کہاں گئی وہ؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”پتہ نہیں کہاں گئی۔ پر تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”تو نے جس سلطہ می کو دیکھا تھا، بعد میں وہ ویسی نہیں رہی تھی۔ دیکھ کر گھسن آتی تھی۔“

”تو رتختے کو لے کر جاتا رہا ہے۔ اس کے بھی پتر ہیں۔ کوئی مر گیا اور اس نے بھی سلطہ می کی طرح رو رو کر اپنا ناس مار لیا تو اس کا کیا کرے گا؟“ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”اسے بھی نکال دے گا؟“

”اور کیا کروں گا۔“ مراد خاں نے کہا۔ ”میں نے اس کا کوئی زندگی بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”ایسا ٹھیکہ تو میں نے صرف اپنی ذال کا لیا ہے۔ اسے ویسا کر لایا ہوں۔ اس سے تو میری آگے نسل چلے گی۔“

”سلطہ می کے بچے بھی تو تیرے ہی ہیں۔“

”ہوں گے، ضرور ہوں گے۔“ وہ جھوم کر بولا۔ ”پر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کی رن کے بچے

بھی کمی ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی حک نہیں بنتا۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”ریتے کے نکلے بھی شاہ جی ہی کے ہیں پر اس نے ریتے کے ساتھ انھیں بھی نکال دیا۔“

رحیم داد نے دبی زبان سے شکوہ کیا۔ ”شاہ جی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“
 ”تیرا مطلب ہے وہ انھیں اپنی حویلی میں رکھتا؟ انھیں اپنے بچوں کی طرح پالتا۔ زمین دار بنانا، اپنی جائیداد کا وارث ٹھہراتا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”برانہ منانا چوبدری تو مجھے خاندانی زمین دار نہیں لگتا ورنہ ایسے نہ سوچتا۔“

رحیم داد تمللا کر رہ گیا۔ جینپ مٹانے کے لیے بولا۔ ”لگتا ہے تجھے کچھ آج زیادہ ہی چڑھ گئی ہے۔ رم پی رہا ہے ناں۔ سنا ہے یہ وہسکی سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ ویسے آج گرمی بھی زیادہ ہے۔“
 ”ایسی گالہ نہیں۔“ مراد خاں شاہانی اپنے موقف پر اڑا رہا۔ ”کوئی وڈا اور خاندانی زمین دار اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا ورنہ کب کی زمین داریاں اور بگیڑیں ختم ہو چکی ہوتیں۔ ایسی رتاں تو زمین داروں کا دل ہلانے کے لیے ہوتی ہیں۔“ اس نے رحیم داد کو خار آلود نظروں سے دیکھا۔
 ”زمین داری چلانے کے لیے یہ ضروری بھی ہے۔ تجھے اتنا تو پتہ ہی ہے کہ گھروالی، مرد کی عزت ہوتی ہے۔ ہوتی ہے ناں؟“

”بالکل ہوتی ہے۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

”مزارعوں اور کیوں کو کا بو میں رکھنے کے لیے ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح ان میں عزت اور آن کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ مزارع سر نہیں اٹھاتا۔“ مراد خاں نے سنجیدگی سے کہا۔
 ”مزارعے اور کمی اسی طرح زمین دار اور بگیڑہ دار کے تابع دار اور غلام رہ سکتے ہیں۔ ہمارے بزرگ اور وڈیرے ایسا نہ کرتے تو مزارعے سرکشی اور بغاوت کر کے کب کے ہم سے زمین داریاں چھین لیتے۔ کیا سمجھا؟“ اس نے زور کا تقبہ لگایا۔ ”لا، اسی بات پر ایک ڈبل بنا کر دے۔ تو نے مزہ خراب کر دیا۔“

رحیم داد نے مراد خاں کے گلاس میں رم ڈالی، پیگ بنایا اور گلاس مراد خاں کی جانب بڑھا دیا۔ اس نے گلاس سنبھال کر غٹا غٹ کئی گھونٹ بھرے۔ رحیم داد نے گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ ”تو دو چار روز تو میرے ساتھ ٹھہرے ہی گا؟ میں تجھے جلد نہیں جانے دوں گا۔ بہت دنوں بعد تجھ سے ملنا ہوا ہے۔“

”نہیں، میں نے کل صبح جانا ہے۔“ مراد خاں نے کہا۔ ”تو بھی میرے ساتھ چل۔ یہاں اکیلا پڑا ہے، ساتھ رہے گا تو تیرا دل بھی بیلے گا۔ تیرے پاس جب آگنی ہے، اسی میں چلیں گے۔ میں

نے پہلے ملنا جانا ہے۔ وہاں سے ٹرین پکڑ لیں گے۔“

رحیم داد تھوڑی جیل حجت کے بعد رضا مند ہو گیا۔ وہ بھی تنہائی سے آگیا تھا۔ زمین داری کی طرف سے اسے کوئی فکر نہ تھی۔ نادر خاں کی کارکردگی سے وہ مطمئن تھا۔

پہررات گزر چکی تھی۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ ہوا کی موٹی تھی۔ دونوں کے چہروں پر پسینے کے قطرے لرز رہے تھے۔ مراد خاں نے اپنا گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے گلاس ختم نہیں کیا۔ وہ پہلے ہی بہت پی چکا تھا۔ دونوں لڑکھڑاتے ہوئے کچھ دور ساتھ ساتھ چلے۔

سردار مراد خاں شاہانی جھومتا جھومتا ریتے کے پاس پہنچا۔ وہ کوٹھری کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے چارپائی پر لیٹی تھی اور ابھی تک جاگ رہی تھی۔ برابر کی چارپائی پر اس کے بچے بے خبر سو رہے تھے۔ مراد خاں کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں کاہل تھا۔ بالوں کو تیل ڈال کر سنوارا تھا۔ اس نے شام کو نما دھو کر اگلے کپڑے پہنے تھے۔ وہ سبز لچا باندھے ہوئے تھی۔ کرتا باریک ملل کا تھا اور دوپٹا گہرا بنی تھا۔ وہ پورا سنگھار کیے مراد خاں کا انتظار کر رہی تھی۔

ریتے کا گہرا سانولا رنگ دالان میں روشن پینو میکس کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ پنگھا جھلنے ہوئے اس نے مسکرا کر مراد خاں شاہانی کو دیکھا، چارپائی سے نیچے اتری، آہستہ سے بولی۔

”آج گرمی بہت ہے۔“

مراد خاں شاہانی نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے آگے بڑھ کر ریتے کا بازو تھما اور اس کے سارے جھومتا جھومتا زینے کی طرف بڑھا۔ گھٹاں نے اس کے لیے جھٹ پر پلنگ بچھا کر اجلا بستر لگا دیا تھا۔ شاہانی کے قدم بری طرح ڈنگا رہے تھے۔ ریتے اسے بار بار سنبھالتی۔ دونوں نے بیڑھیاں طے کیں اور چھت پر پہنچ گئے۔ رحیم داد خاموش کھڑا مراد خاں شاہانی اور ریتے کو دیکھتا رہا۔

سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی ڈرائیور نے جپ حویلی کے پھانک پر لا کر کھڑی کر دی تھی۔ رحیم داد نے رات ہی کو سفر کے بارے میں گھٹاں کو ضروری ہدایات دے دی تھیں۔ وہ تاروں کی پھاؤں میں اٹھ گیا تھا۔ اس نے رحیم داد اور مراد خاں کو جگایا۔ نادر خاں کو بھی مطلع کیا۔

آسمان پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلا تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نے غسل کیا، لباس تبدیل کیا اور سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ ریتے بھی پوری طرح تیار تھی۔ رحیم داد اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ شاہانی پچھلی نشست پر ریتے اور اس کے بچوں کے ہم راہ بیٹھا تھا۔ روانگی کے وقت حویلی کے دوسرے ملازموں کے علاوہ نادر خاں بھی موجود تھا۔ رحیم داد نے نادر کو بتایا کہ وہ سردار مراد خاں شاہانی کے ساتھ بھکر جا رہا ہے۔

ادری جسم برہنہ تھا۔ زیر ناف بس ایک پھنار پانا چھتڑا لپٹا تھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال خاک دھول سے اٹے تھے اور بدن پر میل کی تہہ جی تھی۔ نہ جانے کب سے اس نے غسل نہیں کیا تھا۔ اس کی عمر ۲۵ برس سے زیادہ نہیں تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں مگر بجھی بجھی اور ویران تھیں میل کی تہہ کے نیچے سے اس کی گوری جلد جھلک رہی تھی۔ کبھی وہ خوب صورت اور دلکش رہی ہو گی لیکن اب غلاظت کا ڈھیر لگتی تھی۔ سب کی نظریں اسی کی جانب تھیں اور وہ بالکل بے نیاز بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک بوڑھا شخص بیٹھا تھا۔ وہ اس کے عریاں سینے پر چادر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر عورت بار بار چادر جھٹک کر ایک طرف پھینک دیتی۔ اس نے سر اٹھایا اور اس پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ایک نوجوان جو وضع قطع سے کسی لاری کا کلیز نظر آتا تھا، عین اس کی سامنے کھڑا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی پگلی کا چہرہ غضب ناک ہو گیا۔ چیخ کر بولی۔ ”تو ادھر بھی آگیا۔ دفع ہو جا میرے سامنے سے۔“ نوجوان سخت سٹٹایا اور غل ہو کر پیچھے ہٹ گیا۔

ہجوم میں سے ایک ادھیڑ شخص لسی سے بھرا ہوا گلاس سنبھالے آگے بڑھا اور عورت کے نزدیک جا کر نرم لہجے میں عاجزی سے بولا ”لے کر ہاں بھری“ اسے پلی لے۔“ عورت نے نیکی نظروں سے اسے دیکھا اور جھجکا کے ایسا ہاتھ مارا کہ گلاس دور جا گرا۔ ساری لسی مٹی میں مل گئی۔ عورت ٹھٹھا مار کر ہنسی اور ادھر ادھر نگاہیں گھما کر رحیم داد کو دیکھا۔ وہ ایک نک اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کے چہرے کا اچانک رنگ بدلا۔ تھکے لہجے میں بولی۔ ”وئے تو اکیلا ہی آگیا۔ حکیم کدھر ہے؟“ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ عورت برابر اسے گھورتی رہی۔ ”تو حکیم کو جانتا ہے ناں؟ تو اسے ضرور جانتا ہے۔ تو اس کے ساتھ تھا۔ ہاں تو ہی اس کے ساتھ تھا۔“

رحیم داد نے گھبرا کر مراد خاں کی طرف دیکھا۔ مراد خاں اس کے برابر ہی کھڑا تھا۔ اس نے مکرار کر رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری یہ تو مست ملنگ ہے، جو سمجھ آتی ہے بولتی ہے، پتہ نہیں کون ہے۔“

”میں جی، پچھلے کئی مہینے سے اسے ادھر ہی دیکھ رہا ہوں۔“ ڈرائیور نے بتایا۔ وہ مراد خاں اور رحیم داد کے عقب میں کھڑا تھا۔ ”کبھی لاریوں کے اس اڈے پر نظر آتی ہے کبھی دوسرے پر۔ غصہ آتا ہے تو پتھر اٹھا کر مارتی ہے۔ کپڑے لتے پٹاؤ تو چیر پھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ کبھی خوب زور زور سے روتی ہے۔ کبھی آپ ہی آپ ٹھٹھا مار کر ہنستی ہے، کبھی اسی بیٹھی گھٹنوں بیڑواتی رہتی ہے۔“

”پگلی جو ٹھیری۔“ مراد خاں بولا۔ ”پر یہ آئی کہاں سے؟“

”یہ جی کمال گڑھ کے حکیم چشتی کی گھر والی ہے۔“ ڈرائیور نے مطلع کیا۔

”واپسی کب تک ہوگی جی؟“ نادر خاں نے دریافت کیا۔

اس دفعہ رحیم داد کے بجائے مراد خاں بولا۔ ”چوہدری دیر ہی سے لوٹے گا ویسے تو موجود ہی ہے۔“

”بھکر ہی میں ٹھیریں گے ناں؟“ نادر خاں نے کرید کر پوچھا۔

”نہیں۔“ مراد خاں شاہانی نے جواب دیا۔ ”بھکر نہیں، بیٹ میں ٹھیریں گے۔ وہاں شکار کھیلیں گے۔ ادھر گرمی بھی کم ہوتی ہے۔ ساتھ میں دریا بہتا ہے۔ تو نے بیٹ تو دیکھا ہی ہے۔ کوئی ضروری کام ہو تو وہیں آجاتا۔“

نادر خاں نے مزید بات چیت نہیں کی۔ رحیم داد نے ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ اس نے انجن اشارت کیا اور جپ آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور تک نہر کے ساتھ ساتھ دوڑتی رہی، پھر پختہ سڑک پر آگئی۔ سڑک ابھی تک سنان تھی۔ ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔ جپ چک بیدی کے راستے پاک پتن پٹنی اور وہاں سے شہر کی جانب روانہ ہو گئی۔ سڑک پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ کشادہ بھی تھی۔ جپ تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔

مرید کوٹ پختہ پختہ دوپہر ہو گئی۔ ڈرائیور نے جپ ٹھیرالی۔ ریڈی ایٹر کا ڈھکتا کھولا۔ کھولتا ہوا گرم پانی ڈرا ٹھنڈا ہوا تو اس نے ریڈی ایٹر میں اور پانی بھر دیا۔ ناشتے دان میں کھانا تھا۔ ڈرائیور نے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے سائے میں درری بچھا کر کھانا لگا دیا۔ رحیم داد اور مراد خاں کھانے سے فارغ ہوئے تو ڈرائیور نے رختے اور اس کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا مگر انھوں نے زیادہ دیر قیام نہیں کیا۔ سب دوبارہ جپ میں سوار ہو گئے۔ وہ ایک بار پھر سرمئی سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ دن ڈھلے جپ شہر سے گزری۔ رحیم داد کو طرح طرح کے اندیشوں نے ستایا۔ اس نے چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور سما ہوا بیٹھا رہا۔ جپ آن کی آن میں شہر سے نکل گئی۔



لالیاں والہ بس اسٹاپ پر جپ پٹنی تو ایک درخت کے نیچے راہ گیروں کا مختصر ہجوم نظر آیا۔ مراد خاں شاہانی نے جپ رکوائی، نیچے اترا اور ہجوم کی جانب بڑھا۔ ڈرائیور اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ رختے بھی نیچے اتری اور اس کے اصرار کرنے پر رحیم داد کو بھی اتارنا پڑا۔ دونوں ہجوم کی طرف بڑھے۔

قریب جا کر رحیم داد نے دیکھا، ایک عورت درخت کے تنے سے نیک لگائے بیٹھی ہے۔ اس کا

حکیم چشتی کا نام سن کر رحیم داد کا چہرہ فق ہو گیا۔ مراد خاں شاہانی اس کی سراسیمگی سے بے نیاز تھا۔ اس نے ڈرائیور سے دریافت کیا۔ ”حکیم اب کہاں ہے؟ اسے لے کیوں نہیں جاتا۔ اس کا علاج معالجہ کیوں نہیں کراتا؟“

”وہ تو جی بہت مدت سے لاپتہ ہے۔“ ڈرائیور نے بتایا۔ ”سنا ہے وہ جڑی بوٹیاں، دوائی پلانے کے لیے اکٹھی کرتا تھا اور ان کی تلاش میں جھل اور ویرانوں کی طرف چلا جاتا تھا۔ ایسے ہی گرمی کے دن تھے، ایک روز بوٹیوں کی تلاش میں ایسا گیا کہ فیر نہ لوٹا۔“

مراد خاں شاہانی نے حیرت اور دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟“

”وہ ایسا ہے جی! میرا ایک اماں ادھر لال سانی میں ہوتا ہے۔ لال سانی جی کمال گڑھ سے نزدیک ہی ہے۔ وہ حکیم چشتی سے دوا دارو کراتا تھا۔ اسی نے حکیم کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے جانتا تھا۔ کہتا تھا بہت نیک بندہ تھا۔“

شاہانی نے کرید کر پوچھا۔ ”تھانے میں حکیم کی گمشدگی کا پرچہ تو چاک کرایا ہی ہو گا؟“

”کرایا تو تھا۔ اماں ہی بتاتا تھا۔ پولیس نے کھوج نکالنے کی بھی بہت کوشش کی پر کچھ پتہ نہ چلا۔“ ڈرائیور نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”بات یہ ہے جی! حکیم کا کوئی پتر تو ہے نہیں اور نہ کوئی رشتے دار نہ اس کی گھر والی کا ادھر رشتے دار اور شریک ہے جو اس کا پتہ چلانے کے لیے بھاگ دوڑ کرتا۔“ اس نے پگلی کی جانب دیکھا۔ وہ گردن اٹھائے فضا میں گھور رہی تھی۔ ”حکیم کی صرف ایک جوان بیٹی تھی۔ سنا ہے ایک پولیس جو تفتیش کے لیے حکیم کے گھر آتا جاتا تھا اسے اٹھا کر لے گیا یا وہ خود ہی اس کے ساتھ بھاگ گئی۔“

رحیم داد نے استفسار کیا۔ ”وہ بھی واپس نہیں آئی؟“

”نہیں جی! وہ بھی اپنے پیو کی طرح لاپتہ ہو گئی۔ جانے اب کہاں ہے اور کیسی ہے؟ کسی کو کچھ پتہ نہیں۔“

سردار مراد خاں نے حکیم چشتی کی پاگل بیوی کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا۔

”پر یہ پگلی کیسے بن گئی؟“

ایک بوڑھا قریب کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا، وہ بیچ میں بول اٹھا۔ ”میں بتاؤں جی یہ پگلی کیسے بنی۔ میرا نام جی بودی ہے۔ میں کمال گڑھ میں ہی رہتا ہوں۔“ اس نے مراد خاں کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”جب حکیم کی طرح اس کی دھی بھی لاپتہ ہو گئی تو یہ خود دونوں کی تلاش میں نکلی۔“

اس نے مڑ کر حکیم کی بیوی کی سمت دیکھا۔ ”یہ تھانے کے چکر کاٹتی رہی۔ حکیم کے ملنے جلنے والوں کے گھر جاتی رہی۔ دن بھر ادھر ادھر گھومتی رہتی شام کو واپس گھر آتی۔ ایک شام واپسی پر اندھیرا بڑھ گیا۔ دھند ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سردی بھی زوروں پر تھی۔ پڑوس کے پنڈ کا کوئی وڈا زمیں دار تاک میں لگا تھا تب یہ تھی بھی بہت سوہنی۔ سنا ہے اس نے اپنے کندوں کے ذریعے اسے اٹھوا لیا۔“

”پہلے سے اس نے اپنے کندوں کو لگا رکھا ہو گا؟“ ڈرائیور نے قیاس آرائی کی۔

”ایسا ہی لگتا ہے جی!“ بودی نے بتایا۔ ”بہت دنوں تک یہ پنڈ میں نظر ہی نہیں آئی۔ مکان خالی پڑا رہا۔ بعد میں اسے دیکھا تو بالکل پاگل دیوانی ہو چکی تھی۔ کپڑے لٹے پھٹے ہوئے، بال بکھرے ہوئے۔ اور اب تو اسے ذرا بھی ہوش نہیں۔ گالاں نکالتی ہے۔ ڈانٹتی ہے بیچتی چلاتی ہے۔ پھر اٹھا کر مارنے دوڑتی ہے۔“

”کتے ہیں جی اب تو یہ مجذوب ہو گئی ہے۔“ ڈرائیور نے پگلی کے قریب بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بابا روز اس کے پاس آتا ہے۔ روٹی لاتا ہے، مٹھائی لاتا ہے اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔“

”اور بھی ایسے کئی ہیں جی!“ بودی بول پڑا۔ ”کئی تو ایسے آتے ہیں جن کے ساتھ زنانیاں بھی ہوتی ہیں۔“ اس نے مراد خاں شاہانی کی جانب دیکھا۔ ”پر ایک گل اور بھی ہے جی!“

”وہ کیا؟“ مراد خاں نے دریافت کیا۔

”وہ یہ ہے جی۔“ بودی نے بتایا۔ ”جس پر یہ غصے سے تھوک دے۔ سمجھو اس کا کام بن گیا۔ سب یہی جانتے ہیں۔ اسی لیے دور دور سے لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ منت کرتے ہیں، مٹھائی لاتے ہیں، دودھ لسی لاتے ہیں۔“

مراد خاں نے مسکرا کر رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری تو اس کے پاس ضرور چلا جا۔ اسے اپنے کسی کام کے لیے کہہ۔ یہ تجھ پر غصے سے ضرور تھوکے گی اور تیرا کام فائدہ بن جائے گا۔ تجھ سے تو اس نے بات بھی کی تھی، جیسے تجھے پہلے سے جانتی ہو۔ تو کبھی کمال گڑھ تو نہیں رہا؟“

”نہیں جی! میں ادھر کبھی نہیں گیا۔ اسے تو میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔“ رحیم داد نے گھبرا کر صفائی پیش کی۔ ”میں نے اس کی گالاں نہیں سنیں۔“ رحیم داد نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔

”مراد خاں! بہت دیر رک لیا، اب چل۔“ لہا سفر ہے۔“ اس نے پگلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں نے اس سے کچھ نہیں لیتا۔“

”تیرا مطلب ہے، ساری رات سفر کرنا ہے۔ ڈرائیور کو آرام نہیں کرنا؟“ مراد خاں شاہانی مسکرا کر بولا۔ ”رات ملتان میں سلیم خاگوانی کی حویلی میں گزارنی ہے۔“
دونوں مڑے، جیب کی جانب بڑھے۔ انھوں نے دیکھا کہ رختے ایک اجلا دوپٹا ہاتھ میں دبائے تیز تیز قدم اٹھاتی ہجوم کی جانب بڑھی۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بنا تی حکیم چشتی کی پاگل بیوی کے قریب پہنچی۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ درخت کے نیچے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ پگلی نظریں اٹھائے فضا میں گھوری تھی۔ درخت کی شاخوں کے درمیان سے جھانکتی ہوئی ڈوبتے سورج کی ایک کرن اس کے منیالے چہرے پر جھللا رہی تھی۔ رختے اس کا جسم دوپٹے سے ڈھانکنے لگی۔ پگلی نے مطلق مزاحمت نہیں کی۔ رختے نے جس طرح اس کے جسم کے گرد دوپٹا لپیٹا، اس نے اسی طرح لپٹا رہنے دیا۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے دوپٹے کے آچل سے سر ڈھکا اور گھونٹ نکال کر رختے کی جانب مڑ کر دیکھا اور اشارے سے اسے قریب بلایا۔ رختے کھسک کر اور نزدیک ہو گئی۔ پگلی کھل کھلا کر ہنسی، ہاتھ بڑھایا اور رختے کی دھوتی کا کنارہ پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ دھوتی کھل گئی۔ رختے نیم برہنہ ہو گئی۔ وہ سخت پریشان ہوئی۔ ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں میں سے بعض نے زور سے ٹھٹھا مارا۔
رختے بدحواسی میں جھک کر دہری ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی دھوتی باندھی۔ مگر وہ پگلی کے قریب سے ہٹی نہیں، وہیں بیٹھی رہی۔ پگلی نے اپنے سر اور سینے سے لپٹا ہوا دوپٹا اتار کر نفرت سے ایک طرف پھینک دیا، تیرا لود نظروں سے رختے کو دیکھا، ہاتھ بڑھا کے زور سے دھکا دیا اور چیخ کر بولی۔

”دفع ہو۔ میراں آکھیاں آگوں دور ہو جا۔“

رختے سخت سراپد ہوئی۔ وہ نظریں جھکائے ہوئے انھی اور سیدھی جیب کی جانب لپکی اور اپنی نشست پر جا کے بیٹھ گئی۔ رحیم داد اور مراد خاں نے مسکرا کر رختے کو دیکھا اور جیب میں بیٹھ گئے۔
ڈرائیور پہلے ہی اپنی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس نے جیب اشارت کی۔

رحیم داد گم سم اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا اور آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ رختے بھی پریشان اور نجل تھی۔ وہ گردن جھکائے سکڑی سٹی بیٹھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے رختے کو چھیڑا۔ ”رختے! پگلی کو تجھ پر غصہ تو آیا تھا۔ اگر وہ تھوک دیتی تو تیرا کام ضرور بن جاتا۔“

”میں نے جی اس سے کیا کام لیتا تھا۔“ رختے نے جھینپ کر کہا۔ ”وہ بگلی تھی، مجھے لاج آئی۔“

میں بھی تو اسی کی طرح زبانی ہوں۔ سو میں نے اُسے اپنا دوپٹا اڑھا دیا۔ پر وہ تو ایک دم پگلی ہے۔ اسے ذرا بھی ہوش نہیں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس پر ظلم بھی تو کتنا ہوا ہے۔ اس کا تو سب کچھ لٹ گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا۔ اسے پاگل تو ہونا ہی تھا۔“ رختے کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ ”اب تو اسے نہ کوئی فکر ہے، نہ غم۔“



جیب تیزی سے سڑک پر دوڑتی رہی۔ گرمی کی شدت کم ہو گئی تھی۔ سائے پھیلنے جا رہے تھے۔ سورج خزاں رسیدہ درختوں کی الجھی ہوئی برہنہ شاخوں کے پیچھے سرخ گولے کے مانند نظر آ رہا تھا۔ اس کا دکھنا ہوا الاؤ سرد پڑ گیا تھا۔ شام نیچے اترنے کے لیے اپنے بازو آہستہ آہستہ پھیلا رہی تھی۔ سڑک پر آمد و رفت بھی رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

جیب ملتان شہر میں داخل ہوئی تو رات گہری ہو چکی تھی۔ سلیم اللہ خاگوانی جاگ رہا تھا۔ مراد خاں سے اس کی پرانی یاد اللہ تھی۔ وہ بڑی گرم جوشی سے ملا اور انھیں اپنی کونٹھی میں ٹھہرایا۔

مراد خاں کا ارادہ صرف رات بھر قیام کرنے کا تھا مگر خاگوانی نے اصرار کر کے انھیں روک لیا۔ رحیم داد نے مراد خاں سے مشورہ کر کے اپنی جیب واپس کو لے کر کشن بھیج دی۔ ملتان میں ایک روز ٹھہرنے کے بعد دوسرے روز وہ کار پر سلیم اللہ کی جاگیر کی جانب روانہ ہو گئے۔ فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ جگہ جگہ کھیتوں میں گندم اور جو کے کٹے ہوئے پودوں کے تھر نظر آ رہے تھے۔ سلیم اللہ خاگوانی اپنی جاگیر کے دورے پر نکلا تھا۔ مراد خاں شاہانی اور رحیم داد اس کے ہم راہ تھے۔ وہ گاؤں گاؤں گھومتے پھرے۔ ہر طرف چل چل پھل تھی، خوشی اور مسرت تھی جو فصلوں کی کٹائی کے بعد مزارعوں اور کیوں کی زندگی میں ہر سال نظر آتی ہے۔ اس بار بیج کی فصل بہت اچھی تھی لہذا مسرت کا اظہار بھی زیادہ کیا جا رہا تھا۔

دوہفتے سے بھی زیادہ جاگیر میں ٹھہرنے کے بعد سلیم اللہ خاگوانی واپس ملتان پہنچا۔ مراد خاں اور رحیم داد بھی اس کے ہمراہ تھے۔ واپسی کے بعد رحیم داد اور مراد خاں نے تین روز اور ملتان میں قیام کیا۔ گرمی بہت بڑھ گئی تھی۔ لو چلنے لگی تھی۔ دن بھر خاک اڑتی رہتی۔ گلی کو چپے سنسان نظر آتے۔ مگر شام ہوتے ہی شہر کی رونق لوٹ آتی اور گرمی کی شدت کم ہوتی جاتی۔ رات خوش گوار ہوتی۔

مٹی کی ایک غبار آلود صبح کو مراد خاں اور رحیم داد رخصت ہوئے۔ وہ خاگوانی کی کار میں اسٹیشن پہنچے۔ رختے اور اس کے بچے بھی ان کے ساتھ تھے۔ مراد خاں نے روانگی سے قبل اپنی آمد کے

بارے میں تار دے کر کریم بخش رادھانی کو مطلع کر دیا تھا۔ سلیم اللہ خاگانی دونوں کو الوداع کہنے اسٹیشن تک آیا۔ اس نے گرم جوشی سے گلے مل کر دونوں کو رخصت کیا اور دوبارہ آنے پر زور دیا۔

مراد خاں شاہانی اور رحیم داد نرین میں سوار ہوئے اور مظفر گڑھ کے راستے بھکر کے لیے روانہ ہو گئے۔ مراد خاں اور رحیم داد سیکنڈ کلاس میں تھے اور رتھتے اپنے بچوں کے ساتھ تھڑکلاس کے ایک زنانہ ڈبے میں بیٹھی تھی۔

جب وہ بھکر پہنچے تو اسٹیشن کے باہر مراد خاں کی جیب موجود تھی۔ نرین سے اترتے ہوئے مراد خاں نے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری، تک کھے پیر کا مزار اسٹیشن کے احاطے ہی میں ہے۔ ایک بار فیمنت مان لے۔“

مگر رحیم داد آمادہ نہیں ہوا، بے دلی سے بولا۔ ”نہیں جی! میں نے اب منت شت نہیں مانی۔“ مراد خاں شاہانی نے اصرار کیا۔ ”میرا کہا مان، اس دفعہ تجھے جیلہ اس طرح مل جائے گی کہ ہمیشہ تیرے ہی پاس رہے۔“

رحیم داد کے دل میں جیلہ کی یاد نے انگڑائی لی اور اس کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ وہ دل گرفتہ ہو کر بولا۔ ”تجھے۔ لیکن ہے جیلہ واپس آجائے گی؟“

”میں تو کہتا ہوں، وہ ضرور واپس آئے گی۔ تک کھے پیر کی زیارت پر مانی ہوئی منت اس بار بھی پوری ہو گی۔“ سردار شاہانی نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”زیارت پر چڑھانے کے لیے چراغ اور میٹھی روٹیاں ڈرائیور کو بھیج کر بازار سے منگوائے لیتا ہوں۔ تو منت ماننے کو تیار ہو جا۔“ لیکن رحیم داد نے ارادہ بدل دیا۔ اس نے عذر پیش کیا۔ ”بیٹ سے واپسی پر منت مانوں گا۔ ابھی رہنے دے۔“

مراد خاں نے اصرار نہیں کیا۔ وہ رتھتے اور رحیم داد کے ہم راہ جیب میں بیٹھ گیا۔ مگر بھکر میں واقع اپنی حویلی کی جانب نہیں گیا۔ بیٹ کی سمت روانہ ہو گیا۔ جیب ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ سڑک پر دوڑنے لگی اور جب بیٹ میں داخل ہو کر یہوں والی پہنچی تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔

شفیق کی سرخی سے دریائے سندھ کا پانی لالہ رنگ ہو گیا تھا۔ فضا خوش گوار تھی۔ یہ ساحلی علاقہ ہے۔ ملتان اور بھکر کے مقابلے میں گرمی بھی کم تھی۔ دریا کی جانب سے بھگے بھگے جھونکے آرہے تھے۔ طویل سفر کے بعد سب نے فرحت اور تازگی محسوس کی۔ جیب حویلی کے پھانک پر رکی۔ مراد خاں کا کاردار کریم بخش رادھانی پھانک پر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ مراد خاں جیب سے نیچے اترے۔

رادھانی نے جھک کر سردار کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور نگاہیں جھکائے ہوئے ادب سے بولا۔ ”خیر اے سیں۔ خوش ہو۔ راضی باضی ہو۔ بالیس بھیجیں، ڈیڈھی پر دے سب خیر اے۔ بال جان، مال ڈھکی، سب خیر اے؟“

”شکر اے۔“ مراد خاں نے مسکرا کر سر پرستانہ انداز میں کہا۔ ”تو اپنا حوال سنا۔ خیر سلا اے؟“

”خیر سلا اے سیں۔“ رادھانی نے زیر لب مسکرانے کی کوشش کی۔ رحیم داد رتھتے اور اس کے بچے بھی جیب سے اتر چکے تھے۔ مراد خاں شاہانی آگے بڑھا۔ سب اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ پھانک عبور کر کے حویلی کے احاطے میں داخل ہوئے۔ شام کالی پڑتی جا رہی تھی، اندھیرا پھیل رہا تھا۔

مراد خاں سفر کی تکان سے بڑھال نظر آ رہا تھا۔ اس کا لباس گرد آلود تھا۔ اس نے مڑ کر رادھانی کی طرف دیکھا۔ ”جیب سے سامان اتروا۔ میں نے نہا کر کپڑے بدلنے ہیں۔ سو بھی جلدی جاؤں گا۔ تجھ سے صبح آرام سے بات ہو گی۔“

”فکر نہ کریں۔“ کریم بخش رادھانی نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”تیرے اور چوہدری کے لیے میں نے ویڑے میں دو منجے ڈال کر بستر لگوا دیئے ہیں۔ دھانوں کے لیے حمام میں پانی بھی رکھ دیا ہے۔ روٹی جلدی کھانی ہے تو وہ بھی تیار ہے۔ سیں! کوئی اور حکم؟“

مراد خاں قریب رکھی ہوئی کرسی پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے نزدیک ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رتھتے کچھ فاصلے پر سر جھکائے خاموش کھڑی تھی۔ اس کے بچے بھی خاموش اور سسے ہوئے تھے۔ کاردار کریم بخش رادھانی پھانک کے پاس کھڑے ہوئے نوکروں کی جانب بڑھا اور انھیں ضروری ہدایات دے کر واپس آگیا۔ مراد خاں شاہانی کی طرف جھک کر آہستہ سے بولا۔

”جیب سے سامان اتار کر کمروں میں پہنچا دیا جائے گا۔ سیں تو اب حمام میں چلا جا۔ دھانوں سے طبیعت ایک دم تازہ ہو جائے گی۔ ویسے آج گرمی بھی زیادہ ہی ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو نے فصل کی واڈھی کرا دی؟“

”ہا سیں! کرا دی۔“ رادھانی نے جواب دیا۔ ”تیرا حکم ملتے ہی میں نے واڈھی شروع کرادی تھی۔ اب تو گاہنے کے لیے پڑ میں بھی پہنچنے لگی ہے۔“

”سویرے تیرے ساتھ ادھر چلوں گا۔“ مراد خاں نے کرسی چھوڑتے ہوئے کہا اور مڑ کر رتھتے

کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”یہ رختے ہے۔ یہیں رہے گی۔ اس کے ٹھہرنے کا بندوبست سلحرمی کی کوٹھڑی میں کر دے۔“ یہ کہہ کے وہ غسل کرنے حویلی کے اندر چلا گیا۔

رادھانی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”سین چودھری، تو بھی نادمہو کر کپڑے بدل لے۔ تیرا سامان کمرے میں پہنچ گیا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”تیرے لیے میں نے اسی کمرے میں بندوبست کیا ہے جس میں تو پچھلی بار ٹھہرا تھا۔“

رحیم داد نے غسل کیا اور لباس تبدیل کیا۔ وہ واپس پہنچا تو مراد خاں شاہانی نادمہو کر ’اجلا لباس زیب تن کیے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ سامنے میز پر بوتل تھی، گلاس تھے اور جگ میں پانی تھا۔ سردار مراد خاں نے گلاس بھرے مگر انھوں نے زیادہ دیر شغل نہیں کیا۔ کھانا کھایا اور کھڑے ہو گئے۔

مراد خاں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ رحیم داد ڈیرے کی جانب بڑھا۔ صحن میں دو بڑے بڑے پلنگ بچھے تھے۔ ان کے پائے رنگین اور اونچے تھے۔ بستر صاف ستھرے تھے۔ بستر کے سرانے نرم اور دبیز تکیے رکھے تھے۔ پائنتی پر دو تابی قرینے سے رکھی تھی۔ دو تابی پر رنگین ڈھانکوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ رحیم داد خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا اور دیر تک مراد خاں شاہانی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ بار بار قریب کا پلنگ دیکھتا رہا مگر ہر بار بستر خالی نظر آتا۔ مراد خاں نہیں آیا۔ آخر رحیم داد سو گیا۔

صبح رحیم داد کی آنکھ کھلی تو مراد خاں شاہانی بستر پر بے خبر سو رہا تھا۔ رات وہ کب آکر بستر پر لیٹا، رحیم داد کو خبر نہیں ہوئی۔ اس نے خاموشی سے اٹھ کے غسل کیا اور صحن میں واپس آیا تو مراد خاں بیدار ہو چکا تھا اور بستر تکیے کے سارے بیٹھا انگڑائیاں لے رہا تھا۔

دونوں نے ناشتا کیا اور حویلی کے احاطے سے نکلے۔ کریم بخش رادھانی بھی ان کے ہم راہ تھا۔ تینوں کھیتوں کی جانب چلے۔ رنج کی کٹائی مکمل ہو چکی تھی۔ کھیت ویران اور اجاڑ نظر آرہے تھے۔ اکا دکا ستھر بھی تھے۔ یہ کئی ہوئی فصل کے پودے تھے جو دھوپ میں سکھانے کے لیے بکھیر دیے گئے تھے۔ کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ پڑتے۔ مٹی کے ان چوتروں پر دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے گندم جو اور چنے کے پودوں کے کھلیان تھے۔ یہ خشک پودے تھے اور ساندھنے کے لیے ان پر گید اور پیری کی سبز شاخوں کے پھلے چل رہے تھے۔

رحیم داد کا یہ معمول ہو گیا کہ ناشتے سے فارغ ہو کر مراد خاں اور رادھانی کے ساتھ صبح نکلتا۔ دوپہر تک گاؤں گاؤں کھیتوں کے درمیان گھومتا رہتا، مراد خاں یا رادھانی سے فصل کے ساندھنے

کے بارے میں پوچھ چمچ کرتا اور دوپہر کو مراد خاں شاہانی کے ہم راہ واپس آتا۔ پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتا۔ مراد خاں شاہانی بھی دوپہر کے بعد کھیتوں کی طرف کم ہی جاتا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی اور روز بہ روز شاہانی کے لیے ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔



گرمی میں اور اضافہ ہو گیا۔ رحیم داد تیز دھوپ میں گھومنے پھرنے سے کتراتا۔ مراد خاں نے بھی اس کی پریشانی محسوس کی۔ اب وہ خود بھی کئی کئی روز حویلی سے نہ نکلتا اور اگر نکلتا بھی تو دھوپ کی حدت بڑھنے سے پہلے آجاتا۔

گرمی بڑھنے کے ساتھ ساتھ رحیم داد نے یہ بھی محسوس کیا کہ فصل کی کٹائی کے بعد عام طور پر جو خوشی اور شادمانی نظر آتی ہے، وہ کم ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ مزارعوں کے چروں پر مسرت کے بجائے خلاف معمول خشونت ہوتی، جوش و خروش کے بجائے بے زاری اور چڑچڑاہٹ ہوتا۔ بٹائی کے دن قریب آتے جا رہے تھے۔ مزارعوں کے چہرے زیادہ بچھے بچھے دکھائی دیتے مگر رحیم داد نے اس سلسلے میں مراد خاں سے کوئی استفسار نہیں کیا۔ مراد خاں بھی چپ چاپ رہتا۔ وہ بہت کم بات کرتا۔ کبھی کبھی شام ہوتے ہی ڈھانڈلوں اور نوانیوں کے پاس چلا جاتا اور آدھی رات تک نہ لوٹتا۔

رحیم داد اکتا گیا تھا اور واپس کو ٹلہ ہر کشن جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مٹی کی ایک گرم اور غبار آلود رات تھی۔ مراد خاں شاہانی دن ڈھلے نکل گیا اور اب تک نہیں لوٹا تھا۔ پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد تنہا بیٹھا تھا۔ وہ لکسی شراب کے تین گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس کا چہرہ پیسے سے بھیگا ہوا تھا۔ اسی اثنا میں کریم بخش رادھانی آگیا۔

رحیم داد نے پوچھا۔ ”رادھانی! سردار کدھر گیا ہے؟“

”وہ توجی! کرم خاں نوانی کی طرف گیا ہے۔“

”کب تک واپس آئے گا؟“

”گلتا ہے، آج بھی دیر ہی سے لوٹے گا۔“ رادھانی نے بتایا۔ ”نوانیوں کے علاوہ ڈھانڈلے بھی

ہیں۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ بات چیت لمبی ہی چلے گی۔“

”آج کل مراد خاں روز شام کو ڈھانڈلوں اور نوانی زمیں داروں کے پاس جا رہا ہے، اور دیر سے

لوٹتا ہے۔“ رحیم داد نے رادھانی کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”سردار وہاں کیا کرتا رہتا ہے؟“

”بات ہی ایسی ہے جی!“ کریم بخش رادھانی نے مختصر جواب دیا۔

نے لہے سے لہرا کر اسے ٹوکا۔

”چپ کر کے سنتا جا۔“ مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ ایسا ہوا کہ ایک کجری گانے کے ساتھ ساتھ ناچ بھی رہی تھی۔ مجھارتے ہوئے کسی طرح اس کے ماتھے کا ٹکا گر گیا۔ رات کو تو اسے کچھ معلوم نہیں ہوا۔ سویرے سو کر اٹھی تو اسے پتہ چلا کہ اسکا ٹکا غائب ہے۔ وہ افضل خاں ڈھانڈلہ کے پاس پہنچی اور ٹکا کھونے پر روٹا پٹینا شروع کر دیا۔ افضل خاں ڈھانڈلہ بہت زور آور سردار تھا۔ اسے غصہ بھی بہت آتا تھا۔ اس نے ٹکا تلاش کرایا۔ ٹکا نہ ملا تو وہ بہت نراض ہوا۔ ”شاہانی نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”جانتے ہو اس نے کیا کیا؟“ رحیم داد خاموش رہا۔ مراد خاں نے بتایا ”افضل خاں نے کجری کو نیا ٹکا بنوا کر دیا اور سزا کے طور پر اپنے تمام مزارعوں پر ٹکا ٹیکس لگا دیا۔ ہریگ بن پر ایک من کنڑک۔“

”تب تو ایک ہی فصل پر ٹکے کی قیمت سے کہیں زیادہ مالیت کی گندم مل گئی ہوگی۔“ رحیم داد کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”اب تک یہ ٹیکس کیسے چل رہا ہے؟ تو نے ہی تو بتایا تھا کہ انگریزوں کے زمانے سے چل رہا ہے۔“

”گالہ سچی امہ اسے کہ ایک بار جو ٹیکس زمیں دار اپنے مزارعوں پر لگا دیتے ہیں وہ کبھی بند نہیں ہوتا۔ تجھے بھی یہ اچھی طرح پتہ ہے۔ یہ بتا انگریزوں کے زمانے کا کون سا ٹیکس ختم ہوا؟ سبھی چل رہے ہیں بلکہ زمیں داروں نے کم کرنے کی بجائے بڑھا دیے ہیں۔“

”پر ٹکا ٹیکس تو افضل ڈھانڈلہ نے اپنے مزارعوں پر لگایا تھا۔ تجھے اور نوانی زمیں داروں نے اس سے کیا لیتا۔“

”ہوا تو ایسا ہی تھا پر اب تو بیٹ کے سارے زمیں دار اپنے مزارعوں سے ٹکا ٹیکس وصول کرتے ہیں۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”ہوتا یہ ہے کہ ربیع کی واڈھی پر ہر زمیں دار اپنے مزارعے سے بٹائی کے وکٹ ایک من کنڑک ٹکا ٹیکس کے طور پر کاٹ لیتا ہے۔“

”افضل خاں ڈھانڈلہ ابھی زندہ ہے؟“

”نا سس! اسے تو مرے ہوئے بھی برسوں ہو گئے۔“ مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ سنا ہے بہت زبردست سردار تھا۔ کوئی مزارع اس کے سامنے گردن اٹھا کر نہیں بول سکتا تھا۔ اس کے پاس بہت عمدہ نسلوں کے کتے تھے۔ شکار بھی بہت کھیلتا تھا۔ مزارعوں کو ایک دم دبا کر رکھتا تھا۔ کوئی مزارع ذرا بھی سرکشی دکھاتا تو اس پر کتے چھوڑ دیتا وہ اسے چیر پھاڑ کر برابر کر دیتے۔ تھانے دار اور دوسرے سارے افسران سے ڈرتے تھے۔؟“

”مجھے تو وہ پریشان پریشان دکھائی دیتا ہے۔ تو بھی پریشان لگتا ہے۔ خیر خیریت تو ہے؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”ہنڈ بھی سونے سونے نظر آتے ہیں۔ حویلی بھی ویران ویران لگتی ہے۔“ رحیم داد نے نشے کی جھونک میں ہلکا تھمہ لگایا۔ ”کوئی پوپٹ رن بہت دنوں سے ادھر نہیں آئی؟“

”سس! آج کل ایسی گالہ نہ کر۔“ رادھانی کے لہجے میں تردد تھا۔ ”ادھر کا حال احوال ٹھیک نہیں۔ تجھے پتہ نہیں بہت مگر بڑبڑی ہوئی ہے۔“

”لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔ پر نہ میں نے سردار مراد خاں سے پوچھا نہ اس نے بتایا۔“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”تو بتا ایسا کیوں ہے؟“

”سس! بات دراصل یہ ہے۔“ رادھانی نے بتایا۔ ”مزارعے کہتے ہیں اس بار بٹائی پر وہ ٹکا ٹیکس نہیں دیں گے۔“

”ٹکا ٹیکس؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”وہ کیا ہوتا ہے؟“

کریم بخش جواب دینے ہی والا تھا کہ پھانک پر اونچی آواز سے بولنے کا شور بلند ہوا۔ مراد خاں شاہانی واپس آگیا تھا۔ رادھانی تیز تیز قدم اٹھاتا پھانک کی جانب بڑھا۔ زرا دیر میں مراد خاں شاہانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا اور رحیم داد کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”کئی روز سے میں تجھے پریشان پریشان دیکھ رہا ہوں۔“

”ہا سس! کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

رحیم داد نے کہا۔ ”یہ ٹکا ٹیکس کا کیا چکر ہے؟ میں نے تو کبھی ایسا ٹیکس ٹیکس نہیں سنا۔“

”تو نے سچ سچ نہیں سنا ہو گا اور تو اسے سمجھ بھی نہیں پائے گا۔ تیری طرف کے زمیں دار اپنے مزارعوں سے ایسا کوئی ٹیکس وصول نہیں کرتے۔“

”ادھر کب سے وصول کیا جا رہا ہے؟“

”آج سے نہیں انگریزوں کے زمانے سے وصول کیا جا رہا ہے۔“

”یہ ٹیکس ہوتا کیا ہے؟“

”یہ ٹیکس اس طرح شروع ہوا کہ افضل خاں ڈھانڈلہ نے جو بیٹ بہت وڈا بیکر دار تھا اپنے پتراسلم خاں کا پرنا کیا۔“ مراد خاں اپنے لیے جیگ بنا کر بولا۔ ”افضل خاں ذیل دار بھی ہوتا تھا۔ دور دور تک مشہور تھا۔ اس نے بہت دھوم دھام سے اپنے پتر کے پرنے پر جشن منایا۔ لہور اور ملتان سے کجریاں بلائیں۔ کئی روز تک ناچ گانے کی محفل جی۔ بہت زور دار میل ہوا۔“

”میں نے تجھ سے افضل خاں اور اس کے پتر کے ویاہ کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔“ رحیم داد

”اوپر تک پہنچ ہوگی اس کی؟“

”بالکل تھی۔ انگریز اسے بہت مانتے تھے۔ لائٹ گورنر کے دربار میں اسے کرسی ملتی تھی۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”افضل خاں ڈھانڈلہ کا مرثیہ ہو گیا پر اس کا لگایا ہوا نکا ٹیکس ختم نہیں ہوا۔ ختم ہو بھی نہیں سکتا۔ چوہدری، تو خود ہی سوچ، نکا ٹیکس بند ہو گیا تو زمیں داروں کا کتنا گھانا ہو گا۔“

”مزارعوں نے ابھی تک کوئی گزبڑ تو نہیں کی؟“

”یہ گزبڑ کچھ کم ہے کہ وہ بٹائی پر نکا ٹیکس دینا نہیں چاہتے۔“ مراد خاں شاہانی نے تیکھے لمبے میں کہا۔

”پہلے بھی کبھی انھوں نے نکا ٹیکس دینے سے انکار کیا؟“

”نہیں! پہلی بار انھوں نے ایسا کیا ہے۔“ مراد خاں کے چہرے پر جھنجھلاہٹ ابھرنے لگی۔ ”تجھے

پتہ نہیں، بیٹ کے مزارعے اور کاٹے تو بہت سیدھے اور نیک بندے ہیں۔“

”پر وہ اچانک اتنے سرکش کیسے ہو گئے؟ میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، مزارعے نظریں

اٹھا کر اپنے زمیں داروں سے گل بات نہیں کرتے۔ ادھر کے مزارعے تو بہت ہی نیک بندے لگتے

ہیں۔ اب ان میں اتنا حوصلہ کیسے آگیا؟“ رحیم داد نے گلاس اٹھا کر لبھا گھونٹ بھرا۔ ”کوئی نہ کوئی

گل ضرور ہوگی۔“

”گلاس کچھ اس طرح ہے چوہدری۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”لہور اور لائل پور سے کچھ بندے

ادھر آ گئے ہیں۔ وہ زمیں داروں کے خلاف جگہ جگہ گزبڑ پھیلاتے ہیں۔ انھوں نے ہی مزارعوں

اور کاموں کو ہٹا کر یہ آگ بھڑکائی ہے۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”مزارعوں اور کاموں کے

ساتھ مصلحتانہ اور کئی دوسرے بھی لگ گئے ہیں۔ ایک ملا بھی ان سے مل گیا ہے۔ اس کا نام

مولوی احمد بخش ہے۔ وہ سب سے آگے ہے۔ جلسے کرتا ہے، تحریریں کرتا ہے۔ مزارعوں اور

کیوں کو زمیں داروں کے خلاف بھڑاتا ہے۔“

”ڈھانڈلوں نے اب تک ان کے خلاف کچھ نہیں کیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”ادھر کی زیادہ

زمیں داری تو انھی کے پاس ہے۔ بڑے زمیں دار بھی وہی ہیں۔ شاہانی تو بہت کم ہیں۔ میں نے یہی

سنا ہے۔“

”تو نے ٹھیک سنا ہے۔ بہنوں والی میں ڈھانڈلے زمیں دار زیادہ ہیں۔ دیے پورے بیٹ کے

مئی ہے۔ ڈھانڈلوں کے ساتھ نوانیوں اور شاہانیوں، سب کو مل کر سوچنا ہو گا۔“

”سب نے مل کر کیا سوچا؟“

”کارروائی کرنے ہی کی سوچ رہے ہیں۔ سارے ڈھانڈلے نوانی، شاہانی، زمیں دار آپس کے تمام جھگڑے نئے بھول کر اکٹھے ہوتے جا رہے ہیں۔ روز میٹنگیں کرتے ہیں۔ مزارعوں کو دبانے کی سکیمیں بناتے ہیں۔“

”ابھی تک سکیمیں ہی بن رہی ہیں، ہوا ہوا یا کچھ نہیں۔“ رحیم داد کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”تجھے پتہ نہیں، زمیں داروں کے کردندوں اور دوسرے بندوں نے گزبڑ پھیلانے والے

مزارعوں پر مسلح حملے کیے۔ گھروں پر ہلا بول دیا۔ ڈھور موٹی اٹھوا لیے۔“

”تب تو وہ ڈر گئے ہوں گے۔“

”نا سیں، ان کے حوصلے اور بڑھ گئے۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”نکا ٹیکس دینے سے تو وہ انکار کر

ہی رہے ہیں۔ اب تو انھوں نے محصول دینا بھی بند کر دیا ہے۔“ اس کے چہرے پر پریشانی پھیلنے

لگی۔ ”پچھلے کچھ دنوں سے یہ بھی خبریں مل رہی ہیں کہ مزارعوں نے زمینوں پر کبفہ کرنا شروع

کر دیا ہے۔ وہ زمیں داروں کے مسلح کردندوں سے ڈٹ کر لڑتے ہیں۔ پورے بیٹ میں گزبڑ پھیل

چکی ہے اور کم ہونے کی بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے آج یہ طے کیا گیا ہے کہ بارڈر ملٹری

پولیس بلائی جائے۔ کردندوں سے تو وہ اب دبنے کے نہیں۔ ضرورت پڑی تو بھکر بلکہ میاں والی سے

بھی پولیس آجائے گی۔“

”جو مزارعے آگے آگے ہیں، انکے خلاف چوری ڈکیتی کے الزام میں پرچے بھی تھانے میں

چاک کرانے چاہیں۔ کنیوں کو مکدے بنا کر بند کرانا ہو گا۔“ رحیم داد نے تجویز پیش کی۔

”بھی کچھ کرنا ہو گا۔ ایسے ہی تو نہیں بیٹھے رہنا۔“

دونوں نے اپنے اپنے گلاس خالی کیے، کھانا کھایا اور صحن میں بچھے ہوئے پلنگوں پر لیٹ گئے۔

مراد خاں تھکا ہوا تھا، جلد ہی سو گیا مگر رحیم داد جاگتا رہا۔ وہ واپس کو ملد ہر کشن جانے کے بارے

میں سوچنے لگا۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔

صبح ہوئی، دن چڑھا۔ ناشتے پر رحیم داد کی مراد خاں سے ملاقات ہوئی۔ رادھانی بہت دیر سے

اس کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ سویرے سویرے آگیا تھا۔ مراد خاں شاہانی کے چہرے سے پریشانی ہویدا

تھی۔ کریم بخش رادھانی بھی سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد کے پیچھے کے تھوڑی ہی دیر بعد رادھانی

اٹھ کر چلا گیا۔

کام چل سکتا ہے؟“ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”سبس‘ تو یہ باتیں نہیں سمجھ سکتا۔ ادھر زمیں داری کرنا نکل نہیں ہے۔ مزار سے کجوتی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔“ اس کا چہرہ کرحشت ہو گیا۔ ”جہاں وہ سراٹھائے، ٹھوکر مار کر توڑ دو۔“

”پر گڑ بڑا دیر ہو گئی تو آگے کے لیے زمیں داروں نے کیا سوچا۔؟“ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

”سوچنا کیا ہے، خون بنے گا۔ دس بیس کی لاشیں پڑی ہوں گی۔“ مراد خاں کے وجود میں چھپا ہوا سردار جاگ اٹھا۔ غصے سے اس کی مونچس پھر پھڑانے لگی تھیں۔ ”پولیس عدالت سب اپنی ہے۔ ادھر سرداروں کا قانون چلتا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں چکا چوند ابھری۔ ”ہو سکتا ہے، آج ایسا ہی ہو۔ گڑ زیادہ بڑھی تو یہی کرنا ہو گا۔ زمیں داروں نے سوچ رکھا ہے۔“

”تو نے رات بتایا تھا بارڈر ملٹری پولیس کو مدد کے لیے بلایا گیا ہے۔“

”ہاں، آج بارڈر ملٹری پولیس پہنچ جائے گی۔ پوری طرح مسلح بھی ہوگی۔ زمیں داروں اور ان کے بندوں کے پاس بھی ہر طرح کا اسلحہ ہے۔“ مراد خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”دیکھنا ہے، گولیوں کی بوجھاڑ کے سامنے کتنی دیر ٹھیر سکیں گے۔ کتنی دیر پھراؤ کریں گے۔ جو آگے آگے ہیں اور لیڈر بنے ہوئے ہیں، ان کے خلاف بلوے اور چوری ڈکیتی کے کمزور پہلے ہی سے تیار رکھے ہیں۔ وہ آج ہی گرفتار کر لیے جائیں گے۔ پولیس حالات میں بند کر کے ایسی مار لگائیں گے کہ ساری زور زاری نکل جائے گی۔“

”تھوڑی بہت جو سکتا رہ جائے گی، وہ مکدے بازی کی بھاگ دوڑ اور عدالتوں کا چکر کانٹے کانٹے نکل جائے گی۔“ رحیم داد نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے بھی مکدوں کا فیصلہ مبینوں اور اکثر برسوں نہیں ہوتا۔ تب تک تو ان کا زور بالکل ہی ٹوٹ جائے گا۔ گڑ کڑائیں گے، معافی مانگیں گے، برپکڑیں گے۔“ اس نے مراد خاں کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”مزارعوں کے ساتھ میں داروں اور سرداروں کے جھگڑے تو پہلے بھی ہوتے ہوں گے۔؟“

”کیوں نہیں۔“ مراد خاں نے اسے آگاہ کیا۔ ”بے دخلی پر تو اکثر ہوتے رہتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”پرچی گانہ ایسہ ہے سبس۔ اتنی زیادہ گڑ بڑ پہلے کبھی بیٹ میں نہیں ہوئی۔ اس بار تو سارے ہی مزارعوں نے زبردست اکٹھ کر رکھا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ایک ہو گئے ہیں۔“ اس کے لیے سے تردد عیاں تھا۔ ”انھیں دبانے کے لیے بہت زور لگانا پڑے گا۔“

”آج تجھے تو کہیں نہیں جانا؟“

رحیم داد نے ہمدردی کے انداز میں پوچھا۔ ”سردار! تو رات سے بھی زیادہ پریشان نظر آ رہا ہے۔ خیر کچھ ہے؟“

”تجھے تو پتہ ہی ہے، مزارعوں اور کاموں نے گڑ بڑ چا رکھی ہے۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”ان کے جوصلے برابر بڑھتے جا رہے ہیں۔ کسی طرح کابو میں نہیں آ رہے۔“

”کوئی خاص بات ہو گئی؟“

”رات بہتی نظام میں زبردست جھگڑا ہوا۔ ادھر نوایتوں کی زمیں داری ہے۔ مزارعوں نے کنڑک کے کھلیانوں اور ڈھیریوں پر جھٹکا کر رکھا ہے۔ کاردار اور کرندے وندائی کے لیے وندولوں کے ساتھ پہنچے تو مزارعوں نے انھیں روک دیا۔“ مراد خاں ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا۔ ”کاردار اور کرندے مسلح ہو کر گئے تھے۔ انھوں نے ڈھیریاں اپنی تحویل میں لینے کی کوشش کی۔ اسی پر جھگڑا شروع ہو گیا۔“

”رات کو تو نے یہ نہیں بتایا تھا۔“

”مجھے پتہ ہی کب تھا۔“ مراد خاں بولا۔ ”صبح رادھانی گھرایا ہوا آیا۔ اس نے مجھے بہتی نظام کے بارے میں بتایا۔ کہتا تھا، مزارعوں کے ساتھ ان کے بال بچے بھی نعرے لگاتے تھے، پھراؤ کرتے تھے۔ بہت خوں خرابہ ہوا۔ آخر زمیں داروں کے بندوں کو پیچھے ہٹا پڑا۔ کرتے بھی کیا۔ یوں سمجھو، ساری بہتی نے ان پر ہلا بول دیا تھا۔ ان کے حوصلے اتنے بڑھ جائیں گے، یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا۔“

”کمرے میں خاموشی ہو گئی۔ چند لمحوں بعد رحیم داد کی آواز ابھری۔“ اپنی سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ ”وہ آہستہ سے بولا۔

”کیسی بات؟“ مراد خاں نے تجسس سے پوچھا۔

”ساری گڑ بڑ ٹکس کی وجہ سے ہے ناں؟ اسے ختم کر دیا جائے تو سارے جھگڑے منٹے اور ساری گڑ بڑ ختم ہو جائے گی۔“

”سبس، گانہ صرف اتنی نہیں ہے۔“ مراد خاں کا لہجہ خٹکھا تھا۔ ”یہ اپنے سرداروں اور زمیں داروں کی عزت اور آن کا بھی سوال ہے۔ ایک بار مزارعوں اور کیوں کی گردن اونچی ہو گئی تو اسے جھکانا بہت مشکل ہو گا۔ آج وہ ٹکس ختم کرائیں گے تو کل پرنا ٹکس، مرن ٹکس، موئٹن ٹکس، ڈھور ڈگر ٹکس، دری ٹکس، کنڑ ٹکس، سارے ہی ٹکس ایک ایک کر کے ختم کراتے جائیں گے۔ تب زمیں داروں کا کیا بنے گا؟ خالی وندائی سے فصل پر کیا لے گا؟ تو خود سوچ، صرف اس سے کیسے

”مجھے رادھانی کے ساتھ بستی نظام جانا ہے۔“
رحیم داد نے شکوہ کیا۔ ”تو روز چلا جاتا ہے۔ میں یہاں اکیلا پڑا رہتا ہوں۔“
”تو بھی میرے ساتھ چل۔“

”میں تو واپس جانے کی سوچ رہا ہوں۔“ رحیم داد اس کے ہم راہ جانے پر رضامند نہیں ہوا۔
”چند روز ٹھہر جا۔ تب تک گڑ بڑ بھی کم ہو جائی گی۔“ سردار مراد خاں شاہانی نے کہا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔ اکٹھے امور پہنچیں گے۔ شاہ جی سے ملیں گے۔ مجھے اس سے یہاں کے حالات کے بارے میں مشورہ بھی کرنا ہے۔“
”پر مجھے تو گڑ بڑ جلد کم ہوتی نہیں لگتی۔“ رحیم داد بولا۔ ”یہاں ٹھہر کر میں تیری مدد بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے تو اب جانے ہی دے۔“

”جیسی تیری مرضی۔ پر جانا ہی ہے تو پرسوں جانا۔“
”پرسوں کیوں؟ آج ہی مجھے جانے دے۔“
”خدا نہ کر۔“ سردار مراد خاں نے مسکرا کر کہا۔ ”اس بارے میں بستی نظام سے واپسی پر بات کروں گا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مراد خاں کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔
دونوں پھانک پر پہنچے۔ سامنے جیب کھڑی تھی۔ قریب ہی رادھانی بھی موجود تھا۔ اس کے ساتھ تین کارندے بھری ہوئی بندوقیں سنبھالے کھڑے تھے۔

مراد خاں اگلی نشست پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کے سوار ہوتے ہی رادھانی اور مسلح کارندے بھی جیب میں داخل ہوئے اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ مراد خاں اور کاردار رادھانی کے پاس بھی بھری ہوئی رانفلین تھیں۔ سردار مراد خاں کی کمر سے چمڑے کے ہولسٹر میں پستول بھی لٹک رہا تھا۔

رحیم داد نے مراد خاں کو گرم جوشی سے رخصت کیا۔ جیب کا انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے بستی نظام کی سمت روانہ ہو گئی۔



دھوپ کی تمازت بڑھ چکی تھی۔ سورج درختوں کی چوٹیوں کے اوپر دھک رہا تھا۔ رحیم داد کو اپنے کمرے میں پہنچے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ باہر آہٹ ابھری۔ اس نے نظریں اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ نادر خاں کمرے کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ گرد اور پسینے سے مٹیالا پڑ گیا

تھا۔ وہ حتمی سے غمگین نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔
”تو کیسے آگیا نادر؟ خیر خیریت تو ہے؟“

”خیریت ہی ہے جی!“ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا۔
”بہت تھکا ہوا لگ رہا ہے۔ بیٹھ جا۔“
نادر خاں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے زور دے کر دریافت کیا۔ ”تو نے بتایا نہیں، کیسے آتا ہوا؟“ اس نے نادر خاں کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”فکری تو کوئی گل نہیں؟ تو نے فصل کی واڑھی تو کرادی ناں؟“
”وہ تو جی کب کی ہو چکی۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”اب تو مٹائی ہوئی ہے۔ میں اسی سلسلے میں تیرے پاس آیا ہوں۔“

”اچھا ہوا تو آگیا۔“ رحیم داد بولا۔ ”میں واپسی کی سوچ رہا تھا۔ آج ہی سردار سے گل بات ہوئی تھی۔ وہ تو مجھے روک رہا ہے۔“

”پر ادھر تو جی بہت گڑ بڑ ہے۔ مزارعوں نے کھلم کھلا سرکشی شروع کر دی ہے۔“
”تجھے کیسے پتہ چلا؟“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ ”ادھر آنے پر ہی پتہ چلا ہو گا۔“
”نہیں جی! مجھے یہاں آنے سے پہلے ہی پتہ چل گیا تھا۔ وہ ایسا ہوا میں ایک روز منگمری گیا۔ ایک پرانا یار مل گیا۔ وہ لیہ میں ہوتا ہے۔ اس نے باتوں باتوں میں ادھر کی گڑ بڑ کا ذکر کیا۔“ نادر خاں نے بتایا۔

”اپنی طرف تو سب ٹھیک ٹھاک ہے؟“

”اپنی طرف کیا ہوتا ہے جی!“ نادر نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”سارے ہی ہندے راضی خوشی ہیں۔ فصل کی واڑھی کی بعد سے جشن کا سماں ہے۔ ڈھول بجاتا ہے۔ بھنگڑا ڈالا جاتا ہے۔ بچے لاپے جاتے ہیں۔“ وہ مسکرایا۔ ”اب تو مٹائی کا انتظار ہے۔ تو پہنچے گا تو وہ بھی شروع ہو جائے گی۔“

”نادر! تو مزارعوں سے پچھلا کرض ادھار مٹائی پر وصول کرنے کو کہتا تھا۔“ اس کے لہجے میں تشویش کا عنصر غالب تھا۔ ”دیکھ، وصولی میں مزارعوں کے ساتھ زبردستی یا سختی نہ کرنا۔“

”سختی تو جی کچھ نہ کچھ کرنی ہی پڑے گی۔ آسانی سے تو کبھی وصولی نہیں ہوتی۔ اس کے بغیر کیسے کام بنے گا۔“

”نہیں، کوئی سختی کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ وہ کسانوں کی ٹکانیکس تحریک

سے ڈر گیا تھا۔ ”بات سچی یہ ہے نادر! میں اپنی زمیں داری میں کوئی گڑبڑ دیکھنا نہیں چاہتا۔“
 ”پر چوہدری یہ تو سوچ، آسانی سے ادھار وصول ہو جاتا تو کب کا وصول ہو چکا ہوتا۔ اللہ وسایا
 اور جیلہ کی کمزوری سے مزارعوں نے فائدہ اٹھایا اور ادھار کم ہونے کی بجائے بڑھتا گیا۔“ نادر
 نے وضاحت کی۔ ”ویسے ادھر روپے کی ضرورت بھی ہے۔ جپ کی رقم شاہ جی کو ادا کرنی ہے، اور
 بھی ضروری خرچے ہیں۔“

”میں یہ نہیں کہتا کہ ادھار وصول نہ کیا جائے۔“ رحیم داد نرم پڑ گیا۔ ”پر سختی سے بچنے کی
 کوشش کر۔ سمجھا بجھا کرنزی سے کام نکال۔ میرا مطلب ہے، ایسا نہ کر کہ کوئی گڑبڑ ہو۔ اللہ وسایا
 اور جیلہ نے مزارعوں کا داغ پہلے ہی خراب کر رکھا ہے۔ انھیں دھیرے دھیرے اپنے راستے پر
 لانا ہو گا۔ تو سمجھ گیا ناں؟“

”فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا حکم ہو گا ویسے ہی ہو گا جی!“ نادر نے لمحے بھر کے لیے تامل
 کیا۔ ”واپسی کے بارے میں کیا سوچا؟“

”میں نے تجھے بتایا نہیں۔ آج ہی سردار مراد خان سے اس بارے میں میری بات ہوئی تھی۔“
 ”میں نے تو آج ہی واپس جانا ہے۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”تیرے ساتھ ہی جانا ہے۔
 بٹائی کی ساری تیاری ہو چکی ہے۔ میں نے تو اس کے لیے وعدہ اے بھی بلا کر بٹھا رکھے ہیں۔“

”واپسی کے بارے میں تو مراد خان کے آنے ہی پر طے ہو گا۔“
 ”شام تک واپسی ہو جائے تو ٹھیک ہے۔“ نادر خاں نے اپنی رائے ظاہر کی۔
 رحیم داد نے گردن بڑھا کر دروازے کی جانب دیکھا اور نوکر کو اونچی آواز سے پکارا۔ نوکر فوراً
 آگیا۔ رحیم داد نے نادر خاں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ ادھر ہی ٹھیرے گا۔ اسے اپنے ساتھ لے جا
 اور اس کے ٹھیرے کا بندوبست کر دے۔“ نوکر کو ہدایات دینے کے بعد وہ نادر خاں کی جانب متوجہ
 ہوا۔ ”نادر تو اب جا۔ نہادھو کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل بات ہو گی۔“

نادر خاں کے جانے کے بعد رحیم داد کمرے میں بیٹھا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ دن
 ڈھلے وہ نہادھو کر صحن میں گیا۔ نوکروں نے کرسیاں اور موٹے ڈال دیے تھے۔ رحیم داد ایک
 کرسی پر بیٹھ گیا۔ نادر خاں بھی پہنچ گیا۔ رحیم داد دیر تک اس کے ساتھ اپنی زمین داری کی بارے
 میں باتیں کرتا رہا۔

اندھیرا پھیلنے پر نادر خاں کھانا کھانے چلا گیا۔ سفر کی تکان ابھی نہیں اترتی تھی۔ وہ جلد ہی سو
 گیا۔



رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ رات گزرتی رہی۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ رات آگئی۔ رحیم داد نے
 اس کا چہرہ نظر بھر کر دیکھا۔
 وہ مضطرب اور تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔ دریافت کرنے پر اس نے بتایا۔ ”جوڑا واپس آگیا ہے۔
 وہ صبح سردار کے ساتھ بستی نظام گیا تھا۔“

”اسے تو میں نے بھی سردار کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔“ رحیم داد اس کی بات کاٹ کر
 بولا۔ ”پر سردار اب تک نہیں آیا۔“ رحیم داد کے لہجے میں استعجاب کے ساتھ تشویش کا پہلو
 نمایاں تھا۔ ”جوڑے نے یہ نہیں بتایا سردار ادھر کیا کر رہا ہے؟ بستی نظام میں زیادہ گڑبڑ تو نہیں
 ہوئی؟“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں۔ جوڑا کہتا تھا سردار رات ادھر ہی رہے گا۔ کل لوٹے گا۔ میں تجھے یہی
 بتانے آئی تھی۔“

”تو پریشان پریشان لگ رہی ہے۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ٹھاک ہے؟“
 ”بچھلے کئی روز سے میری طبیعت گڑبڑ ہے۔“ اس کے لہجے میں تردد تھا۔ ”میرا یہاں بالکل جی
 نہیں لگ رہا۔“

رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”گھبرا نہیں۔ مراد خاں چند ہی دنوں میں دو چار زنانیاں اٹھوا کر ادھر
 پہنچا دے گا۔ تب تو اکیلی نہیں رہے گی۔ ان کی انچارج بن جائے گی۔ ایسے ہی جیسے شاہ جی کے
 کوٹ کی انچارج تھی۔“

”میں اب اس دھندے میں پڑنا نہیں چاہتی۔“ وہ بے زاری سے بولی۔ ”یہ بھی کوئی زندگی ہے،
 کنجروں سے بھی خراب۔“

”ایسی بات تھی تو سردار شاہانی کے ساتھ ادھر آئی کیوں؟ یہ تو تجھے پہلے ہی سوچنا تھا۔“
 ”غلطی ہو گئی۔ میں نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”تجھے اب تو ادھر ٹھیرنا ہی ہو گا۔ سردار برا منائے گا۔ ایسا خیال دل سے نکال دے۔“ رحیم داد
 نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”سردار سے میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں۔“

”بہت نراض ہوا ہو گا۔“

”نراض تو ہوا تھا، پر زیادہ نہیں۔“

”آگے کے لیے تو نے کیا سوچا؟“ رحیم داد نے اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔

”گھر والے کے پاس چلی جاؤں گی۔“

”گھر والے کے پاس؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو نے تو ایک بار شاہ جی کے کوٹ میں مجھے کہا تھا کہ تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں، وہ کہاں ہے اور کیسا ہے۔“

”پچھلے دنوں مجھے پتہ چلا تھا وہ بھاول پور میں ہے۔ پہلے وہ لوہار تھا پر اب لوہار کا دھند اچھوڑ کر غلہ منڈی میں دھڑوائی لگ گیا ہے۔ میرے بچے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔ برسوں سے میں نے انھیں نہیں دیکھا۔“ رحیم داد نے آواز دھیمی پڑ گئی۔ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ”بہت یاد آتے ہیں۔ اب تو اونچے ہو گئے ہوں گے۔ جانے کیسے لگتے ہوں گے۔“

”تو چلی تو جائے گی، پر تیرا گھر والا تجھے اپنے پاس رکھنے پر راضی ہو جائے گا؟“ رحیم داد نے اپنے شے کا اظہار کیا۔ ”اسے پتہ ہے تو شاہ جی کے کوٹ میں برسوں رہ چکی ہے۔ نہ بھی پتہ ہو تو شاہ جی کی نشانی تیرے یہ تینوں چھوہرے تو موجود ہی ہیں۔“

”اسے پتہ ہے۔ سب کچھ پتہ ہے۔ پر وہ مجھے اپنے پاس رکھ لے گا۔“ رحیم داد نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ ”میں نے تجھے ایک بار بتایا بھی تھا۔ وہ مجھے لینے شاہ جی کے پاس آیا تھا۔ پر شاہ جی نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اس سے ملنے بھی نہیں دیا۔“

”مجھے تو نہیں لگتا اتنی لمبی مدت گزر جانے کے بعد وہ تجھے اپنی گھر والی بنا کر رکھ لے گا۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”وہ مرد ہے۔ مرد کی کچھ غیرت اور آن ہوتی ہے۔“

”غیرت اور آن کی سوچے گا تو زندگی بھر رنڈوا ہی رہے گا۔“

”رنڈوا کیوں رہے گا؟ دو سراویاہ نہیں کر سکتا۔ میرا تو چارہ ہے اس نے اب تک کسی کڑی سے ویاہ کر بھی لیا ہو گا۔“

”میں نوں پتہ ہے اس نے اب تک ویاہ نہیں کیا۔“ رحیم داد نے لہجہ ٹیکھا ہو کیا۔ ”وہ دو سراویاہ کر بھی نہیں سکتا۔ ویاہ کرنا کوئی محول ہے۔ کوئی کڑی اسے مفت تو نہیں مل جائے گی۔ اس کا بچہ پورا پورا مول آئے گا۔ بھاری سمبھاوا مانگے گا۔“

”کتنا سمبھاوا مانگے گا؟“

”پندرہ ہزار سے کم سمبھاوا لیے بنا کوئی بھی اپنی بیٹی کا ویاہ نہیں کرے گا۔“ رحیم داد کو بتایا۔ ”میرا گھر والا تو اب ادھکڑ ہو گیا ہے۔ سر کے بال بھی کہیں کہیں سے چنے ہو گئے ہیں۔ میں نے اس کے بارے میں یہی سنا ہے۔ جتنی عمر زیادہ ہو جاتی ہے اتنی ہی زیادہ سمبھاوا لیا جاتا ہے۔“

بڑھے سے تو کوئی کوئی اپنی بیٹی کا ویاہ کرنے کے لیے ۲۰ ہزار سے بھی زیادہ مانگتے ہیں۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”میرا گھر والا غریب دھڑوائی ہے۔ غلہ منڈی سے تو اتنی ہی مزدوری ملتی ہو گی کہ مشکل سے اپنا اور اپنے دونوں نکوں کا پیٹ پال سکے۔ وہ ویاہ کرنے کے لیے وہی کے بچہ کو پندرہ ہزار روپے سمبھاوا کہاں سے دے گا۔“

”یہ سمبھاوا تو بیٹی کو بیچنے کا سیدھا سیدھا بیوپار ہے۔“ رحیم داد جل کر بولا۔ ”ابویں ہی ریت بنا رکھی ہے۔“

”ایسا تو جی کرنا ہی پڑتا ہے۔ پہلے سے جو ریتاں رساں چلی آ رہی ہیں انھیں کیسے چھوڑا جاسکتا ہے۔“

”مطلب یہ کہ تو اپنے گھر والے کے پاس چلی جائے گی اور وہ تجھے اپنے پاس رکھ بھی لے گا۔“ رحیم داد نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔

”خوشی خوشی رکھ لے گا۔ مجھ سے اسے ہر طرح کی مدد ملے گی۔ میں اس کا بازو بن کر رہوں گی۔“

”تیرے ساتھ تیرے تینوں چھوہروں کو بھی وہ رکھ لے گا؟“

”رکھ ہی لے گا۔“ وہ تذبذب میں پڑ گئی۔ ”یہ اس کی روٹی تو نہیں کھائیں گے۔ میں بھی کہیں کام دھندے سے لگ جاؤں گی۔ خود بھی کھاؤں گی، اپنے بچوں کو بھی کھلاؤں گی۔“

”ایسا کر بچوں کو شاہ جی کے پاس پہنچا دے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر رحیم داد کو چھیڑا۔

”چوہدری تو کیسی گلاں کر رہا ہے۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”وہ کبھی ان کو نہیں رکھے گا۔ اس نے کبھی ان کو اپنا نہیں سمجھا۔ ان کی طرح اور جانے کتنے چھوہرے چھوہریاں ہیں۔“ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ ”تو شاہ جی کی گل چھوڑ۔ یہ بتا، تجھے کب یہاں سے جانا ہے؟“

”میں تو کل چلا جاؤں گا۔ میرا فیئر نادر خاں آیا ہوا ہے۔ ادھر بیٹائی شروع ہونے والی ہے۔ پر میرے واپس جانے سے تجھے کیا لینا؟“

”میں بھی تیرے ساتھ ہی چلی جاؤں گی۔ تو نے مظفر گڑھ ہی کے رستے سے لوٹنا ہے ناں؟“

”ہاں، اسی رستے سے جاؤں گا جس سے آیا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔

”تب تو ٹھیک ہے۔ مجھے ملتان کے ٹیشن پر چھوڑ دینا۔ میں وہاں سے بھاول پور چلی جاؤں گی، تو اپنے پنڈ چلا جانا۔ ٹھیک رہے گا ناں؟“

”ٹھیک تو رہے گا۔ پر سردار سے پوچھ لے۔“

”سنیں! وہ پچھلی رات دیر سے لوٹا تھا۔“ ڈرائیور نے بتایا۔ ”سوئیے سوئیے سردار حکم خاں ڈھانڈلہ ادھر آیا۔ وہ اسے اپنی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ آگے کا مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

رحیم داد آگے نہیں گیا۔ اس نے ابھی ناشتا نہیں کیا تھا۔ وہ ناشتے کے لیے دالان میں داخل ہوا تھا کہ رختے ایک کمرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ اس نے نما دھو کر اجلا لباس پہنا تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔ وہ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اس سے بھی مراد خاں کے بارے میں استفسار کیا۔ ”رختے! تجھے پتہ ہے، سردار واپس آیا ہے۔ پر اب وہ کدھر گیا ہے اور کب تک واپس آئے گا؟“

”یہ تو میں نوں پتہ نہیں وہ کب تک لوٹے گا۔“ وہ تھکے انداز میں بولی۔ ”پر وہ رات ہی کو آیا تھا اور صبح بہت تڑکے کہیں چلا بھی گیا۔“

”اس کے ساتھ تیری گل بات ہوئی تھی؟“

”اس نے مجھے رات ہی کو بلوایا تھا۔“ رختے نے نظریں جھکا کر شرمائے کی کوشش کی۔ ”بات کی تو تھی۔“ اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ ”پر وہ راضی نہیں ہوا۔ کتا تھا، میں نے تجھے نہیں چھوڑنا۔ تو میرے ساتھ ہی رہے گی۔“

”پر تو نے آگے کے لیے کیا سوچا؟“

”میں نے جی کیا سوچنا۔“ رختے نے گردن کو باکسا سم دے کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”بات یہ ہے چوہدری“ وہ انگلی سے سر کے بال کریدنے لگی۔ ”جب وہ اتنے پیار سے روکے تو میں اسے چھوڑ کر کیسے جاسکتی ہوں۔ وہ نرا ض ہو جائے گا ناں۔“

رحیم داد کچھ نہیں بولا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ رختے میں اسے سلطنتی کی جھلک نظر آئی اور اس کا انجام بھی یاد آیا۔ مگر اس نے اپنے رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔

رختے نے رحیم داد کو گم صم پایا تو آہستہ سے بولی۔ ”مجھے اب جانا ہے۔ کئی کام کرنے ہیں۔“ یہ کہتے ہی وہ پلٹی اور آگے بڑھ گئی۔

رحیم داد مراد خاں شاہانی کی واپسی کا خطرہ تھا۔ مراد خاں دوپہر کو واپس آیا۔ کھانا اس نے رحیم داد کے ساتھ ہی کھایا۔

رحیم داد بستی نظام کی صورت حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس نے مراد خاں سے پہلا حال اسی سلسلے میں کیا۔ ”سردار! بستی نظام میں مزارعوں کی گڑبڑ کا کیا حال ہے؟“

”ادھر تو اب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ مراد خاں نے بتایا۔ ”جتنے مزارعوں اور کاموں پر گڑبڑ کرنے

”اس کی فکر نہ کر۔“ رختے بولی۔ ”کل وہ آئے گا تو میں اس سے ایک بار فریاد کر لوں گی۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر رختے زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ ”تو یہ طے رہا میں کل تیرے ساتھ ہی چلوں گی۔“ اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کو خاص ادا سے دیکھا۔ ”ادھر میں بالکل اکیلی ہوں۔ سردار تو صبح سے پہلے نہیں لوٹے گا۔ آج میں ادھر ہی ٹھہر جاتی ہوں۔“ اس کے انداز میں لگاؤ تھا۔

مگر رحیم داد کا دماغ منتشر تھا۔ اس نے رکھائی سے کہا۔ ”نہیں! اب تو جا کر اپنے بچوں کو دیکھ۔ تجھے کل صبح چلنا ہے تو تیاری بھی کرنی ہوگی۔“

رختے کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ رخسار کا سیاہ مسابھوڑے کی مانند بند نما نظر آنے لگا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ اندھیرے میں گم ہو گئی۔ رحیم داد بھی زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ اٹھا اور سونے کے لیے اپنے بستر کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ کوئلہ ہر کشن واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے سردار مراد خاں کا انتظار تھا۔

مراد خاں شاہانی رات کے پچھلے پہر واپس آگیا، مگر سویرے سویرے چلا بھی گیا۔ رحیم داد کو یہ اطلاع ملی تو وہ سخت حیرت زدہ ہوا۔ کسی نوکر کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے۔ کاردار کریم بخش راوحانی بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ موجود ہوتا تو مراد خاں کے بارے میں صحیح اطلاع دیتا۔

رحیم داد حیران و پریشان اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ نادر خاں بھی موجود تھا لیکن اس نے نادر خاں سے دیر تک بات نہیں کی۔ کچھ دیر بعد وہ کھڑا ہو گیا اور کمرے سے چلا گیا۔ یہ موسم گرما کی ایک ویران صبح تھی۔ حویلی کے وسیع احاطے میں سناٹا تھا۔ سورج کھنے درختوں کی آڑ سے جھانک رہا تھا۔ دم بہ دم گرم ہوتی ہوئی چمکی دھوپ پھیلتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ فضا میں تمازت گھلتی جا رہی تھی۔

رحیم داد دھیرے دھیرے آگے بڑھا۔ پھانک پر پہنچا۔ یہ دیکھ کر اسے سخت تعجب ہوا کہ سردار مراد خاں شاہانی کی جیب ایک درخت کے نیچے کھڑی ہے۔ ڈرائیور نزدیک ہی فرش پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد پھانک سے گزر کر اس کے پاس پہنچا۔ ڈرائیور بڑبڑا کر اٹھا اور نظریں جھکا کر ادب سے بولا۔

”سیس خیر اے! خوش ہو، راضی ہو۔ خیر سلا اے۔ چوکھڑے ہو۔ ٹکڑے ہو۔“

رحیم داد نے اسے مزید بولنے کا موقع نہیں دیا۔ ”یہ بتا، سردار کدھر ہے، کب آیا اور کہاں گیا ہے؟“

اس نے تابڑ توڑ کئی سوالات کر ڈالے۔

کر شبہ تھا، رات کو گھروں پر چھاپے مار کر سب کو اٹھالیا گیا۔ ملا احمد بخش بھی ادھر ہی تھا۔ پردہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ رات کے اندھیرے میں نکل گیا۔ پر کب تک گرفتاری سے بچے گا۔ جلد ہی پکڑا جائے گا۔ میں نے تجھے یہ نہیں بتایا، بھکرے ایک تھانے دار بھی پولیس پارٹی کے ساتھ پہنچ گیا ہے۔

”یہ تو نے چنگی خبر سنائی۔“ رحیم داد بے ساختہ بولا۔ ”پر تو صبح حکم خاں ڈھانڈلے کے ساتھ کہاں گیا تھا؟“

”بستی نظام میں تو گڑ بڑ گرفتاریوں کے بعد ختم ہو گئی۔ پر شرفاں والی میں بڑھتی ہوئی لگتی ہے۔ ادھر حکم خاں ڈھانڈلے کی زمین داری ہے۔ وہ اسی کے بارے میں گل بات کرنے مجھے اپنی حویلی لے گیا تھا۔ ڈھانڈلوں کے علاوہ نوانی اور شاہانی زمیں دار بھی ادھر موجود تھے۔ میں اب تک ان کی ساتھ ہی تھا۔ مزارعوں کی گڑ بڑی کے بارے میں بات ہوتی رہی۔“

رحیم داد حرف مطلب پر آگیا۔ ”سردار! میں اب تیرے پاس نہیں ٹھہر سکوں گا۔ میرا فیج نارڈ خاں مجھے لینے آیا ہے۔“

”کب آیا وہ؟“ مراد خاں نے حیرت سے پوچھا۔ ”فکر کی کوئی گالہ تو نہیں؟“

”نہیں، فکر کی کوئی گل بات نہیں۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”فصل کی بٹائی ہوئی ہے۔ اس کے لیے میرا ادھر موجود ہونا ضروری ہے۔“

”کب تک تیرا جانے کا ارادہ ہے؟“

”روٹی کھانے کے بعد ہی چلا جاؤں گا۔“ رحیم داد نے اسے مطلع کیا۔

”جیسی تیری مرضی۔“ مراد خاں نے اسے روکنے پر اصرار نہیں کیا۔

”میری جیب تجھے بھکر پہنچا دے گی۔ وہاں سے ٹرین پکڑ لیتا۔“

رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے نادر خاں کو بلوایا جیب میں اپنا سامان رکھوایا اور کمرے سے باہر نکلا۔ سردار مراد خاں شاہانی اس کے ہمراہ تھا۔ انے رحیم داد کو گرم جوشی سے گلے لگایا اور رخصت کیا۔ رحیم داد اور نادر خاں جیب میں بیٹھ گئے شاہانی کا ایک مسلح کارندہ بھی جیب میں موجود تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ ہندوق سنبھالے چوکس تھا۔



جیب کچے راستوں پر ہچکولے کھاتی ہوئی دوڑنے لگی۔ گاؤں کے گلی کوچوں سے گزر

اور بستیوں کے درمیان سے آگے، اور آگے بڑھتی گئی۔ رحیم داد نے دیکھا کہ جگہ جگہ کسانوں کی ٹولیاں جمع ہیں۔ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی تھے۔ جیب دیکھ کر وہ زور زور سے نعرے لگاتے۔

سرڈیوں، جان ڈیوں

ٹکانکس نہ ڈیوں!

ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ گلے کی رگیں تھیں۔ چہرے درشت تھے۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچی ہوئی تھیں۔ رحیم داد دھڑکتے دل سے ان کے پھرے ہوئے تیور دیکھتا رہا اور نعروں کی گھن گرج سناتا رہا۔

جیب آگے بڑھتی گئی۔ ایک بستی سے گزری تو مردوں، عورتوں اور بچوں کے ایک ہجوم نے اسے روک لیا۔ ڈرائیور جماندیدہ اور معاملہ فہم آدمی تھا۔ اس نے بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ ہجوم کو ہر طرف سے یلغار کرتے دیکھ کر اوسان بجا رکھے۔ پھرے ہوئے لوگوں کو روند کر تیزی سے آگے نکل جانے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ رفتار سست کر دی اور کارندے سے ہندوق لے کر سیٹ کے نیچے اس طرح ڈال دی کہ نظر نہ آئے۔ اس نے بریک لگائے۔ جیب ٹھہر گئی۔ ہجوم اس کے چاروں طرف اکٹھا ہو کر زور زور سے نعرے لگانے لگا۔ ایک پتھر بھی جیب کے مڈ گاڑ پر آکر لگا۔ رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے ہجوم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ کسانوں کی نفرت اور سرکشی بیٹ کے علاقے میں اس قدر شدت اختیار کر چکی ہے۔

مظاہرین اسے کسی سردار یا بڑے زمین دار کی جیب سمجھ کر ٹوٹ پڑے تھے۔ ان کے غضب ناک چہروں اور اوپر اٹھے ہوئے ہاتھوں سے غم و غصہ عیاں تھا۔ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ جیب کو توڑ پھوڑ کر آگ لگا دیں گے۔ اس نازک مرحلے پر ایک بار پھر ڈرائیور نے اپنے حواس بحال رکھے۔ مصلحت اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گردن باہر نکالی۔ ایک نوجوان ہجوم کے آگے آگے تھا۔ ڈرائیور نے اسے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

”سین! ہم تو تیرے مسمان ہیں۔ رات منگمری سے آئے تھے۔ اب واپس جاتے ہیں۔ ہمارا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں۔ ہمیں اپنے گھر جانے دے۔ رب راضی ہو۔“

ہجوم میں سے کئی ملی جلی آوازیں ابھریں۔ ”اگر تساں پر دیسی ہو۔ ادھر کے زمین دار بھی نہیں، نہ ہمارا کوئی بحیرہ نہیں۔ لگاؤ ہمارے ساتھ نعرہ۔“ ہجوم سے نعرے بلند ہوئے۔

سرڈیوں، جان ڈیوں

ٹکا ٹکس نہ ڈیون!

ڈرائیور نے ان کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر نعرہ لگایا۔ رحیم داد نادر خاں اور مراد خاں کے کارندے نے بھی نعرہ لگایا۔ بچوں اور جوانوں نے زور سے تقبہ لگایا۔ ان کے چروں کی درشتی مننے لگی۔ آنکھوں میں چراغ جھلکانے لگے۔ ہونٹوں پر تبسم ہویدا ہوا۔ ہجوم آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ ڈرائیور نے مسکرا کر اونچی آواز سے کہا۔

”فی امان اللہ۔ بالیس بچیں، یاریں دوستیں سب کو خیر سلا ڈیو! ہے۔“

اس نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا۔ بکھرے ہوئے ہجوم سے بھی ہاتھ بلند ہوئے اور لہرانے لگے۔ راستہ صاف ہو گیا۔ ڈرائیور نے ایک سیلیئر دبایا۔ جیپ رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے ہجوم جیپ کے پیلوں سے اٹھتے ہوئے گرد کے بادلوں میں او جھل ہو گیا۔

جیپ راستوں کے پیچ و خم سے گزرتی، ہچکولے کھاتی پختہ سڑک پر آگئی۔ راہ میں اور کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ مگر رحیم داد سہا ہوا بیٹھا رہا۔ بھکرا اسٹیشن پہنچ کر اس نے اطمینان کی سانس لی۔

ٹرین کے لیے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ٹرین اسٹیشن پر آکر ٹھہری۔ نادر خاں نے سامان رکھوایا۔ دونوں سوار ہوئے اور مظفر گڑھ کے راستے ٹنگمری کے لیے روانہ ہو گئے۔



دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی۔ دن ڈھلتے ہی کمر کا دھند لکا کوئلہ ہر کٹن پر پھیلتا شروع ہو جاتا۔ سورج غروب ہونے پر دھند اور گہری ہو جاتی۔ سربا کی ایک ایسی ہی سرد اور کمر آلود شام تھی۔ رحیم داد اپنے میزبان نادر خاں کے ساتھ کمرے میں بیٹھا گندم کی فصل کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا جس کی بوائی ہو چکی تھی۔ اب کھیتوں میں گندم کے نرم و نازک پودے ہوا کے جھونکوں سے لہراتے تھے۔ ان کی ہریالی آنکھوں کو فرحت اور تازگی بخشتی تھی۔

رحیم داد سہا کو پیراں والہ سے لونا تھا۔ وہ احسان شاہ سے ملے گیا تھا۔ احسان شاہ سے اس کی ملاقات بھی ہوئی مگر یہ ملاقات ادھوری رہی۔ کھل کر بات کرنے کا موقع نہ ملا۔ میاں سبحان پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ احسان شاہ اس کے ساتھ گفتگو میں ایسا الجھا ہوا تھا کہ رحیم داد پر پوری توجہ نہ دے سکا۔ دونوں ملکی سیاست کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور رحیم داد سیاسی اتار چڑھاؤ سے نااہل اور بے خبر تھا۔ لہذا وہ خاموش بیٹھا ان کی گفتگو سننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوپہر کا کھانا اس نے احسان شاہ اور میاں سبحان کے ساتھ کھایا۔ لیکن کھانے سے فارغ ہونے کے بعد احسان شاہ زیادہ دیر اپنی حویلی میں نہ ٹھہرا۔ میاں سبحان کے ہم راہ لاہور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد بھی پیراں والہ میں نہ رکا۔ کوئلہ ہر کٹن واپس آ گیا۔

کمرے میں انٹیمٹھی دھک رہی تھی۔ انگاروں کی لال لال روشنی میں رحیم داد اور نادر خاں کے جنسے دمک رہے تھے۔ نادر خاں نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”چوہدری، اپنی ایک تجویز ہے۔ کئی روز سے اس کے بارے میں بات کرنے کی سوچ رہا تھا۔“

”ضرورت بات کر۔“ رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”پر اس سے پہلے بوتل اور گلاس منگوا۔ تمکا ہوا ہوں۔ سردی بھی آج زیادہ ہی ہے۔ طبیعت ذرا گرم ہو تو آرام سے گل بات ہوگی۔“

نادر خاں نے کسی ملازم کو طلب نہیں کیا، خود اٹھ کر باہر گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرا ہوا جگ اور گلاس تھا۔ وہ سکی کی بوتل کمرے ہی میں موجود تھی۔ نادر نے رحیم داد کی ہدایت پر لوہے کی الماری کھولی۔ اندر سے بوتل نکالی اور میز پر رکھ دی۔ میز پر گلاس اور جگ پہلے سے رکھے تھے۔

نادر خاں نے ادب سے پوچھا۔ ”اور کوئی حکم جی؟“

رحیم داد نے بوتل کھولی۔ پیگ بنا کر بوا گھونٹ بھرا۔ مونچھوں کے بھیگے ہوئے بال ہاتھ سے صاف کیے۔ ”اب بول، تجھے کیا کہنا ہے؟“

”کہنا کیا ہے جی، یہ تو چودہری تجھے پتہ ہی ہے، اپنے پاس بہت سی پڑیلی زمین ہے۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”اس غیر مزروعہ زمین کے کچھ حصے پر جھنگر ہے۔ کہیں کھنڈل ہے کہیں کھڑوڑ۔ پر ہے گھسو۔“ اس نے رحیم داد کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”ایسی زمین کو میرا بھی کہتے ہیں۔“

”یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ آگے بتا۔“

”تب تو تجھے یہ بھی پتہ ہو گا۔ ایسی زمین کار آمد اور زر نیز ہوتی ہے۔ اس پر آسانی سے بل پلایا جا سکتا ہے۔ ایسی زمین میں ریت کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ کنک اور کپاس کی فصلوں کے لیے ٹھیک رہتی ہے۔“

”مجھے یاد ہے، تو نے پڑیلی زمین پر کھیتی واڑی کرنے کی گل جیلہ کے سامنے بھی کی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تو نیا نیا میجر لگا تھا۔ بعد میں تو نے اس کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں۔“

رحیم داد نے منہ بگاڑ کر نادر خاں کو دیکھا۔ ”تب تو بہت وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔“

”میں نے تو جی جیلہ سے اس بارے میں کئی بار کہا۔“ نادر خاں نے صفائی پیش کی۔ ”پر اس پر تو جی سکول اور ڈپنری بنانے کی دھن سوار تھی۔ اس طرف اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔ بغیر روپیہ لگائے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اس پر کچھ خرچ کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔“

”اب تجھے کیا کہنا ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔“

”میں نے یہ بتانا ہے جی۔ جن دنوں تو بھکر میں سردار مراد خاں کے پاس ہوتا تھا، میں نے مزارعوں اور کمیوں کو ویکار پر لگا کر جھنگر صاف کرا دیا تھا۔ پر پچھلی برسات میں فیر گھاس اور جنگل بوئے اگ آئے۔ ان کو تو آسانی سے صاف کرایا جا سکتا ہے۔ پر اب اس کے لیے کچھ نہ کچھ کر

ہی پڑے گا۔“

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”کتنی زمین ہوگی؟“

”چھ مرعے سے اوپر ہی ہوگی۔“

”یہ تو بہت ہوئی۔“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”ہاں جی، کافی زمین ہے۔ اسے کابل کاشت بنا لیا جائے تو اپنی زمیں داری آٹھ سو ایکڑ کے لگ بھگ ہو جائے گی۔“ نادر خاں نے کارگزاری دکھانے کی کوشش کی۔ ”ابھی تو جی میں زمیں داری اور بڑھاؤں گا۔ بات یہ ہے جی، جب تک جیلہ ادھر تھی، زمیں داری پر لگانے کے لیے اپنی پاس روپیہ ہی کہاں تھا۔ پہلی بار دو فصلوں کی آمدنی اپنے ہاتھ میں آئی ہے۔ اب تو بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔“

”میں تو کہتا ہوں کنک اور کپاس کی فصلوں کی بجائے پڑیلی پر آم اور مالٹے کے باغ لگا۔“ رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”اس بارے میں تیرا کیا دوا ہے؟“

”آم اور مالٹے کے باغ بھی ٹھیک رہیں گے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی مشکلات کا بھی کھل کر اظہار کیا۔ ”پر باغ لگانے سے پہلے یہ سوچنا ہو گا کہ ربیع اور خریف کی فصلوں کا جو مالہ اور آبیانہ دیا جاتا ہے باغات کے لئے حسب ضابطہ زیادہ شرح سے دیتا ہو گا اور اگلے برس ہی سے دیتا ہو گا۔“

”لیکن باغوں سے آمدنی بھی تو فصلوں سے زیادہ ہوگی۔“

”چار برس سے پہلے آمدنی کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”مطلب میرے کہنے کا یہ ہے، اس سے پہلے درختوں میں پھل نہیں آتے۔ آمدنی تو پھلوں ہی سے ہوگی۔“

”پر چار برس بعد تو ہر برس پابندی سے آمدنی ہوگی۔“ رحیم داد ہنوز باغ لگانے پر مصر تھا۔ اس کے ذہن پر بیٹ کے مزارعوں کی شورش کا خوف غالب تھا۔ اور اس نے اپنے خدشات کا اظہار بھی کر دیا۔ ”کھیتی واڑی پر خرچ بھی زیادہ آئے گا۔ ساتھ ہی مزارعوں کا بھی پکر چلے گا۔ باغات کے پھلے میں ایسا کوئی بکھیرا نہیں ہو گا۔“

”باغ ہی لگانا ٹھیک رہے گا۔“ نادر خاں نے مزید الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

”باغ تو لگائے جا سکتے ہیں۔“ رحیم داد کچھ دیر خاموش رہا، پھر نشے کی جھونک میں اچانک کھل نکلا کر ہنسا۔ ”پر تو نے یہ بھی سوچا، پانی کہاں سے ملے گا؟“

نوکر نے گلاس، جگ اور بوتل اٹھا کر میز صاف کی، کھانا لگایا اور دہلیز کے پاس نظریں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد اونچا اور رنگ گہرا سانولا تھا۔ وہ جوان تھا مگر اپنی عمر سے زیادہ نظر آتا تھا۔ اس کی بھیجی بھیجی آنکھوں سے کچھ ایسی دیرینی جھلکتی تھی کہ رحیم داد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔

”میں نے تجھے پہلی بار ادھر دیکھا ہے۔ لگتا ہے تو نیا نیا لگا ہے؟“

”میں جی پچھلے ہی مہینے ادھر لگا ہوں۔“

”تیرا نام کیا ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”رب نواز ہے جی!“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تیراویاہ ہو گیا؟“ رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

”ویاہ تو ہو گیا ہے جی!“ رب نواز سر جھکا کے بولا۔ ”پر گھر والی ادھر کیر میں ہے۔ کیر میرا پنڈ ہے۔ نور شاہ کے پاس ہی ہے۔ میں مزارع ہوتا تھا جی، پر زمیں دار نے ناراض ہو کر بے دھل کر دیا۔ یہ پچھے برس کی گل ہے۔“

رحیم داد کھانا کھاتا رہا۔ رب نواز دہلیز کے قریب فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے ایک بار پھر اسے غور سے دیکھا۔ ”تو جانگلی ہے؟“

”ہاں جی۔“ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اعتراف کیا۔

”تیری گھر والی تو ادھر اکیلی ہی ہے نا؟ تو اسے بھی ادھر بلا لے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”حویلی میں لگ جائے گی۔“

”بلا لوں گا جی، بالکل بلا لوں گا۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔

رحیم داد کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ رب نواز برتن اٹھا کر چلا گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔



دن ڈوبتے ہی رحیم داد کے پاس نادر خاں آیا۔ اس کے ہم راہ محکمہ نہر کا اور سیر بھی تھا۔ اس کا نام اسلم تھا۔ قد میاں تھا مگر جسم پر خوب چربی چڑھی ہوئی تھی۔ رحیم داد اس وقت عسماں خانے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ وہ اسلم کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اسلم پہنچا تو وہسکی کی نئی بوتل کھلی۔ اسلم نے تکلف سے کام نہیں لیا۔ نادر خاں خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد اور اسلم نے دودھ بیگ لگائے اور نمس نمس کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔

نادر خاں نے اور سیر کو سرخوشی کے عالم میں پایا تو فوراً حرف مطلب زبان پر لایا۔ ”اسلم

”میں نے جی اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔“

”کیا سوچ رکھا ہے تو نے؟“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر نادر خاں کی جانب دیکھا۔

”میں نے جی محکمہ نہر کے ایک اور سیر سے بات کی تھی۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”چوہدری، تجھے پتہ ہے، ہمیں تو راجہاہ شرکی سے پانی ملتا ہے۔ اس کے لیے ہمارے چار موگھے ہیں۔“

”ان چار موگھوں سے تو اپنی فصلوں کو بھی پوری طرح پانی نہیں ملتا۔“

”پہلے میری پوری گل سن لے۔“ نادر خاں نے فوراً وضاحت کی۔ ”ایک موگھا ہمیں اور مل جائے تو کام بالکل ٹھیک بن جائے گا۔ بہت شان دار باغ لگ سکتے ہیں۔“

”سوچا تو بہت ٹھیک ہے تو نے۔“ رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”پر اور سیر نیا موگھا کھولنے کے لیے تیار ہو جائے گا؟ یہ سوچ لے، کام آسان نہیں ہے۔“

”کام بن تو جانا چاہیے جی۔ پر اس کی مٹھی گرم کرنی ہوگی۔ میں ایسا کرتا ہوں، اور سیر کو کل شام ادھر بلالوں گا۔ اسے بھی پینے پلانے کا چکا ہے“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”اس کے ساتھ تیری چنگی شام گزرے گی۔ معاملے کی بات بھی ہو جائے گی۔“

”تو بھی موجود رہتا۔“ رحیم داد بولا۔ ”کتنے میں وہ تیار ہو جائے گا؟“

”میرا خیال ہے، دو ہزار میں اور سیر اپنا کام کر دے گا۔“

”کل نہیں، تو اسے پرسوں بلا۔“

”پرسوں ہی بلا لوں گا۔“ نادر خاں نے جواب دیا اور پہلو بدل کے بولا۔ ”میں نے جی اب جا کر

روٹی کھانی ہے۔“

”کیا جنت واپس آگئی؟“

”ہاں جی۔“ نادر خاں کھڑا ہو گیا۔ ”وہ دوپہر کو آگئی تھی۔“

”پر وہ گھر میں کھسی کیوں بیٹھی ہے، ادھر نہیں آئی؟“ رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”وہ ایسا ہے جی۔“ نادر خاں نے نظریں جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ”جنت کے بال بچے ہونے والا ہے۔ ایسے میں تیرے سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے۔“ رحیم داد کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے مزید کچھ نہیں کہا۔

نادر خاں چلا گیا۔

رحیم داد کمرے میں اکیلا بیٹھا وہسکی کی چسکی لگاتا رہا۔ رات تاریک اور زیادہ سرد ہو گئی۔ رحیم داد نے گلاس خالی کیا۔ نوکر کو بلایا اور کھانا لانے کے لیے کہا۔

”نادر، پانچ سو اور نکال۔ اسے پوری طرح خوش کر دے۔“ رحیم داد جھوم کر بولا اور مزے اسلام کی جانب متوجہ ہوا۔ ”دیکھ، اب انکار نہ کرنا۔ گلاس اٹھا، اسے خالی کر۔ تو نے ابھی کچھ نہیں لگائی۔“

”چوہدری مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔“ اسلام نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تجھے پتہ ہے میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے اوپر بھی انجینئر اور ایس ڈی او بیٹھے ہیں۔ بات ان تک پہنچے گی۔ اسی لیے اوپر سے نیچے تک سب کا حصہ لگتا ہے۔ مجھے ان سب کو ماہانہ بھتا دینا پڑتا ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ ”پانی کم ملا تو آگے کے حصے دار اوپر عرضیاں لگائیں گے۔ شکایتیں کریں گے۔ وہ چپ کر کے تو نہیں بیٹھ جائیں گے۔“

رحیم داد نے نادر خاں کی جانب دیکھا اور مسکرا کر بولا۔ ”نادر پورے دو ہزار کر دے۔“ وہ اسلام سے مخاطب ہوا۔ ”اسلم! اب میں انکار نہیں سنوں گا۔ موگھا تو اب کھولنا ہی ہو گا۔“ اسلام خاموش رہا۔ نادر نے پانچ سو روپے اور ملا دیے۔ رحیم داد نے پورے دو ہزار روپے اٹھا کر اسلام کی قمیص کی جیب میں ڈال دیے۔ وہ پھر بھی خاموش رہا رحیم داد نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرایا اور ہنس کر بولا۔

”یار اسے بھی ختم کر اور اپنے لیے خود بنا۔ وڈا بنا۔“

اسلم نے گلاس ہونٹوں سے لگا کے چڑھا لیا۔ وہ بڑا دھاکڑ پینے والا تھا۔ دونوں دیر تک پیتے رہے نادر خاں اٹھ کر جا چکا تھا۔ اسلام نشے سے لہرا کر بولا۔ ”چوہدری، تو اپنا پیار ہے، جگر ہے۔“ اس نے رحیم داد کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور اپنا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

رحیم داد نے گھونٹ بھر کر کہا۔ ”اب تو یاری پکی ہو گئی۔ کام بھی اپنا پکا ہونا چاہیے۔“ ”فکر نہ کر چوہدری۔ تیرا کام ضرور ہو گا اور بالکل پکا ہو گا۔ میں تیل دار لگا کر کل ہی تیرے لیے نیا موگھا کھلا دوں گا۔ ایک سے کام نہ چلے تو دو سرا بھی کھلا لینا۔ جب تک اسلام ادھر اوو سیر لگا ہے، تیری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کیا سمجھا؟“

رحیم داد نے خوشی سے چمک کر اس کا منہ چوم لیا۔ ”کیا بات ہے، تیری اسلم! یار ہو تو ایسا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ابھی تو ایک ہی موگھا کھول دے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔“ ”جیسی تیری مرضی، میں نے تو کچھ نہیں کہنا۔“

”موگھا تو کھل ہی جائے گا۔“ رحیم داد نے اسلام سے کہا۔ ”پر ایسا نہ کرنا کہ ادھر کا رستہ ہی بھول جائے۔ جب بھی شام کو فرصت ملے، ادھر آجایا کر۔ میں اکیلا ہی ہوتا ہوں، تیرے ساتھ

صاحب! اپنے کام کے بارے میں کیا سوچا؟“ ”یاد تو پڑتا ہے تو نے نیا موگھا کھولنے کی گل کی تھی۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”کب تک ہو جائے گا یہ کام!“ اس دفعہ رحیم داد نے پوچھا۔ ”پانی ملے تو اپنے مالٹے اور آم کے باغوں کا کام شروع ہو۔“

”نیا موگھا کھولنا تو بہت مشکل ہے۔“ اسلام جھٹ سنجیدہ ہو گیا۔ ”کوئی مشکل نہیں۔“ رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”تو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ ”ایسی گل نہیں۔“ اسلام اور سنجیدہ ہو گیا۔ ”چوہدری، تجھے یہ تو پتہ ہی ہے۔ آگے چھوٹی چھوٹی زمینوں والے حصے دار ہیں۔ کسی کے پاس ۲۵ کلا سے زیادہ زمین نہیں۔ سچ پوچھ تو کم زمین رکھنے والے بہت زیادہ ہیں۔ وہ پہلے ہی پانی کی کمی کی شکایت کرتے رہتے ہیں۔“ ”اپنے چار موگھے ہیں۔ ایک اور بڑھ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔“ نادر خاں نے مسکرا کر کہا۔

”بہت فرق پڑے گا۔“ اسلام نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”مہندم کی فصل کے لیے آج کل دیے ہی پانی کی بہت مانگ ہے۔ پانی نہ ملا تو آگے کے چھوٹے زمیں دار تباہ ہو جائیں گے۔ تو نے یہ نہیں سوچا۔“

”کوئی تباہ شاہ نہیں ہونے کا۔“ رحیم داد نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”میں ان کی زمینیں خرید لوں گا۔ اپنا مزارع لگا لوں گا۔ زیادہ ہی مزے میں رہیں گے۔ اسلم، تو ان کی فکر نہ کر۔“ ”چوہدری، تجھے یہ تو پتہ ہے، کسان کو اپنی زمین سے کتنا پیار ہوتا ہے۔“ اسلام نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”ایسے آسانی سے وہ اپنی زمینیں چھوڑنے والے نہیں۔ کئی تو ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی زیر کاشت زمین بڑھانا چاہتے ہیں مگر پانی کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ روزی اس بارے میں میرے پاس آتے رہتے ہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنا کام نہیں بنے گا۔“ رحیم داد نے ہلکے لہجے میں کہا۔ ”کام بنے گا، اور ضرور بنے گا۔“ نادر خاں نے مداخلت کی۔ ”اب تو اسلم صاحب سے تیری یاری ہو گئی۔ تیری بات خالی نہیں جائے گی۔ نیا موگھا ضرور کھلے گا۔“ اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق جب سے ہزار روپے نکال کر اوور سیر کے سامنے رکھ دیے۔ ”یہ نذرانہ رکھ لے۔ کوئی اور خدمت اپنے لیے ہو تو بتا۔“

اوو سیر بے رخی سے بولا۔ ”یہ اپنے ہی پاس رکھ۔“

سے پہلے پہلے وہ رحیم داد کی جیب میں بیٹھ کر واپس چلا جاتا۔ سنبھل کی شام کو وہ ضرور آتا۔ کبھی کبھار رات بہت زیادہ ہو جاتی تو مہمان خانے ہی میں ٹھہر جاتا۔ رحیم داد اور اسلم کے تعلقات روز بروز سمرے اور خوش گوار ہوتے گئے۔ بیگانگی اور اجنبیت دور ہوتی گئی، بے تکلفی بڑھتی گئی۔

زمین قابل کاشت ہو گئی تو رحیم داد نے اسلم کو مطلع کیا۔ چند ہی روز بعد اور سیر اسلم کی ہدایت پر نیل داروں نے راجہا شرقی میں نیا موگھا کھول دیا۔ موگھے کا پانی تالیوں میں دوڑنے لگا۔ زمین نرم اور پوئی ہو گئی۔ رحیم داد نے ملتان اور لائل پور کے زرعی فارموں سے آم اور مالٹے کے عمدہ پودے منگوائے۔ آٹھ ہوشیار اور تجربہ کار مالی ملازم رکھے۔ انھوں نے بیس بیس فٹ کے فاصلے پر زمین کھود کر پودے لگا دیے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں باغ لگانے کا کام مکمل ہو گیا۔ یہ پھناؤ کے دن تھے۔ درختوں اور پودوں میں نئی کونپلیں پھونتی تھیں۔ شگوفے کھلتے تھے۔ آم اور مالٹے کے پودوں میں بھی جلد ہی کونپلیں پھونٹنے لگیں۔

اسلم نے دو ہزار روپے لے کر اپنا کام کر دیا تھا۔ نادر خاں کے مشورے سے رحیم داد نے نمر میں جہاں نشان لگوا یا، اسلم نے وہیں موگھا کھلوا دیا۔ مگر اس نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا، وہ جلد ہی سامنے آیا۔ موگھا کھلنے کے بعد نمرے نکلنے والے سوئے میں پانی کی سطح گر گئی۔ اس سوئے سے نشیبی علاقے کے چھوٹے حصے داروں اور زمیں داروں کو آب پاشی کے لیے پانی ملتا تھا۔ ریح کی فصل ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جب گندم کے پودے گوہ کی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس وقت پودوں کا بالائی سرا پھول کر موٹا ہو جاتا ہے اور سٹوں کے پھوٹ کر باہر نکلنے میں لگ بھگ پندرہ روز کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ گوہ کی حالت پودوں کے لیے اس قدر نازک ہوتی ہے کہ اگر اس مرحلے پر فصل کو پانی لگانے میں تاخیر یا غفلت ہو جائے تو پیداوار میں ۵۰ فیصد تک کمی واقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ گندم کے پودوں کے لیے پانی کی سخت ضرورت تھی۔

کھیتوں کو پانی ملنے میں کمی ہوئی تو حصے داروں کو پریشانی اور تشویش لاحق ہوئی۔ ابتدا میں تو پانی کی کمی کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ چھوٹے حصے داروں نے ایک دوسرے کو شک سے دیکھا۔ آؤ اور پانی کی نکاسی کی تالیوں کے کنوں کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ جانچ پڑتال اور روک ٹوک شروع ہوئی۔ پانی کی تقسیم پر آپس میں جھگڑے اور فساد ہوئے۔ مارپیٹ اور سرپھول ہوئی۔

دوسری طرف مالیوں نے رحیم داد سے آم اور مالٹے کے باغات کے لیے پانی کی کمی کا گلہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ موگھے کا منہ کچھ بڑا کر دیا جائے تاکہ پانی ضرورت کے مطابق مل سکے۔ مگر نادر خاں نے تجویز پیش کی کہ موگھا بڑا کرانے کے بجائے نیا موگھا کھلوا دیا جائے۔ رحیم داد نے نادر خاں کی

پر لطف شام گزرے گی۔ جیب تو موجود ہی ہے۔ ڈرائیور تجھے چھوڑ دے گا۔ تجھے لینے بھی جاسکتا ہے۔“

”اس کی فکر نہ کر۔ میرے پاس سرکاری جیب رہتی ہے۔ دیے ادھر آنے کے لیے تاکنا بھی مل جاتا ہے۔“ اسلم نے غمار آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو اتنے پیار سے بلائے گا تو کیوں نہیں آؤں گا۔ ویسے ایک بات سن لے، دیکھی یا کوئی دوسری اپنے سے نہیں چلتی۔ کسی زمانے میں ساوی کا رسیا تھا۔ پر اب وہ بالکل منہ کو نہیں لگتی۔“

رحیم داد نے گردن اونچی کی اور ہنس کر بولا۔ ”میں احسان شاہ کے ساتھ بیٹھ کر پینے والا ہوں۔ تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا، وہ کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ میں بھی صرف اسکاچ و مسکی لگاتا ہوں۔ تو اطمینان رکھ۔“ دونوں نے گلاس خالی کر دیے۔

نوکرنے خالی گلاس اور بوتل اٹھا کر کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی اسلم واپس جانے کی لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو یقین دلایا۔ ”چودھری، جب تو کئے گا، موگھا کھول دیا جائے گا۔ تو کہہ توکل ہی کھلوادوں؟“

رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ابھی نہیں۔ آرام سے کام ہونا چاہیے۔ نادر جب کہے گا تب کھول دیتا۔“

رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے نادر خاں کو بلوایا۔ اسلم سے رخصت ہوا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔

نادر خاں نے اسلم کو سنبھالا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے، آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ زبان سے پوری بات ادا نہیں ہو رہی تھی۔ نادر اسے مہمان خانے کے دروازے تک لے گیا۔ باہر کھڑی ہوئی جیب میں اسلم بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے انجن اشارت کیا۔ جیب آگے بڑھی اور کچے راستے پر دوڑنے لگی۔

صبح ناشتے کے بعد رحیم داد نے نادر خاں کے ہم راہ غیر مزرعہ اور پڑیلی زمین کا معائنہ کیا۔ مزارعوں اور کیوں کو بیگار پر لگایا اور زمین قابل کاشت بنانے کا کام شروع کر دیا۔ جھاڑیاں صاف کی گئیں، جنگلی پودے نکالے گئے۔ زمین کو ہل چلا کر ہموار کیا گیا، وٹ بندی کی گئی۔ پودے سیراب کرنے کے لیے تالیاں بنائی گئیں۔



اسلم اکثر شام کو آ جاتا۔ رات گئے تک پینے پلانے کا سلسلہ چلتا۔ اور عام طور پر آدھی رات

تجویز مان بھی لی۔

شام کو اسلم آیا۔ تین پیگ کے بعد اس پر سرخوش طاری ہوئی تو رحیم داد حرف مطلب زبان پر لایا اور بے تکلفی سے بولا۔ ”یار اسلم! تیری بادشاہت میں اپنا کام پورا نہیں بنا۔ یہ یاری تو نہ ہوئی۔“

”چوہدری تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“

رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ ”تو نے ایک موگھا کھلویا ہے۔ اس سے کام نہیں بن رہا۔ میرے باغوں کو زیادہ پانی کی ضرورت ہے۔ تو ادر کا ادور سیر لگا ہو اور میرے باغوں کے پودے سوکھ جائیں۔“

”تو چاہتا کیا ہے؟“ اسلم نے نشے سے جھوم کر دریافت کیا۔ ”صاف صاف بتا۔“

”بتانا کیا ہے۔ ایک موگھا اور کھلوا دے۔“

”بہت مشکل ہے۔“ اسلم سنجیدہ ہو گیا۔

”اس میں مشکل کیا ہے؟“ رحیم داد ہنس کر بولا۔ ”ایک کھل سکتا ہے تو دوسرا بھی کھل جاتا

چاہیے۔“

”تجھے آگے کے حصے داروں کا بھی کچھ پتہ ہے؟“

”سب پتہ ہے، ٹھیک طرح پتہ ہے۔“

اسلم اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”تجھے کچھ پتہ نہیں۔“ اس دفعہ اس کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ ”ادھر پہلے ہی

گزر بڑ ہے۔ ایک موگھا اور کھل گیا تو معاملہ بہت خراب ہو جائے گا۔ تو اسے نہیں سمجھ سکتا۔“

”میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تو میرا کام کرنا نہیں چاہتا۔“ رحیم داد نے روشنے کے انداز میں منہ بگاڑ

کر کہا۔ اس کے چہرے کی چمک دک بھگ گئی تھی۔

اسلم نے رحیم داد کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گیا۔ ”چوہدری! میں نے تجھے یار کہا ہے تو

ہمیشہ اپنا یار ہی سمجھوں گا۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”مجھے سمجھنے کی کوشش کر۔ یہ سوچ

میرے اوپر بھی افسر لگے ہیں۔“

”میں یاری دوستی میں اپنا کام نکالنا نہیں چاہتا۔“ رحیم داد نے کاروباری چہرہ اختیار کیا۔ ”پہلے

موگھا کھلنے کا جو کچھ دیا تھا، اس بار بھی دوں گا۔ مجھے پتہ ہے تجھے اوپر والوں کو بھی حصہ پہنچانا ہوتا

ہے۔“

رب سونہر میں نے تجھ سے کچھ نہیں لیتا۔“ اسلم نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”تو

میری فکر نہ کر۔ اگر کیٹو انجینئر اودھ ایس ڈی او اس دفعہ بہت آنکھیں دکھائیں گے۔ ویسے سچ پوچھ تو معاملہ ہے بھی ٹیڑھا۔“

اسلم نے اپنی مجبوری اس طرح بیان کی کہ رحیم داد متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر اپنے مطالبے سے دست بردار نہیں ہوا۔ زور دیتا رہا۔ آخر اسلم آمادہ ہو گیا۔ لیکن دو کے بجائے تین ہزار روپے پر۔ رحیم داد نے نادر خاں کو گھر سے بلوایا اور اسلم کو تین ہزار روپے دلوا دیے۔

اسلم اس رات اپنے گھر نہیں گیا۔ کھانا کھایا اور مہمان خانے کے دالان میں پٹنگ پر بستر لگوا کر سو گیا۔ صبح اس نے رحیم داد کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ نادر خاں بھی موجود تھا۔ اسلم کی ہدایت کے مطابق نادر خاں نے رحیم داد کی جانب سے درخواست لکھی۔ درخواست میں پانی کی کمی بیان کی گئی تھی۔ خاص طور پر آم اور مالٹے کے باغات کے لیے پانی کی قلت پر زور دیا گیا تھا۔ مزید پانی میا کرنے کی غرض سے دو نئے موگھے کھولنے کی ضرورت پر ہمدردی سے غور کرنے کی اپیل کی گئی تھی۔

نادر خاں درخواست لکھ چکا تو اسلم نے اسے توجہ سے پڑھا۔ اس میں ضروری ترمیم کی۔ نادر نے دوبارہ درخواست لکھی۔ اسلم کی ہدایت کے پیش نظر نادر نے درخواست پر چار مہینے پہلی کی تاریخ ڈالی۔ اسلم نے ایک بار پھر درخواست دیکھی۔ رحیم داد نے بھی اسے غور سے پڑھا اور دستخط کر دیے۔

اسلم نے درخواست جیب میں رکھی اور جیب میں بیٹھ کر چلا گیا۔ وہ دو روز نہیں آیا۔ تیسرے روز آیا تو محکمہ نہر کے تیل داروں نے راجہ شرقی میں ایک نیا موگھا کھول دیا تھا۔ یہ موگھا رحیم داد کی زمیں داری کی حدود میں کھولا گیا تھا اور اس کا منہ بھی پچھلے موگھوں سے بڑا تھا۔

نیا موگھا کھلنے کی بعد نہر کے سوئے میں پانی کی سطح اور گر گئی۔ نشیبی علاقے کے حصے داروں کو اور بھی کم پانی ملنے لگا۔ پانی کی بڑھتی ہوئی قلت سے فصلیں متاثر ہوئیں تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ ان میں بے چینی پیدا ہوئی۔ اس دفعہ پانی کی کمی کا انھوں نے سراغ بھی لگایا۔

نشیبی علاقے کے متاثرہ حصے داروں نے صورت حال پر غور کرنے کے لیے پنچایت بلائی۔ مسئلے کے مختلف پہلوں پر تبادلہ خیال کیا اور فوری اقدام کے طور پر ایک وفد تشکیل دیا۔ وفد اعلیٰ حکام سے ملا۔ پانی کی چوری کی شکایت کی۔ انھیں بتایا کہ محکمہ آب پاشی کے اہل کار بڑے زمین داروں سے ساز باز کر کے غیر قانونی طور پر ریگولیشنوں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ نئے موگھے بنا دیتے ہیں۔ نہر میں شگاف ڈال دیتے ہیں۔ انھوں نے ہر طرح اپنی پریشانی بیان کی۔ سب احتجاج کیا مگر کوئی

کوشش کی۔ ”اس نے درخواست پر جب پچھلی تاریخ دلوائی تھی، صبحی میں اس کی ہوشیاری مان گیا تھا۔“

”ایسا کرنے میں کون سی ہوشیاری تھی۔“ رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔
 ”اس میں ہوشیاری یہ تھی کہ اس نے پچھلے موگھے کو بھی قانونی شکل دے دی۔ بلکہ آگے کے لیے بھی اپنے ہاتھ مضبوط کر لیے۔ اسے پہلے ہی طوم تھا کہ بعد میں کیا کیا ہو سکتا ہے اور اس کا توڑ کس طرح کیا جائے۔ اسلم پیسہ تو دبا کے کھاتا ہے پر ہاتھ پاؤں بچا کر۔“
 ”سوچ لے، آگے کوئی گڑبڑ نہ ہو۔“

”فکر نہ کریں جی!“ نادر خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”حصے دار ادھر ادھر بھاگ دوڑ کرنے کے بعد آخر میں اپنے ہی پاس آئیں گے۔“
 رحیم داد کو نادر خاں کی بات پر یقین نہیں آیا مگر اس نے مزید بے اطمینانی کا اظہار نہیں کیا۔



ایک صبح نشیبی علاقے کے چھوٹے زمین داروں کے دو نمائندے رحیم داد کے پاس آئے۔ نادر خاں کو ان کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ سیدھا رحیم داد کے کمرے میں پہنچا۔ نادر خاں نے اسے سمجھایا۔ ”چوہدری، آگے کے حصے دار پانی کا جھگڑا چکانے آئے ہیں۔ تجھے ان سے زیادہ گل بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں گا۔ پہلے بھی کئی بار ایسے معاملات طے کر چکا ہوں۔ تجھے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ رحیم داد نے بلا عذر اس کی تجویز مان لی۔

وہ نادر خاں کے ہم راہ حویلی کے بڑے کمرے میں پہنچا۔ دونوں نمائندے وہاں اس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ گفتگو کا آغاز نادر ہی نے کیا۔

”کیسے آنا ہوا جی؟“

ایک جو سن و سال میں بڑا تھا، اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ”میں جی نیک محمد ہوں۔“ اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کرم دین ہے۔ ہم دونوں پڑوس کے زمین دار ہیں۔“ وہ رحیم داد سے مخاطب ہوا۔ ”چوہدری تو نے دو موگھے کھول کر ہمارا بیڑا گرک کر دیا۔“ اس کا لہجہ جھکیا اور تلخ تھا۔

رحیم داد بولا۔ ”میرے موگھوں سے تجھے کیا لینا؟“

اس نے جان بوجھ کر بے نیازی سے کام لیا۔

”حد ہو گئی جی!“ اس دفعہ کرم دین بولا۔ ”ہم چھوٹے حصے داروں کو پہلے ہی پانی کم مل رہا تھا“

نتیجہ نہیں نکلا۔ اسلم نے کام پکا کیا تھا۔ اس نے رحیم داد کی درخواست کی بنیاد پر موگھے کھولے تھے اور اپنی کارروائی کی تائید میں معقول جواز بھی پیش کیا تھا۔

رحیم داد کو متاثرہ حصے داروں کی بھاگ دوڑ اور سرگرمیوں کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے نادر سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”نادر! سنا ہے، آگے کے چھوٹے زمین دار پانی کم ملنے پر رولا گولا کر رہے ہیں۔“

”وہ توجی انھیں کرنا ہی تھا۔“ نادر خاں نے بے نیازی سے کہا۔ ”یہ تو پہلے ہی سے پتہ تھا، پر ہونا ہونا کچھ نہیں۔“

”بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد بدستور پریشان تھا۔ ”پانی کی اس طرح چوری پر اپنے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ کچھ نہ ہوا تو بھی موگھے تو بند ہو سکتے ہیں۔ ایسا ہوا تو آم اور مالے کے باغوں کا کیا بنے گا؟ بہت پریشانی اٹھانی ہوگی۔“

”کچھ بھی نہیں ہو گا جی!“ نادر خاں نے اطمینان دلایا۔ ”اسلم بہت ہوشیار افسر ہے۔ اس نے سوچ سمجھ کر کام کیا ہے۔ اس نے اپنی نوکری خطرے میں نہیں ڈالتی۔“

”اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔“ رحیم داد مطمئن نہیں ہوا۔ ”مجھے تو یہ پتہ ہے کہ موگھے قانونی طور پر نہیں کھولے گئے۔“

”بالکل قانونی طور پر کھولے گئے ہیں۔“ نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تب ہی تو اسلم نے درخواست لکھوائی تھی۔“

”درخواست سے کیا ہوتا ہے۔ وہ تو زیادہ پانی مانگنے کے لیے کوئی بھی زمین دار لگا سکتا ہے۔“

”پر اپنی درخواست میں اور دوسرے زمین داروں کی درخواست میں بہت فرق ہے۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”ہم نے باغوں کے لیے پانی مانگا ہے۔ تجھے پتہ نہیں، پاکستان بننے سے بھی پہلے کا قانون ہے کہ باغوں کے لیے دوسری فصلوں کے مکابلے میں دگنا پانی نسرے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہ قانون اب تک نافذ ہے۔ اسلم نے اسی قانون کی رو سے اپنی درخواست پر دونوں موگھے کھول دیئے۔“

”اگر حصے دار یہ معاملہ اور اوپر تک لے گئے تو گڑبڑ پیدا کر سکتے ہیں۔“

نادر نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”اوپر کیا، وہ عدالت تک چلے جائیں، تب بھی کچھ نہیں ہو گا۔ اسلم نے تمام کام قانون سامنے رکھ کر کیا ہے۔ ایسے کام وہ پہلے بھی کرتا رہا ہے۔ اسے سب پتہ ہے۔ میں نے کیا تا اس نے اپنی نوکری نہیں چھوڑنی۔“ نادر نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی

تیرے موگھے کھل جانے سے سوئے میں اتنا پانی کم ہو گیا کہ فصلیں سوکھنے لگی ہیں۔ اس دفعہ برکھا بھی نہیں ہوئی۔ تو ہمیں تباہ کر دینا چاہتا ہے۔“

”تیرا مطلب ہے ہم نے سوچ سمجھ کر ایسا کیا ہے۔“ نادر خاں نے بھی ٹیکھا لہجہ اختیار کیا۔ ”آگے کے حصے داروں اور زمیں داروں سے ہماری دشمنی تو ہے نہیں۔ ہم انھیں تباہ کرنے کی کیوں سوچنے لگے؟“

”دشمنی تو نہیں پر یہ تو پتہ ہے۔ آج کل جب فصلیں تیار کھڑی ہیں اور ان کے لیے زیادہ ہی پانی کی ضرورت ہے تو نے موگھے کھول کر پانی بند کر دیا۔ ہماری فصلیں تباہ نہیں ہوں گی تو کیا ہو گا۔“ کرم دین نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے صورت حال کی وضاحت کی۔

”تو یہ کہنا چاہتا ہے ہم نے غلط موگھے کھلوائے ہیں؟“ نادر خاں کا لہجہ بدستور تیز اور ٹیکھا تھا۔ ”غلط کام نہیں تو اور کیا ہے۔“ کرم دین کے چہرے پر جھنجھلاہٹ ابھرنے لگی۔ ”سچ پوچھ تو یہ پانی کی کھلی چوری ہے۔“

”چوری ہے تو تھانے میں جا کر پرچہ چاک کرا۔“ نادر خاں بھی مشتعل ہو گیا۔ ”محکمہ نہروالوں کے پاس جا۔ اوپر درخواست لگا۔ عدالت میں جا۔ یہاں کیوں آیا ہے؟“

نیک محمد نے بات بگڑتی دیکھی تو جھٹ مداخلت کی۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کرم دین کو روکا۔ ”کرے تو چپ کر۔ میں نوں گل بات کرنے دے۔“ وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”چوہدری، تجھ سے پہلے ادھر کا زمیں دار اللہ وسایا ہوتا تھا اور اس سے بھی پہلے لالہ کرشن دیال ہوتا تھا، پر پانی کے معاملے میں ہمارا کبھی کسی سے جھگڑا مٹا نہیں ہوا۔ سب کو اپنے اپنے حصے کا پانی ملتا رہا۔“

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔“ رحیم داد کے بجائے نادر خاں بولا۔

”کہنا کیا ہے جی۔“ نیک محمد نے اس دفعہ بھی رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری، تو ڈراما میں دار ہے۔ ہم چھوٹے حصے دار ہیں۔ پانی نہ ملا تو ہماری فصلیں سوکھ جائیں گی۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ”تو چاہے تو ہماری کھڑی فصلیں تباہ ہونے سے بچ سکتی ہیں۔“

”تو یہ چاہتا ہے کہ تیری فصلیں بچانے کے لیے ہم اپنا بیڑا غرک کر لیں۔“ نادر خاں نے رحیم داد کی جانب سے ترجمانی کا فرض ادا کیا۔ ”ہمارے باغ پانی کے بغیر سوکھ جائیں۔ تو خود ہی سوچ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ نیک محمد نے نادر سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ امدتے جذبات قابو میں

رکھے اور معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے زیادہ نرم لہجہ اختیار کیا۔ ”پر تجھے ہماری فصلیں بچانے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔“

”اس کے لیے تو محکمہ نہر کے افسروں سے گل بات کر۔“ نادر خاں نے بے رخی سے کہا۔ ”پانی تو وہی دیتے ہیں۔ وہی کچھ بندوبست کریں گے، ہم کیا کر سکتے ہیں۔“

”وہ تو جی کچھ نہیں کریں گے اور نہ ان سے اوپر والے کچھ کریں گے۔“ نیک محمد نے نرمی سے کہا۔ ”ہماری فصلیں بچانے کے لیے تجھے ہی کچھ کرنا ہو گا۔ ہم چھوٹے حصے داروں کی طرف سے اسی لیے آئے ہیں۔“

نادر خاں سر جھکا کر سوچنے لگا۔ رحیم داد بھی گم صم بیٹھا رہا۔

نیک محمد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا اور نادر خاں کی جانب دیکھا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ ایک بار پھر وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ ”چوہدری، ہم تیرے پاس بہت امیدیں لے کر آئے ہیں۔ ہمیں نہ تیرے خلاف اوپر درخواست لگانی ہے نہ مکدے بازی کرنی ہے۔ ہمیں تو اپنی فصلیں بچانی ہیں اور وہ تو ہی بچا سکتا ہے۔“

رحیم داد نے نادر سے پوچھا۔ ”نادر، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“ اس نے کھکار کر گلا صاف کیا۔ ”یہ بتا، ان کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔“

”وہی جو ایسے معاملات میں ہوتا ہے۔“ نادر خاں نے گول مول جواب دیا۔

”کیا ہو سکتا ہے جی؟“ کرم دین نے بے قرار ہو کر دریافت کیا۔

”ہم یہ کر سکتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کچھ پانی فروخت کر دیں۔“ نادر خاں نے پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جواب دیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ دوسرے موگھے کا منہ بڑا ہونے کے باعث باغات کی ضرورت سے زیادہ پانی مل رہا ہے۔ ”یہ کوئی نئی گل نہیں۔ وڈے زمیں دار چھوٹے حصے داروں کی اسی طرح مدد کرتے ہیں۔ اس کا تم کو بھی پتہ ہو گا۔“

”سنا تو ہے جی پانی اس طرح فروخت ہوتا ہے۔“ نیک محمد نے انکٹے ہوئے کہا۔ ”پر اپنے ساتھ کبھی ایسا ہوا نہیں۔“

”پہلے نہیں ہوا تو اب ہو سکتا ہے۔“ نادر خاں نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ ”فصلیں بچانی ہیں تو پانی خریدنا ہو گا۔“

”یہ تو جی بہت مشکل ہو گا۔“ کرم دین نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

”مشکل ہو یا آسان۔ یہ میں نہیں جانتا۔“ نادر خاں نے ٹیکھی نظروں سے کرم دین کو دیکھا۔

”تمہاری مدد میں اسی طرح کر سکتا ہوں۔“ اس نے مشورہ دیا۔ ”جاؤ اور دوسرے حصے داروں سے اس معاملے میں بات کرو۔ اچھی طرح سوچ لو، سمجھ لو۔“ اس نے کرسی پر پہلو بدلا۔ ”میں نے اور زمیں دار نے ابھی اور بھی کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“

نیک محمد نے نادر کے رویے سے اندازہ لگا لیا کہ زیادہ جیل و جنت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ جیل و جنت اور سکرار کرنے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ گرمی رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ گندم کے پودوں کی رنگت سنہری پڑتی جا رہی تھی۔ گرمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ بخارات کے ذریعے پودوں سے پانی کا اخراج تیز ہو گیا تھا۔ اس کی کو پورا کرنے کے لیے پودوں کو پانی کی شدید ضرورت تھی۔ پانی مناسب مقدار میں نہ ملنے کی صورت میں پودے تیزی سے مرجھانے لگتے ہیں جسے کاشتکاروں کی اصطلاح میں فصل کا ہل جانا کہا جاتا ہے۔ فصل ہل جائے تو بالیوں میں لہلہاتے ہوئے گندم کے دانے سکر جاتے ہیں۔ ان کی نشوونما رک جاتی ہے۔ وزن ہلکا پڑ جاتا ہے اور پیداوار بہت گھٹ جاتی ہے۔ لہذا صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر نیک محمد نے رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے نادر خان کو اپنی مجبوری کا احساس دلایا۔

”فیصلہ ہم دونوں توجی کر نہیں سکتے۔ تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔ دوسرے حصے داروں سے گل بات کرنی ہوگی۔ اس سے پہلے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ بھی بتا دے کہ پانی کس طرح خریدنا ہو گا۔ ہم نے واپس جا کر ساری باتیں بتانی ہوں گی۔“

”بچ روپے فی کلا کے حساب سے کمیت ادا کرنی ہوگی۔“ نادر خان نے کہا۔ ”اور ساری رقم پیٹنگی دینی ہوگی۔“

”یہ تو بہت زیادہ ہے۔“ نیک محمد نے عاجزی سے کہا۔ ”یہ تو سوچ، چھوٹے حصے دار اتنی کمیت کیسے ادا کریں گے۔ پیٹنگی تو وہ بالکل نہیں دے سکتے۔ فصل کی واڈھی کے بعد ہی دے سکیں گے۔“ اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”ہم چھوٹے حصے داروں کی غریبی کا خیال کر۔ کمیت میں کمی کر دے اور پیٹنگی کی شرط بھی ہٹا دے۔“

”میں نے جو کہہ دیا، ویسا ہی ہو گا۔“ نادر خان نے رعوت سے کہا۔

رحیم داد کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ نادر اس کا ملازم نہیں مالک و مختار ہے۔ رحیم داد نے فوراً مداخلت کی۔ نیک محمد سے دریافت کیا۔ ”آگے کے چھوٹے حصے داروں کی کتنی زمین ہوگی؟“

نادر خاں کارگزاری دکھانے میں کچھ زیادہ ہی آگے بڑھ گیا۔ نیک محمد کے جواب دینے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ”زمین کتنی ہی ہو۔ ہم نے اس سے کیا لیتا۔ سوال یہ ہے۔۔۔“

رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے نادر خاں کو جھڑک دیا۔ ”نادر! چپ کر۔“ وہ نیک محمد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ہاں جی کتنی زمین ہوگی؟“

”لگ بھگ ۳۵ مرنے ہوگی۔“

”ایسا کرنی ایکڑ تین روپے کے حساب سے کمیت چکا دینا۔ آدھی پیٹنگی اور آدھی فصل کی واڈھی پر۔“ رحیم داد نے چہرے پر رعب اور دبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”اور یہ بھی سن لے۔ میں نے جو فیصلہ کر دیا وہ نہیں بدلے گا۔ سارے حصے داروں کو صاف صاف بتا دینا۔“

نیک محمد اور کرم دین نے بات کو طول نہیں دیا، فوراً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے جلد آنے کا وعدہ کیا اور رخصت ہو کر حویلی سے چلے گئے۔

ان کے جانے کی بعد نادر خاں نے معذرت کرنے کے انداز میں صفائی پیش کی۔ ”کوئی غلطی ہو گئی توجی معافی دے دیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ انھیں اس طرح دیا جائے کہ وہ اوپر جانے کی نہ سوچیں۔“

”تو نے انھیں بہت دبا دیا تھا۔“ رحیم داد کی جھنجھلاہٹ رفع ہو گئی۔ وہ مسکرایا۔ ”اب سوچنا یہ ہے کہ وہ مان بھی جائیں گے؟“

”بالکل مان جائیں گے۔“ نادر خاں بولا۔ ”انھیں اپنی فصلیں بچانی ہیں۔ چوہدری، تجھے پتہ نہیں، سارے ہی حصے دار پانی کی کمی سے بہت پریشان ہیں۔ فصلوں کی بڑھوتری رک گئی ہے۔ ان کو سوکا لگنے کا ڈر ہے۔“

”ایسا ہو گیا تو اپنی دی ہوئی آدھی رقم تو نکل ہی آئے گی۔“

”میں تو پوری ہی نکلوانا چاہتا تھا۔“ نادر کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ خوشامد پر اتر آیا۔ ”پر زمیں دار تو بہت نیک اور رحم دل بندہ ہے۔ تیرا دل بہت ڈا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”میں نے تو یہ دیکھا ہے، دوسرے ڈوے زمیں دار ایسے معاملوں میں چھوٹے حصے داروں کو بہت تنگ کرتے ہیں۔ ان کی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پانی کی منہ مانگی کمیت وصول کرتے ہیں۔ ذرا بھی ترس نہیں کھاتے بلکہ زیادہ سے زیادہ کمیت مانگتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ مانگتے ہیں، انھیں مل بھی جاتا ہے۔“

”نہیں جی! اتنا زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہیے۔“ رحیم داد ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ ”میں

تو کہتا ہوں نادر اتنا ہی مل جائے کافی ہے۔“

”فکر نہ کریں جی، باغ لگانے پر جو خرچ آیا ہے سب مل جائے گا۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔“

”پورا خرچ کیسے نکل آئے گا۔“ رحیم داد نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ ”مالی بتاتے ہیں، بوٹے چار پانچ برس سے پہلے پھل نہیں دیں گے، تب تک خرچ تو ہوتا ہی رہے گا۔“

”پانی کی کیمت تو جی آگے بھی ملتی رہے گی۔ یہ تو طے ہے۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔

”خریف کی واڈھی تک پودے خوب بڑھ جائیں گے۔ اگلی ربیع کی فصل پر باغ کی زمین پر کٹک اور جو بوٹی جاسکتی ہے۔ اس سے بھی اچھی کمائی ہو جائے گی۔“

”ہاں جی! یہ تو ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ ”ابا ہی کرنا ہو گا۔“

”اطمینان رکھیں جی! بالکل ایسا ہی ہو گا۔ میں نے سب تیاری کر رکھی ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر خاں رحیم داد سے اجازت لے کر باہر چلا گیا۔

دوسرے روز سہ پہر کو نیک محمد اور کرم دین آئے۔ ان کے ہم راہ دو اور چھوٹے حصے دار بھی تھے۔ انھوں نے بات چیت میں قطعی نرم اور چمک دار رویہ اختیار کیا۔ رحیم داد نے جو شرائط پیش کی تھیں، ان کے بارے میں انھوں نے نہ مین میخ نکالی نہ سودے بازی کی کوشش کی۔ ہر بات بلا حیل و حجت مان لی۔ انھیں اپنی فصلوں کے لیے پانی کی شدید ضرورت تھی۔ وہ اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ پانی کی مطلوبہ پیشگی رقم وہ ساتھ لائے تھے۔ رقم انھوں نے رحیم داد کے حوالے کی اور بقیہ نصف رقم فصل کی کٹائی پر ادا کرنے کا یقین دلایا۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرے۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی چلے گئے۔

رحیم داد نے سمجھوتے کے مطابق اسی روز ایک موگھا بند کرا دیا۔ یہ چھوٹا موگھا تھا۔ اس کے بند ہوتے ہی نشیب کے حصے داروں کی فصلوں کے لیے پانی پہنچنے لگا۔

ربیع کی فصل کی کٹائی کے بعد ان کے نمائندے دوبارہ آئے اور حسب وعدہ بقیہ رقم بھی لائے۔ انھوں نے پورا حساب صاف کر دیا۔ اس دفعہ رحیم داد نے انھیں کھانا کھلایا، خاطر تواضع کی۔ محبت اور نرمی سے پیش آیا۔ اسی ملاقات میں آئندہ کے لیے پانی کا سودا بھی طے ہو گیا۔



خریف کی فصل سے فارغ ہونے کے بعد نادر خاں نے پروگرام کے مطابق گندم کی بوائی کے لیے باغات کی زمین پر بھی مل چلایا اور دوسری زمینوں کے ساتھ اس پر بھی بوائی کرائی۔ رحیم داد

نے بھی اس میں پوری پوری دلچسپی لی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہونے کی بعد حویلی سے نکلتا اور دوپہر تک بوائی کی دیکھ بھال کرتا۔ اکثر دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بھی چلا جاتا اور شام کو لوٹتا۔

ادور سیزاسلم کی آمد و رفت بند ہو چکی تھی۔ اس کالا کل پور تبادلہ ہو گیا تھا مگر جب تک وہ ضلع منگھری میں تعینات رہا، اکثر رحیم داد کے پاس آ جاتا اور ہفتے کی شام کو پابندی سے آتا۔ دونوں رات گئے تک بیٹے پلانے میں مصروف رہتے۔ اسلم کے بعد رحیم داد کی شامیں سونی ہو گئی تھیں۔ احسان شاہ سے بھی اس کی ملاقات نہیں ہو سکی۔ وہ ان دنوں سیاسی سرگرمیوں میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ یہ سیاست میں نت نئی تبدیلیوں، جوڑ توڑ، سازشوں اور دھڑے بندیوں کا دور تھا۔ احسان شاہ کبھی ایک سیاسی دھڑے کے ساتھ، کبھی دوسرے کے ساتھ لگ جاتا۔ جس کا ستارہ عروج پر دیکھتا، اس کی ہم نوائی کرتا، سیاسی وفاداریاں بدلتا اور ہر طرح کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ ان دنوں وہ لاہور میں رہتا یا کراچی میں۔ اپنے گاؤں پیراں والہ کم ہی آتا اور جب بھی آتا، ایک دو روز سے زیادہ نہ ٹھہرتا۔

نادر خاں کے بچوں میں ایک کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس بار بیٹا پیدا ہوا۔ یہ تین بیٹیوں کے بعد ہوا تھا لہذا اس کا لاڈ پیار بھی زیادہ تھا۔ نادر کی بیوی جنت بی بی ہر وقت بیٹے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی۔ وہ گھر سے بہت کم باہر نکلتی۔ رحیم داد شدید تنہائی میں مبتلا تھا۔ وہ تنہائی سے بچنے کے لیے زمیں داری کے امور میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیتا، خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا اور شام ہوتے ہیں شغل بادہ نوشی شروع کرتا۔ اکیلا بیٹھا پیتا رہتا۔

ایک سہ پہر نادر خاں اس کے پاس آیا۔ وہ زمین داری کے کام کے سلسلے میں تحصیل دار سے ملنے دہپال پور گیا تھا اور سیدھا وہیں سے آ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے رحیم داد سے کہا۔

”چوہدری! میں نے جیلہ کے بارے میں تجھ سے جو کہا تھا، وہی ہوا نا۔“

جیلہ کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ ”کیا ہوا جیلہ کو؟“

”وہی ہوا جو میرا اندازہ تھا۔“ نادر خان مسکرا کر بولا۔ ”بھائیوں اور بھرجائیوں کے ساتھ زیادہ عرصے گزارا نہیں ہوا۔ ان بن ہو گئی۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا؟“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”تو یہاں ہے، وہ ادھر سرحد

پار، فیروز پور میں ہے۔“

”وہ ایسا ہوا جی! دہپال پور میں مجھے جلیل مل گیا۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”وہ تو مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا، پر میں نہیں گیا۔ بات چیت اس سے ضرور ہوئی اور دیر تک ہوئی۔ جیلہ کے بارے

میں وہی بتاتا تھا۔

”پر جیلہ سے وہ کہاں ملا؟ فیروز پور تو وہ جانے سے رہا۔“ رحیم داد بدستور حیرت زدہ تھا۔
 ”جلیل فیروز پور تو نہیں گیا لیکن چند مہینے پہلے دہلی ضرور گیا تھا۔ دہلی میں اس کا چھوٹا بھائی ہے۔
 وہ ادھر نہیں آیا۔ پاکستان بنا تو وہ دہلی ہی میں تھا اور اب تک وہیں ہے۔ بال بچے دار ہے۔ جلیل
 اس سے ملنے گیا تھا۔ دہلی سے واپس آ رہا تھا کہ جلندر کے سٹیشن پر اسے جیلہ نظر آئی۔ وہ اس کے
 پاس گیا، بات چیت بھی کی۔“

رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ ”جیلہ کے بارے میں کیا بتایا اس نے؟“
 ”کہتا تھا، جیلہ کی باتوں سے اسے یہ پتہ چلا کہ ہریال کی گھر والی سے اس کا اتنا بھگڑا ہوا کہ وہ
 روٹھ کر چھوٹے بھائی منو ہریال کے پاس امرت سرچلی گئی۔ پر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکی۔“ نادر
 خاں سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ ”ان دنوں وہ سب سے چھوٹے بھائی ایٹور دیال کے پاس جلندر
 میں تھی۔ ہریال اسے منانے آیا تھا اور اپنے ساتھ واپس فیروز پور لے جانا چاہتا تھا، پر اس کی
 باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔“

”تو گویا اب وہ جلندر میں ہے۔“
 ”پتہ نہیں جی جلندر میں ہے یا فیروز پور میں۔ جلیل اس سے کئی مہینے پہلے ملا تھا۔ بعد میں وہ
 کہاں گئی یہ تو اسے بھی خبر نہیں۔“
 رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔ ”میرے بارے میں بھی اس نے جلیل سے کل بات
 کی؟“

”جلیل کہتا تھا، تیرے بارے میں بھی اس نے پوچھا تھا۔“
 ”برا ہی کہتی ہوگی۔“ رحیم داد نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مجھ سے سخت نراض ہو کر گئی تھی
 ناں۔“

”پر اس نے جلیل سے تیرے بارے میں کسی نراضی کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اتنا پوچھا کہ
 چوہدری کیسا ہے؟“ نادر خاں نے بتایا۔ ”اس نے اوروں کا بھی حال احوال پوچھا۔ جلیل کہتا تھا، وہ
 اب تک کوئٹہ ہرکشن کو بھولی نہیں۔ یہاں کے بارے میں باتیں کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں
 آنسو آ گئے۔ ایک ایک بات کا ذکر کرتی تھی۔ سب کو پوچھتی تھی، سب کو یاد کرتی تھی۔ لگتا ہے
 یہاں سے جانے پر وہ خوش نہیں ہے۔“

”لیکن نہیں آتا۔“ رحیم داد بے چارگی کے انداز میں بولا۔

”چوہدری، یہ تو سوچ، وہ یہ پنڈ کیسے بھول سکتی ہے۔“ نادر خاں نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے
 کی کوشش کی۔ اس کوشش میں رحیم داد کی خوشنودی حاصل کرنے کا جذبہ بھی کار فرما تھا۔ ”وہ
 یہاں برسوں رہی ہے۔ دکھ تو دیکھے ہیں پر بہت سکھ بھی اٹھایا۔ زین داری تو وہی کرتی تھی، اللہ
 وسایا تو اس کا مزارع ہی لگتا تھا۔ سب یہی بتاتے ہیں۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”میں
 غلط تو نہیں کہہ رہا؟ تجھے یہ بھی پتہ ہے، دو بچوں کی ماں بھی وہ بیس بنی۔ ادھر کی تو اسے ایک ایک
 گل بات یاد آتی ہوگی۔“

رحیم داد کو نادر خاں کی باتوں سے سارا ملا۔ ”ویسے وہ ملے تو اصلی گل کا پتہ چلے۔“ اس کے
 ہونٹوں پر چٹکی مسکراہٹ ابھری۔ ”پر وہ مل بھی کیسے سکتی ہے۔“ اس کے چہرے پر دکھ کا غبار چھا
 گیا۔

”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ خود ہی چلی آئے۔“ نادر نے رحیم داد کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔
 ”میں کہتا ہوں جی، بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔ وہ تیری گھر والی ہے۔ تیرے ساتھ اس کا نکاح ہو چکا ہے،
 اور جی سب سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس کی جو شان ادھر تھی وہاں کیسے ہوگی۔ وہاں تو
 اسے اچھوت ہی سمجھا جائے گا۔ مسلمان کے ساتھ گھر والی بن کر جو رہ چکی ہے۔ وہ ہندو ہیں۔ اسے
 اور اس کے بچوں کو کیسے قبول کر لیں گے۔ جلیل کی گھر والی، زینت کے بارے میں تجھے معلوم ہی
 ہے۔ اسے ادھر اتنا تنگ کیا گیا کہ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر فیرا دھر آ گئی۔ ایسا ہی جیلہ
 کے ساتھ بھی ہو رہا ہو گا۔ جلیل کی باتوں سے تو صاف یہی لگتا تھا۔“

”کہتا تو تھیک ہی ہے۔“ رحیم داد نے نادر خاں سے اتفاق کیا۔

نادر مزاج شناس تھا۔ اس نے رحیم داد کی کم زوری بھانپ لی تھی۔ وہ کچھ دیر جیلہ کے بارے
 میں اسی انداز سے باتیں کرتا رہا۔ رحیم داد دل چسپی اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ نادر خاں
 اٹھ کر چلا گیا مگر رحیم داد کے ذہن میں کھلبلی پیدا کر گیا۔ جیلہ کی یاد ایک بار پھر شدت کے ساتھ
 ابھری۔ اس کا سراپا نظروں میں سامنے خواب بن کر منڈلانے لگا۔ وہ رات اس نے بڑی بے چینی
 میں بسر کی۔



سردی ختم ہو رہی تھی۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مارچ کی آخری تاریخوں کی ایک خوش گوار شام
 تھی۔ فضا میں پھولوں کی مک رکچی ہوئی تھی، چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا۔ اجلی اجلی
 چاندنی درودیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ رحیم داد مہمان خانے میں بیٹھا اسکاچ و سکی سے شغل کر رہا

تھا۔ اسی عالم میں اس نے مہمان خانے کے باہر چپ رکنے کی آواز سنی۔ مڑ کر دروازے کی جانب دیکھا۔ احسان شاہ اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم راہ رفیع سمہ بھی تھا۔ احسان شاہ کو دیکھتے ہی رحیم داد کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور احسان شاہ سے ملٹ گیا۔

رحیم داد نے احسان شاہ اور رفیع سمہ کو کرسیوں پر بٹھایا۔ احسان شاہ نے رفیع سمہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری، یہ رفیع سمہ ہے۔ آج سمہ پر بہت مدت بعد میرے پاس آیا تھا۔ میں فوراً اسے تیرے پاس لے آیا۔“

رحیم داد نے مسکرا کر رفیع سمہ کی جانب دیکھا۔ اس کی عمر لگ بھگ رحیم داد کے برابر ہی تھی۔ قد اونچا اور جسم مضبوط تھا۔ رحیم داد نے جھوم کر بے تکلفی سے رفیع سمہ کو مخاطب کیا۔ ”بہت انتظار کرایا تو نے۔“ پھر وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ”شاہ جی! تجھے دیکھنے کو تو آنکھیں ترس گئیں۔ اس بار تو لمور جا کر ایسا بیٹھا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔“

”پر دو گرام کچھ زیادہ ہی لبا ہو گیا۔“ احسان شاہ نے وضاحت کی۔ ”کیا بتاؤں چوہدری، کیسے کیسے چکروں میں گھر گیا ہوں۔ اور ابھی تک ان سے نکل نہیں سکا۔ کل سویرے ہی واپس جانا ہے۔“

”کل جا رہا ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا اب تو نے لمور ہی میں ٹھہرنے کا طے کر لیا ہے؟“

”یہاں ہی سمجھ لے۔“ احسان شاہ مسکرایا۔ ”باتیں تو ہوتی رہیں گی، پہلے دو گلاس تو منگوا۔ لگتا ہے تو اکیلا ہی بیٹھا لگا رہا تھا۔“

”اکیلا ہی بیٹھ کر لگا لیتا ہوں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”تجھے تو پتہ ہے۔ ادھر اپنا کوئی ملنے جلنے والا نہیں۔“

اس نے نوکر کو بلایا، دو گلاس منگوائے، پیگ تیار کیے۔ گلاس رفیع سمہ اور احسان شاہ کے سامنے رکھ کر بولا۔ ”لوجی، اپنے اپنے گلاس اٹھاؤ۔“ سب نے گلاس اٹھائے، ہاتھ بڑھا کر ہولے سے ٹکرائے اور ایک ایک گھونٹ بھرا۔

سمہ خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ نے گردن ادھر ادھر گھما پھرا کر مہمان خانہ دیکھا، پھر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چوہدری، بہت پرانی بات ہے۔ ان دنوں جنسی لال ادھر فیجر ہوتا تھا۔ میں ایک رات ہرویل سے ملنے آیا تھا، اسی مہمان خانے میں ٹھہرا تھا۔ تب یہ بہت شان دار ہوتا تھا۔ اللہ وسایا نے اس کا بالکل ٹاس مار دیا۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ پہلے تو اس کی حالت بہت خراب تھی۔ تو نے بھی دیکھی تھی۔“ رحیم داد

نے بتایا۔ ”میں نے پچھلے دنوں اسے ٹھیک ٹھاک کرایا ہے۔“

”ابھی اسے اور درست کرانے کی ضرورت ہے۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”تجھے زمیں داری کرنی ہے تو سرکاری افسروں اور آس پاس کے وڈے زمین داروں سے میل ملاپ پیدا کرنا ہو گا، انھیں روٹی پر بلانا ہو گا۔ دعوتیں کرنی ہوں گی۔ ان کی دل چسپی کا سامان بھی کرنا ہو گا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”مہمان آئیں گے تو ادھر ہی ٹھہریں گے۔ پر یہاں تو ایک ہی کمرہ ہے اور ایک کو ٹھنڈی رہ گئی ہے۔ پہلے تو کئی کمرے ہوتے تھے۔“

”نا ہے اللہ وسایا نے سارے کمرے توڑ پھوڑ کر گھوڑوں کا اصطبل اور ڈنگروں کا ڈھارا بنوا دیا۔“

”اے وڈا مہمان خانہ رکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔“ احسان شاہ نے رحیم داد سے کہا۔ ”وہ تو زمیں دار بن ہی نہیں سکا، مزارع کا مزارع رہا۔“

”پر میں گھوڑوں اور ڈنگروں کو کہاں لے جاؤں گا؟“

”سکول کو اصطبل بنا دے۔ ڈنگر اور مویشی بھی ادھر ہی پنچا دے۔“ وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”سکول کی عمارت اصطبل کے لیے بالکل ٹھیک رہے گی۔ اب وہ اسی کام آتی چاہیے۔ تجھے زمیں داری کرنی ہے۔ مزارعوں کے منڈوں کو پٹھالکھا کر ان کا دماغ خراب نہیں کرنا۔ اب یہ سکول شکول کا چکر نہیں چلنا چاہیے۔“

”سکول تو جیلہ کے جانے کے بعد سے بند پڑا ہے۔“

”یہ تو ہوتا ہی تھا۔“ احسان شاہ بولا۔ ”اب تو ابے اصطبل اور ڈھارا بنا۔ مہمان خانے کے کمرے بڑھا۔ اس کی شان بڑھا۔ زمین داری کی اصل شان تو اسی سے ملوم ہوتی ہے۔“

رفیع سمہ بھی دوسرا پیگ ختم کر چکا تھا، ہنس کر بولا۔ ”چوہدری، تب تو شاہ جی کی طرح تجھے بھی کوٹ بنوانا ہو گا۔ ورنہ شان پیدا نہیں ہو گی۔“

”نہیں جی، میں شاہ جی کی طرح کا کوٹ نہیں بنا سکتا۔ میں اتنا وڈا زمیں دار کہاں ہوں۔“

”کوٹ نہ بنو، پر مزارعوں کی گھر والیاں اور کڑیاں تو اٹھوانی ہی ہوں گی۔“ احسان شاہ نشے میں جھوم کر بولا۔ ”تجھے زمیں داری چلانی ہے۔ مہمانوں کے لیے دو چار پونٹ زنانیاں تو ہونی ہی چاہیں۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”تو بھی جیلہ کے جانے کے بعد ریٹو دارہ گیا ہے۔“

رحیم داد نے دبی زبان سے کہا۔ ”شاہ جی! تو نے جیلہ کے بارے میں سمہ سے بھی بات کی؟“

”نہیں، میں اسکو کو ادھر ہی چھوڑے جا رہا ہوں۔ رات تیرے مہمان خانے میں ٹھہرے گا۔ تو

آرام سے خود ہی بات کر لیتا۔ ”احسان شاہ نے مڑ کر رفیع سمہ کی جانب دیکھا۔ ”رنیے! تجھے یہ تو پتہ ہی ہے، چوہدری بھی اپنا گمراہ رہے۔ تجھے اس کا ایک کام کرنا ہے اور ضرور کرنا ہے۔“

”ضرور کروں گا۔ پتا کام کیا ہے؟“ رفیع سمہ نے دریافت کیا۔

”یہ تو تجھے چوہدری ہی بتائے گا۔ مجھے واپس پیراں والہ جانا ہے۔ افسر مال میری ہی حویلی میں ٹھہرا ہے۔ انتظار کرتا ہو گا۔ اس سے مجھے کچھ ضروری گل بھی کرنی ہے۔ سویرے تو میں لوہر چلا جاؤں گا۔“

احسان شاہ نے گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد اور رفیع سمہ نے مہمان خانے کے باہر اسے رخصت کیا۔ دونوں واپس آئے اور اپنی اپنی کرسیوں پر پھر بیٹھ گئے۔ گلاس اٹھائے اور وہسکی کی چسکی لگانے لگے۔

رفیع سمہ نے پوچھا۔ ”یہ جیلہ کا کیا چکر ہے؟“

”وہ میری گھر والی ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”پہلے وہ ہندنی تھی۔ فسادات ہوئے تو ادھر رہ گئی۔ اس کے گھر والے ادھر سرحد پار ہیں۔ پچھلے دنوں اس کا بھرا ہر دیال اپنے مسلح کردوں کے ساتھ آیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”ہر دیال غلے کا بہت ڈا سمگلر ہے۔ تو اسے جانتا ہے؟“

”نام تو اس کا میں نے بہت سن رکھا ہے پر کبھی ملا نہیں۔“ سمہ نے جواب دیا۔ ”ویسے اس کے کردوں سے میری جان پہچان ہے۔“

”سنا ہے وہ فیروز پور میں رہتا ہے۔ مجھے یہ پتہ کرنا ہے، جیلہ اس کے پاس ہے یا اپنے کسی اور بھائی کے گھر چل گئی۔“

”یہ تو آسانی سے معلوم ہو جائے گا۔ پر تجھے ہر دیال سے تو نہیں ملنا؟“

”نہیں مجھے اس سے نہیں ملنا بلکہ اسے تو میرے بارے میں پتہ بھی نہیں چلنا چاہیے۔ میں نے تو جیلہ کو ایک سندیا بھیجتا ہے۔ تیری جان پہچان کا کوئی ایسا بندہ ہے جو جیلہ سے مل سکتا ہو؟“ رحیم داد نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”پر اسے ادھر جیلہ کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ وہاں سب اسے پاروتی کہتے ہیں۔ یہ تو میں تجھے بتا چکا ہوں وہ ہر دیال کی چھوٹی بھین ہے۔“

”اس بارے میں ابھی تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ واپسی پر کچھ کیا جاسکتا ہے۔ چوہدری، تو ایسا کر میرے ساتھ چل۔ وہیں بیٹھ کر آرام سے سوچیں گے۔ میں کل اپنے پنڈ واپس جا رہا ہوں۔ تو میرے ساتھ چل سکتا ہے؟“

”میرا منیجر نادر خان لوہر گیا ہے۔ کل سویرے آگیا تو میں تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔“ رحیم داد نے رضا مندی کا اظہار کیا۔ ”نادر کل نہ آیا تو تجھے ٹھہرنا ہو گا۔ وہ پرسوں ضرور آجائے گا۔ میرے پاس جپ ہے، دونوں اس میں اکٹھے چلیں گے۔“

”پر میں ایک روز سے زیادہ کسی طور نہیں ٹھہر سکتا۔“ رفیع نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”مجھے واپسی پر کئی بہت ضروری کام کرنے ہیں۔“

”نہیں، میں نے تجھے ایک روز سے زیادہ نہیں روکنا۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔

دونوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کیے۔ ذرا دیر بعد نوکروں نے کھانا لگا دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر رحیم داد اور رفیع سمہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سمہ کو نوکر نے مہمان خانے کے کمرے میں پہنچا دیا۔ رحیم داد حویلی میں چلا گیا۔

نادر خان دوسرے روز واپس نہیں آیا۔ مگر تیسرے روز دن چڑھے پہنچ گیا۔ رحیم داد نے اسے اپنا پروگرام بتایا اور رفیع سمہ کے ساتھ جپ میں سوار ہو کر حویلی روڈ کے راستے بھاول نگر کی جانب روانہ ہو گیا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے ہی دونوں صادق منج پہنچ گئے۔ صادق منج سے رفیع سمہ کا گاؤں زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن راستہ کچا تھا۔ سمہ کے گاؤں پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی۔



رفیع سمہ کھانا پیتا زمین دار تھا۔ گاؤں میں اس کا دو منزلہ عالی شان مکان تھا۔ رہتا بھی ٹھاٹ باٹ سے تھا۔ سواری کے لیے اس کے پاس بھی جپ تھی۔

سمہ کا مکان پختہ ہونے کے ساتھ ساتھ خوب کشادہ تھا۔ مکان کے ارد گرد وسیع احاطہ تھا جس میں جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ باغیچہ تھا۔ کنواں تھا اس سے پانی نکالنے کے لیے ہینڈ پمپ لگا تھا۔ مہمانوں کے قیام کے لئے علیحدہ ڈیرا تھا۔ نوکروں کے واسطے مکان کے پچھواڑے مٹی کی بنی ہوئی کچی کوٹھریاں تھیں۔ قریب ہی مویشیوں کا بارا اور اصطبل تھا۔ اصطبل میں عمدہ نسل کے کئی گھوڑے تھے۔ گائے اور بھینسوں کے علاوہ اونٹ بھی تھے۔

احاطے کے چاروں طرف اونچی چار دیواری تھی۔ اندر داخل ہونے کے لیے دو پھانک تھے۔ ایک بڑا دوسرا چھوٹا تھا۔ بڑے پھانک پر مسلح سپردار مقرر تھا۔ چھوٹا پھانک پچھواڑے تھا جو گھر میں کام کاج کرنے والے نوکروں اور دوسرے کیوں کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔

رفیع سمہ کا مکان طرز تعمیر کے اعتبار سے دیہات کی پرانی وضع کی حویلیوں کی طرح کا نہ تھا۔ نیا نیا

بنا تھا۔ اسے دیکھ کر پہلی ہی نظر میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ رفیع سہ خاندانی زمین دار نہ تھا۔ اس نے قیام پاکستان کے بعد ترقی کی اور اس میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ مکان بھی اس نے سال سوا سال قبل تعمیر کیا تھا۔ اور اس کی توسیع کا کام ہنوز جاری تھا۔

رحیم داد کو اس نے ڈیرے کے ایک کمرے میں ٹھہرایا۔ کمرہ سلیتے سے سجایا گیا تھا۔ آرام دہ بھی تھا۔ شام گہری ہو چکی تھی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی۔ باغیچے میں بیٹھنے کے لیے کرسیاں موجود تھیں۔ مگر دونوں وہاں نہ بیٹھے۔ باغیچے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس کے پیچھے ہال نما کشادہ کمرہ تھا جس میں قالین کا فرش تھا۔ صوفے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پردے پڑے تھے۔ یہ رفیع سہ کی بیٹھک تھی۔

بیٹھک میں لیپ روشن تھا۔ نوکروں نے ایک میز پر پہلے ہی تھری ایکس روم کی بوتل رکھ دی تھی جو ہندوستان سے اسکل ہو کر آئی تھی۔ میز پر دو گلاس بھی موجود تھے اور شیشے کے جگ میں پانی بھرا تھا۔ رفیع سہ اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھ گئے اور شراب نوشی میں مشغول ہو گئے۔

دونوں نے رات کا کھانا ساتھ بیٹھ کر کھایا اور سویرے اٹھ کر ناشتا بھی ساتھ ہی کیا۔ دوپہر کے کھانے پر رفیع نے کھل کر بات کی۔ زندہ دل اور یار باش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ صاف گو اور ہنس کھکھ بھی تھا۔ باتوں باتوں میں اس نے رحیم داد سے کہا۔

”چوہدری، میرے بارے میں شاہ جی نے تجھے بتا ہی دیا ہو گا۔ زمیں داری کے ساتھ ساتھ میرا دھندا اسمگلنگ اور رسا گیری بھی ہے۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”رسا گیری کے بغیر زمیں دار دوڑا زمیں دار بن ہی نہیں سکتا۔“

”شاہ جی نے تیرے بارے میں کچھ بتایا تو تھا، پر زیادہ گل بات نہیں ہوئی۔“

رفیع سہ نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”رسا گیری تو زمیں داروں کا کھیل ہے۔ بات یہ ہے جی، زمیں داری تو بچ پوچھو فشی اور کرنڈے چلاتے ہیں۔ زمیں دار خالی بیٹھے بیٹھے کریں بھی کیا۔ وہ دوسروں کے ڈنگر اور موریشی اٹھواتے ہیں۔ مزارعوں کی زنانیاں اٹھا کے انھیں ادھر سے ادھر کرتے ہیں، بیچ دیتے ہیں، یا ر کم لے کر واپس کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھی دوپاریوں کے بیچ میں پڑ کر سودا بھی طے کر دیتے ہیں اور اپنا کمیشن وصول کر لیتے ہیں۔“ وہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”دھندا برا نہیں۔ پر میں زنانیاں اٹھوانے کا دھندا نہیں کرتا۔“

”کیوں نہیں کرتا؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔

”بات یہ ہے چوہدری، میری گھروالی بہت زور آور ہے۔ وہ ہے بھی دڑے گھر کی۔ یہ دھندا اسے

بالکل پسند نہیں۔“

”پر رسا گیری اور اسمگلنگ اسے پسند ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بات سمجھ نہیں آئی۔“

”یار رسا گیری کو وہ کیسے ناپسند کر سکتی ہے۔“ سہ نے بے تکلفی سے کہا۔ ”اس کا پتہ جتنا ڈاڑھ میں دار ہے، رحیم یار خان کا اتنا ہی مشہور رسا گیر بھی ہے۔ میری اس کی جان پہچان اسی چکر میں ہوئی تھی۔ میں اسے ایسا پسند آیا کہ اس نے اپنی دھمی مجھ سے ویاہ دی۔“

”اسے یہ پتہ تھا کہ تو اسمگلنگ بھی کرتا ہے؟“

”بالکل پتہ تھا۔ پر میری گھروالی شروع میں اسمگلنگ کو برا سمجھتی تھی، اب نہیں سمجھتی۔ میرا پنڈ بارڈر کے نزدیک ہی ہے۔ یہ تو تجھے بھی پتہ ہے۔ ادھر رسا گیری اور اسمگلنگ میں بہت آسانیاں ہیں۔ بس ادھر کا مال ادھر اور ادھر کا مال ادھر کرنا پڑتا ہے، فاصلہ بھی کم ہے۔ اب تک بہت آرام سے اپنا کام چل رہا ہے۔ سچی بات یہ ہے اسی کمائی سے میں نے پانچ سو کلا زمین خریدی۔ نئی ماڑی بنوائی، جیپ خریدی۔“ رفیع سہ نے ایک آنکھ دبائی۔ ”میں تو کتنا ہوں چوہدری، تو بھی اپنی ساتھ لین میں لگ جا۔ زمیں داری کا مزا بھول جائے گا۔ اسمگلنگ کا بھی عجب نشہ ہے۔ کمائی تو ایسی ہے، سمجھو روپیہ بارش کی طرح برستا ہے۔“

”بات یہ ہے جی، میں ہوں ماجر۔ زمیں داری بھی کلیم میں نئی نئی ملی ہے۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ ”شاہ جی نے تجھے شاید یہ بات بتائی بھی ہو۔ رہ گئی رسا گیری اور اسمگلنگ، وہ جی میں نے پہلے کبھی نہیں کی۔“

”اب شروع کر دے۔ رینج کی فصل تو تیار ہی ہے۔ واڈھی پر شروع کر دے۔“ اس نے رحیم داد کو سبز باغ دکھایا۔ ”آڑھتی تجھے فصل کی اتنی کمیت کہاں دیں گے جو میں اسمگلنگ کے ذریعے دلاؤں گا۔ دگنی کمیت سے بھی زیادہ مل جائے تو تعجب کی بات نہیں۔“

”نہیں، مجھے اس چکر میں نہ ڈال۔“ رحیم داد سرا سید ہو گیا۔ ”یہ بہت خطرناک دھندا ہے۔“

”کوئی خطرناک خطرناک دھندا نہیں۔“ سہ نے اس کی حوصلہ افزائی کرنے کی کوشش کی۔

”دور سے دیکھو تو خطرہ ہی خطرہ نظر آتا ہے۔ نزدیک آئے گا تو اتنا خطرہ نظر نہیں آئے گا جتنا تو سمجھتا ہے۔“ اس نے گرم جوشی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ ”یار تجھے کیا پتہ، اوپر سے نیچے تک سب کھاتے ہیں۔ اسمگلنگ کی روک تھام کرنے والے تو دبا کے کھاتے ہیں۔ وہ نہ کھائیں تو اسمگلنگ کا دھندا ایک روز نہ چلے۔ نزدیک سے دیکھو گا تو اس دھندے میں تجھے ایسا ایسا چہرہ دکھائی دے گا جس



کے بارے میں تو نے کبھی شبہ بھی نہ کیا ہو گا۔ کیا سمجھا؟“
 رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ رفیع سہ نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اب
 کچھ تیرے کام کے بارے میں بات ہو جائے جس کے لیے تو آیا ہے۔“
 ”وہ تو میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ رحیم داد نے کہا۔

”وہ تو مجھے یاد ہے۔ کل رات چینی اور تیل سے لدے میرے ست اوٹھ سرحد پار جا رہے ہیں۔
 میں اس سلسلے میں شام ہی کو نکل جاؤں گا۔ سارا بندوبست پہلے ہی کرنا ہوتا ہے۔“ اس نے لسی کا
 گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا، چند گھونٹ پئے۔ ہاتھ سے مونچھوں میں لگی ہوئی لسی کے قطرے
 صاف کیے۔ ”آج رات میں نے تیرے ساتھ روٹی نہیں کھائی۔ تو اکیلا ہی روٹی کھا لیتا۔ جس چیز کی
 ضرورت ہو، میرے نوکر اکبر کو بتا دیتا۔ میں سویرے لوٹوں گا۔ جہاں میں جا رہا ہوں ادھر ہریال کا
 بھی ایک کردندہ ہو گا۔ ہے تو وہ سکھ پر اس سے اپنی پرانی یاری ہے۔“

”تو سنتو کھے کی گل تو نہیں کر رہا؟“ رحیم داد نے جھجک کر پوچھا۔
 ”ہاں، میں سنتو کھے ہی کی گل کر رہا ہوں۔ ویسے اس کا اصلی نام سردار سنتو کھ سکھ ہے۔“ رفیع
 سہ نے حیرت زدہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو سنتو کھ کو جانتا ہے؟“
 ”میں اسے بالکل نہیں جانتا، کبھی دیکھا بھی نہیں۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”ہریال جیلہ
 کو لینے آیا تھا تو اس نے میرے سامنے سنتو کھ کا ذکر کیا تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے اتنا پتہ ضرور
 چل گیا تھا کہ وہ اس کے بہت اعتبار کا بندہ ہے۔“

”ٹھیک اندازہ لگایا تو نے۔“ رفیع سہ نے تائید میں کہا۔ ”سنتو کھ اس کے پو کے زمانے کا نوکر ہے۔
 اب تو ادھکڑ ہو گیا ہے۔ داڑھی اور سر کے بال کپٹنے لگے ہیں۔ ہریال اسے بہت مانتا ہے۔“
 ”تب تو سنتو کھ سے جیلہ کے بارے میں ہر بات کا پتہ چل سکتا ہے۔“
 ”چل تو سکتا ہے۔ پر بہت سمجھا بھرا کر گل کرنی ہو گی۔“ رفیع سہ مسکرایا۔ ”تو فکرنہ کر۔ میں
 باتوں باتوں میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گا۔“

”کیا کیا پوچھے گا؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر استفسار کیا۔
 ”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ میں اس سے آج ہی بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی پر کل تجھے
 بتا بھی دوں گا اس سے کیا بات ہوئی۔“
 دونوں کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ سہ اٹھ کر ماڑی میں چلا گیا۔ رحیم داد کچھ دیر کرسی پر بیٹھا
 رہا، پھر اٹھا اور بستر پر جا کر دراز ہو گیا مگر اسے نیند نہیں آئی۔

دن ڈھلے رحیم داد کمرے سے نکلا اور ٹھٹھا ہوا درختوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ کچھ
 فاصلے پر چار دیواری کی قریب دو نو عمر لڑکے انور دڑا کھیل رہے ہیں۔ ان کے لباس بوسیدہ اور میلے
 کپڑے تھے۔ ایک کا قد ذرا ٹھٹھا ہوا تھا، اس کے بال خشک تھے، آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔ عمر نو
 دس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ دوسرا اس کا ہم عمر تھا۔ سر گھٹا ہوا، چہرہ گول منول، قد ذرا دیتا ہوا۔
 وضع قطع سے دونوں کیوں کے بچے نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر کے دو دو ٹکڑے دبے
 تھے۔

ایک نے پتھر اچھالا۔ پتھر کچھ دور جا کر گرا۔ دوسرے کا قد قدرے اونچا تھا۔ اس نے ہاتھ میں
 دبے ہوئے پتھر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ پتھر سامنے پڑے ہوئے دوسرے کھلاڑی کے پتھر کا
 نشانہ باندھ کر ہاتھ میں دبا ہوا پتھر زور سے پھینکا مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔

اب دوسرے کی باری تھی۔ اس نے زمین پر پڑا ہوا اپنا پتھر اٹھایا۔ اس نے بھی اپنے دونوں
 پتھروں کو ایک دوسرے سے ٹکرا کر بجایا۔ ایک ہاتھ اٹھایا اور پہلے کھلاڑی کے زمین پر پڑے ہوئے
 پتھر پر ٹاک کر اس طرح اپنا پتھر مارا کہ وہ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ دونوں پتھروں کے ٹکرانے سے زور
 کی آواز پیدا ہوئی۔

جس کھلاڑی کا پتھر ٹٹ گیا تھا، اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ ہار گیا تھا۔ کھیل کے اصول کی رو سے وہ
 زمین پر دونوں ہاتھ ٹکا کر گھوڑا بن گیا۔ دوسرا اپنی جیت سے سرشار ہنستا مسکراتا آگے بڑھا اور
 اچک کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔

دونوں بچوں کو انور دڑا کھیلنے دیکھ کر رحیم داد کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بہت اچھا کھلاڑی رہ چکا
 تھا۔ اس کا نشانہ بہت کم چوکتا تھا۔ عام طور پر اس کھیل میں جیتتا تھا اور ہارنے والے کھلاڑی کی پیٹھ
 پر شان سے اکر کر بیٹھتا تھا۔ منہ سے ٹخ ٹخ کی آواز نکال کر اسے چھیڑتا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لڑکوں کے قریب پہنچ گیا۔ اوپر بیٹھا ہوا لڑکا ہارنے والے کھلاڑی کو
 ہڑانے کے لیے اس کی پیٹھ دونوں ہاتھوں سے تھپ تھپا کر ہولے ہولے اچھل رہا تھا، قہقہے لگا رہا
 تھا۔ ہارنے والا کھلاڑی اس کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ وہ نجل اور پریشان تھا۔ اس کی گردن جھکی
 ہوئی تھی۔ وہ رک رک کر ہاتھ پیروں کی مدد سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحیم داد کے قدموں کی
 نہٹ سن کر دونوں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ جو کھلاڑی گھوڑا بنا ہوا تھا، وہ آگے بڑھتے بڑھتے ٹھٹکا
 اور رحیم داد کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔ رحیم داد نے نزدیک سے

دیکھا تو اس کی صورت میں اسے اپنے پہلوئی کے بیٹے کریم کی شبابت نظر آئی۔ وہی تیز چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈیاں۔ دیکھنے میں وہ کریم ہی لگتا تھا، مگر کریم تو اپنی ماں نوران کے ساتھ اکال گڑھ میں تھا۔ رحیم داد نے اسے آخری بار وہیں دیکھا تھا۔

کریم یاں کیسے آگیا؟ رحیم داد تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہا۔ لڑکے نے رحیم داد کو اس طرح گھورتے دیکھا تو ایسا گھبرایا کہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی بیٹھ پر بیٹھا ہوا لڑکا اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ وہ پھسلتا ہوا دھڑام سے نیچے گرا اور جھنجھلا کر لڑنے کے لیے تیزی سے اٹھا۔ مگر اس کے اٹھنے سے پہلے ہی دوسرا لڑکا بگٹ بھاگا۔ وہ تیزی سے اس سمت بڑھا جدھر نوکروں اور کیوں کی کچی کوٹھریاں تھیں۔ وہ مڑ مڑ کر رحیم داد کو دیکھتا بھی رہا۔ اس کے چہرے پر سراپسنگی کے ساتھ ساتھ تعجب بھی تھا۔ نیچے گرنے والا لڑکا کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھا۔ رحیم داد کو چند لمحوں تک گھورتا رہا، پھر وہ بھی اسی طرف بھاگا جدھر اس کا سانس ٹپ گیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے دونوں لڑکے درختوں کی آڑ میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

رحیم داد جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ دونوں لڑکے بھاگتے ہوئے ایسے غائب ہوئے کہ دوبارہ نظر نہیں آئے۔ نہ جانے وہ کہاں روپوش ہو گئے تھے۔ ان کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔

رحیم داد مڑا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا باغیچے میں پہنچ گیا۔ شیشم کے ایک گھنے درخت کے نیچے چند کرسیاں اور موٹڑے پڑے تھے۔ وہ تھکا ہوا سا ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا، سائے طویل ہو کر پھیلتے جا رہے تھے۔ ہوا میں تیزی تھی۔ شیشم کے خزان رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے۔

سورج ماڑی کی اونچی مٹی کے عقب میں ڈوب رہا تھا۔ دھوپ نیلی پڑ گئی تھی۔ خنکی ہولے ہولے بڑھنے لگی۔ رحیم داد اٹھا اور ڈیرے کی سمت بڑھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ بیٹے دنوں کی یادوں کے چراغ جل رہے تھے۔ مجھ رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔



شام کا دھندلا آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ نوکرنے لیپ روشن کر دیا مگر رحیم داد کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا۔ اٹھ کر برآمدے میں آگیا۔ سامنے سے رفیع سمہ نمودار ہوا، قریب آیا اور مسکرا کے بولا۔

”چوبدری، میں تو اب جا رہا ہوں۔ تجھ سے کل صبح ملوں گا۔“

”سنو کھا بھی ادھر ہو گا۔ اسے بھی ملے گا ناں؟“

”ہاں، وہ ادھر ہی ہو گا۔ اس نے مجھے پہلے ہی اطلاع بھجوا دی تھی۔ اس سے تولی گل ہو گی۔“

”جیلہ کے بارے میں بھی بات کرنا۔“ رحیم داد نے یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔

”یار! یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”مجھے یہاں اپنے ساتھ لایا کس لیے ہوں۔ جیلہ کے بارے میں تو اس سے بہت سی باتیں ہوں گی۔ اسے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ جیلہ اپنے بھرا ہر دیال کے ساتھ ہے۔“

”کیوں نہیں پتہ ہو گا۔ اسے سب کچھ ملوم ہے۔ جیلہ نے ہر دیال کو بلانے کے لیے جو خط بھیجا تھا، وہ سنو کے ہی نے پہنچایا تھا۔ ہر دیال نے یہ گل میرے سامنے ہی جیلہ کو بتائی تھی۔“ رحیم داد نے رفیع کو آگاہ کیا۔ ”اور دیکھ، اتنا خیال رکھنا سنو کے سامنے تو جیلہ نہیں پاروتی یا پارو کہنا۔ ادھر اس کا یہی نام ہے۔“

”تو پروانہ کر۔“ رفیع سمہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”مجھے پتہ ہے، سنو کے سے کس ڈھب سے بات کرنی ہو گی۔“ اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھی۔ ”مجھے اب چلنا چاہیے۔ تو اپنے کمرے میں جا کر روٹی کھا۔ آرام سے سو۔ دن چاہے تو تھوری سی لگالے۔ اکبرے کہہ دینا، وہ بندوست کر دے گا۔“

”نہیں، آج میرا پینے کا ارادہ نہیں۔ کل تیرے ساتھ بیٹھ کر لگاؤں گا۔“

سمہ نے ہنس کر کہا۔ ”جیسی تیری مرضی۔“ وہ آگے بڑھ کے چھانک کی جانب روانہ ہو گیا۔

شام اب گہری ہو چکی تھی۔ ڈیرے کے کمروں میں روشنی جھل مل رہی تھی۔ رحیم داد کے علاوہ ڈیرے میں دو مہمان اور بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ رحیم داد برآمدے سے نکل کر باہر آگیا۔ اس نے دیکھا، دونوں مہمان ایک کمرے میں چارپائی پر بیٹھے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ بھاول پوری حقے پر کش لگا رہے تھے۔ رحیم داد کی ان سے شناسائی نہ تھی۔ اس کا کمرہ بھی ڈیرے کے ایک گوشے میں بالکل الگ تھلگ تھا۔ رحیم داد کچھ دیر اندھیرے میں گم سم کھڑا رہا پھر وہ مڑا، کمرے کی جانب چلا مگر اندر نہ گیا۔ برآمدے میں دو موٹڑے پڑے تھے۔ درمیان میں جھوٹی میز بھی رکھی تھی۔ وہ ایک موٹڑے پر بیٹھ گیا۔

برآمدے کے آگے جال کے دو اونچے اونچے درخت تھے۔ رات کی آمد آمد تھی۔ درختوں تلے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اکبر نے میز پر کھانا لگا دیا۔ کھانا چٹ پٹا اور خوش ذائقہ تھا۔ رحیم داد نے رغبت سے کھایا۔ کھانے کے بعد لسی کا پورا گلاس

چڑھایا، ڈکاری اور موٹھے پر ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ اکبر کھانے کے برتن اٹھا کر لے گیا۔ رات رفتہ رفتہ کالی کا بل ہو گئی۔ رحیم داد اٹھ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔ بستر پر لیٹا مگر نیند نہ آئی۔ اس کے ذہن پر جیلہ چھائی ہوئی تھی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سناٹا بڑھ گیا تھا۔ رحیم داد کی آنکھ ذرا لگی ہی تھی کہ کھڑکی پر آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں، گردن موڑی اور کھلی ہوئی کھڑکی کی جانب دیکھا۔ لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اندھیرے میں کھڑا کوئی کمرے میں جھانک رہا تھا۔ اسے صرف دھندلا سایہ نظر آیا اور ہلکی سی جھلک۔ رحیم داد نے گردن اونچی کی حیران و پریشان ہو کر کھڑکی کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں اب کوئی نہ تھا۔

رحیم داد کی نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ زور سے کھٹکا را۔ بستر سے نیچے اتر کے کھڑکی پر پہنچا اور سلاخوں کی آڑ سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہر طرف تاریکی کا جال پھیلا تھا۔ ہوا ٹیکھی تھی۔ ہوا کے ایک سرد جھونکے نے رحیم داد کے بدن میں ہلکی ہلکی کچکی پیدا کر دی۔ عین اس وقت درختوں کے خشک پتوں پر دبی دبی چاپ ابھری۔ لیکن اندھیرا اس قدر گہرا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے گردن گھما پھرا کر ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ چاروں طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ سے لگا خاموش کھڑا رہا۔ جب دیر تک کوئی آہٹ

آبھری نہ آواز آئی تو وہ واپس جا کر بستر پر دراز ہو گیا۔ نیند اڑ چکی تھی۔ وہ بستر پر چپ لیٹا رہا۔ اس کی نظریں بار بار کھڑکی کی جانب اٹھ جاتیں۔ کھڑکی کے باہر گھنے درخت تھے۔ پتہ جھڑ لگ چکا تھا۔ خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے اور ہوا کے پھرے ہوئے جھونکوں سے آہستہ آہستہ کھڑکھڑا رہے تھے۔ رات گزرتی رہی۔ سردی بڑھ گئی۔ آخر رحیم داد کی آنکھ لگ گئی۔

رفیع سمہ آدمی رات کے بعد واپس آگیا تھا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات سویرے ناشتے پر ہوئی۔ اس وقت بھی آسمان پر بادلوں کا غبار چھایا تھا۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کو بوندا باندی بھی ہوئی تھی۔ موسم اچانک بدل گیا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ صبح خشک اور دھندلی تھی۔

رحیم داد نے رفیع سمہ سے دریافت کیا۔ ”سنو کھے سے بھی تیری ملاقات ہوئی؟“

”بالکل ہوئی۔“ سمہ نے مسکرا کے جواب دیا۔ ”اس سے بہت ساری باتیں ہوئیں۔“

”جیلہ کے بارے میں بھی گل بات ہوئی؟“

”کیوں نہیں ہوئی۔“ رفیع سمہ اس کی بے چینی پر مسکراتا رہا۔ جان بوجھ کر مختصر جواب دیتا رہا۔

”جیلہ کے بارے میں دیر تک بات ہوئی۔“

”کیا کہتا تھا وہ؟“ رحیم داد تفصیل معلوم کرنے کے لیے بے تاب تھا۔

”تو نے جیلہ کے بارے میں ٹھیک ہی سوچا تھا۔“

”کیا؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”صاف صاف گل کر۔“

”سنو کھا کہتا تھا، جیلہ کے فیروز پور پہنچنے پر تو سب بہت خوش تھے، امرت سر سے ہریال کے دو بھائی رام دیال اور منو ہریال، جیلہ سے ملنے اپنے بال بچوں کے ساتھ فوراً پہنچے۔ جلدی سے چھوٹا بھائی ایٹور دیال بھی پہنچا۔“

رحیم داد نے استفسار کیا۔ ”کیا سب بھائی ساتھ نہیں رہتے؟“ حالانکہ وہ جلیل کے حوالے سے نادر خاں کی زبانی سن چکا تھا کہ جیلہ کے بھائی علیحدہ علیحدہ رہتے ہیں۔ مگر وہ نادر خاں سے سنی ہوئی ہر بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں!“ رفیع سمہ نے مطلع کیا۔ ”ہریال فیروز پور میں رہتا ہے۔ ماں بھی اس کے ساتھ ہی رہتی ہے۔ ہریال اپنے سالے کشوری لال کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ رام دیال اور منو ہر اپنا الگ بیوپار کرتے ہیں۔ وہ امرت سر میں ہوتے ہیں اور سب سے چھوٹا ایٹور دیال جلدی میں ہے۔“ اس نے رحیم داد کا چہرہ غور سے دیکھا۔ ”جیلہ تیرے پاس سے گئی تو ہریال کے ساتھ ہی ٹھہری تھی۔“

”وہ تو ابھی تک ہریال کے ساتھ ہی ہوگی؟“

”نہیں اب وہ فیروز پور میں نہیں ہے۔ وہ ہریال کے گھر سے چلی گئی۔“

رحیم داد نے پوچھا۔ ”وہ کہاں چلی گئی؟“

”ہریال کی گھروالی سے اس کا زبردست جھگڑا ہو گیا۔ جھگڑا تو پہلے بھی کئی بار ہوا پر اس دفعہ کچھ زیادہ ہی زوردار ہوا۔“

”کس بات پر جھگڑا ہوا؟“

”سنو کھا کہتا تھا، ہریال کی گھروالی غصے کی بہت تیز اور جھگڑا لو ہے۔ چھوٹ چھات بھی بہت کٹی ہے۔ جیلہ کے بچے اس کے برتن یا روٹی چھو لیتے یا رسوٹی میں چلے جاتے تو وہ سخت زراض ہوتی۔ انھیں مارتی پیٹتی، چیتتی چلاتی۔ جیلہ بولتی تو اسے طعنے دیتی۔“ رفیع سمہ نے رحیم داد کو کسی قدر تفصیل سے بتایا۔ ”بس جی، ایسی ہی باتوں پر جھگڑا شروع ہوا اور اکثر ہوتا رہا۔ ہریال گھروالی کو تلخ کرتا۔ ڈانٹ پھینکا بھی کرتا پر اس کی گھروالی بہت چنڈال ہے۔ ہریال سے ڈانٹ کھا کر ٹسوے لانے بیٹھ جاتی۔“

”شکر سے تو نہیں ملا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”نہیں۔“ رفیع سمہ نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”وہ ہوشیار پور گیا ہے۔ واپسی پر اس سے ملوں گا۔ اس سے بھی میری بہت یاری ہے۔“

”وہ کب تک واپس آئے گا؟“

”یہ تو مجھے پتہ نہیں۔“ سمہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”ایسا کر تو کچھ روز اور یہاں ٹھہر جا۔“

”میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔“ رحیم داد نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”یہ بھی تو ٹھیک سے پتہ نہیں وہ کب لوٹے گا۔“

”میں نے آج رات بھی جانا ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی نکل جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے، آج ہی رات شکر سے ملنا ہو جائے۔“

”ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک ہے۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔

”شکر سے گل بات ہو گئی تب تو میں کل سویرے آ جاؤں گا۔“ سمہ مسکرایا۔ ”تیرے ہی لیے آؤں گا ورنہ میرا پروگرام تو دو روز بعد لوٹنے کا تھا۔“

”اگر تو سویرے نہ آیا تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ شکر سے تیری ملاقات نہیں ہوئی۔ تو نہ لوٹا تو میں سویرے واپس چلا جاؤں گا۔“

”جیسی تیری مرضی، لیکن میں چاہتا تھا کہ تو کچھ روز ٹھہر جاتا۔“

”کیا کیوں گا ٹھہر کر۔ دو روز تک تو بھی ادھر نہیں ہو گا۔ اکیلے میں دل گھبرائے گا۔ ویسے کوئلہ ہرکشن میں مجھے کئی ضروری کام بھی کرنے ہیں۔“

رفیع سمہ نے مزید اصرار نہیں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ جلد ہی اٹھ کر چلا گیا۔ رحیم داد نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

شام کو رفیع سمہ کمرے میں آیا۔ بادل آسمان پر چھائے تھے۔ سمہ اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔

رحیم داد نے کہا۔ ”سر دی بہت ہے، ہوا بھی تیز ہے۔ بارش بھی ہو سکتی ہے۔ ایسے میں تو کیسے جائے گا؟“

”ایسا موسم تو اپنے کام کے لیے بالکل ٹھیک ہوتا ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”بیٹہ کرا رام سے گل کر۔“ رحیم داد اس سے بات چیت کرنا چاہتا تھا۔

”نہیں، مجھے اب جانا ہے۔ باہر جیب تیار رکھڑی ہے۔“

”تو سویرے نہیں آیا تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ تو شکر سے ملنے کے بعد میرے پنڈ آجانا۔ میں

”بہت خراب زبانی ہے۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

”ہاں جی بہت خراب ہے وہ۔ سنتو کھا بھی یہی کہتا تھا۔“ رفیع سمہ نے رحیم داد کی تائید کی۔ ”کئی مہینے پہلے کا ذکر ہے۔ ہر دیال گھر پر نہیں تھا، چند ہی گز گھبرا گیا تھا۔ ادھر اس کی گھر والی نے جیلہ سے سخت جھڑا کیا۔ نکلی نکلی گالاں بھی نکالیں۔ مارنے کو بھی بار بار جھپٹی۔ جیلہ رونے لگی۔ دیر تک روتی رہی۔ سنا ہے، اسی روز اس نے گھر چھوڑ دیا اور بچوں کو بھی ساتھ لے گئی۔“

”کہاں چلی گئی تھی۔ سنتو کھا کیا بتاتا تھا؟“

”وہ بتاتا تھا جیلہ اپنے بچوں کے ساتھ منو ہر دیال کے پاس امرت سرگئی تھی۔“

”تب تو اسے امرت سر میں ہونا چاہیے۔“

”نہیں، منو ہر کی گھر والی سے بھی اس کی ان بن ہو گئی۔ کچھ دن وہ رام دیال کے ساتھ بھی

ٹھہری رہی۔“

”اب کہاں ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”امرت سر سے وہ ایشور دیال کے پاس جلد ر چلی گئی۔ بلکہ ہوا یہ کہ ایشور دیال اسے امرت سر

اپنے ساتھ لے گیا تھا۔“

”ہر دیال اسے مٹانے نہیں گیا؟“

”امرت سر بھی گیا تھا، جلد ر بھی پہنچا۔ سنتو کھا کہتا تھا ہر دیال نے جیلہ کو مٹانے اور اپنے ساتھ

فیروز پور لانے کی بہت کوشش کی پر اس نے صاف انکار کر دیا۔“

”مطلب یہ کہ جیلہ اب فیروز پور میں نہیں، جلد ر میں ایشور دیال کے ساتھ ہے۔“

”سنتو کھا تو یہی بتاتا ہے۔“ سمہ نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔

”سنتو کھے کی باتوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ایشور دیال کی گھر والی سے تو جیلہ کا جھڑا مٹا نہیں ہوا

چھوٹ چھات تو وہ بھی کرتی ہوگی؟“

”جلندر کے بارے میں سنتو کھے کو کچھ پتہ نہیں۔“ رفیع سمہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ زیادہ

ترفا نکلا میں رہتا ہے۔ جلندر اس کا بالکل جانا نہیں ہوتا۔“

”ادھر کے بارے میں کیسے پتہ چلے گا؟“ رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”لگتا ہے

تو نے جیلہ کے بارے میں پوری طرح پتہ نہیں کیا۔“

”فکر نہ کر۔“ سمہ نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”جلندر کا حال احوال شکر سے معلو

ہو سکتا ہے۔ وہ پچھلے دنوں ادھر ہی تھا اور ایشور دیال ہی کے گھر ٹھہرا تھا۔“

تیرا انتظار کروں گا۔

رفیع سہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”میں تیرے پاس ضرور آؤں گا۔ شکر سے جو کچھ جیلہ سے بارے میں پتہ چلے گا تجھے بتا دوں گا۔“

”یہ بتا، تیرے کہنے پر شکر بلند رہا کہ میرا سندیہا جیلہ تک پہنچا سکتا ہے؟“ رفیع داد سے دریافت کیا۔

”ابھی تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شکر سے ملنے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔“

”ایسے کام نہیں چلے گا۔“ رفیع داد نے اپنے بات پر زور دیا۔ ”یہ کام تو شکر سے کرانا ہی پڑے گا۔ شکر تیرا گماریا رہے۔ وہ ضرور یہ کام کر دے گا۔“

”میں کب انکار کر رہا ہوں۔ تھوڑا صبر کر۔ شکر سے میری گل بات تو ہو جائے۔“ رفیع سہ نے رفیع داد کو یقین دلایا۔ ”سویرے نہ آیا تو تیرے ہنر ضرور آؤں گا۔ تو اطمینان رکھ۔ میں شکر سے ملنے ہی تیرے پاس آؤں گا۔“

رفیع سہ مڑا۔ رفیع داد اس کے ساتھ ساتھ چھانک نک گیا۔ گرم جوشی سے اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ وہ جیب میں بیٹھ کر چلا گیا۔



رات کا کھانا کھانے کے بعد رفیع داد باہر نہیں گیا، بستر پر لیٹ گیا۔ رات سنسان ہوتی گئی، تاریک اور سرد ہوتی گئی۔

ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پھنپھڑا رہی تھی۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے، کھڑکھڑا رہے تھے۔ رفیع داد آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا مگر وہ سو نہیں سکا۔

آہستہ سے آہٹ ہوئی۔ رفیع داد نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی کی جانب مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا، البتہ دروازے پر رک رک کر آہٹ ابھر رہی تھی۔ کوئی ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ دروازہ بند تھا مگر رفیع داد نے زنجیر نہیں چڑھائی تھی۔ اس نے سوچا، ڈیرے کا ملازم اکبر کسی کام سے آیا ہو گا۔ رفیع داد نے کوٹ بدل کر دروازے کی سمت دیکھا اور آواز ذرا اونچے کرتے ہوئے بولا۔

”دروازہ کھلا ہے، اندر آجا۔“

دروازے کا ایک پٹ چڑھتا ہوا دھیرے سے کھلا، کوئی جھپاک سے کمرے میں داخل ہوا

اس نے مڑ کر جھٹ دروازہ بند کر دیا۔ اس کی پشت رفیع داد کی طرف تھی مگر وہ اکبر نہیں تھا، کوئی عورت تھی۔ وہ پلٹی تو رفیع داد ششدر رہ گیا۔ اس نے پہلی نظر میں اسے پہچان لیا۔ وہ اس کی بیوی نوراں تھی۔ وہ دروازے سے بیٹھ نکلا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی حیران اور گھبرائی ہوئی نظریں رفیع داد کی سمت تھیں۔ وہ سسکی ہوئی تھی اور سردی سے کپکپا رہی تھی۔

رفیع داد اٹھ کر کتیکے کے سہارے بیٹھ گیا۔ اس نے نوراں کو پہچان کے بھی انجان بننے کی کوشش کی۔ بے رخی سے بولا۔ ”کون ہے تو؟“

”آہستہ بول۔“ اس نے رسان سے کہا۔ ”میں نوراں ہوں۔“

”کون نوراں؟“ رفیع داد نے بے اعتنائی سے پوچھا۔

نوراں نے کچھ نہ کہا۔ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور رفیع داد کے روبرو کچھ فاصلے پر رک کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رفیع داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تو نوراں کو نہیں جانتا؟“

”میں کسی نوراں شوراں کو نہیں جانتا۔“ رفیع داد نے بے زاری سے کہا۔ ”تو یہاں کیسے آئی؟ کس لیے آئی؟“

”تجھے ملنے آئی ہوں۔“ وہ نظریں جھکا کر بولی۔

”مجھ سے!“ رفیع داد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں تو تجھے جانتا بھی نہیں۔ مجھ سے تجھے کیا لیا؟“

نوراں کچھ نہ بولی۔ کھوئی کھوئی سی کھڑی رہی۔ اس کے پیروں میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ وہ نیلی دھوئی باندھے ہوئے تھی۔ جھگاموٹی سفید لمبل کا تھا۔ دوپٹہ ہلکا بنستی تھا۔ وہ پھول دار کھیس اوڑھے ہوئی تھی۔ اس کا لباس دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے آج ہی کپڑے دھو کر پہنے تھے۔ سردی کے باوجود غسل بھی کیا تھا۔ آنکھوں میں کاجل اور سر میں تیل ڈالا تھا۔ اس کا چہرہ روکھا اور زردی مائل تھا۔

رفیع داد نے محسوس کیا کہ نوراں کے رخساروں کے شکستہ پھول مرجھا گئے ہیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں، جن میں کبھی ستارے جھلکاتے تھے، اب بھ کر ویران ہو گئی ہیں۔ اس کا چمکتا دمکتا حسن ابڑ گیا تھا۔ چمکتی بولتی جوانی ڈھلک گئی تھی۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر کھنڈر بن گئی تھی۔

رفیع داد نے اسے چھیڑا۔ ”تجھے اکبر نے میرے پاس بھیجا ہے؟“

”وہ مجھے تیرے پاس کیوں بھیجنے لگا؟“ اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔ وہ

گردن جھکا کر دبی زبان سے بولی۔ ”میں تو خود تیرے پاس آئی ہوں۔ کل رات بھی آئی تھی۔ پر اندر آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔“

”لگتا ہے پچھلی رات تو کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ تو ہی تھی ناں؟“

”ہاں، میں ہی تھی۔“ اس کی آواز میں تھر تھراہٹ تھی۔

”پر تو آئی کیوں؟“ رحیم داد تخی سے بولا۔

نوراں ایک بار پھر چپ ہو گئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور رحیم داد کے چہرے کو اس طرح نکتے لگی گویا کچھ تلاش کر رہی ہو۔ رحیم داد اس کی متلاشی اور نوکیلی نظروں کی تاب نہ لاسکا۔ گھبرا گیا۔ سرا سید ہو گیا۔ اس نے جھٹ گردن موڑی۔ ہاتھ بڑھایا۔ سرہانے رکھی ہوئی بینک اٹھائی اور آنکھوں پر لگائی۔

وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ اس کی نظریں بدستور رحیم داد کی جانب اٹھی تھیں۔ ان میں تلاش تھی، جستجو تھی۔

رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہی ہے؟“

نوراں اس کے لہجے کی تلخی نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”بالکل ویسی ہی آنکھیں وہی متھا۔“ وہ کچھ اس انداز سے بول رہی تھی جیسے خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔ ”پہلے داڑھی نہیں تھی۔ آنکھوں پر عینک بھی نہیں ہوتی تھی۔ گال پر چوٹ کا یہ نشان بھی نہیں تھا۔“

رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ ”تو کتنا کیا چاہتی ہے؟“ اس کے لہجے سے پریشانی اور گھبراہٹ صاف عیاں تھی۔

وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھی اور رحیم داد کے سامنے فرش پر دونوں گھٹنے اٹھا کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کے چہرے کو ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ نرمی سے بولی۔ ”مجھے تو پتہ بھی نہ تھا۔ کریم نے تجھے ادھر درختوں تلے دیکھا تھا۔ بھاگتا ہوا میرے پاس آیا۔ میرا ہتھ پکڑ کر باہر لایا۔ تو سامنے بیٹھا تھا۔ میں اور کریم درختوں کی آڑ سے چوری چوری تجھے دیکھتے رہے۔ کریم تو تیرے پاس جانے کے لیے بچل رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا۔ پر میں نے اسے روک لیا۔“

رحیم داد نے ایک بار پھر انجان بننے کی کوشش کی۔ ”یہ کریم کون ہے؟ وہی منڈا تو نہیں جو کل دن ڈھلے درختوں تلے انور وڑا کھیل رہا تھا۔ پر وہ تو دوتھے۔ ان میں کریم کون سا تھا؟“

”وہی تھا جس کی آنکھیں اور ناک تیری ہی طرح ہیں۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ ”وہ میرا وڈا پتر

کریم داد ہے۔ آج بھی دن بھر تجھے چھپ چھپ کر دیکھتا رہا۔ وہ تو تیرے کمرے میں آنا بھی چاہتا تھا۔ پر میں نے اسے منع کر دیا۔“

”میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔“ رحیم داد نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔ تجھے بھی نہیں جانتا۔“

نوراں تڑپ کر بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”جج جج بتا تو رحیم داد ہی ہے ناں؟ میں کسی کو یہ بات نہیں بتاؤں گی۔“

”تیرا مغز تو نہیں فیروز گیا۔“ رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے کہا۔ ”میں کسی رحیم داد خیم داد کو نہیں جانتا۔ جانے تو کس کی گل کر رہی ہے۔“

”تو تو کون ہے؟“ نوراں نے انکلتے ہوئے پوچھا۔

”میراں ناں چوہدری نور الہی ہے۔“ رحیم داد نے خفگی کا اظہار کرنے کی غرض سے قبر آلود نظروں سے دیکھا۔ ”تو یہاں سے جا۔ مجھے تنگ نہ کر۔“

”زراض نہ ہو۔ میں چلی جاؤں گی۔“ وہ کسی قدر عاجزی سے بولی۔ ”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ مجھے ہی دھوکا ہوا۔ تو مجھے کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے تو کادر آباد کے مہوں کے درمیان کتل کر دیا گیا۔“

”کون تھا وہ؟“

”وہ میرا گھروالا تھا۔“ نوراں کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی چمک لہرائی۔ ”مجھے بہت پیار کرتا تھا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ”آنکھوں کی چمک دکھ ماند پڑ گئی۔ اب تو اسے مرے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے۔“

”کیا کرتا تھا وہ؟“ اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ کھردرا نہ تھا۔

”زمین دار تھا۔“ نوراں نے فخر سے گردن اونچی کرتے ہوئے بتایا۔ ”بارہ کلا سے اوپر اپنی زمین ہوتی تھی۔“

”تیری زمین داری کا کیا بنا؟“

”مجھے کے مرنے کے بعد ختم ہو گئی۔“ نوراں کی آواز میں درد کی کک تھی۔ ”گھر بار سب کچھ اجڑ گیا۔“ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے احمد کوٹ تو دیکھا ہو گا؟“

”نہیں، میں کبھی ادھر نہیں گیا؟“

”تو رہنے والا کہاں کا ہے۔“ نوراں نے پوچھا۔

”میں گورداسپور کا ماجر ہوں۔ موضع نصیر پور میں میرا گھر ہوتا تھا۔ ادھر اپنی زمیں داری بھی تھی۔ فسادات میں سب کچھ جاتا رہا۔ میں بچ بچا کر پاکستان آگیا۔“

”ادھر آکر کیا کر رہا ہے؟“

”کوئلہ ہرکشن میں میری زمیں داری ہے۔ کلیم میں چوی مرے الاٹ ہوئے تھے۔“ رحیم داد نے نوراں کو بتایا۔

”تب تو وڈا زمیں دار ہوا تو پر اپنی زمین پر تو سیف اللہ کے بھائیوں نے زبردستی کبضہ کر لیا۔ ابھی تک ان کے پاس ہے۔“

”کیوں کبضہ کر لیا انھوں نے؟“

”سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ساتھ رچھے کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ انھوں نے کھیتوں کی وٹ بندی کی آڑ میں ہماری زمین دہالی تھی۔ جھگڑے میں سیف اللہ زخمی ہو کر اسپتال چلا گیا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔“ نوراں سنبھل سنبھل کر بول رہی تھی۔ ”سیف اللہ بعد میں اسپتال میں مر گیا۔ اس کے بھائیوں نے بدلہ لینے کے لیے رات کے اند میرے میں میرے گھر کو آگ لگا دی۔ میرا چھوٹا پتر شیشا لگ سے جل کر مر گیا۔ میں کریمے اور چھوٹی کڑی، زیو کو لے کر اسی رات احمد کوٹ سے نکل گئی۔ وہ تو مجھے اور میرے سارے ہی بچوں کو کتل کر دیتا چاہتے تھے۔ پر جمال دین نے بچا لیا۔ وہ مجھے اور بچوں کو لے کر اکال گڑھ آگیا۔“

”یہ جمال دین کون ہے؟“ رحیم داد ہر تفصیل نوراں کی زبانی سننے کے لیے کوشاں تھا۔

”رچھے کا بچپن کا ساتھی رہا ہے۔ دونوں میں بہت گہری یاری تھی۔ میں اکال گڑھ میں اسی کے ساتھ رہتی تھی۔“ بات کتے کتے وہ لمحہ بھر کے لیے ہٹکی۔ ”تو کبھی اکال گڑھ تو نہیں گیا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے صاف انکار کر دیا۔ مگر فوراً ہی اس کے دل کا چور بول اٹھا۔ ”یہ بات تو مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہے؟“

”میں جن دنوں اکال گڑھ میں ہوتی تھی، ایک رات مجھے تیری ہی طرح کا ایک بندہ اپنے گھر کے اندر نظر آیا تھا۔ وہ دیوار کد کر چوری سے آیا تھا۔“

”ہو گا کوئی۔ چوری چکاری کرنے آیا ہو گا۔“

”گھر میں دھرا ہی کیا تھا جو کوئی چوری کرنے آتا۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولی۔

”تجھے سزا دیا ہو گا۔“ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”جمال دین بھی پہلے ہی کہتا تھا۔ پر صبح میں نے اور جمال دین نے گھر کے پچھواڑے گلی میں

پروں کے نشان دیکھے۔ دیوار پر بھی نشان تھے اور گھر کے اندر آگن میں بھی گھاس کے منٹے کے پاس نشان نظر آئے۔ وہ وہیں چھپ کر بیٹھا تھا۔“



رحیم داد کو یاد آگیا کہ اکال گڑھ پہنچ کر اس نے کس طرح گھر کی دیوار پھاندی، اندر گیا۔ صحن میں بے خبر سوتے ہوئے کریمہ اور زیو کے رخساروں اور پیشانیوں کو چوما، کوٹھری کی طرف گیا۔ دروازے کی جھری سے اندر دیکھا۔ نوراں اس وقت جمال دین کے پہلو میں لیٹی تھی۔ پھر وہ اشتعال انگیز منظر اس کی نظروں کے سامنے آگیا جب جمال دین اسے بازوؤں میں اٹھائے برآمدے میں کھڑا تھا۔ نوراں نے اپنا ایک ہاتھ پیار سے جمال دین کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ وہ گھاس کے ڈھیر کے عقب میں دیکھا ہوا جمال دین اور نوراں کو دیکھ رہا تھا۔

ان یادوں کے ساتھ ہی رحیم داد کا سینہ سلگنے لگا۔ غصے اور نفرت کا اچانک ایسا شدید حملہ ہوا کہ آنکھوں سے گویا دھواں اٹھنے لگا۔ اس نے جھٹ آنکھوں پر سے عینک اتاری اور انھیں ہتھیلوں سے ملنے لگا۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں ملتا رہا۔

اس نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تیری باتیں بہت سن لیں۔ اب تو یہاں سے رُ جا۔ مجھے نیند ملوم ہو رہی ہے۔“

”تو کہتا ہے تو چلی جاؤں گی۔ زراض نہ ہو۔“ وہ عاجزی سے بولی۔ ”مجھے تھوڑی دیر اور بیٹھا رہنے دے۔“

رحیم داد کو جمال دین بھی اپنے لیے خطرہ معلوم ہوا۔ وہ اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ دونوں ایک ساتھ کھیل کود کر ایک ہی گاؤں میں پلے بڑھے تھے۔ وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ اس کا پہچان لینا بہت خطرناک ہوتا۔ وہ اس کا رقیب تھا اور اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس نے جمال دین کے بارے میں ٹوہ لگانے کی کوشش کی۔

”یہاں بیٹھ کر کیا کرے گی۔ جمال دین تیرا انتظار کرتا ہو گا۔“

”جمال دین میرا کیوں انتظار کرنے لگا؟“ وہ منہ بگاڑ کر نفرت سے بولی۔ ”وہ تو مجھے چھوڑ کر کب کا چلا گیا۔“

”کہاں چلا گیا؟“ رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔

”سنا ہے جنگ میں ہوتا ہے۔ ادھر اس نے ویاہ بھی کر لیا۔“ نوراں کے چہرے پر نفرت جھنجھلاہٹ بن کر ہنوز چھائی ہوئی تھی۔

”تجھ سے اس نے نکاح شکاح نہیں کیا تھا؟“ رحیم داد کو نور اس کو کریدا۔ ”تجھے اس نے ایسے ہی رکھ چھوڑا تھا۔“

”کیسا نکاح؟ کہاں کا ویاہ؟ خالی لارے دیتا تھا۔ جھوٹ بولتا تھا۔ کیواس کرتا تھا۔“ نور اس غصے سے پھٹ پڑی۔ ”ٹھیک ہی ہوا۔ نکاح ہو جاتا تو جانے وہ کیا کرتا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”تجھے کیسے بتاؤں وہ کتنا برا بندہ تھا۔ اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔“

”کیا کیا اس نے؟“ رحیم داد کو جمال دین کے خلاف نور اس کی نفرت انگیز باتوں سے راحت مل رہی تھی۔

”یہ پوچھ کیا نہیں کیا اس نے۔“ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ ”رہما جب جیل میں تھامیں ہر ملاکات پر احمد کوٹ سے اسے ملنے جیل جاتی تھی۔ تجھے پتہ نہیں مجھے اس سے کتنا پیار تھا۔ میں اس کے لیے کتنا روکتی تھی۔“

”جب ہی تو نے جمال دین سے یاری لگائی تھی۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”اب کتنی ہے مجھے رنج سے بہت پیار تھا۔ میں اس کے لیے روکتی تھی۔“

”تجھے پتہ نہیں جمال دین نے مجھ سے یاری لگانے کے لیے کیا چکر چلایا۔ یاری میں نے نہیں اس نے لگائی تھی۔“ نور اس نے صفائی پیش کی۔ ”اس نے مجھے ہر کیا کہ رنجہ کی سیف اللہ کی بھین کے ساتھ یاری تھی۔ وہ اسے چھپ کر ملتا تھا۔ جھگڑا تو اصلی یہی تھا۔ زمین اور وٹ بندی کا تو بہانہ تھا۔“

”تو نے آنکھیں بند کر کے اس کی ہر بات مان بھی لی۔“

”میں نے اس کی بات پہلے بالکل نہیں مانی تھی۔“ نور اس نے وضاحت کی۔ ”فیر اس نے ایسا کیا، مئی کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ مئی بھی رنجہ کا پرانا یار تھا۔ ہر دم اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ جمال دین کے سکھانے پڑھانے پر اس نے بھی رنجہ کے بارے میں ایسی ہی باتیں کیں۔ میں دونوں کے بھکانے میں آگئی۔ مجھے رنجہ پر اتنا کھٹ آیا کہ اسے ملنے جیل جانا بھی چھوڑ دیا۔“

رحیم داد نے بالکل انجان بن کر دریافت کیا۔ ”رہما جیل سے رہا ہونے کے بعد تجھے ملنے نہیں آیا؟“

”وہ جیل سے رہا ہی کب ہوا تھا۔ وہ ایک اور کیدی کے ساتھ جیل سے فرار ہو گیا تھا۔ جیل سے بھاگنے کے بعد وہ مجھے کبھی نہیں ملا۔ مل جاتا تو میں جمال دین کے ہاتھوں اس طرح برباد کیوں ہوتی۔“

”پر جمال دین نے تجھے چھوڑ کیوں دیا؟“

”وہ پکا بڈھڑا تھا۔ کرتا دھرتا کچھ نہیں تھا۔ دن بھر گھر میں پڑا رہتا۔ شام کو نکلتا تو نشہ کر کے آتا۔ اس نے میرے سارے زیور اور کپڑے لئے بیچ ڈالے۔ جب کچھ نہ رہا تو ادھار مانگنے کے لیے پاس پڑوس میں بھیجتا۔“ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ”ایسے کب تک کام چلتا۔ ادھار ملنا بھی بند ہو گیا تھا۔ کوئی کب تک ادھار دیتا۔“

نور اس بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی۔ سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”فیر کیا ہوا؟“

”ہو نیا کیا تھا۔ میں ادھار نہ ملنے پر خالی ہاتھ واپس آتی تو وہ نگلی نگلی گالوں نکالتا۔ مجھے زمین پر گرا کر ٹھڈے مارتا۔ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا۔ منت کرتی تب بھی نہ مانتا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بچے کئی کئی دکھت بھوکے رہتے۔ بھوک سے بلبلا کر روتے تو وہ انھیں بھی مارتا۔“

”تو اسے چھوڑ کر کہیں اور چلی جاتی۔“

”سوچا تو کئی بار پر سمجھ نہیں آتی تھی کیا کروں۔ ایک رات ایسا ہوا۔ وہ نشے میں دہت ہو کر لوٹا۔ مجھے اور بچوں کو مارا۔ اس رات اس نے مجھے بہت مارا تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تو وہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ نشے کی دہن میں خود ہی بتانے لگا کہ رنجہ کے بارے میں اس نے اور مئی نے جو کچھ کہا تھا، سب جھوٹ تھا۔ رنجہ سے تو سیف اللہ کی بھین کی نہ کبھی ملاکات ہوئی نہ گل بات۔“

”یہ طوم ہونے کے بعد بھی تو اس کے ساتھ رہی۔“

”وہ ایسا ہوا کہ جب مجھے اصلی گل کا پتہ چلا تو بہت کھٹ آیا۔ اس رات میں نے اسے چھوڑنے کا پکا ارادہ کر لیا۔“ نور اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”کب تک اس کی مار کھاتی۔ اس کے جھوٹ کا بھی پتہ چل گیا تھا۔“ اس نے رحیم داد کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ”رات کو جب وہ مست ہو کر سو گیا تو میں نے بچوں کو ساتھ لیا۔ چوری سے گھر کے باہر آئی اور سورج نکلنے سے پہلے نظام اولیا پہنچ گئی۔ ادھر میری رشتے کی ایک میمیری رہتی ہے۔ میں اس کے پاس ٹھیر گئی۔“

”جمال دین کو تیرے نظام اولیا جانے کا پتہ نہ چلا؟“

”بالکل چل گیا تھا۔ وہ مجھے لینے وہاں آیا۔ منت بھی کی۔ پر میں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ مجھے گالوں نکالتا ہوا چلا گیا۔ دوبارہ نہ آیا۔“

”تجھے یہ کیسے پتہ چلا کہ جمال دین جھگ چلا گیا اور اس نے ادھر ویاہ بھی کر لیا؟“ رحیم داد نے نور اس کو چھیڑا۔ ”اس کو منانے جھنگ گئی ہوگی۔“

”وہ گہری نیند سو رہے ہیں۔ سویرا ہونے سے پہلے نہیں جاگیں گے۔ تو ان کی فکر نہ کر۔“
 رحیم داد کو اس کے رویے سے اندازہ ہوا کہ وہ جانا نہیں چاہتی۔ اس نے نور ان سے چچھا
 چڑانے کے لیے بے زاری سے کہا۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی بتا دیا کہ میں تیرا رخصت نہیں ہوں۔ میں
 نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔ میں چوہدری نور الہی ہوں۔ گورداسپور کا مہاجر۔ مجھ سے تجھے کیا
 لینا۔ اب تو جا کر سو۔ بہت رات ہو گئی۔ مجھے بھی نیند آرہی ہے۔“
 اس نے جہاں لینے کے لیے منہ کھولا۔

مگر نور ان نہ گئی۔ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھی رہی۔ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔
 آہستہ سے بولی۔ ”جانے کیوں تیرے پاس سے جانے کو دل نہیں کرتا۔ تجھے نیند آرہی ہے تو سو جا۔
 میں یہیں بیٹھی رہوں گی۔ کسی بھی دکھت اٹھ کر چپ چاپ چلی جاؤں گی۔“
 ”تو یہاں کیوں بیٹھی رہنا چاہتی ہے؟“
 ”تجھے دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے میں اپنے رخصت کے پاس بیٹھی ہوں۔ سچ کہہ رہی ہوں مجھے بالکل
 ایسا ہی لگ رہا ہے۔“

”رخصت سے تجھے بہت پیار تھا۔؟“
 ”ہاں جی۔“ اس نے آہستہ آہستہ سر ہلایا۔ ”مجھے اس سے بہت پیار تھا۔ ایسا لگتا ہے اس کے
 بعد میری زندگی میں کچھ نہیں رہا۔“

”ایسا کر کسی سے نکاح کر لے۔ ابھی تو جوان ہے۔“ رحیم داد نے اسے مشورہ دیا۔
 ”کہاں جوان رہی۔“ وہ شرما گئی۔ نظریں نیچی کرتے ہوئے بولی۔ ”اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ تو
 نے مجھے پہلے نہیں دیکھا۔ میں ایسی نہ تھی۔“ اس کا لہجہ دل گرفتہ ہو گیا۔ ”میں نے اب کسی سے
 نکاح شکار نہیں کرنا۔ دکھ اور تنگی کے جتنے دن ہیں کسی نہ کسی طرح کاٹ لوں گی۔ میرا کریمہ جوان
 ہو گیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو اسی کے سمارے زندہ ہوں۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ نور ان بھی سر جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔ کمرے میں سکوت تھا۔ باہر
 درختوں تلے خشک پتے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ پت جھڑکی رات اور کالی ہو گئی۔ ڈیرا انسان تھا۔
 سب سو گئے تھے۔ صرف نور ان اور رحیم داد جاگ رہے تھے۔

رحیم داد نے نظریں اٹھا کر نور ان کی جانب دیکھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اس کے سفید
 نچے کا ایک بٹن ٹوٹا ہوا تھا۔ گریبان دور تک کھلا تھا۔ یس کی زرد زرد دم روشنی میں اس کے
 گورے گورے سینے کا بالائی حصہ جھلک رہا تھا۔ رحیم داد کی نظروں میں چکا چوندا پیدا ہو گئی۔ سانس

”توبہ کرو جی، میں اس کے پاس کیوں جانے لگی۔“ نور ان جل کر بولی۔ ”مجھے تو بعد میں اکال
 گڑھ کے نائی سے پتہ چلا تھا کہ جمال دین اپنے ایک شریکے کے پاس جھگ چلا گیا۔ اس کے دیہ
 کے بارے میں بھی اسی نے بتایا تھا۔“
 ”نظام اولیا سے تو یہاں کیسے آگئی؟“

”نظام اولیا میں جب ہوتی تھی تو پڑوس میں ایک چاک رہتا تھا۔ اس کی ایک بھین رات ہے۔ وہ
 ادھر کام کرتی ہے۔ وہی مجھے اپنے ساتھ لے آئی۔ تب سے میں ادھر ہوں۔ چھ مہینے سے اوپر ہو گئے
 ادھر آئے ہوئے۔“

رحیم داد کے دل میں جو غم و غصہ تھا، نور ان کی باتیں سن کر بڑی حد تک زائل ہو چکا تھا۔ اسے
 وہ ایک بے سہارا اور مظلوم عورت نظر آئی۔ رفتہ رفتہ اس کے ذہن کے کسی گوشے میں جذبہ
 ہمدردی نے سر ابھارا۔ وہ سالہا سال تک اس کی شریک حیات رہی تھی۔ وہ ایک اچھی اور محبت
 کرنی والی بیوی تھی۔ کھیتی باڑی کے کاموں میں برابر سے اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ دن رات محنت
 کرتی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی جو بالکل بے قصور تھے۔ اور اپنی
 ماں کے ساتھ غریب اور ناداری کی دن گزار رہے تھے۔

نور ان نے اسے خاموش پایا تو مسکرا کر پوچھا۔ ”تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“
 رحیم داد نے اس کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا دکھ کر غبار مٹ گیا
 تھا۔ وہ اب مطمئن اور پرسکون نظر آرہی تھی۔ رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ سوچنے لگا، کیا وہ اسے اپنے
 بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دے؟ اس پر ظاہر کر دے کہ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔ مگر وہ ایسا کر
 نہ سکا۔ وہ نور ان پر یہ حقیقت آشکارہ کر کے خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا کہ وہ حکیم نذر محمد چشتی اور
 چوہدری نور الہی کا قاتل ہے۔ اس نے چوہدری نور الہی بن کر جعلی کلیم کے ذریعے کوئلہ ہرکشن میں
 ڈھائی سو ایکڑ زمین اور بہت بڑی حویلی اپنے نام الاٹ کرائی ہے۔ جیلہ کی ساڑھے تین سو ایکڑ
 زمین بھی ہتھیالی ہے۔ اب وہ علاقے کا ایک بڑا زمین دار ہے۔ عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہا
 ہے۔ اگر اس کا راز افاش ہو جاتا تو تباہی اور بربادی کے دروازے کھل جاتے۔ اسے جیل بھی ہو
 سکتی تھی۔ حکیم چشتی اور نور الہی کے قتل کے جرم میں پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ جیل اور پھانسی کا
 خیال آتے ہی وہ سرا سید ہو گیا۔

”نور ان تو اب جا۔“ رحیم داد نے گہرا کر بے رخی سے کہا۔ ”رات بہت ہو گئی ہے۔ تیرے
 بچے انتظار کرتے ہوں گے۔“

بھی بوجھل ہو گئی۔

نورائے گردن اٹھائی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ نورائے نظرس ملیں۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ نورائے اس کی نظروں کی چمک دک کی تاب نہ لاسکی۔ شرمائی۔ اس کے رخساروں پر ہلکی ہلکی سرفی بکھر گئی۔ ناک میں پڑا ہوا کوکا جھلملانے لگا۔ ہونٹوں پر خفیف سی لرزش ہویدا ہوئی۔

اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ نگاہیں نیچی کیں اور فرش کو تکتے لگی۔ رحیم داد ٹکٹکی باندھے اسے تکتا رہا۔ وہ یادوں کی چمکڑیوں پر چلتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ بیتے دن چراغوں کی مانند جھلگانے لگے۔ نورائے ہنوز بیت بنی بیٹھی تھی۔ وہ رحیم داد کو ویسی ہی نورائے نظر آئی جو خوبصورت تھی۔ جوان تھی اور جسے تنہائی میں پا کر وہ بے قرار ہو جاتا تھا۔ وارفتہ ہو جاتا تھا۔

نورائے اس وقت بھی تنہا تھی۔ رحیم دار وارفتہ ہو گیا۔ بے قرار ہو گیا۔ خود فراموشی کے عالم میں بستر سے نیچے اترتا۔ دھیرے دھیرے اس طرح نورائے کی جانب بڑھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ نورائے بدستور خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے نگاہیں نہ اٹھائیں۔ رحیم داد قریب پہنچ گیا۔ اس کی سانس تیز اور بے ترتیب تھی۔ پیروں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ وہ نورائے کے عین مقابل جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس کا کبڑا سایہ دیوار پر لہرا رہا تھا۔ باہر تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھ رہی تھی۔ ٹکٹکیاں تھیں۔ خشک پتے گر رہے تھے۔ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کمرے میں بوجھل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لیپ کی لوہو لے ہوئے بھڑک رہی تھی۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ جھکا ہاتھ بڑھا کر نورائے کا بازو پکڑا۔ اسے آہستہ سے اٹھایا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ٹوٹی ہوئی ڈال کی مانند جھوم کر رحیم داد کے کندھے سے لگ گئی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور وہ دھیرے دھیرے ہانپ رہی تھی۔



باہر تیز ہوا شاخوں میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ خشک پتے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے تھے۔ کھڑکھڑا رہے تھے۔ کمرے کے اندر لیپ کی لوہا کے جھوکوں سے کبھی تیز ہو جاتی کبھی دھیمی پڑ جاتی۔ رات گزرتی رہی۔ کالی ہوتی گئی۔ رات آدمی ہو گئی، ڈھلنے لگی۔

نورائے آہستہ سے اٹھی۔ بستر سے نیچے اترتی۔ رحیم داد جاگ رہا تھا۔ نورائے اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکرائی۔ آہستہ سے بولی۔ ”رہے!“

رحیم داد کو ایسا محسوس ہوا جیسے بچھونے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ سہانا خواب دیکھتے دیکھتے چونک کر بیدار ہو چکا تھا۔ یادوں کے حصار سے باہر آچکا تھا۔ وسوسوں اور اندیشوں نے کلبلا کر سر ابھارا۔ آنکھوں تلے اندھیرا آگیا۔ چھانی کا پھندا سامنے لہرانے لگا۔

رحیم داد پریشان ہو کر اٹھ بیٹھا۔ بے اعتنائی سے بولا۔ ”تو مجھے بار بار رچے کیوں کہتی ہے؟“ ”اور کیا کہوں تجھے۔؟“ وہ شوخی سے کھل کر مسکرائی۔

رحیم داد کھدو رے لمبے میں بولا۔ ”میں رچے نہیں ہوں۔ تجھے دھوکا ہوا۔“ اس نے نورائے سے نظرس نہ ملائیں۔

”سچ بتا تو رچے نہیں ہے؟“ نورائے تذبذب کے عالم میں بولی۔

”میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“ رحیم داد نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ ”تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔“

”نہیں“ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ”وہ ایک بار پھر مسکرائی۔ ”مجھے پتہ ہے تو رچے ہی ہے۔ تو کوئی اور نہیں ہو سکتا۔“ اس کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔ ”پہلے مجھے تیرے بارے میں شبہ تھا۔ اب کوئی شبہ نہیں رہا۔ تو رچے ہے بالکل رچے ہے۔“

”بیکار کی کڑکڑ نہ کر۔“ رحیم داد نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔

”میں تیرا رچے نہیں۔ چوہدری نورالہی ہوں۔ اب تو یہاں سے رُجا۔“ نورائے ہکا بکا ہو کر رحیم داد کا منہ تکتے لگی۔

رحیم داد مڑا۔ تکیے کے نیچے رکھا ہوا چمڑے کا بٹہ نکالا۔ اسے کھولا۔ سو روپے کا ایک نوٹ نکالا۔ نورائے کی جانب پلٹا۔ اور سو روپے کا نوٹ سرہانے کھڑی نورائے کے ہاتھ میں تھما کر بولا۔ ”لے اسے رکھ لے۔ جا مویاں کر۔“ اس نے بد معاشی سے آنکھ مار کر مسکرائے کی کوشش کی۔ ”کسی نے ایک رات کے لیے اتنے روپے نہیں دیے ہوں گے۔“

نورائے ہاتھ میں نوٹ تھامے چند لمحے مبسوت کھڑی رہی۔ پھر وہ چونکی۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے نوٹ انگلیوں میں سمجھنے کر مسلا۔ رحیم داد کے منہ پر مارا۔ تڑپ کر بولی۔ ”اسے اپنے ہی پاس رکھ۔ میں کبجری نہیں ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو، ستارے بن کر جھلملانے لگے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا لیا اور ہلکے ہلکے کر رونے لگی۔

اس کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں ابھرنے لگیں۔ رحیم داد نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ مگر

نہیں آیا۔“

”یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟“ رحیم داد نے نوکروں کی کوٹھریوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر پوچھا۔
 ”سبیں بہت برا ہو گیا۔“ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد خاموش رہا۔ اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ ”وہ نوران تھی ناں۔ ادھر نوکرانی لگی تھی۔“ اکبر الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”رات جانے اسے کیا ہوا۔ اس کے ایک نکا تھا اور ایک لگی۔ دونوں کا اس نے خیز کاتی سے گلا کاٹ ڈالا۔ اپنے کپڑوں پر تیل چھڑکا اور آگ لگائی۔“
 رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ اس نے محسوس کیا۔ ہوا میں جلے ہوئے گوشت کی بو رچی ہے۔ وہ کچھ نہ بولا۔ منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ اس نے سنا۔ اکبر کہہ رہا تھا۔

”نوران نے اندر سے در بند کر رکھا تھا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ چینی چلائی بھی نہیں۔ چپ چاپ جلتی رہی۔ پاس کی کوٹھری میں رستم رہتا ہے۔ گوشت جلنے کی بو سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس دکھت اندھا رہا تھا۔ سردی بھی بہت تھی۔ وہ باہر نکلا۔ نوران کی کوٹھری سے دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے در کھولنے کی کوشش کی پر کھلا نہیں۔ تب رستم نے شور کیا۔ پاس پڑوس کے سارے ہی نوکر اور باندھے اکٹھے ہو گئے۔ دروازہ توڑ کر اندر گھسے تو دھواں اتنا بھرا تھا کہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔“
 ”اب نوران کیسی ہے؟“ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”سبیں“ اس کا تو مرن ہو گیا۔ جب میں پہنچا تو سسک رہی تھی۔“ اکبر نے ٹھنڈی سانس بھری۔
 ”سبیں لگتا ہے اس پر آسیب تھا۔ جن کا اثر تھا۔ تب ہی اس نے ایسا کیا۔ بہت دکھ کی گالہ ہے۔“
 اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ ”وہ بری ذال نہیں تھی۔ بہت دکھیا رہی تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔“

رحیم داد بے قرار ہو کر بولا۔ ”میرے ساتھ چل۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔“ وہ نوران اور اپنے دونوں بچوں کو آخری بار دیکھنا چاہتا تھا۔
 مگر اکبر نے اسے روک دیا۔ ”نا سبیں“ تو ادھر نہ جا۔ کیا کرے گا اسے ویکہ کر۔ جل کر اس کا منہ ایسا بگڑ گیا ہے کہ دیکھنے سے دل گھبراتا ہے۔ ڈر لگتا ہے۔ تو وہاں نہ جا۔ ویسے بھی تجھے اس سے کیا لینا۔“

رحیم داد نے نوران کی کوٹھری کی جانب جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے میں واپس گیا۔

اکبر نے ناشتا لگا دیا۔ مگر رحیم داد نے کچھ نہ کھایا۔ کھایا ہی نہ گیا۔ بہت اداس اور دل گرفتہ تھا۔

کچھ بولا نہیں۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے نظریں اٹھا کر روتی بلمتی نوران کی جانب دیکھا بھی نہیں۔
 نوران کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہری۔ اس نے دوپٹے کے آٹھل سے آنسو پونچھے۔ اس کا چہرہ مڑھا کر پیٹا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کا کاہل پھیل گیا تھا۔ بال بکھر کر منہ پر آ گئے تھے۔ وہ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر مڑی۔ دروازے پر پہنچ کر اسے کھولا اور باہر چلی گئی۔

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر نوران کو جاتے ہوئے دیکھا۔ دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ بستر سے نیچے اتر۔ دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ واپس آیا۔ دیکھا، لیمپ کی دھندلی دھندلی روشنی میں سو روپے کا مڑا تڑا نوٹ بستر کی سلوٹوں کی درمیان پڑا ہے۔ رحیم داد ٹٹکی باندھے نوٹ کو تکتا رہا۔ پھر وہ جھکا۔ نوٹ اٹھایا اور بٹوے میں رکھ دیا۔ اس نے مڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ پتہ جھڑکی ویران رات بڑھال کھڑی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ پتے شاخوں سے نوٹ ٹوٹ کر رہے تھے۔ اڑاڑ کر ادھر ادھر بکھر رہے تھے۔

رحیم داد بستر پر دراز ہو گیا۔ خاموش لیٹا چھت کو تکتا رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے بے قرار ہو کر کروٹ بدلی۔ دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا اب نوران کبھی اس کے پاس نہ آئے گی۔ وہ اپنے بیٹے کریم داد اور بھولی بھالی بیٹی زینو کو سینے سے لگا کر پیار نہ کر سکے گا۔ اس کے اور بیوی بچوں کے درمیان چوہدری نور الہی دیوار بن کر حائل ہو گیا تھا۔ یہ دیوار اس نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کی تھی۔ مضبوط اور اونچی کی تھی۔ اب وہ اسے گرا نہ سکتا تھا۔ گراتا تو خود اس کے لمبے کے نیچے دب کر رہ جاتا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ یادوں کی اونچی نیچی لہروں پر ڈولتا رہا۔ بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ وہ تھک کر بڑھال ہو گیا۔ گہری نیند سو گیا۔

ملی جلی آوازوں کے ہلکے ہلکے شور سے رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ آوازیں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب سے ابھر رہی تھی۔ سزئی اس وقت بھی اچھی خاصی تھی۔ رحیم داد بستر سے نیچے اتر۔ ادنی دوہرا اوڑھی۔ دروازہ کھولا۔ باہر نکلا۔ صبح ہو چکی تھی۔ مگر آسمان پر ابھی تک بادل چھائے تھے۔ روشنی دھندلی تھی۔ احاطے میں ہو کا عالم تھا۔ دور دور تک کوئی نظر نہ آتا تھا۔ رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس جانب بڑھا جہاں سے شور اٹھ رہا تھا۔

وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے اکبر نمودار ہوا۔ رحیم داد ٹھہر گیا۔ اکبر قریب آکر بولا۔ ”خیر اے سبیں خوش ہو، راضی ہو۔“
 ”زمیں دار واپس آگیا؟“ رحیم داد نے رفیع سمہ کے بارے میں دریافت کیا۔ ”نا سبیں“ وہ ابھی

اس نے اپنے ڈرائیور کو بلایا۔ سامان جیب میں رکھوایا اور اس میں بیٹھ کر کوئلہ ہرکشن کی جانب روانہ ہو گیا۔

کوئلہ ہرکشن پہنچنے کے بعد بھی اس کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔ وہ شام ہی سے پینے بیٹھ گیا۔ اور غم غلط کرنے کے لیے رات گئے تک شغل بادہ نوشی کرتا رہا۔ وہ رات اس نے بہت کرب اور بے چینی میں گزاری۔ اس کی کتنی ہی راتیں اسی بے چینی اور ذہنی اذیت میں کئیں۔



ایک روز دوپہر کو رافع سمہ اچانک رحیم داد کے پاس پہنچ گیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تو نے بہت دیر لگا دی۔ کہاں رہا اب تک؟“

”شکر سے مل نہ سکا تھا۔ اسے ملے اور گل بات کئے بغیر تیرے پاس آکر کیا کرتا۔“

”شکر تجھے کیوں نہیں ملا؟“

”وہ مجھے پر سوں ملا۔ ہوشیار پور سے بہت دیر بعد فنانکا آیا تھا۔ ہوشیار پور میں اپنے کسی شریک کے ویاہ میں پھنسا رہا۔ تب ہی دیر سے لوٹا۔“ رافع سمہ نے وضاحت کی۔

”جیلہ کے بارے میں اس سے گل بات تو ہوئی ہوگی؟“

”اس کے بارے میں دیر تک بات ہوتی رہی۔“

رحیم داد نے اپنی بے قراری چھپانے کی کوشش نہ کی، پوچھا۔ ”کیا کہتا تھا وہ؟“

رافع نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد اس کی پراسرار خاموشی سے پریشان ہو گیا۔

گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”تو چپ کیوں ہو گیا؟ تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

رافع نے کھاکر کرگلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں گویا ہوا۔ ”چوہدری، میرا کہنا مان۔ جیلہ کا دھیان اب چھوڑ دے۔“

”کیوں؟“ رحیم داد تڑپ کر بولا۔ ”تو ایسی بات کیوں کہہ رہا ہے؟“

”میں ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔ اس کے پاس سند یا شندیہ پہنچانے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ وہ

اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

رحیم داد کو اپنا دل ڈوتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”صاف صاف بتا۔ شکر کیا کہتا تھا؟“

”کیا کرے گا جان کر۔ تجھے دکھ ہی ہو گا۔“

رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ ”وہ زندہ تو ہے یا؟“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور بے تابی سے

سمہ کا چہرہ سوالیہ نظروں سے نکتے لگا۔

”وہ زندہ ہے۔ بالکل چنگی ہے۔ پر تو نے ایسا کیوں سوچا؟“

رحیم داد کو معانوں یاد آگئی۔ مگر اس نے نوراں کا ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا کہا۔ ”تو بات اس طرح کر رہا ہے، میں سمجھا اس نے کہیں خود کشی تو نہیں کر لی۔“

”وہ خود کشی کیوں کرنے لگی؟“ رافع نے مسکرا کر کہا۔

رحیم داد کو اس کا مسکرانا اور چبا چبا کربات کرنا پسند نہ آیا۔ کسی قدر تھکے لہجے میں بولا۔ ”ٹھیک ٹھیک بتا۔ شکر سے تیری کیا گل بات ہوئی؟ میں یہی جاننے کے لیے تیرا انتظار کر رہا تھا، اور تو مجھا پھر اکربات کر رہا ہے۔ صاف اور پوری بات بتاتا نہیں۔“

”صبر سے کام لے۔“ رافع سمہ کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ ”صاف بات یہ کہ جیلہ نے پچھلے مہینے جلندہ میں ویاہ کر لیا۔ اب وہ اپنے گھر والے کے ساتھ رہتی ہے۔“

رحیم داد کا چہرہ اتر گیا۔ سمجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا کرتا ہے وہ؟“ اس کی آواز حلق سے اس طرح نکل رہی تھی جیسے کہیں دور سے بول رہا ہو۔

”شکر بتاتا تھا، ہے تو وہ ڈاکٹر پر دونوں آنکھوں سے اندھا ہے اور سکھ ہے۔“

”جیلہ نے اس اندھے ڈاکٹر سے کیوں ویاہ کیا؟“ رحیم داد نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے پوچھا۔

”اندھا اور وہ بھی سکھ۔ اسے کوئی ہندو ویاہ کرنے کو نہیں ملا۔“

”یہ تو جیلہ ہی بتا سکتی ہے، اس نے ایسا کیوں کیا؟ میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ رافع سمہ کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”مجھے تو صرف یہ پتہ ہے کہ وہ اندھا ہے، سکھ ہے اور شرنا رہتی ہے۔ فسادات ہوئے تو وہ پنڈی میں ہوتا تھا۔ شکر کہتا تھا، رات کے اندھیرے میں اس کے مکان پر حملہ ہوا۔ اس کی جوان گھر والی اور دو بھینسوں کو مسلمان بلوائی اٹھا لے گئے۔ ایک پتر بھی تھا، اسے خاندان کے دوسرے ہندوں کے ساتھ حملہ کرنے والوں نے مار دیا۔“

”وہ تو بچ گیا تھا ناں؟“

”ہاں وہ بچ گیا۔“ رافع سمہ اس کے احمقانہ سوال پر مسکرانے لگا۔ ”یا تو بھی کمال کرتا ہے۔ بچ نہ جاتا تو اب تک زندہ کیسے ہوتا۔ پر حملے میں وہ بھی گھائل ہو گیا تھا۔ سر پر ایسی زبردست چوٹ آئی کہ دونوں آنکھوں کی روشنی جاتی رہی۔ کسی نہ کسی طرح سکھوں اور ہندوؤں کے ایک جتھے کی ماتھ مرحد پار پہنچ گیا۔ لیکن بالکل اکیلا تھا۔ اس کا کوئی بھی نہ بچا۔“

”جیلہ کے بھائیوں نے اس کے ساتھ ویاہ کرنے پر برا نہیں منایا؟“

”ہر دیال تو سخت زراض ہوا تھا۔“ رفیع سمہ نے جواب دیا۔ ”شکرتا تھا، ڈاکٹر کی جیلہ کے بھرا پیٹور دیال سے یاری تھی۔ اس کے گھر پر جیلہ کا ڈاکٹر کے ساتھ میل ملاپ بڑھا۔ پر جیلہ نے جب اندھے سکھ ڈاکٹر سے ویاہ کرنا چاہا تو ایٹور دیال نے بھی مخالفت کی۔ جیلہ کو منع کیا۔ سمجھایا بجھایا پر وہ بہت ضدی ہے۔ ڈاکٹر سے ویاہ کرنے پر اس طرح اڑ گئی کہ ایٹور دیال بھی راضی ہو گیا۔“

”تو گویا جیلہ اب جلد ر میں سکھ ڈاکٹر کے ساتھ رہتی ہے۔“

”نہیں ویاہ کے کچھ ہی دنوں بعد وہ اپنی گھر والے کے ساتھ چندی گڑھ چلی گئی۔“ رفیع سمہ نے مطلع کیا۔ ”اب وہ چندی گڑھ میں ہوتی ہے۔ شکر جیلہ سے ملا تھا۔ کہتا تھا وہ ڈاکٹر کے ساتھ بہت خوش ہے۔ آرام سے ہے۔“

”یار حد ہو گئی۔“ رحیم داد جل کر بولا۔ ”اندھے کے ساتھ کیسے خوش رہ سکتی ہے۔“

”میں کیا بتا سکتا ہوں۔“ سمہ نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔ ”میں نے تو نہ جیلہ کو دیکھا نہ اس کے اندھے خصم کو۔“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”تیرا اور جیلہ کا بہت دنوں ساتھ رہا ہے۔ وہ تیری گھر والی رہ چکی ہے۔ تجھے اس کے بارے میں ٹھیک سے پتہ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو شکر سے جو کچھ سنا، تجھے بتا دیا۔“

”اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔“ رحیم داد نے بے بسی سے اظہار خیال کیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس پر کوئی رد عمل نہ تھا۔ کوئی واضح تاثر نہ تھا۔

”میں کہتا ہوں تو جیلہ کو سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ تجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاتی۔“ رفیع سمہ کے چہرے سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ ”ساری باتیں سن کر مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ پیار کی بھوکی تھی۔ اسے سارے کی ضرورت تھی جو تو اسے دے نہ سکا۔ ڈاکٹر اندھا ہے تو کیا ہوا، جیلہ کو اس میں دونوں ہی چیزیں مل گئیں۔“ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”چوہدری، برا نہ منانا۔ میں نے جو کچھ سوچا اور سمجھا تجھے صاف صاف بتا دیا۔ اب تجھے یہ بھی بتا دوں کہ تو اس کی واپسی کا دھیان، بالکل چھوڑ دے۔ وہ ہر گز تیرے پاس نہیں آئے گی۔“

”یہ بات تجھے شکر نے بتائی تھی؟“ رحیم داد نے اپنے ڈوبتے دل کو ڈھارس دینے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں نے اس کی باتوں سے یہ اندازہ لگایا۔“ رفیع سمہ نے وضاحت کی۔ ”ہاں، شکر نے مجھے یہ ضرور بتایا کہ وہ ابھی تک اللہ وسایا کو نہیں بھولی۔ پر تجھے اچھا بندہ نہیں سمجھتی۔ میں تجھے زیادہ بتانا نہیں چاہتا۔ یوں سمجھ لے وہ تیرے پاس واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اور یہ بھی سمجھ لے کہ اندھے ڈاکٹر سے اس نے سوچ سمجھ کر ویاہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے

کا سارا ہیں۔ ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش ہیں۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”شکرتا تھا، دونوں لئے پٹے شرارتیوں کے لیے خیراتی اسپتال کھولنا چاہتے ہیں۔ ان پر ان دنوں اس کی دھن سوار ہے۔“

رحیم داد کو رفیع سمہ کا رویہ پسند نہ آیا۔ اس کے زخم خوردہ احساس کو ٹھیس پہنچی۔ مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ مضحل اور مرجھایا ہوا تھا۔ وہ اجڑا اجڑا اور بڑھال نظر آ رہا تھا۔

رفیع سمہ نے اس کی پریشانی محسوس کی۔ لمبے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”چوہدری جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔“ اس نے رحیم داد کی دل جوئی کی۔ ”ویسے مجھے پتہ ہے تجھے دکھ پہنچا ہے۔ تو کہہ تو اگے کے لیے سوچا جائے۔ میں تیری ہر طرح مدد کرنے کو تیار ہوں۔ پر میں تجھ سے کسوں گا۔“

رحیم داد نے اسے پوری بات کہنے نہ دی۔ جھکے لمبے میں بولا۔ ”مجھے پتہ ہے تو کیا کہنا چاہتا ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ مجھے اب جیلہ کو بھول جانا چاہیے۔ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گی۔“

رفیع سمہ نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ ”شاہ جی سے تو نہیں ملنا ہوا؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے گردن ہلا کر انکار کیا۔ ”بچھلی بار تیرے ساتھ ہی آیا تھا۔ تب سے نہیں ملا۔ وہ آج کل طرح طرح کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔“

”میں چند روز بعد لاہور جاؤں گا۔ شاہ جی سے بھی ملنے کی کوشش کروں گا۔“

”شاہ جی سے کہنا، چوہدری تجھے بہت یاد کرتا ہے۔“

رفیع سمہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ غلٹ میں تھا۔ رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ دو چار روز اس کے ساتھ قیام کرے۔ مگر سمہ رضامند نہ ہوا۔ وہ اپنی جیب میں آیا تھا۔ اس میں سوار ہوا۔ دوبارہ آنے کا وعدہ کیا۔ جیب آگے بڑھی اور دھول کے بادل اڑاتی تیزی سے دوڑنے لگی۔

رفیع سمہ کو زخمت کرنے کے بعد رحیم داد اور دل گرفتہ ہو گیا۔ وہ بڑھال اور بجھا نظر آ رہا تھا۔

ہے۔“

”ایسا تھا تو مجھے بلایا ہی کیوں؟“ رحیم داد نے گلہ کیا۔ ”میں تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ تیرے ساتھ چند روز ٹھہروں گا۔ بہت دن ہو گئے تھے ملے ہوئے۔ بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔ مشورے لینے تھے۔“

”باتیں بھی ہوں گی اور آرام سے ہوں گی۔“ احسان شاہ بے تکلفی سے ہنسا۔ ”تو ایسا کر اتوار کی شام کو میرے پاس لوہ پھنچ جا۔ تیرے ڈرائیور نے میری کوٹھی دیکھ رکھی ہے۔ آرام سے پہنچ جائے گا۔ وہیں ساری باتیں کر لیتا۔ اب تو میں نے جانا ہے۔“

”ادھر بیٹھ کر گل بات نہیں ہو سکتی۔“ رحیم داد اس کے ساتھ بیٹھ کر شغل بادہ نوشی کرنا چاہتا تھا۔ دل بسلانا چاہتا تھا۔

”نہیں۔“ احسان شاہ رضامند نہ ہوا۔ ”میں نے تجھے لوہ میں محکمہ بحالیات کے ایک افسر سے ملانا ہے۔ اس کا ایک کام مجھ سے انکا ہوا ہے۔ متروکہ جائیداد کے ایک اونچے فراڈ میں پھنس گیا ہے۔ نوکری جانے کے ساتھ جیل کاٹنے کا بھی خطرہ ہے۔ وہ چاہتا ہے میں گورنر سے سفارش کر کے معاملہ دوا دوں۔ گورنر میری بات مان لے گا۔ اسے بھی آج کل میری ضرورت ہے۔“

”پر میں نے بحالیات اور آباد کاری کے افسر سے کیا لیتا۔“ رحیم داد بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا۔

”تیرے پاس جو کلیم ہے وہ کس لیے ہے؟“ احسان شاہ نے حیکھے لمبے میں کہا۔ ”تو نے اسے کیڑوں کو کھلانے کے لیے رکھ چھوڑا ہے؟“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”جو کچھ الاٹ کرانا ہے ابھی الاٹ کرا لے۔ بعد میں کچھ بھی نہ رہے گا۔ کلیم کی دستاویزات پڑی پڑی سڑ جائیں گی۔ تو اکیلا کلیم ہولڈر نہیں۔ نہ جانے کتنے ہیں جو کلیم کے کاغذات دبائے الاٹمنٹ کے چکر میں سرکاری دفاتروں کے چکر کاٹ رہے ہیں۔ سفارش بھی پہنچا رہے ہیں۔ رشوت بھی کھلا رہے ہیں۔ پر الاٹمنٹ آسانی سے نہیں ملتی۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے جھٹ اپنی غلطی تسلیم کر لی۔ ”میں نے بھی الاٹمنٹ کے لیے بہت چکر کاٹے ہیں۔ تجھے یہ پتہ نہیں۔“

”مجھے پتہ ہے۔ اچھا اب کام کی گل سن۔ لائل پور میں دس ایکڑ کے گل بھگ شری متروکہ اراضی ہے۔ کوشش کی جائے تو تیرے کلیم میں الاٹ ہو سکتی ہے۔“

”میں اس کی الاٹمنٹ لے کر کیا کروں گا؟“ رحیم داد نے دبی زبان سے انکار کیا۔ وہ الاٹمنٹ



ربیع کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ تیز ہوائیں چلتیں تو گندم اور جو کے پودے جھولتے۔ لہلاقی فصلوں میں بیٹیاں بکتیں۔ اس بار فصل کچھ زیادہ ہی اچھی تھی۔ کسانوں کے چہرے خوشی سے دکتے تھے۔

رحیم داد نے فصل کی کٹائی میں خلاف معمول زیادہ ہی دلچسپی لی۔ وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس نے پے در پے جو صدے اٹھائے تھے ان کی اذیت اور کرب سے فرار حاصل کرنے کا اسے ایک ہی راستہ نظر آیا کہ زمیں داری کے کاموں میں خود کو مصروف رکھے۔

فصل کی کٹائی ہو گئی۔ بٹائی بھی خوش اسلوبی سے ہو گئی۔ رحیم داد خریف کی بوائی کی تیار کر رہا تھا کہ ایک صبح احسان علی شاہ کا ملازم شیدا اس کے پاس آیا۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو پیراں والہ بلایا تھا۔

دن ڈھلے رحیم داد نے جیب نکلائی اور اس میں بیٹھ کر پیراں والہ پہنچ گیا۔ احسان علی شاہ اپنی حویلی کے پھانگ ہی پر مل گیا۔ حسب معمول اس نے گرم جوٹی کا مظاہرہ کیا۔ گلے سے لگا کر دل جوٹی کی باتیں کیں۔ ”معاف کرنا چوہدری، میں ان دنوں ایسا پھنسا ہوا ہوں کہ کوشش کے باوجود تجھے اب تک نہ مل سکا۔“

رحیم داد خوش ہو گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”یہ بتا، آج تو نے کیسے بلایا۔ کوئی خاص گل بات ہے؟“

”خاص ہی سمجھ لے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”میں نے زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ آج ہی لوہ جانا

اور ایک درخت کے نیچے جا کر کھڑا ہو گیا۔

اسے کھڑے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کھیتوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے کچے راستے پر درختوں کی آڑ سے ایک عورت اور مرد نکل کر سامنے آگئے۔ رحیم داد نے دونوں کو دیکھا۔ اس نے مرد کو فوراً پہچان لیا۔ وہ لالی تھا۔ اس کے ہمراہ شاداں تھی۔ رحیم داد انھیں دیکھتے ہی سخت پریشان ہو گیا۔ دونوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے اپنا چہرہ موڑ لیا۔ اور سڑک کی سمت دیکھنے لگا۔

لمٹان روڈ پر کاریں، بسیں اور دوسری گاڑیاں شور مچاتی ہوئی تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے رحیم داد کی جیب کھڑی تھی۔ ڈرائیور پیسہ اتار کر اسٹین چڑھانے میں مصروف تھا۔ رحیم داد درخت کے نیچے گم صم کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے گھبراہٹ جھلک رہی تھی۔ وہ زیادہ دیر ایک ہی حالت میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گردن موڑی۔ اچھتی نظروں سے دیکھا۔ لالی کچے راستے سے نکل کر سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رحیم داد کی جانب بڑھ رہے تھے۔

رحیم داد نے جھٹ نکاہیں ادھر سے ہٹائیں اور سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیوں کو ٹکنے لگا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گھبراہٹ میں اچانک اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ لالی کے سامنے آتے ہوئے کھڑا رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر لالی کی تیز اور عقابی نظروں نے اسے پہچان لیا تو وہ اس کے لیے زبردست خطرہ بن سکتا ہے۔ رحیم داد سے چوہدری نور الہی بن جانے کے بعد وہ خود کو ایسا سربستہ راز سمجھتا تھا جس میں کسی کو شامل کرنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس معاملے میں وہ کسی کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا۔ اسی رازداری کے باعث نوراں اور اس کے دونوں بچے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سے جدا ہو گئے۔ لالی پر تو اسے مطلق اعتماد نہ تھا۔ وہ عادی مجرم اور سزایافتہ تھا۔

رحیم داد کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پگڑی کے شٹلے سے چہرہ پر آیا ہوا پیمنہ پونچھا۔ عقب میں قدموں کی آہٹ سنی۔ چاب دم دم بڑھتی گئی۔ لالی اور شاداں قریب آ رہے تھے۔ رحیم داد نے سرا سید ہو کر جیب کی طرف دیکھا۔ ڈرائیور زمین پر اکڑوں بیٹھا ہاتھ میں پانا سنبھالے پئے کے کٹ بولٹ کس رہا تھا۔ رحیم داد نے قدم اٹھائے اور جیب کی سمت بڑھا۔

قریب پہنچ کر اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”عابد! ابھی کتنی دیر اور لگے گی؟“

”اب بالکل دیری نہیں ہوگی جی۔ سارا کام ختم ہو گیا۔“ یہ کہتا ہوا وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد جیب کی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر بعد ڈرائیور بھی اسٹیرنگ ڈنیل سنبھال کر

کے چکر میں پڑنا نہ چاہتا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں اس کے کلیم کی جعل سازی کا راز افشاں نہ ہو جائے اور لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

”اس پرنیکسائل مل لگے گی۔“ احسان شاہ نے اس کی عدم دلچسپی نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟“ رحیم داد نے ایک بار پھر کتنی کاٹنے کی کوشش کی۔

”مل تو لاکھوں میں لگتی ہے۔ اس کے لیے حکومت سے پرمٹ اور لائسنس بھی لینا پڑتا ہے۔“

”تو ان باتوں کی فکر نہ کر۔ یہ سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔“ احسان شاہ نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا۔ ”بینک سے کرضہ مل جائے گا۔ مجھے جلد ہی کراچی بھی جانا ہے۔ پرمٹ اور لائسنس بھی کوالوں گا۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”یہ تیرے سوچنے کی گل بات نہیں۔ میں سب بندوبست کر لوں گا۔ تو اکیلا نہیں ہو گا۔ میں بھی تیرے ساتھ شریک رہوں گا۔ کمپنی بنانی ہوگی۔ اسے رجسٹر کرانا ہو گا۔“

”مجھے تو جی صاف بات یہ ہے کہ کچھ پتہ نہیں۔“

”سب پتہ ہو جائے گا۔ میں نے کہا تھا کہ میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔“ احسان شاہ نے حکیکے لہجے میں کہا۔ ”تو خواہ مخواہ کی باتیں نہ سوچ۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ رحیم داد نے مزید الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ”تو جیسا کہے گا میں نے وہی کرنا ہے۔“

”مل لگانے کے لیے اپنے پاس زمین ضرور ہونی چاہیے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”ایک اچھا موکع ہاتھ آ گیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ میں نے ساری سکیم سوچ رکھی ہے۔ تجھے صرف اتنا کرنا ہے کہ کلیم کے کاغذات لے کر اتوار کو لاہور پہنچ جا۔ آگے کیا کرنا ہے یہ تجھے نہیں سوچنا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ احسان شاہ نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔

احسان شاہ لاہور چلا گیا۔ رحیم داد واپس کوئلہ ہر کشن آ گیا۔



اتوار کو رحیم داد نے کلیم کے کاغذات کا بستہ نکالا۔ حفاظت سے سوٹ کیس میں رکھا۔ اسے لے کر جیب میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ جیب سڑکوں پر دوڑتی آگے بڑھی۔ لمٹان روڈ پر پہنچتے ہی ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔

مگر جیب چوکی کے نواح میں پہنچی تو ایک ٹائز میں پکچر ہو گیا۔ ڈرائیور نے جیب روک لی۔ جیک لگایا اور پیسہ اتارنے لگا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ دھوپ نیالی پڑتی جا رہی تھی۔ رحیم داد جیب سے اترا

اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ رحیم داد نے نظرس اٹھا کر جیب میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ اسے شاداں نظر آئی۔ لالی اس کے پیچھے تھا۔ وہ لمبے کرتے کے نیچے سفید دھوٹی باندھے ہوئے تھا۔ پہلے سے کچھ بھڑا بھی ہو گیا تھا۔ سر برہنہ تھا۔ بالوں میں پڑا ہوا تیل دھوپ میں خوب چمک رہا تھا۔ شاداں بھی اجلا لباس پہنے ہوئے تھی۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔ چہرے پر نکھار تھا۔

رحیم داد پیٹھ موڑے چپ چاپ بیٹھا تھا اور آئینے میں دیکھ رہا تھا کہ دونوں رفتہ رفتہ جیب کے نزدیک آتے جا رہے ہیں۔ شاداں کی نگاہیں جیب ہی کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر دہلی دہلی مسکراہٹ تھی۔ اور قدموں کی رفتار تیز ہوتی جا رہی تھی۔

رحیم داد سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”عابد! گڈی شارٹ کر۔“
ڈرائیور نے فوراً انجن اشارٹ کر دیا۔ انجن کی گڑگڑاہٹ میں قریب سے شاداں کی آواز ابھری۔ ”چوہدری گل سن۔ گڈی روک لے۔ میری گل سن لے۔“

مگر رحیم داد نے اس کی ایک نہ سنی۔ پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ ایک ہاتھ سے گھڑی کا اونچا طرہ درست کیا۔ اور گردن اکڑائے خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے کھچ دیا کہ گاڑی گیسٹر میں ڈالی۔ ایک سیلیئر پڑ پیر رکھا۔ جیب تیزی سے آگے بڑھی۔ رحیم داد نگاہیں اٹھائے سامنے دیکھتا رہا۔ آگے جا کر اس نے درختوں کی اوٹ سے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ شاداں ابھی تک جیب کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس کے برابر لالی کھڑا تھا۔ دور سے دونوں سایوں کی مانند دھندلے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ جیب فرائے بھرتی لاہور کی سمت دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا لالی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ الجھن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ اسی ذہنی خلفشار کے عالم میں وہ احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔



یہ ایک گرم اور بے رونق شام تھی۔ ہوا دم بخود تھی۔ ہر طرف اس اور ٹھنڈی تھی۔ آسمان پر گہرا غبار چھایا تھا۔ اندھیرا رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ فضا میں گھل کر کالا پڑتا جا رہا تھا۔ احسان شاہ کوٹھی کے وسیع سبزہ زار کے ایک گوشے میں تنہا بیٹھا تھا۔

وہ اپنے شام کے معمولات میں مگن تھا۔ سامنے میز پر جن کی بوتل رکھی تھی۔ ایک بڑے کنویرے میں برف کے ٹکڑے بھرے تھے۔ احسان شاہ کے ہاتھ میں گلاس تھا۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر گلاس ہونٹوں سے لگاتا اور جن کے گھونٹ بھرتا۔ قریب ہی لکڑی کا اسٹول تھا۔ اس پر رکھا ہوا بجلی کا پنکھا تیزی سے گردش کر رہا تھا۔

رحیم داد کو دیکھتے ہی احسان شاہ نے ٹکڑے کرنے کے انداز میں کہا۔ ”چوہدری، تو نے پہنچنے میں دیر کر دی۔“

”کیا ہو گیا شاہ جی؟“ رحیم داد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کسی قدر حیرت سے بولا۔

”ہونا ہوا کیا تھا۔ پر تو کچھ دیر پہلے آجاتا تو چیمہ سے تیری ملاکات ہو جاتی۔“

”یہ چیمہ کون ہے جی؟“ رحیم داد اور حیرت زدہ ہو گیا۔

”چیمہ ٹھکے بحالیات کا وہی افسر ہے جس سے تیرے کلیم پر لائل پور میں زمین الاٹ کرانی ہے۔ سورج ڈوبنے سے کچھ دیر پہلے ہی میرے پاس آگیا تھا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”اس نے تیرا بھی انتظار کیا۔ اسے کسی ضروری کام سے جانا تھا۔ اسے گئے ہوئے پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں گزرے۔“

”اب وہ کب ملے گا؟“

”مل جائے گا، فکر نہ کر۔“ احسان شاہ نے اس کی تشویش فرو کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ بتا، کلیم کے کاغذات تو ساتھ لے کر آیا ہے نا؟“

”بالکل لے کر آیا ہوں۔“ رحیم داد نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”دیکھنے ہیں تو دیکھ لے۔“

”مجھے ان سے کیا لینا۔“ احسان شاہ بے نیازی سے بولا۔ ”سویرے مہربان علی تیرے پاس آجائے گا۔ اسے کاغذات دے دینا۔ وہ ان کی مدد سے الاٹمنٹ کے لیے درخواست تیار کر دے گا۔ تو اس پر دستخط لگا دینا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ احسان شاہ نے میز پر رکھا ہوا خالی گلاس رحیم داد کی جانب سرکا دیا۔ ”اپنے لیے خود ہی پیگ بنا لے۔“ رحیم داد نے بوتل کھول کر جن انگڑیلی۔ پیگ تیار کیا۔ گلاس وٹنوں سے لگایا۔ ایک بڑا گھونٹ بھر کر بولا۔

”شاہ جی تو نے وہاں کی پانی چھوڑ دی؟“

”نہیں جی، ایسی کوئی گل نہیں۔“ احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ ”وہاں آج کل گرمی بہت کرتی ہے۔ گرمی کا موسم ہے نا۔ میرے پاس ان دنوں جن ہی چل رہی ہے۔“ اس نے جن کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارا۔ ”تیرے لیے رم منگوا دوں۔ پچھلے دنوں سرحد پار سے چھ بوتلیں آئی ہیں۔ جی بے تو میری لے۔ وہ بھی موجود ہے۔“

”نہیں، میرے لیے جن ہی ٹھیک ہے۔ جو تو پیئے گا وہی میں بھی لگاؤں گا۔“

احسان شاہ نے پھر چیمہ کا ذکر چھیڑ دیا۔ ”چیمہ بہت گھبرایا ہوا ہے۔“
”کسی نے چکر میں پھنس گیا؟“

”جیسے پتہ ہی ہے۔ جعلی طور پر بوس الاٹمنٹوں کا وعدہ اکتی زور شور سے چل رہا ہے۔ بحالیات اور آباد کاری کے سارے ہی چھوٹے وڈے افسر دبا کے رشوت کھا رہے ہیں۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”پر آپس میں لگتی بھی ہے۔ کسی نے اوپر شکایت لگا دی۔ اس پر چیمہ کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی۔ معطل ہو جاتا۔ پر ابھی تک ایسا ہوا نہیں۔ سچ پوچھ تو کوئی سخت کارروائی ابھی ہوئی نہیں۔ ویسے معاملہ بے چیدہ اور سنگین ہے۔ چیمہ خود بتاتا تھا، نوکری بھی چلی جائے گی اور جیل بھی ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں۔“

”میں نے تو جی کسی وڈے سرکاری افسر کو جیل جاتے دیکھا نہیں۔“ رحیم داد نے ہنس کر بے تکلفی سے کہا۔ ”شروع شروع میں بہت شور مچتا ہے۔ بعد میں سارا معاملہ اس طرح چپ کر کے دبا دیا جاتا ہے کہ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلتا۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔
”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے، پر چیمہ کا معاملہ زیادہ ہی سنگین لگتا ہے۔ بات بہت دور تک جا پہنچی ہے۔ سنا ہے خود وزیر آباد کاری نے چیمہ کے خلاف انکوائری کا حکم دیا ہے۔“

”تو کیا سچ چیمہ کو جیل ہو جائے گی؟“ رحیم داد نے پریشان ہو کر پوچھا۔
”ہونی تو نہیں چاہیے۔“ احسان شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں پرسوں گورنر سے مل رہا ہوں۔ اس سے چیمہ کے بارے میں بات کروں گا۔ اس کے صرف ایک ٹیلی فون کھڑکانے پر سارے انکوائری شکوائری ختم ہو جائے گی۔ چوہدری، وہ آج کل بہت ٹکڑا جا رہا ہے۔ وزیر بحالیات کیا اس کی بات تو وزیر اعلیٰ بھی نہیں ٹال سکتا۔“
”ایسا کر شاہ جی، پہلے الاٹمنٹ کرا لے۔ اس کے بعد گورنر سے چیمہ کے بارے میں سفارش کرنا۔“ رحیم داد نے مشورہ دیا۔

”تو الاٹمنٹ کی فکر نہ کر۔ وہ تو چیمہ کو کرنا ہی پڑے گی۔ اسے ٹھیک طرح پتہ ہے، گورنر میرے کیسے مراسم ہیں۔ چیمہ میرے ہاتھ سے نکل کر جائے گا کہاں؟“ احسان شان نے رحیم داد یقین دلایا۔ ”کوئی گڑبڑ کی تو دوبارہ انکوائری شروع کرادوں گا۔“
”تو فیہ مجھے چیمہ سے مل کر کیا لیتا۔ کام تو وہ کر ہی دے گا۔“
”جیسی تیری مرضی۔ پر میں اتنا ضرور کہوں گا سرکاری افسروں سے تجھے میل ملاپ

چاہیے۔ زمین داری چلانے کے لیے ایسی یاری دوستی بہت ضروری ہے۔“ احسان شاہ نے نشے کی خمبوک میں قہقہہ لگایا۔ ”چوہدری، سچ پوچھ تو دونوں ہی کے لیے یہ ضروری ہے۔ افسر اگر زمین داروں کے کام آتے ہیں تو زمین دار بھی ان کی مدد کرتے ہیں۔ انھیں پروموشن دلاتے ہیں۔ ان کے تبادلے رکواتے ہیں۔ کسی چکر میں پھنس جائیں تو چھڑوا دیتے ہیں۔ اب یہ چیمہ ہی کا معاملہ دیکھ لے۔ اسے انکوائری سے بچنے کے لیے میری ضرورت ہے۔ اور مجھے زمین الاٹ کرانے کے لیے اس کی ضرورت ہے۔“

”تیرا مطلب ہے، حکومت، افسر اور زمیں دار مل کر چلاتے ہیں۔ یہی کہنا چاہتا ہے ناں؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”بالکل ایسا ہی ہے۔“ احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ ”اسی لیے میں چاہتا ہوں چیمہ سے تیری ملاکت ہو جاتی۔ اگے بھی اس سے کام پڑ سکتا ہے۔ سرکاری افسروں سے ضرور میل ملاپ رکھنا چاہیے۔ پتہ نہیں کل کون کیا بن جائے۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”جیسے پتہ ہے، چوہدری محمد علی، وزیر اعظم ہونے پہلے سرکاری افسر ہوتا تھا۔ لیاکت علی خان جب وزیر اعظم ہوتا تھا تو چوہدری محمد علی سرکاری افسر لگا ہوا تھا۔ لیاکت علی خان کا پنڈی میں قتل ہوا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین دستور ساز اسمبلی کا اجلاس بلاتا۔ ان دنوں اسمبلی میں مسلم لیگ سب سے وڈی پارٹی ہوتی تھی۔ گورنر جنرل اس کے لیڈر سے حکومت بنانے کو کہتا۔ پر ایسا نہ ہوا۔ چوہدری نو علی نے اپنے بیٹے پر گورنر جنرل اور سارے وزیروں کو اکٹھا کیا۔ ناظم الدین کو وزیر اعظم لگایا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل اور خود مرکزی وزیر خزانہ بن گیا۔ نہ وہ اسمبلی کا ممبر تھا نہ مسلم لیگ کا۔“

”پر وہ کیسے وزیر بن گیا؟“ رحیم داد نے حیرت سے دریافت کیا۔

”وہ افسروں کا افسر سیکریٹری جنرل جو تھا۔“ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”غلام محمد بھی وزیر خزانہ بننے سے پہلے سرکاری افسر ہوتا تھا۔ وہ اتنا زور آور ہوتا تھا کہ اس نے وزیر اعظم ناظم الدین کو ہٹا کر دیا۔ ناظم الدین نے ملکہ اثر بہتہ سے مدد مانگنی چاہی پر غلام محمد نے اس کے اور دوسرے سفارشوں کی ٹیلی فون کی تاریں ہی کٹوا دی تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ناظم الدین ہی نے ملکہ سفارش کی تھی کہ غلام محمد کو گورنر جنرل لگایا جائے۔ اور ملکہ نے اسے گورنر جنرل لگا بھی دیا۔“

”ملکہ کو یہ اختیار کیسے حاصل ہوا۔ وہ تو انگلستان کی ملکہ ہوتی ہے۔“ رحیم داد نے تعجب سے انہماک سے پوچھا۔ ”مگر یوں کی حکومت تو کب کی ختم ہو چکی۔“

”چوہدری محمد علی کو دیا تھا۔ چوہدری محمد علی نے سردار رشید پر اعتماد کرتے ہوئے وہ خط اسے دے دیا۔ گل صرف اتنی تھی کہ اس میں دولتانہ نے لکھا تھا کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ دن یونٹ سے پنجاب کچھ گھانٹے میں رہے گا۔“

”وہ گھانا کیا تھا؟“ رحیم داد بیچ میں بول اٹھا۔

”وہ یہ کہ مغربی پاکستان اسمبلی میں پنجاب کے ممبروں کا کوٹا ۵۶۱ فی صد بنتا تھا جسے کم کر کے ۴۰ فی صد کر دیا گیا تھا۔ اور اس کا ۲۱ فی صد حصہ چھوٹے صوبوں میں ان کی آبادی کے لحاظ سے بانٹ دیا گیا تھا۔“

”تب توجی پنجاب ہی گھانٹے میں رہا۔“

”بالکل رہا۔ پر آگے چل کر دولتانہ نے اپنے کانفیڈنشل خط میں بتایا تھا کہ پنجاب کے افسروں کو شروع میں عہدوں اور نوکریوں پر اس طرح ہاتھ نہیں مارنا چاہیے کہ چھوٹے صوبے والے نراض ہو جائیں۔ انھیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اگر دن یونٹ کا منصوبہ ناکام ہو گیا تو اس ناکامی سے پنجاب اور بھی زیادہ گھانٹے میں رہے گا۔ وہ اس طرح رہے گا کہ ایسٹ پاکستان ہمیشہ ہمیش کے لیے وڈا اور طاقت ور بن جائے گا۔ اپنی اکثریت کے بل بوتے پر بنگالی جو فیصلہ کرانا چاہیں گے کرا لیں گے۔“

”اپنی سمجھ میں توجی صاف بات ہے کچھ آیا نہیں۔“ رحیم داد نے سادگی سے کہا۔ ”مجھے تو یہ مارا چکر افسروں اور ان کی نوکریوں کا لگتا ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“ احسان شاہ نے وضاحت کی۔ ”پنجاب کا تو صرف نام ہی نام ہے۔ اصلی چکر تو یہ تھا کہ حکومت افسروں کے ہاتھ میں رہے پر ان کے فائدے کے ساتھ اپنا بھی تو فائدہ ہے۔ اسی لیے میں نے تجھے کہا تھا کہ افسروں سے میل ملاپ رکھنے کی کوشش کر۔“ اس نے بے تکلفی سے تقہر لگایا۔ ”تجھے یہ ساری باتیں سمجھ لینی چاہیں۔ تجھے بھی آگے چل کر سیاست میں حصہ لینا ہو گا۔ کوشش کرے گا تو کبھی وزیر بھی لگ جائے گا۔ ورنہ اسمبلی کا ممبر تو بن ہی جائے گا۔“

رحیم داد نے چونک کر احسان شاہ کو دیکھا۔ احسان شاہ مسکرایا۔ دیر تک اسے سیاست کے ارادور موز سمجھاتا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ سناٹا بڑھ گیا۔ دونوں نے شراب نوشی ختم کی۔ کھانا کھایا اور اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے۔



نمائش کے بعد مہمان علی آگیا۔ رحیم داد نے کلیم کے کاغذات اس کے حوالے کر دیے۔

”سکندر مرزا“ افسر سے کیسے گورنر جنرل بن گیا؟“

”سکندر مرزا نے چوہدری محمد علی سے مل کر غلام محمد کو ہٹانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ محمد علی نے ملکہ الزبتھ کو لکھا کہ غلام محمد کو دو ماہ کی رخصت پر بھیج دیا جائے اور اس کی جگہ سکندر مرزا کو گورنر جنرل لگا دیا جائے۔ ملکہ نے چوہدری محمد علی کی سفارش منظور کر لی۔“ احسان شاہ ٹھہر ٹھہر کر بتا رہا۔ ”دو مہینے گزر گئے تو غلام محمد سے چوہدری محمد علی نے کسی نہ کسی طرح استعفیٰ پر دستخط ہم لگوائے۔ استعفیٰ فوراً ملکہ کے پاس بھیج دیا گیا۔ ساتھ ہی یہ بھی درخواست کی گئی کہ سکندر مرزا پکا گورنر جنرل لگا دیا جائے۔ ملکہ نے غلام محمد کا استعفیٰ منظور کر لیا اور سکندر مرزا کو گورنر جنرل دیا۔“

رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”شاہ جی، تو نے بہت عجیب باتیں بتائیں۔ مجھے پتہ نہیں تھا سرکاری افسرانے طاقت ور ہوتے ہیں۔“

”تجھے ایک اور دلچسپ گل سناؤں۔“ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”سردار عبدالرشید جو یونٹ بننے سے پیشتر سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا، پہلے انسپٹر جنرل پولیس ہوتا تھا۔ خان کیوم خان سرحد کا وزیر اعلیٰ تھا۔ اسے مرکزی وزیر لگایا گیا تو اس نے سردار رشید کو اپنی جگہ صوبے کا وزیر بنا دیا۔ سردار رشید بھی نہ صوبائی اسمبلی کا ممبر تھا نہ مسلم لیگ کا۔“

”شاہ جی، یہ بتا، یہ دن یونٹ کا کیا چکر ہے؟“

”دن یونٹ یہ ہوا کہ ادھر کے تینوں صوبوں اور بلوچستان کو ملا کر ایک صوبہ مغربی پاکستان گیا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”جب مری میں اسمبلی کا اجلاس ہوا اور اس یونٹ بنانے کا بل پیش ہوا تو میں وہاں موجود تھا۔ سردار رشید نے بھی دوسروں کے ساتھ مخالفت کی تھی اور یہ الزام لگایا تھا کہ دن یونٹ دراصل ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔ او سازش ثابت کرنے کے لیے ایک خفیہ دستاویز بھی پڑھ کر سنائی تھی۔“

”کیا تھی وہ دستاویز؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”دستاویز شتاویز کیا تھی؟ یہ دراصل میاں ممتاز دولتانہ کا ایک خط تھا، جو اس نے

”وہی سبست کا چکر ہو گا۔“ رحیم داد مسکرا کر بولا۔

”ہے تو وہی چکر۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”گورنر نے میری یہ ڈیوٹی لگائی ہے کہ مسلم لیگی ممبروں کو گھر گھر کر ری پبلکن پارٹی میں لاؤں۔ وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت میں ان سے اسمبلی کے اندر ہاتھ اٹھاؤں۔ اب گورنر کی گل تومانی ہی پڑے گی۔ اس سے پرانی یاری جو ہوئی۔ اپنے بت کام آتا ہے۔ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کے معاملے ہی کو دیکھ لے۔ گورنر اگر چیہ کے خلاف انکوائری نہ رکوائے تو چیہ رشوت کھائے بغیر کیسے الاٹمنٹ کر سکتا ہے۔ سنا ہے اس زمین کے لیے ۵۰ ہزار تک کی رشوت اسے پیش کی جا چکی ہے۔“

”یہ بتا چیہ کے خلاف گورنر نے انکوائری رکوا دی؟“

”گورنر سے چیہ کے بارے میں میری گل بات تو ہو چکی ہے۔ اس نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔ اور جب اس نے وعدہ کر لیا تو سمجھ لے انکوائری ختم ہو جائے گی۔“

”چیہ کو بھی اس گل کا پتہ ہے؟“

”ہاں میں نے اسے بتا دیا ہے۔“

”تو بہت تھکا ہوا نظر آ رہا ہے۔ کیا کرتا رہا دن بھر؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”نہ پوچھ کیا کرتا رہا۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”ہر روز نیا تماشا دیکھنے میں آتا ہے۔ صوبائی اسمبلی کے کتنے ہی ممبر ایسے ہیں کہ صبح لیگ میں ہیں تو دوپہر کو ری پبلکن پارٹی میں۔ شام ہوتے ہوئے پھر لیگی بن جاتے ہیں۔ رات کو خبر آتی ہے کہ ری پبلکن پارٹی کے کیپ میں پہنچ گئے۔ وعدے ہوتے ہیں۔ کہیں کھائی جاتی ہیں۔ حلف اٹھائے جاتے ہیں۔ کلام مجید پر دستخط کرائے جاتے ہیں۔ پر کسی کا اعتبار نہیں۔ راتوں رات وفاداریاں بدل جاتی ہیں۔ زبردست سودے بازی ہو رہی ہے۔ ہر طرح کی رشوت چل رہی ہے۔ پر مٹ، لائنس، الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ دھونس اور دھمکی بھی چل رہی ہے۔ نہ پوچھ کیسے کیسے چکر چلائے جا رہے ہیں۔“

اس نے حسب معمول بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”پچھلے دنوں سپیکر کا انتخاب کرنے کے لیے اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ مسلم لیگ پارٹی نے میر غلام علی تالپور کو اور ری پبلکن پارٹی نے چوہدری فضل الہی کو کھڑا کیا۔ نہ پوچھ کتنا رد لا گولا ہوا۔ جسے دیکھو گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا ہے۔ ممبروں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔ شور شرابہ کھینچا تانی ہاتھ پائی سب ہی کچھ ہوا۔ ووٹ گئے گئے تو برابر برابر نکلے۔ ممتاز علی کزلباش صدارت کر رہا تھا۔ اس نے اپنا کاسٹنگ ووٹ ری پبلکن پارٹی کے امیدوار کو دے دیا۔ لوجی اس طرح چوہدری فضل الہی سپیکر بن گیا۔“

مہربان علی نے کانڈاٹ الٹ پلٹ کر جگہ جگہ سے پڑھے۔ کلیم کے بارے میں جو نکات واضح نہ تھے ان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ رحیم داد سے سوالات کیے۔ پوچھ گچھ کی۔ اور کانڈاٹ کا بستہ سنبھال کر چلا گیا۔

شام کو رحیم داد کو مٹی کے سبزہ زار پر سید احسان شاہ کے ساتھ بیٹھا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ احسان شاہ اور رحیم داد ایک ایک پیگ لگا کر طلوع ہو رہے تھے۔ مہربان علی بھی پہنچ گیا۔ اور الاٹمنٹ کے لیے درخواست تیار کر کے لایا تھا۔ مہربان علی نے درخواست پڑھ کر سنائی۔ احسان شاہ نے اسے توجہ سے سنا۔ مسکرا کر بولا۔ ”ٹھیک ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری دستخط لگا دے۔“ رحیم داد نے مہربان علی کے ہاتھ سے قلم لیا اور خاموشی سے دستخط کر دیے۔

مہربان علی درخواست لے کر چلا گیا۔

وہ ایسا گیا کہ کئی روز تک نظر نہ آیا۔ احسان شاہ بھی کم ہی نظر آتا۔ ان دنوں وہ سیاسی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ایک روٹ پر مٹ کے لیے بھی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک بیٹے کے نام سے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی قائم کر رکھی تھی۔ اسی کمپنی کے لیے وہ روٹ پر مٹ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ پر مٹ نیا نہ تھا۔ پہلے بھی وہ کئی روٹ پر مٹ لے چکا تھا۔ کمپنی کی لاریاں اور بسیں ان پر مٹوں کے مطابق مقررہ راستوں پر چل رہی تھیں۔ احسان شاہ کمپنی کا کام اور بڑھانا چاہتا تھا۔ اس کا منصوبہ تھا کہ وسطی پنجاب میں ہر طرف اس کی کمپنی کی بسوں کا جال پھیل جائے۔ اپنے اس منصوبے کا ذکر وہ رحیم داد سے بھی کر چکا تھا۔

رحیم داد کی احسان شاہ سے دن میں تو ملاقات ہی نہ ہوتی۔ مگر اکثر شام کو دونوں مل بیٹھے۔ شراب نوشی کرتے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ احسان شاہ عام طور پر سیاسی صورت حال کے بارے ہی میں بات کرتا۔ رحیم داد کو اپنی سیاسی سرگرمیوں سے آگاہ کرتا۔

پھر ایسا ہوا کہ تین روز تک وہ رحیم داد سے بالکل نہ مل سکا۔ رات کو کس وقت واپس آتا۔ رحیم داد کو مطلق علم نہ ہوتا۔ وہ بے خبر سوتا ہوتا۔

شام کو وہ ملا تو بہت غڑھال اور تھکا ہوا تھا۔ رحیم داد نے پوچھا۔ ”شاہ جی، تو ادھر کہاں غائب رہا۔ پتہ نہیں تو کن چکروں میں پڑا ہے۔“ اس کے انداز میں تجسس تھا۔ ”تیرے روٹ پر مٹ؟ کیا بنا؟“

”وہ تو مل گیا پر میں اھر ایک اور چکر میں پھنسا ہوا ہوں۔“

”تب تو تیری ہی پارٹی کی جیت ہوئی تھی۔“

”وہ تو ہونی ہی تھی۔ سکندر مرزا اسمبلی کا اجلاس شروع ہونے سے دو روز پہلے ہی لہور آکر بیٹھ گیا تھا۔ ری پبلکن پارٹی کو جتانے آیا تھا۔ اس کی اپنی پارٹی جو ہوئی۔“ احسان شاہ کھل کھلا کر ہنسا۔ ”پر سب سے دلچسپ تماشا اجلاس کے دوسرے دن دیکھنے میں آیا۔ لنگی لمبروں نے اسمبلی کی کارروائی کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ حکومت کا دباؤ پڑا تو درخواست مسترد ہو گئی۔ ججوں کو نوکری کرنی تھی۔ ترکی جو لینی تھی۔ اسمبلی کا ایک سندھی ممبر، بنو صوبائی وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر بھی رہ چکا ہے، مسلم لنگی امیدوار کی حمایت میں سب سے آئے تھا۔ صبح ہائی کورٹ میں درخواست لگانے میں بھی آگے آگے تھا۔ بہت وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ یہ کروں گا وہ کروں گا۔ سہ پہر ہوئی تو دیکھا، ری پبلکن پارٹی کے وزیر کی حیثیت سے حلف اٹھا رہا تھا۔“

”حد ہو گئی جی۔“ رحیم داد چند لمحے حیرت زدہ بیٹھا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”مہربان علی اب تک نہیں لوٹا۔ کب تک آجائے گا؟“

”میں تجھے بتانا بھول گیا، وہ کل صبح واپس آ رہا ہے۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا وہ کل آ رہا ہے؟“

”میرا ایک کزنہ بھی پچھلے دنوں لائل پور گیا تھا۔ آج دوپہر کو واپس آیا ہے۔ وہی بتاتا تھا۔“

چوہدری تو فکر نہ کر۔ مہربان علی پورا کام کر کے ہی آئے گا۔ دوسرے روز رحیم داد کو مہربان علی کا انتظار رہا، مگر وہ نہ آیا۔ احسان شاہ بھی شام کی ٹرین سے اچانک کراچی چلا گیا۔ روائی سے قبل رحیم داد سے ملا بھی نہیں۔ احسان شاہ کے ساتھ اس کا بڑا بیٹا، رحمان شاہ بھی کراچی گیا تھا۔

رحیم داد کو یہ اطلاع کوٹھی کے نوکروں سے ملی تو سخت حیرت زدہ ہوا۔ حیرت کی بات ہی تھی۔ رات ہی کو احسان شاہ کے ساتھ اس کی لمبی نشست رہی تھی۔ لیکن کراچی جانے کے بارے میں اس نے اشارہ تک نہ کیا۔ رحیم داد نے کرید کرید کر نوکروں سے پوچھا۔ مگر انھیں اس کے پروگرام کے بارے میں کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ بالکل بے خبر تھے۔ احسان شاہ کے اس طرح پر اسرار طور پر چلے جانے سے رحیم داد سخت الجھن میں پڑ گیا۔



کوٹھی پر ہر وقت سناٹا چھایا رہتا۔ احسان علی شاہ ہنوز کراچی میں تھا اور کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کب واپس آئے گا۔

رحیم داد شدید تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ اس کا جی اچاٹ ہو گیا تھا۔ لیکن وہ اپنے گاؤں کو ملے ہرکشن واپس جانا نہ چاہتا تھا۔ اسے احسان شاہ کے فیجر مہربان علی کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ کلیم کے تمام ضروری کاغذات بھی اس کی تحویل میں تھے۔ رحیم داد کلیم کے کاغذات اس کے پاس چھوڑنا نہ چاہتا تھا۔ وہ اپنے تمام کاغذات لے کر ہی واپس جانا چاہتا تھا۔

کئی روز گزر گئے۔ مگر مہربان علی نہ آیا۔ نہ یہ معلوم ہو سکا کہ زمین کے الاٹمنٹ کے بارے میں کیا کارروائی ہوئی اور وہ کب واپس آئے گا۔ مہربان علی نے لائل پور سے کوئی اطلاع بھی نہ بھیجی۔ رحیم داد کو کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ لائل پور میں کیا کر رہا ہے۔ وہ سخت تشویش میں مبتلا تھا۔ تشویش کا بنیادی سبب یہ تھا کہ الاٹمنٹ کی درخواست پر اس کے دستخط قطعی جعلی تھے۔ وہ چوہدری نور الہی نہ تھا رحیم داد تھا۔ کلیم، چوہدری نور الہی کے نام سے منظور ہوا تھا جسے قتل کر کے رحیم داد نے کلیم کی دستاویزات اپنے قبضے میں کر لی تھیں اور رحیم داد سے چوہدری نور الہی بن گیا تھا۔ اب وہ نور الہی کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ اسے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا کہ کیس اس کی جعل سازی کا پردہ نہ فاش ہو جائے۔

گرمی اپنے شباب پر تھی۔ دن بھر لو کے جھکڑ چلتے۔ در و دیوار سے چنگاریاں اڑتیں۔ زمین دھوپ کی تمازت سے تپتی۔ آسمان پر گرد کا غبار چھایا رہتا۔ سورج غبار کی اوٹ میں تانبے کے سرخ تھال کی مانند دکھتا۔ دن ڈھلے جب گرمی کی شدت کا زور قدرے ٹوٹتا تو نوکر کوٹھی کے وسیع لان میں کرسیاں قرینے سے لگا دیتے۔

رحیم داد اس روز بھی معمول کے مطابق دن ڈھلے لان کے ایک پرسکون گوشے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ فضا غبار آلود اور بوجھل تھی۔ رحیم داد نے کچھ ہی دیر پہلے غسل کیا تھا۔ اجلا لباس پہنا تھا مگر جسم پر پسینے کی نمی تھی۔ طبیعت میں آکٹا ہٹ تھی۔ تنہائی کا احساس رہ رہ کر ستا تھا۔

سائے پھیل کر طویل ہو گئے۔ دن کی چمک دمک دھندلی پڑ گئی۔ سورج ڈوب گیا۔ آسمان کی رنگت سرمئی ہو گئی۔ اندھیرا دیرے دیرے فضا میں گھلنے لگا۔ رحیم داد کرسی کی پشت سے سر نکائے گم صم بیٹھا تھا۔ ناگاہ کوٹھی کے پھانک پر ایک کار آکر ٹھہری۔ ساتھ ہی کسی کی آواز بھی ابھری۔ رحیم داد کو آواز مانوس معلوم ہوئی۔ اس نے ذہن پر زور دیا اور جھٹ پچان لیا۔ وہ سردار مراد خاں شاہانی تھا۔ چوکیدار سے احسان شاہ کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ رحیم داد کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ اٹھا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا پھانک کی جانب بڑھا۔

مراد خاں شاہانی اسے دیکھتے ہی خوشی سے چیخا۔ ”اؤے چوہدری تو ادھر ہے!“ وہ تیزی سے آگے

وہا۔ قریب پہنچا اور گرم جوشی سے رحیم داد کو دونوں بازوؤں میں دلوچ لیا۔

”شابانی، تو کب آیا؟“ رحیم داد نے علیحدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”میں کل صبح آیا۔ تو نے شاہ جی کو کہاں بھیج دیا؟ سنا ہے کراچی گیا ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی سنا، وہ کراچی گیا ہے۔“

مراد خان شابانی نے مڑ کر سردار شہ زور خان مزاری کی جانب دیکھا۔ وہ قریب ہی کھڑا تھا۔

شابانی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”سینس چوہدری، تو نے اسے نہیں

پہچانا؟“

”کیوں نہیں پہچانا۔ یہ اپنا شہ زور مزاری ہے نا۔ بھکر میں تیری ہی حویلی میں تو اسے بلا تھا۔“

رحیم داد نے آگے بڑھ کر مزاری کو گلے سے لگایا اور آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ ”اسے میں

کیسے بھول سکتا ہوں۔ یہ تیرا یا رہے تو تیرے ساتھ اپنا بھی یا رہے۔“ رحیم داد نے شابانی کو مخاطب

کیا۔ ”دونوں اکٹھے ہی آئے ہو؟“

”میں تو ہفتہ بھر سے لمہور میں ہوں۔“ شابانی کے بجائے مزاری نے جواب دیا۔

تینوں باتیں کرتے ہوئے لان کی جانب بڑھے۔

رحیم داد نے شہ زور مزاری سے دریافت کیا۔ ”تو ہفتہ بھر سے ادھر کیا کر رہا تھا؟“

”کراچی سے ایک کار آنے والی تھی۔ اس کا سودا طے کرنے کے لیے آیا ہوں۔“

”ہو گیا سودا؟“ رحیم داد نے مزاری سے پوچھا۔

”ہو گیا۔ کئی روز ہو گئے۔“ سردار مزاری نے بتایا۔ ”آج کل وہی کار میرے پاس ہے۔“

”بہت شاندار گاڑی ہے۔“ سردار مراد خان شابانی نے ہنس کر کہا۔ ”سینس چوہدری، یہ ڈرائیور

بھی زبردست ہے۔ ایسی تیز گاڑی دوڑاتا ہے جیسے توپ سے نکلا ہوا گولا۔“ اس نے بے تکلفی سے

تقبہ بلند کیا۔

تینوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے لان کے اس گوشے میں پہنچ گئے جہاں کرسیاں قریب سے رکھی

تھیں۔ انھوں نے کرسیاں کھسکائیں اور اطمینان سے بیٹھ گئے۔

رحیم داد نے شہ زور مزاری سے دریافت کیا۔ ”شاہ جی سے تیرا میل ملاپ نہیں؟“

”ہے تو، پر زیادہ نہیں۔“

”تو ہفتہ بھر سے ادھر ہے، ایک روز بھی شاہ جی سے ملنے نہیں آیا؟“ رحیم داد نے شکوہ کرنے

کے انداز میں کہا۔

”کار کے چکر میں پھنسا رہا۔“ سردار مزاری نے صفائی پیش کی۔

رحیم داد نے مڑ کر شابانی کی طرف دیکھا۔ ”تو کل ہی ادھر کیوں نہیں آیا؟“

”کل اور آج سرکاری افسروں سے ملتا رہا۔“ شابانی نے بھی صفائی پیش کی۔ ”فرصت ملے ہی

ادھر آیا ہوں۔“

”تیرے علاقے میں تو سخت گڑبڑ تھی۔“ رحیم داد نے شابانی سے کرید کر پوچھا۔ ”اب ادھر کا کیا

حال احوال ہے؟“

مزاری بیچ میں بول پڑا۔ ”گڑبڑ تو اتنی زبردست تھی کہ بیٹ سے نکل کر مظفر گڑھ اور ڈیرہ غازی

خان کے مزارعوں اور کسانوں تک میں پھیلنے لگی تھی۔“

”اب تو سب ٹھیک ٹھاک ہے۔“ شابانی نے بتایا۔ ”پولیس نے سختی سے دبا دیا۔ ویسے ابھی تک

کیس کیس تھوڑی بہت گڑبڑ ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ گڑبڑ پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔ دوبارہ بھڑک سکتی ہے۔“ رحیم داد

نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

”ایسا خطرہ تو ہے۔“ سردار شہ زور مزاری نے رحیم داد سے اتفاق رائے کرتے ہوئے کہا۔

”ویسے بارڈر ملٹری پولیس ملک پر نہ آتی تو ضلع میانوالی کی پولیس سے ابھی تک گڑبڑ نہ دیتی۔“

”میں تو ان دنوں شابانی کے ساتھ بیٹ ہی میں تھا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”نہ پوچھ ادھر کیسی زبردست گڑبڑ تھی۔ میں تو سخت پریشان ہو گیا تھا۔ واپسی پر ایسا ہوا کہ تنہوں

والی سے آگے مزارعوں اور کیوں کے ایک جھوم نے میری جیب کو گھیر لیا۔ بسے دیکھو لال لال

آنکھیں نکالے گھورتا تھا۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختا تھا۔ انھوں نے تو سمجھو بلا ہی بول دیا تھا۔ پر ڈرائیور

بہت ہشیار تھا۔ اس نے منت کی۔ سمجھایا بجھایا، تب جیب ان کے گھیرے سے کسی نہ کسی طرح نکلی

اور آگے بڑھی۔“

”اُجد اور جانگلی جو ٹھہرے۔“ سردار مزاری نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”انھیں کیا پتہ تو کون ہے

اور کس لیے آیا ہے؟ ان کے پاس اتنی سمجھ ہی ہوتی تو ایسی گڑبڑ کیوں کرتے۔ اپنے ہاتھوں اپنی

خرابی کی۔ گرفتار ہوئے، جیل گئے۔ اب سزا بھگت رہے ہیں۔“

”کئی تو پولیس کی فائرنگ سے مارے بھی گئے۔“ سردار مراد خان شابانی نے گردن اونچی کرتے

ہوئے کہا۔ ”لاشیں بھی دریا میں بہادی گئیں۔ مچھلیاں کھا گئیں۔ کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔“

”سنا ہے زخمی بھی بہت ہوئے۔“ مزاری بولا۔

پریش اور طرح طرح کے لائنس حاصل کر رہا ہے۔ ”وہ اپنی بات کتے کتے اچانک خاموش ہو گیا۔“
 ”سینس تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سردار شاہانی نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”یہاں سرکاری افسروں سے گزربڑکے بارے میں بات ہوئی تو پتہ چلا وہ بھی اسی انداز سے سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے مزید پولیس فورس بھیجنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ ادھر بھی سخت کھلبلی مچ گئی تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ بہت پریشان تھا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مجھ سے پہلے سردار ظفر خاں ڈھانڈلہ کی سربراہی میں بیٹ کے زمین داروں کا ایک وفد مری میں وزیر داخلہ سے ملا تھا۔ اس نے شورش اور گزربڑکانے کے لیے ہر طرح کی سرکاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے کتا تھا فکر کرنے کی کوئی گالہ نہیں۔ اب کی گزربڑک ہوئی تو زیادہ سختی سے دبا دی جائے گی۔“

”پہلے سے وہ اب بدل ہو گیا ہے پر اتنا نہیں جتنا تو سمجھتا ہے۔“
 شاہانی نے رحیم داد کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”سینس چوہدری، آج پینے پلانے کا ارادہ نہیں؟“

”گرمی بہت ہے۔ شاہ جی بھی آج کل کم ہی پیتا ہے۔ اور جن شن پیتا ہے۔ اپنے کو تو بالکل پسند نہیں آتی۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”گرمی میں تو بچ پوچھ ٹھنڈی ٹھنڈی ساوی پینے کو جی کرتا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”تو نے بھکر میں بہت زوردار ساوی پلائی تھی۔“

”ساوی پینے کا مزہ تو بھکر ہی میں آتا ہے۔ ادھر ویسی ساوی نہیں ملتی۔“ شاہانی ہنس کر بولا۔
 ”ادھر تو گرمی میں پیڑ چلتی ہے۔ برف میں لگی ہوئی ٹھنڈی ٹھنڈی پیڑ۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ البتہ سردار شہ زور خان مزاری نے بے چینی سے کرسی پر پہلو بندلا۔
 ”سینس ایسا کر ہمارے ساتھ ہو نکل چل۔“ سردار شاہانی نے کہا۔ ”وہاں دو چار گلاس پیڑ کے لگائیں گے۔ فیر ہیرا منڈی چلیں گے۔“ اس نے مزکرشہ زور کی جانب دیکھا۔ ”مزاری نے ادھر ایک پھڑک دار کنبڑی رکھ چھوڑی ہے۔ ایک دم پوٹ ہے۔ سوہنڑی ہے اور گاتی بھی بہت عمدہ ہے۔ دیکھو گا تو ایک دم مست ہو جائے گا۔ اس کے پاس ضرور چلنا ہے۔“

”تھوڑی دیر تو یہاں اور بیٹھ۔“ رحیم داد بولا۔

”سینس چوہدری اب دیر نہ کر۔“ مزاری نے گردن گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ ”ادھر تو ایسا سنا ہے کہ ہول آتا ہے۔ پتہ نہیں کیسے تیرا نام کتنا ہے۔“

”بس کت ہی جاتا ہے۔“ رحیم داد بچھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”بچ پوچھ تو اپنے پنڈ میں بھی ایسے ہی کتا ہے۔“ اس نے گرمی سانس بھری۔ ”ادھر بھی اپنا دل بھلائے والا کون ہے۔“

مزاری نے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد کو حیرت سے دیکھا۔ مگر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

شاہانی اس کے استجاب کو تاڑ گیا۔ ہنس کر بولا۔ ”مزاری تو اتے ٹھیک سے نہیں جانتا۔ عجب بندہ ہے۔ شراب پیتا ہے اور اکیلا بیٹھ کر پیتا ہے۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”اور اس سے بھی زیادہ

رحیم داد نے بات مختصر کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ ”پر شاہانی تجھے اور بیٹ کے دوسرے زمین داروں کو اب بہت ہشیار اور چوکس رہنا چاہیے۔“

”سینس تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سردار شاہانی نے اس کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”یہاں سرکاری افسروں سے گزربڑکے بارے میں بات ہوئی تو پتہ چلا وہ بھی اسی انداز سے سوچ رہے ہیں۔ انہوں نے مزید پولیس فورس بھیجنے کی تیاری کر رکھی تھی۔ ادھر بھی سخت کھلبلی مچ گئی تھی۔ صوبائی وزیر داخلہ بہت پریشان تھا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مجھ سے پہلے سردار ظفر خاں ڈھانڈلہ کی سربراہی میں بیٹ کے زمین داروں کا ایک وفد مری میں وزیر داخلہ سے ملا تھا۔ اس نے شورش اور گزربڑکانے کے لیے ہر طرح کی سرکاری مدد کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے کتا تھا فکر کرنے کی کوئی گالہ نہیں۔ اب کی گزربڑک ہوئی تو زیادہ سختی سے دبا دی جائے گی۔“

رحیم داد نے موضوع بدلتے ہوئے مراد خاں شاہانی سے دریافت کیا۔ ”تیرا کب تک ادھر ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ ”اور ہاں یہ تو بتا تو ٹھہرا کہاں ہے؟“

”میں مزاری کے ساتھ فلیئر میں ٹھہرا ہوں۔“

”فلیئر تو ہو نل ہے ناں؟“ رحیم داد بولا۔ ”ہو نل میں کیوں ٹھہرا ہے؟ ادھر شاہ جی کی کوٹھی پر

ٹھہرتا۔ تیرے ساتھ بہت مزے سے وکت کتنا۔ تجھے کیا پتہ؟ اکیسے میں یہاں کتنا جی گھبراتا ہے۔“

”تو ایسا کیوں نہیں کرتا۔ ہو نل ہی میں آجا۔ وکت تو وہیں ٹھیک گزرے گا۔“ شاہانی نے آنکھ

دبا کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ویسے بھی اب شاہ جی بوڑھا ہو گیا ہے۔ ایک زمانے میں اس کے پاس ایک

سے ایک زوردار دانا تھا۔ تو نے تو اس کا کوٹ اچھی طرح دیکھ رکھا ہے۔ شاہ جی خود بھی عیش کرتا

تھا یا روں کو بھی عیش کراتا تھا۔“

”پر اب تو اس نے سب کچھ ختم کر دیا۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

”اسے تو اب سیاست لڑانے سے فرصت نہیں۔“ شاہانی نے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

”جب سے اس کا پتر لندن سے بیرسٹرن کر لوٹا ہے، وہ دوسرے ہی چکروں میں رہتا ہے۔ سرکاری

افسروں اور سیاست دانوں کے ساتھ جوڑ توڑ میں لگا رہتا ہے۔“

”میں تو کتا ہوں جی، کراچی بھی وہ کسی ایسے ہی چکر میں گیا ہے۔“

”بالکل اسی چکر میں گیا ہے۔“ شاہانی نے اس کی تائید کی۔

”سنا ہے اس نے اسمبلی کے لیگی ممبروں کو ری پبلکن پارٹی میں بھرتی کرانے کا دھندا شروع کر

دیا ہے۔“ وہ ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ ”اس کا رگزار ہی کے صلے میں دبا کے الائنمنٹس، روٹ

انوکھی گالہ یہ ہے کہ دوا زمین دار ہے پر رات کو بغیر کسی رن کے سوتا ہے۔ پتہ نہیں اسے نیند کیسے آجاتی ہے۔“

”تیرے مزارے شزارے تو ہوں گے؟“ سردار مزاری نے رحیم داد سے دریافت کیا۔
رحیم داد چپ رہا۔ مگر مراد خاں شاہانی چپ نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ ”مزارے شزارے بھی ہیں۔ ان کے جوان گھروالیاں بھی ہیں۔ محبتیں ہیں، کڑیاں ہیں۔“ اس نے بے تکلفی سے ایک آنکھ دبائی۔ ”سب ہی کچھ ہے۔ پر یہ اپنے مزارعوں سے ڈرتا ہے۔“

”مزارعوں سے ڈرتا ہے؟“ مزاری کو سردار شاہانی کی بات پر یقین نہیں آیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ اس نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”سین اس طرح تو تیری زمین داری نہیں چلنے کی۔“
”چلے گی ضرور چلے گی۔“ سردار شاہانی مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ ”سین چوہدری، تیری زمین داری تو جیسے تیسے چلتی ہی رہے گی۔ پر اب تو ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔“
سردار شہ زور خاں مزاری بھی کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے دبی زبان سے انکار کیا۔ ”شاہانی مجھے نہ لے جا۔ میں نے کہیں نہیں جانا۔“

مراد خاں شاہانی اڑ گیا۔ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ ”خاناخا، خزانہ دکھا۔ جب تک میں انور میں ہوں، تجھے میرے ساتھ غلیظ میں ٹھیرنا ہے۔ ادھر اکیللا رہ کر کیا کرے گا۔ شاہ جی، دو تین ہفتے سے پہلے لوٹنے کا نہیں۔ لگتا ہے وہ تے پروگرام پر کراچی گیا ہے۔ تو اب اس کا انتظار نہ کر۔ جب تک مجھے ادھر رکنا ہے تو بھی ہوٹل میں ٹھیر جا۔ بعد میں کوئلہ ہر کشن واپس چلا جانا۔“
رحیم داد مزید انکار نہ کر سکا۔

تینوں کو خفی سے باہر نکلے۔ پھانک سے کچھ فاصلے پر سردار شہ زور مزاری کی لمبی چوڑی کسر کو زلزلہ کھڑی تھی۔ کار دو سال پرانے ماڈل کی تھی۔ لیکن اتنی اچھی حالت میں تھی کہ بالکل نئی معلوم ہوتی تھی۔ سردار مزاری کو بھی برسے جاگیرداروں کی طرح بڑی حویلی اور بڑی کار رکھنے کا شوق تھا۔ کار میں ڈرائیور موجود نہ تھا۔ شہ زور خاں مزاری نے داد طلب نظروں سے کار کی جانب دیکھا۔ آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ وہ اور شاہانی کار کے اندر داخل ہو گئے۔

رحیم داد نے کار میں بیٹھنے سے پہلے اپنی جیب کے ڈرائیور کو بلایا اور اسے کو خفی میں ٹھیرنے کی ہدایت کی۔

”چوہدری کا سامان بھی اٹھا لا۔“ سردار مراد خاں شاہانی نے ڈرائیور کو حکم دیا۔ ڈرائیور نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ ڈرائیور چپ چاپ کو خفی کے اندر چلا گیا۔ ذرا دیر بعد وہ رحیم داد کا سوٹ کیس دباے ہوئے نمودار ہوا۔ اس نے مزاری سے کبھی لی۔ کار کی ڈکی کھولی اور سوٹ کیس اس میں رکھ دیا۔ رحیم داد بھی اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ سردار مزاری نے اسٹیرنگ ویمیل سنبھالا۔ انجن اشارت کیا۔ کار سڑک پر دوڑنے لگی۔

مراد خاں شاہانی نے مزاری کے بارے میں ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ بہت تیز رفتار سے کار دوڑا رہا تھا۔ مگر وہ بہت مٹھا ہوا اور ہوشیار ڈرائیور بھی تھا۔



کار تیزی سے دوڑتی رہی۔ کسی موڑ پر مڑتی تو پچھلے پختہ سڑک سے اس طرح رگڑتے کہ ان سے نہایت تیز اور خوفناک آوازیں ابھرتیں۔ آس پاس سنسنی پھیل جاتی۔ راہ گیر بدکتے، اور سر اسید ہو کر ادھر ادھر بھاگتے۔ لیکن مزاری کو اس قدر خطرناک انداز سے کار دوڑانے میں مزا آرہا تھا۔ وہ بے نیازی سے بیٹھا ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

رحیم داد خوف زدہ اور سہا ہوا تھا۔ وہ گم صم بیٹھا رہا۔ کار مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی مال پر پٹنی۔ مزاری نے رفتار اور تیز کر دی۔ کار ہوٹل کی جانب مڑی۔ آگے بڑھی۔ یکایک مزاری نے بریک لگائے۔ کار شور مچاتی ہوئی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ رحیم داد پھسلا اور مراد خاں شاہانی کے کندھے سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ مگر اس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

تینوں نے آگے کی بیٹوں کی تیز روشنی میں دیکھا۔ دو لمبے ترنگے بلوچ ایک گھنے درخت کے نیچے سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ مزاری نے انھیں تیز اور تکیھی نظروں سے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کار کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سردار مزاری نے بتایاں بجا دیں۔ روشنی اتنی کم رہ گئی کہ دونوں بلوچ سایوں کی مانند دھندلے اور پراسرار نظر آنے لگے۔

سردار مزاری خاموش بیٹھا، نظریں اٹھائے ان کی جانب دیکھتا رہا۔ قریب پہنچ کر ایک بلوچ آگے بڑھا۔ وہ لمبی قیص اور خوب گھیردار شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر پر ملگجی سفید پگڑی تھی۔ پگڑی کے نیچے گردن پر بالوں کے گھنے پٹے لہرا رہے تھے۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی گھنے اور سخت تھے۔ چہرہ تیز دھوپ سے جھلسا ہوا تھا۔ آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ ڈیل ڈول اور وضع قطع سے وہ اونچی چٹان کی مانند پر شکوہ اور ہیبت ناک نظر آتا تھا۔ گردن پر لہراتے ہوئے سر کے بالوں کے گلائیک دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ کوستانی علاقے کا رہنے والا بلوچ ہے۔ اس نے پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار شہ زور خاں مزاری کو سلام کیا۔

مزاری نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ سامنے کھڑے ہوئے بلوچ کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ رعب دار لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

”داؤد خاں! میں نے تجھ سے حوالہ نہیں لیتا۔ یہ بتا کیا خبر لایا ہے؟“

”سردار! خبر تو چنگی ہی ہے۔“ داؤد خاں نے مڑ کر پشت کی جانب دیکھا۔ دوسرا بلوچ اس کے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ وضع قطع سے وہ داؤد خاں سے قدرے مختلف تھا۔ اس کی گردن پر بالوں کے پٹے نہیں تھے۔ عمر بھی داؤد سے کم تھی۔ وہ بائیس برس سے زیادہ کا نہ لگتا تھا۔ قد بھی ذرا دیتا ہوا تھا۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی سخت اور گھنے نہ تھے۔ رنگت گندی تھی۔ وہ شلوار کے بجائے مٹھلا باندھے ہوئے تھا۔ داؤد نے اسے قریب آنے کا ہاتھ سے اشارہ کیا۔ آہستہ بے بولا۔

”بدھیل خاں! تجھے ٹھیک سے پتہ ہے، سردار کو بتا دے۔“

بدھیل خاں آگے بڑھا، جھکا اور سردار شہ زور مزاری کے پیروں کو چھو کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چند لمحے خاموشی رہی، پھر مزاری کی آواز ابھری۔ وہ بدھیل سے دریافت کر رہا تھا۔ ”بدھیل! یہ بتا سراب لہور پہنچ گیا؟“

”ہاں سیں!“ بدھیل خاں نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”وہ آج صبح اوج پہنچ گیا۔“

”سراب اوج پہنچ گیا؟“ مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”وہ اوج کیسے پہنچا؟ وہ تو بلوکی میں تھا۔ اس نے تو لہور پہنچنا تھا۔ تو نے شاہ میر میں مجھے یہی بتایا تھا ناں؟“

”ہاں سیں!“ بدھیل نے سنبھلے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”سراب! بلوکی میں ہی ٹھہرا تھا۔ پر وہ لہور نہیں آیا۔“

”وہ یہاں کیوں نہیں آیا؟“ مزاری کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تلخی بھی تھی۔

”سیں سردار! گامہ یہ ہے، لہور میں اس نے ممدونوں کے پاس ٹھہرنا تھا۔ پر ممدونوں کی کوٹھی میں آج کل کوئی نہیں۔ سب مری چلے گئے۔“ بدھیل ٹھہر ٹھہر کرتا رہا۔ ”سراب کو پتہ چلا تو اس نے لہور کا ارادہ چھوڑ دیا۔ بلوکی سے صاؤک آباد کی طرف لوٹا۔ پر ادھر نہ گیا۔ احمد پور شرکی سے اس نے گڈی بدلی اور اوج پہنچ گیا۔“

”تجھے پتہ ہے، وہ صاؤک آباد کیوں نہیں گیا؟“

”سیں سردار! میں نے تو یہ سنا ہے، وہ محمد دموں کے پاس جمال دین والی میں زیادہ دیر ٹھہرنا نہیں چاہتا۔ تب ہی اس نے صاؤک آباد جانے کا ارادہ چھوڑ دیا۔“ بدھیل نے داؤد خاں کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اور اپنے بیان کی تائید میں اس سے تصدیق کرنا چاہی۔ ”راہو ایسا ہی بتاتا تھا ناں؟“

مزاری نے داؤد کو نظر انداز کرتے ہوئے بدھیل خاں سے دریافت کیا۔ ”یہ بتا راہو کہاں ہے؟“

”سیں! وہ تو اوج ہی میں ہے۔“ بدھیل نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”بھر خاں کو سہ بھی ادھر ہی ہے۔“

”اور کیا بتاتا تھا راہو؟ اسے تو سراب کے ارادوں کا ٹھیک طرح پتہ ہونا چاہیے۔“

”راہو کہتا تھا، سراب دوبارہ لغاریوں کے پاس واپس جانا چاہتا ہے۔“ بدھیل نے سردار مزاری کو بتایا۔ ”اوج میں سراب کا ایک چاہا ہے۔ سراب اس کے ساتھ ہی ٹھہرا ہے۔ اس نے چاہا کے پتر، زردار، کو لغاریوں کے پاس چونی بھیجا تھا۔“

”زردار ابھی ادھر ہی ہے یا واپس آگیا؟“

”سیں وہ واپس آگیا ہے۔“ بدھیل نے کھٹکار کر گلا صاف کیا۔ ”راہو یہ خبر لایا تھا۔ اس نے تو یہ بھی پتہ چلا لیا ہے کہ سراب اوج میں ابھی دو روز اور ٹھہرے گا۔ بعد میں کینجھ جائے گا۔ دن بھر ادھر ٹھہرے گا۔ وہاں سے غازی گھاٹ کی طرف جائے گا۔ اور دریا پار کر کے رات ہی کو ڈیرہ غازی کے رستے لغاریوں کے پاس چونی پہنچ جائے گا۔“

”اور تو اسے چونی پہنچ جانے دے گا؟“ سردار مزاری نے قہر آلود نظروں سے بدھیل کو دیکھا۔ ”حکم دینے کے انداز میں ڈپٹ کر اونچی آواز سے بولا۔“ اسے کسی بھی طرح چونی نہیں پہنچنا چاہیے۔“

”اب ادھر نہیں جائے گا۔ ہرگز نہیں جائے گا۔“

بدھیل خاں نے ہاتھ باندھ کر شہ زور خاں مزاری کو یقین دلایا۔ ”سیں سردار! تو فکر نہ کر،“

”اب کسی طرح چونی دوبارہ نہیں پہنچ سکے گا۔ تیرا حکم پورا ہو گا۔“ وہ سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر ادب سے جھکا۔ مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ ”سیں تو بالکل فکر نہ کر۔“

سردار مزاری نے کچھ نہ کہا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے یافت کیا۔ ”اوج میں سراب اکیلا ہے؟“

”ہاں سیں!“ اس دفعہ بدھیل خاں کے بجائے داؤد نے جواب دیا جو دیر سے خاموش کھڑا تھا۔

”وک زاوی اس کے ساتھ ہی ہے۔“

شہ زور خاں مزاری نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مگر اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ بکھر گئی۔

میں غصے سے چمکنے لگیں۔ وہ چپ چاپ کار سے باہر نکلا۔ داؤد اور بدھیل خاں کے قریب پہنچا۔

ان کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ بدھیل اور داؤد سر جھکائے اس

میں آہستہ سے کہا۔

”برائے نام کی گالہ نہیں۔“ مراد خاں کا لہجہ اس دفعہ نرم تھا۔ ”مجھے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ شہ زور کی سنگی ماں کا تو مدت ہوئی مرن ہو گیا۔ اس کے بچے سردار نجیب خاں مزاری کی تین گھروالیاں تھیں۔ مرجان سب سے چھوٹی تھی۔ شہ زور کے بچے کا مرن ہوا تو وہ بالکل جوان تھی۔ اب بھی بھرپور جوان ہے۔ میں نے تو اسے دیکھا نہیں پر سنا ہے بہت سوہنٹری ہے۔“

”سراپ بھی دوڑا زمین دار ہو گا؟“

”نہیں! شہابی نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”وہ شہ زور کے ڈیرے کا ماشا تھا۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ کئی بار اس نے میرے بدن کی مالش بھی کی ہے۔ اچھا سکڑا اور ڈاڈھا جوان ہے۔“

”سراپ حویلی کے اندر بھی آتا جاتا ہو گا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”ماشیا حویلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے۔ کوئی رن اس کے سامنے نہیں آسکتی، کسی بھی نامحرم کے سامنے نہیں آسکتی۔“ شہابی نے جھٹ تردید کی۔ ”مجھے پتہ نہیں بلوچ سرداروں کی ذالی تو روج ہو جی رہی ہے۔ روج موجیر کا مطلب سمجھتا ہے؟“ اس نے رحیم داد کو استغماہیہ نظروں سے دیکھا۔ ”روج موجیر کا مطلب ہے سورج سے بھی پردہ کرنے والی رن۔ تو خود ہی سوچ سراپ یا کوئی درغیر بندہ حویلی کے اندر کیسے جا سکتا ہے۔“

”جب ایسی گل بات ہے تو وہ مرجان کو کیسے لے اڑا؟“

”مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔“ شہابی نے کہا۔ ”صرف اتنا سنا ہے کہ حویلی سے ایک رات دونوں پتے چھپاتے کسی طرح نکل گئے۔ دن بھر تمن مزاری کے چک سلیم میں روپوش رہے۔ فیر کسی نہ کی طرح لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچ گئے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”وہ ملوک زادی ہے۔ سراپ کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ اس نے بہت برا کیا۔ شہ زور مزاری دونوں کو زندہ ہی چھوڑے گا۔“

”شہ زور نے دونوں کو لغاریوں سے واپس نہیں مانگا؟“

”نہیں!“ مراد خاں نے ہولے ہولے گردن ہلائی۔ ”مانگتا بھی تو نہ دیتے۔ سراپ اور مرجان چوٹی کی سرحد میں داخل ہوتے ہی لغاری تمن دار کی پناہ حاصل کر لی تھی۔ اس طرح دونوں کے باہوٹ بن گئے۔“

”باہوٹ بن جانے سے کیا ہوتا ہے؟“ رحیم داد نے وضاحت چاہی۔

کے پیچھے چلے۔ تینوں درختوں کے نیچے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔



مراد خاں شہابی اور رحیم داد کار کے اندر خاموش بیٹھے تھے۔ کئی منٹ گزر گئے۔ سردار شہ زور خاں مزاری واپس نہیں آیا۔

رحیم داد نے آتا کر سکوت توڑا۔ آہستہ سے پوچھا۔ ”شہابی یہ چکر کیا ہے؟“

”اسی چکر میں تو مزاری لہور آیا ہے۔ ہفتہ بھر سے یہاں ٹھہرا ہے۔ کار کے سووے کا تو صرف بہانہ تھا۔“ مراد خاں شہابی نے مسکرا کر بتایا۔

رحیم داد کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ لمحہ بھر تک ہونق کی طرح مراد خاں کے چہرے کو ٹٹکتا رہا۔ پھر اس نے اٹکتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یہ ملوک زادی کون ہے؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ مراد خاں شہابی نے ٹالنا چاہا۔ ”یہ مزاری کا گھریلو معاملہ ہے۔“ اس نے آنکھ دبا کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”یاری آشنائی کا چکر ہے۔“

رحیم داد کو معاً حیدہ یاد آگئی۔ حیدہ بھی ملوک زادی تھی۔ وہ مراد خاں شہابی کی بہن تھی اور ہنوز غیر شادی شدہ تھی۔ سال سوا سال پہلے جب رحیم داد بھکر میں تھا اور مہمان کی حیثیت سے شہابی کی شاندار حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرا تھا تو ایک رات حیدہ اچانک اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ رات بھر اس کے پاس رہی تھی۔

رحیم داد نے دبی زبان سے پوچھا۔ ”مزاری کی بھین کا تو کوئی معاملہ نہیں ہے۔“ اس نے شہابی سے نظریں نہ ملائیں۔

”نہیں۔“ مراد خاں شہابی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”وہ اس کی بھین نہیں ماں ہے۔“

”وہ اس کی ماں ہے؟“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں حیرت سے کہا۔ ”نہیں یار! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ سراپ اس کی ماں کو اٹھا کر کیسے لے جا سکتا ہے؟“

”وہ شہ زور کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کا نام مرجان ہے۔“ شہابی نے کھل کر بتایا۔ ”سراپ اسے اٹھا کر نہیں لے گیا۔ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ بھاگ گئی۔“

”سراپ سے اس کی یاری کیسے ہو گئی؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”بس ہو گئی یاری۔ مجھے کیا پتہ۔“ شہابی کے لہجے سے بیزاری آشکارہ تھی۔

”برانہ منا۔ میں نے تو ایسے ہی ایک گل پوچھی تھی۔“ رحیم داد نے معذرت کرنے کے انداز

”ایک بار جب کوئی کسی کی پناہ میں آجاتا ہے یا باہوت بن جاتا ہے تو پناہ دینے والا اس کامیادار بن جاتا ہے۔ اگر میاردار ایک بار پناہ دے کر منحرف ہو جائے تو بلوچ اسے ذلیل اور بے غیرت سمجھتے ہیں۔ اس کی ساری دھج وچ، ساری عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ اسے بے میار کہتے ہیں۔ یہ بلوچوں کا بہت پرانا دستور ہے۔ اسے کوئی توڑ نہیں سکتا۔“

”پر سوال یہ ہے لغاریوں نے سراب اور مرجان کو پناہ ہی کیوں دی؟ کیوں انھیں باہوت بنایا؟“ رحیم داد اپنی بات کتے کتے لمحہ بھر کو الجھا۔ ”تو نے میاردار ہی تو کہا تھا؟“

”ہاں، پناہ دینے والے کو بلوچ میاردار ہی کہتے ہیں۔“

”لغاری تمہن دار بھی تو سردار ہی ہو گا۔“ رحیم داد بات پوری طرح سمجھتا چاہتا تھا۔ ”اسے دوسرے بلوچ سردار کی عزت اور آن کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“

”تو عزت اور آن کی گالہ کرتا ہے۔“ شاہانی مسکرا کر بولا۔ ”لغاری یہی تو چاہتے تھے۔ وہ سراب اور مرجان کو باہوت بنا کر مزار یوں کے متھے پر بدنامی اور خواری کا داغ لگانا چاہتے تھے۔ اسے تک کرنا کہتے ہیں۔ لغاریوں نے تو جان بوجھ کر سراب اور مرجان کو باہوت بنایا۔ میں تو سمجھتا ہوں دونوں کو پوٹی میں خود لغاریوں ہی نے بلایا تھا۔“

”یہ تو انھوں نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”چوہدری اصلی بات یہ ہے“ شاہانی نے وضاحت کی۔ ”مزار یوں سے لغاریوں کی بہت پرانی دشمنی ہے۔ دونوں کے درمیان روز ہی جھگڑے نئے ہوتے ہیں۔ اندھا دھند گولیاں چلتی ہیں۔ جی پوچھ مزار یوں کو موقع ملتا تو وہ بھی ایسا ہی کرتے۔ لغاریوں کو تک کرنے میں ذرا بھی نرمی یا رعایت سے کام نہ لیتے۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ شاہانی نے بے تکلفی سے رحیم داد کی ران پر ہاتھ مارا۔ ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”چوہدری، اب تو مزار یوں اور لغاریوں کی دشمنی اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ذرا غازی خاں کے تمہن دار دو گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔“

”کتے تمہن دار ہیں؟“ رحیم داد نے اپنی معلومات کے لیے شاہانی سے دریافت کیا۔

”ویسے تو نو تمہن دار ہوتے ہیں۔“ مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ ”پر آٹھ ایسے ہیں جو دو گروہوں میں بٹے ہیں۔ ایک گروہ کی سرداری یا سربراہی مزاری کرتے ہیں اور دوسرے کی لغاری۔ مزار یوں کے ساتھ دریشک، گورچانی، اور کھوسہ تمہن ہیں۔ اور لغاریوں کے ساتھ لنڈ، کینہرائی اور کھڑوان ہیں۔ صرف تمہن بزدار کسی ایک کے ساتھ نہیں۔ ویسے بزدار اب زیادہ طاقت ور بھی نہیں

رہے۔“

”یہ بتا شاہانی، تیرے خیال میں مزار یوں اور لغاریوں میں زیادہ زور آور اور طاقت ور کون ہے؟“

”پہلے تو مزاری بہت طاقت ور ہوتے تھے۔“ شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”تو نے سر امام بخش مزاری کا نام تو سنا ہی ہو گا۔ وہ بہت وڈا بلوچ سردار تھا۔ سچ پوچھ تو مزار یوں کو اسی نے آگے بڑھایا۔ ۱۸۵۷ء کے غدر میں اس نے انگریزوں کی زبردست مدد کی۔ بلوایوں کو کچلنے میں پوری طرح ان کا ساتھ دیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”ویسے تو ان دنوں مزار یوں کا سردار، دوست محمد خاں تھا۔ پر وہ تو نام کا سردار تھا۔ سرداری تو اصل میں اس کا چاچا، امام بخش خاں کرتا تھا۔ انگریز اس سے بہت خوش تھے۔ اسی کو مزار یوں کا سردار مانتے تھے۔“ شاہانی نے مڑ کر رحیم داد کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ ”سین چوہدری، انگریزوں میں یہ زبردست خوبی تھی۔ جو ان کی مدد کرتا، ان کے ساتھ وفا داری کرتا اسے آگے لاتے تھے۔ بہت عزت دیتے تھے۔ منصب اور بیکہ انعام میں دیتے تھے۔“

”جیلہ بتاتی تھی اپنے شاہ جی کے بزرگوں اور وڈیوں نے بھی غدر میں بلوایوں کے خلاف انگریزوں کی بہت مدد کی تھی۔“

”ضرور کی تھی۔ تبھی تو اس کے پاس اتنی وڈی بگیرہ ہے۔ اس کے پتر اونچے اونچے عمدوں پر لگے ہیں۔ انگریزوں ہی نے لگائے تھے۔“ شاہانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اب تو سر امام بخش خان مزاری کے بارے میں سن۔ ہوا یہ کہ انگریزوں نے جب ڈیرہ غازی خان کو اپنی عمل داری میں شامل کیا تو امام بخش خاں نے ان کی ہر طرح مدد کی۔ اس کی وفاداری سے خوش ہو کر انھوں نے اسے آئیری مجسٹریٹ بنایا۔ نواب بنایا، سر بنایا، اور فیروصبائی درباری بنایا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”صوبائی درباری کا عہدہ بہت اونچا ہوتا تھا۔ اسے گورنر کے دربار میں کرسی ملتی تھی۔“

”تب تو وہ زبردست سردار تھا۔“ رحیم داد نے مرعوب ہو کر کہا۔

”ہا سیں، وہ مزار یوں کا زبردست سردار تھا۔“ شاہانی نے رحیم داد سے اتفاق رائے کیا۔ ”سچ پوچھ تو اسے آگے بڑھانے میں سر رابرٹ سنڈھین کا ہاتھ تھا۔ وہ بہت بہادر اور وڈا انگریز افسر تھا۔ جب اس نے بلوچستان کی ریاست کلات پر چڑھائی کی تو امام بخش اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ بلوچوں کے خلاف ہر طرح سنڈھین کی مدد کرتا تھا۔ سنڈھین اس خدمت اور وفاداری سے اتنا خوش ہوا کہ اسے آگے اور آگے ہی بڑھاتا گیا۔ تب سے مزاری بھی آگے اور آگے بڑھتے گئے۔ سر امام بخش خاں کے بعد سردار بہرام خاں نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ وہ بھی نواب بنا۔ سر بنا۔ پنجاب اسمبلی کا

مزاریوں کا زبردست احسان ہوا۔“

”پر لغاری کہتے ہیں، بہرام خاں مزاری نے یہ ساری کارروائی انگریز ڈپٹی کمشنر کے اشارے پر کی تھی۔ وہ انگریزوں کے بہت اعتماد کا بندہ تھا۔“ شاہانی نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری، بات یہ ہے انگریزوں کے راج میں مزاریوں کے سامنے لغاریوں کی زیادہ نہ چلتی تھی۔ ویسے دونوں تمہن کے درمیان انگریزوں کے ساتھ وفاداری دکھانے کے لیے زبردست مقابلہ رہتا تھا۔ دونوں ہی انگریزوں کی سرپرستی حاصل کر کے طاقت پکڑنا چاہتے تھے۔“

”پر اب تو لغاری ہی زیادہ طاقت ور لگتے ہیں۔“ رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”نہیک کہہ رہا ہے تو۔“ مراد خاں شاہانی نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”آج کل تو وہ بہت طاقت پکڑ گئے ہیں۔ بات یہ ہے لغاری پہلے یونینسٹ ہوتے تھے۔ اور یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ یونینسٹ سیاسی طور پر انگریزوں کے بندے ہوتے تھے۔ بزدار پاکستان کے حامی تھے اور مسلم لیگی تھے۔ لغاری تمہن دار نے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر لیگی بزدار امیدوار کے خلاف الیکشن لڑا اور بری طرح ہارا۔“

”تب تو لغاریوں کو کمزور پڑ جانا چاہیے تھا۔“

”پر لغاری تمہن دار بہت ہشیار تھا۔“ مراد خاں نے ہلکا ہنسنہ لگایا۔ ”اس نے مسلم لیگ میں گھسنے کے لیے اپنی ایک دھمی ممدوٹوں کو دیا دی۔ ممدوٹوں کا ان دنوں بہت زور زورہ تھا۔ نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ، پنجاب کا وزیر اعلیٰ اور صوبائی مسلم لیگ کا صدر ہوتا تھا۔“ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”دوسری دھمی بھاول پور کے مخدوموں کو دیا دی اور اپنی ایک پوتی، کالا باغ کے نوابوں کے گھر میں دے دی۔ اس طرح لغاریوں نے رشتہ داریوں کے ذریعے ہر طرف میل جول بڑھا رکھا ہے۔ ان کا اثر رسوخ ڈیرہ غازی سے نکل کر پورے پنجاب میں پھیل گیا۔“ اس نے ایک بار پھر ہنسنہ بلند کیا۔ ”اور دن یونٹ بننے کے بعد توری پبلکن پارٹی کے روپ میں یونینسٹ دوبارہ پنجاب میں طاقت پکڑنے لگے ہیں۔ لغاری ادھر بھی ہیں اور ادھر بھی۔ اس لیے سیاسی طور پر بہت زیادہ طاقت ور ہو گئے ہیں۔“

”یہ تمہن دار بھی اپنی طرح زمین دار ہوتے ہیں نا؟“

”زمین دار تو ہوتے ہی ہیں۔ پر تمہن دار اپنے کیلہ کا سردار ہوتا ہے۔ پورے تمہن پر اس کی حکومت ہوتی ہے۔ وہ پکھری اور عدالت لگاتا ہے۔ مکدہوں کے فیصلے سناتا ہے۔“ شاہانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”تمہن داروں کی اپنی جلیں ہوتی ہیں۔ اب سے نہیں انگریزوں کے زمانے سے

ممبر بنا۔ وہ بھی انگریزوں کا زبردست وفادار تھا۔ بلوچوں کی بغاوتوں اور سرکشی کو دبانے میں اس نے بھی انگریزوں کی زبردست مدد کی تھی۔ انگریزوں نے ان خدمات سے خوش ہو کر مزاریوں کو خطابات دیے۔ وڈی وڈی بیکیریں دیں۔ عمدے اور منصب دیے۔ کیا نہیں دیا۔“

”مزاری تو ہمیشہ سے ڈیرہ غازی خاں میں ہوتے تھے۔“

”سنا ہے پہلے سیستان میں ہوتے تھے۔ ان کا کیلہ ایک چٹے کے کنارے آباد تھا جس کا نام مزار تھا۔ بلوچی میں مزار شیر کو کہتے ہیں۔“ شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”مزاری بلوچوں کا بہت زور آور کیلہ ہوتا تھا۔ انھیں سردار جمال خاں ادھر لایا تھا۔ مزاری اپنے بارے میں یہی بتاتے ہیں۔“

”لغاری بلوچ، انگریزوں کے وفادار نہیں رہے ہوں گے۔ انگریزوں سے ان کی لگتی ہوگی۔“

رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”نہیں۔“ مراد خاں شاہانی نے انکار میں گردن ہلایا۔ ”مزاریوں کی طرح لغاریوں نے بھی بلوچوں کی سرکشی اور بغاوت دبانے میں بہت خدمت کی۔ زبردست وفاداری دکھائی۔ سردار جلال خاں لغاری تو انگریزوں کا بہت وفادار ہوتا تھا۔ اس نے انگریزوں کی حمایت میں بلوچ باغیوں کے خلاف زبردست جنگیں لڑیں۔ اس کا رگزاری کے صلے میں نواب کا خطاب پایا۔ چوٹی کی اتنی وڈی بیکری ملی جو آج تک لغاریوں کے پاس ہے۔ سردار جلال خاں لغاری کو بھی جمشتری کے اختیارات حاصل تھے۔“

”تب تو انگریزوں نے لغاریوں کو بھی آگے بڑھایا ہو گا۔“

”انگریزوں نے تو لغاریوں کو آگے بڑھانے کی ہر طرح کوشش کی پر نواب جلال خاں لغاری کے مرن کے بعد اس کے وارثوں کے درمیان ایسا جھگڑا کھڑا ہوا کہ بیکری یاد ہو گئی۔ اس برے زمانے میں سردار بہرام خاں مزاری نے لغاریوں کی بہت مدد کی۔ ان کے بہت کام آیا۔“

”کیا کیا اس نے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”سردار سر بہرام خاں مزاری نے انگریز ڈپٹی کمشنر کی نگرانی میں لغاریوں کا بہت وڈا جرگہ بلایا۔ اس جرگے میں سردار بہرام کے علاوہ سردار جلاب خاں اور سردار جن وڈا خاں نے بھی شرکت کی تھی۔“ مراد خاں شاہانی ٹھنہ ٹھنہ کر بولتا رہا۔ ”اسی جرگے میں سردار دین محمد کو تمہن لغاری کا تمہن دار بنایا گیا۔ اس طرح لغاریوں کا جھگڑا ختم ہوا اور ان کی بیکری تباہ ہونے سے بچ گئی۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مزاریوں نے لغاریوں کو تباہ ہونے سے بچایا۔ یہ تو لغاریوں؟“

س۔ بلکہ انگریزوں کی تو مدت تک جلیں بھی نہ تھیں۔ اپنے کیدی وہ تمن داروں ہی کی جیلوں میں بند کرنے کے لیے بھیجتے تھے۔

”پکھری عدالت تو تو بھی لگاتا ہے۔ کدموں کے فیصلے بھی سناتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ جرمانے لگاتا ہے۔ ٹیکس لگاتا ہے۔ تو تمن دار کیوں نہیں بن سکا؟“ رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”میں تمن دار ہو بھی نہیں سکتا۔ نہ میں اتنا دوا بگیر دار ہوں اور نہ میرے علاقے میں تمن داری کا دستور ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے وضاحت کی۔ ”تمن داروں کو تو وہ عدالتی اختیارات حاصل ہوتے ہیں جو مجسٹریٹوں کے پاس بھی نہیں ہوتے۔ ان کے فیصلے کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ یہ اختیارات انھیں انگریزوں کے زمانے سے حاصل ہیں اور ابھی تک ان کے پاس ہیں۔“ اس نے بے تکلفی سے ہنس کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”ویسے میں اور بینٹ کے دوسرے بلوچ سردار اور وڈے زمین دار پکھری بھی لگاتے ہیں۔ فیصلے بھی کرتے ہیں۔ سزائیں بھی دیتے ہیں۔ حکومت کو سب پتہ ہے۔ پر حکومت ہمارے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاتی۔ تو نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

”شہ زور بھی تمن دار ہو گا؟“

”نہ وہ تمن دار ہے نہ سردار۔“ شاہانی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”ویسے اب تو سارے ہی بلوچ بگیر دار اور وڈے زمین دار اپنے کو سردار کہتے ہیں۔ شہ زور کے بارے میں مجھے اتنا پتہ ہے کہ وہ تمن دار کا رشتے میں بھائی ہے۔ وہ سردار نہیں بن سکتا۔ مدم بھی نہیں بن سکتا۔ ویسے مدم بھی پکھری لگاتا ہے۔ فیصلے سناتا ہے۔ سزائیں دیتا ہے۔ جرمانے لگاتا ہے۔ میں تجھے ساری گل بات سمجھا دوں، لیکن شہ زور مزاری ٹھیک طرح سمجھا سکتا ہے۔“

”مدم کیا ہوتا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”پہلے یہ سمجھ لے تمن کے کہتے ہیں۔ تمن، بگیر اور زمین داری کو بھی کہتے ہیں۔ پر تمن مطلب ہے کیل۔“ وہ ٹانگیں پھیلا کر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ اور سردار اور مقدم کا فرق سمجھا۔

لگا۔

درختوں کے نیچے اندھیرے میں آہٹ ہوئی۔ مگر کوئی سامنے نہیں آیا۔ صرف آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ آوازیں اتنی دھیمی تھیں کہ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ رحیم داد نے نظریں اٹھا کر درختوں کی جانب دیکھا۔ لیکن شاہانی درختوں کے نیچے سرسراتی ہوئی سرگوشیوں سے بے نیاز بیٹھا رہا۔ اس نے ادھر دیکھا بھی نہیں۔ نہایت اطمینان سے بلوچ قبائل کی سماجی در

بندی پر روشنی ڈالتا رہا۔

”ہر بلوچ کیل کا سردار ادھر ڈیرہ غازی خاں میں تمن دار کھلاتا ہے۔ ہر کیل کئی حصوں میں بٹا ہوتا ہے جو پھلی کھلاتا ہے۔ ہر پھلی کا سربراہ مدم ہوتا ہے۔ تمن دار کی طرح مدم کا منصب بھی موروثی ہوتا ہے۔ مدم بھی بہت با اثر اور طاقت ور ہوتا ہے۔ تمن دار یا سردار، اہم معاملات میں مدم کے مشورے کے بغیر فیصلے نہیں کرتے۔“

”تب تو شہ زور خاں پکھری عدالت نہیں لگا سکتا۔ نہ وہ سردار ہے نہ مدم۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ شاہانی نے قہقہہ بلند کیا۔ ”اپنی بگیر میں تو وہ سردار ہی سمجھا جاتا ہے۔ ادھر پکھری لگاتا ہے۔ فیصلے بھی سناتا ہے۔ اور سزائیں بھی دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اب تو بہت کچھ بدل گیا۔ جس کے پاس بگیر یا دوی زمین داری ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اپنی بگیر میں تو اسی کی سرداری اور حکمرانی چلتی ہے۔“

”اس طرح تو مزاریوں کے بہت سے حصے اور ٹکڑے بن گئے ہوں گے۔“

”ایک طرح تو تیری گالہ ٹھیک ہی ہے۔“ شاہانی نے تردید نہیں کی۔ ”شروع میں تو مزاری کیل کے چار مشورے ٹکڑے ہوتے تھے۔ ان کے نام تھے۔ رستمائی، پلانی، صدائی اور سرگانی، پر اب تو بہت سے ہیں۔ ایک نہیں، جانے کتنی تو مزاری کیل میں پھلیاں بن گئی ہیں۔ تب ہی تو مدموں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ بلوچوں کے دوسرے کیلوں کا بھی ایسا ہی حال ہے۔“

”شہ زور خاں تو پرانے والوں ہی میں سے ہو گا؟“

”ہاں اس کا تعلق پلانیوں سے ہے۔ ایک بار شہ زور ہی نے مجھے یہ بات بتائی تھی۔ میں نے مزاری کیل کے بارے میں جو کچھ بتایا، اسی سے سنا تھا۔ کبھی کبھی تو نشے کی ترنگ میں وہ مزاریوں کے بارے میں بہت باتیں جاتا ہے۔ اور بہت عجیب و غریب باتیں بتاتا ہے۔“



سردار شہ زور خان مزاری درختوں کے نیچے سے نمودار ہوا اور سڑک پر آگیا۔ داؤد اور بدھیل خان بھی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ مگر چند ہی قدم اس کے ہم راہ چلنے کے بعد اجازت لے کر رخصت ہو گئے اور جس سمت سے آئے تھے اسی سمت خاموشی سے واپس چلے گئے۔

شہ زور آہستہ آہستہ چلتا ہوا کار کے قریب پہنچا۔ دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوا اور اسٹیرنگ وھیل سنبھال کر چپ چاپ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے کار اشارت کی۔ ذرا دیر بعد وہ سڑک پر دوڑتی ہوئی ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مزاری گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے نہ کوئی بات

کی نہ کسی کی جانب متوجہ ہوا۔

کار ہوٹل کے اندر داخل ہوئی۔ تینوں باہر آئے۔ کمرے میں پہنچے۔ سردار مراد خاں شاہانی نے ہوٹل کے بیرے سے نصف درجن بیڑی بوتلیں منگوائیں۔ ذرا دیر بعد بوتلیں آگئیں۔ گلاس بھی آگئے۔ تینوں کرسیاں کھسکا کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔ بیرے نے بوتلیں کھولیں اور بیڑے تینوں کے گلاس بھر دیے۔ گلاس اٹھائے گئے اور ہونٹوں سے لگائے گئے۔ بیڑہ بہت ٹھنڈی تھی۔ شاہانی نے گھونٹ بھرتے ہوئے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”پسند آئی۔“ اس نے ہلکا سا تھقہ لگایا۔ ”گرمی میں تو ٹھنڈی ٹھنڈی بیڑی مزادیتی ہے۔“

رحیم داد نے بھی گھونٹ بھرا۔ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”چنگی ہے۔“ مزاری نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ ہنوز گم صم تھا۔ کھویا کھویا نظر آ رہا تھا۔ شاہانی نے اسے چھیڑا۔ ”شہ زور تو چپ چپ دکھائی پڑ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟“

”کوئی خاص گالہ نہیں۔“ شہ زور مزاری نے ٹالنا چاہا۔

شاہانی نے شہ زور کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”ایسے کام نہیں چلے گا۔ صاف صاف بتا۔ کوئی نیا چکر تو نہیں چل گیا؟“

”چکر تو چل ہی رہا ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے۔“ شہ زور مزاری کا لہجہ بوجھل تھا۔ ”لغاریوں نے تک کرنا تھا کر چکے۔ اب میں بدنامی کے اس سیاہ داغ کو زیادہ عرصے برداشت نہیں کر سکتا۔“

اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور نفرت کے سائے منڈلانے لگے۔ اس نے گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں نصف کے لگ بھگ خالی کر دیا۔ بیڑے سے بھگی ہوئی مونچھوں کو ہاتھ سے صاف کیا۔ مڑ کر شاہانی کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تو مزا داری کرنی ہے۔ اپنی عزت اور آن کے لیے سب ہی کچھ کرتا ہے۔“ اس کی آواز اونچی ہو گئی۔ ”اس بار لغاریوں سے کھل کر جنگ ہوگی۔“

”سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“ شاہانی نے خبردار کیا۔ ”لغاری اب بہت زور پکڑ گئے ہیں۔“

”مجھے پتہ ہے۔“ شہ زور خاں نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”پر مزاری بھی بدلہ لینا جانتے ہیں۔“

انھیں اتنا کمزور نہ سمجھ۔“

”سوچ لے۔“ شاہانی کا رویہ ہنوز نامحمانہ تھا۔

”سوچ لیا، سب کچھ سوچ لیا۔ تو فکر نہ کر۔“ مزاری نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگایا اور اس دفعہ پورا گلاس خالی کر دیا۔

شاہانی نے بوتل اٹھا کر شہ زور مزاری کا گلاس دوبارہ بیڑے سے بھر دیا۔ اس کی جانب دیکھے بغیر

پوچھا۔ ”آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔“

”تو نے تو ہیرا منڈی چلنے کا پروگرام بنایا تھا۔“ شاہانی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”ٹرین ساڑھے گیارہ بجے چھوٹی ہے۔“ مزاری نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔ ”ابھی دس بجے ہیں۔ میں ٹرین ہی سے جاؤں گا۔ کار سے سفر کرنا آج کل ٹھیک نہیں۔“

”یہی جلدی کیا ہے۔ کل دن کی ٹرین سے چلا جانا۔“ شاہانی نے اسے رات بھر کے لیے روکنا چاہا۔ وہ ہیرا منڈی جانے اور رقص و سرود کی محفل سے لطف اندوز ہونے کے لیے بے چین تھا۔

”نہیں، میں نے آج ہی رات جانا ہے۔ میں اب یہاں نہیں ٹھیر سکتا۔“ شہ زور خاں مزاری آہانہ نہ ہوا۔ اس نے شاہانی کو بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ ”تو بھی میرے ساتھ چل۔“

”مجھے تو ادھر کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“ شاہانی نے انکار کر دیا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ایسا کر چوہدری کو لے جا۔ اسے ادھر کوئی کام شام بھی نہیں کرنا۔“

رحیم داد جو دیر سے خاموش بیٹھا تھا، گھبرا کر بولا۔ ”تو نے کیسے سوچا، مجھے یہاں کوئی کام شام نہیں۔ میں نے لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ لینی ہے۔“

”تو اس کی پرواہ نہ کر۔ وہ تو شاہ جی کرا لے گا۔“ شاہانی ہنس کر بولا۔ ”تجھے پتہ نہیں، وہ آج کل بہت اونچا جا رہا ہے۔ زمین کی الاٹمنٹ تو سمجھ لے اس نے گرا بیھی لی۔ ویسے بھی اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں۔“ اس نے بے تکلفی سے تھقہ بلند کیا۔ ”وہ تو ان دنوں وزارتوں کی الاٹمنٹ لے رہا ہے۔“

شہ زور مزاری نے بھی زور دیا۔ ”چوہدری، تو زمین کی الاٹمنٹ ہی کے چکر میں ادھر ٹھیرا ہے تو میرے ساتھ ڈیرہ غازی خاں چل۔ وہاں ہندوؤں اور سکھوں کی چھوڑی ہوئی بہت متروکہ اراضی ہے۔ میری اپنی تحصیل راجن پور میں ابھی تک کتنی ایسی متروکہ اراضی ہے جو کسی کے نام الاٹ میں ہوئی۔ تحصیل دار تو اپنا ہی بندہ ہے۔ ڈپٹی کمشنر سے بھی یاری ہے۔ محکمہ بحالیات میں بھی ہنے کی بندے لگے ہیں۔ جتنی چاہے زمین الاٹ کرا لے۔“

”میرے کلیم کے کاغذات تو شاہ جی کے منیجر، مہریان علی کے پاس ہیں۔“ رحیم داد نے عذر پیش کیا۔ ”ان کے بغیر کیسے الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔“

”ایسا کر۔ پہلے چل کر اراضی دیکھ لے۔ الاٹمنٹ کی درخواست بعد میں لگانا۔“ شہ زور خاں نے مشورہ دیا۔

رحیم داد کو ڈیرہ غازی خاں کی متروکہ جائیداد سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ مزاری کے ساتھ جانا بھی نہ چاہتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”صاف بات یہ ہے جی، تیرے ضلع کی زمین کے بارے میں سنا ہے یا رانی ہے یا دریا کے کنارے کی ہے۔ اور دریا کے کنارے کی زمین ہر سال برسات میں ڈوب جاتی ہے۔ سیلاب کھڑی فصلوں کو ہمالے جاتا ہے۔ ویسے بھی اس پر صرف رینج کی فصل ہوتی ہے۔ میں نے ایسی زمین سے کیا لیتا۔“

”تجھے یہ گالہ کس نے بتائی۔؟“ مزاری نے ٹیکھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تجھے یہ پتہ نہیں۔ ادھر نہری زمین بھی ہے اور بہت زر خیز بھی ہے۔ تبھی تو ادھر زرعی اراضی کی الاٹمنٹ نہیں ملتی۔ تو اس بھول میں نہ رہنا۔ بات یہ ہے کہ ساری ہی متروکہ اراضی وڈے سرداروں اور زمین داروں نے اپنے مزارعوں اور کھندوں کے ذریعے دبا رکھی ہے۔ کئی مہاجر الاٹمنٹ کے آرڈر لے کر پیچھے۔ سرداروں اور زمین داروں نے مار پیٹ کر انھیں بھگا دیا۔ جنھوں نے افسروں کی مدد سے بننے اور ٹھیرنے کی کوشش کی ان کا اس طرح صفایا کر دیا گیا کہ لاش کا بھی پتہ نہ چلا۔“

”تب تو میں نے ادھر ہرگز زمین کی الاٹمنٹ نہیں لینی۔“ رحیم داد پریشان ہو کر بولا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ منڈلانے لگا۔

”تو نے تو اسے ڈرا دیا۔“ شاہانی نے ہنس کر مزاری کو مخاطب کیا۔ ”ڈرا اس کا چہرہ تو دیکھ۔ کتنا خوف زدہ نظر آ رہا ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہولے ہولے رحیم داد کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ ”سین چوہدری، پرواہ نہ کر۔ شہ زور مزاری کے ہوتے ہوئے تیرے لیے ڈرنے اور گھبرانے کی کوئی گالہ نہیں۔ کوئی تیری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تجھے پتہ نہیں ادھر اس کی بہت دھاک دم ہے۔“

”شاہانی ٹھیک کہہ رہا ہے چوہدری۔“ مزاری نے رحیم داد کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ گردن اٹھائی اور مونچھوں کو مروڑتے ہوئے بولا۔ ”میرے ادھر ہوتے ہوئے تجھے کس سے ڈرنا شرنا۔ میں بلوچ سردار ہوں۔ اور میاں دار بھی ہوں۔“ اس کے لہجے میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ”تو مہمان بن کر میرے علاقے میں آئے گا۔ تیری حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ جان دے دوں گا تجھ پر آغہ نہیں آنے دوں گا۔ یہ گالہ تو پوری طرح سمجھ لے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر بیڑ کا بڑا گھونٹ بھرا۔ ”زمین داری کا مزا اٹھانا ہے تو میری طرف آ۔ ٹنگری میں کیا زمین داری کرنی۔ وہ تو آباد کاروں کا ضلع ہے۔ ادھر کے وڈے زمین داروں کا تو یہ حال ہے کہ گھروالیاں جاگلیوں اور کمیوں سے بھی یاری لگالیں تو چپ کر جاتے ہیں۔ کالی اور کالے کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ زمین داری کی شان

دیکھنا ہے تو ڈیرہ غازی خان چل۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”الاٹمنٹ ٹاٹمنٹ کی بعد میں سوچنا۔ پہلے کچھ دن چل کر میرے ساتھ ٹھیر۔ فیصلہ کرنا۔“

”یہ ٹھیک رہے گا۔“ شاہانی نے مزاری کی تائید کی۔ ”مزاری کے ساتھ چلا جا۔ بہت آرام سے رکت گزرے گا۔ ہفتے ڈیڑھ ہفتے تک واپس آجانا۔ تب تک شاہ جی بھی کراچی سے واپس آجائے گا۔ میں اسے تیرے بارے میں بتا دوں گا۔“

شہ زور مزاری نے اصرار کیا۔ ”سین چوہدری، اب انکار نہ کرنا۔ بس اب تو میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔“ اس نے اپنا گلاس ختم کیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

شاہانی نے اسے روکنا چاہا۔ ”ڈیڑھ بوتل بیڑ میں تیرا کیا بنے گا۔ ایک اور لگا لے۔ ویسے بیڑ میں ہوتا ہی کیا ہے۔ پانی ہی پانی۔ پیٹاب کرو، سب نکل جاتا ہے۔“

مزاری آمادہ نہ ہوا۔ ”مجھے ابھی کئی کام کرنے ہیں۔“ وہ آگے بڑھا اور اپنے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

رحیم داد اور شاہانی خاموش بیٹھے بیڑ کے گھونٹ بھرتے رہے۔ رحیم داد گری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاہانی نے اسے گرم صم دیکھ کر کہا۔ ”سین چوہدری، تو کچھ پریشان پریشان لگ رہا ہے۔ نہیں جانا چاہتا تو نہ جا۔“

”نہیں، مجھے مزاری کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”سوچ رہا تھا کہ لاکل پور کی زمین کی الاٹمنٹ تک مجھے ادھر ہی رکنا چاہیے۔ شاہ جی بھی نہیں ہے۔ وہ واپس آجائے تو تیرے ساتھ ہی مزاری کے پنڈ چلوں گا۔“

”پر میں نے ادھر نہیں جانا۔“ شاہانی نے اپنے پروگرام سے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ ”میں تو لہور سے واپسی پر سیدھا بھکر جاؤں گا۔ تجھے ادھر جانا ہے تو آج ہی چلا جا۔ نہ گیا تو مزاری برا منائے گا۔ میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا، تو الاٹمنٹ ٹاٹمنٹ کی فکر نہ کر۔ مہمان علی بہت ہشیار بندہ ہے۔ سارا کام کر لے گا۔ تو اسے نہیں جانتا۔ وہ ایسے کاموں کا زبردست ماہر ہے۔ یوں سمجھ لے، شاہ جی کی زمین داری تو وہی چلاتا ہے۔“ اس نے حسب معمول ہلکا تھپہ لگایا۔ ”شاہ جی تو بچ پوچھ، چھانٹ چھانٹ کر سوہنڑی زنانیاں رکھتا ہے۔ وہ سکی کی چسکی لگاتا ہے اور سیاست لڑاتا ہے۔ اس نے کوئی اور کام نہیں کرنا۔ نہ مان علی کے ہوتے ہوئے اسے کوئی اور کام کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ الاٹمنٹ کے لیے تیرے یہاں ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔

مراد خاں شاہانی نے گلاس اٹھا کر بیڑے کے کئی گھونٹ بھرے۔ ”میرا کمان تو مزاری کے ساتھ چلا جا۔ وہ خوش ہو جائے گا۔ بہت عیش کرائے گا۔ وہ یاروں کا یار ہے۔ ادھر ٹھہر کر اپنے مطلب کی متروکہ اراضی بھی دیکھ لیتا۔ پسند آئے تو بعد میں الاٹمنٹ کے لیے درخواست لگا دیتا۔ ویسے زمین تو جہاں بھی ملے ضرور لے لے۔ اور ادھر کی زمین تو بہت عمدہ ہے۔ دیکھنے کے بعد تجھے خود اندازہ ہو جائے گا۔“

”تو کہتا ہے تو چلا جاؤں گا۔“ رحیم داد نے شاہانی کے مسلسل اصرار پر رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ ویسے بھی ہر زمین دار کی طرح زمین اس کی بھی کمزری تھی۔ جتنی زیادہ ہوتی ہی ہوس بڑھتی ہے۔

شاہانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ دونوں چپ چاپ بیڑے پہنچے رہے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ کچھ دیر بعد شہ زور خاں مزاری واپس آگیا۔ وہ سفر کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔

”اپنا گلاس ختم کر۔ چلے کے لیے کھڑا ہو جا۔“

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مگر اس نے اپنا گلاس ختم نہ کیا۔ شاہانی کے اصرار کرنے پر بھی نہ کیا۔ وہ پہلے ہی لگ بھگ دو بوتلیں چڑھا چکا تھا۔ مزید پیتا نہ چاہتا تھا۔ رحیم داد غسل خانے میں گیا۔ منہ ہاتھ دھو کر تروتازہ ہوا۔ واپس آیا تو اس عرصے میں شاہانی بیڑے کے ذریعے اس کا سوٹ کیس کار کی ڈکی میں رکھوا چکا تھا۔

تینوں کار کے بیچے۔ شاہانی ان کے ہم راہ اسٹیشن جانے چاہتا تھا۔ اس نے دونوں کو گلے لگا کر رخصت کیا۔ شہ زور رحیم داد کا رومیں داخل ہوئے اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ کار اسٹیشن کی سمت روانہ ہو گئی۔ اب اسے مزاری کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اسٹیشن پہنچ کر شہ زور مزاری نے اپنا اور رحیم داد کا ٹکٹ خرید لیا اور دونوں ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ٹرین روانہ ہوئی اور رات کی تاریکی میں شور مچاتی ہوئی لوہے کی پٹریوں پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

☆

رحیم داد اور شہ زور مزاری شیخوپورہ اور پک جھمرہ کے راستے سرگودھا پہنچے۔ سرگودھا میں انہوں نے ایک روز قیام کیا۔ دونوں صغیر احمد سیال کے ساتھ ٹھہرے تھے۔ وہ بڑا زمین دار تھا۔ مزاری کا پرانا اور بے تکلف یار تھا۔ ان کی دوستی کا آغاز ہیرا منڈی کی ایک طوائف کے بالا خانے سے ہوا تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں دونوں اس قدر گھل مل گئے کہ شہ زور جب لاہور آتا تو سرگودھا

سے گزرتے ہوئے اس کے پاس ضرور قیام کرتا۔ اکثر دونوں سرگودھا سے اکٹھے ہی لاہور جاتے۔ ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرتے۔ ہر شام داد عیش دینے ہیرا منڈی ضرور جاتے۔ لاہور سے واپسی پر بھی مزاری سرگودھا ضرور ٹھہرتا۔ مگر اس دفعہ صغیر احمد سیال کے اصرار کے باوجود مزاری نے ایک روز سے زیادہ سرگودھا میں قیام نہیں کیا۔

مزاری اور رحیم داد ایک بار پھر ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹرین شاہ پور صدر پہنچی۔ دو ایسے مسافر کپارٹمنٹ میں داخل ہوئے جو وضع قطع سے بلوچ نظر آتے تھے۔ مسلح تھے اور مشتبہ بھی معلوم ہوتے تھے۔ رات کا سفر تھا۔ ٹرین فرانے بھرتی ہوئی پٹریوں پر دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد مسلح بلوچوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے جب بھی نظریں اٹھا کر دیکھا، دونوں کو اپنی جانب گھورتے ہوئے پایا۔ وہ عین اس کے مقابل کھڑکی کے پاس بیٹھے تھے۔

مزاری دونوں بلوچوں سے بے نیاز اپنی نشست پر اطمینان سے لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے۔ رحیم داد کی آنکھوں سے نیند اڑ گئی۔ وہ سہا ہوا تھا اور چونکا بھی تھا۔ وہ شہ زور مزاری سے مشتبہ بلوچوں کے بارے میں اپنے خدشات کا اظہار کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکا۔

کچھ دیر بعد سردار مزاری کے خزانے ابھرنے لگے۔ لیکن دونوں بلوچ جاگ رہے تھے۔ رحیم داد بھی جاگ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر مزاری پر غصہ آرہا تھا جو ٹانگیں پیارے بے خبر سو رہا تھا۔ کپارٹمنٹ میں گہری خاموشی تھی۔ روشنی بہت مدھم تھی۔ باہر ہوا کا شور تھا۔ بستیاں آتیں اور پلک جھپکے گزر جاتیں۔ مکانوں میں ٹٹاتے ہوئے چراغ، جگنوؤں کی مانند جھللا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ ٹرین پٹری پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ ایک بلوچ اوجھنے لگا۔ رحیم داد بھی تھک کر اوجھنے لگا۔ نیند کا غلبہ بڑھا تو آنکھ لگ گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ یکایک ہلکا ہلکا شور بلند ہوا۔ رحیم داد کی آنکھ کھل گئی۔ ٹرین کسی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ شہ زور مزاری ابھی تک گہری نیند سو رہا تھا۔ رحیم داد نے چونکا نظروں سے سامنے کی نشست پر نظر ڈالی۔ دونوں بلوچ غائب تھے۔ نہ جانے وہ کب اور کہاں اتر گئے تھے۔ ٹرین کچھ دیر ٹھہر کر آگے روانہ ہوئی۔ رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

رات گزری، صبح ہوئی۔ سفر جاری رہا۔ مزاری اور رحیم داد کندیاں سے گزرتے ہوئے محمود

کوٹ پہنچے۔ مزاری کے ایک دوست علی محمد جکائی کی حویلی میں قیام کیا۔ جکائی سے رحیم داد پہلی بار ملا تھا۔ اور پہلی ہی ملاقات میں اسے اندازہ ہو گیا کہ جکائی نہ صرف مزاری کا گمراہ رہا ہے بلکہ اس کا راز دار بھی ہے۔

سورج غروب ہوتے ہی محفل جمی۔ بادہ و ساغر کا دور چلا۔ مزاری اور جکائی کی گفتگو سے رحیم داد جلدی تاڑ گیا کہ انھیں بدھیل اور داؤد خاں کا انتظار ہے۔ پینے پلانے کا سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔ لیکن رحیم داد جلد ہی اٹھ گیا۔ اس نے کھانا کھایا اور جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ سفر کی تکان سے چور چور تھا۔ لیٹتے ہی گہری نیند سو گیا۔

بدھیل اور داؤد دوسرے روز بھی محمود کوٹ نہ پہنچے۔

شہ زور کے روپے سے رحیم داد کو یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ فوری طور پر اس کا ڈیرہ غازی خاں جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ وہ لاہور سے محمود کوٹ ہی کے لیے آیا تھا۔ یہاں ٹھہر کر اسے بدھیل اور داؤد خاں کا انتظار کرنا تھا۔ ان سے ملنے اور صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہی آئندہ کارپروگرام تیار کرنا تھا۔

دوپہر کے کھانے پر مزاری نے باتوں باتوں میں علی محمد جکائی کو رحیم داد کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ وہ گورداس پور کا مہاجر ہے۔ اس کا ساڑھے چار ہزار ایکڑ اراضی کا کلیم منظور ہو چکا ہے۔ ڈیرہ غازی خاں میں متروکہ اراضی الاٹ کرانے کا ارادہ رکھتا ہے اور اسی مقصد سے اس کے ہمراہ روجھان شرقی جا رہا ہے۔

جکائی نے یہ سنا تو مسکرا کر بولا۔ ”متروکہ اراضی تو ادھر مظفر گڑھ میں بھی کافی ہے اور ابھی اس کی الاٹمنٹ بھی نہیں ہوئی۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سینس چوہدری“ ادھر کی زمین بھی بہت عمدہ ہے۔ بچ پوچھ تو سازی عمدہ زمینیں ہندوؤں اور سکھوں کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ تو چاہے تو ادھر بھی الاٹمنٹ مل سکتی ہے۔ بہت سی متروکہ جائیداد زمین داروں اور کسانوں نے رکھی ہے۔ کوشش کی جائے تو آسانی سے ان کی الاٹمنٹ مل جائے گی۔ محکمہ بحالیات کے افسروں اور ڈپٹی کمشنر سے اپنی بہت جان پہچان ہے۔“

رحیم داد تو خاموش رہا۔ لیکن مزاری نے کہا۔ ”چوہدری زمین تو جدھر بھی ملے الاٹ کرالے دیے بھی زیادہ تر متروکہ جائیداد الاٹ ہو چکی ہے۔ اب تو ایسی چھپی ہوئی اراضی رہ گئی ہے زمینداروں نے اپنے کردندوں اور مزارعوں کے ذریعے زبردستی دبا رکھی ہے۔“

”تو کتنا ہے تو ادھر بھی الاٹمنٹ کرا لوں گا۔“ رحیم داد نے اظہار رضامندی کیا۔

”سینس چوہدری“ تیرے پاس کلیم کے کاغذات تو ہوں گے؟“ جکائی نے رحیم داد سے دریافت کیا۔

”وہ توجی لہور میں ہیں۔ شہ زور مزاری کے ساتھ تو میں صرف اپنے مطلب کی زمین دیکھنے جا رہا ہوں۔“

”ایسا کر لہور سے کاغذات لے کر میرے پاس آجانا۔“ علی محمد جکائی نے کہا۔ ”فکر نہ کر۔ دو اڑھائی سو ایکڑ زمین تو آسانی سے ادھر الاٹ ہو جائے گی۔ اس سے زیادہ تو ایک جگہ کلیم میں زمین الاٹ ہوتی بھی نہیں۔“

”کون تو یہی ہے۔“ مزاری نے ہنس کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”پر میں تو کئی ایسے مہاجروں کو جانتا ہوں جنھوں نے ایک ہی جگہ اڑھائی سو سے بھی زیادہ اراضی الاٹ کر رکھی ہے۔ جان پہچان ہو اور مٹھی گرم کی جائے تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ سارا کنونشنون دھرا رہا جاتا ہے۔ افسر چاہیں تو کیا نہیں کر سکتے۔“

”چوہدری برائے منانا۔“ جکائی نے ہنسی بکپاتے ہوئے کہا۔ ”متروکہ جائیداد کے معاملے میں تو ایسی دھاندلی ہو رہی ہے کہ تجھ سے کیا کہوں۔ ایسے بھی مہاجر ہیں، اور بہت ہیں، جو ایک جگہ متروکہ جائیداد الاٹ کراتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد اسے بیچ کر اسی کلیم پر دوسری جگہ الاٹمنٹ لے لیتے ہیں۔ ان کا کلیم ختم ہی ہو۔ نے میں نہیں آتا۔“ اس نے کچھ سوچ کر فوراً اپنا لہجہ بدلا۔ ”پر تیرا کلیم تو بہت وڈا ہے تجھے ایسا دھندا کرنے کی کیا ضرورت۔“

”اپنا چوہدری نور الہی ایسے مہاجروں میں نہیں ہے۔“ شہ زور خاں مزاری نے رحیم داد کی جانب سے صفائی پیش کی۔ ”یہ تو الاٹمنٹ ٹلائمنٹ کو تیار ہی نہ تھا۔ میں بہت زور دے کر اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔“

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔“ جکائی نے خفیف ہو کر معذرت پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تو ان مہاجروں کی بدینیتی بتائی تھی جنھوں نے الاٹمنٹوں کا باقاعدہ کاروبار کر رکھا ہے۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”دیے جب چوہدری کے پاس پکا کلیم ہے تو اسے ضرور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ خیرات تو نہیں مانگ رہا۔ ادھر اتنی ہی اراضی چھوڑ کر آیا ہے۔ اس نے کربانی دی ہے۔ گھریار لٹوایا ہے۔“ جکائی نے رحیم داد کو خوش کرنے کی کوشش کی۔ ”لٹ پٹ کر ادھر آیا ہے۔ بچ پوچھ تو ایسے ہی مہاجروں کی کربانی سے پاکستان بنا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ مزاری نے اس کی تائید کی اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

”بدھیل اور داؤد آج بھی نہیں پہنچے۔“

”پہنچ جائیں گے۔ تو پریشان کیوں ہوتا ہے؟ کام بن جائے گا تب ہی آئیں گے۔“ جسکانی نے مزاری کو تسلی دی۔

مزاری کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ وہ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا نظر آ رہا تھا۔ تینوں کھانے سے فارغ ہوئے اور اٹھ کر اپنے اپنے بستروں پر جا کر لیٹ گئے۔

سردار شہ زور خان مزاری رات کو بھی بدھیل اور داؤد خان کا بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ کئی روز گزر گئے۔

مگروں میں سے کوئی بھی نہ آیا۔



بدھیل خاں سویرے ہی سویرے اُگیا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ اس کا لباس گرد و غبار سے اٹا ہوا تھا۔ کندھے پر تاج لٹک رہی تھی۔ یہ پانی وضع کی بلوچی بدوق تھی۔ اور دیکسی ساخت کی تھی۔ پستول سے ذرا بڑی تھی۔ بدھیل بہت تھکا ہارا نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ لمبا سفر طے کر کے پہنچا ہے۔

شہ زور خاں مزاری اس وقت رحیم داد کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا۔ علی محمد جسکانی بھی موجود تھا۔ سورج چڑھ کر درختوں کی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھتی جا رہی تھی۔ بدھیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہی حسب دستور جھک کر مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اور سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

مزاری نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”بدھیل، تجھے تو پہلے آنا تھا۔ اتنی دیر کہاں لگا دی؟“

”دیر تو ہو گئی سیں پر مجبوری تھی۔“ بدھیل نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

مزاری نے دریافت کیا۔ ”داؤد کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟“

”وہ بھر خاں کے ساتھ ہے۔ داؤد کا اس کے ساتھ رہنا ضروری تھا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ اب تو حوالہ بنا۔“ مزاری نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

”سیں سردار!“ بدھیل خاں اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ ”لہور سے واپسی پر میں اور داؤد اوج پہنچے۔ سراب اور ملوک زادی اب تک اوج ہی میں تھے۔ ہم دونوں جام بیلا میں بھر خاں کے پاس ٹھہر گئے۔ سیں، تجھے تو پتہ ہی ہے، رادھو بھی اوج میں ہے اور سراب کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ اس نے سراب سے اتنا میل ملاپ بڑھالیا ہے کہ اس کے بارے میں اسے ذرا بھی شبہ نہیں۔“

”تو نے رادھو کو کچھ دیا بھی؟“ مزاری نے پوچھا۔

”جنا پہلے دیے تھے پنجالہور سے لوٹنے کے بعد دیے۔ وہ بہت خوش ہوا۔“ بدھیل نے بتایا۔

”اب تک اس کے پاس سو روپے پہنچ گئے۔“

”یہ تو نے ٹھیک کیا۔ پر وہ کام بھی ٹھیک ٹھاک کر رہا ہے؟“

”بالکل ٹھیک ٹھیک کر رہا ہے۔“ بدھیل نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”شام کا اندھارا ہوتے ہی ہر روز میں اور داؤد چھپ کر اس کے پاس اوج پہنچ جاتے۔ سراب کے بارے میں پوچھتے۔ اس کا ارادہ تو اوج میں دو روز ٹھہرنے کا تھا۔ پر اس کے چاچے کا پتر، زردار، چوٹی سے دیر میں لوٹا۔ اس کی واپسی کے بعد ہی سراب اوج سے نکلا اور ضلع مظفر گڑھ کی طرف چلا۔“

”اس کے ساتھ اور کون کون تھا؟“

”ملوک زادی تھی۔“ بدھیل نے مزاری کی جانب نظریں اٹھائے بغیر بتایا۔ ”زردار اور رادھو بھی تھے۔ اوج سے علی پور کے رستے وہ جوتی کلاں پہنچے۔ اور وہیں ٹھہر گئے۔ میں، داؤد اور بھر خاں کے ساتھ ان کے پیچھے لگا رہا۔ پر ہم جوتی کلاں نہیں گئے۔ سید والا میں ٹھہر گئے۔ سید والا کا فاصلہ جوتی کلاں سے زیادہ نہیں۔ دو اڑھائی میل ہو گا۔“

”تم نے راستے میں انھیں اٹھانے کی کوشش نہیں کی؟“ مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

”سیں سردار! رستے میں انھیں اٹھانا بہت مشکل ہے۔“ بدھیل نے صفائی پیش کی۔ ”وہ اوٹھ پر سفر کر رہے تھے۔ سویرے سورج نکلنے کے بعد سفر کرتے اور جب سورج ڈوبنے لگتا تو کسی دشتی میں ٹھہر جاتے۔ پکی سڑک ہے۔ دن میں اس پر بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ سڑک کے کنارے دشتیاں بھی ڈٹی ہیں۔ دن میں انھیں اٹھانا خطرناک تھا۔ ہاں، جوتی کلاں میں ایک رات ہم نے سراب اور ملوک زادی کو اٹھانے کا پروگرام بنایا۔“

”کیا بنا اس پروگرام کا؟“ مزاری نے بے چینی سے پوچھا۔

”ہم منہ پر منڈا سے باندھ کر اوٹھوں پر بیٹھے اور پچھلی رات کو اس جا پہنچے جہاں سراب اور اس کے ملٹی ٹھہرے تھے۔ میں نے اپنا اوٹھ مکان کی دیوار سے لگایا۔ آرام سے دیوار پر پہنچ گیا۔ سامنے دہڑے میں سراب اور ملوک زادی سو رہے تھے۔ زردار اور رادھو مکان کے باہر گہری نیند میں پڑے تھے۔ میں دیوار سے نیچے اترنے ہی والا تھا کہ جاگ ہو گئی۔ کتوں نے بھونک بھونک کر خام خراب کر دیا۔ پر ہم کسی نہ کسی طرح جوتی کلاں سے صاف بچ نکلے۔ کام بن جاتا تو ہم نے

”ہے۔“

”ہائیں! ایسا نہ سوچ۔“ بدھیل خان نے سینہ تان کر علی محمد جسکانی کی جانب دیکھا۔ ”ہم تینوں میں سے بھاگنے والا کوئی نہیں۔ جان دے دیں گے پر پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“

”جسکانی تجھے پتہ نہیں، تینوں ہی بہت حوصلے والے اور زور آور ہیں۔“ مزاری نے کسی قدر جوش سے کہا۔ ”تو انھیں نہیں جانتا بہت مضبوط اور جیالے ہیں۔“

”پر یہ تو سوچ وہ تعداد میں ان سے زیادہ ہوں گے۔ پوری طرح مسلح بھی ہوں گے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر بدھیل کی طرف دیکھا۔ ”میں تو سمجھتا ہوں سراب اور زردار بھی مسلح ہوں گے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”سہیں! تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ مسلح تو سراب اور زردار بھی ہیں۔ وہ تو ہر وکھٹ مسلح رہتے ہیں۔“ بدھیل نے جسکانی کو بتایا۔ ”ان کے پاس کاربائیں ہیں اور بھری ہوئی رہتی ہیں۔“

جسکانی نے اس دفعہ مزاری کو مخاطب کیا۔ ”شہ زور سن لیا تو نے۔ میرا کمان، تو سراب کے پہنچنے سے پہلے ہی غازی گھاٹ کے اس پار پہنچ جا۔ میں بھی تیرے ساتھ رہوں گا۔ جتنے مسلح بندے درکار ہوں گے، ساتھ لے لوں گا۔ تجھے تو پتہ ہے، میرے پاس کیسے کیسے زور آور کم دار اور کراوے ہیں۔“ اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”مزارعوں کی ڈال اور ڈھور ڈگر تو اٹھاتے ہی رہتے ہیں، لڑائی ہو تو جمر لڑتے بھی ہیں۔“

”تیری گالہ سمجھ آتی ہے۔“ شہ زور مزاری رضامند ہو گیا۔ ”مجھے بھی وہاں موجود رہنا ہو گا۔“ اس نے توقف کیا۔ ”پر ایک جیب کی بھی ضرورت ہوگی۔“

”ایک نہیں دو جیبیں درکار ہوں گی، تاکہ دونوں کو اٹھا کر فٹ نکل جائیں۔“ جسکانی نے شہ زور مزاری کو اطمینان دلایا۔ ”تو فکر نہ کر۔ میں جیبوں کا بندوبست کر لوں گا۔“ ادھر ڈیرہ غازی خاں میں میرے وڈے سالے سردار ظفر اللہ خاں کھوسہ کی حویلی ہے۔ وہ شکاری بھی ہے۔ اس کے پاس دو جیبیں ہیں۔ ویسے بھی کھوسے تو لغاریوں کے خلاف مزاریوں کے ساتھ ہیں۔ تو کہہ تو اسے بھی بلالوں۔“

”نہیں! اسے بلانے کی ضرورت نہیں۔“ مزاری نے جسکانی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ ”تو صرف اس کی دونوں جیبیں منگوالے۔ آج ہی کسی کو اس کے پاس بھیج دے۔“

”کسی کو بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی حویلی میں ٹیلی فون بھی ہے۔“ جسکانی نے بتایا۔ ”میں اسے فون کے ذریعے اطلاع پہنچا دوں گا۔ جیسے کل صبح تک درابہ پہنچ جائیں گی۔ ہم کو آج ہی

دونوں کو اٹھانے اور دریا پار کر کے جام پور پہنچنے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ دریا پار کرنے کے لیے بیڑی کا بھی بندوبست کر لیا تھا۔“

”سراب! ابھی تک جتوئی کلاں میں ہے؟“

”ہائیں! جتوئی کلاں میں تو وہ صرف دو رات اور ایک دن ٹھیرا۔“ بدھیل نے مطلع کیا۔ ”جتوئی کلاں سے آگے انھیں کینچھر رکنا تھا۔ پر انھوں نے ارادہ بدل دیا۔ سیدھے رحمان والی پہنچے۔ اب تک وہیں ہیں۔“

”آگے کے بارے میں پتہ ہے؟“ مزاری نے استفسار کیا۔

”رادھو بتاتا تھا۔ کل سویرے وہ رحمان والی سے نکلیں گے۔ دوپہر تک غازی گھاٹ پہنچیں گے اور دریا پار کر کے سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے چورہ پہنچ جائیں گے۔ وہاں لغاریوں کے کندے ان کے لیے موجود ہوں گے۔ وہ بھی شام تک چورہ پہنچیں گے۔“ بدھیل خان سنبھل سنبھل کر بیان کرتا رہا۔ ”لغاریوں کے پاس جیب ہوگی اور وہ سب پوری طرح مسلح ہوں گے۔ وہ سراب اور ملوک زادی کو اپنی حفاظت میں چوٹی لے جائیں گے۔ رادھوان کے ساتھ غازی گھاٹ سے آگے نہیں جائے گا۔ واپس اپنے جھوک چلا جائے گا۔ ہاں، زرداران کے ساتھ چورہ تک جائے گا۔“ اس نے نظریں اٹھا کر مزاری کی جانب دیکھا۔ ”سہیں سردار! میں نے تجھے ساری گالہ بتادی۔ آگے جیسا تیرا حکم ہو دیا کیا جائے۔“

علی محمد جسکانی اب تک خاموش بیٹھا تھا اور بدھیل کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے مزاری کو مخاطب کیا۔ ”شہ زور! تو نے جو حوالہ لیتا تھا لے لیا۔ اب آگے کی سوچ۔ دونوں اس بار بھی بچ کر نکل گئے اور چوٹی پہنچ گئے تو دوبارہ تیرے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ چوٹی سے انھیں اٹھوانا آسان کام نہیں۔ بہت خون خرابہ ہو گا۔ تب بھی کامیابی کی امید بہت کم ہے۔“

”انھیں چورہ سے پہلے ہی اٹھانا ہو گا۔“ مزاری نے بھاری بھر کم لہجے میں کہا۔ ”انھیں ہرگز چوٹی نہیں پہنچنا چاہیے۔“

”لیکن تجھے بھی ادھر موجود رہنا ہو گا۔“ جسکانی نے مشورہ دیا۔

”میرا وہاں موجود ہونا مناسب ہو گا؟“

”مناسب اور نامناسب تو میں جانتا نہیں۔ یہ تیرے طے کرنے کی بات ہے۔“ جسکانی نے ان کی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”میں تو یہ جانتا ہوں کہ بدھیل، داؤد اور بھرایے خطرناک کام کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ مان لے لغاریوں سے ان کی ٹڈ بھیل ہو گئی تو یہ ان کے سامنے کتنی دیر ٹھیر سکتے

رات در اہمہ پہنچنا ہو گا۔ در اہمہ میں اپنا ایک پرانا یا رہے احمد بخش۔ رات اس کے پاس ٹھہریں گے۔ سویرے بچپن کے بچنے پر اگے نکل جائیں گے۔ سرور والی نزدیک ہی ہے۔ سیم و تھور کا مارا ہوا غیر آباد اور ویران علاقہ ہے۔ وہیں درختوں کی اوٹ میں کہیں گھاٹ لگا کر بیٹھ جائیں گے اور سراب کا انتظار کریں گے۔

”میں سمجھتا ہوں سرور والی سے گیدڑ والا زیادہ ٹھیک رہے گا۔“ مزاری نے تجویز پیش کی۔ ”ویسے میں گیدڑ والا گیا نہیں۔ پر اتنا ضرور سنا ہے، ادھر درخت اور جھاڑیاں بہت ہیں۔ چھپ کر گھاٹ لگانے کے لیے بہت ٹھیک جگہ ہے۔ ویسے جو تیری مرضی۔“

”یہ تو وہاں پہنچ کر ہی طے کرنا ہو گا۔“ جکانی نے کہا۔ ”بات یہ ہے ادھر کے درخت کاٹ کاٹ کر بہت کچھ صاف کر دیا گیا ہے۔ روز ہی درخت کٹتے ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”ایسے ہی تیزی سے درخت اور بوٹے کٹتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب دریا کے اس پار چنیل پدھر رہ جائے گا۔“

مزاری نے قدرے تامل کیا پھر ہیل کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تو نے سارا پروگرام سن ہی لیا۔ اب تو واپس جا۔ داؤد اور ہجر کو ساری گالہ سنا دے۔ سراب کی طرف سے پوری طرح چوکس رہنا۔ تو داؤد اور ہجر کے ساتھ کل دوپہر تک پہنچ جانا۔ میں تجھے سرور والی اور گیدڑ والا کے آس پاس ملوں گا۔“ اس نے تنبیہ کی۔ ”دیکھ بہت ہشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ سراب یا زردار کو ذرا بھی شبہ نہ ہو۔ ورنہ سارا کام گڑبڑ ہو جائے گا۔“

”سین سرور! جیسا تو حکم کرے گا ویسا ہی ہو گا۔“ بدھیل نے نہایت مستعدی سے مزاری کو یقین دلایا۔

”اب تو جا۔ میں تیرا، داؤد اور ہجر خاں کا در اہمہ سے آگے نیلے میں انتظار کروں گا۔“

بدھیل خاں نے کچھ نہ کہا۔ آگے بڑھا۔ جبکہ مزاری کے قدموں کو چھو اور خاموشی سے چلا گیا۔

جکانی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ ”دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد ہمیں غازی گھاٹ کے لیے روانہ ہو جانا چاہیے۔ چار کراوے بھی ساتھ چلیں گے۔“

”دو کانی ہوں گے۔“ مزاری نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ ”زیادہ بندے ہوں گے تو ایک کار سے کام نہیں چلے گا۔ غازی گھاٹ کے اس پار بھی دو سے زیادہ جیپیں درکار ہوں گی۔ تو نے یہ نہیں سوچا، بدھیل، ہجر اور داؤد بھی موجود ہوں گے۔ چوہدری بھی اپنے ساتھ ہی چلے گا۔“

”میں نے تیرے ساتھ جا کر کیا لیتا۔“ رحیم داد نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ وہ اس بکھیرے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

”تجھے ذرہ غازی خاں نہیں چلنا؟“

”مجھے تو اب لمبور واپس جانے دے۔“ رحیم داد نے بے زاری سے کہا۔ ”بعد میں مراد خاں شاہانی کے ساتھ تیرے پاس آجاؤں گا۔“

”سین چوہدری، فکر نہ کر۔“ جکانی نے ہنس کر کہا۔ ”میرے اور شہ زور کے ہوتے ہوئے تجھے ڈرنے شرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے بوے جوش کے ساتھ سینے پر ہاتھ مارا۔ ”گولی پہلے مجھے لگے گی۔“ اس نے قہقہہ بلند کیا۔ ”یہ بتا بندوک چلائی تو آتی ہی ہو گی۔“

”برسوں شکار کھیلتا رہا ہوں۔“ رحیم داد نے گردن کو خم دے کر پر اعتماد لہجے میں کہا۔ ”نشانہ بھی چاہے۔“

”تب تو گھبرا کیوں رہا ہے؟“ جکانی بدستور مسکراتا رہا۔ ”دیکھنے میں بھی عکڑا لگتا ہے۔ حوصلے سے کام لے۔“

جکانی نے رحیم داد کی مردانگی کو لاکار تھا۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ رحیم داد جھٹ تیار ہو گیا۔ ”تم دونوں کی یہی مرضی ہے تو ضرور چلوں گا۔ میں تو یاروں کا یار ہوں۔“

”شاہانی تیرے بارے میں یہی کہتا تھا۔“ مزاری مسکرا کر بولا۔

جکانی اٹھ کر چلا گیا۔

مزاری نے پہلو بدلا۔ چند لمبے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ کمرے میں شلنے لگا۔ وہ کسی قدر بے قرار نظر آ رہا تھا۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔

تینوں کمرے سے باہر نکلے۔

حوٹلی کے صدر دروازے پر جکانی کی فورڈ کھڑی تھی۔ کار تھی تو پرانی مگر بڑی تھی اور کشادہ بھی تھی۔

جکانی کے دو کارندے بندوقیں زانو پر رکھے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جکانی کو دیکھتے ہی سب کار سے نیچے اترے۔ پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز سے سلام کیا۔ اور ایک طرف پرمود ہو کر کھڑے ہو گئے۔

جاتے جن کو بوسوں، ٹوکوں اور ایسی ہی دوسری گاڑیوں کے واسطے استعمال کیا جاتا۔ بلکہ کہیں کہیں تو دریا اس قدر خشک پڑ جاتا کہ اس پار جانے کے لیے درمیان سے راستے بن جاتے جن پر ہر طرح کی آمد و رفت رہتی۔ مگر ان دنوں گرمی اپنے شباب پر تھی۔ قراقرم کے فلک بوس پہاڑوں کی برف پگھل رہی تھی۔ پانی کے تیز ریلے سے دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس کا پاٹ پھیل کر دس میل سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ حد نظر تک پانی ہی پانی تھا۔ راستے اٹنی لہروں میں ڈوب کر اوجھل ہو گئے تھے۔ ان دنوں دریا کو اسٹیمر کے ذریعے عبور کیا جاتا تھا۔

شام کی آمد آمد تھی۔ غازی گھاٹ کی چل پھل رفتہ رفتہ کم ہوتی جا رہی تھی۔

ساحل پر اسٹیمر تیار کھڑا تھا۔ برطانوی دور حکومت کی یادگار یہ پرانا اور بوسیدہ اسٹیمر موسم گرما میں دریا پر آمد و رفت کے لیے اب تک استعمال میں آتا تھا۔ اس کی جنی سے گڈھا گاڑھا دھواں نکل کر شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو رہا تھا۔

ڈرائیور کار کا دروازہ کھول کر سب سے پہلے باہر آیا۔ اس کی ساتھ ہی علی محمد جکائی کے دونوں مسلح کارندے بھی باہر آ گئے۔ جکائی، مزاری اور رحیم داد بھی کار سے اتر کر باہر آ گئے۔ سب نے چروں پر سے ڈھانے اتار دیے تھے۔ کچھ دیر کھلی فضا میں کھڑے سورج کی نارنجی کرنوں کو لہروں پر جھللاتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر اسٹیمر کی جانب بڑھے اور سوار ہو گئے۔ صرف کار کا ڈرائیور کنارے پر کھڑا رہا۔

اسٹیمر مسافروں سے بھر گیا۔ آگے بڑھا اور سرکش موجوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ غازی گھاٹ پیچھے رہ گیا۔ مظفر گڑھ کی سرحد ختم ہو گئی۔ اب وہ ضلع ڈیرہ غازی خان کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اسٹیمر سے اتر کر وہ دریا کے کنارے روانہ ہوئے جو دریا کے کنارے ہی واقع ہے۔

دریا کے بارے میں مشورہ ہے کہ کسی زمانے میں ڈیرہ غازی خان کا شہر یہیں آباد تھا۔ مگر جب دریائے سندھ نے اپنا راستہ بدلا تو دریا کے کنارے اس کی تند اور تیز لہروں کی زد میں آ گیا۔ برسات میں ہر سال جب دریا چڑھتا تو سیلاب کا ریل گاڑی کے ساحلی علاقے کو اپنے ساتھ ہمالے جاتا۔ دریا ہٹ پھوٹ کر رفتہ رفتہ اجڑنے لگا۔ اب وہ ایک چھوٹا سا قصبہ رہ گیا تھا جس میں ماضی کی یادگار، فلک اور اجڑی ہوئی عمارتیں کہیں کہیں نظر آتی تھیں۔

احمد بخش نے علی محمد جکائی کو دیکھا تو بڑے تپاک سے پیش آیا۔ شہ زور مزاری اور رحیم داد سے بھی بہت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ جکائی نے اپنے منصوبے کے بارے میں احمد بخش کو

اعتماد میں نہیں لیا۔ اسے کچھ نہ بتایا۔ سب نے رات کا کھانا کھایا اور جلد ہی بستروں پر لیٹ گئے۔ سڑکی ٹکان سے چور چور تھے۔ لیٹتے ہی گہری نیند سو گئے۔ مگر بہت تڑکے بیدار ہو گئے۔ انھوں نے ہانپا کیا اور بے چینی سے جھپوں کا انتظار کرنے لگے۔

پہر دن چڑھے جکائی کے بڑے سائے، ظفر اللہ خاں کھوسہ، کی دونوں جھپیں ڈیرہ غازی خان سے دریاہم پہنچ گئیں۔ ایک جھپ میں جکائی، مزاری اور رحیم داد بیٹھے۔ دوسری میں جکائی کے دونوں مسلح کارندے تھے۔ احمد بخش نے دوپہر کے کھانے تک ٹھہرنے کے لیے اصرار بھی کیا مگر جکائی نے جلد سے جلد ڈیرہ غازی خان پہنچنے کا عذر پیش کیا۔ مزید قیام کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ احمد بخش نے دو بڑے بڑے ناشتے دانوں میں کھانا بند کر کے ساتھ کر دیا۔ جھپوں کے انجن اشارت ہوئے اور وہ دھول اڑاتی ہوئی روانہ ہو گئیں۔

سڑک پختہ تھی، لیکن آمد و رفت زیادہ نہ تھی۔ سب اس کا یہ تھا کہ لاریوں کا کوئی مستقل اڈا نہ تھا۔ وقتاً فوقتاً بدلتا رہتا تھا۔ ان دنوں اڈا، دریاہم کے بجائے سان میں تھا۔ اب لاریاں سان سے گیدڑ والا کے راستے ڈیرہ غازی شہر اور اس سے بھی آگے جاتی تھیں۔

دونوں جھپیں پختہ سڑک پر فرارے بھرتی ہوئی دوڑتی رہیں۔ سرور والی جلد ہی آگیا۔ فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ علی محمد جکائی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ سیم اور تھور نے پورے علاقے کو اجاڑ دیا تھا۔ مگر سرور والی سے آگے بڑھتے ہی ہریالی نظر آنے لگی۔ سڑک کے دونوں جانب معنی بھاڑیاں تھیں۔ کیکر، شرنہ اور ٹاہلی کے ساتھ ساتھ جنگلی درختوں کے گھنے جھنڈ تھے۔ جگہ جگہ لکڑی کے حصول کی خاطر درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ درختوں کے کٹنے کے باعث اجاڑ میدان بن گئے تھے۔ ان کا سلسلہ دور تک پھیلتا جا رہا تھا۔

جھپیں گیدڑ والا نہ گئیں۔ راستے ہی میں ایک ایسی جگہ ٹھہر گئیں جہاں بھاڑیاں کثرت سے تھیں۔ جکائی اور شہ زور مزاری جھپ سے اتر کر باہر آئے۔ دونوں نے گردنیں اٹھائیں، ادھر ادھر نظریں دوڑا کر گرد و پیش کا چوکنا نظروں سے جائزہ لیا۔ سڑک کے دونوں طرف گھنے اور منجھان درخت تھے۔ لمبی لمبی شاخیں پھیل کر اس طرح مل گئی تھیں کہ ان کے سائے میں سڑک کا یہ حصہ روپوش ہو گیا تھا۔ سڑک کے ایک جانب مٹی کے اونچے نیچے تو دے بھی تھے۔

جکائی اور مزاری آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک گھنے درخت کے نیچے چلے گئے۔ اس جگہ ٹھہر گئے۔ ہوا کے جھونکے نرم اور فرحت افزا تھے۔ دونوں کچھ دیر صلاح مشورہ کرنے کے بعد واپس سڑک پر آ گئے۔ جھپوں کی سمت بڑھے اور اپنی اپنی نشستوں پر جا کر بیٹھ گئے۔

بدھیل اس کے خفا ہونے پر سہم کر رہ گیا۔ ہجر خاں آگے بڑھا۔ اس نے نہایت مستعدی سے نایا۔ جسراپ اور زردار دن ڈھلے غازی گھاٹ پہنچ جائیں گے۔ ملوک زادی ان کے ساتھ ہی ہو گی۔ وہ دریائے پار کر کے دراہمہ پہنچیں گے۔ کچھ دیر ادھر ٹھہریں گے اور سورج ڈوبنے سے پہلے پہلے پورے پہنچنے کی کوشش کریں گے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”رادھو نے یہ خبر پہنچائی ہے۔ وہ نازی گھاٹ تک ان کے ساتھ رہے گا۔“

سردار مزاری نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر کسی قدر نرم لہجے میں نیوں سے مخاطب ہوا۔ ”اب تم جا کر روٹی کھاؤ۔ تھوڑا آرام کرو۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

تینوں خاموشی سے آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ درختوں کے نیچے چلنے لگے۔ مزاری آگے آگے چل رہا تھا۔ داؤد خاں اور ہجر خاں بھی مسلح تھے۔ ان کے پاس دیسی ساخت کا اسلحہ تھا۔

ڈرائیور اور کارندے کھانا کھا رہے تھے۔ بدھیل، داؤد اور ہجر خاں بھی ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گئے۔ شہ زور مزاری اس طرف نہ گیا۔ وہ علی محمد جکائی اور رحیم داد کے پاس چلا گیا۔ دونوں کچھ فاصلے پر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ قریب ہی مٹی کے تودے کی اوٹ میں دونوں جیپیں موجود تھیں۔ ان کی چھتوں پر تازہ کٹی ہوئی درختوں کی شاخیں اس طرح بھول رہی تھیں کہ وہ ان میں روپوش ہو گئی تھیں۔

شہ زور مزاری اور جکائی اپنے منصوبے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ انھوں نے ہر ایک کی ڈیوٹی کی نوعیت اور ایک ایک تفصیل طے کی۔ صلاح مشورے میں رحیم داد بھی شریک تھا۔ مگر وہ بیشتر وقت خاموش رہا۔ اس نے سرگرمی اور جوش و خروش کا اظہار نہ کیا۔ رحیم داد کے لیے یہ قطعی نیا تجربہ تھا۔ مگر زیادہ ہنگامہ خیز اور حیرت انگیز نہ تھا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد وہ اس سے کہیں زیادہ خطرناک ہنگاموں سے دور چار ہو چکا تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ سورج رفتہ رفتہ مغرب کی جانب بھٹکا گیا۔ درختوں تلے ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنے لگا۔ اب ہر شخص کو معلوم ہو چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ پوری طرح مسلح تھے اور چہروں پر ڈھالے باندھے ہوئے تھے۔ سڑک پر آمد و رفت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ اکا دکا راہ گیر سڑک پر گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

علی محمد جکائی انچارج کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ اپنے علاقے کا مشہور رسد گیر تھا۔ اس وقت وہ بہت سرگرم نظر آ رہا تھا۔ مختلف ہدایات جاری کر رہا تھا۔ ڈیوٹیاں مقرر کر رہا تھا۔ اس نے

جکائی کی ہدایت پر ڈرائیوروں نے جیپوں کو نشیب میں اتار دیا۔ جیپیں تاہوار راستے پر ہچکولے کھاتی، جنگلی جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی، دھیرے دھیرے آگے بڑھیں اور سڑک سے ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر مٹی کے ایک بڑے اور اونچے تودے کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں۔ ایک جیپ میں کھائیاں موجود تھیں۔ کارندوں اور ڈرائیوروں نے درختوں کی شاخیں کاٹ کر جیپوں پر ڈال دیں۔ اب وہ اس طرح چھپ گئیں تھیں کہ سڑک پر گزرنے والے انھیں مطلق نہ دیکھ سکتے تھے۔ جکائی جیپوں کے ڈرائیوروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے دونوں کو اعتماد میں لے کر اپنے منصوبے سے پوری طرح آگاہ کر دیا۔ وہ بالکل ہراساں نہ ہوئے۔ تھے بھی قوی ہیکل بات چیت اور طور طریق سے بھی بلند حوصلہ نظر آتے تھے۔



دھوپ کی تمازت بڑھنے لگی۔ سورج دیکھنے لگا۔ دوپہر ہو گئی۔ جکائی کے نوکروں نے درختوں کے گھنے سائے تلے چار بجھائی اور ناشتے دانوں سے کھانا نکال کر لگا دیا۔ مزاری، جکائی اور رحیم داد کھانا کھانے میں مصروف ہو گئے۔ مزاری کو بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کا انتظار تھا۔ اس کی بے چین نظریں بار بار سڑک کی جانب اٹھ جاتیں۔ مگر بدھیل، داؤد اور ہجر خاں نظر نہ آئے۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے۔ شہ زور مزاری اٹھا اور سڑک کی جانب بڑھا۔ مگر سڑک پر نہ گیا۔ کچھ فاصلے پر جال کے ایک درخت کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کو تلاش کر رہی تھیں۔ اب انھیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس کی بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔

مگر اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سردار والی کی ست سے آنے والے اونٹوں کے عقب میں اسے داؤد خاں دکھائی دیا۔ بدھیل اور ہجر خاں بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے۔ مزاری نے فوراً ایک ڈرائیور کو بلایا اور اسے بدھیل اور ہجر خاں کی جانب دوڑایا۔ ذرا دیر بعد وہ تینوں کو اپنے ہم راہ لایا۔ تینوں پسینے سے شرابور تھے۔ تھکے ہوئے تھے اور بھوکے بھی تھے۔

مزاری نے دریافت کیا۔ ”سہراب کے بارے میں کیا خبر ہے؟“ اس کے لہجے سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

”سب خیر اے سیں سٹوارا!“ بدھیل خاں نے جواب دیا۔ ”تو خوش ہو۔ راضی ہو۔ خیر ملا اے۔“

”پہلے کام کی گالہ سنا۔“ شہ زور خاں مزاری نے تیوری پر بل ڈال کر اسے ڈانٹا۔

داؤد، بھر خاں اور اپنے دونوں کارندوں کو سڑک کی دوسری جانب روانہ کیا۔ داؤد کے ایک کندھے پر بھری ہوئی ہلیسنگی لٹک رہی تھی۔ یہ دیکھی ساخت کی بھدی اور بد وضع بلوچی بندوق تھی۔ اس کے دوسرے کندھے پر لچھوں کی صورت میں لپٹی ہوئی ایسی مضبوط اور لمبی رسی جھول رہی تھی جو کتواں صاف کرنے والے غوطہ خور ٹوبھوں کے پاس ہوتی ہے۔ رسی کے ایک سرے میں بڑا سا پھندا لگا تھا۔

چاروں سڑک کے اس پار پہنچے۔ داؤد خاں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر درختوں کا جائزہ لیا۔ سڑک کے بالکل کنارے شیشم کا ایک پرانا اور گھنا درخت تھا۔ داؤد نے اسے اپنے مقصد کے لیے موزوں پایا۔ وہ نہایت ہوشیاری سے درخت پر چڑھا اور گھنی شاخوں میں اس طرح دبک کر بیٹھ گیا کہ نظر نہ آتا تھا۔

بھر خاں اور جبکانی کے دونوں مسلح کارندے جنگلی جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے مٹی کے تودوں کی آڑ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے سے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ بھر خاں سب سے شروع میں تھا۔ اس کے سپرد یہ ذمہ داری تھی کہ سراب، مرجان اور زردار جیسے ہی گھیرے کے اندر داخل ہوں وہ چوکس ہو جائے، مگر خاموش رہے اور جب تینوں بیچ میں پہنچ جائیں تو سبھی بجا کر سنگل دے۔

بدھیل خاں، جبکانی کی ہدایت کے مطابق داؤد کے عین مقابل ایک اونچے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ درخت خوب گھنا اور گنجان تھا۔ اس کی موٹی موٹی شاخیں سڑک پر اس طرح جھکی ہوئی تھیں کہ سامنے کے درختوں کی شاخوں سے مل گئی تھیں۔ اس درخت کے آس پاس جبکانی، مزاری اور رحیم داد جھاڑیوں اور درختوں کے تنوں کی اوٹ میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے پاس بھری ہوئی رائفلیں تھیں۔ وہ پوری طرح چوکس تھے۔ بدھیل خاں کی زبانی انھیں یہ اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی کہ سراب اور زردار، دونوں ہی مسلح ہیں۔ ان کے پاس بارہ بور کی دیکھی فرائیں تھیں۔ یہ چوڑے منہ کی چھوٹی چھوٹی بندوقیں تھیں جن سے پستول کی مانند بیک وقت کئی گولیاں چلائی جاسکتی تھیں۔ ڈرائیوروں کے پاس صرف کلہاڑیاں تھیں۔ لہذا انہیں عقب میں رکھا گیا تھا اور صرف ضرورت پڑنے پر کمک کے لیے طلب کیا جاسکتا تھا۔

سورج کی روشنی دھیرے دھیرے مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ درختوں تلے اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ سب اپنے اپنے مورچوں پر چوکنا اور چوکس تھے۔ متحس نظروں سے سڑک کو دیکھ رہے تھے۔ کچھ وقت اور گزرا۔ دھوپ گہری زرد ہو گئی اور سمٹ کر درختوں کی پھنگیوں پر جھلکانے لگی۔

سرور والی کی سمت سے بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ نمودار ہوا۔ بھیڑیں اور بکریاں رک رک کر منہ

سے آوازیں نکال رہی تھیں۔ آگے اور آگے بڑھ رہی تھیں۔ اونچے قد کا ایک نوجوان چرواہا انھیں لمبی چھڑی سے ہنکاتا ہوا پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ریوڑ بڑھ کر سامنے پہنچ گیا۔ عین اس وقت دور سے ہارن کی تیز آواز ابھری۔ دیکھتے دیکھتے ایک ٹرک قریب پہنچ گیا۔ اب وہ ریوڑ کے عقب میں تھا۔ سڑک پر بھیڑ بکریاں اس طرح بکھری ہوئی تھیں کہ راستہ بند ہو گیا۔

ڈرائیور نے ریوڑ کو راستے سے ہٹانے کے لیے زور زور سے ہارن بجایا۔ بھیڑیں اور بکریاں بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ کچھ نشیب میں اتر کر ادھر ادھر بھاگنے لگیں۔ جبکانی یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوا۔ دوسرے بھی گھبرا گئے۔ بھیڑ بکریاں شور مچاتی ہوئی ان کے آس پاس منڈلا رہی تھیں۔ چرواہا چھڑی سنبھالے ان کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ ٹرک ڈرائیور نے سڑک خالی پائی تو رفتار تیز کر دی اور گردوغبار کے بادل اڑاتا ان کی آن میں دور نکل گیا۔

چرواہے نے جبکانی کے دونوں کارندوں اور بھر خاں کو دیکھ لیا۔ ان کے ڈھاٹوں سے چھپے ہوئے چروں، چکتی آنکھوں اور ہاتھوں میں دبی ہوئی بندوقوں پر نظر پڑتے ہی وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس نے کسی سے نظر نہ ملائی، نہ ہی منہ سے آواز نکالی۔ جلدی جلدی بھیڑ بکریوں کو اکٹھا کیا اور سڑک پر لے گیا۔ جب پورا ریوڑ اکٹھا ہو کر سڑک پر پہنچ گیا تو اسے ہنکاتا ہوا وہ گیدڑ والا کی سمت بڑھا۔ بار بار مڑ کر پیچھے دیکھتا۔ وہ بہت سہما ہوا تھا۔ چرواہا اور اس کا ریوڑ جلد ہی اڑتی ہوئی دھول میں گم ہو کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

سڑک پر اب ہو کا عالم تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ بھیڑ بکریوں کے پیروں اور ٹرک کے پہیوں سے جو خاک دھول اڑی تھی، رفتہ رفتہ شام کی چھپنے میں تحلیل ہوتی جا رہی تھی۔ سورج اونچے اونچے درختوں کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ درختوں کے نیچے تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ رادھو کی اطلاع کے مطابق سراب، مرجان اور زردار کو اب تک گزر جانا چاہیے تھا۔ انھیں شام ہونے سے پہلے پہلے چورہ پہنچنا تھا جہاں لغاریوں کے مسلح کارندے ان کے منتظر تھے۔

مزاری چند منٹ تک خاموش کھڑا بے چینی سے پہلو بدلتا رہا، پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا جبکانی کے قریب پہنچا۔ اسے مخاطب کیا۔ ”جبکانی، تو نے ٹرک کو غور سے دیکھا تھا؟“ اس کے لبے میں تجسس تھا۔

”دیکھا تو تھا۔“ علی محمد جبکانی نے بتایا۔ ”پر دھول مٹی اتنی اڑ رہی تھی کہ کچھ نظر نہ آیا۔ نہ ڈرائیور دکھائی دیا اور نہ ہی یہ نظر آیا کہ اس کے ساتھ کون بیٹھا تھا۔“ اس نے تامل کیا۔ ”بھیڑ بکریوں نے الگ الگ ٹک کر رکھا تھا۔ پر خیریت، ہوئی کہ چرواہا ادھر نہ آیا۔“

”وہ ادھر تو نہیں آیا پر جس طرح مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا اس سے شبہ ہوتا ہے کہ اس نے دوسری طرف درختوں تلے بھر خاں اور تیرے کراؤں کو دیکھ لیا تھا۔“

”لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔“ جبکانی نے بھی اس کے دوسرے کی تائید کی۔

”دیکھ لیا تو دیکھ لینے دے۔ مجھے اس کی اتنی فکر نہیں۔“ مزاری نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”بار بار یہ خیال تنگ کر رہا ہے کہ سراب کو اب تک یہاں سے گزر جانا چاہیے تھا۔“ اس نے بے چین نگاہوں سے جبکانی کے چہرے کو دیکھا۔ ”تینوں ٹرک میں تو نہیں بیٹھے تھے؟“

”ہو سکتا ہے وہ اسی میں بیٹھے ہوں۔“ جبکانی نے دبی زبان سے اپنے شبے کا اظہار کیا۔

”ایسا ہے تو سمجھ لے، تینوں صاف بچ کر نکل گئے۔“ شہ زور مزاری کے چہرے پر پریشانی بکھر گئی۔

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ جبکانی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”اب تو ایک ہی صورت ہو سکتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ شہ زور نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ ان کا پیچھا کیا جائے۔“ جبکانی نے تجویز پیش کی۔ ”ٹرک زیادہ دور نہ گیا ہو گا۔ ڈرائیور بھی اپنے پاس بہت ہوشیار ہیں۔ دونوں چیمپیں دوڑا کر رستے ہی میں ٹرک کو گھیر لیں گے۔“

مزاری خاموش رہا۔ مگر علی محمد جبکانی خاموش نہ رہا۔ اپنی بات پر زور دے کر بولا۔ ”بول کیا کہتے ہیں۔ جو فیصلہ کرنا ہے قناعت کر۔“

مگر شہ زور خاں مزاری کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ مشرق سے اُلتا ہوا شام کا دھندلکا ہر سویلغار کر رہا تھا۔ ناگاہ دور سے اونٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آوازیں ابھریں۔

گھنٹیوں کی آوازیں شام کے سنائے میں گونجتی رہیں۔ رفتہ رفتہ قریب اور قریب آتی گئیں۔ آوازوں سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ دراصل وہ سے اونٹوں کا کوئی قافلہ آ رہا ہے۔ سب کی نظر تر اس طرف اٹھ گئیں۔ وہ پوری طرح چوکننا اور چوکس ہو گئے۔ ان کے کان گھنٹیوں کی آوازوں سے لگے تھے۔

سردار شہ زور مزاری کے ذہن میں مسلسل یہ دوسوہ کائناتیں کرکھٹک رہا تھا کہ سراب، مرحلا اور زردار ٹرک میں موجود تھے، اور صاف بچ کر نکل گئے۔ وہ ان کا تعاقب بھی نہ کر سکا۔ آخر

ملت ہی نہ ملی۔ وہ دل شکستہ اور بھابھا نظر آ رہا تھا۔

رحیم داؤد بھی قریب کی ایک گھنٹی بھاری کی اوٹ میں دھکا ہوا کھڑا تھا۔ وہ مستعدی سے اپنی رائفل سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے مڑ مڑ کر زور مزاری کی جانب دیکھا۔ اس کا افسردہ چہرہ دیکھا۔ چاہا کہ نزدیک جا کر اس کی دل جوئی کرے۔ اس کا حوصلہ بدھائے۔ مگر وہ اس کے پاس نہ جا سکا۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں جما ہوا کھڑا رہا اور چوکننا نظروں سے اس سمت دیکھنے لگا جدھر سے گھنٹیوں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔



گھنٹیوں کی آوازیں بہت قریب آ گئیں۔ اونٹ اب درختوں کی اوٹ سے نکل کر سامنے آ گئے تھے۔ وہ ایک قطار میں چل رہے تھے۔ ان پر لکڑیوں کے گھٹے اور سرکنڈوں کے پولے لدے ہوئے تھے۔ اونٹ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔

سات اونٹ ایک ایک کر کے سامنے سے گزر گئے۔

سب دم بخود تھے اور نظریں اٹھائے گزرتے ہوئے اونٹوں کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں میں تجسس تھا۔ جتنو تھی۔ ہر آنکھ بے چینی سے سراب، مرجان اور زردار کو تلاش کر رہی تھی۔ اونٹ ان کی بے چینی سے بے نیاز سڑک پر چلتے رہے۔ ان کی گردنوں میں پڑی ہوئی بڑی بڑی گھنٹیاں مسلسل بج رہی تھیں۔ ناگاہ گھنٹیوں کے شور میں سٹی بیجنے کی تیز آواز ابھری۔ سب کے کان کھڑے ہو گئے۔ انھیں سنسنیل مل چکا تھا۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں۔

ساربان اونٹوں پر بیٹھے تھے یا تکیل پکڑ کر آگے آگے چل رہے تھے۔ شام کی ہلکی روشنی میں ان کے چہرے دھندلے نظر آ رہے تھے۔ داؤد خاں درخت کی گھنٹی شاخوں میں دھکا ہوا چوکس بیٹھا تھا۔ سٹی سنتے ہی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہراؤٹ کو دیکھنے لگا۔ اونٹ اس کے سامنے سڑک پر گزر رہے تھے۔ قطار کے دو آخری اونٹ دیکھ کر وہ چونکا۔ ایک پر زردار سوار تھا۔ دوسرے پر مرجان، سراب کے پہلو سے لگی ہوئی کجاوے میں بیٹھی تھی۔

زردار کا اونٹ آگے تھا۔ جب وہ عین اس درخت کے قریب سے گزرا، جس پر داؤد خاں بیٹھا تھا تو زردار کا چہرہ صاف نظر آیا۔ داؤد نے جھٹ کندھے پر پڑی ہوئی رسی اتاری۔ اسے سمٹا کر زور سے زردار کی جانب پھینکا۔ مگر نشانہ چوک گیا۔ رسی کا پھندا زردار کے بجائے اونٹ کی گردن میں پڑا۔ داؤد نے فوراً جھٹکا دیا۔ پھندا تنگ ہو گیا۔ اونٹ بدکا۔ جھنجھلا کر زور سے بلجایا۔ اس کے قدم ڈنگائے لیکن گرا نہیں۔ جلد ہی سنبھل گیا۔

آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ لڑکھڑا کر گرا۔ مگر جاندار اور توانا تھا، جھٹ دو بارہ اٹھنے کی کوشش کی۔ مزاری غصے سے دھاڑا۔ ”نمک حرام“ اٹھنے کی کوشش کی تو گولی مار دوں گا۔“

سراب نے اٹھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ جس طرح گرا تھا ویسے ہی زمین پر پڑا رہا۔ آن کی آن میں جسکانی اور رحیم داد بھی پہنچ گئے۔ بھر خان، داؤد اور دونوں کارندے بھی ان کے پیچھے پیچھے نمودار ہوئے۔ ڈرائیور بھی کھائیاں سنبھالے ہوئے پہنچ گئے۔ سراب سب کے زرخے میں خاموش پڑا تھا۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

سڑک اب بالکل سنسان تھی۔ اونٹوں کا غول سرپٹ بھاگتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ ان کے ساتھ زردار بھی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ داؤد خان اس کے نکل بھاگنے پر نادام اور شرمندہ تھا۔ مزاری نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

”داؤد، تو بتا۔ زردار کا کیا بنا؟“

داؤد نظریں جھکا کر بولا۔ ”سین وہ جتوالوں کے ساتھ ہی نکل گیا۔“

”تو نے اسے نکل جانے دیا۔“ مزاری نے غصے سے ڈانٹا۔

داؤد گڑگڑا کر عاجزی سے بولا۔ ”سین، میں نے رے کا پھندا اس پر پھینکا تھا۔ پر وہ اوٹھ کی گردن میں پڑا۔ زردار نے جھٹ میری طرف۔ گولی چلا دی۔ رے میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔“

مزاری قہر آلود نظروں سے اسے گھورنے لگا۔ بدھیل جھٹ داؤد کے آڑے آگیا۔ اس نے ہونٹوں سے رستا ہوا خون پونچھا۔ اور ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”سین سردار، سراب کا اوٹھ ادھر جھنگر میں کھڑا ہے۔ ملوک زادی اس کے کجاوے میں بیٹھی ہے۔“

مزاری نے بدھیل اور داؤد خاں کو اس طرف روانہ کیا۔ فوراً اونٹ لانے کی ہدایت کی۔

بھر خان اپنی کارگزاری سنانے لگا۔ ”سین سردار، اس نے زبردست دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔“ اس نے سراب کی جانب ایک ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ اور زردار جتوالوں کے اوٹھوں کے پیچھے پیچھے اپنے اوٹھ لگائے ہوئے تھے۔ ان کی اوٹ میں چھپ کر نکل جانا چاہتے تھے۔ پر میں نے جھٹ پہچان لیا۔ فوراً سینی مار کر سب کو خبردار کر دیا۔“

”تو نے بہت ہوشیاری دکھائی۔“ شہ زور خان مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”پر داؤد سے چوک ہو گئی۔ زردار بیچ کر صاف نکل گیا۔“

جسکانی بولا۔ ”بدھیل نے زبردست کام دکھایا۔ لگتا بھی بھرتلا اور زور آور ہے۔“

”کام تو بچ پوچھ“ بدھیل ہی نے دکھایا۔ ”مزاری نے علی محمد جسکانی کی تائید کی۔ ”وہ بہت اور

زردار نے اونٹ کے گلے میں رسی کا پھندا دیکھا تو جھٹ پلٹا۔ درخت کی جانب دیکھا۔ اپنی قزاقیں اٹھائی۔ تار تو زور گولیاں چلائیں۔ ایک گولی داؤد خاں کے کان کے برابر سے سنناقی ہوئی گزری۔ وہ گھبرا گیا۔ اور گھبراہٹ میں رسی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اونٹ خوف زدہ ہو کر سرپٹ بھاگا۔ داؤد نے اپنی ہلیسنگ سے زردار پر گولی چلائی۔ وہ دوسری گولی چلانہ سکا۔ زردار کا اونٹ دور جا چکا تھا۔ دھندلی روشنی میں وہ پرچھائیں کی مانند نظر آ رہا تھا۔ گولیوں کی آوازوں سے دوسرے اونٹ بھی بدکے۔ بلبلاتے چیختے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے ہوئے غول کی صورت میں تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگے۔

ہر طرف افرا تفری مچ گئی۔ مگر بدھیل خان نے خود کو قابو میں رکھا۔ سراب کا اونٹ جیسے ہی درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کے نیچے پہنچا بدھیل چھلانگ لگا کر کجاوے میں کود گیا۔ مرجان نے اسے دیکھ کر زور سے چیخ ماری۔ بدھیل نے اس کی جانب توجہ نہ دی۔ آگے جھکا اور سراب کے اس ہاتھ پر تھمکی دی جس میں بھری ہوئی قزاقیں دبی تھیں۔ قزاقین سراب کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ بدھیل نے جھپٹ کر سراب کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اونٹ کی مہار سراب کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اونٹ بے قابو ہو کر سڑک سے نشیب میں اتر گیا۔ لیکن زیادہ دور نہ جاسکا۔ جھاڑیوں سے الجھ کر رک گیا۔ مرجان کجاوے میں بیٹھی خوف سے تھر تھرا کانپ رہی تھی۔

بدھیل اور سراب گتھم گتھا ہو گئے۔ دونوں زور آزمائی کرتے ہوئے کجاوے سے لڑھک کر نیچے گر گئے۔ سراب نے زمین پر پہنچتے ہی خود کو بدھیل کی گرفت سے آزاد کرالیا۔ مگر بدھیل نے اسے نکل بھاگنے کا موقع نہ دیا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور پھر سراب سے لپٹ گیا۔ سراب ماٹیارہ چکا تھا۔ اس کا بدن مضبوط اور کسا ہوا تھا۔ ہاتھوں میں زبردست کس بل تھا۔ اس نے پلٹ کر بدھیل کے منہ پر پوری قوت سے تھپڑ رسید کیا۔ چوٹ کر ارسی آئی۔ بدھیل چکرا گیا۔ ہونٹوں سے خون بننے لگا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ سراب نے دوبارہ آزاد ہونے کی کوشش کی۔ بدھیل اونچی آواز سے چیخا۔

”سین سردار، میں نے سراب کو پکڑ رکھا ہے۔“

بدھیل کی آواز سننے ہی سردار شہ زور خان مزاری تیزی سے اس سمت لپکا۔ علی محمد جسکانی اور رحیم داد بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑے۔

مزاری کو دیکھتے ہی سراب سراپد ہو گیا۔ اس نے بھاگنا چاہا۔ لیکن مزاری اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے سراب کے کندھے پر رانقل کا بٹ زور سے مارا۔ ہاتھ تھلا ہوا پڑا۔ سراب کی

پھرتی سے کام نہ لیتا تو زردار کی طرح یہ بھی نکل جاتا۔“ اس نے زمین پر پڑے ہوئے سراب کو حقارت سے دیکھا۔

بدھیل اونٹ کی ٹکیل تھامے ہوئے واپس آگیا۔ داؤد خان اس کے ہم راہ تھا۔ مرجان کجاوے میں سر جھکائے زخمی فاختہ کی مانند سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ دھندلی روشنی میں وہ ہولے کی طرح نظر آرہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مزاری کی آنکھوں سے گویا چنگاریاں نکلنے لگیں۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ صرف خونخوار نظروں سے مرجان کو گھورتا رہا جس نے ہل مار کر چادر کے پلو سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔

علی محمد جبکانی نے سر پر منڈلاتا ہوا خطرہ محسوس کیا۔ وہ مزاری کو ایک طرف لے گیا۔ اس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”شہ زور“ اب فٹاں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ زردار بیچ کر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ سیدھا چورہ پہنچے گا۔ لغاریوں کو فوراً سب کچھ بتا دے گا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ سراب اور مرجان مدت سے لغاریوں کے ہاتھ میں ہیں۔ ان کی حفاظت کرنا ان کی ذمہ داری ہے۔ یہ ان کی آن اور مزاواری کا سوال ہے۔ وہ فوراً یہاں پہنچنے اور سراب اور ملوک زادی کو چھڑا کر لے جانے کی کوشش کریں گے۔“

”تو کتنا تو ٹھیک ہی ہے۔ اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہیے۔“ شہ زور خان مزاری نے بھرم اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”آگے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دراہمہ واپس چلتے ہیں۔ رانا احمد بخش کے پاس گزارشیں گے۔ تڑکے ہی تڑکے نکل کھڑے ہوں گے۔ تو ڈیرہ غازی خاں شہر تک ہمارے ساتھ چلنا۔ میں وہاں سے اپنی دوستی شاہ میر چلا جاؤں گا۔ تو واپس محمود کوٹ چلا جانا۔ اس نے جبکانی کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”یہ ٹھیک رہے گا؟“

مگر جبکانی نے اس کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ ”سب سے مشکل سوال یہ ہے کہ یہاں سے نکلنے کے لیے کون سا راستہ پکڑا جائے۔ دراہمہ جانا خطرے سے خالی نہیں۔ احمد بخش اتنا وڈا زمین دا نہیں ہے کہ لغاریوں کے خلاف ہماری پوری طرح حفاظت کر سکے۔ اور یہ تو تجھے بھی پتہ ہو چاہیے کہ لغاری دراہمہ ضرور پہنچیں گے۔ ان کے ساتھ بندے بھی زیادہ ہی ہوں گے۔ ہر طرح اسلحہ بھی ہو گا۔ پوری تیاری کر کے آئے ہوں گے۔“

”گالہ تو تیری سمجھ آتی ہے۔“ مزاری کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ وہ چند خاموش کھڑا سوچتا رہا، پھر مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے جوش سے بولا۔ ”میں تو کتنا ہوں چورہ ہی چلتے ہیں۔ شہر جانے کا اور دو سرا تو کوئی رستہ نہیں، چورہ میں لغاریوں نے روکا تو کیا ہو؟

گولی ہی تو چلے گی، چلنے دے۔ میں سراب اور مرجان کو پہلے ہی گولی مار دوں گا۔ ان کی لاشیں لغاریوں کے سامنے پھینک دوں گا۔ یہ میری عزت اور مزاواری کا سوال ہے۔ آگے جو ہوتا ہے دیکھ لیں گے۔“

”یسا ہی کرتا ہے تو چورہ کیوں جانا چاہتا ہے۔ ٹھہر کر لغاریوں کا انتظار کر۔ بیس فیصلہ ہو جائے گا۔“ جبکانی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ لہجہ بھی تیز اور تیکھا تھا جسے شہ زور مزاری نے بھی محسوس کیا۔

”مزاخ نہ ہو۔“ مزاری نے سلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ بتا، اب کیا کیا جائے۔ تو نے تو اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہو گا۔“

”تجھے پتہ نہیں۔ دراہمہ کے نزدیک سے بھی ایک رستہ شہر کی طرف جاتا ہے۔“ علی محمد جبکانی نے بتایا۔ ”اسے ٹھنڈی سڑک کہا جاتا ہے۔ میں نے تو یہاں سے نکلنے کے لیے وہی رستہ سوچ رکھا تھا۔ یہ رستہ چورہ سے اڑھائی میل نیچے سے گزرتا ہے۔ اس رستے کو پکڑنے میں لغاریوں سے ٹڈ بھڑ ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں۔“

”یار تو نے تو کمال کر دیا۔“ مزاری نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ ”مجھے تو ادھر کے رستوں کا کچھ آتا ہی نہیں۔ تو نے یہ گالہ پہلے ہی بتا دی ہوتی۔“

”پہلے ہی بتا دیتا۔ پر تو نے اس بارے میں مجھ سے پوچھا ہی کب۔ میں تو سمجھتا تھا تجھے ادھر کے رستوں کا ٹھیک طرح پتہ ہو گا۔“ جبکانی نے وضاحت کی۔ ”آگے جو کچھ کرتا ہے وہ فٹاں کر۔ چورہ زیادہ دور نہیں۔ زردار اب تک وہاں پہنچ چکا ہو گا۔“

مزاری نے مزید بات چیت نہ کی۔ بڑھ کر بدھیل، داؤد اور ہجر خاں کے پاس پہنچا۔ انھیں ضروری ہدایات دیں۔ فوراً ہی جھپوں پر سے کٹی ہوئی شاخیں ہٹائی گئیں۔ بدھیل اور داؤد نے پگڑیوں سے سراب کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔ مگر مرجان کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ ملوک زادی تھی۔ ان کی نظروں میں ابھی تک اس کی عزت تھی۔ وہ اسے چھونے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔



مردار شہ زور مزاری نے مرجان کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ سراب کے ساتھ فرار ہونے کے بعد سیاہ کاربن چکی تھی۔ شہ زور مزاری غصے سے دھاڑا۔ ”کالی۔“ اس نے مرجان کے لائے لائے سیاہ بال پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ مرجان کے حلق سے تھمتی ہوئی چیخ نکلی۔ وہ کجاوے سے نکل کر زمین پر اتر گئی۔

مزاری اسے کھینچتا ہوا ایک جیب تک لے گیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اس زور سے دھکا دیا کہ وہ جیب کی پچھلی نشست پر دھڑام سے گری۔

داؤد اور بدھیل نے سراب کو بھی مرجان کے ساتھ ہی بٹھا دیا۔ بدھیل اپنی بھری ہوئی دسکی ساخت کی بلوچی بندوق و تاج کے ساتھ دونوں کے قریب بیٹھ گیا۔ مزاری کی ہدایت پر داؤد اور بجر خاں بھی ڈرائیور کے برابر اسی جیب میں سوار ہو گئے۔

مزاری دوسری جیب میں جکانی اور رحیم داد کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جکانی کے دونوں کارندے ڈرائیور کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ سب پوری طرح مسلح اور چوک تھے۔ جیپوں کے انجن اشارت ہوئے۔ جیپیں آگے بڑھیں اور جھاڑیوں کے درمیان سے راستہ بناتی ہوئی نشیب سے نکل کر سڑک پر آگئیں۔ جیپیں اب دراہمہ کی جانب دوڑ رہی تھیں۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔

سرور والی سے گزر کر جیپیں آگے بڑھیں۔ اور رفتہ رفتہ دراہمہ سے قریب ہوتی گئیں۔ مگر دراہمہ ابھی میل سو میل کے فاصلے پر تھا کہ عقب میں درختوں کی آڑ سے تیز روشنی ابھری۔ جکانی کی ہدایت پر دونوں جیپوں کی بتیاں فوراً بجھا دی گئیں۔

علی محمد جکانی نے مزاری کو خبردار کیا۔ ”گلتا ہے لغاری آگئے۔“
”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“ شہ زور خاں مزاری نے بھی اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”اب کیا کیا جائے؟“

جکانی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ڈرائیوروں کو حکم دیا کہ جیپیں سڑک کے نشیب میں اتار دی جائیں۔ سڑک کے ایک جانب اجاڑ میدان تھا۔ مگر دوسری طرف جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ کھنے درختوں کا جھنڈ تھا۔ دونوں جیپیں اس طرف نشیب میں اتار دی گئیں اور کچھ دور جانے کے بعد جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی کر دی گئیں۔

سب جلدی جلدی جیپوں سے باہر نکلے اور درختوں کے تنوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے۔ مگر بدھیل جیب سے نیچے نہ اترا۔ وہ سراب اور مرجان کی جانب اپنی بھری ہوئی و تاج تانے نہایت چوکنا بیٹھا تھا۔ سراب اور مرجان کے منہ میں اس طرح کپڑا ٹھوس دیا گیا تھا کہ اگر وہ کوشش بھی کرتے تو آواز نہ نکلتی۔

روشنی رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی سڑک پر پیوں کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دینے لگیں۔ سب زمین پر لیٹ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں اور رائفلیں تھیں۔ اور ان

کی ٹالیوں کا رخ سڑک کی جانب تھا۔

شہ زور خاں مزاری دم سادھے جکانی کے برابر ہی زمین پر لیٹا تھا۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں جکانی سے کہا۔ ”میرا تو جی کرتا ہے کہ کالے اور کالی کو گولی مار دوں۔“ اس کا اشارہ سراب اور مرجان کی طرف تھا جو بلوچوں کے قبائلی قانون کی رو سے زانی اور سیاہ کار تھے۔ لہذا واجب القتل تھے۔ ”دونوں کو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ لغاریوں کو اگر ملیں تو صرف ان کی خون میں لتھری ہوئی لاشیں ملیں۔“

”فضول باتیں نہ کر۔“ جکانی نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”تو کالے اور کالی کو بعد میں بھی سزا دے سکتا ہے۔ تو یہ یہ بھی سوچا، گولی کی آواز سے لغاریوں کو صاف پتہ چل جائے گا کہ ادھر ہم چھپے ہوئے ہیں۔ تو چپ کر کے دیکھتا جا۔“

عین اس وقت ایک موڑ سے تین جیپیں نکل کر سامنے آگئیں۔ ان کی تیز روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ سب دم سادھے ہوئے تھے۔ ان کی نظریں چورہ کی سمت سے آنے والی جیپوں پر جمی تھیں اور ہاتھ بندوقوں کی بلبلی پر تھے۔ درختوں کے جھنڈ کے قریب پہنچ کر جیپوں کی رفتار سست پڑ گئی۔ ان میں درجن بھر سے بھی زیادہ افراد بیٹھے تھے۔ سب بندوقوں اور رائفلوں سے مسلح تھے۔ ان کی نظریں درختوں اور جھاڑیوں کی جانب اٹھی تھیں۔

مگر دونوں جیپیں رکی نہیں۔ ان کی رفتار میں اضافہ ہوا اور تیزی سے سڑک پر دوڑتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ وہ دراہمہ کی سمت جا رہی تھیں۔ جب ان کی پچھلی بیٹوں کی سرخ روشنی بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو جکانی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دوسرے بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

مزاری نے جکانی سے دریافت کیا۔ ”جیپوں میں لغاری ہی بیٹھے تھے نا؟ مجھے تو لغاری ہی لگتے تھے۔“

”ہاں وہی تھے اور کون ہو سکتا ہے۔“

”دراہمہ کی طرف گئے ہیں۔“ مزاری نے کہا۔ ”رستہ صاف ہے۔ کیوں نہ اب ہم چورہ کے رستے نکل جائیں۔ اب ادھر اپنا رستہ روکنے والا کوئی نہ ہو گا۔“

”نہیں“ ادھر جانا خطرے سے خالی نہیں۔“ جکانی نے شہ زور خاں مزاری کی تجویز رد کر دی۔ ”ادھر سے ایک کپڑا رستہ جاتا ہے۔ کچھ دور جا کر ٹھنڈی سڑک سے مل جاتا ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”ویسے یہ رستہ خراب اور اونچا نیچا ہے۔ کہیں کہیں گڑھے اور کھنڈ ہیں۔ پر رستہ زیادہ لمبا نہیں۔ اب تو سب سے محفوظ یہی رستہ ہے۔“

”جیسی تیری مرضی۔ مجھے تو ادھر کے رستوں کا کچھ آتا ہی نہیں۔“ مزاری نے علی محمد جبکانی سے اختلاف رائے نہیں کیا۔ اس کا مشورہ خندہ پیشانی سے قبول کر لیا۔

ایک بار پھر سب جلدی جلدی جیپوں میں بیٹھ گئے۔ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ لغاری کسی بھی وقت دراہمہ سے واپس آسکتے تھے۔ دونوں جیپیں سڑک پر آگئیں۔ مگر فلاگ بھر راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ جبکانی کی ہدایت پر نشیب میں اتر گئیں۔ اور ایک کچے راستے پر اندھیرے میں ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ ڈرائیور محتاط اور چوکنا تھے۔ جیپوں کو سنبھال سنبھال کر چلا رہے تھے۔

علی محمد جبکانی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ راستہ سخت ناہموار تھا۔ بار بار جیپوں کا توازن بگڑ جاتا۔ اٹلنے کا خطرہ لاحق ہوتا۔ اب ہر طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آبادی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ سناٹا بہت گہرا تھا۔ گرمیوں کی بوجھل اور بے کیف رات تھی۔ آسمان پر غبار چھایا تھا۔

کچا اور ناہموار راستہ زیادہ طویل نہ تھا۔ ڈیڑھ دو میل جنوب کی سمت جانے کے بعد ٹھنڈی سڑک آگئی۔ یہ بہت قدیم سڑک تھی۔ کنکروں کی بنی ہوئی تھی۔ لیکن اب اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ کنکر جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ اور ان کے اکھڑنے سے بڑے بڑے گڑھے پڑ گئے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گھٹے درخت تھے۔ بلندی پر پھیلی ہوئی دونوں طرف کی شاخیں اس طرح ایک دوسرے سے مل گئیں تھیں کہ سڑک پر چلتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا گویا کسی محراب کے نیچے سے گزر رہے ہوں۔ موسم گرما میں راہ گیروں کے لیے یہ سڑک بہت ٹھنڈی اور فرحت بخش تھی۔ مگر اس وقت ہوا بند تھی۔ فضا میں امس اور ٹھنکن تھی۔

دونوں جیپیں ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھیں۔ ان کی رفتار زیادہ نہ تھی۔ دو ڈھائی میل فاصلہ طے کرنے کے بعد سڑک مغرب کی سمت مڑ گئی تھی۔ جیپیں بھی اسی جانب مڑ گئیں۔ آگے اور آگے بڑھتی گئیں۔

ٹھنڈی سڑک ختم ہو گئی۔ جام پور روڈ آگئی۔ دونوں سڑکیں ایک پل پر ملتی تھیں۔ پل کے نیچے نہر تھی جو عرصہ دراز سے خشک پڑی تھی۔ پل پر پہنچ کر دونوں جیپیں ٹھہر گئیں۔ جبکانی، مزاری اور رحیم داد اتر کر باہر آئے۔ جبر خان، داؤد، جبکانی کے کارندے اور دونوں ڈرائیور بھی باہر آگئے۔ صرف بدھیل اپنی و تاج سنبھالے سراب اور مرجان کی نگرانی کے لیے ایک جیپ کی پیچلی نشست پر چوکس بیٹھا رہا۔

جبکانی نے کھلی فضا میں لمبی لمبی سانسیں بھریں۔ پھر رات گزر چکی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ جبکانی نے مسکرا کر سردار شہ زور خاں مزاری سے کہا۔ ”آگے رستہ بالکل صاف ہے۔ اب تو بے

کھٹکے چلا جا۔“

”روحان تہ۔ تو ساتھ چل۔“ مزاری نے اصرار کیا۔

مگر علی محمد جبکانی رضامند نہ ہوا۔ ”مجھے اب ڈیرہ غازی خاں جانا ہے۔ رات شہر میں ظفر اللہ خاں کھوسہ کی حویلی میں ٹھہروں گا۔ سویرے محمود کوٹ چلا جاؤں گا۔ تو راجن پور جا کر ٹھہر جانا۔ اکیلا شاہ میر تک کیسے جیپ چلائے گا۔“

”ارادہ تو یہی ہے۔ مگر میں تیرے ڈرائیور کو ساتھ لے جاؤں گا۔ میں راستے میں کہیں ٹھہروں گا نہیں۔ سیدھا شاہ میر جاؤں گا۔“ مزاری نے جبکانی کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔ ”راجن پور میں جب ڈرائیور کو دے دوں گا۔ آگے وہی چلائے گا۔ وہی جیپ کو واپس ڈیرہ غازی خان شہر لے جائے گا۔ البتہ تو داؤد اور بھر کو اپنے ساتھ لیتا جا۔ میری جیپ میں ان کے لیے جگہ نہیں نکلے گی۔ سویرے دونوں کو واپس روانہ کر دیتا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ جبکانی نے پس و پیش نہ کی۔ ”میں داؤد اور بھر خاں کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”تو نے بہت کام دکھایا۔“ مزاری نے کھل کر جبکانی کی تعریف کی۔ ”تو نہ ہوتا تو یہ دونوں میرے ہاتھ نہ آتے۔“ اس نے سراب اور مرجان کی طرف اشارہ کیا۔ ”صاف نکل جاتے یا لغاری ان کو نکال لے جاتے۔ تو نے بہت مدد کی۔ ہر کام آرام سے ہو گیا۔ نہ گولی چلی نہ خون خرابہ ہوا۔“

”ایسی مگالہ نہ کر۔“ جبکانی نے ہنس کر کہا۔ ”مدد شد کیا کرنی؟ یہ تو میرا اپنا کام تھا۔ تجھ سے یاری جو ٹھہری۔ میں اور تو الگ تو نہیں ہیں۔“ جبکانی نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ ”اب تو جاؤ دیری نہ کر۔ ابھی تجھے لمبے سفر پر جانا ہے۔“

جبکانی آگے بڑھ کر مزاری سے بغل گیر ہوا۔ رحیم داد کو بھی گلے سے لگایا۔ دونوں سے رخصت ہو کر جیپ کی جانب بڑھا اور ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کارندے بھی، بھر خاں اور داؤد کے ساتھ بچھلی نشست پر کسی نہ کسی طرح بیٹھ گئے۔ انجن اشارت ہوا۔ ڈرائیور نے جیپ موڑی اور ڈیرہ غازی خاں شہر کی جانب روانہ ہو گئی۔

مزاری خاموش کھڑا اسے دور تک دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ اپنی جیپ پر جا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کو اپنے ساتھ بٹھایا۔ ڈرائیور بھی اگلی نشست پر بیٹھ گیا۔ مگر اب وہ جیپ نہیں چلا رہا تھا۔

مزاری اسٹریٹک وھیل سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس نے جیپ کا انجن اشارت کیا۔ کچھ دبا کر گیر بدلا

ایکی لیٹر ایک پیر سے دبایا۔ جیپ سڑک پر تیزی سے دوڑنے لگی۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔۔۔ جیپ دوڑتی رہی۔ جام پور سے گزر کر کوئٹہ دیوان پہنچی۔

رات ڈھلنے لگی تھی۔ مزاری بہت تھک گیا تھا۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ اس کا ہاتھ ہلک جاتا۔ ایسے عالم میں جیپ چلانا خطرناک تھا۔ اس نے ایک سنان مقام پر جیپ روک لی۔ ایک بار پھر یاہر آیا۔

ڈرائیور نے اس کی ہدایت پر جیپ کے پچھلے حصے کے گرد چادر باندھ دی۔ آسمان کی رنگت اب بدلنے لگی تھی۔ ہوائیں خوشگوار خنکی آگئی تھی۔ صبح کی آمد کے آثار ہوید اہونے لگے تھے۔

سراب اور مرجان کا کھلی جیپ میں سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ ویسے بھی بلوچ سرداروں اور بڑے زمین داروں کی مستورات کا کھلی جیپ میں سفر کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جاگیردار گھرانوں کی وہ خواتین جو پڑھ لکھ کر ماڈرن بلکہ الزا ماڈرن بن گئی تھیں اور یورپ اور امریکہ میں دھڑلے سے بے پردہ گھومتی تھیں، اپنے علاقے میں پہنچتیں تو چادر سے خود کو اس طرح چھپا لیتیں کہ جسم کا کوئی حصہ نظر نہ آتا۔ کھلی جیپوں میں بیٹھتیں تو ان پر چادر کا پردہ پڑا ہوتا۔

شہ زور مزاری نے جیپ کا اسٹیرنگ و ہیل ڈرائیور کے حوالے کر دیا۔ خود بندوق سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اس کی پشت پر سراب تھا۔ مرجان تھی۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کے منہ میں ٹسے ہوئے کپڑے نکال دیے گئے تھے۔ دونوں خاموش تھے۔ خوف سے سسے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں مطلق نیند کا گزرنہ تھا۔ وہ جاگ رہے تھے۔ بدھیل بھی جاگ رہا تھا۔ اور اپنی تاج سنبھالے چوکس بیٹھا دونوں کی کڑی نگرانی کر رہا تھا۔

جیپ تیز رفتار سے سنان سڑک پر دوڑتی رہی۔ راجن پور پہنچی۔ مگر مزاری وہاں نہ رکا۔ جیپ روجھان شرقی کی سمت دوڑتی رہی۔ مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے لگا۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ دن کی آمد آئی تھی۔

جیپ دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ دھوپ پھیلنے لگی۔ جیپ مزار یوں کے علاقے، روجھان شرقی کی حدود میں داخل ہوئی۔ آگے بڑھی۔ شہ زور کے آبائی گاؤں شاہ میر میں پہنچی اور مختلف راستوں سے گزرتی ہوئی کوٹ کے بڑے دروازے پر رک گئی۔ تمازت اب بڑھ گئی تھی۔ موسم گرما کا سورج آگ کے گولے کی مانند دیکھنے لگا تھا۔



کوٹ سے ملحق نیم پختہ اور پرانی عمارت تھی۔ اس میں بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ تہ خانہ تاریک

تھا۔ فرش کچا تھا۔ ہر طرف سیلن اور نی تھی۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف چھت کے قریب دو مختصر روشن دان تھے جن پر لوہے کی مضبوط سلاخیں لگی تھیں۔

یہ تہ خانہ جس سے سزا ند اور بدلو کے بھیکے اٹھتے تھے، سردار شہ زور خاں مزاری کی ذاتی جیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ مردوں اور عورتوں کی علیحدہ علیحدہ جیل تھی۔ ان کے دروازے بھی علیحدہ تھے۔ قیدیوں کو کھانے میں عام طور پر ڈوڈھا دیا جاتا تھا۔ اس میں جوار کی روٹی کے ساتھ شلجم کے پتوں کا ساگ ہوتا۔ گندم کی روٹی ہفتے میں ایک بار دی جاتی۔ اس کے ساتھ پتلی وال ہوتی۔ مگر کھانے پر جو خرچ آتا قیدیوں کے عزیز و اقارب سے وصول کیا جاتا۔ اور جتنا خرچ آتا اس سے زیادہ وصول کیا جاتا۔ خرچ نہ پہنچتا تو قیدیوں کو قافے کرنے پڑتے۔

تہ خانے کی چھت پر اونچی فصیل نما چار دیواری تھی۔ چار دیواری کے اندر کسی کو بلا اجازت داخل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک سلسلے سے کوٹھریاں بنی تھیں۔ ان کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے آگے کھلا صحن تھا۔ کوٹھریوں میں جیل کے چوکیدار اور کارندے رہتے تھے۔ چار دیواری میں داخل ہونے کے لیے لوہے کا مضبوط پھانک تھا جو ہر وقت بند رہتا تھا۔ پھانک پر سخت پہرہ تھا۔ چونکہ دار بند و قید سنبھالے نہایت مستعدی سے پہرہ دیتے تھے۔ قیدیوں سے ملاقات کرنا بہت دشوار تھا۔ صرف سردار کی اجازت سے ملاقات کی جاسکتی تھی۔ لیکن ملاقات کے لیے کوئی خاص دن مقرر نہیں تھا۔

ایسی نجی جیلیں دوسرے قبائلی سرداروں اور بڑے زمین داروں کی بھی تھیں۔ بلکہ ہر حویلی یا کوٹ کے ساتھ نجی جیل برائی اور شان و شوکت کی علامت سمجھی جاتی تھی۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ضلع بھر میں کوئی سرکاری جیل نہ تھی۔ اس زمانے میں ڈپٹی کمشنروں اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں سے سزا پانے والے قیدی بھی سرداروں کی نجی جیلوں میں بند کیے جاتے تھے۔ حکومت کی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے ایک مقررہ رقم دی جاتی تھی۔

ضلع میں پہلی باقاعدہ جیل سیاسی قیدیوں کے لیے انگریزوں کے عہد حکومت میں تعمیر کی گئی۔ لیکن سرکاری جیل کے قیام کے بعد بھی سرداروں کی نجی جیلوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ وہ پہلے کی طرح اپنی جیلیں رکھتے۔ عدالت لگا کر اپنی مرضی اور اپنے قوانین کے مطابق مقدمات کے فیصلے کرتے۔ جنہیں مجرم قرار دیتے انھیں اپنی جیلوں میں سزا بھگتنے کے لیے قید کرتے۔

تمن دار اور مقدم کی ذاتی جیل، اس کی حویلی اور کوٹ کی طرح زیادہ بڑی ہوتی۔ ان میں قیدی بھی زیادہ بڑی تعداد میں رکھے جاتے۔ ڈیرہ غازی خاں کی طرح بلوچستان کے قبائلی سرداروں اور

جاگیرداروں کی بھی ایسی ہی نجی جیلیں تھیں جو زمین دوز تمہ خانوں میں قائم تھیں۔ ان میں دن رات برابر تھے۔ ہوا اور روشنی کا گزرنہ تھا۔

قیدیوں کو عام طور پر زنجیروں سے باندھ کر رکھا جاتا یا لکڑی کے ذہنی تختوں میں سوراخ کر کے اس طرح پیر ڈال دیے جاتے کہ وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہتے۔ لمبی قید کانٹے والے قیدیوں کے پیر تختوں کے شعلے میں پڑے پڑے اس طرح ناکارہ ہو جاتے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے معذور ہو جاتے۔

نجی جیلوں میں قیدیوں کو طرح طرح سے اذیت پہنچائی جاتی، جسموں کو لوہے کی دھکتی ہوئی سلاخوں سے داغا جاتا۔ کئی کئی روز تک الٹا ٹکایا جاتا۔ سر کے نیچے آگ سلگا کر مریچوں کی دھونی دی جاتی۔ برہنہ جسموں پر کوڑے مارے جاتے۔ اس قدر سفاکی اور بے رحمی سے زد و کوب کیا جاتا کہ اکثر قیدیوں کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جاتے۔ پٹائی جاتی رہتی، قوت سماعت ختم ہو جاتی۔ دماغ میں خلل پیدا ہو جاتا۔ ایسے قیدی رہائی کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لولے، لنگڑے، اندھے، بہرے، پاگل اور اپاہج ہو جاتے۔ ان اذیت ناک سزاؤں کے باعث سرداروں اور جاگیرداروں کی نجی جیلیں، عقوبت خانوں کے نام سے یاد کی جاتیں۔

یہ نجی قید خانے یا عقوبت خانے، جن میں قیدیوں کے لیے علاج معالجے کا کوئی بندوبست نہیں تھا، صدیوں پرانے اس عہد کی یادگار تھے جب غلاموں کو نافرمانی اور حکم عدولی کی پاداش میں مویشیوں کی طرح تاریک تمہ خانوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کے دور حکمرانی میں بھی یہ عقوبت خانے اپنی تمام انسانیت سوزی کے ساتھ برقرار رہے۔ انگریزوں کی حکومت ختم ہو گئی۔ پاکستان بن گیا۔ مگر نجی قید خانے اور عقوبت خانے رکھے کر دواج ختم نہ ہوا۔ عقوبت خانے بدستور قائم رہے اور قیدیوں پر ظلم و ستم ڈھانے کا سلسلہ بھی جاری رہا۔

شہ زور خان مزاری کی نجی جیل بھی ایک ایسی ہی جیل تھی۔ اس کے حکم پر سراب اور مرجان کو قیدی بنا کر عقوبت خانے میں بند کر دیا گیا۔ ان کے پیروں میں لوہے کی بھاری بھاری زنجیریں ڈال دی گئیں۔ ان کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ کسی کو ان سے ملنے اور بات کرنے کی مطلق اجازت نہ تھی۔

سردار شہ زور مزاری قیدیوں کے بارے میں ضروری احکامات جاری کرنے کے بعد کوٹ کے زنان خانے میں چلا گیا۔ رحیم داد کا قیام مسمان خانے میں تھا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ سفر کی ٹکان سے جسم چور چور تھا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ بستر پر جا کر ایسا سویا کہ دن ڈھلے

تک بے خبر سوتا رہا۔

شام کو مسمان خانے کے وسیع صحن کے پختہ چوترے پر محفل جمی۔ رحیم داد کی فرمائش پر مزاری نے نہایت اہتمام سے بھنگ گھٹوائی جسے سرائیکی میں ساوی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ شہ زور مزاری کو بھنگ سے خاص رغبت نہ تھی۔

دونوں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں میز تھی۔ میز پر شیشے کے جگ میں دودھ کی مانند سفید بھنگ تھی۔ مزاری اور رحیم داد کے گلاسوں میں بھی تھی۔ دونوں گھونٹ گھونٹ پی رہے تھے۔ شام درو دیوار سے نیچے اتر کر پھیل گئی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

جب رحیم داد نے اپنا گلاس ختم کر دیا تو خالی گلاس میں جگ سے بھنگ اٹھاتے ہوئے شہ زور مزاری نے مسکرا کر پوچھا۔ ”سیس چوہدری، سچ بتا میرے ذہن کے لیے کیسا دھک پختہ آئی؟“ بھنگ تپتی تھی اور اتنی خوش ذائقہ بھی نہ تھی جو رحیم داد نے بھکر میں مراد خاں شاہانی کی حویلی میں قیام کے دوران پی تھی۔ مگر مزاری کی دل جوئی کے خیال سے اس نے گردن ہلا کر بھنگ کی تعریف کی۔ ”چنگی ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر بڑا گھونٹ بھرا۔ ”مزے دار ہے۔“ ”تجھے پسند آئی۔“ شہ زور مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”ویسے میں ساوی بہت کم پیتا ہوں۔ اسے پی کر مجھے نشہ ہی نہیں ہوتا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”نشہ تو بچ پوچھ اسکاچ و ہسکی پی کر چڑھتا ہے۔“

”شاہ جی بھی یہی کہتا ہے۔“

”ضرور کہتا ہو گا۔ پرانا پینے والا ہے۔“ شہ زور نے کہا۔ ”میرا تو اس کے ساتھ زیادہ میل ملاپ نہیں۔ سنا ہے وہ اچھی شراب پیتا ہے اور اچھی رن رکھتا ہے۔“ مزاری نے بھنگ کا گھونٹ بھرا۔ ”سنا ہے ان کے لیے اس نے علیحدہ کوٹ بنا رکھا ہے۔ جس میں ایک سے ایک سو ہنری رن رکھ چھوڑی ہے۔“

”پر اب تو اس نے کوٹ ختم کر دیا۔ سیاست کے چکر میں پڑ گیا ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”ویسے میں نے اس کا کوٹ دیکھا ہے۔ کئی بار ادھر ٹھہر بھی چکا ہوں۔“

”تب تو تجھے اس کے کوٹ کے بارے میں سب پتہ ہو گا۔ کیسا ہوتا تھا اس کا کوٹ؟“ مزاری نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ”مراد خاں شاہانی بہت تعریف کرتا تھا۔“

رحیم داد اسے احسان شاہ کے کوٹ اور اس میں قید رکھی جانے والی مزارعوں اور کسانوں کی لڑکیوں اور جوان عورتوں کے بارے میں بتانے لگا۔ شہ زور مزاری توجہ اور دلچسپی سے اس کی باتیں

سنتا رہا۔ اسی اثنا میں ایک کوئی دو کتوں کی زنجیر سنبھالے ہوئے نمودار ہوا۔ لبرڈر نسل کے کتوں کی یہ جوڑی، شہ زور خان مزاری نے پچھلے سال خریدی تھی۔ ان سے اسے خاص لگاؤ تھا۔

مزاری نے مسکرا کر پوچھا۔ ”انھیں سیر کرانے لے گیا تھا؟“

”ہاں سیں!“ کوئی نے ادب سے جواب دیا۔ ”روز صبح شام سیر کرانے لے جاتا ہوں۔“

شہ زور خاں دونوں کتوں کو پیار بھری نظروں سے نکتا رہا۔ وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے۔ نہ اس نے کتوں کو قریب بلایا نہ اٹھ کر ان کے قریب گیا۔ چند لمحوں تک انھیں دیکھتا رہا، پھر کوئی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ویسے تو جنگ بھلے لگتے ہیں۔ کوئی پریشانی کی گالہ تو نہیں؟“

”نا سیں نا۔ سب خیر سلا ہے۔ فکر کی کوئی گالہ نہیں۔“ اس نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ جھک کر ایک کتے کی گردن پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔

”اب تو جا۔ میں سویرے ڈاگ ہاؤس دیکھنے آؤں گا۔“

کوئی خاموشی سے مزا اور کتوں کی زنجیر سنبھالے ہوئے چلا گیا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تو نے بھی ڈاگ ہاؤس بنا رکھا ہے؟“

”بنا تو رکھا ہے۔“ شہ زور خان مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”کتے بھی میرے پاس اچھی نسل کے ہیں۔“

”میں نے شاہانی کا ڈاگ ہاؤس دیکھا ہے۔“ رحیم داد بولا۔ ”بہت شان دار ہے۔ تیرا ڈاگ ہاؤس بھی شان دار ہی ہو گا۔“

”شان دار وان دار کیا، بس ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔ ویسے تو سارے ہی سرداروں اور وڈے زمین داروں نے، جنھیں شکار کھیلنے اور کتے پالنے کا چسکا ہے، اپنے اپنے ڈاگ ہاؤس رکھ چھوڑے ہیں۔ کئی کے پاس تو بہت وڈے وڈے ہیں۔“ مزاری نے بتایا۔ ”شان دار ڈاگ ہاؤس تو ج پوچھ، نواب جو ناگزہ کا ہوتا تھا۔ بہت شہرت تھی اس کی۔“

”بہت ہی زیادہ شاندار ہو گا۔“

”نہ پوچھ کتنا شاندار تھا۔ کتے بھی ایک سے ایک عمدہ اور اعلیٰ نسل کے رکھتا تھا۔ ان سے پیار بھی بہت کرتا تھا۔ ان کے لیے بہت شاندار محل بنا رکھا تھا۔“ مزاری نے گلاس اٹھا کر بھنگ کا گھونٹ بھرا۔ ”کتوں کے رہنے کے لیے الگ الگ کمرے تھے۔ ہر کمرے میں قالین بچھے ہوتے۔ بجلی ہوتی۔ میاں تک کہ ٹیلی فون بھی لگے ہوتے۔“

”ٹیلی فون ہوتے تھے؟“ رحیم داد نے سخت تعجب سے پوچھا۔

”کیا نہیں ہوتا تھا۔“ مزاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”کتوں کی دیکھ بھال کے لیے سینکڑوں نوکر تھے، ڈاکٹر تھے۔ زسیں تھیں۔ رات ب تیار کرنے کے لیے باورچی لگے تھے۔ ان کے سونے کے لیے مسکریاں تھیں۔ نرم نرم گدے تھے۔“ مزاری کھل کر مسکرایا۔ ”نہ پوچھ کیسے کیسے ان کے ناز و خیر اٹھائے جاتے تھے۔“ اس نے بے تکلفی سے تقہر لگایا۔ ”کوئی کتا مر جاتا تو اس کا زبردست سیاہ ہوتا۔ نہایت شان سے اسے کبرستان پہنچایا جاتا۔ کبر کھودی جاتی۔ دفن کیا جاتا۔ کتے ہی مرنے والے کتوں کے تو سنگ مرمر کے کبرے تیار کیے گئے تھے۔ ان کا کبرستان بھی علیحدہ ہی تھا۔“

”تیری گل بات سمجھ نہیں آئی۔“ رحیم داد منہ پھاڑ کر ہونق کی طرح مزاری کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”جتنے یہ سکر اور تعجب ہو گا کہ ایک کتے کا تو بہت دھوم دھام سے پرنا بھی ہوا تھا۔“ مزاری بدستور مسکراتا رہا۔

”تیرا مطلب ہے کتے کا ویاہ ہوا تھا۔“ رحیم داد واقعی اور زیادہ حیرت زدہ نظر آنے لگا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔“ مزاری نے نہایت اطمینان سے بتایا۔ ”نواب کے پاس ایک لبرڈر ہوتا تھا۔ یہ اسی نسل کا کتا تھا جو تھوڑی دیر پہلے میرا کوئی لے کر آیا تھا۔ اس کا نام تھا۔“ وہ اپنی بات کتے کتے الجھا۔ چند لمحوں خاموش رہا، پھر مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”یاو آگیا۔ بولی نام تھا اس کا۔ کئی کا نام روشنا تھا۔ ان کا پرنا ہوا تو سرکاری طور پر اعلان کیا گیا۔ دعوت نامے چھپے۔ سارے راجے، مہاراجے، نواب اور وڈے سرکاری افسروں کو دعوت نامے بھیجے گئے۔ وائسرائے کو بھی بلایا گیا تھا۔“

”وائسرائے کو بھی بلایا گیا تھا؟“ رحیم داد نے تجسس انگیز نظروں سے شہ زور مزاری کو دیکھا۔

”ہاں سیں“ وائسرائے کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ پر اس نے انکار کر دیا۔ ”سردار شہ زور خاں مزاری اب سنجیدہ ہو گیا تھا اور سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔“ ویسے سارے ہی راجے، نواب، سرکاری افسر مہمان بن کر دور دور سے جوناگزہ آئے تھے۔ بولی کی جن بہت دھوم دھام سے روانہ ہوئی۔ لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ بندے شریک ہوئے۔ جن کے آگے آگے باڈی گارڈ کا دستہ مارچ کرتا تھا، نواب اپنے شاہی ہاتھی پر سوار تھا۔ بولی سراباندھے شاندار گھوڑے پر بہت جگ دھج کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا خاص کوئی بھی گھوڑے پر بیٹھا تھا اور اسے سنبھالے ہوئے تھا۔ فوجی بینڈ بجاتا تھا۔ آتش بازی پھوڑی جاتی تھی۔“

رحیم داد حیرت سے بت بنا بیٹھا تھا۔ مزاری بتاتا رہا۔ ”بولی جب روشنا کو دیا کہ محل میں لایا تو زبردست دعوت ہوئی۔ عمدہ عمدہ کھانے اور پکوان مہمانوں کو کھلائے گئے۔ بولی اپنی بھری کے ساتھ بہت شان سے مسند پر بیٹھا تھا۔“

رحیم داد نے خمار آلود نظروں سے سردار مزاری کو دیکھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ بھنگ کے نشے میں بہک رہا ہے۔ بے چین ہو کر بولا۔ ”تو جگہ رہا ہے۔“ وہ ہولے ہولے لہرایا۔ ”یکین نہیں آتا۔“

”مجھے جھوٹ بول کر تجھ سے کیا لیتا۔“ مزاری کا لہجہ قدرے تیکھا تھا۔ ”میں تو اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔ پر بولی اور اس کے پرنے کے بارے میں تو اخباروں میں خبریں اور تصویریں بھی چھپی تھیں۔“

”خرچہ بھی بہت آیا ہو گا۔“

”لاکھوں روپے خرچ ہوئے تھے۔“ مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ ”مبینی کے ایک اخبار نے سخت اعتراض کیا تھا۔ لکھا تھا کہ ریاست کی سوا چھ لاکھ تنگی بھوکی رعایا میں سے بارہ ہزار غریب رعایا کی اتنے روپے سے پورے ایک سال تک آرام سے گزر بسر ہو سکتی تھی۔“ مزاری نے نشے کی جھونک میں زور کا تقہر بلند کیا۔ ”پر ابھی باتوں سے کیا بنتا ہے۔ نواب کو اپنی ٹور اور شان دکھانی تھی، سو اس نے ایسی دکھائی کہ ہر طرف دھوم مچ گئی۔“

”نواب اب کدھر ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ادھر کراچی میں ہوتا ہے۔“ مزاری نے مطلع کیا۔ ”اس نے ریاست جو ناگڑہ پاکستان میں شامل کرنے کا اعلان کیا تھا۔ سردار پٹیل، ہندوستان کی حکومت میں ریاستوں کے معاملات کا مرکزی وزیر ہوتا تھا۔ اسے پتہ چلا تو سخت نراض ہوا۔ ریاست کی ہندو رعایا کو برہمنوں کو زبردست گڑبڑ کرائی۔ اور ریاست پر زبردستی کبضہ کر لیا۔ نواب بے چارہ کسی نہ کسی طرح چھپتا لکنا پاکستان پہنچا۔“

”تب تو ہندوؤں نے نواب کو بدنام کرنے کے لیے اخباروں میں ایسی خبریں چھاپی ہوں گی۔“

رحیم داد نے اپنے رو عمل کا اظہار کیا۔

”ایسا ہی ہو گا۔“ سردار مزاری نے اختلاف رائے نہ کیا۔ ”پر بولی اور روشنا کے پرنے کی بات تو پاکستان بننے سے بہت پہلے کی ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مزاری بھی نہ بولا۔ دونوں اب خاصی تعداد میں بھنگ چڑھا چکے تھے۔ رات اجلی اور خوشگوار تھی۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چلتے تھے۔ دونوں نشے سے جھوم رہے تھے۔

انہوں نے اپنے اپنے گلاس ختم کیے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔



سیرے سردار مزاری نے رحیم داد کے ساتھ ناشتا کیا۔ اس نے حویلی میں مزید قیام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ گیراج سے اپنی پرانی پیکارڈ نکالی۔ اس کا ڈرائیور کیس کو زلزلہ کار لے کر ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔

دونوں پیکارڈ میں بیٹھ گئے۔ کار شمیر والی کی جانب دوڑنے لگی۔

پہرہ دن چڑھے کار شمیر والی میں داخل ہوئی۔ یہ مزاری کی جاگیر میں دریائے سندھ کے کنارے چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رینج کی فصل کٹ چکی تھی۔ کھیت اجاڑ تھے۔ جگہ جگہ کٹی ہوئی فصلوں کے ترڈے نظر آتے تھے۔ مگر کھیتوں کے آس پاس خوب ہریالی تھی۔ سایہ دار درخت زیادہ ہی گھنے اور گنجان تھے۔ اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

درختوں کے دامن میں کثرت سے گھنی جنگلی جھاڑیاں تھیں۔ جھنگر تھے۔

شمیر والی پر فضا اور ہری بھری بستی تھی۔ مگر آبادی کم تھی۔ سردار مزاری یہاں عام طور پر شکار کھیلنے آتا تھا۔ اس کے قیام کے لیے ایک بڑا اور کشادہ مکان تھا۔ گاؤں کے دوسرے مکانات عام طور پر دریائی گھاس اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے تھے۔ چند مکانوں کی دیواریں مٹی میں بھوسا ملا کر کھڑی کی گئی تھیں۔ ان پر شہتیر ڈال کر اور بالائی حصے پر گیلی مٹی کا گارا پھیلا کر چھتیں ڈالی گئی تھیں۔ دیواریں سیدھی نہ تھیں۔ بلندی پر پہنچ کر اندر کی جانب جھک گئی تھیں۔

مزاری کے مکان کی دیواریں کچی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ چھت بھی مٹی کی تھی۔ مگر دیواریں سیدھی تھیں۔ اس میں چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ کمروں کے آگے طویل والان تھا۔ اس کی چھت آگے جھکی ہوئی تھی تاکہ بارش کا پانی جمع نہ ہو۔ والان کی چھت، کمروں سے قدرے نیچی بھی تھی۔ والان کے سامنے وسیع احاطہ تھا۔ احاطے کے ایک حصے میں کئی کوٹھریاں تھیں جن میں چوکیدار اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ اناج اور بھوسا رکھا جاتا تھا۔ احاطے میں جگہ جگہ گھنے اور سائے دار درخت تھے۔ احاطے کی چار دیواریں مٹی کی بنی ہوئی تھیں۔ اندر داخل ہونے کے لیے اونچا دروازہ تھا۔

گاؤں بلندی پر تھا۔ نشیب میں دریا بہتا تھا۔ گرمی کے دن تھے مگر ہر طرف پھیلی ہوئی ہریالی اور دریا کی سمت سے آنے والے ہوا کے بھیگے بھیگے جھونکوں نے گرمی کی شدت کم کر دی تھی۔ درختوں کے نیچے ٹھنڈک تھی۔

رحیم داد کو گاؤں پسند آیا۔ پر فضا تھا اور پر سکون بھی تھا۔ سورج ڈوبا، اندھیرا پھیلا دریا کی سمت سے نرم اور ٹھنڈے جھونکے آنے لگے۔ شام بڑی فرحت افزا اور سہانی تھی۔ رحیم داد اور مزاری نے دن ڈھلے غسل کیا تھا۔ اجلا لباس پہنا تھا۔ دونوں احاطے میں والان کے سامنے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ پھر بوتل کھلی۔ شراب کا دورہ چلا اور اس کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ شراب دہی تھی اور خاصی تند و تیز تھی۔

دونوں نے کھانا کھایا اور جھومتے جھومتے جا کر بستروں پر دراز ہو گئے۔ ان کے پلنگ احاطے کے ایک گوشے میں بچے تھے۔



رحیم داد سردار عہ زور خان مزاری کے ہم راہ اس بڑے کمرے میں چلا گیا جس میں کچھری لگائی جاتی تھی۔ کمرے میں دیوار کے قریب خوب چوڑا چکلا پلنگ تھا۔ اس کے پائے اونچے اونچے تھے۔ ان پر رنگ و روغن سے خوش نما نقش و نگار بنے تھے۔

پلنگ پر صاف ستھری چادر بچھی تھی۔ پائنتی دو تہی تھی۔ اس پر رنگین دھاگوں سے خوش نما کشیدہ کاری کی گئی تھی اور حاشیہ گہرا سرخ تھا۔ سرہانے بڑے بڑے دبیز تکیے تھے۔ مزاری آگے بڑھا۔ پلنگ کے اوپر پہنچا اور پاؤں پھیلا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں پیروں کے پنجوں کو جوڑ کر ایک دوسرے سے ملایا اور گھٹنے سمیٹ کر اونچے کر لیے۔ سردار مزاری کا کاردار چاکر خاں سرگانی، جو شاہ میر سے اس کے ساتھ آیا تھا، کمرے میں پہلے ہی سے موجود تھا۔ سرگانی کے اشارے پر ایک ملازم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں خبری تھی۔ یہ سفید لٹھے کا ڈھائی گز لمبا ٹکڑا تھا۔ وہ سردار مزاری کے قریب پہنچا۔ جھکا اور نہایت احتیاط سے خبری اس کی کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بغل بندی کی۔ پھر خبری کے دونوں سروں کا اس طرح دمکا لگایا کہ آنکھوں کے سوا چہرے کا تمام حصہ ڈھک گیا۔

سردار شہ زور خان مزاری، جب قبائلی روایت کے مطابق اس طرح و لٹھ مار کر بیٹھ گیا تو ملازم نے حقہ تازہ کر کے پلنگ کے نزدیک اسٹول پر رکھ دیا۔ سردار اجلا لباس پہنے ہوئے تھا۔ اس پر عطر لگا تھا جس کی تیز خوشبو کمرے کی فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مزاری نے حقے کی نے سنبھالی اور آہستہ آہستہ کش لگانے لگا۔

کمرے کے باہر والان اور احاطے میں درختوں کے نیچے مزارعے اور کئی بیٹھے تھے۔ ان میں بزرگ بھی تھے۔ یہ بھی مزارعے تھے۔ مگر ان کا حق کاشت مو روٹی تھا۔ مو روٹی مزارعوں کو بلوچستان میں

لٹ بستہ کہا جاتا ہے۔ مگر ڈیرہ غازی خان میں بھی پنجاب کے دوسرے اضلاع کی طرح وہ مزارعے یا راہک کہلاتے ہیں۔

مزارعے، بزرگ اور کئی سرائیکی میں بات چیت کر رہے تھے جس میں بلوچی اور پنجابی کی آمیزش تھی۔ ان میں شمشیر والی کے علاوہ آس پاس کے ایسے گاؤں اور چکوں کے رہنے والے بھی شامل تھے جو سردار مزاری کی جاگیر میں شامل تھے۔ وہ اپنے مقدمے لے کر سردار کے پاس فیصلے کے لیے آئے تھے۔ چاکر خاں سرگانی باری باری ہر مقدمہ پیش کرتا۔ کسی مقدمے میں مدعی اور مدعا علیہ دونوں موجود ہوتے کسی میں صرف مدعی حاضر ہوتا۔

کمرے میں جو بھی داخل ہوتا پیشانی تک ہاتھ اٹھا کر سردار شہ زور خان مزاری کو سلام کرتا اور اپنی آواز میں کہتا۔ ”سین، سدا جیویں۔ سکھی صحت ہوے۔ خیر خیریت ہوے۔ رب راضی باضی ہوے۔“ یہ دعائیہ جملے ادا کرتا ہوا وہ آگے بڑھتا، جھکتا، سردار کے قدموں کو چھو کر پیرن پودن کرتا۔ اور ادب سے گردن جھکا کر مزاری کے دروہو کھڑا ہو جاتا۔

مزاری کے چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ وہ حقے کی نے ہونٹوں سے ہٹا کر بھاری بھر کم لہجے میں مقدمہ پیش کرنے کے لیے کہتا۔ ”اپنا دعویٰ بیان کر۔“ مقدمہ پیش کیا جاتا۔ وہ پوری توجہ سے اسے سنتا۔

مقدمات مختلف قسم کے تھے اور بڑی تعداد میں فوجداری نوعیت کے تھے۔ ان میں زمین کی وٹ بندی اور پانی کے تنازعات تھے۔ قبائل کے پرانی دشمنی کے حقے تھے۔ میاں بیوی، سرور داماد کے خانگی جھگڑے تھے۔ سردار شہ زور مزاری پہلے مدعی کا بیان سنتا، پھر مدعا علیہ کو صفائی پیش کرنے کا موقع دیتا۔ فریقین اپنے اپنے گواہ پیش کرتے۔ بیانات اور شہادتیں سننے کے بعد سردار شہ زور زاری جرح کرتا۔ ہر نکتہ اور ہر دلیل سمجھنے کی کوشش کرتا۔ کچھ دیر خاموش بیٹھا مقدمے کے لف پلوں پر غور کرتا رہتا، پھر اپنا فیصلہ سناتا۔ بعض مقدمات میں وہ چاکر خاں سرگانی سے بھی درہ کرتا۔ اس کی رائے معلوم کرتا، اگر مشورہ قابل قبول ہوتا تو اس کی روشنی میں فیصلہ کرتا۔

مقدمات کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک ساربان داخل ہوا۔ اس نے دبلیز پر قدم رکھتے ہی دہائی دی۔ اس سردار، سدا جیویں۔ سین میں لٹ گیا۔ سین میں تباہ ہو گیا۔ ”وہ تیزی سے آگے بڑھا اور ی کے پیر پکڑ کر زار و قطار روٹنے لگا۔“

مزاری نے رعب دار لہجے میں اسے ڈانٹا۔ ”سداھا کھڑا ہو۔ رونا پیٹنا چھوڑ۔ اپنا دعویٰ بیان

مجھے سب جانتے ہیں۔“ اس نے مڑ کر ساریبان کی طرف دیکھا۔ ”سین سردار! یہ جتوال بالکل جھوٹا ہے۔ میرے ہاتھ پر بدنائی کی کالک لگانا چاہتا ہے۔ میں نے اس کا اوٹھ ہرگز ہرگز چوری نہیں کیا۔ سین یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے تو اس کا اوٹھ دیکھا بھی نہیں۔“

وہ اپنے ساتھ دو گواہ بھی لایا تھا۔ مزاری کے حکم پر دونوں گواہ پیش کیے گئے۔ انھوں نے قسم کھا کر لنگر کے بیان کی پوری پوری تائید کی۔ ساریبان ہاتھ کے الزام کو جھوٹا اور گمراہ کن قرار دیا۔

لنگر اور اس کے گواہوں کے بیانات سننے کے بعد سردار مزاری ہاتھ کی جانب متوجہ ہوا۔ ”ہاتھ تجھے کسی اور پر تو اوٹھ کی چوری کا شبہ نہیں۔“

”نا سین نا۔“ ہاتھ نے پورے اعتماد سے کہا۔ ”مجھے کسی اور پر شبہ نہیں۔ میرا اوٹھ تو اسی نے چوری کیا ہے۔“ اس نے لنگر کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہی رات کے اندھیرے میں میرا اوٹھ کھول کر لے گیا۔“

سردار نے کہا۔ ”اس کے تو گواہ ہیں۔ تیرا بھی کوئی گواہ ہے؟“

”سین سردار! میرا کوئی گواہ نہیں۔“ ساریبان نے عاجزی سے کہا۔ ”میرا گواہ تو خدا ہے۔“ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر آسمان کی سمت بلند کیا۔ ”میں نے اپنا اوٹھ بنی شاہ میں لنگر کے باڑے میں بندھا دیکھا تھا۔ سین میں پہلے کھوجی ہوتا تھا۔ اوٹھ کے پاؤں کے نشانات سے کھرا نکالتا دوستی بنی شاہ پہنچا تھا۔ نشانات اس کے گھر تک جاتے تھے۔ وہاں اوٹھ موجود تھا۔ میں نے اسے جھٹ پچان لیا۔ وہ میرا ہی اوٹھ تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔“

”لنگر وہاں موجود تھا؟“ سردار مزاری نے دریافت کیا۔

”نا سین، لنگر وہاں نہیں تھا۔ دریا کے کنارے اپنی بیڑی میں بیٹھا تھا۔“ ہاتھ نے جواب دیا۔ ”میں اس کے پاس پہنچا۔ اپنے اوٹھ کے بارے میں اسے بتایا۔“

”لنگر نے تجھ سے کیا کہا؟“ مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”اس نے جھوٹ بولا۔ صاف انکار کر دیا۔“

”تو نے اس کے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرایا تھا؟“ سردار نے استفسار کیا۔

”نا سین، میں نے ایسا نہیں کیا۔ پرچہ چاک کرانے کے لیے پولیس کی مٹھی گرم کرنی پڑتی ہے۔ میں غریب جتوال ہوں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔“ اس کی آواز گویا گری ہو گئی۔ ”غریب کی فریاد بولے کہاں سنتے ہیں۔ سین سردار! میرا اوٹھ تو ہی دلوائے گا۔ تو سردار ہے۔ انصاف کرنے والا ہے۔ میرا فیصلہ تو ہی کرے گا۔ میں نے کسی اور کے پاس نہیں جانا۔“

”سین میرا نام ہاتھ ہے۔ جتوال ہوں۔ پاس کی دوستی میں رہتا ہوں۔ سین میرا اوٹھ چوری ہو گیا۔“ ساریبان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ گڑگڑا کر کہتا رہا۔ ”سین سردار! میں اوٹھ کے بنا کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو تباہ ہو گیا۔ میرے بالیں بچیں بھوکے مر رہے ہیں۔ سین میرا اوٹھ مجھے واپس دلا دے۔ توں سکھی صحت ہو دے۔ رب راضی ہو دے۔“

”تیرا اوٹھ کس نے چوری کیا؟“ مزاری نے اونچی آواز میں دریافت کیا۔ ”تجھے کسی پر شبہ ہے؟“

”نا سین! شبہ ہے بالکل شبہ ہے۔“ ساریبان ہاتھ نے جلدی جلدی گردن ہلائی۔

سردار نے غضب ناک ہو کر پوچھا۔ ”کون ہے وہ؟“

”وہ دوستی بنی شاہ میں رہتا ہے۔ اس کا نام لنگر ہے۔“ ہاتھ نے مستعدی سے بتایا۔ ”سین اسی نے

میرا اوٹھ چوری کیا ہے۔ مجھے پتہ ہے اسی نے چوری کیا ہے۔ ویسے تو وہ ماچھی ہے پر چوری چکاری اس کا دھندا ہے۔ بالکل ملی مٹی ہے۔ دیکھنے میں مٹی کی طرح ہے۔“

”چاکر تو لنگر کو جانتا ہے؟“ سردار مزاری نے مڑ کر اپنے کاردار کو دیکھا جو اس کی پشت پر بادیاب

بملاحظہ کھڑا تھا۔

اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ ”نا سین، میں لنگر کو جانتا ہوں۔ پھر کھڑا ہے۔ میں نے اسے پہلے ہی بلوایا تھا۔“

”لنگر کو حاضر کیا جائے۔“ مزاری نے حکم دیا۔ ”اسے اپنی صفائی پیش کرنے دی جائے۔“

چاکر خاں سرگانی نے فوراً لنگر کو بلوایا۔

ذرا دیر بعد ایک قوی ہیکل چھیرا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی لمبی قمیص کے نیچے کمرے نیلے رنگ کا منجھلا باندھے ہوئے تھا۔ سر پر ملجی پگڑی تھی۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال سخت اور گھنے تھے۔ گردن تک بالوں کے لمبے لمبے سیاہ پٹھے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور سرخی مائل تھیں۔ رنگت سیاہ تھی۔ اس نے جھک کر مزاری کو ادب سے سلام کیا۔ دعاویہ جملے کہے۔ قدم بوسی کی اور گردن جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

سردار شہ زور خاں نے گھورتے ہوئے دریافت کیا۔ ”یہ جتوال کہتا ہے، تو نے اس کا اوٹھ چوری کیا ہے۔“

تجھے اپنی صفائی میں کیا کہتا ہے۔“

لنگر نے ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑا، پھر دونوں گالوں کو ہاتھ سے چھو کر انکار میں گردن ہلائی۔

”نا سین نا۔ میں چوری رسہ گیری کا دھندا نہیں کرتا۔ میں نیک اور بھلا بندہ ہوں۔ دوستی بنی شاہ

”جب تو نے لنگر کے بازے میں اپنا اوٹھ دیکھ لیا تھا تو کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟“ مزاری نے کرید کر پوچھا۔ ”میرا مطلب ہے، تو اپنا اوٹھ کھول کر کیوں نہیں لے آیا؟“

”سینس میں بالکل اکیلا تھا۔ لنگر مجھ سے ٹکڑا اور زور آور ہے۔“ ہاتو نے وضاحت کی۔ ”میں نے پہلے لنگر سے پوچھنا چاہا تھا۔ جب اس نے صاف انکار کر دیا تو واپس اپنی دستی گیا۔ رات کو اپنے ماما کے پتر اور دو جوتوں کو لے کر دوبارہ بنی شاہ پہنچا۔ تب لنگر اپنے گھر پر موجود تھا۔ پر اوٹھ غائب تھا۔“

”تو نے آگے کیا کیا؟“ مزاری نے دریافت کیا۔

”میں نے پتہ چلایا۔ معلوم ہوا لنگر نے شام کا اندھیرا ہوتے ہیں اوٹھ کو ٹلی جعفر پہنچا دیا۔“ ہاتو نے مزاری کو بتایا۔ ”میں کو ٹلی جعفر پہنچا۔ پر میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس نے اوٹھ بیڑی میں بٹھا کر دریا پار پہنچا دیا۔“

”سینس سردار، یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔“

لنگر تمل کر بولا۔ ”خاما خاثر نہ کر۔“ سردار مزاری نے لنگر کو غصے سے ڈانٹا۔ ”جب تجھے کہا جائے تب ”چپ کر۔“ خاما خاثر نہ کر۔“

”ہا تو! بعد میں تو نے اپنے اوٹھ کا کھوج نہیں نکالا۔“ تجھے پتہ ہے، تیرا اوٹھ اب کہاں ہے؟“

”سینس سردار! مجھے صرف اتنا پتہ ہے۔ میرا اوٹھ رحیم یار خاں میں ہے۔“ ساربان عاجزی سے بولا۔ ”کس دستی میں ہے، کہاں ہے؟ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ تو سردار ہے، تو جم شیر ہے۔“

”تجھ سے میں کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔“

سردار مزاری، چند لمحے خاموش رہ کر لنگر سے مخاطب ہوا۔ ”لنگر، اب تو بتا۔ تو نے ہاتو کا اوٹھ اگر چوری نہیں کیا، تو یہ تجھ پر چوری کا الزام کیوں لگا رہا ہے؟ تیرے سوا اسے کسی اور پر شبہ بھی نہیں۔ ایسا کیوں ہے؟“

”سینس سردار! گالہ اصلی یہ ہے۔“ لنگر نے مزاری کو بتایا۔ ”اس کی چاچی میری بھئی ہے۔ میں نے اسے طلاک دی اور جب وہ بھئی ہو گئی تو اس کے چاچا سے اس نے نکاح کر لیا۔ میری وہی بھئی اب اسے اور اس کے چاچا کو میرے خلاف بھڑکاتی ہے۔ میری اس کی بیٹی دشمنی ہے اور پچھلے ایک سال سے ہے۔“ اس نے مڑ کر ہاتو کو دیکھا۔ ”اس سے پوچھ لے سردار۔ میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“

”لنگر ٹھیک کہہ رہا ہے؟“ سردار مزاری نے ہاتو سے پوچھا۔

”میری چاچی پہلے اس کی ذال ہوتی تھی۔ یہ تو اس نے ٹھیک ہی بتایا۔ پر اوٹھ کی چوری سے اس معاملے کا کیا میل۔“ ہاتو نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”میں تو اپنے چاچا کے گھر بہت کم جاتا ہوں۔ میری چاچی، جو اب اس کی بھئی ہے، مجھے ذرا پسند نہیں۔ وہ زبردست جھگڑا لورن ہے۔ مجھ سے بھی کئی بار جھگڑا مٹا کر چکی ہے۔ میں تو پچھلے چھ سات مہینے سے اس کے گھر گیا ہی نہیں۔“

اس نے لنگر کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”سینس، یہ بکواس کر رہا ہے۔ میرا اوٹھ اسی نے چوری کیا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں، میرا اوٹھ اس نے رحیم یار خاں میں کسیں چھپا دیا ہے یا کسی کی ہاتھ بیچ دیا۔“ وہ گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔ ”سینس سردار! میرا اوٹھ مجھے دلا دے۔ میں تباہ ہو گیا۔ میں لٹ گیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

لنگر نے ہاتو کو اس طرح زار و قطار روئے دیکھا تو نرم لہجے میں بولا۔ ”سینس سردار، میں یہ نہیں کہتا اس کا اوٹھ چوری نہیں ہوا۔ پر میں نے اسے نہیں چرایا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ میرے گواہوں سے پوچھ لے۔“

سردار مزاری نے لنگر کو نظر انداز کرتے ہوئے ہاتو سے پوچھا۔ ”تیرا ملیر اور دونوں جوتوں جو تیرے ساتھ دستی بنی شاہ اور کو ٹلی جعفر گئے تھے اور جنہوں نے تیرے اوٹھ کے بارے میں سنا بھی تھا، ان کی تو نے گواہی کیوں نہیں پیش کی؟“

”سینس، انہوں نے اوٹھ دیکھا نہیں۔ اسے تو لنگر نے پہلے ہی بیڑی میں بٹھا کر دریا پار پہنچا دیا تھا۔“ ہاتو نے وضاحت کی۔ ”ایسے میں وہ کیا گواہی دے سکتے ہیں۔ ہاں وہ اس کی ضرور گواہی دے سکتے ہیں کہ میرے ساتھ دستی بنی شاہ اور کو ٹلی جعفر گئے تھے۔ سینس تو حکم کرتا میں ان سے اس کی گواہی دلا دوں۔“

”نہیں ایسی گواہی سے کام نہیں چلے گا۔“ سردار مزاری نے اختلاف رائے کیا۔ ”ہاں، کسی نے لنگر کو تیرا اوٹھ چوری کرتے دیکھا ہو، اس کی گواہی تو پیش کر سکتا ہے۔“

”نا سینس، میرا ایسا کوئی گواہ نہیں۔ تب ہی تو میں نے تجھے پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا، میرا کوئی گواہ نہیں۔“ ہاتو نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ ”سینس سردار، میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ نہ تیرے سامنے جھوٹے گواہ پیش کروں گا۔“

مزاری نے کچھ نہ کہا۔ نظریں جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ رحیم داد بھی سر کنڈوں کے بنے ہوئے موڑھے پر بت بنا خاموش بیٹھا تھا اور مقدمے کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مقدمہ خاصا پیچیدہ تھا۔ رحیم داد یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد سردار شہ زور خان مزاری نے چاکر خان سرگانی کو مخاطب کیا۔
”چاکر! مکدمہ تو کچھ الجھا ہوا ہے۔ تو کچھ کہنا چاہے تو کہہ سکتا ہے۔“

”سہیں سردار! اوٹھ کی چوری کا ہاتھ کے پاس کوئی پکا ثبوت نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی گواہ ہے نہ شہادت۔ لہذا ہاتھ کا دعویٰ خارج کیا جا سکتا ہے۔“ چاکر خان سرگانی نے نہایت ادب سے اپنا موقف پیش کیا۔ ”ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جرگہ بلایا جائے اور معتبروں کے سامنے مکدمہ پیش کر دیا جائے۔ جرگہ جو فیصلہ کرے گا وہی آخری فیصلہ ہو گا۔“

ہاتھ تڑپ کر بولا۔ ”نا سہیں، جرگہ نہیں، میرا فیصلہ تو سردار ہی کرے گا۔“ وہ بچوں کی طرح مچل کر ضد کرنے لگا۔ ”سہیں، تو ہی اوٹھ دلو سکتا ہے۔ میرا فیصلہ تو ہی کرے گا۔“

”میں ہی فیصلہ کروں گا۔ پر آج نہیں، چار روز بعد۔“ سردار مزاری نے مڑ کر چاکر خان کو دیکھا۔ ”چاکر! یہ مکدمہ اتنا اہم نہیں کہ اس کے لیے جرگہ بلایا جائے۔“ وہ ہاتھ اور لنگر کی طرف متوجہ ہوا۔ ”پچھری برخواست کی جاتی ہے۔ تم سب کو چار روز بعد فیصلے کے لیے حاضر ہونا ہو گا۔ چاکر خان تم کو اس کے بارے میں بتا دے گا۔“

عدالت برخواست ہوتے ہی کمرہ خالی ہو گیا۔ چاکر خان نے بڑھ کر مزاری کی کمر اور ٹانگوں سے لپٹی ہوئی خیری کی گرہ کھول دی۔ مزاری پلنگ سے نیچے اترا اور رحیم داد کے ہم راہ باہر چلا گیا۔



جون کی سنسان دوپہر تھی۔ ہر طرف تیز اور چمکی دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا گرم تھی۔ گرہ کی اینٹوں سے بنی ہوئی اونچی اونچی دیواروں والے کمرے میں قدرے ٹھنڈک تھی۔ رحیم داد اور شہ زور خان مزاری کھانا کھا رہے تھے۔ رحیم داد بالکل خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بشرے سے الجھن جھلکتی تھی۔

سردار مزاری نے اس کے چہرے کو کئی بار نظر بھر کر دیکھا۔ لیکن وہ زیادہ دیر رحیم داد کی یہ کیفیت برداشت نہ کر سکا۔ مسکرا کر بولا۔

”سہیں چوہدری! تو کس سوچ میں پڑ گیا۔ خیر خیریت تو ہے؟“

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر شہ زور خان کی جانب دیکھا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ گردن جھکا کر بدستور کھانا کھاتا رہا۔

مزاری نے کرید کر پوچھا۔ ”تو اس طرح چپ کر کے کیوں بیٹھا ہے؟“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”لگتا ہے، تو اب یہاں سے اکتا گیا۔ واپس جانا چاہتا ہے چلا جانا۔ مجھے بھی ادھر زیادہ دن نہیں ٹھہرنا۔“

”واپس تو میں نے جانا ہی ہے۔ تجھے پتہ ہے ادھر لہور میں شاہ جی کا فیچر مہمان علی میرا انتظار کرتا ہو گا۔ شاہ جی اب تک کراچی سے آگیا ہو گا۔ اسے ملنا بھی ہے۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”پر ابھی تو میں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے سردار مزاری کے چہرے کو دیکھا۔ ”تجھے کل صبح اوٹھ کی چوری کے مکدمے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟“

”وہ تو میں نے کرنا ہی ہے۔ پر تو اتنا پریشان کیوں ہے؟“

”پریشانی کی گل بات نہیں۔“ اس بار رحیم داد مسکرا کر بولا۔ ”سوچ رہا تھا، تو فیصلہ کس طرح کرے گا؟ چوری کا نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ شہادت۔“ اس نے گلاس اٹھا کر پانی کا گھونٹ بھرا۔ ”ہاتھ کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کا اوٹھ تو چوری ہوا ہے۔ اور اسے صرف لنگری پر شبہ ہے۔“

”لنگر کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے؟“ سردار شہ زور مزاری نے اس کا عندیہ لینا چاہا۔ ”اس کے تو دو گواہ بھی ہیں۔“ رحیم داد نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”بیان بھی اس کا ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ بات بھی کڑک کر کرتا ہے۔“ اس کے چہرے پر ایک بار پھر الجھن نظر آنے لگی۔ ”مان لے اس نے ہاتھ کا اوٹھ چوری بھی کیا ہے۔ تب بھی تو اس کے خلاف ثبوت کہاں سے لائے گا؟“

”کل سویرے تو خود ہی دیکھ لیتا۔“ سردار مزاری نے بے نیازی سے ہلکا تقہر لگایا۔ ”لنگر نے چوری کی ہے تو اس کا ثبوت بھی مل جائے گا۔ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔“

”اپنی سمجھ میں تو کچھ آیا نہیں۔ جانے تو نے کیا سوچا ہے۔“

”چوہدری! سچ پوچھ، سوچا تو میں نے بھی کچھ نہیں۔ پر مکدمے کا فیصلہ تو کرنا ہی ہے۔“ سردار مزاری نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ایسے پیچیدہ اور الجھے ہوئے مکدموں کا ہمارے دؤر ہے اور بزرگ بہت ٹھیک طرح فیصلہ کرتے رہے ہیں۔ ہم بلوچوں کا اپنا قانون ہے اور سالہا سال سے رائج ہے۔ ہر بلوچ اسے مانتا ہے، تسلیم کرتا ہے۔ کل صبح میں بلوچوں کے اسی روایتی قانون کی رو سے فیصلہ کروں گا۔“

”کیا فیصلہ کرے گا اور کیسے کرے گا؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے سردار مزاری کو دیکھا۔

وہ زیر لب مسکرایا۔ بے نیازی سے بولا۔ ”تو موجود ہی ہو گا۔ دیکھ لیتا، کتنا ٹھیک اور صحیح فیصلہ ہو گا۔ سارا جھوٹ سچ کھل کر سامنے آجائے گا۔ لنگر نے چوری کی ہوگی تو اسے اپنے جرم کی پوری

پوری سزا ملے گی۔ ورنہ صاف بری ہو جائے گا۔“

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ مگر اس کے ذہن میں کھلبلی مچی تھی۔ چہرے سے بے چینی جھلکتی تھی۔ آنکھوں میں دبا دبا تجسس تھا۔ سردار مزاری نے اس کی ذہنی کیفیت پر توجہ نہ دی، کھانے سے فارغ ہوا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلا گیا۔ رحیم داد بھی کچھ دیر بعد قیلولہ کرنے کی غرض سے بستر پر دراز ہو گیا۔

دن ڈھلے رحیم داد بیدار ہوا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ دیکھا احاطے کے ایک گوشے میں کھنے درختوں تلے دو نوکر ایک بوسیدہ تیرو کمان رگڑ رگڑ کر صاف کر رہے ہیں۔ کمان بانس کی ڈھائی انچ چوڑی اور مضبوط کھجی کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔ اس میں بندھی ہوئی تانت بھی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ نوکر جبلی مل کر کمان کو چکا رہے تھے۔ تانت پر بھی انھوں نے اس طرح جبلی ملی تھی کہ اب اس میں تانہ پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ تیر، خدنگ کی مضبوط لکڑی تراش کر بنایا گیا تھا۔ اس کی تیز نوک لوہے کی تھی۔ مگر اس کی چمک دمک بھی ماند پڑ چکی تھی۔ اسے سروسوں کے تیل میں بھیجی ہوئی ریت سے آہستہ آہستہ رگڑ کر چکایا جا رہا تھا۔ قریب ہی چاکر خان سرگانی کھڑا تھا۔

رحیم داد آہستہ آہستہ چلتا ہوا سرگانی کے قریب پہنچ گیا۔ سرگانی نے اونچی آواز سے اسے سلام کیا۔ رحیم داد نے تیرو کمان کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”چاکر خان یہ کہاں سے لایا؟“

”سینس میں سردار کے حکم پر شاہ میر گیا تھا۔ اسے کوٹ سے لایا ہوں۔“ چاکر خان سرگانی نے رحیم داد کو بتایا۔ ”کل مکدے کا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی ضرورت پڑے گی۔“

”مکدے سے تیر کمان کو کیا لینا؟“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

سرگانی کھل کر مسکرایا۔ ”سینس کل صبح تو خود دیکھ لینا۔“

سردار شہ زور خاں مزاری بھی ٹھٹھا ہوا وہاں آگیا۔ اس نے تیرو کمان کو دیکھا۔ چاکر خان سے پوچھا۔ ”تو اسے لے آیا؟“

”ہا سردار۔“ سرگانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”اب اسے ٹھیک ٹھاک کروا رہا ہوں۔ تو نے اسے پہلے نہیں دیکھا۔ بہت خراب اور ردی حالت تھی اس کی۔“

مزاری نے چاکر خان سرگانی سے مزید بات چیت نہ کی۔ چند لمحے خاموش کھڑا تیرو کمان دیکھتا رہا جسے دونوں نوکر اب زیادہ تندہی سے رگڑ رگڑ کر چکانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سردار مزاری آگے بڑھا اور رحیم داد کے ہم راہ ایک طرف چلا گیا۔

رحیم داد کی الجھن میں اور اضافہ ہو گیا۔ مگر اس نے شہ زور خاں مزاری کے سامنے اپنی الجھن کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے مقدسے کے بارے میں مزید گفتگو ہی نہ کی۔ مگر رات تجسس اور بے چینی کے عالم میں کئی۔



مزاری نے خلاف توقع اپنی قیام گاہ کے بجائے دریا کے ساحل پر پکھری لٹائی۔ پکھری کے لیے ایک اونچے ریتیلے تودے کو منتخب کیا گیا۔ جس پر ایک گھنے درخت کا سایہ تھا۔ باندی پر تودے کی سطح ہموار تھی۔ اسے صاف کر کے عالیچہ بچھایا گیا۔ سردار مزاری اس پر وٹھ مار کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اس کے ہمراہ تھا۔ مگر وہ تودے کے اوپر نہ گیا۔ وہاں صرف سردار شہ زور خاں مزاری تھا۔ وہ اطمینان سے بیٹھا حقہ پر آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔

تودے کے نشیب میں چاکر خان سرگانی ایک طرف ادب سے گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ سردار مزاری کے عین سامنے ہاتھ کر لنگر خاں اپنے دونوں گواہوں کے ساتھ نظریں نیچی کیے سہا ہوا کھڑا تھا۔ گاؤں کے تمام بڑے بوڑھے اور جوان بھی موجود تھے۔ وہ نیم دائرے میں ریتیلی زمین پر بیٹھے تھے۔ ہر شخص گم صم تھا اور سردار مزاری کے دبدبے سے مرعوب نظر آتا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر دریا کے کنارے سندھ بہ رہا تھا۔ پھردن گزر چکا تھا۔ دریا کی تیز اور تند لہریں اٹھ رہی تھیں۔ جھل رہی تھیں۔ دھوپ سے جھللا رہی تھیں۔

شہ زور خاں مزاری نے حقے کی نے ایک طرف کی۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ لنگر خاں کی جانب نظریں اٹھا کر گویا ہوا۔ ”لنگر، تو نے اپنی صفائی میں کچھ اور کتنا ہے۔“ اس کے لمبے میں رعب اور دبدبہ تھا۔

لنگر نے نظریں بلند کیں۔ ہاتھ باندھ کر عاجزی سے بولا۔ ”سینس سردار! مجھے اپنی صفائی میں جو کچھ کتنا تھا پہلے ہی کہہ چکا۔ میں نے اب اور کچھ نہیں کتنا۔“

”تو یہ کتنا چاہتا ہے کہ تو نے ہاتھ جوال کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔ تو نے اپنے بیان میں یہی کتنا تھا؟“

”ہا سینس میں نے یہی کتنا تھا۔ ایک بار فیر کتنا ہوں میں نے ہاتھ کا اونٹھ چوری نہیں کیا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنے کان پکڑے اور انکار میں ہولے ہولے گردن ہلانے لگا۔ ”سینس سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ تو مالک ہے۔ میں تیرا غلام ہوں، باخا ہوں۔ میں تیرے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتا ہوں۔“

”تو نے اگر ہاتھ کا اوٹھ چوری نہیں کیا تو تیرے پاس اس کا کیا ثبوت ہے؟“ سردار شہ زور خاں مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں دریافت کیا۔

”سینس ثبوت تو اسے پیش کرنا چاہیے۔“ اس نے ہاتھ کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”اس کے پاس کیا ثبوت ہے کہ میں نے اس کا اوٹھ چوری کیا؟“

”سینس سردار! توں راضی یا مضی ہووی۔ سکھی، صحت ہووی۔ تیرے بالیں بچیں، ڈیڈھی پردے سب کی خیر ہووی۔“ ہاتھ گڑا کر فریادی ہوا۔ ”سینس میرا اوٹھ لنگری نے چوری کیا ہے۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے اپنا اوٹھ اس کے گھر کے آگے اپنی آنکھوں سے بندھا ہوا دیکھا تھا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

”بکواس نہ کر۔ ثبوت پیش کر۔“ لنگر خاں نے ڈپٹ کر کہا۔

سردار مزاری کو اس کا رویہ سخت ناگوار گزرا۔ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ کڑک کر بولا۔ ”لنگر! اس کے لہجے سے برہمی ٹپک رہی تھی۔“ اس کا اوٹھ بھی چوری ہوا اور یہی ثبوت بھی پیش کرے۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

”اس کا تو کوئی گواہ بھی نہیں۔“ لنگر نے نرم لہجے میں ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”میرے تو دو گواہ موجود ہیں۔“

سردار مزاری نے اس کی دلیل رد کر دی۔ ”تو نے جو گواہ پیش کیے ان کے بیانات سے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ تو نے ہاتھ کا اوٹھ چوری نہیں کیا۔“ مزاری نے اسے تکیھی نظروں سے دیکھا۔ ”تجھے دریا میں غوطہ لگا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت دینا ہو گا۔ یہ بلوچوں کی بہت پرانی ریت ہے۔ یہ ان کا اپنا قانون ہے۔ اس مکدے کا فیصلہ اسی قانون کی رو سے ہو گا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”تجھے بلوچوں کے اس قانون کا پتہ ہے؟“

”ہاں سردار! مجھے پتہ ہے۔ بالکل پتہ ہے۔“ لنگر خاں نے نظریں اٹھا کر سردار مزاری کو دیکھا۔ مگر اس کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر دونوں ہاتھ جوڑے اور گڑ گزبانے لگا۔ ”سینس سردار! میں نے ہاتھ کا اوٹھ چوری نہیں کیا۔ میں تجھ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

”تو سچا ہے تو ڈر تا کیوں ہے؟“ شہ زور خاں مزاری نے ڈپٹ کر کہا۔ ”تیری سچائی کا ابھی امتحان ہو جائے گا۔ سارا جھوٹ سچ سامنے آ جائے گا۔“

”سینس تجھے میرے بیان پر یکنیں نہیں تو میرے گواہوں سے پوچھ لے۔“ لنگر خاں نے عاجزی

سے کہا۔ ”تو ان پر جیسی چاہے جرح کر لے۔“

”بکواس بند کر۔“ سردار مزاری نے اسے جھڑک دیا۔ ”یا تو یہ مان کہ اوٹھ تو نے چوری کیا ہے، ورنہ پکا ثبوت دینے کے لیے تیار ہو جا۔ تو اگر سچا ہے تو ہنستا مسکراتا پانی سے باہر آ جائے گا۔“ اس نے گہری نظروں سے لنگر خاں کو دیکھا۔ ”بول کیا کہتا ہے؟“

”سینس سردار! میں تیار ہوں۔“ لنگر خاں آمادہ ہو گیا۔ ”میں دریا میں غوطہ لگا کر اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کروں گا۔“

”شباش! ہے تو ما جھی پر کھرا بلوچ لگتا ہے۔“ سردار مزاری خوش ہو کر بولا۔

”سینس میرے پرکھے اور دؤیرے ما جھی نہیں تھے۔“ لنگر نے اپنے بلوچ ہونے کے بارے میں مزاری کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”وہ آجڑی ہوتے تھے۔ ان کے پاس شاندار گھوڑے تھے۔ بہت وڈا گلک ہوتا تھا۔“

”یہ بتا، تیرا مددگار کون ہو گا؟“

لنگر نے اپنے ایک گواہ کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”سینس یہ جلاوت میرا مددگار بنے گا۔“ ”ٹھیک ہے۔“ مزاری مرکز چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چاکر! تیرا کون چھوڑے گا؟“

”نوگیر!“ سرگانی نے اونچی آواز سے پکارا۔ ریت پر بیٹھے ہوئے افراد نے نظریں سمجھا پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک نوجوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا قد اونچا تھا۔ چھاتی کشادہ تھی۔ بازو مضبوط تھے۔ سرگانی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سردار شہ زور خاں مزاری کو مطلع کیا۔ ”سینس سردار! میں نے اسے تیرے چھوڑنے کے لیے تیار کیا ہے۔“

مزاری نے نوگیر کو ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”نوگیر! آگے آ جا۔“

نوگیر خاں بندھ کر آگے آگیا اور سردار مزاری کے روبرو نظریں جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ مزاری نے چاکر خاں سرگانی کو حکم دیا۔ ”چاکر! اسے تیرا کمان دے دے۔“ اس نے گردن موڑ کر لنگر خاں کی جانب دیکھا۔ ”لنگر! اب تو دریا میں اتر جا۔ جب میں ہاتھ اٹھاؤں تو ٹھہر جانا۔ نوگیر کے تیر چھوڑتے ہی پانی کے اندر غوطہ بارٹا۔“

لنگر خاں نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے پگڑی اور قمیص اتار کر ایک طرف ریت پر رکھی۔ پیروں سے جوتے اتارے اور کپڑوں کے قریب ہی رکھ دیے۔ اس کے چہرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ وہ دریا کی جانب بڑھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پانی میں اتر گیا۔ وہ ٹھہرا نہیں۔ آگے اور آگے بڑھتا

گیا۔ پانی جب اس کے سینے سے بھی اوپر پہنچ گیا تو مزاری نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ اونچی آواز سے کہا۔
”ٹھیکر جانکر۔“ لنگر خاں رک گیا۔ دریا کی مثلًا طم موجوں کے درمیان اس کا سرا بھرا ہوا تھا۔ بقیہ
جسم پانی کے اندر تھا۔ وہ کنارے سے خامے فاصلے پر تھا اور گردن موڑے سردار شہ زور خاں
مزاری کی سمت ٹنگی باندھے دیکھ رہا تھا۔

سردار مزاری نے نوگیر خاں کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ کمان چاکر خاں سرگانی سے نے کر
کندھے پر لٹکائی۔ تیرا تھ میں سنبھالا اور کھلے میدان میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سانولا چہرہ دھوپ
کی تمازت سے متمتا رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کی نظریں بھی شہ زور مزاری کی جانب انھی
تھیں۔

لنگر خاں کے مددگار جلاوت نے جھٹ اپنی پگڑی اور قمیص اتاری۔ پیروں سے جوتے علیحدہ
کیے۔ شلوار کے پانچے گھٹنوں سے اوپر کیے اور اس کا گھیر نیپے میں اڑس لیا۔ وہ تیز تیز قدموں سے
چلتا ہوا نوگیر کے نزدیک پہنچ گیا۔ اب وہ نہایت مستعد اور چاق چوبند نظر آ رہا تھا۔

نوگیر نے تیر چلے پر چڑھایا۔ سب کی نظریں اس کی جانب انھی تھیں۔ نوگیر گردن کو خم دے کر
چوکنٹا نگاہوں سے سردار مزاری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے اشارے کا منتظر تھا۔ جلاوت
دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بچھنے چوکس کھڑا تھا۔ دریا کی چلتی لہروں کے اوپر لنگر خاں کا سرمہ ناف نظر آ
رہا تھا۔ سورج کی تیز کرنیں اس کے چہرے پر جھللا رہی تھیں۔

اس کی آنکھوں سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں بھر رہا تھا۔ کبھی سردار مزاری کی
جانب دیکھتا کبھی نوگیر کے ہاتھوں میں دبی کمان کو۔

ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ سردار مزاری مسند پر خاموش
بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ تودے کے نشیب میں گاؤں کے بڑے بوڑھے اور
جوان بیٹھے تھے۔ سب دم بخود تھے۔

رحیم داد حیران اور پریشان نظروں سے مزاری کی جانب دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے سردار شہ زور
مزاری نے ہاتھ اٹھا کر نیچے کیا۔ نوگیر خاں کو گنجل ملا۔ اس نے کمان کو پوری قوت سے کھینچا اور
چھوڑ دیا۔ تیر چلے سے نکلا اور تیزی سے فضا میں سنسناتا ہوا چلا۔ لنگر خاں نے اپنی ناک انگلیوں
سے دبائی اور جھٹ ڈبکی لگائی۔ وہ پانی کے اندر چلا گیا۔ جلاوت تیر پر نظریں جمائے سر ہٹ دوڑا۔

تیر درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گیا۔ اس کے تعاقب میں دیوانہ وار بھاگتا ہوا جلاوت بھی
نگاہوں سے او جھل ہو گیا۔ سب کی نظریں اسی سمت انھی تھیں جدھر جلاوت گیا تھا۔ دریا گنگناتا

ہوا بہتا رہا۔ ہوا کے تھپیڑوں سے پانی میں ہلچل پیدا ہوتی۔ بار بار لہریں اٹھتیں اور کناروں سے ٹکرا
کر ٹکھرجاتیں۔

آخر جلاوت درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ تیر اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ وہ
تیزی سے دوڑتا ہوا قریب آیا اور ریتلے تودے پر چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ اس نے تیر مزاری کے
سامنے ڈال دیا۔ لڑکھایا اور مزاری کے قدموں کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی سانس دھونکی کی طرح
چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔

سردار شہ زور خاں مزاری نے تیر مٹھی میں دبا کر ہاتھ بلند کیا۔ اونچی آواز سے کہا۔ ”لنگر اپنا سر
پانی سے باہر نکال۔ جلاوت تیر لے کر آیا۔ تیرا امتحان ختم ہو گیا۔“

مگر لنگر خاں کا سر پانی سے باہر نہ نکلا۔ ہر نگاہ دریا کی جانب انھی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری
تھا۔ سردار مزاری نے زیادہ اونچی آواز سے لنگر کو پکارا۔ اس بار بھی نہ پانی میں ہلچل ہوئی نہ لنگر
خاں کا سر لہروں کے درمیان ابھرا۔ شہ زور خاں مزاری نے تیسری بار لنگر خاں کو پکارا۔ اس کی
آواز زیادہ اونچی اور گرج دار تھی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کوئی نہ بولا، سب خاموش تھے۔ دم بخود
تھے۔ مڑ مڑ کر دریا کی جانب دیکھتے تھے۔ انھیں لنگر خاں کی تلاش تھی۔ مگر اس کا سر پانی سے نہ
ابھرا۔

مزاری کے حکم پر غوطہ خور پانی میں اترے۔ دور دور تک تیرتے ہوئے گئے۔ جگہ جگہ غوطے
لگائے۔ لیکن لنگر خاں کا کوئی سراغ نہ ملا۔

سردار مزاری و۔ ٹھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کے گرد خیری لپٹی ہوئی تھی۔ وہ بالکل
خاموش تھا۔ حقے کی نے ہونٹوں سے لگائے آہستہ آہستہ کش لگا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر گہری
سنجیدگی چھائی تھی۔

دریائے سندھ پر سکون تھا۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سورج چڑھ کر آسمان کے پھونچ پہنچ
گیا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ مگر درختوں کے نیچے ابھی تک ٹھنڈک تھی۔ دریا کی جانب
سے آتے ہوئے بھیکے بھیکے جھونکے خوش گوار اور فرحت بخش تھے۔

ذرا دیر بعد سردار مزاری نے حقے کی نے ہاتھ سے ایک طرف کی۔ کھنکار کر گھگھا صاف کیا۔
حاضرین کو مخاطب کیا۔ ”لنگر، اگر ڈوب کر مر گیا تو اس کی لاش اب تک ابھر کر پانی کے اوپر آجانا
چاہیے تھی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

سامنے نیم دائرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک بوڑھے نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں سیں“

اب تک اس کی لاش پانی پر آ جانا چاہیے تھی۔“

ایک اور آواز ابھری۔ ”سین سردار“ تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔“

مزاری نے اس بار کھل کر اپنے شک کا اظہار کیا۔ ”گستاخ وہ پانی کے اندر ہی اندر تیرتا ہوا کسی طرف نکل گیا۔ وہ ماحچی ہے۔ زبردست تارا اور تیراک ہے۔ وہ بالکل ایسا کر سکتا ہے۔“ اس کے چہرے سے جھنجھلاہٹ جھلکنے لگی۔ ”پر وہ بھاگ کر نہیں جاسکتا۔“ اس نے مڑ کر چاکر خان سرگانی کی جانب دیکھا۔ ”چاکر! بیڑیاں لنگر کو ڈھونڈنے کے لیے روانہ کر۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔“ اس کا لہجہ حکمانہ تھا۔ ”لنگر کو گرفتار کیا جائے اور فوراً پیش کیا جائے۔“

حکم ملتے ہی چاکر خان سرگانی نے ملاحوں کو ہدایات جاری کیں کہ وہ لنگر خاں کو تلاش کریں اور جیسے بھی ممکن ہو پکڑ کر سردار مزاری کے روبرو پیش کریں۔ فوراً پانچ کشتیاں لنگر خاں کی تلاش میں مختلف سمتوں کو روانہ ہو گئیں۔

دیکھتے دیکھتے کشتیاں دریا کی سطح پر دھبوں کی مانند نظر آنے لگیں۔ پھر وہ لہروں پر ڈولتی، ہچکولے کھاتی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔



کشتیوں پر بیٹھے ہوئے ملاح چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ لنگر خاں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ چوڑوں پر تیزی سے چل رہے تھے۔ سانولے جسم دھوپ سے چمک رہے تھے۔ وہ بار بار ہاتھ اٹھا کر پیشانیوں پر آئے ہوئے پسینے کے قطروں کو پونچھتے اور زیادہ مستعدی سے کشتیوں کو آگے اور آگے بڑھاتے۔

نشیب میں، لگ بھگ تین میل آگے جہاں دریا نیم دائرہ بناتا ہوا مغرب کی جانب مڑتا تھا ایک کشتی کے ملاحوں کو دور سے جھاڑیوں سے الجھا ہوا گہرا نیلا منجھلا نظر آیا۔ جھاڑیاں دریا کے کنارے تھیں اور پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ منجھلا شاخوں سے الجھا ہوا تھا اور ہوا کے تھپیڑوں سے پھڑپھڑا رہا تھا۔ ملاحوں نے فوراً کشتی موڑی اور جھاڑیوں کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچ کر انھوں نے دیکھا نیلے منجھلے کے ساتھ ہی ایک گھنی شاخ میں لنگر خاں کی لاش پھنسی ہوئی تھی اور پانی پر ادھر ادھر ڈول رہی تھی۔ لاش بالکل برہنہ تھی۔

ملاح جھٹ کشتی سے پانی میں اترے۔ تیرتے ہوئے لاش کے قریب پہنچے۔ اسے گھنی شاخ سے علیحدہ کیا اور کشتی میں ڈال دیا۔ نیلا منجھلا، جسے پانی میں ڈبکی لگاتے وقت لنگر خاں باندھے ہوئے تھا، اب ملاحوں کے ہاتھ میں دبا تھا۔ انھوں نے منجھلا، لنگر خاں کی برہنہ لاش پر ڈال دیا اور کشتی تیزی

سے کھینچے ہوئے شمشیر والی کی سمت بڑھے۔

کشتی منزل مقصود پر پہنچی۔ کنارے لگائی گئی۔ لنگر خاں کی لاش اتاری گئی۔ اور سردار شہ زور خاں مزاری کے روبرو ریتلی زمین پر رکھ دی گئی۔ منجھلا ہٹا کر اس پر ایک ملگجی سفید چادر ڈال دی گئی۔

سردار مزاری نے لنگر کی لاش غور سے دیکھی مگر خاموش بیٹھا رہا۔ پکڑی ابھی برخواست نہیں ہوئی تھی۔ تودے کے نشیب میں ہاتھ کھڑا تھا۔ ذرا ہٹ کر جلاوت اور لنگر خاں کا دوسرا گواہ غمیسو خاں کھڑا تھا۔ ان کے نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سسے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ان کے چہروں سے خوف اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

رحیم داد، ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ریت پر پچھی ہوئی چٹائی پر گم صم بیٹھا تھا۔ وہ سسے ہوئی نگاہوں سے بار بار لنگر خاں کی لاش دیکھتا جو ریت پر پڑی تھی۔ جس چادر سے لاش ڈھکی تھی وہ ہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے تھر تھرا رہی تھی۔ لنگر خاں کی موت سے رحیم داد خوف زدہ ہو گیا تھا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے دوسوے اور خدشات کلبلا رہے تھے۔

لیکن سردار مزاری کے چہرے پر گھبراہٹ یا پریشانی کے کوئی آثار نہ تھے۔ لاش کے پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد مقدمے کی کارروائی، جو معطل ہو گئی تھی، دوبارہ شروع ہو گئی۔ مزاری نے لنگر خاں کی لاش کی جانب ہاتھ اٹھا کر اپنا فیصلہ سنایا۔ وہ اونچی آواز سے سنبل سنبل کر بول رہا تھا۔

”سب کو پتہ ہے کہ لنگر ماچھی تھا۔ ماچھی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بہت اچھا تیراک بھی تھا۔ سچا اور بے گناہ ہوتا تو میری پہلی ہی پکار پر پانی سے باہر نکل کر ہنستا مسکراتا سب کے سامنے آ جاتا۔ پر وہ جھوٹا اور چور تھا۔ تب ہی ڈوب کر مر گیا۔ اسے مرنا ہی تھا۔ اس نے ہاتھ کا اونٹ چوری کیا تھا۔ اسے چوری کی سزا مل گئی۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ ”سچ پوچھو تو اس کا فیصلہ اوپر والے نے کیا۔“

ایک بوڑھے نے جو وضع قطع سے گاؤں کی مسجد کا ملا نظر آتا تھا، اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اونچی آواز سے کہا۔ ”سین سردار“ تو نے بالکل سچ کہا۔ اصلی فیصلہ تو اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کی نظروں سے کوئی گناہ گار بندہ نہیں بچ سکتا۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملتی ہے۔ لنگر کو بھی اللہ نے چوری کی سزا دی۔“

ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ سب چپ بیٹھے تھے۔ مگر ہاتھ زیادہ دیر خاموش نہ رہا۔ اس نے بالائی دی۔ ”سین سردار“ توں سکھی صحت ہو دی۔ مال جان سب کی خیر ہو دی۔“ اس نے قدرے

اس نے سٹھوں پر لگی ہوئی موٹے موٹے شیشوں کی بوسیدہ عینک درست کی۔ ”کاعدہ کنون تو یہ ہے کہ چور اگر ہنا جرم نہ مانے تو اسے اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے جلتی آگ میں سے گزرتا پڑتا ہے یا پانی میں غوطہ لگاتا ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے لنگر کو کرنا پڑا تھا۔“ بوڑھے نے لنگر خاں کی لاش کی جانب اشارہ کیا۔ ”لنگر نے چوری کی تھی۔ اسے اپنے جرم کی سزا مل گئی۔ اس کے دونوں گواہ جھوٹے تھے۔“ اس نے نظر بھر کر جلاوت اور خمیسو کو دیکھا۔ ”جھوٹے گواہوں کی سزا یہ ہوتی ہے کہ ان کی زبانیں کاٹ دی جاتی ہیں تاکہ آگے جھوٹی گواہی نہ دیں۔ اور انھیں دیکھ کر دوسرے توبہ کریں۔ عبرت پکڑیں۔“

اس نے بات ختم ہی کی تھی کہ ایک اور بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ”سین سردار، میری عمر اسی تودین دار سے کم ہے۔“ اس نے بوڑھے کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”پر میں نے بھی ایسے مکدے بہت دیکھے ہیں۔ مجھے پتہ ہے جھوٹی گواہی دینے کی یہ سزا موت ہوئی بند کر دی گئی۔“

”ایسا نہ کہہ۔ مجھے بھی پتہ ہے یہ سزا بند نہیں کی گئی۔“ بوڑھے دین دار نے وضاحت کی۔ ”ہاں! اتنا ضرور ہے کہ اب ایسی سزا نہیں دی جاتی۔ پر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اب چور کے لیے جلتی آگ میں سے گزرتا ہو کر یا گھرے پانی میں غوطہ لگا کر اپنی تین بے گناہ ثابت کرنے کا پہلا جیسا چلن بھی نہیں رہا۔“ اس نے گردن اونچی کی اور شہ زور مزاری کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ بلوچوں کا پرانا کنون ختم ہو گیا۔ بلوچستان میں اب تک یہی کنون چلتا ہے۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”یہ تو سردار کی مرضی ہے جیسے چاہے مکدے کا فیصلہ کرے۔“ اس کا لہجہ اونچا ہو گیا۔ ”سردار نے بالکل صحیح فیصلہ دیا۔ اور بلوچوں کے کنون کی رو سے ٹھیک ٹھیک دیا۔“

حاضرین پر سکوت طاری ہو گیا۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

جلاوت اور خمیسو گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ اور سر جھکا کر گزر گزرتے گئے۔ ”سین، تو سن سدا جیویں۔ تیرے بالیں بچیں جیویں۔ تو سکھی صحت ہووی۔ سین سردار ہم سے بھل ہو گئی۔ ہماری غلطی معاف کر دے۔ سین، آگے ایسی بھل نہیں ہوگی، کبھی نہیں ہوگی۔“ وہ جھک کر ناک اور پیشانی رتیلی زمین پر رگڑنے لگے۔

”سردار پر کرو۔“ سردار مزاری نے دونوں کو ڈانٹا۔ انھوں نے اپنے سر اٹھائے اور عاجزی سے ”ارائی کی جانب دیکھنے لگے۔ مزاری نے پوچھا۔ ”بتاؤ، چوری کا اوٹھ کہاں ہے؟“

توقف کیا۔ ”سین، لنگر کو تو چوری کی سزا مل گئی۔ پر میرا کیا بنے گا؟“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گزر گزرتے لگا۔ ”سین، میں مصیبت دامار یا غریب جتوال ہوں۔ میں تباہ ہو گیا۔ مجھے میرا اوٹھ دلایا۔“ توں سدا جیویں، رب راضی ہووی۔“

”ججے، تیرا اوٹھ ملے گا، ضرور ملے گا۔ پر تو چپ کر کے کھڑا رہ۔“ سردار مزاری نے اسے تسلی دی۔ گردن کو ہلکا سا خم دیا۔ جلاوت اور خمیسو خاں کی جانب متوجہ ہوا۔ انھیں قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ تند اور تھکے لہجے میں بولا۔ ”لنگر نے چوری کی تھی، اسے اپنے جرم کی سزا مل گئی۔ تم دونوں نے جھوٹی گواہی دی تھی، تم کو کیا سزا ملنی چاہیے؟“

جلاوت اور خمیسو نظریں نیچی کیے دم بخود کھڑے رہے۔ انھوں نے کچھ نہ کہا۔ ان کے چہروں پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

سردار شہ زور خاں مزاری نے سامنے بیٹھے ہوئے گاؤں کے بڑے بوڑھوں پر نظر ڈالی۔ ان میں جو سب سے زیادہ معمر بلوچ نظر آتا تھا اسے مخاطب کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”بابے، تو عمر میں سب سے وڈا نظر آتا ہے۔ تو نے تو ایسے بہت مکدے دیکھے ہوں گے۔ تو بتا جھوٹی گواہی دینے کی کیا سزا ہونی چاہیے؟ تو بلوچوں کی ریتاں رساں ٹھیک طرح جانتا ہے۔ ان کے کانوں کو بھی سمجھتا ہے۔ میں تیری رائے اور تیری صلاح معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

بوڑھا لاٹھی کے سارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال روٹی کے گالوں کی مانند سفید تھے۔ کمر بھی جھکی ہوئی تھی۔ دانت گر گئے تھے۔ وہ پو پلے منہ سے لڑکھاتی آواز میں گویا ہوا۔ ”سردار! تو نے ٹھیک سوچا۔ میری عمر اسی بہت ہے۔ تو نے اپنے باپ سے سنا ہو گا۔ جب لاٹ سنڈ من نے کلات پر چڑھائی کی تو مزاریوں کا سردار امام بخش بھی اپنا لشکر لے کر اس کے ساتھ گیا تھا۔ اس کے لشکر میں میرا بچہ بھی تھا۔ تب میں جوان تو نہیں تھا پر اتنا وڈا ضرور تھا کہ اس کی بھیڑ و کریوں کے گھلے کی پوری طرح دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اس کا بہت وڈا رنگ ہوتا تھا۔ پنجاہ سے اوپر وکریاں رہی ہوں گی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”پر میرا بچہ لڑائی سے نہ لوٹا۔ میں نے اسے فیر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بہت بہادر اور زور آور تھا۔“

سردار مزاری نے اکتا کر بوڑھے کو ٹوکا۔ ”بابے، میں نے تیرے بیٹے کے بارے میں نہیں پوچھا۔ تو میرے سوال کا جواب دے۔“

بوڑھا بلوچ، جو بات کہتے کہتے پٹری سے اتر گیا تھا، فوراً سنبھلا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا اور بول گیا ہوا۔ ”سین سردار، میں نے ان بوڑھی آنکھوں سے نہ جانے کتنے ایسے مکدے دیکھے ہیں۔“

شراب کے گھونٹ آہستہ آہستہ بھرتے رہے۔
قدموں کی آہٹ سن کر انھوں نے مڑ کر دیکھا۔ چاکر خان سرگانی اندھیرے سے نکل کر ان کی جانب بڑھا۔ اس کے ہم راہ دو عورتیں بھی تھیں۔ انھوں نے بوچھن کے آئیل سے ہل مار کر اپنے چروں کو اس طرح چھپا رکھا تھا کہ صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آتی تھیں۔ وہ نگاہیں نیچی کیے سہی ہوئی کھڑی تھیں۔

سردار مزاری نے دونوں کو خمار آلود نظروں سے دیکھا۔ اس کے بشرے سے استجاب ہو رہا تھا۔ چاکر خان سرگانی پر اتنا مزاج شناس تھا۔ فوراً اس کے چہرے کے تاثرات بھانپ گیا۔ آگے بڑھ کر بولا۔ ”سین سرور! یہ جلاوت اور خمیسو کی رن ہیں۔ ان کے بچے بھی حراست میں لے لیے گئے ہیں۔“ اس نے نوکروں کی کونٹریوں کی سمت ہاتھ اٹھا کر بتایا۔ ”ادھر ایک کونٹری میں بند ہیں۔“ مزاری کا چہرہ دکنے لگا۔ ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھری۔ جھوم کر بولا۔ ”انہیں نہلا دھلا۔ ابلے کپڑے پہنا۔ روٹی کھلا اور کمرہ میں پینا دے۔“

چاکر خان کورنش بجالانے کے انداز میں ذرا سا جھکا۔ اور خاموشی سے واپس چلا گیا۔ دونوں عورتیں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلیں۔ والان کے ستون سے لٹکی ہوئی لائین کی روشنی میں وہ سکڑی سکڑائی آگے بڑھ رہی تھیں۔ مزاری نظرس اٹھائے دونوں کو تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ان کے جسموں کے پیچ و خم کا جائزہ لیتا رہا۔

جلاوت اور خمیسو کی بیویاں چاکر خان سرگانی کے ساتھ اندھیرے میں او جھل ہو گئیں۔ سردار مزاری نے گلاس اٹھا کر لمبا گھونٹ بھرا۔ وہ خاموش تھا۔ رحیم داد بھی خاموش تھا۔ احاطے میں خاموشی چھائی تھی۔

مگر گاؤں کے کسی گھر میں شادی کا ہنگامہ تھا۔ ڈھول کی تھاپ پر نوجوان عورتیں اور لڑکیاں آواز سے آواز ملا کر گارہی تھیں۔ انھوں نے ایک شوخ سرائیکی گیت چھیڑا۔ یہ پہا کہ تھا۔ رات کے نائے میں ان کی آوازیں دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ وہ لہک لہک کر پہا کے کے بول الاپ رہی تھیں۔

سوہنی چلی اے بزار
مارے اکھ اٹھاوے یار
تیدے جو بن تے ہمار!
تیز امن کرے دھک دھک

خمیسو خاموش رہا۔ جلاوت بولا۔ ”سردار! ہم نے اوٹھ نہیں دیکھا۔ سین کسم لے لے۔ ہم نے ہاتو کا اوٹھ بالکل نہیں دیکھا۔ سین معافی دے دے۔ ہم سے بھل ہو گئی۔“
”ایسے کام نہیں چلے گا۔“ مزاری نے گرج کر اونچی آواز سے کہا۔ ”تم دونوں کی سزا صرف اسی صورت میں معاف ہو سکتی ہے کہ اوٹھ کا فوراً کھوج لگاؤ اور اسے پیش کرو۔“
دونوں نے ایک زبان ہو کر التجائی۔ ”سردار! ہم اوٹھ کہاں سے ڈھونڈ کر لائیں۔ ہمیں کچھ پتہ نہیں، اوٹھ کیسا ہے؟ کہاں ہے؟ اور کس کے پاس ہے؟“
”جب تم کو کچھ پتہ نہیں تو گواہی دینے کیوں آگئے؟“
”بھل ہو گئی۔ سین معافی دے دے۔ توں سدا جیویں۔“

سردار شہ زور خاں مزاری نے حقے کی سنبھالی۔ منہ سے لگائی۔ چپ چاپ بیٹھا حقے پر کش لگاتا رہا۔ سامنے بیٹھا ہوا ہر شخص دم بخود تھا۔ خاموش تھا۔ پھر اس خاموشی میں مزاری کی بھاری بھر کم آواز ابھری۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”جلاوت اور خمیسو نے جھوٹی گواہی دی ہے۔ دونوں نے اپنے جرم کو مان بھی لیا ہے۔“ سردار کے چہرے سے جلال ٹپک رہا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ سن رہا تھا۔
”جلاوت اور خمیسو پر چار سو روپے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے جسے چاکر خاں کے پاس جمع کرانا ہو گا۔ ہاتو جتوال کا اوٹھ چوری ہوا ہے، اسے اوٹھ ملنا چاہیے۔ جلاوت اور خمیسو اسے اوٹھ واپس کریں گے۔ دونوں کو پندرہ روز کی مہلت دی جاتی ہے۔ تب تک ضمانت کے طور پر دونوں کے بال بچے کید میں رکھے جائیں گے۔ اگر انھوں نے اس مدت میں ہاتو کا اوٹھ اور جرمانہ پیش نہیں کیا تو دونوں کے ہل تیل اور گھریار ضبط کر لیا جائے گا۔ انھیں زمین سے بے دخل کر دیا جائے گا۔ فیصلے پر فوراً عمل درآمد کیا جائے۔ چاکر خان کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جلاوت اور خمیسو کے بال بچوں کو گرفتار کر لے۔ پکری اب برخاست کی جاتی ہے۔“

چاکر خان سرگانی آگے بڑھا۔ تودے کے اوپر پہنچا۔ اس نے شہ زور مزاری کی ٹانگوں اور کمرے گرد لپٹی ہوئی خیری کی گرہ کھول دی۔ مزاری نے ٹانگیں پھیلا کر سیدھی کیں۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ تودے سے نیچے اترا اور رحیم داد کے ہم راہ بستی کی جانب روانہ ہو گیا۔



شام کا اندھیرا دھیرے دھیرے بلندی سے نیچے اترنے لگا۔ سردار مزاری اور رحیم داد احاطے کے ایک گوشے میں کھلے آسمان تلے موڑھوں پر بیٹھے شراب نوشی کر رہے تھے۔ شراب بول کی چھال سے کشید کی گئی تھی۔ بہت تلخ تھی۔ تند اور تیز بھی تھی۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ دونوں دکان

منشیارڈیوی ہار!

توں چل تان بزار

رات گزرتی گئی۔ کاجل کی طرح کالی ہوتی گئی۔ سردار شہ زور مزاری نے گلاس ختم کیا۔ اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے برآمدے کی جانب بڑھے۔ میڈھیاں ملے کیں۔ اوپر پہنچے۔ برآمدے میں کچھ دور چلنے کے بعد اپنے اپنے کمروں کی سمت بڑھے۔

کمرے میں لیپ روشن تھا۔ اس کی ہلکی ہلکی روشنی میں سامنے پٹنگ پر ایک نوجوان عورت پیر لٹکائے گم صم بیٹھی تھی۔ وہ سرخ گوٹ کا ٹکڑا پہنے ہوئے تھی۔ چولا زرد رنگ کا تھا۔ اس کے گریبان پر سیاہ دھاگے سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ سر کے بال سیاہ اور چمک دار تھے۔ چہرہ تیز دھوپ میں کام کاج کرنے سے تپ کر تانبے کی مانند سرخ پڑ گیا تھا۔ اس کی عمر پچیس سال سے زائد نہ تھی۔ مگر سخت مشقت اور غذائیت کی کمی کے باعث وہ اپنی عمر سے زیادہ لگتی تھی۔

رحیم داد کمرے میں داخل ہو کر آگے بڑھا اور اس کے قریب پٹنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ کسمائی اور اپنا بدن سیکڑ لیا۔ رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔

”تو جلادت کی گھر والی ہے یا غمیسو کی؟“

”میں غمیسو کی ڈال ہوں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”ترا نام کیا ہے؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ وہ بے رخی سے بولی۔

”اُٹا نکھرا نہ دکھا۔ آرام نال گل بات کر۔“ رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی۔ ”مسکرا کر بول۔ یوں روشنی روٹھی تو چنگی نہیں لگتی۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ آنکھیں بھیجی بھیجی تھیں۔ رحیم داد خاموشی سے اکتا کر بولا۔ ”چپ کر کے کیوں بیٹھی ہے۔ گل بات کر۔“ اس نے نشے میں جھوم کر ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”جتنے پتہ نہیں۔ میں چاہوں تو غمیسو کو معافی دلا سکتا ہوں۔“

غمیسو کی بیوی نے چونک کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تو ایسا کر سکتا ہے؟“ اس کے انداز میں حیرت اور استعجاب تھا۔

”ہاں“ میں ایسا کر سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے گردن اٹھا کر اونچی کی۔ ”تو فکر نہ کر۔ غمیسو کو معافی مل جائے گی۔“

پہا کے کا آخری بول انھوں نے موقع کی مناسبت سے بگاڑ دیا تھا۔ اور ڈھولک کی تیز تھاپ پر اسے بار بار دہرا رہی تھیں۔ بول کے ساتھ ساتھ قہقہے بھی بلند ہو رہے تھے۔

رحیم داد نے اپنا گلاس اٹھایا۔ ہونٹوں سے لگایا۔ بڑا سا گھونٹ بھرا۔ اس کی نگاہیں اس سمت اٹھی تھیں جدھر سرگانی کے ہمراہ جلاوت اور غمیسو کی نوجوان بیویاں گئیں تھیں۔

”کیا دیکھ رہا ہے چوہدری؟“ مزاری نے ایک آنکھ دبا کر شوخی سے کہا۔ ”ادھر بھی زمین الاٹ کرا لے۔ ابھی بہت متروکہ اراضی پڑی ہے۔ زمین داری کا مزا آجائے گا۔ عیش کرے گا عیش۔“

”تو کہتا ہے تو الاٹ کرا لوں گا۔“ رحیم داد نے انکار نہیں کیا۔ قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”مجھے

ایک بات بتا۔“

”پوچھ کیا پوچھنا چاہتا ہے؟“

رحیم داد کے ذہن میں لنگر خاں کی موت کے بارے میں جو دوسوے اور خدشات گلبلا رہے تھے زبان پر آ گئے۔ اس نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”لنگر دیا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس نے خیرے ہی حکم پر پانی میں غوطہ لگایا تھا۔ اس کے اس طرح مرنے پر تیری خلاف کتل کا کیس بن سکتا ہے۔“

”چوہدری تو کس چکر میں پڑ گیا۔“ شہ زور خان مزاری نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ ”پہا کہ سن۔ بہت پھڑک دار ہے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر آنکھوں کے سامنے کیا۔ لہجہ بھر تک اسے تکتا رہا، پھر ہاتھ بڑھا کر رحیم داد کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا۔ نشے سے لہرا کر بولا۔ ”سین چوہدری ابھی تو رات شروع ہوئی ہے۔“

رحیم داد کو سردار مزاری کی بے نیازی پر سخت تعجب ہوا۔ لیکن اس کا اظہار نہ کر سکا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ رات کے سنائے میں ڈھولک ٹھنکتی رہی۔ پہا کے کے بول گونجتے رہے۔

تیدیا رارے سار

تیدیا رارے منشیار

کچھ دیر بعد ڈھولک کی ٹک ٹک رک گئی۔ قہقہوں کا ایک طوفان اٹھا۔ جل ترنگ کی مانند دے تک فضا میں کھینکتا رہا۔ قہقہے تھے تو ایک بار پھر ڈھولک پر تھاپ پڑی۔ تیز اور تیز ہوتی گئی۔ نوجوان ساغون اور چنچل دو شیزاؤں کی دوسری ٹولی نے پہا کے کے جوابی بول چھیڑے۔ وہ جھوم جھوم کر اونچی آواز سے گانے لگیں۔

سارڈیوی جھانجھراں

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس دفعہ اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ بے زاری اور جھنجھلاہٹ کم ہو گئی تھی۔ ”سردار اپنا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ وہ کبھی اپنا فیصلہ نہیں بدلتا۔“

”یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔“ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اس نے احتجاج نہ کیا۔ چپ بیٹھی رہی۔ ”سردار میرا یار ہے۔ میرے کہنے پر وہ اپنا فیصلہ بدل سکتا ہے۔ تو کل ہی دیکھ لیتا۔“

”سیں‘ توجھ کہہ رہا ہے۔“ اس کا مڑھایا ہوا چہرہ دبی دبی مسرت سے دکنے لگا۔ ”سیں توں سکھی صحت ہووی۔ رب راضی ہووی۔“ اس کے لہجے سے خوشامد صاف عیاں تھیں۔ ”نمیسو کو معافی مل گئی تو میں اپنے گھر چلی جاؤں گی ناں؟“

”بالکل چلی جائے گی۔“ رحیم داد کھسک کر اور تڑپ ہو گیا۔ عین اس وقت سنان رات میں کسی بچے کے بلک بلک کر رونے کی آواز ابھری۔ نمیسو کی بیوی تڑپ کر اٹھی اور دروازے کی جانب بڑھی۔ رحیم داد نے جھٹ اس کا ہاتھ تھام لیا۔ آگے نہ بڑھنے دیا۔ ”تو کدھر چلی؟“

”سیں‘ میرا نکا رو رہا ہے۔“ وہ بے قرار ہو کر بولی۔ ”میں نے اسے دودھ پلاتا ہے۔ وہ بھوکا ہے۔“

”بیٹھ جا۔“ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”تو ابھی نہیں جاسکتی۔“

نمیسو کی بیوی نے بے بسی سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ مگر رحیم داد اس کی بے قراری کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا۔ ”چلی جانا۔ چلی جانا۔ پر ابھی نہیں۔“ وہ نشے کی جھونک میں کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

بچہ بھوک سے ہلکتا رہا۔ اپنی ماں کے لیے روتا رہا۔ اس کے رونے کی آواز رک رک کر سنانے میں ابھرتی رہی۔



رحیم داد ناشتا کرنے پہنچا تو شہ زور مزاری موجود نہ تھا۔ ملازم نے خلاف توقع مزاری کے بچے بغیر ہی ناشتا لگا دیا۔ رحیم داد نے ملازم سے پوچھا۔ ”نو شیر! آج سردار کدھر ہے۔ وہ ناشتا نہیں کرے گا؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”سیں‘ وہ تو سویرے سویرے چلا گیا۔“ نو شیر نے جواب دیا۔

”کہاں گیا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”یہ تو مجھے پتہ نہیں۔“ نو شیر نے بتایا۔ ”اتنا ضرور ملوم ہے‘ سویرے سویرے بہت تڑکے

تھانیدار آیا تھا۔ سردار اسی کے ساتھ چلا گیا۔“

”تھانیدار کے ساتھ گیا ہے؟“ رحیم داد نے گھبرا کر کہا۔

”ہاں۔“ نو شیر نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ نو شیر چلا گیا۔ رحیم داد پریشان ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر خدشات ابھرنے لگے۔ سوچا کیسے ایسا تو نہیں کہ تھانیدار لنگر خان کی موت کے سلسلے میں پوچھ گچھ کے لیے شہ زور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے پہلے ہی دھڑکا تھا۔ شہ زور مزاری کے اس طرح تھانیدار کے ہم راہ جانے پر اور سوا ہو گیا۔

وہ تمام دن پریشان رہا۔ مزاری شام کو بھی نہ لوٹا۔ چاکر خان سرگانی بھی نہ آئے۔ نو شیر کو سرگانی کے بارے میں بھی کوئی علم نہ تھا۔ دور دراز گزر گئے۔ سردار مزاری واپس نہ آیا۔

رحیم داد دوپہر کے کا کھانا کھا کر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ باہر لوکے جھکڑ چل رہے تھے۔ کھڑکی بھی بند تھی۔ کمرے میں ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ یکایک دروازہ کھلا۔ جلالت اندر داخل ہوا۔ وہ چادر سے اپنا چہرہ چھپائے ہوئے تھا۔ اس نے فوراً دروازہ بند کیا۔ چہرے سے لپٹی ہوئی چادر ہٹائی اور رحیم داد کی جانب بڑھا۔

رحیم داد گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر جلالت کو دیکھنے لگا۔ وہ تیزی سے لپکا اور رحیم داد کے پیر پکڑ کر گزرا۔

”سیں‘ توں سدا جیوی۔ سکھی صحت ہووی۔“

رحیم داد کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ اس نے اپنے پیروں کو جلالت کی گرفت سے چھڑایا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”سیدھا کھڑا ہو کر گل بات کر۔ یہ بتا تو ادھر کیسے آیا؟“

جلالت نے کچھ نہ کہا۔ رحیم داد کے پیروں پر سے ہاتھ ہٹائے اور سر جھکا کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے خیکھی نظروں سے دیکھا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ اس کا لہجہ تھکسانہ تھا۔

”سیں‘ میں تیرے پاس اس لیے آیا ہوں کہ توں مجھے سردار سے معافی دلوا دے۔“ اس نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”سیں‘ وہ تیرا کما ضرور مان لے گا۔“

”یہ بات تجھ سے نمیسو کی گھر والی نے کہی ہے؟“

”نا سیں‘ ایسی کوئی گالہ نہیں۔“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”سیں‘ نمیسو کی ذال تو کید مل ہے۔ میں اسے کیسے مل سکتا ہوں؟“ اس نے ہتھی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”سیں‘ مجھے

پتہ ہے، تو مجھے معافی دلوا سکتا ہے۔“

رحیم داد سر جھکا کر سوچنے لگا۔ جلاوت منت سماجت کرتا رہا۔ ”سین، رب راضی ہووی۔ توں سکھی صحت ہووی۔ مجھے معافی دلوا دے۔“ وہ ایک بار پھر رحیم داد کے پیر پکڑنے لگے۔ جھکا۔ رحیم داد نے جھٹ اپنے پیر سمیٹ لیے۔ معاملے کی نزاکت اور پیچیدگی پر روشنی ڈالتے ہوئے بولا۔

”میں سردار سے تیری معافی کے لیے سفارش تو کر سکتا ہوں پر سوال یہ ہے کہ ہاتھ کے اونٹ کا کیا بنے گا۔ اس کا تو اونٹ چوری ہوا ہے۔ وہ اپنا اونٹ چاہتا ہے۔ جب تک اسے اونٹ نہیں ملے گا۔ وہ دہائی دیتا رہے گا۔ تو خود سوچ، وہ جتوال ہے۔ اونٹ کے بغیر وہ کیا کرے گا۔ کیسے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرے گا۔“

”سین، میں اس کا اوٹھ کدھر سے لاؤں۔ مجھے تو اس کا کچھ پتہ نہیں۔“ جلاوت نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”اوٹھ خرید بھی نہیں سکتا۔ غریب راہک ہوں۔ زمین جوتے کے لیے میرے پاس صرف ایک جوڑی ہے۔ اسے بھی بیچ دوں۔ موٹی بھی بیچ دوں، تب بھی اوٹھ نہیں خرید سکتا۔“ اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”سین، یہ بھی تو سوچ۔ جوڑی بیچ دوں تو کروں گا کیا۔ میرے بال بچے بھوکے مرجائیں گے۔ میں ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ سین، میں بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ تو مجھے تباہ ہونے سے بچالے۔“

”تو اکیلا تو نہیں ہے۔“ رحیم داد نے اسے یاد دلایا۔ ”غیسو بھی تو ہے۔ دونوں مل کر اونٹ خرید سکتے ہیں۔ جرمانہ ادا کر سکتے ہیں۔ سردار نے اپنے فیصلے میں بھی یہی حکم دیا ہے۔“

”سین، تجھے پتہ نہیں۔ غیسو کے پاس نہ زمین ہے نہ جوڑی۔ وہ تو آجری ہے۔ گلہ بانی کرتا ہے۔ تھوڑے سے موٹی رکھتا ہے۔ انھی سے کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتا ہے۔“ جلاوت کے لہجے میں غیسو کے لیے جذبہ ہمدردی تھا۔ ”سین، وہ تو تجھ سے بھی زیادہ غریب مسکین ہے۔“

”تب تو اکیلے تجھے ہی اوٹھ دینا ہو گا۔ جرمانہ بھی پورا تجھے ہی ادا کرنا ہو گا۔“

”نا سین، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ جلاوت نے جھٹ وضاحت کی۔ ”میں اپنا ہی تاوان ادا نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے روپیہ کہاں سے لاؤں گا۔“

”مان لے غیسو روپے اکٹھا نہ کر سکا، تب کیا ہو گا؟“ رحیم داد نے غیسو کے بارے میں پریشان ہو کر پوچھا۔

”پندرہاں روز گزرنے کے بعد وہ تاوان کا بندوبست نہ کر سکا تو سردار اس کے مال موٹی سب

ضبط کر لے گا۔“ جلاوت نے مطلع کیا۔

”غیسو کی گھروالی اور بچوں کا کیا بنے گا؟“

”وہ کید میں رہیں گے۔“ جلاوت نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب تک وہ کید میں رہیں گے، ان کی روٹی کا خرچہ غیسو کو دینا پڑے گا۔ جب ان کی روٹی کا خرچہ نہیں پہنچے گا تو سردار ان کو شاہ میر بھیج دے گا۔ غیسو کی رن حویلی میں دیگا پر لگا دی جائے گا۔ وہ اکیلی ڈال نہیں، حویلی میں ایسی اور بھی کئی ہیں۔“

”کب تک وہ حویلی میں دیگا پر رہے گی؟“ رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو سردار کی مرضی پر ہے۔“ جلاوت نے رحیم داد کو بتایا۔ ”اگر غیسو نے ادھار لے کر تاوان ادا کر دیا تب تو وہ اپنی رن اور بچوں کو لے جائے گا۔ ایسا نہ کر سکا تو سردار جب تک چاہے گا اس کے بال بچوں کو دیگا پر لگائے رکھے گا۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ سردار ہے۔“ وہ ایک بار پھر گزر گزرنے لگا۔ ”سین تو سردار سے کہے گا تو وہ معافی دے دے گا۔“

”پر ہاتھ کے اوٹھ کا کیا بنے گا؟ اسے تو اپنا اوٹھ چاہیے۔“ رحیم داد نے اسے مسئلے کی نزاکت کا احساس دلایا۔ ”سردار تو اسے اوٹھ خرید کر دینے سے رہا۔“

”ایسا تو وہ ہر گز نہیں کرے گا۔“ جلاوت پریشان ہو کر بولا۔

”جب ایسا ہے تو وہ تجھے کیسے معافی دے سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔ ”میرا کتنا مان جا کر کسی نہ کسی طرح روپے کا بندوبست کر۔ اس کے بغیر کام نہیں بنے گا۔“

”سین، میں نے بہت کوشش کی۔“ جلاوت نے عاجزی سے کہا۔ ”ادھار بھی لینے کی کوشش کی، پر کام نہیں بنا۔ میں غریب راہک ہوں۔ تاوان ادا کرنے کیسے ادا کر سکتا ہوں۔“

”جب تو روپے کا بندوبست نہیں کر سکتا تو میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے بے رخی سے کہا۔ ”میں زیادہ سے زیادہ یہ کرا سکتا ہوں کہ جرمانے کی رقم معاف کروادوں۔ پر ہاتھ کے اوٹھ کا کیا بنے گا۔ اسے تو اوٹھ چاہیے۔ وہ بھی غریب جتوال ہے۔ اسے اٹھ نہ ملا تو اس کے بال بچے بھوکے مرجائیں گے۔“

جلاوت سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔ چند لمحے بعد جلاوت نے نظریں بلند کیں۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر قدرے اطمینان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی چمک تھی۔

رحیم داد نے اس سے نظریں نہ ملائیں۔ بدستور خاموش بیٹھا رہا۔

موضوع پر آگیا۔ ”مجھے صاف صاف بتا۔“
 ”سین‘ سچ پوچھ تو مجھے اوٹھ کی چوری کا کچھ پتہ نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ گھٹیا کر
 بولا۔ ”میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“

”جب تجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا تو گواہی دینے کیوں چلا آیا؟“

”سین‘ گالہ اصلی یہ ہے کہ لنگر میرا پرانا یا تھا۔“ جلاوت نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ ”اس
 نے منت سماجت کی تو میں گواہی کے لیے تیار ہو گیا۔ ویسے سچی گالہ پوچھ تو وہ یہ ہے کہ میں نے لنگر
 کے پاس ہاتھ کا اوٹھ نہیں دیکھا۔ یہ بات میں کسم کھا کر کہہ سکتا ہوں۔“

رحیم داد بے زاری سے بولا۔ ”اب توجا۔ مجھے سونا ہے۔“

جلاوت نے ایک بار پھر گڑ گڑا کر کہا۔ ”سین‘ تو سردار سے مجھے معافی دلادے گا ناں؟“

”سردار کو واپس آنے دے۔ میں تیرے بارے میں اس سے ضرور گل بات کروں گا۔“ اس
 نے جلاوت کو اطمینان دلایا۔

جلاوت نے بڑھ کر اس کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ مڑا اور خاموشی سے باہر چلا گیا۔



دن ڈھلے سردار شہ زور مزاری اچانک رحیم داد کے کمرے میں آگیا۔ وہ اس وقت بے خبر سو رہا
 تھا۔ شہ زور مزاری نے اسے جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر مزاری کو دیکھا، گھبرا
 کر اٹھ بیٹھا۔

سردار مزاری قریب پڑے ہوئے موٹر سے پر ہنستے ہوئے بولا۔ ”تو مجھے دیکھ کر اتنا گھبرایا گھبرایا
 کیوں نظر آ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟“

”تو حقانیدار کے ساتھ گیا تھا نا؟“ رحیم داد ابھی تک حیران و پریشان تھا۔ ”کوئی گڑ بڑ کی گل تو
 نہیں؟“

”ایسی تو کوئی گالہ نہیں۔“ مزاری بھی حیرت زدہ ہو گیا۔ ”پر تو یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟“
 ”لنگر کی موت کے بارے میں تو پولیس پوچھ تاچھ نہیں کر رہی؟“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا
 کھل کر اظہار کیا۔ ”میں سمجھا پولیس تجھے تفتیش کے سلسلے میں لے گئی تھی۔“

”پولیس کیوں تفتیش کرنے لگی۔ تو خاما خا ایسی باتیں کیوں سوچتا ہے۔“ شہ زور مزاری کے لہجے
 میں اس بار تلخی تھی۔ ”میں اپنی زمین داری میں بسنے والے بلوچوں کا سردار ہوں۔ مجھے پکری
 لگانے اور مکہ موم کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ ان معاملات میں نہ حکومت مداخلت کرتی

”لنگر کی بیڑی سچ کر ہاتھ کے لیے اوٹھ خرید جا سکتا ہے۔“ جلاوت نے تجویز پیش کی۔ ”سردار
 چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ سین‘ ویسے بھی لنگر کی بیڑی اب کون چلائے گا۔ رن اس کی بیمار ہے۔ کچھ
 نہیں کر سکتی۔ بچے بھی بہت چھوٹے ہیں۔ وہ بیڑی دریا میں نہیں چلا سکتے۔ وہ تو پتھر بھی نہیں اٹھا
 سکتے۔“

رحیم داد کو اس کی خود غرضی پر کسی قدر تعجب ہوا۔ مگر نظر انداز کر گیا۔ کہنے لگا۔ ”ایسا ہو تو سکتا
 ہے۔ لیکن مجھے یہ بتا کیا یہ سچ ہے کہ ہاتھ کا اوٹھ لنگر ہی نے چوری کیا تھا؟“

”سین‘ کسم لے لے۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ جلاوت نے اپنی صفائی پیش
 کی۔ ”پر اتنا ضرور ہے۔ جب لنگر پانی میں ڈوب کر مر گیا تو یہ ثابت ہو گیا کہ اوٹھ اسی نے چوری کیا
 تھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتھ ٹھیک ہی کتا ہے۔ لنگر نے جھوٹ بولا تھا۔“

”لنگر نے چوری کی ہو تو حیرانگی کی گالہ نہیں۔“ جلاوت نے دبی زبان سے کہا۔ ”وہ ماجھی تھا۔“

اور ماجھی تو چوری چکاری کے لیے بدنام ہی ہیں۔“

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”تو اس کا یا تھا۔ تو بھی ماجھی رہا ہو گا۔“

”نا سین‘ میں تو راکب ہوں۔ تجھے بتا بھی چکا ہوں۔“ جلاوت نے صفائی پیش کی۔ ”میں تو
 مزاری بلوچ ہوں۔ پر اس سے کیا ہوتا ہے۔ سین‘ تجھ سے کیا چھپانا، مزاریوں کے بارے میں
 مشہور ہے کہ ان کے پرکے اور وڈیرے بھی چوری ڈکیتی کرتے تھے۔ جب وہ بچوں کے پہاڑوں میں
 رہتے تھے تو نیچے اتر کر موٹی اٹھالے جاتے تھے۔“ اس نے مغرب کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔
 ”ادھر دریا کنارے آکر بے تورا تو ان کو چھپ چھپ کر ٹولیوں میں نکلتے۔ دریا کے کنارے کھڑی ہوئی
 بیڑیوں اور کشتیوں میں لدا ہوا سارا مال اسباب لوٹ کر لے جاتے۔ تب ہی تو لغاری اور دوسرے
 تمن‘ مزاریوں کو دریائی لیرے کہتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”سین‘ سچ پوچھ تو پرانے
 زمانے میں سارے ہی بلوچ تمن لیرے ہوتے تھے۔ پہاڑوں میں رہتے تھے۔ جب کھانے پینے کو کم
 پڑ جاتا تو نیچے اترتے۔ جو مکا بلے پر آتا اسے مار دیتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ بلوچوں کی
 ایسی لوٹ مار کرنے والی ٹولیوں کو چاپاؤ کہا جاتا تھا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ مزاری بھی پہلے چور ڈکیت ہوتے تھے۔“

”اب بھی ہوتے ہیں۔ چور ڈکیت تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔“ جلاوت کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔
 ”تیری باتوں سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ لنگر نے ہاتھ کا اوٹھ چوری کیا تھا یا نہیں۔“ رحیم داد اصل

ہے نہ پولیس۔ تجھے پتہ ہے یہ بلوچ تہن داروں کا علاقہ ہے۔ یہاں ان کا ہی قانون چلتا ہے۔
 ”تو ایسا گیا کہ مجھ سے مل کر بھی نہ گیا۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”میں سمجھا نہ جانے تو اس طرح اچانک کیوں تھانیدار کے ساتھ چلا گیا؟ تجھے پتہ نہیں، میں تیرے بارے میں ادھر کتنا پریشان رہا۔“

”تو خاما خا پریشان رہا۔“ اس نے بے نیازی سے قہقہہ لگایا۔ ”میں تجھ سے مل کر نہ گیا یہ غلطی مجھ سے ضرور ہوئی۔ پر تجھ سے مل بھی تو نہ سکتا تھا۔ تو بے خبر سو رہا تھا۔ چاکر نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ تیرے کمرے میں بھی گیا تھا۔“

”چاکر خان بھی مجھے نظر نہیں آیا۔ وہ بھی تیرے ساتھ گیا تھا؟“
 ”وہ میرے ساتھ نہیں گیا تھا۔ مگر وہ ادھر بھی نہیں رہا۔ روجھان گیا تھا۔“ سردار مزاری نے بتایا۔ ”مگر اسے تو کل شام کو واپس آ جانا چاہیے تھا۔“

”پتہ نہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”مجھے تو وہ اب تک نظر نہیں آیا۔“
 ”میں واپس آ گیا ہوں تو وہ اب ضرور آ جائے گا۔“
 ”یہ تو بتا تو گیا کہاں تھا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”راجن پور گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھی ادھر موجود تھا۔ اسی نے بلوایا تھا۔“
 ”کوئی خاص گل بات تھی؟“ رحیم داد نے جھٹ پوچھا۔ وہ جلد سے جلد بات کی تہہ تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

”وہی سیاست کا چکر ہے۔“ شہ زور خاں نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”اسمبلی میں مزاروں کے دو ووٹ ہیں۔ حکومت دونوں ووٹ ری پبلکن پارٹی کی حمایت میں دلوانا چاہتی ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے پاس اوپر سے حکم آیا ہے۔ تب ہی وہ اتنی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔ مزاری سرداروں سے مل رہا ہے۔ حکم کی تعمیل کرنی جو ہوئی۔“

رحیم داد کی پریشانی اب بالکل ختم ہو چکی تھی۔ مسکرا کر بولا۔ ”لگتا ہے تو بھی اسی چکر میں پڑ گیا جس میں آج کل شاہ جی الجھا ہوا ہے۔“

”میں تو پڑنا نہیں چاہتا تھا پر ڈپٹی کمشنر کی بات بھی تو ٹالی نہیں جاسکتی۔“ مزاری نے صفائی پیش کی۔ ”ویسے اس سے یاری بھی ہے۔ کام کا بندہ ہے۔“

کمرے کا دروازہ کھلا۔ اونچے قد کا ایک نوجوان داخل ہوا۔ وہ ٹائیوں کی ہلکی بٹش شرت اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا۔ رنگ اجلا تھا۔ وضع قطع اور صورت شکل سے تعلیم یافتہ نظر آتا تھا۔

مزاری نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا۔ رحیم داد سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرا ملیر ہے۔ آج کل وڈا سرکاری افسر لگا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ اپنا چوہدری نور الہی ہے۔ اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

رحیم داد فوراً بستر سے نیچے اترا۔ آگے بڑھا اور شہ زور مزاری کے ماموں زاد بھائی سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

”یہ بھی لمور سے مزاریوں کے دونوں کے چکر میں ادھر بھیجا گیا ہے۔“ سردار مزاری نے اس کے آنے کا مقصد بیان کیا۔ ”پر ابھی کچھ طے نہیں ہوا۔“

شہ زور خاں کا ماموں زاد بھائی ایک موٹو ہا سر کا کر بیٹھ گیا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

مگر رحیم داد خاموش نہ رہا۔ پلنگ پر پیر لٹکا کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”ابھی تک کچھ طے کیوں نہیں ہوا؟“ اس نے اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

”جھگڑا یہ کھڑا ہو گیا ہے کہ وزارت تو لغاریوں کو مل رہی ہے۔“ شہ زور مزاری نے مسئلے کی پیچیدگی پر روشنی ڈالی۔ ”وہ لیگی جو ٹھیرے اور اوپر والوں کو ری پبلکن پارٹی کے لیے لیگ کے ووٹ کاٹنے ہیں۔ پر سوال یہ ہے کہ مزاری سرکاری پارٹی کو کیوں ووٹ دیں؟ وہ کہتے ہیں وزارت ہم کو دو۔ ورنہ دونوں میں سے کسی کو نہ دو۔ اسی میں معاملہ الجھا ہوا ہے۔ مجھے دوبارہ جانا پڑے گا۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے ماموں زاد بھائی کے کندھے کو ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ ”یہ مجھے اپنے ساتھ ہی لے کر جائے گا۔ اسی لیے شمشیر والی آیا ہے۔“

”تو جا رہا ہے تو مجھے بھی لمور واپس جانے دے۔“
 ”ادھر تو جی سخت گرمی ہے۔“ شہ زور کے ماموں زاد بھائی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”زبردست لو چل رہی ہے۔ اس بار نمبر ۸۸ فارن ہاؤس سے بھی اوپر پہنچ چکا ہے۔“

”سن لیا تو نے۔“ سردار شہ زور خان مزاری نے ہنس کر کہا۔ ”اتنی سخت گرمی میں لمور جا کر کیا کرے گا؟ آج کل شمشیر والی بہت پر سکون جگہ ہے۔ دریا کا کنارہ ہے۔ ہوا بھی زیادہ گرم نہیں۔ اور شام کو تو ادھر ٹھنڈی رہتی ہے۔ جب تک گرمی زیادہ ہے تو ادھر ہی ٹھیر۔“

”تو یہاں سے کب جائے گا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”رات کو تو ادھر ہی رہوں گا۔ صبح ہوتے چلا جاؤں گا۔“ سردار مزاری نے بتایا۔ ”پر سوں دوپہر تک واپس آ جاؤں گا۔ دوپہر کو نہ آسکا تو رات کو ضرور پہنچ جاؤں گا۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خاموش رہا۔

”تجھے ادھر کوئی تکلیف شکایت تو نہیں؟“ مزاری نے پوچھا۔ ”میں نے نوشیر کو کہہ دیا ہے۔ وہ تیری ٹھیک طرح دیکھ بھال کرے گا۔“ سردار مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب مجھے چلنا ہے۔ تجھے شام کو ملوں گا۔“

شہ زور مزاری اپنے ماموں زاد بھائی کے ہم راہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

رات کو پینے پلانے کا دور چلا۔ مزاری اپنے ساتھ اسکاچ کی بوتل لایا تھا۔ رحیم داد اور مزاری وہسکی کی چسکی لگاتے رہے۔ مزاری کا ماموں زاد بھائی سرشام ہی کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ گہری نیند سو رہا تھا۔ دریا کی سمت سے آتے ہوئے جھونکے بھیکے بھیکے تھے۔ آسمان صاف اور اجلا تھا۔ ستارے جگنوؤں کی مانند جگمگا رہے تھے۔ فضا میں رعنائی تھی۔ ٹکٹنگلی اور فرحت تھی۔

سردار مزاری اور رحیم داد سرخوشی کے عالم میں تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ رحیم داد کو یکایک جلاوت یاد آگیا۔ اس کی منت ساجت اور مجبوری یاد آگئی۔ اس کا ذکر چھڑنے کی غرض سے رحیم داد نے تمہید باندھی۔ ”لنگر تو مر گیا۔“

مزاری اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ”اس نے تو مرنا ہی تھا۔ جیسا کیا تھا اس کی سزا پائی۔ جتوال کا اوٹھ چوری کیا اور جھوٹ بھی بولا۔“ اس نے گردن کو خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے دیکھا“ میں نے مکدے کا کتنا ٹھیک فیصلہ کیا۔ ہمارے وڈوں اور وڈیروں نے سوچ سمجھ کر ہی بلوچوں کے لیے قانون بنائے تھے۔ اور ایسے زبردست بنائے تھے کہ انگریزوں کی بنائی ہوئی عدالتیں اور ان کے قانون آج تک ادھر رائج نہیں ہو سکے۔ قانون تو بلوچ سرداروں کا ہی چلتا ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”تو خود سوچ کتنا سستا انصاف ہے۔ نہ وکیل کھڑا کرنے کی ضرورت نہ ضمانت کی اور نہ مبینوں عدالتوں کی پیشیاں بھٹکتی کی۔ بلکہ کبھی کبھی تو برسوں عدالت اور پکھری کے چکر کاٹنے پڑتے ہیں۔“

”تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض سے ہاں میں ہاں ملائی۔ ”لنگر کو تو اس کے جرم کی ٹھیک ٹھیک سزا مل گئی۔ اب جلاوت اور نمیسو کا کیا بنے گا؟“

”دونوں نے جھوٹی گواہی دی تھی اس کی انھیں سزا ملے گی۔“

”لگتا ہے وہ تو لنگر کی یاری میں گواہی دینے چلے آئے تھے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”اوٹھ

کی چوری کے بارے میں ان کو کچھ پتہ نہیں تھا۔“

”تو نے کیسے اندازہ لگایا؟“ مزاری کا لہجہ تیکھا تھا۔ ”دونوں میں سے کوئی تیرے پاس سفارش کرانے تو نہیں آیا؟“

رحیم داد قدرے سٹ پٹایا۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ اور کھل کر بات کرنا چاہی۔ مگر وہ اپنی بات کہہ نہ سکا۔ چاکر خان سرگانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ سردار مزاری اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”چاکر، تجھے تو کل رات یہاں پہنچنا تھا۔“

”سین، میں کل رات نہیں پہنچ سکا۔“ چاکر خان سرگانی نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ ”میں آج صبح یہاں پہنچا۔“

”پر اب تک تو رہا کہاں؟“ شہ زور مزاری نے تیوری پر بل ڈال کر سوال کیا۔

”سین، میں صبح سے ہاتو جتوال کو ڈھونڈ رہا تھا۔“

”اسے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟“ مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”یہاں پہنچنے ہی مجھے پتہ چلا کہ ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا ہے۔“ سرگانی نے اکتے ہوئے بتایا۔

”ہاتو کو اس کا اوٹھ مل گیا!“ سردار مزاری نے حیران و پریشان ہو کر چاکر خان کو دیکھا۔ ”کہاں ملا اسے اپنا اوٹھ؟ کیسے ملا، کیوں کر ملا؟“

”سین سردار، یہ تو مجھے پتہ نہیں۔“ سرگانی کے چہرے پر لائینن کی مدہم روشنی میں پریشانی اور گھبراہٹ صاف نظر آرہی تھی۔ ”ٹھیک ٹھیک گالہ تو ہاتو ہی بتا سکتا ہے۔ میں یہی جاننے کے لیے صبح سے اب تک اسے تلاش کرتا رہا۔“

اب مزاری بھی پریشان نظر آنے لگا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر وہسکی کا بڑا گھونٹ بھرا۔ سرگانی سے پوچھا۔ ”پہلے یہ تو ہاتو اوٹھ کہاں سے ملا اور کیسے ملا؟ تو نے اس کے بارے میں کیا سنا؟“

”میں نے سنا ہے، اوٹھ اس کے بیٹے کے پاس تھا۔ وہ ادھر اکبر والی میں رہتا ہے۔“ سرگانی کی آواز میں ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ تھی۔

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہاتو نے لنگر کے خلاف جھوٹا مکدہ بتایا تھا۔“ مزاری نے اپنے شے کا اظہار کیا۔ ”لنگر بے گناہ تھا۔“

”لگتا تو ایسا یہی ہے۔“ چاکر خان سرگانی نے دبی زبان سے اس کی تائید کی۔ ”تب ہی تو وہ بھگوڑا ہو گیا۔ پرسوں رات چپکے سے بھاگ گیا۔“

”کہاں گیا، بھاگ کر؟“ مزاری نے بے چہن ہو کر پوچھا۔

”مجھے پتہ چلا ہے، وہ فرار ہو کر کیمبرانیوں کے علاقے کی طرف گیا ہے۔“

”یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔“ سردار مزاری اور پریشان ہو گیا۔ ”کیمبرانی اسے پناہ دے کر اپنا باہوت بنالیں گے۔ کیمبرانیوں کے ساتھ ہم مزاریوں کی پرانی دشمنی ہے۔ وہ لغاری تمسن کے ساتھ ہیں۔ وہ تو اسے پناہ دے کر بہت خوش ہوں گے۔“

چاکر خان سرگانی نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ سر جھکائے سہا ہوا کھڑا رہا۔ سردار مزاری نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس کے چہرے پر رفتہ رفتہ جھنجھلاہٹ چھا رہی تھی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد مزاری نے چاکر خان سے دریافت کیا۔ ”وہ اکیلا گیا ہے یا اپنی ذال اور بچوں کو بھی لے گیا ہے؟“

”سین سردار وہ اکیلا ہی گیا ہے۔ اس کے بال بچے ادھر ہی ہیں۔“ چاکر خان نے بتایا۔

”اب تو جا۔“ سردار مزاری نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ ”صبح ہاتو کی ذال کو اس کے بچوں کے ساتھ پیش کر۔ کرا دوں کو اس کی نگرانی پر لگا دے تاکہ وہ بھاگ کر ہاتو کے پاس نہ پہنچ سکے۔“

”سین سردار میں صبح ہاتو کے بال بچوں کو تیرے سامنے پیش کر دوں گا۔“ سرگانی نے مزاری کو یقین دلایا۔ ”ان کی کڑی نگرانی بھی ابھی جا کر شروع کرائے دیتا ہوں۔“

شہ زور خان مزاری کچھ نہ بولا۔ چاکر خان سرگانی خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

مزاری گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے تھمتھا رہا تھا۔ رحیم داد نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ مزاری کا گلاس اٹھا کر بٹھایا۔ ”لے تو ڈی سی لگا لے۔“ مزاری نے گلاس سنبھالا اور وہسکی کا گھونٹ بھرا۔

رحیم داد نے کہا۔ ”برانہ مان تو ایک بات کہوں؟“

”کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“ مزاری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے تو ایسا لگتا ہے ہاتو نے لنگر کے خلاف جھوٹا مکدمہ پیش نہیں کیا تھا۔“

”اگر ایسا تھا تو وہ بھاگا کیوں؟“ مزاری نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

”وہ تیری نراضی کے ڈر سے بھاگ گیا۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”اے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ سچا تھا تو اپنا بیچ ثابت کر سکتا تھا۔“ شہ زور خان مزاری نے

اس کی دلیل رد کر دی۔

”یہی تو وہ چاہتا تھا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”بیچ ثابت کرنے کے لیے اسے بھی مگرے پانی میں غوطہ لگانا پڑتا۔ لنگر کا انجام دیکھ کر وہ کیسے ایسا کر سکتا تھا۔“

سردار مزاری کو اس کی بات پسند نہ آئی۔ مگر کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموشی سے اسکاچ کا گھونٹ بھرا۔ اور گلاس خالی کئے بغیر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد نے ٹوکا۔ ”کہاں چلا؟“

”مجھے اب سونا ہے۔“ سردار مزاری نے بے زاری سے کہا۔ ”بہت تھک گیا ہوں۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ اب تجھ سے صبح گل بات ہوگی۔“

وہ آگے بڑھا اور اس طرف چلا گیا جہاں اس کا ماموں زاد بھائی کھلے آسمان کے نیچے ابلے بستر پر سو رہا تھا۔ رحیم داد بھی اپنے پلنگ پر جا کر لیٹ گیا۔



صبح کی دھوپ درود دیوار سے نیچے اتر رہی تھی۔ سردار مزاری اپنے کمرے میں ادبھی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے روبرو فرش پر ایک عورت میلے کپیلے لباس میں سر جھکائے سہی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کے قریب ہی دو نیم برہنہ بچے تھے۔ ان کے لباس بھی گندے اور بہت بوسیدہ تھے۔

رحیم داد نے کمرے میں پہنچتے ہی پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا کہ وہ ہاتو ساربان کی بیوی ہے۔ اور بچے بھی اسی کے ہیں۔

ہاتو کی بیوی کا چہرہ اجڑا ہوا تھا۔ وہ عاجزی سے گڑگڑا رہی تھی۔ ”سین سردار!“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”اونٹھ ہاتو کے بچو کو کوئلہ رحمان کے رستے میں ملا تھا۔ اس نے اونٹھ کو پہچان لیا اور اپنے گھر لے گیا۔ وہ یہی بتاتا تھا۔ مجھے اس سے زیادہ کچھ پتہ نہیں۔ سین میں تجھ سے بالکل بیچ کہہ رہی ہوں۔“

”تو یہ گالہ کتنی بار بتائے گی۔ میں نے اسے سن لیا۔“ مزاری نے بے رخی سے کہا۔ ”اب تو اپنی بواں بند کر۔“

رحیم داد خاموشی سے ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ ہاتو کی بیوی نے گھگھیا کر سردار مزاری کو رام کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ ”سین معافی دے دے۔ توں سکھی صحت ہو دی۔ رب راضی ہو دی۔“

مزاری کا ماموں زاد بھائی اسی اثنا میں کمرے میں داخل ہوا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ اس کا لباس صاف تھرا تھا۔ اس نے مزاری کو مخاطب کیا۔ ”شہ زور تجھے چلنا نہیں۔ دھوپ تیز ہو گئی تو سفر میں

تکلیف ہوگی۔ گرمی بڑھ جائے گی۔“

”میں تو بالکل تیار بیٹھا ہوں۔“ مزاری کے چہرے سے خشونت غائب ہو گئی۔ مسکرا کر

بولاً۔ ”میں تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔“

مزاری پلنگ سے نیچے اترا۔ قریب کھڑے ہوئے چاکر خاں سرگانی کی جانب دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر ہاتوکی بیوی اور بچوں کی جانب اشارہ کیا۔ ”انھیں شاہ میر لے جا اور جیل میں بند کر دے۔“

ہاتوکی بیوی تڑپ کر بولی۔ ”سین سر دارا! میری گالہ سن لے۔“

مگر مزاری نے اس کی ایک نہ سنی۔ مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ بے نیازی سے دروازے کی جانب بڑھا۔ اس کا ماموں زاد بھائی ساتھ ساتھ چلا۔ رحیم داد بھی اٹھ کر ان کے ساتھ

چلا۔

تینوں کمرے سے نکل کر چار دیواری کے پھانک پر پہنچے۔ سامنے مزاری کی نئی کار موجود تھی۔

رحیم داد نے سردار مزاری کو گلے لگا کر گرم جوشی سے رخصت کیا۔ اس کے بھائی سے بھی گلے ملا۔

ڈرائیور نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شہ زور خاں مزاری اور اس کا ماموں زاد بھائی آگے بڑھے اور کار کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔

کار گاؤں کے کچے راستے پر گرد کے بادل اڑا تی آگے بڑھی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے

اوجھل ہو گئی۔

رحیم داد واپس ہوا۔ احاطے میں داخل ہوتے ہی اسے چاکر خاں نظر آیا۔ وہ پھانک کی جانب

بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہمراہ ہاتوکی بیوی سر جھکائے چل رہی تھی۔ دونوں بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔

وہ خوف سے سسے ہوئے نظر آرہے تھے۔

رحیم داد خاموشی سے ان کے قریب سے گزرا۔ کمرے میں پہنچا۔ ناشتا کیا۔ مگر اس کی طبیعت

بوجھل تھی۔ دن بھر وہ مضحل رہا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ ہو اگر گرم ہو گئی تھی۔ وہ کمرے

سے باہر نہ نکلا۔ دن ڈھلے اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ گرمی کی شدت اب کم ہو گئی تھی۔

رحیم داد بھی اب کسی قدر بشاش نظر آ رہا تھا۔



پہر رات گزر چکی تھی۔ احاطے میں گہرا سانا چھایا تھا۔ رحیم داد برآمدے میں آنکھیں بند کیے مونڈھے پر خاموش بیٹھا تھا۔ یکایک قدموں کی آہٹ ابھری۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ چاپ رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا۔ ڈیرے کے ملازم نوشیر کی نوجوان بیوی نوری، اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب بڑھی اور قریب پہنچ کر کھڑی ہو گئی۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ ”غیسو کی گھر والی کدھر ہے؟“

”اس کی طبیعت گڑبڑ ہے۔“ نوری نے اس کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”وہ آج تیرے پاس نہیں آسکتی۔“

رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”اس کی بجائے آج تو آئی ہے؟“

وہ شرما گئی۔ دوپٹے کے انچل سے سر ڈھکتے ہوئے رسان سے بولی۔ ”ناسین، ایسی کوئی گالہ نہیں۔“ اس نے نگاہیں نیچی کر لیں۔

”فیرو تویساں کیوں آئی ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”نوشیر کہاں ہے؟“

”سین، وہ ادھر ہے۔“ اس نے نوکروں کو کوٹھڑیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اس لیے آئی تھی۔“ بات کتے کتے وہ جھجکی۔ اس کی آواز اور دھیمی ہو گئی۔ ”تجھ سے ایک گالہ کہنی ہے، مان لے گا۔“

”کہہ، کیا کہنا چاہتی ہے؟“ رحیم داد نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ ”کوئی خاص گل بات

کہنی ہے؟“

”خاص ہی سمجھ لے۔“ وہ دہلی زبان سے بولی۔

”صاف صاف بات کر۔“ رحیم داد نے اسے جھکی نظروں سے دیکھا۔ ”تو اس طرح چبا چبا کر

کیوں بات کر رہی ہے؟“

”تجھے پتہ ہے سردار کل ملوک زادی اور سراب کو ادھر پہنچا گیا ہے۔“ اس نے ہچکچاتے ہوئے

بتایا۔

”ملوک زادی اور سراب ادھر ہیں!“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”شہ زور نے تو اس

بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”کہاں ہیں دونوں؟“

”آہستہ بول۔“ اس نے چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ سرگوشی کے انداز میں دھیرے سے

بولی۔ ”ملوک زادی تو سردار کے ساتھ والے کمرے میں بند ہے۔ سراب کو ادھر نوکروں کی ایک

کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے۔“

”وہ دونوں کو یہاں کیوں لایا ہے؟“

”دو تین روز میں جرگہ بیٹھے گا۔ دونوں پر مقدمہ چلایا جائے گا۔“ نوری نے رحیم داد کو مطلع

کیا۔ وہ رحیم داد کے قریب ہی فرش پر بیٹھ گئی۔ ”لگتا ہے سردار نے تجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”ہاں اس نے مجھے ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔“

نوری نے جھک کر اپنا منہ رحیم داد کے قریب کیا۔ رمان سے بولی۔ ”ملوک زادی تجھ سے ملنا

چاہتی ہے۔ اس نے تجھے اپنے پاس بلایا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رحیم داد سراپہ ہو کر بولا۔ ”مرحان کے کمرے پر تو پہرہ ہو گا۔ اس کی

اور سراب کی تو کڑی نگرانی کی جا رہی ہوگی۔“

”وہ تو کی جا رہی ہے۔ پر کمرے کے دروازے پر کوئی نہیں ہے۔“ نوری نے رازدارانہ لہجے میں

مطلع کیا۔ ”راکھ بندو کیس سنھالے باہر بھانک پر بیٹھے ہیں۔“

”بہن اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟ کمرے کے دروازے پر تو تالا پڑا ہو گا۔“

”تالا تو ضرور پڑا ہے۔ پر اس کی چابی میرے پاس ہے۔“ نوری آہستہ سے بولی۔ ”میں روٹی

پہنچانے ملوک زادی کے کمرے میں گئی تو اس نے مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ یہ جاننے کی

کوشش کی، یہاں کون کون ٹھہرا ہے۔ جب اسے یہ پتہ چلا کہ تو ادھر ہے تو اس نے مجھے تیرے پاس

بھیجا۔ وہ تجھ سے کچھ ضروری گانہ کہتا چاہتی ہے۔“

”نوٹیر کو پتہ ہے کہ تو ادھر میرے پاس آئی ہے؟“

”ہاں سیں، اسے بالکل پتہ ہے۔“ نوری نے بلا جھجک کہا۔ ”اس سے صلاح کر کے ہی تو تیرے پاس آئی ہوں۔ تو اس کی فکر نہ کر۔“

رحیم داد منھ سے پڑ گیا۔ مرجان کے بارے میں اس کے ذہن میں بہت دنوں سے تجسس تھا۔ وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا۔ بات کرنا بھی چاہتا تھا۔ مگر مزاری کے ناراض ہونے کا خطرہ تھا۔ اور یہ بات اسے گوارہ نہ تھی۔ وہ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔

”سیں، توں کس سوچ میں پڑ گیا؟“ نوری نے دریافت کیا۔

”یہ خطرناک کام ہے۔“ رحیم داد نے اپنے خدشے کا کھل کر اظہار کیا۔ ”شہ زور کو پتہ چل گیا

کہ میں مرجان سے چھپ کر ملا تھا تو وہ بہت برا مانے گا۔ میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔“

”سیں، تو بالکل فکر نہ کر۔ مجھے پتہ ہے سردار تجھ سے نراض نہیں ہو گا۔“ نوری نے اسے

مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”وہ تیرا گریا رہا ہے۔ تجھے بہت پیار کرتا ہے۔ تیری تعریف کرتا ہے۔

نوٹیر سے چلتے چلتے کہہ گیا ہے کہ چوہدری کو ذرا تکلیف نہ ہو۔ اسے ہر طرح آرام پہنچانا، خوش رکھنا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔ پر مرجان کا معاملہ اور ہی طرح کا ہے۔ شہ زور کے نراض ہونے کا خطرہ

ہے۔“ رحیم داد آمادہ نہ ہوا۔

”سیں، تو بالکل نہ گھبرا۔“ نوری نے رحیم داد کی ہمت بڑھائی۔ ”نوٹیر کہتا تھا، سردار تجھ سے

نراض نہیں ہو سکتا۔ وہ بچپن سے اس کی نوکری کر رہا ہے۔ وہ اس کا پرانا بھانجا ہے۔ اسے ٹھیک

طرح جانتا ہے، سمجھتا ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”پر سیں، تو سردار

سے میرے اور نوٹیر کے بارے میں کچھ نہ کہتا۔ تیری گانہ اور ہے، تو اس کا پیار ہے۔ اور مہمان

بھی ہے۔ ہم دونوں تو اس کے مولیٰ بنے ہیں۔ ہم سے تو وہ سخت نراض ہو گا۔ چڑی ادھیڑ ڈالے

گا۔ کیہ میں ڈال دے گا۔“

”جب سردار کا اتنا ہی ڈر ہے تو اس چکر میں تو پڑی ہی کیوں؟“

”سیں، سچی بات یہ ہے، ملوک زادی میرے سامنے روٹی، مگر گڑائی، منت کی۔“ نوری نے

صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ہے تو وہ ملوک زادی ہی۔ میں اس کی منت اور زاری پر کیسے سن نہ

ہوتی۔ کیسے چپ کر کے بیٹھی رہتی۔ نوٹیر بھی اسی لیے مان گیا۔“ اس نے دوپٹے کا پلو کھول کر

کڑے کی شکل کا ایک زیور دکھایا۔ ”سیں، اس نے مجھے یہ منگی بھی دی ہے۔ سیں، تو اس سے

ضرور ملے۔“ اس کے لیے میں التجا تھی۔
”صاف‘ صاف بتا تو چاہتی کیا ہے؟“ رحیم داد نے صورت حال پوری طرح سمجھنے کی کوشش

کی۔

”سین‘ میں ملوک زادی کے کمرے کا پچھلا دروازہ چپکے سے کھول دوں گی۔“ نوری نے جھک کر مدھم لیے میں کہا۔ ”ادھر درخت بہت ہیں۔ اندھیرا بھی زیادہ ہی رہتا ہے۔ تو آدمی رات کو آجانا۔ میں تجھے وہیں ملوں گی۔ تو پچھلے دروازے سے اندر چلا جانا۔ میں باہر کھڑی چوکیداری کرتی رہوں گی۔“

رحیم داد چند لمبے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر تجسس‘ خوف پر غالب آگیا۔ وہ مرجان سے ملنے اور بات کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ آہستہ سے بولا۔ ”نوری‘ اب تو رجا۔ میں آدمی رات کو ادھر پہنچ جاؤں گا۔ تو میرا انتظار کرنا۔“
نوری نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی برآمدے سے نیچے اتری اور احاطے میں پھیلے ہوئے اندھیرے میں گم ہو گئی۔



رات کا کارواں اپنا سفر طے کرتا رہا۔ اندھیرا گہرا ہو گیا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ رحیم داد کی آنکھوں میں دور دور تک نیند کا گزرنہ تھا۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ مرجان کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ اسے اب تک دیکھ نہ سکا تھا۔ مزاری جب اسے سراب کے ساتھ گرفتار کر کے شاہ میر لایا تو تمام وقت اس نے اپنا چہرہ دوپٹے کے انچل سے چھپائے رکھا۔ اب وہ اس مرجان کو دیکھ سکتا تھا‘ جو بلوچ ملوک زادی تھی‘ جو کبھی سورج سے بھی پردہ کرتی تھی اور روج موج کھلاتی تھی۔ وہ اس سے بات بھی کرنا چاہتا تھا اور اس راز کا سراغ لگانا بھی چاہتا تھا کہ اس نے کسی بلوچ سردار یا امیر زادے کے بجائے حویلی کے ایک ادنا خدمت گار‘ سرسراب کو کیوں پسند کیا؟ کیوں اس کے ساتھ فرار ہونے کا خطرہ مول لیا؟

رحیم داد مسلسل مرجان کے متعلق غور کرتا رہا۔ بہت دیر بعد وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چوکنٹا نظروں سے باہر دیکھا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ وہ آہستہ سے نیچے اتر ا۔ کمرے کے اندر گیا۔ گھڑی دیکھی۔ پونے بارہ بجے تھے۔ رات نصف سفر طے کر چکی تھی۔

وہ آئینے کے رو برو جا کر کھڑا ہو گیا۔ لیب کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس نے مھوم پھر کر مختلف زاویوں سے اپنا عکس دیکھا۔ کتنی اٹھا کر سراور ڈاڑھی کے بالوں کو سنوارا۔ مونچھوں کو اٹھایا

سے آہستہ آہستہ مروڑ کر نوکیلا بنایا۔ کپڑے اس کے صاف ستھرے تھے۔ شام ہی کو نما کر بدلے تھے۔ اس نے سوٹ کیس سے عطر کی شیشی نکالی۔ لباس اور ڈاڑھی پر ہلکا ہلکا عطر لگایا۔

ایک بار پھر آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھا۔ زیر لب مسکرایا۔ مڑا‘ کمرے سے باہر نکلا۔ دروازہ ہولے سے بند کیا۔ برآمدے سے اتر کر سنسان احاطے میں گیا اور ادھر ادھر دیکھتا بھاتا‘ دبے دبے قدموں چلتا ہوا پچھواڑے کے گھنے درختوں کی جانب بڑھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ ہو کا عالم تھا۔ رات آدمی ہو چکی تھی۔

وہ درختوں تلے پہنچا۔ اندھیرے میں ایک سایہ اسے اپنی جانب بڑھتا ہوا نظر آیا۔ سایہ اس کے قریب آگیا۔ رحیم داد نے غور سے دیکھا‘ وہ نو شیر کی بیوی‘ نوری ہی تھی۔ وہ مدھم لیے میں بولی۔ ”سین‘ توں آگیا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ نوری بھی خاموش رہی۔ آگے بڑھی۔ رحیم داد اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ پھانک پر بیٹھے ہوئے مسلح پسریداروں میں سے کوئی زور سے کھنکرا۔ خوف سے نوری کے قدم ڈگمگائے۔ رحیم داد نے ہاتھ بڑھا کر جھٹ اس کا بازو تھام لیا۔ وہ سمٹ کر رحیم داد کے بہت قریب آگئی۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں زور زور سے سانس بھر رہی تھی۔ اس کا جسم ہولے ہولے کپکپا رہا تھا۔ وہ مڑ مڑ کر پھانک کی سمت دیکھ رہی تھی۔

نوری کا ہاتھ سخت اور کھردرا تھا۔ اس کے گلجے لباس سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ رحیم داد نے اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے کسماکس سرگوشی کی۔ ”سین‘ ملوک زادی تیرا انتظار کر رہی ہے۔“ اس نے قریب کے ایک دروازے کی جانب اشارہ کیا۔ ”وہ اس کے پیچھے ہے۔“
رحیم داد چپ چاپ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

نوری نے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ کر نرمی سے علیحدہ کیا۔ آگے بڑھی۔ آہستہ سے دروازہ کھولا۔ مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ منہ آگے بڑھا کر بہت دھیرے سے بولی۔ ”سین‘ تو اندر چلا جا۔ مجھے باہر ٹھہر کر چوکیداری کرنی ہے۔“ وہ جہاں تھی وہیں رک گئی۔

رحیم داد اندر داخل ہوا۔ باہر سے نوری نے دروازہ بند کر دیا۔

کمرے میں لیمپ روشن تھا۔ مرجان دیوار کے قریب بیچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی پلنگ سے نیچے اتری اور نظریں جھکا کر اس کے رو برو کھڑی ہو گئی۔ رحیم داد نے مرجان کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ بھرا بھرا میانہ قد‘ بیضوی چہرہ‘ سیاہ اور روشن آنکھیں‘ سبک خدو خال‘ کھلتا ہوا چہرہ‘ رنگ۔ وہ چھپیں ستائیس سال کی جوان اور خوبصورت عورت تھی۔

مکراپ اس کی آنکھوں سے دیرانی جھلکتی تھی۔ چہرہ مرجھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ وہ بلوچی ساخت کی قیص، ہنسک، پنے ہوئے تھی۔ ہنسک کا رنگ گلابی تھا۔ اور اس کے ہنسک پر ہفت رنگی ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ ہنسک گریبان سے سینے تک پھیلا تھا جس کی کڑھائی میں چھوٹے چھوٹے شیشے بھی لٹکے تھے۔ کلائیوں پر چاندی کے منقش تمل بندھے تھے۔ کانوں میں سونے کے درتھے۔ سر کے بالوں پر جگمگاتی کید تھی۔ یہ سونے کی نازک زنجیر تھی جو کانوں کے دونوں دروں سے جڑی ہوئی تھی۔ ناک میں جھللاتا پلوہ جھول رہا تھا اس میں چوٹی کے برابر فیروزہ آویزاں تھا۔ مرجان بڑی طرح دار بلوچ ملوک زادی تھی۔

مرجان نے رحیم داد کو خاموش پایا تو اس کی جانب جھکتی ہوئی نظر سے دیکھا۔ مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آہستہ سے بولی۔ ”سین چوہری، تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“

رحیم داد نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو نے مجھے یہاں کس لیے بلایا ہے؟“ ”دھیرے بول۔“ وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر گویا ہوئی۔ ”میں نے شہ زور کو ایک گالہ کھلوانی ہے، توں ہی میری گالہ اسے پہنچا سکتا ہے۔“ وہ ہنسک پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔ ”ادھر اور کوئی ایسا نہیں جو اس سے بات کر سکے۔ میں نے اس رات گیدڑ والا شہ میر جاتے ہوئے جیب میں اندازہ کر لیا تھا کہ تیرے ساتھ اس کی کتنی گمری یاری ہے۔“

”تو نے شاہ میر میں کسی اور کے ذریعے ایسی کوشش کیوں نہیں کی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔ ”میں نے کوشش کی تھی۔ شہ زور کی رن کو بلوایا تھا۔ اس کی ماں اور بھین کو بھی بلوایا تھا۔“ ”مرجان نے بتایا۔“ ”پر کوئی بھی میرے پاس نہ آیا۔ صاف انکار کر دیا۔ وہ سب شہ زور سے بت ڈرتی ہیں۔“

”مجھے بتا، تجھے شہ زور سے کیا کہتا ہے؟“ رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”تجھے پتہ نہیں، سارا جھگڑا جائیداد کا ہے۔“ ”مرجان نے کھل کر بات کی۔“ ”شہ زور جائیداد کی خاطر میری جان لینا چاہتا ہے۔ اس نے دوبارہ میرا خون کرنے کی کوشش کی۔ پر میں کسی نہ کسی طرح بچ گئی۔“

”میری سمجھ میں ابھی کچھ نہیں آیا۔“ رحیم داد بات کی تہ تک نہیں پہنچ سکا۔ ”میں تجھے سب کچھ بتا دوں گی۔ کچھ نہیں چھپاؤں گی۔“ ”مرجان نے رحیم داد کو یقین دلایا۔“ ”تجھے یہ تو پتہ ہو گا، میں شہ زور کی سوتیلی ماں ہوں۔ میرا پیر رند بلوچ تھا۔ وہ صادک آباد کا معمولی زمین دار تھا۔ میں چوداں سال کی تھی جب اس نے شہ زور کے پیر، سردار نجیب خان مزاری کے

ساتھ میرا پرنا کر دیا۔ لیکن پرنا کرنے سے پہلے اس نے میرے نام سردار نجیب خاں کی بجائے ایک حصہ لکھوا لیا تھا۔ بیس سال بعد سردار نجیب سے میرا ایک پتر پیدا ہوا۔ جب وہ تین سال کا تھا تو اچانک تیار پڑا اور مر گیا۔“

”کیا پیاری ہوئی تھی اسے؟“

”بیاری شیماری تو ایسی خاص نہیں تھی۔“ ”مرجان نے ٹیکھے لہجے میں کہا۔“ ”اس کے مرن کے بعد مجھے پتہ چلا کہ شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی نے میرے پتر کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔“ ”مرجان کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔“ ”شہ زور نے دو سال بعد اپنے بھائی کو بھی مار ڈالا۔ سردار نجیب کا پہلے ہی مرن ہو چکا تھا۔ یہ سب کچھ اس نے پوری جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے کیا۔“

”تیرے اور کوئی اولاد نہیں ہوئی؟“

”نہیں!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اب شہ زور جائیداد کا وہ حصہ جو میرے نام ہے اپنے پاس رکھنے کے لیے مجھے راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔“

”تیرا بیٹا اب کہاں ہے؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”دو سال ہوئے اس کا بھی مرن ہو گیا۔“

”بھائی بھین نہیں ہیں؟“

”بھین کوئی نہیں۔“ ”مرجان نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”دو بھائی تھے۔ چھوٹا تین سال ہوئے چلتی ٹرین سے گر کر مر گیا۔ وڈا ہے۔ وہ صادک آباد میں زمینداری کرتا ہے۔“

”تو اپنے بھرا کے پاس کیوں نہیں گئی؟“ رحیم داد نے کہا۔ ”لٹاریوں کے پاس چوٹی کیوں پہنچی؟“

”میں صادک آباد اسی کے پاس گئی تھی۔“ ”مرجان کا چہرہ اور افسردہ ہو گیا۔“ ”پر اس نے ملنے سے صاف انکار کر دیا۔ مجھے اپنے گھر میں گھسنے بھی نہ دیا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ نراض ہے۔“ ”وہ تجھ سے اتنا نراض کیوں ہے؟“

”وہ مجھ سے تب ہی سے نراض ہے جب میرا سردار نجیب خان کے ساتھ پرنا ہوا تھا۔“ ”مرجان نے جواب دیا۔“ ”وہ اس رشتے کے سخت خلاف تھا۔ اس نے پیڑے سے اتنا جھگڑا کیا کہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ میرے پرانے میں بھی شریک نہیں ہوا۔ اب مجھ سے اور بھی زیادہ نراض ہے۔ اور اس لیے نراض ہے کہ میں سراب کے ساتھ کیوں نکلی۔“

”نراض ہونے کی تو گل ہی ہے۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”تو نے یہ نہیں سوچا

کہ سراب کی ہے۔ وہ تیری ہی حویلی کا مٹا تھا۔ تو نے یہ بت برا کیا۔ یہ تو بت ہی بدنامی کی گل ہے۔ تو نے سب کے منہ پر کالک لگا دی۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔

”میں سراب کے ساتھ نہ نکل بھاگتی توشہ زور مجھے کتل کر دیتا۔“ مرجان نے صفائی پیش کی۔

”شہ زور میرے خون کا پیاسا ہے۔ وہ اسی روز سے خار رکھتا ہے جب میں حویلی میں سردار نجیب کی رن بن کر داخل ہوئی۔“

”جب تجھے پتہ ہے کہ شہ زور تیرے خون کا پیاسا ہے تو اب تو اس سے کیا کتنا چاہتی ہے؟“

”وہ جانیدا ہی کے لیے تو میرے خون کا پیاسا ہے ناں۔“ وہ تھکے لہجے میں بولی۔ ”مجھے ایسی جانیدا نہیں چاہیے۔ وہ مجھے جھوڑے۔ میں خوشی سے ساری جانیدا اس کے نام لکھ کر دے دوں گی۔ مجھے اس سے اب کچھ نہیں لینا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”تو میری یہ بات شہ زور تک پہنچا دے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”چوہدری مجھے بچا لے۔ وہ مجھے مار ڈالے گا۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ مجھے جانیدا نہیں زندگی چاہیے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”سین چوہدری، مجھے زندگی دلا دے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“

مرجان نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا اور ہلک ہلک کر رونے لگی۔ رحیم داد اٹھ کر اس کے قریب گیا اور اس کا سر آہستہ آہستہ تھک کر تسلی دینے لگا۔ ”تو اطمینان رکھ، میں شہ زور سے ضرور بات کروں گا۔ اسے سمجھاؤں گا۔ اسے ہر طرح راضی کرنے کی کوشش کروں گا۔ تو آنسو پونچھ۔ آرام سے سو۔ مجھے بھروسہ ہے وہ میری بات ضرور مان لے گا۔“

مرجان نے کچھ نہ کہا۔ اس کی سسکیاں کمرے کی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔

دروازہ چرچاتا ہوا ذرا سا کھلا۔ رحیم داد اور مرجان نے سرا سید ہو کر اس طرف دیکھا۔ دروازے کی آڑ سے نوری کا چہرہ نظر آیا۔ رحیم داد نے مرجان کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”بہت دیر ہو گئی۔ اب مجھے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ فکر نہ کر مرجان، جیسا تو چاہتی ہی ویسا ہی ہو گا۔“ وہ آگے بڑھا اور باہر چلا گیا۔

نوری نے دروازہ بند کیا اور اس میں تالا ڈالنے لگی۔ رحیم داد نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ درختوں کے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا اپنے کمرے کی جانب چلا۔ برآمدے میں پہنچا اور خاموشی سے بستر پر دراز ہو گیا۔



سردار شہ زور خان مزاری واپس آیا تو سردار مراد خاں شاہانی بھی اس کے ہم راہ تھا۔ رحیم داد

نے اسے حیرت سے دیکھا۔ خوش بھی ہوا۔ بڑھ کر نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا۔ ”شاہانی، تو کیسے ادھر آگیا؟“

شاہانی نے علیحدہ ہوتے ہوئے بتایا۔ ”شاہ جی تو ابھی کراچی سے لوٹا نہیں۔ البتہ اس کا بیٹا مرجان علی لائل پور سے واپس آگیا ہے۔ میں ایک روز شاہ جی کی کوٹھی پر گیا اور مرجان علی مجھے مل گیا۔ میں نے تیرے کلیم کے کاغذات اس سے لے لیے۔ مجھے پتہ تھا تو ابھی ادھر ہی ہے۔ سوچا تجھ سے مل لوں گا۔ کاغذات تیرے حوالے کر دوں گا۔“

”یہ تو نے بہت چنگا کام کیا۔“ رحیم داد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھی پتہ چلا کہ لائل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کا کیا بیانا؟“

”مرجان کتا تھا، الاٹمنٹ میں کچھ پیچیدگی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ زمین پہلے ہی دو کلیم ہولڈروں کو الاٹ ہو چکی ہے۔ مکدے بازی چل رہی ہے۔ معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔“

”یہ تو نے چنگی خبر نہیں سنائی۔“ رحیم داد بھگ کر رہ گیا۔

”فکر نہ کر چوہدری۔“ شہ زور مزاری نے اسے تسلی دی۔ ”میں نے ڈپٹی کمشنر اور محکمہ بحالیات کے افسروں سے تیرے بارے میں بات کر رکھی ہے۔ تحصیل راجن پور میں تیرے لیے متروکہ اراضی بھی دیکھ لی ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہے۔“

”کیسی زمین ہے؟“ رحیم داد نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تو نہری زمین کو کتا تھا۔ یہ نہری ہی زمین ہے۔“ مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔ ”بہت زیادہ زمین ہے۔ تیرے لیے اڑھائی سو ایکٹر تو آسانی سے الاٹ ہو جائے گی۔“

شام کا جھٹ پٹا تھا۔ اندھیرا فضا میں آہستہ آہستہ گھل رہا تھا۔ تینوں برآمدے کے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ نوکروں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے موٹے لاکر رکھ دیے۔ وہ اطمینان سے ان پر بیٹھ گئے۔

”چوہدری یہ تو بہت ٹھیک ہوا۔“ شاہانی نے بے تکلفی سے تقہر لگایا۔ ”تجھے ادھر زمین الاٹ ہو گئی توشہ زور کے ساتھ اچھا وکٹ گزرے گا۔ یہ یاروں کا یار ہے۔ اور کام آنے والا بندہ ہے۔“

مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”شاہانی آج صبح شاہ میر پختیہ گیا تھا۔ میں نے اس سے تیرے کلیم کے کاغذات لے کر درخواست بھی تیار کر والی۔ چاکر خان کے پاس ہے۔ دستخط کر دیتا۔ دو چار روز میں وہ درخواست لگا دے گا۔ الاٹمنٹ کی پرواہ نہ کر۔ کام فائنٹ بن جائے گا۔ میں چاہتا ہوں تو ادھر میرے پاس آجا۔“

”الائمنٹ مل جائے تو ادھر بھی آتا رہوں گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”پر میری اصلی زمین داری تو کوئلہ ہر کٹن ہی میں ہے۔ اسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔“

”کون کتا ہے تو اسے چھوڑ دے۔“ شاہانی نے اتفاق رائے کیا۔ ”پر تیرا ادھر رہنا کون سا ضروری ہے۔ تجھے خود تو زمیں داری چلائی نہیں۔ تیرا کاردار نادر خاں کام کا بندہ لگتا ہے۔ وہ زمیں داری کی اچھی طرح دیکھ بھال کر سکتا ہے۔ زمیں داری تو کاردار اور کم داری چلاتے ہیں۔“

”سارے ہی وڈے زمین داروں کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔ ذرا ہشیار رہنا پڑتا ہے۔ کاردار کم دار اور مزارعوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔“ مزاری نے مراد خاں شاہانی کی تائید کی۔

چاکر خاں سرگانی بھی پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں الائمنٹ کی درخواست تھی۔ رحیم داد اس کے ہم راہ کمرے کے اندر گیا۔ لیپ کی روشنی میں اس نے درخواست پر ایک نظر ڈالی اور دستخط کر دیے۔

سرگانی چلا گیا۔

رحیم داد احاطے میں واپس پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ گھروں میں چراغ جھللا رہے تھے۔ باورچی خانہ نوکروں کی کوٹھریوں کے قریب ہی تھا۔ ادھر گوشت بھونا جا رہا تھا۔ اس کی تیز خوش بو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ مزاری اور شاہانی کے سامنے اسکاچ کی بوتل رکھی تھی۔

مراد خاں شاہانی نے بیگ بنا کر رحیم داد کو دیا۔ اپنا گلاس اٹھایا۔ رحیم داد کے گلاس سے لکرایا اور وہسکی کی چسکی لگاتے ہوئے بولا۔ ”مزاری نے تیرا دل بھلانے کا بھی کوئی انتظام کیا؟“

”کیا تو ہے۔“ رحیم داد نے بلی زبان سے کہا۔

مراد خاں شاہانی ہنس کر بولا۔ ”لگتا ہے، تجھے ادھر پسند کی ڈال نہیں ملی۔“ اس نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”چوہدری، پسند نا پسند کے چکر میں نہ پڑ۔ ہر ڈال چنگی ہوتی ہے۔ بس نئی ہوتی

چاہیے اور ہر رات ملتی چاہیے۔“

”شاہانی تو ڈال کے معاملے میں بالکل سندھی وڈیرا ہے۔“ مزاری نے قہقہہ بلند کیا۔ ”میری ایک بھین ساگنڈھ میں دیا می ہے۔ اس کا خاوند سندھی بلوچ ہے۔ جانے کب سے اس کا خاندان

ادھر آباد ہے۔ وہ سندھی کی ایک مثال سنا تا ہے۔ وہ کچھ اس طرح ہے کہ بھوک میں تو کواڑ بھی پاؤں لگتے ہیں۔ کہتا تھا رن کے معاملے میں تو سندھی وڈیروں کا حال یہ ہے کہ کسی جھاڑی پر بوجھن پڑا

لہراتا ہو تو وڈیرے دونوں بازو پھیلا کر اسے بھی بھینچ لیتے ہیں۔“

سردار شہ زور خاں مزاری نے بات ختم کی تو زور کا قہقہہ بلند ہوا۔ تینوں نشے کی جھونک میں دیے

تک ہنستے رہے۔

نوکر نے پلیٹ میں گرم گرم تلا ہوا مرغ لا کر میز پر رکھ دیا۔ تینوں اسکاچ وہسکی کے گھونٹ بھرتے رہے۔ نوج نوج کر مرغ کا گوشت کھاتے رہے۔ رات کی تاریکی بڑھتی گئی۔ سناٹا سوا ہو گیا۔ شہ زور مزاری کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا تھا۔ پہر رات گزرتے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ شاہانی اور رحیم داد وہسکی سے شغل کرتے رہے۔

☆

سردار مزاری کے اچانک اٹھ کر چلے جانے پر رحیم داد پریشان ہو گیا۔ وہ مرجان کے بارے میں اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر شہ زور اکیلا نہ تھا۔ مراد خاں شاہانی بھی ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایسی بات چھیڑنا مناسب نہ معلوم ہوا۔

مگر مزاری جا چکا تھا۔ صبح جرگہ تھا۔ اسکے شروع ہونے سے پہلے ہی رحیم داد کو مرجان کا عندیہ نہ صرف مزاری کو پہنچانا تھا بلکہ اس پر اسے رضامند کرنے کی بھی اپنے طور پوری پوری کوشش کرنا تھی۔ رحیم داد آہستہ آہستہ وہسکی کے گھونٹ بھرتا رہا اور خاموش بیٹھا سوچتا رہا کہ مرجان کے معاملے پر کس طرح سردار مزاری سے بات کرے۔

مراد خاں شاہانی نے اسے خاموش پایا تو آکتا کر بولا۔ ”سین چوہدری، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

رحیم داد لمحہ بھر تک ٹٹکی باندھے اس کا چہرہ تکتا رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے شہ زور سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔“

”وہ اتنی دیر تیرے ساتھ بیٹھا رہا، تو نے تب گالہہ کر لی ہوتی۔“ شاہانی نے مشتبہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”لگتا ہے تو میرے سامنے بات کرنی نہیں چاہتا تھا۔“

”ہاں!“ رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ ”بات ہی کچھ ایسی ہے۔“

”مجھے بتانے کی نہیں؟“ شاہانی نے پوچھا۔

”اب تجھے ہی بتانی ہوگی۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”شہ زور مزاری تو اب اپنے کمرے میں ہو گا۔ اس کے ساتھ جلاوت کی گھردالی یا کوئی اور زبانی ہوگی۔“

”ہاں، اب اسے ملنا مشکل ہو گا۔“ شاہانی نے قدرے توقف کیا۔ ”کوئی خاص گالہہ نہ ہو تو مجھے

بتا دے۔ ویسے تیری مرضی۔“

رحیم داد اپنا مونڈھا کھسکا کر مراد خاں شاہانی سے اور قریب ہو گیا۔ اس نے ادھر ادھر چوکنا نظروں سے دیکھا۔ آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد کے چہرے سے

سراسیمگی عیاں تھی۔

مراد خاں شاہانی نے اس کی یہ کیفیت دیکھی تو آہستہ سے پوچھا۔ ”سین چوہدری، تواتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے؟“

”گل ہی ایسی ہے۔“ رحیم داد نے رازدارانہ انداز میں دھیرے سے کہا۔ ”تجھے پتہ ہے، مرجان ادھر ہی ہے۔“

”ہوگی۔ تجھے اس سے کیا لینا۔“ مراد خاں شاہانی نے بے نیازی سے کہا۔

”پہلے میری گل تو سن لے۔“ رحیم داد نے سرگوشی کی۔ ”اس نے ایک رات مجھے اپنے کمرے میں بلوایا تھا۔“

”مرجان نے تجھے اپنے پاس بلایا تھا!“ شاہانی نے چونک کر حیرت زدہ نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو اس کے پاس گیا تھا؟“

”ہاں میں اس کے پاس گیا تھا۔“

”تو نے اسے دیکھا ہے؟“ شاہانی بدستور حیرت زدہ تھا۔

”ویسے دیکھا تو میں نے اسے ایک بار پہلے بھی تھا۔ تب وہ چدر سے منہ چھپائے ہوئی تھی۔ اندھیرا بھی تھا۔ شہ زور مزاری بھی ساتھ تھا۔ میں دیکھ کر بھی اسے دیکھ نہیں سکا تھا۔“ رحیم داد نے شاہانی کو بتایا۔ ”پر اس رات جب اس نے اپنے کمرے میں بلوایا تب میں نے اسے ٹھیک سے دیکھا۔“

”سنا ہے بہت سوہنڑی رن ہے۔ تو بتا کیسی ہے؟“ شاہانی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”ہے تو جی وہ بہت سوہنی اور جوان بھی ہے۔ بالکل نیار لگتی ہے۔“ رحیم داد نے رک رک کر بیان کیا۔ ”پر اب تو سمجھو اجڑ کر رہ گئی ہے۔ موت کے ڈرنے سے اسے ایک دم پیلا کر دیا ہے۔“ اس نے شاہانی کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”تجھے پتہ ہے، اصل جھگڑا کیا ہے؟“ پھر اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی دے دیا۔ ”سارا جھگڑا تو جائیداد کا ہے۔“

”اتنا تو مجھے بھی پتہ ہے۔ یہ بہت پرانا جھگڑا ہے۔“ شاہانی نے بتایا۔ ”یہ جھگڑا تو شہ زور کے پیو سردار نجیب خاں کی زندگی ہی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کے مرن کے بعد بہت برہ گیا۔“ اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ ”پر جائیداد کا جھگڑا تو بہت پیچھے رہ گیا۔ اب تو یہ جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ وہ سراب کی ساتھ بھاگ کر لغاریوں کے پاس چلی گئی۔ تجھے پتہ ہے۔ لغاریوں سے مزاریوں کی کتنی زبردست دشمنی ہے۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”مرجان نے یہ بہت برا کیا۔ اس

نے شہ زور مزاری اور اس کے خاندان کی پیشانی پر ٹک لگا دیا۔ اسے اپنی ہی حویلی کے کی سراب کے ساتھ نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔“ شاہانی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”بھاگنے کے لیے سراب کے سوا اسے اور کوئی نہیں ملا۔“

”مرجان کتنی تھی، شہ زور جائیداد حاصل کرنے کے لیے اسے جان سے مار دینا چاہتا تھا۔“ رحیم داد نے مرجان کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”شاید تجھے پتہ نہیں، شہ زور اور اس کے چھوٹے بھائی حنے مرجان کو دوبار زہر دے کر مار ڈالنے کی کوشش کی۔ جائیداد کے لیے تو اس نے اپنے بھائی کو بھی قتل کر دیا۔“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم تھا۔“ شاہانی کی آنکھوں میں استعجاب تھا۔ ”میں نے تو یہ سنا ہے اس کی لاش جیب میں پائی گئی تھی۔ وہ اکیلا اپنی جیب چلا رہا تھا۔ لغاریوں نے چھپ کر اس پر حملہ کیا اور رات کے اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ شہ زور نے مجھے یہی بتایا تھا۔ تو بالکل نئی گالہ سنا رہا ہے۔“

”پتہ نہیں کون سچا ہے۔ مرجان تو مجھے یہی بتاتی تھی کہ اسے شہ زور نے قتل کر دیا تھا۔“

”چوہدری، سچ تو پتہ تو یہ جائیداد ہوتی ہی ایسی ظالم ہے۔ اندھا بنا دیتی ہے اندھا۔“ شاہانی نے اس دفعہ اپنے شے کا اظہار کیا۔ ”اب یہ بتا۔ مرجان نے تجھے کس لیے رات کو اپنے پاس بلایا تھا۔“ اس نے نشے کی جھونک میں ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”یاری لگانے کے لیے تو تجھے بلایا نہیں ہو گا۔“

”ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ رحیم داد نے کھل کر بتایا۔ ”وہ چاہتی ہے، شہ زور اسے معافی دے دے۔ اسے چھوڑ دے۔ جرجے میں اس کا معاملہ پیش نہ کرے تو وہ اپنے حصے کی تمام جائیداد شہ زور کے نام لکھ دے گی۔ اسے زندگی چاہیے ہے جائیداد نہیں۔ شہ زور سے یہی بات کہنے کے لیے اس نے مجھے بلایا تھا۔“

”یہ بات تو وہ شہ زور سے خود بھی کہہ سکتی ہے۔“ شاہانی نے کہا۔ ”تیرے ذریعے کیوں کہلوانا چاہتی ہے؟“

”اس نے شہ زور سے گل بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے، اسے کامیابی نہیں ہوئی۔“ رحیم داد نے توجیہ پیش کی۔ ”میں نے تو اس کی باتوں سے یہی اندازہ لگایا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے وہ یہ سمجھتی ہو کہ میرے سمجھانے بجھانے پر شہ زور راضی ہو جائے اور جائیداد لے کر اسے چھوڑ دے معافی دے دے۔“

مراد خاں شاہانی کچھ دیر غلامی گھورتا رہا۔ وہ سوچتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے مڑ کر رحیم داد

پھنسا چاہتا ہے۔ اسے تو جائیداد ہی چاہیے نا وہ مل جائے گی۔ مرجان کی جان لے کر اسے کیا ملے گا؟

”مان لے وہ مرجان کی شرط منظور کر لے۔“ شاہانی نے سنجیدگی سے کہا۔ ”جائیداد اپنے نام لکھوا کر اسے چھوڑ دے۔ پرشہ زور یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ وہ سراب کے ساتھ رہے۔“ شاہانی نے نظر بھر کر رحیم داد کو دیکھا۔ ”سراب کو تو وہ زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ کی ہے۔ ملوک زادی کو بھگا کر لے گیا۔ اس کا یہ جرم کیسے معاف کیا جاسکتا ہے۔ اسے اتنے سنگین جرم کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔ تو خود ہی بتا سراب کو سزا ملنی چاہیے یا نہیں؟“

”ضرور ملنی چاہیے۔“ رحیم داد کے اندر چھپا ہوا زمین دار فوراً جاگ اٹھا۔ ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سراب کی ہے۔ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں لیا۔ جتنا ڈاا اس نے جرم کیا اتنی ہی سخت اسے سزا ملنی چاہیے۔“ رحیم داد نے تامل کیا۔ ”میرا خیال ہے مرجان بھی سراب کو بچانے کی کوشش نہیں کرے گی۔ وہ تو اپنی جان بچانا چاہتی ہے۔ اسے اب یہ پتہ چل گیا ہے کہ اس نے سراب ایسے کی کے ساتھ فرار ہو کر غلطی کی۔“

”مرجان نے ایک اور زبردست غلطی یہ کی کہ لغاریوں کی پناہ میں چلی گئی۔ ان کی باہوت بن گئی۔“ شاہانی نے نشے سے لہرا کر کہا۔ ”اس نے بہت برا کیا۔ بہت برا کیا۔ اپنے بھائی کے پاس چلی جاتی تو بہت سی مصیبتوں سے بچ جاتی۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ اس نے رحیم داد کی طرف خارا آلود نظروں سے دیکھا۔ ”سنا ہے اور تجھ سے ہی سنا ہے کہ اس کا ایک بھائی بھی ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی سنا۔“ رحیم داد نے اس کی اطلاع کی تصدیق کی۔ ”مرجان کا اب ایک ہی بھائی ہے۔ صادق آباد میں زمین داری کرتا ہے۔ مرجان نے مجھے یہی بتایا تھا۔ وہ یہ بھی بتاتی تھی کہ وہ اپنے بھائی کے پاس گئی تھی پر وہ اس سے اتنا زیادہ نراض ہے کہ نہ بات کی اور نہ ہی اسے اپنے گھر میں داخل ہونے دیا۔ وہ روٹی بیٹی واپس آگئی۔ اس کا کوئی ایسا شریک بھی نہیں جس کے پاس جا کر وہ ٹھہر جاتی۔ لغاریوں کے پاس پناہ لینے نہ جاتی تو کس کے پاس جاتی۔“

رحیم داد نے مرجان کی اس طرح وکالت کی کہ مراد خاں شاہانی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ آہستہ سے بولا۔

”مجھے ان باتوں کا بالکل پتہ نہ تھا۔“

”پر تجھے یہ تو پتہ ہے کہ مرجان ایک بار تو لغاریوں کے پاس سے چلی آئی تھی۔“ رحیم داد نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”جب اسے کہیں بھی پناہ نہ ملی، کوئی اسے اپنے ساتھ

کی جانب دیکھا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سین چوہدری، ویسے تو شہ زور مزاری کو مرجان کی تجویز مان لینی چاہیے۔ پر اب ایسا ہو نہیں سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“ رحیم داد نے مراد خاں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”اسے جائیداد چاہیے، وہ مل جائے گی۔ مرجان کا خون وہ کیوں اپنی گردن پر لینا چاہتا ہے۔ جب آسانی سے کام بن جائے تو خون خرابہ کرنے سے کیا فائدہ۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”مجھے کنون کا ٹھیک سے پتہ نہیں۔ پر ایسے ہی ایک کدے میں مجھے گواہ بننا پڑا تھا۔ میرے پڑوس میں ایک رائڈر تھی۔ اس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ مرنے کے بعد سوتیلے پتروں نے زمین پر کبضہ کر لیا۔ لیکن مرنے والی کے بھائی یحیٰی نے ان کے خلاف کدمہ کر دیا۔ اور جیت بھی گئے۔“

”تو کہتا کیا چاہتا ہے؟“ شاہانی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔

”میں یہ کہتا چاہتا ہوں کہ مرجان کے مرنے کے بعد اس کا بھائی بھی جائیداد حاصل کرنے کے لیے شہ زور کے خلاف کدمہ کر سکتا ہے۔ اسے جیت بھی جانا چاہیے۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے اختلاف رائے نہ کیا۔ ”شہ زور مزاری کو بھی اس کا پتہ ہو گا۔ تب ہی وہ جرگے کے سامنے کدمہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ اگر مرجان پر سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا۔ اور جرگے نے اسے کالی اور سراب کو کالا کرار دے دیا تو جائیداد پر مرجان کا حکم ختم ہو جائے گا۔ اس کی ساری جائیداد خود بخود مزاری کو مل جائے گی۔“

”تب تو شہ زور نہیں ملے گا۔“ رحیم داد نے مجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر سوالیہ نظروں سے شاہانی کی جانب دیکھا۔ ”کیا جرگے کے فیصلے کے خلاف عدالت میں معاملہ نہیں پیش کیا جاسکتا؟“

”پیش تو کیا جاسکتا ہے اور اکثر ایسے کدے عدالت میں پیش بھی کیے گئے۔“ شاہانی نے بتایا۔ ”پر بلوچ جرگے کے فیصلے کے خلاف عام طور پر سرکاری عدالتوں میں نہیں جاتے۔ اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے مرجان کا بھائی ایسا کرے۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ تو یہاں رہتا بھی نہیں۔ ممکن ہے وہ جرگے کا فیصلہ نہ مانے۔“

”ایسا وہ کر تو سکتا ہے۔“ شاہانی نے رحیم داد سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔

”میں تو کہتا ہوں، شہ زور کے لیے یہ ٹھیک رہے گا کہ وہ مرجان کی تجویز مان لے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر مراد خاں شاہانی کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”خانا خاں وہ کیوں جھڑے میں

رکھنے پر تیار نہ ہوا تو مجبور ہو کر دوبارہ لغاریوں کے پاس جا رہی تھی۔ کتنی بھی کیا۔ اسے پتہ تھا کہ شہ زور نے اپنے بندے اسے اور سراب کو پکڑنے یا کتل کرنے کے لیے لگا رکھے ہیں۔ وہ تو لغاریوں کے پاس پہنچ بھی جاتی پر رستے میں شہ زور مزاری نے اسے اور سراب کو پکڑ لیا۔ میں تو شہ زور کے ساتھ ہی تھا۔ گیدڑ والا کے نزدیک اس نے دونوں کو پکڑا تھا۔

”یہ تو مجھے پتہ ہے۔ شہ زور نے مجھے شاہ میر میں بتا دیا تھا۔“ شاہانی نے بات مختصر کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ بتا آگے کیا کرتا ہے؟“

”میں نے تجھے بتایا نہیں کہ تو شہ زور مزاری کو سمجھا بھگا کر راضی کرنے کی کوشش کر۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”تو اس کا پرانا یار ہے۔ تیری گل وہ مان لے گا۔ مرجان زندہ بچ گئی تو تجھے دھابی دے گی۔ وہ مرنا نہیں چاہتی۔ پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی۔ منت اور زاری کرتی تھی۔“

”مرجان کو نہیں مرنا چاہیے۔ تو ٹھیک کہہ رہا ہے، ابھی تو وہ جوان ہے۔“ شاہانی نے مرجان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ ”میں مرجان کے بارے میں مزاری سے بات تو کر سکتا ہوں۔ جب وہ لغاریوں کے پاس چوٹی میں تھی تو شہ زور نے مرجان کے بارے میں بات کی تھی۔ اور اپنا پرانا یار سمجھ کر کی تھی۔ ایسی بات ہر ایک سے تو نہیں کی جاسکتی۔“

”تب تو مزاری سے تو مرجان کے بارے میں نڈر ہو کر گل بات کر سکتا ہے۔ اسے سمجھا بھگا کر راضی بھی کر سکتا ہے۔“

”مزاری نے جب مرجان کے بارے میں بات کی تھی تب حالات اور تھے۔ تب وہ مجبور تھا۔ سخت پریشان تھا۔“ شاہانی رک رک کر بول رہا تھا۔ ”اب وہ مزاری کی کید میں ہے۔ ایسے میں مرجان کے بارے میں اس سے بات کروں گا تو وہ پوری طرح جرح کرے گا۔“

”شاہانی تو بھی عجب بندہ ہے۔“ رحیم داد تکیے لمبے میں بولا۔ ”کبھی کبھار کتا ہے کبھی کچھ۔ صاف صاف گل بات کر۔“

”صاف ہی صاف گل بات کر رہا ہوں۔ نراض کیوں ہوتا ہے۔“ شاہانی نے رحیم داد کو متانے کی کوشش کی۔

”تیری باتوں سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ مرجان کو بچانے کی کوئی صورت نہیں رہی۔“ رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر کچھ لمبے میں کہا۔

شاہانی وہ سکی کا بڑا سا گھونٹ بھر کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چند لمبے خاموش رہنے کی بعد اس نے گردن اٹھا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”یہ بتا، شہ زور نے اگر مجھ سے یہ پوچھا کہ مرجان کو اس

نے چھوڑ دیا تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ دوبارہ لغاریوں کی باہوت نہ بن جائے۔ بتائیں اسے کیا جواب دے گا۔ تو نے خود ہی بتایا تھا کہ لغاریوں کے علاوہ کوئی اسے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں۔ یہ تو سوچ وہ جائے گی تو کہاں جائے گی؟ کس کے پاس جائے گی؟“

”یہ سوال مزاری کر تو سکتا ہے۔“ رحیم داد نے شاہانی سے اتفاق رائے کیا۔

”ایک اور تجویز سمجھ آتی ہے۔“ شاہانی نے کہا۔

”وہ کیا ہے؟ صاف صاف بتا۔“ رحیم داد نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”اگر مرجان کسی سردار یا اونچی ذات برادری والے زبیر دار سے نکاح کر لے تو اس کے لیے کہیں جانے اور پناہ مانگنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔“ شاہانی نے اپنی تجویز کی وضاحت کی۔ ”تب تو مزاری کو بھی رضا مند کیا جاسکتا ہے۔ پر سوال یہ ہے کہ ایسا بندہ کہاں ملے گا جو مرجان سے پرنا کرنے پر آمادہ ہو جائے۔“

”میں تو کہتا ہوں تو مرجان کو اپنی گھر والی بنالے۔ وہ جوان ہے۔ سوہنی ہے اور ملوک زادی بھی ہے۔“ رحیم داد نے مشورہ دیا۔ ”تو بھی بلوچ سردار ہے۔ شہ زور مزاری بھی مان جائے گا۔“

”تو کیسی گالہ کر رہا ہے۔“ شاہانی جھنجھلا کر بولا۔ ”تو اسے اپنی گھر والی کیوں نہیں بنا لیتا۔ تو اکیلا ہے۔ تجھے اپنے لیے ایک دن کی ضرورت بھی ہے۔“

”تو کہتا ہے تو میں مرجان سے ویاہ کر لوں گا۔ بچ پوچھ تو مرجان مجھے پسند بھی ہے۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”سُن چودری، تو مرجان کو اپنی دن بنالے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ مراد خاں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر تعجب سے آنے کے انداز میں کہا۔ ”یہ تو سوچ وہ سراب کے ساتھ یاری لگا چکی ہے۔ مدت تک اس کے ساتھ رہی ہے۔ سب کو اس کے بارے میں پتہ ہے۔ وہ بہت بدنام ہو چکی ہے۔ ایسا بد چلن اور بے معیار ذال کو تو کیسے اپنی گھر والی بنا سکتا ہے؟“

”میں تیری طرح بلوچ سردار نہیں ہوں۔“ رحیم داد نے پوری سنجیدگی کے ساتھ شاہانی کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ”مجھے بدنامی شد نامی کی فکر نہیں۔ جیلہ بھی تو کئی کیوں اور مزارعوں کے

پاس فسادات کے زمانے میں رہ چکی تھی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ میں تو اسے ہر طرح اپنی گھر والی بنانے پر تیار تھا۔ پر وہ راضی ہی نہیں ہوئی۔ واپس اپنے گھر والوں کے پاس چلی گئی۔“

”تو مرجان ہی سے کیوں پرنا کرنا چاہتا ہے؟“ شاہانی نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ”تجھے تو بہت عزت دار خاندان کی کڑی مل سکتی ہے۔“

اس نے ذرا جھپکی لی ہی تھی کہ آہٹ سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا، نوری پتنگ کے قریب کھڑی ہے۔ وہ جھٹ اٹھ کر بیٹھ گیا اور نوری کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھالیا۔ اس کے کپڑے صاف ستھرے تھے۔ سر کے بالوں میں تل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں گمراہی کا جہل تھا۔ اس کا سانولا چہرہ کمرے میں روشن لیمپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں تازہ اور بیاں نش نظر آ رہا تھا۔

نوری نے بستر پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ ”تو نے ملوک زادی کے بارے میں سردار سے بات کی؟“
”شام ہی کو بات کی تھی۔ جیسے مرجان نے کہا ویسے ہی کی تھی۔“ رحیم داد صاف جھوٹ بول گیا۔

”سین، یہ تو نے بہت ٹھیک کیا۔ توں سدا چوبی۔ سکھی صحت ہووی۔“ وہ اسے دعائیں دینے لگی۔ اس کے انداز میں خوشامد تھی۔ ”ملوک زادی بہت دکھ میں ہے۔ بار بار روتی ہے۔“ اس کا لہجہ اور دھیمہ ہو گیا۔ ”اس نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے۔“
”نو شیر کو پتہ ہے تو ادھر ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”بالکل پتہ ہے؟“ نوری نے مسکرا کر بتایا۔ اس کے انداز میں لگاوت تھی۔ ”اسے یہ بھی پتہ ہے ملوک زادی نے آج اپنے کئی اور گھنے بھی مجھے دے دیے ہیں۔“ اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”ان میں سونے کی باڑی بھی ہے۔ بہت سوہنری ہے۔ میں اسے میاں پہنوں گی۔“ اس نے اپنے کان کے درمیانی حصے کو انگلیوں سے پکڑ کر دکھایا۔ ”یہ بتا، سردار تیری گالہ سن کر کیا بولا۔“
”تو اس دھمت مرجان کے پاس جاسکتی ہے؟“

”اب تو مشکل ہے۔ سردار بھی ادھر موجود ہے۔“ اس کے چہرے سے سراپنگی جھلکنے لگی۔
”تو نے ملوک زادی سے کچھ کہلوانا ہے؟“
”بہت ضروری گل بات کہلوانی ہے۔“ رحیم داد نے کہا۔
”نو شیر سے گالہ کئی ہو گی۔“ وہ رمان سے بولی۔ ”یہ بتا، سین، تو نے ملوک زادی سے کیا کہلوانا ہے؟“

”اسے جا کر بتا دے کہ جائیداد کے ساتھ اسے سراب کو بھی چھوڑنا ہو گا اور مجھ سے ویاہ کرنا ہو گا۔“

”تو اسے اپنی رن بنا لے گا؟“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رحیم داد سے دریافت کیا۔
”سوچ لے۔“

”سوچ لیا، بالکل سوچ لیا۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ ”میں مرجان کو بچانے کے لیے سب

”میں نے مرجان سے وعدہ کر لیا ہے۔“ رحیم داد نے جوش و خروش کا اظہار کیا۔ ”میں اسے مرنے نہیں دوں گا۔ اسے بچانے کے لیے پوری پوری کوشش کروں گا۔“ اس نے پراعتماد نظروں سے مراد خاں شاہانی کو دیکھا۔ ”میں تو تیار ہوں۔ پر شہ زور مزاری بھی مان جائے گا کہ میں مرجان کو اپنی گھر والی بنالوں؟ تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ میں بلوچ سردار نہیں ہوں۔“
”تو بلوچ سردار نہیں ہے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے کہا۔ ”لغار یوں نے اپنی ایک دھمی منھ دموں کو اور دوسری ممدوٹوں کو دیا ہی ہے۔ وہ کون سے بلوچ سردار ہیں۔“ اس نے گلاس اٹھا کر چسکی لگائی۔ ”تو بھی وڈا زمین دار ہے۔ شہ زور مزاری کو تجھے قبول کر لینے میں کیا رکاوٹ ہو سکتی ہے۔“

”وہ تیار ہو سکتا ہے تو میں نکاح پڑھا کر مرجان کو اپنے ساتھ لے جانے پر بالکل تیار ہوں۔ میں مرجان کو موت کے منہ سے نکالنا چاہتا ہوں۔“ اس کے لہجے میں جوش و خروش سے زیادہ عاجزی تھی۔ ”شاہانی اسے بچانے میں میری مدد کر۔ تو مزاری سے بات کر۔ تو کہے گا تو وہ ضرور مان جائے گا۔“

”سین چوہدری، تو بہت نیک بندہ ہے۔“ شاہانی نے رحیم داد کے جذبے کو سراہا اور یقین دلایا۔
”میں مزاری سے ضرور بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ اس شرط پر مان جائے کہ مرجان کے ساتھ تیرا پرنا ہو جائے اور مرجان اپنے حصے کی بیکیر اور جائیداد سے دست بردار ہو جائے۔“
”تجھے کل سویرے ناشتے پر جرگہ شروع ہونے سے پہلے پہلے شہ زور سے اس معاملے میں گل بات کرنی ہو گی۔“ رحیم داد نے مشورہ دیا۔ ”میں ناشتا اپنے کمرے میں ہی کروں گا۔ تو اکیلے میں شہ زور سے کھل کر بات کر سکے گا۔ ضرورت پڑے تو مجھے بلا لیتا۔“

مراد خاں شاہانی نے رحیم داد کو ایک بار پھر یقین دلایا۔ ”اطمینان رکھ میں شہ زور مزاری سے ضرور گل بات کروں گا۔ جیسا تو کہتا ہے ویسے ہی کروں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور جھومتا جھامتا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کا کمرہ بالکل بکھر چکا تھا۔



اندھیرا گمراہ ہو گیا تھا۔ رات سنسان تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ صرف نوکروں کی ایک کوٹھری میں چراغ روشن تھا۔ اس کی دھندلی روشنی تاریکی میں روشن دھبے کی مانند جگمگا رہی تھی۔
رحیم داد نے قیص اور شلوار اتار کر دھوئی باندھی اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نشے سے بوجھل تھیں۔ لیٹتے ہی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ نیند کا غلبہ بڑھنے لگا۔

کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ تو جا کر اسے بتا دے۔ اگر اس نے یہ شرط مان لی تو سردار اسے معاف کر دے گا۔ جرے میں اس کا کلمہ بھی پیش نہیں کرے گا۔“

”پتہ نہیں ملوک زادی تیری شرطیں ماننی ہے کہ نہیں۔“ نوری نے تہمت سے کہا۔ ”میں نوشیر کے پاس جاتی ہوں۔ اس سے صلاح کرنے کے بعد ملوک زادی کو تیری گاہہ بتا۔ نہ کی کوشش کرتی ہوں۔“

وہ اٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے ٹوکا۔ ”دیر نہ لگانا۔ میں تیرا انتظار کروں گا۔“

وہ ہولے ہولے گردن ہلاتی، دے قدموں چلتی ہوئی دور چلی گئی۔ رحیم داد پھر بستر پر لیٹ گیا۔ بے چینی سے نوری کا انتظار کرنے لگا۔

نوری جلد ہی واپس آگئی۔

”تو مرجان کے پاس گئی تھی؟“ رحیم داد نے بے قراری سے پوچھا۔ ”میں نے تجھے جو کہا تھا اسے بتا دیا؟ کیا کہا اس نے؟“ وہ سوال پر سوال کرنا چلا گیا۔

”سیں، میں اس کے پاس نہیں گئی۔ جا بھی نہیں سکتی تھی۔“

”کیوں؟“ رحیم داد نے گھبرا کر دریافت کیا۔

”جب میں تیرے پاس تھی تو سردار نے نوشیر کو بلایا۔ ملوک زادی کے کمرے پر جو تالا پڑا ہے اس کی چابی نوشیر سے لے کر اپنے پاس رکھ لی۔“ اس نے چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ ”سردار ابھی جاگ رہا ہے۔ جلالت کی رن بھی اس کے کمرے میں ہے۔“

”یہ تو بری خبر سنائی۔“ رحیم داد اور پریشان ہو گیا۔ ”سردار کو کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا۔“

”پتہ نہیں۔“ نوری نے کہا۔ ”دیے ایسا لگتا نہیں۔ سردار جب ادھر ہوتا ہے تو ملوک زادی کے کمرے کی چابی رات کو کبھی کبھی اپنے پاس رکھتا ہے۔“

”سردار اس سے ملنے تو نہیں گیا؟“

”اس کی مرضی ہے۔ مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“

”یہ تو ٹھیک نہیں ہوا۔ مرجان سے میری بات کہنی بہت ضروری تھی۔“ رحیم داد نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔

نوری نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ خاموشی سے اٹھ کر جانے لگی۔ رحیم داد نے روکنا چاہا۔ مگر وہ اس کے پاس مزید نہ ٹھہری۔ آگے بڑھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی رات کی تاریکی میں گم ہو گئی۔ رحیم داد دکھتا ہی رہ گیا۔ کچھ کہہ بھی نہ سکا۔

سویرے اس نے ناشتا اپنے کمرے ہی میں کیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ شاہانی کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ پھر دن گزرا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی۔ گیارہ بجے سے چند منٹ پہلے سردار مراد خاں شاہانی اس کے پاس آیا۔

رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”شبہ زور سے مرجان کے بارے میں تو نے گل بات کی؟“ اس کے لہجے سے بے قراری آشکارہ تھی۔

”میں نے اس سے گاہہ کر لی۔“ مراد خاں شاہانی مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے گویا ہوا۔ ”اس نے کیا سوچا اور کیا طے کیا؟ وہ تجھے خود بتا دے گا۔ ویسے جرگہ آج نہیں ہو رہا۔“

”یہ تو نے زبردست خبر سنائی؟“ رحیم داد نے اطمینان کی سانس لی۔ چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا شہار مٹنے لگا۔ ”یہ بتا، شبہ زور سے تیری کیا کیا گل بات ہوئی؟“

”میں نے بتایا نہیں، وہ تجھ سے خود بات کرے گا۔ تجھے سب کچھ بتا دے گا۔“

”تو نے اس کی باتوں سے کیا اندازہ لگایا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”وہ مان جائے گا ناں؟“

”مان تو جانا چاہیے۔ اس کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“

”اگے تیرا کیا ارادہ ہے۔ ابھی تو یہاں ٹھہرے گا نہیں؟“ رحیم داد نے مراد خاں کا پروگرام معلوم کرنا چاہا۔ ”میں چاہتا ہوں، تیرے یہاں رہتے ہوئے سب کچھ آرام سے طے ہو جائے۔“

”لیکن مجھے تو ابھی واپس جانا ہے۔“ مراد خاں شاہانی نے بتایا۔ ”میں تو تیرے کلیم کے کاغذات پہنچانے آیا تھا۔ مجھے بھکر جانا ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے ادھر گڑ بڑ ہے اور ابھی پوری طرح ختم نہیں ہوئی۔“

”ٹھہر جاتا تو ٹھیک تھا۔“ رحیم داد نے شاہانی کو روکنا چاہا۔

شاہانی مزید قیام کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا اور باہر جانے کے لیے دروازے کی جانب مڑا۔ رحیم داد بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے اور آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ پھانک پر پہنچ کر بھی وہ خاموش رہے۔ پھانک کے سامنے مزاری کی کار کھڑی تھی۔ مزاری بھی موجود تھا۔ شاہانی باری باری دونوں سے بغل گیر ہوا۔ چاکر خاں سرگانی نے بڑھ کر کار کا دروازہ کھولا۔ مراد خاں اندر داخل ہوا اور پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ کار آگے بڑھی، مگر دو غبار کے بادل اٹھنے لگے۔ کار تیزی سے دوڑتی ہوئی ایک موڑ پر مڑ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ رحیم داد واپس ہوا۔ مگر مزاری اس کے ہمراہ نہ گیا۔ چاکر خاں سرگانی کے ساتھ بستی کی جانب چلا گیا۔ رحیم داد سے اس کی کوئی بات چیت نہ ہوئی۔

رحیم داد اپنے کمرے میں پہنچا۔ مونڈھا سر کا یا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اسے توقع تھی کہ مزاری اس کے پاس آئے گا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا۔ سردار شہ زور مزاری کمرے میں داخل ہوا۔ وہ تیز دھوپ میں چل کر آیا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے بیگا ہوا تھا۔ وہ تھکا ہوا سا اس کے قرب ہی بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری، کلیم داخل کر دیا گیا۔ سرگانی بتاتا تھا چند روز میں الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔“

رحیم داد کو اس وقت متروکہ اراضی کے الاٹمنٹ سے زیادہ مرجان کے معاملے میں دلچسپی تھی۔ وہ مسلسل اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”تو کوشش کرے گا تو الاٹمنٹ ضرور مل جائے گی۔“

”سبس، تجھے الاٹمنٹ ملنے کی خوشی نہیں ہوگی؟“ شہ زور خاں مزاری نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ہوگی، کیوں نہیں ہوگی۔ اراضی ملنے کسے بری لگتی ہے۔“ اس نے تامل کیا۔ پھر دھڑکتے دل سے دریافت کیا۔ ”مراد خاں شاہانی سے صبح تیری کچھ گل بات ہوئی تھی؟“

”ہوئی تو تھی۔“ مزاری نے ہاتھ اٹھا کر پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ وہ رحیم داد سے نظریں ملانے سے کترا رہا تھا۔ دبی زبان سے بولا۔ ”اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ جو کچھ تو نے اسے کہا اس نے مجھ سے کہہ دیا۔“

”تو نے کیا طے کیا؟“ رحیم داد بے قرار ہو کر مجسم سوال بن گیا۔

”تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ تجھ سے کچھ چھپا نہیں۔“ اس نے رک رک کر رحیم داد سے کہا۔

”اب تو تجھ سے یاری بھی ہو گئی۔ تو بتا مجھے کیا طے کرنا چاہیے؟“

”شاہانی نے تجھے نہیں بتایا؟“

”اسے چھوڑ اپنی گانہ کر۔“ سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”میں تیری زبان سے سننا چاہتا ہوں کہ مرجان کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں تیری صلاح لیتا چاہتا ہوں۔“

”میری صلاح پوچھتا ہے تو میں تجھے یہی کہوں گا، مرجان اگر بگیر میں اپنا حصہ چھوڑنا چاہتی ہے اور تیرے نام کرنے پر تیار ہے تو اسے معافی دے دے۔“

”یہ شرط اس نے خود تجھے بتائی تھی؟“ سردار مزاری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

پوچھا۔

”ہاں!“ رحیم داد نے بہت مختصر جواب دیا۔ اسے دھڑکا تھا۔ کہیں مزاری یہ نہ پوچھ لے کہ وہ مرجان کے پاس پہنچا کیسے۔

مگر مزاری نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔ ”اپنی جائیداد تو وہ چھوڑ دے گی، پر وہ سراب کو بھی چھوڑنے پر تیار ہے کہ نہیں؟“ سردار مزاری کے تیوری پر بل پڑ گئے۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”وہ اسے چھوڑے نہ چھوڑے پر میں اس نمک حرام کو نہیں چھوڑوں گا۔ وہ بالکل بھول بیٹھا کہ وہ کمی ہے اور مرجان ملوک زادی۔ اس سنگین جرم کی اسے سخت سزا ملنی چاہیے۔“ اس نے گہری نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔ ”تو بتا مجھے سراب کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اسے اپنے کیے کی ضرور سزا ملنی چاہیے۔“ رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسے سراب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ مرجان کو بچانا چاہتا تھا جو خوبصورت تھی، جوان تھی، ملوک زادی تھی اور اسے پسند بھی تھی۔ اس نے برملا اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”مجھے سراب سے کیا لینا۔ تو اسے جو سزا دینی چاہے خوشی سے دے۔“ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ ”پر مرجان کو معافی دے دے۔“

”تو کتنا ہے تو اسے معافی دے دوں گا۔“ مزاری نے اس کی بات مان لی۔ ”شاہانی کہتا تھا تو اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”ہاں، میں اس کے لیے تیار ہوں۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”اگر تجھے کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے اس سے اب کیا لینا۔“ مزاری نے اپنی رضامندی دے دی۔ ”تو دو زائیں دار ہے، عزت دار بھی ہے۔ تیرے گھر میں رہے گی تو عزت ہی سے رہے گی میرے لیے اور میرے خاندان کے لیے بدنامی کا سبب تو نہیں بنے گی۔“ اس نے رحیم داد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ ”پر سوال یہ ہے کہ وہ بھی اس کے لیے تیار ہے۔ تو نے اس بارے میں اس سے معلوم کر لیا ہے؟“

”نہیں، میں نے اس بارے میں ابھی تک اس سے کوئی بات نہیں کی۔“ رحیم داد نے مزاری سے کہا۔ ”تیری مرضی ہو تو میں آج ہی اس سے مل کر اس بارے میں پوچھ لیتا ہوں۔“

”ابھی نہیں۔“ سردار مزاری آمادہ نہ ہوا۔ ”پہلے میں اپنے نام جائیداد کے ٹرانسفر کی اسٹامپ پیپر پر دستاویز تیار کروالوں۔ تو اسے لے کر مرجان کے پاس جانا۔ دستاویز پر اس کے دستخط لینا۔ وہ

دستخط کرنا جانتی ہے۔ انگوٹھے کا نشان نہ لگوانا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”دستخط کروانے سے پہلے اس سے پوچھ لینا کہ وہ تیرے ساتھ نکاح کرنا چاہتی ہے اور تیری ذال بن کر رہنا چاہتی ہے کہ نہیں؟“

”ایسا کیوں نہیں کرتا“ تو خود دستاویز لے کر اس کے پاس چلا جا۔ ”رحیم داد نے مشورہ دیا۔“ اس سے میرے بارے میں بھی پوچھ لینا۔“

”نہیں“ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گا۔ اسے دیکھ کر میرا خون کھول اٹھتا ہے۔ میں اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ ”سردار مزاری نے رحیم داد کی تجویز مسترد کر دی۔“ تجھے ہی اس کے پاس جانا ہو گا۔ اپنے بارے میں تجھے اس سے گاہہ کرنی ہوگی۔ وہ تیار ہو جائے تو دستاویز پر تجھے دستخط کرنے ہوں گے۔ دوسرا گواہ چاکر خاں ہو گا۔ وہ بھی دستخط کرے گا۔“

”تو کتنا ہے تو میں اس کے پاس چلا جاؤں گا۔“ رحیم داد آمادہ ہو گیا۔ ”دستاویز تو کب تیار کرائے گا؟“

”میں ابھی اس کام کے لیے چاکر خاں کو روانہ کیے دیتا ہوں۔ جیپ تو موجود ہے۔ وہ اس میں بیٹھ کر وکیل کے پاس چلا جائے گا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔ دستاویز تیار کروا کے کل شام تک واپس آجائے گا۔“ سردار مزاری نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ اس کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ نہ صرف پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے بلکہ چاکر خاں سرگانی سے صلاح مشورہ بھی کر چکا ہے۔

مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں چلا؟“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کیا۔

”میں نے چاکر کو دستاویز تیار کروانے کے لیے روانہ کرنا ہے۔ میں دوپہر کی روٹی کھانے تیرے پاس آؤں گا۔ اب مجھے جانے دے۔“ مزاری آگے بڑھا اور کمرے سے چلا گیا۔

رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مزاری کے جانے کے بعد وہ کمرے ہی میں بیٹھا رہا۔ وہ خوش اور مطمئن تھا کہ سردار مزاری نے بغیر کسی حیل و حجت کے اس کی بات مان لی۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا اس آسانی سے ہو جائے گا اسے یقین نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شہ زور خاں سرکش اور ضدی ہے لہذا طرح طرح کے سوال اٹھائے گا۔ رضامند بھی ہو گا تو مشکل ہی سے ہو گا۔

دوپہر کے کھانے پر سردار مزاری وعدہ کرنے کے باوجود اس کے پاس نہ آیا۔ وہ دیر تک اس کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اس نے اکیلے ہی کھانا کھایا۔ مزاری کے نہ آنے پر رحیم داد کو تعجب بھی ہوا۔

مگر نہ اس نے کسی نوکر چاکر سے مزاری کے بارے میں بات کی اور نہ ہی اس کے کمرے میں جانے کی کوشش کی۔ کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو سردار شہ زور خان مزاری سے اس کی ملاقات ہوئی۔ رحیم داد نے مرجان کا ذکر پھینچا۔ ”تو نے چاکر خاں کو دستاویز تیار کرنے کے لیے بھیج دیا؟“

”ہاں“ وہ چلا گیا۔ ”مزاری نے مختصر جواب دیا۔

”چاکر کب تک لوٹے گا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”کل وکیل سے دستاویز تیار کرانے کے بعد آئے گا۔“

”مرجان کو بھی اس بارے میں پتہ ہے؟“ رحیم داد نے بات آگے بڑھانے کی کوشش کی۔

”نہیں۔“ سردار مزاری نے آہستہ سے انکار میں سر ہلایا اور گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ”چاکر تیرے کلیم کے بارے میں بھی متعلقہ افسروں سے بات کرے گا۔ تجھے ادھر اراضی کی الاٹمنٹ مل جائے تو بہت مناسب ہو گا۔“

رحیم داد نے بھی مرجان کے بارے میں مزید بات چیت کرنے سے گریز کیا۔ مزاری کے رویے سے اس نے بھانپ لیا تھا کہ وہ مرجان کے مسئلے پر اس وقت گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ”چاکر رہا ہے۔ وہ رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہیں ٹھیرا۔ اس نے شراب سے بھی شغل نہ کیا، کھانا کھایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

مزاری چلا گیا۔ رحیم داد برآمدے میں پہنچا۔ کچھ دیر مونڈھے پر خاموش بیٹھا رہا اور مرجان کے بارے میں سوچتا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

صبح ناشتے پر بھی مرجان کے متعلق مزاری سے کوئی بات نہ ہوئی۔ نہ رحیم داد نے کوشش کی اور نہ ہی مزاری نے۔ دوپہر کا کھانا دونوں نے حسب معمول ساتھ ہی بیٹھ کر کھایا۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہوئیں، مگر مرجان کا مسئلہ زیر بحث نہ آیا۔

دن ڈھلے سردار مزاری نے رحیم داد کو اپنے کمرے میں بلوایا۔ وہ اس وقت صاف ستھرا لباس پہنے پلنگ پر بیٹھا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی اس نے اونچی آواز سے کہا۔ ”سینس، تو سو تو نہیں رہا تھا؟“ اس نے جواب کا انتظار نہ کیا۔ اپنی بات جاری رکھی۔ ”چاکر خاں واپس آگیا ہے؟“

”نہ ہر ہے وہ؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”ہاں ہے۔“ سردار مزاری پلنگ سے نیچے اترا۔ ”وہ دستاویز تیار کروا لایا ہے۔ تیرے پاس اسے لے کر آئے گا۔ تو مرجان کے پاس چلا جانا۔ چاکر جہاں بتائے وہاں اس سے دستخط لگوا لینا۔“

”تو بھی تو موجود ہو گا نا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”نہیں، مجھے بہت ضروری کام سے روجھان جانا ہے۔“ مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

”تجھے کب جانا ہے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ابھی جا رہا ہوں۔“ سردار مزاری آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ چلا۔ دونوں دروازے سے گزرے۔ برآمدے میں پہنچے۔ مزاری نے رحیم داد سے کہا۔ ”چاکر کو سب پتہ ہے۔ میرا موجود ہونا ضروری نہیں۔“

دونوں ساتھ ساتھ برآمدے میں چلتے رہے۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تو کب تک لوٹے گا؟“

”سویرے واپس آ جاؤں گا۔“ مزاری نے بتایا۔ دونوں رحیم داد کے کمرے کے سامنے پہنچے۔ مزاری ٹھہر گیا۔ ”تو اب آرام کر۔ باہر دھوپ بہت تیز ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مزاری آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ بستر پر نہیں لیٹا۔ مونڈے پر بیٹھا چاکر خاں سرگانی کا انتظار کرتا رہا۔ دقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ سائے طویل ہو گئے مگر سرگانی نہیں آیا۔



سورج غروب ہو چکا تھا۔ شام کا دھند لکا پھیل رہا تھا۔ رحیم داد کمرے سے باہر نکلا اور برآمدے میں ایک مونڈے پر بیٹھ گیا۔ اسے برآمدے میں بیٹھے ہوئے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ چاکر خاں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں اشامپ پیپر دیا تھا۔

رحیم داد نے اشامپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”یہ دستاویز ہے نا؟“

”ہا سس!“ اس نے نہایت ادب سے جواب دیا۔ ”تجھے اس پر ملوک زادی سے دستخط کراوانے ہیں۔“ وہ کمرے کے اندر چلا گیا۔ جب سے ماچس نکال کر لیپ روشن کیا۔ اسے ابک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے باہر آیا۔ اشامپ رحیم داد کے سپرد کیا۔ ”اسے پڑھ لے۔“

رحیم داد نے دیکھا دستاویز اردو میں لکھی تھی اور مرجان کی جانب سے تھی۔ تحریر کی رو سے عرجان نے بہ قائم ہوش و حواس اور بہ رضا و رغبت اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ املاک اپنے سوتیلے بیٹے، سردار شہ زور خاں مزاری کے نام منتقل کر دی تھی۔ دستاویز ہر چند کہ عدالتی زبان میں تھی مگر سیدھی سادی تھی۔ کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہ تھا۔ رحیم داد نے اسے آسانی سے پڑھ لیا۔

جب وہ دستاویز کا مطالعہ کر چکا تو چاکر خاں سرگانی نے جھک کر انگلی کے اشارے سے بتایا۔

”سس چوہدری، تجھے اس جگہ ملوک زادی سے دستخط لینے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں یہیں اس کے دستخط لگوا لوں گا۔“ رحیم داد نے ہامی بھری۔ ”مجھے اس کے پاس اکیلے جانا ہو گا یا تو بھی میرے ساتھ چلے گا؟“

”ہا سس، میں نے ملوک زادی کے پاس جا کر کیا لیٹا۔“ چاکر خاں سرگانی نے کہا۔ ”تو اکیلا ہی اس کے پاس جائے گا۔ تجھے اس سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ مجھے سب پتہ ہے۔ سردار نے مجھے پوری طرح سمجھا دیا ہے۔“

چاکر خاں سرگانی واپس کمرے میں گیا۔ لیپ طاق میں رکھا۔ لوٹ کر رحیم داد کے پاس آیا۔ جیب سے فونٹین پین نکال کر رحیم داد کے حوالے کیا۔ ”سس، اسے رکھ لے۔ تجھے اس سے ملوک زادی کے دستاویز پر دستخط کرانے ہیں۔“

رحیم داد نے قلم لے لیا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے ذہن میں طرح طرح کے دوسوے گھبرا رہے تھے۔ خدشہ تھا کہ کہیں مرجان دستخط کرنے سے انکار نہ کر دے۔ اپنے ساتھ نکاح پڑھانے کا اظہار کرے تو بھڑک نہ اٹھے۔ وہ ادھیڑ بن میں جلتا تھا اور گرم صم بیٹھا تھا۔

چاکر خاں سرگانی جہاں دیدہ اور گھاگ تھا۔ چہرے کے آثار چڑھاؤ سے رحیم داد کی ذہنی الجھن بھانپ گیا۔ مسکرا کر بولا۔ ”سس، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

رحیم داد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا، خود کو سنبھالا۔ بحث سوال کیا۔ ”مجھے مرجان سے دستخط لینے کب جانا ہو گا؟“

”ابھی چلنا ہو گا۔“ سرگانی نے رحیم داد کو بتایا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چاکر خاں سرگانی نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”سس، میرے ساتھ آ۔“ وہ آگے بڑھا۔ رحیم داد اس کے ساتھ چلا۔

دونوں شام کے ہلکے ہلکے اندھیرے میں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اس کمرے کے دروازے پر پہنچے جس میں مرجان کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ دروازے پر قفل پڑا تھا۔ چاکر خاں سرگانی نے کنجی نکال کر قفل کھولا اور دروازے کا ایک پٹ سرکا کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد اندر چلا گیا۔ چاکر خاں سرگانی باہر ہی ٹھہر گیا۔



مرجان گرم صم بیٹھی تھی۔ لیپ کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آنکھیں دیران تھیں۔ لباس ملجاء پڑ گیا تھا۔ اب وہ اور بھی زیادہ ایز گئی تھی۔ اس نے رحیم داد کو دیکھا تو

بڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ حیران و پریشان ہو کر بولی۔
”سہیل، تو یہاں کیسے آگیا؟“

رحیم داد نے اسے تسلی دی۔ ”گھبرا نہیں، میں چوری سے نہیں آیا ہوں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔
”شہ زور کی اجازت سے آیا ہوں۔“

”اس نے تجھے ادھر آنے کی اجازت دے دی؟“ وہ بدستور حیرت زدہ تھی۔ اس قدر گھبرائی ہوئی تھی کہ ہانپنے کے انداز میں گہری گہری سانسیں بھر رہی تھی۔

”تو نے ہی تو شہ زور سے گل بات کرنے کو کہا تھا۔ میں نے تیرے بارے میں اس سے صاف صاف گل کی۔“ رحیم داد نے کمرے میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دیوار کے قریب ایک موئذہ چڑا تھا۔ بوسیدہ اور کمزور تھا۔ رحیم داد اس پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں جس تھا۔ گھٹن تھی۔ سخت گرمی تھی۔ ہوا اور روشنی کے لیے صرف ایک روشندان تھا۔ جو چھت کے قریب بلندی پر تھا۔ رحیم داد گرمی سے پریشان ہو کر بولا۔ ”یہاں تو بہت گرمی ہے۔ تو یہاں کیسے رہتی ہے؟“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گرمی بہت ہے۔“ وہ تجھے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”گرمی شری کی فکر نہ کر۔ یہ بتا شہ زور نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟“ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ ”پر وہ خود فیصلہ کب کرے گا۔ وہ تو جرگے سے فیصلہ کرائے گا۔ میں نے یہی سنا ہے۔“

”جرگے سے فیصلہ کراتا تو مجھے تیرے پاس کیوں آنے کی اجازت دیتا؟“

”تیرا مطلب ہے جرگہ نہیں ہو رہا؟“

”جرگہ تو کل صبح ہونے والا تھا۔ تجھے بھی پتہ ہو گا۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”پر اب جرگہ نہیں ہو گا۔“

مرحان کے چہرے پر چھائے ہوئے سائے رفتہ رفتہ مٹنے لگے۔ وہ سر جھکا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ پریشانی اور قید میں بھی حسین نظر آرہی تھی۔ رحیم داد بے قرار نظروں سے اس کے چہرے کو کتنے لگا۔ مرحان نے نگاہیں اٹھائیں، دونوں کی نظریں ملیں۔ مرحان نے جھٹ نظریں نیچی کر لیں۔ دہلی زبان سے پوچھا۔

”شہ زور نے کیا فیصلہ کیا؟“

”فیصلہ اسے نہیں اب تو تجھے کرنا ہے۔“ رحیم داد کے ہونٹوں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی۔

”میں، میں کیا فیصلہ کر سکتی ہوں۔ تو کیسی گالہ کر رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں گھبراہٹ اور حیرت کا امتزاج تھا۔

”ہاں، تجھے ہی فیصلہ کرنا ہو گا۔“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔ ”تو نے مجھے جو کچھ کہا تھا، میں نے شہ زور سے کہہ دیا۔“ اس نے اپنی اہمیت جنائی۔ ”پہلے تو وہ تیار نہیں ہوا۔ تجھ سے سخت نراض ہے۔ پر جب میں نے اسے سمجھایا بھجایا تو وہ تیار ہو گیا۔“

”اب وہ کیا چاہتا ہے؟“ مرحان نے دریافت کیا۔

”وہی جو تو چاہتی تھی۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”تو ساری جائیداد اس کے نام کر دے گی تو وہ تجھے معافی دے دے گا۔ تو یہی تو چاہتی تھی نا؟“

”تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ میں یہی چاہتی تھی۔“ مرحان نے اعتراف میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”اب وہ کیا چاہتا ہے؟“

”اس نے وکیل کے مشورے سے جائیداد اپنے نام کرنے کی دستاویز بنوائی ہے۔“ رحیم داد نے ہاتھ میں دبا ہوا اسٹامپ پیپر مرحان کو دکھایا۔ اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پڑھ سکتی ہے تو اسے پڑھ لے۔“

”میں اتنا پڑھنا نہیں جانتی۔ ہاں دستخط بتا لیتی ہوں۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔
”تو نے صرف اپنے دستخط ہی لگانے ہوں گے۔ میں نے دستاویز اچھی طرح پڑھ لی ہے۔“ رحیم داد نے اسے اعتماد میں لینے کی کوشش کی۔ ”مجھے تو ٹھیک ٹھاک لگی۔ پتہ نہیں تجھے پر بھروسہ ہے کہ نہیں۔“

”میرے لیے تجھ پر بھروسہ کرنے کے سوا اور رستہ ہی کون سا ہے۔“ اس کا لہجہ صاف اور ٹیکھا تھا۔ رحیم داد نے اندازہ لگایا کہ وہ خاصی ذہین اور سمجھ دار ہے۔ مرحان نے لمحہ بھر کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر رحیم داد سے دریافت کیا۔ ”شہ زور کی اور بھی شرطیں ہوں تو صاف صاف بتا دے۔“

”تجھے سراب کو چھوڑنا ہو گا۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”ویسے تو اسے چھوڑنے کو نہ بھی تیار ہو تب بھی شہ زور اسے معافی نہیں دے گا۔“

مرحان نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر افسردہ ہو گیا۔ اس نے گردن جھکالی اور خاموش بیٹھی رہی۔

”تو کس سوچ میں پڑ گئی؟“ رحیم داد خاموش نہ رہ سکا۔

”سوچ رہی تھی، کمزور جتنا میرا ہے اتنا ہی سراب کا بھی ہے۔“ مرحان نے رحیم داد کی جانب پر اعتماد نظروں سے دیکھا۔ ”جب وہ جائیداد لے کر مجھے معافی دے سکتا ہے تو اسے سراب کو بھی

معافی دینی چاہیے۔ اسے تو جائیداد چاہیے، وہ اسے مل جائے گی۔ اس کے بعد اسے مجھ سے اور سراب سے کیا لینا۔“

”یہ تو سوچ سراب ماثیا ہے۔ حویلی کا پرانا نوکر رہ چکا ہے۔“ رحیم داد نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔ ”اس نے اپنے مالک سے نمک حرامی کی ہے۔“

”ٹھیک ہے سراب حویلی کا ماثیا ہوتا تھا۔ شہ زور اور اس کے پیو کا باخوارہ چکا ہے۔“ اس کا لہجہ تیز اور ٹیکھا تھا۔ ”مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے۔“ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”سراب نے زیادہ سے زیادہ نمک حرامی ہی تو کی ہے۔ شہ زور کی طرح خونی تو نہیں ہے۔ جائیداد کے لیے اس نے اپنی سبھی بھائی کو کتل تو نہیں کر دیا۔“

”لگتا ہے تو سراب کو چھوڑنا نہیں چاہتی۔“ رحیم داد نے زچ ہو کر کہا۔

”سب تو خود ہی سوچ۔ سراب نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے بچانے کی کوشش کی۔“ مرجان نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ ”وہ مجھے کوٹ سے نکال کرنے لے جاتا تو شہ زور جائیداد لینے کے لیے کب کا میرا خون کر چکا ہوتا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”شہ زور کے ساتھ اگر اس نے نمک حرامی کی ہے تو میرے ساتھ تو وفاداری کی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتی ہوں؟ یہ تو خود غرضی اور کینکلی ہوگی۔ میں اسے دھوکا نہیں دے سکتی۔“

اس کے لہجے کے اعتماد سے رحیم داد کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وہ پہلی ہی مرجان نہیں رہی تھی جس نے اپنی زندگی بچانے کے لیے رو رو کر اس سے التجا کی تھی۔ پچھلے چند دنوں میں اس نے موت کو اس قدر قریب پایا کہ اس کا ڈر اور خوف کم ہو گیا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ مرجان خود سر اور دنگ عورت ہے۔ وہ زندگی سے بیزار اور آکٹائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

رحیم داد نے اسے رام کرنے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ ”تو بھی ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ وہ اس سے الجھتا نہ چاہتا تھا۔ اس نے پتیرا بدلا اور عزت اور خاندانی وجاہت کا واسطہ دیا۔ ”مرجان“ یہ تو سوچ، تو ملوک زادی ہے اور سراب کی ہے۔ شہ زور یہ کیسے دیکھ سکے گا تو سراب سے یاری لگائے۔ اس کے ساتھ رہے۔ وہ بلوچ سردار ہے۔ یہ اس کی شان اور آن کا سوال ہے۔“

”سبب، شان اور آن کی گمانہ نہ کر۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔ ”مجھے اس کی شان اور آن کا سبب پتہ ہے۔ وہ ہر رات کسی ڈال کے ساتھ حرام کاری کرتا ہے۔ اسے گندہ کرتا ہے۔“ اس کا لہجہ اور تیغ اور ٹیکھا ہو گیا۔ ”پر اپنی مونچھ اونچی کیے عزت والا بنا پھرتا ہے۔ سردار کہلاتا ہے۔ اسی عزت اور آن کے لیے اپنی حسینوں اور رن کو حویلی کی اونچی اونچی دیواروں کے اندر بند رکھتا ہے۔ ان کی کڑی

چوکیداری کرواتا ہے۔“ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ ”پر چوکیداری شوکیداری سے کیا ہوتا ہے۔ مجھے پتہ ہے کس نے کس کی اور کس بانے اور نوکر سے یاری لگا رکھی ہے۔ کیسے راتوں کو چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ مجھے کیا نہیں معلوم؟ میں نے ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔“ مرجان کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ ”شہ زور کو تو یہ بھی پتہ نہیں ہو گا کہ وہ کسی بانے کا پتر ہے یا سردار نجیب خان کا۔“

”ایسی الٹی سیدھی گلاں نہ کر۔“ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔ گھبرا کر دروازے کی جانب دیکھا جس کے دوسری طرف چاکر خان سرگانی کے موجود ہونے کا امکان تھا۔ ”لگتا ہے تو معافی شافی نہیں چاہتی۔“ اس کے لہجے میں شکوہ کرنے کا انداز صاف نمایاں تھا۔ ”ایسا ہی تھا تو اس رات تو نے نوری کے ذریعے مجھے کیوں بلایا تھا؟ کیوں مجھے رو رو کر کہا تھا کہ تجھے معافی دلانے کے لیے شہ زور سے گل بات کروں۔“ اس کا لہجہ قدرے ٹیکھا ہو گیا۔ ”اپنی زندگی بچانے کے لیے تو جائیداد تک چھوڑنے کو تیار تھی۔ تو ایسا نہ کہتی تو میں کیوں شہ زور کو معافی دینے پر راضی کرتا؟“ اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے اسٹامپ پیپر کو سامنے کر دیا۔ ”یہ دستاویز کیوں تیار کروا تا؟“

مرجان خاموش بیٹھی رہی۔ گردن جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی جھنجھلاہٹ رفتہ رفتہ ختمی جا رہی تھی۔

”تو مرنا چاہتی ہے؟“ رحیم داد نے اسے زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔

”کون خوشی سے مرنا چاہتا ہے؟“ مرجان نے دل گرفتہ ہو کر جواب دیا۔ موت پر زندہ رہنے کی خواہش غالب آگئی۔ ”مرتا ہی ہوتا تو تجھے کیوں اپنے پاس بلائی؟“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہی، پھر اس نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر میں یہ بھی نہیں دیکھ سکتی کہ سراب کو شہ زور مار ڈالے۔“

”سراب کو بھی معافی دلانے کی ایک صورت ہو سکتی ہے؟“

”وہ کیا؟“ مرجان نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”تو کسی اور سے نکاح پڑھالے۔“ رحیم داد نے ریا کاری سے کام لیا۔ نہایت نرمی سے گویا ہوا۔ ”اگر تو ایسا کرنے پر تیار ہو جائے تو میں کسی نہ کسی طرح شہ زور کو راضی کر لوں گا کہ وہ سراب کو بھی معافی دے دے۔“ اس نے نظر بھر کر مرجان کو دیکھا۔ ”خند کرنے سے کام نہیں چلے گا“ اس طرح تیرے ساتھ سراب کی بھی جان بچ جائے گی۔ میں تو کہتا ہوں تو میری صلاح مان لے۔ ایک بار دونوں کی جان بچ جائے تو آگے کے لیے جو تیرا جی کرے کرنا پر شہ زور کو راضی کرنے کے لیے ابھی تو تیرے لیے بھی ٹھیک رہے گا کہ سراب کے علاوہ تو کسی اور سے نکاح پڑھوالے۔“

”تو نے کیا طے کیا؟“ اس بار رحیم داد اپنی بے قراری پر قابو نہ رکھ سکا۔
 ”طے کیا کرتا ہے۔ تیار ہوں۔“ مرجان نے اپنی رضامندی کا کھل کر اظہار کر دیا۔ ”پر چوہدری
 تجھے سہراب کو بھی معافی دلانا ہوگی۔ تو نے مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔“
 ”تجھ سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا کروں گا۔“ رحیم داد نے نہایت جوش و خروش سے کہا۔
 ”سننے پر ہاتھ رکھ کر مرجان کو یقین دلایا۔“ یہ مرد کا وعدہ ہے۔“

مرجان خاموش رہی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مرجان کے قریب گیا۔ اسٹامپ اس کے
 ہاتھوں میں دیا۔ مڑا اور لیمپ اٹھا کر واپس مرجان کی پاس پہنچا۔ فونٹین پین نکالا۔ مرجان کی جانب
 بڑھایا۔ ”لے“ اب دستاویز پر اپنے دستخط لگا دے۔“

رحیم داد نے انگلی رکھ کر جس جگہ بتایا مرجان نے اسی جگہ دستخط کر دیے۔
 رحیم داد نے دستاویز مرجان سے واپس لی۔ لیمپ جہاں رکھا تھا وہیں رکھا۔ مرجان سے مخاطب
 ہوا۔ ”مرجان“ مجھے اب جانا ہے۔ چاکر خان باہر میرا انتظار کرتا ہو گا۔“

مرجان نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سین!“ وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ
 دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔

رحیم داد نے اس کے جھکے ہوئے سر کو ہولے ہولے تھپکتے ہوئے تسلی دی۔ ”پریشان نہ ہو۔
 اب ٹھیک ہو گا۔“

مرجان کی سسکیاں رک رک کر کمرے کی خاموشی میں ابھرتی رہیں۔
 رحیم داد آگے بڑھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔



شام کا اندھیرا گہرا ہو گیا تھا۔ رات کی آمد آمد تھی۔ چاکر خان سرگانی دروازے سے کچھ فاصلے پر
 کھڑا رحیم داد کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی قریب آیا۔ ”سین“ تو نے بہت
 دیر لگا دی۔“ رحیم داد خاموش رہا۔

چاکر خان نے دروازے میں تالا ڈال کر کنبی سے بند کر دیا۔
 دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کمرے کے سامنے پہنچے جس میں رحیم داد کا قیام تھا۔
 برآمدے میں پلنگ بچھا کر رحیم داد کا بستر لگا دیا گیا تھا۔

رحیم داد تھکا ہوا سا بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاکر خان سرگانی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

رحیم داد نے کچھ اس ڈھب سے بات کی کہ مرجان رضامند ہو گئی۔ رسان سے بولی۔ ”تیری
 صلاح دیے تو ٹھیک ہی لگتی ہے، پراتی بدنامی کے بعد کون مجھے اپنی رن بنانے کے لیے تیار ہو جائے
 گا؟ شہ زور تو یہی چاہے گا کہ وہ کوئی ڈوا زمیں دار ہو اور عزت دار بندہ ہو۔ ایسا بندہ کون ہو سکتا
 ہے؟“

”میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔“ رحیم داد نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔ ”یہ تو تجھے ہی
 سوچنا ہو گا۔ اس میں دیری بھی نہیں ہونی چاہیے۔“

”میں تو یہاں بند ہوں۔ میں اس بارے میں کیا کر سکتی ہوں۔“ اس نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔
 ”تو نے جب میری اتنی مدد کی ہے تو اس معاملے میں بھی تو ہی میری مدد کر سکتا ہے۔“

”تجھے تو پتہ ہی ہے میں یہاں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی سے میل ملاپ بھی نہیں۔“ رحیم داد نے
 احتیاط سے کام لیا۔ دل کی بات زبان پر نہ آنے دی۔ صورت حال کا تقاضا بھی یہی تھا۔

مرجان نے ایک بار پھر اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ عاجزی سے بولی۔ ”سین چوہدری“ اس بارے
 میں تجھے ہی مدد کرنی ہوگی۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“

”میں تیری یہی مدد کر سکتا ہوں کہ خود تجھ سے نکاح کر لوں۔“ رحیم داد ڈرتے ڈرتے حرف
 مطلب زبان پر لایا۔ ”برانہ منانا۔ یہ تیری مرضی پر ہے کہ مانے یا نہ مانے، فیصلہ تجھے ہی کرنا
 ہے۔“

”میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”سین“ تو بہت نیک بندہ ہے۔
 سمجھ نہیں آتی، تو ایسا کیوں چاہتا ہے؟“

رحیم داد نے اپنی اہمیت بتائی۔ ”میں نے تو تجھے بچانے کے لیے ایسا سوچا ہے۔“ اس نے لہجے
 میں رقت پیدا کی۔ ”مرجان“ تجھے پتہ نہیں، میں بھی تیری طرح مصیبت کا مارا ہوا ہوں۔ گورداسپو

کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہوں۔ فسادات میں گھریا لٹ گیا۔ ڈوا پتر میری آنکھوں کے سامنے
 بلوائیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ جوان دمگی کو بھی وہ اٹھا کر لے گئے۔ میں بیڑی میں سوار ہو کر کسی

کسی طرح راوی پار کر کے اکیلا ہی پاکستان پہنچ سکا۔ گھر والی اور بچوں کا پتہ نہیں کیا بنا۔ زندہ ہیر
 سب ختم ہو گئے۔ بہت تلاش کیا۔ پر کسی کا پتہ نہ چلا۔“ اس نے گہری سانس بھری ”تب سے

اکیلا ہوں۔“ اس نے مرجان کی جانب دیکھا۔ ”میں نے اپنے بارے میں تجھے سب کچھ بتا دیا۔
 بھی نہیں چھپایا۔“

”نہ بھی بتاتا تو کیا فرق پڑتا۔“ مرجان نے کہا۔ ”مجھے تو اتنا پتہ تھا کہ تو بھی ڈوا زمیں دار۔“

چاکر خاں نے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”سین‘ تو چپ چپ نظر آ رہا ہے۔ کوئی فکر کی گالہ تو نہیں؟“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا جس پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔ ”کیا ملوک زادی نے دستخط نہیں لگائے؟“

”نہیں۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”اس نے دستخط لگا دیے ہیں۔“ رحیم داد نے ہاتھ میں دبا ہوا اسٹامپ چاکر خاں سرگانی کی جانب بڑھایا۔ ”یہ رہی دستاویز۔ اسے اندر جا کر لیپ کی روشنی میں ٹھیک سے دیکھ لے۔“

چاکر خاں کی آنکھوں میں خوشی کی چمک ابھری۔ اس نے دستاویز رحیم داد کے ہاتھ سے لے لی۔ مسکرا کر بولا۔ ”کام بن گیا۔ اب تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

رحیم داد نے صاف گوئی سے کام نہ لیا۔ بات بتانے کی کوشش کی۔ ”اس نے آسانی سے دستخط نہیں لگائے۔ دیر تک مغز ماری کرنی پڑی۔ تب وہ تیار ہوئی۔“

”وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔“ سرگانی کے لبوں پر بدستور مسکراہٹ تھی۔ ”تو دیر تک اس کے پاس رہا، اس کا مطلب بالکل صاف ہے کہ وہ تجھ سے سخت جھٹ کر رہی تھی۔ میں نے پتہ ہے وہ کتنی ضدی اور سر پھرا رہا ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔

چاکر اٹھ کر کمرے کے اندر گیا۔ لیپ کی روشنی میں دستاویز پر مرجان کے دستخط دیکھے۔ جب اچھی طرح اطمینان کر لیا تو لیپ اٹھا کر رحیم داد کے پاس آیا۔ دستاویز اس کے سامنے رکھی۔

”سین‘ اب تو بھی گواہ کے طور پر دستخط کر دے۔“ اس نے انگلی رکھ کر دستخط کرنے کی جگہ بتائی۔

رحیم داد نے قلم لے کر دستخط کر دیے۔ چاکر خاں نے دستاویز واپس لے لی۔ رحیم داد نے چند لمبے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ”سردار کل صبح واپس آجائے گا؟“

”ضرور آجائے گا سین۔“ چاکر خاں نے اسے یقین دلایا۔ ”وہ یہی کہہ کر گیا ہے۔“

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ چاکر خاں سرگانی بھی زیادہ دیر نہ رکا۔ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”سین‘ اب تو روٹی کھا کر آرام کر۔ میں نے کئی اور کام کرنے ہیں۔“ وہ مڑا اور خاموشی سے چلا گیا۔

رحیم داد بستر پر لیٹ گیا۔ وہ ذہنی طور پر پریشان تھا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال ستا رہا تھا کہ شہ زور مزاری کسی صورت میں سراب کو زندہ نہ چھوڑے گا۔ مرجان کو اس کا علم ہو گا تو اسے نہ صرف شدید دکھ ہو گا بلکہ اس کی طرف سے بھی بدگمان ہو جائے گی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ

سراب کو معافی مل جائے۔ اس کی خواہش تھی کہ سراب کا کاٹنا راستے سے صاف ہو جائے اور مرجان نکاح کے بعد پوری طرح اس کے قبضے میں آجائے۔

مگر اسے زیادہ دیر اس مسئلے پر غور کرنے کا موقع نہ ملا۔ ملازم کھانا لے کر آیا۔ لیکن وہ نوشیر نہیں تھا۔ رحیم داد نے اسے بغور دیکھا۔ دریافت کیا۔

”تیرا نام کیا ہے؟“

اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”سین‘ میرا نام سا بھی ہے۔“

”نوشیر کدھر ہے۔ وہ کیوں نہیں آیا؟“

”سین‘ مجھے پتہ نہیں وہ کدھر ہے؟“ اس نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سرجھکا کر کھانا کھانے لگا۔ سا بھی برآمدے کے ستون سے ٹیک لگا کر فرش پر بیٹھ گیا۔ رحیم داد کھانا کھا چکا تو وہ برتن اٹھا کر لے گیا۔ رحیم داد بستر پر نہ لیٹا۔ مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ احاطے میں سناٹا چھا گیا۔

بست دیر بعد وہ اٹھا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

سردار مزاری صبح واپس نہ آیا۔ چاکر خاں سرگانی بھی نظر نہ آیا۔ رحیم داد تمام دن شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا۔ شام ہو گئی مگر مزاری کے واپس پہنچنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ نوشیر بھی اس کے پاس نہ آیا۔ رات کا کھانا بھی سا بھی ہی لے کر آیا۔

رحیم داد نے اس سے پوچھا۔ ”سردار آج صبح آنے کو کہہ گیا تھا اب تک نہیں آیا۔ تجھے پتہ ہے وہ کب آئے گا؟“

”سین‘ مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“

”چاکر خاں بھی صبح سے نظر نہیں آیا۔ نوشیر بھی نہیں آیا۔ دونوں کہاں ہیں؟“ رحیم داد نے سا بھی سے پوچھا۔

”سین‘ مجھے پتہ نہیں۔“ سا بھی نے مختصر جواب دیا۔ اس کے رویے سے بیزاری جھلک رہی تھی۔ رحیم داد نے بھی اسے محسوس کیا۔ مگر چپ رہا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ اٹھا برآمدے کے سامنے ٹھٹھلے لگا۔ سا بھی جا چکا تھا۔ احاطے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پھانک پر مسلح پہرے دار بیٹھے تھے۔ ان کی کھنکار رات کے سنانے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔

رحیم داد واپس برآمدے میں گیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ نوری رات گئے اس

کے پاس آئے گی۔ وہ بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ پہر رات گزر گئی۔ رحیم داد کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک گزر نہ تھا۔ وہ جاگ رہا تھا اور اس کے کان آہٹ پر لگے تھے۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات کالی ہو کر کاجل بن گئی۔ سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

آدھی رات سے کچھ پہلے برآمدے میں چاپ ابھری۔ رحیم داد نے چونک کر کروٹ بدلی۔ اس جانب دیکھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ نظر آیا۔ چاپ قریب اور قریب آتی گئی۔ رحیم داد اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ توقع تھی کہ نور ہوگی۔ مگر وہ نوری نہیں غمیسو کی بیوی تھی۔ وہ صاف ستھرا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ آنکھوں میں کاجل تھا۔

رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ ”اب تو تو ٹھیک ٹھاک ہے نا؟“

”سہیں، ٹھیک ہی ہوں۔“ وہ اس کے برابر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”پرنکے کی طبیعت گڑبڑ ہے۔ ہر دم روتا رہتا ہے۔ بہت مشکل سے اسے سلا کر آئی ہوں۔“

”کیا ہو گیا نکلے کو؟“ رحیم داد نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

”سہیں، اسے تپ چڑھی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”تو نے غمیسو کو معافی دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ لگتا ہے تو نے اس کے بارے میں سردار سے گمانہ نہیں کی۔“ اس کے لہجے میں عاجزی پیدا ہو گئی۔ ”سہیں، اسے معافی دلوا دے۔ میرا بھی ادھر جی گھبراتا ہے۔ مگر بہت یاد آتا۔ غمیسو بھی برے حال میں ہو گا۔“

رحیم داد نے اسے اطمینان دلایا۔ ”گھبرا نہیں، سردار کل واپس آجائے گا۔ میں اس سے غمیسو کو معافی دلانے کے بارے میں ضرور کل بات کروں گا۔“

”پہلے بھی تو نے یہی کہا تھا۔“ اس نے شکوہ کیا۔ ”اب تو غمیسو کو ویسے بھی معافی مل جانی چاہیے۔ سنا ہے ہاتھ کو اس کا اوٹھ مل گیا۔ اس نے جھوٹی شکایت لگائی تھی۔ تب ہی تو اوٹھ لے کر بھاگ گیا۔“

”تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اب غمیسو کو ضرور معافی مل جائے گی۔“

”سہیں، تو سردار سے کل ضرور گمانہ کرے گا ناں؟“ اس نے اصرار کیا۔

”کروں گا، ضرور کروں گا۔“ رحیم داد نے اسے یقین دلایا۔ ”یہ ہوتا نو شیر کدھر ہے؟ کل سے بالکل نظر نہیں آیا۔ اس کی گھر والی، نوری، بھی نہیں آئی۔ دونوں کہاں ہیں؟“

”سہیں، میں نے بھی نو شیر اور نوری کو نہیں دیکھا۔“ اس نے جھکتے ہوئے دہی زبان سے کہا۔

”سا بھئی کی رن بتاتی تھی، سردار نے دونوں کو شاہ میر بھیج دیا۔ بہت نراض ہے ان سے۔“

”سردار ان سے کیوں نراض ہے؟“ رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر غمیسو کی بیوی کو دیکھا۔

”بے چینی سے پوچھا۔“ ٹھیک ٹھیک بتا؟“

”سہیں، مجھے ان کے بارے میں اتنا ہی پتہ ہے۔“ وہ گڑگڑا کر بولی۔ ”میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“

رحیم داد نے مزید استفسار نہ کیا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے سائے پھیل گئے۔ ذہن میں طرح طرح کے سوالات منڈلانے لگے۔ غمیسو کی بیوی نے اس کے ذہنی خلفشار کی جانب توجہ نہ دی۔ خاموش بیٹھی رہی۔

سناٹا بڑھ گیا تھا۔ رات اور کالی ہو گئی۔ برآمدے کے قریب ہی شیشم کا گھٹا درخت تھا۔ اس کی ابھی ہوئی شاخوں میں کوئی پرندہ پھر پھر لٹایا۔ مگرمی خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا اور پھر سکوت طاری ہو گیا۔



صبح بھی ناشتا رحیم داد نے اکیلے ہی کیا۔ اور اپنے کمرے میں کیا۔ ناشتا بھی سا بھئی لے کر آیا تھا۔ مگر رحیم داد نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی خاموش رہا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہوا تو سا بھئی چپ چاپ اندر آیا اور برتن اٹھا کر چلا گیا۔

سا بھئی کے جانے کے تھوڑی ہی دیر بعد چاکر خان سرگانی کمرے میں آیا۔ مسکرا کر یہ خوش خبری سنائی۔ ”سردار نے بتایا ہے۔ سہیں تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو گئی ہے۔ فکر نہ کر الاٹمنٹ بھی چند روز میں مل جائے گی۔“

”کیا سردار واپس آگیا؟“ رحیم داد نے جھٹ سوال کیا۔

”سہیں، وہ تو سویرے ہی سویرے ادھر پہنچ گیا تھا۔“

”کدھر ہے وہ، میرے پاس کیوں نہیں آیا؟“ رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

”سہیں آج ادھر جرمگہ ہے ناں۔“ سرگانی نے بتایا۔

”آج جرمگہ ہے؟“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر دریافت کیا۔ ”جرمگہ کیوں بلایا گیا ہے؟“

”جرمگے کے سامنے لوک زادی اور سراب کا مکدہ پیش ہو گا۔“

رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”جرمگہ

کب شروع ہو گا؟

”سین‘ دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شروع ہو گا۔“ چاکر خان سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔
”سردار ادھر اپنے کمرے میں معتبروں کے ساتھ بیٹھ بات چیت کر رہا ہے۔ جرگے میں شرکت کرنے کے لیے گیارہ معتبر آئے ہیں۔“
”میں جرگے کی کارروائی نہیں دیکھ سکتا؟“

”مشکل ہی ہے سین۔“ چاکر خان نے جواب دیا۔ ”جرگہ تو بند کمرے میں ہو گا۔ وہاں تو سردار ہو گا۔ معتبر ہوں گے۔ ان کے علاوہ سراب ہو گا۔ ملوک زادی ہو گی۔ وہ پردے کے پیچھے بیٹھی ہو گی۔“

”تو جرگے میں موجود نہیں رہے گا؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”میں بھی رہوں گا۔ سین‘ میرا کام پیش کار کی طرح ہو گا۔“ سرگانی سنبھل سنبھل کرتا رہا۔
”بدھیل‘ بھر خاں اور داؤد بھی رہیں گے۔ تینوں گواہ ہیں۔ سردار کے ساتھ ہی ادھر پہنچے ہیں۔“
”سردار سے کہنا‘ چوہدری تجھے اپنے کمرے میں بلا رہا ہے۔“ رحیم داد نے چاکر خان سرگانی کے ذریعے شہ زور خان مزاری کو پیغام بھجوایا۔

”سین‘ تو اطمینان رکھ‘ میں سردار سے ضرور کہہ دوں گا۔“ چاکر خان سرگانی نے یقین دلایا۔
چاکر خان چلا گیا۔ رحیم داد کمرے میں بیٹھا سردار شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا۔ دوپہر ہو گئی‘ مگر وہ نہ آیا۔ البتہ سانبھی کھانا لے کر آگیا۔ رحیم داد نے کھانا کھایا۔ اسے توقع تھی کہ شہ زور خان مزاری اس کے پاس ضرور آئے گا۔ کمرے کے باہر چل پھل تھی۔ ملی جلی آوازیں کا دبا دبا شور ابھر رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا۔ سردار مزاری اس کے پاس نہ آیا۔ رحیم داد تھک کر بستر پر لیٹ گیا۔ وہ سخت ذہنی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔

شام ہونے سے کچھ دیر پہلے رحیم داد نیند سے بیدار ہوا۔ کمرے کے باہر سناٹا تھا۔ جرگہ اب ختم ہو چکا تھا۔ سناٹے سے رحیم داد نے یہی اندازہ لگایا۔ اس نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا اور برآمدے میں جا کر ایک موٹے پر بیٹھ گیا۔ شام درود پوار سے نیچے اتر کر پھیل چکی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

پہررات ہو گئی۔ سردار مزاری آہستہ آہستہ چلتا ہوا رحیم داد کے پاس آیا۔ وہ تھکا ہوا نظر آ رہا

تھا۔ آتے ہی موٹھا کھسکا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر کسری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ بیزار اور روٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔

”طبیعت تو تیری ٹھیک ہے ناں؟“ سردار شہ زور مزاری نے پوچھا۔

”ٹھیک ہی ہے۔“ رحیم داد نے بے رخی سے جواب دیا۔ ”مجھے کل سوراہا پس جانا ہے۔“

”چلا جانا۔“ مزاری نے بے تکلفی سے کہا۔ ”مجھے بھی جانا ہے۔ اکٹھے ہی چلیں گے۔“

”نہیں‘ مجھے کل ہی جانا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”مجھے اب یہاں ہرگز نہیں ٹھہرنا۔“

”ادھو تو‘ تو سخت زراں لگتا ہے۔ مجھے پتہ ہے تو کیوں زراں ہے۔“ اس نے ہکا بکا قلم لگایا۔

رحیم داد کو منانے کی کوشش کی۔ نرم لہجے میں بولا۔ ”میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

”میں نے تجھے بلایا تھا۔ تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟“

”میں معتبروں کے ساتھ جرگے میں بیٹھا تھا۔ تیرے پاس کیسے آتا؟ جرگہ ختم ہوتے ہی سیدھا ادھر آیا۔“ سردار شہ زور مزاری نے صفائی پیش کی۔

”تو نے تو پکا وعدہ کیا تھا کہ جرگہ نہیں ہو گا۔“ رحیم داد نے شکوہ کیا۔

”میں نے تجھے یار کہا ہے تو ہمیشہ یار ہی رہے گا۔“ شہ زور مزاری نے دل جوئی کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تجھے کئی باتوں کا پتہ نہیں۔ جب تجھے پتہ چلے گا تب سب کچھ تیری سمجھ میں آجائے گا۔“

رحیم داد نے گلہ کیا۔ ”تو نے مجھے بتایا ہی کب۔“

”سین‘ چوہدری تو ادھر پہلی بار آیا ہے۔“ مزاری نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تو بلوچوں اور ان کی کباہلی روایات اور رسم و رواج کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ ان کا اپنا قانون ہے۔ تجھے پتہ ہے سردار کیا ہوتا ہے؟ سرداری کیسے چلتی ہے؟“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”تجھے کیا پتہ مجھے جرگہ کیوں بلانا پڑا؟“

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”یہ بتا‘ جرگے نے کیا فیصلہ کیا؟“ عین اسی وقت نوکروں کی کوٹھری کی جانب سے تیز زبانی چیخ ابھری۔ رحیم داد تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مزاری بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا۔ ”چوہدری‘ میرے ساتھ آ۔ تجھے خود پتہ لگ جائے گا جرگے نے کیا فیصلہ کیا۔“

”مجھے ادھر نہ لے جا۔“ رحیم داد نے سراپا ہو کر انکار میں گردن ہلائی۔

مزاری نے بے تکلفی سے رحیم داد کا ہاتھ تھام لیا۔ ”ادھر زمین داری کرنی ہے تو تجھے سب کچھ دیکھنا پڑے گا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ تھکے تھکے قدموں سے شہ زور خاں مزاری کے ہم راہ چلتے لگا۔ دونوں برآمدے سے اتر کر احاطے میں پہنچے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ دونوں نوکروں کی کوٹھریوں کی جانب بڑھے۔ درختوں کے نیچے پہنچے۔ خشک پتے ان کے جوتوں کے نیچے ہلکی آہٹ پیدا کر رہے تھے۔

سردار مزاری اور رحیم داد ایک کوٹھری کے سامنے پہنچ گئے۔ چاکر خان سرگانی باہر کھڑا تھا۔ اس نے بڑھ کر کوٹھری کا دروازہ کھولا۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ شہ زور مزاری آگے تھا۔ رحیم داد اس کے عقب میں پریشان اور سہاوا کھڑا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ سانس کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔

کوٹھری میں لالٹین روشن تھی۔ اس کی ملگجی زرد روشنی میں دیوار کے نزدیک سراب کی لاش پڑی تھی۔ اس پر چادر ڈال دی گئی تھی۔ مگر اس کی گھنی سیاہ ڈاڑھی اور چہرے کا کچھ حصہ چادر کا کونا سرک جانے کے باعث نظر آ رہا تھا۔ اسے بہت پہلے چھانی دی جا چکی تھی۔

چھت کے پتوں بچ مضبوط شبیر تھا۔ اس میں لوہے کا کڑا تھا۔ کڑے سے رسی بندھی تھی۔ اس کا پھندا مرجان کی گردن میں پڑا تھا۔ مرجان کا منہ ٹوٹ چکا تھا۔ گردن ایک طرف جھول رہی تھی۔ وہ مرجلی تھی۔ لاش کے نیچے ایک اسٹول الٹا ہوا تھا۔ اسی اسٹول پر چڑھ کر اس نے رسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈالا تھا۔

دروازے کے قریب دو بلوچ معتبر کھڑے تھے۔ ان کی ڈاڑھیاں سفید تھیں اور خوب گھنی تھیں۔ مونچھیں بھی سفید تھیں اور چڑھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے تھے۔ چہروں پر سختی اور گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ رحیم داد نے مرجان کی لاش کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں اٹل کر باہر نکل آئی تھیں۔ زبان منہ سے باہر لٹکی ہوئی تھی۔ گردن کھینچ کر لمبی ہو گئی تھی۔ اس کا خوبصورت اور دل آویز چہرہ مسخ ہو کر فیلا لڑ گیا تھا۔

رحیم داد یہ لرزہ خیز منظر زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا۔ اسے کوٹھری میں سخت ٹھٹھن محسوس ہوئی۔ جی مٹانے لگا۔ اس نے حواس باختہ ہو کر کوٹھری کی دھندلی روشنی میں ادھر ادھر دیکھا اور چپ چاپ نکل کر باہر کھلی فضا میں آگیا۔ مزاری کوٹھری کے اندر ہی رہا۔

دریا کی سمت سے آنے والے تھکے جھوٹے درختوں کے پتوں میں اس طرح سرسراتے ہوئے گزرتے تھے گویا سسکیاں بھر رہے ہوں۔ احاطے پر سناٹا چھایا تھا۔ کوٹھریوں کے دروازے بند

تھوڑی دیر بعد سردار شہ زور خاں مزاری باہر نکلا۔ دونوں معتبر اس کے ہمراہ تھے۔ چاکر خان سرگانی گردن جھکائے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ سب خاموش تھے۔ ان کے چہروں پر سنجیدگی بکھری ہوئی تھی۔

سردار مزاری نے مڑ کر چاکر خان سرگانی کی جانب دیکھا۔ ”چاکر، مسجد کے ملا کو بلوالے۔ وہ لاشوں کو غسل دے کر کفن ڈال دے گا۔ تو نے کفن تو تیار کر ہی لیا ہو گا؟“

”ہا سس، میں نے کفن دفن کی پوری تیاری کر رکھی ہے۔“ چاکر خان سرگانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ ”تو بالکل فکر نہ کر۔“

”اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ دونوں کو سورج نکلنے سے پہلے پہلے دبا دیا جائے۔“ سردار مزاری نے حکم دیا۔

”چاکر تجھے پتہ ہونا چاہیے، کالے اور کالی کو رات کے اندھیرے میں ہی دفن کیا جاتا ہے۔“ ایک معتبر نے اپنی سفید ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خبردار کیا۔ ”ان بدکاروں پر دن کی پاک صاف روشنی نہیں پڑنی چاہیے۔ ان کی تو نماز جنازہ بھی نہیں ہوتی۔ نہ فاتحہ پڑھی جاتی ہے نہ نذر نیاز ہوتی ہے۔“

”سس، مجھے سب پتہ ہے۔“ چاکر خان سرگانی نے یقین دلایا۔ ”سارا ہی کام ٹھیک ٹھاک طرح ہو جائے گا۔“

سردار مزاری نے گردن گھما کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ”سس، چوہدری، تو بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔ تھوڑا آرام کر۔ میں تیرے پاس چند منٹ بعد پہنچ جاؤں گا۔ سونا نہیں، میرا انتظار کرنا۔“

مزاری آگے بڑھا اور معتبروں کے ہم راہ احاطے کے چانک کی جانب چل دیا۔ چاکر خان سرگانی مڑا اور درختوں کے نیچے اندھیرے میں جاکر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

رحیم داد گم صم تھا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا برآمدے کی جانب بڑھا اور ایک موڑے پر جا کر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ وہ نہ حال اور نہ شکستہ نظر تھا۔ قریب ہی اس کا پلنگ تھا مگر وہ بہتر پر جا کر لیٹا نہیں۔ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے جذبات میں الجھن برپا تھی۔

رحیم داد کو سردار شہ زور مزاری کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ آیا اور اس کے قریب موڑے پر بیٹھ گیا۔ اس نے بے نیازی سے پوچھا۔ ”چوہدری، تو کب تک ایسے چپ کر کے بیٹھا رہے گا؟“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”روٹی ٹوٹی بھی کھائی؟“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ رحیم داد نے بے زاری سے جواب دیا۔

”ایسا کر تھوڑی سی دھکی لگا لے۔ مراد خاں شاہانی نور سے لایا تھا۔ میرے کمرے میں پڑی ہے۔“ وہ بدستور غیر سنجیدہ تھا۔ ”ایک دم کھلا دڑا بن جائے گا۔ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“
 ”نہیں، میں نے آج نہیں بٹنی۔“ رحیم داد نے بے رخی سے انکار کر دیا۔ ”تیرا جی کرے تو ضرور لگا۔ میری فکر نہ کر۔“

”تو نے نہیں بٹنی تو میں بھی نہیں لگاؤں گا۔ پر یہ بتا تو اتار روٹھا روٹھا کیوں ہے؟“

”تو بھی عجب بندہ ہے۔“ رحیم داد اس کی ڈھٹائی پر بلبلا اٹھا۔ جل کر بولا۔ ”پوچھتا ہے، میں نراض کیوں ہوں؟ ایک طرف یاری کا دم بھرتا ہے دوسری طرف تو نے نوشیر اور نوری کو میرے پاس آنے سے روک دیا۔“

”نوزی اور نوشیر کا میرے سامنے نام نہ لے۔“ مزاری کا لہجہ اچانک بدل گیا۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ برسنے لگی۔ ”زیور اور گمنزوں کے لالچ میں دونوں نے نمک حرامی کی۔ مرحان سے مل کر ساز باز کی۔ میں نے انھیں جیل میں ڈال دیا ہے تاکہ انھیں اور دوسرے کراووں اور بانہوں کو پتہ چل جائے کہ میرا حکم نہ ماننے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔“

”نوری اور نوشیر کے بارے میں تجھے شاہانی نے بتایا تھا؟“

”نہیں!“ مزاری نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”اس نے ان کے بارے میں کوئی گالہ نہیں کی۔ پر مجھے سب کچھ پتہ چل گیا۔“ اس کا رویہ اور سخت ہو گیا۔ ”میں اتنا چوکنا نہ رہوں تو فیر چل چکی سررداری۔“

”تب تو یہ بھی تجھے پتہ ہو گا کہ میں اپنی مرضی سے مرحان سے ملنے نہیں گیا تھا۔ اس نے ہی مجھے اپنے پاس بلوایا تھا۔“ رحیم داد کا انداز اب مدافعانہ تھا۔

”تو بھول رہا ہے۔ یہ گالہ تو نے پہلے بھی مجھے بتائی تھی۔“ سردار شہ زور خان مزاری نے رحیم داد کو یاد دلایا۔ ”تجھے مجھ سے گلہ ہے اور تو مجھ سے نراض بھی ہے۔ پر مجھے بھی تجھ سے گلہ ہے۔ تو چھپ کر مرحان سے ملنے کیوں گیا؟ تو میرا یار ہے۔ تجھے اس سے کیا لینا تھا۔ تجھے پتہ تھا کہ اس نے مجھ تک کیا بدنام کیا۔ میری ناک پر کالک لگا دی۔“

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اس نے اظہارِ ندامت کے بجائے دفاعی حربہ آزمایا۔ ”تو نے میری حرکت پر برا منایا تھا تو پہلے اس کا گلہ کیوں نہ کیا؟ تب تو چپ کر کے رہ گیا۔“ اس نے سردار مزاری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”تو نے تو برا منانے کی بجائے

جانیہ داد اپنے نام کرانے کے لیے جھٹ دستاویز تیار کروائی۔ اس پر دستخط لینے کے لیے مجھے مرحان کے پاس بھیجا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”تجھے کیا پتہ دستاویز پر دستخط لینے کے لیے میں نے کس طرح مرحان کو راضی کیا۔ وہ آسانی سے دستخط کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔“

”مجھے سب پتہ ہے۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔“ شہ زور کا لہجہ نرم پڑ گیا۔

”تو وعدہ کر کے پلٹ گیا۔ یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔“ رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تو نے بہت برا کیا۔ تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”تجھے ایسا کرنا بھی تھا تو کسی اور کو اس کام پر لگایا ہوتا۔ مجھ سے یہ کام نہ لیا ہوتا۔ تجھے پتہ نہیں مجھے کتنا دکھ پہنچا۔“
 ”تو ٹھیک کہہ رہا ہے، مجھے تجھ سے ایسا کام نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ سردار مزاری نے معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تو خود کو اب پریشان نہ کر۔ جو کچھ ہوا ٹھیک ہی ہوا۔“

”کیا ٹھیک ہوا؟“ رحیم داد تڑپ کر بولا۔ ”تو اسے معافی دے دیتا، اس کا خون نہ کرتا تو تیرا کچھ نہ جاتا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ اس کے چہرے پر غم کے سائے پھیل گئے۔ آنکھوں میں جھلملاتے چراغ دھندلے پڑ گئے۔ ”وہ مرنا نہیں چاہتی تھی۔ زندہ رہنا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔“

”گلتا ہے تجھے اس سے بہت ہمدردی ہے۔“ سردار مزاری نے کہا۔ ”تو اس سے پرنا کرنا چاہتا تھا۔ اپنی رن بنانا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا تھا۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“ رحیم داد نے اعتراف کیا۔ ساتھ ہی صفائی بھی پیش کی۔ ”تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے اس سے پیار شیار تھا، تو یہ ٹھیک نہیں۔ میں تو اسے صرف اس لیے اپنی گھر والی بنانا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی بچ جائے اور اس کی جانیہ داد تجھے مل جائے۔ میں تجھ سے بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

”تو بالکل سچ کہہ رہا ہے۔“ سردار مزاری نے اس کی نیک نیتی کے بارے میں کسی شک کا اظہار نہ کیا۔ ”مجھے یہ بھی پتہ ہے تو بہت نیک بندہ ہے۔ دل بھی تیرا بہت نرم ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”پر تجھے یہ پتہ نہیں وہ کتنی مکار اور فریبی تھی۔ تو اس کی چترائی اور چلاکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”وہ تجھے اور مجھے دونوں کو دھوکا دے چاہتی تھی۔ تیرے سامنے خوب ٹوے بہائے۔ منت اور زاری کی۔ تیرا دل پکھل گیا۔ تو نے اس کی باتوں کو سچ مان لیا۔“

”یہ تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ وہ میرے سامنے پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ منت سماجت بھی کی۔“ رحیم

داو نے سردار مزاری کی تائید کی۔

”سینس چوہدری، جھگڑا صرف جائیداد کا نہیں۔ مرجان نے مجھے تک کیا۔ میری ناک پر سیاہی مل دی۔“ سردار مزاری نے وضاحت کی۔ ”میں اپنی ناک صاف کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے مجھے یہ معاملہ جرگے کے سامنے پیش کرنا پڑا۔“

رحیم داد نے مداخلت نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مزاری بتاتا رہا۔ ”میں چاہتا تو دونوں کو تب ہی ختم کر دیتا جب میں نے گیدڑ والا میں ان کو پکڑ لیا تھا۔ میں ان کا خون کر دیتا تو بلوچوں کے قانون کی رو سے یہ ہرگز جرم نہ ہوتا۔ پر میں چاہتا تھا کہ دونوں کو ان کے جرم کی سزا جرگے کی جانب سے ملے۔ صرف اسی طرح میں اس بدنامی اور رسوائی کی کالک صاف کر سکتا تھا جو اس نے میری پیشانی پر لگائی تھی۔ جرگے کے فیصلے کے بعد اب کوئی میرے خلاف یہ تو الزام نہیں لگائے گا کہ میں نے جائیداد ہتھیانے کے لیے اس کا اور سراب کا خون کیا۔“

”جرگے نے کیا فیصلہ دیا تھا؟“ رحیم داد کے انداز میں تجسس تھا۔

”وہ تو سینس تو نے دیکھ ہی لیا۔“ سردار مزاری نے بتایا۔ ”جرگے میں دونوں کے خلاف سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا تھا۔ جرگے نے مرجان کو کالی اور سراب کو کالا مان لیا۔ بلوچ قانون کی رو سے کالی کی سزا یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ کالے کو کوئی بھی پھانسی پر چڑھا سکتا ہے۔ دونوں کے بارے میں جو فیصلہ ہوا وہ سارے معتبروں کا فیصلہ ہے۔ معتبر اپنے اپنے کیلوں کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ان کا فیصلہ سب کو ماننا پڑتا ہے۔ کوئی اس کے خلاف نہیں بول سکتا۔“

”جو بھی تو نے کیا“ اپنے تئیں ٹھیک ہی کیا۔ ”رحیم داد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”پر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ ایسا نہ ہوتا تو بہت ٹھیک تھا۔“

”تو سمجھتا ہے کہ مرجان سے نکاح پڑھانے کے بعد تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا اور کوئٹہ ہر کشن میں اپنی رن بنا کر رکھتا اور وہ تیرے ساتھ آرام سے رہتی؟“

”کیوں نہیں رہتی؟ کس کے پاس جاتی؟ کہیں بھی تو اس کا ٹھکانا نہیں تھا۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”ویسے میں نے اس کی مرضی طوم کر لی تھی۔ وہ مجھ سے ویاہ کرنے اور میری گھر والی بننے کے لیے بالکل رضامند تھی۔“

”ہرگز رضامند نہ تھی۔ بالکل جھوٹ بول رہی تھی۔“ سردار مزاری نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”مجھے پتہ ہے وہ تیرے ساتھ نکاح پڑھا لیتی۔ تیرے ساتھ گھر والی بن کر کوئٹہ ہر کشن بھی چلی

جاتی۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند ہویدا ہوا۔ ”پر ایک روز چپکے سے تیری حویلی سے نکلتی اور سیدھی ممدوٹوں کے پاس لہور پہنچتی۔ وہ اسے پوری حفاظت کے ساتھ لغاریوں کے پاس چوٹی پہنچا دیتے۔“

”ایسا کر کے اسے کیا ملتا؟“ رحیم داد نے حیرت سے پوچھا۔ ”ویسے بھی وہ تیرا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ دستاویز پر دستخط کرنے اور مجھ سے نکاح کرنے کے بعد وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔“

”وہ بہت کچھ کر سکتی تھی۔“ سردار مزاری نے ہنس کر کہا۔ ”سینس چوہدری، تجھے کچھ پتہ نہیں۔ وہ لغاریوں کی مدد سے میرے اور تیرے دونوں کے خلاف پولیس میں پرچہ چاک کرائی۔ یہ الزام لگائی کہ میں نے ڈرا دھمکا کر زبردستی دستاویز پر دستخط کرائے اور جائیداد ہتھیالی۔ تجھ پر وہ میرے ساتھ سازباز کرنے اور جبری نکاح کرنے کا الزام لگائی۔“

”کیا وہ ایسا بھی کر سکتی تھی؟“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں کہا۔

”وہ بالکل ایسا کر سکتی تھی۔“ مزاری نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”اور ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ یہ راز کسی اور نے نہیں بتایا خود مرجان نے بتایا اور پھانسی پر لٹکنے سے پہلے بتایا۔“

”کیا کبھی تھی وہ؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

سردار مزاری نے تفصیل سے بتایا۔ ”پھانسی کا پھندا اگر دن میں ڈالنے سے پہلے وہ غصے سے پاگل ہو گئی۔ چیخ چیخ کر معتبروں سے کہنے لگی۔ جرگے کے سامنے مکہ نہ پیش نہ ہوتا اور مجھے معاف کر دیا جاتا تو میں شہ زور اور اس کے یار چوہدری، دونوں کو عدالت میں بلاتی۔ سراب کا خون کرنے اور جائیداد پر کبہ کرنے کے لیے اسامپ پر زبردستی دستخط کرائے کا الزام لگائی۔ پورا پورا بدلہ لیتی۔ پر میں ہار گئی۔ میں اپنا بدلہ نہ لے سکی۔“ سردار شہ زور مزاری نے رحیم داد کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”غیر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔“

رحیم داد پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ حیران و پریشان نظر آ رہا تھا۔ مزاری بھی خاموش رہا۔ رات اور سناں ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد سردار مزاری نے پہلو بدلا۔ مسکرا کر بولا۔ ”تو پریشان نظر آ رہا ہے۔ اب تو آرام کر۔ نمیسو کی رن تیرے پاس آجائے گی۔ تیری ساری پریشانی جاتی رہے گی۔“

اس نے اٹھنا چاہا۔ مگر رحیم داد نے روک دیا۔ ”شہ زور تو میری اک بات مان لے گا؟“

”بتا گیا کہنا چاہتا ہے۔؟“ مزاری نے مستعدی سے کہا۔

”ہاتو کا اوٹھ مل جانے کی بعد یہ تو ثابت ہو گیا کہ لنگرنے چوری نہیں کی تھی۔“

”ہاتو کا اوٹھ مل جانے سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ لنگرنے چوری نہیں کی تھی۔“ شہ زور نے

رحیم داد کی دلیل مسترد کر دی۔ ”ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ چوری کرنے کے بعد لنگر نے جس کے پاس ادھ چھپا کر رکھا تھا اس نے سزا کے ڈر سے اسے چھوڑ دیا ہو اور وہ ہاتھ کے پیچہ کو مل گیا۔ جب تک پوری تفتیش نہ کی جائے تب تک ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”لنگر کی گالہ چھوڑ، صاف، صاف بتا تو چاہتا کیا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں تو نمیسو اور جلاوت کو معافی دے دے۔ ان کے بال بچوں کو چھوڑ دے تاکہ وہ اپنے گھر چلے جائیں۔“ رحیم داد نے کسی قدر عاجزی سے کہا۔

”تو کہتا ہے تو دونوں کو معافی دے دوں گا۔“ سردار مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”اب تو خوش ہو جا۔ تجھے یار کہا ہے تو تیری بات بھی ماننی پڑے گی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”مجھے جانا ہے۔ جلاوت کی رن میرا انتظار کرتی ہو گی۔“

سردار مزاری اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مزید روکنے کی کوشش نہ کی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا رات کے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ اٹھ کر بستر پر نہ گیا۔ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔



تاریکی میں ایک پر چھائیں لہرائی۔ رحیم داد نے چونک کر دیکھا۔ نمیسو کی بیوی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ وہ پریشان اور گھبرائی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس نے سسے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”سب تو نے اپنی کھٹ یہاں کیوں ڈلوائی؟“ نمیسو کی بیوی نے ایک ہاتھ اٹھایا اور درختوں کے جھنڈ کی جانب اشارہ کیا۔ ”ادھر ملوک زادی اور سراب کے مردوں کو منسلایا جا رہا ہے۔“

رحیم داد نے گردن موڑ کر اس سمت نظر دوڑائی۔ درختوں تلے لالین کی دھندلی دھندلی روشنی میں انسانی سائے ادھر ادھر حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ پانی گرنے کی آواز ابھری رہی تھی۔ رحیم داد نے نمیسو کی بیوی کے گھبرائے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”سب تو نے نمیسو کو معافی دلانے کو کہا تھا۔ تو نے سردار سے بات کی تھی؟“ اس کی نظروں میں الجھا تھی۔ ”سب تو اسے معافی دلوا دے۔ بھل ہو گئی۔ سب توں سدا جیوی۔ سبھی صحت ہووی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔

”نمیسو اور جلاوت کو معافی مل جائے گی۔ کل تو اپنے گھر چلی جائے گی۔ جلاوت کی گھر والی بھی چلی جائے گی۔ سردار نے معافی دینے کا مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔“

”سب تو بچ کہہ رہا ہے؟“ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ رحیم داد کو اس طرح

دیکھنے لگی جیسے اس کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔ وہ بے قرار ہو کر بولی۔ ”سب ٹھیک ٹھیک بتا۔ سردار نے وعدہ کر لیا ہے؟“

”میں تجھ سے جھوٹ نہیں بول رہا۔“ رحیم داد نے اسے باور کرایا۔ ”نمیسو اور جلاوت کو اب نہ ہاتھ کے لیے ادھ کا بندوبست کرنا پڑے گا نہ سردار کو جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔“

وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ”سب تو جھوٹ نہیں بول سکتا۔ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ اس کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ ویران آنکھوں میں چراغ روشن ہو گئے۔ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر رحیم داد کو دیکھا۔ اس میں عشوہ تھا۔ لگاوت تھی۔ ”سب تو کمرے کے اندر چل۔ میں کھٹ اندر ڈال دوں گی۔ تیرے ہی پاس رہوں گی۔“

”مجھے یہیں بیٹھا رہنے دے۔“ رحیم داد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تو اپنے بچے کے پاس جا۔ وہ بھوکا ہو گا۔ جلاوت کی گھر والی کو بھی بتا دیتا۔“

”وہ تو سردار کے کمرے میں ہے۔ سویرے اسے بتا دوں گی۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر وہ خاموش نہ رہی۔ ”سب تو نراض تو نہیں ہے؟“ اس نے عاجزی سے کہا۔ ”میں اب جاؤں؟“

”ہاں اب تو نر جا۔“ رحیم داد نے بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

نمیسو کی بیوی آگے بڑھی۔ برآمدے سے نیچے اترتی اور نوکروں کی کوٹھری کی جانب روانہ ہو گئی۔ رحیم داد مت ہٹا چپ بیٹھا رہا۔ ہوا میں تیزی تھی۔ خشک پتے ہولے ہولے آہٹیں پیدا کر رہے تھے۔ فضا میں کافور کی تیز بو پچی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مڑ کر درختوں کی جانب دیکھا۔ اندھیرے میں لالین کی روشنی زرد دھبے کی مانند نظر آ رہی تھی۔ ہوا کے جھونکوں سے بار بار لالین کی لوبھڑکتی۔ درختوں کے نیچے رکھے ہوئے جنازوں کا اجلا اجلا کفن کبھی نمایاں ہو جاتا کبھی دھندلا پڑ جاتا۔ ان میں ایک مرجان کا جنازہ تھا اور دوسرا سراب کا۔ مرجان کالی قرار دی گئی تھی اور سراب کالا۔ دونوں کو سیاہ کاری کے جرم میں جرمے کے حکم پر پھانسی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کفن میں لپیٹی ہوئی ان کی لاشیں لالین کی دھندلی روشنی میں دور سے نظر آ رہی تھیں۔

رحیم داد اس طرح زیادہ دیر نہ بیٹھ سکا۔ پریشان ہو کر اٹھا۔ کمرے کے اندر گیا۔ اس نے لباس تبدیل کیا۔ دھوئی باندھی اور برآمدے کی جانب بڑھا۔ مگر دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا۔ جنازے اب کالپائیوں پر رکھے تھے۔ مزاری کے کارندے اور نوکر چاکر چارپائیوں کو کاندھوں پر اٹھائے

آہستہ آہستہ پھانک کی جانب بڑھ رہے تھے۔ ایک کارندہ ہاتھ میں لائین سنبھالے جنازوں کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

رحیم داد نے گہری سانس بھری۔ بوجھل قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکلا۔ بستر کی جانب بڑھا اور نڈھال ہو کر لیٹ گیا۔ اسے بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ رات سخت ذہنی کرب کے عالم میں گئی۔ صبح اس نے حسب معمول سردار مزاری کے ساتھ ناشتا کیا اور دھوپ کی تمازت بڑھنے سے پہلے ہی مزاری کے ہم راہ جیپ میں بیٹھ کر شاہ میر کی جانب روانہ ہو گیا۔



رحیم داد بے زار اور اکتایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ شاہ میر پہنچنے کے چند ہی روز بعد سویرے ہی سویرے اس نے سردار شہ زور خان مزاری سے صاف صاف کہہ دیا۔ ”مزاری“ میں نے لمبور جانا ہے۔ اب تیرے ساتھ نہیں ٹھہر سکتا۔“

سردار مزاری نے اس بار بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کی، مسکرا کر بے تکلفی سے بولا۔ ”لمبور جانا ہے تو ضرور جا۔ میں کب کہتا ہوں نہ جا، پر میں نے بھی لمبور جانا ہے۔ دونوں اکٹھے ہی چلیں گے۔“

”تو بعد میں پہنچ جانا۔ مجھے جانے دے۔“

”میں نے ادھر شاہ میر میں کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ ان سے فارغ ہوتے ہی چل دوں گا۔“ شہ زور مزاری نے اسے روکنے کے لیے عذر پیش کیا۔ ”چند روز میں سارے کام نمٹ جائیں گے۔ تو چند روز بھی انتظار نہیں کر سکتا؟“

”میں لمبور میں تیرا انتظار کروں گا۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”میں نے شاہ جی سے مل کر لاکھ پور کی الاٹمنٹ کا فیصلہ کرانا ہے۔ تجھے پتہ نہیں ادھر کی زمین کتنی کام کی ہے۔ میں نے اسے اپنے نام الاٹ کرنا ہے اور فوری طور پر کرانا ہے۔“

”شابانی بتاتا تھا، وہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ اس کے تو کئی دعویدار ہیں۔ اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔“ سردار مزاری نے کہا۔ ”جب تک ادھر کا فیصلہ ہو ادھر تجھے الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔ تیری درخواست پر کارروائی شروع ہو چکی ہے۔ اب تو الاٹمنٹ ملنے کا انتظار ہے۔ اس میں

زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ محکمہ بحالیات میں اوپر سے نیچے تک سارے ہی اپنے بندے لگے ہیں۔ ڈپٹی کنشٹر اور افسر مال سے بھی یاری ہے۔ کبفہ بھی جلد مل جائے گا۔

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ ”ادھر کی الاٹمنٹ کا کام تو دیکھ لے گا۔ لائل پور کا معاملہ الجھا ہوا ہے۔ اس کے لیے مجھے خود جا کر کوشش کرانی ہوگی۔“

”ضرور کرانا۔ پر ادھر کی اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے تیرا یہاں موجود ہونا بھی ضروری ہے۔“ سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”میں آج ہی چاکر خاں کو روانہ کرتا ہوں کہ وہ افسروں سے مل جل کر کم سے کم مدت میں الاٹمنٹ حاصل کر لے۔ تو چند روز ادھر آرام کر۔ اپنی اراضی کی الاٹمنٹ لے اور چلا جا۔ بعد میں چاکر تیری اراضی کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔“ اس کے لہجے میں نرمی اور محبت کی شیرینی تھلی ہوئی تھی۔ ”میری خوشی ہے تو ابھی نہ جا۔ دونوں اکٹھے چلیں گے۔ کچھ ہی دنوں کی تو بات ہے۔“

رحیم داد نے مزاری کے مسلسل اصرار کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سردار مزاری نے خوش ہو کر فوراً چاکر خاں سرگانی کو بلایا اور اسے ڈیرہ غازی خاں شہر کی جانب روانہ کر دیا۔

رحیم داد کوٹ کے ڈیرے میں ٹھہرا رہا۔ شاہ میر پہنچتے ہی سردار شہ زور خاں کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ روزانہ ہی ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد پکھری لگاتا۔ پکھری کا بندوبست عام طور پر مہمان خانے کے اس وسیع اور کشادہ کمرے میں کیا جاتا جو روشن اور ہوادار بھی تھا۔ اس کی کھڑکیاں صحن میں کھلتی تھیں۔ زیادہ گرمی اور جس ہوتا تو پکھری درختوں تلے لگتی۔ سردار مزاری اونچے اور چوڑے چٹکے پلنگ پر بیٹھ جاتا۔ کوئی ہاتھایا کراوا اس کے پیروں اور کمرے کے گرد خیری لپیٹ کر زانو بندی کر دیتا۔

پکھری میں طرح طرح کے مقدمات پیش کئے جاتے۔ سردار مزاری مقدمے کی کارروائی کے دوران حسب معمول سنجیدہ رہتا۔ اس کے چہرے پر رعب و دبدبہ چھایا ہوتا۔ وہ فریقین کے بیانات پوری توجہ سے سنتا۔ گواہوں پر جرح کرتا۔ مقدمہ سمجھنے اور اصل حقیقت کا سراغ لگانے کی حتی الوسع کوشش کرتا۔ فیصلہ سنانے سے قبل کچھ دیر مقدمے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتا۔ اس کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا۔ ہر فریق کو تسلیم کرنا پڑتا۔ کوئی فریق اس کے فیصلے کے خلاف سرکاری عدالت سے رجوع کرنے کا مجاز نہ تھا۔ اگر کوئی ایسی جرات کرتا تو حکم عدولی اور نافرمانی کے الزام میں اس کے خلاف قبائلی قوانین کے مطابق مقدمہ چلایا جاتا اور کڑی سزا دی جاتی۔

پکھری، سردار شہ زور مزاری کی آمدنی کا نہایت اچھا اور معقول وسیلہ تھی۔ وہ مقدمات کی باقاعدہ فیس وصول کرتا اور جرمانے کی رقم بھی۔ سردار مزاری دوپہر تک پکھری لگاتا۔ پھر کھانا کھاتا اور آرام کرنے حویلی کے اندر چلا جاتا۔ شام کو پینے پلانے کا شغل ہوتا۔ دوست احباب اور سرکاری افسر آجاتے تو جا بھی ہوتا۔ رات گئے تک اس کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ ہزاروں روپے ادھر سے ادھر ہو جاتے۔

رحیم داد، دل بہلانے کے لیے پکھری میں جا کر بیٹھ جاتا۔ مقدمات کی کارروائی دلچسپی سے سنتا۔ اور اس سے بھی زیادہ دلچسپی سے فیصلے سنتا۔ مقدمات کی طرح فیصلے بھی عجیب و غریب ہوتے۔ ان کے ذریعے رحیم داد کو بلوچوں کے روایتی قوانین اور ان کے قبائلی رسم و رواج سمجھنے کا موقع ملتا۔

چاکر خاں سرگانی، ڈیرہ غازی خاں شہر سے واپس نہیں آیا تھا۔ وہ رحیم داد کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی کا الاٹ منٹ حاصل کرنے کے لیے اعلیٰ حکام اور سرکاری اہل کاروں سے ملاقاتیں کر رہا تھا۔ دفتر کے چکر کاٹ رہا تھا۔ فائلوں کو ایک شعبے سے دوسرے شعبے تک جلد سے جلد پہنچانے کی کوشش میں لگا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں پکھری کا انتظام و انصرام، کم دار وحدت خاں گور چانی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ وہ پیش کار کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ مقدمات کی فیس اور جرمانوں کی رقم وصول کرتا تھا۔ رجسٹر میں باقاعدہ اس کا اندراج کرتا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ لیکن پرانا ملازم تھا۔ کم دار کی حیثیت سے کام کرتے کرتے زمین داری کے امور کے ساتھ پکھری کے معاملات بھی خوش اسلوبی سے انجام دینے لگا تھا۔ وہ سردار شہ زور مزاری کا مزاج بخوبی سمجھتا تھا۔ اس کی نظریں پہچانتا تھا۔

ایک صبح پکھری لگی تھی۔ رحیم داد بھی کمرے میں موجود تھا۔ سردار مزاری، پلنگ پر وٹھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی طبیعت قدرے مکدر تھی۔ رات اس نے کچھ زیادہ ہی شراب نوشی کی تھی۔ اور قمار بازی میں ہارا بھی زیادہ تھا۔ اس کے چہرے سے تھکن اور شب بیداری کے اثرات ہویدا تھے۔ آنکھوں میں سرخی تھی۔ ہونٹ خشک تھے۔ مقدمات کی کارروائی کے دوران بار بار پانی پیتا۔ ایک ملازم پشت پر کھڑا نہایت مستعدی سے پکھا جھل رہا تھا۔ قریب ہی کم دار وحدت خاں ادب سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے دو ماتحت کراوے دروازے کے دائیں بائیں چاق چوبند کھڑے تھے۔

مقدمات کی سماعت جاری تھی۔ سردار شہ زور خاں مزاری، فریقین کے بیانات سن رہا تھا۔ گواہوں پر جرح کر رہا تھا۔ اور بیانات اور جرح کی روشنی میں قبائلی قوانین اور ضابطوں کے

مطابق فیصلے کر رہا تھا۔ عام طور پر وہ فریقین کے مابین صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتا۔ جرم سنگین نوعیت کا ہوتا تو جرمانہ عائد کرتا۔ زیادہ سنگین ہوتا تو جرمانے کے ساتھ ساتھ قید کی سزا بھی دیتا۔

کمرے کی فضا بو جھل تھی۔ خلاف معمول خاموشی کچھ زیادہ ہی تھی۔ ایک بوڑھی بلوچ عورت اپنا مقدمہ پیش کرنے کی غرض سے داخل ہوئی۔ اس کا لباس میلا پھیلا اور بوسیدہ تھا۔ سر کے بال بھی میلے چپکے تھے۔ جسم سے پسینے کی بو کے تیز بھجکے اٹھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھی اور سردار مزاری کے روبرو ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

سردار مزاری نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ بوڑھی عورت نے گڑگڑا کر فریاد کی۔ ”سینس سردار سدا جیویں۔ سکھی صحت ہوویں۔ سینس! میں لٹ گئی۔ تباہ ہو گئی۔ میں فیادی ہوں۔ تیرے پاس نزوار کے لیے آئی ہوں۔ مجھے پکا۔ یکین ہے تو میرے ساتھ نیائے کرے گا۔ توں ضرور نیائے کرے گا۔“

”تیرے ساتھ پورا پورا نزدار اور انصاف ہو گا۔“ سردار مزاری نے بوڑھی بلوچ عورت کو یقین دلایا۔ ”پروانہ نہ کر۔ صاف صاف بتا، تیرے ساتھ کیا ظلم ہوا۔ کس نے ظلم کیا؟ بے دھڑک اپنا بیان پیش کر۔“

”سینس! میرے گھروالے کادت ہوئی مرن ہو گیا۔ تب سے میں رنڈیوہ ہوں۔“ بوڑھی عورت نے گلوگیر لہجے میں اپنا بیان شروع کیا۔ ”میری صرف ایک ینگدھی ہے۔ اس کا ابھی پرنا نہیں ہوا۔ کنواری ہے۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ ”سینس! میری دھی کو اغوا کر لیا گیا۔ اٹھا لیا گیا۔ چار روز سے وہ اسی کے پاس ہے۔ اس نے مجھے تک کر دیا۔ بے عزت کر دیا۔ توں اسے سزا دے کر میری تک صاف کر دے، کالک کا داغ مٹا دے۔“ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ ”سینس سردار! میرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ میں مصیبت کی ماری ہوں۔ غریب ہوں۔ حلیم ہوں۔ سینس میرا کوئی بھی نہیں۔“

بوڑھی عورت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سردار مزاری اس کی آہ و زاری سے بہت متاثر ہوا۔ نرم لہجے میں اسے تسلی دی۔ ”مہر کر، مہر کر۔ تجھے پتہ ہے اسے کون اغوا کر کے لے گیا؟“

”سینس! میں نے پتہ ہے۔ اچھی طرح پتہ ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلاتی۔

”سردار کی تیوری پر پل پڑ گئے۔“ تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کون ہے وہ؟ کہاں رہتا ہے؟“

”سینس سردار! وہ چک رحمان کا بدھیل خاں ہے۔“ بوڑھی بلوچ عورت نے بتایا۔ ”میرے گھر والے کا اختر بچا ہے۔ اس طرح وہ میرا ایک شلوار ہوتا ہے۔ بہت نزدیک کا رشتہ سا لگا ہے۔“

بدھیل کا نام سن کر رحیم داد چونکا۔ وہ بدھیل کو کئی بار دیکھ چکا تھا۔ اس حقیقت سے بخوبی واقف

تھا کہ وہ شہ زور خان مزاری کا بہت وفادار اور جانثار تھا۔ قابل اعتماد تھا۔ رازدار تھا۔ سراب اور مرجان کی گرفتاری میں اس نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ایسا زبردست کارنامہ انجام دیا تھا کہ شہ زور مزاری کا بدنامی اور خجالت سے جھکا سراونچا ہو گیا۔ اس کا دبہہ اور وقار بحال ہو گیا۔

رحیم داد نے غور کیا، سردار مزاری کا چہرہ بھی دم بھر کے لیے متغیر ہو گیا۔ مگر بوڑھی بلوچ عورت رحیم داد کے ذہنی خلفشار اور سردار مزاری کے چہرے کے تاثرات سے بے نیاز، بدھیل خاں کے خلاف بولتی رہی۔ ”سینس! سب کو پتہ ہے۔‘ میری دھی اب تک اس کے گھر میں ہے۔“

”تو نے اپنی دھی کو واپس لانے کی کوشش کی؟“ سردار مزاری نے دریافت کیا۔ ”تو بدھیل کے گھر گئی تھی۔“

”سردار! میں اس کے گھر گئی تھی۔“ عورت نے جواب دیا۔ ”پر اس نے ساؤنی کو واپس دینے سے صاف انکار کر دیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”سینس! میری دھی کا ناں ساؤنی ہے۔ بدھیل کے لیے تو وہ رشتے کے اعتبار سے نیاڑی ہے۔ تجھے پتہ ہے، نیاڑی کے ساتھ لک لچھپ کے یاری لگانا بلوچوں میں حرام سمجھا جاتا ہے۔ اور اسے ورغلا کر لے جانا کتنا وڈا جرم ہوتا ہے۔ تو بلوچ سردار ہے۔ تجھے تو سب پتہ ہے ناں؟“

”یہ بتا، جب تو بدھیل کے گھر ساؤنی کو لینے گئی تو اس نے تجھے کیا کہا؟“ سردار مزاری نے سوال کیا۔

”سینس! وہ بہت نراض ہوا۔“ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔ ”جیج کر بولا، ساؤنی یہاں سے نہیں جائے گی۔ کوئی اسے نہیں لے جا سکتا۔“ بات کہتے کہتے وہ لمحے بھر کے لیے ٹھکی۔ ”سینس! اس نے تو یہ بھی کہا۔ میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں سردار کالا ڈلا ہوں۔ میں اس کا...“

”بکواس نہ کر۔“ سردار شہ زور مزاری نے جھنجھلا کر ڈانٹا۔ ”وہ ہرگز ایسی گالہ نہیں کہہ سکتا۔“ اس کا چہرہ غصے سے تھمنا لگا۔ تیوری پر پل پڑ گئے۔ ”کوئی میرا لاڈلا شاولا نہیں۔“

بوڑھی عورت خوف سے زرد پڑ گئی۔ گھگھیا کر بولی۔ ”سینس! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“ اس کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”میں نے تو اپنی ساؤنی واپس لینی ہے۔ میں نے بدھیل سے کیا لیتا۔ توں نیائے کر۔ میرے ساتھ انصاف کر۔“ وہ گڑگڑا کر دعائیں دینے لگی۔ ”سینس سردار سدا جیویں، رب راضی ہو دے۔ میں صدکے و نجاں۔“

”تیرے ساتھ انصاف ہو گا۔ پورا انصاف ہو گا۔“ مزاری نے ایک بار پھر اسے یقین دلایا۔ عورت نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموش کھڑی رہی۔ سردار مزاری نے مڑ کر وحدت خاں

گورچانی کی جانب دیکھا۔ ”وحدت“ کل صبح بدھیل کو ساؤنی کے ساتھ پکڑ کر پھری میں پیش کیا جائے۔“ وہ بوڑھی عورت کی طرف متوجہ ہوا۔ ”اب تو جا۔ کل بدھیل اور ساؤنی کے ساتھ تیری بھی پیشی ہوگی۔“

بوڑھی عورت دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی۔

سورج اب آسمان کے پتھوں پہنچ چکا تھا۔ دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ گرمی اس روز کچھ زیادہ ہی تھی اور سردار مزاری کی طبیعت بھی مضطرب تھی۔ لہذا کچھ معمول سے کچھ پہلے ہی برخاست کر دی گئی۔

دوسرے روز پھری گئی۔ مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ وحدت خان گورچانی نے بدھیل کو سردار مزاری کے روبرو پیش کیا۔ ساؤنی کی بوڑھی ماں بھی موجود تھی۔ شہ زور مزاری کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی سنجیدگی چھائی تھی۔ اس کی آنکھیں سوچتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بدھیل خان جب سامنے آیا تو اس نے نظریں اٹھائیں۔ لمحہ بھر کے لیے اس کے چہرے کو دیکھا اور گردن اٹھا کر دیوار کو تنکے لگا۔ وہ انگلیوں سے آہستہ آہستہ مونچھیں مروڑ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد سردار مزاری کی بھاری بھر کم آواز ابھری۔ ”بدھیل۔“ اس نے بوڑھی عورت کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تو اس زال کو جانتا ہے؟“

بدھیل نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش رہا۔ مگر ساؤنی کی ماں خاموش نہ رہی۔ تھیکے لہجے میں بولی۔ ”کیوں نہیں جانتا؟ بالکل جانتا ہے۔ سیں سردار! یہ تو۔“ سردار مزاری نے اسے آگے نہ بولنے دیا۔ غصے سے ڈپٹ کر بولا۔ ”بدھڑی! چپ کر کے کھڑی رہ۔ جب تجھ سے پوچھا جائے تب بول۔“ ساؤنی کی ماں ڈانٹ سن کر سہم گئی۔ نظریں جھکا کر فرش کو تنکے لگی۔

مزاری۔ ”بدھیل کی جانب دیکھا۔“ اس زال نے تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام لگایا ہے۔ اپنے بیان میں کہا ہے تو اس کی دھی، ساؤنی، کو اٹھا کر لے گیا۔ وہ ابھی تک تیرے پاس ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”تو اپنی صفائی میں کیا کتنا چاہتا ہے؟“

”سیں سردار! میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ سچ بتا دوں گا۔“ بدھیل نے انڈی صفائی میں کہا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ ساؤنی سے میں پیار کرتا ہوں۔ اسے اپنی رن بنانا چاہتا ہوں۔ مگر اس کے ساتھ پرنا کرنا چاہتا تھا۔“ اس نے نظریں موڑ کر بوڑھی کو دیکھا۔ ”میری ماں اس کے پار بازو منگن کے لیے گئی۔ میں بھی گیا۔ ایک بار نہیں بار بار گیا۔ اس کی منت کی۔ زاری کی پر اس۔“

ہر باری میری منت کو ٹھکرا دیا۔ میرے ساتھ ساؤنی کا پرنا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔“ ساؤنی کی ماں نے تھیکے نظریں سے بدھیل کو دیکھا۔ مگر خاموش رہی۔ بدھیل خان سنبھل کر بولتا رہا۔ ”سیں! سچي گالہ یہ ہے کہ یہ ایک بڑھے سے ساؤنی کا پرنا چاہتی ہے۔ اس کا ناں تاج محمد ہے۔ وہ میران پور کا سارا ہے۔ اس کے پاس بہت مال متال ہے۔ یہ ساؤنی کے لیے اس سے دو ہزار روپے لے رہی تھی۔“

بوڑھی عورت کے لیے اب غصے پر قابو پانا ممکن نہ رہا۔ تملاکر بولی۔ ”سیں! اس سے پوچھ! یہ میرا کیا لگتا ہے؟ ساؤنی! میری دھی ہے۔ میری جس سے مرضی ہوگی اس کے ساتھ ساؤنی کا پرنا کر دیں گی۔ یہ کون ہوتا ہے؟ یہ ساؤنی کو اٹھا کر کیوں لے گیا؟“

”سیں سردار! یہ بالکل غلط کہہ رہی ہے۔ میں ساؤنی کو اٹھا کر نہیں لے گیا۔“ بدھیل نے فوراً تردید کی۔ ”ساؤنی اپنی مرضی سے چل کر میرے گھر آئی تھی۔“

”سیں! یہ صاف جھوٹ بول رہا ہے۔“ بوڑھی عورت کے لہجے میں تنگی اور جھنجھلاہٹ تھی۔ ”یہ اونٹ پر بیٹھ کر اندھیرے میں میرے گھر آیا۔ اور ساؤنی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا کہ یہ ساؤنی کو زبردستی اٹھا کر لے گیا۔“ سردار مزاری نے جرح کرنے کے انداز میں ساؤنی کی ماں سے دریافت کیا۔ ”کیا ساؤنی نے تجھے ایسا کہا ہے؟“

”نا سیں۔“ بوڑھی عورت نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”میں اس کے گھر گئی تھی۔ پر اس نے مجھے ساؤنی سے ملنے ہی نہیں دیا۔ اس کی ماں نے اسے گھر کے اندر بند کر رکھا ہے۔ کسی سے اسے ملنے نہیں دیتی۔“

”سیں سردار! یہ بالکل جھوٹ بول رہی ہے۔“ بدھیل خاں نے صفائی پیش کی۔ ”ساؤنی کو میری اماں نے کہیں چھپا کر نہیں رکھا۔ جب یہ میرے پاس آئی تو ساؤنی میرے گھر میں تھی ہی نہیں۔“

”کہاں ہے وہ؟“ سردار مزاری نے بدھیل سے سوال کیا۔

”سیں سردار! مجھے کچھ پتہ نہیں! وہ کہاں ہے۔“ بدھیل نے بتایا۔

ساؤنی کی ماں تڑپ کر بولی۔ ”سیں! یہ فریبی ہے۔ بالکل جھوٹا ہے۔ اسے سب پتہ ہے! ساؤنی کہاں ہے۔ وہ اس کے گھر ہی میں ہے۔“

سردار شہ زور خاں مزاری نے بوڑھی عورت کو نظر انداز کرتے ہوئے مڑ کر وحدت خاں گورچانی کی طرف دیکھا۔ ”وحدت! اکل تجھے حکم دیا گیا تھا کہ بدھیل کے ساتھ ساؤنی کو بھی پیش کیا جائے۔ تو اسے کیوں نہیں لایا؟“ اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ”وہ کیوں نہیں آئی؟ کدھر ہے وہ؟“

وحدت نے بتایا۔ ”آج صبح یہ خود ہی حاضر ہو گئی۔“

مزاری نے نظر بھر کر ساؤنی کو دیکھا، پوچھا۔ ”تیرا ناں ساؤنی ہے؟“

”ہاں! ساؤنی نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر اقرار کیا۔

”تو اب تک کہاں تھی؟“ مزاری نے سوال کیا۔

”میں اپنی سوتر کے پاس تھی۔“ ساؤنی نے لرزتی آواز میں کہا۔ ”وہ چک سلیم میں رہتی ہے۔ وہ

مجھے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کا گھر والا بھی نیک بندہ ہے۔ دونوں نے مجھے بہت آرام سے رکھا۔“

”تو اس کے پاس کیوں گئی؟“

”ماں کے ڈر سے گئی تھی۔ وہ نراض ہوتی۔ مجھے مارتی جیٹتی۔“ ساؤنی نے سردار مزاری کو مطلع

کیا۔

”بدھیل کو پتہ تھا تو اپنی سوتر کے گھر میں ہے؟“

”نا سنا!“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”میں کسی کو بتائے بنا، ایک شام چپ چباتے اس

کے پاس چلی گئی تھی۔“

ل

”سین سردار، یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ ساؤنی کی ماں نے مداخلت کی۔ ”اسے بدھیل نے

ادھر پہنچایا ہو گا۔ ایسے ہی وہ اسے اٹھا کر بھی لے گیا تھا۔“

سردار مزاری نے اس کی مداخلت کو پسند نہ کیا۔ قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ساؤنی کی

جانب متوجہ ہوا۔ ”ساؤنی، تیری ماں کہتی ہے بدھیل تجھے زبردستی اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا یہ ٹھیک

ہے؟“

ساؤنی کچھ نہ بولی۔ گردن جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ کچہری

میں موجود ہر شخص کی نظریں ساؤنی کی جانب انہی تھیں۔ چہروں پر تجسس کے تاثرات ہو رہے تھے۔

جب ساؤنی نے دیر تک سوال کا جواب نہ دیا تو سردار شہ زور نے نرمی سے اصرار کیا۔ ”ڈر

نہیں، سچ بتا۔“

ماں نے بھی پچکار کر محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”ساؤنی، توں سردار لے صاف صاف بتا دے،

بدھیل تجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ اپنے گھر میں بند رکھا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا ناں؟“

ساؤنی نے ماں کی جانب توجہ نہ دی۔ نظریں اٹھا کر مزاری کی جانب دیکھا اور انکار میں آہستہ

آہستہ گردن ہلانے لگی۔

”خالی گردن نہ ہلا۔“ مزاری نے ڈپٹ کر کہا۔ ”جو کچھ کہتا ہے، زبان سے کہہ اور ٹھیک ٹھیک

”سین سردار، میں بدھیل کے گھر خود گیا تھا۔“ وحدت خان نے وضاحت کی۔ ”پر ساؤنی وہاں

نہیں تھی۔“

”تو نے گھر کی تلاشی لی تھی؟“ سردار مزاری نے سوال کیا۔

”میں نے گھر کی پوری تلاشی لی تھی۔ جب ساؤنی وہاں نہیں ملی تو اسے ڈھونڈنے کی ہر جگہ

کوشش کی۔ پر اس کا کچھ سراغ نہیں ملا۔“

”سین، اس نے اسے کیس چھپا دیا ہے۔“ ساؤنی کی ماں نے بدھیل کی طرف غصے اور نفرت

سے دیکھا۔ ”اسے پتہ ہے وہ کہاں ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ

گڑ گڑانے لگی۔ ”سین، مجھے میری ساؤنی دلوا دے۔ میں غریب ہوں۔ حلیم ہوں۔ رنڈ بیوہ ہوں۔

میرا کوئی نہیں۔ میرے ساتھ نیائے کیا جائے۔ توں سردار ہے۔ مالک ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔

”صبر کر۔ تسلی رکھ۔“ سردار مزاری نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تیرے ساتھ نیائے

ہو گا۔ پورا پورا انصاف ہو گا۔“

بدھیل کے چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے منڈلانے لگے۔ ساؤنی کی ماں دوپٹے کے پلو سے

آنسو پونچھنے لگی۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ پھر سردار مزاری کی آواز

ابھری۔ اس نے وحدت کو مخاطب کیا۔

”وحدت! ساؤنی کو پوری طرح تلاش کر۔ جہاں بھی ملے پکڑ کر پیش کیا جائے۔ جب تک وہ

برآمد نہ ہو، تب تک بدھیل کیدی رہے گا۔ اسے جیل میں بند کر دیا جائے۔“

یہ حکم صادر کرنے کے بعد مقدمے کی کارروائی آئندہ پیشی تک ملتوی کر دی گئی۔

☆

ساؤنی کچہری میں حاضر تھی۔ اس کی ماں بھی موجود تھی۔ بدھیل بھی تھا۔ ساؤنی جوان تھی اور

خوش شکل بھی تھی۔ قد ٹھٹھا ہوا تھا، جسم چھیرا تھا۔ رنگ اجلا تھا۔ مگر غنایت کی کمی اور سخت

مشقت کے باعث زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے خوف جھلکتا تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور ملگجا تھا۔ وہ

دوپٹے کے آچل سے چہرے کا نصف سے زائد حصہ چھپائے سہی ہوئی کھڑی تھی۔

مقدمے کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے وحدت خان گور چانی نے ساؤنی کو پیش کیا۔ ہاتھ کے

اشارے سے سردار شہ زور مزاری کو آگاہ کیا۔ ”سین سردار، یہ ساؤنی حاضر ہے۔“

”تو نے اسے کہاں سے برآمد کیا؟“ مزاری نے دریافت کیا۔

بیان کر۔

”میں اپنی مرضی سے بدھیل کے گھر گئی تھی۔“ ساؤنی کی آواز کپکپا رہی تھی۔ نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ ”سین، اس نے مجھے اٹھایا نہیں۔“

”سردار، یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ صاف صاف جھوٹ بول رہی ہے۔“ ماں نے گلوگیر لہجے میں احتجاج کیا۔ ”بدھیل نے اسے ڈرایا دھمکایا ہے۔“

مزاری نے ساؤنی سے سوال کیا۔ ”کیا تیری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے؟ بدھیل نے تجھے ڈرایا دھمکایا ہے؟“

”نا سیں!“ اس بار ساؤنی کے لہجے میں اعتماد جھلک رہا تھا۔ ”بدھیل نے مجھے بالکل ڈرایا دھمکایا نہیں۔ میں اس کے ساتھ راضی باضی تھی۔“ بات کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے جھلکتی آنکھوں سے سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ ”سین، میں تاج محمد سے پرنا کرنا نہیں چاہتی۔ ماں اس کے ہاتھ مجھے بچ دینا چاہتی ہے۔ وہ بڑھا کھوسٹ ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے گھن آتی ہے۔“

ماں غصے سے دانت پیستی ہوئی۔ ”وئی پر جھپٹی، اس کی پیٹھ پر زور سے دو تھرا مار اور سر کے بال نوچنے کھسوٹنے لگی۔ چیخ چیخ کر کونے لگی۔ شہ زور خان مزاری کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ اس نے خونخوار نظروں سے بوڑھی عورت کو دیکھا۔ جھنجھلا کر ڈانٹا۔ ”الگ ہٹ۔ چپ کر کے کھڑی ہو۔ آگے تو نے ایسی حرکت کی تو پکھری سے باہر نکال دوں گا۔ جرمانہ ڈال دوں گا۔“

ساؤنی کی ماں، سردار مزاری کو غصے کے عالم میں دیکھ کر سسم گئی۔ اس نے ساؤنی کے بالوں کو چھوڑ دیا۔ اور روتے ہوئے بولی۔ ”سین، میں لٹ گئی۔ میں برباد ہو گئی۔ بدھیل نے اس پر جادو ٹونکا کر دیا ہے۔“ اس نے ہاتھ سے ساؤنی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ ایسی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں نے اسے جتنا ہے۔ مجھ سے زیادہ اسے کون جانتا ہے۔“

”بہت بول چکی۔ بند کر اپنی کواں۔“ سردار مزاری نے ایک بار پھر برہم ہو کر اسے جھڑکا۔ ”تو چپ کر کے کھڑی نہیں رہ سکتی؟ تجھے پتہ ہے، یہ پکھری ہے۔“

کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی۔ ہر شخص دم بخود تھا۔ سردار مزاری نے گردن جھکائی اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ چہرے پر چھائے ہوئے غصے اور جھنجھلاہٹ کا غبار رفتہ رفتہ چھٹنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر ساؤنی کو دیکھا۔ اسے مخاطب کیا۔ ”ساؤنی، یہ بتا تو بدھیل کے پاس

کہتے روز رہی تھی۔؟“

”دو روز۔“ ساؤنی نے سردار مزاری سے نظریں ملائے بغیر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گہبراہٹ اور سراسیمگی پھیل گئی۔

ساؤنی کی ماں ڈانٹ پھنکار کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس نے ایک بار پھر مداخلت کی۔ ”سین سردار، یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“ بوڑھی عورت نے نفرت سے ساؤنی کو دیکھا۔ ”پر دو روز میں اس نے اپنی پت بگاڑ لی۔“ اس نے بدھیل کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے ساؤنی کو خراب کر دیا۔ سین سردار یہ کالا ہے۔ اسے کڑی سزا ملنی چاہیے۔“

”اگر یہ کالا ہے تو ساؤنی بھی کالی ہوئی۔“ سردار مزاری نے تیکھی نظروں سے ساؤنی کی ماں کو دیکھا۔ ”تجھے پتہ ہے کالے اور کالی کی سزا کیا ہوتی ہے؟“

ساؤنی کی ماں دم بخود رہ گئی۔ جھنجھلاہٹ اور برہمی کے بجائے اس کے چہرے پر خوف اور سراسیمگی کے سائے پھیل گئے۔

رحیم داد پکھری میں موجود تھا۔ کالا اور کالی کے الفاظ سن کر وہ بھی پریشان ہو گیا۔ اسے اب اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ کالے کالی کی سزا کیا ہوتی ہے۔ وہ سراب اور مرجان کا ہولناک انجام دیکھ چکا تھا جن پر سیاہ کاری کے الزام میں مقدمہ چلا تھا اور جرگے نے کالا اور کالی قرار دے کر دونوں کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ رحیم داد نے بدھیل اور ساؤنی کو دیکھا۔ ان کے چہروں پر اسے موت کے سائے منڈلاتے نظر آئے۔

سردار مزاری نے ساؤنی سے دریافت کیا۔ ”سچ بتا، بدھیل نے تجھے خراب تو نہیں کیا؟“

”نا سیں۔“ ساؤنی نے شرما کر اٹکتے ہوئے بتایا۔ ”میں بالکل ستھری ہوں۔ نیک مٹی ہوں۔“

”کیا ثبوت ہے کہ بدھیل نے تجھے خراب نہیں کیا۔ تو کالی نہیں ہوئی؟“ مزاری نے جرح کی۔

ساؤنی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑی رہی۔ مزاری کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ نظریں جھکائے فرش کو تکتی رہی۔ سردار مزاری گردن جھکا کر ایک بار پھر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

کچھ دیر بعد اس نے نظریں اٹھا کر ساؤنی کو دیکھا۔ لمحہ بھر تک اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ مگر اس پر مزید جرح نہ کی۔ مڑ کر وحدت خاں گورچانی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”وحدت!“ اس نے ساؤنی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ کوٹ میں رہے گی۔ اسے پرسوں پکھری میں پیش کرنا۔ فیصلہ بھی اسی روز سنایا جائے گا۔“

”ٹھیک ہے سس!“ وحدت خاں گورنپانی نے نہایت مستعدی سے جواب دیا۔ اس نے قدرے تامل کیا۔ پھر بلی زبان سے دریافت کیا۔ ”بدھیل کے بارے میں کیا حکم ہے؟“

”اے چھوڑ دیا جائے۔ اب یہ اپنے گھر جا سکتا ہے۔ اسے اگلی پیشی پر پکھری میں حاضر ہونا ہو گا۔“ مزاری نے بدھیل کی رہائی کے لیے حکم جاری کیا۔

مقدمے کی کارروائی دو روز کے لیے ملتوی کر دی گئی۔



دوپہر کو رحیم داد نے شہ زور مزاری کے ساتھ کھانا کھایا۔ مگر مقدمے کے بارے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔ رات کو بھی نہیں ہوئی۔ دوسرے روز سردار مزاری نے پکھری نہ لگائی۔ رحیم داد سے بھی اس کی ملاقات نہ ہوئی۔

دن ڈھلے رحیم داد نے معمول کے مطابق غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کمرے سے باہر نکلا۔ مہمان خانے کے وسیع صحن میں نوکروں نے مونڈھے ڈال دیئے تھے۔ چھڑکاؤ بھی کیا تھا۔ زمین سے مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

رحیم داد ایک مونڈھے پر جا کر بیٹھ گیا۔ شام کے سرمئی سائے دروہام پر پھیلتے جا رہے تھے۔ کمروں اور کونٹریوں میں لیپ اور چراغ روشن کر دیئے گئے تھے۔ مہمان خانے کے ایک گوشے میں باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے سے کھانوں کی خوشبو نکل کر فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ موسم گرما کی یہ شام بوجھل اور بے کیف تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ رحیم داد بدن پر پسینے کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ اسے سردار مزاری کا انتظار تھا۔

شام گرمی ہو گئی تھی۔ مگر شہ زور مزاری نہ آیا۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ اسی اثنا میں بدھیل خاں آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے حیرت سے دیکھا، پوچھا۔ ”بدھیل، تو ادھر کیسے آگیا؟“

”سس، میں نے سردار سے ملنا تھا۔“ بدھیل نے جواب دیا۔

”سردار، تجھے ملا؟“ رحیم داد نے انفسار کیا۔

”ہا سس، پر اس سے کوئی گالہ نہیں ہوئی۔ وہ جیب میں بیٹھ کر چلا گیا۔ اس نے مجھے دیکھا پر کچھ بولا نہیں۔“ بدھیل خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ ”وہ اپنے مامناں کے پاس رو جھان گیا ہے۔ اس کا مامناں بیمار ہے۔“

”تو سردار سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟“

”سس، میں نے اسے یہ بتانا تھا کہ ساؤنی بالکل ستھری ہے۔ بے گناہ ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔“ بدھیل نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔

”پر تو نے اسے گھر میں رکھا ہی کیوں؟“

”سس، میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ جب ساؤنی چھپ کر میرے گھر آئی تو میں گھبرا گیا۔ ماں نے بھی برا منایا۔ میں نے ساؤنی کو کہا کہ وہ اپنی ماں کے پاس واپس چلی جائے۔ پر وہ رونے لگی۔ بولی، میں نے ماں کے پاس واپس نہیں جانا۔ وہ مجھے تاج کے ہاتھ بیچ دے گی۔ سس، میں اسے اپنے گھر سے تو نہیں نکال سکتا تھا۔ وہ میرے گھر میں پناہ گمن آئی تھی۔“ بدھیل رک رک کر بولتا رہا۔ ”ویسے سس، میں اس سے بہت پیار بھی کرتا ہوں۔“

”وہ بھی تجھ سے پیار کرتی ہے؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”پیار نہ کرتی تو میرے گھر کیوں آتی۔ میں تو اس سے پرنا کرنا چاہتا تھا۔ پر اس کی ماں مجھ سے بھی دو ہزار روپے مانگتی تھی۔“ بدھیل نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”میں غریب راہک ہوں۔ اتنا روپیہ کہاں سے لاتا۔“

”تو سردار کا مزارع ہے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”میں تو سمجھتا تھا تو اس کا کردہ ہے۔ کردہ نہ ہوتا تو سردار تجھے سراب اور مرجان کو پکڑنے پر داؤد اور ہجر خاں کے ساتھ کیوں لگاتا۔“

”سس، یہ اس کی مرضی ہے۔ جب چاہے وہ کسی بھی راہک یا مزارع کو باغیا کرادنا کر دیا کر پر لگا دے۔ جو کام چاہے لے۔ وہ سردار ہے، مالک ہے۔ اس کا حکم تو ماننا ہی پڑتا ہے۔“ بدھیل نے اپنی مجبوری بیان کی۔

”مان لے سردار نے تجھے کالا اور ساؤنی کو کالی سمجھا، تب تو وہ تجھے اور ساؤنی کو پھانسی پر بھی لٹکا سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”کنون تو یہی ہے۔“ بدھیل نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ویسے سردار کی مرضی ہے۔ جیسا چاہے فیصلہ دے۔“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر گرمی سوچ میں ڈوب گیا۔ مگر بدھیل نے اسے زیادہ دیر خاموش نہ رہنے دیا۔ نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”سس، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

رحیم داد نے اس کے سوال کا براہ راست جواب نہ دیا۔ چونکہ نظروں سے اُدھر ادھر دیکھا۔ اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے مشورہ دیا۔ ”موت تیرے سر پر کھڑی ہے، تو یہاں سے بھاگ

کیوں نہیں جاتا؟

”سائیں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ بدھیل کے چہرے پر سراسیمگی چھا گئی۔ ”میں نے بھاگنے کی کوشش کی، تب تو سردار بالکل یہ سمجھ گیا کہ میں گناہ گار ہوں۔ وہ مجھے کالا بنا کر ایک دم پھانسی پر لٹکا دے گا۔ ہرگز زندہ نہ چھوڑے گا۔ لگتا ہے توں نے اس کا سہہ نہیں دیکھا۔ ایسا گرم ہو جاتا ہے کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔“ اس کی آنکھوں سے خوف جھلکنے لگا۔ ”ویسے میں بھاگنا بھی چاہوں تو بھاگ نہیں سکتا۔ تجھے پتہ نہیں کم دار وحدت خان نے میرے پیچھے دو کراوے لگا دیئے ہیں۔ وہ میری کڑی پھیری کرتے ہیں۔ ہر دم ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔“

”یہاں تو مجھے کوئی ایسا کرا دیا کرندہ نظر نہیں آتا۔“ رحیم داد نے مٹلاشی نظروں سے اذھر ادرہ دیکھا۔

”دونوں کوٹ کے باہر بیٹھے ہیں۔“ بدھیل نے مڑ کر سہمی ہوئی نظروں سے حویلی کے صدر دروازے کی جانب دیکھا۔ ”دونوں ہی مسلح ہیں۔ ہر دم چوک رہتے ہیں۔“

”یہ بتا، تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟“

”سائیں، میں سردار سے جو کچھ بتانا چاہتا ہوں، توں اسے بتا دے۔“ بدھیل خان نے جھک کر رحیم داد کے پیر پکڑ لیے۔ گڑگڑا کر فریاد کرنے لگا۔ ”سائیں توں سدا جیویں، رب راضی ہووی۔ سردار تیرا یار ہے۔ تجھ پر بھروسہ کرتا ہے۔ توں جو کہے گا مان لے گا۔“

رحیم داد نے اپنے پیر چھڑاتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ”تو کہتا ہے تو میں سردار سے تیرے بارے میں بات کروں گا۔ پر یہ اس کی مرضی ہے، مانے نہ مانے۔“

”میں نے پتہ ہے، وہ ضرور مان لے گا۔“ بدھیل عاجزی سے بولا۔

”اب تو یہاں سے جا۔ سردار آتا ہی ہو گا۔“ رحیم داد نے بیزار سے کہا۔ ”تجھے میرے پاس دیکھ کر ہو سکتا ہے وہ نراض ہو جائے۔“

بدھیل نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ خاموشی سے مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا حویلی کے صدر دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

شام اور گہری ہو گئی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ رات ہو گئی۔ رحیم داد خاموش بیٹھا، شہ زور خان مزاری کا انتظار کرتا رہا۔

رات گئے سردار مزاری واپس آیا۔ وہ اس وقت سرخوشی کے عالم میں تھا۔ قدم ہنکے ہوئے آنکھیں چڑھی ہوئیں۔ اس نے ایک مونڈھا کھینچا اور اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”معاف کرنا

چوہدری، مجھے لوٹنے میں دیر ہو گئی۔ جاتے ہوئے تجھ سے مل بھی نہ سکا۔“

”مجھے پتہ ہے، تیرا ماما بیمار ہے۔ تو اسی کے پاس گیا تھا نا؟“ رحیم داد نے کہا۔ ”اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟“

”صبح کچھ زیادہ گڑبڑ ہو گئی تھی پر اب پہلے سے ٹھیک ہے۔“

”بیماری کیا ہے اسے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”ایک بیماری ہو تو بتاؤں۔ سب سے وڈی بیماری تو خود بڑھاپا ہے۔ بہت عمر ہو گئی ہے اس کی۔ چل پھر بھی نہیں سکتا۔ دن رات بستر ہی پر پڑا رہتا ہے۔ اب تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ میں زیادہ دیر اس کے پاس ٹھہر نہ سکا۔“

”جب تو اس کے پاس زیادہ دیر نہیں رہا تو اب تک کہاں تھا؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”راجن پور سے تحصیل دار آیا ہے۔ اسے بھی ملنا تھا۔“ سردار مزاری نے بتایا۔ ”اس نے پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور بھی سرکاری افسر موجود تھے۔ بوتل کھلی تھی۔ گلاس ٹکرا رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ روٹی بھی ان کے ساتھ ہی کھائی۔“ اس نے تامل کیا۔ ”تو نے روٹی کھالی ہو گی؟“

”نہیں!“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تیرا انتظار کر رہا تھا۔“

”حد کر دی تو نے، اب تک بھوکا بیٹھا ہے۔“

”جب تو آگیا ہے تو کھالوں گا۔ ویسے مجھے زیادہ بھوک بھی نہیں ہے۔“ رحیم داد بدستور مسکراتا رہا۔

سردار مزاری خاموش رہا۔ رحیم داد بھی نہیں بولا۔ مگر زیادہ دیر چپ نہ رہا، حرف مطلب پر آگیا۔ ”تو نے کل صبح بدھیل اور ساؤنی کے مکدے کا فیصلہ کرنا ہے نا؟“

”کرنا تو ہے، پر تجھے اس سے کیا لینا۔“ مزاری کے لہجے میں بیزار جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنی مخور آنکھوں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”بدھیل تو تیرے پاس نہیں آیا تھا؟“ نشے کی لہر سے اس کا سر ہولے ہولے جھوننے لگا۔ ”ضرور آیا ہو گا۔ مجھے ملا تھا۔ تجھے بھی ملا ہو گا۔ ملا تھا نا؟“

”ہاں، وہ مجھے ملا تھا۔“ رحیم داد اناکارہ کر سکا۔

”کیا کہتا تھا؟“ سردار مزاری نے کرید کر پوچھا۔

”کہتا تھا، میں نے تو ساؤنی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ وہ پاک دامن ہے۔ بالکل بے گناہ ہے۔“

رحیم داد نے مزاری کو آگاہ کیا۔

”اس نے جو کچھ کہا تو نے مان بھی لیا۔ لگتا ایسا ہی ہے۔“ مزاری نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔ ”سین چوہدری تو بہت نیک بندہ ہے۔ یہ تو سوچ دوںوں ہی بھر پور جوان ہیں۔ یاری بھی لگا رکھی ہے۔ دو راتوں تک اکٹھے بھی رہے۔“ اس کا لہجہ نامحانہ ہو گیا۔ ”جوانی تو اندھی ہوتی ہے نا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ تجھے یا مجھے کیا پتہ؟“

”مجھے تو دونوں ہی بے گناہ لگتے ہیں۔“ رحیم داد نے بدھیل اور ساؤنی کی حمایت میں کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ دونوں بے گناہ ہیں؟“ سردار مزاری نے جرح شروع کر دی۔ رحیم داد کے پاس کوئی مناسب جواب نہ تھا۔ اس نے پتیرا بدلا اور مزاری کے ذہن میں بدھیل کے حق میں ہمدردی کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”تجھے یہ تو پتہ ہے بدھیل تیرا کتنا وفادار بندہ ہے۔ سراب اور مرجان کو پکڑنے میں اس نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ تیری پگ اونچی کرنے کے لیے اس نے یہ سب کچھ کیا تھا۔“

”وفاداری اپنی جگہ پر وفاداری سے اس کا جرم تو ختم نہیں ہو جاتا۔“ مزاری متاثر نہ ہوا۔ ”مجھے انصاف کرنا ہے اور جرم کو سامنے رکھ کر ہی کرنا ہے۔“

”مان لے بدھیل نے ساؤنی کو خراب کر دیا تب تو کیا کرے گا؟“ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے سوال کیا۔

”سزا تو وہی دینی ہوگی جو کالے اور کالی کو بلوچوں کے قانون کے رو سے دی جانی چاہیے۔“

سردار مزاری کے لہجے میں تذبذب کا عنصر غالب تھا۔ رحیم داد نے بھی اسے محسوس کیا۔ اور اسی تذبذب کا سہارا لے کر اس نے زیادہ کھل کر بات کی۔ ”یہ بتا تجھے کل کیا فیصلہ دیتا ہے؟“

”میں نے اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ جو بھی فیصلہ دوں گا، کل صبح تو سن لیتا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں نے اب جانا ہے۔ تو روٹی کھا کر سو جا۔“

رحیم داد اس سے مزید بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ ٹھہرا نہیں۔ جھومتا جھومتا آگے بڑھ گیا۔ رحیم داد صرف اس کی جانب دیکھتا ہی رہ گیا۔



رات جاگ رہی تھی۔ رحیم داد بھی جاگ رہا تھا۔ اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ سخت ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ بے چینی سے بستر پر گھوم رہا تھا۔ اسے بدھیل اور ساؤنی کے بارے میں

تشویش تھی۔ دونوں ہی نوجوان تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے اور اس کی نظروں میں بے قصور بھی تھے۔ اسے دھڑکا تھا کہ سردار شہ زور خاں مزاری انھیں کالا اور کالی قرار دے کر کہیں پھانسی پر نہ چڑھا دے۔ وہ سردار تھا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ لنگر خاں کو اس کے حکم پر دریا میں ڈوب کر مرتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ سراب اور مرجان کی موت کا لرزہ خیز منظر بار بار اس کی نظروں کے سامنے آ جاتا۔ وہ بدھیل اور ساؤنی کو اس طرح مرتے ہوئے دیکھنا نہ چاہتا تھا۔

صبح ہوئی۔ رحیم داد کی بے کلی ختم نہ ہوئی۔ وہ شہ زور مزاری سے مقدمے کے بارے میں ایک بار پھر بات کرنا چاہتا تھا۔ بدھیل اور ساؤنی کو بچانے کی یہ آخری کوشش تھی، مگر سردار مزاری خلاف معمول ناشتے پر نہ آیا۔ زنان خانے سے نکل کر سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جس میں پکھری لگتی تھی۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کرتا رہ گیا۔

سردار مزاری نے اسے پکھری میں بلوایا بھی نہیں۔ وہ بو جھل قدموں سے چلتا ہوا خود ہی وہاں پہنچ گیا۔ مزاری نے اسے داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ رحیم داد ایک مونڈھے پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ سردار مزاری حسب دستور و لٹھ مارے پلنگ پر بیٹھا تھا۔

پکھری پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ہر شخص چپ تھا۔ کچھ دیر بعد سردار شہ زور مزاری نے نظرس اٹھا کر بدھیل اور ساؤنی کو دیکھا۔ دونوں دم بخود تھے۔ ان کے چہرے خوف سے مٹیالے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں دیران اور افرہ تھیں۔

ان کے قریب ہی ساؤنی کی ماں ادب سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ وہ بھی خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آرہی تھی۔ حویلی کا ماحول شہ زور مزاری کے کندھے اور بازوؤں کے پٹھے ہولے ہولے دبا رہا تھا۔

سردار مزاری نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور یوں گویا ہوا۔ ”میں نے سب کے بیانات سنے۔ ان کی جانچ پڑتال بھی کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ساؤنی کی ماں نے بدھیل کے خلاف جو الزام لگایا ہے وہ ٹھیک اور درست ہے۔“

رحیم داد نے بے قرار ہو کر پہلو بدلا۔ پریشان ہو کر سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجب اور دبدبہ تھا۔ وہ نہایت یکسوئی کے ساتھ بول رہا تھا۔ ”بدھیل نے اپنی صفائی میں جو کچھ کہا ہے، اس کی تائید ساؤنی کے بیان سے تو ہوتی ہے۔ پر ساؤنی کیوں کہ برابر سے شریک جرم ہے اس واسطے اس کے بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔ بدھیل نے خود بھی مانا ہے، تسلیم کیا ہے کہ ساؤنی اس کے

گھر میں دو روز تک رہی۔ پر اس الزام سے انکاری ہے کہ وہ ساؤنی کو اٹھا کر نہیں لایا۔ اپنے اس بیان کو کچ ثابت کرنے کے لیے اس نے نہ کوئی گواہی پیش کی نہ شہادت۔

”سین سردار! گواہی اور شہادت تو ساؤنی کی ماں نے بھی پیش نہیں کی۔ اس طرح تو اس کے الزام کی سچائی بھی ثابت نہیں ہوتی۔“ بدھیل خان نے دلیل پیش کی۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹ خشک تھے۔ آنکھوں کے چراغ مدھم پڑ گئے تھے۔ چہرے پر موت کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ بے حال اور شکستہ نظر آ رہا تھا۔

”اس کی دھمی اٹھالی جائے اور وہی گواہ اور شہادت بھی پیش کرے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر تو بے گناہ ہے تو اپنی بے گناہی کا تجھے ثبوت دینا ہو گا۔ تیرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں۔“ سردار مزاری نے اس کی دلیل سختی سے مسترد کر دی۔ اس کی پیشانی پر پل پڑ گئے۔

”سین سردار! میں سچ کہہ رہی ہوں بدھیل مجھے اٹھا کر نہیں لایا۔“ ساؤنی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک کر رخساروں پر بننے لگے۔ ”بدھیل بے گناہ ہے۔“

”سین! یہ جھوٹی ہے۔ ایک دم کوڑی ہے۔ جھوٹے بیج بھا کر بدھیل کو بے گناہ ثابت کرنا چاہتی ہے۔“ ماں نے قہر آلود نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔ ”تیرے دونوں بچن سے بدھیل بے گناہ نہیں بن سکتا۔“ اس نے مڑ کر شہ زور خاں مزاری کو مخاطب کیا۔ ”سین سردار! یہ جھوٹ بول رہی ہے۔ بدھیل نے اسے خراب کر دیا۔ یہ کالی ہو گئی۔“

”تیرا یہ الزام درست نہیں ہے۔“ سردار مزاری نے جیکھی نظروں سے ساؤنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ ”ساؤنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا تھا۔ وہ کالی نہیں کہی جاسکتی۔“

رحیم داد نے سردار مزاری کا بدلا ہوا رویہ دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ یہ اچانک تبدیلی قطعی خلاف توقع تھی۔ وہ ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ بدھیل اور ساؤنی نے بھی حیرت زدہ نظروں سے سردار شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی مردنی رفتہ رفتہ زائل ہوتی جا رہی تھی۔ سب گم صم تھے۔ مرہ لب تھے۔

مگر ساؤنی کی ماں زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے مزاری کے رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ ”سین سردار! مجھے پتہ ہے۔“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“ سردار مزاری نے اسے مزید بولنے کا موقع نہ دیا۔ درشت لہجے میں بولا۔

”بدھیل کے پاس دو روز ساؤنی رہی تھی یا تو؟“ اس نے ساؤنی کی ماں کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ”مجھے کیا پتہ کہ ساؤنی کالی ہے۔ مجھے پتہ ہے اور ٹھیک طرح پتہ ہے کہ وہ کالی نہیں ہے۔“ ساؤنی نے چونک کر سردار مزاری کے چہرے پر نظر ڈالی۔ پھر اس کی گردن جھک گئی۔ رخساروں پر سرخی پھیل گئی۔ مزاری اونچی آواز سے بولتا رہا۔ ”جب ساؤنی کالی نہیں ہے تو بدھیل کیسے کالا ہو سکتا ہے۔“ وہ ساؤنی کی ماں کی جانب متوجہ ہوا۔ زور سے دھاڑا۔ ”میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”ہا سیں! توں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ سردار مزاری کو غضب ناک دیکھ کر ساؤنی کی ماں کا چہرہ خوف سے فٹ ہو گیا۔ گڑگڑا کر معذرت کرنے لگی۔ ”سین! توں سردار ہے۔ توں مالک ہے۔ توں غلط نہیں بول سکتا۔ ہرگز غلط نہیں بول سکتا۔ میں نے ہی غلط سوچا۔ بھل ہو گئی۔ میکوں معافی دیدے۔“ وہ زار و قطار رونے لگی۔ ”سین! میں فریادی ہوں۔ تیرے پاس نیائے کے لیے آئی ہوں۔“

”بچہ نہ بھا۔ چپ کر کے کھڑی رہ۔ تیرے ساتھ نیائے کیا جائے گا۔ پورا پورا انصاف ہو گا۔“ سردار مزاری کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجھلاہٹ کا غبار چھٹنے لگا۔ لہجہ نرم پڑ گیا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اپنا فیصلہ سنایا۔ ”بدھیل کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ساؤنی کو اٹھا کر لے گیا۔ دو روز اسے اپنے گھر میں رکھا۔ اس لیے وہ قانون کی نظروں میں مجرم ہے۔ اس جرم کی سزا کے طور پر اسے جی ادا کرنی ہو گی۔“

رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر سردار مزاری کو دیکھا۔ وہ جیٹی کی تفصیل بیان کر رہا تھا۔ ”بدھیل کو پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ جرمانے کی رقم میں سے اڑھائی سو ساؤنی کی ماں کو تاوان کے طور پر دیا جائے گا۔ جیٹی کے قانون کی رو سے بدھیل کو ساؤنی کی طرح کی دودھ دجوان نیٹنگ رن بھی پیش کرنی ہوں گی۔“

”سین سردار! میں دو نیٹنگ کماں سے لاؤں گا۔“ بدھیل نے ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے کہا۔ ”میری تو صرف ایک بھین ہے۔ وہ بھی پندرہاں برس سے کم ہی ہو گی۔ اس کے علاوہ ماں ہے۔“ اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”سین! میرا اور کوئی نہیں۔“

”بھین اور ماں ہی کو لے آ۔“ سردار مزاری نے مطلق مروت سے کام نہ لیا۔ مڑ کر ساؤنی کی ماں کی جانب دیکھا۔ ”تیرا کوئی پتر ہے؟ بچہ ہو یا جوان۔ پرنا ہو یا بن پرنا۔ کوئی فرک نہیں پڑتا۔ بدھیل کی بھین سے اس کا پرنا کر دیا جائے گا۔ وہ اسے اپنی ڈال بنا کر رکھ سکتا ہے۔“

”ہا سیں! میرا کوئی پتر نہیں۔“ ساؤنی کی ماں نے بتایا۔ ”میں تجھے پہلے ہی بتا چکی ہوں! ساؤنی کے

سوامیرا کوئی نہیں۔“

”ساؤنی کا کوئی بھائی نہیں اس لیے بدھیل کی بھین اور ماں کو کوٹ میں رکھا جائے گا۔“ سردار مزاری نے اعلان کیا۔ ”جب تک بدھیل جرمانہ اور مکدے کی پوری فیس جمع نہیں کرائے گا، اپنی ماں اور بھین کو نہیں پہنچائے گا۔ تب تک ساؤنی کو حویلی ہی میں رہنا ہو گا۔ بدھیل اسے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے تو اسے چٹی کو پورا کرنا ہو گا۔“

مقدے کا فیصلہ سن کر ساؤنی کی ماں اور بدھیل خاموش رہے۔ مگر ساؤنی بلک بلک کر رونے لگی۔ اس کی دہلی دہلی سسکیاں کمرے کے گرمے سکوت میں رک رک کر ابھرتی رہیں۔ بدھیل سر جھکائے پکری سے باہر چلا گیا۔ ساؤنی کی ماں بھی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ ساؤنی کو دوبارہ زنان خانے میں پہنچا دیا گیا۔

دن گزرا، رات ہوئی۔ مگر مزاری سے رحیم داد کی ملاقات نہ ہو سکی۔ صبح ناشتے پر وہ اس کے پاس آیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد رحیم داد نے بدھیل کے مقدے کا ذکر چھیڑا۔ کھل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ ”مزاری، یہ بتا تجھے کیسے پتہ چلا کہ ساؤنی کو بدھیل نے خراب نہیں کیا؟ تو نے ساؤنی کی ماں کو تو چپ کر دیا پر تیرے پاس کیا ثبوت کہ ساؤنی کالی نہیں ہوئی؟ بدھیل کے ساتھ دو روز رہنے کے بعد بے گناہ اور پاک صاف رہی۔“

”سینس چوہدری، تو نے تو حد کر دی۔ بالکل بھولا بادشاہ ہے۔“ شہ زور خاں ٹھٹھا مار کر زور سے ہنسا۔ ”تجھے پتہ نہیں ساؤنی کل اور پرسوں ساری رات میرے کمرے میں رہی تھی۔“ اس نے جھپٹی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”جب مکدے کا فیصلہ مجھے کرنا تھا تو ثبوت بھی میں نے ہی لیتا تھا؟“

رحیم داد کو دل لگی سو جھی۔ ”تب تو وہ کالی ہو گئی اور تو کالا۔“ اس نے مسکرا کر مزاری کو چھیڑا۔ ”تو نے پکری لگا رکھی ہے؟“ سردار مزاری کی تیوری پر ہل پڑ گئے۔ لہجہ درشت ہو گیا۔ ”سردار کے ساتھ سونے پر کوئی رن کیوں کر کالی ہو سکتی ہے؟“ اس نے قہر آلود نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”تو نے یہ سوچا کیسے؟ لگتا ہے تو خاندانی زمین دار نہیں ہے۔“

رحیم داد کی تپتی گم ہو گئی۔ معذرت کرنے کے انداز میں بولا۔ ”مزاری، میں نے ایسے ہی پوچھ لیا۔ میرا مطلب تجھ پر الزام لگانا ہرگز نہیں تھا۔“

”تیرا مطلب کچھ بھی ہو۔“ مزاری کی جھنجھلاہٹ کم نہ ہوئی۔ ”اگر تیری ایسی ہی سوچ ہے تو ادھر

زمین الاٹ کرانے کا دھیان چھوڑ دے۔ تجھے کچھ پتہ نہیں کہ سرداری اور زمیں داری کیا ہوتی ہے۔“

”میں تو محول کروں گا۔ مجھے کیا پتہ تھا تو اتنا برا متائے گا۔“ رحیم داد نے اسے منانے کی کوشش کی۔ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے دریافت کیا۔ ”یہ بتا، لہور چلنے کا کب تک ارادہ ہے؟ میں اب زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔“

”چاکر کو تو آجانے دے۔“ مزاری کا غصہ اب ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔ لہجہ بھی سنبھلا ہوا تھا۔ ”لگتا ہے الاٹمنٹ میں کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی، ورنہ چاکر کو اب تک الاٹمنٹ کا آرڈر لے کر آ جانا چاہیے تھا۔“

”ایسا کر۔ کسی کو شہر بھیج کر چاکر خاں سے میرے کانڈات واپس منگوا لے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”الاٹمنٹ ٹائٹل منٹ ہوتی رہے گی۔ مجھے لہور جانے دے۔ تو بعد میں میں آ جانا۔ میں کچھ روز شاہ جی کی کوٹھی میں ٹھہروں گا۔ اسے ملنے کے بعد ہی واپس کو ٹلڈ ہر کشن جاؤں گا۔“

”میرا کہا مان، تو چاکر کے لہجہ کا ایک دو روز انتظار کر لے۔“ مزاری نے مشورہ دیا۔ ”ورنہ جیسا تو کہتا ہے وہی کروں گا۔“

رحیم داد نے مزید اصرار نہ کیا۔ سردار مزاری اٹھ کر چلا گیا۔



چاکر خاں سرگانی کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چند ہی روز بعد کا ذکر ہے۔ رحیم داد اور شہ زور خاں مزاری دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد باتیں کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں چاکر خاں آگیا۔ اس کا لباس گردوغبار سے اٹا ہوا تھا۔ چہرے پر سفر کی تھکان کے آثار نمایاں تھے۔ مگر ہونٹوں پر دہلی دہلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ بغل میں کانڈات کی مسل دہلی تھی۔

چاکر خاں نے جھک کر سردار مزاری کے پیروں کو ہاتھ لگایا اور سر جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس نے خیر و غایت دریافت کی۔ ”خیر اے سینس، خوش ہو، راضی ہو، خیر سلا اے۔“ ”شکرا اے، تساں اپنا حوالہ سنا۔“ مزاری نے جواب دیا۔ ”اتنی دیر کیوں لگا دی۔ الاٹمنٹ میں کوئی چکر تو نہیں پڑ گیا؟“

”سینس، وہ ایسا ہوا کہ ڈپٹی کمشنر لہور گیا تھا۔ اس کی واپسی کا انتظار کرنا پڑا۔“ چاکر خاں سرگانی نے صفائی چس کی۔

”بہت زیادہ دیر لگا دی تو نے۔“ مزاری نے کہا۔ ”چوہدری پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے لہور جانا

ہے۔ ادھر ضروری کام ہے اس کا۔

”سین سردار، دیر تو لگ گئی پر کام پکا ہو گیا۔“ چاکر خاں سرگانی نے مسل، سردار مزاری کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ رہا زمین کی الاٹمنٹ کا آرڈر۔“ اس نے مسل کھول کر قائم نامہ دکھایا۔

شہ زور نے حکم نامہ ہاتھ میں لے کر پڑھا، مسکرایا۔ اور مسل رحیم داد کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”سین چوہدری، مبارک ہو۔ تجھے اڑھائی سو ایکڑ متروکہ اراضی، دلاور والا میں الاٹ ہو گئی ہے۔“

رحیم داد نے مسل ہاتھ میں سنبھالی۔ الاٹمنٹ آرڈر پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر خوشی سے سرخی پھیل گئی۔ آنکھوں میں چراغ جگمگانے لگے۔ اسے توقع نہیں تھی کہ الاٹمنٹ اتنی آسانی سے مل جائے گا اور اس قدر کم مدت میں مل جائے گا۔ سرکاری دفاتروں کے چکر کاٹنا پڑے۔ نہ افسروں سے ملنے کے لیے صبر آزما انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ نہ کسی قسم کی سفارش پہنچانے کی ضرورت پیش آئی۔ ہر کارروائی اطمینان بخش طور پر مکمل ہو گئی۔

چاکر خاں سرگانی اپنی کارکردگی سنانے لگا۔ ”سین! الاٹمنٹ لینے کے لیے میں بحالیات و انوں کے پاس پہنچا۔ صدر دفتر کے اہل کاروں سے ملا۔ افسر مال اور تحصیل دار سے ملا۔ پڑاری سے ملا۔ فنانس فائل آگے بڑھوائی۔ کام نکلا۔ آگے لیے کنیوں کی مٹھی گرم کی۔ سین، تجھے پتہ ہے اس کے بغیر فائل آگے نہیں بڑھتی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”دلاور والا بھی گیا۔ اراضی کا معائنہ کیا۔ بہت عمدہ زمین ہے۔ فاضل پور کے نزدیک ہی ہے۔ فاضل پور موضع ہے۔ وڈی دستی ہے۔“

”مجھے پتہ ہے تو بہت ہوشیار ہے۔ افسروں اور اہل کاروں سے کام نکلا۔ کانے کا ہر گڑ جانتا ہے۔“ شہ زور مزاری نے خوش ہو کر داد دی۔ مڑکر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری، اپنا چاکر بہت کام کا بندہ ہے۔ بچ پوچھ تو میری زمینداری اسی نے سنبھال رکھی ہے۔“

”پر سین، کبفہ ملنے میں مشکل پیش آئے گی۔“ چاکر خاں نے دبی زبان میں اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر سردار مزاری نے چونک کر پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

”زمین، راکھوں اور مزارعوں نے بار کھی ہے۔“ چاکر خاں سرگانی نے مطلع کیا۔ ”پہلے بھی کئی بار مزارعوں کو الاٹ ہو چکی ہے پر راکھوں نے کبفہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بہت گڑبچائی۔ ابھی تک جتنے بیٹھے ہیں۔“

”ایسا ہے، تب تو الاٹمنٹ ملنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“ شہ زور خاں مزاری نے بچھے ہوئے لہجے

میں کہا۔ ”تو نے الاٹمنٹ لینے سے پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا تھا؟ کچھ تو سوچا ہوتا۔“

”سوچا تھا، سین بالکل سوچا تھا۔“ چاکر خاں سرگانی نے وضاحت کی۔ ”صدر دفتر کے ایک اہل کار نے مجھے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔“

”اس کے خبردار کرنے پر بھی تو نے الاٹمنٹ آرڈر نکلا لیا۔ تیری گالہ سمجھ نہیں آئی۔“ مزاری کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔

”سین فکر نہ کر۔“ سرگانی نے نے مزاری کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تین دریشک کا علاقہ ہے۔ دریشکوں سے مد مل جائے تو کبفہ آسانی سے مل جائے گا۔“ اس نے مزاری کے چہرے کی جانب دیکھا جس پر چھائی ہوئی خشونت زائل ہوتی جا رہی تھی۔ ”سردار عظمت اللہ خاں دریشک سے تیری گہری یاری ہے۔ توں کے گا تو وہ ضرور مدد کرے گا۔ ادھر اس کی زمیں داری ہے۔ تھانیدار سے اس کا بہت زیادہ میل ملاپ ہے۔ کبفہ حاصل کرنے کے لیے اپنا کام تو پولیس ہی سے پڑے گا۔ پولیس پیچھے ہو تو کبفہ لینے سے کون روک سکتا ہے۔ پولیس تو راکھوں کی ساری زور زدوری اور انکڑا ایسے نکال دیں گے کہ آگے انھیں سراٹھانے اور گڑبڑ کرنے کی کبھی ہمت نہیں ہوگی۔“ اس نے قدرے توقف سے کہا۔ ”سین، میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ سردار عظمت اللہ خاں دریشک اپنا پرانا پیار ہے۔“ مزاری کے لہجے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ”اس کی تو تھانیدار ہی سے نہیں، سرے ہی وڈے افسروں سے یاری دوستی ہے۔ عظمت سے زمین کا کبفہ لینے میں پوری مدد مل سکتی ہے۔“ اس نے مڑکر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سین چوہدری، پروا نہ کر۔ زمین کی الاٹمنٹ مل گئی تو کبفہ بھی مل جائے گا۔“

”تو نے زمین کی الاٹمنٹ دلا دی کبفہ بھی دلا دے گا۔ پر اس کی دیکھ بھال بھی تو نے ہی کرنی ہو گی۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھے تو کوئلہ ہر کھن ہی میں رہنا ہے۔ ویسے ادھر آتا جاتا رہوں گا۔“

”تو فکر نہ کر۔ دیکھ بھال کرنے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔“ مزاری نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”ویسے تجھے کرنا بھی کیا ہے۔ زمین داری تو کاروار اور کم داری چلاتے ہیں۔ تو اپنے کاروار کو ادھر بھیج دیتا۔“

”میں اسے ضرور بھیج دوں گا۔ پردہ میاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ کوئلہ ہر کھن کی ساری زمین داری وہی چلاتا ہے۔“ رحیم داد نے مجبوری کا اظہار کیا۔ ”میں تو ادھر کسی کو تیرے علاوہ جانتا بھی نہیں۔ جب تو نے اتنا احسان کیا ہے تو زمین داری چلانے کے لیے کسی بھروسے کے بندے کا انتظام

بھی تجھے ہی کرنا ہو گا۔

”اسان کی گالہ نہ کر۔“ مزاری نے کہا۔ ”تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی بندہ دست ہو جائے گا۔“ وہ چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چاکر! تجھے چوہدری کے لیے ایک بندہ تلاش کرنا ہو گا۔ زمین داری کے کام کا تجربہ رکھتا ہو۔ مخفی ہو اور ایماندار بھی ہو۔ تیری نظر میں ایسا کوئی بندہ ہے؟“

”عزیز خاں گھوٹال ٹھیک رہے گا۔“

”کون عزیز خاں گھوٹال؟ میں تو کسی ایسے بندے کو نہیں جانتا۔“ شہ زور خاں مزاری نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

”سین تو نے اسے دیکھا تو ہے، پر زیادہ نہیں جانتا۔“ چاکر خاں نے مسکرا کر کہا۔ ”میں جن دنوں مظفر گڑھ میں خاکوانیوں کے پاس ہوتا تھا، گھوٹال بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ میں ادھر آگیا تو اس نے بھی خاکوانیوں کی نوکری چھوڑ دی۔ آڑھت کا کام شروع کر دیا، پر چلا نہیں۔ آج کل وہ خالی ہے۔ میں اسے ٹھیک طرح جانتا ہوں۔ ہشیار بھی ہے اور بھروسے کا بندہ ہے۔“

”اب کہاں ہوتا ہے وہ؟“ مزاری نے دریافت کیا۔

”سین، وہ راجن پور میں ہوتا ہے۔“ چاکر خاں نے بتایا۔ ”چوہدری کو جو اراضی الاٹ ہوئی ہے، گھوٹال ہی نے اس کا کھوج نکالا تھا۔ یہ پہلے رائے بہادر ہتورام کے پوتے، بالا رام کی بگیر میں ہوتی تھی۔ بالا رام پاکستان بننے ہی سرحد پار چلا گیا۔ اس کی ساری بگیر اور زمین داری ادھر ہی رہ گئی۔“ اس نے تامل کیا۔ ”سین سردار، توں تو بالا رام کو تو جانتا ہی ہو گا۔“

”جانتا ہوں، اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہت وڈا زمین دار ہوتا تھا۔“ مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”اور اس کے دادا ہتورام کو کون نہیں جانتا۔ ڈیرہ غازی خاں میں اسٹنٹ کمشنرہ چکا تھا۔ بعد میں رابرٹ سنڈیمین کے ساتھ کوئٹہ چلا گیا۔ ادھر بھی وڈا افسر لگا تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد راجن پور ہی آگیا تھا۔ بہت شاندار حویلی ہے اس کی۔ بالا رام اسی میں رہتا تھا۔“

”بالا رام کی راجن پور والی حویلی بھی ابھی کسی کو الاٹ نہیں ہوئی۔ گھوٹال بتاتا تھا۔ متروکہ اراضی کرادے کر اسے کسٹوڈین کے حوالے کر دیا گیا۔ آج کل اس میں کلا نور کے رائٹنر مہاجر بے ہوئے ہیں۔ کوشش کی جائے تو الاٹ ہو جائے گی۔ ڈپٹی کمشنر چاہے تو الاٹمنٹ کے ساتھ ساتھ کب نہ بھی جلد مل جائے گا۔“ چاکر خاں نے مشورہ دیا۔ ”حویلی بہت عالیشان ہے، کیوں نہ اس کی الاٹمنٹ کے لیے بھی چوہدری کی طرف سے درخواست لگا دی جائے؟“

”لگا دے، ضرور لگا دے۔ چوہدری کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ مزاری نے رحیم داد کی جانب

دیکھا۔ ”سین چوہدری، میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔“ رحیم داد نے ہنس کر کہا۔ ”تو جو کچھ سوچے گا میری بھلائی کے لیے ہی سوچے گا۔ تیری مرضی سے میری مرضی الگ تو نہیں ہو سکتی۔ حویلی کی الاٹمنٹ کے لیے بھی درخواست لگوا دے۔ مل جائے تو رہنے کو شان دار جگہ ہو جائے گی۔“

سردار مزاری چند لمحے خاموش رہ کر چاکر خاں سرگانی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چاکر! یہ بتا۔ گھوٹال اتنا ہشیار ہے کہ چوہدری کی زمین داری کا ٹھیک طرح کام چلا سکے؟“

”سین سردار، میں نے بتایا ناں کہ اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ چوہدری کے لیے بہت کار آمد ثابت ہو گا۔“ چاکر خاں نے مزاری کو اطمینان دلایا۔ ”ویسے چوہدری کی زمین داری ہی کتنی ہے۔ کل اڑھائی سو ایکڑ اراضی ہے۔ گھوٹال تو وڈی سے وڈی زمین داری آسانی سے چلا سکتا ہے۔ بہت ہشیار بندہ ہے۔“

”ٹھیک ہے، اسے فوراً میاں بلوالے۔“ مزاری نے حکم دیا۔ ”اب تو جا۔ نما کروٹی شوٹی کھا۔ بہت تھکا ہوا لگتا ہے۔“

چاکر خاں چلا گیا۔ سردار شہ زور مزاری بھی رحیم داد کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ بھی آرام کرنے چلا گیا۔



رحیم داد کو عزیز گھوٹال کا انتظار تھا۔

عزیز گھوٹال تو نہ آیا نادر خان آگیا۔ اور کچھ اس طرح اچانک آیا کہ اسے دیکھ کر رحیم داد بھونچکا رہ گیا۔ پہر دن گزر چکا تھا۔ کمرے کے باہر تیز اور چٹیلی دھوپ پھیلی تھی۔ ہوا میں تمازت بڑھ گئی تھی۔ صحن میں چمپ پھل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا ہلکا ہلکا شور ابھر رہا تھا۔ سردار مزاری کچھ ہی دیر پہلے اٹھ کر گیا تھا۔ اور اب کچھری میں بیٹھا مقدمات کے فیصلے کر رہا تھا۔

رحیم داد بھی معمول کے مطابق کچھری میں بیٹھ کر مقدمات کی کارروائی دیکھنا چاہتا تھا مگر نادر خاں کے پہنچنے کے بعد اس نے کمرے سے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی غیر متوقع آمد سے رحیم داد کے ذہن میں طرح طرح کے اندیشے گردش کرنے لگے۔ اس نے نادر خاں کے گرد آلود چہرے پر نظر ڈالی۔ ٹرین اور لاریوں کے تکلیف دہ سفر اور مسلسل شب بیداری کے باعث وہ خستہ حال اور کچھ زیادہ ہی بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ ڈاڑھی کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ چہرے کی جھریاں نمایاں ہو گئی تھیں۔

رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”نادر، خیر خیریت تو ہے؟ فکر کی تو کوئی گل بات نہیں؟“
 اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”تو کھرا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“
 ”فکر کی کوئی گل نہیں۔“ نادر خاں نے سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”میں توجی ایک ضروری مشورے کے لیے آیا تھا۔ مجھے تو پتہ بھی نہ تھا کہ تو ادھر ہے۔“ اس نے کندھے پر پڑے ہوئے پرنے سے چرے پر آیا ہوا ہمینہ پونچھا۔ ”میں تو سیدھا لہور گیا۔ سوچا تھا تو شاہ جی کی کوٹھی پر ملے گا۔ جاتے ہوئے بتایا بھی یہی تھا۔ میں تجھ سے ملنے شاہ جی کی کوٹھی پہنچا۔ اپنی جیب باہر ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ اس کی زبانی پتہ چلا کہ تو ادھر ہے۔“

”شاہ جی کراچی سے واپس آگیا؟“

”مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ شاہ جی کب کراچی گیا۔“ نادر خاں نے نہایت معصومیت سے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”میں نے ڈرائیور سے اس کے بارے میں پوچھا بھی نہیں۔ کوٹھی کے اندر بھی نہ گیا۔ وہاں سے سیدھا سٹیشن پہنچا۔ اور یہاں آنے کے لیے ٹرین میں سوار ہو گیا۔“ اس نے اپنی پریشانی کا اظہار کرنا چاہا۔ ”ادھر کے سفر میں توجی بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ ڈیرہ غازی خاں کے بارے میں تجھے پتہ ہے کہ ادھر تو ٹرین بھی نہیں چلتی۔“

نادر خاں کی زبانی سفر کی روداد سننے سننے رحیم داد اکتا گیا۔ اس نے نادر خاں کو اس سلسلے میں مزید کہنے کا موقع نہ دیا۔ دریافت کیا۔ ”یہ بتا تو کس سلسلے میں مشورہ کرنے میرے پاس آیا ہے۔ کوئی خاص گل بات ہے؟“

”پچھلے دنوں رفیع سمہ دوبار آیا۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”پہلی بار جب وہ آیا اور اسے یہ پتہ چلا کہ تو موجود نہیں ہے تو خاموشی سے چلا گیا۔ پچھلے جمعے کو فیر آیا۔“ بات کہتے کہتے لمحہ بھر کے لیے وہ ٹھنکا۔ ”اس بار اس نے کھل کر مجھ سے گل بات کی۔“

”کیا کہتا تھا وہ؟“ رحیم داد نے گفتگو میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”تجھے پتہ ہے وہ غلے کی سگنگ کا دھندا کرتا ہے۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”کہتا تھا جن دنوں تو اس کا مسمان تھا اس نے اس بارے میں تجھ سے بات بھی کی تھی۔ اور تو راضی بھی ہو گیا تھا۔“

”تتا تو مجھے یاد ہے کہ سمہ نے غلے کی سگنگ کے بارے میں گل بات کی تھی۔“ رحیم داد انکار نہ کر سکا۔ ”وہ میری فصل بھی سرحد پار سگنگ کرنے کو کہتا تھا۔ دام اور مل بھی بہت بتاتا تھا۔ پر میں ہوں ہاں کر کے رہ گیا۔ سوچا تھا فصل کی واڈھی کے بعد تجھ سے اس معاملے میں بات کروں گا۔ پر

ایسے کاموں میں ہاتھ ڈالتے ہوئے خوف آتا ہے۔ اس میں خطرہ بہت ہے۔“
 ”خطرہ تو ہے۔“ نادر خاں نے کہا۔ ”پر فائدہ بھی اتنا ہی زیادہ ہے۔ آڑھتی فصل کی اتنی کمیت نہیں ادا کریں گے جتنی سگنگ سے ملے گی۔ سمہ کہتا تھا لگ بھگ دگنی ہوگی۔“
 ”تو اس بارے میں کیا سوچتا ہے؟“

”میں نے کیا سوچنا ہے جی۔ فیصلہ تو تجھے کرنا ہے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”ویسے فصل تو ابھی اپنے ہی پاس ہے۔ آڑھتی چکر کاٹ رہے ہیں۔ نرخ تو تیری واپسی پر ملے ہو گا۔ میں نے ان سے یہی کہہ دیا۔“
 ”سمہ سے تو نے کیا کہا؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”میں نے اسے کیا کہنا تھا جی۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”صاف صاف بتا دیا کہ زمیں دار کی اجازت کے بغیر میں کچھ نہیں کر سکتا۔ جیسا وہ حکم کرے گا، میں نے ویسا ہی کرنا ہو گا۔“ اس نے تامل کیا۔
 ”میں یہی معلوم کرنے آیا ہوں۔ اس سلسلے میں میرے لیے کیا حکم ہے؟“
 ”سمہ کب آنے کو کہہ گیا ہے؟“

”چند روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔“ نادر خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ ”جو فیصلہ کرنا ہے اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ فوراً جواب دینا ہو گا۔“

رحیم داد نے نادر خاں کے رویے سے اندازہ لگا لیا کہ وہ غلے کی اسگنگ میں رفیع سمہ کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا ہے۔ مگر رحیم داد تیار نہ تھا۔ وہ کسی ایسی مہم جوئی میں شریک ہونے سے ڈرتا تھا جس میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہو۔ وہ پولیس کا سامنا کرنے اور عدالت کے روبرو پیش ہونے سے گھبراتا تھا۔ اس میں خطرہ ہی خطرہ تھا۔ صرف جیل جانے کا نہیں بلکہ پھانسی پر لٹک جانے کا بھی خطرہ تھا۔

اسے طرح طرح کے دوسو ستانے لگے۔ وہ گردن جھکا کر ممکنہ خطرات کے بارے میں غور کرنے لگا۔ نادر خاں نے اسے شکر اور پریشان دیکھا تو کیرید کر پوچھا۔ ”چوہدری، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”نادر، بات یہ ہے میں نے کبھی ایسا خطرناک دھندا کیا نہیں۔“ رحیم داد نے اپنے پریشانی کا اظہار کیا۔ ”میں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سوچ کر بتاؤں گا۔ تو ٹھکا ہوا ہے، اجا کر آرام کر۔ تجھ سے بعد میں گل بات ہوگی۔“

”جیسی تیری مرضی۔ ویسے میرا ارادہ آج ہی واپس جانے کا ہے۔“

”نہیں، تو ابھی نہیں جاسکتا۔ تجھ سے کئی ضروری باتیں کرنی ہیں۔“ رحیم داد نے اسے واپس کو ملہ ہرکشن جانے سے روک لیا۔

”میرے لیے یہی حکم ہے جی تو ٹھہرے جاتا ہوں۔“ نادر خاں نے اصرار نہ کیا۔ ایک تابع دار اور فرض شناس ملازم کی طرح رحیم داد کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

رحیم داد نے ایک نوکر کو بلایا۔ اسے ہدایت کی کہ مہمان خانے میں نادر خاں کے ٹھہرنے اور کھانے پینے کا مناسب بندوبست کر دیا جائے۔

نادر خاں نوکر کے ہم راہ چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد رحیم داد بھی کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ کچھ دیر تنہا بیٹھا سوچتا رہا، پھر اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کمرے کی جانب روانہ ہو گیا جس میں کچہری لگی تھی۔

دن گزرا، شام ہوئی، رحیم داد صحن میں بیٹھا تھا۔ مہمان خانے میں جسے دیرہ یا وساخ کہا جاتا ہے، خاصی چل پھل تھی۔ گرمی کی شدت قدرے کم ہو چکی تھی۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ باورچی خانے کے چولہے سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں ملی جلی آوازوں کا شور رہا ہوا تھا۔ زندگی جاگ رہی تھی، مسکرا رہی تھی۔

رحیم داد تھا تھا۔ بیزار اور اکتایا ہوا تھا۔ سردار شہ زور خاں مزاری سہ پہر کو روجھان چلا گیا تھا اور اب تک واپس نہ آیا تھا۔ وہ موجود نہ ہوتا تو رحیم داد کے لیے وقت کا نٹا دو بھر ہو جاتا۔ مزاری کے بغیر وہ شغل بادہ نوشی بھی نہ کرتا۔ حالانکہ کئی بار اس نے اصرار بھی کیا۔ لیکن اکیلے بیٹھ کر شراب پینا اسے کچھ اچھا نہ لگا۔ ملازم گلاس اور بوتل لے کر آتا بھی تو وہ منع کر دیتا۔ البتہ بھنگ پینے میں اسے عار نہ تھا۔ مگر لسی کو بھنگ پر ترجیح دیتا۔ ان دنوں اس کا یہی معمول تھا۔

اس وقت بھی رحیم داد کے سامنے لسی سے بھرا ہوا کانسی کا لمبا گلاس رکھا تھا۔ وہ خاموش بیٹھا ٹھنڈی ٹھنڈی لسی کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد نادر خاں پہنچ گیا اور کرسی کھسکا کر رحیم داد کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ غسل کر کے آیا تھا۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ تمام دن آرام کرنے کے بعد اب وہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر لا۔ ”نادر، تو بہت دیر سو تا رہا۔“

”بہت تھک گیا تھا جی۔“ نادر نے شکوہ کرنے کے انداز میں سفر کی مشکلات بیان کیں۔ ”ادھر تو جی سفر کرنا اور وہ بھی گرمی میں بہت دشوار ہوتا ہے۔ کیا بتاؤں جی مجھ پر کیا ہوتی۔ لاریاں ایسی پرانی کھنار ہیں کہ چلنے میں ایک ایک پرزہ شور کرتا ہے۔ سڑک بھی کچی ہے۔ جگہ جگہ گڑھے ہیں۔

لاری اس پر دوڑتی ہے تو ایسی گرد اڑاتی ہے، ایسے جھکے لگتے ہیں کہ بدن کا جوڑو ٹہل جاتا ہے۔ اب تک ہڈیاں دکھ رہی ہیں۔ اور خاک تو ایسی جی کہ بار بار نمانے پر بھی ایسا لگتا ہے کہ خاک ابھی اتری نہیں۔“

”پر لاری تو ادھر آتی نہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”سڑک تو بہت دور رہ جاتی ہے۔ تو شاہ میر تک آیا کیسے؟ تاں گانا گنا بھی نہیں ملتا۔“

”بس جی، کسی نہ کسی طرح یہاں تک پہنچ ہی گیا۔“ نادر خاں نے سفر کی مزید دشواریاں بیان کرنے سے احتراز کیا۔ گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”سمہ کے بارے میں کیا سوچا جی؟ میں نے واپس جا کر اسے جواب دینا ہو گا۔“

”سوچتا تو اس کے بارے میں دن بھر رہا۔ پر سمجھ نہیں آتی کیا کیا جائے۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”تجھے پتہ ہے یہ سگنگ کا دھند اکتنا خطرناک ہے۔ ویسے روپے کی ابھی اتنی زیادہ ضرورت بھی نہیں کہ ایسا خطرناک کام کیا جائے۔“

”روپے کی ضرورت تو ہے اور بہت زیادہ ہی ہے۔“

”وہ کس لیے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے نادر خاں کو دیکھا۔

”زمین داری بڑھانے کے لیے۔“ نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اپنے پاس لگ بھگ آٹھ سو ایکڑ اراضی ہے۔ اتنی کم اراضی کے لیے فیجری کرتے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ میں تو چاہتا ہوں کہ زمیں داری اور بڑھے تاکہ فیجری کرنے کا کچھ مزا آئے۔ مجھے بھی محنت کرنے اور اپنی کارگزاری دکھانے کا موقع ملے۔“

”پر تو زمیں داری بڑھائے گا کیسے؟“ رحیم داد اور زیادہ حیرت زدہ ہو گیا۔ ”غیر مزدور اور پیڑلی زمین پر تو نے باغات لگا لیے۔ زمیں داری بڑھانے کے لیے اور زمین کہاں سے آئے گی؟“

”اس کے بارے میں تو بعد میں بتاؤں گا۔“ نادر خاں نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ پہلے سمہ کا معاملہ طے ہو جائے۔“

”تو بتا اس معاملے میں کیا کیا جائے۔ تو نے کیا سوچا؟“

”میں تو جی یہی صلاح دوں گا سمہ کی بات مان لی جائے۔ اس میں بتنا فائدہ ہے خطرہ اتنا زیادہ نہیں۔“ نادر خاں نے کھل کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”چوہدری، تجھے شاید پتہ نہیں۔ غلے کی سگنگ تو اپنا شاہ جی بھی کرتا ہے اور ساری سگنگ۔ رفیع سمہ کے ذریعے ہوتی ہے۔ اب سے نہیں بھول سے ہو رہی ہے۔“

کارروائی نہیں ہوئی۔ آخر مجبور ہو کر ہمارے پاس آئے۔ اور اپنی فصلوں کے لیے ہم سے پانی خریدنے لگے۔ تجھے ساری باتوں کا ٹھیک طرح سے پتہ ہے۔“
 ”وہ تو مجھے ہے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”میں سمجھا، وہ کوئی نئی گزبزدکھڑی کرنا چاہتے ہیں۔“ اس نے ایسی کا گھونٹ بھرا۔ ”کھیتوں کو لگانے کے لیے کافی پانی نہ ملے اور فصلیں سوکھ جائیں تو کوئی زمین دار بامزارع کیسے چپ کر کے بیٹھ سکتا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔“
 ”انھوں نے یہ کیا کہ سندھ میں بیراجوں کی جو زمینیں نکلی ہیں، وہ الاٹ کرانی شروع کر دیں۔“
 ”نادر خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔“ اب وہ آباد کارین کر سندھ جارہے ہیں۔“
 ”ادھر کی اراضی کا کیا کریں گے؟“

”اسے وہ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔“ نادر خاں نے بتایا۔ ”ادھر زمین داری چلانے کے لیے بھی توروپے کی ضرورت ہوگی۔ صرف زمین الاٹ کرا لینے سے تو کام نہیں چلتا۔“
 ”تجھے کیسے پتہ چلا کہ وہ اپنی زمین فروخت کرنا چاہتے ہیں؟“
 ”کئی تو میرے پاس آچکے ہیں۔ ویسے بھی حک شفعہ کی رو سے سب سے پہلے اپنا ہی حک بنتا ہے۔ اپنی زمینیں جو ان کے ساتھ ملتی ہیں۔ ان کو تو اپنی زمینیں فروخت کرنے سے پہلے ہم سے صلاح مشورہ کرنا ہی ہو گا۔ کون یہی ہے۔“
 ”پر وہ تو اپنی زمینوں کی بہت کمیت مانگتے ہوں گے۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔
 ”مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ ضرورت کے مطابق پانی نہ ملنے سے وہ بہت پریشان ہیں۔ دوسری طرف یہ سننے میں آیا ہے کہ بیراجوں کی زمین بہت زرخیز ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ وہ جلد سے جلد ادھر جا کر کاشت شروع کرنا چاہتے ہیں۔“

”تیرا مطلب ہے وہ اپنی زمینیں سستے دام فروخت کر دیں گے۔“
 ”ان کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے۔“ نادر خاں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔
 ”ضرورت مند ہیں، اس لیے سستے داموں زمینیں فروخت کر دیں گے۔“
 ”سوال یہ ہے کہ زمین خریدنے کے لیے اتنا روپیہ کہاں سے آئے گا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”اگر پوری فصل ربيع سہ کے ذریعے سبھل کرا دی جائے، تب بھی اتنا روپیہ تو نہیں ملے گا کہ ساری زمینیں خریدی جاسکیں۔“

”ساری زمینیں خریدنے کا تو نہ میرا ارادہ ہے اور نہ اتنی گنجائش ہی ہے۔“ نادر خاں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”میں تو یہ چاہتا ہوں اتنی زمین خرید لی جائے کہ اپنے پاس ۵۰ مربع اراضی ہو

”پر شاہ جی نے کبھی مجھے ایسی گل بات نہیں بتائی۔“ رحیم داد نے تعجب سے کہا۔ ”تجھے کیسے پتہ چلا شاہ جی اپنی فصلوں کی سرحد پار سنگٹ کر آتا ہے اور سہ کے ذریعے کراتا ہے؟“ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھنکا۔ ”شاہ جی نے سہ کے بارے میں مجھے یہ تو بتایا تھا کہ وہ سبھل ہے یہ نہیں، بلکہ سہ کے ساتھ مل کر وہ بھی سنگٹ کر آتا ہے۔“

”مجھے تو جی یہ گل سہ ہی نے بتائی تھی۔“ نادر نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ تو جی یہ بھی بتاتا تھا کہ شاہ جی کی فصل تو گوداموں اور کھلیانوں سے اٹھ کر سرحد پار جانی بھی شروع ہو گئی۔ اب تک آدمی سے زیادہ فصل سبھل ہو چکی ہے۔“
 ”یہ تو نے بہت تعجب کی گل سنائی۔“

”سچ تو یہ ہے جی، مجھے اس بارے میں پہلے ہی سے پتہ تھا۔ سہ کے ساتھ شاہ جی کی یاری کا اصل سبب بھی یہی ہے۔“

”تیری باتوں کا صاف مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ سہ کے ساتھ معاملہ کر لیا جائے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا برملا اظہار کیا۔ ”پر یہ سوچ لے، ہے یہ کام خطرناک۔“ اس نے نادر خاں کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”جو کچھ کرنا ہے، تجھے ہی کرنا ہو گا۔“

”فکر نہ کریں جی۔“ نادر خاں نے ہنٹوں پر بھی ہلکی ہلکی مسکراہٹ ابھری۔ ”مجھے تو جی صرف اجازت چاہیے۔ آگے کی مجھ پر چھوڑ دیں۔“ اس نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”پردانہ کریں جی سب کام بالکل ٹھیک ہو گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ رحیم داد رضامند ہو گیا۔ ”میری طرف سے تجھے اجازت ہے۔“

”اب جی، یہ بھی سن لیں۔ میں زمین داری کس طرح بڑھا، چاہتا ہوں۔“

”سنا، ضرور سنا۔“ رحیم داد نے خوش ہو کر اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

”تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ اپنی زمین داری کے نشیب میں جو چھوٹے زمیندار اور حصے دار ہیں، ان کا پانی باغات لگانے کے بعد ہم نے کم کر دیا ہے۔“ نادر خاں سنبھل سنبھل کر بتانے لگا۔ ”ان کی زمینوں کے لیے تو لگانے کو اتنا کم پانی مل رہا ہے کہ انھوں نے منجی کے بوتلوں کی جو پیٹری لگائی تھی، سب سوکھ گئی۔ دوسری فصلوں کو بھی پورا پانی نہ ملا تو وہ بھی خراب ہو گئیں۔“

”ایسی گل بات ہے تو وہ بہت گزبزد کر سکتے ہیں۔“ رحیم داد نے قدرے پریشان ہو کر کہا۔

”ان کو جو گزبزد کرنی تھی کر چکے۔“ نادر خاں نے رحیم داد کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔ ”اوپر تک درخواستیں لگائیں۔ سرکاری دفاتروں کے بہت چکر کاٹے۔ پر اپنا کام ایسا پکا تھا کہ کوئی

جائے۔“

میں تو تجھے یہ بتانے آیا تھا کہ عزیز گھوٹال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا۔“

”پر اب تک وہ رہا کہاں؟“ رحیم داد نے گھوٹال کے بارے میں استفسار کیا۔

”سینس“ وہ دلاور والا گیا تھا۔ اراضی دیکھ کر اور ساری معلومات اکٹھی کر کے ہی تیرے پاس آئے گا۔“ چاکر خاں سرگانی نے بتایا۔ ”وہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو اس سے مل کر بہت خوش ہو گا۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر اسے تیرے پاس لگایا ہے۔ زمین داری کے کام کا اسے بہت تجربہ ہے۔ سارا کام سنبھال لے گا۔ اس کے ہوتے ہوئے تجھے کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے نادر خاں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ نادر خاں ہے۔ آج ہی کوئلہ ہرکشن سے ادھر آیا ہے۔ میرا بیجر ہے۔“

”سینس تو نے اسے مشورے کے لیے بلایا ہے؟“ سرگانی نے پوچھا۔

”نہیں“ ایک ضروری کام کے بارے میں گل بات کرنے خود ہی آیا ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔

”اسے تو میں نے اب تک یہ بھی نہیں بتایا کہ دلاور والا میں میرے نام اڑھائی سوا کیڑ مٹرو کہ زرعی اراضی الاٹ ہو چکی ہے۔“

چاکر خاں سرگانی نے نادر خاں سے پوچھا۔ ”سینس“ تو ادھر آرام سے ہے ناں؟ کوئی تکلیف شکیلت تو نہیں؟“

”بالکل آرام سے ہوں۔“ نادر خاں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”کوٹ کا دیر بہت شاندار ہے۔

کمرے بھی وڈے اور کھلے ہوئے ہیں۔ پر گرمی ادھر بہت زیادہ ہے۔“

”اس بار کچھ زیادہ ہی گرمی پڑی ہے۔“ سرگانی نے بھی گرمی کی شدت کا اعتراف کیا۔ ”تو شمشیر

والی آتا تو گرمی اتنی نہ لگتی۔ دریا کا کنارہ ہے۔ صبح شام ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ چوہدری بھی پچھلے

دنوں سردار کے ساتھ ادھر ہی ہوتا تھا۔ یہاں آئے ہوئے تو اسے چند ہی روز ہوئے ہیں۔“

نادر خاں خاموش رہا۔ مگر رحیم داد مزید خاموش نہ رہ سکا۔ اس نے چاکر خاں سرگانی سے

دریافت کیا۔ ”تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے کہ عزیز گھوٹال کل صبح یہاں پہنچ جائے گا؟“

”سینس“ تو فکر نہ کر۔ وہ ضرور پہنچ جائے گا۔“ سرگانی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں چلا۔“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”سینس“ میں نے سردار کے ایک ضروری کام کے لیے جانا ہے۔“ سرگانی نے جواب دیا۔ ”میں

تو صرف گھوٹال کے کل یہاں آنے کی اطلاع دینے آیا تھا۔“

چاکر خاں سرگانی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا اور شام کے پھلتے ہوئے گھرے

”تو یہ کہنا چاہتا ہے، ساڑھے چار سو کلا زمین خرید لی جائے؟“

”چاہتا تو میں یہی ہوں۔“ نادر خاں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اپنے پاس کم سے کم اتنی زمین تو ہو کہ زمین داری کی کچھ شان نظر آئے۔“

”پر اس کے لیے روپے کی بھی تو ضرورت ہوگی۔“ رحیم داد کالجہ بجھا ہوا تھا۔

”کچھ روپیہ اپنے پاس ہے، کچھ شاہ جی سے ادھار لیا جاسکتا ہے۔“ نادر خاں نے مشورہ دیا۔

”میں تو سمجھتا ہوں جی، وہ اس معاملے میں ضرور مدد کرے گا۔ مجھے پتہ ہے وہ تجھے کتنا مانتا ہے۔ وہ تو

تجھے بہت وڈا زمیں دار دیکھتا چاہتا ہے۔ اوروں کی گل بات نہیں کرتا۔ خود مجھ سے وہ ایسا ہی خیال

ظاہر کر چکا ہے۔“ اس نے رحیم داد کے چہرے کو نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”تو شاہ جی سے بات کر کے تو

دیکھ۔ وہ ضرور تیری مدد کرے گا۔“

”تھوڑی بہت رقم تو وہ ادھار دے سکتا ہے۔ پر اتنی نہیں کہ جس سے ساڑھے چار سو کلا زمین

خریدی جاسکے۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ ”ویسے میں شاہ جی سے ادھار

مانگنا نہیں چاہتا۔ مان لے اس نے انکار کر دیا تب کیا ہو گا؟ خاما خا شرمندگی اٹھانی ہوگی۔“ اس نے

گلاس اٹھا کر لسی کے کئی گھونٹ بھرے۔ ”بھتا اپنے پاس روپیہ ہے، بس اتنی ہی زمین خریدنے کی

سوچ۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”روپیہ ہو گا تو بعد میں بھی زمین خریدی جاسکتی ہے۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ نادر خاں نے بدل ہو کر دھیسے لہجے میں کہا۔ ”پر میں ایک گل ضرور کہوں

گا ایسا موقع روز، روز نہیں ملتا۔“ اس نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”ویسے تجھے

پتہ ہی ہے، زمین دار کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو اپنی زمین کم کرنے کی بجائے ہمیشہ بڑھانے کے چکر میں

رہتا ہے۔“



چاکر خاں سرگانی اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔

رحیم داد نے اسے دیکھا تو مسکرا کر پوچھا۔ ”تو اکیلا ہی آگیا۔ تیرا سردار کدھر ہے؟“

”سینس“ میں سردار کے ساتھ نہیں گیا تھا۔“ چاکر خاں سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔

”تجھے یہ تو پتہ ہو گا، وہ کب تک واپس آئے گا؟“ رحیم داد نے سرگانی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”تو

کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“

چاکر خاں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”سینس چوہدری، مجھے بالکل پتہ نہیں سردار کب تک لوٹے گا۔“

اندھیرے میں گم ہو گیا۔

نادر خاں نے رحیم داد سے کہا۔ ”مجھے بھی کل واپس جانا ہے۔ سویرے ہی سویرے نکل جاؤں گا۔ ویسے مجھے اب یہاں ٹھہرنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جو صلاح مشورہ کرنا تھا کر لیا۔“

”نہیں، تو ابھی بیس ٹھہرے گا۔ تجھ سے اور بھی ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”میں تو اس لیے فوراً واپس کوئٹہ ہرکشن جانا چاہتا تھا کہ سمہ چند ہی روز میں آنے کو کہہ گیا تھا۔“ نادر خاں نے وضاحت کی۔ ”اب تو اسے ملنا میرے لیے ضروری ہو گیا ہے۔“

”میں نے تجھ سے دلاور والا کی اراضی کے بارے میں صلاح کرنی ہے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں تو بھی دلاور والا کا ایک چکر لگا کر دیکھ لے۔“ اس نے مسکرا کر نادر خاں کی جانب

واد طلب نظروں سے دیکھا۔ ”اسی الاٹمنٹ کی خاطر تو میں ادھر آیا تھا۔ اور اب تک ٹھہرا ہوا تھا۔ جج پوچھ تو مجھے امید نہیں تھی اتنی آسانی سے الاٹمنٹ مل جائے گی۔“

”زمین تو جی جہاں ملے ضرور لے لینی چاہیے۔ پر ادھر زمیں داری چلانے میں بہت دشواریاں ہیں۔ طرح طرح کے جھگڑے بکھیرے ہیں۔“

”فکر نہ کر۔ تجھے ادھر نہیں لگاؤں گا۔“ رحیم داد نے ہنس کر نادر خاں کو اطمینان دلایا جس کے چہرے سے دہلی دہلی پریشانی جھلک رہی تھی۔ ”میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ ادھر کی

زمین داری چلانے کے لیے عزیز گھوٹال کو لگایا ہے۔“

”کیسا بندہ ہے؟“ نادر خاں نے دریافت کیا۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا پریشانی اور بے زاری کا ہلکا ہلکا غبار چھٹ چھٹا تھا۔ اب وہ مطمئن اور ریشاش نظر آ رہا تھا۔

”میں نے تو اسے ابھی تک دیکھا بھی نہیں وہ کل صبح آ رہا ہے۔ تو بھی اسے مل کر پتہ چلا لیتا کیسا بندہ ہے۔ ویسے تیرے سامنے ہی تو عزیز گھوٹال کے بارے میں مزاری کا کامدار چاکر خاں گل بات

کر رہا تھا۔ تو نے سنا نہیں، وہ اسے بہت ہشیار اور کام کا بندہ بتا رہا تھا۔“

”چاکر خاں اس کے بارے میں ٹھیک ہی بتاتا ہو گا۔ اس نے سوچ سمجھ کر ہی عزیز گھوٹال کی سفارش کی ہو گی۔ پہلے سے اسے ٹھیک طرح جانتا ہو گا۔“ نادر خاں نے کوشش کی کہ زبان سے

کوئی ایسا لفظ نہ ادا ہو جس سے عزیز گھوٹال کی مخالفت کا پہلو نکلے۔ اسے ڈر تھا، کیس ایسا نہ ہو کہ رحیم داد اسے دلاور والا کی زمیں داری کی دیکھ بھال پر مقرر کر دے۔ وہ ادھر آنا نہ چاہتا تھا۔ اگر وہ

تیار بھی ہو جاتا تو اس کی بیوی، جنت ہرگز رضامند نہ ہوتی۔ لہذا نادر خاں نے ملاقات سے پہلے ہی گھوٹال کے حق میں اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ ”زمین دار، تو نے گھوٹال کو لگا کر بہت ٹھیک فیصلہ

کیا۔ وہ ادھر ہی کاربنے والا ہے۔ حالات ٹھیک طرح سمجھتا ہے۔ تجھے ایسے ہی بندے کی ضرورت بھی تھی۔“

”ابھی میں نے گھوٹال کے بارے میں پوری طرح طے نہیں کیا۔“ رحیم داد نے نادر خاں کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”وہ کتنا ہشیار اور کام کا بندہ ہے یہ تو اسے ملنے کے بعد ہی اندازہ ہو گا۔ تو بھی

اس سے گل بات کرنا۔ پتہ چلانا کام بھی چلا سکتا ہے کہ نہیں۔ یہ سوچ لے، میں نے ادھر روز روز نہیں آتا۔ جس کو بھی ادھر لگایا جائے گا اس پر پورا پورا بھروسہ کرنا ہو گا۔ میں اسی لیے تجھے روک

رہا ہوں۔“

”جیسا حکم کریں جی ویسا ہی کروں گا۔ میں گھوٹال سے ملنے کے بعد واپس جاؤں گا۔“

”نادر، اب تو جا کر روٹی کھا۔ آرام کر۔ تو صبح میرے پاس آ جانا۔“

نادر خاں خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

رحیم داد تنہا بیٹھا سردار شہ زور مزاری کا انتظار کرتا رہا، اندھیرا بڑھتا گیا۔ مہمان خانے کی چل پھل کم ہوتی گئی۔ دقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات تاریک ہو گئی۔ مگر سردار شہ زور خاں مزاری

واپس نہ آیا۔ نوکروں کو مطلق علم نہ تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور کس کے پاس گیا ہے۔



پہر دن گزر چکا تھا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ عزیز گھوٹال خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ چاکر خاں سرگانی اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خاں دونوں کی آمد سے پہلے ہی کمرے میں

موجود تھا۔ سردار شہ زور خاں رات کے پچھلے پہر واپس آ گیا تھا اور ابھی تک زنان خانے سے مہمان خانے میں نہیں آیا تھا۔

عزیز گھوٹال ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ مگر صحت بہت اچھی تھی۔ جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ قد ذرا چھوٹا تھا۔ طبیعت میں خوشامد کی حد تک انکساری تھی۔ بات نہی تلی کرتا تھا اور سنبل سنبل کر بولتا تھا۔

رحیم داد نے اسے پرکھنے والی تیز نظروں سے دیکھا۔ دریافت کیا۔ ”عزیز! تو دلاور والا گیا تھا؟“

”ہاں سیں، بالکل گیا تھا۔“ عزیز گھوٹال نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”کئی روز سے ادھر ہی تھا۔ یہ دعا وہیں سے آ رہا ہوں۔“

اس بار نادر خاں نے سوال کیا۔ ”زمین کیسی ہے؟ بخیر یا کلر تو نہیں ہے؟“

”نا سیں۔“ عزیز گھوٹال نے انکار میں سر ہلایا۔ ”بہت عمدہ زمین ہے۔ پانی بھی بہت ہے۔ ایسی

زرخیز زمین تو پوری تحصیل میں نہیں ہوگی۔

”اچھی اور زرخیز کیوں نہیں ہوگی۔“ چاکر خان مسکرا کر بولا۔ ”میں نے الاٹمنٹ لینے سے پہلے ہی زمین کے بارے میں پتہ کر لیا تھا۔“ اس نے مڑ کر عزیز گھوٹال کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری کو یہ بتا تو ادھر اب تک کیا کرتا رہا؟“

”میں دوستی والوں سے ملتا رہا۔ پٹاری سے بھی ملا۔“ گھوٹال نے بتایا۔ ”راہوں کے بارے میں پتہ کیا۔“

”سنا ہے زمین راہوں اور مزارعوں نے دبا رکھی ہے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”کب نہ بہت مشکل سے ملے گا۔“ وہ چاکر خان کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چاکر، تو نے یہی بتایا تھا؟“

چاکر خان کے جواب دینے سے پہلے ہی عزیز گھوٹال بول پڑا۔ ”سب سے پہلے ہی سنا۔“ اس کے چہرے سے ہلکی ہلکی پریشانی جھلکنے لگی۔ ”کئی راہوں اور مزارعوں نے پٹاری کی مٹی گرم کر کے اپنا کبندہ پکا کر لیا ہے۔ زمینوں کے انکالات بھی اپنے نام کرا لیے ہیں۔ پٹاری کے پاس تو رجسٹر خسرو گرداوری ہوتا ہے ناں۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انکالات دیکھے ہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو زمین کی الاٹمنٹ کیسے ملی؟“ نادر خاں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔ چاکر خان سرگانی بہت سٹ پٹایا۔ اس نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”پر پٹاری نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“ اس نے گھوٹال کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”تو نے پٹاری سے پوچھا تھا یا اس نے خود بتایا؟“

”پتہ تو پٹاری کو بھی نہ تھا۔“ عزیز گھوٹال نے وضاحت کی۔ ”یہ کارروائی تو اس سے پہلے کے کسی پٹاری نے کی تھی۔“ اس نے براہ راست چاکر خان کو مخاطب کیا۔ ”سب چاکر خان، لگتا ہے پٹاری نے رجسٹر خسرو گرداوری دیکھے بغیر مسل صدر دفتر بھیج دی۔“

”تب تو گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔“ نادر خاں نے کھل کر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”اگر معاملہ عدالت تک گیا تو الاٹمنٹ منسوخ ہو سکتی ہے۔“

”چاکر خان تو سب سے ملا۔ اہل کاروں سے، افسروں سے، اوپر سے نیچے تک سب کے پاس گیا پر تو نے یہ پتہ نہیں کیا کہ کئی مزارعوں کے نام زمین سرکاری ریکارڈ میں منسلک ہو چکی ہے؟“ رحیم داد نے تحیکی نظروں سے چاکر خان سرگانی کو دیکھا۔ اس کے لہجے میں طنز تھا۔

”سب چوہدری، فکر نہ کر۔“ چاکر خان نے مسکرا کر رحیم داد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ ”پٹاری نے اپنی کارروائی ڈالی تو اس کے اوپر تحصیل دار بھی بیٹھا ہے۔ وہ انکالات خارج کر کے

زمین تیرے نام کر دے گا۔“ وہ زیادہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ”تحصیل دار کی سردار سے گہری یاری ہے۔ میری بھی اس سے جان پہچان ہے۔ سب تو بالکل پرواہ نہ کر۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دے۔ تجھے اس معاملے میں کچھ نہیں کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

عزیز گھوٹال نے بھی چاکر خان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ رحیم داد کو مزید مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تحصیل دار بالکل ایسا کر سکتا ہے۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”انکالات کیا، گرداوریوں تک منسوخ ہو سکتی ہیں، بدل سکتی ہیں۔ اپنا چاکر خان سب کچھ کرا سکتا ہے۔ اس کی تو صدر دفتر تک پہنچ ہے۔ جیسا چاہے گا آرام سے کرا لے گا۔ سب اس معاملے میں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

رحیم داد کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کا غبار چھٹنے لگا۔ وہ سرگانی اور گھوٹال کی یقین دہانی سے مطمئن ہو گیا، مگر نادر خاں مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”مجھے تو ایسا لگتا ہے مزارعے آگے چل کر بہت گڑبڑ پیدا کریں گے۔“ اس نے سرگانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”مجھے ادھر کے راہوں اور مزارعوں کے بارے میں پتہ ہے۔ بہت سرکش اور زور آور ہیں۔“ نادر خاں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”چاکر خان، تو نے بھی سنا ہو گا۔ دو تین سال پہلے کا ذکر ہے۔ خریف کی فصل پڑ چوٹی کے لغاری سرداروں نے موضع کمال خاں کے چاندیہ کھوسہ مزارعوں اور راہوں کو زمینوں سے بے دخل کرنے کے لیے نزدیک کے پناؤں سے سو سے بھی زیادہ ہدیائی بلوچوں کو بلایا۔ ان کے ذریعے مونجی کی فصل اٹھانے کی بھی کوشش کی۔ ہدیائیوں نے ہستی پر رات کے اندھیرے میں حملہ کر دیا۔ پر کھوسہ مزارعوں نے حملہ آوروں کو گھیرے میں لے لیا۔ زبردست لڑائی ہوئی۔ آخر ہدیائی حملہ آوروں کو پسپا ہونا پڑا۔ بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔“

”تو نے یہ تو سنا، پر یہ نہیں سنا کہ بعد میں کیا ہوا؟“ چاکر خان نے بے نیازی سے کہا۔ ”لغاریوں نے کھوسہ راہوں کے خلاف دو سرا حربہ استعمال کیا۔ پولیس اور کٹون کا چکر چلایا۔ ان کے خلاف دفعہ ۳۶۵-۱۳۸/۱۳۹ کے تحت مکدمے بنوائے۔ لغاری زمین داروں کے خلاف کھوسہ راہوں نے بھی پرچے چاک کرائے۔ پر لغاریوں کے پرچے درج ہو گئے۔ کھوسوں کے پرچے خارج ہو گئے۔“ اس نے نادر خاں کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ”راہوں کو پولیس نے بند کر دیا۔ لغاری زمین داروں نے ان کی غیر حاضری میں مونجی کی فصل اٹھوائی۔ بعد میں سارے سرکش راہوں کو بے دخل بھی کر دیا۔“ اس نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”سب ادھر سرداروں کا کٹون چلتا ہے اور کوئی کٹون نہیں چلتا۔ ادھر راہک اور مزارعے سر اٹھائیں تو ان کا سر کچل دیا جاتا ہے۔“

نادر خاں خاموش رہا۔ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کبفہ ملنے میں کوئی گزربز نہ ہو۔“

”میں تو فکر نہ کر، کوئی گزربز نہیں ہوگی۔ سب کام ٹھیک ٹھاک اور آرام سے ہو جائے گا۔“

چاکر خاں نے نہایت اعتماد سے کہا۔

مگر نادر خاں اس کی یقین دہانی سے مطمئن نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے، پر مجھے شبہ ہے کبفہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔“

چاکر خاں سرگانی نے اسے تکیھی نظروں سے دیکھا، لیکن خاموش رہا۔



اس روز پکھری میں سب سے پہلے ایک ایسے مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی جو خاصہ پیچیدہ اور سنگین تھا۔ یہ مقدمہ سردار شہ زور خان مزاری کے روبرو پہلی بار پیش نہیں ہوا تھا۔ اس کی سماعت ایک عرصے سے جاری تھی۔ اب تک کئی بیٹیاں پڑ چکی تھیں۔ رحیم داد ان میں بھی شرکت کر چکا تھا۔ وہ فریقین اور ان کے گواہوں کے بیانات سن چکا تھا۔ سردار مزاری کے علاوہ وہ چاکر خاں سرگانی سے بھی اس کے بارے میں کئی بار بات چیت کر چکا تھا۔ لہذا اس کے پس منظر سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔

وہ پکھری میں خاموش بیٹھا دلچسپی اور اٹھناک سے مقدمے کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ مگر مقدمے کے سماعت نے طویل کھینچا تو رحیم داد اکتا گیا۔ اس نے سوچا بعد میں چاکر خان سرگانی سے اس روز کی کارروائی کی پوری روداد سن لے گا۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور پکھری سے باہر چلا گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچا تو نادر خان موجود تھا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رحیم داد نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نادر خان سے دریافت کیا۔ ”نادر، تو صبح سے اب تک ادھر ہی رہا؟“

”نہیں جی، میں تو کچھ ہی دیر پہلے ادھر آیا تھا۔“

”کوئی خاص گل بات تو نہیں؟“

”خاص گل بات تو نہیں۔“ نادر خاں نے دبی زبان سے کہا۔ ”صرف یہ کہنے آیا تھا کہ مجھے

والپس کو ملے ہر کشن جانے کی اجازت مل جائے۔“

”لگتا ہے، تجھے اپنے بال بچے یاد آ رہے ہیں۔“

”ایسا نہیں ہے جی، میں نے ادھر کئی ضروری کام کرنے ہیں۔“ نادر خان نے وضاحت کی۔
”رفیع سہ آئے کو کہہ گیا تھا۔ وہ آیا اور میں نہ ملا تو بہت گڑبڑ ہو جائے گی۔“

”تیری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سہگلنگ کا فیصلہ کر کے ہی ادھر آیا تھا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

”ایسی گل بات نہیں ہے جی۔ بغیر اجازت میں کیسے ایسا فیصلہ کر سکتا ہوں۔“ نادر خان نے جھٹ صفائی پیش کی۔ ”رفیع سہ سے پوچھ لیں جی۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ زمین دار کے حکم کے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ وہ انگلی سے سر کے بال کیدنے لگا۔ ”پر میں یہ گل ایک بار فیہر کھوں گا کہ سہ سہگلنگ کے ذریعے فصل کا جتنا دلا دے گا، آدھی ہرگز نہ دیں گے۔ ویسے ادھر روپے کی زیادہ سے زیادہ ضرورت بھی ہے۔ چھوٹے حصے داروں اور زمین داروں کی زمینیں اس وکت جس مول مل رہی ہیں، بعد میں اتنی سستی زمینیں نہیں ملیں گی جتنی بھی خریدی جائیں خرید لیں۔“

”خریدنے کو تو ان کی ساری ہی زمینیں خرید لی جائیں، پر اس کے لیے روپیہ کہاں سے آئے گا؟“ رحیم داد نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔

”میں تو کہتا ہوں جی ادھر ڈیرہ غازی خان میں جو زمین الاٹ ہوئی ہے اسے بھی فروخت کر دیں۔“ نادر خان نے مشورہ دیا۔ ”اس طرف ہم نے کیا لینا۔ اپنی اصل زمین داری تو ادھر ہی ہے۔ اسی کو بڑھانا چاہیے تاکہ پوری طرح اس کی دیکھ بھال بھی ہو سکے۔“

”نادر ایسا نہ سوچ۔“ رحیم داد نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”شہ زور مزاری نے یہ بات سن لی تو بہت برا منائے گا۔ میں اسے نراض کرنا نہیں چاہتا۔ یہ تو سوچ اس نے ادھر زمین الاٹ کرانے کی کتنی زبردست کوشش کی ہے۔ میری یاری دوستی ہی کے لیے تو اس نے ایسا کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے جی۔ آگے میں ایسی گل بات نہیں کہوں گا۔“ نادر خان نے فوراً اپنی تجویز واپس لے لی۔ ”پر اتنا ضرور کہوں گا کہ زمین تو الاٹ ہو گئی، کبفہ کب ملے گا اور کیسے ملے گا؟“

”تو نے سنا نہیں چاکر خان سرگانی اس بارے میں کیا کہہ رہا تھا۔“

”برانہ منائیں جی، مجھے تو چاکر خان ہشیار بندہ نہیں لگتا۔ ویسے وہ گلاں وڈی وڈی کرتا ہے۔“ نادر خان نے دہلی زبان سے چاکر خان سرگانی کی مخالفت کی۔

مگر رحیم داد کو اس کا رویہ پسند نہ آیا۔ ”تو کہتا ہے وہ ہشیار بندہ نہیں ہے۔ پر

تو نے یہ نہیں سوچا زمین کی الاٹمنٹ تو اسی نے کرائی ہے۔ زمین الاٹ کرانا بھول ہے۔ تجھے پتہ نہیں اس کے لیے کتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ الاٹمنٹ ایسے ہی نہیں مل جاتی۔ اور اب تو ملتی ہی کہاں ہے۔ کتنے ہی کلیم ہولڈر اپنے اپنے کلیم دبائے ادھر ادھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ الاٹمنٹ کہیں نہیں ملتی۔“

”پتہ نہیں جی اس نے کیسے الاٹمنٹ لے لی۔“ نادر خان نے کہا۔ ”اپنی سمجھ میں تو آتا نہیں کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں زمین کے مالکانہ حلوک دوسروں کے پاس ہوں اور الاٹمنٹ تیرے نام کر دی جائے۔ پٹواری ایسی غیر کٹنی کارروائی کر ہی نہیں سکتا۔ اور جب تک درخواست پر پٹواری کی رپورٹ نہ لگی ہو الاٹمنٹ ہو ہی نہیں سکتی۔“

”ہو سکتی ہو یا نہ ہو سکتی ہو پر چاکر خان الاٹمنٹ کرا ہی لی۔“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”وہ تو جی بالکل ٹھیک ہے۔“ نادر خان نے تائید کی۔ ”الاٹمنٹ بھی سولاں آنے پکی ہے۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”بات یہ ہے جی، ادھر کوئی کاغذ کنون تو ہے نہیں۔ افسر بھی نااہل اور بدعنوان ہیں۔ یہاں تو وہ افسر لگائے جاتے ہیں جن کو سزا دینی منظور ہوتی ہے۔ تب ہی تو افسروں میں اس ضلع کو کالا پانی کہا جاتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ادھر تو سرداروں کی حکمرانی ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں افسر ویسا ہی کرتے ہیں۔ ملازمت جو کرنی ہوئی۔ سرداروں سے تو حکومت بھی ڈرتی ہے۔ تب ہی تو ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کی جاتی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”اب یہی دیکھ لیں جی، سرکاری عدالتیں موجود ہیں۔ پولیس بھی ہے، تھانے بھی ہیں، پر مکدموں کا فیصلہ جرگے میں ہوتا ہے یا سردار اپنی عدالتیں لگا کر کرتے ہیں۔“

”یہ تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے تو۔“ رحیم داد نے نادر خان سے اختلاف رائے نہ کیا۔ ”سردار نہ صرف عدالت اور پکھری لگاتے ہیں، بلکہ مکدے کی فیس بھی لیتے ہیں۔ جرمانے لگاتے ہیں، سزائیں دیتے ہیں، ان کی تو اپنی جلیں بھی ہیں۔ اپنا سردار شہ زور مزاری روز ہی پکھری لگاتا ہے۔ مکدموں کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس کی بھی اپنی جیل ہے جس میں آج بھی نہ جانے کتنے کیدی بند ہیں۔“

”تب ہی تو میں کہتا ہوں ادھر زمین داری چلائی بہت مشکل ہے۔“

”اس کی تو فکر نہ کر۔ یہ بتا، الاٹمنٹ تو مل گئی آگے کیا کرنا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”کبفہ کیسے ملے گا؟“

”اس کے لیے سب سے پہلے یہ کرنا ہو گا کہ صدر دفتر جاکر آرڈر نکلوایا جائے۔ اسے لے کر

پڑاری سے ملا جائے۔ اس کی مٹھی گرم کی جائے۔ موجودہ مالکان کے انکالات منسوخ کرائے جائیں اور اپنے نام کرا لیے جائیں۔“ نادر خان نے مشورہ دیا۔ ”یہ کام جلد سے جلد ہو جانا چاہیے، اگر موجودہ مالکان کو پتہ چل گیا اور انھوں نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا تو بہت گڑبڑ ہوگی۔ عدالت رجسٹر خسرہ گرداوری کی بنیاد پر الاٹمنٹ منسوخ کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ اب تک جو کارروائی ہوئی ہے وہ بالکل غیر کنونی ہے۔“

”یہ تو چاکر کو پہلے ہی سوچنا چاہیے تھا۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”تب ہی تو جی، میں نے کہا تھا چاکر اتنا ہشیار بندہ نہیں جتنا وہ خود کو ظاہر کرتا ہے۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”زمین کا کبضہ لینے کے لیے کیا ایسا کرنا ضروری ہے؟“

”بالکل ضروری ہے۔ اس کے بغیر تو کبضہ مل ہی نہیں سکتا۔“

”میں اس کے بارے میں آج ہی شہ زور سے بات کروں گا۔“ رحیم داد نے نادر خان کو اطمینان دلایا۔

”بالکل کریں جی۔ اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ نادر خان بھی چپ بیٹھا رہا۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی چھائی رہی، پھر رحیم داد کی آواز ابھری۔ اس نے کہا۔ ”یہ کام بھی چاکر خان ہی کر سکتا ہے۔ عزیز گھوٹال کو بھی اس کے ساتھ لگا دوں گا۔“

”اسے ضرور لگائیں جی۔“ نادر خان نے رحیم داد کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ”گھوٹال مجھے چاکر سے زیادہ ہشیار اور کام کا بندہ نظر آتا ہے۔“

”ایسا ہی کروں گا۔ دونوں کو لگا دوں گا تاکہ کام ٹانٹ ہو جائے۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے؟“

”چاکر اور گھوٹال کے ساتھ تو بھی چلا جا۔“

”میں نے صدر دفتر جا کر کیا لیتا ہے۔“ نادر خان نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”میں تو ادھر کے کسی افسر کو جانتا بھی نہیں۔“

”مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”تو ان کے ساتھ آسانی سے شہر پہنچ جائے گا۔ وہاں سے لہور چلا جانا۔ شاہ جی کراچی سے واپس آگیا ہو تو اسے بتا دینا کہ زمین کی الاٹمنٹ کے لیے میں ادھر ٹھہرا ہوا ہوں، کبضہ ملتے ہی اس کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے

قدرے تامل کیا۔ ”شاہ جی سے ملنے کے بعد تو واپس کو ٹلہ ہرکشن چلا جانا۔“

”سمہ آئے تو اس سے بات کچی کرلوں؟“

”بالکل کر لے۔ اس کے لیے تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”مجھے فصل کی سگنگ کرنی ہے تو وہ بھی کر لے۔ پر ساری ذمہ داری تیری ہی ہوگی۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ ”اور یہ بھی سن لے۔ کوئی گڑبڑ ہوئی تو تجھے ہی نمٹنا ہوگا۔ میں نے اس میں خود کو نہیں پھنسانا۔“

”فکر نہ کریں جی۔“ نادر خان نے رحیم داد کو یقین دہانی کرائی۔ ”نیل بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا، پر تجھ پر آج نہیں آنے دوں گا۔“ اس نے جوش و خروش سے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ”آزمائش کا وکت آیا تو دیکھ لینا میں تیرا کتنا وفادار اور جانثار ہوں۔“

”وہ تو مجھے پتہ ہے۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ ”پر جو کچھ کرنا ہشیاری سے کرنا۔“

”اطمینان رکھیں جی۔ سب ٹھیک ہی ہوگا۔“ نادر خان نے اسے ایک بار پھر یقین دلایا۔ ”ویسے ریف سمہ بہت ہشیار بندہ ہے۔ اس کی اوپر سے نیچے تک سب سے یاری ہے۔ سگنگ سے خود کھاتا ہے تو دوسروں کو بھی کھاتا ہے۔ ہر ایک کا اس نے بھتا باندہ رکھا ہے۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔“ رحیم داد نے مطمئن ہو کر کہا۔ ”برسوں سے یہ دھندا کر رکھا ہے۔ اب تک تو کسی چکر میں پڑا نہیں۔“ مجھے پتہ نہیں، بہت شان سے رہتا ہے۔ میں تو اس کی ماڑی میں ٹھہر چکا ہوں۔“

”سمہ بھی تیری بہت تعریف کرتا ہے۔“ نادر خان لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ”فصل کا روپیہ سمہ سے مل جائے تو زمین کی خریداری کے لیے حصے داروں اور زمین داروں کو بیعانہ دے دوں۔؟“

”تو ٹھیک سمجھتا ہے تو ضرور دے دے۔“

”پوچھ دے، سودا تو تیری واپسی کے بعد ہی ملے ہوگا۔“ نادر خان نے وضاحت کی۔ ”بیعانہ دینے سے اطمینان ہو جائے گا۔“

اب دوپہر ہو گئی تھی۔ نادر خان نے کرسی چھوڑتے ہوئے پوچھا۔ ”اجازت ہو تو جی، روٹی کھا لوں؟ جانے سے پہلے اور بھی ضروری باتیں پوچھ لوں گا۔“

”ہاں، اب تو جا۔“ رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ”شہ زور مزاری ادھر آگیا تو اس کے ساتھ روٹی کھا لوں گا۔ ورنہ اکیلے ہی کھاؤں گا۔ مجھے بھی بھوک معلوم ہو رہی ہے۔“

نادر خان کمرے سے باہر چلا گیا۔

رہا ہے؟ میں نے تو اسے خود دیکھا ہے۔ تو نے بھی دیکھا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“
 ”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔“ رحیم داد نے صورت حال واضح کرنے کی کوشش کی۔ ”الائمنٹ تو
 مل گئی پر رجسٹر خسرہ گرداوری میں زمین کے انفکلات تو مزارعوں ہی کے نام ہیں۔ اس طرح تو زمین
 کے کنونی مالک وہی ہوئے۔“ اس نے گلاس اٹھا کر گھونٹ بھرا۔ ”رجسٹر خسرہ گرداوری کے اعتبار
 سے تو اپنی الائمنٹ غیر کنونی بن جاتی ہے۔“

”پر چاکر خان نے تو یہ گالہ مجھے نہیں بتائی۔“
 ”عزیز گھوٹال بتاتا تھا وہ دلاور والا بھی گیا تھا۔ صدر دفتر میں کاغذات کی بھی جانچ پڑتال کر چکا
 ہے۔ اس نے پڑاوری کے پاس رجسٹر خسرہ گرداوری بھی دیکھا۔“
 ”بہت ہشیار بندہ لگتا ہے۔“

”وہ تو یہ بھی بتاتا تھا کہ مزارعے بہت سرکش ہیں۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”انفکلات ان کے نام
 ہیں۔ کبفہ ان کا پکا ہے۔ وہ تو بہت گڑبڑ الیں گے۔ تجھے پتہ نہیں، اس متروکہ اراضی کی پہلے بھی
 کئی بار الائمنٹ ہو چکی ہے۔ پر مزارعوں نے کبفہ نہ دیا۔ بلکہ کئی نے تو پڑاوری کی مٹھی گرم کر کے
 انفکلات اپنے نام کرا لیے۔“

”سردار مزاری نے گلاس اٹھا کر لبہا گھونٹ بھرا۔ اس کے چہرے سے تشویش چھلکنے لگی۔ اس
 نے فوراً چاکر خان سرگانی کو طلب کیا۔
 ذرا دیر بعد چاکر خان آگیا۔

”چاکر، یہ تو نے چوہدری کے لیے کیسی الائمنٹ کرائی ہے؟“ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی،
 جسے سرگانی نے بھی محسوس کیا۔ اس کے بشرے سے پریشانی پھلکنے لگی۔ اس نے مودب ہو کر جواب
 دیا۔ ”سین سردار، تو نے تو الائمنٹ کا سرکاری حکم نامہ دیکھا ہے۔ چوہدری نے بھی دیکھا ہے۔
 اس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں۔“

”گڑبڑ تو سرکاری ریکارڈ میں ہے۔“ سردار مزاری نے سرگانی کو جیکھی نظروں سے دیکھا ”تو نے
 یہ بھی پتہ نہ کیا کہ رجسٹر خسرہ گرداوری میں اراضی کے انفکلات کئی مزارعوں نے اپنے نام کرا
 رکھے ہیں؟“

رحیم داد بھی خاموش رہ سکا۔ اس نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”اس طرح تو الائمنٹ غیر
 کنونی بن جاتی ہے۔“

”سین، چوہدری، تو فکر نہ کر۔“ چاکر خان سرگانی نے نرم لہجے میں رحیم داد کو مطمئن کرنے کی



دھوپ تیز ہو گئی۔ گرمی بڑھ گئی۔ پکھری برخواست ہو گئی۔ رحیم داد یہ معلوم کرنے کے لیے بے
 چین تھا کہ مقدمے کا کیا فیصلہ ہوا۔ مگر سردار شہ زور مزاری اس کے پاس نہیں آیا۔ وہ پکھری سے
 اٹھ کر سیدھا زنان خانے میں چلا گیا۔ چاکر خان سرگانی بھی نہ آیا۔

رحیم داد نے ڈیرے کے ملازم کو بلایا۔ کھانا منگوایا اور اکیلے ہی بیٹھ کر کھایا۔ کھانے سے فارغ
 ہونے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گیا۔

شام کو سردار شہ زور خان مزاری سے رحیم داد کی ملاقات ہوئی۔
 دونوں مسمان خانے کے پختہ چوتھے پر بیٹھے تھے۔ سامنے شراب کی بوتل رکھی تھی۔ گلاس
 تھے جن میں شراب تھی۔ دونوں ایک ایک پیگ چڑھا کر سرور کے عالم میں تھے۔ شام گرمی ہو چکی
 تھی۔ اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ چراغ روشن کر دیے گئے تھے۔ باورچی خانے سے دھواں
 اٹھ رہا تھا۔ فضا میں کھانوں کی تیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔
 رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”صبح کے مقدمے کے بارے میں تو نے کیا فیصلہ دیا۔“ اس کے لہجے
 سے تجسس عیاں تھا۔

شہ زور مزاری نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”مقدمہ الجھا ہوا ہے، اگلی پیشی پر فیصلہ سناؤں
 گا۔ اب کی لمبی تاریخ دی ہے۔ اگلے مہینے سماعت کروں گا۔“
 ”مقدمہ تو بہت الجھا ہوا ہے۔“ رحیم داد نے مقدمے میں اپنی دلچسپی کا اظہار کیا۔ ”یہ بتا تو نے
 فیصلہ کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”کارروائی پوری ہو جائے تو فیصلہ بھی دے دوں گا۔“ سردار مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی
 نہیں کی۔ موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ ”سرگانی بتاتا تھا گھوٹال آگیا ہے۔ تجھے مل بھی چکا
 ہے۔ تو نے اسے ملازم رکھنے کے بارے میں کیا سوچا؟“

”اسے لگا تو لوں، پردہ کرے گا کیا؟“
 ”تیری زمین داری کی دیکھ بھال کرے گا۔ اور کیا کرنا ہے اس نے۔“ سردار مزاری کے لہجے
 میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

”زمین داری کی دیکھ بھال تو وہ تب کرے گا جب زمین کا کبفہ مل جائے۔“ رحیم داد نے شہ
 زور مزاری کو مطلع کیا۔ ”ابھی تو الائمنٹ بھی پکی نہیں۔“

”پکی کیوں نہیں ہے؟“ شہ زور نے حیران ہو کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سین تو کیسی گالہ کر

کوشش کی۔ ”آج ہی دوسرے کو تیرے کاردار نادر خان سے میری گالہ ہوئی تھی۔ میں نے اسے ٹھیک طرح سمجھا دیا ہے۔“

”کیا سمجھایا ہے تو؟“ سردار مزاری نے تھکمانہ لہجے میں سرگانی سے دریافت کیا۔

”سین سردار“ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ رجسٹر خسرو گرداوری میں مزارعوں کے انفکلات منسوخ کرا کے چوہدری کے نام کروائے جائیں گے۔“

”پر یہ کام فنافٹ ہونا چاہیے۔“ اس دفعہ رحیم داد بولا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”مزارعوں کو الاٹمنٹ کا پتہ چل گیا تو وہ معاملہ عدالت میں لے جائیں گے۔“

”عدالت میں“ تو وہ انفکلات منسوخ ہونے کے بعد بھی جاسکتے ہیں۔ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ”چاکر خان سرگانی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”سین چوہدری“ تو بالکل فکر نہ کر۔ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔“

”میں چاہتا ہوں اس کام میں دیری نہ ہو۔“ رحیم داد نے زور دے کر کہا۔

سردار مزاری نے بھی رحیم داد کی تائید کی۔ ”چوہدری ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تو کل صبح صدر دفتر کے لیے روانہ ہو جا۔ اور راکوں کے انفکلات فنافٹ منسوخ کرا کے چوہدری کے نام کرا دے۔ سرکاری ریکارڈ میں کوئی ایسا اندراج نہیں رہنا چاہیے جس سے آگے چل کر پریشانی اٹھانی پڑے۔“

”عزیز گھوٹال کو بھی اپنے ساتھ لے جانا اور میرے سینئر نادر خان کو بھی۔“ رحیم داد نے چاکر خان سے کہا۔ ”نادر تیرے ساتھ ٹھیرے گا نہیں۔ اس نے لہو جانا ہے۔“

”سین جیسا حکم کریں، ویسا ہی ہو گا۔ میں کل ہی صبح گھوٹال اور نادر کے ہم راہ شہر چلا جاؤں گا۔“ سرگانی نے سر جھکا کر نہایت ادب سے کہا۔

”اب تو جا۔“ سردار شہ زور مزاری نے چاکر خان سرگانی کو حکم دیا۔

سرگانی مزا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا چوہدری کی سیڑھیوں سے نیچے اترا اور شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

صبح صدر دفتر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے وہ رحیم داد کے کمرے میں آیا۔ رحیم داد اسی وقت غسل کر کے آیا تھا اور اپنے بھیگے ہوئے سر کے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہا تھا۔ سرگانی کے ہمراہ عزیز گھوٹال اور نادر خان بھی تھے۔

سرگانی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”سین چوہدری“ میں شہر جا رہا ہوں۔“ اس نے اپنی بات پر

زور دینے کی کوشش کی۔ ”تیرے ہی کام سے جا رہا ہوں۔ کوئی اور حکم میرے لیے ہو تو بتا دے۔“

”میں نے کیا بتانا ہے۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔ ”تجھے سب کچھ پتہ ہے۔ میں تو چاہتا

ہوں کام فنافٹ ہو جانا چاہیے۔ اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔“

”سین تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔“ اس بار عزیز گھوٹال نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش

کی۔ اس کا لہجہ نرم تھا، مگر اس میں مستعدی کی جھلک نمایاں تھی۔

رحیم داد خاموش رہا۔ سرگانی اور گھوٹال چلے گئے۔ نادر خان ٹھہر گیا۔ رحیم داد نے اسے خلیکی

نظروں سے دیکھا۔ ”نادر تو نے نہیں جانا؟“

”کیوں نہیں جانا؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”فیروغ ٹھیر کیوں گیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

نادر خان نے نہایت ادب سے دریافت کیا۔ ”میرے لیے کوئی اور حکم ہو تو بتا دیں۔“

”کل دن میں تو تجھ سے ساری باتیں ہو چکی ہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”ویسے میں بھی زیادہ دیر

ادھر نہیں ٹھیروں گا۔“

نادر خان چند لمحے ادب سے سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ پھر رحیم داد سے اجازت لے کر کمرے

سے باہر چلا گیا۔



کئی روز گزر گئے، مگر نہ چاکر خان سرگانی واپس آیا اور نہ ہی عزیز گھوٹال۔ رحیم داد بے چینی سے ان کا انتظار کرتا رہا۔ اس کے لیے وقت کا ٹکڑا دو بھر ہو گیا۔ ایک روز تو اس قدر اکتا گیا کہ اس نے

شیڈگی سے سوچا کہ دلاور والا کی وہ اراضی، جو اسے الاٹ ہوئی تھی، کسی کے ہاتھ فروخت کر

دے۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ ڈیرہ غازی خان کی سماجی زندگی سے، جس پر قبائلی رسم و رواج کی

گہری چھاپ تھی، ہنوز مانوس نہیں ہو سکا تھا۔ اسے اجنبیت کا احساس قدم قدم پر ہوتا۔

اس نے طے کیا کہ اس سلسلے میں شہ زور خان مزاری سے اپنا مدعا بیان کرے گا اور اسے اپنا ہم

خیال بنانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی مرضی کے بغیر وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھانا نہ چاہتا تھا۔

دیے بھی سردار مزاری کی مدد اور تعاون کے بغیر زمین فروخت کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا۔

مزاری کے علاوہ کسی کے ساتھ نہ اس کا ربط ضبط تھا نہ میل ملاپ۔ علاقے کی زمین داروں اور

سرکاری افسروں سے کبھی ملاقات بھی ہوئی تو ہمیشہ سردار مزاری کے ساتھ ہی ہوئی۔ ان ملاقاتوں کی

نوعیت بھی رسمی تھی اور صورت آشنائی تک محدود تھی۔

رحیم داد تمام دن دلاور والا کی اراضی بیچنے کے بارے میں سوچتا رہا۔ لیکن رات کو اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ہوا یہ کہ سردار مزاری سہ پہری کو رو جھان چلا گیا۔ اس کے پیار اور ضعیف ماموں کی طبیعت ایک بار پھر بگڑ گئی تھی۔ وہ رات گئے تک واپس نہ آیا۔

رحیم داد نے کھانا کھایا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ فضا میں افس تھی۔ گھٹن تھی۔ ہوا ٹھہری ہوئی تھی۔ آسمان پر غبار چھایا تھا۔ سمناں خانے کا ایک ملازم سرہانے کھڑا آہستہ آہستہ پنکھا جھل رہا تھا۔ رحیم داد نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ کروٹ بدل کر اس کا سرسری جائزہ لیا، پوچھا۔

”تو ادھر نیا لگا ہے؟ میں نے تجھے پہلے نہیں دیکھا۔“

”سیں، تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔“ ملازم نے جواب دیا۔ ”سردار نے پچھلے ہی جمعہ کو مجھے اپنا ہاتھ لگایا ہے۔ مجھے ادھر آئے ہوئے آج بھئیوں روز ہے۔“

”تیرا نام کیا ہے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”اب تو جی سب مجھے دریا مانگتے ہیں۔“

”لگتا ہے پہلے تیرا نام کچھ اور ہوتا تھا۔“

”ہا سیں، میرا نام پہلے منصب ہوتا تھا۔“ دریا مانے بتایا۔ ”تب میں مظفر گڑھ میں گورمانیوں کے پاس چھمائی دار ہوتا تھا۔“

”تو گورمانیوں کے پاس کیوں نہیں رہا؟“

”سیں، تجھے پتہ ہی ہے۔ چھمائی دار، دونوں ہی فصلیں تیار کرتا ہے پر اسے فصل کی واڈھی پر راہ کی شاہ کی تو ملتی نہیں۔ کوئی تنخواہ بھی نہیں ملتی۔ کپڑا لاتا بھی تب ملتا ہے جب بالکل پھٹ جاتا ہے۔ صرف روٹی ملتی ہے۔“ دریا مانے آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”راہک یا مزارع تو را کی لینے کے علاوہ منجی پر بھی بیٹھ سکتا ہے۔ پر چھمائی دار تو صرف زمین پر بیٹھ سکتا ہے اور زمین دار کی اجازت کے بنا پر نا بھی نہیں کر سکتا۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”چھمائی دار تو سیں دیگا کرنے کے لیے پیدا ہوتا ہے اور دیگا کرتے کرتے ایک روز ختم ہو جاتا ہے۔“

”یہ بتا تو چھمائی دار کیسی بن گیا؟“

”سیں، گالہ اس طرح ہے کہ میرے پیو نے زمین دار سے ترائے سو روپیہ ادھار لیا تھا۔ اس کی کھڑی فصل چھل اور سیلاب میں بہہ گئی تھی۔ مونٹی بھی بہہ گئے تھے۔ کچھ بھی نہ بچا تھا۔“ دریا مانے بتایا۔ ”زمین دار نے ادھار بھی دیا تو اس شرط پر کہ جب تک ادھار ادا نہ ہو گا تب تک میں اس کے پاس رہن رہوں گا۔ تب میں چوداں برس کا ہوتا تھا۔“

”تیرے پیو نے زمین دار کے تین سو ادھار کے ادا نہیں کیے؟“ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ چھریے جسم کا نوجوان تھا۔ قد زیادہ اونچا نہ تھا۔ مونچھیں سیاہی مائل تھیں مگر زیادہ گھنی نہ تھیں۔ ”تو ۲۲ سال سے تو کم کا نہیں لگتا۔“

”سیں، توں نے ٹھیک سوچا۔ ماں بتاتی تھی، جب میں پیدا ہوا تب کوئٹہ میں زلزلہ آیا تھا۔“ اس نے رحیم داد کا قیاس درست قرار دیتے ہوئے کہا۔ ”میں گرمانیوں کے پاس ست سال سے اوپر ہی رہا۔ میرے پیو کا ادھار ادا کرتے کرتے مرن ہو گیا۔ پر وہ کم نہ ہوا کچھ بڑھ ہی گیا۔“

”وہ کیسے؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔ ”تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“

”وہ ایسا ہے سیں۔“ دریا مانے وضاحت کی۔ ”زمین دار کا کاردار ہر سال سود لگا کر ادھار کی رقم بڑھا دیتا تھا۔ میرا پیو جتنا ادا نہیں کرتا تھا سود اس سے زیادہ لگ جاتا تھا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”زمین دار تو سمجھو ادھار کے بدلے ساری ہی فصل اٹھالے جاتا تھا۔“

”تب تو اس کا ادھار ادا ہو جانا چاہیے تھا۔“

”کیسے ادا ہو جاتا۔“ دریا مانے بتایا۔ ”سیں، توں تو زمین دار ہے۔ توں نے پتہ ہے نائی، موچی، لوہار، ترکھان اور ایسے ہی سارے کیوں کو فصل سے حصے کے طور پر جو رو لگ دیا جاتا ہے، وہ بھی راہک اور مزارے کی ڈھیروں سے دیا جاتا ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔ ”ادھا مالہ بھی راہک کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے ٹیکس ہیں جو زمین دار کو دینے ہوتے ہیں۔ در ٹیکس، کھڑی ٹیکس، مکڑ ٹیکس، ٹیکس، موٹن ٹیکس، پرنا ٹیکس، مرن ٹیکس، کتنے ہی تو ٹیکس ہیں اور سارے ہی فصل کی واڈھی پر زمین دار کو ادا کیے جاتے ہیں۔ مزارے یا راہک کے پاس فصل میں سے بچتا کیا ہے۔ بیج اور کھاد خریدنے کے لیے ہر فصل پر ادھار ہی لینا پڑتا ہے۔“

رحیم داد نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”مطلب کی گل بات کر۔“ اس کا لہجہ قدرے ٹیکھا تھا۔ ”یہ بتا تو نے اپنا نام کیوں بدلا؟“

”سیں، میں یہی بتا رہا تھا۔“ اس نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔ ”وہ ایسا ہوا جی، مجھے دوستی کی ایک دن سے پیار ہو گیا۔“

رحیم داد کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے دریا مانے کی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔ ”کون تھی وہ؟“

”سیں، اس کا ناں سو جھلا تھا۔“ دریا مانے کی آنکھوں میں چراغ جھلکانے لگے۔ ”ویسے تو وہ رنڈ

بیوہ تھی۔ پردیکھنے میں بالکل کنواری لگتی تھی۔ جوان اور سوہنری تھی۔ بال بچہ بھی نہ تھا۔ کوئی بھی اس کا نہ تھا۔ صرف ایک بڑھا چا چا تھا۔
”تو نے سو جھلا سے ویہ کر لیا تھا؟“

”سینس ارادہ تو یہی تھا۔“ وریا مانے بتایا۔ ”پر زمین دار کی مرضی کے بنا کیسے پرنا یا ویہ کر سکتا تھا۔ میں نے اجازت مانگی تو وہ ایک دم گرم ہو گیا۔ آنکھیں نکال کر بولا۔ تو چھمائی دار ہو کر پرنا کرے گا۔ خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ تو اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ ابھی تو وہ ادھار بھی ادا نہیں ہوا جو تیرے پو نے لیا تھا۔ چل دفع ہو میاں سے۔ آگے ایسی گالہ سوچنا بھی نہیں۔“ اس نے بھیجی ہوئی نظروں سے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”سینس، وہ بہت وڈا زمین دار ہے۔ ہزاروں کلا زمین ہے اس کے پاس۔ وہ اتنا نراض ہوا کہ میں ڈر کر منت اور زاری کرنے لگا۔ پر اس کا سہہ کم نہ ہوا۔ اس نے اپنے کمدار کو بلا کر حکم دیا۔ اس کے سو جوتے لگا تاکہ آگے پرنا کرنے کی نہ سوچے۔ اس نے وہیں ٹھک ٹھک سو جوتے لگائے اور دھکے دے کر باہر نکال دیا۔“

”وریامے!“ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ ”تیرے زمین دار نے ٹھیک ہی تو کیا تو نے سو جھلا سے یاری لگانے سے پہلے یہ نہیں سوچا اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا، کپڑا تاکہ کیسے بنائے گا؟ تو چھمائی دار تھا۔ تجھے تنخواہ تو ملتی نہیں تھی۔ فصل سے بنائی یا راکہ بھی نہیں ملتی تھی۔ ویہ یا پرنا کرنا تو گھر والی کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا۔“

”سینس، وہ بہت مخنتی ذال ہے۔ مونج سے رسیاں بٹتی۔ کھجور کی پتیوں سے پٹکے اور چٹائیاں بناتی۔“ وریا مانے بتایا۔ ”اور بھی کئی طرح کے کام کرتی تھی۔ اپنی روٹی تو وہ منت کر کے کھا ہی سکتی تھی اور مجھے بھی کھلا سکتی تھی۔ وہ تو میرا بازو بن سکتی تھی۔“

”جب زمین دار نے پرنا کرنے کی اجازت نہ دی، تو تو نے کیا کیا؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔
”سینس، میں نے یہ کیا۔ ایک رات جب سردی بہت تھی اور اندھیا رہی تھی، میں نے سو جھلا کو اپنے ساتھ لیا اور چھپتا چھپتا دوستی سے نکل کر خانے وال پہنچا۔ ایک ملاں سے نکاح پڑھوایا اور وہ میری رن بن گئی۔“
”خانے وال میں تو کیا کرتا رہا؟“

”خانے وال تو میں تھوڑے دن رہا۔“ وریا مانے رحیم داد کے سوال کے جواب میں بتایا۔ ”میں وہاں سے رحیم یار خان پہنچا اور مخدوموں کے پاس چلا گیا۔ سینس، میں ریاستی ہوں۔ میرا دادا ابھی ادھر ہی کا ہوتا تھا۔ میرا وڈا بھرا وہاں راہک تھا۔ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔ اس نے مجھے اور

میری رن سو جھلا کو مخدوموں کے پاس لگا دیا۔ وہ حویلی میں کام کرتی تھی اور میں پھریدار لگا دیا گیا۔ وہ حویلی مخدوم کے وڈے پتر، مخدوم زادے کی تھی۔ وہ جی بہت وڈا حاکم ہے، صوبائی وزیر ہے۔ ریس میں گھوڑے دوڑاتا ہے۔ سیاست لڑاتا ہے۔ بیٹکوں سے اپہار لیتا ہے اور کبھی واپس نہیں کرتا۔ عیش کرتا ہے۔ بہت ٹھانڈے ہیں جی اس کے۔“

”ناہے اس کی تو کئی گھر والیاں ہیں۔ حویلیاں بھی کئی ہوں گی۔“

”سینس، یہ تو میں نے پتہ نہیں، اس کی حویلیاں کتنی ہیں اور کہاں کہاں ہیں؟ پر ذال کئی ہیں۔“
وریامانے مسکرا کر کہا۔ ”ایک کو تو اس نے چھوڑ رکھا ہے۔ وہ کراچی میں ہوتی ہے۔ نائی کا کام کرتی ہے ادھر۔“

رحیم داد نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”نائی کا کام کرتی ہے؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”ہا سینس، میں نے یہی سنا ہے۔ تجھ سے میں نے جھوٹ نہیں بولنا۔“ وریامانے دبی زبان سے کہا۔ ”اس نے یہ کام ولایت جا کر سیکھا ہے۔ پر وہ صرف رتاں کے بال کاٹتی ہے۔ اس کے پاس کئی ذال ملازم ہیں۔ وہ بد شکل رن کو سوہنری اور بڑھی کو جوان بنا دیتی ہے۔ اس کی بہت آمدنی ہے جی۔ ویسے بھی اسے مخدوم زادے سے مر میں بہت روپیہ ملا ہے۔ سینس، اس نے تو ایک فلم بھی بنائی ہے۔ بہت زبردست رن ہے۔ مخدوم زادہ اب تک اس سے ڈرتا ہے۔“

”یہ تو نے بہت عجب گالہ سنائی۔“ رحیم داد ابھی تک حیرت زدہ تھا۔

وریامانے اسے اپنی جانب متوجہ پایا تو مسکرا کر بولا۔ ”سینس، تجھے ایک اور عجب گال سناؤں۔“

”ضرور سنا۔“ رحیم داد نے اس کی باتوں میں گہری دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔

”سینس، وہ ایسا ہوا کہ مخدوم زادے کو ایک وڈے سرکاری افسر کی بیٹی سے پیار ہو گیا۔ دونوں میں بہت دن تک یاری چلتی رہی۔ پر جب مخدوم زادے نے اس سے پرنا کرنا چاہا تو پہلے تو اس کے پو نے انکار کر دیا۔ فیر اس نے ایک کڑی شرط لگائی۔“ اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی اور خاموشی سے پکھا جھلنے لگا۔

رحیم داد اس کی خاموشی زیادہ دیر برداشت نہ کر سکا۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”پرنا یا ویہ کرنے کی کیا شرط لگائی تھی اس نے؟“

”اس نے یہ شرط لگائی کہ پرنا تب ہی ہو سکتا ہے جب مخدوم خود اپنے پتر کا بازو منگن کے لیے

اس کے پاس آئے۔ ”دریامانے بتایا۔ ”یہ شرط اس لیے لگائی تھی کہ اسے پتہ تھا کہ مخدوم بازو منگن کے لیے نہیں آئے گا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ مخدوم اس رشتے کے سخت خلاف ہے۔ اصلی گالہ یہ ہے سیں کہ وہ اپنی بیٹی کا مخدوم زادے سے پرنا کرنا ہی نہ چاہتا تھا۔“

”آگے کیا ہوا؟“ رحیم داد نے بے یقینی سے پوچھا۔

”مخدوم زادے نے اپنے بیوی کی بہت منت کی اور کسی نہ کسی طرح اسے راضی باضی بھی کر لیا۔“ دریامانے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”مخدوم بازو منگن کے لیے گیا۔ پر مخدوم زادے کے ساتھ سرکاری افسر کی بیٹی کا پرنا نہ ہو سکا۔“

”کیوں؟“ رحیم داد نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

”سیں میں نے تو صرف اتنا پتہ ہے کہ مخدوم واپس آیا تو وہ بھی اس کے ساتھ تھی۔“ دریامانے نہایت سادگی سے بتایا۔ ”پر اب وہ مخدوم کی رن تھی۔ اور مخدوم زادے کی سوتیلی ماں بن چکی تھی۔“

”توچ کہہ رہا ہے؟“ رحیم داد نے یقین نہ ماننے کے انداز میں پوچھا۔

”ہا سیں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“

”مخدوم زادے کو پتہ چلا ہو گا تو بہت نراض ہوا ہو گا۔“

”ہا سیں اس نے کچھ بھی نہ کیا۔ چپ کر کے بیٹھ گیا۔“

”پر مخدوم تو بہت بوڑھا ہے۔“ رحیم داد کے بشرے سے تعجب جھلک رہا تھا۔ ”بڑی کے بیو نے اس کے ساتھ کیسے دیاہ کر دیا؟“

”پتہ نہیں جی مخدوم نے کیا چکر چلایا۔“ دریامانے بتایا۔ ”مجھے تو یہ معلوم ہے وہ اب مخدوم کی گھر والی ہے۔“

”مخدوم زادے نے اپنے بیوی کی اس زیادتی اور حک ماری پر کچھ نہیں کیا؟“ رحیم داد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”اس نے کچھ نہ کچھ رولا تو ضرور ڈالا ہو گا۔“

”اس نے صرف اتنا کیا۔“ دریامانے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ ”اس نے چپکے چپکے اس سے یاری لگا رکھی ہے۔“ وہ لمحے بھر کے لیے خاموش رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”اب تو مخدوم کو بھی اس یاری آشنائی کا پتہ چل گیا ہے۔ پر اس نے کبھی شور شرابہ نہیں کیا۔“

”بدنامی کے ڈر سے چپ کر کے رہ گیا ہو گا۔“

”ایسا ہی ہو گا۔“ دریامانے مختصر جواب دیا۔

رحیم داد نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ”دریامانے تو نے یہ نہیں بتایا کہ تیرا نام منصب سے دریا ایسے پڑ گیا۔ تو نے خود بدلا ہے؟“

”ہا سیں میں کیوں ایسا کرنے لگا۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”ایک روز مخدوم کا حکم آیا کہ میں اپنا نام بدل کر دریام رکھ لوں۔ یہ حکم اس لیے آیا تھا کہ اس کے ایک پوتے کا نام انھی دنوں منصب رکھا گیا تھا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”مخدوم یہ کیسے سن سکتا تھا کہ اس کے معمولی نوکر کا نام بھی وہی ہو جو ایک مخدوم زادے کا تھا۔ سیں اس طرح میں منصب سے دریام بن گیا۔ فیر آگے چل کر دریام ہو گیا۔“

”تو مخدوموں کے پاس سے ادھر کیسے آگیا؟“

دریامانے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑا ہولے ہولے پٹکھا جھلتا رہا۔

رحیم داد نے اصرار کیا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”سیں ڈر لگتا ہے۔“ دریامانے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”یوں سمجھ لے میری مت ماری گئی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”مخدوم کی ایک بیٹی نے میرے ساتھ کے ایک سپردار کے ساتھ یاری لگا رکھی تھی۔ وہ تھا بھی من موچی اور سوہنڑا گھرو۔ سب کو مخدوم زادی کے ساتھ اس کی یاری کا پتہ تھا۔ پر مجھے خیر خواہی سوچھی۔ ایک روز مخدوم کی پاس پہنچا۔ شام ہو چکی تھی۔ وہ اکیلا ہی بیٹھا تھا۔ میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔“

”مخدوم نے تیری گل بات سن کر کیا کیا؟“

”سیں وہ تو ایک دم گرم ہو گیا۔“ دریامانے رحیم داد کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”اتنا زیادہ نراض ہوا کہ جھٹ ایک کمدار کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ مجھے جیل میں ڈال دیا جائے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”سیں اس کی اپنی جیل ہے۔ ایسی ہی جیسے ادھر کے سرداروں کی ہوتی ہے۔“

”تو جیل میں کب تک رہا؟“

”میں جیل گیا ہی نہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”کمدار مجھے جیل کی طرف لے کے چلا تو رستے میں میں نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ہمانہ بتایا کہ سخت درد ہو رہا ہے۔ پہلے تو اس نے آنکھیں دکھائیں پر جب میں نے اس کی بہت منت کی تب وہ مجھے ٹٹی کرانے کے لیے کھیتوں کی طرف لے گیا۔ شام کا اندھیا رہ تو پھیلا ہی تھا۔ کھیتوں میں گھستے ہی میں اس کی نظروں سے بچتا بچتا دھیرے دھیرے ایک طرف نکل گیا اور سویرا ہونے سے پہلے ہی مخدوموں کی دستی سے دور چلا گیا۔“

”تیری گھروالی ادھر ہی رہ گئی؟“

”ہاں سیں، وہ ادھر ہی ہے۔“ دریا مانے بتایا۔ ”میرے اس طرح فرار ہونے پر میری رن کو سزا ملی۔ اسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ میرے بھرا کو بھی سزا دی گئی۔ اسے حکم دیا گیا کہ مجھے پکڑ کر حاضر کرے ورنہ اڑھائی ہزار جرمانہ بھرے۔ جب تک جرمانہ ادا نہ ہو گا جیل میں رکھا جائے گا۔ سیں، وہ بہت غریب ہے، حلیم ہے، معمولی راہک ہے۔ اتنا بھاری جرمانہ کیسے ادا کرتا۔ اس لیے اسے بھی جیل میں بند کر دیا گیا۔“

”یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ ”خود تو صاف بچ کر نکل آیا۔ اپنے بھرا اور گھروالی کو پھنسا دیا۔ ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔“

”سیں، توں ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میری ہی وجہ سے دونوں کو جیل جانا پڑا۔“ اس نے نظریں جھکا کر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”پر میں کرتا ہی کیا۔ مخدوم کے پاس چلا جاؤں تو وہ مجھے جیل میں تو ڈال ہی دے گا پتہ نہیں اور جانے کتنی کڑی سزا دے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”میں تو اب اڑھائی ہزار روپے اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں تاکہ بھرجانی کو پہنچا دوں۔ جرمانہ مل جائے تو مخدوم میرے بھرا کو رہا کر دے گا۔ وہ باہر نکلنے کے بعد منت زاری کر کے میری رن سو جھلا کو بھی جیل سے رہائی دلا سکتا ہے۔“

”تو نے اب تک کتنا روپیہ اکٹھا کر لیا؟“

”ابھی تو پورے اڑھائی سو بھی اکٹھے نہیں ہوئے۔“ دریا مانے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”مخدوموں کی دستی سے نکلنے کے بعد پہلے تو میں ملتان میں گیلانیوں کے پاس رہا۔ ادھر میرے چاچا کا ایک پتر ہوتا ہے۔ میرے اس سوترنے مجھے گیلانیوں کے ڈیرے پر لگوا دیا۔“

”تو نے گیلانیوں کی نوکری کیوں چھوڑ دی؟“

”سیں، تجھے یہ تو پتہ ہو گا۔ گیلانی بھی گدی نشین اور مخدوم زادے ہوتے ہیں۔ بہت وڈے زمین دار بھی ہیں۔“ دریا مانے بتایا۔ ”گیلانیوں کو کسی طرح میرے بارے میں پتہ چل گیا۔ وہ مجھے پکڑ کر مخدوموں کے پاس بھیجنا چاہتے تھے۔ میرے سوترو کو گیلانیوں کے ارادوں کے بارے میں معلوم ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ اب ادھر رہنا خطرناک تھا۔ اس لیے میں بھاگ کر یہاں آ گیا۔ پر سیں، میں نے ادھر بھی زیادہ دن نہیں ٹھیرنا۔“ اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ”سیں توں سدا جیویں، رب راضی ہووے، توں سردار سے یہ گالہ نہ بتانا۔“

”فکر نہ کر۔ میں تیرے بارے میں اسے کچھ نہیں بتاؤں گا۔“ رحیم داد نے اسے اطمینان دلایا۔

”پر مجھے یہ بتاؤ ادھر ٹھیرنا کیوں نہیں چاہتا۔“

”سیں، ادھر رہ کر میں اڑھائی ہزار روپیہ کبھی اکٹھا نہیں کر سکوں گا۔“ دریا مانے وضاحت کی ”گیلانیوں کے پاس ہوتا تھا تو دیرے پر وڈے زمین دار اور سرکاری افسر روزی آکر ٹھیرتے تھے۔ مجھے خشخیش دیتے تھے۔ پر ادھر تو بالکل سکا معاملہ ہے۔ نہ خشخیش نہ انعام، کچھ بھی ملتا مالتا نہیں۔“

اس کے انداز میں حسن طلب تھا۔ رحیم داد فوراً بھانپ گیا کہ بن بلائے وہ کیوں اس کے پاس آیا اور پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ اس خدمت گزاری کا مطلب اس پر واضح ہو چکا تھا۔ مگر اس وقت وہ اسے کچھ دے نہیں سکتا تھا۔ چند لمبے خاموش رہنے کے بعد اس نے دریا مانے سے دریافت کیا۔

”تو ادھر آیا ہی کیوں؟ ملتان کی طرح کسی اور وڈے شرکی طرف نکل جاتا۔ کسی ایسے زمین دار کی حویلی پر لگ جاتا جس کے ڈیرے پر وڈے افسر اور زمین دار آکر ٹھیرتے ہوں۔“

”ایسا ہی کروں گا جی۔ میرا ارادہ کراچی جانے کا ہے۔ مجھے پتہ ہے وہ کتنا وڈا شر ہے۔ ادھر کام بھی مل جاتا ہے اور مزدوری بھی ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔“ دریا مانے بتایا۔ ”ادھر تو سیں، میں مخدوموں اور گورمانیوں کی سزا سے بچنے کی لیے آ گیا تھا۔ میں نے تو کوئی سنگین جرم بھی نہیں کیا۔ وہ جو قتل، ڈکیتی اور ایسے ہی دوسرے وڈے وڈے جرم کرتے ہیں، ادھر سے بھاگ کر اسی طرف آتے ہیں۔ کسی وڈے سردار کے ہاتھ یا نوکر بن جاتے ہیں۔ سردار کی پناہ مل جائے تو نہ پولیس کچھ بگاڑ سکتی ہے اور نہ کون نہ عدالت۔ ادھر تو سرداروں ہی کا کنون چلتا ہے۔ سیں، میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

رحیم داد نے غور کیا، دریا مانا بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ جس طرح دوسرے اضلاع اور علاقوں کے مقابلے میں دریا مانا یہاں خود کو محفوظ سمجھتا ہے اسی طرح کوئلہ ہر کشن کی بہ نسبت وہ بھی ڈیرہ غازی خاں میں زیادہ محفوظ ہے۔ کوئلہ ہر کشن میں کسی بھی وقت اس کا کوئی ایسا قربات دار یا شناسا مل سکتا ہے جو اسے پہچان لیتا۔ پولیس سے مخبری کر دیتا۔ پھر جیل ہی نہیں اسے پھانسی پر لٹکا پڑتا۔ نام اور حلیہ تبدیل کرنے کی باوجود خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ڈیرہ غازی خاں میں یہ خطرہ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہاں نہ کسی جان پہچان والے سے ڈبھیڑ ہونے کا خدشہ تھا نہ پولیس کا دھڑکا۔ اس نے دلاور والا کی اراضی فروخت کرنے اور اس سلسلے میں سردار شہ زور مزاری سے بات کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

شہ زور مزاری روحان سے واپس آگیا تھا۔ مگر رحیم داد سے اس کی ملاقات نہ ہوئی۔ وہ پکھری میں بیٹھا مقدمات کے فیصلے سن رہا تھا۔ رحیم داد بھی پکھری میں حسب معمول دل بہلانے اور وقت گزرنے کی غرض سے چلا گیا۔

اس نے دیکھا چاکر خان سرگانی پکھری میں موجود تھا۔ سردار مزاری بھی پر نہایت آن بان سے بیٹھا تھا۔ اس کے روبرو بدھیل سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ قریب ہی ایک ادھیڑ عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کا لباس نہایت بوسیدہ تھا۔ چہرہ ویران اور اڑا ہوا تھا۔ اغلاس اور سخت محنت نے اسے وقت سے پہلے ہی بوڑھا بنا دیا تھا۔ وہ بدھیل کی ماں تھی۔ اس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر تیرہ چودہ سال کے لگ بھگ تھی۔ مگر غدایت کی کمی کے باعث اس کا جسم بڑھنے اور پھیلنے کے بجائے سکڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے کم نظر آ رہی تھی۔ وہ دوپٹے کے آچل سے بکل مار کر چہرہ کسی قدر چھپائے ہوئے تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے پھیلے تھے۔

سردار شہ زور خان مزاری نے گردن موڑ کر سرگانی کو دیکھا۔ اونچی اور گرج دار آواز سے بولا۔
”چاکر!“ اس نے ہاتھ اٹھا کر بدھیل کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس نے جتنی کی شرائط پوری کر دیں؟“
”ہا سیں!“ چاکر خان سرگانی نے نہایت ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”بدھیل نے جرمانے کی رقم اور مکدے کی فیس جمع کرادی ہے۔ ماں اور بھین کو بھی لے آیا ہے۔ دونوں پکھری میں حاضر ہیں۔“

سردار نے بدھیل کی ماں اور بہن کو نظر بھر کر دیکھا۔ پھر حکم دیا۔ ”فیصلے کی رو سے ساؤنی کو بدھیل کی تحویل میں دے دیا جائے۔ ساؤنی کی ماں کو اڑھائی سو روپے تاوان کے دیئے جائیں۔ بدھیل کی ماں اور بھین کو کوٹ میں رکھا جائے۔ وہ اب ادھر ہی رہیں گی۔“

پکھری پر سکوت طاری ہو گیا۔ بدھیل کی ماں نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلما رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنسو ٹپک ٹپک کر رخساروں پر گرنے لگے۔ بیٹی، جواب تک حیران و پریشان کھڑی تھی، ماں کو آنسو بہاتے دیکھ کر رونے لگی۔

سردار مزاری نے ساؤنی کو بلوایا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ رحیم داد نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ روپ اب نکھر گیا تھا۔ بالوں میں تیل چمک رہا تھا۔ لباس اجلا تھا۔ جسم بھی اب پہلے کی نسبت سڈول اور کسی قدر بھاری ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں دوشیزگی کی حیا اور جھجک کے بجائے بے باکی اور شوخی نمایاں تھی۔

سردار مزاری نے ساؤنی کو بدھیل کے حوالے کرتے ہوئے نصیحت کے ساتھ ساتھ تنبیہ بھی

کی۔ ”اسے لے جا۔ ابھی جا کر مسجد کے ملاں کو بلانا اور اس کے ساتھ نکاح پڑھوا لیتا۔ اب میں تیرے خلاف سیاہ کاری کا الزام نہ سنوں، ورنہ کڑی سزا دوں گا۔“
بدھیل گڑگڑا کر دعائیں دینے لگا۔ ”سین سردار سدا جیویں، بالیں بچیں سکھی صحت، ہوویں، خیر ملا ہو۔ رب راضی ہو۔“ اس نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ ”الایا گلا یا معاف۔“
ساؤنی آگے بڑھی اور بدھیل کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔

بدھیل نے مرکز ماں اور بہن کو دیکھا۔ گرمی سانس بھری۔ دونوں سسکیاں بھرنے لگیں۔ وہ ان سے رخصت ہوتے ہوئے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ گردن جھکا کر، مڑا اور آستین سے آنسو پونچھتا ہوا دروازے کی سمت بڑھا۔ ساؤنی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ دونوں باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بدھیل کی ماں اور بہن ایک کارندے کی نگرانی میں پکھری کے باہر چلی گئیں۔ دونوں کو کوٹ میں پہنچا دیا گیا۔



پکھری پر خاست ہونے کے بعد چاکر خان سرگانی فوراً رحیم داد کے کمرے میں پہنچا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”جس کام کے لیے تو گیا تھا اس کا کیا بنا؟“ اس کے لہجے سے بے چینی صاف عیاں تھی۔

”سین تیرا حکم چاہیے۔“ وہ چمک کر بولا۔ ”تیرا کام ہو گیا۔ ایک دم پکا کام ہو گیا۔ رجسٹر خسرہ گرداوری میں اراضی کے انفکالات کا اندراج تیرے نام ہو گیا۔ پچھلے انفکالات خارج کر دیے گئے۔ میں نے اپنے سامنے پنواری سے کرائے ہیں۔“ وہ کھنکھلا کر بے تکلفی سے ہنسا۔ ”کرتا کیسے نہیں۔ صدر دفتر کا حکم تھا۔ فیذاں کی مٹھی بھی تو ٹھیک طرح گرم کی تھی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اس کے بغیر تو سین کام چلتا ہی نہیں۔“

”مجھے پتہ تھا تو پکا ہی کام کر کے آئے گا۔ سردار بالکل ٹھیک کہتا ہے، چاکر تو بہت ہشیار بندہ ہے۔“ رحیم داد نے خوش ہو کر داد دی۔ ”یہ بتا عزیز، کٹھوال کدھر ہے؟ وہ اب تک نظر نہیں آیا۔“

”سین، چوہدری میں نے اسے ادھر چھوڑ دیا۔“ سرگانی نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ یہ پتہ کر کے آئے گا کہ کہنہ ملنے میں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی۔ اگر ایسا امکان ہوا تو اس کا پہلے سے بندوبست کر لیا جائے۔“

سرگانی نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ چلا گیا۔

رحیم داد کی دو روز تک اس سے ملاقات نہ ہو سکی۔ تیسرے روز دن ڈھلے وہ آیا۔ عزیز گھوٹال اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں خاموشی سے سر کندوں کے موڑوں پر بیٹھ گئے۔ گھوٹال مڈھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بشرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ سرگانی بھی گم صم تھا۔ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔ ”گھوٹال! کیا خبر لایا؟ تو پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔“

”سین گامہ ہی ایسی ہے۔“ اس نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”صاف صاف بتا۔“ رحیم داد نے گھوٹال کو ٹیکھی نظروں سے دیکھا۔

”سین“ کبفہ ملنے میں بہت مشکل پڑے گی۔“ گھوٹال نے بتایا۔ ”ان نکالات خارج ہونے کی اطلاع میرے پہنچنے سے پہلے ہی دلاور والا پہنچ گئی تھی۔ وہ تو جی بہت سرکش اور جھگڑا لو بندے ہیں۔ میں نے ان کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی تو میرے گلے پڑ گئے۔ غصے سے آنکھیں نکال کر زور زور سے چیخنے چلانے لگے۔“

”تو نے کیا کیا؟“ رحیم داد کی آواز اونچی ہو گئی۔ چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔

”سین“ میں نے کیا کرنا تھا۔ چپ کر کے چلا آیا۔“ عزیز گھوٹال نے مسکین سی صورت بنا کر صفائی پیش کی۔ ”ویسے تو وہ تعداد ۱۸ ہیں۔ ان میں سے بھی صرف ۱۰ نے مالکانہ حکوک حاصل کر لیے تھے۔“

”وہی جن کے ان نکالات خارج کر دیے گئے؟“

”ہاں سین۔“ گھوٹال نے بتایا۔ ”اٹھ تو ابھی تک راہک اور مزارعے ہیں۔ ان کا کبفہ تو پہلے ہی غیر کوئی تھا۔“ اس نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”پر سین وہ سب ایک ہیں۔ انھوں نے آپس میں سنگت کر رکھی ہے۔ سب ہی ایک دوسرے کی پوری طرح مدد کر رہے ہیں۔“

”پنڈ کے دوسرے بندے کیا کہتے ہیں؟“ رحیم داد نے صورت حال پوری طرح سمجھنے کی غرض سے کرید کر دریافت کیا۔ ”تو ان سے بھی ملا تھا؟“

”پہلے میں انھی سے ملا تھا۔“ گھوٹال نے مطلع کیا۔ ”ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ پوری دوستی ہی راہکوں اور مزارعوں کے ساتھ ہے۔“

”وہ تو سین ہوتا ہی چاہیے۔“ چاکر خان سرگانی پہلی بار بولا۔ ”برسوں سے اکٹھے رہتے آئے ہیں۔ کوم بھی ایک ہے۔ سارے ہی تو بوڑھیں۔ آپس میں گہرے رشتے ناتے ہیں۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ عزیز گھوٹال بھی کچھ نہ بولا۔ مگر چاکر خان زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔

اس نے رحیم داد کو اطمینان دلانے کی کوشش کی۔ ”سین، فکر کی کوئی گامہ نہیں۔“

”دلاور والا تو گیا تھا یا گھوٹال؟“ رحیم داد نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اے ادھر کے بارے میں زیادہ پتہ ہے یا تجھے؟“

”سین، زراض نہ ہو۔“ سرگانی نے نرم لہجے میں کیا۔ ”گھوٹال سے ساری باتیں میں پہلے ہی سن چکا ہوں۔ مجھے سب پتہ ہے اور اس کے بارے میں برابر سوچنا بھی رہا ہوں۔“

”کیا سوچا تو نے؟“ رحیم داد کے چہرے سے جھنجھلاہٹ بدستور عیاں تھی۔

”سین، تجھے تو پتہ ہی ہے۔ زمیں داری میں تو ایسے چکر چلتے ہی رہتے ہیں۔“ اس کا لہجہ بدستور اطمینان بخش تھا۔ ”راہکوں کے ساتھ تو ایسے جھگڑے نئے روز کی گامہ ہے۔“

”تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ صاف صاف گل کر۔“ رحیم داد نے سرگانی کو ٹیکھی نظروں سے دیکھا۔

”سین، میں سردار کو سب کچھ بتا دوں گا۔ تو بھی اس سے بات کر لیتا۔“ چاکر خان سرگانی نے وضاحت کی۔ ”سردار عقلمند اللہ دریشک سے مدد لینی ہوگی۔ وہ اپنے سردار کا گہرا ریا ہے۔ دلاور والا اسی کے علاقے میں ہے۔ سردار عقلمند اللہ بہت ڈاڑھیں دار ہے۔ اور بہت زور آور سردار بھی ہے۔ وہ مدد کرے گا تو کبفہ ایک ہی روز میں مل جائے گا۔ سارے راہکوں اور مزارعوں کی سرکشی اور اکڑ رسی کے بل کی طرح نکال کر رکھ دے گا۔ سین، تو بالکل فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

چاکر خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گھوٹال بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں چلے گئے۔

رحیم داد گم صم بیٹھا رہا۔ چاکر خان سرگانی کے اطمینان دلانے کے باوجود اس کی پریشانی رفع نہ ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی سے کمرے میں آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔



شام نکھری نکھری تھی۔ فضا میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بسی تھی۔ غروب آفتاب سے کچھ دیر پہلے ہلکی بوند ا باندی ہوئی تھی۔ مگر اب مطلع صاف تھا۔ ہوا کے نرم نرم جھونکوں میں سرسراہٹ تھی، ٹھنکسی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر بادلوں کے سفید سفید ٹکڑے دوڑ رہے تھے۔ سردار شہ زور خان مزاری اور رحیم داد مسمان خانے کے وسیع محن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔

رحیم داد نے دلاور والا کی اراضی کا قضیہ چھیڑ دیا۔ وہ کسی قدر پریشان اور فکر مند نظر آ رہا تھا۔ لیکن سردار مزاری اس کی ذہنی پریشانی سے مطلق متاثر نہ ہوا۔ بے نیازی سے بولا۔ ”سین چوہدری، فکر نہ کر۔ چاکر نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ میں نے سوچ رکھا ہے آگے کیا کرنا ہوگا۔“

”تو نے کیا سوچا؟“ رحیم داد کے لہجے میں اضطراب تھا۔
”سرکش اور بھگڑا لورا اکوں کو بے دخل کر کے اپنے راہب لگانے ہوں گے۔ ان کو بے دخل نہ کیا گیا تو آگے بھی تنگ کرتے رہیں گے۔“

”بے دخل کرنے کی صورت میں تو بہت گڑبڑ ہوگی۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ ”پرانے مزارے ہیں، آسانی سے بے دخل نہیں ہوں گے۔“

”آسانی سے تو کوئی بھی راہب اور مزارع زمین نہیں چھوڑتا۔“ سردار مزاری کا لہجہ قدرے ٹیکھا ہو گیا۔ ”ان کو تو زبردستی بے دخل کرنا پڑتا ہے۔“

”پر یہ تو سوچ، دلاور والا تیری زمین داری سے دوری پر ہے۔“

”مجھے بھی پتہ ہے کہ دلاور والا میری زمین داری سے دوری پر ہے۔“ شہ زور خان مزاری نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”پر مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ دلاور والا تمہیں دریشک کے علاقے میں ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو میں تجھے متروکہ اراضی کی ادھر لائمنٹ نہ دلاتا۔“

”دریشکوں کے بارے میں چاکر بھی بتاتا تھا کہ زمین کا کب نہ لینے کے لیے ان سے مدد مل سکتی ہے۔“

”اس نے بالکل ٹھیک سوچا۔ صرف مدد نہیں، پوری پوری مدد مل سکتی ہے۔“ سردار مزاری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”عظمت اللہ دریشک ادھر کا سردار ہوتا ہے۔ وہ میرا پرانا یار ہے۔ زور آور اور با اثر بھی ہے۔ بہت وڈا زمین دار ہے۔ ہزاروں ایکڑ پر اس کی زمین داری پھیلی ہوئی ہے۔“

”تب تو سب سے پہلے اس سے مشورہ کرنا ہوگا۔“
”خالی مشورہ ہی نہیں، راہبوں کو بے دخل کرنے کے لیے اس سے کچھ بندے بھی لینے ہوں گے۔“

”پولیس کی مدد بھی لینی ہوگی۔“
”بالکل لینی ہوگی۔“ شہ زور خان مزاری نے اتفاق رائے کیا۔ ”پولیس کی مدد کے بغیر کام آسانی سے نہیں بنے گا۔ کوئی کارروائی کرنے سے پہلے پولیس کو اعتماد میں لینا ہوگا۔“
”یہ تو بہت ضروری ہے۔“

”بالکل ضروری ہے۔“ مزاری نے وضاحت کی۔ ”راہبوں اور مزارعوں کو بے دخل کرنے کے لیے پولیس کی مدد سے ان کے خلاف کئی طرح کے مکدے بنوانے ہوں گے۔ جو راہب زیادہ اکڑ

دکھائیں گے اور گڑبڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گے ان کو گرفتار کر کے تھانے میں بلوانا ہوگا۔“
”حوالات میں بند کر کے پٹائی کرانی ہوگی۔“ اس نے داد طلب نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”ان میں ڈر اور خوف پیدا کرنے اور دہشت بٹھانے کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ تو سمجھ گیا نا میری بات کا مطلب؟“

”سمجھ گیا، بالکل سمجھ گیا۔“ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”یہ بتا ادھر کے تھانے دار سے بھی تیری یاری ہے؟“

”پتہ نہیں، آج کل ادھر کون تھانے دار لگا ہے۔“ سردار مزاری نے رحیم داد کے سوال کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ ”تھانے دار کوئی بھی ہو، اس سے کیا اثر پڑتا ہے۔ عظمت اللہ دریشک کا تو یار ہی ہو گا۔ صرف تھانے دار ہی نہیں سارے ہی سرکاری افسروں سے اس کی یاری ہے۔ ویسے تو تحصیل راجن پور کے سرکاری افسروں سے اپنی بھی گہری یاری ہے۔“ وہ بے تکلفی سے کھل کر مسکرایا۔ ”سین چوہدری، یہ تو تجھے بھی اچھی طرح پتہ ہوگا۔ سرکاری افسروں سے یاری دوستی کے بغیر زمین داری نہیں چل سکتی۔“

رحیم داد نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی ذہنی الجھن کا اظہار کیا۔ ”تیری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے یہ معاملہ تو لمبا ہی کھینچے گا۔“

”لمبا بھی ہو سکتا ہے۔“ سردار مزاری نے صاف گوئی سے کام لیا۔
”پر میں تو اب زیادہ روز ادھر نہیں ٹھہر سکتا۔“ رحیم داد کے لہجے میں بے زاری اور اکتاہٹ نمایاں تھی۔ ”مجھے کوئلہ ہر کشن جانا ہے۔ اور جلد ہی جانا ہے۔ میں نے ادھر کتنے ہی ضروری کام نمنائے ہیں۔“

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔ ادھر آئے ہوئے تجھے کافی دن ہو گئے۔“ سردار مزاری نے نرم لہجے میں کہا۔ ”میں کوشش کروں گا تیرا کام جلد سے جلد ہو جائے۔“

”ایسا کر اپنے یار سردار عظمت اللہ دریشک کو مشورے کے لیے یہاں بلوالے۔“ رحیم داد نے تجویز پیش کی۔ ”ویسے ٹھیک تو یہی رہے گا کہ خود ہم کو اس کے پاس جانا چاہیے۔“
”تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔“ سردار شہ زور مزاری نے اس کی تجویز کی تائید کی۔ ”اب دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل ہی صبح اس کی طرف چلتے ہیں۔“

اس نے چاکر خان سرگانی کو طلب کیا۔ وہ آیا تو اسے اپنے پروگرام سے آگاہ کیا اور ضروری ہدایات دے کر رخصت کر دیا۔

صبح، سورج نکلنے سے قبل سردار شہ زور خان مزاری کی کار حویلی کے چھانک کے سامنے کھڑی تھی۔ ڈرائیور کار کے نزدیک ہی موجود تھا۔ چاکر خان سرگانی بھی ایک طرف کھڑا تھا۔

سردار مزاری چھانک سے نمودار ہوا۔ رحیم داد اس کے ہم راہ تھا۔ عزیز گھوٹال دونوں کے پیچھے پیچھے ادب سے سرجھکائے چل رہا تھا۔ چاکر خان نے بڑھ کر کار کی پچھلی نشست کا دروازہ کھولا۔ مزاری کار میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو اس نے اپنے ساتھ بٹھایا۔ عزیز گھوٹال کو آگے کی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چاکر خان سرگانی باہر ہی کھڑا رہا۔ وہ ان کے ہم راہ نہ گیا۔

ڈرائیور نے کار اشارت کی۔ آن کی آن میں آگے بڑھی اور گردوغبار کے بادل اڑاتی ہوئی کچے راستے پر تیزی سے دوڑنے لگی۔

دن ڈھلنے سے پہلے پہلے کار راجن پور پہنچ گئی۔



راجن پور میں سردار شہ زور خان مزاری کے قیام کو دو سہ روز تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ساتھ تھا۔ مزاری کو پروگرام کے مطابق جانا تو عظمت اللہ دریشک کے پاس تھا مگر راجن پور میں عطاء اللہ خان بزدار مل گیا۔ وہ اس کا پرانا ملنے والا تھا۔ اس نے اصرار کیا تو مزاری ٹھہر گیا۔

سہ پہر کو وہ رحیم داد کے ساتھ کار میں بیٹھ کر باہر نکلا۔ رحیم داد کو رائے بہادر بیہورام کی حویلی دکھائی۔ حویلی پرانی تھی، لیکن بہت عالیشان تھی۔ رحیم داد کو پسند بھی آئی۔ اس وقت تک کسٹوڈین کی تحویل میں تھی اور کسی کو الاٹ نہ ہوئی تھی۔ شہ زور مزاری نے رحیم داد کا عندیہ معلوم کیا تو اس نے حویلی کے الاٹمنٹ میں گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔

سردار مزاری کی بھی خواہش تھی کہ حویلی رحیم داد کو الاٹ ہو جائے۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں یہ حویلی دکھانے اسی لیے لایا تھا کہ تجھے پسند ہو تو اس کی الاٹمنٹ کے لیے کوشش کی جائے۔“ ”پر اس میں تو کئی مہاجر خاندان ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”کب نہ لینے کے لیے ان کو بھی بے دخل کرنا ہو گا۔“ اس کے لہجے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”دلاؤ والا کی اراضی کی طرح اس پر بھی جھگڑا کھڑا ہو گا۔“

”اگر دلاؤ والا کی زمین کا کب نہ مل سکتا ہے تو اس کا بھی مل جائے گا۔“ سردار مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ”ویسے میرا خیال ہے الاٹمنٹ کے لیے درخواست تو لگا ہی دیں چاہیے۔ آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ بول کیا کہتا ہے؟“

”جیسی تیری مرضی۔“ رحیم داد نے سردار مزاری کی تجویز سے اختلاف نہ کیا۔ ”الاٹمنٹ کی

سے سیکھا وہ پکری میں مکدات کی کارروائی کے دوران مجھے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ بعد میں بھی ان کے بارے میں بتاتا تھا۔ وہ بہت زبردست بلوچ سردار تھا۔ سرکاری عدالتیں تک اس کے فیصلے کو ماننی تھیں۔“

”فیصلے تو تیرے بھی کم زبردست نہیں ہوتے۔“ رحیم داد بدستور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

سردار شہ زور مزاری مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

شام کو وکیل سردار شہ زور مزاری کے پاس آیا۔ وہ ادھر تھا۔ چہرے مہرے سے سنجیدہ اور بردبار نظر آتا تھا۔ لباس اور وضع قطع سے استغنا اور بے نیازی جھلکتی تھی۔ وہ سونپی پت کاربنے والا تھا۔ تعلیم دہلی میں حاصل کی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑکی تو کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا اور مہاجرین گیا۔ کچھ عرصہ لاہور میں وکالت کی مگر جی نہیں۔ سونپی پت میں مکان کے علاوہ زرعی اراضی چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کا کلیم داخل کیا جو منظور ہو گیا۔ بھاگ دوڑ کی تو ضلع ڈیرہ غازی خاں کی تحصیل راجن پور میں زرعی اراضی اور ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ گزشتہ پانچ برس سے وہ وہیں مقیم تھا۔ زمین داری کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ وکالت بھی کرتا تھا۔

وکیل جب پہنچا تو سردار مزاری کے علاوہ رحیم داد اور عزیز گٹھوال بھی موجود تھے۔ سردار مزاری نے رحیم داد سے وکیل کا تعارف کرایا۔ دلاور والا کی اراضی کے بارے میں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وکیل نے تمام باتیں توجہ سے سنیں۔ الاٹمنٹ آڈر اور دوسری متعلقہ دستاویزات کا مطالعہ کیا۔

”راشد تو کس نتیجے پر پہنچا؟“ شہ زور مزاری نے وکیل کی رائے معلوم کرنا چاہی۔

”یہ تو جی آپ کو اچھی طرح علم ہے کہ الاٹمنٹ کی درخواست میں نے ہی تیار کی تھی۔ مجھے اس کے بارے میں پہلے ہی سے بہت کچھ معلوم ہے۔“ وکیل نے اظہار خیال کیا۔ ”کیس بہت مضبوط ہے۔ الاٹمنٹ بھی پکا ہے۔ رہ گیا زمین پر قبضہ حاصل کرنے کا مسئلہ تو یہ تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس میں عام طور پر جھگڑا کھڑا ہوتا ہے۔“

”جی جھگڑے کو نمٹانے کے لیے تو تجھ سے مشورہ کرنا ہے۔“ سردار مزاری نے وکیل سے کہا۔

”یہ بتا آگے کیا کارروائی کرنی ہے۔“

”آپ نے اپنے طور پر اس سلسلے میں کیا سوچا؟“

درخواست لگانے میں اپنا کیا جاتا ہے۔“

”میں شام کو اپنے وکیل راشد احمد انصاری کو بلاؤں گا۔“ سردار مزاری نے رحیم داد کو بتایا۔

”اس سے الاٹمنٹ کی درخواست تیار کروالوں گا۔ آگے کی کارروائی وکیل کے مشورے سے چاکر اور گٹھوال کرتے رہیں گے۔ تجھے الاٹمنٹ کے لیے ادھر ٹھہرنا نہیں پڑے گا۔“

”تیرا وکیل راجن پور ہی میں ہوتا ہے۔“

”ہاں وہ ادھر ہی ہوتا ہے۔ ویسے تو میرے اور بھی کئی وکیل ہیں۔ پر کوئی مکدمہ پیچیدہ ہو تو میری طرف سے راشد انصاری ہی پیروی کرتا ہے۔“ شہ زور خاں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”بہت ہشیار وکیل ہے تو اس سے مل کر خوش ہو گا۔ دلاور والا کی زمین کی الاٹمنٹ کی درخواست بھی اسی نے تیار کی تھی۔ الاٹمنٹ دلانے میں چاکر کی مدد بھی کی تھی۔“

”تب تو دلاور والا کی زمین کے جھگڑے کا بھی اس کو پتہ ہو گا۔“

”بالکل ہو گا۔ پر اس سلسلے میں میری اب تک وکیل سے کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔“

”شام کو تو وہ آ رہا ہے نا؟“

”ضرور آئے گا۔ دلاور والا کی زمین کے بارے میں اس سے مشورہ لیتا ہے۔“ شہ زور خاں نے رحیم داد کو بتایا۔ ”اس سے مشورہ لینے ہی کے لیے تو میں ادھر ٹھہر گیا۔ سوچا عظمت اللہ دریشک سے ملنے سے پہلے کوئی پہلو بھی پوری طرح سمجھ لینا چاہیے۔“

”ویسے تو بھی کسی وکیل سے کم کٹون نہیں جانتا۔“ رحیم داد نے سردار شہ زور مزاری کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے کہا۔ ویسے قانونی مہارت کے معاملے میں وہ مزاری سے مرعوب بھی تھا۔ ”تو روز ہی پکری لگتا ہے۔ ایسے الجھے ہوئے اور پے پیچیدہ مکدوں کے فیصلے کرتا ہے کہ کئی بار تو میں حیران رہ گیا۔“

”پر وکیل وکیل ہی ہوتا ہے۔“ شہ زور خاں مزاری نے انصاری کا مظاہرہ کیا۔ ”راشد نے دیوانی اور فوجداری ہر طرح کا قانون پڑھ رکھا ہے۔ بلکہ اکثر اپنی پکری کے مکدات کے بارے میں اس سے مشورہ بھی لیتا ہوں۔“

”جب سے تیرے ساتھ ٹھہرا ہوں“ میں نے تو کبھی راشد انصاری وکیل کو تیرے پاس مشورہ دینے کے لیے آتے نہیں دیکھا۔“

”میں اسے بہت کم مشورے کے لیے بلاتا ہوں۔ پچھلے دنوں اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“

شہ زور مزاری نے وضاحت کی۔ ”بچ پوچھ تو قانون کے بارے میں جو کچھ میں نے سیکھا۔ وہ اپنے پیچہ

”میرا تو یہ خیال ہے کہ سارے راکھوں کو فوری طور پر بے دخل کر دیا جائے۔“ شہ زور مزاری نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”وہ کب نہ دینے میں پہلے ہی تنگ کر رہے ہیں، آگے اور زیادہ کریں گے۔“

”راکھوں اور مزارعوں کو بے دخل کرنے کے تمام حربے اور طریقے آپ مجھ سے زیادہ بہتر طور پر جانتے ہیں۔ اب تک کتنے ہی مزارعوں کو بے دخل کر چکے ہیں۔ آپ کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں۔“ وکیل نے مسکرا کر شہ زور مزاری کی طرف دیکھا۔ ”جہاں تک اس تنازعے کے قانونی پہلو کا تعلق ہے تو یہ سیدھا سیدھا دیوانی کیس ہے۔ لیکن اسے فوجداری بنانا ہو گا۔ تب ہی کام بنے گا۔“

”وہ کیسے؟“ اس دفعہ رحیم داد بولا جواب تک خاموش بیٹھا تھا۔

”وہ اس طرح کے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۳۵ کے تحت عدالت سے زمین قرق کروائی جائے۔“ وکیل نے قانونی چارہ جوئی کا طریقہ کار کسی قدر وضاحت سے بتایا۔ ”اس میں زیادہ لمبا پکر بھی نہیں۔ تھانے میں صرف اس مضمون کی رپٹ درج کرانی ہو گی کہ زمین کے قبضے کے سلسلے میں چونکہ مزارعوں کے ساتھ تنازعہ ہے لہذا ان کی طرف سے نقص امن کا شدید خطرہ ہے۔ وہ آدہ فساد ہیں۔ پولیس کیس رجسٹر کرنے کے بعد چالان مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر دے گی۔“

”تب تو پولیس کے ساتھ ساتھ مجسٹریٹ کو بھی ملانا ہو گا۔ اس کی مٹھی بھی گرم کرنی ہو گی۔“

رحیم داد نے مداخلت کی۔

”چوہدری صاحب، یہ آپ کی درد سہی نہیں۔ اس کی آپ بالکل فکر نہ کریں۔“ اس نے مسکرا کر شہ زور مزاری کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس معاملے کو آپ مزاری صاحب پر چھوڑ دیں۔ ان کو اچھی طرح پتہ ہے کہ پولیس اور مجسٹریٹ سے کس طرح کام لیا جائے۔ کس طور ان کی مدد حاصل کی جائے۔“

”سین چوہدری، یہ تیرے سوچنے کی باتیں نہیں ہیں۔ راشد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تجھے نہ تھانے جانے کی ضرورت ہے نہ عدالت۔“ سردار مزاری نے گردن اکڑا کر رعوت سے مونچھ پر ہاتھ پھیرا۔ ”تھانیدار اور مجسٹریٹ خود تیرے پاس پہنچ جائیں گے۔“ وہ وکیل کی جانب متوجہ ہوا۔

”راشد، یہ بتا آگے کیا کارروائی کرنی ہو گی؟“

”کارروائی تو مجسٹریٹ کو کرنی ہو گی۔“ وکیل کھل کر مسکرایا۔ ”مزاری صاحب، میں اس سلسلے میں کیا بتا سکتا ہوں۔ آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے کہ قانونی چارہ جوئی کے ذریعے مزارعوں اور

ہوں کو کس طرح بے دخل کیا جاتا ہے۔ آپ کو تو اس کے علاوہ بھی دوسرے تمام حربوں اور یقینوں کا اچھی طرح پتہ ہے۔“

”میں چاہتا ہوں چوہدری کو بھی پتہ چل جائے آگے کیا کیا کرنا ہو گا۔“

”آپ کو تو اچھی طرح علم ہے کہ مجسٹریٹ ایسے مقدمات میں عام طور پر مزارعے یا راکب کی غیر ضری میں زمین قرق کرنے کا حکم جاری کرتا ہے۔“ وکیل نے قانونی چارہ جوئی کی مزید تفصیل کی۔ ”اس حکم کے ذریعے مزارعے کو زمین کے نزدیک جانے، مل چلانے، پانی لگانے اور فصل نئے سے روک دیا جاتا ہے۔“

”ایسی صورت میں تو مکدمہ مبینوں کیا برسوں چل سکتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ ”میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”آپ نے جی بالکل ٹھیک سوچا۔“ وکیل نے اس کے خیال کی تائید کی۔ ”سچ پوچھئے تو ہونا بھی یہی چاہیے۔ بلکہ آپ کی طرف سے تو یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مقدمہ زیادہ سے زیادہ طول پکڑتا جائے۔“

”وہ کیوں؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

”وہ اس لیے کہ عدالت میں روز روز کی پیشیوں سے مزارع پریشان ہو جاتا ہے۔ مقدمہ بازی کرنا ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ قدم قدم پر روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مزارعے کو اس کے لیے قرض ادھار لینا پڑتا ہے۔ مقدمہ جس قدر طول پکڑتا جاتا ہے، قرض کا بوجھ اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔“ وکیل کے ہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔ وہ نہایت اعتماد کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ ”ایک طرف تو وہ مالی پریشانی کا شکار ہوتا ہے دوسری طرف دباؤ ڈالنے کی خاطر قرق کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کے ہمارے پولیس کی جانب سے طرح طرح کے چالان کئے جاتے ہیں۔ تھانے میں بلا کر دھمکیاں دی جاتی ہیں۔ آخر وہ اتنا تنگ آ جاتا ہے کہ سمجھوتہ کرنے کے لیے منت ساجت کرتا ہے۔ زمین دار کے پیروں پر گڑی ڈال دیتا ہے اور جب اس سے بھی کام نہیں چلتا تو بدحواس ہو کر صرف زمین ہی نہیں، اپنی آبائی بستی تک چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔“

”سین چوہدری، یہ تو تجھے بھی پتہ ہے کہ لمبی مکدمے بازی کے لیے راکب کے پاس نہ روپیہ ہوتا ہے نہ وکت۔ وہ تو کچھ ہی مدت بعد حوصلہ چھوڑ بیٹھتا ہے۔“ سردار مزاری نے وکیل کی تائید کرتے ہوئے مزید وضاحت کی۔ ”تب ہی تو مالک کی جانب سے پیش کار کو رشوت دے کر پیشیاں بڑھائی جاتی ہیں۔ لمبی لمبی تاریخیں لی جاتی ہیں۔“

”میں تیار اور وکیل کا مطلب بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا برملا اظہار کیا۔
”پر میں تو اتنی مدت تک ادھر ٹھہر نہیں سکتا۔ یہ تو بہت لمبا پتھر ہے۔ میں نے کوئلہ ہر کس واپس
جا کر ادھر کی زمین داری دیکھنی ہے۔ کئی ضروری کام ہیں جن کو نمٹانا ہے۔“

”چوہدری نور الہی صاحب‘ آپ کو ادھر ٹھہرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔“ وکیل نے اس کی
مجبوری محسوس کرتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ”آپ نے اگر مجھے اپنا وکیل مقرر کیا تو مقدمے کی
بتیہوں سے تو میں نمٹ لوں گا۔ ویسے مناسب تو یہ ہو گا کہ آپ مختار نامہ دے کر مقدمے کی
پیروی اور دوسرے ضروری کاموں کے لیے کسی کو اپنا مختار بنادیں۔“

”سینس چوہدری یہ تو تجھے کرنا ہی پڑے گا۔“ شہ زور مزاری نے وکیل کی تجویز سے اتفاق کرتے
ہوئے رحیم داد سے کہا۔ ”گھوٹال کو تو نے ملازم تو رکھ ہی لیا ہے۔ اسی کو اپنا مختار بنادے۔ تیری غیر
حاضری میں آگے تو اسی نے کام چلانا ہو گا۔“

”تو کہتا ہے تو اسے مختار نامہ دے دوں گا۔“ رحیم داد نے بھی اختلاف رائے نہ کیا۔ مگر ساتھ
ہی یہ شرط بھی عائد کی۔ ”پرساری ذمہ داری تجھے ہی لینی ہوگی۔ عزیز گھوٹال جو بھی کارروائی کرے
گا تیری اجازت اور مشورے ہی سے کرے گا۔“

”اس بارے میں تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“ مزاری نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔
”تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی ہو گا۔“

وکیل نے جانے کے لیے اٹھنا چاہا تو سردار مزاری نے اسے ٹوکا۔ ”سینس راشد‘ تجھے دو ضروری
کام کرنے ہوں گے۔ ایک تو تجھے گھوٹال کے لیے مختار نامہ تیار کرنا ہو گا اور دوسرے یہ کہ رائے
بہادر بیتو رام کی حویلی الاٹ کرانے کے لیے چوہدری کی طرف سے درخواست بھی تیار کرنی ہو
گی۔“

”مگر اس حویلی کے معاملے میں تو بہت جھگڑے چل رہے ہیں۔“
”چلنے دے۔“ شہ زور مزاری نے وکیل سے کہا۔ ”درخواست لگانے میں کیا جاتا ہے۔ کوشش
کر کے دیکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے الاٹمنٹ مل جائے۔ کبہ لینے کے بارے میں بعد میں سوچ لیں
گے۔“ اس نے مسکرا کر وکیل کی جانب دیکھا۔ ”اپنا وکالت نامہ بھی لیتا آنا۔ چوہدری سے دستخط
کرا لیتا۔ مکدمہ چلانا پڑا تو پیروی تجھے ہی کرنی ہوگی۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”پر یہ سارے کام
جلد ہی ہونے چاہئیں۔“

”میں ساری دستاویزات کل دس بجے تک تیار کر کے لے آؤں گا۔“ وکیل نے سردار مزاری کو

اطمینان دلایا۔ صبح آنے کا وعدہ کیا اور اٹھ کر چلا گیا۔

دوسرے روز راشد احمد انصاری وکیل دقت مقررہ پر پہنچ گیا۔ مگر وہ مطلوبہ دستاویزات تیار نہیں
کر سکا تھا۔ اس نے معذرت کی تو شہ زور خان مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”فکر کی کوئی گالہ نہیں،
بعد میں تیار کر لیتا۔ میں نے تو آج عظمت اللہ دریشک کے پاس جانا ہے۔ اس سے بھی اس سلسلے
میں صلاح مشورہ کرنا ہے۔ تجھے ادھر ہی بلا لوں گا۔“
وکیل نے وکالت نامے پر رحیم داد سے دستخط کرائے اور مطمئن ہو کر چلا گیا۔



سردار شہ زور مزاری نے راجن پور کو خیر یاد کہا۔ رحیم داد اور عزیز گھوٹال کے ساتھ کار میں
بیٹھ کر فاضل پور کی جانب روانہ ہوا۔ سفر زیادہ لمبا نہ تھا۔ لیکن دھوپ کی تمازت بڑھ گئی تھی۔ لو
بھی چل رہی تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا راہ گیر نظر آتے تھے۔ کار فرائے بھرتی
سڑک پر تیزی سے دوڑتی رہی۔

سردار دریشک کا گاؤں، کوٹ اکبر، سڑک سے دور تھا۔ مگر خاصا بڑا گاؤں تھا۔ فاضل پور سے
نزدیک بھی تھا۔ کوٹ اکبر جانے کے لیے ایک کچی سڑک فاضل پور سے جاتی تھی۔ کار فاضل پور
پہنچ کر اسی کچی سڑک پر مڑ گئی۔ کوٹ اکبر میں داخل ہوئی اور سردار دریشک کی حویلی کے سامنے جا
کر ٹھہر گئی۔

عظمت اللہ دریشک اس وقت اپنی حویلی میں موجود تھا۔ سردار شہ زور مزاری کے آنے کی
اطلاع ملی تو ہنستا مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ نہایت گرم جوشی سے شہ زور مزاری سے بغل گیر ہوا۔
مزاری نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ وہ اس سے بھی گلے ملا۔ خندہ پیشانی سے پیش آیا۔

اس نے بلوچوں کے روایتی انداز میں حال احوال پوچھنے کے بعد سوال کیا۔ ”سینس شہ زور‘ یہ بتا
تو اچانک کیسے آگیا؟ میں تو دوپہر کی روٹی کھانے کے بعد شہر جانے والا تھا۔ اچھا ہوا تو پہلے ہی آگیا۔“
اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”آرام سے بیٹھ کر بات ہوگی۔“ شہ زور خان مزاری نے چہرے سے پیمینہ پونچھتے ہوئے کہا۔
”یہاں تو سخت گرمی ہے۔ اندر چل۔“

سب مہمان خانے میں پہنچے۔ اطمینان سے بیٹھے تو سردار دریشک نے اپنا سوال دہرایا۔ ”اب بتا
کیسے آنا ہوا؟“

شہ زور مزاری نے اپنی آمد کی غایت بیان کی۔ عظمت اللہ دریشک نے پوری توجہ سے اس کی

ایک ایک بات سنی۔ اس کے چہرے پر رفتہ رفتہ شجیدگی طاری ہوتی گئی۔ کچھ دیر وہ سر جھکائے سوچتا رہا۔ پھر گویا ہوا۔ ”مجھے دلاور والا کی اس مٹرو کہ اراضی کے بارے میں ٹھیک طرح پتہ ہے۔ یہ تو جھگڑے کی اراضی ہے۔ پہلے بھی کئی مہاجرین کو الاٹ ہوئی۔ پر کب نہ کسی کو نہ مل سکا۔“ اس نے مڑ کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تو نے چوہدری کو کہاں پھنسا دیا؟ الاٹمنٹ لینے سے پہلے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔“ اس کے لہجے میں شکوہ کرنے کا انداز تھا۔

”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔“ سردار مزاری نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”اب تو الاٹمنٹ لے لی ہے۔ اور زمین کا کب نہ بھی لیتا ہے۔“ اس نے اپنی بات پر زور دیا۔ ”یہ بتاؤ اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتا ہے؟“

”جو مدد تو چاہے گا کروں گا۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ ”جان مانگے گا تو تیرے لیے جان بھی حاضر ہے۔ تیری مدد سے تو تمہیں دار بھی انکار نہیں کر سکتا۔ آپس کا پرانا اتحاد اور سنگت جو ٹھہرا۔“ اس نے ہلکا سا تھقہ لگایا۔ ”ویسے تو میرا یار بھی ہے۔ تیری مدد نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”وہ تو مجھے پتہ تھا کہ تو پوری پوری مدد کرے گا۔ ورنہ میں چوہدری کے ساتھ تیرے پاس آتا ہی کیوں۔“ سردار مزاری نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ بتا آگے کیا کرتا ہے؟“

عظمت اللہ دریشک نے اپنے کاردار غوث بخش لاشاری کو بلایا۔ وہ حاضر ہوا تو اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھکمانہ لہجے میں بولا۔ ”غوث، میں نے انکار نہیں سنا۔ چوہدری کو کب نہ ملنا چاہیے۔“ اس نے چہرے پر رعب اور دبدبہ طاری کیا۔ ”یہ کام کرنا ہے اور ہر صورت میں کرنا ہے۔“ عظمت اللہ نے مڑ کر سردار شہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ”تجھے ٹھیک طرح پتہ ہے شہ زور سے میری کتنی گہری یاری ہے۔ یہ خود چل کر میرے پاس مدد کے لیے آیا ہے۔ اس کی مدد تو کرنی ہی کرنی ہے۔“

”سین سردار! توں جو حکم کرے گا ویسا ہی ہو گا۔“ غوث بخش لاشاری نے نہایت مستعدی سے سردار عظمت اللہ کو یقین دلایا۔

”یہ بتا، آگے کیا کارروائی کرنی ہوگی؟“ سردار دریشک نے سوال کیا۔

”دلاور والا کے کئی چھوٹے زمین دار اور راہک میرے جاننے والے ہیں۔ ان سے ملوں گا۔ پوچھ تاچھ کروں گا۔ یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا اس معاملے میں وہ کس انداز سے سوچ رہے ہیں۔“ غوث بخش لاشاری نے جواب دیا۔ ”جب تک پورے طور پر حالات کا پتہ نہ چلے گا تب

میں کوئی کارروائی کیسے کی جاسکتی ہے۔ حالات کو سامنے رکھ کر آگے کے بارے میں سوچنا ہو گا۔“ ”ادھر کی زمیں داری کے معاملات کی دیکھ بھال کے لیے چوہدری نے اسے لگایا ہے۔“ شہ زور مزاری نے گھوٹال کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”اس کا نام عزیز گھوٹال ہے۔ یہ دلاور والا گیا بھی تھا۔ غوث تو اس کی بھی سن لے۔ تجھے حالات کو سمجھنے میں اس سے بھی مدد ملے گی۔“

عزیز گھوٹال نے بتایا۔ ”سین، تجھے یہ تو پتہ ہی ہے کہ ادھر چوہدری کو اڑھائی سو ایکڑ زرعی اراضی الاٹ ہوئی ہے جس پر ۱۸ راہک کاشت کرتے ہیں۔ سب ہی پرانے راہک ہیں۔ ان میں سے اٹھ ایسے ہیں جنہوں نے ہندو مالک کے ہندوستان جانے کے بعد زمین پر ناجائز کب نہ کر رکھا ہے۔ دس کے پاس مالکانہ حکوک ہوتے تھے۔ پر اب نہیں رہے۔“

”وہ کس طرح؟“ غوث بخش لاشاری نے عزیز گھوٹال سے کیرد کر پوچھا۔

”صدر دفتر کے حکم پر ان کے انفکلات خارج ہو کر چوہدری کے نام ہو چکے ہیں۔“ گھوٹال نے مطلع کیا۔ ”پڑاری نے رجسٹر خسرہ گرداوری میں ان کا اندراج بھی کر دیا ہے۔“

”تب تو کام آسانی سے بن سکتا ہے۔“ عظمت اللہ دریشک نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔ ”غوث تو ایسا کر۔ پہلے ان اٹھ راہکوں سے ملنے کی کوشش کر، جن کے پاس کبھی مالکانہ حکوک نہیں رہے۔ ان کو اطمینان دلا کہ جیسے وہ پچھلے زمین دار کے راہک تھے ویسے ہی چوہدری کے رہیں گے۔ ان کو بالکل ٹھیک نہیں کیا جائے گا۔ آرام سے کاشت کرتے رہیں۔“ اس نے اپنی تجویز کی کسی قدر وضاحت کی۔ ”ٹھیک سے کوشش کی جائے تو ان کو اپنے ساتھ ملایا جاسکتا ہے۔ دوسرے راہک تو انفکلات منسوخ ہونے کی وجہ سے سخت زراعت ہوں گے۔ وہ تو جھگڑا ڈالیں گے۔ ان کے بارے میں آگے سوچا جائے گا کہ کس طور نمٹ جائے۔“

”سین سردار! وہ سب ایک ہیں۔“ عزیز گھوٹال نے مداعت کی۔ ”ان کا آپس میں بہت سنگت اور اتحاد ہے۔“

”سب سے پہلے اسی سنگت کو توڑنا ہو گا۔ تب ہی تو کام بنے گا۔“ عظمت اللہ دریشک نے گھوٹال سے کہا۔ ”یہ بہت ضروری ہے۔“ وہ غوث بخش لاشاری کی جانب متوجہ ہوا۔ ”غوث تو یہ کوشش کر کہ ان میں کسی نہ کسی طرح پھوٹ پڑ جائے۔“ اس نے سردار مزاری کی طرف مسکرا کر داد طلب نظروں سے دیکھا۔ ”شہ زور! ایسا کرنا ٹھیک رہے گا؟“

”تو نے بالکل ٹھیک سوچا۔“ شہ زور مزاری نے اس کی تجویز سے پورا پورا اتفاق کیا۔ ”اٹھ راہک ٹوٹ کر اپنے ساتھ آگئے تو دوسرے کمزور پڑ جائیں گے۔“

غوث بخش لاشاری نے بھی سردار دریشک کی تائید کی۔ ”سین سردار“ جیسا تو نے سوچا ہے ویسے ہی کرنا ہو گا۔“

”پر تو خود دل اور دلانہ جانا۔“ عزیز گٹھوال نے غوث بخش کو خبردار کیا۔

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے آگے کیا کرنا ہے۔“ غوث بخش لاشاری نے عزیز گٹھوال کی تنبیہ کو اہمیت نہ دی۔

”غوث اب توجا۔“ سردار دریشک نے حکیمانہ انداز میں کہا۔ ”جیسا میں نے کہا ہے تو نے دیا ہی کرنا ہے۔“

غوث بخش لاشاری نے سردار عظمت اللہ دریشک کو یقین دلایا کہ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرے گا۔ اور اس سلسلے میں جو کوشش کرے گا اس سے جلد ہی مطلع کرے گا۔



غوث بخش لاشاری خلاف توقع شام کو نہ آیا۔ دوسرے روز سہ پہر کو آیا۔ سردار دریشک اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ شہ زور مزاری اور رحیم داد بھی بیٹھے تھے۔ عزیز گٹھوال بھی موجود تھا۔ وہ تینوں سے ذرا ہٹ کر گردن جھکا کر ادب سے بیٹھا تھا۔

سردار دریشک نے غور کیا کہ غوث بخش لاشاری کا چہرہ اترا ہوا ہے۔ وہ بڑھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے جیبتی ہوئی نگاہوں سے غوث بخش کی جانب دیکھا، دریافت کیا۔ ”غوث تو پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔ لگتا ہے کام بنا نہیں۔“

”ہا سین، معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔ آسانی سے کام نہیں بنے گا۔“ غوث بخش نے سمجھے ہوئے لہجے میں مطلع کیا۔

”تو راکھوں سے ملا تھا۔ کیا کہتے تھے وہ؟“

”سین سردار“ وہ تو بہت لمبی لمبی باتیں کرتے ہیں۔ ”غوث بخش لاشاری نے عظمت اللہ دریشک کو بتایا۔ ”میں نے ان کو بہت سمجھایا۔ اطمینان بھی دلایا۔ پر وہ کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔“

”مجھے پہلے ہی ملوم تھا کہ وہ کسی طرح راضی باضی نہیں ہوں گے۔“ عزیز گٹھوال نے اپنی ناک کے بارے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”میں بھی ان سے ملا تھا۔ ہر طرح سمجھایا بجھایا۔ اس نے مزکرشہ زور مزاری کی جانب دیکھا۔ ”سین سردار“ تجھے پتہ ہے، میں نے تجھے اور چوہدری کو یہی بتایا تھا؟“

”تو چپ کر۔“ عظمت اللہ دریشک نے غصے سے گٹھوال کو ڈانٹا۔ دریشک کو اس کی مداخلت

نہایت شاق گزری۔ اس نے غوث بخش کو مخاطب کیا۔ ”غوث تو بتا۔ کیا کہتے تھے وہ؟“

”سین“ تیری ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے میں سب سے پہلے اٹھ راکھوں کے وڈوں اور وڈیروں سے ملا۔ آرام سے ان کو سمجھایا۔ پر وہ اپنی ہی کہتے رہے۔ میری کسی گالہ کو مان نے اور سمجھنے کو تیار ہی نہ ہوئے۔“

”وہ اس طرح کیوں اڑے ہوئے ہیں؟“ عظمت اللہ دریشک نے غوث بخش لاشاری سے سوال کیا۔

”ان کی تو سین، دلیل ہی نرالی ہے۔“

”کیا دلیل ہے ان کی؟ میں بھی تو سنوں۔“ سردار دریشک نے غوث بخش لاشاری سے سوال کیا۔

اس کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھا۔

”سین“ میں ان کے ایک نمائندے کو اپنے ساتھ لایا ہوں۔ ”غوث بخش نے مطلع کیا۔ ”وہ تجھے اپنی دلیل خود ہی بتا دے گا۔“

”مگر ہر ہے وہ؟“ دریشک نے چونک کر پوچھا۔

”خوبی کے باہر بیٹھا ہے۔“ غوث بخش لاشاری نے بتایا۔ ”تیری اجازت ہو تو میں اسے بلا لوں۔“

”ضرور بلا۔“ دریشک نے اجازت دے دی۔ ”اے پیش کر۔ تو نے یہ ٹھیک کیا کہ اسے اپنے ساتھ ہی لے آیا۔ اس سے صاف صاف گالہ ہوگی۔“

غوث بخش لاشاری فوراً خوبی سے باہر گیا۔ واپس آیا تو ایک ادھیڑ مزارع اس کے ہم راہ تھا۔ وہ لاشاری کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس کا جسم دبلا پتلا تھا۔ مگر مضبوط اور گٹھا ہوا۔ قد ٹکٹا ہوا تھا۔ گردن قدرے جھکی ہوئی تھی۔ سر پر ملنگی پگڑی تھی۔ بال کھجڑی تھے۔ لباس بھی میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ بار بار پگڑی کے شملے سے چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ بدن سے بھی پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔

عظمت اللہ دریشک کے روبرو پہنچتے ہی اس نے حسب دستور دعائیہ کلمات ادا کیے۔ ”سین سردار، سکھی صحت ہو دیں، بالیں پھیں، یاریں دوستیں، سب کو خیر سلا ہو دیں۔ مال جان، مال ڈھکی کون خیر ہو دیں۔ رب راضی ہوں۔“

عظمت اللہ نے پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

”نصیر بھڑ۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”راہوں نے تجھے اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا ہے؟“

”ہاں سیں!“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”مجھے کسی نے نمیندا شیندا نہیں بنایا۔ نہ مجھے کسی نے بھیجا۔“ اس نے مڑ کر غوث بخش لاشاری کی جانب دیکھا۔ ”سیں نے بلایا۔ میں چلا آیا۔“

”تو اسے جانتا ہے؟“ عظمت نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ تیرا زمین دار چوہدری نور الہی ہے۔ آگے تو نے اسے راہ کی یا بھائی دینی ہوگی۔ اپنا زمین دار ماننا ہوگا۔ پوری پوری عزت دینی ہوگی۔“

نصیر بھڑ نے نظریں اٹھا کر رحیم داد کو دیکھا۔ مگر خاموش کھڑا رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اس کا سکڑا ہوا چہرہ چلچلاتی دھوپ سے جھلسا ہوا تھا جس پر اس وقت گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

”تو نے میری گالہ کا جواب نہیں دیا؟“ سردار دریشک نے قدرے بلند آواز سے پوچھا۔

”سیں سردار، تیرے کاردار نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔“ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”پہلے دیکھا نہیں تھا، اب دیکھ لیا۔“

”یہ میری گالہ کا جواب نہیں ہے۔“ عظمت اللہ دریشک کا لہجہ ٹیکھا تھا۔

”سیں سردار، میں نے جو جواب دینا ہے، تیرے کاردار کو پتہ ہے۔“ اس نے مڑ کر غوث بخش لاشاری پر نظر ڈالی۔ ”اس نے تو تجھے سب کچھ بتا ہی دیا ہوگا۔ میں نے اب کیا کہا۔“

”یہ کہتا تھا تو چوہدری کو اپنا زمین دار ماننے کو تیار نہیں۔“

”سیں، میں ماننے نہ ماننے والا کون ہوتا ہوں۔ میں اکیلا تو نہیں ہوں۔“ اس نے نہایت اعتماد سے جواب دیا۔ ”اور بھی کئی بندے ہیں۔“

”وہ چوہدری کو زمین دار اور اپنے تئیں راہک ماننے کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟“ دریشک نے استفسار کیا۔

”سیں، پہلے وہ راہک یا مزارعے ہوتے تھے اب نہیں رہے۔“

”زمین دار بن گئے ہیں وہ؟“ سردار دریشک کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”اب نہیں بنے۔ پچھلے کئی سال سے زمین دار ہیں۔“ نصیر بھڑ نے بلا جھجک جواب دیا۔

”کیسے بن گئے زمین دار؟ کس نے ان کو زمین دار بنایا؟“ سردار دریشک کے لہجے میں استعجاب تھا۔ شہ زور مزاری اور رحیم داد کے چہروں سے بھی حیرت جھلک رہی تھی۔ وہ نظریں اٹھائے

نصیر بھڑ کو دیکھ رہے تھے جو نہایت سکون سے ان کے رویہ کو کھڑا تھا۔

”سیں سردار، تو نے ٹھیک طرح پتہ ہے۔ جب پاکستان بننے جا رہا تھا تب مسلم لیگی لیڈر ہر طرف گھومتے پھرتے تھے۔ جلے کرتے تھے۔ جلوس نکالتے تھے۔ تجھے یاد ہے نا؟“ نصیر بھڑ نے سردار دریشک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

”مجھے یاد ہے، بالکل یاد ہے۔“ سردار عظمت اللہ دریشک نے اعتراف کیا۔ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”صاف صاف گالہ کر۔ تو کتنا کیا چاہتا ہے؟“

”سیں، انھوں نے چیخ چیخ کر اور بار بار کہا تھا۔ مسلم لیگ کے لیے الیکشن میں پرچی ڈالو تاکہ پاکستان بن جائے۔ اور جب پاکستان بن جائے گا تو زمین وڈے زمین داروں اور بگیر داروں سے چین کر کسانوں اور راہکوں کو دے دی جائے گی۔ جس زمین پر بل چلاتے ہیں، وہ ان کی ہو جائے گی۔ وہ مزارعے اور راہک نہیں رہیں گے زمین دار بن جائیں گے۔“ نصیر بھڑ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ ”تب ہی تو سیں، سارے راہکوں نے مسلم لیگ کے لیے بکسوں میں پرچیاں ڈالیں۔ اور پاکستان بن گیا۔“

”اور تم نے زمین پر کبضہ کر لیا اور زمین دار بن گئے۔“ سردار دریشک نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”مڑ کر سردار مزاری کی جانب دیکھا۔ ”شہ زور تو اس کی گالہ سن رہا ہے۔“

شہ زور مزاری تو خاموش رہا مگر نصیر بھڑ خاموش نہ رہا۔ اس نے نہایت اطمینان سے سردار عظمت اللہ دریشک سے کہا۔ ”سیں سردار، ہم نے کسی کی زمین نہیں جھپٹی۔ جو زمین میرے پاس ہے، اس پر میں راہک کے طور پر برسوں مل چلا تا رہا۔ میرا بیٹا بھی چلا تا رہا۔ اس کا بیٹا بھی چلا تا رہا۔ یہ زمین پہلے ایک ہندو زمین دار کی ہوتی تھی۔ وہ بہت وڈا زمین دار تھا۔ اس کے پاس ہزاروں کلا زمین ہوتی تھی۔ پاکستان بنا تو وہ بھاگ کر ہندوستان چلا گیا۔ اس کی زمین کا کوئی مالک نہ رہا۔“

”جب کوئی مالک نہ رہا تو تم نے اس کی زمین دہائی اور زمین دار بن گئے۔“ سردار عظمت اللہ دریشک نے نصیر بھڑ کو جھپٹی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ ”تم سب نے یہ نہیں سوچا۔ ایسے بھلا کوئی زمین دار بن سکتا ہے۔ کون بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ لوٹ تو نہیں لگی ہے کہ جس کا بیٹا چاہا زمین پر کبضہ کر لیا اور راہک سے مالک بن بیٹھا۔“

”سیں، یہ اکیلے میرے سوچنے کی گالہ نہیں۔ سب اسی طرح سوچتے ہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”نہ وہ کسی اور کو زمین دار ماننے کو راضی ہیں نہ راہکی یا بھائی دینے کو۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری سے پہلے بھی کئی مہاجروں نے اس زمین کی الاٹمنٹ لی پر

کبضہ کسی کو نہ ملا۔ بہت جھگڑا ڈالا پر ہاتھ کچھ نہ آیا۔ جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے۔“ اس دفعہ اس نے براہ راست رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”سین چوہدری! توں دڈا زمیں دار ہے۔ سنا ہے تیرے پاس پہلے بھی بہت زمیں ہے۔“ اس کے لہجے میں التجا تھی۔ ”تجھے پتہ نہیں ہم سب غریبی طہی میں کسی نہ کسی طرح گزر بسر کر رہے ہیں۔ توں ہم کو کیوں تنگ کرنا چاہتا ہے؟“

”چوہدری کسی کو تنگ کرنا نہیں چاہتا۔“ دریشک نے رحیم داد کی وکالت کی۔ ”چوہدری تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ تم پہلے کی طرح محنت کرو۔ فصل پیدا کرو۔ اپنی راکھی لو۔ بٹائی میں زمین دار کے طور پر اس کا جو حصہ بنتا ہوا ہے دو۔“

”سین سردار! برانہ منانا۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عاجزی کا مظاہرہ کیا ”سین! توں جو کچھ چاہتا ہے وہ نہیں ہو گا۔ کوئی اسے نہیں مانے گا۔“

سردار عفت اللہ دریشک کا چہرہ تھمتانے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ بے زاری سے بولا۔ ”نصیرے! میں نے تیری بکواس اور نہیں سنی۔ اب تو جا۔“ اس کا لہجہ اچانک درشت ہو گیا۔ ”پنے یاروں اور سنگتیوں سے کہہ دینا، چوہدری دوسرے مساجروں کی طرح ادھر اکیلا نہیں ہے۔ وہ سردار شہ زور خان مزاری کا یار ہے اور میرا بھی۔“ اس نے غصے سے پھڑپھڑاتی ہوئی اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”آگے کے لیے وہ ٹھیک طرح سوچ رکھیں۔ زمین داری کا خناس اپنے دباغ سے نکال دیں۔“ یہ سیدھی سادی دھمکی تھی۔

نصیر بوہڑ نے اس کے غصے سے مرعوب ہوا نہ دھمکی سے۔ اس نے گردن اٹھا کر سردار عفت اللہ دریشک کی جانب دیکھا اور اطمینان بخش لہجے میں گویا ہوا۔ ”سین سردار! اپنی امان اللہ۔“ وہ مڑا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چلا گیا۔

سردار عفت اللہ دریشک کی تیوری پر بل پڑے تھے۔ آنکھوں سے جھنجھلاہٹ اور کدورت جھلک رہی تھی۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر شخص خاموش تھا اور جھنجھلایا ہوا نظر آتا تھا۔ نصیر بوہڑ کی صاف اور کھری باتوں نے ان کے ذہنوں میں کھلبلی برپا کر دی تھی۔

کچھ دیر بعد شہ زور مزاری کی آواز ابھری۔ اس نے غوث بخش لاشاری کو مخاطب کیا۔ ”نصیر کی باتوں سے پتہ چلتا ہے وہ راکب جن کے انفکالات منسوخ ہو گئے ہیں زیادہ ہی رولا ڈالیں گے۔ ان کے بارے میں تو نے کیا پتہ لگایا؟“

”سین وہ تو معاملے کو عدالت میں لے جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا ایک وکیل بھی کھڑا کر دیا ہے۔“ غوث بخش لاشاری نے بتایا۔ ”سنا ہے صدر دفتر کے حکم کے خلاف وہ اپیل

دائر کرنے والے ہیں۔“

”ابھی انھوں نے اپیل دائر تو نہیں کی۔“ مزاری نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”جہاں تک مجھے پتہ ہے، ابھی تک نہیں کی۔“ غوث بخش نے جواب دیا۔

”تب تو آگے کی پیش بندی کے لیے فوری طور پر قانونی کارروائی کرنی ہوگی۔“ مزاری نے دریشک کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”عفت! تیرا کیا خیال ہے؟“

”جیسی تیری مرضی۔“ اس نے بے نیازی سے کہا۔ ”ویسے میں تجھے یہ بتا دوں کہ یہ جھگڑا قانونی کارروائیوں سے طے ہونے کا نہیں۔ اسے تو زور آزمائی سے طے کرنا ہو گا۔“

”مجھے بھی پتہ ہے، ہو گا تو ایسے ہی۔ پر قانونی طور پر بھی اپنی پوزیشن زیادہ مضبوط کرنی ہوگی۔ میرے وکیل نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔“ شہ زور مزاری نے عفت اللہ دریشک کو بتایا۔ ”ایسا کرتے ہیں، وکیل کو ادھر ہی بلا لیتے ہیں۔“

”ادھر بلائے کی کیا ضرورت ہے۔“ دریشک نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ ”درخواستیں تو راجن پور ہی میں لگانی ہوں گی۔ وکیل بھی وہیں طے گا۔ فوری کارروائی کرنی ہے تو کل ہی راجن پور پہنچ جانا چاہیے۔“

سردار شہ زور مزاری نے اس کی تجویز قبول کر لی۔ رحیم داد نے بھی تائید کی۔



سردار شہ زور مزاری اور سردار عفت اللہ دریشک کے ہم راہ رحیم داد، عزیز گھوٹال اور غوث بخش لاشاری راجن پور پہنچے۔ راشد احمد انصاری وکیل سے ملے۔ اس نے ضروری دستاویزات تیار کر لی تھیں۔ ان میں عزیز گھوٹال کے نام رحیم داد کا مختار نامہ تھا۔ دفعہ ۱۳۵ کے تحت مزارعوں کے خلاف چارہ جوئی کی درخواست تھی۔ اور دوسری رائے ہمارے دستورام کی حویلی کے الاٹمنٹ کے لیے تھی۔

رحیم داد نے مختار نامے اور دونوں درخواستوں پر دستخط کر دیے تو وکیل نے مشورہ دیا۔ ”ابھی ضابطے کی کارروائی مکمل نہیں ہوئی۔“

”وہ کیسے مکمل کرنی ہوگی؟“ سردار عفت اللہ خان دریشک نے وکیل سے دریافت کیا۔

”دریشک صاحب، پہلے مقدمہ کی نوعیت سمجھ لی جائے تو بہتر ہے۔“ وکیل نے عفت اللہ دریشک سے کہا۔ ”اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سب ہی راکب یا مزارع چھپر بند ہیں یعنی ان کا حق مزارعت قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ بعد میں جب ہندو زمین دار چلا گیا تو وہ مزارع خود

کاشت کارین گئے اور دس نے تو مالکانہ حقوق بھی حاصل کر لیے۔“

”مگر جب زمیں کو متروکہ اراضی ڈھلے کر دیا گیا اور چوہدری کے نام اس کی الاٹمنٹ ہو گئی تو مزارعوں کی نوعیت بدل گئی۔“ سردار دریشک نے وکیل پر اپنی قانونی مہارت کا سکہ بھانے کی کوشش کی۔

”جی نہیں۔“ وکیل نے وضاحت کی۔ ”آپ ایک قانونی نکتہ نظر انداز کر گئے۔ اور وہ یہ ہے کہ دس مزارعوں کی نوعیت اس وقت تبدیل ہوئی جب رجسٹر خسرو گرداوری میں ان کے انتقالات منسوخ ہو گئے اور چوہدری صاحب کی نام منتقل ہو گئے۔“

”سبس“ تو نے ٹھیک بتایا۔ ”سردار دریشک نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔“ اب تو سوچنا یہ ہے کہ اگے ضابطے کی کارروائی کیا کرنی ہے؟“

”اب تو انھیں مزارع تابع مرضی مالک بنانا ہے۔“ وکیل نے مطلع کیا۔

”اور سبس“ وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں۔“ اس بار شہ زور مزاری نے لقمہ دیا۔ ”کل ان کا ایک بندہ آیا تھا۔ وہ تو بہت اونچی اونچی باتیں کرتا تھا۔“

”کرنا بھی چاہیے۔“ وکیل مسکرا کر بولا۔ ”گزشتہ نو دس سال سے وہ زمین پر قابض ہیں۔ آسانی سے تو دست بردار نہیں ہوں گے۔ اپنا قبضہ جائز ثابت کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کریں گے۔“

”ایسا تو وہ کری رہے ہیں۔“ اس بار بھی شہ زور مزاری بولا۔

”ضابطہ فوجداری کے تحت جو کارروائی کی جائے گی“ اس کا طریقہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں۔

بلکہ اس کے لیے درخواست بھی تیار کی جا چکی ہے۔ چوہدری صاحب نے اس پر دستخط بھی کر دیے۔

اب تو اسے ضروری کارروائی کے لیے آگے بڑھنا ہے۔“ وکیل نے وضاحت سے اپنا موقف بیان کیا۔

”مگر اس کے ساتھ ہی ٹیننسی ایکٹ کے تحت تحصیل دار کو اس مضمون کی درخواست بھی دینی ہوگی کہ مزارعے بٹائی دینے سے انکاری ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔

”اپنا مقدمہ مضبوط بنانے کے لیے ان کے خلاف دوسرے ایسے الزامات بھی عائد کرنے ہوں گے جو ٹیننسی ایکٹ کے تحت ضروری ہیں۔ مثلاً یہ کہ مزارعے کاشت کی طرف پوری توجہ نہیں دے رہے ہیں جس کے باعث پیداوار گھٹ رہی ہے۔ زمین خراب ہو رہی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔“ اس نے شہ زور مزاری اور

عظمت اللہ دریشک کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”آپ دونوں تو خاندانی زمین دار ہیں۔ آپ کو تو بخوبی علم ہو گا کہ مزارعوں کو بے دخل کرنے کے لیے کس کس طرح کی دیوانی اور فوجداری کارروائی کی جاتی

ہے۔“

”سبس“ ایسا ہے تو ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے دوسری درخواست بھی تیار کر لی جائے۔“ شہ زور مزاری نے کہا۔ ”اس پر چوہدری سے دستخط لگوالے اور درخواست تحصیل دار کے سامنے پیش کر دے۔“

”پر یہ ساری کارروائی آج ہی پوری ہو جانی چاہیے۔“ سردار دریشک نے تاکید سے کہا۔

”آج ہی پوری ہو جائے گی۔ میں درخواست تیار کر کے چوہدری صاحب سے دستخط کروالوں گا اور تحصیل دار کے سامنے پیش کر دوں گا۔“ وکیل نے دریشک کو باور کرایا۔

اس نے کیا بھی ایسا ہی۔ گھنٹہ بھر کے اندر اندر درخواست تیار کی اور رحیم داد سے اس پر دستخط بھی کرا لیے۔

ایک درخواست تحصیل دار کے دفتر میں پیش کر دی گئی، دوسری تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۵

کے تحت قانونی چارہ جوئی کے لیے تھانے میں۔ تحصیل دار اور تھانے دار دونوں ہی سردار شہ زور

مزاری اور عظمت اللہ دریشک کے نہ صرف جانے والے تھے بلکہ بے تکلف دوست بھی تھے۔ لہذا

دونوں درخواستوں پر فوری کارروائی کے احکامات بھی جاری کر دیے گئے۔

سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے وہ راجن پور سے کوٹ اکبر واپس پہنچ گئے۔

دلاور والا کی زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے رحیم داد سے زیادہ سردار شہ زور مزاری فکرمند

تھا۔ اور سردار عظمت اللہ خان دریشک کو شہ زور مزاری سے بھی زیادہ تشویش تھی۔ نصیبو ہڑ سے

بات چیت کرنے کے بعد یہ اس کے وقار کا مسئلہ بن گیا تھا۔

دن ہو یا رات، جس وقت بھی تینوں یکجا ہوتے، دلاور والا کی زمین کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور ایک بار

جب یہ ذکر چھڑ جاتا تو گھنٹوں جاری رہتا۔ رحیم داد کی درخواست پر تحصیل دار نے ہنوز کوئی فیصلہ

نہیں دیا تھا۔ اسے ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے وقت درکار تھا۔ حالانکہ دہرہ وہ شہ

زور مزاری اور عظمت اللہ دریشک کو یقین دلا چکا تھا کہ فیصلہ رحیم داد ہی کے حق میں ہو گا۔

لیکن سردار دریشک تحصیل دار کے فیصلے اور پولیس کی کارروائی سے پہلے اپنے طور پر کارروائی

کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ایک شام اس نے کھل کر اس کا اظہار بھی کیا۔ اس وقت شہ زور مزاری اور

رحیم داد کے علاوہ اس کا کاردار، غوث بخش لاشاری بھی موجود تھا۔ عزیز گٹھوال مقدمے کی جیرو

کے سلسلے میں راجن پور میں مقیم تھا۔

سردار عظمت اللہ دریشک نے شہ زور مزاری کو مخاطب کیا۔ ”شہ زور“ پتہ نہیں تحصیل دار کب

فیصلہ سنائے گا۔ ہم نے کب تک اس کا انتظار کرنا ہو گا۔ ابھی تو بیانات لیے جائیں گے۔ گواہ پیش ہوں گے۔ ثبوت مہیا کئے جائیں گے۔“

”تحصیل دار کو عدالتی کارروائی تو پوری کرنی ہی ہوگی۔“ شبہ زور مزاری نے اپنے رائے کا اظہار کیا۔ ”اس کے فیصلے سے پہلے کیا ہی کیا جاسکتا ہے؟“

سردار عظمت اللہ دریشک اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”راہوں کو بے دخل ہی تو کرتا ہے۔“ اس نے اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”میرے یا تیرے لیے یہ کوئی نئی یا انوکھی گالہ نہیں۔ پہلے بھی کتنوں ہی کو بے دخل کیا ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”تو نے بالکل ٹھیک کہا۔“ سردار مزاری نے اس کی تائید کی۔ ”پر یہ تو سوچ۔ ایک بار جب تحصیل دار کے سامنے بے دخلی کی درخواست لگا دی گئی تو فیصلے تک تو چپ کر کے بیٹھنا ہی پڑے گا۔“

”تو میری گالہ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

”تو سمجھائے گا تب ہی تو سمجھوں گا۔“ سردار مزاری نے مسکرا کر دریشک سے کہا۔ ”مجھے کیا پتہ

تو نے کیا سوچ رکھا ہے اور تو کیا کرنا چاہتا ہے؟“

”میں چاہتا ہوں کہ اپنے کچھ مسلح کراوے اور زور آور بندے دلاؤ والا سمجھوں۔ وہ چوہدری کی طرف سے راہوں کو ڈرانے دھمکانے کی کوشش کریں۔ توڑ پھوڑ کریں۔ جو کوئی آکر دکھائے، دنگا فساد کرے، اس کی پٹائی کریں۔“

”اس طرح تو اپنا مکدمہ کمزور پڑ جائے گا۔“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”کمزور نہیں اور مضبوط ہو سکتا ہے۔“ دریشک نے ہنس کر کہا۔ ”راہک ڈر جائیں گے۔ کدے بازی چھوڑ کر صلح صفائی کرنے کے کوششیں کریں گے۔ منت کریں گے۔ زاری کریں گے۔“

”مان لے وہ ڈرانے دھمکانے میں نہ آئے۔ تب کیا ہو گا؟“ رحیم داد اپنی بات پر جمارہا۔

”ہو گا کیا۔ وہ تھانے میں پرچہ چاک کرانے کی کوشش کریں گے۔“ دریشک نے رحیم داد کو باور کرایا۔ ”تو اطمینان رکھ۔ ان کی رپورٹ درج نہیں ہوگی بلکہ تیری نہ صرف درج ہو جائے گی اس پر فائف کارروائی بھی شروع ہو جائے گی۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ تھانیدار اپنا بندہ ہے۔ گمراہ ہے۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ سردار شبہ زور مزاری نے بھی عظمت اللہ دریشک کے ساتھ مزید جت کرنے سے گریز کیا۔ یہ اس کا علاقہ نہ تھا دریشک کا تھا۔ رحیم داد کو زمین کا قبضہ دلانے کے لیے

اسے عظمت اللہ دریشک کی مدد درکار تھی۔ لہذا اس کی مرضی اور رضا کو اہمیت دینا ضروری تھا۔ اسی مقصد کے تحت وہ رحیم داد کے ساتھ کوٹ اکبر آیا تھا۔



سردار عظمت اللہ دریشک نے اپنے کارندوں اور نوجوان مزارعوں کو اکٹھا کیا۔ اور ضروری ہدایت دے کر ایک مضبوط اور قوی پیکل کمدار کی سربراہی میں انھیں دلاور والا کی جانب روانہ کیا اور سردار شبہ زور مزاری اور رحیم داد کے ساتھ بیٹھ کر بے چینی سے ان کا انتظار کرنے لگا۔

وہ واپس آئے۔ مگر ان کی حالت دگرگوں تھی۔ چروں کی رنگت اڑی اڑی تھی۔ لباس بے ترتیب اور گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ نڈھال اور درماندہ نظر آتے تھے۔ گھبراہٹ اور پریشانی ان کی آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ سردار عظمت اللہ نے ان کی یہ اہتری اور خستہ حالی دیکھی تو خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پوری بہتی اٹھارہ مزارعوں کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئی۔ سب ہی بوہڑ تھے۔ تعداد میں بھی بہت زیادہ تھے اور مسلح بھی تھے۔ وہ ہر طرف سے شور مچاتے ہوئے نکلے اور اس طرح یلغار کی کہ سردار دریشک کے آدمی ان کے زرخے میں پھنس گئے۔ جان بچانا مشکل ہو گئی۔ کسی نہ کسی طور گلو خلاصی حاصل کی۔ اس طرح پسا ہوئے کہ نظریں ہزیمت اور گھبراہٹ سے جھکی ہوئی تھیں اور بوہڑوں کے سراونچے تھے اور گردنیں تکی ہوئی تھیں۔ سردار دریشک نے چاہا تھا کہ خوف و ہراس پھیلا کر مزارعوں کو جھکنے پر مجبور کر دیا جائے۔ مگر اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ وہ سخت چراغ پا ہوا۔ چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا۔ آنکھوں سے پنگاریاں اڑنے لگیں۔ اس نے غیظ و غضب کے عالم میں نہ صرف اپنے کمدار اور کارندوں کو بلکہ سب ہی کو گالیاں دیں۔ دیر تک چیخا چلاتا رہا، دھاڑتا رہا، پھر دھتکار کر سب کو کمرے سے نکال دیا۔ اس کی آن بان اور عزت و وقار کو سخت ٹھیس پہنچی تھی۔ اب وہ اور بھڑک اٹھا تھا۔ اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس نے راہوں یعنی مزارعوں کی سرکشی اور شورش کچلنے کے لیے دوسرے حربے اور ہتھکنڈے آزمانے کا تہیہ کیا جو سرداروں اور بڑے زمین داروں کا عام وسیلہ ہے۔

اس نے علاقے کے تھانیدار کو بلایا۔ اس کا نام عبدالغنی خاں نیازی تھا۔ تن و توش کے اعتبار سے بڑا دنگ نظر آتا تھا۔ اس کی سخت دلی اور مزاج کی برہمی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ جب وہ آیا تو کردار شبہ زور مزاری اور رحیم داد بھی موجود تھے۔ سردار دریشک نے تھانیدار کو تازہ صورت حال سے آگاہ کیا۔ بوہڑوں کے خلاف اپنی شدید نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔

مسلکے کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لیا گیا۔ آخر باہمی صلاح مشورے سے یہ طے پایا کہ ان بوہڑوں

کے خلاف مویشیوں کی چوری اور ایسے ہی دوسرے الزامات کی بنیاد پر جھوٹے مقدمے قائم کئے جائیں جو سرکشی اور محاذ آرائی میں پیش پیش ہیں۔ ان کو گرفتار کیا جائے اور حوالات میں بند کر کے اس طرح زد و کوب کیا جائے کہ نہ صرف ان کا سارا اظہانہ اور کس بل نکل جائے بلکہ دوسرے بوجہ بھی عبرت حاصل کریں۔ دہشت زدہ ہو کر سردار دریشک کے پیروں پر اپنے سروں کی پٹریاں ڈال دیں۔

تھانے واپس جا کر عبدالغنی خاں نیازی نے بوہڑوں کے خلاف مقدمات قائم کئے اور ان کی گرفتاری کے لیے پوری تیاری بھی کر لی۔ مگر دلاور والا جانے سے قبل وہ کوٹ اکبر پہنچا۔ پولیس کی ایک جماعت اس کے ساتھ تھی۔ ادھر سردار عظمت اللہ دریشک کی حویلی کے سامنے کھلے میدان میں اس کے کارندے، بھگڑے اور مضبوط مزارعے اور کی سورج غروب ہوتے ہی اکٹھا ہونے شروع ہونے لگے تھے۔ ان کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔

پہر رات گزری تو میدان میں ہر طرف چل پھل اور گھما گھمی تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ ان کے لیے کھانے کے علاوہ خاص طور پر بھگ گھونٹ کر تیار کی گئی تھی۔ وہ بھگ کے گلاس پر گلاس چڑھا رہے تھے۔ ہمک رہے تھے۔ قمقمے لگا رہے تھے۔ پولیس والے بھی شریک ہو کر ان کے رنگ میں رنگتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ہنگامہ ہاؤ ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان نے نشے میں جھوم کر دوہڑہ چھیڑا۔ کان پر ایک ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔

عاشق مست مدام جہاں بھر جام شکر دا پیوے

جے دت بہک لنگاں یار دکھیو نے

لوں لوں دے دج ساہ پورے اے رنج رنج بھر پیوے

جے دت بہک لنگاں یار دکھیوے

اس کی آواز پاٹ دار اور سر ملی تھی۔ دوسرے بھی نشے کی ترنگ میں اس کی آواز سے آواز ملا کر کورس کے انداز میں دوہڑے کے بول لاپنے لگے۔ ان کی آوازیں اونچی اور اونچی ہوتی گئیں۔ وہ جھوم رہے تھے۔ لہرا رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ فضا گنگنا رہی تھی۔ بول رہی تھی۔ بتا رہی تھی۔

یہ سدا کا مست عاشق شکرانے کے جام بھر کر پئے

اگر ایک بار بھی اپنے محبوب کو دیکھ لے

میرے رد میں روئیں میں لہر دوڑ جائے، زخمی روح زندہ ہو جائے

اگر ایک بار بھی اپنے محبوب کو دیکھ لے

حویلی کے وسیع صحن میں سردار دریشک، سردار مزاری، تھانیدار عبدالغنی نیازی اور رحیم داد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ہنس رہے تھے ہنسا رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ رات جاگ رہی تھی۔ وہ بھی جاگ رہے تھے۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ سنان اور تاریک ہوتی گئی۔ رات آدھی ہو گئی۔ تھانیدار نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حویلی سے باہر آیا۔ سردار دریشک، سردار مزاری اور رحیم داد اس کے ہم راہ تھے۔ تھانیدار نے مسکرا کر سردار عظمت اللہ کو مخاطب کیا۔ ”سردار! فکر نہ کر۔ صبح سارے بد معاش اور سرکش بوہڑوں کو باندھ کر تیرے سامنے پیش کر دوں گا۔“ اس نے ایک ہاتھ اٹھا کر مونچھوں پر تآؤ دیا۔ نخوت سے گردن کو اکڑایا۔

سردار دریشک نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے پتہ ہے تو کامیاب لوٹے گا۔ پہلے بھی کب ناکام ہوا ہے۔ ہر معرکہ سر کیا ہے۔“

تھانیدار نے نشے کی ترنگ میں قہقہہ لگایا۔ سردار دریشک اور سردار شہ زور مزاری سے رخصت ہوا۔ آگے بڑھا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ تینوں ایک جیب میں بیٹھ گئے۔ کچھ پولیس والے بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ایک جیب اور بھی تھی۔ پولیس کے بقیہ سپاہی اس میں بیٹھ گئے۔ سردار دریشک کے کارندے اور گرگے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔

دونوں جیبیں آگے آگے تھیں۔ ان کے عقب میں گھوڑے اور اونٹ تھے۔ تھانیدار کی کمر پر لٹکتے ہوئے ہولسٹر میں بھرا ہوا پستول تھا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری کے پاس بارہ بور کی دو تالی بندوقیں تھیں۔ دو کائینیل بھی پرانی وضع کی راکٹوں سے مسلح تھے۔ سردار دریشک کے کارندوں اور گرگوں کے ہاتھوں میں کھانا یاں اور اونچی اونچی ڈانکیں تھیں۔ ہر ڈانگ پر تیز دھار کی چمکی چھوڑی چڑھی ہوئی تھی۔ وہ کچے اور ناہموار راستوں پر دھول کے بادل اڑاتے دلاور والا کی ست جا رہے تھے۔

تھانیدار عبدالغنی خاں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اند میرے میں نہایت خاموشی سے بستی کا محاصرہ کر لیا جائے۔ اور رات کے پچھلے پراس طرح اچانک گھروں پر چھاپ مارا جائے کہ سب بے خبر سوئے ہوں۔ کسی ملزم کو فرار ہونے کا موقع نہ ملے۔ سب کو آسانی سے حراست میں لے لیا جائے۔

بوہڑوں کو پولیس کے چھاپے کی سن گن مل گئی تھی۔ وہ نہ صرف چوکس اور چونکنا تھے بلکہ پولیس اور اس کے مددگاروں کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ گاؤں کے ارد گرد جھنگر اور گھٹی جھاڑیاں تھیں جن کے درمیان کہیں کہیں ٹیلے اور بٹے تھے۔ بوہڑوں نے ٹیلوں پر مورچے لگا رکھے تھے۔ ان کے پاس کلباڑیاں اور ڈانکیں تھیں۔ پتھروں کی ڈھیریاں تھیں۔ گوچھن اور دوسا نکھیاں تھیں جو فصلوں اور باغوں سے پرندوں کو بھگانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ مگر اس وقت وہ ان سے ایک موثر ہتھیار کا کام لیتا چاہتے تھے۔ دوسا نکھیوں یا غلیلوں کے ذریعے دور نشانے پر ناک کر مارنے کے لیے انھوں نے مٹی کی گولیوں کو تیار کیا تھا جن کو کھمارنے بمٹی میں پکا کر پختہ اور مضبوط بنا دیا تھا۔

عورتیں اور بچے مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی چھوٹے بڑے پتھروں کی ڈھیریاں جگہ جگہ بنا رکھی تھیں۔ معذور اور بیماروں کو چھوڑ کر بستی کے تمام بوڑھے بھی مستعد اور سرگرم نظر آ رہے تھے۔ وہ گھروں کے دروازوں پر بیٹھے حقے کے کش لگا رہے تھے۔ کھانسنے رہے تھے کھنکھار رہے تھے باتیں کر رہے تھے۔

سب ہی چونکنا اور چوکس تھے۔ جاگ رہے تھے اور ان طرح طرح کی ذمہ داریوں سے پوری طرح باخبر تھے جو خطرے کے وقت ان کو انجام دنا تھیں۔

رات ڈھلتی جا رہی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے کنول جگمگا رہے تھے۔ ہوا سرسراہٹ ہوئی درختوں سے گزر رہی تھی۔ سب چونکنا نظروں سے ہار ہار گردنیں اٹھا کر ان راستوں کو دیکھ رہے تھے جو مختلف سمتوں سے گاؤں کی طرف آتے تھے۔ یکایک دور شمال میں تیز روشنی ابھری جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آہٹیں اور آوازیں بھی ابھرنے لگیں۔ بستی پر فوراً گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ عورتیں چھتوں کی منڈیوں کی اوٹ میں دبک گئیں۔ نوجوانوں نے مورچے سنبھال لیے۔ بوڑھوں نے گھروں میں کھس کر دروازے بند کر لیے۔ بستی پر اب ہو کا عالم طاری تھا۔

شمال میں درختوں کی آڑ سے ابھرتی ہوئی تیز روشنی جھپوں کی تھی جن میں رحیم داد اور غوث بخش لاشاری کے علاوہ تھانیدار اور پولیس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ تھانیدار عبدالغنی خان نیازی نے جھپوں گاؤں سے دور درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے رکوائیں۔ جھپوں کے رکتے ہی گھوڑے اور اونٹ بھی ٹھہر گئے۔

جھپوں کی بتیاں بجادی گئیں۔ سب سے پہلے تھانیدار باہر آیا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری بھی باہر آ گئے۔ دوسرے بھی جھپوں، گھوڑوں اور اونٹوں پر سے اتر کر نیچے آ گئے۔ سب تھانیدار عبدالغنی خان نیازی کے گرد اکٹھا ہو گئے۔ اس نے ایک ڈرائیور کو جھپوں، گھوڑوں اور اونٹوں کی نگرانی پر مقرر کیا۔ دوسروں کو ساتھ لیا۔ ضروری ہدایات دیں اور آگے بڑھا۔ سب کچے راستوں پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بستی کی جانب بڑھے۔ قریب پہنچے۔

تھانیدار نے کچھ لوگوں کو گرد و نواح میں جگہ جگہ تعینات کیا۔ گاؤں بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ تھانیدار نے قدم آگے بڑھائے۔ رحیم داد اور غوث بخش بھی اس کے ساتھ ساتھ چلے۔ ان کے علاوہ پولیس کی جمعیت تھی۔ سردار دریشک کے کارندے اور مزارعے تھے۔ مگر جیسے ہی وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہوئے اچانک ہر طرف سے زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ عورتوں اور بچوں نے حلق کے اندر سے طرح طرح کی آوازیں نکالیں۔ رات کے سانے میں ان کا شور اس قدر پر ہول اور خوفناک تھا کہ ان پر سراسیمگی اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ وہ ٹھٹھک کر جہاں تھے وہ وہیں رک گئے۔

عبدالغنی خان نیازی دنگ اور دھاکڑ پولیس افسر تھا۔ ڈاکوؤں اور خطرناک مجرموں کے خلاف کتنے ہی سنگین معرکے سر کر چکا تھا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ پلٹ کر اقل بردار کانشیلوں کی جانب دیکھا۔ ہوائی فائر کرنے کا حکم دیا۔ چار پانچ فائروں کے بعد تمام آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔

تھانیدار اپنی جمعیت کے ساتھ آگے بڑھا۔ اس کی گردن اوپر اٹھی ہوئی تھی۔ چال میں دبدبہ تھا۔ لیکن جب وہ اور اس کے ساتھی آبادی کے درمیان پہنچ گئے تو ایک بار پھر زور زور سے سیٹیاں بجنے لگیں۔ خوفناک آوازیں ابھرنے لگیں اور ان آوازوں کے ساتھ ساتھ ہر سمت سے پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ وہ اس وقت بالکل کھلی جگہ پہ کھڑے تھے اور تاروں کی روشنی میں نمایاں اور صاف نظر آ رہے تھے۔

پتھر کٹا کٹ جسموں سے ٹکرانے لگے۔ کوئی ان کی زد سے محفوظ نہ رہا۔ پتھر نوکیلے تھے اور ان میں ایسی تیز دھار بھی تھی کہ جسم کے جس حصے پر لگتے اسے زخمی کر دیتے۔ ایک بھاری پتھر بھد سے رحیم داد کی پیٹھ پر لگا۔ وہ بے قرار ہو کر پلٹا۔ اسی وقت دوسرا کھسی سے ٹکلی ہوئی مٹی کی پختہ گولی اس کے دائیں کندھے کی ہڈی سے ٹکراتی ہوئی گزر گئی۔ وہ تکلیف سے بلبلاتا اٹھا۔ اور ایک ہاتھ سے کندھا پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

دوسرے بھی پتھروں کی چونوں سے بچ نہ سکے۔ ایک نوکیلا پتھر تھانیدار کے سر پر اس طرح لگا کہ اس کی ٹوپی گر گئی۔ سر جھنجھٹا اٹھا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ مگر اس نے ہمت سے کام لیا۔ ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور سب کو زمین پر لیٹ جانے کا حکم دیا۔ سب جلدی جلدی پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ اور پتھروں اور مٹی کی پختہ گولیوں کی زو سے بچنے کے لیے سروں کو دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کی۔

مگر فرش پر لیٹ جانے کے باوجود پتھروں کی بوچھاڑ سے محفوظ نہ رہ سکے۔ پتھران کے سروں پر اور کمر پر، گردن پر، ٹانگوں اور ہاتھوں پر، غرضیکہ جسم کے ہر حصے پر کھناکھٹ کر رہے تھے، مگر ارہے تھے۔ زخم پر زخم لگا رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف پتھری پتھری بکھر ہوئے تھے۔ جوابی کارروائی کے طور پر انھوں نے کئی بار پتھرا اٹھا کر مارنے کی بھی کوشش کی۔ مگر اپنے دشمن انھیں کیس نظر نہ آئے۔ رات کے اندھیرے میں وہ کین گاہوں میں مورچے لگائے اس طرح دیکے بیٹھے تھے کہ ان کو دیکھنا اور تلاش کرنا ممکن نہ تھا۔

تھانیدار عبدالغنی سخت الجھن میں مبتلا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پسائی کی صورت میں بدنامی کا ڈر تھا۔ وہ بدنامی مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی ہوا اکھڑ جاتی۔ علاقے پر جو دھاک بیٹھی تھی ملیا میٹ ہو جاتی۔ فائرنگ سے وہ حتی الوسع گریز اختیار کرنا چاہتا تھا۔ بظاہر اس کا کوئی نتیجہ بھی برآمد ہوتا معلوم نہ ہوتا تھا۔

وہ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ بوھڑوں نے نیا حربہ آزمایا۔ انھوں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق سیٹیوں، خوفناک آوازوں اور پتھروں کے ساتھ گھنی جھاڑیوں میں بھیڑیں اور بکریاں دوڑانا شروع کر دیں۔ ان کے کھروں کی آہٹوں سے ایسی آوازیں ابھریں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ بہت سے لوگ نقل و حرکت کر رہے ہیں۔

اس تازہ حربے کا خاطرہ خواہ نفسیاتی رد عمل ہوا۔ تھانیدار کے پاس زیادہ بڑی جمعیت نہ تھی۔ کیس سے کمک ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ اسے اپنی افرادی قوت کے مقابلے میں بوھڑوں کی تعداد بہت بھاری معلوم ہوئی۔ دوسروں نے بھی یہی محسوس کیا۔ پتھروں کی زبردست بارش سے سب پہلے ہی بدحواس تھے۔ تھانیدار بھی کم پریشان نہ تھا۔ اس اثنا میں ایک بھاری پتھر رحیم داد کے سر پر گرا۔ پگڑی سر پر نہ ہوتی تو بھیجا نکال کر باہر آجاتا۔ مگر چوٹ ایسی کراری آئی تھی کہ رحیم داد تڑپ اٹھا۔ اس نے کر دھت بدلی، اٹھا اور بدحواس ہو کر سر پٹ بھاگا۔

تھانیدار نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا۔ عین اس وقت دوسرا ٹکھی سے نکل ہوئی مٹی کی ایک

ٹھوس گولی اس کی کتھنی پر اس طرح لگی کہ وہ چکرا گیا۔ خون کی ایک دھار بہتی ہوئی رخسار سے گردن تک پہنچ گئی۔ تھانیدار عبدالغنی نیازی اس چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ رحیم داد کو بھاگتے دیکھ کر دوسرے بھی ایک ایک کر کے بھاگنے لگے۔ تھانیدار نے گھبرا کر فائرنگ کا حکم دیا۔ اپنا پستول نکال کر خود بھی گولی چلائی۔ مگر کسی کو پتہ نہ تھا کہ وہ کس پر گولی چلا رہا ہے۔

مگر اس اندھا دھند، فائرنگ کا یہ نتیجہ ضرور نکلا کہ پتھروں کی بوچھاڑ ست پڑ گئی۔ سب کے قدم پہلے ہی اکھڑ چکے تھے۔ تھانیدار نے پسپا ہونے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ رک رک کر پستول سے فائرنگ کرتا ہوا اٹھا اور بھاگنا شروع کر دیا۔ پتھروں کی بھگدڑ مچی کہ جس کا جدھر منہ اٹھا، اسی طرف بھد بھد کرتا ہوا بھاگا۔ پتھراؤ ایک بار پھر تیز ہو گیا۔ اور اس میں تیزی پیدا ہوتے ہی بھاگنے والوں نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

پتھروں اور مٹی کی گولیوں کی چون میں سے، تکلیف سے بلبلاتے، وہ کسی نہ کسی طرح گاؤں سے باہر نکلے اور درختوں کے اس جھنڈ کی طرف دوڑنا شروع کر دیا جہاں جیسیں تھیں، گھوڑے اور اونٹ تھے۔ وہ بغیر رکے ہوئے مسلسل دوڑتے رہے۔

درختوں کے جھنڈ کے نیچے پہنچنے پر ہر شخص بدحواس اور پریشان تھا۔ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ زخمی اور گھائل تھا۔ کسی کو ہلکے زخم لگے تھے کسی کو گہرے۔ ان کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ لباس خاک سے لتھڑے ہوئے تھے۔ سروں کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ اور ٹھکڑ میں کسی کی ٹوپی اور پگڑی پھوٹ گئی تھی اور کسی کے جوتے۔

تھانیدار عبدالغنی خان نیازی بالکل خاموش تھا۔ اس کی حالت کچھ زیادہ ہی اہتر تھی۔ وہ خوب تھومند تھا۔ لہذا بھاگتے وقت سب سے زیادہ اسے پریشانی اٹھانا پڑی۔ چونیں بھی زیادہ آئی تھیں۔ اس کی ٹوپی بھی بھاگتے ہوئے کہیں گر گئی تھی۔ وردی کی ایک آستین پھٹ گئی تھی۔ چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ مگر آنکھوں میں خوف و ہراس کے بجائے شدید غم و غصہ تھا۔

وہ کتھنی کے گہرے زخم پر ایک ہاتھ سے رومال رکھے ہوئے تھا تاکہ زیادہ خون نہ بہے۔ اسی عالم میں وہ جیب پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد اور غوث بخش لاشاری اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ رحیم داد نے کسی نہ کسی نظر سے ملائیں۔ وہ گم صم بیٹھا تھا۔ غوث بخش بھی خاموش تھا۔ پولیس والے دونوں جھپوں میں بیٹھ گئے۔ دوسرے گھوڑوں اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ اور جس راستے سے دلاور والا آئے تھے اسی راستے سے کوٹ اکبر واپس ہوئے۔

میں گیا اور بستر پر جا کر لیٹ گیا۔

دن ڈھلے رحیم داد نے غسل کیا۔ لباس تبدیل کیا۔ کمرے سے باہر نکل کر ڈیرے کے صحن میں پہنچا تو شام درد دیوار سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ سردار شہ زور مزاری صحن میں اکیلا بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ شہ زور مزاری نے اس کی دل جوئی کی مسکراتے ہوئے گویا ہوا۔

”چوہدری، تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ چند روز میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو یہ تھانیدار کی ناک کا مسئلہ بن گیا ہے۔ تو نے سنا نہیں وہ کیا کہہ کر گیا ہے۔“

”میں نے سب کچھ سنا ہے۔“ اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ”پر میں تجھے صاف صاف کہہ دیتا چاہتا ہوں کہ نہ میں نے زمین کا کبضہ لیتا ہے نہ ادھر زمین داری کرنی ہے۔“

”تو کیا کہہ رہا ہے؟“ مزاری نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”میں نے ادھر ہرگز زمین داری نہیں کرنی۔“ رحیم داد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”میں تو پہلے ہی ایسا سوچ رہا تھا۔ کل رات جو کچھ دلاور والا میں ہوا اس کے بعد تو میرے لیے ادھر زمین داری کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تجھے زمین داری کون سی چلانی ہے۔“ شہ زور مزاری نے اس کی حوصلہ افزائی کی کوشش کی۔

”تو نے گھوٹال کو اپنا مختار تو بتایا دیا ہے۔ وہ زمین داری کی دیکھ بھال کرتا رہے گا۔“ اس نے رحیم داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”چوہدری، یہ تو سوچ عفت اللہ کو پتہ چلا تو وہ تیرے بارے میں کیا سوچے گا۔ کہے گا چوہدری ڈر گیا۔ دوسرے بھی یہی کہیں گے۔“

”اگر وہ ایسا سوچیں گے تو ٹھیک ہی سوچیں گے۔“ رحیم داد نے پردہ پوشی کی کوشش نہ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ رات کے ہولناک واقعے کے بعد وہ بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ ”جو کچھ ہو چکا وہی کم نہیں۔ آگے جو کچھ ہونے والا ہے اس کے بارے میں تو میں سنتا بھی نہیں چاہتا۔ مجھے پتہ ہے تھانیدار نے جو کچھ کہا ہے وہ ایسا کر سکتا ہے اور ضرور کرے گا۔ تو بھی یہی چاہتا ہے۔ عفت اللہ دریشک تو بالکل ایسا ہی چاہتا ہے۔ پر میں کسی طور اس خطرناک جھگڑے میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ تو چاہے مجھے بزدل کہہ یا ڈر پوک۔ میں نے تجھے اپنے دل کی بات صاف صاف بتا دی۔“

”پر یہ تو سوچ کدے کا کیا بنے گا۔ زمین کا کیا ہو گا؟“ سردار شہ زور مزاری نے پریشان ہو کر کہا۔

”تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟“

”کیا مدد چاہتا ہے؟“ سردار مزاری نے بے چہن ہو کر سوال کیا۔

سردار عفت اللہ دریشک اور شہ زور خان مزاری بے قراری سے انتظار کر رہے تھے۔ جب وہ واپس پہنچے تو دونوں ان کی اہتر حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ عالم یہ تھا کہ کوئی لنگڑا کر چل رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ کسی کا منہ سو جا ہوا تھا کسی کی آنکھ۔ کسی کی گردن اکڑی ہوئی تھی کسی کے ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ خون زخموں سے رس رس کر جگہ جگہ سیاہ دھبوں کی طرح جم گیا تھا۔

سردار دریشک نے حیران و پریشان ہو کر تھانیدار سے پوچھا۔ ”یس عبد الغنی، یہ کیا ہو گیا؟“

”یہ تو اپنے بندوں سے معلوم کر لیتا۔ مجھے فوراً واپس تھانے جانا ہے۔ مرہم پٹی کرانی ہے۔ اپنی اور اپنے جوانوں کی میڈیکل رپورٹ تیار کرانی ہے۔“ اس نے رک رک کر کہا۔ ”لزموں کے خلاف مضبوط کیس تیار کرانا ہے۔“ وہ آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ ”سردار، تجھے فوری طور سے مجسٹریٹ سے ملنا ہو گا۔ لزموں کی زمین قرق کرانے کے لیے دفعہ ۳۵ کے تحت عدالت کا حکم جاری کرانا ہو گا۔ میں نے چوہدری کی درخواست پر ضابطے کی کارروائی مکمل کر کے عدالت میں پہلے ہی چالان پیش کر دیا ہے۔ راشد احمد وکیل کو سب پتہ ہے۔“

”تو جیسا کہتا ہے وہ تو میں کرا لوں گا، پر یہ تو بتا یہ سب کچھ ہوا کیسے؟“ وہ بدستور حیرت زدہ تھا۔

”میں نے کہا تو ساری تفصیل لاشاری یا اپنے کسی بھی بندے سے معلوم کر لیتا۔“ یہ کہتے کہتے اس کے وجود میں چھپا ہوا تھانیدار جاگ اٹھا۔ آنکھوں سے شرارے اڑنے لگے۔ لہجہ تلخ ہو گیا۔

”مجھے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر رپورٹ کرنی ہے۔ پولیس کی زبردست فورس اکٹھی کرنی ہے۔ دلاور والا کے ایک ایک بوہڑ کی مونچھ پید شتاب سے نہ منڈوائی تو عبدالسمیع خان نیازی کے نطفے سے نہیں۔“

وہ غصے سے دھاڑا۔ ”ان کے مکانوں کو مہار کرانا ہے۔ فصلوں کو آگ لگوانی ہے۔ زنانیوں کے سروں کے بال کٹوانے ہیں۔ ان کو برہنہ کر کے رات بھر نچوانا ہے۔ ان کے مردوں کے سامنے نچوانا ہے۔ ان کے مردوں کو بھی تنکا کر کے نچوانا ہے۔ میں ان کو دکھا دوں گا پولیس سے ٹاکہ لینا محول نہیں ہے۔ ایسی عبرت ناک سزاؤں کا زندگی بھر یاد رکھیں گے۔“

سردار دریشک نے تھانیدار کو روکنے کے لیے اصرار کیا مگر وہ نہ رکا۔ دونوں چپوں میں زخمی اور خستہ حال کانشیلوں کے ساتھ بیٹھ کر راجن پور واپس چلا گیا۔ سردار دریشک نے اپنے کاردار غوث بخش لاشاری سے کرید کرید کر ایک ایک تفصیل معلوم کی۔ جب تمام باتیں سامنے آگئیں تو وہ بھی سخت برہم ہوا۔ بوہڑوں کی سرکشی کے خلاف جذبہ انتقام سوا ہوا۔

مگر رحیم داد تمام وقت خاموش بیٹھا رہا۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بولا۔ اس کا جوڑو ڈکھ دیا تھا۔ آنکھیں سلکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ سردار دریشک کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اپنے کمرے

”میں دلاور والا کی زمین فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“ رحیم داد نے اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ ”تو نے میری اب تک بہت مدد کی ہے ایک ہزار روپے کر دے۔ مجھے اس زمین کا کوئی گاہک مہیا کر دے اور اگر تو لیتا چاہے تو میں خوشی سے تجھے بیچ کر دوں گا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”تجھ سے تو کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین تو بچ پوچھ تیری ہی ہے۔ تو نے ہی الاٹ کرائی ہے۔“

”میرے لیے تو ادھر زمین لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سردار مزاری نے صاف انکار کر دیا۔ ”یہ تمہیں دریشک کا علاقہ ہے۔ اس کے لیے تو عظمت اللہ سے بات کرنی ہوگی۔ وہ تیری مدد کر سکتا ہے۔“ اس نے ایک بار پھر رحیم داد کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”ویسے میری مرضی ہے کہ تو ایسا نہ سوچ۔ کل رات جو کچھ ہوا، لگتا ہے اس سے تو بہت گھبرا گیا۔ چند روز میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”زمین داری میں تو کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ اس سے گھبرانا اور پریشان ہونا نہیں چاہیے۔“

رحیم داد اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”جی پوچھ تو میرا میسر نادر خان بھی یہی چاہتا ہے۔ تجھے پتہ ہے وہ پچھلے دنوں ادھر آیا تھا۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”بات دراصل یہ ہے ادھر کوئلہ ہر کشن میں چھوٹے زمین داروں اور حصہ داروں کی زمین بہت سستے مول مل رہی ہے۔ اور اس لیے مل رہی ہے کہ چھوٹے زمین داروں کو سندھ میں بیہوجوں کی زمین الاٹ ہو گئی ہے۔ وہ ادھر کی زمین بیچ کر جلد سے جلد ادھر جانا چاہتے ہیں۔“

سردار شہ زور مزاری نے اس کی بات کاٹ کر مداخلت کی۔ ”وہ جو کچھ چاہتے ہیں، مجھے اس سے کچھ نہیں لینا۔ یہ بتا تو کیا چاہتا ہے؟“

”مجھے ان کی زمین خریدنے کے لیے روپے کی سخت ضرورت ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر اپنا مقصد بیان کیا۔

”یہ بات تو نے پہلے بتانی تھی۔“ شہ زور نے قدرے خٹکے لہجے میں کہا۔ ”اگر تو نے پہلے بتا دیا ہوتا تو معاملہ اتنا آگے کیوں جاتا۔“

”میں نے سوچا تو ناراض ہو گا۔ اس لیے صرف سوچتا ہی رہ گیا۔“ اس بار اس نے صاف گوئی سے کام نہیں لیا۔ رحیم داد مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اسی اثنا میں سردار عظمت اللہ دریشک پہنچ گیا۔ اس نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تو بہت چپ چاپ نظر آ رہا ہے۔“

رحیم داد تو خاموش رہا مگر شہ زور مزاری خاموش نہ رہا۔ اس نے کہا۔ ”چوہدری، ادھر زمین داری کرنا نہیں چاہتا۔ دلاور والا کی زمین فروخت کرنا چاہتا ہے۔“

”لگتا ہے کل رات کی گزیرنے اسے بہت تنگ کیا۔“ عظمت اللہ دریشک نے بے تکلفی سے کہا۔ ”فکر نہ کر۔ چند روز کی گالہ ہے فیر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

رحیم داد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی شہ زور مزاری بول پڑا۔ ”یہ ٹھہرا ماجرا، ادھر کی زمین داری اس کے لیے بالکل نیا تجربہ ہے۔“ اس نے مسکرا کر عظمت اللہ کو دیکھا۔ ”ویسے اس نے ادھر کوئلہ ہر کشن میں زمین بھی خریدنی ہے۔ سستی مل رہی ہے اور اس کی زمینوں سے ملی ہوئی ہے۔ اس کی خریداری کے لیے اسے روپے کی ضرورت ہے۔“

”یہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔“ سردار دریشک ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”اس مرحلے پر ایسا کرنے سے تو بہت گزیر ہو جائے گی۔“ اس نے گردن اٹھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”چوہدری اب تو میری آن کا سوال پیدا ہو گیا ہے۔“

”ایسا کرتو دلاور والا کی زمین خرید لے۔“

”میری پاس تو ویسے ہی بہت زمین ہے۔“ سردار دریشک رضامند نہ ہوا۔

”پر یہ زمین تو تیری آن کا مسئلہ بن گئی ہے۔ اسے تو تجھے ہی خریدنا چاہیے۔“ مزاری نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”اپنی آن کی خاطر تجھے خریدنا چاہیے۔“

”تو کہتا ہے تو خرید لوں گا۔“ وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”بول چوہدری، کیا لے گا زمین کا؟“

”جو تو دے دے۔ میں نے تجھ سے مول تول تو کرنا نہیں۔“ رحیم داد نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔ سردار مزاری نے مداخلت کی۔ ”زمین کا مول تو بعد میں طے ہو جائے گا، پر یہ بات یکنی ہو گئی کہ دلاور والا کی زمین اب تیری ہوگی۔“ اس نے بات کو طول دینے کے بجائے اختصار سے کام لیا۔ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چوہدری، تو جانے کو کہتا تھا تو واپس جا۔ میں اور دریشک زمین کے مکدے سے نمٹنے کے بعد کوئلہ ہر کشن پہنچ جائیں گے۔“ وہ مسکرایا۔ ”کچھ دن تیرے سہان رہیں گے۔ وہیں بیچ نامہ تیار ہو گا اور زمین کی کمیت بھی ادا کر دی جائے گی۔“ اور اس نے عظمت اللہ دریشک کی جانب مڑ کر دیکھا۔ ”میں نے ٹھیک ہی کہا نا؟“

”تو جیسا کہے گا ویسا ہی ہو گا۔“ سردار دریشک نے شہ زور مزاری کی تجویز مان لی۔

زمین کا معاملہ خلوص اور محبت کی فضا میں طے ہو گیا۔ وکیل کے مشورے پر رحیم داد نے عزیز گٹھوال کا مختار نامہ منسوخ کر کے سردار عظمت اللہ کو اپنا مختار عام مقرر کر دیا۔ اب وہ جلد سے جلد ڈیرہ غازی خان چھوڑنا چاہتا تھا۔

سردار عظمت اللہ دریشک نے گلے لگا کر رحیم داد کو رخصت کیا۔ سردار شہ زور مزاری اس کے ساتھ غازی گھاٹ تک گیا۔ دلاور والا کی زمین کا تنازعہ حائل نہ ہوتا تو وہ حسب وعدہ اس کے ساتھ لاہور جاتا۔

رحیم داد ایک بار پھر اسٹیمر پر سوار ہوا۔ دریائے سندھ عبور کیا۔ مظفر گڑھ پہنچا اور ٹرین میں بیٹھ کر لاہور کی جانب روانہ ہو گیا۔



بحری دہسہر تھی اور چلچلاتی گرمی۔ ریل گاڑی شور مچاتی، کھٹ کھٹ کرتی، لوہے کی پٹریوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ رحیم داد سکند کلاس کے ایک ڈبے میں بیٹھا تھا۔ اس کے علاوہ کئی اور مسافر بھی تھے۔ وقت گزرنے کے لیے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کوئی اخبار، کوئی اونگھ رہا تھا۔ کچھ ہنس بول رہے تھے۔ ایک مسافر اوپر کی نشست پر لیٹا اطمینان سے سو رہا تھا۔ اس نے چھت میں لگے ہوئے عکسے کا رخ موڑ کر اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس کا ایک پیر نشست سے باہر نکلا ہوا تھا جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دراز قد ہے۔

رحیم داد گرمی اور تپش سے بے زار اور اکتایا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ نشست پر جو مسافر بیٹھا تھا وہ اخبار کے مطالعے میں اس قدر غرق تھا کہ جب رحیم داد ڈبے میں داخل ہوا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تو اس نے صرف نظریں اٹھا کر دیکھا اور پھر اخبار پڑھنے میں محو ہو گیا۔ رحیم داد نے بھی اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ اخبار سے اسے کبھی دلچسپی نہ رہی۔ اس وقت بھی اس نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ نہ خبروں کی سرخیوں پر نظر ڈالی نہ تصاویر پر۔

وہ کچھ دیر گرم صم بیٹھا رہا پھر گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادلوں کے ہلکے ہلکے سرمئی لکے منڈلا رہے تھے۔ سورج ان کی اوٹ میں چھپ جاتا تو دور تک سائے پھیل جاتے۔ فضا دم بھر کے لیے سہانی ہو جاتی۔ مگر جب سورج دوبارہ نمودار ہوتا تو منظر اچانک بدل جاتا۔ دھوپ اتنی تیز اور چمکیلی ہوتی کہ آنکھوں میں چھبتی ہوئی محسوس ہوتی۔

ریل گاڑی سرپٹ دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ سورج بادلوں سے آنکھ پھولی کھلتا رہا۔ سائے

کھٹے بڑھتے رہے۔ ریل گاڑی کی رفتار سست پڑ گئی۔ پڑیاں بدلنے لگیں۔ ریل گاڑی ٹھہر گئی۔ سامنے اسٹیشن کی مختصر اور پرانی عمارت تھی۔ اسٹیشن کے عقب میں شہینہ کے ایک گھر اور تن آور درخت کے نیچے دو تانگے کھڑے تھے۔ سامنے نکری کی ہوئی سڑک تھی جس پر دوڑتا ہوا ایک تانگا تیزی سے اسٹیشن کی عمارت کی سمت بڑھ رہا تھا۔ کچھ مسافر ریل گاڑی کے مختلف ڈبوں سے اترے اور اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھے۔ کچھ سوار ہونے کے لیے افزا تفری کے عالم میں بھاگ دوڑ رہے تھے۔

ایک شخص جو وضع قطع سے ریلوے کا ملازم نظر آتا تھا، ایک ہاتھ میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی اور دوسرے میں المونیم کا گلاس تھامے کھڑکی کے پاس سے گزرا۔ رحیم داد نے اسے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ وہ پیا سا تھا اور پانی پیتا چاہتا تھا۔ یکا یک قریب سے آواز ابھری۔

”آپ کو پیاس محسوس ہو رہی ہے تو میرے پاس پانی موجود ہے۔ اسے جانے دیجئے۔“

رحیم داد نے پلٹ کر دیکھا۔ ساتھ بیٹھا ہوا مسافر اس کی جانب نگاہیں اٹھائے بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ وہ ادھر بیٹھا۔ سر پر بال بہت کم تھے اور ان میں بھی سیاہ کم اور سفید زیادہ تھے۔ وہ ملل کا باریک کرتا اور کھلی موری کا اجلا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ جسم قدرے بھاری تھا۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا۔ آنکھوں پر چوڑے فریم کی عینک تھی۔ چرا بھرا بھرا تھا۔ ہانے پر کسی پرانی چوٹ کا نشان تھا۔ جس سے ناک ٹکونی ہو کر بدو وضع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ خاصا سفری سازو سامان تھا۔ چوڑا چکلا اور اونچا ناشتے دان تھا۔ پانی سے بھری ہوئی صراحی تھی۔ تھرماس تھا۔ دو ٹوکریاں تھیں۔ ایک میں تولیا، کنگھا، صابن، دانی اور ضرورت کی ایسی ہی دیگر اشیاء تھیں۔ دوسری آموں سے بھری ہوئی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور آن بان سے وہ کھانا پیتا اور باوقار نظر آتا تھا۔

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر وہ خاموش نہ رہا۔ کہنے لگا۔ ”یہ کنویں کا پانی ہے۔ اسے پی کر معدہ خراب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ گرمی کے موسم میں ویسے بھی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا اخبار ایک طرف رکھا۔ جھکا صراحی پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس اٹھایا اس میں صراحی سے پانی اٹھایا۔ عین اس وقت انجن زور سے چٹکھاڑا۔ گاڑی کی سیٹی جیٹی۔ ریل گاڑی ایک جھٹکے سے کھسکی اور لوہے کی پٹریوں پر آگے بڑھنے لگی۔

گلاس میں بھرا ہوا پانی پھٹکا اس نے فوراً گلاس مضبوطی سے پکڑ لیا۔ لمحہ بھر توقف کیا۔ پھر گلاس رحیم داد کی جانب بڑھایا۔ رحیم داد نے اسے ہاتھ میں لے لیا۔ ہونٹوں سے لگانا چاہا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ تھرماس اٹھایا۔ اس کا ڈھکنا کھولا۔ برف کی ایک ڈلی نکالی اور گلاس میں

ڈالنے ہوئے بولا۔ ”اب آپ شوق سے پیئیں۔“ اس نے نظریں موڑیں اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سورج انگارے کی مانند دھبہ رہا تھا۔ دھوپ کی تمارت اور چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ بے قرار ہو کر اس نے پہلو بدلا اور آہستہ آہستہ بڑھانے لگا۔ ”غضب کی گرمی پڑ رہی ہے۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔

”ٹھیک کہا جی آپ نے“ آج تو بہت گرمی ہے۔“ رحیم داد نے پانی کا ٹھنڈا ٹھنڈا کھونٹ بھرتے ہوئے اس کی تائید کی۔

”یہی دیکھی گرمی ہے۔ در دیوار سے چنگاریاں اڑ رہی ہیں۔“ اس نے تولیا اٹھا کر چہرے اور گردن کا پھینٹ پونچھا۔ رحیم داد کی جانب دیکھے بغیر نہایت شائستگی سے دریافت کیا۔ ”نام پوچھ سکتا ہوں آپ کا؟“

”چودھری نور الہی“ رحیم داد نے صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔

”تو گویا آپ چودھری صاحب ہیں۔ خوب بہت خوب۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے مسکرا کر اظہار خوش نوئی کیا۔ ”مجھے مرزا اسرار بیگ کہتے ہیں۔ مظفر گڑھ میں کچھ زمین داری ہے۔ وہیں سے آرہا ہوں۔“ اس نے کسی قدر تفصیل سے اپنا تعارف کرایا۔ ”چودھری صاحب“ آپ کا شغل کیا ہے؟“ اسرار بیگ نے قیاس آرائی کی۔ ”بظاہر تو آپ بھی مجھے زمین دار معلوم ہوتے ہیں۔“

”ہاں جی زمین دار ہی ہوں“ رحیم داد نے جواب دیا۔ ”ادھر وہ پال پور میں اپنی زمین داری ہے۔“

”ادھر کیسے آتا ہوا؟“ مرزا اسرار بیگ نے بات آگے بڑھائی۔

”میں تو جی ڈیرہ غازی خاں سے آرہا ہوں۔“ رحیم داد نے مطلع کیا۔ ”ادھر بھی تحصیل راجن پور میں مجھے کچھ زمین الاٹ ہوئی ہے۔“

”متروکہ آراضی ہے؟“ مرزا نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”ہاں جی متروکہ آراضی ہے۔“

”تو گویا آپ بھی مہاجر ہیں۔ بھی بہت خوب۔“ مرزا اسرار بیگ نے بے تکلفی سے اظہار کرت کیا۔ ”چودھری صاحب“ مہاجر تو میں بھی ہوں۔ مظفر گڑھ میں میری جو آراضی ہے وہ بھی میرے کلیم کی بنیاد پر الاٹ ہوئی ہے۔“

رحیم داد نے کچھ کہنا چاہا مگر مرزا نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ”آپ سے تو اب تفصیل سے

بات چیت ہوگی۔ کیوں نہ پہلے کھانا کھالیا جائے؟“ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ ”فی الحال تو کوئی اسٹیشن نزدیک نظر نہیں آتا۔ گاڑی تو دیر ہی میں رکے گی۔“ وہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”بات یہ ہے چودھری صاحب۔ میرا ملازم آگے کے کسی قہر ڈکلاس کپارٹمنٹ میں سفر کر رہا ہے۔ مگر اس کا انتظار کرنا فضول ہے۔ بھوک بھی کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی ہے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”جیسی آپ کی مرضی۔ ویسے مجھے بھوک زیادہ نہیں لگ رہی“ رحیم داد نے تکلف سے کام لیا۔ سامنے کی نشست پر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے مداخلت کی۔ ”میں نے کہا جی، آگے کوٹ اڈو ہے۔ وڈ اسٹیشن ہے۔ وہاں ٹرین دیر تک ٹھہرے گی۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ البتہ مرزا اسرار بیگ نے مڑ کر اس مسافر کی جانب دیکھا۔ بالکل درست فرمایا آپ نے۔ مجھے بالکل خیال نہ رہا کہ کوٹ اڈو پر گاڑی خاصی دیر ٹھہرے گی۔ زیادہ دیر انتظار بھی نہ کرنا پڑے گا۔“ وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوا۔ ”چودھری صاحب، کھانا تو اب وہیں کھانا مناسب رہے گا۔ میرا ملازم آکر کھانا لگا دے گا۔ بڑا مستعد اور فرمانبردار ہے۔ میں ہمیشہ سفر میں اسے اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے جی، کوٹ اڈو ہی پر روٹی کھالیں گے۔“ رحیم داد نے اس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ ”کئی چیز کی ضرورت ہوگی تو اسٹیشن پر مل جائے گی۔“

مرزا اسرار بیگ نے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی اور اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہاں تو آج کل سخت گرمی پڑ رہی ہے۔ سنا ہے ڈیرہ غازی میں تو اور بھی زیادہ گرمی ہے۔ ویسے بھی وہاں کچھ زیادہ ہی گرمی پڑتی ہے۔ علاقہ بھی نہایت پس ماندہ ہے۔ نہ ریل گاڑی ہے نہ کوئی ڈھنگ کی سڑک۔ آمدورفت کے معاملے میں تو ادھر بہت تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔“

”ہاں جی، وہاں کا حال کچھ ایسا ہی ہے۔“ رحیم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اور جی گرمی تو ادھر بہت ہی زیادہ ہے“ اس نے گرمی کی شدت کا سبب بتانے کی کوشش کی۔ ”دور دور تک خشک اور خنجر ہماڑ پھیلے ہیں۔ گرمی تو غیر پڑنی ہی چاہیے۔“

”مجھے بھی ڈیرہ غازی خان میں متروکہ آراضی الاٹ ہو رہی تھی۔ مگر جب وہاں جا کر خود اپنی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لیا تو ارادہ ترک کر دیا۔ زمین داری کے لیے تو نہایت ناموزوں جگہ ہے۔ سنا ہے مزارے بھی بہت سرکش اور اکھڑ ہیں۔“ مرزا اسرار بیگ نے مسکرا کر رحیم داد کو دیکھا۔ بے تکلفی سے گویا ہوا۔ ”بھئی چودھری صاحب، آپ ادھر کہاں پھنس گئے؟“

”بس جی پھنس ہی گیا۔“ رحیم داد نے سنجیدگی سے کہا۔ ”دلاور والا میں اڑھائی سو ایکڑ زمین نہ ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ تو جی آپ کو پتہ ہی ہے الاٹ ہو ہی نہیں سکتی۔ پر اب میں نے سوچا اسے فروخت کروں۔ یوں سمجھئے جی، سودا بھی طے ہو چکا ہے۔“

”بہت مناسب فیصلہ کیا آپ نے۔“ مرزا نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”بات دراصل یہ ہے ادھر زمیں داری کرنا ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ وہاں تو صرف بلوچ سرداری داری کر سکتے ہیں۔“

”ادھر تو جی، حکومت ہی سرداروں کی ہے۔ جلیں ان کی، کچھری عدالت ان کی۔“ رحیم داد نے ہا کر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”سرکاری افسر بھی جیسے ان کے اپنے بندے ہیں۔ جو چاہتے ہیں ان کو کر لیتے ہیں۔ نہ کریں تو تبادلہ کر دیتے ہیں۔ ان کی تو جی اوپر تک پہنچ ہے۔“

”میں نے بھی یہی سنا ہے۔ حالانکہ میرا وہاں بہت مختصر قیام رہا۔ مگر چند ہی روز میں صورت حال ع ہو گئی۔“ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کی رائے سے اتفاق کیا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ پھر گویا۔ ”چودھری صاحب یہ متروکہ آراضی کے معاملے میں ڈھائی سو ایکڑ کی قید لگانے کی ننگ اپنی میں نہیں آئی۔ بہت پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔“

”ہاں جی پریشانی تو بہت ہوتی ہے۔“

”اب یہی دیکھیے، خوشاب میں بھی مجھے اتنی ہی زرعی آراضی الاٹ ہوئی ہے۔ میں وہیں جا رہا ہوں۔“ مرزا اسرار بیگ کے لہجے سے بے زاری ہو رہا تھا۔ ”یہ ادھر ادھر بکھری ہوئی زمیں داری اور دوسری کا باعث بنتی ہے۔ ایک ہی جگہ ساری زمین داری ہو تو یکسوئی اور اطمینان سے اس کی بھال ہو سکتی ہے۔ میری اس رائے سے آپ بھی اتفاق کریں گے۔“

”ہاں جی، بات تو آپ نے ٹھیک ہی کہی۔ پر کیا کریں حکومت نے پالیسی ہی ایسی بنا رکھی ہے۔“

”ہم داد نے فوراً تائید کی۔“ ”ویسے جی، میری اصلی زمین داری تو ضلع منٹھری ہی میں ہے۔“

”کیا میں معلوم کر سکتا ہوں وہاں کتنی آراضی ہے آپ کے پاس؟“ مرزا اسرار بیگ نے نہایت نگلی سے سوال کیا۔

”لگ بھگ ۳۲ مرعے ہوں گے۔“ رحیم داد نے بڑے فخر سے مرزا اسرار بیگ کو مطلع کیا۔

”تب تو چودھری صاحب آپ خاصے بڑے زمین دار ہیں۔“ مرزا اسرار بیگ نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے پاس بھی بس اتنی ہی آراضی ہوگی۔“ اس نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔ ”کچھ زیادہ ہوگی۔ کوئی ساڑھے گیارہ بارہ سو ایکڑ۔ مگر صاحب یہ بھی کیا زمین داری ہوئی۔ ادھر پنجاب اور ادھر

سندھ میں تو ایسے بھی زمین دار ہیں جن کے پاس ہزاروں ایکڑ زمین ہے۔ سرحد اور بلوچستان کا حال تو صحیح طور پر معلوم نہیں۔ سنا ہے وہاں بھی بعض خوانین اور سرداروں کے پاس اتنی ہی بڑی زرعی آراضی ہے۔

”ضرور ہوگی جی۔“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”ان کے سامنے تو جی ہم بہت چھوٹے زمیں دار ہوئے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”بالکل بجا فرمایا آپ نے۔“ مرزا نے اتفاق رائے کیا۔ ”ویسے میری بھی اصلی زمیں داری سندھ میں ہے۔ میرپور خاص کا نام تو آپ نے سنا ہی ہو گا۔ وہیں میری زمین ہے۔ کچھ الاٹمنٹ کے ذریعے ملی ہے۔ کچھ خریدی ہے۔“

”دوسری جگہ کی زمینیں فروخت کر کے خریدی ہوگی۔“ رحیم داد نے نہایت بھونٹے پن سے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

”نہیں جناب، ایسی کوئی بات نہیں۔“ مرزا اسرار بیگ کو رحیم داد کا رویہ شاق مگزا۔ مگر اس نے درگزر کیا۔ وضاحت کے طور پر بتایا۔ ”چودھری صاحب، میرا معاملہ دوسرے ماجرین سے بہت مختلف ہے۔ میں نے ہجرت کرنے سے پہلے ہی اپنا کچھ روپیہ یہاں منتقل کر دیا تھا۔ زمین کا بیڑ حصہ میں نے اسی روپے سے خریدا۔“

”برا نہ منائیں جی، بہت سے ماجرین نے اپنی زمیں داری اسی طرح بیچائی ہے۔“ رحیم داد نے اپنے موقف کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس دفعہ اس کا لہجہ نرم تھا اور اس میں معذرت کا بھی پہلو تھا۔

”ایسا ہوا ہے اور بہت ہوا ہے۔“ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ ”اور ہونا بھی چاہیے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ادھر ادھر بکھری ہوئی زمیں داری میں بڑی درد سری اٹھانا پڑتی ہے۔ ایک جگہ زمیں داری ہو تو اطمینان سے دیکھ بھال ہوتی ہے۔“

”ویسے جی، متروکہ جائیداد کے معاملے میں بہت گڑبڑ ہوتی۔“

”بالکل درست فرمایا آپ نے۔“ مرزا اسرار نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”چودھری صاحب، آپ سے کیا بتاؤں، متروکہ جائیداد کے سلسلے میں کیسی لوٹ مار مچتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسے باقاعدہ کاروبار بنا لیا ہے۔ جگہ جگہ الاٹمنٹ حاصل کرتے ہیں اور جوں ہی موقع ملتا ہے متروکہ مکانات اور دکانیں پکڑی پر دے کر یا بیچ کر کسی دوسرے شرکی طرف نکل جاتے ہیں۔ اگر دھندے میں لاکھوں کے وارے نیارے ہو گئے۔“

”ضرور ہو گئے ہوں گے جی۔“

”جعلی فروختیت اور جعلی کلیم فارموں کی بنیاد پر متروکہ آراضی کا الاٹمنٹ ایک علیحدہ ہی چکر ہے۔ میں آپ سے کیا کیا بتاؤں۔“ مرزا اسرار بیگ نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ”چودھری صاحب، اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”بھائی، ایک دن مرکز اللہ کو بھی منہ دکھانا ہے۔ اس وقت نہ دولت کام آئے گی نہ جائیداد۔“ مرزا اسرار نے ران پر ہاتھ مارا اور گرزین ہلا کر گنگنانے لگا۔

سکندر جب چلا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

رحیم داد متاثر ہو کر بولا۔ ”ہاں جی، اصلی گل تو یہی ہے۔“ اس کے لہجے سے خفت اور پشیمانی عیاں تھی۔

مرزا اسرار بیگ نے مزید بات چیت نہ کی۔ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ سامنے چٹیل میدان تھا جس میں گولے منڈلا رہے تھے۔ کہیں کہیں کیکر کی جھاڑیاں تھیں، جو سایوں کی مانند دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھیں۔ ریل گاڑی فرائے بھرتی ہوئی لوہے کی پیڑیوں پر تیزی سے دوڑ رہی تھی۔

کوٹ اڈو آگیا۔ ریل گاڑی اسٹیشن کے سامنے پہنچ کر ٹھہر گئی۔ پلیٹ فارم پر بھاگ دوڑ مچی تھی۔ طرح طرح کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ڈبے کے چند مسافر دروازہ کھول کر نیچے اتر گئے۔ کچھ نئے مسافر سوار ہوئے اور اپنا سامان ادھر ادھر رکھنے لگے۔ مرزا اسرار بیگ کا ملازم بھی ڈبے میں داخل ہوا۔ وہ بھی ادھیڑ تھا۔ ملگجالباس، چہرے پر چھدری ڈاڑھی۔ سر پر دوپٹی سفید ٹوپی۔ کندھے پر چار خانے کا رد مال۔ وہ پریشان اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

مرزا نے اسے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”تم آگئے۔“

”سرکار! آپ نے کھانا تو ابھی نہیں کھایا۔“ ملازم نے ناشتے دان پر نظر ڈالی۔

”میاں عبدل، تم بھی کمال کرتے ہو۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”تمہارا ہی انتظار ہو رہا تھا کہ تم آؤ، کھانا لگاؤ۔ مگر تم نے تو پلٹ کر خبری نہ لی۔ نہ آتے تو خود ہی کھانا نکالنا پڑتا۔“

”زرا آنکھ لگ گئی تھی۔ معافی چاہتا ہوں۔“ عبدل نے عاجزی سے صفائی پیش کی۔ ”میں تو ہر اسٹیشن پر حاضری دیتا۔ مگر کیا کروں، جگہ دور کے ڈبے میں ملی ہے۔ چھوٹے اسٹیشنوں پر تو گھڑی بھر کے لیے گاڑی ٹھہرتی ہے۔ ڈرتا ہوں بھاگ دوڑ میں کہیں ٹرین نہ چھوٹ جائے۔ مجھے اپنی نہیں آپ کی تکلیف کی فکر تھی۔“

”اچھا اب تم باتیں کم کرو۔“ مرزا اسرار بیگ نے اسے جھڑکا۔ ”کھانا لگاؤ۔ سخت بھوک لگی

ہے۔

عبدل نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ ٹوکری سے زرد رنگ کا چھپا ہوا چھوٹا سا دسترخوان نکالا، مرزا اسرار اور رحیم داد کے درمیان نشست پر بچھایا۔ فرش پر بیٹھ کر ناشتے دان کھولا۔ اور دسترخوان پر کھانا چن دیا۔ کھانے میں پرائٹھے تھے۔ بھنا ہوا مرغ تھا۔ کباب تھے۔ آلو کا سالن تھا۔ بھنڈی کی بھجیا تھی۔ آم کا اچار تھا۔

عبدل نے گلاس میں ہاتھ دھوئے کاپانی دیا۔ مرزا اسرار بیگ اور رحیم داد نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر پانی سے دھوئے اور کھانے کی جانب رجوع ہو گئے۔ کھانا ڈال فرمایا۔ مرغن تھا اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ دونوں رغبت سے کھانا کھانے لگے۔ عبدل نے ٹوکری سے آم نکالے اور ایک پلیٹ میں کٹ کٹ کر ان کی قاشیں رکھنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ اسرار کر کے رحیم داد کو کھانا کھلانے لگا۔ پلیٹ اس کی جانب سرکاتا۔ بار بار کھانے کے لیے کہتا۔ رحیم داد نے بھی تکلف سے کام نہ لیا۔ ذہب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ دونوں کھانے سے فارغ بھی نہ ہوئے تھے کہ گاڑی کی آبی ابھری۔ عبدل نے جانا چاہا تو مرزا اسرار بیگ نے اسے روک لیا۔ ”اب کھانا کھلا کر ہی جانا۔ اگلے اسٹیشن پر اتر کر اپنے کپارٹمنٹ میں چلے جانا۔“

”جو حکم سرکار کا۔“ عبدل نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

ریل گاڑی شور مچاتی آگے بڑھی۔ رفتہ رفتہ اس کی رفتار تیز ہوتی گئی۔ کوٹ آدو کا اسٹیشن، مکانات اور کوچہ و بازار پیچھے رہ گئے۔ رحیم داد اور مرزا اسرار بیگ کھانے سے فارغ ہوئے تو عبدل نے بچا ہوا کھانا اٹھا کر ایک طرف رکھا۔ آم کی قاشوں سے بھری ہوئی پلیٹ دسترخوان پر رکھ دی۔ مرزا نے پلیٹ اٹھائی اور رحیم داد کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”چودھری صاحب، یہ آم ملاحظہ فرمائیے۔ میرے اپنے باغ کے ہیں۔ میں نے باغیت اور ملیح آباد سے خاص طور پر آم کے پودے منگوا کر لگائے ہیں۔ آپ کو ضرور پسند آئیں گے۔“

رحیم داد کو آم پسند بھی آئے، عمدہ اور خوش ذائقہ تھے۔ حالانکہ اس نے کچھ زیادہ ہی کھانا کھایا تھا۔ مگر آم اس قدر لذیذ تھے کہ وہ ہاتھ نہ روک سکا۔ ایک کے بعد دوسری قاش اٹھاتا رہا۔ مرزا اسرار بیگ خوش خوراک تھا۔ وہ بھی رغبت اور ذوق و شوق سے آم کھاتا رہا۔ پلیٹ خالی ہو گئی تو عبدل نے اور آم نکالے۔ مگر رحیم داد نے منع کر دیا۔ مرزا اسرار کے اصرار کرنے کے باوجود آم کھانے پر آمادہ نہ ہوا۔

دونوں نے ایک بار پھر کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر دھوئے۔ برف کا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی پیا اور ٹائیس پھیلا کر اطمینان سے بیٹھ گئے۔ عبدل نے دسترخوان اٹھایا۔ جھاڑا اور تہہ کر کے ٹوکری میں رکھ دیا۔ جھوٹے برتن اٹھا کر دھونے کی غرض سے غسل خانے میں چلا گیا۔ واپس آکر اس نے برتنوں کو بھی ٹوکری میں رکھا اور بچا کھچا کھانا لے کر ایک گوشہ میں بیٹھ کر کھانے لگا۔

مرزا اسرار بیگ آنکھیں بند کیے سوئے کی کوشش کر رہا تھا۔ رحیم داد بھی اوجھ رہا تھا۔ ریل گاڑی کھٹ کھٹ کرتی لوہے کی پٹریوں پر سرپٹ دوڑتی رہی۔ ایک چھوٹا اسٹیشن آیا۔ گاڑی رکی۔ عبدل اتر اتر اپنے ڈبے کی جانب چلا گیا۔ مرزا اسرار نے کھڑکی سے گردن نکال کر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

ریل گاڑی آگے بڑھی۔ اور تیزی سے دوڑنے لگی۔ گرمی اب اور بڑھ گئی تھی۔ مرزا نے پانوں کی ڈبیا اٹھائی۔ کھولی اور رحیم داد کی جانب بڑھائی۔ مسکرا کر کہا۔ ”لیجئے پان سے شوق فرمائیے۔“ رحیم داد نے انکار کر دیا۔ ”نہیں جی، میں پان نہیں کھاتا۔“ مرزا نے مزید اصرار نہیں کیا۔ ڈبیا سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھا۔ بوڑھ کھولا۔ چھالیا اور تمباکو نکالی۔ چٹکی بھر کر منہ میں ڈالی۔ چند لمحے تک وہ پان چباتا رہا۔ پھر کھڑکی سے منہ باہر نکال کر بیک تھوکی۔ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ ”چودھری صاحب، آپ کہاں جا رہے ہیں۔“

”میں نے جی لور جانا ہے۔“

”آپ کا تو خاصا لمبا سفر ہے۔“ مرزا نے مسکرا کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”کبھی آپ کا کراچی آنا نہیں ہوتا؟“

”نہیں جی، میں اب تک کراچی نہیں گیا۔“ رحیم داد نے سادگی سے جواب دیا۔ ”میرا مستقل قیام کراچی ہی میں رہتا ہے۔“ مرزا اسرار بیگ نے بتایا۔ ”پہلے جمشید روڈ پر رہتا تھا۔ وہاں مجھے ایک کوٹھی الاٹ ہوئی تھی۔ کئی سال اس میں مقیم رہا۔ پھر اسے فروخت کر دیا۔“ باتوں کی رو میں اسے بالکل یاد نہ رہا کہ کچھ ہی دیر پہلے وہ متروکہ مکانات اور دکانیں الاٹ کرانے اور انھیں فروخت کر کے نئے الاٹمنٹ حاصل کرنے کے رجحان کی شدید مذمت کر چکا تھا۔

”اب آپ کہاں رہتے ہیں جی؟“

”اب تو میں اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتا ہوں۔“ مرزا نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ سرکاری افسر ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی میں اس نے پچھلے ہی سال اپنا بنگلہ تعمیر کرایا ہے۔ نہایت خوبصورت اور عالیشان ہے۔ آپ اسے دیکھ کر خوش ہوں گے۔“ اس نے ایک بار پھر پان کی پیک تھوکی۔

”میں جی گورداسپور میں ہوتا تھا۔“

”ویسے ہندوستان میں میری جو کوئی تھی وہ بھی کم شاندار نہ تھی۔ زمین داری بھی بہت بڑی تھی۔ پورے تین گاؤں تھے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”سب کچھ چھوٹ گیا۔ خواب و خیال ہو گیا۔“

”ہاں جی سب ہی کچھ چھوٹ گیا۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔

”کراچی آئیے تو غریب خانے پر ضرور تشریف لائیے۔ بلکہ میرے ساتھ ہی قیام کیجئے۔“ مرزا نے کہا۔ ”میں رخصت ہونے سے پہلے آپ کو اپنا پتہ اور ٹیلی فون نمبر دے دوں گا۔ کراچی آنے کا جب بھی ارادہ ہو تو ٹیلی فون کر دیجئے گا یا تار سے مطلع کر دیجئے گا۔ اسٹیشن پر اپنی کار بھیج دوں گا۔ آپ کو مطلق زحمت اٹھانا نہ پڑے گی۔“

”کراچی آؤں گا تو جی آپ کو ضرور تار بھیج دوں گا۔“

”ضرور آئیے۔ اب آپ سے ملاقات ہو گئی ہے تو اسے برقرار بھی رہنا چاہیے۔“ مرزا نے اصرار کیا۔ ”یہ بھی محض اتفاق ہے۔ ورنہ میں عام طور پر فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتا ہوں۔ اس ٹرین میں صرف ایک ہی فرسٹ کلاس کپار ٹمنٹ ہے۔ اور اس کی بھی تمام سیٹیں پہلے ہی سے ریزرو تھیں۔ مجبوراً سیکنڈ کلاس میں سفر کرنا پڑا۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ وہ اس کی گفتگو سے اتنا مرعوب ہو گیا تھا کہ مزید بات چیت نہ کر سکا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ مگر مرزا اسرار بیگ زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکا۔ کہنے لگا۔ ”میرا مشورہ مانیں تو ہمیشہ فرسٹ کلاس ہی میں سفر کریں۔ کرایہ تو زیادہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ مگر سفر آرام و سکون سے گزرنے کے ساتھ ساتھ تعلقات پیدا کرنے اور مراسم بڑھانے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔“

رحیم داد کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ وہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ مرزا اسرار بیگ فوراً تازہ گیا۔ مسکرایا اور کھل کر بتانے لگا۔ ”چودھری صاحب‘ یہ تو آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ زندگی میں اثر و رسوخ پیدا کیے بغیر کام نہیں چلتا۔“ اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ ”فرسٹ کلاس میں اعلیٰ سرکاری حکام کے علاوہ اسمبلیوں کے ممبروں اور کبھی کبھی تو وزیروں سے بھی مراسم پیدا کرنے کے مواقع مل جاتے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے سفرو سیلہ ظفر۔ میں نے تو بھائی بزرگوں کے اس قول کو گرہ میں باندھ لیا ہے۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔

رحیم داد بھی ہنسنے لگا۔

چند لمحے خاموشی رہی، پھر مرزا اسرار بیگ کی آواز ابھری۔ اس نے بات چھیڑی۔ ”چودھری

صاحب‘ ہندوستان کے کس علاقے سے آپ کا تعلق رہا ہے؟“



اوپر کی نشست پر لیٹا ہوا مسافر اتر کر نیچے آگیا۔ وہ چھریے بدن کا قد آور جوان تھا۔ وہ سامنے کی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ بش شرٹ کی جیب سے کنگھا نکالا اور سر کے بکھرے ہوئے بالوں کو

”وہاں تو بڑا خون خرابا ہوا۔ مسلمانوں کا زبردست قتل عام ہوا۔ سکھوں اور ہندوؤں نے بڑے مظالم ڈھائے۔“ اس نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”بھائی‘ آپ نے تو بہت دکھ اٹھائے ہوں گے۔ بڑی تباہی و بربادی دیکھی ہوگی۔ نہ جانے کیسی کیسی مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھا کر پاکستان پہنچے ہوں گے۔“

”نہ پوچھئے جی کیا کیا دکھ نہ اٹھانے پڑے۔“ اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”بس کسی نہ کسی طرح ادھر پہنچ ہی گیا۔“ رحیم داد نے چودھری نور الہی مرحوم کی اس الم ناک روداد کو شانے سے اجتناب برتا جسے وہ اپنی ذات سے منسوب کر کے اکثر سنا تا تھا اور اس کی بنیاد پر سننے والوں کی ہمدردی حاصل کرتا تھا۔ مگر اب وہ احتیاط سے کام لیتا تھا۔ اور تفصیل میں جانے سے گریز کرتا تھا۔ مرزا اسرار بیگ کو تو وہ قصداً کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ مرزا کی گفتگو سے یہ تو واضح ہی ہو چکا تھا کہ وہ مہاجر ہے۔ ممکن ہے گورداسپور میں بھی رہ چکا ہو یا وہاں کے کسی ایسے مہاجر خاندان سے واقف ہو جو چودھری نور الہی مرحوم کا عزیز یا رشتہ دار ہو۔ تفصیلات بتانے میں خطرے کا امکان تھا۔ اور وہ کوئی خطرہ مول لینا نہ چاہتا تھا۔ اس نے چہرے پر افسردگی کے اثرات پیدا کیے۔ بجھے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”اب تو جی ساری باتیں پرانی ہو گئیں۔ کبھی یاد آجاتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں‘ چودھری صاحب‘ وہ ایک ڈراؤنا خواب ہی تھا۔“ مرزا اسرار بیگ نے آہ سرد کھینچی۔ ”گھربار‘ مال دولت‘ عزت و ناموس سب کچھ لٹا اور اسے لٹتے ہوئے ان گناہ گار آنکھوں سے دیکھنا بھی پڑا۔“ اس کے چہرے پر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ ”کاش‘ یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ نہ رہتا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ اس نے عینک اتاری۔ رومال سے آنسو پونچھے۔ ”چودھری صاحب‘ ایک بار جب یہ زخم ہرے ہو جاتے ہیں تو کلیجہ کٹنے لگتا ہے۔ ایسی ٹپس اٹھتی ہے کہ ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ بے اختیار دل بھر آتا ہے۔“

رحیم داد اس کا حزن و ملال دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ”صبر کریں جی‘ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا۔ اب تو صبری کرنا پڑے گا۔“

مرزا اسرار بیگ کھویا کھویا سا بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر افسردگی چھائی تھی۔

درست کرنے لگا۔

مرزا اسرار بیگ نے اس کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ وہ نظریں جھکائے خیالات میں غرق تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے گردن اٹھائی۔ رحیم داد کی جانب دیکھا۔ اور دل گرفتہ ہو کر بولا۔ ”چودھری صاحب سچ پوچھے تو پاکستان ہمارے اور آپ کے ایسے لئے بنے اور ستم رسیدہ مہاجرین کی قربانیوں سے حاصل ہوا ہے۔“ اس کے لہجے میں اچانک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ”ہم نے سب کچھ لٹا کر اور اپنے پیاروں کے خون کا نذرانہ دے کر یہ نیا وطن بنایا ہے۔“

رحیم داد تو خاموش رہا۔ مگر اس بار سامنے بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز ابھری۔ وہ اٹھ کر ہلے بالوں کو کٹھکے سے سنوارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مرزا صاحب“ آپ نے بالکل درست فرمایا۔ واقعی آپ نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں زبردست قربانیاں دی ہیں۔ میں تو اس کا یقینی شاہد ہوں۔“

مرزا اسرار بیگ نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ ”آپ کی تعریف؟“ اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

”معاف کیجئے، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”خاکسار کو صغیر احمد کہتے ہیں۔“ اس نے کنگھا جیب میں رکھا۔ ”مرزا صاحب“ آپ تو شاید مجھے نہ جانتے ہوں۔ مگر میں آپ کی ذات گرامی سے بخوبی واقف ہوں۔ دہرہ دون کا رہنے والا کون آپ سے واقف نہ ہو گا۔ آپ تو بڑی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”میں تو آپ کو اس وقت سے جانتا ہوں، جب آپ ضلع پکری میں عرائض نویس تھے۔ اور پھر آپ کا وہ دور بھی دیکھا، جب آپ کانگریسی نیتا بن گئے۔ ان دنوں آپ کھادی کا کرتا اور پاجامہ اور بنجام کی پٹھی ہوئی چپل پہنتے تھے۔ گاندھی ٹوپی لگاتے تھے۔ پنڈت گوبند ولیمہ چنت، رفیع احمد قدوائی، حافظ محمد ابراہیم اور ایسے ہی دوسرے بڑے کانگریسی نیتاؤں کی آمد پر پیش پیش ہوتے تھے۔ ان کا سواگت کرتے تھے۔ گلے میں ہار پھول ڈالتے تھے۔ زندہ باد اور بے ہند کے نعرے لگاتے تھے۔“

”میاں اب بس بھی کیجئے۔“ مرزا اسرار بیگ نے صغیر احمد کو ٹوکا۔ ”خدا معلوم آپ کس کا ذکر لے بیٹھے۔ میرا تو کبھی کانگریس سے تعلق نہیں رہا۔ معلوم ہوتا ہے آپ کو میرے بارے میں مغالطہ ہوا۔“

”مرزا صاحب“ آپ کے بارے میں تو ہرگز مغالطہ نہیں ہو سکتا۔“ صغیر احمد نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”میں اوپر لیٹا بہت دیر سے آپ کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے تو آپ کی وہ عالیشان کوٹھی بھی دیکھی ہے جو رام گلی کے کنگڑ پر واقع تھی۔“ وہ بدستور مسکراتا رہا۔ ”ممکن ہے وہ کبھی کوٹھی رہی ہو مگر میں نے جسے دیکھا، وہ ایک بوسیدہ مکان تھا۔ جس کی دیواریں کالی سے کالی پڑ چکی تھیں۔

دروازے پر کواڑوں کے بجائے پھنار پانا پردہ پڑا رہتا تھا۔ اور اس کا مالک بھی ماتادین حلوائی تھا۔ وہی ماتادین حلوائی، جس کی صدر بازار میں بہت بڑی مٹھائی کی دکان تھی۔“

”آپ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔“ مرزا اسرار بیگ نے اس بار تلخ لہجے میں مداخلت کی۔ ”خدا معلوم آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔ میرے تو فرشتوں کو بھی پتہ نہیں کہ رام گلی کہاں ہے۔“

”آپ کو پتہ نہیں، مگر مجھے پتہ ہے۔“ صغیر احمد اپنی بات پر اڑا رہا۔ ”ہاں، یہ پتہ نہیں کہ آپ کی زمیں داری کے وہ پورے تین گاؤں کہاں واقع تھے۔ جن کا آپ ذکر فرما رہے تھے۔ معاف کیجئے، میں نے تو آپ کو ہمیشہ پھٹے حال دیکھا۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر عجز و انکسار کا مظاہرہ کیا۔ ”البتہ الیکشن کا زمانہ آپ کے عروج کا زمانہ تھا۔ اس وقت آپ کا لباس بھی اجلا ہوتا۔ ہر وقت گلے میں پان کا بیڑا دبا ہوتا۔ اور بیڑی کے بجائے سگریٹ سے شوق فرمانے لگے تھے۔ اور جب آپ ضلع کانگریس کمیٹی کے جوائنٹ سیکریٹری بن گئے تب تو آپ کے ٹھانڈے باٹ اور بھی بڑھ گئے تھے۔ سنا ہے ان دنوں رائے صاحب کنور کھیلالال کی جانب سے آپ کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا تھا۔ آپ

کنور صاحب کو تو اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ وہی جن کے دہرہ دون میں چائے کے باغات تھے۔“

”دیکھئے میاں صاحبزادے، آپ بہت زیادتی فرما رہے ہیں۔“ مرزا اسرار بیگ نے خفا ہو کر کہا۔ ”مرزا صاحب میں تو کوئی زیادتی نہیں کر رہا ہوں۔“ وہ نہایت اطمینان سے بولتا رہا۔ ”زیادتی تو آپ نے صرف مجھ سے نہیں بلکہ دہرہ دون کے سارے ہی مسلمانوں کے ساتھ اس وقت فرمائی تھی جب آپ مسلم لیگ کے امیدوار کے مقابلے میں صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنا چاہتے تھے۔ میں ان دنوں مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں تھا اور دوسرے مسلمان طلباء کے ساتھ میں نے آپ کے گھر کے سامنے بھوک ہڑتال بھی کی تھی تاکہ آپ اس ارادے سے باز آجائیں۔“

”بھئی آپ کہاں کی ہانک رہے ہیں؟“ اس دفعہ مرزا اسرار بیگ نے درشت لہجے میں کہا۔ ”معلوم نہیں آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ استغفر اللہ، کیسا الیکشن، کس کا الیکشن؟ میں نے تو کبھی اسمبلی و سبلی کا الیکشن نہیں لڑا۔“

”لڑتے تو آپ ضرور۔“ کوشش بھی پوری پوری کی تھی۔ مگر کانگریس پارلیمنٹری بورڈ نے ٹکٹ ہی نہیں دیا۔“ صغیر احمد نے کہا۔ ”سنا ہے، آپ نے تو بورڈ کے فیصلے کے خلاف کانگریس ہائی کمان سے اپیل بھی کی تھی لیکن وہ بھی مسترد ہو گئی۔ اس کے باوجود آپ کی وفاداری میں فرق نہ آیا۔ ان دنوں نیشنلسٹ مسلم کی اصطلاح وضع ہوئی تھی۔ آپ بھی نیشنلسٹ مسلم بن گئے تھے اور کانگریسی امیدوار کے لیے دن رات بھاگ دوڑ کرتے تھے۔“ وہ کھکھلا کے ہنسا۔ ”یہ خاکسار اس زمانے

میں طلباء کے اس گروہ میں شامل تھا جس کا کام نیشنلسٹ مسلمانوں کے جلسوں کو دہرم برہم کرنا اور ناکام بنانا ہوتا تھا۔ ”اس نے مرزا اسرار بیگ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”آپ کو تو اچھی طرح یاد ہو گا۔ ایک بار انتخابی جلسے میں زبردست ہنگامہ ہوا۔ لائیں اور ڈنڈے چلے۔ کرسیاں اٹھا اٹھا کر پھینکی گئیں۔ ایک کرسی آپ کے چہرہ انور پر لگی۔ آپ شاید جلسے کی صدارت فرما رہے تھے۔ کرسی آپ کے چہرے پر ایسی لگی کہ ناک زخمی ہو گئی۔ آپ کو اسپتال جانا پڑا تھا۔“

رحیم داد نے جھٹ مرزا اسرار بیگ کی ٹکنی اور بد وضع ناک کی جانب دیکھا۔ اور یک لخت دیکھتا رہا۔ غور کرتا رہا کہ ناک پر چوٹ کا نشان بھی ہے۔

صغیر احمد نے رحیم داد کی جانب توجہ نہ دی۔ نہایت اطمینان سے بولتا رہا۔ ”مرزا صاحب“ آپ اسپتال سے نکلے تو لوٹوٹے لپاڑے آپ کی ناک دیکھتے تھے، اور شرارت سے مرزا سنگھاڑا کا نعروں لگاتے تھے۔ تب سے آپ کا نام مرزا سنگھاڑا پڑ گیا۔ جدھر نظر اٹھتی دیواروں پر مرزا سنگھاڑا لکھا ہوا نظر آتا۔ آپ کے عجیب و غریب کارٹون بنے ہوتے۔“

”زبان سنہال کر بات کریں۔“ مرزا اسرار بیگ ایک دم پھٹ پڑا۔ غصے سے چہرہ سرخ پڑ گیا۔ ”برداشت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔“ وہ غیظ و غضب کے عالم میں ہانپنے لگے۔ ”آپ حد سے تجاوز کرتے جا رہے ہیں۔“

مرزا اسرار کی اونچی آواز سن کر ڈبے میں بیٹھے ہوئے تمام مسافر دونوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ صغیر احمد کے چہرے سے بھی اب مسکراہٹ اور شگفتگی غائب ہو چکی تھی۔ اس نے جیکسی نظروں سے دیکھا اور تڑپ کر بولا۔ ”مرزا صاحب“ ان زخموں کو بھی تو یاد کیجئے جو آپ نے ستم رسیدہ مسلمانوں کو محض سیاسی اختلافات کی بنا پر لگائے تھے۔ یاد کیجئے وہ دن جب دہرہ دون میں فسادات کی آگ بھڑکی۔ ہر دروازے سے شراباریوں کے غول کے غول دہرہ دون پہنچنے لگے اور مقامی ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ مسلمانوں پر حملے کرنے لگے۔ راشٹرہ سیوک سنگھ کے والدین خنجر اور بلم اٹھائے ہر طرف دندناتے پھرتے تھے۔ مسلمانوں کے خلاف کھلم کھلا اشتعال انگیز نعرے لگاتے تھے۔“

ریل گاڑی پٹریوں پر تیزی سے دوڑتی رہی۔ ڈبے کے تمام مسافر صغیر احمد کی جانب دیکھ رہے تھے اور وہ جیسے لمبے میں بول رہا تھا۔ ”مرزا صاحب“ آپ کو وہ رات تو یاد ہو گی جب متاثرہ محلوں کے مسلمان کسی نہ کسی طور داسرے روڈ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ وہ مسلمانوں کا مضبوط گڑھ تھا۔ مگر بلوائیوں کی اس پر نگاہ تھی۔ انھوں نے اس رات حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تمام تیاریاں مکمل تھیں۔“

”پر حملہ تو جی ہندوؤں اور سکھوں نے کرنا تھا۔“ رحیم داد نے مرزا اسرار بیگ کی حمایت میں راجت کی۔ ”مرزا صاحب کو ان کے حملے سے کیا لیتا تھا۔“

”سنئے جائیے۔“ صغیر احمد نے رحیم داد کی طرف دیکھا۔ ”جب حملے کی اطلاع مسلمانوں کو پہنچی تو ان کا ایک وفد چھپتا چھپاتا کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب کے پاس پہنچا۔ درخواست کی کہ مسلمانوں کی جان و مال بچانے کے لیے اعلیٰ حکام سے مدد دلائی جائے۔ میں اس وفد میں شامل تھا۔ مجھے یاد ہے۔“ اس نے مرزا اسرار بیگ کو مخاطب کیا۔ ”مرزا صاحب“ آپ کو بھی اچھی طرح یاد ہو گا کہ آپ نے کسی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جب بار بار گڑا گڑا کر فریاد کی۔ دہائی دی تو آپ نے دھکار دیا تھا۔ اور طنزیہ فرمایا تھا، میرے پاس کیوں آئے ہو؟ پاکستان جاؤ۔ تم نے اپنا پاکستان بنا لیا۔ اب تم کو وہیں اماں ملے گی۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ یاد ہے نا آپ کو؟ آپ کو شاید اب یاد نہ رہا ہو۔ مگر مجھے اب تک ایک ایک بات یاد ہے۔ آپ کا ٹولیس کمیٹی کے دفتر میں نہایت آن بان سے کرسی پر بیٹھے تھے اور نہایت اطمینان سے پان چہا رہے تھے۔“

”کیوں مرزا صاحب“ یہ سچ کہہ رہے ہیں؟“ صغیر احمد کے برابر بیٹھے ہوئے ایک مسافر نے دریافت کیا۔

”بھائی مجھے تو کچھ خبر نہیں۔ انھی سے پوچھو۔“ مرزا اسرار بیگ نے صغیر احمد کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آواز میں ہلکی ہلکی لرزش تھی۔ ”یہ جو کچھ کہیں ٹھیک ہے، میں بوڑھا ہیہ جوان۔ میں ان کے ساتھ دھینگا مشتی تو کرنے سے رہا۔“

”آگے کیا ہوا جی؟ ہندوؤں اور سکھوں کے حملے کا کیا بنا؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔

”وہ تو مہادیو تیگی کو وعا دیجئے کہ انھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو اس رات قتل و غارتگری سے بچالیا۔“

”وہ کون تھے جی؟“

”اس وقت وہ یوپی اسمبلی کے ممبر تھے۔“ صغیر احمد نے بتایا۔ ”مرزا صاحب کی طرف سے نا امید ہونے کے بعد مسلمانوں کا وفد ان کے پاس پہنچا۔“

”پر وہ تو ہندو تھا۔ وہ کیا مدد کرتا۔“ صغیر احمد کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر نے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

”وہ نہ صرف ہندو ہیں بلکہ کٹر کانگریسی بھی ہیں۔“ صغیر احمد نے جواب دیا۔ ”انھوں نے وفد کی

اس کا لہجہ بدستور ٹھنڈی تھا۔ ”آپ مطلق پریشان نہ ہوں۔ نہ میں سی آئی ڈی میں ہوں نہ میرا
ہاں سے تعلق ہے۔ میں محکمہ زراعت سے وابستہ ہوں۔ سینڈ کلاس میں دیکھ کر آپ میرے
ہاں میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ میں معمولی سرکاری ملازم ہوں۔ تھل ڈیو لمینٹ
جیکٹ کے سلسلے میں ریگ زار کی خاک چھانٹا پھرتا ہوں۔ عام طور سے تھرو کلاس میں سفر کرتا
ہاں کبھی کبھار انٹر میں۔ آج تھرو اور انٹر کلاس میں جگہ نہ مل سکی تو سینڈ کلاس میں بیٹھ گیا۔
ت بھر کا جاگا ہوا بھی تھا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”بہر حال آپ کو کسی طور
ہاں ہونے کی ضرورت نہیں۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ مار اتنی عام ہے کہ کس کس کو جعلی فرد
بت، جعلی کلیم اور جعلی الاٹمنٹ حاصل کرنے کا الزام دیا جائے۔ جس کا موقع لگتا ہے مطلق
ہاں چوکتا۔ کیا مہاجر کیا مقامی، اس حمام میں سب ننگے ہیں۔“

اس کی باتیں سن کر رحیم داد کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ وہ گردن موڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ مرزا
رار بیگ نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔ خاموشی سے اخبار اٹھا کر پڑھنے لگا۔ صغیر احمد اٹھا اور دروازہ
دل کر غسل خانے میں چلا گیا۔

رحیم داد نے آنکھیں بند کر لیں اور ٹانگیں کسی قدر پھیلا دیں۔ نیند کا غلبہ ہوا۔ وہ ریل گاڑی
ہاں جھکوں کے ساتھ آہستہ آہستہ جھومنے لگا۔ ایک بار نیند کا ایسا جھونکا آیا کہ اس کا سر کھڑکی سے
را گیا۔ رحیم داد نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

مرزا اسرار بیگ اس کی جانب دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ رحیم داد خفیف ہو کر آنکھیں ملنے لگا۔
مرزا اسرار بیگ نے مشورہ دیا۔ ”چودھری صاحب، آپ کو نیند معلوم ہو رہی ہے۔ اوپر جا کر
لمینان سے سو جائیے۔ یہاں آپ بے چین رہیں گے۔“

رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔ جوتے اتارے اور اوپر کی نشست پر چلا گیا۔ قیص اتار
لر کھوٹی پر ٹانگ دی۔ مرزا اسرار بیگ سے ٹکیہ لے کر سرہانے رکھا اور ٹانگیں پیار کر اطمینان
سے لیٹ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر چھت سے لگے ہوئے ٹکے کا رخ بھی اپنی طرف کر لیا۔ کچھ دیر
آنکھیں بند کیے خاموش پڑا رہا، پھر سو گیا۔



ریل گاڑی شور مچاتی کھٹ کھٹ کرتی دوڑتی رہی۔ اسٹیشن آتے رہے، جاتے رہے۔ ریل
گاڑی ٹھیرتی، اور پھر آگے بڑھ جاتی۔ مسافر اترتے رہے، سوار ہوتے رہے۔ لیٹے کا اسٹیشن آیا تو
صغیر احمد نے اپنی ٹیجی کیس سنبھالا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

باتیں پوری توجہ سے سنیں اور صورت حال کی نزاکت کو بھی محسوس کیا۔ اسی وقت ایس بی کو فون
کیا۔ وہ سمجھ گیا تھا اور نہایت متعجب سمجھ گیا تھا۔ اس نے پولیس کی امداد مہیا کرنے سے صاف انکار کر
دیا۔ مگر تیاگی جی نے حوصلہ نہ ہارا۔ ڈپٹی کمشنر سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ اسے صورت حال سے
آگاہ کیا۔ وہ بھی متعجب ہندو تھا۔ اس نے کسی قسم کی مدد دینے کے بجائے الٹا تیاگی کو طعنہ دیا۔ کہنے
لگا۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کا جو قتل عام ہو رہا ہے ان کی آپ کو کوئی فکر نہیں۔ یہاں کے
مسلمانوں کا بڑا غم ہے۔“

”تب تو تیاگی بھی کچھ نہ کر سکا ہو گا۔“ ایک مسافر نے تبصرہ کیا۔

”نہیں جناب، تیاگی جی نے تب بھی ہتھیار نہ ڈالے۔ بڑی جرات کا مظاہرہ کیا۔“ صغیر احمد نے
بتایا۔ ”انھوں نے غصے سے ڈپٹی کمشنر کو ڈانٹا۔ چیخ کر کہا۔ میں تم کو معطل کرتا ہوں اور شر کا انتقام
اسی وقت سے اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں۔ انھوں نے کیا بھی ایسا ہی۔ فوراً اپنی جیب نکالی۔ کانگریس
کے کچھ والٹیر اپنے ساتھ لیے۔ وفد کے ممبروں کو دوسری جیب میں بٹھایا۔ ایس بی کو بھی معطل
کیا۔ جس تھانے دار نے انکار کیا اسے بھی فوراً معطل کیا۔ پولیس کی ایک مسلح جمیعت اپنے ساتھ
لی۔ جیب پر لاؤڈ اسپیکر نصب کرایا۔ وائس رے روڈ پہنچے۔ مسلمانوں کو اطمینان دلایا۔ وہاں سے اس
علاقے میں گئے جہاں حملے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر ان کو خبردار کیا کہ اگر کسی نے گڑ
بڑکی تو اس کو سخت سزا دی جائے گی۔ ضرورت پڑی تو فائرنگ بھی کی جائے گی۔ ذرا بھی کسی بلوائی
کے ساتھ رعایت نہیں ہوگی۔“

”اس کا کیا نتیجہ نکلا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”ہوایہ کہ بلوائی ڈر گئے۔ اور ایسے ڈرے کہ دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔“
صغیر احمد نے بتایا۔ ”مگر بعد میں مسلمانوں کے لیے حالات خراب ہی ہوتے گئے۔“ اس نے مسکرا
کر مرزا اسرار بیگ کی جانب دیکھا۔ ”یہاں تک کہ مرزا صاحب کو بھی ہندوستان چھوڑ کر پاکستان
آنا پڑا۔ ان کے بڑے صاحبزادے پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ سنا ہے وہ کلیم افسر ہیں۔ کیوں مرزا صاحب
میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”میں تو یہی کہوں گا کہ آپ غلط فہمی کا شکار ہیں۔“ مرزا اسرار بیگ نے ہٹ دھرمی سے کام لیا۔
اس نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی غرض سے پوچھا۔ ”اچھا اب اس تھنے کو چھوڑیے، یہ بتائیے
آپ کا شغل کیا ہے؟“

مرزا اسرار بیگ نے جھنب مٹانے کے لیے مسکراتے کی کوشش کی۔ مگر صغیر احمد مطلق متاثر نہ

رہا تھا۔ طرح طرح کے الزام لگا رہا تھا۔ نہ میں کبھی دہرو دون میں رہا نہ کبھی میرا کانگریس سے رہا۔ میں تو پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ وہیں سے لٹ پٹ کر پاکستان آیا۔

”پ نے جی اسے صاف صاف یہ گل بات بتائی کیوں نہیں؟“ رحیم داد نے لقمہ چباتے ہوئے فٹ کیا۔

”چودھری صاحب، اس نامعقول نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا۔ برابر اپنی ہی ہانکتا رہا۔“

اریک نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اس کے جھوٹے الزامات کا تو صرف ایک ہی جواب تھا اور وہ یہ تھا جو نا اٹھا کر اس کی چندیا پر تڑا تڑ لگائے جاتے۔ ساری ٹھسول بازی نکل جاتی۔ مگر ہاتھ پائی میں ان کس کا ہوتا۔ مجھے تو وہ کوئی ادب باش اور چڑچڑاتیا لگتا تھا۔ اس کا کچھ نہ جاتا۔ اس کی عزت ہی ہے جو جاتی۔ شریف آدمی تو شرافت میں مارا جاتا ہے۔ اسی لیے خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا۔“

”اس نے تو جی مت بکو اس کی۔“

”طبیعت ایسی مکد کردی کہ کھانا کیا کھا رہا ہوں، زہر مار کر رہا ہوں۔“ مرزا اسرار بیگ نے اپنے بے غم دغھے کا اظہار کیا۔ ”غضب خدا کا، کیسے کیسے نازیبا الزامات لگائے۔ اور کس ڈھٹائی سے نے جن کا نہ سرنہ پیر۔“

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ صغیر احمد کے بارے میں جلی کٹی سنا رہا۔ اپنے دل کی س نکالتا رہا۔ رحیم داد بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ مرزا کے ملازم، عبدل نے جھوٹے برتن لے کر صاف کیے۔ نوکری میں حفاظت سے رکھے۔ ناشتا دان بند کیا۔ اسٹیشن آیا تو وہ اپنے ڈبے کی چلا گیا۔

وقت گزرتا رہا۔ رات تاریک ہوتی گئی۔ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چودھری صاحب، خوشاب تک تو آپ کا ساتھ رہے گا۔ آپ سرگودھا کے راستے لاہور جائیں گے نا؟“

”نہیں جی، میں اس راستے سے نہیں جاؤں گا۔“ رحیم داد نے انکار میں گردن ہلائی۔ حالانکہ وہ ارشد زور مزاری کے ہم راہ اسی راستے سے آیا تھا۔ واپس بھی اسی راستے سے جانا چاہتا تھا۔ دراگلی سے قبل اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ کہنے لگا۔ ”میں تو جی پنڈی جاؤں گا۔ وہاں سے لاہور لیے ٹرین پکڑوں گا۔“

”بہر حال کنڈیاں تک تو ساتھ رہے گا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ کے ساتھ بہت اچھا نگہرا۔“

رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ بلاشبہ مرزا اسرار بیگ کے ساتھ اس کا سفر نہ صرف اچھا گزرا تھا

مرزا اسرار بیگ خاموش بیٹھا تھا۔ صغیر احمد نے اس کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر ایک بار پھر اسے چھیڑا۔ کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”مرزا سنگھاڑا!“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”معاف کیجئے، مرزا اسرار بیگ صاحب اگر کوئی گستاخی ہو گئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔“

مرزا اسرار بیگ نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ صغیر احمد آگے بڑھا اور ڈبے سے نکل کر باہر پلیٹ فارم پر آگیا۔ وہ آہستہ آہستہ اسٹیشن کی عمارت کی جانب بڑھ لگا۔ مرزا اسرار بیگ اسے دور تک دیکھتا رہا۔

ریل گاڑی آگے بڑھ گئی۔ مرزا اسرار بیگ خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا رہی تھی۔ اس نے نہ کسی مسافر کی جانب دیکھا نہ کسی سے بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ صغیر احمد اس کے ذہن میں کھلبلی برپا کر دی تھی۔

رحیم داد اوپر کی نشست پر بے خبر سوتا رہا۔

دن ڈوبا رات ہو گئی۔ ہر سواندھیرا پھیل گیا۔ مرزا اسرار بیگ نے رحیم داد کو آہستہ آہستہ جھنجھوڑا۔ رحیم داد نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ مرزا نے مسکرا کر کہا۔ ”چودھری صاحب بہت سوچکے ہیں۔ رات ہو گئی۔ اٹھئے کھانا کھا لیجئے۔ رحیم داد آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا نشست سے نیچے اترا۔ فیص کھوٹی سے اتار کر پینی اور غسل خانے میں چلا گیا۔

رحیم داد منہ ہاتھ دھو کر باہر آیا اور مرزا اسرار بیگ کے برابر بیٹھ گیا۔ اس کا ملازم عبدل موز تھا۔ اس نے کھانا لگا دیا۔ رحیم داد نے کھانا کھاتے ہوئے ڈبے میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مسافروں میں اب نئے چہرے نظر آ رہے تھے۔ پرانے غائب تھے۔ صغیر احمد بھی اسے دکھائی نہ دیا۔ رحیم داد نے مرزا اسرار بیگ سے دریافت کیا۔ ”وہ بندہ چلا گیا؟ میرا مطلب ہے صغیر احمد گیا؟“

”جی ہاں، وہ مردود وفان ہو گیا۔“ مرزا نے جل کر کہا۔ ”یہ پر اتر گیا۔ عجب نامعقول شخص تھا۔“

”ہاں جی، چنگا بندہ نہیں تھا۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

”سخت واہیات شخص تھا۔ نہایت لاپڑا۔“ مرزا اسرار بیگ غصے سے بل کھاتے رہے اور

احمد کو برا بھلا کہتے رہے۔ ”خدا معلوم یہ بیٹھ کہاں سے نازل ہو گیا۔“

”آپ کی جی اس کے ساتھ کب کی جان پہچان ہے؟“

”توبہ کیجئے چودھری صاحب، میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ خدا دوبارہ نہ دکھائے۔“

بیگ نے صفائی پیش کی۔ ”مجھے تو حیرت اس کی ڈھٹائی پر ہے۔ کس دھڑلے سے جھوٹ پر جھوٹ

داڑے کے قریب کھڑا تھا۔ یکایک دھندلی روشنی میں ایک سایہ لہرایا۔ رحیم داد نے سراپہ ہو کر لہا۔ چند قدم کے فاصلے پر کوئی کھڑا تھا۔ رحیم داد خوف زدہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ نہ بولتا نہ رحیم داد۔ دونوں اپنی اپنی جگہ بت بنے کھڑے تھے۔

رحیم داد نے خود کو سنبھالا۔ ہمت سے کام لیا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا۔ سوچ ٹھٹھلا اور چھت پر ہوا بلب روشن کر دیا۔ ڈبے میں روشنی پھیل گئی۔ رحیم داد دم بخود رہ گیا۔ حیرت سے آنکھیں اڑ کر دیکھا۔ جمال دین، ایک نشست کا سارا لیے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ رحیم داد نے پہلی ہی لڑیں اسے پہچان لیا۔ اس کا لباس میلا پچھلا اور بوسیدہ تھا۔ گہری گلے میں پڑی تھی۔ سر کے بال گرے، اُٹھے اور خاک دھول سے اُٹے تھے۔ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ چہرہ ستا ہوا تھا اور بالائیلا نظر آ رہا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گھورتے رہے۔ جمال دین کو دیکھ کر رحیم ادخت سراپہ ہو گیا تھا۔ اس کا خدشہ بیجا بھی نہ تھا۔ جمال دین اس کا بچپن کا ساتھی تھا۔ لنگوٹیا ر تھا۔ دونوں ایک ہی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے اور ایک ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ دان ہو کر بھی ان کی یاری دوستی قائم رہی۔ وہ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے۔ ایک دوسرے کی ہر طرح مدد بھی کرتے۔ زمین کی دھندلی پر جب رحیم داد کا سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ماتھ مسلح تصادم ہوا تو یہ جمال دین ہی تھا جس نے کھڑی سنبھال کر رحیم داد کا ساتھ دیا تھا۔ جم کر قابض کیا تھا۔ زخمی ہوا تھا اور رحیم داد کے ساتھ ہی جیل بھی گیا تھا۔ بعد میں وہ ضمانت پر رہا ہو گیا اور اقدام قتل کے مقدمے میں بری بھی ہو گیا تھا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی۔ وہ جیل ہی میں رہا۔

اب ایک طویل مدت کے بعد وہ آمنے سامنے کھڑے تھے۔ رحیم داد نے ٹوہ لگانے کی کوشش کی کہ جمال دین نے اسے پہچان تو نہیں لیا۔ اس نے اجنبیت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کون ہے؟“

جمال دین نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں اٹھا کر رحیم داد کی جانب ٹکٹی باندھے دیکھتا رہا۔ رحیم داد نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔ ”تجھے پتہ نہیں یہ سیکنڈ کلاس ہے۔ اس کا کرایہ بہت زیادہ ادا کرنا ہو گا۔“ اس نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔ ”اگلے سیشن پر اتر جانا۔“

”میں نے جہاں اترنا ہو گا اپنی مرضی سے اتروں گا۔“ جمال دین نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تو مجھے لاکھ والا کون؟ تو کوئی ٹکٹ بابو لگا ہے؟ جیسے تو مسافر ویسے میں۔“

رحیم داد نے اس کی گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ مگر وہ یہ بھی نہ چاہتا تھا

بلکہ بڑے آرام سے گزرا تھا۔ کھانے پینے کے علاوہ اسے مرزا سے ہر طرح کی سہولت ملی تھی۔ کندیاں آگیا۔ عبدل ڈبے میں قلی کے ہم راہ داخل ہوا۔ اس نے تمام سامان باہر نکالا۔ مرزا اسرار بیک رخصت ہوتے ہوئے رحیم داد سے بغل گیر ہوا۔ مگر نہ اس نے اپنا کراچی کا پتہ دیا اور نہ ہی رحیم داد نے طلب کیا۔ مرزا اسرار بیک ڈبے سے نکل کر باہر گیا تو رحیم داد بھی اس کے ساڑ پلیٹ فارم پر گیا۔



ریل گاڑی آگے روانہ ہوئی تو ڈبے میں صرف دو مسافر رہ گئے۔ مگر داد خیل پر وہ بھی اتر گئے ڈباب بالکل خالی رہ گیا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی۔ مگر رحیم داد کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ سر پر بہت دیر تک گہری نیند سوچکا تھا۔ رحیم داد کچھ دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ پھر اٹھ کر گیا۔

ڈبے میں اندھیرا تھا۔ رحیم داد نے بستر پر لیٹنے سے قبل تمام پتیاں بجھا دی تھیں۔ صرف خانے کی بقی روشن تھی۔ جس کی مدھم روشنی دروازے میں لگے ہوئے شیشے سے چھن چھن کر با آ رہی تھی۔ مگر یہ روشنی اتنی کم تھی کہ ایک زرد دھبے کی مانند نظر آتی تھی۔ رحیم داد کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ ریل گاڑی اندھیرے میں دوڑتی رہی۔ کسی بستی کے نزد سے گزرتی تو دور سے چراغوں کی روشنی جگنوؤں کی طرح ٹٹمٹاتی ہوئی معلوم ہوتی۔ بستی قریب تو روشنیوں کی جگہ گھٹ تیز ہو جاتی اور آن کی آن میں گزر کر پیچھے رہ جاتی۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر رکی۔ رحیم داد اتر کر پلیٹ فارم پر چلا گیا۔ ریل گاڑی کچھ دیر وہاں تھی۔ رحیم داد ٹٹمٹا ہوا انجن تک چلا گیا۔ گاڑی کی سینی جیتی تو وہ چونکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ڈبے کی طرف چلا۔ اس کا ڈبا بہت پیچھے تھا۔ رحیم داد سخت پریشان ہوا۔ گاڑی میں حرکت پیدا تو وہ اور زیادہ پریشان ہوا۔ اس نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اب گاڑی کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ مگر داد اچھل کر پائیدار پر قدم جمائے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے ہینڈل دوسرے سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

ڈبے میں اندھیرا چھایا تھا۔ رحیم داد نے دروازہ بند کیا۔ چٹنی چڑھائی اور دروازے سے کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی سانس ہنوز پھولی ہوئی تھی۔ اوسان بجانہ تھے۔ جب ذرا قرار آیا اور آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اسے اپنے قریب سر محسوس ہوئی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ تمام نشستیں خالی تھیں۔ وہ حیران و

کہ وہ موجود رہے اور خطرہ بن کر اس کے سر پر مسلسل منڈلاتا رہے۔ اس دفعہ اس نے دھمکی سے کام لیا۔ ”تجھے اترنا پڑے گا۔ تو اس ڈبے میں نہیں ستر کر سکتا۔ میں زنجیر کھینچ کر تیریں رکوا لوں گا۔“ اس نے زنجیر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

جمال دین نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا اور اسے کھول کر زور سے چیخا۔ ”ٹھہر جا۔“ رحیم داد کھلا ہوا چاقو دیکھ کر خوف زدہ ہو گیا۔

رحیم داد نے سہمی ہوئی نظروں سے جمال دین کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی جھلک رہی تھی۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ وہ ہاتھ میں چاقو دبائے ڈراؤنا اور خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ رحیم داد سنبھلا بھی نہ تھا کہ جمال دین اچھل کر تیزی سے اس پر جھپٹا۔ اس نے چاقو سے وار کیا۔ رحیم داد جھپاک سے ایک طرف ہٹ گیا۔ جمال دین اپنے ہی حملے کے زور میں لڑکھڑا کر آگے نکل گیا۔ چاقو کا پھل دروازے سے ٹکرا کر لکڑی میں اتر گیا۔

جمال دین لکڑی میں پھنسے ہوئے چاقو کو جھکا دے کر نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ رحیم داد اڑ اثناء میں سنبھل چکا تھا۔ وہ پلٹا اور جھپٹ کر پشت کی جانب سے جمال دین کو دونوں ہاتھوں میں دو بچ لیا۔ جمال دین گھبرا گیا۔ چاقو پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ مڑا اور رحیم داد کے ہاتھوں سے نکلنے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ دیکھنے میں وہ دبلا پلٹا تھا، مگر ہاتھ پیروں میں کس بل تھا رحیم داد کے لیے اسے قابو میں رکھنا آسان نہ رہا۔ اس نے بھی پوری قوت صرف کر دی۔ دیر تا کنکاش جاری رہی۔ آخر جمال دین اس کی پکڑ سے خود کو آزاد کرانے میں کامیاب ہو گیا۔

مگر رحیم داد نے اس سے قبل کہ جمال دین سنبھلے نہایت چابک دستی سے چاقو کے دستے کو تو لیا۔ زور لگا کر اسے کھینچا۔ چاقو اب اس کے ہاتھ میں تھا۔ جمال دین جھپٹنے کے لیے پلٹا تو رحیم داد چاقو ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ دونوں ہانپ رہے تھے۔ لیکن جمال دین اب کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ نہ زور اور رحیم داد کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپتا رہا اور قہر آلود نظروں سے رحیم کو گھور رہا تھا۔

”تو ذہنیت کے ارادے سے آیا تھا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”نہیں۔“ جمال دین نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”میں نے چوری ذہنیت کبھی نہیں کی، میں ایسا کام نہیں کرتا۔“

”کسی کا خون کر کے بھاگا ہے؟“ رحیم داد نے سوال کیا۔

جمال دین کے چہرے پر چھائی ہوئی جھنجھلاہٹ غائب ہو گئی۔ آنکھوں سے گھبراہٹ جھلکنے لگی

خاموش کھڑا رہا۔ اس دفعہ رحیم داد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”صاف صاف بتا۔“ اس نے ایک بار پھر دھمکی دی۔ ”ورنہ میں زنجیر کھینچ کر گڈی روک لوں گا۔ تجھے فرار ہونے بھی نہیں دوں گا۔ گرفتار کرادوں گا۔“ اس نے جمال دین کو خائف کرنے کی غرض سے زنجیر کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

”زنجیر نہ کھینچ۔“ اس کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ”میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

”ٹھیک ہے، تو ادھر بیٹھ جا۔“ رحیم داد نے ہاتھ کے اشارے سے سامنے کی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ ”تجھ سے آرام سے گل بات ہوگی۔“

جمال دین آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور رحیم داد کی ہدایت کے مطابق خاموشی سے بیٹھ گیا۔ رحیم داد بھی اپنی نشست پر پہنچا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر کیس اور تکیے سے کمر نکا کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ چاقو ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبا تھا۔ رحیم داد نے جمال دین کی جانب دیکھا اور لہجے میں بھاری بھر کم پن پیدا کرتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، اب بتا تو کیا واردات کر کے آیا ہے؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ جمال دین نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے کوئی واردات کی بھی ہے تو تجھے اس سے کیا لیتا۔“ اس کی آواز کا تیکھا پن پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ اب اس میں التجا کا پہلو نمایاں تھا۔ ”تو پریشان نہ ہو۔ میں نے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا۔ اگلے ٹیشن پر اتر جاؤں گا۔“

”تجھے کہاں جانا ہے؟“ رحیم داد نے کبید کر پوچھا۔

”مجھے خود پتہ نہیں کہاں جانا ہے۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”کہیں بھی چلا جاؤں گا۔“

رحیم داد چاہتا بھی یہی تھا کہ جمال دین جلد سے جلد ڈبے سے باہر چلا جائے۔ وہ بلائے ناگمانی بن کر نازل ہوا تھا اور اس کے لیے مسلسل پریشانی کا سبب بنا ہوا تھا۔ رات کا پچھلا پھر تھا۔ بار بار نیند کا غلبہ ہوتا۔ رحیم داد کی آنکھیں بند ہو جاتیں۔ چاقو پر گرفت کمزور پڑ جاتی۔ چاقو اس کے لیے مددگار ہونے کے ساتھ ساتھ خطرے کا باعث بھی تھا۔ اگر جمال دین دوبارہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو اسے قتل کرنے سے نہ چوکتا۔ اس کی نیت ایسی ہی معلوم ہوتی تھی۔

رحیم داد نے سوچا چاقو تکیے کے نیچے رکھ کر سو جائے۔ مگر خطرہ پھر بھی موجود تھا۔ جمال دین نیند کی غفلت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ آخر اس نے چاقو سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہا۔ ساتھ ہی جمال دین پر احسان بھی جتایا۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ جمال دین کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تو آرام سے سیٹ پر لیٹ جا۔ میں نے تجھے تنگ کر کے کیا لیتا۔“ اس نے چاقو سامنے کر دیا۔ ”تو اس سے ڈر رہا ہے تو میں اسے پیچھے دیتا ہوں۔“ اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر چاقو ایک گھنی جھاڑی کی طرف

اجمال دیا۔

جمال دین پر رحیم داد کے اس اقدام کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”تو مجھے برا بندہ نہیں لگتا۔“ وہ معذرت کرنے لگا۔ ”مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں نے بہت برا کیا۔ مجھے تجھ پر حملہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ گڑگڑانے لگا۔ ”تو اجازت دے تو میں یہیں بیٹھا رہوں۔ صبح ہوتے چلا جاؤں گا۔“

”تو نے تو اگلے شیش پر اترنے کو کہا تھا۔“ رحیم داد نے اسے چونکا ہوا کر دیکھا۔ ”کسی دوسرے ڈبے میں جا کر بیٹھ جا۔“

”چلا تو جاؤں پر ادھر خطرہ ہے۔ کوئی مجھے پہچان لے گا تو گرفتار کرادے گا۔ تیرا ڈبا خالی تھا جی تو اس میں آگیا۔“ جمال دین نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔ ”پیدل بھی ارب چلنے کی ہمت نہیں۔ کل رات میں جبری میں تھا۔ تب سے برا بر پیدل چل رہا ہوں۔ روٹی شوٹی بھی نہیں کھائی۔“

”خون کیا ہے کسی کا؟“ رحیم داد نے نرمی سے پوچھا۔ ”مٹھے صاف صاف بتا دے۔ شاید میں تیری کچھ مدد ہی کر سکوں۔“

”ہاں جی، میں نے خون ہی کیا ہے؟“ جمال دین نے دلی زبان سے کہا۔

”کس کا خون کیا؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”میں جی جھنگ میں سید زادوں کے پاس لگا ہوا تھا۔ گھروالی بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کا نام بلو تھا۔ میں اسے اکال گڑھ سے ویاہ کر لایا تھا۔ اس کے ساتھ پہلے سے میری یاری بھی رہ چکی تھی۔ پر اس نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ میں زمین دار کے کام سے شہر جاتا تو کئی کئی روز ادھر رہتا۔“ وہ آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”میرے پیچھے وہ چھپ چھپ کر باری سے ملتی۔ وہ بھی سید زادوں کا نوکر تھا۔ ایک بار جب میں کئی روز بعد شہر سے لوٹا تو بلو غائب تھی۔“

”باری کے ساتھ بھاگ گئی تھی؟“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔

”ہاں جی، وہ اس کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“ جمال دین نے اعتراف کیا۔ ”میں نے بہت تلاش کیا، پر کوئی پتہ نہ چلا۔ یہ کئی مہینے ادھر کی گلی ہے۔ پچھلے دنوں مجھے ایک لاری ڈرائیور نے بتایا۔ اس نے باری کو جبری میں دیکھا تھا۔ بلو بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ مجھے بہت کسہ چڑھا۔ فوراً جبری پہنچا۔ پتہ چلا کہ ڈرائیور نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔“

”تو بلو کو واپس لینے تھانے نہیں گیا؟“

”نہیں جی، اسے واپس لے کر کیا کرتا۔ وہ میرے کام کی کہاں رہی تھی۔“ اس نے رحیم داد

سے تیکھے لہجے میں کہا۔

”ایسا تھا تو جبری گیا ہی کیوں؟“ رحیم داد نے جرح کرنے کے انداز میں سوال کیا۔

”میرت بھی کوئی چیز ہوتی ہے جی۔ میں دونوں سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے گیا تھا۔“ جمال دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ ”آدھی رات تک میں جبری کے نزدیک ایک جھنگر میں چھپا رہا۔ جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پنڈ میں داخل ہوا۔ باری کے گھر پر پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر حملہ کیا۔ پورا چاکو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ میں نے دوسرا وار کیا تو اس کی ساری استریاں پیٹ سے نکل کر باہر آگئیں۔“

”بلو کا کیا بنا؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

”باری نے زخمی ہونے کے بعد شور مچایا تو وہ بھی باہر آگئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ اس نے بہت منت کی۔ پر میں نے اسے نہیں چھوڑا۔ زمین پر گرا کر اس کا گلا کاٹ ڈالا۔“ اس نے رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”اسی چاکو سے دونوں کا خون کر دیا جو تو نے کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔“

”شور شرابے سے پنڈ میں جاگ ہوگئی ہوگی۔“

”ہاں جی بالکل ہوگئی تھی۔“ جمال دین نے رحیم داد کو بتایا۔ ”کئی بندوں نے تو مجھے پکڑنے کی بھی کوشش کی۔ دور تک میرا پیچھا کیا۔ پر میں کسی نہ کسی طرح نکل بھاگا۔ ان کے ہاتھ نہ لگا۔“

”تو نے ادھر ہی کے کسی شیش سے زین کیوں نہ پکڑی؟“ رحیم داد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”یہاں تک پیدل کیوں آیا؟“

”ادھر سے زین پکڑنا خطرناک تھا۔“ جمال دین نے جواب دیا۔ ”واردات کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے آس پاس کے ییشنوں کی نگرانی شروع کر دی ہوگی۔ میں نوں پتہ ہے پولیس ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہے۔“

”تو بہت ہشیا رہندہ لگتا ہے۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”حوصلے والا بھی ہے۔ صاف بچ کر نکل آیا۔“

”ہاں جی، چھپتا لگتا کسی طرح ادھر پہنچ ہی گیا۔ آگے کیا ہوگا، کچھ پتہ نہیں۔“ جمال دین نے رحیم داد کو یقین دلایا۔ ”میں نے ذرا بھی جھوٹ نہیں بولا۔ تجھے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔“

جمال دین اب مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت اور پریشانی مٹتی جا رہی تھی۔ آنکھوں کی سرخی بھی کم ہوگئی تھی۔ اس نے ٹانگیں پھیلائیں اور کھڑکی سے ٹیک لگا کر

اطمینان سے بیٹھ گیا۔

رحیم داد نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ”اب تو سو جا۔ بہت تھکا ہوا ہے۔ تجھے آرام کی ضرورت ہے۔“

جمال دین خاموش بیٹھا رہا۔ رحیم داد نے قیص اتار کو کھوٹی پر ناگی۔ سوٹ کیس کھول کر دھوٹی نکالی۔ اور شلوار اتار کر دھوٹی باندھنے لگا۔



جمال دین کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں۔ ان میں حیرانی تھی۔ تجسس تھا۔ وہ نظریں اٹھائے رحیم داد کی برہنہ کمر کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ رحیم داد کے چہرے کا رخ دوسری جانب تھا۔ اس نے مڑ کر جمال دین کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دھوٹی باندھ کر اس نے شلوار بھی کھوٹی پر لٹکا دی۔ مگر جب وہ پلٹا تو جمال دین نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”لگتا ہے میں نے تجھے کہیں دیکھا ہے۔ آواز بھی کچھ پہچانی پہچانی لگتی ہے۔“

رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ اس کا چہرہ فٹ ہو گیا۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا۔ لمبے میں بے نیازی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”دیکھا ہو گا۔ پر میں نے تو تجھے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تیرا نام کیا ہے۔“

”میرا نام جمال دین ہے۔“ اس کی آنکھوں سے تجسس بدستور عیاں تھا۔ ”تو کبھی احمد کوٹ میں تو نہیں رہا۔ پہلے میں بھی ادھر ہی ہوتا تھا۔“

”میں نے تو احمد کوٹ کا نام ہی پہلی بار سنا ہے۔“ رحیم داد نے جمال دین سے نظریں نہ ملائیں۔ بے زاری سے بولا۔ ”بے کار باتیں کر کے اپنا مغز خراب نہ کر“ اب تو سو جا۔“

رحیم داد اب اس کے سامنے موجود رہنا نہ چاہتا تھا۔ روشنی بھی نہ چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کھوٹی پر سے قیص اتار کر پرہیز اور ہاتھ بڑھا کر سوچ دبا دیا۔ چھت میں لگا ہوا روشن بلب بجھ گیا۔ ڈبے میں اندھیرا پھیل گیا۔ رحیم داد نے اپنی نشست کی جانب بڑھتے ہوئے صفائی پیش کی۔ ”میں نے بتی اس لیے بجھا دی کہ اگلے سٹیشن پر ٹرین رکی اور کوئی سیکنڈ کلاس کا مسافر ہوا تو بتی جلتے دیکھ کر اندر آنے کی کوشش کرے گا۔ دروازہ کھٹکٹائے گا۔ اندھیرا ہوا تو سمجھے گا اندر کے سارے مسافر سو رہے ہیں۔ رات کو سیکنڈ کلاس کے سوتے ہوئے مسافروں کو جگایا نہیں جاتا۔ سیکنڈ کلاس میں سفر کرنے کا ایک یہ بھی فائدہ ہے۔“ رحیم داد اپنی نشست پر بچھا ہوا بستر درست کرنے لگا۔ تکیہ اپنی جگہ رکھا۔ جمال دین کی جانب دیکھا۔ ”اب تو بیٹھا کیوں ہے؟ سو جا۔“

جمال دین خاموش رہا۔ ٹانگیں سمیٹ کر اوپر کیں۔ ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھا اور اطمینان سے لیٹ گیا۔

رحیم داد بھی بستر پر لیٹ گیا۔ ریل گاڑی ہچکولے کھاتی، فرائے بھرتی تیزی سے دوڑتی رہی۔ وقت گزرتا رہا۔ رات اور ڈھل گئی۔ رحیم داد نے کروٹ بدلی اور جمال دین کی جانب سے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بو جھل ہو رہی تھیں۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر غنودگی اس قدر بڑھی کہ آنکھ لگ گئی۔

یکایک رحیم داد کو کھٹکا معلوم ہوا۔ آنکھ کھل گئی۔ اسے اپنی کمر پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ کوئی اس پر جھکا ہوا رک رک کر سانس لے رہا تھا۔

وہ چند لمحوں تو سما ہوا دم بخود پڑا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا، دھندلی دھندلی روشنی میں جمال دین اس کے قریب کھڑا ہے۔ اس وقت وہ بہت پر اسرار نظر آ رہا تھا۔

”تو یہاں کھڑا کیا کر رہا تھا؟“ رحیم داد نے ڈپٹ کر پوچھا۔

جمال دین نے اس کے استفسار کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”تو رہا ہے نا؟“ اس کے لمبے میں ہچکچاہٹ تھی۔

”کون رہا؟“ کیسا رہا؟“ رحیم داد نے جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا۔ ”میں کسی رہا شیمما کو نہیں جانتا۔“

مگر جمال دین اس کی برہمی سے ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ ڈھیٹ بنا کھڑا رہا۔ مسکرا کر بولا۔ ”مجھے پتہ ہے تو رہا ہے۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ تو رہا ہی ہے۔“ اس کا لہجہ نرم اور شکفتہ ہو گیا۔ ”رہے“ تو مجھے صاف صاف بتا دے۔ میں تیرا پرانا یار ہوں۔ کسی کو تیرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تو مجھ پر بھروسہ رکھ۔“ وہ نہایت اطمینان سے سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔

رحیم داد سخت حواس باختہ ہوا۔ اس کی حالت دگرگوں ہو گئی۔ مگر اس نے حوصلے سے کام لیا۔ ”تیرا مغز تو نہیں فر گیا۔“ اس نے جمال دین کو ڈانٹا۔ ہاتھ بڑھا کر بجلی کا سوچ دبا دیا۔ ڈبے میں روشنی پھیل گئی۔ رحیم داد نے تیوری پر پل ڈال کر غصے سے جمال دین کو گھورا۔

”نراض نہ ہو۔“ جمال دین گڑ گڑانے لگا۔ ”سچ بتا تو کبھی احمد کوٹ میں تو نہیں رہا؟“

”کبواس نہ کر۔ جا اپنی جگہ جا کر بیٹھ۔“ رحیم داد نے اونچی آواز سے کہا۔

”تو رہا نہیں ہے؟“ جمال دین اپنی جگہ پر جما کھڑا رہا۔

”نہیں۔“ رحیم داد نے غصے سے آنکھیں نکال کر کہا۔ ”بیکار کی بکواس نہ کر۔ یہاں سے ٹر جا۔“

جمال دین پلٹا اور اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا۔ وہ ٹھنکی باندھے رحیم داد کے چہرے کو نکلتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”اگر تو رہما نہیں تو فیر کون ہے؟“

”میں چوہدری نور الہی ہوں۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”پہلے گورداسپور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ فسادات میں لٹ پٹ کر پاکستان آ گیا۔ اب کوئلہ ہر کشن میں ہوتا ہوں۔ ادھر میری زمین داری ہے۔ متروکہ اراضی سے کلیم کی بنا پر لاٹ ہوئی ہے۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا۔“ اس کے رویے سے تذبذب آشکارہ تھا۔

”یہ بتا۔ تو میرے سرہانے کھڑا کیا کر رہا تھا؟“

”وہ جی ایسا ہے نوران نے ایک گل بتائی تھی۔“

”کون نوران؟“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”وہ رہما کی گھروالی ہوتی تھی۔“ جمال دین نے بتایا۔ ”جب رہما جیل میں تھا تو میری اس سے یاری ہو گئی۔ میں اسے اکال گڑھ لے گیا۔“

”تو نے کس کس سے یاری لگائی؟ ایسا تو گھرو بھی نظر نہیں آتا کہ ہر میاں ہر زنانی تجھ پر مرے۔“ رحیم داد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”میں پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ان دنوں تو نے مجھے نہیں دیکھا۔“ جمال دین نے سادگی سے کہا۔

”تب میں بہت نکڑا اور زور آور ہوتا تھا۔“

”تو نے بلو کی طرح نوران کو بھی قتل کر دیا ہو گا۔“

”نہیں جی، وہ تو مجھ سے لڑ جھگڑ کر چک بیدی چلی گئی تھی۔“ جمال دین نے بتایا۔ ”بلو سے میری پہلے سے یاری چل رہی تھی۔ میں نے اس سے دیاہ کیا اور جھنگ کی طرف ایک یاریلی کے ساتھ چلا گیا۔ اگے تجھے پتہ ہے کیا ہوا۔“

”رہما کا کیا بنا؟“ رحیم داد نے انجان بن کر پوچھا۔

”وہ جیل سے فرار ہو گیا۔“ جمال دین نے بتایا۔ ”پر سیف اللہ کے بھائیوں نے اسے نہریاری

دو آب کے بیوں پر قتل کر دیا۔“

”جب رہما قتل ہو گیا تو میں یا اور کوئی کیسے رہما ہو سکتا ہے۔“ رحیم داد ہنسنے لگا۔ ”تو بھی

عجب بندہ ہے۔ تیرے دماغ میں کچھ گڑبڑ تو نہیں؟“

”نہیں جی ایسی کوئی گل نہیں۔“ جمال دین نے صفائی پیش کی۔ ”پتہ تو یہی چلا تھا کہ رہما قتل کر دیا گیا۔ احمد کوٹ میں اس کی لاش لا کر دفن کی گئی۔ ادھر اس کی کبر بھی ہے۔ پر نوران کبھی تھی رہما مرا نہیں زندہ ہے۔“

”اس کو کیسے پتہ چلا رہما زندہ ہے؟“

”وہ ایسا ہوا جی، جب میں نوران کے ساتھ اکال گڑھ میں تھا تو ایک رات نوران نے مجھے جگا کر بتایا کہ اس نے رخصتے کو گھر میں دیکھا ہے۔ میں نے تلاش کیا۔ پر وہ کیس نظر نہ آیا۔“

”نظر کیسے آتا وہ تو مرچکا تھا۔“

”پر صبح اٹھ کر میں نے اور نوران نے دیکھا۔ گھر کے اندر اور باہر گلی میں جگہ جگہ پیروں کے نشان صاف نظر آئے۔“

”کسی چور ڈکیت کے ہوں گے۔“

”میں نے بھی نوران سے یہی کہا تھا۔ پر وہ نہ مانی۔ بار بار یہی کہتی تھی وہ رہما ہی تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔“

”نوران نے ایسے ہی کہا ہو گا۔“ رحیم داد نے اس کے مقابلے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ ”یہ بتا تو اندھیرے میں میرے نزدیک کھڑا کیا کر رہا تھا؟“

”دوبی تو جی میں بتا رہا تھا۔“ جمال دین نے وضاحت کی۔ ”نوران اپنی بات پر اڑی رہی۔ کبھی تھی رات گھر میں رہما ہی آیا تھا۔ میں اسے پہچان سکتی ہوں۔ برسوں اس کے ساتھ رہی ہوں۔ اس کے تین بچوں کو پیدا کیا ہے۔ میں اس کی گھروالی ہوں۔ میں اسے جتنا جانتی ہوں، کوئی نہیں جانتا۔ میرے سوا اسے کوئی نہیں پہچان سکتا۔ اس کے بدن پر کئی ایسی نشانیاں ہیں جنہیں صرف میں جانتی ہوں۔ کبھی تھی سب سے دڑی پہچان اس کی کمر سے تھوڑا نیچے ایک لال لال پیسہ برابر نشان ہے۔ وہ کیسے لگا، کب لگا؟ یہ مینوں پتہ اے۔“

رحیم داد خوف سے دم بخود رہ گیا۔ واقعی اس کی کمر پر ایک گہرا سرخ نشان موجود تھا۔ اس نشان کے بارے میں اسے ایک ایک بات یاد آنے لگی۔



کئی سال پہلے کا ذکر ہے۔ اس وقت رحیم داد کا پہلوئی کا بیٹا کریم داد عرف کریم جی مینے کا تھا۔ ایک روز کھیتوں میں پانی دیتے ہوئے اس کا پیر پھسل کر آڈ میں چلا گیا۔ وہ دھڑام سے گرا۔ کمر میں

داغنے سے کمر کی کھال جل کر سیاہ پڑ گئی تھی۔ رحیم داد ساری رات تڑپتا رہا۔ تکلیف سے کراہتا رہا۔ ہائے کرتا رہا۔ نوراں بھی رات بھر جاگتی رہی۔ بے قرار ہو کر آنسو بہاتی رہی۔ زخم ایسا گہرا آیا کہ مینوں دوا دارو کرنا پڑا۔ نوراں راتوں کو اٹھ اٹھ کر اس کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ تھنوں اس کے سرہانے بیٹھتی دل جوئی کرتی رہتی تھی۔

زخم کپنے سڑنے کے بعد ٹھیک تو ہو گیا۔ مگر اس کا نشان نہ مٹا۔ اب تک باقی تھا اور کمر سے ذرا نیچے دائیں طرف صاف نظر آتا تھا۔ نوراں اسے دیکھ کر ایک مدت تک اظہارِ پشیمانی کرتی رہی۔ بار بار خود کو برا بھلا کہتی۔ رحیم داد سمجھتا تو رونے لگتی۔

☆

رحیم داد یا دوں کی پگڈنڈیوں پر بھٹکتا رہا۔ جمال دین اس کے خیالات اور احساسات سے بے نیاز ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ ”مجھے جب یہ شبہ ہوا کہ تو رحیم ہے تو میں نے یہ نشان تیری کمر پر دیکھنے کی کوشش کی۔“

رحیم داد نے چونک کر جمال کی جانب دیکھا۔ ”تو اندھیرے میں کھڑا میری کمر پر وہی نشان دیکھ رہا تھا۔“ اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ تھی۔

”ہن جی، سچی گل بات تو یہی ہے۔“ جمال دین نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”جب تو کپڑے بدل رہا تھا تو میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی بھی تھی۔“

”تو بخول تو نہیں کر رہا؟“ رحیم داد نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”میں نے بخول کر کے تجھ سے کیا لیتا۔“ اس نے نہایت معصومیت سے جواب دیا۔ ”ج پوچھ تو تیری آنکھیں، تیری ناک، تیری آواز سب مجھے کی طرح ہیں۔“ اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو دیکھا۔

”تو نے فیروبی بکواس شروع کر دی۔“ رحیم داد نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا۔ ”تو گھاس تو نہیں کھا گیا۔“

”نراض نہ ہو۔“ جمال دین نے نرمی سے کہا۔ ”مگر تو رحیم جیسا نہیں ہے تو کمیس ہٹا کر مجھے اپنی کمر دکھا دے۔ میرا شک جاتا رہے گا۔“

رحیم داد غصے سے تڑپ کر اٹھا اور جھپٹ کر جمال دین کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ وہ لڑکھڑا کر نشست سے نیچے گر گیا۔ رحیم داد تھلا کر دھاڑا۔ ”میں ابھی زین رکوا کر تجھے گرفتار کرواتا ہوں۔ تو بخونی ہے، ایک نمبر کمینہ ہے۔ میں نے تجھے ہرگز نہیں چھوڑنا۔“ وہ چیختا چلاتا آگے بڑھا اور

زور کا جھٹکا آیا۔ ایسا شدید درد اٹھا کہ کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ کسی پہلو قرار نہ آتا۔ کمر ٹہلنے پر ٹیس اٹھتی۔ بہت علاج معالجہ کرایا مگر درد کم نہ ہوا۔ آخر گاؤں کی ایک بوڑھی عورت، مائی شیداں کے مشورے پر نوراں ایک پیر کے پاس گئی۔ اس نے کمر پر باندھنے کے لیے تعویذ دیا۔ مگر کوئی افادہ نہیں ہوا۔ اسی پیر نے ایک ٹونکا بتایا۔ دو روپے نذرانے کے لیے اور تانبے کا ایک پیسہ دیا۔ کوئی دعا پڑھ کر اس پر دم کی۔ ہدایت کی کہ پیسے کو انگاروں پر رکھ کر گرم کیا جائے اور جب انگاروں ہی کی طرح سرخ پڑ جائے تو اس سے کمر کو داغا جائے۔

ماگھ کی اندھیری رات تھی۔ مہاوتوں کی سردی پڑی تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ شام کو بارش بھی ہوئی تھی۔ مگر اب بارش بند ہو چکی تھی۔ البتہ ہوا فرائے بھرتی ہوئی چل رہی تھی۔ رحیم داد کی کمر کا درد کچھ اور شدید ہو گیا تھا۔ وہ چٹائی پر اوندھا لیٹا تھا۔ قریب ہی انگیٹھی رکھی تھی۔ اس میں سرخ سرخ انگارے دھک رہے تھے۔

نوراں انگیٹھی کے ایک طرف اکڑوں بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چمٹا تھا۔ وہ گردن جھکائے انگیٹھی میں بھرے ہوئے انگاروں کو تک رہی تھی جن کے درمیان پیر کا دم کیا ہوا تانبے کا پیسہ رکھا تھا۔ وہ چپے سے بار بار پیسے کو الٹ پلٹ رہی تھی تاکہ وہ پوری طرح گرم ہو جائے۔

رحیم داد کے چہرے کا رخ نوراں کی جانب تھا۔ مگر وہ پوری توجہ سے انگاروں کو دیکھ رہی تھی جن کی گرمی سرخ روشنی سے اس کے رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔ رحیم داد کو اس روپ میں وہ اس قدر خوبصورت اور دل ربا نظر آ رہی تھی کہ کمر کی تکلیف کے باوجود وہ ٹٹکتی باندھے اس کے شعلہ گوں چہرے کو تک رہا تھا۔

نوراں نے دیکھتے انگاروں کو دیکھتے دیکھتے ایک بار گردن کو خم دے کر رحیم داد کی طرف دیکھا۔ شوخی سے مسکرائی۔ رحیم داد کی کمر پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرا۔ پلٹ کر انگاروں کو دیکھا۔ تانبے کا پیسہ اب انگاروں ہی کی طرح سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے چپے سے دیکھتا ہوا پیسہ اٹھا یا۔

رحیم داد نے گھبرا کر اپنا چہرہ دوسری جانب کر لیا۔ آنکھیں بند کر لیں اور دانت سختی سے بھینچ لیے۔

نوراں نے چپے میں دبا ہوا سرخ سرخ پیسہ رحیم داد کی برہنہ کمر پر رکھا اور پیر کی ہدایت کے مطابق زور سے دبا دیا۔ رحیم داد تکلیف کی شدت سے تڑپ اٹھا۔ بلبلاتا اس بری طرح چیخا کہ نوراں اس کی پیٹھ پر سر رکھ کر بے اختیار رونے لگی۔

زنجیر کا دستا چھوڑ دیا۔

جمال دین فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہائی دتا ہوا رحیم داد کی جانب بڑھا۔ ”ایسا نہ کر۔ میری گل تو سن۔“ اس نے جھپاک سے رحیم داد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ رحیم داد زنجیر کھینچنا چاہتا بھی نہ تھا۔ جمال دین کو گرفتار کرانے کی کوشش میں وہ خود بھی گرفتار ہو جاتا۔ رحیم داد نے تھوڑی سی کشمکش کے بعد زنجیر کا دستا چھوڑ دیا۔

وہ چند لمبے خاموش بیٹھا آہستہ آہستہ ہانپتا رہا۔ پھر وہ کھڑا ہو گیا۔ آگے بڑھا۔ جمال دین نے ٹوکا۔ ”تو کدھر چلا؟“

رحیم داد نے بڑھ کر غسل خانے کا دروازہ کھولا۔ آنکھیں نکال کر جمال دین کو دیکھا۔ خوف زدہ کرنے کی غرض سے دم مکی دی۔ ”مندر بھی ٹرین روکنے کی زنجیر ہے۔“ وہ غسل خانے میں داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مگر اس نے زنجیر نہ کھینچی۔ ایسا ارادہ بھی نہ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر کر کے سرخ نشان کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ پشت کی جانب نشیب میں ایسا دبایا ہوا تھا کہ مڑ مڑ کر دیکھنے کے باوجود نظر نہ آیا۔

اس نے انگلیوں سے کمر کے مچلے حصے کی کھال آہستہ آہستہ ٹٹولی۔ ایک جگہ گول دائرے میں کھال ہٹا ہوا اور کچھ کھردری تھی۔ یہی زخم کا نشان تھا۔ وہ سخت یریشان ہوا۔

جمال دین اس کے لیے اب سنگین خطرے کا باعث بن گیا تھا۔ اس کے بارے میں اسے پہلے ہی شبہ تھا۔ کمر کے نشان سے وہ اسے پہچان بھی سکتا تھا۔ وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا کرے؟ کس طرح جمال دین سے چمٹکارا حاصل کرے؟ رحیم داد نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھولا۔ غسل خانے سے باہر نکلا۔

اسے یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ جمال دین اپنی نشست پر موجود نہ تھا۔ رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر اسے ادھر ادھر تلاش کیا۔ لیکن اس کا کس سرانجام نہ ملا۔ اس نے اپنا سوٹ کیس دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ رحیم داد حیرت میں ڈوبا ہوا اپنی نشست پر جا کر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ جمال دین کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی نظر دروازے کے اوپر گئی۔ دیکھا، چٹنی کھلی ہے۔

وہ گوگو کے عالم میں بیٹھا جمال دین کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ریل گاڑی کی رفتار ست پڑ گئی۔ ذرا ہی دیر بعد گاڑی ٹھہر گئی۔ رحیم داد نے کھڑکی سے گردن باہر نکال کر دیکھا، ریل گاڑی ایک دیہانے میں کھڑی تھی۔ پیڑی کے دونوں طرف جنگل جھاڑیاں تھیں۔ کس کس اکا کا درخت تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ مشرقی افق پر ہلکا ہلکا اجالا پھوٹ رہا تھا۔ رات کا چل چلاؤ

نا۔ صبح کا ذب اندھیرے سے جھانک رہی تھی۔

رحیم داد نے بولنے اور باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں سنیں۔ دیکھا، کئی مسافر اپنے اپنے ڈبوں سے اترے اور ٹرین کے اس سرے کی طرف چلے جدھر گارڈ کا ڈبہ تھا۔ رحیم داد کو تجسس پیدا ہوا۔ بھی دروازہ کھول کر باہر آیا اور دوسرے مسافروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ریل گاڑی سے کوئی دو سو گز کے فاصلے پر ہلکی ہلکی سرمئی روشنی میں گارڈ، ٹکٹ چیکر اور ریلوے کے دوسرے ملازم، چند مسافروں کے ساتھ ہجوم کی صورت میں کھڑے نظر آئے۔ رحیم داد قریب بچا۔ دیکھا، لوہے کی پیڑیوں کی دونوں جانب انسانی جسم کے کٹے پھنے حصے گوشت کے ٹوٹھروں کی شکل میں بکھرے ہوئے تھے۔ ہر طرف تازہ تازہ خون پھیلا تھا۔ ریل گاڑی کے پیروں سے کٹ کر لٹی مسافر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ غائب تھا۔ صرف گردن اور سینے کا کچھ حصہ باقی تھا۔ یہ نال دین تھا جو خاک و خون میں تھڑا ہوا ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کرب کا دم توڑ چکا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں رحیم داد کے چہرے کو تک رہی تھیں۔

رحیم داد یہ دل خراش منظر دیکھ کر لرز گیا۔ وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا بھی اس کے لیے خطرناک تھا۔ خاموشی سے مڑا اور سر جھکا کر تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوا۔ اپنے ڈبے کے پاس پہنچا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

دُٹ حلق سے اتارتا رہا اور بارش سے لطف اٹھاتا رہا۔
فضا اب سہانی ہو گئی تھی۔ بارش کے ساتھ ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ گھاس پر درختوں پر ہر طرف
اجم جم، رجم، مینہ برس رہا تھا۔ نوکروں نے کوٹھی کی بتیاں روشن کر دی تھیں۔ روشنی درپچوں
پھوٹ پھوٹ کر باہر بکھر رہی تھی۔ بارش کے قطرے روشنی میں بھلکاتی جھار کی مانند ہوا کے
دکوں سے لہرا رہے تھے۔ احسان علی شاہ واپس نہ آیا تھا۔ رحیم داد برآمدے میں خاموش بیٹھا ہے
نی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

رات کے آٹھ بجے سے کچھ دیر قبل ایک لمبی چوڑی کار کوٹھی کے چھانک پر آکر رکی۔ احسان
وہ کار سے باہر نکلا اور بارش سے بچتا بچتا کوٹھی میں داخل ہوا۔ ایک نوکر نے بڑھ کر رحیم داد کی
مدد کی اطلاع دی۔ احسان شاہ فوراً برآمدے میں پہنچا۔ رحیم داد اسے دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
شاہ مسکراتا ہو آگے بڑھا اور نہایت گرم جوشی سے بغل گیر ہو گیا۔

رحیم داد نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”شاہ جی، تو کراچی ایسا گیا کہ پلٹ کر خبر ہی نہ لی۔
خی دیر ادھر کیا کرتا رہا؟“

”میں تو کراچی میں طرح طرح کے چکروں میں پھنسا رہا۔ روز ہی واپس آنے کی سوچتا، پر کوئی نہ
لوئی ایسا کام نکل آتا کہ رکنا پڑتا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کے برابر کرسی پر بیٹھتے ہوئے صفائی
پیش کی۔ ”پر تو ادھر ڈیرہ غازی خان میں اب تک کیا کرتا رہا؟ سنا ہے سردار شہ زور خان مزاری کے
ماٹھ تھا۔ شاہانی نے تجھے اس سے ملوایا ہو گا۔“

”ہاں جی، اسی نے شہ زور سے ملوایا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”ویسے بہت پہلے بھکر میں بھی اس
سے ملا تھا۔ مراد خاں شاہانی ہی کی حویلی میں ملا تھا۔“

”مہربان علی بتاتا تھا، شاہانی تیرے کلیم کے کاغذات بھی ادھر لے گیا تھا۔ مل گئے نا؟“
”مل گئے، بالکل مل گئے۔ اب تو میرے ہی پاس ہوتے ہیں۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو مطلع
کیا۔

”کلیم کے کاغذات تو نے کیوں منگوائے تھے؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔
”میں نے تو نہیں منگوائے تھے شاہانی خود ہی لایا تھا۔ پر ان کے ملنے سے ادھر دلاور والا میں
اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زری اراضی میں نے اپنے نام الاٹ کروالی ہے۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔

”یہ دلاور والا کدھر ہوا؟“



رحیم داد لاہور پہنچا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ تانگے پر بیٹھا اور سیدھا احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔
چھانک پر رحیم داد کا ڈرائیور، عابد، مل گیا۔ وہ اس کی ہدایت پر بنوڑہاں مقیم تھا۔ عابد کی زبانی رحیم
داد کو معلوم ہوا کہ احسان شاہ دو روز قبل کراچی سے واپس آگیا ہے۔ مگر وہ کوٹھی میں اس وقت
موجود نہ تھا۔ اس کا مینجر، مہربان علی بھی غائب تھا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ صبح بارش بھی ہوئی تھی۔ لیکن اب
بارش کے ساتھ ساتھ ہوا بھی ٹھہری ہوئی تھی۔ شدید جس تھا جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی
بھی وقت بادل ٹوٹ کر برسیں گے اور ہر طرف جل تھل ہو جائے گا۔

طویل سفر کی ماندگی سے رحیم داد نڈھال ہو رہا تھا۔ لباس اور سر کے بالوں پر گرد جی تھی۔ جسم
سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ وہ فوراً غسل خانے میں گھس گیا اور دیر تک نہاتا رہا۔ باہر آیا۔
اجلا لباس پہنا۔ قدرے تازگی محسوس ہوئی۔ وہ کوٹھی کے وسیع لان میں بید کی بنی ہوئی ایک کرسی پر
جا کر بیٹھ گیا۔ شام ہونے سے پہلے ہی اندھیرا اس قدر زیادہ تھا کہ شام کا گمان ہوتا تھا۔

مگر رحیم داد زیادہ دیر لان میں نہ بیٹھ سکا۔ ہلکی ہلکی بوند باندی شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے
موٹے موٹے قطرے گرنے لگے۔ بادل زور سے گرے اور موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ نوکر دار
نے جھپاک جھپاک کر سیاں اٹھائیں اور برآمدے میں ڈال دیں۔ رحیم داد بارش کے تیز ہوتے
اٹھ کر برآمدے میں چلا گیا۔ اس نے ایک کرسی کے کھسکائی اور اس پر بیٹھ گیا۔ ایک نوکر نے گرم گرم
چائے ڈاکر نیز پر رکھ دی۔ چائے کے ساتھ بکٹ بھی تھی۔ رحیم داد بکٹ کھاتا رہا۔ چائے۔

”خصیل راجن پور میں ہے۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”ویسے راجن پور میں ایک حویلی کی الاٹمنٹ کے لیے بھی درخواست لگا دی ہے۔ بڑی شاندار حویلی ہے۔ پہلے ایک ہندو کی تھی۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔ ادھر کا بہت مشہور زمین دار ہوتا تھا۔ پاکستان بنا تو وہ بھی ہندوستان چلا گیا۔“

”چودھری“ تو بھی کہاں جا کر پھنس گیا۔ ”احسان شاہ کے لہجے سے بے زاری آشکارہ تھی۔ ”سرکاری افسر تو اسے کالا پانی کہتے ہیں۔ تو نے الاٹمنٹ نکلوانے سے پہلے مجھ سے مشورہ تو کر لیا ہوتا۔“

”میں نے تو بار بار تیرے پاس آنے کا ارادہ کیا۔ پر شہ زور نے آنے ہی نہیں دیا۔ کہتا تھا میں بھی تیرے ساتھ لوہر چلوں گا۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”ویسے تو لوہر رہا ہی کب۔ شاہانی آیا تو اس نے یہی بتایا کہ تو کراچی سے واپس نہیں آیا۔ نادر خان ادھر سے ہوتا ہوا میرے پاس گیا تھا۔ اس نے بھی یہی بتایا تھا۔ یہاں آ بھی جاتا تو مشورہ کیسے کرتا؟ تو ادھر رہا ہی کب۔“

”زمین تو الاٹ کرالی۔ شہ زور کو شش کرے گا تو حویلی کی الاٹمنٹ بھی مل جائے گی۔ اس کا ادھر کے سرکاری افسروں میں بہت اثر و رسوخ ہے۔ اس کا اپنا چچیرا وڈا افسر لگا ہے۔ پر تو ادھر رہے بھی سکے گا؟ زمین داری چلا سکے گا؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ کوئلہ ہر کشن کی زمین داری کا کیا بنے گا؟“

”شاہ جی“ تجھے تو پتہ ہی ہے۔ میری اصلی زمین داری تو کوئلہ ہر کشن ہی میں ہوتی ہے۔ میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو اپنے موقف سے آگاہ کیا۔ ”ویسے جی ادھر زمین داری کرنی بہت مشکل ہے۔ مزارے ایسے سرکش اور خراب ہیں تجھ سے کیا بتاؤں۔ انھوں نے تو ساری ہی زمین دبا رکھی ہے۔ کبندہ دینے کو تو بالکل تیار نہیں۔“

”اس کی تو فکر نہ کر۔ شہ زور دلا دے گا۔“

”وہی کوشش کر رہا ہے۔ پر دلاور والا، تمن دریشک کے علاقے میں ہے۔ شہ زور مزاری مجھے ادھر کے ایک سردار کے پاس لے گیا تھا۔ اس کا نام عظمت اللہ دریشک ہے۔ کوٹ اکبر میں رہتا ہے۔“

”تب تو زمین کا کبندہ مل جانا چاہیے۔“ احسان علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ”میں عظمت اللہ خان دریشک کو بھی جانتا ہوں۔ لوہر آتا رہتا ہے۔“

”زمین کا کبندہ دلانے کے لیے دوبار اس نے اپنے بندے بھیجے۔ ایک بار تو تھانیدار بھی پولیس

رٹی کے ساتھ گیا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”دلاور والا میں سارے ہی بوہڑ آباد ہیں۔ ایسے سرکش اور جھگڑالو ہیں کہ زبانیوں اور بچوں تک نے رات کے اندھیرے میں مورچے لگا کر ایسا شور مڑا دیا۔ ایسے پھر برسائے کہ سب ہی زخمی ہوئے۔ میرے بھی بہت چوٹ آئی۔ تھانیدار تو سب سے زیادہ زخمی ہوا۔ نہ جانے کس طرح جان بچا کر نکل پائے۔“

”حد ہو گئی۔“ احسان شاہ کے لہجے میں حیرت کے ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ بھی تھی۔ ”لگتا ہے مزارے بہت ہی زیادہ بد معاش ہیں۔ پر دلاور والا جانے کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی۔ پہلے ان کے لاف جگہ جگہ سے مکدے بنوانے تھے۔ جو زیادہ سرکش اور آگے آگے تھے ان کو بلا کر تنگ کیا آتا۔ حلالوں اور جیلوں میں بند کیا جاتا۔ مکدے بازی میں تو ان کے مال موٹی تک بک جاتے۔

یٹان ہو کر خود آتے اور پیروں پر پگڑیاں ڈال دیتے۔“

”اب عظمت اللہ نے یہی سوچا ہے۔ تھانیدار تو بہت غصے میں تھا۔ وہ تو بوہڑوں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کو کہتا تھا۔“ رحیم داد کے لہجے میں تشویش تھی۔ ”پر شاہ جی، میں تو گھبرا گیا۔ میں نے شہ زور مزاری سے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے ادھر زمین داری نہیں کرنی۔ میرا ارادہ ہے کہ اراضی عظمت اللہ کے ہاتھ فروخت کر دوں۔ وہ تیار بھی ہو گیا۔ وہ سارے مزارعوں کو بے دخل کر کے کبندہ بھی لے سکتا ہے۔ ان سے نمٹ بھی سکتا ہے۔ میں نے غلط فیصلہ تو نہیں لیا؟“

”تو نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا۔ میں بھی تجھے یہی مشورہ دینا چاہتا تھا۔“ احسان شاہ نے اتفاق رائے لیا۔ ”تو نے بہت ٹھیک کیا۔ پر یہ تو بتا کتنے میں سودا طے کیا؟“

”میں نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ شہ زور پر چھوڑ دیا وہ جیسا مناسب سمجھے طے کر دے۔“

”عظمت اللہ دریشک کو لے کر میرے پاس آنے کو کہتا تھا۔ وہیں بیچ ہو جائے گی۔ بلکہ میں تو ان کو نرے پاس لے آؤں گا۔ تیرے ہی سامنے سب کچھ طے ہو گا۔ جیسا تو کہے گا میں نے تو وہی کرنا ہے۔“

”پر ادھر کی زمین کا مول کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بارانی یا چاہی ہے تو کسی کام کی نہیں۔“

رحیم داد نے فوراً وضاحت کی۔ ”زمین تو نہری ہے۔ پانی پورا پورا ملتا ہے۔ زرخیز بھی ہے۔ میں نے عزیز گھوٹال کو زمین داری کی دیکھ بھال کے لیے لگا دیا تھا۔ بہت ہشیار بندہ ہے۔ اس نے ساری طلبات اکٹھی کر لی تھیں۔“

”تب تو زمین کے ڈیڑھ لاکھ تک مل جانے چاہئیں۔“ احسان شاہ نے قیاس آرائی کی۔ ”پر

جھگڑے کی زمین ہے۔ عظمت اللہ دریشک کبندہ دلانے میں بھی مدد کرے گا۔ ایسی صورت میں لاکھ روپے بھی دے دے تو برے نہیں۔“

”میں نے اسے مختار نامہ بھی دے دیا ہے۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”ویسے مجھے ادھر روپے کی ضرورت بھی تھی۔ میری زمین داری کے نیچے کے چھوٹے زمین دار اور حصے دار اپنی زمینیں بیچ رہے ہیں اور سستی بیچ رہے ہیں۔ نادر ان سے بات بھی کر چکا ہے۔ بلکہ وہ خود چل کر اس کے پاس آئے تھے۔ نادر اس بارے میں مجھ سے بات کرنے ڈیڑھ غازی خان آیا تھا۔“

نور نے آکر اطلاع دی کہ کھانا لگا دیا گیا ہے۔ احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد کو اس نے مخاطب کیا۔ ”چوہدری، روٹی کھالے۔ وہیں بیٹھ کر آرام سے باتیں کریں گے۔“ رحیم داد بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کھانے کے کمرے میں جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میز پر کھانا موجود تھا۔ دونوں کھانا کھانے لگے۔

احسان شاہ نے پوچھا۔ ”چھوٹے حصے دار اپنی زمینیں کیوں فروخت کرنا چاہتے ہیں؟“

”انھیں اپنی فصلوں کے لیے پانی کم مل رہا ہے۔ دوسرے ان کو سندھ کے بیراجوں میں سستے داموں زمین الاٹ ہو رہی ہے۔ وہ ادھر کی زمینیں بیچ کر ادھر جانا چاہتے ہیں۔“

”ابھی تو غلام محمد بیراج مکمل بھی نہیں ہوا۔ زمینوں کی الاٹمنٹ کیسے شروع ہو گئی؟“ احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”جب میں کراچی میں تھا تو میں نے بھی سنا تھا کہ آباد کاروں میں یہ افواہ گرم ہے کہ بیراج کی زمینیں الاٹمنٹ شروع ہونے والی ہے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نے اونچا چکر چلایا ہے۔“

”ایسا ہی ہو گا۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں۔ نادر نے جو مجھے بتایا وہ میں نے تجھے بتا دیا۔ سچی گل کیا ہے؟ یہ مجھے بالکل پتہ نہیں۔“

”نہ نادر کو اصلی گل کا پتہ ہے نہ حصے داروں کو۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی ٹھیک سے پتہ نہیں۔ اس کے لیے تو پوری طرح معلومات کرنی ہوں گی۔“ احسان شاہ نے کہ۔ ”پر اس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب تو بارش شروع ہو چکی ہے۔ پانی کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب تو بیچنے والے بھی سستے داموں زمین نہیں بیچیں گے۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ابھی تو زمین خریدنے کا خیال چھوڑ دے۔“

”کہتا تو شاہ جی تو ٹھیک ہی ہے۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ ”جب نہر میں پانی کی کمی ہو جائے گی تو میں اپنے موٹوں سے زیادہ پانی لینے لگوں گا۔ نیچے پانی کم ہو گا۔ فصلیں سوکھنے لگیں گی تو

حصے دار زمینیں فروخت بھی کریں گے تو کم سے کم ہی دام مانگیں گے۔ ابھی تو ان سے سودے کی بات ہی کئی ٹھیک نہیں۔“

”میں تجھ سے یہی کہنا چاہتا تھا۔“ احسان علی شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”ابھی تو تجھے کئی ضروری باتیں بتانی ہیں۔ دلاور والا کی زمین فروخت ہونے کے بعد جو روپیہ آئے اسے زیادہ ضروری کاموں میں لگایا جاسکتا ہے۔ تجھے کیا خبر، میں کراچی میں اتنے عرصے رہا تو کیا کیا کرتا رہا؟“

”تو بتائے تو پتہ چلے گا۔“ رحیم داد نے گلہ کیا۔ ”ویسے تو مجھے ملے بنا اچانک کراچی چلا گیا۔ یہ بھی نہ بتایا کہ کیوں جا رہا ہے؟ مہربان علی بھی لاکل پور جا چکا تھا۔ کسی نے مجھے کچھ نہیں بتایا میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔“

”ہاں چوہدری تیری شکایت بالکل ٹھیک ہے۔“ احسان شاہ نے اظہارِ پشیمانی کیا۔ ”مجھے بالکل اچانک کراچی جانا پڑا۔ سویرے ہی سویرے جانا تھا۔ سوچا تجھے گرمی نیند سے جگا کر بات کروں گا تو تیرے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ کام اتنا ضروری تھی کہ رک بھی نہ سکتا تھا۔“

رحیم داد بہت دیر سے یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھا کہ لاکل پور کی زمین کے الاٹمنٹ کا کیا فیصلہ ہوا۔ وہ فوراً حرف مطلب پر آگیا۔ ”شاہ جی، تو نے اب تک یہ نہیں بتایا لاکل پور کی زمین کی الاٹمنٹ کا کیا پتا؟“

”یہ تو تجھے پتہ ہی ہو گا کہ زمین کا جھگڑا چل رہا ہے۔ دود عویداروں کو وہ اراضی پہلے ہی الاٹ ہو چکی ہے۔ انھوں نے عدالت میں مکدمہ بھی دائر کر رکھا ہے۔“

”شاہانی نے مجھے اس بارے میں بتایا تھا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ زمین میرے نام الاٹ نہیں ہو سکتی۔ چیمہ نے کچھ نہیں کیا۔“

”چیمہ نے تو تیرے نام الاٹمنٹ کر دی۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو اطمینان دلایا۔ ”اب تو سوال کبندہ ملنے کا ہے۔ جب تک معاملہ عدالت کے سامنے ہے اور اس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا کبندہ کیسے مل سکتا ہے؟“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”پر میں نے اس کا بھی ایک حل نکالا ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر سوال کیا۔

”میں نے کراچی سے واپس آتے ہی اس سلسلے میں کوشش شروع کر دی ہے۔“ اس نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”محکمہ بحالیات کے اعلیٰ حکام کو ایک وزیر کی سفارش پہنچائی کہ دونوں ہی دعویداروں پر اس طرح دباؤ ڈالیں کہ عدالت سے اپنے مکدمے واپس لے لیں اور اپنی اپنی الاٹمنٹوں سے دست بردار ہو جائیں۔“

”تو سمجھتا ہے، وہ آسانی سے مان جائیں گے۔“

”آسانی سے تو کوئی بھی نہیں مانتا۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”ان کو یہ پیشکش کی گئی ہے کہ وہ کسی دوسری جگہ متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ لے لیں اور لائل پور کی زمین سے کوئی سروکار نہ رکھیں۔“

”ایسا ہو جائے تو بہت ٹھیک ہے۔ شاہ جی تو نے حل تو بہت ٹھیک نکالا ہے۔“ رحیم داد نے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ اس کے بشرے سے خوشی آشکارہ تھی۔ ”میں نہ کہتا ہوں جی ان کو رضا مند ہو جانا چاہیے۔ مکدے بازی کے چکر سے بھی بچ جائیں گے اور اراضی بھی مل جائے گی۔“

”مشکل یہ ہے کہ زمین بہت عمدہ ہے۔ اس پر تو نہ جانے کتنی کی آنکھ لگی ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”لاکھوں روپے کی اراضی ہے۔“

”کیا اسے بھی دلاور والا کی زمین کی طرح فروخت کرنے کا ارادہ ہے؟“ رحیم داد نے احسان شاہ کی بات سے یہی نتیجہ اخذ کیا۔

”کیسی عجب گل کر رہا ہے چوہدری۔“ احسان شاہ نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”تجھے پتہ ہے اس زمین پر تو میں نے ٹیکسٹائل مل لگانی ہے۔ جلد ہی اس کا پرٹ بھی مل جائے گا۔ مشینری امپورٹ کرنے کا لائسنس بھی نکلوا لوں گا۔ بینک سے کرضہ لینے کا بندوبست ہو چکا ہے۔ میں نے تو ساری تیاری کر رکھی ہے۔“ اس کی آنکھوں میں مسرت جھلکتی تھی۔ ”میں کراچی میں ٹھہر کر صرف سیاست ہی نہیں لڑاتا رہا۔ اپنا کام بھی کرتا رہا۔ ایک دن بھی آرام سے نہ بیٹھا۔ کبھی اس کے پاس جاتا کبھی اس کے پاس۔ اپنا کام جو نکلوانا ہوا۔“

رحیم داد خاموش رہا۔ مگر احسان شاہ بولتا رہا۔ ”میں نے جلد ہی ایک لینڈ کمپنی کا اعلان کرنا ہے۔ اس کی کانغذی تیاری مکمل ہو چکی ہے۔ اب تو اسے رجسٹر کرانا ہے۔ پر کمپنی کے کنٹرولنگ شیئرز اپنے پاس رکھنے ہیں۔ دلاور والا کی زمین کے روپے سے تو بھی کمپنی کے شیئرز خرید لیتا۔ میں تجھے کمپنی کا ڈائریکٹر لگا دوں گا۔“

رحیم داد کی سمجھ میں احسان شاہ کا منصوبہ مطلق نہ آیا۔ پریشان ہو کر گویا ہوا۔ ”شاہ جی، مجھے تو زمین داری ہی کرنے دے۔“ اس کے لہجے سے بے زاری عیاں تھی۔ ”مجھے ڈائریکٹری شائر کنٹری نہیں کرنی۔ مجھے اس چکر میں نہ ڈال۔“

”تو گھبرا کیوں گیا؟“ احسان علی شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”عیش کرے گا۔ کمپنی کے منافع میں سے تجھے ڈیویڈنڈ تو ملے گا ہی، اس کے علاوہ ڈائریکٹری حیثیت سے کئی الاؤنس بھی ملیں گے۔ تو اکیلا

ڈائریکٹر نہیں ہو گا کئی اور بھی ہوں گے۔ فینجنگ ڈائریکٹر تو میرا وڈا پتر رحمان علی شاہ ہو گا۔“

”نہیں، شاہ جی، مجھ سے یہ کام نہیں ہو گا۔“ رحیم داد ہنوز گھبرایا ہوا تھا۔ ”تجھے تو پتہ ہی ہے کہ مجھے انگریزی نہیں آتی۔ تو نے ڈائریکٹر لگا دیا تو کیسے کام چلاؤں گا۔“

”تجھے تو صرف بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگوں میں حاضری لگانی ہو گی۔ چپ کر کے بیٹھا رہنا۔ دوسروں کی سنتا رہنا۔“ وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ ”دوسروں نے بھی صرف باتیں ہی کرنی ہوں گی۔ کام تو مینجر اور دوسرے بندے چلاتے ہیں۔ جہاں تک انگریزی جاننے کا سوال ہے تو کراچی میں کئی مل مالک اور وڈے وڈے سینئر تو ایسے ہیں کہ انگریزی میں اپنے ٹھیک سے دستخط بھی نہیں لگا سکتے۔ وہ کمپنیوں کے صرف ڈائریکٹر ہی نہیں فینجنگ ڈائریکٹر اور چیئرمین بنے بیٹھے ہیں۔“

”پر مجھے تو جی کچھ پتہ نہیں۔“

”سب پتہ چل جائے گا۔ شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔ ”کچھ عرصے بعد تو سب کچھ سمجھنے لگے گا۔“ احسان شاہ اچانک سنجیدہ ہو گیا۔ ”ویسے چوہدری، تجھے انگریزی ضرور سیکھ لینی چاہیے۔ مہراں علی سے کون گاہہ تیرے لیے ٹیوٹر کا بندوبست کر دے گا۔“

”وہ کیا کرے گا؟“ رحیم داد نے ہونق کی طرح منہ پھاڑ کر احسان شاہ کی طرف دیکھا۔

”وہ تجھے انگریزی پڑھائے گا۔ تو اسے اپنے ساتھ کوئلہ ہرکشن لے جانا۔ تجھے ادھر کرنا ہی کیا ہوتا ہے۔ آرام سے انگریزی پڑھنا۔ اگے تجھے اس کی ضرورت پڑے گی۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”ویسے تو اخبار ضرور پڑھا کرنا کہ تجھے یہ تو پتہ چلے کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ سیاست کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟“

”تو کہتا ہے تو اخبار بھی پڑھ لیا کروں گا۔“ رحیم داد نے اس بار انکار نہ کیا۔ ”پر میں نے تیری طرح سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔“

”سیاست میں حصہ نہ لے پر اس کے بارے میں جاننا تو چاہیے۔“ احسان شاہ کا انداز سرپرستانہ تھا۔ ”ویسے وڈا زمین دار بننا ہے تو سیاست میں بھی تجھے دلچسپی لینی ہو گی۔ زمین داری تو تیرا منہج اور منہشی چلاتے رہیں گے۔ تو خالی رہ کر کیا کرے گا۔ خود بخود سیاست سے دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”تیری زمین داری بڑھ جائے تو دیکھوں گا تو سیاست سے خود کو کیسے الگ رکھتا ہے۔ اسمبلیوں کی ممبری حاصل کرنے کی سوچے گا۔ وزیر بننے کے خواب دیکھے گا۔“ وہ ٹھنکا مار کر ہنسا۔ ”چوہدری، میں تجھے ایک راز کی بات بتاؤں۔ ہر وڈے زمین دار کے دماغ میں ایک

وزیر چھپا ہوتا ہے۔ وہ خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ حالات اسے پیدا کر دیتے ہیں۔“

رحیم داد اس کی باتوں سے متاثر نہ ہوا۔ گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”اور تو سب کچھ تو کرتا ہی رہتا پر سب سے پہلے لاکھوں پور کی زمین کا کبہ ملنا چاہیے۔“ رحیم داد کو بنیادی طور پر اسی سے دلچسپی تھی۔ اور جب سے اس نے یہ سنا تھا کہ زمین کی مالیت لاکھوں روپے ہے تو اس کی دلچسپی اور بڑھ گئی تھی۔

احسان علی شاہ نے بھی اس کی بات کی اہمیت محسوس کی۔ ”تجھے پتہ نہیں، آج کل میں اسی کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میری تو یہی کوشش ہے کہ جلد سے جلد زمین مل جائے۔ کل بھی کئی سرکاری افسروں سے اسی سلسلے میں ملنا ہے۔ دونوں دعویدار راضی ہو جائیں تو فوراً زمین اپنے کینے میں آجائے گی۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی پھیل گئی۔ ”زرعی اراضی حاصل کرنا مشکل نہیں پر شہری اراضی حاصل کرنا مشکل ہے۔ اس کا تجھے کچھ اندازہ نہیں۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ ہوا میں نمی تھی۔ خنکی تھی۔ موسم خوش گوار تھا۔ احسان شاہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد سے رخصت ہو کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ رحیم داد بھی خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

صبح ناشتے پر احسان علی شاہ سے رحیم داد کی پھر ملاقات ہوئی۔ رحیم داد کو ملد ہر کشن واپس جانے کے لیے بے چین تھا۔ مگر احسان شاہ نے اسے روک لیا۔ اس کا خیال تھا کہ لاکھوں پور کی زمین کا تصفیہ ہونے تک وہ لاہور ہی میں ٹھہرا رہے۔ عین ممکن ہے کسی مرحلے پر اس کی ضرورت پڑے۔ عذر داری کرنا ہو یا نئی درخواست پیش کرنا پڑے، ایسی صورت میں رحیم داد کے دستخط ضروری تھے۔ وہ کو ملد ہر کشن چلا جاتا تو بروقت چارہ جوئی کرنے میں مشکل پیش آتی۔

احسان شاہ کے زور دینے پر رحیم داد نے کو ملد ہر کشن جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

احسان شاہ زمین حاصل کرنے کی تنگ و دو میں لگا رہا۔ مگر معاملہ بہت الجھا ہوا تھا۔ دود دعویدار پہلے ہی موجود تھے۔ ان کے کلیم تصدیق شدہ تھے۔ فرد حقیقت اور دوسری دستاویزات بھی مکمل تھیں۔ الاٹمنٹ بھی ان کے پاس تھے۔ حکام میں دونوں کا اثر و رسوخ بھی تھا۔ ایک دعویدار کی پشت پناہی درپردہ ایک مرکزی وزیر کر رہا تھا دوسرے کی محکمہ بحالیات کے ایک اعلیٰ افسر سے قریبی رشتے داری تھی۔ تنازعہ طویل کھینچتا جا رہا تھا۔ لیکن احسان علی شاہ نے ہمت نہ ہاری۔ وہ بھی اپنی

کوشش میں لگا رہا۔ رحیم داد سے ملاقات ہوتی تو اسے صورت حال سے آگاہ بھی کرتا رہتا۔ مگر احسان شاہ نے اس کے سامنے کسی مایوسی یا ناامیدی کا اظہار نہ کیا۔ بار بار یقین دلاتا کہ قضیہ جلد ہی طے ہو جائے گا اور زمین کا قبضہ مل جائے گا۔

رحیم داد لاکھوں پور کی زمین ملنے کی خوش خبری سننے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ اس کا بیشتر وقت احسان شاہ کی کوٹھی ہی پر گزرتا۔



سہ پہر کا وقت تھا۔ مہربان علی خاموشی سے رحیم داد کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہم راہ ایک اجنبی تھا۔ اس کے بال خشک تھے۔ آنکھوں پر بوسیدہ عینک تھی۔ گال پتکے ہوئے تھے۔ ہش شرٹ پر سلوٹیں تھیں۔ پتلون بھی ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اور اس کی موریات کثرت استعمال سے گھس گئی تھیں۔ جوتے پر گرد کی تہہ تھی۔ وہ ہر پہلو سے پریشان حال اور ضرورت مند نظر آتا تھا۔

مہربان علی نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری، تیرے لیے یہ ماسٹر لایا ہوں۔ شاہ جی نے کہا تھا چوہدری کو کسی ایسے بندے کی ضرورت ہے جو اسے انگریزی پڑھا سکے۔“ اس نے آگے بڑھ کر رحیم داد کو نہایت ادب سے سلام کیا۔

مہربان علی نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری، اب تو اس سے گل بات کر لے۔ میں نے شاہ جی کے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔“ رحیم داد نے اسے روکنے کے لیے اصرار بھی نہ کیا۔ رحیم داد نے اس شخص کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا، تیرا نام کیا ہے؟“ ”مجھے عبداللطیف کہتے ہیں۔“ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے نہایت ادب سے بتایا۔

رحیم داد نیکی کا سہارا لیے بستر پر بیٹھا تھا۔ عبداللطیف نے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کیا تو رحیم داد کی گردن اکڑ گئی۔ قد و قامت کچھ اونچا ہو گیا۔ سامنے بیٹھا ہوا عبداللطیف اسے کم تر اور مسکین نظر آیا۔ اس نے آواز میں بھاری بھر کم پن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انٹرویو لینے کے انداز میں سوال کیا۔

”لطیف! تو نے کتنا پڑھا ہے؟“

”جناب میں انٹرمیڈیٹ پاس ہوں۔“ عبداللطیف نے رحیم داد سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔ ”ایک بار بی اے کا پرائیویٹ امتحان بھی دیا تھا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ بعد میں بھی امتحان میں بیٹھنے کی تیاری کی، لیکن حالات کچھ ایسے نامسا زگار پیدا ہوئے کہ امتحان نہ دے سکا۔“ عبداللطیف نے رحیم داد کو متاثر کرنے غرض سے اپنی تعلیمی استعداد کے بارے میں کسی قدر

وضاحت سے بتایا۔ رحیم داد اس کی باتیں سن کر متاثر بھی ہوا۔ اسے معا جیلہ یاد آئی۔ وہ بھی بی اے فاسل کی طالبہ تھی۔ اسی اثناء میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بجڑک اٹھی۔ تمام تعلیمی ادارے بند ہو گئے۔ اسے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر لاہور سے دیپال پور واپس جانا پڑا تھا۔ تعلیم کا سلسلہ ایسا منقطع ہوا کہ دوبارہ جاری نہ ہو سکا۔ رحیم داد اس کی علیست اور دانائی سے بہت زیادہ مرعوب تھا۔ اس نے چونک کر عبداللطیف کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔

”تو نے تو بہت پڑھ رکھا ہے۔“

”جی ہاں، اتنی تعلیمی استعداد تو رکھتا ہوں کہ آپ کو ہر مضمون پڑھا سکتا ہوں۔“ عبداللطیف نے اسے اطمینان دلایا۔

”میں نے تو صرف انگریزی پڑھنی ہے۔“

”میں آپ کو انگریزی پڑھا دوں گا۔“ عبداللطیف نے رحیم داد سے کہا۔ ”لیکن آپ کو اردو اور فارسی پڑھنا ہو تو وہ بھی پڑھا سکتا ہوں۔“

”فارسی پڑھنے کی تو مجھے کوئی ضرورت نہیں۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”اردو تھوڑی بہت جانتا ہوں۔ پر انگریزی بالکل نہیں جانتا۔“

”تب تو انگریزی کے ساتھ ساتھ آپ کو اردو کی تعلیم بھی حاصل کرنا چاہیے۔“ اس نے مشورہ دیا۔ ”یہ میری اپنی رائے ہے۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔“

”دونوں ہی پڑھ لوں گا۔“ رحیم داد نے اس کا مشورہ قبول کر لیا۔

”شام کے علاوہ آپ جو بھی وقت مقرر کریں گے، میں پڑھانے کے لیے آ جاؤں گا۔“ اس نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ گفتگو کا موضوع بھی بدلا۔ رحیم داد سے دریافت کیا۔ ”آپ کی گھڑی میں کیا وقت ہوا ہے؟“

”چھ بجنے میں دس منٹ رہتے ہیں۔“ رحیم داد نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے بتایا۔

”مجھے اپنے ایک یوشن کے لیے جانا ہے۔“ اس نے گردن بڑھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ”بادل بھی گھر آئے ہیں اور مجھے جانا بھی دور ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کل میں کسی وقت آ جاؤں؟“

”نوبت تک آ جانا۔ کل آرام سے گل بات ہوگی۔“ رحیم داد نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بے چینی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگر رحیم داد رد کرنا بھی چاہتا تو وہ نہ رکتا۔ معذرت کر کے چلا جاتا۔

عبداللطیف نے سلام کیا۔ آگے بڑھا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اسے دور تک دکھتا رہا۔ پہلی نظر میں اس نے رحیم داد کو بالکل متاثر نہ کیا تھا۔ وضع قطع اور شکل و صورت سے وہ نہایت پھینچ نظر آتا تھا۔ مگر گفتگو کے بعد رحیم داد کو انداز ہوا کہ وہ آداب مجلس سے واقف تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور بات کرنے کا اسے سلیقہ بھی تھا۔

دوسرے روز رحیم داد اس کا انتظار کرتا رہا۔ مگر وہ نہ آیا۔ تیسرے روز وہ آیا اور ٹھیک نوبت پر آیا۔ آتے ہی اس نے معذرت کی۔ ”معاف کیجئے چوہدری صاحب، میں کل حاضر نہ ہو سکا۔ ایک ضروری کام میں ایسا پھنسا کہ دوپہر تک فرصت نہ مل سکی۔“

رحیم داد نے نہ خفگی کا اظہار کیا نہ شکوہ، مسکرا کر بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔ بہت ضروری کام رہا ہو گا۔“ اس نے ایک نوکر کو بلایا۔ چائے لانے کی ہدایت کی۔ اس وقت تک عبداللطیف کمرے کے ماحول سے مانوس ہو چکا تھا۔ وہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھا تھا۔ لباس اس کا وہی تھا جو پہلے روز تھا بلکہ کچھ زیادہ ہی ملگبا ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی زیادہ مرجھایا اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔

رحیم داد اس روز بستر کے بجائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے عبداللطیف کی ذات میں دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”لطیف، تو آج کل کیا کر رہا ہے؟“

”فی الحال تو ایک عرصے سے بے روزگار ہوں۔“ عبداللطیف نے بچے ہوئے لہجے میں بتایا۔

”بے روزگار ہے تو کام کیسے چلتا ہے؟“

”ایک صاحب کے بچوں کو شام کے وقت پڑھاتا ہوں۔“ اس نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”اس سے کسی نہ کسی طرح کام چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔“

”لگتا تو تو بھی اپنی طرح مہاجر ہی ہے۔“ رحیم داد نے قیاس آرائی کی۔ ”میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا؟“

”بالکل درست فرمایا آپ نے۔“ عبداللطیف نے مسکرا کر اعتراف کیا۔ ”رہنے والا تو میں بخور کا ہوں۔ مگر ملازمت کے سلسلے میں کئی برس سے دہلی میں مقیم تھا۔“ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر دکھ کا سایہ پھیل گیا۔ ”دہلی میں فسادات ہوئے تو مجھے بھی گھریا پھوٹنا پڑا۔ ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لی۔ پھر دوسرے مصیبت زدہ مسلمانوں کے ایک قافلے کے ساتھ میں بھی کسی نہ کسی طرح بیوی بچوں کے ہم راہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔“

”پاکستان پہنچ کر کیا کرتا رہا؟“ رحیم داد نے عبداللطیف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا۔

گیا کہ اس کا نام کیدار ناتھ ساہنی تھا۔

”دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ کیا بولا؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر دریافت کیا۔

”میں یہی بتا رہا تھا کہ میں نے کیدار ناتھ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ پہلے تو اس نے دیر تک دروازہ ہی نہ کھولا۔ جب میں مسلسل کھٹکھٹاتا رہا تو اس نے دروازہ کھولا۔ ہاتھ جوڑ کر گھلیا نے لگا۔ ”مجھے قتل نہ کرنا۔ تم کو جو چاہیے ہو لے لو۔“ عبدالطیف زیر لب مسکرایا۔ ”وہ اس طرح سسکا سسکایا کھڑا تھر تھرا رہا تھا کہ پہلے تو میں حیران و پریشان کھڑا گھورتا رہا۔ پھر اس کی مٹھکھیز حالت دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔“

”جان کا ایسا ہی خوف تھا تو وہ ادھر ٹھیرا ہی کیوں؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”بال بچوں کے کے ساتھ ہی سرحد پار چلا جاتا۔“

”چوہدری صاحب، یہ جائیداد اور املاک کی محبت بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ نہ جان کو پرواہ رہتی ہے نہ موت کا خوف۔“ کہنے کو تو عبدالطیف باتوں کی رو میں کہہ گیا۔ معاً اسے خیال آیا کہ رحیم داد بھی صاحب جائیداد ہے۔ اس کی بات ناگوار گزر سکتی ہے۔ اس نے فوراً پتیرا بدلا۔ اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی غرض سے صفائی پیش کی۔ ”لیکن یہ بھی تو غور کرنے کی بات ہے کہ وہ معمولی اسکول ٹیچر تھا۔ نہ جانے کس طرح اپنی خواہشات مار کر اور پیٹ کاٹ کر پیسہ پیسہ جوڑا ہو گا۔ تب مکان بنایا ہو گا۔“

”ہاں جی مکان اسی طرح بنتا ہے۔“ رحیم داد نے تائید کی۔ ”پر اسے مکان کی اچھی قیمت نہیں ملی ہوگی۔“

”اچھی اور بری قیمت تو اس وقت ملتی جب مکان فروخت ہو جاتا۔“ عبدالطیف نے بتایا۔

”کیدار ناتھ نے بہت کوشش کی۔ مگر نہ مکان بک سکا نہ زرعی آراضی۔ کوئی خریدار ہی نہ ملا۔ لوگ تو مفت حاصل کرنے کی ناک میں لگے تھے۔ وقت جتنا گزرتا گیا حالات اور خراب ہوتے گئے۔ پڑوسیوں نے اسے خبردار کیا۔ مجھے بھی بڑھتے ہوئے خطرہ سے آگاہ کیا۔“

”کیدار ناتھ کا کیا بنا؟“ رحیم داد نے تشویش کا اظہار کیا۔

”وہ اس قدر خوف زدہ ہوا کہ ایک روز مکان میرے سپرد کر کے اپنے بال بچوں کے پاس ہندوستان چلا گیا۔ معلوم نہیں پہنچا بھی کہ نہیں۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ جاتے وقت مڑ مڑ کر اپنے گھر کو دیکھتا تھا۔ اور بار بار آنکھوں میں اٹھتے ہوئے آنسو پونچھتا تھا۔“ عبدالطیف نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”آج بھی وہ منظر یاد آتا ہے تو دل تڑپ اٹھتا ہے۔“

”کچھ مدت تک یہیں لاہور کے ایک مہاجر ریلیف کمپ میں بیوی بچوں کے ساتھ رہا۔ کمپ ہی کے قیام کے دوران ہمارے کارڈ وغیرہ بنے۔ مگر جب حکومت نے مہاجرین کو دوسرے شہروں میں منتقل کیا تو مجھے ٹرین میں بٹھا کر شیخوپورہ پہنچا دیا گیا۔ کئی مہینے بے روزگار رہا۔ بھاگ دوڑ کی تو ایک اسکول میں ٹیچر مقرر ہو گیا۔ تنخواہ قلیل تھی۔ مگر کسی نہ کسی طرح گزر بسر ہو جاتی تھی۔“ عبدالطیف اپنی پریشان حالی کے بارے میں بتاتا رہا۔ رحیم داد پوری توجہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتا رہا۔

”سب سے بڑا مسئلہ رہائش کا تھا۔ مگر وہ اس طرح حل ہو گیا کہ ایک ہندو نے مشکل کشائی کی۔ وہ بھی اسکول ٹیچر رہ چکا تھا۔ اس کے بال بچے سرحد پار جا چکے تھے۔ ان دنوں وہ بالکل تنہا رہتا تھا۔“

”پر وہ کیوں نہ گیا؟“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”اس کی کچھ زرعی آراضی تھی۔ ذاتی مکان بھی تھا۔ وہ اپنی جائیداد فروخت کر کے ہندوستان جانا چاہتا تھا۔“ عبدالطیف نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ بوڑھا آدمی تھا۔ نیک دل تھا اور خوش اخلاق بھی تھا۔ پاس پڑوس والوں سے اس کے بہت خوش گوار تعلقات تھے۔ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ٹھیرا ہوا تھا۔“ اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ ”چوہدری صاحب، واقعی وہ بہت بھلا مانس تھا۔ میری پریشانی کا حال سن کر بہت متاثر ہوا۔ مجھے اپنے ساتھ ٹھیرانے پر رضامند ہو گیا۔ مکان تھا تو چھوٹا اور پرانا بھی تھا مگر سر چھپانے کے لیے بہت کافی تھا۔“

”تیرے رہنے سے اس کو بھی تو مدد ملی ہوگی۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔ ”اکیلے میں تو ہر دم جان سے مارے جانے کا خطرہ لگا رہتا ہو گا۔“

”جی ہاں، اس حیثیت سے دیکھا جائے تو میرے ساتھ رہنے سے اسے ایک طرح کا تحفظ مل گیا۔ مگر چوہدری صاحب، وہ زمانہ بڑا پر آشوب تھا۔ پرانے رشتے ٹوٹ چکے تھے۔ وضع داری ختم ہو چکی تھی۔ آپس میں بھائی چارہ نہ رہا تھا۔ ایک دوسرے کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔“ عبدالطیف نے کھٹکار کر گلا صاف کیا۔ ”آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ مجھے بھی شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا وہ تجھ پر بھی شک کرتا تھا؟“ رحیم داد کی آنکھوں سے حیرت آشکارہ تھی۔

”سخت گرمی میں بھی وہ کمرے میں سوتا تھا اور ہمیشہ اندر سے دروازہ بند کر لیتا تھا۔ ایک رات ایسا اتفاق ہوا کہ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ چائے کی طلب نے ستایا۔ میں نے چائے بنانے کے لیے بیوی کو جگایا۔ مگر گھر میں ماچس نہ تھی۔“ عبدالطیف اب رحیم داد کی شخصیت اور اس کے رعب و دبدبے کے حصار سے باہر نکل چکا تھا اور نہایت اطمینان سے بول رہا تھا۔ ”ماچس لینے کے لیے میں نے کیدار ناتھ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”میں یہ بتانا تو بھول ہی

”ہاں جی، بالکل ایسا ہی ہوا ہو گا۔“ رحیم داد نے اپنی جمانے کی کوشش کی۔ لمبے میں رقت پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”جب میں نے نصیر پور چھوڑا تو اپنے گھر کو اسی طرح مڑ مڑ کر نکلتا تھا۔ گھر والی تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔“

”درست فرمایا آپ نے۔“ عبداللطیف نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”اس دکھ کا اندازہ تو وہی بخوبی لگا سکتا ہے جس پر ایسا کڑا وقت پڑا ہو۔ اپنا گھر بار ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا ہو۔“

”پر کیدار ناتھ کے جانے سے تجھے تو رہنے کا کچا ٹھکانا مل گیا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”تو نے تو کبنہ کی بنیاد پر آسانی سے اسے اپنے نام الاٹ کر لیا ہو گا۔“

”چوہدری صاحب ایسی اپنی قسمت کہاں۔ کیدار ناتھ ساہنی کے چلے جانے سے سرچھپانے کا سارا بھی جاتا رہا۔“ عبداللطیف نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”نہ معلوم کتنی ہی نظریں پہلے ہی سے اس مکان پر لگی تھیں۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ مکان حاصل کرنے ہی کی غرض سے کیدار ناتھ کو طرح طرح سے ڈرایا دھمکایا گیا تھا۔ عجب نہیں کہ کسی روز اسے قتل بھی کر دیا جاتا۔“

”ایسا بھی خطرہ تھا؟“ رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔

”بالکل تھا۔ بوڑھے کیدار ناتھ کو اس خطرے کا بخوبی اندازہ بھی ہو گیا تھا۔“ عبداللطیف نے رحیم داد کو بتایا ”تب ہی تو وہ اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ جان بچا کر بھاگنے پر مجبور ہو گیا۔“

”اس کے جانے کے بعد کیا ہوا؟“

”کچھ ہی دنوں بعد گوالیار کے ایک مہاجر نے کلیم کی بنیاد پر مکان اپنے نام الاٹ کر لیا۔“

”تو نے کیا کارروائی کی؟“

”میں سوچ ہی رہا تھا کیا کروں۔“ عبداللطیف نے بچھے ہوئے لمبے میں رحیم داد کو بتایا۔ ”ایک روز وہ پولیس لے کر آیا اور مکان پر قبضہ کر لیا۔ میں اس وقت اسکول میں طلباء کو پڑھا رہا تھا واپس آ کر دیکھا، میرا سامان گھر کے باہر پڑا تھا۔ بیوی ایک ٹرنک پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اس کی گم میں چھوٹی بچی تھی۔ اسے بخار تھا۔ بیوی نے مجھے دیکھا تو بلک بلک کر رونے لگی۔ گھر کے اندر قوت گونج رہے تھے۔ مکان ملنے پر خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”چوہدری صاحب، کسی نے سچ کہا ہے، کہیں بچتے ہیں نقارے، کہیں ماتم بھی ہوتے ہیں۔ دنیا اسی کا ہے۔“

”تیرے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔“ رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔

”نہ پوچھئے کیسے کیسے ظلم ہوئے۔ آپ سے کیا کیا بتاؤں۔“ عبداللطیف کے چہرے پر افسردگی

”ہی۔“ ایک بار پھر رہائش کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ میں اکیلا بے گھر نہ تھا۔ میری طرح نہ جانے کتنے اور سرچھپانے کے لیے چھت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔“

”تیرا کلیم شلیم نہیں تھا؟“

”جناب کلیم تو تب ہوتا جب ہندوستان میں میری کوئی جائیداد یا املاک ہوتی۔ وہاں بھی کرائے کے مکان میں رہتا تھا، یہاں بھی کرائے کے مکان کی تلاش تھی۔“ عبداللطیف نے صاف گوئی سے رحیم داد کو اپنے بارے میں بتایا۔ ”حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ بنوانے والوں نے دھڑلے سے بوگس کلیم بنوائے اور ان کی بنیاد پر الاٹمنٹ بھی حاصل کیے۔ راتوں رات دولت مند اور صاحب جائیداد بن گئے۔ مگر میرے پاس نہ رشوت دینے کے لیے رقم تھی نہ وسائل تھے، نہ اعلیٰ حکام تک رسائی تھی۔ اور سچ پوچھئے تو نہ مجھ میں جمل سازی کی ہمت ہی تھی۔“

وہ باتوں کی دھن میں ایک بار پھر ہلک گیا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مہربان علی کی زبانی وہ رحیم داد کے بارے میں سن چکا تھا کہ وہ مہاجر ہے اور اپنے بہت بڑے کلیم کی بنیاد پر متروکہ جائیداد الاٹ کرا چکا ہے۔ بہت بڑا زمین دار بن چکا ہے۔ اس نے جھٹ تلافی کی۔ معذرت کرنے کے انداز میں کہا۔ ”مگر اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سے ایسے مہاجر ہیں جو ہندوستان میں لاکھوں کی جائیداد چھوڑ کر آئے مگر ان کا اتنا بڑا کلیم منظور نہ ہوا۔ اور متروکہ جائیداد میں سے الاٹمنٹ کے ذریعے کچھ ملا بھی تو ہزار طرح کی مشکلات برداشت کرنے کے بعد۔ بات یہ ہے چوہدری صاحب، چند برے اور بددیانت افراد کی مجبورانہ حرکتوں کے باعث سارے ہی مہاجر بدنام ہوئے۔ ایک گندی مچھلی سارے ہی تالاب کو گندہ کرتی ہے۔“ عبداللطیف اب خود اپنی تردید کر رہا تھا۔

رحیم داد نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بعد میں تو کہیں نہ کہیں رہنے کو ٹھکانا مل گیا ہو گا؟“

”کرائے کا مکان بہت تلاش کیا، لیکن کہیں ملا نہیں۔“ عبداللطیف نے بتایا۔ ”بہت عرصے تک یہ عالم رہا کہ چند ہفتے کسی ایک ملنے والے کے ساتھ ٹھہر جاتا چند مہینے کسی دوسرے کے ساتھ۔ کوئی مستقل ٹھور ٹھکانا نہ تھا۔ سامان اٹھائے ادھر ادھر پھرتا تھا۔ جہاں موقع ملتا پڑاؤ ڈال دیتا۔ آخر مرگٹ میں جگہ ملی۔ وہیں رہنے لگا۔“

”مرگٹ میں!“ رحیم داد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر عبداللطیف کو دیکھا، جس کے چہرے پر خزاں چھائی ہوئی تھی۔ ”وہاں تو ہندو اپنے مردے جلاتے ہیں۔“

”مگر اب تو نہ ہندو رہے تھے نہ ان کے مردے اور ارتھیاں۔ ان کو جلانے وہاں کون آ؟“ عبد اللطیف نے بے نیازی سے کہا۔ ”مرگھت بہت پرانا تھا اور ایک مدت سے بالکل ویران پڑا مردوں کا کریا کرم کرنے والے، لکڑیوں پر ارتھی رکھ کر چتا بتانے والے، اس پر تیل یا گھی ڈال آگ لگانے والے اور ایسے ہی دوسرے کام کرنے والے سارے ہی ہندو، فسادات کے بعد، گئے تھے۔ صرف ایک ہندو مرگھت کی دیکھ بھال کے لیے ٹھہرا رہا۔ پھر وہ بھی اپنے بال بچوں کو چلا گیا۔ بلکہ سننے میں تو یہ بھی آیا کہ اس کو بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ مجھے صحیح طور پر علم نہیں کیا حشر ہوا۔ میں نے تو جب مرگھت دیکھا تو وہاں کسی انسان کا نام و نشان تک نہ تھا۔“

”کیسی جگہ تھی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔



عبد اللطیف جب پہلی بار گیا تو مرگھت پر ہو کا عالم طاری تھا۔ شیشم اور نیم کے درختوں کے جھنڈے آس پاس کئی کچے مکانات تھے۔ ایک مکان کی قدر بڑا تھا۔ اس میں دو کمرے تھے۔ کوٹھری تھی۔

کھانا پکانے کے لیے چھوٹی سی رسوئی بھی تھی۔

صحن میں مٹی کی ٹوٹے ہوئے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ ایک طرف دو بوسیدہ چارپائیاں تھیں۔ قریب ہی ایک گوشے میں پھٹے پرانے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ صحن میں گھاس اور جنگلی کثرت سے تھے۔ کمروں میں لکڑیوں کے جگہ جگہ جالے تھے۔ دوسرے گھروں کا حال بھی ا تھا۔

خالی اور اجڑے ہوئے مکانات سے کچھ فاصلے پر ایک سادھی تھی۔ مگر وہ پختہ اینٹوں کی بنی تھی۔ سادھی میں گیدڑوں نے گمرے گمرے بھٹ بنا رکھے تھے۔ سادھی سے متصل دو کوٹھیاں تھیں جن میں مردوں کو نذر آتش کرنے کے لیے کبھی تیل اور گھی کے کنستر رکھے جاتے تھے اب ان میں چند ٹوٹے پھوٹے زنگ آلود ٹین کے ڈبے اور کنستر ادھر ادھر بے ترتیبی سے تھے۔

کوٹھریوں کے آگے چھپر تھا۔ چھپر کے سامنے ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر تھا۔ ایک ادبھی لکڑیاں تولنے کے لیے ترازو لٹک رہی تھی جس کا ایک پلڑا نوٹ پھوٹ کر ختم ہو چکا تھا۔ مرگھت میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے پیپل کا ایک گھٹا درخت ملتا تھا۔ اس کے چوڑے تھا۔ ارتھیاں کریا کرم سے پہلے اسی پختہ چوڑے پر لا کر رکھی جاتی تھیں۔ چوڑے۔

رہنڈ پپ تھا جس کا ہینڈل زنگ آلود ہو چکا تھا۔ مرگھت میل سوا میل کے رقبے میں پھیلا تھا۔ جگہ جگہ راکھ کی مٹی مٹی ڈھیریاں تھیں جن کے رد کوئلے اور جلی ہوئی لکڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ مردوں کی اہلیاں بھی نظر آتی تھیں۔ ہر طرف خاک اڑتی تھی اور ویرانی برستی تھی۔



عبد اللطیف نے مرگھت کے بارے میں رحیم داد کو تفصیلات بتانے سے گریز کیا۔ صرف اس قدر پراکتفا کیا۔ ”چوہدری صاحب، نہ پوچھئے کیسی جگہ تھی۔ بالکل اجاڑ اور ویران۔ ایسی ہی جیسے اور ویران مرگھت ہوتے ہیں۔“

”یہ تو بتا، تو ادھر پہنچا کیسے؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”میرے ساتھ اسکول میں ایک ٹیچر تھا۔ اس کا نام جبار خان تھا۔ وہ بھی میری ہی طرح بے گھر در تھا۔ اسی نے اس جگہ کا سراغ نکالا۔“ عبد اللطیف نے مطلع کیا۔ ”وہی مجھے مرگھت لے گیا۔ وہ پہلے بھی کئی بار وہاں جا چکا تھا اور گھوم پھر کر اچھی طرح جائزہ بھی لے چکا تھا۔ مرگھت کے میں ہر طرح کی واقفیت بھی رکھتا تھا۔“

”تو ایسی ویران جگہ رہنے کو تیار کیسے ہو گیا؟“

”بھوری جو تھی۔“ عبد اللطیف نے مسکرا کر کسی قدر بے تکلفی سے جواب دیا۔ ”کیا تو شاید اہل رہنے پر تیار نہ ہوتا مگر جبار خان نے ہمت بندھائی تو میں رضامند ہو گیا۔ کرتا بھی کیا۔ بٹکے لیے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ جس کے گھر میں عارضی قیام تھا وہ سامان اٹھا کر باہر بھینکنے کی دھمکی دے چکا تھا۔ آخر ہم دونوں نے ایک روز اپنا اپنا سامان اٹھایا اور بیوی بچوں کے ساتھ مرگھت میں بٹکے لیے پہنچ گئے۔ بڑا مکان اس نے مجھے رہنے کے لیے دے دیا۔ اس لیے کہ اس کا چھوٹا تھا۔ اس کا صرف ایک بچہ تھا۔ اور میرے تین تھے۔“

”مرگھت تو بہت ڈراؤنی جگہ ہوتی ہے۔ تجھے ادھر ڈر اور خوف نہیں لگا؟“ رحیم داد نے مسکرا کر نا آرائی کی۔ ”ضرور لگا ہو گا۔“



عبد اللطیف مرگھت پر رہنے کے لیے پہنچا تو اتوار کا دن تھا۔ اسکول میں چھٹی تھی۔ اس نے بیوی

کے ساتھ مل کر کمروں سے کمریوں کے جا لے ہٹائے۔ مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے اور پھٹے پرانے کپڑے اٹھا کر گھر سے دور پھینکے۔ صحن کو گھاس اور جنگلی پودوں سے صاف کیا۔ کمروں کی صفائی کی اور رات کا کھانا کھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ دن بھر گھر کی صفائی کرنے کے بعد اس قدر تھک گیا تھا کہ فوراً ہی گہری نیند سو گیا۔

جاڑے کی رات تھی۔ عبدالطیف بیوی بچوں کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سو رہا تھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ باہر صحن میں کوئی چل رہا ہے۔ قدموں کی دبی دبی آہٹ ابھر رہی تھی۔ کمرے میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی تھی۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دیکھا بیوی پہلے ہی بیدار ہو چکی ہے۔ وہ خوف زدہ اور سہمی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

عبدالطیف کھڑا ہوا بستر سے نیچے اترا۔ لالٹین کی لو اونچی کی۔ اسے ہاتھ میں لٹکایا۔ جی کڑا کیا اور دھڑکتے دل سے دروازہ کھولا۔ بیوی بھی اٹھ کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ دلمیز پر دم بخود کھڑی رہی۔ عبدالطیف نے لالٹین اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی نظر نہ آیا۔ ہر طرف کمر کا ہلکا سرمئی دھندلا پھیلا تھا۔ اس نے جبار خان کو آواز دی۔ وہ بھی جاگ رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے میں ڈنڈا سنبھالے فوراً گھر سے باہر نکلا اور سردی سے کپکپاتا ہوا عبدالطیف کے پاس پہنچ گیا۔

دونوں دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ خوف اور سراسیمگی کا احساس زائل کرنے کے لیے ہنستے رہے، قہقہے لگاتے رہے۔ بھوت پریت کے وجود کو واہمہ قرار دے کر ایک دوسرے کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جبار خان چلا گیا۔ مگر عبدالطیف آدھی رات تک جاگتا رہا۔ بوا بھی جاگتی رہی۔ ذرا بھی آہٹ ہوتی، چونک کر دروازہ کی جانب دیکھتی۔

پہلی رات سخت بے چینی میں کئی دوسری رات آئی، تیسری آئی، جاڑے کی یہ راتیں ڈرا خوف کے عالم میں گزرتی رہیں۔ بار بار آنکھ کھل جاتی۔ کبھی رات کے پر ہول سنائے میں رو اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں ابھرتیں کبھی تیز تیز قدموں سے دوڑنے کی۔ ہوا تیز ہوتی تو ایسا ہوتا جیسے پتیل کے پیڑ پر بیٹھا کوئی کھکھلا گھر بن رہا ہے۔ قہقہے لگا رہا ہے۔ سب سے زیادہ ڈرا ہراس گیدڑ پھیلاتے۔ سرشام ہی ان کے غول کے غول مرگھٹ میں منڈلانے لگتے۔ ایسی ڈرا ناک آوازیں نکالتے تھے کہ بچے نیند سے بیدار ہو جاتے اور ڈر کر زور زور سے رونے لگتے۔

ملنے جلنے والوں سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا تو طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔ کہ چڑیل کا ذکر کیا کسی نے جھکل چیری کا واقعہ سنایا۔ کسی نے سرکٹے کے بارے میں بتایا کہ اس

نب ہوتا ہے۔ صرف گردن ہوتی ہے اور وہ زرخرے سے ایسی خوف ناک آواز نکالتا ہے کہ سننے لاڈ کر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ کسی نے آگیا ہتال کا قصہ چھیڑ دیا کہ وہ چھلاوا ہوتا ہے۔ مرگھٹ ن کا مسکن ہوتا ہے۔ آگ کی مانند دکھتا ہے۔ کبھی یہاں کبھی وہاں۔ ایک جگہ نہیں نکلتا۔ ان دنوں کون کر خوف اور سوا ہوا۔

عبدالطیف اور جبار خان عام طور پر سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھروں کو واپس پہنچتے۔ کسی وجہ سے کبھی دیر ہو جاتی تو واپسی پر کئی بار ایسا محسوس ہوا کہ مرگھٹ کے اندھیرے میں ہانک شعلہ بھڑک۔ آن کی آن میں قریب آیا اور دور جا کر غائب ہو گیا۔ مگر پلک جھپکتے ہی پھر نمودار آتا۔ معاً آگیا ہتال کا خیال آتا اور خوف سے دل دہل جاتا۔ قدم ڈگمگا جاتے۔ کتنے والے کہتے ہیں کہ یہ مردوں کی ہڈیوں سے خارج ہونے والا ایک کیمیائی عنصر، فاسفورس ہوتا ہے جو آگ کی طرح جلتا ہوا نظر آتا ہے اور پھر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے۔

ڈر اور خوف سے پریشان ہو کر عبدالطیف نے کئی بار مرگھٹ چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر کہیں سر پانے کا ٹھکانا نہ ملا۔ اسی عالم میں جاڑا گزر گیا۔ گرمی کا موسم شروع ہوا تو راتوں کا پر ہول سناٹا لمحہ کم ہو گیا۔ مرگھٹ کی ویرانی بھی زیادہ محسوس نہ ہوتی۔ اب راتیں مختصر ہو گئی تھیں اور دن دبل ہو گئے تھے۔ سورج جلد طلوع ہوتا اور دیر سے غروب ہوتا۔

عبدالطیف اور جبار خان رفتہ رفتہ مرگھٹ کے کے ماحول سے مانوس ہوتے گئے۔ خوف اور ہشت میں اس قدر کمی آگئی کہ چاندنی راتوں میں دونوں گھر کے باہر چارپائی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ اسے پیتے، سگریٹوں پر کش لگاتے اور رات گئے تک اطمینان سے باتیں کرتے رہتے۔

بچے دن بھر مرگھٹ میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے۔ بے دھڑک اس چبوترے پر لیٹ جاتے جس پر لمبی اترتھیں رکھی جاتی تھیں۔ کبھی کھیل کود میں کسی چتا کی پچی کچی راگھ اڑاتے، ہنستے، قہقہے اٹاتے، اکثر مردوں کی ہڈیاں اٹھا کر گھروں میں لے آتے۔ ابتدا میں تو ان کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ انڈ ڈپٹ سے بھی کام لیا گیا۔ پھر ایک ایسا وقت آیا کہ مردوں کی ہڈیوں کا خوف بھی جاتا رہا۔ مرگھٹ نہ رہا عام میدان بن گیا۔ زندگی کے ہنگامے موت کے خوف پر غالب آ گئے۔



رحیم داد نے مرگھٹ کے بارے میں ڈر اور خوف کا اظہار کیا تو عبدالطیف نے مسکرا کر بے ڈانسی سے کہا۔ ”شروع شروع میں تو واقعی بہت ڈر معلوم ہوتا تھا۔ خاص طور پر راتیں بہت راتوں ہوتیں۔ اکثر جاگتے ہوئے گزر جاتیں۔ مگر بعد میں تو یہ عالم ہوا کہ مرگھٹ مرگھٹ ہی نہ

حاصل کیے اور ایک روز پولیس کی بھاری جمعیت کے ساتھ پہنچا۔ تمام مکانات پولیس کی مدد سے خالی کرائے۔ ان کو کدالوں اور بیجوں سے توڑ پھوڑ کر مسمار کر دیا گیا۔

”پروکیل کو اس سے کیا ملا؟“ رحیم داد اب تک بات کی تمہ تک نہ پہنچ سکا تھا۔

”اس نے مرگھٹ کی زمیں کو دو دو اور چار چار مرلے کے چھوٹے بڑے پلاٹوں میں تقسیم کیا۔ ان میں سے بیشتر کو سوسائٹی کے فرضی ممبروں کے نام الاٹ کر کے فروخت کر دیا۔ اس طرح اس نے لاکھوں روپے پیدا کر لیے۔“

”لگتا ہے وکیل بہت اونچا کارِ بیکر تھا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر تبصرہ کیا۔

عبداللطیف نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”جب تک میں رہا اسے خاموش کالونی کہا جاتا تھا۔ بعد میں اس کا کیا نام رکھا گیا، یہ مجھے نہیں معلوم۔ میں ایسا دل برداشتہ ہوا کہ شیخوپورہ ہی چھوڑ دیا۔ لاہور آ گیا۔ تب سے یہیں ہوں۔“

اس نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ ایک ملازم کمرے میں داخل ہوا۔ رحیم داد کو یہ پیغام پہنچایا کہ احسان شاہ نے اسے بلایا ہے۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عبداللطیف بھی کھڑا ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے مخاطب کیا۔ ”لطیف، تو کل آجانا۔ میں آج شاہ جی سے بھی تیرے بارے میں مشورہ کر لوں گا۔“ رحیم داد آگے بڑھا۔ عبداللطیف سر جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلا۔



احسان علی شاہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ رحیم داد اس کے پاس پہنچا۔ احسان علی شاہ نے مسکرا کر پوچھا۔ ”چوہدری تو کمرے میں بیٹھا کس کے ساتھ باتیں کر رہا تھا؟“

”عبداللطیف تھا۔“ رحیم داد نے قریب کے صوفے پر بیٹھے ہوئے جواب دیا۔

”کون عبداللطیف؟“ احسان شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”وہی جسے مہربان علی لایا تھا۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”تو نے کہا تھا انگریزی پڑھنے کے لیے ماسٹرنگا لے۔ وہ اسی لیے آیا تھا۔“

احسان شاہ نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”مہربان سے تو میں نے ہی کہا تھا۔ وہ تیرے لیے ماسٹر لے آیا؟ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں۔ تجھے کیا لگا؟“

”مجھے تو ٹھیک ٹھاک بندہ لگتا ہے۔ بی اے تک پڑھا ہے۔ کتا تھا امتحان دیا تھا پر بی اے پاس نہیں کر سکا۔“

”پر تجھے پڑھانے کے لیے تو اتنی تعلیم کافی ہے۔“

معلوم ہوتا۔ نہ کبھی ڈر محسوس ہوتا نہ خوف۔ میں لگ بھگ تین سال تک مرگھٹ میں رہا۔“

”لطیف، تو تین سال تک مرگھٹ میں رہا؟ حد ہو گئی۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”صرف میں اور جبار خان ہی وہاں نہیں رہے۔ سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ دوسرے خالی مکان بھی آباد ہو گئے۔“ عبداللطیف نے بتایا۔ ”پھر تو ایسا بھی ہوا کہ میری طرح کے دوسرے بے گھر لوگوں نے بھی رہنے کے لیے مرگھٹ میں اپنے گھر خود بنانے شروع کر دیے۔ بعض نے اینٹوں کی پختہ دیواریں کھڑی کیں اور ان پر چھپر یا مٹین کے سائبان ڈال کر رہنے لگے۔“

”کسی نے روک ٹوک تو نہیں کی؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”روک ٹوک کون کرتا۔ مرگھٹ کی زمین تھی۔ نہ کوئی مالک تھا نہ کوئی دعویٰ دار۔ نہ کرایہ نہ کسی قسم کا ٹیکس۔“ عبداللطیف نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”ہر شخص اپنے مکان کو ذاتی ملکیت سمجھتا تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ دل ہی دل میں کہتا، چلو زندگی میں اپنا بھی ایک عدد مکان ہو گیا۔ تھا تو شہر سے دور لیکن اطمینان اور سکون حاصل تھا۔ مزے سے گزر بسر ہو رہی تھی۔“

”تو نے وہ مکان بعد میں فروخت کر دیا یا کرائے پر چڑھا دیا؟“

”نہ میں نے اسے فروخت کیا نہ ہی کسی کو کرائے پر دیا۔“ عبداللطیف کے چہرے پر ایک بار پھر دکھ کے سائے پھیل گئے۔ ”جب اجاڑ اور ڈراؤ نے مرگھٹ پر اچھی خاصی آبادی ہو گئی، ویرانی کے بجائے زندگی کی چل پھل اور رونق نظر آنے لگی تو ہوشیار پور کے ایک مہاجر وکیل نے ہوشیاری دکھائی۔ مہاجرین کی آباد کاری کے نام پر ایک کوپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کی۔ ایک ریٹائرڈ سیشن جج کو اس کا سرپرست بنایا۔ سوسائٹی کو باقاعدہ رجسٹر کرایا اور سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے ساز باز کر کے اور ٹکڑی رشوت دے کر مرگھٹ کی زمیں سوسائٹی کے نام پر الاٹ کرائی۔“

”مرگھٹ کو الاٹ کرایا، یہ کیسے ہو گیا؟“ رحیم داد نے تعجب سے عبداللطیف کو دیکھا۔

”اس کا علم تو ان سرکاری افسروں کو ہو گا، جنہوں نے الاٹمنٹ کا حکم جاری کیا۔“ عبداللطیف کے لہجے میں تلخی پیدا ہو گئی۔ ”کس قانون اور کس ضابطے کے تحت ایسا کیا گیا یہ مجھے نہیں معلوم۔ کوشش بھی نہ کی۔“

”پر جب الاٹمنٹ کا حکم دیا ہو گا تو تجھے بھی پتہ چل گیا ہو گا۔“

”تمام کارروائی اس قدر رازداری سے کی گئی کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔“ عبداللطیف نے رحیم داد کو بتایا۔ ”پتہ اس وقت چلا جب وکیل نے عدالت سے سب کی بے دخلی کے احکامات

”پہلے بھی سکول میں پڑھاتا رہا ہے۔“ رحیم داد نے احسان شاہ کا عندیہ لینا چاہا۔ ”تیری رائے ہو تو اسے لگا لوں۔“

”پڑھنا تجھے ہے یا میں نے؟“ احسان شاہ نے ہنس کر کہا۔ ”تجھے ٹھیک ٹھاک معلوم ہوتا ہے تو لگا لے۔ اپنے ساتھ لے جا۔“

”میں نے اسے کل بلایا ہے۔“ رحیم داد نے مطلع کیا۔ ”پتہ نہیں، وہ کوئلہ ہرکشن جانے کو تیار بھی ہو گا کہ نہیں۔ اس کے بال بچے ادھر ہی ہوتے ہیں۔“

”مہراں نے اسے یہ بات پہلے ہی بتادی ہوگی۔ آگے اس کی مرضی ہے۔ تو اس سے پوچھ لیتا۔“

”پوچھ لوں گا۔“ رحیم داد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”یہ بتا تو نے مجھے کس لیے بلایا ہے؟“

”میں کل صبح پشاور جا رہا ہوں۔“

”کب تک واپسی ہوگی؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”ہفتہ بھر لگ جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ پہلے آجاؤں۔“ کوئلہ ہرکشن جانا چاہے تو چلا جانا۔ ویسے تیری مرضی ہے۔ میرے واپس آنے تک ٹھیر سکتا ہے تو ٹھیر جا۔“

”کیا کروں گا ادھر ٹھیر کر۔ پتہ نہیں لاکل پور کی زمین کا جھگڑا کب طے ہو۔ تو نے تو مجھے ان کے لیے روکا تھا۔“ رحیم داد نے تجسس کا اظہار کیا۔ ”یہ بتا، لاکل پور کی زمین کا کیا بتا؟“

”اس کے فیصلے میں تو دیر لگے گی۔ ویسے میری کوشش تو یہی ہے کہ جلد ہی کام بن جائے۔ جھگڑا عدالت میں نہ جاتا تو بہت پہلے زمین اپنے پاس آجاتی۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”تو کوئلہ ہرکشن ہی میں ٹھیرنا۔ ضرورت ہوگی تو تجھے بلا لوں گا۔“

”میں کل نہیں تو پڑسوں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی مجھے اب اپنے پنڈ میں ہونا چاہیے۔ وہاں سے آئے ہوئے ڈیڑھ مہینے سے بھی کچھ اوپر ہی ہو گیا۔“

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ دونوں اٹھ کر کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے روز صبح ہی صبح احسان شاہ پشاور کے لیے روانہ ہو گیا۔

ساڑھے نو بجے عبدالطیف آگیا۔ رحیم داد اس کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اس نے غور کیا کہ عبدالطیف بہت تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کی بش شرٹ پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ پیشانی پر بھی پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ اس روز گرمی بھی زیادہ تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے، مگر ہوا بند تھی۔ جس اس قدر تھا کہ دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

”عبدالطیف تو رہتا کہاں ہے؟“ رحیم داد نے اس کی خستہ حالت دیکھ کر قیاس آرائی کی۔ ”گلتا ہے کہیں دور ہی رہتا ہے۔“

”یہاں سے کم و بیش پانچ میل کا فاصلہ ہو گا۔“

”تب تو بہت دور سے چل کر آ رہا ہے۔“ رحیم داد نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کرائے کا مکان لے رکھا ہو گا۔“

”نہیں چوہدری صاحب“ عبدالطیف نے بتایا۔ ”اتنی آمدنی ہی نہیں کہ مکان کا کرایہ ادا کر سکوں۔ لہذا تلاش ہی نہیں کیا۔“

”پر کہیں نہ کہیں تو رہتا ہی ہو گا۔“

”میں نے آپ سے بتایا تھا کہ شام کو ایک صاحب کے بچوں کو پڑھاتا ہوں۔“ عبدالطیف نے رحیم داد کو کسی قدر تفصیل سے اپنی رہائش کے بارے میں بتایا۔ ”وہ آگرہ کے مہاجر ہیں۔ انارکلی میں ان کی جو توں کی دکان ہے۔ آگرہ میں بھی یہی کاروبار کرتے تھے۔ سنا ہے وہاں بہت بڑا کاروبار تھا۔ مکان بھی اپنا ذاتی تھا۔ یہاں ان کو جو کوٹھی الاٹ ہوئی ہے اس میں گیراج بھی ہے۔ مگر گیراج میں رکھنے کے لیے کار نہیں ہے۔ میں اسی گیراج میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں۔“

”اس میں تو بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔“ رحیم داد نے اظہار ہمدردی کیا۔

”ہوتی تو ہے لیکن یہی کیا کم ہے کہ سر چھپانے کو ٹھکانا تو ہے۔“ اس کے لہجے میں دفعتاً افسردگی پیدا ہو گئی۔ ”شاید اسے بھی جلد ہی خالی کرنا پڑے۔ سنا ہے اسے جو توں کا گودام بنانے کا منصوبہ زیر غور ہے۔ صرف سنا ہی سنا ہے۔ کسی نے اس سلسلے میں مجھ سے بات نہیں کی۔“

”فکر نہ کر، اب تجھے زیادہ دنوں پریشانی نہیں اٹھانی پڑے گی۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”تو میرے ساتھ کوئلہ ہرکشن چل۔ بال بچوں کو بھی ساتھ لے لے۔ ادھر ٹھیرنے کو بہت جگہ ہے۔ ویسے مہراں علی نے تجھے بتا ہی دیا ہو گا۔ تجھے کوئلہ ہرکشن جانا ہو گا۔“

”انہوں نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا تھا۔“ عبدالطیف کے مڑھائے ہوئے چہرے پر تازگی ابھرنے لگی۔ ”دوسری تفصیلات کے بارے میں فیصلہ آپ کریں گے۔“

”فیصلہ تو میں نے کر لیا ہے۔“ رحیم داد نے عبدالطیف کو بتایا۔ ”تجھے ۶۰ روپے مہینہ تنخواہ ملے گی۔ رہنے کو مکان اور فصل پر غلہ بھی ملے گا۔ اپنے پاس بہت موٹی ہیں۔ دودھ اور مکھن بھی ملے گا۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”جان بن جائے گی تیری۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھ۔ بدن پر ذرا بھی گوشت نہیں۔ ہڈیوں کا بچھر نظر آتا ہے۔“

”آپ کب تک کوئلہ ہرکشن جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“
 ”مجھے تو کل جانا ہے۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”اگر تجھے میری نوکری کرنی منظور ہے تو کل میرے ساتھ چلنے کو تیار ہو جا۔“
 ”مگر میں اتنی جلدی کیسے چل سکتا ہوں۔“ عبداللطیف نے اپنی مشکل بیان کی۔ ”میرے ساتھ بیوی بچے بھی تو ہیں۔“

”ایسا کر، تو کل میرے ساتھ کوئلہ ہرکشن چل۔“ وہاں ٹھہر کر دو چار روز میں دیکھ لے، سمجھ لے۔ آگے جیسی تیری مرضی۔ بال بچوں کو بعد میں ادھر لے آتا۔“
 ”آپ کی تجویز نہایت مناسب ہے۔“ عبداللطیف نے اتفاق رائے کیا۔

رحیم داد نے جیب سے پچاس روپے نکال کر عبداللطیف کو دیئے۔ ”لے یہ رکھ لے۔ جو کتا ہیں شروع میں پڑھانی ہیں، ان کو خرید لیتا۔ کاپیاں شاپیاں بھی خرید لیتا۔ جو روپے بچ جائیں اپنے پاس رکھ لیتا۔ تجھے گھر کا کام چلانے کے لیے گھر والی کو بھی تو کچھ دے کر جانا ہو گا۔“
 ”جی ہاں، مجھے سب سے زیادہ یہی فکر تھی۔“ عبداللطیف کے لہجے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔
 ”کل آپ کس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے؟“

”صبح ناشتا کر کے چلنے کا ارادہ ہے۔ تب تک تو پہنچ جائے گا نا؟“
 ”میں صبح ٹھیک آٹھ بجے پہنچ جاؤں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اجازت ہو تو میں اب چلا جاؤں۔“

”بالکل چلا جا۔ کل میں تیرا انتظار کروں گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔

عبداللطیف نے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

صبح آٹھ بجنے سے چند منٹ پہلے ہی عبداللطیف پہنچ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی تھا جس میں چند کپڑے اور ضروری ساز و سامان تھا۔ بغل میں بستر دبا تھا جو ایک درمی چادر اور کتے کو لپیٹ کر بنایا گیا تھا۔ رحیم داد ناشتے سے فارغ ہو کر سفر کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ کوٹھی کے پھانک پر اس کی جیب کھڑی تھی۔ رحیم داد نے عبداللطیف کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ کوٹھی سے باہر نکلا اور عبداللطیف کے ہم راہ اس میں بیٹھ گیا۔ جیب آگے بڑھی اور پختہ سڑک پر دوڑنے لگی۔

بارش رکی ہوئی تھی۔ راستے میں بھی بارش سے سابقہ نہ پڑا۔ مگر جب جیب کوئلہ ہرکشن میں پہنچی تو چھما چھم بارش ہو رہی تھی۔ اطلاع ملنے ہی نادر خان حویلی کے پھانک پر پہنچ گیا۔ رحیم داد کو ادب سے سلام کیا۔ مزاج پوچھا۔ حال احوال معلوم کیا۔ رحیم داد نے اسے عبداللطیف سے ملایا۔

اس کی آمد کا مقصد بیان کیا۔ اور یہ ہدایت کی کہ عبداللطیف کے قیام کا عارضی طور پر مسمان خانے میں بندوبست کر دیا جائے۔

رحیم داد نے نادر خان سے زیادہ بات چیت نہ کی۔ سفر کی ٹکان سے مڑھا ہوا رہا تھا۔ وہ غسل کرنے کے بعد آرام کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مڑکر نادر خان کی جانب دیکھا۔ ”نادر، تجھ سے کل صبح آرام سے گل بات ہوگی۔ اب تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔“ وہ آگے بڑھا اور اپنے کمرے کی جانب روانہ ہو گیا۔ نادر خان خاموش کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

عبداللطیف بھی گم صم کھڑا تھا۔ وہ حویلی کی شان و شوکت اور رحیم داد کی آن بان دیکھ کر بہت مرعوب ہوا۔ نادر خان کے ہم راہ مسمان خانے میں گیا۔ ایک کمرے میں داخل ہوا جس میں نوکروں نے پہلے ہی اس کا بستر لگا دیا تھا۔ نادر خان اس کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔

ناشتا کرنے کے بعد رحیم داد صبح آٹھ بجے کے لگ بھگ اوپر کی منزل سے اتر کر نیچے آیا۔ بڑے کمرے میں پہنچا اور ایک صوفے پر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس نے نادر خان کو طلب کیا اور خاموش بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد نادر خان پہنچ گیا۔ اس کی بیوی، جنت بھی اس کے ہم راہ تھی۔ وہ بن سنور کر آئی تھی اور دوپٹے کے انچل سے ہلکا سا گھونٹ نکال کر اپنے شوہر کے پہلو میں سٹی سٹنائی کھڑی تھی۔ گود میں اپنے شیر خوار بیٹے کو اٹھائے ہوئے تھی۔ رحیم داد نے اسے دیکھا تو چونک پڑا۔ معاً اسے اپنا پہلوئی کا بیٹا کریم داد یاد گیا۔ بچپن میں وہ ہو ہوا ایسا ہی تھا۔ مگر کریم داد عرف کریم اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ وہ اپنی ماں نوراں کے ساتھ آگ میں جل کر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کی یاد کے ساتھ ہی اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔

جنت شرماتی لچاتی آگے بڑھی اور اپنے بچے کو رحیم داد کی طرف بڑھایا۔ رحیم داد نے اسے ہاتھوں میں لے کر سنبھالا۔ سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ گال کو پیار سے تھپ تھپایا اور جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نادر خان بہت خوش نظر آ رہا تھا تھا۔ چار بیٹیوں کے بعد یہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جنت کا چہرہ بھی مسرت سے سرخ پڑ گیا تھا۔

بچے نے ماں کی طرف دیکھا۔ رونے کے لیے منہ بگاڑا۔ رحیم داد نے اسے واپس جنت کی گود میں دے دیا۔ وہ سر جھکائے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ دروازے پر پہنچ کر ٹھکی۔ مڑکر رحیم داد کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ جنت نے بچے کو سینے سے چٹا کر پیرا کیا اور باہر نکل گئی۔

رحیم دار نے نادر خان کی جانب دیکھا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب وہ اس کے قریب ہی ایک

صوفی پر بیٹھ گیا تو رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”رفیع سمہ فصل اٹھا کر لے گیا؟“
 ”ہاں جی، وہ لے گیا۔ اس کی جو رقم بنتی تھی وہ بھی دے گیا۔“ اس کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں
 موجود تھیں۔ ”یہ رہی جی پوری رقم۔“

رحیم داد نے رومال میں لپٹے ہوئے نوٹ لے کر اپنے قریب رکھ لیے۔

نادر خان نے کہا۔ ”سمہ خریف کی فصل اٹھانے کو بھی کتنا تھا۔“

”خریف کی فصل کے بارے میں واڈھی پر سوچا جائے گا۔“ رحیم داد نے بے نیازی سے کہا۔
 ”یہ بتا، تو نے نیچے کے چھوٹے زمین داروں اور حصے داروں کی زمین خریدنے کے لیے بیعانہ شیعانہ
 تو ابھی نہیں دیا؟“

”تیری اجازت کے بغیر کیسے دے سکتا تھا۔ ویسے شہ زور مزاری کی حویلی میں میں نے تجھ سے
 پوچھ لیا تھا۔ پر نہ اب تک کسی کو کچھ دیا نہ بات کہی کی۔“ نادر خان نے نہایت مستعدی سے جواب
 دیا۔ ”کچھ مینے ان کے کچھ بندے سودا طے کرنے کی نیت سے آئے بھی تھے۔ میں نے ان سے
 صاف صاف کہہ دیا۔ چوہدری کی واپسی سے پہلے کچھ طے نہیں ہو سکتا۔“

”یہ تو نے بہت ٹھیک کیا۔“ رحیم داد خوش ہو کر بولا۔ ”میں نے اس بارے میں شاہ جی سے بھی
 گل بات کی تھی۔ اس نے مشورہ دیا ہے کہ ابھی تو برسات کا موسم ہے۔ پانی ویسے ہی بہت ہے۔
 بارش کے بعد جب پانی کی کمی ہو جائے تب سودا کرنا ٹھیک رہے گا۔“

”شاہ جی نے مشورہ تو ٹھیک ہی دیا۔“ نادر خان نے رحیم داد کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”جب پانی کی
 کمی ہو تو اپنے موگھوں سے زیادہ پانی نکالنا شروع کر دیا جائے۔ فصلیں خراب ہونے لگیں گی تو بہت
 سستے مول زمینیں مل جائیں گی۔“

”پر شاہ جی تو یہ بھی کہتا تھا کہ ابھی غلام محمد بیراج تیار نہیں ہوا۔ سندھ میں بیراجوں کی زمینوں
 کی الاٹمنٹ کیسے شروع ہو گئی؟“ رحیم داد نے نادر خان کو مطلع کیا۔ ”زمینوں کی الاٹمنٹ تو تب ہی
 ہونی چاہیے جب بیراج بن کر تیار ہو جائے۔“

”مجھے تو جی بیراجوں کی زمینوں اور ان کی الاٹمنٹوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ نادر خان
 نے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”اور اب تو“ تو آہی گیا ہے جو طے کرنا ہو گا طے کر لیتا۔“ اس نے بات
 کا رخ بدلتے ہوئے دریافت کیا۔ ”دلاور والا کی زمین کا کیا بتائی؟“

”وہ تو بہت جھگڑے کی زمین ہے۔ مزارعے اتنے سرکش اور جھگڑا لو ہیں کہ میں تجھے کیا بتاؤں۔
 انھوں نے تو بہت رولا کیا۔ کسی طرح کب نہ دینے کو تیار نہیں۔“

”جب ایسا ہے تو اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔“ نادر خان نے دبی زبان سے کہا۔ ”میں نے
 توجی پہلے ہی کہا تھا ایسی جھگڑے کی زمین اپنے پاس رکھنا ٹھیک نہیں۔“

”تو نے جو کہا تھا میں نے وہی کیا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”سردار عظمت اللہ دریشک کے
 ہاتھ اسے فروخت کر دیا۔ اب زمین کا کب نہ اس نے ہی حاصل کرنا ہو گا۔ جب کب نہ مل جائے گا تو
 وہ زمین کی کمیت یہاں آکر ادا کر دے گا۔ اس کے بارے میں میں نے خود طے نہیں کیا۔ شہ زور
 مزاری پر چھوڑ دیا ہے۔ شاہ جی کو بھی میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کی کوٹھی پر لکھا پڑھی ہو
 جائے گی۔“

”یہ توجی بہت ہی ٹھیک ہو گیا۔“ نادر خان نے مسکرا کر تائید کی۔

بارش رکی ہوئی تھی۔ رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے کمرے میں گیا۔ نادر خان نے فصل کی جو
 رقم دی تھی، اسے لوہے کی مضبوط ٹرک میں رکھ کر تالا لگایا۔ واپس آیا اور نادر خان کے ہم راہ
 مخریف کی فصل کا معائنہ کرنے کھیتوں کی طرف چلا گیا۔



رحیم داد نے عبداللطیف کو بلایا۔ وہ آیا تو رحیم داد نے مسکرا کر پوچھا۔ ”تجھے ادھر کوئی تکلیف
 شکایت تو نہیں؟ نوکر تو مہمان خانے میں موجود ہی رہتا ہے۔ جس چیز کی ضرورت ہو اسے بتا دیتا۔“
 ”آپ کی مہربانی ہے۔ چوہدری صاحب، میں بہت آرام سے ہوں۔“ عبداللطیف نے اسے
 اطمینان دلایا۔ ”مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔“ اس نے رسان سے اپنی خواہش کا اظہار
 کیا۔ ”اگر سفر کی تھکن دور ہو گئی ہو تو کیوں نہ آج ہی شام سے پڑھائی کا سلسلہ شروع کر دیا
 جائے؟“

رحیم داد نے بلا عذر اس کی بات مان لی۔

عبداللطیف شام کو کتابیں لے کر رحیم داد کے پاس پہنچ گیا اور تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ رحیم
 داد نے پڑھائی میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ عبداللطیف بھی پوری توجہ سے اسے پڑھاتا۔ ہر لفظ اور ہر
 جملہ ذہن نشین کراتا۔ رحیم داد کہیں الجھتا یا اسے دقت پیش آتی تو نہایت صبر و سکون سے سمجھاتا
 اور نہایت وضاحت سے بار بار سمجھاتا۔

وہ رحیم داد کو صبح و شام دونوں وقت پابندی سے پڑھاتا رہا۔ ہفتہ بھر بھی نہ گزرا تھا کہ رحیم داد
 سے اجازت لے کر عبداللطیف لاہور گیا اور بیوی بچوں کو بھی لے آیا۔ ان کے ٹھہرنے کا انتظام بھی
 مہمان خانے میں ہی کیا گیا۔ رحیم داد کے پاس کوئی مہمان آتا ہی نہ تھا۔ پاس پڑوس کے زمین

داروں سے اس کا میل جول بھی نہ تھا۔ سرکاری افسروں اور اہل کاروں سے بھی اس نے کبھی مراسم پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ لہذا مہمان خانہ عام طور پر خالی ہی رہتا تھا۔

برسات کے موسم میں تو ویسے بھی کسی مہمان کے آنے اور قیام کرنے کی توقع نہ تھی۔ عبداللطیف نہایت سکون سے مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کی صحت پہلے سے بہتر ہو گئی تھی۔ جسم پر گوشت چڑھنے لگا تھا۔ چہرہ بھر گیا تھا۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی جھلکنے لگی تھی۔

عبداللطیف کی بیوی کو کچھ عرصہ تواجیبت کا احساس ہوا۔ وہ بیزار اور اکتائی ہوئی رہتی۔ مگر جب جنت کے ساتھ میل ملاپ بدھا تو اس کا دل لگ گیا۔ بیشتر وقت جنت ہی کے ساتھ ہنستے بولتے گزرتا۔ جنت بھی ہر طرح اس کی مدد کرتی۔ دل جوئی کرتی۔ نادر خان کا رویہ بھی عبداللطیف کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ وہ ہر طرح اس کا خیال رکھتا۔ عبداللطیف زیادہ تعلیم یافتہ بھی تھا۔ لہذا نادر خان کو لکھنے پڑھنے کے کام میں اس سے مدد ملتی۔

برسات کا بھیگا بھیگا موسم گزر گیا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو گئی۔ جاڑا شروع ہو گیا۔ رحیم داد نہایت لگن اور دلچسپی سے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ عبداللطیف پوری توجہ سے اس کی تعلیمی استعداد بدھانے کے لیے کوشاں تھا۔ رحیم داد نے پینا پلانا بہت کم کر دیا تھا۔ کبھی ہڑک اٹھتی تو کمرے میں تنہا بیٹھ کر شغل کر لیتا۔ نادر خان کی غیر حاضری میں وہ کبھی کبھار چوری چھپے جنت کو اپنے کمرے میں بلا لیتا۔ مگر اب وہ بہت محتاط رہتی تھی۔ کترانے اور دور دور رہنے کی کوشش کرتی۔ عبداللطیف کی بیوی میں اس نے کبھی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ وہ سیدھی سادی گھریلو عورت تھی۔ بھدی اور کم رو بھی تھی۔ بناؤ سنگھار کا بھی شوق نہ تھا۔ ویسے بھی رحیم داد استاد کی حیثیت سے عبداللطیف کا خاصا احترام کرتا تھا۔ حالانکہ وہ عمر میں اس سے بہت بڑا نہ تھا۔

جاڑا بھی ختم ہو گیا۔ کھیتوں میں گندم اور جو کے ہرے بھرے پودے لہرا رہے تھے۔ گرمی کی آمد آمد تھی۔ مگر اس عرصے میں نہ احسان شاہ نے رحیم داد کو بلایا اور نہ ہی رحیم داد اس سے ملنے کے لیے لاہور گیا۔ دلاور والا کی زمین کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی۔ حسب وعدہ نہ سردار شہ زور مزاری اس کے پاس آیا اور نہ سردار عظمت اللہ دریشک نے کوئی پیغام بھیجا۔ رحیم داد کو تشویش پیدا ہوئی اور اس میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔

اپریل کے آغاز میں رحیم داد ایک صبح اپنی جیب میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔ احسان شاہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ تو نظر نہ آیا مگر مہمان علی مل گیا۔ رحیم داد کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ ”میں تو تیرے پنڈ کی طرف آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ تو آگیا یہ ٹھیک ہوا۔ چوہدری، لائل پور کی زمین

کا تصفیہ ہو گیا ہے، کب نہ بھی مل گیا۔“

”یہ خوش خبری سننے کے بعد رحیم داد سارا گلہ شکوہ بھول گیا۔ اس کا چہرہ مسرت سے دکنے لگا۔ پوچھا۔ ”شاہ جی کدھر ہے؟“

”وہ کل ہی کراچی گیا ہے۔“ مہمان علی نے مطلع کیا۔ ”مجھے کہہ گیا تھا کہ تجھے لائل پور کی زمین کے بارے میں خوش خبری سنا دوں۔“

”شاہ جی کراچی کیوں گیا ہے؟“

”جہاں تک مجھے پتہ ہے وہ اپنی کمپنی، جوائنٹ اسٹاک ایکسچینج میں رجسٹر کرا چکا ہے۔“ مہمان علی نے بتایا۔ ”ٹیکسٹائل مل لگانے کا پرمٹ اور مشینری امپورٹ کرنے کا لائسنس نکلوانے گیا ہے۔ بینک سے کرضہ بھی لیتا ہے۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”تجھے تو مجھ سے زیادہ پتہ ہونا چاہیے۔ تجھے تو کمپنی کا ڈائریکٹر لگایا گیا ہے۔ میں نے تو ساری ہی دستاویزات دیکھی ہیں۔“

”شاہ جی نے مجھے بتایا تو تھا۔ آگے کا مجھے پتہ نہیں۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے بتایا۔ ”شاہ جی کب تک لوٹے گا؟“

”اس دفعہ تو جی اس کا لہبا ہی پروگرام ہے۔ پتہ نہیں کب واپس آئے۔ بتا کر بھی نہیں گیا۔“ ”سردار شہ زور مزاری یا سردار عظمت اللہ دریشک تو پچھلے دنوں ادھر نہیں آئے؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔ اس کے لہجے سے بے چینی آشکارہ تھی۔

”میرے سامنے تو جی دونوں میں سے کوئی نہیں آیا۔“ مہمان علی نے لائسنس کا اظہار کیا۔ ”شاہ جی نے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔“

رحیم داد نے مزید پوچھ گچھ نہیں کی۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا معلوم کر چکا تھا۔ اس نے احسان شاہ کی کوٹھی پر ایک روز قیام کیا۔ دوسرے روز وہ واپس جانے لگا تو مہمان علی موجود تھا۔ رحیم داد اپنی جیب میں جا کر بیٹھا تو مہمان علی نے کہا۔

”چوہدری، مجھے بھی جانا ہے۔ کوٹھی کے نامکمل حصے کی تعمیر کے لیے اینٹوں کا بندوبست کرنا ہے۔ ادھر اینٹوں کے بھٹے ہیں۔ مجھے وہیں جانا ہے۔ تو مجھے ادھر چھوڑ دینا۔“

”ضرور چھوڑ دوں گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر مہمان علی سے بچھلی نشست پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ڈرائیور کو ہدایت کی۔ ”عابد، جیب فیروز پور روڈ کی طرف لے چل۔ مہمان کو ادھر پہنچانا ہے۔“ مہمان علی بچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔ جیب تیزی سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ فیروز پور روڈ پونچھی۔ مہمان علی اینٹوں کے ایک بھٹے کے سامنے اتر گیا۔

جپ آگے بڑھی۔ میل بھر سے بھی کم راستہ طے کیا ہو گا کہ ڈرائیور نے اسے روک کر ایک سائے دار درخت کے نیچے کھڑا کر دیا۔ ڈرائیور کو ریڈ ایئر میں پانی ڈالنا تھا۔ وہ ٹین کا خالی ڈبا ہاتھ میں دبا کر ایک طرف چلا گیا۔ رحیم داد بھی نیچے اترا اور جپ کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف جگہ جگہ اینٹوں کے بٹھے تھے۔ ان کی چمنیوں سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ کر فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔ رحیم داد نظریں اٹھائے اس سمت دیکھ رہا تھا جدھر ڈرائیور گیا تھا۔

”وے چوہدری، تو ادھر کیسے؟“ اچانک عقب سے آواز ابھری۔

رحیم داد نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ شاداں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی۔ رحیم داد بہت سٹ پٹایا۔ گھبراہٹ میں کچھ کہہ نہ سکا۔ لیکن شاداں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”چوہدری، تو نے مجھے پہچان لیا نا؟“

رحیم داد نے گہرے سبز شیشوں کا چشمہ آنکھوں پر درست کرتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا۔ ”تو شاداں تو نہیں ہے؟“

”ہاں جی، میں شاداں ہی ہوں۔“ وہ چمک کر بولی۔ ”پچھلے سال تو مجھے پتہ کی پر نظر آیا تھا۔ میں نے بار بار ہانک لگائی۔ تجھے بہت روکا۔ پر تو نہ رکا۔ گڈی میں سوار ہو کر چلا گیا۔ اس روز تو لالی بھی میرے ساتھ تھا۔“

”کون لالی؟“ رحیم داد نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”تو لالی کو نہیں جانتا؟“ شاداں کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”پر تو نے اسے کہاں دیکھا ہو گا۔“ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ”ہاں، یہ تو یاد ہو گا میں تجھے کاسم بیلا میں ملی تھی۔ ان دنوں تو گرد دیزویوں کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ لالی تب ملتان جیل میں ہوتا تھا۔ کاسم بیلا جیل سے زیادہ دور نہیں۔ میں اسی کے لیے ادھر تھی۔ تجھے بتایا بھی تھا۔“

”کچھ یاد تو پڑتا ہے۔“ رحیم داد نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ ”تو نے کاسم بیلا کیوں چھوڑ دیا؟“

”میں اپنے بچوں کے پاس چلی گئی تھی۔“

”تیرے بچے بھی ہیں؟“ رحیم داد نے مسکرا کر دریافت کیا۔

”گھر والا بھی تھا۔“ شاداں نے بتایا۔

رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔ ”اب وہ کہاں ہے؟“

”اپنے پنڈ میں ہوتا ہے۔ بچے بھی اس کے ساتھ ہی ہیں۔“ شاداں نے اکتتے ہوئے کہا۔ ”

اب وہ میرا گھر والا نہیں رہا۔ میں نے پچھلے دنوں اس سے طلاق لے لی۔ اس نے دوسرا دیاہ بھی کر لیا ہے۔“

”تب تو لالی سے تو نے بھی دیاہ کر لیا ہو گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔

”نہیں! وہ نظریں جھکا کر آہستہ آہستہ گردن ہلانے لگی۔ ”پر اب کر لوں گی۔“

”لالی، اب کدھر ہوتا ہے؟“ رحیم داد نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”وہ اب جیل سے چھوٹ چکا ہے۔“ شاداں نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”تب میں پتوکی میں اپنے اماں کے پاس ہوتی تھی۔ لالی کو پتہ تھا۔ جیل سے نکلتے ہی سیدھا میرے پاس پہنچا۔“

”لالی نے کوئی کام دھندا بھی شروع کیا یا ابھی تک۔“ رحیم داد نے مسکرا کر اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ شاداں فوراً اس کا اشارہ سمجھ گئی۔ اس نے صفائی پیش کی۔ ”لالی پہلے ایک کارخانے میں لگ گیا تھا۔ پر وہاں چھانٹی ہوئی تو اس کی نوکری بھی جاتی رہی۔ اب بھنے پر ہتھیرا لگ جائے گا۔“ اس نے ایک اونچی چمنی کی طرف ہاتھ اٹھا دیا۔ ”جمعہ دار حنیف ڈوگر نے لگوایا ہے۔ بھنے کے لیے وہی ہتھیرول کی بھرتی کرتا ہے۔ لالی اس کے پاس گیا ہے۔“

”تو بھی لالی کے ساتھ بھنے پر لگ گئی؟“

”ہاں جی میں بھی لگ جاؤں گی۔ دونوں مل کر کام نہیں کریں گے تو گزارہ کیسے ہو گا۔“ شاداں نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر محنت بہت کرنی پڑتی ہے۔ دہاڑی بھی کم ملتی ہے۔“

ڈرائیور ڈبے میں پانی بھر کر لے آیا تھا۔ وہ ریڈ ایئر کا ڈھکنا کھول کر پانی ڈالنے لگا۔ رحیم داد اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اسی اثنا میں شاداں کی آواز ابھری۔ ”چوہدری، لے دیکھ لالی بھی آگیا۔“

رحیم داد نے مڑ کر دیکھا۔ لالی ایک بھنے سے نکل کر جپ کی طرف آ رہا تھا۔ رحیم داد نے لالی کو دیکھا تو سخت سراپا ہوا۔

شاداں اس کی گھبراہٹ سے بے نیاز بولتی رہی۔ ”چوہدری، تو دو ڈاڑھیں دار ہے۔ لالی کو اپنے پاس لگالے۔ میں بھی تیری حویلی میں لگ جاؤں گی۔ دونوں ساتھ رہیں گے۔ بھنے پر تو سخت دھوپ اور گرمی میں کام کرنا پڑے گا۔“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”تو لالی کو اپنے پاس لگالے گا نا؟“

”یہ تو دیکھنے ہی میں مونشی چور لگتا ہے۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ ”تجھے پتہ نہیں، میں دوسرے ڈبے زمیں داروں کی طرح رسہ گیری کا دھندا نہیں کرتا۔“

”ناجی نا، لالی نے دوسروں کے ڈھور ڈنگر اٹھانے کا دھندا کبھی نہیں کیا۔“ شاداں نے لالی کی

جانب سے تردید کی۔

”فیر، جیل کیوں گیا تھا؟“

”چرا اب اس نے چوری ڈکیتی بالکل چھوڑ دی ہے۔“ شاداں نے رحیم داد کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”کبھی ایسا گندا کام نہیں کرے گا۔ چوہدری، اس نے مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔ اب تو بالکل نیک بندہ بن گیا ہے۔ میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔“

”اس کے وعدے کا کیا اعتبار۔“ رحیم داد کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ ”یہ ٹھیرا چور ڈکیت۔ میں شریف اور عزت دار زمین دار ہوں۔ ایسے سزا یافتہ اور جرائم پیشہ بندے کو اپنے پاس رکھ کر میں نے اپنی عزت خراب کرنی ہے؟“

لالی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا جیب کے قریب پہنچ چکا تھا۔ شاداں نے مسکرا کر کہا۔ ”لے یہ تیرے پاس آگیا۔ تو خود اس سے گل بات کر لے۔“

رحیم داد نے لالی کی طرف مطلق توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور جھپاک سے جیب میں بیٹھ گیا۔ شاداں نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ ”چوہدری، میری گل تو سن۔“

رحیم داد خاموش بیٹھا رہا۔ ڈرائیور نے انجن اشارت کیا۔ رحیم داد نے اس کے شور میں سنا۔ شاداں کہہ رہی تھی۔ ”چوہدری، تو لالی سے قول لے۔“ رحیم داد نے مڑ کر اس کی جانب نہ دیکھا۔ گردن اونچی کیے سامنے دیکھتا رہا۔ جیب آگے بڑھ گئی۔

لالی نے شاداں سے پوچھا۔ ”یہ کون تھا؟“

”یہ اپنا چوہدری نور الہی ہے۔“ شاداں نے بتایا۔ ”گھوڑا سپور کا مہاجر ہے۔ پر آج کل منگھری میں ہوتا ہے۔ کوئٹہ ہر کشن کا وڈا زمیں دار ہے۔ میں نے اس کے بارے میں پہلے بھی تجھ سے گل بات کی تھی۔ یاد ہے ناں، بچو کی پر بھی یہ نظر آیا تھا۔“

لالی نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ ”یہ چوہدری نور الہی ہے۔“ وہ گردن اٹھا کر جیب کی طرف دیکھنے لگا۔

جیب فراٹے بھرتی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے دور نکل گئی۔ شاداں اور لالی سڑک کے کنارے کھڑے کھوئی کھوئی نظروں سے رحیم داد کی جیب دیکھ رہے تھے، جو گردوغبار کے گولے اڑاتی رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی تھی۔



تیموں کے ایک بھٹے پر لالی اور شاداں، مٹی کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہے تھے۔ لالی رف دھوتی باندھے ہوئے تھا جس پر جگہ جگہ داغ دھبے تھے۔ چلچلاتی دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے سر پر پگڑی تھی۔ پگڑی بھی دھوتی کی طرح بوسیدہ اور میلی کچی تھی اور بے ترتیبی سے بندھی لی تھی۔ اس کے بدن کی رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ لالی کے قریب ہی شاداں اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے لمبے بال بکھرے پڑے تھے۔ دھوپ اور گردے مٹا لے پڑ گئے تھے۔ بالوں کی بے ترتیب لٹیں ہوا کے جھونکوں سے لڑاؤ کر چرے پر آجائیں جن کو وہ مٹی سے بھرے ہوئے ہاتھوں سے بار بار ہٹا کر سر کے پیچھے لے نے کی کوشش کرتی۔ اس کا چہرہ سورج کی تیز کرنوں سے جھلس کر تانبے کی طرح دھبہ رہا تھا۔ ٹھنوں میں ہلکی ہلکی سرخی تھی اور ہونٹ خشک پڑ گئے تھے۔

دونوں کے جسم پسینے سے شرابور تھے۔ وہ رک رک کر پیشانی پر بکھرے ہوئے پسینے کے قطرے کو نہچتے۔ ہاتھوں کو پھرتی سے چلاتے۔ لوہے کے سانچوں میں گارا بھر بھر کا اینٹیں تیار کرتے۔ ان پر نئے کے ٹریڈ مارک کا نشان ڈالتے، کھسکتے، پبلو بدلتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ان کو نہ گرمی کی شدت احساس تھا نہ بھوک پیاس کا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اینٹیں تیار کرنے کی دھن میں مگن تھے۔

سورج چڑھ کر آسمان کے پتھوں پہنچ گیا تھا۔ آسمان غبار آلود تھا۔ زمین سے گرمی کے بھبکے مٹے تھے۔ لو کے گرم گرم جھکڑ چلتے تھے۔ دھوپ کی تمازت سے جسم کھلتے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ رلی اپنے شباب پر تھی۔ پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی گول چنی سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

تو کچھ ٹھنڈا ہو جاتا۔ اینٹوں کی تپش کم ہو جاتی۔ تب بھٹوں سے اینٹیں نکالنے والوں کا کام شروع ہوتا۔ ان کے پیروں میں لکڑی کی کھڑاویں ہوتیں اور انگلیوں پر کپڑے کی پٹیاں لپی ہو تیں تاکہ پیر اور انگلیاں اینٹوں اور توے کی تمازت سے جھلس نہ جائیں۔

پختہ اینٹوں کو باہر نکالا جاتا۔ ایک بار پھر ریڑھوں اور ٹھیلوں میں بھرا جاتا اور میدان کے ایک گوشے میں ترتیب سے لگا کر پختہ بنا دیے جاتے۔ توے کے اوپر سے سرخ سرخ راکھ ہٹا کر صاف کر دیا جاتا۔



تیموں کے بھٹے پر اینٹیں تیار کرنے والے اپنے اپنے کام میں جتے تھے۔ لالی اور شاداں کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کے سامنے کچی اینٹوں کی قطاریں پھیلتی جا رہی تھیں۔ گارا کم ہوتا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اینٹوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ گارا ختم ہو گیا۔ مگر شاداں کام کرنے کے لیے مستعد تھی۔

”ہو ر گارا تیار کر۔“ شاداں نے دوپٹے کے پلو سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے لالی کو لکارا۔ ”پھوڑا اٹھا فافٹ مٹی نکال۔ آج تو زیادہ ہی کام کرنا ہو گا۔ تو نے سویرے ہی سویرے مجھے جگا کر کیا کہا تھا۔ یاد ہے ناں؟“

”یاد ہے بالکل یاد ہے۔“ لالی مسکرا کر بے نیازی سے بولا۔ ”تھوڑا دم لینے دے۔“ وہ پھسکڑا مار کر زمین پر بیٹھ گیا۔

شاداں نے منہ بگاڑ کر پھر ڈانٹا۔ ”پوستی نہ بن۔ اٹھا پھوڑا۔“ اس نے قریب پڑے ہوئے پھاؤڑے کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

لیکن لالی نہ اٹھا۔ دانت نکال کر ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔

اسی لمحے عقب سے آواز ابھری۔ ”بھین جی، تھوڑا پانی مجھے پلا دے۔“

شاداں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک نوجوان، تھین کچی اینٹوں کے نزدیک بڑھال بیٹھی تھی۔ اس کے میلے کپیلے بال خاک سے اٹے ہوئے تھے۔ ماتھے پر پسینے کے موٹے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ٹیٹیم اور غذاہیت کی کمی کے باعث چہرہ مرجھا کر مینالا پڑ گیا تھا۔ سر کے بال بھورے ہو گئے تھے۔ وہ بار بار لاغر نظر آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ہانپ رہی تھی۔ اس کی جوانی سسک رہی تھی اور بڑھاپے کے سائے وقت سے پہلے ہی منڈلانے لگے تھے۔ اس کے سامنے میلے اور بوسیدہ کپڑے پر نصف روٹی رکھی تھی۔ روٹی کے ساتھ ہری مرچیں اور نمک کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں تھیں۔

فیروز پور روڈ کے کئی میل کے علاقے میں جگہ جگہ بھٹوں کی ادھنی نیچی چنیاں تھیں جو دور سے نظر آتی تھیں۔ کچھ چنیاں پختہ تھیں کچھ لوہے کی معمولی چادروں کی بنی ہوئی تھیں۔ یہ چنیاں دھواں اگل رہی تھیں جو رفتہ رفتہ فضا میں پھیلتا جا رہا تھا۔ چنیلوں کے دامن میں وسیع میدان تھے جن میں بڑے بڑے گڑھے تھے۔ ان گڑھوں سے ہتھیرے زمیں کھود کو مٹی نکالتے۔ مٹی میں ضرورت کے مطابق پانی ملائے پھاؤڑے اور ہاتھوں کی مدد سے اسے آٹے کی طرح گوندھ کر گارا تیار کرتے۔ گارے کو سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کرتے۔

ہتھیروں میں کڑیل جوان، بوڑھے، بچے اور عورتیں سب ہی شامل تھے۔ پورے پورے کنبے اور خاندان تھے۔ دوسری ذات برادریوں کے علاوہ ان میں شیخ، مصلیٰ اور عیسائی زیادہ بڑی تعداد میں تھے۔ بیشتر بھاول پور کے رہنے والے تھے جن کو ریاستی کہا جاتا تھا۔ یہ خاندانوں کی صورت میں کام کرتے۔ یہ ہتھیرے نہ صرف پنجاب کے دور درواز علاقوں کے بھٹوں پر اینٹیں تیار کرتے۔ بلکہ بلوچستان بھی جاتے جہاں کوئٹہ کا وہ مشہور بھٹ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں اینٹیں تیار کرنے کا سب سے بڑا بھٹ ہے۔

گرمی بڑھتی جا رہی تھی۔ مگر ہتھیروں کے سدھے ہوئے ہاتھ مٹینوں کی طرح تیزی سے چل رہے تھے۔ ان کے سامنے ہموار زمین تھی جس پر دور تک ریت پھیٹی تھی۔ دوپہر کی دھوپ میں ریت چاندی کے تاروں کی طرح جھللا رہی تھی۔ اینٹیں سانچوں سے نکل نکل کر ریت کے اس چمکتے دکتے فرش پر تھاروں میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ یہ کبھی اینٹیں تھیں۔

اینٹیں دھوپ میں سوکھ کر سخت ہو جاتیں تو پختہ بنا کر ان کی گنتی کی جاتی۔ گنتی کے بعد چٹوں پر گیلیا چونا اس طرح چھڑک دیا جاتا کہ گنتی میں دوبارہ شامل کرانے کے لیے کوئی ہتھیرا ہیرا پھری نہ کر سکے۔ کمار ان اینٹوں کو چٹوں سے نکال نکال کر گدھوں پر لادتے یا ریڑھوں کے ذریعے بھٹوں تک پہنچاتے۔ بھرائی کرنے والے مزدور ان کو اٹھا اٹھا کر بھٹوں کے اندر اس مہارت سے چن دیتے کہ آگ تمام اینٹوں کو ایک ساتھ پکا کر سرخ کر دے۔ جب کبھی اینٹیں چن دی جاتیں تو جلائی کا کام کرنے والے آگے بڑھتے اور لکڑیاں اور کوئلے سلگا کر آگ روشن کر دیتے سرخ سرخ انگارے دھکتے۔ شعلے بلند ہوتے اور بھٹوں کی چنیاں گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اگلنے لگتیں۔

ہر بھٹے کی چنی کے عین نیچے پختہ چہوڑہ تھا جس پر ریت اور نرم مٹی پھیٹی تھی۔ اس چہوڑے کو ہتھیروں کی اصطلاح میں توکا کہا جاتا ہے۔ توڑا رفتہ رفتہ سرخ پڑتا جاتا اور اس پر چنی ہوئی کچی اینٹیں دھکتے انگاروں کی تیز آنچ سے تپ کر ٹھوس اور پختہ بن جاتیں۔ پھر وہ مرحلہ آتا جب آگ بجھ جاتی۔

کے گارے سے کچی اینٹیں تیار کر رہی تھی۔ چلچلاتی دھوپ سے اس کا جسم پکھل رہا تھا۔ وہ سینے سے شرابور تھی۔

شاداں نے حیرت سے پوچھا۔ ”تو نے کل ہی بچہ جنا ہے اور آج کام پر بھی آگئی؟“
 ”لگتا ہے تو نے بھنے پر نیا نیا کام شروع کیا ہے۔“ مریم کے ہونٹوں پر پھکی پھکی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ادھر رہے گی تو پتہ چل جائے گا کیا کیا ہوتا ہے۔ کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔“

”پر تجھے کچھ روز آرام تو کرنا ہی چاہیے۔“ شاداں نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”اپنے تو بیمار پڑ جائے گی۔ دیکھ تو کتنی کمزور لگ رہی ہے۔ جا کر آرام کر، کل آنا۔“

”آرام کرنے لگیں تو گزارہ کیسے ہو۔“ وہ گہری سانس بھر کر بولی۔ ”ویسے ہی خالی پیٹ رہنا پڑتا ہے۔ آرام کی سوچنے لگیں تو بھوک اور تنگ سے مرجائیں۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”ادھر رہے گی تو تجھے بھی ایسا ہی کرنا ہو گا۔“ آرام شارام بھول جا۔

مریم نے روٹی ختم کی۔ مٹی کا پیالہ اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگی۔
 ”میں تو کبھی ایسا نہیں کروں گی۔“ شاداں نے عکسے لیے میں کہا۔

”تیری بات دوسری ہے۔ پر ہم نے تو سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔“ مریم کی آواز میں درو کی کسک تھی۔ ”جتنا زیادہ کام کریں اتنا ہی کم ہوتا ہے۔“

”تجھے اتنا زیادہ کام کیوں کرنا پڑتا ہے؟“ شاداں کے لیے میں تجتس تھا۔

”وہ ایسا ہے جی۔“ مگر وہ اپنی بات پوری نہ کر سکی۔ قریب سے مردانہ آواز ابھری۔ ”مریم تو نے کام نہیں کرنا؟ باتیں ہی کرتی رہے گی۔“

شاداں نے گردن کو خم دے کر دیکھا۔ ایک -تھیرا تیکھی نظروں سے مریم کو گھور رہا تھا۔ شاداں نے مریم سے پوچھا۔ ”یہ تیرا گھروالا ہے؟“

”ہاں!“ مریم آہستہ سے بولی۔ اس نے مٹی کا پیالہ اٹھایا اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ہوئی بانی کے منکے کی جانب بڑھی۔ قریب پہنچی پیالہ پانی سے بھرا اور ہونٹوں سے لگا کر خالی کر دیا۔ پیالہ منکے کے پر رکھا اور واپس آگئی۔

لالی، گارا بنانے کے لیے اب مٹی کھود رہا تھا۔

مریم اپنی جگہ بیٹھ کر اینٹیں بنانے لگی۔ اس نے شاداں کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ سر جھکائے مستعدی سے سانچوں میں گارا بھرتی رہی۔ شاداں اٹھ کر لالی کے پاس چلی گئی اور کھدی ہوئی مٹی میں پانی ملا کر گارا تیار کرنے لگی۔

شاداں اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ فوراً اٹھی اور شیشم کے اس درخت کی جانب بڑھی جس کے نیچے پانی سے بھرا ہوا منکا رکھا تھا۔ وہ منکے کے پاس پہنچی۔ مٹی کے پیالے میں پانی بھرا اور اسے سنبھالے ہوئے اس عورت کے قریب گئی۔ پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ پیالہ ہونٹوں سے لگا کر بے صبری سے غٹاٹ پانی پینے لگی۔

وہ پانی پی چکی تو شاداں نے پوچھا۔ ”ہو پانی چاہیے؟“
 اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ پیالہ قریب ہی رکھ لیا۔ اس میں ابھی پانی موجود تھا۔ اس نے روٹی کا ٹکڑا توڑ کر لقمہ بنایا۔ منہ میں رکھا۔ مرچ اٹھا کر دانتوں سے کتری اور نمک کی ایک ڈلی منہ میں ڈال کر چبانے لگی۔

شاداں نے پوچھا۔ ”تیرا نام مریم ہے؟“

”ہاں!“ اس نے لقمہ چباتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

شاداں نے اسے غور سے دیکھا۔



نکل دن ڈھلے شاداں جب لالی کے ساتھ اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی تو یکایک -تھیروں کساروں، بھرائی اور جلائی کرنے والے مزدوروں کی ملی جلی آوازوں کے شور میں نسوانی چیخیں بلند ہوئیں۔ شاداں جھٹ اس طرف متوجہ ہوئی۔ دیکھا ایک نوجوان عورت کچی اینٹوں کی قطاروں کے پاس زمین پر پڑی بے قراری سے پہلو بدل رہی ہے۔ اس کے حلق سے مٹھی مٹھی چیخیں نکل رہی تھیں۔ دیکھتے دیکھتے -تھیروں میں سے چند عورتیں انھیں -جھپاک سے قریب پہنچیں۔ سروں سے چادریں اتاریں اور اس کے چاروں طرف چادروں کا پردہ تان کر کھڑی ہو گئیں۔

شاداں بھی گھبرا کر وہاں پہنچ گئی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک -تھیرن نے بچہ جنا ہے۔ بچہ چادروں کے حصار کے اندر نیاؤں نیاؤں کر رہا تھا۔ اسی اثناء میں ایک بوڑھی عورت -تھیروں کی جھونپڑیوں کی جانب سے نمودار ہوئی۔ نزدیک پہنچی۔ اس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ اسے سنبھالے ہوئے وہ چادروں کے پیچھے گئی۔ چھری سے نال کافی۔ بچے کو علیحدہ کیا۔ ذرا ہی دیر بعد زچہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لال لال گوشت کا لوتھڑا، نوزائیدہ بچہ، اس کے ہاتھوں میں کلبلا رہا تھا۔ زچہ ایک عورت کے سارے آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ایک جھونپڑی میں داخل ہو گئی۔
 یہ زچہ مریم تھی اور شاداں کے سامنے بیٹھی ہری مرچ اور نمک کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی۔ دوسرے -تھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کے ساتھ ہی صبح کام پر آگئی تھی۔ اور منہ

تو ہنٹ کیسے گزرے گا؟“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”منشی“ میرا تیرا چاچا یا ماماں تو ہے نہیں۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرے گا۔ ایک ایک پیسہ کاٹ لے گا۔“

عنایت مسیح جن انڈیشوں اور دوسوں سے سہا ہوا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد کھل کر سامنے آگئے۔ وہی ہوا جو اس نے مریم سے کہا تھا۔



یہ ہفتے کی شام تھی۔ ہتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے دوسرے محنت کشوں کا چٹھا تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ان کو ہفتے بھر کی محنت کی اجرت ادا کی جا رہی تھی۔ بھٹے کے مالک، میاں اسلم کا منشی، ایک بوسیدہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے لکڑی کی بھدی میز تھی۔ میز پر رجسٹر رکھا تھا۔ قریب ہی دھندلی سی لائین تھی۔ میز کے ارد گرد ہتھیروں، کھمار، بھرائی کرنے والے اور دوسرے مزدور نیم دائرے میں بیٹھے تھے۔

منشی کے سپاٹ چہرے پر سببگی سے زیادہ خشونت تھی۔ آنکھوں سے بے مری جھلکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی عینک درست کرتا۔ رجسٹر کے اوراق پلٹتا۔ لائین کی زرد زرد روشنی میں نظریں جھکا کر ان کو دیکھتا۔ وہ ہتھیروں کا چٹھا تقسیم کر رہا تھا۔ رجسٹر کے مندرجات کا غور سے جائزہ لینے کے بعد وہ نظریں اٹھاتا۔ اونچی آواز سے نام پکارتا۔ نام سنتے ہی مطلوبہ ہتھیروں کو کھڑا ہو جاتا اور منشی کے رو برو پہنچ جاتا۔ وہ ہتھیروں کے انگوٹھے پر روشنائی لگاتا۔ اس کا ہاتھ پکڑتا۔ قریب لاتا اور رجسٹر کے کھلے ہوئی ورق پر ہتھیروں سے انگوٹھے کا نشان لگواتا۔ معاوضے کی رقم گن کر اس کے حوالے کر دیتا۔ کوئی ہتھیروں کے بعد اعتراض کرتا یا بے اطمینانی کا اظہار کرتا تو وہ بے زاری سے اسے معاوضے کی تفصیل بتا دیتا۔ مزید جھگڑا تو غصے سے جھڑک دیتا۔

وہ ہتھیروں کے نام پکارتا رہا۔ ایک کے بعد دوسرا ہتھیروں کے سامنے پہنچتا رہا اور اپنا معاوضہ وصول کرتا رہا۔ منشی نے عنایت مسیح کا نام پکارا۔ وہ اٹھا اور جھٹ منشی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ منشی نے رجسٹر میں انگوٹھے کا نشان لگوا دیا اور دو روپے آٹھ آنے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ عنایت معاوضے کی رقم ہاتھ میں لیے چند لمحے گم صم کھڑا رہا۔ پھر اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ ”سب منشی“ یہ تو بہت کم ہے۔ اس بار تو میں نے زیادہ ہی محنت کی ہے۔ دہاڑی بھی اتنی ہی ہوئی چاہیے۔“

منشی نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ہاتھ اٹھا کر اپنی عینک درست کی۔ جھک کر رجسٹر دیکھا اور طوطے کی طرح فر فر پڑنے لگا۔

مریم کے شوہر نے ڈپٹ کر کہا۔ ”مریم تیرا ہاتھ چلا۔“

”چلا تو رہی ہوں۔“ مریم نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”عنایت“ مجھے تنگ نہ کر۔ تجھے پتہ ہے، میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”مجھے پتہ ہے، سب پتہ ہے۔“ عنایت مسیح نے نظریں اٹھا کر بیوی کی طرف نہ دیکھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ سانچوں میں گارا بھر بھر کر اینٹیں بناتے رہے۔ وہ بڑبڑانے کے انداز میں رک رک کر بولتا رہا۔ ”پر مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ شام کو چھٹا بٹے گا۔“

”مجھے بھی پتہ ہے۔ تب ہی تو سویرے ہی سویرے کام پر آگئی۔“ مریم کے لہجے میں ہنوز گلہ شکوہ تھا۔ ”نکے کو صرف ایک بار دودھ پلانے گئی تھی۔ بار بار اس کے رونے کی آواز سنتی ہوں۔ پر کام چھوڑ کر اس کے پاس نہیں گئی۔“ وہ اپنے نوزائیدہ بچے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ”بھوک سے رو رہا ہے۔ شور مچا رہا ہے۔“

”تو نے شیماں کو بھی ادھر نکٹے کے پاس چھوڑ رکھا ہے۔“ عنایت مسیح نے مریم کو یاد دلایا۔

”اس کا کام بھی تو ہم نے ہی کرنا ہو گا۔“

”شیماں کو ادھر نہ چھوڑتی تو نکٹا اکیلا رہ جاتا۔ کس کو تو اس کے پاس رہنا ہی چاہیے۔“ مریم نے صفائی پیش کی۔ ”ویسے چار سال کی شیماں کتنا کام کرتی ہے۔“

”یہ جو سارے ذرا ذرا سے نکٹے اور نکٹیاں ہیں، ان کو دیکھ رہی ہے۔“ عنایت نے ہاتھ اٹھا کر لہرایا اور ان کم سن اور نو عمر بچوں اور بچیوں کی جانب اشارہ کیا جو عورتوں اور مردوں کے ساتھ طرح طرح کے کام کر رہے تھے۔ ”یہ کھیل تماشا تو نہیں کر رہے۔ کام ہی تو کر رہے ہیں ناں؟“

”تو چاہتا ہے شیماں کو بھی ادھر کام پر لگا لیتی۔ نکٹے کو ادھر اکیلا چھوڑ دیتی تاکہ روتے روتے اس کا مرن ہو جائے۔“ مریم نے جھنجھلا کر عنایت کی جانب دیکھا۔ ”یہی چاہتا ہے ناں؟“

”میں تو یہ جانتا ہوں کام کم ہوا تو نہ تجھے کھانے کو ملے گا نہ نکٹے کو۔“ عنایت مسیح کے سدھے ہوئے ہاتھ تیزی سے چلتے رہے۔ اس کے ہاتھوں اور گردن کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ گال چپکے ہوئے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں اور اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ بدن پر گوشت اس قدر کم تھا کہ جگہ جگہ سے ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ وہ مسلسل کام کرتا رہا اور بولتا رہا۔

”آگے کی سوچ مریم“ آگے کی۔“

”سوچتے سوچتے میرا تو گھر فر گیا۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”تجھے پتہ ہے ہماری دہاڑی تو پیشگی میں کٹ جاتی ہے۔ ملتا ہے کیا ہے؟ زیادہ کام نہیں کرے گی“

۶۲۲۵

۳۵

۱۰۰

۶۰۰۰

۱۲ روپے

ایک روپے چار آنے

۱۲ آنے

۷ روپے ۸ آنے

۲ روپے ۸ آنے

تعداد اینٹ

فی ہزار پریس اینٹ کے حساب سے کٹوتی

نوٹ پھوٹ

کل اینٹ جس کی ادائیگی کی گئی

دو روپے فی ہزار کی شرح سے چھ ہزار اینٹ کی اجرت

ٹیرمھی دنگی اینٹوں پر کٹوتی

دو آنے فی ہزار کی شرح سے جمع داری

وصول پیشگی

کل اجرت

عنایت مسیح نے حساب کتاب کی پوری تفصیل سنی، مگر مطمئن نہ ہوا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ ”سین

نشی، تیرا حساب سمجھ نہیں آیا۔“

”وہ تو کبھی نہیں آئے گا۔“ نشی نے بے رخی سے کہا۔ ”تیرے اڑھائی روپے بنتے ہیں وہ تجھے

مل گئے نا؟“

”وہ تو جی مل گئے۔“ عنایت اب گڑ گڑانے لگا۔ ”پیشگی اس دفعہ کم کاٹ۔ سین، تجھے پتہ ہے

میری ذال نے کل ہی نکا جتا ہے۔“

”مجھ سے پوچھ کر جتا ہے؟“ نشی نے اسے ڈانٹا۔ ”خانا خاکی ٹرٹرنہ کر۔ مجھے ابھی دوسروں کو بھی

چھٹا باٹنا ہے۔“ اس نے مڑ کر حنیف ڈوگر کو دیکھا جو ہاتھ میں چمڑے کا پتھر دبائے کھڑا تھا۔ نشی نے

اسے ہشکارا۔ ”ڈوگر! اسے سنبھال۔ سیدھی گل بات اسے سمجھ نہیں آتی۔“

حنیف ڈوگر فوراً آگے بڑھا۔ اس نے عنایت مسیح کا بازو پکڑ کر زور سے کھینچا۔ عنایت نے

احتجاج کیا۔ ”میرا بازو تو چھوڑ۔“ مگر ڈوگر نے اس کا بازو نہ چھوڑا۔ کھینچتا ہوا ایک طرف لے گیا

چھتر اٹھایا اور سڑاک سڑاک عنایت کی کمر اور پیٹھ پر مارنے لگا۔

عنایت مسیح نے کھانے والی نظروں سے حنیف ڈوگر کو دیکھا۔ نہ اس نے اپنی کمر اور پیٹھ

چوٹ سہلائی نہ زبان سے کچھ کہا۔ خاموشی سے مڑا اور سر جھکا کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنی جھوپ

کی جانب روانہ ہو گیا۔

وہ جھوپڑی میں داخل ہوا۔ دیکھا شاداں اس کی بیوی کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی ہے۔

نوزائیدہ بچہ مریم کے سامنے پڑا تھا۔ شیمیں جھوپڑی کے باہر بے خبر سو رہی تھی۔ چراغ کی دہ

دھندلی روشنی میں مریم کا چہرہ مڑھایا ہوا نظر آرہا تھا۔ مگر عنایت نے نہ شاداں کی جانب توجہ دی نہ

بیوی کے مڑھائے ہوئے چہرے پر۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

مریم نے اس کے تسمائے ہوئے چہرے اور تیوری پر پڑے ہوئے گل دیکھے تو دم بخود رہ گئی۔

نرم لہجے میں دریافت کیا۔ ”دہاڑی مل گئی؟“

”ہاں!“ عنایت نے تلخی سے جواب دیا اور ہاتھ میں دبلی ہوئی ڈھائی روپے کی رقم حقارت سے

اس کے سامنے پھینک دی۔ ”لے یہ رہی دہاڑی۔“

”کل اڑھائی روپے!“ مریم نے دور روپے اور اٹھنی اٹھاتے ہوئے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

”اتنا کم کیوں ملا؟“

”یہ جا کر نشی سے پوچھ۔“ عنایت نے تلخی سے کہا۔ ”آگے اتنا بھی نہیں ملے گا۔ تجھ سے کام

ہو نہیں سکتا۔ شیمیں کو تو نے نکلے کی دیکھ بھال پر لگا دیا۔ جتنا کم کام ہو گا دہاڑی اتنی ہی کم ملے گی۔“

”پر اب گزارہ کیسے ہو گا؟ پورا ہفتہ کیسے کئے گا؟“ وہ دل گرفتہ ہو کر اپنی پریشانی بیان کرنے لگی۔

”روٹی نہیں ملے گی تو نکلے کو دودھ کیسے پلاؤں گی۔“ بچے نے اچانک رونا شروع کر دیا۔ ”بھوک سے

رورہا ہے۔“

وہ غصے سے چیخا۔ ”ایسا کر اس کا گلا گھونٹ دے۔“ بچہ اس کی اونچی آواز سن کر اور زور زور

سے رونے لگا۔ عنایت مسیح مشتعل ہو گیا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ ”میں خود ہی اس کا

گلا دباؤں دیتا ہوں۔“ وہ تڑپ کر بچے کی جانب پڑھا۔

مریم جھپاک سے اٹھی اور عنایت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مگر وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس

نے ہاتھ بڑھا کر مریم کو دھکا دیا۔ وہ پہلے ہی بڑھال تھی۔ دھکے سے سنبھل نہ سکی۔ لڑکھاتی ہوئی

دور جا کر گری۔ عنایت مسیح بچے کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے بچے کی جانب ہاتھ بڑھائے۔

شاداں بے قرار ہو کر چیخی۔ ”تو پاگل تو نہیں ہو گیا۔“ وہ تیزی سے اٹھی اور عنایت کے دونوں

کندھے پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔

عنایت مسیح نے پلٹ کر شاداں کو خونخوار نظروں سے دیکھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

شاداں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”اتنا نراض نہ ہو۔ آرام سے گل کر، آرام سے۔“

اس نے عنایت کا ہاتھ پکڑا اور ایک طرف لے گئی۔ عنایت خاموش رہا اور اپنی سانس پر قابو پانے

کی کوشش کرنے لگا۔ شاداں نے پیالہ اٹھایا۔ قریب رکھے ہوئے گھڑے سے اس میں پانی اٹھایا

پیالہ لے کر عنایت کے پاس گئی اور اس کے ہاتھ میں دے کر بولی۔ ”لے پانی پی لے۔“ عنایت پیالہ ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔

مریم ابھی تک فرش پر پڑی تھی۔ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس کا جسم آہستہ آہستہ مل رہا تھا۔ وہ رورہی تھی۔ رک رک کر سسکیاں بھر رہی تھی۔

شاداں نے دھوتی کے ڈب سے پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور عنایت مسج کی طرف بڑھا کر بولی۔

”لے اسے رکھ لے۔ اپنا کام چلا۔“

”میں نے تیرے روپے نہیں لینے۔“ عنایت نے انکار کر دیا۔ ”میں تیرا ادھار ادا نہیں کر سکوں گا۔ پیٹنگی ہی اب تک ادا نہیں کر سکا۔ تیرا ادھار کیسے چکاؤں گا۔“

”جب تیرے پاس ہوں دے دیتا۔ میں تجھ سے مانگوں گی نہیں۔“ شاداں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”تو بالکل فکر نہ کر۔“

مریم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شاداں کو منع کرنے لگی۔ ”بھین جی، اپنے روپے واپس لے لے۔“ وہ دوپٹے کے آئٹل سے اپنی بیٹگی ہوئی آنکھیں خشک کرنے لگی۔ ”تو نئی نئی آئی ہے۔ تجھے پتہ نہیں“

ادھر کوئی کسی کو ادھار نہیں دیتا۔ ہوتا ہی نہیں، ادھار دیں کہاں سے۔“

”ابھی تو میرے پاس ادھار دینے کو ہے۔“ شاداں مسکرا کر بولی۔ ”جب نہیں ہو گا تو نہیں دوں گی۔ اب تو جھگڑا ختم کر۔“

مگر مریم نے جھگڑا ختم نہ کیا۔ اس نے غصے سے چیخ کر عنایت سے کہا۔ ”تو ننگے کا گلا دبا دے ضرور دبا دے۔ پر یہ بھی سوچ لے، اس کے کفن دفن کو کوئی ادھار نہیں دے گا۔ نہ منشی دے گا نہ مالک۔“

عنایت مسج سر جھکائے گم صم بیٹھا رہا۔ مریم کی آواز ابھرتی رہی۔ ”تجھے پتہ ہے، پچھلے جاڑے میں واحد کے پتر کا مرن ہوا تو کیا ہوا تھا۔ واحد، منشی کے پاس گیا۔ میاں صاحب کے پاس بار بار گیا۔

منت کی، زاری کی۔ پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا جب تک پیٹنگی ادا نہیں ہو گی کوئی ادھار نہیں ملے گا۔“

”میت کو اٹھانے کے لیے بھی کچھ نہیں دیا۔ ہائے رہا، وہ کیسا بندہ ہے۔“ شاداں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مریم کو دیکھا۔

”تین روز تک لاش پڑی رہی۔ جب بہت زیادہ بو اٹھنے لگی تو ڈوگر آکر واحد پر سخت گرم ہوا۔ گالاں نکالیں۔ چھتر تھام کر بار بار اسے مارنے کو جھپٹا۔“ مریم بتاتی رہی۔ ”واحد نے شام تک کفن

دفن کا وعدہ کیا۔ تب ڈوگر نے اسے چھوڑا۔ واحد ایک ایک کے آگے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ کسی نے کچھ دیا، کسی نے انکار کر دیا۔ پر پورے سات روپے بھی اکٹھے نہ ہوئے۔ اس میں تو کفن بھی نہ آ سکتا تھا۔“

”فیر لاش کا کیا بنا؟“ شاداں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ویسے میونسپلٹی کی مردہ گاڑی لاش اٹھانے آگئی تھی۔“ اس دفعہ عنایت مسج نے جواب دیا۔

”پر شام ہونے سے پہلے پہلے میاں صاحب کے حکم پر منشی ۱۵ روپے لے کر پہنچ گیا تھا۔“

”اب یاد آیا تجھے۔“ مریم نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”مردہ شاداں کی جانب متوجہ ہوئی۔“ ”ایسا پہلی

بار نہیں ہوا۔ کئی بار ہو چکا ہے۔ تجھے کیا پتہ، ادھر کیا کیا ہوتا ہے۔“

مریم کی باتیں سن کر شاداں پریشان ہو گئی۔ اسی عالم میں وہ لالی کے پاس پہنچی۔



لالی اپنی جھونپڑی کے سامنے کھلے آسمان کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے قریب ایک ادھیڑ پتھیرا بھی بیٹھا تھا۔ دونوں باتیں کر رہے تھے۔

لالی نے شاداں کو دیکھا تو تعجب سے پوچھا۔ ”تو اب تک کدھر تھی؟“ اس نے پاس بیٹھے ہوئے پتھیرے کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ باری ہے۔ پرانا پتھیرا ہے۔ تیرے بارے میں بار بار پوچھ رہا تھا۔“

”کیا پوچھ رہا تھا تو؟“ شاداں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

”ماراض نہ ہو۔“ باری نے صفائی پیش کی۔ ”تو جوان دن ہے۔ تجھے رات کو اس طرح اکیلے نہیں جانا چاہیے۔“

”تیرا مطلب ہے کوئی مجھے اٹھا کر لے جائے گا۔“ شاداں کے لہجے میں بدستور جھنجھلاہٹ تھی۔

”آہستہ بول، آہستہ۔“ باری نے اسے نرمی سے ٹوکا۔

”تجھے پتہ نہیں شاداں۔“ لالی نے دبی زبان سے بتایا۔ ”باری کی ایک دھمی میاں صاحب نے اپنے پاس رکھ چھوڑی ہے۔ دوسری ڈوگر کے پاس ہے۔ ایک ۱۳ سال کی ہے دوسری ۱۰ سال کی۔

باری مجھے تیرے آنے سے پہلے یہی بتا رہا تھا۔“

”باری، تو نے ان کو واپس لانے کے لیے کچھ نہیں کیا؟“ شاداں نے حیرت سے دریافت کیا۔

”غریب پتھیرا ہوں، کیا کر سکتا ہوں؟“ باری نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ادھر تو بات کرنے کی بھی اجازت نہیں۔“

”ایسی گل نہ کر۔ باری تیری تو غیر مرگئی ہے۔“ لالی نے جھنجھلا کر طعنہ دیا۔

باری نے پلٹ کر قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا تھا۔ اسی وقت حریف ڈوگر کی آواز ابھری۔ وہ کسی ہتھیرے یا عٹے مزدور پر برس رہا تھا۔ گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ مارنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ ڈوگر کی آواز سننے ہی باری کے چہرے سے غصہ غائب ہو گیا۔ وہ سرا سیدہ ہو گیا۔ خاموشی سے اٹھا اور اندھیرے میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

حریف ڈوگر ایک جھونپڑی کی آڑ سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ لالی اور شاداں ہی کی جانب آ رہا تھا۔

حریف ڈوگر کے ہم راہ دو کارندے بھی تھے۔ دونوں ہی مسلح تھے۔ دھندلی دھندلی روشنی میں وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ ان کے چروں پر خشونت تھی۔ آنکھوں سے سفاکی جھلکتی تھی۔ وہ بار بار اپنی گھنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے۔ زور زور سے کھنکارتے تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی ہر آواز اور ہر آہٹ ختم ہو گئی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ نہ کوئی بول رہا تھا نہ کھانس رہا تھا۔ بھٹے کا وسیع میدان دفعتاً ”قبرستان کی طرح سسنا ہوا گیا تھا۔

ڈوگر کے ہاتھ میں اس وقت بھی چوڑے کا پتھر دبا تھا۔ وہ بھی میاں اسلام کا کارندہ تھا۔ قابل اعتماد تھا اور محرم راز بھی تھا۔ اس کا کام بھٹے کی نگرانی کرنا تھا۔ بھٹے پر کام کرنے والے ہتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ ان کو پوری طرح قابو میں رکھنا اور ضرورت کے مطابق بھٹے کے لیے ہتھیارے اور مزدور فراہم کرنا بھی تھا۔

کوئی ہتھیار یا عٹے مزدور سرکشی کرتا یا ہنگامہ برپا کرنے کی کوشش کرتا تو ڈوگر اس کے جسم پر پتھر مارنا شروع کر دیتا۔ ہنگامہ کرنے والے اگر تعداد میں زیادہ ہوتے تو وہ مسلح کارندوں کے ساتھ ان پر دھاوا بول دیتا۔ مار مار کر ان کو لہو لہان کر دیتا۔ طرح طرح کی سزائیں دیتا۔ کسی کی دھاڑی کٹوا دیتا کسی کو چپنی کے دیکھتے ہوئے توے پر برہمنہ پا کھڑا کر دیتا۔ کسی کو درخت سے الٹا لٹکا کر مچوں کی دھونی دیتا۔ ہر ہتھیار اور ہر عٹے مزدور اس کے نام سے قہر آتا، لرزتا تھا۔ اس کے سامنے نظریں اٹھا کر بات کرنے کی جرأت نہ کرتا تھا۔

بھٹے پر جب کام زیادہ ہوتا تو حریف ڈوگر ہتھیروں اور دوسرے مزدوروں کی بھرتی کے لیے میاں اسلام کے حکم پر نکلتا۔ بستی بستی، گاؤں گاؤں گھومتا پھرتا۔ ایسے کسانوں کو تلاش کرتا جن کے پاس کھیتی باڑی کے لیے زمین نہ ہوتی۔ جو کھیت مزدور ہوتے یا زمیں داروں کے ہاتھوں بے دخل ہونے

”ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔“ شاداں نے اس کی تائید کی۔ ”ادھر تو کوئی کسی سے گل بات نہیں کرتا۔ سب چپ چاپ رہتے ہیں۔ پوچھو تو بتاتے بھی نہیں۔ ایسے دیکھتے ہیں جیسے سنا ہی نہیں۔“

”سب میاں اسلام اور اس کے کرندوں سے ڈرتے ہیں۔ کرندے تو شکاری کتوں کی طرح جھپٹے ہیں۔ ایسی زبردست مار لگاتے ہیں کہ میرا جوڑ جوڑ درد کرتا ہے۔“ باری نے دھیمے لہجے میں اپنا دکھ درد بیان کیا۔ ”میں تو جنم جنم کا ہتھیار ہوں۔ میرا پو بھی ہتھیار تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس نے مجھے بھی بھٹے پر لگا دیا تھا۔ میں نے سارے ہی بھٹوں پر کام کیا ہے۔“

”میاں اسلام ہمیشہ سے ہی اس بھٹے کا مالک ہے؟“ لالی نے سوال کیا۔

”ناجی۔ میں تو اسے برسوں سے جانتا ہوں۔“ باری نے کہا۔ ”بھٹوں کے مالک سب ہی ہندو ہوتے تھے۔ لالہ سرل چند اور امر ناتھ سب سے زیادہ بھٹوں کے مالک تھے۔ میاں اسلام تو لالہ سرل چند کا منشی ہوتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے منشی گیری کرتے دیکھا ہے۔ پاکستان بنا تو سرل چند بھی دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بھاگ کر امر تر چلا گیا۔“

”میاں اسلام پہلے منشی ہوتا تھا؟“ شاداں کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”ہاں جی، لالہ سرل چند کا منشی تھا اور بہت وفادار منشی تھا۔“ باری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”شروع شروع میں تو چوری چھپے لالہ سرل چند کو بھٹے کی آمدنی کے ہزاروں روپے بھی پہنچاتا رہا۔ بعد میں مالک بن بیٹھا۔ تجھے پتہ ہے، اب تو میاں اسلام کے کئی بھٹے ہوتے ہیں۔“

”پہلے بھی بھٹوں پر ایسا ہی ہوتا تھا۔ ہتھیروں کو اسی طرح تک کیا جاتا تھا؟“ اس دفعہ لالی نے پوچھا۔

”دھاڑی تو کم ملتی تھی۔ ایک ہزار اینٹ بنانے کے چوداں آنے سے ایک روپیہ تک ملتا تھا۔ تب اتنی منگانی بھی نہیں تھی۔“ باری بتاتا رہا۔ ”جمعہ داری دو پیسے ہزار اینٹ پر نکلتی تھی۔ ہر ہفتے ایک من لکڑی، مٹی کا تیل اور گڑ دیا جاتا تھا۔“ اس نے لالی کی جانب دیکھا۔ ”ہاں، ہزار اینٹ پر اسی طرح ۲۰ اینٹوں کی کٹوتی ضرور ہوتی تھی۔“

”پر اب تو نہ لکڑی ملتی ہے نہ تیل نہ گڑ۔ جمعہ داری بھی زیادہ ہو گئی ہے۔“ شاداں نے تبصرہ کیا۔ ”ہتھیارے لکڑی، تیل اور گڑ کیوں نہیں مانگتے؟“

”شروع شروع میں ملتا تھا۔ جب بند ہوا تو ہتھیروں نے رولا کیا۔ پر ان کو ایسی کڑی سزائیں دی گئیں ایسی مار لگائی گئی کہ سب چپ کر کے بیٹھ گئے۔“ باری نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ ”اب تو ایسا ڈر اور خوف ہے کہ کڑیاں اور زنائیاں بھی اٹھائی جائیں تب بھی کچھ نہیں کہتے۔“

والے بے روزگار اور پریشان حال مزارعے ہوتے۔ ان کو وہ کم سے کم اجرت پر بھرتی کرتا۔ ان کی مجبوری اور زبوں حالی سے پورا پورا پورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ ہنگامی حالات اور فوری ضرورت کی صورت میں وہ زیادہ اجرت پر بھی ہتھیروں اور ہٹے مزدوروں کو بھرتی کرنے سے دریغ نہ کرتا۔ میاں اسلم نے اسے ایسے اختیارات بھی دے رکھے تھے۔

ہتھیروں اور مزدوروں کو بھرتی کرنے کے بعد وہ ریل گاڑی یا لاری سے ہتھیروں کی صورت میں بھٹے پر پہنچاتا۔ مگر ایک بار بھٹے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ان کی چوبیس گھنٹے کڑی نگرانی کی جاتی۔ اگر کوئی ہتھیرا یا مزدور کسی اشد ضرورت کے تحت اپنے آبائی گاؤں یا عزیز واقارب کی غمی یا خوشی میں شرکت کرنے کے لیے جانا چاہتا تو عام طور پر اسے اجازت ہی نہ ملتی اور ملتی بھی تو اس شرط پر کہ اس کے بال بچوں کو یہ غمال بنا کر رکھا جاتا۔

کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا کہ کوئی ہتھیرا اس قیدوند سے گھبرا کر فرار ہونے کی کوشش کرتا۔ پکڑا جاتا تو اسے کڑی سزا دی جاتی۔ رات کو باتھوں میں ہتھیریاں اور بیروں میں زنجیریں ڈال کر قید کر دیا جاتا۔ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو دُور اس کی تلاش میں نکلتا۔ اس کا سراغ لگانے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ اور ایک روز اچانک چھاپہ مار کر اسے پکڑ لیتا۔ پولیس اس کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی۔ بھٹے تک پہنچانے میں ہر طرح کی مدد کرتی اور اس کے صلے میں نقد مختانہ وصول کرتی۔

حنیف دُورگر ہر چند کہ میاں اسلم کا کارندہ تھا۔ نہایت وفادار تھا۔ حامی اور مددگار بھی تھا۔ اس کے لیے ہر جائز اور ناجائز کام کرنے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا تھا۔ وہ کسی دوسرے بھٹے کے لیے نہ کام کر سکتا تھا نہ اس سے کوئی تعلق رکھ سکتا تھا۔ مگر اس تمام کارگزاری اور جانثاری کے باوجود اس کی حیثیت ایک ٹھیکیدار سے زیادہ نہ تھی۔ اسے نہ کوئی تنخواہ ملتی تھی نہ کمیشن ملتا تھا اور نہ کسی قسم کا بھتہ یا الاؤنس۔

اسے صرف جعداری ملتی تھی۔ یہ جعداری ہر ہزار کچی اینٹ پر مقرر تھی۔ ہر ہفتے جب چٹھا بانٹا جاتا تو ہتھیروں کو اجرت ادا کرنے سے پہلے ہی جعداری کی رقم کاٹ لی جاتی۔ کوئی ہتھیرا نہ اس کے خلاف احتجاج کر سکتا تھا نہ اعتراض۔ جعداری کی ادائیگی ایک تسلیم شدہ ضابطہ تھا جو سالہا سال سے رائج تھا۔ اتنا قدیم تھا کہ کسی کو یہ بھی علم نہیں کہ کب رائج ہوا اور کس نے رائج کیا۔

ہتھیروں کی فی ہزار کچی اینٹ کی اجرت میں اضافہ ہوتا تو جعداری میں بھی اضافہ ہوتا۔ لیکن جعدار کو چونکہ ہٹے مالک کی خوش نودی اور سرپرستی حاصل ہوتی تھی، لہذا ہر بار جب ہتھیرے اپنی اجرت بڑھانے کے لیے آواز بلند کرتے اور اپنی اجرت بڑھانے میں کامیاب بھی ہو جاتے تو

جعداری میں اجرت کے تناسب سے کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو جاتا۔

حنیف دُورگر کو ان دنوں ہر ہزار کچی اینٹ پر دو آنے جعداری مل رہی تھی۔ مگر وہ اپنی جعداری میں اضافہ کرانے کے لیے ہتھیروں اور دوسرے ہٹے مزدوروں پر ہر طرح کا ظلم و ستم ڈھا رہا تھا تاکہ میاں اسلم پر اپنی زیادہ سے زیادہ وفاداری اور خیر خواہی کا سکہ ٹھاسکے۔ اس کی خوش نودی اور اعتماد حاصل کر سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بھٹے کے لیے سستے اور جفاکش ہتھیرے بھی میاں کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

یہ میاں اسلم کی مرضی پر تھا کہ کسی ہتھیرے کو کب تک بھٹے پر رکھا جائے اور کب علیحدہ کر دیا جائے۔ مگر وہ کسی بھی صورت میں ان کو آزاد نہ کرتا تھا۔ کاروبار میں مندی ہوتی تو وہ ان کو دوسرے بھٹوں کے مالکان کے ہاتھ فروخت کر دیتا تھا۔ اس سلسلے میں باقاعدہ مول تول ہوتا۔ موسمی حالات اور رسد و طلب کی روشنی میں بھاؤ طے کیا جاتا اور جب سودا پٹ جاتا تو موسیٹیوں کے ریوڑ کے طرح ان کو خریدار کے حوالے کر دیا جاتا۔

ہر بھٹے کا مالک ہتھیروں کا اسی طرح لین دین کرتا تھا۔ حالانکہ بھٹوں کے مالکان میں سخت کاروباری رقابت تھی اور کبھی کبھی تو یہ رقابت اتنی شدید ہو جاتی کہ مسلح تصادم بھی ہوتے۔ مقدمے بازی ہوتی اور برسوں چلتی۔ مگر ہتھیروں کے معاملے میں وہ ایک دوسرے سے ہر طرح کا تعاون کرتے۔ کوئی ہتھیرا فرار ہو کر کسی دوسرے بھٹے پر پہنچ جاتا تو اسے گرفتار کر کے فوراً اس کے مالک کے پاس پہنچا دیا جاتا۔ بھٹوں کے مالک ضرورت کے مطابق ہتھیرے خریدتے بھی تھے اور فروخت بھی کرتے تھے۔

خرید و فروخت کے اس کاروبار میں ہتھیروں اور ہٹے مزدوروں کے خاندان بکھر جاتے۔ شوہر ایک بھٹے پر ہوتا تو بیوی کسی دوسرے پر۔ باپ کہیں ہوتا بیٹا کہیں اور۔ جب وہ بچھڑ کر بکھر جاتے تو ایک دوسرے کو یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ کون کہاں ہے؟ کس بھٹے پر کام کر رہا ہے؟ کس شہر میں ہے؟ کس علاقے میں ہے؟ یہاں تک کہ آنے سامنے یا قریب کے بھٹے پر کام کرنے کے باوجود وہ مینوں بے تعلق اور بے خبر رہتے اور اگر کسی دوسرے شہر کے بھٹے پر لگا دیئے جاتے تو برسوں ایک دوسرے سے جدا رہتے بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاتے۔

ہتھیروں اور دوسرے ہٹے مزدوروں کی خرید و فروخت کی بنیاد، ہٹے مالکوں کی اصطلاح میں پیٹلی ہوتی تھی۔ پیٹلی کی صورت یہ ہوتی کہ جب ہتھیروں یا ہٹے مزدوروں کو بھرتی کیا جاتا تو عام طور پر وہ بالکل قلاش ہوتے۔ ان کے بدن پر لباس کے بجائے چھتھرے ہوتے۔ مسلسل فاقہ کشی

سے نیم جاں ہوتے۔ وہ بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر ہی اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے کے لیے آمادہ ہوتے تھے۔ بیشتر مقروض بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ قرض کی ادائیگی اور فوری ضروریات کے لیے بھرتی کے وقت حٹہ مالکان کی جانب سے ہتھیروں کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی۔ یہ ایسا قرض ہوتا جو قسطوں میں ہتھیروں اور حٹہ مزدوروں کی اجرت سے کٹا رہتا۔

قرض دینے کا یہ طریقہ کار قیام پاکستان سے قبل ہندو حٹہ مالکان نے رائج کیا تھا۔ مگر سودر سود کی بنیاد پر وہ ہتھیروں کو قرض کے جال میں اس طرح جکڑ دیتے تھے کہ کم ہونے کے بجائے گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔

قرض میں اس اضافے کا ایک بنیادی سبب یہ بھی تھا کہ ہر ہفتے چٹھا بانٹتے وقت ہتھیروں کی اجرت سے پیشگی رقم کی جو قسط کاٹی جاتی وہ حساب کتاب کے رجسٹر میں کم اور اکثر سرے سے درج ہی نہیں کی جاتی۔ ہتھیروں اور حٹہ مزدور ان پڑھ اور جاہل ہوتے۔ انھیں مطلق خبر نہ ہوتی کہ رجسٹر میں ان کے نام کے خانے میں کتنی رقم کا اندراج کیا گیا اور آیا کیا بھی گیا کہ نہیں۔

منشی ان کے ان پڑھ ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا اور مالک کی خوش نوری حاصل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کارگزاری دکھانے کی کوشش کرتا۔ اس کارگزاری کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پیشگی کا سلسلہ ایک بار شروع ہوتا تو کبھی ختم نہ ہوتا۔ ہتھیروں اور حٹہ مزدور مالکان کی ایک طرح سے ذاتی ملکیت بن جاتے۔ ملک تقسیم ہوا۔ آزاد ہوا۔ مگر ہندو حٹہ مالکان نے پیشگی کا جو طریقہ کار رائج کیا تھا، اسی طرح برقرار رہا۔ اس میں سرمو فرق نہ آیا۔ بلکہ اس پر پہلے کی بہ نسبت زیادہ سختی سے اس طرح عمل درآمد کیا جاتا کہ پیشگی کا طریقہ کار کھلی دھاندلی بن گیا۔

لالی نے بھی بھٹے پر کام شروع کرنے سے قبل تین سو روپے پیشگی لیے تھے حالانکہ اسے اتنی رقم کی ضرورت نہ تھی۔ شاداں کے پاس کچھ کم پچاس روپے موجود تھے۔ ان سے وہ کام چلا سکتا تھا مگر حنیف ڈوگر کے اصرار کرنے پر اس نے بھی دوسرے پھروں کے ساتھ پیشگی وصول کر لی تھی۔ بعد میں بھی ڈوگر کا رویہ اس کے ساتھ دوستانہ رہا۔ بات کرتا تو لہجے میں نرمی اور گفتگو ہوتی اس شفقت اور سربستی کو نہ صرف اس نے محسوس کیا بلکہ دوسرے ہتھیروں اور حٹہ مزدوروں نے بھی محسوس کیا تھا۔ لالی اس کی اس قدر مرہانی کا مقصد ہنوز سمجھ نہ سکا تھا۔ وہ اس سے خائف تھا اور کتراتا بھی تھا۔ اس لیے کہ بھٹے پر کام کرنے والے سارے ہی ہتھیروں اور محنت کش ڈوگر سے شدید نفرت کرتے تھے۔

حنیف ڈوگر اپنے مسلح مگروں کے ساتھ آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچ گیا اس نے شاداں کو یہی چھٹی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ گھبرا گئی۔ دوپٹہ کھینچ کر سر ڈھک لیا۔ نظریں جھکا کر فرش کو ناموشی سے تکتے لگی۔

لالی نے اٹھ کر ڈوگر کو سلام کیا۔ پوچھا۔ ”جعدار کیسے آنا ہوا ہے؟“

”تجھ سے کچھ ضروری گل بات کرنی تھی۔“ حنیف ڈوگر نے اس وقت بھی مسکرا کر شفقت کا اظہار کیا۔ ”آ میرے ساتھ۔“

”مجببات نہیں ہو سکتی۔“ لالی نے ٹالنا چاہا۔ ”اب تو مجھے اونگھ لگ رہی ہے۔ آج تو میں بہت تھک گیا۔ کام بھی زیادہ ہی کیا تھا۔“

”سو جانا۔ میں نے تجھے زیادہ دیر نہیں روکنا۔“

”جیسی تری مرضی۔“ لالی مزید انکار نہ کر سکا۔

حنیف ڈوگر نے دونوں مسلح کارندوں کو گشت پر روانہ کر دیا اور لالی کے ہم راہ جھونپڑیوں کے قریب سے گزرنے لگا۔ وہ اندھیرے میں سنہل سنہل کر چلتے رہے اور گھرے گڑھوں سے بچتے بچاتے میدان کے دوسرے سرے پر پہنچ گئے۔ ان کے سامنے ایک کشادہ کوٹھری تھی جس پر ٹین کا سائبان تھا۔

سائبان کے نیچے دیسی شراب کشید کرنے کی بھٹی تھی۔ جنوبی دیوار میں طاق تھا۔ اس میں لائین رکھی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ وہ صرف دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ کوٹھری میں گرمی اور امس تھی ان کے چروں اور پیٹھ پر پسینے کے قطرے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ شراب کشید کر رہے تھے۔ ہر طرف تیز بو پھیلی ہوئی تھی۔

دروازہ کھلا تھا۔ حنیف ڈوگر اندر داخل ہو گیا۔ لالی بھی اس کے ساتھ ساتھ اندر چلا گیا۔ شراب کشید کرنے والوں نے مرکز ڈوگر اور لالی کو دیکھا۔ اونچی آواز سے سلام کیا۔ لالی کو بھٹی کے بارے میں سن گن مل چکی تھی۔ مگر پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے بھٹی کی اس نکلی کو دیکھا جس سے قطرہ قطرہ شراب ٹپک رہی تھی اور نکلی کے نیچے رکھے ہوئے ایک پیپے میں جمع ہو رہی تھی۔

خالی اور شراب سے بھرے ہوئے کئی پیپے کوٹھری کے ایک گوشے میں رکھے تھے۔ شراب سے بھری ہوئی چند بوتلیں بھی تھیں۔ ڈوگر نے مسکرا کر لالی کی جانب دیکھا۔ پوچھا۔ ”پینی ہے؟“

”نہیں جی، میں ایسا کام نہیں کرتا۔“ لالی نے صاف انکار کر دیا۔

”جیسی تیری مرضی۔“ ڈوگر نے اصرار نہ کیا۔ اس کے منہ سے بھگے نکل رہے تھے۔ آنکھیں نشے سے چڑھی ہوئی تھیں۔ ”میں نے تو شام ہی کو اپنا کوٹا پورا کر لیا تھا۔“

لالی خاموش کھڑا رہا۔ حنیف ڈوگر بھٹی کے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ گرمی اور جس سے اس کے ماتھے پر بھی پسینے کے قطرے جھلکانے لگے تھے۔ وہ باہر نکلا۔ لالی بھی اس کے ہم راہ باہر آگیا۔ تازہ ہوا میں ان کو سکون ملا۔ ہوا کے جھوکے ٹھنڈے اور خوشگوار محسوس ہوئے۔ دونوں آگے بڑھے۔ شراب کشید کرنے کی بھٹی سے بیس پیچیس قدم کے فاصلے پر بھٹے کا دفتر تھا۔ اس کی دیواریں پختہ تھیں۔ دفتر کے دروازے پر اس وقت قفل پڑا تھا۔

دفتر سے منسلک پختہ کمرہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی مقفل تھا اور صرف میاں اسلم کی آمد پر کھلتا تھا۔ وہ اکثر رات کو اس کمرے میں ٹھہرتا بھی تھا۔ سرما کی طویل اور کسر آلود راتوں میں یہ کمرہ عام طور پر آباد رہتا تھا۔ میاں اسلم دوست احباب کے ساتھ آتا۔ پیتا پلاتا۔ بے تکلفی سے قہقہے لگاتا۔ داو عیش دیتا۔ کبھی آدمی رات کو اٹھ کر چلاتا اور کبھی صبح تک کمرے میں مقیم رہتا۔

کمرے کی کینچی بھٹے کے ایک پرانے ملازم کے پاس رہتی تھی۔ وہ ادھیڑ تھا۔ قابل اعتماد تھا اور دفتر کی پشت پر ایک جھونپڑی میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ اس وقت جاگ رہا تھا۔ حنیف ڈوگر اور لالی کے پیچھے ہی وہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلا اور ایک چارپائی لا کر دفتر کے سامنے ڈال دی۔ حنیف ڈوگر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ لالی کو بھی اپنے قریب ہی بٹھالیا۔ اس نے ملازم کو مخاطب کیا۔

”میراں پانی تو پلا۔ بہت پیاس لگی ہے۔“

میراں مڑا اور ذرا ہی دیر بعد المونیم کے گلاس میں پانی لے کر واپس آگیا۔

حنیف ڈوگر نے پانی پی کر گلاس میراں کو واپس دیا۔ وہ خاموشی سے اپنی جھونپڑی کی جانب چلا گیا۔ ڈوگر نے مڑ کر لالی کو دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”پتہ ہے میں تجھے یہاں کس لے لایا ہوں۔“

”مجھے کیا پتہ تو کس لیے لایا ہے۔“ لالی نے اپنی لاعلمی کا برملا اظہار کیا۔ ”جب تک توجھائے گا نہیں مجھے کیسے پتہ چلے گا۔“

”بھٹے پر جو کام کر رہا ہے اس سے تو خوش ہے؟“ ڈوگر نے قطعی مختلف سوال کیا۔

لالی نے چونک کر ڈوگر کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”بعد ازاں میں تیری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

”مطلب یہ کہ تو شاداں کے ساتھ سخت دھوپ اور گرمی میں اینٹیں تیار کرنے کا جو کام کرتا ہے تجھے پسند ہے؟“ ڈوگر نے اس دفعہ اپنی بات کا مفہوم وضاحت سے بیان کرنے کی کوشش کی۔

”میں تو جی، جب بہت چھوٹا تھا تب بھی بھٹے پر کام کرتا تھا۔“ لالی نے حنیف ڈوگر کو آگاہ کیا۔

”سخت گرمی میں کام کرتا تھا اور کڑا کے کے جاڑے میں بھی کرتا تھا۔ ویسے ہی اب کرتا ہوں۔ کام جو کرنا ہوا۔ کوئی مفت میں تو دوباڑی دیتا نہیں۔“

”تو اب تک میری بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“ ڈوگر نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لودھوپ میں کام کر کے تو اور شاداں دونوں ہی ختم ہو جائیں گے۔ بدن پر نہ گوشت رہے گا نہ خون۔ کچھ ہی دنوں بعد ہی تم دونوں دوسرے پتھریوں کی طرح ہڈیوں کا پنجرہ جاؤ گے۔ یہی دیکھ جب تو ادھر آیا تھا تو کیسا تھا اور اب تیرا کیا حال ہے۔ شاداں بھی ایسی لگتی ہے جیسے بھٹے کے اندر سے جھلس کر نکلی ہو۔“

”وہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔ پتھیرے کا کام ہی ایسا ہوتا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں تو پتھیرے کا کام چھوڑ دے۔“ حنیف ڈوگر نے کھل کر بات کی۔ ”کرندہ لگ جا۔“ اس نے لالی کا بازو پکڑ کر انگلیوں سے گوشت ٹٹولا۔ ”تو نکڑا جوان ہے۔ بہت چنگا کرندہ بن سکتا ہے۔ کام بھی کم کرنا ہوگا۔“

”صرف دسی شراب پی کرنے میں بڑھکیں ماریں ہوں گی۔ پتھریوں اور کساروں کی کڑیاں اٹھا کر تیرے پاس پہنچانی ہوں گی۔ کوئی گڑ بڑ کرے گا، شور شرابہ کرے گا تو دبا کے اس کی پٹائی کرنی ہوگی۔“ لالی نے تھکے لہجے میں کہا۔ ”یہی کام کرنا ہوگا؟“

”زیادہ اونچی اونچی گلاں نہ کر۔“ ڈوگر مشتعل ہو گیا۔ ”مجھے پتہ ہے تو چوری ڈکیتی کرتا رہا ہے۔ کئی بار جیل میں بھی بند رہا ہے۔“ اچانک اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”تو چاہتا ہے نیک بندہ بن کر رہے تاکہ پولیس تجھے تنگ نہ کریں۔ سچ بتاؤ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا ہے۔“

”تو پولیس کی فکر نہ کر۔“ حنیف ڈوگر نے لالی کو رام کرنے کی کوشش کی۔ ”سارے ہی میاں اسلم کے یار ہیں۔“ اس نے کمرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”جاڑا آنے دے تب دیکھنا تھا نیدار اور دوسرے وڈے افسر تجھے ہر رات ادھر نظر آئیں گے۔ پر گرمی میں بھی کبھی کبھی ادھر محفل بنتی ہے۔ بیس کمرے کے سامنے کرسیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ رات دیر تک پینے پلانے کا شغل ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہو گا جی، پر میں نے اس سے کیا لیا۔“

”تنخواہ ٹھیک ٹھاک ملے گی۔ سب پر رعب بھی رہے گا۔“ ڈوگر نے لالی کو متاثر کرنے کی ایک

ہیں۔ وہ میرے کہنے پر چلتے ہیں۔ میں بھی ہر طرح ان کی مدد کرتا ہوں۔“ اس نے مسکرا کر لالی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ لالی کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ”تو چاہتا ہے، میں تیرے لیے خبری کروں۔ یہی چاہتا ہے؟“

”خبری شخبری نہیں، میں تو صرف یہ چاہتا ہوں تو ادھر رہے تو ایسا بندہ بن کر رہے جس پر میں بھی بھروسہ کر سکوں۔ اس میں تیرا ہی فائدہ رہے گا۔“

”بھدار تیری بہت بہت مہربانی۔“ لالی نے انکساری سے کام لیا۔ ”پر میں ایسا کام نہیں کر سکتا۔ میں نے خبری ہی کرنی ہوتی تو پولیس کا خبر لگ جاتا۔ اس میں تو زیادہ فائدہ تھا۔ پر میں کسی ایسے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا۔“

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ حنیف ڈوگر نے اسے حکیمی نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے سے جھنجھلاہٹ اور برہمی آشکارہ تھی۔ مگر وہ چپ رہا۔ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔

لالی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ حنیف ڈوگر کے رویے میں نمایاں تبدیلی آگئی ہے۔ بات کرتا تو تیوری پر بل پڑے ہوتے۔ لہجہ کرجت اور تحقیر آمیز ہوتا۔ وہ لالی کو بات بات پر ڈانٹا ڈپٹا۔ طرح طرح سے پریشان کرنے کی کوشش کرتا۔

منشی بھی اب چٹھا بانٹنے وقت اس کی اجرت سے زیادہ سے زیادہ کٹوتی کرتا۔ نوٹ پھوٹ بڑھا کر لکھتا۔ خراب اور غیر معیاری اینٹوں میں اضافہ کر دیتا۔ اینٹوں کی کم سے کم تعداد مقرر کر کے معاوضہ ادا کرتا۔ پیشگی کی وصولی میں بھی گھپلا کرتا۔ ہر چند کہ لالی کی تعلیمی استعداد بہت واجبی سی تھی مگر رجسٹر میں درج کی جانے والی ہر تفصیل پڑھ سکتا تھا۔ وہ انگوٹھا لگانے کے بجائے پیشہ دستخط کرتا تھا اور دستخط کرنے سے پہلے رجسٹر میں لکھی جانے والی کچی اینٹوں کی تعداد اور ان کے معاوضے کی رقم ضرور پڑھتا تھا۔ کوئی غلطی دیکھتا تو منشی کو ٹوکتا اور اسے درست کراتا۔

منشی نے اسے پریشان کرنے اور پیشگی کی وصولی میں دھاندلی کرنے کی غرض سے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایسے شکستہ اور جتاتی خط میں اندراج کرتا کہ لالی کے لیے اس کا پڑھنا مشکل ہوتا۔ لالی نے اس کے اس رویے کے خلاف احتجاج کیا۔ بکڑ بولا۔ ”منشی، صاف صاف لکھ۔ تو لکھتا کچھ ہے پڑھتا کچھ اور ہے۔“ مگر منشی نے اسے جھڑک دیا۔ ”بکو اس نہ کر۔“ وہ بہت اونچی آواز سے بولا۔ یہ ڈوگر کے لیے اشارہ تھا جو اس کی پشت پر اپنے مسلح مگرگوں کے ساتھ چٹھا بیٹھے وقت موجود رہتا تھا۔ وہ فوراً بڑھا۔ ڈپٹ کر لالی سے کہا۔ ”کتوں نہ گھار۔ دباڑی لے اور آگے بڑھ۔“ وہ چڑے کا چھتر

اور کوشش کی۔ ”میرے کہنے پر چلے گا تو عیش کرے گا۔“

لالی پھر بھی آمادہ نہ ہوا۔ حنیف ڈوگر کے سمجھانے بھانے اور اصرار کرنے کے باوجود آمادہ نہ ہوا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”میں تو جی، جتیرا ہوں اور جتیرا ہی رہ کر ادھر کام کروں گا۔ میں نے کردہ شرنده نہیں بننا۔“ لالی نے اس کی پیشکش سختی سے مسترد کر دی۔ ”تو مجھے جتیرا رکھنا نہیں چاہتا تو میں تیرا بھٹہ چھوڑ دوں گا کسی اور بھٹے پر لگ جاؤں گا۔“

”دوسرے بھٹے پر جانے کی نہ سوچ۔ آگے ایسی گل نہ کرنا۔“ ڈوگر نے تنبیہ کی۔ ”تو جتیرا رہتا چاہتا ہے تو جتیرا ہی رہ۔ میں نے تو تیرے ہی بھٹے کو کہا تھا۔ سوچا تھا سخت گری اور لو سے تنگ ہو گا۔“

”لودھوپ کی تو فکر نہ کر۔ اس کے بارے میں تو جتیرا لگنے سے پہلے میں نے سوچ رکھا تھا۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”میں اکیلا تو نہیں ہوں۔ دوسرے بندے بھی ہیں۔ سب ہی دھوپ اور گرمی میں کام کرتے ہیں۔“

”چران میں کئی ایسے ہیں جو ٹھیک بدے نہیں ہیں۔ کام چور اور کہنے ہیں۔ سختی کر دو تو میرے اور میاں اسلم کے خلاف طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ گند اور نفرت پھیلاتے ہیں۔“ ڈوگر نے حقارت سے منہ بگاڑ کر لالی کو خبردار کیا۔ ”تو ان کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دینا۔“

”میرا تو جی ادھر کسی سے میل ملاپ ہی نہیں ہے۔“ لالی نے اسے اطمینان دلایا۔ ”دن بھر کام کرنے کے بعد اتنا تھک جاتا ہوں کہ کسی سے گل بات کرنے کو جی نہیں کرتا۔“

”میں یہ نہیں کہتا تو کسی سے میل ملاپ نہ رکھ۔ گل بات نہ کر۔“ اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ ”پر کوئی گند اور نفرت پھیلانے کی کوشش کرے تو مجھے اس کے بارے میں بتا دینا۔“

لالی نے حیرت زدہ ہو کر ڈوگر کی جانب دیکھا مگر خاموش رہا۔ ڈوگر نے نشے کی جھونک میں لہرا کر بے تکلفی سے لالی کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ ”تو فکر نہ کر۔ میں منشی سے تیرے بارے میں بول دوں گا۔ آگے نہ وہ تیری دباڑی سے نوٹ پھوٹ کاٹے گا نہ خراب اور ٹیڑھی ونگی اینٹوں کا چکر چلائے گا۔ پیشگی میں بھی کوئی ہیر پھیر نہیں کرے گا۔ تجھے بالکل تنگ نہیں کرے گا۔ ٹھیک دباڑی دے گا۔“

لالی ہنوز خاموش رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ ڈوگر اسے اعتماد میں لے کر کہتا رہا۔ ”ادھر ایسے اور بھی بندے ہیں جو مجھے بھٹے پر کام کرنے والوں کے بارے میں ایک ایک بات بتاتے

دیکھا، دھیرے سے بولا۔ ”ڈوگر کو پتہ چل گیا تو گلے پڑ جائے گا اور زیادہ تنگ کرے گا۔“

”تو کچھ ہی کہہ۔ پر میں نے اب یہاں نہیں رہنا۔“ وہ اپنی بات پر اڑی رہی۔

”کیسے جائے گی؟ کس کے ساتھ جائے گی؟“ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”جاؤں گی کس کے ساتھ، تیرے ساتھ جاؤں گی۔ اکیلی نہیں جاؤں گی۔“ اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ عاجزی سے بولی۔ ”دیکھ لالی، میں نے تیری ہر گل بات مان لی۔ جو تو نے کہا میں نے دی کیا۔ تیرے ساتھ بٹھے پر بھی لگ گئی۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”مجھے اب ادھر نہیں رہنا۔ گرمی میں دھوپ میں سخت کام کرو پر نہ کپڑے لٹے رہے نہ ٹھیک سے کھانے کو روٹی ملتی ہے۔ ایسے کب تک کام چلے گا۔ ذرا اپنی حالت دیکھ۔ میں نے تو اب آئینہ ہی دیکھنا چھوڑ دیا۔ لگتا ہے اپنی نہیں کسی اور کی شکل دیکھ رہی ہوں۔“

”تو چاہتی کیا ہے؟“ لالی بھنا کر بولا۔

”ذرا سوچ تو یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ خانہ بدوشوں کی طرح میدان میں پڑے ہیں۔ میں چاہتی ہوں۔ میرا بھی گھر ہو۔“ شاداں نے اپنی محرومیوں کا اظہار کیا۔ ”سب سمجھتے ہیں میں تیری گھروالی ہوں۔ پر کسی کو کیا پتہ۔ میرا تو تیرے ساتھ دیا بھی نہیں ہوا۔“ اس نے شرما کر نظریں جھکا لیں۔ ”میں یہاں سے نکل کر سب سے پہلے تیرے ساتھ نکاح پڑھاؤں گی۔ کیا تو ایسا نہیں چاہتا؟“

”بالکل چاہتا ہوں۔“ شاداں نے اس کے دل کی بات کہی تھی۔ وہ یکایک سنجیدہ ہو گیا۔ ”پر یہ تو سوچ۔ ہم یہاں سے نکل کیسے سکتے ہیں۔ تجھے پتہ ہے کسی کو باہر جانے کی اجازت نہیں۔ اور جب تک پیشگی ادا نہیں ہو جاتی بٹھے سے کہیں اور جا ہی نہیں سکتے۔“

”تجھے پتہ ہے، پیشگی تو کبھی ادا نہیں ہوگی۔“ شاداں نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو اسے ادا کرنے کو بھی کچھ نہیں رہا۔“

لالی نے کچھ نہ کہا۔ گردن جھکا کر سوچنے لگا۔

شاداں چند لمبے خاموش بیٹھی لالی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کرید کر پوچھا۔ ”تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”سوچ رہا تھا، ہم دونوں تو اکٹھے یہاں سے نکل نہیں سکتے۔“ لالی نے اپنی تجویز شاداں کے سامنے پیش کی۔ ”ایسا کر تو یہاں سے کسی بہانے نکل جا۔“

”میں اکیلی تو ہرگز نہیں جاؤں گی۔“ شاداں نے لالی کی بات کاٹ کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”تو بھی میرے ساتھ ہی چلے گا۔“

سنبھال کر لالی کو قہر آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔

لالی نے حریف ڈوگر سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ منشی نے جو کچھ دیا لے کر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ بعد میں بھی اس نے کئی بار منشی سے احتجاج کیا۔ اسے ٹوکا۔ مگر ہر بار ڈوگر چڑے کا چہرہ سنبھالے اسے دہشت زدہ کرنے کی غرض سے بڑھ کر سامنے آ جاتا۔ ویسے دوسرے ہتھیاروں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ لیکن ڈوگر نے لالی کو کبھی چہرے سے مارا ہی نہیں۔ صرف ڈرانے دھمکانے پر اکتفا کیا۔ لالی نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ منشی جو دباؤ ڈالتا خاموشی سے لے لیتا۔

لالی اب چپ چاپ رہتا۔ شاداں سے بھی کم بات چیت کرتا۔ وہ خود بھی پریشان تھی۔ لالی کو گم سم دیکھتی تو اور پریشان ہو جاتی۔



ایک شام لالی کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹا تھا۔ شاداں اس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ بٹھے کے وسیع میدان میں جگہ جگہ چولہوں میں آگ روشن تھی۔ کئی روٹی پکا رہا تھا۔ کوئی کھا چکا تھا۔ کوئی کھانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بچوں کے رونے اور شور مچانے کے ساتھ ساتھ عورتوں اور مردوں کی ملی جلی آوازیں بھی ابھر رہی تھیں۔ مگر لالی خاموش تھا۔

شام خوش گوار تھی۔ شدید گرمی کے بعد موسم کسی قدر بدل گیا تھا۔ آسمان پر صبح سے بادل چھائے تھے۔ لیکن بارش نہیں ہوئی تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خشکی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی چت لیٹا تھا اور آسمان کو تنگ رہا تھا۔ بادلوں کی اوٹ سے کہیں کہیں کوئی ستارہ جھلکنا ہوا نظر آ رہا تھا۔

شاداں نے لالی کو مخاطب کیا۔ ”لالی، میں نے تجھ سے ایک گل کہنی ہے۔ کئی روز سے اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

مگر لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش لیٹا رہا۔

”تو بولتا کیوں نہیں؟“ اس دفعہ شاداں نے تھکے لہجے میں کہا۔

”بول کیا کتنا چاہتی ہے؟“ لالی نے اس کی جانب دیکھے بغیر بے نیازی سے کہا۔

”میں نے اب ادھر نہیں رہنا۔“ شاداں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے لالی کو مطلع کیا۔ ”میں تجھے صاف صاف کہہ دیتی ہوں۔“

”تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ لالی نے کروٹ بدل کر شاداں کی جانب دیکھی نظروں سے

”پہلے میری پوری گل تو سن لے۔“ لالی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”یا تو میں جاسکتا ہوں یا تو۔ دونوں ہرگز نہیں جاسکتے۔ کسی ایک کو پیشگی ادا کرنے کے لیے رکنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ تجھے میں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے ہی رکنا پڑے گا۔“

”جب تو کبھی تو نہیں نکل سکے گا۔“ شاداں نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ ”نہ پیشگی کبھی ادا ہوگی نہ تو نکل سکے گا۔“

لالی نے چونکا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ اپنا منہ شاداں کے قریب کر کے رازداری سے مدھم لہجے میں کہا۔ ”جب تو یہاں سے چلی جائے گی تو میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے باہر نکل جاؤں گا۔“ اس نے مسکرا کر شاداں کو دیکھا۔ ”جب میں جیل سے فرار ہو سکتا ہوں تو یہاں سے نکلنا میرے لیے کیا مشکل ہے۔“

”مجھے تو ابھی سے ڈر لگ رہا ہے۔“ شاداں کے چہرے پر گھبراہٹ نظر آنے لگی۔ ”تو نے کزنوں کو دیکھا ہے۔ کتوں کی طرح ادھر ادھر سو گھٹتے پھرتے ہیں۔ تو ان کے ہوتے ہوئے کیسے نکل سکے گا؟“

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”مجھے تو یہ فکر ہے کہ تو یہاں سے نکلے گی کیسے؟ ڈوگر دیے بھی خار کھاتا ہے۔ وہ تو ہرگز تجھے جانے نہیں دے گا۔“

”کوئی نہ کوئی ہمانہ سوچ لے۔“ شاداں اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے پر رضامند ہو گئی۔ ”ڈوگر کی منت ساجت کر لیتا۔“

”تو کہتی ہے تو ایسا بھی کر لوں گا۔“ شاداں کی بات لالی کے دل کو لگی۔

”ضرور کر لیتا۔“ شاداں نے مسکرا کر کہا۔ ”اپنا کام ہی تو نکالنا ہے۔ آگے ہم نے اس سے کیا لیتا۔“

”ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں جلد ہی ڈوگر سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ اس نے غصے سے دو چار گلاں بھی نکالیں تو وہ بھی چپ کر کے سن لوں گا۔ اسے تو میں کسی نہ کسی طرح راضی کر ہی لوں گا۔ مجھے پتہ ہے وہ کیا چاہتا ہے۔“

”یہاں سے تو جیسے بھی ہو قنات نکل جانا چاہیے۔ بہت گندی جگہ ہے۔ جیل بھی ایسی ہی ہوتی ہوگی۔“ شاداں نے لالی سے پوچھا۔ ”میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”تو نے ٹھیک ہی کہا۔ ایک طرح سے یہ بھی جیل ہی ہے۔“ لالی نے اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی اپنی تشویش کا بھی اظہار کیا۔ ”یہ بتا یہاں سے نکل کر تو جائے گی کہاں؟“

”ویسے تو میں اپنے اماں کے پاس بھی جاسکتی ہوں۔ پہلے بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہری ہوئی تھی۔“ شاداں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”میرا ارادہ چوہدری نور الہی کے پاس کوئلہ ہرکشن جانے کا ہے۔“

لالی نے جھٹ مداخلت کی۔ ”تو بار بار اس کا ذکر کرتی ہے۔ پر نہ جانے کیوں مجھے وہ بالکل چنگا بندہ نہیں لگا۔“

”تو چوہدری کو جتنا برا سمجھتا ہے وہ ایسا برا بندہ نہیں ہے۔ دکھی بھی ہے۔ پہلے گورداسپور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا۔ فسادات اور بلوے ہوئے تو گھریا، بال بچے سب چھوٹ گئے۔“ شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اس کا کوئی بھی نہیں رہا۔“

”یہ باتیں تو اس کے بارے میں پہلے بھی بتا چکی ہے۔“ لالی نے ناگواری سے کہا۔ ”اب اور کتنی بار بتائے گی۔“

”مراض نہ ہو۔“ شاداں نے نرمی سے کہا۔ ”سچ پوچھ تو میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ وہ نیک بندہ ہے۔ دوا زمین دار ہے۔ تجھے اپنے ساتھ لگالے گا۔ میں بھی اس کی حویلی میں لگ جاؤں گی۔ دونوں آرام سے رہیں گے۔“

”پر میں چاہتا ہوں تو چوہدری کے پاس نہ جانا۔ یہاں سے نکل کر اپنے اماں کے پاس جانا۔“

”تیری مرضی ہے تو اماں ہی کے پاس چلی جاؤں گی۔“ شاداں نے اس کی بات مان لی۔ مگر دہلی زبان سے یہ بھی کہا۔ ”پر یہ بتا دوں میں چوہدری سے کہوں گی تو وہ ہم دونوں کو ضرور لگالے گا۔ ادھر ادھر دھنڈا ڈھونڈنے سے بچ جائیں گے۔“

”تو کہتی ہے تو چوہدری کے پاس کوئلہ ہرکشن بھی چلے جائیں گے۔“ لالی نے شاداں سے مزید الجھنے کی کوشش نہ کی۔ ”پر میں جب یہاں سے فرار ہو کر باہر نکلوں گا تو تیرے اماں کے گھر پہنچوں گا۔ تو میرا وہیں انتظار کرنا۔“

شاداں نے انکار نہ کیا۔ فوراً ہای بھر لی۔

لالی کی ہدایت پر شاداں صبح کام پر نہ گئی۔ تمام دن چادر اوڑھے اپنی جھونپڑی میں پڑی رہی۔ لالی کیلا ہی گارایا رہا اور لوہے کے سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کرتا رہا۔ شاداں کی غیر باضری کے بارے میں کوئی تبصیرا پوچھتا تو کہہ دیتا کہ بیمار ہے۔ شاداں کے پاس کوئی عیادت کرنے جاتا تو وہ بھی یہی کہتی۔ آواز میں ثقاہت پیدا کرنے کی کوشش کرتی اور بہت دھیسے لہجے میں بولتی۔ کوئی بھی تبصیرا یا بھستہ مزدور کام سے غیر حاضر ہونے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ غیر

حاضری کے نتیجے میں اس کی دہاڑی نہ لگتی اور دہاڑی کا نہ لگنا پریشانی کا باعث ہوتا۔ ہفتہ گزارنا مشکل ہو جاتا۔ شاداں دوسرے روز بھی کام پر نہ گئی۔ جھوپڑی میں بیماروں کی طرح پڑی رہی۔ لالی اکیلا ہی کام کرتا رہا۔ دو ہی روز میں بھنے پر یہ بات پھیل گئی کہ شاداں بیمار ہے۔ تیسرے روز لالی سورج غروب ہوتے ہی حنیف ڈوگر سے ملنے گیا۔



موسم گرمی کی سکتی ہوئی شام دروہام سے آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ جھوپڑیوں میں چراغ روشن ہو گئے تھے۔ ڈوگر شام کے بھٹ پٹے میں بھنے کے دفتر کے سامنے چارپائی پر بیٹھا تھا۔ وہ نڈھال اور تھکا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تازگی اور سرخوشی پیدا کرنے کے لیے پینے پلانے کا مشغل شروع نہیں کیا تھا۔ لالی اندھیرے سے نکل کر سامنے آیا تو اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت تھی، استعجاب تھا۔ اس نے منہ بکا کر حقارت سے پوچھا۔ ”میرے پاس کیوں آیا ہے؟“ لالی نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”مجھ سے ایک گل کرنی تھی۔“ وہ مجرم کی طرح اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔

”میں نے اس دھت کوئی گل شل نہیں سنی۔“

”کل آجاؤں گا جی۔ جب تو کے گائب آجاؤں گا۔“ لالی گڑگڑانے لگا۔ ”جمعدار مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دے۔“

”مجھے اب اپنی غلطی کا پتہ چلا۔“

لالی خاموش کھڑا رہا۔ ڈوگر نے قبر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ تیوری پر بل ڈال کر گویا ہوا۔ ”مجھے اپنی غلطی کا پتہ چلا جب منشی نے تیرا داغ پوری طرح ٹھیک کر دیا۔ ابھی تو وہ اور چابی کے گا۔“ اس کا لہجہ اور درشت ہو گیا۔ ”تیرے ایسے ٹیڑھے، تیرے روزی ادھر آتے ہیں۔ پرچھے ہی چابی کسی گئی ایک دم ٹھیک ہو کر رستے پر آجاتے ہیں۔“

لالی بدستور نظریں جھکائے کھڑا رہا۔ اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت سمجھی۔ وہ چاہتا تھا ڈوگر اپنی برہمی کا پوری طرح اظہار کر لے۔ اور جب اس کے دل کی بھڑاس نکل جائے تو حرف مطلب زبان پر لائے۔ حنیف ڈوگر نے جھنجھلا کر اسے برا بھلا کہا۔ گندی گندی مغلظات بھی سنائیں۔ مگر لالی مطلق مشتعل نہ ہوا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چپ چاپ کھڑا رہا۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ اندھیرا اور بڑھ گیا۔ پھر ڈوگر کی آواز ابھری۔ ”شاداں کیسی ہے؟“

اس دفعہ اس کا لہجہ درشت ہوا تھا۔

”وہ تو جی سخت بیمار ہے۔“ لالی نے آہستہ سے کہا۔

”فکر نہ کر، دو چار روز میں چنگی ہو جائے گی۔“

”جمعدار، تجھے پتہ نہیں وہ بہت بیمار ہے۔“ لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتی۔ ہائے ہائے کرتی رہتی ہے۔“

”دوا دارو کے لیے کل کسی کمرندے کے ساتھ اسے خیراتی شفا خانے بھجوا دوں گا۔“ حنیف ڈوگر نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”تو فکر نہ کر۔ وہ ٹھیک ہو جائے گی۔“ یکایک اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”میں نے تجھے پہلے ہی کہا تھا اس سے سخت گرمی میں کام نہ کرا۔ تب تو تو اونچاڑ رہا تھا۔ وڈی وڈی گلاں کرتا تھا۔ کمرندہ لگ جاتا تو عیش کرتا۔ اب تو کمرندہ بھی نہیں لگ سکتا۔ میاں صاحب نے ایک بندے کو لگا دیا ہے۔“

”ہاں جی غلطی ہو گئی۔“ لالی نے اطمینان کی سانس لی۔ نہ وہ پہلے کا رندہ بننا چاہتا تھا اور نہ اب ایسا کوئی ارادہ تھا۔ لالی نے دبی زبان سے اظہار مدعا کیا۔ ”وہ تو جی علاج کے لیے اپنے ماماں کے پاس جانا چاہتی ہے۔“

”وہ کسی پنڈ میں رہتا ہو گا۔ ادھر پنڈ میں کس سے علاج کرائے گی؟“ ڈوگر نے لالی کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”نہ ڈاکٹر نہ حکیم، علاج کون کرے گا؟“

”نہیں جی، وہ گو جرنوالہ شہر میں رہتا ہے۔“ لالی نے فوراً بات بتائی۔ ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔ ”وہ ایک ڈاکٹر کا کمپو ڈر لگا ہوا ہے۔ ادھر شاداں کا علاج بہت ٹھیک ٹھاک ہو سکتا ہے۔“

”تو اسی لیے میرے پاس آیا ہے۔“ ڈوگر نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

”ہاں جی۔ آیا تو اسی لیے تھا۔“ لالی انکار نہ کر سکا۔

”اس کے لیے تو میاں صاحب سے اجازت لینی ہو گی۔“ ڈوگر نے ٹالنا چاہا۔

”تو چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ لالی نے خوشامد اور چالپوسی سے کام لیا۔ ”جج پوچھ تو عٹے تو ہی چلاتا ہے۔ تیرے بتاؤ ادھر ایک روز کام نہیں چل سکتا۔ سارا ہی کام تو کرتا ہے۔ یہ تو سب ہی کو پتہ ہے۔“

”پر میاں صاحب کو تو پتہ نہیں میں کتنا کام کرتا ہوں۔“ اس نے دبی زبان سے شکوہ کیا۔ ”سارے ہی بھٹوں کے جمعداروں کو، تیرے بھرتی کرنے کا نہ صرف کمیشن ملتا ہے بلکہ کبھی کبھی تو مالک خوش ہو کر بخشش اور انعام بھی دیتے ہیں۔“

جن کا پورا نمبر ادھر ہوتا ہے۔ بال بچے ہوتے ہیں۔ تو شاداں کے جانے کے بعد اکیلا رہ جائے گا۔
تیرا ادھر سے فرار ہونا کوئی مشکل نہیں۔“

”ایسی گل نہ کر۔“ لالی نے اسے ٹوکا۔ ”میں نے پیشگی کے تین سو روپے کے لیے فراری ہونا
ہوتا تو اب تک چوری دیکھتی کرتا ہوتا۔ ادھر بھنے پر لودھوپ میں اینٹیں بنانے کا دھندا نہ کرتا۔“
لالی کی بات حریف ڈوگر کے دل کو لگی۔ اس کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ وہ شاداں کو
چھٹی دینے پر پوری طرح رضامند ہو گیا۔

لالی جھونپڑی میں واپس گیا۔ شاداں کو خوش خبری سنائی تو اس کے چہرے پر تازگی آگئی۔
صبح کو لالی اکیلا ہی کام پر گیا۔ شاداں جھونپڑی میں رہی۔ چادر سے منہ لپیٹے اس طرح بے حال
پڑی رہی گویا سخت علیل ہو۔

دوپہر کو میاں اسلم معمول کے مطابق بھٹے سے چلا گیا تو ڈوگر نے لالی کو اپنے پاس بلایا۔ ہنس
کر بولا۔ ”تو چاہے تو شاداں کو آج ہی گوجرانولہ بھیج دے۔ ورنہ کل سویرے بھیج دیتا۔“ دفعہ
اس کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”تجھے یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ میاں صاحب نے میری ضمانت پر شاداں کو
بٹھ چھوڑنے کی اجازت دی ہے۔ اگر شاداں کے جانے کے بعد یہاں سے بھاگ گیا تو تیری پیشگی
میری بعداری سے کاٹ لی جائے گی۔“

”بعداری تیری بہت بہت مہربانی۔“ لالی نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ خوشامد بھی کی۔ ”تو بہت نیک
بندہ ہے۔ مجھے اب پتہ چلا تو دل کا کتنا بھلا ہے۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر خوش و خوش کا اظہار
کیا۔ ”تو بالکل اطمینان رکھ میں تجھ سے ہرگز دھوکا نہیں کروں گا۔“

حریف ڈوگر خاموش بیٹھا اپنی مونچھیں مڑوتا رہا۔
لالی اٹھ کر سیدھا اپنی جھونپڑی میں گیا۔ شاداں کو مطلع کیا۔ وہ سہ پہر کو جانا چاہتی تھی۔ مگر لالی
نے اسے روک لیا۔

رات کو دونوں دیر تک جاگتے رہے۔ مدھم لہجے میں باتیں کرتے رہے۔ آئندہ کے بارے میں
منصوبے بتاتے رہے۔

شاداں بہت ترکے بیدار ہو گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا۔ روٹی پکائی۔ لالی کو جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ
آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا شاداں سفر کے لیے تیار بیٹھی ہے۔ مشرقی افق پر روشنی پھوٹ
رہی تھی۔ اجالا دھیرے دھیرے پھیلتا جا رہا تھا۔ بھنے پر چل پھل شروع ہو چکی تھی۔

شاداں نے روانگی سے پہلے رازداری میں کہا۔ ”دیکھ لالی تو جلدی پہنچنے کی کوشش کرنا۔ میں تیرا

”تجھے بھرتی کرنے پر کمیشن دیشن نہیں ملتا؟“ لالی نے اس کی خوش نودی حاصل کرنے کی غرض
سے لہجے میں استعجاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔

”توبہ کروئی۔ کیسا کمیشن کہاں کا انعام۔ اوپر سے ڈانٹ ڈپٹ بھی سننی پڑتی ہے۔“
”بعداریہ تو ٹھیک گل نہیں ہوئی۔“ لالی نے ہمدردی کا اظہار کیا۔ ”تیرے ساتھ تو بہت بے
انسانی ہو رہی ہے۔ تیرا ایسا کام کا بندہ تو میاں صاحب کو ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔“

”جب یہ بٹھ چھوڑ دوں گا تب اسے پتہ چلے گا۔“ ڈوگر نے تنبی سے کہا۔ مگر فوراً ہی اسے اپنی
غلطی کا احساس ہوا۔ ”پر یہ گل تو کسی سے نہ بتانا۔“ اس نے دھمکی دی۔ ”تجھے پتہ نہیں بدلہ لینے پر
آؤں تو میں کیا نہیں کر سکتا۔ ڈھونڈے سے لاش بھی نہیں ملے گی۔“

”مجھے پتہ ہے تو کتنا زور آور ہے۔“ اس نے ڈوگر کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”تو مجھ پر
بھروسہ رکھ۔ ایسی گل تو میں شاداں کو بھی نہیں بتاؤں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر۔“

ڈوگر مطمئن ہو کر بولا۔ ”تو شاداں کو کب اس کے اماں کے گھر بھیجتا چاہتا ہے؟“
”جب تو کسے گا تب بھیج دوں گا۔“ لالی نے خوش ہو کر کہا۔ ”ویسے میں اسے جلدی بھیجتا چاہتا

ہوں۔ اس کی طبیعت زیادہ ہی گڑبڑ ہے۔“

”کل صبح جب میاں اسلم ادھر دفتر میں آئے گا تو میں شاداں کے بارے میں اسے بتا دوں گا۔“
حریف ڈوگر نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”اس کو بتانا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ بعد میں بہت گرم
ہوتا ہے۔ ننگی ننگی گالوں نکالتا ہے۔ تب ہی تو میں کوشش کرتا ہوں کوئی کام اس کی مرضی کے
خلاف نہ ہو۔“

”ایسی گل بات ہے تو اس سے ضرور مشورہ کر لینا۔“ لالی نے ٹوہ لگانے کی غرض سے دریافت
کیا۔ ”اگر تو اجازت دے تو میں شاداں کو چھوڑنے کو گوجرانولہ چلا دیتا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے وہ کتنی
سخت بیمار ہے۔“ لالی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”اسے ماں کے پاس چھوڑ کر فائف
واپس آ جاؤں گا۔“

”تو کیسے جا سکتا ہے؟“ ڈوگر ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”جب تک شاداں واپس نہیں آجائے گی تو
بھٹے سے باہر نہیں جا سکتا۔ تو اتنے دنوں سے بھٹے پر کام کر رہا ہے، تجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ پیشگی ادا
کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو ضرور ضمانت کے طور پر رکھا جاتا ہے۔ ویسے تو عام طور پر کسی کو چھٹی
دی ہی نہیں جاتی۔“

لالی کو اندازہ تھا کہ وہ یہی کہے گا۔ وہ خاموش رہا۔ ڈوگر بولتا رہا۔ ”چھٹی تو ان کو دی جاتی ہے

تو میرے پاس پہنچے تو میں تیرے لیے کام دھندے کا بندوبست کر رکھوں۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا ہے؟

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔ پر جب تک میں پہنچ نہ جاؤں تو اپنے اماں ہی کے پاس رہنا۔“ لالی نے تاکید کی۔ ”کسی کے پاس نہ جانا۔ پتہ نہیں میں کب اور کس روز تیرے پاس پہنچوں۔“

”ایسا ہی کروں گی۔“ شاداں نے یقین دلایا۔ ساتھ ہی اپنے خدشات کا بھی اظہار کیا۔ ”دیکھ بہت ہشیاری سے کام لیتا۔ ایسا نہ ہو کسی پکڑ میں پھنس جائے۔ مجھے پتہ بھی نہ چلے گا۔ اب تو میں ادھر آہمی نہ سکوں گی۔“ اس نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”ویسے ادھر رہ کر بھی کسی کو کسی کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا یہ اتنی خراب اور گندی جگہ ہوگی۔“

”اب تو تجھے یہاں سے آزادی مل گئی۔“ لالی نے آہستہ سے کہا۔ اس کے لہجے میں درد کی کک تھی۔ ”پتہ نہیں میں یہاں سے کب نکل سکوں گا۔“

شاداں بھی افسردہ ہو گئی۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہے، پھر شاداں نے اپنی گٹھری اٹھائی اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ آگے بڑھی۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں خاموش تھے۔ اداس اور دل گرفتہ تھے۔

وہ لالی سے رخصت ہوئی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی بھٹے کی حدود سے باہر چلی گئی۔ مڑ مڑ کر لالی کو دور تک دیکھتی رہی۔ پھر ایک موڑ پر شاداں نظروں سے اوجھل گئی۔ لالی دیر تک گم صم کھڑا رہا۔

دھوپ اب ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اس کی چمک اور تمازت بھی بڑھ گئی تھی۔

انتظار کروں گی۔ تو نے دیری کی تو میں پریشان ہو جاؤں گی۔“
”تو اطمینان رکھ، میں جلدی تیرے پاس پہنچنے کی کوشش کروں گا۔“ لالی نے مسکرا کر شاداں کو دیکھا۔ ”تو سیدھی اپنے اماں کے پاس جائے گی نا؟“

”اسی کے پاس جاؤں گی۔ اور میں نے کہاں جانا ہے؟“
”میں نے سوچا تو اماں کا کہہ کر کہیں چوہدری کے پاس نہ چلی جائے۔“ لالی نے اسے چھیڑا۔ ”تو اسے بہت یاد کرتی ہے۔ بار بار اس کا ذکر کرتی ہے۔“

”تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ شاداں تنک کر بولی۔ ”میں نے چوہدری سے کیا لیتا۔ وہ میرا کون لگتا ہے۔“ اس نے لالی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ ”ویسے میں یہ ضرور کہوں گی۔ وڈا زمین دار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بھلا بندہ بھی ہے۔“

”مجھے کیا پتہ وہ کیسا بندہ ہے۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”میں تو اسے بالکل نہیں جانتا۔ میری تو اس سے کبھی گل بات بھی نہیں ہوئی۔“

”میں تو اسے کئی بار مل چکی ہوں۔ گل بات بھی کر چکی ہوں۔“ اس نے ایک بار پھر اپنا مدعا بیان کیا۔ ”اگر وہ ہم دونوں کو اپنے پاس لگا لے تو آرام نال رہیں گے۔“ اس نے اکتاتے ہوئے کہا۔ ”تو کہہ تو میں اس بارے میں بات کرنے اس کے پاس کو ملد ہر کشن چلی جاؤں؟“

لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کھویا کھویا سا نظر آ رہا تھا۔
شاداں نے ٹوکا۔ ”لالی، تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“

”نہ جانے مجھے کیوں ایسا لگتا ہے چوہدری کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے؟ کچھ پتہ نہیں۔“ لالی نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

”تو پہلے بھی کئی بار یہ بات کہہ چکا ہے۔“ شاداں نے مسکرا کر کہا۔ ”تجھے ایسے ہی شک ہو گیا ہے۔ تو چوہدری سے پہلے ملا ہوتا تو وہ تجھے ضرور پہچان لیتا۔ پر مجھے پتہ ہے وہ تو تجھے بالکل نہیں جانتا۔“

”ایسا ہی ہو گا۔“ لالی نے بات خواہ مخواہ بڑھانے کی کوشش نہ کی۔
شاداں نے اصرار کیا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”کون سی بات؟“ لالی نے شاداں کے چہرے کی جانب حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔
”حد کر دی تو نے۔“ شاداں نے ہاتھ جھٹک کر اپنی بات دہرائی۔ ”تو کہہ تو میں چوہدری کے پاس کو ملد ہر کشن چلی جاؤں۔“ وہ اسے خوش کرنے کے لیے مسکراتے لگی۔ ”میں چاہتی ہوں جب

کے اندیشوں اور وسوسوں کے ساتھ ساتھ فرار ہونے کی امنگ اور ترنگ بھی ہوتی۔ وہ مناسب وقت کی تلاش میں برابر لگا رہا۔

چاند کی ابتدائی تاریخوں کا ذکر ہے۔ ایک رات لالی نے فرار ہونے کا تہیہ کیا۔ چاند مغرب افق پر لوع ہوا اور چند گھنٹے بعد غروب ہو گیا۔ آسمان بھی دھندلا اور غبار آلود تھا۔ چاند کے غروب ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ سناٹا بڑھتا گیا۔ اندھیرا اور گہرا ہو گیا۔ لالی سویا نہیں جا سکتا رہا۔ بے چینی سے لڑ نہیں بدلتا رہا۔ بار بار گردن اٹھا کر چوکنٹا نظروں سے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھتا۔ بجھے کی ٹرائی کرنے والے پیریدار گشت پر تھے۔ ان کے قدموں کی آہٹ رات کے سناٹے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔

لالی جاگتا رہا اور پیریداروں کے قدموں کی آہٹ سنتا رہا۔ چاب کبھی قریب آجاتی کبھی دور ہو جاتی۔ مگر وہ جھوپڑیوں اور جھگیوں کے آس پاس ہی منڈلا رہے تھے۔ رات آدمی ہو گئی۔ رات چلنے لگی۔ پیریداروں کے قدموں کی آہٹ بھی مدھم پڑ گئی۔ وہ بھی اب تھکن اور نیند کے غلبے سے مدھمال ہو رہے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے سخت اور خنجر زمین پر اپنی لاٹھیاں بجاتے اور اس طرح ٹکارتے اور بولتے کہ ان کی آواز میں غوغا کی کاغذ شامل ہوتا۔

پیریداروں کی آوازیں جب دور ہو گئیں اور مدھم ہوتے ہوتے سناٹے میں تحلیل ہو کر ختم ہو گئیں تو لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھوپڑیوں کے آگے کھلے میدان میں مرد، عورتیں اور بچے ہارپائیوں اور فرش پر بے خبر سو رہے تھے۔ لالی نے نظریں گھما پھرا کر ادھر ادھر دیکھا اور گہری نیند دینے والوں کے درمیان سے گزرتا ہوا دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔

وہ جھوپڑیوں سے دور نکل گیا۔ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ سونے والے ہنوز بے خبر سو رہے تھے۔ ہونپڑیاں اور جھگیاں سایوں کی مانند دھندلی نظر آرہی تھیں۔ رات کا پچھلا پیر تھا۔ ہر طرف ہوا کا الم تھا۔ لالی آگے بڑھتا گیا۔ ناگاہ اس نے قدموں کی آہٹ سنی۔ کوئی اسی کی طرف آرہا تھا۔ لالی نے سراپہ ہو کر آواز کی جانب پلٹ کر نظر دوڑائی۔ ایک سایہ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ وہ جھٹ اندھے منہ زمین پر لیٹ گیا۔ نگاہیں گھما پھرا کر آس پاس دیکھا۔ تھوڑے لمفاصلے پر اینٹوں کا چٹا تھا۔ لالی آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اس طرف بڑھا۔ قریب پہنچا اور چپے کی دھم میں دیک کر بیٹھ گیا۔

قدموں کی آہٹ رفتہ رفتہ نزدیک آتی گئی۔ لالی چپے کی اوٹ میں دیکھا ہوا بیٹھا رہا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی دم سادھے چپ بیٹھا رہا۔ انتظار کرتا رہا کہ آنے



لالی اب زیادہ سے زیادہ محنت کرتا۔ سویرے ہی سویرے کام پر چلا جاتا۔ مٹی کھود کر گارا تیار کرتا۔ سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں بناتا۔ تھلے پر کچی اینٹوں کی قطاریں بنتی جاتیں۔ دوسرے ہتھیروں کے مقابلے میں وہ کچھ زیادہ ہی دیر تک کام میں جتا رہتا۔ کام سے فارغ ہونے کے بعد منہ ہاتھ دھوتا۔ چولہے میں آگ سلگاتا اور روٹی پکاتے بیٹھ جاتا۔ کھانا کھاتا اور دن بھر کی سخت محنت مشقت سے ایسا مدھمال اور تھکا ہارا ہوتا کہ بستر لیٹتے ہی آنکھ لگ جاتی۔

سورج طلوع ہوتا، غروب ہوتا۔ وقت دن رات میں بدلتا رہتا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ لالی کی بے چینی بڑھتی گئی۔ شاداں کے جانے کے بعد ہی اس نے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ موقع کی تاک میں تھا۔ گھوم پھر کر بجھے کے محل وقوع کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔

دن میں فرار ہونا ممکن نہ تھا۔ باہر آنے جانے پر سخت روک ٹوک تھی۔ خاص طور پر ان ہتھیروں اور مدھم مزدوروں کی نقل و حرکت کی کڑی نگرانی کی جاتی جن کی پیٹھ کی پٹکی واجب الادا تھی۔ بجھے پر کام کرنے والوں کی بھاری اکثریت ایسے ہی قرض داروں پر مشتمل تھی۔ رات کا وقت فرار ہونے کے لیے مناسب اور سازگار تھا۔ نہ کسی قسم کی چل پھل ہوتی نہ گہما گہمی۔ پھر رات گزرتے ہی بجھے پر سناٹا طاری ہو جاتا۔ رات جس قدر آگے بڑھتی سناٹا بھی اسی قدر بڑھتا۔

سنان اور اندھیری راتوں کو لالی اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ فرار ہونے کا منصوبہ بناتا۔ گرد و پیش کا جائزہ لیتا۔ اس کے کان ہر آہٹ اور ہر آواز پر لگے ہوتے۔ نظریں ادھر ادھر گردش کرتیں۔ طرح طرح

والا گزر جائے اور دور چلا جائے تو وہ اٹھ کر آگے بڑھے اور بھٹے کی حدود سے باہر نکل جائے۔ آگے دیر نہ تھا۔ کیکر اور جنگلی بیروں کی جگہ جگہ بھاڑیاں تھیں۔ ان کی آڑ میں چھپتا چھپا آدھ آگے نکل جاتا۔ فرار ہو کر شاداں کے پاس پہنچ جاتا جو اپنے ماموں کے گھر میں اس کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔

مگر چاپ عین اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ لالی سنبھلا بھی نہ تھا کہ کسی نے لاشی سے ٹوکا دیا۔ لاشی پر لوہے کی ٹھوس شام چڑھی تھی۔ لاشی کمر سے جھپکتی ہوئی گزری اور گھٹنے پر اس زور سے ٹکرائی کہ لالی تڑپ اٹھا۔ ساتھ ہی آواز ابھری۔

”اُوئے کون ہے تو؟“

لالی نے مڑ کر دیکھا۔ تاریکی میں ایک پریدار اس کے سر پر بھوت کی مانند کھڑا تھا۔ لالی نے گھٹنا سلاتے ہوئے جھٹ بات بتائی۔ ”پیٹ میں جی سخت مروڑ تھی۔ ادھر ٹٹی کرنے گیا تھا۔“

لیکن پریدار نے اس کا عذر قابل اعتنا نہ سمجھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”اتنی دور کیوں آیا؟ ادھر جھگیوں کے نزدیک ہی کیوں نہیں بیٹھ گیا؟“ اس نے غصے سے لالی کو دیکھا جو سما ہوا بیٹھا تھا۔ ”تجھے پتہ نہیں ادھر ٹٹی کرنے کی اجازت نہیں۔ اینٹیں گندی اور خراب ہو جاتی ہیں۔“

لالی نے مڑ کر اکر معذرت کی۔ ”غلطی ہو گئی جی۔“

”کھڑا ہو۔“ پریدار نے لالی کی گردن اپنے مضبوط ہاتھ سے دوپٹی اور ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔

لالی کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ الجھنے اور مزید تاویل پیش کرنے کی کوشش نہ کی۔ لنگڑا تا ہوا آہستہ آہستہ اپنی جھونپڑی کی جانب چلا۔ پریدار سائے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ جھونپڑی کے قریب پہنچ کر اس نے ایک بار پھر لالی کو ڈانٹا، تنبیہ کی اور زمین پر اپنی لاشی بجاتا اور زور زور سے کھکارتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

لالی خاموشی سے بستر پر لیٹ گیا۔ آس پاس سونے والوں میں سے کئی کی نیند پریدار کی ڈانٹ ڈپٹ سے اچاٹ ہو گئی۔ کسی نے کروٹ بدلی کسی نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ مگر نہ کوئی بولا نہ پرسش احوال کی۔ لالی بھی چپ پڑا رہا۔ لاشی سے گھٹنے میں ایسی کراری چوٹ آئی تھی کہ درد کی کک سے دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ کسی پہلو قرار نہ تھا۔ بار بار اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ بہت دیر بعد اسے نیند آئی۔ صبح کام پر بھی دیر سے گیا۔ گھٹنے کی تکلیف کے باعث ٹھیک سے کام بھی نہ کر سکا۔

گھٹنے پر چوٹ سے ورم آگیا تھا۔ وہ دو تین روز تک درد میں مبتلا رہا۔ چلنے پھرنے اور کام کرنے میں تکلیف ہوتی۔ مگر اس واقعے کے بعد وہ بہت محتاط ہو گیا۔ یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ بھٹے سے فرار ہونا وہ جس قدر آسان سمجھتا تھا ایسا نہ تھا۔ مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ اپنے ارادے پر مضبوطی سے جما رہا۔ اس نے زیادہ سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے اور اپنے منصوبے کو زیادہ سے زیادہ ہوشیاری سے عملی جامہ پہنانے کا ایک بار پھر تہیہ کیا۔ وہ فرار ہونے کے لیے دن رات سوچتا رہا۔ اور مناسب موقع کی تلاش میں لگا رہا۔



سہ پہر کا وقت تھا۔ یکایک تیز ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ بادل گھر کر آئے۔ بارش کا چھینٹا بھی پڑا۔ تھلوں پر رکھی ہوئی اینٹیں دھوپ میں خشک ہونے کے لیے دور دور تک قطاروں میں پھیلی تھیں۔ بارش بیس منٹ بھی نہ ہوئی مگر خاصی تیز تھی۔ کچی اینٹیں بڑی تعداد میں موٹے موٹے نظروں سے بھیک کر جگہ جگہ سے چٹکتیں۔ ایسی اینٹیں ناکارہ قرار دے کر مسترد کر دی جاتی ہیں۔ ہتھیروں کو ان کی کوئی اجرت نہیں دی جاتی۔

بارش ختم ہو گئی۔ مگر بھٹے پر کام نہ ہو سکا۔ گارا بارش کے پانی سے ترقیر ہو کر اس قابل نہ رہا تھا کہ اسے سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کی جاسکیں۔ زمین بھی نم تھی اور بھیگی ہوئی اینٹیں جو نوٹے ہوئے سے بچ گئی تھیں، اس قابل نہ رہی تھیں کہ کھمار ان کو اٹھاتے اور ریزھوں میں بھر کر کپکنے کے لیے بھٹے کے اندر پہنچاتے۔

مٹی سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے تھے۔ نام ہونے سے پہلے ہی شام کا سماں تھا۔ فضا نہایت سہانی اور خوش گووار تھی۔ مگر ہتھیرے سوگووار تھے۔ ان کے چرے مرجھائے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دکھ کے سائے منڈلاتے تھے۔ ان کی ایک دوڑی دھاڑی ماری گئی تھی۔ ان کی اجڑی اور بکھری ہوئی زندگی میں یہ ایک دل خراش سانحہ تھا۔

شام دھیرے دھیرے بھٹے کے در و دیوار پر پھیلتی جا رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ وہ اپنی مونپڑیوں کے سامنے بڑھال اور گم صم بیٹھے تھے۔ کہیں کہیں چولہوں میں آگ روشن تھی۔ فضا لپکی ہوئی روٹیوں کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مگر نہ روز مرو کی چل پھل تھی نہ ملی جلی آوازوں کا در تھا۔ ہر طرف بے کیف خاموشی چھائی تھی۔

اس خاموشی سے آگیا کہ بھاول پور کے ایک ریاستی ہتھیرے نے کان پر ہاتھ رکھ کر تان لگائی۔ ایک ماہیا لاپٹے لگا۔

بدلی آگنی ہے ساونردی

کوئی تدبیر ڈسا

رٹھے یار مناؤ نردی

ہٹیاں تے کھنڈو کدی

ہک تال غریبی ہے

دو جھا سبز ۱۱ کنڈ کستی

باغاں وچ گھا کوئی ناں

جیر ہے پاسے ماہی ٹریا

۰ اوں پاسے داراہ کوئی ناں

اس کی آواز میں سوز تھا۔ درد کی کک تھی۔ سانولی سلونی شام اجڑ کر راکھ ہو گئی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل دھواں دھواں ہو گئے۔ فضا بوجھل اور بڑھال ہو گئی۔ سرسراتی ہوئی ہوا میں ماہیے کے بولوں کی بازگشت تھی۔ لالی بھی اپنی جھونپڑی کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ ماہیا سن کر تڑپ اٹھا، جس کے بولوں کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

ساون کی بدلی گھر کر آگئی۔ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ روٹھے ہوئے یار کو مناسکوں! دکانوں پر شکر اور شیرینی بک رہی ہے۔ ادھر غربت ہے۔ یار نے بھی مجھ سے منہ موڑ لیا ہے باغوں میں کہیں سبزہ نہیں ہے۔ جدھر میرا محبوب گیا ہے، اس طرف جانے کا کوئی راستہ نہیں۔

لالی کو شاداں یاد آگئی۔ اس کے پاس جانے اور اسے دیکھنے کے لیے وہ بے قرار ہو گیا۔ اس نے نئے عزم اور تازہ ولولے کے ساتھ فرار ہونے کا تہیہ کیا۔ موسم بھی فرار ہونے کے لیے سازگار تھا۔ اندھیرا دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے روٹی پکائی۔ کھانا کھایا۔ اور رات کے سنان ہونے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔

لیکن پہر رات بھی نہ گزری تھی کہ میاں اسلم اپنے چند دوستوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ سیدھا بچے کے دفتر گیا۔ اسے کھلوا یا۔ نوکروں نے جھپاک جھپاک کر سیاں نکال کر دفتر کے سامنے رکھیں۔ ایک میز بھی رکھی۔ میاں اسلم اپنے یار دوستوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گیا۔ اس کا اشارہ ملتے ہی میراں بھی میں گیا۔ دسی شراب کی بوتل لایا اور میاں اسلم کے سامنے میز پر رکھ دی۔ گلاس بھی رکھ دئے اور پانی سے بھرا ہوا جگ بھی میز پر رکھ دیا۔ پینے پلانے کا دور شروع ہو گیا۔

میاں اسلم لگ بھگ مہینہ بھر بعد رات کے وقت بچے پر آیا تھا۔ اس کی آمد کے خبر آن کی آن

میں ہر طرف پھیل گئی۔ لالی کو اطلاع ملی تو اس نے فرار ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اب ایسی کوشش میں ناکامی کے امکانات زیادہ تھے۔ طرح طرح کے خطرات تھے۔ اور سب سے بڑا خطرہ میاں اسلم کا بچنے پر موجود ہونا تھا۔ جب تک وہ موجود تھا، ہر کارندہ اور ہر نوکر مستعد اور چوکس تھا۔ لالی بستر پر خاموش لیٹا تھا۔ دفتر کی سمت سے قہقہوں اور بے تکلفی سے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان آوازوں میں بچے کے مالک میاں اسلم کی آواز بھی شامل تھی۔ لالی ان آوازوں کو سنتا رہا۔ پھر نیند کا غلبہ ہوا اور وہ سو گیا۔



رات کے سناٹے میں دبا دبا شور بلند ہوا۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ شور مغربی کونے کی جھونپڑیوں میں ہو رہا تھا۔ البتہ دفتر کی جانب خاموشی چھائی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پینے پلانے کی محفل ختم ہو چکی ہے۔ رات ابھی آدھی نہیں گزری تھی۔ مگر ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ لالی اٹھا اور تاریکی میں سنبل سنبل کر قدم رکھتا ہوا اس طرف روانہ ہوا جدھر شور اٹھ رہا تھا۔

قریب جا کر اس نے دیکھا، ایک بوسیدہ جھونپڑی کی دہلیز پر ایک عورت سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اور ہلکے ہلکے کر رو رہی تھی۔ جھونپڑی کے اندر چراغ روشن تھا۔ اس کی پھپکی پھپکی روشنی میں عورت کا چہرہ نیلا نظر آ رہا تھا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے بھیگے ہوئے تھے۔ دو تنگ دھڑنگ نو عمر بچے بھی اس کے پہلو میں حیران و پریشان بیٹھے تھے۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں عورت کو پہچان لیا۔ وہ سلامو جھیرے کی بیوی، بگنی تھی۔ سلامو کا نام بھی اسلم تھا۔ مگر سب اسے سلامو کہتے تھے۔

سلامو کی بیوی کی سسکیاں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ لیکن سلامو غائب تھا۔ اس کی بیوی کے آس پاس بچے پر کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کا جھوم تھا۔ جھوم زیادہ بڑا نہ تھا اور اس میں بھی اکثریت سلامو کے عزیز واقارب کی تھی۔ لالی بھی جھوم میں شامل ہو گیا۔ دریافت کرنے پر عقدہ کھلا کہ اندھیرے میں دو کارندے آئے اور جھونپڑی کے باہر سوئی ہوئی سلامو کی چودہ سالہ بیٹی رانو کو اٹھا کر لے گئے۔ انھوں نے جب رانو کو اٹھانے کی کوشش کی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مزاحمت کی۔ ہاتھ پیر چلائے۔ چیخنے چلانے کی بھی کوشش کی۔ لیکن ایک کارندے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس زور سے دبا یا کہ آواز نہ نکل سکی۔

سلامو اور اس کی بیوی کی بھی آنکھ کھل گئی۔ دونوں نے پریشان ہو کر دیکھا، رانو کا بستر خالی تھا۔ کارندے اسے اٹھا کر تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ اب سلامو کی بیوی اپنی رسوائی اور بے بسی پر آنسو بہا رہی تھی۔ اور سلامو اپنی بیٹی کو واپس لینے میاں اسلم کے پاس گیا تھا جو ابھی تک دفتر کے

برابروالے کمرے میں موجود تھا۔

ہجوم میں شامل عورتوں اور مردوں کے چروں پر جھنجھلاہٹ تھی۔ آنکھوں میں نفرت کے شرارے تھے۔ وہ دہلی زبان سے اپنے اپنے طور پر غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کوئی احتجاج کر رہا تھا۔ کوئی رانو کی ماں سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا، تسلی دے رہا تھا، دل جوئی کر رہا تھا۔ اور وہ رو رو کرتا رہی تھی۔

”میں نے اور سلامو نے تو یہ سوچا تھا جی کہ اب کے برکھا میں پنڈ جا کر رانو کا ویاہ کر دیں گے۔ نکاح تو تب ہی کر دیا تھا جب وہ نو سال کی تھی۔ اب تو وداع کرنا تھا۔ اسے سوہرے بھیجنا تھا۔“ وہ بے قرار ہو کر سینے پر دو ہتھ مارتی۔ ”ہائے رہا میں تو برباد ہو گئی۔“

وہ روتی رہی، ہلکتی رہی، فریاد کرتی رہی۔ اپنا دکھ درد سناتی رہی۔ اندھیری رات دم بخود کھڑی تھی۔ آسمان پر ابھی تک بادل چھائے تھے۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی تھی، سرسراہٹ تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ لالی خاموش کھڑا تھا۔ نہ اس نے کوئی تبصرہ کیا نہ کسی رد عمل کا اظہار کیا۔

کچھ دیر بعد قدموں کی آہٹ ابھری۔ سلامو اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ قریب آیا تو دھندلی دھندلی روشنی میں سب نے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا۔ رانو اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال گرد سے آلودہ تھے۔ قمیص پھٹ کر لیر لیر ہو گئی تھی۔ برہنہ پیٹھ اور کمر پر چھتری مار کے نشان صاف نظر آ رہے تھے جن سے خون رس رہا تھا۔ ایک آنکھ سو جی ہوئی تھی۔ کپٹی اور رخساروں پر خراشیں تھیں۔

بیوی نے اسے تہا دیکھا تو اور زور زور سے رونے لگی۔ تڑپ کر بولی۔ ”تو اکیلا آگیا۔ میری رانو کو نہیں لایا۔ ہائے، اب میں اس کے گھر والے کو کیا بتاؤں گی۔ اسے کیسے منہ دکھاؤں گی۔“ وہ سسکیاں بھر رہی تھی۔ گلے شکوے کر رہی تھی۔ ”سلامو، تو رانو کو کیوں نہیں لایا؟ تیری غیرت کو کیا ہو گیا۔؟“ بول، اب بولتا کیوں نہیں؟“

سلامو کچھ نہ بولا۔ یکایک اس کے مرچھائے ہوئے چہرے پر تہاؤ پیدا ہو گیا۔ ہاپنے کے سے انداز میں زور زور سے سانس لینے لگا۔ اس نے خونخوار نظروں سے اپنی بیوی، جتنی، کو دیکھا۔ تیزی سے جھپٹا اور اس کی کمر پر اس زور سے لات ماری کہ وہ دوہری ہو گئی۔ سلامو نے ہاتھ بڑھا کر اس کے بال پکڑے، اپنی طرف کھینچا، اور پاگلوں کی طرح مارنے لگا۔ کئی مرد ہجوم سے نکل کر جھٹ اس کے قریب پہنچے اور پکڑ کر علیحدہ کیا۔ مگر وہ بار بار ان کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ بیوی کو تنگی لگی گالیاں دیتا، بھرتا اور مارنے کے لیے جھپٹتا۔

شور سن کر ہر طرف سے مرد اور عورتیں گھبرا کر وہاں پہنچ گئے۔ ہجوم اب بڑھ گیا تھا۔ سب سلامو کو دیکھ رہے تھے۔ فرش پر بے سدھ پڑی ہوئی جتنی کو دیکھ رہے تھے۔ بول رہے تھے، باتیں کر رہے تھے، بڑبڑا رہے تھے۔ کوئی سلامو کو لعن طعن کر رہا تھا۔ کوئی سمجھا بجا کر اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوئی اس کی بیوی سے اظہار ہمدردی کر رہا تھا۔

اسی اثنا میں حنیف ڈوگر کئی کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ قریب پہنچ کر اس نے سلامو کو غصے سے ڈانٹا۔ ”اوتے حرام دے، تو نے فیرولا کیا۔ ابھی تیرا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔ کچھ اور گرمی اتروانی ہے؟“

ڈوگر کو دیکھتے ہی سب دم بخود ہو گئے۔ ہجوم بکھرنے لگا۔ سب دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگے۔ حنیف ڈوگر نے ان کو بھی تہر آلود نظروں سے دیکھا۔ گندی سی گالی دے کر زور سے دھاڑا۔ ”یہاں تماشا دیکھنے آئے ہو؟ جاؤ، جا کر سو جاؤ، سویرے کام نہیں کرنا۔“ کسی نے کچھ نہ کہا۔ اور سب منتشر ہو کر اس کی نظروں سے بچتے بچاتے اپنی اپنی جھوپڑیوں کی جانب کھسکنے لگے۔ لالی بھی پیچھے ہٹا، مڑا اور اپنی جھوپڑی کی سمت روانہ ہو گیا۔ بعد میں سلامو اور اس کی بیوی پر کیا گزری اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

صبح ہوئی تو لالی نے دیکھا، سلامو سانچوں میں گاڑا بھر بھر کر اینٹیں بنا رہا تھا۔ بیوی بھی اس کے ساتھ کام کر رہی تھی اور رانو بھی موجود تھی۔ وہ سر جھکائے اینٹیں تیار کرنے میں مصروف تھی۔ بادل اب چھٹ چکے تھے۔ مگرے نیلے آسمان پر ابر کے سفید سفید لکے منڈلا رہے تھے۔ ان کے پیچھے سورج چمک رہا تھا۔ گرمی پھر بڑھ گئی تھی۔

سلامو کام کرتا جاتا۔ پیشانی پر آیا ہوا پیمانہ پونچھتا اور جھنجھلا کر کبھی بیوی کو گالیاں دیتا، کبھی بیٹی کو۔ اس کی اونچی آواز بار بار سنائی دیتی۔ آس پاس کام کرنے والے، تھیرے اسے نرم لہجے میں سمجھاتے، سمجھاتے، خاموش رہنے کی تلقین کرتے۔ مگر وہ باز نہ آیا۔ برابر گالم گلوچ کرتا رہا۔ جو سمجھانے کی کوشش کرتا اس پر بھی غصے سے برستا۔ اس کے پیچھے چلانے کی آواز بھٹے کے دفتر تک پہنچ رہی تھی جہاں اسلم بیٹھا تھا۔ وہ اس روز خلاف معمول سہ پہر کو آیا تھا۔

میاں اسلم کے پیچھے کچھ ہی دیر بعد حنیف ڈوگر، تھیروں کی جانب آتا ہوا نظر آیا۔ وہ سیدھا سلامو کے پاس پہنچا۔ اس کے ہاتھ میں چھتر دبا تھا جسے وہ آہستہ آہستہ ہلاتا رہا تھا۔ حنیف ڈوگر نے غصے سے سلامو کو ڈانٹا پٹکارا۔ گالیاں بھی دیں۔ آنکھیں نکال کر جھپٹا اور سڑاک سڑاک چھتر مارے۔ سلامو چند لمحے خاموش کھڑا پٹتا رہا اور ٹیکھی نظروں سے ڈوگر کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے

جھپٹ کر ڈوگر کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ کچی اینٹوں سے ٹکرا کر گرتے گرتے پچا۔ سنبھل کر پلٹا اور چھتر اٹھا کر سلامو پر جھپٹا۔ مگر سلامو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ آخر ڈوگر نے جھکا دے کر اپنے ہاتھ چھڑا لیے۔ اب وہ سخت جھنجھلیا ہوا تھا۔ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے پھر پھر کر سلامو کو چھتر سے مارنا شروع کر دیا۔ سلامو بلبلا بلبلا کر کبھی ادھر ہٹا کبھی ادھر۔ پھر ایک ایسا مرحلہ آیا کہ وہ جھنڈا اور ڈوگر سے چٹ گیا۔ دونوں ایک دوسرے کو زیر کرنے کی ہر طرح کوشش کرنے لگے۔ اس کشمکش اور کھینچا تانی میں دونوں نے اپنی پیروں سے تازہ بنی ہوئی کچی اینٹوں کو روند کر مسمار کر دیا۔

یہ سب اینٹیں سلامو، اس کی بیوی اور بیٹی نے بنائی تھیں۔ مگر اس کی بیوی اور بیٹی سہمی ہوئی کھڑی تھیں اور سلامو کو ڈوگر سے ہاتھ پائی اور زور آزمائی کر۔ نہ دیکھ رہی تھیں۔ ہتھیروں اور دوسرے بڑے مزدوروں نے بھی کام چھوڑ دیا تھا اور دونوں کو رٹتے بھگڑتے دیکھ رہے تھے۔ وہ خاموش تھے اور حیران و پریشان نظر آ رہے تھے۔ نہ کسی نے سلامو کو منع کیا نہ بچ بچاؤ کی کوشش کی۔

حریف ڈوگر بھاری بھر کم تھا۔ اس کے جسم پر خوب گونت چڑھا تھا۔ ٹھکڑا اور مضبوط بھی تھا۔ اس کے مقابلے میں سلامو دبلا پتلا تھا۔ گوشت کم اور ہڈیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ ڈوگر بار بار دھکا دے کر سلامو کو گرا دیتا۔ کبھی اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچتا کبھی سر کے بال پکڑ کر اٹھاتا اور گھما کر چھتر مارتا۔ مگر سلامو ہر بار اس کی گرفت سے آزاد ہو جاتا۔ پلٹتا اور پھر جھپٹتا۔ وہ برابر پٹتا رہا، مار کھاتا رہا۔ مگر کیا زندہ آیا۔ اب ڈوگر لمبی لمبی سانسیں بھر کر ہانپنے لگا تھا۔

سلامو نے ایک بار کچکا کے اس زور سے ڈوگر کے منہ پر چھتر مارا کہ وہ چکر اگیا۔ سنبھلا بھی نہ تھا کہ سلامو نے اچھل کر دھکا دیا۔ ڈوگر لڑکھڑا کر گارے میں گر پڑا۔ سلامو نے جھپٹ کر اس کی گردن پکڑ لی اور گارے میں ٹھونس دی۔ مگر ڈوگر نے جلد ہی زور لگا کر اپنی گردن گارے سے باہر نکال لی۔ اس کا چہرہ گارے سے لت پت ہو کر نہایت ڈراؤنا اور ہیبت ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ زور زور سے ہانپ رہا تھا اور اونچی آواز سے سلامو کو گالیاں دے رہا تھا۔

چچ پکار کر آتا "فانا" چاروں طرف سے کارندے حریف ڈوگر کی مدد کو دوڑے۔ انھوں نے سلامو کو دبوچ کر بے بس کر دیا۔ ڈوگر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گارے سے ٹھٹھڑا ہوا اس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی آتی تھی۔ وہ اس بری طرح ہانپ رہا تھا کہ سانس سینے میں نہ ساتی تھی۔ نہ اس نے سلامو کو مارنے کی کوشش کی اور نہ ہی گالیاں دیں۔ سب کی سامنے اس کی ایسی کرکری ہوئی تھی کہ وہ کسی سے نظر

ملانے کے قابل نہ رہا تھا۔ وہ چہرے سے گارا پونچھتا، کپڑے جھاڑتا، دفتری جانب روانہ ہوا۔ اس کی ہدایت پر کارندے سلامو کو مارتے پیٹتے اور گھسیٹتے ہوئے اسی سمت لے گئے جدھر حریف ڈوگر گیا تھا۔

سارے ہتھیروں اور بڑے مزدوروں کا ہکا بکا کھڑے تھے۔ نہ کسی نے کارندوں سے باز پرس کی اور نہ ہی سلامو کو چھترانے اور آزاد کرانے کی کوشش کی۔ صرف سلامو کی بیوی اور بیٹی کے چروں پر غم و غصہ برس رہا تھا۔ وہ سسکیاں بھر کر رو رہی تھیں اور قہر آلود نظروں سے سلامو کو کارندوں کے نرغے میں جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔

ڈوگر کے ساتھ ساتھ سلامو بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ بھٹے پر سکوت طاری ہو گیا۔ کوئی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں جڑے ہوئے تھے۔ کسی کو مطلق پتہ نہ چلا کہ سلامو کا کیا حشر ہوا۔ اس کی بیوی بھی ادھر نہ گئی۔ سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور آنسو بہاتی رہی۔ اس کے ساتھ صرف اس کی بیٹی رو رہی تھی۔ نہ کوئی ان کو تسلی دینے آیا نہ کسی نے دل جوئی کی۔ سب خاموش اور دہشت زدہ تھے۔



سورج مغرب میں اتر گیا۔ شام نیچے اترنے لگی، پھیلنے لگی۔ جھٹ پٹے میں ہتھیروں اور بڑے مزدوروں نے دیکھا، سلامو دفتر کے عقب سے نکلا۔ کارندے اس کے بازو اور ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ وہ نہایت حقارت اور سبے دردی سے سلامو کو دھکے دیتے ہوئے چپنی کی جانب بڑھے اور بھٹے کے اندر داخل ہو گئے۔

سلامو کو بھٹے کے دیکھتے ہوئے تو بے پر کھڑا کر دیا گیا۔ اس کے پیر برہنہ تھے۔ تو بے پر پہنچتے ہی اس کے تلوے سلگنے لگے۔ اس نے تکلیف اور جلن برداشت کرنے کی غرض سے اپنے دانت بھیج لیے۔ تپتے تو بے سے وہ نیچے نہ اتر سکتا تھا۔ دو کارندے اس کی نگرانی پر مامور تھے اور نہایت چوکس کھڑے تھے۔ سلامو بار بار پیر پٹتا۔ بے بسی سے ادھر ادھر دیکھتا۔ اس کے پیر جھلتے رہے، سلگتے رہے۔ اس نے بے بسی سے گردن ہلائی۔ درد سے تملایا، منہ پھاڑا اور بے اختیار چیخ نکل گئی۔

شام کے سناتے میں چپنی کے اندر سے سلامو کی گھٹی گھٹی چپنیوں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔ اس کی بیوی اور بیٹی ہر چیخ پر تڑپ اٹھتیں۔ روتیں، آنسو بہاتیں، بے قرار ہو کر چپنی کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھتیں جس کے بچوں بچ گرم تو بے پر سلامو کھڑا تھا۔ اس تو بے کو کوٹنے اور لکڑیاں جلا کر انگارے کی طرح گرم کیا جاتا تھا اور کچی اینٹوں کو پکا کر پختہ بنایا جاتا تھا۔ اب اس تو بے پر کچی

بینوں کے بجائے کارندوں نے سلام کو کھڑا کر دیا تھا۔ اس کے پیر جل رہے تھے۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو کر چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا، دہائی دے رہا تھا۔

موسم گرما کی سلگتی شام رفتہ رفتہ تاریک ہوتی گئی۔ بجھے پر کام کرنے والا ہر ہتھیرا ہر محنت کش سہا ہوا تھا، خوف زدہ تھا۔ سلام کی چیخیں سن رہا تھا۔ اچانک چیخیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر بعد سلامو بجھے سے باہر نکلا۔ مگر چند قدم چلتے ہی لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا۔ وہ فرش پر بے حال پڑا تھا۔ کارندوں نے اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ مگر نہ وہ کھڑا ہو سکتا تھا نہ چل سکتا تھا۔

ایک مضبوط اور قوی ہیکل کارندے نے بڑھ کر اسے اٹھایا اور کندھے پر ڈال لیا۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا سلامو کی جھوپڑی کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا۔ جھوپڑی کے اندر داخل ہوا اور سلامو کو جھڑپ ڈال دیا۔ کارندہ چلا گیا۔ سلامو خاموش لیٹا تھا اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ اس کے تلوے جل کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ کھال جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی۔ بیوی اور نوجوان بیٹی رانوں نے اس کا یہ حال دیکھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ دونوں بچے بھی ماں اور بہن کو روتے دیکھ کر منہ بسورنے لگے۔ جھوپڑی میں کھرام برپا تھا۔

سب سے پہلے عزیز دار اور کنبے والے سلامو کو دیکھنے جھوپڑی کے اندر گئے۔ رفتہ رفتہ دوسرے ہتھیرے اور حٹ مزدور بھی پہنچنے لگے۔ لالی بھی گیا۔ اس نے دیکھا چراغ کی زرد زرد روشنی میں سلامو آنکھیں بند کئے پڑا تھا اور بے قراری سے اپنی گردن ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ نہ وہ بول رہا تھا نہ بات کر رہا تھا۔ اس کا مرتھایا ہوا چہرہ میلا پڑ گیا تھا۔

ایک ہتھیرے نے سلامو کی بیوی جگنی کو مشورہ دیا۔ ”بیروں پر دیوے کا گرم گرم تیل روٹی ڈبو کر لگا دے۔ جلن کم پڑ جائے گی۔“

”دیوے کے تیل سے کیا بنے گا۔ یہ علاج تجھے کس نے بتایا؟“ سلامو کے بوڑھے چچا نے اسے ٹوکا اور اپنا نسخہ تجویز کیا۔ ”دودھ مل دے۔ آرام آجائے گا“ پر دودھ ابلا ہوا نہ ہو۔ دودھ بالکل تازہ ہو تو فوراً آرام آجائے گا۔“

”بابے تو نے بھی حد کر دی۔“ سلامو کے سرہانے کھڑے ہوئے ایک نوجوان کھمار نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”ادھر بجھے پر دودھ کہاں ملے گا اور تازہ دودھ ملنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔ ”یہاں تو تک کی روٹی بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتی۔ تو دودھ کی گل کر رہا ہے۔“

باری بھی جھوپڑی میں موجود تھا۔ وہ جنم جنم کا ہتھیرا تھا۔ اس کا باپ بھی ہتھیرا تھا۔ اور کم سنی ہی میں اسے اینٹیں بنانے پر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ اب وہ ادھیڑ ہو چکا تھا۔ سر کے بال کچھڑی ہو گئے تھے۔ وہ دور دور نزدیک کے مختلف بھٹوں پر کام کر چکا تھا۔ اس کی دو نوجوان بیٹیاں ابھی تک میاں اسلم اور حنیف ڈوگر کے قبضے میں تھیں۔ ایک جوان بیٹا تھا۔ وہ کسی اور بجھے پر کام کر رہا تھا۔ بیوی کہیں اور کام کر رہی تھی۔ باری کو بیٹے اور بیوی کی بارے میں کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں؟

جوانی میں باری بھی بہت سرکش اور جیالا مشہور تھا۔ حٹ مالکوں اور ان کے بعداروں کے طرح طرح کے مظالم جھیل چکا تھا۔ دوبار سزا کے طور پر بجھے کے دیکھتے ہوئے تو بے رحم بھی کھڑا ہو چکا تھا۔ اسے ہر طرح کے ظلم و ستم کا بخوبی تجربہ تھا۔

باری نے پہلا کام تو یہ کیا کہ دوسرے ہتھیروں کی مدد سے سلامو کو جھوپڑی سے باہر نکالا اور تازہ ہوا میں ایک چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک طرح چلا گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچے آلود بے تھے۔ خدا معلوم کہاں سے ڈھونڈ کر لایا تھا۔ وہ جھوپڑی کے اندر گیا۔ چراغ کی روشنی میں آلو پتھر پر رکھ کر اچھی طرح کچلے۔ مٹی کی ایک پلیٹ میں سمیٹ کر رکھے۔ سلامو کے پاس پہنچا اور ہولے ہولے کچلے ہوئے آلوؤں کا لیپ سلامو کے تلوؤں پر لگانے لگا۔

سلامو نے تھلا کر پہلو بدلا۔ باری نے نرم لہجے میں اسے سمجھایا۔ ”گھبرا نہیں، تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”مجھے بھی پتہ ہے۔ تو بے کھڑے ہونے کی بعد بیروں میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔“

باری نے آلوؤں کا لیپ سلامو کے دونوں تلوؤں پر اچھی طرح لگا دیا۔ سلامو کچھ دیر تو بے قرار رہا، مگر اب وہ خاموش پڑا تھا اور آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ بیوی چارپائی کی پٹی سے لگی اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ سر دبا رہی تھی۔ قریب ہی اس کی بیٹی رانو اور دونوں بچے دم ڈوڑ بیٹھے تھے۔

ڈوگر ایک طرف سے دو کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ سلامو کی پاس پہنچا اور اس کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسروں کو بھی گالیاں دینے لگا، دھونس اور دھمکی دینے لگا۔ مگر اس دفعہ کوئی ہٹا نہیں۔ جس جگہ کھڑا تھا وہیں رہا۔ حنیف ڈوگر برا فروخت ہو کر اور زور زور سے ڈانٹنے پھنکارنے لگا۔ ہتھیروں اور دوسرے حٹ مزدوروں کے چروں پر جھنجھلاہٹ پھیلنے لگی۔ احتجاج کے طور پر طرح طرح کی آوازیں ابھرنے لگیں۔

”بعد ارگالاں نہ نکال۔“

”رب سے ڈر۔ اتنا ظلم کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”کڑیاں اور زنا نیاں اٹھاتے ہوئے تجھے شرم کئی چاہیے۔“

”سلامونے جو کچھ کیا بالکل ٹھیک کیا۔“

”ہن جی، یہ عزت کا سوال ہے۔“

آوازیں اونچی اور اونچی ہوتی گئیں۔ لہجہ تلخ تر ہوتا گیا۔ چروں کا تناؤ بڑھ گیا۔ آنکھوں سے غم و غصہ جھلکنے لگا۔ حنیف ڈوگر نے ان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہوا اپنے کارندوں کے ہم راہ چلا گیا۔ وہ سخت چراغ پا تھا۔

رات گزری۔ صبح ہوئی۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ صرف سلامون اپنی جھونپڑی میں تنہا اپنا تکلیف سے کراہتا رہا۔ بے چینی سے بار بار کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی بیوی جگنی اور بیٹی رانو گارا بنا رہی تھیں اور گارے کو سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کر رہی تھیں۔ سلامون کے دونوں کم سن بچے بھی ماں اور بہن کا ہاتھ بنا رہے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق مستعدی سے مدد کر رہے تھے۔

حنیف ڈوگر دن بھر نظر نہ آیا۔ مگر شام کو جب چٹھا بنا تو وہ حسب معمول منشی کے عقب میں کارندوں کے ہم راہ موجود تھا۔ وہ منشی کے سامنے نیم دائرے میں فرش پر بیٹھے ہوئے ہتھیروں اور بٹے مزدوروں کو غصے سے گھور رہا تھا۔ گزشتہ شب اس کی جو بے عزتی ہوئی تھی، اس پر سخت براہم تھا۔ اس کی آنکھوں سے جو کدورت اور نفرت جھلک رہی تھی، اس کی شدت کا اندازہ اس وقت ہوا جب کسی کو منشی نے اجرت نہ دی۔ ہنپتے بھر کی پوری دھاڑی پیٹنگی میں کاٹ لی۔ جس نے بھی احتجاج کرنے کی کوشش کی حنیف ڈوگر نے پھر پھر کر اس کی پیٹھ اور کمر پر سزا کا چھتر لگائے۔ مگر نہ کوئی ہنگامہ ہوا نہ گزربوٹ۔



تمام ہتھیارے اور بٹے مزدور رات بھر جاتے رہے۔ چوری چھپے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ سرگوشیاں کرتے رہے۔ تمام رات یہ خفیہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ صبح ہوئی تو کوئی ہتھیار اور کوئی بٹہ مزدور کام پر نہ گیا۔ سب اپنی جھونپڑیوں میں بیٹھے رہے۔

پہر دن گزرا۔ سورج چڑھ کر آسمان کے پھونچ پہنچ گیا۔ دوپہر ہو گئی۔ مگر بٹے سنان تھا۔ نہ کوئی چم پھل تھا نہ گھما گھی۔ حنیف ڈوگر اپنے کارندوں کے ساتھ پیچ و تاب کھاتا ہوا

جھونپڑیوں پر پہنچا۔ چیخا چلایا۔ ڈرایا دھمکایا۔ مگر کوئی بھی جھونپڑی سے نکل کر کام پر نہ گیا۔ دوسرے روز بھی کوئی کام پر نہ گیا۔

میاں اسلم اس صورت حال سے سخت پریشان ہوا۔ اسے ایک سرکاری عمارت کی تعمیر کے لیے بہت بڑی تعداد میں اینٹیں فراہم کرنا تھیں اور کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں فراہم کرنا تھیں۔ یہ ٹھیکہ اس نے بہت بھاگ دوڑ کرنے اور محنتی رشوت دینے کے بعد حاصل کیا تھا۔ ٹھیکے کی بنیادی شرط وقت مقرر کے اندر اینٹیں فراہم کرنا تھی۔ تاخیر کی صورت میں ٹھیکہ منسوخ ہ جانے کا شدید خطرہ تھا۔

سہ پہر کو میاں اسلم نے ڈوگر کو طلب کیا۔ وہ اس وقت بجٹے کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ بشرے سے گھبراہٹ اور پریشانی عیاں تھی۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ چہرے سے پسینا پونچھ رہا تھا۔ حنیف ڈوگر دفتر میں داخل ہوا اور سر جھکا کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

میاں اسلم نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”ڈوگر، آج بھی بجٹے پر کام شروع نہیں ہوا۔“

”فکر نہ کریں جی، کل کام شروع ہو جائے گا۔“ حنیف ڈوگر نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”بھوکے مریں گے تو سارے ہی ہتھیارے اور مزدور خود ہی کام پر پہنچ جائیں گے۔“

”اور وہ کل بھی کام پر نہ آئے تو؟“

”نئے ہتھیارے بھرتی کر کے لے آؤں گا۔“ ڈوگر نے صفائی پیش کی۔ ”کیا کریں جی۔ سب نے بہت تنگ کر رکھا ہے۔ آنکھیں دکھاتے ہیں۔ رولا کرتے ہیں۔ ان کی چابی کتنا بہت ضروری تھی۔ آگے بھی بہت زیادہ تنگ کریں گے۔“

”تو چابی کتنا رہتا، ادھر اپنا ہتھکن نکل جائے گا۔“ میاں اسلم برس پڑا۔ ”تو بالکل کام کا بندہ نہیں۔ ایک دم ہڈ حرام ہو گیا ہے۔ تجھ سے بعد ارگالاں نہیں ہونے کی۔“

”میاں صاحب، میری گل تو سنو۔“ ڈوگر نے عاجزی سے ایک بار پھر صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”میں نے تیری کوئی گل شل نہیں سنی۔“ میاں اسلم جھنجھلا کر زور سے چیخا۔ ”تو میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔ نکل جا یہاں سے۔“

حنیف ڈوگر نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ مڑا اور گردن جھکائے ہوئے چپ چاپ دفتر سے باہر چلا گیا۔

شام کو میاں اسلم نے تمام ہتھیروں اور دوسرے محنت کشوں کو بلوایا۔ جب وہ دفتر کے سامنے

میتان جھلکنے لگا۔ میاں اسلم نے سلام کی بیوی، جگنی، کو بلایا۔ پندرہ روپے جیب سے نکال کر امو کے علاج معالجے کے لیے دیے۔ اسے تسلی بھی دی۔ اس نے گردن اٹھا کر سامنے بیٹھے، تھیرے اور مزدور فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے جسموں سے پسینے کی تیز بو اٹھ رہی تھی۔ ان کے چہرے بالکل سپاٹ تھے۔ وہ نظریں اٹھائے میاں اسلم کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میاں اسلم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اونچی آواز سے سب کو مخاطب کیا۔ ”کیوں جی، تم سب نے دو روز سے کام کیوں بند کر رکھا ہے؟“

اس اعلان سے تھیرے واقعی خوش ہو گئے۔ بن مانگے مراد پوری ہوئی تھی۔ وہ ہنسنے مسکراتے ہیں اسلم کو دعائیں دیتے اپنی اپنی جھوپڑیوں اور جھگیوں کی جانب روانہ ہو گئے۔ سلام کی بیوی نے اپنا سارا دکھ درد بھول گئی۔ پندرہ روپے اس کی دھوتی کے ڈب میں نہایت حفاظت سے رکھے۔ باری سب سے زیادہ خوش تھا۔ اس کی دونوں بیٹیاں جو لگ بھگ چار مہینے سے لاپتہ تھیں اب ہی کو واپس آگئی تھیں۔

میاں اسلم نے ایسا ابھر پھینکا کہ تھیرے اس سے نہال ہو گئے۔ ان کے سوکھے پتلے اور مرمل سوں میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ وہ اب دبا کے محنت کرتے۔ زیادہ جوش و خروش سے کام کرتے اور ٹروڈیٹر بلتا عذر چودہ چودہ کھٹے کام کرتے۔ بھٹے کے وسیع میدان میں ہر طرف اینٹوں کے چٹے راتے تھے۔

مٹی کا روٹیہ بھی بدل گیا تھا۔ اب وہ چٹھا بانٹنے وقت بے زاری اور جھنجھلاہٹ کا اظہار نہ کرتا۔ بی سے بات کرتا۔ پیٹنگی بھی کم سے کم کاٹتا۔ ٹوٹ پھوٹ اور ٹیڑھی بیڑھی اینٹوں کی کٹوتی میں بھی عایت سے کام لیتا۔ ہنسنے بولنے اور ملنے جلنے پر بھی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ کارندے بھی بہت کم لڑتے۔ اور حریف ڈوگر تو بالکل نظر نہ آیا۔ عام خیال یہ تھا کہ میاں اسلم نے اس کی جعداری تم کردی ہے۔



لالی نے زیادہ سے زیادہ کمائی کرنے کی خاطر فرار ہونے کا ارادہ عارضی طور پر ملتوی کر دیا تھا۔ وہ دن ڈوبنے کے بعد بھی دیر تک اینٹیں بتاتا رہتا۔ وہ تھکا ہارا کام سے واپس آتا۔ جلدی جلدی لٹی پکاتا اور کھانا کھاتے ہی بے خبر ہو کر سو جاتا۔ دو ہفتے سے بھی زائد عرصہ اسی عالم میں مغموم رہا۔ ایک صبح اس نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا، حریف ڈوگر بھٹے میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ہم والے نے تھیرے بھی تھے جنہیں لالی نے پہلی بار دیکھا تھا۔

لالی نے معمول کے مطابق کچی اینٹیں تیار کیں۔ کام ختم کیا۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ کر سو

راؤ بھی اپنی ماں کے ساتھ بیٹھی تھی اور تعجب سے آنکھیں پھاڑے میاں اسلم کو دیکھ رہی تھی جس کے ساتھ اس نے تمام رات بے بسی کے عالم میں بسر کی تھی۔

مگر میاں اسلم اس کے احساسات اور حیرانی و پریشانی سے بالکل بے نیاز تھا۔ اس نے تیوری پر مل ڈالے، چہرے پر جھنجھلاہٹ طاری کی اور اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ ”میں ڈوگر کی جعداری ختم کر دوں گا۔ اس کی چھٹی کر دوں گا۔“

مجھے میں ہلکی ہلکی سرسراہٹ ہوئی۔ دبی دبی سرگوشیاں ابھریں۔ مرچھائے ہوئے چروں پر

گیا۔ پھر رات گزری تھی کہ کسی نے اسے زور زور سے جھنجھوڑا۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک مسلح کارندہ سرہانے کھڑا تھا۔ لالی نیند سے بوجھل آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کر کمر بیٹھ گیا۔

کارندے نے ڈپٹ کر کہا۔ ”مناٹ اپنا سامان اٹھا۔“

”کیوں؟“ لالی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔“ کارندہ آنکھیں نکال کر بولا۔ اندھیرے میں وہ بھوت کی مانند خوفناک نظر آ رہا تھا۔

لالی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ چارپائی سے نیچے اترا اور جلدی جلدی اپنا سامان اکٹھا کرنے لگا۔ کارندے نے اپنی لمبی ڈانگ سے اس کی کمر کو ٹوکا دیا۔ تھکے لہجے میں بولا۔ ”تیزی سے ہاتھ چلا۔“ لالی نے کچھ نہ کہا۔ اپنا سامان سمیٹ کر گٹھری بنالی اور کارندے کی جانب دیکھنے لگا۔

”ادھر چل۔“ کارندے نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر چلنے کا اشارہ کیا۔

لالی چپ چاپ آگے بڑھا۔ کارندہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ لالی ہنوز حیران و پریشان تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دبی زبان سے دریافت کیا۔ ”تو مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

”چپ کر کے چلتا رہ۔“ کارندے نے بے رخی سے ڈانٹا۔ ”بیکار کی بکواس نہ کر۔“

ڈانٹ سن کر لالی کو مزید پوچھ گچھ کرنے کی جرات نہ ہوئی۔ وہ اپنی گٹھری سنبھالے، کان دبائے، کارندے کے ہم راہ چلتا رہا۔ دونوں اندھیرے میں ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیروں اور گڑھوں سے بچتے بچاتے آگے بڑھتے رہے۔ نہ کارندے نے کوئی بات چیت کی اور نہ ہی لالی بولا۔ کارندہ گردن اٹھائے نہایت مستعدی سے چل رہا تھا۔

لالی نے دور سے دیکھا، بٹھے کے ٹکڑ پر سڑک کے کنارے ایک ٹرک کھڑا تھا۔ کارندہ ٹرک ہی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ لالی بھی اس کے ساتھ اسی طرف بڑھا۔ قریب جا کر اسے جمعدار حنیف ڈوگر نظر آیا۔ وہ ٹرک کے نزدیک دھندلی دھندلی روشنی میں نہایت پر اسرار انداز میں کھڑا سگریٹ پر کش لگا رہا تھا۔ سگریٹ کا سلگتا ہوا کنارہ اندھیرے میں بار بار دکھتا۔ اس کے دیکھنے سے سرخ سرخ روشنی پھیلتی۔

حنیف ڈوگر نے لالی سے کوئی بات نہیں کی۔ سرسری نظر سے اسے دیکھا اور کارندے کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس نے لالی کو ٹرک کے پچھلے حصے میں بٹھا دیا جو کھلا ہوا تھا۔ کئی پتھیرے پہلے ہی

میں موجود تھے۔ سب ڈرے سبے بیٹھے تھے۔ لالی بھی سما ہوا تھا۔ پتھیرے جھونپڑیوں کی ف سے کارندوں کی نگرانی میں آتے رہے اور ٹرک میں بیٹھے رہے۔ پھر ان کی آمد کا سلسلہ بند ہو گیا۔

چار مسلح کارندے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے اور پتھیروں کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ حنیف ڈوگر نے اسے آس پاس گھوم پھر کر پتھیروں کا جائزہ لیا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ انجن اشارت ہوا ٹرک سڑک پر دوڑنے لگا۔ ٹرک میں انہیں پتھیرے سوار تھے۔ ان میں مرد تھے۔ عورتیں تھیں بچے بھی تھے۔ مگر سلاوا اور اس کے بال بچے ان میں شامل نہ تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اموا بھی تک چل پھر نہیں سکتا تھا۔ البتہ اس کے لگ بھگ سب ہی عزیز و اقارب ٹرک میں یا۔

ردھنی

ٹرک رات کے سنانے میں سڑک پر دوڑتا رہا۔ مختلف راستوں سے گزرتا، موڑ کاٹتا، کبھی داؤ بگور دیکھتا اور کبھی بائیں طرف گھومتا، آگے اور آگے بڑھتا رہا۔ پتھیرے چپ بیٹھے تھے۔ نہ کوئی تھانہ بات کر رہا تھا۔ انھیں کچھ پتہ نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کدھر جا رہے ہیں؟ انھوں نے کی یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہ کی۔ اور اگر جھونپڑیوں اور جھگیوں سے نکلے ہوئے ایسی شل کی بھی تو ان کو بھی لالی کی طرح کارندوں نے ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کر دیا تھا۔

بٹھے کے چاروں کارندے نہایت چوکس بیٹھے تھے۔ دو کے پاس بندوقیں بھی تھیں جنھیں وہ ہولٹی سے تھامے ہوئے تھے۔ وہ چوکنا نظروں سے ٹرک میں بیٹھے ہوئے پتھیروں کو گھور رہے تھے۔ کبھی کبھار کوئی بوڑھا کھانسا تو خاموشی کا ظلم ٹوٹ جاتا۔ کارندے کھانسی کی آواز کے کے تھ ہی چونک پڑتے اور غصے سے کھانسنے والے پتھیرے کو دیکھتے۔ ان کے چروں پر سختی اور ننگی تھی۔ نام کو بھی نرمی اور مروت نہ تھی۔ وہ اپنے ہر رویے اور ہر انداز سے ڈرے سبے نمبول کو دہشت زدہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

ٹرک نے ایک موڑ کاٹا تو گشت کرنے والی پولیس کی ایک ٹولی سامنے آگئی۔ ایک پولیس والے ہاتھ اٹھا کر ٹرک روکنے کا اشارہ کیا۔ ٹرک رک گیا۔ کارندوں نے جھٹ اپنی بندوقیں قریب لی ہوئی پتھیروں کی گٹھریوں کی اوٹ میں چھپا دیں۔ پولیس والے ٹرک کی تلاشی لینے کی غرض سے آگے بڑھے۔

حنیف ڈوگر خود نیچے اترا۔ نرم لہجے میں ایک پولیس والے کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا

”والدارجی، ٹرک میں پتھیرے بیٹھے ہیں۔ ان کو بٹھے پر پہنچانے جا رہا ہوں۔“

نیںد سویا کہ صبح ہونے سے پہلے آنکھ نہ کھل سکی۔



رہی روز میں لالی نے ماحول سے مانوس ہو گیا۔ لکھو ڈیر کے بھٹے اور تیلوں کے بھٹے میں کوئی رہ تھا۔ ہتھیروں پر وہی روک ٹوک اور پابندی تھی۔ جعدار اور کارندوں کی وہی شورہ ہشتی بات بات پر ڈانٹتے ڈپٹتے تھے۔ حقارت سے دھکارتے تھے۔ تمام دن کڑی نگرانی کرتے تھے۔ لو سپردار جھونپڑیوں کے ارد گرد گشت کرتے تھے۔ زمین پر زور زور سے لائیاں مار کر بجاتے اونچی آواز سے کھکارتے تھے۔ کوئی پیشاب کو بھی اٹھاتا تو فوراً ڈپٹ کر ٹوکتے تھے۔

نئے کی شام کو چٹا بانٹا گیا۔ لالی کو پانچ روز کی دہاڑی کا صرف ڈیڑھ روپیہ ملا تو وہ بہت چکرایا۔ لے چرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ صورت شکل سے وہ بھی خراٹ لگتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی اندر دھنسی آنکھیں، پھولے پھولے گال، بے ڈول جسم، پیٹ بڑھا ہوا۔ وہ گردن جھکائے رجسٹر کو بغور دیکھتا۔

لی نے دریافت کیا۔ ”سوا چار ہزار اینٹ کی تو یہ بہت کم دہاڑی ہوئی۔ تو نے ٹوٹ پھوٹ کی لٹوٹی کی؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

ٹوٹ پھوٹ تو اتنی نہیں بنتی۔ پر تیری طرف پیٹھی بہت ہے۔ ”منشی نے اس کی جانب دیکھے بغیر دیا۔

کتنی پیٹھی ہوتی ہے جی؟“

پورے آٹھ سو روپے۔ ”منشی نے لالی کو مطلع کیا۔

”آٹھ سو!“ لالی ہکا بکا ہو کر منشی کا منہ کھنکے لگا۔ ”میری طرف تو جی دو سو سے بھی کم پیٹھی ہوتی ہے۔“

”کتنی پیٹھی پہلے ہوتی تھی“ اس کے بارے میں جعدار حنیف ڈوگر بتائے گا۔ ”منشی نے بے جا سے بتایا۔ ”میرے رجسٹر میں آٹھ سو روپے پیٹھی کے لکھے ہیں۔“ اس دفعہ اس نے نظریں رلالی کی جانب دیکھا۔ ”تیرے نام پر اتنی ہی پیٹھی ڈوگر کو ادا کی گئی ہے۔“ اس کا لہجہ تلخ اور ہو گیا۔ ”کان کھول کر سن لے۔ ادھر رہ کر تجھے اتنی ہی پیٹھی ادا کرنی ہوگی۔“

’پر میں نے تو جی، کل تین سو روپے پیٹھی لی تھی۔“ لالی نے وضاحت کی۔ ”میرے حساب سے جائے تو لگ بھگ سو روپے پیٹھی کے ادا بھی کر چکا ہوں۔“

”میں نے تیرے حساب کو نہیں دیکھا۔ میں نے تو وہ دیکھا ہے جو میرے رجسٹر میں درج ہے۔“

حوالدار نے ٹرک کے نزدیک جا کر ہتھیروں اور کارندوں کو ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ سارے ہتھیروں چپ بیٹھے رہے۔ کسی نے ڈر کے مارے چوں تک نہ کی۔ حوالدار اور دوسرے پولیس والوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

حوالدار نے ڈوگر سے پوچھا۔ ”تو کون ہے؟“

”میں جی جعدار ہوں۔“ حنیف ڈوگر نے اسے مطلع کیا۔ ”سارے ہی ہتھیروں میاں اسلم کے بھٹے کے ہیں۔“

حوالدار نے مزید پوچھ سمجھ نہ کی۔ ہاتھ ہلا کر ٹرک آگے بڑھانے کا اشارہ کیا۔ حنیف ڈوگر ٹرک پر سوار ہوا اور ڈرائیور کے برابر بیٹھ گیا۔ ٹرک ایک بار پھر سڑک پر دوڑنے لگا۔ کارندوں نے جھک کر اپنی بندوبست نکالیں۔ انھیں سنبھالا اور چوکس ہو کر بیٹھ گئے۔

”ادھر ٹرک لکھو ڈیر کے بھٹے پر پہنچ کر رک گیا۔ رات کا پچھلا پھر تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ حنیف لالی رٹرک کو ایسے پیچیدہ اور طویل راستوں سے گھما پھرا کر لے گیا تھا کہ ہتھیروں کو نہ تو راستے کی سمجھ اندازہ ہو سکا اور نہ یہ علم ہوا کہ وہ کہاں پہنچے اور کس بھٹے پر پہنچے؟ وہ حیرت زدہ تھے۔ سہ ہوئے تھے۔ تھکن اور نیند سے مدھال تھے۔

ٹرک کے پہنچنے ہی بھٹے کا جعدار، زماں خان، کئی کارندوں کے ساتھ نمودار ہوا۔ ہتھیروں ٹرک سے نیچے اترے۔ حنیف ڈوگر نے ہتھیروں کو زماں خان کے حوالے کیا۔ اس نے ان کی گنتی کی۔ حنیف ڈوگر زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ زماں خان سے رخصت ہوا اور ڈرائیور کے ساتھ ایک بار پھر چلا گیا۔ اس کے ہم راہ آنے والے چاروں کارندے بھی ٹرک پر سوار ہو گئے۔ ٹرک اشارت ہوا اور فیروز پور روڈ کی جانب واپس روانہ ہو گیا۔

زماں خان کی ہدایت پر لالی اور دوسرے ہتھیروں کو بھٹے کے کارندوں نے دفتر کے پاس درختوں کے نیچے پہنچا دیا۔ نہ انھوں نے کارندوں سے کچھ پوچھا اور نہ ہی انھوں نے کچھ بتایا۔ ہتھیروں بے سرو سامانی کے عالم میں رات بھر درختوں کے نیچے پڑے رہے۔ سویرے کچھ جھونپڑیاں خانہ کرائی گئیں اور ان کے لیے رہائش کا بندوبست کر دیا گیا۔ مگر انھیں پرانے ہتھیروں سے الگ تھلک رکھا گیا۔

لالی نے دوپہر تک آرام کیا۔ کھانا کھایا اور کام کرنے پہنچ گیا۔ اس نے مٹی کھود کر گارا بنایا اور سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگا۔ تھکن اور شب بیداری کے باعث اس روز زیادہ دیر تک کام نہ کر سکا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی اٹھ گیا۔ سرشام ہی پڑ کر سو گیا اور

اس کی آواز اونچی ہو گئی، برہم ہو کر بولا۔ ”اب تو میرا مغز نہ کھا۔ اپنی دہاڑی اٹھا اور میاں سے نرجا۔ تو اکیلا نہیں، میں نے اوروں کو بھی چٹھا باٹھا ہے۔“

لالی نے منشی سے مزید جھٹ کرنے کی کوشش نہ کی۔ خاموشی سے اپنی جھونپڑی میں گیا۔ اٹھ سو روپے پیشگی کی اطلاع نے اسے ذہنی طور پر اس قدر پریشان کر دیا تھا کہ نہ تو اس نے روٹی پکائی اور نہ ہی کچھ کھایا پیا۔ نڈھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا اور بے چین ہو کر کروٹیں بدلنے لگا۔

شام جب رات میں ڈھل گئی تو واجد اس کے پاس آیا۔ وہ بھی ہتھیرا تھا۔ بیوی اور ایک نو عمر بیٹے کے ساتھ قریب کی جھونپڑی میں رہتا تھا۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی نے اسے وقت سے پہلے بوڑھا بنا دیا تھا۔ سر اور ڈاڑھی کی بال کھجڑی ہو گئے تھی۔ ہر وقت کھانا بھی رہتا تھا۔

لالی نے واجد کو دیکھا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ واجد اس کے برابر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ پوچھا۔ ”تو شام سے چپ پڑا ہے۔ تو نے روٹی بھی نہیں کھائی۔ تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اس کے لہجے سے ہمدردی عیاں تھی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہی ہے۔ پر بھوک ہی نہیں لگی۔“

”تو کچھ پریشان پریشان نظر آ رہا ہے۔“ واجد نے قیاس آرائی کی۔ ”لگتا ہے دہاڑی بہت کم ملی۔ میں نے دیکھا تھا تو منشی سے پیشگی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔ میں تو منشی کے بالکل سامنے ہی بیٹھا تھا۔ کتنی پیشگی تو نے لے رکھی ہے؟“

”پیشگی تو میں نے تین سولی تھی۔ سو روپے کے لگ بھگ دہاڑیوں سے کٹ بھی چکے تھے۔“ لالی نے اسے مروان پایا تو دل کی بات زبان پر لایا۔ ”میرے حساب سے دو سو سے کچھ ہی اوپر ہو گی۔ تب میں میاں اسلم کے بھٹے پر کام کرتا تھا۔ ادھر آیا تو منشی نے اٹھ سو پیشگی بتائی۔ ساری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لی، کل ڈیڑھ روپیہ دیا۔“

”ہاں جی، یہ پیشگی کا چکر ہی ایسا ہے۔ ایک بار شروع ہو جائے تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔“ واجد نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جتنی کتنی ہے اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک بھٹے سے دوسرے پر جاؤ تو اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ منشی سے پوچھو تو ٹھیک سے بتاتا بھی نہیں۔ اپنی مرضی سے جتنی چاہتا ہے کاٹ لیتا ہے۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتا ہے۔“

”تو نے کتنی پیشگی لے رکھی ہے؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”کوئی پیشگی شیگی نہیں لی۔“ واجد نے وضاحت کی۔ ”جب ملتان کے بھٹوں پر کام کرتا تھا تب بھی نہیں لی۔ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں لی۔“

”تب تو ادھر کیسے آگیا؟ جمعدار زیادہ دہاڑی کا لالچ دے کر لایا ہو گا۔“

”ناجی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ واجد نے لالی کو بتایا۔ ”وہ ایسا ہوا جی کہ میرا ایک بھتیجا جی ٹی روڈ کے بھٹے بندے ماراں پر ہتھیرا لگا ہوا تھا۔ اس کا ناں ہاشم ہے۔ بھٹے کے مالک نے اس پر ہزار روپے پیشگی بنا رکھی تھی۔ ساری دہاڑی پیشگی میں کاٹ لیتا تھا۔ ہاشم کے پاس ہفتے بھر کی روٹی کو بھی نہ بچتا۔ اس کا پتہ تیار پڑا۔ منت سماجت کرنے پر بھی ہٹے مالک نے اس کے دوا دارو کے لیے ادھار نہ دیا۔ وہ بیماری اور بھوک سے مر گیا۔ تھا تو پندرہ سال کا پر جوان لگتا تھا۔ یہ اونچا ہوتا تھا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر اونچائی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”ہاشم خود بھی بیمار رہتا تھا اور اس کی گھر والی بھی روگی تھی۔ ہٹے مالک نے ہاشم کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔“

”تنگ تو جی سارے ہی ہتھیروں کو اسی طرح کیا جاتا ہے۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔

”ہاشم کو زیادہ ہی تنگ کر رکھا تھا۔“ واجد نے مطلع کیا۔ ”اس کے بارے میں جب مجھے پتہ چلا تو بہت دکھ ہوا۔ اپنے خاندان والوں سے بات کی۔ وہ بھی ہتھیرے تھے اور ایک ہی بھٹے پر اکٹھے کام کرتے تھے۔ سب کے مصالح مشورے سے یہ طے کیا گیا کہ ہاشم کو بھوک اور تنگ سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ ورنہ وہ بھی اپنے پتر کی طرح مرجائے گا۔“

”تم سب نے اس کے لیے کیا کیا؟“ لالی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”کرنا کیا تھا جی، ملتان سے لوہر پنچے اور ہاشم کی پیشگی اتارنے کے لیے بندے ماراں کے بھٹے پر کام کرنے لگے۔“ واجد نے بتایا۔ ”ہم اٹھ بندے تھے۔ ان میں تین زنانیاں بھی تھیں۔ سب یہ سوچ کر گئے تھے کہ ہاشم کو اپنے ساتھ ہی ملتان لے جائیں گے۔ ہم نے دن رات زبردست محنت کی۔ اینٹیں بنانا کے ڈھیر لگا دیئے۔ کئی لاکھ اینٹیں بنا ڈالیں۔“

”تب تو ہاشم کی پیشگی ادا ہو گئی ہو گی۔“

”ادا تو ہو جانا چاہیے تھی، پر ایسا ہوا نہیں۔“ واجد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میدنہ بھر سے کچھ اوپر ہوا ہو گا کہ ہم سب کو فیروز پور روڈ کے ایک بھٹے کے مالک کو تین ہزار روپے لے کر فروخت کر دیا گیا۔ ہم کو اپنے فروخت ہونے کا بھی تب پتہ چلا جب نئے بھٹے پر پنچے۔“

”ہاشم بھی تمہارے ساتھ ہی نئے بھٹے پر چلا گیا ہو گا؟“

”نہ وہ ہمارے ساتھ آیا نہ ہی اس کی پیشگی ادا ہوئی۔ وہ پہلے کی طرح اپنی گھر والی کے ساتھ بندے ماراں کے بھٹے پر کام کرتا رہا۔“

”یہ کیسے ہوا؟“ لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بس ایسے ہی ہوا جیسے میں بتا رہا ہوں۔“ واجد نے لالی کی حیرت پر توجہ نہ دی۔ ”ہم سب کو ایک رات زبردستی ٹرک میں بھرا گیا اور ایسے ہی ادھر پہنچا دیا گیا جیسے تو ادھر آیا ہے۔“ اس نے سوالیہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”تو اپنی مرضی سے تو ادھر نہیں آیا۔“

”تو مرضی کی گل کر رہا ہے۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں کہ میاں اسلم کے بھنے سے اٹھا کر مجھے کیوں لایا گیا؟“ لالی نے بے زاری سے بتایا۔

”ہتھیروں کی خرید و فروخت ایسے ہی ہوتی ہے۔ ان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب اور کہاں جانا ہو گا۔ لگتا ہے تو یانیا ہتھیرا لگا ہے۔“

”ایسی ہی گل بات ہے۔“ لالی نے اس کی تائید کی۔ ساتھ ہی دریافت کیا۔ ”یہ بتاؤ فیروز پور روڈ کے بھنے سے ادھر لکھو ڈیر کیسے آگیا۔ تو میاں اسلم کے بھنے پر تو نہیں کام کرتا تھا؟“

”ناجی وہ شریف خان کا بھٹہ ہوتا تھا۔“ واجد نے فوراً تردید کی۔ ”اس کے بھنے پر لگ بھگ ہم نے دو مہینے کام کیا۔ وہ جی سردی کے دن تھے۔ ہم کو رہنے کے لیے کوئی جھونپڑی کوئی جھگی بھی نہ دی گئی۔ سردی سے بچنے کے لیے رات ہم چینی کے پاس گزارتے۔ وہ گرم ہوتی تھی۔ اندر کچی اینٹیں پکانے کے لیے آگ جلتی رہتی تھی۔ تب بھی سردی سے نیند نہ آتی۔ چادریں اوڑھے سکرے سکرے پڑے رہتے۔“

”تمہارے پاس رضائیاں نہیں تھیں؟“

”ہمارے پاس رضائیاں بنانے کو کچھ بھی نہ تھا۔“ واجد نے لالی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

”شریف خان کی جب بہت منت و حاجت کی تو اس نے بیس بیس روپے پیشگی دی۔ ہم نے اس کے بھنے پر دو مہینے تک کام کیا۔ پر ہم کو کچھ بھی نہ ملا۔ پیشگی کے ساتھ ساتھ وہ تین ہزار بھی ہماری دھاڑیوں سے کاٹے گئے جو بندے ماراں کے بھٹے مالک نے ہم کو خریدنے کے لیے شریف خان کو دیے تھے۔“ اسے کھانسی کا ٹھٹھا لگا۔ وہ بے چین ہو کر کھانسنے لگا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی، تو میں یہ بتا رہا تھا کہ شریف خاں نے ہم کو بہت تنگ کیا۔ اتنا تنگ کیا کہ کھانے کو روٹی بھی نہ ملتی۔ تب ہم نے شور شرابہ کیا۔“

”تب تو شریف خان نے اپنی کرندوں کے ذریعے سب کی زبردست پٹائی کی ہوگی۔“ لالی نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”ان دنوں وہ لاہور میں نہیں تھا۔ اس کا جمدار بھی نہیں تھا۔ دونوں کو نہ گئے ہوئے تھے۔ تب ہی تو ہم نے بھٹہ چھوڑا اور واپس ملتان چلے گئے۔ پر ادھر بھی زیادہ دن نہ ٹھہرے۔ لودھراں چلے

گئے۔“

”ہاشم کا کیا بنا؟“ لالی نے استفسار کیا۔ ”وہ ابھی تک بندے ماراں کے بھنے پر کام کر رہا ہے یا کہیں اور چلا گیا؟“

”وہ جی، اپنے رب کے پاس چلا گیا۔“ واجد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”پچھلے دنوں اس کا مرن ہو گیا۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ لالی نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”پر تم آٹھوں بندے تو شریف خان کے چکر سے چھوٹ ہی گئے۔“

”کہاں چھوٹے جی۔ ہفتہ بھر نہ گزرا تھا کہ شریف خاں اپنے جمدار رحمان اور دو کرندوں کے ساتھ پہلے ملتان پہنچا۔ وہاں سے اس نے ہمارے بارے میں پتہ کیا اور لودھراں پہنچ گیا۔ تھانیدار سے ملا۔ ہمارے خلاف پرچہ چاک کرایا۔“ واجد نے بتایا۔ ”رات کے اندھیرے میں پولیس نے گھروں پر اس طرح چھاپے مارے جیسے ہم نے کوئی دوا جرم کیا ہے۔ سب کو گرفتار کر کے تھانے لے جایا گیا۔ رات بھر چمڑوں اور سوٹوں سے پٹائی کی گئی اور حوالات میں بند کر دیا گیا۔“

”پر پولیس نے ایسا کیوں کیا؟ تو نے تھانیدار سے نہیں پوچھا؟“

”پوچھا تھا۔“ واجد نے جواب دیا۔ ”تھانیدار نے بتایا کہ ہم نے شریف خان کے اڑھائی ہزار پیشگی کے ادا کرنے ہیں۔ ہم نے انکار کیا۔ کہیں کھائیں۔ پر اس نے ہماری ایک نہ سنی۔ گالاں نکالیں۔ لاٹوں اور مکوں سے پٹائی بھی کی۔“

”شریف خان نے ٹھکڑی رشوت دی ہوگی یا سفارش پہنچائی ہوگی۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”ایسا ہی ہو گا۔ میں نوں کچھ پتہ نہیں۔“ واجد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”مجھے تو یہ پتہ ہے کہ تھانیدار کے حکم پر ہم سب کو دھکے دے دے کر ایک لاری میں بھرا گیا۔ ایک حوالدار اور تین پولیسے نگرانی پر لگائے گئے۔ پہلے ہم سب ملتان گئے۔ وہاں سے ہاشم کے بھائی اور پیو کو پکڑ کر بٹھایا۔ اس کا پیو بوڑھا اور بیمار تھا۔ اس نے گڑگڑا کر منت کی تو اسے چھوڑ دیا گیا۔ وہاں سے ادا کاڑے لے جایا گیا۔ رات بھر سب کو ایک کوٹھڑی میں بند کر کے رکھا گیا۔ کھانے کو روٹی بھی نہ دی گئی۔ اس کے کرندے بندو کہیں اور پستول دکھا کر ڈراتے دھمکاتے رہے۔“

”یہ تو بہت ظلم ہوا جی۔“ لالی نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ ”جعلی پیشگی بنائی اور اوپر سے اتنا تنگ بھی کیا۔“

بھٹے کی حدود سے نکل کر پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔

مگروہ ٹھہرا نہیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ عٹ اب پیچھے رہ گیا تھا اور گھرے اندر گھرے میں نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دونوں جانب ویرانہ تھا۔ لالی تیز تیز قدم اٹھاتا آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ اسے توقع نہ تھی کہ اس قدر آسانی سے وہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ وہ مڑ مڑ کر عقب میں دیکھتا۔ مگروہ دور تک نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ نہ آدم تھا نہ آدم زاد۔

اس نے میل سو میل فاصلہ طے کیا تھا کہ دور سے روشنی جھللاتی نظر آئی۔ ساتھ ہی پختہ سڑک پر گھوڑے کے دوڑنے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ ٹاپوں رفتہ رفتہ قریب آتی گئیں۔ لالی نظریں اٹھائے روشنی کی سمت دیکھتا گیا۔ اس نے قدموں کی رفتار میں احوال پیدا کیا۔ اور آگے بڑھتا رہا۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد اس نے دیکھا ایک ٹانگا سامنے سے آرہا ہے۔ ٹانگا دیکھ کر وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھٹکا۔ مگر نہ اس نے راستہ بدلا اور نہ اپنی جگہ رکا۔ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ٹانگا قریب آ گیا۔ اس کے رفتار اچانک ست پڑ گئی۔ نزدیک پہنچ کر ٹانگا چند قدم کے فاصلے پر رک گیا۔ لالی نے مڑ کر چوکتا نظروں سے دیکھا، ایک شخص ٹانگے کی پچھلی نشست سے نیچے اترا۔ لالی نے گردن موڑی اور اپنی رفتار تیز کر دی۔ فوراً عقب سے آواز ابھری۔

”اوائے خانہ خراب، تو ادھر کیسے آگیا؟“

لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ بھٹے کا جعدار، زماں خان، ٹانگے کی لائین کی ہلکی ہلکی روشنی میں اس کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ سینما کا آخری شو دیکھ کر ایک کارندے کے ہم راہ بھٹے کی جانب واپس جا رہا تھا۔ کارندہ بھی ٹانگے سے اتار کر سڑک پر آگیا تھا اور زماں خان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ لالی نے دونوں کو دیکھا تو سرا سید ہو گیا۔ مڑا، سڑک سے نشیب میں اترا اور سر ہٹ بھاگنے لگا۔

زماں خان کے ساتھ ساتھ کارندے نے بھی لالی کا تعاقب کیا۔ زماں خان نے اسے روکنے کی غرض سے زور سے ڈانٹا۔ ”ٹھہر جا، ورنہ بہت برا ہو گا۔“ مگر لالی کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ اس نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ زماں خان غصے سے چیخا چلاتا، ڈانٹا ڈنچا، برابر اس کا تعاقب کرتا رہا۔ وہ بھی نہایت چست اور بھرتیلا تھا۔ دوڑتا بھی تیز تھا۔

لیکن لالی اس کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ عادی اور ننھا ہوا چور رہ چکا تھا۔ بھاگنے کے معاملے میں چھلوا تھا۔ آن کی آن میں دور نکل گیا۔ وہ ایک پرانے بھٹے سے گزر رہا تھا جو ختم ہو کر اب دیران پڑا تھا۔ جگہ جگہ گھرے گڑھے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے بکھرے ہوئے ڈھیر پھلاکتا، جھاڑیوں سے

”سنتا جا کیسا کیسا ظلم ہوا۔“ واجد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”اوکاڑے سے شریف خان ہم سب کو لوہور لے گیا۔ اس کے سات بھٹے ہیں۔ کرندوں نے پہلے تو ہم سب کی دبا کے پٹائی کی۔ فیر منہ میں جوتا دے کر کر میں رسیاں ڈالی گئیں اور تمام بھٹوں پر سارے ہتھیروں کے سامنے گھمیلیا تاکہ وہ بھی ڈر جائیں اور آگے شریف خان کے خلاف شور شرابہ اور گڑبڑ کرنے کی ہمت نہ کریں۔“

”تم سب کو اس لیے یہ سزا دی گئی تھی کہ شریف خان کی مرضی کے خلاف اس کا عٹ چھوڑ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تھے؟“

”ہاں جی، یہ اسی کی سزا دی گئی تھی۔“ واجد نے تائید کی۔ ”شریف نے مہینہ بھر تک اپنے ایک بھٹے پر ہم سب کو رکھا۔ بعد میں اس بھٹے کے جعدار، رحمان، کے ذریعے فروخت کر دیا۔ تب سے جی میں ادھر ہی ہوں۔“

”دوسرے بندے بھی تیرے ساتھ ہی ہوں گے۔“

”ناچی، ایسا نہیں ہے۔“ اس نے انکار میں آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”دوسروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ کہاں کہاں ہیں اور کس کس بھٹے پر کام کر رہے ہیں؟ میری ایک دمی اور ایک پڑکا بھی پتہ نہیں کدھر ہیں، کیسے ہیں؟“ اس نے مری سانس بھری۔ ”یہ پیٹھ کی چکر ہی ایسا ہے۔ اس سے کبھی چھٹکارہ نہیں ملنے کا۔ ہر بھٹے داڑی سے لٹتی ہے پر کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

لالی اس کی باتیں سن کر اور پریشان ہو گیا۔ سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ واجد اٹھ کر اپنی جھونپڑی میں گیا۔ ایک روٹی اور مرچیں لایا۔ لالی کے آگے رکھ کر بولا۔ ”لے اے کھالے، تو نے شام سے کچھ نہیں کھایا۔“ لالی نے انکار کیا۔ مگروہ واجد نے اصرار کر کے کھانا کھلا دیا۔

واجد زیادہ دیر نہ رکا۔ اٹھ کر چلا گیا۔



لالی بستر پر لیٹ گیا۔ مگر سویا نہیں جا سکتا رہا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لالی نے اس رات فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ رات گزرتی رہی۔ آدمی سے زیادہ ہو گئی۔ ہر طرف گہری خاموشی چھائی تھی۔ صرف پہریداروں کے کھکانے اور لاٹھیاں بجانے کی آوازیں رک رک کر سنائے میں ابھر رہی تھیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چوکتا نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ جھونپڑیوں کے سامنے ہتھیارے اور مزدور گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ اٹھا اور دبے دبے قدموں چلتا ہوا ایک طرف بڑھا۔ کبھی قدموں کی رفتار تیز کر دیتا کبھی ست۔ کبھی ٹھہر جاتا۔ وہ راستہ بدلتا، رکتا، مڑتا، پہریداروں کی نظروں سے چھپتا چلتا

دامن بچانا، ادھر ادھر مڑنا تیزی سے دوڑتا رہا۔ وہ جلد سے جلد بھٹے کی حدود سے نکل جانا چاہتا تھا تاکہ پوری رفتار سے دوڑ سکے اور زماں خان کی پہنچ سے اتنی دور نکل جائے کہ وہ اس کی گرد کو بھی نہ پا سکے۔

خوف اور گھبراہٹ کے باوجود وہ پوری احتیاط سے کام لے رہا تھا۔ ناہموار زمین پر دوڑتے ہوئے کہیں ٹھوکر بھی کھاتا تو فوراً خود کو سنبھال لیتا۔ مگر ایک گڑھے سے بچتے ہوئے اندھیرے میں اینٹوں کے ایک ڈھیر سے اس بری طرح ٹکرایا کہ اس کے قدم ڈگمگائے۔ اچھل کر دوڑ گرا اور لڑھکتا ہوا گھرے گڑھے میں چلا گیا۔ سر میں ایسی کراری چوٹ آئی کہ آنکھوں کے سامنے ستارے گردش کرنے لگے۔ وہ خاک میں لٹھڑا ہوا زمین پر بے حال پڑا تھا اور منہ کھولے زور زور سے ہانپ رہا تھا۔

دور سے قدموں کی آہٹ ابھری اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔ لالی نے سنا، زماں خان اونچی آواز سے کارندے کو بلا رہا تھا۔

”کرے! اسی طرف آجا۔ میں نے اسے ادھر ہی بھاگتے دیکھا تھا۔“

لالی خاموش پڑا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ زماں خان اور کما دوسری طرف چلے جائیں تو وہ راستہ بدل کر نکل بھاگنے کی کوشش کرے۔ قدموں کی آہٹ اور قریب آگئی۔ لالی نے مڑ کر اس سمت دیکھا۔ دھندلی روشنی میں زماں خان گڑھے کے اوپر نظر آیا۔ لالی کے کپڑوں کی سفیدی اندھیرے میں صاف نظر آرہی تھی۔ زماں خان نے اسی دیکھا تو ٹھہر گیا۔

لالی نے خطرہ بھانپ لیا۔ اٹھ کر بھاگنا چاہا۔ مگر اس وقت تک زماں خان دوڑ کر عین اس کے سر کے اوپر پہنچ چکا تھا۔ اس نے جھلانگ لگائی اور اس طرح نیچے آیا کہ لالی زمین پر لوٹ لگا کر اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتا تو وہ اس کے اوپر ہی گرتا۔ لالی اٹھا اور تیزی سے آگے بڑھا، زماں خان اس کے پیچھے لپکا۔ لالی نے نشیب سے اوپر جانے کے لیے زغند بھرنے کی کوشش کی۔ لیکن زماں خان نے جھپٹ کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔

لالی لڑکھڑا کر گرا۔ زماں خان نے جھٹ اسے دبوچ لیا۔ لالی نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ دونوں سمٹھم گٹھا ہو گئے۔ دونوں میں زور آزمائی ہونے لگی۔ مگر لالی کمزور پڑ رہا تھا۔ سخت محنت اور پوری غذا نہ ملنے کے باعث اس کے جسم میں اب پہلا سا کس بل نہ رہا تھا۔ زماں خان مضبوط تو تھا۔ اس نے لالی کو اپنی گرفت سے نکلنے نہ دیا۔

اسی اثناء میں کما بھی پہنچ گیا۔ وہ بھی لالی سے لپٹ گیا۔ اب زماں خان اور کما نے لالی کو پوری

طرح قابو میں کر لیا تھا۔ دونوں دھکے دیتے ہوئے اسے گڑھے سے اوپر لے گئے اور سڑک کی جانب بڑھنے لگے۔ لالی کی سانس دھونکنی کی طرح زور زور سے چل رہی تھی۔ اس نے دونوں کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش نہ کی۔ چپ چاپ ان کے نرغے میں چلتا رہا۔

زماں خان نے چلتے چلتے لالی کے منہ پر غصے سے تھپڑ مارا۔ دریافت کیا۔ ”تو پھیرا روں کی نظروں سے بچ کر فرار کیسے ہوا؟“

لالی نے بات بتانے کی کوشش کی۔ ”میں جی فرار شرار نہیں ہوا تھا۔ میرا چاچا ادھر ہی ہوتا ہے بہت بیمار ہے۔ اسے ملے جا رہا تھا۔ صبح واپس آجاتا۔ جمعدار میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ بالکل سچ بتا رہا ہوں۔“

زماں خان کو اس کی دھٹائی پر اور تاؤ آیا۔ اس نے تڑاق سے ایک تھپڑ اور رسید کیا۔ ”مجھے پتہ ہے تو بالکل سچ بول رہا ہے۔“ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”تب ہی تو مجھے دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوا۔“

”میں تجھے دیکھ کر ڈر گیا تھا۔“ لالی نے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی ایک اور کوشش کی۔ ”بات یہ ہے جی، میں کسی پھیردار کو بتا کر نہیں آیا تھا۔ بتاتا تو وہ بھٹے سے باہر جانے نہ دیتا۔“

”اب تو چپ کر کے چل۔ بیکار کی بکواس نہ کر۔“ زماں نے ایک بار پھر مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ لیکن مارا نہیں۔

لالی خاموش ہو گیا۔ زماں خان اور کما اس کے بازوؤں کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ اور سڑک سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ تینوں اونچی نیچی ناہموار زمین پر سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ ہر طرف بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں، خورد و پودوں اور بھاڑیوں سے بچنے کی غرض سے بار بار ادھر ادھر مڑتے تھے۔ آخر وہ اس پگھڑی پر پہنچ گئے جو بھٹے کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑک کی طرف جاتی تھی۔

ٹانگا ابھی تک سڑک پر کھڑا تھا۔ اس کی لائٹوں کی روشنی تاریکی میں دور سے نظر آرہی تھی۔ پگھڑی پر چلتے ہوئے وہ سڑک پر آگئے۔ زماں خان نے حقارت سے دھکا دے کر لالی کو ٹانگے پر سوار کرایا۔ اس نے مطلق احتجاج نہ کیا۔ سہا ہوا خاموشی سے کوچوان کے برابر بیٹھ گیا۔

کوچوان نے مسکرا کر زماں خان سے کہا۔ ”میں نے تو سوچا تھا جی، یہ اب ہاتھ نہیں آنے کا۔ پر تو اسے پکڑ ہی لایا۔“

”نکل کیسے جاتا۔“ زماں خان نے رعونت سے کوچوان کی جانب دیکھا۔ ”اسے پتہ نہیں۔ میرا

ناں زماں خان ہے۔ یہ کیا ہے، اس سے بہت زیادہ بد معاش، ہتھیرے میں نے دیکھے ہیں۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اول تو میں اسے نکل کر جانے ہی نہ دیتا۔ اور اگر اندھیرے میں نکل بھی جاتا تو میں اس کا پتہ چلا لیتا۔ پکڑ کر بٹھے پر لے آتا۔“ اس نے مڑ کر کہا کو دیکھا۔ ”کرے، تیں نوں یاد ہے۔ وہ جو تین ہتھیرے چپکے سے بھاگ نکلے تھے انھیں میلی اور حاصل پور سے پکڑ کر لایا تھا۔ وہ تو بہت چالاک تھے۔ یہ تو ان کے سامنے کچھ بھی نہیں۔“

زماں خان اپنی ترنگ میں بولتا رہا۔ کوچوان نے تانگا آگے بڑھایا۔ گھوڑے کے سموں میں لگی ہوئی لوہے کی نئی نعلیں پختہ سڑک پر ٹپ ٹپ بجتے لگیں۔ زماں خان اور کما مضبوطی سے لالی کے بازو اور ہاتھ پکڑے جو کس بیٹھے تھے۔



رات کے سنائے میں گھوڑے کے سموں سے ٹپ ٹپ کی آواز تسلسل سے ابھر رہی تھی۔ تانگا سنان سڑک پر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ ہوا کے سرسراتے ہوئے جھونکے جسموں سے ٹکرا رہے تھے۔ آسمان صاف شفاف تھا۔ ستاروں کے کنول جھللا رہے تھے۔

لالی کو بچنے کے بعد زماں خان اور کارندے کرنا نے اپنے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ مگر لالی نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ موقع کی ناک میں تھا۔ تانگے نے میل بھر سے زیادہ راستہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ اس نے زور زور سے کھانسا شروع کر دیا۔ اس کی بے چینی سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اچانک کھانسی کا شدید دورہ پڑا ہے۔ کھانستے کھانستے لالی نے ادھر ادھر پہلو بدلا۔ زماں خان اور کرنا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

لالی آگے جھکا، کسمایا اور دونوں کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ کھسک کر تانگے کے اگلے سرے پر پہنچا۔ بھپاک سے زغند بھری اور تانگے سے دور جا کر گرا۔ لالی نے ایسی پھرتی دکھائی اور اس مفاہی سے چلنے ہوئے تانگے سے کود کر باہر گیا کہ زماں خان اور کرنا ہکا بکا رہ گئے۔ کوچوان بھی چکرا گیا۔ اس نے حیرت زدہ نظروں سے مڑ کر دیکھا۔ لالی کی نشست خالی تھی۔

سڑک پر گرتے ہی لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے جسم پر جگہ جگہ چوٹیں آئی تھیں۔ دابے کھینچنے میں رک رک کر ٹیس اٹھ رہی تھی۔ مگر اس نے کسی چوٹ چھیٹ کی ذرا پرداہ نہ کی۔ کھڑا ہوا اور سڑک پر نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔

زماں خان نے ڈپٹ کر کوچوان سے کہا۔ ”تانگا روک۔“

کوچوان نے تانگا روکنے کی کوشش کی۔ لیکن تانگا رکنے بھی نہ پایا تھا کہ زماں خان نے چھلانگ لگائی۔ سڑک پر گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس نے گرتے گرتے کہا کوچھ کر مدد کے لیے پکارا۔ کہا بھی کوکو تانگے سے باہر آگیا۔ اس کے قدم لڑکھڑائے، مگر اس نے خود کو سنبھال لیا اور زماں خان کی جانب بڑھا، وہ اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے مڑ کر کہا کی طرف نہ دیکھا اور لالی کے تعاقب میں سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کہا بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔

لالی نے پختہ سڑک پر قدموں کی آہٹ سنی۔ پلٹ کر دیکھا، زماں خان اور کہا اس کے تعاقب میں تھے۔ وہ کچھ دور تو سڑک پر دوڑتا رہا، پھر سڑک سے کچے میں اتر گیا۔ زمین خنجر اور ناہموار تھی۔ یہ چٹیل میدان تھا۔ چھپنے اور اوچھلنے کے لیے دور دور تک کوئی درخت نہ تھا۔ کہیں کہیں خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں، لیکن اتنی گھنی اور بڑی نہ تھیں کہ وہ ان کی اوٹ میں دھک کر روپوش ہونے کی کوشش کرتا۔ وہ منہ اٹھائے براہروڑتا رہا۔

زماں خان اور کہا بھی سڑک سے اتر کر میدان میں پہنچ گئے۔ لالی دھندلے سائے کی مانند ان کے سامنے بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ انھوں نے تعاقب جاری رکھا۔ زماں خان آگے آگے تھا۔ اس کی رفتار بھی تیز تھی۔ اور جوش و خروش بھی زیادہ تھا۔ مگر لالی رفتہ رفتہ دور ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا دھندلا سایہ اور زیادہ دھندلا ہوتا جا رہا تھا۔ زماں خان نگاہیں اٹھائے لالی کی جانب دیکھتا رہا اور سر پٹ دوڑتا رہا۔ کہا بھی اس کے عقب میں تھا اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتار سے دوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لالی دوڑتے دوڑتے دور نکل گیا۔ مگر اس نے اپنی رفتار ست نہ کی۔ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور ان کی روشنی میں منزل سے بے خبر، لالی مسلسل دوڑ رہا تھا۔ یکایک خود رو پودوں کے درمیان سے ایک شخص نکل کر سامنے آگیا۔ کوئی راہ گیر تھا۔ کسی ضرورت سے جا رہا تھا۔ وہ اس طرح سامنے آیا کہ بچتے بچتے بھی لالی بچ نہ سکا۔ اس زور سے مکرایا کہ وہ بھی گرا اور لالی بھی سنبھل نہ سکا۔ اس کے پیر لڑکھڑائے اور وہ ایک جھاڑی پر گرا۔ یہ لیکر کی جھاڑی تھی۔ زیادہ گھنی نہ تھی۔ لیکن لالی کی دھوٹی اور قمیص کانٹوں سے کچھ اس ڈھب سے الجھی کہ نکلنے کے بجائے وہ اس میں پھنس کر رہ گیا۔

لالی خود کو جھاڑی کے کانٹوں سے چھڑانے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ زماں خان دوڑتا ہوا اس کے سر پر پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے اس کی گرفت سے خود کو آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اسی اثناء میں کہا بھی پہنچ گیا۔ وہ بھی لالی پر جھپٹا اور گردن

ایک ہاتھ ڈال کر اس طرح دبایا کہ وہ بے بس ہو گیا۔

زماں خان بری طرح ہانپ رہا تھا۔ کہا بھی ہانپ رہا تھا اور لالی بھی۔ راہ گیر جھاڑی سے ہٹ کر قدم کے فاصلے پر پڑا تھا۔ تینوں کو حیران و پریشان ہو کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سخت خوف زدہ اور سما ہوا۔ اس نے زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔ جس طرح زمین پر پڑا تھا اسی طرح دم بخود پڑا رہا۔

زماں خان ذرا سنبھلا تو زور سے دھاڑا۔ ”تجھے پتہ نہیں، میں پولیس میں رہ چکا ہوں۔ مجھ سے لڑ کوئی مجرم نکل نہیں سکا۔“ اس نے گردن پکڑ کر لالی کو اس زور سے دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

لالی کچھ دیر زمین پر پڑا رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کہانے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کر دیا۔ رمن پر زور دار تھپڑ بھی رسید کیا۔ لالی تڑپ اٹھا۔ غصے سے بے قابو ہو کر کہا پر جھپٹا۔ گردن جھکا اس کے منہ پر مکر ماری۔ کہا چوٹ سے سنبھلا بھی نہ تھا کہ لالی نے دوسری مکر ماری۔ اس بار سنبھل نہ سکا۔ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ زماں خان بڑھ کر قریب پہنچا تو لالی نے پلٹ کر مکا مارا۔ مکا بٹی پر ایسا بیٹھا کہ زماں خان کا سر گھوم گیا۔

لالی نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی۔ مگر کہا اٹھ کر اس کی ٹانگوں سے پلٹ گیا۔ زماں خان نا جھپٹا اور لالی کو دبوچ کر بے بس کر دیا۔ زماں خان اپنا جڑا ایک ہاتھ سے سلالتے ہوئے بولا۔

”خواب، تو نے تو میرا دانت ہی تو ڈبیا تھا۔“ اس نے لالی کے منہ پر جھنجھلا کر تھپڑ مارا۔

کہانے بھی مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ مگر زماں خان نے روک دیا۔ ”رہنے دے کرے، بھٹے چل کر اس کی ٹھیک طرح گرمی اتارنی ہے۔“ اس نے دھکا دے کر لالی کو آگے بڑھایا۔ تھیکے لہجے ل بولا۔ ”تیری پیشگی کے آٹھ سو روپے حریف ڈوگر کو بھٹے کے مالک نے نہیں دیے، میں نے اپنی بے سے دیے ہیں۔“ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”میں نے تو تجھے پکڑنا ہی پکڑنا تھا۔“

لالی خاموش رہا اور زماں خان اور کہا کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا چلتا رہا۔ تینوں سڑک کی جانب روانہ ہوئے۔ میدان عبور کیا اور سڑک پر پہنچ گئے۔ تانگا موجود تھا۔ تینوں تانگے کے قریب پہنچے۔ کوچوان، تانگے سے اتر کر نیچے آگیا۔ زماں خان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ تباریہ نکل ہی گیا۔ پر بعد ازاں تو نے اسے چھوڑا نہیں پکڑی لایا۔ تو بھی بہت اونچی چیز ہے۔“

”بعد ازاں کرنا محول نہیں۔“ زماں خان نے گردن اکڑا کر کہا۔

”بر بادشاہو، اسے میرے نزدیک نہ بٹھانا۔“ کوچوان نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ ”ایسا کوکو در والی طرح گیا کہ میں تو دیکھ بھی نہ سکا۔“

زمان خان نے کچھ نہ کہا۔ پہلے لالی کے سر سے گھڑی اتاری، پھر کمر کے سر سے۔ دونوں گھڑیوں سے لالی کے ہاتھ پر مضبوطی سے باندھے اور پستارے کی مانند اٹھا کر تانگے کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ خود بھی ساتھ ہی بیٹھ گیا اور لالی کی ٹانگیں اپنے پیروں کے نیچے دبائیں۔ کمر اگلی نشست پر کچھ اون کے برابر بیٹھ گیا اور لالی کی گردن اس طرح اپنے ایک ہاتھ کے حلقے میں دبائی کہ اگر بھاگنے کی کوشش کرے تو اس کی گرفت سے نکل نہ سکے۔

تانگے آگے بڑھا۔ سڑک پر دوڑنے لگا۔ جھٹے پر پہنچا۔ تانگہ دیکھ کر پیریدار بھی پہنچنے لگے۔ زمان خان کی ہدایت پر لالی کو تانگے سے نیچے اتار دیا گیا۔ وہ بت کی مانند خاموش تھا اور آنے والے طوفان کا انتظار کر رہا تھا۔ مگر کوئی طوفان نہ آیا۔ زمان خان نے نہ اسے مارا پیٹا اور نہ ہی گالی گلوچ کی۔ تانگے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔ لالی کے ہاتھوں اور پیروں کو کھلوایا۔

”جمعہ دار!“ لالی نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

”چپ کر کے کھڑا رہ۔“ زمان خان نے غصے سے ڈانٹا۔

لالی نے مزید کچھ نہ کہا۔ زمان خان نے لوہے کی زنجیر منگوائی جس سے محتوب، تھیموں اور مزدوروں کو باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ زنجیر آئی تو اس سے لالی کے دونوں ہاتھوں کو کس کر باندھا گیا۔ زنجیر کے دونوں سروں کے حلقوں میں تالا ڈال دیا گیا۔

جھٹے کے دفتر کے برابر ایک کوٹھری تھی۔ زمان خان نے اسے کھلوایا اور لالی کو اس میں بند کر دیا۔ کوٹھری کے دروازے پر نہ صرف لوہے کا مضبوط تالا پڑا تھا بلکہ ایک پیریدار بھی نگرانی پر مقرر تھا۔

دو روز تک لالی کو کوٹھری میں قید رکھا گیا۔



صبح ہوتے ہی لالی کو باہر لایا جاتا۔ ہاتھوں پر لپٹی ہوئی زنجیر کا تالا کھولا جاتا۔ زنجیر علیحدہ کی جاتی اور کام پر لگا دیا جاتا۔ دن بھر وہ جھٹے کے دوسرے تھیموں کے ساتھ کچی اینٹیں بتاتا۔ جب تک کام کرتا اس کی کڑی نگرانی کی جاتی۔ شام کو دونوں ہاتھ پھر جکڑ دئے جاتے۔ زنجیر کے حلقوں میں تالا ڈالا جاتا اور کوٹھری میں بند کر دیا جاتا۔

تیسرے روز کوٹھری کے بجائے لالی کو جھونپڑی میں رکھا گیا۔ یہ جھونپڑی دوسری جھونپڑیوں جگہوں سے الگ تھلگ ایک گوشے میں تھی۔ البتہ جھٹے کے دفتر سے قریب تھی۔ اس رات کے ساتھ ایک اور تھیمے کو بھی رکھا گیا۔ دونوں کا ایک ایک ہاتھ ملا کر زنجیر سے جکڑ دیا

ہر کے سروں کو جوڑ کر تالا ڈال دیا گیا۔ زنجیر اس قدر کس کر لپٹی گئی کہ کھانوں کی کھال میں اتار بہ سخت تکلیف ہوئی۔ مگر لالی نے اف نہ کی۔ دوسرا تھیمہ بھی چپ رہا۔ نہ اس نے کسی طور باج کیا نہ دہائی دی۔

دونوں کو جھونپڑی کے اندر ایک ہی چارپائی پر لٹایا گیا۔ ٹانگوں پر مضبوط رسی لپیٹ کر چارپائی کی ن سے اس طرح باندھ دی گئی کہ وہ نیچے نہ اتر سکیں۔ ان کی نگرانی کے لیے کوئی پیریدار تو مقرر کیا گیا، مگر رات بھر جھونپڑی کے ارد گرد پیریداروں کا گشت رہا۔ وہ رات کے ستارے میں زور سے کھنکھارتے۔ اپنی لاشیاں وقفے وقفے سے زمین پر مار کر بجاتے۔ ان کے قدموں کی آہٹ لسل ابھرتی رہی۔ کبھی کبھار ان کے بولنے اور باتیں کرنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔

مگر لالی خاموش تھا۔ دوسرا تھیمہ ابھی گرم صم تھا۔ دونوں چارپائی پر چپٹ لیے جھونپڑی کی چھت تک رہے تھے۔ اپنے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نہ انھوں نے ایک دوسرے سے بات چیت کی نہ پرسش احوال۔ دونوں دم بخود اور سہمے ہوئے تھے۔ رات آہستہ آہستہ گزرتی تھی۔ لالی نے گردن موڑ کر قریب لیٹے ہوئے تھیمے کی جانب دیکھا۔ وہ بھی ابھی تک جاگ رہا۔ لالی نے اس کا نام پوچھا۔

”ارشاد!“ اس نے لالی کی طرف دیکھے بغیر نہایت مختصر جواب دیا۔

لالی نے اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کی۔ ”تجھے کس چکر میں یہ سزا ملی؟“

ارشاد خاموش رہا۔

لالی نے اصرار کیا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“

”چپ کر کے پڑا رہ۔“ وہ بے رخی سے بولا۔ ”کوئی راکھا ادھر آگیا تو دونوں کی چھتر سے پٹائی لے لے گا۔“

”عد ہو گئی، بات کرنے پر کیوں پٹائی ہوگی؟“

لیکن اس بار بھی ارشاد خاموش رہا۔ وہ بہت خوف زدہ اور سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ نگاہیں اٹھائے رستور چھت کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ عمر بیس ایکس سال کے لگ بھگ تھی۔ جسم لاغر نہ سخت محنت اور غذاایت کی کمی اس کے چہرے پر ویرانی بن کر چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے ٹوٹی جھلکتی تھی۔ جسم کی ہڈیاں جگہ جگہ سے ابھری ہوئی تھیں کیلشیم کی کمی کے باعث بال بھورے ہونے لگے تھے۔

لالی نے بھی اس سے مزید گفتگو کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور پیریداروں کی

آوازیں سننا رہا۔ جھونپڑی میں جس تھا۔ اس کا بدن پسینے کی نمی سے چھچھا رہا تھا۔ اسی عالم میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ مگر ذرا ہی دیر بعد کھل گئی۔ ارشاد نے کوٹ لی۔ جسم کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی ہلا۔ لالی کے ہاتھ کو جھٹکا لگا۔ اسے بھی پہلو بدل کر کوٹ لینا پڑی۔ رات بھر کی ہوتا رہا۔ ارشاد کوٹ بدلتا تو لالی بیدار ہو جاتا۔ لالی کوٹ لیتا تو ارشاد کی نیند اچاٹ ہو جاتی۔ کبھی ہاتھوں کی زنجیر پریشان کرتی کبھی پیروں میں بندھی ہوئی رسی۔ دونوں ہر بار جھنجھلاتے۔ دل ہی دل میں کڑھتے۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہتے۔ تمام رات نہایت بے چینی میں گئی۔

ان کی راتیں اسی طرح سوتے جاگتے بے چینی میں کٹتی رہیں۔ دن میں ان کو کھلا رکھا جاتا۔ کچی اینٹیں بنوائی جاتیں اور رات ہوتے ہی ہاتھوں اور پیروں کو زنجیر اور رسی سے باندھ کر چابائی پر لٹا دیا جاتا۔ چٹھے کا دن آیا۔ وہ خوشی خوشی ہفتے بھر کی دھاڑی لینے نشی کے رو برو پہنچے۔ مگر دونوں ہی خالی ہاتھ لوٹے۔ ان کو کچھ بھی نہ ملا۔ صرف ہفتے بھر کے راشن کے طور پر پی کی کس ڈھائی سیر آٹا اور ایک چھٹانک نمک دیا گیا۔ ڈیڑھ چھٹانک سرخ مرچ بھی دی گئی۔

اس رات ارشاد بہت بے قرار اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار کوٹ بدلتا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے کوٹیں بدل بدل کر لالی کی نیند بھی اڑادی۔ شام سے رک رک کر بارش ہو رہی تھی۔ ہوا سنسناتی ہوئی چل رہی تھی۔ پھر بار بھی گشت پر نہ تھے۔ لیکن وہ جاگ رہے تھے۔ چوکس اور چوکنا بھی تھے۔ رک رک کر کھانسیں رہے تھے۔ کھنکار رہے تھے۔ ان کی آوازیں رات کی خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔

ارشاد نے ایک بار کوٹ بدلی تو لالی نے اس کے ساتھ پہلو بدلتے ہوئے احتجاج کیا۔ ”یار تو نے آج سوتا نہیں؟“

”نیند نہیں آ رہی۔“ ارشاد نے آہستہ سے کہا۔ ”سر میں درد ہے۔“

لالی نے کھلا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کی پیشانی پر رکھا۔ ”بخار تو بالکل نہیں ہے۔“ اس نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”شام کو جتنا تو کسی تبصرے سے اسپرہ کی مکئی مانگ لیتا۔ اسے کھانے سے درد جا رہتا۔“ وہ ایک ہاتھ سے ہولے ہولے اس کا سر دبانے لگا۔

ارشاد کو کچھ سکون ملا۔ وہ خاموش لیٹا رہا۔ باہر ہلکی ہلکی بوند باندی ہو رہی تھی۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ لالی نے سر دباتے دباتے دریافت کیا۔

”تو پہلے تو اس بھٹے پر نہیں ہوتا تھا۔ کہاں تھا تو؟“

”میں جی ملتان روڈ کے ایک بھٹے پر ہوتا تھا۔ وہ بھی ملک صاحب کا بھٹہ ہے۔“ ارشاد نے بتایا

”جتنے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ اس بھٹے کا مالک ملک شاعر محمد ہے۔“

”مجھے پتہ ہے یہ ملک کا بھٹہ ہے۔ پر یہ نہیں پتہ اس کے اور بھی بھٹے ہوتے ہیں اور کہاں کہاں

ہوتے ہیں۔“ لالی نے اسے مطلع کیا۔ ”پر تو دھر کیسے آگیا؟“

”کیا کرے گا جان کر۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔

”نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔“ لالی نے کہا۔ ”باتیں کرنے سے کچھ آرام ہی ملے گا۔ نیند بھی آجائے گی۔“

”تو نے سر دیا تو درد کچھ کم ہو گیا۔“ ارشاد نے کوٹ بدلی۔ لالی کو بھی کوٹ بدلنا پڑی۔ اب دونوں چت لیٹے تھے۔ مگر لالی اس کا سر نہیں دبا سکتا تھا۔ ارشاد نے گہری سانس بھری۔ ”ملتان روڈ کے بھٹے پر ہم آٹھ تبصرے ایسے تھے جن کو بھٹے کا جعدار، دلاور، حاصل پور سے خرید کر لایا تھا۔ پچھلے مینے نشی سے پیٹنگی پر ہمارا جھگڑا ہو گیا۔ اس نے ہفتے بھر کی لگ بھگ پوری ہی دھاڑی کاٹ لی۔ دوسرے تو سب چپ کر کے رہ گئے۔ پر دیدار چپ نہ رہا۔ وہ نشی کے گلے پڑ گیا۔ نشی ایک دم گرم ہو گیا۔ پہلے تو اس نے نگلی نگلی گالاں نکالیں، فیر دوات اٹھا کر ماری۔ دیدار کے متھے پر اس زور سے لگی کہ خون نکل آیا اور اس کے منہ پر پھیل گیا۔“

”نشی بہت غصے والا بندہ تھا۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔ ”اسے اتنا غصہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

”وہ جی بہت ہی غصہ کرتا ہے۔ بات بات پر گالاں نکالتا ہے۔ غصے سے پاگل ہو جاتا ہے۔“ ارشاد آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”پہلے بھی کئی بار وہ ایسا ہی کر چکا تھا۔ کبھی رجسٹر اٹھا کر منہ پر مار دیتا۔ کبھی کچھ اور۔ جو ہاتھ میں آجاتا وہی اٹھا کر مار دیتا۔“

”دیدار کے متھے سے خون بہتا دیکھ کر ساتھ کے تبصروں کو بھی غصہ آگیا ہو گا۔“

”ہاں جی، ایسا ہی ہوا۔“ ارشاد نے اس کی تائید کی۔ ”سب پہلے ہی نشی سے خار کھائے ہوئے تھے۔ اس روز وہ بھی اتنے گرم ہو گئے کہ نشی پر ایک دم ہلا بول دیا۔ نشی کو گرا کر لالتوں اور مکوں سے زبردست پٹائی کی۔“

”بھٹے کا جعدار موجود نہیں تھا؟“

”نہیں!“ ارشاد نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔ ”کرنڈے بھی صرف دو ہی تھے۔ وہ ٹنکی مدکو آئے تو ان کی بھی دبا کے پٹائی کی گئی۔“

”پر بعد میں تو جعدار اور بھٹے کے دوسرے کرنڈوں نے تم سب کو زبردست مار لگائی ہو گی۔“

”ہاں جی بہت پٹائی کی۔“ ارشاد نے لالی کو بتایا۔ ”ہم تو بھٹہ چھوڑ کر حاصل پور کی طرف نکل

جانا چاہتے تھے۔ پر ہمارے ٹکٹے سے پہلے ہی جعدار پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ کزنوں کے علاوہ اور بھی کئی بندے تھے۔ سب مسلح تھے۔ ایک کے پاس تو بھری ہوئی کاربین بھی تھی۔ وہ آگے آگے تھا۔ اسے دیکھ کر سب ڈر گئے۔ ”اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔“ پٹائی کرنے کے بعد ہم سب کے ہاتھوں کو زنجیروں سے جکڑا گیا اور ایک جگہ میں بند کر دیا گیا۔“

”میں بھی دو روز تک ایسے ہی بند رہ چکا ہوں۔“

”تو نے بھی منشی سے جھگڑا کیا تھا؟“ ارشاد نے پوچھا۔

”میں نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔“ لالی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”مجھے سے تو نکل بھی گیا تھا اور بہت دور چلا گیا تھا۔ پر میرا نصیب ہی خراب تھا۔“

”کیا ہو گیا تھا؟“ ارشاد نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”رستے میں اس بھٹے کا جعدار زماں خان مل گیا۔ وہ ایک کزنہ کے ساتھ فلم دیکھ کر لوٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور تانگے میں ڈال کر واپس لے آیا۔“ لالی کے لہجے سے افسردگی جھلکتی تھی۔ ”تو بتا، آگے کیا ہوا؟“

”آگے کیا ہونا تھا جی۔“ ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”تین روز تک تو روٹی بھی نہیں دی گئی۔ جگہ کے باہر ہر روکت دو کزنہ موجود رہتے تھے۔ صبح کو نئی پیشاب کے لیے لے جاتے۔ پر سب کھڑے ہو کر کڑی عمرانی کرتے تھے۔“

”تم سب کو کام پر بھی نہیں لگایا گیا؟“

”کام شام کیسا“ رات ہو یا دن، ہر دم جگہ میں بند رکھا جاتا تھا۔ ”ارشاد کا لہجہ تلخ ہو گیا۔“ ویسے بھوک کے مارے اٹھا بھی نہ جاتا تھا۔ نہ پوچھ کیا برا حال تھا۔“ اس نے لہجہ بھر کے لیے تامل کیا۔ ”جو تھے روز روٹی ملی۔ مجھے ادھر بھیج دیا گیا۔ دوسروں پر کیا بتی، کچھ پتہ نہیں۔ کہاں ہیں اور کیسے ہیں؟ میں تو یہاں اکیلا ہی آیا تھا۔“ اس نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”تو میری گل سن رہا ہے ناں؟“

مگر لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آنکھیں بند کئے بے خبر سو رہا تھا۔ ارشاد نے اسے جگانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔ بارش اب بند ہو چکی تھی۔ پیریداروں نے گشت شروع کر دیا تھا۔ ان کے قدموں کی آہٹ رات کے سانے میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔



مطلع بالکل صاف تھا۔ ہوا میں سرسراہٹ تھی۔ نیلے نیلے آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ لالی اور

ارشاد دن بھر کچی اینٹیں بناتے رہے۔ شام کو انھوں نے روٹیاں پکا کیں۔ کھانا کھایا۔ بھٹے کے کارندوں نے ان کے ہاتھ زنجیر سے جکڑ دئے۔ چارپائی پر لٹایا اور پیروں کو رسیوں سے باندھ دیا۔ رات کو ارشاد ہی نے بات چھیڑی۔ ”میں تجھے بتا رہا تھا، ملتان روڈ کے بھٹے پر مجھ پر کیا بتی۔ ادھر سے مجھے یہاں کیسے آنا پڑا۔“ وہ مسکرایا۔ ”مڑ کر دیکھا، تو سو رہا تھا۔“

”ہاں جی اونگھ آگئی تھی۔ پر میں نے تیری پوری گل سن لی تھی۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”ساری رات ٹھیک سے سونے کو بھی نہیں ملتا۔ تو پلٹتا ہے تو میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں پلٹتا ہوں تو تو جاگ اٹھتا ہے۔ پتہ نہیں کب تک یہ چکر چلے گا۔“

”یہ تو ملک ٹار کو پتہ ہو گا۔“ ارشاد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کی مرضی ہے جب چاہے سزا ختم کر دے، پر ابھی تو وہ چھوڑے گا نہیں۔“ تحسیر بے بتاتے ہیں بہت ظالم بندہ ہے۔“

”مجھے تو یہ پتہ ہے۔ بھٹوں کے سارے ہی مالک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ تحسیروں کو تو وہ ڈھور ڈنگر سمجھتے ہیں۔“ لالی نے تیکھے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ گردن کو خم دے کر ارشاد کی جانب دیکھا۔ ”تو مجھے پرانا تحسیرا نہیں لگتا۔ تو کیسے اس چکر میں پھنس گیا۔“

”بس جی پھنس ہی گیا۔“ ارشاد نے بتایا۔ ”جب کوئی کام دھندا نہ ملا تو تحسیرا لگ گیا۔ پیٹ بھرے کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ مجھے تحسیرا بننا پڑے گا۔ میرا پو تو مجھے پڑھا لکھا کر ڈا افسر بنانا چاہتا تھا۔ اب تو یہ بالکل خواب لگتا ہے۔“ اس کے لہجے میں درد کی کک تھی۔ ”دیکھتے دیکھتے سب کچھ بدل گیا۔ کیا سے کیا ہو گیا؟“

”تو مہاجر تو نہیں ہے؟“ لالی نے قیاس آرائی کی۔

”ہاں جی، میں مہاجر ہی ہوں۔“ ارشاد نے بتایا۔ ”میں گوداس پور میں ہوتا تھا۔ فسادات کی آگ بھڑکی تو بھاگ کر ادھر گیا۔“

”جب فسادات اور بلوے شروع ہوئے، تب تو کتنے برس کا تھا؟“

”میں جی دس گیارہاں برس کا رہا ہوں گا۔“ ارشاد نے لالی کو بتایا۔ ”پر مجھے سب کچھ اچھی طرح یاد ہے۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ عید منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میرے دو بھائی بھین وڈے تھے۔ ماں نے سب کے لیے نئے کپڑے لے سلوائے تھے۔ ٹھیک چاند رات کو آس پاس کے سکھوں اور ہندوؤں نے پنڈ پڑ دھاوا بول دیا۔ ان کو تو مسلمانوں نے بھگا دیا تھا، پر ان کے بھاگنے کے قہوڑی ہی دیر بعد ریاست پٹیالہ کی ملٹری کے فوجی، جیپوں اور لاریوں میں بھر کر حملہ کرنے پہنچے۔ ان کے پاس تو مشین گنیں بھی تھیں۔“

”انہوں نے تو بہت خوان خرابہ کیا ہو گا۔“ لالی نے تشویش کا اظہار کیا۔

”کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ ان کے آنے سے پہلے ہی پنڈ کے سارے مسلمان بندے فصلوں میں چھپ گئے تھے۔“ ارشاد نے بتایا۔ ”ان کی لاریوں اور جیپوں کی بٹیاں اس طرح چمک رہی تھیں کہ بہت دور تک روشنی پھیلی تھی۔ سکھ فوجی لاریوں اور جیپوں سے کود کود کر نیچے اتر رہے تھے۔ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ مڑ مڑ کر ہر طرف دیکھ رہے تھے۔ سارے مسلمان ڈرے ہوئے چپ کر کے بیٹھے تھے۔ پر وہ فصلوں کی طرف نہیں آئے۔ مجھے تو اب تک یاد ہے گیانی ہر نام سنگھ ایک فوجی افسر کے سامنے ہاتھ جوڑے منت کر رہا تھا۔“

”ہر نام سنگھ بھی سکھ ہی تھا نا۔ اس نے مخبری نہیں کی؟“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔

”ہاں جی، بالکل سکھ تھا۔ پر بہت نیک بندہ تھا۔ پنڈ ہی میں رہتا تھا۔ ماں بتاتی تھی اسی نے سب کو بچایا تھا۔ اور وہی سب کو پنڈ سے نکال کر تریموں کے چتن پر لے گیا تھا۔“ ارشاد سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ ”سب مسلمان بندے پنڈ سے اس طرح گھبرائے ہوئے نکلے کہ گھروں کو بھی نہ جا سکے۔ سب کچھ چھوڑ دیا۔ کچھ بھی نہ لیا۔ سکھ فوجیوں کے دوبارہ آنے کا ڈر لگا تھا۔ پر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ رستے میں کئی بار میں اپنے نئے کپڑوں کے لیے رویا۔ ماں سے واپس گھر چلنے کی ضد کرتا۔ وہ زراض ہوتی۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ہر دم تو سکھوں اور ہندوؤں کے حملے کا سر پر خطرہ تھا۔ نئے کپڑے پہننے اور عید منانے کا کسی کو ہوش ہی کب تھا۔ عید کا تو پتہ ہی نہ چلا۔“ اس کا لہجہ اور افسردہ ہو گیا۔ ”عیدیں تو بعد میں بھی آتی رہیں گی۔ میں نے کپڑے کبھی نہ پہن سکا۔“

”تو اکیلا تو پاکستان نہیں آیا۔ تیرے ماں پو، بھین بھائی بھی آئے ہوں گے۔“ لالی نے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے کرید کر پوچھا۔ ”وہ کدھر ہوتے ہیں؟“

”یہ نہ پوچھ، وہ کدھر ہوتے ہیں، اور کہاں ہوتے ہیں؟“ اس نے آہ سرد کھینچی اور یوں گویا ہوا۔ ”تریموں کے چتن تک تو سب ساتھ تھے۔ پر بیڑیاں اور کشتیاں چند ہی تھیں۔ بیچ میں راوی بہتا تھا اور اس پار پاکستان کی سرحد تھی۔ بس بیڑیوں میں سوار ہو کر راوی پار کرتا تھا۔ سارے ہی ملال اور مابھی مسلمان تھے۔ پر ایک ایک بندے کا کئی کئی سو کرایہ مانگتے تھے۔ تریموں کے چتن پر اور بھی نہ جانے کتنے مسلمان بندے پڑے تھے۔ ہر روز اور ہر دم ان کی ٹولیاں پہنچ رہی تھیں۔ سب ہی لٹ پٹ کر آرہے تھے۔ پر ملاحوں نے نہ کسی سے رعایت کی نہ ترس کھایا۔ وہ تو جی دبا کے کمائی کر رہے تھے۔ ادھر سارے ہی بندے ننگے بھوکے تھے۔ جیسے خالی تھیں۔ نہ کھانے کو روٹی تھی نہ سر

چھپانے کو چھت تھی۔ اوپر سے زبردست بارشیں ہو رہی تھیں۔ ہر دم حملے کا بھی ڈر رہتا تھا۔“

”پر حملہ ہوا بھی کہ نہیں؟“ لالی نے اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

”بالکل ہوا تھا، ایک بار نہیں، بار بار ہوا۔“ ارشاد نے مطلع کیا۔

دونوں چت لیے تھے۔ نہ پہلو بدل رہے تھے نہ کروٹ لے رہے تھے۔ ارشاد آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔ ”مجھے اب تک یاد ہے۔ اس روز بارش رکی ہوئی تھی۔ آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ سب نے اپنے بھیکے ہوئے کپڑے لٹے دھوپ میں سوکھنے کے لیے ریت پر اور جنگلی جھاڑیوں پر پھیلا رکھے تھے۔ ایک دم شورا اٹھا۔ بلوائی آگے، بلوائی آگے۔ دور سے گھوڑوں کے ہنسانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ سب ادھر ادھر بھاگے۔ نزدیک ہی کھیت بھی تھے اور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں مکئی اور کما کی فصلیں کھڑی تھیں۔ ماں میرا اور سردار کا ہاتھ پکڑ کر کھیتوں کی طرف دوڑی اور فصلوں میں گھس گئی۔ تھوڑی ہی دیر بعد سکھ حملہ آور گھوڑے دوڑاتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ اندھا دھند گولیاں چلا رہے تھے۔ خون میں ڈوبی ہوئی لال لال تلواریں اٹھائے کبھی ادھر حملہ کرتے کبھی ادھر۔ جو سامنے آیا اسے قتل کر دیا۔ نہ زبانی دیکھی، نہ بوڑھا نہ بچہ۔ ہر طرف رونے چلانے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ گھوڑوں کے دوڑنے سے ریت کے بادل اٹھ رہے تھے۔ میں ماں سے چٹنا ہوا ڈرا سما بیٹھا تھا۔“

”سارے مسلمانوں نے اکٹھے ہو کر سکھوں کا مقابلہ نہیں کیا؟“

”کئی جوانوں نے مقابلہ بھی کیا۔ پر کتنی دیر کرتے۔ ادھر لڑنے کے لیے تھا ہی کیا؟ صرف ڈانگیں اور کلہاڑیاں تھیں۔ وہ بھی تھوڑے ہی بندوں کے پاس تھیں۔ ادھر بلوائیوں کے پاس ہندو کیس تھیں۔ رانٹلیں تھیں۔ تلواریں تھیں۔ پوری تیاری کر کے حملہ کرنے آئے تھے۔“ ارشاد نے وضاحت کی۔

”تب تو بہت مسلمان بندے مارے گئے ہوں گے۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔

”ہاں جی، بہت مارے گئے۔“ ارشاد نے اعتراف کیا۔ ”جب میں ماں کے ساتھ فصلوں سے باہر آیا تو شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف خون میں ڈوبی ہوئی لاشیں ریت پر پڑی تھیں۔ ان میں میرا ڈا بھرا، کرم الہی بھی تھا۔ وہ بلوائیوں سے لڑتا ہوا مارا گیا تھا۔ زخمی بھی بہت تھے۔ کوئی تڑپ رہا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ نہ پوچھ کیسا ڈراؤنا سماں تھا۔ میں تو ایسا ڈرا ہوا تھا کہ رو بھی نہ سکا۔ ماں، کرم الہی کی لاش سے لپٹ کر روٹی رہی۔“

”تیرا پو کدھر تھا؟“ لالی نے پوچھا۔

زور آور اور گھرو ہوتا تھا۔“

”اب تو آگے کی بتا۔ سردار کا کیا بتا؟“

”سردار پیچھے رہ گیا تھا۔ کسی نہ کسی طرح لنگڑا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ پر اس سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ ماں اس کا ہاتھ تھامے ہوئے تھی۔ تب تک حملہ آور نزدیک آگئے تھے۔ ملاح نے گھبرا کر ماں کو زور زور سے ڈانٹا۔ وہ گڑ گڑانے لگی۔ پر ملاح نے اس کی ایک نہ سنی۔ بازو پکڑ کر کھینچا اور دھکا دے کر جلدی سے بیڑی میں ڈال دیا۔ خود بھی بیڑی میں سوار ہوا اور تیزی سے اسے آگے بڑھانے لگا۔“

”سردار بیڑی میں نہ بیٹھ سکا؟“ لالی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔

”وہ جی کنارے پر کھڑا زور زور سے ماں، ماں پکار رہا تھا۔ ماں ملاحوں کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ منتیں کر رہی تھی۔ ملاحوں سے رو رو کر کہہ رہی تھی، بیڑی واپس لے چلو۔ میں نے اپنے پتر کے بنا نہیں جانا۔“

ارشاد نے آہ بھرنے کے انداز میں لمبی سانس لی۔ ”ادھر بلوائیوں نے بیڑیوں پر بھی فائر کھول دیا تھا۔ گولیاں چیختی ہوئی ہمارے پاس سے گزر رہی تھیں۔ سب ڈر کر کشتی میں لیٹ گئے۔ پر ماں روتی رہی، گڑ گڑاتی رہی۔ ملاح بھی بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ نراض ہو کر ماں کو تنگی تنگی گالاں نکالنے لگے۔ دوسرے بندے بھی آنکھیں نکال کر چیخنے لگے۔ کہنے لگے تو عجیب زبانی ہے۔ تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ اپنے ساتھ ہم سب کی جان لینا چاہتی ہے۔“

”تب تو وہ بھی چپ کر کے بیٹھی رہی ہوگی۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”نہیں جی، ماں برابر روتی رہی، چیختی رہی۔ وہ تو دریا میں کود جاتی پر کئی بندوں نے اسے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس پار پہنچ کر بھی وہ سردار سردار کی پکار لگاتی رہی۔ ان دنوں زبردست بارشیں ہوتی تھیں۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا اور اتنا شور کرتا ہوا کہ ماں کی آواز سردار تک پہنچ بھی نہ سکتی تھی۔ دوسرا کنارہ نظر بھی نہ آتا تھا۔ شام بھی ہو رہی تھی۔“

”سردار بعد میں بھی نہ آیا؟“

”وہ کبھی نہیں آیا۔ وہ چھوٹا سا تو چھوٹا تھا۔ چھ سال کا بھی نہ رہا ہو گا۔ زخمی بھی تھا۔ کون اسے اپنے ساتھ لاتا۔ ہر ایک کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔ پتہ نہیں ہمارے آنے کے بعد اس کا کیا بنا۔ کرم الہی کی طرح کسی بلوائی کی گولی یا تلوار نے اسے بھی ختم کر دیا ہو گا۔ وہ تو بھاگ کر فصلوں میں چھپ بھی نہیں سکتا تھا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”دونوں بھائی مارے گئے۔ بھین بھی گئی۔ پتہ نہیں

”ایک زخمی بندے نے بتایا۔ وہ بیڑی میں سوار ہو کر راوی پار چلا گیا تھا۔ بار بار سب کو پکارتا تھا۔ گھبرایا ہوا ادھر ادھر دوڑتا تھا۔ جب کوئی نہ ملا کوئی نہ آیا تو وہ آخری بیڑی سے چلا گیا۔“ ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ ”اسی زخمی بندے نے یہ بھی بتایا تھا کہ سکھ بلوائی میری جوان بھین صابرہ کو بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ کرم الہی اس کو بچانے کے لیے دوڑا بھی تھا۔ پر گولی کھا کر ایسا گرا کہ دوبارہ اٹھ نہ سکا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”مجھے بہت پیار کرتا تھا۔“

”سکھ رات کو حملہ کرتے تھے یا صرف دن میں؟“

”وہ تو جی ان کی مرضی تھی۔ جب جی کرتا اکٹھے ہو کر گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آتے اور دھواوا بول دیتے۔ ان کے آتے ہی ہم کھیتوں میں بھاگ کر چھپ جاتے۔“ ارشاد نے لالی کو مطلع کیا۔ ”خریف کی فصل سمجھو تیار ہی تھی۔ روٹی شوٹی تو ملتی نہیں تھی۔ ملتی کے سٹوں میں دانے آگئے تھے۔ ان کو کھا کر پیٹ بھرتے تھے۔“

ارشاد اپنی بات کتے کتے اچانک چپ ہو گیا۔ لالی نے مزید اس کی جانب دیکھا۔ وہ آنکھیں کھولے چھت کو تنک رہا تھا۔ لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”ارشاد تو چپ کیوں ہو گیا؟“

”کیا کیا بتاؤں تجھے۔ اب یاد کرتا ہوں تو لگتا ہے وہ سب کچھ ڈراؤنا خواب تھا۔“ ارشاد نے بچے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب حملہ ہوتا تو ترتر گولیوں کی آوازیں ابھرتیں۔ ایک گولی میرے چھوٹے بھائی سردار الہی کی ٹانگ میں لگی، بہت خون نکلا۔ دوا دارو کو تو کچھ تھا نہیں۔ ماں نے پٹی شٹی باندھ دی تھی۔ گولی ٹانگ کے اندر رہی رہ گئی تھی۔ سردار چل بھی نہ سکتا تھا۔ ہر دم پڑا درد سے ہائے ہائے کرتا رہتا۔“

”اب وہ کہاں ہوتا ہے؟“

”وہ جی ہمارے ساتھ نہ آ سکا۔“ ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر بتایا۔ ”وہ ایسا ہوا جی کہ ماں نے ایک ملاح کی بہت منت کی۔ اس کے پاس جو زیور شیور تھا سب اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اسے کچھ ترس آگیا۔ وہ ہم سب کو اپنی بیڑی میں اس پار لے جانے پر تیار ہو گیا۔ ہم بیڑی میں بیٹھے جا ہی رہے تھے کہ حملہ آور گھوڑیاں دوڑاتے ہوئے آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ کوئی ادھر بھاگا کوئی ادھر۔ ماں نے مجھے اور سکینہ کو بیڑی میں بٹھا دیا تھا۔ وہ بھی میری وڈی بھین تھی۔ پر صابرہ سے چھوٹی تھی۔“

”صابرہ سب سے وڈی تھی؟“

”ناجی وہ کرم الہی سے چھوٹی تھی۔“ ارشاد نے لالی کو بتایا۔ ”سب سے وڈا تو کرم الہی تھا۔ بہت

زندہ ہے کہ مرگئی۔“

ارشاد نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف کر لیا۔ لالی کو بھی اس کے ساتھ ساتھ کروٹ بدلنا پڑی۔ ارشاد بالکل خاموش تھا۔ لالی نے آواز بھی دی۔ مگر وہ نہ بولا۔ لالی نے محسوس کیا وہ رو رہا تھا۔ اس کی دہلی دہلی سسکیوں کی سرسراہٹ خاموشی میں رک رک کر ابھر رہی تھی۔ لالی بھی افسردہ ہو گیا۔ ارشاد کو تسلی بھی نہ دے سکا۔ چپ لیٹا رہا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔



لالی اور ارشاد اپنے اپنے تھکوں پر پہنچے۔ گارا بنایا اور اسے سانچوں میں بھر بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگے۔ شام تک کام کرتے رہے۔ روٹی پکائی اور مرچ اور نمک سے کھا کر جھونپڑی کے سامنے بیٹھ گئے۔ ایک کارندے نے ان کے ہاتھوں کو زنجیر سے جکڑ کر تالا ڈال دیا۔ جھونپڑی کے اندر لے گیا۔ چارپائی پر لٹایا اور پیروں کو رسی سے باندھ دیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی رہی۔ بجھنے کی چل پھل اجڑ گئی۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے میں گشت کرنے والے پریداروں کے قدموں کی آہٹ وقفے وقفے سے ابھرنے لگی۔ لالی اور ارشاد جاگ رہے تھے۔ دونوں چپ لیٹے تھے۔ اس طرح لیٹنے میں ان کو آرام ملتا تھا۔

بچھلی رات گفتگو کرنے کے بعد لالی کو ارشاد سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ وہ اسے بہت مظلوم اور دل گرفتہ نظر آیا۔ اس کی ذات میں دلچسپی بھی پیدا ہوئی۔ اس نے کرید کر پوچھا۔ ”ارشاد جب تو پاکستان پہنچا تو تیرا بچہ کدھر تھا؟ وہ تو تم سب کا انتظار ہی کرتا ہو گا۔“

”پتہ نہیں جی۔ وہ ہم کو ملا ہی نہیں۔“ ارشاد نے جواب دیا۔ ”ہم سب کو لہور کے باؤلی رفیو جی کیمپ میں ٹھہرا گیا تھا۔“

”تیرا بچہ بھی دوسرے پناہ گیزروں کے ساتھ اسی کیمپ میں ٹھہرا ہو گا۔“ لالی نے قیاس آرائی کی۔

”کیمپ کا تو جی یہ حال تھا کہ ہر طرف بندے ہی بندے نظر آتے تھے۔ زنانیاں تھیں، منڈے اور کڑیاں تھیں۔ سب ہی اپنے اپنوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ کسی کو کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ سب بنی اپنوں کو ڈھونڈتے تھے۔ ایک ایک سے پوچھتے تھے۔ ماں تو مجھے کہیں جانے بھی نہ دیتی تھی۔ ڈرتی تھی ادھر ادھر بھٹک کر کھو نہ جاؤں۔ وہ مجھے اور سیکنہ کو چھوڑ کر بچوں کو ڈھونڈنے نکل جاتی۔ اس کے بارے میں پوچھتی پھرتی۔ پر اس کا کچھ پتہ نہ چلا۔“ ارشاد نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”ایک

روز ہم تینوں کو ٹرک میں بھر کر لہور سے لائل پور پہنچا دیا گیا۔ ماں نے بچہ کو وہاں بھی تلاش کیا۔ پر وہ نہ ملا۔“

”بعد میں تو نے اس کا کھوج لگانے کی کوشش نہیں کی؟“

”کیوں نہیں کی۔“ ارشاد نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”میں تو چھوٹا تھا۔ ماں اسے برابر ڈھونڈتی رہی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ وہ گھروں میں نوکری چاکری کرتی۔ ہر ایک سے بچہ کے بارے میں پوچھتی۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے۔ اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم لائل پور سے خوشاب گئے، سیالکوٹ گئے، گوجرانوالہ گئے۔ اسی کو ڈھونڈتے ہوئے ملتان پہنچے۔ وہاں پتہ چلا کہ وہ بمبادلہ نگر کے موضع نذر محمد جھلن میں ہوتا ہے۔ ماں مجھے ساتھ لے کر نذر محمد جھلن پہنچی۔“

”تیری بھین سیکنہ ساتھ نہیں گئی تھی۔“ لالی نے کرید کر پوچھا۔ ”اسے کسی کے پاس چھوڑ دیا تھا؟“

ارشاد خاموش رہا۔ مگر لالی خاموش نہ رہا۔ اس نے اصرار کیا۔ ”تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ سیکنہ بھی تو تیرے ساتھ ہی پاکستان آئی تھی نا؟“

”آئی تھی، بالکل آئی تھی۔ میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“ ارشاد نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جب ہم خوشاب میں ہوتے تھے تو سیکنہ بھی ساتھ ہی تھی۔ ماں کے ساتھ وہ بھی ایک زمیں دار کی حویلی میں کام کرتی تھی۔ اس نے ہم کو شاہ پور جہانیاں کے پیر انعام محمد کے پاس بھیج دیا۔ وہ بہت دوا زمیں دار تھا۔ اس کے پاس سینکڑوں مربع اراضی تھی۔ حویلی بھی بہت شاندار تھی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”ایک روز ماں کو پتہ چلا کہ سیکنہ کے پیٹ میں بچہ ہے۔ وہ سخت نراض ہوئی۔ سیکنہ کو مارا۔ گالوں کا لیس، بد دعائیں دیں۔ وہ چپ بیٹھی رہی۔ نہ کچھ بولی نہ روئی۔ رات کو روٹی بھی نہ کھائی۔ چپ کر کے سو گئی۔ صبح دیکھا تو وہ غائب تھی۔ بعد میں اس کی لاش نہر میں تیرتی ہوئی ملی۔“

”اسے کسی نے قتل کر کے لاش نہر میں ڈال دی تھی؟“

”اسے قتل شل نہیں کیا گیا تھا۔ اس نے نہر میں چھلانگ لگا کر خود کشی کر لی تھی۔“ ارشاد نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ ”زمیں دار کو پتہ چلا تو اس نے ماں کو اپنے کمرے میں بلایا۔ دو سو روپے دیے اور دھمکی دی کہ سیکنہ کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہنا تو تیرے پتر کی بھی جان جائے گی۔ ماں ایسی ڈری کہ مجھے ساتھ لے کر ایک رات چھپتی لکٹی شاہ پور جہانیاں سے نکل گئی۔“

”جب تو ماں کے ساتھ نذر محمد جھلن پہنچا تو تیرا بچہ وہاں موجود تھا یا تیری ماں کو غلط اطلاع ملی

تھی؟

”اطلاع تو بالکل ٹھیک تھی، پر وہ وہاں موجود نہ تھا۔“ ارشاد نے بتایا۔ ”نذر محمد جملن میں اسے چار مربع متروکہ اراضی الاٹ ہو گئی تھی۔ وہ ادھر شان سے زمیں داری کرتا رہا۔“

”پر وہ اپنی زمین داری چھوڑ کر چلا کیوں گیا؟“

”وہ مخدوموں کا علاقہ ہے۔“ ارشاد نے لالی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ ”مخدوم رحمان شاہ ادھر کا بہت وڈا زمین دار ہوتا ہے۔ اس نے کسی بھی مہاجر کو ادھر ٹھہرنے نہ دیا۔ طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ مزارعوں کو سرکشی پر اکساتا تھا۔ اس کے کندے مسلح ہو کر آتے، ڈراتے دھمکاتے۔ جب میرا پوڈرانے دھمکانے پر بھی اپنی زمین داری چھوڑنے پر تیار نہ ہوا تو اس نے اپنے کندوں کو بھیجا۔ وہ اسے گرفتار کر کے مخدوم کے پاس لے گئے۔ وہ مجسٹریٹ بھی ہوتا تھا۔ اس نے میرے پو کے خلاف موٹی چوری کا جھوٹا مقدمہ بنوایا۔ اس کی اپنی جیل بھی تھی۔ اس نے میرے پو کو اپنی جیل میں بند کر دیا۔ اس کی خریف کی فصل تیار کھڑی تھی۔ اسے بھی اٹھوایا۔ گھر توڑ پھوڑ کر گرا دیا۔ بہت ظلم کیا جی؟“

”تیرا پو کب تک مخدوم کی جیل میں رہا؟“

”یہ تو جی مجھے پتہ نہیں۔“ ارشاد نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”سنا ہے جب وہ جیل سے نکلا تو سخت بیمار تھا۔ اسے بخار رہتا تھا۔ ہر دم کھانتا رہتا تھا۔ جیل سے نکلنے کے بعد وہ ایک روز بھی نذر محمد جملن میں نہ ٹھہرا۔ مخدوم چاہتا بھی یہی تھا۔ اس کے پاس منظور شدہ کلیم ہوتا تھا۔ وہ متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے کسی اور طرف نکل گیا۔“

”اس کے پاس کلیم بھی ہوتا تھا؟ پہلے بھی زمیں دار ہی رہا ہو گا؟“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

”ہاں جی، وہ زمیں دار ہی ہوتا تھا۔“ ارشاد نے نہایت اعتماد سے بتایا۔ ”ویسے تو وہ ریاست پیالہ کی پولیس میں حوالدار ہوتا تھا، پر ماں بتاتی تھی ضلع گورداس پور کے موضع نصیر پور میں اس کے پاس سات مرعے ہوتے تھے۔ کچی ماڑی تھی۔ وہ اچھا وڈا زمیں دار تھا۔“

لالی نے چونک کر گردن موڑی۔ ارشاد کو غور سے دیکھا۔ ”تو پہلے گورداس پور کے موضع نصیر پور میں ہوتا تھا؟“ وہ پہلے سے بھی زیادہ حیرت زدہ نظر آتا تھا۔

ارشاد نے بھی اس کے لہجے میں حیرت محسوس کی۔ ”ہاں جی، نصیر پور ہی میں ہوتا تھا۔ پر اس میں اتنے اچنبھے کی کون سی گل ہے؟“

لالی نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ”تیرے پو کا نام کیا تھا۔ وہ چوہدری تو نہیں تھا؟“

”ہاں جی چوہدری ہی تھا۔“ ارشاد نے کہا۔ ”اس کا نام چوہدری نور الہی اور میرا ارشاد الہی ہے۔ پر تو ایسی گل بات کیوں پوچھ رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں بھی استعجاب تھا۔ ”تو اسے جانتا ہے؟“

”ہاں میں اسے جانتا ہوں۔“ لالی نے مسکرا کر خوش خبری سنائی۔

ارشاد الہی نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ ”تو نے اسے کہاں دیکھا کب دیکھا؟“

”میں ان دنوں فیروز پور روڈ کے ایک بٹھے پر نیا نیا تعمیرانگا تھا۔“ لالی نے بتایا۔ ”تیرا پو جیب میں بیٹھ کر ادھر آیا تھا۔“

”یہ کب کی گل ہے؟“ ارشاد الہی کی آوازیں ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ تھی۔

”پچھلے ہی برس کی گل ہے۔ یہی گرمی کے دن ہوتے تھے۔“

”تب تو اسے نہیں جانتا۔“ ارشاد الہی کا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ تجھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرے پو کو تو مرے ہوئے بھی تین برس سے اوپر ہو گئے۔“

”تجھے کسی نے غلط بتایا۔ وہ مرا نہیں، زندہ ہے۔“ لالی نے اسے باور کرانے کی کوشش کی۔ ”میں نے اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے۔“ اس نے شاداں کا حوالہ دیے بغیر مطلع کیا۔ ”مجھے یہ بھی پتہ ہے وہ گورداس پور کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہے۔ اس کا نام چوہدری نور الہی ہے۔ تب ہی تو میں نے اس کا نام اور موضع پوچھا تھا۔“

”پر میں نے تو اس کی کبر بھی دیکھی ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ مکان بھی دیکھا ہے جس میں وہ مرا تھا۔“ ارشاد الہی نے لالی کا بیان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ”پتہ نہیں تو کس کی گل کر رہا ہے۔“

”تو نے کب اس کی کبر دیکھی تھی؟“ لالی نے عجبتے ہوئے استفسار کیا۔

”دو برس پہلے دیکھی تھی۔“ ارشاد الہی نے مطلع کیا۔ ”تو پچھلے برس کی گل کر رہا ہے۔“ اس کا لہجہ تیکھا ہو گیا۔ ”وہ کبر سے نکل کر تو تیرے پاس آنے سے رہا۔ تجھے دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور ہی بندہ ہو گا۔“

”تیری بات سمجھ نہیں آئی۔“ لالی الجھن میں پڑ گیا۔ اسے یقین تھا کہ شاداں نے اسے نور الہی

کے بارے میں وہی بتایا تھا جو اس کی زبانی سنا تھا۔ وہ اس سے ایک بار نہیں کئی بار مل چکی تھی۔ ایک عرصے سے اسے جانتی تھی لالی نے کرید کر پوچھا۔ ”ارشاد یہ بتا تو نے اپنے پیو کی کبر کہاں دیکھی تھی۔ تو وہاں تک پہنچا کیسے؟“

”میں نے چک ۵۸ میں اس کی کبر دیکھی تھی۔“ ارشاد الہی نے بتایا۔ ”میں ان دنوں بھی حاصل پور ہی میں ہوتا تھا۔ وہیں مجھے پٹیلہ کے ایک مہاجر سے پتہ چلا تھا۔ میرا پیو بھی متروکہ اراضی کی الاٹمنٹ کے لیے ادھر گیا تھا، پر اسے وہاں الاٹمنٹ نہیں ملی۔ بعد میں وہ چک ۵۸ چلا گیا اور ادھر الاٹمنٹ کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ ان دنوں وہ بیمار تھا اور وہیں رہتا تھا۔ مجھے جیسے ہی اس کے بارے میں پتہ چلا، میں فوراً چک ۵۸ پہنچا۔“

”ماں بھی تیرے ساتھ گئی تھی؟“

”لو جی، وہ کیوں نہ جاتی۔ وہی تو مجھے لے کر ادھر گئی تھی۔“ ارشاد الہی نے جواب دیا۔ ”چک ۵۸ زیادہ وڈا پنڈ نہیں ہے۔ پہلے دو زمیں دار ہوتے تھے۔ ایک مسلمان اور دوسرا ہندو کراڑ تھا۔ مسلمان زمین دار تو ابھی تک ادھر ہوتا ہے پر ہندو زمین دار پاکستان بننے کے بعد بال بچوں کے ساتھ بھاگ کر سرحد پار چلا گیا۔ بعد میں اس کی زمینوں پر مزارعوں نے کھنہ کر لیا۔ اکبر بھی اس کا مزارع تھا۔ پر بہت نیک بندہ ہے۔ اکبر چاہتا تھا وہ زمین جو اس نے دیا رکھی تھی، میرے پیو کے نام الاٹ ہو جائے اور وہ اس کا مزارع بن کر کاشت کرے۔“

”اکبر کے پاس جو زمین تھی، وہ تیرے پیو کے نام الاٹ ہو گئی تھی؟“

”الاٹ تو ہو جاتی پر میرا پیو بہت بیمار تھا۔ اکبر بتاتا تھا وہ کیسے جا بھی سکتا تھا۔ ہر دھت منجی پر پڑا کھانا کرتا۔ بکھار بھی رہتا تھا۔ کھانا تو منہ سے خون بھی آتا تھا۔“ ارشاد الہی نے گہری سانس بھری۔ ”اسے جی ٹی بی تھی۔ اسے یہ بیماری مندوموں کی جیل میں ہی ہو گئی تھی۔ ٹھیک سے دوا دارو بھی نہیں ہوا۔ ایک حکیم سے دوا لی لاتا تھا۔ پر بیماری کم نہ ہوئی اور بڑھ گئی۔“

”جب وہ اتنا سخت بیمار تھا تو اس کا کام کیسے چلتا تھا۔“

”اکبر اور اس کی گھروالی، جیناں میرے پیو کا سارا کام کرتے تھے۔ جیناں اس کے لیے روٹی تیار کرتی تھی۔ صبح شام خود پہنچاتی تھی۔ اس کے کپڑے دھوتی تھی۔ گھر کی صفائی کرتی تھی۔ خوشی خوشی ہر کام کرتی تھی۔ اکبر بھی اس کی مدد کرتا تھا۔ حکیم دوسرے پنڈ میں ہوتا تھا۔ وہ ان سے اس کے لیے دوا لی لاتا تھا۔“ ارشاد الہی آہستہ آہستہ بولتا رہا۔ ”دونوں بہت نیک بندے ہیں۔ مزارع نہ ہونے پر بھی وہ خود کو میرے پیو کا مزارع سمجھتے تھے۔“

”تو ان سے ملا تھا؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”میں چک ۵۸ گیا۔ تو ان کے ہی گھر میں ٹھہرا تھا۔“ ارشاد الہی نے لالی کو بتایا۔ ”میں نے وہ مکان بھی دیکھا جس میں میرا پیو رہتا تھا۔ جیناں مجھے اور ماں کو لے کر وہاں گئی تھی۔ رورو کر میرے پیو کے بارے میں بتاتی تھی۔ کتنی تھی، وہ ہر دم ہم سب کو یاد کرتا رہتا تھا۔ جگہ جگہ ڈھونڈتا تھا۔“

”تیرے پیو کے پاس تو روپیہ پیسہ بھی ہو گا۔ اس کا تو منظور شدہ کلیم بھی تھا۔ اکبر اور جیناں نے وہ سب کچھ تجھے اور تیری ماں کو نہیں دیا؟“

”میرے پیو کے بکسے سے کل ۲۲ روپے نکلے تھے جس سے اس کا کفن دفن کر دیا گیا۔“ ارشاد الہی نے جواب دیا۔ ”کلیم کے کاغذات بکسے سے نہیں نکلے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”جیناں نے مجھے وہ بکسہ دکھایا تھا جس میں میرے پیو کے کپڑے لٹے تھے۔ کنگھی اور آئینہ تھا۔ اس کی گجری اور جوتے تک جیناں نے بکسے میں بند کر کے رکھ چھوڑے تھے۔“

”پر اس کے کلیم کے کاغذات کہاں گئے؟ اکبر اور جیناں کے تو وہ کسی کام کے نہ تھے۔“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”تو نے یا تیری ماں نے ان کے بارے میں اکبر اور جیناں سے ملم نہیں کیا؟“

”ملم کیا تھا۔ ماں نے تو بار بار پوچھا تھا۔“ ارشاد الہی نے کہا۔ ”اکبر کہتا تھا اس نے کلیم کے کاغذات میرے پیو کے پاس دیکھے بھی تھے۔ وہ ان کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر رکھتا تھا۔ زمین کی الاٹمنٹ کے لیے سرکاری افسروں کے پاس جاتا تو کاغذات اس کے ہاتھ میں دبے ہوتے تھے۔ واپسی پر بکسے میں رکھ دیتا تھا اور اس میں تالا ڈال دیتا تھا۔ اس کے پاس سیکل بھی ہوتی تھی۔ اسی پر سوار ہو کر وہ سرکاری افسروں کے پاس جاتا تھا۔ وہ سیکل بھی میں نے دیکھی۔“ ارشاد الہی نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”اکبر نے سیکل، بکسہ اور بستر سب کچھ مجھے دے دیا تھا۔ سیکل تو میں نے بعد میں بیچ دی تھی۔ کرتا بھی کیا، ان دنوں تو اپنے پاس پیٹ بھرنے کو بھی کچھ نہ تھا۔“

لالی کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ کلیم کے کاغذات ہوتے تو اکبر وہ بھی تجھے دے دیتا۔“

”ضرور دے دیتا۔ میں نے بتایا تاکہ اکبر بہت نیک بندہ ہے۔ میں نے اور ماں نے پوچھا تو ہر بار مکی کہتا تھا، پتہ نہیں کہاں چلے گئے۔ نہ بکسے میں طے نہ بستر تلے طے۔ بہت ڈھونڈا پر کیس نہ ملے۔“ ارشاد الہی لمحہ بھر خاموش رہ کر گویا ہوا۔ ”پر اس نے ایک عجب گل بھی بتائی۔“

”وہ کیا تھی؟“ لالی نے بے چینی کا اظہار کیا۔

”اکبر کہتا تھا، میرے پو کے مرنے سے دو تین روز پہلے اس کے پاس ایک انجان بندہ آکر ٹھہرا تھا۔ نہ وہ کبھی گھر سے باہر نکلا نہ اسے کسی نے دیکھا۔“

”اکبر کو اس کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟“

ارشاد الہی نے لالی کو بتایا۔ ”اکبر نے ایک شام کھڑکی سے اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پو کے نزدیک موڑھے پر بیٹھا آہستہ آہستہ باتیں کر رہا تھا۔ اکبر نے اس کے بارے میں اپنی گھردالی جینار کو بھی بتایا تھا۔ پر جیناں نے جب میرے پو سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ بولا، جیناں بچے دھوکا ہوا۔ میرے پاس تو کوئی بندہ نہیں آیا۔“

”اکبر کو دھوکا ہی ہوا ہو گا۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔

”پر اکبر بتاتا تھا کہ جیناں سے بات کرنے کے بعد بھی اسے اطمینان نہ ہوا۔ دوسرے روز شام کا اندھیرا ہوتے ہی وہاں پہنچا۔ چھپ کر کھڑکی سے جھانکا تو وہ میرے پو کے پاس موجود تھا آرام سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر میرے پو کو پانی بھی پلایا تھا۔ اکبر نے اسے ٹھیک طر دیکھا تھا۔“ ارشاد الہی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”پر سویرے وہ اس بھید کو جاننے کے لیے میرے پو کے پاس پہنچا تو وہ بستر پر مرا ہوا پڑا تھا۔“

”یہ تو بہت الجھنے کی گل ہوئی۔“ لالی نے حیرت سے کہا۔ ”تو نے اس بارے میں کھوج لگا کی کوشش نہیں کی؟“

”جیناں کہتی تھی، وہ موت کا فرشتہ تھا۔ ہمیں بدل کر میرے پو کی روح کھینچنے آیا تھا۔“ ارشاد الہی نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بات اسے مسجد کے ملاں نے بتائی تھی۔“

”پتہ نہیں کیا چکر تھا۔“ لالی نے اپنی رد عمل کا اظہار کیا۔

ارشاد الہی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش لیٹا رہا۔ لالی بھی تھوڑی دیر چپ پڑا سوچتا رہا، پھر اس آہستہ سے کھنکار کر کہا۔ ”اپنی سمجھ میں تو یہ آتا ہے، مرنے والا تیرا پو نہیں تھا۔ کوئی اور ہی تھا۔“ اس نے مسکرا کر ارشاد کی طرف دیکھا۔ ”شادے! تیرا پو مرا نہیں زندہ ہے۔ اس نے ا کلیم کے ذریعے ضلع منٹگری کی تحصیل دیپال پور میں متروکہ اراضی الاٹ کر رکھی ہے۔ کو ہرکشن میں اس کی زمیں داری ہے۔ وہ ادھر کا وڈا زمیں دار ہے۔ شان سے حویلی میں رہتا۔ حویلی بھی اسے کلیم ہی میں ملی ہے۔“ یہ تمام تفصیلات اسے شاداں ہی نے بتائی تھیں۔ مگر لالی اس بار بھی شاداں کے متعلق ارشاد الہی سے کوئی ذکر نہ کیا۔ ضرورت بھی نہ تھی۔ لالی نے ایکے پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”لگتا ہے، تجھے اپنے پو کے بارے میں ٹھیک سے پتہ

”شاید ایسا ہی ہو۔“ ارشاد الہی مختصے میں پڑ گیا۔ اس نے مزید وضاحت کی۔ ”پر میں دوبار اپنے کے بارے میں پوچھنا چاہے کے لیے چک ۵۸ جا چکا ہوں۔ کاد آباد سٹیشن سے بہت نزدیک ہے۔ سمجھ نہ رہا، دو آب کے ٹیوں کے بالکل اس پار ہے۔ آگے تخت ہزارہ ہے۔“



لالی کو رحیم داد یاد آگیا۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد اس نے روپوش ہونے کے لیے نہریاری آب کے اجاڑ اور اونچے نیچے ٹیوں اور ٹیلوں کو اپنا ٹھکانا بنایا تھا۔ رحیم داد بھی اس کے ہم راہ اس کی لاش بھی ٹیلوں کے درمیان ہی ملی تھی۔ پولیس کی حراست میں رحیم داد کی لاش اسی شناخت کی تھی۔ لیکن لاش اس بری طرح مسخ ہو چکی تھی کہ صرف جیل کی وردی ہی سے اڑھ لگایا جاسکتا تھا جو ہنوز مقتول کے جسم پر موجود تھی۔ البتہ اسے اپنی وہ ہیمیانی بار بار دیکھنے کے بعد نظر نہ آئی تھی جس میں تین ہزار سے اوپر رقم تھی۔ یہ ہیمیانی پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے ہائے احتیاط رحیم داد کے حوالے کر دی تھی۔ اور یہ ہدایت بھی کی تھی کہ اسے حفاظت سے کمر لگا کر باندھ لے۔ مگر لاش کی کمر پر ہیمیانی نہ تھی۔ قاتلوں کے ہتھے چڑھ گئی تھی یا ہو سکتا ہے پس والوں نے اڑائی ہو۔ لالی نے اس وقت ہیمیانی کے بارے میں یہی قیاس آرائی کی تھی۔

وہ اب تک نہ ہیمیانی بھولا تھا نہ رحیم داد کو۔ اس کی نگاہوں میں چوہدری نور الہی کا چہرہ گردش رہے لگا۔ اس چہرے کی پیچھے اسے رحیم داد کی ہلکی سی جھلک نظر آتی تھی اس نے چوہدری نور الہی دیکھتے ہی محسوس بھی کیا تھا۔ لیکن لالی نے اپنے اس شبے کا کبھی شاداں سے اظہار نہ کیا۔ لالی نے اسے صرف چند لمحے کے لیے دیکھا تھا۔ نہ بات چیت کا موقع ملا تھا نہ غور سے دیکھنے کا۔ دوبارہ وقت کی نوبت ہی نہ آئی۔ شبہ ابھرا اور ذہن کے نماں خانے میں دب کر گم ہو گیا۔ مگر اب وہ اس کے متعلق خاموشی سے لیٹا ہوا سوچ رہا تھا۔

”تو کس سوچ میں پڑ گیا؟“ ارشاد الہی نے اس کی طویل خاموشی سے اتنا کر دریافت کیا۔

لالی خیالات کے حصار سے فوراً باہر نکل آیا۔ ارشاد الہی سے پوچھا۔ ”تو اپنے پو کو کچھ کر پہچان لے گا؟“

”پہچان تو لیتا چاہیے۔“ اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ ”ویسے دس گیارہاں برس میں میری سادہ بھی بہت بدل گیا ہو گا۔“

ارشاد الہی کے لہجے سے تذبذب آشکارہ تھا۔ لالی نے بھی اسے محسوس کیا۔ ”پر تیری ماں تو

”ہاں جی، میں سیکھ ہی کے بارے میں بتا رہا تھا۔“ ارشاد الہی نے لالی کی مداخلت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھے پتہ نہیں وارث کتنا بھلا بندہ تھا۔ پہلے کالج میں پڑھتا تھا۔ پر ان دنوں تو سکول کالج سب بند تھے۔ میں جب نصیر پور میں ہوتا تھا تو پرائمری اسکول کی تیسری جماعت میں ہوتا تھا۔ ہمیشہ اول آتا تھا۔ تب ہی تو میرا پوچھے آگے پڑھا کر ڈا افسر دیکھنا چاہتا تھا پر نصیر پور چھوٹا تو میری پڑھائی بھی چھوٹ گئی۔ سکول جانا نصیب نہ ہوا۔ روٹی تو پیٹ بھر کر ملتی نہیں تھی۔ پڑھنا کیسے طرح طرح کے کام دھندے کرتا رہا۔ کبھی یہاں لگ گیا کبھی وہاں۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اپنے نصیب میں تو تھیرا بننا لکھا تھا۔ آخر تھیرا بن گیا۔ گل امر ہے۔“

”سیکھ کیسے واپس ملی؟“ لالی نے آکٹا کر مداخلت کی۔

”وارث ہی کی مدد سے ملی تھی۔“ ارشاد الہی نے بتایا۔ ”رضا کاروں نے اسے ایک کنجری کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ یہ اطلاع بھی وارث ہی نے دی تھی۔ ماں کو پتہ چلا تو وہ اس کنجری سے سیکھ کو واپس لینے ہیرا منڈی پہنچی۔ پر اس نے واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ماں نے نراض ہو کر شور مچا دیا۔ کنجری اور اس کے دلوں نے ماں کو مارا پیٹا اور دھکے دے کر اپنے گھر سے نکال دیا۔“ اس نے جھنجھلا کر گالی دی۔ ”ایسے زور سے اسے دھکا دیا کہ میڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی دور جا کر گری۔ کر میں ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اس سے اٹھا بھی نہ گیا۔ زمین پر پڑی ہائے کرتی تھی۔“

”وارث اس کے ساتھ نہیں تھا؟“

”وہ بعد میں پولیس لے کر پہنچا تھا۔“ ارشاد نے لالی کو مطلع کیا۔ ”پولیس کو دیکھ کر کنجری اور اس کے دلے ڈر گئے۔ سیکھ کو واپس کر دیا۔ بہت ساری فتنیں بھی کیں۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وارث مدد نہ کرنا تو سیکھ واپس نہ آئی۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”کنجری کے ساتھ رہ کر کنجری بن جاتی۔“

”ہاں جی، ایسا ہی ہوتا۔ ماں کو تو انھوں نے دھکے دے کر نکال ہی دیا تھا۔“ ارشاد الہی نے کہا۔ ”کئی روز تو وہ پڑی رہی۔ کمر پر بہت زور کی چوٹ آئی تھی۔ بعد میں مالش کرانے سے کچھ ٹھیک ہو گئی تھی۔ پر ٹھیک سے چل نہ سکتی تھی۔ دھیرے دھیرے درد جاتا رہا۔ ہاں، سردی میں اس کا درد بڑھ جاتا۔ کچھ عرصہ وہ بھی میرے ساتھ حاصل پور کے بھٹے پر کام کرتی رہی۔ پر ایک رات اندھیرے میں بھٹے کے گڑھے میں گر گئی۔ اس بار بھی اس کی کمر پر چوٹ آئی اور ایسی زبردست چوٹ آئی کہ اس سے کام نہ کیا جاتا تھا۔ لنگڑا لنگڑا کر چلتی تھی۔ جب اس میں بالکل کام کرنے کی

اسے دیکھتے ہی پہچان لے گی۔“ اس نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”وہ اسے ضرور پہچان لے گی۔ برسوں گھر والی بن کر اس کے ساتھ رہی ہے۔ اس کے تین پتروں اور دو بیٹیوں کو پیدا کر چکی ہے۔“ لالی نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ ”تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا؟“

مگر ارشاد الہی! اتنا ذہین اور جامع مدیدہ نہ تھا کہ لالی کی بات کی ترہ تک پہنچ جاتا۔ وہ چند لمحوں کی ہونق کی طرح نظریں اٹھائے لالی کو تنکٹا رہا، پھر اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”ہاں وہ اسے پہچان لے گی۔ دیکھتے ہی پہچان لے گی۔“ اس کے رویے سے اعتماد جھٹک رہا تھا۔

”تیری ماں آج کل کہاں ہوتی ہے؟“

ارشاد الہی نے لالی کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ لینا چھت کو تنکٹا رہا۔

مگر لالی چپ نہ رہ سکا۔ اصرار کر کے پوچھا۔ ”شادے! تجھے یہ تو پتہ ہی ہو گا کہ تیری ماں کہاں ہے اور کس کے پاس ہے؟“

”مکان میں ہوتی ہے۔“ ارشاد الہی نے لالی کی جانب دیکھے بغیر جواب دیا۔ وہ نگاہیں اٹھا۔ چھت کو تنک رہا تھا۔

”ادھر بھی کسی کے پاس نوکرانی شوکرانی لگی ہوئی ہے؟“ لالی نے کرید کر دریافت کیا۔ ”کوئی کوئی کام دھندا تو کرتی ہی ہوگی۔“

”کیا کرے گا جان کر وہ کیا کرتی ہے۔“ ارشاد الہی نے بے زاری سے کہا۔

”جب تو نے سب کچھ مجھے بتا دیا تو یہ بھی بتا دے وہ کیا کرتی ہے؟“ لالی نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ ”ویسے نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔ مجھے اس سے کیا لینا۔“

”میں نے تجھے یہ نہیں بتایا کہ جب ہم لاہور کے رفیو جی کیمپ میں ہوتے تھے تو ایک رات کارنہ جانے کس طرح سیکھ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔“

”رضا کار تیری بھین کو اٹھا کر لے گئے تھے؟“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔

”ہاں جی رضا کار ہی اٹھا کر لے گئے تھے۔“ ارشاد الہی نے بلا جھجک بتایا۔ ”پر یہ بات بھی آ رضا کار ہی نے ماں کو بتائی تھی۔“ اس نے گردن گھما کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”سب ہی بندے آ سے تو نہیں ہوتے۔ چنگے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ وہ رضا کار بھی چنگا اور نیک بندہ تھا۔ نام وارث تھا۔ عمر بھی اس کی زیادہ نہیں تھی۔ ۲۲ برس سے زیادہ کا نہ ہو گا۔ ہر ایک کی مدد تھا۔ کبھی نراض نہ ہوتا تھا۔ بات بھی بہت پیار سے کرتا تھا۔“

لالی نے ارشاد الہی کو ٹوکا۔ ”تو سیکھ کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وارث کو کہاں سے بچ میں

سکتا نہ رہی تو ایک روز حاصل پور سے چلی گئی۔ مجھے بتایا بھی نہیں۔ بعد میں پتہ چلا وہ ملتان چلی گئی تھی۔

”ملتان میں وہ کیا کرتی ہے؟“

”اب تجھ سے کیا چھپانا، وہ ملتان کی ایک درگاہ پر بھیک مانگتی ہے۔“ ارشاد الہی نے افسردہ لہجے میں بتایا۔ ”وہ ملنگوں اور بھکاریوں کے ساتھ رہتی ہے۔“

”تو اس کے پاس گیا نہیں؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”نہیں، پر مجھے پتہ ہے وہ کہاں ہوتی ہے۔“

”تجھے اس کے پاس جانا چاہیے تھا۔“ لالی نے اس کے رویے کو پسند نہ کیا۔ ”اسنے اپنے پاس لا کر رکھتا۔ تجھے یہ جان کر دکھ نہیں ہوتا، تیرے ہوتے وہ لاوارثوں کی طرح ملتان میں پڑی بھیک مانگتی رہے۔“

”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ ارشاد نے لالی کی بات پر کسی خفگی کا اظہار نہ کیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا تھا کہ اسے اپنے پاس لے آؤں۔ پر میں ملتان جانہ سکا۔ ملتان روڈ کے بھٹے کا بعد ار دلاور دوسرے ہتھیروں کے ساتھ مجھے بھی خرید کر حاصل پور سے لاور لے آیا۔ تب سے میں ادھر ہی ہوں۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”اب تو ماں کے پاس جا بھی نہیں سکتا۔ پتہ نہیں کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟“

”پرواہ نہ کر شادے، میں تجھے ماں کے پاس ملتان لے جاؤں گا۔“ لالی نے اسے تسلی دی۔

”تو مجھے ماں کے پاس لے جائے گا۔“ ارشاد الہی نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”تو مجھے ملتان کیسے لے جا سکتا ہے۔“ اس کا لہجہ نیلکا ہو گیا۔ ”بھٹے سے باہر جانے کی تو اجازت نہیں۔ تو ملتان جانے کی گل کر رہا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تجھے جلد ہی پتہ چل جائے گا میں تجھے کیسے ملتان لے جاؤں گا۔“ لالی نے اسے اطمینان دلایا۔ ”مجھ نہیں آتی تو مجھے کیسے لے جائے گا۔“ ارشاد الہی مطمئن نہ ہو سکا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر زنجیر کو آہستہ آہستہ ہلایا۔ ”یہ زنجیر دیکھ رہا ہے۔“

”دیکھ رہا ہوں، بالکل دیکھ رہا ہوں۔ پر یہ ہمیشہ تو ہاتھوں میں نہیں پڑی رہے گی۔ ایک نہ ایک روز تو اس سے چھٹکارہ مل ہی جائے گا۔“

”مان لے زنجیر سے ہاتھوں کو باندھنا بند بھی کر دیا گیا تب بھی تو بھٹے سے باہر کیسے نکلے گا؟“ ارشاد الہی نے بے دلی سے کہا۔ ”تو نے دیکھا نہیں کندنے ہم دونوں کی کتنی کڑی نگرانی کرتے

ہیں۔ دن میں تو رات سے بھی زیادہ نگرانی کرتے ہیں۔ کسی دوسرے ہتھیارے سے بات تک تو کرنے نہیں دیتے۔ آنکھیں نکال کر ڈانٹتے ہیں۔“

”نگرانی شکرانی تو چلتی ہی رہے گی۔“ لالی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ”تو دیکھ لینا۔ ایک روز میاں سے صاف نکل جاؤں گا اور تجھے بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔“

”میں نے ایسا نہیں کرنا۔“ ارشاد الہی نے صاف انکار کر دیا۔ وہ خوف زدہ اور گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ”تو ایسا کیوں کر کر سکتا ہے؟“

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ لالی نے اسے ایک بار پھر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تو چپ کر کے دیکھتا جا۔ میں جیسا کہوں تو ویسا ہی کرنا دونوں آرام سے نکل جائیں گے۔“

”نہیں جی، اس طرح کسی اور چکر میں پڑ جائیں گے۔“ ارشاد الہی آمادہ نہ ہوا۔ وہ بدستور خوف زدہ تھا۔ ”یہ تو سوچ فرار ہونے کی کوشش میں پکڑے گئے تو کیا ہو گا؟“

”پکڑے بھی گئے تو کیا ہو گا۔ جیسے اب زنجیر سے جکڑ کر رکھا گیا آگے بھی ایسے ہی رکھا جائے گا۔ جان سے تو نہیں مار دیا جائے گا۔ پھانسی پر تو نہیں لٹکایا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا۔ نگرانی اور سخت کر دی جائے گی۔“ لالی نے اسے للکارا۔ ”شادے! حوصلے سے کام لے حوصلے سے۔“ اس نے آہستہ آہستہ زنجیر ہلائی۔ ”تجھے اس زنجیر سے ہاتھ میں درد ملوم نہیں ہوتا؟“

”کیوں نہیں ملوم ہوتا۔ رات میں ٹھیک سے نیند بھی نہیں آتی۔ دن میں اینٹیں تیار کرنے اور گارہ بنانے میں بھی بہت تکلیف ہوتی ہے۔“

”یہ تو سوچ نہ دہاڑی لگتی ہے نہ پیٹ بھر روٹی ملتی ہے۔ اس طرح ہم کب تک دیکار کرتے رہیں گے؟ کب تک اس طرح زنجیر اور رسی سے جکڑے ہوئے ساری ساری رات پڑے رہیں گے؟“ لالی نے ارشاد الہی کی ہمت افزائی کی۔ ”اس مصیبت سے نکلنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ اس نے ارشاد الہی کو ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”کیسے میاں سے نکلیں گے، یہ تیرے سوچنے کی گل نہیں۔ آگے میں جو کچھ کروں گا اچھی طرح سوچ بچار کر کے کروں گا۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”میں تجھے ماں سے بھی ملاؤں گا اور تیرے پیو کے پاس بھی لے جاؤں گا۔ تجھے غلط اطلاع ملی۔ تیرا پیو مرا نہیں زندہ ہے۔ وہ کوئلہ ہر کشتن میں شان سے زمیں داری کرتا ہے۔ تو اس کے پاس چلا گیا تو عیش کرے گا۔“

ارشاد الہی نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ گھر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالا۔ خاموش لیٹا جھٹ کو تکتا رہا۔ لالی نے بھی مزید بات چیت نہ کی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور سوئے کی



لالی معمول کے مطابق سانچے میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرتا رہا اور مسلسل ارشاد الہی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی اجڑنے اور ٹوٹ پھوٹ کر بکھرنے کی دل گداز روداد سن کر وہ شدت کے ساتھ متاثر ہوا تھا۔ لالی کو اس سے گہری ہمدردی اور لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طور ارشاد الہی کو بھٹنے سے نکال کر باہر لے جائے۔ اس کے ہم راہ کوئلہ ہر کڑن پینچے چوہدری نور الہی سے ملے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ آیا یہ ارشاد الہی کا باپ ہے کہ نہیں؟ اگر وہ واقعی اس کا باپ نکلا تو ایک دوسرے سے مل کر دونوں کس قدر خوشی ہوں گے۔ ارشاد الہی کے دن پھر جائیں گے۔ طرح طرح کی اذیت ناک مصیبتوں سے نجات مل جائے گی۔ اس کی اپانچ ماں کو لمٹان میں مزاروں اور خانقاہوں پر بھیک کے۔ ایسے کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے پڑے گا۔ وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جائے گی۔ برسوں کے چھڑے ایک بار پھر مل بیٹھیں گے تو کتنے مسرور اور شادماں ہوں گے۔ اس خوشی میں جولدت اور گرم خوشی تھی اس کے احساس سے لالی وارفتہ ہو جاتا۔

وہ اینٹیں تیار کرتا رہا اور سوچتا رہا۔ وقت گزرتا رہا۔ دو بہر ہو گئی۔ دن ڈھلنے لگا۔ سہ پہر ہو گئی۔ ایک کارندہ اس کے پاس آیا اور یہ پیغام لایا کہ بھٹے کے مالک، ملک ثار محمد نے اسے بلایا ہے۔ لالی کو حیرت کے ساتھ ساتھ تشویش بھی لاحق ہوئی۔ تشویش کی بات ہی تھی۔ اب تک اس کی ملک ثار محمد کے سامنے پیشی نہیں ہوئی تھی۔ ویسے بھی عام طور پر نہ وہ کسی ہتھیرے سے بات کرتا تھا نہ اپنے دفتر میں بلاتا تھا۔ ہتھیروں اور دوسرے بھٹہ مزدوروں سے اس کا رابطہ ہمیشہ جعدار کے وسیلے سے رہتا تھا۔

لالی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دفتر کی جانب چلا۔ کارندہ اس کے ہم راہ تھا۔ مگر وہ دروازے کے باہر رک گیا۔ لالی دفتر کے اندر چلا گیا۔ ملک ثار محمد کرسی پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ لالی نے اونچی آواز سے سلام کیا۔ ملک ثار نے کوئی جواب نہ دیا۔ اخبار میز پر ڈالا اور نظریں اٹھا کر لالی کی جانب متوجہ ہوا۔

”تو لالی ہتھیرا ہے؟“ ملک نے تہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔

”ہاں جی! لالی نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

”ملک نے نہایت گندی گالی دی۔ چیخ کر بولا۔ ”تو نے اپنی بد معاشی نہیں چھوڑی۔“

”میں نے تو جی کچھ نہیں کیا۔“ لالی نے سادگی سے کہا۔ ”میں تو جی دن بھر اینٹیں بناتا ہوں۔ شام کو زنجیر سے باندھ کر منجی پر ڈال دیا جاتا ہوں۔ بھٹے کے سپرد رات بھر کڑی نگرانی کرتے ہیں۔“ اس نے لہجے میں رقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”نہ کسی سے مل سکتا ہوں نہ گل بات کر سکتا ہوں۔“

”تیرے ساتھ شادا ہتھیرا نہیں ہوتا؟“

”ہاں جی، وہ تو ہوتا ہے۔“ لالی نے اعتراف کیا۔ ”رات ہوتے ہی میرا اور اس کا ہاتھ زنجیر سے جکڑ کر تالا لگا دیا جاتا ہے۔ بیروں سے رسی پلٹ کر منجی سے باندھ دی جاتی ہے۔“

”تیرے منہ میں تو تالا نہیں ڈالا جاتا۔ تو شادا سے گل بات تو کر سکتا ہے۔“

لالی نے گھبرا کر ملک کی جانب دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر خوف کے سائے پھیل گئے۔

”چپ کر کے کیوں کھڑا ہے۔ بولنا کیوں نہیں؟“ ملک ثار محمد نے ٹپٹ کر کہا۔ ”تو نے پہلے بھی یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ لگتا ہے تجھے ٹھیک سے سزا نہیں ملی۔ تب ہی دوبارہ فرار ہونے کی سوچ رہا ہے اور شادا کو بھی اپنے ساتھ نکال لے جانا چاہتا ہے۔“

”نہیں جی، ایسی کوئی گل بات نہیں۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”لگتا ہے کسی نے میرے بارے میں تجھے غلط اطلاع دی ہے۔“

”کوئی اور نہیں، تیرا ساتھی شادا خود میرے پاس آیا تھا۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا کہ تو کیا کرنا چاہتا ہے۔“ ملک کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”اب تو کہہ دے کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔“

”اگر اس نے تجھ سے ایسی بات کہی تو بالکل غلط کہی۔“ لالی نے نہایت ڈھٹائی سے کہا۔ ”اس نے جھوٹ بولا ہے۔ میں نے کبھی اس سے ایسی گل بات نہیں کہی۔“

ملک ثار محمد نے باہر دروازے پر کھڑے ہوئے کارندے کو آواز دی۔ وہ اندر آیا تو ملک نے اس سے کہا۔ ”شادا ہتھیرے کو یہاں بھیج دے۔“

لالی سخت پریشان ہوا۔ سما ہوا خاموش کھڑا رہا۔ ملک بھی چپ بیٹھا بے چینی سے کرسی پر پلو بدلتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ارشاد الہی اندر داخل ہوا۔ اس نے لالی کو دیکھا تو بہت سٹ پٹایا۔ جھٹ گردن موڑی اور ملک ثار محمد کی جانب منہ اٹھا کر دیکھنے لگا۔

”اس نے کل رات تجھے فرار ہونے کے لیے کہا تھا نا؟“ ملک نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب

اشارہ کیا۔

ارشاد الہی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے بشرے سے گھبراہٹ اور پریشانی جھلک رہی تھی۔ ملک نے اسے ڈانٹا۔ ”چپ کیوں ہے؟ بتانا کیوں نہیں؟“

اس بار اس نے اقرار کرنے کے انداز میں گردن ہلائی۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ ”اس طرح گردن نہ ہلا۔ ٹھیک ٹھیک بتا۔“ ملک نے تیوری پر بل ڈال کر غصے سے ارشاد الہی کو دیکھا۔ ”اس نے یہاں سے نکل بھاگنے کے لیے تجھے کیا کہا تھا؟“

”اس نے وہی کہا تھا جو میں پہلے بتا چکا ہوں۔“ ارشاد الہی نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”یہ بھٹے بھاگ جانا چاہتا ہے۔ مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کو کہتا تھا۔“

لالی نے جھنجھلا کر ارشاد الہی کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”بکواس نہ کر۔ میں نے تجھ سے کب ایسی گل بات کہی تھی۔ تجھے جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی۔“

”چپ کر کے کھڑا رہ۔“ ملک نے برہم ہو کر لالی کو ڈانٹا۔ مڑ کر ارشاد الہی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”صاف صاف بتا، اس نے تجھے کیا کہا تھا؟“

”اس نے کہا تھا۔ یہاں سے فرار ہونے کے بعد یہ مجھے اپنے ساتھ لے کر میرے بچے کے پاس جائے گا۔ مجھے اس سے ملائے گا۔“

”یہ بات تو نے مجھے پہلے نہیں بتائی تھی۔“ ملک نار نے ٹیکھی نظروں سے ارشاد!! کو دیکھا۔ قدرے توقف کیا ”یہ بتا تیرا بچہ کہاں ہوتا ہے؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ وہ مر چکا ہے۔“ ارشاد الہی نے مطلع کیا۔ اس کے لہجے سے افسردگی عیاں تھی۔

لالی نے پلٹ کر ارشاد الہی کی جانب دیکھا۔ ”اسے جی کچھ پتہ نہیں۔ وہ مرا نہیں زندہ ہے۔“ ”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ جی۔ اسے مرے ہوئے کئی برس ہو گئے۔“ ارشاد الہی نے لالی کی جانب دیکھے بغیر کہا۔ ”مجھے اچھی طرح پتہ ہے وہ کب مرا اور کہاں مرا؟“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”یہ تو جی مجھے برکانے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا تاکہ میں اس کے ساتھ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔“

”نہیں جی، اسے بالکل پتہ نہیں۔“ لالی نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”اسے کسی نے غلط بتایا۔ میں نے اسے دیکھا ہے اور مجھے یہ بھی پتہ ہے وہ کہاں ہوتا ہے؟“

اس بار ملک نار محمد نے مداخلت کی۔ ”شادے کا بچہ زندہ ہے یا مر گیا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا پر اس سے تو انکار نہیں کر سکتا تو شاد کو اس کے بچے سے ملانے کے بہانے یہاں سے فرار ہو

چاہتا تھا اور اپنے ساتھ اسے بھی لے جانا چاہتا تھا۔“

لالی کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ جوش میں آکر ایسی بات کہہ گیا تھا جو اسے نہیں کہنا چاہیے تھی۔ اس نے گھبرا کر ملک نار محمد کی جانب دیکھا۔ لمحہ بھر خاموش رہا۔ خود کو سنبھالا اور ایک بار پھر جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔ ”مجھتے ہوئے گویا ہوا۔“ میں نے تو جی اسے صرف اس کے بچے کے بارے میں بتایا تھا۔ فرار ہونے کو نہیں کہا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔“

”مجھے اچھی طرح پتہ چل گیا ہے۔ کون جھوٹ بول رہا ہے کون ج؟“ ملک نار محمد نے ڈپٹ کر کہا۔ ”تو نے ایک بار پہلے بھی فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ کہہ دے یہ بھی جھوٹ ہے۔“

لالی نے نظریں نیچی کر لیں۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا فرش کو ٹکتا رہا۔ اسی اثناء میں جعدار زمان رخان دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

بھٹے کے ہانک نے اسے مخاطب کیا۔ ”یہ ٹھیک ہوا تو بھی آگیا۔ میں تجھے بلانے ہی والا تھا۔“ اس نے غصے سے گالی دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”یہ خانہ خراب دوبارہ یہاں سے نکل بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔“

”ضرور کر رہا ہو گا جی۔“ جعدار نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”مجھے پتہ چلا ہے یہ تو جی جیل سے بھی فرار ہو چکا ہے۔ چوری ذمیت کے جرم میں کئی بار سزا کاٹ چکا ہے۔“ اس نے خونخوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”اس بار میں اس کی ایسی چابی کسوں گا۔ ایسی کڑی سزا دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے۔“ جعدار نے نار محمد کو یقین دلایا۔ ”فکر نہ کریں جی۔ میں اس کو بالکل ٹھیک کر دوں گا۔ ساری بد معاشی نکال دوں گا۔“

”میں نے اب اس کے ساتھ نہیں رہنا جی۔“ ارشاد الہی نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ مجھے بہت تنگ کرے گا۔“

”نہیں تجھے اب اس کے ساتھ نہیں رکھا جائے گا۔ ہاتھوں میں زنجیر بھی نہیں ڈالی جائے گی۔“ ملک نار محمد نے ارشاد الہی کو اطمینان دلایا۔

”میری دباڑی بھی لگانی شروع کر دی جائے۔ بہت مہربانی ہو گی جی۔“ ارشاد الہی نے گڑگڑا کر کہا۔ ”جو غلطی ہو گئی اسے معاف کر دیا جائے۔“

ملک نار محمد نے فیصلہ سانے کے انداز میں جعدار کو ہدایت کی۔ ”زمان، ابھی جا کر منشی سے کہہ دے، آج سے شادا کی بھی دوسرے ہتھیروں کی طرح دباڑی لگانی شروع کر دے۔ اسے علیحدہ جگہ دی جائے۔ مجھے یہ کام کا بندہ لگتا ہے۔“

اس نے ایک بار پھر لالی کو خفگی سے دیکھا۔ ”یہ تو دیکھنے میں بھی خطرناک جراثیم پیشہ لگتا ہے۔“ اس نے گردن موڑی۔ جعدار کی طرف متوجہ ہوا۔ ”زمانہ تو نے بھٹے کے لیے اسے کیسے بھرتی کر لیا؟“

”یہ جی پہلے تینوں کے بھٹے پر ہتھیرا ہوتا تھا۔“ جعدار نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”ادھر سے دوسرے ہتھیروں کے ساتھ آیا تھا۔ تب مجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا۔ یہ تو بعد میں پتہ چلا کہ یہ سزا یافتہ ہے۔ کئی بار جیل میں رہ چکا ہے۔“

”تو دونوں کو اپنے ساتھ لے جا۔“ ملک ثار نے حکم صادر کرنے کی انداز میں اونچی آواز سے کہا۔ ”اور دیکھ، شادا کا آگے خیال رکھنا۔“

جعدار آگے بڑھا۔ ارشاد الہی اور لالی اس کے پیچھے پیچھے چلے۔ تینوں چپ چاپ باہر چلے گئے۔ باہر نکل کر جعدار نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا اور ارشاد الہی سے نرم لہجے میں کہا۔ ”شادے، تو جا کر آرام سے اپنا کام کر۔“

ارشاد الہی خاموشی سے سزا اپنے تھلے پر پہنچا اور سانچوں میں گارا بھر کر اینٹیں تیار کرنے لگا۔ محلہ مالک کے حکم پر اسے قید و بند سے چھٹکارا مل گیا۔ اسی روز سے اس کی دہاڑی بھی لگنے لگی۔ رہنے کے لیے علیحدہ جگہ بھی مل گئی۔ لالی کے خلاف مخبری کرنے کا اسے خاطر خواہ صلہ ملا۔



جعدار زماں ایک جھونپڑی میں پہنچا۔ لالی اس کے ہم راہ تھا۔ جھونپڑی بالکل خالی تھی اور بھٹے سے الگ تھلک ایک ویران گوشے میں تھی۔ جعدار نے لالی کے تمام کپڑے اتروائے اور اس کے برہنہ جسم پر پانی میں بھیجے ہوئے چھتر اس طرح بے دردی سے سڑاک سڑاک لگائے کہ لالی تکلیف سے تڑپ اٹھا۔ بلبلاتا کر چیخنے چلانے لگا۔ کبھی ادھر مڑتا کبھی ادھر۔ مگر جعدار کا ہاتھ برابر چلتا رہا۔ وہ ہتیرے بدل بدل کر لالی کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود بے حال ہو گیا۔ منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔

لالی کے جسم پر نیل پڑ گئے تھے۔ کہیں کہیں سے کھال بھی پھٹ گئی تھی۔ زخموں سے خون رس رہا تھا۔ اسی حالت میں کمر کے گرد درسی باندھ کر بھٹے پر گشت کرایا گیا۔ اس کا جسم مادر زاد برہنہ تھا۔ زخموں سے ٹپٹپ رہی تھی۔ نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑکتے قدموں سے ہتھیروں اور دوسرے محلہ مزدوروں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

عورتیں لالی کو اس حال میں دیکھتیں تو گھبرا کر دوپٹے کے آٹھل سے منہ چھپا لیتیں۔ بھٹے پر کام کرنے والا ہر شخص دم بخود تھا۔ خوف سے لرزہ بر اندام تھا۔ پورے بھٹے پر دہشت طاری تھی۔ نہ کوئی بول رہا نہ بات کر رہا تھا۔

ارشاد الہی کے سامنے سے گزرتے ہوئے لالی ٹھٹکا۔ نظریں بلند کیں، ارشاد الہی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ سینے میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس نے منہ بگاڑا۔ گہری سانس بھری اور جھنجھلا کر حقارت سے زمین پر تھوک دیا۔ جعدار نے آگے بڑھ کر لالی کی کمر پر

سزاگ سے چھتر مارا۔ ہاتھ بھر پور پڑا۔ لالی درد کی شدت سے بلبلاتا تھا۔ اس کے قدم خود بخود اٹھ گئے۔ آگے بڑھا اور نظریں جھکائے ہوئے ہتھیلوں کے درمیان سے گزرنے لگا۔

بھنے کا گشت کرانے کے بعد دن ڈھلے لالی کے پیروں کو رسی سے جکڑا گیا اور شیشم کے درخت کی ایک مضبوط ڈال سے باندھ کر لٹکایا گیا۔ اس کی ٹانگیں اوپر تھیں اور سر نیچے تھا۔ جسم پر ہنوز کوئی لباس نہ تھا۔ نہ اس نے کوئی مزاحمت کی نہ شور مچایا۔ اس کے لیے یہ نیا تجربہ نہیں تھا۔ کئی بار اقبال جرم کرانے کے لیے تھانوں میں اسی طرح لٹکایا جا چکا تھا۔ اس کا سابقہ ایک ایسے بکٹ تھانے دار سے بھی پڑ چکا تھا جو ملزموں کو لٹکایا کر طرح طرح سے اذیتیں پہنچانے کے باعث رسا شاہ کے نام سے مشہور تھا۔ لہذا اسے بخوبی اندازہ تھا کہ اگر اس نے ہنگامہ برپا کرنے کی ذرا بھی کوشش کی تو اس کے زخمی جسم کو چھتر مار کر مزید زخمی کر دیا جائے گا۔ وہ لٹکایا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

شام ہو گئی۔ اندھیرا پھیلنے لگا۔ ہتھیلوں نے کام ختم کر دیا۔ جھوپڑیوں میں چراغ جھلکانے لگے۔ چولہوں میں آگ سلگنے لگی۔ تازہ روٹیوں کی خوشبو فضا میں رچ گئی۔ لالی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ روٹیوں کی خوشبو سے بھوک کی شدت اور بڑھ گئی۔ مگر اس نے بھوک پر قابو پالیا۔ البتہ پیشاب پر قابو پانا اس کے لیے ممکن نہ رہا۔ ایک کارندہ اس کی نگرانی پر مامور تھا۔ لالی نے گڑگڑا کر اس سے فریاد کی۔ اپنی تکلیف بیان کی، منت ساجت کی۔

لیکن وہ ذرا متاثر نہ ہوا۔ نہایت بے رخی سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”تو چاہتا ہے میں تجھے نیچے اتار دوں۔ جانتا ہے کیا ہو گا؟ جعدار مجھے بھی تیری طرح لٹکایا کر چھتر سے مار لگائے گا۔ پیشاب کرنا ہے تو کر لے۔ کس نے منع کیا ہے؟ میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“

لالی خاموش ہو گیا۔ بے چین ہو کر جسم کو ادھر ادھر گردش دینے لگا۔ مگر وہ دیر تک یہ تکلیف اور اذیت برداشت نہ کر سکا۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا جب اس کی قوت برداشت نے جواب دے دیا۔ پیشاب نکلا اور اس کے قطرے اس کے جسم پر پھیلنے لگے۔ اور پھیلتے پھیلتے اس کے چہرے تک پہنچ گئے۔ اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ مگر پیشاب کی قطرے نتھنے کے راستے ناک کے اندر جانے لگے۔ اس نے سانس روک لی۔ کسی نہ کسی طرح ایک ہاتھ اٹھا کر منہ اور ناک پر رکھ لیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مگر اس کا برہنہ پیٹ، سینہ، گردن، چہرہ اور سر کے بال پیشاب سے تر ہونے لگے۔

پیشاب کرنے کے بعد اسے سکون تو ملا لیکن اس کی تیزبو اور گندگی کے احساس سے جی متلائے

لگا۔ وہ بار بار ابکائی لیتا اور ہر بار آنکھ اس کے منہ سے خارج ہوتی۔ اس نے گردن ہلا کر چہرہ ادھر ادھر کیا۔ بے بسی سے سامنے بیٹھے ہوئے کارندے کو دیکھا۔ مگر وہ لا تعلق بیٹھا نہایت بے نیازی سے سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔

اندھیرا بڑھتا اور پھیلتا گیا۔ رات ہو گئی۔ بھنے پر سناٹا چھا گیا۔ سپرداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا۔ گہری خاموشی میں ان کے قدموں کی آہٹیں اور وقفے وقفے سے کھکارنے کی آوازیں ابھرتی رہیں۔ لالی درخت سے لٹکایا ہوا تھا۔ رات آدمی ہو گئی۔ رات ڈھلنے لگی۔ صبح ہو گئی۔ ہتھیلے جھوپڑیوں سے نکل نکل کر اپنے تھیلوں پر پہنچنے لگے۔ گار اتیار کر کے اینٹیں بنانے لگے۔ بھنے پر ہر طرف چل پل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور تھا۔ ہتھیلے اینٹیں تیار کر رہے تھے۔ کھار سوکھی ہوئی اینٹیں ریزروں اور ٹھیلوں میں بھر بھر کر چنی کے نیچے پہنچا رہے تھے۔ بھرائی کرنے والے مزدور کچی اینٹیں توے پر جم رہے تھے۔ آگ سلگائی جا چکی تھی۔ تیز آج سے کچی اینٹیں تپ کر پختہ ہو رہی تھیں۔ چنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں اٹھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہو رہا تھا۔

لالی ہنوز لٹکایا ہوا تھا۔ ہتھیلے اور دوسرے بھٹ مزدور سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے اور خوف زدہ ہو کر زیادہ تن دی سے اپنے کام میں جٹ جاتے۔ دوسرے ہو گئی۔ سورج مغربی افق کی سمت کھٹکنے لگا۔ سائے طویل ہو گئے۔ اس عرصے میں کئی بار لالی کی قوت مزاحمت جواب دے گئی۔ اس پر غشی طاری ہو جاتی۔ آنکھیں بند ہو جاتیں۔ منہ سے رال بننے لگتی۔ جب اس کی حالت بہت خیر ہو جاتی تو جعدار زماں کو اطلاع دی جاتی۔ وہ آتا۔ لالی کی دیگرگوں حالت کا اندازہ لگاتا۔ اسے نیچے اتارتا۔ پینے کو پانی دیتا۔ مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔ صرف ایک بار لسی پلائی۔ لالی کچھ دیر بے سدھ پڑا رہتا۔ مگر جب حالت کچھ سنبھل جاتی تو جعدار پھر اسے درخت سے لٹکایا دیتا۔

غروب آفتاب سے کچھ پہلے ملک نثار محمد بھنے میں داخل ہوا۔ لالی کے قریب سے گزرا۔ حقارت سے اس پر ایک ہچکچتی ہوئی نظر ڈالی اور گردن اٹھائے بے نیازی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چلنے والے کارندے بھی بے نیازی سے گزر گئے۔ کسی نے اس کی جانب توجہ دینے کی مطلق زحمت گوارہ نہ کی۔ ہر شخص خاموش تھا اور اپنے رویے سے لا تعلق کا اظہار کرتا تھا۔

جھٹ پٹا ہوتے ہی جعدار زماں خان اس کے قریب آیا۔ کچھ دیر تہر آلود نظروں سے اسے گھورتا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر لالی کے منہ پر تباہ توڑ کئی تھپڑ مارے۔ زماں خان کا جسم بھاری بھر کم اور مضبوط تھا۔ ہاتھ ایسے کرارے پڑے کہ لالی کا ایک ہونٹ پھٹ گیا۔ اس سے خون رس رس کر

بنے لگا اور رخسار سے ہتا ہوا پیشانی تک پھیل گیا۔ لالی چپ چاپ الٹا لٹکا رہا۔ نہ اس نے دہائی دی نہ احتجاج کیا۔

جعدار کے حکم پر کارندوں نے لالی کو درخت سے نیچے اتارا۔ دونوں پیروں کو رسی سے آزاد کیا۔ مگر ہاتھ بدستور زنجیر سے جکڑے رہے۔ لالی تھکن اور نقاہت سے نڈھال ہو رہا تھا۔ وہ کھڑا بھی نہ ہو سکا۔ لڑکھڑا کر فرش پر گر گیا۔ منہ پھاڑ کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ جعدار نے اشارہ کیا۔ ایک کارندے نے مٹی کے پیالے میں پینے کو پانی دیا۔ پانی پی کر ذرا قرار آیا۔ مگر وہ فرش پر بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اسے پینے کے لیے کپڑے دیے گئے۔ مگر وہ ان کو پین نہ سکتا تھا۔ اس دفعہ اس کے ہاتھ بھی کھول دیے گئے۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے کپڑے پینے اور انھ کھڑا ہو گیا۔

شام دیرے دیرے بجنے کے در و دیوار پر اتر رہی تھی۔ سرمئی دھندلکا پھیلتا جا رہا تھا۔ جھونپڑیوں کے آگے چولہوں پر کھانا پک رہا تھا۔ اس کی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ لالی کی بھوک شدت سے بیدار ہوئی۔ مگر اسے کچھ کھانے کو نہ دیا گیا۔ جھونپڑی میں پھنپایا گیا اور چارپائی پر ڈال کر ہاتھوں کو ایک بار پھر زنجیر سے جکڑ کر تالا ڈال دیا گیا۔ پیروں کے گرد رسی لپیٹ کر چارپائی کی پٹیوں سے باندھ دیا گیا۔

پہلے اس کا ایک ہاتھ زنجیر سے جکڑا جاتا تھا۔ مگر اس دفعہ اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے جکڑ دئے گئے۔ اسی طرح پہلے رسی اس طور پیروں سے باندھی جاتی تھی کہ وہ کروٹ بدل سکتا تھا۔ اب وہ اپنے پیروں کو ہلانہ سکتا تھا۔ صرف چت لیٹا رہ سکتا تھا یا اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ زنجیر اس قدر کس کر باندھی گئی تھی کہ اس کے حلقے گوشت کے اندر پیوست ہو گئے تھے۔ کلائیوں میں درد سے ٹیس اٹھ رہی تھی۔

ایک پیریدار اس کی جھونپڑی کے آگے گشت لگاتا رہا۔ وقفہ وقفہ سے اس کے جوتوں کی آہٹ ابھرتی۔ جھونپڑی کے عین سامنے پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ ایک نظر جھونپڑی کے اندر ڈالتا اور آگے بڑھ جاتا۔ لالی رات بھر بھوکا رہا۔ دن میں بھی اسے کھانے کو کچھ نہ دیا گیا۔



شام ہونے سے کچھ دیر قبل بادل گھر کر آئے اور بوند باندی شروع ہو گئی۔ اندھیرا بڑھا۔ شام ہو گئی۔ اندھیرے کے ساتھ ساتھ بارش بھی تیز ہو گئی۔ بارش کے چھینے ہوا کے ساتھ جھونپڑی کے اندر پہنچنے لگے۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ تیز بارش سے بجھنے میں ہر طرف جل ٹھل ہو گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی رہی۔ ہر سو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا تھا۔ بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ بادل رک رک کر زور سے گر جتے تھے۔ تیز بارش کے باعث پیریداروں نے گشت لگانا ختم کر دیا تھا۔ البتہ بجھنے کے مشرقی گوشے سے ان کے بار بار کھنکھانے اور بولنے کی آوازیں خاموشی میں ابھر رہی تھیں۔ لالی خاموش لیٹا تھا۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ وہ بے چین ہو کر بار بار پہلو بدلنے کی کوشش کرتا۔ مگر دونوں پیر رسی سے اس طرح جکڑے ہوئے تھے کہ وہ کسی طور کروٹ نہ لے سکتا تھا۔

بے چینی جب زیادہ بڑھی تو لالی بے قرار ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے جھونپڑی کے باہر نظر دوڑائی۔ بارش کے قطروں کی جھار کے سوا اندھیرے میں اسے کچھ نظر نہ آیا۔ کچھ دیر وہ گم صم بیٹھا رہا، پھر آگے جھکا۔ ہاتھ کو بڑھا کر پیروں تک لے گیا۔ انگلیوں سے پیروں میں بندھی ہوئی رسی ٹٹولی۔ رسی سوت کی بنی ہوئی تھی۔ ہاتھ کی انگلی سے زیادہ موٹی نہ تھی۔ لالی نے ہاتھوں کو ادھر ادھر گھمایا۔ رسی کی گرہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بار بار کوشش کے باوجود اس کے ہاتھ نہ آئی۔ اسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا ہاتھ رسی کی گرہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ گرہ چارپائی کے ایک پائے کے نچلے حصے کے گرد رسی لپیٹ کر لگائی گئی تھی۔

لالی نے دونوں پیروں کو زور زور سے اس طرح ہلایا کہ گرہ ڈھیلی پڑ کر کھل جائے۔ اس کے پیر تکلیف سے دھکنے لگے مگر رسی کی گرہ نہ کھلی۔ لالی نے دل برداشتہ ہو کر گہری سانس بھری اور مدھال ہو کر لیٹ گیا۔ مگر اسے قرار نہ آیا۔ ایک بار پھر اٹھ کر بیٹھا۔ ہاتھ کو بڑھا کر رسی کے قریب لے گیا۔ اس نے رسی کانٹے کی غرض سے تالے کے دھار دار کنارے سے آہستہ آہستہ رگڑی۔ اس کے ہاتھوں کی حرکت تیز اور تیز ہوتی گئی۔ لیکن رسی نہ کٹی۔ لالی کے ہاتھ شل ہو گئے۔ وہ زور زور سے ہانپنے لگا اور زیادہ دیر بیٹھ نہ سکا۔ تھکا ہوا سا چارپائی پر پھر لیٹ گیا۔

وہ دیر تک جاگتا رہا۔ بھوک اور نقاہت سے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ جسمانی تکلیف کے ساتھ ساتھ ذہنی کوفت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بارش کے قطروں کی آواز مسلسل ابھر رہی تھی۔ آخر پچھلے پیر اس کی آنکھ لگ گئی۔ جھونپڑی میں گہرا اندھیرا تھا۔ یکایک خاموشی میں آہٹ ابھری۔ لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک سایہ لہرایا اور رفتہ رفتہ قریب آ گیا۔

بارش ابھی رکی نہ تھی۔ مگر اس کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ رات کے گہرے سکوت میں بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں جل ترنگ کی مانند بج رہی تھیں۔ ہوا بدستور تیز تھی اور سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی کچھ دیر دم بخود پڑا رہا، پھر گھبرا کر اٹھا۔ سہمی ہوئی آوازیں دریافت کیا۔ ”کون ہے؟“ وہ حیرت

سے سائے کی جانب آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا۔

”دھیرے بول۔“ اندھیرے میں آواز ابھری۔

لالی نے فوراً پہچان لیا۔ وہ ارشاد الہی تھا اور لالی کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ لالی نے غصے اور نفرت سے منہ بگاڑ کر کہا۔ ”تو یہاں کیوں آیا؟“ اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ ”کٹل کرنے آیا ہے؟“ ارشاد الہی نے اس کی خفگی پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہاتھ میں دبی روٹی کا نوالہ توڑ کر لالی کے منہ کے قریب لے گیا۔ نرم لہجے میں بولا۔

”لے لے اے کھالے۔“

”میں نے کچھ نہیں کھانا۔“ لالی نے روٹھے ہوئے بچے کی مانند گردن جھٹک کر انکار کیا۔ ”تو یہاں سے چلا جا۔ میں نے نے تیری روٹی شوٹی نہیں کھانی۔“

ارشاد الہی نے اس دفعہ بھی مطلق برا نہ مانا۔ نوالہ لالی کے منہ میں ٹھونس دیا۔ مسکرا کر بولا۔

”پہلے روٹی کھالے۔ بعد میں نراض ہونا۔ مجھے پتہ ہے تو نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔“

لالی کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے روٹی کا لقمہ چبانے لگا۔ ارشاد الہی نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔ روٹی کے لقمے پٹا پٹا کر لالی کو کھلاتا رہا۔ لالی بھوک سے بے قرار تھا۔ چند لمحوں تو اس نے تکلف برتا، پھر ہبڑ ہبڑ روٹی کے لقمے کھانے لگا۔ ارشاد الہی سہا ہوا تھا۔ بار بار مڑ کر جھونپڑی سے باہر نظر دوڑاتا۔

لالی روٹی کھا چکا تو ارشاد الہی نے جھونپڑی میں رکھے ہوئے گھڑے سے المونیم کے گلاس میں پانی اُغلا۔ واپس لالی کے پاس گیا۔ گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا۔ لالی نے پانی پی کر آہستہ سے ڈکاری۔ پیٹ میں غذا پہنچی تو ثقاہت کم ہوئی۔ جان میں جان آئی۔ حواس بجا ہوئے۔ اس نے ارشاد الہی سے پوچھا۔ ”پہلے تو نے میرے خلاف ملک ثار سے جبری کی۔ سزا دلوائی۔ اب روٹی لے کر آیا۔ تو نے ایسا کیوں کیا؟“ وہ ابھی تک ارشاد الہی کے بدلے ہوئے رویتے پر حیران و پریشان تھا۔

”مجھے پتہ نہیں تھا، تیرے ساتھ اتنا ظلم ہو گا۔“ اس نے نرم لہجے میں اظہارِ پشیمانی کیا۔ ”غلط ہو گئی۔ معافی دے دے۔“

”پر تو مجھے کب تک اس طرح چوری چوری روٹی کھلاتا رہے گا؟“ لالی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”بعد ازاں کو پتہ چل گیا تو تجھے بھی میری طرح سخت سزا دے گا۔ تجھے پتہ ہے، وہ کتنا ظالم ہے۔“

”مجھے سب پتہ ہے۔ پر توجہ کر کے بیٹھارہ۔“ ارشاد الہی نے تنبیہ کی۔

لالی خاموش ہو گیا۔ ارشاد نے دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا۔ اسے کھولا۔ لالی نے کھلا ہوا چاقو اس کے ہاتھ میں دیکھا تو سخت سراپہ ہوا۔ گھبرا کر بولا۔ ”تو کیا کرنا چاہتا ہے؟“ اس نے پریشانی کے عالم میں زنجیر سے جکڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر چہرے کے سامنے کر لیے۔

مگر ارشاد الہی نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ نہ زبان سے کچھ کہا۔ آگے بڑھا اور لالی کے پیروں میں بندھی ہوئی رسی جلدی جلدی چاقو سے کاٹنے لگا۔ اس کے رویتے سے صاف عیاں تھا کہ وہ خود کو خطرے میں ڈال کر پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت لالی کو قید سے رہائی دلانے کی غرض سے آیا ہے۔

رسی کٹ گئی۔ لالی کے دونوں پیر آزاد ہو گئے۔ اس نے پیروں کو آہستہ آہستہ ہلا کر اطمینان کیا۔ اب وہ چارپائی سے نیچے اتر سکتا تھا۔ چل پھر سکتا تھا۔ جھونپڑی سے نکل کر باہر جا سکتا تھا۔

ارشاد الہی نے چاقو بند کیا۔ دھوتی کے ڈب میں حفاظت سے رکھا۔ سرگوشی کرنے کے انداز میں آہستہ سے بولا۔ ”بٹھے کی سپرد اداری پر آج رات صرف دو راکھے ہیں۔ دونوں ہی نشے میں مست پڑے ہیں۔“

”تجھے ان کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟“ لالی نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ادھر آنے سے پہلے میں ان کی جھگی میں گیا تھا۔ دونوں ایسے بے سدھ پڑے ہیں کہ ان کو میرے آنے کا ذرا بھی پتہ نہ چلا۔“ اس نے جھک کر باہر دیکھا۔ ”بارش ابھی رکی نہیں۔ ایسے میں تو آرام سے فرار ہو سکتا ہے۔“

”تو میرے ساتھ نہیں چلے گا؟“ لالی نے اسے ایک بار پھر اپنے ہم راہ فرار ہونے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں!“ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ ”مجھے تیرے ساتھ نہیں جانا۔“ ارشاد الہی نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”تو میری فکر نہ کر۔ فٹا فٹ یہاں سے نکل جا۔“ اس کے آواز خوف سے قہر قرار دی تھی۔ قدرے توقف کے بعد اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تیرا اب ادھر ٹھہرنا ہم دونوں ہی کے لیے بہت خطرناک ہو گا۔“

”تھوڑی دور بھی میرے ساتھ نہیں چلے گا؟“

”نہیں۔“ ارشاد الہی نے لالی کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”میں تو اب چھپتا لکتا اپنی جھگی میں جاؤں گا۔ میں نے تو اب یہاں ایک منٹ بھی نہیں رکنا۔“

لالی کچھ کہہ نہ سکا۔ خاموشی سے ارشاد الہی کو دیکھتا رہا۔

ارشاد الہی نے گردن جھکا کر باہر جو کتنا نظروں سے دیکھا۔ باہر رم جھم رم جھم مینہ برس رہا تھا۔ بھیگی ہوئی ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا چھایا تھا۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ ارشاد الہی نے پلٹ کر لالی کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ چپ چاپ آگے بڑھا۔ جھوپڑی سے باہر نکلا۔ لمحہ بھر کے لیے ٹھنکا اور پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا گہری تاریکی میں اوجھل ہو گیا۔



لالی چارپائی سے نیچے اترا۔ لڑکھڑایا اور گرتے گرتے بچا۔ اس کی دونوں ٹانگیں اکڑ گئی تھیں۔ ان میں رہ رہ کر اینٹھن ہو رہی تھی۔ نقابت بھی بہت تھی۔ کچھ دیر تک وہ اندھیرے میں گم سم کھڑا رہا۔ پھر اس نے ہمت سے کام لیا۔ قدم اٹھایا، ڈنگایا، سنبھلا، دوسرا قدم اٹھایا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اس کے پیر پتھر کے بن گئے ہیں۔ بھاری اور بے جان۔ وہ جھوپڑی کے دوسرے سرے تک گیا۔ واپس آیا۔ اس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ جھوپڑی کے اندر ٹھلنے لگا تاکہ ٹانگوں میں توانائی اور اعتدال پیدا ہو جائے۔ وہ رک رک کر قدم اٹھاتا۔ بار بار پیروں کو جھٹکتا۔ رسی کٹ جانے کے بعد اس کی ٹانگیں آزاد ہو گئی تھیں لیکن دونوں ہاتھ لوہے کی مضبوط زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھوں کو ہلایا۔ ادھر ادھر گھمانے پھرانے کی کوشش کی۔ مگر زنجیر کی کڑیاں گوشت میں اس طرح پیوست ہو گئی تھیں کہ ہلانے سے کلائیوں میں ٹیس اٹھتی تھی۔

اس کے لیے اب جھوپڑی میں مزید ٹھہرنا کسی طور مناسب نہ تھا۔ باہر نکلتا خطرناک تھا تو جھوپڑی میں رکتا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ نہ صرف اس کے لیے بلکہ ارشاد الہی کے لیے بھی جو ہر طرح کا خطرہ مول لے کر چھپتا چھپاتا اس کے پاس آیا تھا۔ کھانا لایا تھا اور کھلایا بھی تھا۔ پیروں میں بندھی ہوئی رسی چاقو سے کاٹی تھی۔ چلنے پھرنے کے قابل بنایا تھا اور فرار ہونے کا پورا پورا موقع فراہم کیا تھا۔ وہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے گردن بڑھا کر جو کتنا نظروں سے باہر دیکھا۔ ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ بارش کی بعضی مٹی بوندیں مسلسل آسمان سے گر رہی تھیں۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ اس کی جھوپڑی، بھٹے کے ایک گوشے میں الگ تھلگ تھی۔ سامنے نیم دائرے میں پتھریوں اور دوسرے حصے مزدور دل کی جھوپڑیاں تھیں۔ ان کے آگے گہرا اور وسیع گڑھا تھا جس کی مٹی نکال کر اینٹیں بنائی جا چکی تھیں۔

دائیں طرف لگ بھگ سو قدم کے فاصلے پر بھٹے کا دفتر تھا۔ اس کے قریب دو جھوپڑیاں تھیں

ایک جھوپڑی کے باہر لالین کی ہلکی ہلکی زرد روشنی بکھری ہوئی تھی۔ وہ جھوپڑی کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اتنا ضرور جانتا تھا کہ دونوں پیریدار اسی جھوپڑی میں موجود ہیں۔ جھوپڑی پر گہری خاموشی طاری تھی۔ ارشاد الہی کی اطلاع کے مطابق دونوں ہی پیریدار نشے میں دھت تھے اور بے سدھ پڑے تھے۔

لالی اپنی جھوپڑی سے باہر نکلا۔ بھیگی ہوئی ہوا کا سرد تھپڑا منہ پر لگا۔ قدم لڑکھڑائے۔ جسم سردی سے کپکپایا۔ وہ ٹھنک کر رہ گیا۔ خوف زدہ نظروں سے ایک بار پھر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف اندھیرا نما۔ خاموشی تھی۔ بارش کی بوندوں سے ہلکا ہلکا جل ترنگ بچتا تھا۔ جگہ جگہ پانی سے بھرے ہوئے گڑھے تھے۔ کچڑ تھی۔ وہ پانی اور کچڑ سے بچتا بچتا، سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا آگے بڑھا۔ اچانک پیر پڑا۔ قدم ڈنگائے، گہرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ گرنے سے خاموشی میں آہٹ پیدا ہوئی۔ عین اس وقت کوئی آہستہ آہستہ کھانسنے لگا۔

اس نے بدحواس ہو کر دفتری جانب دیکھا۔ مگر وہاں سکوت طاری تھا۔ کھانسی دفتر کے عقب سے ابھر رہی تھی۔ لالی دم سادھے پڑا رہا اور اس سمت دیکھتا رہا جدھر سے کھانسی رک رک کر ابھر رہی تھی۔ مگر اسے کوئی نظر نہ آیا۔ صرف چنی اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دے رہی تھی۔ بارش کے باعث بھی سرد پڑی تھی۔ نہ وہاں آگ روشن کی گئی نہ چنی کے نیچے دیکھتے ہوئے تو بے پر کئی اینٹیں رکھ کر پکائی گئیں۔

لالی کے دونوں ہاتھ زنجیر سے جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے لیے اٹھنا اور اٹھ کر کھڑا ہونا آسان نہ تھا۔ خطرہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا۔ کھانسی وقفے وقفے سے سناٹے میں ابھر رہی تھی۔ وہ پانی اور کچڑ میں تھڑا ہوا کچھ دیر زمین پر پڑا رہا اور بارش میں بھٹکتا رہا۔ اس کا جسم بار بار سردی سے تھر تھراتا، لیکن وہ اس طرح زیادہ دیر پڑا نہ رہ سکتا تھا۔ اسے جلد سے جلد بھٹے کی حدود سے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے کروٹ بدلی۔ جھکا کہمنیوں کے بل اٹھا اور ٹانگوں پر پورا زور دے کر کھڑا ہوا تو گرتے گرتے بچا۔

وہ چند لمحے اندھیرے میں کھڑا رہا اور بارش میں بھٹکتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے قدم اٹھایا۔ آگے بڑھا۔ بار بار ٹھٹکتا، مڑ کر عقب میں دیکھتا وہ ڈرا سہما آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ بھٹے کی حدود سے باہر نکلا اور پختہ سڑک پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنی رفتار تیز کر دی اور بارش کے قطروں سے بے نیاز آگے بڑھتا گیا۔ اس کے کپڑے پانی اور کچڑ سے لت پت تھے۔ ایک کہنی فرش سے اٹھنے کی کوشش میں چھل گئی تھی۔ اس میں

مسلل سوزش ہو رہی تھی۔ لیکن نہ وہ اسے چھو سکتا تھا نہ دیکھ سکتا تھا۔ نہ یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ زخم کہاں ہے اور کیسا ہے۔ خوف بھی دامن گیر تھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھتا۔ مگر دور تک نہ کوئی آواز تھی نہ آہٹ۔ صرف ہوا کہ سرسراہٹ تھی اور بادلوں سے گرتی ہوئی بوندوں کا ہلکا ہلکا جل ترنگ تھا۔ لیکن وہ زیادہ دور نہ جاسکا۔ جسم ٹھکن اور سردی سے شل ہو گیا تھا۔ قدم آگے نہ بڑھتے۔ آخر وہ ایک گھنے درخت کے نیچے پہنچ کر ٹھہر گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔

رات ڈھل رہی تھی۔ درخت کے پتوں سے بارش کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ وہ ایک موٹی شاخ کی آڑ میں سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ وہ بھنے سے فرار ہونے میں کامیاب تو ہو گیا تھا مگر اب یہ مسئلہ سامنے تھا کہ کہاں جائے اور کس کے پاس جائے؟ وقت کم تھا اور سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے اسے بہت دور نکل جانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ درخت کے نیچے سہا ہوا کھڑا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

شرقی افق پر بادلوں کے پیچھے ہلکا ہلکا اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ بارش ہلکی ہوتے ہوتے رک گئی۔ مگر ہوا تیز تھی۔ اس میں خنکی بھی تھی۔ لالی کا لباس ابھی تک بھیگا ہوا تھا۔ جسم سردی سے کپکپا رہا تھا۔ صبح کی آمد کے ساتھ خطرہ بڑھ گیا تھا۔ وہ درخت کے نیچے سے نکلا اور سڑک پر پہنچ گیا۔ سڑک دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ فیوز پور روڈ ہے اور وہ اس وقت چورنگی امرسدھو کے گرد و نواح میں ہے۔ سڑک ہنوز سنسان تھی۔ دور دور تک نہ کوئی راہ گیر تھا نہ کسی گاڑی کی آواز تھی۔ لالی نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔

اب آبادی کے نشانات نظر آنے لگے تھے۔ دور تک اونچے نیچے مکانات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ایک پختہ عمارت پر پولیس اسٹیشن کا بورڈ دھندلی دھندلی روشنی میں دور سے نظر آیا۔ لالی اتار دیکھ کر ٹھٹکا۔ خوف زدہ بھی ہوا۔ مسلسل چلتے چلتے اس کے پیر شل ہو گئے تھے۔ دونوں ہاتھ زنجیر جکڑے ہوئے تھے۔ مزید آگے جانے کی اس میں سکت نہ رہی تھی اور خطرہ سر پر منزل لا رہا تھا۔ کیا اور جانے کے بجائے وہ سیدھا تھانے میں پہنچا۔ اس وقت تھانہ ہی اسے محفوظ مقام معلوم ہوا۔



تھانے پر خاموشی چھائی تھی۔ لالی ہیڈ محرر کے پاس گیا اور اس کے روہو گردن جھکا کر کھڑا گیا۔ ہیڈ محرر رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ آنکھوں میں نیند کی غنودگی تھی۔ وہ مضعل اور تھکا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے چونک کر لالی کو دیکھا۔ اس کے بال بھیگ کر پیشانی اور کپٹیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ لباس پر جگہ جگہ مٹی کے بوے بوے دھبے تھے۔ پیر کچڑ سے لت پت تھے اور ہاتھ زنجیر

ی طرح جکڑے ہوئے تھے۔

وہ لالی کو چند لمحے تک حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھتا رہا، پھر ٹوہ لگانے کے انداز میں دریافت کیا۔
”لوں ہے تو؟“

لالی نے مسکین سی صورت بنا کر آہستہ سے بتایا۔ ”میرا نام لال دین ہے جی۔ جتھیرا ہوں۔
لٹار محمد کے بھٹے پر کام کرتا ہوں۔“

”تیرے ہاتھوں میں یہ زنجیر کیوں پڑی ہے؟“ ہیڈ محرر بدستور حیرت زدہ تھا۔

لالی نے رقت انگیز لہجے میں بتایا کہ بھٹے کے مالک ملک ٹار محمد نے اپنے جعدار اور کارندوں کے ریلے اس پر کس قدر ظلم و ستم ڈھایا۔ کیسی کیسی ایذا پہنچائی۔ کس طرح قیدی بنا کر رکھا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بننے لگے۔

ہیڈ محرر ادھر تھا۔ ڈاڑھی اور سر کے بال کچھوی ہو چکے تھے۔ چہرے پر عام پولیس والوں کی سی فنی اور خشونت نہ تھی۔ عیال دار تھا اور دردمند دل بھی رکھتا تھا۔ پچھلے ہی دنوں اس کا بڑا بیٹا، بڑی جوانی میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ لالی کی الم ناک روداد سن کر وہ بہت متاثر ہوا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ فکر نہ کر۔ ملزمان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔“ اس نے روز تانچہ کھسکا کر سامنے کیا۔ قلم اٹھا کر ابتدائی رپورٹ درج کرنا چاہی مگر کچھ سوچ کہا تھ روک لیا۔

”حوالہ دیجیے!“ لالی نے تعجب سے ہیڈ محرر کو مخاطب کیا۔ ”تو نے میری ریٹ نہیں لکھنی؟“
”نہیں!“ ہیڈ محرر نے قلم ایک طرف رکھتے ہوئے نرم لہجے میں وضاحت کی۔ ”کیس کی نوعیت خاص نکلیں ہے۔ ایس ایچ او صاحب کے سامنے تیری پیشی ہونی ضروری ہے۔ وہی تیرا بیان لیں گے اور ضروری کارروائی کا حکم جاری کریں گے۔ وہ صبح نو بجے تک تھانے میں آئیں گے۔ ویسے بری ڈیوٹی بھی اب ختم ہونے والی ہے۔“ اس نے لالی کو اطمینان دلایا۔ ”پریشان نہ ہو۔ سب ٹیک ٹھاک ہی ہو گا۔“

لالی اس کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔ اس نے مزید اصرار نہ کیا۔

ہیڈ محرر نے ایک کانٹیل کو بلایا۔ لالی کی جانب ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”اسے اپنے ساتھ لے جا۔
میرے ایس ایچ او صاحب کے سامنے پیش کرنا ہو گا۔“

کانٹیل نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ آگے بڑھا اور لالی کو حوالات کے سامنے

ایک گوشے میں بیٹھا دیا۔ نہ لالی نے اس سے کوئی بات کی اور نہ ہی اس نے لالی سے کچھ پوچھا۔ کانٹیل چلا گیا۔ لالی سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔

صبح ہو گئی۔ دن چڑھے تھانیدار اپنے دفتر میں پہنچا۔ لالی کو اس کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس نے گڑگڑا کر اسے بھی اپنی اذیت ناک روداد سنائی۔ ہاتھ جوڑ کر دوسری چابی۔ تھانیدار کچھ ہی عرصہ قبل تھانے میں تعینات ہوا تھا۔ سرگرم اور مستعد افسر تھا۔ ہوشیار اور دہنگ تھا۔ اپنی کارکردگی سے علاقے پر دھاک بٹھانے کے ساتھ ساتھ افسران بالا کی زیادہ سے زیادہ خوش نودی بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تھانیدار نے لالی کا بیان توجہ سے سنا۔ الزامات کو بوعیت پوری طرح سمجھنے کے لیے مختلف سوالات بھی کئے۔

لالی کے لیے یہ پہلا موقع نہ تھا۔ وہ کئی بار تھانیداروں اور دوسرے پولیس افسروں کے دربار میں ہو چکا تھا۔ ان کے مزاج اور افتاد طبع کو بخوبی سمجھتا تھا۔ بات کرنے کا ذہب جانتا تھا۔ اس نے ہر سوال کا سوچ سمجھ کر اور سنبھل سنبھل کر جواب دیا۔ تھانیدار کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے لمبے میں رقت پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

تھانیدار کے بشرے سے رعب و دبدبہ ٹپک رہا تھا۔ اس نے لالی کو غور سے دیکھا۔ کریم پوچھا۔ ”تو بھٹے سے فرار ہو کر یہاں پہنچا کیسے؟“

لالی اس سوال کے لیے پہلے ہی سے ذہنی طور پر تیار تھا۔ مگر وہ تھانیدار کو صاف بات بتانا چاہتا تھا۔ خدشہ تھا کہ اگر اس نے ارشاد الہی کا نام بتایا تو محض مالک نثار محمد اسے بھی اپنے جروتہ کا نشانہ بنائے گا۔ طرح طرح سے پریشان و حراساں کرے گا۔ اس نے سرے سے ارشاد الہی کا ذکر ہی نہ کیا۔ کہنے لگا۔ ”وہ جی ایسا ہوا کہ میرے پیر جس رسی سے جکڑ کر باندھے گئے تھے اس کی گر میں نے کسی نہ کسی طرح کھول لی۔ منجی سے نیچے اترا۔ باہر نکلا۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔“

”تیری نگرانی پر کل رات کوئی پریدار نہیں لگایا گیا تھا؟“

”ایک نہیں جی دور رکھے نگرانی پر تھے۔ پر دونوں ہی نشہ کر کے مست پڑے تھے۔ ان کو بالکل ہوش نہیں تھا۔“ لالی نے تھانیدار کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”بارش بھی ہو رہی تھی۔ طرف اندھیرا چھایا تھا۔ میں چھپتا کلتا بھٹے سے نکل کر سڑک پر پہنچا اور بارش میں بھیکتا ہوا یہاں گیا۔“

تھانیدار خاموش بیٹھا رہا۔ لالی نے عاجزی سے کہا۔ ”میرے ساتھ بہت ظلم ہوا جی۔ بھاگ ادھر نہ آتا تو وہ مجھے جان سے مار دیتے۔ میرے ساتھ انصاف کیا جائے۔ میں اسی لیے یہاں

ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”دوبارہ محض مالک کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔ وہ بہت ظالم ہے۔ اور اس کا جعدار تو بہت ہی ظالم ہے۔ ذرا ترس نہیں کھاتا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے۔ جعدار کا جبر و تشدد یاد کر کے اس کا دل بھر آیا۔ آنسو پلکوں سے ٹپکنے لگے۔

تھانیدار نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ نہ تسلی دی نہ دل جوئی کی۔ چند لمبے خاموش رہا، پھر اس نے ایک کانٹیل کو بلایا۔ اسے حکم دیا کہ بھٹے پر جائے اور ملک نثار محمد کو اپنے ہم راہ لے کر آئے۔ کانٹیل نے جو تے کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے سلام کیا۔ مڑا، کمرے سے باہر نکلا اور بھٹے کی جانب روانہ ہو گیا۔

لالی کو ایک بار پھر حوالات کے سامنے پہنچ پر بٹھا دیا گیا۔ اسے چائے بھی پلائی گئی۔ مگر اس کے دونوں ہاتھ لوہے کی زنجیر سے ہنوز جکڑے ہوئے تھے۔ اور نہ ہی اس کی رپورٹ درج کی گئی تھی۔ وہ گوگو کے عالم میں بیٹھا رہا۔ اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ ملک نثار محمد کے پیچھے کے بعد ضابطے کی کیا کارروائی ہوگی۔

لگ بھگ گھنٹہ بھر بعد کانٹیل واپس آیا۔ لیکن اس کے ساتھ ملک نثار محمد نہیں تھا۔ بھٹے کا جعدار، زماں خان تھا۔ اس کے پیچھے ہی تھانیدار نے لالی کو بھی اپنے دفتر میں طلب کیا۔ لالی فوراً تھانیدار کے سامنے پہنچا اور نظریں جھکا کر ادب سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

جعدار زماں خان وہاں موجود تھا۔ اس نے کرسی کھسکائی اور اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر نہ کسی قسم کی پریشانی تھی نہ گھبراہٹ۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ مسکرا کر تھانیدار کے سامنے پیش کیا۔ اس نے انکار میں گردن ہلائی۔ جعدار نے پیکٹ سے سگریٹ نکالی، سٹائی اور بے نیازی سے کش لگائے لگا۔

تھانیدار کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جعدار کا رویہ اسے شاق گزرا ہے۔ مگر اس نے کسی برہمی کا اظہار نہ کیا۔ لالی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جعدار سے دریافت کیا۔

”اسے جانتے ہو؟“

”کیوں نہیں جانتا جی،“ اپنے بھٹے کا ہتھیرا ہے۔“ جعدار نے تیوری پر بل ڈال کر لالی کو دیکھا۔ ”رات کو چپکے سے فرار ہو گیا تھا۔ یہ جی ایک نمبری بد معاش ہے۔ پہلے بھی ایسی کوشش کر چکا ہے۔ پریس نے اسے پکڑ لیا۔ بھاگنے نہ دیا۔“ وہ تھانیدار کی جانب متوجہ ہوا۔ ”سامنے کھڑا ہے۔ اس سے پوچھ لیں۔“

مگر تھانیدار نے لالی سے کچھ نہ پوچھا۔ جعدار سے سوال کیا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ اسے مارا بیٹا گیا؟“

ضرب شدید پہنچائی گئی۔ نگا کر کے درخت سے الٹا لٹکایا گیا۔ تین روز تک کچھ کھانے کو نہ دیا گیا۔
”یہ بالکل بکواس کرتا ہے جی۔ نہ اسے مارا پیٹا گیا نہ الٹا کر کے لٹکایا گیا۔“ جعدار نے نہایت
ڈھٹائی سے تردید کی۔ ”یہ جی بہت جھوٹا ہے۔ اس نے سب غلط بتایا۔“

”کیا یہ بھی غلط ہے کہ اس کے ہاتھوں اور پیروں کو باندھ کر جس بے جا میں رکھا گیا؟“ تھانیدار
نے اس دفعہ اونچی آواز سے پوچھا۔ اس کے لیے میں ٹیکھا پن تھا۔ ”اس کے زنجیر سے جکڑے
ہوئے ہاتھوں کو دیکھ رہے ہو۔“

”ایسا تو جی کرنا ہی پڑتا ہے۔“ جعدار انکار نہ کر سکا۔ اس نے لالی کو حقارت سے دیکھا۔ ”آپ
کو پتہ نہیں جی۔ یہ حرام واکتنا کمینہ اور بد معاش ہے۔ یہ ان دھوکے باز جتیموں میں سے ہے جو
ہزاروں روپے منت اور خوشامد کر کے پیشگی لے لیتے ہیں اور چپکے سے کسی روز فرار ہو جاتے ہیں۔
ان کے ساتھ ایسی کارروائی نہ کی جائے تو کیسے کام چلے۔ پیشگی وصول کرنے کے لیے تو ایسا کرنا ہی
پڑتا ہے۔“

لالی نے مداخلت کی۔ ”پیشگی کا معاملہ تو یہ ہے جی، جتنی ادا کرو اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے۔ وہ تو جی
کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

تھانیدار نے لالی کی مداخلت نظر انداز کرتے ہوئے جعدار سے کہا۔ ”تو گویا تم یہ تسلیم کرتے ہو
کہ اسے مارا پیٹا گیا۔“ اس نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔ ”زنجیر سے جکڑ کر جس بے جا
میں رکھا گیا۔“

جعدار نے اس دفعہ صاف گوئی سے کام لیا۔ نہایت بے باکی سے بتایا۔ ”میں نے بتایا تا جی، ایسا
نہ کریں تو کیسے کام چلے۔ ان کی تو اس طرح چابی کسی ہی پڑتی ہے۔“ وہ دانت نکال کر بھونڈے پن
سے ہنسنے لگا۔

تھانیدار کا چہرہ غصے سے سرخ پڑ گیا وہ زور سے دھاڑا۔ ”ٹھیک سے بات کر۔“ وہ بھڑک اٹھا۔
آگے بڑھا اور جعدار کے منہ پر تڑ سے تھپڑ رسید کیا۔

ہاتھ ایسا کرارا پڑا کہ کرسی ڈگمگائی۔ جعدار نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ مگر وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا
کہ تھانیدار نے زناٹے کا ایک اور ہاتھ رسید کیا۔ جعدار لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ تھانیدار اپنی کرسی پر
جا کر بیٹھ گیا۔ جعدار اٹھا۔ سرا سہ ہو کر وحشت زدہ نظروں سے تھانیدار کی جانب دیکھا۔ ایسا
گھبرایا کہ زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

جعدار کرسی کی جانب بڑھا۔ تھانیدار نے ٹوکا۔ ڈپٹ کر حکم دیا۔ ”کھڑا رہ۔“ اس نے غضب

ہاک ہو کر کئی گالیاں دیں۔ ٹیکھے لیے میں پوچھا۔ ”بھٹے کا مالک کہاں ہے؟ وہ کیوں نہیں آیا؟“
”وہ تو جی دفتر میں بیٹھا ہے۔“ جعدار نے مسکین سی صورت بنا کر مری ہوئی آواز میں جواب
دیا۔ ”اسی نے مجھے ادھر بھیجا تھا۔“

تھانیدار نے ایک کانٹیل کو طلب کیا۔ جعدار کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”اسے لے جاؤ اور
حوالات میں بند کر دو۔“

جعدار سہمی ہوئی نظروں سے تھانیدار کے جھنجھلائے ہوئے چہرے کو ٹکٹنے لگا۔ وہ اس قدر خوف
زدہ تھا کہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ بھی نہ سکا۔ ہکا بکا کھڑا رہا۔ تھانیدار مڑ کر لالی کی جانب متوجہ ہوا۔
”تو نے بالکل ٹھیک بتایا۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔“ اس کے لیے میں ہمدردی تھی۔
”دوسرے جتیموں پر بھی اسی طرح جبر و تشدد ہوتا ہو گا۔“

”بہت ہوتا ہے جی۔ چھترے سڑاک سڑاک مارا جاتا ہے۔ نگا کر کے سارے بھٹے پر گھمایا جاتا
ہے۔ درخت سے باندھ کر الٹا لٹکایا جاتا ہے۔“ لالی رقت انگیز لہجے میں سنبھل سنبھل مکر بولتا رہا۔
”بھٹی کے گرم گرم توتے پر اتنی دیر تک کھڑا رکھا جاتا ہے کہ پچھیں نکل جاتی ہیں۔ پیروں کی کھال
جل جاتی ہے۔ نہ کوئی دوا دار ہوتا ہے نہ بھٹے سے باہر جانے دیا جاتا ہے۔ چوبیس گھنٹے راکھے کڑی
نگرائی کرتے ہیں۔ کیا بتاؤں جی، جتیموں پر کیسا کیسا ظلم ہوتا ہے۔“

”اطمینان رکھ، اب ظلم نہیں ہو گا۔“ تھانیدار نے تسلی دی۔ سامنے کھڑے ہوئے کانٹیل کو
خاطب کیا۔ ”کھوکھر، اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس کے ہاتھ کھول دے۔ کھانے کو بھی دے۔ پتہ
نہیں کب سے اسے روٹی نہیں ملی۔“

کھوکھر جانے کے لیے مڑا تو تھانیدار نے اسے ٹوکا۔ ”بات سن۔ بھٹے کے مالک، ٹار محمد، کو یہاں
لے کر آ۔ دو کانٹیل ساتھ لیتا جا۔ سیدھی طرح آجائے تو ٹھیک ہے۔ گزیر کر کے کی کوشش کرے
یا بیکری دکھائے تو پکڑ کر لے آ۔ حوالات میں بند کر کے اس کی بھی گرمی اتارنی ہے۔ اس کے
غلاف جبر و تشدد اور جس بے جا میں رکھنے کے الزامات ہیں۔ خاصا سنگین کیس ہے۔“

کھوکھر نے نہایت مستعدی سے دونوں پیروں کی ایڑیاں جوڑ کر کھٹاک سے تھانیدار کو سلیوٹ
کیا۔ جعدار زباں خان کا بازو پکڑا اور نہایت تحقیر کے ساتھ دھکے دیتا ہوا باہر لے گیا۔ لالی بھی
دونوں کے پیچھے پیچھے چلا۔ وہ خاموش اور سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔

باہر نکل کر جعدار کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ لالی کے ہاتھوں میں پڑی ہوئی زنجیر کا تالا کسی نہ
کسی طرح کھولا گیا۔ ہاتھ آزاد ہوئے تو لالی نے دیکھا کھائیوں میں زنجیر کی کڑیاں پوست ہونے سے

گڑھے پڑ گئے تھے۔ دونوں ہاتھ ابھی تک دکھ رہے تھے۔ مگر وہ ہاتھوں کی تکلیف سے بے نیاز دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ زیر لب مسکرا رہا تھا۔ مڑ مڑ کر حوالات کی جانب دیکھ رہا تھا جس کی سلاخوں کے پیچھے جعدار زماں حیران و پریشان کھڑا تھا۔

لالی نے کھانا کھایا۔ چائے بھی پی۔ اور ہیڈ محرر کے کمرے میں پڑی ہوئی بیچ پر خاموشی سے بیٹھا رہا۔



دوپہر کو بجھے کا مالک نثار محمد تھانے میں داخل ہوا۔ لالی نے اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے ہم راہ دو افراد اور بھی تھے۔ ایک تو ملک نثار محمد کا منشی تھا۔ دوسرے کو لالی نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وضع قطع سے وہ کھاتا پیتا اور معزز نظر آتا تھا۔ چال ڈھال میں تمکنت تھی، طمطراق تھا۔ وہ آگے بڑھا اور سب سے پہلے ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا۔ ملک نثار محمد اور اس کا منشی بھی اندر چلے گئے۔ دونوں سسے ہوئے اور خوف زدہ معلوم ہوتے تھے۔ تھانیدار اپنے کمرے میں موجود تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے کسی واردات کی تفتیش کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔ نیتوں کو کمرے میں گئے ہوئے دس منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ تھانیدار نے ایک کانشیل کو اندر بلایا۔ ذرا ہی دیر بعد وہ باہر نکلا۔ سیدھا حوالات کے دروازے پر پہنچا۔ قفل کھولا۔ جعدار کو باہر نکالا اور تھانیدار کے کمرے میں پہنچا دیا۔ لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ تھانیدار کے دفتر میں چائے پہنچائی گئی۔ لالی بے چینی سے مڑ مڑ کر اس طرف دیکھتا رہا۔ کمرے سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔

نصف گھنٹے بعد ملک نثار محمد کمرے سے باہر نکلا۔ منشی اور دوسرا شخص بھی باہر آیا۔ جعدار زماں خان بھی ان کے ہم راہ تھا۔ ایس ایچ او انھیں رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ لالی یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ نہ جعدار اور نہ ہی ملک نثار محمد حوالات کی جانب آئے۔ ان کے چروں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ وہ آگے بڑھے اور نہایت سکون سے قدم اٹھاتے تھانے کی حدود سے باہر چلے گئے۔

لالی صورت حال کی اس تبدیلی پر غور ہی کر رہا تھا کہ ایک کانشیل اس کے پاس آیا۔ اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ دونوں حوالات کے دروازے پر پہنچے۔ قفل کھولا گیا۔ کانشیل نے حقارت سے دھکا دے کر لالی کو حوالات میں داخل کر دیا۔ دروازہ بند کیا گیا

یہ اس میں قفل ڈال دیا گیا۔ لالی بہت چکرایا۔ اس نے احتجاج کیا۔ ”یار تو نے مجھے کیوں بند کر دیا۔ میں نے کیا جرم کیا ہے؟“

”یہ ایس ایچ او صاحب سے پوچھ جن کے حکم سے تجھے بند کیا گیا۔“ کانشیل نے بے رخی سے جواب دیا۔

”پر میں تو فریاد لے کر یہاں آیا تھا۔“ لالی ہنوز حیران و پریشان تھا۔

”جو اس نہ کر۔“ کانشیل نے آنکھیں نکال کر ڈانٹا۔ مڑا اور اس کی جانب مزید توجہ دیے بغیر ایک طرف چلا گیا۔

لالی حوالات کے آہنی دروازے کی سلاخیں تھامے حیرت زدہ کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ تبدیلی اچانک کیسے رونما ہوئی۔ عجب ماجرا تھا۔ جعدار آزاد ہو کر ملک نثار محمد کے ساتھ جا چکا تھا اور لالی حوالات میں بند تھا۔ وہ گم صم کھڑا کانشیلوں کو دیکھ رہا تھا جو تھانے میں ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ کسی نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا بھی نہیں۔ وہ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔

دوسرے روز بھی لالی حوالات میں رہا۔ اس روز اتوار تھا۔ لالی کو کچھ خبر نہ تھی کہ اسے کیوں حوالات میں رکھا گیا؟ اس کے خلاف کیا الزام عائد کیا گیا؟ پیر کی صبح اسے حوالات سے باہر نکالا گیا۔ ہاتھوں میں جھکڑیاں ڈالی گئیں۔ علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ مزید تفتیش اور پوچھ گچھ کے لیے پولیس کی درخواست پر عدالت نے ایک ہفتے کا ریمائنڈ دے دیا۔ لالی کو جھکڑیاں ڈال کر تھانے میں واپس لایا گیا۔ ایک بار پھر حوالات میں بند کر دیا گیا۔ وہ سخت آزرہ اور نڈھال تھا۔

مگر نہ لالی سے مزید پوچھ گچھ کی گئی اور نہ ہی تھانیدار کے روبہ رو پیشی ہوئی۔ حوالات میں کئی اور بھی ملزم بند تھے۔ لیکن کوئی بھی اس کا شہسارہ نہ نکلا۔ ان کے جو عزیز و اقارب اور ملنے جلنے والے آتے، ان میں بھی کوئی ایسا نظر نہ آیا جس سے اس کی جان پہچان ہوتی۔ وہ خود کو یک و تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کر رہا تھا۔ حیران و پریشان بھی تھا۔ وہ تھانے میں دادرسی کی غرض سے آیا تھا مگر نتیجہ بالکل برعکس نکلا۔ بجھے کے مالک، ملک نثار محمد اور جعدار زماں خان کے بجائے اسے ملزم قرار دے کر حوالات میں ڈال دیا گیا۔

وہ اسی پریشانی کے عالم میں تھا کہ ایک روز بجھے کا جعدار اس کے پاس آیا۔ لالی نے اسے دیکھا تو

نفرت سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”اب کیا لینے آیا ہے؟“

جعدار مسکرا کر نرمی سے گویا ہوا۔ ”میں نوں اب تو پتہ چل گیا کہ تو ملک نثار کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی بہت اوپر تک جان پہچان ہے۔ سارے ہی وڈے افسروں سے یاری ہے۔ اس روز ملک جب تھانیدار سے ملنے آیا تھا تو اپنے ساتھ صوبائی اسمبلی کے ممبر کو لایا تھا۔ تو دیکھ لیا۔ اس کے آنے سے میں حوالات سے باہر آگیا اور تو اندر ہو گیا۔“ اس کے لہجے میں طنز تھا۔ ”سوچ لے، ابھی کچھ نہیں ہوا۔ پولیس نے تیرے خلاف ابھی نہ مکدمہ بتایا ہے نہ عدالت میں چالان پیش کیا ہے۔“

”تو چاہتا کیا ہے؟“ لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔

”بھنے پر چل کر کام کر۔ تو نے جو پیشگی ادا کرنی ہے ادا کر۔“ جعدار نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں نے ملک کو منت کر کے راضی کر لیا ہے۔ اب وہ تجھے کوئی سزا سننا نہیں دے گا۔ آرام سے پہلے کی طرح کام کرنا۔“ اس نے ادھر ادھر چوتنا نظروں سے دیکھ کر سرگوشی کی ”ملک نثار کے کہنے پر تھانیدار معاملہ وادے گا۔ تجھے حوالات سے رہائی مل جائے گی۔“ لیکن لالی آمادہ نہ ہوا۔ بے رخی سے بولا۔ ”میں نے اب بھنے پر نہیں جانا۔ نہ پیشگی ادا کرنی۔ اور نہ ہی ہتھیارے کا کام کرنا ہے۔“

”ایسا سوچے گا تو جیل کا ٹی ہوگی۔“

”جیل کیوں کا ٹی ہوگی؟“ لالی اس کی دھمکی سے مرعوب نہ ہوا۔ ”میں نے جرم ہی کیا ہے؟“

جعدار نے جل کر کہا۔ ”آگے تجھے پتہ چل جائے گا کیا جرم کیا ہے؟“

لالی خاموش رہا۔ جعدار چلا گیا۔

ریمانڈ کی مدت ختم ہونے کے بعد لالی کو دوبارہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا گیا۔ پولیس۔ عدالت سے ایک ہفتے کا اور ریمانڈ مانگا۔ وہ بھی مل گیا۔ لالی پھر حوالات میں واپس آگیا۔ دوسرے روز بھنے کا جعدار، زمان خان پھر اس کے پاس آیا۔ سمجھانے بھانے کی کوشش کی۔ ڈرایا دھمکا بھی۔ لیکن لالی کسی طور بھنے پر واپس جانے کے لیے آمادہ نہ ہوا۔ جعدار اس بار بھی ناکام اور جھنجھلایا ہوا گیا۔

لالی کو عدالت میں حاضر کیا گیا۔ اس دفعہ پولیس نے اس کے خلاف چالان بھی پیش کر دیا۔ پولیس نے تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۳۸۲ کے تحت سرقہ بالجبر کا مقدمہ قائم کیا تھا۔ مقدمہ کی بنیاد

بھنے کے منشی کی رپورٹ تھی جس میں لالی کے خلاف یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ اس نے چاقو دکھا کر منشی کو دہشت زدہ کیا اور پانچ ہزار سے زائد کی وہ رقم زبردستی چھین کر فرار ہو گیا جو ہتھیاروں اور دوسرے عٹے مزدوروں کا چھٹا بانٹنے کے لیے اس کی تحویل میں تھی۔ استغاثہ کے مطابق ابتدائی رپورٹ درج کرنے کے بعد پولیس کی ایک جمعیت نے لالی کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مارے اور اسے گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چوری کی رقم بھی برآمد ہو گئی۔ اس کے معنی شاہد بھی تھے۔ چالان میں استغاثہ کے گواہوں کی فہرست بھی درج تھی۔

عدالت نے مقدمے کی آئندہ سماعت تک کے لیے لالی کو جیل بھیج دیا۔

لالی کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ خالی جیبیں، خالی ہاتھ۔ لہذا وہ اپنے مقدمے کی پیروی کے لیے نہ کوئی وکیل کھڑا کر سکا اور نہ ہی ضمانت کے لیے کوئی بھاگ دوڑ کرنے والا تھا۔ وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔ مقدمے کی سماعت کا سلسلہ جاری رہا۔ پیشیاں پڑتی رہیں۔ لگ بھگ دس مہینے جیل میں گزر گئے۔ مگر مقدمے کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ حالانکہ لالی، حوالاتی تھا لیکن جیل میں اسے ان قیدیوں کی طرح مشقت کرنا پڑتی جن کو عدالتوں سے مجرم قرار دیا جا چکا تھا۔

لالی نے عدالت کے روبرو اپنی صفائی پیش کی۔ خود کو بے قصور ثابت کرنے کی ہر طرح کی کوشش کی۔ بھنے کے مالک اور جعدار نے جو ظلم و ستم ڈھایا تھا، گڑگڑا کر اور رقت انگیز لہجے میں اس کی ایک ایک تفصیل بیان کی۔ مگر اپنے بیان کی تائید میں نہ وہ کوئی ثبوت پیش کر سکا نہ گواہ۔ دوسری طرف استغاثہ کی جانب سے ایک نہیں کئی گواہ پیش کیے گئے۔ ان میں بھنے کا منشی تھا، جعدار تھا اور وہ ہتھیارے بھی شامل تھے، جن کو بخوبی علم تھا کہ لالی بے قصور ہے اور بھنے کے مالک نے انتقامی کارروائی کے طور پر اس کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا ہے جس میں اسے پولیس کے اہل کاروں کی پوری پوری حمایت اور تائید حاصل ہے۔

گواہوں کے علاوہ وکیل سرکار کو اپنے دلائل میں لالی کے داغدار ماضی سے بہت مدد ملی۔ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ عادی مجرم رہ چکا تھا۔ چوری اور ڈکیتی کے کئی مقدمات میں سزا کاٹ چکا تھا۔ جرح کے دوران وہ لالی سے اس کے سابقہ جرائم کا اعتراف کرانے میں بھی کامیاب ہو گیا۔ اس نے لالی کے خلاف دستاویزی ثبوت بھی پیش کئے۔ غرضیکہ استغاثہ نے بہت مضبوط مقدمہ تیار کیا تھا۔

آخر کار مقدمہ کی سماعت مکمل ہو گئی۔ وہ دن بھی آگیا جب عدالت نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اسے دفعہ ۳۸۲ کے تحت سرقہ بالجبر کے جرم میں ایک سال قید با مشقت اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا

دی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید تین ماہ قید بھگتنے کا حکم دیا گیا۔

لالی نے مقدمے کا فیصلہ نہایت صبر و سکون سے سنا۔ نہ اس نے فریاد کی نہ احتجاج اور نہ ہی ماتحت عدالت کے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کے بارے میں سوچا۔ اتنے وسائل ہی نہ تھے۔ عدالت نے جو فیصلہ دیا، اس کے لیے وہ ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ مقدمے کا سن دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ فیصلہ اس کے خلاف ہی ہو گا۔ پولیس کی حراست میں وہ عدالت سے باہر نکلا اور دوسرے قیدیوں کے ساتھ جیل کی گاڑی میں خاموشی سے سوار ہو گیا۔ گاڑی سینٹرل جیل کی جانب روانہ ہو گئی۔ لالی جیل میں واپس پہنچ گیا۔ اب وہ حوالاتی نہ رہا تھا سزا یافتہ قیدی بن چکا تھا۔ جیل میں کتنے ہی قیدی ایسے تھے جن سے لالی کی شناسائی تھی یا ریں دوستی تھی۔ ان میں کئی ایسے بھی تھے جو قید کی مدت پوری ہونے کے بعد رہا ہوئے۔ لالی نے ان کے ذریعے شاداں کو پیغام بھیجا کہ وہ آئے اور اس سے ملے۔ ایسا ہر پیغام بھیجنے کے بعد وہ ملاقات کے دن کا بے چینی سے انتظار کرتا۔ ملاقات کا دن آتا۔ اس کی نگاہیں ملاقاتیوں کے ہجوم میں شاداں کو تلاش کرتیں۔ مگر ہر بار اس کی نظریں بے قراری سے بھٹکتی رہ گئیں اور ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ شاداں اسے دکھائی نہ دی۔ وہ اس سے ملنے نہ آئی۔

وہ شاداں کی جانب سے مایوس ہو گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ شاداں کی یاد کے نقوش دھندلے پڑ گئے۔ لیکن بھولنے کی کوشش کے باوجود وہ اسے بھلا نہ سکا۔ صبح ہوتی شام ہوتی۔ دن ہفتوں میں، اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے رہے۔ ادھر ملک میں بھی نئی تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ مرکز اور صوبوں میں آئے دن وزارتیں ٹوٹتی اور بنتی رہیں۔ اسمبلیوں میں سیاسی جماعتوں اور گروہوں کے مابین پرانے رشتے ختم ہوتے، نئے گٹھ جوڑ ہوتے۔ راتوں رات اکثریت، اقلیت میں اور اقلیت، اکثریت میں بدل جاتی۔ نئے وزیر اعلیٰ اور نئے وزیر اعظم مقرر ہوتے۔

ملک فیروز خاں نوں، وزیر اعظم تھے۔ فروری ۱۹۵۹ء میں ہونے والے عام انتخابات کا ہر طرف چرچا تھا۔ لیکن انتخابات سے چار مہینے قبل اکتوبر ۱۹۵۸ء کی ایک رات کو ان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ مارشل لا نافذ کر کے فوج نے اقتدار مملکت پر قبضہ کر لیا۔ اسمبلیاں توڑ دی گئیں۔ آئین منسوخ کر دیا گیا۔ سیاسی جماعتوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی۔ کتنے ہی سیاسی اور ٹریڈ یونین رہنماؤں اور کارکنوں کو گرفتار کر کے جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ کئی سیاسی نظربندوں کو سینٹرل جیل میں بھی رکھا گیا جس میں لالی تھا۔

لالی کی رہائی میں کچھ کم دو مہینے باقی تھے۔ اب وہ جیل کی زندگی سے مانوس ہو چکا تھا۔ ایک روز اسے اطلاع ملی کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔ ملاقات کا دن تھا۔ ہر طرف چل پھل اور گہما گہمی تھی۔ قیدی ہنستے مسکراتے نظر آ رہے تھے۔ لالی نے جا کر دیکھا، ملاقاتیوں کے ہجوم میں شاداں بھی موجود تھی۔ لالی نے اسے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔

شاداں اب اتنی بدل چکی تھی کہ پہلی نظر میں تو وہ اسے پہچان ہی نہ سکا۔ لالی نے جب اسے آخری بار دیکھا تھا تو بٹھے پر چلچلاتی دھوپ اور لو کے گرم گرم تھپیڑوں میں کام کرنے سے اس کا رنگ روپ ماند پڑ گیا تھا۔ چہرہ جھلس کر راکھ ہو گیا تھا۔ بال بھورے پڑ گئے تھے۔ آنکھیں بے رونق اور ویران نظر آتی تھیں۔ سخت محنت اور غذائیت کی کمی کے باعث اس کا مضبوط اور بھرا بھرا صحت مند جسم مرجھا گیا تھا۔ جلد کھردری پڑ گئی تھی۔ دانت گندے اور پیلے پیلے نظر آتے تھے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سن رسیدہ لگتی تھی۔ اس کے گلجے اور بوسیدہ لباس سے پسینے کی تیزبو کے بھبکے اٹھتے تھے۔

مگر اب شاداں کا رنگ نکھر گیا تھا۔ چہرے پر شگفتگی اور رعنائی کی چاندنی تھی۔ آنکھیں ایسی روشن اور اجلی تھیں گویا چراغ جھللا رہے ہوں۔ لباس بھی عمدہ اور بھرا بھرا تھا۔ وہ بڑے زمیں دار گھرانوں کی عورتوں کی طرح ریشمی کرتا اور شلوار پہنے ہوئے تھی۔ جسم کا بالائی حصہ سفید اونی شال سے ڈھکا تھا۔ ہاتھوں میں طلائی کنکین اور کانوں میں جڑاؤ مندرے تھے۔ لباس سے عطری بھکی بھکی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ دل ربا اور طرح دار نظر آ رہی تھی۔

لالی نے اس کی یہ جھج دیکھی تو ایسا حیرت زدہ ہوا کہ کچھ کہہ نہ سکا۔ گم سم کھڑا کھوئی کھوئی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ شاداں کا چہرہ کندن کی طرح دکنے لگا۔ رخساروں پر بھکی بھکی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے شرما کر شال کھینچی اور سر ڈھک لیا۔ نظریں جھکا کر بولی۔ ”تو مجھے اس طرح گھور کیوں رہا ہے؟“ اس کے انداز میں پہلی سی بے باکی اور اکھڑین نہ تھا۔

”دیکھ رہا ہوں تو کتنی بدل گئی ہے۔ پہلے تو میں تجھے پہچان ہی نہ سکا۔“ لالی نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا۔ ”شکارے مار رہی ہے۔ تو اب تک رہی کہاں؟ میں نے کتنے بندے حے پاس بھیجے، پر تو نہ آئی۔“ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔ ”تو اپنے اماں ہی کے پاس ہے نا؟“

”نہیں۔“ شاداں نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”اس کی تو موت کو بھی بہت مدت ہو گئی۔

میرے پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ مر گیا۔“

”تیرا اماں مر گیا؟“ لالی نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔ ”کیسے مر گیا؟“

”سویرے دودھ لے کر جا رہا تھا۔“ شاداں کی چہرے پر افسردگی کا غبار چھا گیا۔ آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”وڈی سڑک پر اس کی سیکل ایک بس سے ٹکرائی۔ بس اسے کچلتی ہوئی گزر گئی۔ یہ بھی پتہ نہ چلا، کس کی بس تھی اور کہاں چلی گئی؟ اماں کی لاش گھر آئی تو ایسی خراب ہو گئی تھی کہ پہچانی نہ جاتی تھی۔ بس کا پسیا اس کی سر پر سے گزر گیا تھا۔“

”یہ تو نے بہت بری خبر سنائی۔ تیرا اماں بہت نیک بندہ تھا۔“ لالی نے اظہار ہمدردی کیا۔ ”تجھے تو بہت پیار کرتا تھا۔“

”نہ پوچھ کتنا پیار کرتا تھا۔“ شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا۔“

”پر تو نے اس کا گھر کیوں چھوڑ دیا؟ ماما تو موجود تھی۔“

”اماں کی موت کے بعد تو اس نے زبردست سیپا کیا۔ اسے یاد کر کے بہت روتی تھی۔“ شاداں نے بتایا۔ ”پر عدت پوری ہوتے ہی اس نے ایک دودھی سے نکاح پڑھوا لیا۔ وہ چنگا بندہ نہیں ہے۔ مجھے طرح طرح سے تنگ کرتا تھا۔ نشہ کر کے ماما کو بھی مارتا پینتا تھا۔ ایک شام ماما گھر پر نہیں تھی۔ وہ نشہ کر کے آیا۔ مجھے اکیلا پایا تو نوپنے کھسوٹنے لگا۔ اسنے میں ماما بھی آگئی۔ اس نے اپنے گھروالے کو تو کچھ نہ کہا۔ الٹا مجھ پر زراض ہوئی۔ گندی گندی گالاں نکالیں۔ مجھے اتنا کتہ آیا کہ دوسرے ہی روز اس کا گھر چھوڑ دیا۔“

”گھر چھوڑ کر تو کہاں گئی؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”جاتی کہاں، سیدھی تیرے پاس پہنچتی۔“ شاداں نے مطلع کیا۔ ”پر تو تینوں کے بھنے کو چھوڑ چکا تھا۔ کسی کو پتہ نہ تھا تو کہاں ہے؟ کس بھنے پر کام کر رہا ہے؟ کتنے ہی ہتھیروں سے پوچھ تاچھ کی پر کسی نے تیرے بارے میں کچھ نہ بتایا۔“

”بھنے کے جمدار کو تو میرے بارے میں سب کچھ پتہ تھا۔ تو نے اس سے کیوں نہیں پوچھا؟“

”اس کے پاس اس ڈر سے نہ گئی کہ پکڑ کر بھٹے پر نہ لگا دے۔“ شاداں نے بتایا۔ ”جب تو نہ ملا تو میں کاسم بیلا اپنی میسرے کے پاس چلی گئی۔ جب تو ملتان جیل میں ہوتا تھا تب بھی میں اس کے ساتھ رہتی تھی۔ پر اس بار اس کی بیوہ ننان بھی گھر میں اپنے بچوں کے ساتھ موجود تھی۔ ایسی جھگڑا لو کہ میں تجھ سے کیا بتاؤں۔ روز ہی مجھ سے جھگڑا کرتی تھی۔ تنگ آکر میں نے کاسم بیلا بھی چھوڑ دیا۔“

”تو کاسم بیلا سے یہاں آئی ہے؟“

”تب تو مجھے پتہ بھی نہ تھا تو جیل میں ہوتا ہے۔“

”فیروہاں کیسے پہنچی؟“ لالی نے دریافت کیا۔

بھلی جمہرات کو میں پاک پتن گئی تھی۔“ شاداں نے جواب دیا۔ ”وہاں بابا فرید کی زیارت پر گئی۔ جب سے اس کا گھر چھوڑا پہلی بار ملی تھی۔ تیرے جیل کے کئی ساتھی اس کے گھر جا۔ ان سے ماما نے تیرے بارے میں جو کچھ سنا تھا مجھے سب بتایا۔“

ب تو کہاں ہوتی ہے؟“

اسم بیلا چھوڑنے کے بعد میں چوہدری نورالہی کے پاس نوکری کرنے چلی گئی تھی۔“ شاداں کو مطلع کیا۔ ”تب سے میں کوئلہ ہر کشن میں ہوں۔“

نوکرانی تو بالکل نہیں لگتی۔“ لالی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”تو نے چوہدری سے ویاہ تو نہیں کیا۔“

”میں نے اس سے ویاہ کر لیا۔ اب وہ میرا گھر والا ہے۔“ شاداں نے دہلی زبان سے کیا۔

اششدر رہ گیا۔ چند لمحے شاداں کو گھورتا رہا، پھر اس نے یقین نہ آنے کے انداز میں پوچھا۔

چوہدری سے ویاہ کر لیا؟ کب کیا ویاہ؟“

پہلے مہینے کیا ہے۔“ شاداں نے نہایت سکون سے جواب دیا۔

ترب کر لولا۔“ تجھے پتہ ہے چوہدری کیسا بندہ ہے؟“

”نوں پتہ ہے، ٹھیک طرح پتہ ہے وہ کیسا بندہ ہے۔“ شاداں نے لالی کی آنکھوں میں ڈال کر کہا۔ ”تجھ سے بہت زیادہ چنگا بندہ ہے۔ وڈا زمیں دار ہے۔ شان سے رہتا ہے۔ کرتا ہے۔ ہر طرح کا آرام پہنچاتا ہے۔“

ب تو آرام سے ہے تو اب میرے پاس کیوں آئی ہے؟“ لالی نے غصے سے جھنجھلا کر شاداں کو

رے پاس یہ بتانے آئی ہوں کہ میں اب چوہدری کی گھر والی بن چکی ہوں۔ وہ تجھے بالکل پسند تا۔“ شاداں نے لالی کو خبردار کیا۔ ”اگے تو میرے پاس نہ آنا۔ میں نے تجھ سے اب کچھ نہ۔“

کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھے دھوکا دیتی رہی۔ تو نے مجھ سے جھوٹے وعدے کئے۔“ لالی نے

وٹا وعدہ میں نے کیا یا تو نے؟“ شاداں نے حیکمے لہجے میں کہا۔ ”تو نے پکا وعدہ کیا تھا کہ لیتی چھوڑ دے گا۔ پر تو باز نہ آیا۔ چوری کی پکڑا گیا۔ اب جیل میں بند ہے۔“ اس کا لہجہ

اور تلخ ہو گیا۔ ”میں نے تیرے ایسے چور ڈکیت سے کوئی رشتہ نانا نہیں رکھنا۔“
 ”تجھے غلط اطلاع ملی۔ میں نے کوئی چوری ڈکیتی نہیں کی۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”بھٹے کے مالک ثار محمد اور اس کے جعدار نے پولیس کی مٹھی گرم کر کے میرے خلاف جھوٹا کیس بنوایا اور مجھے جیل میں بند کروادیا۔“

”مجھے سب پتہ ہے تو جیل میں کیوں ہے؟ ماما نے تیرے بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔“
 شاداں اس کی صفائی سے ذرا متاثر نہ ہوئی۔ ”اے تو تیرے ہی جیل کے ساتھی کیدیوں نے ساری باتیں بتائی ہیں۔“

”انہیں کچھ پتہ نہیں۔“ لالی نے شاداں کو مطمئن کرنے کی ایک بار پھر کوشش کی۔ ”تو ملک ثار محمد کے ہتھیاروں سے پوچھ لے۔ ان کو پتہ ہے کہ کس طرح میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنایا گیا۔“
 ”میں نے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا۔“ اس نے اس دفعہ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی میں نے اب تجھ سے کیا لیتا۔ جو ہوتا تھا ہو چکا۔ مجھے تو اب چوہدری کی گھر والی ہی بن کر رہنا ہے۔“
 ”یہ کیوں نہیں کہتی اب تو دوڑی زمیں دارنی بن گئی ہے۔ شان سے رہتی ہے۔ عیش کرتی ہے۔ اب میرے ایسے غریب بندے سے تجھے کیا لیتا۔“ لالی نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تو جو چاہتی تھی تجھے مل گیا۔“

”تیرا جو جی چاہے سوچتا رہ۔“ شاداں نے مڑتے ہوئے کہا۔ ”پر آگے تو مجھے ملنے یا میرے پاس آنے کی نہ سوجنا۔“

شاداں آگے بڑھی اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ لالی لوہے کی سلاخیں ہاتھوں سے تھامے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ سامنے ایک گھنے درخت کے نیچے جیب کھڑی تھی۔ شاداں جیب کے نزدیک پہنچی اور پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے مڑ کر لالی کی جانب دیکھا بھی نہیں۔
 جیب کا انجن شور مچاتا ہوا اشارت ہوا۔ پائے حرکت میں آئے۔ جیب تیزی سے مڑی۔ پختہ سڑک پر پہنچی اور تیز رفتار سے دوڑنے لگی۔

لالی لوہے کی سلاخیں دونوں ہاتھوں سے تھامے جیب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جیب آن کی آواز میں نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ شاداں چلی گئی۔ لالی کی پہنچ سے بہت دور چلی گئی۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ لیے اس سے رخصت ہو چکی تھی۔ لالی سے منہ موڑ کر کسی اور کی بن چکی تھی۔
 لالی نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری اور بے قرار ہو کر اپنا سر سلاخوں پر رکھ دیا۔



شاداں کو ملہ ہر کشن واپس پہنچی تو پہر رات گزر چکی تھی۔ رحیم داد بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شاداں سفر کی تکان سے نڈھال تھی۔ لالی سے ملنے کے بعد ذہنی طور پر پریشان بھی تھی۔ آنکھیں بھیجی بھیجی تھیں اور چہرے پر افسردگی چھائی تھی۔

رحیم داد نے شاداں کو افسردہ اور مضطرب پایا تو اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”شاداں! تو کچھ پریشان پریشان سی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے لالی سے تیرا جھگڑا ہو گیا۔ میں نے پہلے ہی منع کیا تھا اس کے پاس نہ جا، پر تو نے میری بات نہ مانی۔ یہ نہ سوچا وہ بدنام مجرم ہے۔ چوری ڈکیتی کرنا اور جیل جانا اس کا دھندا ہے۔ سمجھ نہیں آتی تو اس کے چکر میں کیسے پڑ گئی۔“

شاداں کے دل کے کسی گوشے میں ابھی تک لالی کے لیے جگہ تھی۔ رحیم داد کی جلی کئی باتیں سن کر اس نے لالی کی جانب سے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ”پر وہ تو کہتا تھا میں نے چوری نہیں کی۔ بھٹے کے مالک نے پولیس کو اپنے ساتھ ملا کر میرے خلاف جھوٹا مقدمہ بنایا اور مجھے جیل میں بند کروادیا۔“

”شاداں! تو جتنی سوہنی ہے اتنی ہی بھولی بھی ہے۔“ رحیم داد نے محبت سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ ”کوئی مجرم کبھی یہ نہیں کہتا اس نے جرم کیا ہے۔ ہمیشہ اپنے تئیں بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ تو جب پولیس دبا کے پٹائی کرتی ہے تب بتاتا ہے اس نے کیا جرم کیا ہے۔ اور لالی تو ایسا پکا جرائم پیشہ ہے کہ زبردست مار پڑنے پر بھی اپنا جرم صاف صاف بتانے کا نہیں۔ تجھے پتہ نہیں وہ کتنا خطرناک بندہ ہے۔“

”وہ تو مجھے یہ بھی کہتا تھا کہ بھٹے کے سارے ہی قصیدوں کو پتہ ہے اس نے چوری نہیں کی۔“ شاداں پر رحیم داد کی باتوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ اس نے لالی کی جانب سے مزید صفائی پیش کی۔ ”وہ تو یہاں تک کہتا تھا تجھے میری بات پر۔ لیکن نہ ہو تو بھٹے پر جا کر قصیدوں سے پوچھ لے۔ خود ہی پتہ چل جائے گا میں جھوٹ بول رہا ہوں یا ج۔“

”وہ کچھ ہی کہے اور اپنے بے گناہ ہونے کے بارے میں کیسی ہی صفائی پیش کرے، پر میں تجھے صاف صاف بتا دیتا چاہتا ہوں کہ اب تو میری گھروالی ہے، آگے میں تیری زبان سے لالی کا ذکر نہ سنوں۔“ رحیم داد اچانک بھڑک اٹھا۔ تیوری پر پل ڈال کر اس نے تھکے لہجے میں شاداں کو خبردار کیا۔ ”نہ تو اب اسے طے کی اور نہ وہ کبھی یہاں آئے گا۔ میں عزت دار زمیں دار ہوں۔ ہرگز یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میری گھروالی کسی بدنام جرائم پیشہ کے ساتھ کسی بھی طرح کا میل ملاپ رکھے۔“

شاداں نے رحیم داد کے بگڑے ہوئے تیور دیکھے تو نرم پڑ گئی۔ فوراً اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”برانہ منا۔ تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی ہوگا۔ میں نے لالی کو صاف صاف کہہ دیا۔ آگے نہ کبھی یہاں آئے اور نہ مجھے ملنے کی کوشش کرے۔ میں اسے یہی کہنے جیل گئی تھی اور تجھے بتا کر گئی تھی۔“ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دیا، مسکرا کر دیکھا اور رحیم داد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا۔ ”چوہدری، تو میرا گھروالا ہے۔ زندگی بھر کا سنگی ساتھی ہے۔ میں نے اب لالی شالی سے کیا لیتا۔“ اس کے انداز میں لگاوٹ تھی۔ دلداری تھی۔ ناز اور عشوہ تھا۔ رحیم داد اس کی اس ادا پر تڑپ اٹھا۔ ساری برہمی اور کدورت کا فورہ گئی۔ ایسا وارفتہ ہوا کہ بے اختیار دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر شاداں کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے کندھے محبت سے ہولے ہولے تھپکنے لگا۔



فردری کا مہینہ تھا۔ سردی کا زور اب کسی قدر ٹوٹ چکا تھا۔ مگر اس وقت فضا میں خاصی خشکی تھی۔ کمر کی ہلکی نیلگوں دھندلتی جا رہی تھی۔ سورج درختوں کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔ دھوپ کی تمازت لطف دیتی تھی۔ رنج کی فصل تیاری کے مرحلے میں تھی۔ ہوا سرسراہتی ہوئی چل رہی تھی۔ گندم کے ہرے بھرے پودے جھونکوں سے لہرا رہے تھے۔ سرسوں کے کھیتوں میں زرد زرد پھولوں سے لدی ہوئی شاخیں جھوم رہی تھیں۔ بسنت کی آمد آمد تھی۔ فضا خوش گوار تھی، مہک رہی تھی۔

رحیم داد صبح سے کھیتوں کے درمیان گھوم رہا تھا۔ فصل کے بارے میں مزارعوں سے ہنس ہنس

کرنا پس کر رہا تھا۔ جب وہ حویلی میں واپس پہنچا تو پھر دن گزر چکا تھا۔ سورج نیلے آسمان پر دھک رہا تھا۔ دھوپ کی حرارت اور گرمی بڑھ گئی تھی۔

رحیم داد ٹھٹھا ہوا مہمان خانے میں چلا گیا۔ مہمان خانہ خالی پڑا تھا۔ ماسٹر عبداللطیف اپنے بال بچوں کے ساتھ جا چکا تھا۔ اسے سکھر کے ایک اسکول میں ملازمت مل گئی تھی۔ پچھلے چار ماہ سے وہ سکھر ہی میں تھا۔ رحیم داد نے اسے روکنا بھی چاہا مگر اس کی بیوی کسی طور راضی نہ ہوئی۔ وہ مزاج کی تیز اور طرار تھی۔ آئے دن نادر خان کی بیوی، جنت، سے اس کا جھگڑا ہوتا تھا۔ عبداللطیف بیوی سے دیتا بھی تھا۔ منع کرتا تو اس کی ذرا پرواہ نہ کرتی۔ حقارت سے جھڑک دیتی۔ عبداللطیف روز روز کے جھگڑے سے عاجز آ گیا تھا۔ اور جیسے ہی اپنے رشتے کے ایک سالے کے ذریعے ملازمت کی سہیل پیدا ہوئی اور بیوی نے دباؤ ڈالا، اس نے بس تو ریا باندھا اور سکھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

عبداللطیف کے جانے کی بعد رحیم داد نے مہمان خانے کی مرمت کرائی تھی۔ دو نئے کمرے تعمیر کرائے تھے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کر نیا فرنیچر ڈلوایا تھا۔ دو دیواریں نیا رنگ روغن کیا گیا۔ پردے تبدیل کئے گئے۔ اب مہمان خانے کا کلیہ بالکل بدل گیا تھا اور اس قابل ہو گیا تھا کہ سرکاری افسر اور دوسرے مہمان قیام کرتے تو آرام و سکون محسوس کرتے۔

رحیم داد مہمان خانے سے باہر جا رہا تھا کہ دروازے پر نادر خان مل گیا۔ رحیم داد نے دریافت کیا۔ ”تو سید حالور ہی سے آرہا ہے؟“

”دو روز تو مہمان علی کے پاس شاہ جی کی کوٹھی میں رہا، پر رات کو پیراں والہ آ گیا تھا۔ مہمان بھی ساتھ ہی آیا ہے۔ وہ پیراں والہ ہی میں ہے۔“

”وہ پیراں والہ کیوں آ گیا؟“

”شاہ جی آج کراچی سے واپس آرہا ہے۔“ نادر خان نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ لمبور کی بجائے اس دفعہ پیراں والہ ٹھہرے گیا۔“

”شاہ جی کب پیراں والہ پہنچے گا؟“

”اے لینے سویرے ہی سویرے ڈرائیور کارلے کر سٹیشن چلا گیا تھا۔ مہمان نے مجھے ادھر بھیج دیا۔ کما چوہدری کو اپنی ساتھ لے کر پیراں والہ آجا۔ شاہ جی نے چوہدری سے آج ہی ملنا ہے۔ فون پر شاہ جی نے اسے یہی کہا تھا۔“

”ایسا ہے تو روٹی کھا کر پیراں والہ کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔“ رحیم داد نے اپنا پروگرام

تایا۔ ”تب تک شاہ جی بھی پہنچ جائے گا۔“

نادر خان سے رحیم داد نے مزید بات چیت نہیں کی۔ وہ اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ رحیم داد حویلی کی جانب مڑ گیا۔

دوپہر کا کھانا شاداں کے ساتھ کھانے کے بعد رحیم داد نے جیب منگوائی اور احسان شاہ سے ملنے پیراں والہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ نادر خان بھی اس کے ہم راہ تھا۔ نادر خان اب پہلے کی نسبت کسی قدر فریہ ہو گیا تھا۔ مگر اس کے سر اور مونچھوں کے بال زیادہ سفید ہو گئے تھے جو مندی کا دوسرا لگانے کے باعث سرخی مائل نظر آتے تھے۔ البتہ وہ ابھی تک نہایت چاق چوبند تھا اور اپنے فرائض نہایت مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔



رحیم داد پیراں والہ پہنچا۔ احسان علی شاہ حسب معمول نہایت گرم جوشی سے ملا۔ مسکرا کر بولا "چوہدری! سنا ہے تو نے ویاہ کر لیا۔"

"تو نے ہی تو کراچی جانے سے پہلے کہا تھا فوراً ویاہ کر لے۔" رحیم داد نے بتایا۔ "میں نے وہی کیا جو تو نے کہا تھا۔ پہلے بھی تیرا مشورہ میں نے کب ٹالا ہے۔"

"یہ تو نے بہت نیک کام کیا۔ تیرے لیے ویاہ کرنا، ضروری تھا۔" اس نے ٹوہ لگا۔ "کی کوشش کی۔" وہ بھی کیسی ہے؟ کہاں کیا ویاہ؟

"بس جی ٹھیک ہی ٹھاک ہے۔" رحیم داد نے کھل کر بات نہ کی۔ وہ شاداں کے بارے میں اسے کچھ بتانا نہ چاہتا تھا۔ "ایک گھروالی چاہیے تھی وہ آگئی۔"

احسان شاہ نے بھی مزید پوچھ گچھ نہ کی۔ بس کر بے تکلفی سے بولا۔ "نئی بنی وہی ملی ہے۔ تو آج کل تو اس کے ناز نخرے اٹھانے میں لگا ہو گا۔ عیش کر رہا ہو گا۔" اس نے ایک آنکھ دبا کر سرگوشی کی۔ ایسی بات کسی کہ رحیم داد کچھ کہہ نہ سکا۔ شرابا کر رہ گیا۔

احسان شاہ اسے لان پر لے گیا۔ سر پہر کی ہلکی دھوپ میں کئی کرسیاں گھاس پر قرینے سے رکھی تھیں۔ ایک کرسی پر علی نواز چاندیو بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ وہ سندھ کا ایک بڑا وڈیر تھا۔ ادھیڑ تھا۔ احسان شاہ کے ساتھ کراچی سے آیا تھا اور اس کے حویلی کی مہمان خانے میں ٹھہرا تھا۔ احسان شاہ نے رحیم داد سے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے اٹھ کر رحیم داد سے مصافحہ کیا۔ حسب دستور حال احوال دریافت کیا۔

جب تینوں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے تو علی نواز چاندیو نے احسان شاہ کو مخاطب کیا "سائیں احسان شاہ! تو نے اخبار میں وہ خبر تو پڑھی ہوگی۔ ڈیرہ غازی خان کے علاقے، چوٹی بالا۔"

ایک نہر چوری ہو گئی۔"

"نہر چوری ہو گئی؟" رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ "نہر کیسے چوری ہو سکتی ہے جی۔ یہ بات سمجھ نہیں آئی۔"

"سمجھ نہ آنے والی بات ہی ہے۔ اب تک تو موسیوں کی چوری کی واردات سنی تھیں۔ مال اسباب اور روپے پیسے کی چوری سنی تھی۔ طرح طرح کی اور چوریاں سنی تھیں، لیکن نہر کی چوری کے بارے میں تو اب تک نہ سنا نہ دیکھا۔" علی نواز نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "سائیں، معلوم ہوتا ہے تو نے وہ خبر نہیں پڑھی۔"

"کیوں نہیں پڑھی؟" پر اب تو خبر پرانی ہو گئی۔ "احسان شاہ نے بتایا۔" اس کے بارے میں تو انکو اڑی بھی ہوئی تھی۔

"نہر تو جی چوری ہونے سے رہی۔" رحیم داد نے کھل کر اپنے تجسس کا اظہار کیا۔ "یہ تو کچھ اور ہی چکر جان پڑتا ہے۔"

"چکر شکر کیا ہے۔ ہوا یہ کہ لغاریوں کا ایک وڈا سردار، صوبائی وزیر زراعت و آب پاشی لگ گیا تھا۔ اس کی وزارت کے زمانے میں چوٹی بالا کے لیے ایک نہر تعمیر کرنے کے منصوبے پر کام ہو رہا تھا۔" احسان شاہ نے مطلع کیا۔ "لغاری سرداروں کی زمینیں چوٹی زیریں کے علاقے، درخواست ہمال میں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے چوٹی بالا میں نہر نکلنے سے وزیر کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس نے سوچا موکے سے فائدہ اٹھایا جائے۔ چوٹی بالا کی بجائے نہر کے پانی سے اپنی بنجر اور غیر مزدور زمینوں کو زرخیز بنایا جائے۔ اس نے محکمہ آب پاشی کے افسروں اور انجینئروں کو اپنے ساتھ ملایا۔ کسی کو بد موثر دی۔ کسی کی تنخواہ بڑھائی۔ نہر کی کھدائی رکوائی۔ سروے رپورٹ بدلوائی اور سرکاری ریکارڈ میں بالا کی جگہ زیریں لکھوا دیا۔"

"یہ تو جی اس نے زبردست کارروائی ڈالی۔" رحیم داد نے ہنس کر تبصرہ کیا۔

"اس طرح جو نہر چوٹی بالا سے گزرتی تھی، چوٹی زیریں پہنچ گئی۔" احسان شاہ نے مزید تفصیل بتائی۔ "چوٹی بالا کی پیاسی زمینیں، جو برسوں سے پانی کو ترس رہی تھیں، بنجر اور غیر آباد ہی رہیں۔ اور بنی زیریں کے درخواست جمال کی زیر کاشت اراضی میں ہزاروں ایکڑ کا اضافہ ہو گیا۔ زمیں ایسی زرخیز ہو گئی کہ اب سونا اگتی ہے۔ ویران اور چٹیل میدان کی جگہ ہر طرف فصلیں لہلہاتی نظر آتی ہیں۔"

"سائیں، چوٹی بالا میں بھی تو زمین دار ہوں گے۔ انھوں نے شور شرابہ نہیں کیا۔" علی نواز نے

مگر رحیم داد نے اس سے اتفاق رائے نہیں کیا۔ ”جب ایس ڈی او اور سیر معطل کیے گئے تو وزیر کے خلاف بھی کچھ نہ کچھ کارروائی تو ہونی ہی چاہیے تھی۔ جرم بھی اس نے معمولی نہیں کیا تھا۔ پوری نہری سرست بدل کر اپنی بنجر زمینوں کو زرخیز بنانے کے لیے لے گیا۔ حد ہو گئی جی۔“

”چوہدری، تجھے پتہ نہیں۔ وہ لغاریوں کا بہت ڈا سردار ہے۔ تو ڈیرہ غازی خان میں رہ چکا ہے۔ تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سرداروں سے تو ہر حکومت ڈرتی ہے۔ ادھر تو ان کی حکمرانی اور ان کا ہی کون چلتا ہے۔“ احسان شاہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”سرداروں کے خلاف نہ پہلے کوئی کارروائی ہوتی تھی اور نہ اب ہوتی ہے۔ تب ہی تو ساری انکوائری شکواری دبا دی گئی۔“

”ایسا ہونا نہیں چاہیے تھا۔“ رحیم داد نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔

”دیے انکوائری سے ہوتا بھی کیا۔ نہ تو بن ہی چکی تھی۔ نہ اسے توڑ پھوڑ کر ختم کیا جاسکتا تھا نہ اٹھا کر چوٹی زیریں سے چوٹی بالا پہنچایا جاسکتا تھا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”لغاری وزیر نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اس کی میلوں تک پھیلی ہوئی بیکار اور بنجر زمینوں کو اتنا پانی لگے لگا کہ جیسی چاہے فصلیں اگائے۔ اس کے ساتھ دوسرے لغاری سرداروں کے بھی عیش ہو گئے۔ چوٹی بالا والوں کے شور شرابے صرف شور شرابے ہی ہو کر رہ گئے۔“

”سائیں، چوٹی بالا کے زمین داروں کی زمینیں تو ابھی تک بنجر اور غیر آباد پڑی ہیں۔ وہ کیسے چپ رہ سکتے ہیں۔“ علی نواز چانڈیو نے تازہ ترین صورت احوال سے آگاہ کیا۔ ”انھوں نے معاملے کو دوبارہ اٹھایا۔ تب ہی تو ایک بار پھر انکوائری شروع ہونے والی ہے۔ اور اس بار تو مارشل لا کے تحت ہونے والی ہے۔ میں نے یہی بتانے کے لیے تو بات چھیڑی تھی۔ سائیں اب حالات پہلے سے نہیں رہے۔ نہ اسمبلیاں رہیں نہ ان کی جمہری نہ وزارتیں۔ وہ سارا سیاسی چکر ہی ختم ہو گیا۔“

”انکوائریاں تو دوسرے بھی کئی وزیروں کے خلاف ہو رہی ہیں۔ پر میں تو یہی کہوں گا ہونا ہونا کچھ نہیں۔“ احسان شاہ نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی ”علی نواز تو خاندانی وڈیرا ہے بہت وڈا زمیں دار ہے۔ یہ بتا تو نے کبھی کسی وڈے زمیں دار کے خلاف کارروائی ہوتے دیکھی یا کئی ہے۔“

”پہلے تو نہیں دیکھی لیکن آئندہ کی کچھ خبر نہیں۔“ اس کے لمبے سے تشویش صاف عیاں تھی۔ ”سائیں، روز ہی تو مارشل لا کے نئے نئے ضابطے جاری کئے جا رہے ہیں۔ طرح طرح کے آرڈیننس نافذ ہو رہے ہیں۔ سب سے زیادہ پریشانی تو زرعی اصلاحات کی ہے جو سر پر حکومت کی طرح

کریڈ کر پوچھا۔ ”ان کے ساتھ تو بہت ظلم ہوا۔“

”چوٹی بالا میں زمیں دار تو ہوتے ہیں، پر زیادہ تر چھوٹے ہی زمیں دار ہیں۔ لغاری سرداروں کے سامنے تو بہت چھوٹے ہیں۔ ان کا زیادہ اثر و رسوخ بھی نہیں۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”انھوں نے احتجاج کیا۔ اوپر درخواستیں بھی لگائیں۔ ان کے وفد وزیر اعلیٰ اور گورنر سے بھی ملے۔ پر کوئی کارروائی نہ ہوئی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”چوٹی بالا کا ایک وکیل بہت ہشیار نکلا۔ وہ لاہور میں پریکٹس کرتا ہے۔ اس کی کچھ زمین داری بھی چوٹی بالا کے علاقے میں ہوتی ہے۔ اس نے ایک اخبار کے ایڈیٹر سے مل کر نہری چوری کی خبر لگوا دی۔ خبر ایسی انوکھی اور چونکا دینے والی تھی کہ ہر طرف اس کا چرچا ہو گیا۔ بات اتنی زیادہ پھیلی کہ ایک ممبر نے صوبائی اسمبلی میں بھی اس مسئلے کو اٹھایا۔ زبردست بحث ہوئی۔ آخر یہ ملے ہوا کہ سارے معاملے کی انکوائری کرائی جائے۔“

”سائیں، انکوائری کا کیا نتیجہ نکلا؟“ علی نواز چانڈیو نے استفسار کیا۔

”نتیجہ کیا نکلتا تھا۔ ایک ایس ڈی او اور دو اور سیر معطل کر دیے گئے۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے جواب دیا۔ ”وزیر آب پاشی اور اس کے گروپ کے اسمبلی ممبروں نے دباؤ ڈال کر ان کو بھی ملازمت پر بحال کرا دیا۔ تینوں کو صرف اتنی سزا ملی کہ تبادلہ کر کے دوسرے ضلع میں لگا دیا گیا۔“

”وزیر آب پاشی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوئی؟“

”اس کے خلاف کیا کارروائی ہونی تھی۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”صوبائی اسمبلی میں اس کا گروپ بہت نکڑا تھا۔ اس کے گروپ کے ممبروں کی مدد جاتی رہتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا پوری کابینہ ہی ختم ہو جاتی۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزیروں کو اس خلاف کارروائی کر کے اپنی وزارتوں سے ہاتھ دھونا تھا؟“

”سائیں، یہ تو بہت سنگین جرم تھا۔“

”یار علی نواز تو کیسی گل کر رہا ہے۔ ایسے جرائم تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ سیاست میں ان کو ج شرم نہیں سمجھا جاتا۔“ احسان شاہ نے علی نواز کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ جو وڈے وڈے زمیں دار اسمبلی کی ممبری حاصل کرنے اور وزیر بننے کے لیے اتنا روپیہ پیسہ خرچ کرتے ہیں بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ طرح طرح کی رشوتیں دیتے ہیں، تو وہ صرف اسمبلی میں ٹکریں کر وزیر کھلانے کے لیے تو نہیں کرتے۔ پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کی ”سچی بات یہ ہے جی۔ ان کو ایسا کرنا بھی چاہیے۔ گھانے کا سودا کوئی نہیں کرتا۔ غلط کہہ رہا،



علی نواز چانڈیو نے جن خدشات کا اظہار کیا تھا ان کی نوعیت یہ تھی کہ ملک میں مارشل لاء نافذ ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد زرعی اصلاحات کا اعلان ہوا۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے حکم سے ایک لینڈ ریفارم کمیشن مقرر کیا گیا۔ کمیشن نے ۱۹۵۹ء کے اوائل میں اپنی رپورٹ مارشل لاء حکومت کو پیش کر دی۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر فروری میں مارشل لاء ضابطہ نمبر ۲۳ نافذ کیا گیا۔ اس ضابطے کے ذریعے جو زرعی اصلاحات کی گئیں، وہ کچھ اس طرح تھیں۔

۱۔ زرعی اراضی کی حد ملکیت پانچ سو ایکڑ نہری یا ہزار ایکڑ بارانی یا ۳۶ ہزار پیدلاری یونٹ جو بھی زیادہ ہو، مقرر کی گئی۔

۲۔ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے بعد اگر کسی زمین دار نے جس کی اراضی مقررہ حد ملکیت سے زیادہ تھی اور اس نے اپنی اراضی یا اس کا کچھ حصہ رہن، بیع یا ہبہ کر دیا تھا، ایسا ہر رہن، بیع یا ہبہ کا عدم قرار دے دیا گیا۔

۳۔ مقررہ حد ملکیت اراضی سے یونیورسٹیوں اور منظور شدہ تعلیمی اداروں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۴۔ دینی اور رفاہی اداروں کو بھی مقررہ حد ملکیت اراضی سے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۵۔ گھوڑی پال، گائے پال اور بکری پال فارموں کے مالکان کو بھی مقررہ حد ملکیت سے فارموں کے زیر استعمال اراضی کی حد تک، مستثنیٰ قرار دیا گیا۔

۶۔ زرعی اراضی کے مالکان کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ مقررہ حد ملکیت کے علاوہ ۵۰ ایکڑ اراضی باغات کے مالک رہ سکتے ہیں۔

۷۔ مالکان اراضی کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ ۱۸ ہزار پیدلاری یونٹ تک اپنے ورثا میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایسی مستورات کو، جن کی وہ کفالت کرتے ہوں، ۶ ہزار پیدلاری یونٹ منتقل کر سکتے ہیں یا بطور عطیہ دے سکتے ہیں۔

۸۔ مقررہ حد ملکیت اور مستثنیات کے تحت آنے والی اراضی کے علاوہ تمام فاضل اراضی مالکان سے جتنی سرکار لے لی جائے گی اور ایک مقررہ فارمولے کے تحت اس اراضی کے مالکوں معاوضہ دیا جائے گا۔

۹۔ مالکان سے حاصل کی جانے والی اراضی، مزارعوں اور گزراہ ملکیت سے کم اراضی رک والوں کے ہاتھوں فروخت کرنا ممنوع قرار دیا گیا اور فروخت کے وقت قابض مزارعوں کا حق افہ

۱۰۔ غیر اقتصادی ملکیتوں کی فروخت اور تقسیم وغیرہ پر پابندی عائد کر دی گئی۔

۱۱۔ مزارعوں کی بے دخلی کے متعلق مروجہ قوانین جاری رکھے گئے۔



علی نواز کے بشرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ رحیم داد بھی مضطرب اور گم صم بیٹھا تھا۔ مگر احسان علی شاہ مطمئن اور نہایت ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس نے مسکرا کر علی نواز کی جانب دیکھا۔ بے تکلفی سے گویا ہوا۔ ”جب سے مارشل لاء یوٹیشن ۲۳ سامنے آیا ہے علی نواز تیری طرح زرعی اصلاحات کا بھوت نہ جانے کتنے ڈرے زمین داروں اور بگیرداروں کے سروں پر خطرہ بن کر منڈلا رہا ہے۔ سب ہی تیری طرح ڈرے ہوئے ہیں۔“ اس کا لہجہ قدرے سنجیدہ ہو گیا۔ ”پر یہ تو سوچ، زرعی اصلاحات پہلی بار تو ہوئی نہیں۔ پیچھے بھی ہوتی رہی ہیں۔“

”مشرقی پاکستان میں تو سائیں ۱۹۵۰ء ہی میں زرعی اصلاحات کا قانون لاگو ہو گیا تھا۔ کسی بھی زمین دار یا مالک اراضی کو ایک سو بیگھ سے زیادہ زمین رکھنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔“ علی نواز چانڈیو نے مطلع کیا۔

”یہ ایک سو بیگھ کتنے کلا زمین ہوتی ہے؟“ رحیم داد نے استفسار کیا۔

”۳۳ ایکڑ اور وہ بھی فی کتبہ۔“ علی نواز چانڈیو نے جواب دیا۔

”یہ تو جی بہت کم زمین ہوئی۔“ رحیم داد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”اتنی تھوڑی زمین سے کیا بنتا ہو گا۔“

احسان شاہ نے رحیم داد کی تشویش نظر انداز کرتے ہوئے علی نواز چانڈیو سے کہا۔ ”ادھر کی گل چھوڑ، بنگال اسبیلی میں تو پاکستان بننے سے پہلے ہی زمین داری ختم کرنے کا کانون منظور ہو چکا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں تو اسے لاگو کیا گیا تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کیا گیا تھا کہ مشرقی پاکستان کے لگ بھگ سارے ہی وڈے زمین دار ہندو ہوتے تھے۔ مسلمان زمین دار چھوٹے تھے اور مغربی پاکستان کی طرح وڈے اور ٹکڑے بھی نہ تھے۔ اس طرف کا تو حال ہی کچھ اور ہے۔“ اس نے ہلکا ہلکا لگایا۔ ”وزیر تک ایسے ہیں کہ دیکھنے میں بالکل یتیم نظر آتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے معمولی مکانوں میں رہتے ہیں۔ نہ کسی کے پاس موٹر ہے نہ گڈی۔ اور کسی کے پاس ہے تو ایسی پرانی کھٹارا جیسے کباڑ خانے سے اٹھا کر لایا ہو۔ میں تو ادھر کئی بار جا چکا ہوں۔ سب کو ٹھیک طرح جانتا ہوں۔“

”کراچی میں ادھر کے ذریعوں سے تو ہمارا بھی میل ملاپ رہتا ہے۔“ علی نواز چانڈیو نے کہا۔

”سائیں“ تجھے تو معلوم ہی ہے۔ میں تو زیادہ تر کراچی میں ہی رہتا ہوں اور برسوں سے رہتا ہوں۔“
 ”مجھے پتہ ہے اور ٹھیک طرح پتہ ہے تو کراچی ہی میں ہوتا ہے۔ پر تو اکیلا نہیں۔ سندھ کے زیادہ تر وڈے زمین دار اور بگیر دار کراچی یا حیدر آباد میں ہوتے ہیں۔ سب ہی نے وہاں اپنی اپنی کوٹھیاں اور بنگلے بنا رکھے ہیں۔“
 ”سائیں ایسا نہ کریں تو کیسے کام چلے۔ گوٹھ میں نہ بجلی ہے نہ ٹکے، اسکول ہیں بھی تو ایسے ہیں کہ ان میں ہاریوں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ اب ہاریوں کے بچوں کے ساتھ ہمارے بچے کیسے پڑھ سکتے ہیں؟“

”ادھر تو سکول بننے ہی نہیں چاہیے۔ ہاریوں اور مزارعوں کے پتر پڑھ لکھ جاتے ہیں تو سرکشی کرتے ہیں۔ کنون کی گل بات کرتے ہیں۔“ احسان شاہ نے علی نواز چانڈیو کو مشورہ دیا۔ ”میں نے تو اپنی زمین داری میں آج تک کوئی سکول شکول نہیں بننے دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے بھی بہت زور لگایا، پر میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔“

”سائیں تو نے بالکل ٹھیک کیا۔“ علی نواز نے احسان شاہ سے اتفاق رائے کیا۔ ”گوٹھ میں نہ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ جوان لڑکے ادھر زمین داری پر رہتے ہیں تو بد معاشوں اور پتھاریداروں کی صحبت میں رہ کر خراب ہو جاتے ہیں۔ ہاریوں کی عورتوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ نشہ کرتے ہیں، مرغ اور کتے پالتے ہیں۔ ان کو لڑاتے ہیں۔ لمبی لمبی شرمیں لگاتے ہیں۔ ہزاروں روپیہ برباد کرتے ہیں۔ زمین داری سے تو ان کو کچھ مطلب ہوتا نہیں۔ صرف عیاشی کرتے ہیں۔“

احسان شاہ نے اس کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تجھے یہ تو پتہ ہو گا سندھ میں زرعی اصلاحات کے لیے ہاری کمیٹی بنائی گئی تھی۔“

”سائیں“ بالکل یاد ہے۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں بنی تھی۔“

”سر راج راج ناس اس کا چیئرمین ہوتا تھا۔“ احسان شاہ نے بات آگے بڑھائی۔ ”مسعود بھی اس کمیٹی کا ممبر ہوتا تھا۔ بہت وڈا افسر تھا۔ آئی سی ایس تھا۔ پر نہ جانے کیسے زمین داروں کا سخت دشمن بن گیا تھا۔“ اس نے ایک عدد گندی گالی دی۔ ”کسی کمیٹی شمی خاندان سے رہا ہو گا۔ اس نے زمین داروں کے خلاف بہت بکواس کی۔ ہاری کمیٹی کی رپورٹ کے ساتھ اختلافی نوٹ بھی لکھا۔“ احسان شاہ کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ ”اس میں یہ کہا تھا کہ زمین داری بالکل ختم کر دی جائے اور ان کی ساری اراضی کسانوں کو دے دی جائے۔ پر حکومت میں بھی زمین دار موجود تھے۔“

انہوں نے دباؤ ڈال کر مسعود کا اختلافی نوٹ رکوا دیا تھا۔“ اس نے مڑ کر علی نواز کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تجھے تو اس کے بارے میں یاد ہو گا۔“

”یاد ہے۔ سائیں ہم کو بالکل یاد ہے۔“ علی نواز نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔

”تجھے یہ بھی پتہ ہو گا سر راج ناس خود بھی بہت وڈا زمین دار تھا۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”جب ہی تو اس نے جو رپورٹ تیار کرائی تھی اس میں صاف صاف لکھا تھا کہ ہاریوں کو اگر کوئی تکلیف شکایت ہے تو وہ خود اس کے ڈسے دار ہیں۔ زمین دار تو ہر طرح ان کی مدد ہی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پر وہ ان کے احسانات کو مانتے ہی نہیں اور نہ ان کی مدد سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔“

”سائیں“ تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ علی نواز نے بھی اپنی معلومات کا مظاہرہ کیا۔ ”کمیٹی نے تو اپنی رپورٹ میں ہاریوں کو مستقل حقوق کاشت دینے پر بھی اعتراض کیا تھا۔ لیکن کمیٹی کے ممبروں کی اکثریت نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ حکومت، بیٹائی کو باقاعدہ بنائے اور ہاریوں کو ان کے حقوق دینے کے لیے قانون بنائے۔“

”پر اس کا تو کچھ نتیجہ نکلا شکلا نہیں۔ ہاں، مسعود کے نوٹ کے بارے میں اخبارات نے بہت شور مچا دیا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”حکومت سے مطالبہ کیا کہ کمیٹی کی رپورٹ شائع کی ہے تو مسعود کا اختلافی نوٹ بھی شائع کیا جائے۔ تب ہی تو لیاکت علی خان نے اس معاملے کی جانچ پڑتال کے لیے مسلم لیگ کی ایک خاص کمیٹی بھی بنائی تھی۔ اس کمیٹی نے بھی زمین داروں کے خلاف کارروائی کرنے پر زور دیا تھا۔ پر زمین دار بھی کمزور نہیں تھے۔ ان کا بھی مسلم لیگ میں زبردست زور رہا ہے۔ انہوں نے وہ رپورٹ ہی دیوا دی۔“

”لیکن سائیں، ملاؤں اور مولویوں نے بھی زمین داروں کی بہت مدد کی۔“ علی نواز چانڈیو نے کہا۔ ”انہوں نے مسعود کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ وہ کمیونسٹ اور ملحد ہے اور اس کا اختلافی نوٹ غیر اسلامی ہے۔ یہ فتویٰ اخبارات میں چھپوانے کے علاوہ ملاؤں کی طرف سے مفت بانٹا گیا۔ پوسٹر بنا کر ہر جگہ دیواروں پر لگایا گیا۔“

”پر تجھے پتہ نہیں اس فتوے نے آگے چل کر بہت گڑ بڑ پیدا کی۔“ سید احسان علی شاہ نے انکشاف کیا۔ ”یہ فتویٰ حکومت سندھ نے دس ہزار روپے رشوت دے کر ملاؤں سے لیا تھا۔ مسعود کے ہاتھ اس کا دستاویزی ثبوت لگ گیا۔ اس نے صوبائی حکومت کو ہنگ عزت کا مکدمہ چلانے کا نوٹس دیا۔ ۵ لاکھ روپے ہر جانے کا مطالبہ کیا۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”ادھر

اخبارات میں یہ اعتراض اٹھایا جا رہا تھا کہ جب مسعود کا نوٹ شائع ہی نہیں ہوا تو ملاؤں کو کیسے پتہ چل گیا اس میں کیا لکھا ہے۔ تب تک وہ ایک خفیہ سرکاری دستاویز تھی۔

”ہاں سائیں، بہت گڑبڑ پیدا ہوئی تھی۔“ علی نواز چانڈیو نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس وقت پیر الٹی بخش وزیر اعلیٰ تھا۔ اس اسکنڈل سے اس کی اتنی بدنامی ہوئی کہ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اسے برطرف کر کے یوسف ہارون کو سندھ کا وزیر اعلیٰ لگا دیا۔ اس نے وزیر اعلیٰ بننے ہی مسعود کا اختلافی نوٹ چھاپنے کا حکم دیا۔ آخر اسے شائع کر دیا گیا۔“

”پر یہ ہوا بہت برا۔“ احسان شاہ نے منہ بگاڑ کر خفگی کا اظہار کیا۔ ”لیاقت علی خان کو اس طرح دینا نہیں چاہیے تھا۔“

”سائیں ایسا نہ کیا جاتا تو کیسے کام چلتا۔“ علی نواز چانڈیو نے احسان شاہ سے اتفاق رائے نہ کیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ سندھ میں ان دنوں ہاریوں نے بٹائی کی زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ وہ فصل کا نصف حصہ مانگتے تھے۔ ان کے لیڈر میاں محمد مبارک تاپور، خدا داد اور رئیس بروہی تھے۔ ایک تھانیدار بھی ملازمت چھوڑ کر ان کے ساتھ لگ گیا تھا۔“

”تھانیدار بھی ان کے ساتھ لگ گیا تھا؟“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”ہاں سائیں، صرف تھانیدار ہی نہیں، شہداد پور کا ایک ہندو ڈاکٹر آشاد رام بھی ان کے ساتھ تھا۔“ علی نواز نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”حیدر بخش جتوئی تو بہت بڑا افسر تھا۔ کلنگڑ لگا ہوا تھا۔ مگر سرکاری نوکری چھوڑ کر ہاریوں کا لیڈر بن گیا۔ کئی بار جیل بھی گیا۔“

”اس زمانے میں سندھ میں ہاریوں نے گڑبڑ بھی بہت پھیلا رکھی تھی۔“ احسان شاہ نے تبصرہ کیا۔

”تب ہی تو ہاری کمیٹی کے بعض ممبروں کو جھکنا پڑا۔“ علی نواز نے بتایا۔ ”کمیٹی کی رپورٹ کی بنیاد پر ۱۹۵۰ء میں سندھ ٹینسی ایکٹ بھی منظور کرنا پڑا۔ اس ایکٹ کے تحت ہاریوں سے بے گار لینے اور نذرانہ وصول کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ ہاریوں کو یہ حق بھی دیا گیا کہ جو ہاری کم از کم تین سال تک ایک ہی مالک کے چار ایکڑ پر کاشت کرے، اسے مستقل ہاری ہونے کا حق حاصل ہو جائے گا۔“

”سچ بتا۔ ان زرعی اصلاحات کا اور مسعود کی سفارشات کا کیا نتیجہ نکلا؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔ ”ہاریوں کو جو کچھ دیا گیا تھا، مل گیا؟“

”شروع شروع میں تو سائیں سارے ہی زمین داروں کو دینا پڑا۔ فصل کی نصف بٹائی بھی دینی

پڑی۔ نہ دیتے تو ہاریوں کے لیڈر اپنے ساتھیوں کے جتھے لے کر پہنچ جاتے۔ وہ سرخ جھنڈا ہاتھوں میں اٹھائے، نعرے لگاتے ہوئے گوٹھ میں داخل ہوتے اور زبردستی فصل کا نصف حصہ ہاریوں کو دے دیتے۔ ترازو نہ ملتی تو زمین کے ڈبے سے فصل کو دو برابر حصوں میں بانٹ دیتے۔“ علی نواز ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ ”وڈیرے اور زمیں دار اپنی مدد کے لیے پتھاریداروں کو اکٹھا کرتے، مگر ہاریوں کی طاقت ان دنوں ایسی زبردست تھی کہ پتھاریدار اور پولیس والے لال جھنڈے والوں کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے۔ وڈیرے ان سے ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ سرہاری کے ایک ہندو وڈیرے بھانول کے گوٹھ میں لال جھنڈے والے بچے تو وہ اتنا گھبرا گیا کہ گھوڑوں کی لگام پکڑ کر ان کو نیچے اترنے کے لیے سارا دیا۔ اپنے ہاتھ سے گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھا۔ اوطاق میں لے جا کر خود نیچے زمیں پر بیٹھا اور ان کو چارپائی پر بٹھایا۔ جو انھوں نے کہا، بالکل ویسا ہی کیا۔“

”لگتا ہے سندھ کے زمیں دار بہت کمزور اور بزدل ہیں۔“ احسان شاہ نے جھنجھلا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”سائیں، ایسی بات نہیں۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔“ علی نواز نے وضاحت کی۔ ”بعد میں وڈیروں نے بھی اپنی طاقت بڑھائی۔ اپنے کمداروں اور نوکروں کی تعداد میں اضافہ کیا۔ پتھاریداروں اور پولیس کی مدد حاصل کی۔ سرکاری افسروں کو لمبی لمبی رشوتیں دے کر اپنے ساتھ ملایا۔ ہاریوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنے کی پوری پوری تیاری کی۔“ اس نے احسان شاہ کی جانب نظر بھر کر دیکھا۔ ”سائیں، اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ سنا تھا۔ میر پور خاص میں رلوہ کے مرزا حامد کی بہت بڑی جاگیر ہے۔ اس کے ایک گوٹھ میں فصل کی کٹائی ہو چکی تھی۔ مگر بٹائی نہ ہوئی تھی۔ گوٹھ کے سارے ہی مرد، ہاری کمیٹی کے ایک جلسے میں شرکت کرنے شہر گئے ہوئے تھے۔ قادیانوں کے میمنہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اپنے کمداروں اور پتھاریداروں کو لے کر گوٹھ میں پہنچا۔ ان کو حکم دیا کہ ساری فصل اٹھا کر لے جائیں۔ گوٹھ کی ایک بوڑھی عورت مائی بختارو نے ان کو فصل نہ اٹھانے دی۔ اناج کی ڈھیری پر جا کر لیٹ گئی۔ کسنے لگی آدمی سے زیادہ فصل کا ایک دانہ اٹھانے نہ دوں گی۔ زمیندار کے آدمیوں نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی۔ بندو قیں تان کر پہلے اسے دھمکی دی۔ جب وہ نہ اٹئی تو فائرنگ شروع کر دی۔ اتنی گولیاں برسائیں کہ اس کا بدن چھلکی ہو گیا۔ وہ اناج کے ڈھیری ہی پر مر گئی۔ کمداروں اور پتھاریداروں نے اس کی لاش اٹھا کر ایک طرف پھینکی اور ساری فصل اٹھا کر لے گئے۔“

”ہاریوں نے بعد میں بہت شور شرابہ کیا ہو گا۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔

”ہاں سائیں، انھوں نے بہت شور مچایا۔ جلے کئے۔ تھانے میں رپوٹ لکھوائی۔ وزیروں اور افسروں کو درخواستیں دیں۔ لیکن کوئی کارروائی نہ ہوئی۔“ علی نواز چانڈیو نے بتایا۔ ”پھر تو زمیں داروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے کہ ہاریوں کو پوری بٹائی دینی بھی بند کر دی۔ بے دخلیاں بھی شروع کر دیں۔ جو سرکش ہاری تھے ان کے خلاف فوجداری کیس بنائے اور جیلوں میں بند کروا دیا۔ موٹی اٹھوائے۔ نوجوان عورتوں کو اغوا کر لیا۔ گھروں میں آگ لگا کر ٹریکٹر چلوا دئے۔ ہاری ایسے ڈرے کہ کتنے ہی اپنے گوتھ جھوڑ کر بھاگ گئے۔ دوسروں نے ڈیڑوں کے پیروں پر ٹوپیاں اور پگڑیاں ڈال دیں۔“

”زمیں داروں کو یہ کام تو پہلے ہی کرنا چاہیے تھا۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”اصلی گل بات یہ ہے جی، کنون تو بننے ہی رہتے ہیں۔ ان کی پابندی کون زمین دار کرتا ہے۔ کون تو پہلے بھی زمیں داروں کا چلتا تھا بعد میں بھی چلتا رہا۔ ہاری یا مزارعے جب بہت زیادہ شور شرابہ کرتے ہیں تو ان کو چپ کرنے کے لیے زرعی اصلاحات کا چکر چلایا جاتا ہے۔“

”پنجاب میں بھی تو پہلے زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں۔“ رحیم داد نے یاد دلایا۔

”اس کے بارے میں تو مجھے بھی اچھی طرح پتہ ہے۔“ علی نواز نے کہا۔ ”سندھی ڈیڑوں میں بھی اس کا بہت ذکر ہوتا تھا۔ سائیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ مارچ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا۔ اخباروں میں اس کی خبریں روز چھپتی تھیں۔ حکومت پنجاب نے ایک انکوائری کمیٹی بنائی تھی۔ ملک فیروز خان نون اس کا چیئرمین تھا۔ اس کمیٹی کی رپوٹ پر ۱۹۵۰ء میں اور پھر ۱۹۵۲ء میں زرعی اصلاحات کی گئی تھیں۔ ان کا مقصد بے دخلیوں کو روکنا اور مزارعوں کو تحفظ دینا تھا۔“ اس نے مڑ کر احسان شاہ کی جانب دیکھا۔ ”سائیں، تجھے بھی یاد ہو گا۔ پنجاب اسمبلی کے جنوری ۱۹۵۳ء کے اجلاس میں بڑی گرما گرم بحث کے بعد زرعی اصلاحات کے بل پاس ہوئے تھے۔“

”تجھے تو بھیلی زرعی اصلاحات کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ یہ بھی پتہ ہے کہ کوئی مالک اراضی جو ایک ایکڑ سے زیادہ کا مالک ہو، ۵۰ ایکڑ نہری، ۵۵ ایکڑ نیم زرعی اور سوا ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ خود کاشت کے لیے نہیں رکھ سکتا۔ پر کس نے اس کی پابندی کی۔“ احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”مزارعوں کی بے دخلیاں جیسے پہلے ہوتی تھیں ویسے ہی بعد میں بھی ہوتی رہیں۔ بٹائی پر زمیں دار نہ مزارعے کو رسید دیتے ہیں نہ اس کے حصے کی پوری فصل دیتے ہیں۔ مزارعے کو بے دخل کرنا ہو تو اپنے حصے کی فصل نہیں اٹھاتے اور بٹائی نہ کرنے کے الزام میں مزارعے کے خلاف درخواست لگا دیتے ہیں۔ مطلب کہنے کا یہ ہے جی کہ ان زرعی اصلاحات کا کچھ

بھی نہ بنا۔“

علی نواز نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ رحیم داد بھی خاموش بیٹھا رہا۔

احسان شاہ بولتا رہا۔ ”زرعی اصلاحات کے تحت تو یہ بھی کنون میں تھا کہ کوئی مالک اراضی، مزارعے کو اس بیج کے علاوہ جو اس نے ادھا دیا ہو، زیادہ وصول کرے یا لگان کے علاوہ کوئی وصولی، خرچ، محصول یا نذرانہ وصول کرے، مزارعے کو غیر کنونی طور پر بے دخل کرے یا مکررہ خود کاشت اراضی سے زیادہ اپنے پاس رکھے اور افسر مال کو اس کی اطلاع نہ دے تو اس کے لیے ایک سال کی جیل اور جرمانے کی سزا یا دونوں ہی دی جا سکتی ہیں۔“ اس نے مسکرا کر علی نواز چانڈیو کو دیکھا۔ ”اب تو ہی ایمان سے بنا۔ سارے ہی زمیں دار کھلی خلاف ورزی کرتے ہیں، پر کون زمیں دار جیل گیا؟ کس پر جرمانہ لگا؟ کچھ بھی نہ ہوا۔ زمیں داری اسی رستے پر شان سے چل رہی ہے جس پر زرعی اصلاحات سے پہلے چلتی تھی۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”سائیں، بات تو تیری ٹھیک ہی ہے۔ لیکن ان دنوں حالات بھی دوسرے تھے۔“ علی نواز کے لہجے سے ایک بار پھر تشویش آشکارہ تھی۔ ”تب تک ملک میں مارشل لاء نہیں لگا تھا۔ نہ مارشل لاء کے ضابطے تھے نہ فوجی عدالتیں تھیں۔ اب تو نہ وکیل پیش ہو سکتے ہیں نہ ضمانت ہو سکتی ہے۔ آج مقدمہ شروع ہوا کل فیصلہ ہو گیا۔ جیل بھی ہوتی ہے، جرمانہ بھی لگتا ہے اور کوڑے بھی لگائے جاتے ہیں۔“

”تو فکر نہ کر۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔

”سائیں تیری بات دوسری ہے۔“ علی نواز پریشان نظر آ رہا تھا۔ ”تیرا ایک بیٹا محکمہ مال میں بڑا افسر ہے۔ بھتیجا فوج میں کرنل ہے اور مارشل لاء میں لگا ہوا ہے۔ تجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”میں نے کہا تاکہ تو فکر نہ کر۔“ احسان شاہ نے ایک بار پھر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”چوہدری کو بھی میں نے اسی سلسلے میں گل بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔ تجھ سے آرام سے بات ہوگی۔“ اس نے ہلکا ہنسنے لگا۔ ”میں تو یاروں کا یار ہوں۔ بیٹھ یاروں کی مدد ہی کرتا ہوں۔ تجھے پریشان دیکھ کر ہی تو اپنے ساتھ لے آیا۔ اب تو آرام سے یہاں رہ اور اپنا معاملہ مجھ پر چھوڑ دے۔ تجھے پریشان ہونے کی ذرا بھی ضرورت نہیں۔“

علی نواز نے مزید کچھ نہ کہا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہو کر دور دور تک پھیلتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی حرارت میں کمی

آگئی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی جانب اتر رہا تھا۔ ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ ملازم نے چائے لاکر میز پر رکھ دی۔ تینوں چائے پینے لگے۔
علی نواز بہت تھکا ہوا تھا۔ چائے پینے کے بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔



رحیم داد اور سید احسان علی شاہ ہلکی ہلکی دھوپ میں لان پر بیٹھے تھے۔ احسان شاہ نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”چوہدری“ زرعی اصلاحات سے علی نواز بہت ڈرا ہوا ہے۔ اس کے پاس اراضی بھی بہت ہے۔ ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اور یہ اس میں سے ایک ایکڑ بھی زرعی اصلاحات کے تحت حکومت کو دینا نہیں چاہتا۔“

”یہ تو جی بہت زیادہ زمین ہوئی۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”اسے تو بہت زیادہ زمین دینی بھی ہوگی۔“
”زمین کے معاملے میں تو یہ اتنا لالچی ہے کہ کسی کرنے کی بجائے اسے بدھانے کی فکر میں رہتا ہے۔ تب ہی تو اس کی دو بیٹیاں ویاہ کے بعد بھی ابھی تک گھر میں کنواری بیٹھی ہیں۔“
”ویاہ کے بعد بھی کنواری ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رحیم داد نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”اپنی سرال نہیں گئیں۔ ان کے گھروالے کیسے ہیں جنہوں نے ان کو اس کے پاس چھوڑ رکھا ہے؟“
”ان کا کوئی گھروالا نہیں۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔

”تب ان کا ویاہ کیسے ہوا؟“

”بہت عجب طرح سے ہوا۔ سنے گا تو حیران ہو گا۔“ احسان شاہ بدستور بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ ”پچھلے سال علی نواز مجھے کراچی سے اپنے گوٹھ لے گیا۔ ادھر بھی اس نے بہت شاندار حویلی بنا رکھی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جمعے کا دن تھا۔ رات کو اس نے اپنے کچھ رشتے داروں اور شریکوں کو اکٹھا کیا۔ گوٹھ کی مسجد کا ملا بھی آیا۔“

”وہ کس لیے آیا تھا؟“ رحیم داد نے دریافت کیا۔

”نکاح پڑھانے آیا تھا۔“

”تب تو جتنی بھی آئی ہوگی۔ اس کے ساتھ وہی لاکھوٹ بھی آیا ہو گا۔“

”نہ براتی آئے نہ دولہا۔ یہی تو میں تجھے بتانے جا رہا تھا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔
”لکڑی کی ایک چوکی پر محل لاکر رکھی گئی۔ اس پر ریشمی جزدان میں بند کران مجید رکھا گیا۔ سارے مسمان چوکی کے گرد نیم دائرے میں بیٹھ گئے۔ ہر طرف اگر بیٹوں کی خوشبو پھیلی تھی۔ کران مجید جزدان سے نکال کر اس طرح رکھا گیا کہ سب اسے دیکھ سکتے تھے۔“

”یہ سب کچھ کس لیے کیا گیا تھا؟“ رحیم داد نے بے چین ہو کر مدخلت کی۔

”چپ کر کے سنتا جا۔“ احسان شاہ نے قدرے خیکھے لہجے میں کہا۔ ”کران مجید پر پھولوں کا ہار ڈالا گیا۔ ملا نے ایک وکیل، دو گواہوں کے ہم راہ حویلی میں عورتوں کے بیچ میں بیٹھی ہوئی وہابی کے پاس بھیجا۔ انھوں نے اس سے اجازت لی۔ واپس آکر ملا کو بتایا۔ ملا نے اونچی آواز سے نکاح پڑھایا۔ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی۔ دوسروں نے بھی دعا کے لیے اپنے اپنے ہاتھ اٹھائے۔ لوجی نکاح ہو گیا۔ چھوڑے اور مٹھائی بانٹی گئی۔ سب نے علی نواز کو مبارک باد دی۔ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا جیسے نکاح میں ہوتا ہے۔ بعد میں علی نواز نے سب کو روٹی کھلائی۔“

”پر نکاح ہوا کس کے ساتھ؟“ رحیم داد نے حیران و پریشان ہو کر دریافت کیا۔

”کران مجید کے ساتھ ہوا تھا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔

”کران مجید کے ساتھ کیسے نکاح ہو سکتا ہے؟“ رحیم داد ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”علی نواز نے ایسا کیوں کیا؟“

”ایسا اس لیے کیا تھا کہ کسی مرد کے ساتھ ویاہ کرنا تو بیٹی کے ساتھ اس کے حصے کی زمین اور جائیداد بھی چلی جاتی۔ علی نواز جائیداد اپنے خاندان میں رکھنا چاہتا ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر بتایا۔ ”پہلے بھی ایک بیٹی کا اس نے نکاح کران مجید کے ساتھ پڑھایا تھا۔ دونوں اس کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔“

”پر یہ تو بہت غلط بات ہوئی۔“

”پتہ نہیں غلط ہے یا صحیح۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”یہ تو ملا ہی کو معلوم ہو گا جس نے نکاح پڑھایا تھا۔ پر مجھے اتنا ضرورت پتہ ہے کہ جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے ادھر کے کتنے ہی زمین دار اپنی بیٹیوں کا نہ صرف کران شریف سے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ چاند اور سورج سے نکاح پڑھا کر اپنے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ وہ زندگی بھر کنواری ہی رہتی ہیں اور بوڑھی ہو کر مرجاتی ہیں۔“

رحیم داد کو معاً بھکر کے مراد خاں شاہانی کی بہن حمیدہ یاد آگئی۔ مسکرا کر بولا۔ ”تب تو حویلی کے نوکر چاکر عیش کرتے ہوں گے۔“

احسان علی شاہ نے اس کے طنز کا مفہوم فوراً بھانپ لیا۔ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جس لکڑی کا کران سے نکاح ہو جاتا ہے، اسے بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی سے چوری چھپے یا ریشمی لگا لے تو اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ سزا کے طور پر اسے اور اس کے یا ر دو نوں کو کاراگاہی کر اردے کر کٹل کر دیا جاتا ہے۔“

”پر شاہ جی، یہ تو بہت بری رسم ہوئی۔“

”سندھ میں ایسی ایک اور رسم بھی ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”مرید اپنے پیر کی خوش نودی اور برکت حاصل کرنے کے لیے منت مانتے ہیں۔ اپنی سب سے زیادہ سوہنی کڑی کو اس کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں۔ اسے عمدہ سے عمدہ کھلاتے ہیں۔ جب وہ جوان ہو جاتی ہے تو ایک روز پیر کو اپنے گھر بلا تے ہیں۔ اس کی دعوت کرتے ہیں۔ کڑی کا وہی کی طرح خوب سنگھار کرتے ہیں۔ پیر کے آگے ہاتھ جوڑ کر منت ساجت کرتے ہیں کہ وہ اسے قبول کر لے۔ جب وہ راضی ہو جاتا ہے تو کڑی کو رات گئے اس کے کمرے میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہ ایک رات یا جتنی راتوں تک چاہے اسے اپنے ساتھ سلاتا ہے۔“

رحیم داد جیران و پریشان بیٹھا احسان شاہ کی باتیں سنتا رہا۔ وہ اسے بتاتا رہا۔ ”ایسی کڑی کو بروہی کہتے ہیں۔ پیر تو بعد میں اس کے پاس کبھی نہیں آتا، بروہی بھی ایک طرح سے پیر بن جاتی ہے۔ اس کی اتنی عزت ہوتی ہے کہ لوگ اس کے پاس مرادیں مانگنے آتے ہیں۔ نذرانے چڑھاتے ہیں۔ اس کی خدمت کرتے ہیں۔“

”اس کا بھی ویاہ نہیں ہوتا ہو گا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”نہیں، بروہی بننے کے بعد وہ پیر کے علاوہ کسی دوسرے مرد کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔“ احسان شاہ نے جواب دیا۔ ”اگر وہ چوری چوری کسی سے یاری لگا لے اور پتہ چل جائے تو ماں بیوی بھائی رات کو اسے گوثھ سے باہر جنگل میں لے جاتے ہیں۔ اس کے سر کے بال کھول دیے جاتے ہیں۔ دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے جاتے ہیں۔ اس کو زمین پر بٹھا دیا جاتا ہے۔ سر جھکا کر کسی لکڑ پر ٹکا دیا جاتا ہے۔ کھماڑی تمام کر گردن پر ایسا بھر پور وار کیا جاتا ہے کہ سر کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔“

”جب اس کے ساتھ ایسا کیا جاتا ہے تو وہ شور شرابہ نہیں کرتی؟“

”سنا ہے وہ اپنا گناہ چپ کر کے مان لیتی ہے۔ سزا کے لیے بھی آسانی سے راضی ہو جاتی ہے۔ نہ شور شرابہ کرتی ہے نہ فریاد۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”خاموشی سے اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیتی ہے۔“

”پر شاہ جی یہ تو سیدھا سیدھا کتل ہوا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”پولیس اس جرم کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتی۔“

”پولیس کو بھی اس رسم کا پتہ ہے۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”اور پولیس کوئی کارروائی کرے تو

کیسے۔ کتل کے فوراً ہی بعد لاش کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ اگر پولیس کو لاش مل جائے یا کتل کا پتہ چل جائے تو کوئی گواہ نہیں ملتا۔ گوثھ یا پنڈ کے سارے ہی بندے ایسے کتل کو بالکل ٹھیک سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک بروہی کو اپنے گناہ کی یہی سزا ملنی چاہیے۔“

”زمیں دار بھی اپنی کڑیوں کو اسی طرح پیر کے سامنے پیش کرتے ہیں؟“

”عام طور پر پیر کے ہماری مرید ہی ایسا کرتے ہیں۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”زمیں داروں کے بارے میں مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔“

”وہ تو جائیداد کو بچانے کے لیے صرف اپنی کڑیوں کا کران یا چاند سورج کے ساتھ نکاح کر دیتے ہیں۔“ رحیم داد نے تبصرہ کیا۔ ”تیرے یار علی نواز نے بھی ایسا ہی کیا۔ ویسے شاہ جی، سچی بات یہ ہے، کوئی بھی زمیں داریہ نہیں چاہتا کہ اس کی اراضی کم ہو جائے۔“

”تب ہی تو علی نواز زرعی اصلاحات سے اتنا زیادہ پریشان ہے۔“

”پریشان تو جی، میں بھی بہت ہوں۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

”تیری اراضی ہی کتنی ہے جو تو اتنا پریشان ہے۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے مسکرا کر کہا۔

”بچے کے حصے داروں اور چھوٹے زمیں داروں کی زمین خریدنے کے بعد میری زمین داری، لنگ بھگ ۳۵ ایکڑ ہو جائے گی۔“ رحیم داد نے بتایا۔ ”دلاور والا کی زمیں دریشکوں کے ہاتھ نہ بیع کی ہوتی تو اور زیادہ ہو جاتی۔“

”اسے بیچ کر تو نے بہت ٹھیک کام کیا۔“

”پر عظمت اللہ دریشک نے اس کا پورا معاوضہ اب تک نہیں دیا۔“ رحیم داد نے شکوہ کیا۔

”تو اس کا مطالبہ بھی نہ کرنا۔“ احسان شاہ نے مشورہ دیا۔ ”عظمت اللہ تو اسے خرید کر خود مصیبت میں پھنس گیا۔ تجھے پتہ ہے بوہڑوں کو بے دخل کرنے کے لیے اسے کیا کیا کرنا پڑا؟“

”میں نے اس کے بارے میں سنا تو ہے پر پوری طرح معلوم نہیں۔“ رحیم داد نے کہا۔ ”تو نے بھی مجھے اس کے بارے میں پہلے کب بتایا۔“

”عظمت اللہ دریشک نے اپنے ساتھ پولیس کی ٹکڑی پارٹی لی۔ اس کے اپنے بندے بھی تھے۔

سب ہی پوری طرح مسلح تھے۔ رات کے اندھیرے میں اچانک وہ دلاور والا پہنچا اور پنڈ کا چاروں طرف سے گھیراؤ کر کے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ بوہڑ ایسے ڈرے کہ منت ساجت کرنے لگے۔ پر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔“

”بوہڑوں نے بھی تو اس کے بندوں اور پولیس کے ساتھ پہلے کم بد معاشی نہیں کی تھی۔“ رحیم

داو نے کہا۔ ”میں تو وہاں موجود ہی تھا۔ تھانیدار تک کو بری طرح زخمی کر دیا تھا۔ دریشک کو غصہ تو آتا ہی چاہیے تھا۔“

”اسی غصے میں اس نے پنڈی رٹی میں سب کو اکٹھا کیا۔ حکم دیا کہ گڑکی بولی بولو۔ بعد میں کھوتی کی آوازیں نکالو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ فیر اس نے سارے مردوں کو کپڑے اتار کر ناپنے کو کہا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”وہ ننگے ہو کر ناپتے رہے۔ عفت اللہ اور تھانیدار آرام سے بیٹھے شراب پیتے رہے۔ اتنی زیادتی کہ بدست ہو گئے۔ اسی حالت میں انھوں نے زنانیوں کو بھی ننگا کر کے نچوایا۔ جب سب ناپتے ناپتے تھک کر گر گئے لگے تو کما دوڑ لگاؤ۔ انھوں نے دوڑ لگائی۔ ادھر دریشک کے کندوں نے فصول اور گھروں میں آگ لگوا دی۔ کتنے ہی بوڑھے اور بچے جل کر زخمی ہو گئے۔ مویشی تو نہ جانے کتنے مر گئے۔ سارا پنڈ جل کر راکھ ہو گیا۔“

”تب تو بعد میں بہت شور شرابہ ہوا۔“ احسان شاہ نے بتایا۔ ”اخباروں میں خبریں چھپیں۔ معاملہ اتنا

بدھاکہ انکو آڑی ہوئی۔“

”اب تو معاملہ عدالت کے سامنے ہے۔“ رحیم داو نے اٹکتے ہوئے کہا۔

”جیسے سب کچھ تو پتہ ہے۔ اس پر بھی گلہ ہے کہ زمین کا پورا معاوضہ نہیں ملا۔“ احسان شاہ نے قدرے تھکے لہجے میں کہا۔ ”چوہدری، زیادہ لالچ ٹھیک نہیں ہوتا۔“

”شاہ جی، یہ بتا زری اصلاحات کے بارے میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ رحیم داو نے گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے استفسار کیا۔

”تو نے مارشل لاء ریگولیشن ۶۳ پڑھ لیا ہے؟“

”ہاں جی، پڑھ تو لیا ہے۔ تب ہی تو اتنا پریشان ہوں۔“

”اس میں پریشانی کی کون سی گل ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”۵ سو ایکڑ اراضی تو اپنے پاس رکھ ہی سکتا ہے۔ ڈیڑھ سو ایکڑ باغات کے ہو گئے۔ گھروالی کے علاوہ تیرااد کوئی تو ہے نہیں۔ ورنہ ۱۳ ہزار پیداداری یونٹ تو اسے عطیہ کے طور پر دے سکتا ہے۔“

”پر یہ تو ۸ سو ایکڑ سے کچھ اوپر اراضی بنتی ہے۔“ رحیم داو نے ہجے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”

اراضی بیچ گئی اس کا کیا بنے گا؟“

”تین سو ایکڑ اپنے بھروسے کے مزارعوں کے نام اکتوبر ۱۹۵۸ء سے پہلے کی تاریخوں میں بیچ دے۔“ احسان علی شاہ نے مشورہ دیا۔

”مزارعے بعد میں گڑ بڑ کریں گے۔“ رحیم داو نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”اللہ وسایا اور جیلہ نے پہلے ہی ان کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔“

”سرکشی تو نہیں کرتے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”ویسے بیچ کے ساتھ ہی ان سے ادھار کی رسید پر نشانی انگوٹھا لگوا لیتا اور ادھار پر زمین رہن رکھ لیتا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”اس طرح تو ایک ہاتھ سے زمین دے کر دوسرے سے لے لے گا۔“

”پر شاہ جی، پچھلی تاریخوں میں بیچ کیسے ہوگی؟“ رحیم داو ہنوز پریشانی میں مبتلا تھا۔

”اس کی تو فکر نہ کر۔ پٹواری سے رجسٹر خسرہ گرداوری میں انفکالات اراضی کی پچھلی تاریخیں ڈالوا دوں گا۔“ احسان شاہ نے رحیم داو کو اطمینان دلایا۔ ”پٹواری اپنا بندہ ہے۔ بس اس کی مٹھی گرم کرنی ہوگی۔ اس کے بغیر تو وہ اپنے سنگے پیو کے لیے بھی کچھ نہیں کرنے کا۔“ اس نے قدرے نال کیا۔ ”اور دیکھ، یہ خیال رکھنا زمین داری کے ایسے تمام کاغذات اور دستاویزات ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔ اس معاملے میں گھروالی پر بھی بھروسہ نہ کرنا۔“

”پر شاہ جی، سوال یہ ہے تیرے حساب سے ساری زمین تو میرے پاس نہ رہ سکے گی۔“

”کچھ نہ کچھ تو سرکار کو دینی ہی ہوگی۔“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔ ”یہ بتا، تیرے پاس بنجر اور بے کار کتنی زمین ہے؟“

”پہلے تو بہت تھی، پر کچھ زمین پر میں نے باغات لگوا لئے۔“ رحیم داو نے بتایا۔ ”ڈیڑھ سو کلا سے زیادہ بنجر اور غیر آباد پڑی ہے۔“

”یہ زمین تیرے لیے تو بیکار ہی ہے نا۔ اسے سرکار کو نہری بتا کر دے دے۔“ احسان شاہ مسکرا کر بولا۔ ”یہ مفت نہیں جائے گی۔ اس کا ایک روپے سے پانچ روپے تک حکومت معاوضہ دے گی جو راشی بوڑکی صورت میں ملے گا۔ یہ رقم سٹیٹ بینک کے کھاتے میں عوامی کرض کے نام سے ڈال دی جائے گی۔ اس پر تجھے چار فی صد سالانہ سود ملتا رہے گا۔ اپنی بنجر اور غیر مزدورہ اراضی کو نہری اور زرخیز دکھائے گا تو معاوضہ بھی چنگا ملے گا۔ اسے فروخت کرتا تو ہرگز اتنی کمیت نہ ملے۔“ وہ بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”جتنا تو حکومت کو دے گا نہیں، اس سے زیادہ تجھے ملے گا۔ تو زری اصلاحات سے فصول میں پریشان ہے۔ اس میں تو تیرا فائدہ ہی فائدہ ہے۔“

”ایسا ہو جائے تب تو فائدہ ہی رہے گا۔“ رحیم داو کے چہرے سے اطمینان جھلکنے لگا۔ ”پر میں یہ سب کچھ کوں گا کیسے؟“

”اس کی تو فکر نہ کر۔ میرا میمنجر مہمان علی بہت ہشیار بندہ ہے۔ تو ناہر کو اس کے ساتھ لگا دیتا۔“

اس کی چال ڈھال میں تمکنت آگئی تھی۔ رکھ رکھاؤ اور سلیقہ آگیا تھا۔ مزارعوں اور کیوں کی عورتوں سے بات کرتی تو اس کے انداز میں ظننہ اور رعب داب ہوتا۔ اس کا کسا ہوا مضبوط جسم ملائکہ اب کسی قدر پھیل گیا تھا مگر اس میں بھدا پن نہ تھا۔ اس کی شخصیت اور نکھر گئی تھی۔ رگب خاصا اجلا ہو گیا تھا۔ رخساروں پر گلاب کھلتے تھے۔ آنکھوں میں ستارے جھللاتے تھے۔ زندگی میں پہلی بار اسے اس قدر عیش و آرام ملا تھا کہ وہ ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی۔ خوشی اور مسرت میں مگن رہتی۔

رحیم داد اس کا ہر طرح خیال رکھتا۔ ناز برداری کرتا۔ اسے خوش دیکھ کر خود بھی مسرور ہوتا۔ وہ کھر کر جتنی خوبصورت اور طرح دار ہوتی جا رہی تھی رحیم داد اس پر اتنا ہی زیادہ فریفتہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے اپنے ساتھ جیب میں بٹھا کر نہر کے کنارے اکثر شام کو سیر کرانے لے جاتا۔ کئی بار کپڑے اور زیورات کی خریداری کے لیے اسے شہر بھی لے گیا۔ خریداری کے ساتھ ساتھ دونوں نے سینما میں ساتھ بیٹھ کر تین چار بار فلمیں بھی دیکھیں۔ اس کی اسی دل داری اور دل جوئی نے شاداں کو بھی رحیم داد کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ اپنے دکھ بھرے ماضی کی تلخ یادیں بھولتی جا رہی تھی۔

شاداں کسی سے بدکتی یا بھرتکتی تھی تو وہ ادھیر عمر نادر خان کی جوان بیوی، جنت تھی۔ اس نے اب تک شاداں کی اہمیت اور مرتبے کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ ہر معاملے میں ہم سری بلکہ خود کو اونچا اور زیادہ اہم ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔ شاداں کو ذرا خاطر میں نہ لاتی۔ وہ موجود بھی ہوتی تو جنت نوکر چاکروں پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہی زمیں دارنی اور حویلی کی مالک و مختار ہے۔

جنت کئی بچوں کی ماں تھی، مگر ہر وقت بنی ٹھنی رہتی تھی۔ لباس بھی شوخ اور بھڑکیلا پہنتی تھی۔ اس کا رنگ خوب کھلتا ہوا اور گور تھا جو شاداں کو شاق گزرتا تھا۔ جنت کبھی رحیم داد کے سامنے آتی تو اٹھلا اٹھلا کر بات کرتی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے باکی سے مسکراتی۔ اس کے ہر انداز میں عشوہ ہوتا، لگاوت ہوتی۔ شاداں اس کی یہ ادائیں اور غمزے دیکھتی تو دل ہی دل میں کڑھتی۔

شاداں کو اس کی ایک اور حرکت بھی سخت ناگوار گزرتی۔ وہ رحیم داد کے پاس آتی تو ہمیشہ اپنے اٹھوتے بیٹے شاکر کو ساتھ لاتی اور نہایت بے تکلفی سے رحیم داد کی گود میں دے دیتی۔ رحیم داد بھی بچے کے ساتھ شفقت سے پیش آتا۔ اسے زانو پر بٹھاتا۔ محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتا۔ زیادہ خوش ہوتا تو اس کے رخسار چوم لیتا۔ اسے ہنسانے کے لیے طرح طرح کی حرکتیں کرتا۔

ایک شام ایسا ہوا کہ جنت کا بیٹا باغیچے میں رحیم داد کی گود میں بیٹھا تھا۔ رحیم داد پیار سے اس

احسان شاہ نے کہا۔ ”حکومت کو زمین داری کے بارے میں جو گوشوارے بھر کر دینے ہیں، مہمان اور نادر مل کر تیار کر لیں گے۔ پٹواری اور محکمہ مال کے افسروں سے مل جل کر اپنا کام نکال لیں گے۔ جو رشوت و رشوت دینی ہوگی اس کے بارے میں بھی وہی طے کریں گے۔ تجھے اب اس معاملے میں سوچنے اور پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آرام سے کوئلہ ہر کشن جا اور اپنی نئی نویلی دہائی کے ساتھ عیش کر۔“

”میں کل تیرے پاس فیر آ جاؤں گا۔“ رحیم داد نے کرسی چھوڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو ابھی تو ادھر ہی ہے نا؟“

”نہیں، کل دوپہر کی روٹی کھا کر، میں نے علی نواز چانڈیو کے ساتھ لہور جانا ہے۔ اسے ادھر کچھ ضروری کام ہے اور مجھے اس کا وہ کام کروانا ہے۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”پر میں ہفتہ بھر بعد واپس آ جاؤں گا۔ گوشوارے بھرنے کا کام اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔ تجھے بھی بلوا لوں گا۔“ سورج مغربی افق پر پہنچ چکا تھا۔ دھوپ درختوں کی چوٹیوں پر جھللا رہی تھی۔ دن ختم ہو رہا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ ہوا میں خنکی پڑھ گئی تھی۔

رحیم داد آگے بڑھا۔ احسان شاہ اس کے ساتھ ساتھ حویلی کے باہر گیا۔ گلے لگا کر گرم جوش سے رحیم داد کو رخصت کیا۔ رحیم داد نے احسان شاہ کی ہدایت پر نادر خان کو میمان علی سے گوشواروں کے بارے میں صلاح مشورہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ رحیم داد اپنی جیب میں بیٹھا اور کوئلہ ہر کشن کے لیے روانہ ہو گیا۔



اپریل کا آخری ہفتہ تھا۔ موسم بدل چکا تھا، گرمی شروع ہو گئی تھی۔ رنج کی فصل تیار کھڑی تھی۔ گندم اور جو کے پودے سورج کی تمازت سے پک کر سنہری ہو گئے تھے۔ ہوا چلتی تو کھیتوں میں سرسراہٹیں ہوتیں۔ سیٹیوں کی سی ہلکی ہلکی جھٹکار گونجتی۔ فردری اور مارچ کے اداکل میں بارش بھی ہوئی تھی۔ کھیتوں کو سیراب ہونے کے لیے خوب پانی ملا تھا۔ لہذا اس دفعہ فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ گندم کے پودے خوشوں سے لدے ہوئے تھے۔

زمیں دار اور مزارعے اپنی فصلوں کو دیکھتے تو خوشی سے ان کے چہرے دکنے دکنے تھے۔ شاداں بھی بہت خوش و خرم تھی۔ اب وہ بڑی زمیں دارنی بن چکی تھی۔ شاندار حویلی میں رہتی تھی۔ اچھے سے اچھا کھاتی تھی۔ عمدہ سے عمدہ لباس پہنتی تھی۔ خدمت کے لیے ہر وقت نوکرانیاں آگے پیچھے گھومتی تھیں۔ گاؤں کا ہر فرد اسے عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا تھا۔

کے سر کے بالوں کو انگلیوں سے سنوار رہا تھا۔ مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جنت بھی خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے مسکراتے اس کی زبان سے بی ساختہ نکل گیا۔ ”زمین دار“ شاکر تیرے پاس آکر ایسا خوش ہوتا ہے جیسے تیرا اپنا پتر ہو۔“ شاداں نے چونک کر پہلے جنت کو مشتبہ نظروں سے دیکھا پھر شاکر کو۔ اسے گول مٹول مٹولے چنے شاکر میں رحیم داد کی شباہت صاف جھلکتی نظر آئی۔

اس وقت تو وہ خاموش رہی، مگر شبہ اس کے دل میں گھر کر گیا۔ رات کو اس نے رحیم داد سے اپنی شبہ کا اظہار بھی کر دیا۔ ”چوہدری، آج جنت نے اپنے شاکر کے بارے میں یہ کیوں کہا وہ تیرا پتر لگتا ہے؟“

”اس نے ایسے ہی کہہ دیا ہو گا۔“ رحیم داد نے جھٹ بات بنائی۔ اس نے شاداں کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تجھے اس پر پیار نہیں آتا؟“

رحیم داد نے بات اس ڈھب سے کی کہ شاداں لا جواب ہو گئی۔ صرف اتنا کہہ سکی۔ ”پر جنت مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔“ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”کھسم کو دیکھو تو کتنا بوڑھا لگتا ہے اور وہ الہ چنگ منک کرتی ہے جیسے اللہ مٹیا رہو۔“ شاداں کے چہرے پر جھنجھلاہٹ پھیل گئی۔

مگر رحیم داد پر سکون رہا۔ بے نیازی سے بولا۔ ”وہ جانے اور اس کا خصم۔ تجھے اس سے لینا؟“

”پر وہ تیرے سامنے ایسے نکھرے کیوں دکھاتی ہے؟ ذرا بھی تو اسے شرم نہیں آتی۔“ شاداں نے کھل کر اپنے شبہ کا اظہار کیا۔ ”تو نے اس سے یاری تو نہیں لگا رکھی؟“

”تیرا داغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ رحیم داد ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”کوئی اور گل بات کر۔“ تیرا داغ تو نہیں خراب ہو گیا۔ ”وہ بے زاری سے منہ بگاڑ کر بولا۔ ”اپنی طبیعت آج کل ویسے ہی پریشان رہے۔ تجھے یاری آسانی نظر آرہی ہے۔“

رحیم داد نے تیوری پر بل ڈال کر کچھ اس طرح ڈپٹ کر بات کی کہ شاداں نرم پڑ گئی۔ اس بات آگے نہ بڑھائی۔ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ”میں بھی دیکھ رہی ہوں تو ادھر کچھ سے پریشان پریشان دکھائی پڑتا ہے۔ روٹی بھی ٹھیک سے نہیں کھاتا۔ اکیلا بیٹھا سوچتا رہتا۔ شاداں نے ہمدردی کے ساتھ ساتھ گلہ بھی کیا۔ ”تجھے پریشانی ہے کچھ بتاتا بھی تو نہیں۔“ اس اصرار کیا۔ ”بول تو آج کل پریشان اور کھویا کھویا کیوں رہتا ہے؟“

رحیم داد ان دنوں واقعی سخت پریشانی میں مبتلا تھا۔ لیکن اصرار کے باوجود اس نے شاداں

پریشانی سے آگاہ نہ کیا۔ بات کو صاف ٹال گیا۔ اتنا بے لہجے میں بولا۔ ”فصل تیار کھڑی ہے، پر کٹائی کے لیے ابھی تک لاوے ہی نہیں ملے۔ نادر خان ان کی تلاش میں دن رات بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔“ اس کی آواز بو جھل ہو گئی۔ ”ویسے جب سے گرمی بڑھی ہے، طبیعت گڑبڑ رہتی ہے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی رہتا ہے۔“

”کسی ڈاکٹریا حکیم کو دکھا کر دوائی لے لے۔“ شاداں نے دل جوئی کی۔ ”ایسے کس طرح کام چلے گا؟“

رحیم داد نے مسکراتے کی کوشش کی۔ ”تو کہتی ہے تو دوائی بھی لے لوں گا۔“ اس نے بات کا رخ بالکل موڑ دیا۔ شاداں کو اپنی اصل پریشانی کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا۔ بتانا بھی چاہتا تو اسے مطلق نہ بتا سکتا تھا۔ اس کی پریشانی اور ذہنی الجھن کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی کہ وہ اس کے بارے میں کسی کو کچھ بھی نہ بتا سکتا تھا۔



رحیم داد کی پریشانی ایسا سرسبز راز تھی جو صرف اور صرف اس کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اس راز میں کسی کو شریک کرنے کا مطلب سراسر خطرہ مول لینا تھا۔ خطرہ ایسا دیا بھی نہ تھا۔ اس میں جیل جانے سے کہیں زیادہ پھانسی پر لٹک جانے کا واضح امکان تھا۔ رحیم داد کی اس پریشانی کا سبب یہ تھا کہ پچھلے دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ محکمہ بحالیات کے تفتیشی شعبے نے سینکڑوں ایسے جعلی کلیموں کا سراغ لگایا ہے جن کے ذریعے لگ بھگ بارہ کروڑ روپے مالیت کی متروکہ زرعی اراضی اور صنعتی اداروں پر ناجائز طریقے سے قبضہ کر لیا گیا تھا۔ ایک سرکاری اعلامیہ کے مطابق صرف صوبہ سندھ میں ڈیڑھ کروڑ کی متروکہ زرعی املاک سالہا سال سے غیر مستحق افراد کے قبضے میں تھیں۔ ایسی دھاندلی اور ہیرا پھیری کے معاملے میں پنجاب کی صورت حال کم تشویش ناک نہ تھی۔

محکمہ بحالیات کا تفتیشی شعبہ ان دنوں بہت مستعد تھا۔ اپنی کارگزاری دکھانے کی غرض سے نہایت سرگرمی سے متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ اور بدعنوانیوں کے بارے میں چھان بین کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں حکومت کی جانب سے یہ اعلان بھی کیا جا چکا تھا کہ متروکہ جائیداد پر غیر قانونی قبضہ کرنے والے مجرموں کو مارشل لا کے تحت سخت سزائیں دی جائیں گی۔ ان میں جرمانہ، قید یا مشقت اور کوڑوں کی سزا شامل تھی۔

تفتیش اور تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری تھا کہ اسی اثناء میں حکومت نے ایک نیا قانون نافذ کیا۔

ہے زیادہ جعل سازی اور دھوکہ دہی کی واردات کا سراغ ملا ہے جن میں جعلی کلیموں اور بوگس کلیم فارموں کی بنیاد پر متروکہ جائیداد الاٹ کرائی گئی تھی۔ ان کلیم فارموں کو سینٹرل ریکارڈ آفس لاہور اور تحصیل کے دفاتر میں جعل سازی کے ذریعے تیار کیا گیا تھا۔ انھوں نے یہ دلچسپ انکشاف بھی کیا کہ ایک دعویدار کو اصل ریکارڈ کے مطابق ۱۷۶ کنال متروکہ اراضی الاٹ ہونا چاہیے تھی مگر اسے ۲۲۳۳ کنال زمین ناجائز طور پر الاٹ کر دی گئی۔

محمد یار کھنڈ نے زور دے کر کہا تھا کہ جعلی دستاویز بنانے والوں اور محکمہ بحالیات کے حکام کو دھوکا دے کر غیر قانونی طور پر متروکہ املاک الاٹ کرانے والوں کے خلاف مفصل تحقیقات کی جا رہی ہے۔ ایسے دعویداروں کے خلاف جنھوں نے جعلی کلیم فارموں کے ذریعے متروکہ جائیداد اپنے نام الاٹ کر رکھی ہے، سخت کارروائی کی جائے گی۔ ان کی تمام ایسی جائیداد نہ صرف بحق سرکار ضبط کر لی جائے گی، بلکہ مارشل لا کے مختلف قوانین اور ضابطوں کے تحت عبرت ناک سزائیں بھی دی جائیں گے تاکہ متروکہ جائیداد کے سلسلے میں ہونے والی ہر طرح کی بدعنوانی اور جعل سازی کا مکمل طور پر سدباب ہو جائے۔

رحیم داد نے یہ خبر پڑھی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس قدر ہراساں ہوا کہ دوپہر کا کھانا بھی نہ کھا سکا۔ شاداں نے اصرار بھی کیا۔ مگر سر میں درد ہونے کا بہانہ کر کے اسے ٹال دیا۔ اس کے بشرے سے پریشانی عیاں تھی۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلاتے تھے۔ اس نے ذہنی انتشار پر قابو پانے کے لیے پانی کے کئی گلاس پئے اور بڑھال ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔

شاداں سرہانے بیٹھ کر محبت سے اس کا سر دبانے لگی۔ رحیم داد نے منع بھی کیا، مگر وہ باز نہ آئی ہوئے ہوئے اس کا سر دباتی رہی۔ رحیم داد کو اس کی انگلیوں کے لمس سے کسی قدر سکون بھی ملا۔ مگر بے چینی کم نہ ہوئی۔ وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا، پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔



دن ڈھلے رحیم داد نے غسل کیا۔ لباس بھی تبدیل کیا اور باغیچے میں جا کر بیٹھ گیا۔ شام دھیرے دھیرے نیچے اتر رہی تھی۔ دھند لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ گرمی کا زور کسی قدر ٹوٹ چکا تھا۔ ہوا میں فرحت اور تازگی تھی۔ لیکن رحیم داد ہنوز مضطرب اور گم صم تھا۔ اسے اپنے سر پر خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی۔ نہ وہ مہاجر تھا اور نہ چوہدری نور الہی جس کے کلیم کی دستاویزات پر جعلی دستخط ثبت کر کے اس نے کوئٹہ ہر کھن کی متروکہ اراضی اور حویلی کا الاٹمنٹ حاصل کر لیا تھا۔ اب وہ علاقے کا ایک بڑا زمیندار سمجھا جاتا تھا۔

اسے ”پاکستان میں متروکہ جائیداد کی تنظیم کا قانون“ کہا گیا۔ اس نئے قانون کے ذریعے ۱۹۵۷ء کے متروکہ جائیداد کی تنظیم کے ایکٹ (۷) میں نہ صرف اہم ترمیمات کی گئیں بلکہ اس کے تحت متروکہ جائیداد کی تحقیق اور جانچ پڑتال کے لیے ایک خصوصی ٹریبونل بھی قائم کیا گیا۔ اس ٹریبونل کی اہمیت واضح کرنے کے لیے ہائی کورٹ کے ایک جج کو بھی رکن کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔

رحیم داد ہر روز پابندی سے اخبار پڑھتا تھا۔ متروکہ جائیداد کی لوٹ کھسوٹ کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات اور حکومت کے نت نئے اقدامات کی خبریں پڑھ پڑھ کر اس کی پریشانیوں میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اسے کسی پہلو قرار نہ تھا۔ ہر وقت دھڑکا لگا رہتا۔ خطرہ سر پر منڈلاتا نظر آتا۔ اپریل اسی پریشانی اور طرح طرح کے خدشات میں گزر گیا۔

مئی کا مہینہ شروع ہوا۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ چلچلاتی دھوپ میں جسم پگھلتا ہوا محسوس ہوتا۔ نادر خان نے فصل کی کٹائی کے لیے لاووں کا بندوبست کر لیا تھا۔ انھوں نے گاؤں کے باہر میدان میں درختوں تلے ڈیرہ ڈال دیا تھا۔ فصل کی کٹائی شروع ہو چکی تھی۔ رحیم داد بھی اس کی دیکھ بھال میں سرگرمی سے حصہ لے رہا تھا۔ وہ سویرے ہی سویرے کھیتوں کی طرف نکل جاتا اور دوپہر کو واپس آتا۔

اس روز بھی رحیم داد کھیتوں سے تھکا ہارا حویلی میں واپس آیا۔ گرمی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس کا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ چہرہ اور لباس خاک وھول سے آلود تھا۔ اس نے غسل کیا۔ اجلا لباس پہنا۔ اپنے کمرے میں گیا، میز پر اخبار رکھا تھا۔ اس نے اخبار اٹھایا اور اسے پڑھنے لگا۔

ان دنوں اخبارات کے نامہ نگار اور کالم نویس بہت سرگرم تھے۔ متروکہ جائیداد کی دھاندلیوں کے بارے میں خبروں کو نمایاں طور پر شائع کیا جا رہا تھا۔ صفحہ اول پر ایک ایسی دو کالمی خبر تھی جس کی سرخی پر رحیم داد کی نظر ٹھک گئی۔ یہ محمد یار کھنڈ، ایڈیشنل کمشنر بحالیات کا ایک انٹرویو تھا۔ انھوں نے کچھ ہی عرصہ قبل بھاول پور ڈویژن کا دورہ مکمل کیا تھا۔

محمد یار کھنڈ نے اپنے اس انٹرویو میں یہ انکشاف کیا تھا کہ ضلع بھاول مگر کی تحصیل منچن آباد میں زرعی اراضی کے سلسلے میں ایسے پچاس کلیم ان کے معائنہ میں آئے جو مشتبہ اور جعلی تھے۔ انھوں نے ایسے کلیم فارموں کو مفصل تحقیقات کے لیے اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ یار کھنڈ نے موقع پر جو ابتدائی تحقیقات کی تھی، اس سے یہ عقدہ کھلا کہ منچن آباد میں بیشتر متروکہ اراضی کا الاٹمنٹ جعلی کلیموں کے ذریعے حاصل کیا گیا تھا۔

محمد یار کھنڈ نے ضلع منٹگری کا بھی دورہ کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ تحصیل پاک چن میں درجن بھر

وہ اسی خوف اور پریشانی کے عالم میں بیٹھا تھا کہ نوکر نے آکر احسان علی شاہ کی آمد کی اطلاع دی۔ رحیم داد نے شاداں کو اشارہ کیا۔ وہ باغیچے سے اٹھ کر حویلی میں چلی گئی۔ رحیم داد بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ احسان شاہ کے پاس پہنچا۔ گرم جوشی سے بغل گیر ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا باغیچے میں واپس آگیا۔ دونوں اطمینان سے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

احسان شاہ نے رحیم داد کے چہرے پر چھائی ہوئی پریشانی کو فوراً بھانپ لیا۔ اظہار ہمدردی کے طور پر دریافت کیا۔ ”چوہدری، خیریت تو ہے؟ تو کچھ پریشان پریشان سا نظر آ رہا ہے۔“ اس نے لمبے میں بے تکلفی پیدا کی۔ ”تو زرعی اصلاحات سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ معرکہ تو گزر گیا۔ تیرے گوشوارے داخل ہو گئے۔ ان پر کوئی اعتراض شتراض بھی نہیں ہوا۔ زمین بھی تو نے صرف ۵۷ ایکڑ حکومت کے حوالے کی۔ سارا کام تیری مرضی کے مطابق ہو گیا اور بالکل ٹھیک ٹھاک طور پر ہو گیا۔“

”مجھے جی اس میں کیا کرنا تھا۔ جیسے تو نے ہدایت دی، مریاں اور نادر نے ویسے ہی گوشوارے بھر دیے۔ جتنی زمین انھوں نے چھوڑی وہی میں نے حکومت کو دے دی۔“

”صرف تو نے ہی نہیں، سارے وڈے زمین داروں نے ایسا ہی کیا۔“ احسان شاہ نے مطلع کیا۔ ”زرعی اصلاحات کے تحت زمین داروں کو جو رعایت دی گئی تھی، اس سے تو انھوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس کے علاوہ مویشی فارموں، شکار گاہوں اور چراگاہوں کی کوئی حد نہیں رکھی گئی۔ ہر ایک نے اپنی مرضی چلائی اور حکومت نے تسلیم بھی کر لی۔ رحیم یار خان کے ایک بگیردار نے جو شکار گاہ دکھائی ہے، وہ ایک لاکھ ایکڑ سے بھی اوپر زمین پر پھیلی ہے۔ اسی طرح کتنے ہی وڈے زمین داروں نے ایسی چراگاہیں تیار کی ہیں، اور ایسے مویشی خانے بنائے ہیں جو ہزاروں ایکڑ پر پھیلے ہوئے ہیں۔ سچ پوچھ تو یہ ساری ہی زیر کاشت اراضی ہے اور بہت زر خیز ہے۔ نہ بخر ہے نہ ٹکر۔ اور ٹکر تو حکومت کے حوالے کر دی اور اس کا نہری اور زر خیز زمین کے مول معاوضہ وصول کر رہے۔“

”حد ہو گئی جی۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”کئی وڈے زمین دار اور بگیردار تو اپنی پرانی اور بیکار زمین سے پہلے ہی تنگ آ چکے تھے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”تب بھی ۳ کروڑ ۹۳ لاکھ اراضی میں سے کل تین لاکھ ایکڑ زمین داروں نے حکومت کو دی۔ میرا پتہ یہی بتاتا تھا۔“ اس نے بے تکلفی سے تہقیر لگایا۔ ”اس اراضی کو بھی زمین دار جب چاہیں گے واپس لے لیں گے۔ میں نے تجھے کہا تھا کہ ایسی زرعی اصلاحات

سے کچھ ہونا ہوتا نہیں۔ پہلے بھی زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں۔ ان کا جو نتیجہ نکلا وہ کسے نہیں معلوم۔ جنرل ایوب خان زمین دار نہیں ہے۔ اس لیے اسے زمین داروں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔ جب وہ خود دوا زمین دار بن جائے گا تب اسے سب پتہ چل جائے گا۔“ اس نے قدرے نابل کے بعد کہا۔ ”تو دیکھ لیتا وہ جلد ہی دوا زمین دار بن جائے گا اور یہ کام اس کا یا جنرل برکی کرے گا۔ اسے تو دیوانگی کی حد تک زمین حاصل کرنے کا مرض ہے۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ گم صم بیٹھا رہا۔

احسان شاہ نے کہا۔ ”چوہدری، تو چپ کر کے کیوں بیٹھا ہے؟“ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو مجھے پریشان لگتا ہے۔ بتانا، پریشانی کیا ہے؟“

رحیم داد تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ اپنی پریشانی احسان شاہ کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ مگر اسے شاداں کی طرح ٹال بھی نہ سکتا تھا۔ وہ اس کا ہمدرد تھا اور ہر آڑے وقت میں کام بھی آتا تھا۔ اس نے دبی زبان سے کہا۔ ”متروکہ اراضی کے بارے میں آج کل جو خبریں چھپ رہی ہیں، تو نے وہ تو پڑھ ہی رکھی ہوں گی۔“

”ضرور پڑھ رکھی ہیں۔ پر تجھے ان سے کیا لیتا۔“ اس نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا۔ رمان سے پوچھا۔ ”تیرے کلیم میں کوئی گڑبڑ شہرتو نہیں؟“

رحیم داد نے اسے صحیح صورت حال سے تو آگاہ نہیں کیا، صرف اتنا بتایا۔ ”وہ ایسا ہے جی، میرے کلیم کی دستاویزوں پر دستخطوں میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ ان دنوں اللہ وسایا زندہ تھا۔ اس نے اور اس کے وکیل رندھاوا نے معاملہ ٹھیک ٹھاک کرا دیا تھا۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔ مگر احسان شاہ کو دیکھا۔ ”اس کے بارے میں تو تجھے بھی پتہ ہو گا۔“

”کچھ یاد تو پڑتا ہے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”پر وہ تو بہت پرانی بات ہو گئی۔ اب تو اس کے بارے میں کیوں اتنا پریشان ہے؟“

”پریشانی کی بات ہی ہے جی۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”متروکہ جائیداد کی الاٹمنٹوں کی آج کل دوبارہ جانچ پڑناں ہو رہی ہے۔ روز ہی اخباروں میں ان کے بارے میں طرح طرح کی خبریں چھپ رہی ہیں۔ کسی افسر نے دستخطوں کا معاملہ فیراٹھا دیا تو خاماخا کا چکر شروع ہو جائے گا۔“ رحیم داد نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”مارشل لا کا زمانہ ہے۔ ڈرتا ہوں اس چکر میں کہیں میری الاٹمنٹ منسوخ نہ ہو جائے۔“

”اس طرح الاٹمنٹ منسوخ نہیں ہوتی۔“ احسان شاہ نے اسے اطمینان دلایا۔ ”یہ دستخطوں کا

بھی عجب چکر ہے۔ وکت کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت بدلتے ہی رہتے ہیں۔ مارشل لا لگنے سے کچھ ہی دنوں پہلے کا ذکر ہے۔ نواب مشتاک احمد گورمانی کے ساتھ ایسا ہی چکر چلا۔

”وہ کیا تھا جی؟“ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”تجھے پتہ ہے سیاست دانوں میں تو ایک دوسرے سے لگتی ہی رہتی ہے۔ کبھی یاری دوستی ہے تو کبھی مخالفت میں بیان بازی ہوتی ہے۔ گرانے کے لیے سازشیں ہوتی ہیں۔“ احسان شاہ نے بتایا۔

”کراچی کے ایک انگریزی اخبار کے ایڈیٹر نے، جس کا اخبار چلتا چلتا نہیں تھا، حکومت سے اشتہارات اور کچھ روپیہ انٹھنے کے لیے فیروز خان نون کے اشارے پر گورمانی کے خلاف چکر چلایا۔ فیروز خان نون تب وزیر اعظم ہوتا تھا۔ صدر اسکندر مرزا کی حمایت سے وزیر اعظم لگا تھا۔ ان دنوں اسکندر مرزا کی گورمانی سے سخت لگتی تھی۔“

”گورمانی کے خلاف اخبار نے کیا چکر چلایا تھا؟“ رحیم داد نے اسے ٹوکا۔

”اس میں گورمانی کا ایک خط چھپا تھا جو ہندوستان کے وزیر داخلہ سردار پٹیل کے نام تھا۔ جب یہ خط لکھا گیا تب گورمانی ریاست بھاول پور کا وزیر اعظم ہوتا تھا۔“ احسان شاہ نے تفصیل بتائی۔

”پاکستان نیا نیا بنا تھا۔ گورمانی نے سردار پٹیل کو اپنے خط میں لکھا تھا۔ اگر اس کو ہندوستان کی حکومت میں وزیر لگا دیا جائے تو وہ ریاست بھاول پور اپنی کوششوں سے ہندوستان میں شامل کرا دے گا۔ سردار پٹیل نے اس کی شرط مان لی۔ گورمانی کو اس سلسلے میں خط بھی لکھا۔“

”پر ریاست بھاول پور تو ہندوستان میں شامل نہیں ہوئی۔ پاکستان ہی میں رہی۔“ رحیم داد نے مداخلت کی۔

”گورمانی بہت ہشیار بندہ ہے۔ اسے تو دراصل سردار پٹیل کے خط کی ضرورت تھی۔ خط اس کے ہاتھ آیا تو اسے لے کر وزیر اعظم لیا کت علی خان کے پاس پہنچا۔ سردار پٹیل کا اسے خط دکھایا۔ سنا ہے وہ سخت پریشان ہوا۔ نواب گورمانی نے جو شرط سردار پٹیل کو پیش کی تھی وہی اسے پیش کی۔“ احسان شاہ اطمینان سے بولتا رہا۔ ”لیا کت علی خان نے اس کی شرط مان لی۔ اپنی کابینہ میں وزیر لگا دیا۔ اس طرح ریاست بھاول پور، ہندوستان میں نہ جاسکی۔ پاکستان میں شامل ہو گئی۔“

”پر اس میں دستخطوں کا کیا چکر تھا؟“

”اخبار میں خط چھپا تو گورمانی کی بہت بدنامی ہوئی۔ سچ پوچھ تو اسے چھاپا ہی اسی لیے گیا تھا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”گورمانی نے جھٹ ایک بیان کے ذریعے اس کی تردید کی۔ خط کو جعلی بتایا۔ ساتھ ہی اخبار کے خلاف عدالت میں جھگ عزت کا مقدمہ دائر کر دیا۔ اخبار سے

مقابلہ کیا کہ وہ اس کی تردید کرے اور معافی مانگے۔“ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی۔

”اخبار نے معافی نہ مانگی۔ ادھر ملک فیروز خان نے بھی اخبار کی حمایت میں بیان دے دیا۔“

”گورمانی نے تب کیا کیا؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”وہ بھی کمزور نہیں تھا۔ وزیر اعظم کی کھلم کھلا اور صدر اسکندر مرزا کی درپردہ حمایت کے باوجود ڈٹا رہا۔ عدالت کو بتایا کہ اس نے سردار پٹیل کو کبھی ایسا خط لکھا ہی نہیں۔ خط پر اس کے جعلی دستخط بنائے گئے ہیں۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”اس مرحلے پر عدالت نے دستخطوں کی جانچ پڑتال کرنے والے ایکسپٹ کو بلایا۔ اس نے دستخط کا ٹھیک طرح معائنہ کرنے کے بعد عدالت کو بتایا کہ خط پر جو دستخط ہیں وہ نواب گورمانی کے نہیں ہیں۔“

”عدالت نے کیا فیصلہ دیا؟“

”عدالت نے جعلی خط چھاپنے کے جرم میں اخبار کے ایڈیٹر کو جیل میں بند کر دیا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو بتایا۔ ”ایڈیٹر کو جیل بھی کافی پڑی اور عدالت کے حکم پر تین روز تک اپنے اخبار کے پہلے صفحے پر معافی نامہ بھی چھاپنا پڑا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”فیروز خان نون کی بھی بہت بدنامی ہوئی۔ خیال تو یہ تھا کہ اتنی بدنامی کی بعد وہ حکومت سے استعفیٰ دے دے گا۔ انگلستان کا وزیر اعظم ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ پر فیروز خان جمارہا۔ چپ کر کے بیٹھ گیا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دستخط گورمانی کے تھے ہی نہیں۔ جعلی بنائے گئے تھے۔“ رحیم داد کے دل کا چور بول اٹھا۔

”اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔“ احسان شاہ نے وضاحت کی۔ ”خط بالکل جعلی ہوتا تو فیروز خان نون اس کی حمایت نہ کرتا۔ وہ بھی کم ہشیار نہیں ہے۔ اس نے بھی خط چھپانے سے پہلے اطمینان کر لیا ہو گا۔ ویسے وہ خط تو بھوپال کا ایک حکیم دلبر حسین لایا تھا۔ پر سنا ہے وہ اسے ہندوستانی افسروں سے مل ملا کر سرکاری فائلوں میں سے کسی نہ کسی طرح اڑا کر لایا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ خط کے بارے میں ہندوستانی حکومت کی جانب سے بھی کوئی تردید نہیں کی گئی۔“

”تب تو خط جعلی نہ تھا۔ نواب گورمانی نے سردار پٹیل کو ایسا خط لکھا ہو گا۔“

”مجھے ایک دوڑے سرکاری افسر نے کراچی میں بتایا تھا کہ گورمانی نے ایسا خط لکھا تو تھا۔ پر وہ بہت ہی زیادہ ہشیار بندہ ہے۔ اسے پتہ تھا کہ آگے چل کر یہ راز کبھی نہ کبھی ضرور کھلے گا۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”سنا ہے اس نے یہ کیا کہ خط پر اپنے ہاتھ سے دستخط نہ کئے۔ اپنے بھروسے

کے کسی بندے سے ایسے دستخط کروائے جو اس کے دستخط سے بالکل ملتے جلتے تھے۔
”یہ تو جی اس نے زبردست چکر چلایا۔“ رحیم داد بے ساختہ ہنس پڑا۔

”پتہ نہیں کیا چاہے کیا جھوٹ۔ اس سلسلے میں طرح طرح کی باتیں سننے میں آئیں۔ پر اتنا ضرور ہے کہ نواب گورمانی زبردست سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ ہشیار بھی بہت ہے۔ جب اس کے خلاف یہ معاملہ چل رہا تھا تو اس کی ہوشیاری کے بارے میں ہندوستان کے مشہور انگریزی اخبار ”ٹائمز آف انڈیا“ نے بھی ایک دلچسپ خبر چھاپی تھی۔“
”وہ کیا تھی جی؟“ رحیم داد نے کرید کر پوچھا۔

”خبر میں لکھا تھا کہ گورمانی نے اونٹوں کی دموں کے ذریعے لاکھوں روپے بنائے تھے۔“
”تیری گل سمجھ نہیں آئی۔“ رحیم داد نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ ”اونٹوں کی دموں سے کیسے لاکھوں روپے بن سکتے ہیں؟“

”اخبار نے بتایا تھا کہ دوسری جنگ عظیم میں گورمانی وڈا سرکاری افسر لگا ہوا تھا۔ فوجی ساز و سامان کی جو سپلائی بھاول پور اور جیسلمیر کے ریگستانی رستے سے ہوتی تھی وہ اونٹوں کے ذریعے ہوتی تھی اور گورمانی کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ رستے میں اکثر اونٹ مر جاتے تو حکومت اس کا معاوضہ ادا کرتی تھی۔ پر جتنے اونٹ ہوتے نہیں تھے اس سے کہیں زیادہ کا معاوضہ وصول کیا جاتا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو آگاہ کیا۔ ”پر یہ بات زیادہ دن چھپی نہ رہ سکی۔ حکومت کو پتہ چلا تو اس بد عنوانی کی روک تھام کے لیے یہ حکم جاری کیا گیا کہ جتنے اونٹ رستے میں مرجائیں ان کا معاوضہ وصول کرنے کے لیے ساتھ میں مرے ہوئے اونٹ کی دم بھی کاٹ کر بھیجی جائے ورنہ پے منٹ نہیں ہو گا۔“

”ایسا کیا بھی گیا کہ نہیں؟“ رحیم داد نے پوچھا۔

”کیوں نہیں کیا گیا؟ سرکاری حکم جو تھا۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”مرنے والے اونٹوں کا معاوضہ لینے کے لیے دیس کاٹ کر بھیج دی جاتیں۔“

”تب تو بد عنوانی بالکل بند ہو جانی چاہیے تھی۔“

”ہرگز بند نہیں ہوئی۔ بد عنوانی کرنے والے تو ہر روک تھام کا توڑ بھی نکال لیتے ہیں۔“ احسان شاہ نے بے تکلفی سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”ہوتا یہ تھا کہ جو دیس بھیجی جاتیں ان کو مال خانے میں رکھ دیا جاتا۔ بعد میں مال خانے کے انچارج کو رشوت دے کر چوری چوری دیس واپس لے لی جاتیں۔ ان کو نئے مرنے والے اونٹوں کی دموں کے ساتھ دوبارہ بھیج دیا جاتا۔ سب ہی مل کر کھاتے تھے۔“

اس طرح لاکھوں روپے کی ہیرا پھیری ہوتی رہی۔ پر اس کا بھی پتہ چل گیا۔ ایک روز تو چلنا ہی تھا۔ رانی کا زمانہ تھا بدنامی کے ڈر سے دبا دیا گیا۔ یہ اونٹوں کی دموں کے سکیڈنڈل کے نام سے مشہور ہوا۔

”توچ کہہ رہا ہے شاہ جی؟“ رحیم داد نے یقین نہ آنے کے انداز میں پوچھا۔

”ویسے میں نے وہ اخبار تو دیکھا نہیں پر سننے میں ہی آیا ہے۔“ احسان شاہ نے کہا۔ ”ویسے یہ تو تجھے بھی ماننا پڑے گا کہ نواب گورمانی بہت ہشیار بندہ ہے۔ ہشیار نہ ہوتا تو مرکزی حکومت میں وزیر کیسے لگتا۔ مغربی پاکستان کا گورنر کیسے بنتا۔ سیاسی جوڑ توڑ کا تو وہ ماہر ہے۔ جواب نہیں اس کا۔“
”تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ گورمانی زبردست سیاست داں رہا ہے۔“ رحیم داد نے سید احسان علی شاہ کی تائید کی۔ ”وہ تو جی ہر حکومت میں ہوتا تھا۔“

”جی گل تو ایسہ ہے چوہدری، صرف نواب گورمانی ہی نہیں چوہدری محمد علی غلام محمد، اسکندر مرزا سب ہی بہت ہشیار بندے ہیں۔ ورنہ سرکاری افسری کرتے کیسے وزیر اعظم، گورنر جنرل، اور صدر بن گئے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”ذرا سوچ تو چوہدری محمد علی غلام محمد اور اسکندر مرزا نے پاکستان بنانے کے لیے کیا کیا تھا۔ یہ بھی پتہ نہیں پاکستان بنانے کے لیے انھوں نے مسلم لیگ کو الیکشن میں ووٹ بھی دیا تھا کہ نہیں۔“
”پروہ اتنے وڈے وڈے حاکم کیسے بن گئے؟“

”میں نے بتایا تا۔ وہ بہت ہشیار بندے ہیں۔ انھوں نے انگریز افسروں کی ماتحتی میں کام کیا ہے۔“ اس نے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”انگریز افسروں کی کیا بات تھی۔ وہ حکومت چلانا جانتے تھے۔ انگریز افسروں سے ہی انھوں نے بھی حکومت چلانی سیکھی اور یہ بھی سیکھا کہ حکومت کیسے حاصل کی جاتی ہے۔“

رحیم داد دلچسپی اور انہماک سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ احسان شاہ مسکرا مسکرا کرتا رہا۔ ”تجھے پتہ ہے چوہدری محمد علی کیسے سیاست میں آیا۔ ہوا یہ کہ جب لیاکت علی خان کانپڑی میں قتل ہوا تو اس رات کو چوہدری محمد علی نے سارے وزیروں کو اپنی کونٹری پر اکٹھا کیا۔ تب وہ حکومت میں میکرڈی جنرل ہوتا تھا۔ اس نے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم بنایا۔ غلام محمد کو گورنر جنرل لگایا۔ گورمانی کو وزیر داخلہ بنایا۔ اور وزیر داخلہ خواجہ شہاب الدین کو گورنر بنا کر صوبہ سرحد میں بھیجا اور خود وزیر خزانہ بن گیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نہ وہ مسلم لیگ کا لیڈر تھا اور نہ دستور ساز اسمبلی کا ممبر تھا۔ ایسا چکر چلایا کہ کسی کو مخالفت کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔“

”اسکندر مرزا تب کیا ہوتا تھا؟“

”وہ وزارت دفاع کا سیکریٹری ہوتا تھا۔“ احسان شاہ نے رحیم داد کو مطلع کیا۔ ”وہ پولیٹیکل ایجنٹ رہ چکا تھا۔ طرح طرح کی رشوت دے کر کبائلی سرداروں کو اپنے کنٹرول میں رکھتا تھا۔ جو سردار سرکشی کرتا اس کے خلاف دوسروں کو لگا دیتا۔ وہ آپس میں لڑتے تو ان میں صلح صفائی بھی وہی کرتا تھا۔ چوہدری محمد علی، سرکاری افسر سے وزیر بنا تو سکندر مرزا کو بھی وزیر بننے کی سوچھی اور وزیر بن بھی گیا۔ اتنا آگے بڑھا کہ محمد علی کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ کبھی کسی پارٹی میں نہ رہا۔ بیش سیاست سے باہر رہا اور سیاست لڑاتا بھی رہا۔ ایسی زبردست سیاست لڑاتا تھا کہ سارے ہی سیاست داں اس کی منہی میں رہتے تھے۔ جسے چاہا اوپر چڑھا دیا جسے چاہا گرا دیا۔“

”پر جنرل ایوب خان تو اسکندر مرزا سے بھی زیادہ ہشیار نکلا۔ اس نے اسکندر مرزا کا ایسا پتا پایا کہ اسے صرف حکومت ہی سے نہیں پاکستان سے بھی باہر نکال دیا۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”ویسے شاہ جی، دیکھا جائے تو ایوب خان اور اس کے جرنیلوں نے بھی پاکستان بنانے کے لیے کیا کیا تھا۔ سنا ہے انگریزوں کی فوج میں ایوب خان کرنل ہوتا تھا۔“ وہ زیب لب مسکرایا۔ ”پر اب تو جی اپنے جرنیلوں کے ساتھ ٹھٹھ سے حکومت کر رہا ہے۔ سیاست ایسی بند کی ہے کہ سارے ہی سیاست داں چپ کر کے بیٹھ گئے ہیں۔“

”اس کے پاس بندوک جو ہے، اور بندوک سے کون نہیں ڈرتا؟“ احسان شاہ ٹھٹھا مار کر ہنسا۔ ”بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ یہ بتا تیری الاٹمنٹ میں اور تو کوئی گزبڑ نہیں؟“

”نہیں جی، اور کوئی گزبڑ نہیں۔“ رحیم داد نے جواب دیا۔

”مان لے تیرا کلیم اگر جعلی بھی ہے تب بھی تجھے فکر کرنے کی ذرا ضرورت نہیں۔ تیرا کوئی بچہ نہیں بگاڑ سکتا۔“ احسان شاہ نے بے نیازی سے کہا۔ ”اب تجھ سے کیا چھپانا۔ جیل کے بیٹو لاا کشن دیال کی متروکہ اراضی کا اچھا خاصا حصہ میرے پاس ہے۔ تجھے تو پتہ ہی ہے میں کہاں کا ماہا ہوں۔ میرے پاس تو کوئی کلیم شلیم بھی نہیں۔“

”پر تو نے اس پر کیسے کب نہ کر رکھا ہے؟“

”الاٹمنٹ کرا رکھی ہے۔“ احسان شاہ نے مسکرا کر کہا۔ ”پر اپنے نام سے نہیں، اپنے ایک مہاجر نشی کے نام سے۔“

”اگے چل کر اس نے کوئی گزبڑ کی تو کیا ہو گا؟“

”کچھ بھی نہیں ہو گا۔“ احسان شاہ نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ ”الاٹمنٹ کے سا

ہی اراضی کی بیج کر رکھی تھی۔ پکا کام کیا ہے۔ اب وہ ساری اراضی میری ملکیت ہے۔ پر ایسا میں نے ہی نہیں کیا۔ کتنے ہی غیر مہاجر زمین داروں نے بھی اسی طرح متروکہ جائیداد پر کب نہ کر رکھا ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”چوہدری، بیچ پوچھ تو کتنی ہی جگہ ہندوؤں اور سکھوں کی جائیداد اور اراضی پر کب نہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بھڑکا کر فسادات کرائے گئے۔“

”چکر تو زبردست چلایا۔ فسادات سے ڈر کر ہندو اور سکھ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سرحد پار چلے گئے اور ان کی جائیداد اور اراضی پر بعد میں کب نہ کر لیا گیا۔“

”ویسے اسہ گل بھی ہے کہ ہندو بیٹے اور لالے ادھار اور سود و سود کے ذریعے مسلمانوں کی اراضی اور جائیداد دھیرے دھیرے اپنی ملکیت میں لیتے جا رہے تھے۔ وڈے زمین دار بن گئے تھے۔“ احسان شاہ نے وضاحت کی۔ ”ایسی لوٹ مار مچا رکھی تھی کہ مسلمان ان سے خار کھانے لگے تھے۔ ان کے سینوں میں آگ تو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مسلمان زمین داروں نے یہ آگ ذرا بھڑکائی تو ایسی پھیلی کہ پھیلی ہی چلی گئی۔“

”شاہ جی، تو نے ٹھیک ہی کہا۔“ رحیم داد نے اس کی تائید کی۔ ”بالکل ایسا ہی ہوا۔ ادھر کے مسلمانوں نے جو کچھ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ کیا ویسا ہی ادھر انھوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔“ رحیم داد نے خود کو مہاجر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ”تجھے کیا بتاؤں، ادھر کے مسلمانوں پر کتنا ظلم ہوا۔ اس کے بارے میں کبھی سوچتا ہوں تو لگتا ہے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں جی، بہت ظلم ہوا۔ اب اس کی یاد نہ کر۔ دکھ ہی ہو گا۔“ احسان شاہ نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔ ”تو اپنی الاٹمنٹ ٹائٹمنٹ کے بارے میں فکر نہ کر۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر اپنے جوش و جذبے کا اظہار کیا۔ ”میرے ہوتے ہوئے تجھے گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ملک میں مارشل لاء لگ گیا تو کیا ہوا، سرکاری افسر تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اب وہ فوجیوں کے ساتھ مل کر حکومت چلا رہے ہیں۔ ویسے فوجی ہوں یا غیر فوجی افسر، سارے ہی اپنے بندے ہیں۔“

رحیم داد نے کوئی تبصرہ نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔ احسان شاہ بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے دہلی زبان سے پوچھا۔ ”چوہدری، ایک گل تو بتا۔ میں نے سنا ہے، تیری گھر والی پہلے نوکرانی ہوتی تھی؟“

رحیم داد فوراً تارڑ گیا کہ نادر خان نے شاداں کے بارے میں احسان شاہ کو آگاہ کر دیا۔ اب انکار کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس نے اکتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی، تو نے ٹھیک ہی سنا۔ مجھے تجھ سے

جھوٹ نہیں بولنا۔“

”چوہدری، تجھے ویاہ کرنے کے لیے کوئی اور کڑی نہیں ملی۔“ احسان شاہ کا لہجہ تیکھا تھا۔ ”اس سے یاری لگائی تھی تو لگائے رکھتا۔ نوکرانیاں شوکرانیاں تو ہوتی اسی کام کے لیے ہیں۔ پر ان سے ویاہ نہیں کیا جاتا۔“

”تو بھول گیا۔ تو نے ہی تو کہا تھا پھیستی نال ویاہ کر لے۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ ”وہی ڈھونڈتا تو دیر لگتی۔ لہذا چکر چلتا۔ فوری طور پر تو وہی مجھے ویاہ کرنے کے لیے نظر آئی۔ دھوم دھام تو کرنی نہیں تھی۔ مسجد کے ملاں کو بلایا اور خاموشی سے نکاح پڑھوا لیا۔“

”جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب اگے کی سوچ۔“ احسان شاہ نے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ ”تجھے پتہ ہونا چاہیے اب تو ڈا زمین دار ہے۔ تجھے اپنی نسل کے بارے میں پوری طرح سوچ بچار کرنی چاہیے۔ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ کسی عزت دار اور اونچے زمین دار خاندان کی کڑی ویاہ کر لانا تیرا بھی نام اونچا ہو اور تیرے بال بچوں کا بھی۔“ اس نے بات کو مختصر کیا۔ ”ایسا کر، میرے ساتھ لہور چل۔ میں نے پیراں والہ نہیں، لہور ہی جانا ہے۔ وہاں اکٹھے بیٹھ کر سوچیں گے اس معاملے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔“

رحیم داد کی پریشانی احسان علی شاہ سے گفتگو کرنے کے بعد کم ہو گئی تھی، مگر ہنوز خوف زدہ تھا۔ کوئلہ ہر کشتن کے بجائے لاہور اسے زیادہ محفوظ مقام معلوم ہوا۔ وہاں احسان شاہ موجود تھا۔ اگر اس کے کلیم کے بارے میں کوئی تحقیقات ہوتی اور اس کے نتیجے میں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوتا تو احسان شاہ بروقت مدد کر سکتا تھا۔ ہر طرح سے مشکل کشائی کر سکتا تھا۔ وہ بہت بڑا زمین دار تھا۔ سرکاری حلقوں میں اثر و رسوخ رکھتا تھا۔ منسار اور یارباش بھی تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکاری افسروں سے کام نکالنے کا گھر بھی جانتا تھا۔

رحیم داد نے تامل نہ کیا۔ فوراً احسان علی شاہ کے ہم راہ لاہور جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ ذرا ہی دیر بعد اٹھ کر حویلی میں چلا گیا۔

شاداں اس کا انتظار کر رہی تھی۔ رحیم داد نے اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ جلد ہی لوٹنے کا وعدہ کیا۔ اس نے شاداں سے زیادہ بات چیت نہ کی۔ واپس احسان شاہ کے پاس پہنچا۔ اس کے ساتھ کار میں بیٹھا اور لاہور کے لیے روانہ ہو گیا۔



دن کے بارہ بجے کا عمل تھا۔ بھری دوپہر تھی۔ گرمی بڑھ گئی تھی۔ شاداں کمرے میں تنہا تھی۔ باہر چللائی دھوپ پھیلی تھی۔ شاداں کا یہ معمول تھا کہ رات بالائی منزل پر بسر کرتی۔ سورج غروب ہوتے ہی چھت پر پھڑکاؤ کر دیا جاتا۔ نوکر کمرے سے پلنگ نکال کر باہر چھت پر بچھا دیتے۔ ان پر اجلا بستر لگا دیا جاتا۔ صبح اٹھ کر وہ ناشتا اوپر ہی کی منزل پر کرتی تھی۔ دھوپ کی تمازت بڑھ جاتی تو پھر دن چڑھے نیچے چلی جاتی۔ وہاں بھی آرام کرنے کے لیے اس کا کمرہ مخصوص تھا۔ رحیم داد کوئلہ ہر کشتن میں موجود ہوتا تب بھی اس کے اس معمول میں فرق نہ آتا۔

رحیم داد ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا تھا۔ شاداں اس روز خلاف معمول بالائی منزل کے کمرے میں تھی۔ وہ نیچے جانے کا ارادہ کر رہی رہی تھی کہ ایک نوکرانی نے اطلاع دی۔

”چوہدرائی، تجھے ملنے کوئی بندہ آیا ہے۔“

”مجھے ملنے کون آیا ہے؟“ شاداں نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”یہ تو مجھے پتہ نہیں کون ہے۔“ نوکرانی نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ”اپنا نام لالی بتاتا ہے۔“

لالی کا نام سن کر شاداں چونکی۔ اسے لالی کا اتنا گوار گزرا۔ پیشانی پر ہل پڑ گیا۔ چہرے پر ہلکی ہلکی جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ اس نے سوچا لالی سے ملنے سے صاف انکار کر دے۔ اب وہ اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ رحیم داد اسے سخت ناپسند کرتا تھا۔ اس کے نام سے بھڑکتا تھا۔ وہ رحیم داد کو ناراض کرنا نہ چاہتی تھی۔ مگر وہ لالی کو بھی ناراض نہ کر سکتی تھی۔ لالی اسے سکھ نہ دے سکا لیکن اسے کبھی دکھ پہنچانے کی بھی کوشش نہ کی تھی۔

شاداں چند لمحے تذبذب کے عالم میں گم سم بیٹھی رہی، پھر اس نے نوکرانی سے کہا۔ ”اسے وڈے کمرے میں بٹھا دے۔ میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔“
نوکرانی خاموشی سے مڑی اور واپس چلی گئی۔

شاداں نے گرمی کے باوجود سفید ریشمی چادر اوڑھی۔ جسم کے بالائی حصے کو اچھی طرح ڈھانکا کمرے سے باہر نکلی۔ چھت عبور کی اور زینے کی سیڑھیاں طے کر کے بڑے کمرے میں پہنچ گئی۔ لالی کمرے میں موجود تھا۔ اس کا لباس بوسیدہ اور میلا پھیلا تھا۔ چہرہ اور سر کے بال خاک دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ وہ تھکا ہارا اور عموماً نظر آ رہا تھا۔ اس کے بشرے سے پریشان حالی آشکارہ تھی۔

شاداں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی چادر کے پلو سے ہٹ کر نصف چہرہ چھپا لیا۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھی اور لالی کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس نے پلٹ کر نوکرانی کی جانب دیکھا۔ لسی لانے کی ہدایت کی، پھر لالی کی طرف متوجہ ہوئی۔ لالی کی آنکھوں میں حسرت دیاس تھی۔ اس نے کھوئی کھوئی نظروں سے شاداں کو دیکھا۔

شاداں اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔ فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ آہستہ سے بولی۔ ”اب تو کیوں آیا ہے؟ چوہدری کو پتہ چلے گا تو سخت نراض ہو گا۔ میں تجھے یہی بتانے جیل گئی تھی۔ پر منع کرنے پر بھی تو نے میری بات نہ مانی اور یہاں چلا آیا۔ یہ تو نے ٹھیک نہیں کیا۔“ اس کے لہجے سے ناگواری عیاں تھی۔

”تو نے اس روز میری پوری گل بات ہی کب سنی تھی۔ اپنی ہی کہتی رہی۔“ لالی نے شکوہ کیا۔
”میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں چوری ڈکیتی کرنے کے جرم میں جیل نہیں گیا تھا۔ تجھ سے وعدہ کرنے کے بعد میں نے تو کبھی چوری ڈکیتی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔ تجھے پتہ نہیں۔“
”مجھے پتہ بھی نہیں کرنا۔“ شاداں نے اسے آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ”تجھے جو کچھ بتانا تھا“ اسی روز مجھے بتا دیا تھا۔“ اس کا لہجہ حیکما ہو گیا۔ ”تو جیل کیوں گیا؟ کیسے گیا؟ مجھے اب اس سے کچھ نہیں لینا۔“

”تو پہلے میری گل تو سن لے۔“ لالی نے اصرار کیا۔
مگر شاداں نے اس دفعہ بھی اسے صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں دیا۔ ”میں نے کچھ نہیں سنا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔“ اس کے لب و لہجے میں اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے لاا کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”میں اب چوہدری کی گھر والی بن چکی ہوں۔ اس کے سوا کسی اور مرد کے بارے

میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔“
”سوچنا بھی نہیں چاہیے۔“ لالی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ آواز میں تنگی پیدا ہو گئی۔ اس نے نظریں گھما پھرا کر دروازوں پر پڑے ہوئے خوش رنگ پردے، فرش پر بچھا ہوا نرم نرم قالین اور صوفے دیکھے۔ شاداں کا قیمتی لباس دیکھا۔ ”ایسی شاندار حویلی میں رہ کر تو کچھ اور سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب تو وڈی زمیں دار بنی بن گئی ہے۔ عیش کر رہی ہے۔“

لالی کے لہجے میں طنز تھا۔ جھنجھلاہٹ اور برہمی تھی۔ شاداں نے اسے محسوس کیا۔ اس کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔ مگر اس نے ضبط کا دامن نہ چھوڑا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ اپنے رویے سے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لالی نے قدرے توقف کیا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمایاں ہوا۔ ”لگتا ہے تجھے چوہدری سے بھی پیار ہو گیا ہے۔“

”ہاں!“ شاداں نے اس کی جانب دیکھے بغیر نہایت مختصر جواب دیا۔

”یہ بتا، تیرا کب تک چوہدری سے پیار کرنے کا ارادہ ہے؟“ اس کے لہجے میں تحقیر تھی، تلوار کی کاٹ تھی۔ ”تو نے پہلے بالے سے یاری لگائی۔ اس کے لیے اپنے کھسم کو چھوڑا۔ مگر یار چھوڑا، بال بچوں کو چھوڑا، فیریالے سے نراض ہوئی تو اس کا خون کر دیا۔ مجھ سے یاری لگائی۔“

لالی کے منہ سے بالے کا ذکر سن کر شاداں لرز کر رہ گئی۔ اس کے بشرے سے چپکتی ہوئی برہمی کا نور ہو گئی۔ اسے تمام عرصے میں پہلی بار اندازہ ہوا کہ لالی اس کے لیے خطرہ بھی بن سکتا ہے۔ وہ نہ صرف اقبال عرف بالا کے قتل کے راز سے واقف تھا، بلکہ اس نے بالا کی لاش ٹھکانے لگانے میں اس کی پوری پوری مدد بھی کی تھی۔ وہ اس کے جہانگیرہ کے مکان کی اس کوٹھری کو بھی اچھی طرح جانتا تھا جس میں گمراہ گھوڑا کھود کر لاش دفن کی گئی تھی۔

شاداں نے بولنا چاہا، مگر سراسیمگی کے عالم میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ اسی اثنا میں نوکرانی لسی کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ آگے بڑھی، شاداں کے اشارے پر گلاس لالی کو پیش کیا۔ مگر لالی نے گردن ہلا کر انکار کر دیا۔ ”میں نے لسی شیشی نہیں چینی۔“ اس کی آنکھوں سے خشکی جھلک رہی تھی۔

شاداں نے اصرار کیا۔ ”گرمی میں چل کر آیا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پینے ہے آرام ملے گا۔“ اس کا لہجہ نرم اور شیریں تھا۔ لالی مزید انکار نہ کر سکا۔ پیاسا بھی تھا۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے بے نیازی سے گلاس ہاتھ میں لیا اور ہونٹوں سے لگا کر بڑا گھونٹ بھرا۔

نوکرانی نے شاداں سے پوچھا۔ ”زمین دار بنی روٹی تیار ہے۔ بیس لے آؤں یا تو نے اپنے

کمرے میں کھانی ہے؟“

”میں بعد میں روٹی کھاؤں گی۔“ شاداں نے نوکرانی کو ہدایت کی۔ ”پہلے تولالی کے لیے روٹی لے آ۔ یہ روٹی کھا کر جائے گا۔“

نوکرانی چلی گئی۔ لالی نے گلاس خالی کیا۔ ایک طرف رکھا۔ اور ایک ہاتھ سے بھیگی ہوئی مونچھیں صاف کرنے لگا۔ شاداں خاموش بیٹھی رہی۔ لسی پینے سے لالی کو سکون ملا۔ اس کے غم و غصے میں کمی پیدا ہوئی۔ لیکن وہ ہنوز روٹھا ہوا تھا۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ ”مجھے اب جانا ہے۔ تیری روٹی شوٹی نہیں کھانی۔“ اس نے اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔

مگر شاداں نے اسے اٹھنے نہ دیا۔ ”کہاں چلا؟ تجھے روٹی کھا کر جانا ہو گا۔ رستے میں تجھے کہاں روٹی ملے گی۔“ اس نے پیار سے ڈانٹا۔ ”اتنی زراعت کی ٹھیک نہیں۔ چپ کر کے بیٹھا رہ۔ دیکھ تو تو نے اپنا کیا حال بنا رکھا ہے۔“ اس نے اظہار ہمدردی کیا۔

”میرا کچھ بھی حال ہے، تجھے اس سے کیا لینا۔“ لالی نے ایک بار پھر گلہ شکوہ شروع کر دیا۔ شاداں چاہتی بھی یہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ لالی کہتا رہا۔ ”یاد ہے، تو نے مجھ سے کیسے کیسے وعدے کیے تھے۔ وہ سب کیا تھا؟“

”اے بھول جا۔“ شاداں نے نرمی سے کہا۔ ”میں نے کہا تھا جو ہونا تھا ہو گیا۔“ لالی نے افسردہ نظروں سے شاداں کو دیکھا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکا۔ صرف گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ نوکرانی کھانا لے کر آئی۔ اس نے چھوٹی میز اٹھا کر لالی کے سامنے رکھی اور کھانا اس پر چن دیا۔ کھانا عمدہ اور مرغین تھا۔ پرائیٹے تھے، بھنا ہوا گوشت تھا، سبزی تھی، وال تھی اور چاول بھی تھے۔ لالی نے نالا توڑا اور کھانے لگا۔ لالی بچپنی رات سے بھوکا تھا۔ کھانا خوش ذائقہ تھا۔ وہ سر جھکا کر رغبت سے کھاتا رہا۔ شاداں خاموش بیٹھی اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

لالی نے کھانا کھاتے کھاتے نظریں اٹھا کر شاداں کو دیکھا۔ پوچھا۔ ”تجھے پتہ ہے چوہدری کون ہے؟“

”مجھے سب پتہ ہے وہ کون ہے کیسا ہے؟“ شاداں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

”تجھے کچھ پتہ نہیں۔“ لالی کا لہجہ اونچا ہو گیا۔

”دھیرے بول۔“ شاداں نے نرمی سے سمجھایا۔ ”تو چوہدری کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتا۔ وہ میرا گھر والا ہے۔ مجھ سے پیار بھی کرتا ہے۔ مجھے ہر طرح آرام پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس نے تو اپنی زمیں داری میں سے ڈیڑھ سو کلا زمین بھی میرے نام لکھ دی ہے۔“ اس نے ٹھنڈی سانس

بھری۔ ”میں نے اپنے پہلے گھر والے کو چھوڑ کر جو غلطی کی اس کی سزا بھی پائی۔ لالی میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ تو جیل چلا گیا۔ تجھے کیا پتہ میں نے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہیں۔“ اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”اب میں وہ دکھ وہ مصیبتیں نہیں اٹھا سکتی۔ اتنی جوان بھی نہیں رہی۔ میں چوہدری سے دھوکا نہیں کر سکتی۔“ اس کا چہرہ شرم سے گلابی ہو گیا۔ نگاہیں جھک گئیں۔ ”میں اس کے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

لالی کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے چونک کر شاداں کو دیکھا۔ وہ رحیم داد کے بارے میں اسے جو کچھ بتانا چاہتا تھا بتا نہ سکا۔ شاداں آہستہ آہستہ بولتی رہی۔ ”میں نے ایک بار اپنا گھر اجاڑا ہے اب اسے دوبارہ اجاڑنے کی مجھ میں بالکل ہمت نہیں۔ میں اب تیرے کام کی بھی نہیں رہی۔ تو کسی سوہنی کڑی سے ویاہ کر کے اپنا گھر بسالینا۔“

”میں نے کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا، یہ تیرے سوچنے کی بات نہیں۔“ لالی نے جل کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

”زراعت نہ ہو۔“ شاداں نے عاجزی سے کہا۔ ”میں تیری منت کرتی ہوں مجھے تنگ کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میں نے برسوں دکھ اٹھانے کے بعد آرام پایا ہے، خوشی کے دن دیکھے ہیں۔ میری اس خوشی کو برباد کرنے کی نہ سوچتا۔“ اس نے آب دیدہ ہو کر لالی کو دیکھا۔ ”اب تو یہاں نہ آنا۔ میرا رستہ اور ہے تیرا اور۔ ہم نے اب ایک دوسرے سے کچھ نہیں لینا۔ سمجھ لے تیری شاداں مر گئی۔“ اس کا لہجہ اور جذباتی ہو گیا۔ ”ہاں لالی، وہ شاداں اب مر گئی۔ میں نے جس روز چوہدری کے ساتھ نکاح کیا تھا وہ اسی روز مر گئی تھی۔“ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ آنسو پلکوں سے ڈھلک ڈھلک کر رخساروں پر بہنے لگے۔

لالی بھی جذباتی ہو گیا۔ وہ شاداں کو اس قدر دل گرفتہ نہ دیکھ سکا۔ تڑپ کر بولا۔ ”شاداں آنسو پونچھ لے۔ میں اب تیرے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔ تجھے بھول جانے کی کوشش کروں گا۔“ جذبات کی شدت سے اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ اس نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ بلی گیا۔ پانی پینے سے طبیعت میں ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ وہ پھر شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”شاداں، میں نے ہمیشہ تجھے خوشی دینے کی کوشش کی پر دے نہ سکا۔ تو چوہدری کے ساتھ رہ کر خوش ہے تو تیری خوشی کے ساتھ میں بھی خوش ہوں۔“

شاداں نے آنسو پونچھے۔ اس کے چہرے پر چھایا ہوا افسردگی کا غبار چھٹنے لگا۔ اس نے لالی کی خوش نودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ”مجھے پتہ ہے، تیرا دل بہت وڈا ہے۔“ وہ لالی کی دل جوئی

کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے یہ بھی پتہ ہے تو نے زندگی بھر دکھ ہی اٹھائے ہیں۔ تو کسی کو دکھ نہیں پہنچا سکتا۔“

لالی خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ شاداں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ لالی نے ٹوکا۔ ”کہاں چلی؟“

”میں اوپر اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تیرے لیے کچھ روپے لے کر آتی ہوں۔ لگتا ہے تیرے پاس کچھ بھی نہیں۔“

”تو مجھے رشوت دینا چاہتی ہے؟“ لالی نے مسکرا کر چوٹ کی۔

”ایسی گل نہ کر۔“ شاداں نے گردن کو خم دے کر تیکھی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”تو نے ہمیشہ ہی میری مدد کی ہے۔ میری جگہ ملک کی گولی سے مر گئی۔ تو نے مجھے ویسی ہی دوسری جگہ لاکر دی۔ بعد میں دو ہزار روپیہ بھی دیا۔ تو نے کب میری مدد نہیں کی؟“ اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ”اب میں تیری کچھ مدد کر سکتی ہوں تو اسے رشوت کہہ رہا ہے۔ تو مجھے اتنا ذلیل سمجھتا ہے؟“

”نراض نہ ہو۔“ لالی نرم پڑ گیا۔ دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ ”میں نے تو تجھے چھیڑنے کے لیے کہا تھا۔ تو ایک دم بھڑک اٹھی۔“

شاداں نے کچھ نہ کہا۔ تیز قدم اٹھاتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ لالی سر جھکا کر کھانا کھانے لگا۔ دروازے پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ لالی نے مڑ کر دیکھا۔ وہاں نہ شاداں تھی نہ اس کی نوکرانی۔ سامنے رحیم داد کھڑا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔ رحیم داد کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ ڈپٹ کر پوچھا۔ ”کون ہے تو؟“ لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ٹٹولنے والی نظروں سے رحیم داد کے چہرے کو تکتا رہا۔

”بولتا کیوں نہیں؟ کون ہے تو؟“ اس دفعہ رحیم داد نے زیادہ برہمی کا اظہار کیا۔

”میں لالی ہوں جی۔“ لالی نے دبی زبان سے کہا۔

”تو جیل میں ہوتا تھا نا۔ باہر کیسے آگیا؟“

”سزا ختم ہو گئی تو باہر آگیا۔“ لالی نے تلخی سے کہا۔ ”میرے باہر آنے سے تجھے تکلیف ہوئی؟“

”نہیں اس نے نہ کر۔“ رحیم داد بھڑک اٹھا۔ ”یہاں کیسے آیا؟ تجھے کس نے یہاں آنے دیا؟“

لالی کچھ نہ بولا۔ تنگنی باندھے رحیم داد کی جانب دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے اور ہر ہر انداز کا بغور جائزہ لیتا رہا۔ ہر چند کہ اس کی آنکھوں پر اب عینک تھی۔ چہرے پر ڈاڑھی تھی۔ اور رخسار پر زخم کا ہلال نما واضح نشان تھا۔ اس کا حلیہ بڑی حد تک بدل چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے کے آثار چڑھاؤ اور لمبے میں اس رحیم داد کی جھلک تھی جو مدت تک لالی کی ساتھ جیل میں رہ چکا تھا اور اسی کے ہم

راہ جیل سے فرار بھی ہوا تھا۔ لالی کا شبہ رفتہ رفتہ پختہ ہو گیا۔

رحیم داد اس کی متجسس نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ غضب ناک ہو کر چیخا۔ ”تو میری حویلی میں داخل کیسے ہوا؟“ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آواز اونچی ہو گئی۔ ”چور ڈکیت۔ کسی شان سے صوفے پر بیٹھا آرام سے روٹی کھا رہا ہے۔ تیری اتنی ہمت کیسے ہوئی؟“ وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ میز پر زور سے ٹھوکر ماری۔ میز الٹ گئی۔ کھانے کی قابیں اور پلیٹیں چھٹانے کے ساتھ فرش پر گر گئیں اور ادھر ادھر بکھر گئیں۔ رحیم داد کا غصہ کم نہ ہوا۔ ”تجھے اس کمینے نے بلایا ہو گا۔ کدھر ہے وہ؟ کہاں چلی گئی؟“ وہ شاداں کو گالیاں دیتا رہا۔

لالی پر سکون رہا۔ اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ گلاس اٹھایا اور ہونٹوں سے لگا کر پانی پینے لگا۔ رحیم داد زور سے دھاڑا۔ ”نکل جا یہاں سے۔ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جا۔“ مگر لالی اس کے غیظ و غضب سے مرعوب نہ ہوا۔ ڈھیٹ بن کر بولا۔ ”اتنی گرمی نہ دکھا۔ پانی تو پی لینے دے۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“ اس نے پانی پیا۔ گلاس فرش پر رکھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

رحیم داد غصے سے ہانپ رہا تھا۔ مگر وہ کچھ بولا نہیں۔ نڈھال ہو کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ لالی دروازے کی جانب بڑھا۔ ٹھٹکا رحیم داد کو ایک بار پھر ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ رحیم داد اس سے نظریں نہ ملا سکا۔ وہ مڑا اور چہرے پر آیا ہوا پسینہ پونچھنے لگا۔

لالی کمرے سے باہر نکلا۔ دالان میں پہنچا تو شاداں سے مڈ بھٹھو گئی۔ اس نے لالی کو ٹوکا۔ ”تو کہاں چلا؟“

لالی نے تیکھے لمبے میں کہا۔ ”اندر جا کر دیکھ۔ تیرا پیار کرنے والا کھسم تجھے اور مجھے دونوں کو تنگی تنگی گالیاں نکال رہا ہے۔“ شاداں کے چہرے پر سراپسنگی طاری ہو گئی۔ لالی نے اس کی جانب مزید توجہ نہ دی۔ آگے بڑھا اور قدم اٹھاتا ہوا حویلی سے باہر چلا گیا۔



حویلی کے سامنے کھلے میدان میں ہر طرف تیز دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لو بھی چل رہی تھی۔ لالی دھوپ کی تمازت اور لو کے تھپڑوں سے بے نیاز چلتا رہا۔ لاریوں کے اڈے پر پہنچا۔ نیلی ٹرانسپورٹ کا ایک لاری میں سوار ہوا۔ شریچ کر وہ لاہور جانے والی بس میں بیٹھ گیا۔

لاہور پہنچنے کے بعد بھی اس کے ذہن پر رحیم داد سوار تھا۔ اس نے لالی کو جس حقارت سے دھتکار کر اپنی حویلی سے نکالا تھا اس بے عزتی اور ذلت کو وہ بھولا نہ تھا۔ اسے وہ رہ کر رحیم داد کی گالیاں اور ڈانٹ پھٹکار یاد آرہی تھی۔ جتنا وہ ان کو یاد کرتا اسی شدت کے ساتھ رحیم داد کے

خلاف اس کی نفرت اور کدورت بڑھتی جا رہی تھی۔ رحیم داد کے ساتھ ساتھ وہ شاداں سے بھی خفا تھا۔

رحیم داد کے بارے میں اس کا شبہ نہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ ارشاد الہی سے اس کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ اپنے اطمینان کے لیے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کا باپ چوہدری نور الہی نہیں بلکہ رحیم داد ہے جو اس کے کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی الاٹ کرا کے کوئلہ ہرکشن کا بہت بڑا زمین دار بن گیا ہے۔

وہ ارشاد الہی کو تلاش کرنے ملک ٹار محمد کے بھٹے پر پہنچا۔ جیل جانے سے قبل ارشاد الہی اسی بھٹے پر پتھیرا تھا۔ لالی نے بھٹے کے پتھروں سے چوری چھپے رابطہ قائم کیا۔ ارشاد الہی کے بارے میں دریافت کیا۔ مگر وہ اب اس بھٹے پر نہیں تھا۔ جعدار نے کچھ دوسرے پتھروں کے ساتھ اسے کسی اور بھٹے کے مالک کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ مگر پوچھ گچھ کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ ارشاد الہی کس بھٹے پر پہنچا گیا تھا۔

لالی نے فیروز پور روڈ، جی ٹی روڈ اور بیدیاں روڈ کے تمام ہی بھٹوں پر ارشاد الہی کو تلاش کیا۔ مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ اسی کوشش میں لگا رہا کہ کہیں اس کا سراغ مل جائے۔ وہ ارشاد الہی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ ایک شام اس کا پرانا ساتھی غنی چٹا مل گیا۔ وہ تالا توڑنے اور نقب زنی میں ماہر تھا۔ کئی بار پکڑا گیا۔ جیل گیا، مگر باز نہ آیا۔ اب وہ منجھا ہوا جرائم پیشہ بن چکا تھا۔

غنی چٹا اصرار کر کے لالی کو اپنے گھر لے گیا۔ نہ اس کی بیوی تھی نہ بچے۔ دو بڑے بھائی تھے۔ وہ اپنے بال بچوں کے ساتھ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ لیکن چٹا ان سے ملتا نہ تھا۔ وہ بھی اس سے کتراتے تھے۔ چٹا مصری شاہ کے چھوٹے سے تنگ و تاریک مکان میں رہتا تھا۔ لالی کے پاس رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ غنی نے زور دیا تو وہ اس کے ساتھ ہی رہنے لگا۔

غنی نے لالی کو اپنے دھرمے پر لگانا چاہا۔ اسے ایک معاون و مددگار کی ضرورت تھی۔ لالی نے بہت چاہا کہ جس دلدل سے ایک بار نکل چکا ہے دوبارہ اس میں نہ گرے۔ مگر نہ اسے کہیں کا دھندلا اور نہ ہی سرچھپانے کے لیے جگہ ملی۔ مسلسل بے روزگاری اور پریشان حالی سے تنگ آکر اس نے غنی کا کہا مان لیا۔ ویسے بھی نہ اب شاداں اس کی رہی تھی اور نہ اس وعدے کی کوئی اہمیت رہی تھی جو اس نے چوری ڈاکہ زنی نہ کرنے کے سلسلے میں اس سے کیا تھا۔

لالی اور غنی چٹا مل جل کر چوری ڈاکہ زنی کرتے اور چوری کا مال آپس میں بانٹ لیتے۔ رہتے ہیں

ایک ہی گھر میں تھے۔ لالی ایک بار پھر بندر اور بے باک جرائم پیشہ بن گیا۔ ایسے دھڑلے سے واردات کرنا کہ کبھی کبھی تو چٹا دنگ رہ جاتا۔

دو مہینے سے زیادہ عرصہ گزر گیا۔ گرمی کا زور ٹوٹنے لگا۔ جولائی کا مہینہ تھا۔ بارش کا پہلا چھینٹا پڑ چکا تھا۔ ایک رات غنی چٹا اور لالی چوہدری کی نیت سے کرشن نگر کے ایک مکان میں داخل ہوئے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ واردات سے پہلے ہی جاگ ہو گئی۔ گھبرا کر دونوں نے راہ فرار اختیار کی۔ لالی تو بچ کر صاف نکل گیا۔ چٹا بدحواس ہو کر چھت پر پہنچ گیا۔ شور زیادہ بلند ہوا تو اس نے برابر کے مکان پر پہنچنے کی کوشش کی۔

دونوں مکانوں کے درمیان تنگ گلی حائل تھی۔ غنی نے زغند بھری لیکن چھت کے منڈیر پر اس کا پیر اس طرح پھسلا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر دھڑام سے گلی کے پختہ فرش پر گرا۔ ٹخنہ اتر گیا۔ اس نے چوٹ کی مطلق پرواہ نہ کی۔ سر پٹ بھاگا اور فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ گھر پہنچا تو لالی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ چوٹ تازہ تھی، لہذا رات کو اس کی شدت کا پوری طرح اندازہ نہ ہو سکا۔ چٹا صبح سو کر اٹھا تو پیر میں شدید درد کے ساتھ ساتھ درم بھی تھا۔

غنی چٹا اب گھر ہی پر رہتا۔ ٹوٹی ہڈیاں جوڑنے اور ہڈیوں کے اکھڑے ہوئے جوڑ بٹھانے والے ایک معالج کے علاج معالجے سے ٹخنے کی ہڈی کا جوڑ تو بیٹھ گیا لیکن ابھی تک وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ ہوا تھا۔ اس عرصے میں چوہدری کی ساری رقم ختم ہو گئی۔ فائدہ کشی کی نوبت آگئی۔ لہذا ایک رات لالی اکیلا ہی چوری کرنے کے ارادے سے نکلا۔

آسمان پر بادل چھائے تھے۔ ہوا مدھم چل رہی تھی۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔ لالی نے ایک مکان تالا۔ گھوم پھر کر جائزہ لیا۔ موقع و محل دیکھا۔ یہ پرانی وضع کا بنگلہ تھا۔ اس کے پچھلے حصے کی دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ آس پاس آبادی بھی کم تھی۔ جگہ جگہ گھنے درخت تھے۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ لالی اچھل کر آسانی سے ایک دیوار پر چڑھ گیا۔ بنگلے کے وسیع صحن میں ایک پلنگ پڑا تھا۔ کوئی اس پر بے خبر سو رہا تھا۔ لالی نے چونکنا نظروں سے اوجھڑا دیکھا اور آہستہ سے نیچے اتر گیا۔

صحن کے ساتھ کچہریل کی چھت کا طویل برآمدہ تھا۔ لالی دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ برآمدے میں پہنچا۔ ایک کمرے کے دروازے پر رکا۔ ہولے سے دھکا دیا۔ مگر دروازہ بند تھا۔ دوسرا بھی اندر سے بند تھا۔ البتہ کمرے کے کمرے کا دروازہ ہاتھ لگاتے ہی چرچراتا ہوا کھل گیا۔ لالی دم سادھے کمرے کے باہر کھڑا رہا۔ اس نے مڑ کر پلنگ پر لیٹے ہوئے شخص کی جانب دیکھا۔ وہ بدستہ رگڑی بند

سورہا تھا۔

لالی نے نہایت احتیاط سے دروازے کا ایک پٹ کھولا۔ کمرے کے اندر داخل ہوا۔ قیصر کی جیب سے چھوٹی سی نارنج نکالی۔ اسے روشن کیا۔ کمرہ زیادہ بڑا نہ تھا۔ ایک گوشے میں میز تھی۔ اس پر چند کتابیں رکھی تھیں۔ کلائی پر باندھنے کی گھڑی بھی ایک طرف رکھی تھی۔ میز کے قریب ہی کھوئی پر پتلون اور بش شرٹ لٹکی ہوئی تھی۔ لالی نے نارنج بجھا دی۔ ہاتھ بڑھا کر پتلون اور بش شرٹ کی جیبیں ٹٹولیں۔ پتلون کی پچھلی جیب میں چند کرنسی نوٹ موجود تھے۔ اس نے نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لیے۔ میز پر رکھی ہوئی گھڑی بھی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔

میز سے ذرا ہٹ کر لکڑی کی اونچی الماری تھی۔ وہ اس کی جانب بڑھا۔ مگر اس کا ایک پیر قریب رکھے ہوئے پیڈسٹل لیپ سے کچھ اس طرح ٹکرایا کہ لیپ ڈمگا کر کرسی پر گرا اور کرسی اس کے بوجھ سے الٹ گئی۔ رات کے سناٹے میں اچانک شور ہوا۔ لالی سرا سید ہو کر جہاں تھا وہیں دم بخور کھڑا رہا۔ باہر صحن میں کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر تھمموں کی آہٹ سنائی دی اور رفتہ رفتہ قریب آتی گئی۔

دروازے کی دہلیز پر اندھیرے میں ایک سایہ لہرایا۔ لالی کو خطرے کا شدت سے احساس ہوا۔ سنبھلا بھی نہ تھا کہ دیوار پر لگا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ کمرے میں ہر طرف روشنی پھیل گئی۔ لالی۔ جھٹ چاقو نکالا۔ اسے کھولا اور مضبوطی سے ہاتھ میں دبا کر دروازے کی جانب دیکھا۔ سامنے سلیم لودھی کھڑا تھا۔ اس کے سر کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں نیند کا غما تھا۔ چہرے پر خوف و ہراس تھا۔ اس کا جسم چھریا تھا۔ عمر ۳۵ برس سے زیادہ نہ تھی۔ مگر بالوں میں وقت سے پہلے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی سن رسیدہ نظر آتا تھا۔

لالی نے سلیم لودھی کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ اسے سامنے دیکھ کر بہت سٹ پٹایا۔ لالی جیل میں قیدی تھا تو انھی دنوں سلیم لودھی بھی نظر بند تھا۔ اسے مارشل لا کے ایک ضابطے کے تحت دوسرے سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ تخریب کاری اور ملک دشمنی کے الزام میں گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ وہ بی کلاس قیدی تھا اور لالی کو اس کا مشقتی لگا یا گیا تھا۔ لالی ساتھ اس کا رویہ نہایت دوستانہ اور مشفقانہ تھا۔ اس کے لہجے میں ہمیشہ نرمی اور گفتگو ہوتی۔ لالی بھی اسے عزت و احترام کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔

سلیم لودھی نے بھی لالی کو پہچان لیا تھا۔ کچھ دیر حیران و پریشان کھڑا لالی کو نکلتا رہا، پھر اپنے ہوئے پوچھا۔ ”تو لالی تو نہیں ہے؟“ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔ ”یاد پڑتا ہے تو میرے سامنے“

ہل میں تھا۔“

لالی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بت بنا خاموش کھڑا رہا۔

”یار، تو بولتا کیوں نہیں؟“ اس دفعہ اس کے انداز میں کسی قدر بے تکلفی تھی۔ ”تو لالی ہے؟“

”ہاں جی، میں لالی ہی ہوں۔“ لالی نے نظریں جھکا کر دبی زبان سے کہا۔

”تو یہاں پہنچا کیسے؟“ اس نے پلٹ کر صحن کی چار دیواری کی جانب دیکھا۔ ”دیوار پھاند کر آیا، وہ کھل کر مسکرایا۔ ”چوری کرنے آیا تھا۔ مگر تو نے غلط مکان کا انتخاب کیا۔ میرے پاس شکل سے تیس پینتیس روپے ہوں گے۔ ان سے تیرا کیا کام بنے گا؟“

لالی بہت خجل ہوا۔ لیکن نہ اس نے معذرت کی نہ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ سر جھکائے لڑکوں کی طرح چپ کھڑا رہا۔ سلیم لودھی مسکرا مسکرا کر بولتا رہا۔ ”یار، چوری ہی کرنی تھی تو کسی مال دار کا گھرتا کا ہوتا۔ زرو مال بھی بھڑا ہاتھ آتا۔“ وہ لمحے بھر کے لیے ٹھکا۔ ”ویسے اس گھر کو دیکھ کر بھی مغالطہ ہوتا ہے۔ یہ میری چھوٹی بہن کا گھر ہے۔ اس کا شوہر بی ڈبلیو ڈی کا ٹھیکیدار ہے۔ پیسے والا بھی ہے۔ مگر آج کل وہ بال بچوں کے ساتھ مری میں ہے۔ برسات شروع ہو چکی ہے۔ اب اسے واپس آ جانا چاہیے۔“

سلیم لودھی نے جھک کر فرش پر اوٹھ کر کرسی اٹھا کر سیدھی کی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو ابھی تک دبا تھا۔ سلیم لودھی نے سہمی ہوئی نظروں سے چاقو دیکھا۔ ”یار لالی، اسے بند کر کے جیب میں رکھ۔ دیکھ کر خواہ مخواہ ڈر لگتا ہے۔“ اس نے چاقو کی جانب اشارہ کیا۔

لالی نے اس کی طرف دیکھے بغیر چاقو بند کیا اور جیب میں رکھ لیا۔ ساتھ ہی جیب سے گھڑی اور چھوٹا نکال کر خاموشی سے میز پر رکھ دیے۔ سلیم لودھی نے نوٹ اور گھڑی دیکھ کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”یار یہ تو میرے پاس آخری اثاثہ تھا۔ لے جاتا تو سگریٹ خریدنے کو بھی کچھ نہ رہتا۔“ اس نے مسکرا کر شوخی سے لالی کو دیکھا۔ ”ہاں گھڑی کے بغیر تو کسی نہ کسی طرح کام چل سکتا ہے۔ تجھے اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو تو لے جا۔“

”نہیں جی، میں نے کچھ نہیں لیتا۔“ لالی نے انکار میں گردن ہلائی۔ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی تھر تھراہٹ تھی۔ لہجے میں معذرت اور پشیمانی تھی۔ ”مجھے تو جی بالکل پتہ نہ تھا کہ آپ یہاں رہتے ہیں۔“

”تو جی ہی کہہ رہا ہو گا۔“ سلیم لودھی نے پیڈنٹل لیمپ اٹھا کر درست کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔
 ”ویسے رشوت خور اور چور کسی کے یار نہیں ہوتے۔“

لالی نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ سلیم لودھی نے سوچ دیا۔ چھت سے لگتا ہوا بجلی کا پنکھا
 تیزی سے گردش کرنے لگا۔ سلیم لودھی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے قریب رکھی ہوئی دوسری کرسی کی
 جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”تو کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔ اب تو نیند آنکھوں سے اڑی گئی۔ تجھ سے
 کچھ باتیں ہی ہو جائیں۔“

لالی خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔

”جب تو جیل میں تھا تو خود کو بے گناہ ثابت کرتا تھا۔ کہتا تھا کہ تیرے خلاف چوری ڈکیتی کا جھوٹا
 کیس بنایا گیا۔ کسی جرم کے بغیر تجھے جیل میں بند کر دیا گیا۔ یہی کہا کرتا تھا نا؟“

”ہاں جی یہی کہتا تھا۔“ لالی نے تردید نہ کی۔ ”اور جی میں غلط بھی نہیں کہتا تھا۔“

”یہ بھی تو کہتا تھا کہ تو نے چوری ڈکیتی چھوڑ دی ہے۔“ سلیم لودھی نے مسکرا کر طنز کیا۔ ”یہاں
 تو دیوار پھاند کر آدمی رات کو چوری کرنے کے لیے نہیں مجھ سے ملنے آیا ہو گا۔“

”اصلی بات یہ ہے جی۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”کئی سال پہلے میں نے شاداں سے چوری
 ڈکیتی نہ کرنے کا پکا وعدہ کیا تھا۔ محنت مزدوری کر کے پیٹ پالنے کی کوشش کی۔ بھٹوں پر ہتھیار لگ
 گیا۔“ لالی کے چہرے پر افسردگی چھا گئی۔ ”پر جب میں جیل میں تھا تو اس نے مجھ سے دھوکا کیا۔
 ایک زمیں وار سے ویاہ کر لیا۔“

”اس نے ٹھیک ہی کیا۔ تیرے انتظار میں بیٹھی رہتی تو بھوک اور مفلسی سے مر جاتی۔“ سلیم
 لودھی نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔ ”اب آرام سے رہتی ہو گی۔ عیش کرتی ہو گی۔“

”ہاں جی بہت عیش کرتی ہے۔ وڈی زمین دار بنی بن گئی ہے۔“ لالی کا لہجہ جھکھا ہو گیا۔ ”اس کا گ
 والا ویسے ہے تو بہت وڈا زمین دار، پر اس نے جعلی کلیم کے ذریعے متروکہ اراضی الاٹ کر رکھی
 ہے۔ بے ایمانی اور دھوکے فریب سے اتنا وڈا زمیں دار بن گیا ہے۔“

”صرف وہی نہیں، سارے ہی وڈے زمیں داروں نے بے ایمانی اور دھوکے فریب کے ذریعے
 اتنی وسیع زمین داریاں حاصل کی ہیں۔ کچھ نے خود اس طرح حاصل کی ہیں، کچھ ایسے ہیں جن کے
 بزرگوں نے اسی طرح کی تھیں اور مرنے کے بعد اپنے وارثوں کے لیے چھوڑ گئے۔“ سلیم لودھی
 اطمینان سے بولتا رہا۔ ”کسی نے زبردستی زمین دہالی، کسی نے انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے
 لیے ملک اور اس کے محکوم عوام سے غداری کی اور انعام کے طور پر دولت اور جاگیر پائی۔“ اس کا

لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”انگریزوں کی حکومت تھی، تب بھی وہ عیش کرتے تھے۔ اب بھی عیش کرتے ہیں۔
 پہلے وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر حکومت چلاتے تھے۔ اب ان کے دیکسی ماتحتوں اور کارندوں کے
 ساتھ مل کر چلاتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو لوٹ مار اور غداری کے صلے میں ملنے والی زمیں داریاں کب
 کی ختم ہو جاتیں۔ تجی سرکار ضبط کر کے بے زمین کسانوں میں تقسیم کردی جاتیں۔“

”مجھے اس بارے میں جی کچھ پتہ نہیں۔“

”تجھے تو یہ بھی پتہ نہ ہو گا کہ تو چور ہے تو وہ زمیں دار بھی چور ہے، جس نے تیری شاداں سے
 شادی کر لی۔“ سلیم لودھی نے لالی کو بتایا۔ ”بلکہ تو چھوٹا چور ہے، اور وہ بڑا چور ہے۔“

”وہ کیسے چور ہو سکتا ہے جی؟ اس نے چوری ڈکیتی تو نہیں کی۔“ لالی اس کی بات کا مضموم مطلق
 نہ سمجھ سکا۔ نہایت سادگی سے بولا۔ ”یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی۔“

”آبھی نہیں سکتی۔ تو اکیلا نہیں۔ کروڑوں ایسے بندے ہیں جو یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔“ سلیم
 لودھی نے میز پر رکھی ہوئی اپنی گھڑی اٹھائی۔ لالی کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ گھڑی دیکھ رہا
 ہے جسے تو چوری کر کے لے جانا چاہتا تھا۔ اسے میں نے دو سو روپے میں خریدا تھا۔ تو اسے چرا کر
 لے جاتا تو یوں سمجھ لے، میرے دو سو روپے کی چوری کر لیتا۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟“

”ہاں جی، یہ تو بالکل ٹھیک گل ہوئی۔“ لالی نے اس کی تائید کی۔

”یہ دو سو روپے کیسے بنے؟“ سلیم لودھی سر اٹھا کر لہجہ بھر سوچتا رہا، پھر گویا ہوا۔ ”یہ میری لگ
 بمک ۱۵ روز کی تنخواہ تھی۔ مطلب کہنے کا یہ ہے کہ میری ۱۵ روز کی محنت دو سو روپے میں بدل گئی۔
 یہ گھڑی اٹھا کر تو لے جاتا تو دراصل وہ مری ۱۵ دن کی محنت کی چوری ہوتی۔“ اس نے غور سے لالی
 کا چہرہ دیکھا۔ ”تو میری بات کا مطلب سمجھ رہا ہے نا؟“

”ہاں جی، بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ لالی نے مستعدی سے جواب دیا۔

”اب تو ذرا اپنی شاداں کے شوہر کے بارے میں سوچ۔“ سلیم لودھی نے کہا۔ ”اس کے
 ۱۵ روپے چھپچھاتی دھوپ، کڑا کے کی سردی اور سخت بارشوں میں فصلیں اگاتے ہیں۔ مل چلاتے
 ہیں، بوائے کرتے ہیں، فصلوں کو پانی لگاتے ہیں۔ دن رات محنت کرتے ہیں۔ اور زمیں دار کچھ نہیں
 کرتا۔ پر بٹائی پر آدمی بلکہ اس سے کہیں زیادہ فصل اپنے حصے کے طور پر لے جاتا ہے۔“ اس نے
 لالی کو والیہ نظروں سے دیکھا۔ ”لے جاتا ہے نا؟“

”ہاں جی، بالکل لے جاتا ہے۔“

”جس طرح میری ۱۵ روز کی محنت گھڑی میں بدل گئی، بالکل اسی طرح مزارعوں کی محنت فصل

میں بدل جاتی ہے۔” وہ اس انداز سے بات کر رہا تھا جیسے اسکول کا کوئی استاد اپنے شاگرد کو کوئی نکتہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کا استدلال عام فہم تھا۔ بات کرنے کا انداز دل نشین اور اثر انگیز تھا۔ وہ بتاتا رہا۔ ”زمین دار جب فصل کا آدھے سے بھی زیادہ حصہ بٹائی کے ذریعے اٹھا کر لے جاتا ہے تو وہ دراصل اپنے حصے کی شکل میں مزارعوں کی کئی مہینوں کی محنت چرا کر لے جاتا ہے۔“

”یہ بات سمجھ نہیں آئی جی۔“ لالی بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

”زمین جو اس کی ہوتی ہے۔ زمین دار اسی کی بنا پر اپنے حصے کی فصل لے جاتا ہے۔ یہ چوری تو نہیں ہوتی۔“

”میں نے تجھے بتایا نہیں کہ وڈے زمین داروں کو یا ان کے بزرگوں کو یہ زمین انگریز حاکموں کی خدمت اور وطن سے غداری کرنے کے صلے میں ملی تھی۔ سچ پوچھ تو انگریز بھی چور تھے۔“

”وہ جی کیسے چور ہوئے؟“ لالی نے مداخلت کی۔

”وہ اس طرح چور ہوئے کہ وہ بھی اس ملک کے عوام کی محنت طرح طرح سے لوٹتے تھے۔ زمین دار اور جاگیردار اس لوٹ مار میں ان کی مدد کرتے تھے۔ وہ لوٹ کے مال میں ان کے ساتھ دار ہوتے تھے۔ لوٹ کے حصے کا یہ مال زمین ہوتی تھی۔ لگ بھگ سارے ہی وڈے زمین دار ایسے ہی زمین حاصل کر کے بنے ہیں۔“

”پر اب تو جی زمین ان ہی کی ہوئی تا۔“ لالی قائل نہ ہوا۔

”تو میری یہ گھڑی چرا کر لے جاتا تو یہ چوری ہی کا مال ہوئی تا؟“ سلیم لودھی نے مسکرا کر لالی کو دیکھا۔ ”زمین دار کا معاملہ تو اور بھی مختلف ہے۔ جس طرح ہوا، روشنی اور پانی سب ہی کی ملکیت ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی ضرورت کے اعتبار سے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح زمین بھی سب کی ملکیت ہے۔ ہر ایک کو اپنی ضرورت کے اعتبار سے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ زمین تو اس کی ہونی چاہیے جو فصل اگانے کے لیے اس پر اہل چلائے۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”اس طرح تو خود ہی سوچ، تو اگر چور ہے تو تیری شاداں کا زمین دار شوہر تجھ سے وڈا چور ہے۔ ہر چوری دراصل محنت ہی کی چوری ہوتی ہے۔“ سلیم لودھی نے لالی کے چہرے کو دیکھا۔ ”تو میری بات کا مطلب سمجھ گیا تا؟“

لیکن اس کی بات کا مفہوم لالی بالکل نہ سمجھ سکا۔ اسے یاد آیا کہ جیل میں بھی وہ کبھی کبھی ایسی ہی بے نیکی باتیں کرتا تھا۔ اور جب بولنے پر آتا تو بے تکان بولتا تھا۔ تب ہی تو جیل کے عملے کے ارکان اسے خطبے اور سسکی کہتے تھے۔ اور چکر منشی تو اسے ہمیشہ چریا کہہ کر یاد کرتا تھا۔ غرضیکہ

لودھی کا انتہائی فلسفہ لالی کے پلے نہ پڑا۔ البتہ رحیم داد کے بارے میں اس نے جو کچھ کہا تھا، اسے سن کر وہ بہت خوش ہوا۔ سلیم لودھی کی یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس نے نہایت جوش و خروش سے سلیم لودھی کی تائید کی۔ ”وہ تو جی بہت ہی وڈا چور ہے۔ میرا تو یہ پکا شبہ ہے، اس نے جعلی کلیم سے زمین الاٹ کرائی ہے، اور وڈا زمین دار بن کر اپنی شان اور ٹوہر دکھاتا ہے۔“ لالی کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ”اس نے مجھے چور اور جرائم پیشہ کہہ کر اپنی حویلی سے نکال دیا۔ میری بہت بے عزتی کی۔ گندی گندے گالوں نکالیں۔ آپ کو جی اس کے بارے میں پتہ نہیں۔“

”مجھے اس کے بارے میں پتہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔“ سلیم لودھی نے قطع کلام کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔ ”سارے ہی وڈے زمین دار ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ دوسروں کی محنت نہایت بے دردی سے چوری کرتے ہیں اور خود کو چور نہیں بلکہ شریف اور عزت دار سمجھتے ہیں۔ تیرے ایسے چھوٹے چوروں کو بچ اور کینہ سمجھتے ہیں۔ ان کو دھمکارتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ ان کو گرفتار کروا کر جیل میں ڈلوادیتے ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند ابھرا۔ ”غیریت ہوئی کہ اس نے تجھے جیل نہیں بھجوا یا۔ آئندہ تو اس کے پاس گیا، تو وہ تجھے چوری کے الزام میں ضرور گرفتار کر دے گا۔“

”پر میں نے ایک بار شاداں کے پاس ضرور جانا ہے۔ اسے رحیم داد کے بارے میں کئی باتیں بتائی ہیں۔“

”تو اسے جو کچھ بتائے گا، وہ اس پر بالکل اعتبار نہیں کرے گی۔“ سلیم لودھی نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”تو اب اسے بھول جا۔ وہ اب وڈی زمین دار بنی بن چکی ہے۔ عیش کرتی ہے۔ آرام سے رہتی ہے۔ اور اسے یہ سارا عیش و آرام اس کے زمین دار شوہر ہی نے دیا ہے۔ وہ نہ اسے چھوڑ سکتی ہے اور نہ اس کے خلاف کچھ سن سکتی ہے۔“ اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ ایک بار عیش و آرام کا چکا لگ جائے تو مشکل ہی سے چھوڑتا ہے۔“ سلیم لودھی لمحہ بھر خاموش رہ کر بے تکلفی سے بولا۔ ”یار تو جو چاہتا ہے اب نہیں ہو سکتا۔“

لالی نے غور کیا، شاداں نے بھی اس سے یہی بات کہی تھی۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ پھیل گیا۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ سلیم لودھی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لالی اب تو شاداں کی نہیں اپنی فکر کر۔ اس نے لالی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”تو چوری ذمہ داری نہیں چھوڑ سکتا؟“

”چھوڑ دوئی تھی جی۔“ لالی نے کہا۔ ”میں نے اس بارے میں پہلے ہی بتایا تھا۔“

”تو وہی اپنی محبوبہ شاداں کی بات کرے گا۔“ سلیم لودھی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”اگر اس نے تجھے

دھوکا دیا، بے وفائی کی تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تو خود کشی کر لے۔ یہ چوری ذکیٹی اختیار کرنا، چ پوچھ تو خود کشی ہی کرنا ہوا۔ یہ تباہی کا راستہ ہے۔“

لالی سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اس نے سر اٹھا کر سلیم لودھی کو دیکھا۔ آہستہ سے بولا۔
”آپ مجھے اپنے ساتھ نہیں لگا سکتے؟“

”میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو آج کل خود بے روزگار ہوں۔“

”آپ تو جی کسی کالج میں پڑھاتے ہیں۔“ لالی نے اسے یاد دلایا۔ ”جیل میں تو جی آپ نے مجھے یہی بتایا تھا۔“

”پہلے میں انگریزی کا پروفیسر ہوتا تھا۔“ سلیم لودھی نے لالی کو مطلع کیا۔ ”مگر جب میں جیل سے رہا ہو کر کالج پہنچا تو معلوم ہوا کہ مجھے ملازمت سے بر طرف کر دیا گیا۔“

”ایسا کیوں کیا گیا جی؟“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

”مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں طلباء کو حکومت کے خلاف بھڑکاتا ہوں، ان کو دہشت گردی پر اکساتا ہوں۔ تحریب کاری کرتا ہوں۔“ سلیم لودھی نے بتایا۔ ”اسی الزام میں مجھے گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا گیا۔“

”یہ تحریب کاری کیا ہوتی، جی؟“

”وہی باتیں جو میں جھوٹے چور اور بڑے چور کے بارے میں تجھے بتا رہا تھا۔“ سلیم لودھی نے ہنس کر کہا۔ ”حکومت کے نزدیک یہ تحریب کاری ہے۔ ملک دشمنی ہے۔“

”آپ نے تو جی جی جی گلاں کی تھیں، کچھ کچھ تو سمجھ بھی آتی ہیں۔“

”یہی تو لطیفہ ہے۔ سچ بات کہو تو تحریب کاری کہلاتی ہے۔ ملک دشمنی سمجھی جاتی ہے۔ جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ملازمت سے نکال دیا جاتا ہے۔“ سلیم لودھی کا لہجہ تیکھا تھا۔ ”ایوب خان اپنے جرنیلوں کے ساتھ رات کے اندھیرے میں چوروں کی طرح بندوق دکھا کر حکومت پر قبضہ کر لے تو اسے ڈاکہ زنی نہیں حب الوطنی کہا جاتا ہے۔ نظریہ ضرورت قرار دیا جاتا ہے۔“ وہ روانی سے بولتا رہا۔

”مارشل لا لگا کر طرح طرح کے ضابطوں سے اپنے ہی ملک کے پر امن عوام کو ڈرایا دھمکایا جائے۔ جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جائے تو اسے غنڈہ گردی اور دہشت گردی نہیں، ملک اور قوم کی خدمت ثابت کرنے کے لیے ریڈیو اور اخبارات سے دن رات پروپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ کیسی کیسی قصیدہ خوانی ہوتی ہے۔“ اس کا لہجہ اور تلخ ہو گیا۔ ”ادھر اپنا حال یہ ہے کہ سچ بات کہتا بھی چاہیں تو کہہ نہیں سکتے۔“ وہ آہستہ آہستہ ہنسنے لگا۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بد نام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

لالی نے اس کی باتوں میں کسی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اکتا کر بولا۔ ”نیم کیا ہو گیا ہے جی؟“
سلیم لودھی نے گھڑی اٹھا کر دیکھی۔ لالی کو بتایا۔ ”چار بجنے والے ہیں۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔
جہاں لی۔ ”لگتا ہے تجھے نیند معلوم ہو رہی ہے۔ اب تو جا۔ جی چاہے تو کبھی آجانا۔ مگر چوری کے ارادے سے نہیں۔“

”یہی گل نہ کریں جی۔“ لالی نے احتجاج کیا۔ ”آپ تو اب ادھر رہی ہوتے ہیں نا؟“
”کچھ کہہ نہیں سکتا، کب تک یہاں رہوں۔“ سلیم لودھی نے کہا۔ ”پتہ نہیں مری سے واپسی کے بعد بنوئی مجھے اب ٹھہرنے بھی دے گا کہ نہیں۔ وہ میری وجہ سے حکومت کو ناراض کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ سرکاری ٹھیکیدار جو ٹھہرا۔“

سلیم لودھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی بھی کھڑا ہو گیا۔ دونوں کمرے سے باہر نکلے۔ برآمدے سے گزر کر صحن میں پہنچے۔ سلیم لودھی نے آگے بڑھ کر بیرونی دروازہ کھولا۔ لالی خاموشی سے باہر چلا گیا۔ اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لالی اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچا تو مسجدوں سے اذان کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ مشرقی افق پر ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھیل رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ غنی چٹا بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“

”کوئی گڑبڑ، شر، بڑ نہیں ہوئی۔“ لالی نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”پر کام نہیں بنا۔“

”کام نہیں بنا۔“ اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”تو اب تک رہا کہاں؟“

”یار اب سونے دے۔ مجھے سخت نیند آرہی ہے۔“ لالی نے بے زاری سے کہا۔ ”بعد میں تجھے سب کچھ بتا دوں گا۔“

چٹا خاموش ہو گیا۔ وہ اس وقت لالی سے الجھتا نہ چاہتا تھا۔ لالی نے آنکھیں بند کیں اور گہری نیند سو گیا۔ وہ دوپہر تک بے خبر سوتا رہا۔



سلیم لودھی کی باتوں کا لالی پر کچھ اثر ہوا تو یہ ہوا کہ رحیم داد کے خلاف اس کی نفرت دوچند ہو گئی۔ رات کو وہ چوری کے ارادہ سے نکلا۔ اس دفعہ اس نے ایک جنرل اسٹور ٹاکا، تالا توڑ کر دکان کے اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس نے دکان کا جائزہ لیا۔ کاؤنٹر کی ایک دراز کی تلاشی لی

تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے تھے۔ شام ہونے سے پہلے ہی شام کا ساں تھا۔ بارش ہونے کے آثار صاف نظر آرہے تھے۔ ہوا بھیگی بھیگی تھی۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک کوئی راہ گیر دکھائی نہ دیتا تھا۔

بارش شروع ہونے سے پہلے ہی وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ وہ سر جھکائے اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا سڑک کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ ناگاہ غب میں ہارن کی آواز ابھری۔ لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک جیپ سڑک پر دوڑتی ہوئی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ آن کی آن میں جیپ اس کے قریب پہنچی اور آگے نکل گئی۔ مگر کچھ فاصلے پر جا کر اس کی رفتار سست پڑ گئی۔ جیپ رک گئی۔

جیپ میں رحیم داد بیٹھا تھا۔ اس نے اب ڈرائیونگ سیکھ لی تھی اور اکثر خود ہی جیپ چلاتا تھا۔ ان دنوں اس کا ڈرائیور بیمار تھا۔ لہذا اس وقت خود ہی جیپ چلا رہا تھا۔ وہ ایک بھٹے کے مالک سے ملنے کے بعد واپس کوئلہ ہرکشن جا رہا تھا۔ اس نے لالی کو پہچان لیا تھا اور جیپ روک کر اس کے نزدیک آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

لالی قدم بڑھاتا ہوا جیپ کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے چلتے چلتے جیپ کے اندر جھانکا۔ رحیم داد اگلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ وھیل پر تھا اور دوسرے سے گیسٹر کو آہستہ آہستہ ادھر ادھر ہلا رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ گیسٹر پھنس گیا ہے اور وہ اسے درست کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

لالی نے بھی رحیم داد کو پہچان لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے ٹھنکا۔ غور سے رحیم داد کو دیکھا۔ اسکی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ گیسٹر درست کرنے میں منہمک تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر نہ لالی کی طرف دیکھا اور نہ ہی کوئی توجہ دینے کی کوشش کی۔

لالی نے نفرت سے رحیم داد کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ مگر وہ رکا نہیں۔ پیچ و آہٹ کھاتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ مسلسل رحیم داد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

جیپ اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ لالی آگے اور آگے بڑھتا گیا۔ اس نے فرلانگ بھر راستہ بھی نہ طے کیا ہو گا کہ سڑک پر جیپ کے پیلوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ لیکن اس نے مڑ کر پیچھے نہ دیکھا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

جیپ کے پیلوں کی آواز قریب آتی گئی۔ پھر اس قدر قریب آئی کہ لالی نے پلٹ کر دیکھا۔ جیپ سڑک سے اتر کر کچے راستے پر دھول اڑاتی طوفان کی مانند اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ لالی کو فوراً

توفندی نظر آئی۔ رقم زیادہ نہ تھی۔ ۳۶۸ روپے تھے۔ لالی نے تمام روپے اٹھا کر جیب میں رکے اور جس ہوشیاری سے دکان کے اندر پہنچا تھا اسی ہوشیاری اور احتیاط کے ساتھ باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

دوسرے ہی روز اس نے ایک بار پھر ارشاد الہی کی تلاش شروع کر دی۔ وہ رحیم داد کے بارے میں جتنا غور کرتا اسی قدر اس کا یہ گمان پختہ ہوتا جاتا کہ وہ ارشاد الہی کا باپ نہیں ہو سکتا۔ ارشاد الہی کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی تو وہ کسی طرح پینتیس سے زیادہ نہ تھا۔ مستزاد یہ کہ ارشاد الہی سے بڑی ایک بہن بھی تھی جسے بلوائی اٹھالے گئے تھے اور اس سے بھی بڑا ایک بھائی تھا جو تریموں کے چن پر دریائے راوی کے کنارے سکھ حملہ آوروں کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا تھا۔ یہ تمام باتیں ارشاد الہی نے اسے بتائی تھیں۔ اس نے باتوں باتوں میں یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا اور اس کے بڑے بھائی بہن کا باپ ایک ہی تھا اور اس کی ماں نے دوسری شادی بھی نہیں کی تھی۔ عمر کے اعتبار سے وہ ادھیڑ تھا۔ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال کہیں کہیں سے سفید بھی ہو چکے تھے۔ اس کے برعکس رحیم داد جوان تھا اور اس کا ایک بھی بال سفید نہ تھا۔ علاوہ ازیں، علیہ بہت حد تک تبدیل ہو جانے کے باوجود لالی کو اس کے چہرے کے خدو خال، آواز اور بات کرنے کے انداز میں اس رحیم داد کی جھلک نظر آتی تھی جو مدت تک اس کے ساتھ رہ چکا تھا۔

رحیم داد نے نہ صرف شاداں کو اس سے چھین لیا تھا بلکہ اسے ذلیل و خوار کر کے اپنی حویلی سے نکالا بھی تھا۔ لالی اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس کوشش میں ارشاد الہی اس کے لیے نہایت کا آمد اور موثر ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ رحیم داد کو بے نقاب کر سکتا تھا۔ گرفتار کر سکتا تھا۔ سیف اللہ کے قتل اور جعلی کلیم کی بنیاد پر متروکہ اراضی الاٹ کرانے کے جرم میں جفا بھجوا سکتا تھا۔ چھانسی پر لٹکوا سکتا تھا۔

چند روز کی بھاگ دوڑ کے بعد اس بار وہ ارشاد الہی کا سراغ لگانے میں کامیاب بھی ہو گیا برسات کا موسم تھا۔ ان دنوں بھٹوں پر عام طور سے کام بند رہتا تھا۔ لہذا چتھیروں اور مزدوروں سے ملنا آسان تھا۔

جی ٹی روڈ کے ایک بھٹے کے واقف کار چتھیرے کے ذریعے اسے یہ اطلاع ملی کہ ارشاد الہی میلی کے ایک بھٹے پر کئی مہینے سے کام کر رہا ہے۔

لالی اس روز ارشاد الہی کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جی ٹی روڈ بھٹے پر ایک بار پھر گیا۔ واپسی پر وہ بہت مطمئن تھا اور میلی جا کر ارشاد الہی سے ملنے کا منصوبہ بن

اس نے دونوں ہاتھ بلند کیے، جسم سمیٹ کر زور سے اچھلا اور دیوار کے اوپر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر اچھلنے کے ساتھ ہی کمر میں اٹھی۔ یہ اس چوٹ کی تکلیف تھی جو رحیم داد کی جپ سے ٹکرانے کے باعث ریڑھ کی ہڈی میں آئی تھی۔ یہ چوٹ ایسی شدید تھی کہ وہ کئی روز تک بستر پر پڑا رہا۔ کوٹ بھی بدلتا تو درد سے بلبلا اٹھتا۔ اس چوٹ کے علاوہ جپ کی ٹکڑے سے کمر اور ٹانگوں پر زخم بھی آئے تھے، مگر زیادہ گہرے نہ تھے۔ کوئی ہڈی پسلی بھی نہ ٹوٹی تھی۔ علاج معالجے سے وہ صحت یاب تو ہو گیا تھا، لیکن جھٹکا لگتا تو چمک کے ساتھ کمر میں ابھی تک درد ہوتا تھا۔

لالی دیوار سے چٹ کر لیٹ گیا اور آہستہ آہستہ ہانپنے لگا۔ جب ذرا قرار آیا تو اس نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ صحن بالکل خالی تھا۔ البتہ برآمدے میں ایک چارپائی نظر آ رہی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسی سمت دیکھتا رہا۔ مگر نہ کوئی آہٹ ابھری نہ آواز۔ وہ ٹانگیں لٹکا کر آہستہ سے نیچے اترا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نہایت احتیاط سے بیرونی دروازے کی کنڈی کھول دی تاکہ خطرے کی صورت میں آسانی سے باہر نکل جائے۔ وہ ہوشیار اور منجھا ہوا چور تھا اور ہر ایسا چور واردات سے پہلے فرار ہونے کا بندوبست کر لیتا ہے۔

وہ دبے دبے قدموں چلتا ہوا برآمدے میں پہنچا۔ چارپائی کو قریب سے دیکھا مگر چارپائی خالی تھی۔ مہمان خانے کا ملازم موجود نہ تھا۔ لالی نے نہایت احتیاط سے کمروں کا جائزہ لیا لیکن سب خالی تھے۔ مہمان خانے کی جانب سے اطمینان کرنے کے بعد وہ پھر صحن میں آیا۔ گردن اٹھا کر اس دروازے پر پہنچا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ لالی نے آہستہ سے دھکا دیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھل گیا۔ وہ خاموشی سے اندر چلا گیا۔

حویلی میں پہنچ کر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ حویلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ البتہ صدر دروازے پر بیٹھا ہوا کیدار جاگ رہا تھا۔ اس کی کھٹک روکنے وقفے سے رات کی خاموشی میں ابھر رہی تھی۔ لالی حویلی کے طویل دالان میں داخل ہوا۔ بائیں ہاتھ کو اوپر جانے کا زینہ تھا۔ وہ آگے نہ گیا۔ زینے میں داخل ہوا اور میزبیاں طے کرتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ چھت خالی تھی۔ مگر سامنے کے کمرے میں روشنی تھی۔

لالی نے چاقو مضبوطی سے ہاتھ میں دیا لیا۔ نہایت ہوشیاری سے آگے بڑھا اور دروازے کے نزدیک پہنچ گیا۔ کمرے میں خاموشی تھی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ لالی نے گردن بڑھائی۔ دروازے کی اوٹ سے اندر دیکھا۔ کمرے کے ایک گوشے میں لیپ روشن تھا۔ مدھم روشنی میں رحیم داد عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ صرف بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس کی نیچے دھوتی تھی۔

خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے تیزی سے نشیب میں اترنے کی کوشش کی۔ وہ سخت بدحواس اور سراپہ تھا۔

لالی نشیب میں جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ جپ اس کے سر پر پہنچ گئی۔ اس زور سے ٹکرائی لالی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ جپ گرد کے بادل اڑاتی ہو تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کچھ دور جانے کے بعد کچے راستے سے پھر پختہ سڑک پر پہنچ گئی۔ ار نہایت تیز رفتار سے دوڑتی ہوئی بہت دور نکل گئی۔

لالی گردو غبار میں لٹھڑا ہوا سڑک کے کنارے بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور رک رک کر سانس لے رہا تھا۔ سڑک دیران تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ بادل ایک بار زور گرجے اور دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔



اکتوبر کے نیم گرم نیم سرد شب دروز تھے۔ برسات کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ مگر خلاف مع کوئلہ ہر کشن میں اس روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر کالی کالی گھٹائیں چھائی تھیں رات تاریک اور ساکت تھی۔ ہوا میں نمی تھی، سرسراہٹ تھی۔ لالی کوئلہ ہر کشن میں داخل، دس بج رہے تھے۔ بستی پر ہو کا عالم طاری تھا۔ ہر طرف کچڑ تھی۔ جگہ جگہ بارش کے پانی بھرے ہوئے گڑھے تھے۔

لالی کچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں سے بچتا بچتا سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتا ہوا جانب بڑھ رہا تھا۔ سنان رات میں مینڈکوں کے زور زور سے ٹرانے کی آوازیں رک رک کر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا حویلی کے چھوٹے پہنچ گیا۔ سامنے مہمان خانہ تھا اور سے متصل نادر خان کا مکان تھا۔ مکان پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ ایک کھڑکی کی جھری سے اس طرح پھوٹ رہی تھی کہ اندھیرے میں زرد زرد دھبے کی مانند نظر آتی تھی۔ لیکن مہمان میں اندھیرا تھا۔

وہ مہمان خانے کے دروازے کے قریب گیا۔ چونکہ نظروں سے گرد پیش کا جائزہ لیا۔ خانے میں بھی خاموشی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا۔ لیکن اندر سے بند تھا۔ وہ کچھ دیر اندھیرے میں دم سادھے کھڑا رہا، پھر نگاہیں اٹھا کر مہمان خانے دیواری کی بلندی کا اندازہ لگایا۔ دیواریں زیادہ اونچی نہ تھیں۔ اس نے چاقو نکالا، کھولا اور میں دبایا۔

جانب دیکھا۔

لالی کی نظر بھگی تو رحیم داد نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھایا۔ وہ تیزی سے جھپٹا اور لالی کو دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لالی نے خود کو اسکی گرفت سے آزاد کرانے کے لیے زور لگایا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ دونوں زور آزمائی کرنے لگے۔ لالی کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ رحیم داد میں اس سے کیس زیادہ کس بل ہے۔ وہ پہلے سے اور قوی ہو گیا ہے۔ رحیم داد نے لالی کو اپنے بازوؤں کے ٹکجنے میں جکڑ کر بے بس کر دیا تھا۔

لالی کے کے ہاتھ میں ہنوز چاقو دبایا تھا۔ اس نے آخری حربے کے طور پر چاقو سے وار کرنے کی کوشش کی۔ مگر رحیم داد نے اسے وار کرنے کا موقع نہ دیا۔ جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ کر چاقو جھینے کی کوشش کی۔ لالی نے مدافعت کی۔ اس جھینا چھینی میں چاقو لالی کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور چلا گیا۔

رحیم داد چاقو اٹھانے کے لیے جھپٹا۔ لالی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ زور سے جھٹکا دیا۔ رحیم داد لڑکھڑا کر گرا۔ لالی اس سے چٹ گیا۔ دونوں متحتم متحتم ہو گئے۔ رحیم داد نے اس بار بھی طاقت کے بل پر لالی کو زیر کر لیا۔ اسے مضبوطی سے پکڑا، زور لگایا اور ڈھکیلا ہوا دیوار تک لے گیا۔ اس نے لالی کو دیوار سے اڑا دیا۔ غضب ناک ہو کر تھپڑ اور گھونے مارنے لگا۔ لالی خاموشی سے مار کھاتا رہا۔ اس نے کسی طرح کی مزاحمت نہ کی۔ رحیم داد نے اس بری طرح دبا رکھا تھا کہ وہ مزاحمت کر بھی نہ سکتا تھا۔ ویسے بھی وہ پولیس والوں کے ہاتھوں اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب بٹنے کا عادی ہو گیا تھا۔ پولیس تشدد کے ذریعے کبھی اس سے اقبال جرم کرانے میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ مار کھا کھا کر اس کی کھال سخت اور ہڈیاں مضبوط ہو گئی تھیں۔

رحیم داد اس پر جھکا ہوا تھا۔ پھر پھر کر مار رہا تھا۔ مارتے مارتے رحیم داد کے ہاتھ شل ہو گئے۔ چوہینے سے شرابور تھا۔ سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی تھی۔ لالی بظاہر بیڑہال اور شکستہ نظر آ رہا تھا۔ مگر موقع کی تلاش میں تھا اس نے رحیم داد کا زور اور دباؤ ٹوٹا ہوا محسوس کیا تو فوراً خود کو سنبھالا۔ اپنی پیٹھ پوری طرح دیوار سے ٹکائی۔ دونوں پیر سینے، تیزی سے اوپر اٹھائے اور رحیم داد کے پیٹ پر زور سے مارے۔ وہ اس اہانک اور شدید حملے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے جسم کا توازن کچھ اس طرح بگڑا کہ قدم اکھڑ گئے۔ وہ ہلٹ کر فرش پر دھڑام سے گرا۔

لالی نے ایک بار پھر اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچا چاہی۔ ٹانگ تو اسکے ہاتھ نہ آئی، دھوتی آگئی۔ رحیم

اس لباس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بستر پر لیٹنے جا رہا ہے۔ لالی نے اسے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے سراپدہ ہو گیا۔ لیکن وہ جلد ہی سنبھل گیا۔ رحیم داد اس طرح کھڑا تھا کہ اس کی پشت لالی کی طرف تھی۔ لالی نہایت خاموشی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ رحیم داد کو اس کی آمد کی مطلق خبر نہ ہوئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

لالی دہلیز کے قریب چپ چاپ کھڑا رہا۔ ٹکٹکی باندھے نہایت چوکنا نظروں سے رحیم داد کو دیکھ رہا۔ کئی لمحے اسی عالم میں گزر گئے۔ پھر لالی نے جرات سے کام لیا۔ ٹوہ لگانے کی غرض سے رحیم داد کو بے تکلفی سے مخاطب کیا۔ ”رحیم!“ اس کا یہ نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا۔ رحیم داد چونکا۔ فوراً پلٹ کر دیکھا۔ لالی کو روہرو پایا تو بوکھلا گیا۔ ہکلاتے ہوئے بولا۔ ”تت‘ بت‘ تو لالی ہے!“ وہ آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ سہمی ہوئی نظروں سے لالی کو گھورنے لگا۔

”ہاں‘ میں لالی ہوں۔“ لالی نے اس کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”تو یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میں مر گیا۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔ ”تو نے تو اپنی جیب چڑھا کر مجھے مار ڈالنے کی پوری کوشش کی تھی، پر میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں رحیم۔“

”تو مجھے رحیم کیوں کہہ رہا ہے؟“ رحیم داد کے چہرے پر گھبراہٹ کے ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ بھی چھا گئی۔ ”میرا نام چوہدری نور الہی ہے۔ میں کسی رحیم رحیم سے کچھ نہیں جانتا۔“

”تو رحیم سے نہیں جانتا تو آواز دینے پر پلٹا کیوں؟“ لالی نے مسکرا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”تجھے دھوکا ہوا۔“ اس دفعہ رحیم داد کا لہجہ سنبھلا ہوا تھا۔ ”میں نے تجھ سے بھگڑا نہیں کرنا۔“ رحیم داد چاہتا تو شور مچا کر اپنے نوکروں کو مدد کے لیے بلا سکتا تھا۔ لالی کو پکڑ کر چوری کے الزام میں پولیس کے حوالے کر سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ پولیس کی تحویل میں جانے کی بعد وہ اس کے لیے اور خطرناک بن جاتا۔ لہذا اس نے صرف دھمکی پر اکتفا کیا۔ ”اب تو یہاں سے چپ کر کے چلا جا ورنہ مجھے اپنے نوکروں کو بلانا پڑے گا۔“

”اے دیکھا ہے۔“ لالی نے جھٹ کھلا ہوا چاقو سامنے کر دیا۔ ”آواز نکالی تو چھاتی میں ایسا اتار دوں گا کہ سانس بھی نہ لے سکے گا۔“

رحیم داد کچھ نہ بولا۔ خونخوار نظروں سے لالی کو گھورتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ اچانک وہ تیزی سے پلٹا۔ میز پر رکھا ہوا کانسی کا گلاس اٹھا کر لالی کے سر پر مارا۔ لالی بھی غافل نہ تھا۔ اس نے نہایت ہوشیاری سے سر ایک طرف کر لیا۔ گلاس اس کے کان کے پاس سے گزرتا ہوا کھڑکی کے پردے سے الجھ کر فرش پر گر گیا۔ اس کے گرنے سے ہلکی سی جھٹکارا بھری۔ لالی نے مڑ کر اس

داد کا نچلا دھڑا بالکل برہنہ ہو گیا۔ اس نے کروٹ لی۔ اٹھنا چاہا۔ لیکن لالی نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا۔ دھوٹی ایک طرف پھینکی۔ عقاب کی طرح جھپٹا اور اچھل کر اس قدر زور سے کمر پر لات ماری کہ رحیم داد فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

لالی پلٹا اور آگے بڑھ کر فوراً اپنا چاقو اٹھا لیا۔ رحیم داد کے پاس پہنچا اور گردن گھٹنے سے دبا کر بیٹھ گیا۔ رحیم داد اب بے بس ہو چکا تھا۔ وہ خاموش پڑا رہا۔ اور آہستہ آہستہ ہانتا رہا۔ لیپ کی روشنی میں اس کے برہنہ کولے پر زخم کا بڑا سا نشان صاف نظر آ رہا تھا۔ لالی اس نشان کو دیکھ کر چونکا اور بغور دیکھنے لگا۔ رحیم داد کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ رک رک گہری سانس بھر رہا تھا۔

لالی نے زخم کے نشان پر چاقو کی نوک آہستہ سے چھوئی۔ رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”رہجہ!“ رحیم داد نے تکلیف سے منہ بگاڑا۔ لالی مسکرا کر بولا۔ ”تو نے داڑھی رکھ لی۔ عینک لگانی شروع کر دی۔ ہر طرح اپنا حلیہ بدل لیا۔ نام بھی بدل لیا۔ پر تو اس نشان کو نہ بدل سکا۔“ رحیم داد دم بخود پڑا رہا۔ لالی بولتا رہا۔ ”تیری شناخت کا یہ نشان تو تھانے اور جیل، دونوں جگہ رجسٹروں میں لکھا ہے۔“ اس نے رحیم داد کی گردن پر رکھے ہوئے گھٹنے کو دبایا۔ ”اب چپ کر کے کیوں پڑا ہے؟ کہہ دے میں رحیم داد نہیں، چودھری نور الہی ہوں۔ اور احمد کوٹ کا نہیں، ضلع گورداسپور کے موضع نصیر پور کا مہاجر ہوں۔“ اس نے اپنے گھٹنے کو ذرا سا اور دبایا۔

”میری گردن تو چھوڑ۔“ رحیم داد نے تکلیف سے بے قرار ہو کر فریاد کی۔

”پہلے میری بات کا جواب دے۔“ لالی نے اس دفعہ گھٹنے پر زور دے کر رحیم داد کی گردن کا زیادہ قوت سے دبایا۔

رحیم داد جیس بول گیا۔ ”بتا دوں گا، سب کچھ بتا دوں گا۔“ اس نے بلبلاتا کر عاجزی سے کہا۔ ”میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔“ وہ منہ کھول کر زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس کی آنکھیں تکلیف سے پھا ہوئی تھیں۔

لالی علیحدہ ہو گیا۔ اٹھا اور رحیم داد کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ چاقو بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ رحیم داد کچھ دیر بے سدہ پڑا رہا۔ پھر اس نے پہلو بدلا۔ اٹھ کر کھڑا ہوا۔ لڑکھڑاتے قدموں۔ آگے بڑھا۔ دھوٹی اٹھائی اور اسے باندھنے لگا۔ اس نے لالی سے نظریں نہ ملائیں۔ وہ منڈھال! نکست خوردہ نظر آ رہا تھا۔

لالی نے چاقو لہراتے ہوئے حکم دینے کے انداز میں کہا۔ ”سامنے بیٹھ جا۔“ رحیم داد گرا جھکائے ہوئے بدھا اور بستر پر پیر لٹکا کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ چر

پروریانی چھائی تھی۔

”رہجہ!“ لالی نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ”یہ بتا، نہریاری دو آب کے نزدیک بیوں پر جیل کی وردی میں بھلاش ملی تھی، وہ کس کی تھی؟“

”تو اسے نہیں جانتا۔“ رحیم داد نے مری ہوئی آواز میں کہا۔ ”وہ حکیم چشتی تھا۔“ ”تجھے پتہ نہیں میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے ایک بار میرا علاج بھی کیا تھا۔ شادو مجھے اس کے پاس لے گیا تھا۔ وہ دو لائی نہ دیتا تو میں کب کا مر چکا ہوتا۔ وہ بہت نیک بندہ تھا۔“ لالی کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ”اس کا خون کر کے تو نے ٹھیک نہیں کیا۔“

”ان باتوں کو چھوڑ۔“ رحیم داد نے اس دفعہ نظریں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”صاف صاف بتا۔ تو چاہتا کیا ہے؟“

”پہلے یہ بتا، تو نے جپ دوڑا کر مجھے جان سے مار دینے کی کوشش کیوں کی تھی؟“ ”صاف بات یہ ہے کہ مجھے شبہ ہو گیا تھا کہ تو نے مجھے پہچان لیا۔“ اس نے عذر پیش کیا۔ ”مجھے تیری طرف سے زبردست خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے میں تجھے ختم کر دینا چاہتا تھا۔ میں نے حکیم کا بھی اسی لیے خون کیا تھا کہ اس نے جیل کی وردی میں مجھے دیکھ لیا تھا۔“ ”تیری گھروالی نوراں اور بال بچے کہاں ہیں؟“

”وہ اس دنیا میں اب نہیں رہے۔“ رحیم داد نے بچھے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”نوراں کو بھی مجھ پر شبہ ہو گیا تھا۔“

”تو نے جان بچانے کے لیے اپنی بیوی بچوں کا بھی خون کر دیا۔“ لالی نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”مجھے یہ پتہ نہ تھا تو اتنا ظالم اور بے رحم ہے۔“

”میں نے ان کا خون نہیں کیا۔“ رحیم داد نے صفائی پیش کی۔ ”اس نے تیل چھڑک کر خود ہی آگ لگائی اور بچوں کے ساتھ جل کر مر گئی۔“ لالی کچھ نہ بولا۔ رحیم داد بھی خاموش رہا۔



کمرے میں ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے نم آلود جھونکے آرہے تھے۔ باہر یوندا باندی ہو رہی تھی۔ پختہ چھت پر بارش کے قطرے سے ہلکا ہلکا جل ترنگ بج رہا تھا۔ رات سنسان اور بھیگی ہوئی تھی۔ ”تجھے اچھی طرح پتہ ہے میں شاداں سے کتنا پیار کرتا ہوں۔ میں نے اس کے سوا دنیا میں کسی بھی عورت سے اتنا پیار نہیں کیا۔“ لالی نے خاموشی کو توڑا اور افسردہ لہجے میں رک رک کر بولنے

”جن دنوں میں ملک ثار کے بھٹے پر تھیرا لگا ہوا تھا، وہ بھی میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی جگہ میں اکٹھے رہتے تھے۔ وہ اپنے پیو کے بارے میں مجھے سب کچھ بتا چکا ہے۔“ لالی بے باکی سے مسکراتے لگا۔ ”تو صاف صاف سنتا چاہتا ہے تو وہ بھی سن لے۔ میں ارشاد الہی کی جانب سے تیرے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرواؤں گا۔ کتل اور جعل سازی کے الزام میں تجھے گرفتار کروا کر مکدمہ چلوایوں گا۔ آگے جو کچھ ہونا ہے، اس کے بارے میں تو خود اندازہ لگا سکتا ہے۔“

لالی اس کا فوری رد عمل معلوم کرنا چاہتا تھا، مگر رحیم داد بالکل خاموش رہا۔ چند لمحوں بعد اس نے لالی سے ایک بالکل مختلف سوال کیا۔ ”یہ بتا، تجھے شاداں سے بہت محبت ہے؟“

”ہاں!“ لالی نے تعجب سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”پر تو مجھ سے یہ بات کیوں پوچھ رہا ہے؟“

”میں تجھے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اگر تو نے مجھے گرفتار کروایا تو یہ بھی سمجھ لے تیری شاداں بھی نہیں بچے گی۔“ رحیم داد گردن اٹھائے نہایت سنبھلے ہوئے لمحوں میں بول رہا تھا۔ اس کے انداز میں زمین دارانہ غلطی تھا۔

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”اس نے کیا کیا؟“

”میں نے سیف اللہ اور حکیم چشتی کا خون کیا ہے تو شاداں نے بالے کا۔“ رحیم داد نے ٹھیکسی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”تو اس راز کو پوری طرح جانتا ہے۔ تو جہانگیرہ کے اس مکان کی کوٹھڑی کو بھی جانتا ہے جس میں تو نے بالے کی لاش ڈالی تھی۔“ اس نے براہ راست دھمکی دی۔ ”تو نے لاش ٹھکانے لگانے میں شاداں کی مدد کی تھی۔ اس کو اعانت جرم کہا جاتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنی قانونی سوجھ بوجھ سے لالی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ ”اس الزام میں شاداں کے ساتھ تو بھی گرفتار ہو گا۔ تیرے خلاف بھی مکدمہ چلے گا۔ آگے جو کچھ ہو گا، وہ تجھے سوچنا ہے۔“

تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ لالی بہت چکرایا۔ اس نے صورت احوال کے اس پہلو کے بارے میں بالکل نہیں سوچا تھا۔ بالا کے قتل کی واردات کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ رحیم داد نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”میں نے تو اپنے بارے میں سوچ لیا۔ یہ بتا تو نے شاداں اور اپنے بارے میں کیا سوچا؟“

”میرے خلاف تو ہر کارروائی کر سکتا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی گل بات نہیں۔“ لالی نے رحیم داد کو خبردار کیا۔ ”پر شاداں تو تیری گھروالی ہے۔ تو اسے پیار بھی کرتا ہے۔ پیار نہ کرتا تو اسے سواہ کیوں کرتا۔“

”مجھے شاداں سے کوئی پیار شیار نہیں۔“ رحیم داد نے نہایت حقارت سے کہا۔ ”میں نے اسے

لگا۔“ یہ جاننے ہوئے بھی تو نے اس سے ویاہ کر لیا۔ اسے مجھ سے چھین لیا۔ مجھے مار ڈالنے کی کوشش کی۔“ اس کی باتوں سے اچانک تلخی جھلکنے لگی۔ ”اب مجھ سے پوچھتا ہے میں کیا چاہتا ہوں؟“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تو مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔“ رحیم داد نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”ہاں، میں تجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہوں۔“ لالی نے بڑے جوش سے کہا اور کھلا ہوا چاقو نکال کر سامنے کر دیا۔

رحیم داد نہ خوف زدہ ہوا نہ پریشان۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ ”تو نے مجھے کتل کر دیا تو یہ بھی جان لے، تو بھی میری طرح اپنی جان بچانے کے لیے ایک کے بعد دوسرا کتل کرتا جائے گا۔ اور بھانسی کا پھندا ہر گھڑی تیرے سر پر خطرہ بن کر ٹکٹا رہے گا۔“ وہ نہایت اطمینان سے بول رہا تھا۔ ”تو موت سے جتنا دور بھاگے گا وہ اتنا ہی تیرے نزدیک آتی جائے گی۔ ہر دم اس کے ڈر سے سہا ہوا رہے گا۔“

لالی نے چونک کر رحیم داد کو دیکھا اور اس کی دانش مندی اور سوجھ بوجھ سے دنگ رہ گیا۔ نئے ماحول اور نئے حالات نے اسے اس قدر تبدیل کر دیا ہے، لالی نے سوچا بھی نہ تھا۔ اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے نفرت اور کدورت کے چراغ بجھ گئے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔

لالی کو خاموش پا کر رحیم داد نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”میں نے اپنے تجربے سے جو کچھ سیکھا، تجھے بتا دیا۔ آگے تیری مرضی۔“ رحیم داد نے اسے مزید متاثر کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے غلط اندازہ تو نہیں لگایا۔ تو مجھے کتل کرنے ہی کے ارادے سے آیا تھا؟“

”نہیں، میں نے تجھے کتل نہیں کرنا۔ میں نے آج تک کسی کا خون نہیں کیا۔“ لالی نے پسائی اختیار نہ کی۔ ”پر میں نے تجھ سے بدلہ لینا ہے۔ اور ضرور لینا ہے۔“

رحیم داد جواب تک نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا، لالی کی بات سن کر بہت شگایا۔ حیرت زدہ ہو کر بولا۔ ”تو کیا کرے گا؟“

”تو نے جس چوہدری نور الہی کے کلیم کے ذریعے اتنی وڈی متروکہ اراضی الاٹ کر رکھی ہے اس کا پتر ارشاد الہی زندہ ہے۔“ لالی نے چبھتی ہوئی نظروں سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”اور میں اسے جانتا ہوں۔“

”تو اسے کیسے جانتا ہے؟“ رحیم داد کے چہرے پر ایک بار پھر خوف کے سائے پھیل گئے۔

نہیں بلایا تھا۔ وہ خود ہی میرے پاس آئی تھی اور منہ کر کے میری حویلی میں نوکرانی لگ گئی تھی۔
”اگر ایسی ہی گل بات ہے تب تو نے اس سے ویاہ کیوں کیا؟“

”وہ تو میری ایک ضرورت تھی۔“ رحیم داد نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”مجھے جلد سے جلد ویاہ کرنا تھا اور اس لیے کرنا تھا کہ زرعی اصلاحات کے تحت حکومت میری سیکڑوں ایکڑ اراضی ضبط کر لیتی۔ اسے بچانے کے لیے مجھے ایک گھر والی چاہیے تھی جس کے نام عارضی طور پر میں اپنی کچھ اراضی علیحدہ کر سکتا تھا۔ گوشواروں کی خانہ پری کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔“ رحیم داد بے باکی سے مسکراتے لگا۔ ”مجھے شاداں ہی ایسی زبانی نظر آئی جسے میں فوری طور پر اپنی گھر والی بنا سکتا تھا۔ جچ پوچھ تو ان دنوں وہ مجھے بہت سونہی بھی لگ رہی تھی۔“

”پر اب تو وہ تیری گھر والی ہے۔ تجھے اس کے بارے میں اس طرح نہیں سوچنا چاہیے۔“ لالی نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”کیوں نہیں سوچنا چاہیے؟“ رحیم داد یکایک بھڑک اٹھا۔ تیوری پر بل ڈال کر بولا۔ ”تجھے پتہ ہے، میں وڈا زمیں دار ہوں، عزت دار ہوں۔ شاداں ایسی کی زبانی کہ جو میری ہی حویلی میں نوکرانی رہ چکی ہو، کب تک اپنی گھر والی بنا کر رکھ سکتا ہوں؟ مجھے آگے کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ مجھے اپنی نسل خراب نہیں کرنی۔“

”تو کیا تو اسے چھوڑ دینا چاہتا ہے؟“

”بالکل چھوڑ دوں گا۔ بلکہ اب تک اسے چھوڑ بھی چکا ہوتا۔ پر مسجد کے ملاں نے روک دیا۔ کہنے لگا جب تک وہ حاملہ ہے طلاق نہیں ہو سکتی۔ شرع اس کی اجازت نہیں دیتی۔“ رحیم داد نے اپنے ارادے سے کھل کر لالی کو آگاہ کیا۔ ”میں تو یہ مہینہ ختم ہوتے ہی دوسرا ویاہ کرنے والا ہوں۔ احسان شاہ کی ایک بیوہ بھین کی بیٹی سلیمہ کے ساتھ رشتہ بھی ملے ہو چکا ہے۔“

”یہ احسان شاہ کون ہے؟“ لالی نے کرید کر پوچھا۔

”میرا بہت گمراہ ہے۔ ادھر کا وڈا اور خاندانی زمین دار ہے۔“ رحیم داد نے نہایت فخر سے بتایا۔

”تو اسے نہیں جانتا۔ شاداں جانتی ہے۔“

”شاداں کو یہ بھی پتہ ہے کہ تو دوسرا ویاہ کرنے والا ہے اور اسے طلاق دینا چاہتا ہے؟“
”میں نے ابھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے پتہ چل گیا ہے۔ رحیم داد نے کہا۔ ”لگتا ہے، نادور خان کی گھر والی، جنت نے اسے ضرور کچھ نہ کچھ بتا دیا ہے۔ تب ہی پچھلے کئی روز سے وہ روشنی روشنی نظر آتی ہے۔ رات بھی نیچے ہی کے کمرے میں رہی۔ یہاں

ی آتی ہے۔ آج سویرے اس نے مجھ سے بات بھی کرنی چاہی۔ میرا خیال ہے وہ اسی سلسلے میں مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی، پر میں نے اسے ٹال دیا۔“

”تو نے یہ بھی سوچا طلاق ہونے کے بعد وہ اپنے بچے کے ساتھ کہاں جائے گی؟“ لالی نے شاداں کے لیے شدت کے ساتھ جذبہ ہمدردی محسوس کیا۔ اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا۔ ”اس کا تو کوئی بھی نہیں۔ وہ کس کے پاس جائے گی۔ کیا کرے گی؟ کیسے گزر بسر کرے گی؟“

”پہلے بھی تو کسی نہ کسی طرح گزر بسر کرتی تھی۔ آگے بھی کر لے گی۔“ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر فحاش سے کہا۔ ”میں نے کوئی اس کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔“

لالی اس کے زمیں دارانہ فتنے پر پہلے ہی بھنایا ہوا تھا۔ برابر ضبط سے کام لے رہا تھا۔ دل ہی دل میں سلگ رہا تھا۔ رحیم داد کی کھلی خود غرضی کے اس مظاہرے پر وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔ دانت پس کر بولا۔ ”بکو اس نہ کر۔“ وہ تیزی سے جھپٹا اور رحیم داد کے سر پر پہنچ گیا۔ کھلا ہوا چاقو سامنے کر کے غصے سے لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔ ”یہ پورا گردن میں اتار دوں گا۔ آواز بھی نہ نکل سکے گی۔“ اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن پر رکھ دی۔ ”تجھے اپنی عزت اور نسل کے خراب ہونے کا ایسا ہی خیال تھا تو اس سے ویاہ کیوں کیا؟“

رحیم داد نے کچھ نہ کہا۔ لالی بوڑھا بنا رہا۔ ”تیری تو عزت ہے، اس کی کوئی عزت نہیں۔“ لالی نے جھنجھلا کر رحیم داد کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ لالی نے اچھل کر اس کی کمر بلات ماری۔ لات ایسی کراری لگی کہ رحیم داد لڑکھڑا کر پٹنگ سے نیچے گر گیا۔ لالی غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ جھٹ اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ رحیم داد اس قدر بدحواس ہو گیا کہ منہ سے آواز نہ نکل سکی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پٹی ہوئی تھیں۔ لالی کی آواز ابھرتی رہی۔ ”خونی، دھوکے باز۔“ اس نے فحاش سے منہ بگاڑا۔ ”کتا ہے، میں وڈا زمیں دار ہوں، عزت دار ہوں۔ مجھے پتہ ہے تو کتنا عزت دار ہے۔ آخ تھو!“ لالی نے غضب ناک ہو کر اس کے منہ پر تھوک دیا۔

”میری گل تو سن۔“ رحیم داد گھٹیانے لگا۔

”بہت سن لیس تیری گلاں۔“ لالی نے اس کے رخسار پر تھپڑ مارا۔ چاقو لہرا کر بولا۔ ”تیرے جیسے بالی اور کینے کو میں نے زندہ نہیں چھوڑنا۔“

”مجھے پہلے ہی پتہ تھا تو مجھے کتل کرنے کے ارادے سے آیا ہے۔“ رحیم داد نے آہستہ سے کہا۔ ”پر اس کا انجام بھی سوچ لے۔“ اس نے لالی کو دبلی زبان سے دھمکی دی۔ ”اس کے بارے میں تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

”پہلے میری پوری گل تو سن لے۔“ رحیم داد نے گالیاں سن کر بھی کسی برہی کا اظہار نہ کیا۔
 سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میرے پاس تیرے چار ہزار روپے ہیں۔ وہی جو تو نے ہیانی میں رکھ
 کر مجھے نہریاری دو آب کے ٹیوں پر دیے تھے۔ یاد ہے نا؟“
 ”کیوں نہیں یاد؟ بالکل یاد ہے۔“ لالی نے گردن ہلا کر کہا۔ ”یہ بھی کوئی بھولنے والی بات
 ہے۔“

”میں صرف چار ہزار نہیں، تجھے دس ہزار روپے دوں گا۔“ رحیم داد نے کھل کر اپنی تجویز لالی
 کے سامنے رکھی۔ ”اتنے روپے سے تو کوئی بھی دھندا شروع کر سکتا ہے۔ شاداں کے ساتھ آرام
 سے رہ سکتا ہے۔“

تجویز معقول تھی اور دل کو بھی لگتی تھی۔ مگر لالی بھی کم کائیاں اور گھاگ نہ تھا۔ جیل میں ہر
 طرح کے جرائم پیشہ افراد کے ساتھ عرصہ دراز تک رہ چکا تھا۔ ان میں چوراچکے، بٹے باز، جعل
 ساز، بلیک میلر، سب ہی شامل تھے۔ نہایت فخر سے اپنے کارنامے سناتے تھے۔ طرح طرح کے گر
 اور ہتھکنڈوں سے آگاہ کرتے تھے۔ اس وقت لالی کا پلا بھاری تھا۔ رحیم داد دبا ہوا تھا۔ لالی نے اس
 کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سودے بازی کرنا چاہی۔ کہنے لگا۔ ”دس ہزار تو بہت کم ہوئے، ۵۰ ہزار
 تو دے۔“ لالی کا غصہ رفع ہو چکا تھا۔ لہجے میں سنجیدگی پیدا ہو چکی تھی۔

”تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا۔“ رحیم داد نے بھنا کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔
 ”دماغ میرا خراب ہو گیا یا تیرا۔“ لالی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”تو اتنا دوا زمین دار ہے۔
 تیرے پاس سیکڑوں کلا زمین ہے۔ رہنے کو شاندار حویلی ہے۔ سواری کو چپ ہے۔ کام کرنے کو نوکر
 چاکر ہیں۔ کیا نہیں ہے تیرے پاس؟ عیش کر رہا ہے۔“

”تو اپنی گل کر۔“ رحیم داد نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ اس دفعہ اس کا رویہ نرم تھا۔ ”لاالچ
 میں نہ پڑ۔ بعد میں پچھتائے گا۔“ اس نے لالی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ”سوچ لے۔“

”سوچ لیا، سوچ لیا۔“ لالی ذرا مرعوب نہ ہوا۔ ”سوچتا تو تجھے ہے۔“ اس نے پیترا بدلا، رحیم
 داد کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ ”میں نے تو صرف لاش ٹھکانے لگائی تھی۔ اور لاش ٹھکانے
 لگانے یا دبانے کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ سال کی سزا ہوگی۔ پہلے بھی کاٹ
 چکا ہوں، ایک بار اور کاٹ لوں گا۔“ اس نے رحیم داد کو کھل کر خطرے سے خبردار کیا۔ ”تو نے تو
 ایک سے زیادہ کتل کیے ہیں۔ اور کتل کی سزا پھانسی ہی ہوتی ہے۔ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“
 ”تو نے نہیں، پر شاداں نے تو بالے کا کتل کیا ہے۔“ رحیم داد نے بھی لالی کی کمزوری سے فائدہ

”مجھے پتہ ہے، سب پتہ ہے۔“ لالی کے غصے کا جھاگ اب آہستہ آہستہ بیٹھنے لگا تھا۔ رحیم داد
 نے بھی اسے بھانپ لیا۔ لہجے میں رقت پیدا کرتے ہوئے اس نے لالی سے کہا۔ ”مجھے جان سے مار
 کر تجھے کیا ملے گا؟“

لالی خاموش رہا۔ رحیم داد نے عاجزی سے کہا۔ ”پہلے میری ایک گل سن لے۔ بعد میں جو تیرا
 جی کرے کرنا۔“

لالی بدستور خاموش رہا۔ مگر رحیم داد کے سینے پر سے اتر کر علیحدہ ہو گیا۔ رحیم داد اٹھ کر بیٹھ
 گیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا۔ ”تو اجازت دے تو منجی پر بیٹھ جاؤں۔“
 ”بیٹھ جا۔“ لالی نے منہ بگاڑ کر تحارت سے کہا۔

رحیم داد اٹھا اور ایک بار پھر پٹنگ پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا اظہار اور طمطراق کا فور ہو
 گیا تھا۔ منہ لٹکا ہوا تھا۔ آنکھوں میں خوف کے سائے منڈلا رہے تھے۔



بارش اب رک گئی تھی مگر ہوا تیز تھی اور درختوں میں سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ رات کالی
 اور سنسان تھی۔ کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ لیپ کی لوہوا کے جھونکوں سے ہولے ہولے
 ڈنگا رہی تھی۔ اس کی گھنٹی بدھتی روشنی میں دیواروں پر چھائیاں لہرا رہی تھیں۔
 رحیم داد نے سراٹھایا۔ لالی کی طرف دیکھا۔ نرم لہجے میں بولا۔ ”ایک تجویز سمجھ آتی ہے۔ پر
 اس کے لیے مجھے تیری مدد چاہیے ہوگی۔“
 ”کیا تجویز ہے؟“ لالی نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”تو شاداں سے پیار کرتا ہے نا۔“ رحیم داد نے لالی کے چہرے پر سے نظریں ہٹالیں۔ ”ایسا کر“
 اسے اپنے ساتھ لے جا۔ اس میں ہم تینوں ہی کا بھلا ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ ”نہ
 مجھ سے بدلہ لینے کے لیے ارشاد الہی کی مدد کے بارے میں سوچے گا اور نہ مجھے شاداں اور تجھے
 گرفتار کرانے کے لیے پولیس کو بالے کے کتل کا راز بتانے کی ضرورت پڑے گی۔“ اس
 مسکرانے کی کوشش کی۔ ”تجھے تیری شاداں مل جائے گی۔“

”تو اپنی چار سو بیسی سے باز نہیں آئے گا۔“ لالی نے جل کر اسے گالی دی۔ ”میں تیرا مظل
 ٹھیک طرح سمجھ گیا۔“ اس نے نفرت سے رحیم داد کو دیکھا۔ ”ایسا کر کے شاداں سے تیرا پنڈ
 چھوٹ جائے گا۔ شان سے نیاویا کرے گا۔ دوا زمین دار بن کر عیش کرے گا۔“ اس کا لہجہ تلخ
 گیا۔ ”یہی چاہتا ہے نا؟ رخصت تو بہت کتنی چیز ہے۔“

اٹھانے کی کوشش کی۔

”تو مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے؟“ لالی کا لہجہ بدستور ٹیکھا تھا۔ اس نے رحیم داد پر رعب جمانے کی کوشش کی۔ ”تجھے پتہ ہے کہ زانی کے لیے کتل کی سزا پھانسی نہیں ہوتی۔ میں ایک بار نہیں کئی بار جیل جا چکا ہوں۔ مجھے کون کے بارے میں تجھ سے زیادہ پتہ ہے۔ میں نے تو کبھی کسی زانی کو پھانسی پر لٹکتے نہ دیکھا نہ سنا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”تو اپنی فکر کر۔ تو کتل عمد کے جرم میں دفعہ ۳۰۲ کے تحت پھانسی سے نہیں بچ سکتا۔“

”اس کا فیصلہ تو نے نہیں عدالت نے کرنا ہے۔“ رحیم داد نے اپنے دفاع میں تاویل پیش کی۔ مگر لالی کی باتیں سن کر وہ دہل گیا تھا۔ اسے مطلق اندازہ نہ تھا کہ قانونی سوجھ بوجھ کے معاملے میں لالی اس سے کسی طور کم نہ تھا۔ لالی کی دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس نے لالی سے اٹھنے کی کوشش نہ کی۔ معاملہ فہمی سے کام لیا۔ لہجے میں نرمی پیدا کرتے ہوئے گویا ہوا۔

”کڑودی اور جھگڑے کی گل بات کرنے سے نہ تجھے فائدہ ہو گا نہ مجھے اور نہ ہی شاداں کو۔ ایسی بات کر جس میں تینوں کا بھلا ہو۔“

”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ لالی نے بھی مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ سیدھی سیدھی معاملے کی بات کی۔ ”تو نے چوہدری نور الہی کے کلیم کے ذریعے لاکھوں روپے کی متروکہ جائیداد الاٹ کرائی۔ تو اس میں سے مجھے ۵۰ ہزار بھی نہیں دے سکتا۔“

”تجھے پتہ نہیں۔ یہ جائیداد میں نے صرف اپنی کوشش سے الاٹ کرائی ہے۔ چوہدری نور الہی تو برسوں بھاگ دوڑ کرنے اور سرکاری دفتروں کے دن رات چکر کاٹنے کے بعد بھی ساڑھے بارہا کا گزارہ اراضی بھی الاٹ نہ کرا سکا۔“ رحیم داد نے وضاحت کی۔ ”وہ تو بالکل مایوس ہو چکا تھا۔ تخت ہزارہ کے نزدیک ایک چمک میں پڑا خون تھوکتا تھا۔ اسے ٹی بی ہو گئی تھی۔ بالکل اکیلا تھا۔ سسک سسک کر دم توڑ رہا تھا۔“

لالی خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے رحیم داد کو نہ روکا اور نہ ہی ٹوکا۔ وہ اس کی باتیں توجہ سے سن رہا۔

بات کہتے کہتے رحیم داد نے کاروباری پتہ بدلا۔ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ”لالی! میں۔ تجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔“ اس نے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”جی گل بات یہ ہے کہ میرے پاس اتنا روپیہ نہیں جتنا تو مانگ رہا ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”میں کوشش کر کے کسی کسی طرح ۲۵ ہزار روپے کا بندوبست کر سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ نرم اور سر پرستانہ ہو گیا۔ ”میں

بنا مان۔ اتنا روپیہ لے لے۔ اس سے تو کوئی بھی اچھا کاروبار کر سکتا ہے۔ چوری ڈکیتی چھوڑ۔ میں ہر دم جیل جانے کا خطرہ سر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ تو کب تک جیل کا قنا رہے گا۔ نیک بندہ بننے کی کوشش کر۔ میں تو تجھے ابھی تک اپنا یا ربیلی سمجھتا ہوں۔“ اس کا رویہ نامحاند ہو گیا۔ اس نے اپنا تھیں۔ بے تکلفی تھی۔ ”تو لہور میں نہ رہتا۔ پولیسے تجھے آرام سے رہنے نہیں دیں گے۔ لوح طرح سے تنگ کرتے رہیں گے۔ پہلے تو یہی پوچھیں گے کہ کاروبار کرنے کے لیے تیرے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ میری گل بات کا مطلب تو سمجھ رہا ہے نا؟“

”بالکل سمجھ رہا ہوں۔“ لالی نے اختلاف رائے نہ کیا۔ ”تو اپنی بات پوری کر۔“

”میرا تو مشورہ یہ ہے کہ تو کراچی چلا جا۔ وہاں نہ تجھے پولیس کا ڈر ہو گا نہ جان پہچان والوں کا۔“ رحیم داد نے لالی کو رمان سے سمجھایا۔ ”کراچی بہت دڈا شہر ہے۔ وہاں تو آرام سے کوئی نہ کوئی اور بار شروع کر سکتا ہے۔“ وہ کھل کر بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”شاداں کو اپنی ساتھ لے جا۔ بلی کر۔ آرام سے زندگی بسر کر۔ جو کچھ تو نے اب تک کیا اسے بھول جا۔ آگے کی سوچ۔“

رحیم داد نے لالی کو شیشے میں اتارنے کے لیے ہر نفسیاتی حربہ اور ہر گر آزمایا۔ اس کا خاطر خواہ ثبوت بھی برآمد ہوا۔ لالی اس کی تجویز پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔ رحیم داد نے اسے زندگی کے ایسے نشیب و فراز سمجھائے اور ایسی فضا پیدا کی جس کے حصار سے باہر نکلنا مشکل تھا۔

لالی خاموش بیٹھا رہا اور گردن جھکائے سوچتا رہا۔

رحیم داد نے اسے خاموش پایا تو کسی قدر بے چین ہو کر پوچھا۔ ”لالی تو کس سوچ میں پڑ گیا۔ تجھے میری تجویز منظور نہیں؟“

”سوچ رہا ہوں“ میں نے تیری تجویز مان بھی لی پر سوال یہ ہے کہ شاداں بھی اس کے لیے تیار ہو گی کہ نہیں؟“ لالی نے کھل کر اپنے تذبذب کا اظہار کیا۔ ”اس بارے میں پہلے اس سے بھی پوچھنا ہو گا۔ میں نے غلط تو نہیں سوچا؟“

لالی کی بات دل لگتی تھی۔ رحیم داد نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ لالی نے خاموش تھا۔

ہم بڑھی۔ مگر رحیم داد کے قریب بستر پر نہ بیٹھی۔ ایک کرسی پر خاموشی سے بیٹھ گئی۔
کمرے میں سکوت تھا۔ شاداں زیادہ دیر اپنی بے چینی قابو میں نہ رکھ سکی۔ اس نے گردن موڑ کر لالی کی جانب دیکھا، استفسار کیا۔ ”تو یہاں کیسے آیا؟“ لالی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔
”مہم صم بیٹھا رہا۔ اسے خاموش پا کر وہ رحیم داد کی طرف متوجہ ہوئی۔“ چوہدری، تو نے اسے بلایا ہے؟“ شاداں نے ہاتھ اٹھا کر لالی کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ کیوں آیا اور کیسے آیا؟ یہ میں تجھے بعد میں بتاؤں گا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر کہا۔ ”پہلے یہ ہاتھ اتنی رات گئے کیسے ادھر آگئی؟“

”میرے یہاں آنے کی مٹا ہی ہے؟“ شاداں نے تند لہجے میں پوچھا۔ ”جب چاہوں، جس دکھت ہاوں آسکتی ہوں۔ مجھے کون روک سکتا ہے؟“

”تجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ تو بالکل یہاں آسکتی ہے۔ یہ تیرا اپنا گھر ہے۔“ رحیم داد نے نرم لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”میں سمجھا تو نے کوئی خاص گل بات کرنی ہے۔“

”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“ شاداں کا لہجہ مدہم پڑ گیا۔ ”میں نے تجھ سے ایک خاص ہی گل کرنی تھی۔ پر اب نہیں کروں گی، گل کر لوں گی۔“

”مجھے پتہ ہے تو کیا گل کرنا چاہتی ہے۔“ رحیم داد نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ ”میں دوسرا دیاہ کر رہا ہوں۔ تو یہی معلوم کرنا چاہتی ہے نا؟“ وہ بے نیازی سے مسکرایا۔ ”اس بارے میں تجھے جنت نے بتایا ہو گا۔“

”میں اس کنجری سے بات نہیں کرتی۔“ جنت کا نام سن کر شاداں پھٹ پڑی۔ جو بات وہ لالی کے ماننے کرنا نہ چاہتی تھی، جھنجھلاہٹ میں بے ساختہ زبان پر آگئی۔ ”پر اس نے حویلی کی ساری ہی ڈکرائیوں میں یہ بات پھیلا دی ہے۔ شام ہی کو کیریاں نے بھی مجھے یہی بات کہی تھی۔ وہ جنت کے ہاں سے اٹھ کر میرے پاس آئی تھی۔“ اس نے شکوہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”وہ کنجری ایسی گلاں کیوں کر رہی ہے؟ بتا وہ ایسا کیوں کہتی ہے۔؟“

”کچ بات سنتا چاہتی ہے؟“ رحیم داد نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں میں سچ ہی بات سنتا چاہتی ہوں۔“ اس کا لہجہ بدستور تند اور تیکھا تھا۔

”جنت نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔“ رحیم داد نے کھل کر بات کی۔ وہ اب ذہنی طور پر ہزاروں سے شاداں کو آگاہ کرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

مگر شاداں ایسی بات رحیم داد کے منہ سے سننے کے لیے ذہنی طور پر بالکل آمادہ نہ تھی۔ حیرت



لالی اور رحیم داد کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔

آخر کمرے کے کمرے سکوت میں لالی کی آواز ابھری۔ ”رخصے، تو نے میری بات کا جواب دیا۔“

رحیم داد نے نگاہیں اٹھا کر لالی کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا، اچانک باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔

لالی اور رحیم داد نے چونک کر دروازے کی سمت دیکھا اور ٹھنکی باندھے دیکھتے رہے۔ چارہ رفتہ قریب آئی گئی۔

شاداں اندھیرے سے نکل کر سامنے آگئی۔ لالی کو کمرے میں دیکھ کر وہ دلہیز پر ٹھنکی آکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

رحیم داد نے اس کا استعجاب نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ”شاداں، تو ابھی تا رہی تھی؟“

”مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔“ شاداں بدستور دلہیز پر کھڑی رہی۔

”ادھر کیوں کھڑی ہے؟“ رحیم داد نے اسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ ”ادھر آ کے

شاداں وہاں ٹھہرنا تو نہیں چاہتی تھی مگر لالی کو اتنی رات گئے رحیم داد کے کمرے میں

حیران و پریشان ہو گئی تھی اور یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی کہ وہ رحیم داد کے

اندھیری رات میں کیوں آیا ہے؟ کس لیے آیا ہے؟ وہ ان سوالات پر غور کرتی ہوئی تھی۔

رحیم داد نے کوئی جواب نہ دیا۔ نظریں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

لالی نے شاداں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”اس سے کیا پوچھ رہی ہے؟ مجھ سے بات کر۔“ وہ رحیم داد کی زمیں دارانہ شان و شوکت کی بلند و بالا عمارت توڑ پھوڑ کرنے صرف لمبے کا ڈھیر بنا دینا چاہتا تھا بلکہ شاداں کو اس کی پرکشش شخصیت کے حصار سے باہر بھی لانا چاہتا تھا۔ ”اس نے سیف اللہ ہی کا خون نہیں کیا، حکیم چشتی کا بھی کتل کیا ہے۔ چوہدری نور الہی بن کر اس کے کلیم کے ذریعے جعل سازی سے اتنی دڈی متروکہ جائیداد بھی الاٹ کرائی ہے۔ دڈا زمیں وار بن گیا ہے۔“

رحیم داد کو اس کی باتیں سخت ناگوار گزریں۔ اس نے جھنجھلا کر قمر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ لالی نے بھی اس کی برہمی محسوس کی۔ اس نے فوراً پتہزرا بدلایا۔ شاداں کو ایک اور زوردار ذہنی جھٹکا دیا۔ ”تو نے اسے اب تک نہیں پہچانا۔ جب تو نے بالے کا خون کیا تھا تو اس رات یہ بھی میرے ساتھ تھا۔ میں نے اور اس نے مل کر تیرے مکان کی کوٹھڑی میں کھدائی کی تھی۔ اور بالے کی لاش اس میں دبائی تھی۔ یاد ہیں نا تجھے وہ ساری باتیں؟“

رحیم داد کے چہرے پر چھایا ہوا غم و غصہ زائل ہو گیا۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہا تھا۔ مگر لالی نے اس دفعہ شاداں کو جو ذہنی جھٹکا دیا تھا وہ اس قدر لرزہ خیز تھا کہ وہ بدحواس ہو گئی۔ تڑپ کر بولی ”ہائے رہا! افسوس کیسہ ہو گیا؟ میں کیسہ کراں؟“ وہ خود پر قابو نہ پاسکی۔ بے قرار ہو کر رونے لگی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ کر رخساروں پر ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

لالی چاہتا بھی یہی تھا۔ شاداں اب ٹوٹ پھوٹ کر نکھر گئی تھی۔ اس کی ساری تیزی طراری ختم ہو گئی تھی۔ لالی نے ڈپٹ کر کہا۔ ”اس طرح ٹوٹے بھانے سے کام نہیں چلے گا۔ بول، اب کیا کہتی ہے؟ تجھے ساری ہی باتوں کا ٹھیک طرح پتہ چل گیا۔ بتا اب تو نے آگے کیا کرنا ہے؟“

”سمجھ نہیں آتی، کیا کہوں؟“ وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بے بسی سے بولی۔

”تجھے سمجھ نہیں آتی۔ پر میں نے اور لالی نے مل کر ایک تجویز سوچی ہے۔“ اس دفعہ رحیم داد نے بات شروع کی۔ ”تجویز یہ ہے کہ لالی تجھے اپنے ساتھ کراچی لے جائے گا۔“

”میں نے اس کے ساتھ نہیں جانا۔“ شاداں ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”مجھے اس کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو تجھ سے ویاہ کیوں کرتی۔“ اس نے کھا جانے والی نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”یہ چوری اُکھٹی کرے گا۔ جیل جائے گا۔ میں نے ایسے خطرناک بندے کے ساتھ نہیں رہنا۔“

”میں اسے ۲۵ ہزار روپے دوں گا، جس سے یہ کراچی میں کوئی بھی ٹھیک ٹھاک دھندا شروع کر سکتا ہے۔“ رحیم داد نے شاداں کو رضامند کرنے کے لیے اپنی تجویز کھل کر بیان کی۔ ”اسے چوری

سے آنکھیں پھاڑ کر بولی۔ ”تو جگہ رہا ہے؟“

”ہاں!“ رحیم داد نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کھٹ۔ ”یہ بات میں اب تجھ سے چھپانا نہیں چاہتا۔ شاداں غصے سے تڑپ کر بولی۔ ”اگر تو نے ایسا کیا تو یہ بھی سن لے۔ میں نے اس کے سامنے نہیں رہنا۔ ہرگز نہیں رہنا۔“

”کیا کرے گی؟“ رحیم داد نے اس کا ارادہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔

”کچھ ہی کروں گی، جو جی کرے گا کروں گی۔“ وہ غصے اور جھنجھلاہٹ کے عالم میں آگے کچھ نہ سکی۔ ویسے اسے خود بھی اندازہ نہ تھا کہ اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ وہ کس طرح اس کا اظہار کر گی۔ اس نے اس مسئلے پر سنجیدگی سے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ اب تک اس نے جس بات کو، افواہ سمجھا تھا اچانک حقیقت بن کر سامنے آگئی تھی۔

”میں چاہتا ہوں تو جو کچھ کرنا چاہتی ہے، اس کے بارے میں آرام سے گل بات ہو جائے رحیم داد نے نرم اور سلجھے ہوئے لہجے میں اظہار خیال کیا۔ ”اگر تو یہاں نہیں رہنا چاہتی تو ام بھی سوچا جاسکتا ہے۔“

”کیا تو مجھے جھوڑ دینا چاہتا ہے؟“ شاداں نے پریشان ہو کر اس کا عندیہ معلوم کرنا چاہا۔

”ارادہ تو میرا یہی ہے۔“ اس نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ ”اس بارے میں لالی سے بات کر چکا ہوں۔“

”یہ میرا اور تیرا معاملہ ہے۔“ اس نے منہ بگاڑ کر اپنی برہمی کا اظہار کیا۔ ”یہ بیچ میں بول کون ہوتا ہے۔ اس نے کیا لیتا؟“

لالی نے مداخلت کی۔ اس نے رحیم داد کو مخاطب کیا۔ ”رہے، میری گل سن۔“ لالی نے بوجھ کر اسے رخصتے کہا۔ وہ شاداں کو ذہنی جھٹکا دینا چاہتا تھا۔ وہ جھٹکا لگا بھی۔ شاداں ہکا بکا ہو کر کا منہ تنکنے لگی۔ چند لمحوں وہ اسی عالم میں بیٹھی رہی، پھر اس نے پوچھا۔ ”تو نے چوہدری کو، کیوں کہا؟“ اس کے لہجے میں تجسس اور بے چینی تھی۔

”میں اسے ہمیشہ رخصتے ہی کہتا ہوں۔“ لالی نے گردن اٹھا کر پر اعتماد لہجے میں کھل کر انکار کیا۔ ”تجھے پتہ ہے یہ کون ہے؟“ اس نے رحیم داد کی جانب اشارہ کیا۔ ”یہ چوہدری نور الہی میرا پرانا یا ر رحیم داد ہے۔“

شاداں نے یقین نہ آنے کے انداز میں رحیم داد سے دریافت کیا۔ ”لالی سچ کہہ رہا ہے؟“

”وہ سخت حیران و پریشان تھی۔“

ذہنی کی ضرورت ہی نہ پڑے گی۔ محنت سے اپنا کام دھندا کرے گا۔ تجھے آرام سے اپنی گھر والی بنا کر رکھے گا۔“

”میں نے تو اس سے وعدہ کرنے کے بعد چوری و دہشت بالکل چھوڑ دی تھی۔“ لالی نے فوراً صفائی پیش کی۔ ”میرے خلاف تو ملک ٹار محمد نے چوری کا جھوٹا مقدمہ بنایا تھا۔ میں نے اس کے بھٹے سے فرار ہو کر پتھریوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف تھانے میں پرچہ چاک کرایا تھا۔ اس لیے اس نے مجھ سے بدلہ لیا۔ پولیس کے ساتھ مل کر مجھے جیل بھجوا دیا۔“ اس نے براہ راست شاداں کو مخاطب کیا۔ ”شاداں، تجھے تو ٹھیک سے پتہ ہے۔ بھٹوں میں پتھریوں پر کتنا ظلم ہوتا ہے۔ تو نے تو میرے ساتھ بھٹے پر کام بھی کیا ہے۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔“

شاداں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ گردن جھکائے گم صم بیٹھی رہی۔

رحیم داد نے زور دے کر اس سے پوچھا۔ ”بول، تو نے کیا سوچا۔ تجھ سے اب کچھ بھی چھپا نہیں۔ ساری باتیں تیرے سامنے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، اس میں ہم تینوں ہی کا بھلا ہے۔“ اس نے قائل کیا، پھر کھل کر اپنے ارادے سے شاداں کو آگاہ کیا۔ ”ویسے میں تجھے صاف صاف بتا دیتا چاہتا ہوں کہ اب تو میرے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“

”میں نے بھی تیرے ایسے خوفی اور دھوکے باز کے ساتھ نہیں رہتا۔“ شاداں نے جل کر کہا۔

لالی نے جھٹ مداخلت کی۔ ”رہے، جب تک تو اسے طلاک نہیں دے گا یہ میرے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟“

”جب یہ اپنے پہلے کسم کو چھوڑ کر بالے کے ساتھ جہانگیرہ میں رہتی تھی، تب اس نے کون سی طلاک شاک لے رکھی تھی۔“ رحیم داد نے مسکرا کر بے نیازی سے کہا۔

”پرانی گلاں نہ نکال۔“ شاداں نے بھنا کر رحیم داد کو ٹوکا۔ ”میں نے اب ایسا نہیں کرتا۔“

”ویسے تو جب نکاح کی لکھا پڑھی نہ ہوئی تو طلاک کا کاغذ لکھنے سے کیا فائدہ؟“ رحیم داد نے شاداں سے الجھنے کی کوشش نہ کی۔ معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”تو کہتی ہے تو میں کاغذ لکھ کر بھی دے دوں گا۔ ویسے میری طرف سے تجھے پوری اجازت ہے جہاں جی کرے رہے۔ میری رائے پوچھ تو میں یہی کہوں گا، تجھے لالی سے اچھا گھروالا نہیں ملے گا۔ یہ جتنا تجھے پیار کرتا ہے، کوئی نہیں کر سکتا۔“ اس نے مڑ کر لالی پر نظر ڈالی۔ ”میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”یہ تو اسے بھی ٹھیک طرح پتہ ہے۔“ لالی نے جذباتی ہو کر شاداں کی جانب دیکھا۔ گہری سانس بھری۔ آواز میں رقت پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”میں تو اسے اپنے ساتھ لے جانے کو تیار ہوں پتہ

بھی میرے ساتھ جانے کو تیار ہے کہ نہیں؟“

شاداں نے کچھ نہ کہا، نہ لالی کی جانب نظرس اٹھا کر دیکھا۔ گردن جھکائے خاموش بیٹھی رہی۔

”تو اس کی فکر نہ کر۔ مجھے پتہ ہے یہ تیرے ساتھ چلی جائے گی۔ اب تو آگے کی سوچ۔“ رحیم داد نے اپنے طور پر بات ختم کر دی۔ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”تو جا کر آرام سے مہمان خانے میں سو۔ ساری باتیں تو سمجھ لے طے ہی ہو گئیں۔ میں نے اب تجھے روپیہ دینا ہے۔ اس کا بھی کل ہی کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح بندوبست کر دوں گا۔“

رحیم داد اٹھ کر کھڑا ہو گا۔ لالی بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ رحیم داد نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ”میں تیرے ساتھ مہمان خانے میں چلوں گا۔ تجھے اس کے بارے میں کچھ اتنا پتہ نہیں۔ میرا خیال ہے، وہاں نوکر بھی نہ ہو گا۔ اسے کل شام سے بخار ہے۔ سویرے کسی دوسرے نوکر کا بندوبست ہو جائے گا۔ تجھے کسی طرح کی تکلیف نہیں ہوگی۔“

وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ شاداں نے نگاہیں اٹھا کر دونوں کو جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر نہ کچھ بولی اور نہ ہی اپنی جگہ سے اٹھی۔ اس کا چہرہ مر جھا کر زرد پڑ گیا تھا۔ بڑی بڑی روشن آنکھوں میں ہر وقت جھللاتے ہوئے چراغ بجھ گئے تھے۔ وہ شکستہ اور دل گرفتہ نظر آرہی تھی۔



آسمان پر گہرے بادل چھائے تھے۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ ہر طرف سناٹا چھایا تھا۔ رحیم داد اور لالی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے زمین میں داخل ہوئے۔ میڑھیوں سے اتر کر نیچے پہنچے۔ مہمان خانے میں جانے والا دروازہ ہوا سے پاٹوں پاٹ کھل گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے نظر انداز کر دیا۔ لالی کے ہم راہ مہمان خانے میں چلا گیا۔

مہمان خانے میں کوئی نہ تھا۔ اندھیرا تھا۔ خاموشی تھی۔ رحیم داد نے برآمدے میں پہنچ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولا۔ لالی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے جب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ سامنے ہنگ موجود تھا۔ اس پر اجلا بستر تھا۔ ہنگ کے سرہانے میز تھی۔ اس پر لیپ رکھا تھا۔ قریب ہی ماہی بھی موجود تھی۔ رحیم داد نے ماچس اٹھا کر لیپ روشن کر دیا۔ کمرے میں زرد زرد روشنی پھیل گئی۔

رحیم داد نے باغیچے میں کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پتے کھلا دیے۔ ہوا کے ہچکے ہچکے جھونکے کمرے کے اندر آنے لگے۔ رحیم داد کمرے میں زیادہ دیر نہ ٹھہرا۔ اس نے لالی کو مخاطب کیا۔

”اب تو بستر آرام سے سو۔ میں سویرے تیرے پاس آؤں گا۔“ ایک بار پھر اس نے لالی کو یقین دلایا۔ ”اطمینان رکھ۔ میں کل ہی روپے دے کر شاداں کو تیرے ساتھ رخصت کر دوں گا۔ پر جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرنا۔ سیدھا کراچی جانا۔“

”تو جیسا کہتا ہے ویسا ہی کروں گا۔“ لالی نے پنگ پر بیٹھے ہوئے مختصر جواب دیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے جمائی لی۔ وہ تھکن سے نڈھال ہو رہا تھا۔ نیند سے آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

رحیم داد خاموشی سے بڑھا۔ کمرے سے باہر نکلا اور ہاتھ بڑھا کر دروازے کے دونوں پٹ بھیز دیئے۔ اس نے مسمان خانے کا صحن عبور کیا۔ حویلی میں داخل ہوا۔ زینے کی سیڑھیاں طے کر کے چھت پر پہنچا۔ دیکھا شاداں کمرے سے باہر نکل رہی ہے۔ اس نے قریب پہنچ کر ٹوکا۔

”شاداں، تو کہاں جا رہی ہے؟“

”میں نے اب یہاں رک کر کیا لیتا ہے۔“ شاداں نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ ”جو کچھ ملے ہوتا تھا وہ تو سب ملے ہو گیا۔“

”ابھی کچھ ملے نہیں ہوا۔“ رحیم داد نے مسکرا کر ہولے ہوئے شاداں کی پیٹھ تھپ تھپائی اور محبت سے اس کا بازو تھام لیا۔ ”ابھی تو میں نے تجھ سے کئی ضروری باتیں کہنی ہیں۔ تجھے بتانا ہے میں نے آگے کیا کرنا ہے۔“

”میں نے پتہ ہے تجھے آگے کیا کرنا ہے۔“ وہ ہنوز روٹھی ہوئی تھی۔

”تجھے کچھ پتہ نہیں۔“ رحیم داد بے تکلفی سے مسکراتا رہا۔ ”تجھے اصلی گل بات کا تو بچلے؟ جب میں تجھے بتاؤں گا۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”اندر چل۔ آرام سے گل بات ہوگی۔“

رحیم داد اس کا بازو تھامے ہوئے آگے بڑھا۔ شاداں اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ رحیم داد۔ شاداں کو کرسی پر بٹھایا اور دوسری کرسی کھسکا کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ شاداں بھونچکا ہو کر سوچ رہی تھی کہ رحیم داد کے رویے میں یہ اچانک تبدیلی کیسے پیدا ہو گئی؟ وہ تو جلد سے جلد آئے چھپڑے حاصل کرنا چاہتا تھا اور کچھ ہی دیر پہلے اس کا برملا اظہار بھی کر چکا تھا۔ شاداں نے۔ چینی سے پہلو بدلا۔ حیکمے لہجے میں پوچھا۔

”صاف صاف بتا، تو کہنا کیا چاہتا ہے؟ کیا کرنا چاہتا ہے؟“

”تو سمجھتی ہے میں تجھے چھوڑ دوں گا۔“ اس نے شاداں کا ہاتھ محبت سے تھام لیا۔ ”تو سوہنی ہے کہ میں جتا نہیں سکتا۔ مجھ سے پیار بھی کرتی ہے۔ مجھے ہر طرح آرام پہنچاتی ہے۔“

سب سے بڑھ کر یہ کہ تو میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”تو خود ہی سوچ میں تجھے کیسے چھوڑ سکا ہوں۔ تو چلی گئی تو یہ حویلی ویران ہو جائے گی۔“

”مجھ نہیں آتی تو کیسا بندہ ہے۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔“ شاداں نے تیوری چڑھا کر رحیم داد کی جانب دیکھا۔ ”بھول گیا، تھوڑی ہی دیر پہلے تو لالی کے سامنے کیا کہہ رہا تھا؟ تو نے اس کے ساتھ کیا ملے کیا تھا؟“

”وہ تو میں لالی کو بھکانے کے لیے کہہ رہا تھا۔“

”کیوں؟“ شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

”نہ میں تجھے چھوڑنا چاہتا ہوں اور نہ لالی کو کچھ دینا چاہتا ہوں۔“ رحیم داد نے حیکمے لہجے میں کہا۔ ”مان لے، میں نے اسے ۲۵ ہزار روپے دے دیئے تو وہ جا کر عیش کرے گا۔ جب روپے خرچ ہو جائیں گے تو بعد میں اور روپے لینے کے لئے مجھے بلیک میل کرتا رہے گا۔“

”وہ کس طرح کرے گا؟“ شاداں اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکی۔

”وہ اس طرح کرے گا کہ اگر میں اسے روپے دینے سے انکار کر دوں گا تو دھمکی دے گا کہ پولیس کو میرے بارے میں سب کچھ بتا دے گا۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لیے اس کی بات ماننی پڑے گی۔ وہ اسی طرح دھمکی دے کر مجھ سے بار بار روپیہ اینٹھتا رہے گا۔“ رحیم داد نے لمحہ بھر توقف کرنے کے بعد پوچھا۔ ”تو خود ہی سوچ وہ ایسا کر سکتا ہے کہ نہیں؟“

”وہ ایسا کر تو سکتا ہے۔“ شاداں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”پر وہ ایسا کرے گا نہیں۔“

”وہ بالکل ایسا ہی کرے گا۔ وہ پرانا جراثیم پیشہ ہے۔ برسوں سے چوری و دیکیتی کر رہا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔“ رحیم داد نے شاداں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔ ”میں اسے جتنا جانتا ہوں تو نہیں جانتی۔ میں جیل میں مدت تک اس کے ساتھ رہ چکا ہوں۔ اسی کے بھکانے پر میں جیل سے فرار ہوا۔ اگر میں اس کے ساتھ فرار نہ ہوتا تو میں نے اب تک جو کچھ کیا کبھی نہ کرتا۔“ اس نے دل گرفتہ ہو کر ٹھنڈی سانس بھری۔ ”تو سوچ نہیں سکتی اس نے میرے ساتھ کتنا ظلم کیا۔ مجھے بھاد کر دیا۔ مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔“

”اب تو کیا کرنا چاہتا ہے؟“ شاداں نے دہلی زبان سے دریافت کیا۔

”ابھی بتاتا ہوں۔“ رحیم داد کا لہجہ یکایک درشت ہو گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھا۔ تیزی سے کمرے میں گیا۔ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں رانقل دہلی ہوئی تھی۔ شاداں ایسی حواس باختہ ہوئی کہ کچھ نہ کہہ سکی۔ رحیم داد نے منہ بگاڑ کر اپنی نفرت اور کدورت کا اظہار کیا۔ ”میں ہمیشہ کے لیے لالی



لالی مسمان خانے میں گمری نیند سو رہا تھا۔

رات کے پچھلے پہر آہٹ سے لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کمرے کے باہر چاپ سٹائی دی جو رفتہ رفتہ دور ہوتی جا رہی تھی، پھر گمری خاموشی میں ڈوب گئی۔ لالی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کمرے میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔ مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ وہ دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نظر میز پر پڑی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا چاقو موجود نہ تھا۔ لالی نے اپنے ارد گرد خطرہ منڈلاتا ہوا محسوس کیا۔ وہ آہستہ سے نیچے اترا۔ میز پر رکھی ہوئی اپنی ٹارچ اٹھائی۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ اس نے گردن نکال کر باہر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔ وہ واپس میز کے قریب گیا۔ پھونک مار کر لیپ بچھایا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

مسمان خانہ بدستور ویران تھا۔ بارش رک گئی تھی۔ لیکن بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ لالی نے صحن میں نکل کر حویلی کی بالائی منزل کی سمت گردن اٹھا کر دیکھا۔ اسے کمرے میں روشنی جھللاتی ہوئی نظر آئی۔ یکایک ایسا محسوس ہوا کہ بالائی منزل پر کوئی آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ مگر یہ کراہ جلد ہی خاموشی میں ڈوب گئی۔

لالی اس دروازے کی جانب لپکا جو حویلی میں کھلتا تھا۔ قریب پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے۔ لالی اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا اور ٹانگیں لٹکا کر حویلی میں اترا۔ حویلی بالکل سناں تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ سب بے خبر سو رہے تھے۔ لالی زینے میں داخل ہوا اور چونکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مگر اس میں خاموشی چھائی تھی۔ لالی زینے کے قریب اندھیرے میں دھکا ہوا دم بخود کھڑا رہا۔ جب کمرے میں کسی قسم کی آہٹ نہ ابھری تو وہ دبے دبے قدموں آگے بڑھا۔ دروازے کی اوٹ سے اس نے اندر نظر ڈالی۔ لیپ کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے شاداں کرسی پر بیٹھی ہوئی نظر آئی۔ رحیم داد بستر پر لیٹا تھا۔ لالی نے پلٹ کر نگاہیں دوڑائیں۔ بارش سے بھیگی ہوئی ہتھ بالکل ویران تھی۔ گاؤں اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کی پرچھائیں دیوار پر لہرائی۔ شاداں نے چونک کر لالی کی جانب دیکھا۔ وہ فوراً اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میں تازہ تازہ خون سے لتھڑا ہوا چاقو دبا تھا۔ لالی نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا وہ اس کا چاقو تھا۔ لالی خوف زدہ نظروں سے

کا کاٹنا ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔“

”تو کیا تو اسے کتل کر دے گا؟“ شاداں سرا سید ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں تجھے ایسا نہیں کرنے دوں گی۔“

”لگتا ہے تجھے لالی سے بہت پیار ہے۔“

”بکواس نہ کر۔“ شاداں آنکھیں نکال کر تھیکے لیجے میں بولی۔ ”مجھے تو تیری فکر ہے۔ یہ تو سوچ، اسے کتل کر کے تو چھانی پہ نہیں لٹک جائے گا؟“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”پولیسے تفتیش کرنے آئیں گے تو ان سے کیا کہے گا؟“

”کہہ دوں گا ذکیقتی کرنے آیا تھا۔ مجھ پر بندوک تان کر کھڑا ہو گیا۔ اگر میں گولی نہ چلاتا تو مجھے جان سے مار دیتا۔ یہ بھی کہوں گا، وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ دو ذکیقت اور بھی تھے۔ سب پوری طرح مسلح تھے۔ لالی زخمی ہو کر گرا تو اس کے دونوں ساتھی گھبرا کر اندھیرے میں فرار ہو گئے۔ وہ لالی کی بندوک بھی اٹھا کر لے گئے۔“

”تو جو کچھ کہے گا پولیس اسے آسانی سے مان بھی لیں گے؟“ شاداں قائل نہ ہوئی۔

”بالکل مان لیں گے۔ تھانیدار اپنے احسان علی شاہ کا یار ہے، مجھ سے بھی اس کی جان پہچان ہے۔ لالی کو ۲۵ ہزار دینے کی بجائے تھانیدار کو ۵ ہزار بھی دوں گا تو وہ معاملے کو بالکل دبا دے گا۔“ رحیم دار ٹھہر ٹھہر کر بولتا رہا۔ ”لالی پرانا جرائم پیشہ ہے۔ چوری ذکیقتی کرنے کے جرم میں کئی بار جیل جا چکا ہے۔ پچھلے ہی دنوں چوری کرنے کے جرم میں جیل سے رہا ہو کر نکلا ہے۔ پچھلے ریکارڈ سے پولیس کو اس کے خلاف کیس تیار کرنے میں پوری پوری مدد ملے گی۔“ رحیم داد کھل کر مسکرایا۔ ”شاداں، تو بالکل فکر نہ کر۔ میں نے اس بارے میں پہلے ہی سے سب کچھ سوچ رکھا ہے۔“

”پر خطرہ تو ہے۔“ شاداں نے ایک بار پھر اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ”میں کہتی ہوں تو لالی کی جان لے کر اپنی جان کیوں خطرے میں ڈالنا چاہتا ہے؟ کوئی ایسی تدبیر سوچ۔“

رحیم داد نے اسے اپنی بات بھی پوری نہ کرنے دی۔ جھنجھلا کر بولا۔ ”کان کھول کر سن لے شاداں۔“ اس کا چہرہ خونخوار ہو گیا۔ آنکھوں سے خون اگلنے لگا۔ ”جسے بھی اس راز کا پتہ چل جاتا ہے کہ میں چوہدری نور الہی نہیں رحیم داد ہوں میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑتا۔“ وہ راتفل کے میگزین میں کارٹون ڈالنے لگا۔

شاداں دم بخود رہ گئی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ خوف زدہ ہو کر رحیم داد کے چہرے کو تیکنے لگی۔ جو اس وقت بہت ڈراؤنا نظر آ رہا تھا۔

شاداں کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وحشت طاری تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔

شاداں نے خون خوار نظروں سے لالی کو دیکھا۔ تیز لہجے میں پوچھا۔ ”تو یہاں کیوں آگیا؟“ لالی نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ ”تو نے خون میں ڈوبا ہوا چاکو کیوں دبا رکھا ہے؟ کسی کا خون کیا ہے؟“

شاداں نے بستر کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”تو بھی دیکھ لے۔“

لالی نے دیکھا بستر کی چادر اور تکیے پر لال لال خون پھیلا تھا۔ رحیم داد بے جان لیٹا تھا۔ اس کا گلا کٹا ہوا تھا۔ گوشت کے ٹکڑوں سے ابھی تک خون رس رس کر ادھر ادھر بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ چہرہ نہایت خوف ناک نظر آ رہا تھا۔ وہ لالی کے پینچنے سے پہلے ہی دم توڑ چکا تھا۔

لالی پریشان ہو کر شاداں کی جانب متوجہ ہوا۔ ”یہ تو نے کیا کر دیا شاداں؟“

شاداں نے خون آلود چاقو اس کے سامنے کر دیا۔ ”اسے دیکھ رہا ہے۔“ اس نے غضب ناک ہو کر خبردار کیا۔ ”چپ کر کے یہاں سے چلا جا۔ ورنہ تجھے بھی کاٹ کر اس کے برابر لٹا دوں گی۔“ اس کا چہرہ ڈراؤنا ہو گیا۔ آنکھوں سے چنگاریاں برسنے لگیں۔ وہ ہانپنے کے انداز میں رک رک کر گہری سانس بھر رہی تھی۔ اس کے سر پر خون سوار تھا۔ اس وقت وہ اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔

لالی کو وہ رات یاد آگئی جب اس نے پہلی بار شاداں کو دیکھا تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ اتنا ہی ڈراؤنا تھا۔ اس رات اس نے بالا کا قتل کیا تھا اور لالی کو اسی طرح خونخوار نظروں سے گھور کر دھمکی دی تھی۔ وہ بالکل وہی شاداں تھی۔ ویسے ہی بکھرے ہوئے بال۔ وہی لال لال ڈراؤنی آنکھیں۔ وہی چہرے پر چھائی ہوئی وحشت و دیوانگی۔

لالی نے نرمی سے کہا۔ ”تجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“

شاداں نے پھر کر اسے ڈانٹا۔ ”تو مجھ سے یہ کہنے والا کون ہوتا ہے؟“ اس نے چاقو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ ”جا، ٹر جا یہاں سے۔“ وہ چاقو اٹھا کر لالی پر جھپٹی۔ رار کیا۔ مگر لالی جھکاؤ دے کر صاف بچ گیا۔ لالی نے جھپٹ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ شاداں نے اسے چھڑانے کی کوشش کی۔ لالی نے ہاتھ مروڑ کر چاقو چھین لیا۔

وہ خاموش کھڑی اسے قبر آلود نظروں سے گھورتی رہی۔ پھر پھر کر اس پر جھپٹی۔ چاقو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لالی نے اس کی کوشش ناکام بنا دی۔ نرمی سے سمجھایا۔ ”ہوش میں آ شاداں

تو پاگل تو نہیں ہو گئی؟“ مگر وہ باز نہ آئی۔ اس نے لالی کے اس ہاتھ کو جھپٹ کر پکڑ لیا جس میں چاقو دبا تھا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ چاقو لالی کے ہاتھ سے چھوٹ کر پینچے گر گیا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے لپکی۔ لیکن لالی نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ لالی نے اسے سنبھلے اور سنبھل کر جھپٹنے کا موقع نہ دیا۔ اس کے منہ پر زور سے تھپڑ مارا، دوسرا، پھر تیسرا۔ شاداں چکرا گئی۔ تیور کر فرش پر گری۔ چند لمحے بے حال پڑی ہانپتی رہی، پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

لالی نے چاقو اٹھا کر اپنے قبضے میں کیا۔ کمرے کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی صراحی کے قریب گیا۔ گلاس میں پانی اٹھایا۔ اسے ایک ہاتھ میں سنبھالے ہوئے واپس شاداں کے پاس پہنچا اور اس کے نزدیک ہی فرش پر بیٹھ گیا۔ اس نے پیار سے اس کا سر تھپکا۔ سارا دے کر اٹھایا۔ وہ خاموش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ لالی نے گلاس بردھا کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ”تھوڑا سا پانی پی لے۔“ شاداں نے مزاحمت نہ کی۔ خاموشی سے پانی پینے لگی۔ وہ پورا گلاس چڑھا گئی۔ لالی نے بازو تھام کر اسے کھڑا کر دیا اور قریب رکھی ہوئی کرسی پر بٹھا دیا۔

شاداں سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت کم ہو چکی تھی۔ وہ اب مضطرب اور عذراں نظر آ رہی تھی۔ لپک کی روشنی میں رحیم داد کا کٹا ہوا گلا اور اس کی پھٹی ہوئی بے نور آنکھیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ لالی سے یہ ہولناک منظر زیادہ دیر نہ دیکھا گیا۔ اس نے چادر ڈال کر اس کا خوف ناک چہرہ چھپا دیا۔ بارش ابھی تک تھمی ہوئی تھی۔ لیکن بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ ہوا بھیگی ہوئی تھی۔ رات تاریک اور سنسان تھی۔

لالی بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے شاداں کی جانب دیکھا۔ اظہار تاسف کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”تو نے یہ ٹھیک نہیں کیا شاداں۔ سب کچھ طے ہو چکا تھا اور تیرے سامنے ہی طے ہوا تھا۔“ شاداں نے جواب نہ دیا۔ گم صم بیٹھی رہی۔ لالی نے زور دے کر کہا۔ ”تو نے ایسا کیوں کیا؟ بولتی کیوں نہیں؟“

شاداں نے نظریں اٹھا کر لالی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک بار پھر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ آنکھوں سے وحشت برسنے لگی۔ نفرت سے منہ بگاڑ کر بولی۔ ”تجھے پتہ ہے بالے نے میرے ساتھ ہوا کیا تھا تو میں نے اس کا چہرہ سے گلا کاٹ ڈالا تھا۔ یہ تو بہت زیادہ گندا اور پانی تھا۔“ اس نے رحیم داد کی لاش کی جانب حقارت سے دیکھا۔ ”اس نے تو مجھ سے زبردست دھوکا کیا۔ اسے میں بے زندہ چھوڑتی۔“

”مجھے بھی پتہ ہے،“ اس نے تیرے ساتھ دھوکا کیا۔ ”لالی نے نرم لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے تجھے

بالے کی طرح اس سے بھی پیار ہو گیا تھا۔ یہی بات ہے نا؟“

”بالکل ایسی گل بات نہیں۔“ شاداں نے تنکھے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تو اس سے صرف اس لیے ویاہ کیا تھا کہ مجھ سے اب دکھ نہیں اٹھائے جاتے تھے۔ تو جیل میں تھا۔ میرا نہ کوئی گھر تھا نہ کوئی ٹھکانا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ایک بار اپنا گھر اجاڑ کر میں نے سوچا تھا دوبارہ گھر بساؤں گی۔ میرے بال بچے ہوں گے۔ گھر والا ہو گا۔ آرام سے زندگی گزاروں گی۔“

”پر تو میرے ساتھ بھی اسی طرح آرام سے زندگی گزار سکتی تھی۔ میں تو تیرے ساتھ تیرے بچے کو بھی بیٹھ اپنا ہی سمجھتا۔ تجھے کیا پتہ میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں۔“ لالی نے دل گرفتہ ہو کر کہا۔ ”میں غریب بندہ ہوں۔ تو مجھے کیوں پیار کرنے لگی؟ کیوں میرے ساتھ رہتی؟ غلط کہہ رہا ہوں میں؟“

”سچ بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔“ شاداں نے کہا۔ ”میں نے زندگی میں صرف بالے سے پیار کیا۔“ اس نے نظر بھر کر لالی کو دیکھا۔ ”میں نے تجھے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں تو برا بندہ نہیں بہت بھلا ہے اور میرے لیے تو بیٹھ ہی بھلا رہا ہے۔ مجھے پیار بھی کرتا ہے۔“ وہ لہجہ بھر خاموش رہی پھر گویا ہوئی۔ ”میں نے تجھ سے جھوٹ نہیں بولنا۔ میں تیرے ساتھ جانے کو بالکل تیار تھی۔“

”پر تو نے اس لیے ارادہ بدل دیا کہ میں تجھے اتنا آرام نہ دے سکوں گا جو تجھے یہاں مل رہا ہے میں تجھے رہنے کے لیے ایسی شاندار حویلی اور زمیں داری کی ٹوہر نہیں دے سکتا۔“

”ایسی گل بات نہیں۔“

”اور کیا گل بات ہے؟“ لالی نے مداخلت کی۔ شاداں کی بات کاٹ کر بولا۔ ”رحیم داد مجھے ہزار روپے دے رہا تھا۔ اتنے روپے سے تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔“

”تجھے کچھ پتہ نہیں۔“ شاداں نے وضاحت کی۔ ”وہ تجھے ایک پیسہ نہ دیتا۔“

”تیرے سامنے ہی تو اس نے وعدہ کیا تھا۔“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ کتنا دھوکے باز تھا تجھے کچھ بھی پتہ نہیں۔“ شاداں نے بتایا۔

”مہمان خانے میں پہنچانے کے بعد وہ واپس آیا اور مجھے بھکانے کی کوشش کی۔ کہنے لگا، نہ میں ویاہ کر رہا ہوں نہ تجھے چھوڑنا چاہتا ہوں۔ میں تو لالی کا منٹا ہی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔ وہ میری جا

لیے زبردست خطرہ بن گیا ہے۔“

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”وہ مجھے کتل کرنا چاہتا تھا؟“

”ہاں!“ شاداں نے دیوار پر کھونٹی سے لٹکی ہوئی رائفل کی طرف ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ اس نے تجھے جان سے مار دینے کے لیے بھر کر رکھی تھی۔ وہ سویرا ہونے سے پہلے ہی تجھے گولی مار کر ختم کر دینا چاہتا تھا۔“

”مجھے پتہ نہیں تھا وہ اتنا ڈاڈھو کے باز تھا۔“ لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

شاداں نے اسے رحیم داد کے خطرناک منصوبے سے پوری طرح آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”پر جب اس نے گتے سے آنکھیں نکال کر یہ کہا کہ جو کوئی یہ راز جان جاتا ہے، میں چوہدری نور الہی نہیں رحیم داد ہوں تو میں اسے کبھی زندہ نہیں چھوڑا۔ تنہا سن کر میں اتنی ڈر گئی کہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ میں نے سوچا اس کا یہ راز تو مجھے بھی معلوم ہو گیا ہے۔ وہ مجھے صاف صاف دھوکا دے رہا ہے۔ تجھے کتل کرنے کے بعد مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا۔ پر میں نے اس بارے میں اس سے کچھ نہ کہا۔ اس کی باتیں سن کر چپ بیٹھی رہی۔“

”یہ تو نے بالکل ٹھیک کیا۔“ لالی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”کچھ کہتی تو اسے تیرے بارے میں شبہ ہو جاتا۔“

”ہاں!“ اسے ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ ”شاداں نے لالی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”جب میں سونے کے لیے نیچے جانے لگی تو اس نے پیار محبت کی باتیں کیں۔ بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ مجھے چھوڑنا نہیں چاہتا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”نیچے آکر میں بستر لیٹ گئی۔ پر مجھے نیند نہ آئی۔ دیر تک چپ کر کے لیٹی رہی، فیراٹھ کر تیرے کمرے میں گئی۔ سوچا تجھے جگا کر سب کچھ بتا دوں۔“

”پر بعد میں میں نے ارادہ بدل دیا۔ مجھے ڈر لگا تو گتے میں کہیں اس کا خون نہ کر دے۔ مجھے پتہ ہے تیرا کتہ بھی کم نہیں۔ میں نے میز پر رکھا ہوا تیرا چاکو اٹھا لیا اور چپ کر کے نکل گئی۔“

”تو میرا چاکو اٹھانے آئی تھی؟“ لالی نے چونک کر شاداں کی طرف دیکھا۔ ”میں تو فوراً جاگ گیا تھا۔ پر میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ چپ کر کے لیٹا رہا۔“

”میں اپنے کمرے میں نہیں گئی۔ یہاں آگئی۔ رحیم داد بے خبر سو رہا تھا۔ اسے میرے آنے کا ذرا پتہ نہ چلا۔ مجھے بندوک چلائی نہیں آتی۔ ورنہ میں اسے گولی مار کر ختم کر دیتی۔“ شاداں نے لالی کو بتایا۔ ”میں نے آہستہ سے چاکو کھولا اور رحیم داد کا گلا کاٹ دیا۔ وہ ذرا ہی دیر بعد ختم ہو گیا۔“

”میں نے اس کے ہائے کرنے کی آواز تو سنی تھی، تب ہی تو میں ادھر آیا۔“

”اس نے صرف تھوڑی سی ہائے ہائے کی اور وہ بھی زیادہ زور سے نہیں۔“ شاداں بولی۔ ”پر اس کی آواز تو نے بھی سنی لی۔“

”میری ایک خواہش ہے، اور وہ یہ کہ تیرا جو بچہ پیدا ہو، اس کا نام لالی رکھنا۔ اس سے تو ضرور پیار کرے گی۔ میں سمجھ لوں گا مجھے تیرا پیار مل گیا۔ تو ایسا ضرور کرتا۔“

شاداں نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ بت کی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

”کب تک تو اس طرح میاں بیٹھی رہے گی؟“ لالی نے پوچھا۔

”تو چاہتا کیا ہے؟“ شاداں نے حیکمے لہجے میں کہا۔

”تو نے سنا نہیں، میں نے اب تک کیا بکواس کی؟“ وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”نیچے جا اور فٹ کپڑے بدل۔“

”میں نے کہیں نہیں جانا۔“ شاداں نے صاف انکار کر دیا۔

”تو نہیں جائے گی۔“ لالی نے غضب ناک ہو کر کہا۔

”نہیں، میں نے کہیں نہیں جانا۔“ شاداں اپنی ضد پر اڑی رہی۔ ”چاکو مجھے دے اور تو یہاں سے جا۔“

”تجھے نہیں جانا میاں سے؟“ لالی حیکمے نظروں سے شاداں کو گھورتا ہوا اٹھا۔ قریب پہنچا۔ چاقو مٹا کر کے بولا۔ ”اگر تو نے میری بات نہیں مانی تو میں اپنے ہاتھ سے تیرا گلا کاٹ دوں گا اور اپنا بھی کاٹ ڈالوں گا۔ تجھے پتہ ہے، میں جو کہتا ہوں اسے کر کے دکھا بھی دیتا ہوں۔“

شاداں نے لالی کو اس قدر غیظ و غضب کے عالم میں دیکھا تو سرا سید ہو گئی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اے تو پرے ہٹا۔“ اس نے خون آلود چاقو کی جانب اشارہ کیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ”لا، یہ مجھے دے۔ خون تیرے کپڑوں سے بھی لگ جائے گا۔“

”لگنے دے۔“ لالی نے بے نیازی سے کہا۔

”پاگل نہ بن۔ اسے دے دے۔ میں اسے پانی سے دھو کر صاف کر دوں گی۔“ شاداں نے اسے زور لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ ”میں اپنی جان بچانے کے لیے تجھے پھانسی پر لٹکنے نہیں دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہو گا۔“ اس نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر لالی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ”میں اپنے خون بھرے کپڑے بدل کر دوسرے پن لوں گی۔ جیسا تو کہتا ہے ویسا ہی کروں گی۔ پر تو یہاں ٹھہرے گا نہیں۔ جھیتی نال چلا جانا۔“

”نہیں، میں نے کہیں نہیں جانا۔“ لالی نے آہستہ آہستہ انکار میں گردن ہلائی۔

”تو نے میری بات نہیں مانی تو میں نے بھی کہیں نہیں جانا۔“ وہ بھی اپنی ضد پر اڑ گئی۔ ”چاہے تو میرا خون ہی کر دے۔ مجھے خوشی ہو گی کہ تیرے ہاتھوں ماری جاؤں۔“

لالی نے کچھ نہ کہا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے شاداں سے کہا۔ ”جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب آگے کی سوچ۔ سویرا ہونے میں زیادہ دیر نہیں۔ لاش بھی کھود کر کہیں دبائی نہیں جاسکتی۔ سب کو پتہ چل جائے گا۔“

”وہ تو چلنا ہی ہے۔“ شاداں نے نہایت اطمینان سے کہا۔ ”میں نے اس بارے میں پہلے ہی سوچ رکھا ہے۔“

”کیا سوچ رکھا ہے؟“ لالی نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”صاف صاف کہہ دوں گی، میں نے خون کیا ہے۔“ شاداں نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میں نے اب زندہ نہیں رہتا۔ مجھے ایسی گندی زندگی نہیں چاہیے۔“ اس نے بے زاری سے کہا۔ ”اب تو جا، بیکار میں پکڑا جائے گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔“

”ایسے تو نہیں چھوڑوں گا۔“ لالی کے لہجے میں اچانک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ ”تو نے میری جان بچائی اور میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں۔ تو مجھے اتنا کمینہ اور خود غرض سمجھتی ہے۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ اب میں جیسا کہتا ہوں، وہ کر۔“

”کیا کرنا چاہتا ہے تو؟“ شاداں نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

”تو نیچے جا کر اپنے یہ خون لگے کپڑے بدل لے۔ انھیں کہیں چھپا دیتا۔ بعد میں جلا کر راکھ کر دیتا تاکہ تجھ پر کوئی الزام نہ آئے۔“

”اور تو کیا کرے گا؟“ شاداں نے دریافت کیا۔

”میں یہیں بیٹھا رہوں گا، پولیس کے آنے کا انتظار کروں گا۔“ لالی نے نہایت سکون سے اپنے منصوبہ بتایا۔ ”پولیس سے صاف صاف کہہ دوں گا، میں نے خون کیا ہے۔“

”ایسا کرے گا تو پھانسی پر نہیں لٹک جائے گا؟“

”تیرے لیے میں سب کچھ کر سکتا ہوں۔“ اس کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔ ”تو کتل کے الزام میں پکڑی جائے یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔“

”اور میں چپ کر کے یہ دیکھتی رہوں کہ خون میں کروں اور تو پھانسی سے لٹک جائے۔“

”ہاں، تجھے ایسا ہی کرنا ہو گا۔“ لالی نے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”مجھے پھانسی لگنے سے کسی کو ڈر نہیں ہو گا۔ کچھ بھی نہ ہو گا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے۔ ”میرا تو کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں۔“ اس کی ہلکوں سے آنسو ڈھلک کر رخساروں پر آگئے۔ ”مجھے یہ تو خوشی ہو گی تو آرام رہے گی۔ یہ حویلی، یہ ساری زمین داری تیری ہو گی۔“ اس نے قیص کے دامن سے آنسو پونچھے۔

”تو چاہتی کیا ہے؟“ لالی نے زچ ہو کر پوچھا۔

”جو میں کہہ رہی ہوں وہ کر۔ لا اسے مجھے دے دے۔“ شاداں کی نظریں لالی سے ملیں۔ لالی کو اس کی آنکھوں میں ستاروں کے کنول جھللاتے دکھائی دیے۔ وہ ہمیشہ کی طرح خوبصورت اور دل آویز تھیں۔ لالی اس کی شفاف آنکھوں کی جھلیوں میں ڈوب گیا، کھو گیا۔ شاداں نے ہاتھ بڑھایا اور چاقولے لیا۔ لالی نے کوئی مزاحمت نہ کی۔

شاداں مڑی اور برابر والے کمرے کی سمت بڑھی۔

”ادھر کہاں چلی؟“ لالی نے اسے ٹوکا۔

”میرے کپڑے لے اسی کمرے میں رکھے ہیں۔“ شاداں نے جواب دیا۔

”نفائٹ واپس آنا۔ میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ تو بھی میرے ساتھ چلے گی۔“ لالی نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ ”رات ختم ہو رہی ہے۔ سویرا ہونے سے پہلے پہلے دونوں یہاں سے بت دور نکل جائیں گے۔“ لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”سن رہی ہے ناں؟“

شاداں نے نہ کوئی جواب دیا نہ مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ آگے بڑھی، کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اس نے اندر سے دروازے کے پٹ بند کر دیے۔

بادل رک رک کر گرج رہے تھے۔ بوند اباندھی پھر شروع ہو گئی تھی۔ ہوا کے پھرے ہوئے جھونکے کمرے کے اندر آتے۔ لیپ کی لو بار بار بھڑکتی۔ دیواروں پر چھائیاں منزلانے لگتیں۔ بستر پر رحیم داد کی لاش پڑی تھی۔ اس کے ڈراؤنے چہرے پر پڑی ہوئی چادر پر خون کے دھبے نمایاں ہو گئے تھے۔ لالی نے لاش کی جانب نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ چپ بیٹھا شاداں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔

بھئی بھئی اندھیری رات دھیرے دھیرے اپنا آخری سفر طے کر رہی تھی۔ تیز ہوا درختوں کی شاخوں سے الجھتی ہوئی پڑ پڑا رہی تھی۔ کئی منٹ گزر گئے، مگر شاداں کمرے سے باہر نہ نکلی۔ بتی کے کسی مکان سے پیچلی رات کے سنٹے میں مرغ کی بانگ ابھری اور ٹھہر ٹھہر کر ابھرتی رہی۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ صبح کی آمد آمد تھی۔ لالی نے پریشان ہو کر مشرقی رخ کے اس کمرے کی سمت دیکھا جس میں شاداں کپڑے تبدیل کرنے گئی تھی۔ یکایک کمرے میں دھم سے کچھ گرا۔ آہٹ ہوئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

لالی بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا۔ سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے آواز دی۔ ”شاداں، شاداں، تو اندھیرے میں کیا کر رہی ہے؟“ کوئی جواب نہ ملا۔ ار

نے مزید انتظار نہ کیا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے ایک بار پھر شاداں کو پکارا۔ لیکن اس دفعہ بھی کوئی جواب نہ ملا۔ کمرے میں گھرا سکوت تھا۔

لالی نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔ اس نے ادھر ادھر نظریں گھما پھرا کر کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک دیوار کے پاس روشنی کے زرد زرد چلتے میں اسے شاداں نظر آئی۔ وہ فرش پر خون میں لت پت پڑی تھی۔ لالی وہاں مزید نہ ٹھہرا۔ باہر نکلا۔ لیپ اٹھایا اور اسے سنبھالے ہوئے واپس کمرے میں پہنچا۔

شاداں دم توڑ رہی تھی۔ اس کی گردن میں چاقو پیوست تھا۔ شہ رگ کٹ گئی تھی۔ گلے کے کمرے زخم سے خون ابل ابل کر اس کے سینے پر، کپڑوں اور فرش پر پھیلتا جا رہا تھا۔

لالی نے شاداں کو اس جاکنی کے عالم میں دیکھا تو لرز کر رہ گیا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا آگیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ اس نے لیپ قریب کے ایک ٹرینک پر رکھ دیا اور شاداں کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ وہ بھٹی بھٹی حیران و پریشان نگاہوں سے شاداں کی گردن دیکھنے لگا جو دور تک کٹی ہوئی تھی۔ گوشت کے لو تھڑوں میں پھنسا ہوا چاقو گہرائی تک اتر گیا تھا۔ لالی نے زپ ہو کر کہا۔ ”شاداں، یہ تو نے کیا کر لیا؟ میں نے تو سوچا تھا۔ دونوں رات کے اندھیرے میں چھپتے لکتے نکل جائیں گے۔ شادو کے پاس لائل پور جائیں گے۔ تو اس کے گھر میں چھپ کر بیٹھ جاتی۔ میرے بارے میں تو کسی کو پتہ نہیں میں کب آیا اور کب یہاں سے چلا گیا۔“ لالی بے قراری کے عالم میں بولتا رہا۔ مگر شاداں نے کچھ بھی نہ کہا۔ اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔ اس نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ ان میں جھللاتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ منکا ایک طرف ڈھلک گیا۔ شاداں ختم ہو گئی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ لالی اسے سفر آخرت پر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کے سینے سے دھواں اٹھا۔ آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس نے دل گرفتہ ہو کر گہری سانس بھری۔ اب کچھ بھی نہ رہا تھا۔ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ شاداں اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ اس نے وہی کیا جو سوچا تھا، پہلے سے طے کر رکھا تھا۔

لالی نے جھک کر شاداں کے چہرے پر ہنسرے ہوئے پال ہٹائے۔ اس کی اجلی اور روشن پیشانی کو چوما اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیپ اٹھایا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس نے لیپ اسی جگہ پر رکھ دیا جہاں سے اٹھا تھا۔ مڑا، رحیم داد کی لاش پر ایک نظر ڈالی۔ آگے بڑھا۔ دروازے سے گزر کر پھٹ پر پہنچا۔ ہلکی ہلکی بوند اباندھی ہو رہی تھی۔

زینے کی بیڑھیاں ملے کر کے وہ نیچے پہنچا۔ حویلی پر ویرانی چھائی تھی۔ صدر دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار زور سے کھکارا۔ لالی نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ فوراً مسمان خانے کی جانب بڑھا۔ دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوا۔ مسمان خانہ ہنوز سنان تھا۔ اس نے باہر جانے والے دروازے کی کنڈی چڑھائی۔ اچھلا اور دیوار پر پہنچ گیا۔

جب وہ دیوار سے نیچے اتر تو عین اس وقت مسمان خانے کے برابر والے مکان میں کوئی زور زور سے کھانے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ نادر خان باہر نکلا۔ وہ دس قدم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ لالی جھٹ دیوار کے ساتھ اندھیرے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ نادر خان اس کی جانب بڑھا۔ مگر چند قدم چلنے کے بعد مڑا اور واپس گھر میں چلا گیا۔

بستی کے مکانوں میں اب بوڑھوں کے کھانے کھکارنے، بچوں کے رونے اور موسیٹوں کی گردنوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ہلکی ہلکی آوازیں وقفے وقفے سے ابھر رہی تھیں۔ کالے کالے بادلوں کے مشرقی کناروں سے ہلکی ہلکی کافوری روشنی پھوٹ رہی تھی۔ رات کا چل چلاؤ تھا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ بارش تیز نہ تھی۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ لالی نے چونکنا نظروں سے اوجھڑا دھری دیکھا۔ کیچڑ اور پانی سے بھرے ہوئے گڑھوں سے چٹا چٹا آگے بڑھا۔ نہر کے پاس پہنچا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ مڑ کر کوئلہ ہرکشن کے مکانوں کو دیکھا اور ان کے درمیان ابھری ہوئی دو منزلہ حویلی دیکھی جس کی بالائی منزل کے کمروں میں رحیم داد اور شاداں کی لاشیں پڑی تھیں۔ اس نے قدموں کی رفتار تیز کر دی۔ دن نکلنے سے پہلے پہلے وہ کوئلہ ہرکشن سے بہت دور چلا جانا چاہتا تھا۔

پہر دن چڑھے وہ چک بیدی پہنچ گیا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ لاریوں کے اڈے پر چل پھل بڑھ گئی تھی۔ اس نے ڈرائیور ہوسٹل میں جا کر گرم گرم پراٹھا کھایا۔ چائے پی۔ شب بیداری کا شمار کچھ کم ہوا۔ باہر نکلا تو نیلی ٹرانسپورٹ کی ایک بس شہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ وہ بس پر سوار ہو گیا۔ بس ذرا ہی دیر بعد روانہ ہو گئی۔ وہ لاہور جانا چاہتا تھا جہاں غنی چٹا رہتا تھا۔ اس کا گھر ہی اب لالی کا واحد ٹھکانا تھا۔ پچھلے کئی مہینے سے وہ چٹے کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔

لیکن شہر پہنچ کر لالی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ لاہور جانے کے بجائے سیلی کی جانب روانہ ہو گیا۔



لالی سیلی پہنچا تو شام دروہام سے نیچے اتر رہی تھی۔ وہ سیدھا اینٹوں کے اس بھٹے پر گیا جہاں ارشاد الہی دوسرے ہتھیروں کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بھٹے کا جعدار اکبر سانول تھا۔ لمبا ترنگ کا۔

بھنگ۔ چرے پر چپک کے گہرے گہرے داغ۔ صورت شکل سے جتنا خوف ناک نظر آتا تھا مزاج کے اعتبار سے اتنا ہی درشت اور کڑوا بھی تھا۔ لالی اس سے ملا۔ ارشاد الہی کے بارے میں دریافت کیا۔

”جعدار، ہتھیر ارشاد الہی ادھر ہی ہوتا ہے؟“

”تو شادا کے بارے میں پوچھ رہا ہے؟“ جعدار اکبر سانول نے تیوری پر بل ڈال کر بے رخی سے جواب دیا۔ ”وہ ادھر ہی ہوتا ہے، پر تجھے اس سے کیا لینا؟“

”میں جی شادا سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”تو اسے نہیں مل سکتا۔“ سانول نے بے زاری سے منہ بگاڑا۔ ”اسے کوئی نہیں مل سکتا۔“

”میں اسے کیوں نہیں مل سکتا؟“ لالی نے لمبے میں عاجزی پیدا کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”اس کی طبیعت گڑبڑ رہتی ہے۔ بخار آتا ہے۔ ہر دم کھانتا رہتا ہے۔“ اس نے لالی کو بتایا۔

”اس سے کام وحدنا بھی نہیں ہوتا۔ منتیں کر کے پیشگی لیتا رہتا ہے۔ اس کی پیشگی بہت زیادہ ہو گئی ہے۔“ جعدار نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”تجھے پتہ نہیں جس ہتھیرے کی پیشگی بہت زیادہ ہو جاتی ہے وہ نہ بھٹے سے باہر جا سکتا ہے اور نہ کسی سے مل سکتا ہے۔ حٹہ مالک رانا محمود نے اس پر سخت پابندی لگا رکھی ہے۔“ وہ منہ ٹیڑھا کر کے بڑبڑانے لگا۔ ”ایسی سختی نہ کریں تو پیشگی کیسے وصول ہو۔ ہتھیرے تو ہمارے ہی ہڈ حرام اور کھتے ہوتے ہیں۔“

اکبر سانول کے سخت گیر رویے سے لالی کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اسے ارشاد الہی سے ملنے نہیں دے گا۔ اس کا ذاتی تجربہ تھا کہ جعدار کی مرضی کے بغیر کوئی بھی کسی ہتھیرے سے نہ مل سکتا ہے نہ بات کر سکتا ہے۔ اس نے جعدار سے الجھنے کی کوشش نہ کی اور جس ارادے سے آیا تھا اس کا کھل کر اظہار کر دیا۔

”جعدار، میں اس کی پیشگی ادا کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو اس کی پیشگی ادا کرے گا؟“ جعدار نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا۔ ”تو اس کا ضمانتی بنے گا؟ جب تک اس کی پیشگی ادا نہ ہوگی بھٹے پر کام کرتا رہے گا؟“

”ہاں جی، جب تک شادا کی پیشگی ادا نہ ہوگی میں کام کرتا رہوں گا۔ میں پہلے بھی ہتھیرا رہ چکا ہوں۔ مجھے پیشگی کے بارے میں اچھی طرح پتہ ہے کیسے ادا ہوتی ہے۔“ لالی نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”تو اسے چھٹی دے دے، میں اس کی جگہ کام کروں گا۔“

جعدار نے لالی کو اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا۔ اس کا ایک بازو پکڑ کر گوشت انگلیوں سے

ٹولا۔ مسکرا کر بولا۔ ”دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ ہتھیرا بھی رہ چکا ہے۔“ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ ”ٹھیک ہے، شادا کو چھٹی مل جائے گی۔ تجھے اس کی جگہ لگا دیا جائے گا۔“ اس نے قدرے توقف کیا۔ ”پر ایسا کرنے سے پہلے رانا محمود سے اجازت لینی ہو گی۔ وہ یہاں موجود بھی ہے۔ تو بیس ٹھیر۔ میں اس سے تیرے بارے میں بات کرنے جا رہا ہوں۔“

جعدار مڑا۔ آگے بڑھا اور اندھیرے میں اوجھل ہو گیا۔

لالی چپ چاپ کھڑا رہا۔

شام اب گہری ہو گئی تھی۔ مگر آسمان صاف تھا۔ ستارے جھلملہا رہے تھے۔ ہتھیروں اور بھٹے پر کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی جھونپڑیوں میں چراغ ٹٹار رہے تھے۔ چولوں سے دھواں اٹھ کر فضا میں منڈلا رہا تھا۔

لالی کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ جعدار اندھیرے سے نکل کر سامنے آگیا۔ قریب پہنچ کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”میرے ساتھ آ۔“ وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

دونوں بھٹے کے مالک رانا محمود کے پاس پہنچے۔ وہ ادھیڑ تھا۔ سر کے بال کالے کم سفید زیادہ تھے۔ چہرے مرے سے کاروباری اور گھاگ نظر آتا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ سامنے بھدی سی لکڑی کی میز تھی جس پر کھلا ہوا رجسٹر رکھا تھا۔ قریب ہی اس کا منشی بھی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

رانا محمود آنکھوں پر چشمہ لگائے سامنے رکھے ہوئے رجسٹر کو لائین کی روشنی میں غور سے دیکھ رہا تھا۔ جعدار اکبر سانول نے کھنکار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ رانا محمود نے گردن اونچی کی اور مرکز جعدار کو دیکھا۔ لالی اس کے پہلو میں مسکین سی صورت بنائے سکڑا سکڑایا کھڑا تھا۔

جعدار نے لالی کی طرف ہاتھ اٹھایا۔ ”یہ جی، شادا کا ضامنی ہے۔ اس کی جگہ کام کرنا چاہتا ہے۔“

”سامنے آ۔“ بھٹے کے مالک نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

لالی آگے بڑھا اور اس کے روبرو سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ رانا محمود نے آنکھوں پر لگا ہوا چشمہ اتارا اور لالی کو پرکھنے والی نظروں سے دیکھا۔ دریافت کیا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“ اس کے لہجے میں رعب اور دبدبہ تھا۔

”لالی۔“ لالی نے مختصر جواب دیا۔

”یہ جی، ہتھیرا بھی رہ چکا ہے۔“ جعدار نے لقمہ دیا۔

لالی گھبرا گیا کہ اب رانا محمود پوچھے گا، کتنے بھٹوں پر کام کیا؟ کتنے عرصے کام کیا اور چھوڑا کیوں؟ مگر اسے سخت حیرت ہوئی کہ رانا محمود نے نہ صرف یہ کہ ایسی کوئی پوچھ گچھ نہیں کی بلکہ اس سے مزید بات چیت ہی نہیں کی۔ وہ جعدار اکبر سانول کی جانب متوجہ ہوا۔

”تجھے یہ ٹھیک ٹھاک لگتا ہے تو کام پر لگا دے۔ کام تو تجھے ہی اس سے لیتا ہے۔“

”تو جی فیہ شادا کو چھٹی دے دی جائے؟“ جعدار نے پوچھا۔

”ہاں، اسے چھٹی دے دے۔“ رانا محمود نے جعدار سے اتفاق رائے کیا۔ ”وہ اپنا علاج معالجہ کرا لے گا۔“ قدرے توقف کے بعد اس نے مڑ کر منشی کی جانب دیکھا۔ ”رحمت، ایسا کر۔ شادا کی پیشگی لالی کے نام ڈال دے۔ اور اسکا انگوٹھا لگوا لے۔“

منشی نے فوراً سرخ جلد کا دبیز رجسٹر نکالا۔ اسے کھولا۔ ورق الٹے۔ قلم اٹھایا۔ لالی سے دریافت کیا۔ ”تیرا پورا نام کیا ہے؟“

”لال دین ولد کرم دین۔“ لالی نے بغیر پوچھے اپنی ولدیت بھی بتادی۔

”بیس میلی میں رہتا ہے؟“

”ہاں جی میں رہتا ہوں۔“ لالی نے جان بوجھ کر لاہور کا پتہ نہ بتایا جہاں وہ ان دنوں مقیم تھا۔ منشی سر جھکا کر لائین کی روشنی میں رجسٹر کے سادہ ورق پر لکھنے لگا۔ اس نے پیشگی کا اقرار نامہ تیار کیا۔ لالی کو قریب بلایا اور رجسٹر سامنے کر کے انگلی سے بتایا۔

”یہاں انگوٹھا لگا دے۔“

لالی نے روشنائی لگائی اور منشی رحمت کی ہدایت کے مطابق انگوٹھا لگا دیا۔ وہ عام طور پر انگوٹھا لگانے کے بجائے دستخط کرتا تھا۔ تھوڑا بہت لکھ پڑھ بھی لیتا تھا۔ لیکن بڑے مالک کے سامنے یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ بالکل جاہل اور ان پڑھ ہے۔

رانا محمود نے آنکھوں پر چشمہ لگایا اور ایک بار پھر توجہ سے سامنے رکھا ہوا رجسٹر دیکھنے لگا۔

جعدار نے لالی کو اپنے ہم راہ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا۔ لالی اس کے عقب میں چلا۔

باہر آکر جعدار نے ایک کارندہ بلایا۔ لالی کو اس کے سپرد کیا اور یہ ہدایت کی۔ ”اسے شادا کی پاس لے جا۔“ وہ لالی کی جانب متوجہ ہوا۔ ”لالی، تو جا کر شادا سے گل بات کر۔ میں بھی تھوڑی دیر بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔“ وہ مڑا اور بڑے مالک رانا محمود کے پاس واپس چلا گیا۔



جھونپڑی میں چراغ روشن تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں ارشاد الہی چارپائی پر لیٹا رک رک کر

”پر تو نے ایسا کیوں کیا؟“

”میں تو بہت پہلے چاہتا تھا تو اس چکر سے نکل جا۔ پر تو نے میری بات ہی نہیں مانی۔ الٹی میری شکایت جا کر لگا دی۔“

”ہاں جی، بہت غلطی ہو گئی۔“ ارشاد الہی نے اظہار تاسف کیا۔ ”تجھ پر ملک ثار اور اس کے بعد دار نے بہت ظلم کیا۔“

”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔“ لالی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔ ”تو ٹھیک کہتا تھا۔ تیرا پو مر گیا۔ پر میں نے بھی غلط نہیں کہا تھا۔ کوئلہ ہر کشتن میں جو چوہدہری نور الہی تھا، اس نے جعل سازی کر کی تیرے پو کے کلیم کے ذریعے بہت وڈی زمیں داری اور جائیداد الاٹ کرالی تھی۔ وہ اب نہیں رہا۔ بچھلے دنوں وہ بھی مر گیا۔“ لالی نے جان بوجھ کر رحیم داد کے قتل اور شاداں کی خودکشی کا تذکرہ نہیں کیا اور نہ یہ بتایا کہ دونوں سے نہ صرف اچھی طرح واقف تھا بلکہ ان کے ساتھ اس کے دیرینہ اور گہرے مراسم تھے۔ جیل میں پیشہ ور مجرموں اور طرح طرح کے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ رہ کر وہ ہوشیار اور آزمودہ کار ہو گیا تھا۔ اس نے بہت محتاط رویہ اختیار کیا۔ شاداں کا تو سرے سے ذکر ہی نہیں کیا۔ رحیم داد کے بارے میں صرف اسی قدر بتایا۔ ”اس بندے کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ سنا ہے اس کا کوئی وارث بھی نہیں اور اگر وارث ہوتا بھی تو کوئی فرک نہ پڑتا۔ اپنے پو کا اصلی وارث تو ہے۔“

”پر میں کیا کر سکتا ہوں؟“ ارشاد الہی نے نہایت سادگی سے اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔ ”تو ایسا کر۔ یہاں سے سیدھا ملتان جا۔“ لالی نے مشورہ دیا۔ ”ماں کو اپنے ساتھ لے اور کوئلہ ہر کشتن پہنچ کر پیو کی زمیں داری اور جائیداد حاصل کرنے کی کوشش کر۔“

”میں جاؤں گا کیسے؟“ ارشاد الہی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ کھانے تک کو تو ہے نہیں۔ پڑوس کا ہتھیرا لیمائیک بندہ ہے۔ وہ کھانے کو روٹی دے دیتا ہے۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”جب وہ روٹی نہیں دیتا تو بھوکا پڑا رہتا ہوں۔ ویسے تو اب بھوک بھی نہیں لگتی۔“

لالی نے جیب سے روپے نکالے۔ ان کو گنا۔ اس کے پاس اس وقت ۲۸ روپے تھے۔ اس نے ۱۸ روپے اپنے لیے رکھ لیے۔ ۳۰ روپے ارشاد الہی کی جانب بڑھاتے ہوئے گویا ہوا۔ ”لے یہ روپے رکھ لے۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”اب تو تو ملتان جا سکتا ہے۔“

ارشاد الہی نے روپے لے لیے۔ رفت انگیز لمبے میں بولا۔ ”مجھے پتہ نہیں تھا تیرا دل اتنا ڈٹا

کھانس رہا تھا۔ باہر رات کی تاریکی پھیلی تھی۔ آس پاس کی جھونپڑیوں اور جھکیوں سے بولنے اور بات کرنے کی جلی جلی آوازیں آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔

لالی بھٹے کے کارندے کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا۔ کارندہ لالی کو جھونپڑی میں پہنچا کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

ارشاد الہی نے لالی کو دیکھا تو شہد ررہ گیا۔ فوراً اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ خاموشی سے لالی کا چہرہ نکلنے لگا۔ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”شادے، تو نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں لالی ہوں۔“

”کیوں نہیں پہچانا۔“ ارشاد الہی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ اس نے انکلتے ہوئے پوچھا۔ ”پر تو یہاں آیا کیسے؟“ لالی نے ارشاد الہی کو غور سے دیکھا۔ اس کا لاغر جسم اب ہڈیوں کا ڈھانچہ وہ گیا تھا۔ رنگت پہلی پڑ گئی تھی۔ آنکھیں اور اندر دھنس گئی تھیں۔ ان کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ لالی کو دھچکا لگا۔ اس نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ ”تو نے اپنی حالت کیا بتائی ہے؟“

”بخار آتا ہے۔ کھانسی بھی آتی ہے۔“

”مجھے پتہ نہیں تھا تو اتنا بیمار ہے۔“

”کھڑا کیوں ہے؟ بیٹھ جا۔“ ارشاد الہی نے لالی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

لالی نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”دوائی شوائی بھی لے رہا ہے؟“

”تو دوائی کی بات کر رہا ہے کھانے کو روٹی تو ملتی نہیں۔“ ارشاد الہی بچھے ہوئے لمبے میں اپنی پریشان حالی بیان کرنے لگا۔ ”بچھلے دنوں تو اتنا بیمار رہا کام بھی نہیں کر سکتا تھا۔ منجی پر پڑا رہتا تھا۔“ بات کرتے کرتے وہ ہولے ہولے ہانپنے لگا۔ ”پر اب طبیعت کچھ ٹھیک ہے۔ سوچتا ہوں کل صبح سے کام شروع کر دوں۔“

”پر تو کام کیسے کرے گا؟ کتنا تو بیمار ہے۔“

”کام نہیں کروں گا تو روٹی کہاں سے ملے گی؟ پیٹنگی کیسے ادا ہوگی؟“

”فکر نہ کر۔ اب تجھے پیٹنگی ادا نہیں کرنی پڑے گی۔“ لالی نے مسکرا کر اسے اطمینان دلایا۔

”پیٹنگی کیوں نہیں ادا کرنی ہوگی؟“ ارشاد الہی نے آنکھیں پھاڑ کر لالی کو دیکھا۔

”میں تیری پیٹنگی ادا کروں گا۔ تیری جگہ میں یہاں کام کروں گا۔ تجھے چھٹی مل گئی ہے۔“ لالی نے اسے مطلع کیا۔ ”میں پہلے بعد دار کے ساتھ حٹ مالک رانا محمود کے پاس گیا تھا۔ سب کچھ ملے ہو گیا۔ میں نے پیٹنگی کی رسید پر انگوٹھا بھی لگا دیا۔“

ہے۔ کیسے بتاؤں تو کتنا نیک بندہ ہے۔“ اس نے دُور جذبات سے وارفتہ ہو کر لالی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور بے اختیار رونے لگا۔

”اوئے شادے‘ تو تو رونے لگا۔“ لالی نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ ”یار‘ اس میں نیکی بھی کرنے کی کوئی بات ہے۔ بندہ بندے کے کام آتا ہی ہے۔“ وہ ہولے ہولے اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ ”آنسو پونچھ لے اور کام کی گل سن۔“

ارشاد الہی نے کچھ نہ کہا۔ کرتے کا دامن اٹھا کر آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو پونچھنے لگا۔

”کوئلہ ہر کشتن جانا تو ایسی حالت میں نہ جانا۔“ لالی نے اس کے میلے کچیلے اور بوسیدہ لباس کی جانب اشارہ کیا۔ ”شان سے جانا۔ ایسی شان سے کہ دیکھنے میں زمیں دار لگے۔ اپنے لیے اور ماں کے لیے نئے کپڑے سلوا لینا۔“ بات کہتے کہتے وہ جھجکا۔ ”پر تو نئے کپڑے سلوائے گا کیسے؟“ لالی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بار پھر روپے نکالے۔ تین جیب میں رکھ لیے اور پندرہ روپے ارشاد الہی کو دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ”لے یہ بھی رکھ لے۔ اب تو تیرے اور تیری ماں‘ دونوں کے نئے کپڑے بن جانے چاہیے۔“

لیکن اس بار ارشاد الہی نے روپے لینے سے انکار کر دیا۔ ”انھیں اپنے ہی پاس رہنے دے۔ تجھے بھی تو ضرورت پڑے گی۔“

”فکر نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ اصرار کر کے روپے ارشاد الہی کو دے دیے۔ ساتھ ہی تاکید کی۔ ”تو یہاں سے فافٹ چلا جا۔ ابھی رات زیادہ نہیں ہوئی۔ ملتان جانے والی بس پکڑنا۔ ماں کو ساتھ لینا اور کوئلہ ہر کشتن پہنچنے کی کوشش کرنا۔“

”پر وہاں پہنچ کر کیسے ثابت کروں گا میں چوہدری نور الہی کا پتر ہوں۔ اس کی زمیں داری اور جائیداد کا وارث ہوں۔“ ارشاد الہی نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔ ”مجھے تو اپنے پوے کے بارے میں ٹھیک سے کچھ یاد بھی نہیں۔“

”اسی لیے تو کہتا ہوں‘ ماں کو اپنے ساتھ لے جانا۔ اسے سب پتہ ہو گا۔ وہ ایک ایک بات بتا دے گی۔“ لالی نے بے تکلفی سے ارشاد الہی کی پیٹھ پر ہولے سے دھپ مارا۔ ”یار‘ تو تو ابھی سے گھبرانے لگا۔ پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہی ہو گا۔“ اس نے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”زمیں داری مل جائے تو اس کی شان میں مجھے نہ بھول جانا۔“

”تجھے کیسے بھول سکتا ہوں۔“ ارشاد الہی کے مرجھائے ہوئے چہرے پر اچانک رونق آگئی۔ اس نے ایک بار پھر لالی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں گرم جوشی سے دبایا۔ ”زمیں داری مل گئی تو پہلا کام“

کروں گا تیرے پاس آؤں گا‘ بیٹگی ادا کروں گا تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ دونوں مل کر زمیں داری چلائیں گے۔ یہ ٹھیک رہے گا ناں؟“

”شادے‘ تو تو ابھی سے سفے دیکھنے لگا۔“ لالی کا لہجہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”مجھے تو سب سے زیادہ خوشی اس کی ہو گی کہ تجھے تیرا حاکم مل جائے۔ ایسا ہو جائے تو میرے پاس آنا ضرور۔“

”ضرور آؤں گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے تیرے پاس نہ آؤں۔“ ارشاد الہی نے اسے یقین دلایا۔ ”میں تیرا انتظار کروں گا۔“

ارشاد الہی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دریافت کیا۔ ”یہ تو بتا‘ میں کوئلہ ہر کشتن پہنچوں گا کیسے؟ مجھے تو دوسرے بارے میں کچھ اتا پتا نہیں۔“

لالی اسے کوئلہ ہر کشتن کے راستے کے بارے میں تفصیل سے بتانے لگا۔ اسی اثناء میں جعدار اکبر سانول آگیا۔ اس نے مسکرا کر لالی کو مخاطب کیا۔ ”لالی‘ تو نے اپنے یار سے ٹھیک طرح حل بات کر لی۔ کل ہی سے کام شروع کر دے۔“

”کل ہی شروع کروں گا۔“ لالی نے رضامندی کا اظہار کیا۔

جعدار نے مڑ کر ارشاد الہی کی جانب دیکھا۔ ”لالی نے بتا ہی دیا ہو گا کہ تجھے چھٹی مل گئی۔ تیری بیٹگی یہ ادا کرے گا۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد دریافت کیا۔ ”یہ بتا اب تیرا ارادہ کیا ہے؟ ابھی جائے گا یا کل صبح؟“

ارشاد الہی کے جواب دینے سے پہلے ہی لالی نے لقمہ دیا۔ ”ترج ہی جائے گا جی۔ اور ابھی جائے گا۔ یہ بہت بیمار ہے‘ جا کر اپنا علاج کرائے گا۔“

”ہاں جی‘ میرا یہی ارادہ ہے۔“ ارشاد الہی نے لالی کی تائید کی۔

”ٹھیک ہے۔ میرے ساتھ آ۔ میں تجھے بھنے کے باہر پہنچا دوں۔“ سانول نے کوئی رخ نہ ڈالا۔ ارشاد الہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی نے گلے لگا کر رخصت کیا تو ارشاد الہی بے قرار ہو کر سسکیاں بھرنے لگا۔ لالی نے ہولے ہولے پیٹھ تھپک کر تسلی دی۔ ارشاد الہی آگے بڑھا اور جعدار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

لالی خاموش کھڑا دونوں کو دیکھتا رہا۔ ارشاد الہی نے چلتے چلتے کئی بار مڑ کر لالی کی جانب دیکھا۔ آخر وہ اور جعدار اندھیرے میں او جھل ہو گئے۔

لالی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔ تھکا ہارا تھا اور مسلسل جاگتا بھی رہا تھا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر بے خبر ہو کر سو گیا۔



لالی سویرے ہی سویرے کام کرنے پہنچ گیا۔ اس نے مٹی کھود کو گار ایتایا اور سانچوں میں بھر کر کچی اینٹیں تیار کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ ہنرمندی سے چل رہے تھے۔ ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پیرو بھی تیزی سے چل رہے تھے۔ جھپاک سے کبھی ادھر جاتا کبھی ادھر۔

سورج چڑھ کر آسمان کے پتھوں پہنچ گیا۔ دھوپ میں تیزی آگئی۔ لالی دھوپ کی بڑھتی ہوئی تمازت سے بے نیاز کام میں جٹا رہا۔ تھلے پر پھیلی ہوئی اینٹوں کی قطاروں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے قیص اتار کر ایک طرف رکھ دی تھی۔ اس کا جسم پسینے سے بیگھا ہوا تھا۔ مگر ہاتھ اور پیرو تیزی سے چل رہے تھے۔

جعدار اکبر سانول ہتھیروں کے کام کا معائنہ کرتا ہوا لالی کے پاس بھی آیا۔ وہ ایک طرف خاموشی سے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چمڑے کا چھتر دیا تھا۔ سیاہ چہرہ دھوپ سے اور سیاہ پڑ گیا تھا اور کچھ زیادہ ہی کمرہ اور خوف ناک نظر آ رہا تھا۔

لالی کی اس پر نظر پڑی تو فوراً سلام کیا اور گردن جھکا کر مودب کھڑا ہو گیا۔ وہ جعدار کی خوش نودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جعدار اس کے رویے سے لہو خوش بھی ہو گیا۔ چہرے پر چھائی ہوئی خشونت کچھ کم ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا لالی کے قریب آیا۔ اس کی پسینے سے بیگھی ہوئی پیٹھ ہولے ہولے تھپک کر گویا ہوا۔

”اوائے لالی، تو نے تو شام ہونے سے پہلے ہی تھلا اینٹوں سے بھر دیا۔ تو تو بہت کام کا بندہ ہے۔“

”کام تو جی کرنا ہی کرتا ہے۔“ لالی نے انکساری کا مظاہرہ کیا۔

”تجھے یہاں کوئی تکلیف ٹھیک تو نہیں؟“

”نہیں جی، بہت آرام سے ہوں۔“ لالی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”منشی کو بول دے ابھی پیٹھی کم کاٹے۔ میرے پاس جو روپے تھے سب شادا کو دے دیے۔ اس کے پاس تو گھر جانے کو کراہ بھی نہیں تھا۔“ لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”ایسا ہو جائے تو تیری بہت مہربانی ہوگی۔“

”تو بالکل فکر نہ کر۔ میں منشی کو بول دوں گا تیری پیٹھی زیادہ نہ کاٹے۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹیں بھگنتی میں کم نکالے۔“ جعدار نے رضامندی کا اظہار کیا۔ وہ لالی کے کام سے بہت زیادہ مطمئن نظر آتا تھا۔ کہنے لگا۔ ”ویسے تجھے پیٹھی چاہیے ہو تو وہ بھی دلوا دوں گا۔“

”نہیں جی، ابھی ضرورت نہیں۔“ لالی آمادہ نہ ہوا۔ ”ابھی تو مجھے شادا کی پیٹھی ادا کرنے کی فکر ہے۔ ضرورت پڑی تو بعد میں مانگ لوں گا۔“

”جیسی تیری مرضی۔“ جعدار اکبر سانول نے خوش نودی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بار پھر لالی کی پیٹھ تھپ تھپائی۔ ”اب تو اپنا کام کر۔ میں کام کرنے والے بندے کی ہمیشہ مدد کرتا ہوں۔ کام چور اور نکتے کے لیے اسے کام میں لاتا ہوں۔“ اس نے ہاتھ میں دبا ہوا چھتر آہستہ آہستہ لہرایا۔ ”کیسا ہی ٹیڑھا بندہ ہو اس سے ایک دم سیدھا ہو جاتا ہے۔“

جعدار مسکراتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

لالی اپنے کام میں جٹ گیا۔ دبا دبا اینٹیں تیار کرنے لگا۔ جعدار کے نرم رویے سے اس کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ وہ بہت مطمئن تھا کہ پہلے ہی روز اپنے کام سے اس کی خوش نودی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ جعدار کو کسی طور ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بخوبی اندازہ تھا کہ جھٹے پر سب سے زیادہ اہم شخصیت جعدار کی ہوتی ہے۔ اس کا عتاب زندگی کو جنم دیتا ہے۔

لالی غروب آفتاب کے بعد تک محنت اور پوری لگن سے کام کرتا رہا۔ شام کو اس نے روٹی پکا کر کھائی اور تھکن سے مدھال ہو کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

لالی مستعدی اور جانفشانی سے صبح سے شام تک کام کرتا رہتا۔ وہ نہ کسی ہتھیرے سے غیر ضروری بات چیت کرتا اور نہ ہی اس نے کسی سے میل جول بڑھانے کی کوشش کی۔ اپنے کام سے غرض رکھتا۔ جعدار اکثر کام کے دوران اس کے پاس آتا اور اس کے کام سے مطمئن ہو کر چلا جاتا۔ لالی نے کبھی اسے شکایت کا موقع نہ دیا۔

سنیچر کا دن آگیا۔ شام کو چٹھایا۔ ہفتے بھر کے کام کا ہتھیروں اور دوسروں کے مزدوروں کو معاوضہ دیا گیا۔ جعدار نے لالی سے جو وعدہ کیا تھا اس کا نتیجہ بھی اس روز برآمد ہوا۔ منشی نے دوسرے ہتھیروں کے مقابلے میں اس کے ساتھ زیادہ نرم رویہ اختیار کیا۔ پیٹھی بھی زیادہ نہیں کاٹی۔ ٹیڑھی میڑھی اینٹیں بھی کم مسترد کیں۔ لالی نے دو ہتھیروں کے برابر کام کیا تھا۔ اسے کچھ کم دس روپے معاوضہ ملا۔



رانا محمود کے جھٹے پر کام کرنے والوں میں دوسرے بھٹوں کے برعکس نو عمر لڑکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان میں کوئی بھی تیرہ چودہ برس سے زیادہ عمر کا نہ تھا۔ لیکن یہ ہتھیرے کم تھے بیشتر بھٹ مزدور تھے۔ وہ ٹوٹی پھوٹی پختہ اینٹیں ہتھوڑیوں سے توڑ کر روڑی بناتے۔ کچی اینٹیں ریزہ ریزہ اور ٹھیلوں میں بھر کر چینی کے پاس پہنچاتے۔ جھٹے سے پک کر نکلنے والی مختلف قسم کی اینٹوں کے علیحدہ علیحدہ چٹے بناتے۔

”نیرے! تجھے کھانے کو روٹی نہیں ملتی؟“

”روٹی کھانے سے پیٹ میں بہت درد ہوتا ہے۔“ اس کے لہجے میں رقت پیدا ہو گئی۔ ”نئی آتی ہے۔ نئی کے ساتھ خون بھی آتا ہے۔“

لالی نے اس بار اسے غور سے دیکھا۔ اس کا جسم لاغر تھا۔ چہرے بے رونق اور مرصھا ہوا تھا۔ وہ غارش زدہ کتے کی طرح بیمار اور مرگلا نظر آ رہا تھا۔ لالی اس کی حالت زار دیکھ کر بچ گیا۔ اظہار ہمدردی کرتے ہوئے گویا ہوا۔

”لگتا ہے تجھے تو بچش ہے۔ کوئی دوائی شوائی نہیں لیتا؟“

”نہیں جی، دوائی شوائی کہاں ملتی ہے۔“ نیرا نے شکوہ کیا۔ ”بھٹے سے باہر تو جانے نہیں دیا جاتا۔“ وہ ندید یوں کی طرح لچائی ہوئی نظروں سے پلیٹ میں رکھے ہوئے چاولوں کو سکتے لگا۔ ”تو مجھے تھوڑے سے چاول نہیں دے سکتا؟“

”ضرور دوں گا تجھے چاول۔“ لالی نے جھک کر نیچے رکھا ہوا مٹی کا پیالہ اٹھایا۔ پلیٹ سے آدھے سے بھی زیادہ چاول نکال کر پیالے میں رکھے اور ان پر دال بھی ڈال دی۔ پیالہ اس کی جانب بڑھا کر چکارتے ہوئے گویا ہوا۔ ”لے پتر، کھالے۔“

نیرا نے چاولوں سے بھرا ہوا پیالہ لیا اور وہیں فرش پر بیٹھ کر ہیز ہیز کھانے لگا۔ اس نے چند ہی لمحے چاولوں کے کھائے تھے کہ اچانک ایک کارندہ آفت ناگمانی کی طرح نازل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں چمچ رہا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے نیرا کو دیکھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ ”اے اے حرام دے۔ تو ادھر بیٹھا عیش کر رہا ہے۔ میں تجھے نہ جانے کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا۔“ اس نے جھپٹ کر نیرا کا بازو پکڑا اور اس زور سے جھٹکا دیا کہ نیرا ڈگڈگا کر ایک طرف لڑھک گیا۔ پیالہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر چٹاخ سے گرا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چاول دور تک فرش پر بکھر گئے۔

نیرا نے بدحواس ہو کر بکھرے ہوئے چاولوں کو دیکھا اور فرش سے اٹھا کر جلدی جلدی کھانے لگا۔ کارندے نے غضب ناک ہو کر اس کی پیٹھ پر زور سے چمچ مارا۔ دوسرا، تیسرا، وہ زنانے سے چمچ مارا رہا۔ مگر نیرا فرش پر اوندھا پڑا پٹا رہا اور چاول اٹھا اٹھا کر بے صبری سے کھاتا رہا۔

لالی اس کی بے بسی دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ اس نے کارندے کو ٹوکا۔ ”یار! اسے کھا تو لینے دے۔ بہت بھوکا لگتا ہے۔“ اس نے اپنی پلیٹ اٹھا کر نیرا کی طرف بڑھائی۔ ”نیرے! لے یہ کھالے۔ وہ چاول تو مٹی میں مل کر خراب ہو گئے۔“

کارندے نے بھنا کر لالی کو دیکھا۔ ”اے تو چپ کر۔“ وہ تیزی سے لالی پر جھپٹا۔ سزاک سے

ان لڑکوں کی رہائش کا بندوبست سب سے الگ تھلگ ایک ہی جگہ کیا گیا تھا۔ یہ مویشیوں کے باڑے کے مانند طویل سائبان تھا جس کی دیواریں کچی تھیں اور پھوس کی بھت تھی۔ ان کو کام کرنے کی کوئی مزدوری نہیں ملتی تھی۔ کھانے کے لیے ہر ایک کو ہفتہ بھر کا راشن ملتا تھا۔ راشن میں آٹے کے علاوہ نمک ملتا تھا اور مرچیں۔ مینے میں صرف ایک بار پاؤ بھر دال ملتی تھی۔ عام طور پر یہ چنے کی دال ہوتی تھی۔

جمعہ دار اکبر سانول ان کی بھرتی کے لیے گاؤں گاؤں، بستی بستی گھومتا رہتا تھا۔ غربت اور افلاس کے مارے عیال دار والدین کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتا اور فی لڑکا دو ڈھائی ہزار معاوضہ دے کر خرید لیتا۔ فوری ضرورت کے لیے بردہ فروشوں کے ذریعے بھی خریداری کرتا تھا۔ مگر بردہ فروش عام طور پر زیادہ قیمت لیتے تھے۔ ہر لڑکے کی خریداری پر جمعہ دار کو معقول کمیشن ملتا تھا۔ ایک بار بھنے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد انھیں کبھی واپس جانا نصیب نہ ہوتا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد انھیں چمچہ کے نیچے مویشیوں کی طرح ہانک کر پنچا دیا جاتا۔ ہاتھوں کو زنجیروں سے جکڑ کر باندھ دیا جاتا اور پیروں میں بیڑیاں ڈال کر تالے لگا دیے جاتے جن کی کنجیاں جمعہ دار کی تحویل میں رہتی تھیں۔ وہ لمبی لمبی قطاروں کی صورت میں چٹائیوں پر سوتے تھے۔ یہ چٹائیاں گندی اور بوسیدہ ہوتی تھیں اور ان میں کھٹملوں کی اس قدر بہتات ہوتی کہ انھیں چین سے نیند بھی نہ آتی۔ ان کی کڑی نگرانی کی جاتی۔ رات کو یہ نگرانی اور سخت کردی جاتی۔ دو مسلح سپردار رات بھر نہایت مستعدی سے ان کی چوکیداری پر تعینات رہتے۔

لالی نے انھیں بھٹے پر کام کرتے اور ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ مگر کسی سے بات چیت کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ایک شام کو ایسا ہوا کہ اس نے کھانے کے لیے روٹی کے بجائے چاول پکائے۔ وہ پلیٹ میں چاول نکال کر کھانا شروع ہی کرنے والا تھا کہ ایک نو عمر لڑکا اندھیرے سے نکل کر جھونپڑی میں داخل ہوا اور اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ اس کی عمر بارہ برس کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت سہا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بار بار پلیٹ کو چوکنٹا نظروں سے پیچھے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

لالی نے چونک کر اسے دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”اے، کون ہے تو؟“

”میں نیرا ہوں جی۔ بھٹے پر کام کرتا ہوں۔“

”یہاں کیسے آیا؟“ لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔

”مجھے تھوڑے سے چاول کھانے کو دے دے۔“ نیرا نے ہاتھ سے اپنے پیچھے ہوتے پیٹ کو ہولے ہولے تھپ تھپایا۔ گڑگڑا کر بولا۔ ”بہت بھوک لگی ہے۔ کل رات سے کچھ نہیں کھایا۔“

ایک چھتر لالی کے کندھے پر مارا۔ لالی تکلیف سے بلبلاتا تھا۔ پلیٹ اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے پٹی۔

کارندہ آنکھیں نکال کر لالی کو ڈانٹنے پھینکارنے لگا۔ ”تو نے اسے یہاں کیوں بلایا؟ تو اس کا ماں لگتا ہے؟“ اس نے ایک اور چھتر مارا۔ اس دفعہ ہاتھ کھر پڑا۔

لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر طرح دے گیا۔ وہ کسی سے جھگڑا فساد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ خاموشی سے وقت گزارتا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ ارشاد الہی جلد ہی آئے گا۔ پیٹنگی کی تمام رقم بے باق کرے گا اور اسے جعدار کی قید سے چھڑا کر اپنے ہم راہ لے جائے گا۔ لہذا اس نے برہمی کا اظہار کرنے کے بجائے اپنی کمر سلاتے ہوئے نرمی سے صفائی پیش کی۔

”میں نے اسے نہیں بلایا۔ یہ تو خود ہی ادھر آیا تھا۔ میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔“ کارندے نے ڈپٹ کر لالی کو تنبیہ کی۔ ”آگے اسے یہاں نہ دیکھوں۔ ورنہ تیری چوڑی ادھیڑ ڈالوں گا۔“ لالی کو ڈانٹنے پھینکارنے کے بعد وہ نیرا کی جانب متوجہ ہوا جو زمین پر پڑا ابھی تک چادل اٹھا اٹھا کر کھا رہا تھا۔ کارندہ اس کے قریب گیا اور مردار بھیڑ کی طرح گھسٹتا ہوا باہر لے گیا۔ لالی اس قدر دل گرفتہ ہوا کہ کھانا بھی نہ کھایا۔ بھوکا نہ سو گیا۔



لالی دوسری ہتھیروں اور عٹے مزدوروں سے الگ تھلگ رہتا۔ پہلے ہی دن سے اس نے جو دتیرہ اختیار کیا تھا اس پر سختی سے قائم رہا۔ محنت اور لگن سے کام کرتا۔ جعدار کو ہر طرح مطمئن رکھنے کی کوشش کرتا۔

اس روز لالی سرشام ہی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات کا پہلا پہر تھا۔ جھونپڑی میں خاموشی چھائی تھی۔ لیکن آس پاس کی جھونپڑیوں اور جھگیوں سے ابھی تک ہنسنے بولنے، بوڑھوں کے کھانسنے کھنکارنے اور بچوں کے رونے کی آوازیں رک رک کر ابھر رہی تھیں۔

لالی خاموش لیٹا ہر آواز اور ہر آہٹ سن رہا تھا۔ اسی اثناء میں جھونپڑی کے باہر کوئی آہستہ سے کھنکارا۔ اس نے گردن بڑھا کر اندر بھانکا۔ دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”لالی، جاگ رہا ہے؟“

لالی نے آواز پہچان لی۔ وہ تاج محمد تھا۔ وہ بھی ہتھیرا تھا۔ دو چار جھونپڑیاں چھوڑ کر اس کی جھونپڑی تھی۔ وہ ادھیڑ تھا اور بیمار بھی رہتا تھا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر کھانست رہتا۔ لالی نے رات کے

سنائے میں اکثر اس کی کھانسی سنی تھی۔ وہ ایک بار پہلے بھی لالی کے پاس آیا تھا۔ آٹا مانگنے آیا تھا۔ صبح سے اس نے اور اس کے بیوی بچوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لالی نے آٹے کے علاوہ اسے ایک روپیہ ادھار بھی دیا تھا۔ مگر زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دم بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔

لالی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ”تاجے باہر کیوں کھڑا ہے؟ اندر آجا۔“

تاج محمد اندر آگیا۔ لالی سٹ کر ایک طرف ہو گیا۔ تاج محمد سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”ادھر آرام سے بیٹھ جا۔“ تاج محمد اس کے قریب چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”سنہا ہے رانا محمود کی ماں کا آج دن ڈھلے مرن ہو گیا۔“ لالی نے کہا۔ ”رانہ نے زبردست سیپا کیا ہے۔ سوگ میں تین روز تک بھٹے پر کام بند رہے گا۔“

”ہاں جی ایسا ہی ہو گا۔“ تاج محمد نے بچھے ہوئے لہجے میں اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”پچھلے دنوں بارش کی وجہ سے کام بند رہا۔ اب یہ تین دن کی چھٹی آگئی۔ پہلے ہی کم تنگی نہیں تھی پیٹنگی لے کر کسی نہ کسی طرح پیٹ بھرتا پڑ رہا تھا۔ تب ہی تو پیٹنگی کبھی ادا نہیں ہو پاتی۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”یہ پیٹنگی ایسی گلے پڑی ہے کسی طرح پنڈی نہیں چھوڑتی۔“

”پیٹنگی کا چکر بھی عجب چکر ہے۔ ایک بار جو اس چکر میں پھنس گیا فیر نہیں نکلا۔“

”تیری پیٹنگی تو بہت زیادہ ہے۔“ تاج محمد نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اس کا لہجہ رازدارانہ ہو گیا۔ ”پر تیرے ساتھ تو بہت دھوکا ہوا۔“

”دھوکا کیسے ہوا؟“ لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔

”تو شادا کی پیٹنگی ادا کر رہا ہے ناں؟“

”ہاں جی، اسی کی پیٹنگی ادا کر رہا ہوں۔“ لالی ہنوز حیرت زدہ تھا۔ ”پر اس میں دھوکے شوکے کی کون سی گل بات ہے۔“

”شادا کی پیٹنگی تو پہلے ہی معاف ہونے جا رہی تھی۔“

”شادا کی پیٹنگی معاف ہونے جا رہی تھی۔ وہ کیسے؟“ لالی کی حیرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ ”ایسا تو کبھی ہوتا نہیں۔“

”اس کی چھٹی کی جا رہی تھی۔“ تاج محمد نے بتایا۔ ”جب کسی کی چھٹی کر دی جاتی ہے اور بھٹے سے اس کا کوئی ناتا نہیں رہتا تو فیر پیٹنگی کو تو معاف ہونا ہی ہوتا ہے۔“

”پر سوال یہ ہے کہ شادا کی چھٹی کیوں کی جا رہی تھی؟“

”تو شادا کا یار ہے پر لگتا ہے تجھے اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ تاج محمد کھک کر لالی کے

قریب ہو گیا۔ مدھم لہجے میں بولا۔ ”وہ سخت بیمار ہے۔ اسے ہر دم بکھار رہتا ہے۔ کھانسی بھی ہے اور کھانسی کے ساتھ منہ سے خون بھی آتا ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔“

”تجھے کیسے پتہ چلا شادا کو ٹی بی ہے؟“ لالی نے گہرا کردریافت کیا۔

”ڈاکٹر نے جعدار کو میرے سامنے بتایا تھا۔“ تاج محمد نے کھل کر بات کی۔ ”وہ شادا کو لے کر سرکاری اسپتال گیا تھا۔ میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ان دنوں مجھے بھی بکھار رہتا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے تو طیریا بتایا اور دوائی دے دی۔ شادا کے لیے کہا اسے ٹی بی ہے۔“ اس کا لہجہ افسردہ ہو گیا۔ ”ڈاکٹر نے تو یہ بھی کہا تھا اس کے پھیپھڑے بالکل بیکار ہو گئے۔ اب یہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں مر جائے گا۔ جیسی تو اس کی چھٹی کی جارہی تھی۔ کفن دفن جو کرنا پڑتا۔“

”مجھے یہ پتہ نہیں تھا وہ اتنا زیادہ بیمار ہے۔“ لالی فکر مند ہو گیا۔

”شادا تو بالکل جوان ہے۔“ تاج محمد نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔ ”اسے ابھی نہیں مرنا

چاہیے۔“

”تاجے، فکر نہ کر شادا اتنی جلدی مرنے کا نہیں۔“ لالی نے تاج محمد کے ساتھ ساتھ خود کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”یہاں سے جانے کے بعد وہ اپنا علاج کرائے گا اور بالکل چنگا ہو جائے گا۔“ اس نے بات کا رخ بدل دیا۔ ”یہ بتا تو آیا کیسے؟“ مسکرا کر پوچھا۔ ”ادھار لینے آیا ہے؟“

”نہیں، میں ایک اور ہی کام سے آیا ہوں۔“

”کیا کام ہے؟“

”تو میری ایک مدد کر سکتا ہے؟“

”کیسی مدد چاہتا ہے؟“ لالی نے قدرے حکیکے لہجے میں کہا۔ ”صاف صاف بتا۔“

”تو تاجو سے ویاہ کر لے۔“ تاج محمد نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔

”تاجو کون؟“ لالی نے پوچھا۔ ”تیری دمی؟“

”ہاں۔“ تاج محمد بدستور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ”اب وہ پوری طرح جوان ہو گئی ہے۔ جعدار

اسے بری طرح گھورتا رہتا ہے۔ اس کی نیت ٹھیک نہیں۔ مجھے ہر دم فکر رہتی ہے وہ اپنے کرمندوں

سے اسے اٹھوانے لے۔“ وہ رک رک کر بولتا رہا۔ ”جب تک چاہے گا زبردستی اپنی پاس رکھے گا۔

جی کرے گا تو واپس کر دے گا ورنہ ملتان لے جا کر کنجریوں کے ہاتھ بیچ دے گا۔ وہ کئی جوان کڑیوں کو

اٹھوا کر ایسا ہی کر چکا ہے۔“ اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ ”میں غریب، پتھرا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر

سکتا۔ رولا یا جھگڑا کروں گا تو اٹالکا کر چھتر سے مار لگائے گا۔ تجھے پتہ نہیں، وہ کتنا ظالم اور کدہ

ہے۔“

لالی پریشانی میں مبتلا ہو گیا۔ مگر اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ خاموش بیٹھا رہا۔

مگر تاج محمد خاموش نہ رہا۔ عاجزی سے بولا۔ ”تو مجھے بدنامی سے بچا سکتا ہے۔ تاجو کو برباد ہونے

سے بچا سکتا ہے۔“ اس نے لالی کو رضامند کرنے کے لیے اونچ نیچ سے بھی آگاہ کیا۔ ”تو اکیلا بندہ

ہے۔ تجھے بہت دڈی پیشگی ادا کرنی ہے۔ تجھے پتہ ہے تاجو کتنی اہری اور محنتی ہے۔ دونوں مل کر کام

کریں گے تو تیری پیشگی جلد ادا ہو جائے گی۔ تجھے اپنی روٹی بھی نہیں پکانی پڑے گی۔ بیمار پڑ جائے گا

تو تیری دیکھ بھال کرے گی۔ وہ تیرا ہر کام کرے گی۔ جیسا کہے گا ویسا ہی کرے گی۔ ویاہ کر کے تو اس

کے ساتھ آرام سے رہے گا۔“

”چاچا، اس معاملے میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔“ لالی نے صاف انکار کر دیا اور انکار کی وجہ

بھی بتا دی۔ ”بات یہ ہے نہ میرا ابھی ویاہ کرنے کا ارادہ ہے اور نہ یہاں رہنے کا۔“ اس نے گردن

اونچی کر کے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”میں پتھرا ہوں کیریاں کید رہتا نہیں چاہتا۔ یہاں کام کرنے والا

ہر بندہ کیدی ہے۔ یہ تو جیل ہے۔ سرکاری جیل سے بھی بری۔ مجھے اس جیل میں نہیں رہنا۔

تھوڑے ہی دنوں میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”پر تو پیشگی ادا کیے بنا یہاں سے کیسے جا سکتا ہے؟“ تاج محمد نے حیرت زدہ ہو کر اپنے فوری رد

عمل کا اظہار کیا۔ ”یہاں سے بھاگنے کی ہرگز ہرگز کوشش نہ کرنا۔“ اس نے لالی کو خبردار کیا۔

”کرمندے اور راکھے بہت چوکنا رہتے ہیں۔ تو ان کی نظروں سے بچ کر باہر نہیں جا سکتا۔ پکڑا گیا تو

جعدار بہت ظلم کرے گا۔ تو سوچ بھی نہیں سکتا، وہ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔“

”مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے وہ کتنا ظالم اور برا بندہ ہے۔“ لالی نے تاج محمد سے اختلاف نہ کیا۔

”میں یہاں سے فرار ہونے کی بالکل کوشش نہیں کروں گا۔“ اس نے مطلع کیا۔ ”شادا جلد ہی

واپس آئے گا۔ پیشگی کے سارے روپے رانا محمود کے سامنے ڈالے گا اور مجھے اپنے ساتھ لے

جائے گا۔“

”شادا واپس آئے گا؟ تو کیسی گل بات کر رہا ہے؟“ تاج محمد نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

”بھنوں پر کام کرتے کرتے اب تو میرے بال بھی چپٹے ہو گئے۔“ اس نے اپنے سر کے کچھڑی بالوں

پر ہاتھ پھیرا۔ ”میں نے تو دیکھا نہیں، کسی کی بیماری کے بعد چھٹی کردی گئی ہو اور وہ بھٹے پرواپس

آیا ہو۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ جو یہاں سے جاتا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔“

”شادا کے معاملے میں ایسا نہیں ہو گا۔“ لالی نے کھل کر بات نہ کی۔ صرف اتنا کہا۔ ”اس نے

مجھ سے پکا وعدہ کیا ہے۔ وہ آئے گا اور ضرور آئے گا۔“
”مجھے تو ایسا لگتا نہیں کہ شادا واپس آئے گا۔“ تاج محمد مطمئن نہیں ہوا۔

لالی نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ خاموش بیٹھا رہا۔

تاج محمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عدہ حال اور بجا بجا نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ چلتا ہوا باہر چلا گیا۔
وہ لالی کو الجھن میں مبتلا کر گیا۔ مگر وہ ناامید نہ ہوا۔ چارپائی پر لیٹ کر دیر تک ارشاد الہی کے بارے میں سوچتا رہا۔



لالی حسب معمول مستعدی سے کام کرتا رہا۔ صبح سے شام تک سانچوں میں نگار ابھر کر اینٹیں تیار کرتا اور ہر روز بے چینی سے ارشاد الہی کی واپسی کا انتظار کرتا۔

موسم بدل رہا تھا۔ درختوں میں پت جھڑ لگ گیا تھا۔ تیز ہوائیں چلتیں۔ خزاں رسیدہ پتے شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر بکھر جاتے۔ آسمان پر غبار چھایا رہتا۔ دن میں گرمی رہتی۔ مگر رات کو ہلکی ہلکی خنکی ہو جاتی۔ بھٹے پر زور شور سے کام ہو رہا تھا۔ چنی سے گاڑھا گاڑھا سیاہ دھواں نکلتا اور فضا میں پھیل جاتا۔

لالی اپنے تھلے پر بیٹھا اینٹیں بنا رہا تھا۔ دن ڈھل رہا تھا۔ سورج ڈھلک کر مغربی افق پر پہنچ گیا تھا۔ بتیمیرے اب تھکے تھکے نظر آرہے تھے۔ لالی بھی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ صبح سے اس کی طبیعت بھی کچھ مضطرب تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ مگر وہ کام کرتا رہا۔ اسی اثناء میں لیما اس کے پاس آگیا۔

لالی نے ہاتھ چلاتے چلاتے اس کی جانب دیکھا۔ لیما کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی بھیجی بھیجی تھیں۔ لالی نے اسے افسردہ دیکھا تو ہاتھ روک کر پوچھا۔ ”لئے تو کچھ پریشان پریشان لگ رہا ہے۔ بات کیا ہے؟“

”تو نے میرا کو دیکھا ہے ناں۔“ لیما نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”وہی چھو ہرا جو ہر دم روتا رہتا تھا۔ ماں پیو کو بہت یاد کرتا تھا۔“

”میں اسے جانتا ہوں۔“ لالی نے لیما کو غور سے دیکھا۔ ”بیمار بھی رہتا ہے۔ پر تو اس کے بارے میں کیا کہنا چاہتا ہے؟“

”نیرا مر گیا۔“

”کب مرادہ؟“ لالی بے قرار ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”تھوڑی دیر پہلے۔ میں ادھر ہی سے آ رہا ہوں۔“

”پر وہ اتنا بیمار تو نہیں لگتا تھا۔“

”تین نوں پتہ نہیں وہ بہت بیمار تھا۔“ لیما نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”اتنا بیمار تھا کہ اس کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ آج شام اپنے پنڈ جانے والا تھا۔ چلا جاتا تو ماں پیو سے مل لیتا۔ ان کے پاس جانے کو بہت کہتا تھا۔ پر جاتا کیسے۔ اسے تو جعدار خرید کر لایا تھا۔ وہ تو۔۔۔“

لیما نے بات پوری بھی نہ کی تھی کہ سامنے سے جعدار آتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر لیما گھبرا گیا۔ وہ مڑا اور اپنے تھلے کی جانب چلا گیا۔ لالی اداس اور دل گرفتہ تھا۔ وہ کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔ جعدار قریب آگیا اور ہاتھ میں دبا ہوا چھتر ہولے ہولے بلاتا ہوا خاموشی سے گزر گیا۔

جعدار دور چلا گیا تو لالی پھر اپنا کام کرنے لگا۔ گارا ختم ہو گیا تھا۔ اس نے زمین کھود کر مٹی نکالی۔ اس میں پانی ملایا۔ آئے کی طرح گوندہ کر گارا تیار کیا اور سانچوں میں بھر بھر کر اینٹیں تیار کرنے لگا۔ مگر اب وہ بے دلی سے کام کر رہا تھا۔ چابک دستی اور پھرتی ماند پڑ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔

دن ڈھلا۔ سورج کھسکتا ہوا دھیرے دھیرے مغربی افق پر اپنی الوداعی شعاعیں بکھرتا ہوا اوجھل ہو گیا۔ شام ہو گئی۔ غبار آلود آسمان دھندلا ہوا کر تار یک ہو گیا۔ ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

خزاں کی ایسی کتنی ہی اداس شامیں آئیں اور بے پاؤں گزر گئیں۔ لالی کی بے کیف زندگی میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ صبح سے شام تک بھٹے پر کام کرتا رہا۔

میں تیری روٹی پکائے دیتی ہوں۔“

وہ گردن جھکا کر زور زور سے سلتی ہوئی لکڑیوں کو منہ سے پھونکنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آج تیز ہو گئی۔ لکڑیوں سے شعلے اٹھنے لگے۔ ناچو نے گردن کو خم دے کر لائی کی جانب دیکھا۔ ”اگ ایسے جلتی ہے۔“ اس نے آٹے سے پیڑا بنایا۔ جھپاک جھپاک اسے ہاتھوں پر پھیلا دیا اور روٹی توڑے پر ڈال دی۔

لالی ایک طرف کھٹک گیا اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔

ناچو چولے کے سامنے بیٹھی روٹی پکاتی رہی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ اگ کی تپش سے چہرہ تھمرا رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ بکھر کر بار بار رخسار پر آجاتی اور وہ ایک ہاتھ سے بار بار ہٹا دیتی۔ اس کا رنگ سائو لٹا تھا۔ مگر جسم سڈول اور کسا ہوا تھا۔ کولے چوڑے اور بھرے بھرے تھے۔ چہرہ خون کی گرمی سے دمک رہا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کی کمکشاں جھجکا رہی تھی۔

ناچو روٹی پکاتی رہی۔ لالی چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ اس کے ہاتھ سخت اور کھدرے تھے اور بدن سے پسینے کی بو اٹھ رہی تھی۔ لالی کو معاشاواں یاد آگئی۔ روٹی پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی اسی طرح جھپا جھپ چلتے تھے۔ وہ بھی چہرے پر آئی بالوں کی لٹ روٹی پکاتے پکاتے ایک ہاتھ سے ہٹاتی رہتی تھی۔ شاداں کی یاد کے ساتھ کتنے ہی سائے خواب آنکھوں میں اتر آئے۔ وہ یادوں کی پکڑ پکڑیوں پر بھٹکتا ہوا بہت دور نکل گیا۔

”لے روٹی پک گئی۔“ ناچو کی آواز ابھری۔

لالی نے چونک کر دیکھا۔ وہ چولے کے سامنے بیٹھی ہاتھوں میں لگا ہوا آٹا صاف کر رہی تھی۔ اس نے لالی کی جانب پلٹ کر دیکھا بھی نہیں۔ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مگر جب وہ باہر جانے کے لیے مڑی تو لالی نے ٹوکا۔ ”تو جا رہی ہے ناچو؟“

”جاؤں گی نہیں تو کیا بیس بیٹھی رہوں گی۔“ ناچو نے منہ بگاڑ کر بے رخی سے کہا۔

لالی کو اس کا تکیہ اور کڑوا لہجہ ناگوار نہ گزرا۔ شاداں بھی اسی لہجے اور اسی منہ سے بات کرتی تھی۔ ناچو آگے بڑھی تو لالی نے ایک بار پھر ٹوکا۔ ”کدھر چلی؟ بات تو سن۔“

وہ ٹھکی۔ گردن کو خم دے کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”کہہ کیا کہنا چاہتا ہے؟“ اس کا لہجہ بدستور ٹپکھا تھا۔

”جا کر اپنے پیو کو میرے پاس بھیج دے۔“

”کیوں؟ اسے میری شکایت لگانے ہے؟“ وہ تلخی سے بولی۔



خزاں کی ایک شام کا ذکر ہے۔ لالی کام ختم کر کے جھونپڑی میں پہنچا تو بڑھال اور بہت تھکا ہارا تھا۔ مگر اسے ابھی کھانا پکانا تھا۔ بھوکا سو جاتا تو دوسرے روز کام ٹھیک سے نہ ہوتا۔ کام کم ہوتا تو اجرت بھی کم ملتی۔ پیشگی کا بوجھ سر پر سوار تھا۔ اسے اتارنے کے لیے زیادہ سے زیادہ کام کرنا ضروری تھا۔

اس نے چولہا سلگایا۔ دال تو کسی نہ کسی طور پک گئی۔ مگر روٹی پکانا دو بھر ہو گیا۔ لکڑیاں گیلی تھیں۔ بار بار اگ ٹھنڈی پڑ جاتی۔ پھونک پھونک کر اسے تیز کرنا پڑتا۔ سانس پھول جاتی۔ دھواں اتنا اٹھتا کہ آنکھوں سے پانی بننے لگتا۔

وہ جھکا ہوا چولہا پھونک رہا تھا کہ پشت پر آواز ابھری۔ ”لکڑیاں گیلی ہیں۔ آرام سے اگ نہیں پکڑیں گی۔“

لالی پہلے ہی پریشان تھا۔ اس نے جھنجھلا کر گردن موڑی۔ دیکھا، ناچو سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ لالی کو اس کی شوخی سخت ناگوار گزری۔ جل کر بولا۔ ”لکڑیاں گیلی ہیں یا سوکھی، تجھے ان سے کیا لینا؟ چل اپنا رستہ پکڑ۔“

”وے نراض کیوں ہوتا ہے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”لکڑیاں تنگ کر رہی ہیں تو مجھے کیوں آنکھیں دکھا رہا ہے؟“

”روٹی مجھے پکانی ہے تجھے تو نہیں پکانی۔“ لالی نے بے زاری کا اظہار کیا۔

”پرے ہٹ۔“ وہ دھوتی سنبھال کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”تجھ سے آج روٹی نہیں پکنے کی۔“

”زیادہ تیزی نہ دکھا۔“ لالی نے مسکرا کر اسے ڈانٹا۔ ”جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔“

ناجو چلی گئی۔ لالی نے کھانا نکالا اور چارپائی پر بیٹھ کر کھانے لگا۔ وہ نظریں اٹھا کر بار بار جھونپڑی کے باہر دیکھنے لگا۔ اسے تاج محمد کا انتظار تھا۔

لالی کھانا کھا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ پہر رات گزر گئی۔ تاج محمد نہیں آیا۔ لالی انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

کئی دن گزر گئے۔ لیکن تاج محمد اس کے پاس نہ آیا۔

ہفتے کی شام کو چٹھایا۔ لالی نے اپنی اجرت لیتے ہوئے منشی سے پوچھا۔ ”میری پیشگی اب کتنی رہتی ہے؟“

”بہت رہتی ہے۔“ منشی نے رجسٹر کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھے۔ ”ابھی تو سو روپے بھی ادا نہیں ہوئے۔“

لالی بہت چکرایا۔ اس کا خیال تھا کہ اب تک پیشگی بکے کئی سو روپے ادا ہو چکے ہوں گے۔ مگر اس نے منشی سے تکرار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اسے ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس میں سراسر اس کا نقصان تھا۔ حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

ہفتے بھر کی مزدوری کے روپے دھوٹی کے ڈب میں رکھتے ہوئے لالی نے سوچا۔ صرف اس کی تنہا محنت سے تو پیشگی کا بوجھ کبھی سرے نہیں اتر سکے گا۔ یکایک اسے نا جو یاد آگئی۔ وہ شاداں کی طرح مخنتی اور جفاکش ہے۔ اس کے ہاتھ سدھے ہوئے ہیں اور تیزی سے چلتے ہیں۔ بغیر آرام کئے صبح سے شام تک کام کرتی ہے۔ تاج محمد ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے ساتھ شادی کر کے وہ بہت آرام سے رہے گا۔ دونوں مل کر جلد ہی پیشگی ادا کر دیں گے۔ اس کی سپاٹ اور بے کیف زندگی میں سرخوشی اور گما گماہی پیدا ہو جائے گی۔

شام کے جھٹ پٹے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا وہ اپنی جھونپڑی کی جانب جا رہا تھا۔ ابھی چولہا جلا کر اسے کھانا پکانا تھا۔ کپڑے بھی دھونا تھے۔ بہت میلے ہو گئے تھے۔ ایسے سارے کام ناہ کر سکتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ ہوتی تو ان کے متعلق سوچنا بھی نہ پڑتا۔ اسے تاج محمد سے مل کر اب نا جو کے رشتے کی بات طے کر لینا چاہیے۔ مگر وہ اس کے پاس آیا کیوں نہیں؟ ہو سکتا ہے نا؟ اس کا پیغام دینا بھول گئی ہو۔

لالی اپنی جھونپڑی سے دور ہی تھا کہ ایک موڑ پر تاج محمد مل گیا۔ چلتے ہوئے اس کی کمر اس طرح جھکی ہوئی تھی کہ وہ اپنی عمر سے کچھ زیادہ ہی بوڑھا نظر آ رہا تھا۔ لالی بدھ کرا سکے قریب گیا اور جا۔

شکوہ کیا۔

”چاچا میں نے تجھے بلایا تھا تو آیا نہیں۔“

”تو نے مجھے کیوں بلایا تھا؟“ تاج محمد نے دریافت کیا۔

”مجھے نا جو کے بارے میں تجھ سے بات کرنی تھی۔“ لالی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ”میں نا جو سے دیاہ کرنے پر تیار ہوں۔“

”پر تجھے تو ہتھیرا بن کر میاں ٹھیرنا نہیں۔“ تاج محمد کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”کہتا تھا یہ تو مرکاری جیل سے بھی بری جیل ہے۔ شادا آئے گا اور پیشگی ادا کر کے تجھے لے جائے گا۔“

”ان دنوں میں نیا نیا آیا تھا۔ ایسی ہی الٹی سیدھی باتیں سوچتا تھا۔ اب تو مجھے یہیں رہنا ہے۔ در ہتھیرا بن کر ہی رہنا ہے۔“ لالی نے صفائی پیش کی۔ ”چاچا، تو نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ جس کی یک بار بھٹے سے چھٹی کر دی جاتی ہے وہ واپس نہیں آتا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلا جاتا ہے۔“ اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے پھیل گئے۔ ”نیرا کی طرح شادا بھی اپنے رب کے پاس چلا گیا۔“

”تیرا مطلب ہے شادا مر گیا۔“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ لالی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”زندہ ہوتا تو ضرور واپس آتا اور پیشگی ادا کر کے مجھے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اس نے مجھ سے پکا وعدہ کیا تھا۔“

”مجھے یہ تو پتہ نہیں اس نے تجھ سے کیا وعدہ کیا تھا۔ پر میں یہ جانتا ہوں وہ زندہ ہے۔“ تاج محمد نے لالی کو مطلع کیا۔ ”آج کل اڈہ لاریاں جو ند سنگھ والا میں ہوتا ہے۔ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ دونوں اڈے پر بھیک مانگتے ہیں۔“

لالی نے چونک کر تاج محمد کو دیکھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ ”تجھے کس نے بتایا کہ شادا زندہ ہے؟“

”بعد ار بتاتا تھا۔ اس نے شادا اور اس کی ماں کو جو ند سنگھ والا میں بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تھا۔“ تاج محمد نے لالی کو بتایا۔ ”بعد ار پچھلے دنوں ہتھیروں کی بھرتی کرنے کے لیے ادھر بھی گیا تھا۔“

”چاچا، تو جی کہہ رہا ہے؟“ لالی نے اس طرح حیرت کا اظہار کیا جیسے اسے تاج محمد کی بات پر یقین نہ آیا ہو۔

”مجھے تجھ سے جھوٹ بول کر کیا لینا۔“ تاج محمد نے وضاحت کی۔ ”بعد ار نے مجھے جو بتایا میں نے تجھے بتا دیا۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”پر بعد ار کو یہ نہ بتانا میں نے تجھے شادا کے

بارے میں بتایا ہے۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچے۔ بیکار میں میرے گلے پڑ جائے۔ تجھے پتہ ہے اس کام کتنا برا ہے۔“

”چاچا، تو اطمینان رکھ میں جعدار سے شادا کے بارے میں کوئی گل بات نہیں کروں گا۔“ لالی نے اسے یقین دلایا اور ایک بار پھر حرف مطلب پر آگیا۔ ”یہ بتا۔ ناجو کے بارے میں اب کیا ہے؟ میں نے تو تیری بات مان لی۔“

تاج محمد نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکائے چپ چاپ لالی کے ساتھ چلتا رہا۔

لالی نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ”چاچا تو نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”سمجھ نہیں آتی کیا جواب دوں۔“

”کیوں؟“ اس نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔

”تجھے پتہ ہے۔ ناجو کی ماں تو بیمار ہی رہتی ہے۔ ہر دم منجی پر پڑی ہائے کرتی رہتی ہے۔ میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ مجھ سے اب کام نہیں ہوتا۔ نکابت چھوٹا ہے۔“ تاج محمد ٹھہر ٹھہر اپنی پریشانی بیان کرتا رہا۔ ”ناجو ویاہ کر چلی گئی تو ہم سب کا کیا بنے گا۔ بچ پوچھ تو اکیلے ناجو ہی کرتی ہے۔ وہ کام نہ کرے تو کھانے کو روٹی بھی نہ ملے۔“

اس کا جواب سن کر لالی بہت چکرایا۔ حیرت بھی ہوئی، غصہ بھی آیا۔ جل کر بولا۔ ”چاچا، نے تیرے آگے ہاتھ تو نہیں جوڑے تھے۔ تو نے خود ہی تو کہا تھا کہ ناجو کو اپنی گھر والی بنا لے۔ تو نے اس کے رشتے کی بات کی تھی تب تو نے یہ باتیں نہیں سوچی تھیں۔“

”تب تو جعدار کا ڈر تھا۔“ تاج محمد نے جواز پیش کیا۔

”اور اب جعدار نیک بندہ بن گیا ہے۔ تو سمجھتا ہے اب وہ ناجو کو کرندوں سے نہیں اٹھوا گا۔“ لالی ہنوز جھنجھٹایا ہوا تھا۔ تاج محمد کا رویہ اسے سخت ناگوار گزار تھا۔ ”کہتا تھا مجھے بدنامی بچا لے۔ ناجو کو برباد ہونے سے بچا لے۔“ وہ غصے سے بڑبڑانے لگا۔ ”کبھی کچھ کہتا ہے کبھی پتہ نہیں کیسا بندہ ہے؟ ایک دم خود غرض اور نکم۔“

”بکواس نہ کر۔“ تاج محمد بھی ایک دم بھڑک اٹھا۔ ”ناجو میری دھی ہے۔ میں جب چاہے وہاں کر دوں۔ جس سے چاہوں کروں۔ یہ میری مرضی ہے۔ تو مجھ سے پوچھنے والا کون؟“ اس صاف انکار کر دیا۔ ”مجھے ناجو کا ویاہ تیرے ساتھ نہیں کرنا۔“

لالی سکتے میں آگیا۔ کچھ کہتے نہ بن پڑا۔ تاج محمد نے بھی مزید بات چیت نہیں کی۔ مڑا اور جھکی کی جانب چلا گیا۔



لالی اب زیادہ مستعدی اور جانفشانی سے کام کرنے لگا تھا۔ وہ سویرے ہی سویرے اپنے تھلے پر آجاتا اور شام کو اس وقت تک اینٹیں بناتا رہتا جب تک اندھیرا گہرا نہ ہو جاتا۔ ہفتے کے روز چٹھا اودھ منشی رحمت کی ہر طرح خوشامد کرتا۔ کم سے کم پیشگی کٹوا تا اور زیادہ ہے زیادہ مزدوری وصول کرنے کی کوشش کرتا۔

سردی روز بروز بڑھتی چلی ہی تھی۔ دن میں دھوپ مزاحمتی اور رات کو آگ کے قریب بیٹھنے میں آتا۔ جن محنت مزدوروں اور ہتھیروں کے پاس سردی سے محفوظ رہنے کے لیے گرم بستر نہیں، وہ چینی کے ارد گرد لیٹ جاتے۔ حرارت اور گرمی حاصل کرتے اور صرف ایک سوٹی چادر بکھ کر کسی نہ کسی طرح رات بسر کرتے۔ لحاف اور رضائیاں بنانے کے لیے پیشگی حاصل کرنے کی شل کی جاتی۔ جعدار کی طرح طرح سے خوشامد ہوتی۔ منشی کو راضی کیا جاتا۔ وہ ہر ضرورت مند درخواست قبول بھی کر لیتا۔ اس لیے کہ برسات اور جاڑے میں پیشگی دینے کا عام دستور تھا۔ پیشگی تو دے دیتا مگر محنت مالک کی بدایت پر سختی سے عمل کرتا۔ ہیرا پھیری اور جعل سازی کرنے باز نہ آتا۔ جتنی پیشگی دیتا اس سے زیادہ رقم رجسٹر میں درج کرتا۔ ان پڑھ ہتھیروں اور محنتیوں کو مطلق علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کے نام کتنی پیشگی لکھی ہے۔ وہ آنکھ بند کر کے انگوٹھا بیٹے اور جتنی رقم ملتی خوشی خوشی لے لیتے۔

لالی بھی پیشگی لینا چاہتا تھا اور زیادہ سے زیادہ لینا چاہتا تھا۔ حالانکہ اس کے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ روپے موجود تھے۔ مگر تاج محمد سے گفتگو کرنے کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ رقم اکٹھا کرنے لگس رہتا۔ اسی مقصد کے تحت وہ ایک رات جعدار کے پاس پہنچا۔

جعدار کی جھونپڑی بٹھے کے ایک گوشے میں آگ تھلگ تھی۔ اس کی دیواریں پختہ تھیں جو اور ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کی چٹائی بٹھے سے نکلنے والی سرخ راہ سے کی تھی۔ اس کی جھونپڑی دو سری جھونپڑیوں اور جھگیوں سے بڑی بھی تھی۔

لالی اس کے پاس پہنچا تو اول شب تھی۔ جعدار اس وقت تما تھا۔ چارپائی پر تھکا ہوا سا بیٹھا ہالی کو دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”کیسے آیا؟“

”تجھے ملنے آیا تھا۔“ لالی نے جانتے ہی خوشامد شروع کر دی۔ ”جعدار، بہت تھکا ہوا نظر آ رہا ہے آج تجھے بہت کام کرنا پڑا۔ ویسے تجھے تو روزی بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ بچ پوچھ تو محنت

”تو کہتا ہے تو چار ہی سو دلوادوں گا۔ پر تو گھروالی کو روپے بھیجے گا کیسے؟ منی آؤر کرنے کے لیے ڈاک خانے جانے کی اجازت نہیں۔“ جمدار نے تیکھے لہجے میں کہا۔ قدرے تامل کے بعد بولا۔

”جتنے روپے بھیجے ہوں، مجھے دے دیتا۔ میں منی آؤر کروادوں گا۔ تجھے رسید مل جائے گی۔ دوسرے ہتھیاروں کے لیے بھی ایسا ہی کرتا ہوں۔“

”کب تک مل جائے گی یہ پیشگی؟“

”میں کل سویرے منشی کو بول دوں گا۔ تو دوپہر کو اس کے پاس چلا جانا۔ وہ تجھے روپے دے دے گا۔“ جمدار اکبر سائول نے لالی کو مطلع کیا۔ ”میں چند دنوں بعد ہتھیار لینے بھاؤں مگر جاؤں گا۔ میں نون بجتی نال روپے منی آؤر کرنے ہوں تو مجھے پرسوں دے دیتا۔ ورنہ واپسی پر تیرا کام کر دوں گا۔“

”تیری بہت بہت مرہانی۔“ لالی نے منی آؤر بھیجنے کے بارے میں مزید بات چیت نہیں کی۔ جمدار کے کندھے اور زیادہ مستعدی سے دبانے لگا۔

”اب تو رجا۔“ جمدار نے مسکرا کر کہا۔ ”میں نے آج رات تاجو کو بلایا ہے۔ وہ آتی ہی ہو گی۔“

لالی باہر نکلا اور اپنی جھونپڑی کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ اندھیرے میں دو ماٹے نظر آئے۔ وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ سائے قریب آگئے۔ لالی نے دونوں کو پہچان لیا۔ ان محمد آگے آگے تھا اور تاجو اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ تاج محمد نے اس کی جانب کوئی توجہ دی۔ لیکن تاجو مڑ کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ لالی نے نہ اسے ٹوکا نہ روکا۔ خاموشی سے ان کے برابر سے گزر گیا۔ لیکن اس نے دل میں ہلکی سی کک محسوس کی۔

دوسرے روز دوپہر کو وہ منشی رحمت کے پاس گیا۔ جمدار نے حسب وعدہ سویرے ہی سویرے ئی سے اس کی سفارش کر دی تھی۔ اس نے مسکرا کر لالی کو دیکھا، پوچھا۔ ”پیشگی لینے آیا ہے؟“

”رجسٹر کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا۔“ میاں انگوٹھا لگا دے۔ ”منشی نے انگلی رکھ کر بتایا۔“

لالی نے پڑھا۔ رجسٹر میں چار سو کے بجائے سات سو کی رقم کا اندراج کیا گیا تھا۔ اسے غصہ تو آتا تھا۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ اس نے نہ اعتراض کیا نہ احتجاج۔ وہ منشی پر یہ واضح کرنا نہیں چاہتا کہ وہ لکھ پڑھ بھی سکتا ہے۔ اس نے خاموشی سے انگوٹھا لگا دیا۔ منشی سے چار سو روپے لے کر گئے راجوئی کے ڈب میں رکھ لیے۔

تو ہی چلاتا ہے۔ ”لالی اس کے سر ہانے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اس کے کندھے آہستہ آہستہ دبانے لگا۔“

”تو نے بتایا نہیں کیسے آیا؟“ جمدار نے مسکرا کر پوچھا۔

”تیری مدد چاہیے ہے۔“ لالی کے لہجے میں عاجزی تھی۔

”کیسی مدد؟“ جمدار کا لہجہ خفکا ہو گیا۔ ”چھٹی کے لیے تو نہیں آیا؟ ایسی گل بات نہ کرنا۔ اس کے بارے میں تو سوچنا بھی نہیں۔“

”نہیں جی، مجھے چھٹی شئی نہیں چاہیے۔“ لالی نے فوراً تردید کی۔ ”مجھے تو پیشگی چاہیے ہے۔“

”تو میرے پاس کیوں آیا؟ منشی کے پاس جا۔ وہ تو آج کل سب ہی کو پیشگی دے رہا ہے۔“

”مجھے کچھ زیادہ ہی پیشگی لینی ہے۔“ لالی اور بھی زیادہ مستعدی سے جمدار کے کندھے دبانے لگا۔ ”تو منشی سے کہہ دے گا تو جتنی پیشگی کے لیے کہوں گا وہ دے دے گا۔ مجھے پتہ ہے وہ تیری

سفارش پر انکار نہیں کر سکتا۔“

”کتنی پیشگی تجھے چاہیے؟“

”چاہیے تو چار سو ہیں۔ پر تین سو بھی مل جائیں تو کام چل جائے گا۔“

”تین سو تو بہت ہوئے۔ تجھے تو پہلے ہی بہت وڈی پیشگی ادا کرنی ہے۔“ جمدار نے مسکرا کر اپنے

رد عمل کا اظہار کیا۔ ”اتنی زیادہ پیشگی لے کر تاجا کی کڑی تاجو سے ویاہ تو نہیں کرنا؟“ اس نے لالی

کو خبردار کیا۔ ”پر تجھے یہ پتہ ہونا چاہیے تاجو میری رکھیل ہے۔ جب چاہتا ہوں رات کو اسے بلانے

ہوں۔ مفت میں رکھیل بنا کر نہیں رکھا۔ جتنی تاجو کو ہر ہفتے دباڑی ملتی ہے اتنی ہی اس کے بچہ کو

کام کئے دیتا ہوں اور اپنے ڈب سے نکال کے دیتا ہوں۔“ اس کا لہجہ اچانک تند اور تلخ ہو گیا۔

”تاجو سے ویاہ کرنے کا دھیان دل سے نکال دے ورنہ بہت بچھتا ہے گا۔“

”نہیں جی، مجھے تاجو سے ویاہ نہیں کرنا۔ کسی نے تجھے غلط بتایا۔“ لالی کے دل کو سخت دھچکا لگا

اس نے خود کو سنبھالا۔ فوراً بات بدلتی۔ ”میں اس سے کیوں ویاہ کرنے لگا۔ میری گھروالی نہیں

ہے؟“

”تیرا ویاہ ہو چکا ہے؟“

”کئی سال ہو گئے۔ اب تو دو ٹکڑوں کا بچہ ہوں۔“ لالی نے نہایت ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

والی کو روپے بھیجنے کے لیے تو پیشگی مانگ رہا ہوں۔ وہ بیمار رہتی ہے۔ ادھار بھی اس نے بہت

رکھا ہے۔ ”وہ گڑ گڑانے لگا۔ ”چار سو پیشگی دلا دے۔ جمدار تیری بہت مرہانی ہو گی۔“

”تھیرا یا حد مزدور بھولے سے بھی کھیتوں کے قریب چلا جاتا تو وہ سختی سے ڈانٹتا تھا اور چمتر سنبھال کر مارنے کے لیے جھپٹتا تھا۔ ہاتھ آجاتا تو دو چار چمتر لگانے سے بھی دریغ نہ کرتا۔

اس روز آسمان ابر آلود تھا۔ ہوا بھی سنگی ہوئی تھی۔ سردی چمک گئی تھی۔ لالی کام ختم کر کے شام کو اپنی جھونپڑی میں پہنچا تو بدن میں سردی سے ہلکی ہلکی کپکپاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے چولہا روشن کیا۔ کھانا پکانے سے پہلے چائے تیار کی۔ پیالے میں انڈیلی اور گرم گرم چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ تھکا ہوا بھی تھا۔ چائے پینے میں بڑا لطف آیا۔ اسی اثناء میں بھٹے کا ایک کارندہ نواز گل آگیا۔ وہ ریاست دیر کا اتمان زئی پٹھان تھا۔ اس کی عمر ۴۰ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر جسم مضبوط اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ ان کارندوں میں سے تھا جن سے لالی نے شناسائی اور کچھ میل جول پیدا کر لیا تھا۔ نواز گل کبھی کبھار لالی کی جھونپڑی میں بھی آجاتا اور وہ بھی چائے پینے کے لیے۔ ورنہ چپ چاپ اس کی جھونپڑی کے سامنے سے گزر جاتا۔ وہ اس دقت یہ معلوم کرنے کے لیے محنت پر نکلتا تھا کہ تمام ”تھیرے“ کام ختم کر کے اپنی جھونپڑیوں میں پہنچ گئے کہ نہیں۔ ”تھیرے“ عام طور پر گڑ کی چائے بناتے تھے، مگر لالی گڑ کے بجائے چائے میں شکر ڈالتا تھا۔ لہذا اس کی چائے نواز گل کو پسند بھی آتی تھی۔

لالی چولہے کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے نواز گل کو اپنے قریب بٹھایا۔ پیالے میں چائے ڈالی اور پیالہ اس کی جانب بڑھا دیا۔ نواز گل بھی چائے پینے لگا۔

لالی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ”لالہ“ آج سردی بہت ہے۔“

”سردی ادھر کہاں پڑتا ہے۔“ نواز گل نے بے نیازی کا اظہار کیا۔ ”سردی تو دیر میں پڑتا ہے۔ آج کل تو وہاں برف گر رہی ہے۔ ہر طرف سفید سفید برف نظر آتی ہے۔ درختوں پر، مکانوں کی چھتوں پر، راستوں پر۔“

”تب تو سارے ہی راستے بند ہو جاتے ہوں گے۔ کوئی کام دھندا نہیں ہوتا ہو گا۔“

”ہاں جی، سچہ مبینہ تک کوئی کام دھندا نہیں ہوتا۔“

”بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی ہو گی۔“ لالی نے دریافت کیا۔ ”تم ادھر کیا کرتے تھے؟“

”جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا۔ اسے فروخت کرتا تھا۔ مزدوری کرتا تھا۔“ نواز گل نے لالی کو بتایا۔ ”ان دنوں امارا باپ زندہ تھا۔ میں چھوٹا تھا۔ شادی بھی نہیں ہوا تھا۔ باپ کے ساتھ بلزئی چلا جاتا۔ بلزئی دیر سے آٹھ میل آگے ہے۔ بلزئی سے پینہ پر دو ڈھائی من بوجھ اٹھا کر عشریت تک لے جاتا تھا۔ یہ تیس میل سے بھی زیادہ لمبا راستہ ہے۔ اور بہت خطرناک ہے۔ کہیں سیدھی

لالی کے پاس اب ساڑھے پانچ سو سے بھی زیادہ روپے تھے۔ وہ جلد سے جلد بھٹے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے صرف جعدار اکبر سانول کے بھاول مگر جانے کا انتظار تھا۔ اس کی موجودگی میں فرار ہونا خطرناک تھا۔ وہ بڑا گھاگ اور بے ڈھب جعدار تھا۔ برسوں سے جعداری کر رہا تھا۔ ہر ”تھیرے“ پر نظر رکھتا تھا اور ہر وقت چونکنا رہتا تھا۔

لالی کی ان دنوں یہی کوشش رہتی کہ جعدار سے آمتا سامتا نہ ہو۔ مبادا وہ منی آرڈر کے بارے میں پوچھ بیٹھے۔ جعدار نظر بھی آتا تو وہ اس قدر انہماک سے کھٹا کھٹ اینٹیں بنانے لگتا گویا اسے دیکھا ہی نہیں۔ اس کی گردن جھکی ہوتی اور ہاتھ تیزی سے چلتے رہتے۔ شام ہوتے ہی وہ کام ختم کرتا۔ سیدھا اپنی جھونپڑی میں جاتا اور چولہا جلا کر کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتا۔

چند ہی روز بعد جعدار بھاول مگر چلا گیا۔ وہ صرف دو روز کے لیے گیا تھا۔ انھی دو دنوں میں لالی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ وقت بہت کم تھا اور اسے جو کچھ کرنا تھا جلد سے جلد کرنا تھا۔ مگر ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اور پوری احتیاط سے اٹھانا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر فرار ہوتے ہوئے پکڑا گیا تو ایسی ہولناک سزا ملے گی جس کے تصور ہی سے وہ لرزہ بر اندام ہو جاتا۔ ملک ٹار محمد کے بھٹے سے فرار ہونے کی پاداش میں جعدار زماں خان نے اس کی جو درگت بنائی تھی اسے اب تک فراموش نہ کر سکا تھا۔

دن میں تو فرار ہونے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ رات کے اندھیرے میں ایسی کوشش کی جاسکتی تھی۔ بھٹے میلی کی آبادی سے الگ تھلگ ایک دیرانے میں تھا۔ اس کا محل وقوع کچھ اس طرح تھا کہ رات کو بھی فرار ہونا خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس کے ارد گرد دور تک پھیلا ہوا لٹق دتق میدان تھا۔ جس میں پیلو اور بھول کے اکا دکا درخت تھے۔ جھاڑیاں کہیں کہیں تھیں اور اتنی کمزور اور اونچی بھی نہ تھیں کہ ان کی اوٹ میں دھک کر چھپا جاسکے۔ میدان سے گزرنے والا دور ہی نہ نظر آتا تھا۔

بھٹے کے صرف ایک طرف کھیت تھے جن کا سلسلہ بہتی ۲۰۳ ڈیوبولی تک جاتا تھا۔ ان میں کماد فصل تیار کھڑی تھی۔ اگر لالی کسی طرح ان کھیتوں کے اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو ان کے اونچے اونچے پودوں میں چھپتا چھپتا آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ مگر کماد کے کھیتوں کی دن رات نگرانی کی جاتی تھی۔ رات کو یہ نگرانی اور سخت کردی جاتی۔ کھیتوں کے آگے مٹی کی لگ بھگ پا فٹ اونچی دیوار تھی جسے زمیں دار نے اپنی فصلوں کو مویشیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے تعمیر کیا تھا۔ بھٹے کا ایک چوکیدار اس دیوار کے سامنے رات بھر چوکس کھڑا نگرانی کرتا رہتا تھا۔ اگر

چڑھائی ہوتی کہیں ایک دم ڈھلوان آجاتا۔ راستے میں لواری کی چوٹی پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ بہت اونچی چوٹی ہے۔ نیچے دیکھو تو سر چکرانے لگے۔

”یہ تو سخت محنت کا کام تھا۔ بہت خطرناک بھی تھا۔“ لالی نے تبصرہ کیا۔

”کہیں کہیں تو راستہ اتنا تنگ ہو تا کہ کسی مزدور کا پیر پھسل جاتا یا پتھر سے ٹھوکر لگ جاتا تو لڑھک کے نیچے ایسے گھرے کھڈ میں جاتا کہ لاش نکالنا بھی مشکل ہو جاتا۔ راستے میں پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف کے تودے گرتے تھے۔ بہت مزدور ان کے نیچے دب کر مر جاتے۔“ نواز گل نے گہری سانس بھری۔ ”اما را باپ بھی ایسے ہی تودے کے نیچے دب کر مر گیا۔ کئی مہینے بعد جب برف پگھلی تو لاش نکالی گئی۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا۔ ”بڑی سخت مزدوری تھی۔“

”پر مزدوری تو چنگی ملتی ہوگی۔“

”ٹھیکیدار پانچ روپیہ فی من مزدوری دیتا تھا۔“ نواز گل نے بتایا۔ ”جس دن کام نہیں ملتا تو جیری کہیں ہوتا۔ کوئی مزدوری نہیں ملتا تھا۔ سات میل پیدل آنے جانے کا سفر یا نکل بے کار جاتا۔ ایسا تب ہوتا تھا جب عشریت سے چترال جانے کے لیے کوئی سامان نہ ہوتا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”باپ کے مرنے کے بعد ام بلزئی سے دیر واپس آگیا۔“

”دیر میں اینٹیں بنانے کے بھٹے نہیں ہوتے؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”نہیں، بھٹے پشاور میں ہوتے ہیں، دیر میں بھٹے مٹے نہیں ہوتے۔ لکڑی سے مکان بنائے جاتے ہیں۔“ نواز گل نے جواب دیا۔ ”زیادہ تر مکان نواب محمد شاہجہاں خان کے ہیں۔ وہ ادھر کا حاکم ہے۔ مکان کا کرایہ چار روپیہ فی مربع گز کے حساب سے وصول کیا جاتا ہے۔ کرایہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ایک ایک کمرے میں دس دس بارہ بارہ لوگ رہتا ہے۔ وہیں بھیڑ بکریاں بھی رکھی جاتی ہیں۔“ اس نے نظر بھر کر لالی کی جانب دیکھا۔ ”کرائے میں دیری ہو تو جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ نواب کے ملازم سامان اٹھا کر بارہ ڈال دیتے ہیں۔ زبردستی مکان خالی کرا لیتے ہیں۔ کرائے دار کو بارہ کھڑا کر دیتے ہیں۔ چاہے برف باری ہوتی ہو یا طوفان آیا ہو۔ وہ ذرا بھی ترس نہیں کھاتے۔ کوئی رعایت نہیں کرتے۔ کرائے داروں کے لیے نواب کا یہی حکم ہے۔“

”تب تو ادھر بہت ظلم ہوتا ہے۔“

”یار اتم کو کیا پتہ کتنا ظلم ہوتا ہے؟“ نواز گل نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نواب کی ضرورت کے لیے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانی پڑتی ہیں۔ مویشیوں کے لیے گھاس لانی پڑتی ہے۔ وہ شکار پر جاتا ہے تو اس کے کتوں کے ساتھ دوڑنا پڑتا ہے۔ محل اور قلعے بنانے ہوتے ہیں۔ زمین کاشت

کرنی ہوتی ہے۔ صبح سے شام تک بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ مگر اس کا کوئی دباڑی کوئی مزدوری نہیں ملتا۔“ اس نے چائے کا بڑا گھونٹ بھرا۔ ”ایسی بیگار نواب کے لیے کرنی پڑتی ہے اور خوانین کے لیے بھی۔ خوانین بھی بڑے زمین دار ہوتے ہیں۔ ہر کسان کو جو اپنی زمین پر کاشت کرتا ہے اسے اپنے خاندان کا ایک جوان بیگار کے لیے دینا لازمی ہے ورنہ زمین کا ایک حصہ نواب یا خوانین کو دینا پڑتا ہے۔ کوئی ایسا نہ کرے تو اسے دیر یا پکدرہ کی جیل میں بند کر دیا جاتا ہے۔“

رات اب آہستہ آہستہ نیچے اتر رہی تھی۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ چولہے میں جلتی ہوئی لکڑیوں سے شعلے ابھر کر لہرا رہے تھے۔ ان کی روشنی میں نواز گل کا سرخ چہرہ اور زیادہ سرخ نظر آ رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں ابھی ابھی سی تھیں۔ وہ چائے کے گھونٹ بھرتا رہا اور لالی کو بتاتا رہا۔

”بیگار تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ نواب کسانوں سے مویشی رکھنے پر کلنگ بھی وصول کرتا تھا۔ یہ ٹیکس سہمی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ جتنے زیادہ مویشی ہوں اتنا ہی زیادہ سہمی لیا جاتا ہے۔ ۳۰ سیر سے من بھر تک سالانہ سہمی لیا جاتا ہے۔ نواب اپنے نوکروں اور کندوں کو کوئی تحفہ نہیں دیتا۔ ان کے گزارے کے لیے ہر خاندان سے دس سیر غلہ فصل پر وصول کیا جاتا ہے۔ کسی کے بچہ پیدا ہو تو ایک مرغ اور ایک روپیہ نواب کو دینا ہوتا ہے۔“ اس کا لہجہ ٹیکھا ہو گیا۔ ”وہ کیا ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ نواب زادگان اور خوانین کے علاوہ ریاست میں کسی کو اجلا لباس پہننے کا اجازت نہیں۔ مکانوں پر نمین کی چھت ڈالنے اور کھڑکی یا روشن دان پر شیشہ لگانے کا اجازت نہیں۔ کوئی اس کا حکم نہ مانے تو جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ٹوپی نہ پہنے تب بھی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ لیکن نواب زادگان ٹوپی نہیں پہنتے۔“

”لالہ، ریاست کا نواب کیسا بندہ ہے؟“ لالی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”بیش کرتا ہے۔ بہت عالی شان محل میں رہتا ہے۔ ایک نہیں اس کے کئی شاندار محل اور قلعے ہیں۔“ نواز گل نے لالی کو بتایا۔ ”وہ زبردست خنزیر ہے۔ اس کی چھ تو زنانیاں ہیں۔ دو سو عورات ہیں جو اس کی داشتائیں ہیں۔ ریاست میں کوئی خوبصورت لڑکی نظر آجائے تو اسے بلوا کر محل میں زبردستی رکھ لیتا ہے۔“

”وہ پاگل تو نہیں ہو گیا؟“ لالی نے جل کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”اس کا باپ نواب اورنگ زیب خان اس سے بھی بڑا پاگل کا بچہ تھا۔“ نواز گل کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”نواب اورنگ زیب خان کی ایک زبانی بہت خوبصورت تھی۔ اس سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ مرگئی تو نواب اورنگ زیب خان نے بہت غم منایا۔ اسی غم میں اس پاگل کے

بچے نے خدا کے نام انگریز پولیٹکل ایجنٹ کی معرفت ایک چٹھی بھیجی۔ اس میں لکھا۔ اللہ تعالیٰ! اگر تو اپنی رحمت سے میری زبانی کو دوبارہ زندہ کر دے تو میں تو تیرے نام پر دو سو بھیڑوں کی قربانی کروں گا۔ نمازیں پڑھوں گا۔ ہر سال حج کروں گا۔ اس چٹھی پر اس نے ریاست کی سرکاری سرنگائی۔ دستخط کیے۔ اپنے پیر سے اس پر سفارش لکھوائی اور رجسٹری سے بھجوا دی۔ نواب مدت تک جواب کا انتظار کرتا رہا۔ اس کا ایک ملازم روزانہ صبح شام ڈاک خانے جاتا اور یہ معلوم کرتا اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی درخواست کا جواب آیا کہ نہیں۔“

”یار نواز گل‘ توچ کہہ رہا ہے؟“ لالی نے حیران پریشان ہو کر نواز گل کی جانب دیکھا۔
”یہ بالکل سچ ہے۔“ نواز گل نے نہایت اعتماد سے کہا۔ ”ریاست دیر کا ہر رہنے والا یہ بات جانتا ہے۔“

”ادھر توچ گج بہت ظلم ہوتا ہو گا۔“ لالی نے اظہار خیال کیا۔
”نواب محمد شاہجہاں خان کے علاوہ بڑا خان ہے۔ وہ بھی کسانوں اور مالداروں پر بہت ظلم کرتا ہے۔“

”یہ مالدار کون ہوتے ہیں؟“ لالی نے اظہار خیال کیا۔

”مالدار وہ مزارع یا کسان ہوتے ہیں جو زمین کے مالک کو بٹائی نہیں دیتے۔ کئی بکریاں اور مرغیاں دیتے ہیں۔ عشاؤں کرتے ہیں جو فصل کا دسواں حصہ ہوتا ہے۔“ نواز گل کے چہرے پر جھنجھلاہٹ چھا گئی۔ ”یار اتم کو کیا بتائیں۔ سرحد کے دوسرے خوانین جو بڑے زمین دار ہیں غریب لوگ پر ایسا ہی ظلم کرتے ہیں۔ کسان پہاڑ اور چٹانیں کھود کو کھیتی باڑی کے لیے زمین نکالتے ہیں۔ اس پر فصل اگاتے ہیں۔ خوانین انھیں بے دخل کر کے خود زمین کے مالک بن جاتے ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ ”امارا ایک رشتے دار شمالی ہشت نگر کے موضع کنڈو میں کھیتو باڑی کرتا تھا۔ خان نے پولیس کو رشوت دے کر اس کے خلاف مقدمہ بنوایا۔ اس کا زمین قرز کروایا۔ اس کا گھریا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ آخر وہ پریشان ہو کر محنت مزدوری کرنے کراچی چلا گیا۔ ام کو بھی وہی کراچی لے گیا تھا۔“

نواز گل نے چائے ختم کر کے پیالہ رکھ دیا۔ اٹھنے کے لیے پہلو بدلا۔ کہنے لگا۔ ”اب میں روئے جاؤں گا۔ تجھ سے آج بہت باتیں کر لیں۔“

لالی نے اسے جانے نہ دیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ”یار‘ تھوڑی دیر تو اور بیٹھ۔ تو نے بہت عجیب غریب باتیں بتائیں۔“ اس نے نواز گل کے پیالے میں اور چائے ڈال دی۔ ”لے ایک پیالہ چائے

ورہی۔ اسے ختم کر کے چلا جانا۔“

نواز گل نے انکار نہ کیا۔ پیالہ اٹھا کر چائے پینے لگا۔

”تو کراچی کتنا عرصہ رہا؟“ لالی نے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”ادھرام سات سال رہا۔“ نواز گل نے بتایا۔ ”وہاں بھی مزدوری کرتا تھا۔“

”کراچی تو نے کیوں چھوڑ دیا؟“

”ام اور سرحد کا دوسرا لوگ ادھرا ایک خالی میدان میں جھگیاں ڈال کر رہتا تھا۔ وہ کسی ہندو کا زمین تھا۔ وہ ہندوستان چلا گیا تھا۔ ایک مسلم لنگی لیڈر نے وہ زمین اپنے نام الاٹ کرا لیا۔ ام کو بولا۔ زمین خالی کر دو۔“ نواز گل نے تلخی سے کہا۔ ”وہی بے دخلی کا پکڑا ادھر بھی شروع ہو گیا جس کی وجہ سے ام سرحد سے کراچی آیا تھا۔“

”آگے کیا ہوا؟“ لالی نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

”ام نے زمین خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے بہت ڈرایا دھمکایا۔ پولیس کو بھی لایا۔ مگر ام نے زمین خالی نہ کیا۔“

”تب اس نے کیا کیا؟“

”اس خنزیر نے ایک رات اماری جھگیوں میں آگ لگوا دی۔“ نواز گل نے بچھے ہوئے لمبے میں کہا۔ ”اس رات ہوا بھی بہت تیز چل رہی تھی۔ ساری ہی جھگیاں جل گئیں۔ ایک بھی نہ بچی۔ سامان بھی جل گیا۔ ایک زبانی اور دو بچے بھی جل کر مر گئے۔“

”سب نے اس کے خلاف پولیس میں پرچہ نہیں درج کرایا؟“

”اخبار میں اس کا خبر بھی چھپا۔ لیکن نہ پولیس نے اس کے خلاف کارروائی کیا نہ سرکاری افسروں نے۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ ام کو وہ جگہ چھوڑنا پڑا۔“ نواز گل نے تھکے لمبے میں کہا۔ ”ام ایسا مایوس ہوا کہ کراچی چھوڑ دیا۔ پروٹن واپس نہیں گیا۔ ادھر آ گیا۔“

”بہاں تو تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔

”کیا ٹھیک ٹھاک ہے۔“ نواز گل نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ ”کام بہت زیادہ ہے۔ رات کو ڈیوٹی دو۔ دن میں بھی کام کر دو۔ اور پکار بہت کم۔ تم کو تو پیٹنگی ملتا ہے۔ ام کو تو وہ بھی نہیں ملتا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”گھر خرچہ بھیجتا ہے۔ زبانی بتا رہا ہے۔ بچہ بھی بیمار ہے۔ کچھ نہیں آتا کہاں سے ان کو خرچہ مرچہ بھیجا جائے۔“

”تجھے گھر بھیجنے کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہے؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”اور جو کسی نے تم کو ادھر دیکھ لیا۔ دوسرے سپردار بھی ہیں۔ رات بھر روٹ پر رہتے ہیں۔“
 نواز گل نے لالی کو خطرے سے خبردار کیا۔ ”تب کیا ہو گا؟“

”تو مجھے سخت ڈانٹ پلانا۔ گالاں بھی نکالنا۔ ایک آدھ چھتر بھی لگا دینا۔“ لالی نے اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کی۔ ”پرواہ نہ کر۔ میں گالاں چپ کر کے سن لوں گا۔ مار بھی کھالوں گا۔“ لالی نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”پر میں تو ایسے دکھت آؤں گا جب بالکل سناٹا ہو گا۔ آج کل اندھیرا بھی بہت ہوتا ہے۔ کوئی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔“

”بہت مشکل ہے۔ تم فرار ہو گیا تو جعدار گرم ہو گا۔“ نواز گل نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔
 ”حٹ مالک ام کو نوکری سے نکال دے گا۔“

”حٹ مالک یا جعدار کو پتہ ہی کیسے چلے گا میں کدھر سے گیا۔“ لالی نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ ”تو اکیلا تو نہیں۔ دوسرے سپردار بھی تو ڈیوٹی پر رہتے ہیں۔ ذمہ داری تو سب ہی کی ہوتی ہے۔ وہ کس کس کو نوکری سے نکالے گا۔“

لالی نے بات دل لگتی کسی تھی۔ نواز گل کی سمجھ میں بھی آگئی۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ لالی نے مالی اعانت کے طور پر اسے سو روپے رشوت بھی دی تھی۔ اصرار کر کے بڑے خلوص سے چائے پلائی تھی۔ پوری توجہ اور دلچسپی سے اس کے دکھ درد کی روداد سنی تھی۔ ہر طرح سے دل جوئی کی تھی۔ نواز گل کے لیے انکار کرنے کی گنجائش نہ رہی۔

لالی نے اسے خاموش پایا تو ایک بار پھر خوشامد درآمد سے کام لیا۔ ”لالہ، تیری بہت مہربانی ہو گی۔ میں اپنے پترے مل لوں گا۔ زندگی بھر تجھے دعائیں دوں گا۔“ اس نے بڑے جذباتی انداز میں نواز گل کا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے بھیجنے لیا۔

لالی نے ایسے رقت انگیز لہجے میں بات کی کہ نواز گل پہنچ گیا۔ اس کا کندھا تھکتے ہوئے گویا ہوا۔ ”تم اپنے پیارے بچے کے پاس ضرور جائے گا۔“ اس نے سینے پر ہاتھ مار کر وعدہ کیا۔ ”ام تمہارا مدد کرے گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”کل رات ام ادھر تمہارا انتظار کرے گا۔“

نواز گل چلا گیا۔ لالی نے جلدی جلدی روٹی پکائی۔ کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گیا۔ مگر نواز گل کے وعدے کے باوجود اسے پوری طرح یقین نہ تھا کہ بھٹے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔



رات آدمی سے بھی زیادہ گزر چکی تھی۔ جھونپڑیوں اور جگیوں میں گہری خاموشی تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ آواز۔ یکایک لالی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ کوئی ہولے ہولے اس کا

”پچاس روپے تو کم سے کم بھیجے ہی جائیں۔“ نواز گل نے بتایا۔ مگر ساتھ ہی حیرت زدہ ہو کر استفسار کیا۔ ”لیکن تم نے یہ بات کیوں پوچھا؟“

”نواز گل، تو میرا یار ہے۔ میرا بھائی ہے۔“ لالی نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”مجھے پیشگی ملی ہے۔ میں تیری مدد کروں گا۔“ اس نے دھوتی کے ڈب سے سو روپے نکالے اور نواز گل کی جانب بڑھا دیئے۔ ”پچاس نہیں سو روپے گھر بھیج دے۔“
 ”لیکن میں تمہارا یہ روپی کیسے ادا کروں گا؟“ نواز گل نے روپے لیتے ہوئے کہا۔

”تو اس کی فکر کیوں کر رہا ہے؟ میں تجھ سے روپے کب واپس مانگ رہا ہوں۔“ لالی نے چہرہ افسردہ بناتے ہوئے کہا۔ ”میرا پتر بھی سخت بیمار ہے۔ وہ میرا ایک ہی بچہ ہے۔ مجھے اس سے بہت پیار ہے۔ اس کے لیے میں ہر دم پریشان رہتا ہوں۔“ اس نے آواز میں رقت پیدا کی اور منہ بسور کر گویا ہوا۔ ”لالہ، اگر وہ مر گیا تو سمجھ نہیں آتی میرا کیا ہو گا؟ تو بھی اپنے پتر کا پیو ہے۔ تو میرے درد کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔“

”پریشان نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے شفا دے گا۔“ نواز گل اسے تسلی دینے لگا۔ ”ام اس کے لیے نماز پڑھنے کے بعد دعا کرے گا۔“

”لالہ، میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“ لالی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ”پر میں اس کے پاس کیسے جا سکتا ہوں؟“

”تم تو اس کے پاس نہیں جا سکتا۔“ نواز گل نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”تم کو تو بھٹے سے باہر جانے کا بالکل اجازت نہیں۔“

”جا تو سکتا ہوں۔ بس تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے۔“ لالی نے اس کی صاف گوئی کے باوجود ہمت نہیں ہاری۔

”تم امارا کیا مدد چاہتا ہے؟“ نواز گل نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔
 ”لالہ، بندہ بندے کے کام آتا ہے۔ دنیا میں ایک دوسرے کا کام ایسے ہی چلتا ہے۔“ لالی نے

اس دفعہ کھل کر بات کی۔ ”کل رات تم اپنی ڈیوٹی کھیتوں کی طرف لگواؤ۔“
 ”امارا تو کھل ویسے ہی ادھر کا ڈیوٹی ہے۔ لیکن تم کو اس سے کیا لینا؟“ نواز گل بات کی تہ تک

نہ پہنچ سکا۔

”میں ایک بار کماد کی فصل میں داخل ہو گیا تو سمجھ لو کام بن گیا۔“ لالی نے بے دھڑک ہو کر کہا۔

کندھا جھنڈوڑ رہا ہے۔ لالی گہری نیند میں تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ دیکھا دھندلی دھندلی روشنی میں نواز گل اس کے سرہانے کھڑا ہے۔

اس نے گہرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نواز گل تم!“ وہ سخت حیران و پریشان تھا۔
نواز گل نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر تاکید کی۔ ”شی“ آہستہ بولو۔“ اس نے جھک کر سرگوشی کی۔
”جلدی سے اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ اور امارے ساتھ چلو۔“

”کہاں؟“ لالی ابھی تک حیرت زدہ تھا۔ سرا سبگی میں بھی جلتا تھا۔

”گل کی بجائے تم آج ہی رات کو نکل جاؤ۔“

لالی چارپائی سے نیچے اترا۔ نواز گل کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ”آج کیوں؟“
”جعدار کل شام کو واپس آجائے گا۔ اس کے آنے کے بعد تم بھٹے سے باہر نہیں جاسکے گا۔ وہ خنزیر بہت ہوشیار ہے۔“ نواز گل نے لالی کو بتایا۔ ”جعدار کے کل شام واپس آنے کا اطلاع ام کو ایک کرنڈے نے دیا۔ اسے منشی نے بتایا تھا۔“

”مگر لالہ آج رات تو کھیتوں کی طرف دوسرے پیریدار کی ڈیوٹی ہوگی۔“ لالی نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”وہ مجھے کیسے جانے دے گا؟“

”تم اس کا فکر نہ کرو۔ سب پیریداروں کو سردی لگتا ہے۔ ادھر چینی کے پاس آگ سے بدن کو گرم کرتا ہے۔“ نواز گل نے وضاحت کی۔ ”وہاں بیٹھ کر چائے پیتا ہے۔ کھیتوں کی طرف اب کوئی ڈیوٹی پر نہیں ہے۔ سمجھ گیا؟“

”بالکل سمجھ گیا۔“ لالی نے مسکرا کر گردن ہلائی۔ ”تب تو اپنا کام بن جائے گا۔“

نواز گل نے جیب سے سو روپے نکالے اور لالی کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔ ”لو! اپنا یہ روپی رکھ لو۔ تمہارا بچہ بیمار ہے۔ جا کر اس کا علاج ملاج کراؤ۔ تم کو ادھر روپی کی ضرورت ہوگا۔“
لالی نے روپے واپس نہ لیے۔ کہنے لگا۔ ”یار! تیرا بچہ بھی تو بیمار ہے۔ تیری گھر والی کو اس کے علاج کے لیے روپے کی ضرورت ہے۔ یہ روپے تو اسے بھیج دے۔ میری فکر نہ کر۔ اپنا کام چل جائے گا۔“

”نہیں! یہ روپی ام نہیں لے گا۔ ام نے ایک بار تم کو بول دیا۔ اپنا روپی اپنے پاس رکھو۔“ نواز گل نے اس بار سختی سے کہا۔ ”باتیں کم کرو۔ جیسا کہتا ہوں ویسا کرو۔ ورنہ تم اپنے بیمار بچے کے پاس نہیں جاسکے گا۔“

نواز گل آگے بڑھا۔ لالی نے خاموشی سے روپے دھوتی کے ڈب میں رکھ لیے اور نواز گل کے

بیچے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں جھونپڑی سے باہر نکلے۔

بھٹے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ہر طرف کمر کا نیل گوں دھندلکا پھیلا تھا۔ دونوں سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے گڑھوں اور ادھر ادھر بکھری ہوئی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں سے بچتے بچاتے آہستہ آہستہ بڑھتے رہے۔ بھٹے کی چینی دھندلی دھندلی نظر آرہی تھی۔ اس کے نیچے جلتی ہوئی لکڑیوں کا الاؤ روشن تھا۔ چینی کے کھلے ہوئے در سے گرمی سرخ روشنی پھوٹ رہی تھی۔ اس روشنی میں بھٹے پر کام کرنے والے مزدور اور دوسرے لوگ پر چھائیوں کی مانند ادھر ادھر گردش کر رہے تھے۔

سردی اب اور بڑھ گئی تھی۔ لالی کا بدن قہر قہرا رہا تھا۔ وہ بظلوں میں دونوں ہاتھ دبائے چوکنا نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ نواز گل اس سے چند قدم آگے تھا۔ لالی کی نظریں برابر اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جدھر مڑتا لالی بھی اسی طرف مڑتا۔ چلتے چلتے اس نے کئی بار اندھیرے میں ٹھوکر بھی کھائی مگر سنبھل جاتا۔ ایک بار ایسی ٹھوکر لگی کہ لڑکھڑا کر دھڑام سے گرا۔ گھٹنے پر خاصی کراہی چوٹ آئی۔ لیکن نواز گل کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کا خطرہ تھا۔ لہذا گھٹنے کے درد کی پرواہ کیے بغیر جلدی سے اٹھا اور لنگڑاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

دونوں چلتے چلتے ایک موڑ سے نکلے تو سامنے کما دکے کھیت تھے۔ نواز گل مٹی کی دیوار سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گیا۔ لالی اس کی جانب بڑھنے لگا۔ قریب پہنچا ہی تھا کہ چینی کے نیچے پھیلی ہوئی سرخ سرخ روشنی میں ایک پیریدار نظر آیا جو اسی سمت آ رہا تھا۔ نواز گل نے اسے دیکھا تو سرا سبہ ہو گیا۔ گہرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”واپس جاؤ! واپس جاؤ۔ پیریدار آتا ہے۔“

مگر لالی منع کرنے کے باوجود نہ رکا۔ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی جانب بڑھا۔ نواز گل نے اس بار ڈیٹ کر کہا۔ ”تم نے امارا بات نہیں سنا؟ فوراً واپس جاؤ۔“

پیریدار اب سامنے آگیا تھا۔ لالی بدستور خاموش رہا۔ آگے بڑھا اور دیوار کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ نواز گل نے غصے سے چیخ کر کہا۔ ”ٹھہرو۔ تم کیدر جاتا ہے؟“ وہ جھنجھلایا ہوا اس کی طرف بچھا۔

لالی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اچھلا اور دیوار کی بلندی پر دونوں ہاتھ رکھ کر زغند بھری اور گتے کے اونچے اونچے پودوں کے درمیان جا کر گرا۔ اسی وقت دیوار کے پیچھے آواز ابھری۔
”کون تھا؟ کدھر چلا گیا؟“

”ام نے اسے روکا۔ مگر وہ خنزیر دیوار پھاند کر کھیتوں میں چلا گیا۔ پتہ نہیں کون تھا۔“ نواز گل

تیکھے لمبے میں تیار ہوا تھا۔ ”اندھیرے سے نکلا اور ایک دم غائب ہو گیا۔“

لالی اس سے زیادہ نہ سن سکا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور پودوں کو ہاتھوں سے ادھر ادھر ہٹاتا ہوا کھیتوں کی منڈ پر سرپٹ دوڑنے لگا۔ کئی بار گتے کے پودوں سے الجھ کر ڈمگایا۔ لمبے لمبے تیز دھار کے پتوں سے جسم پر جگہ جگہ خراشیں بھی آئیں۔ لیکن رکائیں۔ آگے اور آگے بڑھتا گیا۔

کما د کے کھیتوں سے گزر کر وہ باہر نکلا تو سنسان رُئی میں کھڑا تھا۔ یہ گاؤں کے سامنے کا وسیع میدان تھا۔ اس پار مکانات تھے جو دھند میں لپٹے ہوئے دھندلے دھندلے نظر آرہے تھے۔ کہیں کہیں روشنی جھلک رہی تھی جو کمر کے جال میں الجھی ہوئی زرد زرد دھبوں کی مانند معلوم ہو رہی تھی۔

لالی رُئی عبور کر کے بستی میں نہ گیا۔ مڑا اور ایک جھنگر میں داخل ہو گیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں اور خود رو پودوں کے درمیان سے گزرتا ہوا انجان راستوں پر چلتا رہا۔ رات تاریک تھی اور سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن کہیں ٹھہرے بغیر اس نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جب وہ موضع قادر بلوچ کے نزدیک پہنچا تو مشرقی افق پر اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ دھند میں الجھی ہوئی سرا کی صبح طلوع ہو رہی تھی۔

میلی کی بستی پیچھے رہ گئی تھی۔ آگے کوٹ ملک تھا۔ قادر بلوچ سے میلی روڈ زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ ایک راہ گیر نے اسے یہی بتایا تھا۔ وہ اسی سمت چلتا ہوا میلی روڈ پر پہنچا تو دن نکل آیا تھا۔ کمر کا غبار چھٹنے لگا تھا۔ ہلکی ہلکی دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ اب چم چم پھل اور آمد و رفت شروع ہو چکی تھی۔ وہ بس میں سوار ہوا اور ملتان کے راستے جو ند سنگھ والا کی جانب روانہ ہو گیا۔



شام ہو چکی تھی۔ ہر طرف کمر کا ہلکا ہلکا نیلگوں دھند لگا پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر جو ند سنگھ والا میں بسوں کے اڈے پر ابھی تک گھما گھمی تھی۔ لالی جیسے ہی بس سے اترا ایک گداگر اس کی جانب بڑھا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال خاک دھول سے اٹے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ چہرے بے رونق اور مرجھایا ہوا تھا۔ لباس نہایت گند اور بوسیدہ تھا۔

گداگر نے قریب پہنچ کر ہاتھ پھیلائے اور گھٹیا کر صدانگائی۔

دے جا بخیا اللہ نام!

مولا بنائے تیرے کام

لالی نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ارشاد الہی تھا۔ اس کی نظریں لالی کی نظروں سے دو چار ہو گئیں

تو چہرے پر سراسیمگی اور گھبراہٹ چھا گئی۔ اس نے بھی لالی کو پہچان لیا تھا۔ وہ فوراً مڑا اور تیزی سے ایک جانب بڑھ کر چاہا کہ اندھیرے میں او جھل ہو جائے۔ لالی نے جھپٹ کر اس کا ایک ہاتھ تھام لیا۔ ڈپٹ کر بولا۔

”اوائے شادے مکدھر چلا۔ تو نے مجھے پہچانا نہیں؟“

”تو لالی ہے ناں۔“ ارشاد الہی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”تو یہاں کیسے آیا؟“

ارشاد الہی کی آنکھوں سے خوف جھلک رہا تھا۔ چہرے پر دہشت طاری تھی۔ لالی نے ارشاد الہی کو اس قدر خوف زدہ پایا تو دل لگی سو جھی۔ اسے اور دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ ”جمعدار اکبر سانول نے مجھے بھیجا ہے کہ تجھے پکڑ کر بھنے پر لے چلوں۔ تجھ سے پیٹنگی وصول کرنی ہے۔“

”ایسا نہ کرنا۔“ وہ مسکین سی صورت بنا کر گڑگڑانے لگا۔ ”مجھ سے اب بھنے پر کام نہیں ہو سکتا۔ بہت بیمار ہوں۔ کام کروں گا تو مر جاؤں گا۔“

”تو ادھر عیش کرتا رہے اور میں ادھر تیری پیٹنگی ادا کروں۔ تو یہ چاہتا ہے۔“ لالی نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔ ”دھوکے باز، مجھ سے واپس آنے کا پکا وعدہ کر کے آیا تھا اور ادھر آکر چھپ گیا۔ تجھے بھنے پر لے جا کر جمعدار کے سامنے پیش کروں گا۔“

ارشاد الہی اس قدر بدحواس ہو گیا کہ لالی کے پیچھے پکڑ لئے۔ ”مجھے بھنے پر نہ لے جا۔“ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ”مجھے معافی دے دے۔“

”اٹھ کر کھڑا ہو۔“ لالی نے تیکھے لمبے میں کہا۔

ارشاد الہی اٹھا اور ہاتھ جوڑے ہوئے لالی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”یہ بتا تو میرے پاس آیا کیوں نہیں؟“ لالی نے دریافت کیا۔ ”میں نے تو تیری مدد کرنی چاہی تھی

اور تو میری گروں پھنسا کر صاف نکل گیا۔ تو نے میری نیکی کا یہ صلہ دیا۔“

”تجھے پتہ ہے، میں پہلے ہی سخت بیمار تھا۔ ماں کے پاس ملتان پہنچا تو میری حالت ایسی تھی کہ یوں لگتا تھا دو چار روز میں مر جاؤں گا۔ مجھ سے بولا تک نہ جاتا تھا۔ بستر پر پڑا پڑا کھانسا تھا اور خون تھوکتا تھا۔“ ارشاد الہی رقت انگیز لمبے میں صفائی پیش کرنے لگا۔ ”ماں مجھے سرکاری اسپتال لے گئی۔ ڈاکٹر نے علاج کے لیے انجکشن بتائے۔ پر ایسے انجکشن اسپتال سے نہیں ملتے تھے۔ ماں ہیکل مانگ کر پیسے اکٹھے کرتی تھی اور میرے لیے انجکشن خرید کر بازار سے لاتی تھی۔ دو مہینے تک اسپتال میں پڑا رہا اور انجکشن لگواتا رہا۔ پوری طرح چنگا بھی نہ ہوا تھا کہ اسپتال سے چھٹی کردی گئی۔ ماں مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ تب تک میں چل بھی نہیں سکتا تھا۔“

”اب تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔“ لالی نے غور سے دیکھا۔

”بعد میں بھی انجکشن لگتے رہے۔“ ارشاد الہی نے بتایا۔ ”ان سے میں چکا ہو گیا تو ماں مجھے ادھر لے آئی۔ میں بھی اس کے ساتھ بھیک مانگنے لگا۔ یہاں بس شاپ پر چنگی بھیک مل جاتی ہے۔“

دونوں بس اسٹاپ سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کے نیچے اندھیرے میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ارشاد الہی ابھی تک سہا ہوا تھا اور گڑگڑا کر صفائی پیش کر رہا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک بار پھر پوچھا۔

”تو مجھے بھنے پر کام کرنے تو نہیں لے جائے گا۔“

”میں تجھے کیسے بھنے پر لے جاؤں گا؟ میں تو خود ادھر سے بھاگ کر تیرے پاس آیا ہوں۔“ لالی نے اس کا خوف رفع کرنے کی غرض سے ہلکا قہقہہ لگایا۔ ”پر شادے“ تو ہے بہت ڈرپوک۔“

”تو نے مجھے ڈرا ہی اتنا دیا تھا۔“ ارشاد الہی اب سنبھل چکا تھا۔ ”بچھلے دنوں مجدد ارادہ آیا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ بھی لیا تھا۔ میں سمجھا اس نے تجھے ادھر بھیجا ہے۔“ فیرو نے باتیں بھی ایسی کیں کہ ڈرنہ جاتا تو کیا کرتا۔ سچ کہتا ہوں، بھنے کے بارے میں سوچتے ہی جان نکل جاتی ہے۔ تجھے پتہ ہے کتنی خراب جگہ ہے۔ وہاں کام کرنے سے تو بھیک مانگنی ٹھیک ہے۔ پیشگی تو گلے نہیں پڑتی۔“

”یہ بتا، تو کوئلہ ہر کشن بھی گیا کہ نہیں؟“ لالی نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

”ایک بار گیا تھا؟“

”ماں کو بھی ساتھ لے گیا تھا؟“

”نہیں، وہ نہیں گئی۔ وہ تو مجھے بھی وہاں جانے نہیں دے رہی تھی۔“

”کوئلہ ہر کشن جا کر تو نے کیا کیا؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”وہاں جا کر کرنا کیا تھا۔ وہ تو جی بہت وڈی زمیں داری ہے۔ حویلی اتنی شاندار ہے کہ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔“ ارشاد الہی نے بتایا۔ ”پر میرے بچوں کی اتنی زمیں داری کہاں تھی۔ پورے دس مربع بھی نہیں تھی۔ گھر بھی معمولی تھا۔ تھا تو پکی اینٹوں کا بنا ہوا مگر بہت چھوٹا تھا۔ اتنی وڈی زمیں داری اور ایسی شاندار حویلی اسے کیسے الٹ ہو سکتی تھی۔ تجھے دھوکا ہوا۔“

”مجھے یہ تو پتہ نہیں تیرے بچوں کی کتنی زمیں داری اور کتنی جائیداد تھی، پر مجھے یہ پتہ ہے کہ کوئلہ ہر کشن کی زمیں داری اور حویلی رحیم داد نے تیرے بچوں کے نام سے الٹ کر رکھی تھی۔“ لالی نے

وضاحت کی۔ قدرے تامل کے بعد دریافت کیا۔ ”تو نے کچھ پوچھنا پوچھ بھی کی؟ یہ نہیں بتایا وہاں جا کر تو نے کیا کیا؟“

”کوئلہ ہر کشن میں داخل ہوتے ہی میں حویلی کے پھانک پر پہنچا۔ وہاں کئی نوکر موجود تھے۔ ایک سے میں نے پوچھنا پوچھ کرنا چاہی۔ اتنے میں ایک شاندار کار آکر بالکل میرے سامنے رکی۔ سارے نوکر اس کی طرف دوڑے۔ ایک نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ اندر سے ایک بندہ بہت شان سے نکلا۔ سر پر اونچے طرے کی ٹیگ۔ کیمس پر سونے کے چمکتے ہوئے ٹن۔ ہاتھ پر سونے کی گھڑی۔“ ارشاد الہی سنبھل سنبھل کر بولتا رہا۔ ”اس نے میری طرف دیکھا۔ گردن ٹیڑھی کر کے پوچھا۔ کون ہے تو؟ میں نے اپنے بارے میں بتانا چاہا، پر میرے بولنے سے پہلے ہی اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔“

”اور تو نے چپ کر کے لے بھی لیا۔“ لالی نے جل کر کہا۔

”لے نہ لیتا تو کیا کرتا؟“

”تجھے پتہ تھا اس نے بھکاری سمجھ کر تجھے بھیک دی تھی؟“ لالی کا لہجہ بدستور تلخ اور تیکھا تھا۔ ”بالکل پتہ تھا۔“ ارشاد الہی نے سادگی سے جواب دیا۔ ”اتنی بھیک تو مجھے آج تک کسی نے نہیں دی۔ پیسہ دو پیسہ ملتی ہے۔ بہت ہوا تو آندہ دو آندہ۔“

”حد کر دی تو نے۔“ لالی نے جھنجھلا کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ ”تو بھکاری کا بھکاری ہی رہا۔“ اس نے منہ بگاڑ کر حقارت سے ارشاد الہی کو دیکھا۔ ”نوٹ اس کے منہ پر مارا ہوتا۔ اسے بتاتا تو کون ہے؟ کس لیے آیا ہے؟“

”اس نے مجھ سے کوئی گل بات ہی نہیں کی۔ نہ میری طرف مڑ کر دیکھا نہ کسی اور کی طرف۔ گردن اٹھائے حویلی کے اندر چلا گیا۔“ ارشاد الہی نے وضاحت کے ساتھ ساتھ قیاس آرائی بھی کی۔ ”اس کی شان اور ٹوہرہ دیکھ کر تو مجھے ایسا لگا وہی ادھر کا زمیں دار ہے۔“ اس نے گردن کو خم دے کر لالی سے دریافت کیا۔ ”تو تو کہتا تھا کوئلہ ہر کشن کا زمیں دار مر گیا۔“

”پتہ نہیں وہ کون تھا۔“ لالی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”میں نے تو یہی سنا ہے کہ ادھر کا زمیں دار رحیم داد تھا جو کئی مہینے پہلے مر گیا۔ وہ خود کو چوہدری نور الہی بتاتا تھا۔“

”میں نے کہا ناں۔ تجھے دھوکا ہوا۔“ ارشاد الہی نے زور دے کر کہا۔ ”کسی نے تجھے غلط بتایا۔“ ”مجھے ٹھیک طرح پتہ ہے وہ مر چکا ہے۔“ لالی نے اس دفعہ بھی کھل کر بات نہیں کی۔ وہ اسے بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جب رحیم داد کا قتل ہوا تو اس وقت وہ حویلی میں موجود تھا۔ اس نے ارشاد الہی

کو غور سے دیکھا اور تھیکے لمبے میں پوچھا۔ ”تو اسی محلے میں کوئلہ ہر کشتن گیا تھا؟ میں نے تجھے کہا تھا
نے کپڑے پہن کر شان سے جانا۔ اس کے لیے تجھے روپے بھی دیے تھے۔“
”وہ سارے ہی روپے ملتان پہنچتے ہی دوا علاج پر خرچ ہو گئے تھے۔“ ارشاد الہی نے وضاحت
کی۔ ”نئے کپڑے لئے کیسے بنو آتا؟“

”بہن تو جس نے بھی تجھے بھکاری سمجھا ٹھیک ہی سمجھا۔ تو تو دیکھنے ہی میں بھک مٹکتا لگتا ہے۔“
لالی نے منہ بگاڑ کر بے زاری کا اظہار کیا۔ ”پوچھا۔“ ”تیری ماں کدھر ہے؟“
”ادھر جھگی میں ہے۔“ ارشاد الہی نے ایک طرف ہاتھ اٹھا کر بتایا۔
”مجھے اس کے پاس لے چل۔“

ارشاد الہی آگے بڑھا۔ لالی اس کے ساتھ ساتھ چلا۔ جھگی قریب ہی تھی جسے درختوں کی
شاخوں، ٹہن کے پرانے ٹکڑوں، لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے تختوں اور پھٹے پرانے کپڑوں سے تیار کیا
گیا تھا۔ جھگی کے ارد گرد سوکھی جھاڑیوں کی اونچی باڑھ تھی۔
لالی نے جھگی کے اندر داخل ہو کر دیکھا ایک ادھیر عورت چولہے کے سامنے بیٹھی کھانا پکا رہی
تھی۔ اس کے بے رونق چہرے پر غمت اور افلاس کے سائے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کا آدمے سے
بھی زیادہ سرفیدہ تھا۔ لباس میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ ارشاد الہی کی ماں کلثوم بی بی تھی۔
ارشاد الہی نے لالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”اماں، یہ لالی ہے۔ اس کے بارے میں
تجھے پہلے ہی بتا چکا ہوں۔“

کلثوم بی بی نے لالی کو اس طرح گھگھکیا کہ دعائیں دینا شروع کر دیں جیسے خیرات مانگ رہی ہو۔ لالی
نے مسکرا کر فوراً اسے ٹوکا۔ ”بے بے، تو اب اس طرح دعائیں شعاں دینا چھوڑ دے۔ زمین
دارانی کی شان پیدا کر۔ تو تھوڑے ہی دنوں میں وڈی زمین دارانی بننے والی ہے۔“
”مخول نہ کر۔ میں نوں سب پتہ ہے۔“ کلثوم بی بی نے بے زاری کا اظہار کیا اور ارشاد الہی کی
طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”جب تو نے اسے بھٹے سے چھٹی دلا کر میرے پاس بھیجا تھا تب یہ
بھی ایسی ہی وڈی وڈی گھلاں کرتا تھا۔ اپنے نصیب میں تو بھیک مانگتی ہی لکھی ہے۔“
”بے بے، ایسے نہ سوچ۔“ لالی نے بات کو طول دینے کی کوشش نہ کی۔ ”تجھ سے آرام سے
گل بات ہوگی۔ پہلے تو مجھے روٹی کھلا۔ سخت بھوک لگی ہے۔“

لالی فرش پر پچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گیا۔ ارشاد الہی بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ اس کی ماں
نے کھانا تیار کیا۔ وال روٹی تھی جسے اس نے المونیم کی میلی میلی رکابیوں میں نکالا۔ وہ دونوں ہاتھ

تھنوں پر رکھ کر اٹھی۔ تکلیف سے منہ بگاڑا۔ تھیکے لمبے میں ارشاد الہی کو مخاطب کیا۔ ”شادے،
نہ سے اب روٹی نہیں کپنے کی۔ کمر میں سخت درد ہوتا ہے۔ تو رات کو بھی بازار سے روٹی لے آیا
ر۔“ وہ دائیں طرف ذرا سا جھک کر لنگڑاتی ہوئی چلی اور کھانا لالی اور ارشاد الہی کے سامنے لا کر
بکھ دیا۔ خود چولہے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگی۔

لالی نے کھانا کھاتے ہوئے ارشاد الہی سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”بعد اراکبر سانول مجھے
اش کرتا ہوا ادھر بھی آئے گا۔ شاید کل ہی آجائے۔ اسے پتہ ہے تو ادھر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے
برے ساتھ تجھے بھی پکڑ کر بھٹے پر لے جائے۔“ اس نے ارشاد الہی کو خوف زدہ کرنے کی کوشش
لا اور وہ خوف زدہ ہو بھی گیا۔ اس کی ماں کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔

”تب تو یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔“ اس نے تجویز پیش کی۔ ”ملتان واپس چلے ہیں۔“
”ملتان تو میلی سے نزدیک ہے۔ ادھر تو اور بھی زیادہ خطرہ ہے۔“ لالی نے اس کی تجویز سے
فاق نہ کیا۔ مگر مسئلہ یہ درپیش تھا کہ وہاں سے جایا کہاں جائے۔ اس کا کوئی ٹھور ٹھکانا تو تھا نہیں۔
لے دے کے ایک غنی چٹا کا گھر تھا۔ مگر وہ اس کے پاس جانا نہ چاہتا تھا۔ معاً اسے شادی یاد آگیا۔ وہ
ن کا پرائیڈ دوست تھا۔ بہت مخلص تھا اور اس کی مدد کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ شادو کا خیال
تے ہی اس نے فوراً کہا۔ ”لائل پور چلتے ہیں۔ ادھر میرا پرائیڈ شادو ہوتا ہے۔ اس کے پاس ہم
رام سے ٹھیر سکتے ہیں۔ لائل پور دور بھی ہے۔ بعد اراکبر کے ادھر پہنچنے کا کم خطرہ ہے۔ سویرے ہی
برے میاں سے نکل جائیں گے۔“

ارشاد الہی اور اس کی ماں نے لالی کی رائے سے اختلاف نہ کیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے
دو تینوں رات گئے تک باتیں کرتے رہے۔ لالی بتاتا رہا کہ آئندہ انھیں کیا کرنا ہوگا۔ ارشاد الہی
اس کی ماں نے پہلے پہل تو لالی کی باتوں کو اہمیت نہ دی۔ طرح طرح کے سوالات کرتے۔ اپنے
رشتات اور شک و شبہ کا اظہار کرتے۔ مگر لالی نے سمجھا بھجا کر آمادہ کر لیا کہ جیسا وہ کہے گا دونوں
ل پر عمل کریں گے۔

لالی بہت تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی سو گیا۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں کلثوم بی بی بھی جھگی کے ایک
اٹے میں سو گئے۔

مچھتیوں اٹھ کر بس میں سوار ہوئے۔ خانے وال پہنچے۔ اسٹیشن جا کر لائل پور کے ٹکٹ
لیا۔ ٹرین آئی تو تیسرے درجے کے ایک ڈبے میں جا کر بیٹھ گئے۔

پہر رات گزر چکی تھی۔ سردی بڑھ چکی تھی۔ لالی لاکل پور پہنچا۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں دونوں ہم راہ تھے۔ سردی سے ٹھہرتے ہوئے تینوں شادو کے گھر پہنچے۔ مگر گھر کے دروازے ٹالا پڑا تھا۔ سخت کوفت ہوئی۔ سردی کے ساتھ سناٹا بھی بڑھ گیا تھا۔ پاس پڑوس کے دروازے تھی۔ گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ لالی حیران و پریشان کھڑا سوچتا رہا۔ کہاں جائے کس کے پاس جائے؟ شادو کے علاوہ شہر میں کوئی شناسا بھی نہ تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے طے کیا رات اسٹیشن کے مسافر خانے میں بسر کی جائے۔

سردی میں زیادہ دیر ٹھہرنا ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ارشاد الہی کی ماں کا برا حال تو بوڑھی تھی اور جسم پر لباس بھی پھٹا پھٹا تھا۔ وہ سردی سے سکڑی سکڑائی ایک کونے میں دبی ہوئی کھڑی تھی۔ بادل غواستہ تینوں واپس ہوئے۔ مگر گلی کے کنارے پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے شادو ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھتے ہی لالی کی جان میں جان آئی۔ لپک کر اس کے قریب پہنچا۔

”اوئے لالی تو اتنی رات کو کہاں سے آچکا؟“ شادو نے آگے بڑھ کر لالی کو اپنے بازوؤں میں لیا۔ محبت سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے گویا ہوا۔ ”تو ہمیشہ ایسے ہی اچانک ملتا ہے۔ کہاں رہا تک؟“

”پہلے گھر کا دروازہ کھول۔ اندر بیٹھ کر آرام سے کل بات ہو گی۔“ لالی نے سردی قہر قہراتے ہوئے کہا۔ ”تو نہ ملتا تو پتہ نہیں اپنا کیا بنتا۔ رات گزارنے اسٹیشن جا رہا تھا۔“

شادو نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ تینوں کو گھر کے ایک کمرے میں پہنچایا۔ چارپائیوں پر جم جھپاک بستر لگائے۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں کو گرم گرم بستر ملے تو ان کے ہوش بجا ہوئے۔

شادو نے لالی کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر لے گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔ ”تو ان دونوں کو سے پکڑ لایا۔؟ کوئی نیا چکر چلایا ہے؟ یہ تو دیکھنے ہی میں بھک مٹکے لگتے ہیں۔“

”ایسا نہ کہہ۔ گودا سپور کے مہاجر ہیں۔ بہت پریشان ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے اپنے خا سے چھڑ گئے۔ نہ جانے کب سے انھیں تلاش کر رہے ہیں۔“ لالی نے کھل کر بات نہ کی۔ ان کے خاندان والوں کو جانتا ہوں۔ دونوں کو ان سے ملانے لے جاؤں گا۔“ اس نے مسکراتے تلفظ سے کہا۔ ”یاد زندگی بھر چوری ڈکیتی کی۔ کبھی کبھی نیک کام بھی کر لیتا چاہیے۔“ اس بات کا رخ فوراً موڑ دیا۔ ”یہ بتا بھائی کہاں ہے؟“

”وہ اپنی چھوٹی بھین کے ویاہ میں شریک ہونے جہلم گئی ہے۔“

”کب تک ادھر رہے گی؟“

”ہفتے بھر سے پہلے تو اس کے واپس آنے کا کوئی پروگرام نہیں۔“ شادو نے لالی کو بتایا۔ ”پر تجھے اس کے واپس آنے کی فکر کیوں ہے؟ جب تک چاہے ٹھہر۔ تو پہلی دفعہ تو اس گھر میں آیا نہیں۔“

”مجھے زیادہ دن ادھر نہیں ٹھہرنا۔ اس کی واپسی سے پہلے ہی چلا جاؤں گا۔“ لالی نے وضاحت کی ساتھ ہی دریافت کیا۔ ”تو آج کل کیا کر رہا ہے؟“

”میاں سبحان ہی کے پاس ہوں۔ ڈرائیوری کر رہا ہوں۔“ شادو نے بتایا۔ ”اسی کے ایک کام سے آیا تھا۔ کل چلا جاؤں گا۔“

”جانے سے پہلے ایک کام کرتا جا۔ مجھے اپنے لیے اور ان دونوں کے لیے کپڑے لے سنوانے ہیں۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”میں چاہتا ہوں جب یہ اپنے گھر والوں کے پاس جائیں تو ٹھیک ٹھاک ہو کر جائیں۔“

”تیرا یہ کام کر کے ہی جاؤں گا۔“ شادو نے لالی سے اتفاق رائے کیا۔ ”تو نے ٹھیک ہی سوچا۔“

”ج کتا ہوں ان کپڑوں میں تو یہ بے چارے بالکل بھکاری لگتے ہیں۔ ان کی مدد کر کے تو نے بہت چنگا کام کیا۔“

دونوں میں مزید بات چیت نہ ہوئی۔ وہ کمرے میں گئے۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں لحافوں میں دبکے ہوئے بے خبر سو رہے تھے۔ شادو اور لالی بھی سونے کے لیے برابر کے کمرے میں چلے گئے۔

صبح اٹھ کر شادو پوریاں اور چھولے لایا۔ تینوں کے ساتھ بیٹھ کر ناشتا کیا۔ میاں سبحان کی لمبی چوڑی پیکار اس کے پاس تھی۔ دن چڑھے تینوں کو اس میں بٹھا کر بازار لے گیا۔ لالی تو سب کے لیے ایک ایک جوڑا سلوانا چاہتا تھا لیکن شادو کے مشورے پر دو دو جوڑے سلوانے پر تیار ہو گیا۔ جو کپڑا انھوں نے پسند کیا شادو نے خریدا۔ لالی نے اصرار بھی کیا۔ مگر شادو نے اس کی ایک نہ سنی۔ قیمت اپنی جیب سے ادا کی اور درزی کو سلنے کے لیے کپڑا دے دیا۔ ساتھ ہی یہ تاکید بھی کی کہ کپڑے جلد سے جلد تیار کر دے۔

دوپہر کو شادو چلا گیا اور یہ وعدہ کیا کہ چند ہی روز میں واپس آکر ان کی خیر خیریت معلوم کرے گا۔ چوتھے روز کپڑے تیار ہو گئے۔ لالی درزی کے پاس گیا۔ سلائی ادا کر کے کپڑے لے آیا۔ تینوں نے اس روز گرم پانی سے غسل کیا۔ نئے لباس پہنے۔ مگر باہر نہ گئے۔ ان کا بیشتر وقت گہری میں گزرتا۔ کبھی بازار بھی جاتے تو چونکنا رہتے۔ ہر دم جعدا راکبر سانول کا خوف دامن گیر رہتا۔

دو روز بعد شادو بھی آگیا۔ اس نے لالی سے پوچھا۔ ”آگے تیرا کیا پروگرام ہے؟“

”تیرا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ لالی نے بتایا۔ ”میاں سے ان دونوں کے ساتھ لمور جاؤں گا۔ وہاں

ایک روز ٹھیر کر دہ پال پور چلا جاؤں گا۔“

”لہور میں تو ٹھیرے گا کہاں؟“ شادو نے دریافت کیا۔

”غنی چٹا کے پاس ٹھیرنے کا ارادہ ہے۔“ لالی نے بے زاری کا اظہار کیا۔ ”سچ پوچھ تو میں اس کے پاس ٹھیرنا نہیں چاہتا۔ تجھے پتہ ہے وہ چوری ڈکیتی کرتا ہے۔ اور میں نے یہ دھند بالکل چھوڑ دیا۔“

”یہ تو نے ٹھیک سوچا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔“ شادو نے خوش نودی کا اظہار کیا۔ ”میں چنے کو کبھی نہیں ملا۔ صرف اتنا سنا ہے کہ کئی بار کسرا یافتہ ہے۔ اس کے پاس تیرا ٹھیرنا ٹھیک نہیں۔ پولیس تجھے بھی مشتبہ نظروں سے دیکھے گی۔“ اس نے تجویز پیش کی۔ ”اگر تو کل لہور چلنا چاہے تو میرے ساتھ چل۔ میں لہور ہی جا رہا ہوں۔ ادھر میاں بھان کی کوٹھی ہے۔ انیکسی میں جب تک چاہے ٹھیر سکتا ہے۔ ویسے کوٹھی بھی بالکل خالی ہے۔“ میاں بھان پر سوں رحیم یا رخاں جا رہا ہے۔ ادھر اس کی شکار گاہ ہے۔ باہر سے سمان آئے ہیں۔ میاں بھان ان کے ساتھ شکار کھیلے گا۔“

لالی نے اس کی تجویز بلا غدر مان لی۔ دوسرے روز ارشاد الہی اور اس کی ماں کے ہم راہ میاں بھان کی چمکتی دکتی پیکارڈ میں بیٹھ کر لالی لہور چلا گیا۔ شادو نے حسب وعدہ تینوں کے قیام کا بندوبست میاں بھان کی کوٹھی کی انیکسی میں کر دیا۔ شادو رخصت ہوتے وقت حسب معمول لالی سے گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہوا۔ اس کی پیٹھ محبت سے تھپکتے ہوئے بولا۔ ”دہ پال پور سے واپسی پر بھی ادھر ہی ٹھیر جانا۔ میں کوٹھی کے نوکروں کو بول دوں گا۔ فکر نہ کر، تو ادھر آرام سے رہ سکتا ہے۔ میں بھی ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔“

شادو چلا گیا۔

تینوں نے رات انیکسی میں بسر کی۔ صبح ہوئی۔ دن چڑھے لالی نے ارشاد الہی کو اپنے ہم راہ لیا۔ انارکلی گیا۔ بازار سے اپنے اور ارشاد الہی کے لیے ملے دار کھتے خریدے۔ عمدہ ململ کی پگڑیاں اور ان کے ساتھ کا مدار سنہرے کلاہ بھی لیے۔ دو اونٹ لویاں بھی خریدیں۔ کلثوم بی بی کے لیے ایسی قیمتی جوتی خریدی جو بڑے گھرانوں کی زمیں دارنیاں اور چوہدرائیاں پہنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے لیے سفید کشمیری شال بھی لی جس پر سنہری کلاہ جو سے کشیدہ کاری کی گئی تھی۔

بازار سے واپسی کے بعد تینوں نے نما دھو کر نئے لباس پہنے۔ میلے کپڑے دھلنے کے لیے ایک ملازم کے سپرد کیے۔ کوٹھی سے نکل کر اسٹیشن گئے۔ ریل گاڑی میں سوار ہر کر منگمری پہنے اور وہاں

سے بس میں بیٹھ کر پاک پتن کے راستے کو ملد ہر کشن روانہ ہو گئے۔ علی رحمان کے اڈے پر بس سے اترے اور تانگے میں بیٹھ کر کو ملد ہر کشن پہنچ گئے۔



سرما کی شام ختم ہو رہی تھی۔ مگر کمر میں لپٹا ہوا کو ملد ہر کشن جاگ رہا تھا۔ گھروں میں چل پھل تھی۔ ملی جلی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ چراغوں کی دھندلی دھندلی روشنی کہیں کہیں ٹھنڈا رہی تھی۔ تانگا حویلی کے سامنے جا کر ٹھہرا۔ لالی تانگے سے اتر ا۔ ارشاد الہی بھی اپنی ماں کے ساتھ نیچے اتر ا۔ لالی نے تانگے والے کو کرایہ دیا۔ تانگا مڑا اور علی رحمان کی جانب واپس روانہ ہوا۔

نادر خان حویلی کے بڑے دروازے ہی پر مل گیا۔ اس نے تینوں کو حیرت سے دیکھا۔ ان کے لباس اور وضع قطع سے خاصا مرعوب بھی ہوا۔ خندہ پیشانی سے آنے کا سبب دریافت کیا۔

لالی نے بے نیازی سے کہا۔ ”نادر چل کر آرام سے بات ہوگی۔“

نادر خان نے مزید پوچھ گچھ کرنے سے گریز کیا۔ خاموشی سے انھیں حویلی کے اندر لے گیا۔ بڑے کمرے میں گیا۔ تینوں کو صوفوں پر بٹھایا۔ کمرے کی آرائش سے جاگیر دارانہ شان و شوکت جھلکتی تھی۔ کلثوم بی بی نے گھبرا کر اپنی شال کے پلو سے بکل مارا اور منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ ارشاد الہی بھی گم صم تھا۔

لالی چونکہ پہلے بھی آچکا تھا لہذا وہ زیادہ اجنبیت محسوس نہیں کر رہا تھا۔

نادر خان نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اپنے بارے میں بتایا۔ ”میں جی یہاں کانپیر ہوں۔ میرا نام نادر خان ہے۔“

لالی نے اپنے متعلق کچھ کہنے سے اجتناب کیا۔ ارشاد الہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”یہ جی چوہدری نور الہی کا پتر چوہدری ارشاد الہی ہے۔“ اس نے مڑ کر کلثوم بی بی کی طرف دیکھا۔ ”اور یہ اس کی گھر والی ہے۔“

نادر خان نے حیران و پریشان ہو کر دونوں کو دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد دم بخود بیٹھا رہا۔ مگر جہاں دیدہ اور معاملہ فہم تھا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ کھنکار کر گلا صاف کیا۔ نرم لہجے میں بولا۔ ”چوہدری بھی اکثر ان کا ذکر کرتا تھا۔ برسوں ان کو جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا۔“

”ضرور ڈھونڈتا ہو گا۔ یہ بھی اسے برسوں سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ پاکستان آتے ہوئے ایسے پھڑے کہ اب تک نہ مل سکے۔“ لالی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”ارشاد الہی تو ان دونوں چھوٹا ہو گا۔ اسے تو زیادہ یاد نہ ہو گا۔“

”چھوٹا تو ضرور تھا۔ پر مجھے بھی سہ پتہ ہے۔“ ارشاد الہی نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ ماں نے بھی اس کی تائید کی۔ ”اسے پتہ تو ہوتا چاہیے، جب ہم نے نصیر پور چھوڑا تو یہ لگ بھگ دس برس کا رہا ہو گا۔“

”بے جی۔“ لالی نے ارشاد الہی کی ماں کو نادر خان کے سامنے احترام سے مخاطب کیا۔ ”پر جتنا تجھے پتہ ہو گا اسے اتنا کہاں معلوم ہو گا۔“ اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ ”تو نے تو سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو گا۔“

”ہن جی کیوں نہیں دیکھا۔“ اس نے آہ سرد کھینچی۔ ”کیا بتاؤں، کیسے بتاؤں۔ ہم پر کیا کیا گزری۔ اب تو سب کچھ ڈراؤنا سفنہ لگتا ہے۔“ اس کے چہرے پر افسردگی کے سائے پھیل گئے۔ ”نصیر پور میں شان سے رہتے تھے۔ ادھر اپنی بہت وڈی زمیں داری ہوتی تھی۔ کیا نہیں تھا ہمارے پاس۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے نظریں جھکا کر سوچتی رہی، پھر گویا ہوئی۔ ”میں نوں اب تک یاد ہے۔ عید سے ایک روز پہلے کی گل ہے۔ سب خوشی خوشی عید کا چاند دیکھ رہے تھے۔ ٹھیک سے دیکھ بھی نہ سکے تھے اتنے میں سکھ بلوائیوں نے پنڈ پر حملہ کر دیا۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔ ”ہائے وہ کیسی ڈراؤنی کالی رات تھی۔ سب کچھ گھر میں چھوڑ چھاڑ کر ایسے نکلے کہ دوبارہ اسے دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ نہ جانے کیسے چھپتے لکتے ڈرے ڈرائے کسی نہ کسی طرح تریموں کے چتن پر پہنچے۔ نہ پوچھ ادھر کیسا کیسا ظلم ہوا۔ ان آنکھوں نے کیا کیا دیکھا۔“ اس نے بے قرار ہو کر آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”ہائے رہا۔ تب ہی مرجاتی تو ٹھیک تھا۔“

اس کی آواز گلو گیر ہو گئی۔ آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ نادر خان سکتے کے سے عالم میں خاموش بیٹھا رہا۔ لالی بھی گم سم تھا۔

کلثوم بی بی سسکیاں بھرتی رہی اور رک رک کرتی رہی کہ تریموں کے چتن پر کس طرح بلوائی گھوڑے دوڑاتے ہوئے اچانک حملہ آور ہوئے۔ کس طرح انھوں نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ حملہ آوروں سے جان بچانے کے لیے کیوں کر انھوں نے قریب کے کھیتوں میں پناہ لینے کی کوشش کی۔ کیسے اس کی جوان بیٹی صابرہ کو بلوائی اٹھا کر لے گئے اور بہن کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش میں اس کا پہلوئی کا جوان بیٹا کرم الہی مارا گیا۔ ہر طرف لاشیں ہی لاشیں نظر آتی تھیں۔ اوپر سے موسلا دھار بارش ہوتی تھی۔ دور دور تک کھیتوں کے سوا کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی تھی۔ بلوائی بالکل اچانک حملے کرتے تھے اور اندھا دھند فائرنگ کرتے تھے۔ ملاح کشتیوں پر راوی کے اس پار لے جانے کا بھاری کرایہ مانگتے تھے۔ ہر طرف افرا تفری مچی تھی۔ اسی افرا تفری میں

شوہر بھی بیوی بچوں سے نچھڑ گیا۔ پاکستان پہنچ کر بھی اس سے ملنا نصیب نہ ہوا۔

ارشاد الہی بھی بیچ بیچ میں لقمہ دیتا رہا۔ کبھی ماں کی تائید کرتا کبھی وضاحت کرتا۔ کوئی بات بھول جاتی تو یاد دلانے کی کوشش کرتا۔

نادر خان یہی درد ناک روداد رحیم داد کی زبانی بھی سن چکا تھا۔ لیکن کلثوم بی بی نے جس قدر وضاحت سے رو رو کر اور دل گرفتہ ہو کر اسے سنایا، نادر خان اسے سن کر بہت متاثر ہوا۔ بجھے ہوئے لمبے میں بولا۔

”چوہدرانی، تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تیرے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ پر تو اب تک کہاں رہی؟ چوہدری کو تلاش کرتی ہوئی ادھر کیوں نہیں آئی؟“

کلثوم بی بی تو خاموش رہی۔ اس کے بجائے صرف ارشاد الہی کو بولنا تھا۔ لالی اسے اور اس کی ماں کو پچھلے چند دنوں میں اچھی طرح سمجھا بجا چکا تھا۔ ضروری ہدایات دے چکا تھا۔ چنانچہ ارشاد الہی نے فوراً وضاحت کی۔

”میں ماں کے ساتھ پہلے یہاں آیا تھا۔ تب میرا بیو ادھر نہیں ہوتا تھا۔ جب وہ نہ ملا تو اسے ڈھونڈتا ہوا کیمبل پور چلا گیا۔ کسی نے بتایا تھا کہ وہ ادھر ہوتا ہے۔ تب سے ہم دونوں کیمبل پور میں رہے۔ ادھر آہی نہیں سکے۔“

”لیکن تم دونوں نے بہت دیر کر دی۔“ نادر خان نے مطلع کیا۔ ”مجھے یہ بتاتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔“ اس نے گہری سانس بھری۔ ”وہ اپنے رب کے پاس چلا گیا۔ اس نے دوسرا ویاہ کر لیا تھا۔ اس کی دوسری گھر والی کا نام شاداں تھا۔ پر چوہدری کی اس سے بی بی نہیں۔ وہ بہت ضدی اور جھگڑالو زبانی تھی۔ اس کا غصہ بہت خراب تھا۔ ایک رات غصے سے ایسی پاگل ہوئی کہ اس نے سوتے میں چھری سے چوہدری کا گلا کاٹ ڈالا اور اسی چھری سے اپنے گلا کاٹ کر خود کشی کر لی۔ دونوں ہی ختم ہو گئے۔“

”ہم کو اس کی اطلاع مل چکی ہے۔“ لالی نے ارشاد الہی اور اس کی ماں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان دونوں کو جب اس کا پتہ چلا تو بہت روئے پیٹے۔ بہت سیپا کیا۔“ وہ اب حرف مطلب پر آنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی کلثوم بی بی تنک کر بولی۔

”نہیں جی، نہ ہم نے کوئی بیٹی ڈالی، نہ سیپا کیا۔ ہم نے اس سے کیا لیتا تھا۔ وہ نہ جانے کون بندہ تھا۔ ہم نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

لالی بہت سٹ پٹایا۔ وہ چاہتا تھا کہ رحیم داد کے ذکر کے بغیر ہی کام چل جائے۔ اس نے کوئلہ

ہر کشن جانے سے پہلے ارشاد الہی اور اس کی ماں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کم سے کم بولیں۔ اسی وقت بولیں جب وہ ان سے بولنے کو کہے اور وہ جو کچھ کہے اسے خاموشی سے سن لیں۔ نہ اس کی مخالفت کریں اور نہ ہی اس کی کسی بات کی تردید کرنے کی کوشش کریں۔

ارشاد الہی نے لالی کی پریشانی بھانپ لی۔ اس نے فوراً ماں کو ٹوکا۔ ”اماں، لالی جو کہہ رہا ہے اسے کہنے دے۔ تو بچ میں نہ بول۔“

”وے، میں کیوں نہ بولوں؟ تو چپ کر۔“ اسے بیٹے کی بات سخت ناگوار گزری۔ تھکے لہجے میں بولی۔ ”لالی کو کیا پتہ تیرا بچو کیسا بندہ تھا۔ میں نوں پتہ ہے اس نے کوئی دوسرا دیا نہیں کیا۔ وہ بہت نیک بندہ تھا۔ مجھے بہت پیار کرتا تھا۔ دوسرا دیا کرنے کی تو وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔“ اس نے نادر خان کی طرف دیکھا۔ ”میرے گھروالے کی نہ دوسری گھر والی تھی نہ کسی نے چھری سے گلا کاٹ کر اس کا خون کیا۔ وہ تو برسوں پہلے مر گیا تھا۔ تخت ہزارہ کے نزدیک چک ۵۸ میں اس کی موت ہوئی تھی۔ میں نے اس کی کبر بھی دیکھی ہے۔“ اس نے ارشاد الہی کو مخاطب کیا۔ ”شادے، اپنے بچو کی کبر تو تو نے بھی دیکھی ہے۔ اکبر اور اس کی گھر والی جیناں نے دکھائی تھی۔ تیں نوں یاد ہے ناں۔“

ارشاد الہی نے جھنجھلا کر ماں کو تیکھی نظروں سے دیکھا۔ لیکن کچھ بولا نہیں۔ لالی بھی خاموش رہا۔ مگر نادر خان خاموش نہ رہ سکا۔

”چوہدری کی باتوں سے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ کوئلہ ہر کشن کا جو زمیں دار تھا وہ کوئی دوسرا ہی چوہدری نور الہی تھا۔“ اس نے اس دفعہ براہ راست لالی کو مخاطب کیا۔ ”تجھے کسی نے غلط اظہار دی۔“

لالی نے بات بگڑتے دیکھی تو فوراً پتہ بدلا۔ اب کھل کر بات کرنے کے سوا چارہ کار نہ رہا تھا۔ اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”نادر خان، جیسا تو سوچ رہا ہے ایسا نہیں ہے۔ بے جی کو پتہ نہیں۔“

”کیوں نہیں پتہ؟“ کلثوم بی بی نے تلخ لہجے میں مداخلت کی۔ ”میں مرنے والے کے خلاف کوئی غلط بات نہیں سن سکتی۔“ وہ بے قرار ہو کر رونے لگی۔ سسکیاں بھر کر این کرنے لگی۔ ”ہائے اب وہ نہیں رہا تو اس پر الزام لگائے جا رہے ہیں۔ اسے بدنام کیا جا رہا ہے۔ میں نصیباں دی ماری۔ سن نے کو زندہ ہی کیوں رہ گئی؟“

لالی کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر اس نے ضبط سے کام لیا۔ نرم لہجے میں کلثوم بی بی کو مخاطب کیا۔ ”بے جی، کوئی تیرے گھروالے پر نہ الزام لگا رہا ہے نہ اسے بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مجھے پوری بات کہہ لینے دے۔“

ارشاد الہی نے لالی کی تائید کی۔ ”لالی ٹھیک کہہ رہا ہے اماں۔ تو چپ کر کے اماں کی گل بات سن لے۔“

لالی نے مڑ کر نادر خان کی جانب دیکھا۔ ”ہاں تو جی میں یہ بتا رہا تھا کہ میں نے کوئی غلط گل بات نہیں کہی۔ بے جی بھی ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اسے یہ پتہ نہیں کہ اس پنڈ کا جو زمیں دار تھا وہ اس کا گھر والا چوہدری نور الہی نہیں تھا۔ نہ وہ مہاجر تھا اور نہ کبھی نصیر پور میں رہا تھا۔ اس کا اصلی نام رحیم داد تھا۔ وہ اسی ضلع کے پنڈ احمد کوٹ کا رہنے والا تھا۔ ادھر اس کی چھوٹی سی زمیں داری ہوتی تھی۔ کھیتوں کی وٹ بندی پر اس کا اپنے ہی پنڈ کے ایک زمیں دار سیف اللہ سے جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے میں سیف اللہ مارا گیا۔ رحیم داد کو سزا ہو گئی اور وہ جیل میں بند کر دیا گیا۔“ لالی سنبھل کر بولتا رہا۔ ”ایک رات وہ جیل سے فرار ہو گیا۔ اور نہریاری دو آب کے نزدیک ویران بٹیوں میں جا کر چھپ گیا۔ ادھر اسے کمال پور کا حکیم چشتی مل گیا۔ اسے رحیم داد نے کتل کر دیا۔ اپنی جیل کی وردی اسے پناہ دی اور اس کے کپڑے لئے خود پن لے لیے۔ پولیس نے اسے رحیم داد کی لاش سمجھا اور احمد کوٹ لے جا کر دفن کرا دیا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟“ نادر خان نے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ ”کپڑے لئے بدل لینے سے دونوں کی شکلیں تو نہیں بدل گئیں۔ پولیس ایسی غلطی نہیں کر سکتی۔ تیری بات سمجھ نہیں آئی۔“

”رحیم داد نے لاش کو پتھر سے کچل کر ایسا بگاڑ دیا تھا کہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔“ لالی نے وضاحت کی۔ ”پولیس نے اس کی شناخت جیل کی وردی سے کی۔ رحیم داد نے پولیس کو دھوکا دینے کے لیے لاش کو بگاڑا ہی کچھ اس طرح تھا۔“

”وہ اتنا دھوکے باز تھا۔ یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔“ نادر خان نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”چپ کر کے سنتا جا۔ وہ کتنا ڈاڈا دھوکے باز تھا۔ تجھے اس کا کچھ انداز نہیں۔“ لالی نے نادر خان کو بتایا۔ ”حکیم چشتی کا خون کرنے کے بعد وہ چک ۵۸ پہنچا۔ وہاں اسے چوہدری نور الہی مل گیا۔ وہ کئی روز تک اس کے گھر میں چھپا رہا۔ چوہدری ان دنوں سخت بیمار تھا۔ میرا خیال ہے اس نے اپنے اور اپنے کلیم کے بارے میں رحیم داد کو سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک رات چوہدری چل بسا۔ اس کے مرنے کے بعد رحیم داد نے اس کے کلیم کے کاغذات چرائے اور رات کے اندھیرے میں باہر نکل

گیا۔ گرفتاری سے بچنے کے لیے اس نے داڑھی رکھ لی۔ آنکھوں پر چشمہ لگانے لگا۔ اپنا نام بدل کر چوہدری نور الہی رکھ لیا۔ جمل سازی اور چار سو بیسی کر کے چوہدری نور الہی کے کلیم پر متروک اراضی اور جائیداد کی الاٹمنٹ کرائی اور اس طرح کوئلہ ہر کشن کا زمین دار بن گیا۔ لالی نے مسکرا کر نادر خان کی طرف دیکھا۔ ”اب تو سب کچھ تو ٹھیک طرح سمجھ گیا۔“ پھر وہ کلثوم بی بی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ”بے جی، تجھے بھی اصل گل بات کا پتہ چل گیا۔“

”تو نے جو کچھ بتایا ہو سکتا ہے ٹھیک ہی ہو۔“ نادر خان نے مشتبہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”پر یہ سمجھ نہیں آئی۔ تجھے ان باتوں کا کیسے پتہ چلا؟ تیری اس سے یاری دوستی ہوتی تو کبھی اس کے پاس ضرور آتا۔ پر میں تو یہاں کئی برس سے ہوں۔ میں نے تجھے ادھر کبھی نہیں دیکھا۔“

یہی وہ نازک مرحلہ تھا جس سے بچنے کے لیے وہ رحیم داد کے ذکر سے کترا رہا تھا۔ لالی کو یہ خدشہ تھا، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے وہ باتیں بتانے پر مجبور ہونا پڑے جن کے اظہار سے بات بننے کے بجائے بگڑ جائے اور رحیم داد اور شاداں کے قتل کے شبے میں اسے دھریا جائے۔ بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ مگر وہ ارشاد الہی اور اس کی ماں کی طرح سادہ لوح اور گھامڑ نہیں تھا۔ جہاں دیدہ اور گھاگ تھا۔ برسوں عادی مجرموں کے ساتھ رہ چکا تھا۔ پولیس سے بار بار سابقہ پڑ چکا تھا۔ لہذا بات بتانے کا گر جانتا تھا۔ اس نے حاضر دماغی سے کام لیا۔ نادر خان کے استفسار پر بتایا۔

”رحیم داد سے میری جان پہچان تھی۔ پر جب پولیس نے یہ بتایا کہ سربراہی دو آب کے نزدیک اسے قتل کر دیا گیا تو میں نے بھی مان لیا کہ وہ مر گیا۔ مجھے کیا پتہ وہ نام بدل کر ادھر زمیں داری کر رہا ہے۔ پچھلے دنوں ایسا ہوا کہ برسوں بعد مجھے اچانک رحیم داد کا بہت پرانا اور گریا ر جمال دین مل گیا۔ وہ مجھے بھی جانتا ہے۔ اسی نے مجھے رحیم داد کے بارے میں ساری باتیں بتائیں۔ شاید وہ مجھے یہ راز کبھی نہ بتاتا۔ پر اب تو رحیم داد اس دنیا سے جا چکا ہے۔ جمال دین اس کے بارے میں مجھ سے کچھ چھپاتا تو کس کے لیے چھپاتا۔“ قدسے توقف کے بعد وہ حرف مطلب پر آگیا۔ ”جمال دین سے مجھے یہ باتیں معلوم ہوئیں تو میں ان دونوں کو لے کر یہاں آگیا۔“

”یہاں کیوں آئے؟“ نادر خان نے انجان بننے کی کوشش کی۔

”رحیم داد نے جو کچھ کیا وہ جانے اور اس کا رب جانے۔ جو ہوتا تھا وہ تو ہو گیا۔“ لالی نے کھل کر بات کی۔ ”پر اس نے جو زمیں داری اور جائیداد چھوڑی ہے اس کا اصلی مالک تو چوہدری نور الہی تھا ناں۔ اس کے وارثوں کی حیثیت سے اس پر ان دونوں کا حکم بنتا ہے۔ اب یہ زمیں داری اور جائیداد ان کو ملنی چاہیے۔ یہی اس کے اصلی وارث ہیں۔“

نادر خان پر انا گھاگ تھا اور جس کا نمک کھاتا تھا اس کا وفا دار بھی تھا۔ اس نے لالی کی مطلق حوصلہ افزائی نہ کی۔ بے رخی سے بولا۔ ”مجھے یہ تو پتہ نہیں اصلی چوہدری نور الہی کون تھا اور جعلی چوہدری نور الہی کون تھا۔ اور نہ مجھے یہ پتہ ہے کہ یہ دونوں کس کے وارث ہیں۔“ اس نے سراسر دروغ گوئی سے کام لیا۔ ”میں تو یہ جانتا ہوں کہ ادھر کا جو زمیں دار ہوتا تھا اس نے موت سے پہلے اپنی زمیں داری اور جائیداد پیراں والہ کے زمیں دار سید احسان علی شاہ کے ہاتھ بیچ کر دی تھی۔“ لالی اس کی بات سن کر چونکا۔ رحیم داد نے مرنے سے پہلے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تھا۔ ہر راز پر سے پردہ اٹھا دیا تھا۔ لیکن اس نے اشارہ تک نہ کیا کہ اپنی زمیں داری اور جائیداد فروخت کر دی ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتا۔ لالی نے دبی زبان سے اپنے شک و شبہ کا اظہار کیا۔ ”میں نے سنا ہے وہ تو بہت شان سے زمیں داری کر رہا تھا اور بہت خوش بھی تھا۔ اسے زمیں داری اور جائیداد بیچنے کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟“

”تمیں نوں پتہ نہیں۔ وہ لاکھ پور میں کپڑا بنانے کا بہت وڈا کارخانہ لگا رہا تھا۔ کارخانے کے لیے اسے زمین کی الاٹمنٹ بھی مل گئی تھی۔“ نادر خان نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے جواز پیش کیا۔ ”کارخانہ لگانے کے لیے اسے بہت زیادہ روپے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بھی مشورہ کرتا رہتا تھا۔“ اس نے اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کی۔ ”میں نے منع بھی کیا، پر وہ نہ مانا۔ زمیں داری اور جائیداد بیچ کر دی۔ اسے ڈیرہ غازی خان کے موضع دلاور والا میں بھی کلیم کی بنیاد پر اڑھائی سو ایکڑ متروکہ زرعی اراضی الاٹ ہوئی تھی۔ اس نے وہ اراضی بھی راجن پور کے زمیں دار سردار عظمت اللہ دریشک کے ہاتھ بیچ کر دی۔“

نادر خان نے اس طرح ہمارک بات کی کہ لالی کی ساری امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس نے سوچا تھا کہ ارشاد الہی اور اس کی ماں کو زمیں داری اور جائیداد مل گئی تو اسے بھٹے کی صبر آزما زندگی سے نجات مل جائے گی۔ ارشاد الہی اسے زمیں داری میں اپنے ساتھ لگے گا۔ اس نے لالی سے ایسا وعدہ بھی کیا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی کے سائے پھیل گئے۔ اس نے انکھتے ہوئے پوچھا۔

”بیچ کی رجسٹری وغیرہ بھی ہو گئی؟“

نادر خان اس کے استفسار پر کچھ گھبرا گیا۔ اس نے دبی زبان سے بتایا۔ ”بیچ کی رجسٹری شاید نہیں ہوئی۔“

لالی کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اس نے کرید کر دریافت کیا۔ ”بیچ کی رجسٹری کیوں نہیں ہوئی؟ کوئی خاص وجہ تھی؟“

”مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں۔ جب بیچ کا معاملہ طے ہو رہا تھا میں ان دنوں سخت بیمار تھا۔ مجھے ٹائی فائڈ ہو گیا تھا۔“ نادر خان نے عذر پیش کیا۔ ”بیچ کی رجسٹری شاید اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ مارشل لاک کی زرعی اصلاحات کا کچھ چکر پڑ گیا تھا۔ پر میں نے وہ مختار نامہ دیکھا ہے جو چوہدری نے مرنے سے پہلے احسان علی شاہ کو دیا تھا۔“

”پر مختار نامے کی بنیاد پر کسی جائیداد کے وارثوں کو ان کے حک سے محروم تو نہیں کیا جاسکتا۔“ لالی نے جیل میں قیدیوں سے سنی سنائی باتوں کا سہارا لیا۔ ان سے جو معلومات حاصل کی تھیں ان کی روشنی میں اپنی قانونی سوجھ بوجھ کا اظہار کیا۔ ”میں نے تو اس سلسلے میں یہی سنا ہے۔“

”یہ تو کوئی وکیل ہی بتا سکتا ہے۔“ نادر خان نے اس سے انجھنے کی کوشش نہیں کی۔

”یہاں آنے سے پہلے ہم نے وکیل سے مشورہ کیا تھا۔“ لالی نے نادر خان کو مرعوب کرنے کے لیے نیا حربہ آزمایا۔ ”بلکہ ہم تو وکیل کو ساتھ لے کر آ رہے تھے۔ پر یہ سوچ کر اسے نہ لائے کہ پہلے معلومات حاصل کر لی جائیں۔“

ارشاد الہی اور اس کی ماں نے حیرت زدہ نظروں سے لالی کو دیکھا۔ مگر خاموش بیٹھے رہے۔

لالی کا حربہ کار آمد ثابت ہوا۔ نادر خان اس کی باتوں سے واقعی مرعوب ہو گیا۔ اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”زمین داری اور جائیداد کے بارے میں تو ساری معلومات احسان شاہ سے ہی مل سکتی ہیں۔ ادھر کا زمین دار تو وہی ہے۔ میں تو پہلے بھی نیچر تھا اور اب بھی نیچر ہوں۔“

”تو مجھے احسان شاہ سے ملو ادے۔“ لالی نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”اصلی گل بات تو ہم نے اسی سے کرنی ہے۔“ اس نے ذرا جما کر بات کی۔ ”مختار نامہ دیکھتا ہے۔ اور دوسرے ضروری کاغذات بھی دیکھتے ہیں۔“

”شاہ جی سے ضرور مل لیں۔“ نادر خان نے بلا عذر اس کی بات مان لی۔ ”آج تو وہ پیراں والہ میں ہے۔ عام طور پر ادھر ہی ہوتا ہے یا گھر میں۔ ادھر بھی آتا رہتا ہے۔“

”وہ یہاں کب آئے گا؟“ لالی نے دریافت کیا۔

”کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ یہاں کب آئے گا۔ اس کی مرضی ہے۔ جب جی کرتا ہے آ جاتا ہے۔“

نادر خان نے لالی کو بتایا۔ ”دیے میں اسے اطلاع کروادوں گا۔ تب تک تم تینوں مہمان خانے میں ٹھہرو۔“ وہ کھل کر مسکرایا۔ ”تھکے ہوئے ہو۔ آرام کرو۔ روٹی ٹکڑاؤ۔“

نادر خان نے ملازم کو بلایا۔ تینوں کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ ”یہ تینوں مہمان ہیں۔ ان کو مہمان خانے میں لے جا۔ لٹا سے کھانا کو آرام سے رکھے۔ کسی طرح کی بھی تکلیف نہ ہو۔“

لالی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ارشاد الہی بھی کھڑا ہو گیا۔ اس کی ماں بھی گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر انھی تینوں ملازم کے ہم راہ باہر چلے گئے۔

نادر خان اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے سے پریشانی آشکارہ تھی۔ لالی نے اپنی باتوں سے اسے الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اٹھا اور اسی وقت پیراں والہ جانے کا ارادہ کیا۔



مہمان خانے کا اب نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ اس کی از سر نو تعمیر کی گئی تھی۔ توسیع بھی کی گئی تھی۔ پہلے مہمانوں کے قیام کے لیے صرف تین کمرے تھے۔ جنہیں ڈھا کر پانچ نئے کمرے تعمیر کیے گئے تھے۔ پرانا فرنیچر ہٹا کر نیا فرنیچر ڈالا گیا تھا۔ ایک بڑا کمرہ تھا جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں سلیپ سے صوفہ سٹ رکھے تھے۔ بڑی چھوٹی میزیں تھیں۔ کرسیاں تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر خوش رنگ پردے ڈالے گئے تھے۔ کمروں کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے سامنے کشادہ صحن تھا۔ اس کا کچا فرش پختہ کر دیا گیا تھا۔ صحن کے ارد گرد کرسیاں تھیں۔ ان میں گلاب کثرت سے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ موسمی پودے بھی تھے جن میں رنگا رنگ پھول ہوا کے جھونکوں سے جھومتے تھے۔ فضا کو معطر کرتے تھے۔

صحن کے ایک گوشے میں مہمان خانے کی دیکھ بھال کرنے والے نوکروں کی رہائش کے لیے کوٹھریاں تھیں۔ چار دیواری بھی نئی تعمیر کی گئی تھی۔ اس میں لکڑی کا مضبوط دروازہ لگایا گیا تھا۔

عرصہ ہوا جنب لالی بھی مہمان خانے میں ایک رات قیام کر چکا تھا۔ اس وقت رحیم داد زندہ تھا۔ لالی نے مہمان خانے کو اس بار دیکھا تو بہت مرعوب ہوا۔ اس کی شان ہی نزالی تھی۔ اسے علیحدہ کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں کا قیام ایک ہی کمرے میں تھا۔ مگر یہ کمرہ بڑا تھا۔ اس میں دو مسکریاں تھیں جن پر اچلے بستر لگے تھے۔ ہر مسکری کے ساتھ میز رکھی تھی۔ میزوں کے علاوہ بیٹھنے کے لیے کرسیاں بھی موجود تھیں۔ کمروں میں خوبصورت لیپ روشن تھے۔ لالی کی طرح ارشاد الہی اور اس کی ماں، دونوں ہی مہمان خانہ دیکھ کر مرعوب ہوئے تھے۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی مرعوب ہوئے۔ حیرت سے نظریں اٹھا کر ہر طرف دیکھتے تھے۔

لالی نے رات کا کھانا ارشاد الہی اور اس کی ماں کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ ملازم نے دونوں میزوں ملا کر کھانا سلیپ سے چن دیا تھا۔ بیٹھنے کے لیے میزوں کے ارد گرد کرسیاں لگا دی تھیں۔ کھانا لگانے کے بعد وہ دہلیز کے قریب مودب کھڑا رہا۔ کھانے کے دوران کسی کو پانی پینے کی خواہش ہوتی تو فوراً

برہہ کر شیشے کے جگ سے گلاس میں پانی ڈالتا اور اسے احتیاط سے پیش کرتا۔ کھانا خوب مرغن تو اور خوش ذائقہ بھی تھا۔ تینوں بھوکے بھی تھے۔ انھوں نے بہت رغبت سے کھانا کھایا۔

تینوں کھانے سے فارغ ہوئے تو ملازم نے برتن اٹھائے۔ دونوں میز جھاڑن سے صاف کیر اور انھیں اپنی سابقہ جگہ پر رکھ دیا۔ کمرے سے باہر جاتے ہوئے وہ ہٹکا۔ مسکرا کر نرم لہجے میں گویا ہوا۔

”میرا نام لہتا ہے جی۔ تینوں پتہ ہی ہے۔ پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ میں ابھی جاگ رہا ہوں۔ اپنی کوٹھڑی میں رہوں گا۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیں۔“

”نہیں، جی اب کوئی ضرورت نہیں۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”روٹی تو نے مزیدار کھلائی۔ جی خوش ہو گیا۔“

لہتا نے لالی کی جانب کوئی توجہ نہ دی۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں کو غور سے دیکھا اور چند لمبے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر مڑا اور خاموشی سے چلا گیا۔ کلثوم بی بی نے جیسے لہجے میں کہا۔ ”لہتا مجھے اور شادا کو گھور کیوں رہا تھا؟“ اس کے لہجے میں شبہ تھا۔

”اپنے نئے زمیں دار اور اس کی ماں کو دیکھ رہا تھا۔“ لالی بے تکلفی سے ہنسنے لگا۔ ”آگے اس نے ادھر نوکری جو کرنی ہے۔ بے بے‘ تو نے یہ نہیں دیکھا۔ لہتا نے کیسے آرام سے روٹی کھائی۔“

”ہشیار اور کام کا بندہ لگتا ہے۔“ ارشاد الہی نے لہتا کے بارے میں خوش نودی کا اظہار کیا۔

”اسے ہشیار تو ہونا ہی چاہیے۔“ لالی نے ارشاد الہی کی رائے سے اتفاق کیا۔ ”ادھر مہمان خانے میں دوڑے افسر اور زمین دار آکر ٹھہرتے ہیں۔ ان کو ہر طرح خوش رکھنا پڑتا ہے۔“

”ویسے مہمان خانہ ہے بہت شاندار۔“ ارشاد الہی نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں جی بہت شاندار ہے۔ پر حویلی بھی کم شاندار نہیں۔“ لالی نے مسکرا کر ارشاد الہی کو دیکھا۔ ”اب تو ادھر کا زمیں دار تو بن ہی رہا ہے۔ جیسی مرضی ہو ویسی شاندار حویلی بھی کر لیتا۔“

”ایسا اپنا نصیب کہاں جو اتنی وڈی زمیں داری اپنی بن جائے اور رہنے کو ایسی شاندار حویلی ملے۔“ ارشاد الہی کی ماں کلثوم بی بی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مجھے تو سب کچھ ابھی تک سنہ ہی لگتا ہے۔“

”ماں ٹھیک ہی کہہ رہی ہے۔“ ارشاد الہی نے مجھے ہوئے لہجے میں ماں کی تائید کی۔ ”مجھے تو زمیں داری اور جائیداد ملتی ملاتی معلوم نہیں ہوتی۔“

”شادے‘ حوصلے سے کام لے۔“ لالی نے اس کی مایوسی رفع کرنے کی کوشش کی۔ ”زمیں داری

اور ساری جائیداد تو تجھے ملنی ہی ملنی ہے۔ ہم نے کوئی دھوکا فریب تو کرنا نہیں۔ اس پر تیرا پورا پورا حکم بنتا ہے۔ یہ تیرے پیو کی جائیداد ہے۔ تو اور تیری ماں اس کے اصلی وارث ہیں۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا۔“

”تو ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ پر نادر خان کی باتوں سے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔“ ارشاد الہی ہنوز غیر مطمئن تھا۔

”یار تو کس چکر میں پڑ گیا۔ نادر خان کچھ ہی کہتا رہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔“ لالی نے وضاحت کی۔ ”نادر کو تو خود کچھ پتہ نہیں۔ کبھی کچھ کہتا ہے کبھی کچھ۔ پہلے کہتا تھا کہ زمیں داری اور جائیداد کی بیع ہو گئی۔ میں نے پوچھ تاجھ کی اور وکیل سے مشورہ کرنے کی بات کی۔“

”تو نے کس وکیل سے مشورہ کیا تھا اور کب کیا تھا؟“ ارشاد الہی نے حیرت زدہ ہو کر لالی کو ٹوکا۔

”وہ تو میں نے نادر خان پر رعب جمانے کے لیے سیدھی سیدھی بلف چال چلی تھی۔“ لالی نے ہلکا ہنسنے لگا۔ ”ایسا چکر چلایا کہ وہ ایک دم گھبرا گیا۔“

”یہ تو میں نے بھی دیکھا وہ گھبرا سا گیا تھا۔ کتنے لگا بیج کی رجسٹری تو ہو نہیں سکی۔ مختار نامہ مل گیا ہے۔“ ارشاد الہی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”مجھے تو ایسا لگتا ہے اب تک کوئی لکھا پڑھی نہیں ہوئی۔ نادر خان ایسے ہی چکر چلا رہا تھا۔“ لالی نے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ”اسے تو ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔ اس کی نوکری کا جو معاملہ ہے۔“

”زمیں داری مل جائے تو نادر کو ہرگز نہ رکھنا۔“ ارشاد الہی کی ماں نے مداخلت کی۔ ”مجھے وہ ٹھیک بندہ نہیں لگتا۔ اس کی تو چھٹی کر دینی چاہیے۔“

لالی نے چونکنا نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔ ”بے بے آہستہ بول۔ نادر سے ابھی بگاڑنا ٹھیک نہیں۔ ورنہ بہت گڑبڑ ڈالے گا۔ اسے تو بالکل پتہ نہیں چلنا چاہیے کہ ہم نے آگے کیا کرنا ہے۔“

”پر یہ تو سوچ۔ نادر نہ رہا تو زمیں داری کون چلائے گا۔“ ارشاد الہی نے اپنی مجبوری بیان کی۔ ”مجھے تو زمیں داری کے بارے میں کچھ پتہ نہیں۔“ اس نے نظر بھر کر لالی کے چہرے کو دیکھا۔ ”لالی‘ تو زمیں داری چلا سکتا ہے؟“

”ویسے تو زمیں داری کا مجھے بھی کوئی تجربہ نہیں۔ پر میں یہ جانتا ہوں کہ زمیں داری تو منشی اور کاردار چلاتے ہیں۔ صرف ان کے کام کی نگرانی کرنی ہوتی ہے۔ وہ میں کر سکتا ہوں۔“ لالی نے

اپنے بارے میں ارشاد الہی کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ ”یہ تو تیری مرضی پر ہے۔ تو مجھے اپنے ساتھ لگانا چاہے گا تو زمیں داری چلانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

”ایسی گل بات نہ کر۔“ ارشاد الہی کی ماں نے پیار سے لالی کو ڈانٹا۔ ”شادا تجھے کیوں نہیں لگائے گا؟ تو اور شادا علیحدہ تھوڑا ہی ہیں۔ میرے لیے تو جیسے شادا ویسے تو۔“

”تجھے میں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔“ ارشاد الہی نے لالی کو باور کرایا۔ ”تیری ہی کوشش سے زمین داری مل رہی ہے۔ مجھے تو اس کے بارے میں پتہ تک نہیں تھا۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”میری مرضی کیا۔ سب کچھ تو تجھے ہی کرنا ہے۔ میں نے تو وہی کرنا ہے جو تو کئے گا۔“

”پتراب تو ہمارے ساتھ ہی رہے گا۔“ ارشاد الہی کی ماں نے مسکرا کر لالی سے کہا۔ ”تیرے لیے ویاہ کر دہی لاؤں گی۔ دونوں حویلی کے چوبارے میں رہتا۔“

”حویلی کے اوپر کے حصے میں کئی کمرے ہیں۔ شادا کی وہی ویاہ کر لانا تو دونوں کو ادھر ہی رکھنا۔ لالی نے مشورہ دیا۔ ”بے بے تو بھی اوپر ہی کے کمرے میں رہنا۔ ضرورت پڑی تو اور کمرے بنوا لیں گے۔ اوپر بہت جگہ ہے۔“

”ناپتر‘ میں کوٹھے پر نہیں رہ سکتی۔“ اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر منہ بگاڑا۔ ”میں تو اوپر جا ہی نہیں سکتی۔ ہردم تو کمر میں درد رہتا ہے۔ زینے کی میٹھیوں پر کیسے چڑھ سکوں گی۔“

”ہاں اماں‘ میٹھیاں چڑھنے اترنے سے تجھے بہت تکلیف ہوگی۔“ ارشاد الہی نے ماں کا تکلیف محسوس کرتے ہوئے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”ویسے بے بے اوپر رہنے میں تجھے بہت آرام رہتا۔ گرمی میں تو رات کو شان سے سوتی۔“ لالی نے کلثوم بی بی کو بتایا۔ ”پر حویلی کا آگن بھی بہت دڑا ہے۔ تو نے دیکھا نہیں؟“

”اندھیرے میں کیا دیکھتی۔“ ارشاد الہی کی ماں نے اظہار خیال کیا۔ ”حویلی مل گئی تو آرام نہ دیکھوں گی۔ ابھی دیکھ کر کیا لیتا۔“

”بے بے فکر نہ کر۔ حویلی بھی ملے گی اور زمیں داری بھی۔ بس تو دعا کرتی رہ۔“

”پتر‘ وہ تو میں کرتی رہی ہوں۔ ورنہ اپنے نصیب میں تو اب سب کے آگے بھیک کے لیے ہانڈ پھیلاتا ہی رہ گیا ہے۔“ اس نے دل گرفتہ ہو کر گرمی سانس بھری۔ ”میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں نہ پوچھ مجھ پر کیسی کیسی مصیبت پڑی ہے۔“

”بے بے اب تیری مصیبت کے دن ختم ہو گئے۔“ لالی نے کلثوم بی بی کو تسلی دی۔ ”اب شان سے زمیں داری بن کے ادھر رہنا۔ نوکرانیوں پر حکم چلانا۔“

”نصیر پور میں تو میں زمین داری ہی ہوتی تھی۔ کئی نوکرانیاں تھیں میرے گھر میں۔“ ارشاد الہی کی ماں کلثوم بی بی نے ایک بار پھر آہ سرد کھینچی۔ ”بعد میں تو خود نوکرانی بننا پڑا۔ ہائے کیا کیا نہ ہوا میرے ساتھ۔“

”بے بے بیتے دنوں کو بھول جا۔ آگے کی سوچ آگے کی۔“ لالی نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لی۔ ”بہت نیند لگ رہی ہے۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دروازے کی جانب بڑھا۔

ارشاد الہی اور اس کی ماں نے اسے روکنے پر اصرار نہ کیا۔ وہ بھی بہت تھکے ہوئے تھے اور اب سونا چاہتے تھے۔

”یہ سوال تو تب پیدا ہو سکتا ہے جب کوئی اسے عدالت میں چیلنج کرنے والا ہو۔ مجھے تو ایسا کوئی نظر نہیں آتا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے جی۔ پر تیس نوں یہ بھی پتہ ہے۔ مختار نامے پر ان دنوں کی تاریخ پڑی ہے جب چوہدری زندہ تھا۔“ مہربان علی نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”چوہدری کے مرنے کے بعد تو مختار نامہ خود بخود ختم ہو گیا۔ اب اس کی کوئی کانونی حیثیت نہیں رہی۔“

”یہ بات تجھے وکیل نے بتائی ہے؟“

”ہاں جی اسی نے بتائی ہے۔“

”پر تو نے تو مختار نامہ وکیل کے مشورے سے بنوایا تھا۔“

”فوری طور پر کبفہ لینے کے لیے یہی نکتہ سمجھ میں آیا تھا۔“ مہربان علی نے وضاحت کی۔ ساتھ ہی اپنی کارگزاری کا بھی اظہار کیا۔ ”اسے قافٹ حاصل کرنے کے لیے مجھے کتنی کوشش کرنی پڑی۔ کسی کو رشوت دی۔ کسی کی منت کی۔ مختار نامے کے لیے پرانی تاریخوں کا سامپ پیسہ حاصل کرنا بہت مشکل کام تھا۔“

احسان شاہ نے کسی فوری رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”مختار نامہ بنوانے سے تو کہیں بہتر تھا کہ بیچ کی جعلی دستاویز تیار کروالی جاتی۔“

”اس کے لیے تو سب سے پہلے سوچا گیا تھا۔ بلکہ اس کا مسودہ بھی بن گیا تھا۔ پر اس کی رجسٹری کرانے میں کتنی مشکل پیش آرہی تھی۔“ مہربان علی نے احسان شاہ کو یاد دلایا۔ ”رجسٹرار سے معاملہ طے بھی کر لیا جاتا تو سب سے دشوار مسئلہ زرعی اصلاحات کا تھا۔ تیرے پاس تو سو ایکڑ حد ملکیت سے زیادہ پہلے ہی زرعی اراضی موجود ہے۔ چوہدری نور الہی کی اراضی کیسے خرید سکتا تھا۔ تیس نوں یاد نہیں اس کے بارے میں کتنا سوچ و چار کیا گیا؟“

”یاد آیا۔ ایسی ہی دشواری پیش آئی تھی۔“ احسان شاہ نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ اب تو یہ سوچ آگے کیا کرنا ہے؟“

”اس بارے میں تو وکیل سے ملنے کے بعد ہی سے میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا۔“

”کوئی نیا نکتہ کوئی نئی سکیم سمجھ آئی؟ تو نے تو دیر تک وکیل سے صلاح مشورہ کیا ہے۔ بہت سے پہلو سامنے آئے ہوں گے؟“

”میں نے تو جی بید سوچا ہے کہ دوسرا مختار نامہ حاصل کیا جائے اور اس دفعہ چوہدری کے کسی وارث سے مختار نامہ لیا جائے۔ نہ بچپلی تاریخوں کا سامپ پیسہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ جعلی



آتش دان میں سرخ سرخ انگارے دھک رہے تھے۔ احسان علی شاہ آتش دان کے قریب آراء کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ انگاروں سے پھوٹی ہوئی روشنی میں سرخ پڑ گیا تھا۔ وہ سر جھکائے گمراہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ ذرا ہٹ کر اس کا منبر مہربان علی بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ دونوں بالکل خاموش تھے۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا۔

احسان علی شاہ نے قریب رکھا ہوا پوکر اٹھایا اور اس کا چوبی دستہ ہاتھ میں دبائے ہوئے انگاروں پر جمی ہوئی راکھ کریدنے لگا۔ ذرا دیر تک وہ خاموشی سے انگاروں کو التما پلٹتا رہا۔ پھر اس نے مڑ کر مہربان علی کی سمت دیکھا۔ پوکر آتش دان کے نزدیک دیوار سے ٹکا کر کھڑا کیا اور بجھے ہوئے لمبے مٹر گویا ہوا۔

”تو گویا بات بنی نہیں۔“ اس نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ ”اور کیا کہتا تھا وکیل؟“

”نکتہ تھا، کوئلہ ہر کشن کی زمیں داری پر بغیر دستاویزی ثبوت کے زیادہ عرصے تک کبفہ نہیں رکھا جاسکتا۔“

”لیکن چوہدری نور الہی کا مختار نامہ تو میرے نام کا موجود ہی ہے۔“ احسان شاہ نے گردن موڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ ”اسے دستاویزی ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا؟ مختار نامہ بھی تو دستاویزی ہی ہے نا؟“

”شاہ جی، تیس نوں پتہ ہے۔ مختار نامے پر چوہدری نور الہی کے جعلی دستخط بنائے گئے ہیں۔“

”پر یہ کون پوچھ رہا ہے کہ چوہدری کے دستخط اصلی ہیں یا جعلی؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

دستخط کی۔

”چوہدری کا تو اب کوئی بھی نہیں رہا۔ پہلی گھر والی اور بچوں کے بارے میں کہتا تھا۔ برسرِ ڈھونڈتا رہا۔ ان کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ دوسری گھر والی تھی اس نے بھی اس کے ساتھ ہی خودکشی کر لی۔“ احسان شاہ نے مہمان علی کو آگاہ کیا۔ ”اب اس کے وارث کو کہاں سے پیدا کیا جائے؟ تو۔۔۔ یہ نہیں سوچا۔“

”جب اس کا کوئی وارث ہی نہیں تو کسی کو بھی کھڑا کیا جاسکتا ہے۔“ مہمان علی نے تجویز پیش کی۔ ”کوئی بھروسے کی زبانی مل جائے تو کام آسانی سے بن سکتا ہے۔ اسے چوہدری کی گھر والی ثابت کیا جاسکتا ہے۔ آرام سے نکاح نامہ بھی بن سکتا ہے۔ صرف عدالت سے اس کی وراثت اُسریفیکٹ نکلوانے کے لیے بھاگ دوڑ کرنی ہوگی۔“

”بات تو تیری سمجھ آتی ہے پر ایسی زبانی کون ہو سکتی ہے جو اپنے بھروسے کی ہو اور آسانی سے مجھے مختار نامہ بھی دے دے؟“

”شاہ جی، یہ تو تیں نوں ہی سوچنا پڑے گا۔“

احسان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ سر جھکا کر آتش دان میں دیکھتے ہوئے انگاروں کو نکتے لگا۔ اس کے چہرے پر انگاروں کی آج کی سرخی بھیلی ہوئی تھی۔ وہ بت بنا خاموش بیٹھا تھا۔ مہمان علی بھی خاموش تھا۔ کمرہ خوب گرم تھا۔ مگر گرمی خاموشی نے فضا کو بوجھل بنا دیا تھا۔

احسان شاہ نے گردن اٹھائی اور سامنے کی دیوار خواب ناک نظروں سے نکتے ہوئے بولا۔

”چوہدری ہوشیار بندہ نہیں تھا۔ کبھی کبھی بالکل غلط فیصلے کرتا تھا۔ جب اس نے یہ بتایا کہ اس کی دوسری گھر والی نوکرانی رہ چکی ہے تو میں نے اسے شرم دلائی۔ اپنی غلطی پر ایسا بچھتا یا کہ اسے طلاق دے کر الگ کرنے پر تیار ہو گیا۔“ مہمان علی کی جانب دیکھے بغیر احسان شاہ بولتا رہا۔ ”میری بھانجی سلیمہ سے دیاہ کرنے پر بالکل رضامند ہو گیا تھا۔ کہتا تھا شاہ جی، تیرے ساتھ رشتے داری ہو گئی تو میری عزت بڑھ جائے گی۔“

”سلیمہ بی بی کدھر ہوتی ہے جی؟“ مہمان علی نے دریافت کیا۔

”میرے ہی ساتھ رہتی ہے۔“ احسان شاہ نے مڑ کر مہمان علی کی جانب دیکھا۔ ”اڑھائی برس کی تھی تو ماں چل بسی۔ بچہ پہلے ہی گردن توڑ بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ ماں کے مرنے کے بعد میں اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ تب سے وہ میرے ہی پاس ہے۔“

”اس سے زیادہ کس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔“ مہمان علی نے دلی زبان سے بوجھا۔ ”شاہ جی

اگر تیں نوں کوئی اعتراض نہ ہو تو سلیمہ کو چوہدری کا وارث بنایا جاسکتا ہے۔ اس کا تو چوہدری سے رشتہ بھی ملے ہو چکا تھا۔ اپنے پنڈ کی مسجد کا ملا آرام سے نکاح نامہ تیار کر دے گا۔ نکاح کے گواہ اور وکیل کے لیے اپنے اعتماد کے ایسے بندے بھی مل جائیں گے جو ضرورت پڑنے پر عدالت میں گواہی دے سکیں۔ گواہوں کے لیے میں اور نادر خان تو موجود ہی ہیں۔ دو بندے اور تلاش کر لیں گے۔ تو وکیل بن جانا۔ وکیل تو وہی کی طرف کا ہوتا ہے نا۔“

”تجویز تو تیری ٹھیک لگتی ہے۔ سلیمہ سے مختار نامہ بھی مل سکتا ہے۔“ احسان شاہ نے مہمان علی کی رائے سے اتفاق کیا۔ ساتھ ہی اپنے خدشے کا بھی اظہار کیا۔ ”مگر ایک نہ ایک دن تو اس کا دیاہ کرنا ہو گا۔ معلوم نہیں وہ کیسا بندہ ہو۔ بعد میں اس کی نیت خراب ہو جائے۔ زمیں داری اور جائیداد اپنی تحویل میں لینا چاہے۔ یہ جائیداد بہت ظالم ہوتی ہے۔“

”تیرے چھوٹے پتر، رحمان شاہ سے عمر کم ہے تو اس کے ساتھ سلیمہ بی بی کا دیاہ کر دے۔ تیں نوں رحمان شاہ کا دیاہ تو کرنا ہی ہے۔“ مہمان علی نے مشورہ دیا۔

”میں تو سلیمہ کا دیاہ رحمان شاہ سے کرنے کے بارے میں پہلے ہی سوچ رہا تھا۔ پر اس کی ماں راضی نہیں ہوتی۔“ احسان شاہ نے اپنی مجبوری بتائی۔ ”وہ رحمان شاہ کا دیاہ کسی دڑے زمیں دار خاندان میں کرنا چاہتی ہے۔“

”جب سلیمہ بی بی خود دوی زمین دار بن جائے گی تب تو اسے راضی ہو جانا چاہیے۔“ مہمان علی نے مسکرا کر اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”ویسے بھی رحمان شاہ کی ماں تیری گھر والی ہے۔ تیرا کما کیسے ٹال سکتی ہے۔“

”رحمان شاہ کی ماں کو میں راضی کر لوں گا، پر اس سلسلے میں وکیل سے ضرور مشورہ کر لینا چاہیے۔“

مہمان علی کچھ کہنا چاہتا تھا اسی اثناء میں ملازم نے کمرے میں داخل ہو کر نادر خان کے آنے کی اطلاع دی۔ احسان شاہ نے نادر خان کو فوراً بلایا۔

نادر خان کمرے میں داخل ہوا اور سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

”کیسے آیا نادر؟“ احسان شاہ نے اس کی غیر متوقع آمد پر حیرت کا اظہار کیا۔ ”کوئی خاص گل بات تو نہیں؟“

”خاص ہی گل بات ہے۔“ نادر خان نے جواب دیا۔

”آرام سے بیٹھ کر بتا۔ کیا کہنا چاہتا ہے؟“

نادر خان کرسی کھسکا کر احسان شاہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے قدرے تامل کے بعد احسان شاہ کو بتایا۔ ”شاہ جی، تجھے یہ بتانے آیا ہوں چوہدری نور الہی کی پہلی گھروالی آئی ہے۔ اس کے ساتھ چوہدری کا پتر ارشاد الہی بھی ہے۔“

”چوہدری کی گھروالی اور اس کا پتر۔“ احسان شاہ سخت حیرت زدہ ہوا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ”دونوں کہاں ہیں؟ کدھر ہیں؟“

مہربان علی نے بھی حیران و پریشان ہو کر نادر خان کو دیکھا۔ مگر خاموش رہا۔

”دونوں آج شام کو آئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک بندہ اور ہے۔ اس کا نام لالی ہے۔ اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اس کی باتوں سے لگتا ہے کہ وہی چوہدری کی گھروالی اور اس کے پاس کو لایا ہے۔“ نادر خان نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”میں نے تینوں کو مہمان خانے میں ٹھہرا دیا ہے۔“

”کس لیے آئے ہیں؟ اس بارے میں انھوں نے کچھ بتایا؟“ احسان علی شاہ نے دریافت کیا۔

”چوہدری کے وارث کی حیثیت سے اس کی زمین داری اور جائیداد پر کسبہ کرنے آئے ہیں۔“

”کیا ثبوت کہ وہ چوہدری کے وارث ہیں؟“ مہربان علی نے جرح کرنے کے انداز میں نادر خان سے سوال کیا۔ ”ان کے پاس وراثت کا سرٹیفکیٹ ہے؟ کوئی اور ایسی دستاویز جس سے یہ ثابت ہو سکے وہ چوہدری کی بیوہ ہے۔ ارشاد الہی اس کا پتر ہے۔“ اس نے قدرے تامل کیا۔ ”اب تک وہ رہے کہاں؟ پہلے کیوں نہیں آئے؟“

”انھوں نے ایسا کوئی ثبوت تو پیش کیا نہیں اور نہ میں نے ان سے کوئی ثبوت مانگا۔“ نادر خان نے مہربان علی کو تنکی نظروں سے دیکھا۔ ”میں نے انھیں چوہدری کی زمین داری کا کسبہ تو دینا نہیں تھا جو ان سے ثبوت مانگتا۔ بیکار میں جھگڑا کھڑا کرنے سے کیا فائدہ؟“

”تو نے ان سے پوچھنا تو کی ہوگی۔“ اس دفعہ احسان شاہ نے استفسار کیا۔

”بالکل کی تھی جی۔“ نادر خان نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”انھوں نے اپنے بارے میں بالکل وہی باتیں بتائیں جو چوہدری بتایا کرتا تھا۔ بلکہ چوہدری سے بھی کچھ زیادہ ہی تفصیل سے بتایا۔“

”یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہوا۔“ احسان شاہ مطمئن نہ ہوا۔ ”ہو سکتا ہے انھوں نے یہ ساری باتیں کسی سے سن رکھی ہوں۔ چوہدری بھی دوسرے مہاجروں کی طرح اپنے لٹ پٹ کر آنے کے بارے میں سب ہی کو بتایا کرتا تھا۔“ اس نے نادر خان کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”وہ دھوکے باز

بھی ہو سکتے ہیں۔ تو نے ان کے بارے میں کیا اندازہ لگایا؟“

”دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتے ہیں۔ وڈے زمیں داروں کی طرح اونچے طرے کی پگ لگائے شان سے آئے ہیں۔ ارشاد الہی کی ماں بھی عمدہ شمال اوڑھے ہوئے چوہدرانی لگتی ہے۔ پر میرا اندازہ ہے کہ معمولی زمیں دار ہیں۔“ نادر خان نے احسان شاہ کو آگاہ کیا۔ ”تینوں دھوکے باز تو نہیں معلوم ہوتے ہیں۔ دھوکے باز تو دراصل چوہدری تھا۔“

”چوہدری دھوکے باز تھا؟“ احسان شاہ بہت چکرایا۔

”اس نے توجی خود کو چوہدری نور الہی بنا رکھا تھا۔ اس کا نام تو رحیم داد تھا۔ اسی ضلع کے پنڈ احمد کوٹ کا رہنے والا تھا۔ مہاجر بھی نہیں تھا۔ اس نے تو نصیر پور کبھی دیکھا بھی نہیں جہاں کا چوہدری نور الہی تھا۔ وہ تو کئی سال پہلے فوت ہو گیا۔ رحیم داد اس کے کلیم کے کاغذات چرالایا تھا۔“

”تجھے یہ ساری باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”لالی نے بتائی تھیں۔ وہ رحیم داد کو جانتا ہے۔“

”کیا کہتا تھا وہ؟“

لالی نے رحیم داد کے بارے میں نادر خان کو جو کچھ بتایا تھا وہ اس نے تفصیل سے احسان علی شاہ کو بتا دیا۔

”وہ اتنا زبردست دھوکے باز اور فریبی تھا یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ دیکھنے میں تو بالکل سیدھا سادا لگتا تھا۔“ احسان شاہ نے مڑ کر مہربان علی کی جانب دیکھا۔ بچے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ”مہربان، تو نے جو سکیم بنائی تھی وہ تو بیکار ہو گئی۔ اب تو کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔“

احسان شاہ کے بجائے مہربان علی نے نادر خان کو مخاطب کیا۔ ”نادر، تو نے ان سے اتنی باتیں ہی کیوں کیں؟ یہ کہہ کر انھیں ٹرخا دیتا کہ زمیں داری اور ساری جائیداد کی شاہ جی کے نام بیع ہو چکی ہے۔ بہت عرصے سے اس کے پاس ہے۔ لکھا پڑھی کرنے کے بعد حاصل کی گئی ہے۔“

”مہربان علی، تو کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہا ہے؟“ اس دفعہ بھی نادر خان کا لہجہ ٹیکھا تھا۔ ”میرے اتنا کہہ دینے سے وہ چپ کر کے چلے جاتے؟ یہ اتنی دڈی جائیداد کا معاملہ ہے۔ کوئی بھی دعویدار اس طرح آسانی سے اپنے حک سے دست بردار ہو سکتا ہے؟ اول تو ہمارے پاس کوئی رجسٹری شدہ بیع نہیں۔ انھوں نے دیکھنی چاہی تو کیا دکھائیں گے؟“ وہ احسان شاہ کی جانب متوجہ ہوا۔ ”شاہ جی، وہ ایسے ہی جائیداد کے دعویدار بن کر نہیں آگئے۔ وکیل سے مشورہ کر کے آئے

ہیں، بلکہ وکیل کو بھی اپنے ساتھ لانا چاہتے تھے۔ وہ تو عدالت میں چوہدری نور الہی کے وارث ہونے کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے پاس تو صرف مختار نامہ ہے اور وہ بھی جعلی۔“

”مختار نامہ تو بالکل بیکار ہے۔ اس کی اب کوئی قانونی حیثیت نہیں رہی۔“ احسان شاہ کے اندر کا جاگیدار بیدار ہو گیا۔ چرے سے جلال نپکنے لگا۔ اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ”پر میں نے کوئٹہ ہر کشن کی زمیں داری اپنے پاس رکھنی ہے۔ وہ میں نہیں دینے کا۔ یہ میری عزت کا سوال ہے۔“

”برانہ منائیں جی تو ایک بات کہوں۔“ مہمان علی نے اٹکتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری کی بیوہ سے نکاح کر لیا جائے تو سارا جھگڑا ہی ختم ہو جائے گا۔“

”وہ میرے ساتھ نکاح کرنے پر کیوں تیار ہونے لگی اور اگر وہ تیار بھی ہو جائے تو اس سے کیا ملے گا؟“ احسان شاہ نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔ ”اصلی وارث تو اس کا پتر ہے۔ جائیداد پر بیوہ کا حکم تو روپے میں دو آنے برابر بنتا ہے۔“ اس نے مہمان علی کی تجویز مسترد کر دی۔ ”مجھے تو پوری جائیداد اپنے پاس رکھنی ہے۔“

”تب تو ان سے اس پر بات کی جاسکتی ہے کہ کچھ رقم لے کر وہ اپنے حکم سے دست بردار ہو جائیں اور جائیداد شاہ جی کے نام کر دیں۔“ مہمان علی نے نادر خان کو مخاطب کیا۔ ”نادر، اگر ان سے گل بات کی جائے تو وہ کیا مطالبہ کریں گے؟ تیرا اندازہ کیا ہے؟“

”جائیداد سے تو وہ دست بردار نہیں ہونے کے۔ اگر کسی طرح تیار بھی ہو گئے تو بہت لمبی کیمت مانگیں گے۔“ نادر خان نے قیاس آرائی کی۔ ”ان کی باتوں سے تو یہی لگتا ہے۔ وکیل سے مشورہ کر کے آئے ہیں۔“

”کیمت ہی دینی ہے تو جائیداد فروخت کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ میں پہلے ہی ہزاروں روپے خرچ کر چکا ہوں۔ نیا مسمان خانہ بنوایا ہے۔ حویلی کی مرمت کرائی ہے۔ نیا فرنیچر ڈلوایا ہے۔ ٹیوب ویل لگوا یا ہے۔“ احسان شاہ نے نادر خان کی جانب دیکھا۔ ”سارا خرچ تو تیرے ہی ہاتھوں سے ہوا ہے۔“ اس نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا۔ ”میں نے اب کچھ نہیں دیا۔ اگر کچھ دینا بھی پڑا تو ان کو ہرگز نہیں دوں گا۔ اپنا کبضہ برقرار رکھنے کے لیے سرکاری افسروں کو دوں گا۔ ان سے تو روزی واسطہ پڑتا ہے۔ ان دونوں سے مجھے آگے کیا لینا۔“

مہمان علی اور نادر خان نظریں جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ آتش دان میں انگاروں کی آج بھمی پڑ گئی تھی۔ احسان شاہ نے ہاتھ بڑھا کر پوکرا کا چوبی دستہ پکڑا اور انگاروں کو آہستہ آہستہ کریدنے لگا۔ آج تیز ہو گئی۔ آتش دان سے ابھرتی ہوئی روشنی سرفی بن کر اس کے چہرے پر دکنے

لگی۔

کمرے میں خاموشی چھائی تھی۔ کچھ دیر بعد نادر خان کی آواز ابھری۔ ”شاہ جی، ان تینوں کے بارے میں کیا حکم ہے؟ وہ پوچھیں تو میں کیا جواب دوں؟“

”انہیں جواب کیا دینا۔“ احسان شاہ کی آنکھوں میں مجرمانہ چمک ابھری۔ اس کا چہرہ خوف ناک نظر آنے لگا۔ ”اب تو ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تینوں کا منشا ہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ لاشیں رات کے اندھیرے میں ادھر کسی گھنے جھنگر میں دبا دی جائیں گی یا نہر میں ڈال دی جائیں گی۔“

نادر خان کے چہرے پر خوف کا سایہ پھیل گیا۔ ”شاہ جی، ایسا نہ سوچ۔“ اس کی آواز میں ہلکی ہلکی قہر قہراہٹ تھی۔ ”وہ ایک نہیں تین ہیں۔ اکٹھے تین بندوں کو ٹھکانے لگانے سے بہت گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔“

”نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ مہمان علی نے نادر خان کی تائید کی۔ ”ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ چوری ذہنی کا مکدمہ بنوا کر تینوں کو اندر کر دیا جائے۔“

”سال دو سال بعد تینوں رہا ہو جائیں گے۔ فیروہی مصیبت سامنے ہوگی۔“ احسان شاہ نے اس کی تجویز مسترد کر دی۔ ”کچھ اور ہی سوچنا پڑے گا۔“

”۳۰۲ کا مکدمہ بنوایا جائے۔“ مہمان علی نے نئی تجویز پیش کی۔ ”اس میں تو تینوں پھانسی سے بھی لٹک سکتے ہیں۔ پھانسی نہ ہوئی تو عمر کید سے تو نہیں بچ سکتے۔“

”دفعہ ۳۰۲ کے تحت کیس بنوانے کے لیے تو کسی کو قتل بھی کر دانا پڑے گا۔“ نادر خان نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ”ایسا بندہ کون ہو سکتا ہے؟“

”یہ تو تھانیدار ہی بتا سکتا ہے کہ ضابطے کی کیا کارروائی کی جائے۔ مکدمہ تو اسے ہی بتانا ہوگا۔“ احسان شاہ نے مہمان علی کو مخاطب کیا۔ ”مہمان، تو ایسا کر کل صبح تھانے چلا جا۔ ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان کو یہاں لے آ۔ بہت دنگ اور حوصلے والا پولیس افسر ہے۔ میرا بہت گہرا ریا ہے۔ تجھے تو پتہ ہے میری ہی سفارش پر اسے ادھر تعینات کیا گیا ہے۔ میرا کام تو خوشی خوشی کرے گا۔“

”یہ تو جی میں نے بھی غور کیا ہے، تھانیدار شاہ نواز خان تجھے بہت مانتا ہے۔ جیسا تو کہے گا ویسا ہی کرے گا۔“ مہمان علی نے احسان شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”پچھلے اتوار کی شام کو تو وہ ادھر تھمرے ہی پاس تھا۔“

”اپنے ایک کام سے آیا تھا۔ ایک چکر میں پھنس گیا ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔“

احسان شاہ نے بتایا۔ ”اس کے لیے اوپر بات کرنی ہے۔ معاملہ بہت الجھا ہوا ہے۔“

”ان تینوں کا کٹنا بیچ سے نکل جائے تو سلیمہ بی بی کو چوہدری نور الہی کا وارث بنانے کے لیے کوشش کی جائے۔“ مہراں علی نے اپنا منصوبہ ایک بار پھر پیش کیا۔ ”ان تینوں کی اچانک آمد نے تو سارا پروگرام ہی گڑبڑ کر دیا۔“

”مجھے ٹھیک سے پتہ نہیں مہراں علی کی سکیم کیا ہے۔ پر شاہ جی، میرا خیال ہے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے وکیل سے مشورہ کر لیا جائے۔“ نادر خان نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ وہ مہراں علی کے مقابلے میں اپنی اہمیت جتنا چاہتا تھا۔ ”فریک مخالف کو کبھی کمزور نہیں سمجھتا چاہیے۔ وہ بھی اپنے وکیل سے گل بات کر کے آئے ہیں۔ پتہ نہیں ان کے پیچھے اور کون کون ہے۔ وہ ایسے ہی تو نہیں چلے آئے۔“

احسان علی شاہ کو نادر خان کی بات دل لگتی معلوم ہوئی۔ اس میں استدلال تھا، وزن تھا۔ اس نے نادر خان کی تائید کرتے ہوئے مہراں علی کی جانب دیکھا۔ ”نادر ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وکیل سے پہلے مشورہ کرنا ضروری ہے۔ مہراں، تو کل وکیل کے پاس بھی چلا جا۔ اسے اپنے ساتھ ہی لیتا آ۔“ تھانیدار بھی ادھر ہی ہو گا۔ دونوں سے تفصیلی بات کرنے کے بعد ہی طے کرنا ہو گا آگے کیا کیا جائے۔ اس سے پہلے ہم نے کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔“ اس کے بدلے ہوئے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ نادر خان نے اس کی سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔ غیظ و غضب اب سرد پڑ چکا تھا۔ معاملہ فہمی اور سوجھ بوجھ غالب آچکی تھی۔ احسان علی شاہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

”ہم نے جو کچھ بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کے کرنا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی معیبت گلے پڑ جائے۔“

مہراں علی کو احسان شاہ کا بدلا ہوا رویہ پسند نہ آیا۔ اور اس لیے بھی پسند نہ آیا کہ اسے بدلنے میں نادر خان کی رائے کو دخل تھا جسے وہ کم تر اور کوڑھ مغز سمجھتا تھا۔ اور ہمیشہ یہ کوشش کرتا تھا کہ اس کی رائے کو بلا دستی حاصل نہ ہو۔ وہ احسان شاہ کی نظروں میں سرخ رونہ ہو جائے۔ مگر احسان شاہ نے اس وقت اس طرح دو ٹوک بات کی تھی کہ اس نے مصلحت اندیشی سے کام لیا۔ احسان شاہ کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

”شاہ جی! جیسی تیری مرضی۔ میں کل وکیل کے پاس بھی چلا جاؤں گا اور اسے اپنے ہم راہ لانے کی کوشش کروں گا۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے جی۔“ نادر خان نے احسان علی شاہ سے دریافت کیا۔

احسان علی شاہ نے ضروری ہدایات دے کر نادر خان کو رخصت کر دیا۔



سورج چڑھ کر درختوں کے اوپر پہنچ گیا تھا۔ کھر کی دھند چھٹ چکی تھی۔ سرما کی ہلکی ہنستی دھوپ پگھلے ہوئے سونے کی مانند ہر طرف پھیلی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد لالی اور ارشاد الہی مہمان خانے کے صحن میں کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ناشتے میں پراٹھے تھے جن پر تازہ مکھن رکھا تھا۔ تلے ہوئے مرغ تھے۔ آم کا اچار تھا اور لسی سے لبالب بھرے ہوئے کاسی کے اونچے اونچے گلاس تھے۔ رات کے کھانے کی طرح ناشتا بھی انھوں نے رغبت سے کیا تھا اور اب کرسیوں پر اطمینان سے بیٹھے دھوپ کی خوش گوشت حرارت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

ارشاد الہی کی ماں کمرے کے اندر ہی تھی۔ کچھ دیر قبل نادر خان کی بیوی جنت اس کے پاس آگئی تھی۔ ارشاد الہی کی ماں کلثوم بی بی کی کمر میں درد کی کک رہ رہ کر اٹھ رہی تھی۔ وہ لحاف اوڑھے خاموش لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کا غبار چھایا تھا۔

جنت نے اس کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھتے ہوئے خیریت دریافت کی۔ کلثوم بی بی نے کراہتے ہوئے بتایا۔ ”کمر میں سخت درد ہے۔ سردی میں درد اسی طرح بڑھ جاتا ہے۔ آج کچھ زیادہ ہی ہے۔“ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھ کر ہولے ہولے دبانے لگی۔

جنت نے فوراً ایک نوکرانی کو بلایا۔ اپنے گھر سے تیل کی شیشی اور پیتل کی کنوری منگوائی۔ کنوری میں تیل ڈالا۔ نوکرانی کو ہدایت کی کہ تیل چولے کی آٹھ پر رکھ کر گرم کر لائے۔ نوکرانی تیل گرم کر کے لے آئی تو جنت نے اس میں انگلی ڈبو کر اندازہ لگایا کہ تیل زیادہ گرم تو نہیں ہے۔ تیل نیم گرم تھا۔ جنت نے نوکرانی سے کہا۔

”چوہدرانی کی کمر میں سخت درد ہے۔ مریم تو تیل سے کھر کی مالش کر دے۔“

مریم نے تیل کی کنوری سنبھالی اور کلثوم بی بی کے قریب بیٹھ کر آہستہ آہستہ مالش کرنے لگی۔ مالش سے کلثوم بی بی کو بہت آرام ملا۔ جنت کرسی پر بیٹھی کلثوم بی بی کی دل جوئی کرتی رہی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

مالش کرانے کے بعد کلثوم بی بی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ جنت کی ہدایت پر مریم نے کلثوم بی بی کے سر میں تھوڑا سا تیل ڈال کر سر اور بالوں میں کھپایا۔ کٹھنسی سے بالوں کو سنوارا اور چوٹی باندھنے لگی۔

جنت تھوڑی دیر بعد اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر کی طرف چلی گئی۔ کلثوم بی بی اس کے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ سے بہت متاثر ہوئی۔ جلد ہی آنے پر اصرار کیا۔

موم خاموش بیٹھی اس کی چوٹی گوندھتی رہی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلے رہے۔

کمرے کے باہر صحن میں لالی اور ارشاد الہی ابھی تک کرسیوں پر بیٹھے دھوپ کھا رہے تھے۔ ان کے قریب ہی گلاب کے پھولوں کا تختہ تھا۔ سفید اور عنبی گلاب ہوا کے ہلکے ہلکے جموٹوں سے شاخوں میں جمبول رہے تھے۔ ان کی ہنکھریوں پر ابھی تک شبنم کے قطرے چمیلی دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔

لالی اور ارشاد الہی کو نادر خان کا انتظار تھا۔ مگر وہ ابھی تک ان کے پاس آیا نہیں تھا۔ دھوپ کی تمازت رفتہ رفتہ بڑھتی جا رہی تھی۔ دونوں کے چہرے تھمتھانے لگے اور پسینے کی نمی پیشانی پر محسوس ہونے لگی۔

لالی نے آگٹا کر انگڑائی لی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ارشاد الہی کو مخاطب کیا۔ ”یار مہاں کب تک بیٹھا رہے گا۔ باہر نکل کر اپنی زمیں داری تو دیکھیں۔“

”نادر خان کا انتظار نہیں کرے گا؟“

”اتنا انتظار تو کر لیا۔“ لالی نے مسکرا کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ باہر ہی مل جائے۔“

ارشاد الہی نے مزید بات چیت نہ کی۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے بڑھے اور مہمان خانے سے باہر چلے گئے۔ گاؤں کی رڑی میں پہنچے۔ اس وسیع میدان میں مزارعے اور کمی ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ سب انھیں مڑ مڑ کر حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ سویرے ہی سے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک بوڑھے نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ اکتے ہوئے پوچھا۔

”سنا ہے جی، تسی پنڈ کے نئے زمیں دار ہو۔“

لالی نے ارشاد الہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ”یہ چوہدری نور الہی مرحوم کا پتر چوہدری ارشاد الہی ہے۔ اپنے پیو کی زمیں داری سنبھالنے آیا ہے۔ اب یہ ادھر ہی رہے گا۔ اس کی ماں بھی ساتھ ہی آئی ہے۔“

”ہن جی ضرور سنبھالے اپنے پیو کی زمیں داری۔“ بوڑھے نے مسکرا کر خوش نودی کا اظہار کیا۔

ارشاد الہی کی گردن تن گئی۔ سرفخر سے اونچا ہو گیا۔ لالی نے بھی چہرے پر رعب اور دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

دونوں گردنیں اونچی کیے رڑی سے گزر کر کھیتوں کی طرف نکل گئے اور ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک راستے پر آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ یہ اتنی کشادہ گنڈنڑی تھی جس پر دو آدمی

اطمینان سے ساتھ ساتھ چل سکتے تھے۔ اس کے دونوں جانب کھیت تھیں۔ ان کا سلسلہ دور تک پھیلا تھا۔ ریش کی فصل کی ہوائی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ گندم اور جو کے نرم و نازک پودوں نے کھیتوں میں سبز مخل بچھا دی تھی۔ ہوا کے بھرے ہوئے جموٹوں سے پودے بار بار جھومتے۔ کھیتوں میں سبزے کی لہریں اٹھتی۔

کسیں کسیں نکلے کے پاس بیٹھے ہوئے مزارعے آڈ کے پانی سے اپنے کھیتوں کو سیراب کر رہے تھے۔ لالی اور ارشاد الہی بے نیازی سے گردن اٹھائے چپ چاپ ان کے قریب سے گزرے۔

دونوں کھیتوں کے آس پاس کچھ دیر گھومتے پھرتے رہے، پھر باغوں کی طرف چلے گئے۔ آم کے اکا دکا درختوں میں بور اُٹھ گیا تھا۔ سفید سفید پھولوں کے پتھوں پر شمد کی کھیاں منڈلا رہی تھیں۔ چند درختوں میں کیڑا لگ گیا تھا۔ ایک ادھیڑ مائی ایسے پودوں پر کیڑا مار دوا چھڑک رہا تھا۔ دونوں کو اس نے سلام کیا اور زیادہ مستعدی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

مالٹے کے درخت دیکھ کر دونوں کے چہرے کھل اٹھے۔ سرخ سرخ مالٹے شاخوں سے جھولتے ہوئے بہت خوبصورت نظر آرہے تھے۔ لالی نے ہاتھ اونچا کر کے ایک مالٹا توڑا اور ارشاد الہی کی جانب بڑھا کر بولا۔ ”شادے، یہ مالٹا دیکھ رہا ہے۔“ وہ بے تکلفی سے مسکرایا۔ ”باغ تو کھیتوں سے بھی زیادہ شاندار ہے۔ یار بہت دڈی زمیں داری ہے۔ زندگی بھر عیش کرے گا۔“

مالٹے کے ایک درخت کی اوٹ سے باغ کا رکھوالا نمودار ہوا۔ دونوں کے قریب آیا اور حیرت زدہ نظروں سے انھیں دیکھنے لگا۔ لالی نے اسے ٹوکا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہا ہے؟“ اس نے ارشاد الہی کی سمت اشارہ کیا۔ ”تو نے اسے نہیں پہچانا؟ یہ کوئلہ ہر کشن کا نیا زمیں دار ہے۔ چوہدری نور الہی کا پتر چوہدری ارشاد الہی۔“

رکھوالے نے فوراً ارشاد الہی کو سلام کیا۔ گھگیا کر معذرت کرنے لگا۔ ”معاف کرنا جی۔ میں نے پہچانا نہیں۔ پہلی بار ادھر آئے ہوتاں۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک سرخ سرخ مالٹا شاخ سے توڑا اور ارشاد الہی کو دیتے ہوئے کہا۔ ”اس بار تو جی فصل پچھلے برس سے بھی چنگی ہے۔“

ارشاد الہی فوراً زمیں دار بن گیا۔ اس نے آہستہ آہستہ گردن ہلا کر خوش نودی کا اظہار کیا۔ دونوں آگے بڑھ گئے۔ رکھوالا ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لالی اور ارشاد الہی دیر تک باغوں میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ جب تھک گئے تو واپس مہمان خانے میں چلے گئے اور سیدھے اس کمرے میں پہنچے جس میں ارشاد الہی اپنی ماں کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ مگر کمرہ خالی تھا۔ ارشاد الہی کی ماں موجود نہ تھی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ لالی نے لٹا کو

بلایا۔ کٹھوم بی بی کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ جنت کے ہم راہ حویلی دیکھنے آ رہے۔

لالی نے مسکرا کر لہنا سے کہا۔ ”ہنر بہت پیاس لگی ہے ٹھنڈی ٹھنڈی لسی پلا۔“

لہنا نے مستعدی سے جواب دیا۔ ”ابھی لایا جی۔“ وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

لہنا ذرا ہی دیر بعد لسی سے بھرے ہوئے دو گلاس لایا اور دونوں کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ لا اور ارشاد الہی لسی پینے لگے۔ لہنا نے دریافت کیا۔ ”کوئی اور حکم جی؟“

”نہیں“ اب تو رجا۔“ اس دفعہ ارشاد الہی بولا۔

لہنا چلا گیا۔ دونوں لسی پینے لگے۔ اسی اثناء میں نادر خان آگیا۔ اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے معذرت کی۔ ”معاف کرنا جی۔ میں سویرے نہیں آسکا۔ رات کو شاہ جی سے ملنے پیراں والہ چلا آ تھا۔ وہاں سے لوٹا تو رات آدمی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ اس لیے دیر سے سو کر اٹھا۔“ اس قدرے توقف کے بعد پوچھا۔

”کوئی تکلیف شکیف تو نہیں؟“

”ویسے تو بہت آرام ہے۔ پر کپڑے بہت گندے ہو گئے ہیں۔“ لالی نے بتایا۔ ”ہم اپنے ساتھ کپڑے لے کر تولاے نہیں تھے۔ ادھر ٹھہرنے کا ارادہ تو تھا نہیں۔ سوچا تھا شاہ جی سے گل بات کر کے واپس چلے جائیں گے۔ بعد میں آرام سے آئیں گے۔“

”کپڑوں کی فکر نہ کریں جی۔ نئے تیار ہو جائیں گے۔ حویلی کا اپنا درزی ہے۔ میں اسے بھیج دوں گا۔ وہ تینوں کی ناپ لے لے گا۔ میں آج ہی شہر جا کر کپڑا لے آؤں گا۔ درزی سے کسوں کا فٹ کپڑے سی دے۔ کل شام تک کپڑے تبدیل کرنے کا بندوبست ہو جائے گا۔“

”کوئی فکر کی گل نہیں۔“ ارشاد الہی نے مسکرا کر کہا۔ ”ایک روز اور انھی کپڑوں میں گزارہ کر لیں گے۔“

”تو شاہ جی کے پاس گیا تھا۔ تیری اس سے کیا گل بات ہوئی؟“ لالی نے فوراً وہ سوال اٹھایا۔ جر کا جواب جاننے کے لیے وہ گزشتہ رات سے بے چین تھا۔

”وہ بہت مصروف تھا۔ کچھ سرکاری افسران اس کی حویلی میں ٹھہرے ہیں۔ انھی کے ساتھ باتوں میں لگا ہوا تھا۔“ نادر خان نے صحیح صورت حال بتانے سے گریز کیا۔ گول مول جواب دیا۔ ”تب ہی تو مجھے ادھر اتنی دیر ہو گئی۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہمارے بارے میں تیری شاہ جی سے گل بات ہی نہیں ہوئی۔“

ارشاد الہی نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا۔

”بات تو ہوئی تھی، پر زیادہ تفصیل سے نہیں ہوئی۔“ نادر خان نے مطلع کیا۔ ”شاہ جی نے کہا ہے کہ وہ تم سے ملے گا اور آرام سے بیٹھ کر گل بات کرے گا۔“

”تو نے کیا اندازہ لگایا؟“ لالی نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں بے قراری تھی۔ ”ارشاد الہی کو زمین داری دینے میں کوئی جھگڑا تھا تو نہیں کھڑا کرے گا؟“

”مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔“ نادر خان نے گل کر بات نہ کی، ٹالنے کی کوشش کی۔ ”وہ بہت وڈا بگیردار ہے۔ اس کی زمیں داری ہزاروں ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے۔ زرعی اصلاحات کے تحت خاندان کے سارے ہی بندوں میں بانٹنے کے بعد بھی اس نے بہت زیادہ اراضی حکومت کو دے دی۔“ اس نے قدرے تامل کے بعد نرم لہجے میں کہا۔ ”کوئلہ ہرکشن کی زمیں داری تو اس نے اس لیے سنبھال لی تھی کہ چوہدری سے اس کی بہت گہری یاری تھی۔“

”تب تو چوہدری نور الہی کے وارث کی حیثیت سے اسے ارشاد الہی کو ادھر کی زمیں داری دے دینا چاہیے۔“ لالی نے قیاس آرائی کی۔

”فکر نہ کریں جی۔“ نادر خان نے دونوں کو اطمینان دلایا۔ ”سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔ شاہ جی کو جیسے ہی فرصت ملی وہ تم سے ملنے خود ادھر آئے گا۔ تب تک ادھر آرام سے ٹھہریں۔ کوئی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں۔“

”کپڑے لے کر بندوبست ہو جائے تو ادھر ٹھہرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔“ لالی نے ایک بار پھر اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔

”وہ تو جی کل شام تک ہو جائے گا۔“ نادر خان نے یقین دلایا۔ ”اس کی بالکل فکر نہ کریں۔ میں میاں سے اٹھ کر کپڑا لینے شہر چلا جاؤں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے ٹھٹکا۔ مڑ کر دونوں کو دیکھا۔ ”چوہدرانی کی دیکھ بھال کے لیے میں نے اپنی گھر والی کو لگا دیا ہے۔ وہ چوہدرانی کو کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گی۔“

نادر خان باہر چلا گیا۔

نادر خان سے گفتگو کرنے کے بعد لالی اور ارشاد الہی خاصے مطمئن ہو گئے تھے۔ ان کے چروں سے مسرت اور شادمانی عیاں تھی۔ وہ اپنے تاریک ماضی سے نکل کر روشن مستقبل میں داخل ہونے کے سامنے خواب دیکھ رہے تھے۔

زمین دار ہے۔ تجھے اب تک پتہ نہیں؟
”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“ نادر خان نے بے زاری سے ٹالنے کی کوشش کی۔

”تو ارشاد الہی کو کب سے جانتا ہے؟“

”میں نے تو اسے پہلی بار دیکھا ہے۔“ نادر خان نے ایک بار پھر بے زاری کا اظہار کیا۔ ”پر تو ایسی بات کیوں پوچھ رہا ہے؟ مہمان خانے میں جا کر اپنا کام کر۔ مہمانوں کو آرام پہنچا۔ انھیں کوئی تکلیف ٹھیک نہ ہو۔“

”وہ تو جی میں کر ہی رہا ہوں۔ میں تو تجھے یہ بتانے آیا ہوں کہ ارشاد الہی کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔“

”تو اسے پہلے سے جانتا ہے؟“ نادر خان نے لہنا کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ ”تب تو یہ بھی جانتا ہو گا کہ وہ چوہدری نور الہی کا پتر ہے۔“

”یہ تو جی میں نوں پتہ نہیں۔ پراتا پتہ ہے کہ ارشاد الہی ایک بار پہلے بھی ادھر آچکا ہے۔“
”وہ ادھر پہلے بھی آیا تھا؟ کب آیا تھا؟“ نادر خان نے لہنا سے پوچھا۔ ”میں نے کل رات سے پہلے اسے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔“

”پچھلے سال بھی انھی دنوں وہ یہاں آیا تھا۔ تو اس روز لہور گیا تھا۔“ لہنا نے بتایا۔ ”میں حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھ سے ادھر کے زمیں دار کے بارے میں پوچھا۔ اتنے میں شاہ جی کی گڈی حویلی کے آگے آکر رکی۔ شاہ جی نے ارشاد الہی کو دیکھا۔ اس کے کپڑے لٹے گندے اور پھنے پرانے تھے۔ سر کے بال بھی گندے تھے۔ دیکھنے میں بھک مٹکا لگتا تھا۔ شاہ جی نے بھی اسے بھک مٹکا سمجھا۔ جب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اسے دیا۔ اس نے چپ کر کے نوٹ لے لیا اور بنا کچھ کہے سنے چلا گیا۔“

”تجھے دھوکا ہوا۔ وہ کوئی اور ہو گا۔“ نادر خان کو یقین نہیں آیا۔ ”چوہدری ارشاد الہی تو کسی طرف سے بھکاری نہیں لگتا۔“

”تجھے پتہ نہیں۔ وہ بھکاری ہی ہے۔“ لہنا نے اس دفعہ ذرا جما کے کہا۔ ”میں اسے اور اس کی ماں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”تو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ نادر خان نے اس کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ ”تجھے لہجے میں ڈپٹ کر کہا۔“ آگے ایسی گل بات نہ کرنا۔ جا کر اپنا کام کر۔“

”نراض نہ ہو۔ پہلے میری پوری گل تو سن لے۔“ لہنا نے نرم لہجے میں بتایا۔ ”میں کوئی غلط گل

حویلی کے پچھواڑے دور تک پھیلا ہوا وسیع میدان تھا جو مویشیوں کی چراگاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہ جگہ تھا جس میں لیکر اور شیشم کے اکا دکا درخت تھے۔ خود رو پودوں کی جھاڑیاں تھیں ہری بھری گھاس تھی۔ کسین چھدری کسین خوب گھنی۔ جگہ کے ایک طرف مویشیوں کا باڑا تھا۔ ج کی چار دیواری کا ایک حصہ پچھلی برسات میں گر گیا تھا۔ پہلے اس جگہ اسکول تھا۔ یہ اسکول ج نے قائم کیا تھا۔ اس میں گاؤں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ جیلہ بچوں کو خود پڑھاتی اور اسکول کی دیکھ بھال بھی کرتی تھی۔ وہ اسے باقاعدہ سرکاری طور پر تسلیم شدہ پرائمری اسکول چاہتی تھی۔ مگر جب وہ کوئلہ ہرکشن چھوڑ کر اپنے بڑے بھائی ہرویاں کے ہم راہ سرحد پار چلی گئی عرصہ دراز تک اسکول کی عمارت ویران پڑی رہی۔ اسکول بند ہو گیا تھا۔ رحیم داد نے اسے چلا۔ میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ احسان علی شاہ نے رحیم داد کے قتل کے بعد کوئلہ ہرکشن کی زمیں داری ا تمام جائیداد پر قبضہ کیا تو اسکول کو مویشیوں کا باڑا بنا دیا۔

باڑے کی دیوار سے متصل نین کی چھت کا سانبان تھا۔ سانبان کے نیچے رحیم داد مرحوم جیب کھڑی تھی جو اب عام طور پر نادر خان کے استعمال میں رہتی تھی۔

جیب تو موجود تھی مگر ڈرائیور غائب تھا۔ نادر خان سانبان کے سامنے کھڑا ڈرائیور کا انتظار رہا تھا۔ وہ لالی، ارشاد الہی اور اس کی ماں کے نئے لباس سلوانے کے لیے کپڑا لینے شرجانا چھا تھا۔ ڈرائیور تو نہیں آیا۔ البتہ جگہ کے درمیان سے گزرتی ہوئی پکڑ پکڑی پر لہنا نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا باڑے کی جانب آ رہا تھا۔

لہنا قریب پہنچا تو نادر خان نے حیرت زدہ ہو کر دریافت کیا۔ ”لہنا! تو مہمان خانے سے ادھر کیے آیا؟“

”میں تو تجھے دیر سے پنڈ میں ڈھونڈ رہا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔

”تو مجھے کیوں ڈھونڈ رہا تھا؟“

”تجھ سے ایک ضروری گل کرنی تھی۔“

”ایسی کیا گل کرنی تھی جو تو مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں آیا؟“ نادر خان ہنوز حیرت زدہ تھا۔

”یہ جو ارشاد الہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہے کیا ادھر کا زمیں دار بن گیا ہے؟“ لہنا نے دریافت کیا۔

”ابھی تو نہیں بنا۔“ نادر خان نے جواب دیا۔ ”پر تجھے کیسے پتہ چلا؟“

”حد ہو گئی جی۔“ لہنا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ”سارے پنڈ میں چرچا ہے کہ ارشاد الہی پنڈ کا

بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ ارشاد الہی کے یہاں آنے کے کچھ ہی دنوں بعد میں جوند سنگھ والا گیا۔ تیر نوں پتہ ہے ادھر میرا چاچا رہتا ہے۔ میں اسی کے پاس گیا تھا۔ میں نے دیکھا بس شاپ پر ارشاد الہی بھیک مانگ رہا تھا۔ ساتھ میں اس کی ماں بھی تھی۔ وہ ایک درخت کے نیچے چادر بچھائے بیٹھی تھی دونوں ہی بھیک مانگ رہے تھے۔

نادر خان اس کی باتیں سن کر ششدر رہ گیا۔ اس نے حیران پریشان ہو کر پوچھا۔ ”لئے! تو کہہ رہا ہے؟“

”بالکل سچ کہہ رہا ہوں جی۔“ لہنا نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔ ”پچھلے مہینے میں جوند سنگھ والا گیا۔ تب بھی ارشاد الہی اپنی ماں کے ساتھ بس شاپ پر بھیک مانگ رہا تھا۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”ساتھ میں میرا چاچا بھی تھا۔ اس نے بھی دونوں کو بھیک مانگتے دیکھا تھا۔ میرے چاچا سے پوچھ لے۔ میں کل ہی جوند سنگھ والا جا کر اسے ادھر لے آؤں گا۔ وہ تو دونوں کو ٹھیک طرح پہچانتا ہے۔ روز ہی ان کو بھیک مانگتے بس شاپ پر دیکھتا ہے۔“

نادر خان نے کچھ نہ کہا۔ خاموش کھڑا سوچتا رہا۔ اسی اثناء میں سامنے سے ڈرائیور آتا ہوا نظر آیا۔ نادر خان نے مڑ کر لہنا کی جانب دیکھا۔ ”لئے! تو جا کر مہمان خانے میں اپنا کام کر۔ مہمانوں پہلے کی طرح آرام سے رکھ۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں کو بالکل پتہ نہ چلے کہ تو ان کو جانتا ہے۔ او کسی سے بھی ان کے بارے میں کچھ نہ کہنا۔“

”تیں نوں مہمان خانے نہیں جانا؟“ لہنا نے پوچھا۔

”پہلے شہر جانے کا ارادہ تھا۔ پر اب شاہ جی کے پاس پیراں والہ جاؤں گا۔“ نادر خان نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی تھی۔

ڈرائیور اب قریب آچکا تھا۔ لہنا نے مزید بات چیت نہیں کی۔ خاموشی سے مڑا اور آگے بڑ گیا۔



دن ڈھل رہا تھا۔ سائے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ دھوپ کی چمک دمک ماند پڑ گئی تھی۔ کلثوم بی بی مہمان خانے میں واپس آئی۔ لالی اور ارشاد الہی کمرے میں بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کلثوم بی بی کا دل حویلی میں ایسا لگا کہ دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے صحن میں چارپائی ڈلوائی۔ اجلا بستر لگوا دیا اور ٹانگیں پسار کر اطمینان سے لیٹ گئی۔ دھوپ کی ہلکی ہلکی حدت سے اسے بہت سکون ملا۔ ایک نوکرانی اس کے قریب بیٹھ گئی اور آہستہ

آہستہ کمر اور پنڈلیاں دبائے گئی۔ عرصہ دراز بعد اسے اتنی آسائش نصیب ہوئی تھی۔ ایسا آرام ملا کہ آنکھ لگ گئی۔ وہ دیر تک سوئی رہی۔ آخر جنت نے ہولے ہولے جھنجھوڑ کر اسے جگایا۔ درزی کپڑوں کی ٹاپ لینے آیا تھا۔ لالی اور ارشاد الہی کی ٹاپ وہ مہمان خانے میں جا کر پہلے ہی لے چکا تھا۔ جنت نے کلثوم بی بی کی ٹاپ ہلے کر درزی کو بتا دی۔ ساتھ ہی تاکید کی کہ جلد سے جلد کپڑے تیار کر دے۔

کلثوم بی بی کمرے میں پہنچ کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئی تو لالی نے شکوہ کیا۔ ”بے بے! تو حویلی میں جا کر ایسی بیٹھی کہ دوپہر کی روٹی کھانے بھی ادھر نہ آئی۔“ وہ زیر لب مسکرایا۔ ”لگتا ہے حویلی تجھے بہت پسند آئی۔“

”ہاں جی بہت پسند آئی۔“ کلثوم بی بی کے چہرے پر خوشی جھلکنے لگی۔ ”بہت شاندار ہے۔ بالکل محل لگتی ہے۔ یہ دوڑے دوڑے کمرے۔ ایک نہیں کئی ہیں۔ ہر کمرے میں کپڑے لتے رکھنے کے لیے الماریاں، میز، کرسیاں، اچی اچی منجیاں۔ ان پر اچلے بستر لگے ہوئے۔ کیا نہیں ہے؟“ اس نے قدرے توقف کے بعد بتایا۔ ”میں نے تو اپنے لیے ایک کمرہ پسند بھی کر لیا ہے۔“

”نوکرانیاں کیسی ہیں؟“ ارشاد الہی نے دریافت کیا۔

”مریم تو ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔ دیر تک بیٹھی میری کمرہ باتی رہی۔“ کلثوم بی بی نے نفرت سے منہ بگاڑا۔ ”دوسری تو ایک دم ہڈ حرام لگتی ہے۔ مریم کے سوا سب کو نکال کر دوسری نوکرانیاں لگاؤں گی۔“

”اماں! تو نے کسی نوکرانی سے جھگڑا تو نہیں کیا؟“ ارشاد الہی نے مسکرا کر اسے چھیڑا۔ ”تیرا غصہ بہت خراب ہے۔“

”وے میں پاگل ہوں۔“ کلثوم بی بی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ”ابھی تو چپ کر کے سب کو دیکھتی رہی۔ زمیں داری اپنے پاس آجائے تب ان سے پوچھوں گی۔“

”زمیں داری تو ملتی ہی ملتی ہے۔ تو اس کی فکر نہ کر۔“ لالی نے اسے مطلع کیا۔ ”نادر خان دوپہر کو آیا تھا۔“

”کیا کہتا تھا وہ؟“ ارشاد الہی کی ماں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

”وہ کل رات شاہ جی سے ملنے پیراں والہ گیا تھا۔ کہتا تھا دو چار روز میں شاہ جی ادھر آئے گا۔ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔“ لالی نے کلثوم بی بی کو بتایا۔

”زمیں داری اور جائیداد تو مل جائے گی ناں؟“

”کیوں نہیں ملے گی؟“ لالی نے کلثوم بی بی کو اطمینان دلایا۔ ”شاہ جی ادھر آکس لیے رہا ہے۔“
 کلثوم بی بی خاموش رہی۔ اس کے چہرے سے سرت جھلکنے لگی۔ عمدہ غذا کھانے کو ملی اور آراء
 و آسائش سے رہتا نصیب ہوا تو وہی دن میں اس کا روپ رنگ ٹھہر گیا۔ غربت و افلاس کا غبار مٹ
 گیا اور بھیجی بھیجی بے رونق آنکھوں میں چاندنی اتر آئی۔
 لالی نے اس کے چہرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ ”بے بیٹے تو تو ابھی سے دوی زمیں
 دارنی لگ رہی ہے۔“

”زمیں داری تو تجھے اور شادا کو سنبھالنی ہے۔“ میں نے اس سے کیا لیتا۔ ”ارشاد الہی کی ماں
 نے بے نیازی کا اظہار کیا۔“

”شادے!“ لالی نے فوراً منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”آگے میں تجھے پوچھ رہی کہوں گا۔“ اس نے
 قدرے تامل کے بعد کہا۔ ”ہاں تو پوچھ رہی جب تو کو ملد ہر کشن کا زین دار بن جانا تو مجھے اپنا فیجر لگا
 لیتا۔“

”نادر خان کا کیا بنے گا؟“ ارشاد الہی کی ماں نے فوراً اپنے رد نسل کا اظہار کیا۔ ”اس کی گھر والی
 جنت نے تو مجھے بہت آرام پہنچایا۔ میری ایسی دیکھ بھال کرتی ہے کہ تجھے کیا بتاؤں۔“

”اماں، تو اس کی فکر نہ کر۔“ ارشاد الہی نے ماں کو اطمینان دلایا۔ ”زمیں داری مل جائے تو اس
 کے بارے میں سوچیں گے۔ لالی کے ساتھ مل کر تو مجھے زمیں داری چلائی ہے۔“

تینوں اسی طرح کی باتیں کرتے رہے۔ آئندہ کے منصوبے بتاتے رہے۔
 شام ہو گئی۔ مگر نادر خان نہ آیا۔ تاریکی پھیلنے لگی۔ رات کالی کا بل ہو گئی۔ سردی بڑھ گئی۔ ہر
 طرف گمراہ سناٹا چھا گیا۔ کوئلہ ہر کشن سو گیا۔ لیکن نادر خان نظر نہ آیا۔

صبح ہوئی۔ کلثوم بی بی ناشتے سے فارغ ہوتے ہی حویلی میں چلی گئی۔ لالی اور ارشاد الہی کے لباس
 اتنے میلے کچیلے ہو گئے تھے کہ مہمان خانے سے باہر جاتے ہوئے انھیں عار محسوس ہوا۔ انھوں نے
 صحن میں کرسیاں ڈلوائیں اور دھوپ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

دونوں کی حجامت بھی بڑھ گئی تھی۔ لالی نے لہٹا کو بلایا۔ اس سے دریافت کیا۔ ”لہٹے، حویلی کا
 درزی ہے تو تائی بھی ہو گا؟“

”کیوں نہیں ہے جی، بالکل ہے۔“ لہٹا نے جواب دیا۔ ”پر وہ کل شام سے جیون شاہ گیا ہوا
 ہے۔“

”یہ جیون شاہ کدھر ہے؟“ اس دفعہ ارشاد الہی نے دریافت کیا۔

”عارف والا روڈ پر ہے جی۔ ادھر اس کی بھین ہے۔ اسے ملے گیا ہے۔“ لہٹا نے بتایا۔ ”کل
 صبح نہ آیا تو شام کو ضرور واپس آجائے گا۔“

”ادھر اور کوئی تائی شائی نہیں ہے؟“ لالی نے ہاتھ سے رخسار سلاتے ہوئے کہا۔ ”واڈمی
 بنوائی ہے۔ بہت بڑھ گئی ہے۔ سر کے بال بھی کٹوائے ہیں۔“

لہٹا نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ ”فکر نہ کریں جی۔ میں پنڈ کے تائی سینا کو لے کر آتا ہوں۔ سینا
 بھی بہت ہشیار تائی ہے۔“

لہٹا چلا گیا۔ دوپہر کو کھانے کر آیا تو لالی نے تائی کے بارے میں پوچھا۔ لہٹا نے نظریں جھکا کر
 کہا۔ ”سینا تو جی تیار ہے۔ اسے بکھا ہے۔ ٹھیک ہو گیا تو کل بلا لاؤں گا۔“

لالی نے کچھ نہ کہا۔ خاموشی سے کھانا کھانے لگا۔
 دو روز گزر گئے۔ لیکن نادر خان نظر نہ آیا۔ نہ جنت کو اس کے بارے میں کچھ معلوم تھا نہ لہٹا

کو۔ بار بار پوچھنے پر بھی دونوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لالی اور ارشاد الہی سخت پریشان تھے۔ ان
 کے لباس پچھلے پانچ روز میں بہت میلے کچیلے ہو گئے تھے۔ حجامت بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ ابھی تک نہ
 حویلی کا تائی جیون شاہ سے واپس آیا تھا اور نہ گاؤں کے تائی سینا کا بخار اتر تھا۔ کچھ تو سردی کے
 باعث اور کچھ اجلا لباس نہ ہونے کے سبب دونوں غسل بھی نہ کر سکے تھے۔ وہ کوئلہ ہر کشن میں
 زمین دارانہ کدو فر اور آن بان سے داخل ہوئے تھے۔ اب اپنی پرانی جون میں آگئے تھے۔ وضع
 قطع سے کسی بچنے کے جعدار معلوم ہوتے تھے۔



جمعرات کی شام تھی۔ لالی اور ارشاد الہی کمرے میں بیٹھے نادر خان کا بے چینی سے انتظار کر
 رہے تھے۔ باہر کمرہ ہلکا نیل گوں وحنڈ لکا پھیلتا جا رہا تھا۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ ارشاد الہی کی ماں بھی
 کمرے میں موجود تھی۔ اسے کچھ زیادہ ہی سردی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ رضائی ادڑے پٹنگ پر دو
 ٹکیوں کے سارے بیٹھی تھی۔

”نادر خان کدھر چلا گیا؟“ ارشاد الہی کی ماں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا ”اب تک واپس نہیں
 آیا۔“

”پتہ نہیں کدھر چلا گیا۔ کسی کو پتا کر بھی نہیں گیا۔“ لالی نے اسے بتایا۔ ”لگتا ہے شاہ جی کے
 پاس گیا ہے۔ اس نے روک لیا ہو گا۔“

”ایسا ہی لگتا ہے۔“ ارشاد الہی نے بھی اس کی تائید کی۔ ”ورنہ وہ اب تک ضرور آجاتا۔ اسے

گئے ہوئے کئی روز ہو گئے۔“

”کہاں جانا ہے؟“ لالی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔ آگے نہیں بڑھا۔

”تھانے چلنا ہے۔“

”تھانے کیوں چلنا ہے؟“

”یہ وہیں پہنچ کر پتہ چل جائے گا۔“

”مجھے تھانے کیوں لے جا رہے ہو؟ میں نے کوئی جرم کیا ہے؟“ لالی جرح کرنے لگا۔ ”میرے

خلاف کوئی وارنٹ شارنٹ ہے؟“

”اوئے بکو اس نہ کر۔“ ہیڈ کانٹیل نے ڈپٹ کر کہا۔ اور جھپٹ کر لالی کے منہ پر زور کا تھپڑ

مارا۔ اس نے پلٹ کر قریب کھڑے ہوئے کانٹیل کی جانب دیکھا۔ ”فضل دین اسے جیب میں

بٹھا۔ لیکن پہلے اس کی تھوڑی گرمی اتار دے۔ بہت کون چھانٹا ہے۔“

لالی تھپڑ کھا کر سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ فضل دین نے بڑھ کر لالی کی گردن دوچی۔ زور سے دھکا

دیا اور پیٹر ابدل کے ایسی کراری لات ماری کہ لالی لڑکھڑا کر گرا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی

اونچے طرے کی پگ بھی ایک طرف جا کر گری۔ دو کانٹیلوں نے اسے اٹھایا اور دھکے دیتے ہوئے

جیب کے قریب لے گئے۔ یہ رحیم داد مرحوم کی جیب تھی جسے لالی پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ دونوں

کانٹیلوں نے لالی کو پچھلی نشست پر بٹھا دیا۔ ایک کانٹیل اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

ارشاد الہی سما ہوا کھڑا تھا اور لالی کی تذلیل ہوتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ہیڈ کانٹیل نے اسے قہر

آلود نظروں سے دیکھا۔ ”اوئے تو کیوں کھڑا ہے۔ تیں نوں تھانے نہیں جانا؟“ وہ ایک بار پھر فضل

دین کی جانب متوجہ ہوا۔ ”اس کے بھی ٹھڈ لگا۔ کیسا شان سے اکڑا کھڑا ہے۔“

فضل دین نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے زور زور سے دولا تیں ایسی ماریں کہ ارشاد الہی

ڈمگما کر گرا۔ اٹھا اور پھر گرا۔ اس کی اونچے طرے کی پگ بھی قریب کی ایک جھاڑی میں جا کر

گری۔ اسے بھی دھکے دے کر دوسری جیب میں پچھلی نشست پر بٹھا دیا گیا۔ یہ احسان علی شاہ کی

جیب تھی اور ڈرائیور بھی اسی کا تھا۔

لاڑا اور ارشاد الہی جیپوں میں بٹھا دیے گئے تو ایک کانٹیل مہمان خانے میں گیا۔ واپس آیا تو

ارشاد الہی کی ماں کلثوم بی بی اس کے ہم راہ تھی۔ وہ اس قدر حواس باختہ تھی کہ کئی بار ٹھوکر کھا کر

گری۔ وہ اس وقت کچھ زیادہ ہی لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اسے ارشاد الہی کے ساتھ بٹھا دیا گیا۔ ایک

کانٹیل بھی دونوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دوسرا آگے کی نشست پر ڈرائیور کے قریب بیٹھا تھا۔ ہیڈ

کانٹیل دو کانٹیلوں کے ساتھ اس جیب میں بیٹھ گیا جس میں لالی موجود تھا۔

نادر خان کے بارے میں تینوں کئی روز سے ایسی ہی قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔ لالی کچھ

ہی والا تھا کہ یکایک مہمان خانے کے باہر جیب کے ہارن کی تیز آواز شام کے سناٹے میں ابھر

ہارن کی آواز سنتے ہی لہنا اپنی کوٹھری سے نکلا اور بیرونی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔

ارشاد الہی نے لالی سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے نادر خان واپس آگیا۔“

”ہو سکتا ہے احسان علی شاہ بھی اس کے ساتھ ہی آیا ہو۔“ لالی نے ارشاد الہی کے خیال

اتفاق کیا۔ اپنی لوٹی کھول کر دوبارہ جسم کے گرد لپٹی اور کرسی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ارشاد الہی بھی اپنی لوٹی درست کرنے لگا۔

لہنا اندھیرے سے نکل کر دروازے کی دہلیز پر نمودار ہوا۔ لپٹ کی روشنی میں اس کے چہرے

چھائی ہوئی پریشانی صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا۔ ”پولیس آ

ہیں۔“

لالی نے حیران و پریشان ہو کر پوچھا۔ ”پولیس والے یہاں کیوں آئے ہیں؟“

ارشاد الہی بھی گھبرا گیا۔

”پتہ نہیں جی کیوں آئے ہیں؟“ لہنا نے بتایا۔ ”دونوں کو باہر بلاتے ہیں۔“

لالی چند لمحے دم بخود بیٹھا رہا۔ پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی اپنی اونچے طرے کی پگ اٹھا کر

رکھی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر ارشاد الہی کو دیکھا۔

”شادے، تو بھی میرے ساتھ آ۔“

ارشاد الہی نے بھی اپنی پگ اٹھا کر سر پر رکھی اور لوٹی سنبھالتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی آ

بڑھا۔ ارشاد الہی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ دونوں کمرے سے نکل کر صحن میں پہنچے اور مہمان خانہ

سے باہر چلے گئے۔ انھوں نے حیرت زدہ نظروں سے دیکھا۔ دھندلی دھندلی کمر میں لپٹے ہوئے

پولیس والے سامنے کھڑے تھے۔ دو پولیس کی یونیفارم میں تھے اور تین سادہ لباس میں تھے۔

کے عقب میں دو جیپیں کھڑی تھیں۔

”دونوں میں لالی کون ہے؟“ ایک پولیس والے نے پوچھا جو ہیڈ کانٹیل معلوم ہوتا تھا۔

لالی نے آگے بڑھ کر بتایا۔ ”میرا نام جی لالی ہے۔“ اس نے نظریں اٹھا کر دریافت کیا۔ ”آ

آنا ہوا جی؟“

”نادر جا کر بیٹھ جا۔“ ہیڈ کانٹیل نے ہاتھ اٹھا کر ایک جیب کی طرف اشارہ کیا۔

ڈرائیوروں نے انجن اشارت کئے۔ دونوں جیپیں آگے بڑھیں۔ لہا مہمان خانے کے دروازے پر سہا ہوا کھڑا تھا اور جیپوں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا جو آن کی آن میں کمر کے دھندلے میں او جھل ہو گئیں۔



حوالات میں اندھیرا تھا۔ سلین تھی اور سخت بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ لالی، ارشاد الہی اور اس کی ماں، تینوں دیواروں سے لگے سکرے سکڑائے ٹھنڈے فرش پر لیٹے تھے اور سردی سے کپکپا رہے تھے۔ ان کے علاوہ حوالات میں دو ملزم اور بھی تھے۔ وہ قتل کے الزام میں گرفتار کر کے لائے گئے تھے۔

ارشاد الہی کی ماں جب لالی اور ارشاد الہی کے ساتھ حوالات میں داخل ہوئی تو اس قدر خوف زدہ تھی کہ بت بنی خاموش بیٹھی رہی۔ کبھی گہرا کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے لالی کو دیکھتی کبھی ارشاد الہی کو۔ کچھ دیر بعد اس کے حواس کچھ بجا ہوئے تو اس نے لالی سے پوچھا۔
”لالی پتر، پولے، ہم کو پکڑ کر کیوں لائے ہیں؟“

ارشاد الہی بھی اب تک دم بخود بیٹھا تھا۔ اس نے بھی لالی سے ایسا ہی سوال کیا۔ لالی کیا جواب دیتا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ تینوں کو گرفتار کر کے کیوں حوالات میں بند کیا گیا ہے؟ اسے صرف اتنا شبہ تھا کہ اس کا روایتی کے پیچھے احسان علی شاہ کا ہاتھ ہے۔ لیکن پولیس نے ان کے خلاف کیا الزام عائد کیا ہے اس کا اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ مگر اس نے اپنے شے کا ارشاد الہی اور اس کی ماں سے مطلق اٹھارہ نہ کیا۔ صرف اتنا کہا۔

”پتہ نہیں پولیس نے ہم کو کیوں پکڑا ہے؟ سمجھ نہیں آتی ایسی کارروائی ہمارے خلاف کیوں کی گئی؟ صبح ہونے ہی پر پتہ چل سکے گا۔“ اس نے چونکنا نظروں سے باہر کی جانب دیکھا۔ کسی کانٹیل کو دروازے کے قریب نہ پایا تو رسان سے دونوں کو سمجھایا۔ ”ایس ایچ او کے سامنے میں جو بیان دوں تم دونوں بھی وہی کہنا۔ یہ ہرگز نہ بتانا کہ تم جو نہ ٹکھ والا کے بس شاپ پر بھیک مانگتے تھے۔ بے بے، تو زیادہ نہ بولنا۔ تو بھی مصیبت میں پھنس جائے گی اور ہم کو بھی پھنسا دے گی۔ فکر نہ کر سب ٹھیک ٹھاک ہی ہو گا۔“

لالی دونوں کو اسی طرح دیر تک سمجھاتا بجاتا رہا۔ طرح طرح سے تسلی دیتا رہا۔ ان کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ خوف زائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جاڑوں کی پھاڑی رات کاٹے نہیں کٹ رہی تھی۔ تینوں سونے کی کوششیں کرتے رہے۔ بے

چین ہو کر بار بار ہلہولتے۔ مکر سونہ سکے۔ آنکھ لگ جاتی تو ذرا ہی دیر بعد کھل جاتی۔ کڑا کے کی سردی تھی اور طرح طرح کے اندیشے ستاتے تھے۔ البتہ دوسرے دونوں ملزم حوالات کے ایک گوشے میں بے خبر سو رہے تھے۔ وہ اقبال جرم کر چکے تھے یا ان کو امید تھی کہ جلد ہی ضمانت پر رہا ہو جائیں گے۔

صبح ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان کے سامنے تینوں کی پیشی ہوئی۔ وہ بڑا قوی ہیکل پولیس افسر تھا۔ چہرے پر رعب اور دبدبہ تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر چیختی ہوئی نگاہوں سے دیکھا۔ سامنے رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھنے کو بھی نہ کہا۔ تینوں کو کھڑا رکھا۔ وہ کچھ دیر تینوں کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دریافت کیا۔

”تم سب کیا کرتے ہو؟ کوئلہ ہر کشن کس لیے آئے تھے۔“

”ہم جی کیمبل پور سے آئے تھے۔ ادھر ہماری زمیں داری ہے۔“ لالی نے تینوں کی نمائندگی کرتے ہوئے وہی کہا جو اپنے بارے میں نادر خان کو بتا چکا تھا۔ اس نے ارشاد الہی کی جانب ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ”یہ چوہدری نور الہی کا پتر چوہدری ارشاد الہی ہے۔ اس کا بیوہ کوئلہ ہر کشن کا زمیں دار ہوتا تھا۔ اسے پچھلے ہی دنوں اس کی موت کا پتہ چلا۔ اس کے وارث کی حیثیت سے یہ اپنی ماں کے ساتھ اپنے بیوہ کی زمیں داری اور جائیداد سنبھالنے کوئلہ ہر کشن آیا تھا۔“

ارشاد الہی نے بھی ایسا ہی بیان دیا۔ کلثوم بی بی نے اس کی تائید کی۔

”تو گویتا زمیں دار ہو۔“ تھانید ارشاد نواز خان اعوان نے آہستہ آہستہ گردن ہلائی۔ ”اور کوئلہ ہر کشن کی زمیں داری کا قبضہ لینے آئے ہو۔“

”ہاں جی، ہم اسی لیے آئے ہیں۔“ لالی نے بیٹھنے کے لیے کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”سیدھا کھڑا ہو۔“ تھانے کے ایس ایچ او نے زور سے لالی کو ڈانٹا۔ وہ ایک دم روایتی تھانے دار بن گیا۔ چہرے پر خشونت چھا گئی۔ آنکھوں سے جلال برسنے لگا۔ اس نے تینوں کی پشت پر کھڑے ہوئے کانٹیل کی جانب دیکھا اور آواز میں گھن گرج پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”میرداد!“

کانٹیل میرداد بڑھ کر آگے آیا اور اپنے جوتوں کی ایڑیاں کھٹاک سے ٹکرا کر سلیوٹ کیا۔

”ان کو فٹنی سمندر خان کے پاس لے جاؤ۔“ تھانے دار نے کرخت لہجے میں حکم دیا۔ ”اسے کو

ان کو تھریڈ کرانے۔ ایسی کہ زمیں داری کی گرمی بالکل اتر جائے۔“

میرداد نے حکم کی تعمیل میں زمیں داری کی گرمی وہیں اتارنا شروع کر دی۔ اس نے تراق سے

لالی کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ٹانگ گھما کر ارشاد الہی کے چوتروں پر زور سے ٹھڈ لگایا۔ کلثوم بی بی کا بازو

بتایا ”یہ رہے جی ملزمان۔ دھوکا دہی اور چار سو بیسی کے الزام میں کوئلہ ہر کشن سے گرفتار کر کے لائے گئے ہیں۔“

”حوالدار جی، ہم نے نہ کوئی چار سو بیسی کی ہے اور نہ کسی کو دھوکا دیا ہے۔“ لالی نے منشی سمندر خان کو مخاطب کرتے ہوئے صفائی پیش کی۔ ”ہمارے خلاف یہ بالکل غلط اور جھوٹا الزام ہے۔ ہم تو کوئلہ ہر کشن۔“

”کیوں اس نہ کر۔“ منشی نے لالی کو غصے سے جھڑک دیا۔ آگے بولنے کا موقع نہ دیا۔ ”مجھے پتہ ہے تم کوئلہ ہر کشن کس لیے آئے تھے۔“ اس نے مڑ کر قریب کھڑے ہوئے کانٹیل کی جانب دیکھا۔ ”لیا اس نوچھتر۔“

ایک کانٹیل بیڑہ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹیوب ویل کے پٹے کے دو ٹکڑے دبے ہوئے تھے جن میں سے ہر ایک لگ بھگ دو فٹ لمبا تھا۔ یہ چھتر تھے۔ ان کو لڑ بھی کہا جاتا ہے۔ لالی ایسے چھتر پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ تھانے میں ملازموں کے خلاف ان سے کیا کام لیا جاتا ہے۔ اس نے خوف زدہ ہو کر سمندر خان کو ایک بار پھر مخاطب کیا۔ ”حوالدار، میری گل تو سن۔“

سمندر خان نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کانٹیلوں سے کہا۔ ”ان دونوں کو چھتر پر پٹے کے لیے تیار کرو۔“ اس نے لالی اور ارشاد الہی کی جانب ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔

لالی نے بار بار احتجاج کیا۔ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ مگر بات سن نے کے بجائے تھپوں اور لالتوں سے اسے خاموش کر دیا گیا۔ کانٹیلوں نے دونوں کے کپڑے اتارے اور مادر زاد برہنہ کر دیا۔ کلثوم بی بی ایک گوشے میں دہشت زدہ بیٹھی تھی۔ اس نے لالی اور اپنے جوان بیٹے کو اس عالم میں دیکھا تو بدحواس ہو کر اپنا منہ چادر سے چھپا لیا۔

دونوں کو برہنہ کر کے فرش پر اوندھے منہ لٹا دیا گیا۔ چار کانٹیل لالی اور ارشاد الہی کا ایک ایک ہاتھ دبا کر بازوؤں پر بیٹھ گئے۔ ایک کانٹیل لالی کی دونوں ٹانگیں جوڑ کر پنڈلیوں پر اس طرح بیٹھ گیا کہ دونوں پر اس کے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے تھے۔ ارشاد الہی کی ٹانگیں دلوچ کر اسی طرح ایک اور کانٹیل بیٹھ گیا۔ کانٹیلوں نے دونوں کو اس طرح بے بس کر دیا تھا کہ وہ اپنے جسموں کو بالکل نہ ہلا سکتے تھے۔

جب دونوں کانٹیلوں نے لالی اور ارشاد الہی کو بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تو سمندر خان آگے بڑھا اور لالی کے قریب پہنچا۔ اس کے ایک ہاتھ میں چھتر دبا تھا۔ دوسرا چھتر میرداد کے ہاتھ میں

پکڑ کر جھٹکا دیا۔ تینوں کو مارتا بیٹتا دھکے دیتا باہر لے گیا۔

تھانے دار شاہ نواز خان اطمینان سے بیٹھا ہونٹوں میں دبی ہوئی سگریٹ کے کش لگاتا رہا اور تینوں کی درگت بنتے دیکھتا رہا۔

کانٹیل میرداد انھیں اس جگہ لے گیا جہاں ملازموں سے اقبال جرم کرایا جاتا تھا۔ تینوں کو وہاں پہنچا کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔

کلثوم بی بی نے چونکنا نظروں سے اوجھر اوجھر دیکھا اور رازدارانہ لہجے میں لالی سے پوچھا۔ ”لالی پتر یہ تتر پڑ کیا ہوتی ہے؟“

”یہ سب ہم کو ڈرانے دھمکانے کے لیے کیا جا رہا ہے۔“

”پر ہم کو کیوں ڈرایا دھمکایا جا رہا ہے؟“ کلثوم بی بی نے پوچھا۔ ”ہم نے کیا جرم کیا ہے جو ہمارے ساتھ ایسا کیا جا رہا ہے؟“

کلثوم بی بی بہت دہشت زدہ نظر آ رہی تھی۔ ارشاد الہی بھی سہا ہوا تھا۔ لالی نے قیاس آرائی کی۔ ”لگتا ہے یہ سارا پکڑ احسان علی شاہ نے چلایا ہے۔ اس نے جائیداد اور زمیں داری پر زبردستی کبندہ جو کر رکھا ہے۔ وہ تم دونوں کو زمیں داری اور جائیداد دینا نہیں چاہتا۔ پولیس کے ذریعے دباؤ ڈالوا رہا ہے تاکہ ہم جائیداد اور زمین داری اس سے نہ لے سکیں۔ اس کے علاوہ اور تو کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔“

”مجھے تو زمیں داری اور جائیداد ملتی ملاتی ملوم نہیں ہوتی۔“ کلثوم بی بی نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بے بے حوصلے سے کام لے۔ زمیں داری اور جائیداد سب کچھ تم دونوں کو ملے گی اور ضرور ملے گی۔ تمہارا اس پر کوئی حکم بنتا ہے۔“ لالی نے اس کی ہمت بندھائی۔ ساتھ ہی ایک بار پھر خبردار کیا۔ ”پر بے بے تو بالکل وہی کہتا جو میں نے کہا ہے۔ گھبراتا نہیں سب ٹھیک ہی ہو گا۔“ اس نے مڑ کر ارشاد الہی کی جانب دیکھا۔ ”شادے! تو بھی حوصلہ رکھ۔ ڈرنا شرنا نہیں۔ سچی بات یہ ہے۔“

مگر وہ سچی بات بتانہ سکا۔ میرداد واپس آ گیا۔ اس کے ہم راہ سات کانٹیل اور تھے۔ ان میں منشی سمندر خان بھی شامل تھا۔ اس کا چہرہ گینڈے کی طرح بھدا اور خوف ناک تھا۔ جسم مضبوط تھا۔ دوسرے بھی بڑے کٹے اور کچم کچم تھے۔

میرداد نے لالی، ارشاد الہی اور اسکی ماں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے سمندر خان کو

تھا۔ وہ بڑھ کر ارشاد الہی کے قریب پہنچ گیا۔ سمندر خان اور میرداد ہاتھ گھما گھما کر لالی اور ارشاد الہی کی کمر اور چوتروں پر سزاک سزاک چھتر مارنے لگے۔

لالی کے لیے یہ نیا تجربہ نہ تھا۔ وہ تھانوں کے اندر پولیس کے ہاتھوں کئی بار چھتروں کی مار کھا چکا تھا۔ اینٹوں کے بھٹوں پر بھی جعدار اور کارندوں کے ہاتھوں اسی طرح پٹ چکا تھا۔ البتہ ارشاد الہی کو پولیس کے ایسے تشدد سے پہلی بار سبقت پڑا تھا۔ مگر بھٹوں پر جعدار اور کارندوں کے ہاتھوں وہ بھی بار بار چھتروں کی مار کھا چکا تھا۔ لہذا دونوں نے نہ دبائی دی اور نہ دوا دلا کیا۔ خاموشی سے مار کھاتے رہے۔ صرف دانتوں کو بھیج کر سسکیوں کی سی آوازیں منہ سے نکالتے اور تکلیف سے بے قرار ہو کر ادھر ادھر پہلو بدلتے کی کوشش کرتے۔

ارشاد الہی کی ماں نے کچھ دیر تو ضبط کیا۔ سہمی ہوئی بیٹھی رہی اور بیٹے پر ہوتے ہوئے ظلم و ستم کو دیکھتی رہی۔ بے بسی سے آنسو بہاتی رہی۔ آخر اس کے صبر کا بندھن ٹوٹ گیا۔ بے قرار ہو کر گڑ گڑانے لگی۔

”وے اسے نہ مار۔ اسے بی بی ہے۔ اسے بخار رہتا ہے۔ کھانسی کے ساتھ خون آتا ہے۔ یہ مر جائے گا۔“

”اوائے بکواس نہ کر۔“ کانٹیل میرداد نے آنکھیں نکال کر اسے ڈانٹا۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی سسکیاں بھرتی رہی۔ پھر تڑپ کر اٹھی اور میرداد کے پیروں پر سر رکھ دیا جو ارشاد الہی کی چھتر سے پٹائی کر رہا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر کلثوم بی بی کی کمر اور پیٹھ پر ٹھوکریں ماریں۔ غصے سے دھکارا۔ گالیاں دیں۔ بال پکڑ کر علیحدہ کرنا چاہا۔ لیکن اس نے پیر نہ چھوڑے۔ میرداد کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ مارتے مارتے تھک بھی گیا تھا۔ اس نے مڑ کر حوالدار سمندر خان کی جانب دیکھا۔

”بہت ہو گیا۔ اتنا کافی ہے اس کے لیے۔“

سمندر خان بڑھ کر قریب پہنچا۔ ٹھوکر مار کر ارشاد الہی کو حکم دیا۔ ”کھڑا ہو جا۔“

ارشاد الہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ عالم یہ تھا کہ ناٹکیں کیکپا رہی تھیں۔ چہرے پر وحشت طاری تھی۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ حواس بجا نہیں تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے مگر مگر سمندر خان کو دیکھ رہا تھا۔



میرداد، ارشاد الہی اور اس کی ماں کو ایس ایچ او کے کمرے میں لے گیا۔

ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان ابھی تک اپنے کمرے میں موجود تھا۔ اس نے دونوں کو گردن اٹھا کر دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”اتر گئی زمیں داری یا ابھی کچھ اور اتاری جائے۔“

ارشاد الہی دم بخود کھڑا رہا۔ مگر اس کی ماں ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگی۔ ”نہیں جی، ہم نے کوئی زمیں داری شمس داری نہیں کرنی۔“

”کیا یہ سچ ہے، تم دونوں اڈہ لاریاں جو ند سنگھ والا پر بھیک مانگتے تھے؟“ ایس ایچ او نے دریافت کیا۔

کلثوم بی بی نے وضاحت کرنا چاہی۔ ”وہ ایسا ہے جی، جب ہم نصیر پور سے پاکستان پہنچے تو شادا کا پیچ۔“

”بکواس نہ کر۔“ ایس ایچ او شاہ نواز خان نے غصے سے ڈانٹا۔ ”جو پوچھتا ہوں اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دے۔“

”ہن جی، ہم دونوں جو ند سنگھ والا کے بس سناپ پر بھیک مانگتے تھے۔“ کلثوم بی بی نے کھبرا کر اعتراف کیا۔

”کمبل پور تم دونوں کس سلسلے میں گئے تھے؟“

”نہیں جی، ہم ادھر کبھی نہیں گئے۔“ ارشاد الہی کی ماں کلثوم بی بی نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”ہم نے تو جی کمبل پور دیکھا بھی نہیں۔“

”لالی، تم کو کہاں ملا تھا؟“ تھانیدار شاہ نواز خان اعوان نے سوال کیا۔

”وہ جی پہلی بار مجھے لہور میں ملک ٹار کے بھٹے پر ملا تھا۔“ اس دفعہ ارشاد الہی نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ادھر چھترے ہوتے تھے۔“

”ہم کو تو جی کچھ پتہ نہیں تھا۔“ کلثوم بی بی نے منافی پیش کی۔ ”لالی ہم کو بیکا کر زمیں داری اور جانیدار دلانے جو ند سنگھ والا سے کوئلہ ہر کشن لایا تھا۔“

تھانیدار نے لمبی ”ہوں“ کی۔ ہولے ہولے گردن ہلائی۔ ”تو لالی تم دونوں کو کوئلہ ہر کشن لایا تھا۔“ لمحہ بھر کے لیے اس نے خاموشی اختیار کی۔ پھر دریافت کیا۔ ”مائی، تیرا اور کون کو ہے؟ میرا مطلب ہے۔ کوئی شریکا، کوئی عزیز دار۔“

”میرا بس یہی ایک چتر ہے۔“ کلثوم بی بی نے ارشاد الہی کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں۔ دڈا پتر کرم الہی تھا۔ پاکستان آتے ہوئے تریموں کے چٹن پر سکھ بلوائیوں نے اسے مار ڈالا۔ میری دڈی دھی صابرہ تھی۔ اسے بلوائی اٹھا لے گئے۔ چھوٹی میرے ساتھ پاکستان آئی

تھی۔ وہ بھی مر گئی۔ گھر والا بھی نہیں رہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنسو رخساروں پر لڑھکتے لگے۔ ”اب تو جی ہم دونوں کا کوئی بھی نہیں رہا۔“

”ٹھیک ہے۔“ تھانیدار شاہ نواز نے مڑ کر کانٹیل میرداد کی طرف دیکھا۔ ”میرداد! ان کو لے جاؤ۔ روٹی شوٹی کھاؤ۔ انھیں آرام سے رکھو۔“

میرداد نے ایک بار پھر اینٹیشن ہو کر کھٹاک سے سیلوٹ کیا۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں سے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان کے ہم راہ دروازے کی جانب بڑھا۔ ایس ایچ او نے اسے ٹوکا۔ ”میرداد۔“ میرداد ٹھٹکا۔ پلٹ کر ایس ایچ او کی جانب متوجہ ہوا۔ ایس ایچ او نے حکم دیا۔ ”ان کو حوالات میں پہنچا کر لالی کو ادھر بھیج دو۔“

تینوں چلے گئے۔ ایس ایچ او شاہ نواز خان خاموش بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ لالی ایک کانٹیل کے ساتھ ایس ایچ او کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔ ہوش ٹھکانے نہیں تھے۔ قدم ڈمگا رہے تھے۔ بال بکھر کر منہ پر آگئے تھے۔ آنکھیں پٹی پٹی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ہانپ رہا تھا۔

تھانیدار نے نظریں اٹھا کر لالی کو دیکھا۔ مسکرا کر پوچھا۔ ”تو کیبل پور کا زمیں دار ہے ناں؟“

”ہاں جی۔“ لالی نے مختصر جواب دیا۔

”تیری زمیں داری ابھی نہیں اتری۔ کچھ اور اتاری جائے۔“ تھانیدار نے غضب ناک ہو کر ڈانٹا۔ ”ارشاد الہی کے ساتھ اینٹوں کے بٹے پر تو نہیں تیری ماں کا کوئی یار ہتھیرا لگا ہوا تھا؟“

لالی نے چونک کر تھانیدار کو دیکھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔ سر جھکایا اور خاموش کھڑا رہا۔

”کوئلہ ہر کشن کی زمیں داری پر دھوکے فریب سے کبھ کرنے کے لیے تجھے کوئی اور نہیں ملا؟“ تھانیدار تھکے لہجے میں گویا ہوا۔ ”اڈھ لاریاں جو نہ سنگھ والا پر بھیک مانگتے والے یہ دونوں بھکاری ہی تجھے ملے۔“

لالی سمجھ گیا کہ سارا کھیل بگڑ گیا۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں نے سب کچھ اگل دیا۔ اب مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے پسائی اختیار کی۔ عاجزی سے بولا۔ ”غلطی ہو گئی جی۔“

”سوال یہ ہے کہ تو نے یہ خطرناک کھیل کیوں کھیلا؟“ تھانیدار شاہ نواز خان نے زور دے کر پوچھا۔ ”جی جی بتا، تو نے ایسا کیوں کیا؟ کس لیے کیا؟“ اس نے قہر آلود نظروں سے لالی کو دیکھا۔ ”جھوٹ بولا تو منجی چڑھاؤں گا۔ رولر پھو ادوں گا۔ الٹا لٹکا کر چڑی ادھیر ڈالوں گا۔ ایسی مار لگاؤں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔“

”میں نے جی جھوٹ نہیں بولنا۔ سب کچھ سچ بتا دوں گا۔“ لالی نے گڑگڑا کر صفائی پیش کی۔ ”یہ ٹھیک ہے جی ارشاد الہی اور اس کی ماں جو نہ والا سنگھ کے بس شاپ پر بھیک مانگتے ہیں۔ پر یہ بالکل سچ ہے ارشاد الہی کوئلہ ہر کشن کے زمیں دار چوہدری نور الہی مرحوم کا پتر ہے اور اس کی ماں چوہدری کی بیوہ ہے۔ دونوں اس کی جائیداد کے اصلی وارث ہیں۔“

”پر نہ تو ارشاد الہی نے اور نہ ہی اس کی ماں نے اپنے بیان میں ایسی کوئی گل بات میرے سامنے کہی۔“ تھانیدار نے منہ بگاڑ کر اپنی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا۔ ”تو ایویں پھنے خان بن کے آگیا۔“

لالی مرعوب نہ ہوا۔ اس نے غڑ ہو کر کہا۔ ”دونوں نے تیرے سامنے ڈر کے مارے ایسی گل بات نہیں کہی۔ پر وہ عدالت میں جا کر یہی کہیں گے جو میں نے تجھے بتایا۔ یہ تو چوہدری نور الہی کے کلیم کے کاغذات سے ثابت ہو جائے گا کہ اس کا وارث کون ہے۔“

”تو نے کسی وکیل کھلیل سے اس سلسلے میں مشورہ کیا ہے؟“ تھانیدار کا لہجہ اس دفعہ بدلا ہوا تھا۔

لالی نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا۔ خوف اور دہشت کے حصار سے وہ رفتہ رفتہ باہر نکل رہا تھا۔ اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”ابھی تو جی مشورہ نہیں کیا۔ پر بعد میں تو کیا جاسکتا ہے۔“

”جو تیرا جی کرے ضرور کرنا۔ یہ تیرا اور ارشاد الہی کا معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لیتا۔“ تھانیدار نے اپنی غیر جانب داری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ ”پر مجھے جو تفتیش کرنی ہے وہ تو کرنی ہی کرنی ہے۔ اس سلسلے میں تجھ سے بعد میں گل بات کروں گا۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لالی کی جانب ہاتھ اٹھاتے ہوئے کانٹیل کو ہدایت کی۔ ”اسے لے جا۔ حوالات میں بند کر دے۔“

ایس ایچ او شاہ نواز خان اعوان نے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور دفتر سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کانٹیل نے مڑ کر لالی کی طرف دیکھا۔ اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ کانٹیل دروازے کی جانب بڑھا۔ لالی اس کے پیچھے پیچھے چلا۔



شام کو احسان علی شاہ کی جیب تھانے کے باہر آکر رکی۔ نادر خان نیچے اترا اور تھانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تھانیدار شاہ نواز خان اعوان اس کے ہم راہ تھا۔ دونوں خاموشی سے جا کر جیب میں بیٹھ گئے۔ جیب آگے بڑھی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔

جیب پیراں والہ پہنچ تو پھر رات گزر چکی تھی۔ جاڑوں کی رات تھی۔ سرشام ہی سناٹا پڑ گیا تھا۔ تھانیدار اور نادر خان جیب سے باہر نکلے۔ حویلی کے مہمان خانے میں پہنچے۔

آتش دان میں انگارے دھک رہے تھے۔ احسان شاہ آتش دان کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ تھانیدار کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اٹھا۔ گرم جوشی سے بھل گیا ہوا۔ تھانیدار کو صوفے پر بٹھایا۔

احسان علی شاہ کا فیخبر مہمان علی بھی کمرے میں موجود تھا۔ نادر خان بھی اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دونوں خاموش تھے۔

”شاہ نواز۔“ احسان شاہ نے تھانیدار کو مخاطب کیا۔ ”تو نے تینوں کی پٹائی شائی بھی کرائی؟“

”وہ تو جی کرائی ہی تھی۔“ تھانیدار نے جواب دیا۔ ”اس کے بغیر کیسے کام چلتا۔“

”انھوں نے کچھ کام کی گل بات بتائی؟“ احسان شاہ نے دریافت کیا۔

”زیادہ تارچہ کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ تینوں نے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔“ تھانیدار نے احسان شاہ کو مطلع کیا۔ ”نادر خان کی اطلاع بالکل درست ہے۔ ارشاد الہی اور اس کی ماں اڈہ لاریاں جو ند سنگھ والا پر بھیک مانگتے تھے۔ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا۔ پر تجھے یہ پتہ نہیں ارشاد الہی پہلے تھمیرا تھا۔ لالی بھی تھمیرا رہ چکا ہے۔ دونوں ایک ہی بھٹے پر کام کرتے تھے۔ وہیں دونوں میں میل جول پیدا ہوا۔“

”لالی تھمیرا رہ چکا ہے؟“ نادر خان نے حیرت سے تھانیدار کو دیکھا۔ ”وہ تو خود کو کھیل پور کا زمیں دار بتاتا تھا۔ کوئلہ ہر کشن میں اس شان سے آیا تھا کہ میں تو اسے زمیں داری سمجھا۔“

”مجھے بھی پہلے اس نے یہی بتایا تھا۔“ تھانیدار نے کہا۔ ”لیکن تتر پڑ کے بعد تینوں میرے سامنے پیش کیے گئے تو ساری زمیں داری شمس داری بھول گئے۔ گڑگڑانے لگے۔ فریاد کرنے لگے۔ سب کچھ اگل دیا۔“

”تب تو تینوں کے خلاف سیدھا سیدھا دھوکا دی کا کیس بنتا ہے۔“ احسان علی شاہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”دھوکا دی کا کیس ہی تو نہیں بنتا۔ ورنہ سارا جھگڑا ہی ختم ہو جاتا۔“ تھانیدار نے صاف گوئی سے کام لیا۔ ”تینوں آسانی سے اندر ہو جاتے۔ سزا بھی لمبی ہو جاتی۔“

”دھوکا دی کا کیس کیوں نہیں بنتا؟“ مہمان علی نے دریافت کیا۔

”یار مہمان علی تو نے اپنے یہ بال کہاں سفید کر لیے؟“ تھانیدار نے مسکرا کر طنز لہجے میں مہمان علی کو مخاطب کیا۔ ”یہ تو سوچ اتنی دڈی زمین داری اور جائیداد پر کوئی بھکاری یا بھیسے کا معمولی تھمیرا دعویٰ کرنے کی کیسے ہمت کر سکتا ہے؟ اس کے دعوے کی کچھ تو بنیاد ہوگی۔ ایسے ہی تو زمیں

داری اور جائیداد لینے نہیں چلے آئے۔“ اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ ”کیس کی نوعیت سے پتہ چلتا ہے کہ ارشاد الہی کوئلہ ہر کشن کے زمیں دار چوہدری نور الہی مرحوم کا پتر ہے اور کلثوم بی بی اس کی بیوہ ہے۔ اگر معاملہ عدالت میں گیا تو ارشاد الہی کا وکیل محکمہ سٹیلٹس کے ریکارڈ سے ثابت کر دے گا کہ دونوں چوہدری نور الہی کے وارث ہیں۔ تلاش کر کے اور بھی دستاویزی ثبوت میا کیے جاسکتے ہیں۔ گواہ بھی آسانی سے مل جائیں گے۔ گورداس پور کے ادھر بہت مہاجر ہیں۔ ان میں موضوع نصیر پور کے رہنے والے بھی ہوں گے۔“

”کوئی اور کیس بنا کر تینوں کو اندر نہیں کرایا جاسکتا؟“ احسان علی شاہ نے پوچھا۔

”اندرونی کروانا ہے تو ارشاد الہی اور اس کی ماں کو انسداد آمدگری ایکٹ کے تحت آسانی سے جیل بھجوا دیا جاسکتا ہے۔ اصلی دعویدار تو وہی دونوں ہیں۔“ تھانیدار شاہ نواز خان نے وضاحت کی۔ ”لیکن یہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ ۴۹ ہے اور اس دفعہ کے تحت زیادہ سے زیادہ چھ مہینے کی سزا ہوگی۔ رسہ گیری یا چوری ڈکیتی کا کیس بھی مشکل سے بنے گا اور اگر بن بھی گیا تو زیادہ لمبی سزا نہیں ہوگی۔“ اس نے احسان شاہ کے چہرے کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ ”شاہ جی، کیس کے ان پہلوؤں پر وکیل کے ساتھ بیٹھ کر ہم پہلے ہی دیر تک غور کر چکے ہیں۔ اور آخر اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ ایسے فوجداری مقدمات سے تیرا کام نہیں بنے گا۔ یہ جائیداد کا جھگڑا ہے۔ سیدھا سیدھا سول کیس ہے۔ اس کا فیصلہ تو عدالت دیوانی سے ہو گا۔ اسے لڑنے کے لیے تیرا کیس بہت کمزور ہے۔ میری یہ رائے وکیل نے بھی تسلیم کی تھی۔“

”جب کوئی مضبوط کیس ہی نہیں بنتا تو فیرتینوں کا شکای کیوں نہ ختم کر دیا جائے۔“ احسان علی شاہ کی آنکھیں آتش دان میں دھکے ہوئے انگاروں کی سرخ سرخ آج میں کچھ زیادہ ہی سرخ نظر آنے لگیں۔ چہرے سے سفاکی جھلکنے لگی۔ ”لاشیں بھی آسانی سے ٹھکانے لگائی جاسکتی ہیں۔“

”شاہ جی، پہلے بھی تو ایسا کہہ چکا ہے۔ میں ایک بار فیرتجھے کوں گا۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دے۔ ایسے خطرناک جکر میں نہ پڑ۔“ تھانیدار کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی۔ ”تینوں پتہ ہے، میرے خلاف قتل کے ایک کیس میں پہلے ہی انکوائری ہو رہی ہے۔ میرے تھانے کی حدود میں ایک نہیں اکٹھے تین قتل ہو گئے تو میں مارا گیا۔“ اس کا لہجہ ٹھیکھا ہو گیا۔ ”کیا تو میری نوکری لیتا چاہتا ہے۔“

”کچھ اور سوچ۔“ احسان علی شاہ نے زور دے کر کہا۔ ”یہ سمجھ لے کوئلہ ہر کشن کی زمیں داری میں نے ہرگز ہرگز نہیں چھوٹی۔“ اس کا لہجہ درشت ہو گیا۔ ”میں یہ دیکھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی

تھانیدار نے اپنے موقف کی وضاحت کی۔ ”ویسے بھی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ لالی ہویا کوئی اور وہ لاکھوں روپے کی اتنی وڈی جائیداد صرف ۵۰ ہزار میں دینے پر کیسے تیار ہو جائے گا؟ وہ وکیل کے ساتھ جا کر تھانے میں رہت درج کرائیں گے کہ شاہ جی نے ان سے زبردستی دستاویز پر دستخط کروا لیے۔ اعانت جرم کے الزام میں مجھے بھی ساتھ میں شامل کریں گے کہ میں نے تھانے میں لے جا کر ان پر دباؤ ڈالا۔ ڈرایا دھمکایا۔ میرے خلاف جس بے جا میں رکھے، مار پیٹ اور تشدد کرنے کے الزام میں دفعہ ۳۰ کے تحت مقدمہ چلائیں گے۔ ابھی تو وہ بالکل ننگے بھوکے ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں۔ ۵۰ ہزار روپے ان کے ہاتھ میں آئے تو اسی سے شاہ جی کے خلاف شان سے مقدمہ لڑیں گے۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ احسان شاہ سر جھکائے گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مہرمان علی اور نادر خان بھی گم صم تھے۔ آتش دان میں سلگتی ہوئی لکڑیوں میں سے ایک زور سے چٹخی۔ ایک شرارہ تیزی سے ابھرا اور روشنی کی لکیر بناتا ہوا فضا میں بکھر گیا۔

احسان شاہ نے چونک کر آتش دان کی جانب دیکھا اور لمحہ بھر تک ٹنٹکی باندھے انگاروں کو دیکھتا رہا۔ پھر تھانیدار کی طرف متوجہ ہوا۔ ”شاہ نواز، تو یہ چاہتا ہے کہ میں کوئلہ ہرکشن کی زمیں داری ان بھک متکوں کو دے دوں۔ یہ نہیں ہوگا۔“ اس کے چہرے پر غم و غصے کے سائے پھیل گئے۔ ”تو میری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟ تیری یاری میرے کب کام آئے گی؟“

”شاہ جی۔“ تھانیدار نے احسان شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”۵۰ ہزار انھیں دینے کی بجائے تو مجھے دے سکتا ہے؟“

”یہ روپے تو لے لے۔ پر میرا کام بکا ہونا چاہیے۔“ احسان علی شاہ فوراً رضامند ہو گیا۔

”رب سونہ، مجھے اس میں سے ایک پیسہ بھی لینا حرام ہے۔“ تھانیدار نے قسم کھا کر احسان شاہ کو باور کرانے کی کوشش کی۔ ”اگر ایک بندہ ہوتا تو دس ہزار ہی میں کام بن جاتا۔ لیکن وہ اکٹھے تین ہیں۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”اب تک تو لیتا ہی رہا مگر تیری خاطر اس دفعہ رشوت دوں گا اور ان سب کو دوں گا جن سے مجھے کام کرانا ہے۔“

”مگر تو میرا کام کرائے گا کیسے؟“ احسان علی شاہ نے پوچھا۔ ”روپے تو میں تجھے کل ہی صبح پہنچا دوں گا۔“

”یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔“ تھانیدار نے ٹھل کر بات نہیں کی۔ ”میں چاہتا ہوں تیرا کام بھی بن جائے اور کوئی خطرہ بھی مول لینا نہ پڑے۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”شاہ جی اب مجھے

بھک منگایا کی کوئلہ ہرکشن میں زمیں داری کرے جس کا میں زمیں دار رہ چکا ہوں۔ اب تو یہ میری عزت اور آن کا سوال بن گیا ہے۔“

کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر مہرمان علی کی آواز ابھری۔ ”اب تو ایک ہی صورت رہ جاتی ہے۔“

”وہ کیا ہے؟“ تھانیدار نے دریافت کیا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ارشاد الہی اور اس کی ماں سے سمجھوتہ کر لیا جائے؟“ مہرمان علی نے دہلی زبان سے اپنی تجویز پیش کی۔ ”انھیں یہ پیشکش کی جائے کہ وہ کچھ رقم لے کر اپنے دعوے سے دست بردار ہو جائیں اور شاہ جی کے نام زمیں داری اور جائیداد مشکل کرنے پر راضی ہو جائیں۔ دونوں بھک ننگے ہیں۔ آسانی سے تیار ہو جائیں گے۔ تھانے میں ایسے ایسے اچھے اوصاحب کی طرف سے دباؤ ڈالا جائے تو کام آرام سے بن جائے گا۔“

”یہ تجویز مہرمان علی نے پہلے بھی پیش کی تھی۔ اور میں نے اس کی مخالفت کی تھی۔“ نادر خان نے مہرمان علی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہونے کی بہت لمبی کہمت مانگیں گے۔ تب تک مجھے پتہ نہیں تھا کہ وہ بھک ننگے اور بالکل کنکال ہیں۔ اب تو صورت حال ہی بدل گئی۔ وہ بہت کم پر تیار ہو جائیں گے۔“

”میں تو سمجھتا ہوں زیادہ سے زیادہ ۵۰ ہزار میں معاملہ طے ہو سکتا ہے۔“ مہرمان علی نے براہ راست احسان علی شاہ کو مخاطب کیا۔ ”شاہ جی، کیا خیال ہے۔ اتنے روپے پر سمجھوتہ کیا جاسکتا ہے؟“

”پچاس ہزار تک تو میں دینے کو تیار ہوں۔ بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی دے دوں گا۔“ احسان علی شاہ نے مہرمان علی کی تجویز بادل خواستہ قبول کر لی۔ ”جب ان کے خلاف کوئی مضبوط کیس ہی نہیں بننا تو اور کیا بھی کیا جاسکتا ہے۔“

”شاہ جی، ایسا ہرگز نہ کرنا۔“ تھانیدار نے مہرمان علی کی تجویز سختی سے مسترد کر دی۔ ”ایسا کیا گیا تو مجھے ڈر ہے ۵۰ ہزار روپے کے ساتھ ساتھ کوئلہ ہرکشن کی زمیں داری بھی ہاتھ سے نکل جائے گی۔“

”وہ کیسے؟“ مہرمان علی نے حیران و پریشان ہو کر اپنے فوری رد عمل کا اظہار کیا۔

”سمجھوتہ کی دستاویز پر دستخط ہونے کے بعد جب ۵۰ ہزار روپے مل جائیں گے تو لالی ان کو کسی وکیل کے پاس لے جائے گا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ بالکل ایسا کرے گا۔ وہ بہت ہوشیار بندہ ہے۔“

جانے دے۔ تیرے کام کے لیے ابھی سے کوشش کرنی ہوگی۔“ تھانیدار شاہ نواز اعوان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”تیرا کام تو ہو جائے گا لیکن میرے کام کا کیا بٹا؟“
 ”تو میرا کام نہ بھی کرتا تب بھی تیرا کام تو مجھے کرا تا ہی تھا۔“ احسان علی شاہ نے تھانیدار کو یقین دلایا۔ ”تو اس کی فکر نہ کر۔ تیرے کام کے لیے کل ہی لوہر جا رہا ہوں۔“
 احسان علی شاہ بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔



حوالات سے قتل کے دونوں ملزم جا چکے تھے۔ اب صرف ارشاد الہی، اس کی ماں اور لالی رہ گئے تھے۔ رات ہو چکی تھی۔ مگر ارشاد الہی پولیس کی مار سے ابھی تک سنبھلا نہیں تھا۔ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ کڑٹ بھی بدلتا تو بدن سے ٹیس اٹھتی۔ وہ فرش پر بندھال پڑا تھا۔ قریب ہی اس کی ماں لیٹی تھی۔ وہ دل گرفتہ اور بے بسی تھی۔ کوئلہ ہر کشن کے قیام کے دوران اس نے مستقبل کے جو سنہرے خواب دیکھے تھے، کبھر کرتا کرتا ہو چکے تھے۔

لالی کے بھی کمر اور پیٹھ میں شدید درد ہو رہا تھا۔ مگر وہ حوصلے والا تھا۔ کئی بار اس سے بھی زیادہ سخت مار کھا چکا تھا۔ اس نے ارشاد الہی اور اس کی ماں کو تسلی دینا چاہی مگر انھوں نے بے رخی اختیار کی۔ سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ لالی نے ان کے رویے میں یہ تبدیلی دیکھی تو صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن دونوں مطلق نہ پیچھے، بلکہ ارشاد الہی کی ماں نے نفرت سے منہ بگاڑ کر جھڑک دیا۔

”وے تنگ نہ کر۔ ہم نے اب تجھ سے کوئی گل بات نہیں کرنی۔“
 لالی نے ڈھیٹ بن کر اسے منانے کی کوشش کی۔ ”بے بے بہت نراض ملوم ہوتی ہے۔ مجھے بتا، تو اتنی نراض کیوں ہے؟“

کٹھن بی بی نے اسے گھورا اور ایسا منہ پھیرا کہ دوبارہ ہلٹ کر نہ دیکھا۔

تینوں کھانا کھا چکے تھے۔ انھیں کبیل بھی دیے گئے تھے۔ مگر بہت بوسیدہ اور گندے تھے۔ ان میں جوئیں بھی تھیں۔ لیکن انھیں اوڑھ کر وہ سردی سے کسی قدر محفوظ رہ سکتے تھے۔ وہ فرش پر خاموش لیٹے تھے۔ انھیں کچھ خبر نہیں تھی کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ صرف لالی نے انیس ایچ او کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ تینوں کو دھوکا اور قریب وہی کے الزام میں گرفتار کر کے حوالات میں بند کیا گیا ہے۔ لیکن وہ صفائی پیش کر چکا تھا اور مزید صفائی پیش کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔
 تینوں رات گئے تک جاگتے رہے۔ حوالات کے باہر پولیس والوں کے بولنے اور بھاری بھاری

بوٹوں سے چلنے پھرنے کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن ان کے پاس کوئی نہ آیا۔
 آدھی رات سے کچھ پہلے تینوں سو گئے۔

صبح ہو گئی۔ کوئی ان کے پاس نہ آیا۔ دن چڑھے انھوں نے ایس ایچ او کو اپنے دفتر میں جاتے ہوئے دیکھا۔ مگر اس نے تینوں میں سے کسی کو اپنے دفتر میں نہ بلایا۔ بہت دیر بعد وہ باہر نکلا۔ تینوں نے لوہے کی سلاخوں والے دروازے کے پیچھے سے اسے دیکھا۔ لیکن اس نے مڑ کر ایک نظر بھی ان پر نہ ڈالی۔ خاموشی سے چلا گیا۔

دوپہر ہو گئی۔ لیکن نہ کوئی کانٹیل ان کے پاس آیا اور نہ ہی کھانے کو کچھ ملا۔ وہ شام تک انتظار کرتے رہے۔ بھوک نے ستیا تو لالی نے لوہے کا دروازہ ہلا ہلا کر شور مچایا۔ کھانے کو مانگا۔ ارشاد الہی تو چیپ پڑا رہا۔ مگر اس کی ماں چپ نہ رہی۔ اس نے بھی چیخنا چلانا شروع کر دیا۔
 وہ زیادہ دیر ہنگامہ برپا نہ کر سکے۔ چار کانٹیل شام کے دھندلکے میں حوالات کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ انھوں نے تنگی تنگی گالیاں دیں۔ تھپڑوں اور لاتوں سے تینوں کو بے رحمی سے مارا پیٹا۔ ان کے جسم پر جو لباس تھا اسے بھی نوچ ناچ کر تار تار کر دیا۔ کھانے کو بھی کچھ نہ دیا۔ واپس گئے تو کبیل بھی اٹھا کے لے گئے۔

پہر رات گزر گئی۔ تینوں بھوک سے بڑھال تھے۔ اور ٹھنڈے فرش پر لیٹے سردی سے کپکپا رہے تھے۔ دفعہ ”حوالات کا دروازہ کھلا۔ اس دفعہ تین کانٹیل اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑی بڑی بالٹیاں دبی تھیں۔ ان میں کچھ اور غلاطت ملا ہوا کالا کالا پانی بھرا تھا۔ ارشاد الہی، اس کی ماں اور لالی نے ان کو دیکھا۔ مگر سسے ہوئے پڑے رہے۔ کانٹیلوں نے گندے پانی سے بھری ہوئی بالٹیاں تینوں پر الٹ دیں۔ انھوں نے احتجاج کیا تو کانٹیلوں نے ٹھوکریں مار مار کر اور ڈانٹ ڈپٹ کے خاموش کر دیا۔

تینوں پہلے ہی سردی سے کپکپا رہے تھے۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی جسم پر پڑا تو سردی سے ان کا اور برا حال ہو گیا۔ دو کانٹیل حوالات کے باہر دروازے پر تعینات تھے۔ وہ وقفے وقفے سے اندر جاتے تینوں کو جھنجھوڑتے اور زور زور سے ٹھوکریں مارتے۔ تمام رات وہ یہی کارروائی کرتے رہے۔ نہ خود سوئے اور نہ ہی ارشاد الہی، اس کی ماں اور لالی کو سونے دیا۔

دن نکلا، کانٹیلوں کی ڈیوٹی بدل گئی۔ دو نئے کانٹیل آگئے۔ وہ بھی وقفے وقفے سے اندر جاتے۔ جھنجھوڑتے، لاتیں مارتے، ٹھوکریں لگاتے۔ طرح طرح سے ستاتے۔ انھوں نے دن میں بھی تینوں کو سونے نہ دیا اور نہ ہی کھانے کو کچھ دیا۔

شام کو دونوں کانٹیل چلے گئے۔ دو نئے کانٹیل ڈیوٹی پر آگئے۔ انھوں نے بھی لالی، ارشاد الہی اور اس کی ماں کو نہ کھانے کو کچھ دیا اور نہ ہی سونے دیا۔ رات بھر تینوں کو نگلی نگلی گالیاں دیتے رہے۔ ڈانٹتے ڈپٹتے رہے۔ جھنجھوڑتے رہے۔ ٹھوکریں اور لاتبیں مارتے رہے۔ انھیں بیدار رکھنے کے لیے طرح طرح کے حربے آزما تے رہے۔ بھوک اور شب بیداری سے وہ اس قدر بے حال تھے کہ نہ بول سکتے تھے نہ بات کر سکتے تھے اور نہ ہی کسی طور احتجاج کر سکتے تھے۔ جاڑوں کی یہ طویل اور سرد رات بھی تینوں نے سخت اذیت اور کرب کے عالم میں بسر کی۔

صبح ہوتے ہی رات کی شفٹ کے کانٹیل رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے ٹھنڈے بھر بعد صرف ایک کانٹیل آیا۔ وہ ان کے لیے کھانا بھی لایا مگر مسلسل فائدہ کشی اور شب بیداری کے باعث وہ اس قدر ناتواں اور بڑھال تھے کہ ان سے کچھ کھایا نہ گیا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی تینوں کے ہاتھوں میں ہتکڑیاں ڈالی گئیں اور کانٹیلوں کی نگرانی میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا دیا گیا۔

عدالت میں پولیس کی جانب سے ان کے خلاف چالان پیش کیا گیا جس کے مطابق تینوں کی گرفتاری لیونٹک ایکٹ کے تحت عمل میں آئی تھی۔ پولیس نے انھیں پاگل اور جنونی قرار دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا تھا کہ سمیان لالی اور ارشاد الہی اور مسات کلٹوم بی بی لاوارث اور بے سارا ہیں۔ کوئی ان کی دیکھ بھال اور نگہداشت کرنے والا نہیں۔ ان کو اگر آزاد اور کھلے بندوں گھومنے پھرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تو وہ حالت جنون میں نہ صرف اپنی بلکہ دوسروں کی زندگی کے لیے شدید خطرے کا باعث بن سکتے ہیں۔ لہذا عدالت مجاز سے درخواست کی جاتی ہے کہ امن عامہ کے بہترین مفاد میں انھیں اس وقت تک نظر بند رکھنے کے احکامات صادر کئے جائیں جب تک ان کا ذہنی توازن درست نہ ہو جائے۔

عدالت کی کارروائی شروع ہوئی تو مجسٹریٹ کے روبہ رو تینوں کی پیشی ہوئی۔ پیش کرنے ان کے مقدمے کی مسل مجسٹریٹ کے ملاحظے کے لیے پیش کی۔ اس نے مسل کھولی۔ پولیس کے چالان کا مطالعہ کیا۔ گردن اٹھا کر تینوں کو غور سے دیکھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ بال خاک وھول اور میل سے اٹے ہوئے تھے۔ چہرے اور لباس کچھ زار و گندے پانی سے آلودہ ہو کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ مسلسل جاگنے سے آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ لالی کی شلوار کا ایک پا پنجا غائب تھا۔ دوسرا نصف سے بھی کم رہ گیا تھا۔ قمیص پر جگہ جگہ چھترے لگ رہے تھے۔ آستینیں بھی غائب تھیں۔ ارشاد الہی کے جسم پر میلی چیکٹ قمیص تھی اور شلوار پھٹ کر جاتکیا بن گئی تھی۔ اس کی ماں

کے سر سے دوپٹہ غائب تھا۔ کرتا اور شلوار اس طرح چھٹے ہوئے تھے کہ وہ نیم برہنہ ہو گئی تھی۔ تینوں سسے ہوئے خاموش کھڑے تھے۔ ان کے گھٹاؤ نے چروں پر وحشت برس رہی تھی۔ وہ پٹی پٹی آنکھوں سے مجسٹریٹ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے سروں میں جو کس پڑ گئی تھیں۔ وہ بے چین ہو کر بار بار اپنے بالوں کو کھڑکھڑکھا رہے تھے۔ وضع قطع اور حلے سے تینوں پاگل اور سودائی نظر آ رہے تھے۔

مجسٹریٹ کنگلی باندھے ذرا دیر تک ان کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر سر جھکا کر فیصلہ لکھنے لگا۔

لالی کھڑا سوچ رہا تھا کہ وہ عدالت کو اس ظلم و ستم سے آگاہ کرے گا جو اس پر ارشاد الہی اور اس کی ماں پر پچھلے چند روز میں پولیس کے ہاتھوں ڈھایا گیا تھا۔ مقدمے کی نوعیت اور اصل حقیقت تفصیل سے مجسٹریٹ کے سامنے بیان کرے گا۔ لیکن مجسٹریٹ نے نہ اس سے کوئی سوال کیا نہ ہی اس کا بیان ریکارڈ کیا۔ تینوں سے سرے سے کوئی بات ہی نہیں کی۔

لالی خاموش کھڑا سوچتا رہا اور مجسٹریٹ سر جھکائے لکھتا رہا۔ اس نے پولیس کے موقف کی تائید کرتے ہوئے یہ حکم جاری کیا کہ جیل کا ڈاکٹر حسب قاعدہ تینوں کا معائنہ کرے اور اگر وہ بھی اپنی طبی رپورٹ میں انھیں پاگل اور ذہنی عدم توازن کا شکار قرار دے تو تعزیرات پاکستان کے دفعہ ۶ کے تحت ان کے خلاف ضابطے کے کارروائی عمل میں لائی جائے۔

مجسٹریٹ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پولیس کی نگرانی میں تینوں کو ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا۔ لالی نے ڈسٹرکٹ جیل کو دیکھا تو یہ سمجھا کہ مجسٹریٹ نے جو ڈیشل ریماڈر پڑا۔ کو جیل میں رکھنے کا حکم دیا ہے۔ ابھی مقدمے کی سماعت مکمل نہیں ہوئی۔ وہ اس جیل میں پہلے بھی حوالاتی کی حیثیت سے رہ چکا تھا۔ لہذا اسے بخوبی علم تھا کہ جن لمزموں کے مقدمات زیر سماعت ہوتے ہیں انھیں سینٹرل جیل کے بجائے ڈسٹرکٹ جیل میں رکھا جاتا ہے۔ وہ زیادہ سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ آئندہ پیشی پر وہ اپنے بیان میں کیا کہے گا اور کس طرح تینوں کو مظلوم اور بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کرے گا؟

جیل میں پہنچنے کے بعد ڈاکٹر نے تینوں کا طبی معائنہ کیا۔ مگر اس نے بھی مطلق پوچھ گچھ نہ کی۔ چند ہی منٹ میں تینوں کو نبٹا دیا اور ان کے پاگل اور جنونی ہونے کی تصدیق کرتے ہوئے اپنی رپورٹ جیلر کو پہنچا دی۔

ارشاد الہی اور اس کی ماں کو کچھ خبر نہ تھی کہ ان کے خلاف کیا کارروائی کی جا رہی ہے۔ لالی بھی صورت حال سے قطعی بے خبر تھا۔ مگر جب اسے اور ارشاد الہی کو اس عقوبت خانے میں داخل

”شاہو! کیسی طبیعت ہے؟“

ارشاد الہی آنکھیں بند کیے خاموش لیٹا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ لالی نے اصرار کیا۔ لمبے میں اور نرمی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ ”بہت طبیعت خراب ہے؟“ اس نے قدرے تامل کے بعد پوچھا۔ ”یار کچھ تو بتا۔ کیسی طبیعت ہے؟“

ارشاد الہی نے آنکھیں کھول کر لالی کو دیکھا۔ جھنجھلا کر بولا۔ ”کیسی بھی طبیعت ہے، تجھے اس سے کیا لینا؟“

”یار، تو بھی اپنی ماں کی طرح مجھ سے نراض ہے۔“ لالی نے فحش رفع کرنے کی کوشش کی۔ میں تو تم دونوں کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ تجھے اور تیری ماں کو کوئلہ ہرکشن کی زمیں داری اور جائیداد مل جاتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ اتنی خوشی ہوتی کہ میں تجھے بتا نہیں سکتا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس مری۔ ”پر میری طرح تم دونوں کی بھی کسمت خراب ہے۔“

ارشاد الہی نے کسی رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانس بھرتا رہا۔ کچھ دیر اسی عالم میں پڑا رہا۔ پھر اس نے کروٹ بدلی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ لالی نے زبردستی کچھ نہ کہا۔ ارشاد الہی بھی خاموش لیٹا تھا اور رک رک کر کھانسنے رہا تھا۔

ان دونوں کے علاوہ کئی پاگل قیدی وہاں اور بھی موجود تھے۔ تین تو ایسے تھے جو اس وارڈ میں س سال سے بھی زیادہ عرصے سے قید تھے اور ایک بوڑھا تو اتنا نحیف و ناتواں تھا کہ بولتا تھا تو آواز ہی لڑکھڑاتی تھی۔ مگر سب اس وقت خلاف معمول خاموش تھے۔ لالی بھی خاموش تھا اور سر ہٹائے گم صم بیٹھا تھا۔ یکایک پشت کی جانب سے کسی نے ادبھی آواز میں صدا لگائی۔

”اؤئے بھول جا۔“

لالی چونکا۔ پلٹ کر دیکھا۔ ایک پاگل بائیں پیر کے گھٹنے پر دایاں پیر نکائے نہایت اطمینان سے آسن جمائے ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر لالی سخت حیران و پریشان ہوا۔ وہ سلیم لودھی تھا۔ ہاں وہی تھا۔ لالی نے اسے پہچان لیا۔ مگر اب وہ بالکل بدل چکا تھا۔ اس کی حجامت بڑھی ہوئی تھی۔ سر کے بال سرکنڈوں کی مانند کھڑے تھے۔ چہرے پر بھریاں تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ وہ ٹوٹ پھوٹ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔

لالی حیرت سے آنکھیں پھاڑے سلیم لودھی کو دیکھ رہا تھا جسے اس بار بھی تخریب کاری اور ملک دشمن سرگرمیوں کے الزام میں نظر بند کیا گیا تھا۔ اسے گرفتار کر کے پہلے شاہی قلعہ لاہور کے عقوبت خانے میں لے جایا گیا تھا جہاں اس قدر ذہنی اور جسمانی تشدد کیا گیا کہ وہ اپنا ذہن تو اڑا

کیا جانے لگا جس میں پاگلوں کو قید رکھا جاتا تھا تو لالی بہت سٹ پٹایا۔ اس نے گھبرا کر احتجاج کیا۔ ”اؤئے نمبردار! یہ تو چریا وارڈ ہے۔ اس میں کیوں بند کر رہا ہے؟“ وہ لال ٹوپی والے نمبردار کی جانب متوجہ ہوا۔ ”یار، میں پاگل شاگل نہیں ہوں، میرا داغ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔“

نمبردار نے منہ بگاڑ کر اسے غصے سے ڈانٹا۔ ”اؤئے چپ کر۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند نمودار ہوا۔ ”ہر پاگل یہاں آکر شروع شروع میں ایسی ہی بکواس کرتا ہے۔“ اس نے دھکا دے کر لالی کو اندر کر دیا۔ لالی برابر واپس آکر رہا۔ ”نمبردار، میری گل تو سن۔ یار، میری گل تو سن۔“ مگر اس نے لالی کی ایک نہ سنی۔ پلٹ کر ارشاد الہی کو دیکھا۔ وہ حیران و پریشان کھڑا نکر نکر اس کا منہ تک رہا تھا۔ نمبردار نے ایک ہاتھ سے اپنی لال ٹوپی درست کی اور دوسرے ہاتھ سے ارشاد الہی کو زور سے دکھا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ نمبردار نے دروازہ بند کیا۔ تالا لگایا۔ بے نیاز سے سے مڑا اور آگے بڑھ گیا۔

قریب ہی زنانہ پاگل خانہ تھا۔ ارشاد الہی کی ماں کو اس میں پہنچا دیا گیا۔ پاگل خانے کی کوٹھڑی میں دو عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ دونوں ہی سڑی سودائی تھیں۔ کلثوم بی بی کو دیکھ کر انھوں نے بے ڈھنگے پن سے قہقہے لگائے۔ طرح طرح سے تشکیں بتائیں۔ اوٹ پٹانگ بائیں کیں۔ خود کو ازار کے زرنے میں پا کر کلثوم بی بی اس قدر حواس باختہ ہوئی کہ چیختے چلانے لگی۔

”ہائے میں مر گئی۔ یہ تو پاگل خانہ ہے۔“ وہ غضب ناک ہو کر پاگل اور دیوانی عورتوں کو ڈانٹنے پھینکارنے لگی۔ ”چپ کر و کجرو۔ پرے ہو۔ میں پاگل شاگل نہیں ہوں۔“ اس نے چیخ چیخ کر لالی کو بھی گالیاں اور کوسنے دیے۔ ”دے لالی حرام دے۔ تیرا بیڑا ڈبے۔ ہم جو ند سنگھ والا میں بھلے چنگے تھے۔ خانہ خراب، تو ہمارے ہمیں وہاں سے لے آیا اور یہاں پاگل خانے میں ڈلوادیا۔ دے تیرا گلہ نہ رہے۔ تو مر جائے۔“

کلثوم بی بی کی چیخ پکار چریا وارڈ میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ لالی نے اس کے کوسنے اور طعنے سے تو سخت پریشان ہوا۔ غصہ بھی آیا اور دکھ بھی ہوا۔ اپنی بے بسی اور مجبوری پر دل ہی دل میں کڑھ رہا۔ پھر وہ ارشاد الہی کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ فرش پر بے حال پڑا تھا۔ رک رک کر کھانسنے رہا تھا۔ کھانسنے کھانسنے اس نے ایک بار تھوکا تو بلغم کے ساتھ کیں کیں خون بھی ملا ہوا تھا۔ لالی گھبرا کر اس کی جانب بڑھا اور قریب جا کر بیٹھ گیا۔ اس نے ارشاد الہی کے ماتھے پر ایک ہاتھ رساں سے رک دیا۔ ماتھا گرم تھا۔ ارشاد الہی کو بخار تھا۔ لالی اور زیادہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

برقرار نہ رکھ سکا۔ لیکن ذہنی امراض کے اسپتال میں داخل کرنے کے بجائے اسے پچھلے مہینے منگمری جیل منتقل کر دیا گیا اور چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رکھا گیا۔ سلیم لودھی اس وقت لالی کی موجودگی سے قطعی بے نیاز تھا۔ اس کے لاغر جسم پر جیل کی وردی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ وہ مراقبہ کے عالم میں بگے کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑا تھا۔ اسی عالم میں اس نے داہنا ہاتھ اٹھایا۔ انگشت شہادت کو چھت کی جانب بلند کیا اور پھر وہی صدا لگائی۔ ”اوائے بھول جا۔“ سلیم لودھی نے اوائے کو اس طرح لمبا کر کے کھینچا کہ اس کی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

لالی نے دل گرفتہ ہو کر سوچا، سلیم لودھی واقعی پاگل اور چریا ہو گیا ہے۔ اس کی اس صدا کا نہ معلوم کیا مطلب ہے۔ لیکن اس خود فراموشی کے عالم میں وہ جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے اور صرف پاگل اور دیوانہ رہ گیا ہے۔ اسے بھی سب کچھ بھول جانا چاہیے۔ یہ بھی بھول جانا چاہیے کہ وہ لالی ہے۔ اب وہ صرف ایک پاگل ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل۔ جیل کے چریا وارڈ میں پاگلوں کے ساتھ رہ کر اسے سلیم لودھی کی طرح پاگل ہی بن کر رہنا ہو گا۔ یہ ایسا وارڈ ہے جس میں داخل ہونے کا تو راستہ ہے مگر واپسی کا کوئی راستہ نہیں۔ اس میں قیدی بننے کے بعد کوئی رہائی پا کر نہیں نکلتا۔ اس کی لاش ہی نکلتی ہے۔

سلیم لودھی نے ایک بار پھر اونچی تان میں صدا لگائی۔ ”اوائے بھول جا۔“

ارشاد الہی پر یکایک شدید کھانسی کا دورہ پڑا۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا اور دونوں ہاتھوں سے سینہ دبوچ کر زور زور سے کھانسنے لگا۔ اس نے کھنکار کر فرش پر تھوکا۔ بلغم کے ساتھ جیتا جیتا خون کا لوتھڑا بھی نکلا۔ ارشاد الہی بدحال ہو کر ایک طرف لڑھک گیا۔

۱۸ ستمبر ۱۹۸۹ء

(ختم شد)

پرم عہدہ دارانہ وقت میں کی گئی ہے۔
 آئینہ شہادت
 کہ ہندوستان کے ہر شہر میں